تبیان الفرقان
فی
تفسیر القرآن
جلد ۵
خلیفہ مجاز
شیخ المحدثین حکیم العصر
حضرت مولانا عبد المجید لدھیانوی
شیخ الحدیث والتفسیر جامعہ اسلامیہ باب العلوم کہروڑ پکا
سابق امیر مرکزیہ
عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت
قطب الاقطاب سلطان الاولیاء
شیخ المشائخ سید نفیس الحسینی شاہ صاحب
سابق امیر مرکزیہ
عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت
نفیس قرآن کمپنی (رجسٹرڈ)
بیسمنٹ مکہ سنٹر ۰ اردو بازار ۰ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تبیان الفرقان
فی
تفسیر القرآن

شیخ المحدثین حکیم العصر
حضرت مولانا عبد المجید لدھیانوی نور اللہ مرقدہ
شیخ الحدیث والتفسیر جامعہ اسلامیہ باب العلوم کہروڑ پکا
سابق امیر مرکزیہ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت

خلیفہ مجاز

قطب الاقطاب سلطان الاولیاء
شیخ المشائخ سید نفیس الحسینی شاہ صاحب نور اللہ مرقدہ
سابق نائب امیر مرکزیہ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت

نفیس قرآن کمپنی (رجسٹرڈ)
۵-لوئر مال ○ بیسمنٹ مکہ سنٹر ○ اردو بازار ○ لاہور
فون: 042-37361460, 0321-320-9464017

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نام کتاب ---------- تبیان الفرقان فی تفسیر القرآن

---------- شیخ المحدثین حکیم العصر حضرت مولانا عبدالمجید لدھیانوی زاداللہ

باہتمام ---------- شیخ الحدیث حضرت مولانا منیر احمد صاحب دامت برکاتہم

سنِ اشاعت ---------- ۱۴۴۲ھ۔۲۰۲۰ء

تعداد ---------- ۱۱۰۰

ناشر ---------- نفیس قرآن کمپنی (رجسٹرڈ) ۵۔لوئرمال ○ بیسمنٹ مکہ سنٹر ○ اُردو بازار ○ لاہور

جامعہ اسلامیہ باب العلوم
کہروڑپکا۔ضلع لودھراں فون نمبر: 0608-342983

مکتبہ عثمانِ غنی
جامعہ دارالقرآن مسلم ٹاؤن فیصل آباد
فون نمبر: 0300-7203324

جامعہ حسینیہ باب العلوم
جڑانوالہ روڈ۔فیصل آباد
فون نمبر: 0321-6670225

مکتبہ رحمانیہ اُردو بازار۔لاہور

اسلامی کتب خانہ
بالمقابل جامعہ اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی

مکتبہ لدھیانوی
سلام کتب مارکیٹ بنوری ٹاؤن۔کراچی
021-34130020
021-24125590

بیت الکتب
بالمقابل اشرف المدارس گلشن اقبال، کراچی

دارالاشاعت اُردو بازار۔کراچی

ادارہ تالیفات اشرفیہ ۔ ملتان

فہرستِ مضامین

***

سورۃ الحجر

آیاتھا ۹۹ ۱۵ سُوْرَةُ الْحِجْرِ مَكِّيَّةٌ ۵۴ رکوعاتھا ۶

سورۂ حجر مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ننانوے آیتیں ہیں اور چھ رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

الٓرٰ قف تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ ①

الٓرٰ۔ یہ کامل کتاب کی اور واضح قرآن کی آیتیں ہیں①

رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ② ذَرْهُمْ يَاْكُلُوْا وَيَتَمَتَّعُوْا وَيُلْهِهِمُ

بار بار چاہیں گے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا کاش! کہ وہ مسلمان ہوتے② ان کو چھوڑ دے کھاتے رہیں عیش اُڑاتے رہیں اور اُمید ان

الْاَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ③ وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ

کو غفلت میں ڈالے رکھے، ان کو عنقریب پتا چل جائے گا③ نہیں ہلاک ہم نے کسی بستی کو مگر اس حال میں کہ اس کے لئے ایک معلوم لکھا

مَّعْلُوْمٌ ④ مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ⑤ وَقَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْ

ہوا وقت تھا④ نہیں سبقت لے جاتی کوئی جماعت اپنے وقت معین سے نہ وہ پیچھے ہٹتے ہیں⑤ اور یہ کافر کہتے ہیں کہ اے وہ شخص جس

نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ⑥ لَوْ مَا تَاْتِيْنَا بِالْمَلٰٓئِكَةِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ⑦

کے اُوپر ذِکر اُتارا گیا بے شک تُو تو دیوانہ ہے⑥ کیوں نہیں لے آتا تُو ہمارے پاس فرشتے اگر تُو سچوں میں سے ہے⑦

مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوْٓا اِذًا مُّنْظَرِيْنَ ⑧ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ

نہیں اُتارتے ہم فرشتوں کو مگر فیصلے کے ساتھ، اور یہ لوگ اس وقت مہلت دیے ہوئے نہیں ہوتے⑧ بے شک ہم نے ہی ذِکر کو اُتارا

وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ⑨ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ شِيَعِ الْاَوَّلِيْنَ ⑩ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ

اور بے شک ہم ہی اس کی البتہ حفاظت کرنے والے ہیں⑨ البتہ تحقیق بھیجا ہم نے آپ سے پہلے پہلی جماعتوں میں⑩ نہیں آتا تھا ان کے

رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ⑪ كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ⑫ لا

پاس کوئی رسول مگر وہ اس کے ساتھ اِستہزا کرتے تھے⑪ ایسے ہی داخل کر دیتے ہیں ہم اِستہزا کو مجرمین کے دِلوں میں⑫

لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۳﴾ وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا

نہیں ایمان لاتے یہ اس قرآن پر اور گزر گیا پہلے لوگوں کا طریقہ ﴿۱۳﴾ اگر کھول دیں ہم ان کے اُوپر آسمان کا دروازہ اور یہ اس دروازے میں

فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ ﴿۱۴﴾ لَقَالُوْٓا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ ﴿۱۵﴾

دِن کے وقت چڑھنے لگ جائیں ﴿۱۴﴾ تو بھی کہیں گے کہ ہماری تو چشم بندی کردی گئی بلکہ ہم پر جادو کر دیا گیا ہے ﴿۱۵﴾

تفسیر

سورۂ حجر کے مضامین کا خلاصہ

متعدد بار آپ کی خدمت میں یہ عرض کیا جا چکا کہ مکی سورتوں میں مضامین ملتے جلتے ہیں، اور زیادہ تر ذکر ان میں اصول کا ہوتا ہے، چنانچہ اسی طرز کے مطابق اس سورۃ کا خلاصہ بھی تقریباً یہی ہے، پہلے قرآنِ کریم کی حقانیت کا ذکر ہے، پھر کُفّار کی تعذیب کا ذکر ہے، اِثباتِ رِسالت ہے، اثباتِ توحید ہے، اللہ تعالیٰ اپنے کچھ انعامات کی تفصیل بیان فرمائیں گے، اور مطیعین کی جزا اور مخالفین کی سزا، نمونے کے طور پر بعض قصص، ایسے ہی مضامین اس سورۃ میں ذکر کیے جائیں گے۔

قرآنِ کریم کا دوصفتوں کے ساتھ ذِکر

الٓرٰ: یہ حروفِ مقطعات میں سے ہیں، اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمُرَادِهٖ بِذٰلِكَ، ان حروف سے اللہ کی جو مراد ہے وہ اللہ ہی بہتر جانتے ہیں، تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ: الکتٰب سے کامل کتاب مراد ہے جس کی پیش گوئی پہلے کتابوں کے اندر مذکور تھی، یہ جو کچھ آپ کو پڑھ کے سنایا جارہا ہے یہ کامل کتاب کی آیتیں ہیں اور واضح قرآن کی آیتیں ہیں، گویا کہ اس کو دوصفتوں کے ساتھ موصوف کیا گیا، یہ کتاب بھی ہے اور قرآن بھی ہے، کتاب میں تو لکھنے والا معنی پایا جاتا ہے اور قرآن میں پڑھنے والا معنی پایا جاتا ہے، گویا کہ اس کی حیثیتیں دونوں ہی ہیں، یہ لکھی بھی جاتی ہے اور پڑھی بھی جاتی ہے، اور جتنی اس کی کتابت ہوئی اور اس کو کتابت کی صورت میں شائع کیا گیا اس کی بھی مثال موجود نہیں، اور جتنی یہ کتاب پڑھی جاتی ہے اس کے مقابلے کا تو وہم بھی نہیں لایا جاسکتا کہ کوئی دوسری کتاب بھی ایسے پڑھی جاتی ہو، دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب یہی قرآنِ کریم ہی ہے، اتنی کیا اس کے لگ بھگ بھی کوئی دوسری کتاب نہیں کہ جس کو پیش کیا جاسکے کہ انسانوں نے سب سے زیادہ اس کو پڑھا ہے یا پڑھی جاتی ہے، اس کے مقابلے میں کسی کا ذکر ہی نہیں کیا جاسکتا، دونوں باتیں اس کے اندر موجود ہیں یہ لکھنے میں بھی آتی ہے پڑھنے میں بھی آتی ہے، ''یہ کامل کتاب کی آیتیں ہیں اور واضح قرآن کی آیتیں ہیں'' ان کا واضح ہونا ہر لحاظ سے ہے، اپنے مفہوم میں واضح ہے، مقصد میں واضح ہے۔

کُفّار کی طرف سے مسلمان ہونے کی آرزو

رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ: رُبَمَا یہ ''رُبَّ'' حروفِ جارہ میں جس کو آپ پڑھتے رہتے ہیں یہ اسی کی تخفیف

ہے، ''مَا'' کافہ آ گیا جس کی بنا پر یہ فعل پر داخل ہو رہا ہے۔ یہ رُبَّ تقلیل کے لئے بھی ہوتا ہے اور تکثیر کے لئے بھی ہوتا ہے، اور یہاں یہ تکثیر کے لئے ہے۔ رُبَمَا یَوَدُّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا: بار بار چاہیں گے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِیْنَ: کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ مسلمان ہوتے۔ لَوْ تمنائیہ ہے۔ وَدَّ یَوَدُّ: چاہنا۔ ''بار بار چاہیں گے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا'' کیا چاہیں گے؟ اس کا بیان آ گیا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِیْنَ کاش! کہ وہ مسلمان ہوتے۔ اور اگر اس کو تقلیل کے لئے لیا ہو تو حضرت شیخ (الہندؒ) کا ترجمہ اسی بات کی طرف ہی مشیر ہے، وہ ترجمہ کرتے ہیں ''کسی وقت آرزو کریں گے یہ لوگ'' یعنی کوئی وقت ایسا آئے گا، اب تو یہ اپنی تکذیب کے اوپر ناز کر رہے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ جو کچھ ہم کیے جا رہے ہیں یہی کامیابی کا راستہ ہے یہی بہتر راستہ ہے، لیکن کوئی وقت آئے گا جب کافر لوگ تمنا کریں گے کہ ہائے کاش! ہم اس قرآن کو ماننے والے ہوتے۔ وقت کب آئے گا؟ جس وقت دنیا میں یہ اللہ کے عذاب میں گرفتار ہو جائیں گے، مرتے وقت جس وقت عالمِ آخرت منکشف ہوگا، برزخ میں جس وقت ان کو تکلیف پہنچائی جائے گی، محشر میں جس وقت مختلف قسم کی سختیاں ہوں گی، جہنم میں جب پھینکے جائیں گے اور مختلف قسم کے عذاب ان کے سامنے درجہ بدرجہ آتے چلے جائیں گے، اور اپنے مقابلے میں یہ مؤمنین کو خوش حال دیکھیں گے کہ ان کے اوپر اللہ تعالیٰ کے انعامات کی بارش ہے، تو ان اوقات میں پھر یہ بار بار تمنا کریں گے کہ کیا ہی اچھا ہوتا کہ ہم بھی فرمانبردار ہوتے تو آج ہم بھی اللہ تعالیٰ کے انعامات حاصل کرتے، اس طرح سے ان کی تمنا کا موقع بار بار آئے گا۔ اور تقلیل کے طور پر جو مفہوم ہے وہ بھی واضح ہے، اب انہیں کہا جا رہا ہے کہ اب تو تم خوش ہو لیکن کوئی ایسا وقت آئے گا کہ جس وقت یہ حالات نہیں رہیں گے پھر تمہیں پتا چلے گا کہ ہمارا طریقہ غلط تھا۔

لمبے منصوبے باندھنے والے کُفّار کے متعلق سرورِ کائنات ﷺ کو ہدایت

ذَرْهُمْ یَاْكُلُوْا وَ یَتَمَتَّعُوْا: ذَرْ کا خطاب سرورِ کائنات ﷺ کو ہے۔ ذَرْهُمْ: ان کو چھوڑ دے، ان کو رہنے دے، یَاْكُلُوْا: یہ ذَرْ اَمر کا جواب ہونے کی بنا پر مجزوم ہے۔ کھاتے رہیں، یَتَمَتَّعُوْا: عیش اڑاتے رہیں، وَ یُلْهِهِمُ الْاَمَلُ: اور امید ان کو غفلت میں ڈالے رکھے، فَسَوْفَ یَعْلَمُوْنَ: ان کو عنقریب پتا چل جائے گا۔ سرورِ کائنات ﷺ سے کہا جا رہا ہے کہ آپ ان کے پیچھے نہ پڑیں، آپ نے اپنا فرضِ تبلیغ ادا کر دیا، اب انہیں رہنے دیجئے، جس طریقے پر یہ چل رہے ہیں چلتے جائیں، کھانے پینے کا ان کا مشغلہ ہے کھانے پینے دو، اور کچھ عیش بہار میں یہ لگے ہوئے ہیں یہ عیش بہاران کو اڑانے دو، ان کے منصوبے بڑے لمبے لمبے ہیں اور وہ منصوبے ان کو غفلت میں ڈالے رکھیں، اَمل امید کو کہتے ہیں، جو لمبی لمبی امیدیں انسان مستقبل کے متعلق بنا لیتا ہے جس طرح سے شیخ چلی کے منصوبے مشہور ہیں، یہ لمبی لمبی اُمیدیں جو لگائی جاتی ہیں، اُمید کا نتیجہ ہی غفلت میں پڑ جانا ہے، کہ جب انسان کو اپنے مرنے کا خیال ہی نہیں ہوتا، لمبے لمبے منصوبے بنا لیتا ہے تو پھر وہ دنیا کی لمبی زندگی کو سوچتا ہے، اس کو کبھی خیال ہی نہیں ہوتا کہ یہ زندگی ختم ہو جائے گی، میں مر جاؤں گا، اس کے بعد بھی کچھ ہوگا، لمبی امیدیں لگانے کا نتیجہ ہی غفلت ہے ''یہ اُمیدیں ان کو غفلت میں ڈالے رکھیں'' یعنی اپنی اُمیدوں کے مطابق یہ زندگی گزارتے رہیں اور انجام سے بے خبر رہیں، ان کو اس حال میں رہنے دو، عنقریب ان کو پتا چل جائے گا۔ یہ بات اگرچہ سرورِ کائنات ﷺ کو خطاب کر کے کہی جا رہی ہے، لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس میں عتاب کا پہلو کُفّار پہ

ہے، کہ جب ایک آدمی کسی بری حرکت میں لگا ہوا ہو اور دوسرا ہر وقت اس کو سمجھانے کے لئے اس کے پیچھے پڑا ہوا ہو تو پھر سمجھانے والے کو یہی کہا جاتا ہے کہ بھائی! تو اس کے لئے کیوں پریشان ہوتا ہے، اس کو رہنے دے، جس کھڈے میں گرتا ہے اس کو گرنے دے، اس کو خود پتا چل جائے گا کہ نتیجہ کیا ہے، اس میں اصل میں ناراضگی اس شخص پر ہوتی ہے جو سمجھتا نہیں یا سمجھانے سے باز نہیں آتا اور اپنی بُری حرکتوں سے رُکتا نہیں ہے۔

کُفّار کی ہلاکت کا وقت عند اللہ طے شدہ ہے

وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ: نہیں ہلاک کیا ہم نے کسی بستی کو مگر اس حال میں کہ اس کے لئے ایک معلوم لکھا ہوا وقت تھا، یعنی اگر اِن کو یہ خیال ہو کہ ہم پہ عذاب کیوں نہیں آتا، تو ان پر عذاب نہ آنا یہ بھی اللہ کی ایک عادت کے مطابق ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے پہلی امتوں کے لئے بھی ایسے ہی کیا تھا، یہ نہیں کہ انہوں نے رسول کی نافرمانی کی اور فوراً ان کے اوپر عذاب آ گیا، بلکہ اللہ کے علم میں لکھا ہوا وقت ہے جس وقت میں کسی قوم کو برباد کیا جاتا ہے، تو اسی طرح سے اِن کے لئے بھی اللہ کے علم میں کوئی لکھا ہوا وقت ہے، اگر یہ باز نہیں آئیں گے تو جب ان کا وہ لکھا ہوا وقت جو اللہ کی تقدیر کے تحت طے شدہ ہے آ جائے گا تو اس وقت ان کے سامنے عذاب بھی آ جائے گا، ”نہیں ہلاک کیا ہم نے کسی بستی کو مگر اس حال میں کہ ان کے لئے (کتاب مکتوب کے معنی میں ہے) لکھا ہوا معلوم متعین وقت تھا۔“ مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا: نہیں سبقت لے جاتی کوئی جماعت اپنے وقت معینہ سے، وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ: نہ وہ پیچھے ہٹتے ہیں، یعنی جو لکھا ہوا وقت ہے اسی وقت ہی ہلاک ہوتے ہیں، نہ آگے ہو سکتے ہیں نہ پیچھے ہو سکتے ہیں، تو ان کے لئے بھی اللہ کے علم میں اگر کوئی وقت مقدر ہے عذاب آنے کا تو جب وہ وقت آ جائے گا اس وقت یہ برباد ہو جائیں گے، باقی! ڈھیل دینا یہ بھی اللہ کی عادت ہے۔

کُفّار کی طرف سے اِستہزا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب

آگے ان کا اِستہزا مذکور ہے یعنی کُفّار کی تکذیب، اِستہزا بھی تکذیب کی بدترین قسم ہے، وَقَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ: اور یہ کافر کہتے ہیں کہ اے وہ شخص جس کے اُوپر ذِکر اُتارا گیا، اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ: بے شک تُو تو دیوانہ ہے، لَوْ مَا تَاْتِيْنَا بِالْمَلٰٓئِكَةِ: کیوں نہیں لے آتا تو ہمارے پاس فرشتے اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ: اگر تو سچوں میں سے ہے، یہاں تک اُن کی بات ہے۔ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ، یہ بطور اِستہزا کے کہتے تھے، کیونکہ وہ تو اس بات کے قائل نہیں تھے کہ سرورِ کائنات ﷺ پر اللہ کی طرف سے کوئی ذکر اُتارا گیا ہے، یعنی جس کو ہم ”بزعم خود“ کہتے ہیں، کہ اے وہ شخص جس کا اپنا خیال یہ ہے کہ اس کے اوپر اللہ کی طرف سے ذکر اترا ہے، ہم تو سمجھتے ہیں کہ تو دیوانہ ہے، تیری عقل ماری گئی، اس قسم کی باتیں کرتا ہے جو ہماری تو سمجھ میں نہیں آتیں، نہ ہمارے آباؤ اجداد کا طریقہ ہے، یہ تو دیوانوں والی باتیں ہیں جس قسم کی تو کرتا ہے، اور اگر واقعی تیرے اوپر کوئی فرشتہ آتا ہے اور وحی لے کر آتا ہے اور فرشتوں سے تیری گفتگو ہوتی ہے تو تو ان فرشتوں کو ہمارے سامنے کیوں نہیں لے آتا اگر تو سچوں میں سے ہے، تیرے پہ فرشتے اُتر سکتے ہیں تو ہم پر کیوں نہیں اُترتے، تجھے کون سے سُرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں کہ تیرا رابطہ تو فرشتوں کے ساتھ ہے اور ہمارا

نہیں، اگر کوئی ایسی بات ہے تو ان فرشتوں کو ہمارے سامنے کیوں نہیں لے آتا۔ مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓىِٕكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوْٓا اِذًا مُّنْظَرِیْنَ: یہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے اُن کے جواب میں۔ نہیں اتارتے ہم فرشتوں کو مگر حق کے ساتھ۔ حق سے یہاں فیصلہ مراد ہے ''مگر فیصلے کے ساتھ اور یہ لوگ اس وقت مہلت دیے ہوئے نہیں ہوتے'' اِذًا کا معنی ہے کہ جب ہم فرشتے اتارتے ہیں۔ مُنْظَرِیْنَ: مہلت دیے ہوئے۔ ''تب یہ لوگ مہلت دیے ہوئے نہیں ہوتے'' یعنی ویسے تو اللہ کی طرف سے فرشتے آتے رہتے ہیں، اپنے کاموں میں لگے ہوئے ہیں، آپ کے اعمال کو لکھنے والے، آپ کی حفاظت کرنے والے نگرانی کرنے والے، مختلف کام سرانجام دینے والے فرشتے صبح شام آتے جاتے ہیں، لیکن اس طرح سے فرشتوں کا آنا جس طرح سے لوگ مطالبہ کرتے ہیں کہ ہمارے سامنے آئیں اور آکر رسول کی حقانیت کو بیان کریں، لوگوں کے مطالبہ کے تحت جب فرشتے آتے ہیں تو پھر وہ آخری فیصلے لے کر آیا کرتے ہیں، پھر مہلت نہیں ملا کرتی، یعنی اللہ تعالیٰ لوگوں کو تماشا دکھانے کے لئے فرشتے نہیں اتارا کرتا، کہ کسی نے کہا کہ ہمارے سامنے فرشتے آجائیں تو اللہ تعالیٰ کہیں کہ لو! فرشتے آگئے، اور آپ کے سامنے کھڑے ہوجائیں، اس طرح سے نہیں ہوتا، یوں جب ضد کرکے لوگ فرشتوں کا مطالبہ کرتے ہیں تو پھر فرشتے اس وقت ہی آیا کرتے ہیں جب اس قوم کا خاتمہ ہی کرنا ہو، پھر ان کو مہلت نہیں ملا کرتی، اس لیے یہ لوگ اپنے منہ سے اپنی موت نہ مانگیں اور اپنے پاؤں پہ خود کلہاڑی نہ ماریں، جس دن فرشتے اللہ کا عذاب لے کے آگئے اس دن پھر ان کی آخری گھڑی ہوگی، پھر ان کو مہلت نہیں ملے گی۔

حفاظتِ قرآن حضور ﷺ کی نبوّت کا ایک مستقل معجزہ ہے

باقی اگر سرورِ کائنات ﷺ کی حقانیت کے لئے کسی معجزے کی ضرورت ہے تو معجزہ تو بہت بیّن ہے، قرآنِ کریم ایک ایسا معجزہ ہے کہ جس کے بعد کسی اور معجزے کی ضرورت ہی نہیں، اس کا ایک معجزہ تو آپ کے سامنے باربار ذکر ہو چکا، کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ایسی حیثیت میں اتارا ہے کہ کوئی شخص اس کا مقابلہ نہیں کرسکا، انفرادی حیثیت میں بھی مقابلہ نہیں کرسکا، اجتماعی حیثیت میں چیلنج کیا گیا تو اجتماعی حیثیت میں بھی وہ مقابلے میں نہ آسکے، اس جیسی کتاب نہ لاسکے، اس جیسی دس سورتیں نہ لاسکے، اس جیسی ایک سورۃ نہ لاسکے، حتّٰی کہ آخر اعلان کر دیا گیا کہ تم لاسکتے ہی نہیں، تو اللہ کی کتاب کا یہ جو اعجاز تھا کہ اس جیسی سورۃ بنا کے نہیں لائی جاسکتی، جس طرح اللہ کے سورج کی طرح سورج نہیں بنایا جاسکتا، اللہ کے چاند کی طرح چاند نہیں بنایا جاسکتا، یہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ مصنوعات براہِ راست اللہ تعالیٰ کی ہیں، جس میں کسی بندے کا دخل نہیں، ایک بندہ اگر کوئی چیز بناتا ہے تو دوسرا اس کے مقابلے میں چیز تیار کرلیتا ہے، کبھی ویسی اور کبھی اس سے بھی اچھی، لیکن جو براہِ راست اللہ تعالیٰ کی مصنوعات ہیں زمین ہے آسمان ہے سورج ہے چاند ہے، جیسے ان کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا اسی طرح سے اللہ کی کتاب ایسی ہے کہ اس کے مقابلے میں کوئی دوسری کتاب بنا کے نہیں لائی جاسکتی، اس کی حیثیت واضح کردی گئی۔ یہاں ایک دوسرے معجزہ کی طرف اشارہ ہے، اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ: بے شک ہم نے ذکر کو اتارا، یعنی تم جو مذاق کے طور پر کہتے ہو کہ بزعم خود جس کے اوپر ذکر اترا ہے، یہ بات صحیح نہیں، حقیقت ہے کہ ہم نے اتارا، اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا: بے شک ہم نے ہی اتارا، وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ: اور بے شک ہم ہی اس کی البتہ حفاظت کرنے والے ہیں، اس ذکر کی

حفاظت یہ اس ذکر کا مستقل معجزہ ہے، کہ قرآن کریم کو جس طرح سے محفوظ رکھا گیا ہے اس کی مثال بھی دنیا کے اندر کوئی دوسری پیش نہیں کی جاسکتی کہ کسی کتاب کو اس طرح سے محفوظ رکھا گیا ہو، آج اس معجزے کی حیثیت بہت اچھی طرح سے نمایاں ہے کہ اس کتاب پر چودہ سو سال گزر گئے، کسی جگہ اس میں زبر زیر کا تغیر نہیں ہوا، لکھنے میں سب سے زیادہ آئی، زبانی یاد سب سے زیادہ کی گئی، اس گئے گزرے دور میں بھی جبکہ مادیت کا غلبہ ہو چکا ہے انسان ہر وقت دنیوی مفاد کو ہی دیکھتا ہے اس وقت بھی آپ کو لاکھوں نہیں کروڑوں انسان اس کتاب کو زبانی یاد کرنے والے مل جائیں گے، جو صبح شام رات دن اس کی تلاوت کرتے ہیں، اور دنیا کے ہر خطے میں جدھر بھی چلے جائیں ایک ہی قرآن ہے جو سب لوگوں کی زبان پر ہے، سب کے سینے میں ہے، سب کے پاس لکھا ہوا موجود ہے، ہر لحاظ سے اس کی حفاظت کی گئی، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حفاظت کا انتظام ہے کہ اول سے لے کر اس وقت تک اس قسم کے لوگ کھڑے کر دیے جو اپنی محبت اور شوق کے ساتھ ہی اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے آخرت کے ثواب کے لئے انہوں نے اس کتاب کی پیچھے زندگی کھپا دی، آج اللہ تعالیٰ نے اگر ہمیں توفیق دے رکھی ہے یا آپ حضرات اس کتاب کو پڑھ رہے ہیں یاد کر رہے ہیں تو کون سا آپ کے سامنے کوئی دنیوی مفاد ہے کہ کہ اس کے بعد ہمیں کوئی مربعے مل جائیں گے، یا اس کے بعد ہمیں کوئی ملازمت مل جائے گی، ہمیں کوئی عہدہ مل جائے گا، الٹا معاشرے کے اندر تو عزت ہی نہیں، لوگ ہنسی مذاق کرتے ہیں، تو ایسے وقت میں بھی کس طرح اللہ تعالیٰ افراد کو چن چن کے اپنی اس فوج کے اندر بھرتی کر رہا ہے، اور قرآنِ کریم کی حفاظت کے لئے کتنے لوگوں کو کھڑا کر دیتا ہے، یہ سعادت ہے ان انسانوں کی جن کو اللہ تعالیٰ اپنے اس خاص کام کے لئے منتخب کرلے۔ تو آپ حضرات جن کو اللہ نے کتاب اللہ پڑھنے کی توفیق دی، یاد کرنے کی توفیق دی، آپ بھی اس فوج کے افراد ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کی حفاظت کے لئے کھڑی کی ہے۔ لفظوں کو محفوظ رکھا گیا، طرزِ ادا کو محفوظ رکھا گیا، اعراب اور حرکات کو محفوظ رکھا گیا، اور ایک ایک چیز کے بارے میں مستقل فن ایجاد ہو گئے، اعراب کی حفاظت کے لئے مستقل نحو کا فن ایجاد ہو گیا، صیغوں کی حفاظت کے لئے مستقل صَرف کا فن ایجاد ہو گیا، لب و لہجے کی ادائیگی کے لئے مستقل تجوید و قراءت کا فن آ گیا، اور اس کے معانی کو حل کرنے کے لئے مستقل لغات کا فن مدون ہو گیا، اور پھر آپ جانتے ہیں کہ قرآنِ کریم (جس طرح سے آپ اصول فقہ میں ابتدا ابتدا کے اندر پڑھا کرتے ہیں) الفاظ اور معانی دونوں کے مجموعے کا نام ہے، دونوں کا مجموعہ قرآنِ کریم کہلاتا ہے، صرف الفاظ کہ جس میں وہ معنی باقی نہ رہے وہ قرآن نہیں کہلائیں گے، مثلاً الفاظ تو آپ سارے کے سارے قرآنِ کریم کے لے لیں لیکن ان کو اول بدل کر کے عبارت ایسی بنالیں کہ جس کے اندر وہ مفہوم باقی نہ رہے جو قرآن کریم ہمیں دینا چاہتا ہے، الفاظ سارے اگرچہ قرآن کے ہوں لیکن ان سے ایک نیا مضمون تیار کر لیجیے جس سے وہ مفہوم نہ نکلے جو مفہوم بیان کرنا مقصود ہے تو اس عبارت کو قرآن نہیں کہا جائے گا، چاہے الفاظ سارے کے سارے قرآنِ کریم کے ہی کیوں نہ ہوں۔ اور الفاظ کے جامے کو اتار دیا جائے، اس کے مفہوم کو آپ اردو میں بیان کر دیں، انگریزی میں بیان کر دیں، فارسی میں بیان کر دیں، کسی دوسری زبان میں کر دیں، اس کو بھی قرآن نہیں کہیں گے، یہ جو اردو کے اندر چھپے پھرتے ہیں جن کے اوپر لکھا ہوتا ہے ''قرآن کریم'' یہ غلط بات ہے، وہ قرآنِ کریم

کا ترجمہ تو کہلا سکتا ہے لیکن قرآن نہیں ہے، اگر کوئی شخص اس اُردو عبارت کو پڑھے گا تو تلاوت والا ثواب نہیں ہے، وہ قرآن کا ترجمہ ہے، اس کا مفہوم کسی نے اپنی زبان میں ادا کر دیا، اس کو قرآن نہیں کہیں گے، نماز میں آپ اگر اس اُردو عبارت کو پڑھیں گے تو نماز نہیں ہوگی، تو قرآنِ کریم دونوں کے مجموعے کا نام ہے کہ الفاظ بھی یہی ہوں اور ان کے اندر مفہوم بھی یہی ہو جو اللہ تعالیٰ بیان فرمانا چاہتے ہیں اور جو سرورِ کائنات ﷺ نے واضح فرمایا۔

تو اب کی اس کی جتنی حیثیتیں ہیں، اس کی ترکیب کی حیثیت ہے، اس کے معانی کی حیثیت ہے، لغوی مفہوم کی حیثیت ہے، ہر ایک کے لئے مستقل فن ایجاد ہیں، اور قرآنِ کریم کے معنی کی حفاظت کا ہی تقاضا ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ کے فرمودات اور آپ کی احادیث کو بھی محفوظ رکھا جائے، کیونکہ وہ قرآنِ کریم کے مفہوم کی وضاحت ہے، اگر حدیث شریف دنیا میں موجود نہ رہتی تو قرآنِ کریم کا مفہوم ختم ہو جاتا، حفاظتِ حدیث بھی حفاظتِ قرآن کا ایک ذریعہ ہے، تو اگر اور کوئی دلیل نہ ہو تو حفاظتِ قرآن کا وعدہ یہی حجیتِ حدیث کے لئے کافی ہے، کہ اگر سرورِ کائنات ﷺ جو کہ قرآنِ کریم کے لئے مبیّن اور معلم بنا کے بھیجے گئے ہیں، اگر ان کے بیان کردہ مفہوم کو باقی نہیں رکھا جائے گا تو قرآنِ کریم کے مفہوم کو باقی رکھنے کا جو وعدہ ہے، حفاظتِ قرآن کا جو وعدہ ہے اس میں خلل پڑتا ہے، تو سرورِ کائنات ﷺ نے جتنی اس کی تشریحات بیان فرمائی تھیں وہ بھی امت نے ساری کی ساری محفوظ رکھیں، اور ایک ایک لفظ ایک ایک حرکت ایک ایک نقطہ محفوظ رکھا، کسی مجمع کے اندر چاہے وہ دیہاتوں میں ہے چاہے شہروں میں ہے کتنا بڑے سے بڑا عالم تقریر کر رہا ہو ایک آیت اگر غلط پڑھ دے تو اس مجمع میں سے لوگ ٹوکنے کے لئے کھڑے ہو جائیں گے اور فوراً غلطی نکال دیں گے، ممکن ہی نہیں کہ کوئی شخص اس کے اندر کسی قسم کی تحریف کر سکے، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اس کتاب کا ایک مستقل معجزہ ہے جو دنیا کے سامنے ہے، جس کا کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ فصاحت اور بلاغت کے اعتبار سے حقانیت کو پرکھنا یہ تو اہلِ علم کا کام ہے، جو ادیب ہوگا عربی کلام کے اندر ماہر ہوگا وہی اس کو پرکھے گا، لیکن یہ حفاظت والا پہلو، اس کا تو جاہل سے جاہل آدمی بھی اندازہ کر سکتا ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو کس طرح سے محفوظ رکھا، لب ولہجہ تک محفوظ ہے، قاریوں کی ایک مستقل جماعت پیدا ہوگئی جنہوں نے اس کے لب ولہجے کو محفوظ رکھا، تجوید اور قراءت مستقل فن بن گیا، اور اسی طرح سے کتنے فنون ہیں جو صرف قرآنِ کریم کی حفاظت کے جذبے سے مدون ہوئے۔

سوال:- غلط قسم کے لوگ قرآن کا غلط ترجمہ اور غلط تفسیر کرتے ہیں، تو حفاظت پھر کیسے ہوئی؟

جواب:- اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ حقیقت محفوظ ہے، یہ جو آپ کو پتا لگ گیا کہ وہ غلط ہے وہ اسی حفاظت کا تو نتیجہ ہے، اگر صحیح مفہوم محفوظ نہ ہوتا تو آپ کو پتا کیسے چلتا کہ یہ غلط کہہ رہے ہیں، صحیح مفہوم باقی ہے تبھی تو ان کی غلطی پکڑی جاتی ہے۔

تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی شخص تحریف کی کوشش نہیں کرے گا، کوشش تو لوگوں نے کی ہے، ہر زمانے میں کرتے ہیں، لیکن وہ چل نہیں سکتی، کیونکہ حقیقت محفوظ ہے، اس لیے ہمیشہ اس قسم کے بد باطن بددین بدزبان جو پیدا ہوئے ان کی کارروائیاں ختم ہوتی چلی گئیں، قرآن اپنے مفہوم کے اندر اسی طرح باقی چلا آ رہا ہے۔ اس لیے اس علاقے میں اگر کسی نے گڑبڑ کی ہے تو

دوسرے علاقے میں اُس کا اثر نہیں، وہاں اسی طرح سے صحیح محفوظ، اور اگر دوسرے علاقے میں کسی نے گڑبڑ کی ہے تو اس علاقے میں اثر نہیں، تو قرآنِ کریم جو ساری دنیا کے اندر مشترک موجود ہے وہی حق ہے، اور اگر کسی نے اپنے طور پر کوئی غلط لفظ چھاپ دیا تو اس میں چھاپنے والے کا قصور ہے، عمداً کسی نے غلطی کی ہے تو اس کا قصور ہے لیکن باقی نہیں رہ سکتی، ایسے نہیں ہوسکتا جس طرح سے توراۃ اور انجیل محرف ہوگئیں اور ساری دنیا کے اندر وہ محرف ہی چل رہی ہیں، اس علاقے میں توراۃ کچھ اور ہے، دوسرے علاقوں میں کچھ اور ہے، یہاں توراۃ جو تقسیم ہو رہی ہے اس میں کچھ ایسی عبارتیں ہیں جو دوسری جگہ نہیں ہیں، اسی طرح سے انجیل ہے، ایسا قرآنِ کریم کے متعلق نہیں ہوسکتا۔ دنیا نے بہتیری کوشش کی ہوگی اس کو مٹانے کے لئے اور بدلنے کے لئے، لیکن کوئی کامیاب نہیں ہوا۔

کفار کا انبیاء علیہم السلام اور ان کے متبعین کے ساتھ ہمیشہ اِستہزا کا معاملہ رہا ہے

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ شِيَعِ الْاَوَّلِيْنَ: "شِيَعٌ" یہ "شِيْعَةٌ" کی جمع ہے، شیعہ کہتے ہیں ایک جماعت کو جو کسی ایک نظریہ پر متفق ہوگئی ہو، اور یہ جو ہمارے ہاں رافضیوں کو "شیعہ" کہتے ہیں یہ بھی اصل کے اعتبار سے "شیعۂ علی" ہیں (بزعمِ خود)، علی کی جماعت، جو حبِّ علی پہ اکٹھے ہوئے، یہ شیعہ کہلاتے تھے۔ "البتہ تحقیق بھیجا ہم نے آپ سے پہلے پہلی جماعتوں میں" یعنی پہلی جماعتوں میں بھی ہم نے رسولوں کو بھیجا۔ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ: نہیں آتا تھا ان کے پاس کوئی رسول اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ: مگر وہ اس رسول کے ساتھ استہزاء کرتے تھے۔ یہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تسلی ہے کہ رسالت کا سلسلہ پہلے سے جاری ہے اور لوگوں کا معاملہ اپنے رسولوں کے ساتھ پہلے سے ہے، کتنی آیات ہیں جن میں یہ ذکر کیا گیا کہ رسول جس وقت بھی آئے تو سامنے سے قوم نے ان کا مذاق ہی اڑایا۔ یہ بار بار آپ کی خدمت میں اس بات کو اس لیے دوہراتا ہوں کہ اگر آپ کے سامنے اس کا استحضار رہے، دل کے اندر یہ بات ہر وقت موجود رہے، اور آپ کے ذہن اس سے خالی نہ ہوں، کہ انبیاء علیہم السلام کا لوگوں نے مذاق اڑایا، اور ان کے استہزاء کا ذکر قرآنِ کریم میں کثرت کے ساتھ کیا گیا ہے، تو آپ کے دل کو قوت حاصل ہوگی کہ آج کے معاشرے میں اگر کوئی شخص مولوی اور ملاں کا مذاق اڑاتا ہے تو یہ علامت ہے اس بات کی کہ ہمارا نسب صحیح ہے، جس جماعت سے ہمارا تعلق ہے ان کے ساتھ بھی اسی طرح سے کیا گیا، تو انبیاء علیہم السلام کے ساتھ تعلق کی بنا پر اگر لوگ ہمارا اِستہزا کرتے ہیں تو اس میں کوئی گھبرانے کی بات نہیں، نہ نبیوں کی قدر لوگوں نے کی جو دنیادار تھے دنیا پرست تھے، حبِّ دنیا کے اندر مبتلا تھے، اور نہ یہ لوگ ورثائے انبیاء کی قدر کرسکتے ہیں، تو آپ ان لوگوں کے استہزاء سے کبھی گھبرایا نہ کیجئے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی انہی الفاظ سے تسلی دیتا ہے کہ ایسا معاملہ تو ہر رسول کے ساتھ ہوا ہے، اگر یہ آپ کے ساتھ کرتے ہیں تو اس میں کونسی بات ہے، ان لوگوں کے اِستہزا کے ساتھ کوئی آپ کی شان میں فرق نہیں پڑتا، کوئی آپ کے مرتبے میں فرق نہیں پڑتا۔ اب اگر کوئی بادشاہِ وقت اچھا لباس پہن کے اور اپنی ٹھاٹھ کے ساتھ چل رہا ہو، اور کسی گلی کے اندر اس کو کتے بھونکنے لگ جائیں، تو وہ بیٹھ کے رونے لگ جائے کہ میری قدر نہیں ہے، دیکھو! مجھے کتے بھونک رہے ہیں، تو یہ تو اس کی بے عقلی ہے، اور جو لوگ حق کو نہیں پہچانتے وہ تو کتوں سے بھی بدتر ہیں، تو اگر وہ کبھی آپ کو بھونکیں، اور آپ کی عزت پر اس قسم کی بات کریں، اِستہزا کریں، تو اس میں گھبرانے کی کون سی

بات ہے، فوراً اس بات کا خیال کیا کیجئے کہ واقعی دونوں ہی اپنی اپنی وراثت کو سنبھالے ہوئے ہیں، ان کے حصے میں وہ وراثت آ گئی جس قسم کی منکرین کافرین کی تھی، جو عادت ان کی تھی وہی ان کے حصے میں آ گئی، یہ حق کا مذاق اڑاتے ہیں، حق والوں سے استہزا کرتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس راستے کے اوپر چلایا ہے جس راستے پر انبیاء علیہم السلام تھے، تو جیسے اللہ تعالیٰ ان کو یہ کہہ کے تسلیاں دیتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ہمیشہ ایسے ہی ہوا ہے، تو آپ حضرات یہ سوچیں گے تو اس کے ساتھ دل کو اتنی قوت حاصل ہو جائے گی کہ واقعہ ہے کہ ان لوگوں کی ہنسی مذاق کی ایسی حیثیت ہوگی جیسے کسی معزز آدمی کو دیکھ کے کتا بھونکتا ہے، اس سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں، تو گھبرانے کی کیا بات ہے، ہم اپنے آپ کو گھٹیا کیوں سمجھیں، ہم اپنی قیمت اس بازار میں معلوم کرنے کی کوشش ہی کیوں کرتے ہیں، ان کو کیا پتا کہ کیا قدر ہے علم کی، کیا قدر ہے قرآن اور حدیث کی، یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ جس کو ہم ان سے پوچھیں کہ ہمارا یہ علم عزت کا ذریعہ ہے یا نہیں؟ ہماری حیثیت معزز آدمی کی ہے یا نہیں؟ جب ہم نے اللہ تعالیٰ کی کتاب کو لیا ہے اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال کو لیا ہے تو ہمیں عزت اور قدر و قیمت انہی کے دربار میں دیکھنی چاہیے، دوسرے کریں یا نہ کریں ہمیں اس کی کوئی پروا نہیں چاہیے۔ تو اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ میں جو لفظ آئے تھے اصل کے اعتبار سے آپ لوگ اسی فوج کے افراد ہیں، اور اس پر آپ جتنا فخر کریں اور جتنا اللہ کا شکر کریں اتنا ہی کم ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے خاص اپنے کام کے لئے آپ حضرات کو منتخب کر لیا، اس فوج میں شامل کر لیا جس کو اپنی کتاب کی حفاظت کے لئے کھڑا کیا ہے۔ وَمَا یَاْتِیْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ: نہیں آیا کوئی رسول مگر یہ لوگ اس سے استہزا کرتے تھے۔ كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِیْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِیْنَ: ایسے ہی داخل کر دیتے ہیں ہم استہزا کو مجرمین کے دلوں میں، مجرمین کے دلوں میں استہزا کا جذبہ بس آ ہی جاتا ہے، ایسے ہی گھسیڑ دیتے ہیں ہم اس جذبے کو مجرمین کے قلوب میں۔ ''ہٗ'' ضمیر استہزا کی طرف راجع ہے۔ یعنی جن کے دل مجرم ہوتے ہیں وہ اہلِ حق کا مذاق ضرور اڑائیں گے، اور جو اہلِ حق کا مذاق اُڑاتے ہیں یوں سمجھو کہ یہ مجرم ہیں، یہ علامت ہے اس بات کی۔ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ: ایمان نہیں لاتے یہ قرآنِ کریم کے ساتھ، اس ذکر کے ساتھ جس کا پیچھے تذکرہ ہوا تھا، وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِیْنَ: پہلے لوگوں کا طریقہ گزر چکا، پہلے سے طریقہ یہی چلا آتا ہے، اسی طریقے پر یہ چل رہے ہیں، ''نہیں ایمان لاتے یہ اس قرآن کے ساتھ، اور گزر گیا پہلے لوگوں کا طریقہ۔''

ضدی کفّار کو معجزات دِکھانا کوئی مفید نہیں

وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَیْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ: اگر کھول دیں ہم ان کے اوپر آسمان کا دروازہ۔ فَظَلُّوْا فِیْهِ یَعْرُجُوْنَ: ظَلَّ یَظَلُّ کا معنی ہوتا ہے دِن کے وقت کسی کام کو کرنا، افعالِ ناقصہ میں جس طرح سے آپ معنی پڑھتے رہتے ہیں، بَاتَ: رات کے وقت کسی کام کو کرنا۔ اَصْبَحَ: صبح کے وقت کسی کام کو کرنا۔ اَمْسٰی: شام کے وقت کسی کام کو کرنا۔ اور ظَلَّ کا معنی ہوتا ہے دن کے وقت کسی کام کو کرنا۔ سورۂ نحل میں لفظ آئیں گے اِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِیْمٌ (آیت: ۵۸) جس وقت ان میں سے کسی کو لڑکی کے پیدا ہونے کی خبر دی جاتی ہے تو سارا دِن اس کا منہ سیاہ رہتا ہے، اور دل میں کڑھتا رہتا ہے کہ لڑکی کیوں پیدا ہو گئی۔ تو یہاں ظَلَّ کا لفظ جو آیا اس کا مفہوم بھی اسی طرح سے ہوگا، ''اگر ہم ان کے اوپر آسمان کا دروازہ کھول دیں اور یہ اس دروازے میں دِن کے

وقت چڑھنے لگ جائیں" کھلے دن، یعنی دن صاف ستھرا ہے، یہ بھی نہیں کہ رات کی تاریکی ہے، دن دیہاڑے، دیکھتے ہوئے یہ اس دروازے میں چڑھنے لگ جائیں، لَقَالُوْٓا: تو بھی کہیں گے اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا: ہماری تو چشم بندی کر دی گئی ہے، ہماری آنکھیں بند کر دی گئی ہیں بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ: بلکہ ہم پر جادو کر دیا گیا ہے۔ یعنی یہ کہتے ہیں کہ فرشتے ہمارے سامنے لے آؤ، فرشتوں کا سامنے آجانا اتنا عجیب نہیں، کیونکہ فرشتے تو آسمان سے زمین پر اترتے رہتے ہیں، صرف یہی ہے کہ نظر نہیں آتے، ان کا آسمان کی طرف سے اتر کر زمین پہ آجانا یہ کوئی اتنا عجیب کام نہیں ہے، یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتے آتے ہیں، یہ علیحدہ بات ہے کہ ان کو نظر نہیں آتے، لیکن اگر ہم ان کے سامنے ایسا معجزہ ظاہر کر دیں کہ آسمان کا دروازہ ان کے لئے کھول دیں اور یہ دن دیہاڑے، کھلی آنکھوں، جاگتے ہوئے آسمان کی طرف چڑھنا شروع ہو جائیں، اور آسمان کے دروازہ میں داخل ہونے لگ جائیں تو کہیں گے کہ بس یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ ہماری نظر بندی ہو گئی، بلکہ ہم پر تو جادو ہی ہو گیا، کہ ہمیں یوں معلوم ہو رہا ہے کہ ہم آسمان کی طرف چڑھ رہے ہیں۔ تو جب ایک شخص نے تکذیب ہی کرنی ہو تو کہا کرتے ہیں کہ "خوئے بد را بہانہ بسیار" بُری عادت کے لئے ہزاروں بہانے، جب ایک دفعہ انسان کی نیت خراب ہو جائے تو پھر اس کو آپ جو بھی دلیل دیں گے وہ اس میں کوئی نہ کوئی نقص نکال لے گا، تو اسی طرح سے یہ لوگ بھی یوں ہی کہیں گے کہ ہماری چشم بند کر دی گئی، ہماری آنکھیں بند کر دی گئیں، بلکہ ہم پر تو جادو کر دیا گیا، کہ ہمیں ایسے معلوم ہوتا ہے جس طرح سے ہم آسمان پہ چڑھتے جا رہے ہیں۔ تو جو لوگ اتنے ضدی ہوں اور تکذیب پر اتنے تُلے ہوئے ہوں تو ان کو معجزات دکھانا یا ان کی بات کو پورا کرنا مفید نہیں ہے، اگر ان کی مرضی کے مطابق کوئی ظاہر کی گئی تو پھر اللہ تبارک وتعالیٰ کی عادت ہے کہ اگر اس کے بعد لوگ نہ مانیں تو پھر ان کو برباد کر دیا جاتا ہے۔

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿١٦﴾ وَحَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ
ہم نے آسمان میں بڑے بڑے ستارے بنائے اور ہم نے اس کو مزین کر دیا دیکھنے والوں کے لئے ﴿۱۶﴾ اور ہم نے اس کی حفاظت کی ہر
شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ﴿١٧﴾ اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيْنٌ ﴿١٨﴾ وَالْاَرْضَ
مردود شیطان سے ﴿۱۷﴾ لیکن جو کوئی شخص چُرا لے کسی سنی ہوئی بات کو تو ایک واضح شعلہ اس کے پیچھے لگ جاتا ہے ﴿۱۸﴾ اور زمین،
مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ ﴿١٩﴾ وَجَعَلْنَا
ہم نے اس کو بچھا دیا اور ڈال دیا ہم نے اس کے اندر بوجھل پہاڑوں کو، اور اُگایا ہم نے اس زمین میں ہر موزون چیز کو ﴿۱۹﴾ اور ہم نے بنائے
لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ ﴿٢٠﴾ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا
تمہارے لیے اس زمین میں اسباب زیست اور ان کے لئے بھی جن کو تم روزی دینے والے نہیں ہو ﴿۲۰﴾ نہیں ہے کوئی چیز مگر ہمارے پاس

خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۲۱﴾ وَاَرْسَلْنَا الرِّیٰحَ لَوَاقِحَ

اس کے خزانے ہیں، اور نہیں اُتارتے ہم اس کو مگر ایک معلوم اندازے سے ﴿۲۱﴾ اور بھیجا ہم نے ہواؤں کو جو بوجھل کرنے والی ہیں

فَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَسْقَیْنٰكُمُوْهُۚ وَمَاۤ اَنْتُمْ لَهٗ بِخٰزِنِیْنَ ﴿۲۲﴾ وَاِنَّا لَنَحْنُ

پھر ہم نے اُوپر کی جانب سے پانی اُتارا پھر ہم نے وہ پانی تمہیں پلایا اور تم اس کے لئے خزانہ کرنے والے نہیں تھے ﴿۲۲﴾ بے شک ہم ہی

نُحْیٖ وَنُمِیْتُ وَنَحْنُ الْوٰرِثُوْنَ ﴿۲۳﴾ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِیْنَ

البتہ زندگی دیتے ہیں اور ہم ہی موت دیتے ہیں اور ہم ہی پیچھے رہنے والے ہیں ﴿۲۳﴾ اور تحقیق جان لیا ہم نے ان لوگوں کو جو تم میں سے پہلے

مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِیْنَ ﴿۲۴﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ هُوَ یَحْشُرُهُمْؕ اِنَّهٗ حَكِیْمٌ عَلِیْمٌ ﴿۲۵﴾

گزرے ہیں اور البتہ تحقیق جانا ہم نے پیچھے آنے والوں کو ﴿۲۴﴾ اور بے شک تیرا رَبّ ان سب کو جمع کرے گا، بے شک وہ حکمت والا علم والا ہے ﴿۲۵﴾

تفسیر

عالمِ بالا میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے کچھ نمونے

آگے اللہ تعالیٰ اپنی کچھ علاماتِ قدرت کی طرف متوجہ کرتے ہیں جس میں انعامات کے پہلو بھی ہیں وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا: بروج بُرج کی جمع ہے، بُرج کا لفظ قلعے کے لئے اور بڑے محل کے لئے بولا جاتا ہے، چنانچہ قرآنِ کریم میں دوسری جگہ یہی لفظ آئے گا اَیْنَ مَا تَكُوْنُوْا یُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَةٍ (النساء:۷۸) جہاں بھی تم ہو گے تمہیں موت پالے گی اگرچہ تم مضبوط کیے ہوئے، چونا کیے ہوئے محلات یا قلعوں کے اندر ہی بند کیوں نہ ہو۔ مُشَیَّد: چونا گچ، سیمنٹڈ جسے کہتے ہیں، سیمنٹ کیے ہوئے، چونے کے بنے ہوئے، مضبوط قسم کے قلعے۔ اگر تم ان کے اندر بھی بند ہو گے تو موت تمہیں وہاں بھی پالے گی۔ تو یہ بروج کا لفظ وہاں قلعوں اور محلات کے معنی میں ہے، تو یہاں بھی یہ معنی کیا جا سکتا ہے کہ ہم نے آسمان میں بڑے بڑے قلعے بنائے جن کے اندر فرشتے متعین ہیں جو پہرہ دیتے ہیں، حفاظت کرتے ہیں۔ اور بروج سے بڑے بڑے ستارے بھی مراد بھی لیے گئے ہیں کہ ہم نے آسمان میں بڑے بڑے ستارے بنائے، اور بعض لوگوں نے اس سے سورج چاند کی منزلیں بھی مراد لی ہیں جو منزلیں یہ طے کرتے ہیں، ''ہم نے آسمان میں بڑے بڑے ستارے بنائے، یا بڑے بڑے قلعے اور محلات بنائے'' وَزَیَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِیْنَ: اور ہم نے آسمان کو مزین کر دیا دیکھنے والوں کے لئے، یعنی یہ کائنات ہم نے بنائی ہے تو اس کے اندر زینت اور سجاوٹ کی رعایت بھی رکھی ہے، یہ نہیں کہ اوپر کو جھانکو تو ڈر لگے، نہیں! اللہ تعالیٰ نے آسمان کی جہت کو بڑا مزین کر دیا ہے، اب رات کی تاریکی میں جس وقت آپ اوپر کو دیکھتے ہیں تو کس طرح سے باغ و بہار نظر آتا ہے، مختلف قسم کے ستارے چمکتے ہیں، اور دیکھتے ہوئے انسان گھبراتا نہیں، بلکہ نظر کو

سرور حاصل ہوتا ہے، خوشی حاصل ہوتی ہے۔ وَحَفِظْنٰهَا: اور ہم نے اس آسمان کی حفاظت کی مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ: ہر مردود شیطان سے۔ رجیم: رجم کیا ہوا، مردود۔ یعنی کوئی شیطان مردود اوپر کی طرف نہیں جاسکتا کہ وہاں جا کے آسمان کی خبریں لے آئے، جس طرح سے پہلے زمانے میں یہ شیاطین اور جنات آسمان پہ جاتے تھے، آپ کے سامنے خود واقعہ کی تفصیل گزر چکی کہ یہ ابلیس جو کہ ان شیاطین کا جدِ اعلیٰ ہے، حضرت آدم علیہ السلام کو جس وقت پیدا کیا گیا تھا تو اس وقت یہ آسمان میں آتا جاتا تھا، اور وہیں تو اس کے ساتھ وہ معاملہ ہوا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے سجدے کا حکم دیا اور یہ انکاری ہوا، ملعون ہوا، پھر اس کو آسمان سے اتار دیا گیا، تو اس وقت ان کی آمد ورفت تھی اور اس کے بعد سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک بھی یہ اوپر تک جاتے تھے، اگرچہ اس طرح سے آسمان کے اوپر جا کے چکر نہ لگا آتے ہوں جس طرح سے پہلے تھے لیکن بہر حال جا کے مختلف جگہوں میں بیٹھ کے فرشتوں کی خبریں سن لیتے تھے، اور گفتگو سنتے، خبریں معلوم کرتے کہ آنے والے وقت میں کیا ہونے والا ہے، پھر دنیا کے اندر آ کے کاہنوں کو جن کے ساتھ ان کا تعلق ہوتا تھا یہ خبریں بتا دیتے تھے، اور کاہن پیش گوئیاں کرتے، کچھ ساتھ جھوٹ ملاتے، وہ پیش گوئیاں سچی نکلتیں، تو اس طرح سے لوگ ان کو مانتے تھے اور چڑھاوے دیتے تھے مٹھائیاں دیتے تھے، تو جاہلیت میں کہانت ایک مستقل پیشہ تھا، جس طرح سے سورۂ جن کے اندر آئے گا اَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ، کہ وہ خود ذکر کریں گے کہ مختلف ٹھکانوں پہ ہم بیٹھتے تھے، بیٹھ کے خبریں سُن آیا کرتے تھے، لیکن اب اگر کوئی سننے کی کوشش کرتا ہے تو اسے مار پڑتی ہے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں آ کے یہ پابندی ہوگئی، پھر ان کو اوپر آنے کی اور آسمان کی طرف بلندی پر آنے کی اجازت نہ رہی، بادلوں وغیرہ میں یہ آتے ہیں سننے کی کوشش کرتے ہیں، وہاں سے بھی اگر کوئی بات سن لیتا ہے تو شہابِ ثاقب اس کے پیچھے لگ جاتا ہے، یا تو اس کو ہلاک کر دیتا ہے، بالکل بیہوش کر دیتا ہے، اور گاہے گاہے کوئی مختصری بات سن کے آگے اب بھی پہنچا دیتے ہیں جس طرح سے روایات سے معلوم ہوتا ہے، لیکن آسمان کی بلندیوں میں نہیں جاسکتے، یہ بادلوں میں اور اردگرد کچھ نہ کچھ چوروں کی طرف اگر کسی نہ کسی بات کو سن کر اگر پہنچا دیں تو ایسی بات گاہے کوئی سچی بھی نکل سکتی ہے، جس طرح سے روایات کی تفصیل سے معلوم ہوتا ہے، بہر حال جتنی بلندی پہ پہلے جاتے تھے آسمانوں کی طرف، ایسی بلندی پہ اب نہیں جاسکتے، وَحَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ: ہم نے ہر شیطانِ رجیم سے اس آسمان کی حفاظت کی۔ اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيْنٌ: یہ اِلَّا لٰكِنْ کے معنی میں ہے، مستثنیٰ منقطع۔ اِسْتِرَاق: چوری کرنا۔ سَمْع: سنی ہوئی بات، مسموع۔ مایؤول کے اعتبار سے چونکہ وہ بات مسموع ہوگئی اس لیے اس کو سَمع سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ''لیکن جو کوئی شخص چُرا لے کسی سنی ہوئی بات کو'' فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيْنٌ: تو اس کے پیچھے شہابِ مبین لگ جاتا ہے، ایک واضح شعلہ اس کے پیچھے لگ جاتا ہے۔ شہابِ مبین واضح شعلہ یہ وہی ہے جس کو آپ اپنی زبان میں ستارے کا ٹوٹنا کہتے ہیں کہ ستارہ ٹوٹ گیا، یہ اصل کے اعتبار سے مختلف شعلے ہیں جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے پیدا ہوتے ہیں، اور اب ان سے رجمِ شیاطین کا کام لیا جاتا ہے، ورنہ یہ شہاب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بھی اس طرح سے ہوتے تھے، ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے آگ سی ایک طرف سے دوسری طرف کو جارہی ہے، اور پُرانی عربی کے اندر بھی اس کو ''انقضاضِ کوکب'' کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے یعنی ستارے کا ٹوٹنا، اُس وقت یہ ٹوٹتے تھے اللہ کی کسی اور حکمت کے تحت، اور بعد میں ان سے رجمِ شیاطین کا کام بھی لینا شروع کر دیا گیا۔ اور موجودہ سائنس جو کچھ کہتی ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ زمین کی طرف سے

کچھ بخارات اوپر جاتے ہیں جن کے اندر کچھ ایسے مادّے بھی ہوتے ہیں جو آگ کو قبول کرلیں تو اُوپر جا کے اُوپر کی فضا کا کوئی اثر پڑتا ہے تو اس کو آگ لگ جاتی ہے، آگ لگنے کے ساتھ وہ یوں بھاگتے ہوئے نظر آتے ہیں جس طرح سے کوئی آگ کا شعلہ ہے، ظاہری اسباب کی طرف دیکھتے ہوئے اگر ایسی تحقیق ہے تو ہم اس کا بھی انکار نہیں کرتے، اور ستاروں سے بھی اس قسم کے شعلے نکلتے ہوں تو اس کے انکار کی بھی کوئی وجہ نہیں ہے، اس کے ظاہری اسباب کچھ ہوں لیکن اللہ تعالیٰ باطنی اسباب کی نشاندہی کرتا ہے کہ اصل میں اللہ نے شیاطین کو رجم کرنے کا ان کو ذریعہ بنایا ہے، پہلے بھی یہ شہابِ مبین ہوتے تھے لیکن ان سے رجم کا کام نہیں لیا جاتا تھا، سرورِ کائنات ﷺ کی آمد کے بعد ان سے رجم کا کام لینا شروع کر دیا گیا، یہ تو عالمِ بالا کی طرف کی علامات تھیں۔

عالمِ سفلی میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے کچھ نمونے

وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا: اور زمین، ہم نے اس کو بچھا دیا، وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ: یہ لفظ بار بار آپ کے سامنے گزر چکے۔ رَوَاسِيَ رَاسِيَة کی جمع ہے، مضبوط اور بوجھل پہاڑ۔ ڈال دیے ہم نے ان کے اندر مضبوط اور بوجھل پہاڑ۔ ان کے ڈالنے کی حکمت دوسری جگہ آپ کے سامنے آئے گی اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ (النحل:۱۵) تا کہ تمہیں لے کے یہ ایک طرف کو جھک نہ جائے، اگر یہ پہاڑ نہ ہوتے تو پانی اور ہوا کے اثر سے زمین ہچکولے کھاتی، اور ایسا ہوسکتا تھا کہ جس طرح سے گیند آپ پانی کے اندر چھوڑ دیں اور وہ کسی وقت بہت پانی کے ساتھ یوں ہو جائے گی، الٹ جائے گی جس طرح سے کشتی الٹ جاتی ہے، تو اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کو قائم کر کے اس کا تناسب بحال کر دیا کہ اب یہ اس طرح سے ہچکولے نہیں کھاتی، ''ڈال دیا ہم نے اس کے اندر بوجھل پہاڑوں کو'' وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ: اور اُگایا ہم نے اس زمین میں ہر موزون چیز کو۔ موزون: متعین مقدار کی، وزن کی ہوئی، اور موزون مناسب کو بھی کہتے ہیں، ہر مناسب چیز ہم نے اس کے اندر اُگائی، ایک اندازے کے ساتھ اگائی، ایک وزن کے تحت اگائی، بے تحاشا نہیں، اتنی سی چیز اللہ تعالیٰ پیدا فرماتے ہیں جتنا اس کی حکمت کا تقاضا ہوتا ہے اور زمین کی آبادی کی ضرورت کے لئے وہ کافی ہوتی ہے، کچھ طلب باقی رہے اور کچھ ضرورت پوری ہوتی چلی جائے، اسی طرح سے اس دنیا کا نظام قائم ہے، اگر ایک چیز اتنی وافر مقدار میں پیدا کر دی جائے جو ضرورت سے بہت زائد ہو تو وہ نعمت کی بجائے الٹا مصیبت بن جائے گی، ''ہر موزون چیز ہم نے اس زمین کے اندر اُگائی'' متعین چیز، اندازہ کی ہوئی، مناسب چیز ہم نے اس کے اندر اُگائی، یعنی اس ایک ایک لفظ کے اندر پوری کی پوری کائنات مضمر ہے کہ آپ اندازہ لگانا شروع کریں کہ کونسی چیز پیدا ہوئی، کس تناسب کے ساتھ پیدا ہوئی، کس مقدار کے ساتھ پیدا ہوئی، اس میں کتنی حکمتیں ہیں، اگر اس سے کم ہوتی تو کیا تکلیف ہوتی، اگر اس سے زیادہ ہوتی کیا تکلیف ہوتی، آپ ایک چیز چیز کا جائزہ لینا شروع کریں گے تو اللہ کی حکمت ہی حکمت نمایاں ہوتی چلی جائے گی۔ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ: اور ہم نے تمہارے لیے (معایش مَعِيْشَة کی جمع ہے) اسبابِ زیست، زندگی گزارنے کے اسباب ہم نے تمہارے لیے اس زمین میں بنائے یعنی زندگی گزارنے کے لئے تمہیں جتنی چیزوں کی ضرورت ہے وہ ہم نے اس زمین کے اندر تمہارے لیے بنا دیں۔ وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ: اس کا عطف لَكُمْ پر ہے، یعنی تمہارے لیے اور ان کے لئے جن کو تم روزی دینے والے نہیں ہو، یعنی اتنے حیوانات اس زمین کے اندر موجود ہیں

سمندروں میں دریاؤں میں خشکیوں میں اور جنگل میں، کہ جن کے رزق کا انتظام انسان نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے بھی اسباب معیشت بنائے ہیں، اور بعض جانور ایسے ہیں جن کو آپ گھروں میں پالتے ہیں، تو چلو ظاہری طور پر آپ ان کے لئے چارے کا کوئی انتظام کرتے ہیں، لیکن اس سے کروڑ ہا زائد جانور ایسے ہیں، پرندے ہوں، چرند ہو، درند ہو، جس قسم کے بھی ہیں، دریاؤں میں سمندروں میں، انسان ان کی روزی کا کوئی انتظام نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے بھی معاش بنائی ہے، اسباب زیست ان کے لئے بھی اللہ نے بنائے ہیں۔ "بنائے تمہارے لیے اس زمین کے اندر اسباب زیست، زندگی گزارنے کے اسباب، اور ان کے لئے بھی جن کو تم روزی دینے والے نہیں ہو۔" وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ: نہیں ہے کوئی چیز مگر ہمارے پاس اس کے خزانے ہیں، ہمارے پاس ہر چیز کے خزانے بھرے پڑے ہیں، وَمَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ: اور نہیں اتارتے ہم اس کو مگر ایک معلوم اندازے سے، ہمارے پاس کمی نہیں ہے لیکن ہم اس کو اتارتے ایک اندازے کے ساتھ ہیں۔ وَاَرْسَلْنَا الرِّیٰحَ لَوَاقِحَ: لَوَاقِحَ لاقِحه کی جمع ہے، بوجھل کرنے والی۔ اور بھیجا ہم نے ہواؤں کو جو بوجھل کرنے والی ہیں، یعنی بادلوں کو پانی سے بھر دیتی ہیں، ان کو بوجھل کر دیتی ہیں۔ یہ بارش کا نظم جو اللہ نے قائم کیا ہے، جس میں بہت بڑی قدرت بھی نمایاں ہے اور بہت بڑے احسانات بھی ہیں، سمندر سے بخارات اٹھتے ہیں، ہوائیں ان کو اٹھا کے لے جاتی ہیں، طبقۂ زمہریر میں پہنچ کے وہ پانی بنتے ہیں، بادلوں کی شکل اختیار کرتے ہیں، اور پھر یہ پانی کے ٹینک اور پانی کے بھرے ہوئے جہاز، ان کو ہوا اٹھا کے مختلف علاقوں میں لے جاتی ہے، اور وہاں پھر یہ اللہ کی حکمت کے تحت برستے ہیں، اس طرح سے اللہ نے آب پاشی کا نظام قائم کیا ہوا ہے کائنات کو فائدہ پہنچانے کے لئے۔ برستے ہیں پھر ندی نالوں میں بہتے ہوئے آتے ہیں، آپ کی زمین کو سیراب کرتے ہیں، کچھ پانی زمین چوس لیتی ہے وہ نیچے کے مساموں کے ذریعے سے آپ کو کنوؤں کی شکل میں ملتا ہے، اور کچھ پانی آپ کے لئے دوسرے وقت میں کام آنے کے لئے محفوظ رکھ لیا جاتا ہے، اب اگر محفوظ رکھنے کھلے جوہڑ اور کھلے تالاب ہی ہوتے تو اس میں بھی پانی کے خراب ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے، کیڑے پیدا ہو جاتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ زائد مقدار کو برف کی شکل میں پہاڑوں کی چوٹیوں پر ذخیرہ کر دیتا ہے، کتنے کروڑ ہا ٹن پانی برف کی شکل میں پہاڑوں کی چوٹیوں پہ پڑا ہوا ہے، اور جس موسم میں بارش نہیں ہوتی ان دنوں میں آہستہ آہستہ پگھل پگھل کے کس طرح سے صاف ستھرا پانی آپ تک پہنچتا ہے، کچھ زمین کے اندر سے ہو کر چشموں کی شکل میں آرہا ہے، کچھ ویسے پگھل پگھل کے دریاؤں کی شکل میں آرہا ہے، تو اللہ تعالیٰ کی حکمت کے تحت اس پانی کی تقسیم کیسی ہے؟ اگر اس کے اوپر غور کیا جائے تو یہی ایک احسان اللہ کا ایسا ہے کہ جس کا شکر ادا نہیں کیا جا سکتا، پانی کا ذائقہ محفوظ، پانی کے اثرات محفوظ، اس میں خس وخاشاک نہیں مل سکتے، برف کی طرح جب جم گیا تو کتنی دیر پڑا رہے خراب ہونے کا سوال ہی نہیں۔ اور اس احسان کو بھی اللہ تعالیٰ نے سورۂ واقعہ کے اندر ذکر فرمایا اَفَرَءَیْتُمُ الْمَآءَ الَّذِیْ تَشْرَبُوْنَ: تم نے دیکھا؟ جو پانی تم پیتے ہو، ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ: کیا بادلوں سے اس کو تم اتارتے ہو؟ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ: یا ہم اتارنے والے ہیں؟ لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا: اگر ہم چاہتے تو اس کو کڑوا کر دیتے، پینے کے قابل ہی نہ ہوتا، پھر تم کیا کر لیتے؟ "بھیجا ہم نے ہواؤں کو جو بوجھل کرنے والی ہیں" فَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً: پھر

ہم نے اوپر کی جانب سے پانی اتارا۔ سماء جانبِ عالی کو کہتے ہیں۔ اوپر کی جانب سے ہم نے پانی اتارا، فَاَسْقَيْنٰكُمُوْهُ: پھر ہم نے وہ پانی تمہیں پلایا، پینے کے لئے دیا، تمہیں سیراب کیا اس پانی سے، وَمَاۤ اَنْتُمْ لَهٗ بِخٰزِنِيْنَ: اور تم اس کا پانی کا خزانہ کر کے رکھنے والے نہیں، یعنی اگر تمہیں کہہ دیا جاتا کہ تم اپنی ضرورت کا پانی محفوظ کرلو تو تم اتنا پانی استعمال کرتے ہو کہ اگر اس کو محفوظ کر کے رکھنا پڑ جاتا تو کہاں رکھتے؟ اتنی مشکیزے! اتنے ٹینک! اتنی ٹینکیاں! کہاں سے لاتے؟ یہ اللہ تعالیٰ نے محفوظ کر دیا، کچھ زمین کے اندر کچھ زمین کے باہر، کچھ تالابوں کی شکل، کچھ پہاڑوں کے اوپر، کچھ کسی طرح سے، یہ ذخیرہ سارے کا سارا اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے محفوظ رکھا، بوقتِ ضرورت تم اس میں سے نکالتے رہتے ہو، مٹی میں سرایت کرتا ہوا فلٹر ہو کر آتا ہے، اس میں کوئی اس قسم کی چیز نہیں ہے، چشموں میں آتا ہے، دریاؤں میں بہتا ہے، وَمَاۤ اَنْتُمْ لَهٗ بِخٰزِنِيْنَ: تم اس کے لئے خزانہ کرنے والے نہیں تھے۔

معاد اور آخرت کا ذکر اور اس سے مقصود

وَاِنَّا لَنَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ وَنَحْنُ الْوٰرِثُوْنَ: یہ معاد کا تذکرہ آ گیا، کہ اللہ کی اس قسم کی قدرتوں کو دیکھنے کے بعد اس میں کوئی شک نہیں رہنا چاہیے کہ مرنے کے بعد دوبارہ بھی اللہ تعالیٰ زندہ کرلیں گے، "بے شک ہم ہی البتہ زندگی دیتے ہیں اور ہم ہی موت دیتے ہیں، اور ہم ہی پیچھے رہنے والے ہیں" یعنی ایک وقت آئے گا تم سب مرجاؤ گے اور تم سب کا ورثہ ہمارے پاس ہی رہ جائے گا، ہم وارث ہوں گے، وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنْكُمْ: البتہ تحقیق جان لیا ہم نے ان لوگوں کو جو تم میں سے پہلے گزرے ہیں، یعنی گزشتہ اُمتیں جو وفات پا گئے، پہلے لوگ، وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِيْنَ: اور البتہ تحقیق جانا ہم نے تم سے پیچھے آنے والوں کو، اگلے پچھلے سب ہمارے علم میں ہیں، کوئی ہمارے علم سے باہر نہیں، وَاِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ: اور بے شک تیرا رب ان سب کو جمع کرے گا، اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ: بے شک وہ حکمت والا ہے علم والا ہے۔

سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۚ﴿۲۶﴾ وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ

البتہ تحقیق پیدا کیا ہم نے انسان کو بجنے والی مٹی سے جو سڑے ہوئے گارے سے ہے ﴿۲۶﴾ اور جن کو پیدا کیا ہم نے اس (آدم) سے پہلے

مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ﴿۲۷﴾ وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا

ایسی آگ سے جو گرم ہوا کی طرح ہے ﴿۲۷﴾ اور یاد کیجئے جس وقت کہ تیرے رب نے فرشتوں سے کہا بے شک میں بنانے والا ہوں ایک بشر

مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۸﴾ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ

بجنے والی مٹی سے جو کہ سڑے ہوئے گارے سے ہے ﴿۲۸﴾ جس وقت میں اس کے اعضا دُرست کرلوں اور اس میں اپنی رُوح پھونک دُوں

فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴿۲۹﴾ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ﴿۳۰﴾ اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰٓى اَنْ

تو گر جانا اس کے لئے سجدہ کرنے والے ﴿۲۹﴾ فرشتوں نے سجدہ کیا سب نے اکٹھے ہی سوائے ابلیس کے ﴿۳۰﴾ انکار کردیا اس نے اس بات سے

يَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۳۱﴾ قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۳۲﴾

کہ وہ سجدہ کرنے والوں کے ساتھ ہو جائے ﴿۳۱﴾ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اے ابلیس! تجھے کیا ہو گیا کہ تو سجدہ کرنے والوں کے ساتھ نہ ہوا ﴿۳۲﴾

قَالَ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۳۳﴾

ابلیس نے کہا نہیں ہوں میں کہ سجدہ کروں ایسے بشر کو جس کو پیدا کیا تو نے بجنے والی مٹی سے جو سڑے ہوئے گارے سے تیار ہوئی ﴿۳۳﴾

قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ﴿۳۴﴾ وَّاِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۳۵﴾ قَالَ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا نکل جا یہاں سے پس بے شک تو دھتکارا ہوا ہے ﴿۳۴﴾ اور تیرے اُوپر لعنت رہے گی قیامت کے دن تک ﴿۳۵﴾ اس نے کہا کہ

رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۳۶﴾ قَالَ فَاِنَّكَ

اے میرے پروردگار! پس تو مجھے مہلت دے دے اس دن تک جس میں مخلوق کو اُٹھایا جائے گا ﴿۳۶﴾ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بے شک تو

مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ﴿۳۷﴾ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ﴿۳۸﴾ قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ

مہلت دیے ہوؤں میں سے ہے ﴿۳۷﴾ وقتِ معلوم کے دن تک ﴿۳۸﴾ وہ کہنے لگا کہ اے میرے رَبّ! بسبب تیرے مجھ کو گمراہ کردینے کے

لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۳۹﴾ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ

میں ان کے لئے زینت پیدا کروں گا زمین میں اور میں البتہ ضرور گمراہ کردوں گا ان سب کو ﴿۳۹﴾ لیکن تیرے بندے ان میں سے

الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۴۰﴾ قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ ﴿۴۱﴾ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ

جو چُنے ہوئے ہوں گے ﴿۴۰﴾ اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہی ہے سیدھا راستہ جو مجھ تک پہنچتا ہے ﴿۴۱﴾ بے شک میرے بندے، تیرا ان کے اُوپر

سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿۴۲﴾ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۴۳﴾ لَهَا

کوئی زور نہیں، مگر جو تیری اطاعت کرے گا گمراہوں میں سے ﴿۴۲﴾ بے شک جہنم البتہ ان سب کا وعدہ ہے ﴿۴۳﴾ اس (جہنم) کے لئے

سَبْعَةُ اَبْوَابٍ ؕ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ ﴿۴۴﴾ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ

سات دروازے ہوں گے، ہر دروازے کے لئے ان (انسانوں) میں سے جزء تقسیم کیا ہوا ہے ﴿۴۴﴾ بے شک اللہ سے ڈرنے والے باغات میں

وَّعُيُوْنٍ ﴿۴۵﴾	اُدْخُلُوْهَا	بِسَلٰمٍ	اٰمِنِيْنَ ﴿۴۶﴾

اور چشموں میں ہوں گے ﴿۴۵﴾ (انہیں کہہ دیا جائے گا کہ) داخل ہو جاؤ اس جنت میں سلامتی کے ساتھ اس حال میں کہ تم امن والے ہو ﴿۴۶﴾

وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ﴿۴۷﴾

ہم کھینچ لیں گے جو کچھ ان کے سینوں کے اندر کینہ بغض ہے، بھائیوں کی طرح تختوں کے اوپر آمنے سامنے بیٹھنے والے ہوں گے ﴿۴۷﴾

لَا يَمَسُّهُمْ فِيْهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ ﴿۴۸﴾

نہ ان کو اس کے اندر کوئی مشقت چھوئے گی اور نہ وہ اس سے نکالے جائیں گے ﴿۴۸﴾

تفسیر

اِنسان کی پیدائش کا ذِکر اور اس سے مقصود

یہاں اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کرنے اور اس کو شرفِ روحانی ملنے کا ذکر فرمایا ہے، اور اس میں یہ یاددہانی کرانی مقصود ہے کہ جس وقت اللہ تعالیٰ نے تمہیں یہ شرف عطا فرمایا تھا تو اس وقت ہی ابلیس حسد میں مبتلا ہوا، اور آدم علیہ السلام کے ساتھ حسد کرنے کی وجہ سے اس کو مردود ٹھہرایا گیا، اور آئندہ کے لئے اس نے دھمکی دی تھی کہ میں آدم کی اولاد کو گمراہ کروں گا، تو آدم کے بچوں کو چاہیے کہ ہر وقت ہوشیار رہیں، اور یہ دُنیوی زندگی ایک قسم کا میدانِ جنگ ہے، جس میں شیطان پچھاڑنے کی کوشش کرے گا تا کہ جس طرح سے تمہارے جدِ اعلیٰ کو جنت سے نکال دیا تھا آئندہ کے لئے بھی تمہیں وہ محروم کر دے، تو اپنا شرف بچانے کا طریقہ یہی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے بتائے ہوئے طریقے کو اختیار کرو، اور اللہ کے طریقے کے خلاف جتنے طریقے ہیں وہ سب ابلیسی طریقے ہیں، ان ابلیسی طریقوں سے بچو، تبھی جا کے تمہارا یہ شرف محفوظ رہے گا، ورنہ تم ذلیل ہو گے اور تمہارا انجام خراب ہوگا۔ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ: لَقَدْ تاکید کے لئے ہے۔ پیدا کیا ہم نے انسان کو۔ انسان سے اصلِ انسان مراد ہے جس کا مصداق آدم علیہ السلام ہیں، مِنْ صَلْصَالٍ: بجنے والی مٹی، جو خشک ہونے کے بعد کھڑکتی ہے، کھنکھنانے والی مٹی، مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ: حَمَاٍ: گارا۔ مسنون: سڑا ہوا۔ سڑے ہوئے گارے سے، یعنی گارے کو جس وقت چند دِن بھگو کے رکھ لیا جائے اور اس میں کسی درجے میں تعفن پیدا ہو جائے تو پھر اس میں کچھ لزوجت اور چکناہٹ بھی آجاتی ہے، اور خشک ہونے کے بعد پھر وہ مٹی بجنے لگ جایا کرتی ہے، جس طرح سے یہ کمہار برتن بنانے والے یوں ہی مٹی کو کافی وقت تک بھگو کے رکھتے ہیں تب اس کے اندر ذرا چکناہٹ آجانے کے بعد، چکنا پن آجانے کے بعد پھر اس سے برتن بنائے جاتے ہیں، اور خشک ہونے کے بعد پھر وہ برتن بجتے ہیں، تو صلصال وہی بجنے والی مٹی ہے۔ اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ کرنا مقصود ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے انسان کی خلقت میں مٹی کا عنصر غالب رکھا ہے تو اس کو چاہیے کہ یہ مٹی طرح ہی تواضع اختیار کرے، ابتدا تو مٹی سے ہوئی اور انسان اکڑے شیطان کی طرح، اور اللہ تعالیٰ کے احکام

سے سرکشی کرے، یہ مناسب نہیں ہے۔ البتہ جنوں کو اللہ نے آگ سے پیدا کیا ہے جس طرح سے اگلی آیت کے اندر ذکر کیا گیا، اور آگ کے مزاج کے اندر اشتعال ہے، چنانچہ وہ اسی اشتعال کی وجہ سے ملعون ٹھہرا، تو انسان کو مناسب نہیں ہے کہ شیطانوں کی طرح اس کے اندر اشتعال ہو اور اللہ تعالیٰ کے اَحکام کے مقابلے میں یہ گردن کشی کرے، یہ بات کسی صورت میں اچھی نہیں لگتی، جیسا کہ ہمارے شیخ (سعدیؒ) کہتے ہیں:

زِخاک آفریدت خداوند پاک پس اے بندہ! افتادگی کُن چو خاک[1]

اس میں یہی یاددہانی کرائی گئی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے تمہیں مٹی سے بنایا ہے تو آئندہ کے لئے تمہیں مٹی کی طرح ہی تواضع اختیار کرنی چاہیے۔

جنّات کی پیدائش کا ذِکر

وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ: جانّ سے بھی یہاں اصلِ جن مراد ہے، ابوالجن، جہاں سے یہ نسل چلی تھی۔ ’’اور جن کو پیدا کیا ہم نے اس آدم سے پہلے‘‘ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ: نارِ سموم کے اندر اضافت تشبیہی ہے، سموم کہتے ہیں گرم ہوا کو جو مساموں کے اندر گھستی چلی جاتی ہے، تو نارِ سموم سے مراد ہو گیا ایسی آگ جو لطافت میں گرم ہوا کی طرح تھی۔ چونکہ ان کا عنصر لطیف ہے تو اسی کا اثر ہے کہ یہ مختلف شکلیں بھی تبدیل کر لیتے ہیں اور عام طور پر انسان کو نظر بھی نہیں آتے، جیسے کہ فرشتوں کا عنصر بھی لطیف ہے وہ نُوری ہیں، نُوری اور ناری اس اعتبار سے آپس میں دونوں برابر ہیں کہ ان کے اندر وہ کثافت نہیں جو مٹی کے اندر ہوتی ہے، اس لیے فرشتے بھی نظر نہیں آتے اور جن بھی نظر بھی نہیں آتے، فرشتے بھی مختلف شکلوں میں متشکل ہو جاتے ہیں اور جن بھی مختلف شکلوں میں متشکل ہو جاتے ہیں، اور انسان کو عام طور پر یہ نظر نہیں آتے، لیکن اصل کے اعتبار سے فرق ہوا کہ فرشتے نُوری ہیں اس لیے ان کے اندر خیر ہی ہے، اور جنات ناری ہیں اس لیے ان کے اندر اشتعال اور شرارت کا غلبہ ہے۔ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ: ایسی آگ سے پیدا کیا جو لطافت میں گرم ہوا کی طرح ہے۔

رُوح کی حقیقت اور اَقسام

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ: اور یاد کیجیے جس وقت کہ تیرے رَبّ نے فرشتوں سے کہا، بے شک میں پیدا کرنے والا ہوں انسان کو، بنانے والا ہوں ایک بشر بجنے والی مٹی سے جو کہ سڑے ہوئے گارے سے ہے، فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ: جس وقت میں اس کو ٹھیک ٹھاک کر لوں، اس کے اعضا دُرست کر لوں، یہ تو ظاہری ڈھانچہ بنانے کی طرف اشارہ ہو گیا، وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ: رُوْحِیْ کے اندر رُوح کی نسبت جو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف کی کہ میں اس میں اپنی رُوح پھونک دوں تو یہ اضافت تشریف کے لئے ہے، ورنہ یہ رُوح اللہ کا جز نہیں، جس طرح سے بیت اللہ میں بیت کی نسبت اللہ کی طرف کر دی گئی، ناقۃ اللہ میں ناقہ کی نسبت اللہ کی طرف کر دی گئی، اللہ کی ناقہ، اللہ کا گھر، اسی طرح سے روح کی نسبت اللہ کی طرف کی گئی ہے۔ اب روح کیا چیز ہے؟ اس کی حقیقت

(۱) بوستاں، باب چہارم کا شروع۔

پر مطلع ہونا مشکل ہے، اللہ تعالیٰ کے امر سے کوئی چیز انسان کے اس وجود میں آتی ہے جس کی وجہ سے اس میں کمالات حاصل کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے، روح اصل میں دو قسم کی ہے، ایک ہے جس کو روح حیوانی کہتے ہیں، وہ تو ہر حیوان میں ہے جس کی بنا پر حیوان کو زندگی ملتی ہے، وہ تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ جس وقت کسی جانور کو ذبح کیا جاتا ہے اور اس کی رگوں سے خون نکلتا ہے تو ایک دھواں سا اٹھتا ہوا، بخارات بھی اٹھتے ہوئے بھی محسوس ہوا کرتے ہیں، خاص طور پر بڑا جانور ذبح کریں گائے بھینس وغیرہ، تو اس میں یہ چیز زیادہ نمایاں ہوتی ہے، چونکہ خون زیادہ نکلتا ہے اور گرم ہوتا ہے، اور اس گرم خون سے اک بھاپ سی اُٹھتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، تو یہ جو بھاپ سی اُٹھ رہی ہے اصل کے اعتبار سے حیوانی روح یہ ہے جو اللہ تعالیٰ ان بخارات کو خون سے ابھارتا ہے اور اس بھاپ کے ذریعے سے حیوان کی مشین چلتی ہے، اور جس وقت رگیں کٹتی ہیں خون نکلتا ہے تو پھر ساری کی ساری روح بھی نکل جاتی ہے، اور اس روح کے نکلنے کی وجہ سے پھر وہ مشین ٹھہر جاتی ہے، اس درجے کی روح کہ جس کے ساتھ اس مشین کو حرکت دی جا رہی ہے اور اس کے اندر احساسات بیدار ہوتے ہیں جس طرح سے کہ حیوان حساس ہے، اس میں احساسات ہوتے ہیں، تو وہ تو اسی حیوانی روح کا نتیجہ ہے، اور یہ تو انہی عناصر سے ہی پیدا ہوتی ہے، خاص طور پر خون کی گرمی سے بخارات اٹھتے ہیں جو اس مشین کو حرکت دیتے ہیں۔ لیکن انسان میں صرف یہی بات نہیں بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ایک نئی روح بھی اس کے اوپر فائض ہوتی ہے، یہ من جانب اللہ جو آئی اللہ کے امر سے، اصل کے اعتبار سے انسان کی خصوصیات اور اس میں کمالات حاصل کرنے کی جو صلاحیت پیدا ہوتی ہے وہ اسی خصوصی روح کی بناء پر ہے جو عالم بالا کی طرف سے اللہ تبارک وتعالیٰ انسان میں بھیجتے ہیں، اس کے آنے کے ساتھ انسان کو وہ شرف حاصل ہوا جس کی بنا پر یہ مسجودِ ملائکہ ٹھہرایا گیا۔ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ: پھر گر جانا تم سارے کے سارے اس کے لئے سجدہ کرنے والے۔ قَعُوْا امر کا صیغہ ہے، وَقَعَ یَقَعُ سے اُمر کا صیغہ آئے گا: قَعْ، قَعَا، قَعُوا۔ ''گر جاؤ اس کے لیے سجدہ کرنے والے'' یعنی جس وقت میں اس میں روح پھونک دوں تو تم اس کو سجدہ کرنا۔

حکمِ ربانی کے آگے فرشتوں کی فرماں برداری اور شیطان کا اِنکار

فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ: درمیان میں اس واقعے کو حذف کر دیا گیا کہ پھر اللہ نے اس میں روح پھونکی، پھر وہ آدم زندہ ہوا، اس میں حیات آئی، تو فرشتے اللہ کے حکم تحت آدم کے سامنے سجدہ کے لئے جھک گئے، اس کی تعظیم کی، فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ: فرشتوں نے سجدہ کیا سب نے اکٹھے ہی، اِلَّآ اِبْلِيْسَ: سوائے ابلیس کے۔ اب آیات سے جیسے معلوم ہوتا ہے کہ سجدہ کرنے کا براہِ راست حکم تو فرشتوں کو تھا، اور جن کا ذکر نہیں آیا کہ جنوں کو بھی حکم دیا تھا کہ سجدہ کرنا ہے، لیکن یہ اس میں شامل تھا، یا تو اس لیے کہ جس وقت اشرف مخلوق کو حکم دے دیا گیا تو جو اس سے گھٹیا تھا وہ بدرجہ اولیٰ اس میں آجائے گا، یا عملاً یہ فرشتوں کے اندر شامل رہتا تھا، آسمان میں آتا جاتا تھا، وہاں اس کا چلنا پھرنا ہوتا تھا، تو جب حکم دیا گیا تو یہ بھی اس میں شامل تھا۔ اور ابلیس یہ سمجھتا تھا کہ مجھے بھی حکم دیا گیا ہے، ورنہ جس وقت اس نے سجدہ کرنے سے انکار کیا اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس کے اوپر گرفت ہوئی کہ تُو نے سجدہ کیوں نہیں کیا، تو اس نے آگے سے یہ عذر نہیں کیا کہ کہ مجھے تو حکم ہی نہیں دیا گیا، میں سجدہ کیوں کرتا؟ آپ نے

مجھے کب کہا تھا کہ تُو نے بھی سجدہ کرنا ہے؟ آپ نے تو فرشتوں سے کہا تھا، اس لیے میں نے اگر سجدہ نہیں کیا تو اس لیے نہیں کیا کہ آپ کا حکم ہی مجھے نہیں تھا، اس نے یہ عذر نہیں کیا، وہ آگے سے عذر یہ کرتا ہے کہ میں افضل ہوں اعلیٰ ہوں، میں ادنیٰ کو سجدہ کیوں کروں؟ تیرا یہ حکم حکمت کے خلاف ہے، مصلحت کے خلاف ہے، چاہیے تو یہ کہ جو افضل ہو اس کو سجدہ کرایا جائے، یہ کیا کہ افضل کو غیر اُفضل کے سامنے جھکایا جا رہا ہے؟ آگے سے اس نے جو یہ دلیل بیان کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت کے اعتبار سے وہ بھی مامور تھا اور اس کو بھی حکم دیا گیا تھا، اور اگر اس کو حکم نہ دیا گیا ہوتا تو جب اس کے اوپر سختی کی گئی تھی تو وہ یہ عذر کر سکتا تھا کہ آپ نے مجھے کہا کب ہے؟ کہا ہے نہیں اور ایسے ہی ناراض ہونے لگ گئے، یہ عذر کیا جا سکتا تھا، لیکن اس نے یہ عذر نہیں کیا، لہٰذا سجدہ کرنے کا حکم اس کو بھی تھا، اس نے سجدہ نہیں کیا باقی سب نے کر دیا، اَبٰۤى اَنْ یَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِیْنَ: اَبٰی یَأْبٰی: انکار کر دینا، کسی بات سے شدت کے ساتھ اُڑ جانا۔ انکار کر دیا اس نے اس بات سے کہ وہ سجدہ کرنے والوں کے ساتھ ہو جائے، سجدہ کرنے والوں کے ساتھ شامل ہونے سے وہ رک گیا، اُڑ گیا، اس نے انکار کر دیا۔

اِبلیس کا قیامت تک ملعون ٹھہرایا جانا

قَالَ یٰۤاِبْلِیْسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِیْنَ: اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اے ابلیس! تجھے کیا ہو گیا کہ تُو سجدہ کرنے والوں کے ساتھ نہ ہوا؟ قَالَ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ: یہ وجہ بتائی سجدہ نہ کرنے کی۔ وہ کہتا ہے کہ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ: نہیں ہوں میں کہ سجدہ کروں ایسے انسان کو، ایسے بشر کو جس کو پیدا کیا تُو نے بجنے والی مٹی سے جو سڑے ہوئے گارے سے تیار ہوئی، میں اس کو سجدہ نہیں کر سکتا، سورۂ اَعراف کے اندر یہ واقعہ جس طرح سے آپ کے سامنے آیا ہے، اس میں الفاظ یہ آئے تھے کہ تُو نے اس کو مٹی سے بنایا، وہاں ''طین'' کا لفظ ہے، اور یہاں صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ آ گیا، بات ایک ہی ہے، ''طین'' بھی گارے کو کہتے ہیں، حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ کا مصداق طین ہے، اور مقابلے میں ذکر کیا تھا کہ مجھے تُو نے آگ سے بنایا ہے، اور اس میں سے نتیجہ اخذ کیا تھا کہ اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ میں اس سے بہتر ہوں، کہ چونکہ میرا اصل اس کے مقابلے میں بہتر ہے، تو وہ تفصیل وہاں آپ کے سامنے آ گئی تھی، یہاں کچھ اجمال کے ساتھ اس کو ذکر کیا جا رہا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِیْمٌ، یعنی اس کی اس دلیل کو اللہ تعالیٰ نے توڑا نہیں، کیونکہ یہ بالکل بدیہی البطلان تھی کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے بعد اس قسم کی حُجت بازی مخلوق کے لئے زیبا نہیں، اس لیے یہاں اللہ تعالیٰ نے حاکمانہ جواب دیا کہ میرے حکم کے سامنے اس قسم کی منطق چلاتے ہو، اور یوں اپنی مصلحتیں بیان کر کے میرے حکم کے خلاف سرکشی کرتے ہو تو نکل جاؤ یہاں سے، فَاخْرُجْ مِنْهَا: نکل جا یہاں سے، فَاِنَّكَ رَجِیْمٌ: پس بے شک تُو دھتکارا ہوا ہے، رجم کیا ہوا ہے، پھٹکارا ہوا ہے، وَّاِنَّ عَلَیْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى یَوْمِ الدِّیْنِ: اور تیرے اوپر لعنت رہے گی قیامت کے دِن تک، جب قیامت تک ملعون ٹھہرا دیا گیا تو قیامت کے بعد تو مرحوم ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کو اگر حاصل کیا جا سکتا ہے تو عمل اور نیکی کے ذریعہ سے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے، تو جب یہ قیامت تک ملعون ہے تو اس کا مطلب یہ ہے اس کو نیکی کی

توفیق نہیں ہوگی، یہ توبہ نہیں کر سکے گا، تو ایسی صورت میں قیامت کے بعد تو سزا کا سلسلہ شروع ہو جائے گا پھر اس کے مرحوم ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اِبلیس کا بنی آدم سے حسد اور اللہ تعالیٰ سے قیامت تک کی مہلت مانگنا

قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِیْۤ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ: اب اس سے یہ نہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کو دیکھ کے اللہ تعالیٰ کے سامنے جھک جاتا، معافی مانگ لیتا کہ مجھ سے غلطی ہوگئی کہ میں نے سجدہ نہیں کیا، میں اب سجدہ کر دیتا ہوں، اس طرح سے معافی مانگ سکتا تھا اگر وہ مانگنا چاہتا، لیکن جب وہ ضد اور سرکشی میں آ گیا تو اس نے لعنت تو برداشت کرلی، عذاب تو برداشت کرنے کے لئے وہ تیار ہو گیا، یہ نہیں ہو سکا کہ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لیتا۔ ہاں! البتہ حسد کی بنا پر یہ کہتا ہے کہ یہ جس کو تُو نے اپنا بہت محبوب بنایا، پیارا بنایا، جس کی بنا پر تُو نے مجھے ٹھکرا دیا، مردود کر دیا، مجھے ذرا موقع دینا تو میں تجھے اس کے کمالات دکھاؤں گا، کہ یہ کس قسم کا آدمی ہے، کس قسم کا انسان ہے، مجھے موقع دے تو میں بتاؤں، اور دیکھ لینا کہ اس کی جتنی نسل ہوگی میں سب کو گمراہ کر دوں گا، کچھ تھوڑے، بہت بچیں گے، سورۂ اعراف کے اندر جہاں اس بات کو ذکر کیا گیا تھا وہاں اس نے تفصیل کے ساتھ یہ بات کہی تھی فَبِمَاۤ اَغْوَیْتَنِیْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِیْمَ تُو نے مجھے جو گمراہ کیا تو میں ان کے لئے تیرے سیدھے راستے پر بیٹھوں گا، سیدھے راستے سے طریق توحید مراد ہے، پھر میں ان کے پاس آؤں گا ان کے آگے سے پیچھے سے دائیں سے بائیں سے، وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِیْنَ (آیت:۱۶، ۱۷) تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہیں پائے گا، سب تیرے ناشکرے ہو جائیں گے۔ یہ تھی تفصیلی دھمکی جو اس نے اس وقت دی تھی، صراط مستقیم سے توحید کا راستہ مراد ہے، کہ اللہ تعالیٰ کو جاننا پہچاننا اور اس کی نعمتوں کو اس طرف منسوب کر کے اس کے شکر گزار بن کے رہنا، یہ ہے اصل کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کا راستہ جس کی بنا پر اللہ کی رضا حاصل ہوتی ہے، وہ کہتا ہے اسی راستے پر بیٹھوں گا، تیرے شکر گزار نہیں رہنے دوں گا، کھائیں گے تیرا اور گائیں گے میرا، نعمتیں تیری کھائیں گے لیکن تیرا شکر ادا نہیں کریں گے، اطاعت میری کریں گے، قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِیْۤ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ: اس نے کہا کہ اے میرے پروردگار! پس تُو مجھے مہلت دے دے اس دن تک جس میں مخلوق کو اُٹھایا جائے گا، اس سے مراد وہی قیامت کا دن ہے۔

اللہ تعالیٰ کا اِبلیسِ ملعون کو مہلت دینا

قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ: اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بے شک تُو مہلت دیے ہوؤں میں سے ہے، میری طرف سے تجھے مہلت مل گئی، اِلٰی یَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ: وقتِ معلوم کے دن تک، اس وقتِ معلوم سے بھی قیامت کا دن مراد ہے، قیامت کا دن ایک طویل زمانہ ہے نفخِ اُولیٰ جس وقت ہوگا، جس وقت کہ اس دنیا کو برباد کر دیا جائے گا وہاں سے لے کے آگے تک سارے کا سارا دن قیامت کا دن ہی کہلاتا ہے، اسی دن کے ایک حصے میں گویا کہ بعث ہو جائے گا، اسی دن کے حصے میں فنائیت طاری ہوگی، اس لیے نفخِ اُولیٰ کے وقت شیطان بھی فنا ہو جائے گا، اس وقت شیطان باقی نہیں رہے گا، تو اس لیے بظاہر جو معلوم ہوتا ہے کہ یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ بعث کے دن تک وہ زندہ رہے یعنی نفخِ اُولیٰ ہو جائے، کائنات ساری فنا ہو جائے پھر بھی شیطان زندہ رہے، اور جب

انسانوں کو اُٹھایا جائے وہ غایت ہے، ایسی بات نہیں، نفخِ اُولیٰ کے وقت جہاں ساری کی ساری چیزیں فنا ہوں گی وہاں شیطان پر بھی موت طاری ہو جائے گی، اس کی دُعا میں یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ سے مراد قیامت کا دِن ہے، اور قیامت کا دِن شروع ہو جائے گا نفخِ اُولیٰ سے جس کے ایک حصے میں فنائیت ہے، دوسرے حصے میں بعث ہے، تو اس کی دُعا قبول ہوئی قیامت کے دِن تک، اور نفخِ اُولیٰ کے وقت یہ فنا ہو جائے گا۔

اِبلیسِ ملعون کی دھمکی

قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ: وہ کہنے لگا کہ اے میرے رَبّ! بسبب تیرے مجھ کو گمراہ کر دینے کے۔ یہ دیکھو! گمراہ کرنے کی نسبت اس نے اللہ کی طرف کی، کہ تُو نے مجھے حکم ہی ایسا ہی دیا کہ جس کو میں مان ہی نہیں سکتا تھا، میں مجبور تھا سرکشی کرنے پر، میں مجبور تھا نافرمانی کرنے پر، تو اس میں قصور آپ کا ہے کہ آپ نے مجھے ایسا حکم ہی کیوں دیا جو میں نہیں مان سکتا تھا۔ یعنی گمراہ تو وہ ہوا سجدہ نہ کرنے کی بنا پر، لیکن اللہ کی طرف نسبت اس معنی کے اعتبار سے کر رہا ہے کہ آپ کا حکم ہی ایسا تھا، آپ کہہ ہی ایسی بات رہے تھے جو میرے لیے ممکن ہی نہیں تھی کہ میں کرتا، لہٰذا میرے گمراہ ہونے کی ذمہ داری تیرے پہ ہی ہے، کہ آپ نے مجھے ایسی بات کیوں کہی تھی جو میرے بس میں نہیں ہے، یہ سارے کا سارا اِلزام اللہ تعالیٰ کو دے رہا ہے، بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ: تیرے گمراہ کر دینے کے کی وجہ سے مجھ کو، لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ: میں ان کے لئے زینت پیدا کروں گا زمین میں، زمین کی بہت ساری چیزوں کو ان کے سامنے سجا دوں گا جس کی طرف وہ راغب ہو جائیں گے، دُنیا کی محبت میں مبتلا ہو جائیں گے، ''زمین میں ان کے لئے تزئین کروں گا'' یعنی دنیوی زندگی میں ان کے لئے اسبابِ زینت پیدا کروں گا اور ان کی رغبت ان کی طرف کر دوں گا، چیزوں ان کو اچھی لگیں گی کہ دل ان دے بیٹھیں گے، توجہ ان کی طرف ہو جائے گی، وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ: اور میں البتہ ضرور گمراہ کر دوں گا ان سب کو، بھٹکا دُوں گا، اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ: لیکن تیرے بندے ان میں سے جو چُنے ہوئے ہوں گے، یعنی کچھ مخلص بندے رہ جائیں گے، جو چُنے ہوئے ہوں گے، باقی سب کے اوپر میں قابو پالوں گا، جیسے ایک جگہ لفظ آئے گا لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ (الاسراء:۶۲) کہ میں اس کی اولاد کو ڈانٹی مارلوں گا، آپ نے کبھی دیکھا ہوگا کاشت کاروں کو اور زمین داروں کو کہ اگر کوئی بیل یا بھینس یا اس طرح کا کوئی جانور سرکش سا ہو جائے تو اس کے نچلے جبڑے پہ رَسّی باندھ لیا کرتے ہیں جس وقت اس کے نچلے جبڑے کے اوپر اچھی طرح سے مضبوط کر کے رَسّی باندھ لیں تو پھر وہ جانور قابو آ جاتا ہے، تو ''اِحتناك'' کا یہی معنی ہوتا ہے، کہتا ہے میں ان کو اس طرح سے قابو کرلوں گا جس طرح سے جانور کے منہ میں لگام دے کے یا اس کا نچلا جبڑا باندھ کے قابو کیا جاتا ہے، میں اس کی اولاد اسی طرح سے قابو میں لاؤں گا۔ یوں اس نے کھڑے ہو کے اللہ تعالیٰ کے سامنے دھمکایا، اور آدم کے متعلق ایسے جذبات ظاہر کیے ہیں، تو اللہ تعالیٰ آپ کے سامنے یہ باتیں نمایاں اسی لیے کر رہا ہے کہ اس کو دشمن سمجھو اور اس سے ہوشیار رہو۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کی ہدایات اور اس کے اَحکام کو چھوڑ کے اس کے طریقے پہ چلو گے تو پھر تم خسارے میں رہو گے، اور تمہارے باپ کو جنت سے نکالنے والا بھی

یہی ہے، لیکن تمہارے باپ نے تو توبہ کر کے تلافی کر لی، اور اگر تم اس کے پیچھے چلتے رہے تو نتیجۃً تم جنت سے محروم ہو جاؤ گے۔ تو شیطان نے کہا کہ تیرے کچھ چنے ہوئے بندے بچیں گے باقی سب کو قابو کر لوں گا۔

مخلصین، شیطان کے تسلط سے محفوظ رہیں گے

قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيمٌ: هٰذَا کا اشارہ ماقبل کی طرف ہے کہ چنے ہوئے بندے محفوظ رہیں گے، تو یہ چنا جانا، منتخب ہو جانا یہی ہے سیدھا راستہ جو مجھ تک پہنچاتا ہے، یعنی جو مخلص ہو گیا وہی مجھ تک پہنچے گا، لیکن مخلص ہونے کا طریقہ کیا ہے؟ طاعت اور اللہ تعالیٰ کی عبادت، اللہ کے احکام ماننا۔ تو مطلب یہ ہوگا کہ طاعت اور عبادت یہی طریقہ ہے جس کی بنا پر میرے بندے مخلص بنیں گے، اور جو مخلص ہو گئے وہ شیطان کے تسلط سے بچے رہیں گے، ان کے اوپر شیطان کا کوئی زور نہیں چلے گا۔ یا هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيمٌ سے توحید کے راستے کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے، جیسے کہ اس تفصیل میں ذکر کیا گیا تھا کہ تو اپنے بندوں کو شکر گزار نہیں پائے گا، تو یہ شکر گزاری ہی ایک ایسا راستہ ہے جو سیدھا اللہ تعالیٰ تک پہنچاتا ہے، اور شکر گزاری کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اللہ کو محسن سمجھو، اللہ کو منعم سمجھو، اور دل جان سے اس کی تعظیم کرو، اور اسی کی عبادت کرو، اسی کا کہنا مانو، یہ شکر گزاری والا راستہ جس سے بندوں کو روکنے کی دھمکی دی تھی کہ تو ان کو شکر گزار نہیں پائے گا یہی راستہ سیدھا اللہ کی طرف پہنچتا ہے اسی کے نتیجہ میں انسان توحید اختیار کرتا ہے، اور شکر گزاری کے نتیجے میں ہی انسان شرک سے بچتا ہے، اور اطاعت عبادت جتنی ہے وہ سب شکر گزاری کا ایک طریقہ ہے۔

شیطان کے متبعین کا انجام

إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ: بے شک میرے بندے، تیرا ان کے اوپر کوئی زور نہیں، ہاں! مگر جو تیری اطاعت کرے گا گمراہوں میں سے، یعنی جو گمراہ لوگ تیرے پیچھے لگ جائیں گے، وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ أَجْمَعِينَ: بے شک جہنم ان سب کا موعد ہے، ان سب کے لئے وعدہ ہے، بے شک جہنم البتہ ان سب کا وعدہ ہے، لَهَا سَبْعَةُ أَبْوَابٍ: اس جہنم کے لئے سات دروازے ہوں گے، سات دروازوں سے سات طبقات کی طرف اشارہ ہے، جہنم مختلف درجوں والی ہے، ساری کا ایک ہی درجہ نہیں، لوگ اپنے اعمال کے اعتبار سے مختلف درجات میں جائیں گے، لِكُلِّ بَابٍ مِنْهُمْ جُزْءٌ مَقْسُومٌ: ہر دروازے کے لئے ان انسانوں میں سے جز تقسیم کیا ہوا ہے، یعنی بانٹ کر درجات کے اعتبار سے مختلف دروازوں سے ان کو گزارا جائے گا، اور جہنم تک پہنچا دیا جائے گا۔

متقین کا انجام

اس کے مقابلے میں آگے متقین کا ذکر کر دیا، إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ: بے شک متقین، اللہ سے ڈرنے والے باغات میں ہوں گے اور چشموں میں ہوں گے، ادْخُلُوهَا بِسَلَامٍ آمِنِينَ: انہیں کہہ دیا جائے گا کہ داخل ہو جاؤ اس جنت میں سلامتی کے ساتھ اس حال میں کہ تم امن والے ہو، آئندہ سلامتی ہی سلامتی ہے، امن ہی امن ہے، کوئی خوف کوئی خطرہ کوئی بے چینی جنت میں نہیں ہوگی،

یہ جگہ ایسی ہے کہ جس کے اندر انسان کو امن ہی امن اور سلامتی ہی سلامتی نصیب ہوگی، وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ إِخْوَانًا عَلَىٰ سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ: مشترکہ ماحول میں جہاں انسان رہتا ہے وہاں اگر اس کو اپنی ذات کے اندر نعمتیں حاصل بھی ہوں تو اس کے باوجود پریشانی کی ایک وجہ ہو جایا کرتی ہے کہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ دل نہیں ملتا، ان کے ساتھ دل میں کسی قسم کا انقباض ہے، آپس میں محبت سے بولتے نہیں، ایک دوسرے کے ساتھ کچھ کھچتے ہیں، تو یہ کدورت، کینہ، حسد جو ایک دوسرے کے ساتھ ہو جایا کرتا ہے یہ مستقل پریشانی کا باعث ہے، اب اگر جنّت میں جا کر بھی آپ اسی طرح سے لڑتے رہے اور ایک دوسرے کی ٹانگیں یوں ہی کھینچتے رہے تو پھر جنّت بھی انسان کے لئے کوئی امن سلامتی کی جگہ نہیں رہے گی، بلکہ آپس کے فسادات اس نعمت کو مکدر کر دیں گے۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو وہاں جنّت میں چلے جائیں گے تو ان کے دلوں کے اندر کوئی کسی قسم کا کینہ بغض نہیں رکھا جائے گا، حتیٰ کہ اگر دُنیا کے اندر دو نیک آدمیوں کے درمیان میں کسی وجہ سے کدورت تھی اور چلے گئے دونوں جنّت میں، (ایسا ہو جاتا ہے، کچھ طبعی اسباب اس قسم کے پیش آ جاتے ہیں کہ ایک دوسرے سے محبت نہیں ہوتی، اجتہادی اختلاف کی بنا پر ایک دوسرے سے لڑائی ہو جاتی ہے، شرعی نقطۂ نظر سے بھی ہو جاتی ہے، طبعی طور پر بھی ہو جاتی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے دونوں کو معاف کر کے دونوں کو جنّت میں پہنچا دیا) تو یہ دنیوی زندگی کی جو آپس میں عداوت یا آپس میں کینہ، بغض، اس قسم کی چیز اگر دل کے اندر باقی رہ جائے تو وہاں جا کے پھر یہ پریشانی کا باعث بنے گی، تو اللہ تعالیٰ جنّت میں داخل کرنے سے قبل ہی اہلِ جنّت کے قلوب کو صاف کر دیں گے، ان کے دل میں جو کینہ، بغض ہے سب دُور کر دیں گے، اور جنّت میں جانے کے بعد کوئی کسی کے خلاف کسی قسم کا جذبہ نہیں رکھے گا، بھائیوں کی طرح سب ایک دوسرے کی طرف منہ کر کے بیٹھیں گے، یہ نہیں کہ دنیا میں اگر کسی مجلس کے اندر جانا ہو جائے تو جس سے نفرت ہوتی ہے انسان منہ دوسری طرف کو کر لیتا ہے، اس کی طرف جھانکتا ہی نہیں، جنّت میں ایسا نہیں ہوگا۔ جیسے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول تفاسیر میں نقل کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ میں، طلحہ، زبیر سب اس کا مصداق ہیں کہ جن کے دِلوں سے اللہ تعالیٰ یہ کدورتیں دُور کر دے گا، کیونکہ دُنیا کے اندر بعض مسائل میں آپس میں اختلاف ہوا، ایک دوسرے سے لڑائی ہوئی، ایک دوسرے کے مقابلے میں آئے، لیکن جنّت میں جانے سے پہلے پہلے اللہ سب کی صفائی کر دے گا۔ طلحہ، زبیر، علی رضی اللہ عنہم سارے ہی عشرہ مبشرہ میں سے ہیں اور جنّت میں جائیں گے اور دنیوی اختلافات کا کوئی اثر نہیں رہے گا، سب بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کی طرف منہ کر کے بیٹھیں گے۔ اور ''مشکوٰۃ شریف'' میں آپ نے پڑھا ہی ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنّتی جتنے ہوں گے سب کے سینوں میں ایک ہی دِل ہوگا۔[1] تو وہاں ایک دل کا یہ مطلب نہیں کہ واقعۃً ایک ہی دل ہوگا، جو حرکت کرے گا تو سارے زندہ ہوں گے، مطلب یہ ہے کہ دل تو اپنے اپنے ہی ہوں گے لیکن ہوگا سب کا دل ایک جیسا، خواہشات کا اختلاف نہیں ہوگا، دنیا کے اندر میرا دل کچھ اور چاہتا ہے، آپ کچھ اور چاہتے ہیں، اس طرح سے آپس میں اختلاف ہو جاتا ہے، جب آپس میں اختلاف ہو جاتا ہے تو پھر آگے بدمزگی ہوتی ہے، لیکن اگر میرا دل اور آپ کا دل ایک ہی ہو، یک جان دو قالب ہو جائیں کہ میری

---

(۱) بخاری ۱/۴۶۰، باب ما جاء فی صفة الجنة. مشکوٰة ۲/۴۹۶، باب صفة الجنة ولفظ الحدیث: قُلُوبُهُمْ عَلَىٰ قَلْبِ رَجُلٍ وَاحِدٍ

خواہش آپ کی خواہش، آپ کی خواہش میری خواہش، تو ایسی صورت میں پھر کوئی اختلاف پیش نہیں آیا کرتا، تو جنتی لوگ اس قسم کے ہوں گے کہ جن کے سینوں میں ایک ہی جیسا ہی دل ہوگا، خواہشات کا اختلاف نہیں ہوگا، اختلاف نہ ہونے کی بنا پر پھر کوئی بدمزگی بھی نہیں ہوگی۔

سوال:- مثلاً جب کھانا ہوگا تو سب کا دِل ایک ہی چیز کھانے کا خواہش مند ہوگا؟

جواب:- نہیں، یہ چیزیں مراد نہیں ہوا کرتیں، مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایسی خواہشات جو آپس میں اختلاف کا باعث بن جائیں ایسا نہیں ہوگا۔ باقی! اگر آپ کا آم کھانے کو جی چاہے، کسی کا لسی پینے کو جی چاہے تو اس کی نفی نہیں ہے، کوئی کہے کہ میں لسی نہیں پیتا کوئی کہے کہ میں پیتا ہوں، اس قسم کے اختلافات مراد نہیں، وہ اختلافات جو آپس میں بدمزگی کا باعث بنتے ہیں خواہشات کا ایسا اختلاف نہیں ہوگا۔

(پھر شاید کسی نے سوال کیا کہ یہ سبق کی مجلس بھی جنت میں یاد آئے گی؟ تو اس پر فرمایا) آپس میں باتیں تو بیٹھ کے کریں گے، دُنیا میں کیا ہوا کرتا تھا، یہ باتیں تو آپس میں کریں گے، جب یہ باتیں کریں گے تو پھر کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے احسان کیا کہ ہمیں یہاں پہنچادیا، دُنیوی مشقتیں ہم سے ختم ہوگئیں، موت ایک ہی دفعہ آنی تھی وہ آگئی، اب ہم آئندہ مریں گے بھی نہیں، اس قسم کی گفتگو آپ کے سامنے سورۂ صافات میں اور سورۂ طور میں آئے گی، تو یہ تذکرے کریں گے، اور ہوسکتا ہے کہ دُنیوی باتیں یاد آئیں اور یاد آنے کے ساتھ ان قصے کہانیوں کا بھی آپس میں ذکر ہوسکتا ہے۔

وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ: ہم کھینچ لیں گے جو کچھ ان کے سینوں کے اندر کینہ بغض ہے، غِل کہتے ہیں خفگی اور کینے کو، اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ: بھائیوں کی طرح تختوں کے اوپر آمنے سامنے بیٹھنے والے ہوں گے، مُتَقٰبِلِيْنَ: ایک دوسرے کی طرف منہ کر کے بیٹھنے والے ہوں گے، اِخْوَانًا: بھائیوں کی طرح، یعنی کوئی آپس میں بغض عداوت نہیں ہوگا، دُنیا میں اگر تھا بھی تو اس کو صاف کردیا جائے گا۔ لَا يَمَسُّهُمْ فِيْهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ: نہ ان کو اس کے اندر کوئی مشقت چھوئے گی، کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی، تھکاوٹ نہیں ہوگی، مشقت نہیں چھوئے گی، اور نہ وہ اس جنت میں سے نکالے جائیں گے، یعنی یہ بھی ان کو امن بھی حاصل ہوجائے گا کہ نہ مرنے کا خطرہ، نہ جنت سے نکلنے کا خطرہ، تو عیش عشرت امن سکون سلامتی اپنی انتہا کو اور اپنے کمال کو پہنچ جائے گی، جتنا آپ سوچ سکتے ہیں اس سے بھی زیادہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے امن اطمینان نصیب ہوگا۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّآ أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ إِلَيْكَ

سورہ صافات کی جو یہ آیتیں ہیں جن میں آپس میں گفتگو کرنے کا ذکر ہے، فَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ۝ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ إِنِّيْ كَانَ لِيْ قَرِيْنٌ ۝ يَّقُوْلُ أَإِنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِيْنَ ۝ أَإِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا أَإِنَّا لَمَدِيْنُوْنَ ۝ قَالَ هَلْ أَنْتُمْ مُّطَّلِعُوْنَ ۝ فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِيْ سَوَآءِ الْجَحِيْمِ ۝ قَالَ تَاللّٰهِ إِنْ كِدْتَّ لَتُرْدِيْنِ ۝ وَلَوْلَا نِعْمَةُ رَبِّيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ۝: ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوں گے باتیں پوچھیں گے، ان میں سے ایک کہنے والا کہے گا کہ میرا ایک دوست ہوتا تھا جو مجھے کہا کرتا تھا کیا تو انبیاء

کی تصدیق کرنے والوں میں سے ہے؟ کیا جس وقت ہم مرجائیں گے اور مٹی ہوجائیں گے، ہڈیاں ہوجائیں گے کیا ہم پھر بدلہ دیے جائیں گے؟ تو جنتیوں میں اپنے ساتھیوں سے وہ کہے گا کہ تم ذرا جھانکو کہیں وہ نظر آتا ہے؟ تو دیکھیں گے جھانکیں گے وہ جہنم کے وسط میں پڑا ہوا نظر آئے گا، وہ دوست جو کہ معاد کا انکار کیا کرتا تھا، تو پھر یہ جنتی اس کو خطاب کر کے کہے گا کہ اللہ کی قسم! تُو تو قریب تھا کہ مجھے بھی ہلاک کر دیتا، یعنی اگر تیری باتوں سے میں متاثر ہوجاتا جس طرح سے تُو آخرت کا انکار کیا کرتا تھا، میں انکار کرتا تو میں تو بالکل برباد ہوجاتا، تُو تو مجھے بھی برباد کر دیتا، اگر میرے پر میرے ربّ کا احسان نہ ہوتا تو میں بھی آج جہنّم میں حاضر کیے ہوؤں میں سے ہوتا۔ پھر آپس میں باتیں کریں گے اَفَمَا نَحْنُ بِمَیِّتِیْنَ الخ۔ تو اس قسم کی گفتگو ایک دوسرے کے ساتھ سورۂ صافات میں آئی ہوئی ہے۔ اسی طرح سے ستائیسویں پارے میں سورۂ طور میں بھی ہے وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ یَّتَسَآءَلُوْنَ ﴿۲۵﴾ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِیْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِیْنَ ﴿۲۶﴾ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَیْنَا وَوَقٰىنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ ﴿۲۷﴾ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلُ نَدْعُوْهُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِیْمُ ﴿۲۸﴾: بعض بعض پر متوجہ ہوں گے، آپس میں ایک دوسرے سے پوچھیں گے، کہیں گے کہ ہم دُنیا میں جس وقت اپنے گھر میں ہوتے تھے تو بڑا ڈرتے تھے کہ آخرت میں کیا ہوگا، یہ ہوگا، وہ ہوگا، ہم پر بڑا خوف سوار ہوتا تھا، تو اللہ نے ہم پہ احسان کر دیا کہ ہمیں گرم ہوا کے عذاب سے بھی بچالیا، دُنیا میں ڈرتے تھے، اللہ نے ہمیں امن دے دیا، اب اللہ تعالیٰ نے ہم پر رحمت فرمائی، فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَیْنَا: بے شک ہم اس سے قبل اسی کو ہی پکارتے تھے، وہ بہت احسان کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔ تو ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جنتی کچھ آپس میں تذکرے کریں گے، دُنیا کی باتیں بھی ان کو یاد آئیں گی، کوئی اپنے یار دوست یاد آئیں گے کہ ہمارا فلاں دوست بُرا ہوتا تھا، ہمیں بُرائی کی تلقین کرتا تھا، اور اسی طرح سے اچھی باتوں کا تذکرہ بھی کریں گے۔

نَبِّئْ عِبَادِیْٓ اَنِّیْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ﴿۴۹﴾ وَاَنَّ عَذَابِیْ هُوَ الْعَذَابُ
خبر دے دیں میرے بندوں کو اس بات کی کہ میں بخشنے والا ہوں رحم کرنے والا ہوں ﴿۴۹﴾ اور اس بات کی کہ بے شک میرا عذاب دردناک
الْاَلِیْمُ ﴿۵۰﴾ وَنَبِّئْهُمْ عَنْ ضَیْفِ اِبْرٰهِیْمَ ﴿۵۱﴾ اِذْ دَخَلُوْا عَلَیْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ
عذاب ہے ﴿۵۰﴾ خبر دیجئے ان لوگوں کو ابراہیم کے مہمانوں کی ﴿۵۱﴾ جبکہ داخل ہوئے وہ ابراہیم پر تو انہوں نے کہا ہم سلام کہتے ہیں، ابراہیم نے کہا
اِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُوْنَ ﴿۵۲﴾ قَالُوْا لَا تَوْجَلْ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِیْمٍ ﴿۵۳﴾ قَالَ اَبَشَّرْتُمُوْنِیْ
ہم تم سے خوف محسوس کرنے والے ہیں ﴿۵۲﴾ بے شک ہم تجھے بشارت دیتے ہیں ایک علم والے بچے کی ﴿۵۳﴾ ابراہیم نے کہا کیا تم مجھے بشارت دیتے ہو
عَلٰٓى اَنْ مَّسَّنِیَ الْكِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ ﴿۵۴﴾ قَالُوْا بَشَّرْنٰكَ بِالْحَقِّ
باوجود اس بات کے کہ مجھے بڑھاپا پہنچ گیا؟ پھر تم کس چیز کی بشارت دے رہے ہو؟ ﴿۵۴﴾ وہ کہنے لگے ہم تجھے واقعی بات کی خبر دیتے ہیں

فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ ﴿۵۵﴾ قَالَ وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ ﴿۵۶﴾

پس آپ مایوس ہونے والوں میں سے نہ ہوں ﴿۵۵﴾ ابراہیم نے کہا کون مایوس ہوتا ہے اللہ کی رحمت سے سوائے گمراہ لوگوں کے ﴿۵۶﴾

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۵۷﴾ قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ﴿۵۸﴾ اِلَّآ اٰلَ

ابراہیم نے کہا تمہیں کیا واقعہ درپیش ہے اے بھیجے ہوئے فرشتو! ﴿۵۷﴾ وہ کہنے لگے کہ ہم بھیجے گئے ہیں مجرم لوگوں کی طرف ﴿۵۸﴾ آلِ لُوط کے

لُوْطٍ ؕ اِنَّا لَمُنَجُّوْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۵۹﴾ اِلَّا امْرَاَتَهٗ قَدَّرْنَآ ۙ اِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۶۰﴾

علاوہ، بے شک ہم ان سب کو نجات دینے والے ہیں ﴿۵۹﴾ سوائے اس کی بیوی کے، ہم نے مقدر کر دیا ہے کہ وہ بھی پیچھے رہنے والوں میں سے ہے ﴿۶۰﴾

تفسیر

اللہ تعالیٰ کی دو مختلف شانیں اور کمالِ ایمان کا معیار

نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۙ وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ ﴿۵۰﴾: یہ دو آیتیں آنے والے مضمون کے لئے بطور تمہید کے ہیں، آگے قصہ آ رہا ہے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا، اور اس کے متصل لوط علیہ السلام کا، اور اس کے بعد اصحابِ اَیکہ اور اصحابُ الحجر کا مختصراً اجمالاً۔ تو اللہ تعالیٰ سرورِ کائنات ﷺ کو خطاب کر کے فرماتے ہیں نَبِّئْ: خبر دے دیں میرے بندوں کو اس بات کی کہ میں غفور رحیم ہوں، بخشنے والا ہوں رحم کرنے والا ہوں، اور اس بات کی کہ بے شک میرا عذاب دردناک عذاب ہے، یعنی میری دونوں شانیں ہیں، جو متوجہ ہوتے ہیں، توبہ کرتے ہیں، استغفار کرتے ہیں، نیکی کو اپناتے ہیں، میں ان کے لئے غفور رحیم ہوں، یہ میری شان ہے، اور جو نافرمان ہیں، ان کے لئے میرا عذاب بھی بڑا دردناک ہے، یہ نہیں کہ میرے پاس صرف رحمت ہی رحمت ہے، نہیں! عذاب بھی ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کے اسماء میں "شدید العقاب"، "المنتقم" اس قسم کے الفاظ بھی ہیں، سخت سزا دینے والا، انتقام لینے والا، اللہ تعالیٰ کے ناموں کے اندر یہ الفاظ بھی آتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ کی دونوں شانیں ہیں، اس لیے بندوں کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے متعلق دونوں قسم کا ہی عقیدہ رکھیں اور دونوں قسم کا خیال رکھیں، اُمید بھی رکھیں کہ اللہ کی رحمت ہم پر ہوگی، ڈرتے بھی رہیں کہ کہیں عذاب کا ڈنڈا سر پہ نہ آ جائے، اس لیے مشہور ہے کہ "اَلْاِيْمَانُ بَيْنَ الْخَوْفِ وَالرَّجَاءِ" ایمان کا کمال یہی ہے کہ رجاء اور خوف کے درمیان میں ہو، اگر اللہ تعالیٰ پر صرف اُمید ہی لگائی جائے اور اس کی شانِ غفور رحیم ہی آنکھوں کے سامنے ہو تو پھر انسان معاصی پر دلیر ہو جاتا ہے، اور اگر نااُمیدی کی کیفیت طاری ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کا عذاب ہی سامنے رہے تو ایسی صورت میں مایوسی بھی انسان کو بسا اوقات عملی طور پر اپاہج بنا دیتی ہے، مایوسی میں بھی قوتِ عملیہ میں ختم ہو جاتی ہے، اگر پتا ہو کہ وہاں چھوٹنا تو ہے نہیں، مار ہی پڑنی ہے، جانا تو جہنم میں ہی ہے جو کچھ چاہو کر لو، تو ایسی صورت میں بھی انسان کی عملی قوت جواب

دے جاتی ہے، تو اس لیے ان دونوں شانوں کو سامنے رکھنا ہی ایمان کا کمال ہے کہ اللہ کی رحمت کی اُمید بھی رکھو اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرتے بھی رہو۔

اللہ تعالیٰ کی مختلف شانوں کے ظہور کے واقعات

آگے جو واقعات بیان کیے جا رہے ہیں وہ اسی کی تائید ہے کہ دیکھو! فرشتوں کا ایک گروہ دنیا میں آیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے تو وہ رحمت کے ظہور کا باعث بنا، کہ آپ کے بیٹے کی بشارت دی، پوتے کی بشارت دی، جیسا کہ واقعہ کی تفصیل آپ کے سامنے سورۂ ہود میں گزر چکی ہے، اور وہی فرشتوں کا گروہ قومِ لُوط کے لئے عذاب کے ظہور کا باعث بنا، کہ ان کو کس طرح سے برباد کر دیا گیا، تو ایک جگہ اللہ کی رحمت کی شان نمایاں ہوئی اور ایک جگہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کی شان نمایاں ہوئی، اور اسی طرح سے آگے جو اصحاب اَیکہ کے اور اصحاب الحجر کے واقعات ذکر کیے جا رہے ہیں ان میں دونوں قسم کے لوگ تھے، جو حضرت شعیب علیہ السلام پر ایمان لانے والے تھے، حضرت صالح علیہ السلام پر ایمان لانے والے تھے ان کے لئے اللہ تعالیٰ کے غفور رحیم ہونے کی شان نمایاں ہوئی، اور جو ان انبیاء علیہم السلام کا انکار کرنے والے تھے تکذیب کرنے والے تھے ان کے لئے عذابِ الیم نمایاں ہوا۔ تو اس لیے نہ تو اللہ کے اوپر اس طرح سے اُمید باندھو کہ جو چاہو کرتے رہو اور سمجھو کہ ہم چھوٹ ہی جائیں گے، یہ چیز بھی بدعملی پیدا کرتی ہے، اور نہ اس طرح مایوس ہوؤ کہ اللہ کی رحمت کے حاصل کرنے کا ذریعہ کوئی نہیں، کیونکہ یہ مایوسی بھی آخر کار انسان کو بدعملی کا میں مبتلا کر دیتی ہے۔

شانِ رحمت کے ظہور کا واقعہ (فرشتوں کا ابراہیم علیہ السلام کے پاس بچّے کی خوش خبری لے کر آنا)

وَنَبِّئْهُمْ عَنْ ضَيْفِ إِبْرٰهِيمَ: واقعہ آپ کے سامنے سورۂ ہود میں تفصیل سے گزر چکا ہے۔ خبر دیجیے ان لوگوں کو ابراہیم کے مہمانوں کی۔ مہمانوں سے وہی فرشتے ہیں مراد ہیں اور ان کو مہمانوں کے لفظ کے ساتھ ذکر کیا جا رہا ہے چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پہلے پہلے ان کو آنے والے مہمان ہی سمجھے تھے۔ ''جبکہ داخل ہوئے وہ ابراہیم پر'' فَقَالُوْا سَلٰمًا: تو انہوں نے کا کہا نُسَلِّمُ سَلَامًا ہم سلام کہتے ہیں قَالَ إِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُوْنَ: تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے جواب وہاں (سورۂ ہود میں) منقول تھا کہ انہوں نے بھی سلام کا جواب دیا، پھر جلدی سے ان کے کھانے کے لئے بچھڑا بھون کے لے آئے، اور جب ان کے سامنے رکھا اور ان کے ہاتھ ان کی طرف نہیں بڑھے تو پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل میں کچھ خوف سا پیدا ہوا کہ یہ کون لوگ ہیں جو ہمارے گھر آئے اور کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھاتے، تو کہیں یہ ہمارے دشمن نہ ہوں، کوئی نقصان پہنچانے کے لئے نہ آئے ہوں، اس لیے ہمارے گھر کھانا کھا کے ہمارے احسان کو قبول نہیں کرنا چاہتے، تو اس طرح سے دل کے اندر ایک بشر ہونے کی حیثیت سے اس قسم کے خیالات آئے، جب یہ خیالات آئے تو پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے سامنے اظہار بھی کر دیا إِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُوْنَ: ہم تم سے کچھ خوف محسوس کرنے والے ہیں، ڈرنے والے ہیں۔ وَجَل خوف کو کہا جاتا ہے۔ وہ کہنے لگے ڈرنے کی کوئی بات نہیں، إِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ: اور یہ ہیبت جو طاری ہو رہی تھی اس سے کچھ معلوم یوں ہوتا ہے کہ وہ فرشتے چونکہ عذابِ الٰہی کے حامل بھی بن کے آئے تھے تو حضرت

ابراہیم علیہ السلام کا قلب یہ محسوس کر رہا تھا کہ یہ جماعت ایسی ہے کہ جن کے ساتھ کوئی کسی قسم کی سختی ہے، اور وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے چونکہ عذاب کا مظہر بھی بننے والے تھے تو وہی اثر قلب کے اوپر پڑا، تو اس لیے دِل نے محسوس کیا اور زبان پر بھی بات آگئی، تو انہوں نے اس خوف کا اِزالہ کر دیا کہ آپ ڈریے نہیں، خوف کرنے کی بات نہیں ہے، ہم جو کھانا نہیں کھا رہے تو وجہ یہ ہے کہ ہم انسان نہیں ہیں، اظہار کر دیا کہ ہم فرشتے ہیں، ''بے شک ہم تجھے بشارت دیتے ہیں ایک علم والے بچّے کی'' غلام سے بچّہ مراد ہے۔ علیم: علم والا۔ اور علم والے بچّے سے یہاں نبوّت کی طرف اشارہ مقصود ہے، کیونکہ اس زمانے میں علم اعلیٰ درجے کا انبیاء کے ذریعے سے اُترتا تھا، اور انبیاء ہی عالم ہوتے تھے، تو غلام کے ساتھ جو علیم کا ذکر کر دیا یہ حضرت ابراہیم کے لئے بشارت کا گویا کہ دوسرا جزء ہے، کہ بچہ بھی پیدا ہوگا اور بچہ ہوگا بھی علیم، بہت علم والا، اور نبی اپنی اولاد کے متعلق اسی قسم کی بات سُن کے ہی خوش ہو سکتا ہے۔ حضرت ابراہیم چونکہ بوڑھے ہو چکے تھے اور بیوی جو تھی سارہ وہ بھی اولاد کے قابل نہیں تھی، اس لیے مزید یقین حاصل کرنے کے لئے حضرت ابراہیم نے اس انداز سے سوال کیا کہ اَبَشَّرْتُمُوْنِيْ عَلٰٓي اَنْ مَّسَّنِيَ الْكِبَرُ: کیا تم مجھے بشارت دیتے ہو باوجود اس بات کہ مجھے بڑھاپا پہنچ گیا؟ فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ: پھر تم کس چیز کی بشارت دے رہے ہو؟ کیا واقعی ایسے ہوگا؟ یہ اِستفہام ہے، یہاں اس سوال کی نسبت کی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف کی گئی ہے، اور سورۂ ہود کے اندر نسبت حضرت ابراہیم کی بیوی کی طرف بھی کی گئی تھی، جس نے کہا تھا هٰذَا بَعْلِيْ شَيْخًا (آیت: ۷۲) میرا خاوند بوڑھا ہے اور میں اولاد کے قابل نہیں، تو تم کس چیز کی بشارت دے رہے ہو؟ تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی اس کے اوپر تعجب کا اظہار کیا، اور سارہ نے جس وقت یہ بات سنی تو انہوں نے بھی اسی قسم کے تعجب کا اظہار کیا، تو فرشتوں نے آگے اس بات کو پختہ کر دیا کہ ہم جو کچھ کہہ رہے کہ بالکل صحیح بات ہے اور اللہ کی جانب سے ہے اور ایسا ہی ہوگا، کہنے لگے بَشَّرْنٰكَ بِالْحَقِّ: حق سے یہاں واقعی بات مراد ہے۔ ہم تجھے ایک حق بات کی خبر دیتے ہیں، واقعی بات کی خبر دیتے ہیں جو کہ ہونے والی ہے، فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ: آپ مایوس لوگوں میں سے نہ ہوں۔ قانطین قُنُوط سے ہے، جیسے قرآنِ کریم میں دوسری جگہ الفاظ آئے ہیں لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ (سورۂ زُمر: ۵۳)، اور جیسے آپ نے ''پندنامہ'' (بعنوان مناجات) میں پڑھا تھا:

مغفرت دارم امید از لطف تو زانکہ خود فرمودۂ لا تقنطوا

لَا تَقْنَطُوْا: مایوس نہ ہوؤ۔ تو قانطین: مایوس ہونے والے۔ ''آپ مایوس ہونے والوں میں سے نہ ہوں'' ہم آپ کو واقعی خبر دینے والے ہیں، اللہ کی رحمت کی اُمید رکھیں، اللہ کی رحمت کے سامنے کوئی کام مشکل نہیں ہے۔ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام فرماتے ہیں کہ مایوسی کی کوئی بات نہیں، ظاہری اسباب کی طرف دیکھ کے یہ پوچھا جا رہا تھا کہ کیا اندریں حالات یعنی انہی حالات میں اولاد ہوگی؟ یا کوئی نئی شادی کے لئے کہا جائے گا؟ یا مجھے دوبارہ جوان کیا جائے گا؟ آخر اللہ کی طرف سے کسی نتیجے کے ظاہر ہونے کے لئے کچھ اسباب ہوتے ہیں، تو انہی حالات میں اولاد ہوگی یا حالات میں کچھ تغیر تبدل آئے گا؟ اس لیے سوال کیا تھا، ورنہ مایوسی کی کون سی بات ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس تو گمراہ لوگ ہی ہو سکتے ہیں، علم والے لوگ اور سمجھ دار لوگ اللہ کی رحمت سے مایوس کب ہوتے ہیں؟ قَالَ وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ: سوائے گمراہ لوگوں کے اللہ کی رحمت سے کون مایوس ہوتا ہے؟ کون

مایوس ہوتا ہے اللہ کی رحمت سے سوائے گمراہ لوگوں کے؟ تو معلوم ہو گیا کہ اللہ کی رحمت سے مایوسی گمراہی ہے، اور مایوس ہونا گمراہی کا شعبہ ہے، تو جو ہدایت یافتہ لوگ ہوتے ہیں وہ آخر وقت تک اللہ کی رحمت کے امیدوار رہتے ہیں، لیکن ظاہری اسباب کو دیکھ کے دل چھوٹ جانا کہ اللہ کی قدرت اور اللہ کی رحمت سے تو کوئی چیز بعید نہیں لیکن ظاہری اسباب ایسے ہو گئے ہیں کہ جس میں مایوسی ہے، اس قسم کی مایوسی طاری ہو سکتی ہے جس طرح سے إِذَا اسْتَيْـَٔسَ الرُّسُلُ (سورۃ یوسف:۱۱۰) کے اندر آیا تھا کہ جب رسولوں کے اوپر مایوسی طاری ہو گئی تو وہاں اُس کی نسبت رسولوں کی طرف کی گئی تھی ظاہری اسباب کو دیکھتے ہوئے، ورنہ اللہ کی رحمت اور اللہ کی قدرت کی طرف دیکھتے ہوئے مایوسی کی کوئی بات نہیں ہوتی، سورۂ یوسف میں بھی یہ لفظ آئے تھے لَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ: اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوؤ، اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ (آیت:۸۷) اللہ کی رحمت سے کافر لوگ ہی مایوس ہو سکتے ہیں۔ تو اللہ کی رحمت سے مایوسی کی کوئی بات نہیں، لیکن ظاہری اسباب کی طرف دیکھتے ہوئے اُس کی نسبت موجود ہے۔

جب یہ بشارت مکمل ہو گئی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کچھ احساس کیا کہ صرف بشارت دینے کے لئے یہ ٹولے کا ٹولہ نہیں آیا، کوئی اور کام بھی ذمے لگا ہوا ہے، اور وہ چونکہ اللہ تعالیٰ کے جلال کا مظہر بننے والے تھے اس لیے ممکن ہے جیسے میں نے پہلے عرض کیا کہ ان کی حالت دیکھ کے حضرت ابراہیم پر کچھ اثر پڑا ہو کہ ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے جلال کی شان بھی ہے۔ اس لیے پوچھ لیا قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ: معلوم ہو گیا کہ انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ ان کے بھیجے جانے کا مقصد صرف بشارت دینا نہیں ہے، کوئی بڑا واقعہ درپیش ہے، ورنہ بشارت تو ایک فرشتہ بھی آ کے دے سکتا تھا۔ تمہیں کیا واقعہ درپیش ہے اے مرسلون! خطب کہتے ہیں بڑے واقعے کو۔ اے مرسلون! اے بھیجے ہوئے فرشتو! تمہیں کیا واقعہ درپیش ہے؟۔ قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ: وہ کہنے لگے کہ ہم مجرم لوگوں کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ قومِ لُوط کا جرم اتنا نمایاں تھا کہ قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ کہنے سے خود ہی معلوم ہو گیا کہ اس سے قومِ لُوط مراد ہے۔ تو اس سے لُوط علیہ السلام کے جو مخاطب تھے جن کی طرف آپ علیہ السلام بھیجے گئے تھے وہ قوم مراد ہے۔ تو گویا کہ ان کا جرم بہت نمایاں ہو چکا تھا، وہ قوم مجرم تھی۔ ''ہم بھیجے گئے ہیں مجرم لوگوں کی طرف۔'' اور ان کے جرم کے اندر صرف وہی بات نہیں تھی جو آپس میں بدمعاشی کرتے تھے کہ نر، نر کے ساتھ قضائے شہوت کرتا تھا، بلکہ ڈاکا زنی اور اس قسم اور بہت ساری فواحش کا ارتکاب کرتے تھے، ظلم تھا، لوٹ مار تھی، ڈاکا زنی تھی، جس طرح سے دوسری جگہ تَّعْمَلُ الْخَبٰٓئِثَ (الانبیاء:۷۴) کا لفظ آتا ہے، کہ وہ بستی ایسی تھی جو کہ خبائث کا عمل کرتے تھے، مِنْ قَبْلُ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ (سورۃ ہود:۷۸) پہلے سے ان کو بُری بُری حرکتوں اور بُرے بُرے عملوں کی عادت تھی، تو صرف ایک یہی عادت نہیں تھی جس کی بنا پر ان کو برباد کیا گیا، یہ تو اخلاق کی ایک انتہائی گھناؤنی بات ہے، اس کے علاوہ ظلم ستم، لوٹ مار، حرام حلال کا امتیاز نہ کرنا، یہ ساری کی ساری باتیں ان کے اندر موجود تھیں۔ اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ: آلِ لُوط کے علاوہ۔ یہ مستثنیٰ منقطع ہے، کیونکہ قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ کے اندر یہ شامل نہیں ہیں۔ ''آلِ لُوط کے علاوہ''، ''آل'' کا لفظ عام ہے، اولاد کو بھی شامل ہے اور اگر کوئی شخص ان میں ایسا ہو جو لُوط علیہ السلام پر ایمان لایا تھا اور آپ علیہ السلام کا متبع تھا، تو یہ ''آل'' کا لفظ اس کو بھی شامل ہے۔ (مطلب یہ ہو گا کہ) لُوط علیہ السلام کے متعلقین کو چھوڑ کر مجرم لوگوں کی طرف ہم بھیجے گئے ہیں۔ اِنَّا لَمُنَجُّوْهُمْ اَجْمَعِيْنَ: بے شک ہم ان کو سب کو نجات

دینے والے ہیں، ان کو ہم بچالیں گے، یعنی عذاب آنے والا ہے لیکن لوط علیہ السلام کے متعلقین کو بچالیا جائے گا، اِلَّا امْرَاَتَهٗ: یہ آلِ لُوط سے مستثنیٰ ہوگیا، کہ آلِ لُوط کو ہم بچانے والے ہیں سوائے اس کی بیوی کے، بیوی کو بچانے والے نہیں، قَدَّرْنَاۤ: ہم نے اندازہ کرلیا ہے، ہم نے مقدر کردیا ہے اِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِیْنَ: وہ بھی پیچھے رہنے والوں میں سے ہے، یعنی لُوط علیہ السلام کے باقی متعلقین اس علاقے کو چھوڑ کے آجائیں گے، باہر نجات پاجائیں گے لیکن یہ بیوی پیچھے رہنے والوں میں سے ہے۔

فَلَمَّا جَآءَ اٰلَ لُوْطِ ِالْمُرْسَلُوْنَ ﴿۶۱﴾ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ﴿۶۲﴾ قَالُوْا بَلْ جِئْنٰكَ

جب آگئے لُوط کے گھر والوں کے پاس بھیجے ہوئے ﴿۶۱﴾ تو لُوط علیہ السلام نے کہا بے شک تم اجنبی سے لوگ ہو ﴿۶۲﴾ وہ کہنے لگے بلکہ ہم تو آپ کے پاس

بِمَا كَانُوْا فِیْهِ یَمْتَرُوْنَ ﴿۶۳﴾ وَاَتَیْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّا

وہ چیز لے کر آئے ہیں جس میں یہ لوگ شک کر رہے تھے ﴿۶۳﴾ اور ہم آپ کے پاس ایک حق کو لے کر آئے ہیں، اور بے شک ہم

لَصٰدِقُوْنَ ﴿۶۴﴾ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّیْلِ وَاتَّبِعْ اَدْبَارَهُمْ وَلَا یَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ

البتہ سچے ہیں ﴿۶۴﴾ رات کے ایک حصے میں لے کر چل اپنے گھر والوں کو اور ان کے پیچھے پیچھے چلنا اور تم میں سے کوئی بھی مڑ کے نہ دیکھے

وَّامْضُوْا حَیْثُ تُؤْمَرُوْنَ ﴿۶۵﴾ وَقَضَیْنَاۤ اِلَیْهِ ذٰلِكَ الْاَمْرَ اَنَّ دَابِرَ هٰۤؤُلَآءِ مَقْطُوْعٌ

اور چلو وہیں جہاں تمہیں حکم دیا گیا ہے ﴿۶۵﴾ ہم نے فیصلہ کر کے لُوط کو اطلاع دے دی کہ ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی جائے گی

مُّصْبِحِیْنَ ﴿۶۶﴾ وَجَآءَ اَهْلُ الْمَدِیْنَةِ یَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۶۷﴾ قَالَ اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ

اس حال میں یہ صبح کے وقت میں داخل ہونے والے ہوں گے ﴿۶۶﴾ آگئے شہر والے خوشیاں مناتے ہوئے ﴿۶۷﴾ لُوط علیہ السلام نے کہا کہ یہ

ضَیْفِیْ فَلَا تَفْضَحُوْنِ ﴿۶۸﴾ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ ﴿۶۹﴾ قَالُوْۤا اَوَلَمْ نَنْهَكَ

میرے مہمان ہیں، تم مجھے رُسوا نہ کرو ﴿۶۸﴾ اللہ سے ڈرو اور (عام لوگوں کی نظر میں بھی) مجھے رُسوا نہ کرو ﴿۶۹﴾ وہ کہنے لگے کہ کیا ہم نے تجھے روکا نہیں

عَنِ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۷۰﴾ قَالَ هٰۤؤُلَآءِ بَنٰتِیْۤ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِیْنَ ﴿۷۱﴾ لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِیْ سَكْرَتِهِمْ

جہانوں سے؟ ﴿۷۰﴾ لُوط علیہ السلام نے کہا یہ میری بیٹیاں ہیں اگر تم کرنے والے ہو ﴿۷۱﴾ آپ کی زندگی کی قسم! وہ تو اپنی مستی کے اندر

یَعْمَهُوْنَ ﴿۷۲﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّیْحَةُ مُشْرِقِیْنَ ﴿۷۳﴾ فَجَعَلْنَا

بھٹکتے پھرتے تھے ﴿۷۲﴾ پس پکڑلیا ان کو چیخ نے اس حال میں کہ وہ سورج نکلنے کے وقت میں داخل ہونے والے تھے ﴿۷۳﴾ ہم نے ان بستیوں

عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ﴿۷۴﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ

کے اُوپر والے حصے کو نچلا حصہ بنا دیا، ہم نے ان کے اُوپر کھنگر کے پتھر برسائے ﴿۷۴﴾ بے شک اس واقعے میں البتہ بہت نشانیاں ہیں

لِّلْمُتَوَسِّمِيْنَ ﴿۷۵﴾ وَاِنَّهَا لَبِسَبِيْلٍ مُّقِيْمٍ ﴿۷۶﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۷﴾ وَاِنْ كَانَ

سمجھ دار لوگوں کے لئے ﴿۷۵﴾ اور بے شک یہ بستیاں البتہ آباد سڑک پر ہیں ﴿۷۶﴾ بے شک اس میں البتہ نشانی ہے مؤمنین کے لئے ﴿۷۷﴾ اور بے شک

اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ لَظٰلِمِيْنَ ﴿۷۸﴾ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ ۘ وَاِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ ﴿۷۹﴾

بَن والے بھی البتہ ظالم تھے ﴿۷۸﴾ پھر ہم نے ان سے بھی انتقام لیا، اور یہ دونوں ہی بستیاں واضح سڑک پر ہیں ﴿۷۹﴾

تفسیر

اب آگے حضرت لُوط علیہ السلام کا واقعہ جو ذکر کیا جا رہا ہے تو اس واقعے کی ترتیب کچھ بدلی ہوئی ہے، ان کے معذب ہونے کا ذکر جلدی سے پہلے کر دیا گیا ہے اور پھر واقعے کے کچھ اجزا بعد میں ذکر کیے گئے ہیں، کیونکہ قرآنِ کریم کا مقصد کسی تاریخی واقعے کو ذِکر کرنا تو مقصود نہیں ہوتا، اس میں تو عبرت کے پہلو اُجاگر کرنے ہوتے ہیں، اس لیے موقع محل کے مطابق کبھی نتیجہ پہلے ذکر کر دیا تفصیل بعد میں ذکر کر دی، اور کبھی ان کے حالات پہلے ذکر کر کے ان کا انجام بعد میں ذکر کر دیا، دونوں طرح سے ہوتا رہتا ہے۔

شانِ عذاب کے ظہور کا واقعہ (واقعۂ قومِ لُوط)

فَلَمَّا جَآءَ اٰلَ لُوْطِ ِالْمُرْسَلُوْنَ: یہ واقعہ بھی سورۂ ہود اور سورۂ اَعراف دونوں میں ذکر ہو چکا ہے۔ جب آ گئے لُوط علیہ السلام کے گھر والوں کے پاس بھیجے ہوئے۔ الْمُرْسَلُوْنَ سے وہی فرشتے مراد ہیں جن کا ذکر فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ کے اندر آیا تھا، یہ مرسلون جب لُوط علیہ السلام کے خاندان کے پاس آ گئے، آپ علیہ السلام کے اہل وعیال کے پاس آ گئے، قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ: تو لُوط علیہ السلام نے بھی کہا کہ تم تو کچھ اجنبی سے لوگ ہو۔ منکَر کہتے ہیں جس کے اوپر انکار کیا گیا ہو، اجنبی، جو معروف نہ ہو، جو پہچان میں نہ آئے۔ ''بے شک تم اجنبی سے لوگ ہو'' قَالُوْا بَلْ جِئْنٰكَ بِمَا كَانُوْا فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ: دیکھو! نتیجے کی بات یہاں پہلے کہہ دی۔ وہ کہنے لگے کہ ہم انسان نہیں ہیں، جس طرح سے آپ ہمیں ظاہری طور پر سمجھ رہے ہیں، بلکہ ہم تو آپ کے پاس وہ چیز لے کے آئے ہیں جس میں یہ لوگ شک کر رہے تھے، اور ان کو یقین نہیں آتا تھا کہ ان بُری حرکتوں کے اوپر عذاب بھی آ سکتا ہے، اس میں یہ متردد تھے، ہم تو وہی چیز ان کے پاس لے کے آئے ہیں، وَاَتَيْنٰكَ بِالْحَقِّ: اور ہم آپ کے پاس ایک حق کو لے کے آئے ہیں، امرِ واقعی، جو ایسا ہی ہونے والا ہے، وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ: اور بے شک ہم البتہ سچے ہیں۔ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ: رات کو لے کے چل اپنے گھر والوں کو۔ سَرٰی يَسْرِيْ بھی رات کے وقت چلنے کو کہتے ہیں، اَسْرٰی يُسْرِيْ اِسراء کا بھی یہی معنی ہے، جیسے آگے سورۂ اِسراء کے شروع میں آئے گا: اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ۔ اور بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ میں چونکہ رات کا ذکر الگ آ رہا ہے اس لیے اَسْرِ کو ترجمہ کرتے وقت لیل کے معنی سے خالی کر دیا

جائے گا، "اپنے گھر والوں کو رات کے ایک حصے میں لے کے چل" وَاتَّبِعْ اَدْبَارَهُمْ: اور ان کے پیچھے پیچھے چلنا۔ ادبار دُبر کی جمع ہے۔ یعنی اپنے متعلقین کو آگے لگا لینا اور خود ان کے پیچھے پیچھے چلنا، جس طرح جہاں کوئی خطرے کا مقام ہوتا ہے کہ کوئی بھیڑ بکری گم نہ ہو جائے تو چرواہا بھیڑ بکریوں کو آگے لگا لیتا ہے اور خود پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ تو یہاں بھی کہیں کوئی سستی نہ کر لے، کہیں کوئی پیچھے نہ رہ جائے، اس لیے اپنے متعلقین کو چلا کے خود پیچھے رہو، تا کہ کوئی کوتاہی نہ کرے، اور ایسا نہ ہو کہ آپ آگے نکل جائیں اور وہ پیچھے بیٹھا رہ جائے کہ دیکھیں قوم کے ساتھ کیا ہوتا ہے؟ تماشا دیکھنے کے جذبے سے جیسے ٹھہر جاتے ہیں اور یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ جب عذاب آئے گا تو ہمیں بھی کوئی تکلیف پہنچ سکتی ہے، اس لیے ان کو آگے لگا کے آپ ان کے پیچھے پیچھے چلیں، وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ: اور تم میں سے کوئی بھی مڑ کے نہ دیکھے، یہ کنایہ ہوتا کہ جلدی جلدی چلو، جس طرح ہم کہتے ہیں کہ جلدی جلدی جاؤ، بس اپنے دھیان سے چلتے چلے جانا، پیچھے مڑ کے نہ دیکھنا، تو یہ جلدی چلنے سے کنایہ ہوتا ہے، وَّامْضُوْا حَيْثُ تُؤْمَرُوْنَ: اور چلو وہیں جہاں تمہیں حکم دیا گیا ہے، جدھر جانے کے لئے تمہیں کہا گیا ہے بس ادھر چلے جانا، وَقَضَيْنَآ اِلَيْهِ: اِلَيْهِ کی ضمیر حضرت لُوط علیہ السلام کی طرف لوٹ رہی ہے، قضاء کا معنی ہوتا ہے فیصلہ کرنا، اور جب "اِلٰی" کا لفظ آ گیا تو اس میں اطلاع والا معنی مضمر ہو گیا۔ ہم نے فیصلہ کر کے لُوط کو اطلاع دے دی اس بات کی، قَضَيْنَآ اِلَيْهِ ذٰلِكَ الْاَمْرَ کا مفہوم اس طرح سے ادا ہو جائے گا، ہم نے فیصلہ کر کے اس بات کی لُوط کو اطلاع دے دی، اس امر کا فیصلہ کر کے لُوط علیہ السلام کو اطلاع دے دی، اَنَّ دَابِرَ هٰٓؤُلَآءِ مَقْطُوْعٌ مُّصْبِحِيْنَ: کہ ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی جائے گی اس حال میں کہ یہ صبح میں داخل ہونے والے ہوں گے۔ اَصْبَحَ: صبح کرنا۔ مُصْبِحِيْنَ: جب یہ صبح کرنے والے ہوں گے، صبح میں داخل ہونے والے ہوں گے، یعنی طلوع فجر کے بعد۔ "ان کی جڑ کاٹ دی جائے گی اس حال میں کہ یہ صبح کے وقت میں داخل ہونے والے ہوں گے۔"

اب یہ قصے واقعات کے آخری اجزا، لیکن ان کو ذکر پہلے کر دیا، اور جو واقعے کا پہلا حصہ تھا اس کو پیچھے ذکر کیا جا رہا ہے، اور سورۂ ہود میں ترتیب اسی طرح سے تھی جس طرح کہ واقعات ہیں، کہ لوط علیہ السلام کے گھر میں یہ مہمان گئے، شہر والوں کو پتا چلا، وہ آ کے مطالبہ کرنے لگے کہ یہ لوگ ہمارے سپرد کر دو، حضرت لوط علیہ السلام نے ان کو بچانے کے لئے ہر جتن کیا، لیکن جب وہ نہیں مانے اور حضرت لُوط علیہ السلام انتہائی پریشان ہوئے تو تب انہوں نے اظہار کیا تھا کہ ہم فرشتے ہیں، وہاں جو ذکر کیا گیا تھا وہ واقعے کے مطابق تھا، اور یہاں کسی حکمت کے تحت ان کے انجام کو پہلے ذکر کر دیا گیا تا کہ عذاب کا ذکر، ان کے معذب ہونے کا ذکر پہلے آ جائے، اور واقعے کے کچھ اجزا بعد میں ذکر کیے جا رہے ہیں کیونکہ قرآنِ کریم کا مقصد تو صرف موعظت اور نصیحت کو اجاگر کرنا ہے، تاریخی واقعے کو تاریخی انداز سے بیان کرنا مقصود نہیں ہے۔ وَجَآءَ اَهْلُ الْمَدِيْنَةِ يَسْتَبْشِرُوْنَ: آ گئے شہر والے خوشیاں مناتے ہوئے، خوش ہو گئے کہ آج تو بڑے خوبصورت لونڈے آئے ہیں، بہت اچھے لڑکے آئے ہیں، آج تو خوب مزے سے گزرے گی، اس طرح سے خوش ہوتے ہوئے وہ بھاگے ہوئے آ گئے۔ اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ فسق و فجور میں وہ لوگ کتنا آگے گزر گئے تھے، کہ کسی شریف آدمی کے پاس جا کر اس قسم کے تذکرے کرنے سے بھی وہ نہیں شرماتے تھے، اور ان میں کوئی آدمی ایسا نہیں تھا جو ان کو ملامت کرتا یا ان کو سمجھاتا، کہ دیکھو! اس طرح سے نہ کرو، ساری کی ساری قوم اس درجے کی بگڑی ہوئی تھی۔ قَالَ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ ضَيْفِيْ: لُوط علیہ السلام نے کہا کہ یہ میرے مہمان ہیں، فَلَا تَفْضَحُوْنِ: لا تفضحونی تم مجھے رُسوا نہ کرو۔ مہمانوں کی نظر میں بے عزت نہ کرو، کہ یہ

لوگ کہیں گے کہ ہم اس کو شریف آدمی سمجھ کے اس کے گھر مہمان آئے تھے اور یہ ہمیں اس طرح سے ظالموں کے سپرد کر رہا ہے، اور ظالموں سے ہمیں اس نے نہیں بچایا، ہمیں تحفظ نہیں دے سکا، تو مہمانوں کی نظر میں مجھے ذلیل نہ کرو، وَاتَّقُوا اللّٰهَ: اللہ سے ڈرو، وَلَا تُخْزُوْنِ: لا تخزونی اور عام لوگوں کی نظر میں بھی مجھے رُسوا نہ کرو، کیونکہ لوگ جب سنیں گے تو کہیں گے کہ لُوط کی اس بستی کے اندر کیا عزت تھی، کہ اس کے گھر مہمان آجاتا تھا تو اس کو بھی نہیں بچا سکتے تھے۔ تو مہمان بھی بُرا جانیں گے، مہمانوں کی نظر میں بھی میں رُسوا ہوں گا، اور عام لوگوں کے اندر بھی میری کیا عزت رہے گی، اس لیے تم مجھے رُسوا نہ کرو، یہ میرے مہمان ہیں، ان سے صَرفِ نظر کر جاؤ، انہیں کچھ نہ کہو۔ قَالُوْٓا: وہ کہنے لگے اَوَلَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے بھی کبھی کبھی کوئی ایسا واقعہ پیش آجاتا ہوگا کہ کوئی راہ گزر اور مسافر ان کو مل جاتا ہوگا تو اس کو ان کے ظلم وستم سے بچانے کے لئے حضرت لُوط علیہ السلام اس کو اپنے گھر میں ٹھہرا لیتے ہوں گے، اور وہ روکتے ہوں گے کہ آنے والوں کو تحفظ نہ دیا کرو، کیونکہ وہ لوٹتے تھے اور اپنی شہوات پوری کرتے تھے، تو حضرت لُوط علیہ السلام کے تحفظ میں جب کوئی آجاتا تھا تو ان کی کارروائی میں رُکاوٹ پڑتی تھی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے بھی حضرت لُوط علیہ السلام کے ساتھ ان کی اس سلسلے میں مزاحمت جاری رہتی ہوگی کہ کوئی مسافر آئے اس کو ہمارے سپرد کیا کرو، آپ اس کو ٹھکانا نہ دیا کرو۔ کہتے ہیں کہ ہم نے تجھے روکا نہیں جہانوں سے کیا؟ تُو نے جہانوں کا ٹھیکہ لے رکھا ہے کہ جو باہر سے آئے، آ کے تیرے گھر ہی ٹھہر جائے، ہم نے پہلے بھی تجھے روکا ہے کہ کوئی باہر سے آدمی آئے تو اسے اپنے گھر نہ ٹھہرایا کر، اس لیے یہ ہمارے سپرد کر، ہم تیرے پاس نہیں رہنے دیں گے۔ تو اس لفظ سے اندازہ ہوتا ہے کہ پہلے بھی اس قسم کی کشاکشی جاری رہتی ہوگی، کہ کوئی مسافر آتا ہوگا، حضرت لُوط اس کو گھر ٹھہرا لیتے ہوں گے، اس کے جان مال کو تحفظ دیتے ہوں گے، اور یہ لوگ سمجھتے تھے کہ یہ تو ہماری کارروائیوں میں رکاوٹ پڑتی ہے، ہمیں یہ نقصان پہنچاتا ہے، تو لُوط علیہ السلام سے اس بارے میں پہلے بھی اُلجھتے ہوں گے، لیکن اتنی شدت کے ساتھ پہلے واقعہ پیش نہیں آیا ہوگا، کیونکہ اس طرح سے نوعمر، خوبصورت، گروہ کی شکل میں جیسے یہ آئے تھے، تو اب یہ لوگ صبر نہ کر سکے، اپنی شہوات میں اس طرح سے مغلوب ہو گئے، اور پہلے ممکن ہے کہ کبھی روکے ہوئے رُک بھی جاتے ہوں۔ قَالُوْٓا: وہ کہنے لگے کہ اَوَلَمْ نَنْهَكَ: کیا ہم نے تجھے روکا نہیں؟ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ: جہانوں سے۔ جہانوں سے روکنے کا مطلب یہی ہے جس کو میں اپنے الفاظ میں یوں ادا کر رہا ہوں، کہ ہم نے تجھے پہلے نہیں کہا؟ کہ ساری دنیا کا تُو نے کوئی ٹھیکہ لے رکھا ہے؟ کہ جو بھی آئے، آ کے تیرے گھر ٹھہرے، جو بھی آئے تُو اس کو تحفظ دے دے، ہم نے پہلے روکا تھا، اس لیے اب موقع گزر گیا، اب ہم نہیں چھوڑیں گے، باہر سے آنے والے لوگوں کو ہمارے سپرد کرو۔ قَالَ هٰٓؤُلَآءِ بَنٰتِيْٓ: جب وہ کسی طرح سے نہ سمجھے تو آخر یہ لفظ بھی حضرت لُوط علیہ السلام کے منہ سے نکلے، اس کے دونوں مطلب آپ کی خدمت میں پہلے ذکر کر دیے گئے تھے، ''یہ میری بیٹیاں ہیں'' اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ: اگر تم کرنے والے ہو۔ هٰٓؤُلَآءِ بَنٰتِيْٓ کا اشارہ یا تو قوم کی بیٹیوں کی طرف ہے، چونکہ بڑا آدمی جو ہوتا ہے تو قوم کی لڑکیاں اس کی بیٹیاں ہی ہوتی ہیں، مطلب یہ ہے کہ تمہارے گھروں کے اندر تمہارے بیویاں میری بیٹیاں، تم نے اگر اس قسم کی شہوات پوری کرنی ہیں تو اپنے گھروں میں جاؤ، اللہ تعالیٰ نے ان کو تمہارے لیے اسی مقصد کے لئے پیدا کیا ہے، تو تمہیں اُدھر متوجہ ہونا چاہیے، یہ خلافِ فطرت حرکت تم کیوں کرتے ہو؟ تو هٰٓؤُلَآءِ کا اشارہ انہی بچیوں اور بیٹیوں کی طرف ہے جو ان کے گھروں میں آباد تھیں۔ اور

اگر اپنی ہی بیٹیاں مراد ہوں تو پھر یہ انتہائی عجز کا لفظ ہے، اس میں پیشکش نہیں ہوا کرتی جس طرح سے ظاہری طور پر الفاظ معلوم ہوتے ہیں، بلکہ اگر کسی کے دل میں ذرّہ برابر بھی احساس ہو، غیرت اور شرم ہو تو اس قسم کی بات سُن کے انسان کی آنکھ نیچی ہو جاتی ہے، وہ سمجھ سکتے ہیں کہ دیکھو! لُوط علیہ السلام کو اپنے مہمانوں کا کتنا خیال ہے کہ ان کے لئے اپنی بیٹیوں کی قربانی دینے کے لئے تیار ہیں، دینا مقصود نہیں ہوتا، بیٹیاں سپرد نہیں کرنی تھیں، یہ لفظ دوسرے کی غیرت کو جھنجوڑنے کے لئے ہوتے ہیں، جس طرح سے آپ کا کوئی بڑا آپ سے کہے کہ بھئی! اگر تیرا غصہ نہیں اُترتا تو لے! میرے سر میں جوتے لگا لے، اس کو چھوڑ دے، اسے معاف کر دے۔ اب یہاں جوتے کھانے مقصود نہیں ہوتے، نہ ہی تمہیں کہنا مقصود ہے کہ تم جوتے مارلو، لیکن اس قسم کی بات سے غیرت مند کی غیرت کو جھنجوڑا جاتا ہے، اور اگر اس میں حیا کی کچھ بھی رمق ہوتی ہے تو ان باتوں سے متاثر ہو جایا کرتا ہے۔ تو حضرت لُوط علیہ السلام نے یہ لفظ اسی طرح سے فرمائے تھے۔

لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ: عَمر عُمر کے معنی میں ہے، یہ خطاب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے، آپ کی زندگی کی قسم! وہ تو اپنی مستی کے اندر بھٹکتے پھرتے تھے، وہ لُوط علیہ السلام کی باتوں سے کہاں متاثر ہو سکتے تھے، ان کے اُوپر تو اس طرح سے مستی اور شہوت چڑھی ہوئی تھی کہ ان کی تو عقل ہی ماری گئی تھی، جیسے پہلے آپ کی خدمت میں ذکر کیا تھا کہ ایک ہوتا ہے: عَمِيَ يَعْمٰى جس سے اعمیٰ بنتا ہے وہ ہے آنکھوں کا اندھا، اور ''عَمِهَ'' ہوتا ہے دل کے اندھا، یہاں مطلب یہی ہے کہ ان کو اس طرح سے نشہ چڑھا ہوا تھا، اس طرح سے شہوت کی مستی چڑھی ہوئی تھی کہ ان کی عقل ہی ماری گئی تھی، ان کی سوچنے کی صلاحیت ہی ختم ہو گئی تھی۔ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُشْرِقِيْنَ: پس پکڑ لیا ان کو ایک چیخ نے، چیخ کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح سے بادل آیا، کڑکا، جس طرح سے بجلی کڑکتی ہے، ممکن ہے کوئی طوفان کی صورت ہوئی ہو، سخت آندھی چلی جس میں پتھر برسے، زلزلہ آیا، بستیاں اُلٹ گئیں، کیونکہ حقیقت کے اعتبار سے تو ٹھیک ہے جیسے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض روایات میں ذکر کیا گیا ہے کہ جبریل علیہ السلام نے آکے ان کی بستیوں کو اُٹھایا اور اُٹھا کے پھینک دیا، وہ تو حقیقت ہے، اللہ تعالیٰ جتنے کام لیتے ہیں فرشتوں سے لیتے ہیں، لیکن اس کے آثار جس قسم کے نمایاں ہوا کرتے ہیں وہ یہی ہے کہ آندھی آ گئی، زلزلہ آ گیا، دیکھنے والے سمجھیں گے کہ زلزلہ آیا اور اس سے تباہی آ گئی، پہاڑی علاقے سے اتنی زور کے ساتھ آندھی چلی کہ اس نے زور سے پتھر لا لا کر برسائے، ظاہری اسباب کے طور پر بات یوں نمایاں ہوا کرتی ہے، تو شدّت کے ساتھ آندھی چلی اور اتنی زبردست کہ اس میں پتھر اُڑ اُڑ کر آئے، مارنے والے تو فرشتے ہی تھے، کیونکہ کام سارے فرشتے ہی کرتے ہیں، پتھر ان کے اُوپر برسے، زلزلہ آیا، جس کے ساتھ ساری کی ساری بستی تہہ و بالا ہو گئی۔ اور اسرائیل کے علاقے میں جو ''بحرِ لُوط'' ہے جس کو ''بحرِ میّت'' بھی کہتے ہیں اس قوم کا یہی علاقہ ہے، اب وہاں بہت زہریلے قسم کے پانی کی جھیل ہے جس میں کہتے ہیں کہ کوئی جاندار چیز زندہ نہیں رہتی اسی لیے اس کو ''بحرِ میّت'' کہا جاتا ہے۔ ''پکڑ لیا ان کو صیحہ نے، چنگھاڑ نے، چیخ نے، گرج نے، کڑک نے'' جو بھی لفظ بولیں، تو عذاب کی صورت اس طرح سے گرج اور کڑک کے ساتھ آئی تھی جس کو صیحہ کے ساتھ تعبیر کیا جا رہا ہے، مُشْرِقِيْنَ: اس حال میں کہ سورج نکلنے کے وقت میں وہ داخل ہونے والے تھے۔ اَشْرَقَ: سورج کا روشن

ہونا۔ گویا کہ طلوعِ فجر سے عذاب شروع ہوا اور سورج نکلنے تک ختم ہوگیا، اور اسی گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے اندر ان کو نیست و نابود کر دیا گیا، اور ساری تباہی ان کے اوپر آ گئی، اتنا ہی وقفہ ہوتا ہے، ڈیڑھ گھنٹہ، ایک گھنٹہ بیس منٹ، بس سارے کا سارا اتنا وقت لگا، اور ساری قوم برباد ہوگئی۔ فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا: ہم نے ان بستیوں کے اوپر والے حصے کو نچلا حصہ بنا دیا، جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ان کو تہہ و بالا کر دیا۔ تہہ: نیچے۔ بالا: اوپر۔ تو چھتیں گر گئیں، ان کے اوپر دیواریں گر گئیں، اُوپر والا حصہ نیچے آ گیا، نیچے والا حصہ اُوپر ہوگیا، اور زلزلے کے صورت میں بسا اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ جس طرح سے آتش فشاں پہاڑ پھٹا کرتا ہے تو نیچے سے جب اٹھیں گے تو مٹی اتنی اُبھرے گی کہ عمارتیں نیچے دھنس جائیں گی، مٹی اُوپر آ جائے گی، تو اُوپر والا حصہ نیچے چلا گیا، اب نیچے زمین پھٹے جس طرح آتش فشاں پہاڑ پھٹتے ہیں اور نیچے سے کوئی زلزلے کی صورت ایسی پیدا ہو جائے تو نیچے والی مٹی اُبھر کے اُوپر آ سکتی ہے، اُوپر والی نیچے جا سکتی ہے، ظاہری دیکھنے میں یوں معلوم ہوگا اور حقیقت میں جبریل علیہ السلام نے اٹھایا اور پھینک دیا، وہ باطن کی بات ہے یہ ظاہر کی بات ہے۔ تو ہم نے ان بستیوں کو بالکل تہہ و بالا کر دیا۔ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ: اور ان کے اوپر ہم نے پتھر برسائے سجیل سے۔ سجیل کا لفظ پہلے بھی آیا تھا، یہ معرّب ہے سنگِ گل سے، سنگِ گل: مٹی کے پتھر، جنہیں آپ کھنگر کہتے ہیں، جہاں بھٹے پکتے ہیں وہاں آپ نے بعض کھنگر بنے ہوئے دیکھے ہوں گے۔ ''کھنگر کے پتھر ہم نے ان کے اوپر برسائے'' اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِيْنَ: متوسمین کا لفظ وَسم سے لیا گیا ہے، وَسم کہتے ہیں علامت کو، توسُّم کا معنی ہوتا ہے علامات دیکھ کے کسی چیز کو معلوم کر لینا، یہ سمجھ دار انسانوں کا کام ہوتا ہے کہ آثار دیکھ کے، علامات دیکھ کے کسی بات کو سمجھ جائیں، تو متوسمین کا معنی ہے صاحبِ فراست لوگ، سمجھ دار لوگ، جو ظاہری حالات دیکھ کر حقیقت کو معلوم کر لیا کرتے ہیں، علامات دیکھ کے کسی چیز کو پہچان لیتے ہیں، ان لوگوں کے لئے اس واقعہ میں البتہ بہت نشانیاں ہیں، وَاِنَّهَا لَبِسَبِيْلٍ مُّقِيْمٍ: اور بے شک یہ بستیاں البتہ آباد سڑک پر ہیں، سبیلِ مقیم سے مراد آباد سڑک جس کے اوپر آمد و رفت ہے، چنانچہ اہلِ مکہ جس وقت شام کی طرف جایا کرتے تھے تو انہی بستیوں کے پاس سے گزر کے جاتے تھے، اور ان کو معلوم تھا کہ یہ تباہ شدہ علاقہ ہے اور اس علاقے کے اوپر کوئی عذاب آیا ہوا ہے، جس طرح سے اب ہمارے ملک میں بھی کئی جگہ کھنڈرات موجود ہیں یا نہیں؟ جو برباد شدہ شہروں کے ہیں، شورکوٹ کی طرف جاؤ، ہڑپے کی طرف جاؤ، سڑکیں پاس سے گزرتی ہیں تو انسان گزرتے ہوئے دیکھتا جاتا ہے کہ یہاں کبھی کوئی شہر آباد تھا اور برباد ہو یا ہوا ہے، لیکن چونکہ ان کی تاریخ ہمارے سامنے نہیں ہے کہ یہ کیسی آبادیاں تھیں اور کس طرح سے برباد ہوئیں، اس لیے ہم اس کو تفصیل کے ساتھ نہیں جان سکتے، تو یہی چیز وہاں بھی تھی کہ کھنڈرات معلوم ہوتے تھے لوگ دیکھتے تھے، قرآنِ کریم نے آ کر پردہ اٹھا دیا کہ ان کی بربادی کو ایسے نہ سمجھو جیسے اتفاقاً ہو جایا کرتی ہے، بلکہ یہی اخلاقی زوال، یہی اخلاقی بیماریاں، یہی کُفر و شرک ان کی بربادی کا باعث بنا ہے۔ تو تباہ شدہ بستیاں ہر علاقے میں ہوتی ہیں، باقی! کیسے تباہ ہوگئیں، اس کے اسباب اور اس کی حقیقت چونکہ نمایاں نہیں، اس لیے انسان تفصیل کے ساتھ ان کو ذہن میں نہیں لا سکتا۔ وَاِنَّهَا لَبِسَبِيْلٍ مُّقِيْمٍ: بے شک یہ بستیاں البتہ آباد راستے پر ہیں، آباد سڑک پر، جس کے اوپر آمد و رفت ہے۔ ''بے شک اس میں البتہ نشانی ہے مؤمنین کے لئے۔''

شانِ عذاب کے ظہور کا دُوسرا واقعہ (واقعۂ قومِ شعیب)

وَإِنْ كَانَ أَصْحٰبُ الْأَيْكَةِ لَظٰلِمِيْنَ: اصحابِ اَیکہ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم ہے جن کو اصحابِ مدین بھی کہا جاتا ہے اور اصحابِ اَیکہ بھی، اَیکہ اصل کے اعتبار سے جنگل کو کہتے ہیں، بَن، جس میں درخت بہت زیادہ کھڑے ہوتے ہیں، کہ بَن والے، جنگل والے، یہ بھی البتہ ظالم تھے، اس سے قومِ شعیب مراد ہے، ان کی طرف شعیب علیہ السلام آئے تھے۔ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ: پھر ہم نے ان سے بھی انتقام لیا۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کے عذابِ الیم کا ایک مظہر ہے، اس کی تفصیل بھی آپ کے سامنے سورۂ ہود اور سورۂ اَعراف میں گزر گئی ہے، وَإِنَّهُمَا: اور یہ دونوں ہی بستیاں یعنی قومِ لُوط کی اور قومِ شعیب کی، لَبِإِمَامٍ مُّبِيْنٍ: واضح سڑک پر ہیں۔ اِمام سے یہاں سڑک مراد ہے۔ واضح راستے پر ہیں جہاں لوگوں کے قافلے گزرتے ہیں، دونوں ہی سڑک کے اوپر آباد ہیں، تو یہ بستیاں واضح سڑک پر تھیں اور اسی پر ہی اب ان کے کھنڈرات ہیں، یہ وہی شاہراہ ہے جو مکہ معظمہ سے شام کی طرف جاتی تھی۔

وَلَقَدْ كَذَّبَ أَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿٨٠﴾ وَاٰتَيْنٰهُمْ اٰيٰتِنَا فَكَانُوْا عَنْهَا
البتہ تحقیق جھٹلایا حجر والوں نے مرسلین کو ﴿٨٠﴾ اور ہم نے ان کو واضح واضح نشانیاں دی تھی، یہ ان نشانیوں سے

مُعْرِضِيْنَ ﴿٨١﴾ وَكَانُوْا يَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا اٰمِنِيْنَ ﴿٨٢﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ
اِعراض کرنے والے تھے ﴿٨١﴾ اور وہ تراشا کرتے تھے پہاڑوں سے گھروں کو بےخوف ہو کر ﴿٨٢﴾ پس پکڑ لیا ان کو چیخ نے

مُصْبِحِيْنَ ﴿٨٣﴾ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿٨٤﴾ وَمَا خَلَقْنَا
اس حال میں کہ وہ صبح کے وقت میں داخل ہونے والے تھے ﴿٨٣﴾ جو کچھ وہ کرتے تھے وہ ان کے کچھ کام نہ آیا ﴿٨٤﴾ نہیں پیدا کیا ہم نے

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ ۗ وَاِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ
آسمانوں کو اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے مگر مصلحت کے ساتھ، بےشک قیامت البتہ آنے والی ہے، آپ ان سے اچھی طرح سے

الْجَمِيْلَ ﴿٨٥﴾ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ﴿٨٦﴾ وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ
درگزر کر جائیے ﴿٨٥﴾ بےشک تیرا رَبّ پیدا کرنے والا ہے اور علم والا ہے ﴿٨٦﴾ البتہ تحقیق دیں ہم نے آپ کو سات آیات جو بار بار دہرائی جاتی ہیں

وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ﴿٨٧﴾ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ
اور قرآنِ عظیم ﴿٨٧﴾ نہ پھیلائیے آپ اپنی آنکھیں اس چیز کی طرف جس کے ذریعے سے ہم نے ان میں سے مختلف لوگوں کو فائدہ پہنچایا

وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۸﴾ وَقُلْ اِنِّيْٓ اَنَا النَّذِيْرُ الْمُبِيْنُ ﴿۸۹﴾

اور نہ ان پر غم کیجئے اور اپنے بازو کو پست کیجئے مؤمنین کے لئے ﴿۸۸﴾ اور کافروں کو کہہ دیجئے کہ میں تو صریح ڈرانے والا ہوں ﴿۸۹﴾

كَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِيْنَ ﴿۹۰﴾ الَّذِيْنَ

(ہم ان کے اُوپر عذاب اُتاریں گے) جس طرح سے کہ ہم نے اُن لوگوں پر عذاب اُتارا تھا جنہوں نے حصے کر لیے تھے ﴿۹۰﴾ جنہوں

جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِيْنَ ﴿۹۱﴾ فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۹۲﴾ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۳﴾

نے قرآن کے مختلف حصے کر لیے تھے ﴿۹۱﴾ تیرے رَبّ کی قسم! البتہ ضرور ہم ان سب سے پوچھیں گے ﴿۹۲﴾ ان کاموں کے متعلق جو یہ کرتے ہیں ﴿۹۳﴾

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۹۴﴾ اِنَّا كَفَيْنٰكَ

کھول کھول کے بیان کیجئے ان باتوں کو جن کے متعلق آپ کو حکم دیا جا رہا ہے اور مشرکین سے اعراض کر جائیے ﴿۹۴﴾ ہم آپ کی طرف

الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ﴿۹۵﴾ الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۚ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۹۶﴾ وَلَقَدْ نَعْلَمُ

سے ٹھٹھا کرنے والوں کے لئے کافی ہیں ﴿۹۵﴾ جو اللہ کے ساتھ اور معبود قرار دیتے ہیں، ان کو عنقریب پتا چل جائے گا ﴿۹۶﴾ اور تحقیق ہم جانتے ہیں

اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ﴿۹۷﴾ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ

کہ آپ کا دِل تنگ ہوتا ہے ان باتوں کی وجہ سے جو یہ کہتے ہیں ﴿۹۷﴾ پس آپ اللہ کی تسبیح بیان کیجئے اس کی حمد کے ساتھ

وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۹۸﴾ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ﴿۹۹﴾

اور سجدہ کرنے والوں میں سے ہو جائیے ﴿۹۸﴾ اور اپنے رَبّ کی عبادت کرتے رہیے یہاں تک کہ آپ کو موت آجائے ﴿۹۹﴾

تفسیر

شانِ عذاب کے ظہور کا تیسرا واقعہ (واقعۂ قومِ ثمود)

وَلَقَدْ كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِيْنَ: اصحابِ حجر یہ قومِ ثمود ہے جس کی طرف حضرت صالح علیہ السلام تشریف لائے تھے، اس کی تفصیل بھی سورہ ہود میں آپ کے سامنے آگئی۔ حِجر وادی کا نام ہے جس کے اندر یہ لوگ آباد تھے۔ ''حِجر والوں نے مرسلین کو جھٹلایا'' آئے ان کے پاس اللہ کے رسول صالح علیہ السلام تھے، اور حضرت صالح چونکہ بات وہی کرتے تھے جو سارے ہی رسول کہہ رہے ہیں تو جب اس رسول کی تکذیب کر دی یوں سمجھو سب کی کر دی، جب دس آدمی ایک ہی بات کہتے ہیں تو ایک سامنے آئے اور

اس کی بات کو جھٹلا یا دیا جائے تو یوں سمجھو کہ دس کی بات ہی جھٹلا دی، ’’البتہ تحقیق جھٹلایا حجر والوں نے مرسلین کو‘‘ وَاٰتَيْنٰهُمْ اٰيٰتِنَا: اور ہم نے ان کو واضح واضح نشانیاں دی تھیں، جن میں سے زیادہ واضح نشانی ناقۃ اللہ تھی جس کا ذکر سورہ ہود میں آیا تھا، فَكَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ: یہ ان نشانیوں سے اعراض کرنے والے تھے، وَكَانُوْا يَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا اٰمِنِيْنَ: اور وہ تراشا کرتے پہاڑوں سے گھروں کو بے خوف ہو کر، یعنی بڑی امن کی زندگی انہوں نے اختیار کر رکھی تھی، پہاڑ تراش تراش کے مکان بناتے تھے، وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان مضبوط عمارتوں میں کبھی عذاب آ سکتا ہے، اور یہ ہمارے محلات اور یہ مضبوط عمارتیں یہی ہمارا قبرستان بن سکتی ہیں، کبھی وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے، فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ: پس ان کو بھی اسی طرح سے چیخ نے، چنگھاڑ نے، کڑک نے پکڑ لیا، یعنی اسی طرح سے ان کے اوپر بھی کوئی کڑک وغیرہ آئی جس طرح سے بادل آتے ہیں اور کڑ کتے ہیں، اور وہ عذاب کی صورت اختیار کر گئے، یا جب زور کی آندھی آیا کرتی ہے تو اس میں بھی ایک چیخ چنگھاڑ ہوتی ہے، سورۂ ہود میں بھی غالباً صیحہ کا ذکر ہی آیا تھا، کہیں رَجفہ کا ذِکر ہے، بہر حال جب شدّت کے ساتھ آندھی چلی، آندھی چلنے کے ساتھ وہ عذاب آ جاتا ہے، زلزلہ بھی ہو سکتا ہے، اور یہ شدّت کی آواز بادلوں سے بھی پیدا ہو سکتی ہے جس کی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بعض آثار میں یہ بھی ہے کہ جبریل علیہ السلام نے آ کر ایک چیخ ماری، وہ ہے باطن کا ذکر، ظاہری طور پر جب بات نمایاں ہوگی تو اسی طرح سے ہوگی جیسے بادل آئے، بجلی کڑکی، اور اتنی شدّت کے ساتھ کڑکی کہ وہی عذاب کی صورت اختیار کر گئی۔ صاحَ يَصِيْحُ اصل میں چیخنے کو کہتے ہیں، اور جس وقت عذاب آتا ہے تو قوم خود بھی چیخ و پکار میں لگ جایا کرتی ہے، یعنی یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اللہ کی طرف سے کوئی عذاب آیا، جب عذاب آیا تو قوم بھی چیخ و پکار میں لگ گئی اور چیختے چنگھاڑتے ہوئے ختم ہو گئے، مُصْبِحِيْنَ: اس حال میں کہ وہ صبح کے وقت میں داخل ہونے والے تھے، اُسی وقت ان پر عذاب آیا، فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ: جو کچھ وہ کرتے تھے وہ ان کے کچھ کام نہ آیا۔ اغنٰی عنہُ کا ترجمہ کئی دفعہ آپ کی خدمت میں ذکر کیا، دُور ہٹانا، کام آنا، فائدہ پہنچانا، جن لفظوں سے چاہیں آپ اس کو ادا کر سکتے ہیں۔

پوری کائنات کی تخلیق محض کھیل تماشا نہیں

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ: نہیں پیدا کیا ہم نے آسمانوں کو اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے مگر مصلحت کے ساتھ، حق کے ساتھ، یہ باطل نہیں، محض کوئی کھیل تماشا نہیں ہے کہ پیدا کیا، دل بہلایا اور ختم کر دیا، جس طرح سے بچے کھیلا کرتے ہیں کہ مٹی کے گھر بنا لیں گے، سب کچھ کر کرا کے جب کھیل ختم کرنے لگتے ہیں تو کہتے ہیں ’’ہتھاں نال بنایا سی تے پیراں نال ڈھایا سی‘‘ (ہاتھوں سے بنایا تھا اور پاؤں سے گرا دیا تھا)، تو یہ کھیل تماشا نہیں کہ جس کا نتیجہ کچھ نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس میں بہت مصلحت رکھی ہے، جب یہ دنیا آباد کی ہے تو اس کے اندر خصوصیت کے ساتھ انسانوں کو جو کھانے پینے کے لئے اور ہر قسم کے فائدے اٹھانے کے لئے آزاد چھوڑا، تو اس کا نتیجہ یقیناً نکلے گا، اور اللہ تعالیٰ محاسبہ کرے گا، اسی محاسبے کی طرف آگے اشارہ ہے وَاِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ: بے شک قیامت البتہ آنے والی ہے فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ: آپ ان سے اچھی طرح سے درگزر کر جائیے، یعنی یہ اگر آپ کی تکذیب کرتے اور آپ کی باتیں نہیں مانتے اور آپ کے کہنے کے مطابق اللہ کی عبادت نہیں

کرتے شرک سے باز نہیں آتے تو آپ درگزر کر جائیں، اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ: بے شک تیرا رَبّ پیدا کرنے والا ہے اور علم والا ہے، پیدا بھی وہی کرتا ہے اور سب کچھ جانتا بھی ہے، جیسے سورۂ تبارک الذی کے اندر آئے گا اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ کیا جس نے پیدا کیا وہ نہیں جانتا؟ جو کسی چیز کا بنانے والا ہوتا ہے وہ اس کے جزء جزء سے واقف ہوتا ہے، تو جب ساری کائنات کو بنایا اللہ نے، پیدا اللہ نے کیا، انسان کو بھی اللہ نے پیدا کیا، اس کے اعمال کا بھی خالق وہی ہے، تو اس کے علم سے کون سی چیز باہر جا سکتی ہے، سب کچھ اللہ کو معلوم ہے، لہٰذا اپنے علم کے مطابق اللہ تعالیٰ سب کو اکٹھا کرلے گا۔

سب سے عظیم نعمت قرآنِ کریم کا حصول ہے،

کُفّار اور اہلِ ایمان کے متعلق حضور ﷺ کو ہدایات

وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ: البتہ تحقیق دیں ہم نے تجھے سات آیات جو بار بار دوہرائی جاتی ہیں اور قرآنِ عظیم، سَبْعًا: سات۔ مثانی مثنی کی جمع ہے، بار بار دوہرائی جانے والی۔ اصح روایات کے مطابق اس کا مصداق سورۂ فاتحہ ہے۔ اور قرآنِ عظیم کا جو اس کے اوپر عطف ڈالا جا رہا ہے تو گویا کہ یا تو یوں کہہ لیجیے کہ دو باتوں کا ذکر آ گیا کہ سورۂ فاتحہ بھی دی اور قرآنِ عظیم بھی دیا، سورۂ فاتحہ کا ذکر خصوصیت سے آ گیا، اور سورہ فاتحہ کو ہی اگر قرآنِ عظیم کا مصداق بنایا جائے تو یہ بھی اپنی جگہ ایک واقعہ ہے، کیونکہ یہ سارے قرآنِ کریم کا خلاصہ ہے، یعنی ہم نے تجھے ایک ایسی عظیم نعمت دے دی ہے کہ آپ اس نعمت کی طرف متوجہ رہیں اور اس نعمت کے ساتھ آپ اپنا دل بہلائیں، اور مشرکین کی طرف سے اگر کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اس سے درگزر کر جائیں۔ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖ: مَا مَتَّعْنَا بِهٖ: جس چیز کے ساتھ ہم نے فائدہ پہنچایا، اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ: ان میں سے مختلف قسم کے کافروں کو، ان میں سے مختلف گروہوں کو، مختلف ٹولوں کو، مختلف قسم کے لوگوں کو، طرح طرح کے لوگوں کو جس چیز کے ساتھ ہم نے فائدہ پہنچایا لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ: آپ اپنی آنکھیں ادھر اُٹھائیں بھی نہ۔ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ: مَدَّ يَمُدُّ: پھیلانا۔ نہ پھیلا تو اپنی دونوں آنکھیں اس چیز کی طرف جس کے ذریعے سے ہم نے ان میں سے مختلف لوگوں کو فائدہ پہنچایا، اور نہ ان پر غم کر، اور اپنے بازو کو پست کر مؤمنین کے لئے۔ یہ کافروں کے مختلف قسم کے گروہ، ان کو جس چیز سے بھی ہم نے فائدہ پہنچایا، کسی کو ہم نے بکریوں کے ریوڑ دیے، کسی کو اونٹوں کے ریوڑ دیے، کسی کی تجارت خوب چل رہی ہے، کسی کے محلات بہت اچھے ہیں، کسی کے پاس خدام بہت زیادہ ہیں، کسی کے پاس سونے کے ڈھیر ہیں، کسی کے پاس چاندی ہے، گھر کا سامان بہتات سے ہے، سواریاں عجیب وغریب قسم کی ہیں، آج کی اصطلاح میں کاریں ہیں موٹریں ہیں کوٹھیاں ہیں، ہر قسم کا سامانِ عیش جو بھی ہے وہ مَا مَتَّعْنَا بِهٖ کے اندر آ گیا، ''جو کچھ بھی ہم نے ان مختلف قسم کے لوگوں کو دیا ہے آپ ان کی طرف آنکھ بھی نہ اٹھائیں'' آنکھ اٹھانے کا یہ مطلب تو ہو نہیں سکتا کہ حرص اور لالچ کے طور پر آنکھ نہ اٹھائیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ غیظ کے طور پر بھی آنکھ نہ اٹھائیں کہ ان کافروں کے پاس اللہ کی یہ نعمتیں کیوں ہیں؟ غصہ آئے کہ ان کو ان چیزوں سے محروم ہونا چاہیے، اس طرح سے بھی آپ ان کی طرف آنکھ نہ اٹھائیں، یا یوں نہ سوچیں کہ دیکھو! ان کے پاس کتنی اللہ کی نعمتیں ہیں اور پھر بھی یہ

کس طرح سے اللہ کی نافرمانیاں کر رہے ہیں، آپ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھئے۔اس کی وجہ کیا؟ وجہ یہ ہے کہ یہ نعمتیں جو بظاہر ان کے لئے نعمتیں ہیں اور جن کے ذریعے سے ان کو فائدہ پہنچایا گیا ہے یہ حقیقت کے اعتبار سے ان کے لئے عذاب کا سامان ہے، اور تمہیں جو قرآنِ عظیم دے دیا گیا، سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي دے دی گئیں، یہ ہے حقیقت کے اعتبار سے دولت جو آپ کو مل گئی، کافروں کا پاس جو کچھ بھی ہو وہ اس کے مقابلے میں آنکھ اٹھا کے دیکھنے کے قابل بھی نہیں ہے (بات کو ذرا توجہ سے سمجھ لیجئے!) اگر کوئی شخص ایمان سے محروم ہے، نیکی سے محروم ہے، اور دنیا کا پورا پورا کا ساز و سامان اس کو دے دیا گیا ہے، اور ایک شخص کو اللہ نے ایمان دے دیا اور اپنی کتاب اس کو دے دی تو ایمان اور کتاب کے مل جانے کے بعد دنیا کی کوئی چیز اس قسم کی نہیں جو کسی کافر کے پاس ہو، یا کسی بدعمل شخص کے پاس ہو، جس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا جائے، کہ یہ نعمت ہمارے پاس نہیں ہے، ہمارے پاس ہونی چاہیے، کسی چیز کی اس قسم کی قدر نہیں ہے، جیسے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا قول تفسیر مظہری میں نقل کیا ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے کسی شخص کو اپنی کتاب دے دی (کتاب دینے کا مطلب یہ ہے کہ اس کو یاد کرنے کی توفیق دے دی، سمجھنے کی توفیق دے دی، ایمان نصیب فرما دیا، اس کے مطابق عمل کی توفیق دے دی) اور پھر وہ دنیا کی کسی نعمت کو دیکھ کے للچاتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ یہ میرے پاس کیوں نہیں، میرے پاس ہونی چاہیے، تو اس نے قرآنِ کریم کی بے قدری کی۔قرآنِ کریم اتنی عظیم نعمت ہے کہ اگر اس کو حاصل کر لینے کے بعد انسان کسی اور چیز کی طرف جھانکتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اس کی قدر نہیں کی، سورۂ یونس میں غالباً آپ کے سامنے لفظ گزرے تھے هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ (آیت:۵۸) جو کچھ لوگ اکٹھا کرتے ہیں یہ اس کے مقابلے میں بہتر ہے، اس لیے آپ اپنی اس دولت پہ مست رہیے، کافروں کو ان کے حال پہ چھوڑ دو، ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھو، یہ سامان جو ان کو دیا گیا ہے یہ ان کے لئے عذاب کا ذریعہ ہے، یہ ان کے لئے نعمت نہیں ہے۔" نہ پھیلا تو اپنی آنکھیں اس چیز کی طرف جس کے ذریعے سے ہم نے ان میں سے مختلف لوگوں کو فائدہ پہنچایا، اور نہ آپ ان کے اوپر غم کیجئے۔" اور اپنی محبت اپنی شفقت ساری کی ساری مؤمنوں کی طرف متوجہ کرو، وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ: کا لفظی معنی یہ بنتا ہے کہ جناح اصل میں ہوتا ہے پرندے کا بازو، اور پرندے کے پاس جس وقت اس کے بچے آتے ہیں، آپ نے مرغی کو دیکھا ہوگا، جس وقت اس کے بچے قریب آتے ہیں تو یوں پر پھیلا کے بچوں کو ساتھ لے کے یوں جھکا لیتی ہے، یہ ہے خفضِ جناح، گویا کہ ان کو اپنے پہلو میں لے کے اس طرح سے ساتھ لگا لیا، ان کے ساتھ محبت اور شفقت کا اظہار کر دیا۔تو کافروں کو چھوڑو، مؤمن جو آپ کے پاس ہیں چاہے وہ مسکین ہیں، دنیا کے مال و دولت سے محروم ہیں، ان کے پاس کوئی چیز نہیں، لیکن قرآنِ کریم کی نعمت جیسے آپ کو ملی اور ایمان ان کو نصیب ہوا تو آپ کی محبت شفقت توجہ جو کچھ ہے سب مؤمنین پر ہونی چاہیے، "ان کے لئے اپنے بازو کو پست کیجئے" پست کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جیسے جانور اپنے بچوں کو دامن میں لے لیتا ہے، اپنے پہلو میں لے لیتا ہے، اسی طرح سے مؤمنین کے ساتھ آپ کا معاملہ یہ ہونا چاہیے۔وَقُلْ إِنِّي أَنَا النَّذِيرُ الْمُبِينُ: اور کافروں کو تو اتنا کہہ دو کہ میں تو نذیرِ مبین ہوں، کھول کھول کے تمہارے سامنے بات کو بیان کرنے والا ہوں، ان کے سامنے اس حقیقت کو نمایاں کر دیجیے۔

علم ومعرفت کے مقابلے میں بادشاہت کی کوئی اہمیت نہیں

پچھلی آیت میں جو قرآنِ کریم کا مقابلہ کیا گیا مَا مَتَّعْنَا بِہٖ کے ساتھ، اس کی عظمت آپ سمجھ گئے؟ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے وعظ کے اندر ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک اللہ والا، عارف، وہ کسی شہر میں گیا جو دارالخلافہ تھا، کوئی بادشاہ اس وقت رہتا ہوگا، دارالسلطنت تھا، تو جا کے کیا دیکھتا ہے کہ دِن کے وقت اس کی فصیل کے دروازے بند ہیں، وہ دیکھتا ہے کہ باہر کوئی دشمن بھی نہیں، حملہ بھی نہیں ہو رہا، تو یہ دروازے کیوں بند ہیں؟ (یہ سُورِ بلد جس کو آپ کتابوں میں پڑھتے ہیں، پہلے زمانے میں حملے کو روکنے کے لئے اردگرد دِیوار ہوا کرتی تھی، پُرانے شہروں میں اب بھی ہے، تو اس کے دروازے ہوتے تھے، جب کوئی دشمن باہر سے حملہ کرتا تھا تو دروازے بند کر دیے جاتے تھے) تو وہ حیران ہوئے، بعد میں پوچھا تو معلوم ہوا کہ بادشاہ کا باز اُڑ گیا تھا تو بادشاہ نے حکم دے دیا کہ فصیل کے دروازے بند کر دو، کہیں وہ باہر نہ نکل جائے، باز اُڑ گیا تھا اور فصیل کے دروازے بند کروا دیے، تو وہ اللہ والا اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو کے ایک ناز کی کیفیت میں کہتا ہے کہ عجب عقل مند کو بادشاہی دی ہے، کہ جس کو یہ پتا نہیں کہ اگر باز اُڑ جائے تو اس نے کوئی فصیل کے دروازوں سے نکلنا ہے؟ عجب عقل مند کو بادشاہی دی ہے، اور ایک ہم ہیں کہ باوجود اس علم ومعرفت کے جُوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں، کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فوراً دِل میں اِلقاء کیا گیا کہ کیا تجھے یہ پسند ہے کہ اس کی حماقت اور اس کی بادشاہت تجھے دے دی جائے اور تیرا علم ومعرفت اسے دے دیا جائے، کیا اس تبادلے پہ راضی ہو؟ تو فوراً اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑگڑائے اور توبہ اِستغفار کی کہ یا اللہ! بالکل نہیں، علم ومعرفت کے مقابلے میں یہ حماقت اور بے عقلی اور بادشاہت کیا چیز ہے۔ یعنی بادشاہت کے ساتھ اگر عقل چلی گئی، بادشاہت کے ساتھ اگر شرافت چلی گئی، جس طرح سے اللہ تعالیٰ کسی کو سرمایہ دے دے، حیا رُخصت کر دے، خود بدمعاش ہے، اس کے اہل وعیال بدمعاش ہیں، شرافت رُخصت ہو جائے، دِین رُخصت ہو جائے، دیانت رُخصت ہو جائے، تو اس نے پیسے لے لیے اور باقی سب چیزیں دے دیں، ہم تو کہتے ہیں کہ اس سے بڑھ کر خسارے کی تجارت کوئی دوسری ہو ہی نہیں سکتی، کہ پیسے تو آج ختم ہو جائیں گے کل ختم ہو جائیں گے، یہ نہیں ختم ہوں گے تو خود آدمی ختم ہو جائے گا، یہ تو پاس رہنے والی چیز ہے ہی نہیں، اور شرافت دیانت اخلاق اور اس قسم کی چیزیں یہ تو قبر میں حشر میں، ہر جگہ جا کے ان کی ضرورت ہے، تو ایک عارضی اور فانی چیز کو لے کے اس قسم کی چیزوں کو ضائع کر دینا یہ کوئی عقل مندی نہیں ہے، بہت بڑی گھاٹے کی تجارت ہے۔ اس لیے اگر کسی کو دیکھو کہ سرمایہ دار ہے، کار میں سفر کرتا ہے، کوٹھی میں رہتا ہے، خادم اس کے آگے پیچھے ہیں، لیکن بدمعاش ہے، عیاش ہے، شرابی ہے، زانی ہے، زکوٰۃ نہیں دیتا، نماز نہیں پڑھتا، اس میں کوئی ایمان کی علامت نہیں پائی جاتی، تو اس کو دیکھ کے اس کے اوپر رحم آنا چاہیے کہ یہ کتنی بڑی غلطی میں ہے، یہ سمجھتا ہے کہ میری زندگی کامیاب جا رہی ہے اور میں بہت کامیاب زندگی گزار رہا ہوں، حالانکہ یہ انتہائی خسارے کی طرف جا رہا ہے کہ عارضی سی راحت کو لے کے دائمی عذاب کے اندر مبتلا ہو رہا ہے، اس لیے حدیث شریف میں آتا ہے کہ کسی فاجر کے پاس نعمت دیکھ کے اس کے اُوپر غبطہ نہ کیا کرو کہ ہائے کاش!

ہم بھی ایسے ہوتے، تمہیں کیا پتا اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کے لئے کون سا قاتل متعین ہے جو کبھی مرے گا نہیں،[1] اس سے مراد جہنم کی آگ ہے۔ تو نیکی کی توفیق اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہت بڑی نعمت ہے جو ملتی ہے، اور قرآنِ کریم کی دولت کا نصیب ہو جانا ایک بہت بڑی سعادت ہے جو انسان کو نصیب ہوتی ہے، اس کے مقابلے میں دُنیا کا سامان آنکھ اٹھا کے دیکھنے کے قابل نہیں ہے، یہ علیحدہ بات ہے کہ اِس بازار کے اندر آپ کو اس کی قدر و قیمت معلوم نہیں، اور اس کا بازار کھلے گا مرنے کے بعد، اس وقت پتا چلے گا کہ یہ کتنی بڑی دولت ہے۔

کُفّار کو دھمکی

''اور کافروں کو کہہ دو میں تو صریح ڈرانے والا ہوں'' باقی میرے پہ ذمہ داری کوئی نہیں، كَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِيْنَ: ہم ان کے اوپر عذاب اتاریں گے جس طرح سے کہ ہم نے ان لوگوں پر عذاب اتارا تھا جنہوں نے حصے کر لیے تھے، مقتسمین: جنہوں نے جس بانٹ لیا تھا، حصے کر لیے تھے، جس کی تفصیل آگے آ گئی، الَّذِيْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِيْنَ: جنہوں نے قرآن کے مختلف حصے کر لیے تھے۔ عِضَةٌ: ایک حصہ، جزء۔ ''قرآن'' سے مراد یہاں تورات اور انجیل ہیں، اور حصے کر لینے کا مطلب یہ ہے کہ یؤمنون ببعضِ الکتابِ و یکفرون ببعضٍ، جیسے دوسری جگہ لفظ ہیں اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ (البقرۃ:٨٥) تو گویا کہ بعض پر وہ ایمان لاتے تھے اور بعض کا انکار کرتے تھے، کسی کو مانتے تھے، کسی کو چھپاتے تھے، کسی کا اظہار کرتے تھے۔ تو جنہوں نے اپنے قرآن کے اس طرح سے حصے کر لیے، اور اس طرح سے چھپا کے رکھ لیا، جیسے مختلف اوقات میں ہم نے اُن پر عذاب بھیجا ہے اسی طرح سے ہم اِن پر بھی عذاب بھیجیں گے، گویا کہ نذیرِ مبین کے اندر یہ مضمون آ گیا کہ ان کو اس بات سے ڈراؤ کہ ہم تم پر عذاب بھیجیں گے جس طرح سے ہم نے عذاب بھیجا تھا ان لوگوں پر جو کہ بانٹنے والے ہیں، جنہوں نے اپنے قرآن کو (یعنی جو قرآن ان کو دیا گیا تھا، پڑھنے کی کتاب، تورات انجیل) جنہوں نے اس کو مختلف حصے بنا لیا۔ فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ: تیرے رَبّ کی قسم! البتہ ضرور ہم ان سب سے پوچھیں گے عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ: ان کاموں کے متعلق جو یہ کرتے ہیں، یعنی یہ نہ سمجھیں کہ ہم جو کچھ کرتے رہیں مرنے کے بعد ہمیں پوچھنے والا کوئی نہیں، تیرے رَبّ کی قسم ہم ضرور پوچھیں گے، یہ ہم سے چھوٹ کر نہیں جا سکتے، جس طرح سے کہا کرتے ہیں ''آخر پانی انہی پلوں کے نیچے سے گزرنا ہے'' تو جانا کدھر ہے، ہمارے سامنے آئیں گے اور ہم ایک ایک بات پوچھیں گے کہ تم نے یہ کیا کیا اور کیوں کیا؟

کُفّار کے اِستہزا سے تنگ ہونے کی صورت میں علاج

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ: کھول کھول کر بیان کیجیے ان باتوں کو جن کے متعلق آپ کو حکم دیا جا رہا ہے، وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ: اور مشرکین سے اِعراض کر جائیے، اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ: یہ پھر وہی اِستہزا کی بات آ گئی، کہ آج یہ آپ کا مذاق اڑاتے ہیں، ٹھٹھا

---

(۱) التاریخ الکبیر للبخاری، رقم: ٢٢٩٦۔ ولفظہ: لا تَغْبِطَنَّ فَاجِرًا بِنِعْمَةٍ اِنَّ لَهُ عِنْدَ اللهِ قَاتِلًا لا يَمُوْتُ. نیز مشکوۃ ٢/ ٢٤٤، باب فضل الفقراء۔ فصل ثانی۔

کرتے ہیں، ان کا فکر نہ کیجیے، ہم تیرے لیے کافی ہو جائیں گے، ان ٹھٹھا کرنے والوں کی طرف سے ہم آپ کے لئے کافی ہو جائیں گے، کفایت کریں گے ہم آپ کو اِن مستہزئین سے، یعنی آپ کی طرف سے مستہزئین کے لیے ہم کافی ہیں، الَّذِیْنَ یَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ: مستہزئین کون لوگ ہیں؟ جو اللہ کے ساتھ اِلٰہِ آخر بناتے ہیں، کوئی اور معبود قرار دیتے ہیں، فَسَوْفَ یَعْلَمُوْنَ: ان کو عنقریب پتا چل جائے گا۔ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ یَضِیْقُ صَدْرُكَ بِمَا یَقُوْلُوْنَ: اب یہ ایک طبعی بات ہے، چاہے آپ سمجھتے ہیں کہ ہم صحیح ہیں، اور چاہے آپ سمجھتے ہیں کہ ہمیں اللہ نے بہت کچھ دے رکھا ہے، اللہ نے بڑی نعمت دے رکھی ہے، دین دے دیا، علمِ دِین دے دیا، قرآن دے دیا، لیکن پھر بھی جب کوئی ہنسی کرتا ہے، مذاق اُڑاتا ہے، باتیں بناتا ہے، پھبتیاں کستا ہے، تو دِل میں ایک تنگی آتی ہے، یہ ایک انسانی خاصیت ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کے دِل پر بھی گرانی آتی تھی، جب وہ لوگ اِستہزا کرتے تھے، ٹھٹھا کرتے تھے، پھبتیاں کستے تھے اور آگے سے باتیں بناتے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہمیں پتا ہے کہ تیرا دِل تنگ ہوتا ہے ان باتوں کی وجہ سے جو یہ کہتے ہیں، تو اس کا علاج یہ ہے کہ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ: پس آپ اللہ کے ذکر کی طرف متوجہ رہا کیجئے، اللہ کی تسبیح بیان کیجیے اس کی حمد کے ساتھ، سبحان اللہ، الحمد للہ، بس اللہ کے ذکر کی طرف متوجہ رہو، وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِیْنَ: اور سجدہ کرنے والوں میں سے ہو جاؤ، نماز پڑھنے والوں میں سے ہو جاؤ، بس اپنی نماز کی طرف متوجہ ہو گئے، اللہ کے ذکر کی طرف متوجہ ہو گئے تو اللہ کا ذکر اور نماز یہ قلبی اطمینان کا باعث ہے، جہاں بھی کسی کافر نے کوئی مذاق اڑایا، دل میں کوئی تکلیف ہوئی، بس اللہ کا نام لیا، اللہ کی طرف متوجہ ہو گئے، نماز پڑھنے لگ گئے، ان کا دھیان چھوڑ دیا۔ وَاعْبُدْ رَبَّكَ: اور اپنے رَبّ کی عبادت کرتا رہ، حَتّٰى یَاْتِیَكَ الْیَقِیْنُ: یقین کا معنی موت۔ یہاں تک کہ آپ کو موت آ جائے، یعنی وفات تک اپنے رَبّ کی عبادت کرتا رہ، کافروں کی باتوں سے دل تنگ ہونے کی ضرورت نہیں، اگر کبھی طبعی طور پر اس قسم کے اثرات ہوں بھی تو فوراً اللہ کے ذکر کی طرف اور نماز کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَیْكَ
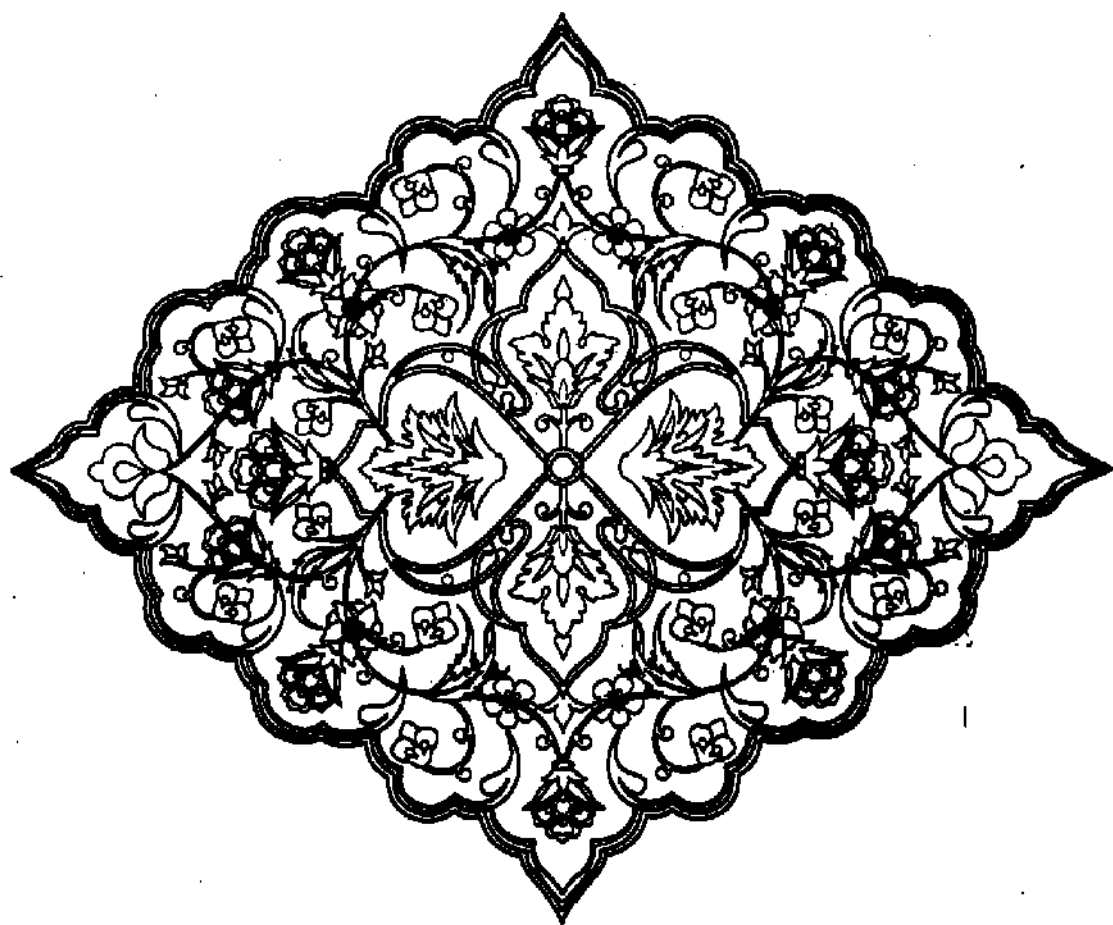
سورة النحل

آیاتہا ۱۲۸ ۱۶ سورۃ النحل مکیۃ ۷۰ رکوعاتہا ۱۶

سورۂ نحل مکہ میں اُتری، اور اس میں ایک سو اٹھائیس آیتیں ہیں اور سولہ رُکوع ہیں

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اَتٰۤی اَمۡرُ اللّٰہِ فَلَا تَسۡتَعۡجِلُوۡہُ ؕ سُبۡحٰنَہٗ وَ تَعٰلٰی عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ ① یُنَزِّلُ

اللہ کا حکم آ گیا پس تم اس کو جلدی نہ کرو، اللہ پاک ہے اور بلند و بالا ہے ان چیزوں سے جن کو یہ شریک ٹھہراتے ہیں ① اُتارتا ہے

الۡمَلٰٓئِکَۃَ بِالرُّوۡحِ مِنۡ اَمۡرِہٖ عَلٰی مَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِہٖۤ اَنۡ اَنۡذِرُوۡۤا اَنَّہٗ

اللہ تعالیٰ فرشتوں کو رُوح کے ساتھ یعنی اپنے حکم کے ساتھ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے، کہ (ان لوگوں کو) خبردار کر دو کہ

لَاۤ اِلٰہَ اِلَّاۤ اَنَا فَاتَّقُوۡنِ ② خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ ؕ تَعٰلٰی

کوئی معبود نہیں سوائے میرے پس تم مجھ سے ہی ڈرو ② پیدا کیا اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو اور زمین کو مصلحت کے ساتھ، وہ بلند ہے

عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ ③ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ نُّطۡفَۃٍ فَاِذَا ہُوَ خَصِیۡمٌ مُّبِیۡنٌ ④ وَ الۡاَنۡعَامَ

ان کے شریک ٹھہرانے سے ③ پیدا کیا اللہ تعالیٰ نے انسان کو نطفے سے پس اچانک وہ کھلم کھلا جھگڑنے والا ہو گیا ④ اور چوپائے

خَلَقَہَا ۚ لَکُمۡ فِیۡہَا دِفۡءٌ وَّ مَنَافِعُ وَ مِنۡہَا تَاۡکُلُوۡنَ ⑤۪

پیدا کیا اللہ نے ان کو، تمہارے لیے ان میں گرمی حاصل کرنے کا سامان ہے اور بہت سے فوائد ہیں اور ان میں سے بعض کو تم کھاتے ہو

وَ لَکُمۡ فِیۡہَا جَمَالٌ حِیۡنَ تُرِیۡحُوۡنَ وَ حِیۡنَ تَسۡرَحُوۡنَ ⑥۪

تمہارے لیے ان چوپایوں میں شان و شوکت ہے شام کو جس وقت واپس لاتے ہو اور جس وقت چرنے کے لئے چھوڑتے ہو ⑥

وَ تَحۡمِلُ اَثۡقَالَکُمۡ اِلٰی بَلَدٍ لَّمۡ تَکُوۡنُوۡا بٰلِغِیۡہِ اِلَّا بِشِقِّ الۡاَنۡفُسِ ؕ

اور یہ جانور اٹھا کر لے جاتے ہیں تمہارے بوجھوں کو ایسے شہر کی طرف کہ نہیں تھے تم اس شہر تک پہنچنے والے مگر جانوں کی مشقت کے ساتھ،

اِنَّ رَبَّکُمۡ لَرَءُوۡفٌ رَّحِیۡمٌ ۙ⑦ وَّ الۡخَیۡلَ وَ الۡبِغَالَ وَ الۡحَمِیۡرَ لِتَرۡکَبُوۡہَا

بے شک تمہارا ربّ البتہ شفقت کرنے والا ہے رحم کرنے والا ہے ⑦ اور (پیدا کیا) گھوڑوں کو خچروں کو اور گدھوں کو تاکہ تم ان پر سواری کرو

وَزِیۡنَۃً ؕ وَیَخۡلُقُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ⑧ وَعَلَی اللّٰہِ قَصۡدُ السَّبِیۡلِ وَمِنۡہَا

اور (پیدا کیا) زینت کے لئے۔ پیدا کرے گا اللہ تعالیٰ ان چیزوں کو جن کو تم جانتے بھی نہیں ہو⑧ اللہ پر ہی ہے سیدھا راستہ اور بعض راستے

جَآئِرٌ ؕ وَلَوۡ شَآءَ لَہَدٰىکُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ ⑨ ہُوَ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّکُمۡ

ٹیڑھے ہیں، اور اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا⑨ اللہ وہ ہے جس نے اوپر کی جانب سے پانی اتارا تمہارے نفع کے لئے،

مِّنۡہُ شَرَابٌ وَّمِنۡہُ شَجَرٌ فِیۡہِ تُسِیۡمُوۡنَ ⑩ یُنۡۢبِتُ

اس پانی میں سے پینے کی چیز ہے، اور اسی کے سبب سے درخت ہیں، اور ان میں تم جانوروں کو چراتے ہو⑩ اگاتا ہے اللہ تعالیٰ

لَکُمۡ بِہِ الزَّرۡعَ وَ الزَّیۡتُوۡنَ وَالنَّخِیۡلَ وَالۡاَعۡنَابَ وَمِنۡ کُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ

تمہارے نفع کے لئے اسی پانی کے ذریعے سے کھیتی کو اور زیتون کو اور کھجوروں کو اور انگوروں کو اور ہر قسم کے میووں کو، بے شک اس میں

لَاٰیَۃً لِّقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ ⑪ وَسَخَّرَ لَکُمُ الَّیۡلَ وَالنَّہَارَ ۙ وَالشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ ؕ

البتہ نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو کہ تفکر کرتے ہیں⑪ اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے نفع کے لئے مسخر کیا رات کو اور دن کو اور سورج کو اور چاند کو،

وَالنُّجُوۡمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمۡرِہٖ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ⑫ۙ

اور ستارے بھی مسخر ہیں اللہ کے حکم کے ساتھ، بے شک اس میں البتہ نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل سے کام لیتے ہیں⑫

وَمَا ذَرَاَ لَکُمۡ فِی الۡاَرۡضِ مُخۡتَلِفًا اَلۡوَانُہٗ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً

اور (مسخر کیا) ان سب چیزوں کو جو پھیلائیں تمہارے لیے زمین میں اس حال میں کہ ان کی قسمیں مختلف ہیں، بے شک اس میں البتہ نشانی ہے

لِّقَوۡمٍ یَّذَّکَّرُوۡنَ ⑬ وَہُوَ الَّذِیۡ سَخَّرَ الۡبَحۡرَ لِتَاۡکُلُوۡا مِنۡہُ لَحۡمًا طَرِیًّا

ان لوگوں کے لئے جو کہ نصیحت حاصل کرتے ہیں⑬ اللہ وہ ہے جس نے مسخر کیا سمندر کو تا کہ تم اس میں سے تر و تازہ گوشت کھاؤ

وَّتَسۡتَخۡرِجُوۡا مِنۡہُ حِلۡیَۃً تَلۡبَسُوۡنَہَا ۚ وَتَرَی الۡفُلۡکَ مَوَاخِرَ فِیۡہِ وَلِتَبۡتَغُوۡا مِنۡ فَضۡلِہٖ

اور تا کہ تم نکالو اس میں سے زیور جس کو تم پہنتے ہو۔ دیکھتا ہے تو کشتیوں کو کہ پانی کو چیرتی پھرتی ہیں سمندر میں، اور تا کہ تم تلاش کرو اللہ کا فضل

وَلَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ ⑭ وَاَلۡقٰی فِی الۡاَرۡضِ رَوَاسِیَ اَنۡ تَمِیۡدَ بِکُمۡ وَاَنۡہٰرًا وَّسُبُلًا

اور تا کہ تم شکر گزار ہو جاؤ⑭ اللہ نے زمین کے اندر بوجھل پہاڑ ڈال دیے تا کہ تمہیں لے کر زمین مائل نہ ہو جائے، اور نہریں جاری

لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿١٥﴾ وَعَلٰمٰتٍ ۭ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿١٦﴾
کردیں اور راستے بنادیے تاکہ تم راہ پاؤ ⑮ اور بہت سارے نشانات قائم کردیے، اور ستاروں کے ذریعے سے بھی لوگ ہدایت پاتے ہیں ⑯
اَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿١٧﴾ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ۭ
کیا جو پیدا کرتا ہے وہ اس کی طرح ہے جو پیدا نہیں کرتا؟ کیا تم سوچتے نہیں؟ ⑰ اگر تم شمار کرنے لگو اللہ کے احسانات کو تو تم ان کا احاطہ
اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٨﴾ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ﴿١٩﴾
نہیں کرسکتے، بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ⑱ اور اللہ جانتا ہے جو کچھ تم چھپاتے ہو اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو ⑲
وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ﴿٢٠﴾ اَمْوَاتٌ
اور وہ چیزیں جن کو پکارتے ہیں یہ لوگ اللہ کے علاوہ وہ کچھ بھی پیدا نہیں کرتیں اور وہ خود پیدا کی ہوئی ہیں ⑳ یہ بے جان ہیں
غَيْرُ اَحْيَاۗءٍ ۚ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۙ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ﴿٢١﴾
جو کہ زندہ نہیں ہیں اور ان کو پتا ہی نہیں کہ کب اُٹھائے جائیں گے ㉑

تفسیر

سورۂ نحل کے مضامین

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ۔ سورۂ نحل مکہ میں اُتری، اور اس میں ایک سو اٹھائیس آیتیں ہیں اور سولہ رکوع ہیں، مکی سورتوں کی طرح اس میں بھی رَدِّ شرک اور اثباتِ توحید ہے، اس سورۃ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے زیادہ تر اپنی نعمتوں کو ذکر فرمایا ہے، اور نعمتوں کو ذکر کرکے اپنا محسن ہونا بھی واضح کیا اور اپنی ذات کا بے مثل اور بے مثال ہونا بھی واضح کیا، گویا کہ بصورتِ امتنان اِثباتِ توحید ہے، اور شرک اللہ تبارک وتعالیٰ کی انتہائی درجے کی ناشکری ہے جس کے اوپر جگہ بہ جگہ انکار آئے گا۔

ماقبل سورۃ سے ربط

پچھلی سورۃ میں اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ۙ﴿۹۵﴾ الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ ۚ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ یہ اختتامی مضمون ہے، اگلی آیت تسلی کے لئے ہے، کہ اِستہزا کرنے والوں کے ساتھ نمٹنے کے لئے ہم آپ کے لئے کافی ہیں۔ اور مستہزئین کون لوگ تھے؟ یہ مشرک تھے جو اللہ کے ساتھ دوسروں کو ملاتے تھے، دوسروں کو الٰہ قرار دیتے تھے۔ اِستہزا کس بات پہ کرتے تھے؟ آپ کے سامنے وضاحت آئی تھی کہ ان کے اِستہزا کا تعلق زیادہ تر دعید سے تھا کہ جب ان کے سامنے ان کے طور طریقے کو ذِکر کرتے ہوئے یہ بات

کہی جاتی کہ اگر تم باز نہیں آؤ گے تو عذاب آئے گا، اور یہ طریقہ جو ہم پیش کر رہے ہیں یہ اللہ کی رحمت حاصل کرنے کا طریقہ ہے، تو وہ مذاق اُڑاتے تھے کہ پاؤں میں جوتی نہیں، بدن پہ کپڑا نہیں اور یہ بہت بڑے اللہ کے مقبول آ گئے، اور ہم جو کھاتے پیتے ہیں، ہر قسم کی عیش وعشرت ہمیں حاصل ہے تو ہمیں کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے مبغوض ہیں، تو کوئی اپنے دشمنوں کو بھی کھلایا پلایا کرتا ہے؟ کوئی اپنے دشمنوں کو بھی عیش وعشرت کرایا کرتا ہے؟ یہ تو علامت ہے کہ ہم مقبول ہیں، تو اپنے اسی مال و دولت کو سامنے رکھتے ہوئے اور اسی خوش حالی کو سامنے رکھتے ہوئے ان مساکین کا مذاق اڑاتے تھے، اور نبی کی زبان سے جب اس قسم کی باتیں سنتے تو ان کا بھی اِستہزا کرتے، وہاں بھی یہ دھمکی دی گئی تھی فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ: ان کو عنقریب پتا چل جائے گا، اِستہزا کا نتیجہ ان کے سامنے آ جائے گا، اب اس سورۃ کی اِبتدا میں یہی وعید ہے اور فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ کے اندر انہی کو خطاب ہے جو اللہ کے عذاب کی خبر سن کے مذاق اُڑاتے ہیں۔

مشرکین کی اَوہام پرستی کی تردید

انہیں کہا جا رہا ہے اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ: اَتٰى ماضی کا صیغہ ہے۔ اللہ کا امر آ گیا، اللہ کا حکم آ گیا۔ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ: پس تم اس کو جلدی طلب نہ کرو، منکرانہ طور پر اس میں جلدی نہ مچاؤ۔ اور آپ پڑھتے رہتے ہیں کہ بسا اوقات آنے والی چیز کو ماضی کے ساتھ تعبیر کر دیا جاتا ہے تحقق وقوع کے طور پر، یعنی یقینی طور پر اللہ کا حکم واقع ہونے والا ہے، یوں سمجھو کہ آ ہی گیا، سر پہ موجود ہے، سر پر لٹکا ہوا ہے، تو تم اس کی منکرانہ جلدی نہ مچاؤ۔ اور اگر تمہیں یہ خیال ہو کہ ہم نے جو شرکاء بنا رکھے ہیں، شفعاء بنا رکھے ہیں، اگر اللہ کی طرف سے کوئی عذاب آئے گا تو یہ ہمیں بچالیں گے دنیا میں، اور اگر بالفرض آخرت ہوئی تو وہاں بھی ہمارے کام آئیں گے تو یہ شفعاء یہ شرکاء یہ تمہارے اوہام ہیں، یہ وہم پرستی ہے، ان کا کوئی وجود نہیں، اس لیے اللہ کا حکم جس وقت واقع ہوگا کوئی کام نہیں آ سکتا، اللہ کے ساتھ کوئی شریک ہے ہی نہیں کہ جو اپنے پوجنے والوں کو اس قسم کی تکالیف سے بچالے۔ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ میں ان کی اسی وہم پرستی کی تردید ہے، سُبْحٰنَهٗ: اللہ پاک ہے، وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ: اور بلند و بالا ہے ان چیزوں سے جن کو یہ شریک ٹھہراتے ہیں یا ان کے شریک ٹھہرانے سے۔ دو طرح سے ترجمہ ہوا کرتا ہے، کہ "مَا" کو موصولہ بنالو، یا مصدریہ بنالو، مَا یُشْرِکُوْن یہ اِشْرَاکِھِمْ کے معنی میں ہوگا، پھر ترجمہ ہو جائے گا: تَعَالٰی عَنْ اِشْرَاکِھِمْ اِن کے شریک ٹھہرانے سے وہ بلند و بالا ہے۔ اور اگر "مَا" موصولہ تو پھر معنی ہوگا "ان چیزوں سے جن کو یہ شریک ٹھہراتے ہیں اللہ شان بہت اونچی ہے"، وہ چیزیں اللہ کی شریک نہیں۔ تو جب کوئی اللہ کا شریک ہے ہی نہیں، اور یہ عیب اللہ کی ذات پر نہیں لگتا، اللہ کی ذات اس عیب سے پاک ہے، تو تم کن پہ اعتماد کر کے غرا رہے ہو، اور ڈینگیں مار رہے ہو؟ تمہیں ڈرنا چاہیے، اللہ کا عذاب آیا ہی آیا۔ تحقق وقوع کے طور پر اس کو ماضی سے تعبیر کر دیا، " آ گیا اللہ کا حکم، آ پہنچا اللہ کا حکم" یعنی آیا ہی چاہتا ہے، یوں سمجھو آ ہی گیا، کیونکہ نبی کا وجود اللہ کی طرف سے ایک قسم کا چیلنج ہوتا ہے، نبی کا کسی جماعت میں مبعوث ہو جانا یہ اس جماعت کے لئے چیلنج ہوتا ہے، کہ اگر قبول کر لو گے تو دنیا اور آخرت میں سرخرو ہو گے، اور اگر قبول نہیں کرو گے تو یوں سمجھو کہ یہی علامت عذاب ہے۔

اِثباتِ توحید پر نقلی دلیل

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اَنْ اَنْذِرُوْٓا اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاتَّقُوْنِ...... سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ میں تو رَدِّ شرک تھا، اب آگے اِثباتِ توحید ہے نقلی دلیل کے ساتھ۔" اُتارتا ہے اللہ تعالیٰ فرشتوں کو" اس کا خصوصی مصداق تو جبریل علیہ السلام ہیں، اور جبریل علیہ السلام جس وقت وحی لاتے تھے تو چونکہ ان کے ساتھ اور محافظین معاونین بھی ہوتے تھے، اس لیے اس کو جمع کے ساتھ تعبیر کر دیا، ورنہ وحی جبریل علیہ السلام لاتے تھے،" اُتارتا ہے فرشتوں کو روح کے ساتھ" روح سے وحی مراد ہے، مِنْ اَمْرِهٖ: "بیان القرآن" میں مِن کو بیانیہ بنایا گیا ہے۔" اُتارتا ہے فرشتوں کو روح کے ساتھ یعنی اپنے حکم کے ساتھ، یا اپنے حکم سے وحی دے کر فرشتوں کو اُتارتا ہے" عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے، ہر کسی پر فرشتے نہیں اُترا کرتے، جس کو چاہتا ہے اللہ نبی بناتا ہے، جس کو چاہتا ہے چن لیتا ہے، اس کی طرف اپنا حکم دے کے فرشتوں کو بھیج دیتا ہے، اور اس حکم کا حاصل کیا ہے؟ اَنْ اَنْذِرُوْٓا اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاتَّقُوْنِ: اَنْذِرُوْٓا، اِنذار سے ہے، اِنذار ڈرانے کے معنی میں ہوتا ہے، اور ڈرانے کا مفہوم ہوتا ہے ایسی خبر، ایسا اعلان کہ جس میں آنے والے خطرے سے آگاہ کیا گیا ہو، تو یہاں اَنْذِرُوْٓا اَعْلِمُوْٓا کے معنی میں ہے۔ ان لوگوں کو خبردار کر دو، ان لوگوں کو اطلاع دے دو، ایسی اطلاع کہ جس کے ضمن میں خطرے کی نشاندہی ہے، لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاتَّقُوْنِ: کہ کوئی معبود نہیں سوائے میرے، پس تم مجھ سے ہی ڈرو۔ جن بندوں کو اللہ نے وحی اتارنے کے لئے چنا، جن کے اوپر فرشتے آتے ہیں، ان سب کو اصل حکم یہ دیا کہ لوگوں کو خبردار کر دو کہ میرے علاوہ کوئی معبود نہیں پس تم مجھ سے ہی ڈرو، معلوم ہو گیا کہ یہ متفق علیہ عقیدہ ہے، اور اللہ کی طرف سے جو نبی آیا اس نے آ کے پہلا اعلان یہی کیا لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاتَّقُوْنِ، یعنی اللہ کی طرف سے یہ بات پہنچائی، کہ میرے بغیر کوئی دوسرا معبود نہیں پس تم مجھ سے ہی ڈرو۔

عقیدۂ توحید تمام انبیاء علیہم السلام کا متفق علیہ عقیدہ ہے

مختلف علاقوں میں آنے والے، مختلف زبانیں بولنے والے، اور کثیر تعداد میں جن کے متعلق ایک حدیث شریف میں ذکر کیا گیا ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار ہیں، یہ خبر واحد ہے جس میں کمی بیشی کا امکان ہے، ایک لاکھ چوبیس ہزار یا اس سے کم وبیش جو اللہ کے علم میں ہے نبی آئے، مختلف علاقوں میں آئے، مختلف قوموں میں آئے، مختلف زبان بولنے والے آئے، وہ سارے ایک ہی بات کہتے ہیں "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں، تو آپ جانتے ہیں کہ یہ بھی تو ایک تواتر کا طریقہ ہے، اور تواتر کی خبر موجب یقین ہوا کرتی ہے، اتنی موجب یقین ہوا کرتی ہے جیسا کہ آنکھوں سے دیکھ لیا، اب اتنے زیادہ لوگ، اتنی زبانوں میں، اتنے علاقوں میں، مختلف اوقات میں یہ خبر دے رہے ہیں، تو اس سے زیادہ ٹھوس دلیل تمہارے پاس توحید کی اور کیا ہونی چاہیے، تو عقیدۂ توحید انبیاء علیہم السلام کا متفق علیہ عقیدہ ہے، اور اللہ تعالیٰ نبیوں پہ جب وحی اتارتا ہے تو اس کے اندر یہ حکم ہوتا ہے کہ یہ اطلاع دے دو، خبردار کر دو۔ یہ تو توحید کے متعلق نقلی دلیل ہے، اور آگے (جس طرح سے میں نے پہلے آپ کی خدمت میں عرض کیا) قدرت کا اظہار بھی ہے احسانات بھی ہیں، گویا کہ احسان کرنے کے ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی عبادت کی طرف متوجہ کرتے ہیں اور توحید کی

تلقین فرماتے ہیں کہ یہ سارے کے سارے احسان میری طرف سے ہیں، اس لئے میرا شکر ادا کرو اور میری عبادت کرو، یہ مضمون بارہا آپ کی خدمت میں عرض کر دیا گیا۔

آسمانوں اور زمین کی تخلیق کا مقصد

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ: پیدا کیا اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو اور زمین کو حق کے ساتھ، ٹھیک ٹھیک، مصلحت کے ساتھ، یہ کوئی عبث نہیں ہے، لایعنی کام نہیں کہ جس کا کوئی نتیجہ نکلنے والا نہیں، بلکہ مصلحت کے ساتھ پیدا کیا ہے، اور وہ مصلحت یہی ہے کہ انسانوں کو آباد کر کے ان کو مبتلا کیا گیا، امتحان میں ڈال دیا گیا، احکام دیے گئے، آخر اس کا شاندار نتیجہ نکلے گا، اللہ تعالیٰ نے یہ کوئی بے سُود یا عبث کام نہیں کیا۔ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ: وہ بلند ہے اس چیز سے جس کو وہ شریک ٹھہراتے ہیں، یا ان کے شریک ٹھہرانے سے اس کی شان بہت اونچی ہے، اس کے ساتھ کوئی دوسرا شریک نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

اِثباتِ معاد کے لئے اِنسان کی تخلیقِ اوّل کا ذِکر

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ: پیدا کیا اللہ تعالیٰ نے انسان کو نطفے سے۔ نَطَفَ: ٹپکانا، نُطفة: ایک دفعہ ٹپکائی ہوئی مقدار۔ جیسے لَقَمَ: نگلنا۔ لُقمة: ایک مرتبہ نگلنے کی مقدار۔ شَرِبَ: پینا۔ شُرْبة: ایک دفعہ پینے کی مقدار، جس کو آپ گھونٹ کہتے ہیں، اسی طرح جَرَعَ سے جُرعة۔ فُعْلَةٌ مقدار کے لئے آیا کرتا ہے، تو نطفہ: ایک دفعہ ٹپکانے کی مقدار، ایک دفعہ جو چیز ٹپکتی ہے اس کو نطفہ کہتے ہیں۔ "پیدا کیا اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک ٹپکائی ہوئی بوند سے" فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ: پس اچانک وہ کھلم کھلا جھگڑنے والا ہو گیا، علی الاعلان جھگڑا کرتا ہے۔ انسان جھگڑا کیا کرتا ہے؟ اپنی ابتدا کو بھول گیا، اور اس کو یہ نہیں معلوم کہ ہماری بنیاد کس طرح سے اٹھی اور ہمیں کیسے بنایا گیا، گندے پانی کی ایک بوند سے اس کو بنایا، اور آج یہ کتنا زبان دراز ہے کہ جھگڑنے بھی لگ گیا، اس جھگڑے کا ذکر سورۂ یٰسٓ میں ہے اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ۞ اس سے آگے ہے وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ: یہ اس کے جھگڑے کا بیان ہے کہ ہمارے لئے مثالیں بیان کرتا ہے اور اپنے پیدا کیے جانے کو بھول گیا ہے۔ کیا مثالیں بیان کرتا ہے؟ کہتا ہے مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ (سورۂ یٰسٓ: ۷۸) یہ ہڈیاں جس وقت بوسیدہ ہو جائیں گی پھر ان کو کون زندہ کرے گا؟ یہ ہمارے سامنے اس قسم کے مضمون بیان کرتا ہے، جیسے دوسری جگہ آیا کہ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ (الرعد: ۵) کیا جس وقت ہم مٹی ہو جائیں گے تو کیا ہم دوبارہ نئے سرے سے پیدا کر دیے جائیں گے؟ تو آگے سے یہ سوال اٹھاتا ہے، اور اپنے پیدا کیے جانے کو بھول گیا، اگر اس کو یہ یاد رہتا کہ پانی کے ایک قطرے سے تو میری بنیاد اٹھائی گئی، اور کس طرح سے مجھے بنایا گیا تو اگر ابتدائے خلق کو یہ ذہن میں رکھتا تو دوبارہ پیدا کیے جانے پر اس کو تعجب نہ ہوتا، اسی لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے وہاں جواب یہی تلقین فرمایا کہ جب یہ کہتا ہے کہ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ: کون ہڈیوں کو زندہ کرے گا، وَهِيَ رَمِيْمٌ: اس حال میں کہ وہ بوسیدہ ہو چکی ہوں گی قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ (سورۂ یٰسٓ: ۷۹) اس کو یہ جواب دے دو کہ وہی پیدا کرے گا جس نے پہلی دفعہ بنایا، اور وہ ہر قسم کا پیدا کرنا جانتا ہے، ابتدا سے پیدا کرنا بھی جانتا ہے، اور ابتداء سے پیدا کرنے کے بعد ریزہ ریزہ کر کے پھر

دوبارہ پیدا کرنا بھی جانتا ہے۔تو یہ ہے جو انسان جھگڑا کرتا ہے اپنی خلقت کو بھول کر، ورنہ اگر اپنی ابتدا کو یاد رکھے اور اس وقت سے دیکھے کہ ہماری تعمیر کس طرح سے ہوئی، تو دوبارہ زندہ کیے جانے میں کیا اِشکال باقی رہتا ہے؟

چوپایوں کی تخلیق اور ان کے فوائد

وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا: اَنعام نَعَمٌ کی جمع ہے، چوپائے۔''اور چوپائے، پیدا کیا اللہ نے ان کو''۔''ھا'' ضمیر اَنعام کی طرف لوٹ گئی، اور اَنعام علیٰ شریطة التفسیر منصوب ہے، زیداً ضربتُه والی توجیہ۔لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ: تمہارے لئے اس میں گرمی حاصل کرنے کا سامان ہے اور بہت سے فوائد ہیں، وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ: اور ان میں سے بعض کو تم کھاتے ہو۔دِفْءٌ: گرمی حاصل کرنے کا سامان۔آپ کو معلوم ہی ہے کہ پرانے زمانے میں عرب کی معیشت کا دار و مدار زیادہ تر چوپایوں پر ہی تھا، بکریاں رکھتے تھے، بھیڑیں پالتے تھے، اونٹ پالتے تھے، گھوڑے گدھے خچر یہ سب کچھ گھروں میں ہوتا تھا، اونٹوں کے بالوں کے ساتھ یعنی اونٹ کی جو اُوپر سے پبری اُتارتے، اس کو کاتتے، کات کر اس سے کپڑے بناتے، خیمے بناتے، کمبل بناتے، اور بھیڑوں اور دُنبوں کی اُون کے ساتھ بھی اسی طرح سے گرم کپڑے تیار ہوتے، اور اسی طرح چمڑا بمع بالوں کے پوستین کے طور پر استعمال کرتے، تو ہر قسم کی چیز، پہننے کے کپڑے، سردی سے بچنے کا سامان انہی حیوانات سے میسر آتا، تو دِفْءٌ کے اندر اس بات کی طرف اشارہ ہو گیا کہ ان حیوانات میں تمہارے لیے گرمی حاصل کرنے کا سامان ہے، ورنہ یہ چیزیں تمہیں میسر نہ ہوتیں تو تم ٹھنڈ کے ساتھ ویسے ہی مرجاتے، یہ بھی اللہ کا احسان ہے کہ جانور پیدا کیے اور وہاں سے تمہیں گرمی کا سامان دیا۔مَنَافِعُ کے اندر تعمیم کردی کہ تمہارے لیے اس میں بہت منافع ہیں، ان جانوروں کا دودھ استعمال کرتے ہو، مکھن نکال کے کھاتے ہو، اور کتنی قسم کی چیزیں ہیں جو حیوانات سے انسان حاصل کرتا ہے، اور دودھ سے آگے کتنی کتنی چیزیں بنالیتے ہو، گھی نکال کر اس کے استعمال کا کیا کیا طریقہ تم نے اختیار کر رکھا ہے، یہ سب فوائد ہیں۔اور خصوصیت کے ساتھ اَکل کا ذکر بھی کر دیا کہ بعض حیوانوں کو کھاتے بھی ہو، ذبح کر کے کھالیتے ہو، تو یہ سب اللہ تعالیٰ نے تمہیں انعامات دیے ہیں۔

وَلَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ: جمال: خوبصورتی، جس کو شان و شوکت کہتے ہیں۔تمہارے لیے ان حیوانات میں، ان چوپایوں میں خوبصورتی ہے، شان و شوکت ہے'' ان جانوروں کی وجہ سے تمہاری شان و شوکت نمایاں ہوتی ہے، حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ: تُرِيْحُوْنَ، اَرَاحَ سے ہے۔اَرَاحَ: شام کے وقت جانوروں کو چرا کے واپس لانا۔مُراح کہتے ہیں باڑے کو جہاں رات کے وقت جانوروں کو ٹھہرایا جاتا ہے، تو اَرَاحَ کا معنی ہے مُراح کے اندر لانا، باڑے میں جانوروں کو واپس لانا۔سَرَحَ: چرنے کے لئے چھوڑنا۔مَسْرَح کہتے ہیں چراگاہ کو۔جس وقت کہ تم ان کو چرنے کے لئے چھوڑتے ہو۔'' شام کو جس وقت واپس لاتے ہو اور جس وقت چرنے کے لئے چھوڑتے ہو تو تمہارے لئے ان جانوروں میں جمال ہے، زیب و زینت ہے، شان و شوکت ہے'' اس کا تعلق بھی اس دور کے ساتھ بہت نمایاں ہے، اُس زمانے میں بڑا آدمی اسے سمجھا جاتا تھا کہ جس کے پاس جانوروں کے گلے (ریوڑ) زیادہ ہوں، سردار ہونے کی علامت یہی ہوتی تھی کہ جس وقت اس کے ریوڑ چھوڑے جاتے ہیں تو

بکریاں ہی بکریاں نظر آتی ہیں، بھیڑیں ہی بھیڑیں نظر آتی ہیں، اونٹ ہی اونٹ نظر آتے ہیں، کہتے ہیں کہ یہ بہت بڑا آدمی ہے، دیکھو اس کے پاس کتنے جانور ہیں، تو جب ان کو چرنے کے لئے چھوڑا جاتا ہے تو جانور بھاگتے ہیں، دوڑتے ہیں، مختلف قسم کی آوازیں نکالتے ہیں تو ایک شان بن جاتی ہے، اور جس وقت شام کو چر کر واپس آتے ہیں تو اس وقت بھی یہی حال ہوتا ہے، اور جس وقت چراگاہ میں گئے ہوئے ہوتے ہیں اور چر رہے ہوتے ہیں اس وقت تک مالک اتنی شان وشوکت نمایاں نہیں ہوتی، کیونکہ باہر نسبت ایک قسم کی منقطع ہوجاتی ہے، کسی کو کیا پتا کس کے ہیں کس کے نہیں ہیں، لیکن جب گھر میں داخل ہو رہے ہیں، گھر سے نکل رہے ہیں، باڑے میں ان کو لایا جارہا ہے، باڑے سے نکالا جارہا ہے، اس وقت ان کی نقل وحرکت دیکھ کر دوسرا محسوس کرتا ہے کہ دیکھو کتنا بڑا آدمی ہے، کتنا بڑا سرمایہ دار ہے، اُس وقت عرب کا سرمایہ یہی جانور ہی ہوتے تھے، تو یہ تمہارے لیے شان وشوکت کا ذریعہ بنتے ہیں، تمہاری ٹھاٹھ باٹھ نمایاں ہوتی ہے جس وقت تم ان کو چرنے کے لئے چھوڑتے ہو اور جس وقت شام کو تم لاتے ہو۔

جانوروں کی باربرداری میں اللہ کا بہت بڑا اِحسان ہے

وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ: اور یہ جانور اٹھا کے لے جاتے ہیں تمہارے بوجھ۔ اَثقال ثِقل کی جمع ہے، ثِقل بوجھ کو کہتے ہیں، اور ثَقَل ثاء کے فتح کے ساتھ ہو تو اُٹھائے ہوئے سامان کو کہتے ہیں۔ تَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ: تمہارے بوجھوں کو اٹھا کے لے جاتے ہیں، اِلٰى بَلَدٍ: ایسے شہر کی طرف، لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ: کہ نہیں تھے تم اس شہر تک پہنچنے والے، اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ: مگر جانوں کی مشقت کے ساتھ۔ ''نہیں تھے تم خود اس شہر کو پہنچنے والے''۔ یہ نہیں کہا کہ ''اٹھا کے لے جاتے ہیں تمہارے بوجھ ایسے شہر کی طرف کہ تم ان بوجھوں کو وہاں تک پہنچانے والے نہیں تھے مگر جانوں کی مشقت کے ساتھ''، بلکہ کہا کہ تم خود پہنچنے والے نہیں تھے، یعنی بوجھ اٹھا کے لے جانا تو اپنی جگہ رہا، تم خود ان شہروں کو پہنچنا چاہو تو بغیر جانوں کو مشقت میں ڈالے نہیں پہنچ سکتے تھے، تو بوجھ اُٹھانا تو دُور رہا۔ یہ جانور تمہارے بوجھ ایسی جگہوں کی طرف لے کے جاتے ہیں اور تمہیں اُٹھا کے لے جاتے ہیں، بوریوں کی بوریاں تم ان اونٹوں کے اوپر لادتے ہو، اور آج کے حساب سے چھکڑے، کہ چھکڑے پر سامان لاد کے ان میں بیلوں کو جوتتے ہو، کس طرح سے کھینچ کھینچ کے ایسی جگہ کی طرف لے جاتے ہیں جہاں خود تمہیں بھی پہنچنا مشکل تھا، وہاں تک یہ تمہارے سامانوں کو اٹھا کے لے جاتے ہیں، آج جس طرح سے مال گاڑی کی یا ٹرک کی حیثیت ہے اُس دَور میں یہ حیثیت اونٹ کی تھی یعنی ایک ملک سے دوسرے ملک، ایک شہر سے دوسرے شہر میں جتنا سامان منتقل ہوتا تھا سب اونٹوں کے ذریعے ہوتا تھا، جیسے آج بھی ریگستانی علاقوں میں ایسے ہی ہے، جہاں سڑکیں نہیں بنیں وہاں باربرداری جتنی بھی ہے ساری کی ساری انہی اونٹوں کے ذریعے سے ہوتی ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے کہ کس طرح سے ان جانوروں کو ہمارے لیے مسخر کردیا، کیسے ہم ان کی کمروں کے اوپر بوجھ لادتے ہیں، کس طرح سے یہ اٹھائے اٹھائے چلتے ہیں؟ یہ بہت بڑا احسان ہے۔ ''اٹھا کے لے جاتے ہیں تمہارے بوجھوں کو ایسے شہر کی طرف کہ نہیں تھے تم اس شہر کو پہنچنے والے مگر جانوں کی مشقت کے ساتھ'' اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ: بے شک تمہارا رَبّ

البتہ شفقت کرنے والا ہے رحم کرنے والا ہے، یہ اس کی شفقت اور اس کی رحمت کا تقاضا ہے کہ تمہارے لیے اس قسم کی آسائش کے سامان پیدا کردے۔

گھوڑے، خچر اور گدھوں کی تخلیق، مقصدِ تخلیق اور ان کا شرعی حکم

وَّالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً: اور پیدا کیا اللہ تعالیٰ نے گھوڑوں کو، خچروں کو اور گدھوں کو تاکہ تم ان کے اوپر سواری کرو اور پیدا کیا زینت کے لئے۔ زینت اور جمال ایک ہی چیز ہے۔ یہ بھی تمہارے ٹھاٹھ باٹھ کا ذریعہ ہیں، یہ جانور اگر کسی کے پاس موجود ہوتے ہیں تو اس کے لئے بھی اُس دور میں بہت زیادہ ٹھاٹھ باٹھ اور زینت اور جمال نمایاں ہوتا تھا، ''تاکہ تم ان پہ سواری کرو'' یہ تینوں جانور سواری کے کام آتے ہیں، گھوڑا بھی خچر بھی اور گدھا بھی، گدھا بھی اللہ نے سواری کے لئے بنایا ہے، اور عرب کے اندر سواری کے لئے زیادہ تر گدھا ہی استعمال ہوتا تھا، اونٹ بار برداری کے لئے استعمال ہوتے تھے، اور گھوڑے زیادہ تر جنگ کے موقع پر کام آتے تھے، عام چھوٹا موٹا سفر جو وہ لوگ کرتے تھے تو گھوڑوں کی سواری کم ہوتی تھی گدھوں کی سواری زیادہ ہوتی تھی، اور اسی طرح سے خچر بھی استعمال کرتے تھے، یہ بھی بہت بوجھ اُٹھاتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کو سواری کے لئے پیدا کیا ہے اور زیب و زینت کے لئے پیدا کیا کہ تمہاری زیب و زینت کا ذریعہ بھی ہیں، باقی ان کو اَنعام سے علیحدہ کردیا، اَنعام چوپائے ہیں جو گھروں کے اندر رکھے جاتے ہیں، یہ لفظ اونٹ گائے اور بھیڑ بکری کے لئے بولا جاتا ہے، اور بھینس اس وقت وہاں عرب میں تھی ہی نہیں، اور آج بھی وہاں بھینس نہیں ہے، بھینس اس علاقے کا جانور نہیں، اس لئے بھینس گائے میں سے صراحت کے ساتھ اَنعام کا مصداق گائے ہے۔ گائے اونٹ بھیڑ بکری یہ چیزیں وہاں تھیں، ان کو لوگ کھاتے بھی تھے اور ان سے دوسرے کام بھی لیتے تھے۔ اور خیل، بغال، حمیر یہ زیادہ کھانے کے کام نہیں آتے تھے، اگرچہ اس وقت بھی لوگ ان کو کھاتے تھے، گدھے کو بھی کھاتے تھے، گھوڑے کو بھی کھاتے تھے، خچر کو بھی کھاتے تھے، لیکن ان سے زیادہ تر کام سواری کا اور بار برداری کا لیتے تھے، پھر غزوۂ خیبر کے موقع پر سرورِ کائنات ﷺ نے گدھوں کی ممانعت کردی یعنی جو گدھے گھروں میں رکھے جاتے ہیں، حُمُرِ اِنْسِيَّة، مانوس گدھے (یہ حمارِ وحشی سے اِحتراز کرنے کے لئے ہے، کیونکہ جنگلی گدھا حلال ہے) اور گھریلو گدھوں کی حرمت کا اعلان خیبر میں فرمایا، اور خچر بھی اسی کے حکم میں ہے، ہاں! البتہ گھوڑا مختلف فیہ ہے، بعض ائمہ کے نزدیک حلال ہے اور ہمارے ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے نزدیک مکروہ ہے، کیونکہ اس قسم کی روایت بھی موجود ہے ''نَهٰى عَنْ لُحُوْمِ الْخَيْلِ''[1] رسول اللہ ﷺ نے گھوڑوں کے گوشت سے منع فرمایا، یہ ''ابوداؤد'' کی روایت ہے، ''مشکوٰۃ'' میں بھی آپ ''باب ما یحل اکلہ'' میں پڑھیں گے، اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ گھوڑا کھایا جاتا ہے اور اس کی ممانعت نہیں ہے، اس لیے ائمہ کے درمیان اختلاف ہے، ہمارے صاحبین کے نزدیک بھی حلال ہے، اور ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ نے اس کو مکروہ قرار دیا ہے، دوسرے اَئمہ اس کو حلال کہتے ہیں، اور خچر اور گدھا جمہور کے نزدیک حرام ہیں، ان کی حرمت کا اعلان سرورِ کائنات ﷺ نے غزوۂ خیبر کے موقع پر فرمایا تھا، اس لیے یہاں ان کے کھانے کا ذکر نہیں، اُس وقت بھی

(۱) ابوداؤد ۲/۱۷۵، باب فی اکل لحوم الخیل/ مشکوٰۃ ۲/۳۶۱، باب ما یحل اکلہ وما لا یحل، فصل ثانی۔ ولفظہ: اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَهٰى عَنْ اَكْلِ لُحُوْمِ الْخَيْلِ

یہ کھانے میں کم استعمال ہوتے تھے، ان کے گوشت کو زیادہ اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا بمقابلہ اَنعام کے، اور اللہ کے علم میں تھا کہ آئندہ ان کے کھانے کی ویسے ہی حرمت ہونے والی ہے اس لیے یہاں ان کے کھانے والے فائدے کا ذکر نہیں کیا، صرف رکوب کا ذکر کیا ہے۔

اب اگر کوئی شخص گدھے کے اوپر سواری کو مناسب نہ سمجھے تو گویا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی اس حکمت کے منافی ہے کہ اللہ نے تو پیدا ہی سواری کے لئے کیا ہے، تو پھر اس کو اپنے لئے باعثِ ذِلّت یا باعثِ مذمت سمجھنا یہ کوئی اچھا جذبہ نہیں ہے، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بہت جگہ روایات میں آتا ہے کہ آپ گدھے پر سوار ہو جاتے تھے، اسی لئے تو جہاں شمائل کے اندر یہ ذکر آیا ہے کہ ''کَانَ یَرْکَبُ الْحِمَارَ''(۱) کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم گدھے پر سواری کر لیتے تھے، تو اس کے اُوپر ملا علی قاری رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ بعض لوگ گدھے کے اُوپر سواری کرنے کو بُرا جانتے ہیں کَجَهَلَةِ الْهِنْدِ جیسا کہ ہندوستان کے جاہل (''ہندوستان'' سے ''متحدہ ہندوستان'' مراد ہے، کیونکہ ملا علی قاری رحمہ اللہ کے زمانے میں ''متحدہ ہندوستان'' ہی تھا، پاکستان تو بہت بعد میں بنا ہے) جیسا کہ ہندوستان کے جاہل گدھے کی سواری کو بُرا جانتے ہیں ''اَخَسُّ مِنَ الْحِمَارِ''(۲) کہتے ہیں کہ وہ خود گدھے سے زیادہ کمینے ہیں جو گدھے کے اوپر سواری کو عار سمجھتے ہیں۔ تو ہندوستان کے جاہلوں کی خاص طور پر مثال دی ہے۔

سوال:- گدھے کے پسینے کا کیا حکم ہے؟

جواب:- اس کا پسینہ پاک ہے، یہ مسئلہ متفق علیہ ہے، اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ اس کی وجہ؟ دیکھو! اِستدلال یہیں سے ہو سکتا ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے اُوپر سواری کا ذِکر کیا کہ اس کے اُوپر تم سوار ہو سکتے ہو، اور سواری کے لئے زین کا رکھنا ضروری نہیں، گدھے کی کمر پر آپ ویسے ہی بیٹھ سکتے ہیں، اور جس وقت انسان بیٹھا ہوتا ہے تو جانور کو پسینہ یقیناً آتا ہے، تو اگر پسینہ ناپاک ہو تو پھر تو ان کے اُوپر سواری ممکن ہی نہیں اس شخص کے لئے جو کپڑوں اور بدن کو پاک رکھنا چاہتا ہے، وہ جب بھی بیٹھے گا کسی نہ کسی درجے میں پسینہ آ جائے گا۔ تو ان کا پسینہ پاک ہے، اس میں کوئی اِشکال نہیں۔ اور گھوڑے کا جھوٹا بھی پاک ہے، اور بغال اور حمیر کا جھوٹا مشکوک ہے، جس طرح سے آپ فقہ کے اندر پڑھتے رہتے ہیں۔

سوال:- بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس کے پاک ہونے کی وجہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پہ سواری کی تھی۔

جواب:- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سواری کرنے سے اس کے پسینے کا پاک ہونا اسی طرح ہے جیسے میں عرض کر رہا ہوں، کہ رکوب کی ضرورت ہے کہ پسینہ پاک ہو، گھوڑے کا پسینہ بھی پاک ہے اور گدھے کا بھی، اگر پسینہ پاک نہ ہو تو پھر سواری مشکل ہو جائے گی۔

قیامت تک آنے والے سامانِ راحت وآسائش کی پیش گوئی

وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ: يَخْلُقُ مضارع کا صیغہ ہے مستقبل کے معنی میں۔ اب اس میں دیکھئے کیسا اشارہ فرمایا يَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ، اور یہاں ذکر ہے لِتَرْكَبُوْهَا یعنی سواریوں کا۔ ''پیدا کرے گا اللہ تعالیٰ ان چیزوں کو جن کو تم جانتے بھی نہیں ہو'' یعنی آئندہ

---

(۱) ترمذی ۱/ ۱۹۷ باب ماجاء فی قتل احد سے اگلا باب/ مشکوۃ ۲/ ۵۱۹ باب فی اخلاقہ، فصل ثانی۔ ولفظہ: کَانَ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم وَيَرْكَبُ الْحِمَارَ۔

(۲) مرقات کی عبارت یہ ہے: فَفِيْ اسْتِنْكَافِ مِنْ رُكُوْبِهِ كَبَعْضِ الْمُتَكَبِّرِيْنَ وَجَمَاعَةٍ مِنْ جَهَلَةِ الْهِنْدِ فَهُوَ أَخَسُّ مِنَ الْحِمَارِ

انسان کی ضرورت کے تحت ایسی ایسی سواریاں بھی پیدا کرے گا جو ابھی تمہارے علم میں بھی نہیں، یہ ایک اجمالی لفظ ہے جس میں قیامت تک آنے والی ساری کی ساری سواریاں شامل ہیں، جس میں کاریں بھی آگئیں، بسیں بھی آگئیں، ٹرک بھی آگئے، ریل گاڑیاں بھی آگئیں، ہوائی جہاز بھی آگئے، ہیلی کاپٹر بھی آگئے، اور اس سے آگے پتا نہیں کیا کچھ بنتا ہے، جو کچھ بھی بنتا ہے جو موجودہ لوگوں کے علم میں نہیں اس کے اندر سب کچھ آگیا، اس میں اشارہ کر دیا کہ بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جو اللہ پیدا کرتا ہے، جو اس وقت مخاطب لوگوں کے علم میں نہیں، اب گدھے گھوڑے وغیرہ تو علم میں تھے، تو مَا لَا تَعْلَمُوْنَ اِن سواریوں کو شامل ہو جائے گا، اور یہ ان سب سواریوں کو شامل آ جائے گا جو بھی انسان کی ضرورت تحت آنے والے وقت میں بننے والی ہیں۔ "پیدا کرتا رہتا ہے، پیدا کرے گا" دونوں طرح سے اس کا ترجمہ ہوسکتا ہے "پیدا کرے گا اللہ، پیدا کرتا رہتا ہے اللہ تعالیٰ ایسی چیزیں جن کو تم جانتے بھی نہیں ہو" یعنی اس وقت تمہارے علم میں نہیں۔ اور اگر "مَا" کو عام لے لیا جائے، اس کو صرف رکوب کے ساتھ نہ لگایا جائے تو اتنی طویل فہرست ہو جائے گی! کہ جو چیزیں کھانے پینے کی، پہننے کی، استعمال کرنے کی جو چیزیں بھی اُس وقت موجود نہیں تھیں جس وقت قرآنِ کریم اتر رہا تھا، اور بعد میں وہ چیزیں موجود ہوئیں، جیسے کہ آج ہمارے استعمال میں ایسی بے شمار چیزیں ہیں جو صحابہ کرام کے زمانے میں موجود نہیں تھیں وہ سب مَا لَا تَعْلَمُوْنَ کا مصداق ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے پیش گوئی کی کہ آئندہ آسائش کا اور آرائش کا سامان جو لوگوں کے کام آئے گا اس قسم کی چیزیں اللہ تعالیٰ پیدا فرمائیں گے جن کو تم اس وقت جانتے بھی نہیں ہو۔

مخلوق کی اِیجادات پر "خلق" کا لفظ بولنا مناسب نہیں

باقی! یہ پیدا اللہ کرتا ہے، تمہارے دل میں یہ خیال نہ آئے کہ یہ جو لوگ بناتے ہیں، مستری بناتے ہیں، سائنس دان بناتے ہیں، اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ میں پیدا کرتا ہوں اور میں پیدا کرتا رہوں گا حالانکہ یہ چیزیں تو انسان بناتا ہے۔ انسان کے بنانے کو "پیدا کرنا" نہیں کہتے (اس بات کو یاد رکھیے!)، "پیدا کرنا" تو یہ ہوتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ مواد پیدا کیا جو پہلے موجود نہیں تھا، اور انسان کا کام ہے کہ ان موجود چیزوں میں جوڑ توڑ کرتا ہے، جوڑ توڑ کر کے ایک نئی چیز بنا لیتا ہے، جس طرح سے لکڑی اللہ نے پیدا کر دی اور کسی ترکھان نے اس کو چیر کے تخت کی شکل دے دی، اب اس تخت کا خالق اس ترکھان کو نہیں کہیں گے، ورنہ یہ بھی تو پہلے موجود نہیں تھا، لیکن لکڑی اللہ نے پیدا کی، جس لوہے کے ساتھ اس نے تراشا وہ اللہ نے پیدا کیا، اور ان چیزوں کو آپس میں جوڑ توڑ کر کے یہ صورت بنائی گئی۔ تو کوئی چیز موجود نہ ہو اور براہِ راست اس کو پیدا کیا جائے یہ صرف اللہ کی شان ہے، اور ہم جو کچھ کرتے ہیں یا سائنس دان جو کچھ بناتے ہیں ان کو "ایجاد" کہتے ہیں، اور اس کا حاصل صرف یہ ہے کہ اللہ کی پیدا کردہ چیزوں میں کچھ ایسا جوڑ توڑ کر لیا کہ ایک نئی چیز آگئی۔ گندم موجود ہے، اس کو پیس کے آٹا بنا لیا، اور آٹے کو گوندھ کے روٹی کی شکل بنالی، تو آپ اپنی اماں کو اس روٹی کا خالق نہیں کہیں گے کہ دیکھو! یہ پہلے موجود نہیں تھی ہماری اماں نے اس کو پیدا کر دیا، ورنہ ایک سائنس دان اگر ہوائی جہاز بناتا ہے اور ایک عورت روٹی پکاتی ہے تو اس میں فرق تو کوئی نہ ہوا کہ وہ بھی پہلے موجود نہیں تھا انہوں نے بنالیا اور یہ بھی پہلے موجود نہیں تھی اس نے بنالی، لیکن اس کے لئے "خلق" کا لفظ نہیں بولا جاتا، تو یہ "صنعت" ہے، "ایجاد" ہے، جس کا مطلب یہ

ہے کہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ چیزوں کو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی عقل اور صلاحیتوں کے ذریعے سے آپس میں جوڑ توڑ کر دیا۔ پانی موجود ہے، آگ موجود ہے، پانی کو آگ کے اوپر رکھا بھاپ پیدا ہو گئی، اس میں ایک قوت ہے جس کو آگے استعمال کر لیا، ورنہ اگر اللہ آگ پیدا نہ کرتا، پانی پیدا نہ کرتا، لکڑی لوہا پیدا نہ کرتا یا تمہیں اس قسم کی عقل فہم اور سمجھ نہ دیتا تو پھر یہ چیزیں کس طرح سے وجود میں آسکتی تھیں؟ تو ''خالق'' ہر چیز کا اللہ ہے، یہ لوگ جو کچھ کرتے ہیں یہ ''صنعت'' اور ''ایجاد'' کہلاتی ہے جس کا مقصد ہے محض تصرف فی الموجودات، موجودات کے اندر تصرف کر کے اس میں سے کوئی نئی چیز نکال لی جائے تو اس کو ''خلق'' سے تعبیر نہیں کیا جاتا، اِس لئے جتنی سواریاں ہیں جو کچھ بھی ہے سب اللہ کی پیدا کی ہوئی ہیں۔

سوال:- جب سب کچھ اللہ کا پیدا کیا ہوا ہے لوہا وغیرہ، وہ تو پیدا ہو چکا، اب یہ کہنا کہ ''پیدا کرتا رہتا ہوں'' اس کا کیا مطلب؟

جواب:- عالَمِ غیب سے ظاہر کرنا، یہ جو اللہ کا فعل ہے اس فعل کو ہم خلق سے تعبیر کرتے ہیں، بہت ساری چیزیں جو اس وقت موجود نہیں تھیں اللہ تبارک وتعالیٰ نے موجود کر دیں، اللہ کا یہ فعل خلق ہے چاہے کسی صورت میں ظاہر ہو، باقی انسان کا جو موجودات میں تصرف ہے اس کو ہم یا ''صنعت'' سے تعبیر کرتے ہیں یا ''ایجاد'' سے تعبیر کرتے ہیں، اور ''خلق'' بمعنی بنانا بھی قرآنِ کریم میں مستعمل ہے، بنانے پر بھی ''خلق'' کا لفظ بولا جاتا ہے، قرآنِ کریم میں بھی ہے، اَنِّیْۤ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّیْنِ كَهَیْـَٔةِ الطَّیْرِ فَاَنْفُخُ فِیْهِ فَیَكُوْنُ طَیْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰهِ (آل عمران:۴۹) میں تمہارے لیے بناتا ہوں مٹی سے ایک پرندے کی شکل، پھر اس میں پھونک مارتا ہوں، وہ اللہ کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے۔ اور اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ (مؤمنون:۱۴، صافات:۱۲۵) کے اندر اللہ تعالیٰ نے جو ''خالقین'' کا لفظ استعمال کیا ہے کہ تمام بنانے والوں سے اللہ بہتر بنانے والا ہے، تو معلوم ہوا کہ ''خلق'' کا لفظ مطلق ''صنعت'' کے معنی میں بھی آتا ہے۔ ویسے عالمِ غیب سے کسی چیز کا بغیر کسی واسطے کے ظاہر کرنا یہ ''خلق'' ہے، اور یہ اللہ کی صفتِ خاصہ ہے، باقی! اس کو مجازاً ''صنعت'' کے معنی میں بھی لے لیتے ہیں، اس لیے ''خالق'' کا (اللہ کے علاوہ) کسی کے لئے بولنا مناسب نہیں، جس طرح سے قائدِاعظم کو کہتے ہیں ''خالقِ پاکستان''، جیسے ڈاکٹر اقبال کو کہتے ہیں ''مصوّرِ پاکستان''، تو ''مصوّرِ پاکستان'' تو مناسب ہے کہ اس نے ایک صورت بنادی، نقشہ بنادیا، باقی! ''خالق'' کا لفظ غیر اللہ کے لئے بولنا اگرچہ کفر، شرک نہیں، لیکن یہ مُوہم ہے، یہ صفت اللہ کے ساتھ ہی خاص ہے، اگرچہ مجازی طور پر دوسرے معنی میں استعمال ہوئی ہے، اس لیے اگر کوئی کسی کو ''خالق'' کہتا ہے اور اس معنی کے اعتبار سے کہتا ہے کہ ظاہر ہونے کا ذریعہ وہ بنا ہے، تو یہ کُفر تو نہیں، لیکن بہر حال یہ لفظ مُوہم ہے، یہ استعمال نہیں کرنا چاہیے۔

دونوں راستوں کی نشان دہی

وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِیْلِ وَمِنْهَا جَآىِٕرٌ: یہ ایک معنوی انعام ذِکر کیا، قَصْدُ السَّبِیْلِ میں صفت کی اضافت موصوف کی طرف ہے۔ سَبیلِ قصد: متوسط راستہ، سیدھا راستہ۔ ''سیدھا راستہ اللہ تک پہنچتا ہے اور بعض راستے ٹیڑھے ہیں''۔ جائر کا معنی ٹیڑھے۔ بعض راستے ٹیڑھے ہیں کہ جن پر چلنے سے انسان اللہ سے دُور ہٹتا چلا جاتا ہے، اور سیدھا راستہ اللہ تک پہنچتا ہے، اور وہ سیدھا راستہ

توحید والا راستہ ہے جو پچھلی آیات کے اندر غور کرنے کے بعد انسان کو معلوم ہوتا ہے۔ ''اللہ پر ہی ہے سیدھا راستہ اور بعض راستے ٹیڑھے ہیں'' وَلَوْشَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ: اور اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا۔ اس کی تفصیل بارہا گزر چکی۔

بارش کا نزول اور اس کے فوائد

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ: یہ بھی وہی نعمتوں کا ذکر ہے۔ اللہ وہ ہے جس نے تمہارے لئے آسمان سے پانی اُتارا۔ سماء ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو ہمارے سروں سے اُونچی ہو، ''اُوپر کی جانب سے پانی اُتارا'' لَكُمْ: تمہارے نفع کے لئے مِّنْهُ شَرَابٌ: شراب مشروب کے معنی میں ہے، پینے کی چیز۔ اس پانی میں سے پینے کی چیز ہے، تمہارے لئے مشروب ہے۔ وَّمِنْهُ شَجَرٌ: اور اسی پانی کے سبب سے درخت ہیں، پانی کے ساتھ نباتات پیدا ہوتی ہے، درخت پیدا ہوتے ہیں، فِيْهِ تُسِيْمُوْنَ: اور ان میں تم جانوروں کو چراتے ہو، یہ جانور رکھنا اور چرانا چونکہ عرب کے اندر معیشت کا ایک بہت بڑا جزء تھا اس لئے بار بار اس کی یاد دہانی کرائی جارہی ہے، شجر کا عام اطلاق تو تنے والے درخت پر ہوتا ہے، یہ جو اپنے تنے پر کھڑے ہوتے ہیں، لیکن یہ مطلق نباتات کے معنی میں بھی آتا ہے، جب یہ مطلق نباتات کے معنی میں آجائے گا تو پھر بیلوں پر اور چھوٹے پودوں پر اور بڑے درختوں پر سب پر بولا جائے گا۔ اور تُسِيْمُوْنَ اسامۃ سے ہے، اور یہ سوم سے لیا گیا ہے، سوم جانوروں کے چَرانے کو کہتے ہیں، سائمہ کا لفظ آپ فقہ کی کتابوں میں پڑھتے رہتے ہیں جس کا معنی ہے چَرنے والے جانور، کتاب الزکوۃ کے اندر ان کا ذکر آیا کرتا ہے۔ ''اللہ وہ ہے جس نے تمہارے نفع کے لئے آسمان سے پانی اُتارا، اس میں سے مشروب ہے، اور اسی کے سبب سے نباتات پیدا ہوتی ہیں جس میں کہ تم جانوروں کو چراتے ہو'' شجر کا معنی درخت بھی کر سکتے ہیں، اور عموم کے طور پر اس کا معنی مطلق نباتات سے بھی کیا جاسکتا ہے۔ يُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ: اگاتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے نفع کے لئے اسی پانی کے ذریعے سے کھیتی کو، وَالزَّيْتُوْنَ: اور زیتون کو وَالنَّخِيْلَ: اور کھجوروں کو وَالْاَعْنَابَ: اور انگوروں کو وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ: اور ہر قسم کے میووں کو۔ انگور اور کھجور چونکہ عرب کے استعمال میں بہت زیادہ رہتی تھی، اور ان کی پیداوار بھی اس علاقے میں تھی، اور ایسے ہی زیتون اور کچھ کھیتیاں، وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ: باقی دنیا کے اندر جس قسم کے میوے ہیں جو آج عرب کی طرف سمٹ سمٹ کے جارہے ہیں اور عرب ان سے فائدہ اٹھارہے ہیں، تو جو وہاں پیدا ہوتے ہیں وہ بھی آگئے اور جو وہاں پیدا نہیں ہوتے مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ میں وہ بھی آگئے جو باقی دنیا کے اندر پیدا کیے۔ تو لَكُمْ کا خطاب براہِ راست اگرچہ اس وقت ان لوگوں کو تھا جو وہاں موجود تھے یعنی عرب، لیکن چونکہ قرآنِ کریم تو تمام جہانوں کے لئے اُترا ہے، مستقبل میں جتنے لوگ پیدا ہونے والے تھے ان سب کے لئے اترا ہے، تو اس لئے جتنے بھی میوے جس علاقے میں بھی پیدا ہوتے ہیں وہ سب ان انعامات کے اندر آگئے، اور لَكُمْ کا خطاب عام بنی آدم کے لئے ہوگیا، اگرچہ براہِ راست مخاطب وہ تھے جو اُس وقت موجود تھے۔ اب اس میں ایک ایک لفظ میں کتنی کتنی تفصیل ہے، کھیتی کے طور پر کتنی چیزیں پیدا ہوتی ہیں جن کو آپ غلہ جات یا سبزیوں سے تعبیر کرتے ہیں، دیکھو! اس میں کتنی تفصیل ہے، کتنے غلے، کتنی سبزیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اور اسی طرح زیتون کو انسان کتنے طریقوں سے استعمال کرتا ہے، تیل کے طور پر استعمال کرتا ہے، پھل کے طور پر استعمال کرتا ہے، اچار ڈال کے کھاتا

ہے، تیل کی مالش کرتے ہیں، مختلف قسم کے کھانے تیار کرتے ہیں۔ اور کھجور تو عرب کی معیشت کا ایک جزء تھا اس کو کس طرح سے استعمال کرتے تھے، اس سے کیا کیا فوائد حاصل کرتے تھے، اور اسی طرح سے انگور، اور آگے تعمیم آگئی مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ: بے شک اس مذکور میں (ذٰلِكَ کا اشارہ مذکور کی طرف ہے) اس مذکور میں البتہ نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو کہ تفکر کرتے ہیں، جن کو سوچنے کی عادت ہے، سوچنے والوں کے لئے اس میں بہت نشانی موجود ہے اللہ کے منعم ہونے کی اور اللہ کے ایک ہونے کی، یکتا ہونے کی، محسن ہونے کی۔

کائنات میں بکھرے ہوئے اللہ تعالیٰ کی قدرت واِحسان کے کچھ نمونے

وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ: اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے نفع کے لئے مسخر کیا، اپنی قدرت کے تابع کیا رات کو اور دِن کو وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ: سورج کو اور چاند کو، وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ: اور ستارے بھی سارے کے سارے مسخر ہیں اللہ کے حکم کے ساتھ۔ نجوم عام ہے، اور شمس اور قمر بڑے سیارے تھے تو ان کو علیحدہ ذکر کر دیا، جس میں یہ بتا دیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو پیدا تو ان کو تمہارے نفع کے لئے کیا ہے اور یہ انسان کی کتنی بدبختی ہے کہ جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے بطور خادم کے بنایا تھا انسان نے انہی کی پُوجا کرنی شروع کر دی، کوئی سورج کو پُوجنے لگ گیا، کوئی چاند کو پُوجنے لگ گیا، وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ: اور ستارے سارے کے سارے مسخر ہیں اللہ کے حکم کے ساتھ، اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ: بے شک اس میں البتہ نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو کہ عقل رکھتے ہیں، جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

وَمَا ذَرَاَ لَكُمْ فِی الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ: اس کو بھی سَخَّرَ کے نیچے لے لیجئے۔ اور مسخر کیا اللہ تعالیٰ نے ان سب چیزوں کو جو پیدا کیں، جو پھیلائیں تمہارے لیے زمین میں اس حال میں کہ ان کے رنگ مختلف ہیں۔ لون: رنگ۔ اور لون بول کر قسم بھی مراد لی جاتی ہے "جن کی مختلف قسمیں ہیں"، اللہ تعالیٰ نے زمین کے اندر کتنی مختلف قسمیں پھیلا دیں، اور اپنی قدرت سے ان کو تمہارے نفع کے لئے مسخر کیا، اس میں ساری کائنات جس سے تم فائدہ اٹھاتے ہو وہ سب آگئی۔ ذَرَاَ پھیلانے کو کہتے ہیں۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّذَّكَّرُوْنَ: اس میں البتہ نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو کہ نصیحت حاصل کرتے ہیں، یعنی جو جو چیز تم استعمال کرتے ہو، جدھر کو نظر اٹھا کر دیکھتے ہو تمہارے فائدے کی چیزیں پھیلی ہوئی ہیں، ان میں غور کرو، سوچو، تو تمہیں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت بھی سمجھ میں آئے گی اور اسی طرح سے اللہ تعالیٰ کا محسن ہونا بھی سمجھ میں آئے گا، پھر اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق ٹھیک ہوگا اور توحید بھی اختیار کرو گے۔ اور اگر سوچو ہی نہیں، عقل سے کام ہی نہ لو، غور وفکر کی عادت ہی نہ ڈالو، بیلوں اور سانڈوں کی طرح کھاتے پھرو، یہ سوچو ہی نہیں کہ ان کو کس نے پیدا کیا اور یہ کیوں دی ہیں، تو پھر انسان کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا، تفکر، عقل، تذکر، یہی چیز ہے جو انسان کو سیدھے راستے کی طرف لے جاتی ہے۔

وَهُوَ الَّذِیْ سَخَّرَ الْبَحْرَ: اللہ وہ ہے جس نے مسخر کیا بحر کو، بحر کا لفظ سمندر اور دریا دونوں کے اوپر بولا جاتا ہے، سمندر کو مسخر کیا لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِیًّا: تاکہ تم اس میں سے تر وتازہ گوشت کھاؤ۔ لَحْمًا طَرِیًّا کا مصداق مچھلی ہے، اس کو لحم کے طور پر ہی ذکر کیا،

چونکہ اس میں ہڈی کم ہوتی ہے، ذبح کرنے کی بھی نوبت نہیں آتی، یوں سمجھو کہ پورا گوشت ہی گوشت ہے، ''مسخر کیا سمندر کو تمہارے لئے تاکہ تم اس میں سے تروتازہ گوشت کھاؤ'' وَتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا: اور تاکہ تم نکالو اس بحر سے زیور جس کو تم پہنتے ہو، اس حلیہ سے مراد موتی جواہرات ہیں جو سمندر سے نکلتے ہیں، اور پھر لوگ ان کے ہار بنا کے نگینے بنا کے مختلف طور پر استعمال کرتے ہیں، کھانے کے کام بھی آتے ہیں، مقویات کے طور پر بھی استعمال کیے جاتے ہیں، تَسْتَخْرِجُوْا کا عطف تاکلوا پر ہے، ''تاکہ تم اس میں سے تروتازہ گوشت کھاؤ اور تاکہ تم اس میں سے زیور نکالو جس کو تم پہنتے ہو'' وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيْهِ: یہ دوسری معاشی حیثیت آگئی۔ دیکھتا ہے تو کشتیوں کو کہ پانی کو چیرتی پھرتی ہیں سمندر میں۔ مواخر ماخرۃ کی جمع ہے، مخر چیرنے کو کہتے ہیں، یعنی جب یہ جہاز چلتے ہیں تو کس طرح سے پانی کو چیرتے ہوئے چلتے ہیں۔ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ: اس کا معطوف علیہ محذوف نکال لیجئے لِتَرْكَبُوْا وَلِتَبْتَغُوْا تاکہ تم ان کشتیوں کے اوپر سواری کرو اور تاکہ تم اللہ کا فضل تلاش کرو۔ تو ان کے اوپر چڑھے پھرتے ہو اور اللہ کا فضل یعنی رزق تلاش کرتے ہو، ایک ملک سے مال تجارت دوسرے ملک میں لے جاتے ہو، اور سمندروں نے کس طرح سے سینے کے اوپر تمہارا بوجھ اٹھایا اور ایک طرف سے اٹھا کے دوسری طرف پہنچا دیا، یہ کتنا اللہ کا احسان ہے کہ اس نے پانی کی طبیعت ایسی بنادی، اور اسی طرح سے لکڑی پیدا کردی، لوہا پیدا کردیا، جس سے کشتیاں اور جہاز بنے، اور یوں لاکھوں مَن بوجھ اٹھا کے وہ ایک طرف سے دوسری طرف کو جا رہے ہیں، اُس وقت بھی لوگ کشتیوں کے ذریعے سے تجارت کرتے تھے، اور آج تو یہ چیز بہت ہی نمایاں ہے کہ دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک کس طرح سے مال سمندری راستے سے پہنچتا ہے، ''تاکہ تم تلاش کرو اللہ کا فضل'' اللہ کے فضل سے یہاں رزق مراد ہے، وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ: یہ اصل مقصود ہے۔ تاکہ تم اللہ کے شکر گزار ہو جاؤ۔

وَاَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ: یہ مضمون بھی کئی دفعہ آچکا۔ اللہ تعالیٰ نے زمین کے اندر بوجھل پہاڑ ڈال دیے، اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ: لِئَلَّا تَمِيْدَ بِكُمْ تاکہ تمہیں لے کے زمین مائل نہ ہو جائے وَاَنْهٰرًا: اور اللہ نے زمین میں نہریں جاری کردیں، بڑی نہریں چھوٹی نہریں، بڑی نہریں جن کو ہم دریا کہتے ہیں، اور ندی نالے سب اس کے اندر آگئے، ''اللہ تعالیٰ نے زمین کے اندر نہریں بہادیں'' وَسُبُلًا: اور اللہ نے زمین کے اندر راستے بنادیے، لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ: تاکہ تم اپنی منزل کی طرف راہ پاؤ۔ اگر زمین اس قسم کی اونچی نیچی دشوار گزار ہوتی کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچنا مشکل ہو جاتا تو جہاں انسان پیدا ہوتا وہیں تھوڑی سی جگہ کے اندر ہی اپنا وقت گزار کے مرجاتا، لیکن اللہ نے زمین کو ایسا بنایا کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ سکتے ہو، پھر راستے بنادیے، سڑکیں بنادیں، جس کی وجہ سے تم اپنی منزلوں تک آسانی سے پہنچ جاتے ہو، نہریں جاری کردیں، دریا بہادیے، وَعَلٰمٰتٍ: اور بہت سارے نشانات قائم کردیے جن کے ذریعے سے تمہیں راستہ معلوم ہوتا ہے، نشانیاں دیکھ دیکھ کے چلتے ہو کہ یہ علامت ہے یہ راستہ اس طرف جا رہا ہے، یہ علامت ہے یہ راستہ ادھر کو جا رہا ہے، وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ: اور ستاروں کے ذریعے سے بھی لوگ ہدایت پاتے ہیں۔ زمین کے اندر بھی نشانات قائم کردیے جن کے ساتھ راستے پہچانے جاتے ہیں، اور ستاروں کو بھی اللہ تعالیٰ نے اہتداء کا ذریعہ بنایا، جس وقت آپ سمندر میں چلتے ہیں تو وہاں نہ تو کوئی درخت نظر آتا ہے نہ پہاڑ، اب کیا پتا کہ ہم کدھر کو جا رہے ہیں، اور اسی طرح سے فضا میں اُڑتے ہیں، جہاز بلندی پر چلا جاتا ہے تو کوئی چیز نظر نہیں آتی، نہ کوئی درخت نظر آئے نہ کوئی پہاڑ نظر آئے، وہاں راستہ معلوم کرنا

ستارے کے ذریعے سے ہوتا ہے، یہ ''قطب نما'' جو بنا ہوا ہے یہ ستارے کی جہت ہی دکھاتا ہے جس کے ساتھ وہ متعین کرتے ہیں کہ یہ ستارہ ادھر ہوگا تو ہم فلاں جگہ پہنچ جائیں گے، ادھر ہوگا تو فلاں جگہ پہنچ جائیں گے، ہوائی سفر اور سمندری سفر جتنے ہیں وہ سارے اسی ''قطب نما'' کے ذریعے سے ہوتے ہیں، پُرانے زمانے میں وہ لوگ ستارے کو تاڑتے تھے، تاک کے چلتے تھے، اور آج اس مشینی دور میں ستارے کی طرف دیکھنے کی نوبت کم آتی ہے، وہ آلہ ہی ایسا ہوتا ہے جو بتادیتا ہے کہ ستارہ کدھر ہے، ''قطب نما'' یہ صرف قطب ستارہ دکھاتا ہے، اور قطب ستارہ ایک ایسا ستارہ ہے جو اپنی جگہ ٹکا ہوا ہے وہ اپنی جگہ سے ہلتا نہیں، اس لیے راہ معلوم کرنے کے لئے اسی کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، جس سے آپ قبلہ معلوم کیا کرتے ہیں جسے ''قبلہ نما'' کہتے ہیں، وہ بھی ستارے کا رُخ ہی بتاتا ہے، تو سمندروں میں اور فضا میں ستارے کے ذریعے اہتداء ہوتا ہے۔ یہاں حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ عرب کے اندر میں نے بعض ایسے بدوؤں کو دیکھا (جو راہنمائی میں، راستہ بتانے میں بہت ملکہ رکھتے تھے، پُرانے زمانے میں جب لوگ سفر کرتے تھے تو راہنماؤں کو ساتھ لے لیتے تھے جن کو راستے معلوم کرنے کی مہارت ہوتی تھی) کہتے ہیں کہ وہ راستے کی مٹی سونگھ کے بتادیتے تھے کہ یہ راستہ کدھر سے آرہا ہے کدھر جارہا ہے، یعنی اتنی ان کو مہارت تھی، مثلاً آپ چلے جارہے ہیں آگے ایک سڑک آگئی، آپ کو معلوم نہیں یہ کدھر سے آرہی ہے کدھر کو جارہی ہے، آج تو آپ میل لگے ہوئے دیکھ لیں گے، جس میں لکھا ہوگا کہ لاہور اتنے میل، شیخوپورہ اتنے میل، تو معلوم ہو جائے گا کہ ادھر شیخوپورہ ہے اور ادھر لاہور ہے، یہ میلوں کو دیکھ کے معلوم کرلیں گے، اور اگر میل وغیرہ بھی کچھ نہ لگے ہوئے ہوں، چلتے چلتے ایک راستہ آگیا تو کیا پتا چلے گا کہ کدھر سے آرہا ہے کدھر کو جارہا ہے، تو کہتے ہیں کہ وہ مٹی سونگھ کے بتادیتے تھے کہ یہ راستہ کون سا ہے، اِسی مقام پر یہ انہوں نے لکھا ہے ''میں نے خود بعض اَعراب کو دیکھا کہ مٹی سونگھ کر راستہ کا پتا لگا لیتے ہیں'' (تفسیر عثمانی) تو یہ بھی ان علامات میں شامل ہے۔

مذکورہ آیاتِ قدرت کا مقصد

آگے رَدِّ شرک آگیا، اَفَمَنْ یَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا یَخْلُقُ: اللہ کی مخلوقات کی تو یہ تفصیل آپ نے سُن لی کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے کیا کچھ بنایا، اور جو تم نے اللہ کے ساتھ شرکاء قرار دے لیے ہیں انہوں نے کیا بنایا؟ وہ تو کچھ بھی نہیں بنا سکتے، وہ تو خود مخلوق ہیں۔ تو کیا جو پیدا کرتا ہے وہ اس کی طرح ہے جو پیدا نہیں کرتا؟ یہ دونوں آپس میں برابر ہو سکتے ہیں؟ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ: کیا تم سوچتے نہیں، نصیحت حاصل نہیں کرتے؟

اللہ کے اِحسانات کا اِحاطہ ممکن نہیں، اللہ کا علم محیط ہے

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا: اگر تم شمار کرنا چاہو اللہ کے احسانات کو تو تم ان کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ یہ تو تھوڑے سے ہیں جو گنوا دیے، اور ایک ایک لفظ کے ضمن میں پتا نہیں کتنے کتنے احسانات ہیں، اگر تم شمار کرنے لگو اللہ کے احسانات کو تو تم ان کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ: بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ: یہ انسان کے اعمال کا ذکر آگیا، کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ تم چھپاتے ہو اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو، تمہاری ساری کی ساری حرکتیں اللہ کے سامنے ہیں،

تمہاری کوئی کارروائی اللہ سے مخفی نہیں، تو جب اللہ کے سامنے ہے تو اللہ تعالیٰ جب پکڑنا چاہے گا یا اس کے اوپر کوئی سزا دینا چاہے گا تو کسی جرم کو چھپایا نہیں جاسکے گا۔

''اَمْوَاتٌ غَیْرُ اَحْیَآءٍ'' کا مفہوم ومصداق

وَالَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ: وہ چیزیں جن کو پکارتے ہیں یہ لوگ اللہ کے علاوہ، لَا یَخْلُقُوْنَ شَیْئًا: وہ کچھ بھی پیدا نہیں کرتیں وَھُمْ یُخْلَقُوْنَ: اور وہ خود پیدا کی ہوئی ہیں، وہ سب کی سب مخلوق ہیں۔ اور اگر خلق کو ظاہری (مجازی) معنی میں لے لیا جائے تو ''بیان القرآن'' میں یہ ترجمہ کیا گیا ہے کہ ''وہ اللہ کے علاوہ جن کو پکارتے ہیں وہ کچھ پیدا نہیں کر سکتے اور وہ خود تراشے ہوئے ہیں، خود بنائے ہوئے ہیں''(۱) چونکہ زیادہ تر مشرکین پتھر کے بتوں کو ہی پوجتے تھے، اور وہ اپنے ہاتھوں سے گھڑے ہوئے ہوتے تھے، تراشے ہوئے ہوتے تھے، خود تراشتے تھے اور خود تراشنے کے بعد ان کو پوجنے لگ جاتے، وَھُمْ یُخْلَقُوْنَ: وہ مخلوق ہیں، عام معنی بھی کیا جاسکتا ہے کہ اللہ کے پیدا کیے ہوئے ہیں، مخلوق ہیں، تو اس میں پھر جنات بھی آجائیں گے، ملائکہ بھی آجائیں گے، انسان بھی آجائیں گے، جن کو لوگوں نے معبود کے درجے میں رکھا، سورج چاند پانی آگ، جس کی بھی پوجا کی گئی سب اس میں شامل ہوجائیں گے، سب اللہ کی مخلوق ہیں، اور ان میں سے کسی میں بھی پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں تھی۔

اَمْوَاتٌ غَیْرُ اَحْیَآءٍ: پہلی کمی تو ان کے اندر یہ ہے کہ وہ مخلوق ہیں خالق نہیں، تو ان کو خالق کے برابر کیسے ٹھہرایا جاسکتا ہے؟ پھر آپ جانتے ہیں کہ سارے کے سارے کمالات کا مدار حیات پر ہے، کہ جس چیز کے اندر زندگی ہے اس کے اندر کمالات بھی آسکتے ہیں، جس کے اندر زندگی نہیں اس میں کمالات بھی نہیں آسکتے، اس لیے اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے یہ صفت ایک مرکزی حیثیت رکھتی ہے ''حَیٌّ لَا یَمُوْتُ'' کہ اللہ حیات ہی حیات ہے جس کے اُوپر موت کا ورود نہیں ہوگا، ''حَیٌّ لَا یَمُوْتُ'' وہ ایسا زندہ ہے جو مرے گا نہیں، اس کے اوپر موت وارد نہیں ہوگی۔ اور اللہ کے علاوہ یہ جتنی چیزوں کو پوجتے ہیں وہ سارے کے سارے اَمْوَاتٌ غَیْرُ اَحْیَآءٍ ہیں، اَمْوَاتٌ غَیْرُ اَحْیَآءٍ یہ ''حَیٌّ لَا یَمُوْتُ'' کی ضد ہے، اللہ تو زندہ ہے جس پر موت نہیں آئے گی، اور یہ اموات ہیں جو کہ زندہ نہیں ہیں، اس کا کیا مطلب؟ بے جان ہیں، ان میں جان نہیں، اگر تو اَلَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ کا مصداق جمادات ہوں جیسے کہ میں نے عرض کیا کہ مشرکین کے معبود پتھر کی تصویریں بھی تھیں، جس طرح سے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ''الفوز الکبیر'' میں لکھتے ہیں، آپ مشرکین کے تذکرے میں پڑھیں گے کہ شرک کی بنیاد اگرچہ اسی طرح سے اُٹھی کہ مقبولین کی تصویریں بنائی گئیں اور اس تصور سے ان کو پوجا گیا کہ وہ مقبولین خوش ہوں گے، لیکن آہستہ آہستہ وہ شخصیات آنکھوں سے اوجھل ہوگئیں اور یہ تصویریں ہی سامنے رہ گئیں، بے جان چیزیں مراد ہوں تو اَمْوَاتٌ غَیْرُ اَحْیَآءٍ بالکل ٹھیک ہے کہ جو فی الحال بھی میت ہیں اور ان میں کوئی جان نہیں، اور نہ

---

(۱) ''بیان القرآن'' میں اس آیت کا ترجمہ تو یوں نہیں، البتہ سورۂ اعراف آیت: ۱۹۱ کا ترجمہ ایسے کیا ہے۔

ماضی میں حیات تھے اور نہ مستقبل میں ہوں گے، بے جان چیزوں میں یہ تو ساری باتیں آ گئیں۔ یاَمْوَاتٌ غَیْرُ اَحْیَآءٍ کا مطلب یہ ہے کہ اگر چہ فی الحال وہ میت کا مصداق نہ ہوں بلکہ "حیّ" کا مصداق ہوں لیکن ان کی حیات ذاتی نہیں، آنے والے وقت میں مر جائیں گے زندہ نہیں رہیں گے، اس میں جنات شامل ہو سکتے ہیں جن کو مشرکین پوجتے تھے، ملائکہ شامل ہو سکتے ہیں کیونکہ فنا ان کے اوپر بھی طاری ہونا ہے، اور جو پہلے زندہ تھے وفات پا گئے وہ بھی اسی میں شامل ہو سکتے ہیں، بہر حال مقصد یہ ہے کہ ان کی حیات ذاتی نہیں ہے، یا اس وقت بے جان ہیں، یا ہمیشہ کے لئے بے جان تھے اور بے جان رہیں گے، یا پہلے جاندار تھے اب بے جان ہو گئے، یا اب جاندار ہیں آئندہ بے جان ہو جائیں گے، تو اس لئے عیسیٰ علیہ السلام کو پوجنے والے، ملائکہ کو پوجنے والے، عزیر علیہ السلام کو پوجنے والے، یا مرے ہوئے اولیاء کو پوجنے والے، یا زندہ اولیاء کو پوجنے والے، زندہ چیزوں کی عبادت کرنے والے، سب اس کی زد میں آ جائیں گے، کیونکہ اس کا مفہوم یہ ہوا کہ ان کی حیات ذاتی نہیں ہے، "حَیٌّ لَا یَمُوْتُ" صرف اللہ کی شان ہے۔

وَمَا یَشْعُرُوْنَ اَیَّانَ یُبْعَثُوْنَ: اور پھر جس کو پوجا جائے اس کا علم بھی کامل ہونا چاہیے، اور ان کا علم کامل نہیں، ان کو پتا ہی نہیں کہ کب اُٹھائے جائیں گے؟ اور معبود تو ایک بہت بڑی بنیادی ضرورت ہے کہ ہم اس کا کہنا مانیں، کل کو ہمارے سامنے اس کی طرف سے بدلہ آئے، ہم عبادت کریں کل کو ہمارے سامنے اس کی جزا آئے، اور جو نافرمانی کرے اس کے سامنے سزا آ جائے۔ تو جن کو یہ پوجتے ہیں ان کو پتا ہی نہیں کہ کب اُٹھائے جائیں گے؟ ان کا علم بھی ناقص ہے، تو جب علم بھی ناقص، قدرت بھی نہیں، حیات بھی نہیں، نہ حیات ہے، نہ علم ہے، نہ قدرت ہے تو پھر ان کو اللہ کے ساتھ شریک کس حیثیت سے یہ بنا رہے ہیں؟ "اور وہ جانتے ہی نہیں کہ یہ کس وقت اٹھائے جائیں گے؟"

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۲۲﴾

تمہارا اِلٰہ اِلٰہِ واحد ہے، پھر جو آخرت کے متعلق ایمان نہیں رکھتے ان کے دل انکار کرنے والے ہیں اور وہ متکبر ہیں ﴿۲۲﴾

لَا جَرَمَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۗ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ ﴿۲۳﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ مَّاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ۙ قَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۴﴾

یہ پکی بات ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ جانتا ہے اس چیز کو جس کو یہ چھپاتے ہیں اور جس کو یہ ظاہر کرتے ہیں، بے شک اللہ محبت نہیں کرتا تکبر کرنے والوں سے ﴿۲۳﴾ اور جب ان سے پوچھا جاتا ہے تمہارے رَبّ نے کیا اتارا؟ وہ کہتے ہیں کہ پہلے لوگوں کی قصے کہانیاں ہیں ﴿۲۴﴾

لِيَحْمِلُوْٓا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۙ وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ

ان کے اس کہنے کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ اٹھائیں گے وہ اپنے بوجھ پورے پورے قیامت کے دن اور ان لوگوں کے بوجھوں سے بھی کچھ

يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۭ اَلَا سَاۗءَ مَا يَزِرُوْنَ ۝۲۵ قَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ

جن کو گمراہ کرتے ہیں بغیر علم کے، خبردار! بُری ہے وہ چیز جس کو یہ اُٹھائیں گے ۲۵ تحقیق مکر کیا ان لوگوں نے جو ان سے پہلے گزرے ہیں

فَاَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَاَتٰىهُمُ الْعَذَابُ

پھر اللہ نے ان کی عمارت کو بنیادوں سے اکھیڑ دیا پھر گر گئی ان کے اُوپر چھت ان کے اُوپر سے اور آیا ان کے پاس عذاب

مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝۲۶ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُخْزِيْهِمْ وَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَاۗءِيَ الَّذِيْنَ

ایسی جگہ سے کہ ان کو شعور بھی نہیں تھا ۲۶ پھر قیامت کے دِن اللہ انہیں رُسوا کرے گا اور کہے گا کہ کہاں ہیں میرے وہ شرکاء جن کے

كُنْتُمْ تُشَاۗقُّوْنَ فِيْهِمْ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ وَالسُّوْۗءَ عَلَي

متعلق تم جھگڑا کیا کرتے تھے، کہیں گے وہ لوگ جن کو علم دیا گیا بے شک آج کے دِن رُسوائی اور بُرائی

الْكٰفِرِيْنَ ۝۲۷ۙ الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ ظَالِمِيْٓ

انہی لوگوں پر ہے جو انکار کرنے والے تھے ۲۷ یہ وہ لوگ ہیں جن کو وفات دیتے ہیں فرشتے اس حال میں کہ وہ لوگ اپنے نفسوں پر ظلم

اَنْفُسِهِمْ ۠ فَاَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْۗءٍ ۭ بَلٰٓى اِنَّ اللّٰهَ

کرنے والے ہوتے ہیں، پھر یہ سپر ڈال لیں گے (اور کہیں گے) ہم تو کوئی بُرا کام کرتے ہی نہیں تھے، کیوں نہیں، بے شک اللہ تعالیٰ

عَلِيْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۲۸ فَادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ

خوب جاننے والا ہے ان کاموں کو جو تم کیا کرتے تھے ۲۸ داخل ہو جاؤ جہنم کے دروازوں میں اس حال میں کہ ہمیشہ رہنے والے ہو گے

فِيْهَا ۭ فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ۝۲۹ وَقِيْلَ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا مَاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ۭ

اس میں، البتہ بُرا ہے ٹھکانا متکبرین کا ۲۹ اور پوچھا جاتا ہے ان لوگوں سے جو تقویٰ اختیار کیے ہوئے ہیں تمہارے رَبّ نے کیا اُتارا؟

قَالُوْا خَيْرًا ۭ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۭ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ ۭ وَلَنِعْمَ

وہ کہتے ہیں خیر اُتاری ہے، ان لوگوں کے لئے جو اس دُنیا کے اندر بھلائی کرتے ہیں بھلائی ہے اور آخرت کا گھر بہت بہتر ہے، متقین کا

دَارُ الْمُتَّقِيْنَ ۝۳۰ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهُمْ فِيْهَا

گھر بہت ہی اچھا ہے ۝۳۰ ہیشگی کے باغات ہیں، داخل ہوں گے ان میں، جاری ہوں گی ان کے نیچے سے نہریں، ان کے لئے ان باغات میں

مَا يَشَآءُوْنَ ؕ كَذٰلِكَ يَجْزِي اللّٰهُ الْمُتَّقِيْنَ ۝۳۱ الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ

وہ چیز ہوگی جو وہ چاہیں گے، اللہ تعالیٰ متقین کو اسی طرح سے جزا دیتا ہے ۝۳۱ یہ وہ لوگ ہیں جن کو وفات دیتے ہیں فرشتے

طَيِّبِيْنَ ۙ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ۙ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ

اس حال میں کہ وہ لوگ پاکیزہ ہوتے ہیں، فرشتے انہیں کہتے ہیں تم پر سلامتی ہو، داخل ہو جاؤ جنت میں ان کاموں کی وجہ سے جو

تَعْمَلُوْنَ ۝۳۲ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ كَذٰلِكَ فَعَلَ

تم کیا کرتے تھے ۝۳۲ نہیں انتظار کرتے یہ مگر اس بات کا کہ آجائیں اِن کے پاس فرشتے یا آجائے تیرے رب کا حکم، ایسے ہی کیا

الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝۳۳ فَاَصَابَهُمْ

ان لوگوں نے ان سے پہلے گزرے ہیں، اور ان کے اوپر اللہ نے ظلم نہیں کیا لیکن یہ اپنے نفسوں پر خود ہی ظلم کرتے تھے ۝۳۳ پھر جو کچھ

سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۳۴ وَقَالَ الَّذِيْنَ

انہوں نے کیا اس کی سزائیں انہیں پہنچیں، اور جس چیز کا وہ مذاق اُڑایا کرتے تھے اس نے ان کو گھیر لیا ۝۳۴ ان لوگوں نے کہا جنہوں

اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ نَّحْنُ وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ

نے شرک کیا اگر اللہ چاہتا تو ہم اللہ کے علاوہ کسی چیز کی پوجا نہ کرتے، نہ ہم کرتے نہ ہمارے آباء، اور نہ ہم اللہ کے حکم کے بغیر کسی چیز

دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ ؕ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ

کو حرام ٹھہراتے، اسی طرح سے کیا ان لوگوں نے جو ان سے پہلے گزرے ہیں، نہیں ہے رسول کے ذمے مگر کھول کر

الْمُبِيْنُ ۝۳۵ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ

پہنچا دینا ۝۳۵ البتہ تحقیق بھیجا ہم نے ہر جماعت میں رسول یہ پیغام دے کر کہ عبادت کرو تم اللہ کی اور شیطان سے بچ کے رہو،

فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ

پھر ان میں سے بعض وہ تھے جن کو اللہ نے سیدھے راستے پر چلنے کی توفیق دی، اور ان میں سے بعض وہ ہے کہ جس کے اوپر گمراہی

الضَّلٰلَةُ ؕ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۳۶﴾ اِنْ تَحْرِصْ
ثابت ہوگئی، پھر تم چلو پھرو زمین میں پھر دیکھ لو، ان جھٹلانے کا انجام کیا ہوا ﴿۳۶﴾ اگر آپ ان کی ہدایت پر حرص کریں
عَلٰى هُدٰىهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ يُّضِلُّ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۳۷﴾ وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ
پس بے شک اللہ تعالیٰ راستہ نہیں دکھاتا اس شخص کو جس کو اللہ بھٹکا دیتا ہے، اور نہ ان کے لئے کوئی مددگار ہوگا ﴿۳۷﴾ قسمیں کھاتے ہیں یہ اللہ کی
جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ ؕ بَلٰى وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ
پختہ قسمیں کہ جو مرجائے گا اللہ اسے نہیں اُٹھائے گا، کیوں نہیں، اللہ کے ذِمّے یہ سچا وعدہ ہے، لیکن اکثر لوگ
لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۸﴾ لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِيْ يَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّهُمْ كَانُوْا
جانتے نہیں ہیں ﴿۳۸﴾ تاکہ واضح کردے ان لوگوں کے لئے وہ بات جس میں یہ اختلاف کرتے تھے اور تاکہ جان لیں کافر لوگ کہ بے شک وہ
كٰذِبِيْنَ ﴿۳۹﴾ اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ اِذَآ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۴۰﴾
جھوٹے تھے ﴿۳۹﴾ سوائے اس کے نہیں کہ ہمارا کہنا کسی شئ کو جب ہم اس کے متعلق ارادہ کرلیں (ہمارا قول) یہی ہوتا ہے کہ ہم اس کو کہہ دیتے ہیں کُن پس وہ ہو جاتی ہے ﴿۴۰﴾

تفسیر

ماقبل رُکوع سے ربط

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۔ پچھلے رکوع کے آخر میں رَدِّ شرک کا مضمون تھا کہ اللہ کے علاوہ جن کو یہ پکارتے ہیں وہ کسی چیز کو پیدا نہیں کرسکتے بلکہ وہ خود مخلوق ہیں، جو مخلوق ہو وہ معبود نہیں ہوسکتا، اور خالق صرف اللہ ہے مالک بھی وہی ہے اس لئے اطاعت اور عبادت بھی اسی کی چاہیے، اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ کے اندر ذکر کیا گیا تھا کہ کمالات کا مرکز جو حیات ہے وہ بھی ان کو حاصل نہیں، یعنی دائمی حیات حاصل نہیں، یا حیات ان کی اپنی ذاتی نہیں، اپنی ذات کے لحاظ سے یہ اموات کا مصداق ہیں، اگر ان میں حیات ہے تو عارضی ہے، اور ''حَيٌّ لَا يَمُوْتُ'' یہ صرف اللہ کی شان ہے جو زندہ ہی زندہ ہے اس کو کبھی موت نہیں آئے گی، تو اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ یہ ''حَيٌّ لَا يَمُوْتُ'' کے مقابلے میں ہے، اس لئے اگر کوئی شخص اِس وقت زندہ بھی ہو تو بھی اس کو اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ کا مصداق بنا سکتے ہیں۔ اور پھر دوسرے نمبر پر علم کی نفی تھی کہ ان کو یہ بھی معلوم نہیں کہ کب اٹھائے جائیں گے، تو جب بعث کے متعلق ان کو کوئی علم نہیں تو اپنے پُوجنے والوں کو یہ کیا جزا دے سکتے ہیں اور کیا سزا دے سکتے ہیں؟ اور پھر ان کی عبادت کی ضرورت کیا ٹھہری؟ اس انداز کے ساتھ رَدِّ شرک کیا گیا تھا۔

تکبّر کی بنا پر منکرین صحیح بات کو قبول نہیں کرتے

تو انہی باتوں کے نتیجے کے طور پر یہ بات ذکر کی جارہی ہے کہ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ: تمہارا اِلٰہ اِلٰہِ واحد ہے، یعنی حقیقی اِلٰہ۔ انہوں نے تو اپنے لیے آلہہ بہت متعین کر رکھے تھے، ان کے آلہہ تو کثیرہ تھے، لیکن وہ تھے ان کے بنائے ہوئے، واقع کے لحاظ سے، حقیقت کے اعتبار سے تمہارا معبود، تمہارا اِلٰہ اِلٰہِ واحد ہے، فَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ: پھر جو لوگ آخرت کے متعلق ایمان نہیں رکھتے ان کے دل انکار کرنے والے ہیں، وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ: اور وہ متکبر ہیں، استکبار والے ہیں۔ اس میں گویا کہ ان کے شرک پر اڑے رہنے کے منشاء کی طرف اشارہ کیا ہے، کہ باتیں اتنی واضح کی جاچکی ہیں کہ جن میں تھوڑا سا غور وفکر کرنے والا انسان بھی اس نتیجے تک پہنچ سکتا ہے کہ شرک کا طریقہ غلط ہے اور صحیح طریقہ توحید کا ہے، لیکن جن لوگوں کو اپنے انجام کی فکر نہیں وہ اپنے پرانے طریقے کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں، اور توحید کی جو شاہراہ ان کے سامنے پیش کی جارہی ہے، صاف راستہ جو واضح کیا جارہا ہے، اس سے وہ بدکتے ہیں، اس کا انکار کرتے ہیں۔ انکار کرنے کی وجہ کیا ہے؟ ان کے پاس اپنے مسلک کی کوئی دلیل ہے؟ یا ان کا یہ عقیدہ کسی صحیح بنیاد پر ہے؟ نہیں! وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ اصل یہ ہے کہ تکبر ان کو صحیح بات قبول کرنے سے روکے ہوئے ہے، اب یہ سمجھتے ہیں کہ جب آباء واجداد سے ایک طریقہ چلا آرہا ہے چاہے وہ باطل ہے، اس کا چھوڑنا گویا کہ اپنی پچھلی نسل اور اپنی پچھلی زندگی کے متعلق خود ہی باطل ہونے کا فیصلہ کرنا ہے، اب وہ باطل پر جو چمٹے ہوئے ہیں تو اس وجہ سے نہیں کہ ان کے پاس اس کی کوئی دلیل ہے، بلکہ اس تکبر کی بنا پر کہ اپنے طریقے کو چھوڑتے ہوئے انہیں عار آتی ہے، اور توحید کو جو اختیار نہیں کرتے باوجود اس بات کے کہ وہ حق ہے، پھر بھی اس سے بدکتے ہیں، تو اسی لیے بدکتے ہیں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ جب ہم پرانے طریقے پر چلے آرہے ہیں اب ہم پہلا طریقہ چھوڑ کے دوسرے طریقے کو جو اختیار کریں گے تو اس میں بظاہر ان کو ایک پستی معلوم ہوتی ہے کہ ہم اپنے طریقے سے باز آگئے اور دوسرے طریقے کو اختیار کرلیا، ہم کسی کے سامنے کیوں جھکیں اور اپنی پچھلی غلطی یا اپنے آباء واجداد کے غلط ہونے کا اقرار کیوں کریں، یہ جو ان کے اندر تکبر اور بڑائی ہے یہ ان کو توحید کی تعلیم قبول کرنے سے رکاوٹ ڈالے ہوئے ہے، ورنہ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ والی بات کو یہ کسی دلیل کے ساتھ رد نہیں کرسکتے، قبول نہ کرنے اور انکار کرنے کی وجہ اور ان کے دل کے انکار کرنے کی وجہ تکبر ہے، اپنے راستے کو چھوڑ کے گویا کہ دوسرے کے سامنے یہ اقرار نہیں کرسکتے کہ ہم پہلے غلط تھے، جب ایک طریقہ اختیار کرلیا بس کرلیا، تو وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ کے اندر وجہ ذکر کی گئی ہے۔

متکبرین کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دھمکی اور تکبّر کی حقیقت

لَا جَرَمَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ: لَا جَرَمَ یہ لفظ پہلے سورۂ ہود کے اندر بھی آیا تھا، یہ اَلْبَتَّةَ کے معنی میں ہوتا ہے، یہ پکی بات ہے، اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ بے شک اللہ تعالیٰ جانتا ہے اس چیز کو جس کو یہ چھپاتے ہیں اور جس کو یہ ظاہر کرتے ہیں، ان کے ظاہر کو بھی اللہ جانتا ہے اور شرک پر اڑے رہنے کے جو باطنی محرکات ہیں باطنی جذبات ہیں وہ بھی اللہ کے سامنے ہیں، اور ان کا ظاہری کردار بھی اللہ کے سامنے ہے، بے شک اللہ تعالیٰ کو مستکبرین اچھے نہیں لگتے، اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ: اللہ تعالیٰ محبت

نہیں کرتا۔ "محبت نہیں کرتا" کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ کو ان سے نفرت ہے۔ مستکبر استکبار سے ہے اکڑنے والا، جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ حق بات دلیل کے ساتھ سامنے آبھی جائے پھر بھی اس کو نہ مانے وہ ہوتا ہے مستکبر، جیسا کہ "مشکوٰۃ شریف" میں آپ نے پڑھا، ایک شخص نے پوچھا تھا کہ یارسول اللہ! کسی شخص کو اچھا لباس پسند ہے، اچھا جوتا پسند ہے، تو کیا یہ بھی تکبر میں داخل ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ نہ! یہ تو جمال ہے، اِنَّ اللہَ جَمِیْلٌ یُّحِبُّ الْجَمَالَ، یہ تو اچھی صفت ہے کہ انسان صاف ستھرا ہو، اچھا لباس پہنے، اچھا جوتا پہنے، تکبر تو ہے: بَطَرُ الْحَقِّ وَغَمْطُ النَّاسِ، کہ حق بات کے سامنے اڑ جانا، حق بات کو قبول نہ کرنا، اور لوگوں کو نفرت کے ساتھ اور حقارت کے ساتھ دیکھنا یہ ہے تکبر۔[1] تو یہاں مستکبرین کا موقع محل بھی ہے کہ یہ صرف ایک اپنی ذاتی طور پر ہٹ دھرمی کی بنا پر اور ایک بڑائی کا تصور کیے ہوئے حق بات کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں، ورنہ ان کے نظریات ان کے نزدیک بھی اب کسی صحیح دلیل پر مبنی نہیں ہیں، تو ایسے لوگ اللہ کو اچھے نہیں لگتے، اللہ تعالیٰ انہی لوگوں سے محبت کرتا ہے جو حق واضح ہو جانے کے بعد اس کو قبول کر لیتے ہیں، بلاوجہ اپنے مسئلے کے اُوپر اَڑی نہیں اختیار کرتے۔

قرآنِ کریم کے متعلق رُؤسائے مشرکین کی بدعقیدگی

وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ: اور جب ان سے پوچھا جاتا ہے، مَّاذَاۤ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ: تمہارے رَبّ نے کیا اُتارا؟ قَالُوْۤا اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ: وہ کہتے ہیں کہ پہلے لوگوں کی قصے کہانیاں۔ "اساطیر" یہ "اُسطورۃ" کی جمع ہے، ایسے قصے جو پہلے چلے آرہے ہیں، اِذَا قِیْلَ لَهُمْ: جب ان سے پوچھا جاتا ہے، پوچھنے والے کون لوگ ہیں؟ اس کو آپ اس انداز میں سمجھ لیجئے! کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے جس وقت حق نازل کیا گیا اور یہ کتاب اتری تو جو سردار قسم کے لوگ ہوتے ہیں، متبوع، وہ تو حُبِّ جاہ کی بنا پر اس کو قبول کرنے سے اَڑے ہوئے ہوتے ہیں تاکہ اپنی سرداری میں فرق نہ آئے، لیکن عوام الناس کے اندر چونکہ یہ کبر اور غرور نہیں ہوتا اور وہ حبِ جاہ میں مبتلا نہیں ہوتے، ان کے سامنے جس وقت ایک حق بات آتی ہے تو وہ بسا اوقات سوچتے ہیں، سوچ لینے کے بعد اس کو قبول کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اب عرب میں، مکہ معظمہ میں اور مکہ معظمہ کے اردگرد ماحول میں جب قرآنِ کریم نے اپنی آواز بلند کی اور حق نمایاں ہوا تو نچلے طبقے کے قلوب کے اندر تردد کا پیدا ہو جانا یقینی بات تھی، لیکن عملی زندگی کے اندر وہ اپنے سرداروں کے تابع ہوتے ہیں، اپنے لیڈروں کے تابع ہوتے ہیں، تو پھر وہ تحقیق کرنے کے لئے کہ ہمارے بڑوں کا اس بارے میں کیا خیال ہے، یعنی اپنے دل میں تو وہ کلامِ الٰہی سے متاثر ہو رہے ہیں، اور وہ بات ان کی سمجھ میں آرہی ہے، لیکن اپنے بڑوں کے پاس جاتے ہیں تاکہ ان کی رائے بھی معلوم کرلیں، جماعتی زندگی کے اندر جو ان کے سردار ہیں، قبائل کے اندر جن کو قیادت کا درجہ حاصل ہے، وہ ان سے جاکر پوچھتے ہیں کہ یہ جی آج کل جو پڑھا جارہا ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی کلام ہے اس کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟ وہ آگے سے کہتے ہیں کچھ نہیں، یہ تو پہلے لوگوں کی قصے کہانیاں ہیں، یوں کہہ کے ان کو اس کتاب کے قبول کرنے سے روکتے ہیں، اِذَا قِیْلَ لَهُمْ کا یہی معنی ہے کہ جب ان کے نچلوں کی طرف سے، ان کے متبوعین کی طرف سے تحقیقِ حال کے لئے، ان کی رائے معلوم کرنے

---

(1) صحیح مسلم ۱/۶۵ باب تحریم الکبر وبیانہ/مشکوٰۃ ۲/۴۳۳ باب الغضب والکبر، فصل اول۔

کے لئے پوچھا جاتا ہے کہ یہ جو رَبُّکُمْ: تمہارے رَبّ نے جو اتارا، یعنی جس طرح سے لوگ کہتے ہیں، تو اس کی کیا حقیقت ہے؟ مَاذَآ اَنْزَلَ رَبُّکُمْ کا فقرہ اس موقع کے مطابق استعمال کرتے ہیں جو ان کے کان میں پڑتا تھا، جب انہیں کہا جارہا تھا کہ یہ کتاب تمہارے رَبّ نے اتاری ہے، اسی انداز سے اس کو وہ نقل کرتے ہیں، ورنہ وہ یا ان کے سردار اس کو مَاذَآ اَنْزَلَ رَبُّکُمْ کا مصداق نہیں سمجھتے تھے، کہ یہ اللہ کا اتارا ہوا ہے، لیکن ایک فقرہ جس انداز میں ان کے سامنے آتا ہے کہ یہ کتاب اللہ نے اتاری، اسی کی تحقیق کے لئے وہ اپنے بڑوں سے سوال کرتے ہیں، اور بڑے کہتے ہیں کہ کچھ نہیں، یہ تو پہلے لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں، کوئی قومِ عاد کا قصہ آگیا، کوئی قوم ثمود کا آگیا، فلاں کا آگیا، ورنہ یہ اللہ کا اتارا ہوا نہیں ہے۔

دُوسروں کو گمراہ کرنے والوں کے ساتھ قیامت کے دِن کیا معاملہ ہوگا؟

لِیَحْمِلُوْٓا اَوْزَارَهُمْ کَامِلَةً یَّوْمَ الْقِیٰمَةِ: یہ لام لامِ عاقبت ہے جیسے ''شرح مائۃ عامل'' میں آپ نے پڑھا تھا لَزِمَ الشَّرَّ لِلشَّقَاوَةِ: اس نے بُرائی کو لازم پکڑا جس کا نتیجہ بدبختی ہے، تو یہ لام بھی لامِ عاقبت ہے، ماقبل والے عمل کا نتیجہ واضح کرتا ہے، ترجمہ اس کا یونہی ہوگا ''ان کے اس کہنے کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ اٹھائیں گے وہ اپنے بوجھ پورے پورے قیامت کے دن، اور ان لوگوں کے بوجھوں سے بھی کچھ جن کو گمراہ کرتے ہیں بغیر علم کے'' اَلَا سَآءَ مَا یَزِرُوْنَ: خبردار! بری وہ چیز ہے جس کو یہ اٹھائیں گے۔ وَزَرَ یَزِرُ بوجھ اُٹھانے کو کہتے ہیں، خصوصیت کے ساتھ معصیت اور گناہوں کا بوجھ۔ ان کی اس گفتگو کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ قیامت کے دن اپنے بھی پورے پورے بوجھ اٹھائیں گے، ساری کی ساری گمراہی اور ضلالت ان کے سر پر بھی پڑے گی، اور پھر یہ اساطیر الاولین کہہ کے لوگوں کو گمراہ کررہے ہیں، بغیر علم کے بغیر تحقیق کے جاہلیت کی بنا پر جو لوگوں کو گمراہ کررہے ہیں تو جو اِن کے پیچھے لگ کے گمراہ ہوں گے اُن کے بوجھوں میں سے بھی کچھ بوجھ یہ اٹھائیں گے، کچھ بوجھ اس لئے کہا کہ وہ گمراہ بھی سبکدوش نہیں ہوں گے، وہ اپنا بوجھ بھی اٹھائیں گے، لیکن گمراہی کا سبب بننے کی بنا پر اُن کے گناہ میں سے اِن کو بھی حصہ ملے گا۔ جس طرح سے حدیث شریف میں بہت ساری روایات میں یہ بات واضح کردی گئی ''مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً فَلَهٗ اَجْرُهَا وَاَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا'' کہ جو شخص بھی کوئی اچھا طریقہ جاری کرتا ہے تو اس کو اس طریقے کا ثواب ملتا ہے اور جتنے لوگ بھی اس کے اوپر عمل کرتے جاتے ہیں اُن کے اجر میں سے بھی اِس کو اجر ملتا چلا جاتا ہے۔ اور اس بانی کو، موجد کو، اچھے طریقے کے چلانے والے کو جو ثواب ملے گا وہ عمل کرنے والوں کے عمل سے کاٹا نہیں جائے گا، بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے طور پر یہ دیں گے۔ اور بالکل اسی طرح سے اس کے مقابلے میں دوسرا فقرہ حدیث شریف میں آیا ''مَنْ سَنَّ سُنَّةً سَیِّئَةً فَعَلَیْهِ وِزْرُهَا وَوِزْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا'' کہ جو کوئی بُرا طریقہ جاری کرے گا اس بُرے طریقے کے جاری کرنے کا بوجھ اس پر پڑے گا، اور جو لوگ بھی اس برے طریقے کے اوپر عمل کرنے والے ہوں گے ان کے گناہوں میں سے بھی اس کو حصہ ملے گا۔[1] اور یہ سلسلہ الیٰ یوم القیامۃ ہے، قیامت تک اس طریقے پر چلنے والے لوگوں کے گناہوں میں سے اس کو حصہ ملے گا جو ان

---

(۱) احکام القرآن للجصاص، سورۃ توبہ آیت ۱۰۰ کے تحت۔ واللفظ لہ/ نیز مسلم ۳۴۱/۲ باب من سنۃ حسنۃ/ ابن ماجہ ص ۱۸ باب من سن سنۃ حسنۃ

کی گمراہی کا سبب بنا ہے، اسی لئے آپ کے سامنے ذکر کیا گیا تھا کہ حضرت آدم علیہ السلام کا بیٹا جس نے قتل کا طریقہ جاری کیا، ''اَوَّلُ مَنْ سَنَّ الْقَتْلَ''، یہ قابیل کے متعلق جو آیا کہ پہلا وہ شخص جس نے دنیا کے اندر قتل کا طریقہ جاری کیا، جہاں کہیں بھی کوئی شخص ظلماً قتل کیا جاتا ہے اُس کے قتل کا گناہ اس قابیل کے پلے بھی ڈالا جاتا ہے جس نے ابتدا ابتدا کے اندر اس قتل کی رسم کو جاری کیا تھا۔[1] تو یہاں وہی بات ہے کہ جن کو یہ بغیر تحقیق کے اور بغیر علم کے گمراہ کرتے ہیں ان کے گناہوں میں سے بھی کچھ گناہ یہ اٹھائیں گے، کچھ گناہوں کا بوجھ یہ اٹھائیں گے، اَلَا سَآءَ مَا یَزِرُوْنَ: خبردار! بُری ہے وہ چیز جس کو یہ اٹھائیں گے، یعنی یہ بوجھ جو لد کے جائے گا، اور اس بوجھ کو اُٹھا کر لے جائیں گے تو اس کا نتیجہ کوئی اچھا نہیں نکلے گا، بلکہ اس کے نتیجے میں جہنم کے اندر ڈال دیے جائیں گے، تو جو بوجھ ان پر لدا ہوا ہوگا بہت بُرا ہوگا۔ مَا یَزِرُوْنَ یہ سَآءَ کا فاعل ہے۔ بُری ہے وہ چیز جس کو بھی یہ اٹھا کر لائیں گے۔

حق کے خلاف تدابیر کرنے کا اَنجامِ بد

قَدْ مَکَرَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتَی اللّٰهُ بُنْیَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَیْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَاَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَیْثُ لَا یَشْعُرُوْنَ: مَکْرٌ کا لفظ آپ کے سامنے بہت دفعہ گزر گیا کہ یہ خفیہ تدبیر کرنے کو کہتے ہیں، اگر کسی اچھے کام کے لئے کی جائے تو وہ اچھی ہوتی ہے، کسی بُرے کام کے لئے کی جائے تو بُری ہوتی ہے، اس لیے (دوسری جگہ ہے) مَکَرُوْا وَمَکَرَ اللّٰهُ، مکر کی نسبت اللہ کی طرف بھی آئی ہے اور دوسرے لوگوں کی طرف بھی آئی ہے۔ قَدْ مَکَرَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ: حق سے روکنے کی جیسے یہ تدبیریں کر رہے ہیں ان سے پہلے لوگوں نے بھی اسی قسم کی بہت تدبیریں کی تھیں، فَاَتَی اللّٰهُ بُنْیَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ: قواعد قاعدۃ کی جمع ہے، قاعدہ بنیاد کو کہتے ہیں، اور بنیان کا معنی عمارت ہے۔ ''پھر آیا اللہ ان کی عمارت کے پاس اس کی بنیادوں کی طرف سے'' لفظی معنی یوں بنے گا، ''اللہ تعالیٰ بنیادوں کی طرف سے ان کی عمارت کے پاس آیا''، فَخَرَّ عَلَیْهِمُ السَّقْفُ: پھر گرگئی اُن کے اوپر چھت، مِنْ فَوْقِهِمْ: اوپر سے، وَاَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَیْثُ لَا یَشْعُرُوْنَ: اور ان کے پاس عذاب آگیا ایسی جگہ سے جہاں وہ شعور بھی نہیں رکھتے تھے، ان کو خیال بھی نہیں تھا کہ ادھر سے عذاب آسکتا ہے وہاں سے ان کے پاس عذاب آگیا۔ تو فَاَتَی اللّٰهُ بُنْیَانَهُمْ کا محاورۃً ترجمہ ہوگا کہ اللہ نے ان کی عمارت ڈھادی، اللہ تعالیٰ نے ان کی عمارت کو بیخ و بن سے اکھیڑ دیا، انہوں نے بڑی بڑی عمارتیں کھڑی کیں، بڑے بڑے محل تعمیر کیے مکر وفریب کے، تاکہ لوگوں کو حق سے روک دیا جائے، لیکن ان کی ساری کی ساری تدبیریں انہی کے خلاف پڑیں، اور ان تدبیروں کے نتیجے میں دنیا اور آخرت کو برباد کر بیٹھے، حق کی آواز کو دبا نہیں سکے، حق کی آواز تو نمایاں ہو کے رہتی ہے۔ اسی طرح سے یہ جتنی چاہے تدبیریں کرلیں اور جس قدر چاہیں زور لگالیں حق کو روکنے کے لئے ان کی تدبیریں نتیجۃً انہی کے لئے نقصان کا باعث ہوں گی۔ اور آج یہ سمجھتے ہیں کہ ہم قوت والے ہیں، جماعت والے ہیں، خوشحالی والے ہیں، ہمارے پاس عذاب کدھر سے آسکتا ہے؟ پہلے لوگ بھی ایسے ہی سمجھا کرتے تھے، لیکن جب اللہ کا عذاب آیا تو پھر ایسے طور پر آیا کہ ان کو شعور ہی نہیں تھا کہ یہ کدھر سے آگیا۔ ''مکر کیا، تدبیریں کیں ان لوگوں نے جو ان سے پہلے گزرے ہیں، پھر اللہ نے ان کی عمارت کو بنیادوں سے اکھیڑ دیا، پھر گرگئی ان

---

(۱) بخاری ۱/۶۹ ۴ باب خلق آدم/مشکوٰۃ ص ۳۲، کتاب العلم، فصل اول، عن ابن مسعودؓ

کے او پر چھت ان کے اوپر سے، اور آیا ان کے پاس عذاب ایسی جگہ سے کہ ان کو شعور نہیں تھا' لَا یَشْعُرُوْنَ: وہ سمجھتے نہیں تھے۔ ثُمَّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ یُخْزِیْهِمْ: یہ تو دنیا کے اندر بربادی آئی، پھر قیامت کے دن اللہ انہیں رسوا کرے گا، وَیَقُوْلُ اَیْنَ شُرَكَآءِیَ: اور یہ بھی ایک رُسوائی کی بات ہے کہ اس وقت ان کو ڈانٹتے ہوئے یوں کہا جائے گا کہ کہاں ہیں وہ میرے شرکاء جن کے متعلق تم ضد کیا کرتے تھے، الَّذِیْنَ كُنْتُمْ تُشَآقُّوْنَ فِیْهِمْ: جن کے بارے میں تم جھگڑا کرتے تھے، جن کی حمایت کے اندر تم ہمیشہ آستینیں چڑھائے رہتے تھے، ان کی حمایت میں ہر وقت لنگوٹا کسے ہوئے تھے، جو بھی اُن کے خلاف آواز اٹھاتا اس پر چڑھ دوڑتے تھے، آج وہ کہاں چلے گئے جن کے بارے میں تم جھگڑا کیا کرتے تھے؟ قَالَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ: جن کو علم دیا گیا، یعنی یہ تو بغیر علم کے گمراہ کرتے ہیں، انبیاء علیہم السلام کے پاس صحیح علم ہے اور انبیاء علیہم السلام کے متبعین کے پاس صحیح علم ہے، یہ اہلِ علم کہیں گے، اِنَّ الْخِزْیَ الْیَوْمَ وَالسُّوْٓءَ عَلَى الْكٰفِرِیْنَ: بے شک رُسوائی آج کے دِن اور بُرائی (وَالسُّوْٓءَ کا عطف اَلْخِزْیَ کے اوپر ہے) آج کے دن رسوائی اور بُرائی انہی لوگوں پر ہے جو انکار کرنے والے تھے، یعنی پھر ان کو دیکھ دیکھ کے اہلِ علم خوش ہوں گے کہ ہم جو باتیں کہتے تھے وہ صحیح نکلیں، اور یہ ہمیں وہاں ذلیل کرنے کی کوشش کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ ہم عزت والے ہیں، لیکن آج رُسوائی اور بُرائی جتنی تھی وہ سب انہی کافروں پر آ پڑی۔ الْكٰفِرِیْنَ سے کون لوگ مراد ہیں؟ اس کی آگے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے وضاحت ہے کہ جن کے لئے قیامت میں بُرائی اور رُسوائی ہوگی اس سے وہ لوگ مراد ہیں جو زندگی بھر کُفر کرتے رہے، حتی کہ ان کی موت بھی کُفر پر آئی، کیونکہ اگر کوئی شخص کُفر کا ارتکاب کرے لیکن مرنے سے پہلے پہلے مؤمن ہو جائے، تو چاہے اس نے زندگی میں کتنی ہی بُرائیاں کی ہوئی ہوں ساری مٹ جاتی ہیں، تو یہ کافرین جو کہ رُسوا ہوں گے اور بُرے حالات کے اندر مبتلا ہوں گے یہ وہ ہیں کہ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ ظَالِمِیْٓ اَنْفُسِهِمْ: جن کو وفات دیتے ہیں فرشتے اس حال میں کہ وہ لوگ اپنے نفسوں پر ظلم کرنے والے ہوتے ہیں، یعنی اپنے نفسوں پر ظالم ہوتے ہیں ایسی حالت میں فرشتے ان کو وفات دیتے ہیں، اپنے نفسوں پر ظلم کرنے والے ہوتے ہیں یعنی کُفر و شرک میں مبتلا ہوتے ہیں، کُفر و شرک میں مبتلا ہونے کی حالت میں جن کو فرشتے وفات دے دیتے ہیں ان کافروں سے وہ کافر مراد ہیں، ورنہ اگر زندگی میں پہلے کُفر کیا ہے لیکن مرنے سے پہلے پہلے ایمان لے آئیں تو ان کے کُفر کا اثر مٹ جاتا ہے۔ ''یہ کافر وہ لوگ ہیں کہ وفات دیتے ہیں ان کو فرشتے اس حال میں کہ وہ لوگ اپنے نفسوں پر ظلم کرنے والے ہوتے ہیں'' فَاَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ: آج تو ان کا بڑا طمطراق ہے اور بڑا جوش و خروش دکھاتے ہیں، لیکن جب اللہ کے عذاب کا ایک تھپیڑ لگے گا اس وقت یہ ساری اکڑ نکل جائے گی، فَاَلْقَوُا السَّلَمَ: سَلم تسلیم کے معنی میں ہے، یہ تسلیم کا اسم ہے۔ اِلقاء: ڈالنا۔ فرمانبرداری ڈالیں گے، یعنی سپردگی اختیار کرلیں گے، جس طرح کسی کے سامنے انسان گر پڑتا ہے اور اپنے آپ کو سپرد کر دیتا ہے، عاجزی کا اظہار کرتا ہے۔ اور سَلم کا ترجمہ صلح کے ساتھ بھی کیا گیا ہے، ''اطاعت، فرمانبرداری، صلح ڈالیں گے'' یعنی اللہ تعالیٰ کے سامنے پھر اس قسم کا اظہار کریں گے، جس طرح سے کوئی شکست خوردہ آدمی سپر ڈال دیتا ہے، اردو کے محاورے کے مطابق، اس دن یہ سپر ڈال دیں گے، شکست تسلیم کرلیں گے، اطاعت اور فرمانبرداری کا اظہار کریں گے، اور ساتھ یہ بھی کہیں گے کہ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ: یہ جھوٹ بولیں گے جان چھڑانے کے لئے۔ مِنْ سُوْٓءٍ، یہ نکرہ تحت نفی ہے۔ ہم تو کوئی کسی قسم کا بُرا کام کرتے ہی نہیں تھے۔ یہ ویسے ہی ہے جیسے دوسری جگہ آتا ہے وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا

مُشْرِكِيْنَ (الانعام: ۲۳) انکار کر دیں گے کہ ہم تو مشرک تھے ہی نہیں، تو شرک کرنے کا انکار کر بیٹھیں گے، جس کے جواب میں اللہ تعالیٰ کہے گا کہ (اُنْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ) دیکھو! اپنے آپ پر کیسے جھوٹ بولتے ہیں۔ تو دنیا کے اندر تو شرک کی حمایت کے اندر ہر وقت آستینیں چڑھائے ہوئے تھے، ہر وقت مقابلے کے لئے تیار رہتے تھے اور ان کے شرکاء کے متعلق ذرا کوئی زبان کھولتا تھا تو پتھر اُٹھا کر اس کے پیچھے لگ جاتے تھے، اور اس کو مارتے تھے ذلیل کرتے تھے، اور آج سرے سے انکار کر بیٹھے کہ ہم تو مشرک تھے ہی نہیں، دیکھو! کیسے جھوٹ بول رہے ہیں اپنے آپ پر۔ تو یہ بھی اُسی قسم کا جھوٹ ہے جو کہیں گے کہ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ: ہم تو کوئی بُرا کام کرتے ہی نہیں تھے۔ تو جواب یہ ملے گا بَلٰٓى اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ: کیوں نہیں، بے شک اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہے ان کاموں کو جو تم کیا کرتے تھے، سب کچھ اللہ کے علم میں ہے، اب عذر معذرت کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا، فَادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا: داخل ہو جاؤ جہنم کے دروازوں میں اس حال میں کہ ہمیشہ رہنے والے ہو گے اس میں، فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ: متکبرین کا ٹھکانا بہت ہی برا ہے، البتہ برا ہے ٹھکانا متکبرین کا۔ تو یہاں بھی ان کو متکبر کے عنوان سے ذکر کیا گیا ہے جس طرح سے پیچھے مستكبر کے لفظ سے ذکر کیا گیا تھا، کہ کفر و شرک آج دنیا میں جتنا اختیار کیے بیٹھے ہیں یہ سب ان کے تکبر کا نتیجہ ہے، ایک بڑائی کے احساس کا نتیجہ ہے کہ ہم بڑے ہو کر ان کے پیچھے کیوں لگ جائیں، ''ان متکبروں کا ٹھکانا برا ہوگا۔''

قرآنِ کریم کے متعلق متقین کی عقیدت اور ان کا انجامِ خیر

وَقِيْلَ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا مَاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ: جو لوگ تقویٰ اختیار کیے ہوئے ہیں، جو اللہ سے ڈرتے ہیں، جو کفر و شرک سے باز آ گئے اگر ان سے پوچھ لیا جاتا ہے کہ مَاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ، یہ اُسی سوال کا مقابل آ گیا، کہ ان کافروں سے پوچھا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ، لیکن جن کو حقیقت تک رسائی ہوگئی، وہ اللہ سے ڈرنے والے ہیں، کفر و شرک سے بچنے والے ہیں جب ان کے سامنے یہ سوال کیا جاتا ہے کہ مَاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ: تمہارے ربّ نے کیا اتارا؟ قَالُوْا خَيْرًا: وہ کہتے ہیں کہ بھلائی ہی بھلائی ہے، سراپا خیر ہی خیر ہے جو کچھ اللہ نے اتارا ہے، قَالُوْا خَيْرًا: یعنی اَنْزَلَ رَبُّنَا خَيْرًا اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے خیر اُتاری ہے، یعنی جو کچھ اُتارا ہے اس میں بھلائی ہی بھلائی ہے، یہ سراپا خیر ہے جو کچھ اللہ نے اتارا ہے، اس لفظ کے اندر وہ قرآنِ کریم کے متعلق اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۚ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ: ان کا انجام پھر یہ ہوگا، ''ان لوگوں کے لئے جو اس دنیا کے اندر بھلائی کرتے ہیں بھلائی ہے'' وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ: اور آخرت کا دار تو بہت ہی اچھا ہے۔ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا: ان لوگوں کے لئے جو کہ اچھائی اختیار کرتے ہیں، احسان کی صفت اپناتے ہیں، ہر کام کو ٹھیک کرتے ہیں، ہر وقت اللہ تعالیٰ کا استحضار رکھتے ہیں، جیسا کہ احسان کا مفہوم ہے، جو بارہا آپ کی خدمت میں عرض کر دیا گیا، کہ احسان کا عام مفہوم یہی ہے: ''مَا الْاِحْسَانُ، قَالَ: اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ''(۱) تو جس کا مطلب یہ ہے کہ عبادت کرتے وقت بلکہ زندگی کے ہر کام کے وقت یہ استحضار رکھا جائے کہ ہم اللہ کے سامنے ہیں، اللہ ہمارے سامنے ہے، ''جو اللہ کو ہر معاملے میں یاد رکھتے ہیں'' جب اللہ کو ہر معاملے

---

(۱) بخاری ص ۱۲ باب سوال جبریل/مسلم ص ۲۷ باب بیان الایمان الخ مشکوٰۃ ص ۱۱، کتاب الایمان کی دوسری حدیث

میں یاد رکھیں گے تو ہر کام کو اچھی طرح سے کریں گے، تو جنہوں نے دنیا کے اندر صفت احسان کو حاصل کر لیا، ہر کام کو اچھی طرح سے کرنے لگ گئے ان کے لئے بھلائی ہے، تو فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا کا تعلق بھلائی (حَسَنَةٌ) کے ساتھ بھی لگ سکتا ہے، ان کے لئے دنیا میں بھلائی ہے۔ فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا کا تعلق اَحْسَنُوْا سے بھی ہو سکتا ہے، حَسَنَةٌ سے بھی ہو سکتا ہے، ''جن لوگوں نے صفت احسان کو اپنایا ان کے لئے دنیا میں بھلائی ہے'' یا ''جنہوں نے دنیا میں صفت احسان کو اپنایا ان کے لئے بھلائی ہے'' پھر بھی بھلائی سے مراد وہی دنیوی بھلائی ہے، کیونکہ آخرت کا ذکر آگے آ گیا، وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَیْرٌ: اور آخرت کا گھر بہت بہتر ہے، وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِیْنَ: متقین کا گھر بہت ہی اچھا ہے، متقین کو جو گھر ملے گا وہ بہت اچھا ہے۔ جَنّٰتُ عَدْنٍ یَّدْخُلُوْنَهَا تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ: ہیشگی کے باغات ہیں، داخل ہوں گے ان میں، جاری ہوں گی ان کے نیچے سے نہریں، لَهُمْ فِیْهَا مَا یَشَآءُوْنَ: دیکھو! اس فقرے کے اندر سب کچھ آ گیا، ان کے لئے ان باغات میں وہ چیز ہوگی جو وہ چاہیں گے، جو وہ چاہیں گے ان کو ملے گا (''مَا'' عموم کے لئے آ گیا)، انسان کی ہر خواہش پوری کر دی جائے گی، كَذٰلِكَ یَجْزِی اللّٰهُ الْمُتَّقِیْنَ: اللہ تعالیٰ متقین کو اسی طرح سے جزا دیتا ہے۔

''متقین'' کون لوگ ہیں؟

اور یہ متقین کون لوگ ہیں؟ یہاں بھی اسی طرح سے وضاحت کر دی، جیسے خراب انجام انہی کافروں کا ہوگا جو موت تک کافر رہے، اسی طرح سے متقین جن کو آخرت میں اللہ یہ جزاء دے گا اس سے مراد وہ ہیں جو موت تک متقی رہے، اگر زندگی میں کوئی شخص نیکیاں کرتا رہا لیکن موت سے قبل وہ بُرائی کی طرف آ گیا تو زندگی کی نیکیاں برباد ہو جاتی ہیں، ان کے اوپر یہ کوئی جزا نہیں آئے گی، ہاں! البتہ موت کے وقت جو شخص تقویٰ اختیار کیے ہوئے ہوگا اس کے لئے یہ جزا ہے۔ متقین سے مراد وہ لوگ ہیں کہ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَیِّبِیْنَ: جن کو وفات دیتے ہیں فرشتے اس حال میں کہ وہ لوگ پاکیزہ ہیں، ہر قسم کی نجاستوں سے بچے ہوئے ہیں، معصیت کی نجاست سے، بداعتقادی کی نجاست سے، بدکرداری کی نجاست سے، جو دنیا سے صاف ستھرے جاتے ہیں، ''جن کو وفات دیتے ہیں فرشتے اس حال میں کہ وہ لوگ پاکیزہ ہوتے ہیں'' یَقُوْلُوْنَ: فرشتے انہیں کہتے ہیں سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ: تم پر سلامتی ہو، اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ: داخل ہو جاؤ جنت میں ان کاموں کی وجہ سے جو تم کیا کرتے تھے۔

کافروں کی ضد اور گزشتہ واقعات کے ساتھ ان کو وعید

هَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ تَاْتِیَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ: نہیں انتظار کرتے، یہ کافر مشرک جو سمجھائے ہوئے سمجھتے نہیں، نہیں انتظار کرتے مگر اس بات کا کہ آ جائیں ان کے پاس فرشتے یا آ جائے تیرے رَبّ کا حکم، ایسے ہی کیا ان لوگوں نے جو ان سے پہلے گزرے ہیں، وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ: اور ان کے اوپر اللہ نے ظلم نہیں کیا وَلٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ: لیکن یہ اپنے نفسوں پر خود ہی ظلم کرتے تھے۔ فَاَصَابَهُمْ سَیِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ: فَاَصَابَهُمْ: پھر پہنچا انہیں، سَیِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا: جو کچھ انہوں نے کیا اس کی سزائیں، سیئات سیئۃ کی جمع ہے، یہاں سیئہ سے سزا مراد ہے، جو کچھ انہوں نے کیا اس کی سزائیں ان کو پہنچیں اور گھیر لیا ان کو ان کاموں نے جن کے ساتھ کہ یہ استہزا کیا کرتے تھے۔ مطلب یہ ہوا کہ جس طرح سے آج یہ لوگ سمجھائے ہوئے نہیں سمجھتے پہلے لوگوں کا بھی

ایسے ہی حال تھا، یہ اس بارے میں منتظر بیٹھے ہیں کہ یا تو ان کے پاس فرشتے آجائیں یا براہ راست تیرے رَبّ کا عذاب کا حکم آجائے تب یہ سمجھیں گے، یعنی ان کا حال اس بات کے اوپر دلالت کرتا ہے، جو شخص دلیل سے نہیں سمجھتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک کوئی عذاب کا ڈنڈا سامنے نہیں آئے گا اس وقت تک یہ نہیں سمجھے گا، یا قیامت آجائے اور فرشتے عذاب لے کے سامنے آجائیں، لیکن اس وقت سمجھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ ”ایسے ہی کیا تھا ان لوگوں نے جو ان سے پہلے گزرے ہیں“ پھر جب وہ دنیا اور آخرت کے اندر عذاب کے اندر مبتلا ہوئے تو ان کو ملامت اپنے آپ کو کرنی چاہیے، اللہ نے تو ان پر کوئی زیادتی نہیں کی، جو انہوں نے کیا تھا اللہ نے تو اسی کا نتیجہ ان کے سامنے رکھ دیا، سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا: جو کچھ انہوں نے کیا اس کے برے نتائج، تو سَیِّاٰت: برے نتائج، ”ان کے کیے ہوئے کاموں کے برے نتائج ان کے سامنے آگئے، کیے ہوئے کاموں کی برائیوں نے انہیں گھیر لیا، ان کو برائیاں پہنچ گئیں“ یعنی ان کی سزائیں پہنچ گئیں، ”اور جس چیز کا وہ مذاق اُڑایا کرتے تھے، استہزا کیا کرتے تھے اس نے ان کو گھیر لیا“ اس مَا کَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ سے عذاب مراد ہے، کیونکہ انبیاء ﷺ جس وقت ان کو کوئی عذاب کی خبر دیتے تھے تو یہ آگے مذاق اُڑاتے تھے، تو مَا کَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ کا مصداق ہوا عذاب، اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو وعید آتی ہے، اللہ کا رسول جو وعید بیان کرتا ہے، اسی چیز نے ان کو گھیر لیا۔

شرک کرنے پر مشرکین کی جاہلانہ دلیل اور اس کا جواب

وَقَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ: ان لوگوں نے کہا جنہوں نے شرک کیا، اگر اللہ چاہتا تو ہم اللہ کے علاوہ کسی چیز کی پوجا نہ کرتے، نہ ہم کرتے نہ ہمارے آباء، وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ: اور نہ ہم اللہ کے حکم کے بغیر کسی چیز کو حرام ٹھہراتے، كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ: اسی طرح سے کیا ان لوگوں نے جو ان سے پہلے گزرے ہیں، فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ: نہیں ہے رسول کے ذمے مگر کھول کے پہنچا دینا۔ اس آیت کا حاصل یہ ہے کہ مشرکین کے پاس جب کوئی کسی قسم کی دلیل نہ رہتی انبیاء ﷺ کے جواب میں، تو پھر وہ یوں کہتے کہ اگر ہمارا یہ طریقہ برا ہے تو اللہ ہمیں روک کیوں نہیں دیتا، روکنے سے مراد یہ ہے کہ زبردستی روک دے، جب وہ روکتا نہیں بلکہ ہمیں اس نے قدرت دے رکھی ہے کہ ہم یہ کام کرلیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ سب اللہ کی رضا کے مطابق ہے، اگر اللہ چاہتا تو ہم بھی شریک نہ ٹھہراتے، ہمارے آباء بھی شریک نہ ٹھہراتے، ہم اللہ کے حکم کے علاوہ کسی چیز کو حرام نہ ٹھہراتے، لیکن جب اللہ نے ہماری رسی ڈھیلی چھوڑ رکھی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ راضی ہے، مقابلے میں وہ یہ دلیل بیان کرتے ہیں، لیکن یہ دلیل بالکل بدیہی البطلان ہے، جیسے کہ سورۂ انعام کے اندر آپ کے سامنے اس کی تفصیل آئی تھی، اس لیے اللہ نے اجمالاً سا اس کے اوپر نقض کیا ہے کہ ایسی باتیں وہ بھی کیا کرتے تھے جو ان سے پہلے گزرے ہیں، لیکن اللہ کا فیصلہ سامنے آگیا، عذاب آگیا، تو پتا چل گیا کہ ان کی یہ دلیل ٹھیک نہیں اور ان کا یہ طریقہ درست نہیں ہے، یہ دلیل بودی ہے، اس کا بطلان بدیہی ہے۔ تو یہ مشرکین کی دلیل ذکر کی ہے، یعنی انبیاء ﷺ کے مقابلے میں مشرک یوں کہتے تھے کہ جب ہم یہ کام کر رہے ہیں یا ہمارے آباء بھی کرتے رہے، اللہ چاہتا تو ہمیں روک دیتا، جب اللہ نے ہمیں چھٹی دے رکھی ہے کہ ہم یہ کام کرتے رہیں تو

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ ان کاموں پر راضی ہے۔ یہ جاہلانہ دلیل ہے، جاہلانہ دلیل اس لیے ہے کہ اس دلیل کا حاصل یہ ٹھہرا کہ جس کام کے کرنے پر انسان کو قدرت دے دی جائے اور اس کام کے کرنے پر فوراً پکڑا نہ جائے تو یہ اللہ کی رضا کی دلیل ہے، یہ حاصل ہے مشرکوں کی اس دلیل کا، کہ ایک انسان ایک کام کرتا ہے اور اس کام کے کرنے پر اللہ کی طرف سے فوراً گرفت نہیں آتی، اللہ نے اس کام کے کرنے کی قدرت دے رکھی ہے، تو یہ دلیل ہے کہ یہ کام درست ہے اور اللہ کی مرضی کے مطابق ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ اگر اس دلیل کو مان لیا جائے تو دنیا کے اندر کوئی کام بھی برا ثابت نہیں ہوسکتا، آخر آپ دیکھیں گے کہ ایسے کام بھی ہیں کہ جن کے بُرے ہونے کے اوپر پوری کی پوری انسانیت بھی متفق ہے اور وہ مشرک بھی بعض کاموں کو بُرا سمجھتے تھے، اور ان کو اپنے خیال کے مطابق وہ درست نہیں سمجھتے تھے، لیکن لوگ اس کو بھی کرر ہے تھے، وہ کام بھی لوگ کرتے ہیں، چوریاں لوگ کرتے ہیں، ڈاکے لوگ مارتے ہیں، زنا کرتے ہیں، بدمعاشیاں کرتے ہیں، یتیموں کا مال لوٹتے ہیں، کونسی بُرائی ایسی ہے جو دنیا میں نہیں ہوتی، اور کرنے والے ڈٹ کے کرر ہے ہیں، اور اس قسم کی بُرائیوں میں مبتلا ہیں اور خوب عیاشیاں کرر ہے ہیں، اللہ تعالیٰ زبردستی ان کو ان بُرائیوں سے روکتا نہیں، اور بُرائی کرتے ہی فوراً اس کے اوپر اللہ کی طرف سے گرفت نہیں آجاتی، تو مشرکوں کی اس دلیل کا حاصل تو یہ ہے کہ یہ سارے ہی ٹھیک ہیں، جو کچھ ہورہا ہے اللہ کی مرضی کے مطابق ہورہا ہے، اس دلیل کو مان لینے کے بعد اچھائی اور بُرائی کی تقسیم کیا رہ گئی؟ پھر تو جو دنیا میں ہوتا ہے، جس کے کرنے کے لئے اختیار اللہ نے انسان کو دے دیا اور اس کے کرتے ہی زبردستی اس کو روکا نہیں جاتا تو اس کا جواز ثابت ہوجائے گا اور وہ اللہ کی رضا کے مطابق ہوجائیں گے، تو اس سے زیادہ بڑھ کے جہالت اور کیا ہوسکتی ہے؟ تو یہ اللہ تعالیٰ کی منشاء کو سمجھتے نہیں، کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دنیا کے اندر مختار بنا کر بھیجا ہے اور اس کو کسی درجے میں آزادی دی ہے، جب آزادی دی ہے تو وہ ہر قسم کے کام کر سکے گا اللہ کے دیے ہوئے اختیار کی وجہ سے، جب کر سکے گا تو ان میں سے کون سا کام اللہ کی مرضی کے مطابق ہے اور کونسا کام اللہ کی مرضی کے مطابق نہیں، اس کا پتا چلے گا اللہ کے قانون سے، جو اللہ نے قانون اتارا، اس میں بتادیا کہ فلاں کام کرنے سے میں راضی ہوں فلاں کام کرنے سے میں راضی نہیں ہوں، تو اللہ کے قانون سے تقسیم ہوجائے گی کہ کون سے کام اچھے ہیں کون سے کام اچھے نہیں ہیں، تو اللہ نے کتابیں اتاریں، انبیاء کو بھیجا، جس میں یہ ظاہر کردیا کہ شرک کا طریقہ غلط ہے، شرک کا طریقہ صحیح نہیں، تو اب صرف اس کے وقوع سے دلیل پکڑنا کہ یہ اللہ کی رضا کے مطابق ہے، یہ بات صحیح نہیں۔ اب آگے یہ بات کہی جائے گی کہ اگر یہ طریقہ صحیح ہوتا تو پھر اس قسم کی بُرائیاں کرنے والے لوگ اللہ کے عذاب میں گرفتار کیوں ہوتے؟ انبیاء ﷺ نے ان کو خبر دی کہ اگر تم باز نہیں آؤ گے تو عذاب آئے گا، تو انبیاء ﷺ کی خبر کے مطابق ان کے اوپر عذاب آیا۔ دوسرے الفاظ میں آپ اس کو اس طرح سمجھ لیجئے! کہ آج ملک میں ایک قانون ہے جس میں قتل کو، چوری کو، ڈاکے کو، ڈکیتی کو جرم قرار دیا گیا ہے، لیکن اس کے باوجود اس ملک کی رعایا میں سے اکثر لوگ اس قسم کے کام کرتے ہیں، اب اگر آپ ان کو روکنا چاہیں اور یہ کہیں کہ یہ کام نہ کرو، برے ہیں، تو وہ کہیں کہ اگر یہ برے ہیں تو حکومت ہمیں روکتی کیوں نہیں؟ روکنے کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ جب تم کام کرنے لگو تو ہاتھ پکڑ لے، حکومت نے تو قانون بنادیا تمہیں روک دیا، باقی! اگر چند دن تم حکومت کے قبضے

میں نہیں آرہے تو یہ حکومت کی رضا کی دلیل تو نہیں ہے، جس دن پکڑے جاؤ گے لٹک جاؤ گے، لیکن یہاں تو یہ ہے کہ ایک جگہ چوری ہوتی ہے اور اصحاب حکومت کو پتا نہیں چلتا، ارباب اقتدار اس کو پکڑ نہیں سکتے، ان کو قدرت حاصل نہیں ہے، اوران کا علم ناقص ہے، لیکن اللہ کی حکومت میں تو جو کچھ ہو رہا ہے اللہ کے قانون کے مطابق اگر وہ ناجائز ہے تو نہ وہ چھپا رہ سکتا ہے، نہ کہیں بھاگ کر چھوٹ سکتا ہے، اگر اپنی حکمت اور مصلحت کے تحت اس نے کچھ دن کے لئے مہلت دے رکھی ہے تو یہ اس کی رضا کی دلیل نہیں، نہ اُس فعل کے جواز کی دلیل ہے، تو ان کی اس جاہلانہ دلیل کو یہاں نقل کیا گیا ہے، اوراس پر انکار صرف اتنا سا کر دیا گیا کہ اس قسم کی باتیں پہلے لوگ بھی کرتے تھے، لیکن یہ دلیل ان کے مسئلے کو جائز ثابت نہیں کرتی جس کی بنا پر یہ لوگ دنیا اور آخرت میں اللہ کے عذاب سے بچ نہیں سکتے، جیسے کہ آگے آئے گا، انبیاء علیہم السلام زبردستی روکنے کے لئے نہیں آیا کرتے، ان کے ذمے تو صرف اللہ کی طرف سے صاف صاف پہنچا دینا ہے انہوں نے پہنچا دیا کہ یہ کام اللہ کی مرضی کے مطابق ہے جائز ہے، اور یہ کام اللہ کی مرضی کے خلاف ہے ناجائز ہے، یہ کام دنیا اور آخرت میں راحت کا باعث بنے گا، یہ کام دنیا اور آخرت میں ذلت کا باعث بنے گا، انبیاء علیہم السلام کے ذمہ تو وضاحت ہے، انبیاء زبردستی روکنے کے لئے نہیں آیا کرتے۔

گزشتہ واقعات سے عبرت حاصل کرنے کا حکم

(وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللهَ) ''البتہ تحقیق بھیجا ہم نے ہر جماعت میں رسول، یہ پیغام دے کر'' یہ اللہ کا قانون ہے جس کے اندر یہ وضاحت کر دی گئی کہ شرک اللہ کو منظور نہیں اور شرک اللہ کو پسندیدہ نہیں، اللہ کے قانون میں اس چیز کی وضاحت موجود ہے اور ہر نبی نے اس کا پرچار کیا ہے، ''البتہ تحقیق بھیجا ہم نے ہر جماعت کے اندر رسول یہ پیغام دے کر کہ عبادت کرو تم اللہ کی'' وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ: طاغوت کا لفظ پہلے سورۂ نساء میں بھی آیا تھا، طاغوت: شیطان، انتہائی درجے کا سرکش، طاغی باغی شخصیت جو ہوا کرتی ہے اس کو طاغوت کہتے ہیں، اس کا اعلیٰ فرد ابلیس ہے، اور جو کوئی ابلیس کے نمائندے ہوتے ہیں، دنیا کے اندر اللہ کے مقابلے میں بغاوت پھیلاتے ہیں، سرکشی اختیار کرتے ہیں وہ سب طاغوت کا مصداق ہیں، جو چیز اللہ سے روکتی ہے اور برائی کی طرف لے جاتی ہے وہ طاغوت ہے۔ فَمِنْهُم مَّنْ هَدَى اللهُ: جب اللہ کی طرف سے اس قانون کا اعلان ہوا تو ان میں سے بعض وہ تھے جن کو اللہ نے سیدھے راستے پر چلنے کی توفیق دی، هَدَى اللهُ کا یہی معنی ہوتا ہے، جنہوں نے نیک نیتی کے ساتھ انبیاء کی باتوں کو سنا تو اللہ نے انہیں ہدایت دی یعنی اچھے راستے پر چلنے کی توفیق دی، وَمِنْهُم مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلَالَةُ: اوران میں سے بعض وہ ہے کہ جس کے اوپر گمراہی ثابت ہوگئی، فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ: اب اگر تم یہ دیکھنا چاہتے ہو کہ کونسا طریقہ صحیح ہے اور کون سا طریقہ غلط ہے، اگر تم انبیاء علیہم السلام کی زبان سے نہیں سمجھتے، اللہ تعالیٰ کی کتاب میں لکھے ہوئے کو دیکھ کر اگر تم امتیاز نہیں کر سکتے تو زمین میں چلو پھرو اور کھنڈرات کی زبان سے قصے سن لو، زمین کے اوپر پھیلے ہوئے آثار تمہیں بتا دیں گے کہ انبیاء علیہم السلام کی مخالفت کرنے والوں کا انجام کیا ہوا، فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ: پھر تم چلو پھرو زمین میں، فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ: پھر دیکھ لو، ان جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا؟ جنہوں نے انبیاء علیہم السلام کی اس تعلیم کو جھٹلایا تھا جو انبیاء نے پیش کی تھی کہ اعْبُدُوا اللهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ، یہ شرک کے

مقابلے میں پیش کی تھی، کہ اللہ کی عبادت کرو اور شیطان سے بچ کے رہو، جنہوں نے اس بات کو قبول نہیں کیا بلکہ جھٹلایا ان کا انجام جا کے ان کھنڈرات کی زبان سے سن لو۔

سرورِ کائنات ﷺ کو تسلی

اِنْ تَحْرِصْ عَلٰی هُدٰىهُمْ: یہ سرورِ کائنات ﷺ کے لئے تسلی کی بات ہے۔ ”اگر آپ ان کی ہدایت پر حرص کریں“ یعنی آپ کا جی کتنا ہی چاہے کہ یہ راہ پر آجائیں، فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ مَنْ یُّضِلُّ: پس بے شک اللہ تعالیٰ راستہ نہیں دکھاتا اس شخص کو جس کو اللہ بھٹکا دیتا ہے، یعنی اس کی بدکرداری کی بنا پر جس کو ضلالت میں ڈال دیا اس کو اللہ سیدھے راستے پر نہیں چلائے گا، وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ: اور نہ ان کے لئے کوئی مددگار ہوگا۔

مشرکین کا انکارِ معاد اور اللہ کی طرف سے جواب

یہ تو شرک کی بات تھی اور انبیاء ﷺ کے انکار کی بات تھی، اب آگے معاد کا تذکرہ آ گیا کہ جیسے یہ شرک پر اڑے ہوئے ہیں، نبوت کے منکر ہیں، اسی طرح سے یہ معاد کے بھی منکر ہیں، وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَیْمَانِهِمْ: قسمیں کھاتے ہیں اللہ کی پختہ قسمیں، جَهْدَ اَیْمَانِهِمْ کی ترکیب ہوا کرتی ہے: مُجتهدِینَ فی توکیدِ اَیْمَانِهِم، اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں اور ان قسموں کے پختہ کرنے میں خوب کوشش کرنے والے ہیں، بڑی پکی قسمیں کھاتے ہیں، قسمیں کھا کے کیا کہتے ہیں؟ لَا یَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ یَّمُوْتُ: جو مر جائے گا اللہ اسے اٹھائے گا نہیں، کیونکہ وہ اللہ کے وجود کے تو قائل تھے، انکارِ آخرت ان الفاظ میں کرتے تھے کہ جو مر جائے گا اللہ تعالیٰ اسے دوبارہ نہیں اٹھائے گا، یہ بات غلط ہے جو کہتے ہیں کہ مر کے دوبارہ اٹھنا ہے، بَلٰی وَعْدًا عَلَیْهِ حَقًّا: یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب ہے، کیوں نہیں اٹھائے گا اللہ تعالیٰ، اللہ کے ذمے یہ سچا وعدہ ہے، وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ: لیکن اکثر لوگ اس بات کو جانتے نہیں ہیں، ان کو علم نہیں ہے۔

اثباتِ معاد اور اس کی حکمت

لِیُبَیِّنَ: کیوں اُٹھائے گا؟ بَلٰی کے اندر جس طرح سے جواب ہے، بَلٰی: کیوں نہیں، یعنی اللہ تعالیٰ اٹھائے گا۔ کیوں اُٹھائے گا، اس اٹھانے میں حکمت یہ ہے ”تاکہ واضح کر دے ان لوگوں کے لئے وہ بات جس میں کہ یہ اختلاف کیا کرتے تھے اور تاکہ جان لیں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا“، اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰذِبِیْنَ: کہ وہ جھوٹے تھے اس بات میں کہ لَا یَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ یَّمُوْتُ، مطلب یہ ہے کہ بعث اس لئے ضروری ہے کہ غلط غلط ہو کے سامنے آجائے، صحیح صحیح ہو کے سامنے آجائے، حق اور باطل کی کشمکش کا فیصلہ ہو جائے، جس وقت تک آخرت نہیں آئے گی یہ فیصلہ کیسے ہوگا۔ ”اللہ تعالیٰ اٹھائے گا تاکہ واضح کر دے ان لوگوں کے لئے اس بات کو جس میں یہ اختلاف کرتے تھے اور تاکہ جان لیں کافر لوگ کہ بے شک وہ جھوٹے تھے“ جھوٹے اسی بات میں جس کا ذکر اوپر آیا ہوا ہے لَا یَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ یَّمُوْتُ۔ باقی تمہارا یہ کہنا کہ اٹھائے گا نہیں، اس کا منشاء یہ ہے کہ تم سمجھتے ہو کہ اٹھائے جا سکتے نہیں، مرنے کے

بعد ہڈیوں کے بوسیدہ ہوجانے کے بعد دوبارہ زندہ کیسے کیے جائیں گے، تو اس بارے میں ہماری بات سن لو، اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَیْءٍ اِذَآ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ: ہمیں کوئی اہتمام نہیں کرنا پڑتا، ہماری قدرت سے کوئی چیز بعید نہیں ہے، "سوائے اس کے نہیں کہ ہمارا کہنا کسی شئ کو جب ہم اس کے متعلق ارادہ کرلیں کہ وہ ہوجائے، کسی چیز کے متعلق اگر ہم ارادہ کرلیتے ہیں تو ہمارا قول یہی ہوتا ہے کہ ہم اس کو کہہ دیتے ہیں كُنْ۔ فَیَكُوْنُ: پس وہ ہوجاتی ہے، ہمیں کوئی اہتمام کرنے کی ضرورت نہیں، جس وقت ہمارا ارادہ متعلق ہوگا اسی وقت وہ چیز وجود میں آجائے گی، تو ہماری قدرت اتنی محیط ہے کہ ایک کلمہ کن کے ساتھ ہر کسی کو موجود کیا جاسکتا ہے، تو پھر تمہارا بعث کا انکار اس بنا پر کہ کون زندہ کرے گا، زندہ نہیں کیا جاسکتا، ہڈیوں میں زندگی میں نہیں ڈالی جاسکتی، یہ تو ہماری قدرت کا انکار ہے، اور ہماری قدرت تو یہ ہے کہ جس چیز کے متعلق بھی ہم ارادہ کرلیں، چھوٹی ہو بڑی ہو، ابتداءً پیدا کرنا ہو، دوبارہ پیدا کرنا ہو، ہمارے ارادے کی دیر ہے کہ ہم نے كُنْ کہا، پس وہ چیز ہوجاتی ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۭ وَلَاَجْرُ

اور وہ لوگ جنہوں نے گھربار چھوڑا اللہ کی رضا کے لئے مظلوم ہونے کے بعد البتہ ضرور ٹھکانا دیں گے ہم انہیں دُنیا میں اچھا اور آخرت

الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿٤١﴾ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰي رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿٤٢﴾ وَمَآ

کا اجر بڑا ہے، کاش! کہ یہ لوگ جانتے ﴿۴۱﴾ جن لوگوں نے صبر کیا اور اپنے رَبّ کے اوپر وہ بھروسا رکھتے ہیں ﴿۴۲﴾ نہیں

اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ

بھیجا ہم نے آپ سے پہلے مگر آدمیوں کو ہی، ہم ان کی طرف وحی کرتے ہیں، اہلِ علم سے پوچھ لو اگر تمہیں

لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٤٣﴾ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ ۭ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ

پتا نہیں ﴿۴۳﴾ (ہم نے بھیجا) واضح دلائل دے کر اور کتابیں دے کر، ہم نے آپ کی طرف بھی یہ ذکر اُتارا تاکہ آپ واضح کریں لوگوں کے لئے

مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿٤٤﴾ اَفَاَمِنَ الَّذِيْنَ مَكَرُوا السَّيِّاٰتِ

اس بات کو جو ان کی طرف اُتاری گئی ہے، اور تاکہ وہ لوگ تفکر کریں ﴿۴۴﴾ کیا وہ لوگ بے خوف ہوگئے جو بُری بُری تدبیریں کرتے ہیں

اَنْ يَّخْسِفَ اللّٰهُ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٤٥﴾ اَوْ

کہ اللہ تعالیٰ ان کو زمین میں دھنسا دے یا ان کے پاس عذاب ایسی جگہ سے آئے جہاں سے ان کو شعور ہی نہیں ﴿۴۵﴾ یا

يَأْخُذَهُمْ فِي تَقَلُّبِهِمْ فَمَا هُمْ بِمُعْجِزِينَ ﴿۴۶﴾ أَوْ يَأْخُذَهُمْ عَلَىٰ تَخَوُّفٍ ۖ فَإِنَّ رَبَّكُمْ

پکڑ لے ان کو چلنے پھرنے میں ہی، پھر یہ اللہ کو ہرانے والے نہیں ہوں گے (۴۶) یا پکڑ لے ان کو گھٹاتے گھٹاتے، پس بے شک تمہارا رب

لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ ﴿۴۷﴾ أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَىٰ مَا خَلَقَ اللَّهُ مِنْ شَيْءٍ يَتَفَيَّأُ

البتہ شفقت کرنے والا رحم کرنے والا ہے (۴۷) کیا ان لوگوں نے دیکھا نہیں اس چیز کی طرف جس کو اللہ نے پیدا کیا، مائل ہوتے ہیں

ظِلَالُهُ عَنِ الْيَمِينِ وَالشَّمَائِلِ سُجَّدًا لِلَّهِ وَهُمْ دَاخِرُونَ ﴿۴۸﴾ وَلِلَّهِ يَسْجُدُ

اس کے سائے دائیں طرف اور بائیں طرف اللہ کو سجدہ کرتے ہوئے اور وہ عاجزی کرنیوالے ہیں (۴۸) اور اللہ ہی کے لئے سجدہ کرتی ہے

مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مِنْ دَابَّةٍ وَالْمَلَائِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ ﴿۴۹﴾ يَخَافُونَ

ہر وہ چیز جو آسمانوں میں ہے اور جو چلنے والی چیز زمین میں ہے، اور فرشتے بھی، اور وہ تکبر نہیں کرتے (۴۹) وہ ڈرتے ہیں

رَبَّهُمْ مِنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ ۩ ﴿۵۰﴾ وَقَالَ اللَّهُ لَا تَتَّخِذُوا إِلَٰهَيْنِ اثْنَيْنِ ۖ

اپنے رب سے اپنے اوپر سے اور کرتے ہیں وہی کام جس کا وہ حکم دیے جاتے ہیں (۵۰) اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا دو خدا نہ بناؤ

إِنَّمَا هُوَ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۖ فَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ ﴿۵۱﴾ وَلَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلَهُ الدِّينُ

وہ الٰہ ایک ہی ہے، پس تم مجھ سے ہی ڈرو (۵۱) اسی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے، دائماً طاعت اسی

وَاصِبًا ۚ أَفَغَيْرَ اللَّهِ تَتَّقُونَ ﴿۵۲﴾ وَمَا بِكُمْ مِنْ نِعْمَةٍ فَمِنَ اللَّهِ ۖ ثُمَّ إِذَا

کے لئے ہے، کیا پھر تم اللہ کے غیر سے ڈرتے ہو؟ (۵۲) جو نعمت بھی تمہارے پاس ہے پس وہ اللہ ہی کی جانب سے ہے، پھر جس وقت

مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَإِلَيْهِ تَجْأَرُونَ ﴿۵۳﴾ ثُمَّ إِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنْكُمْ إِذَا فَرِيقٌ مِنْكُمْ

تمہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو پھر تم اسی کی طرف چلاتے ہو (۵۳) پھر جس وقت وہ تکلیف تم سے دور کر دیتا ہے اچانک ایک فریق تم میں سے

بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُونَ ﴿۵۴﴾ لِيَكْفُرُوا بِمَا آتَيْنَاهُمْ ۚ فَتَمَتَّعُوا ۖ

اپنے رب کے ساتھ شریک ٹھہرانے لگ جاتا ہے (۵۴) جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ناشکری کرتے ہیں وہ اس چیز کی جو ہم نے انہیں دی، مزے اڑا لو،

فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ﴿۵۵﴾ وَيَجْعَلُونَ لِمَا لَا يَعْلَمُونَ نَصِيبًا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ ۗ

عنقریب پتا چل جائے گا (۵۵) جو کچھ ہم نے ان کو دیا اس میں سے ایک حصہ متعین کر دیتے ہیں ان چیزوں کے لئے جن کے متعلق ان کو کوئی علم نہیں،

تَاللّٰهِ لَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَفْتَرُوْنَ ﴿۵۶﴾ وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ سُبْحٰنَهٗ
اللہ کی قسم البتہ ضرور پوچھے جاؤ گے تم ان باتوں کے متعلق جو تم تراشا کرتے تھے ﴿۵۶﴾ اور اللہ کے لئے بیٹیاں قرار دیتے ہیں، اللہ پاک ہے،
وَلَهُمْ مَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ
اور ان کے لئے وہ چیز ہے جو یہ چاہتے ہیں ﴿۵۷﴾ جب ان میں سے کسی کو خبر دی جاتی ہے لڑکی (کے پیدا ہونے) کی، تو سارا دن اس کا منہ
مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ﴿۵۸﴾ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ
سیاہ رہتا ہے اور وہ گھٹنے والا ہوتا ہے ﴿۵۸﴾ قوم سے چھپتا پھرتا ہے، اس چیز کی عار سے جس کی اس کو خبر دے دی گئی، (دل میں سوچتا
اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿۵۹﴾ لِلَّذِيْنَ
ہے کہ) کیا اس کو روک رکھے ذلت پر؟ یا اس کو دھنسا دے مٹی میں؟ خبردار! یہ بہت ہی برا فیصلہ کرتے ہیں ﴿۵۹﴾ ان لوگوں کے لئے جو
لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ ۚ وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۶۰﴾
آخرت پر ایمان نہیں لاتے بری حالت ہے، اور اللہ کے لئے تو اعلیٰ مثال ہے، اور وہ زبردست ہے حکمت والا ہے ﴿۶۰﴾

تفسیر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ- وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ: اور وہ لوگ جنہوں نے گھر بار چھوڑا اللہ کی رضا کے لئے، اللہ کے راستے میں۔ فِي اللّٰهِ: فی سبیل اللہ۔ اور یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اللہ کے لئے۔ اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے جنہوں نے اپنے گھر بار کو چھوڑا، مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا: مَا مصدریہ ہے۔ ظلم کیے جانے کے بعد، بعد اس کے کہ وہ ظلم کیے گئے، مظلوم ہونے کے بعد، لَنُبَوِّئَنَّهُمْ: البتہ ضرور ٹھکانا دیں گے ہم انہیں فِي الدُّنْيَا: دنیا میں، حَسَنَةً: اچھا، وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ: اور آخرت کا اجر بڑا ہے، لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ: کیا ہی اچھا ہو کہ یہ لوگ جان لیں، کاش! کہ یہ لوگ جانتے۔ اَلَّذِيْنَ صَبَرُوْا: جن لوگوں نے صبر کیا، وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ: اور اپنے رَبّ کے اوپر وہ بھروسا رکھتے ہیں، اعتماد کرتے ہیں۔

ماقبل رُکوع سے ربط

پچھلے رکوع کے آخر میں معاد کا مسئلہ ذکر کیا گیا تھا، اور کافروں کے اس عقیدے کو ظاہر کیا گیا تھا کہ وہ قسمیں کھا کے کہتے ہیں لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ: مرنے والوں کو پھر اللہ اٹھائے گا نہیں، جو ایک دفعہ مر جائیں گے اللہ انہیں اٹھائے گا نہیں، ان کی اس بات کے اوپر بَلٰى کے لفظ کے ساتھ انکار کیا گیا کہ کیوں نہیں اٹھائے گا، یہ اٹھانا تو اللہ کے ذِمّے ایک وعدہ بالکل حق، واقع کے

مطابق ایک وعدہ ہے، لیکن اکثر لوگوں کو علم نہیں، بے علمی کی وجہ سے ایسی باتیں کرتے ہیں۔ آگے اُس اٹھانے کی حکمت بتائی تھی کہ کیوں اُٹھائے گا؟ کہ لوگوں میں یہاں طریقے مختلف ہیں، اور اُن مختلف طریقوں میں حق کی تعیین اِس دنیا کے اندر رہتے ہوئے عملاً نہیں ہوتی، ہر شخص جس طریقے کو اپنائے بیٹھا ہے اسی کو ہی حق سمجھتا ہے، تو ایک وقت آنا ضروری ہے کہ جس میں حق اور باطل کا عملاً فیصلہ ہوجائے، اور وہاں ان الفاظ کے ساتھ اعلان کردیا جائے وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ (سورۂ یٰس: ۵۹)، مجرم علیحدہ ہوجائیں اور فرمانبردار علیحدہ ہوجائیں، بات نکھر کے لوگوں کی آنکھوں کے سامنے آجائے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے، اللہ تعالیٰ اس مختلف فیہ مسئلے کو واضح کرنے کے لئے آخرت کا دن لائے گا، ورنہ اِس دنیا کے اندر رہتے ہوئے تو دلائل کا ایسا الجھاؤ ہے اور اس قسم کے شبہات اور اشتباہات پیدا ہوجاتے ہیں کہ حق اور باطل کے اندر نمایاں پہچان لوگوں کو مشکل ہوجاتی ہے، امتیاز مشکل ہے، اگرچہ نیک نیتی کے ساتھ، صاف دل سے، خلوص سے، طلب حق کے جذبے کے ساتھ اگر دلائل میں غور کیا جائے تو یہاں بھی حق متعین ہوجاتا ہے، لیکن پھر بھی بہت سارے اشتباہات، بہت سارے شبہات لوگوں کے سامنے آجاتے ہیں، تو دنیا کے اندر اللہ تعالیٰ نے حق اور باطل کو خلط ملط سا کیا ہوا ہے، تو ایک وقت آئے گا جب سب میں امتیاز کردیا جائے گا، اور ان کافروں کا جھوٹ ظاہر کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ اس دن کو ضرور لائے گا۔ باقی اس دن کے لانے میں جو اشکال ہے کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیسے ہوں گے، بوسیدہ ہڈیوں میں دوبارہ جان کیسے ڈالی جائے گی تو تمہیں اس بات کو یاد رکھنا چاہیے کہ ہمیں کسی کام کے کرنے کے لئے کوئی اہتمام نہیں کرنا پڑتا، بس ایک کُن ہے جس کے ساتھ سب کچھ ہی ہوجاتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارادہ متعلق ہوا، لفظ کُن صادر ہوا، ہوجا، کسی چیز کی طرف متوجہ ہو کے کہا گیا، پس وہ ہوجاتی ہے۔

ضرورتِ آخرت عقلاً بھی ثابت ہے

اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایک گروہ کا ذکر کیا ہے جس کو ماقبل کے ساتھ آپ یوں جوڑ سکتے ہیں کہ یہ بھی ضرورتِ آخرت کو نمایاں کرنے کے لئے ایک بات بتادی، کہ دیکھو! دنیا کے اندر دو قسم کے لوگ ہیں، بعضے وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتے ہیں اور اپنے گھروں کے اندر بیٹھے ہوئے عیش وعشرت کرتے رہتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت عبادت کی کوئی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے، اور بعضے لوگ ہیں جو اللہ کی رضا کے لئے اپنے گھر بار تک کو چھوڑ دیتے ہیں، اپنے علاقے کو چھوڑ دیتے ہیں، سفر کی مصیبتیں جھیلتے ہیں، ہر قسم کی عیش وعشرت کو قربان کردیتے ہیں محض اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے، اور اللہ کے راستہ میں سختیاں سہتے ہیں، اگر ان کے سامنے کوئی اچھا انجام آنے والا نہیں تو پھر ان میں اور اُن منکروں میں اور کافروں میں کیا فرق ہوا؟ اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ جو شکر گزار ہیں اور جو ناشکرے ہیں، جو مطیع فرمانبردار ہیں اور جو نافرمان ہیں، انجام کے لحاظ سے سب برابر ہوگئے، اگر آخرت واقع نہ ہو تو پھر ان لوگوں کے درمیان میں امتیاز کیسے ہوگا؟ پھر تو وہ شخص زیادہ اچھا ہے جس نے اس دنیا میں آرام سے گزار لی، چاہے لوگوں کا مال چھین کے کھالیا، چاہے کسی سے زبردستی کرکے عیش وعشرت کرلی وہ لوگ زیادہ کامیاب ہیں، کہ مرنے کے بعد جب آگے کہیں جانا ہی نہیں تو جو اس دنیا کے اندر لذات اٹھالیتا ہے، عیش وعشرت کی زندگی گزار لیتا ہے اس کی زندگی تو کامیاب ہے،

پھر اللہ کا نام لینے والے، اللہ کے راستے میں لٹنے پٹنے والے، ماریں کھانے والے، مظلوم ہونے والے، ان کا انجام کس طرح سے سامنے آئے گا۔ تو اس طرح سے لوگوں کے حالات جب مختلف ہیں تو اس کا نتیجہ یہ ضرور سامنے آئے گا جس میں فرمانبرداروں کے لئے راحت اور نافرمانوں کے لئے عذاب کی صورت بنے گی، جس وقت تک آخرت کا تصور نہ ہو اس وقت تک اچھے اور بُرے کے درمیان امتیاز کا کوئی معیار ہی نہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا ذکر کیا ہے۔

صحابہ کی مخلصانہ ہجرت اور اس پر انعامات

اب یہ سورۃ چونکہ مکی ہے اس لیے وَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا فِی اللّٰهِ کا مصداق وہ لوگ ہیں جو سرورِ کائنات ﷺ کی مکی زندگی میں ہجرت کر کے حبشہ کی طرف گئے، وہ اَسّی (۸۰) آدمی جن کی قیادت حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کی تھی، اور حبشہ کے اندر جا کے وہ ٹھہرے تھے، اس آیت کا اولین مصداق وہ ہیں، اگرچہ عمومِ الفاظ کے ساتھ جس دور میں بھی لوگ اللہ کی رضا کے لئے اپنے گھر بار کو چھوڑیں گے وہ اس بشارت کا مصداق بن سکتے ہیں، هَاجَرُوْا: چھوڑنے والے، جنہوں نے گھر بار کو چھوڑ دیا، اور فِی اللّٰهِ یہ ان کی نیت کا بیان ہے، گھر بار کا چھوڑنا مختلف وجوہ سے ہوا کرتا ہے، دوسرے لوگ بھی گھر بار کو چھوڑ کے دوسری طرف سفر کر کے جاتے ہیں، لیکن جن کے لئے بشارت ہے یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کی رضا کے لئے اپنے گھر بار کو چھوڑتے ہیں، اور واقعہ بھی یہ تھا کہ اللہ کے راستے میں بہت مظلوم ہوئے، لوگوں نے ان کے اوپر بہت زیادتیاں کی تھیں، ''زیادتیاں کیے جانے کے بعد، ظلم کئے جانے کے بعد اللہ کے راستے میں انہوں نے اپنے گھر بار کو چھوڑا، البتہ ہم ضرور ٹھکانا دیں گے انہیں دنیا میں اچھا'' دنیا میں بھی اچھا ٹھکانا دیں گے، ان ظالموں کے مقابلے میں کوئی رحم دل ساتھی مل جائیں گے، اچھے پڑوسی مل جائیں گے، یہ ان کو ذلیل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں دنیا کے اندر عزت دے گا، نیک نامی دے گا، لوگ ان کا اچھے الفاظ میں تذکرہ کریں گے، اور یہاں رزق کی تنگی ہے تو اللہ تعالیٰ ان کو رزق کی وسعت دے گا، امن وامان کی زندگی دے گا، اور ان کے لئے بشارت یہ بھی ہے کہ ان میں سے جو زندہ رہ جائیں گے، جو باقی ہوں گے تو اس جماعت کو......! کیونکہ یہ وعدے بحیثیت کے جماعت کے ہوتے ہیں، بحیثیت فرد کے نہیں ہوا کرتے، جس وقت اللہ تعالیٰ کسی قوم کے متعلق یہ وعدہ کرتا ہے کہ میں تمہیں فتح دوں گا تو اس سے قوم قومی حیثیت میں مراد ہوتی ہے، ورنہ اُس قوم کے جو لشکر کافروں کے مقابلے میں جایا کرتے ہیں، اور نتیجۃً فتح پاتے ہیں اور اس قوم کو فاتح قرار دیا جاتا ہے، تو اس میں بیسیوں آدمی ایسے بھی ہوتے ہیں جو میدان میں قتل ہو جاتے ہیں، اب یہ تو نہیں کہ جو میدان میں قتل ہو گئے یا میدان میں شہید ہو گئے وہ کامیاب نہیں ہیں، کامیابی بحیثیت مجموعی ہوا کرتی ہے، (بات سمجھ آ گئی؟) اب حضور ﷺ کے ساتھ جو صحابہ تھے اللہ نے وعدہ کیا کہ میں انہیں کامیاب کروں گا، تو بعضے ایسے تھے جو بدر میں ہی شہید ہو گئے، انہوں نے وہ دور نہیں دیکھا جس میں مسلمانوں کا پورا غلبہ ہوا اور ہر طرح سے ان کو کافروں کے مقابلے میں اللہ نے عزت دی، لیکن یہ لوگ بھی کامیاب ہیں، تو بحیثیت جماعت ان مہاجرین کے ساتھ وعدہ کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ انہیں دنیا میں اچھا ٹھکانا دے گا، تو اچھا ٹھکانا مدینہ منورہ میں بھی ملا، یہ حبشہ والے بھی مدینہ منورہ پہنچ گئے، اللہ نے عظیم الشان سلطنت کے مالک بھی بنا دیا، تمام کافروں کے اوپر غلبہ دے دیا، جماعتی حیثیت

سے یہ بات بالکل نمایاں ہے، باقی! افراد کے ساتھ یہ وعدے نہیں ہوا کرتے کہ ہر ہر فرد کے ساتھ یہ معاملہ ہوگا، (بلکہ) جماعت کے ساتھ یہ وعدہ ہوا کرتا ہے کہ نتیجۃً یہ جماعت اس طرح سے نمایاں ہوگی، چاہے بعضے افراد ایسے ہوں گے جو راستے میں وفات پا جائیں گے، جو لڑائیوں کے اندر مارے جائیں گے، وہ بھی کامیاب ہیں۔ اور آخرت کا اجر تو بہت ہی بڑا ہے، اس کا تو کیا کہنا، کاش! کہ ان لوگوں کو پتا چل جائے تو اس آخرت کے اجر کو حاصل کرنے کے لئے اللہ کے راستے میں سختیاں اٹھائیں۔

مہاجرین کی صفاتِ حمیدہ اور اس پر اللہ کی طرف سے کامیابی کا وعدہ

اور یہ مہاجرین کی ہی صفت ہے کہ ''یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے صبر کیا'' صبر کا معنی مشکلات کو برداشت کرنا، ناسازگار حالات کو برداشت کرنا، یعنی انہوں نے دین کی ایسی قدر کی، دین کی دولت حاصل کر لینے کے بعد انہوں نے ہر زیادتی کو برداشت کر لیا لیکن دِین چھوڑنا برداشت نہیں کیا، جیسے کہ اُممِ سابقہ کے اندر بھی ایسے لوگ گزرے جن کا ذکر سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ اس دِین کی وجہ سے ان لوگوں کو گڑھے گاڑ کے ان کے سر کے اوپر آری رکھ کے چیر دیا جاتا تھا، دو ٹکڑے کر دیے جاتے تھے، اتنی سختی بھی ان کو دِین سے باز نہیں رکھتی تھی، دِین چھوڑنے کے لئے وہ تیار نہیں ہوتے تھے،[1] صبر کی حد یہی ہے کہ اللہ کے راستے میں انسان اس طرح سے مشکلات برداشت کرنے کے لئے تیار ہو جائے کہ اس کو آگ میں چھلانگ لگانا تو گوارہ ہو لیکن دِین کی نعمت ہاتھ سے دینا گوارہ نہ ہو، آری کے تحت آ کر چِر جانا تو گوارہ ہو، اپنے ٹکڑے کروا لینے تو گوارہ ہو جائیں، لیکن انسان اس دِین کو چھوڑنے کے لئے آمادہ نہ ہو، یہ وصف جس وقت پیدا ہو جاتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کامیابی کے وعدے ہی وعدے ہوتے ہیں۔ پھر اللہ کے اوپر بھروسا، اللہ پر اعتماد، اپنے ظاہری اسباب پر اعتماد نہیں، ظاہری اسباب کتنے ہی خلاف کیوں نہ ہوں، کتنے ہی ناکامی کے اسباب انسان کے سامنے نمایاں ہوں لیکن اللہ کی ذات پر بھروسا ہوتا ہے، کہ ہمارا اللہ ہر قسم کی قدرتوں کا مالک ہے، ہر قسم کے خزانوں کا مالک ہے، اپنے علم وحکمت کے ساتھ ہمارے ساتھ جو معاملہ کرے گا ہمارے لیے وہی بہتر ہوگا، اسباب کی طرف وہ نظر اٹھا کے نہیں دیکھتے، اللہ کی ذات اور اس کی قدرت اور اس کے علم وحکمت کے اوپر نظر رکھتے ہیں۔ تو جن لوگوں کے اندر یہ صفتیں پائی جاتی ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کے لئے دنیا اور آخرت میں کامیابی کا وعدہ کرتا ہے۔

مشرکین کا انبیاء علیہم السلام کی بشریت پر اِعتراض اور اس کا جواب

اس معاد کے مسئلے کے بعد اگلی آیت کے اندر نبوّت اور رِسالت کا تذکرہ ہے، کہ وہ لوگ آپ کی نبوّت کا انکار کرنے کے لئے یہ بات بھی کہتے تھے کہ بھلا! بشر اللہ کا رسول کیسے ہو؟ اگر اللہ نے بھیجنا تھا تو کسی فرشتے کو کیوں نہیں بھیج دیا؟ مشرکوں کی طرف سے رسالت کے انکار کے لئے، نبوت کے انکار کے لئے بطور بہانے کے ہمیشہ سے بات کہی جاتی ہے۔ وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا: نہیں بھیجا ہم نے آپ سے پہلے مگر آدمیوں کو ہی، رِجال کہہ کر اصل میں ملائکہ کی نفی کرنی مقصود ہے کہ اللہ نے پہلے رسول بنا کر کوئی فرشتے نہیں بھیجے، آدمی ہی بھیجے ہیں، اگرچہ اس لفظ سے یہ مطلب بھی لیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی عورت کو پیغمبر

---

(۱) بخاری ۱/ ۵۱۰، باب علامات النبوۃ فی الاسلام۔ مشکوٰۃ ۲/ ۵۲۵، باب علامات النبوۃ

بنا کر نہیں بھیجا، یہ بات بھی اپنی جگہ صحیح ہے، جب بھیجا ہے مردوں کو بھیجا ہے عورتوں کو نہیں بھیجا، جب بھیجا ہے انسانوں کو بھیجا ہے فرشتوں کو نہیں بھیجا انسانوں کی طرف رسول بنا کر۔ نُوْحِیْٓ اِلَیْھِمْ: ہم ان کی طرف وحی کرتے ہیں۔ فَسْـَٔلُوْٓا اَھْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ: یہ خطاب اہلِ مکہ کو ہے۔ پوچھ لو اہلِ ذکر سے۔ ذکر سے یہاں علم مراد ہے۔ اہلِ ذکر سے پوچھ لو، اہلِ علم سے پوچھ لو اگر تمہیں پتا نہیں، تم تو اس سلسلہ کو جانتے نہیں، تمہارا تو علم نہیں، تم تو جاہل ہو، اِس دور میں جو اہلِ علم موجود ہیں......! اہلِ علم سے مراد اہلِ کتاب، اور ذکر سے توراۃ بھی مراد لی گئی ہے، یعنی توراۃ والے، اور مطلق علم بھی مراد لیا گیا ہے، یعنی جو اللہ کی باتوں کو یاد رکھنے والے ہیں......! ''ان سے پوچھ لو اگر تمہیں پتا نہیں ہے'' کیا پوچھ لو؟ کہ پہلے کوئی رسول آئے ہیں؟ وہ تو تمہیں بتائیں گے کہ ہاں! رسولوں کا سلسلہ جاری ہے، پھر ان سے پوچھو کہ کیا وہ رسول جو آئے تھے وہ بنی آدم میں سے ہی تھے، اولادِ آدم میں سے تھے، انسان تھے، رجال تھے؟ تو وہ تمہیں جواب دیں گے کہ ہاں! ایسے ہی تھے۔ تو پھر تمہیں یقین آ جانا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسالت کا سلسلہ جاری ہے، اور اللہ جس وقت بھی انسانوں کی طرف رسول بنا کے بھیجتا ہے تو انسان کو ہی بھیجتا ہے، اگر تمہیں پتا نہیں تو تم اہلِ علم سے پوچھ لو۔ تو اہلِ کتاب اور ہمارا چونکہ اس مسئلے میں کوئی اختلاف نہیں، اہلِ کتاب جن پیغمبروں پر ایمان لائے ہوئے تھے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے ہوئے تھے یا موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے ہوئے تھے، یا اس سے پہلے جتنے پیغمبر آئے سب کو وہ مانتے تھے، تو اس لئے ان سے اگر پوچھا جائے تو وہ یہی جواب دیں گے کہ واقعی رسالت کا سلسلہ ہے، اللہ کی طرف رسول آتے ہیں اور انسان ہی ہوتے ہیں۔ تو اہلِ کتاب کی طرف متوجہ اس لئے کیا گیا کہ یہ مسئلہ ہمارے اور ان کے درمیان میں کوئی مختلف فیہ نہیں ہے، یہ جو بنیاد بنی ہوئی تھی کہ وہ کہتے کہ بشر رسول نہیں ہو سکتا، تو یہ مسئلہ اگر اہلِ کتاب سے پوچھا جائے تو وہ جواب صحیح دیں گے، کیونکہ جن رسولوں پر وہ ایمان لائے بیٹھے ہیں ان کو وہ بھی بشر ہی سمجھتے ہیں، ان کو وہ بھی سمجھتے ہیں کہ یہ رجال ہیں اور اولادِ آدم میں سے ہیں۔

مسئلہ تقلید کی دلیل

تو اس کا موقع محل تو یہی ہے کہ مسئلہ رسالت کی تحقیق کے لئے متوجہ کیا ہے کہ تم ان لوگوں سے پوچھ لو جو اہلِ علم ہیں، یہ تمہیں بتا دیں گے کہ یہ بات صحیح ہے، ویسے عمومِ الفاظ سے یہیں سے لوگوں نے وہ مسئلہ نکالا کہ جس کے پاس علم نہ ہو اسے چاہیے کہ جب بھی کوئی کام کرنے لگے تو اہلِ علم سے پوچھ کے کرے فَسْـَٔلُوْٓا اَھْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ، پھر اسی پر ہی بنیاد رکھی تقلید کے مسئلہ کی کہ عام آدمی جو کہ اللہ اور اللہ کے رسول کی صحیح مراد سمجھنے سے عاجز ہے وہ اس بات کا مکلف ہے کہ اپنی رائے پر عمل نہ کرے بلکہ اہلِ علم سے پوچھ کے کرے، اسی آیت کو اس مسئلے کے اندر بھی ذکر کیا جاتا ہے، اس کا موقع محل اگرچہ مسئلہ رسالت ہے اور یہ بات ہے کہ رسول بشر ہوتا ہے یا نہیں؟ نبی بشر ہوتا ہے یا فرشتہ ہوتا ہے؟ مسئلہ یہ مذکور ہے، اور اہلِ علم سے اِس جگہ مراد وہی لوگ ہیں جو اس زمانے میں تاریخ دان تھے یا پہلی کتابوں کے عالم تھے، لیکن عمومِ الفاظ سے یہ بات نکل آئی کہ بے علم کے لئے ضروری ہے کہ جب کوئی کام کرنا ہو تو علم والے سے پوچھے۔ جیسے ''مشکوٰۃ شریف'' میں آپ نے ''باب التیمم'' میں وہ روایت پڑھی ہوگی ''اِنَّمَا شِفَاءُ الْعِيِّ السُّؤَالُ'' جو شخص عی، عاجز ہے کسی بات کے معلوم کرنے سے، تو یہ عجز اور یہ جہالت بھی ایک بیماری ہے، اس کی شفا یہ ہے

کہ دوسرے سے پوچھو، پوچھ کر اس کے مطابق عمل کرو، تو جہالت کا علاج یہی ہے۔ علمی مسئلے کی تحقیق سے عجز کا مداوا یہی ہے کہ جن کو تحقیق ہے ان سے پوچھ کر چلو۔ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ: یہ اَرْسَلْنَا کے متعلق ہے، اِلَّا نے آ کے نفی توڑ دی، ''نہیں بھیجا ہم نے آپ سے پہلے مگر آدمیوں کو''بیّنات'' اور ''زُبر'' کے ساتھ''یعنی بھیجا ہم نے ''بیّنات'' اور ''زُبر'' کے ساتھ، آدمیوں کو بھیجا اور واضح دلائل دے کے بھیجا، اور کتابیں دے کے بھیجا، زُبر زبور کی جمع ہے، مطلق کتاب کو کہتے ہیں، کتابیں، صحیفے، اوراق، جن کے اندر اللہ کی طرف سے باتیں لکھی ہوئی ہوں، اس قسم کی چیزیں وہ لے کے آئے۔

حجیتِ حدیث پر واضح دلیل

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ: ہم نے آپ کی طرف بھی کتاب اتاری، ذکر سے یہاں قرآنِ کریم مراد ہے جیسے سورۂ حجر میں لفظ آیا تھا اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (آیت:۹) تو ذِکر اس کو اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ ایک قسم کی یاددہانی ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت کے اندر جو اپنے ساتھ تعلق رکھا ہے، اپنے ساتھ محبت رکھی ہے، اطاعت اور عبادت کا جذبہ رکھا ہے، اسی کی یاددہانی ان کُتب کے ذریعے سے کرائی جاتی ہے جو اللہ کی طرف سے اترتی ہیں، ''ہم نے آپ کی طرف بھی یہ ذِکر اتارا'' لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ: تاکہ آپ واضح کریں لوگوں کے لئے اس بات کو جو اُن کی طرف اتاری گئی ہے، اس میں سرورِکائنات ﷺ کا منصب تبیین ذکر کیا گیا ہے، مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ کی تبیین یہ حضور ﷺ کے ذِمّے ہے، تبیین سے مراد وضاحت ہے، اس سے معلوم ہوگیا کہ قرآنِ کریم جو کہ عربی زبان میں ہے اور مخاطب بھی اس کے عربی ہی تھے اور ایسا کوئی لفظ قرآنِ کریم میں نہیں ہوگا کہ جس کا ترجمہ وہ نہ جانتے ہوں، فصیح بلیغ لوگ تھے، بہت اعلیٰ درجے کی زبان جاننے والے تھے، اور یہ بھی عربیٔ مبین ہے جس کے اندر اس کتاب کو اُتارا گیا ہے، تو وہ آج کل کے علماء کے مقابلے میں ان آیات کا ترجمہ خوب سمجھتے ہوں گے، تو ترجمہ سمجھ لینا یا لغوی حیثیت سے کسی آیت کا ترجمہ کر لینا قرآنِ کریم کے سمجھنے کے لئے کافی نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اللہ کے رسول کی تبیین ضروری ہے، جب تک اللہ کے رسول کی طرف سے تبیین نہیں ہوگی اس وقت تک اللہ کی مراد اِس کتاب سے سمجھ میں نہیں آئے گی۔ اور یہ آیت بہت واضح دلیل ہے حجیتِ حدیث کے لئے، کہ قرآنِ کریم کو اگر سمجھنا ہے تو احادیث کی روشنی میں سمجھئے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو معلم بنا کے بھیجا ہے يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ (البقرہ:۱۲۹، وغیرہ)، اور مُبَيِّن بنا کے بھیجا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ کی مراد اس کتاب سے جو بھی ہے اس کی تبیین سرورِکائنات ﷺ کریں گے۔ اب قرآنِ کریم میں ایک لفظ آ گیا اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ: اَقَامَ يُقِيْمُ لغت میں اس کا معنی دیکھ لیجئے! کھڑا کرنا، قائم کرنا اس کا معنی آتا ہے، اور الصَّلٰوةَ کا لفظ بھی پہلے عربی کے اندر اِستعمال ہوتا تھا دُعا کے معنی میں، تو اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ کا لفظی ترجمہ کریں تو یہ ہوگا کہ دُعا کو کھڑا کرو، دُعا کو قائم کرو، صلوٰۃ کو کھڑی کرو، صلوٰۃ کو قائم کرو، صلوٰۃ کا معنی دُعا، لغت کے اندر یہ معنی آتا ہے، لیکن اب اس سے اللہ کی مراد کیا ہے؟ یہ اللہ کے رسول نے بتائی کہ پانچ وقت میں ان شرطوں کے تحت اس انداز کے ساتھ یہ حرکات، یہ اقوال، ان کا مجموعہ، یہ ہیئت کذائی جو آپ کے سامنے نماز کی متعین کردی گئی، اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ کا مصداق یہ ہے، اب اگر کوئی شخص لغات کی کتاب اٹھا کے آج اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ کا مطلب کوئی اور متعین کرتا ہے تو وہ اللہ کی مراد نہیں ہے، اللہ کی مراد وہ ہے جو

اللہ کے رسول نے ظاہر کردی۔اسی طرح سے اٰتُوا الزَّکٰوۃَ ایک لفظ آ گیا، اگر لغات میں دیکھو گے تو زکوٰۃ پاکیزگی کو بھی کہتے ہیں، لغات میں دیکھو گے تو زکوٰۃ نماء کو بھی کہتے ہیں، یعنی کسی چیز کا بڑھنا، تو یہ بڑھنے کے معنی میں بھی آتی ہے اور پاکیزگی کے معنی میں بھی آتی ہے، تو اٰتُوا الزَّکٰوۃَ: زکوٰۃ دو، پاکیزگی دو، پاکیزگی ادا کرو، یا اٰتُوا الزَّکٰوۃَ کا لفظی معنی اگر آپ کریں تو یہ کریں گے کہ نماء اور افزائش دو۔اب اس کا کیا مطلب؟ اس کی کیا مراد ہے؟ آج اگر لغات کے ساتھ آگا پیچھا دیکھ کے اگر اس کی کوئی نئی صورت متعین کر لیتا ہے تو ہم کہیں گے یہ اللہ کی مراد نہیں، اللہ تعالیٰ کی مراد وہی ہے جو اللہ کے رسول نے واضح کی ہے، جس میں آ گیا کہ فلاں فلاں مال میں سے اتنے وقت کے بعد اتنی اتنی چیز دو، اونٹوں میں سے یہ دو، گائیوں میں سے یہ دو، بکریوں میں سے اس انداز سے دو، سونے سے اتنا، چاندی سے اتنا، نباتات سے اتنا، غلہ جات سے اتنا، وہ مراد جو اللہ کا رسول واضح کرے گا (کہ تبیین اس کا منصب ہے) وہی مراد اللہ کی ہے، اس کے خلاف اگر کوئی شخص کہتا ہے تو وہ غلط ہے، یہ مراد کا واضح کرنا، لوگوں کی طرف جو کچھ اترا ہے اس کی حقیقت کو نمایاں کرنا یہ اللہ کے رسول کا منصب ہے۔اس لیے قرآنِ کریم کی مراد احادیث سے قطع نظر کر کے نہیں سمجھی جا سکتی، اور جو سمجھی جائے گی غلط ہوگی، اور صحیح مراد وہی ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں قابل قبول وہی ہے جو اللہ کا رسول بیان کرتا ہے۔تو تبیین یہ منصب ہے سرورِ کائنات ﷺ کا، اور اس سے یہ بات بھی نکل آئی کہ صرف اردو ترجمہ دیکھ لینا یا لغات کے تحت کسی آیت کو حل کر لینا یہ اللہ کی مراد متعین کرنے کے لئے کافی نہیں، اگر ایسی بات ہوتی تو اللہ کے رسول کا یہ منصب نہ قرار دیا جاتا، کہ وہ سارے کے سارے لوگ عربی تھے اور کتاب لکھی لکھائی ان کی طرف اتار دی جاتی، وہ خود پڑھتے جاتے اور مطلب سمجھتے جاتے۔لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ: تا کہ تو کھول کھول کے بیان کرے ان لوگوں کے لئے، مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ: اس چیز کو جو ان کی طرف اتاری گئی ہے، وَلَعَلَّهُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ: اور تا کہ وہ سوچیں۔

صرف کتابیں پڑھ کر اپنے بیوی بچّوں کا علاج خود کیوں نہیں کرتے؟

دین چونکہ آج کل بیچارہ مظلوم ہے، کوئی سرپرستی کرنے والا ہے نہیں، اس لئے سب لوگ اس کو تختۂ مشق بنائے ہوئے ہیں، جو اُٹھتا ہے قرآنِ کریم کی تفسیر بیان کرنے لگ جاتا ہے، جو اُٹھتا ہے دین کی باتوں میں دخل دینا شروع کر دیتا ہے، ورنہ یہ تو فطرتِ انسانی کے تحت ایک اُصول ہے کہ کوئی فن ہو جس وقت تک اس کے ماہرین کی سرپرستی میں اس کو حاصل نہ کیا جائے اس کے اندر رائے زنی کرنی جائز ہی نہیں، اب لوگ ''مشکوٰۃ شریف'' کا اُردو ترجمہ لے کے بیٹھے ہوئے ہیں اور اجتہاد کر رہے ہیں، ''بخاری شریف'' کا اُردو ترجمہ لیے بیٹھے ہیں اور کہتے ہیں کہ بس جی! کوئی مولویوں کا ٹھیکہ تو نہیں ہے، مولویوں کی اجارہ داری تو نہیں ہے، کہ قرآن اور حدیث وہی بیان کر سکتے ہیں، ہم بھی تو آخر عقل رکھتے ہیں، ہمارے لیے بھی تو یہ قرآن اور حدیث اُترا ہے، ہم بھی تو اس سے مراد سمجھ سکتے ہیں، تو اس میں غور کر کے پھر ایسے ہی اُلٹ پلٹ مارتے ہیں، ضَلُّوا وَاَضَلُّوا کا مصداق بنتے ہیں، خود گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو گمراہ کرتے ہیں۔اور میرے ساتھ تو اگر کبھی بھی کسی ایسے آدمی کا واسطہ ہو تو میں تو اسے یہی کہا کرتا ہوں کہ بھائی! اگر اپنی عقل کے اوپر تمہیں اتنا ہی اعتماد ہے تو طب کی اُردو کی کتابیں خرید لو، ڈاکٹری کی اُردو کی کتابیں خرید لو اور اپنے بیوی بچّوں کا علاج ان کتابوں کو دیکھ کے کرنا شروع کر دو، تو ہم سمجھیں گے کہ واقعی تمہیں اپنی عقل پہ اعتماد ہے اور تم بہت سمجھ دار آدمی ہو۔

اُردو میں طب کی کتابیں بھی ہیں اور ڈاکٹری کی بھی ہیں، کیا ضرورت ہے ڈاکٹروں کو فیسیں بھرنے کی؟ کیا ضرورت ہے ہسپتالوں میں دھکے کھانے کی؟ اوزار خرید لو، جس وقت ضرورت پیش آئے اپنی بیوی کا پیٹ چاک کر لو، کتاب کھول کے سامنے رکھ لو، جس میں لکھا ہوا ہوگا کہ یہ چیز نکالنی ہے، یوں کرنا ہے، اور یہ چیز کھانے کے لئے دینی ہے، اور اپنے بیوی بچوں کے اُوپر اپنی عقل آزماؤ تو تمہیں پتا چلے کہ تم کتنے سمجھدار ہو۔ اور اگر یہاں اپنے بیوی بچوں کے بارے میں نزلہ زکام بھی ہو جائے تو تم ڈاکٹر کے مشورے کے بغیر کوئی دوائی دینے کے لئے تیار نہیں، اور یہاں تم اپنی عقل پر اعتماد نہیں کرتے اور یہ کہتے ہو کہ بھائی! جن کا فن ہے باریکیاں وہی جانتے ہیں، ٹھیک ہے دوائی لکھی ہوئی ہے کہ نزلے کی یہ دوائی ہے، دس نسخے لکھے ہوئے ہوں گے، لیکن ان میں سے کون سا اس موسم کے مطابق ہے، کون سا اس مزاج کے مطابق ہے، اس عمر میں کتنی مقدار چاہیے، اور عوارض کیا ہیں، یہ تو صاحب فن ہی پہچان سکتا ہے، اس لئے اُردو کی کتاب دیکھ کے علاج نہیں کرنا چاہیے، جو علاج کرے گا اپنی بیوی بچوں کو مار بیٹھے گا، اور ہر شخص اسے ملامت کرے گا، تو یہاں تمہاری عقل کو کیا ہو گیا، یہاں تمہاری عقل کا جنازہ نکل گیا، یہاں اپنی عقل سے کام کیوں نہیں لیتے؟ تو تمہیں جان تو اتنی پیاری ہے کہ اُردو کی کتابیں دیکھ کے تم اپنی عقل کو آگے نہیں لاتے، اور اپنی عقل کے تحت اپنے اوپر یا اپنے بیوی بچوں پر تجربے نہیں کرتے، تو کیا ایمان کی اتنی فکر نہیں ہے؟ کہ ایمانیات کے متعلق تم اُردو کی کتابیں دیکھ کے فیصلہ کرنے بیٹھ جاتے ہو کہ یہ بات کیسے ہے کیسے نہیں ہے۔

کسی بھی فن میں مہارت حاصل کیے بغیر رائے زنی دُرست نہیں

تو صرف کتاب دیکھ کے انسان اس میں سے مطلب کی بات نہیں نکال سکتا، جس وقت تک کہ اس فن کے ماہرین کے پاس بیٹھ کے انسان نے اس فن کے اندر مہارت پیدا نہ کی ہوئی ہو، ہر چیز تجربہ چاہتی ہے، ہر چیز کا ایک ذوق ہوتا ہے۔ حکومت کے قانون کی کاپی چھپی ہوئی ہے، اور اُردو میں ہے، اب ایک آدمی اُردو کا ادیب ہے، لیکچرار ہے، اور وہ قانون کی کاپی ہاتھ میں لے لے اور عدالت میں جا کے جج کے سامنے کسی قانون کی شق کے اوپر بحث کرنی شروع کر دے، اور جج کہے کہ بھائی! یہ مطلب نہیں ہے تو غلط سمجھ رہا ہے، وہ کہے گا کیوں غلط سمجھ رہا ہوں، اُردو کی عبارت ہے، میری سمجھ میں نہیں آتی؟ کون سا لفظ اس میں مشکل ہے؟ اور میں پروفیسر ہوں، میں لیکچرار ہوں، ادیب ہوں، میں نے فلاں کتاب لکھی ہے، میں نے فلاں کتاب لکھی ہے، اور چار چار گھنٹے میں لیکچر دے سکتا ہوں، تقریر کر سکتا ہوں، تو یہ اُردو کی کتاب میں کیوں نہیں سمجھ سکتا؟ تو کان سے پکڑ کے عدالت سے اس کو باہر کر دیا جائے گا، اور یہ کہا جائے گا کہ پہلے مہارت قانون کی سند دکھاؤ کہ تمہیں یہ وکالت کرنے کا حق ہے، تم نے کسی لاء کالج کے اندر ڈگری حاصل کی ہے؟ کہ تمہیں قانون کی تشریح کا حق ہے، مطلب وہی ٹھیک ہے جو جج بیان کر رہا ہے، یا مطلب وہی ٹھیک ہے جو سند یافتہ وکیل بیان کر رہا ہے، چاہے تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہا، تمہیں اس میں دخل دینے کا حق نہیں ہے، یہ نہیں کہ یہ قانون تمہارے لئے نہیں، وکیلوں کی اجارہ داری ہے، وکیلوں کی اجارہ داری نہیں، نہ ہی جج کی اجارہ داری ہے، لیکن ہر چیز کا ایک طریقہ ہوتا ہے، تم بھی اس میں دخل دے سکتے ہو لیکن چار پانچ سال ماہرین قانون کے سامنے گھٹنے رگڑ کے آؤ، لاء کالج سے ڈگری لے کے آؤ جن کے اندر

قانون کی تشریح بتائی جاتی ہے کہ قانون کی تشریح اس طرح سے کی جاتی ہے، پھر آ کے تم تبصرہ کرنا، پھر تمہیں تبصرہ کرنے کا حق ہے، اجارہ داری کسی کی نہیں لیکن ہر بات میں دخل دینے کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔ اسی طرح سے قرآن پر کسی مولوی کی اجارہ داری نہیں ہے، نہ حدیث پر کسی مولوی کی اجارہ داری ہے، کسی قوم کی نہیں، کسی قبیلے کی نہیں، کسی فرد کی نہیں، ہر قوم ہر قبیلہ اور ہر فرد قرآن وحدیث میں دخل دے سکتا ہے لیکن دخل دینے کا ایک راستہ ہے، کہ اس انداز کے ساتھ تم اس میں مہارت پیدا کر کے آؤ، مہارت پیدا کرنے کے بعد تمہیں حق پہنچتا ہے کہ دارالافتاء کھول کے بیٹھ جاؤ اور فتوے دو، قرآن اور حدیث کی تشریح کرو، پھر تمہیں کون روکتا ہے؟ کسی قوم کی اجارہ داری نہیں، کسی مولوی کی اجارہ داری نہیں ہے کہ ہم کہیں کہ صرف ہم بات کر سکتے ہیں، دوسرا نہیں کر سکتا، ہر وہ شخص بات کر سکتا ہے جو قاعدے کے ساتھ مہارت پیدا کر کے آئے۔ تو جیسے ملکی قانون میں ہر اُردو خواں نہیں بول سکتا حالانکہ وہ عبارت بھی تو اُردو میں ہے اور اس کی تشریح کا کوئی اعتبار نہیں بلکہ اس کی تشریح کرنے کے لئے ایک طبقہ متعین ہے، اسی طرح سے قرآن وحدیث چاہے عربی میں ہو چاہے اُردو میں اس کا ترجمہ لکھا ہوا ہو، اس میں بھی ہر شخص کو زبان کھولنے کی اجازت نہیں جب تک کہ قاعدے کے مطابق اس میں مہارت نہ پیدا کر کے آئے، تو پابندی اس دلیل کے ساتھ ہم لگاتے ہیں کہ ہر کسی کو دخل دینے کی اجازت نہیں ہے، ورنہ ہم کوئی اجارہ داری قائم نہیں کرتے۔ اللہ کے رسول نے تبیین کی ہے تو اللہ کے رسول کی تبیین کے تحت اس کو سمجھو، اور اللہ کے رسول کے شاگردوں سے، ان کے شاگردوں سے، ان کے شاگردوں سے یہ بات سامنے آئے گی کہ قرآنِ کریم کا صحیح مطلب کیا ہے، اس لئے اُمت جو مطلب سمجھتی آئی ہے وہی معتبر ہوگا، اور اس کے خلاف آج اگر کوئی شخص نظریہ پیش کرتا ہے جس کا مطلب یہ ہو کہ آج تک کسی نے قرآن نہیں سمجھا وہ شخص غلط ہے اور باطل ہے، تو کسی کو غلط اور باطل قرار دینے کے لئے سب سے واضح اور سب سے نمایاں بات یہ ہے کہ دیکھو! کہ اس کے نظریات اسلاف کے مطابق ہیں یا نہیں؟ حدیث کے مطابق، صحابہ کے اقوال کے مطابق، صحابہ کے شاگردوں کے مطابق اس کی رائے ہے یا نہیں؟ تو جس کی رائے اسلاف کے مطابق ہوگی وہ صحیح ہے، اور جس کی رائے اسلاف کے مطابق نہیں ہے وہ ردی کی ٹوکری میں پھینکنے کے قابل ہے، چاہے وہ کتنا ہی بڑا ڈاکٹر اور کتنا ہی بڑا ڈگری یافتہ ہی کیوں نہ ہو۔ کسی انجینئر کو حق نہیں کہ عدالت میں جا کے ملک کے قانون کی تشریح کرے، کسی شاعر کو حق نہیں کہ عدالت میں جا کے کسی قانون کے اوپر رائے زنی کرے، چاہے وہ اُس زبان کے کتنے ہی ماہر کیوں نہ ہوں، تو اسی طرح سے یہاں بھی صرف عربی کے اندر مہارت قرآنِ کریم کے اندر رائے زنی کرنے کے لئے کافی نہیں۔ (بات اچھی طرح سے سمجھ میں آ گئی؟)۔ یہ آج کل لوگوں کی زبان پر بہت ہوتا ہے کہ مولوی کی کوئی اجارہ داری ہے؟ کہ قرآن اور حدیث کی یہی تشریح کر سکتے ہیں، ہمیں اللہ نے عقل نہیں دی؟ انہیں کہو کہ بھئی! آپ بہت عقل مند ہیں لیکن صرف دین پر مشق نہ کرو، اپنی عقل کو آزمانے کے اور بھی کئی طریقے ہیں، سب سے پہلا طریقہ یہی ہے کہ بیوی بچوں کا علاج طب کی کتابیں دیکھ کے خود کر کے دکھاؤ، اگر تو تم اتنی جرأت کر سکتے ہو تو ہم سمجھیں گے کہ واقعی تم عقل مند ہو اور تمہیں اپنی عقل پہ اعتماد ہے، اور اگر تم وہاں چھوٹی سے چھوٹی بیماری کے لئے بھی چاہتے ہو کہ صاحب فن کے پاس جاؤ تو ایک یہی یتیم کا لایا ہوا قرآن آج بھی یتیمی کی حالت میں ہے کہ جو چاہے اس کو تختۂ مشق بنالے اور اس

کے اوپر اپنا زور دکھالے؟ یہ ایک یتیم کا لایا ہوا دین آج بھی یتیمی کی حالت میں ہے کہ ہر کوئی اس کے اوپر زور دکھالے؟ یہ بات نہیں، یہ عقل کے خلاف ہے، قرآن اور حدیث میں رائے زنی قائم کرنی ہے تو طریقے سے آؤ، اور اس طریقے کے ساتھ مہارت پیدا کرو، مہارت پیدا کرنے کے بعد پھر تمہیں بات کرنے کا حق ہے، پھر تمہیں خود پتا چل جائے گا کہ مہارت کے بغیر بات کتنی بے جان ہوتی ہے اور کتنی بے جوڑ ہوتی ہے، اور جب قاعدے کے مطابق اس میں غور کیا جاتا ہے تو باتیں کس طرح سے صاف ستھری اور کیسی وزن دار نکلتی ہیں۔ وَاَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الذِّكْرَ: ہم نے تیری طرف یہ ذکر اتارا، یہ یادداشت اتاری، یہ کتاب اتاری، تاکہ واضح کرے تو لوگوں کے لئے اس چیز کو جو ان کی طرف اتاری گئی اور تاکہ وہ لوگ تفکر کریں۔

دِین کے خلاف بُری تدابیر کرنے والوں کو عذابِ دُنیا کے ساتھ وعید

آگے وعید ہے عذابِ دنیا کے ساتھ اَفَاَمِنَ الَّذِیْنَ مَكَرُوا السَّیِّاٰتِ: السَّیِّاٰتِ یہ صفت ہے مَکَرَات کی، اَلَّذِیْنَ مَكَرُوا الْمَكَرَاتِ السَّیِّاٰتِ، جو لوگ بُری بُری تدبیریں کرتے ہیں اِس دِین کے خلاف، دِین کے مٹانے کے لئے، بُرے بُرے مکروفریب کرتے ہیں، کیا وہ بے خوف ہو گئے جو بُری بُری تدبیریں کرتے ہیں؟ اَنْ یَّخْسِفَ اللّٰهُ بِهِمُ الْاَرْضَ: کہ اللہ تعالیٰ ان کو زمین میں دھنسا دے، ان کو اس بات سے ڈر نہیں لگتا؟ وہ بے خوف ہو گئے ہیں؟ اللہ تعالیٰ زمین میں دھنسا سکتا ہے جس طرح سے پہلی قوموں کو دھنسایا تمہیں بھی دھنسا سکتا ہے، بے خوف نہیں ہونا چاہیے، اَوْ یَاْتِیَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَیْثُ لَا یَشْعُرُوْنَ: یا اس بات سے بے خوف ہو گئے کہ ان کے پاس عذاب ایسی جگہ سے آجائے کہ جہاں سے ان کو شعور ہی نہیں، سوچ ہی نہیں سکتے، جیسے مختلف قوموں کے اوپر مختلف عذاب آئے جن کی طرف اِن کا ذہن ہی نہیں جاسکتا تھا کہ اِدھر سے بھی عذاب آسکتا ہے، اَوْ یَاْخُذَهُمْ فِیْ تَقَلُّبِهِمْ: یا پکڑلے ان لوگوں کو چلنے پھرنے میں ہی، کوئی عذاب کے آثار نہیں، چل پھر رہے ہیں اور دفعۃً کوئی مصیبت آجائے جس کے اندر یہ پکڑ لیے جائیں۔ تَقَلُّب: چلنا پھرنا، آمدوشُد۔ آمدوشد کی حالت میں، چلنے پھرنے کی حالت میں، کہ اپنے کاروبار میں گھومتے پھر رہے ہیں، ایسی حالت میں اللہ پکڑلے، فَمَا هُمْ بِمُعْجِزِیْنَ: پھر یہ اللہ کو ہرانے والے نہیں ہوں گے، عاجز کرنے والے نہیں ہوں گے، اَوْ یَاْخُذَهُمْ عَلٰى تَخَوُّفٍ: یا پکڑلے ان کو عَلٰى تَخَوُّفٍ، تخوف کا یہاں ترجمہ کیا گیا ہے تَنَقُّص، گھٹانا، ''گھٹاتے گھٹاتے اللہ تعالیٰ ان کو پکڑلے'' یعنی دفعۃً کوئی عذاب نہ آئے بلکہ تدریجی طور پر ان کو فنا کردیا جائے، عام طور پر مفسرین نے اس کا ترجمہ تنقص کے ساتھ ہی کیا ہے، اور کلام عرب کے اندر تخوف تنقص کے معنی میں آتا ہے، اس لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جس وقت یہ ترجمہ بیان فرمایا تو ساتھ یہ کہا کہ کلامِ عرب کو سیکھا کرو، دواوینِ عرب میں غور کیا کرو، کہ کتاب کے حل کرنے کے لئے اس کا جاننا بہت ضروری ہے، اس لیے یہاں حضرت مفتی محمد شفیع صاحب نے لکھا ہے نا! کہ پُرانے شعراء جاہلیت کے زمانے کے، چاہے ان کی کلام کتنی ہی خرافات پر مبنی کیوں نہ ہو وہ اسی لئے پڑھی جاتی ہے تاکہ اس زمانے کے محاورات سامنے رہیں کہ کون سا لفظ کس معنی میں کیسے استعمال ہوتا ہے؟ تو جس زمانے میں قرآنِ کریم اُترا اس زمانے کی زبان کو جاننا اور اس وقت کے محاورات اور الفاظ کے طریقِ استعمال کو جاننے کے لئے جاہلیت کی کلام پڑھنی ضروری ہے، اور چونکہ اس میں مقصد ہی صرف زبان دانی اور زبان کے محاورے ہیں، اس لیے ان

کے مضامین کی طرف کوئی توجہ نہیں کہ ان میں مضامین اچھے ہیں، برے ہیں، عشق بازی کے قصے ہیں، لغویات ہیں، جیسے کیسے بھی ہیں ان کو محض ایک زبان کی حیثیت سے دیکھنا ہے، تو مدارس کے اندر جاہلیت کے زمانے کے جو شعراء ہیں، جہلاء شاعر جتنے بھی گزرے ہیں، ان کے جو دواوین پڑھائے جاتے ہیں، کتابیں پڑھائی جاتی ہیں تو ان سے مقصد اُس زمانے کی کلام کو باقی رکھنا ہے، اُس وقت کے محاورات کے دیکھنا ہے کہ اس زمانے میں کون سا لفظ کس انداز کے ساتھ استعمال ہوتا تھا۔

اور بعض نے تخوف کا معنی یوں بھی کیا ہے کہ "یا پکڑ لے تمہیں تخوف پر" تخوف خوف سے لیا گیا ہے، خوف محسوس کرنا، جس کا مطلب یہ ہے کہ تغلب میں پکڑنے کا تو یہ معنی ہے کہ کوئی ڈر کے آثار نہیں ہیں جن سے یہ اندیشہ ہو کہ عذاب آنے والا ہے، اور علیٰ تخوف کا معنی یہ ہے کہ پہلے آثار نمایاں ہو گئے، پہلے اس قسم کی چیزیں سامنے آ گئیں جس سے ڈر لگنے لگ گیا، خوف پیدا ہو گیا کہ کوئی عذاب آنے والا ہے، تو پھر اللہ پکڑ لے۔ مطلب تو یہ ہے کہ جس طرح سے چاہے اللہ تمہیں عذاب دے سکتا ہے اس کو روکنے والا کوئی نہیں، چاہے زمین منہ کھول لے اور تمہیں اپنے اندر نگل لے اپنا بھی ہو سکتا ہے، خسف ہو جائے، یا کوئی اور صورت اس قسم کی عذاب کی آ جائے جو تمہارے عقل وفہم میں بھی نہیں ہے کہ ایسا عذاب بھی آ سکتا ہے۔ اب پچھلے دنوں میں یہ جو ہمارے ضلع شیخوپورہ میں نارنگ منڈی پہ جس قسم کے حالات گزرے ہیں تو کسی کے عقل وفہم میں آ سکتے ہیں کہ اس قسم کی بلائیں اور اس قسم کی مصیبتیں بھی اترتی ہیں جو تفصیلات آپ کے سامنے اخبار میں آئی ہیں، یہ دس پندرہ دن کی بات ہے، تو انسان حیران ہیں، کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ اس قسم کی آندھی اور اس قسم کی بارش اور اس قسم کے بگولے جو عمارتوں کو یوں چکر دے کے رکھ دیں، اور وزنی چیزوں کو بھی اُڑا اُڑا کے پھینک دیں، یہ بات کہاں انسان کی عقل وفہم میں آتی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کی قدرت ہر چیز پہ ہے، اور چلتے پھرتے پکڑے جائیں کہ کوئی آثار نہیں تھے، یہ آئے دن آپ کے سامنے نمونے موجود ہیں، ایک تو آدمی مرتا ہے، مرنے کے حالات پیدا ہو جاتے ہیں، تو تخوف پیدا ہو گیا، بیمار ہو گیا، چارپائی پر گھسٹتے رگڑتے ہوئے اس کو مہینوں گزر گئے، مہینوں سے پڑا ہوا ہے، اور دن بدن اس کی حالت اس قسم کی ہوتی جا رہی ہے کہ اس کے متعلقین کو اندیشہ ہو گیا کہ یہ بچے گا نہیں، اور پھر واقعی نہیں بچتا، مر جاتا ہے، اور ایک صورت یہ ہے کہ ہنسے کھیلے، کھا پی کے، پروگرام بنا کے یہاں سے چلتے ہیں اور گھر بتا کے جاتے ہیں کہ ہم شام کو واپس آ جائیں گے ہمارا کھانا پکا کے رکھنا، اور دس میل کے فاصلے پہ جاتے ہیں اور ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے اور ایک ہی منٹ میں ختم، تو یہ آمد وشد کی حالت میں پکڑ لیا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسی گرفت آتی ہے کہ کوئی سوچ ہی نہیں سکتا کہ ہمارے مرنے کا یہ وقت بھی تھا، چلتے پھرتے پکڑ لیا، کوئی آثار ہی نہیں تھے، صبح شام رات دن اس قسم کے واقعات سامنے نہیں آتے؟ تو اللہ تعالیٰ کی قدرت ہر وقت تمہارے اوپر محیط ہے، تم تو بالکل اس طرح سے ہو جس طرح سے چکی کے دو پاٹوں کے درمیان میں دانہ ہوتا ہے، یہ معلوم نہیں کہ کس وقت ذرا سا یوں پاٹ چلیں گے اور پیس کے رکھ دیں گے، تو زمین کے اوپر رہتے ہوئے اور آسمان کے نیچے رہتے ہوئے اللہ کی گرفت سے کبھی کوئی آدمی بے خوف ہو سکتا ہے؟ زمین کی طرف سے ایسے عذاب آ سکتے ہیں جو انسان کو بھسم کر کے رکھ دیں، آسمان کی طرف سے ایسے عذاب آ سکتے ہیں جو انسان کو ایک منٹ میں ختم کر دیں، تو زمین اور آسمان کے درمیان میں رہتے ہوئے انسان کسی وقت بھی بے خوف نہیں ہو سکتا، تو اَوْ یَاْخُذَهُمْ عَلٰی تَخَوُّفٍ کا مفہوم اس طرح سے ہو گیا، "ڈرانے پر" یعنی ایسے حال

میں کہ جس وقت تمہارے دل میں بھی اندیشہ آیا ہوا ہو، ایسی صورت میں بھی اللہ پکڑ سکتا ہے، اور تقلب میں وہ صورت ہوگی کہ اندیشے کی کوئی بات نہیں، چلتے پھرتے گرفت میں آ گئے، یا تخوف کا ترجمہ وہی! تنقص کے ساتھ، تقلب کا معنی ہوگا کہ یکدم پکڑ لے، اور تخوف کا معنی ہوگا گھٹاتے گھٹاتے اللہ تعالیٰ تمہیں ختم کر دے، شخصی طور پر بھی ہو سکتا ہے کہ قوتیں آہستہ آہستہ ختم ہو جائیں، جماعتی طور پر بھی ہو سکتا ہے کہ افراد مرتے چلے جائیں اور ان کی جگہ دوسرے پیدا نہ ہوں، آہستہ آہستہ گھٹاتے گھٹاتے ختم کر دے ایسا بھی ہو جاتا ہے۔ فَإِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ: پس بے شک تمہارا رَبّ البتہ شفقت کرنے والا رحم کرنے والا ہے، تو اس کی رأفت اور اس کی رحمت کا تقاضا ہے کہ تمہیں ڈھیل دے رکھی ہے ورنہ یہ نہیں کہ تم اللہ کی قدرت سے باہر ہو اور پکڑ میں نہیں آ سکتے۔

''سائے'' کے ظاہر ہونے میں اللہ تعالیٰ کی قدرت

آگے اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کا تصرف اور ساری کائنات کے اوپر اس کے حکم کا چلنا، یہ نمایاں کیا ہوا ہے ''کیا ان لوگوں نے دیکھا نہیں اس چیز کی طرف جس کو اللہ نے پیدا کیا'' مِن شَيْءٍ یہ مَا کا بیان ہے، ''کیا ان لوگوں نے دیکھا نہیں اس شئ کی طرف جس کو اللہ نے پیدا کیا، مائل ہوتے ہیں اس کے سائے دائیں طرف اور بائیں طرف اللہ کو سجدہ کرتے ہوئے اور وہ اللہ کے سامنے عاجزی کرنے والے ہیں، یا وہ اشیاء بھی اللہ کے سامنے عاجزی کرنے والی ہیں'' یہ سائے جھکتے ہیں کبھی دائیں طرف، کبھی بائیں طرف، اصل میں جس وقت آپ سایہ دیکھیں گے، اس کے نمایاں ہونے کے اندر اللہ کی قدرت کتنی نمایاں ہے، سورج کی حرکت کے ساتھ اس کا تعلق ہے، زمین کے ساتھ اس کا تعلق ہے، اور ہر چیز کے وجود کے ساتھ اس کا تعلق ہے، سورج کا یوں نمایاں ہونا، اس کی روشنی کا زمین پر پہنچنا، پھر اس سورج کا حرکت کرنا، اس کے اثرات کا درخت پہ یا انسان پہ آنا، یا دوسری چیز پہ آنا، پھر ان کے وجود کا اس طرح سے کثیف ہونا کہ جو اس روشنی کو روکے، روکنے کی وجہ سے اس کا سایہ نمایاں ہو، پھر زمین کے اوپر اس کا پھیلنا، تو ایک سائے کی حرکت اگر آپ دیکھیں گے تو اس میں کتنی اللہ کی قدرت نمایاں ہے، صرف یہ نہیں کہ آپ ذرا چلے تھے اور سایہ ظاہر ہو گیا نہیں! سایہ ظاہر ہونے میں کتنا کام ہو رہا ہے، اس کا تعلق سورج کے ساتھ بھی ہے، سورج کی روشنی کے زمین پر پہنچنے کے ساتھ بھی ہے، پھر اس وجود کے ساتھ بھی ہے کہ وجود ایسا بنایا کہ اس میں سے روشنی عبور نہیں کرتی، کیونکہ جس میں سے روشنی عبور کرے اس کا سایہ نہیں پڑا کرتا، آگے زمین کے ساتھ بھی اسی طرح سے تعلق ہے، تو یہ سائے کا ڈھلنا، کبھی دائیں طرف کو جانا، کبھی بائیں طرف کو جانا یہ علامت ہے اس بات کی کہ ہر چیز کے اوپر تصرف اللہ کا چلتا ہے۔

پوری کائنات اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہے

''اور اللہ ہی کے لئے سجدہ کرتی ہے ہر وہ چیز جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے'' دابہ: زمین پہ چلنے والی چیز۔ مِن دَآبَّةٍ یہ مَا کا بیان ہے۔ جتنی چیزیں بھی چلنے والی ہیں، حرکت کرنے والی ہیں آسمان میں زمین میں، سب اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہیں ''اور فرشتے بھی، اور وہ تکبر نہیں کرتے'' فرشتوں کو خصوصیت کے ساتھ اس لئے ذکر کر دیا کہ وہ لوگ فرشتوں کو بھی معبود بنائے

بیٹھے تھے، اور یہاں ذکر کردیا کہ جن کو تم معبود سمجھتے ہو، جن کو تم نے شفعاء شرکاء قرار دے رکھا ہے وہ بھی سارے کے سارے اللہ کے سامنے عاجزی کرنے والے ہیں، اُن میں اللہ کی بات کے سامنے اکڑنے والا کوئی نہیں ہے، ''وہ ڈرتے ہیں اپنے رَبّ سے'' مِّنْ فَوْقِهِمْ: اپنے اوپر سے، یعنی وہ رَبّ جو ان کے اوپر غلبہ پائے ہوئے ہے۔ مِّنْ فَوْقِهِمْ کا یہ معنی ہے۔ اپنے اوپر سے اپنے رَبّ سے ڈرتے ہیں، اُوپر ہونا یہ کوئی حسی طور پر ضروری نہیں ہوا کرتا، جس طرح سے ایک حاکم کے اوپر دوسرا حاکم ہے، آپ کے اُوپر ایک شخص حاکم ہے، بالادستی، مِّنْ فَوْقِهِمْ میں اسی معنی کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے، ایسا رَبّ جس کو ان کے اُوپر غلبہ حاصل ہے، جو ان کے اُوپر فوقیت رکھتا ہے، ''وہ اپنے رَبّ سے ڈرتے ہیں اپنے اُوپر سے'' یعنی ایسا رَبّ جو ان کے اُوپر فوقیت رکھتا ہے، جس کو ان کے اُوپر غلبہ حاصل ہے، (یہ محاورہ سمجھ میں آ گیا؟) ہم بھی کہتے ہیں ہمارے اوپر فلاں شخص حاکم ہے، اور اس حاکم کے اُوپر فلاں شخص حاکم ہے، تو یہ وہی فوقیت والا معنی ہے۔ ''اور کرتے ہیں وہی کام جس کا وہ حکم دیے جاتے ہیں'' اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرسکتے۔

معبود، مالک، محسن اور فریادرَس صرف ایک ہی ذات ہے

وَقَالَ اللّٰهُ: اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَیْنِ اثْنَیْنِ: اِلٰهَیْنِ اثْنَیْنِ یہ تثنیہ ہوگیا، الٰھین نہ بناؤ، دوخدا نہ بناؤ، دوخدا نہ بناؤ کا یہ معنی نہیں کہ تین بناسکتے ہو، مطلب یہ ہے کہ تعدد نہیں، بس ایک پر ٹھہرے رہو، الٰہ واحد ہی ہے، اس میں دوسرا شریک کرنا ٹھیک نہیں، تعدد کی نفی کرنی مقصود ہے، کہ جب ایک سے تجاوز کرکے دو تک بھی پہنچنا ٹھیک نہیں تو تین چار کی کیا گنجائش ہے، الٰھین کی گنجائش نہیں تو آلہہ کی کیا گنجائش ہوگی، ''دوخدا نہ بناؤ'' اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ: وہ الٰہ ایک ہی ہے، فَاِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ: فَارْهَبُوْنِ پس تم مجھ سے ہی ڈرو، اِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ، اس میں تاکید ہوگئی، مجھ سے ہی ڈرو، کسی دوسرے سے ڈرنے کی ضرورت نہیں، نفع نقصان میرے ہی ہاتھ میں ہے۔ وَلَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: اسی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے، وَلَهُ الدِّیْنُ وَاصِبًا: دین: طاعت۔ واصباً: دائماً۔ دائماً طاعت اسی کے لئے ہے، دوامی طاعت اسی کے لئے ہے، ہمیشہ فرمانبرداری اسی کی ہونی چاہیے، اَفَغَیْرَ اللّٰهِ تَتَّقُوْنَ: کیا پھر تم اللہ کے غیر سے ڈرتے ہو؟ وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ: جو نعمت بھی تمہارے پاس ہے، فَمِنَ اللّٰهِ پس وہ اللہ ہی کی جانب سے ہے، یہ مَا موصولہ ہے جس کے اندر شرط والا معنی آ گیا، تو منعم حقیقی بھی وہی ہے، محسن بھی وہی ہے، معبود بھی وہی، لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: مالک وہی، وَلَهُ الدِّیْنُ وَاصِبًا: مطاع وہی، جس کی طاعت کی جائے، اور وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ: محسن وہی۔ ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ: پھر جس وقت تمہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو پھر تم اسی کی طرف ہی چلّاتے ہو، تو فریادرَس وہی، کیونکہ مشرکین کی عادت یہی تھی کہ جب کوئی بڑی تکلیف پہنچتی تھی وہ سمجھتے تھے کہ یہ چھوٹے چھوٹے خداؤں کے قابو کی نہیں، پھر وہ صرف ایک آسمان والے کو پکارتے تھے، تو معلوم ہوگیا کہ مشکل وقت میں کام وہی آتا ہے، ''پھر جس وقت تمہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو پھر تم اُسی کی طرف چلّاتے ہو'' تو فریادرَس بھی وہی۔ ثُمَّ اِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنْكُمْ اِذَا فَرِیْقٌ مِّنْكُمْ بِرَبِّهِمْ یُشْرِكُوْنَ: پھر جس وقت وہ تکلیف تم سے

دُور کردیتا ہے اچانک ایک فریق تم میں سے اپنے رَبّ کے ساتھ شریک ٹھہرانے لگ جاتا ہے، تکلیف تو اللہ نے دُور کی اور چڑھاوے چڑھائے جارہے ہیں قبروں پر اور مزاروں پر، نسبت کی جارہی ہے دوسرے شرکاء کی طرف، کہ فلاں نے شفادے دی، فلاں نے تکلیف دُور کردی، نام ان کے لیے جارہے ہیں۔

مشرکین کے طرزِ عمل کا نتیجہ ناشکری

لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ: یہ لام بھی لام عاقبت ہے، اُن کے اس طرزِ عمل کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ ہم نے دیا اس کی وہ ناشکری کرتے ہیں، اپنے رَبّ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ناشکری کرتے ہیں وہ اس چیز کی جو ہم نے انہیں دی۔ دینے والے ہم اور پھر نسبت دوسروں کی طرف کردیتے ہیں، بیٹا دیا ہم نے، اور بنادیا پیراں دتہ، اور پھر کبھی کسی خانقاہ پر جاکے اس کا ماتھا ٹیکا جاتا ہے، کبھی کسی جگہ جاکے اس کی چوٹی بنوائی جارہی ہے، اور کبھی کسی جگہ جاکے شکرانے کے چڑھاوے چڑھائے جارہے ہیں، یہ سب چیزیں ایسی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت کی ناشکری ہے، جب اللہ نے دیا ہے تو شکر اللہ کا ادا کرو، فَتَمَتَّعُوْا: یہ وعید ہے، کوئی بات نہیں، مزے اڑالو، یہ خواہشات کا دور تھوڑا سا ہی ہے، فَتَمَتَّعُوْا: مزے کرلو، فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ: عنقریب پتا چل جائے گا۔

غیر اللہ کے لئے نذر و نیاز دینے پر اِنکار

وَيَجْعَلُوْنَ لِمَا لَا يَعْلَمُوْنَ نَصِيْبًا مِّمَّا رَزَقْنٰهُمْ: یہ جو نذر و نیاز پر غیر اللہ کے لئے مانتے ہیں اس کے اوپر انکار ہے، مارزقناهم: جو کچھ ہم نے انہیں دیا اس میں سے ایک حصہ قرار دے دیتے ہیں ان چیزوں کے لئے جن کے متعلق ان کو علم ہی کوئی نہیں، یعنی جن کے حق دار ہونے کی ان کے پاس کوئی علمی دلیل نہیں ہے، ان کے شریک ہونے کی اور نفع نقصان کے مالک ہونے کی کوئی دلیل نہیں، ہمارے دیے ہوئے رزق میں سے ایک حصہ ان کے لئے متعین کردیتے ہیں، جیسے سورۂ انعام کے اندر تفصیل آپ کے سامنے آئی تھی کہ حصے متعین کرکے کہتے ہیں هٰذَا لِلّٰهِ، وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا، کہ یہ تو اللہ کے نام کا ہے اور یہ شرکاء کے نام کا ہے، اور اللہ کے نام پر گھٹیا چیز، شرکاء کے لئے بڑھیا، اللہ کے نام پہ کبھی کبھی، شرکاء کے لئے ہر مہینے، جس طرح سے جاہلوں میں رواج ہے نا! کہتے ہیں کہ گیارہویں کے دِن پیر صاحب کو دُودھ نہ دیں تو بھینس بگڑ جاتی ہے، یعنی اس کا مطلب ہے کہ پیر صاحب انہی کے دُودھ پر پلتے ہیں، اور وہ نظر لگائے بیٹھے ہیں کہ ایک چلو دُودھ آئے گا تو ٹھیک ہے، ورنہ بھینس خراب کردوں گا، یہ تو آج کل کے پولیس مینوں سے بھی گئی گزری بات ہے، کہ اگر کوئی ان کا ماہوار بھتہ نہ دے تو چالان کرنے کے لئے آجاتے ہیں، ہوتا ہے نا؟ محکمے والوں کے ساتھ بھی ماہوار متعین ہوتا ہے، کسی کے ساتھ پانچ روپے، کسی کے ساتھ دس روپے، تانگے والے سے بھی ماہوار متعین ہے، تو وقت پر پہنچتا رہے تو ٹھیک ہے اور جہاں ان کا بھتہ نہ پہنچا تو پولیس والے سر پہ کھڑے ہیں چالان کرنے کے لئے، تو انہوں نے پیر صاحب کو بھی ایسے سمجھا ہوا ہے، کہ اگر ان کا متعین وظیفہ پہنچتا رہے، دُودھ کا چلّو دے دیں تو ٹھیک ہے ورنہ پھر بھینس بگڑ جائے گی، اور اگر یہ فلاں نذر و نیاز نہ دی تو بیٹا مرجائے گا، یہ جگا ٹیکس ہے، آج کل کی اصطلاح میں اس کو جگا ٹیکس کہتے ہیں، کہ بدمعاش لوگ ڈنڈے کے ساتھ مسلط ہوجاتے ہیں، کہتے ہیں اتنا دیتے رہو تو ٹھیک ہے، ورنہ ہم یوں کردیں گے، تو یہ ان اللہ کے

نیک بندوں کو بدنام کرتے ہیں، وہ اللہ کے ہاں نعمتوں سے فائدے اٹھا رہے ہیں، خوش حالی میں ہیں، جنت میں ہیں، ان کے دُودھ کے ایک چلّو کے وہ محتاج نہیں ہیں، کہ اگر یہ نہ دیا گیا تو وہ بھینس کو بگاڑ کے رکھ دیں گے، ہاں البتہ ایصالِ ثواب کی نیت سے اگر دیا جائے تو وہ ٹھیک ہے، کہ دو اللہ کے نام پر اور یہ کہو کہ انہوں نے چونکہ ہمیں دِینی فائدہ پہنچایا، ان کی تعلیمات سے ہم فائدہ اُٹھا رہے ہیں، تو ایصالِ ثواب ان کے لئے ہے، ثواب ان کو پہنچا دیا جائے، اس میں کسی کا اختلاف نہیں۔

غیر اللہ کے لئے نذر و نیاز کی پہچان کے لئے ایک دِلچسپ واقعہ

حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے ملفوظات میں ایک واقعہ بیان کیا ہوا ہے کہ ایک مسجد کے اندر دو طالبِ علم رہتے تھے، ایک طالبِ علم کہتا ہے کہ یہ جو گیارہویں کے نام پر دیتے ہیں اصل میں ان کا مقصد یہ ہوا کرتا ہے کہ دیتے اللہ کے نام پر ہیں اور ثواب پہنچانا مقصود ہوتا ہے پیر جی کی رُوح کو، اس لیے اس کے کھانے میں کوئی حرج نہیں، یہ مَآ اُھِلَّ بِہٖ لِغَیْرِ اللہِ میں داخل نہیں ہے۔ دُوسرا کہنے لگا کہ نہیں! یہ جو گیارہویں کے نام پہ دیتے ہیں یہ مَآ اُھِلَّ بِہٖ لِغَیْرِ اللہِ میں داخل ہے یہ پیر جی کو دیتے ہیں، براہِ راست پیر جی کی رُوح کو خوش کرنے کے لئے، درمیان میں اللہ کا واسطہ نہیں لاتے، یہ ایسے ہے گویا کہ انہی کو دے رہے ہیں، انہی کی طرف نسبت ہے۔ یہ بیٹھے ابھی آپس میں بحث ہی کر رہے تھے کہ اتنے میں ایک بڑھیا جلیبیاں لے کے آ گئی، اور آ کے کہتی ہے کہ لو جی! مولوی صاحب! یہ پیر جی کی نیاز ہے، تو وہ جو کہتا تھا کہ اللہ واسطے دینا مقصود ہوتا ہے اور پیر جی کو ثواب پہنچانا مقصود ہوتا ہے، وہ پوچھتا ہے کہ اماں! تیرا مقصد یہ ہے نا؟ کہ تُو اللہ واسطے دے رہی ہے اور ثواب پیر جی کو بھیجنا مقصود ہے؟ کہتی ہے: نہیں نہیں! اللہ واسطے تو دے آئی ہوں یہ تو پیر جی کی ہے۔ وہ (دوسرا) کہنے لگا: لو! دیکھ لو بھئی! تو جن جاہلوں کا یہ عقیدہ ہو تو یہ ان کا دیا ہوا، مَآ اُھِلَّ بِہٖ لِغَیْرِ اللہِ میں داخل ہے، اور اگر وہ اپنے اس لفظ کو جاہلیت کے طور پر استعمال کرتے ہیں لیکن ان سے اس طرح سے واضح کر کے مراد پوچھی جائے کہ کیا تمہارا مقصد یہ ہے کہ اللہ کے نام پر خیرات دے رہے ہو اور اس کا ثواب پیر جی کو دینا مقصود ہے؟ اگر وہ کہیں ہاں! ہماری مراد یہی ہے، تو پھر وہ صدقہ خیرات کے حکم میں ہے، اور اگر وہ کہیں کہ نہیں نہیں! اللہ میاں کے لئے اور حساب ہے، یہ تو گیارہویں تاریخ متعین ہے اس جگا ٹیکس کے ادا کرنے کی، کہ اگر پیر جی کو براہِ راست نہ دی تو مصیبت آئی، یا چور بھینس کھول کے لے جائیں گے، یا بھینس مر جائے گی، یا دُودھ کی جگہ خون آنے لگ جائے گا اگر پیر کے نام پر نہ دیا، تو یہ جوان کا براہِ راست پیر جی سے معاملہ ہے یہ مَآ اُھِلَّ بِہٖ لِغَیْرِ اللہِ میں داخل ہے، پھر اس کے احکام وہی ہیں جو مَآ اُھِلَّ بِہٖ لِغَیْرِ اللہِ کے ہیں، جو آپ کے سامنے واضح کیے جا چکے ہیں۔

''وَیَجْعَلُوْنَ لِمَا لَا یَعْلَمُوْنَ'' کا دُوسرا مفہوم

وَیَجْعَلُوْنَ لِمَا لَا یَعْلَمُوْنَ نَصِیْبًا مِّمَّا رَزَقْنٰھُمْ: جو کچھ ہم نے ان کو دیا اس میں سے ایک حصہ متعین کر دیتے ہیں ان چیزوں کے لئے جن کے متعلق ان کو کوئی علم نہیں، یعنی جن کو یہ منصب دیے بیٹھے ہیں یہ بغیر علمی دلیل کے ہے۔ اور ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لَا یَعْلَمُوْنَ سے وہی مراد ہیں جن کو دیا جا رہا ہے، ''اللہ کے دیے ہوئے رزق میں سے ایک حصہ متعین کر دیتے ہیں ان

کے لئے جن کو خود پتا ہی نہیں کہ لوگ ہمیں دے رہے ہیں' دے رہے ہیں تو کیوں دے رہے ہیں؟، ان کی کیا ضرورتیں ہم سے متعلق ہیں؟ ان کو کوئی علم نہیں، وہ اپنی جگہ ہیں جیسے کیسے ہیں، ان کو کوئی علم نہیں کہ یہ پیچھے کرنے والے ہمارے ساتھ کیا کرتے ہیں، کیا نہیں کرتے، وہ بے علمی کی کیفیت میں ہیں، نیک ہیں یا بُرے، جو بھی ہیں برزخ میں ان کا اپنا اپنا حال ہے، ملائکہ ہیں تو وہ اللہ کی طرف سے اپنے اپنے کاموں پر متعین ہیں، بے جان چیزوں کو تو کیا ہی پتا ہوگا کہ ہمارے پوجنے والے ہمارے ساتھ کیا کرتے ہیں، اور جو انبیاء اور اولیاء اللہ وفات پا گئے تو ان کو بھی (تفصیلاً) کیا خبر کہ لوگ ہمارے متعلق کیا کیا نظریات رکھے ہوئے ہیں، اور کیا کیا ہمارے ساتھ برتاؤ کرتے ہیں۔ تو لَا یَعْلَمُوْنَ کا یہ بھی معنی ہوسکتا ہے کہ ایسی چیزوں کے لئے حصہ متعین کردیتے ہیں جن کو خود کوئی پتا نہیں کہ یہ لوگ کیا کرتے ہیں اور ہمارے ساتھ کیا معاملہ ہو رہا ہے، تو جس کی پوجا کی جارہی ہے، جس کو نذر و نیاز دی جارہی ہے اسے پتا ہی نہیں کہ مجھے دی جارہی ہے، اور یہ لوگ جہالت میں لگے ہوئے ہیں ٹامک ٹوئیاں مارنے میں۔ تَاللّٰهِ لَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَفْتَرُوْنَ: اللہ کی قسم البتہ ضرور پوچھے جاؤ گے تم ان باتوں کے متعلق جو تم تراشا کرتے تھے، یہ تمہاری تراشی ہوئی باتیں ہیں، گھڑی ہوئی باتیں ہیں، خانہ ساز باتیں ہیں، ان کے متعلق تم سے پوچھا جائے گا کہ یہ نظریہ تم نے اپنایا تھا تو کس دلیل کی بنا پر اپنایا تھا؟

اللہ تعالیٰ کے لئے بیٹیاں ثابت کرنے والوں کی تردید

یہ غیر اللہ کی نذر و نیاز پر تنقید تھی، آگے ان کے اس نظریے پر تنقید ہے جو وہ اللہ کے لئے بیٹیاں ثابت کرتے تھے، فرشتوں کے متعلق کہتے تھے کہ یہ اللہ کی بیٹیاں ہیں، اور سورۂ صافات میں ایک لفظ آئے گا جَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا (آیت:۱۵۸) کہ ان مشرکوں نے اللہ اور جنوں کے درمیان میں رشتہ داریاں قائم کردیں، وہ کہتے تھے (جیسے حدیث شریف میں آتا ہے) کہ یہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں اور ان کی مائیں جنوں کے سرداروں کی لڑکیاں ہیں، گویا کہ جنوں کے سرداروں کی بیٹیوں کے ساتھ اللہ، نعوذ باللہ! شادی کرتا ہے اور پیدا فرشتے ہوتے ہیں، اسی کو کہتے ہیں کہ ''کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا، بھان متی نے کنبہ جوڑا!'' تو کنبہ یوں جوڑ دیا، جنوں کی لڑکیاں نعوذ باللہ! اللہ کی بیویاں، اور پیدا ہوتے ہیں فرشتے۔ وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ: اللہ کے لئے بیٹیاں قرار دیتے ہیں، سُبْحٰنَهٗ: اللہ اس عیب سے پاک ہے، اولاد کی نسبت اللہ کی طرف عیب ہے، لیکن پھر لڑکیوں کی نسبت ان کے خیال کے مطابق بھی عیب ہے، وَلَهُمْ مَّا يَشْتَهُوْنَ: اور ان کے لئے وہ چیز ہے جو یہ چاہتے ہیں، اپنے لیے تو اپنی چاہی ہوئی چیز رکھتے ہیں یعنی بیٹے، ان کو تو شوق ہے کہ ہماری طرف تو نسبت بیٹوں کی ہو، بیٹیوں کی نہ ہو، تو جو نسبت اپنی طرف گوارہ نہیں کرتے اللہ کی طرف نسبت کیے بیٹھے ہیں، اور خود ان کا یہ حال ہے کہ اپنی طرف بیٹی کی نسبت گوارہ نہیں کرتے، وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى: یہ اس وقت کے معاشرے کی ایک تصویر ہے، جاہلیت کے معاشرے کی ایک تصویر ہے، کہ اولاد کے متعلق ان کے کیسے جذبات تھے، کہ اگر کسی کے گھر لڑکی پیدا ہوجائے اور پتا چلے کہ لڑکی پیدا ہوگئی تو کالا منہ ہوجاتا ہے، غم کے مارے رُوسیاہ ہوجاتا ہے، کسی کو شکل دکھانے کے لئے تیار نہیں، کہ لوگ کہیں گے اس کے گھر بیٹی پیدا ہوگئی، پھر بیٹھ کے سوچتا ہے کہ میں اس کو زندہ رکھوں، یا اس کو مار دوں، یا زندہ درگور کردوں؟ پھر اس قسم کی باتیں سوچنے لگ جاتا ہے، تو لڑکی کی نسبت ان کو اپنے لئے کتنی ناگوار گزرتی

تھی، اور جس کو اپنے لیے عیب سمجھتے ہیں اس کو اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اسی آیت کے تحت مفسرین لکھتے ہیں کہ لڑکی کی خبر مل جانے کے بعد طبیعت کے اوپر غم کا طاری ہو جانا یہ وہی مشرکانہ جذبہ ہے، مؤمنین کے لئے تو لڑکی کا پیدا ہونا اسی طرح سے خوشی کا باعث ہے جس طرح سے کہ لڑکے کا پیدا ہونا، بلکہ حدیث شریف میں لڑکیوں کی تربیت کے اوپر زیادہ ثواب کا وعدہ کیا گیا ہے بمقابلہ لڑکوں کے، "باب الشفقة والرحمة" کے اندر آپ کے سامنے وہ سب روایات گزر چکی ہیں کہ لڑکیوں کی تربیت پر کیسے کیسے وعدے ہیں۔ وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُمْ بِالْأُنْثَىٰ: بالانثیٰ: بولادۃ الانثیٰ جب ان میں سے کسی کو خبر دی جاتی ہے لڑکی کے پیدا ہونے کی، ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا: ظَلَّ افعال ناقصہ میں سے ہے، دن کے وقت کسی کام کا ہونا۔ بات: رات کے وقت کسی کام کا ہونا۔ تو ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا کا معنی ہو گیا کہ سارا دن اس کا چہرہ سیاہ ہوتا ہے، دن کے وقت اس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے، سارا دن اس کا منہ سیاہ رہتا ہے، وَهُوَ كَظِيمٌ: اور وہ گھٹنے والا ہوتا ہے، دل میں گھٹتا ہے کہ یہ لڑکی کیوں پیدا ہو گئی؟ يَتَوَارَىٰ مِنَ الْقَوْمِ: قوم سے چھپتا پھرتا ہے، مِنْ سُوءِ مَا بُشِّرَ بِهِ: سوء سے یہاں عار مراد ہے، مَا بُشِّرَ بِهِ کی عار سے، جس چیز کی اس کو خبر دے دی گئی یعنی لڑکی کے پیدا ہونے کی اس کے شرم کے مارے، اس کی عار کے سبب سے لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے، یعنی اپنے آپ کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں سمجھتا، لڑکی کی نسبت اپنی طرف اتنی ناگوار ہے، أَيُمْسِكُهُ عَلَىٰ هُونٍ: یہ اس کا خیال مذکور ہے، يُفَكِّرُ فِي نَفْسِهِ أَيُمْسِكُهُ عَلَىٰ هُونٍ پھر اپنے دل میں سوچتا ہے کہ کیا اس ("ہٗ" ضمیر لوٹ رہی ہے مَا بُشِّرَ بِهِ میں مَا کی وجہ سے، ورنہ مراد تو لڑکی ہے) یہ جو مولود پیدا ہوا ہے، یہ جو مَا بُشِّرَ بِهِ ہے، جس چیز کی بشارت دی گئی ہے، اس کو روک رکھے ذلت پر؟ کہ میں لڑکی کے ہونے کی ذلت قبول کروں اور اس کو گھر میں باقی رکھ لوں؟ ہے تو یہ ذلت، أَمْ يَدُسُّهُ فِي التُّرَابِ: یا پھر اس کو مٹی میں گھسیڑ دوں، "سوچتا ہے اپنے نفس میں کہ روک رکھے اس کو ذلت پر یا اس کو دھنسا دے مٹی میں" دَسّ: مٹی کے اندر دھنسانا۔ یعنی یوں اس کے دل میں خیالات آتے ہیں، کبھی سوچتا ہے کہ ہے تو ذلت، لیکن پیدا ہو گئی، چلو رکھ ہی لیتے ہیں، کبھی کہتا ہے کہ نہیں! اس کو مار کر دفن کر دینا چاہیے، یا اس کو زندہ مٹی میں گھسیڑ دینا چاہیے، اس قسم کے خیالات آتے ہیں، یعنی ان باتوں کے ذکر کرنے سے بتانا یہ مقصود ہے کہ لڑکی کی نسبت اپنی طرف کتنی ناگوار ہے اور اس کو یہ لوگ کتنا عیب سمجھتے ہیں، تو جس کو اپنے لئے عیب سمجھتے ہیں، اپنے لیے ناگوار مناتے ہیں اسی کو یہ بدبخت اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں، کہ اللہ کی لڑکیاں ہیں، تو اگر اللہ کی طرف منسوب کرنی ہو تو اپنے خیال کے مطابق کم از کم وہ چیز تو منسوب کرو کہ جس کی نسبت تمہارے نزدیک بھی کمال ہے، اور جس کی نسبت تمہارے نزدیک بھی عیب اور نقص ہے تو اس کو اللہ کی طرف منسوب کرنے کا کیا مطلب؟ أَلَا سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ: خبردار! یہ بہت ہی برا فیصلہ کرتے ہیں، جو اللہ کے لئے اس قسم کی نسبتیں قائم کرتے ہیں جس قسم کی نسبتیں اپنے لیے گوارہ نہیں ہیں۔ لِلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ: ان لوگوں کے لئے جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے بری حالت ہے، وَلِلَّهِ الْمَثَلُ الْأَعْلَىٰ: اور اللہ کے لئے تو اعلیٰ مثال ہے، وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ: اور وہ زبردست ہے حکمت والا ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ

اگر مواخذہ کرے اللہ تعالیٰ لوگوں سے ان کے ظلم کے سبب سے تو نہ چھوڑے اس زمین کے اوپر کوئی چلنے والا، لیکن اللہ ان لوگوں کو

إِلٰٓى أَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَإِذَا جَآءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿٦١﴾

ڈھیل دیتا ہے ایک وقتِ معین تک، پھر جس وقت ان کا وقتِ معین آ جائے گا تو نہ وہ ایک گھڑی پیچھے ہٹیں گے اور نہ آگے بڑھ سکیں گے ﴿۶۱﴾

وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ مَا يَكْرَهُوْنَ وَتَصِفُ أَلْسِنَتُهُمُ الْكَذِبَ أَنَّ لَهُمُ الْحُسْنٰى ۖ

قرار دیتے ہیں اللہ کے لئے وہ چیز جس کو اپنے لیے ناپسند کرتے ہیں اور ان کی زبانیں جھوٹ بیان کرتی ہیں کہ ان کے لئے بھلائی ہے،

لَا جَرَمَ أَنَّ لَهُمُ النَّارَ وَأَنَّهُمْ مُّفْرَطُوْنَ ﴿٦٢﴾ تَاللّٰهِ لَقَدْ أَرْسَلْنَآ إِلٰٓى أُمَمٍ

یقینی بات ہے کہ ان کے لئے آگ ہے، اور وہ (جہنم میں) بھلا دیے جائیں گے ﴿۶۲﴾ اللہ کی قسم البتہ تحقیق بھیجا ہم نے مختلف جماعتوں کی طرف

مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ أَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَلَهُمْ

آپ سے پہلے بھی، پھر شیطان نے ان کے لئے ان کے اعمال کو خوبصورت بنا دیا، وہ شیطان ہی ان کا ساتھی ہے آج، اور ان کے لئے

عَذَابٌ أَلِيْمٌ ﴿٦٣﴾ وَمَآ أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ إِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي

دردناک عذاب ہے ﴿۶۳﴾ نہیں اُتاری ہم نے آپ پر کتاب مگر اس لیے تاکہ آپ بیان کریں ان کے لئے اس چیز کو جس میں

اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿٦٤﴾ وَاللّٰهُ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَأَحْيَا

یہ اختلاف کرتے ہیں، اور ہدایت اور رحمت کے لئے ان لوگوں کے واسطے جو ایمان لاتے ہیں ﴿۶۴﴾ اللہ نے آسمان سے پانی اُتارا پھر آباد کیا

بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۗ إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ﴿٦٥﴾ وَإِنَّ

اس کے ذریعے سے زمین کو اس کے بنجر ہو جانے کے بعد، بے شک اس میں البتہ نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو سنتے ہیں ﴿۶۵﴾ اور بے شک

لَكُمْ فِي الْأَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۖ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهِ مِنْ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ

تمہارے لیے چوپایوں میں غور کا مقام ہے، پلاتے ہیں ہم تمہیں اس چیز میں سے جو ان جانوروں کے پیٹ میں ہے گوبر اور خون

لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ ﴿٦٦﴾ وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْأَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ

کے درمیان سے خالص دودھ جو پینے والوں کے لئے خوشگوار ہے ﴿۶۶﴾ اور کھجوروں اور انگوروں کے پھلوں سے، بناتے ہو تم اس سے

سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۞ وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ

نشے کی چیز اور عمدہ رزق، بے شک اس میں البتہ نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو عقل رکھتے ہیں ۞ وحی کی تیرے رَب نے شہد کی مکھی کی طرف

اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ ۞ ثُمَّ كُلِيْ مِنْ كُلِّ

کہ بنا تُو پہاڑوں سے گھروں کو اور درختوں سے اور اس چیز سے جس کو وہ بطور چھپر کے ڈالتے ہیں ۞ پھر کھا تُو ہر قسم کے

الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ۭ يَخْرُجُ مِنْۢ

پھلوں سے پھر چل تُو اپنے رَب کے راستوں پر اس حال میں کہ وہ راستے (تیرے لیے) آسان کیے ہوئے ہیں، نکلتا ہے ان کے

بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَاۗءٌ لِّلنَّاسِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ

پیٹوں سے مشروب جس کے رنگ مختلف ہیں، اس میں لوگوں کے لئے شفاء ہے، بے شک اس میں البتہ نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو کہ

يَّتَفَكَّرُوْنَ ۞ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفّٰىكُمْ ڐ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ

غور کرتے ہیں ۞ اللہ نے تمہیں پیدا کیا پھر وہی تمہیں وفات دیتا ہے اور تم میں سے بعض وہ ہیں جو لوٹا دیے جاتے ہیں رذی عمر کی طرف،

لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَـيْـــًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ۞

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ جاننے کے بعد کسی چیز کو نہیں جانتا، بے شک اللہ تعالیٰ علم والا ہے اور قدرت والا ہے ۞

تفسیر

غلطی پر گرفت کا اُصولِ خداوندی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ - وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَاۗبَّةٍ: اگر مؤاخذہ کرے اللہ تعالیٰ لوگوں سے ان کے ظلم کے سبب سے تو نہ چھوڑے اس زمین کے اوپر کوئی چلنے والا، وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ: لیکن اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ڈھیل دیتا ہے، مؤخر کرتا ہے ایک وقتِ معین تک، فَاِذَا جَاۗءَ اَجَلُهُمْ: پھر جس وقت ان کا وقتِ معین آجائے گا، لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ: نہ وہ ایک گھڑی پیچھے ہٹیں گے اور نہ وہ ایک گھڑی آگے بڑھ سکیں گے۔ توحید رسالت اور معاد کے مضامین کے تذکرے کے ساتھ ساتھ یہ بات لوگوں کے سامنے بار بار واضح کی جارہی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے فوراً گرفت نہ ہو تو اس سے کسی دھوکے میں نہیں پڑنا چاہیے، اس سورۃ میں آپ کے سامنے پہلے بھی یہ مضمون گزر چکا ہے، یہ تاخیر اور اِمہال اللہ کی حکمت کا تقاضا ہے اگر اللہ تعالیٰ فوراً پکڑنا چاہے تو بھی اس کو روکنے والا کوئی نہیں، لیکن اپنی حکمت کی بنا پر وہ کچھ مہلت دیتا ہے کہ اگر کوئی سنبھلنا چاہے تو

سنبھل جائے، ورنہ جس وقت اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہو اسی وقت ہی گرفت ہو جائے، اگر گرفت کا یہ اصول چالو کر دیا جائے تو دنیا کے اندر کوئی آبادی رہ ہی نہیں سکتی، کون انسان ایسا ہے کہ جس سے کچھ نہ کچھ کوتاہی نہیں ہوتی، اور کسی درجے کی کوئی نافرمانی اس سے صادر نہیں ہوتی، اور جب نافرمانی صادر ہو اسی وقت وہ عذاب کی گرفت میں آجائے تو انسانوں کا تو خاتمہ ہو جائے گا، جب انسانوں کا خاتمہ ہو جائے گا تو باقی چیزیں تو اللہ تعالیٰ نے انسانی آبادی کے لئے ہی بطور خدمت گار کے بنائی ہیں، تو جب انسان باقی نہیں رہیں گے تو پھر باقی چیزوں کو باقی رکھنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہوگی، تو یہ جہان ہی ختم ہو جائے۔ تو اللہ تعالیٰ کسی ظلم کے سبب سے، کسی ظلم کے ارتکاب کرنے پر، کسی غلطی کے ارتکاب کرنے پر فوراً مواخذہ نہیں کرتا، اگر کرے تو کوئی بھی نہ بچے، لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ پکڑے گا نہیں، اگر تم اس دھوکے میں ہو کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے گرفت نہیں ہو رہی تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہم پر خوش ہے، یہ بات نہیں ہے، اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے تحت لوگوں کو ایک وقت معین تک مہلت دیتا ہے، اور جب وہ وقتِ معین آجائے گا پھر یہ نہ آگے بڑھ سکیں گے نہ پیچھے ہٹ سکیں گے، مطلب یہ ہے کہ عین اس وقت ہی پھر گرفت میں آئیں گے اور اسی وقت ان کے اُوپر موت طاری کر دی جائے گی یا عذاب آجائے گا، جو بھی ان کا وقتِ معین ہے پھر یہ اس سے آگے پیچھے نہیں ہو سکتے۔

رَدِّ شرک اور مشرکین کا اَنجام

وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ مَا يَكْرَهُوْنَ: یہ پھر رَدِّ شرک ہے۔ مَا يَكْرَهُوْنَ: جس چیز کو وہ لوگ ناپسند کرتے ہیں، يَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ: قرار دیتے ہیں اللہ کے لئے وہ چیز جس کو اپنے لئے ناپسند کرتے ہیں، جس طرح پچھلے رکوع کے اندر اللہ کی طرف بیٹیوں کی نسبت کا ذِکر تھا، اور بیٹیوں کی نسبت کو خود پسند نہیں کرتے، اللہ کی طرف ایسی چیز کو منسوب کرتے ہیں، یا اپنی جائیداد اور اپنے مال میں تو کوئی شریک گوارہ نہیں، وہ تو سمجھتے ہیں کہ ہم اکیلے ہی ہوں تو ٹھیک ہے، اور اپنی جائیداد کے اندر کسی دوسرے کی شرکت یہ گوارہ نہیں کرتے، اور اپنی مملوکہ چیز کے اندر کسی دوسرے کے تصرف کو گوارہ نہیں کرتے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف اس طرح سے شرکاء کی نسبت کر رہے ہیں وَتَصِفُ اَلْسِنَتُهُمُ الْكَذِبَ اَنَّ لَهُمُ الْحُسْنٰى: اور ان کی زبانیں جھوٹ بیان کرتی ہیں کہ ان کے لئے بھلائی ہے، یعنی اللہ کی طرف اس قسم کی نسبتیں بھی کرتے ہیں، پھر زبان سے جھوٹ بھی بولتے ہیں کہ بالفرض اگر آخرت ہوگئی تو اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کے لئے حسنیٰ ہوگی، جیسے قرآنِ کریم میں دوسری جگہ آئے گا وَلَئِنْ رُّجِعْتُ اِلٰى رَبِّيْٓ اِنَّ لِيْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰى (سورۃ فصلت: ۵۰) اگر میں اللہ کی طرف لوٹا دیا گیا تو وہاں بھی میرے لئے حسنیٰ ہی ہوگی، تو اپنی زبانوں سے پھر اپنے لئے حسنیٰ بیان کرتے ہیں کہ ان کے لئے حسنیٰ ہے، تَصِفُ اَلْسِنَتُهُمْ: یہ ان کی زبانی باتیں ہیں، اپنی زبانوں سے جھوٹ بولتے ہیں، واقعہ کچھ نہیں، واقعہ تو یہ ہے جو آگے ذکر کیا جا رہا ہے کہ لَا جَرَمَ اَنَّ لَهُمُ النَّارَ: یقینی بات ہے، اس میں کوئی کسی قسم کا شبہ نہیں، کہ ان کے لئے جہنم ہے، بے شک ان کے لئے آگ ہے، وَاَنَّهُمْ مُّفْرَطُوْنَ: مفرَطون کا معنی آگے بڑھائے ہوئے، مُقدَّمُون یعنی سب سے پہلے یہ ائمۃ الکفر دوزخ میں بھیجے جائیں گے، اور اسی طرح مفرطون، مُتْرَکُون کے معنی میں بھی آتا ہے کہ یہ جہنم میں چھوڑ دیے جائیں گے، پھر ان کی بات کوئی نہیں پوچھے گا، اور اس کا ترجمہ مَنسِیُّون کے ساتھ بھی کیا گیا ہے کہ یہ بھلا دیے جائیں گے، جہنم میں پھینکنے کے بعد بھلا دیے جائیں گے، جیسے دوسری جگہ

ذکر کیا گیا اَلْیَوْمَ نَنْسٰکُمْ کَمَا نَسِیْتُمْ لِقَآءَ یَوْمِکُمْ هٰذَا (الجاثیہ: ۳۴) کہ تم نے اس دن کو یاد نہیں رکھا، ہماری ملاقات کو یاد نہیں رکھا، اسی طرح سے ہم بھی تمہیں یاد نہیں رکھیں گے، بھلا دیں گے، جہنم میں ڈال کے پھر ان کی بات ہی کوئی نہیں پوچھے گا۔

سَروَرِ کائنات ﷺ کو تسلی

تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓی اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ: اللہ کی قسم البتہ تحقیق بھیجا ہم نے مختلف جماعتوں کی طرف آپ سے پہلے بھی، اَرْسَلْنَآ کا مفعول محذوف ہے یعنی رسولوں کو، ہم نے آپ سے پہلے بھی مختلف جماعتوں کی طرف رسولوں کو بھیجا، فَزَیَّنَ لَهُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ: پھر شیطان نے ان کے لئے ان کے اعمال کو خوبصورت بنا دیا، یعنی ان کی نظروں میں ان کی اپنی کارروائیاں مزین ہوگئیں، اپنے کاموں کو وہ اچھا سمجھنے لگ گئے، شیطان نے وہ کام ان کے لئے مزین کردیے، جب مزین کردیے تو وہ ان کو چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوئے، فَهُوَ وَلِیُّهُمُ الْیَوْمَ: وہ شیطان ہی ان کا ساتھی ہے آج، وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ: اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ اس آیت میں سرورِ کائنات ﷺ کے لئے تسلی کا مضمون ہے کہ اگر یہ آپ کی بات کو نہیں مانتے تو کوئی بات نہیں، پہلے سے دستور کچھ ایسے ہی چلا آتا ہے کہ شیطان ان کے دِلوں میں وسوسے ڈالتے ہیں، اور ان کے اعمال کو ان کے سامنے مزین کر کے پیش کرتے ہیں، تو یہ رسولوں کی تبلیغ کے مقابلے میں شیطان کی تعلیم کو پسند کرتے ہیں۔

قرآنِ کریم کے نزول کا مقصد

وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَیِّنَ لَهُمُ الَّذِی اخْتَلَفُوْا فِیْهِ: جیسے پہلے ہم نے رسول بھیجے تھے، نہیں اتاری ہم نے آپ پر کتاب مگر اس لیے تا کہ آپ بیان کریں ان کے لئے اس چیز کو جس میں یہ اختلاف کرتے ہیں، ''جس میں یہ اختلاف کرتے ہیں'' اس میں توحید اور معاد کے مسئلے بھی آ گئے، توحید کے بارے میں ان کا اختلاف ہے، معاد کے بارے میں اختلاف کرتے ہیں تو یہ کتاب اس لئے اُتاری تا کہ تو ان کے سامنے یہ مختلف فیہ باتیں واضح کردے، وَهُدًی وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ: اور وہ کتاب ہدایت اور رحمت ہے ان لوگوں کے لئے جو کہ ایمان لاتے ہیں، وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا هُدًی وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ، مضمون کی تکمیل اس طرح سے ہوجائے گی، ''مگر ہدایت اور رحمت کے لئے ان لوگوں کے واسطے جو کہ ایمان لاتے ہیں'' ہدایت اور رحمت! ان دونوں لفظوں میں فرق بارہا آپ کے سامنے ذکر کردیا گیا کہ ہدیٰ راہنمائی کو کہتے ہیں، یہ اوّل درجہ ہے، کہ قرآنِ کریم سے ہدایت حاصل کرو، راہنمائی حاصل کرو، اور رحمت اس کا نتیجہ ہے، نتیجے کے اعتبار سے یہ کتاب رحمت ہے، جب اس راہنمائی کو قبول کرو گے اور اس کے مطابق چلو گے تو اللہ کی رحمت کے حقدار ہوجاؤ گے۔

چار اِنعاماتِ خداوندی کا ذِکر

وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً: شروع سورۃ سے امتنان کا پہلو اس سورۃ میں غالب رہا ہے، احسانات کا تذکرہ، کہ اللہ تعالیٰ نے کیا کیا نعمتیں دی ہیں، تو یہاں پھر اسی مضمون کی طرف عود ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پھر کچھ نعمتوں کا اظہار کیا جارہا ہے، چار

چیزیں آنے والی آیات میں مذکور ہیں، پانی دودھ شراب اور شہد، چاروں کا تذکرہ اس کے اندر آرہا ہے جو اُس وقت بہترین قسم کے مشروب تھے، اور آج بھی شراب کے علاوہ باقی تینوں چیزیں مشروب کے طور پر استعمال ہوتی ہیں، بلکہ زندگی کا نظام انہی چیزوں کے ساتھ قائم ہے، توسب سے پہلے پانی کا تذکرہ ہے۔

پہلا اِنعام: بارش

وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً: اللہ نے آسمان سے پانی اتارا، فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا: پھر آباد کیا اس پانی کے ذریعے سے زمین کو اس کے بنجر ہوجانے کے بعد، اس کے ویران ہوجانے کے بعد، کیونکہ زمین کی حیات اس کی آبادی ہے، زمین کی موت اس کا بنجر ہوجانا ہے، ''زندہ کیا زمین کو اس کی موت کے بعد'' ہر چیز کی موت اس کی شان کے لائق ہوا کرتی ہے، زمین کی موت اس کا بنجر ہوجانا ہے کہ اس میں نباتات نہ ہو، اور اس کی زندگی اس کا سرسبز ہوجانا ہے، ''آسمان سے پانی اُتارا، پھر اس کے ذریعے سے آباد کیا زمین کو اس کے ویران ہوجانے کے بعد، بنجر ہوجانے کے بعد'' اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ: بے شک اس میں البتہ نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو سنتے ہیں، سننا یہاں کمال درجے کا مراد ہے کہ توجہ سے سنتے ہیں اور سن کر قبول کرتے ہیں، کیونکہ جب کوئی شخص بات سن رہا ہو لیکن سن کر قبول نہ کرے، سنا نہ سنا یکساں کردے، تو اس کا سننا نہ سننا برابر ہوتا ہے، توجہ سے سنتا نہیں، مانتا نہیں، تو اس کا سننا نہ سننا ایک ہی چیز ہے، تو سننے والے لوگوں سے مراد یہاں ماننے والے ہیں جو توجہ سے سنتے ہیں، سننے کے بعد تسلیم کرلیتے ہیں، تسلیم نہ کیا جائے تو وہ گویا کہ بہرہ ہوتا ہے سننے والا نہیں ہوتا، جیسے ہم اپنے محاورے میں کہا کرتے ہیں کہ میں نے اس کو بارہا سمجھایا لیکن وہ میری سنتا ہی نہیں، تو سنتا نہیں کا یہاں یہ معنی ہوتا ہے کہ وہ توجہ سے نہیں سنتا اور مانتا نہیں ہے۔ تو یہاں سماع کا لفظ کمال کے معنی میں ہے، ''ان لوگوں کے لئے جو کہ توجہ سے سنتے ہیں، سننے کے بعد جب حقیقت سمجھ میں آتی ہے تو اس کو مان لیتے ہیں۔''

دُوسرا اِنعام: خالص دُودھ

یہ تو پانی کا تذکرہ تھا۔ وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً: اور بے شک تمہارے لئے چوپایوں میں عبرت ہے، غور کا مقام ہے، عبرت کا معنی ہوتا ہے کہ ایک چیز میں غور کرکے اس سے کسی دوسرے مضمون کو سمجھ لینا، ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف عبور کرجانا، جیسے کہ اعتبار فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ (الحشر: ۲) کے تحت آیا کرتا ہے کہ ایک واقعہ کو دیکھو، اس کا سبب تلاش کرو، اور پھر اس سے آگے گزرو کہ جہاں بھی یہ سبب پایا جائے گا اس کا ایسے ہی نتیجہ نکل سکتا ہے، تو یہاں بھی یہی ہے کہ حیوانات کے اندر غور کرو، غور کرنے کے بعد آگے عبور کرو اللہ تعالیٰ کی قدرت کی طرف، اللہ تعالیٰ کے احسانات کا جائزہ لو، پھر اللہ تعالیٰ کے شکر کو اپناؤ، اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت اختیار کرو، تمہارے لیے غور کا مقام ہے، سوچنے کی جگہ ہے۔ اَنعام نَعَم کی جمع۔ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ: بُطُوْنِهٖ کی ضمیر اَنعام کی طرف لوٹ رہی ہے لفظوں کی طرف دیکھتے ہوئے مذکر ضمیر لوٹادی، اور اگر معنی جمع کی طرف دیکھیں تو مؤنث ضمیر بھی لوٹ سکتی ہے، دوسری جگہ قرآنِ کریم میں نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهَا بھی آیا ہے (المؤمنون: ۲۱)، نُسْقِيْكُمْ: پلاتے ہیں ہم۔ اس کا مفعول

آ ئے گا لَّبَنًا خَالِصًا: پلاتے ہیں ہم تمہیں دُودھ خالص، سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِیْنَ: یہ بھی لَبَنًا کی صفت ہے، سَآئِغًا سَوغ سے لیا گیا ہے، بڑی آسانی کے ساتھ حلق سے اترنے والا، لذیذ بھی ہے اور حلق سے بڑی آسانی کے ساتھ اترتا ہے، ''پینے والوں کے لئے حلق سے آسانی سے اُترنے والا، خوشگوار'' سائغ کا یہ معنی ہے، سورۂ ابراہیم کے اندر لفظ آیا تھا یَتَجَرَّعُهٗ وَلَا یَكَادُ یُسِیْغُهٗ (آیت:۱۷) وہ باب اِفعال سے تھا، اس کے گھونٹ بھرے گا لیکن اس کو اپنے حلق سے اتار نہیں سکے گا، اور یہ سَآئِغًا مجرد سے ہے، بڑی جلدی آسانی کے ساتھ حلق سے اترنے والا، کوئی کسی قسم کی تکلیف کا باعث نہیں بنتا، ''پلاتے ہیں ہم تمہیں خالص دُودھ جو پینے والوں کے لئے خوشگوار ہے'' خالص: اس میں کوئی کسی قسم کی ملاوٹ نہیں، گوبر کی، خون کی، جس کے ساتھ اس میں تعفن پیدا ہو جائے، اس کی رنگت میں فرق آجائے، اس کے ذائقے میں فرق آجائے، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ تو لَبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِیْنَ، یہ نُسْقِیْكُمْ کا مفعول ہے۔ مِّمَّا فِیْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَیْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ: یہ اس جگہ کا ذکر ہے جہاں دُودھ کی تیاری ہوتی ہے، ''پلاتے ہیں تمہیں اس چیز میں سے جو اُن جانوروں کے پیٹ میں ہے گوبر اور خون کے درمیان سے خالص دُودھ جو پینے والوں کے لئے خوشگوار ہے''، دیکھو! متوجہ کر دیا کہ دُودھ تیار کس طرح سے ہوتا ہے؟ آپ جانتے ہیں کہ بھینس چارہ کھاتی ہے، بنولہ کھاتی ہے، جو کچھ بھی اس کو ڈالا جاتا ہے سب کچھ اس کے معدے میں چلا جاتا ہے، معدہ اس کو ہضم کرتا ہے، ہضم کی صورت ایسے ہوتی ہے جیسے اس کو پیس کے باریک کر کے بالکل اس کا قوام تیار کر دیا، اب جس وقت اس کا قوام تیار ہوا تو یہی چیز ہے جس میں خون کے اجزاء بھی ہیں، یہی چیز ہے جس میں دُودھ کے اجزاء بھی ہیں، یہی چیز ہے جس کے اندر فضلات بھی ہیں، گوبر، لید جو کچھ ہے وہ سب اسی میں ہے، جو جانور بھی کھاتا ہے معدے میں سب کچھ خلط ہے، اب اس مخلوط اجزاء میں سے اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کے تحت گوبر کو علیحدہ کر دیتا ہے، اور پھر غذا کا جو خلاصہ نکلتا ہے وہ جگر میں پہنچ جاتا ہے، اب جگر میں جو کچھ پہنچا تو خون، دُودھ کے سب اجزاء آپس میں شریک ہیں، (گوبر کو علیحدہ کر دیا گیا معدے میں)، اور پھر وہاں جا کے خلطیں جو تیار ہوتی ہیں تو اس میں کچھ بلغم بن گئی، کچھ صفراء بن گیا، کچھ خون بن گیا، کچھ سوداء بن گیا، اس طرح سے جگر میں خلطیں تیار ہوتی ہیں، پھر خون میں سے کچھ اجزا منتخب کر کے پستانوں میں بھیجے جاتے ہیں، پستانوں میں پہنچنے تک ان کا رنگ خون جیسا ہوتا ہے، اور پستانوں میں جا کے پھر ان کے اندر تصرف ہوتا ہے کہ ان کا رنگ سفید ہو گیا، خوشگوار ہو گیا، خوش ذائقہ ہو گیا، تو پستانوں میں جا کر یہ صورت بدل جاتی ہے، تو یہ منزلیں طے کرتا ہوا جو جاتا ہے، غذا سے یہ چیز دُودھ کی شکل میں نکلتی ہے، تو وہ گوبر کے ساتھ بھی خلط ہوتی ہے، خون کے ساتھ بھی خلط ہوتی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کے ساتھ کس طرح سے امتیاز کرتا چلا جاتا ہے، کہ جب دُودھ آپ کے سامنے آتا ہے تو ایسا خالص ہوتا ہے کہ نہ اس میں کوئی گوبر کا نشان ہے، نہ اس میں کوئی گوبر کی بُو ہے، اور نہ اس میں کوئی گوبر کی رنگت ہے، نہ اس کے اندر کوئی خون کا ذائقہ ہے، نہ اس میں کوئی خون کی رنگت ہے، تو کس طرح سے سب مخلوط اجزا میں سے اللہ تعالیٰ نے ایک صاف ستھرا مشروب آپ کے لئے تیار کر دیا، اور اتنا اچھا مشروب کہ لذیذ بھی ہے اور مفید بھی ہے، اسی لئے حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب بھی تم کوئی کسی قسم کا کھانا کھاؤ تو اللہ تعالیٰ سے دُعا کیا کرو، اس پر شکر ادا کرو اور ساتھ یہ کہا کرو کہ ''أَطْعِمْنَا خَیْرًا مِّنْهُ'' یا اللہ! اس پر تو تیرا شکر ہے کہ تُو نے ہمیں کھلا دیا، لیکن اس سے بھی اچھی چیز ہمیں کھلا، لیکن جس وقت دُودھ پیو تو دُودھ پینے کے بعد یہ دُعا کرو: ''اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِیْهِ وَزِدْنَا مِنْهُ'' اے اللہ!

ہمارے لئے اس میں برکت دے اور ہمیں یہ زیادہ دے، یہاں ''خَيْرًا مِنْهُ'' کا مطالبہ نہیں ہے، تو حدیث شریف میں آتا ہے کہ کوئی ایسی چیز نہیں جو اِنسان کو غذا اور مشروب دونوں کام دے دے سوائے دُودھ کے۔[1] اور دُودھ کو انسان کے ساتھ اتنی مناسبت ہے کہ پیدا ہونے کے بعد اس کی پہلی تربیت ہی دُودھ کے ذریعے سے ہوتی ہے، اور پھر انسان کے لئے قوت تازگی اور نشوونما کا ذریعہ زندگی کے آخر تک دُودھ ہی رہتا ہے، چاہے اس کو مختلف رنگوں میں آپ استعمال کرتے ہیں، دہی کی شکل میں استعمال کرو، لسی کی شکل میں استعمال کرلو، اسی میں سے آپ مکھن نکالتے ہیں، پھر اس میں سے گھی نکال لیتے ہیں، پھر اس گھی سے کتنی چیزیں تیار کرتے ہیں، یعنی اللہ نے ایک دُودھ کی نعمت دی، تو یہ آگے کتنی ہزارہا نعمتوں کا ذریعہ بن گئی، تو اس میں غور کرو کہ یہ جانور اللہ نے کیسی مشین بنادیے کہ یہ گھاس چارہ کھاتے ہیں اور ان کے پیٹوں سے اللہ تعالیٰ کس طرح سے صاف ستھرا دُودھ نکالتا ہے جو تمہارے لیے بیسیوں نعمتوں کا ذریعہ بن جاتا ہے، آگے ہم اس سے کتنا کام لیتے ہیں، چائے آپ اس سے بناتے ہیں، لسی آپ اس سے مہیا کرتے ہیں، دہی اس سے بنتا ہے، مکھن اسی سے نکلتا ہے، گھی اسی سے تیار ہوتا ہے، پھر گھی اور مکھن کے ساتھ آگے کتنے مرکبات تیار کرلیتے ہو، یہ سب وہی چیز ہے جو خون اور گوبر میں سے نکل کے آئی، تو اللہ تعالیٰ کی قدرت بھی نمایاں ہے اور اس کے اندر احسان کا پہلو بھی کتنا ہے۔

تیسرا اِنعام: پھل

وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ: نخیل: کھجور کا درخت۔ ''اور کھجوروں اور انگوروں کے پھلوں سے، بناتے ہو تم اس سے (ہ ضمیر مذکور کی طرف لوٹ گئی) سکر اور رزقِ حسن، اختیار کرتے ہو تم اس سے سکر اور رزقِ حسن'' رزقِ حسن: عمدہ رزق۔ عمدہ روزی تیار کرتے ہو، عمدہ روزی اختیار کرتے ہو، اور سکر کہتے ہیں نشہ دینے والی چیز کو، کھجوروں سے بھی نشے کی چیز تیار ہوتی ہے، انگوروں سے بھی نشے کی چیز تیار ہوتی ہے۔ اب یہاں اس سکر کو جو ذکر کردیا، اور ہے یہ انعامات کی فہرست جس میں اللہ تعالیٰ کی قدرت بھی نمایاں ہے، تو یہ سورۃ مکی ہے اور مکہ معظمہ کے اندر شراب حلال تھی، اور لوگ اس کو مقویات کے طور پر استعمال کیا کرتے تھے، مدینہ منورہ میں جانے کے بعد بھی کتنی مدت تک شراب حلال رہی ہے، آہستہ آہستہ پھر اس کے اندر حرمت آئی، غزوۂ اُحد کے بعد اس میں حرمت آئی ہے۔ غزوۂ اُحد تک یہ حلال تھی، بعضے لوگ جو غزوۂ اُحد میں گئے تھے، شراب پی کے گئے تھے اور اسی حالت میں شہید ہوگئے، جس طرح سے واقعات میں آتا ہے، تو یہ حلال تھی، لیکن حلال ہونے کے باوجود چونکہ اِس میں خبث کا پہلو تھا اور اللہ کے علم میں تھا کہ عنقریب یہ حرام کی جائے گی تو دیکھو! یہاں رزق کے ساتھ تو حَسَنًا کا لفظ بڑھایا ہے سَكَرًا کے ساتھ اس قسم کا لفظ نہیں ہے، یا تو یہاں اللہ تعالیٰ محض اپنی ایک قدرت بیان کرنا چاہتے ہیں کہ کھجور اور انگور اللہ نے تمہیں دیے اور اس میں سے تم دیکھو! ایک ایسا مشروب نکال لیتے ہو کہ جو تمہارے لئے مقوی ہے اور تم اس کو استعمال کرتے ہو، قطع نظر اس سے کہ وہ اچھا بھی ہے یا

---

(۱) ابوداؤد ۲/ ۱۶۸، باب ما یقول اذا شرب اللبن/ مشکوۃ ۲/ ۳۷۱، باب الاشربۃ، فصل ثانی۔ ولفظ الحدیث: لَيْسَ شَيْءٌ يُجْزِئُ مِنَ الطَّعَامِ وَالشَّرَابِ إِلَّا اللَّبَنُ.

نہیں، لیکن تم اس کو استعمال کرتے ہو مقوی ہونے کی حیثیت سے، اور تمہارے لئے وہ باعث سکون بنتا ہے، تم اس کو مقوی ہونے کی حیثیت سے استعمال کرتے ہو، تو قدرت تو بہر حال نمایاں ہے کہ کھجوروں اور انگوروں میں سے ایسی چیز نکل آئی، مشروب نکل آیا جس کو تم سکون کے لئے استعمال کرتے ہو، تقویت کے لئے استعمال کرتے ہو، یہ علیحدہ بات ہے کہ تمہارے لئے مفید ہے یا نقصان دِہ۔ اور اگر یہ امتنان کے درجے میں ہو تو یہ اُس وقت کی بات ہے جبکہ یہ حلال تھا، اور بعد میں اس کو حرام ٹھہرا دیا گیا، تو چاہے اس میں کچھ فوائد بھی ہیں اس میں کوئی شک نہیں، قرآنِ کریم نے خود کہا یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَیْسِرِ ؕ قُلْ فِیْهِمَاۤ اِثْمٌ كَبِیْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ (البقرۃ:۲۱۹) تو منافع کا قول تو کیا ہے، کہ اس میں نقصان بھی ہے، اِثم بھی ہے، گناہ کی بڑی بات ہے، لیکن منافع بھی ہیں، لیکن اِثْمُهُمَاۤ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا: اس میں جو نقصان مرتب ہوتے ہیں وہ نفع کے مقابلے میں زیادہ ہیں، جس کی بنا پر شریعت نے روک دیا، بہر حال رزق کے ساتھ حَسَنًا کا لفظ بڑھایا کہ تم بہترین روزی تیار کرتے ہو، بہترین روزی سے مراد انگوروں اور کھجوروں سے آگے جو چیزیں بنتی ہیں، خشک کر کے رکھ لیتے ہو، چھوہاروں کی شکل میں رکھ لیتے ہو، کشمش بنا کر رکھ لیتے ہو، پھر ان کو ویسے بھی کھاتے ہو، پھر ان سے آگے کئی کئی چیزیں تیار کرتے ہو، کھجوروں کے گودے کے ساتھ اور کشمش کے ساتھ آگے ماکولات کے اندر مرکبات میں کتنی جگہ یہ استعمال ہوتی ہیں، تو ان کو رزقِ حسن کے طور پر بھی استعمال کرتے ہو۔ ''بے شک اس میں البتہ نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو عقل رکھتے ہیں'' جو عقل سے کام لیتے ہیں تو وہ اللہ کے احسان کو بھی سمجھ سکتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کو بھی سمجھ سکتے ہیں۔ تو یہ شراب کی بات آ گئی، تین مشروب آپ کے سامنے آ گئے۔ اور آپ کو معلوم ہوگا کہ جنت میں بھی اللہ تعالیٰ نے یہ چار نہریں ہی بنائی ہیں جن کا ذکر سورۂ محمد کے اندر آپ کے سامنے آئے گا، فِیْهَاۤ اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَیْرِ اٰسِنٍ ۚ وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ یَتَغَیَّرْ طَعْمُهٗ ۚ وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِیْنَ ۚ۬ وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى (آیت:۱۵) تو یہ چار نہریں اللہ نے جنت میں بنائی ہیں اور چاروں کا نمونہ یہاں دنیا کے اندر بھی دکھا دیا۔

چوتھا اِنعام: شہد

وَ اَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ: اَوْحٰی: وحی کی۔ وحی کا معنی ہوتا ہے کہ آہستگی سے خفیہ طور پر کسی تک کوئی بات پہنچا دی، دل کے اندر اِلقاء کرنے کے لئے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے، تو فطری طور پر جس قسم کی استعداد ان مکھیوں کے اندر رکھی ہے گویا کہ وہ اللہ کی وحی ہے جو اُس مکھی کی فطرت پہ ہوئی، ''وحی کی تیرے رَبّ نے نحل کی طرف'' نحل کہتے ہیں شہد کی مکھی کو۔ کیا وحی کی؟ اس کی فطرت میں یہ بات ڈال دی، اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا: یہ اَنْ اُس وحی کی تفسیر ہے، گویا کہ اس وحی کے ساتھ ہم نے اسے یہ کہا کہ ''بنا تُو پہاڑوں سے گھروں کو'' وَّ مِنَ الشَّجَرِ: اور درختوں سے، وَ مِمَّا یَعْرِشُوْنَ: اور اس چیز سے جس کو وہ بطور چھپّر کے ڈالتے ہیں۔ عرش: چھپّر۔ چھپّر کے طور پر جو چیز ڈالتے ہیں جس کو اونچا اونچا بناتے ہیں، جیسے بیلوں کے نیچے سہارے کھڑے کر دیے جاتے ہیں، ''جو چھپّر یہ بناتے ہیں ان سے، درختوں سے، پہاڑوں سے تُو گھر بنا'' اور یہ مکھیاں عموماً اسی طرح سے اونچی جگہ پر ہی چھتا لگاتی ہیں، پہاڑوں کی چٹانوں میں لگاتی ہیں، درختوں کی شاخوں پر لگاتی ہیں، اسی طرح سے چھپّر وغیرہ جو بنے ہوئے ہوتے ہیں ان کے اندر

لگاتی ہیں، ثُمَّ كُلِي مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ: پھر کھا تو ہر قسم کے پھلوں سے، جو پھل وہاں میسر ہیں ان پھلوں میں سے تو کھا، فَاسْلُكِي سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا: پھر چل تو اپنے رَبّ کے راستوں پر اس حال میں کہ وہ راستے تیرے لئے آسان کیے ہوئے ہیں، ذُلُل ذَلول کی جمع ہے، ذلول کہتے ہیں مطیع اور فرمانبردار منقاد کو، جیسے لَّا ذَلُولٌ تُثِيرُ الْأَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ (البقرہ: ۷۱) وہاں ذلول کا لفظ آیا ہوا ہے، اسی طرح هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ ذَلُولًا (الملک: ۱۵) وہاں بھی ذلول کا لفظ آیا ہوا ہے، مطیع، تابع، سہل، ہموار۔ تو یہ راستے تیرے لیے اللہ تعالیٰ نے ہموار کر دیے، کہتے ہیں کہ شہد کی مکھی جس وقت اپنے کام کے لئے نکلتی ہے پھلوں سے رس چوسنے کے لئے تو دُور دُور تک چلی جاتی ہے اور دُور دُور تک جانے کے باوجود اپنے چھتے کا راستہ نہیں بھولتی، پھل وغیرہ چوس کر سیدھی اپنے چھتے پر پہنچ جاتی ہے، جہاں بھی گھومتی رہے اپنے چھتے میں آ جائے گی، یہ اللہ تعالیٰ نے فضا کے اندر راستے اس کے لئے ایسے ہموار کر دیے، "یہ اللہ تعالیٰ نے مکھی کو وحی کی" یعنی مکھی کی فطرت ایسی بنائی اور اس کے اندر یہ استعداد رکھی، ہر قسم کے پھلوں کو وہ چوستی ہے، چوسنے کے بعد چھتے میں لاتی ہے، يَخْرُجُ مِنْ بُطُونِهَا شَرَابٌ: نکلتا ہے ان کے پیٹوں سے مشروب۔ شراب مشروب کے معنی میں ہے، پینے کی چیز۔ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ: جس کے رنگ مختلف ہیں، فِيهِ شِفَاءٌ لِّلنَّاسِ: اور اس میں لوگوں کے لئے شفاء ہے، اس مشروب میں لوگوں کے لئے شفا ہے، اب بذاتِ خود تو مکھی ایک زہریلی چیز ہے، لڑ جائے تو تکلیف ہوتی ہے، کسی درجے میں اس میں زہر ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس زہریلے جانور کو کچھ اس قسم کا بنا دیا کہ جاتی ہے، جا کے ہر چیز کے نباتات کے رَس کو چوس کے لاتی ہے، چوسنے کے بعد اس کے پیٹ میں آتا ہے تو مٹھاس اختیار کر جاتا ہے، مٹھاس اختیار کرنے کے بعد پھر وہ نکلتا ہے، لوگ اس کو لیتے ہیں، لینے کے بعد اس کو استعمال کرتے ہیں، شربت بھی بنا کے پیتے ہیں، اور بھی بہت طریقوں سے استعمال کرتے ہیں، اس میں اللہ نے شفا بھی رکھی ہے، شہد میں شفا ہے، اطباء کے ہاں شہد بہت بیماریوں میں استعمال ہوتا ہے، اور یہ معجون اور خمیرے جتنے بنتے ہیں شہد ان سب کا جز ہے، اور بعض بیماریوں میں براہِ راست اس کو کھایا جاتا ہے، بعض بیماریوں میں دوسری چیز کے ساتھ ملا کے کھایا جاتا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر شفا بھی رکھی ہے، حدیث شریف میں بھی اس کے استعمال کرنے کی ترغیب آئی ہے اور اس کو شفا قرار دیا گیا ہے۔ "مشکوٰۃ شریف" میں باب الطب میں آپ کے سامنے واقعہ آئے گا کہ ایک شخص آیا اور اس نے آ کے ذکر کیا کہ میرے بھائی کے پیٹ میں تکلیف ہے، استطلاقِ بطن، استطلاقِ بطن کا معنی ہوتا ہے کہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ٹٹیاں آ رہی ہیں، معدہ صاف نہیں ہے، تو آپ ﷺ نے اسے کہا کہ شہد پلاؤ، (شہد ہلکے درجے کا مسہل بھی ہے) اس نے جا کے شہد پلایا تو معاملہ پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گیا، پھر وہ آیا اور آ کے کہتا ہے کہ یا رسول اللہ! وہ تو پہلے سے بھی زیادہ ہو گیا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اور پلاؤ، اس نے جا کے اور پلایا، پھر اسی طرح سے آیا اور کہنے لگا کہ پہلے سے بھی اضافہ ہو گیا ہے، تیسری دفعہ یا چوتھی دفعہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "صَدَقَ اللهُ وَكَذَبَ بَطْنُ أَخِيكَ اِسْقِهِ عَسَلًا" اللہ تعالیٰ نے سچ کہا ہے کہ شہد میں شفا ہے، تیرے بھائی کے پیٹ میں خرابی معلوم ہوتی ہے، جاؤ جا کے اور شہد پلاؤ، جب جا کے اور شہد پلایا تو اس کے بعد اس کو شفا ہو گئی۔[1] تو شارحین لکھتے ہیں کہ اصل یہ ہے کہ اس قسم کی گڑبڑ بدہضمی کی بنا پر ہوتی ہے اور آنتڑیوں کے اندر فاسد مادّے جمع ہو جاتے ہیں، اور شہد فاسد مادّوں کا اخراج کر دیتا ہے۔

---

(۱) مسلم ۲/۲۲۷ باب التداوی بسقی العسل/بخاری ۲/۸۴۸ باب الدواء بالعسل/مشکوٰۃ ۲/۳۸۷، کتاب الطب فصل اول۔

مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ: شہد کے متعلق یہ جو کہا کہ اس کے رنگ مختلف ہوتے ہیں تو یہ مشاہدہ ہے، کہتے ہیں کہ موسم کے لحاظ سے بھی اس کی رنگت میں فرق آتا ہے، اور بعض مکھیوں کی عمر کے لحاظ سے بھی فرق آجاتا ہے، علاقوں کے لحاظ سے فرق ہوتا ہے، کوئی زیادہ سفید ہوتا ہے اور کوئی شربتی سے رنگ کا ہوتا ہے، اور کسی میں کسی درجے کے اندر کچھ سیاہی سی جھلک رہی ہوتی ہے، یوں ان کے رنگ مختلف ہوجایا کرتے ہیں، بڑی مکھی اور چھوٹی کے شہد میں بھی فرق ہوا کرتا ہے۔ تو اس میں اللہ تعالیٰ نے شفا رکھی ہے۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ: بے شک اس میں البتہ نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو کہ غور کرتے ہیں۔

اِنعامات ذِکر کرنے کا مقصد

تو یہ چار مشروب آگئے، پانی، دُودھ، شراب اور شہد، ان سب کو اللہ نے بطور احسان کے بھی ذکر فرمایا، اور جس انداز کے ساتھ یہ تیار ہوتے ہیں اور ہمیں مہیا ہوتے ہیں اس میں خدا تعالیٰ کی قدرت بھی نمایاں ہے، تو اللہ تعالیٰ کی قدرت کو بھی سمجھنا چاہیے، اور اللہ تعالیٰ کا احسان بھی ماننا چاہیے، اور پھر اس کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جائے، اسی کی اطاعت کی جائے، جب نعمتیں اس کی طرف سے ملتی ہیں تو پھر عبادت بھی اسی کی ہو، کسی دوسرے کی طرف ان کی نسبت نہ کی جائے۔

اِنسان کے وجود میں اللہ تعالیٰ کے تصرف کا ذِکر

آگے اللہ تبارک وتعالیٰ کا تصرف انسان کے اپنے وجود میں ذکر کیا ہے، جس کو آپ دلیلِ اَنفسی کے ساتھ تعبیر کرسکتے ہیں، نفس سے ہی دلیل لی، وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ: اللہ نے تمہیں پیدا کیا، ثُمَّ یَتَوَفّٰىكُمْ: پھر وہی اللہ تمہیں وفات دیتا ہے، پیدا کرنا بھی اسی کی طرف سے اور وفات بھی اسی کی طرف سے، وَمِنْكُمْ مَّنْ یُّرَدُّ اِلٰۤى اَرْذَلِ الْعُمُرِ: اور تم میں سے بعض وہ ہیں جو لوٹا دیے جاتے ہیں رذّی عمر کی طرف، تو جس کا (پورا) مضمون یوں ہوگا کہ اللہ نے تمہیں پیدا کیا، پھر وہی تمہیں وفات دیتا ہے، کسی کو بچپن میں وفات ہوجاتی ہے، جوانی میں وفات ہوجاتی ہے، کسی کی عمر لمبی کی جاتی ہے حتیٰ کہ اس کو اَرذلِ عمر کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے۔ اَرذلِ عمر: رذّی عمر۔ رذّی عمر کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے، ''رذّی عمر'' کون سی ہوا کرتی ہے؟ ''رذّی عمر'' وہ ہوتی ہے کہ جس میں انسان کی صلاحیتوں میں زوال آجائے اور وہ اپنی ضرورتیں پوری کرنے پر قادر نہ ہو، بالکل جیسے بچپن میں آپ محتاج تھے کہ اپنے ہاتھوں کھا نہیں سکتے تھے، پیشاب پاخانہ نہیں کرسکتے تھے، دوسرے کی اعانت کی ضرورت ہوتی ہے جو اُٹھائے، بٹھائے، کھلائے، پہنائے، نہلائے، اس قسم کی ضرورتیں دوسرے کے تعاون سے پوری ہوتی ہیں، تو جوانی میں اور بڑی عمر میں انسان ہر کام کرنے پر خود قادر ہوجاتا ہے، اور جب بوڑھا ہوجائے تو بوڑھا ہونے کے بعد نہ ہاتھوں میں طاقت رہی، نہ ٹانگوں میں طاقت رہی، کان آنکھ بھی جواب دے دیتے ہیں، تو ایسی حالت ہوجاتی ہے کہ دوسرا ہی اُٹھاتا ہے، بٹھاتا ہے، دوسرے کے سہارے کے ساتھ ہی سارے کام ہوتے ہیں، تو یہ اَرذلِ عمر ہے، رذّی عمر، کہ جس میں ساری صلاحیتیں زائل ہوگئیں، اور اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے انسان اسی طرح سے محتاج ہوگیا جس طرح سے ابتدائے زندگی میں محتاج تھا۔ اور اس کا معیار آگے جس طرح سے ذکر کیا گیا لِكَیْ لَا یَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَیْـًٔا: کہ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ جاننے کے بعد کسی چیز کو نہیں جانتا، یعنی جو چیزیں پہلے اس کی معلومات میں ہوتی ہیں وہ ساری بھلا بیٹھتا

ہے، جیسے بڑھاپے میں حافظہ خراب ہوگیا، کوئی بات یادنہیں رہتی، پچھلی باتیں بھی بھول جاتی ہیں، اور تازہ بہ تازہ بھی کوئی بات بتاؤ تو تھوڑی دیر کے بعد وہ گم، حواس مختل ہوجاتے ہیں بڑھاپے میں جاکے، تو یہ کیفیت جس وقت ہوجائے کہ جانی ہوئی چیزوں کو بھی انسان بھول جائے، جانی ہوئی چیزوں سے بھی انجان ہوجائے، تو سمجھو یہ ارذل عمر ہے، جس میں انسان کی صلاحیتیں تلف ہوجاتی ہیں، تو اللہ تعالیٰ نمونہ دکھاتا ہے کہ پیدا کرتا ہے، آہستہ آہستہ بڑھاتا ہے، اور بڑھانے کے بعد کس طرح سے زوال کی طرف لے آتا ہے، تو انسان کے وجود میں اللہ تعالیٰ کا تصرف کتنا چلتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ: بے شک اللہ تعالیٰ علم والا ہے اور قدرت والا ہے، یعنی ان تصرفات کی طرف دیکھ کے اللہ کے علم وقدرت کا ہی عقیدہ اختیار کرنا چاہیے، اور علم وقدرت ان دونوں کے عقیدے پر ہی آگے بہت ساری باتوں کی بنیاد ہے، کہ اللہ تعالیٰ کے علم کو محیط سمجھو اور اس کی قدرت کو بھی محیط سمجھو، کہ تمہارا کوئی حال اور کوئی عمل مخفی نہیں ہوگا، تو اس کے ساتھ بھی اللہ کی اطاعت کی ترغیب ہوگی، اور جب اللہ تعالیٰ کی قدرت کو سمجھو گے تو جس قسم کے اِشکالات مشرکین آتے ہیں کہ مرنے کے بعد کیسے اُٹھیں گے، مرنے کے بعد زندہ کیسے کئے جائیں گے، اِن تصرفات سے اللہ کی قدرت سمجھ میں آجانے کے بعد اس قسم کے اشکالات خودختم ہوجاتے ہیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا
اللہ نے فضیلت دی تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں، نہیں ہیں وہ لوگ جو فضیلت دیے گئے لوٹانے والے اپنے رزق کو اپنے
مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ ۭ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ﴿۷۱﴾ وَاللّٰهُ جَعَلَ
مملوکوں پر کہ وہ سب اس رزق میں برابر ہوجائیں، کیا پھر یہ لوگ اللہ کے احسان کا انکار کرتے ہیں؟﴿۷۱﴾ اور اللہ تعالیٰ نے بنائیں
لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً وَّرَزَقَكُمْ مِّنَ
تمہارے لیے تمہارے ہی نفسوں سے بیویاں، اور بنایا تمہارے لیے تمہاری بیویوں سے بیٹوں کو اور پوتوں کو اور تمہیں پاکیزہ
الطَّيِّبٰتِ ۭ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ
روزی دی، کیا پھر یہ لوگ باطل پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ کے احسان کی ناشکری کرتے ہیں؟﴿۷۲﴾ عبادت کرتے ہیں اللہ کو
اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ شَيْـًٔا وَّلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿۷۳﴾ فَلَا
چھوڑ کر ایسی چیزوں کی جو نہیں اختیار رکھتیں ان کے لئے روزی کا آسمانوں اور زمین سے کچھ بھی، اور نہیں قدرت رکھتے وہ﴿۷۳﴾ پس تم

تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۷۴﴾ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا

اللہ کے لئے مثالیں نہ بیان کرو، بے شک اللہ تعالیٰ جانتا ہے، تم نہیں جانتے ﴿۷۴﴾ بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ مثال ایک عبد

مَّمْلُوْكًا لَّا یَقْدِرُ عَلٰی شَیْءٍ وَّمَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ یُنْفِقُ مِنْهُ

مملوک کی جو نہیں قادر کسی شئ پر بھی، اور وہ شخص جس کو ہم نے اپنی جانب سے رزقِ حسن دیا ہے پھر وہ خرچ کرتا ہے اس رزق سے

سِرًّا وَّجَهْرًا ؕ هَلْ یَسْتَوٗنَ ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾

پوشیدہ اور ظاہری طور پر، کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ سب اچھی صفات اللہ کے لئے ثابت ہیں، بلکہ ان میں سے اکثر لوگ بے علم ہیں ﴿۷۵﴾

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَیْنِ اَحَدُهُمَاۤ اَبْكَمُ لَا یَقْدِرُ عَلٰی شَیْءٍ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰی مَوْلٰىهُ ۙ

اللہ تعالیٰ بیان کرتا ہے مثال دو آدمیوں کی ان میں سے ایک تو گونگا ہے، وہ کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتا اور وہ اپنے مولیٰ پر بوجھ ہے

اَیْنَمَا یُوَجِّهْهُّ لَا یَاْتِ بِخَیْرٍ ؕ هَلْ یَسْتَوِیْ هُوَ ۙ وَمَنْ یَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ ۙ وَهُوَ عَلٰی صِرَاطٍ

جہاں بھی اس کا مولیٰ اس کو متوجہ کرتا ہے نہیں لاتا وہ کسی بھلائی کو، کیا برابر ہے یہ اور وہ شخص جو حکم دیتا ہے انصاف کا اور وہ سیدھے

مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۷۶﴾ وَلِلّٰهِ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَاۤ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ

راستے پر قائم ہے ﴿۷۶﴾ اللہ ہی کے لئے ہے آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ چیزیں، نہیں ہے قیامت کا معاملہ مگر آنکھ کے جھپکنے کی طرح بلکہ

هُوَ اَقْرَبُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۷۷﴾ وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ

اس سے بھی زیادہ قریب، بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کے اُوپر قادر ہے ﴿۷۷﴾ اللہ تعالیٰ نے نکالا تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے

لَا تَعْلَمُوْنَ شَیْـًٔا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۸﴾

ایسے حال میں کہ کچھ بھی نہیں جانتے تھے اور اللہ نے بنائے تمہارے لیے کان آنکھیں اور دل، تاکہ تم شکر گزار رہو ﴿۷۸﴾

اَلَمْ یَرَوْا اِلَی الطَّیْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِیْ جَوِّ السَّمَآءِ ؕ مَا یُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ

کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں پرندوں کی طرف جو مسخر کیے ہوئے ہیں آسمان کی فضا میں، نہیں روکے ہوئے انہیں مگر اللہ، بے شک اس میں

لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ﴿۷۹﴾ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْۢ بُیُوْتِكُمْ سَكَنًا

البتہ نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو کہ ایمان لاتے ہیں ﴿۷۹﴾ اور اللہ نے بنایا تمہارے لیے تمہارے گھروں سے سکون حاصل کرنے کی چیز

وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ اِقَامَتِكُمْ

بنائے تمہارے لیے چوپایوں کے چمڑوں سے گھر، تم ان و ہلکا پاتے ہو اپنے سفر کے دِن اور اپنے ٹھہرنے کے دِن، اور

وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا وَاَشْعَارِهَآ اَثَاثًا وَّمَتَاعًا اِلٰى

اوران چوپایوں کے صوفوں سے اوران کے وَبروں سے اوران کے بالوں سے تم سامان بناتے ہواور استعمال کی چیزیں بناتے ہو ایک

حِيْنٍ ﴿۸۰﴾ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ

وقت تک ﴿۸۰﴾ اور اللہ نے بنائے تمہارے لیے ان چیزوں سے جو اللہ نے پیدا کیں سائے، اور بنائیں تمہارے لیے پہاڑوں سے

اَكْنَانًا وَّجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ وَسَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ

چھپنے کی جگہیں، اور بنائیں تمہارے لیے ایسی قمیصیں جو تمہیں گرمی سے بچاتی ہیں اور ایسی قمیصیں جو تمہیں آپس میں تمہاری لڑائی سے

بَاْسَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ ﴿۸۱﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ

بچاتی ہیں، اسی طرح سے اللہ تعالیٰ پورا کرتا ہے اپنا احسان تم پر تاکہ تم اسلام لے آؤ ﴿۸۱﴾ پھر اگر یہ لوگ پیٹھ پھیریں پس آپ کے ذِمے

الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۸۲﴾ يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا وَاَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۳﴾

توصریح طور پر پہنچا دینا ہی ہے ﴿۸۲﴾ پہچانتے ہیں یہ اللہ کے احسان کو پھر اس کے منکر ہو جاتے ہیں اوران میں سے اکثر ناشکرے ہیں ﴿۸۳﴾

تفسیر

شرک کی قباحت ایک مثال کے ذریعے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِى الرِّزْقِ: اللہ نے بڑائی دی تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں۔ فَضَّلَ: فضیلت دی، ایک کو دوسرے کے مقابلے میں بڑھایا۔ ''اللہ نے فضیلت دی تم میں سے بعض کو بعض پر روزی میں'' فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّىْ رِزْقِهِمْ: رادِّی رزقِھم یہ ''مَا'' کی خبر ہے جس کے اوپر باء زائدہ ہے، اصل میں ''رَادِّيْنَ'' تھا، نون اضافت کی وجہ سے گر گیا۔ ''نہیں ہیں وہ لوگ جو فضیلت دیے گئے رَدّ کرنے والے اپنے رزق کو، لوٹانے والے اپنے رزق کو'' عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ: ان پر جن کے مالک ہیں ان کے دائیں ہاتھ، یعنی اپنے غلاموں پر، فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ: کہ وہ اس میں برابر ہو جائیں، وہ سب اس رزق میں برابر ہو جائیں، اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ: کیا پھر یہ لوگ اللہ کے احسان کا انکار کرتے ہیں؟ اس آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے شرک کی قباحت کی ایک مثال دی ہے، جس کو انسانوں کے حالات سے ہی ماخوذ کیا ہے، اُس زمانے میں جب یہ

قرآنِ کریم اتر رہا تھا غلام بھی پائے جاتے تھے، جنہیں زر خرید غلام کہا جاتا ہے، اور آپ فقہ کے اندر اس کی تفصیل پڑھ چکے ہیں کہ جو شخص غلام ہو وہ کسی چیز کا مالک نہیں بن سکتا، اگر آقا اس کو کوئی چیز سپرد کر بھی دے تو بھی ملکیت آقا کی ہی رہتی ہے، کوئی صورت ایسی نہیں کہ غلام آقا کے برابر آجائے، اس کے تصرفات نافذ نہیں ہوتے بغیر آقا کی اجازت کے، کوئی معاملہ نہیں کر سکتا آقا کی اجازت کے بغیر، یہ مالک اور مملوک کا فرق اُس دور میں بچہ بچہ جانتا تھا، آج تو سمجھانے کی ضرورت پیش آرہی ہے چونکہ غلام موجود نہیں، لیکن اُس دور میں یہ بات بالکل واضح تھی کہ مالک کیا ہوتا ہے، مملوک کیا ہوتا ہے، اور دونوں کی حیثیت میں کتنا فرق ہے، باوجود اس بات کے کہ دونوں انسان تھے، اور ان میں سے کوئی دوسرے کا خالق نہیں، کوئی دوسرے کی موت وحیات کا مالک نہیں، لیکن اس کے باوجود اتنا فرق تھا کہ مالک کسی اور درجے کا ہے اور مملوک کسی اور درجے کا ہے، کوئی تصور ہی نہیں کیا جا سکتا کہ مملوک مالک کے برابر آجائے قدرت کے اندر۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ معاشرے میں بعض لوگوں کے پاس رزق زیادہ ہوتا ہے، بعض کے پاس کم ہوتا ہے، اللہ نے یہ تقسیم کی ہے، اپنی حکمت کے تحت کسی کو زیادہ دیا ہے کسی کو کم دیا ہے، جس کو زیادہ دیا ہے وہ مالک ہے، اور بعض اس کے مملوک بھی ہو سکتے ہیں، تو کیا ایسا ہوتا ہے کہ کوئی مالک اپنے رزق کو اپنے غلام پر لوٹا دے، اور لوٹانے کے بعد دونوں آپس میں برابر ہو جائیں؟ مملوک کبھی مالک کے برابر ہو سکتا ہے؟ یہ اُس معاشرے کے اعتبار سے ایک سوال ہے، جس کا جواب بغیر سوچے سمجھے بھی یہی ہے کہ نہیں! برابر نہیں ہو سکتے، کیونکہ اگر مالک اس کو کچھ رزق دے بھی دے گا تو مملوک تو مالک ہوتا ہی نہیں، تو اس کے مالک کے برابر ہونے کا کیا سوال۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم پھر یہ سوچتے نہیں؟ کہ اگر تمہارا مملوک باوجود اس بات کے کہ تم اس کے خالق نہیں ہو تم رزق دے کے اس کو اپنے برابر نہیں کر سکتے، وہ تمہارے برابر نہیں آسکتا، تو جب یہ ساری کائنات میں جو کچھ ہے میرا مملوک ہے تو تم ان کو میرے برابر کس طرح سے ٹھہراتے ہو؟ اگر تمہارا مملوک کسی وجہ سے تمہارے برابر نہیں آسکتا حالانکہ تم اس کے خالق نہیں، اور یہ ملکیت مجازی ہے، عارضی طور پر وہ تمہارے زیر دست ہو گئے، اور ان کو کسی صورت میں تم اپنے برابر نہیں لا سکتے، حتیٰ کہ اگر تم اپنی جائیداد بانٹ کے ان کے سپرد کر دو پھر بھی وہ تمہارے برابر نہیں آسکتے، کیونکہ مملوک مملوک رہتے ہوئے مالک بن ہی نہیں سکتا، اس کے حقوق تمہارے برابر نہیں آسکتے، تو پھر اللہ کے مملوک کو جو اللہ کی مخلوق بھی ہے اور ہر ہر چیز میں اللہ کے محتاج بھی ہیں، ان کی بقاء، ان کی حیات، ان کی موت، جو کچھ بھی ہے سب اللہ کے قبضے میں ہے، ان کو تم اللہ کے برابر کس طرح سے ٹھہراتے ہو؟ کہ جس طرح سے اللہ عبادت کا حق دار ہے یہ بھی عبادت کے حقدار ہیں، جس طرح سے اللہ کو ہمارے اوپر اختیارات حاصل ہیں اِن کو بھی اختیارات حاصل ہیں، ان کو تم کس طرح سے برابر ٹھہرا سکتے ہو؟ تو گویا کہ اُنہی میں سے ایک مثال بنا کر ان کے ذہن میں یہ بات ڈالی جا رہی ہے کہ شرک بری بات ہے، اللہ کے مملوک کو اللہ کے برابر نہ ٹھہراؤ، اللہ کا کوئی مملوک اللہ کے برابر نہیں ہو سکتا۔ یہ تو ہے اس مثال کا حاصل، کہ ''اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی رزق میں، پھر نہیں ہیں وہ لوگ جن کو فضیلت دی گئی لوٹانے والے اپنے رزق کو اپنے مملوکوں پر، کہ پھر وہ اُس رزق میں برابر ہو جائیں، کیا پھر تم اللہ کے احسان کا انکار کرتے ہو؟'' اللہ محسن ہے، اس کا انکار کرتے ہو کہ اس کے مملوکوں کو اٹھا اٹھا کر اس کے برابر ٹھہراتے ہو، شرک کرنا گویا کہ اللہ کے احسان کا انکار ہے۔

رِزق میں عدم مساوات اللہ کے علم وحکمت کا تقاضا ہے

اس جگہ اس آیت کے پیش کرنے سے مقصود تو عبارۃ النص کے درجے میں یہی ہے، کہ اس مثال کے ذریعے سے شرک کی تردید کرنا مقصود ہے، لیکن ایک بات جس کو آپ کہہ سکتے ہیں کہ اشارۃ النص سے ثابت ہے، اگرچہ یہاں وہ مقصودِ متکلم نہیں، ان الفاظ سے یہ بات بھی ثابت ہوگئی وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ، کہ اللہ تعالیٰ کے علم حکمت قدرت کا یہ تقاضا ہے کہ سب کو روزی برابر نہیں دیتا بلکہ بعض کو کم دیتا ہے بعض کو زیادہ دیتا ہے، تو معلوم ہوگیا کہ مساوات کا نظریہ، کہ یہ کوشش کی جائے کہ سارے کے سارے برابر ہی ہوں اور ہر ایک کو ایک جیسا ہی ملے اور سب کی زندگی ایک جیسی ہی ہو، یہ اللہ تعالیٰ کے علم حکمت قدرت کے منافی ہے، اللہ نے یہ عادت نہیں رکھی، مخلوق کے اندر یہ تفضیل ہے، کہ اللہ تعالیٰ بعض کو بعض کے مقابلے میں فضیلت دیتا ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کی حکمتیں ہیں، اس سے ابتلائی زندگی بنتی ہے، کہ اس میں امتحان ہے اونچے طبقے کا بھی اور نچلے طبقہ کا بھی، کسی کے پاس روزی کے اسباب زیادہ ہیں، کسی کے پاس روزی کے اسباب کم ہیں، یہ تفریق ایک حکمتِ عالَم کے تقاضے سے ہے، اللہ تعالیٰ کی حکمت سے ہے، اور واقعہ ہے، جب سے دنیا بنی اس وقت سے ہے، جب تک دنیا رہے گی یہ تفضیل اسی طرح سے رہے گی، اگر کوئی شخص ان حالات کے اندر ٹکرا کر یہ چاہتا ہے کہ سب کو برابر کر دیا جائے تو یہ ممکن نہیں، اور نہ یہ حکمت کا تقاضا ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ تفضیل ہے۔

اِبنِ آدم کے اَحوال میں عدمِ مساوات کی ایک رُوحانی حکمت

حدیث شریف میں آپ نے پڑھا ہوگا، کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جس وقت حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے کے بعد ان کے سامنے ان کی اولاد کو موجود کیا تھا (''مشکوٰۃ شریف، باب القدر'' کے اندر روایت آئی تھی) تو حضرت آدم علیہ السلام نے جس وقت اپنی اولاد کو دیکھا، فَرَأَى الْغَنِيَّ وَالْفَقِيْرَ، تو اس میں کسی کو غنی دیکھا، کسی کو فقیر دیکھا، یعنی آنے والے حالات منکشف ہوئے، کسی کو تندرست دیکھا، کسی کو بیمار دیکھا، کوئی سالم الاعضاء تھا، کسی کا کوئی عضو نہیں تھا، یہ اپنی اولاد کے مختلف حالات دیکھے، تو آدم علیہ السلام نے اسی وقت اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی اولاد کے محبت کے تقاضے سے یہ بات رکھی تھی کہ: رَبِّ لَوْلَا سَوَّيْتَ بَيْنَ عِبَادِكَ، تُو نے اپنے بندوں کے درمیان برابری کیوں نہیں کردی؟ سب کو ایک ہی جیسا کیوں نہیں بنا دیا؟ یہ کیا کہ کوئی غنی ہے کوئی فقیر ہے، کوئی تندرست ہے کوئی بیمار ہے، کوئی دو ٹانگوں والا ہے کوئی ایک ٹانگ والا ہے، کوئی دو بازؤں والا ہے کوئی ایک بازو والا ہے، کوئی اندھا ہے کوئی بینا ہے، کوئی کانا ہے، کوئی بہرہ ہے، کوئی گونگا ہے، اس قسم کے مختلف حالات جو کردیے ہیں تو تُو نے سب بندوں کو ایک جیسا کیوں نہیں کردیا؟ اللہ تعالیٰ نے جواب دیا تھا کہ ''إِنِّي أَحْبَبْتُ أَنْ أُشْكَرَ''[1] مجھے یہ بات پسند ہے کہ میرا شکر ادا کیا جائے، یہ حضرت آدم علیہ السلام کے سوال کا جواب ہے، گویا کہ تسویہ کے نتیجے میں شکر نہیں آسکتا، شکر تبھی پیدا ہوگا کہ جس وقت تفاوت ہو، اس کا کیا مطلب؟ کہ اگر سارے ایک جیسے ہوتے تو اللہ تعالیٰ کی کسی نعمت کا احساس نہ ہوتا، سارے ہی آنکھوں والے ہوتے تو کسی کے سامنے قدر و قیمت نہ

(۱) مسند احمد، رقم الحدیث: ۲۱۲۳۲ / مشکوٰۃ ص ۲۴، باب الایمان بالقدر کا آخر۔

ہوتی کہ آنکھ کتنی قیمتی چیز ہے، اس نعمت کا احساس نہ ہوتا، اب جس وقت کوئی اندھا سامنے آتا ہے تو آنکھوں والوں کو احساس ہوتا ہے کہ آنکھ کتنی بڑی نعمت ہے، تو اللہ کا شکر ادا کریں گے، آپ کے پاس ٹانگیں ہیں آپ کو کوئی پتا نہیں کہ اس ٹانگ کی کیا قدر و قیمت ہے، جس وقت کوئی کٹی ہوئی ٹانگ والا آپ کے سامنے آئے گا اور اس کی زندگی کی تکلیف آپ دیکھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ٹانگ کتنی بڑی نعمت ہے، تو اس طرح سے اللہ تعالیٰ نے کسی انسان کو ایسا نہیں بنایا کہ اس کے پاس کوئی نعمت نہ ہو، ہر شخص کے پاس کوئی نہ کوئی چیز ایسی ہے جو دوسرے کے پاس نہیں ہے، جب وہ اس کا احساس کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا شکر گزار رہتا ہے، جب اس کی طرف اس کی توجہ جائے گی تو کہے گا اللہ! تیرا شکر ہے، فلاں کے پاس یہ چیز نہیں ہے اور مجھے تو نے دے رکھی ہے، یہ تو ایک رُوحانی حکمت ہے کہ مخلوق شکر گزار رہے۔

معاشرتی تنظیم کا تقاضا بھی عدمِ مساوات ہے

اور ایک معاشرتی تنظیم کا تقاضا بھی یہی ہے، جس طرح سے آگے سورۂ زخرف میں آئے گا نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا (آیت: ۳۲) ہم نے لوگوں کے درمیان میں ان کی معیشت کو تقسیم کیا ہے، اور بعض کو بعض کے اوپر درجہ دیا ہے تا کہ تمہارا بعض بعض سے کام لے سکے۔ یعنی یہ ایک کا دوسرے کی طرف ہم نے احتیاج جو رکھا ہے درجات کے تفاوت کے طور پر، اس سے تم ایک دوسرے کے کام آتے ہو، اور اگر یہ احتیاج نہ ہوتا، ہر شخص کی ضرورتیں مکمل پوری ہوتیں، آپس میں ایک دوسرے کی طرف احتیاج نہ ہوتا تو ایک دوسرے کے کام کون آتا؟ تو دنیا کا نظم کیسے درست رہتا؟ ایک آدمی کے پاس بدنی قوت ہے اس کے پاس پیسے نہیں ہیں، ایک آدمی کے پاس پیسے ہیں بدنی قوت نہیں ہے، دونوں مل کے کام کریں گے، بدنی قوت والا اپنی بدنی قوت صرف کرے گا، پیسے والا پیسہ خرچ کرے گا تو کام ہو جائے گا، اس کو پیسے کی ضرورت ہے اس لئے وہ اس کے کام آئے گا، اور اس کو بدنی منافع کی ضرورت ہے وہ مزدور کا محتاج ہے، اس طرح سے آپس میں ملیں جلیں گے، ایک چیز ایک کے پاس ہے دوسرے کے پاس نہیں ہے، ایک چیز اس کے پاس ہے اس کے پاس نہیں ہے، یہ اس میں اس کا محتاج ہے وہ اس میں اس کا محتاج ہے، تو اِس احتیاج نے دنیا کو آپس میں جوڑ رکھا ہے، تو درجات کے اندر تفاوت کی ایک حکمت آپ کے سامنے یہ بھی آئے گی کہ تا کہ تم بعض بعض سے کام لے سکو، اور اگر سب ایک جیسے کر دیے جائیں اور رزق میں مساوات کا درجہ حاصل ہو جائے تو پھر کوئی کسی کے کام نہیں آئے گا۔

مساوات کی کوشش غیر فطری ہے

تو یہ ایک غیر فطری کوشش ہے جس میں کوئی کامیاب ہو ہی نہیں سکتا، اور آپ کے سامنے اس قسم کے نعرے جو لگائے جاتے ہیں مساوات مساوات کے، یہ محض ایک فریب ہے جو دنیا کو دیا جاتا ہے، ورنہ خود ان نعرے لگانے والوں کو اگر آپ دیکھیں کہ اپنے نوکروں کے ساتھ ان کا کیا برتاؤ ہے تو تمہیں پتا چل جائے گا کہ یہ کہتے کچھ ہیں اور ان کا حال کچھ ہے، ان کے گھر بھی نوکروں سے وہی برتاؤ ہے جیسے ان لوگوں کے گھر میں نوکروں سے برتاؤ ہوتا ہے جن کو وہ سرمایہ دار کہتے ہیں، بلکہ شاید ان کے

گھروں میں تشدّد زیادہ ہو، اور جن ملکوں کے اندر غریبوں کی ہمدردی کے نعرے لگائے جاتے ہیں اور انقلاب آتے ہیں وہاں جاکے دیکھیں گے تو شاید غریب پہلے سے بھی زیادہ شکنجے میں کسا ہوا ہو، اور حکمران طبقہ جن کو کسی درجے میں اقتدار حاصل ہو جاتا ہے ان کو بہر حال فوقیت ہے، وہاں بھی آپ کو ہوائی جہازوں میں اڑنے والے اور گدھوں پر بیٹھ کر چلنے والے ملیں گے، اور فٹ پاتھوں کے اوپر پیدل چلنے والے بھی آپ کو نظر آئیں گے، کوٹھیوں میں اور ایئر کنڈیشنروں میں رہنے والے اور کانوں کے اندر کام کرنے والے آپ کو وہاں بھی نظر آئیں گے، نالیاں صاف کرنے والے، سڑکوں پر جھاڑو دینے والے اور ہر وقت قالینوں پر بیٹھنے والے آپ کو وہاں بھی نظر آئیں گے، بس یہ ایک نعرہ ہی نعرہ ہے جو انسان لگاتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فطری طور پر انسانوں کی صلاحیت میں فرق رکھا ہے، اس میں تو کوئی شک نہیں کہ زمین اللہ نے سب کے لئے بنائی، اور سب اس کے اوپر بستے ہیں، آسمان اللہ نے سب کے لئے بنایا ہے، سورج اور چاند سے اللہ نے سب کے لئے برابر استفادہ کرنے کا حق رکھا ہے، ہوائیں سب کے لئے چلائی ہیں، اس میں کوئی شک نہیں، لیکن انسان کے باطنی حالات اتنے مختلف ہیں کہ جس کے نتائج کسی صورت میں ایک نہیں ہو سکتے، چھوٹی سے چھوٹی مثال لے لیں، بڑی سے بڑی مثال لے لیں، بات اپنی جگہ واضح ہے۔

استعداد میں فرق کی وجہ سے نتیجے میں ضرور فرق آئے گا

ایک جگہ خودرَو گھاس ہے، جس طرح سے کہ علاقوں میں ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس میں سب کا حق برابر رکھا ہے، کوئی اس کے اوپر قبضہ نہیں جما سکتا، آپ جائیں وہاں سے گھاس کاٹ کر لا سکتے ہیں، میں جاؤں وہاں سے گھاس کاٹ کر لا سکتا ہوں، اب دو آدمی کھرپا اور کپڑا لے کر وہاں گھاس کھودنے کے لئے جاتے ہیں، ایک باہمت ہے وہ کوشش کرتا ہے، اور ایک بے ہمت سا سستی کا مارا ہوا ہے، کبھی کھود لیا کبھی بیٹھ گیا، کبھی لیٹ گیا، کبھی سگریٹ پینے لگ گیا، کبھی ناچنے لگ گیا، گانے لگ گیا، اس قسم کے حالات ہیں، دو گھنٹوں کے بعد دونوں وہاں سے نکلتے ہیں، ایک کا گٹھا کتنا ہو گا، دوسرے کا گٹھا کتنا ہو گا، جب بازار میں آئیں گے ایک پانچ روپے کا بیچے گا دوسرا دو روپے کا بیچے گا، اب آپ یہ کہیں کہ نہیں نہیں! دونوں انسان ہیں، مساوات چاہیے، اس لئے پانچ اور تین کو اکٹھا کر کے آٹھ روپے بنا کے چار چار دونوں پہ تقسیم کر دیں، تو جس نے تھوڑا کمایا ہے یہ اس پہ رحم نہیں ہے، بلکہ جس نے محنت کر کے زیادہ کمایا ہے یہ اس پہ ظلم ہے، جب دونوں نے اپنی استعداد دو طرح سے استعمال کی ہے تو دونوں کا نتیجہ مختلف ہو گا، اب ایک تو آرام کے ساتھ پڑا رہے، عیاشی کرے، کوئی کام نہیں کرتا، اور شام کو روٹی اس کو بھی ویسی ملے، اور ایک صبح سے لے کر شام تک محنت کرتا ہے کماتا ہے، اور شام کو روٹی اس کو بھی ویسی ملے، تو اگلے دن اس کا کمانے کو جی چاہے گا؟ پھر ہر کوئی کہے گا کہ جب دستر خوان ایک ہی بچھے گا تو کیا ضرورت ہے دھوپ میں جلنے کی، اپنا آرام کرو، استعداد میں اللہ تعالیٰ نے جو فرق رکھا ہے اس کے نتیجے کے اندر فرق یقیناً آئے گا۔

امیر وغریب کے مابین امتیاز ختم کرنے کا اسلامی طریقہ

لیکن اس فرق کو مٹانے کے لئے اسلام نے جو طریقہ وضع کیا ہے وہ یہ ہے کہ اس نے انسان کے حقوق متعین کر دیے،

پہلے تو سب کو مکلف کیا کہ اپنی استعداد کے مطابق خوب محنت کرو اور کماؤ، ہاتھ پر ہاتھ رکھ کے بیٹھنا اور نہ کمانا یہ ناجائز ہے، بے دست و پا ہو کر بیٹھ جانا اور اپنا وقت ضائع کرنا یہ جائز نہیں ہے، اللہ نے جو استعداد دی ہے اسے کام میں لاؤ، لیکن پھر بھی کوئی شخص معذور ہو جاتا ہے، کوئی حوادثات کا شکار ہو جاتا ہے، کوشش کرنے کے باوجود وہ اپنی معاشی زندگی میں کامیاب نہیں ہوتا تو اس کو بھوکا مرنے دینا یہ باقی معاشرے کا جرم ہے، اس کو سہارا دینا باقی معاشرے کے ذمے ہے، اور وہ معاشرے کے ذمے ہے ترغیب کے طور پر اور اللہ کی طرف سے فرائض عائد کرنے کے طور پر، غریب کو حق نہیں پہنچتا کہ سرمایہ دار سے چھین لے، یہ کہنا کہ یہ تیرا حق ہے جو اس کے گھر میں پڑا ہوا ہے اس کو چھین لو یہ کمیونزم ہے، کہ غریب کو برانگیختہ کیا، کہ جس کے پاس دیکھو چھین لو، یہ تمہارا ہے، غریب اور امیر کی لڑائی کروا کے رکھ دی، آج ساری کی ساری دنیا جہنم بنی پڑی ہے اسی اختلاف کی وجہ سے، کہ سرمایہ دار جس کے پاس کچھ سرمایہ ہے وہ غریب کو اپنا دشمن سمجھتا ہے، اور غریب سمجھتا ہے کہ یہ ڈاکو ہے، اس نے سارے سرمائے کے اوپر قبضہ کر رکھا ہے حالانکہ میں بھی اسی طرح سے کھانے کا حقدار ہوں، دونوں دست و گریباں ہیں، مزدور کو کارخانہ دار سے لڑا دیا، کارخانہ دار کو مزدور کے خلاف کر دیا، کاشت کار کو زمین دار سے لڑا دیا، زمین دار کو کاشت کار کے خلاف کر دیا، اور یہ مساوات کا دماغ اتنا ابھارا کہ سکولوں اور کالجوں میں کیا اب تو عربی مدارس میں طالب علم بھی سمجھتے ہیں کہ ہم میں اور استاذ میں کیا فرق ہے، وہ بھی انسان ہے ہم بھی انسان ہیں، جس طرح سے اس کے حقوق ہیں ہمارے بھی حقوق ہیں، جا کے دیکھ لو! ذرا ذرا سی بات کے اوپر استاذ و شاگرد دست و گریباں ہیں، کوئی امتیاز ہی نہیں رہا، کہتے ہیں کہ جیسے اس کے حقوق ہیں ویسے ہمارے حقوق ہیں، ذرا ذرا بات کے اوپر ہڑتالیں ہوتی ہیں، اسٹرائیکیں ہوتی ہیں، اور اس طرح سے آپس میں سارے کے سارے الجھ رہے ہیں، انسان کے دماغ کو یہ اتنی غلط اور غیر فطری ہوا دی کہ سارا نظام ہی درہم برہم کر کے رکھ دیا، آپ کے سامنے ہے، کیا جرأت ہے کسی پروفیسر کی کہ کسی بچے کو ترچھی نگاہ سے دیکھ لے یا اس کی کسی غلطی کے اوپر اسے تنبیہ کر دے، وہ برابر سامنے اکڑ کے کھڑے ہو جاتے ہیں، کہتے ہیں تو بھی انسان، ہم بھی انسان، میرے میں اور تیرے میں کیا فرق ہے؟ تو مساوات کا نشہ اتنا چڑھا دیا۔ اور یہاں (اسلام میں) ہے کہ جس کو اللہ نے گنجائش دی ہے اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ فرائض بتائے جاتے ہیں، کچھ ترغیبات دی جاتی ہیں، وہ اپنی خوشی کے ساتھ چپ چپاتا، چھپ چھپا کے، بغیر احسان جتلانے کے ان لوگوں کی طرف اپنی دولت کو لوٹائے جو کسی وجہ سے محتاج ہیں یا کسی وجہ سے وہ حادثات کا شکار ہو گئے اور ان کے گھر میں فقر ہے فاقہ ہے، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مال دار آدمی اپنی خوشی کے ساتھ جب ان کو دے گا تو اس میں بھی شفقت و محبت کے جذبات ابھریں گے اور جس وقت اس محتاج آدمی کو بغیر کسی قسم کے ذلیل ہونے کے اور بغیر کسی قسم کے سوال کرنے کے جب اس کے گھر میں روزی پہنچے گی تو اُس کے دل میں اس کی محبت پیدا ہوگی، تو نچلا طبقہ اور اوپر والا طبقہ دونوں آپس میں محبت کے طور پر جڑ جائیں گے، اسلامی معاشرے میں عزت اس کو حاصل ہوگی جو خیرات زیادہ کرتا ہے، جو زیردستوں کے اوپر شفقت زیادہ کرتا ہے، تو کماؤ زور سے، بہت کماؤ، جتنا کما سکتے ہو کماؤ، لیکن اس میں سے محتاجوں کی امداد کرتے چلے جاؤ تو آخرت کے درجات بھی ملتے چلے جائیں گے، دنیا کے اندر بھی عزت حاصل ہوتی چلی جائے گی، اس انداز کے ساتھ جب دولت کو تقسیم کیا جاتا ہے تو پھر غریب اور امیر آپس میں دشمن نہیں ہوتے بلکہ ایک دوسرے کے محب ہوتے ہیں۔

انصارِ مدینہ کا جذبہ ایثار

مدینہ منورہ میں یہی دو طبقے اکٹھے ہو گئے تھے، جب مہاجرین گئے ہیں تو یہ طبقہ ایسا تھا کہ ان کے پلے کچھ نہیں تھا، یعنی اسبابِ رزق میں سے ان کے پلے کوئی سبب نہیں تھا جس کے ذریعے سے یہ کمائیں اور کھائیں، اور وہاں کے جو باشندے تھے انصار، وہ جائیداد والے تھے زمین والے تھے، ان کے پاس تو رزق کے حاصل ہونے کا ذریعہ تھا، تو سرورِ کائنات ﷺ نے جا کے جس طرح جوڑا اور انصار کے اوپر مہاجرین کا دباؤ ڈالا، اور انصار کی قوتِ اخلاقی کو بڑھایا، تو پھر کیا تھا کہ انصار اپنے بچوں کو بھوکا رکھ کے بھی آنے والوں کو کھلاتے تھے، اور آنے والوں کے احساسات کیا تھے، حدیث شریف میں آپ پڑھ لیں گے یا پڑھ لیا ہوگا، ''مشکوٰۃ شریف'' میں روایتیں آئیں گی، مہاجرین ان کے احسان کے سامنے اس طرح سے دبے جاتے تھے کہ حضور ﷺ کے سامنے جا کے تذکرے کرتے تھے کہ یا رسول اللہ! ہم نے تو ایسی قوم دیکھی ہی نہیں جو اتنا زیادہ احسان کرنے والی ہو، کسی کے پاس تھوڑا ہے تو احسان کرتے ہیں، کسی کے پاس زیادہ ہے تو احسان کرتے ہیں، ہمیں تو یہ ڈر ہے کہ ساری نیکیاں یہی لے جائیں گے، ہمارے پلے کیا رہ جائے گا، آپ ﷺ فرماتے کہ نہیں نہیں، جب تک تم ان کی تعریف کرتے رہو اور ان کا شکریہ ادا کرتے رہو تم بھی ساتھ شریک ہو، تو ان کو شکریہ ادا کرنے کی تلقین کی کہ جو تمہیں محنت کر کے کھلاتے ہیں، اپنی جائیدادوں میں سے تمہیں حصے دیتے ہیں تم ان کی تعریف کرو اور ان کے لئے دُعائیں کرو اور ان کا شکریہ ادا کرو، تو اب اُن کی طرف سے اگر احسانات ہیں تو اِن کی طرف سے شکر گزاری ہے، تو آپس میں کس طرح سے شیر و شکر ہو گئے اور کس طرح سے آپس میں محبت پیدا ہو گئی، یہ نمونہ ہے دونوں طبقوں کو جوڑنے کے لئے جو سرورِ کائنات ﷺ نے مدینہ منورہ میں قائم کیا، کہ جن کو اسباب حاصل ہیں ان کا ذہن ایسا بناؤ آخرت کی ترغیب کے ساتھ، کہ اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لئے وہ اپنی کمائی دوسروں کو دیں جن کے پاس نہیں ہے، اور جن کو دی جا رہی ہے انہیں کہو کہ یہ تمہارے لئے رزق کا وسیلہ بنے ہیں تم ان کی شکر گزاری کرو اور ان کی تعریف کرو اور ان کے ساتھ محبت رکھو، اس طرح سے دونوں طبقے آپس میں محبت کے طور پر جڑ جائیں گے۔ اور جو طریقہ یہ لوگ تجویز کرتے ہیں کہ چھین لو، کھوس لو، یہ تمہارا ہی ہے، سرمایہ دار کا پیٹ پھاڑ کے اس میں سے نکال لو، اس طرح کی جس وقت تعلیم دی جاتی ہے تو یہ طبقاتی جنگ آپ کے سامنے آ گئی جس نے آج ساری دنیا کو جہنم بنا رکھا ہے۔ تو یہ مساوات مساوات کے تو صرف نعرے ہی نعرے ہیں، یہ بات اللہ کی حکمت اور انسان کی بنائی ہوئی اللہ کی فطرت کے خلاف ہے، کبھی ہو ہی نہیں سکتا، اگر ایسا کرو گے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اچھی استعداد والوں پر ظلم کر کے ان کو نیچے کھینچ کر بے استعدادوں کو تم دیتے ہو، ایک کاہل آدمی ہے، سستی کا مارا ہوا ہے، کام کرنا نہیں چاہتا، اور ایک آدمی محنت کرتا ہے، تو ان دونوں کو اگر آپ برابر کرتے ہیں، تو نچلے پر شفقت کم ہے دوسرے کے اوپر ظلم زیادہ ہے، آخر وہ بھی حق دار ہے کہ اپنی استعداد کو استعمال کرنے کے بعد جو وہ منافع کماتا ہے تو وہ اس کی ملکیت ہونی چاہیے، اپنی مرضی کے مطابق اس میں تصرف کرے، ہاں البتہ اسے ترغیب دو اور اس کی اخلاقی قوت اتنی بڑھاؤ کہ اپنے طور پر وہ انسان ہمدردی کے تحت دوسروں کے ساتھ احسانات کرے، جب اسلامی معاشرہ بن جاتا ہے تو ایسی باتیں پیدا ہو جاتی ہیں، کچھ فرائض ہیں جن کے ادا کرنے کے لئے سختی بھی

کی جاسکتی ہے، اور کچھ مستحبات اور نوافل ہیں جن کو ترغیب کے درجے سے ادا کروایا جائے گا، اور یہ ذہن میں ڈالا جائے گا کہ اگر ایک آدمی بھی بھوکا مر گیا تو اس علاقے کے رہنے والے سارے کے سارے گناہ گار ہوں گے، یہ ضمیر جب بیدار کیا جائے گا تو لوگ تلاش کر کر کے بھوکے کو کھلائیں گے، اور جب اپنے اختیار کے ساتھ کھلائیں گے تو پھر دونوں طبقوں میں آپس میں محبت بھی ہوگی۔

تو فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ سے یہ بات عرض کر رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس کو واقعے کے طور پر اپنی طرف نسبت کر کے ذکر کرتا ہے کہ ہم نے روزی میں بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے، یہ اللہ کی حکمت کا تقاضا ہے اور اللہ کے علم کا تقاضا ہے، اور اس نے اپنی قدرت کے ساتھ اور اپنی حکمت کے ساتھ یہ طرز اپنایا، جس کے بعد پھر اس دنیا میں ایک ابتلائی صورت پیدا ہوئی کہ جس کے پاس پیسے ہیں وہ کس طرح سے وقت گزارتا ہے، اور جس کے پاس پیسے نہیں ہیں وہ کس طرح سے صبر کے ساتھ گزارتا ہے، پھر یہ دونوں طبقے آپس میں کس طرح سے جڑتے ہیں، شریعت کے اَحکام، زکوٰۃ کے، خیرات کے، صدقات کے یہ سارے کے سارے تبھی پیدا ہوں گے جس وقت اس قسم کے دو طبقے ظاہر ہوں گے، تو پھر اللہ تعالیٰ ہر کسی کے سامنے دنیا اور آخرت کے اندر ان کے نتائج بتاتا ہے، تو اس تفضیل کے خلاف مساوات کا نظریہ یہ اَمنِ عالَم کا ذریعہ نہیں، بلکہ فسادِ عالَم کا ذریعہ ہے، جس طرح سے آج آپ دنیا کے اوپر اِس چیز کو دیکھ سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا اِنسان پر اِحسان اور اِنسان کی اِحسان فراموشی

آگے پھر وہی احسانات کا تذکرہ شروع ہو گیا جیسے کہ شروع سورۃ سے چلا آرہا ہے، وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا: اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے تمہارے ہی نفسوں سے بیویاں بنائیں، تمہارے نفسوں سے یعنی تمہاری ہم جنس، ہم نوع، تم جیسی، ''اللہ تعالیٰ نے بنائیں تمہارے لیے تمہارے ہی نفسوں سے بیویاں'' یعنی تمہاری جیسی، تمہاری قسم سے، تمہاری ہم جنس، وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً: اور بنایا اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے تمہاری بیویوں سے بیٹوں کو اور پوتوں کو، یعنی بیٹے اور پوتے حاصل ہونے کا ذریعہ بیویاں ہی بنیں، اللہ تعالیٰ اسی طرح جوڑتا ہے اور آگے نسل چلتی ہے، بَنِيْنَ وَحَفَدَةً: بیٹے اور پوتے، تو یہ نوعی بقا ہوگئی کہ جس سے انسان کی نوع آگے ترقی کرتی ہے اور نسل چلتی ہے، وَّرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ: اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں پاکیزہ روزی دی، یہ شخصی بقاء ہے، شخصی بقاء کے لئے اللہ تعالیٰ نے پاکیزہ چیزوں سے روزی دی، اور نوعی بقاء کے لئے اللہ نے یہ سلسلہ بنایا کہ تمہیں تمہاری جنسوں سے بیویاں دیں اور بیویوں سے پھر آگے نسل چلائی، اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ: کیا پھر یہ لوگ باطل پر ایمان لاتے ہیں، وَبِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ: اور اللہ کے احسان کی ناشکری کرتے ہیں؟ کہ جو یہ سب کچھ دیتا ہے، جس نے یہ سارے کے سارے پیدا کیے اس کے تو شکر گزار نہیں، اور بے کار بے دلیل چیزیں بنا کے ان کی طرف نسبت کرتے ہیں اور ان کے سامنے جھکتے اور ان کی اطاعت کرتے ہیں۔ باطل: بے کار چیز جس کی کسی صحیح دلیل پر بنیاد نہیں ہے۔ ''عبادت کرتے ہیں اللہ کے علاوہ ایسی چیز کی کہ نہیں اختیار رکھتے وہ اِن کے لئے آسمان اور زمین سے رزق دینے کا کچھ بھی'' يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ: اللہ کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہیں ایسی چیزوں کی (مَا چونکہ لفظوں میں مفرد ہے اس لیے لَا يَمْلِكُ میں مفرد کی ضمیر اس کی طرف لوٹ رہی ہے) ایسی چیزوں کی عبادت

کرتے ہیں، (اس لیے معنی اگر جمع کے طور پر ادا کیا جائے تو ٹھیک ہے) جونہیں اختیار رکھتا اِن کے لئے، (یا) وہ چیزیں نہیں اختیار رکھتیں اِن کے لئے روزی کا (رزق مرزوق کے معنی ہے مَرْزُوقًا شَيْـًٔا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ) زمین آسمان سے کچھ بھی رزق دینے کا اختیار نہیں رکھتیں، ان کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ایک تو یہ ہے کہ اب مالک نہیں، ایک یہ ہے کہ ان کو یہ طاقت ہی نہیں کہ اس قسم کا کام کرلیں، منطق میں آپ جو دولفظ استعمال کیا کرتے ہیں کہ ایک بالفعل اور ایک بالقوۃ، نہ تو بالفعل روزی دینے کا اختیار ہے، نہ ہی وہ یہ اختیار حاصل کر سکتے ہیں، اُن میں طاقت ہی نہیں ہے، وَّلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ: اور نہیں قدرت رکھتے وہ۔

شرک کس طرح آتا ہے؟......مشرکین کے نظریۂ باطلہ کی بنیاد

فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ ۚ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ: پس تم اللہ کے لئے مثالیں نہ بیان کیا کرو، بے شک اللہ تعالیٰ جانتا ہے، تم نہیں جانتے، کہ کون سا حال صحیح ہے، کون سا صحیح نہیں، کیا واقعہ ہے کیا واقعہ نہیں، حقیقت اللہ جانتے ہیں، اس لیے جو وہ بتائیں وہی ٹھیک ہے۔ فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ: اس میں شرک کی جڑ کو کاٹا ہے، کہ شرک جتنا آتا ہے مثالوں کے ذریعے سے ہی آتا ہے، تو مشرکین اپنے سارے کے سارے نظریے کی بنیاد اس مثال پر رکھے ہوئے تھے کہ جیسے دنیا کے اندر ایک بادشاہ ہوتا ہے، ٹھیک ہے کہ ملک کے اندر سب سے بڑا وہی ہے، لیکن اس کو اس سلطنت کے چلانے کے لئے کچھ وزیر بنانے پڑتے ہیں، پھر وہ وزیر اپنے ماتحت علاقوں میں افسر بناتے ہیں، تو عوام کا تعلق اصل کے اعتبار سے ان افسروں سے ہوتا ہے جو علاقائی افسر ہوتے ہیں، انہی کو خوش رکھنا ضروری ہے، عرضی جو دی جاتی ہے تو انہی کو ہی دی جاتی ہے جو کہ اپنے علاقے کے افسر ہوتے ہیں، پھر اوپر والوں سے یہ کام کرا لیتے ہیں، ہمارا واسطہ عملاً انہی سے ہے جو نیچے نیچے ہیں، بڑا تو بڑا ہے ہی، وہاں براہِ راست رسائی نہیں ہے، جیسے آج اگر آپ حکومت سے کوئی کام کروانا چاہتے ہیں تو آپ براہِ راست ضیاء الحق کے پاس نہیں جائیں گے، اس صوفی صاحب سے تو شاید آپ کی ملاقات ہی نہ ہو سکے، یہ تصور ہوگا کہ ہماری کہاں رسائی ہے، ہمیں وہاں کون پوچھے گا، وہ تو بڑے درجے کی چیز ہے، آپ پٹواری کے دروازے پہ جائیں گے، تحصیل دار کے دروازے پہ جائیں گے، پولیس والوں کے پاس جائیں گے، جو اس کے نائب یہاں متعین کیے ہوئے ہیں، اگر یہ عملہ جو یہاں کا متعین ہے، یہاں کی پولیس اگر ہمارے اوپر خوش ہے، یہاں کا تحصیل دار اگر ہمارے اوپر خوش ہیں، یہاں کے پٹواری وغیرہ ہمارے اوپر خوش ہیں، تو ہمارا کام یہ صحیح کر دیں گے، ہماری درخواست لیں گے، اس کے اوپر توجہ دیں گے، توجہ دینے کے بعد جب یہاں سے منظور کر کے بھیجیں گے تو اوپر والی سرکار تو منظور کرتی ہی چلی جائے گی، ایسے تو نہیں ہوگا کہ مقامی افسر سفارش لکھ دیں اور اوپر والے اس کو رد کر دیں، نہیں! جب ہماری سفارش یہ لکھ دیں گے اور یہ ہمارے حق میں ہو جائیں گے تو اوپر سے تو کام ہو ہی جائے گا، اور اگر یہ ناراض رہے تو پھر جب انہوں نے ہی ہماری سفارش نہ کی یا ہمارے خلاف رپورٹ لکھ دی تو اوپر والے کچھ نہیں کر سکتے۔ ظاہری حکومت کے متعلق یہ ذہن ہے یا نہیں؟ وہ اسی ظاہری حکومت کے اوپر اللہ کی حکومت کو قیاس کرتے تھے، کہ اللہ تو اپنی جگہ بڑا ہے، ہم جیسے گناہ گاروں کی وہاں تک رسائی کہاں، ہمارا واسطہ تو انہی سے ہے جو علاقوں میں بنا دیے، یہ جو قائم مقام بنے ہوئے ہیں، لہٰذا ہم تو انہی کے پاس ہی جائیں گے، انہی کو نذر

ونیاز دیں گے تا کہ یہ خوش رہیں، جس وقت یہ خوش رہیں گے تو پھر یہ ہماری سفارشیں کریں گے ہمارا کیس اوپر بھیجیں گے، اور اگر یہ خوش ہیں تو اوپر والا تو خوش ہی ہے، اس کی تو ایسی بات ہی نہیں، اور اگر ہم نے اِن کو ناراض کرلیا تو اوپر والا ہمارا کچھ نہیں کرے گا......! تو یہ مثال بیان کر کے انہوں نے سارے کا سارا شرک کا تانا بانا بُنا ہوا تھا، شرک سارے کا سارا یہیں سے چلتا ہے، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم بے سوچے سمجھے اور بے علمی کے ساتھ اللہ کے لئے مثالیں نہ بیان کرو، اللہ کی مثال ایسے نہیں جس طرح سے تم بیان کرتے ہو، یہاں تو یہ ہے کہ حاکم اختیار دے اپنی جگہ فارغ ہو جاتا ہے، اس کو پتا ہی نہیں کہ نچلا کیا کرتا ہے کیا نہیں کرتا، وہ اپنی مرضی پر چلتا ہے، اللہ تعالیٰ کا علم ذرے ذرے کو محیط ہے، اس کی قدرت ہے، اگر اس نے اپنی حکمت کے تحت فرشتوں کو یا کسی دوسرے کو کسی کام کے اندر لگایا بھی ہے تو ان کی حیثیت یہ ہے کہ ایک ذرہ برابر حرکت نہیں کر سکتے اللہ کی اجازت کے بغیر، ہر چیز کے اوپر براہِ راست اللہ کا کنٹرول ہے، قہار وہ ہے جو سب کو سنبھالے ہوئے ہے، یہ نہیں کہ دنیا کے بادشاہوں کی طرح وہ تو رہ گیا عیاشی کے لئے اور کام سارے کا سارا نچلوں نے کرنا ہے، ایسی بات نہیں ہے، تو یہ شرک جو آتا ہے تو اسی قسم کی مثالوں سے آتا ہے، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بے علمی کے ساتھ مثالیں نہ بیان کرو، حقیقت حال اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے، اس لیے جو بات اللہ بیان کرے بس وہی صحیح ہے۔

رَدِّ شرک پر دو مثالیں

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا: اب اسی طرح سے شرک کی مذمت کے لئے ایک دوسری مثال ان کے اپنے حالات سے دے دی، ''اللہ تعالیٰ مثال بیان کرتا ہے ایک عبدِ مملوک کی'' عبد کے ساتھ مملوک کی قید لگادی کیونکہ عبد سب انسانوں پر بھی بولا جاسکتا ہے چاہے وہ اِصطلاحاً آزاد ہیں چاہے غلام ہیں، لیکن یہاں مثال میں چونکہ غلام بیان کرنا مقصود ہے اس لیے عبد کے ساتھ مملوک کی قید لگائی ہے، ورنہ ''کُلُّکُمْ عِبَادُ اللّٰهِ''[1] اللہ کی طرف دیکھتے ہوئے تو ہم سارے ہی عبد ہیں'' بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ مثال ایک غلام کی جو نہیں قادر کسی شیٔ پر بھی'' وہ خود کوئی کام نہیں کر سکتا، اس کو کچھ اختیار حاصل نہیں، ''اور وہ شخص جس کو ہم نے اپنی جانب سے رزقِ حسن دیا ہے پھر وہ خرچ کرتا ہے اس رزق سے'' سِرًّا وَّجَهْرًا: اپنے اختیار کے ساتھ ظاہری طور پر اور پوشیدہ خرچ کرتا ہے، هَلْ يَسْتَوٗنَ: کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ ہر انسان جانتا ہے کہ کیسے برابر ہو جائیں گے، ایک مملوک ہے اس کے اختیار میں کچھ نہیں، اور ایک رزقِ حسن کا مالک ہے، چاہے پوشیدہ طور پر کسی کو دے، چاہے ظاہری طور پر کسی کو دے، اس کا کوئی ہاتھ پکڑنے والا نہیں، دونوں آپس میں برابر کیسے ہو سکتے ہیں؟ تو اسی سے سمجھ لیجئے کہ اللہ اور اللہ کا بندہ کس طرح برابر ہو سکتے ہیں، کہ بندے کے اختیار میں کچھ نہیں، اللہ ہر چیز کا اختیار رکھتا ہے، جس کو چاہے دے، جتنا چاہے دے، سزا دے، جزا دے، سب ہی اختیار اس کے ہیں، یہ دونوں برابر کیسے ہوگئے؟ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ: سب اچھی صفات اللہ کے لئے ثابت ہیں، بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ: بلکہ ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں، بے علم ہیں، ان باتوں کو سمجھتے نہیں۔

---

(۱) مشکوۃ ۲/ ۴۰۷، باب الاسامی، فصل اول۔ واللفظ لہ/ مسلم ۲/ ۲۳۸، باب حکم لفظۃ اطلاق العبد الخ

وَضَرَبَ اللهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ: اللہ تعالیٰ بیان کرتا ہے مثال دو آدمیوں کی، اَحَدُهُمَآ اَبْكَمُ: ان میں سے ایک تو گونگا ہے، زبان سے کچھ بول نہیں سکتا، اور اکثر و بیشتر ہوتا ایسے ہی ہے کہ جو گونگا ہوتا ہے وہ بہرہ بھی ہوتا ہے، بلکہ بہرہ ہونا ہی گونگا بننے کا سبب بنتا ہے اکثر و بیشتر، کہ پیدائشی طور پر اگر کوئی بہرہ ہو تو وہ گونگا ضرور ہوتا ہے، اس کی وجہ کیا؟ کہ جب اس کا کان سنتا ہی نہیں تو لفظ کی بناوٹ وہ سیکھ نہیں سکتا، اس لیے اس سے آواز تو نکلتی ہے، "ہا" کرے گا تو آواز تو آتی ہے، لیکن اس آواز کو کسی لفظ کی شکل دے دینا یہ تو پیدا ہونے کے بعد بچہ سیکھتا ہے، تو جب اس کے کان میں آواز ہی نہیں جاتی کہ ایک الف ہوتا ہے، ایک باء، ایک تاء، ایک ثاء، جب وہ ان چیزوں کو سنتا ہی نہیں تو وہ آواز جو اس کے حلق سے نکل رہی ہے اس کو وہ مختلف حروف کی شکل نہیں دے سکتا، آپ جو بولنا سیکھتے ہیں اس میں واسطہ آپ کے کان بنتے ہیں، کہ بچپن کی حالت میں اردگرد سے لفظ کان میں پڑتے ہیں تو پھر بچہ اس کی نقل اُتارتا ہے، تو نقل اُتارتا اُتارتا ویسے لفظ بنانے لگ جاتا ہے، اس لیے اگر کانوں میں عربی کے الفاظ جانے لگ جائیں تو بچہ عربی بولنے لگ جائے گا، پنجابی کے الفاظ جانے لگ جائیں وہ پنجابی بولنے لگ جائے گا، اُردو کے الفاظ جانے لگ جائیں تو وہ اُردو بولنے لگ جائے گا، تو لفظ کی بناوٹ بچہ بناتا ہے کان سے سننے کے بعد، تو جب وہ خلقی طور پر بہرہ ہو اور اس کے کان میں کوئی بات جاتی ہی نہیں تو اس کی زبان کسی لفظ کا خاکہ نہیں بنا سکتی، تو وہ گونگا بھی ہو گیا بہرہ بھی ہو گیا، لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ: کسی چیز پر وہ قدرت نہیں رکھتا، وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰىهُ: وہ اپنے مولیٰ پر بوجھ ہی بوجھ ہے، اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ: جہاں بھی اس کا مولیٰ اس کو متوجہ کرتا ہے، لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ: وہ کوئی بھلا کام کر کے نہیں آتا، نہیں لاتا وہ کسی بھلائی کو۔ ایک تو ایسا بے کار ہے، هَلْ يَسْتَوِيْ هُوَ: کیا برابر ہے یہ، وَمَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ: اور وہ شخص جو حکم دیتا ہے انصاف کا، وَهُوَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ: اور وہ سیدھے راستے پر قائم ہے، دونوں آپس میں برابر ہو سکتے ہیں؟ تو تم نے یہ جو تراش کے رکھ لیے، جن کو تم نے بنا لیا یہ تو گونگے بہرے ہیں، اللہ کے مقابلے میں ان کی حیثیت کیا ہے، اور تم ان کو اللہ کے برابر ٹھہرائے بیٹھے ہو کہ جس طرح سے سجدہ اللہ کو کرتے ہو اسی طرح سے ان کو بھی کرتے ہو، تو عملاً تم نے دونوں کو برابر ٹھہرا دیا، کتنا واضح اور نمایاں فرق ہے جس کو تم محسوس ہی نہیں کرتے، اِدھر توجہ ہی نہیں دیتے۔

قیامت کا معاملہ تو آنکھ جھپکنے سے بھی زیادہ قریب ہے

وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: اللہ ہی کے لئے زمین و آسمان کا غیب، یعنی زمین و آسمان کی پوشیدہ چیزیں، یہ علم کا احاطہ ہے جیسا کہ بات کرتے کرتے توحید کا تذکرہ آ رہا ہے، رَدِّ شرک آ رہا ہے، احسانات کا تذکرہ آ رہا ہے، معاد کا اِثبات آ رہا ہے، تو اس کا تعلق معاد کے ساتھ ہے، وَمَآ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ: نہیں ہے قیامت کا معاملہ مگر آنکھ کے جھپکنے کی طرح، اَوْ هُوَ اَقْرَبُ: بلکہ اس سے بھی زیادہ قریب، تم کہتے ہو قیامت کیسے آئے گی ہم کہتے ہیں آنکھ جھپکنے میں آ جائے گی، بس اللہ کا ارادہ متعلق ہوا، اللہ کی طرف سے کُن ہوا اور سب کچھ ہو گیا، آنکھ جھپکنے میں تو پھر بھی کچھ دیر لگ سکتی ہے لیکن اللہ کا ارادہ متعلق ہونے میں کیا دیر ہے؟ "نہیں ہے قیامت کا معاملہ مگر آنکھ کے جھپکنے کی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ قریب" اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ:

بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کے اوپر قادر ہے، تم اس کو بہت بڑا حادثہ سمجھتے ہو، واقع کے اعتبار سے بہت بڑا حادثہ ہے لیکن اللہ کی قدرت کے سامنے تو کچھ بھی نہیں، جتنی دیر میں آنکھ جھپکتی ہے اس سے بھی جلدی واقع ہو جائے گی، اللہ کی قدرت کے سامنے کوئی واقعہ بڑا واقعہ بڑا واقعہ نہیں ہے۔

قدرتِ خداوندی اور اِنسان پر اِحسانات ِخداوندی کی بارش

آگے پھر وہی قدرت اور احسان کا تذکرہ ہے، وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ: اللہ تعالیٰ نے نکالا تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے، لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا: ایسے حال میں کہ تم کچھ بھی نہیں جانتے تھے، ایسے تھے جیسے گوشت کا لوتھڑا ہوتا ہے، کوئی طاقت قوت حاصل نہیں تھی، وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ: اور اللہ نے بنائے تمہارے لئے کان آنکھیں اور دل، یہ اعضاء بنائے، اور ان کے اندر استعداد پیدا کی، ان کا استعمال کرنا تمہیں سکھایا، لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ: تاکہ تم شکر گزار رہو۔ اَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ: کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں پرندوں کی طرف؟ مُسَخَّرٰتٍ: جو مسخر کیے ہوئے ہیں، فِيْ جَوِّ السَّمَآءِ: آسمان کی فضاء میں، ہوا کی طرف جو اُڑتے پھرتے ہیں ان کی طرف نہیں دیکھتے؟ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ: نہیں روکے ہوئے انہیں مگر اللہ، فضا کے اندر ان کو اللہ ہی روکے ہوئے ہے، یہ بھی اللہ کی قدرت ہے، پرندوں کی ساخت ایسی کر دی، ان کو ایسا بنا دیا کہ وہ ہوا میں اڑ سکتے ہیں، اور فضا کو ایسا بنا دیا کہ اس میں اڑنے کی گنجائش ہے، وہ گھنٹوں فضا کے اندر اڑے پھرتے رہتے ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے کہ ایک بوجھل چیز ہے لیکن اس کی بناوٹ ایسی کر دی کہ ہوا میں اڑتے ہیں، تو پرندوں کو پیدا کرنے والا، فضا کو بنانے والا، پرندوں کی زندگی کے اندر اس قسم کے واقعات جو نمایاں ہوتے ہیں سب اللہ کی قدرت کی نشانی ہے، اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ: بے شک اس میں البتہ نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو کہ ایمان لاتے ہیں۔ اب دیکھو! مختلف چیزوں کے درمیان میں سازگاری......!، اصل کے اعتبار سے اس تہہ میں یہ بات ہے کہ مختلف چیزوں کے درمیان میں سازگاری اس بات کی دلیل ہے کہ ان سب کا خالق ایک ہے، اگر فضا کا پیدا کرنے والا اور ہوتا، پرندوں کا پیدا کرنے والا اور ہوتا، تو شاید ان میں آپس میں اتنی سازگاری نہ ہو سکتی، اب یہ ہوا اور فضا ایک علیحدہ چیز ہے، پرندے ایک علیحدہ چیز ہیں، لیکن ان میں کتنی سازگاری ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ کیسے معاون بنے ہوئے ہیں، جس طرح سے زمین ایک علیحدہ چیز ہے، آسمان ایک علیحدہ چیز ہے، لیکن ان میں کتنی سازگاری ہے کہ آسمان کے اثرات زمین پہ آتے ہیں، زمین قبول کرتی ہے اور کیا کیا چیزیں اور پھل اُگتے ہیں، تو ان اختلافات میں جو اتحاد نظر آ رہا ہے یہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی طرف مشیر ہے، کہ چیزیں چاہے مختلف نظر آتی ہیں لیکن ان میں اتنی سازگاری ہے کہ اگر ان کا مالک علیحدہ علیحدہ ہوتا تو کبھی یہ آپس میں اس طرح سے موافقت نہ کر سکتے۔ مختلف ہونے کے باوجود آپس میں ان کی موافقت ہے، اس کثرت کے اندر وحدت نمایاں ہے، ان مختلف چیزوں کی طرف توجہ کرنے کے ساتھ یہ بات سمجھ میں آتی ہے، کہ ان سب کا خالق اللہ ہی ہے جو مختلف چیزیں بنانے کے بعد ان کو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ سازگار بھی بناتا ہے، پرندوں کے ساتھ ہوا کو سازگار بنا دیا کہ بوجھل ہونے کے باوجود یہ اُڑے

پھرتے ہیں، اور اللہ کی طرف سے قدرت ان کو سنبھالے ہوئے ہے۔ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْۢ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا: اور اللہ، بنایا اس نے تمہارے لیے تمہارے گھروں سے، سَكَنًا: سکون حاصل کرنے کی چیز، تو گھر انسان کے لئے سکون کا باعث ہیں، واقعہ یہ ہے کہ سفر سے آتے ہوئے تھکے ماندے کہیں راستے میں آپ بیٹھ جائیں تو وہ سکون بالکل نہیں ہوتا جیسے گھر میں پہنچنے کے بعد انسان کو سکون حاصل ہوتا ہے۔ تو اس سے معلوم ہو گیا کہ بیوت تو اصل میں سکون کے لئے ہیں تو گھر ایسا ہی ہونا چاہیے کہ جس میں سکون ہو، اگر ظاہری طور پر جھگی ہے جھونپڑی ہے لیکن وہاں سکون کے اسباب حاصل ہیں کہ انسان وہاں جائے تو اطمینان کے ساتھ لیٹ جائے گا، سو جائے گا، اس کو نیند آ جائے گی، تھکاوٹ دُور ہو جائے گی، تو یہ جھگی اور یہ جھونپڑی نعمت ہے، اور اگر ہیں تو بہت بڑے بڑے محلات لیکن اندر پریشانی ہی پریشانی ہے، کہ اندر جانے کے بعد بھی سکون نصیب نہیں ہوتا تو بے کار ہے، تو بیوت کی حقیقت تو اصل میں سکون حاصل کرنا ہی ہے، جس گھر میں سکون ہو وہی حقیقت میں گھر ہے، چاہے وہ کچی اینٹوں کا بنا ہوا ہو، چاہے وہ کانوں (سرکنڈوں) اور خس کا بنا ہوا ہو، کسی چیز کا بنا ہوا ہو گھر کی حقیقت اس میں موجود ہے جس میں پہنچنے کے بعد انسان کو سکون حاصل ہوتا ہے۔ وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا: اس وقت عرب کے معاشرے میں زیادہ تر آبادی چونکہ دیہاتوں میں رہتی تھی اور خیمے لگا کے رہتے تھے اور خیمے چمڑے کے بناتے تھے، اور آپنے پہننے اور استعمال کرنے کی چیزیں بھی جانوروں کی اون سے اور انہی کے بالوں سے بناتے تھے، بھیڑوں کے بال، بکریوں کے بال، اونٹوں کے بال، انہی سے مختلف چیزیں بناتے تھے، تو اب ان چیزوں کو ذکر کیا جا رہا ہے، ''بنائے اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے چوپایوں کے چمڑوں سے گھر'' چوپایوں کے چمڑوں سے اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے گھر بنا دیے، اس سے خیمے مراد ہیں، تَسْتَخِفُّوْنَهَا: ان کا فائدہ یہ ہے کہ تم ان کو ہلکا پاتے ہو، يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ اِقَامَتِكُمْ: اپنے سفر کے دِن اور اپنے ٹھہرنے کے دِن، یعنی وہ ایسے گھر ہیں کہ جن کو تم اٹھا کے کندھے پر رکھ کے چل دیتے ہو، جہاں گئے جا کے وہاں بیٹھ کر پھر بنا لیا، اور اگر اینٹوں اور پتھروں کے بنے ہوئے مکان ہوتے اور سفر کر کے کہیں جاتے تو ان کو اٹھا کر کہاں لے جاتے، تو وہ خیمے ایسے ہیں، اس لیے ان لوگوں کو خانہ بدوش کہتے ہیں کہ نہیں کہتے؟ خانہ بدوش کا معنی کہ اپنا گھر کندھے پر رکھ کے پھرتے ہیں، جہاں چاہا رکھا اور بنا لیا، گھر بنا کے ایسے بیٹھتے ہیں جیسے اپنے وطن میں بیٹھے ہوتے ہیں، وہاں سے چلنے کا ارادہ ہوا تو اٹھایا اور اٹھا کے آگے چل دیے، تو اللہ کا احسان ہے کہ اس نے چمڑوں سے تمہیں اس قسم کا گھر بنانے کی توفیق دے دی جن کو تم ہلکا محسوس کرتے ہو اپنے سفر کے دِن اور اپنے ٹھہرنے کے دِن۔ وَمِنْ اَصْوَافِهَا: اصواف صُوف کی جمع، یہ بھیڑوں کی ہوتی ہے، ''اور ان چوپایوں کے صوفوں سے'' وَاَوْبَارِهَا: اوبار* کی وَبر کی جمع، یہ اونٹ کی ہوتی ہے، ''اور ان کے وَبر سے''، وَاَشْعَارِهَآ: شعر یہ بال ہو گئے جیسے بکریوں کے ہوتے ہیں، ''ان کے صُوفوں سے، ان کے وَبروں سے اور ان کے بالوں سے تم سامان بناتے ہو اور استعمال کی چیزیں بناتے ہو ایک وقت تک، اَثاث ہے اور متاع ہے ایک وقت تک'' متاع: برتنے کی چیز۔ اَثاث: گھر کے سامان کو کہتے ہیں اَثاثُ البیت۔ کتنی چیزیں تم ان سے بناتے ہو جن کو تم گھروں کے اندر استعمال کرتے ہو اور اپنے لیے راحت حاصل کرتے ہو۔ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا: اللہ نے بنائے تمہارے لئے ان چیزوں سے جو اللہ نے پیدا کیں سائے، اللہ نے سائے پیدا کیے ان چیزوں سے جو اللہ نے

بنائیں، تو سائے میں تمہیں کس قسم کی راحت حاصل ہوتی ہے، وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا: اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے پہاڑوں سے بھی چھپنے کی جگہیں بنائیں، جس طرح سے غاریں ہیں، پہاڑوں میں رہنے والوں کے لئے غاریں بھی بہت بڑی نعمت بنتی ہیں، بارش سے بچنے کے لئے اور دوسری چیزوں سے بچنے کے لئے غاروں میں گھس جاتے ہیں۔ اکنان کِنٌّ کی جمع ہے چھپنے کی چیز۔ وَّجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ: سرابیل سربال کی جمع ہے، اور بنائے اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے لباس، قمیصیں، کرتے۔ جیسے "سروال" واؤ کے ساتھ ہو تو پاجامے کے لئے آتا ہے، (جمع) سراویل۔ اور سرابیل باء کے ساتھ ہو تو کرتے کے معنی میں آجاتا ہے۔ "ایسی قمیصیں اللہ نے تمہارے لیے بنائیں" تَقِيْكُمُ الْحَرَّ: جو تمہیں گرمی سے بچاتی ہیں، وَسَرَابِيْلَ: اور ایسی قمیصیں اللہ نے تمہارے لیے بنائیں تَقِيْكُمْ بَاْسَكُمْ: جو تمہیں آپس میں تمہاری لڑائی سے بچاتی ہیں، اس سے زرہیں مراد ہیں جو لوہے کی بنا کر انسان پہنتا ہے، اور گرمی سے بچانے والے یہی کپڑے ہیں، اب یہی کپڑے سردی سے بچنے کے لئے بھی پہنتے ہیں اور گرمی سے بچنے کے لئے بھی پہنتے ہیں، سردی میں اگر آپ ننگے بدن ہوں تو سردی تکلیف دیتی ہے، دھوپ میں گرمی میں ننگے بدن ہوں تو یہی دھوپ تکلیف دیتی ہے، سردی سے بچنے کا یہاں ذکر نہیں ہے وہ شروع سورۃ میں ہی آ گیا تھا لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ، کہ انہی جانوروں میں تمہارے لیے گرمی کا سامان ہے، تو اس کا ذکر شروع میں آ گیا تھا۔ كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ: اسی طرح سے اللہ تعالیٰ پورا کرتا ہے اپنا احسان تم پر تا کہ تم اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دو، کسی اور کے دروازے پر نہ ڈالو۔ تُسْلِمُوْنَ: تا کہ تم اسلام لے آؤ، اسلام کا معنی یہی ہے کہ تم اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دو کہ جو ہماری اس قسم کی ضرورتیں پوری کرتا ہے بس ہم تو اسی کے ہی ہیں۔ کسی دوسرے دروازے پر اپنے آپ کو نہ ڈالو۔ فَاِنْ تَوَلَّوْا: پھر اگر یہ لوگ پیٹھ پھیریں، فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ: پس آپ کے ذمے تو صریح طور پر پہنچا دینا ہی ہے، زبردستی ان کو کسی راستے پر لانا آپ کے ذمے نہیں، يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا: پہچانتے ہیں یہ اللہ کے احسان کو پھر اس کا انکار کرتے ہیں، پھر اس کے منکر ہو جاتے ہیں، اللہ کے احسان کا اقرار نہیں کرتے، وَاَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ: اور ان میں سے اکثر ناشکرے ہیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا ثُمَّ لَا يُؤْذَنُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَلَا هُمْ

اور جس دن اٹھائیں گے ہم ہر جماعت میں سے گواہ پھر نہیں اجازت دی جائے ان لوگوں کو جنہوں نے کفر کیا اور نہ ان سے ناراضگی

يُسْتَعْتَبُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَاِذَا رَاَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الْعَذَابَ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ وَلَا هُمْ

کے ازالے کا مطالبہ کیا جائے گا ﴿۸۴﴾ اور جس وقت ظالم عذاب کو دیکھیں گے پس نہ وہ عذاب ان سے ہلکا کیا جائے گا اور نہ وہ

يُنْظَرُوْنَ ﴿٨٥﴾ وَاِذَا رَاَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا شُرَكَآءَهُمْ قَالُوْا رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ شُرَكَآؤُنَا الَّذِيْنَ

مہلت دیے جائیں گے (۸۵) اور جس وقت دیکھیں گے مشرکین شرکاء کو تو کہیں گے اے ہمارے پروردگار! یہ ہیں ہمارے شرکاء جن کو

كُنَّا نَدْعُوْا مِنْ دُوْنِكَ ۚ فَاَلْقَوْا اِلَيْهِمُ الْقَوْلَ اِنَّكُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿٨٦﴾ ۚ وَاَلْقَوْا اِلَى اللّٰهِ

ہم پکارا کرتے تھے تجھے چھوڑ کر، پس شرکاء ان کی طرف بات کو لوٹا دیں گے کہ بے شک تم جھوٹے ہو (۸۶) مشرکین اللہ کی طرف

يَوْمَئِذِنِ السَّلَمَ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿٨٧﴾ اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ

اس دِن صلح ڈالیں گے اور جتنی باتیں گھڑا کرتے تھے وہ سب ان سے گم ہو جائیں گی (۸۷) وہ لوگ جنہوں نے کُفر کیا اور انہوں نے اللہ

سَبِيْلِ اللّٰهِ زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يُفْسِدُوْنَ ﴿٨٨﴾ وَيَوْمَ

کے راستے سے روکا زیادہ کریں گے ہم انہیں از روئے عذاب کے عذاب پر بسبب اس کے کہ وہ فساد کرتے تھے (۸۸) جس دِن کہ

نَبْعَثُ فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ وَجِئْنَا بِكَ شَهِيْدًا

اُٹھائیں گے ہم ہر جماعت کے اندر ایک حالات بتلانے والا اُن لوگوں پر انہی میں سے ہی اور ہم آپ کو بھی ان لوگوں پر گواہ بنا کے

عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ ؕ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى

لائیں گے، اور ہم نے اُتارا آپ پر کتاب کو جو ہر چیز کی وضاحت ہے، اور ہدایت اور رحمت ہے اور بشارت ہے

لِلْمُسْلِمِيْنَ ﴿٨٩﴾ ۧ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ

مسلمین کے لئے (۸۹) بے شک اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے عدل اور احسان کا اور ذی قرابت کو دینے کا اور روکتا ہے

الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿٩٠﴾ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا

بے حیائی سے اور بُری چیز سے اور ظلم سے، اللہ تمہیں نصیحت کرتا ہے تا کہ تم یاد رکھو (۹۰) اور اللہ کے عہد کو پورا کیا کرو جس وقت کہ

عٰهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا ؕ اِنَّ

عہد کرلو، اور توڑا نہ کرو قسموں کو ان کے پختہ کرنے کے بعد حالانکہ اللہ تعالیٰ کو تم اپنے اُوپر ضامن بنا چکے، بے شک

اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿٩١﴾ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا ؕ

اللہ تعالیٰ جانتا ہے ان کاموں کو جو تم کرتے ہو (۹۱) نہ ہو جاؤ اس عورت کی طرح جو توڑتی ہے اپنے سُوت کو اس کی قوت کے بعد ٹکڑے ٹکڑے،

تَتَّخِذُوْنَ اَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ ؕ

بناتے ہوتم اپنی قسموں کو آپس میں فساد کا ذریعہ اس وجہ سے کہ ایک جماعت، وہ زیادہ بڑھی ہوئی ہے دوسری جماعت سے،

اِنَّمَا يَبْلُوْكُمُ اللّٰهُ بِهٖ ؕ وَلَيُبَيِّنَنَّ لَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مَا كُنْتُمْ فِيْهِ

اس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ تمہیں آزماتا ہے، البتہ ضرور واضح کرے گا تمہارے لیے قیامت کے دِن جس میں

تَخْتَلِفُوْنَ ۝۹۲ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ

تم اختلاف کیا کرتے تھے ۹۲ اگر اللہ چاہتا تو تمہیں ایک ہی جماعت بنا دیتا لیکن وہ بھٹکاتا ہے جس کو چاہتا ہے اور سیدھے راستے پر

مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَلَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۹۳ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اَيْمَانَكُمْ

چلاتا ہے جس کو چاہتا ہے، اور البتہ ضرور پوچھے جاؤ گے تم ان کاموں کے متعلق جو تم کیا کرتے تھے ۹۳ نہ بنایا کرو اپنی قسموں کو

دَخَلًا بَيْنَكُمْ فَتَزِلَّ قَدَمٌۢ بَعْدَ ثُبُوْتِهَا وَتَذُوْقُوا السُّوْٓءَ بِمَا صَدَدْتُّمْ

آپس میں فساد کا ذریعہ پھر پھسل جائے گا کوئی قدم اس کے ثابت ہونے کے بعد اور چکھو گے تم برائی بسبب اس کے کہ تم نے اللہ کے

عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَلَكُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝۹۴ وَلَا تَشْتَرُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ اِنَّمَا

راستے سے روکا، اور تمہارے لیے بڑا عذاب ہے ۹۴ نہ لیا کرو تم اللہ کے عہد کے مقابلے میں ثمنِ قلیل، جو کچھ

عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۹۵ مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ

اللہ کے پاس ہے وہ بہتر ہے تمہارے لیے اگر تم جانو ۹۵ جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ ختم ہونے والا ہے اور جو اللہ کے پاس ہے

بَاقٍ ؕ وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْٓا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۹۶ مَنْ

وہ باقی رہنے والا ہے، اور البتہ ضرور دیں گے ہم ان لوگوں کو جنہوں نے صبر کیا ان کا اجر ان کے بہترین عملوں کے عوض میں ۹۶ جو کوئی

عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ

شخص نیک عمل کرے مرد ہو یا عورت بشرطیکہ مؤمن ہو تو ہم ضرور عطا کریں گے اس کو عمدہ زندگی، اور البتہ ضرور دیں گے ہم ان کو

اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۹۷ فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ

ان کا اجر ان بہترین کاموں کی وجہ سے جو وہ کیا کرتے تھے ۹۷ جس وقت آپ قرآن پڑھنے لگیں تو اللہ تعالیٰ کی پناہ پکڑا کیجئے شیطانِ

الرَّجِيمِ ﴿٩٨﴾ إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطَٰنٌ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ﴿٩٩﴾ إِنَّمَا

رجیم سے ﴿۹۸﴾ بے شک اس کے لئے کوئی زور نہیں ان لوگوں پر جو ایمان لے آتے ہیں اور اپنے رَبّ پر توکّل کرتے ہیں، سوائے اس کے نہیں ﴿۹۹﴾

سُلْطَٰنُهُ عَلَى الَّذِينَ يَتَوَلَّوْنَهُ وَالَّذِينَ هُم بِهِ مُشْرِكُونَ ﴿١٠٠﴾ ع

کہ اس کا زور تو انہی لوگوں پر ہے جو اس سے دوستی لگاتے ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرانے والے ہیں ﴿۱۰۰﴾

تفسیر

اَحوالِ آخرت اور مشرکین کو تنبیہ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ۔ وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِن كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا: اور جس دِن اُٹھائیں گے ہم ہر جماعت میں سے گواہ۔ شھید: حالات بتلانے والا، حالات پر شہادت دینے والا، گواہی دینے والا، ثُمَّ لَا يُؤْذَنُ لِلَّذِينَ كَفَرُوا: پھر نہیں اجازت دی جائے گی ان لوگوں کو جنہوں نے کُفر کیا، یعنی عذر معذرت کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی، وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُونَ: یہ استعتاب باب استفعال سے ہے، اس کا مأخذ عتاب ہے، عتاب ناراضگی کو کہتے ہیں، اور باب افعال سے یہ لفظ آتا ہے اِعتاب، مُعتَبِین کا لفظ بھی کہیں آئے گا،[1] اِعتاب کا معنی اِزالۂ عتاب کرنا، ناراضگی کو زائل کرنا، تو مُعتَبین کا معنی ہوگا ناراضگی زائل کیے ہوئے، جن سے ناراضگی کو زائل کر دیا گیا ہو، اور استعتاب کا معنی ہوتا ہے ناراضگی کے ازالے کا مطالبہ کرنا، یعنی آپ سے یہ کہا جائے کہ آپ ناراضگی کی وجوہ کو دُور کر دیں اور ناراضگی زائل کر دیں، تو وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُونَ کا معنی یہ ہوگا ''اور نہ ان کافروں سے مطالبہ کیا جائے گا کہ وہ ناراضگی کو زائل کرلیں اور اب اپنے رَبّ کو راضی کرلیں، یہ مطالبہ بھی نہیں کیا جائے گا، کیونکہ اب ناراضگی کو زائل کرنے کا کوئی موقع نہیں ہے۔ ''نہیں اجازت دی جائے گی ان لوگوں کو جنہوں نے کُفر کیا'' عذر معذرت کرنے کی، ''اور نہ ہی ان سے ناراضگی کے ازالے کا مطالبہ کیا جائے گا'' کہ وجوہِ ناراضگی کو زائل کر کے اب تم اپنے اللہ کو راضی کرلو، اس قسم کا مطالبہ ان سے نہیں کیا جائے گا، کیونکہ اس کا وقت گزر چکا۔ تو ان آیات میں آخرت کے احوال کو ذکر کر کے مشرکین کے لئے وعید ہے، ''ہر اُمت سے شہید اُٹھایا جائے گا، گواہی دینے والا اُٹھایا جائے گا'' اس سے مراد اُس اُمت کا نبی ہے جو اللہ تعالیٰ کے سامنے گواہی دے گا کہ میں نے اِن تک تیرا دِین صحیح صحیح پہنچا دیا تھا لیکن انہوں نے نہیں مانا۔ وَإِذَا رَأَى الَّذِينَ ظَلَمُوا الْعَذَابَ: اور جس وقت ظالم عذاب کو دیکھیں گے یعنی دیکھنے کا مطلب یہ ہے کہ عذاب میں واقع ہو جائیں گے، فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ: پس نہ وہ عذاب ان سے ہلکا کیا جائے گا اور نہ وہ مہلت دیے جائیں گے، جتنا اللہ کی طرف سے تجویز ہو گیا اس سے ہلکا نہیں ہوگا، بعض وجوہ سے اس میں اضافہ تو ہو سکتا ہے، اور ان کو مہلت بھی نہیں دی جائے گی بلکہ جس وقت ان کو جہنّم میں بھیج دیا جائے گا اسی وقت ہی اس عذاب کو چالو کر دیا جائے گا، سزا

---

(۱) وَإِن يَسْتَعْتِبُوا فَمَا هُم مِّنَ الْمُعْتَبِينَ (پارہ ۲۴ سورۃ فصلت آیت ۲۴)۔

جاری ہوجائے گی۔ وَاِذَا رَاَ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا شُرَکَآءَهُمْ: اور جس وقت دیکھیں گے وہ لوگ جنہوں نے شریک ٹھہرائے تھے، جنہوں نے شرک کیا تھا، (شُرَکَآءَهُمْ یہ رَاٰی کا مفعول ہے) جس وقت دیکھیں گے مشرکین شرکاء کو تو مشرکین دیکھ کے بول پڑیں گے، قَالُوْا رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ شُرَکَآؤُنَا: کہیں گے اے ہمارے پروردگار! یہ ہیں ہمارے شرکاء جن کو ہم شریک بنایا کرتے تھے، الَّذِیْنَ کُنَّا نَدْعُوْا مِنْ دُوْنِكَ: تجھے چھوڑ کے جن کو ہم پکارا کرتے تھے وہ یہ لوگ ہیں، مقصد اُن کا یہ ہوگا کہ ہماری گمراہی کا باعث یہ بنے ہیں اس لیے تو ان کو پکڑ، اپنے بڑوں کو پکڑوانا چاہیں گے جن کو دنیا کے اندر پوجا کرتے تھے اور جن کو پکارا کرتے تھے، فَاَلْقَوْا اِلَیْهِمُ الْقَوْلَ اِنَّکُمْ لَکٰذِبُوْنَ: شرکاء کو فوراً ڈر لگے گا کہ کہیں ان کے کہنے کی وجہ سے ہم بھی کسی گرفت میں نہ آجائیں تو وہ فوراً ان کی طرف بات کو لوٹا دیں گے، اَلْقَوْا اِلَیْهِمُ الْقَوْلَ: ان کی بات انہی کی طرف لوٹا دیں گے، انہی کے منہ پر ماریں گے، کون سی بات؟ کہ اِنَّکُمْ لَکٰذِبُوْنَ: بے شک تم جھوٹے ہو، تو اِن کی بات اِن کی طرف لوٹا دیں گے اور یہ کہیں گے اِنَّکُمْ لَکٰذِبُوْنَ: بے شک تم جھوٹے ہو، ہم کہاں شرکاء ہیں؟ ہم اللہ کے شریک کہاں ہیں؟ اور یہ کہنے والے کون ہوں گے؟ شرکاء کے اندر جس طرح سے تعمیم ہے اسی طرح ان کا یہ القاء قول ہے، جیسے شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ "جن چیزوں کو مشرکین نے معبود بنا رکھا تھا، سب اپنی علیحدگی اور بیزاری کا اظہار کریں گے۔ کوئی سچ کوئی جھوٹ۔ پتھر کے بتوں کو تو سرے سے کچھ خبر ہی نہ تھی (کہ ہمیں بھی لوگوں نے شریک ٹھہرایا ہوا ہے، تو اللہ تعالیٰ ان کو بولنے کی طاقت دے گا وہ تو کہیں گے کہ تم جھوٹے ہو، ہم کب شرکاء تھے) ملائکہ اور بعض انبیاء وصالحین ہمیشہ شرک سے سخت نفرت و بیزاری اور اپنی خالص بندگی کا اظہار کرتے رہے (فرشتے بھی اللہ کے سامنے اپنی بندگی کا اظہار کرتے ہیں، نیازمندی کا اظہار کرتے ہیں، انبیاء اور صالحین بھی ہمیشہ شرک سے روکتے رہے، تو وہ شرکاء کس طرح سے ہو گئے، وہ کہیں گے تم جھوٹ بولتے ہو، ہم کب شرکاء تھے، ہم نے کب تمہیں کہا تھا کہ ہمیں شرکاء سمجھو یا ہمیں شرکاء قرار دو، اور ہم کب تمہاری ان کارروائیوں کے اوپر خوش تھے؟)۔ رہ گئے شیاطین سو ان کا اظہار نفرت گو جھوٹ ہوگا، تاہم اس سے مشرکین کو کلی طور پر مایوسی ہوجائے گی کہ آج بڑے سے بڑا رفیق بھی کام آنے والا نہیں۔" تو حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تقریر میں یہاں شرکاء عام رکھے ہیں، اور ان کا اِنَّکُمْ لَکٰذِبُوْنَ کہنا ان مختلف صورتوں میں ہے، کہ اللہ تعالیٰ پتھروں کو، بے جان چیزوں کو جن کو یہ لوگ پکارتے تھے ان کو بھی بولنے کی طاقت دے گا، ان کو تو چونکہ خبر ہی نہیں تھی کیا شرک اور کیا شرکاء، اس لیے وہ بھی اپنے ان پکارنے والوں کو کہیں گے کہ تم جھوٹے ہو، ملائکہ انبیاء اور صالحین بھی تردید کریں گے، اور شیاطین اگر کسی درجے میں شرک کی ترغیب بھی دیتے رہے اور ان کی کارروائیوں پر خوش بھی تھے تو اپنی جان بچانے کے لئے وہ بھی یہ کہہ دیں گے کہ ہم کب شرکاء تھے، جس طرح سے آپ کے سامنے سورۂ ابراہیم میں ابلیس اعظم کی تقریر گزر چکی۔ وَاَلْقَوْا اِلَى اللّٰهِ یَوْمَئِذِ السَّلَمَ: اَلْقَوْا کی ضمیر مشرکین کی طرف لوٹ رہی ہے، مشرکین اللہ کی طرف اس دن صلح ڈالیں گے، سَلَم یہ استسلام کا اسم ہے۔ اسلام: فرمانبرداری۔ فرمانبرداری کا اظہار کریں گے، جس کو کہتے ہیں کہ سپر ڈال دینا، اب مقابلے کی قوت نہیں، طاقت نہیں، اپنے دعوے کو کسی طرح سے ثابت نہیں کرسکیں گے، اللہ تعالیٰ کی طرف وہ سَلَم ڈالیں گے، اپنی اطاعت کا اظہار کریں گے، اس مقابلے کے اندر سپر ڈال دیں گے، وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا کَانُوْا یَفْتَرُوْنَ: جتنی باتیں وہ گھڑا کرتے تھے تراشا کرتے تھے، وہ سب ان سے گم ہوجائیں گی، کہ باتیں بناتے تھے کہ آخرت میں یہ کام آجائے گا، اول تو آخرت

ہوگی ہی نہیں، اگر ہوگی تو فلاں کام آجائے گا، وہ سب باتیں بھول جائیں گی، کوئی ان کے سامنے نہیں رہے گی۔ اَلَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ: وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور انہوں نے اللہ کے راستے سے روکا، اور اَلَّذِیْنَ کے بعد ماضی آئے تو نحو میں آپ پڑھتے رہتے ہیں کہ اس کا ترجمہ مضارع کے ساتھ بھی ہوسکتا ہے، کہ جو کفر کرتے ہیں اور اللہ کے راستے سے روکتے ہیں، زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ: ہم ان کو عذاب پر عذاب بڑھائیں گے، زیادہ کریں ہم انہیں از روئے عذاب کے عذاب پر، یعنی عذاب میں ان کے درجات بڑھیں گے، ایک عذاب تو ہوا ان کے کفر کی بنا پر، جہنم میں چلے گئے کفر کی بنا پر، اس کے اوپر اضافہ (اس لیے) ہوگا کہ یہ صرف کافر ہی نہیں تھے بلکہ دوسروں کو کافر بنانے والے بھی تھے، اللہ کے راستے سے روکتے تھے، تو ضلال کے ساتھ ساتھ اِضلال کا فعل جو تھا دوسروں کو گمراہ کرنے کا، اس کی بنا پر ان کا عذاب خالص کافروں کے مقابلے میں جنہوں نے اِضلال نہیں کیا ان کے مقابلے میں ان کا عذاب بڑھا ہوا ہوگا، ایک آدمی صرف کافر ہے لیکن دوسرے کو کفر کی ترغیب نہیں دیتا، حق سے روکتا نہیں ہے، اور ایک کافر بھی ہے اور حق سے روکتا بھی ہے جس طرح سے رُؤسائے مشرکین تھے، تو ان حق سے روکنے والوں کا عذاب دوسروں کے مقابلے میں دگنا ہوگا، بِمَا كَانُوْا یُفْسِدُوْنَ: بسبب اس کے کہ یہ فساد مچایا کرتے تھے، حق کی مخالفت ہی فساد ہے، ان کا فساد یہی تھا کہ لوگوں کو سیدھے راستے پر چلنے نہیں دیتے تھے، حق کو قبول نہیں کرنے دیتے تھے۔ ''جو لوگ کفر کرتے ہیں اور اللہ کے راستے سے روکتے ہیں زیادہ کریں گے ہم انہیں از روئے عذاب کے عذاب پر بسبب اس کے کہ وہ فساد کرتے تھے، خرابی مچاتے تھے، شرارتیں کرتے تھے''۔ وَیَوْمَ نَبْعَثُ فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِیْدًا عَلَیْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ: جس دن کہ اٹھائیں گے ہم ہر جماعت کے اندر ایک حالات بتلانے والا اُن لوگوں پر اُنہی میں سے ہی، کیونکہ نبی جو بھی کسی جماعت میں آیا انہی میں سے ہی آیا، اسی کو اللہ تعالیٰ شہید بنا کے کھڑا کریں گے، وَجِئْنَا بِكَ شَهِیْدًا عَلٰی هٰۤؤُلَآءِ: جس دن باقی جماعتوں میں ان کا گواہ لایا جائے گا، شہید لایا جائے گا تو ہم آپ کو بھی اِن لوگوں پر گواہ بنا کے لائیں گے، هٰۤؤُلَآءِ سے مراد یہ لوگ ہیں جو حضور ﷺ کے زمانے میں تھے جن کو حضور ﷺ دِین سمجھانے کے لئے اور حق بتانے کے لئے آئے تھے، وَنَزَّلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ تِبْیَانًا لِّكُلِّ شَیْءٍ: اور ہم نے اتارا آپ پر کتاب کو جو ہر چیز کی وضاحت ہے، تِبیان مصدر ہے، ہر چیز کو واضح کرنے والی ہے، جس میں ضروریاتِ دِین بیان کردی گئیں، یوں کہہ لیجئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے سرورِ کائنات ﷺ کو بطور شہید کے اُٹھانے کا جو ذکر کیا کہ اِن لوگوں کے خلاف آپ کو بطور شہید کے لایا جائے گا، بطور گواہ کے لایا جائے گا، تو اس میں گویا کہ آپ کی نبوّت کا اظہار ہے، تو جس طرح باقی اُمتوں کے نبیوں کو ان اُمتوں کے خلاف گواہی کے طور پر پیش کیا جائے گا تو آپ بھی آئیں گے اور نَزَّلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ یہ آپ کی نبوّت کی دلیل کے طور پر ذکر کردیا، تِبْیَانًا لِّكُلِّ شَیْءٍ: اس کا ذکر آپ کے سامنے کئی دفعہ ہو چکا کہ کتاب ہر چیز کو واضح کرنے والی ہے، کتاب میں ہر چیز کی وضاحت ہے، تو ہر چیز سے مراد ہوتا ہے ہر ضروری چیز دینی اعتبار سے ہے، کتاب اللہ نے دِین کی ہر بات کو واضح کردیا، کسی کو جزوی رنگ میں، کسی کو اُصولِ کلّی کے طور پر، کلیات کتاب اللہ سے معلوم ہوگئے اور ان کلیات کے ذریعے سے پھر باقی احکام نکلتے چلے گئے، یعنی سرورِ کائنات ﷺ کی حدیث سے استدلال کر کے ہم جو احکام کو ثابت کرتے ہیں وہ بھی کتاب اللہ کی ہی تشریح ہے، اس کے لئے بھی کتاب اللہ نے اصول قائم کردیے، مَاۤ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ (الحشر: ۷) جو کچھ تمہیں رسول دیتا ہے وہ لو، اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا

الرَّسُوْلِ (النساء:۵۹،وغیرہ)، اسی طرح سے اجماع ہوگیا، قیاس ہوگیا، جو بھی اصول قائم کیے گئے ہیں، تو جب ان کے ذریعے سے آگے جزئیات نکالی جائیں گی تو وہ گویا کہ درجہ بدرجہ کتاب اللہ کے ہی اَحکام ہیں۔ تو تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ کا مطلب یہ ہوا کہ دین کے لئے جن باتوں کی ضرورت تھی اِس کتاب نے ان کو واضح کردیا، بعض کو جزئیات کے طور پر، بعض کو کلیات کے طور پر، باقی! آگے سارا دِین انہی باتوں کی تشریح ہے۔ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِیْنَ: اتارا ہم نے آپ پر کتاب کو، ہر چیز کے لئے وضاحت ہے، ہر چیز کا کھلا بیان ہے، اور ہدایت ورحمت ہے اور بشریٰ ہے مسلمین کے لئے، مسلمین کا تذکرہ ہوگیا چونکہ فائدہ اٹھانے والے یہی لوگ ہیں، ہدایت ورحمت کے اندر فرق آپ کے سامنے بارہا آچکا، کہ اِبتدا کے اعتبار سے یہ راہنمائی ہے اور نتیجے کے اعتبار سے اللہ کی رحمت حاصل ہونے کا ذریعہ ہے، کہ جو اس کی راہنمائی کو قبول کریں گے اللہ تعالیٰ کی رحمت انہیں حاصل ہوگی، اور فرمانبرداروں کے لئے بشارت ہے کہ جو فرمانبرداری اختیار کریں، اسلام لے آئیں، کُفر کو چھوڑ دیں، اللہ کے احکام مان لیں، ان کو اچھے انجام کی بشارت دیتی ہے۔

کتابُ اللہ کی تعلیمات کا خلاصہ

اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰى وَیَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْیِ ۚ یَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ: اب یہ تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ کا ایک قسم کا نمونہ ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اپنی اس کتاب کے اندر جو تعلیمات دی ہیں ان کا خلاصہ اس آیت کے اندر جمع کردیا گیا ہے، اس لیے اصولی طور پر یہ آیت تمام احکام پر حاوی ہے، اس کی جامعیت کی طرف دیکھتے ہوئے ہی اسلاف سے معمول چلا آرہا ہے کہ اس کو خطبہ جمعہ کے اندر پڑھا جاتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ: بے شک اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے عدل کا اور احسان کا، وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰى: اِیتاء مصدر ہے، اور اس مصدر کی اضافت مفعول کی طرف ہے، قربیٰ بھی مصدر ہے قرابت کے معنی میں، ''ذی قربیٰ، ذی قرابت، اہل قرابت کو دینے کا حکم دیتا ہے''، ''اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے عدل کا، احسان کا، اور ذی قرابت کو دینے کا''۔ وَیَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ: اور روکتا ہے بے حیائی سے، وَالْمُنْكَرِ: اور بُری چیز سے، وَالْبَغْیِ: اور سرکشی وظلم سے، یَعِظُكُمْ: اللہ تمہیں نصیحت کرتا ہے، لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ: تاکہ تم یادرکھو۔

''عدل'' کا مطلب اور اس کے تقاضے

اس میں تین چیزیں مامور کے درجے میں ذکر کی گئی ہیں اور تین چیزیں منہی کے درجہ میں ذکر کی گئی ہیں، مامور کے درجے میں جو چیز ذکر کی گئی وہ ایک تو ''عدل'' ہے، اور ''عدل'' ایک بہت جامع لفظ ہے، اس کا لفظی معنی ہوتا ہے برابری کرنا، اور عام محاورے کے طور پر آپ اس کا ترجمہ کردیتے ہیں انصاف کرنا، برابری اور انصاف ایک ہی چیز ہے، تو ''عدل'' کا مطلب یہ ہوا کہ جو حقوق آپ کے ذمے لگے ہوئے ہیں آپ برابر سرابر ان کو ادا کردیں، اور یہ سمجھ کر ہی ادا کریں کہ یہ دوسرے کا حق ہے، اس کے اوپر نہ تو کوئی محبت اثر انداز ہو، نہ کسی کی عداوت اثر انداز ہو، نہ کوئی مفاد اثر انداز ہو، نہ کوئی دوسری چیز۔ اپنے معاملے میں بھی عدل کیجئے، اپنے اور اللہ کے احکام کے درمیان میں بھی عدل کیجئے، لوگوں کے نزاعات کے درمیان بھی عدل کیجئے، انصاف کے ساتھ ہر

کسی سے پیش آیئے، دوسرے کے حقوق کی تعیین انصاف کے ساتھ کیجئے، کہ دوسرے کا کتنا حق ہمارے ذمے لگتا ہے اور اس کو پھر برابر سرابر ادا کر دینا ہے، آپ جانتے ہیں کہ اس کے اندر بہت سارے احکام آ گئے، جس طرح سے کہا گیا اِعْدِلُوْا ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی (المائدۃ:۸) کہ ہمیشہ انصاف کیا کرو، اور اس انصاف والے جذبے کو محبت یا عداوت سے متاثر نہ ہونے دو، جو جس کا حق ہے اس کو پوری طرح سے ادا کرو، یہی تقوے کے زیادہ قریب ہے۔

''اِحسان'' کے دو مفہوم

اس سے آگے بڑھ کے ''احسان'' کا تذکرہ آ گیا، جس کا مطلب یہ ہوا کہ صرف حقوق کے ادا کرنے پر کفایت نہ کرو، بلکہ آگے احسان کی صفت بھی ہونی چاہیے، حق سے بھی زیادہ دوسرے کے ساتھ بھلائی کرو، اَحْسَنَ اِحْسَان کا مفہوم دو طرح سے ذکر کیا جاتا ہے، اس کا ایک مطلب ہوتا ہے کہ جو کام بھی کرو اچھی طرح سے کرو، اس میں حُسن ہونا چاہیے، اس میں قبح نہ ہو، تمہارا ہر کام حسن کو لیے ہوئے ہو، اچھی طرح سے کرو جو کام بھی کرو، توجہ کے ساتھ اس کے آداب کی رو رعایت رکھتے ہوئے کسی کام کو کیا جائے۔ اور اسی طرح سے احسان کا خاص مفہوم یہ بھی ہوتا ہے کہ دوسروں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا، یعنی پہلا مفہوم عام ہے کہ جو کام بھی کیا جائے اچھی طرح سے کیا جائے، اور دوسرا مفہوم خاص ہے کہ دوسرے انسان کے ساتھ اچھائی کے ساتھ معاملہ کیا جائے۔ پہلے مفہوم کی طرف اشارہ اسی حدیثِ جبرئیل میں ہے کہ جب جبریل علیہ السلام نے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تھا کہ مَا الْاِحْسَانُ؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ''اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ'' کہ اللہ کی عبادت ایسے طور پر کرو (عبادت میں تمام احکام شامل ہیں) اللہ کی عبادت ایسے طور پر کرو گویا کہ تم اللہ کو دیکھ رہے ہو، کیونکہ تم اگر نہیں دیکھ رہے تو وہ تو دیکھ ہی رہا ہے، مطلب یہ ہے کہ ہمیشہ اپنے آپ کو اللہ کے سامنے سمجھو، اور اس طرح سے کام کرو گویا کہ تم اللہ کے سامنے ہو اور اللہ تمہارے سامنے ہے، تو جس وقت اپنے معاملات میں، عبادات میں، ہر چیز میں اس بات کا استحضار رکھا جائے گا کہ اللہ ہمیں دیکھ رہا ہے، ہم اللہ کے سامنے ہیں، تو پھر اس کام کے اندر کسی طرف سے خرابی نہیں آ سکتی، خلوص ہی خلوص ہوگا۔ تو احسان کا یہ مفہوم ہوا، اور مخلوق کے ساتھ احسان کرنا اسی کا ایک فرد ہے کہ جب کسی کے ساتھ برتاؤ کرو تو اس کے اندر اچھائی کا پہلو ہونا چاہیے، صرف حقوق پر اکتفاء نہ کرو بلکہ حقوق سے بڑھ کر دوسرے کے ساتھ مروت کرو۔

اہلِ قرابت کے حق کی اہمیت

اور پھر عام مخلوق کے ساتھ بھلائی کے بعد خصوصیت کے ساتھ اہل قرابت کا ذکر کر دیا، یہاں اِیتاء کا لفظ آیا ہے جس کا مفعول ذکر نہیں کیا گیا، اہل قرابت کو دو، کیا دو؟ یہاں یہ ذکر نہیں کیا گیا کہ کیا دینا چاہیے؟ کیا دینا چاہیے اور کتنا دینا چاہیے یہ موقع محل کے مطابق ہے، کہ آپ کے رشتہ دار، آپ کی قرابت والے آپ کی جس قسم کی امداد کے مستحق ہیں، جس قسم کی ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ آپ ان کے ساتھ تعاون کریں تو آپ اسی طرح سے ان کے ساتھ تعاون کریں، ان کی خوشی میں شریک ہوں، ان کی غمی میں

شریک ہوں، مصیبت کے وقت ان کی امداد کریں، ان کے ساتھ کاموں میں تعاون رکھیں، خیرخواہی کا معاملہ کریں، اور جہاں تک مال کے خرچ کرنے کا تعلق ہے وہ باقی مخلوق کے مقابلے میں اہلِ قرابت کا زیادہ حق ہے، اس لیے خصوصیت سے یہ ذکر کر دیا۔

مذکورہ تین صفتوں کو اَپنانے کا فائدہ

تو ان تین صفتوں کو اگر ہر شخص اپنا لے، عدل کی صفت کو اپنا لے، احسان کا جذبہ پیدا کر لے، احسان میں یہ بھی آجائے گا کہ اگر دوسرے کی طرف سے کوئی تکلیف پہنچی ہے تو اس کے مقابلے میں اس کو تکلیف پہنچانے کی کوشش نہ کرو بلکہ احسان کرو اچھا برتاؤ کرو، اور اہلِ قرابت کا خیال کرو، تو ان تینوں جذبوں کو اپنا لینے کے بعد آپ دیکھتے ہیں کہ زندگی بھی خوشگوار ہو سکتی ہے، اور دنیا کے اندر امن وامان بھی قائم ہو سکتا ہے۔

دُنیا کے اندر جتنی شرارت ہے اس کے دو شعبے ہیں

اور اس کے مقابلے میں تین چیزوں سے روکا گیا، بے حیائی کی حرکتوں سے، جس میں خصوصیت کے ساتھ زنا، لواطت اور اس قسم کی کھلی بے حیائیاں آگئیں، اور آج فساد سارے کا سارا اسی جذبے کے طور پر ہی لوگوں میں آتا ہے، اکثر و بیشتر لڑائیاں اور آپس میں فساد یہی ہوتا ہے کہ فلاں کسی کی لڑکی اِغوا کر کے لے گیا، فلاں کے فلاں کے ساتھ ناجائز تعلقات تھے، اسی قسم کے جذبات کے تحت اکثر و بیشتر فساد ہوتا ہے، جیسے بعض بزرگوں سے یہ سُنا، وہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر غور کرو گے تو دنیا کے اندر شرارت جتنی بھی ہے اس کے دو ہی شعبے ہیں، یا یہ فساد جاہی ہے یا فساد باہی ہے، یا تو جاہ کی بنا پر لوگ لڑتے ہیں کہ ایک دوسرے سے بڑا بننا چاہتے ہیں، یہ الیکشنوں کے مقابلے اور چوہدراہٹ کے مقابلے یہ سارے جاہی فساد ہے، حُبِّ جاہ کے طور پر مقابلہ ہوتا ہے، کہ ہر شخص چاہتا ہے کہ میں دوسرے سے آگے نکل جاؤں، یا پھر یہ باہ کا فساد ہے، شہوانی جذبے کے ساتھ اپنے مفاد کو حاصل کرنے کے لئے دوسرے کے ساتھ فساد کرتے ہیں، تو فحشاء کے اندر ہر قسم کی بے حیائی آگئی۔ اور المنکر یہ لفظ عام ہے، وہ کام جس کے اوپر انکار کیا گیا ہو، عقلاً، شرعاً، عرفاً جس کو اچھا نہیں سمجھا جاتا وہ منکر کا مصداق ہے، جیسے معروف اس کو کہتے ہیں جو عقل کے نزدیک، دین کے نزدیک اور اچھے معاشرے میں جانی پہچانی چیز ہو، اس کو معروف کہتے ہیں، نیکی کے لئے یہ لفظ بولا جاتا ہے، تو منکر کا لفظ بُرائی کے لئے بولا جاتا ہے، ہر وہ چیز جس کے اوپر عقل انکار کرے، جس کے اوپر شریعت انکار کرے، جس کے اوپر اچھا معاشرہ انکار کرے، شرافت کے ماحول میں جس کو اچھا نہ سمجھا جائے وہ سب منکر ہے، تو یہ عام ہے، اس میں سے خصوصیت کے ساتھ فحشاء کو پہلے ذکر کر دیا، اور ایسے ہی بغی، بغی کا معنی سرکشی، دوسرے کے اوپر ظلم کرنا، جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ طاقت کے بل بوتے پر اپنے مفاد کو حاصل کرنے کی کوشش کرنا، یہ نہ دیکھنا کہ یہ ہمارا حق بھی بنتا ہے یا نہیں بنتا، اس کو بغی اور شرارت کہتے ہیں، زور اور قوت کے ساتھ اپنے مفاد کو حاصل کرنے کی کوشش کرنا اور دوسرے کے حقوق کا خیال نہ کرنا، تو یہ ظلم اور فساد جتنا ہے وہ سب اسی بغی کا نتیجہ ہے۔ ان چیزوں سے اللہ تعالیٰ روکتے ہیں، یَعِظُكُمْ: تمہیں نصیحت کرتے ہیں، لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ: تاکہ تم یاد رکھو، یہ بات بطور نصیحت کے ہے، اگر ان باتوں کو یاد رکھو گے اور ان کے مطابق عمل کرو گے تو تمہاری دنیا اور آخرت آباد ہو جائے گی، اور اگر اس کے خلاف

کرو گے تو دنیا اور آخرت برباد ہوگی، اللہ کی طرف سے یہ نصیحت ہے، زبردستی نہیں، اللہ نے تمہیں اختیار دے دیا اور یہ نصیحت کردی، یاد رکھو گے تو فائدہ اٹھالو گے نہیں یاد رکھو گے تو نقصان اٹھاؤ گے۔

اللہ کے ساتھ عہد کا مفہوم

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ: اور اللہ کے عہد کو پورا کیا کرو جس وقت کہ تم عہد کرلو، ''اللہ سے عہد کرلو'' جس طرح سے نذر مان لی جاتی ہے یا کلمہ پڑھ کے جس وقت اللہ سے عہد کرلیا کہ ہم مطیع اور فرمانبردار ہوں گے، تو سارے کے سارے احکامِ شریعت اس میں آگئے، یہ خصوصیت سے تاکید کی جارہی ہے کیونکہ جس وقت یہ آیات اتر رہی تھیں اس وقت مسلمان کمزور تھے، ان کو برانگیختہ کیا جارہا ہے کہ جو عہد اللہ سے ہوگیا اس کے اوپر پختہ رہنا چاہیے، یہ نہیں کہ کسی مفاد کو نقصان پہنچ رہا ہو تو تم پڑھا ہوا کلمہ چھوڑ کے پھر کُفر کی طرف چلے جاؤ۔ اور بعض مفسرین کے نزدیک اس میں ضمناً یہود کے لئے تنبیہ ہے، کہ اگرچہ یہ آیات مکہ معظمہ کے اندر اتری تھیں لیکن اس وقت یہود بھی اسلام کے خلاف سازشوں میں مشرکین کے ساتھ شریک ہوگئے تھے، کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ یہ نیا دِین جو اُبھر رہا ہے یہ ایک دِن ہمارے لیے خطرہ بن جائے گا، تو در پردہ وہ مشرکین کے ساتھ دلچسپی رکھتے تھے اور اسلام کے خلاف ان کو بہکاتے رہتے تھے، حالانکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنی کتابوں کے اندر عہد کیا ہوا تھا کہ تیرے اَحکام کو بیان کریں گے، ان اَحکام کے اندر یہ بات بھی تھی کہ آنے والے پیغمبر کی پیش گوئی ذکر کریں، اور آنے والے پیغمبر کے اوپر ایمان لانے کی لوگوں کو ترغیب دیں، تو توراۃ وانجیل یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے عہد نامے ہیں جو ان قوموں کے اوپر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلط کئے گئے، اس لیے آج بھی ان کتابوں کو ''عہد نامہ جدید'' اور ''عہد نامہ قدیم'' کے ساتھ ہی تعبیر کیا جاتا ہے، ''توراۃ'' کو ''عہد نامہ قدیم'' کہتے ہیں اور ''اِنجیل'' کو ''عہد نامہ جدید'' کہتے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر یہ کتابیں بطور عہد کے اتری تھیں، ان کو چاہیے کہ اس عہد کو پورا کریں، جو باتیں ان کے اندر لکھی ہوئی ہیں ان کو مانیں، جو پیش گوئیاں ذکر کی گئی ہیں ان کا اظہار کریں، اور عام تاکید بھی ہوگئی تاکہ ایمان لانے والے بھی اس پر پختہ ہوجائیں، کہ جو ایک دفعہ عہد کرلیا اس پر جم جائیں، یہ نہ ہو کہ کسی کا غلبہ دیکھ کے اور کسی کی کمزوری دیکھ کے پھر اپنے عہد سے پھرتے پھریں۔ ''پورا کرو اللہ کے عہد کو جس وقت تم کرتے ہو''۔ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا: اور توڑا نہ کرو قسموں کو ان کے پختہ کرنے کے بعد، قسموں کو پختہ کرنے کے بعد ان کو توڑا نہ کرو، ''حالانکہ اللہ تعالیٰ کو تم اپنے اوپر ضامن بناچکے'' جب قسم کھالی اور اللہ کو اپنے اوپر ضامن بنالیا تو پھر ایسی قسموں کا توڑنا یا ایسے عہد کی خلاف ورزی کرنا مناسب نہیں ہے، ''بے شک اللہ تعالیٰ جانتا ہے ان کاموں کو جو تم کرتے ہو''

عہد کرنے کے بعد اس کو توڑنے کی مذمّت

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا: غزل کہتے ہیں ''سُوت'' کو، یہ ''تاگا'' جو ''کاتا'' جایا کرتا ہے، غزّال کہا کرتے ہیں سُوت بنانے والوں کو۔ قوت سے یہاں سُوت کا مضبوطی کے ساتھ کاتنا مراد ہے، اچھی طرح سے بٹ دے کر جس وقت اس کو بنایا جاتا ہے۔ اَنکاث نِکث کی جمع ہے، نِکث ٹکڑے کو کہتے ہیں۔ ''نہ ہوجاؤ تم اس عورت کی طرح جس نے توڑ دیا اپنے سُوت

کو اس کی قوت کے بعد ٹکڑے ٹکڑے" یعنی یوں سمجھ لیجیے! ایک عورت کاتتی ہے اور کات کے سُوت کو مضبوط کرتی ہے اور جس وقت کام سے فارغ ہوتی ہے تو پھر بیٹھ کے اسے توڑنے لگ جاتی ہے، تو جیسے تم اس عورت کو پاگل سمجھو گے، بے عقل سمجھو گے تو تم بھی پہلے اگر عہد کرلو، قسمیں کھالو، اور معاملات کا ایک تانا بانا بُن لیا، اور بعد میں اپنے مفاد کی خاطر اس کے خلاف کرنے لگ جاؤ گے تو یہ اس پاگل عورت کی طرح ہے، کہ پہلے کاتتے ہو، کاتنے کے بعد پھر اس کو توڑنے لگ جاتے ہو۔ چاہے کوئی متعین ایسی عورت ہو یا نہ ہو، بطور مثال کے کہا جا رہا ہے، لیکن اگر کوئی ایسی پاگل ہوگی تو بات سمجھنی اور بھی زیادہ آسان ہے، کہ مکہ معظمہ میں کوئی ایسی عورت تھی جس کی عقل میں خرابی تھی، وہ سارا دن کاتتی رہتی تھی، جب کات کر فارغ ہوتی تو شام کو اس کو توڑنے لگ جاتی، تو اپنے کیے ہوئے کو برباد کردینے کی یہ ایک مثال ہے کہ اپنے کاتتے ہوئے کو خود ہی توڑ لیا، تو عہد اور پیمان کر کے جو تم ایک بات بناتے ہو، بعد میں اس کی خلاف ورزی کرتے ہو، تو اپنی کوشش پر پانی پھیر لیتے ہو، ایسے نہ کیا کرو، جو تم نے عہد کیا ہے، پیمان کیا ہے، آپس میں قسمیں کھائی ہیں پھر ان پر پکے رہا کرو۔" نہ ہو جاؤ اس عورت کی طرح جو توڑتی ہے اپنے سوت کو اس کی قوت کے بعد ٹکڑے ٹکڑے" تَتَّخِذُوْنَ اَیْمَانَكُمْ دَخَلًۢا بَیْنَكُمْ: بناتے ہو تم اپنی قسموں کو آپس میں فساد کا ذریعہ، دَخَل خرابی کو کہتے ہیں، اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِیَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ: اس سبب سے کہ ایک جماعت وہ زیادہ بڑھنے والی ہے دوسری جماعت سے" ایک جماعت کے ساتھ تم نے ایک عہد کیا، لیکن دیکھا کہ دوسری جماعت زور آور ہے، تو در پردہ اُن کے ساتھ مل گئے اور اِن کے ساتھ کیے ہوئے معاہدے توڑ دیے، اس طرح سے تم کرتے ہو تو تمہاری یہ قسمیں تمہارے لیے فساد کا باعث بن جاتی ہیں۔ اَرْبٰى یہ رَبَا یَرْبُوْ سے ہے، بڑھنا" اس وجہ سے کہ ایک جماعت وہ زیادہ بڑھی ہوئی ہے دوسری جماعت سے" اس وجہ سے تم قسموں کو فساد کا ذریعہ بنالو، یہ کوئی مناسب بات نہیں، جماعتوں کا بڑھنا گھٹنا یہ اللہ کی طرف سے ایک ابتلاء ہے، اللہ تعالیٰ کبھی کسی جماعت کو غلبہ دے دیتے ہیں، کبھی کسی جماعت کو غلبہ دے دیتے ہیں، تو اگر اسی بات کی بنا پر تم آپس میں عہد کو توڑ دو گے کہ کبھی کسی سے مل گئے، کبھی کسی سے مل گئے، دیکھا کہ اب یہ جماعت اقتدار پر آرہی ہے تو اُدھر کو ہو گئے، کل کو وہ کسی دباؤ کے اندر آگئی، اور یہ (دوسری) جماعت ابھرتی جا رہی ہے تو اِدھر کو ہو گئے تو ایسے لوگ دُنیا میں بھی ذلیل ہوتے ہیں، اور کوئی شخص ان پر اعتماد نہیں کرتا، سیاسی پارٹیوں میں اپنی وفاداریاں تبدیل کرنے والے ہمیشہ آپ کے سامنے رہتے ہیں، کہ جو یوں وفاداریاں تبدیل کر لیتے ہیں کہ جو جماعت ذرا قوت میں آتی ہے اس کے اس کے ساتھ مل گئے، جب کسی وجہ سے وہ ابتلاء میں آجاتی ہے تو اس کو چھوڑ کر دوسروں کی طرف ہو گئے، یہ کوئی دنیا کے اندر عزت حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں، لوگوں کی نظر میں بھی انسان ذلیل ہوتا ہے، اس لیے جس کے ساتھ عہد و پیمان کرلو حتی الوسع اسے نبھاؤ۔" بناتے ہو تم اپنی قسموں کو آپس میں فساد کا ذریعہ اس سبب سے کہ ایک جماعت وہ زیادہ بڑھی ہوئی ہے دوسری جماعت سے" اِنَّمَا یَبْلُوْكُمُ اللّٰهُ بِهٖ: ان جماعتوں کے بڑے چھوٹے ہونے کے ساتھ، قوی اور ضعیف ہونے کے ساتھ، یعنی یہ جو جماعتوں کے اندر کوئی بڑھ گئی کوئی گھٹ گئی، اس ذریعے سے اللہ تعالیٰ تمہیں آزماتا ہے، وَلَیُبَیِّنَنَّ لَكُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ: البتہ ضرور بیان کرے گا، واضح کرے گا تمہارے لیے قیامت کے دِن، مَا كُنْتُمْ فِیْهِ تَخْتَلِفُوْنَ: جس چیز میں تم اختلاف کیا کرتے تھے۔ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً: یہ مضمون بہت دفعہ گزر چکا، اس میں بھی اصل میں عمل کی ترغیب دینی مقصود ہوتی ہے کہ اللہ کی طرف سے زبردستی نہیں، اللہ زبردستی کرتا تو سب کو

ایک راستے پر چلا دیتا لیکن تمہیں اختیار دے کر جو چھوڑا ہے تو اپنے اختیار کے ساتھ نیکی کرو گے تو اللہ کے ہاں اجر پاؤ گے، ''اگر اللہ چاہتا تو تمہیں ایک ہی جماعت بنا دیتا لیکن وہ بھٹکاتا ہے جس کو چاہتا ہے اور سیدھے راستے پر چلاتا ہے جس کو چاہتا ہے'' اور اللہ کا چاہنا اس کی حکمت کے مطابق ہے، ''اور البتہ ضرور پوچھے گا وہ ان کاموں کے متعلق جو تم کیا کرتے تھے۔''

قسموں کو فساد کا ذریعہ بنانے کی ممانعت

وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ: نہ بنایا کرو اپنی قسموں کو آپس میں فساد کا ذریعہ، فَتَزِلَّ قَدَمٌۢ بَعْدَ ثُبُوْتِهَا: پھر پھسل جائے گا کوئی قدم اس کے ثابت ہونے کے بعد، وَتَذُوْقُوا السُّوْٓءَ: اور چکھو گے تم بُرائی، بِمَا صَدَدْتُّمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: بسبب اس کے کہ تم نے اللہ کے راستے سے روکا، وَلَكُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ: اور تمہارے لیے عذابِ عظیم ہے، مطلب یہ ہوا کہ اگر تم قسمیں توڑو گے تو ایک بُری رسم پڑ جائے گی، کسی کا قدم پہلے ٹکا ہوا ہوگا تو تمہارے کردار کو دیکھ کے وہ بھی متزلزل ہو جائے گا، جس طرح سے ایک شخص ایمان لاتا ہے گویا کہ اس نے ہدایت کے راستے پر قدم ٹکا لیا، اب یہودی قسمیں کھا کھا کے کہیں کہ یہ دِین وہ نہیں جس کی پیش گوئی کی گئی، یہ کتاب وہ نہیں جس کا ذکر ہماری کتابوں میں ہے، یا یہ رسول سچا رسول نہیں ہے، تو ان کی قسموں کی بنا پر یہ ٹکا ہوا قدم پھسل جائے گا، اگر اس طرح سے کوئی ٹکا ہوا قدم پھسل گیا تو تمہارے اوپر گمراہ کرنے کا وبال بھی آئے گا، ایک تو اپنی بدکرداری کا وبال ہے اور ایک یہ کہ تم جو دوسروں کو حق سے روکنے کا ذریعہ بنے تو اس کا وبال بھی آئے گا۔ اسی طرح اہلِ علم کا مقام ہمیشہ معاشرے میں یہ ہوتا ہے (یاد رکھیے......!) ایک جاہل آدمی کی غلطی اس کی اپنی غلطی ہوتی ہے، اور اس کا نقصان صرف اسی کو پہنچتا ہے وہ متعدی نہیں ہوتی، اور اہلِ علم اگر کسی معاملے کے اندر غلطی کرتے ہیں، غلط بیانی کرتے ہیں، یا غلط کردار اختیار کرتے ہیں تو ان کی طرف دیکھ کے کئی ثابت قدم لوگ پھسل جاتے ہیں، تو پھر ان کے کردار کی وجہ سے ان پر صرف اسی کردار کی ذمہ داری نہیں ہوتی، بلکہ جب یہ دوسروں کے گمراہ ہونے کا باعث بنے تو وہ ذمہ داری بھی ان کے اوپر آتی ہے، اہلِ علم کی یہ ذمہ داری ہمیشہ نمایاں رہی ہے کہ ان کا غلط عمل دوسروں کے لئے گمراہی کا باعث بنتا ہے، اس لئے یہ صرف گمراہ ہونے کے مجرم ہی نہیں ہوتے بلکہ گمراہ کرنے کے مجرم بھی ہوتے ہیں، اسی طرح سے یہود اگر انکار کرتے تھے کہ یہ اللہ کی کتاب صحیح نہیں یا یہ وہ اللہ کے رسول نہیں جن کی پیش گوئی کی ہوئی ہے، تو کئی ثابت قدم پھسل جائیں گے، جب پھسل جائیں گے تو اللہ کے راستے سے روکنے کا وبال بھی آئے گا۔ ''نہ بنایا کرو اپنی قسموں کو آپس میں فساد کا ذریعہ، پھر پھسل جائے گا کوئی قدم اس کے ثابت ہونے کے بعد، اور چکھو گے تم بُرائی بسبب اس کے کہ روکا تم نے اللہ کے راستے سے، اور تمہارے لیے بڑا عذاب ہے''۔ وَلَا تَشْتَرُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا: اوپر تو ذکر کیا تھا کہ جماعتوں کی قوت اور ضعف کی بنا پر وفاداریاں تبدیل نہ کیا کرو، قسمیں توڑا نہ کرو، اب مالی مفاد آ گیا کہ مالی مفاد کے تحت بھی قسم کے خلاف نہ کیا کرو، ''نہ خریدو تم اللہ کے عہد کے خلاف ثمنِ قلیل''، ثمنِ قلیل سے دنیا کا سامان مراد ہے، ''اللہ کے عہد کے مقابلے میں ثمنِ قلیل نہ لیا کرو، جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ بہتر ہے تمہارے لیے اگر تم جانو۔''

اِنسان کے پاس موجود ہر چیز فانی اور اللہ کے پاس ہر چیز باقی ہے

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ: یہ بہتر ہونے کی دلیل دے دی۔ جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ فانی ہے، وہ ختم ہو جائے گا، وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ: اور جو اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے، تو اگر تم دنیوی مفاد کے پیچھے لگ جاؤ گے تو ایک فانی چیز کو لے لو گے، اور اللہ کے پاس جو ثواب ہے باقی رہنے والا، وہ ضائع ہو جائے گا، تو فانی کو لے لینا اور باقی کو چھوڑ دینا یہ کوئی نفع کی تجارت نہیں ہے، مَا عِنْدَكُمْ میں مَا عام ذکر کر دیا، دنیا کی ہر چیز جو ہمارے پاس ہے وہ فانی ہے، یہاں کی کوئی چیز باقی رہنے والی نہیں، مال و دولت باقی رہنے والی چیز نہیں، اور اس کے علاوہ انسان کے جو اپنے حالات ہیں، یہاں کی بھوک باقی رہنے والی نہیں، بھوک لگی، روٹی کھالے تو بھوک ختم ہو گئی، پیٹ بھر لیا تو یہ بھی باقی رہنے والی چیز نہیں، تھوڑی دیر کے بعد وہ بھی ختم ہو جائے گا، دوستی ہو، دشمنی ہو، صحت ہو، جوانی ہو، کوئی چیز ہو دنیا کے اندر، جو بھی انسان کو حاصل ہے وہ زوال پذیر ہے، اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ ملے گا وہ باقی رہنے والا ہے۔ وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْٓا اَجْرَهُمْ: اور البتہ ضرور دیں گے ہم ان لوگوں کو جنہوں نے صبر کیا ان کا اجر، بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ: ان کے بہترین عملوں کے عوض میں، ان کے بہترین عملوں کی وجہ سے ہم ان کو ضرور جزا دیں گے جنہوں نے صبر کیا، صبر کرنے والے وہی ہیں جو اللہ کے راستے میں مشکلات برداشت کرتے ہیں۔

اِیمان اور عملِ صالح کے حامل کے لئے حیاتِ طیبہ

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى: جو کوئی شخص نیک عمل کرتا ہے مذکر ہو یا مؤنث، آدمی ہو یا عورت، جو بھی نیک کام کرے گا بشرطیکہ مؤمن ہو۔ وَهُوَ مُؤْمِنٌ یہ حال ہے اور یہ حال مقامِ شرط میں ہے۔ بشرطیکہ مؤمن ہو یعنی اس کا عقیدہ صحیح ہو، عقیدہ صحیح ہو گا تو نیک عمل کی قدر ہے، اگر عقیدہ صحیح نہیں تو نیک عمل کی قدر نہیں، ''جو بھی کوئی نیک عمل کرے مرد ہو یا عورت حالانکہ وہ مؤمن ہے تو ہم ضرور عطا کریں گے اس کو حیاتِ طیبہ، زندہ رکھیں گے ہم اس کو زندہ رکھنا عمدہ، اس کو حیاتِ طیبہ عطا کریں گے'' یعنی عمدہ زندگی، عمدہ زندگی کا مطلب یہ ہے کہ اطمینان کی زندگی انہیں نصیب ہو گی، دنیا کے اندر رہتے ہوئے حوادثات تو ہوتے ہیں، تکلیفیں بھی پہنچتی رہتی ہیں، لیکن اگر ایمان صحیح ہے اور عمل صالح ہے تو اللہ تعالیٰ قلب کے اندر ایک ایسی قوت پیدا فرما دیتے ہیں کہ اس میں حرص نہیں ہوتا، اس میں آز نہیں ہوتا، اور بے صبری نہیں ہوتی، تو یہ دنیا کے مصائب بھی اس کے حق میں آسان ہو جاتے ہیں، لذیذ ہو جاتے ہیں، زندگی خوشگوار ہو جاتی ہے، تو اطمینان کی زندگی اگر نصیب ہو سکتی ہے تو ایمان اور عمل صالح کے نتیجے میں نصیب ہو سکتی ہے، اور جو ایمان اور عمل صالح سے محروم ہیں اگر دنیا کے اندر وہ بادشاہ بھی بن جائیں، کروڑ پتی بھی ہو جائیں، ان کو ہر قسم کے اسبابِ راحت حاصل بھی ہو جائیں تو بھی ان کے دلوں میں چین نہیں ہوا کرتا، ان کی زندگی پریشانی کی زندگی ہوتی ہے، وہ مزیدار زندگی نہیں ہے۔ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ: اور البتہ ضرور دیں گے ہم ان کو ان کا اجر ان بہترین کاموں کی وجہ سے جو وہ کیا کرتے ہیں۔

قراءتِ قرآن سے پہلے اِستعاذہ کا حکم

فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ: اب یہ نیکیوں کی جو ترغیب دی گئی تو اس نیکی کے راستے سے روکنے کے لئے شیطانی تو تیں آتی ہیں، تو اللہ تعالیٰ ان سے بچنے کا ذریعہ بتاتے ہیں کہ ہر وقت استعاذہ کیا کرو، کیونکہ شیطان ایک ایسا دشمن ہے جو تمہیں نظر نہیں آتا، اس سے بچنے کا طریقہ یہی ہے کہ اللہ کی پناہ میں آؤ، ہر قسم کے نیک کام کرتے وقت اللہ کی پناہ پکڑو تا کہ شیطان اس میں اثر انداز نہ ہو، خصوصیت کے ساتھ قراءتِ قرآن کو ذکر کیا جا رہا ہے، ''جس وقت آپ قرآنِ کریم پڑھنے لگیں تو اِستعاذہ کیجئے'' لفظی معنی تو یوں بنے گا ''جب پڑھیں آپ قرآن تو اللہ کی پناہ پکڑیں'' بظاہر معلوم ہوگا کہ قراءتِ قرآن پہلے ہونا چاہیے اور اِستعاذہ باللہ بعد میں ہونا چاہیے، لیکن ایسا نہیں، بلکہ یہ اذا اردت القراءۃ کے معنی میں ہے، ''جس وقت آپ قرآنِ کریم پڑھنے لگیں تو اللہ تعالیٰ کی پناہ پکڑا کیجئے شیطانِ رجیم سے'' فَاسْتَعِذْ...... عَاذَ يَعُوْذُ مجرد سے ہو یا اِسْتَعَاذَ باب استفعال سے ہو دونوں کا معنی ایک ہی ہے، اس لئے اَعُوْذُ بِاللّٰهِ کہہ لیا جائے تو ٹھیک ہے، اَسْتَعِيْذُ بِاللّٰهِ کہہ لیا جائے تو ٹھیک ہے۔ ''ہدایہ'' میں آپ نے پڑھا ہوگا کہ صاحبِ ہدایہ نے اَسْتَعِيْذُ بِاللّٰهِ کو ترجیح دی ہے تا کہ قرآنِ کریم کے ظاہری الفاظ کے ساتھ بھی مطابقت ہو جائے، دونوں باتیں ایک ہی طرح ہیں، اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ پڑھو، یا، اَسْتَعِيْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ پڑھو، مفہوم دونوں کا ایک ہی ہے۔ زبان سے پڑھنا مستحب ہے یا سُنّت ہے، قلب کے اندر اللہ تعالیٰ پر اعتماد رکھنا اور شیطان سے بچنے کے لئے اللہ کی پناہ اختیار کرنا یہ فرض ہے کہ دھیان اللہ کی طرف رہے، اور زبان سے بھی تعوذ کر لیا جائے یہ سُنّت ہے مستحب ہے۔ حدیث شریف میں بعض مواقع پر سرورِ کائنات ﷺ کا آیاتِ قرآن پڑھنا ثابت ہے اور اس سے پہلے اِستعاذہ نہیں، جیسے آپ نے ''مشکوٰۃ شریف، باب صلوٰۃ اللیل'' میں، میں پڑھا ہوگا یا پڑھیں گے، کہ رسول اللہ ﷺ جس وقت رات کو اُٹھا کرتے تھے تو آلِ عمران کا آخری رکوع تلاوت فرمایا کرتے تھے: ''اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ'' سے ''اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ'' تک، اور بسا اوقات آخر تک، دونوں طرح سے روایات میں آتا ہے، اور وہاں کسی روایت کے اندر بھی شروع میں تعوذ کا ذکر نہیں ہے کہ آپ ﷺ پہلے اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ پڑھتے تھے اور اس کے بعد آیات کی تلاوت کرتے تھے، یہ کسی روایت میں مذکور نہیں، جس کی بنا پر محدثین کہتے ہیں کہ زبان سے تعوذ ادا کرنا واجب نہیں ہے، کہ جب بھی قرآن پڑھیں تو اِستعاذہ ضرور کریں، زبان سے واجب نہیں، سُنّت اور مستحب ہے، باقی! دل میں اللہ تعالیٰ کی طرف خیال رکھنا اور شیطان سے بچنے کے لئے اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرنا یہ ضروری ہے۔

شیطان کا زور کن پر چلتا ہے اور کن پر نہیں؟

اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: بے شک اس کے لئے کوئی زور نہیں ان لوگوں پر جو ایمان لے آتے ہیں اور اپنے رَبّ پر توکل کرتے ہیں، تو گویا کہ شیطان سے بچنے کا ذریعہ یہی ہے کہ ایمان لاؤ اور اللہ کے ساتھ اپنا تعلق مضبوط کرو تو تم شیطان کے حملوں سے بچ جاؤ گے، پھر نیکی میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوگی، اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ: سوائے اس کے نہیں کہ اس کا زور تو انہی لوگوں پر

چلتا ہے، الَّذِيۡنَ يَتَوَلَّوۡنَهٗ: جواس کے ساتھ دوستی لگاتے ہیں، وَالَّذِيۡنَ هُمۡ بِهٖ مُشۡرِكُوۡنَ: بِهٖ کی ضمیر اللہ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں۔ مشرکوں پر، قبر پرستوں پر، بت پرستوں پر اس کا زور بہت چلتا ہے، ان کو کسی نیکی کی طرف نہیں آنے دیتا، ہر بُرائی ان کے لئے آسان ہوجاتی ہے، اور ان کو بہکا بہکا کے وہ بُرائی میں مبتلا کر دیتا ہے۔ تو شرک ایک ایسی چیز ہے جس کے ذریعے سے شیطان اوپر مسلط ہوجاتا ہے، اور شیطانی کاموں کو اچھا سمجھنا! اس کے ساتھ شیطان کا حوصلہ بلند ہوتا ہے، باقی! اللہ کے ساتھ ایمان لاؤ اور اللہ کے اوپر بھروسا رکھو تو شیطان سے تحفظ ہوجاتا ہے، ایسے لوگوں پر شیطان کا کوئی زور نہیں چلتا۔ اِنَّمَا سُلۡطٰنُهٗ: سوائے اس کے نہیں کہ اُس کا زور انہی لوگوں پر ہے جو اس شیطان سے دوستی لگاتے ہیں، وَالَّذِيۡنَ هُمۡ بِهٖ مُشۡرِكُوۡنَ: اور وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرانے والے ہیں۔

سُبۡحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمۡدِكَ اَشۡهَدُ اَنۡ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنۡتَ اَسۡتَغۡفِرُكَ وَاَتُوۡبُ اِلَيۡكَ

وَاِذَا بَدَّلۡنَآ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ ۙ وَّاللّٰهُ اَعۡلَمُ بِمَا

اور جب ہم ایک آیت کے بدلے میں کوئی دُوسری آیت اس کی جگہ لے آتے ہیں، اور جو کچھ اللہ اُتارتا ہے اس کی مصلحت کو اللہ

يُنَزِّلُ قَالُوۡۤا اِنَّمَاۤ اَنۡتَ مُفۡتَرٍ ؕ بَلۡ اَكۡثَرُهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۰۱﴾

خوب جانتا ہے، تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ تو جھوٹی باتیں گھڑنے والا ہے بلکہ ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں ﴿۱۰۱﴾

قُلۡ نَزَّلَهٗ رُوۡحُ الۡقُدُسِ مِنۡ رَّبِّكَ بِالۡحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا

آپ انہیں کہہ دیجئے اُتارا اس کو رُوح القدس نے آپ کے رَبّ کی طرف سے حق کے ساتھ مؤمنوں کو جمانے کے واسطے

وَهُدًى وَّبُشۡرٰى لِلۡمُسۡلِمِيۡنَ ﴿۱۰۲﴾ وَلَقَدۡ نَعۡلَمُ اَنَّهُمۡ يَقُوۡلُوۡنَ اِنَّمَا

اور ہدایت کے واسطے اور مسلمانوں کے لئے بشارت کے واسطے ﴿۱۰۲﴾ ہم خوب جانتے ہیں کہ یہ مشرکین کہتے ہیں کہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ

يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ؕ لِسَانُ الَّذِىۡ يُلۡحِدُوۡنَ اِلَيۡهِ اَعۡجَمِىٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِىٌّ مُّبِيۡنٌ ﴿۱۰۳﴾ اِنَّ

اس کو کوئی انسان سکھاتا ہے، زبان اس شخص کی جس کی طرف منسوب کرتے ہیں عجمی ہے اور یہ زبان واضح عربی ہے ﴿۱۰۳﴾ بے شک

الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۙ لَا يَهۡدِيۡهِمُ اللّٰهُ وَلَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ﴿۱۰۴﴾ اِنَّمَا

جو لوگ اللہ کی آیات پر ایمان نہیں لاتے اللہ انہیں ہدایت نہیں دیتا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے ﴿۱۰۴﴾ اس کے سوا کچھ نہیں کہ

يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَاذِبُونَ ﴿١٠٥﴾ مَن كَفَرَ

جھوٹ بولتے وہی لوگ جو اللہ کی آیات پر ایمان نہیں لاتے اور یہی لوگ کامل درجے کے جھوٹے ہیں ﴿۱۰۵﴾ جو شخص اللہ کے ساتھ

بِاللَّهِ مِن بَعْدِ إِيمَانِهِ إِلَّا مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ وَلَٰكِن مَّن

کُفر کرے اپنے ایمان لانے کے بعد، مگر وہ شخص جو مجبور کر دیا جائے اور حال یہ ہے کہ اس کا دِل ایمان پر مطمئن ہے، لیکن جو کوئی

شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللَّهِ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿١٠٦﴾ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمُ

شخص دِل کھول کے کُفر کرلے ان کے اُوپر اللہ کا غضب ہے اور ان کے لئے بہت بڑا عذاب ہے ﴿۱۰۶﴾ یہ اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے

اسْتَحَبُّوا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا عَلَى الْآخِرَةِ وَأَنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ﴿١٠٧﴾ أُولَٰئِكَ

پسند کیا دُنیوی زندگی کو آخرت کے مقابلے میں، اور اس سبب سے ہے کہ اللہ تعالیٰ کافر لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا ﴿۱۰۷﴾ یہی لوگ ہیں

الَّذِينَ طَبَعَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ ﴿١٠٨﴾ لَا جَرَمَ

کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر مہر لگادی اور یہی لوگ بے خبر ہیں ﴿۱۰۸﴾ پکی بات ہے کہ

أَنَّهُمْ فِي الْآخِرَةِ هُمُ الْخَاسِرُونَ ﴿١٠٩﴾ ثُمَّ إِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِينَ هَاجَرُوا مِن بَعْدِ مَا

یہی لوگ آخرت میں خسارہ اُٹھانے والے ہوں گے ﴿۱۰۹﴾ پھر بے شک تیرا رَبّ ان لوگوں کے لئے جو ہجرت کرتے ہیں بعد اس کے کہ وہ مصیبتوں

فُتِنُوا ثُمَّ جَاهَدُوا وَصَبَرُوا إِنَّ رَبَّكَ مِن بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١١٠﴾

میں ڈال دیے گئے پھر انہوں نے جہاد کیا اور ہر مصیبت کو برداشت کیا بے شک تیرا رَبّ ان اعمال کے بعد البتہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ﴿۱۱۰﴾

تفسیر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۔ وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ: اور جس وقت بدل دیتے ہیں ہم ایک آیت کسی اور آیت کی جگہ، اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ یہ تکرارِ نکرہ کا ہے، اور آپ نے اُصول کے اندر یہ بات پڑھی ہے کہ ''اَلنَّكِرَةُ اِذَا اُعِيْدَتْ نَكِرَةً فَالثَّانِيَةُ غَيْرُ الْاُوْلٰى'': تو ثانی کا مصداق اور ہوتا ہے، اُولیٰ کا مصداق اور ہوتا ہے، ''جب ہم ایک آیت کی جگہ کوئی دوسری آیت لے آتے ہیں، ایک آیت کے بدلے میں کوئی دوسری آیت اس کی جگہ لے آتے ہیں''، وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ: واللہ اعلم بمصلحۃ ما ینزل: جو کچھ اللہ اُتارتا ہے اس کی مصلحت، اس کی حکمت کو اللہ خوب جانتا ہے، قَالُوْٓا: یہ اِذَا کا جواب ہے۔ جب ہم بدلتے ہیں تو یہ لوگ کہتے ہیں،

اِنَّمَآ اَنْتَ مُفْتَرٍ: مُفْتَرٍ: مفتری، اِفترا کرنے والا، جھوٹ بولنے والا۔ "یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ تو جھوٹی باتیں گھڑنے والا ہے" بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ: یہ اللہ کا رسول تو مفتری نہیں، جھوٹ گھڑنے والا نہیں، بلکہ ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں، بے علم ہیں۔

ماقبل سے ربط

پچھلے رکوع کے آخر میں شیطانِ رجیم سے بچنے کے لئے اللہ کے ساتھ پناہ پکڑنے کا تذکرہ تھا، شیطان مختلف قسم کے وسوسے لوگوں کے دلوں میں ڈالتا ہے اوران کو گمراہی کی طرف لاتا ہے، توان میں سے ایک وسوسہ یہاں مذکور ہے۔

یہود اور مشرکین کی طرف سے نسخ کی وجہ سے کلام اللہ پر اِعتراض

حاصل اس کا یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی حکمت کے ساتھ انسانوں کو مکلف بنایا ہے اوران کے اوپر کچھ اَحکام اُتارے ہیں، وقت کے ساتھ ساتھ اللہ کی مصلحت اور حکمت کے تحت ان اَحکام میں کچھ تبدیلی بھی ہوتی ہے، آدم علیہ السلام کا دور ابتدائی دور تھا، اُس میں اس وقت کے مناسب اَحکام دیے گئے، بعد میں جیسے جیسے انبیاء علیہم السلام آئے پچھلے اَحکام میں سے کچھ باقی رہے کچھ بدلتے چلے گئے، اس کو نسخ کہتے ہیں، اوراس نسخ کا مفصل تذکرہ آپ کے سامنے سورۂ بقرہ میں آچکا ہے، مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا (آیت:۱۰۶) اس آیت میں نسخ کا تذکرہ ہوا تھا۔ تو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر جب یہ کتاب اُتری تو اس میں بھی یہی بات تھی، کچھ پہلی شریعتوں کے اَحکام کو منسوخ کیا گیا، اور ایسا بھی ہوا کہ اِس کتاب کے اندر بعض اَحکام اُترے، کچھ وقت کے بعد انہی کو منسوخ کردیا گیا، تو یہود نے یہ وسوسہ پھیلایا اور مشرکین نے اس وسوسے کو قبول کیا، بات اصل میں اہلِ کتاب کی طرف سے چلتی تھی اور مشرکین بھی اس بات کو آگے مشہور کرتے تھے جو اپنی طبیعت کے مطابق ہوتی سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے رَدّ کرنے کے لئے، آپ کی تردید کے لئے۔ تو یہ وسوسہ انہوں نے پھیلایا کہ اگر یہ اللہ کی کلام ہوتی تو پھراس میں یہ تبدیلی کیوں ہوتی ہے کہ پہلے کچھ کہہ دیا، بعد میں اس میں تبدیلی کردی اوراس حکم کو بدل دیا، یایوں کہہ لیجئے کہ اُدھر تو یہ کتاب اعلان کرتی ہے کہ پہلی کتابیں تورات وانجیل وہ بھی اللہ کی کلام تھی، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت، موسیٰ علیہ السلام کی شریعت، یہ بھی منجانب اللہ تھیں، اور اُدھر اس میں تغیر وتبدل بھی کیا جارہا ہے، کہ موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے بعضے اَحکام چھوڑے جارہے ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے بعضے اَحکام چھوڑے جارہے ہیں، اوران کے خلاف دوسری باتیں آرہی ہیں، معلوم ہوتا ہے یہ شخص جھوٹ بولتا ہے، اگر یہ اللہ کی باتیں ہوتیں تو یہ اٹل ہوتیں، ایک دفعہ جو بات کہہ دی جائے اس میں تبدیلی نہ آئے، اس وسوسے کا حاصل یہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب اور مثال سے وضاحت

اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس کا ازالہ کیا گیا، وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ: جو کچھ اللہ اُتارتا ہے اس کی حکمت اور مصلحت کو اللہ خوب جانتا ہے، اوراپنی حکمت اور مصلحت کے مطابق ہی اپنی اُتاری ہوئی چیز کا ایک وقت معین کرتا ہے، چاہے وہ انسانوں کو نہ

بتائے، اس کے علم میں ہوتا ہے کہ اتنی دیر کے لئے یہ حکم دیا جا رہا ہے، جب وہ حالات بدل جائیں گے اس کے بعد نیا حکم دے دیا جاتا ہے، تو یہ اللہ کے علم کے مطابق ہے، تو یہ تبدیلی کسی عجز کی وجہ سے یا علم کی کمی کی وجہ سے نہیں، بلکہ یہ علم وحکمت کا تقاضا ہے۔ اس کو سمجھنے کے لئے ہمیشہ آپ کے سامنے مثال بیان کی جاتی ہے کہ جیسے طبیب ایک مریض کے لئے نسخہ تجویز کرتا ہے، اور ایک ہفتے کے بعد مریض کی حالت کو دیکھ کر نسخہ تبدیل کر دیتا ہے، اب یہ نسخے کی تبدیلی طبیب کی جہالت کی علامت نہیں، کہ اس کو پہلے پتا نہیں چلا کہ کیا مرض تھی اور کیا دوا ہونی چاہیے تھی، بلکہ یہ نسخے کی تبدیلی اس کے علم وفن کا تقاضا ہے، کہ پہلے مریض کی جو حالت تھی اس کے مطابق نسخہ دیا، اب اگر یہ شخص ماہر نہ ہوتا تو آخر تک اسی کو رگڑے جاتا، لیکن اگر یہ شخص اپنے فن کے اندر ماہر ہے، مریض کی حالت کو سمجھتا ہے، ادویات کی خاصیات کو جانتا ہے، تو جیسے جیسے مریض کے حال میں تغیر آتا چلا جائے گا ویسے ویسے یہ اپنے نسخے کو بدلتا چلا جائے گا، یہ نسخے کی تبدیلی علم طب کا تقاضا ہے نہ کہ جہالت، اسی طرح سے انسانوں کے احوال کے ساتھ ساتھ شرائع کی تبدیلی، اَحکام کے اندر نسخ اور نئے اَحکام کا آنا یہ علم وحکمت کا تقاضا ہے، نہ یہ کہ اس کو جہالت کی دلیل بنالیا جائے، کہ کیا پہلے پتا نہیں تھا کہ یہ بدلنا پڑے گا اور یہ ٹھیک نہیں، اور بعد میں تبدیلی کر دی، یہ اعتراض جاہلانہ ہے، ورنہ نسخ اور نئے اَحکام کا آنا، پچھلے اَحکام کا منسوخ ہونا، یہ سب علم وحکمت کا تقاضا ہے، جیسے جیسے دنیا کے حالات بدلے، جس طرح سے انسانیت نے ترقی کی اس کے مطابق اَحکام اللہ تبارک وتعالیٰ اتارتے چلے گئے۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ کے اندر یہی بات ہے۔ ''جب ہم کوئی آیت اتارتے ہیں کسی دوسری آیت کے بدلے میں تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ تو جھوٹ بولنے والا ہے'' اگر یہ اللہ کی کلام ہوتی یا یہ احکام اللہ کی جانب سے ہوتے تو پھر یہ بدلتے کیوں؟ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ: بَلْ کے اندر اس مضمون کا انکار کر دیا گیا، کہ اللہ کا رسول مفتری نہیں، یہ تو بالکل حق اور سچ کہتا ہے، لیکن اِن میں سے اکثر لوگ یہ جانتے نہیں ہیں، بے علم ہیں، اس لیے اس تبدیلی کی حکمت کو سمجھتے نہیں، اگر یہ تبدیلی کی حکمت کو سمجھتے تو رسول کی طرف جھوٹ بولنے کی نسبت نہ کرتے۔

قرآنِ کریم کی حقّانیت اور اس کے نزول کا مقاصد

آپ انہیں کہہ دیجئے نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ: میرا یہ اِفترا کیا ہوا نہیں ہے (کلام کا حاصل یہ ہے) میرا یہ بنایا ہوا نہیں بلکہ اس کلام کو اتارا روح القدس نے تیرے رَبّ کی طرف سے حق کے ساتھ، مصلحت کے ساتھ، حکمت کے ساتھ (حق کا مفہوم اسی طرح سے ہے) حق کے ساتھ اُتارا جس میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ اُتارا کس لئے؟ لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ: تثبیت: جما دینا، پختہ کر دینا، ثابت کرنا۔ اور لام کے بعد اَن مقدر ہوتا ہے، اور مضارع کے اوپر ''اَن'' آجائے تو اس کو مصدر کی تاویل میں کر دیتا ہے، اس لیے لِيُثَبِّتَ، لِتَثْبِيْتَ کے معنی میں ہے، تو اسی کے اوپر عطف ہے ہدیٰ اور بشریٰ کا، اور ہدیٰ اور بشریٰ کو اگر فعل کے عنوان میں لانا ہو تو معنی یوں بن جائے گا لِيُثَبِّتَ، لِيَهْدِيَ، لِيُبَشِّرَ - یا- لِلتَّثْبِيْتِ، لِلْهِدَايَةِ، لِلْبُشْرٰى۔ بات ایک ہی ہے، چونکہ يُثَبِّتَ مصدر کی تاویل میں ہے۔ ''اتارا اس کو روح القدس نے تیرے رَبّ کی طرف سے حق کے ساتھ تاکہ جمائے، تاکہ ثابت کرے ان لوگوں کو جو ایمان لے آئے، اور تاکہ ان کو ہدایت دے، اور تاکہ ان کو بشارت

دے“ یہ فعل کے طور پر ترجمہ ہوگیا۔اور ”مسلمانوں کے لئے بشارت کے واسطے، ہدایت کے واسطے اور مؤمنوں کو جمانے کے واسطے روح القدس نے اس کلام کو تیرے رَبّ کی طرف سے اتارا“ یہ مصدر کے طور پر ترجمہ ہوگیا۔اور لِلْمُسْلِمِیْنَ کی قید کے متعلق آپ کے سامنے ہمیشہ بات ہوتی رہتا ہے کہ چونکہ انتفاع اسی قسم کے لوگ کرتے ہیں جو مطیع اور فرمانبردار ہیں، اس لیے عنوان میں ان کو لے لیا جاتا ہے۔

قرآنِ کریم کے بارے میں مشرکین کا شیطانی پروپیگنڈا

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ یَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا یُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ؕ لِسَانُ الَّذِیْ یُلْحِدُوْنَ اِلَیْهِ اَعْجَمِیٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِیٌّ مُّبِیْنٌ...... :وَلَقَدْ نَعْلَمُ: ہم خوب جانتے ہیں، اَنَّهُمْ یَقُوْلُوْنَ: کہ یہ مشرکین کہتے ہیں، اِنَّمَا یُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ: سوائے اس کے نہیں کہ اس کو ایک انسان سکھاتا ہے، کوئی بشر سکھاتا ہے، بشر نکرہ ہے۔”اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس کو کوئی انسان سکھاتا ہے“ لِسَانُ الَّذِیْ یُلْحِدُوْنَ اِلَیْهِ اَعْجَمِیٌّ: زبان اس شخص کی جس کی طرف منسوب کرتے ہیں عجمی ہے، غیر عربی ہے، وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِیٌّ مُّبِیْنٌ: اور یہ زبان واضح عربی ہے۔اس میں بھی ایک شیطانی پروپیگنڈے کا ازالہ کیا گیا ہے، مکہ معظمہ میں بعض حضرات ایمان لے آئے تھے اور ان میں بعضے غلام ایسے بھی تھے جو غیر عربی تھی، سرورِ کائنات ﷺ ان کے پاس اٹھتے بیٹھتے، ان کے ساتھ محبت کا معاملہ کرتے، تو بات بنانے والوں نے بات بنالی کہ فلاں شخص کا جو فلاں غلام ہے وہ چونکہ دوسرے ملک کا رہنے والا ہے اور اس کو کچھ علم کی باتوں سے مناسبت ہے، تو یہ جو اس کے پاس اُٹھتے بیٹھتے ہیں تو یہ باتیں اِن کو وہ سکھاتا ہے، نکرہ کے طور پر اس کو ذکر کردیا، اور یہ بات میں نے بہت دفعہ آپ کے سامنے ذکر کی ہے کہ جس ماحول میں بات ہورہی ہوتی ہے اس قسم کے اشارے وہ لوگ سمجھا کرتے ہیں، جب وہاں مکہ معظمہ کی گلیوں میں پروپیگنڈا یہی ہوگا کہ یہ فلاں کے پاس بیٹھتے ہیں اور وہ ان کو سکھاتا ہے، تو جس وقت قرآنِ کریم بشر کے عنوان سے ذکر کرے گا تو فوراً سمجھ جائیں گے کہ یہ اشارہ اسی شخص کی طرف ہے، اب ہمارے لیے تو اس میں اجمال آگیا کہ اس بشر سے کون بشر مراد ہے؟ (بات سمجھ میں آرہی ہے یا نہیں آرہی؟)”اس کو فلاں شخص بہکاتا ہے“ جب یوں ہم بولیں گے تو جس شخص کے متعلق پروپیگنڈا ہوگا کہ یہ شخص اُس کی انگلی پہ ناچتا ہے، تو جب کہا جائے گا کہ ”یہ شخص فلاں کے اشارے پہ کام کرتا ہے، فلاں کے اشارے پہ ناچتا ہے، ہم جانتے ہیں کہ کون انسان اِس کو بہکاتا ہے“ تو یہ لفظ جب استعمال کیا جائے گا تو جس ماحول کے اندر پروپیگنڈا ہوتا ہے فوراً ذہن اُدھر منتقل ہوجاتا ہے، اور وہی لکھی ہوئی بات، اور وہی مثال کے طور پر ریکارڈ میں آئی ہوئی بات اگر بعد میں کوئی سنے گا جو اُس ماحول سے واقف نہیں، تو اس کے لئے یہ اشارہ سمجھنا مشکل ہوگا، کہ اِس انسان سے کون انسان مراد ہے؟، لیکن جن کے ساتھ بات کی جارہی ہے ان کے لئے اس میں کوئی ابہام نہیں ہے۔(بات سمجھے؟) اسی طرح سے یہاں بشر کی تعیین اگرچہ ہمارے سامنے نہیں کہ اس بشر سے کون بشر مراد ہے؟ تعیین کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی جاسکتی، کوئی ہو، کسے باشد، لیکن وہ لوگ سمجھتے تھے کہ اس کا مصداق کون ہے؟ جدھر انگلی اٹھاتے تھے کہ فلاں شخص اس کو سکھاتا ہے جس کی بنا پر یہ اس قسم کی باتیں کرتا ہے، یعنی اتنا تو وہ بھی

جانتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ جیسی باتیں ہمارے سامنے نقل کر رہے ہیں، گزری ہوئی اقوام کے حالات ہمیں سنا رہے ہیں، تو یہ پڑھے ہوئے تو ہیں نہیں، انہوں نے کسی کتاب میں نہیں پڑھا، کسی مدرسے میں داخل نہیں رہے، اہلِ علم کی مجلس میں نہیں رہے، اتنا تو وہ جانتے تھے کہ یہ از خود یہ باتیں نہیں کر سکتا، اب سیدھی بات تو یہ تھی کہ وہ مان لیتے کہ یہ تعلیم ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی جاری ہے، تو بات ہی ٹھیک ہو جاتی، لیکن وہ یہ ماننے کے لئے بھی تیار نہیں تھے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے اوپر کتاب اترتی ہے تو اب دو باتوں میں جوڑ کس طرح سے لگائیں، کہ یہ باتیں جو کرتے ہیں از خود تو کر نہیں سکتے، کتابیں انہوں نے نہیں پڑھیں، اور یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ اللہ کی طرف سے اترتی ہے، بس بات بنانے کے لئے کہہ دیا کہ ہاں! فلاں شخص کے پاس جو بیٹھتے ہیں اور وہ قصے کہانیوں کی کتابیں پڑھتا رہتا ہے، یا پرانی کتابوں سے واقفیت رکھتا ہے، یا وہ دوسرے ملک کا رہنے والا ہے، اس لیے وہاں کے حالات وغیرہ اِن کو بتاتا رہتا ہے، وہ انہیں سکھاتا ہے، یہ پٹی وہ پڑھاتا ہے، اور یہ آگے اس کو بیان کرتے رہتے ہیں۔

پروپیگنڈے کا رَدّ!

تو یہ ایک شیطانی پروپیگنڈا تھا جو انہوں نے کیا، اور سرورِ کائنات ﷺ کو اس قسم کی بات سے یقیناً تکلیف ہوتی ہوگی، تو اللہ تعالیٰ اس کا ازالہ کرتے ہیں کہ ہمیں پتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اس کو فلاں شخص پڑھاتا ہے لیکن ان لوگوں کو اتنی عقل نہیں، یہ اتنی سمجھ سے کام نہیں لیتے کہ قرآنِ کریم کی دو حیثیتیں ہیں، ایک اس کی معنوی حیثیت ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے علم وحکمت کے خزانے بھر دیے اور ایک اس کی لفظی حیثیت ہے، اگر یہ معنوی مضامین کا ادراک نہیں کر سکتے کہ کیا اس قسم کا ایک لوہار مزدور غلام اس قسم کے علم وحکمت کے خزانے کیسے لوٹا سکتا ہے، اگر یہ معنوی ادراک نہیں کر سکتے، تو کم از کم اتنا نہیں دیکھتے کہ جس شخص کی طرف یہ نسبت کرتے ہیں اس کو تو سیدھی طرح عربی بولنی بھی نہیں آتی، وہ تو ایک عجمی آدمی ہے جو سیدھی طرح سے عربی بولنی بھی نہیں جانتا، اور یہ قرآنِ کریم لسان عربی اور واضح، اور فصاحت و بلاغت کی اِنتہا کو پہنچی ہوئی، کہ جس کا مقابلہ کرنے کے لئے ان کے بڑے بڑے فصحاء، بلغاء، بڑے بڑے خطباء عاجز آ گئے، تو یہ لفظی حیثیت میں بھی فرق نہیں کر سکتے؟ کہ ایک عجمی آدمی اس قسم کی کلام کیسے سکھا سکتا ہے کہ جس کے سامنے سارے کے سارے عربی عاجز آ جائیں، اگر یہ معنوی حیثیت کا ادراک نہیں کر سکتے تو کیا اس لفظی حیثیت کو دیکھ کے نہیں سمجھ سکتے؟ کہ یہ کتنی غلط بات ہے جو یہ کر رہے ہیں۔ لِسَانُ الَّذِیْ یُلْحِدُوْنَ اِلَیْهِ اَعْجَمِیٌّ: جس کی طرف منسوب کرتے ہیں اس کی زبان تو عجمی ہے، وہ تو سیدھی طرح سے عربی بولنا بھی نہیں جانتا، اگر عربی بولے بھی تو کوئی جگہ غلطی کرتا ہوگا جس طرح سے عجمی جس وقت عربی بولتے ہیں تو ایسے ہی ہوتا ہے جیسے پٹھان اُردو بولتے ہیں، آپ نے دیکھا ہوگا نا؟ پٹھان اگر بیس سال بھی (اردو ماحول میں) گزار لیں جس وقت وہ اُردو بولیں گے تو فوراً پہچانا جاتا ہے کہ یہ پٹھان ہے، مذکر مؤنث کی تمیز نہیں ہوتی، اور اسی طرح سے جب غیر عربی عربی بولتے ہیں تو وہاں بھی اسی طرح سے گڑبڑ ہوتی ہے۔ اس دفعہ مسجدِ نبوی میں بیٹھے تھے، تو وہاں ایک ہمارے دوست ہیں قاری بشیر صاحب، وہ کہنے لگے کہ پچھلے دنوں میں مودودی صاحب تشریف لائے، تو ایک مجلس میں بیٹھے ہوئے ایک شخص نے مودودی صاحب سے سوال کیا: مَتٰی جِئْتُمْ؟ آپ کب تشریف لائے؟ کہتے ہیں مودودی صاحب کہنے لگے: جِئْتُ غَدًا۔

''جِئْتُ غَدًا'' کا معنی سمجھے؟ آئے تو تھے وہ کل گزشتہ، کہنا تو تھا ''جئتُ آمِسِ'' کہ میں کل آیا تھا، اور وہ کہتے ہیں: جِئْتُ غَدًا، اور ''غَدًا'' ہوتا ہے اگلا دِن، کہ کل جو آئندہ ہے میں اس میں آیا۔ یعنی عجمی آدمی جس وقت گفتگو کرے، عالم فاضل ہو، تو بھی اس کی وہ حیثیت نہیں ہوتی۔ اور پھر ایک آدمی جس کا کوئی علمی پیشہ نہیں ہے اور وہ محنت مزدوری کرتا ہے، دوسرے کا غلام ہے، غلاموں جیسی زندگی گزار رہا ہے تو وہ اس درجے کی عربی بولے کہ جس کے سامنے فصحاء بلغاء عاجز آجائیں، یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ تو یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جس طرح سے ہمارے ایک بزرگ نے لکھا کہ جو شخص منہ کے تھوک کی اُڑائی ہوئی چھینٹوں میں اور بارش میں فرق نہ کر سکے وہ تو یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ کلام فلاں کی سکھائی ہوئی ہے، کہاں تھوک کی اُڑائی ہوئی چھینٹیں اور کہاں آسمان کی طرف سے برسنے والی بارش، دونوں کے درمیان میں اتنا فرق ہے، کہ ایک عجمی کی کلام تو ایسی ہی ہے جیسے کوئی شخص منہ سے تھوک کی چھینٹیں اُڑاتا ہے اور یہ قرآنِ کریم کی عربی ایسے ہے جیسے آسمان سے موسلا دھار بارش ہوتی ہے، جو شخص منہ سے تھوک کی اُڑائی ہوئی چھینٹوں کے درمیان اور بارش کے درمیان فرق نہ کر سکے وہی اس قسم کی بات کہہ سکتا ہے کہ یہ کسی عجمی کا پڑھایا ہوا ہے، یہ عجمی کا سکھایا ہوا ہے، ورنہ دونوں میں کیا نسبت ہے؟ تو لفظی حیثیت کو سامنے رکھ کر ہی گویا کہ اس شیطانی پروپیگنڈے کا ازالہ کر دیا گیا۔

اللہ تعالیٰ کن لوگوں سے ہدایت کو سلب کرتے ہیں؟

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۙ لَا يَهْدِيْهِمُ اللّٰهُ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ: بے شک جو لوگ اللہ کی آیات پر ایمان نہیں لاتے اللہ انہیں ہدایت نہیں دیتا۔ ان کا ایمان نہ لانا، ایمان لانے کا قصد نہ کرنا یہ سبب بن جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سلبِ ہدایت کر دیتا ہے کہ ایسے شخص کو ہدایت نصیب نہیں ہوتی، اللہ انہیں ہدایت نہیں دیتا، چونکہ انہوں نے ارادہ ہی کر رکھا ہے کہ ہم نے ماننا نہیں ہے، تو کتنے واضح دلائل کیوں نہ آجائیں وہ مانتے نہیں، تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ارادے پر فعل کی تخلیق ہوجایا کرتی ہے، آپ جس قسم کا ارادہ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ویسی کیفیت اور ویسا فعل پیدا ہوجاتا ہے، جب ہدایت حاصل کرنا تمہارا مقصود ہی نہیں تو اللہ تعالیٰ زبردستی ہدایت دیتا بھی نہیں، وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ: ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ اِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ: یہ اللہ کا رسول جھوٹ نہیں بولتا، جس طرح سے قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مُفْتَرٍ کے اندر آیا، اللہ کا رسول جھوٹ نہیں بولتا، ''اس کے سوا کچھ نہیں کہ جھوٹ بولتے ہیں وہی لوگ جو اللہ کی آیات پر ایمان نہیں لاتے'' وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ: یہی لوگ کامل درجے کے جھوٹے ہیں۔

ایمان لانے کے بعد مرتد ہونے کا انجام اور استثنائی صورت

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ: اس میں ایمان اختیار کر لینے کے بعد کفر اختیار کرنا یعنی ارتداد، مرتد ہوجانے کے اوپر وعید ہے، اور اس موقع محل میں اس کو اس لیے ذکر کیا جا رہا ہے کہ پچھلی آیات میں شیطانی باتوں کا ذکر تھا، کبھی وہ نسخ کو دلیل بنا کر قرآنِ کریم کے خلاف باتیں

پھیلاتے ہیں، کبھی اس قسم کی باتیں کرتے ہیں کہ فلاں کا سکھایا ہوا ہے، فلاں سے پڑھ پڑھ کے آتا ہے، تو ان باتوں سے کوئی شخص کسی شبہ میں مبتلا نہ ہو جائے، تو یہ تاکید کی جارہی ہے خاص طور پر اہل ایمان کو، کہ دیکھو! روشنی قبول کر کے پھر اندھیرے کی طرف بھاگنا یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت شدید جرم ہے، کہ ایک شخص ابتداء سے کافر ہو اور وہ کفر پر رہے یہ بھی برا ہے، لیکن اگر کوئی شخص ایمان لے آئے اور ایمان لانے کے بعد پھر کفر کی طرف چلا جائے تو یہ پہلے سے بھی زیادہ برا ہے، اس لیے دیکھنا! کہیں اس قسم کی باتوں سے متأثر ہو کر کسی کے دل کے اندر کوئی خلجان نہ آئے، کہ ایمان کے بعد کفر کی طرف واقع ہو جائے، نہ تو اس قسم کی باتوں سے متأثر ہونا چاہیے اور نہ کسی کے زور اور زبردستی کے ساتھ متأثر ہونا چاہیے، اگر کوئی ایسا کرے گا اور دل سے مرتد ہو گیا، دل میں کفر آ گیا، تو ایسے شخص کے لئے سخت عذاب ہے، ہاں ایسا ہو سکتا ہے کہ کسی نے کوئی شدید قسم کی دھمکی دی جیسے یہ کہ کفر کرو، ورنہ ہم تمہیں قتل کر دیں گے، جس کو ہم اکراہِ ملجی کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں، فقہ کے اندر آپ پڑھیں گے کہ اکراہ کے دو درجے ہوا کرتے ہیں، ایک اکراہِ ملجی، ایک اکراہ غیر ملجی، اکراہ ملجی کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اتنا مجبور کر دیا گیا کہ جس کے بعد انسان مسلوب الاختیار ہو گیا، اور اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ کسی دھمکی دینے والے نے ایسی دھمکی دے دی کہ یا تجھے ہم قتل کر دیں گے یا تیرا کوئی عضو کاٹ دیں گے، اور وہ دھمکی دینے والا ایسا کرنے پر قادر بھی ہے، اور وہ انسان سمجھتا ہے کہ اگر میں نے ایسا نہ کیا تو یہ مجھے قتل کر دے گا یا میرا عضو کاٹ دے گا، تو اس کو کہتے ہیں اکراہِ ملجی، اس پر انسان کا اختیار ایک درجے میں سلب ہو جاتا ہے، رضا تو بالکل نہیں رہتی، تو ایسی صورت میں اگر کوئی شخص اپنی زبان سے اپنی جان بچانے کے لئے کلمۂ کفر کہہ دے تو اجازت ہے، نہ کہنا عزیمت ہے، نہ کہے اور اسی طرح سے مر جائے تو شہید ہے، لیکن اگر دل میں عقیدہ ٹھیک ہو اور اپنی جان بچانے کے لئے کفر کا لفظ اگر زبان سے بول دیتا ہے تو ایسی صورت میں شریعت نے اجازت دی ہے، اکراہ کی صورت میں کلمۂ شرک زبان سے ادا کر دیا جائے تو اس کی اجازت ہے بشرطیکہ قلب مطمئن رہے، اور اگر اس قسم کے حالات میں آ کے دل بھی بدل گیا، عقیدہ بھی بدل گیا، تو یہ ارتداد ہے، پھر اس کے لئے سخت وعید ہے۔ تو یہاں یہی بات ذکر کی جارہی ہے، مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ: جو شخص اللہ کے ساتھ کفر کرے اپنے ایمان لے آنے کے بعد۔ اس کا جواب آگے آئے گا، درمیان میں یہ استثناء ہے اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ: مگر وہ شخص جو مجبور کر دیا جائے، جس پر زبردستی ہو جائے، اور حال یہ ہے کہ اس کا دل ایمان پر مطمئن ہے، اس کو اِلَّا کے ساتھ مستثنیٰ کر لیا ہے، اس کی یہ سزا نہیں جو آگے ذکر کی جارہی ہے، وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا: لیکن جو کوئی شخص کھل گیا کفر کے ساتھ از روئے سینے کے، یعنی جس نے دل کھول کے کفر کر لیا، تو گویا کہ مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ کا معنی ہے شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا، جو شخص دل کھول کے کفر کر لے، مَنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا یہ مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ کا بیان ہے۔ جو شخص اللہ کے ساتھ کفر کرے اپنے ایمان لے آنے کے بعد یعنی جو دل کھول کے کفر کر لے اس کے اوپر وعید آرہی ہے، اور اگر کوئی شخص مجبور کر دیا ہے مکرَہ کر دیا گیا ہے، دل اس کا ایمان پر مطمئن ہے اس کی یہ سزا نہیں جو آگے ذکر کی جارہی ہے۔ ''جو شخص کھل جائے کفر کے ساتھ از روئے سینے کے'' فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ: ان کے اوپر اللہ کا غضب ہے، وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ: اور ان کے لئے بہت بڑا عذاب ہے۔

مُرتد ہونے پر عذاب کی وجہ

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ: یہ اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے پسند کیا دنیوی زندگی کو آخرت کے مقابلے میں، کہ دنیوی فائدہ دیکھ کے آخرت کو چھوڑ دیا، کہ دل سے کُفر کی طرف چلے گئے، وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ: اور یہ اس سبب سے ہے کہ اللہ تعالیٰ کافر لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا، جو کُفر اختیار کر لیتے ہیں ان کو پھر سیدھی راہ نہیں ملتی۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ: یہی لوگ ہیں کہ جن کے دلوں پر اللہ نے مہر لگادی اور کانوں پر مہر لگادی اور آنکھوں پر مہر لگادی، وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ: یہی لوگ بے خبر ہیں، یعنی جو دنیا کی محبت کے اندر مبتلا ہو کے کُفر کو ترجیح دے دیں، ان کی آنکھ کان دل وغیرہ سب استعداد سے خالی ہو جاتے ہیں پھر ان کو حق سمجھنے کی توفیق نہیں ہوتی، گویا دنیا کی محبت تمام کے تمام فسادات کی جڑ ہو جاتی ہے، جس طرح سے حدیث شریف کے اندر بھی آتا ہے ''حُبُّ الدُّنْيَا رَأْسُ كُلِّ خَطِيْئَةٍ''(۱) کہ دنیا کی محبت ہر گناہ کی جڑ ہے، تو یہاں بھی اسی پر ہی بنیاد رکھی گئی، کہ ایمان کو چھوڑ کے کُفر کا اختیار کرنا یہ اسی سبب سے ہے کہ انہوں نے دنیوی زندگی سے محبت کر لی آخرت کے مقابلے میں، اور اللہ تعالیٰ کی یہ عادت ہے کہ جو کُفر کرتا ہے اس کو اللہ تعالیٰ پھر سیدھے راستے پر چلنے کی توفیق نہیں دیتا، تو دنیا کی محبت کے اندر مبتلا ہو جانا یہی انسان کو حق سمجھنے کی استعداد سے محروم کر دیتا ہے، جیسے کہ اگلی آیت میں ذکر کر دیا کہ ''یہی لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر، ان کے کانوں پر، ان کی آنکھوں پر مہر لگادی'' وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ: یہی لوگ بے خبر ہیں، لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ: لَا جَرَمَ: پکی بات ہے۔ یہ لفظ اَلْبَتَّةَ کی طرح، لَا مَحَالَةَ کی طرح، لَا بُدَّ کی طرح ہے۔ ''پکی بات ہے کہ یہی لوگ آخرت میں خسارہ اٹھانے والے ہوں گے۔''

''ہجرت''، ''جہاد'' اور ''صبر'' کی فضیلت

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا: اب یہ ان کی تعریف آ گئی جو ہر قسم کی سختیاں برداشت کر لیتے ہیں، ہر چیز کی قربانی دے دیتے ہیں، لیکن ایمان پر جمے رہتے ہیں، حتیٰ کہ گھر بار بھی چھوڑنا پڑ جائے تو گھر بار بھی چھوڑ دیتے ہیں، جان مال کی قربانی دینی پڑ جائے تو وہ قربانی بھی دے دیتے ہیں، ایمان پر جمے رہتے ہیں، تو ان کی یہ فضیلت آ گئی، یہ ثُمَّ صرف تاخیر ذکری کے لئے ہے، ''پھر بے شک تیرا رب ان لوگوں کے لئے جو ہجرت کرتے ہیں، جو گھر بار چھوڑ جاتے ہیں'' مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا: بعد اس کے کہ وہ تکلیف میں مبتلا کر دیے گئے، مصیبتوں میں مبتلا کر دیے گئے، فتنے میں ڈال دیے گئے، فتنہ کا لفظ آپ کے سامنے کئی دفعہ گزر چکا ہے، فَتْن اصل کے اعتبار سے اس کا معنی ہے سونے چاندی کو آگ میں ڈالنا تا کہ اس کا کھوٹ نمایاں ہو جائے اور اس کا خالص علیحدہ ہو جائے اس کو کہتے ہیں فتنہ، آگ کے اندر تپانا، تپانے کے ساتھ اس کا کھوٹ نمایاں ہو جاتا ہے، تو اسی طرح سے انسان پر جب مصیبتیں آتی ہیں تو ان مصیبتوں کے آنے کے بعد اس کے باطنی احوال کھلتے ہیں، تو وہ بھی انسان کے لئے فتنہ کہلاتی ہیں، ''بعد اس

(۱) مشکوٰۃ ۲/ ۴۴۴، کتاب الرقاق، فصل ثالث/ الزهد لابن ابی الدنیا، رقم الحدیث: ۹۔

کے کہ وہ مصیبتوں میں ڈال دیے گئے" ثُمَّ جٰهَدُوْا وَصَبَرُوْٓا: پھر انہوں نے جہاد کیا اور ہر مصیبت کو برداشت کیا، اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا: بے شک تیرا رَبّ اِن اعمال کے بعد، یعنی ہجرت جہاد اور صبر جن کا ذکر پیچھے آیا، "بے شک تیرا رَبّ ان کے بعد" یعنی ان کے اختیار کر لینے کے بعد، جب کوئی انسان اِن کو اختیار کر لیتا ہے تو لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ: بے شک بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

يَوْمَ تَاْتِيْ كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا وَتُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُمْ

جس دن آئے گا ہر نفس جھگڑا کرتا ہوا اپنی طرف سے اور پورا پورا دے دیا جائے گا ہر نفس کو جو اس نے کیا ہے اور لوگ

لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا

ظلم نہیں کیے جائیں گے ﴿۱۱۱﴾ بیان کی اللہ تعالیٰ نے مثال ایک بستی کی جو امن والی تھی اور اطمینان والی تھی آتا تھا اس کے پاس اس کا رزق

رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا

وسعت کے ساتھ ہر جگہ سے، اس نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی، پھر مزہ چکھایا اللہ نے اس کو ایک محیط قحط کا اور خوف کا، بسبب ان

كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوْهُ

کاموں کے جو وہ کیا کرتے تھے ﴿۱۱۲﴾ اور البتہ تحقیق ان کے پاس انہی میں سے ایک رسول آیا پھر اس بستی والوں نے اس رسول کی تکذیب کی

فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۪ وَّاشْكُرُوْا

پھر پکڑ لیا ان کو عذاب نے اس حال میں کہ وہ ظالم تھے ﴿۱۱۳﴾ پس کھاؤ اس میں سے جو اللہ نے تمہیں دیا حلال پاکیزہ اور شکر کرو

نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۱۴﴾ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ

اللہ کے احسان کا اگر تم اسی کی عبادت کرتے ہو ﴿۱۱۴﴾ سوائے اس کے نہیں کہ حرام ٹھہرایا اللہ نے تمہارے اُوپر مُردار اور خون اور خنزیر کا

الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا

گوشت اور وہ چیز جس پر اللہ کے غیر کے لئے آواز بلند کی گئی ہو، پھر جو شخص مجبور ہو جائے اس حال میں کہ طالب لذت نہ ہو اور نہ

عَادٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا

ضرورت سے زیادہ تجاوز کرنے والا ہو تو پھر اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے ﴿۱۱۵﴾ نہ کہا کرو اپنی زبانوں کے جھوٹ بیان کرنے کی وجہ سے کہ یہ

حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ

حلال ہے اور یہ حرام ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ تم جھوٹ گھڑتے ہو اللہ پر، بے شک وہ لوگ جو اللہ پر جھوٹ

الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ۪ وَّلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۱۷﴾ وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا

گھڑتے ہیں وہ کامیاب نہیں ہوں گے ﴿۱۱۶﴾ تھوڑا سا برتنے کا سامان ہے اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے ﴿۱۱۷﴾ اور ان لوگوں پر جو یہودی ہوئے

حَرَّمْنَا مَا قَصَصْنَا عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ ۚ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ

ہم نے حرام ٹھہرایا ان چیزوں کو جو ہم نے تیرے اُوپر اس سے قبل بیان کی ہیں، ہم نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا لیکن وہ اپنے نفسوں پر

يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ عَمِلُوا السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ

خود ظلم کرتے تھے ﴿۱۱۸﴾ پھر بے شک تیرا رَبّ ان لوگوں کے لئے جنہوں نے بُرا کام کیا جہالت کی بنا پر پھر انہوں نے توبہ کر لی اس کے بعد

وَاَصْلَحُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۹﴾ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا

اور اپنے حالات کو دُرست کر لیا، بے شک تیرا رَبّ توبہ کے بعد البتہ غفور رحیم ہے ﴿۱۱۹﴾ بے شک ابراہیم ایک مستقل جماعت تھے اللہ کے

لِّلّٰهِ حَنِيْفًا ؕ وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ ۙ شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ ؕ

فرمانبردار تھے خالص طور پر اللہ کی طرف توجہ کرنے والے تھے اور مشرکین میں سے نہیں تھے ﴿۱۲۰﴾ اللہ کی نعمتوں کے شکر گزار تھے،

اِجْتَبٰىهُ وَهَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۲۱﴾ وَاٰتَيْنٰهُ فِى الدُّنْيَا حَسَنَةً ؕ وَاِنَّهٗ فِى الْاٰخِرَةِ

اللہ نے ان کو چُن لیا اور صراطِ مستقیم کی ان کو ہدایت دی ﴿۱۲۱﴾ ہم نے ان کو دُنیا کے اندر بھی بھلائی دی اور بے شک وہ آخرت میں بھی

لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۲۲﴾ ؕ ثُمَّ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ

البتہ اچھے لوگوں میں سے ہیں ﴿۱۲۲﴾ پھر ہم نے آپ کی طرف وحی بھیجی کہ آپ ابراہیم کے طریقے کی اتباع کریں جو کہ مخلص تھے

وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۲۳﴾ اِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَاِنَّ رَبَّكَ

اور وہ مشرکین میں سے نہیں تھے ﴿۱۲۳﴾ ہفتے کی تعظیم کرنا متعین کیا گیا تھا ان لوگوں پر ہی جنہوں نے اس میں اختلاف کیا اور بے شک تیرا رَبّ

لَيَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۲۴﴾ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ

البتہ فیصلہ کرے گا ان کے درمیان قیامت کے دِن اس چیز میں جس میں یہ اختلاف کیا کرتے تھے ﴿۱۲۴﴾ دعوت دے اپنے رَبّ کے

رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۚ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ

راستے کی طرف حکمت کے ساتھ اور اچھی نصیحت کے ساتھ، اور جھگڑا کر ان کے ساتھ اس طریقے سے جو کہ اچھا ہے، بے شک تیرا رب

أَعْلَمُ بِمَن ضَلَّ عَن سَبِيلِهِ ۖ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ﴿١٢٥﴾ وَإِنْ

خوب جانتا ہے ان لوگوں کو جو اس کے راستے سے بھٹکے ہوئے ہیں اور وہ خوب جانتا ہے ہدایت پانے والوں کو (۱۲۵) اور اگر

عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُم بِهِ ۖ وَلَئِن صَبَرْتُمْ

تم (اپنے مدِمقابل کو) کوکوئی سزا ہی دو تو سزا دیا کرو اس کی مثل کے ساتھ جو تم سے معاملہ کیا گیا، اور اگر تم برداشت کر جاؤ

لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصَّابِرِينَ ﴿١٢٦﴾ وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ ۚ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ

تو صبر کرنے والوں کے لئے یہ بہتر ہے (۱۲۶) آپ صبر کیجئے، نہیں ہے آپ کا صبر مگر اللہ کی توفیق کے ساتھ اور ان کے اُوپر آپ غم نہ کریں،

وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ ﴿١٢٧﴾ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوا وَّالَّذِينَ هُم مُّحْسِنُونَ ﴿١٢٨﴾

اور کسی تنگ دِلی میں واقع نہ ہوں ان کے مکر وفریب کی وجہ سے (۱۲۷) بے شک اللہ تعالیٰ انہی لوگوں کے ساتھ ہے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں اور جو کہ محسن ہوتے ہیں (۱۲۸)

تفسیر

ماقبل سے ربط اور آنے والے مضامین پر اِجمالی نظر

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ ۔ پچھلے رکوع کی آخری آیات میں کُفّار کے متعلق ذکر کیا گیا تھا کہ اَنَّهُمْ فِي الْآخِرَةِ هُمُ الْخٰسِرُونَ، اور اس سے بعد والی آیت میں اللہ کے راستے میں قربانی دینے والوں کی کامیابی کا ذکر تھا کہ اُن کے لئے اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے، تو اگلی آیت يَوْمَ تَأْتِي كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَن نَّفْسِهَا، اس میں روزِ جزاء کا ذکر ہے جس دن کافروں کا خسارہ نمایاں ہوگا اور مؤمنین کی کامیابی نمایاں ہوگی، اور وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا قَرْيَةً اس میں ایک مثال کے ذریعے سے دنیوی عذاب کے ساتھ وعید کی گئی ہے، اور فَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ حَلَالًا طَيِّبًا یہاں سے آگے کچھ رسومِ شرکیہ کی تردید کی گئی ہے، اور اگلے رکوع میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ ہوگا، خاص طور پر یہ کہ وہ مشرکین میں سے نہیں تھے، اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے شکرگزار تھے، اور اس کے بعد کچھ آدابِ تبلیغ ذکر کیے جائیں گے۔ یہ ہے خلاصہ مضامین کا سورت کے آخر تک۔

اِنصاف کا دِن

یَوْمَ تَاْتِیْ كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا: جس دن کہ آئے گا ہر نفس جھگڑا کرتا ہوا اپنے نفس کی طرف سے، اپنے آپ کی طرف سے، یعنی ہر نفس کو اپنی طرف سے خود جوابدہی کرنی ہوگی، ''جس دِن آئے گا ہر نفس جھگڑا کرتا ہوا اپنی طرف سے'' وَتُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ: اور پورا پورا دے دیا جائے گا ہر نفس کو جو اس نے کیا ہے، وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ: اور لوگ ظلم نہیں کیے جائیں گے، بلکہ ان کا حق پورا پورا ان کو ادا کر دیا جائے گا، لَا يُظْلَمُوْنَ کے اندر دونوں صورتیں ہی ہوتی ہیں، جیسے آپ کے سامنے یہ باتیں بارہا آ چکیں، کسی کی نیکی ضائع نہیں کی جائے گی اور کسی کو ناکردہ گناہ کی سزا نہیں دی جائے گی۔

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کا انجام

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً: بیان کی اللہ تعالیٰ نے مثال ایک بستی کی (قَرْيَةً یہ مَثَلًا سے بدل ہے۔ ضربِ مَثَل: مثال بیان کرنا) بیان کی اللہ تعالیٰ نے ایک مثال قریہ کی جو آمنہ تھی اور مطمئنہ تھی، امن والی تھی اور اطمینان والی تھی، باہر سے بھی کوئی خوف خطرہ نہیں تھا اور اپنے اندرونی حالات کے اعتبار سے بھی ٹھیک ٹھاک تھے، يَاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا: آتا تھا ان کے پاس ان کا رزق کھلم کھلا، وسعت کے ساتھ، کشادہ۔ رَغِدَ رَغَدًا، وسعت کے معنی میں ہوتا ہے، رغد العیش کشادہ عیش کو کہتے ہیں، حضرت آدم علیہ السلام کے قصے میں یہ لفظ پہلے گزرا ہے۔ مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ: ہر طرف سے۔ یعنی جدھر جدھر سے کسی چیز کے درآمد کرنے کی ضرورت تھی اُدھر سے ہی وہ چیزیں ان کے شہر میں، اس قریہ میں پہنچتی تھیں، ہر جگہ سے ان کے پاس رزق آتا تھا، فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ: كَفَرَتْ کی ضمیر قریہ کی طرف لوٹ رہی ہے، اور مراد اہل قریہ ہیں، ''اس قریہ نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی'' یعنی اہلِ قریہ نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی، فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ: لباس الجوع: بھوک کا لباس۔ بھوک کو لباس کے ساتھ تعبیر کیا گیا اس کے محیط ہونے کی طرف اشارہ کرنے کے لئے، کہ لباس جس طرح سے انسان کے بدن پر محیط ہوتا ہے اسی طرح سے وہ قحط بھی محیط ہو گیا، اور خوف: یعنی امن وغیرہ فوت ہو گیا، دشمنوں کے خطرے پیدا ہو گئے، آفات آنے لگ گئیں، قحط کے اندر مبتلا ہو گئے'' پھر مزہ چکھایا اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک محیط قحط کا اور خوف کا'' بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ: بسبب ان کاموں کے جو وہ کیا کرتے تھے، جو وہ کیا کرتے تھے ان کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو محیط قحط اور خوف کا مزہ چکھایا، جب وہ محیط قحط کے اندر مبتلا ہو گئے تو یہ اطمینان والی جو نعمت تھی جس کی وجہ اِتیانِ رزق تھا کہ ہر طرف سے ان کو روزی حاصل تھی، اسبابِ رزق ان کو حاصل تھے، جس کی بنا پر وہ اطمینان کی زندگی گزار رہے تھے وہ بھی ختم ہو گئی، اور خوف جب طاری ہوا تو اٰمِنَةً والی بات بھی ختم ہو گئی، تو اللہ تعالیٰ نے ان کو نعمتیں دی تھیں جس وقت وہ ان نعمتوں کے شکر گزار نہ رہے تو اللہ تعالیٰ نے وہ نعمتیں چھین لیں۔ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْهُمْ: اور البتہ تحقیق ان کے پاس انہی میں سے ایک رسول آیا، فَكَذَّبُوْهُ: كَذَّبُوْا کی ضمیر اہل قریہ کی طرف لوٹ گئی۔ پھر اہل قریہ نے اس رسول کی تکذیب کی، فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ: پھر پکڑ لیا ان کو عذاب نے، وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ: اس حال میں کہ وہ ظالم تھے۔

''قریہ'' کا مصداق

اس ''قریہ'' سے کون سی قریہ مراد ہے؟ ویسے تو آپ جانتے ہیں کہ جن بستیوں کی طرف بھی اللہ کے رسول آئے ان کے حالات ایسے ہی تھے کہ پہلے وہ خوش حال تھے، رزق کی وسعت تھی، امن تھا، اطمینان تھا، پھر اللہ تعالیٰ کے رسول نے آ کے اللہ کی نعمتوں کی یاد دہانی کرا کے شکر کا مطالبہ کیا، اللہ کے اوپر ایمان لانے کا مطالبہ کیا، کُفر و شرک اختیار کر کے وہ لوگ اللہ کی نافرمانی اور ناشکری کے اندر جو مبتلا تھے اس سے روکا، جب وہ باز نہ آئے تو بہت ساری بستیوں کی مثالیں آپ کے سامنے گزر چکیں جن کے اوپر پھر عذاب آیا اور ان کی خوشحالی ختم ہوگئی، وہ دنیوی عذاب کے اندر مبتلا ہو گئے، تو اس لیے اگر کوئی قریہ متعین نہ کی جائے، لا علی التعیین مثال کے طور پر ایک بستی ہے، تو اس کا انطباق کئی بستیوں پر ہوسکتا ہے، اور بعض حضرات نے اس سے خود مکہ معظمہ کی ہی بستی مراد لی ہے، اور یہ سنانا مقصود ہے اہلِ مدینہ کو، پھر ان اہلِ تفسیر کے نزدیک یہ آیات مدنی ہیں، مقصد یہ ہے کہ اہلِ مدینہ کو یہ سمجھایا جا رہا ہے کہ تمہارے سامنے یہ بستی، قریہ، مکہ معظمہ والے کس طرح سے امن و اطمینان کے ساتھ وقت گزارتے تھے، اللہ تعالیٰ کا رزق ان کے پاس ہر طرف سے آتا تھا، لیکن وہ ناشکرے ثابت ہوئے، کُفر و شرک میں مبتلا رہے، اللہ کے رسول کے سمجھانے کے باوجود وہ نہ سمجھے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا امن و اطمینان بھی ختم ہوا، باہر کے راستے بھی ان کے لئے پرامن تھے جس کی وجہ سے وہ تجارت کرتے تھے اب وہ راستے بھی پرخطر ہو گئے، آپ جانتے ہی ہیں کہ ان کی تجارتی راہیں جتنی بھی تھیں شام کی طرف، سب کے اوپر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا تھا، اور ان راستوں کے اوپر چلنا اب ان کے لئے ممکن نہیں رہا تھا، جگہ بہ جگہ مزاحمت ہوتی تھی، اور اسی طرح سے حدیث شریف میں آتا ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ کی بددعاء کی وجہ سے وہ لوگ ایک محیط قحط میں مبتلا کر دیے گئے تھے، تو قحط کے اندر ابتلا بھی ان کا ہوا اور ان کا امن بھی فوت ہوا، یہ اہلِ مکہ پر واقعہ پیش آیا، تو اہلِ مدینہ کو یہ سنایا جا رہا ہے کہ تم لوگ اللہ کی شکر گزاری کرنا، نافرمانی نہ کرنا، اور اس بستی کی مثال سامنے رکھو اور اس سے عبرت حاصل کرو۔ تو مکہ معظمہ بھی اس کا مصداق ٹھہرایا گیا ہے، لا علی التعیین کوئی بستی بھی مراد لی جاسکتی ہے، اور ایسی کئی بستیوں کا ذکر آپ کے سامنے انبیاء علیہم السلام کے تذکروں میں آ گیا ہے، ان میں سے کسی ایک کو بھی لے لیا جائے، لا علی التعیین کسی بستی کا تذکرہ کر دیا جائے، تو بھی بات اپنی جگہ صحیح ہے، اصل بات یہی کہنی مقصود ہے کہ جب رسُول آ جائے اور رسول کی ہدایات کو نہ مانا جائے اور اس رسول کی تکذیب کی جائے تو پھر اللہ تعالیٰ امن و اطمینان چھین لیتے ہیں، دی ہوئی نعمتیں چھن جاتی ہیں اور انسان عذاب میں مبتلا ہو جاتا ہے، اس پر تنبیہ کرنی مقصود ہے۔

حلال اور پاکیزہ رِزق کے کھانے اور شکر اَدا کرنے کا حکم

فَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا: پس کھاؤ تم حلال پاکیزہ اس چیز میں سے جو اللہ نے تمہیں دی ہے، اللہ نے تمہیں نعمتیں دی ہیں، تو تم مختلف بتوں کی طرف نسبتیں کر کے، غیر اللہ کی طرف منسوب کر کے ان کو حرام نہ ٹھہرایا کرو، جیسے سورۂ انعام میں آپ کے سامنے تفصیل آئی تھی بحیرہ، سائبہ، وصیلہ، حام وغیرہ کی، کہ اس قسم کے جانوروں کو وہ بتوں کی طرف منسوب کر کے اپنے اوپر

حرام کر لیتے تھے، ان کے دودھ سے فائدہ نہیں اٹھاتے تھے، ان کے اوپر سواری نہیں کرتے تھے، ان کا گوشت نہیں کھاتے تھے، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرا دیا ہوا رزق حلال اور طیب جو بھی ہے اس کو کھاؤ، اپنی طرف سے اس کو حرام نہ ٹھہرایا کرو، ''کھاؤ اس چیز میں سے جو اللہ نے تمہیں دیا حلال پاکیزہ، اور شکر کرو اللہ کے احسان کا، اللہ کی نعمت کے شکر گزار رہو'' اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ: اگر تم اسی کی عبادت کرتے ہو، اگر تمہارا عبادت کا تعلق اللہ کے ساتھ ہی ہے تو عبادت کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ اللہ کے حکم کے بغیر کسی چیز کو حرام نہ ٹھہراؤ، جو اس نے حلال ٹھہرا دیا اسے حلال ہی جانو، حلال جان کے استعمال کرو۔

حرام کردہ چیزوں کے متعلق قاعدہ

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ: یہ آیت آپ کے سامنے تین دفعہ پہلے گزر چکی، اس کے پورے اَحکام سورۂ بقرہ کے اندر تفصیل سے بیان کر دیے گئے تھے، ''سوائے اس کے نہیں کہ حرام ٹھہرایا اللہ نے تمہارے اوپر مُردار کو اور دَم کو'' دَم سے بہنے والا خون مراد ہے جو ذبح کرتے وقت رگوں سے نکلتا ہے، یا شکار کی صورت میں جانور کے زخمی ہونے کے بعد جو اس کے عضو سے بہتا ہے، تو دَمِ مسفوح مراد ہے، مسفوح کی قید سورۂ اَنعام میں آئی تھی، وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ: اور خنزیر کا گوشت، وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ: اور وہ چیز جس پر اللہ کے غیر کے لئے آواز بلند کر دی گئی ہو۔ یہ چیزیں اللہ نے تم پر حرام ٹھہرائی ہیں۔ اور حصر کا معنی یہ ہے کہ جن کو تم حرام ٹھہراتے ہو وہ نہیں، اُن کے مقابلے میں ان میں حصر کیا جا رہا ہے، یہ نہیں کہ کلیۃً ساری حرام چیزیں یہی ہیں، نہیں! حرام چیزیں ان کے علاوہ اور بھی بہت زیادہ ہیں، سرورِ کائنات ﷺ نے جن کی تفصیل بیان فرمائی، اور یہ اعلان کر کے بیان فرمائی کہ خبردار! یہ خیال نہ کرنا کہ حرام وہی ہے جو اللہ نے کیا، اور اللہ کے رسول نے بہت ساری باتیں اس قسم کی بیان کی ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تحریمات کو واضح کیا ہے، یعنی اس میں تحریم کی نسبت اگرچہ اللہ کے رسول کی طرف ہے، لیکن اللہ کی اطاعت چونکہ رسول کی اطاعت سے ہی متحقق ہوتی ہے، اس لیے اللہ کے رسول نے جن چیزوں کی تحریم واضح کی ہے وہ بھی اللہ کی جانب سے ہی حرام ہیں، حرام صرف انہی چیزوں کو نہیں سمجھا جاتا جن کو اللہ تعالیٰ نے براہِ راست کتاب اللہ کے اندر ذکر کیا ہے، احادیث کے اندر یہ مضمون کثرت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، آپ نے بھی ''مشکوٰۃ شریف'' میں ''باب الاعتصام'' کے اندر یہ روایات پڑھ لی ہوں گی: ''اِنَّ مَا حَرَّمَ رسولُ اللهِ كَمَا حَرَّمَ اللهُ''[1] وہاں الفاظ ایسے ہی تھے کہ جس طرح سے اللہ نے بعض چیزوں کو حرام ٹھہرایا ہے اللہ کے رسول نے بھی بعض چیزوں کو حرام ٹھہرایا ہے، اور وہ بھی اسی طرح سے ہی ہیں جس طرح سے کہ اللہ کی حرام ٹھہرائی ہوئی چیزیں ہیں، جس کے بعد آگے تفصیل ذکر کی تھی کہ خبردار! تمہارے لیے گھریلو گدھا حلال نہیں، حالانکہ اس کا ذکر قرآنِ کریم میں نہیں ہے، اسی طرح ذی ناب درندے تمہارے لیے حلال نہیں، شیر، چیتا، گیدڑ، ریچھ وغیرہ جتنے یہ درندے ہیں، حالانکہ ان کا ذکر قرآنِ کریم کے اندر تفصیل کے ساتھ نہیں آیا، تو سرورِ کائنات ﷺ نے واضح طور پر یہ مثالیں دی ہیں، تو حضور ﷺ کی زبان سے جن کی حرمت ظاہر ہوئی وہ بھی حقیقت کے اعتبار سے اللہ کی جانب سے ہی ہے، اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ کے اندر

(۱) ترمذی ۲/۹۵، باب ما نهی عنه ان يقال عند حديث النبی ﷺ/ مشکوٰۃ ص ۲۹، باب الاعتصام، فصل ثانی۔

اطاعت رسول کو قرآنِ کریم نے ایک مستقل اُصول کے طور پر ذکر کیا ہے (النساء:۵۹، وغیرہ) لہٰذا حصر کا یہ معنی نہیں کہ صرف یہی چار چیزیں حرام ہیں، وہ اپنے طور پر جو بہت ساری چیزوں کو حرام ٹھہرائے ہوئے تھے اس کے مقابلے میں اس کو ذکر کیا جا رہا ہے، اور ان میں سے بعض کو مشرکین اپنے طور پر حلال ٹھہرائے ہوئے تھے۔ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ کی بھی تفصیل آپ کے سامنے آ گئی تھی، وہ جانور جس کے اوپر اللہ کے غیر کے لیے آواز بلند کی گئی ہو، اللہ کے غیر کی طرف اس کو منسوب کر دیا اور اللہ کے غیر کا تقرب حاصل کرنے کے لئے اس کی روح نکالی جا رہی ہے، تو یہ بھی اسی طرح سے حرام ہے جس طرح سے میتۃ اور لحمِ خنزیر حرام ہے۔

''مضطر'' کی وضاحت اور اس کے لئے حکم

فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ: پھر جو شخص مضطر ہو جائے، مجبور ہو جائے، اس حال میں کہ طالبِ لذت نہ ہو اور نہ ضرورت سے زیادہ تجاوز کرنے والا ہو، غَيْرَ بَاغٍ: طالبِ لذت نہ ہو، طالبِ لذت وہ ہوتا ہے کہ ابھی اضطرار کی کیفیت پیدا نہیں ہوئی اور صرف اپنے منہ کے ذائقے کو ٹھیک کرنے کے لئے، کام ودہن کی لذت کے لئے کھانا شروع کر دیا، اور عادی کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جتنا کھا کر وہ اپنی جان بچا سکتا تھا اس سے زائد کھانے لگ جائے، تو مجبوری کی حالت میں ان کی اجازت جو دی گئی ہے تو ان دو قیدوں کے ساتھ دی گئی ہے، ایک قبل از ضرورت نہ کھائے یہ غَيْرَ بَاغٍ کا مفہوم ہے، قبل از ضرورت، قبل از اضطرار نہ کھائے، اضطرار متحقق ہونے سے پہلے نہ کھائے، یہ غَيْرَ بَاغٍ کا مفہوم ہے، اگر اضطرار متحقق ہونے سے پہلے کھانے لگ گیا تو باغی سمجھا جائے گا، اور زائد از ضرورت نہ کھائے یہ وَّلَا عَادٍ کا مفہوم ہے، اگر ضرورت پوری ہونے سے زائد کھائے گا تو وہ عادی بن جائے گا، پھر دونوں صورتوں میں گناہ گار ہے، اور اگر بقدرِ ضرورت کھاتا ہے اور ضرورت متحقق ہونے پر کھاتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے، فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ، اس میں اشارہ کر دیا کہ اس کے اوپر کوئی گناہ نہیں، اللہ تعالیٰ اس سے درگزر فرمائیں گے۔

اَز خود چیزوں کو حلال اور حرام ٹھہرانا ''اِفتراءٌ علی اللہ'' ہے

یہ تو اللہ تعالیٰ کی حرام ٹھہرائی ہوئی چیزیں ہیں، اور بعض چیزیں ایسی تھیں جن کو مشرک اپنے طور پر حرام ٹھہراتے تھے، ان کے اوپر انکار کیا جا رہا ہے، وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ: لَا تَقُوْلُوْا: نہ کہا کرو، اور لَا تَقُوْلُوْا کا مقولہ ہے هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ، یہ نہ کہا کرو کہ یہ حلال ہے، یہ حرام ہے، بسبب تمہاری زبانوں کے جھوٹ بیان کرنے کے، یعنی اپنی زبانوں کے ساتھ جھوٹ بیان کرتے ہوئے اپنی طرف سے نہ کہا کرو هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ، یہ حلال اور حرام کی تقسیم اللہ سے پوچھو، اللہ کے رسول سے پوچھو، وہ تمہیں بتائے گا کہ کون سی چیز حلال ہے اور کون سی چیز حرام ہے، اپنی زبانوں کے جھوٹ بیان کرنے کی وجہ سے یہ نہ کہا کرو هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ۔ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ: یہ لام لامِ عاقبت ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ تم اللہ کے اوپر جھوٹ گھڑتے ہو، افتراء کرتے ہو تم اللہ کے اُوپر کذب کا، جھوٹ گھڑتے ہو تم اللہ پر، اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ: بے شک وہ لوگ جو اللہ کے اوپر جھوٹ گھڑتے ہیں لَا يُفْلِحُوْنَ: وہ کامیاب نہیں ہوں گے۔

ایک شبہ کا اِزالہ

مَتَاعٌ قَلِيْلٌ: باقی اگر کہو کہ وہ تو دنیا میں بڑے کامیاب ہیں، وہ تو ٹھاٹھ باٹ کے ساتھ رہتے ہیں، اچھا کھاتے ہیں، اچھا پہنتے ہیں، ان کو اچھی رہائش حاصل ہے، دنیا کی تمام سہولتیں حاصل ہیں، یعنی وہ لوگ جو اپنی مرضی کے ساتھ حرام حلال متعین کیے پھر رہے ہیں وہ تو دنیا میں بڑی عیش سے رہتے ہیں، اور یہاں آ گیا لَا یُفْلِحُوْنَ کہ کامیاب نہیں ہوں گے، تو اس شبہ کو ان لفظوں کے ساتھ دور کر دیا گیا مَتَاعٌ قَلِيْلٌ: کہ جو کچھ ان کے پاس موجود ہے یہ تو بہت تھوڑا برتنے کا سامان ہے، یہ تھوڑا سا نفع اٹھانا ہے، وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ: اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

یہود پر مخصوص چیزوں کو حرام ٹھہرانا بطورِ سزا کے تھا

وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا مَا قَصَصْنَا عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ: وہ تو مشرکین کا تذکرہ تھا، آگے یہ یہود کا تذکرہ آ گیا جو اہلِ کتاب ہیں، ''اور ان لوگوں پر جو یہودی ہوئے ہم نے حرام ٹھہرایا ان چیزوں کو جو ہم نے تیرے اوپر اس سے قبل بیان کی ہیں'' وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ: ہم نے ان کے اوپر کوئی ظلم نہیں کیا، وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ: لیکن وہ اپنے نفسوں کے اوپر خود ظلم کرتے تھے، یعنی شریعتِ ابراہیمی کے اندر تو حرام صرف یہی چیزیں ہیں جن کا بیان پہلے آیا، کہ اللہ تعالیٰ نے قطعی طور پر ان کو حرام ٹھہرایا تھا، اور بعض چیزیں اس قسم کی تھیں جو یہود نے اپنی رسوم بد کے طور پر حرام ٹھہرا لیں، پھر اللہ تعالیٰ نے سزا کے طور پر ان کے اوپر وہ حرام قرار دے دیں، یا اونٹ، اونٹ کا گوشت یہ چیز جو تھی یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے نذر ماننے کی وجہ سے ان پر ممنوع ہوئی تھی، پھر ان کے اولاد کے اندر بھی اسی طرح سے ممنوع چلی آئی، بہر حال زائد چیزیں جن کو یہود کے اوپر حرام ٹھہرایا گیا تھا وہ ملّتِ ابراہیمی میں داخل نہیں ہیں، اس لیے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم جو ملّتِ ابراہیمی پر مبعوث ہوئے ہیں اُن چیزوں کو اگر حلال ٹھہرا دیں جو خصوصیت کے ساتھ یہود پر ان کی شرارتوں کی وجہ سے ان کی کج روی کی وجہ سے بطورِ سزا کے حرام ٹھہرائی گئی تھیں، تو یہ بات ملّتِ ابراہیمی کے منافی نہیں ہے، یعنی وہ لوگ اعتراض کر سکتے تھے کہ آپ اپنے آپ کے ملّتِ ابراہیمی پر قرار دیتے ہیں اور یہ چیزیں جو توراۃ کے اندر حرام ٹھہرائی گئی ہیں یہ ملّتِ ابراہیمی میں حرام ہیں، تو پھر آپ ان کو حلال کیسے قرار دیتے ہیں؟ جیسے بعض چربیوں کا ذکر ہے، بعض جانوروں کا ذکر ہے، یا اونٹ کے گوشت اور اونٹ کے دودھ کا ذکر ہے، جن کو یہودی حرام سمجھتے تھے، تفصیل آپ کے سامنے سورۂ اَنعام میں بھی آئی تھی، اور چوتھے پارے (کے شروع) کے اندر بھی آئی تھی كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِيْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ، اس آیت کے ضمن میں اس کی تفصیل ذکر کی گئی تھی، کہ ابراہیم علیہ السلام کی ملت میں یہ چیزیں حرام نہیں تھیں بلکہ یہود پر خصوصیت کے ساتھ یہ چیزیں حرام ٹھہرائی گئی تھیں، اور یہ اُسی ملت کی خصوصیت ہے، اس لیے اس آنے والے دِین میں اگر اُن کو منسوخ کر دیا گیا اور ان کو حلال ٹھہرا دیا گیا تو یہ بات ملّتِ ابراہیمی کے منافی نہیں ہے، ''ان لوگوں پر جو یہودی ہوئے ہم نے حرام ٹھہرایا ان چیزوں کو جو ہم نے تیرے پہ اس سے قبل بیان کی ہیں'' اس سے اِشارہ سورۂ اَنعام کی طرف بھی ہو سکتا ہے، وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ: اور ان کے اوپر ہم نے ظلم نہیں کیا، وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ: وہ اپنے نفسوں پر خود ہی ظلم

کرتے تھے، یعنی ان کے ظلم اور شرارت کی بنا پر اگر دیگر چیزوں کو حرام ٹھہرادیا گیا تو یہ ہماری طرف سے ایک سزا تھی، وہ ملّتِ ابراہیمی کا حصہ نہیں ہے۔

اِرتکابِ گناہ کے بعد توبہ کا دروازہ کب تک کھلا رہتا ہے؟

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ عَمِلُوا السُّوْٓءَ: لیکن ان یہود کے لئے، مشرکین کے لئے جنہوں نے اپنی طرف سے تحریم کی اور بعض حلال چیزوں کو حرام ٹھہرایا، یا اللہ کی طرف سے سزا کا نشانہ بنے، اللہ کی طرف سے ان کے اوپر سختی آئی، ان کے لئے بھی توبہ کا دروازہ کھلا ہے، اس وقت بھی اگر توبہ کرلیں اور اِس پیغمبر کے اوپر ایمان لے آئیں، اپنی عملی اصلاح کرلیں، اللہ تعالیٰ انہیں معاف کردے گا۔ یہ ثُمَّ تاخیرِ ذکری کے لئے ہے۔ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ عَمِلُوا السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ: بےشک تیرا ربّ ان لوگوں کے لئے جنہوں نے بُرا کام کیا جہالت کے سبب سے۔ جہالت: نادانی، جذبات سے مغلوبیت۔ نادانی اور جذبات سے مغلوبیت کی بنا پر جنہوں نے کوئی بُرا کام کرلیا پھر انہوں نے توبہ کرلی اس کے بعد، اور اپنے حالات کو درست کرلیا، بےشک تیرا ربّ توبہ کے بعد البتہ غفور رحیم ہے۔ بِجَهَالَةٍ کی قید کی تفصیل آپ کے سامنے سورۂ نساء میں چوتھے پارے کے آخر میں آگئی تھی اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ، وہاں دو قیدیں لگی ہوئی تھیں "جو جہالت کی بنا پر کوئی برا کام کر بیٹھتے ہیں، پھر جلدی ہی توبہ کرلیتے ہیں" تو وہاں دونوں قسم کی تفسیریں آپ کے سامنے ذکر کردی گئی تھیں کہ بِجَهَالَةٍ اور يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ یہ دونوں قیدیں اتفاقی ہیں یا احترازی ہیں، راجح قول یہی نقل کیا تھا کہ یہ اتفاقی ہیں، کیونکہ جو گناہ بھی ہوتا ہے وہ جہالت کی بنا پر ہی ہوتا ہے، نادانی کی بنا پر ہی ہوتا ہے، اگر انسان عقل مند ہو، ہوش میں ہو، جذبات سے مغلوب نہ ہو تو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر ہی نہیں سکتا، سزا سے غافل ہوتا ہے، سزا مستحضر نہیں رہتی، عقل جذبات کے سامنے مغلوب ہوجاتی ہے، تبھی جا کے انسان گناہ کرتا ہے، اس لیے جو گناہ ہے وہ جہالت کے ساتھ ہی ہے، یہ محض ایک تصویر ہے اُس واقعے کی کہ جب انسان عملی طور پر کوئی کج روی اختیار کرتا ہے اور بُرائی میں مبتلا ہوتا ہے تو اس وقت سمجھو کہ یہ جہالت کا ارتکاب کر رہا ہے، اور مِنْ قَرِيْبٍ میں راجح قول یہی نقل کیا گیا تھا کہ موت کی کیفیت طاری ہونے سے پہلے پہلے توبہ کرلی جائے تو یہ مِنْ قَرِيْبٍ ہی ہے، اور جس وقت موت کی کیفیت طاری ہوجائے گی، غرغرہ کی کیفیت طاری ہوجائے گی، سانس اُکھڑ جائے اور عالم آخرت منکشف ہوجائے، پھر توبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ دوسرا قول یہ بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے توبہ کے قبول کرنے جو وعدہ کیا گیا ہے وہ وہی ہے کہ انسان نادانی سے گناہ کرلے اور پھر تنبہ ہوتے ہی فوراً توبہ کرلے، اِس توبہ کے قبول کرنے کا اللہ کی جانب سے وعدہ ہے، اور ایک گناہ انسان کیا کرتا ہے کہ ہوش میں ہے، جان بوجھ کر کرتا ہے، سوچتا سمجھتا ہوا کرتا ہے، اور جذبات سے بھی کوئی اتنی مغلوبیت نہیں، بس ایسے ہی تلذذ کے لئے شیطان کے بہکانے سے کرنے لگ گیا، اور پھر (فوراً) توبہ بھی نہیں کرتا، خواہ مخواہ بلاوجہ تاخیر کرتا چلا جاتا ہے، تو قرآنِ کریم میں ایسے لوگوں کی توبہ کی قبولیت کا وعدہ نہیں ہے، بلکہ اِس چیز کو پردے میں رکھا گیا ہے کہ اللہ چاہے تو قبول کرے گا، چاہے تو قبول نہیں کرے گا، ہاں البتہ کوئی شخص دفعۃً کسی چیز سے متاثر ہوکر گناہ میں مبتلا ہوگیا اور پھر متنبہ ہوتے ہی اللہ کے سامنے گڑگڑانے لگ جائے، توبہ کرلے، دلی طور پر نادم

ہو جائے تو اس کی توبہ کی قبولیت کا وعدہ ہے، اور جس میں بِجَهَالَةٍ کی قید نہ پائی جائے یا یَتُوبُونَ مِن قَرِيبٍ کی قید نہ پائی جائے تو اُس کے لئے صاف لفظوں میں وعدہ نہیں کیا گیا، جبکہ انکار بھی نہیں کیا گیا، اُس کو خفاء میں رکھا گیا ہے، کہ اللہ چاہے گا تو قبول کرے گا، چاہے گا تو آخرت میں سزا دے دے گا، یہ قول بھی وہاں نقل کیا گیا تھا۔ اسی کے مطابق یہاں بِجَهَالَةٍ کی قید کو سمجھ لیجئے، کہ راجح قول کے مطابق یہ قید بھی اتفاقی ہے کہ ہر ارتکابِ سوء کرنے والا جہالت میں مبتلا ہوتا ہے، گناہ کا ارتکاب کرنا یہ جہالت ہی ہے، اور اس سوء کے ارتکاب کے بعد اگر توبہ کر لے اور اپنے حالات کو درست کر لے تو اللہ تعالیٰ اس توبہ کے بعد غفور رحیم ہے۔

اِبراہیم علیہ السلام کی مقتدائیت تمام اَدیان میں مُسلّم ہے

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا: یہ بات بھی آپ کے سامنے کئی دفعہ ذکر کی جا چکی کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مقتدائے خلق بنایا اور بعد میں آنے والی امتیں اپنی نسبت انہی کی طرف ہی کرتی تھیں، انبیاء علیہم السلام بعد میں اِنہی کی اولاد میں سے ہوئے، اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (البقرۃ: ۱۲۴) اس آیت کے تحت اس مضمون کو ذکر کیا گیا تھا، بڑی بڑی جماعتیں اس وقت تین موجود تھیں، مشرکینِ مکہ یہ بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے اور اپنی نسبت انہی کی طرف ہی کرتے تھے، اور یہود اور نصاریٰ بھی اپنی نسبت انہی کی طرف ہی کرتے تھے اور اپنے آپ کو ملّتِ ابراہیمی پر قرار دیتے تھے، ابراہیمی طریقے پر قرار دیتے تھے، تو اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کے اندر یہ واضح کیا ہے کہ ان تینوں گروہوں میں سے کوئی گروہ بھی ملّتِ ابراہیمی پر نہیں ہے، انہوں نے تحریف کر کے گڑبڑ کر کے سارے کے سارے معاملے کو مسخ کر لیا، گڑبڑ کر لیا، اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر جو کچھ شریعت اُتاری جا رہی تھی اسی کو ملّتِ ابراہیمی قرار دیا گیا تھا، اس لئے اگر کوئی شخص ابراہیم علیہ السلام کی اتباع کرنا چاہتا ہے تو اس کو چاہیے کہ اِس رسول پر ایمان لائے اور اس کی ہدایات کے مطابق چلے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقتدائے خلق ہونا تو اتنا واضح ہے کہ ہندوستان کے جو مشرک ہیں ہندو، ان کا جو سب سے بڑا بُت ہے اس کو یہ ''برہما'' کہتے ہیں، ''برہما'' ان کا سب سے بڑا بُت ہے جس کی طرف نسبت کی بنا پر ان کا مذہبی طبقہ ''برہمن'' کہلاتا ہے، ''برہمن'' ہندوؤں کا مذہبی طبقہ ہے جو کتابیں پڑھتے ہیں اور ان کو مذہبی قیادت حاصل ہے، ان کو ''برہمن'' کہتے ہیں، تو ''برہمن'' کہنے کی وجہ ان کی نسبت وہی بڑے بُت ''برہما'' کی طرف ہے، اس کے متعلق بھی بعض علماء نے لکھا ہے کہ اصل کے اعتبار سے انہوں نے یہ بُت حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بنایا ہوا ہے، گویا کہ یہ بھی ابتدائے بُت پرستی کے طور پر اپنی نسبت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف ہی کرتے ہیں، یہ علیحدہ بات ہے کہ جہالت کے پردے پڑ جانے کی وجہ سے اب ان لوگوں کے سامنے وہ حقائق نہ رہے ہوں، ورنہ ہندوستان کی قومیں بھی اپنی نسبت گویا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف ہی قائم کرتی ہیں، ''گلدستۂ توحید'' حضرت مولانا سرفراز صاحب (خان صفدر رحمہ اللہ) کی جو کتاب ہے اس کے اندر یہ ذکر کیا ہے کہ ''برہما'' بعض لوگوں کے نزدیک حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہی بُت ہے، جس طرح مشرکین نے تراشے ہوئے تھے اسی طرح سے ہندوستان کے مشرکوں نے بھی ایسے ہی کیا ہوا تھا۔

حضرت اِبراہیم علیہ السلام کی صفاتِ حمیدہ

تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا: اُمت جماعت کو بھی کہتے ہیں، جماعت والا معنی کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ''بے شک ابراہیم ایک مستقل جماعت تھے'' یعنی وہ نہ تو اُمتِ یہود پر تھے، نہ اُمتِ نصاریٰ پر تھے، نہ اُمتِ مشرکین پر تھے، بلکہ وہ مستقل ایک اُمت تھے، ایک جدا جماعت تھے، وہ اور ان کے ماننے والے اِن میں سے کسی کے ساتھ بھی مناسبت نہیں رکھتے، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ''اُمت'' کہا جا رہا ان کے طریقے کے اعتبار سے ہے، کہ وہ ایک مستقل جماعت تھے، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ماننے والے ایک مستقل جماعت تھے، پھر مفہوم یہ نکل آئے گا، یعنی نہ تو وہ اُمتِ مشرکہ کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں، نہ اُمتِ یہودیہ سے تعلق رکھتے ہیں، نہ اُمتِ نصرانیہ سے تعلق رکھتے ہیں، بلکہ وہ تو مستقل ایک علیحدہ جماعت تھے۔ اور ''اُمت'' کا لفظ ''مقتدیٰ'' کے لئے بھی بولا جاتا ہے، کہ وہ مقتدیٰ تھے، متبوع الخلق تھے، لوگ ان کی اتباع کرتے تھے، قَانِتًا لِّلّٰهِ: اللہ کے فرمانبردار تھے، قانت قُنوت سے لیا گیا ہے، قرآنِ کریم میں آئے گا وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ، تو قُنوت فرمانبرداری کے معنی میں ہے، ''اللہ کے لئے فرمانبردار تھے''، حَنِيْفًا: خالص طور پر اللہ کی طرف توجہ کرنے والے تھے، ہر غلط طریقے سے ہٹ کر صحیح طریقے کی طرف متوجہ تھے، ''حنیف'' اسے کہتے ہیں جو اَدیانِ باطلہ سے ہٹ کر دینِ حق کی طرف متوجہ ہو گیا ہو، اس لیے دینِ حنیف اور ملّتِ حنیفیہ کا لفظ حضرت اِبراہیم علیہ السلام کے طریقے کے لئے بولا جاتا ہے۔ وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ: اور خصوصیت ان کی یہ تھی کہ مشرکوں میں سے نہیں تھے، ان کے طور طریقے میں بالکل بھی شرک کی بات نہیں پائی جاتی تھی، بلکہ توحید کے علم بردار تھے، موحدِ اعظم تھے، مشرک قوموں کے ساتھ انہوں نے ٹکر لی، اور واضح الفاظ میں لوگوں کے سامنے اعلان کیا: اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (الانعام:۱۶۲) کہ غیر اختیاری اُمور ہوں یا اختیاری اُمور ہوں سب اللہ ہی کے لئے ہیں، موت اور حیات پر تصرف اسی کا ہے، بدنی عبادت ہو مالی عبادت ہو جو کچھ ہو وہ سب اللہ کے لئے ہی ہے، واضح الفاظ میں یہ اعلان کیا، ''مشرکوں میں سے نہیں تھے''۔ شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ: اللہ کی نعمتوں کے شکر گزار تھے، اِجْتَبٰىهُ: اللہ نے ان کو چن لیا، وَهَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ: اور صراطِ مستقیم کی ان کو ہدایت دی، وَاٰتَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً: ہم نے ان کو دنیا کے اندر بھی بھلائی دی، نیک نامی دی، شہرت دی، عزت دی، وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ: اور بے شک وہ آخرت میں بھی البتہ اچھے لوگوں میں سے ہیں، اعلیٰ درجے کے لوگوں میں سے ہیں، صالحین سے اعلیٰ درجہ کے لوگ مراد ہیں شائستہ لوگ، تو جب ابراہیم علیہ السلام کا یہ مقام تھا کہ دنیا میں بھی ان کو بھلائی ملی اور آخرت میں بھی اللہ تعالیٰ ان کو اچھے لوگوں میں شمار کر رہے ہیں، تو جو شخص بھی ملّتِ ابراہیمی پر چلے گا، ابراہیم کا طریقہ اپنائے گا اس کو بھی دنیا اور آخرت کی کامیابی ملے گی، اس لیے ہم نے آپ کی طرف یہ وحی بھیجی ہے ثُمَّ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا: پھر ہم نے آپ کی طرف وحی بھیجی کہ آپ ابراہیم کے طریقے کی اتباع کریں ایسے ابراہیم جو کہ حنیف تھے، مخلص تھے، تمام ادیانِ باطلہ سے ہٹ کر اللہ کی راہ کی طرف متوجہ ہونے والے تھے، اور یہ ان کا خصوصی نشان ہے کہ وَمَا كَانَ مِنَ

الْمُشْرِكِيْنَ: وہ مشرکین میں سے نہیں تھے، اس لئے جن کے طریقے کے اندر کچھ بھی شرک آ گیا، کسی اعتبار سے آ گیا، ان کا ملّتِ ابراہیمی سے کوئی تعلق نہیں۔

یہود کا اِعتراض اور اس کا جواب

اِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ: سبت کا لفظ مصدر کے طور پر بھی آتا ہے ہفتے کے دِن کی تعظیم کرنا، اور سبت ایک متعین دِن کے نام کے طور پر بھی آتا ہے، جمعہ گزرنے کے بعد جو اگلا دِن ہوتا ہے اس کو سبت کہتے ہیں، جو کل آپ کے سامنے گزرا، یہود پر اس دِن کی تعظیم فرض تھی، اور اس میں ان کے لئے شکار وغیرہ کرنا درست نہیں تھا، اور اس معاملے میں انہوں نے گڑبڑ کی تھی جس کی بنا پر یہ بندر بنا دیے گئے تھے، كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ (الاعراف:۱۶۶) کا لفظ آپ کے سامنے گزرا تھا، یہ مچھلی وغیرہ پکڑتے تھے، سورۂ اَعراف کے اندر یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ آیا ہے، اِجمال کے ساتھ اس کا تذکرہ سورۂ بقرہ میں بھی آیا تھا پہلے پارے میں وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ (آیت:۶۵)، تو اِجمالاً یہ واقعہ سورۂ بقرہ میں بھی آیا تھا، اور تفصیل کے ساتھ یہ واقعہ سورۂ اَعراف میں آیا تھا، تو یہاں یہی ذِکر کرنا مقصود ہے کہ ہفتے کے دِن کی تعظیم یہ بھی ملّتِ ابراہیمی کا حصہ نہیں ہے، اس لیے اگر سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ہفتے کے دِن کو نہیں اختیار کیا بلکہ جمعہ کے دِن کو اختیار کر لیا تو یہ ملّتِ ابراہیمی کے منافی نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی عین منشا کے مطابق ہے، جس طرح سے ایک حدیث شریف کے اندر تفصیل آئی ہے۔ اِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ: اس میں سبت کو اگر مصدر کے معنی میں لیں تو پھر معنی ہو جائے گا ''ہفتے کی تعظیم کرنا متعین کیا گیا تھا ان لوگوں پر ہی جنہوں نے اس میں اختلاف کیا'' یعنی بعد میں کسی نے تعظیم کی، کسی نے تعظیم نہ کی، اور یہ اشارہ یہود کی طرف ہے جنہوں نے اس کو نبھایا نہیں، اور اگر سبت سے متعین طور پر ہفتہ کا دِن مراد لیا جائے تو پھر تعظیم کا لفظ محذوف نکالیں گے: اِنَّمَا جُعِلَ تعظیمُ السبتِ عَلَى الذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ۔ وَاِنَّ رَبَّكَ لَيَحْكُمُ بَيْنَهُمْ: اور بے شک تیرا رَبّ البتہ فیصلہ کرے گا ان کے درمیان قیامت کے دِن اُس چیز میں جس میں کہ یہ اختلاف کیا کرتے تھے، تو اس آیت میں بھی گویا کہ یہ ذِکر کر دیا گیا کہ یہود کا طریقہ ملّتِ ابراہیمی کے لئے لازم نہیں، کہ ملّتِ ابراہیمی پر وہی ہوگا جو یہود کے اس طریقے کو اپنائے، جس میں ہفتے کے دِن کی تعظیم بھی آ گئی، اور پیچھے محرّمات کا ذِکر کیا گیا تھا، تو گویا کہ در پردہ یہود کی طرف سے جو اعتراض تھا کہ یہ ملّتِ ابراہیمی پر نہیں ہے، تو ان الفاظ میں اس اعتراض کو اُٹھا دیا گیا۔

آدابِ دعوت وتبلیغ

آگے آدابِ تبلیغ ہیں۔ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ: اُدْعُ: دعوت دے، بلا اپنے رَبّ کے راستے کی طرف حکمت کے ساتھ اور موعظۂ حسنہ کے ساتھ، وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ: اور جھگڑا کر ان کے ساتھ اس طریقے سے جو کہ اچھا ہے، بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ: بالطريقةِ التى هِىَ احسنُ، جو طریقہ اچھا ہے اس طریقے کے ساتھ ان کے ساتھ جھگڑا کیجئے۔ اس میں تین باتیں آ گئیں، اللہ کے راستے کی طرف دعوت دیجئے، اللہ کے راستے کی طرف بلائیے، اللہ کا راستہ یہی ہے جس

کی قرآنِ کریم تفصیل کرتا ہے، اللہ کی طرف بلاؤ، توحید کی دعوت دو، شرک سے روکو، اللہ کے رسول پر ایمان لانے کی دعوت ہے، آخرت پر ایمان لانے کی دعوت ہے، اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور عبادت کی دعوت ہے، یہ سب اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ میں داخل ہے، یہ سب اللہ کے راستے کی تفصیل ہے، اللہ کے احکام کی طرف دوسروں کو بلانا۔

دو طریقے ذکر کیے کہ حکمت اور موعظۂ حسنہ کے ساتھ بُلاؤ، حکمت سے مراد یہ ہے دانش مندی، بصیرت، دل کی سمجھ، یعنی سوچ سمجھ کے، اچھے طریقے سے، عقل مندی کے ساتھ، بیوقوفوں کی طرح نہیں کہ ایسی باتیں کہہ دو جس سے مدمقابل اور چڑ جائے، یا ایسی اوٹ پٹانگ مارو کہ بات عقل آدمی کے ذہن میں ہی نہ آئے کہ کیا کہتے ہیں، سمجھ میں ہی نہ آئے، نہیں! حکمت کے ساتھ، دانش مندی سے، سوچ سمجھ کے، عقل وبصیرت کے ساتھ لوگوں کو دعوت دو۔ اور پھر حکمت کے اندر یہ بات بھی داخل ہے کہ دلائلِ محکمہ کے ساتھ دعوت دو، کہ ہر عقل مند آدمی تمہارے دلائل سے مرعوب ہو جائے، دلائل کا اس کے اوپر رُعب پڑے، بودی باتیں نہ کہو، بے بنیاد باتیں نہ کہو، دلائل بیان کرو، براہین بیان کرو، دلائل محکمہ کے ساتھ دعوت دو، سمجھ داری کے ساتھ بُلاؤ، موقع محل دیکھ کے دعوت دو، یہ سب حکمت میں داخل ہے، کیونکہ دعوت دینے میں صرف یہی داخل نہیں کہ ایک شخص کو جا کے کہہ دو کہ تو یہ کام کر، بسا اوقات خاموشی اختیار کرنا بہتر ہوتا ہے، اگر کوئی آدمی غلطی کر رہا ہے تو کسی دوسرے موقع پر اچھے طریقے سے سمجھا سکتے ہو، کبھی بالواسطہ کہنا مناسب ہوتا ہے کبھی بلاواسطہ کہنا مناسب ہوتا ہے، کبھی صراحتاً کہنا مناسب ہوتا ہے، کبھی اشارے کنایے سے سمجھانا مناسب ہوتا ہے، یہ موقع محل کے مطابق انسان طرز اپناتا ہے جس کے ساتھ دوسرا شخص متاثر ہو، حکمت کے اندر یہ سب باتیں شامل ہیں۔

موعظۂ حسنہ

اچھی نصیحت۔ اس سے مراد یہ ہوا کرتا ہے کہ آپ اپنے دعوے کو دلیل کے ساتھ ثابت کرتے ہیں یہ تو حکمت کا تحقق ہو گیا، موقع محل کے مطابق بات کرتے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ اس کام کے نفع اور نقصان سے آگاہ کرو، مثالوں کے ساتھ، واقعات کے ساتھ، تاکہ دوسرا سننے والا اس سے متاثر ہو، لب ولہجہ نرم ہو، اور خیر خواہی پر مشتمل ہو، کہ سننے والے کو یقین آ جائے کہ واقعی جو کچھ کہا جا رہا ہے میرے ہی فائدے کے لئے کہا جا رہا ہے، اس میں ان کا اپنا کوئی ذاتی مقصد نہیں ہے، اور پھر مثالوں کے ساتھ اور واقعات کے ساتھ اس چیز کے منافع اس چیز کے مَضار، نقصانات فوائد یہ واضح کرو، کیونکہ صرف ایک حکم کو ذکر کر دینا کافی نہیں ہوتا، انسان کو متاثر کرنے کے لئے اگلا یہ سلسلہ بھی چلانا پڑتا ہے، کہ بتاؤ کہ اس میں تمہارا یہ فائدہ ہے اگر تم ایسا کرو گے، اور اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو یہ نقصان ہے، یہ جو تم کام کر رہے ہو یہ اللہ کی طرف سے ممنوع ہے اس کو چھوڑ دو، اللہ کی طرف سے ممنوع ہونے کی دلیل یہ ہے، پھر اگلا قدم یہ اٹھاؤ کہ یہ بتاؤ کہ اگر تم اس کو کرتے رہو گے تو تمہیں یہ نقصان پہنچے گا دنیا میں اور آخرت میں، دنیا اور آخرت کے عذاب کے ساتھ ان کو وعید سناؤ، اور اگر تم اس برے کام کو چھوڑ دو گے تو تمہیں دنیا اور آخرت کے اندر یہ فائدہ پہنچے گا، تو اس طرح سے مثالوں کے ساتھ اور واقعات کے ساتھ انسان کے ذہن کو متاثر کرنا یہ موعظۂ حسنہ ہے۔ پھر اس میں لب

دلہجہ ہمدردوں والا اور خیر خواہوں والا ضروری ہے، کہ اگر انسان سخت زبان استعمال کرے تو اس سے بسا اوقات دوسرا شخص متنفر ہو جاتا ہے اور بات سے متاثر نہیں ہوتا، جیسا کہ قرآنِ کریم میں آپ کے سامنے سورۂ آلِ عمران کے اندر آیا تھا فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ (آیت:۱۵۹) یہ اللہ کی رحمت ہے کہ تو ان کے لئے نرم ہو گیا، نرمی کے ساتھ آپ ان صحابہ کو سمجھاتے ہیں، ان کی غلطیوں سے درگزر کرتے ہیں، اور اگر آپ فظ اور غلیظ القلب ہوتے، فظ کا معنی ترش رو، غلیظ القلب کا معنی سخت دل، چہرے پر ترشی ہوتی، منقبض ہو کر بات کرتے، چہرے پر بشاشت نہ ہوتی، اور دل میں سختی ہوتی، ہر کسی کو قانونی گرفت میں لانا چاہتے، اور قلب کے اندر محبت اور شفقت نہ ہوتی، لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ: تو یہ مجمع جو آپ کے ارد گرد اب اکٹھا ہوا ہوا ہے، آپ سے مانوس ہے، یہ آپ کے ساتھ منسلک نہ رہتا، آپ کے ساتھ جڑا نہ رہتا، بلکہ آپ کے ارد گرد سے بھاگ جاتے، تو سرورِ کائنات ﷺ کے متعلق یہ کہا جا رہا ہے کہ اگر آپ فظ اور غلیظ القلب ہوتے تو لَانْفَضُّوْا (اس کی ضمیر اُس وقت کے عشاق کی طرف لوٹ رہی ہے، صحابہ کرام کا گروہ جو آپ کے ارد گرد اکٹھے ہوئے ہیں) تو یہ اکٹھے نہ ہوتے، آپ اس سے اندازہ کر لیجئے کہ اگر مبلغ کے اندر فظ اور غلیظ القلب والی صفت پائی جائے تو پھر وہ کس طرح سے توقع رکھ سکتا ہے کہ میں اپنے ماحول کو متاثر کر سکتا ہوں، سرورِ کائنات ﷺ کے متعلق جب یہ کہا جا رہا ہے کہ اگر آپ فظ اور غلیظ القلب ہوتے تو یہ لوگ آپ پہ جمع نہ ہوتے، باوجود اس بات کے کہ آپ اتنے کمالات کے حامل ہیں، پھر اس کے بعد کون مائی کا لال ہے جو کہے کہ میرے اندر اتنے کمالات ہیں کہ چاہے میں فظ اور غلیظ القلب ہوں تو بھی لوگوں کو متاثر کر لوں گا، لوگ میرے ارد گرد اکٹھے ہو جائیں گے، ایسی بات نہیں ہے، مبلغ کو ہنس مکھ ہونا چاہیے، مسکرا کے بات کرے، دوسرے کی طرف سے کتنی ہی سختی کیوں نہ ہو اور کتنی ہی احمقانہ حرکتیں کیوں نہ ہوں ہمدردی کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی اشتعال انگیز حرکتوں کی بنا پر غصے میں نہ آئے، بلکہ یوں سمجھے کہ جس طرح سے ایک مریض ہوتا ہے، ڈاکٹر اس کے پٹی کرنے لگا ہے، یا اس کے زخم کو ٹھیک کرنے لگا ہے، تو اس کا چمڑا کاٹتا ہے یا دوائی لگاتا ہے جو اس کو چبھتی ہے، اکثر و بیشتر آپ نے دیکھا ہو گا کہ بے عقل یا کم عمر مریض جو ہوا کرتے ہیں یعنی بچے، وہ ڈاکٹر کو گالیاں دینے لگ جاتے ہیں، ڈاکٹر کو ماں بہن کی گالیاں تک دیتے ہیں، جس وقت ڈاکٹر ان کو پٹی وغیرہ کرتا ہے تو بچے کو جب تکلیف ہوتی ہے تو تکلیف ہونے کی صورت میں وہ ڈاکٹر کو گالیاں دینے لگ جاتا ہے، اب اگر ڈاکٹر نادان قسم کا ڈاکٹر ہو، وہ کہے کہ اچھا! تو گالیاں دیتا ہے تو میں نشتر اور تھوڑی سی گہری کر دیتا ہوں، یا زخم کو اور فراخ کر دے، تو وہ اپنے فن کا ماہر نہیں ہے، ڈاکٹر کا کام یہ ہوتا ہے کہ مریض کو مریض سمجھے، وہ اگر گالیاں بھی دیتا ہے تو اس کی گالیوں کو ہنس کے برداشت کرے، اور اپنے قاعدے اور فن کے مطابق مریض کا علاج کرے، انبیاء علیہم السلام کا جو طریقہ ہمارے سامنے ذکر کیا گیا، وہ یہی ہے۔

انبیاء علیہم السلام کے طرز و طریق کی روشنی میں "جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ" کی تفسیر

جدالِ حسن کی تفسیر بھی انبیاء علیہم السلام کے طریقے سے ہی ہوتی ہے، "اچھے طریقہ کے ساتھ ان سے جھگڑا کرو" جھگڑنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ تم نے ایک دعویٰ پیش کیا، اس کے اوپر دلائل دے دیے، اس کا نفع نقصان سمجھا دیا، ہمدردی اور خیر خواہی کا

اظہار کر دیا، لیکن وہ آگے سے بدتمیزیاں کرتا ہے، یا آگے سے کچھ بے ڈھنگے سے اِشکالات پیش کرتا ہے، کوئی ایسا اِشکال پیش کرے جو ناشی عن دلیل ہے وہ بھی، اور کوئی ایسا اشکال پیش کرے جو محض بے عقلی کی بات ہو یا آگے سے تمسخر اور استہزا کرے، تو اس کو اچھے طریقے سے جواب دو، جدال حسن کا مطلب یہ ہے کہ تم مقابلے میں مشتعل نہ ہو جاؤ، انبیاء علیہم السلام کی زندگی اس آیت کی مکمل تفسیر ہے، انبیاء علیہم السلام کے جو مدمقابل تھے وہ اِستہزا بھی کرتے تھے، اور گالیاں بھی دیتے تھے، نوح علیہ السلام کا ذکر آپ کے سامنے متعدد آیات میں آیا کہ ساڑھے نوسو سال انہوں نے قوم کو تبلیغ کی، کتنا صبر آزما زمانہ ہے، قوم آگے سے کہتی ہے اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ...... اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ سَفَاهَةٍ...... اِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ،[1] ہم تجھے جھوٹوں میں سے سمجھتے ہیں، تُو تو گمراہی میں ہے، تُو تو بے عقلی میں ہے، یہ لفظ قوم کی طرف سے عام طور پر نقل کیے گئے ہیں انبیاء علیہم السلام کے جواب میں، انبیاء علیہم السلام الٹ کے ان کو جو جواب دیتے ہیں وہ کتنا پیارا ہے کہ لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ، لَيْسَ بِيْ سَفَاهَةٌ، میں اللہ کا رسول ہوں، میرے اندر کوئی نادانی کی بات نہیں، میرے اندر کوئی گمراہی کی بات نہیں، میں تمہارے ساتھ خیر خواہی کرتا ہوں، تمہارے نفع کی بات تمہیں بتاتا ہوں، تو انبیاء علیہم السلام کی طرف سے اشتعال انگیزی بالکل نہیں ہوتی، اور نہ ان کی اشتعال انگیزی کے مقابلے میں یہ تیز ہو جاتے ہیں کہ اس قسم کی باتیں کرنے لگ جائیں، انبیاء علیہم السلام کے جو واقعات نقل کئے گئے ہیں وہ اس آیت کی بہت کھلے لفظوں میں تفصیل ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ آپ کے سامنے سب سے زیادہ مفصل آیا، ان کو اس زمانے کے ایک بدتر شخص کی طرف بھیجا گیا تھا فرعون کی طرف جو خود خدائی کا مدعی تھا، اُس سے زیادہ اخبث اُس دور میں اور کون ہوسکتا تھا، اب موسیٰ علیہ السلام جارہے ہیں تو ان کو ہدایات دی جارہی ہیں: قُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا (طٰہٰ: ۴۴)، دونوں بھائیوں کو کہا جارہا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کو، کہ وہاں جاکے بات نرم لب ولہجہ سے کرنا، اب مخاطب فرعون ہے اور خطاب کرنے والے موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام ہیں، ان دونوں سے کہا جارہا ہے: قُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا: اس کے ساتھ جاکے بات نرم لب ولہجے سے کیجیو، آگے لفظ ہیں لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى: ہوسکتا ہے کہ وہ نصیحت حاصل کرلے یا اس کے دل کے اندر خوف اور خشیت پیدا ہوجائے، تو اِس (جملے) کو مرتب کیا گیا ہے قولِ لیّن پر، درشت بات پر نہیں، ترش اور تلخ بات کے اوپر یہ فائدہ مرتب نہیں ہوتا، قولِ لیّن کے اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ جس وقت تم اسے نرم لب ولہجے سے بات کروگے تو ممکن ہے، ہوسکتا ہے کہ وہ کچھ نصیحت حاصل کرلے، اس میں خوف وخشیت پیدا ہوجائے، اور اگر جاکے اس کے ساتھ سختی سے بات کرنی شروع کردوگے تو وہ سننے کے لئے تیار ہی نہیں ہوگا، پہلے ہی بھڑک اٹھے گا، اور جس وقت وہ پہلے ہی بھڑک اٹھے تو پھر کیسے توقع رکھ سکتے ہو کہ وہ تمہاری بات کو توجہ سے سنے گا اور مان جائے گا۔ سیّد مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ہمارے مبلغین آج کل اس بات کو بھول گئے کہ جن لوگوں کو وہ سمجھانا چاہتے ہیں اُن کے ساتھ طرزِ کلام ایسا اختیار کرتے ہیں کہ وہ پہلے ہی اپنے دل کے دروازے اور کھڑکیاں بند کرکے بیٹھ جاتے ہیں، اُن کا ارادہ سمجھنے کا ہوتا ہی نہیں، کیونکہ ان کا اندازِ گفتگو اور ان کا تفہیم کا انداز ایسا ہے کہ مشتعل ہوکر وہ لوگ پہلے ہی مدِمقابل ہوکر بیٹھ جاتے ہیں، تو انبیاء علیہم السلام کے طریقے میں یہ بات نہیں ہے، نادان نادانیاں کرتے

---

(۱) پہلا جملہ قوم نوح کا ہے۔ دوسرا اور تیسرا جملہ قوم عاد کا ہے۔ اور آگے جواب والا پہلا جملہ نوح علیہ السلام کا ہے، دوسرا ہود علیہ السلام کا ہے۔ دیکھیں سورۃ الاعراف

ہیں، پتھر مارتے ہیں، بُرا بھلا کہتے ہیں، لیکن انبیاء علیہم السلام ہمدردی کے لب ولہجہ کے ساتھ ہی ان کے اشکالات کو دُور کرتے ہیں، بار بار ایک بات کو بیان کرتے ہیں، تو جَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ کے اندر یہ بات ہوگئی کہ ان کی طرف سے کوئی نادانی ہو تو نادانی کے مقابلے میں نادانی نہ کی جائے، اُن کی طرف سے کوئی اشتعال انگیزی ہو تو اس کے مقابلے میں اشتعال انگیزی نہ کی جائے، اگر وہ کوئی اعتراض کرتے ہیں تو اس کو اچھی طرح سے سلجھانے کی کوشش کی جائے، جس میں نفع کی توقع ہو، نقصان کا اندیشہ نہ ہو۔

تو یہ تین باتیں جو ذکر کی گئی ہیں سارے آدابِ تبلیغ انہی کے اندر ہی آجاتے ہیں۔

۱۔اپنے دعوے کو صاف الفاظ میں بیان کیجئے، اس کے اوپر دلائلِ محکمہ ذکر کیجئے، موقع محل کے مطابق بات کیجئے، یہ تو حکمت کے تحت آ گیا۔

۲۔مثالوں کے ساتھ اور واقعات کے ساتھ اس کے نفع نقصان سے آگاہ کیجئے، لب ولہجہ نرم رکھیے، خیر خواہی کا اظہار کیجئے، یہ موعظۂ حسنہ کے تحت آ گیا۔

۳۔اوران کی بدتمیزیوں کو برداشت کرو، ان کے اِشکالات کو سُن کر سنجیدہ طور پر اور ٹھنڈے دل کے ساتھ جواب دینے کی کوشش کرو، ان کی اِشتعال انگیزی کے مقابلے میں اِشتعال انگیزی نہ کرو، تبلیغ کے اندر یہ اُصول نہیں اپنایا جاتا کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دو، یہاں تو اینٹ کھائی جاتی ہیں، پتھر کھائے جاتے ہیں، پتھر کھا کر پھر دُعائیں دی جاتی ہیں اور اچھے لب ولہجے کے ساتھ بات کی جاتی ہے، تب جاکے اس کے اوپر اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں، تو جَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ کے اندر یہ بات آ گئی۔

اور انبیاء علیہم السلام کے واقعات قرآنِ کریم میں جتنے ذکر کیے گئے ہیں وہ سارے کے سارے اس آیت کی تفسیر ہیں۔

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِهٖ: بے شک تیرا ربّ خوب جانتا ہے ان لوگوں کو جو اس کے راستے سے بھٹکے ہوئے ہیں اور وہ خوب جانتا ہے ہدایت پانے والوں کو، یعنی اپنی طرف سے کوشش تم کرو، باقی! کسی کو زبردستی ہدایت پر لے آنا، گمراہی سے نکال دینا یہ تمہارے بس کی بات نہیں ہے، یہ براہِ راست اللہ کے ساتھ تعلق رکھتی ہے، اور اللہ ان لوگوں کو خوب جانتا ہے۔

بدلہ لینے میں برابری کا حکم اور صبر کی ترغیب

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ: اور اگر تم اپنے مدِمقابل کو کوئی سزا ہی دو، اس سے کوئی انتقام لو۔ عاقبَ عِقاب: سزا دینا، اور یہاں بدلہ لینے کے معنی میں ہے، ''اور اگر تم اس سے کوئی بدلہ لینا چاہتے ہو اور اس کی کسی بُرائی کا جواب موقع محل کے مطابق تم ضروری سمجھتے ہو کہ اس کا بُرائی کے ساتھ ہی دیا جائے تو فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ: تو سزا دیا کرو اس کی مثل جو تم سے معاملہ کیا گیا۔ عُوْقِبْتُمْ بِهٖ کے اندر جو عقاب کا لفظ اختیار کیا گیا ہے یہ مشاکلۃً ہے، جو معاملہ تمہارے ساتھ کیا گیا ہے اس کی مثلیت کے ساتھ تم ان کو سزا دے سکتے ہو، اس میں برابری کی رعایت رکھو۔ عُوْقِبْتُمْ کا لفظ مشاکلۃً بول دیا گیا جس طرح سے قرآنِ کریم میں دوسری جگہ ہے جَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا (الشوریٰ:۴۰) جو بدلے کے طور پر معاملہ کیا جائے گا وہ حقیقتاً سیئہ کا مصداق نہیں، وہاں سیئہ کا لفظ مشاکلۃً بولا گیا ہے، بُرائی کا بدلہ بُرائی ہے، حالانکہ بُرائی کے بدلے کے طور پر جو کام کیا جائے اس کو حقیقتاً بُرائی نہیں کہہ سکتے،صورۃً مشابہت کی بنا پر اس

کو سیئہ کے ساتھ تعبیر کر دیا گیا۔ اور عربی کے اندر بھی محاورہ ایسے ہی آتا ہے دِنَّاهُمْ كَمَا دَانُوا، یہ محاورہ حماسہ کے (شروع کے) اندر آپ کے سامنے آیا تھا، دِنَّاهُمْ كَمَا دَانُوا: جیسے انہوں نے ہمیں قرض دیا تھا ہم نے بھی ان کو ویسے ہی قرض دیا، مطلب یہ ہے کہ جیسا انہوں نے ہمارے ساتھ کیا تھا ہم نے ویسے ہی ان کے ساتھ کیا، كَمَا تَدِيْنُ تُدَانُ۔ فَعَاقِبُوْا: پھر تم سزا دیا کرو، بِمِثْلِ مَاعُوْقِبْتُمْ بِهٖ: اس چیز کی مثل کے ساتھ جس کے ساتھ تمہارے ساتھ معاملہ کیا گیا ہے، لیکن یہ مثلیت مقدار کے لحاظ سے انفرادی واقعات میں ہوتی ہے، اور جہاں قومی سطح پر جہاد ہو وہاں مثلیت کی رعایت نہیں رکھی جاتی کہ جتنے انہوں نے ہمارے آدمی مارے ہم بھی اتنے ہی ماریں، اور جتنا نقصان انہوں نے ہمیں پہنچایا ہم بھی اتنا پہنچائیں، وہاں یہ بات نہیں، وہاں تو کوشش کی جاتی ہے کہ ہمیں نقصان کچھ نہ پہنچے اور ان کے اوپر ہم فتح اور غلبہ پالیں، تو اُس کے اَحکام علیحدہ ہیں، جو جماعتی اور قومی سطح پر جہاد ہوا کرتا ہے اس کے اَحکام علیحدہ ہیں، یہ جو مثلیت کی رعایت رکھنی ہے یہ ہوتی ہے شخصی واقعات کے اندر، شخصی طور پر آپ کے ساتھ کسی نے کوئی ایسا معاملہ کرلیا تو اس میں برابری کی رعایت رکھی جائے گی، قتل میں، زخمی کرنے میں، مالی نقصان میں، اور اسی طرح سے گفتگو کے طور پر تکلیف پہنچانے میں برابری کی رعایت رکھتے ہوئے اگر آپ اپنے غصے کو ٹھنڈا کرنا چاہتے ہیں تو یہ ٹھیک ہے، اس کی اجازت ہے، لیکن وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ: لیکن اگر تم برداشت کر جاؤ، لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ: تو پھر صبر کرنے والوں کے لئے یہ بہتر ہے، صبر کرنا بہر حال بہتر ہے۔ لیکن بسا اوقات انسان کی طبیعت میں اس قسم کا اشتعال آجاتا ہے کہ جب تک کچھ نہ کچھ انتقام نہ لے لے اس وقت تک اس کو سکون نہیں آتا، تو شریعت نے طبیعت کی رعایت رکھتے ہوئے برابری کی صورت میں انتقام لینے کی بھی اجازت دی ہے، لیکن صبر بہتر ہے۔

سَرْوَرِ کائنات ﷺ کو خصوصیت کے ساتھ کچھ ہدایات

وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ: یہ خصوصیت کے ساتھ سرورِ کائنات ﷺ کو خطاب ہے، کہ آپ برداشت کریں، صبر کیجئے، نہیں ہے آپ کا صبر مگر اللہ کی توفیق کے ساتھ، وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ: اور ان کے اوپر آپ غم نہ کریں، وَلَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ: اور کسی تنگ دلی میں واقع نہ ہوں، مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ: ان کے مکر وفریب کے سبب سے، جو یہ مکر وفریب کر رہے ہیں ان کی وجہ سے آپ تنگ دل نہ ہوں اور نہ ان کے اس برے طریقے کے اختیار کرنے پر آپ حزن ہی کریں، غم بھی نہ کریں کہ میں انہیں کتنا سمجھاتا ہوں، یہ اچھا راستہ کیوں نہیں اختیار کرتے، ان باتوں میں آپ نہ پڑیے، بس اللہ کی توفیق کے ساتھ صبر کرتے رہیے۔ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا: بے شک اللہ تعالیٰ انہی لوگوں کے ساتھ ہے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں، وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ: اور جو کہ محسن ہوتے ہیں، یعنی ہر کام کو اچھی طرح سے کرتے ہیں، یا اللہ تعالیٰ کو حاضر ناظر سمجھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی عبادت میں لگے رہتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی معیت انہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ
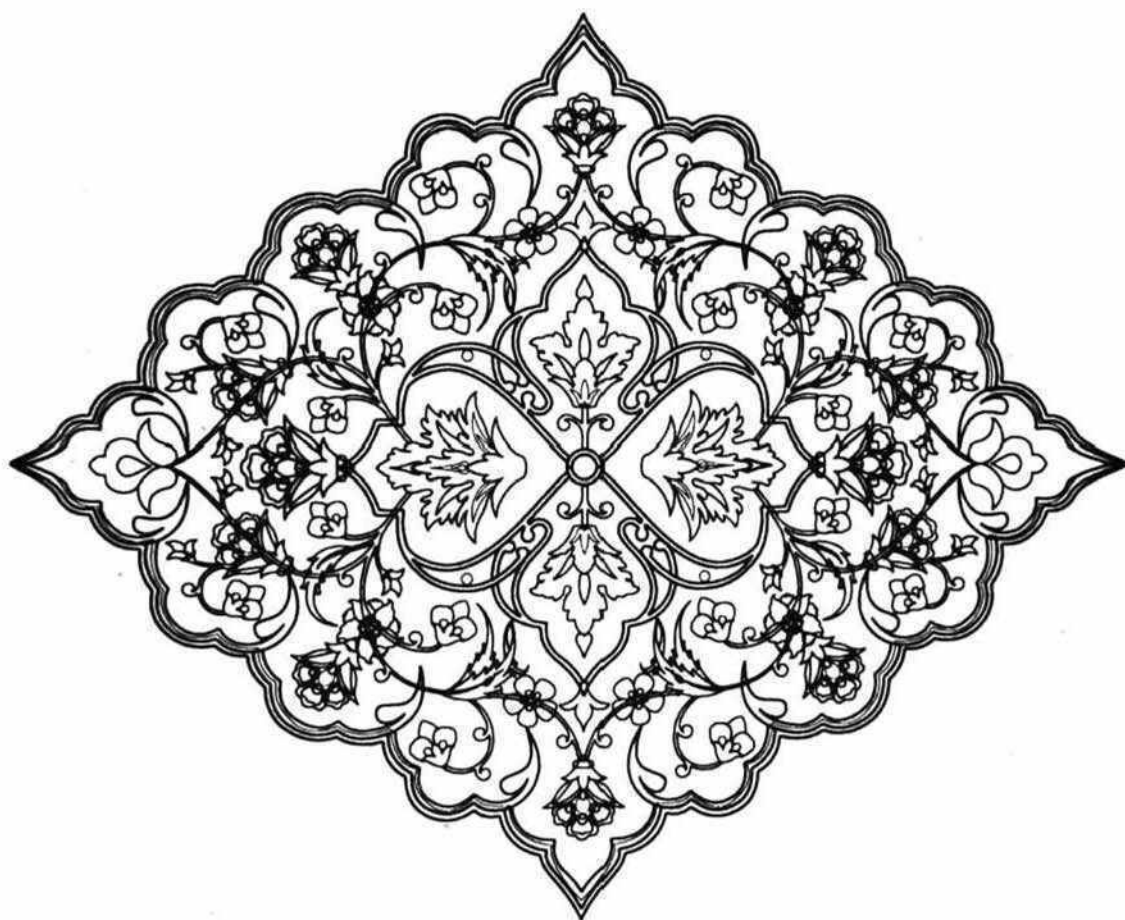
سورۃ بنی اسرائیل

آیاتھا ۱۱۱ ۱۷ سُوْرَۃُ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ مَکِّیَّۃٌ ۵۰ رکوعاتھا ۱۲

سورۂ بنی اسرائیل مکہ میں اتری اور اس کی ایک سو گیارہ آیتیں ہیں بارہ رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ

پاک ہے وہ جس نے چلایا اپنے بندے کو رات کے ایک حصے میں مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک جس کے

بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ① وَاٰتَیْنَا مُوْسَی

اردگرد ہم نے برکت دی ہے تاکہ ہم دکھائیں اس کو اپنی بعض نشانیاں، بے شک وہ سننے والا دیکھنے والا ہے ① اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو

الْکِتٰبَ وَجَعَلْنٰہُ ھُدًی لِّبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِیْ وَکِیْلًا ② ؕ ذُرِّیَّۃَ مَنْ

کتاب دی اور اس کتاب کو بنی اسرائیل کے لئے راہنمائی کا ذریعہ بنایا، کہ نہ بناؤ تم میرے علاوہ کسی کو کارساز ② اے ان لوگوں کے بچو

حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ؕ اِنَّہٗ کَانَ عَبْدًا شَکُوْرًا ③ وَقَضَیْنَآ اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ

جن کو ہم نے نوح علیہ السلام کے ساتھ اُٹھایا تھا، نوح علیہ السلام بہت شکر گزار بندہ تھا ③ اور ہم نے بنی اسرائیل کی طرف اپنا یہ فیصلہ پہنچا دیا

فِی الْکِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِی الْاَرْضِ مَرَّتَیْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا کَبِیْرًا ④ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ

کتاب میں کہ البتہ ضرور فساد کرو گے تم زمین میں دو مرتبہ اور تم سرکشی اختیار کرو گے بہت زیادہ ④ جب آ جائے گا ان دونوں

اُوْلٰىھُمَا بَعَثْنَا عَلَیْکُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِیْ بَاْسٍ شَدِیْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ

مرتبوں میں سے پہلا وعدہ تو مسلط کر دیں گے تمہارے اُوپر اپنے بندے جو سخت لڑائی والے ہوں گے پھر وہ گھروں کے درمیان میں گھس

الدِّیَارِ ؕ وَکَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا ⑤ ثُمَّ رَدَدْنَا لَکُمُ الْکَرَّۃَ عَلَیْھِمْ وَاَمْدَدْنٰکُمْ بِاَمْوَالٍ

جائیں گے اور اللہ تعالیٰ کا وعدہ پورا ہو کر رہے گا ⑤ پھر لوٹا دیں گے ہم تمہارے لیے غلبہ اُن پر اور امداد دیں گے تمہیں مالوں کے ساتھ

وَّبَنِیْنَ وَجَعَلْنٰکُمْ اَکْثَرَ نَفِیْرًا ⑥ اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ

اور بیٹوں کے ساتھ اور کر دیں گے ہم تمہیں اکثر از روئے جماعت کے ⑥ (اور ہم نے یہ بھی کہا) اگر تم اچھا کام کرو گے تو اچھا کام کرو گے

لِاَنْفُسِكُمْ ۚ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ؕ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ
اپنے فائدہ کے لئے اور اگر تم بُرا کام کرو گے تو اپنے لیے کرو گے، جب آ جائے گا پچھلی مرتبہ کا وعدہ (تو ہم تم پر پھر اپنے بندے مسلط
لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ
کریں گے) تاکہ وہ تمہارے چہرے بگاڑ دیں اور تاکہ داخل ہو جائیں وہ مسجد میں جس طرح سے کہ داخل ہوئے تھے پہلی مرتبہ
وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا ۞ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ ۚ وَاِنْ
اور تاکہ وہ تباہ کر دیں ہر اس چیز کو جس پر وہ غلبہ پائیں اچھی طرح سے تباہ کرنا ⑦ قریب ہے کہ تمہارا رَبّ تم پر رحم کرے اور اگر
عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا ۞
تم پھر لوٹے پہلی حالت کی طرف تو ہم بھی لوٹ آئیں گے، اور ہم نے جہنّم کو کافروں کے لئے قید خانہ بنایا ⑧

تفسیر

ماقبل سورۃ سے ربط

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ سورۂ بنی اسرائیل مکہ میں اتری، اور اس کی ایک سو گیارہ آیتیں ہیں، بارہ رکوع ہیں۔ پچھلی سورۃ یعنی سورۂ نحل کے اختتام پر اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ذکر کیا گیا تھا، کہ اللہ تعالیٰ کی معیت متقین کے ساتھ ہے اور محسنین کے ساتھ ہے، اِس سورۃ کی اِبتدا میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے سرورِ کائنات ﷺ کو جو ایک معجزہ دیا گیا جس کو معراج یا اِسراء کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں یہ مذکور ہے، جس میں اللہ تعالیٰ کی نصرت اور معیت اچھی طرح سے نمایاں ہے۔ پچھلی سورۃ میں بنی اسرائیل کا ذکر کچھ اِجمالاً آیا تھا بعض بعض باتوں میں، جیسے قریب کے رکوع میں گزرا تھا وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا مَا قَصَصْنَا عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ ۚ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ، اور اسی طرح اس (آخری) رکوع کے اندر تھا اِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ، اس میں بھی انہی اہل کتاب کا تذکرہ تھا، آنے والی سورۃ میں اُن کے حالات کو کچھ زیادہ کھول کر بیان کیا گیا ہے۔

واقعۂ اِسراء اور مسجدِ اَقصیٰ کا محلِ وقوع

سب سے پہلی آیت میں سرورِ کائنات ﷺ کے واقعۂ اِسراء کا ذکر ہے: سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا: پاک ہے وہ جس نے چلایا اپنے بندے کو رات کے ایک حصے میں۔ بِعَبْدِهٖ: اپنے بندے کو۔ لَيْلًا یہ مفعول فیہ ہے اَسْرٰى کا، اَسْرٰى اِسراء: اس کے اندر خود بھی رات کو چلانے والا معنی ہے، لیکن لَيْلًا چونکہ آگے ذکر کر دیا گیا اس لئے اَسْرٰى کو رات کے معنی سے مجرد کر لیا جائے گا، اور لَيْلًا کو صریح طور پر اس لئے ذکر کر دیا کہ نکرہ تقلیل کے لئے ہے، جس کا معنی ہو گا کہ رات

کے کچھ حصے میں۔ ''مسجدِ حرام سے مسجدِ اَقصیٰ تک'' مسجدِ حرام سے تو وہ مسجد مراد ہوئی جو مکہ معظمہ میں بیت اللہ کے ارد گرد ہے، اور مسجدِ اَقصیٰ سے مراد بیت المقدس ہے، جو پُرانے جغرافیہ کے اعتبار سے شام میں ہے، اور موجودہ جغرافیہ کے اعتبار سے پہلے اُردن میں تھا، اور اِس وقت اسرائیل کے قبضے میں ہے، جغرافیائی حیثیت کے ساتھ اب یوں کہہ سکتے ہیں کہ بیت المقدس جو کہ اسرائیل میں ہے یا جو پہلے اُردن میں تھا، اور اُس سے پہلے اِس کی نسبت شام کی طرف ہے، کیونکہ یہ سارے کا سارا علاقہ ''شام'' کہلاتا تھا۔ ''اَقصیٰ'' کا لفظی معنی ہوتا ہے: بعید، تو یہ مسجد چونکہ اہلِ مکہ سے بہت دُور تھی، چالیس دِن کا سفر لکھا ہے مکہ معظمہ سے مسجدِ اَقصیٰ کا اس وقت جبکہ قافلے پیدل جایا کرتے تھے، اس کا لفظی معنی بنتا ہے: دُور والی مسجد۔ الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ: ایسی مسجد جس کے ارد گرد ہم نے برکت دی ہے، لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا: یہ انتہا کی غایت آگئی، اپنے بندے کو چلایا راتوں رات، لے گیا راتوں رات تاکہ ہم دکھائیں اس کو اپنی بعض نشانیاں، اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ: بے شک وہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔

واقعۂ اِسراء و معراج میں تاریخی اِختلاف، ''اِسراء'' اور ''معراج'' میں فرق

سرورِ کائنات کو اللہ تعالیٰ نے یہ معجزہ جو دیا تھا اس بات پر تو اتفاق ہے کہ یہ مکہ معظمہ میں پیش آیا، باقی مکہ معظمہ میں کون سے سن نبوّت میں پیش آیا؟ اس میں اختلاف ہے، اسی طرح سے مہینے میں بھی اختلاف ہے، کسی نے ربیع الثانی لکھا ہے، کسی نے رجب لکھا ہے، تو چونکہ اس وقت تاریخ نویسی کا رواج نہیں تھا، تو یہ باتیں تاریخ اور دِن کے تعین کے ساتھ ہمارے سامنے واضح نہیں ہیں، محدثین نے بھی اس سلسلے میں کوئی خاص فیصلہ نہیں کیا، اور یہ عام طور پر ایسے ہی مشہور ہے جس کی کوئی پختہ بنیاد نہیں کہ ستائیس رجب کو یہ واقعہ پیش آیا، جس طرح سے ستائیس رجب کی روایت عوام میں مشہور ہے اسی طرح سے کتابوں کے اندر اور تاریخیں بھی نقل کی گئی ہیں، اس لئے ہم قطعی طور اور یقینی طور پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ واقعہ رجب میں ہی پیش آیا اور ستائیس رجب کو پیش آیا، اور نہ اس قسم کی تاریخوں کی صحابہ کے دور میں کوئی خاص اہمیت ہی تھی کہ واقعے کی تحقیق کریں کہ کون سے دِن میں پیش آیا، نہ وہ دِن مناتے تھے، نہ وہ تاریخ مناتے تھے، جس کی بنا پر ان چیزوں کا اہتمام نہیں کیا گیا، یہ رُسوم اور یہ بدعات بہت بعد میں شروع ہوئیں، اس لئے لوگوں نے ظن اور تخمین کے ساتھ اوقات متعین کر کے پھر ان میں اپنی طرف سے کچھ رُسوم متعین کر لیں، صحابہ کے دور میں یہ بات نہیں تھی۔ بہر حال ہجرت سے یہ پہلے پیش آیا، ایک سال پہلے پیش آیا، تین سال پہلے پیش آیا، پانچ سال پہلے پیش آیا، یہ مختلف اقوال ہیں۔ اس سفر کے دو حصے ہیں، ایک مکہ معظمہ سے لے کے بیت المقدس تک جس کا ذکر یہاں صراحتاً ہے، اس کو ''اِسراء'' سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور ایک بیت المقدس سے ساتوں آسمانوں کے اوپر جہاں تک اللہ کو منظور تھا سرورِ کائنات کو لے جایا گیا، سدرۃ المنتہیٰ اور اس سے بھی آگے، اس کو ''معراج'' کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے، پھر توسعاً سارے سفر پر بھی ''اسراء'' کا لفظ بول دیتے ہیں، اور ایسے ہی سارے سفر کے اوپر ''معراج'' کا لفظ بھی بول دیتے ہیں۔ یہ سفر جو اللہ تعالیٰ تبارک وتعالیٰ نے کروایا تو اس میں دو مرکزوں میں حضور ﷺ کی حاضری ہوئی، مسجدِ حرام میں تو خود موجود ہی تھے پہلے ہی، یہاں سے آپ کو لے جایا گیا مسجدِ اَقصیٰ میں جو انبیائے سابقین ﷩ کا قبلہ تھا اور اس وقت وہ اہلِ کتاب کے تسلط میں تھا، وہاں انبیاء ﷩ کے مجمع میں

سرورِ کائنات ﷺ تشریف لے گئے اور وہاں آپ نے امامت کروائی اور سارے نبی آپ کے مقتدی ہوئے، جس میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے غالباً اس بات کی طرف اشارہ کردیا کہ اب جو نبی آنے والا ہے یہ دونوں قبلوں کا جامع ہے اور دونوں قبلوں کی برکات اس کو حاصل ہوں گی اور اِمامت وقیادت بیت المقدس کے متولیوں سے اب مسجدِ حرام کی طرف منتقل ہوجائے گی، اس بات کی طرف اشارہ کردیا گیا، جس میں اس بات کو بھی واضح کردیا گیا کہ پہلے علمی طور پر جو قیادت وسیادت یہود ونصاریٰ کو حاصل ہے اب ان کو منسوخ کیا جارہا ہے اور یہ قیادت اب بنی اسماعیل کی طرف منتقل کی جارہی ہے، تو سرورِ کائنات ﷺ کے واقعے میں یہ ایک واضح بات موجود تھی، اللہ تبارک وتعالیٰ نے گویا کہ لوگوں کے سامنے اس بات کی بنیاد رکھ دی کہ اب حضور ﷺ ہی دونوں قبلوں کے جامع ہوں گے، اور انبیاء علیہم السلام جتنے ہیں وہ سارے کے سارے آپ کے مقتدی ہوئے، جس میں اشارہ کردیا کہ انبیاء کے ماننے والے جتنے ہیں ان کے لئے ضروری ہے کہ اب وہ آپ کی اِمامت کو قبول کریں، اس طرح سے حضور ﷺ کی جامعیت اور عمومِ بعثت نمایاں ہوگئی۔

واقعۂ معراج حالتِ بیداری میں پیش آیا......اَرضِ انبیاء کی برکات

سُبۡحٰنَ کے لفظ کے ساتھ اس کو جو شروع کیا گیا تو اس بات کی طرف اشارہ کردیا کہ اس کو اللہ کی قدرت سے بعید نہ سمجھو، اللہ تعالیٰ ہر قسم کے عجز سے اور ہر قسم کی کمزوری سے پاک ہے، اس کو ہر قسم کی قدرتیں حاصل ہیں، وہ جو کچھ کرنا چاہے کرسکتا ہے۔ اور اس تیز رفتاری کے ساتھ لے جانا، تیز رفتاری کے ساتھ لے آنا اُس زمانے میں اگر قابلِ تعجب ہو تو ہو، آج کوئی قابلِ تعجب نہیں، کیونکہ آج سائنسی تحقیق کے ساتھ یہ بات ثابت ہوگئی کہ تیز رفتاری کی حد ہی کوئی نہیں، جتنی تیز رفتاری یہ تجویز کرتے ہیں اگلی دفعہ اس سے بھی آگے تجویز ہوجاتی ہے، تو اللہ کی قدرت جو کہ ان سب چیزوں کا خالق ہے اس سے بہت زیادہ وسیع ہے، وہ اگر ایک لمحہ کے اندر بھی ساری دنیا کا چکر لگوادے اور آسمانوں پر بھی لے جائے تو اس میں کوئی بُعد نہیں۔ اور پھر اُمت کا اس بات کے اوپر اتفاق ہے کہ یہ واقعہ سرورِ کائنات ﷺ کو بیداری میں پیش آیا، یہ خواب کی بات نہیں ہے، اور اگر یہ بات خواب کی ہوتی تو اس کو اتنی اہمیت سے نقل نہ کیا جاتا، اس قسم کے خواب تو اکثر وبیشتر لوگ دیکھتے ہی رہتے ہیں کہ بیٹھے یہاں ہیں، رات کو دہلی پہنچ گئے، اور مختلف قسم کے تماشے دیکھ کر واپس آگئے، اور انسان کی روح خواب کی حالت میں کہاں کہاں پھرتی رہتی ہے، پھر آپ عجیب وغریب قسم کا خواب بیان کردیں، ساتوں سمندروں کو تیر کر عبور کرلیں، ہوا کے اندر اڑتے ہوئے زمین کے سات چکر لگالیں خواب میں، جس کے سامنے بھی آپ بیان کریں گے کوئی شخص آپ کی تکذیب نہیں کرے گا، وہ کہے گا کہ خواب میں اس قسم کے واقعات ہوتے رہتے ہیں، تو سرورِ کائنات ﷺ نے جب اس واقعہ کو نمایاں کیا تو قوم تو تکذیب پہ تُل گئی، استہزاء اور تمسخر کرنے لگ گئے، یہ خود علامت ہے اس بات کی کہ حضور ﷺ نے اس واقعہ کو بیداری کا واقعہ بنا کر ذکر کیا ہے، یہ خواب کا واقعہ نہیں تھا۔ باقی تفصیل آپ کے سامنے روایات میں آگئی، احادیث کے اندر قصہ مفصل طور پر مذکور ہے، یہاں اس کو ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ ''پاک ہے وہ جو لے گیا اپنے بندے کو راتوں رات مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک۔'' اَلَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَہٗ: جس کے اردگرد ہم نے برکت دے

رکھی ہے، اس برکت سے برکت ظاہری بھی مراد ہے اور برکت باطنی بھی، برکت ظاہری تو یہ ہے کہ وہ علاقہ بہت آباد ہے، ہر قسم کی نعمتیں اس کے اندر موجود ہیں، ہر قسم کی کھیتی، پھل، فروٹ، بہت پیداوار ہے، وہاں کے لوگ خوش حال ہیں، جیسے کہ اسرائیلی روایات میں اس کو دودھ اور شہد کی سرزمین ذکر کیا گیا، جس سے اس کے رہنے والوں کی خوش حالی کی طرف ہی اشارہ ہے۔ اور باطنی برکت اس میں یہ ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام کا مسکن اور مدفن ہے کہ جتنی کثرت کے ساتھ انبیاء علیہم السلام اس علاقے کے اندر آئے ہیں اتنی کثرت کے ساتھ کسی اور علاقے میں نہیں آئے، ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کا علاقہ یہی ہے، اور آپ کی اولاد یہیں پھیلی، اور بہت کثرت کے ساتھ اللہ کی وحی یہیں اترتی رہی، اس لیے اس کو باطنی برکت بھی حاصل ہے۔ برکت کا مفہوم ہوتا ہے نفع، خیر کثیر، یعنی باطنی طور پر بھی اللہ نے یہاں بہت منافع رکھے ہیں اور ظاہری طور پر بھی اس میں اللہ نے انسانوں کے لئے بہت برکات اور بہت خیر اس کے اندر رکھی ہے۔ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا: یہ غایت ذکر کردی کہ بندے کو کیوں چلایا، اس لئے چلایا تا کہ ہم اس کو اپنی نشانیاں دکھائیں، یہ سیر کرادی ملکوتِ ظاہر کی، اللہ تعالیٰ نے زمین کی نشانیاں بھی دکھائیں اور آسمان کی نشانیاں بھی دکھائیں، روایات میں تفاصیل موجود ہیں، کہ برزخ کے واقعات اس سفر میں اللہ تعالیٰ نے دکھائے، کہ منکرین زکوٰۃ کا یہ انجام تھا، عہد کی خلاف ورزی کرنے والوں کا یہ انجام تھا، جھوٹ بولنے والوں کا یہ انجام تھا، برزخ کے واقعات بھی دکھائے، اور اسی طرح سے آسمان پر جنت ودوزخ کے نمونے دیکھے، بیت المعمور اور اس قسم کی اللہ تعالیٰ کی قدرت کی بہت ساری آیات سامنے آئیں۔ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ: وہ سننے والا دیکھنے والا ہے، اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ کردیا کہ مسجدِ حرام ہو یا مسجدِ اقصیٰ یہ دونوں اللہ کے گھر ہیں، اللہ کی طرف منسوب ہیں، اور ان دونوں کے اندر بسنے والوں نے ان گھروں کو جس مقصد کے لئے بنایا گیا تھا اس کے تلف کردیا ہے، مشرکینِ مکہ نے بھی اس خانۂ خدا کو جو کہ توحید کے نمایاں کرنے کے لئے بنایا گیا تھا اس کو شرک کا گڑھ بنادیا، اور اسی طرح سے مسجدِ اقصیٰ کے اندر بسنے والے جتنے تھے وہ بھی سب خائن ہوگئے، بددیانت ہوگئے، انہوں نے دین کو دنیا کمانے کا ذریعہ بنالیا، اپنی طرف سے من گھڑت قصے بنا کے لوگوں کو گمراہ کرنے لگ گئے، تو ان گھروں کا مالک اللہ تعالیٰ سننے والا ہے دیکھنے والا ہے، ایسا نہیں کہ اس کو خبر ہی نہیں کہ نہ وہ سنتا ہے اور نہ کوئی حال دیکھ رہا ہے، اس لئے اب وقت آگیا ہے کہ اپنے ان دونوں گھروں کو وہ ان بددیانتوں سے، خائنوں سے، مشرکوں سے، بددینوں سے پاک کروائے گا، اور ایسے لوگوں کو ان کے اوپر تسلط دے گا جو کہ ان گھروں کے مقصد کے مطابق ان کو آباد کریں گے، اور اللہ تعالیٰ کا نام اجاگر ہوگا، اور یہ عبادت خانے اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے استعمال ہوں گے، اللہ تعالیٰ کے سامنے سارے حالات ہیں، وہ سب کی باتیں سن رہا ہے اور سب کے حالات کو دیکھ رہا ہے۔ بہرحال اس قسم کی حکمتوں اور مصلحتوں کے تحت اللہ تبارک وتعالیٰ نے سفر کروایا۔

گزشتہ تاریخ کا حوالہ دے کر بنی اسرائیل کو تنبیہ

اب چونکہ اس میں مسجدِ اقصیٰ کا ذکر آیا ہے، اور مسجدِ اقصیٰ بنی اسرائیل کے تسلط میں تھی، اس لئے یہاں سے اب کلام منتقل ہو رہا ہے بنی اسرائیل کی طرف، وَاٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ: اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی اور اس

کتاب کو بنی اسرائیل کے لئے ہدایت بنایا، راہنمائی کا ذریعہ بنایا، اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا: یہ بات کتاب کے اندر اچھی طرح سے نمایاں کی گئی کہ میرے علاوہ کسی دوسرے کو کارساز نہ بناؤ، یہ بنیادی تعلیم ہے کتاب اور اس ہدایت کی جو کہ اس کتاب کی شکل میں بنی اسرائیل کو دی گئی تھی، کہ نہ بناؤ تم میرے علاوہ کسی کو کارساز۔ ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ: یہ منادیٰ ہے، اے اولاد ان لوگوں کی جن کو ہم نے نوح کے ساتھ اٹھایا! جن کو ہم نے نوح کے ساتھ کشتی میں اٹھایا ان لوگوں کی اولاد، ان کو خطاب کر کے کہا جا رہا ہے کہ اے ان لوگوں کی بچو! جن کو ہم نے نوح کے ساتھ اٹھایا تھا، تمہیں یہ بات کہی جا رہی ہے کہ لَا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا: میرے علاوہ کسی دوسرے کو کارساز نہ بناؤ، اس میں اشارہ کر دیا نوح علیہ السلام کی تاریخ کی طرف، کہ نوح کے مخاطبین بھی شرک کے اندر مبتلا تھے، اور نوح علیہ السلام نے ان کو بہت سمجھایا لیکن وہ نہیں سمجھے تو ان کو ڈبو دیا گیا، ہلاک کر دیا گیا، اور جو نوح علیہ السلام کے ماننے والے تھے ان کو کشتی میں سوار کر کے نجات دلا دی گئی، یہ سارے کا سارا واقعہ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ کے الفاظ کے اندر سمیٹ دیا گیا، ظاہر کر دیا گیا کہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کی مخالفت کرنے والوں کا انجام کیا ہوتا ہے اور انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کو قبول کرنے والوں کا انجام کیا ہوتا ہے، اور تم اس واقعے کو یاد کرو، تم انہی لوگوں کی اولاد ہو جو حق کو قبول کرنے کی بنا پر بچے تھے اور ان کو ڈبویا نہیں گیا، تو اب تمہیں وہ بات یاد دلائی جا رہی ہے کہ میرے علاوہ کسی دوسرے کو کارساز نہ بناؤ۔ اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا: نوح علیہ السلام بہت شکر گزار بندہ تھا، اور تم بھی ان کی اولاد میں ہو، تو تمہیں بھی اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے، اور یہ جو تم نے ناشکری اختیار کر لی کہ کھاتے ہو اللہ کا اور گاتے ہو دوسرے کا، یہ مناسب نہیں ہے۔

خلاصۂ آیات

وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ: قضیٰ فیصلہ کرنے کو کہتے ہیں اور جس وقت اس کا صلہ اِلیٰ آجائے تو اس کے اندر ابلاغ والا معنی مضمر ہو جاتا ہے، تو قَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ کا مطلب یہ ہوا کہ ہم نے فیصلہ کر کے بنی اسرائیل کو اس بارے میں اطلاع دے دی، ''ہم نے بنی اسرائیل کی طرف اپنا یہ فیصلہ پہنچا دیا کتاب میں'' کتاب سے توراۃ بھی مراد ہو سکتی ہے اور دیگر صحیفے جو ان کے انبیاء علیہم السلام کے اوپر اترے تھے وہ بھی مراد ہو سکتے ہیں، اللہ کی طرف سے جو کتاب بھی اتری چاہے وہ مستقل کتاب کی شکل میں آئی جس طرح سے توراۃ، انجیل اور زبور ہیں، یا مختلف صحیفوں کی شکل میں آئی، جو لکھی ہوئی باتیں اللہ کی طرف سے آئی ہیں ان کے اندر یہ بات واضح کر دی گئی تھی اور فیصلہ کر کے ان تک یہ پہنچا دی گئی تھی، ''ہم نے بنی اسرائیل تک صاف صاف بات پہنچا دی کتاب میں'' لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ: وہ بات یہ تھی کہ البتہ ضرور فساد کرو گے تم زمین میں دو مرتبہ، وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا: اور تم سرچڑھو گے، سرکشی اختیار کرو گے بہت زیادہ، علو اختیار کرو گے بہت بڑا علو، یعنی بہت سرکشی اختیار کرو گے، سرچڑھو گے، فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا: اب یہ دو دفعہ فساد کرنے کی پیش گوئی کی گئی اور اس پیش گوئی کے مطابق قرآن کریم کے اترنے سے پہلے پہلے فساد ہوا اور دونوں دفعہ بنی اسرائیل کو سزا ہوئی، اس لئے آگے جو آیات آ رہی ہیں مترجمین نے اس میں دونوں طریقے اختیار کیے ہیں، بعض

نے مستقبل کے طور پر ترجمہ کیا، تو گویا کہ پچھلا مضمون نقل کیا جارہا ہے کہ یہ بات ان کو بتائی گئی تھی۔ اور بعض نے اس کو ماضی کے ساتھ تعبیر کیا چونکہ واقعہ آچکا تھا تو اس لئے قرآنِ کریم میں ان واقعات کی یاددہانی کرائی جارہی ہے، ترجمہ دونوں طرح سے ٹھیک ہے، کیونکہ اول پیش گوئی کی گئی تھی اور بعد میں قرآنِ کریم اترنے سے پہلے وہ واقعات پیش بھی آگئے، اس لیے ماضی کے واقعات کی یاددہانی کے طور پر یہ آیات ہوں تو بھی ٹھیک ہے، اور پہلا مضمون نقل کیا جارہا ہو پیش گوئی کے طور پر تو بھی یہ بات ٹھیک ہے، مستقبل کے طور پر ترجمہ کریں گے تو یوں گا ''جس وقت ان دونوں مرتبوں میں سے پہلی مرتبہ کے وعدے کا وقت آجائے گا'' فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا: جب آجائے گا ان دونوں مرتبوں میں سے پہلا وعدہ، پہلے فساد کرنے اور اس کے اوپر سزا دینے کا وعدہ، وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا کا یہ مطلب ہے، کیونکہ جب فساد کریں گے تو اس کے ضمن میں گویا کہ یہ خبر بھی ہے کہ دو دفعہ پھر تمہیں پیٹا جائے گا، تمہیں تباہ کیا جائے گا، تمہارے اوپر عذاب آئے گا، لَتُفْسِدُنَّ کے اندر یہ بات بھی ہے کہ جب یہ بتادیا گیا کہ تم دو مرتبہ فساد کرو گے تو اس کے ساتھ اشارہ یہ بھی ہے کہ دونوں مرتبہ ہی اللہ کی گرفت میں آؤ گے، ''جب ان دونوں مرتبوں میں سے پہلا وعدہ آجائے گا'' بَعَثْنَا عَلَیْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ: ہم مسلط کردیں گے تمہارے اوپر اپنے بندے، اُولِیْ بَاْسٍ شَدِیْدٍ: جو سخت لڑائی والے ہوں گے، فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّیَارِ: پھر وہ گھروں کے درمیان میں گھس جائیں گے، وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا: اور اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہو کر رہے گا، پورا ہو کر رہے گا، اللہ تعالیٰ کا وعدہ مفعول ہے، یعنی جو اللہ کی طرف سے وعدہ ہو جائے پھر اس کے مطابق کام ہو کے رہتا ہے۔ یہ تو مستقبل کے طور پر ترجمہ ہوجائے گا، اور ماضی کے طور پر کریں گے تو یوں ہوگا ''جب آیا ان دونوں مرتبوں میں سے پہلی مرتبہ کا وعدہ تو مسلط کردیے ہم نے تمہارے اوپر اپنے بندے سخت لڑائی والے جو گھس گئے گھروں کے درمیان میں اور اللہ تعالیٰ کا وعدہ پورا کیا ہوا ہے'' ماضی کے طور پر یوں ترجمہ ہو جائے گا۔ ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَیْهِمْ: یہاں بھی اسی طرح سے ترجمہ مستقبل کے طور پر کرو گے تو معنی یوں ہوجائے گا ''پھر لوٹائیں گے ہم تمہارے لئے غلبہ تمہارے مخالفین پر'' کرۃ: غلبہ۔ ''پھر لوٹا دیں گے ہم تمہارے لیے غلبہ ان پر''، وَاَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِیْنَ: اور امداد دیں گے تمہیں مالوں کے ساتھ اور بیٹوں کے ساتھ، اور کردیں گے ہم تمہیں اکثر از روئے جماعت کے، از روئے افراد کے، تمہارے افراد بڑھا دیں گے اور تمہاری تعداد بہت زیادہ ہوجائے گی، تو مستقبل کے طور پر ترجمہ یوں ہوجائے گا۔ اور ماضی کے طور پر ترجمہ یوں ہوگا کہ ''پھر لوٹا دیا ہم نے تمہارے لئے غلبہ تمہارے مخالفین پر، اور مدد دی ہم نے تمہیں مالوں کے ساتھ اور بیٹوں کے ساتھ، اور بنایا ہم نے تمہیں اکثر از روئے افراد کے'' تمہاری تعداد اور تمہاری نفری بڑھادی۔ اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ: اور ہم نے تمہیں یہ بھی کہہ دیا کہ اگر تم اچھا کام کرو گے تو اچھا کام کرو گے اپنے فائدہ کے لئے، وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا: اور اگر تم نے بُرا کام کیا تو اپنے لئے کیا، اگر تم نے برائی کی تو اپنے لیے کی، اگر تم بُرا کام کرو گے تو اپنے لیے کرو گے، اچھائی کرو گے تو اپنے لیے کرو گے، فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ: جب آجائے گا پچھلی مرتبہ کا وعدہ، یہ مستقبل کے طور پر ترجمہ ہے، لِیَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ: لام کا متعلق یہاں محذوف ہے، کہ ہم نے پھر تم پر اپنے بندے مسلط کردیئے، یا جس وقت پچھلا وعدہ آجائے گا تو ہم تم پر پھر اپنے بندے مسلط کریں گے لِیَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ: تاکہ وہ تمہارے چہرے بگاڑ دیں، مار مار کے تمہاری شکلیں ہی بگاڑ دیں،

لِیَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ: تاکہ تمہارے چہروں کو برا کردیں، وَلِیَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ: اور تاکہ داخل ہوجائیں وہ مسجد میں، كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ: جس طرح سے کہ داخل ہوئے تھے پہلی مرتبہ، یہاں داخل ہونا بطور فساد کے ہے، وَّلِیُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِیْرًا: اور تاکہ وہ تباہ کردیں ہر اس چیز کو جس پر وہ غلبہ پائیں اچھی طرح سے تباہ کرنا۔ مَا عَلَوْا میں ''مَا'' موصولہ ہے۔ جس چیز کے اوپر وہ چڑھ آئیں، جس چیز کے اوپر وہ غلبہ پالیں اس کو تباہ کردیں اچھی طرح سے تباہ کرنا۔ اور ماضی کے طور پر ترجمہ کریں گے تو یوں ہوجائے گا'' جب آیا پچھلی مرتبہ کا وعدہ مسلط کردیے ہم نے بندے تم پر تاکہ تمہارے چہرے بگاڑ دیں، اور تاکہ مسجد میں داخل ہوجائیں جس طرح سے کہ وہ پہلی مرتبہ داخل ہوئے تھے اور تاکہ وہ برباد کردیں ہر اس چیز کو جس کے اوپر وہ غلبہ پائیں اچھی طرح سے برباد کرنا'' یعنی ایسا ہوچکا، یہ ماضی کے طور پر ذکر کیا جارہا ہے۔ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ یَّرْحَمَكُمْ: قریب ہے کہ تمہارا ربّ تم پر رحم کرے، وَاِنْ عُدْتُّمْ: اور اگر تم پھر لوٹے پہلی حالت کی طرف، عُدْنَا: تو ہم بھی لوٹ آئیں گے، اگر پہلی قسم کی شرارتیں تم نے پھر شروع کیں تو ہم پھر لوٹ آئیں گے، ہم اسی قسم کی پٹائی پھر کرادیں گے، وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِیْنَ حَصِیْرًا: یہ تو دنیوی عذاب تھا، اور ہم نے آخرت کو کافروں کے لئے حصیر بنایا، حصیر: محصور کرنے کی جگہ، قید خانہ، جس طرح سے بھیڑ بکریوں کے لئے باڑہ ہوتا ہے جس میں بھیڑ بکریوں کو بند کردیا جاتا ہے اسی طرح سب کافروں کو اکٹھا کر کے جہنّم کے اندر بند کردیا جائے گا، یہ ان کے لئے باڑہ ہے، محصور کرنے کی جگہ ہے، قید خانہ ہے۔

بنی اسرائیل کے سامنے چند واقعات کی پیش گوئی

ان آیات میں بنی اسرائیل کے سامنے چند واقعات کی پیش گوئی کی گئی جو قرآنِ کریم کے اُترنے سے پہلے اسی طرح سے ہوئے، تاریخی طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم تک بنی اسرائیل پر تقریباً چھ بڑے بڑے حادثے آئے ہیں، جن کے اندر قومی سطح پر ان پر بربادی آئی ہے، لیکن ان میں سے دو ایسے تباہ کن ہیں کہ جنھوں نے ان اسرائیلیوں کو بالکل ذلیل کر کے رکھ دیا تھا۔ ایک واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے پہلے پیش آیا، تقریباً پانچ سو چھیاسی سال پہلے، ۵۸۶ قبل مسیح تاریخ لکھی ہے، اس وقت عراق کے علاقے میں جو ''نینوا'' اور ''بابل'' شہر ہیں ان کا حاکم تھا ''بخت نصر''، وہ شام کے علاقے پر چڑھ آیا تھا، اس نے آکر ان کو بہت برباد کیا، قتل کیا، شہر ویران کردیے، مسجد اُجاڑ دی، توراۃ جلادی، اور یہ بخت نصر خود کافر ہے، اب یہ اسرائیلی جن کے اُوپر وہ چڑھ آیا ہے یہ وہ ہیں جو دعویٰ کرتے تھے کہ نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (المائدۃ: ۱۸) ہم تو اللہ کے بیٹے اور اللہ کے محبوب ہیں، اللہ کی کتاب کے حامل کہلاتے تھے، اللہ کے انبیاء کے اوپر ایمان کا اظہار کرتے تھے، لیکن جب یہ شرارتوں پر آئے تو جوان کے اوپر مسلط کیے گئے وہ مشرک اور کافر ہیں، اور مشرکوں اور کافروں کے ہاتھ سے ان کی پٹائی کروادی، اور ان پٹائی کرنے والوں کو ''عِبَادًا لَّنَآ'' کے ساتھ تعبیر کیا کہ ہم نے اپنے بندے مسلط کردیے، تو یہ ''عِبَادًا لَّنَآ'' اُن کے مقبول ہونے کی علامت نہیں، لیکن اللہ نے چونکہ اپنی تقدیر ان کے ذریعے سے ظاہر کروائی اور وہ اللہ تعالیٰ کے لئے آلۂ کار بنے، اس لئے اُن کو ''عِبَادًا لَّنَآ''

کے ساتھ تعبیر کیا، کہ مخلوق ہونے کے اعتبار سے جو ہمارے بندے ہیں ہم نے وہ تمہارے اوپر مسلط کر دیے، جس میں بنی اسرائیل کو یہ بتایا جا رہا ہے کہ تم اپنے آپ کو شہزادے بنائے بیٹھے ہو، اور اللہ تعالیٰ کے چہیتے بنائے بیٹھے ہو، لیکن تم یہ دیکھو! جس وقت شرارت کرو گے تو جن جوتوں کے ساتھ تمہاری پٹائی کروائی جائے گی ان جوتوں کی تو ہمارے ہاں کچھ قدر ہوگی، اور تمہاری اتنی قدر بھی نہیں ہوگی جتنی ان جوتوں کی ہے، مشرکوں اور کافروں کے ہاتھ سے ان شہزادوں کو پٹوا دیا جو اپنے آپ کو سمجھتے تھے کہ نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ، اس سے زیادہ بڑھ کے اور عبرت کیا ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں تو اعمال کی قدر ہے، ان نسبوں اور نسبتوں کو اللہ تعالیٰ نہیں دیکھا کرتے، اور ان نسبوں اور نسبتوں کی بنا پر دنیا میں یا آخرت میں غلبہ حاصل نہیں ہوتا، یہاں تو دیکھنا یہ ہے کہ تم اللہ کے قاعدے اور قانون کے مطابق چلتے ہو یا نہیں۔ پھر ان کے ہاتھوں سے پٹائی جو کروائی تو یہ ان کی مقبولیت کی کوئی علامت نہیں، اس کو بالکل اس طرح سے سمجھئے جس طرح سے حسی دنیا کے اندر ایک بادشاہ ہے، بڑا آدمی ہے، اس کا بیٹا نافرمان ہو جائے، باغی ہو جائے، سرکش ہو جائے تو اس کو بھنگیوں اور چوڑھوں سے جوتے لگوا دیے جاتے ہیں، تو جس وقت بھنگی اور چوڑھا اس کے چوتڑوں کے اوپر جوتے لگا رہا ہوتا ہے تو یہ علامت نہیں ہوتی کہ بھنگی اور چوڑھے کا درجہ بڑھ گیا، لیکن اس کے لئے بہر حال ذلت ہے جس کو پٹوایا جا رہا ہے، تو ان واقعات کے اظہار کے ساتھ ان کے اس غرور کو توڑا جا رہا ہے جو سمجھتے تھے کہ ہم تو اللہ کے چہیتے ہیں، اس لیے ہمارے لیے تو کوئی کسی قسم کی بات ہی نہیں، کوئی پوچھنے والا نہیں، ہم جو چاہیں کریں سَيُغْفَرُ لَنَا (الاعراف:۱۶۹) ہمیں تو بخش دیا جائے گا، تو ان واقعات کو اس لئے یاد دلایا جا رہا ہے۔ تو پہلا واقعہ تو قبل مسیح کا ہے، پانچ سو چھیاسی سال، اور پھر پانچ سو انتالیس سال قبل ''سائرس'' جس کو ''دارائے اول'' کہتے ہیں، ''ذوالقرنین'' یہ بادشاہ ایران میں ہوا، اور پھر اس نے ان ''کلدانیوں'' کو ''بخت نصر'' کی قوم کو شکست دی، اور یہ بنی اسرائیل کے لئے آزادی کا باعث بنا، اور پھر انہوں نے آ کے دوبارہ بیت المقدس کو آباد کیا اور شہر آباد ہوا، یہ بہت بڑا واقعہ تھا کہ جس میں قومی سطح پر ان لوگوں کے اُوپر بربادی آئی تھی اور یہ جماعت کی جماعت ذلیل ہو گئی۔

اور ایک واقعہ پیش آیا تھا عیسیٰ علیہ السلام کے مرفوع ہونے کے بعد تقریباً ستر عیسوی میں اس وقت شاہِ رُوم جس کا نام ''طیطس'' یا ''طیطاؤس'' اور انگریزی میں ''ٹائیٹس''، تو ''طیطس'' کے لفظ کے ساتھ اس کو تعبیر کیا ہے، یہ بادشاہ ان کے اُوپر چڑھ آیا تھا، یہ بھی بت پرست تھا، اُس وقت تک ابھی انہوں نے عیسائیت قبول نہیں کی تھی، رُوم کے بادشاہوں نے عیسائیت بہت بعد میں قبول کی ہے، اس وقت یہ بیت القدس پر چڑھ آئے، مسجد کو اجاڑ دیا، ویران کر دیا، اور یہود کو بہت کثرت کے ساتھ قتل کیا، تو یہ قومی سطح پر ان کے اوپر بربادی آئی تھی، اور یہ مسجد جو ویران ہوئی تھی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے تک یہ ویران رہی، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں پھر اس کو آباد کیا گیا۔ تو یہ دو وعدے زیادہ نمایاں ہیں، جس کی بنا پر فساد کرنے کا ذکر جو مَرَّتَيْنِ آیا ہے تو اکثر مفسرین نے انہی دو واقعات کو اس کا مصداق بنایا، اگرچہ چھوٹے موٹے واقعات اور بھی پیش آئے ہیں۔ اور بقول

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے کہ اگر ان واقعات کو دو حصوں میں تقسیم کرلیا جائے کہ ایک شریعتِ موسوی کی مخالفت کی بنا پر بربادی کا ذکر، اور ایک شریعتِ عیسوی کی مخالفت کی بنا پر بربادی کا ذِکر، تو پھر یہ سارے واقعات انہی دو مرتبوں کے اندر ہو سکتے ہیں، کہ تم دو مرتبہ فساد کرو گے ایک دفعہ شریعتِ موسوی کی مخالفت کے طور پر، اور ایک دفعہ شریعتِ عیسوی کی مخالفت کے طور پر، پھر تمہارے اوپر عذاب آئے گا، تھوڑے تھوڑے عذاب بھی آئیں گے اور فیصلہ کن عذاب بھی آئے گا جس میں تم قومی سطح پر ذلیل ہو جاؤ گے، تو پھر ان سارے واقعات کو مَرَّتَیْنِ کے اندر یوں بھی سمیٹا جا سکتا ہے۔

اور مسجدِ اَقصیٰ جس کا ذِکر آیا اس کی ظاہری طور پر تعمیر کی نسبت حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف ہے، جس طرح سے مسجدِ حرام کی تعمیر کی نسبت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف ہے، ''مشکوٰۃ شریف'' میں آپ نے ''باب المساجد ومواضع الصلوٰۃ'' کے اندر ایک روایت پڑھی تھی کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے پوچھا تھا کہ یارسول اللہ! سب سے پہلے کون سی مسجد بنائی گئی؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسجدِ حرام، انہوں نے کہا کہ اس کے بعد کون سی مسجد بنائی گئی؟ تو آپ نے صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسجدِ اَقصیٰ، کہا کہ ان دونوں کے درمیان میں فاصلہ کتنا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا چالیس سال۔(۱) اُس روایت کی طرف دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ یہ تعمیر جو حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف منسوب ہے یہ پہلی تعمیر نہیں ہے، اور اسی طرح سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف جو تعمیر منسوب ہے یہ بھی پہلی تعمیر نہیں ہے، آدم علیہ السلام کے زمانے میں مسجدِ حرام کی نشاندہی ہوئی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو جس طرح سے تھا فرشتوں کے ہاتھوں آباد کروایا گیا، ہوسکتا ہے کہ اسی طرح سے بیت المقدس کو بھی آباد کروایا گیا ہو، یہ دو مرکز بنا دیے گئے، اور یا ہوسکتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے جس طرح سے اس بیت اللہ کو تعمیر کیا اسی طرح سے اپنے دوسرے بیٹے کے لئے مرکز بیت القدس کو تعمیر کیا، بنی اسماعیل کو یہاں آباد کیا، بنو اسحاق کو وہاں آباد کیا، دو مرکز تعمیر ہوگئے، ان تعمیروں کے درمیان میں چالیس سال کا فاصلہ ہوسکتا ہے، ورنہ جہاں تک حضرت ابراہیم علیہ السلام والی بنا کا ذِکر ہے جو مشہور ہے، اور سلیمان علیہ السلام کی بنا کا ذِکر ہے جو مشہور ہے، ان کے درمیان میں تو ہزروں سال کا فاصلہ ہے۔ (بات ذہن میں آ گئی؟) تو یہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے جو یہ آباد کی تھی، اس کے بعد یہ بربادی جو آئی ہے تو پھر اس کی آبادی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ہوئی ہے، اُس وقت تک یہ اُسی طرح سے بربادی کے عالم میں تھی۔

وَيُبَشِّرُ	اَقْوَمُ	هِيَ	لِلَّتِيْ	يَهْدِيْ	الْقُرْاٰنَ	هٰذَا	اِنَّ

بے شک یہ قرآن راہنمائی کرتا ہے ایسے طریقے کی طرف جو تمام طریقوں سے زیادہ دُرست اور سیدھا ہے، اور بشارت دیتا ہے

الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا ۙ﴿۹﴾ وَّاَنَّ الَّذِيْنَ لَا

ان لوگوں کو جو ایمان لاتے ہیں جو نیک عمل کرتے ہیں، کہ ان کے لئے اَجرِ کبیر ہے ﴿۹﴾ اور (یہ خبر بھی دیتا ہے) کہ جو لوگ

(۱) بخاری ۱/۴۷۷/ مسلم ۱/۱۹۹، کتاب المساجد کی پہلی حدیث/ مشکوٰۃ ۱/۶۷، باب المساجد کی آخری حدیث۔

يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝١٠ وَيَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ

آخرت پہ یقین نہیں رکھتے ہم نے ان کے لئے دردناک عذاب تیار کیا ہے۝١٠ مانگتا ہے انسان بُرائی مثل مانگنے اس کے

بِالْخَيْرِ ۭ وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا ۝١١ وَجَعَلْنَا الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيْنِ فَمَحَوْنَآ اٰيَةَ الَّيْلِ

بھلائی کو، اور انسان جلد باز ہے۝١١ بنایا ہم نے رات اور دن کو دو نشانیاں، پھر ہم نے مٹا دیا رات کی نشانی کو

وَجَعَلْنَآ اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ

اور بنایا ہم نے دن کی نشانی کو روشن تاکہ تم طلب کرو اللہ کے فضل کو اور تاکہ جان لو تم سالوں کی گنتی

وَالْحِسَابَ ۭ وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا ۝١٢ وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰۗىِٕرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ۭ

اور حساب کو، اور ہر چیز کو ہم نے کھول کھول کے بیان کر دیا۝١٢ اور ہر انسان، لازم کر دیا ہم نے اس کو اس کا نصیبہ اسی کی گردن میں

وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ۝١٣

اور نکالیں گے ہم اس کے لئے قیامت کے دن ایک کتاب، ملاقات کرے گا انسان اس کتاب کے ساتھ اس حال میں کہ وہ کھلی ہوئی ہوگی۝١٣

اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ۭ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ۝١٤ۭ مَنِ اهْتَدٰى

اپنی کتاب کو پڑھ لے، کافی ہے تیرا نفس ہی آج کے دن تیرے اُوپر حساب لینے والا۝١٤ جو کوئی سیدھا راستہ اختیار کرتا ہے

فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا

اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ سیدھا راستہ اختیار کرتا ہے اپنے فائدے کے لئے، اور جو کوئی سیدھے راستے سے بھٹکتا ہے تو اس کے علاوہ کچھ نہیں

يَضِلُّ عَلَيْهَا ۭ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۭ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ

کہ بھٹکتا ہے وہ اپنے ہی نقصان پر، کوئی بوجھ اُٹھانے والا نفس کسی دوسرے نفس کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا، اور نہیں ہیں ہم عذاب دینے والے

حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ۝١٥ وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا

جب تک کہ رسول نہ بھیج دیں۝١٥ جب ہم ارادہ کرتے ہیں کسی بستی کو ہلاک کرنے کا تو حکم بھیجتے ہیں ہم اس بستی کے خوش حال لوگوں کے پاس،

فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا

پھر وہ اس بستی میں فسوق و فجور کا ارتکاب کرتے ہیں، پھر اس بستی پر ہماری بات ثابت ہو جاتی ہے، پھر نیست و نابود کر دیتے ہیں ہم اس کو

تَدْمِیْرًا ﴿۱۶﴾ وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْۢ بَعْدِ نُوْحٍ ؕ وَكَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ

اچھی طرح سے نیست و نابود کرنا ⑯ کتنی ہی جماعتیں ہم نے ہلاک کیں نوح کے بعد، کافی ہے تیرا رَبّ اپنے بندوں کے گناہوں کی

خَبِیْرًاۢ بَصِیْرًا ﴿۱۷﴾ مَنْ كَانَ یُرِیْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِیْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ

خبر رکھنے والا اور دیکھنے والا ⑰ جو شخص ارادہ کرتا ہے دُنیا کا ہم جلدی دے دیتے ہیں اس کو اس دُنیا میں جو ہم چاہتے ہیں جس کے متعلق

نُّرِیْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ یَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿۱۸﴾ وَمَنْ اَرَادَ

ہم ارادہ کرتے ہیں، پھر ہم اس کے لئے جہنم بنادیں گے داخل ہوگا وہ اس جہنم میں اس حال میں کہ دھتکارا ہوا ہوگا ⑱ اور جو شخص ارادہ کرلے

الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْیَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓىِٕكَ كَانَ سَعْیُهُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿۱۹﴾ كُلًّا

آخرت کا اور کوشش کرے آخرت کے لئے آخرت کے مناسب کوشش، یہی لوگ ہیں کہ جن کی کوشش کی قدر کی جائے گی ⑲ ہر کسی کو

نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ؕ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ﴿۲۰﴾

دیتے ہیں ہم، اِن کو بھی دیتے ہیں، اُن کو بھی دیتے ہیں تیرے رَبّ کی عطا سے، تیرے رَبّ کی عطا (دُنیا میں) روکی ہوئی نہیں ہے ⑳

اُنْظُرْ كَیْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِیْلًا ﴿۲۱﴾

خیال کرتو، کیسے فضیلت دی ہم نے بعض کو بعض پر، آخرت درجات کے اعتبار سے بہت بڑی ہے اور فضیلت کے اعتبار سے بہت بڑی ہے ㉑

تفسیر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ: بے شک یہ قرآن راہنمائی کرتا ہے۔ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ: للطریقۃِ الَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ۔ اَقْوَمُ اسم تفضیل کا صیغہ ہے اور اس کا صلہ محذوف ہے، اور یَهْدِیْ کا ایک مفعول بھی محذوف ہے یَهْدِی النَّاسَ ''راہنمائی کرتا ہے لوگوں کی ایسے طریقے کی طرف جو تمام طریقوں سے زیادہ درست اور سیدھا ہے'' تمام طریقوں سے زیادہ، تمام راستوں سے زیادہ سیدھا، اور تمام راستوں سے زیادہ بے خطر، اَقْوَمُ کے مفہوم کے اندر یہ ساری باتیں شامل ہوتی ہیں، جیسے کہ صراطِ مستقیم کے مفہوم میں نقل کیا جاتا ہے کہ جو کسی منزل تک پہنچنے کا سیدھا راستہ ہوتا ہے وہی تمام راستوں کے مقابلے میں چھوٹا ہوتا ہے، جتنا راستہ ٹیڑھا ہوگا اتنا لمبا ہوگا، تو صراطِ مستقیم کے مفہوم میں جہاں یہ بات آتی ہے کہ یہ راستہ سیدھا ہے وہاں یہ بات بھی ہوتی ہے کہ سب سے چھوٹا ہے جس پر چلنے میں زیادہ مشقت نہیں، اور اسی طرح سے سیدھا راستہ کامل طریقے سے ہی ہوا کرتا ہے جو بے خطر بھی ہو، جس میں کوئی کسی قسم کا خطرہ نہ ہو، ورنہ اگر کوئی راستہ مختصر اور سیدھا ہے لیکن اس میں خطرات ہی خطرات

ہیں تو اس کو بھی اصل مفہوم کے اعتبار سے صراطِ مستقیم نہیں کہا جاتا، اس لیے شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کا وہ جو جملہ مشہور ہے کہ ''راہِ راست برو گرچہ دُور است'' بظاہر اس میں دونوں جملوں کے درمیان میں ٹکراؤ ہے، کہ راہِ راست دُور نہیں ہوتا، راہِ راست نزدیک ہوتا ہے، تو یہاں راہِ راست سے بے خطر والا مفہوم مراد ہے، بے خطر راستے پہ چلو اگر چہ دُور ہی کیوں نہ ہو، تو جس راستے میں خطرات پائے جائیں اسے راہِ راست نہیں کہا جاتا، تو یہاں اَقْوَمُ کا معنی یہ ہوا کہ قرآنِ کریم ایسا راستہ بتاتا ہے جو راستہ سب سے زیادہ سیدھا، سب سے زیادہ نزدیک، جس میں زیادہ مشقت نہیں، اور سب سے زیادہ بے خطر ہے۔ اور راہنمائی کس کی کرتا ہے؟ تمام لوگوں کی۔ تو وہ مفعول بھی محذوف کر دیا گیا۔ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ: اور بشارت دیتا ہے ان لوگوں کو جو ایمان لاتے ہیں جو نیک عمل کرتے ہیں، اس مضمون کی بشارت دیتا ہے کہ ان کے لئے اجر کبیر ہے، اور یہ خبر بھی دیتا ہے وَيُخْبِرُ اَنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ: اور قرآنِ کریم یہ خبر بھی دیتا ہے کہ جو لوگ آخرت پہ یقین نہیں رکھتے، اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا: ہم نے ان کے لئے دردناک عذاب تیار کیا ہے۔

ماقبل سے ربط

شروع سورۃ میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ معراج منقول تھا جس میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا تھا کہ اب تمام اُمتوں کی قیادت سیادت آپ کو ملنے والی ہے، اور آپ دونوں قبلوں کے کمالات کے جامع ہوں گے، اور اس کے بعد اہلِ کتاب کو خصوصیت کے ساتھ تنبیہ کی گئی، اور ان کے کچھ حالات کی خبر دی گئی، تو بنی اسرائیل کا ذکر کرنے کے بعد پھر یہ دعوت الی الایمان ہے کہ اس قرآن کو مانو، قرآن پہ ایمان لے آؤ۔

قرآنِ کریم سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی حقانیت کی دلیل اور مستقل معجزہ ہے

اور یہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا مستقل معجزہ بھی ہے، تو آپ کی حقانیت کی دلیل بھی ہے، اس لئے اس کو آپ دلیلِ رسالت کے طور پر بھی ذکر کر سکتے ہیں جس طرح سے پہلا واقعہ دلیلِ رسالت کے طور پر آیا، اور اہلِ کتاب کے لئے دعوتِ ایمان کا عنوان بھی دے سکتے ہیں، کہ اُن کو جو بار بار کہا گیا تھا کہ ہم نے تمہیں کہا تھا کہ اگر اچھے ہو جاؤ گے تو اپنے فائدے کے لئے ہو جاؤ گے، بُرائی کرو گے تو اپنے نقصان کے لئے کرو گے، اِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا: اگر تم سابقہ حالات کی طرف لوٹو گے تو ہم بھی اسی طرح سے سزا دینے کی طرف لوٹ آئیں گے، یہ سب چیزیں ایسی ہیں کہ جن میں ان کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ تم انسان بن جاؤ اور راہِ راست پر چلو، اب اگر اس دور میں راہِ راست معلوم کرنا چاہتے ہو تو یہ قرآن بتاتا ہے، تو اس قرآنِ کریم کو مانو اور قرآنِ کریم کی اتباع کرو تو یہ ہے راہِ راست، یہ ہے سیدھا راستہ جو بہت جلدی تمہیں منزل تک پہنچا دے گا، تو اس قرآنِ کریم کے اترنے کے بعد جو دو طبقے پیدا ہو گئے مؤمنینِ صالحین اور کافرین بالآخرۃ، دونوں کا ذکر کر دیا، ایک کے لئے بشارت اور دوسرے کے لئے وعید ہے۔

اِنسان کی جلد بازی کی شکایت

وَيَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَيْرِ: دَعَا يَدْعُوْ: مانگنا، بلانا۔ رسم الخط کے طور پر يَدْعُ میں عین کے بعد واؤ محذوف ہے، اصل میں واؤ ہوتی ہے، قرآنِ کریم کے رسم الخط کے طور پر یہاں واؤ منقول نہیں ہے۔ ''انسان مانگتا ہے شر مثل مانگنے اس کے بھلائی کو'' وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا: اور انسان جلد باز ہے، عجول مبالغے کا صیغہ ہے۔ اس کا تعلق ماقبل کے ساتھ یہ ہے کہ انسان کی سعادت تو یہ ہے کہ قرآنِ کریم کو مان لے، جو راستہ یہ دکھاتا ہے اس راستے کے اوپر چلنا شروع کردے، لیکن قرآنِ کریم کے جو مخاطبین تھے وہ قرآنِ کریم جیسے معجزے کو کافی نہیں سمجھتے تھے، سرورِ کائنات ﷺ پر ایمان لانے کی بجائے وہ اپنے لئے اس قسم کے مطالبے کرتے تھے جیسے سورۂ انفال میں آپ کے سامنے مشرکینِ مکہ کی دُعا گزری تھی اَللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (آیت: ۳۲) اگر یہ تیری طرف سے حق ہے تو ہمارے اوپر پتھروں کی بارش برسایا دردناک عذاب ہمارے پاس لے آ۔ تو انسان کی یہ جو جلد بازی کی عادت ہے کہ نتیجہ نہیں سوچتا، انجام میں غور نہیں کرتا، ناعاقبت اندیشی کے ساتھ اس طرح سے بُرائی طلب کرنے لگ جاتا ہے کہ جس طرح سے اس کو بھلائی مانگنی چاہیے، یہ اس کی جلد بازی کا نتیجہ ہے، اس کو ایسا نہیں ہونا چاہیے، یہ شکوہ اور شکایت ہے انسان کی، انسان سے یہاں وہی! کافر انسان مراد ہے، اور شر سے مراد ہے وہی! عذاب کا مانگنا جو سرورِ کائنات ﷺ کی صداقت کے نشان کے طور پر کہتے تھے کہ ہمارے پاس عذاب لے آؤ، اس کے اوپر انسان کو تنبیہ کی جارہی ہے کہ ایسا نہیں کرنا چاہیے، اللہ سے جب مانگو بھلائی مانگو، جیسے بھلائی طلب کرنی چاہیے اس طرح سے شر طلب نہ کرو، یہ تمہاری جلد بازی ہے، پھر بعد میں پچھتاؤ گے لیکن پچھتانے سے کچھ ہوگا نہیں۔

معجزہ طلب کرنے والوں کو قدرتِ خداوندی کی طرف متوجہ ہونے کی دعوت

اور اگلی آیات میں اللہ تعالیٰ اپنی آیاتِ قدرت کی طرف متوجہ کرتے ہیں، کہ اگر تم معجزہ ہی دیکھنا چاہتے ہو، اللہ تعالیٰ کی قدرت کو ہی دیکھنا چاہتے ہو......! پھر خاص طور پر آخرت کا انکار ان کا چونکہ اس بات پہ مبنی تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کو اتنا محیط نہیں سمجھتے تھے کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرسکے، ہڈیوں کے بوسیدہ ہوجانے کے بعد دوبارہ اس میں جان ڈال سکے، اس لیے اگلی آیات اللہ تعالیٰ کی قدرت پر بھی دلالت کرتی ہیں، ان کے لئے ایمان کی دعوت بھی ہے، اور کُفر بالآخرۃ کی جو بنیاد تھی گویا کہ اس کو بھی منہدم کیا جارہا ہے، ''مانگتا ہے انسان بُرائی مثل مانگنے اس کے بھلائی کو، اور انسان جلد باز ہے''، وَجَعَلْنَا الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيْنِ: بنایا ہم نے رات کو اور دن کو دو نشانیاں، نشانیاں کس اعتبار سے؟ بارہا اس کا تذکرہ آپ کے سامنے ہوچکا، فَمَحَوْنَآ اٰيَةَ الَّيْلِ: اٰيَةَ الَّيْلِ کے اندر اضافت بیانیہ ہے، یعنی آیت کا مصداق ہی خود رات ہے، ''پھر ہم نے مٹادیا رات کی نشانی کو'' یعنی جو نشانی رات ہے، ہم نے اس کو دھندلا کردیا، کہ اس میں وہ چمک نہیں، روشنی نہیں، محو سے یہاں یہی مراد ہے، وَجَعَلْنَآ اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً: اور دن کی نشانی کو ہم نے روشن بنادیا۔ مُبصِرہ کا لفظی معنی ہے دیکھنے والی، چونکہ یہی دیکھنے کا ذریعہ بنتی ہے، انسان کی بینائی اس کی روشنی میں کام

کرتی ہے اس لیے خود دن کی نشانی کو مُبصِرۃ کہہ دیا گیا،''بنا دیا ہم نے دن کی نشانی کو''یعنی دن جو ایک نشانی ہے، اٰیَۃَ النَّھَارِ میں بھی اضافت بیانی ہے، آیت اور نہار دونوں کا مصداق ایک ہی ہے،''بنایا ہم نے دن کی نشانی کو روشن'' لِتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ: تا کہ تم طلب کرو اللہ کے فضل کو، دن کی روشنی میں کام کرو، معاش تلاش کرو، رزق تلاش کرو، اللہ کا فضل تلاش کرو، فضلِ رَبّ سے مراد یہاں رزق ہے، دن کی نشانی کو ہم نے روشن بنا دیا تا کہ اس کی روشنی کے اندر اپنا کاروبار کر کے اللہ کے رزق کو تم تلاش کرلو۔ دن کی نشانی کو روشن بنانے کا مقصد تو ذکر کردیا لِتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ، تو مقابلۃً فَمَحَوْنَآ اٰیَۃَ الَّیْلِ کا مقصد یہاں محذوف ہے جس طرح سے بارہا آپ کے سامنے واضح کیا جاچکا کہ قرآنِ کریم کی آیات میں ایک لفظ کے قرینے سے تقابل کے طور پر دوسری طرف محذوف نکال لیا جاتا ہے فَمَحَوْنَآ اٰیَۃَ الَّیْلِ لِتَسْکُنُوْا: ہم نے رات کی نشانی کی دھندلا کردیا تا کہ تم اس میں آرام کرسکو، سکون حاصل کرسکو، تو رات کی تاریکی اور اس کے اندر اس چمک کا موجود نہ ہونا یہ انسان کے لئے راحت اور سکون کا باعث ہے، اس لئے جملہ حیوانات رات کو آرام کرتے ہیں، اور سارے کے سارے سوتے ہیں اور اپنی دن کی تھکاوٹ دُور کرلیتے ہیں، اصل فطرت کا تقاضا یہی ہے کہ رات آرام کے لئے ہے دن کام کے لئے ہے، اور اس وقت کے ساتھ انسان کی فطرت کی مناسبت ہے، کہ دن کی روشنی میں اور سورج کی گرمی میں یہ چست ہوتا ہے اور اپنے کام کاج میں لگتا ہے رزق تلاش کرتا ہے دوسرے کام کرتا ہے، اور جونہی سورج غروب ہوا رات کی تاریکی آئی تو اس کو سکون اور راحت حاصل ہوتا ہے، اس لئے جتنی آسانی کے ساتھ آپ دن کو جاگ سکتے ہیں اتنی آسانی سے رات کو نہیں جاگ سکتے، اور سارے کے سارے حیوانات سکون کی طرف مائل ہوجاتے ہیں۔ تو لِتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ کے قرینے سے محونا آیۃ اللیل کی غرض وغایت یہاں محذوف ہوگی لتستریحوا: تا کہ تم راحت حاصل کرلو، ہم نے رات کی نشانی کو دھندلا کردیا اس میں چمک نہیں رہنے دی، تا کہ تم اس سے راحت حاصل کرو۔ وَلِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَالْحِسَابَ: یہ مجموعے سے متعلق ہے، تا کہ جان لو تم سالوں کی گنتی اور حساب کو، یعنی یہ دن اور رات دو نشانیاں کہ دن آتا ہے رات جاتی ہے، رات آتی ہے دن جاتا ہے، یہ اوقات جو ادل بدل ہوتے ہیں تو اس مجموعے سے مقصد یہ بھی ہے تا کہ تم سالوں کی گنتی معلوم کرلو اور دوسرے چھوٹے موٹے حساب معلوم کرلو، اگر وقت ایک ہی جیسا رہتا تو آپ مزدوری طے کرتے وقت کہ اتنے دنوں کے اتنے پیسے، اور لین دین کے جو اوقات متعین کرلیے جاتے ہیں تو اس کا کوئی حساب نہ رکھ سکتا، نہ مہینوں کا نہ ہفتوں کا نہ سالوں کا، تو یہ دن رات جو آپس میں بدلتے ہیں، یہ نشانیاں جو آتی جاتی ہیں تو ان کے ساتھ آپ کے لئے عام حساب بھی آسان ہوگیا اور سالوں کی گنتی بھی آسان ہوگئی، دیکھ لیتے ہو اتنی دفعہ دن آیا اتنی دفعہ رات آئی تو ایک ہفتہ ہوگیا، اور پھر چار ہفتے گزرے تو ایک مہینہ ہوگیا، بارہ مہینے گزرے تو ایک سال ہوگیا، اس قسم کے تمہارے جتنے حسابات ہیں وہ دن رات کے آنے جانے کے ساتھ ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر یہ حکمتیں رکھی ہیں، اور یہ مضمون آپ کے سامنے سورۂ یونس میں تفصیل کے ساتھ گزرا ہے۔ وَکُلَّ شَیْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِیْلًا: اور ہر چیز کو ہم نے کھول کھول کے بیان کردیا، وہ آفاقی علامت تھی، اور یہ ہر چیز کو کھول کھول کے بیان کردیا یعنی اس کتاب میں، تمہاری جو دینی ضرورتیں تھیں وہ اس میں پوری کردیں، جس طرح سے دنیوی ضرورتیں، مادی ضرورتیں ان نشانیوں کے ساتھ پوری کی ہیں، تو اسی طرح سے

دینی ضرورتیں ان آیات کے ساتھ پوری کر دیں جو اللہ تبارک تعالیٰ نے کتاب کے اندر اتاری ہیں۔ ''ہر چیز کو ہم نے کھول کھول کے بیان کر دیا'' جو چیز تمہاری ضرورت کی ہے وہ اس میں سمجھا دی۔

ہر انسان کو اس کا نامۂ اَعمال اس کے ہاتھ میں دیا جائے گا

وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِیْ عُنُقِهٖ: ہر انسان، چمٹا دیا ہم نے اس کو اس کا طائر۔ طائر کا لفظی معنی پرندہ، اڑنے والا، عرب کے اندر چونکہ رواج تھا کہ پرندوں کو اڑا کے وہ فال لیا کرتے تھے، جس وقت گھر سے نکلتے کوئی کام کرنے کے لئے، کوئی پرندہ سامنے آجاتا تو کسی پرندے کو وہ باعث برکت سمجھتے تھے کسی کو منحوس سمجھتے تھے، اور پھر گھونسلوں میں بیٹھے ہوئے پرندوں کو اڑاتے تھے، اگر وہ دائیں طرف کو اڑ گیا تو سمجھتے تھے کہ ہمارا مقصد حاصل ہو جائے گا، بائیں طرف کو اڑ گیا تو سمجھتے تھے کہ یہ کام نہیں ہوگا، جس کو حدیث شریف کی کتابوں میں ''تطیُّر'' کی ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے، تطیُّر کا لفظ بھی طائر سے ہی لیا گیا ہے، فال لینا، شگون لینا، اس لئے طائر کا لفظ مطلق عمل کے معنی میں بھی آجاتا ہے کیونکہ عمل انسان کے لئے شقاوت اور سعادت کا باعث ہے، یہاں عمل کے ساتھ بھی ترجمہ کیا گیا ہے ''ہر انسان کا عمل ہم نے اس کی گردن میں لٹکا رکھا ہے'' یعنی ہر شخص پر اس کے کیے کی ذمہ داری ہے، جو کام وہ کرے گا اس کا عمل اسی کے گلے کا ہار ہے، وہ اسی کے ساتھ ہی چمٹا ہوا ہے، نہ اس کے کردار کی ذمہ داری کسی دوسرے پر آتی ہے، نہ اپنے کردار کی ذمہ داری سے بچ سکتا ہے، ''ہر شخص، اس کے عمل کو ہم نے اس کے گلے کا ہار بنا دیا، اسی کی گردن میں لٹکا دیا'' وہ عمل اسی کو چمٹا ہوا ہے اس کی گردن میں، اور اسی طرح سے طائر کا معنی قسمت اور نصیبہ بھی کیا گیا ہے ''ہر انسان، لازم کر دیا ہم نے اس کو اس کا نصیبہ اسی کی گردن میں'' وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا: اور نکالیں گے ہم اس انسان کے لئے قیامت کے دن ایک تحریر، کتاب سے یہاں کتابِ اعمال مراد ہے جس کو ہم ''نامۂ اَعمال'' کہتے ہیں، ''ہم اس کے لئے ایک تحریر نکالیں گے'' يَلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا: ملاقات کرے گا انسان اس کتاب کے ساتھ اس حال میں کہ وہ کھلی ہوئی ہوگی، کھلا ہوا ''نامۂ اَعمال'' اس کے سامنے آجائے گا، جو کچھ اس نے زندگی میں کیا ہے اس کی گردن پر لٹکا ہوا ہے، اسی کے لئے لازم ہے، تفصیل اس کی قیامت کے دن کھلی ہوئی سامنے آجائے گی، اس دن پتا چل جائے گا کہ کیا کیا، کیا نہیں کیا۔ جس وقت کھلی ہوئی کتاب، کھلا ہوا ''نامۂ اَعمال'' واضح طور پر سامنے آجائے گا تو کہا جائے گا اِقْرَاْ كِتٰبَكَ: اپنی کتاب کو پڑھ لے، اپنے ''نامۂ اَعمال'' کو پڑھ لے، تجھے پتا چل جائے کہ زندگی میں تُو کیا کر کے آیا ہے، كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا: کافی ہے تیرا نفس ہی آج کے دن تیرے اوپر حساب لینے والا، ہمیں کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں کہ تُو اچھا ہے یا بُرا، تیرے سامنے نتیجہ اچھا آنے والا ہے یا بُرا آنے والا ہے، ہمیں حساب لینے کی ضرورت ہی نہیں، تُو اپنی اس تحریر کو پڑھ کے خود ہی سوچ لے کہ تُو کیسا تھا، کیسا نہیں تھا، اور تیرے ساتھ کیا ہونا چاہیے، کیا نہیں ہونا چاہیے، آج خود ہی تُو اپنے نفس کے اُوپر حساب لینے والا کافی ہے، یہ ''نامۂ اَعمال'' پڑھ لو، کھول کے سامنے رکھ دیا جائے گا۔

اِتمامِ حُجّت کے بعد ہی بستیوں کو تباہ کیا جاتا ہے

مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِیْ لِنَفْسِهٖ: دنیا کے اندر رہتے ہوئے جو کوئی سیدھا راستہ اختیار کرتا ہے، سیدھا راستہ وہی جس کی

طرف راہنمائی قرآنِ کریم کرتا ہے،''اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ سیدھا راستہ اختیار کرتا ہے اپنے فائدے کے لئے'' وَمَنْ ضَلَّ: اور جو کوئی سیدھے راستے سے بھٹکتا ہے، فَاِنَّمَا یَضِلُّ عَلَیْهَا: تو اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ بھٹکتا ہے وہ اپنے ہی نقصان پر۔ ہدایت یا ضلالت ان دونوں کی ذمہ داری انسان پر ہے، اگر وہ ہدایت اختیار کرتا ہے، سیدھا راستہ اختیار کرتا ہے تو اسی کا فائدہ ہے، اور اگر وہ بھٹکتا ہے تو ہمارا کچھ نہیں بگاڑتا اس کا دبال بھی اسی پہ آئے گا۔ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی: یہ اسی مضمون کی تفصیل ہے جو اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِیْ عُنُقِهٖ کے تحت نقل کیا کہ ہر انسان اپنے عمل کا خود ذمہ دار ہے،''نہیں اٹھائے گا بوجھ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ'' وَازِرَةٌ یہ لَا تَزِرُ کا فاعل ہے، وِزر کہتے ہیں گناہوں کے بوجھ کو۔''کوئی اٹھانے والا نفس (وَازِرَةٌ یہ نفس کی صفت ہے لا تزرُ نفسٌ وازرۃٌ وِزرَ نفسٍ اُخریٰ۔ تو اُخْرٰی یہ بھی نفس کی صفت ہے) کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے نفس کا بوجھ نہیں اٹھائے گا'' ہر شخص نے اپنے عملوں کا بوجھ خود اٹھانا ہے، اور اس کے کئے کا جو انجام ہوگا خود اسی کے سامنے آئے گا۔ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِیْنَ حَتّٰی نَبْعَثَ رَسُوْلًا: اور نہیں ہیں ہم عذاب دینے والے جب تک کہ رسول نہ بھیج دیں، ہم نے عادت یہی بنا رکھی ہے کہ بغیر تنبیہ کرنے کے، بغیر سمجھانے کے ہم کسی کو سزا نہیں دیا کرتے، اس میں بھی ان کو کہا جا رہا ہے کہ اب کان کھول لو، تمہارے پاس بھی رسول آ گیا، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اِتمامِ حجت ہو گئی، جس وقت تک کوئی سمجھانے والا نہ آئے کسی حد تک اللہ کی طرف سے نرمی کا معاملہ رہتا ہے اور عذاب نہیں آتا، لیکن جب سمجھانے والا آ جائے اور آ کے ساری بات سمجھا دے پھر اگر لوگ بغاوت پر اتر آئیں، سرکشی پر اتر آئیں، اور اللہ کے اَحکام کو نہ مانیں تو پھر ان کے پاس کوئی عذر نہیں ہوتا، پھر ہم ہلاک کر دیتے ہیں، وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِیْنَ حَتّٰی نَبْعَثَ رَسُوْلًا: جس وقت تک ہم رسول نہ بھیج دیں اس وقت تک ہم عذاب دینے والے نہیں، یہی وجہ ہے کہ فترت کا زمانہ جس میں کوئی رسول نہ آئے یا ایسے لوگ جو پہاڑوں میں جنگلات میں موجود ہوں، جن تک کسی رسول کی رسائی نہیں ہے وہ کسی درجے میں معذور ہیں، لیکن عقیدۂ توحید کے بارے میں معذور نہیں، کیونکہ یہ عقل کے تقاضے سے سمجھنے کی بات ہے کہ ہمارا کوئی پیدا کرنے والا ہے اور وہ پیدا کرنے والا ایک ہے، یہ عقیدہ عقلی ہے، ہاں البتہ علماء نے اتنا لکھا ہے کہ اس عقیدے کے بارے میں بھی اس بات کی رعایت رکھی جائے گی کہ اس کی عقل کامل ہو، اس لئے اگر اس کی عقل میں نقص ہے تو پھر وہ اس عقیدے کو بھی اختیار کرنے کا مکلف نہیں، یہی وجہ ہے کہ بچہ نابالغ جس کی عقل ناقص ہوتی ہے وہ مکلف نہیں ہے، مشرکین، کافرین کے بچے جو نابالغی کے زمانے میں مر جاتے ہیں وہ اسی لئے معذب نہیں کیونکہ ابھی تک ان کی عقل بھی کامل نہیں ہوئی، وہ مکلف نہیں، مخاطب نہیں ہیں، عقل مل جائے اور پھر اس کو اتنا تجربے کا اور سوچنے کا موقع مل جائے تو پھر عقیدۂ توحید کے بارے میں انسان معذور نہیں، اور اس کے علاوہ عملی زندگی کا وہ مکلف نہیں ہے، کیونکہ اَحکام اپنی عقل کے ساتھ معلوم نہیں کیے جا سکتے کہ اللہ تعالیٰ کیا چاہتا ہے کیا نہیں چاہتا، یہ اللہ کا رسول ہی بتائے گا یا اللہ تعالیٰ کے رسول کے نمائندے بتائیں گے، اللہ کا رسول خود جائے ان کو سمجھانے کے لئے یا اس کے نمائندے جو کہ اُس شریعت کے حامل ہوتے ہیں جس طرح سے آج علماء، علماء جہاں پہنچ جائیں، جا کے تبلیغ کر دیں، لوگوں کے سامنے ہدایت پیش کر دیں، یہ ایسے ہی ہے جیسے اللہ کا رسول آ گیا، اور اس کے بعد پھر انسان کے لئے کوئی عذر باقی نہیں رہتا، اگر پھر بھی وہ بدعملی اور بدکرداری کو اختیار کرتا ہے تو پھر اس کو ہلاک کر دیا جاتا ہے، تو سرورِ کائنات ﷺ کے تشریف لانے سے پہلے عرب کا علاقہ رسول سے خالی ہے، وہاں کوئی رسول

نہیں آیا، کیونکہ بنی اسرائیل کے رسول جتنے تھے وہ سب شام میں رہے، بنی اسرائیل کو سمجھانے میں مشغول رہے، مشرکین مکہ کے اور ان جیسے دوسرے لوگ، ان کے پاس کوئی رسول نہیں آیا، جیسے کہ قرآنِ کریم میں خود مذکور ہے لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ (سورۃ یٰسٓ:٦) تاکہ تو ایسے لوگوں کو ڈرائے جن کے آباء کو ڈرایا نہیں گیا، اس لئے سرورِ کائنات ﷺ کے تشریف لانے سے قبل جو لوگ وہاں موجود تھے اگر وہ شرک کے مرتکب نہ ہوں، توحید کا عقیدہ رکھتے ہوں، باقی عملی زندگی کیسی ہی کیوں نہ ہو، یہ اصحاب فترت جو ہیں ان کے لئے مغفرت کی توقع ہے، تو مکہ معظمہ میں اُس دور میں بھی بعض بعض حضرات ایسے تھے کہ جو عقیدۂ توحید پر تھے، شرک میں مبتلا نہیں تھے، جیسا کہ زید بن نوفل کا ذکر احادیث میں موجود ہے، اور اسی طرح سے بعض دوسرے حضرات بھی، تو ان کے لئے مغفرت کی توقع ہے، البتہ جو شرک کا ارتکاب کر لے یہ چونکہ خلافِ عقل ہے اس بات کے اوپر پکڑے جائیں گے چاہے اللہ کا رسول نہ ہی آیا ہو، اور پھر یہ معنوی چیز ہے کہ اس عقیدے کے سمجھنے کے لئے کتنی عقل کافی ہے اور کتنا تجربہ کافی ہے وہ اللہ کے علم میں ہے کہ اتنا ان کو تجربے کا موقع ملا یا نہیں ملا، اور ان کی عقل اس درجے کی کامل تھی یا نہیں، یہ تفصیل اللہ کے سامنے ہے، اسی علم کی بنا پر اللہ تبارک وتعالیٰ ان لوگوں سے برتاؤ فرمائیں گے جن کے پاس کوئی رسول نہیں آیا، جن کے پاس کوئی سمجھانے والا نہیں پہنچا۔ تو یہ گویا کہ اہلِ مکہ کو تنبیہ ہے کہ اپنے اعمال کا جائزہ لو، اور یہ نہ سمجھنا کہ ہمیں فلاں چھڑا لے گا یا ہمارے کردار کی اور ہمارے عمل کی ذمہ داری فلاں پر آجائے گی، یہ بات غلط ہے، ہر کسی کی قسمت، ہر کسی کا نصیبہ، ہر کسی کا عمل اسی کے گلے کا ہار ہے، اور اس کی تفصیل قیامت کے دِن اس کے سامنے رکھ دی جائے گی، اور کوئی بوجھ اُٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا، اور ہم اس وقت تک تو نرمی کا معاملہ کرتے ہیں جس وقت تک کوئی رسول نہ آئے، اور جس وقت اللہ کا رسول آجاتا ہے پھر اگر کوئی نہیں سمجھتا تو پھر ہم عذاب دے دیا کرتے ہیں اور ہلاکت ہو جایا کرتی ہے۔ تو یہ اُن کے لئے تنبیہ ہے۔

اور اسی مضمون کے ساتھ تعلق ہے اگلی آیات کا وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً: یہ ایک عادت ذکر کی جارہی ہے ''جب ہم ارادہ کرتے ہیں کسی بستی کو ہلاک کرنے کا''، یعنی کوئی بستی بدکرداری میں مبتلا ہے اور ہم اس کو تباہ کرنا چاہیں تو ہم پہلے ان کے اوپر اِتمامِ حجت کرتے ہیں، اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا: مُتْرَفِيْهَا یہ مضاف مضاف الیہ ہیں، یہ فی جارہ نہیں ہے، مُتْرَفِيْن اِتراف سے اسم مفعول کا صیغہ ہے، اور پھر اضافت کی وجہ سے نون گر گیا، مترف کہتے ہیں خوش حال آدمی کو جس کو راحت دی گئی ہو، آرام دیا گیا ہو، خوش حالی دی گئی ہو، ''حکم بھیجتے ہیں ہم اس بستی کے خوش حال لوگوں کے پاس'' وہاں جو سرمایہ دار اور خوش حال قسم کے لوگ موجود ہوتے ہیں، چونکہ بستی کی قیادت انہی کے ہاتھ میں ہوتی ہے، اور غریب طبقہ عموماً انہی لوگوں کے تابع ہوتا ہے، جس طرح سے آپ اپنے علاقے میں دیکھتے ہیں کہ زمین دار کے ماتحت مزارع یا اس کے گھر کے نوکر تقریباً وہ اسی کے مسلک پہ ہوتے ہیں، اس لیے اللہ کے اَحکام میں سب سے پہلے مخاطب انہی لوگوں کو کیا جاتا ہے جن کو قیادت وسیادت حاصل ہوتی ہے، جن کے اثرات دوسروں پر واقع ہوتے ہیں، انبیاء ﷩ جس وقت آتے ہیں تو آ کے انہی کو ہی خطاب کرتے ہیں، جس طرح سے آپ کے سامنے آیا قَالَ الْمَلَاُ، یہ ''مَلَا'' کا لفظ جو آیا ہے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ انبیاء ﷩ پہلے آ کر ان سرداروں کو سمجھاتے ہیں، ان بڑے لوگوں کو سمجھاتے ہیں جن کو اپنی بستی کے اندر قیادت حاصل ہوتی ہے، جو دوسروں کے اوپر اثر انداز ہوتے ہیں، اگر یہ سمجھ جائیں تو پھر چھوٹوں کا سمجھنا آسان ہو جاتا

ہے، اور بڑی رکاوٹ انہی کی طرف سے ہی ہوتی ہے، اور جب یہ فسق و فجور میں مبتلا ہو جائیں، عیش آرام میں مبتلا ہو جائیں، اللہ کے احکام کی پروا نہیں کرتے تو اکثر و بیشتر نچلی آبادی بھی ان کے ساتھ ہی شامل ہوتی ہے، تو حکام اور مقتدیٰ قسم کے لوگ یہی صلاح کے ذمہ دار ہوتے ہیں اور یہی فساد کے ذمہ دار ہوتے ہیں، اگر یہ اچھے ہو جائیں تو ان کے اچھے ہونے کی صورت میں آبادی کے اندر اچھائی پھیلتی ہے، اور اگر یہ بدمعاش ہوں، برائی کا ارتکاب کرنے والے ہوں تو آبادیوں کے اندر برائیاں پھیلتی ہیں، اس لئے سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی کلام میں انہی کو مخاطب کیا جاتا ہے۔ ''ہم حکم بھیجتے ہیں، ہم حکم دیتے ہیں بستی کے خوش حال لوگوں کو'' یعنی ان کے پاس اپنے احکام بھیجتے ہیں، فَفَسَقُوْا فِیْهَا: پھر وہ اس بستی میں نافرمانی کرنے لگ جاتے ہیں، فسق و فجور میں اتر آتے ہیں، فسق و فجور کا ارتکاب کرتے ہیں، فَحَقَّ عَلَیْهَا الْقَوْلُ: پھر اس بستی پر ہماری بات ثابت ہو جاتی ہے، اتمام حجت ہو گیا، فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِیْرًا: پھر ہم اس کو تہس نہس کر دیتے ہیں، پھر برباد کر دیتے ہیں ہم اس کو، نیست نابود کر دیتے ہیں ہم اس کو اچھی طرح سے نیست نابود کرنا، دَمَّرَ تَدْمِیْر کا معنی ہوتا ہے بالکل ملیامیٹ کر دینا اور اس کو تباہ و برباد کر دینا، جس کو ہم اپنی زبان میں تہس نہس کہہ سکتے ہیں، کہ پھر ہم اس بستی کو بالکل تہس نہس کر دیتے ہیں، جب وہاں کا خوش حال طبقہ فسق و فجور میں مبتلا ہو جاتا ہے اور ہمارے احکام کی رعایت نہیں رکھتا اور ان سے نچلے جو ہوتے ہیں وہ بھی فسق و فجور میں ان کے معاون بن جاتے ہیں، تو ایسی صورت میں بستی برباد ہو جاتی ہے۔

عبرت کے لئے تاریخ رفتہ پر نظر!

نمونہ دیکھنا چاہو تو پچھلی تاریخ کا مطالعہ کر لو، وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْۢ بَعْدِ نُوْحٍ: کتنی ہی جماعتیں ہم نے ہلاک کیں نوح کے بعد، یعنی نوح علیہ السلام کے زمانے میں مخالفین کا ہلاک ہونا وہ تو بہت نمایاں ہے، کہ ایک طوفان آیا جس نے سب کو ڈبو ڈبو کے مار دیا، اور نوح علیہ السلام کے بعد بھی کتنی جماعتیں ہیں جن کو ہم نے ہلاک کر دیا، وَكَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِیْرًۢا بَصِیْرًا: کَفٰی کا فاعل رَبُّكَ ہے اور اس کے اوپر باء زائدہ ہے۔ ''کافی ہے تیرا رب اپنے بندوں کے گناہوں کی خبر رکھنے والا اور دیکھنے والا'' خبیر اور بصیر ہونے کے اعتبار سے، اپنے بندوں کے گناہوں کی خبر رکھنے کے اعتبار سے اور ان کے حال کو دیکھنے کے اعتبار سے تیرا رب کافی ہے، اس کو کسی دوسری دلیل کی ضرورت نہیں، وہ خود خبیر و بصیر ہے جس کے سامنے ہر حال ہے۔

دُنیا کی تقسیم کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ضابطہ

مَنْ كَانَ یُرِیْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِیْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِیْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ یَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا: جو شخص ارادہ کرتا ہے عاجلہ کا، عاجلہ یہ دُنیا کا نام ہے، کیونکہ دُنیا کا لفظ بھی دَنَا یَدْنُوْ سے ہے قریب ہونے کے معنی میں، آخرت کے مقابلے میں دُنیا کا لفظ ہے، ہماری زندگی کے اعتبار سے قریب ہے جس سے ہم فائدہ اٹھاتے ہیں یہ دُنیا ہے، اور جو اس سے پیچھے آنے والی ہے وہ آخرۃ ہے، لفظی معنی یہی ہے، اسی طرح سے یہاں رہتے ہوئے جو چیز ہمیں جلد حاصل ہوتی ہے اس کو عاجلہ کے ساتھ بھی تعبیر کر دیتے ہیں تو یہاں عاجلہ سے یہی دنیا مراد ہے، ''جو شخص ارادہ کرتا ہے عاجلہ کا'' یعنی اس دنیا کی عیش و عشرت کا، رزق کا، عزت کا، جاہ کا ارادہ کرتا ہے، عَجَّلْنَا لَهٗ فِیْهَا: ہم جلدی دے دیتے ہیں اس کو اس عاجلہ میں، اس دنیا میں، ہم اس کو جلدی دے دیتے اس دنیا میں۔ کیا

دے دیتے ہیں؟ مَا نَشَآءُ: جو ہم چاہتے ہیں۔ کس کو دے دیتے ہیں؟ لِمَنْ نُّرِیْدُ: جس کے متعلق ارادہ کرتے ہیں۔ (خیال فرمالیجئے!) دُنیوی تقسیم کا اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہاں کیا ضابطہ بیان فرمایا ہے، کہ دنیا کے بارے میں تو ہم نے یہ عادت بنا رکھی ہے کہ اگر کسی شخص کی ساری کوشش کا حاصل یہی ہے کہ دنیا کمالے، اس کا ارادہ یہی ہے، اس کا اُٹھنا، بیٹھنا، سونا، جاگنا، کام کرنا، حرکت کرنا جو کچھ ہے سب اسی عاجلہ کے ارادے سے ہے، وہ اپنی دنیا کو آباد کرنا چاہتا ہے، تو سن لو، ہم اس دنیا میں دیتے ہیں، لیکن کتنا دیتے ہیں؟ جتنا ہم چاہتے ہیں، اتنا نہیں دیتے جتنا انسان چاہتا ہے، اور یہ ایک بیّن حقیقت ہے کہ انسان اپنے لئے جو چاہے وہ نہیں ملتا، ملتا اتنا ہی ہے جتنا اللہ چاہتا ہے، اور پھر جو شخص بھی دنیا کے لئے کوشش کرتا ہے ہر کوئی کامیاب نہیں ہوتا، دیتے ہم اس کو ہیں جس کو ہم چاہتے ہیں، مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِیْدُ یہ دو قیدیں ہوگئیں، اس لئے دنیا کے بارے میں کوشش کرنے کے نتیجے میں انسان کی کامیابی کی کوئی ضمانت نہیں ہے، ایک انسان کمانے کے لئے ساری زندگی سر کھپاتا رہتا ہے تو بھی اس کو پیٹ بھر کے روٹی نصیب نہیں ہوتی، اور ایک انسان جاہ اور مرتبہ حاصل کرنے کے لئے ساری زندگی الیکشن لڑتا رہتا ہے لیکن اس کو کرسی نہیں ملتی، جتنا انسان چاہتا ہے اتنا اس کو نہیں ملتا، جو چاہتا ہے وہ اس کو نہیں ملتا، بلکہ جتنا اللہ چاہتے ہیں اتنا دیتے ہیں، جس کو چاہتے ہیں اس کو دیتے ہیں، ورنہ اگر انسان اپنی خواہش کے مطابق حاصل کرسکتا تو دنیا کے اندر کوئی غریب نہ رہتا، اور ہر کوئی شخص اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کا سرمایہ دار بننے کی کوشش کرتا، لیکن یہاں ساری زندگی کھپا دیتے ہیں، ہر تدبیر اختیار کرتے ہیں، لیکن پھر بھی رہتے اسی ٹھکانے پر ہیں جہاں اللہ رکھتا ہے، دنیا کے بارے میں تو ہمارا ضابطہ یہی ہے کہ اگر کوئی شخص صرف دنیا کا ارداہ کرے اور اسی کے لئے اپنی پوری کوششیں کرتا ہے تو ہم اس کو دنیا میں دیتے ہیں جلدی، لیکن جو چاہتے ہیں دیتے ہیں جس کو چاہتے ہیں دیتے ہیں، ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ: تو جب اس کا ارادہ ہی دنیا کا تھا، آخرت کا ارادہ اس نے کیا ہی نہیں، آخرت پر وہ ایمان ہی نہیں لایا، تو آخرت کا معاملہ صفر، ''پھر ہم اس کے لئے جہنم بنادیں گے'' یَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا: داخل ہوگا وہ اس جہنم میں اس حال میں کہ بُرائی کیا ہوا ہوگا، دھتکارا ہوا ہوگا، دَحَرَ دھتکارنے کو کہتے ہیں، پھٹکارا ہوا ہوگا، دھتکارا ہوا ہوگا، مذموم ہوگا، بُرائی کی ہوئی ہوگی، اس کی تعریف نہیں کی جائے گی، اس کو بُرا قرار دے کے دھتکارا ہوا قرار دے کے جہنم کے اندر پھینک دیا جائے گا جس نے آخرت کمانے کا ارادہ ہی نہیں کیا، اس نے کوشش جتنی کی وہ ساری کی ساری دنیا ہی کے لئے کی، تو اس کوشش کے نتیجے میں ہم نے جتنا چاہا اسے دیا، جس کو چاہا دیا، پھر نتیجہ جہنم۔

حُسنِ نیت، حُسنِ عمل اور صحتِ عقیدہ والے کی سعی مشکور ہے

وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ: اور اس کے مقابلے میں جو شخص ارادہ کرلے آخرت کا، اپنی کوشش میں، اپنی ہر چیز میں اس کی نیت آخرت حاصل کرنے کی ہے، اَرَادَ الْاٰخِرَةَ کے اندر حسنِ نیت ہے، کہ عمل جو کرتا ہے تو ارادۂ آخرت کے اعتبار سے کرتا ہے، اور صرف ارادہ کافی نہیں بلکہ وَسَعٰى لَهَا: اور پھر آخرت کو حاصل کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے، یہ عملی زندگی آگئی، اور پھر عمل اپنی تجویز کے مطابق نہیں بلکہ سَعْيَهَا جس قسم کی کوشش آخرت کے لائق ہے، کوشش کرتا ہے آخرت کے لئے آخرت کے لائق، آخرت کے

مناسب کوشش، آخرت کے مناسب کوشش کون سی ہوا کرتی ہے؟ آخرت کے مناسب کوشش وہ ہے جس کی راہنمائی قرآن نے کی اور سُنّت نے کی، یعنی دنیا کے اندر تو آپ سمجھتے ہیں کہ ہل چلانا، غلّہ بو دینا، یہ فصل حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے، لیکن آخرت میں کامیابی کن اصولوں سے ہوگی ان کو آپ اپنے طور پر نہیں سمجھ سکتے، ان کو اللہ اور اللہ کا رسول بتائے گا کہ یہ کام اس طرح سے کرو گے تو آخرت میں اس کا ثمرہ اچھا نکلے گا، تو سَعٰی لَهَا سَعْیَهَا کا مطلب یہ ہوا کہ اس کی عملی زندگی آخرت کے مناسب ہو، یعنی اس طریقے پر ہو جو طریقہ اللہ اور اللہ کے رسول نے واضح کیا ہے، اس لئے سَعْیَهَا کا مناسب ترجمہ اگر آپ کر سکتے ہیں تو اتباعِ سُنّت کے ساتھ کر سکتے ہیں، کہ اس کی کوشش سُنّت کے مطابق ہو، عمل اگر کرے تو آخرت کے ارادے سے کرے، لیکن اپنی تجویز کے ساتھ کرتا رہا جس طرح سے بدعتی کرتے ہیں کہ اپنے طور پر ایک کام تجویز کر لیا، تجویز کر کے اس کے مطابق کوشش کرتے رہے، تو وہ کوشش اس کو آخرت کی طرف نہیں لے جائے گی، بلکہ اس کی منزل دوسری طرف قرار دیدی جائے گی، جتنی ہمت کرے گا، جتنی کوشش کرے گا اپنی منزل سے دُور ہٹتا چلا جائے گا، غلط راستہ اختیار کر لینے کی صورت میں انسان جتنا دوڑتا ہے اتنا اپنے گھر سے دُور جاتا ہے، (یہ بات تو آپ سمجھتے ہیں) اگر آپ ایک منزل پہ پہنچنا چاہتے ہیں لیکن اتفاق سے منہ دوسری طرف ہو گیا، ملتان کے اسٹیشن سے گاڑی بہاولپور کی طرف جانی تھی، لیکن اتفاق سے انجن فیصل آباد کی طرف کو لگ گیا، تو جتنی تیز چلے گی اپنی منزل سے دُور ہوتی چلی جائے گی، اب ایک شخص ارادہ تو کرتا ہے آخرت کا کہ اللہ کی رضا حاصل ہو اور آخرت کی نجات حاصل ہو جائے، لیکن طریقہ اپنا لیا اللہ کی ناراضگی کا، اپنے متعلق اس نے چاہے کتنا ہی اچھا خیال کیوں نہ رکھا ہوا ہو لیکن اگر طریقہ غلط ہے تو وہ منزل تک نہیں پہنچے گا بلکہ دُور ہٹتا چلا جائے گا، جیسے ہمارے شیخ (سعدیؒ) کہتے ہیں:

ترسم نرسی بہ کعبہ اے اعرابی! کیں راہ کہ تو میروی بہ ترکستان است[1]

کہ اے بدوی! میں تو ڈرتا ہوں کہ تُو کعبے نہیں پہنچ سکتا، کیونکہ جس راستے پہ تُو چلا جا رہا ہے یہ تو ترکستان کو جاتا ہے، تو جتنا چلو گے تم ترکستان کی طرف نکل جاؤ گے، کعبے کی طرف کیسے آؤ گے؟

تو بدعت جو ہے، جو انسان اپنی طرف سے تجویز کر کے بعض اعمال کو اختیار کر لیتا ہے، چاہے وہ نیکی کے جذبے کے ساتھ ہی کیوں نہ کرے، اللہ کی رضا حاصل کرنے کے جذبے کے ساتھ ہی کیوں نہ کرے، لیکن وہ راستہ غلط ہے، اس لئے جتنا اس کے اُوپر چلے گا آخرت حاصل ہونے کی بجائے آخرت سے دُور ہٹتا چلا جائے گا۔ تو سَعْیَهَا کے لفظ میں اس بات کی طرف اشارہ کر دیا کہ کوشش کرے اس آخرت کے لئے آخرت کے مناسب کوشش، جو اللہ اور اللہ کے رسول نے بتائی ہے کہ یوں کرو گے تو آخرت میں یہ ثواب ملے گا، یوں کرو گے تو یہ ثواب ملے گا، اپنے طور پر اگر کام تجویز کر لئے تو سَعْیَهَا کا مصداق نہیں ہے۔ تو اَرَادَ الْاٰخِرَةَ میں حسنِ نیت آ گئی، سَعٰی لَهَا سَعْیَهَا کے اندر عملی زندگی آ گئی، اور وہ بھی اتباعِ سُنّت کے ساتھ، سرورِ کائنات ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق، وَهُوَ مُؤْمِنٌ: یہ عقیدے کی اصلاح آ گئی، شرط یہ ہے کہ مؤمن بھی ہو، اگر ایمان نہیں تو عملی زندگی کتنی ہی اچھی

---

(۱) گلستان، باب دوم، حکایت نمبر ۲۔

کیوں نہ ہو یہ آخرت کے لئے کوشش نہیں ہے، اس کا کوئی عمل قبول نہیں۔ تو تین باتیں آگئیں حسنِ نیت اور حسنِ عمل اور صحتِ عقیدہ، جب کوئی شخص یہ تین چیزیں اختیار کر لے تو فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا: یہاں پھر یہ نہیں ہے کہ اللہ جس کو چاہے گا دے گا، جتنا چاہے گا دے گا، نہیں! ان کی کوشش کی قدر کی جائے گی، ''یہی لوگ ہیں کہ جن کی کوشش کی قدر کی جائے گی'' ان کی سعی مشکور ہے۔ مشکور: قدر کی ہوئی۔ ان کی کوشش کی قدر کی جائے گی، اللہ تعالیٰ اس کے اوپر اجر وثواب دیں گے۔

دُنیا میں اللہ تعالیٰ کی عطا کسی سے ممنوع نہیں

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ: باقی یہ دو گروہ بن گئے ایک آخرت کے چاہنے والے، ایک دنیا کے چاہنے والے، جہاں تک دنیا کے رزق اور دنیا کی ضرورت کا تعلق ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ہمارے ہاں کوئی فرق نہیں، ہم اِن کو بھی دیتے ہیں، اُن کو بھی دیتے ہیں، وقت نیکوں کا بھی گزرتا ہے، بُروں کا بھی گزرتا ہے، مؤمنوں کا بھی گزرتا ہے، کافروں کا بھی گزرتا ہے، جو آخرت چاہتے ہیں ان کا بھی گزرتا ہے، جو دنیا چاہتے ہیں ان کا بھی گزرتا ہے، ''ہر کسی کو دیتے ہیں ہم اِن کو بھی اور اُن کو بھی تیرے رَبّ کی عطا سے'' تیرے رَبّ کی عطا اِن کو بھی ملتی ہے اُن کو بھی ملتی ہے، اس عطا سے مراد دُنیوی رزق اور دُنیوی ضروریات ہیں، دنیا کے اندر رہتے ہوئے اللہ تعالیٰ دونوں فریقوں کو دیتے ہیں، وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا: تیرے رَبّ کی عطا دنیا کے اندر روکی ہوئی نہیں ہے، محظور نہیں، یعنی دیکھو! اس میں اس بات کی طرف اشارہ کر دیا کہ جس نے تو دنیا کا ارادہ کر لیا اس کو تو آخرت میں مل گیا صاف جواب، اس کے لئے تو آخرت میں سوائے جہنم کے کچھ نہیں، لیکن جو کوئی آخرت کا ارادہ کئے ہوئے ہے اس کو دنیا میں جواب نہیں دیا، کہ جو شخص آخرت کے لئے کوشش کرے تو اس کو آخرت میں تو دیں گے، دنیا میں نہیں دیں گے،، جیسے اُن کے متعلق کہا کہ جو دنیا چاہتا ہے تو اس کو دنیا میں دیں گے آخرت میں نہیں دیں گے، یہاں یہ بات نہیں ہے، اگر کوئی شخص آخرت کا ارادہ کئے ہوئے ہے اور اس کے مطابق عمل کرتا ہے، عقیدہ اس کا صحیح ہے، تو اس کو یہ جواب نہیں کہ اس کو دنیا میں کچھ نہیں ملے گا، اس کے سارے کے سارے عمل کا نتیجہ آخرت میں ہوگا، ایسی بات نہیں، دنیا میں اللہ تعالیٰ اِن کو بھی دیں گے، اُن کو بھی دیں گے، جو دنیا چاہتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو بھی دیتے ہیں، جو آخرت چاہتے ہیں ان کو بھی دیتے ہیں، دنیا کے اندر رہتے ہوئے اللہ کی عطا ممنوع نہیں (محظور: ممنوع، روکی ہوئی) نہ نیکوں سے روکی ہوئی ہے نہ بُروں سے، رزق دونوں کو ملتا ہے، دنیوی ضرورتیں دونوں کی پوری کی جاتی ہیں، ہاں! البتہ یہ تقسیم ہوگی کہ آخرت کے چاہنے والوں کو آخرت میں ان کی کوشش کی قدر کی جائے گی، ثواب ملے گا، اور جنہوں نے آخرت کے متعلق عقیدہ نہیں رکھا اور دنیا کے متعلق ہی کوشش کی انہوں نے جو کچھ کھانا پینا تھا کھا لیا، آخرت میں کچھ نہیں ملے گا۔

گزشتہ دعوے کی دلیل

اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ: خیال کر تو، کیسے فضیلت دی ہم نے بعض کو بعض پر، کس طرح سے ہم نے بڑھوتری دی، کیسے ایک دوسرے کے مقابلے میں بڑھا ہوا ہے، یعنی دنیا میں رزق اور عزت اور جاہ کے معاملے میں، یہ دلیل ہے اس بات کی کہ

پیچھے جو آیا تھا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِیْدُ کہ ہم جس کو چاہتے ہیں دیتے ہیں، جو چاہتے ہیں دیتے ہیں، یہ درجات کا تفاوت ہمارے اس دعوے کی دلیل ہے، کہ ہم نے کسی کو بڑھا دیا کسی کو گھٹا دیا، کسی کے پاس زیادہ ہے کسی پاس تھوڑا ہے، ورنہ ارادے کے اعتبار سے کون آدمی کم رہنا چاہتا ہے، اگر انسان کے ارادے پر ہی دنیا کی کامیابی ہوتی تو سارے ہی آگے بڑھ جاتے، لیکن دیکھو! ہم نے کس طرح سے درجات کا فرق رکھا ہے کہ کسی کے پاس زیادہ ہے کسی کے پاس کم، مال میں فرق ہے، جاہ میں فرق ہے، اور اسی طرح سے صحت کے اعتبار سے فرق ہے، صلاحیتوں کے اعتبار سے فرق ہے، باقی! جہاں تک آخرت کی بات ہے وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ: آخرت درجات کے اعتبار سے بہت بڑی ہے، وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا: اور فضیلت کے اعتبار سے بہت بڑی ہے، دنیا اور آخرت کا کوئی مقابلہ نہیں، آخرت کے درجات بھی بڑے اور آخرت کی فضیلت بھی زیادہ، اس لیے آخرت حاصل کرنے کی کوشش کرو، اپنی ساری صلاحیتیں دُنیوی مفاد یا دُنیوی لذت کے لئے صرف نہ کردو، اس میں تمہارا خسارہ ہے، تو ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے آخرت پر ایمان لانے اور آخرت کے لئے کوشش کرنے کی ترغیب دی ہے، اور جو لوگ اپنی ساری کی ساری توجہ دنیا کی طرف ہی کئے ہوئے ہیں اور دنیا کو ہی اپنا قبلہ بنائے ہوئے ہیں ان کے خسارے کی نشاندہی کی ہے کہ تمہارا یہ رخ ٹھیک نہیں، اس کا نتیجہ تمہارے حق میں اچھا نہیں نکلے گا۔ آگے کچھ اَحکام کی تفصیل آرہی ہے جس کو سَعْيَهَا کی تفصیل کے طور پر آپ سمجھ لیجئے کہ آخرت کے مطابق کوشش کون سی ہے کہ جس کے مقابلے میں آخرت حاصل ہوگی، اگلے دو رکوع اسی کوشش اور اسی عملی زندگی کی تفصیل کے طور پر آپ کے سامنے آرہے ہیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا ﴿۲۲﴾ وَقَضٰى رَبُّكَ

نہ بنا تو اللہ کے ساتھ اور معبود، بیٹھ رہے گا تو بُرائی بیان کیا ہوا اور مدد چھوڑا ہوا ﴿۲۲﴾ تیرے رَبّ نے فیصلہ کر کے یہ اطلاع دے دی

اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۭ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ

کہ نہ عبادت کرو تم مگر اسی کی، والدین کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو، اگر پہنچ جائے تیرے سامنے بڑھاپے کو ان دونوں میں کوئی ایک یا

كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ﴿۲۳﴾ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ

دونوں پھر تو انہیں اُف نہ کہا کر، نہ ان دونوں کو جھڑکا کر، اور ان دونوں کو اَدب کی بات کہا کر ﴿۲۳﴾ پست کر تُو ان کے لئے اطاعت کے

الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ

بازو کو شفقت کی وجہ سے، اور دُعا کرتا رہ اے میرے پروردگار! ان دونوں کے اُوپر رحم فرما جس طرح سے ان دونوں نے مجھے پالا ہے

صَغِیۡرًا ﴿۲۴﴾ رَبُّکُمۡ اَعۡلَمُ بِمَا فِیۡ نُفُوۡسِکُمۡ ؕ اِنۡ تَکُوۡنُوۡا صٰلِحِیۡنَ فَاِنَّہٗ کَانَ

بچپن کی حالت میں ﴿۲۴﴾ تمہارا رَبّ خوب جانتا ہے اس چیز کو جو تمہارے دِلوں میں ہے، اگر تم نیک ہو گے پس بے شک اللہ تعالیٰ

لِلۡاَوَّابِیۡنَ غَفُوۡرًا ﴿۲۵﴾ وَ اٰتِ ذَا الۡقُرۡبٰی حَقَّہٗ وَ الۡمِسۡکِیۡنَ وَ ابۡنَ السَّبِیۡلِ وَ لَا تُبَذِّرۡ

رُجوع کرنے والوں کے لئے بخشنے والا ہے ﴿۲۵﴾ اور رشتہ داروں کو ان کا حق دیا کر، اور مسکین کو اور مسافر کو، بے موقع

تَبۡذِیۡرًا ﴿۲۶﴾ اِنَّ الۡمُبَذِّرِیۡنَ کَانُوۡۤا اِخۡوَانَ الشَّیٰطِیۡنِ ؕ وَ کَانَ الشَّیۡطٰنُ لِرَبِّہٖ کَفُوۡرًا ﴿۲۷﴾

نہ اُڑایا کر ﴿۲۶﴾ بے شک بے موقع اُڑانے والے شیطانوں کے بھائی ہیں، اور شیطان اپنے رَبّ کا ناشکرا ہے ﴿۲۷﴾

وَ اِمَّا تُعۡرِضَنَّ عَنۡہُمُ ابۡتِغَآءَ رَحۡمَۃٍ مِّنۡ رَّبِّکَ تَرۡجُوۡہَا فَقُلۡ لَّہُمۡ قَوۡلًا مَّیۡسُوۡرًا ﴿۲۸﴾ وَ لَا

اور اگر اعراض کرے تو اُن سے اپنے رَبّ کی رحمت کو طلب کرتا ہوا جس کی تو اُمید رکھتا ہے تو کہا کر انہیں نرم بات ﴿۲۸﴾ اور نہ

تَجۡعَلۡ یَدَکَ مَغۡلُوۡلَۃً اِلٰی عُنُقِکَ وَ لَا تَبۡسُطۡہَا کُلَّ الۡبَسۡطِ فَتَقۡعُدَ مَلُوۡمًا

کیا کر تُو اپنے ہاتھ کو بندھا ہوا اپنی گردن کی طرف اور نہ بالکل ہی اس کو کھلا چھوڑ دیا کر پس بیٹھ رہے گا تُو اس حال میں کہ الزام دیا ہوا ہوگا

مَّحۡسُوۡرًا ﴿۲۹﴾ اِنَّ رَبَّکَ یَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَ یَقۡدِرُ ؕ اِنَّہٗ کَانَ بِعِبَادِہٖ خَبِیۡرًۢا

اور تھکا ہارا ہوا ہوگا ﴿۲۹﴾ تیرا رَبّ کشادہ کرتا ہے رزق کو جس کے لئے چاہتا ہے اور تنگ کرتا ہے، بے شک وہ اپنے بندوں کے ساتھ خبر رکھنے والا ہے

بَصِیۡرًا ﴿۳۰﴾ وَ لَا تَقۡتُلُوۡۤا اَوۡلَادَکُمۡ خَشۡیَۃَ اِمۡلَاقٍ ؕ نَحۡنُ نَرۡزُقُہُمۡ

اور بندوں کے احوال کو دیکھنے والا ہے ﴿۳۰﴾ قتل نہ کیا کرو اپنے بچوں کو تنگ دستی کے اندیشے سے، ہم انہیں بھی رزق دیں گے

وَ اِیَّاکُمۡ ؕ اِنَّ قَتۡلَہُمۡ کَانَ خِطۡاً کَبِیۡرًا ﴿۳۱﴾ وَ لَا تَقۡرَبُوا الزِّنٰۤی اِنَّہٗ کَانَ فَاحِشَۃً ؕ وَ سَآءَ

اور تمہیں بھی دیں گے، ان کا قتل کرنا بہت بڑا گناہ ہے ﴿۳۱﴾ اور زنا کے قریب بھی نہ پھٹکا کرو، بے شک یہ بے حیائی اور بہت برا

سَبِیۡلًا ﴿۳۲﴾ وَ لَا تَقۡتُلُوا النَّفۡسَ الَّتِیۡ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالۡحَقِّ ؕ وَ مَنۡ قُتِلَ

طریقہ ہے ﴿۳۲﴾ قتل نہ کیا کرو ایسے نفس کو جس کا قتل کرنا اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے ہاں مگر حق کے ساتھ، جو کوئی قتل کر دیا گیا

مَظۡلُوۡمًا فَقَدۡ جَعَلۡنَا لِوَلِیِّہٖ سُلۡطٰنًا فَلَا یُسۡرِفۡ

مظلوم ہونے کی حالت میں پس تحقیق ہم نے اس کے ولی کے لئے تسلط اور زور قائم کر دیا ہے، اس ولی کو چاہیے کہ وہ بھی قتل کرنے میں

فِّي الْقَتْلِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ۝۳۳ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ

حد سے نہ گزرے، بے شک یہ ولی مدد دیا ہوا ہے ۝۳۳ یتیم کے مال کے قریب بھی نہ جایا کرو مگر ایسے طریقے کے ساتھ جو کہ بہتر ہے

حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۪ وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا ۝۳۴ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا

یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائے اور عہد پورے کیا کرو، بے شک عہد کے متعلق سوال کیا جائے گا ۝۳۴ اور پورا کیا کرو کیل کو جس وقت

كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝۳۵ وَلَا تَقْفُ مَا

کہ تم کیل کرو اور صحیح ترازو کے ساتھ وزن کیا کرو، یہ بہتر ہے اور انجام کے اعتبار سے بڑا اچھا ہے ۝۳۵ پیچھے نہ لگا کر اس بات کے جس کا

لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا ۝۳۶

تجھے علم نہیں، بے شک کان آنکھ اور دل ہر ایک کے متعلق سوال کیا جائے گا ۝۳۶

تفسیر

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ: نہ بنا تُو۔ یہ خطاب ہر مخاطب کو ہے۔ نہ بنا تُو اللہ کے ساتھ اور معبود، اللہ کے ساتھ اور معبود قرار نہ دے، فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا: مذموم ذَمّ سے، بُرائی کیا ہوا۔ مخذول: جس کی مدد چھوڑ دی گئی ہو، جیسے خطبے میں آپ لفظ سنا کرتے ہیں: ''اَللّٰهُمَّ اخْذُلْ مَنْ خَذَلَ دِيْنَ مُحَمَّدٍ ﷺ'' جو شخص محمد ﷺ کے دِین کی مدد چھوڑ دے اے اللہ! تُو اس کی مدد چھوڑ دے، ''بیٹھ رہے گا تو بُرائی بیان کیا ہوا اور مدد چھوڑا ہوا'' نہ تیرا کوئی مددگار رہوگا، نہ تجھے کوئی اچھا کہے گا، اگر تُو نے اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو قرار دے لیا تو ایک وقت آ جائے گا خصوصیت کے ساتھ آخرت میں کہ ہر کوئی تیری بُرائی کرے گا اور کسی طرف سے تیری مدد نہیں ہوگی۔

ماقبل سے ربط

یہاں سے اَحکام کا سلسلہ شروع ہو رہا ہے، سورۂ نحل میں اجمالی طور پر آیا تھا اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ (آیت:۹۰) منکرات کی فہرست بھی دی گئی تھی، مامورات کی بھی دی گئی تھی، تو وہاں جو اجمال تھا اب اگلے اَحکام میں اسی کی تفصیل ہے، اللہ تعالیٰ عدل کی، احسان کی، ایتائے ذی القربیٰ کی تعلیم دیتے ہیں، فحشاء، منکر اور بغی سے روکتے ہیں، تو اسی کی جزئیات کچھ ان آیات کے اندر مفصل ذکر کی جا رہی ہیں، اور اس سورۃ میں پہلے رکوع کے آخر میں یہ لفظ آئے تھے اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ، یہاں اللَّتِیْ ھِیَ اَقْوَمُ میں صراطِ مستقیم کا تذکرہ تھا، کہ قرآن ایسا راستہ دکھاتا ہے جو بہت سیدھا ہے، اب اسی طریقِ اقوم کی تفصیل کہہ لیجئے، کہ قرآنِ کریم جو راستہ دکھاتا ہے وہ عدل کا راستہ، احسان کا راستہ، اور

فحشاء، منکر اور بغی سے بچاتا ہوا انسان کو جو لے جاتا ہے وہ یہی طریقِ اقوم ہے، اور ایسے ہی پچھلے رکوع کے اندر آیا تھا وَسَعٰی لَهَا سَعْيَهَا: کہ جو شخص آخرت کا ارادہ کرے پھر اس کے مناسب کوشش کرے اور وہ مؤمن بھی ہو تو اس کی کوشش کی قدر کی جائے گی، تو یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ آخرت کے مناسب کوشش کی تفصیل اب اِس میں بتائی جا رہی ہے، کہ وہ کون سی کوشش ہے جو آخرت میں قدر کی جائے گی، اور کس طریقے کا عمل کس طریقے کا عقیدہ اور کیسے معاملات اختیار کئے جائیں تو اللہ تعالیٰ آخرت میں انسان کو کامیاب قرار دیں گے، تو یہاں مناسب سعی جو آخرت کے مناسب ہے اس کی تفصیل کی رہی ہے۔

مضمون کی اِبتدا بھی توحید سے اور اِختتام بھی توحید پر کیوں؟

سب سے پہلے بنیادی کام جو ذکر کیا گیا ہے وہ ہے شرک سے بچنا، توحید بنیاد ہے ہر عدل کی ہر انصاف کی، اس لئے شرک کو ظلم عظیم کہا گیا (سورۂ لقمان: ۱۳) تو اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ کا بڑا فرد جو ہے توحید کا اختیار کرنا شرک سے بچنا، اس کا یہاں ذکر آ گیا، اِبتدا بھی اِسی سے ہو رہی ہے اور جہاں یہ اَحکام کا سلسلہ ختم ہوگا آخر آخر میں جا کے اگلے رکوع کے اختتام پر پھر اسی چیز کو ذکر کیا جائے گا وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتُلْقٰى فِيْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا، تو اختتام بھی اسی مضمون پہ ہوگا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شرک سے بچنا ہر کام سے زیادہ اہم ہے، اور توحید کو اختیار کرنا تمام فرائض میں زیادہ اہم ہے، ''اللہ کے ساتھ اور معبود قرار نہ دے پھر بیٹھ رہے گا تو اس حال میں کہ بُرائی کیا ہوگا، اس حال میں کہ تو مدد چھوڑا ہوا ہوگا'' تیری کسی کی طرف سے تعریف نہیں کی جائے گی، کوئی تجھے اچھا نہیں کہے گا، اور کسی طرف سے تیری مدد نہیں کی جائے گی اگر اللہ کے ساتھ تُو نے کوئی اور معبود قرار دے لیا۔

والدین کے حقوق

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ: قَضٰى کا لفظ پہلے بھی آپ کے سامنے آیا، قَضَيْنَآ پہلے رکوع میں آیا تھا، فیصلہ کر کے اطلاع دینے دینا، جب قَضٰى کا ذکر ایسے موقع پر آ جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تیرے رَبّ نے فیصلہ کر کے یہ اطلاع دے دی، تیرے رَبّ نے یہ فیصلہ کیا ہے، تیرے رَبّ نے یہ حکم دیا ہے جو عام لوگوں تک اب پہنچایا جا رہا ہے، ''کہ نہ عبادت کرو تم مگر اسی کی'' عبادت صرف اسی کی کرو، وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا: تو جیسے وہاں يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ کے بعد احسان کا ذکر تھا تو اب اِحسان کے ایک بڑے فرد کی تفصیل بتائی جا رہی ہے جیسا کہ عدل کے بڑے فرد کا ذکر آیا تھا کہ توحید اختیار کرو، شرک سے ظلم عظیم ہے۔ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا: اِحسان مصدر ہے اور مفعول مطلق ہونے کے طور پر یہاں منصوب ہے، اور اس کا فعل محذوف ہے اَحْسِنُوْا بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا: والدین کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو، اللہ تعالیٰ کی عبادت کے بعد اس دنیا کے اندر سب سے زیادہ حقوق جس کے انسان کے اوپر عائد ہوا کرتے ہیں وہ والدین کے ہی ہیں، اس لئے ان کو رَبِّ مجازی کہا جاتا ہے، پیدا کرنے والا اصل کے اعتبار سے اللہ ہے لیکن پیدا ہونے کا ذریعہ والدین بنتے ہیں، اور مربی، پالنے والا، انسان کی ضرورتیں پوری کرنے والا اصل کے اعتبار سے اللہ ہے، لیکن پیدا ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کی اس رُبوبیت کا مظہر والدین ہوتے ہیں، والدین بچے کو پالتے ہیں، اپنے آرام کو قربان کرتے ہیں، تکلیفیں اُٹھاتے ہیں، بچے کی راحت اور آرام کا خیال کرتے ہیں، دیکھ ہی لیا کرو گھر میں، چھوٹے بچوں کی والدین کس طرح سے

خدمت کیا کرتے ہیں، تو جب آپ پر احسان اللہ تعالیٰ کے بعد سب سے زیادہ والدین کا ہے تو تمہیں بھی یہی حکم دیا جا رہا ہے کہ تم بھی اللہ کی عبادت کے بعد اچھا برتاؤ والدین کے ساتھ ہی کیا کرو، ان کے ساتھ اچھا برتاؤ رکھو، ان کی دنیوی ضرورتوں کا خیال کرو، ادب احترام کرو، بدنی خدمت کرو، مالی خدمت کرو، جس قسم کا احتیاج ان کو ہو ان کا خیال رکھو۔ اور والدین کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کے لئے والدین کا مسلمان ہونا بھی ضروری نہیں، اگر وہ کافر بھی ہوں تو بھی دنیا کے اندر ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جاتا ہے، غالباً سورۂ لقمان کے اندر یہ لفظ آئیں گے وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِیْ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِی الدُّنْیَا مَعْرُوْفًا (سورۃ لقمان: ۱۵) کہ اگر وہ تجھے شرک پر مجبور کریں تو ان کا کہنا نہیں ماننا، یعنی نہ صرف یہ کہ مشرک ہیں بلکہ شرک پر مجبور کریں تو ان کا کہنا نہیں ماننا، لیکن صَاحِبْهُمَا فِی الدُّنْیَا مَعْرُوْفًا: دنیا کے اندر پھر بھی ان کے ساتھ اچھی طرح سے ہی رہنا ہے مشرک ہونے کے باجود، اور اگر وہ آپ کو شرک پہ مجبور بھی کرتے ہیں تو بھی ان سے قطع تعلق جائز نہیں، ہاں! البتہ ایسے معاملات میں ان کا کہنا نہیں مانا جائے گا، وہ شریعت نے ہمارے سامنے ایک اصول واضح کر دیا کہ ''لا طاعةَ لِمخلوقٍ فِی مَعْصِیَةِ الخالِقِ ''(۱) جہاں اللہ کی نافرمانی لازم آتی ہو، خالق کی نافرمانی لازم آتی ہو وہاں مخلوق میں سے کسی کا کہنا نہیں مانا جاتا، لیکن دنیا کے اندر پھر بھی ان کے ساتھ اچھا برتاؤ ہی کیا جائے گا، ان کی ضروریات کا خیال کیا جائے گا، ان کی بدنی خدمت کی جائے گی۔

بڑھاپے کی حالت میں والدین کا خصوصی خیال رکھنے کی تاکید

اِمَّا یَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَاۤ اَوْ كِلٰهُمَا: اگر پہنچ جائے تیرے سامنے، عِنْدَكَ: تیرے سامنے، تیری زندگی میں، تیرے پاس، ''اگر پہنچ جائے تیرے سامنے بڑھاپے کو ان دونوں میں سے کوئی ایک یا وہ دونوں'' فَلَا تَقُلْ لَّهُمَاۤ اُفٍّ: پھر تو انہیں اف نہ کہا کر، وَّلَا تَنْهَرْهُمَا: نہ ان دونوں کو ڈانٹا کر، جھڑکا کر، وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِیْمًا: اور ان دونوں کو ادب کی بات کہا کر، یعنی والدین کے ساتھ احسان تو ہر دور میں ہر زمانے میں ہر عمر میں کرنا ضروری ہے، لیکن ان آیات کے اندر خصوصیت کے ساتھ بڑھاپے کا ذکر کیا جا رہا ہے، کیونکہ بڑھاپے کا زمانہ ایک ایسا زمانہ ہے جس میں والدین اولاد کی خدمت کے زیادہ محتاج ہوتے ہیں، جب وہ اپنی ضروریات پوری کرنے پر قادر نہیں ہوتے، جب آپ بچے ہیں اور والدین جوان ہیں، اس وقت آپ کا اطاعت کرنا، فرمانبرداری کرنا، ان کی خدمت کرنا آسان ہے، اس لئے کہ آپ کی ضروریات خود ان سے متعلق ہیں، وہ آپ کو بظاہر کھانے کے لئے دیتے ہیں، پیسے دیتے ہیں، آپ کی خدمت کرتے ہیں تو ایسے وقت میں اگر آپ ان کا کہنا مانیں گے تو یہ کوئی زیادہ مشکل بات نہیں ہے، لیکن جس وقت وہ بوڑھے ہو جائیں تو پھر وہ ایک بوجھ محسوس ہوتے ہیں، ان کی عادات میں چڑچڑاپن پیدا ہو جاتا ہے، پھر وہ ہر ہر چیز میں محتاج ہو جاتے ہیں، تو یہ زمانہ یاد دلایا جا رہا ہے کہ جیسے بچپن کے اندر تم ایک گوشت کا لوتھڑا تھے جو والدین کے سپرد کئے گئے اور والدین نے تمہیں پال پوس کے اتنے بڑے کر دیا، اور تمہاری ہر ضرورت کا خیال رکھا اور تمہاری راحت کے لئے ہر تکلیف برداشت کی، تو بڑھاپے کا زمانہ ایک ایسا زمانہ ہوتا ہے کہ جس وقت ماں باپ ایک ہڈیوں کی مٹھی اولاد کے سپرد ہو جاتے ہیں، وہ

---

(۱) مشکوٰۃ ۳۲۱/۲، کتاب الامارۃ، فصل ثانی بحوالہ شرح السنۃ/ نیز مسلم ۱۲۵/۲ باب وجوب طاعۃ الامراء۔ ولفظہ: لَا طَاعَةَ فِی مَعْصِیَةِ اللهِ۔

صرف ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ ہوتے ہیں، اب ایسے وقت میں پتا چلتا ہے کہ جس طرح سے انہوں نے احسان کیا تھا آپ ان کے اوپر کتنا احسان کرتے ہیں، اس وقت سعادت مند بیٹے کا پتا چلا کرتا ہے کہ خدمت کتنی کرتا ہے کتنی نہیں کرتا، اس لئے خصوصیت کے ساتھ یہاں بڑھاپے کا ذکر کر دیا۔ جیسے سرورِ کائنات ﷺ نے روایات کے اندر بہت کثرت کے ساتھ والدین کی خدمت کی ترغیب دی ہے کہ انسان کے لئے جنت اور دوزخ یہی ہیں، والدین اگر راضی ہوں گے تو اللہ راضی ہے، والدین راضی نہیں تو اللہ راضی نہیں، والدین جنت کے دروازے ہیں ان کو محفوظ رکھو، انہیں ضائع نہ کرو، اس قسم کی روایات آپ کے سامنے ''مشکوٰۃ شریف، باب البر والصلۃ'' (۴۱۸/۲) میں بہت ساری گزر چکی ہیں۔ ''اگر پہنچ جائے تیرے سامنے بڑھاپے کو ان دونوں میں سے ایک یا وہ دونوں تو انہیں اُف نہ کہا کر'' اف کہنا یہ ایک قسم کی بیزاری کا اظہار ہوتا ہے، جیسے کوئی بات کرتا ہے تو ہم آگے سے ''اُونہہ'' کہہ کے ایک نفرت کا اظہار کرتے ہیں، کہ تیری بات ہمیں پسند نہیں ہے، دل کی تنگی کا اظہار ہوتا ہے، تو یہاں اُف کلمہ ہی مقصود نہیں بلکہ ہر وہ بات جو ان کے لئے باعثِ تکلیف ہو، جس زبان میں بھی ہو، جس انداز سے بھی ہو ایسی بات ان کے سامنے نہ کہو، جس طرح سے اُردو میں تعبیر کرتے ہوئے اس کو یوں کہا گیا کہ ''اُن کو ہاں سے ہوں نہ کہو'' مطلب یہ ہے کہ ان کی کسی بات کے اوپر ایسا اظہار نہ کرو کہ جس سے معلوم ہو کہ تم ان کی وجہ سے تکلیف محسوس کر رہے ہو یا ان کی کوئی بات تمہیں پسند نہیں ہے، اور لَا تَنۡهَرۡهُمَا یہ تو اس سے بڑھ کے بات ہوگئی، کہ کسی معاملے میں انہیں ڈانٹو نہیں، جھڑکو نہیں، اور جب بھی بات کرنے کی ضرورت پیش آئے تو ان کے ساتھ باادب بات کرو، ادب کے ساتھ بات کرو، اور اُن کی عظمت کو ہر وقت محسوس کرو۔ وَاخۡفِضۡ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحۡمَةِ: رحمت سے شفقت مراد ہے، ذُل سے اطاعت اور فرمانبرداری مراد ہے، اور جناح کہتے ہیں بازو کو، جس طرح سے پرندے کا پَر ہوا کرتا ہے، آپ نے دیکھا ہوگا کہ مرغی ہو یا دوسرے پرندے ہوں اپنے بچوں کو ہمیشہ اپنے پَروں کے نیچے محفوظ رکھتے ہیں، جہاں کہیں بھی کوئی خطرہ پیش آجاتا ہے تو فوراً اپنے پَروں کے نیچے لے لیتے ہیں، اس طرح سے پَر پھیلایا، بچہ آیا، تو اس کو یوں کر کے اپنے پہلو میں لے لیا جاتا ہے، گویا کہ اپنے بچوں کے اوپر ہمیشہ پَروں کو جھکائے رکھتے ہیں، ان کی حفاظت کرتے ہیں، ان کے ساتھ محبت کا یہی اظہار ہوا کرتا ہے، بالکل والدین کی یہی کیفیت ہوتی ہے اپنی اولاد کے ساتھ، کہ بچوں کو کس طرح سے وہ گود میں لیتے ہیں، کس طرح سے بازوؤں میں سمیٹتے ہیں، کس طرح سے اپنے بدن کے ساتھ لگاتے ہیں، کیسے محبت کا اظہار کرتے ہیں، تو جب تم جوان ہو گئے اور وہ بوڑھے ہو گئے تو ایسی صورت میں تمہیں بھی چاہیے کہ شفقت کے سبب سے اطاعت کا بازو ان کے لئے پست رکھا کرو، وَاخۡفِضۡ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحۡمَةِ: پست کر تو ان کے لئے اطاعت کے بازو کو شفقت کی وجہ سے۔

والدین کے لئے دُعا کی ترغیب واہمیت

وَقُلۡ رَّبِّ ارۡحَمۡهُمَا: اور خود اپنے طور پر بھی ان کے حقوق ادا کرنے کی کوشش کر، لیکن ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے بھی دُعا کر رَّبِّ ارۡحَمۡهُمَا: اے اللہ! ان دونوں کے اوپر رحم فرما، كَمَا رَبَّيٰنِي صَغِيۡرًا: جس طرح سے کہ ان دونوں نے مجھے پالا اس حال میں کہ میں بچہ تھا، بچہ ہونے کی حالت میں جس طرح سے مجھے انہوں نے پالا ہے اے اللہ! تو ان کے اوپر رحم فرما، مطلب یہ ہے کہ میں

خدمت کر کے ان کا حق ادا ہی نہیں کرسکتا، اس لئے اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ اٹھائے جاتے ہیں کہ اے اللہ! تو ان کے اوپر رحم فرما۔ والدین کے لئے دُعا کرنا یہ مستقل ایک حق کی ادائیگی ہے، جیسے کہ آپ کے سامنے حدیث شریف میں آیا، سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ ایک بچہ بسااوقات اپنے والدین کا نافرمان ہوتا ہے، عاق ہوتا ہے، اور والدین ایسی حالت میں فوت ہوجاتے ہیں جب بچہ زندگی میں کوئی خدمت نہیں کرسکا، بعد میں ان کے لئے دُعا کرتا رہتا ہے، دُعا کرتا رہتا ہے (اور اس دُعا کے صلے میں اللہ تعالیٰ اس کے والدین کے درجات بلند کرتے ہیں، نیکیاں دیتے ہیں) حتیٰ کہ اس بچے کو والدین کے لئے ''بار'' لکھ دیا جاتا ہے،[1] یعنی حقوقِ والدین کی عدم ادائیگی والا جو جرم تھا وہ ان کے لئے دُعا کرنے کے ساتھ بھی اس کی تلافی ہوجاتی ہے، کسی کے حق کے ادا کرنے کا ایک یہ طریقہ بھی ہے کہ اس کے لئے دُعا کرو، دُعا کر کے اس کو اتنا نفع پہنچادو کہ جتنی تم نے تکلیف پہنچائی ہے اس کا تدارک ہوجائے، تو والدین کے لئے دُعا بھی کرتے رہو۔ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا: اے میرے پروردگار! ان دونوں کے اوپر رحم فرما، كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا: جس طرح سے ان دونوں نے مجھے پالا ہے بچپن کی حالت میں۔ تو گویا کہ انسان اگر بچپن کی حالت کو یاد رکھے تو پھر والدین کی خدمت آسان ہوتی ہے۔ جیسے کہ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں، ''گلستان'' کے اندر واقعہ آتا ہے، وہ کہتے ہیں کہ کسی بات پر ایک دفعہ میں نے اپنی والدہ کو ڈانٹ دیا، تو والدہ بیٹھ کر رونے لگ گئی اور اس نے یہ کہا کہ سعدی! اگر تجھے اپنا بچپن یاد ہوتا تو آج تو میرے ساتھ یہ برتاؤ نہ کرتا۔[2] تو اصل بات یہی ہے کہ بچپن میں جس قسم کی خدمات والدین ادا کرتے ہیں، بچہ سوائے اس کے کیا ہوتا ہے کہ پاخانہ اور پیشاب کی پوٹلی ہے، ہر وقت کہیں پیشاب کررہا ہے کہیں پاخانہ کررہا ہے، کہیں ناک بہہ رہا ہے، کہیں کچھ ہے، اور ماں باپ کس طرح سے اس کے ساتھ محبت اور پیار کے ساتھ معاملہ کرتے ہیں، اور اس کو پال پوس کے اتنا بڑا کردیتے ہیں، تو اب جس وقت والدین خدمت کے محتاج ہوں تو پھر بیٹا ڈانٹنے لگ جائے یہ کوئی مناسب صورت نہیں ہے۔

صرف ظاہری برتاؤ پر اِکتفاء نہ کرو، دِل میں بھی محبت ہونی چاہیے

رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ: اس میں اس بات پر تنبیہ کی جارہی ہے کہ صرف ظاہری برتاؤ اچھا نہیں ہونا چاہیے، دل میں بھی محبت اور عظمت ہونی چاہیے، جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اللہ تعالیٰ اس کو بھی خوب جانتا ہے، ''تمہارا ربّ خوب جانتا ہے اس چیز کو جو تمہارے دِلوں میں ہے'' اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ: اگر تم نیک ہو، اگر تمہارے دِلوں کے اندر نیکی کا جذبہ ہے، صلاحیت ہے، پھر اگر ظاہری طور پر خدمت میں کوتاہی ہوجائے تو تم اللہ کے سامنے توبہ، اِستغفار کروگے اللہ معاف کردے گا، دلوں کی حالت اللہ کو معلوم ہے، کیونکہ آخر انسان ہے، سب کچھ سوچنے سمجھنے کے باوجود بھی کوتاہی ہوجاتی ہے، ''اگر تم نیک ہوگے'' فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا: پس بے شک اللہ تعالیٰ رجوع کرنے والوں کے لئے بخشنے والا ہے، کہ پھر تم اللہ کی طرف رجوع کرو، اپنی کوتاہی کا اقرار کرو، اور توبہ اور اِستغفار کرو، اللہ تعالیٰ معاف کردے گا۔ تو والدین کے متعلق تاکید ہوگئی، یہ احسان کے درجے میں ایک اعلیٰ جزئیہ کا ذکر ہے۔

---

(۱) مشکوٰۃ ۴۲۱/۲ باب البر والصلہ، فصل ثالث / شعب الایمان، رقم الحدیث: ۷۵۲۴۔

(۲) دیکھئے: گلستان، باب ششم، حکایت نمبر ۶۔

دُنیا میں امن وسکون کا فارمولا

وہاں (سورۂ نحل میں) تیسرے درجے میں ذکر آیا تھا وَ اِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی کا، اب آگے اس کی کچھ تفصیل ذکر کی جارہی ہے، وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ: والدین کے بعد عام رشتہ دار جو ہیں ان کو بھی ان کا حق دیا کرو اور مسکین کو اس کا حق دیا کرو اور مسافر کو اس کا حق دیا کرو، جس سے معلوم ہو گیا کہ مسافر کا بھی حق ہے، اور عام محتاج اور مساکین کا بھی انسان کے ذِمّے حق ہے، اور رشتہ داروں کا بھی حق ہے، رشتہ دار تو رشتہ دار ہونے کی وجہ سے حق دار ہے، چاہے وہ مسکین اور محتاج نہ ہی ہوں تو بھی ان کے ساتھ گاہے گاہے اچھا برتاؤ کرو، ان کی خوشی میں شریک رہو، ان کی غمی میں شریک رہو، کبھی ہدیہ بھیجو، کبھی ملاقات کے لئے جاؤ، بیمار ہو جائیں تو عیادت کے لئے جاؤ، ان کے ساتھ خوش اسلوبی سے پیش آؤ، یہ ساری کی ساری چیزیں رشتہ داروں کا حق ہیں، ان کا محتاج ہونا ضروری نہیں۔ اور پھر عام انسان جن کے ساتھ کوئی رشتہ داری نہیں اگر وہ محتاج ہو جائیں تو محتاج ہونے کی صورت میں پھر تمہارے ذِمّے حق ہے کہ اس کے احتیاج کی بقدر اس کی امداد کرو، آپ کے پاس گنجائش ہے وسعت ہے تو آپ کے ذِمّے ضروری ہے کہ آپ کے اردگرد بسنے والے ملنے والے چاہے رشتہ دار نہ ہوں ان کی ضروریات کا خیال رکھا جائے۔ اور مسافر چاہے اپنے علاقے میں خوش حال ہی ہو لیکن کسی وجہ سے آپ کے علاقے میں آ گیا، تو مسافر اپنی ضروریات پوری کرنے میں محتاج ہوتا ہے چاہے وہ اپنے علاقے کے اندر کتنا ہی خوش حال کیوں نہ ہو، تو ایسے مسافر کی رہائش کا انتظام کرو، وقت پہ اس کی روٹی کا خیال رکھو، اور اگر اس کو کسی چیز کی ضرورت ہے تو اس کی امداد بھی کرو۔ تو یہ چیزیں ایسی ہیں کہ جن کے ساتھ معاشرے کی اصلاح ہوتی ہے، جب ہر شخص اس جذبے کے ساتھ چلے گا کہ رشتہ دار کا حق ادا کرنا ہے، محتاجوں کا حق ادا کرنا ہے، مسافر کا حق ادا کرنا ہے، تو آپ دیکھیں گے کہ امن وسلامتی عام ہو جائے گی، ہر طرف راحت اور آرام کا دور دورہ ہو جائے گا، آج جتنی پریشانیاں ہیں ان پریشانیوں کی بنیاد اسی پر ہے کہ ہر شخص دوسرے سے خود اپنے حقوق کا مطالبہ تو کرتا ہے اور خود حق ادا کرنے کی کوشش نہیں کرتا، یہی وجہ ہے کہ ہر شخص دوسرے کے حق میں ظالم بنا ہوا ہے، ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ میں فائدہ اٹھالوں، دوسرا آدمی مجھے فائدہ پہنچائے، اور خود یہ ذمہ داری محسوس نہیں کرتا کہ میرے ذِمّے بھی دوسرے کا حق ہے میں ادا کرنے کی کوشش کروں، قرآنِ کریم ہمارے سامنے جو طریقہ ذکر کرتا ہے وہ یہ ہے کہ تمہارے اندر ادائے حقوق کا جذبہ ہونا چاہیے، ہر شخص یہ چاہے کہ میں دوسرے کے حقوق ادا کروں، جس وقت یہ جذبہ پیدا ہو جائے گا تو سب کے حقوق ادا ہونے لگ جائیں گے، کیونکہ آپ دوسروں کا خیال رکھیں گے تو دوسرے آپ کا خیال رکھیں گے، تو ادائے حقوق کا جذبہ! اصل کے اعتبار سے کمال یہی ہے، امن اور سکون دنیا کے اندر اگر پیدا ہو سکتا ہے تو صرف ادائے حقوق کے جذبے سے پیدا ہو سکتا ہے۔

فضول خرچی سے ممانعت اور اس کے نقصانات

وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا: بے موقع نہ اُڑایا کر، تبذیر اور اِسراف یہ دو لفظ آتے ہیں، لَا تُسْرِفُوْا، لَا تُبَذِّرْ، اسراف نہ کیا کرو اور بے موقع نہ اڑایا کرو، معصیت میں خرچ کیا جائے، بلاضرورت خرچ کیا جائے، یہ تبذیر ہے، اور ضرورت سے زیادہ خرچ کیا جائے

یہ اسراف ہے، دونوں آپس میں قریب قریب ہی ہیں، اور ان کو یہاں جوڑ کر کیا جارہا ہے اصل میں یہ بھی ادائے حقوق کے ساتھ تعلق رکھنے والی بات ہے، ایک شخص جس کو فضول خرچی کی عادت ہو، بے موقع مال اڑانے کی عادت ہو وہ کبھی دوسرے کا حق نہیں ادا کرسکتا، اب آپ دیکھتے ہیں کہ ایک سرمایہ دار آدمی ہے، دور کیا جائیے، ہمارے شہر (کہروڑپکا) کی مثال لے لیجئے، یہ کل پرسوں جن کا دعوتی کارڈ آیا تھا، وہ کوئی کارخانہ دار ہے، اس کے بیٹے کی شادی ہے، اب وہ کارڈ جو تقسیم ہوئے ہیں ایک ایک کارڈ کم از کم دس دس روپے کا ہوگا،[1] یہ جو دعوتی کارڈ تقسیم ہوئے ہیں، اور کھانا پکانے کے لئے سنا ہے کہ گوجرانوالہ سے ایک مخصوص آدمی آرہا ہے جو ایک وقت کھانا پکانے کی اُجرت چھ ہزار روپے لے گا، اب پکانے والے کی اتنی اُجرت ہوگی تو پکانے میں کیا کچھ ہوگا، اور کھانے والے کیسے لوگ مدعو کیے جائیں گے، اب وہ ایک دن شادی کے اندر لاکھوں روپے اڑا دے گا، جب اس طرح لاکھوں روپے اس قسم کے اللے تللوں میں اڑائے جاتے ہیں، زبان کے چسکے پورے کرنے کے لئے، یا شہرت حاصل کرنے کے لئے، جب مال اس طرح سے اڑایا جاتا ہے، اسی شخص کو کہو کہ اس قسم کی فضول خرچیوں پر تو تم لاکھوں روپے خرچ کررہے ہو، مسجد کے لئے پچاس ہزار دو، پانچ ہزار دے دو، پانچ سو دے دو، کہیں گے جی! گنجائش ہی نہیں۔ گنجائش کس طرح سے ہو جب فضول خرچیاں اتنی شروع کی ہوئی ہیں کہ مال جتنا کماتے ہیں وہ اپنی فضول خرچیوں کے لئے بھی کافی نہیں ہے، جب اپنی کے لئے کافی نہیں تو کسی مسکین کو کسی مسافر کو کسی درویش کو یا کسی کارِ خیر کے اندر کس طرح سے خرچ کریں گے۔ اس لئے اگر کوئی شخص چاہتا ہے کہ مجھے کارِ خیر میں خرچ کرنے کی توفیق ہو تو اس کو سب سے پہلے چاہیے کہ تبذیر اور اسراف کی عادت چھوڑے، فضول خرچی نہ کرے، بے موقع خرچ نہ کرے، ضرورت سے زیادہ خرچ نہ کرے، بقدرِ ضرورت خرچ کرے، جب بقدرِ ضرورت خرچ کرے گا تو پھر اس کے پاس بچت بھی ہوگی، جب بچت ہوگی تو اس کے لئے کارِ خیر میں خرچ کرنا آسان ہوجائے گا، اور جو آمدنی سے زیادہ اپنے اخراجات بڑھائے ہوئے ہے اس کو کب توفیق ہوسکتی ہے کہ وہ کسی رشتہ دار کے ساتھ مروت کرلے یا کسی مسکین کے ساتھ کرلے یا کسی دوسرے کارِ خیر میں خرچ کرلے، اس لئے یہ شیطان کی رفاقت ہے، شیطان اکساتا بہکاتا ہے، انسان کو نیکی کے راستے میں خرچ کرنے سے روکنے کے لئے اس کے سامنے فضول دروازے کھول دیتا ہے، فضول اخراجات شروع ہوجاتے ہیں، جب فضول اخراجات شروع ہوجاتے ہیں تو انسان نیکی کے کاموں سے محروم ہوگیا، اللہ کی رفاقت سے محروم ہوگیا، اور شیطان کا بھائی بن گیا۔ تو لَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا کو ادائے حقوق کے ساتھ جوڑ کر کیا جارہا ہے اس کی اہمیت یہی ہے کہ ادائے کر ہی وہ شخص سکتا ہے جس کے بے موقع، ضرورت سے زیادہ، اور بُرے کاموں میں خرچ کرنے کی عادت نہ ہو، ورنہ جو آدمی اپنے لیے اس قسم کے اخراجات سوچ لیتا ہے تو اس کی آمدنی ان اخراجات کے لئے کافی نہیں ہوتی، فضول تو جتنا چاہو اڑاتے چلے جاؤ، جب اس کی آمدنی اس کے اپنے کاموں کے لئے کافی نہیں ہوگی تو پھر وہ کسی دوسرے کی امداد نہیں کرسکتا۔ لَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا: بے موقع نہ اڑایا کر، اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ: بے شک بے موقع اڑانے والے تو شیطانوں کے بھائی ہیں، اُن کا اللہ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں، اللہ والے تو وہی سمجھے جائیں گے جو بقدرِ ضرورت اپنے اوپر خرچ کرتے ہیں، اور پھر مال کو بچا کے زیادہ سے زیادہ آخرت میں ذخیرہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں،

(۱) یہ بات حضرت الشیخ رحمہ اللہ سن ۱۴۰۱ھ میں کررہے ہیں۔

اللہ والے وہ ہیں، اولیاء اللہ انہیں کہا جائے گا، اور جو دوسری طرف کو جانے والے ہیں، حرام حلال کماتے ہیں، کمانے میں خیال نہیں کرتے، یا کمانے کے بعد وہ مناسب اخراجات نہیں رکھتے، فضول اڑاتے ہیں، معصیت میں اڑاتے ہیں، تو یہ شیطانوں کے ساتھی تو ہو سکتے ہیں، یہ اللہ والے نہیں ہو سکتے، اور معاشرے کی بربادی زیادہ تر اسی طرح سے ہوتی ہے کہ جن کے پاس مال آجاتے ہیں وہ ان کو موقع پر خرچ کرنے کی بجائے بے موقع اڑانے لگ جائیں تو اعتدال ختم ہو جاتا ہے، توازن بگڑ جاتا ہے، جس طرح سے بدن کے اندر خون ہے یہ صحت کا باعث تبھی ہوگا جب یہ ہر عضو کی طرف مناسب مقدار کے ساتھ حرکت کرے، اور اگر ایک عضو کی طرف زیادہ بڑھنا شروع ہو جائے اور ایک عضو میں کمی آنی شروع ہو جائے تو صحت بگڑ جائے گی، تو مال کی تقسیم بھی اسی طرح سے ہے کہ مناسب انداز کے ساتھ رہے تو معاشرہ صحیح رہتا ہے، اور جہاں اس قسم کی بے اعتدالیاں شروع ہو جائیں کہ ایک آدمی تو گل چھرے اڑا رہا ہو اور دوسری طرف محتاج ایک روٹی کے لئے ترس رہا ہے، وہ اپنی فضول خرچیوں پر تو دریا کی طرح پیسہ بہا رہا ہے لیکن کسی ضرورت مند کا خیال کرنے کے لئے تیار نہیں تو توازن بگڑ گیا اور معاشرہ برباد ہو گیا۔ اور اسی قسم کی عیاشیاں اور اسی قسم کی رنگ رلیاں، یہی کمیونسٹوں کو اور سوشلسٹوں کو دعوت دیتی ہیں، کہ دوسرے طبقے کو یوں بھڑکا دیا جاتا ہے کہ دیکھو! یہ تم مزدوروں کی اور کاشت کاروں کی کمائی ہے اور یہ لوگ اس طرح سے گل چھرے اڑا رہے ہیں، اور تمہارے بچوں کو کپڑا میسر نہیں، تعلیم کے اسباب میسر نہیں، صحت کے لئے تمہیں دوا میسر نہیں، کمائی تمہاری ہے، عیش یہ اُڑاتے ہیں، اس طرح سے ان کو بھڑکا کے ایک دوسرے کے ساتھ دشمنی کا سلسلہ شروع کر دیا جاتا ہے۔ اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ: بے شک بے موقع اڑانے والے شیطانوں کے بھائی ہیں، وَكَانَ الشَّیْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا: اور شیطان اپنے رَبّ کا ناشکرا ہے، تو جو بھی اس کے طریقے اپنائے گا اور اس کے ساتھ اُخوّت اور دوستی لگائے گا وہ بھی اللہ کا ناشکرا سمجھا جائے گا، شکر گزاری تو اسی میں ہے کہ اللہ کی نعمت کی قدر کرو، خود صحیح فائدہ اُٹھاؤ اور اللہ کے حکم کے مطابق مخلوق کو فائدہ پہنچاؤ، یہ ہے اللہ کی نعمت کی قدر دانی، اور اس کے خلاف جو کام کیا جائے گا وہ ناشکری ہے، تو شیطان بھی ناشکرا اور جو شیطان کے ساتھ اُخوّت قائم کریں گے اور اس کے ساتھ اپنی دوستی لگائیں گے وہ بھی سارے کے سارے ناشکرے ہوں گے۔

سائل سے نرم بات کرنے کا حکم

وَ اِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّیْسُوْرًا: اور اگر اعراض کرے تو اُن سے اپنے رَبّ کی رحمت کو طلب کرتا ہوا جس کی تُو اُمید رکھتا ہے (تَرْجُوْهَا میں هَا ضمیر رحمتِ رَبّ کی طرف لوٹ رہی ہے) تو کہا کر انہیں نرم بات، مطلب یہ ہے کہ کوئی رشتہ دار آپ کے سامنے آگیا جو امداد کا طالب ہے، یا کوئی مسکین آگیا، مسافر آگیا، لیکن وقت ایسا ہے کہ تیرے پاس ان کو دینے کے لئے کچھ نہیں، لیکن تجھے امید ہے کہ دوسرے وقت میں اللہ کی رحمت حاصل ہو جائے گی، پیسے مل جائیں گے، تنخواہ ملنے والی ہے، فصل آنے والی ہے، مال بیچا ہوا ہے اس کی رقم وصول ہونے والی ہے، آخر یہی طریقے ہوتے ہیں جن میں کسی آمدنی کی امید ہوتی ہے، تو ان کو ٹالتے وقت ان کو نرم بات کہہ، ڈانٹ نہ، اور ان سے نفرت نہ کر، ان کو ذلیل کرنے کی کوشش نہ

کر، نرم طریقے کے ساتھ ان کو سمجھا دے کہ بھائی! اس وقت ہمارے پاس ہے نہیں، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید ہے کہ کسی وقت پیسے مل جائیں گے، جس وقت پیسے ملیں گے تو ہم ان شاء اللہ! ضرور حسب توفیق تمہاری خدمت کردیں گے، نرمی کے ساتھ کہہ کے ان کو ٹال دو، اور سختی کے ساتھ یا تحقیر کے لب و لہجے کے ساتھ ان کو جواب نہ دو۔ ''اگر اعراض کرے تو ان سے'' یعنی مساکین اقرباء مسافر جو تجھ سے امداد کے طالب ہو جائیں ''اگر تو ان سے اعراض کرے اپنے رَبّ کی رحمت کی طلب کے لئے یا اپنے رَبّ کی رحمت کو طلب کرتا ہوا'' یعنی حال یہ ہے کہ تجھے اُمید ہے کہ تیرے رَبّ کی رحمت حاصل ہو جائے گی ''جس کی تو اُمید رکھتا ہے'' تجھے اس کا انتظار ہے ''تو کہا کر ان کو نرم بات۔''

خرچ میں اِعتدال کا حکم

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلٰى عُنُقِكَ: نہ کیا کر تو اپنے ہاتھ کو بندھا ہوا اپنی گردن کی طرف، یہ بخل سے کنایہ ہے، ایسا نہ ہو کہ جیسے کسی کا ہاتھ یہاں باندھ دیا جائے تو کسی وقت یوں جیب میں پڑ کے اس طرح سے پھیلتا ہی نہیں، ہر وقت ایسے ہے جس طرح سے گردن سے بندھا ہوا ہے، یہ خرچ نہ کرنے سے کنایہ ہے، اِمساک جس کو بخل سے آپ تعبیر کرتے ہیں، کہ ایسے نہ کیا کرو جیسے کہ ہاتھ بالکل ہی گردن سے باندھ دیا گیا، کہ کبھی خرچ کرنے کی توفیق ہی نہیں ہوتی، ایسے بخل بھی نہ کیا کرو، جس کو آپ کی اصطلاح میں ''کنجوس مکھی چوس'' کہتے ہیں، ''مکھی چوس'' کا مطلب یہ ہوا کرتا ہے کہ اتنا بخیل ہے کہ کسی انسان کے بچے کو تو اس نے لقمہ کیا دینا ہے، اگر اس کے کھانے کے اُوپر کہیں مکھی آ کر بیٹھ جائے تو اس کو یہ خیال ہوتا ہے کہ اس کے پاؤں کے ساتھ جو تھوڑا بہت کھانا لگ گیا یہ بھی چلا گیا، اس لیے مکھی کو پکڑ کے اس کو بھی چوس کے پھینکتا ہے تا کہ اپنے مال میں سے کوئی ذرہ کسی طرف نہ جانے دے، اس کو کہتے ہیں ''کنجوس مکھی چوس''، کہ اگر مکھی بھی کبھی آ کر اس کے کھانے کے اوپر بیٹھ جائے تو اس کو بھی اڑنے نہیں دیتا، اس کو بھی پکڑ کے چوس لیتا ہے، تو يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلٰى عُنُقِكَ یہ شدتِ بخل سے کنایہ ہے، ایسے نہ ہو جایا کرو کہ اپنے ہاتھ کو بالکل ہی گردن سے باندھ لو کہ کسی وقت وہ کسی دوسرے کی طرف پھیلتا ہی نہیں، جیب کی طرف جا کے کسی دوسرے کی طرف اٹھتا ہی نہیں ہے، ایسے نہ کیا کرو، وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ: اور نہ بالکل ہی اس کو کھلا چھوڑ دیا کرو، کہ اندازہ ہی نہ ہو، بس جو آیا اس کو بکھیر دیا، ایسے بھی نہ کیا کرو، لَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ سے مراد ہے اندازے سے زیادہ خرچ کرنا، بالکل کھلا ہاتھ بھی نہ چھوڑ دیا کرو، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا: کہ بیٹھ رہے گا تو اس حال میں کہ الزام دیا ہوا ہوگا اور تھکا ہارا ہوا ہوگا۔ محسور: حسرت میں ڈالا ہوا، تھکا ہوا۔ یعنی اگر ضرورت سے زیادہ خرچ کرو گے تو خود محتاج ہو جاؤ گے، پھر دوسرے وقت لوگ الزام بھی دیں گے اور تم بھی حسرت زدہ ہو کے بیٹھ جاؤ گے کہ ہم نے ایسے ہی مال ضائع کر دیا، ضائع نہیں کرنا چاہیے تھا، ہماری اپنی ضرورت اٹک گئی، اس لئے اعتدال کی تعلیم دی گئی ہے کہ پہلے اپنی ضروریات کا خیال کرو، پھر اللہ کے راستے میں دو، ایسا نہ ہو اللہ کے راستے میں دے دو اور اپنی ضرورت کا خیال نہ کرو، پھر جب اپنی ضرورت پیش آئے گا تو پھر پچھتاؤ گے کہ ہم نے اللہ کے راستے میں کیوں دے دیا، نیکی کر کے پچھتانا یہ اچھی بات نہیں ہے، اس لئے ابتداء سے ہی اچھے اندازے کے ساتھ خرچ کیا کرو۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ افضل صدقہ وہی ہے جو ''عن

ظَهْرِ غِنًى "ہو،[1] کہ اپنے پیچھے غنا چھوڑ کے جائے پھر صدقہ کرو، یہ افضل صدقہ ہے، غنا دونوں قسم کی ہوتی ہے، غنائے ظاہری، کہ تم نے صدقہ دیا اور تمہارے پاس ضرورت کی مقدار موجود ہے، یہ بھی افضل صدقہ ہے، تا کہ دوسرے وقت میں تمہیں تنگی آ کے کوئی پچھتاوا نہ ہو، اور ایک غنائے باطنی ہوتا ہے، کہ ایسے طور پر دو کہ پیچھے غنا موجود ہے، دل غنی ہے، وہ کبھی محسوس نہیں کرے گا کہ میں نے دوسرے کو کیوں دے دیا، اور میری ضرورت اٹکی رہ گئی، ایسی صورت میں دیا جائے وہ بہتر ہے۔ ورنہ دے کر پھر بعد میں خود محتاج ہو جاؤ اور پچھتانے لگ جاؤ، یہ مناسب نہیں۔ جیسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ گھر میں کچھ بھی نہیں رکھتے تھے، موقع آتا تھا تو سب کچھ ہی دے دیتے تھے، ان کے دل میں غنا ہوتا تھا، اور ایسے ہی دوسرے صحابہ۔ اور اگر اس کے دل کے اندر اتنا ضعف ہے کہ اگر دے دینے کے بعد پھر ضرورت پیش آ جائے گی تو پچھتائے گا کہ میں نے ایسا کیوں کیا، تو اس کے لئے جائز نہیں ہے کہ اپنی ضرورت کو حذف کر کے دوسروں کو دے۔ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا: پس بیٹھ رہے گا تو اس حال میں کہ الزام دیا ہوا ہوگا، ملامت کیا ہوا ہوگا، اور محسور ہوگا، یعنی تھکا ہوا ہوگا، حسرت میں ڈالا ہوا ہوگا، تھک ہار کے بیٹھ جائے گا۔

رزق کی کشادگی اور تنگی اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہے

اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ: اس کا تعلق دونوں کے ساتھ ہی ہے، خرچ کرتے ہوئے ڈرو نہیں کہ ہم محتاج ہو جائیں گے، نہیں! "تیرا ربّ کشادہ کرتا ہے رزق کو جس کے لئے چاہتا ہے اور تنگ کرتا ہے" یعنی يَقْدِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ، خرچ کرنے کے ساتھ روزی میں تنگی نہیں آیا کرتی، اللہ تعالیٰ جس کے لئے چاہتا ہے کشادہ کر دیتا ہے، جس کے لئے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے، بسا اوقات بخل کر کر کے ایک آدمی جوڑتا چلا جاتا ہے، خرچ بالکل نہیں کرتا، اپنے اوپر بھی خرچ کرنے کی اس کو توفیق نہیں ہوتی، کوئی حادثہ ایسا آتا ہے کہ جمع کیا ہوا سارا ہی گیا، جیسے اردو کے اندر محاورہ ہے کہ "بندہ جوڑے پلی پلی، رام لڑھائے کُپا" کہ بندہ تو ایک ایک پلی تیل کی جوڑتا ہے، (پلی کہتے ہیں جس کے ساتھ پیپے سے تیل نکالا کرتے ہیں) ایک ایک پلی تولتے رہے اور کُپا بھر لیا تیل کا، لیکن ایک ہی دن وہ سارے کا سارا لڑھک گیا، تو "بندہ جوڑے پلی پلی، رام لڑھائے کُپا"، تو اس کا یہی معنی ہے کہ جو پلی پلی جوڑی تھی جس وقت کُپا بھر گیا تو رام نے لڑھا دیا، رام اللہ کو کہتے ہیں، اسی طرح سے بخل کرتا ہوا ایک آدمی اپنے پر بھی خرچ نہیں کرتا، تنگی میں رہتا ہے، اور جب جمع کر لیتا ہے تو کسی حادثے کا شکار ہوا اور سارا ہی گیا، تو باوجود اس بات کے کہ اس کو مال بہت ملا تھا لیکن اس کے رزق میں تنگی ہی رہی، اور ایک ایسا آدمی ہے کہ وہ دیتا ہے، حقوق ادا کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ اس کی اتنی آمدنی بڑھا دیتا ہے، دوسری طرف سے آنا شروع ہو جاتا ہے، تو نہ تو دینے کے ساتھ محتاجی آتی ہے، نہ روک رکھنے کے ساتھ کشادگی آتی ہے، بسط اور قدر اللہ کے ہاتھ میں ہے، جس کے لئے چاہے رزق کو کشادہ کرتا ہے، جس کے لئے چاہے تنگ کر دیتا ہے۔ اور اس کو آخری الفاظ کے ساتھ بھی لگایا گیا ہے کہ کوئی محتاج سامنے آ جائے تو اس سے اتنا متاثر نہ ہوا کرو کہ تم یہ کہو میں اس کا احتیاج ہی دور کر دوں گا، نہیں! اپنی ہمت کے مطابق اس کے اوپر خرچ کرو، کسی کی تنگی دوسرا انسان دور نہیں کر سکتا، اس لئے اپنی ہمت سے زیادہ چھلانگ

---

(1) بخاری ۱/ ۱۹۲، باب لا صدقة الا عن ظهر غنى / مشکوٰۃ ۱/ ۱۷۰، باب افضل الصدقه کی پہلی حدیث۔ ولفظ الحدیث: خَيْرُ الصَّدَقَةِ مَا كَانَ عَنْ ظَهْرِ غِنًى

مار کے اگر اس کے اوپر خرچ کرنے کی کوشش کرو گے تو نتیجۃً تم محتاج ہو کے بیٹھ جاؤ گے، بس یہ سوچا کرو کہ اللہ تعالیٰ تنگ کرنے والا ہے، اللہ تعالیٰ کشادہ کرنے والا ہے، جس کے لئے چاہے رزق تنگ کردے، جس کے لئے چاہے کشادہ کردے، ہمیں اپنی ہمت کے مطابق خرچ کرنا چاہیے، اور اپنے طور پر بخل نہیں کرنا چاہیے، باقی اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے تحت اگر کسی کو تنگی میں رکھتا ہے تو کوئی انسان اسکی تنگی دور نہیں کرسکتا، اور اگر اللہ تعالیٰ کسی کو کشادہ کرتا ہے تو کوئی شخص اس کے رزق کو تنگ نہیں کرسکتا، اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًاۢ بَصِيْرًا: بے شک وہ اپنے بندوں کے ساتھ خبر رکھنے والا ہے اور بندوں کے احوال کو دیکھنے والا ہے، ہر بندے کے ساتھ اللہ تعالیٰ اس کے حال کے مطابق برتاؤ فرماتے ہیں، جس کو تنگی دیتے ہیں وہ بھی اس کی حکمت کے مطابق ہوتا ہے، جس کو کشادگی دیتے ہیں وہ بھی اس کی حکمت کے مطابق ہوتا ہے۔

عرب میں بچوں کو تنگ دستی کی وجہ سے قتل کرنے کا رواج اور دینِ اسلام میں اس کی ممانعت

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ: اَمْلَقَ اِمْلَاق: تنگدستی میں مبتلا ہونا۔ قتل نہ کیا کرو اپنے بچوں کو تنگ دستی کے اندیشے سے، یعنی اس اندیشے سے کہ اگر بچے زیادہ ہوجائیں گے تو ہم تنگ دست ہوجائیں گے، عرب کے اندر یہ رواج تھا خصوصیت کے ساتھ لڑکیوں کے متعلق، کہ جب وہ بچیاں پیدا ہوجاتیں تو وہ یہ سوچتے کہ لڑکی کما تو سکتی نہیں، ہماری معاشی زندگی کے اندر تو ہمارے لئے مفید بنے گی نہیں، اس کا بوجھ ہی بوجھ ہے، پہلے کھائے گی، پھر بعد میں بیاہنی پڑے گی تو اس کے اوپر خرچ ہوگا، اس قسم کے اخراجات سے تنگ ہو کے بچیوں کے پیدا ہونے کے بعد ان کو وہ قتل کردیتے تھے، اور ہوسکتا ہے کہ بعضے سنگدل ایسے بھی ہوں کہ جو لڑکے کو بھی قتل کردیتے تھے، لڑکی کی بھی قتل کردیتے تھے۔ پیدا ہونے کے بعد ان کو مارتے تھے، کیونکہ ان کے پاس اس قسم کی تدبیریں اتنی ترقی یافتہ نہیں تھیں کہ حمل نہ ٹھہرنے دیتے جیسے کہ آج کے ترقی یافتہ دور میں ضبطِ ولادت شروع ہوگیا، اور اس قسم کی ادویات آگئیں، اس وقت یہ چیزیں نہیں تھیں جس کی بنیاد پر وہ بچہ جننے کے بعد پھر اس کو قتل کردیا کرتے تھے اس اندیشے سے کہ ہم تو خوش حال ہیں، ہم تو کھاتے پیتے ہیں، لیکن اگر اولاد زیادہ ہوگئی تو ہم تنگی کے اندر مبتلا ہوجائیں گے، تو خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ: اس طرح سے بچوں کو قتل کردیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایسے نہ کیا کرو، نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ: ہم انہیں بھی رزق دیں گے، وَاِيَّاكُمْ: اور تمہیں بھی دیں گے، رزق ہمارے ذِمّے ہے، جو خالق ہے رازق وہی ہے، یہ جذبہ تو تب ہونا چاہیے کہ تم سمجھو کہ خالق تو پیدا کرتا چلا جارہا ہے اور رزق تمہارے ذِمّے ہے، آتے رہے ہیں کہ جن کا تم انتظام نہیں کرسکتے، پھر تو تم اس قسم کی فکر کرو، اگر خالق اور رازق دونوں ایک ہی ہستی کے نام ہیں، پیدا کرنے والا بھی وہ ہے، رازق بھی وہ ہے، تو وہ خود اس تناسب کا خیال رکھے گا جیسے اس کی حکمت کا تقاضا ہوگا۔ قرآنِ کریم میں دوسری جگہ آیا ہے لَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ (سورۃ الانعام: ۱۵۱)، وہاں خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ نہیں ہے، اصل میں دو قسم کے لوگ تھے، بعضے تو فی الواقع خود تنگ دستی میں مبتلا تھے، ان کے بچہ پیدا ہوتا تو ان کو فکر ہوتا کہ ہمیں روٹی نہیں ملتی ہم ان کو کہاں سے کھلائیں گے، پہلے اپنی روٹی کا فکر، بعد میں اولاد کی روٹی کا، وہاں آیا کہ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ: اللہ تعالیٰ نے وہاں پہلے والدین کی روٹی کا ذکر کیا، کہ ہم تمہیں بھی دیں گے اور انہیں بھی دیں گے، اور خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ کا مطلب یہ ہے کہ والدین تو

خوش حال ہیں، اس وقت تو اتنی آمدنی ہے جس میں گزارہ ہو رہا ہے، لیکن اندیشہ ہے کہ اگر زیادہ بچے پیدا ہو گئے تو تنگ دستی میں مبتلا ہو جائیں گے، اپنی روٹی کی فکر نہیں ہوتی، بچوں کی روٹی کی فکر ہوتی ہے، تو یہاں ہے نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ ،ھم پہلے ذکر کر دیا، کہ ہم ان کو بھی دیں گے اور تمہیں بھی دیں گے، اس لئے فکر کرنے کی کونسی بات ہے۔

جدید دور کے ''پڑھے لکھے جاہل''......موجودہ دور میں ضبطِ ولادت کی تحریک کی مذمّت

تو قرآنِ کریم نے جس وقت یہ اعلان کیا تو اس اعلان کے نتیجے میں وہاں قتل اولاد کا قصہ ختم ہو گیا، لوگوں کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ پیدا ہونے والوں کے رزق کی ہمیں فکر نہیں ہے، جو پیدا کرنے والا ہے وہ خود روزی دے گا، تو یہ رسم بدمٹ گئی، اور وہ بدوی لوگ، وہ جاہل وحشی لوگ جو تھے وہ اس مسئلے کو سمجھ گئے، لیکن آج یہ جو ضبطِ ولادت کی تحریک ہے جس کو آپ ''برتھ کنٹرول'' کہتے ہیں اگر چہ یہ اُس درجے کا جرم تو نہیں ہے، کیونکہ اس میں پیدا ہونے کے بعد قتل کرنے کی تحریک نہیں، یہ ہے کہ ان کو پیدا ہی نہ ہونے دیا جائے، ان کا راستہ روک لیا جائے، اگر دیکھا جائے تو جذبہ وہی ہے جو اُس وقت جاہل بدوؤں اور وحشی لوگوں کے اندر تھا، یہ بھی رزق کی تنگی کی بنا پر ہی اس قسم کی باتیں کرتے ہیں، کہ آبادی زیادہ ہو جائے گی، وسائل ہمارے تھوڑے ہیں، پھر یہ پیدا ہونے والے کھائیں گے کہاں سے؟ یعنی اگر چہ اس وقت ملک میں رزق کی اتنی وسعت ہے کہ اگر دیکھا جائے تو فضول خرچی میں اتنا مال جا رہا ہے کہ جس کا حد حساب ہی کوئی نہیں، یعنی ایک سگریٹ کا حساب ہی آپ لگا لیجئے جس کو لوگ فیشن کے طور پر پیتے ہیں، پیتے پیتے پھر عادی ہو جاتے ہیں، عادی ہونے کے بعد پھر اس کو اڑاتے ہیں، ایک دن میں ایک آدمی کا سگریٹ کا کتنا خرچ ہے، آپ کو ایسے لوگ بھی ملیں گے جو کہ آٹھ آٹھ روپے کی ڈبی پیتے ہیں اور پانچ پانچ ڈبیاں ایک ایک دن میں پی جاتے ہیں، چالیس چالیس روپے کی، پچاس پچاس روپے کی سگریٹ ایک ایک دن میں، یہ متوسط طبقہ ہے، اور جو اس سے بھی اعلیٰ طبقہ ہے وہ تو انگریزی سگریٹ پیتے ہیں، امریکی سگریٹ پیتے ہیں، ان کے تو اخراجات اس سے بھی زیادہ ہیں، اور عام مزدور آدمی ایک دو ڈبیاں تو وہ بھی پی لیتا ہے، روپے دو روپے کی سگریٹ تو اس کی بھی گئیں، تو ساٹھ ساٹھ روپے ستر ستر روپے مہینے کا خرچ یہ تو مزدوروں کے گھروں میں صرف سگریٹ کا ہے، اور اگر کل ملک کی آبادی کا حساب لگایا جائے تو کروڑ ہا روپیہ ہر روز اسی طرح سے دھوئیں کی شکل میں اڑایا جاتا ہے، یعنی اگر آپ اوسط لگا لیں، چلو چھ کروڑ آبادی اگر ملک کی ہو، اوسط لگا لیں کہ ایک شخص ایک روپے کی سگریٹ پیتا ہے، کیونکہ بعضے پیتے ہی نہیں آپ جیسے، اور بعضے چالیس چالیس پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ روپے کی بھی پی جاتے ہیں، اگر تناسب لگایا جائے کہ ایک روپے کی سگریٹ اگر ایک آدمی پیے تو پھر بھی چھ سات کروڑ روپے کی سگریٹیں ہر روز جاتی ہیں، جبکہ قاعدے اور قانون کے مطابق ہر ڈبی کے اوپر لکھا ہوا بھی ہوگا، یورپی ملکوں کے اندر بھی لکھتے ہیں، عرب کے اندر بھی ہم نے دیکھا، سگریٹ کی ڈبیاں جو تقسیم ہوتی ہیں تو ان کے اوپر لکھا ہوتا ہے وزارتِ صحت کی طرف سے نوٹس، سگریٹ تمہاری صحت کے لئے نقصان دہ ہیں، اب یہاں پاکستان میں لکھنا شروع کر دیا، ''سگریٹ تمہاری صحت کے لئے نقصان دہ ہے'' یہ ڈبی کے اوپر لکھا ہوا ہوتا ہے، مطلب یہ ہے کہ قومی سطح پر ڈاکٹری رپورٹ کے تحت اس کا فائدہ کوئی نہیں، نقصان ہی نقصان ہے، لیکن قوم ہے کہ لگی

جارہی ہے، یہ تمباکو نوشی سگریٹ کی صورت میں، پھر اس کے بعد حقے کی صورت میں، پھر اس کے بعد ماشاء اللہ! نسوار کی صورت میں، تو اس کا خرچ کس طرح بڑھا ہوا ہے اور کتنا یہ بیماریوں کا باعث بنتی ہے، اس فضول خرچی کے اندر کروڑہا روپیہ جارہا ہے، یہ تو ایک بات ہے، سینما بینی پر کتنا خرچ ہوتا ہے، نشہ خوری کے اوپر کتنا خرچ ہوتا ہے، لوگ کتنی بھنگ اور چرس اور شراب استعمال کرتے ہیں، اور اس قسم کی اور فضولیات کتنی ہیں جن کے اوپر کروڑ ہا روپیہ روز برباد ہوتا ہے، اس پر تو پابندی لگانے کی کبھی سوجھتی ہی نہیں، اور ایسے ہی عیاشی کا سامان، یہ لپ اسٹک، یہ سرخی پاؤڈر کتنا باہر سے آتا ہے، اور کتنا اس کو فضول خرچ کیا جاتا ہے، اگر اس قسم کی چیزوں کے اوپر پابندی لگائی جائے اور قومی سرمایہ کو ضروریات کے اوپر خرچ کیا جائے تو اللہ کا دیا ہوا بہت ہے، کسی قسم کی کوئی کمی نہیں ہے، لیکن اب فضول اخراجات پر تو پابندی لگاتے نہیں اور کوشش یہ کرتے ہیں کہ اور پیدا نہ ہوں تاکہ ہمارے رزق کے اندر کسی قسم کی کمی نہ آجائے، اب آپ اِن پڑھے لکھے جاہلوں کو سمجھانے کی کوشش کریں کہ بھائی! رزق اللہ کے ذِمّے ہے، خالق وہ ہے، رازق وہ ہے، یہ نہیں کہ جس طرح سے ہم یوں کہیں کہ میں تو لڑکوں کو داخل کرتا چلا جاؤں اور مطبخ کا نظام ناظم صاحب کے ذِمّے ہے، انہیں پتا ہی نہیں کہ کتنے داخل ہورہے ہیں، روٹی کتنوں کو دینی ہے، اس لیے اودھم مچ جائے گا کہ داخل تو ہوگئے سو، اور روٹی پکی ہوئی ہے پچاس کی، تو یہاں تو افراتفری ہوجائے گی، کہ داخل کرنے والا کوئی ہے اور مطبخ کا انتظام کرنے والا کوئی ہے، لیکن جب خالق بھی وہی ہے، رازق بھی وہی ہے، رزق بھی اسی نے دینا ہے، پیدا بھی اسی نے کرنا ہے، تو وہ تناسب کس طرح سے بگڑنے دے گا، وہ تو اپنی علم وحکمت کے تحت اگر پیدا کرتا جاتا ہے تو دوسری طرف سے اٹھاتا بھی جاتا ہے، اور جیسے آبادی بڑھتی جارہی ہے ویسے وسائلِ رزق بھی بڑھتے جارہے ہیں، یہ بات اُن وحشیوں کو، جاہلوں کو، بدویوں کو تو سمجھ میں آگئی، اور قرآنِ کریم کے اس اعلان کے بعد وہ تو اس عادتِ بد سے باز آگئے، لیکن یہ ''پڑھے لکھے جاہل'' کبھی اس بات کو نہیں سمجھیں گے (کیونکہ یہ جاہل ایسے جن کو پڑھے لکھے کہہ سکتے ہیں، یہ ''پڑھے لکھے جاہل'' ہیں، جن کو آپ ''جہلِ مرکب'' کے اندر مبتلا کہہ سکتے ہیں) یہ اس بات کو نہیں سمجھ سکتے، آپ ہزار کوشش کریں ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی، اتنا فرق ہے اِن جاہلوں میں اور اُن جاہلوں میں، اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا: ان کا قتل کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔

''زِنا'' اور ''مقدماتِ زِنا'' سے اِجتناب کا حکم

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰۤى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَسَآءَ سَبِيْلًا: زِنا کے قریب نہ پھٹکا کرو، زِنا کے قریب نہ جاؤ، جس کا مطلب یہ ہے کہ زِنا کا ارتکاب تو کیا کرنا ہے جو زِنا کے محرکات ہیں ان سے بھی بچو، نگاہ غلط نہ اُٹھے، کان غلط طور پر کسی کی طرف متوجہ نہ ہوں، اس قسم کا لٹریچر نہ پڑھو جو کہ زِنا کے اُوپر برانگیختہ کرنے والا ہے، اس قسم کی باتیں نہ سنو جن کے ساتھ اس قسم کے فحش جذبات بڑھتے ہیں، تو لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰۤى کے اندر سب کچھ آگیا، کسی عورت کے ساتھ خلوت نہ کرو، کسی عورت کے ساتھ اس طرح سے محبت کی پینگیں نہ بڑھاؤ جس کے نتیجے میں تم اس فعل کے اندر مبتلا ہوسکتے ہو، ''زِنا کے قریب بھی نہ پھٹکو'' اس کی اتنی شدت کے ساتھ ممانعت آگئی، اور اس کے اوپر سزا بھی سب سے زیادہ سخت رکھی گئی، جیسے کہ آپ پڑھتے رہتے ہیں کہ اگر کنوارے ہوں تو ان کے درے لگاؤ،

شادی شدہ ہوں تو ان کو سنگسار کر دو، سنگسار اسلام میں قطعی طور پر سزا ہے، مجمع علیہ ہے، جس میں کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں ہے، اتنی سختی اس کے اوپر کیوں کی گئی؟ اس لئے کی گئی کہ ایک تو یہ بے حیائی ہے بے غیرتی ہے، جب سے دنیا آباد ہوئی ہے اس وقت سے ہر سمجھ دار آدمی اس بات کا قائل ہے کہ مرد اور عورت کا تعلق کسی قاعدے اور قانون کے تحت ہونا چاہیے، بغیر کسی قاعدے اور قانون کے آپس میں ان کا ملنا، دنیا کے اندر ہمیشہ اس کو مذمت کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے، ہاں کچھ ایسے پاگل سر پھرے پیدا ہو گئے جنہوں نے زمین، زن اور زر کو مشترک قرار دے دیا کہ یہ مشترکہ متاع ہے جو چاہے اس سے فائدہ اٹھائے، زمین سے، زر سے، اور زن سے، اس قسم کے سر پھروں کا کوئی علاج نہیں ہے، یہ انسان نہیں، یہ تو جانوروں کا گلہ ہے، جن کے متعلق کوئی بات نہیں کی جا سکتی، انسانیت اگر ہے، فطرت اگر صحیح ہے تو کسی زمانے میں بھی عورت میں اشتراک کو گوارہ نہیں کیا گیا، اور ہر قوم میں ہر مذہب میں ہر مسلک میں اس کے اوپر پابندی لگائی گئی ہے کہ مرد اور عورت کا آپس میں اختلاط اور ان کا آپس میں ملاپ کسی شرافت کے دائرے کے اندر ہونا چاہیے اور کسی ضابطے اور قانون کے تحت ہونا چاہیے، اس بے حیائی کو کبھی برداشت نہیں کیا گیا۔

''زِنا'' کے نقصانات اور مغربی معاشرے میں اس کے اثرات

پھر یہ بہت بُری راہ ہے، اس راستے پر چلنے کے نتیجے میں معاشرہ برباد ہو جاتا ہے (اس بات کو ذرا توجہ سے سمجھئے! دو لفظوں میں آپ کو سمجھاؤں) معاشرے کی صالحیت اور صلاحیت نمایاں اس سے ہوتی ہے کہ لوگوں کی آپس میں رشتہ داریاں قائم ہوں اور لوگ آپس میں رشتہ داریوں کا خیال رکھیں، بھائی چارہ ہو، انسان سمجھے کہ میں فلاں خاندان کا فرد ہوں، اور خاندان والے بھی سمجھیں کہ یہ ہمارا بچہ ہے، اس طرح سے ایک دوسرے کی سرپرستی کریں، ایک دوسرے کے ساتھ مروت کریں، احسان کریں تو دنیا آباد ہوتی چلی جائے گی اور سارے آپس میں جڑتے جائیں گے، لیکن جو زنا کی پیداوار ہوتی ہے وہ کسی خاندان میں شامل ہوتا ہے؟ وہ سمجھ سکتا ہے کہ میرے فلانے ہیں؟ یا اس کو کوئی اپنا سمجھتا ہے؟ سوائے اس کے کہ اس کی نسبت اپنی ماں کے ساتھ تو واضح ہوتی ہے کوئی دوسرا شخص اس کو اپنی طرف منسوب کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا، تو یہ خاندان کہاں سے بنیں گے؟ رشتہ داریاں کہاں سے قائم ہوں گی؟ اور ایک دوسرے کے ساتھ مروت اور اخوت کا سلسلہ کس طرح سے چلے گا؟ یورپ نے زِنا کا طریقہ اختیار کیا، آپ سمجھتے نہیں کہ آج اس معاشرے سے کتنا تنگ ہے کہ وہاں حرامزادوں کی کثرت ہے، کوئی کسی کے ساتھ ہمدردی اور خیر خواہی کرنے کے لئے تیار نہیں، ان کے اندر زیادہ بے چینی اس وجہ سے ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کی محبت سے محروم ہو گئے، یعنی آج سے تقریباً دس سال پہلے کی رپورٹ ہے کہ امریکا کے اندر پیدا ہونے والے بچے ساٹھ فی صد حرامزادے ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اب ان ترقی یافتہ ملکوں کے اندر ولدیت کا اُصول ختم ہوتا جا رہا ہے، وہ کہتے ہیں ولدیت تو دقیانوسی خیال ہے، پُرانے زمانے کی بات ہے کہ اپنا تعارف باپ کی نسبت سے کرواؤ، بس نام اور فوٹو کافی ہے، نام لکھ دیا اور ساتھ تصویر لگا دی، پہچاننے کے لئے کافی ہے، اب باپ دادے کی نسبتوں سے اپنا تعارف کروانا یہ تو کہتے ہیں کہ دقیانوسیت ہے، دقیانوسیت تو خود ہو گئی کہ ترقی یافتہ دور تو ایسا ہے کہ کتیا بچے جنتی پھرتی ہے، بچوں کو کوئی پتا نہیں کہ کس کتے کی نسل ہے؟ اور گدھیاں گھوڑیاں بچے جنتی ہیں ان کو کوئی پتا

نہیں کہ کس کی نسل ہیں؟ کون بیٹی، کون باپ، اور کون ماں؟ کل کو وہی بیٹی اور وہی باپ جس کے نطفے سے پیدا ہوئی تھی کل کو وہی اس کے اوپر چڑھا ہوا ہوگا، اور اس کے بطن سے پیدا ہونے والے کل جوان ہوجائیں گے وہ اسی پہ چڑھے ہوئے ہوں گے، جو حال جانوروں کا ہے وہی حال ان کا ہے، تو جس طرح سے جانور کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتا کہ میں اپنا تعارف اپنے باپ کی نسبت سے کرواؤں، کیونکہ اسے پتا ہی نہیں ہوتا کہ میرا باپ ہے کون؟ تو یہی حال اب اس معاشرے کا ہوگیا، یعنی یہ انسانیت کو حیوانیت کے دائرے میں لے جانے کا ایک بہت ہی بُرا راستہ ہے یہ زِنا والا، کہ جس میں انسانی خاندان کی شرافت ہی ختم ہوجاتی ہے، اور یہ واقعہ ہے کہ وہاں ماں بیٹی کا کوئی امتیاز نہیں رہا، کسی کو کیا پتا کہ جس کو میں لیے پھر رہا ہوں اس کی ماں کے ساتھ میرا تعلق تھا اور یہ اسی نطفے سے پیدا ہوئی ہو۔

''تعلیمِ جدید'' کے معاشرے پر بُرے اثرات کا ایک سچا واقعہ

نہیں! جہالت کی صورت میں نہیں، بلکہ جاننے کی صورت میں بھی اسی طرح کے حالات پیدا ہوگئے کہ ماں بہن کا امتیاز اُٹھ گیا، جیسے جانور عیاشی کرتے پھرتے ہیں، اسی قسم کی عیاشی انسانوں نے شروع کردی۔ رُوس کا انقلاب جس وقت افغانستان میں آیا ہے تو مفتی (محمود) صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تقریر میں ایک واقعہ بیان کیا تھا، کہ رُوس کی زیرِ سرپرستی کس قسم کے اثرات پھیلے ہیں، کہتے ہیں کہ افغانستان میں ایک اچھا بھلا عالم تھا، اس نے اپنے ایک بیٹے کو دُنیوی تعلیم دِلوائی، اور اعلیٰ تعلیم کے لئے اس کو رُوس بھیج دیا، جس وقت وہ رُوس سے فارغ ہو کے آیا باپ کو خوشی ہوئی کہ بیٹا ڈاکٹر بن کے آگیا، انجینئر بن کے آگیا، تو اپنے بیٹے سے بات کرتا ہے کہ بیٹا! باقی تو میں نے اپنے سارے فرائض ادا کردیئے اب تیرا ایک فرض میرے ذِمے ہے، اب میں چاہتا ہوں کہ تیری جلد از جلد شادی کردوں، وہ بیٹا آگے سے کہتا ہے کہ اَبا جی! یہ فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ میری یہ جو چھ سات بہنیں ہیں ان میں سے کسی ایک کو منتخب کرلوں گا، باہر کسی اور طرف جانے کی کیا ضرورت ہے؟ (نعوذ باللہ!) باپ نے یہ بات اس کے منہ سے سُن لی، سننے کے بعد خاموش ہوگیا، وہ سمجھ گیا کہ بیٹا کس ذہن کا ہو کے آگیا ہے، کہ جب اللہ نہیں، اللہ کا رسول نہیں، آخرت نہیں، تو پھر کون سی چیز تمہیں پابند کرے گی کہ اس کو لینا ہے اور اس کو نہیں لینا، یہ پابندیاں تو تبھی لگتی ہیں نا کہ اللہ ہو، اللہ کا رسول ہو، آخرت کا عقیدہ ہو، جب یہ کوئی چیز ہی نہیں ہے تو جہاں دل آجائے ٹھیک ہے، کہتا ہے جی! کیا ضرورت ہے، اتنی ساری بہنیں جو ہیں ان میں سے کسی ایک کو رکھ لوں گا، کہتے ہیں کہ اس باپ نے معززینِ شہر کی دعوت کی، بظاہر عنوان یہ رکھا کہ بیٹا پڑھ کے آیا ہے، اس خوشی کے اندر دعوت کی جارہی ہے، علماء فضلاء اور بڑے لوگ جو تھے وہ سارے دعوت میں جمع ہوگئے، جب سارے لوگ آ کے بیٹھ گئے تو باپ نے بیٹے پر پھر وہی سوال کیا کہ میں تیری شادی کرنا چاہتا ہوں تیری کیا رائے ہے؟ بیٹے نے وہی جواب دیا جو پہلے باپ کو دے چکا تھا، باپ نے پسٹل پہلے بھر کے رکھا ہوا تھا، جب اس نے جواب دیا تو سب لوگوں کے سامنے اس کو گولی نشانہ بنا دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ معاشرہ اس قسم کا ہو رہا ہے ان لوگوں کی سرپرستی میں جنہوں نے آخرت کو اپنے عقیدے سے نکال دیا، اللہ تعالیٰ کے

وجود کا انکار کر دیا، نہ ماں کا امتیاز نہ بہن کا امتیاز، بس جانوروں کا ایک گلہ ہے، کسی جگہ بیٹھے ہیں، کسی چراگاہ کے اندر چریں، لید کریں اور اپنا گزارہ کریں، کھائیں پئیں، مرجائیں، بس یہی بات رہ گئی ساری کی ساری۔ تو اس لئے لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰۤی کو آپ معمولی نہ سمجھیں، پچھلے رکوع کے اندر جو کچھ رشتہ داروں کے متعلق کہا گیا تھا، رشتہ داری کو اہمیت دی گئی تھی، ماں باپ کا ادب سکھایا گیا تھا، یہ چیزیں باقی تبھی رہیں گی اگر معاشرے کے اندر زِنا کا رواج نہ ہو، اور اگر دنیا کے اندر زِنا کی پیداوار شروع ہو جائے تو نہ کوئی ماں باپ کا خیال کرے گا اور نہ کوئی بہن بھائیوں کا خیال کرے گا، نہ کوئی رشتہ داری ہوگی، نہ کوئی خاندان بنے گا، نہ ایک دوسرے کے ساتھ کوئی مروّت اور احسان ہوگا، پھر تو اپنا اپنا کرنا اپنا اپنا بھرنا، جو بوڑھا ہوتا چلا جائے اسے ہسپتالوں میں دفتروں میں (اولڈ ہاؤسز میں) داخل کرواتے چلے جائیں گے جہاں حکومت ان کی کفالت کرے گی، بھنگی ان کو سنبھالیں گے اور اس طرح سے وقت گزرتا چلا جائے گا، تو صالح معاشرہ کسی صورت میں قائم نہیں ہو سکتا اگر زِنا کا رواج کسی معاشرے کے اندر ہو جائے۔ اس لئے اس کو بے حیائی اور بہت برا طریقہ قرار دیا گیا۔ اس کے قریب بھی نہ پھٹکو۔

''قتل'' کی مذمّت اور اس کے شرعی اَحکام

یہ تو عزت کی حفاظت ہوگئی، اور وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ: یہ جان کی حفاظت ہوگئی۔ ''قتل نہ کیا کرو ایسے نفس کو جس کا قتل کرنا اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے ہاں مگر حق کے ساتھ'' حق کے ساتھ قتل کرنا کیا ہے؟ کہ ایک آدمی نے زیادتی کی، دوسرے کو قتل کر دیا تو قصاصاً اسے قتل کر دو، اگر کوئی مرتد ہو گیا تو ارتداد کی سزا میں قتل کیا جا سکتا ہے، زِنا کیا ہے تو زِنا کی سزا میں اس کو مارا جا سکتا ہے، یہ ہے قتل بالحق، اس کے علاوہ کسی کو قتل نہ کرو، وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا: جو کوئی قتل کر دیا گیا مظلوم ہونے کی حالت میں، فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِیِّهٖ سُلْطٰنًا: پس تحقیق ہم نے اس کے سرپرست کے لئے تسلط اور زور قائم کر دیا ہے، اس کو غلبہ دے دیا ہے، کہ اس کا ولی اس کا سرپرست اس قتل کا بدلہ لے سکتا ہے، فَلَا یُسْرِفْ فِّی الْقَتْلِ: اس ولی کو چاہیے کہ وہ بھی قتل کرنے میں حد سے نہ گزرے، قاتل کو قتل کرے، غیر قاتل کو قتل نہ کرے، ایک آدمی قاتل ہے تو ایک کو قتل کرے زیادہ کو قتل نہ کرے، اور اگر معافی ہوگئی دیت کا فیصلہ ہو گیا تو اس کے بعد قتل نہ کرے، یہ سب اسراف کی صورتیں ہیں۔ قرآنِ کریم کے اس لفظ سے یہ معلوم ہو گیا کہ قتل کی صورت میں اختیارات سارے کے سارے ولی کو ہوتے ہیں، حکومت ولی کی معاون ہوتی ہے، حکومت خود دعوے دار نہیں ہوتی، الا یہ کہ کوئی مقتول ایسا ہو کہ اس کا کوئی وارث نہیں ہے تو پھر حکومت دعوے دار ہوتی ہے، اس لئے ولی معاف کر دے تو حکومت انتقام نہیں لے سکتی، ولی پیسے لے کر معاف کرنے پر راضی ہو جائے تو حکومت مداخلت نہیں کر سکتی، اور یہاں آج کے معاشرے میں معاملہ اس کے برعکس ہے کہ یہاں مقتول کے اولیاء کا کوئی اختیار نہیں، اختیار سارے کا سارا حکومت کا ہے، اس لئے آپس میں مصالحت کی کوئی صورت نہیں، آپس میں ایک دوسرے کو معاف کرنے کی کوئی صورت میں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ برسہابرس تک مقدمے چلتے ہیں، دونوں خاندان برباد ہو جاتے ہیں، جیل میں چلا گیا، سزا ہوگئی، جس کا مر گیا ان کے پلے کچھ بھی نہیں، بخلاف اس کے کہ جو اسلامی اصول ہے کہ اگر

ولی قتل کا قصاص لینا چاہے تو شفائے غیظ اس کو فوراً حاصل ہو جائے گی، اس کا دل ٹھنڈا ہو جائے گا کہ اگر اس نے قتل کیا ہے تو ہم نے بھی قتل کر لیا، اور دیت وغیرہ لے کے معاف کرنا چاہے تو چلو اگر ایک آدمی گیا تو اس کے بچوں کے لئے کچھ پیسے مل گئے تو اس کے اوپر ان کا گزارہ ہو جائے گا، آئندہ کے لئے عداوتیں ختم ہو جائیں گی، تو یہ کچہریوں کے دھکے اور اس قسم کی ذلت جو آئے دن برداشت کرنی پڑتی ہے سب سے جان چھوٹے گی۔ تو یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ اختیار سارے کا سارا ولی کو ہے، ولی کی موجودگی میں کوئی دوسرا دعوے دار نہیں ہے، اس لئے ولی معاف کرنا چاہے تو حکومت کچھ نہیں کہہ سکتی، ولی صلح کر لے تو حکومت آگے سے کوئی مداخلت نہیں کر سکتی۔ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا: بے شک یہ ولی مدد دیا ہوا ہے، یعنی اللہ کی طرف سے، حکومت کی طرف سے اس ولی کی مدد کی جاتی ہے، اس لئے اس کو قتل میں اسراف نہیں کرنا چاہیے۔

''یتیم کے مال'' کی حفاظت اور ''عہد'' کو پورا کرنے کا حکم

تیسری صورت آگئی وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْیَتِیْمِ: یہ مالِ یتیم کو خصوصیت سے ذکر کر دیا ورنہ آگے اَوْفُوا الْكَیْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِیْمِ کے اندر سارے مالی نظام کا ذکر آ گیا۔ ''یتیم کے مال کے قریب بھی نہ جایا کرو مگر ایسے طریقے کے ساتھ جو کہ بہتر ہے'' اگر کسی یتیم کی سرپرستی تمہیں حاصل ہے تو اس کے مال میں ناجائز تصرف نہ کرو، اس میں تصرف وہی کرو جو یتیم کے حق میں بہتر ہے، تجارت میں لگاؤ، اس کے اندر کوئی بڑھنے کی صورت پیدا کرو، حَتّٰی یَبْلُغَ اَشُدَّهٗ: یہاں تک کہ وہ یتیم اپنی جوانی کو پہنچ جائے، جب جوانی کو پہنچ جائے تو اس کا مال اس کے سپرد کر دو۔ ''اور عہد پورے کیا کرو'' آپس میں ایک دوسرے سے جو عہد کر لیتے ہو'' بے شک عہد سوال کیا جائے گا'' عہد کے متعلق پوچھا جائے گا کہ تم نے عہد پورا کیا تھا یا نہیں؟ اللہ کے ساتھ عہد کیا جیسے کلمہ پڑھ کے تمام اَحکام ہم نے مان لئے، یا کوئی نذر مانی جاتی ہے، یا ہم آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ عہد کرتے ہیں، تو معاملات کی صحت عہد کی پابندی پہ ہوتی ہے، جو زبان کر لی اس کو پورا کرو، تب جا کے معاملات درست ہو سکتے ہیں۔ صحیح اور صالح معاشرہ پُرامن اور اطمینان والا معاشرہ وہ ہوا کرتا ہے کہ جس میں انسان کو جان مال اور عزت کا تحفظ حاصل ہو، جس معاشرے کے اندر جان مال عزت محفوظ نہیں اس کو کوئی اطمینان کا معاشرہ نہیں کہتا، عزت کو خطرہ ہے کہ جو چاہے کسی کی لڑکی کو چھیڑ دے، جو چاہے کسی کی بیوی کو پکڑ لے، بہن کو پکڑ لے، ایسے وقت میں بھی انسان کوئی سکون اور اطمینان سے نہیں رہ سکتا، جان کا خطرہ ہے کہ معلوم نہیں کس وقت کوئی آ کر ڈاکا ڈالے اور ہمیں بھی قتل کر جائے، مال کا خطرہ ہے کہ معلوم نہیں کب چوری ہو جائے، کب کوئی چھین کر لے جائے، کب کوئی ناجائز طریقے سے ہم سے قبضا لے گا، جب اس قسم کے حالات ہوا کرتے ہیں تو پھر انسان ہر وقت تہلکتا رہتا ہے، کسی وقت بھی اس کو سکون اور اطمینان نہیں آتا، اور اسلام ان تینوں چیزوں کو تحفظ دیتا ہے، کہ ایک دوسرے کی عزت کا خیال بھی کرو، اور ایک دوسرے کی جان کا خیال بھی کرو، اور اسی طرح سے ایک دوسرے کے مال کا خیال بھی کرو، کسی کے مال کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کرو، جس طرح سے آگے آ رہا ہے کہ ڈنڈی مارنے کی عادت ٹھیک نہیں ہے، اگر تولتے وقت کوئی خیانت کرتے ہو، ماپتے وقت کسی

قسم کی خیانت کرتے ہو، تو یہ بھی اللہ تعالیٰ کے نزدیک انتہائی بُری بات ہے، اور یتیموں کا ذکر خصوصیت سے کر دیا، کہ وہ آگے سے محاسبہ نہیں کر سکتے، وہ آپ سے حساب نہیں لے سکتے، جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے خصوصیت سے تاکید کر دی، کہ یتیم کا مال کھانا تو اس طرح سے ہے جس طرح سے کوئی شخص جہنم کی آگ پھانک رہا ہو (النساء:۱۰)۔ ''نہ قریب جاؤ یتیم کے مال کے مگر اس طریقے کے ساتھ جو کہ اچھا ہے، حتیٰ کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائے، اور عہد کو پورا کیا کرو، بے شک عہد پوچھا جائے گا، عہد کے متعلق سوال کیا جائے گا۔''

''کیل'' اور ''وزن'' میں ترازو صحیح رکھنے کا حکم

وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ: اور پورا کیا کرو کیل کو جس وقت کہ تم کیل کرو، ماپتے وقت ٹھیک ماپو، وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ: اور صحیح ترازو کے ساتھ وزن کیا کرو، تمہاری ترازو صحیح ہونی چاہیے غلط نہ ہو، اس لئے جتنا کسی کے ساتھ دینے کا عہد کیا ہے..... ! پانچ روپے لیے اور اس کے مقابلے میں ایک کلو دینا ہے، تو ٹھیک دو، یہ بھی ایک قسم کا عہد ہوتا ہے، اور اگر تم سیر کی بجائے پون سیر دو گے، پاؤ کی بجائے تین چھٹانک دو گے تو یہ تمہارے اپنے عہد کے خلاف ہے جس قسم کی زبان آپس میں ہوئی ہے، اور یہ مالی بددیانتی ہے، ذٰلِكَ خَيْرٌ: یہ بہتر ہے، تجارت کے اصول سے بہتر، معاشیات کے اصول سے بہتر، وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا: اور انجام کے اعتبار سے بڑا اچھا ہے، آپس میں ایک دوسرے کے اوپر اعتماد پیدا ہوتا ہے، ایک دوسرے کے ساتھ محبت ہوتی ہے، آپ میرے پہ اعتماد کریں گے، میں آپ پر اعتماد کروں گا، ہر کسی کے حقوق ادا ہوتے چلے جائیں گے۔

''بدگمانیوں'' سے اِجتناب کا حکم

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ: پیچھے نہ لگ کر اس بات کے جس کا تجھے علم نہیں، بے علمی کی صورت میں محض بدگمانیوں کے طور پر بعض باتیں نہ لے اڑا کر، ایک دوسرے کے متعلق ایسے خیال جمالینا، اس سے بھی ایک دوسرے پر بداعتمادی ہوتی ہے، کوئی واضح دلیل نہیں ہے، کسی کو چور سمجھ لیں، کسی کو بدمعاش سمجھ لیں، کسی کے متعلق اس قسم کی باتیں کر لیں، یہ مناسب نہیں ہے، ''جس چیز کا تجھے علم نہیں اس کے پیچھے نہ لگا کر۔'' قفا یقفو: پیچھے چلنا۔ ''نہ اتباع کر تو، نہ پیچھے چل تو اس چیز کے جس کا تجھے علم نہیں'' اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا: بے شک کان آنکھ دل، ہر کسی کے متعلق سوال ہوگا، کہ آنکھ کے ساتھ کیا دیکھا تھا، کان کے ساتھ کیا سنا تھا، دل کے ساتھ کیا سوچا تھا، ان سب باتوں کے اوپر اللہ تعالیٰ کی طرف سے پرسش ہوگی اور گرفت ہوگی، اس لئے سوچ سمجھ کر چلا کرو، نہ آنکھ غلط استعمال کرو نہ کان اور دل۔ دل (کے غلط استعمال) کا مطلب یہ ہے کہ کسی کے متعلق بلا وجہ بدگمانیاں بنالینا، بدگمانیاں کر لینا، یہ بھی اچھی بات نہیں ہے۔ ''پیچھے نہ لگا کر اس چیز کے جس کے متعلق تجھے علم نہیں، بے شک کان آنکھ دل'' كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا: ہر ایک کے متعلق سوال کیا جائے گا۔

وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ﴿۳۷﴾

مت چل تو زمین میں اکڑتا ہوا، بے شک تو ہرگز نہیں پھاڑے گا زمین کو اور ہرگز نہیں پہنچے گا تو پہاڑوں کو از روئے لمبائی کے ﴿۳۷﴾

كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا ﴿۳۸﴾ ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ

یہ سارے برے کام تیرے رب کے نزدیک ناپسندیدہ ہیں ﴿۳۸﴾ یہ باتیں اس حکمت میں سے ہیں جو تیرے رب نے تیری طرف

الْحِكْمَةِ ۗ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتُلْقٰى فِيْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿۳۹﴾ اَفَاَصْفٰىكُمْ

وحی کی، اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود قرار نہ دے پھر تو ڈال دیا جائے گا جہنم میں ملامت کیا ہوا دھتکارا ہوا ﴿۳۹﴾ کیا خاص کیا تمہیں

رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ اِنَاثًا ۗ اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا ﴿۴۰﴾

تمہارے رب نے بیٹوں کے ساتھ اور اختیار کیں فرشتوں سے لڑکیاں؟ بے شک تم البتہ بہت بڑی بات کہتے ہو ﴿۴۰﴾

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِيَذَّكَّرُوْا ۗ وَمَا يَزِيْدُهُمْ

ہم نے (اس مضمون کو) پھیر پھیر کے اس قرآن کے اندر بیان کیا تاکہ یہ لوگ نصیحت حاصل کریں، نہیں زیادہ کرتا ان کو ہمارا یہ بیان کرنا

اِلَّا نُفُوْرًا ﴿۴۱﴾ قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗٓ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِي

مگر از روئے بدکنے کے ﴿۴۱﴾ آپ کہہ دیجئے اگر اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور آلہہ ہوتے جیسے کہ یہ لوگ کہتے ہیں تب تلاش کر لیتے وہ عرش والے

الْعَرْشِ سَبِيْلًا ﴿۴۲﴾ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا ﴿۴۳﴾ تُسَبِّحُ

کی طرف راستہ ﴿۴۲﴾ وہ (عرش والا) پاک ہے، اور وہ بلند ہے ان باتوں سے جو یہ کہتے ہیں بلند ہونا بہت زیادہ ﴿۴۳﴾ تسبیح بیان کرتے ہیں

لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ۗ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ

اس کے لئے ساتوں آسمان اور زمین اور سب وہ چیزیں جو ان میں ہیں، اور کوئی شی نہیں مگر وہ تسبیح بیان کرتی ہے اللہ کی حمد کے ساتھ،

وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ۗ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ﴿۴۴﴾ وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا

لیکن تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو،، بے شک وہ بردبار ہے بخشنے والا ہے ﴿۴۴﴾ اور جب آپ قرآن پڑھتے ہیں تو کر دیتے ہیں ہم

بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ﴿۴۵﴾ وَّجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ

آپ کے درمیان اور ان لوگوں کے درمیان جو کہ آخرت پر ایمان نہیں لاتے ایک چھپا ہوا پردہ ﴿۴۵﴾ اور کر دیتے ہیں ہم ان کے دلوں

اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ

کے اُوپر پردے تا کہ یہ اس کو نہ سمجھیں، اور کر دیتے ہیں ہم ان کے کانوں کے اندر بوجھ، اور جس وقت آپ اپنے رَبّ کا ذِکر

فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا ۝۴۶ نَحْنُ اَعْلَمُ

قرآن میں کرتے ہیں اس حال میں کہ وہ اکیلا ہے تو وہ اپنی پیٹھوں کے بل بھاگ جاتے ہیں نفرت کرتے ہوئے ۝۴۶ ہم خوب جانتے ہیں

بِمَا يَسْتَمِعُوْنَ بِهٖٓ اِذْ يَسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ وَاِذْ هُمْ نَجْوٰٓى

اس بات کو جس کے سبب سے یہ کان لگاتے ہیں جس وقت یہ آپ کی طرف کان لگاتے ہیں اور جبکہ وہ آپس میں سرگوشیاں کرنے

اِذْ يَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ۝۴۷ اُنْظُرْ كَيْفَ

والے ہوتے ہیں، جس وقت کہ ظالم کہتے ہیں نہیں پیروی کرتے تم مگر ایسے شخص کی جس پر جادو ہو یا ہوا ہے ۝۴۷ دیکھ تو، یہ تیرے لیے

ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ۝۴۸ وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا

کیسی مثالیں بیان کرتے ہیں، پس یہ لوگ بھٹکے پھرتے ہیں، یہ راستہ پانے کی طاقت نہیں رکھتے ۝۴۸ اور یہ کہتے ہیں کہ کیا جس وقت ہم

عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ۝۴۹

ہڈیاں ہو جائیں گے اور چورا چورا ہو جائیں گے کیا البتہ ہم اُٹھائے ہوئے ہوں گے نئے سرے سے پیدا کر کے؟ ۝۴۹

قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًا ۝۵۰ؗ اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِيْ صُدُوْرِكُمْ ۚ

آپ انہیں کہہ دیجئے کہ تم پتھر بن جاؤ یا لوہا ہو جاؤ ۝۵۰ یا کوئی اور مخلوق بن جاؤ اس چیز میں سے جو تمہارے سینوں کے اندر بہت بڑی ہے،

فَسَيَقُوْلُوْنَ مَنْ يُّعِيْدُنَا ؕ قُلِ الَّذِيْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ فَسَيُنْغِضُوْنَ

پھر وہ پوچھیں گے کہ ہمیں کون لوٹائے گا، آپ جواب دے دیجئے کہ وہی جس نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا، تو عنقریب حرکت دیں گے

اِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هُوَ ؕ قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَرِيْبًا ۝۵۱ يَوْمَ

یہ آپ کی طرف اپنے سروں کو اور کہیں گے کہ کب ہوگا یہ لوٹانا؟ آپ کہہ دیجئے کہ ہوسکتا ہے کہ قریب ہی ہو ۝۵۱ جس دن اللہ تعالیٰ تمہیں

يَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِيْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ وَتَظُنُّوْنَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا ۝۵۲ ع

پکارے گا، تم قبول کرو گے اللہ کے اس پکارنے کو اللہ کی تعریف کرتے ہوئے، اور تم یہ سمجھو گے کہ تم نہیں ٹھہرے مگر بہت تھوڑا وقت ۝۵۲

تفسیر

متکبرانہ اور مغرورانہ چال سے ممانعت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ- وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا:مَرَحًا: اکڑنا، اترانا۔ لَا تَمْشِ نہی کا صیغہ ہے۔ مت چل تو زمین میں اکڑتا ہوا اتراتا ہوا۔ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ: بے شک تو ہرگز نہیں پھاڑے گا زمین کو، وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا: اور ہرگز نہیں پہنچے گا تو پہاڑوں کو از روئے طول کے۔ اَحکام کے سلسلے میں ایک حکم یہ بھی دیا گیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ تواضع اختیار کرنی چاہیے، تکبر اچھا نہیں۔ تواضع اور تکبر یہ دونوں اصل کے اعتبار سے تو قلب کی صفتیں ہیں، دل کی ایک کیفیت ہے جس کو تکبر کہتے ہیں کہ ایک انسان اپنے آپ کو بڑا جانتا ہے، دوسرے کو حقیر جانتا ہے، کیونکہ تکبر کی تعریف حدیث شریف میں یہی ذکر کی گئی ہے ''بَطَرُ الْحَقِّ وَغَمْطُ النَّاسِ''[1] حق بات کے سامنے اکڑ جانا، حق بات کو قبول نہ کرنا، اور لوگوں کو حقیر جاننا، اور تواضع کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دوسرے کے سامنے اپنے آپ کو پست رکھا جائے، یہ دل کی کیفیتیں ہیں لیکن ان کے ظاہر میں آثار اسی قسم کے ہوتے ہیں، کہ جن کے دل میں تکبر ہوتا ہے وہ اکڑتے ہیں، اکڑ کے چلتے ہیں، اپنے آپ کو تان کے رکھتے ہیں، اور زمین کے اوپر زور زور سے پاؤں مارتے ہیں، تو یہاں یہی منع کرنا مقصود ہے کہ تمہاری چال متواضعانہ ہونی چاہیے متکبرانہ نہیں، اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے زمین کو بچھایا راحت و آرام کے لئے، اس میں اس کی قدرت بھی نمایاں ہے اور انعام بھی نمایاں ہے، تو تم اگر اس طرح سے پاؤں مار مار کے چلنے کی کوشش کرو تو تم اس زمین کو پھاڑ تو سکتے نہیں، اور اسی طرح سے تم کتنے ہی اپنے آپ کو گردنیں اٹھا اٹھا کر بلند کرنے کی کوشش کرو لیکن اللہ تعالیٰ نے جس قسم کے پہاڑ پیدا کردیے تم ان سے بلند نہیں ہو سکتے، ان کی طرح لمبے نہیں ہو سکتے، ان پہاڑوں کے مقابلے میں تمہاری حیثیت گلہری جتنی بھی نہیں ہے، تو رہو گے تو تم اتنے جتنے کہ ہو، لیکن آپ کے اکڑنے کا اور زور زور سے پاؤں مار کے چلنے کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ کے دل میں اللہ کی عظمت نہیں ہے، اگر اللہ تعالیٰ کی عظمت آپ کے قلب میں ہوتی اور اللہ کا خوف آپ پر مسلط ہوتا، اللہ کے انعامات کا احساس ہوتا تو پھر اس طرح سے گردن اٹھا اٹھا کر چلنے کی بات نہ ہوتی، بلکہ وہ کیفیت ہوتی جس کا سورۂ فرقان کے اندر ذکر کیا گیا ہے وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا (آیت: ۶۳) کہ اللہ کے بندے تو وہ ہیں جو زمین کے اوپر بڑی نرم رفتار چلتے ہیں، اور جس وقت وہ چل رہے ہوتے ہیں تو ان کے بدن کی کیفیت ایسی ہے کہ دیکھ کے انسان محسوس کرتا ہے کہ واقعی ان کے دل میں اللہ تعالیٰ کی عظمت ہے اور ہر وقت یہ اللہ تعالیٰ کے احسانات کا استحضار کیے ہوئے اس کے سامنے دبے دبے سے ہیں، تو علامات آپ کے اوپر تواضع کی نمایاں ہونی چاہئیں، تکبر کی علامات نمایاں نہیں ہونی چاہئیں۔ كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَیِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا: كُلُّ ذٰلِكَ یہ جو کچھ ذکر کیا گیا، ذٰلِكَ کا اشارہ مذکور کی طرف ہے، ''جو کچھ ذکر کیا گیا اس کی برائی تیرے رَب کے نزدیک ناپسندیدہ ہے''، اور سَیِّئُهٗ کی ضمیر كُلُّ ذٰلِكَ کی طرف لوٹ رہی ہے، تو گویا کہ آپ یوں کہہ سکتے ہیں کہ

---

(۱) صحیح مسلم ۱/ ۶۵ باب تحریم الکبر و بیانہ/ مشکوٰۃ ۲/ ۴۳۳ باب الغضب والکبر۔ فصل اول۔

''کَانَ سَیِّئُہٗ عِنْدَ رَبِّکَ مَکْرُوْھًا''۔ اور سَیِّئُہٗ کُلُّ ذٰلِکَ یہ اضافت بیانی ہے، جس کے مطابق ''بیان القرآن'' میں ترجمہ یوں کیا گیا ہے کہ ''بے شک یہ سارے برے کام تیرے رَبّ کے نزدیک ناپسندیدہ ہیں۔'' اور مکروہ کا لفظ یہاں جو استعمال کیا گیا تو اس کا مطلب ہے کہ اللہ کو ان کاموں سے نفرت ہے، یہ جو بُرے کام ذکر کیے گئے ہیں، بعضے صراحتاً جس طرح سے زِنا کا ذکر آیا، اور کم تولنے سے کم ماپنے سے نہی آئی، اور جن میں امر کے صیغے کے طور پر بات آئی ہے، جن کاموں کا مطالبہ کیا گیا ہے تو اس سے اُن کی ضد کا حرام ہونا ثابت ہوتا ہے، ان سب کاموں سے اللہ کو نفرت ہے۔ یہ مکروہ فقہی مکروہ نہیں بلکہ لغوی مکروہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ کام پسند نہیں، اللہ تعالیٰ کو ان کاموں سے نفرت ہے، تو فقہی طور پر وہ کام حرام ہیں، وہ فقہی مکروہ نہیں، کہ جن میں صرف خلافِ اولیٰ ہونے والی بات ہوتی ہے، اور کرنے کی گنجائش ہوتی ہے، تو یہ فقہی مکروہ نہیں ہیں، ''اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ سارے کے سارے بُرے کام ناپسندیدہ ہیں۔'' ذٰلِکَ مِمَّآ اَوْحٰٓی اِلَیْکَ رَبُّکَ مِنَ الْحِکْمَۃِ: اب یہ ان اَحکام کی عظمت بیان کی جارہی ہے کہ یہ جو کچھ آپ کے سامنے بیان کیا گیا یہ اسی حکمت سے ہے جو تیرے رَبّ نے تیری طرف وحی کی۔ مِنَ الْحِکْمَۃِ یہ مَا کا بیان ہے، جس میں اس بات کی طرف اشارہ کردیا کہ یہ ساری کی ساری باتیں پُرحکمت ہیں، دلائل محکمہ کے ساتھ ثابت ہیں، اور ان کے اندر فائدہ ہی فائدہ ہے، ان کے اندر کوئی نقصان کا پہلو نہیں ہے، دانش مندی کی باتیں ہیں، فطرت کا تقاضا ہے، ''یہ باتیں اس حکمت میں سے ہیں جو تیرے رَبّ نے تیری طرف وحی کی۔''

''توحید'' کی عظمت اور ''شرک'' کی مذمت

وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـھًا اٰخَرَ فَتُلْقٰی فِیْ جَھَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا: آپ کے سامنے آچکا کہ ان اَحکام کی اِبتدا بھی اِثباتِ توحید اور ردِّ شرک سے تھی، تو اب ان اَحکام کے سلسلے کو ختم کیا جارہا ہے تو بھی رَدِّ شرک پر، جس سے اندازہ ہوجائے گا کہ اسلامی زندگی کی اِبتدا اور اِنتہا توحید پر ہی ہے، اور توحید میں اگر خلل پڑجائے تو پھر کسی صورت میں بھی اسلامی زندگی باقی نہیں رہ سکتی، اس عقیدۂ توحید کی عظمت اور شرک کی مذمت کو اجاگر کرنے کے لئے آخر میں پھر اسی کو ذکر کردیا، وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـھًا اٰخَرَ: اللہ کے ساتھ الٰہ آخر نہ بنا، اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود قرار نہ دے، فَتُلْقٰی فِیْ جَھَنَّمَ: پھر تو ڈال دیا جائے گا جہنم میں، مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا: ملوم: الزام دیا ہوا، ملامت کیا ہوا۔ مدحور: دھتکارا ہوا۔ دَحْر شدّت کے ساتھ کسی کے دفع کرنے کو کہتے ہیں۔ دھتکارا ہوا ہوگا، الزام دیا ہوا ہوگا، ایسی حالت میں تو جہنم میں پھینک دیا جائے گا اگر تُو نے اللہ کے ساتھ کسی دوسرے الٰہ کو قرار دیا، یعنی پھر کسی دوسری چیز کا اعتبار نہیں، شرک کے نتیجے میں انسان ذلیل ہوکر جہنم میں جاگرے گا۔ لَا تَجْعَلْ فَتُلْقٰی: قرار نہ دے کہ تو ڈال دیا جائے گا، یعنی اگر تو قرار دے گا تو جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔

فرشتوں کے متعلق مشرکینِ مکہ کا عقیدہ

اَفَاَصْفٰىكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِیْنَ: کیا تمہارے رَبّ نے تمہیں خاص کردیا بیٹوں کے ساتھ، وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِكَۃِ اِنَاثًا: اور اختیار

کیں فرشتوں سے لڑکیاں؟ اِناث اُنثٰی کی جمع، لڑکی۔ یعنی تم نے جو عقیدہ اختیار کر رکھا ہے شرک ہونے کے ساتھ ساتھ یہ خلافِ عقل بھی ہے، کہ اپنے لئے تو تم نے لڑکے تجویز کیے، لڑکی کی نسبت تم اپنی طرف گوارہ نہیں کرتے، اور اللہ کی طرف اوّل تو اولاد کی نسبت ہی بُری، اور پھر اولاد کی نسبت کی بھی تو اس قسم کی اولاد کی جس کو تم اپنے لیے بھی عیب سمجھتے ہو، اللہ تعالیٰ کی طرف اس کو منسوب کرتے ہو، کیونکہ مشرکین کے عقیدے میں فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں تھیں۔ اَفَاَصْفٰىكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ: کیا چُن لیا تمہیں اللہ تعالیٰ نے بیٹوں کے ساتھ، کیا خاص کیا تمہیں اللہ تعالیٰ نے بیٹوں کے ساتھ، اور اختیار کیں فرشتوں سے لڑکیاں؟ اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا: بے شک تم البتہ بہت بڑی بات کہتے ہو، یعنی یہ بہت بڑی ہے قباحت میں، بہت بڑی ہے خلافِ دلیل ہونے کے اعتبار سے، مذمت کے اعتبار سے، بہت بڑی بات بہت بھاری بات تم اپنے منہ سے بولتے ہو۔

مختلف اُسلوبوں سے مضمونِ توحید کو بیان کرنے کی وجہ

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِيَذَّكَّرُوْا: صَرَّفَ تَصْرِیْف: کسی چیز کو بار بار مختلف انداز سے بیان کرنا، اور یہاں صَرَّفْنَا کا مفعول یہی مضمونِ توحید ہے یا رَدِّ شرک کا مضمون جس کا ذکر اوپر کی آیت میں آیا۔ ''البتہ تحقیق ہم نے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو، یا اِثباتِ توحید کو، ردِ شرک کو مختلف انداز کے ساتھ، مختلف پہلوؤں سے قرآنِ کریم میں بار بار بیان کیا ہے'' تو صَرَّفْنَا کا مفعول نکال لیا جائے گا مضمونِ توحید، یا رَدِّ شرک کا مضمون، ''ہم نے اس کو بار بار، پھیر پھیر کے، مختلف انداز سے، مختلف اُسلوبوں سے قرآنِ کریم کے اندر واضح کیا ہے'' لِيَذَّكَّرُوْا: تا کہ یہ لوگ نصیحت حاصل کریں، وَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا: لیکن یہ ایسے بدبخت ہیں کہ ان کو جتنا سمجھانے کی کوشش کی جا رہی ہے یہ اُلٹا اور بِدکتے ہی چلے جاتے ہیں، ''نہیں زیادہ کرتا ان کو ہمارا یہ بیان کرنا مگر ازروئے بدکنے کے'' وَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا کا ترجمہ ہو گیا کہ ہمارا یہ بیان کرنا ان کی نفرت ہی بڑھاتا ہے، جتنا ہم ان کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں اتنا ہی یہ بِدکتے ہیں۔

مشرکین کا فلسفۂ شرک

قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗۤ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِي الْعَرْشِ سَبِيْلًا: آپ کہہ دیجئے اگر اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور آلہہ ہوتے، اور الٰہ ہوتے جیسے کہ یہ لوگ کہتے ہیں تب البتہ تلاش کر لیتے وہ عرش والے کی طرف راستہ۔ ان لفظوں میں رَدِّ شرک کو ایک اور انداز سے ذکر کیا گیا ہے، آپ کی خدمت میں بارہا یہ بات آ چکی، پیش کی جا چکی، کہ مشرکین نے اپنے شرک کا فلسفہ جو مرتب کیا تھا وہ اس مثال سے مرتب کیا تھا کہ دنیا کے اندر جس طرح سے ایک بادشاہ ہوتا ہے اور اس کو کام چلانے کے لئے اپنے معاونین کی ضرورت ہوتی ہے، وہ اپنے ماتحت حکام بناتا ہے، اور ان حکام کے ذریعے سے وہ کام لیتا ہے، تو نچلی آبادی کا تعلق ان نچلے حکام کے ساتھ ہوا کرتا ہے، نچلے حکام خوش رہیں تو بڑے سے کام کروا دیتے ہیں، اور اگر نچلے حکام ناراض ہو جائیں تو پھر بڑے سے کام نہیں کروا کے دیتے، اور اس طرح سے پھر زندگی میں مشکلات پیش آتی ہیں، تو ہمیں چاہیے کہ ہم چھوٹوں کو خوش رکھیں، یہ مثال ہے جس سے انہوں نے شرک کا تانا بانا تیار کیا، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ انہوں نے یہ پہلو تو دیکھا کہ بادشاہ کو معاونین کی ضرورت ہوتی ہے،

وہ معاونین کے ذریعے سے کام لیتا ہے، تو کیا انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ یہ معاونین جو ہوتے ہیں، گاہے گاہے یہی حکام ان بادشاہوں کے تختے بھی الٹتے رہتے ہیں، ایک کو گرایا اور دوسرا بادشاہ بن گیا، جب دیکھا اس کی ٹانگ کھینچی اور دوسرا تخت پر چڑھ بیٹھا، دنیا کے بادشاہوں میں یہ مثال ان کے سامنے نہیں؟ اسی طرح سے اگر اللہ تعالیٰ ایک بادشاہ ہوتا اور اس کے ساتھ اس کی حکومت میں اور آلہہ بھی شریک ہوتے، اس کی حکومت میں اس کے اقتدار میں اور آلہہ بھی شریک ہوتے تو کبھی تو ایسی نوبت آتی کہ نچلے بغاوت کر کے اس کے ساتھ فساد کرتے، اس کے ساتھ کھینچا تانی کرتے، اور اس کو گرا کے خود بادشاہ بننے کی کوشش کرتے، دنیا کے اندر یہ عام تاریخ کا ایک پہلو ہے کہ بادشاہوں کے معاونین بادشاہوں کے تختے الٹتے رہتے ہیں، اور اس میں تخلف بہت کم ہوتا ہے، ایک کو گرایا اور دوسرا آیا، پھر اس کی ٹانگ کسی نے کھینچی اور تیسرا آیا، تو اگر اللہ تعالیٰ کے اقتدار کے اندر کوئی دوسرے لوگ شریک ہوتے تو وہ بھی کبھی تو عرش والے کی طرف راستہ تلاش کر لیتے فساد کرنے کا، مخاصمت کا، اور اس کو شکست دینے کا، اور خود عرش کے اوپر غلبہ پانے کا وہ بھی کوئی راستہ تلاش کر لیتے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ان آلہہ کی آپس میں لڑائی ہوتی، ان کا آپس میں اختلاف ہوتا، اور یہ نظامِ عالم سارے کا سارا برباد ہو جاتا، جس کو قرآنِ کریم میں دوسری جگہ ان الفاظ سے ادا کیا گیا ہے کہ لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا (الانبیاء: ۲۲) کہ اگر اس زمین و آسمان کے اندر اللہ کے علاوہ اور آلہہ ہوتے تو ان کا نظم کبھی قرار نہ رہتا، آخر یہ حکام کی فطرت ہے کہ آپس میں اختلاف بھی کرتے ہیں، کھینچا تانی بھی کرتے ہیں، اور دنیا کے اندر اگر تم بادشاہوں کی مثال دیتے ہو تو بادشاہوں کی لڑائیاں بھی تمہارے سامنے ہوں گی، کہ کس طرح سے ایک دوسرے کے اوپر غلبہ پانے کی کوشش کرتے ہیں، تو اگر اللہ تعالیٰ کے ساتھ اقتدار میں کوئی اور شریک ہوتے تو کبھی کا فساد ہو چکا ہوتا، اور زمین و آسمان کسی صورت میں قائم نہیں رہ سکتے تھے۔ تو وہاں اس کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا، اور یہاں ان الفاظ کے ساتھ ذکر کیا کہ ''آپ کہہ دیجئے کہ اگر اللہ کے ساتھ اور آلہہ ہوتے جیسے کہ یہ لوگ کہتے ہیں، تب تلاش کر لیتے وہ عرش والے کی طرف راستہ'' یہاں عرش والے کی طرف راستہ تلاش کرنے سے مراد ہے مخاصمت کا راستہ، غلبہ پانے کا راستہ مراد ہے۔ سُبْحٰنَهٗ: وہ عرش والا پاک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، وَتَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا: اور وہ بلند ہے ان باتوں سے جو یہ کہتے ہیں بلند ہونا بہت زیادہ، وہ ان باتوں سے بہت بلند ہے، بالا و برتر ہے، جس طرح سے یہ بولتے ہیں، اس کی حکومت میں کوئی دوسرا شریک نہیں۔

کائنات کا ہر ذرّہ اللہ کی تسبیح بیان کرتا ہے...... ''تسبیح'' اور ''تحمید'' میں فرق

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ: تسبیح بیان کرتے ہیں اس کے لئے ساتوں آسمان اور زمین اور سب وہ چیزیں جو ان میں ہیں، وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ: نہیں کوئی شی مگر تسبیح بیان کرتی ہے اللہ کی حمد کے ساتھ، وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ: لیکن تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو، اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا: بے شک وہ اللہ تعالیٰ حلیم ہے غفور ہے، بردبار ہے بخشنے والا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے متعلق جو کہا گیا تھا سُبْحٰنَهٗ: اللہ ہر عیب سے پاک ہے، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ بات کہ اللہ تعالیٰ ہر عیب سے پاک ہے کائنات کے ذرّے ذرّے سے نمایاں ہے، زمین و آسمان میں کوئی چیز ایسی نہیں جو اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان نہ کرتی ہو، جو اس بات کے اوپر دلالت

نہ کرتی ہو کہ اس کا خالق ہر عیب سے پاک ہے، تمام چیزیں اللہ کی تسبیح بیان کرتی ہیں، پھر ساتھ ساتھ حمد بھی کرتی ہیں، تسبیح اور حمد کے درمیان فرق آپ سمجھتے ہی ہیں، کہ تسبیح میں سلبی پہلو ہے کہ اللہ کے اندر کوئی نقص کی صفت موجود نہیں، حمد کے اندر اثباتی پہلو ہے کہ جتنی صفاتِ کمال ہیں وہ ساری کے ساری اللہ کے اندر موجود ہیں۔ اب یہ تسبیح کیسی ہے؟ ایک تسبیح تو وہ ہے جو جنات اور ملائکہ اور انسان اپنی زبان کے ساتھ اختیاراً کرتے ہیں جس طرح سے ہم سبحان اللہ والحمدللہ کہتے ہیں، یہ تو ایسی ہے جس میں الفاظ ادا ہوتے ہیں اور عام طور پر ایک دوسرے کی تسبیح کو سنا بھی جاسکتا ہے، میں تسبیح بیان کرتا ہوں آپ سنتے ہیں، اور ہم تسبیح بیان کریں فرشتے سنتے ہیں، اور ایسا بھی آخرت میں قیامت میں ہوگا کہ فرشتے تسبیح پڑھیں گے اور ہمیں معلوم ہوگا، اور جن کو کشف ہوجاتا ہے تو کشف کی صورت میں اب بھی نمایاں ہوسکتی ہے، ایک تسبیح تو یہ ہے جانداروں کی، اور یہ دوسری چیزیں جو کہ نباتات کی شکل میں ہیں یا جمادات کی شکل میں ہیں واقعہ یہ ہے کہ یہ بھی اللہ کی تسبیح بیان کرتی ہیں، ان کا تسبیح بیان کرنا ایک تو یہ ہے کہ یہ اپنے حال کے اعتبار سے دلالت کریں کہ ہمارا خالق اور ہمارا مالک بے عیب ہے اور اُس میں ساری خوبیاں پائی جاتی ہیں، حال سے دلالت کا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ غور کریں تو وہاں سے استدلال کر کے یہ بات سمجھ سکتے ہیں، یعنی اُن سے کسی چیز کا صدور نہیں ہے کہ وہ سبحان اللہ کہتی ہوں، الحمدللہ کہتی ہوں، بلکہ ان کا حال ایسا ہے، جس کو آپ کہتے ہیں بزبانِ حال کہہ رہی ہیں، یعنی اگر عقل مند آدمی ان کو دیکھے تو وہاں سے استدلال کرسکتا ہے کہ اس کا پیدا کرنے والا بے عیب ہے اور اس کا پیدا کرنے والا تمام خوبیوں کا مالک ہے، جیسے کہتے ہیں کہ:

ہر گیاہے کہ از زمیں مے روید وحدہٗ لا شریک لہ مے گوید

گھاس کا جو بھی پتا زمین سے نکلتا وہ وحدہٗ لاشریک لہ کہتا ہوا نکلتا ہے، تو یہ ایک حال سے استدلال کیا جاسکتا ہے کہ عقل مند آدمی اگر سوچے تو سوچ کر معلوم کرسکتا ہے کہ اِس کا پیدا کرنے والا بے عیب ہے اور خوبیوں کا مالک ہے۔ اور یہ جو فرمایا کہ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ یہ شکوہ ہے کافروں مشرکوں پر، کہ وہ اس قسم کا استدلال کرتے نہیں، اس لئے وہ ان کی تسبیح کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے، اگر وہ استدلال کریں تو ان کی تسبیح کو سمجھ سکتے ہیں۔

ساری کائنات کی تسبیح دلالت کرتی ہے کہ شرک غلط اور توحید صحیح ہے

لیکن اس سے بھی بڑھ کے اگر شریعت کے دلائل کی طرف دیکھا جائے قرآن اور حدیث میں جو واقعات بیان کئے گئے ہیں، تو ماننا پڑتا ہے کہ اپنے اپنے درجے کے مطابق ہر چیز اللہ کی تسبیح بیان کرتی ہے، نباتات بھی اللہ کا ذکر کرتے ہیں، پرندے بھی اپنی زبان میں اللہ کا ذکر کرتے ہیں، اور جمادات بھی اللہ کا ذکر کرتے ہیں، ان کے اندر بھی اللہ نے اتنا شعور رکھا ہے کہ جس کی بنا پر یہ اپنے خالق اور مالک کو پہچانتے ہیں، ''مشکوۃ شریف'' میں آپ کے سامنے ''باب علامات النبوۃ'' کے اندر ایک روایت آئی تھی جس میں سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا تھا کہ میں اس پتھر کو پہچانتا ہوں جو زمانہ نبوّت سے پہلے ہی مجھے سلام کیا کرتا تھا۔[1] اور ایک روایت میں آپ نے پڑھا تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے ساتھ تھے، تو حضور ﷺ جدھر جاتے تو حجر شجر سے یہ آواز آتی تھی

---

(۱) صحیح مسلم ۲/ ۲۴۵، باب فضل نسب النبی ﷺ/ مشکوۃ ۲/ ۵۲۴، باب علامات النبوۃ کی دوسری حدیث۔

''السلام علیك یارسول الله!''[۱] تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان سے یہ آواز تو آتی ہے، باقی اللہ تعالیٰ کبھی کسی انسان کو ظاہری طور پر سنوا دیتے ہیں کبھی نہیں سنواتے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی یہ کرامت میں سے ہو گیا کہ انہوں نے سن لیا۔ اور کنکریوں کا سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتھیلی میں تسبیح پڑھنا اور لوگوں کا سننا یہ مشہور بات ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت جو معجزات میں گزری تھی، اور اس کو کرامات میں بھی شمار کیا گیا، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیٹھ کے جب کھانا کھایا کرتے تھے تو ہم کھانے کی تسبیح سنا کرتے تھے کہ کھانا ''سبحان اللہ سبحان اللہ'' پڑھ رہا ہے۔[۲] یہ سب علامت ہے اس بات کی کہ یہ تسبیح پڑھتی ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے ہم سے ان کو ذرا پردے میں رکھا ہے، اور ان کی آواز کو ہم نہیں سنتے، کسی کسی کو اللہ تعالیٰ بطور کشف کے اور بطور کرامت کے سنا بھی دیتے ہیں، حضرت داؤد علیہ السلام کے معجزے کے طور پر ذکر کیا ہوا ہے کہ اس وقت پہاڑوں کی تسبیح، پرندوں کی تسبیح، وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ یُسَبِّحْنَ وَالطَّیْرَ (الانبیاء:۷۹) جس کا ذکر قرآنِ کریم میں ہے کہ پہاڑ بھی حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ تسبیح پڑھتے تھے، پرندے بھی حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ شامل ہو کر تسبیح پڑھتے تھے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ باقاعدہ یہ چیزیں تسبیح پڑھتی ہیں جس طرح سے ہم سبحان اللہ والحمد للہ کہتے ہیں، لیکن ان کے سمجھنے کے لئے جس قوت کی اور جس استعداد کی ضرورت ہے وہ کسی میں ہوتی ہے کسی میں نہیں ہوتی، تو کائنات کا ذرّہ ذرّہ چاہے وہ آسمان میں ہے چاہے وہ زمین میں ہے یا ان کے درمیان میں ہے کسی شکل میں ہو، جمادات ہیں، نباتات ہیں، حیوانات ہیں، پرندے ہوں، درندے ہوں، اور اسی طرح سے انسان جن اور ملائکہ یہ سارے کے سارے ہی اللہ کی تسبیح بیان کرتے ہیں، لیکن انسان اور جن چونکہ مختار ہیں اس لئے بعضے ان میں سے سرکش ہیں جو کہ اپنی زبان سے اللہ کی تسبیح قالاً نہیں کرتے تو ایسی صورت میں یہ ان کا جرم ہے، ورنہ باقی کائنات جتنی ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کی تنزیہ کرتی ہے، تحمید کرتی ہے، اور اس بات کو اچھی طرح سے اپنے قال اور حال کے ساتھ واضح کرتی ہے کہ ان کا پیدا کرنے والا بے عیب ہے اور سب خوبیوں کا مالک ہے، تو ایسی کسی دوسرے کی شان نہیں اس لئے جو لوگ اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی شان گھٹاتے ہیں، اور اس کے اوپر عیب لگاتے ہیں، تو ساری کائنات کی تسبیح اس بات پر شہادت دیتی ہے کہ شرک غلط ہے اور توحید صحیح ہے۔ ''تسبیح بیان کرتے ہیں اس کے لئے ساتوں آسمان اور زمین اور سب وہ چیزیں جو ان میں ہیں، اور کوئی شئ نہیں مگر وہ تسبیح بیان کرتی ہے اللہ کی حمد کے ساتھ (یعنی سبحان اللہ کہنے کے ساتھ، الحمد للہ کہنا بھی، نقص والی صفات سے تنزیہ کرنے کے ساتھ ساتھ، صفاتِ کمال کے ساتھ موصوف کرنا بھی) لیکن تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو۔'' اِنَّهٗ كَانَ حَلِیْمًا غَفُوْرًا: بے شک وہ بردبار ہے بخشنے والا ہے، اس لیے اتنی واضح شان ہونے کے باوجود جو لوگ اس کے ساتھ کفر و شرک کرتے ہیں ان کو فوراً عذاب نہیں ہوتا تو یہ اللہ کے حلم اور اللہ کی صفت مغفرت کا نتیجہ ہے۔

---

(۱) ترمذی ۲/ ۲۰۳، باب فی آیات اثبات نبوة النبی صلی اللہ علیہ وسلم - ولفظ الحدیث: فَمَا اسْتَقْبَلَهٗ جَبَلٌ وَّلَا شَجَرٌ اِلَّا وَهُوَ یَقُوْلُ السَّلَامُ عَلَیْكَ الخ

(۲) ترمذی ۲/ ۲۰۳، باب فی آیات اثبات نبوة النبی صلی اللہ علیہ وسلم/ بخاری ۱/ ۵۰۵، باب علامات النبوة فی الاسلام/ مشکوۃ ۲/ ۵۳۸، باب فی المعجزات، فصل اول۔

مشرکین کے قرآنِ کریم سے متاثر نہ ہونے کی وجہ

وَ اِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَیْنَكَ وَ بَیْنَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا: اب اُن لوگوں کا قرآنِ کریم سے متاثر نہ ہونا، اس کی وجہ بیان کی جارہی ہے، کہ اصل یہ ہے کہ آخرت کے قائل نہیں، انجام کا فکر نہیں، اگر آخرت کا قائل ہوتے، انجام کا فکر ہوتا تو پھر یہ ان باتوں سے متاثر ہوتے، انکارِ آخرت ہر فساد کی جڑ ہے، بارہا اس بات کو آپ کے سامنے واضح کیا جاچکا،'' اور جب آپ قرآن پڑھتے ہیں'' یعنی ان کو سنانے کے لئے بطور تبلیغ کے، جَعَلْنَا بَیْنَكَ وَ بَیْنَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ: کردیتے ہیں ہم آپ کے درمیان اور ان لوگوں کے درمیان جو کہ آخرت پر ایمان نہیں لاتے، حِجَابًا مَّسْتُوْرًا: ایک چھپا ہوا پردہ، ایک چھپا ہوا پردہ درمیان میں حائل ہوجاتا ہے جس کی بنا پر یہ اس سے متاثر نہیں ہوتے۔ وَّ جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً: اور کردیتے ہیں ہم ان کے دلوں کے اوپر پردے، اَنْ یَّفْقَهُوْهُ: لِئَلَّا یَفْقَهُوْهُ تاکہ یہ اس کو نہ سمجھیں، وَ فِیْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا: اور کردیتے ہیں ہم ان کے کانوں کے اندر بوجھ تاکہ یہ اُس کو نہ سنیں، یعنی یہ کیفیت اللہ تعالیٰ پیدا کردیتے ہیں، پیدا کرنے کی وجہ ان کی اپنی کوتاہیاں اور ضد ہے، ان کی اپنی نیت کا فساد ہے، تو اس قسم کی کیفیات پیدا ہوجاتی ہیں کہ ان کے دل سمجھتے نہیں، کان سنتے نہیں۔ وَ اِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِی الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ: اور جس وقت آپ اپنے رَبّ کا ذکر قرآن میں کرتے ہیں اس حال میں کہ وہ اکیلا ہے، رَبّ وحدہٗ کا ذکر کرتے ہیں، اس کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک نہیں ٹھہراتے، وَلَّوْا عَلٰۤى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا: تو اپنی پیٹھوں کے بل بھاگ جاتے ہیں نفرت کرتے ہوئے۔ قرآنِ کریم سمجھنے کی ان میں صلاحیت نہیں، یعنی سمجھنے کی نیت سے یہ سنتے نہیں جیسے کہ آگے الفاظ آرہے ہیں، نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا یَسْتَمِعُوْنَ بِهٖۤ اِذْ یَسْتَمِعُوْنَ اِلَیْكَ: جس وقت یہ آپ کی طرف کان لگاتے ہیں تو ہم خوب جانتے ہیں اس بات کو جس کی وجہ سے یہ کان لگاتے ہیں، یعنی بظاہر آپ کو معلوم ہوگا کہ بڑی توجہ سے سن رہے ہیں، لیکن یہ کیوں سن رہے ہیں اس کی وجہ ہم جانتے ہیں، یہ سمجھنے کے لئے نہیں سن رہے، عیب نکالنے کے لئے، اعتراض کی بات پکڑنے کے لئے سن رہے ہیں، اور جب آدمی کسی کی بات کی طرف کان لگاتا ہے اور اس لئے لگاتا ہے کہ کوئی نقص کی بات ملے تو میں پکڑوں اور اعتراض کروں، تو پھر وہ ان باتوں سے فائدہ نہیں اٹھایا کرتا اور کوئی بات اس کے دل میں اترا نہیں کرتی، کیونکہ اپنے سمجھنے کا تو ارادہ ہی چھوڑا ہوا ہے، دلوں کے دروازے ہی بند کیے ہوئے ہیں، اور کلام کی طرف اگر توجہ ہے بھی تو اس لیے ہے تاکہ اس میں سے کوئی نقص کی بات نکالی جائے، جس کی وجہ سے شور مچایا جاسکے، لوگوں کو متنفر کیا جاسکے۔'' ہم خوب جانتے ہیں اس بات کو جس کے سبب سے یہ کان لگاتے ہیں جس وقت یہ آپ کی طرف کان لگاتے ہیں'' وَ اِذْ هُمْ نَجْوٰۤى: اور جبکہ وہ آپس میں سرگوشیاں کرنے والے ہوتے ہیں، اِذْ یَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ: جس وقت کہ ظالم کہتے ہیں، اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا: نہیں پیروی کرتے تم مگر ایسے شخص کی جس پر جادو ہو یا ہوا ہے، ان سب حالات کو ہم جانتے ہیں۔ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا: تَتَّبِعُوْنَ کا خطاب ہوگا ان لوگوں کو جو ایمان لے آئے، ان کو کہتے ہیں کہ تم نہیں پیروی کرتے مگر ایک رجل مسحور کی، جس کے اوپر جادو ہو یا ہوا ہے، یہ سورۃ مکی ہے اور مکہ معظمہ کے اندر رہتے ہوئے قرآنِ کریم کی آواز جس وقت سرورِ کائنات ﷺ نے بلند کی ہے تو وہ لوگ آپ کے اوپر مختلف مثالیں چسپاں کرتے تھے، کبھی کہتے تھے یہ ساحر ہے، جادو کرتا ہے،

اس کی باتوں میں ایسا اثر ہے جس طرح سے کہ جادو میں ہوتا ہے، کبھی کہتے تھے شاعر ہے کہ اس کی کلام اس طرح سے موزون ہے جس طرح سے کہ شاعروں کی ہوتی ہے، اور اس طرح سے دوسرے کے اوپر اثر انداز ہوتی ہے جس طرح سے شاعر جذبات بھڑکا دیتے ہیں، کبھی مجنون کہتے تھے، کبھی کچھ کہتے تھے، انہی الفاظ میں سے ایک یہ لفظ رجل مسحور بھی ہے، اور رجل مسحور بول کر یہاں مجنون ہی مراد ہے کہ جس کی عقل ماری گئی، کسی نے جادو کر کے اس کی عقل ماردی، اس لئے تم ایسے شخص کی پیروی کی رہے ہو جس کی عقل ٹھکانے نہیں ہے، مسحور کہہ کر یہاں مجنون مراد ہے۔

کیا نبی پر جادو اثر انداز ہوسکتا ہے؟

باقی یہ مسئلہ کہ کیا نبی کے اوپر جادو ہوسکتا ہے؟ نبی کے اوپر جادو چل سکتا ہے؟ یہ ایک علیحدہ مسئلہ ہے، اور صحیح روایات کے اندر بخاری، مسلم میں موجود ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ پر مدنی زندگی میں جادو کر دیا گیا تھا اور آپ پر جادو اثر انداز ہوا، کیونکہ جادو ایک مخفی تدبیر ہے دوسرے کو نقصان پہنچانے کی، تو جس طرح ظاہری تدبیر نبی کے خلاف چل سکتی ہے کہ کسی کافر نے پتھر مارا اور آپ ﷺ کا دانت ٹوٹ گیا، چہرہ زخمی ہوگیا، کسی نے آپ کے اوپر ایسی چیز ڈالی جس کے ساتھ ظاہری طور پر آلودگی ہوگئی، کانٹے بچھا دیے جو آپ کے پاؤں میں چبھ گئے اور باعث تکلیف ہوگئے، حتیٰ کہ نبی دوسرے کے ہاتھ سے قتل بھی ہوسکتا ہے، جس طرح سے قرآنِ کریم میں ہے يَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ (آل عمران:۲۱)، جیسے ظاہری تدبیریں ہیں کہ دشمن اگر اختیار کرتا ہے تو نقصان پہنچ جاتا ہے اسی طرح سے جادو ایک باطنی تدبیر ہے کہ اس کے اختیار کرنے کے ساتھ بھی نقصان پہنچایا جاسکتا ہے، یہ کسی دلیل شرعی کے خلاف نہیں ہے، لیکن جادو کے ساتھ ایسا اثر نہیں ڈالا جاسکتا کہ مقصدِ نبوّت میں فرق آجائے، تعلیم خلط ملط ہوجائے، حق اور باطل کے اندر التباس پیدا ہوجائے، اس طرح سے نہیں کیا جاسکتا، تو سرورِ کائنات ﷺ پر جو جادو کیا گیا تھا اس میں آپ کی صحت پر اثر پڑ گیا تھا کہ آپ بیمار ہوگئے تھے، بسا اوقات ایک کام کرنے کا خیال ہوتا لیکن اس کام کے کرنے پر قادر نہ ہوتے، کام نہ کیا ہوتا ایسا خیال آتا کہ جیسے کرلیا ہے، اس قسم کے خیالات کے اندر تصرف ہوگیا تھا، اور سیّد انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ''فیض الباری'' کے اندر اس مضمون کو بہت وضاحت کے ساتھ لکھا ہے متعدّد مقام میں، وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے اوپر جو جادو کیا گیا تھا اس کا اتنا سا اثر تھا کہ آپ بیویوں کے پاس جانے پر قادر نہیں رہے تھے، وہ کہتے ہیں کہ جو آج کل کے لوگوں میں چلتا ہے، جس کو مرد باندھ دینا کہتے ہیں، مرد کو باندھ دیا، اس قسم کا وہ جادو کر دیتے ہیں جس میں مرد کو باندھ دیا جاتا ہے، پہلے انسان سمجھتا ہے کہ میرے اندر خواہش ہے میں بیوی کے پاس جاؤں، لیکن جب بیوی کے پاس جاتا ہے تو خواہش ختم ہوجاتی ہے، بیوی کے پاس جانے پر قادر نہیں رہتا، تو حضرت نے ان روایات سے مختلف قرینے تلاش کر کے یہ مضمون ذکر کیا ہے کہ یہ وہی جادو تھا جس کو مرد باندھ دینا کہتے ہیں، تو یہ ایک جسمانی بیماری ہے جو حضور ﷺ کے اوپر اثر انداز ہوگئی تھی، آپ خیال کرتے، بیویوں کی طرف متوجہ ہوتے، دل میں خواہش پیدا ہوتی، لیکن عین موقع پر صحبت جواب دے دیتی تھی، باقی ایسا جادو جس کے ساتھ حق اور باطل کو خلط کر دیا جائے، جس کے ساتھ وحی مخلوط ہوجائے، یا نبوت کے دل اور دماغ پر اس قسم کا تصرف ہوجائے، ایسا جادو نبی کے اوپر نہیں ہوسکتا، کہ اللہ تبارک

وتعالیٰ کی طرف سے ہدایت کو ضلالت کی طرف یوں خلط کرنے کی کسی کو قدرت نہیں دی جا سکتی۔ تو بہر حال اس قسم کا جادو ہو سکتا ہے، دونوں باتوں میں چونکہ فرق ہے، مشرکین جو رجل مسحور کہتے تھے تو یہ کہہ کے وہ قرار دیتے تھے بے عقل آدمی، جس کی عقل ماری گئی اور جو مجنون ہے، مشرکین کا مطلب یہ تھا، اور جو رسول اللہ ﷺ پر جادو ہوا، جس کے ازالے کے لئے آخری دونوں سورتیں اُتریں قل اعوذ برب الفلق، قل اعوذ برب الناس، اس کا تعلق ایک بدنی بیماری کے ساتھ ہے، اس کا ذہن اور دل و دماغ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے، اس لئے دونوں باتوں میں کوئی کسی قسم کا تعارض نہیں، دونوں باتیں اپنی جگہ ٹھیک ہیں، کہ یہاں وہ رجل مسحور جو کہتے تھے یہ منفی ہے، آپ رجل مسحور نہیں تھے جس قسم کی بات (مراد لے کر) وہ کہتے تھے، اور وہاں (احادیث میں) ذکر ہو گیا کہ آپ کے اوپر جادو کا اثر ہوا ہے تو وہ بات بھی اپنی جگہ صحیح ہے، ان دونوں کے درمیان میں کوئی تعارض نہیں۔

مذکورہ تفصیل کی غرض منکرینِ حدیث کے شبہ کی تردید ہے

یہ بات میں آپ کی خدمت میں اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ جو منکرینِ حدیث ہیں وہ چونکہ مختلف بہانوں کے ساتھ قرآن اور حدیث کے درمیان میں تعارض پیدا کرتے ہیں، اور تعارض پیدا کرنے کے بعد حدیث کی وقعت ختم کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ دیکھو! فلاں حدیث قرآنِ کریم کی فلاں آیت کے خلاف ہے لہٰذا غلط، فلاں حدیث فلاں آیت کے خلاف ہے لہٰذا غلط، تو ان باتوں کے بارے میں بھی وہ کہتے ہیں کہ اگر حدیث کی یہ روایتیں جو کہ بخاری اور مسلم میں آئی ہوئی ہیں صحیح مان لی جائیں کہ حضور ﷺ پر جادو ہوا تھا تو پھر تو مشرکوں کی یہ بات صحیح نکلتی ہے کہ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا، کہ آپ تو پھر رجل مسحور کا مصداق ہو گئے، مشرکین جو لوگوں کو کہتے تھے کہ تم رجل مسحور کے پیچھے لگے ہوئے ہو تو پھر تو مشرکین کی یہ بات صحیح ہو جائے گی، اور یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ رجل مسحور نہیں تھے، اور وہ روایتیں کہتی ہیں کہ جادو ہو گیا تھا اور آپ رجل مسحور بن گئے تھے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلم اور بخاری کی یہ سب روایتیں جھوٹی ہیں، یوں کر کے وہ احادیث کی وقعت کو ختم کرتے ہیں، حالانکہ دونوں کا مطلب بالکل علیحدہ علیحدہ ہے، مفہوم علیحدہ علیحدہ ہے، وقت علیحدہ علیحدہ ہے، یہ بات مکہ معظمہ کی ہے، اور مکہ معظمہ میں مشرک لوگوں سے کہا کرتے تھے کہ یہ تو دیوانہ ہے، اس کی تو عقل ماری گئی، کسی نے جادو کر دیا جس کی بنا پر یہ اس قسم کی باتیں کرتا ہے جو ہماری عقل میں نہیں آتیں، اور یہ یہ رجل مسحور کہنا ان کا اتہام تھا، تہمت تھی، حضور ﷺ مجنون نہیں تھے، اور جادو کے ذریعے سے بھی آپ کی عقل پر کوئی اثر نہیں تھا، اور مدینہ منورہ میں جو سحر ہوا اس کا تعلق صرف بدنی بیماری کے ساتھ ہے، اور اُس کا اس قسم کے خیالات کے ساتھ، دل اور دماغ کے ساتھ کوئی کسی قسم کا تعلق نہیں تھا، وہ جادو مان لیا جائے تو اس سے مشرکین کی بات کوئی سچی ثابت نہیں ہوتی، وہ روایتیں بھی اپنی جگہ صحیح ہیں، اور مشرکین جو رجل مسحور کہتے تھے یہ بات غلط تھی جیسے قرآنِ کریم میں یہاں آیا، دونوں کے درمیان میں تعارض پیدا کر کے روایاتِ حدیث کی تغلیط کرنا یا ان کو جھوٹا قرار دینا یہ بے ایمانی ہے، یہ کوئی علمی تحقیق نہیں ہے، اس لئے یہ وضاحت میں آپ کی خدمت میں عرض کر رہا ہوں کہ یہاں رجل مسحور کا کیا مطلب ہے، اور سرورِ کائنات ﷺ پر جو جادو ہوا تھا اس

کی کیا کیفیت تھی اور اس کا کیا مطلب تھا۔ ''نہیں پیروی کرتے تم مگر ایسے آدمی کی جس کے اوپر جادو کیا ہوا ہے'' یعنی جس کی عقل جادو کی وجہ سے خراب ہوگئی، مسحور کہہ کر یہاں مجنون مراد ہے۔

مشرکینِ مکہ کے بھٹکنے کی وجہ

اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ: دیکھ تو، یہ تیرے لئے کیسی مثالیں بیان کرتے ہیں، کیسے کیسے فقرے آپ کے اوپر چست کرتے ہیں، کس قسم کے لفظ آپ کے اوپر منطبق کرتے ہیں، کبھی کہتے ہیں مجنون، کبھی کہتے ہیں مسحور، کبھی کہتے ہیں شاعر، اور کبھی کہتے ہیں کاہن، کبھی کچھ کہتے ہیں، کبھی کچھ کہتے ہیں، دیکھ تو، کیسے کیسے فقرے تیرے اوپر چست کرتے ہیں، کیسی کیسی مثالیں تیرے لئے بیان کرتے ہیں، فَضَلُّوْا: پس یہ لوگ بھٹکے پھر رہے ہیں، فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا: یہ لوگ راستہ پانے کی طاقت نہیں رکھتے۔ ایک تو بھٹکنے کی وجہ یہ ہوگئی کہ جب نبی کے متعلق اعتقاد ہی نہیں کرتے تو یہ راستہ کہاں سے پالیں، اور ایک مطلب یہ بھی ہے کہ یہ مثالیں دینے میں بھی بھٹکے پھر رہے ہیں، ان کو کوئی صحیح مثال نہیں ملتی جو کہ آپ کے اوپر منطبق کر دیں، جو منطبق کرتے ہیں آپ کا حال اس کی تکذیب کر دیتا ہے، پھر کوئی اور تجویز کرتے ہیں، وہ بھی صحیح منطبق نہیں ہوتی، پھر کوئی اور نکالتے ہیں، تو یہ بھٹکے پھرتے ہیں، ان کو پوری مثال چسپاں کرنے کے لئے بھی کوئی صحیح راستہ نہیں ملتا، کبھی کچھ کہہ دیتے ہیں، کبھی کچھ کہہ دیتے ہیں، مجنون ہے تو ساحر کیسے؟ مسحور ہے تو کاہن کیسے؟ اسی طرح سے جو مثالیں وہ دیتے ہیں وہ بھی منطبق نہیں ہوتیں اور خود ان کو بھی قرار نہیں ہے، کبھی کچھ کہتے ہیں، کبھی کچھ کہتے ہیں۔ ''پس وہ بھٹکے پھرتے ہیں'' فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا: یہ راستہ پانے کی طاقت نہیں رکھتے، اس راستے سے اگر ہدایت مراد ہو تو اس لیے طاقت نہیں رکھتے کہ نبی کے متعلق جب ان کا عقیدہ ہی صحیح نہیں، اس کی عظمت کو محسوس نہیں کرتے تو یہ سیدھا راستہ کس طرح سے پاسکتے ہیں۔

''بعث بعد الموت'' پر عقلی ونقلی دلائل

وَقَالُوْٓا: پیچھے آیا تھا لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ: یہ آخرت پر ایمان نہیں لاتے، جب آخرت پر ایمان نہیں لاتے تو پھر نبی پر طنز کرتے ہوئے وہ اس قسم کی باتیں کہتے ہیں، وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا: اور یہ کہتے ہیں کہ کیا جس وقت ہم ہڈیاں ہوجائیں گے اور چورا چورا ہوجائیں گے۔ رُفات: چورا چورا۔ ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا: کیا البتہ ہم اٹھائے ہوئے ہوں گے نئے سرے سے پیدا کر کے؟ نئے سرے سے پیدا کر کے ہم اٹھائے ہوئے ہوں گے؟ تو گویا کہ ان کے نزدیک عظام اور عظام کا بھی چورا ہوجانا یہ ایک ایسی چیز ہے کہ جس میں اللہ تعالیٰ کو حیات پیدا کرنے پر یہ قادر نہیں سمجھتے، یہ ہے ان کے انکار کا حاصل۔ تو'' آپ انہیں کہہ دیجئے کہ تم پتھر بن جاؤ یا لوہا ہو جاؤ یا کوئی اور مخلوق بن جاؤ اس چیز میں سے جو تمہارے سینوں کے اندر بہت بڑی ہے'' بہت بڑی اس اعتبار سے کہ وہ حیات کو قبول نہیں کرسکتی، ہڈیوں اور چورے کا حیات کو قبول کر لینا اتنا بعید نہیں کیونکہ ایک دفعہ وہ محل حیات رہ چکے ہیں، تم پتھر بن جاؤ جو بظاہر حیات قبول کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، یا لوہا اور اسٹیل بن جاؤ جس میں تم سمجھتے ہو کہ زندگی پیدا

ہونا ناممکن ہے، یا کوئی اور سخت مخلوق بن جاؤ جو اس اعتبار سے بہت بڑی ہو کہ اس کی حیات سے کوئی مناسبت نہیں ہے، لیکن پھر بھی اللہ تعالیٰ تمہیں پیدا کر کے دوبارہ لے آئے گا اور تمہارے اندر حیات پیدا کر دے گا، زندگی تمہیں دے دے گا، اللہ تعالیٰ پتھر میں حیات ڈال سکتا ہے، لوہے میں ڈال سکتا ہے اور کوئی سخت سے سخت چیز جو تم تجویز کر لو اس میں بھی ڈال سکتا ہے، تو ہڈیوں کے اندر حیات ڈالنے کی کون سی بات ہے، یہ تو پہلے بھی محل حیات رہ چکی ہیں، ان کے اندر تو زندگی پہلے بھی رہ چکی ہے، تو دوبارہ ان کو بنانا اور زندہ کرنا کوئی مشکل نہیں ہے۔ جب یہ بات آپ کہیں گے تو فَسَيَقُوْلُوْنَ مَنْ يُّعِيْدُنَا: پھر وہ سوال کریں گے، پوچھیں گے کہ ہمیں کون لوٹائے گا؟ پہلی حالت کی طرف دوبارہ ہمیں کون لے آئے گا؟ قُلِ الَّذِيْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ: تو آپ جواب دے دیجئے کہ وہی جس نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا وہی تمہارا اعادہ کرے گا، پہلی مرتبہ پیدا کرنے کو اگر تم مانتے ہو تو اعادہ کیا مشکل ہے، فَسَيُنْغِضُوْنَ اِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هُوَ۔ اَنْغَضَ: حرکت دینا۔ اِدھر دیکھو میری طرف، جس وقت کوئی شخص اعتراض کرتا ہے دوسرے کا استہزا اُڑاتا ہوا، تو اس کا انداز یہ ہوا کرتا ہے، ''اچھا جی! پھر یہ وقت کب آئے گا؟'' سر بھی ساتھ ہلاتا ہے، سر ساتھ ہلاتا ہلاتا پھر اعتراض بھی کرتا ہے، تو یہاں وہی کیفیت ہے کہ جب آپ ان کو یہ جواب دے دیں گے کہ تمہیں وہی لوٹائے گا جس نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا تو عنقریب وہ آپ کی طرف سر ہلائیں گے، وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هُوَ: اور کہیں گے کہ کب ہوگا یہ لوٹانا؟ یہ وقت کب آئے گا؟ سر ہلا ہلا کے آپ کے سامنے یہ سوال کریں گے، سر کو حرکت دیں گے اور سر کو حرکت دیتے ہوئے یہ سوال کریں گے، ''عنقریب مٹکائیں یہ آپ کی طرف اپنے سروں کو، حرکت دیں گے آپ کی طرف اپنے سروں کو'' جیسے کہ انداز ہوتا ہے کسی استہزا کرنے والے کا اور دوسرے کے مذاق اُڑانے والے کا، کہ انسان سر بھی ساتھ ساتھ ہلاتا ہے، سر ہلانے کے ساتھ وہ سوال بھی کرتا ہے، ''اچھا جی! یہ وقت پھر کب آئے گا؟'' اس طرح سر ہلا ہلا کے سوال کریں گے۔ آپ کہہ دیجئے کہ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَرِيْبًا: ہوسکتا ہے کہ قریب ہی ہو، جب اس وقت کا پتا نہیں تو ہر وقت یہ احتمال ہے کہ شاید ابھی آجائے، اور پھر ابھی آجائے یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے، یعنی آنے والی چیز قریب ہی ہوتی ہے چاہے بظاہر اس میں کتنا ہی وقت کیوں نہ ہو، جس طرح سے آپ کہا کرتے ہیں ''كُلُّ مَا اٰتٍ فَهُوَ قَرِيْبٌ''، لیکن اس کو چھوڑیے......!، ایک تو قیامت کبریٰ ہے اور ایک قیامت صغریٰ ہے، ایک عالمی قیامت ہے اور ایک شخصی قیامت ہے، شخصی قیامت تو تمہارے سر پر ہر وقت کھڑی ہے، مَنْ مَاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهٗ: جو مر گیا اس کی قیامت تو آگئی، تو جس طرح سے موت ایک یقینی چیز ہے لیکن وقت کسی کو معلوم نہیں کہ کب آئے گی، وقت معلوم نہ ہونے سے ایک حقیقت کا انکار نہیں کیا جاسکتا، آپ جانتے ہیں کہ موت یقیناً آئے گی لیکن وقت نہیں بتایا جاسکتا، اب اگر کوئی احمق کہے کہ بتاؤ میں نے کب مرنا ہے، اور اگر نہ بتایا جاسکے کہ کب مرنا ہے، تو وہ کہے کہ مجھے موت ہی نہیں آئے گی، یہ بات ہی غلط ہے، تو جیسے یہ حماقت ہے اسی طرح سے قیامت کے متعلق تم حماقت کرتے ہو کہ اگر وقت نہیں بتایا جاسکتا تو تم کہتے ہو کہ آئے گی ہی نہیں، جس طرح سے اللہ تعالیٰ نے شخصی موت کا وقت مبہم رکھا ہے، اس کی تعیین نہیں بتائی، یہ اس کی حکمت کا تقاضا ہے، اسی طرح سے عالمی موت کا وقت بھی اللہ نے مبہم رکھا ہے، اس کی تعیین نہیں بتائی، یہ اس کی حکمت کا تقاضا ہے، لیکن جس طرح سے شخصی موت کے وقت کا مبہم ہونا اس بات کی دلیل نہیں کہ موت آئے گی ہی

نہیں، اسی طرح سے عالمی موت کے وقت کے مبہم رکھنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عالمی موت آئے گی ہی نہیں، جس طرح شخصی طور پر موت سر پر کھڑی ہے اسی طرح سے اس دنیا کے اوپر قیامت بھی سر پر کھڑی ہے، پتا نہیں کب آجائے، تو اس کو قریب ہی سمجھنا چاہیے، یہ کوئی دُور نہیں ہے، اور جس وقت اپنی موت کا شکار ہو جاؤ گے تمہیں سب کچھ قیامت کے متعلق بھی پتا چل جائے گا، کہ کیسے جان نکلتی ہے اور قبر میں پھر کیسے دوبارہ کیا جاتا ہے، کس طرح سے حساب کتاب ہوگا، سب نمونے سامنے آجائیں گے۔ ''آپ کہہ دیجئے کہ ہوسکتا ہے یہ قریب ہی ہو۔''

روزِ قیامت ''مستہزئین'' کا حال

یَوْمَ یَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِیْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ: آج تو تم اس قسم کے اِستہزا کرتے ہو، انکار کرتے ہو، جس دن وہ اللہ تمہیں بلائے گا کہ قبروں سے نکل کے آجاؤ، جس دن اللہ تعالیٰ تمہیں دعوت دے گا، فَتَسْتَجِیْبُوْنَ: تم اللہ کی دعوت کو قبول کرو گے، بِحَمْدِهٖ: اس کی تعریف کرتے ہوئے، قبروں سے سبحان اللہ والحمد للہ کہتے ہوئے اٹھو گے، اور یہ کہنا اضطراری ہوگا جس کے اوپر اللہ کی طرف سے کوئی کسی قسم کا انعام نہیں ہوگا بخشش نہیں ہوگی، اس وقت یہ اقرار کرتے ہوئے اٹھو گے کہ واقعی اللہ کے اندر سب صفاتِ حمد پائی جاتی ہیں، سب صفاتِ کمال پائی جاتی ہیں، کوئی نقص کی صفت نہیں ہے، ''پھر تم قبول کرو گے اللہ کی اس دُعا کو، اللہ کے اس پکارنے کو اللہ کی تعریف کرتے ہوئے'' وَتَظُنُّوْنَ: اور تم اس وقت یہ سمجھو گے جب قبروں سے اٹھو گے، اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِیْلًا: کہ تم نہیں ٹھہرے مگر بہت تھوڑا وقت، اس وقت جس کو تم کہتے ہو کہ ہماری عمریں گزر رہی ہیں، اور اپنے آپ کو سمجھتے ہو کہ بڑا طویل زمانہ تم زندہ ہو، تمہیں ایسے ہی لگے گا جیسے ایک ہی لمحہ میں سب کچھ ہو گیا۔ ''اور سمجھو گے تم کہ نہیں ٹھہرے تم مگر تھوڑا سا وقت۔''

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

وَقُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ۭ اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَنْزَغُ بَیْنَهُمْ ۭ اِنَّ الشَّیْطٰنَ كَانَ

اور آپ میرے بندوں سے کہہ دیجئے، کہیں وہی بات جو بہتر ہے، بے شک شیطان فساد ڈالتا ہے ان کے درمیان، بے شک شیطان

لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِیْنًا ۝۵۳ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِكُمْ ۭ اِنْ یَّشَاْ یَرْحَمْكُمْ اَوْ اِنْ یَّشَاْ یُعَذِّبْكُمْ ۭ

انسان کے لئے کھلا دشمن ہے ۝۵۳ تمہارا ربّ خوب جانتا ہے تمہیں، اگر چاہے تو تم سب پر رحم کرے، یا اگر چاہے تو تمہیں عذاب دے دے،

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَیْهِمْ وَكِیْلًا ۝۵۴ وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِمَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ

ہم نے آپ تک کو ان کے اوپر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا ۝۵۴ اور تیرا ربّ خوب جانتا ہے ان کو جو آسمانوں میں ہیں اور زمین میں ہیں،

وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِیّٖنَ عَلٰی بَعْضٍ وَّاٰتَیْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ﴿۵۵﴾ قُلِ ادْعُوا الَّذِیْنَ

البتہ تحقیق ہم نے فضیلت دی ہے بعض نبیوں کو بعض پر، اور ہم نے داؤد علیہ السلام کو زبور دی ﴿۵۵﴾ آپ کہہ دیجئے کہ پکارو تم ان لوگوں کو

زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا یَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِیْلًا ﴿۵۶﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ

جن کو تم اللہ کے علاوہ اپنے کارساز سمجھتے ہو، نہیں اختیار رکھتے وہ تکلیف کو ہٹانے کا نہ بدلنے کا ﴿۵۶﴾ جن لوگوں کو

یَدْعُوْنَ یَبْتَغُوْنَ اِلٰی رَبِّهِمُ الْوَسِیْلَةَ اَیُّهُمْ اَقْرَبُ وَیَرْجُوْنَ

یہ پکارتے ہیں وہ لوگ طلب کرتے ہیں اپنے رب کی طرف قرب، کہ ان میں سے کون زیادہ اقرب ہے، اور وہ اُمید رکھتے ہیں

رَحْمَتَهٗ وَیَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ؕ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا ﴿۵۷﴾ وَاِنْ مِّنْ قَرْیَةٍ اِلَّا

اللہ کی رحمت کی، اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں، بے شک تیرا رب کا عذاب ڈرنے کے قابل ہے ﴿۵۷﴾ کوئی بستی نہیں مگر

نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ یَوْمِ الْقِیٰمَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِیْدًا ؕ كَانَ ذٰلِكَ فِی الْكِتٰبِ

ہم اس کو ہلاک کرنے والے ہیں ہیں قیامت کے دن سے پہلے یا اس کو عذاب دینے والے ہیں سخت عذاب، یہ بات کتاب میں

مَسْطُوْرًا ﴿۵۸﴾ وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰیٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ؕ

لکھی ہوئی ہے ﴿۵۸﴾ ہمیں آیات (منہ مانگی نشانیاں) بھیجنے سے کسی نے نہیں روکا سوائے اس بات کے کہ ان آیات کو پہلے لوگوں نے جھٹلایا،

وَاٰتَیْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ؕ وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰیٰتِ اِلَّا تَخْوِیْفًا ﴿۵۹﴾

ہم نے ثمود کا ناقہ دی تھی جو ایک واضح نشانی تھی، انہوں نے اس ناقہ پر ظلم کیا، اور نہیں بھیجا کرتے ہم نشانیاں مگر ڈرانے کے لئے ہی ﴿۵۹﴾

وَاِذْ قُلْنَا لَكَ اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ ؕ وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْیَا الَّتِیْٓ

اور یاد کیجئے کہ جس وقت ہم نے تجھے کہا کہ بے شک تیرا رب سب لوگوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے، اور نہیں بنایا ہم نے اُس نظارے کو جو

اَرَیْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِی الْقُرْاٰنِ ؕ

ہم نے آپ کو دکھایا تھا مگر لوگوں کے لئے گمراہی کا باعث، اور وہ درخت جس کی بُرائی بیان کی گئی ہے قرآنِ کریم میں،

وَنُخَوِّفُهُمْ ۙ فَمَا یَزِیْدُهُمْ اِلَّا طُغْیَانًا كَبِیْرًا ﴿۶۰﴾

اور ہم ان کو ڈراتے ہیں، اور ہماری تخویف نہیں بڑھاتی ان کو مگر بڑی سرکشی ﴿۶۰﴾

تفسیر

ماقبل سے ربط

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ پچھلی آیات میں ردِّ شرک کے ساتھ ساتھ اثباتِ معاد، اور معاد کے بارے میں ان کے اشکالات کے جواب ذکر کیے گئے تھے، اور یہ صورت آپس میں ایک قسم کی مجادلہ اور مباحثہ کی ہے، ان کی طرف سے اعتراضات اس طرح سے ہیں جیسے کسی کا مذاق اُڑایا جاتا ہے، استہزا کیا جاتا ہے، تو مقابلے میں جواب کی کوشش کی گئی، ایسے موقع پر اندیشہ ہوتا ہے کہ حق کی تبلیغ کرنے والے، حق کو پہنچانے والے جوش میں نہ آجائیں، غصے میں نہ آجائیں، اور مخالفین کی اوچھی حرکتوں کے مقابلے میں صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑ بیٹھیں، اس سے نتیجۃً نقصان ہوتا ہے، اس لئے اللہ تبارک وتعالیٰ آگے تبلیغ کے معاملے میں ترکِ خشونت کی تعلیم دیتے ہیں کہ گفتگو میں اور آپس میں بحث مباحثہ کرتے ہوئے نرمی اختیار کریں، سخت بات زبان سے نہ کہیں، کیونکہ اس سے پھر زیادہ بگاڑ ہوتا ہے، جس سے پھر اصلاح کی توقع نہیں ہوتی، سورۂ نحل کے آخر میں بھی اسی قسم کی تعلیم دی گئی تھی اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ، اور آگے لفظ آئے تھے وَجَادِلْہُمْ بِالَّتِیْ ہِیَ اَحْسَنُ، تو یہ آیت بھی اسی قسم کے مفہوم پر مشتمل ہے۔

دعوت وتبلیغ میں نرم گفتگو کی ترغیب

وَقُلْ لِّعِبَادِیْ: اور آپ میرے بندوں سے کہہ دیجئے یَقُوْلُوا الَّتِیْ ہِیَ اَحْسَنُ: کہیں وہی بات جو بہتر ہے، بہتر بات کہیں، اچھی بات کہیں، اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَنْزَغُ بَیْنَہُمْ: بے شک شیطان انسانوں کے درمیان فساد ڈالتا ہے، ایک دوسرے کے خلاف مشتعل کرکے تیز باتیں کہلوا کے آپس میں فساد کرواتا ہے، ''بے شک شیطان فساد ڈالتا ہے ان کے درمیان، بے شک شیطان انسان کے لئے کھلا دشمن ہے۔'' رَبُّکُمْ اَعْلَمُ بِکُمْ: تمہارا رب خوب جانتا ہے تمہیں، تمہارے کیا حالات ہیں، موافقین کے مخالفین کے جیسے بھی ہیں سب کے حالات کو جانتا ہے، کُمْ کا خطاب مجموعۂ انسان کے اعتبار سے ہوگیا ''تمہارا رب تمہارے حالات کو خوب جانتا ہے'' ''اگر چاہے وہ تم سب پر رحم کرے'' اور رحم کا تقاضا ہے کہ سب کو سیدھے راستہ پر چلادے، سب کو ہدایت دے دے، اَوْ اِنْ یَّشَاْ یُعَذِّبْکُمْ: یا اگر چاہے تو تمہیں عذاب دے دے، یعنی سب کو ہدایت سے محروم کردے، اس کی اپنی مشیت ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے جب اختیار دے کے انسان کو چھوڑا ہے تو کوئی اچھا ہوگا، کوئی برا ہوگا، کوئی اچھائی اختیار کرے گا، کوئی بُرائی اختیار کرے گا، تو اس لئے زیادہ سختی کرنے کی ضرورت نہیں، ''ہم نے آپ کو ان پر کوئی وکیل بنا کر نہیں بھیجا'' کہ اگر یہ سیدھے راستے پر نہ آئے تو آپ سے پرسش ہو کہ یہ سیدھے راستے پر کیوں نہیں آئے، انہوں نے ہدایت کو حاصل کیوں نہیں کیا، تو جب آپ کے ذمے صرف یہ لگایا گیا ہے کہ احکام کو پہنچادیں تو پھر اس میں خشونت، درشتی اور سختی اختیار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ عَلَیْہِمْ وَکِیْلًا: اَرْسَلْنٰکَ یہاں خطاب حضور ﷺ کو کیا گیا، تو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ''بیان القرآن'' میں ترجمے کے اندر اس کی حکمت کو واضح

فرمایا''ہم نے آپ تک کو ان کے اوپر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا، متعین کر کے نہیں بھیجا'' باوجود اس بات کے کہ آپ رسول ہیں، تو رسول ہونے کے باوجود جب آپ کو بھی ذمہ دار نہیں ٹھہرایا گیا تو باقی مسلمانوں کی کیا ذمہ داری ہے کہ یہ (کافر) سیدھے راستے پر ضرور آئیں، یعنی پیچھے خطاب تو عبادی کے لفظ سے عام لوگوں کو کیا گیا کہ نرم بات کہیں، میرے بندوں کو کہہ دو کہ بحث مباحثے میں، تبلیغ میں اچھے انداز کے ساتھ بات کیا کریں، اور آگے یہ کہا گیا کہ آپ کو ہم نے اِن پر وکیل بنا کر نہیں بھیجا، آپ ان پر کوئی داروغہ نہیں ہیں، متعین نہیں ہیں، آپ کی ذمہ داری نہیں، تو پہلے مجموعے کے متعلق بات تھی اب مفرد کے متعلق آگئی، گویا کہ اس میں یہ آگیا کہ جب آپ باوجود رسول ہونے کے ذمہ دار نہیں تو جو رسول بھی نہیں ہیں، جن کا براہِ راست یہ منصب نہیں، تو ان سے کیا پوچھا جائے گا کہ یہ کیوں نہیں مانے؟ اس لئے سختی کرنے کی، خشونت اختیار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''ہم نے آپ تک کو ان پر وکیل بنا کر نہیں بھیجا'' آپ تک کو، یعنی باقیوں کا تو کیا کہنا، آپ بھی ذمہ دار نہیں ہیں۔

سَرورِ کائنات ﷺ کی نبوّت اور فضیلت کا بیان

وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِمَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: اور تیرا ربّ خوب جانتا ہے ان کو جو آسمانوں میں ہیں اور زمین میں ہیں، وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ: البتہ تحقیق ہم نے فضیلت دی ہے بعض نبیوں کو بعض پر، یہ مضمون پہلے آپ کے سامنے تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ کے تحت گزرا ہے، نبوّت کے اندر سب نبی آپس میں برابر ہیں، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے مختلف وجوہ سے بعض نبیوں کو بعض پر فضیلت دی، وَّاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا: اور ہم نے داوٗد علیہ السلام کو زبور دی، یہ بھی ان کے لئے ایک وجہ فضیلت ہے خصوصیت کے ساتھ داوٗد علیہ السلام کی زبور کا ذِکر اس لئے آیا کہ حضور ﷺ اور آپ کی اُمت کا اس میں بہت واضح الفاظ میں ذکر ہے جیسے کہ سورۂ انبیاء کے آخر میں آئے گا وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ۔ تو اِس آیت میں سرورِ کائنات ﷺ کی نبوّت اور آپ کی فضیلت کی طرف اشارہ کر دیا۔

رَدِّ شرک

آگے پھر رَدِّ شرک کا مضمون ہے قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ: آپ کہہ دیجئے کہ بُلاؤ تم، پکارو تم ان لوگوں کو جن کو تم اللہ کے علاوہ اپنے کارساز سمجھتے ہو، اللہ کے علاوہ جن کو تم اپنے کارساز سمجھتے ہو انہیں پکارو، فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا: نہیں اختیار رکھتے وہ تم سے تکلیف کو ہٹانے کا نہ بدلنے کا، کشف کا معنی تو ہو گیا کہ بالکل ہی زائل کر دیں ہٹا دیں، تحویل کا مطلب یہ ہے کہ سختی سے نرمی کی طرف ہی تبدیل کر دیں، بڑی مصیبت کو چھوٹی کی طرف ہی بدل دیں، مطلب یہ ہے کہ کچھ بھی نہیں کر سکتے، نہ بالکل دُور ہٹا سکتے ہیں، نہ اس میں کوئی کسی قسم کی تبدیلی لا سکتے ہیں۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ: جن لوگوں کو یہ پکارتے ہیں وہ لوگ طلب کرتے ہیں اپنے ربّ کی طرف قرب، وسیلہ کہتے ہیں ذریعہ کو، یعنی قرب کا ذریعہ، ''طلب کرتے ہیں اپنے ربّ کی طرف قرب'' اَيُّهُمْ اَقْرَبُ: کہ ان میں سے کون زیادہ اقرب ہے، وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ: اور وہ امید رکھتے ہیں اللہ کی رحمت کی، وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ: اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں، اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا: بے شک تیرے ربّ کا عذاب محذور ہے،

یعنی ڈرنے کے قابل ہے، اس سے ڈرا جانا چاہیے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ مشرکین بعض جنات کو معبود اور فریادرس قرار دے کے پکارا کرتے تھے اور وہ جن مسلمان ہو گئے، جب وہ جن مسلمان ہو گئے تو وہ تو خود اللہ کے قرب کے متلاشی ہیں اور وہ اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ کون زیادہ سے زیادہ اللہ کا قرب تلاش کر لے، کون زیادہ سے زیادہ اللہ کے قریب ہو جائے، اور وہ اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں، اللہ کے عذاب سے ڈرتے ہیں، تو ان جنات کا تعلق جب اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندگی کا ہو گیا تو یہ بدھو کس طرح سے ان کو معبود قرار دے کے ان کے سامنے فریادیں کر رہے ہیں، جن کو یہ پکار رہے ہیں وہ تو خود اللہ کے قرب کے متلاشی ہیں کہ ہمیں کوئی ذریعہ ملے تو ہم اللہ کے مقرب بن جائیں، اور وہ کوشش کرتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ قرب کون حاصل کرتا ہے۔ یَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ یہ ایمان کا کمال ہے، الایمانُ بینَ الخوفِ والرَّجاءِ: ایمان خوف ورجاء کے درمیان میں ہوتا ہے، کہ اللہ تعالیٰ سے رَجاء بھی رکھنی چاہیے، اُمید بھی رکھنی چاہیے کہ رحم فرمائے گا، اور ڈرتے رہنا چاہیے، جس کو یہ دو کیفیتیں حاصل ہو جائیں وہ نہ تو کبھی اللہ کی رحمت سے مایوس ہوتا ہے نہ کبھی گناہوں کے اُوپر دلیر ہوتا ہے، اور ایمان کا کمال یہی ہے کہ اللہ سے رحمت کی اُمید بھی رکھو اور اللہ کے عذاب سے ڈرو بھی۔ تو مطلب یہ ہوا کہ وہ تو مؤمن بن گئے، تو جب وہ ایمان لے آئے اور اللہ کے ساتھ انہوں نے بندگی کا تعلق لگا لیا لیکن یہ اسی طرح سے ان کو معبود اور شریک قرار دے کے پکارتے چلے جا رہے ہیں۔ اور اگر اس کا مصداق فرشتوں کو بنا لیا جائے تو بھی بات صحیح ہے، کیونکہ فرشتوں کو بھی وہ پکارتے تھے، فرشتے تو ہیں ہی اللہ کو پکارنے والے، اللہ کا قرب تلاش کرنے والے، اللہ کی رحمت کے اُمیدوار اور اس کے عذاب سے ڈرنے والے، مطلب یہ ہے کہ مشرک اُن کو سمجھتے ہیں کہ اللہ کے شریک ہیں حالانکہ وہ سارے کے سارے اللہ کے ساتھ عبدیت کا تعلق رکھتے ہیں، اور انبیاء و اولیاء کا بھی یہی حال ہوتا ہے کہ وہ تو خود اللہ تعالیٰ کے ہاں قرب کے متلاشی ہیں، اللہ کا زیادہ سے زیادہ قرب چاہتے ہیں، اس کی رحمت کے اُمیدوار ہیں، اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں، تو ایسے لوگوں کو اللہ کا شریک کیسے ٹھہرایا جا سکتا ہے۔

کُفّار کو ترہیب

آگے ترہیب ہے کُفّار کو عذاب کے ذکر کرنے کے ساتھ، وَاِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا: کوئی بستی نہیں مگر ہم اس کو ہلاک کرنے والے ہیں قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ: قیامت کے دن سے پہلے، اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِيْدًا: یا اس کو عذاب دینے والے ہیں سخت عذاب، تو پہلے مُهْلِكُوْهَا کے ساتھ جب قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ آ گیا تو مُعَذِّبُوْهَا کا تعلق ہو جائے گا کہ یا اس کو قیامت کے دِن سخت عذاب دینے والے ہیں، كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا: یہ بات کتاب میں لکھی ہوئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کافروں کی جو بھی بستی ہے وہ چھوٹ نہیں سکتی، یا تو اللہ تعالیٰ اس کو دنیا میں ہلاک کریں گے کوئی عذاب بھیج دیں گے، اور اگر اللہ کی کسی حکمت کے تحت دنیا میں اس کو ہلاک نہ بھی کیا گیا اور اس کے اوپر عذاب نہ بھیجا گیا تو قیامت کے دِن سخت عذاب دیں گے، یہ بچ نہیں سکتے، قریۃ سے کافروں کی قریہ مراد ہے، قریۂ کافرہ، قریۂ ظالمہ، یہ گرفت میں ضرور آئے گی چاہے دنیا میں یا آخرت میں، اس لئے اگر کچھ دیر تک عذاب میں اِمہال کر دیا جائے، مہلت دے دی جائے، تاخیر کر دی جائے تو اُن لوگوں کو یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ سزا ہو گی ہی نہیں،

اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے تحت ہر معاملے کو کتاب میں لکھ رکھا ہے، جب وہ وقت آجائے گا اس کے مطابق سزا کا سلسلہ ہوجائے گا، کسی کو قیامت سے پہلے دنیا میں برباد کریں گے، کسی کو قیامت کے دن سخت سزا دیں گے۔

منکرین کو منہ مانگی نشانیاں نہ دِکھانا اللہ کی رحمت کا تقاضا ہے

وَمَا مَنَعَنَاۤ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰیٰتِ: نہیں روکا ہمیں اس بات سے کہ بھیجیں ہم آیات کو، اِلَّاۤ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ: اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ یہ مَنَعَ کا فاعل ہے، ہمیں آیات بھیجنے سے کسی چیز نے نہیں روکا سوائے اس کے کہ ان آیات کو پہلے لوگوں نے جھٹلایا، پہلے لوگوں کا آیات کو جھٹلانا یہ باعث بن گیا کہ ہم اِس وقت ان کی مانگی ہوئی نشانی ان کے سامنے واضح نہیں کرتے، کیونکہ ان کافروں کی اور ضدّیوں کی عادت ہمیں پہلے سے معلوم ہے کہ منہ مانگی نشانی ان کو دکھا دی جائے تو بھی یہ مانتے نہیں ہیں، جب مانتے نہیں ہیں تو پھر اگر اللہ دکھاتا ہے تو اپنی عادت کے مطابق پھر اس قوم کو برباد کردیتا ہے، جو اپنے منہ سے مانگ کر معجزہ دیکھ کر پھر مؤمن نہیں ہوتے وہ باقی نہیں رکھے جاتے، اور اِن کو ابھی ہلاک کرنا اللہ کی حکمت نہیں، اس لئے اِن کو منہ مانگی نشانیاں دکھائی نہیں جاتیں، کیونکہ ہمیں پہلے سے عادت معلوم ہے کہ منہ مانگی نشانیاں دیکھ کر بھی یہ لوگ مانتے نہیں، اور پھر ان سب کو ہلاک کرنا پڑے گا، اور ان کو ہلاک کرنا ابھی حکمت نہیں ہے، جس کی بنا پر ہم ان کی منہ مانگی نشانیاں ان کے سامنے واضح نہیں کرتے۔ آگے كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ کا ایک نمونہ دکھا دیا کہ وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً: ہم نے ثمود کو ناقہ دی تھی جو ایک واضح نشانی تھی، مُبْصِرَةً: جو کہ آنکھیں کھولنے والی تھی، بصیرت کا باعث تھی، فَظَلَمُوْا بِهَا: انہوں نے اس ناقہ پر ظلم کیا، ظَلَمُوْا عَلَيْهَا وَ كَذَّبُوْا بِهَا، یوں بھی (تقدیرِ عبارت میں) ہوسکتا ہے، اس نشانی کو جھٹلایا اور اس کے اوپر ظلم کیا، اس کی حق تلفی کی، وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا: اور نہیں بھیجا کرتے ہم نشانیاں مگر ڈرانے کے لئے ہی، ڈرانے سے وہ آخری ڈرانا مراد ہے جس کے بعد پھر ہلاکت آجاتی ہے، یعنی ہم ان کے اوپر شفقت اور رحمت کرتے ہوئے ان کی منہ مانگی نشانیاں نہیں بھیجتے، ورنہ پچھلی تاریخ کی طرف اگر یہ نظر اٹھا کر دیکھیں تو انہیں معلوم ہوجائے گا کہ جن لوگوں نے نشانیاں مانگی تھیں اور ان کو نشانیاں دے دی گئیں پھر نہ ماننے کی صورت میں وہ بچے نہیں، اور ان پر بھی ہمیں یہی توقع ہے کہ یہ مانیں گے تو نہیں، اس لئے اِن کی منہ مانگی نشانیاں نہیں دی جاتیں تو ان کے اوپر ہماری رحمت کا تقاضا ہے۔

کُفّار کی تکذیب والی عادت پر بطورِ دلیل کے دو واقعات کی طرف اِشارہ

اور تکذیب کی عادت اِن کو بھی ہے، دیکھو! جس وقت بھی اِن کے سامنے کوئی عجیب بات واضح کی جاتی ہے، تو اس میں غور فکر کرکے ماننے کی بجائے اس کو اپنے لیے فتنہ بنا لیتے ہیں، تو آگے دو واقعات کی طرف اشارہ کردیا، ایک تو معراج کا واقعہ، جو سرورِ کائنات ﷺ دکھایا گیا، اور آپ نے جب لوگوں کے سامنے واضح کیا تو وہ اللہ کی قدرت اور آپ کی شان سمجھنے کے مقابلے میں تکذیب پہ تُل گئے، اور اسی طرح سے جس وقت قرآنِ کریم میں شجرۂ زقوم کا ذکر آیا اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِيْۤ اَصْلِ الْجَحِيْمِ (الصافات: ۶۴) کہ یہ درخت جہنم کے اندر پیدا ہوتا ہے، یہ گناہ گاروں کو کھانے کے لئے دیا جائے گا، تو یہ ایک عجیب چیز تھی جو اللہ

نے ان کے سامنے واضح کی تو اس کو بھی انہوں نے تکذیب کا ذریعہ بنایا اور اپنے لیے فتنہ بنالیا، مذاق اُڑانے لگ گئے، کہ آگ میں درخت کیسے، اِدھر کہتے ہو جہنم میں آگ ہے، اِدھر یہ بھی کہتے ہو کہ اس میں درخت ہیں، بھلا آگ میں بھی کبھی درخت ہو سکتے ہیں، تو جب کوئی ایسی چیز ان کے سامنے ذکر کی جاتی ہے جو بظاہر ان کی عقل کے خلاف ہے یا بظاہر ایک عام عادت کے خلاف ہے تو فوراً یہ اس کی تکذیب پہ تُل جاتے ہیں اور اپنے لیے اس کو فتنہ بنالیتے ہیں، تو جب ان کی عادت یہ ہے تو ان کے سامنے (منہ مانگی) نشانیاں کس طرح سے واضح کی جائیں۔ وَاِذْ قُلْنَا لَكَ اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ: اور یاد کیجئے کہ جس وقت ہم نے تجھے کہا کہ بے شک تیرا رَبّ سب لوگوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے، سب لوگ اس کی قدرت میں ہیں، اس کی گرفت میں ہیں، کوئی اس سے باہر نہیں جاسکتا، وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ: اور نہیں بنایا ہم نے اُس رؤیا کو، رؤیا کا لفظ اگرچہ عام طور پر خواب پہ بولا جاتا ہے، (جیسے) اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْيَا تَعْبُرُوْنَ (سورۃ یوسف: ۴۳)، هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ (سورۃ یوسف: ۱۰۰) سورۂ یوسف کے اندر جو لفظ آیا تھا تو اس سے خواب کا واقعہ ہی مراد تھا، لیکن یہ خواب کے واقعہ کے ساتھ خاص نہیں، مطلقاً دیکھی ہوئی چیز کے لئے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے چاہے بیداری میں دیکھی گئی ہو، اس لئے رُؤیا کا مصداق چونکہ عام مفسرین نے یہاں واقعہ معراج کو بنایا ہے اور باجماعِ اُمت وہ بیداری کا واقعہ ہے اس لئے رُؤیا سے یہاں صرف دکھائی ہوئی چیز مراد ہے کہ ہم نے جو چیز آپ کو دکھائی تھی، ہم نے جو نظارہ آپ کو دکھایا تھا، ”نہیں بنایا ہم نے اس نظارے کو جو ہم نے آپ کو دکھایا تھا مگر لوگوں کے لئے فتنہ، مگر لوگوں کے لئے گمراہی کا باعث۔“ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ: اور وہ درخت جس کی بُرائی بیان کی گئی ہے قرآنِ کریم میں، ملعونہ یہ مبارکہ کے مقابلے میں ہے، ایک شجرہ مبارکہ ہوتا ہے جس کا ہر ہر جزء انسان کے لئے نفع بخش، راحت رساں، مفید، زبان کے لئے لذت کا ذریعہ ہے، بدن کے لئے صحت کا ذریعہ ہے، تو یہ شجرہ شجرۂ مبارکہ ہوتا ہے، شجرۂ طیبہ اور شجرۂ مبارکہ، شجرۂ طیبہ کی مثال جس طرح سے کھجور کو بنایا گیا، اور شجرۂ مبارکہ کا مصداق زیتون کو بنایا گیا جس میں اللہ تعالیٰ نے بہت فائدے رکھے ہیں، انسان کے لئے ہر طرح سے وہ مفید ہے، اور شجرۃ ملعونہ وہ ہوگا کہ جس میں نفع کا کوئی پہلو نہ ہو، نہ اس میں کوئی ذائقہ ہے، نہ اس میں کوئی بھوک کو دُور کرنے کی قوت ہے، نہ وہ صحت بخش ہے، بلکہ کڑوا ہے، کانٹے دار ہے، ہر طرح سے تکلیف دِہ ہے، تو شجرۃ ملعونہ کا مصداق یہاں شجرۂ زقوم ہے جس کا ذکر دو جگہ قرآنِ کریم میں آیا ہے، اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ ۝ طَعَامُ الْاَثِيْمِ ۝ كَالْمُهْلِ ۚ يَغْلِيْ فِي الْبُطُوْنِ ۝ كَغَلْيِ الْحَمِيْمِ (الدخان) اور اسی طرح سے سورۂ صافات کے اندر بھی اس کا ذکر آیا ہے، ”نہیں بنایا ہم نے اس رؤیا جو ہم نے آپ کو دکھایا مگر لوگوں کے لئے فتنہ اور اس درخت کو جس کی قرآنِ کریم میں برائی بیان کی گئی ہے“ یعنی اس کو بھی ہم نے لوگوں کے لئے فتنہ بنادیا، لوگوں نے اس کو بھی اپنے لئے گمراہی کا باعث ٹھہرالیا، وَنُخَوِّفُهُمْ: اور ہم ان کو ڈراتے ہیں، فَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا طُغْيَانًا كَبِيْرًا: اور ہماری تخویف نہیں بڑھاتی ان کو مگر بڑی سرکشی، یعنی آئے دن جس طرح سے ہم ان کو دھمکاتے ہیں اور اس قسم کے واقعات ذکر کر کے ترہیب کرتے ہیں تو اسی طرح سے ان کی سرکشی ہی بڑھتی چلی جارہی ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ قَالَ ءَاَسْجُدُ

یاد کیجیے جب ہم نے کہا فرشتوں کو کہ سجدہ کرو تم آدم کو، پھر انہوں نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے، ابلیس نے کہا کیا میں سجدہ کروں

لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا ﴿٦١﴾ قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ ؗ لَئِنْ

اس شخص کو جس کو پیدا کیا تُو نے مٹی سے؟ ﴿٦١﴾ ابلیس نے کہا کہ بھلا بتلا تو کہ یہ شخص جس کو تُو نے میرے اُوپر بڑائی دی ہے، اگر

اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿٦٢﴾

تُو نے مجھے مہلت دے دی قیامت کے دِن تک تو کچھ لوگوں کو چھوڑ کر میں اس کی ساری اولاد کو پوری طرح سے اپنے قابو میں کرلوں گا ﴿٦٢﴾

قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا ﴿٦٣﴾

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جا، پھر جو کوئی شخص تیرے پیچھے لگ جائے گا ان میں سے تو بے شک جہنم سزا ہے تم سب کی پوری پوری سزا ﴿٦٣﴾

وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ

جن کی تُو طاقت رکھتا ہے ان میں سے ان کو تُو گھبراہٹ میں ڈال لے اپنی آواز کے ذریعے سے، اور کھینچ لا تُو ان کے اوپر

بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ؕ وَمَا

اپنے شاہسوار اور پیادے، اور شریک ہوجا تو ان کے ساتھ مالوں میں اور اولادوں میں، اور ان کے ساتھ تو وعدے کر، اور نہیں

يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿٦٤﴾ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ؕ

وعدے کرتا ان کے ساتھ شیطان مگر دھوکے کے ﴿٦٤﴾ بے شک میرے بندے، نہیں ہے تیرے لیے اُن کے اوپر کسی قسم کا زور،

وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا ﴿٦٥﴾ رَبُّكُمُ الَّذِيْ يُزْجِيْ لَكُمُ الْفُلْكَ فِي الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ ؕ

اور تیرا ربّ کارساز کافی ہے ﴿٦٥﴾ تمہارا ربّ وہ ہے جو چلاتا ہے تمہارے لیے کشتیاں سمندر میں تا کہ تم طلب کرو اللہ کا رزق،

اِنَّهٗ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ﴿٦٦﴾ وَاِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ

بے شک وہ تمہارے ساتھ رحم کرنے والا ہے ﴿٦٦﴾ اور جس وقت تمہیں سمندر میں کوئی مصیبت آفت چھولیتی ہے تو گم ہوجاتے ہیں وہ سب

تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ ؕ وَكَانَ

جن کو تم پکارا کرتے ہو سوائے اللہ کے، اور جس وقت وہ اللہ تمہیں نجات دے دیتا ہے خشکی کی طرف تو تم پھر منہ موڑ جاتے ہو، اور

الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا ﴿۶۷﴾ اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ یَّخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ اَوْ یُرْسِلَ عَلَیْكُمْ

انسان انتہائی ناشکرا ہے ﴿۶۷﴾ کیا پھر تم بے خوف ہو گئے ہو اس بات سے کہ دھنسا دے تمہیں وہ خشکی کی جانب میں، یا بھیج دے تمہارے اوپر

حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ وَكِیْلًا ﴿۶۸﴾ اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ یُّعِیْدَكُمْ

ایسی آندھی جو کنکریاں برسانے والی ہو، پھر تم کسی کو اپنا کارساز نہیں پاؤ گے ﴿۶۸﴾ کیا تم اس بات سے بے خوف ہو گئے ہو کہ لوٹا دے وہ تمہیں

فِیْهِ تَارَةً اُخْرٰی فَیُرْسِلَ عَلَیْكُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرِّیْحِ فَیُغْرِقَكُمْ بِمَا كَفَرْتُمْ

اس سمندر میں دوبارہ، پھر تمہارے اوپر وہ ہوا میں سے توڑ پھوڑ کرنے والی ہوا بھیج دے، پھر وہ تمہیں ڈبو دے تمہارے کفر کرنے کی وجہ سے،

ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ عَلَیْنَا بِهٖ تَبِیْعًا ﴿۶۹﴾ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا

پھر نہیں پاؤ گے تم اپنے لیے ہمارے خلاف اِس (ہمارے غرق کر دینے) کی وجہ سے کوئی پیچھا کرنے والا ﴿۶۹﴾ البتہ تحقیق ہم نے بنی آدم

بَنِیْۤ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ

کو عزت دی ہے بہت ساری مخلوق کے مقابلے میں اور ہم نے ان کو سوار کیا دریا میں بھی اور خشکی میں بھی، اور ہم نے ان کو پاکیزہ

مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰی كَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِیْلًا ﴿۷۰﴾ یَوْمَ نَدْعُوْا

چیزوں سے روزی دی، اور جن کو ہم نے پیدا کیا ان میں بہتوں پر انسان کو فضیلت دی خاص قسم کی فضیلت ﴿۷۰﴾ جس دِن کہ بلائیں گے ہم

كُلَّ اُنَاسٍۭ بِاِمَامِهِمْ فَمَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ فَاُولٰٓىِٕكَ یَقْرَءُوْنَ كِتٰبَهُمْ

سب لوگوں کو ان کے اِمام کے ساتھ، جس شخص کو دے دیا گیا اس کا نامۂ اَعمال اس کے دائیں ہاتھ میں یہ پڑھیں گے اپنے نامۂ اَعمال کو

وَلَا یُظْلَمُوْنَ فَتِیْلًا ﴿۷۱﴾ وَمَنْ كَانَ فِیْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰی فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰی وَاَضَلُّ

اور ان کے اُوپر تاگا برابر بھی ظلم نہیں کیا جائے گا ﴿۷۱﴾ جو شخص اس دُنیا کے اندر اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا اور زیادہ بھٹکا ہوا ہوگا

سَبِیْلًا ﴿۷۲﴾ وَاِنْ كَادُوْا لَیَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِیْۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ

از روئے راستے کے ﴿۷۲﴾ بے شک بات یہ ہے کہ قریب ہے کہ یہ لوگ پھسلا دیں تجھے اس چیز سے جو ہم نے تیری طرف وحی کی ہے

لِتَفْتَرِیَ عَلَیْنَا غَیْرَهٗ ۖۗ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِیْلًا ﴿۷۳﴾ وَلَوْلَاۤ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ

تا کہ گھڑیں آپ ہمارے ذِمّے کوئی اور بات، تب یہ لوگ تجھے اپنا دوست بنا لیں گے ﴿۷۳﴾ اور اگر ہمارا تجھ کو ثابت قدم رکھنا نہ ہوتا

لَقَدۡ کِدۡتَّ تَرۡکَنُ اِلَیۡہِمۡ شَیۡـًٔا قَلِیۡلًا ﴿۷۴﴾ اِذًا لَّاَذَقۡنٰکَ ضِعۡفَ الۡحَیٰوۃِ

تو قریب تھا کہ آپ ان کی طرف تھوڑا سا مائل ہو جاتے ﴿۷۴﴾ تب البتہ چکھاتے ہم آپ کو دُنیوی زندگی کے عذاب کا دوگنا

وَ ضِعۡفَ الۡمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَکَ عَلَیۡنَا نَصِیۡرًا ﴿۷۵﴾ وَ اِنۡ کَادُوۡا لَیَسۡتَفِزُّوۡنَکَ مِنَ

اور موت کے عذاب کا دوگنا، پھر آپ اپنے لیے ہمارے خلاف کوئی مددگار نہ پاتے ﴿۷۵﴾ قریب ہے کہ یہ لوگ تجھے گھبراہٹ میں ڈال کے

الۡاَرۡضِ لِیُخۡرِجُوۡکَ مِنۡہَا وَ اِذًا لَّا یَلۡبَثُوۡنَ خِلٰفَکَ اِلَّا قَلِیۡلًا ﴿۷۶﴾ سُنَّۃَ مَنۡ

اکھیڑ دیتے زمین سے تاکہ نکال دیں تجھے اس زمین سے اور تب یہ نہیں ٹھہریں گے آپ کے پیچھے مگر بہت کم ﴿۷۶﴾ ان کے طریقے کی طرح

قَدۡ اَرۡسَلۡنَا قَبۡلَکَ مِنۡ رُّسُلِنَا وَ لَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحۡوِیۡلًا ﴿۷۷﴾

جو بھیجے ہم نے آپ سے قبل اپنے رسولوں میں سے، اور نہیں پائیں گے آپ ہمارے طریقے کے لئے کوئی کسی قسم کی تبدیلی ﴿۷۷﴾

تفسیر

ابلیس کے انکارِ سجدہ کا مختصر واقعہ اور ابلیسی طریقہ کار

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ - وَ اِذۡ قُلۡنَا لِلۡمَلٰٓئِکَۃِ اسۡجُدُوۡا لِاٰدَمَ: یاد کیجئے جب ہم نے کہا فرشتوں کو کہ سجدہ کرو تم آدم کے لئے، آدم کو سجدہ کرو، فَسَجَدُوۡۤا اِلَّاۤ اِبۡلِیۡسَ: پھر انہوں نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے، قَالَ: ابلیس نے کہا، ءَاَسۡجُدُ لِمَنۡ خَلَقۡتَ طِیۡنًا: کیا میں سجدہ کروں اس شخص کو جس کو پیدا کیا تو نے مٹی سے؟ طِیۡنًا یہ مِنۡ طِیۡنٍ کے معنی میں ہے، قَالَ اَرَءَیۡتَکَ ہٰذَا الَّذِیۡ کَرَّمۡتَ عَلَیَّ: اس قَالَ کی ضمیر بھی ابلیس کی طرف ہی لوٹ رہی ہے، اَرَءَیۡتَکَ میں کاف حرفِ خطاب ہے جو صرف تاء کی تاکید کے لئے ہے، اور اس کے شروع میں جو ہمزہ ہے یہ محض تنبیہ کے لئے ہے اس میں استفہام کا معنی نہیں، محاورۃً یہ لفظ اب اَخۡبِرۡنِیۡ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور مخاطب کے بدلنے کا اثر صرف کاف پر پڑے گا کہ اگر ایک کو خطاب کیا جائے گا تو اَرَءَیۡتَکَ کہہ دیں گے، زیادہ کو خطاب کیا جائے تو اَرَءَیۡتَکُمۡ کہہ دیں گے، پھر ترجمہ یوں ہو جائے گا اَخۡبِرۡنِیۡ، اَخۡبِرُوۡنِیۡ، جمع کو خطاب ہوگا تو اَخۡبِرُوۡنِیۡ کے ساتھ ترجمہ کر دیں گے، واحد ہوگا تو اَخۡبِرۡنِیۡ کے ساتھ ترجمہ کر دیں گے، اَرَءَیۡتَکَ ہٰذَا الَّذِیۡ کَرَّمۡتَ عَلَیَّ: ابلیس نے کہا کہ تو بتلا مجھے کہ یہ شخص جس کو تُو نے میرے اوپر بزرگی دی ہے، "بیان القرآن" کے بیان کے مطابق آگے لفظ محذوف ہیں: لِمَ کَرَّمۡتَ عَلَیَّ؟ کیوں بزرگی دی ہے اس کو میرے پر؟ اس کی بزرگی کی کیا وجہ ہے؟ "بھلا بتلا تو کہ یہ شخص جس کو تُو نے میرے پہ بڑائی دی ہے، تو کیوں دی ہے؟" اس کی بڑائی کی وجہ کیا ہے؟ میں آگ سے پیدا ہوا، یہ مٹی سے پیدا ہوا، یہ تو اصل کے اعتبار سے میری بڑائی ہے اس پر، اس کو میرے پہ بڑائی حاصل نہیں ہے، اور آئندہ کے لئے مجھے مہلت دے کے دیکھ لے، اس کی اولاد کے ساتھ میرا مقابلہ ہوگا، تو دیکھنا

میں اس کی اولاد کو کس طرح سے قابو میں لے آتا ہوں، یہ اپنی بڑائی کو واضح کر رہا ہے، آگے اِحتناك کا لفظ آ رہا ہے: لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗ، اِحتناك کا مفہوم ہوتا ہے، حَنَكَ الدَّابَّةَ - اِحْتَنَكَ الدَّابَّةَ یہ لفظ کلامِ عرب میں کسی کو قابو میں لانے کے لئے بولا جاتا ہے، اور قابو میں لانا بھی ایسے طور پر کہ جیسے کوئی جانور سرکش ہوتا ہے تو کاشت کار یا جانور کا مالک اس کے نچلے جبڑے میں رسّی باندھ لیتا ہے جس کو ڈاٹی مارنا کہتے ہیں، اور جس کسی بیل کے یا بھینس کے نچلے جبڑے میں رسّی ڈال کے اس کو باندھ لیا جائے تو پھر وہ بالکل بس میں آ جاتا ہے، پھر سرکشی نہیں کر سکتا، کیونکہ اگر وہ زور مارتا ہے تو اس کے جبڑے کے ٹوٹنے کا اندیشہ ہوتا ہے، تو پھر وہ اچھی طرح قابو آ جاتا ہے، تو یہاں لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗ کا یہی معنی ہے کہ اس طرح سے قابو میں کرلوں گا میں اس کی اولاد کو جس طرح سے کسی جانور کے جبڑے پر رسّی باندھ کر جانور کو قابو میں کر لیا جاتا ہے، یعنی مکمل طرح سے میں ان کو اپنے بس میں کرلوں گا۔ اور بعض تفسیروں میں اس کا مفہوم یوں بھی ذکر کیا گیا کہ ''اِحْتَنَكَ الْجَرَادُ الزَّرْعَ'' یہ محاورہ بھی آتا ہے، ٹڈی کھیتی کو چٹ کر گئی، یہ ٹڈی دَل آتا ہے اور آ کے کسی کھیت کو چٹ کر جاتا ہے، یعنی سارے کھیت کو ویران کر جاتا ہے، تو اُس کے مطابق بھی اِس کا مفہوم یہ ہوگا کہ میں اس کی اولاد کو چٹ کر جاؤں گا، چٹ کر جانے کا مطلب یہ ہے کہ کلیۃً اس کے اوپر غلبہ حاصل کرلوں گا۔ لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ: اگر تُو نے مجھے مہلت دے دی قیامت کے دن تک، لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلًا: کچھ لوگوں کو چھوڑ کر میں اس کی ساری اولاد کو پوری طرح سے اپنے بس میں کرلوں گا، ان کے اوپر ہر طرح سے غلبہ حاصل کرلوں گا، ان کو چٹ کر جاؤں گا، ان کو قابو میں لے آؤں گا سوائے کچھ لوگوں کے، کچھ لوگوں کو چھوڑ کر اس کی اولاد کو میں اپنے قابو میں کرلوں گا۔ قَالَ اذْهَبْ: اللہ تعالیٰ فرمایا کہ جا، یہ ''جا'' ایسے ہی ہے جیسے کہتے ہیں دفع ہو، جو چاہے کر، فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ: پھر جو کوئی شخص تیرے پیچھے لگ جائے گا ان میں سے، فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا: بے شک جہنم سزا ہے تم سب کی پوری پوری سزا، جَزَآؤُكُمْ کے اندر جمع کا خطاب ہو گیا جس میں ابلیس اور اس کے متبعین سارے آ گئے، وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ: اِستِفْزاز، اس کا مادّہ فزّ ہے، اور فزّ قَطَعَ کے معنی میں آتا ہے، اور اِستِفْزاز کا معنی ہوتا ہے کسی کو گھبراہٹ میں ڈال کر اس کے موقف سے ہلا دینا، وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ: جن کی تو طاقت رکھتا ہے ان میں سے اُن کو تو گھبراہٹ میں ڈال لے، ان کے قدم اکھیڑ دے، بِصَوْتِكَ: اپنی آواز کے ذریعے سے، وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ: اور کھینچ لا تو ان کے اوپر اپنے شاہسوار اور پیادے۔ رَجِل: پیدل چلنے والے۔ خیل: گھڑسوار۔ وَشَارِكْهُمْ فِی الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ: اور شریک ہو جا تُو ان کے ساتھ مالوں میں اور اولادوں میں، وَعِدْهُمْ: اور ان کے ساتھ تُو وعدے کر، وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا: اور نہیں وعدے کرتا ان کے ساتھ شیطان مگر دھوکے کے، یعنی اللہ تعالیٰ نے اسے کہا کہ میری طرف سے تجھے چھٹی ہے، جا، جو کر سکتا ہے کر لے، اور اگر اولادِ آدم کو تُو گمراہ کرے گا تو اولادِ آدم میں سے جو تیرے پیچھے لگ جائیں تو میرا اس میں کوئی نقصان نہیں، جیسے دوسری جگہ الفاظ آئے تھے لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ (الاعراف:۱۸) میں تم سب کو اکٹھا کر کے جہنم بھر دوں گا، (تو یہاں ہے کہ) ''جہنم تمہاری پوری پوری سزا ہے''، ''اور تُو اپنی آواز کے ذریعے سے'' آواز سے پروپیگنڈا اور وسوسہ مراد ہے، اور یہ گانا بجانا، اور ہر وہ چیز جو انسان کو بُرائی کی طرف بُلاتی ہے، جو آواز بھی بلند اور بُرائی کی طرف بلائے اور بُرائی کی داعی ہو وہ سب بِصَوْتِكَ کا مصداق ہے، گانا بجانا بھی اسی میں شامل ہے اور اسی طرح سے معصیت کی ترغیب کے لئے جو بھی تقریر کی جاتی ہے وہ سب شیطان

کی آواز میں شامل ہے، اور خیل اور رَجِل سے مراد ہر قسم کے اپنے پیادے سوار لشکر جو بھی ہیں، یعنی یہ لفظ بول کر چاہے حقیقت مراد نہ ہو، مطلب یہ ہے کہ اپنے ہر قسم کے لشکر تو لے آ۔ اور اگر ابلیس کے ساتھ ابلیس کے متبعین بھی مراد لے لیے جائیں تو اہلِ حق کے خلاف وہ گھوڑوں پر آ کر بھی مقابلے کرتے ہیں، پیدل آ کر بھی مقابلے کرتے ہیں، جیسے سرورِ کائنات ﷺ کے مقابلے میں یہ شیاطین کے لشکر جو آتے تھے تو پیدل بھی ہوتے تھے اور گھوڑوں پر بھی سوار ہوتے تھے، (مطلب یہ ہے کہ) تو جس طرح سے چاہے اپنے لشکروں کو لے آ، فوجوں کو لے آ، وہ گھوڑوں پہ چڑھ کے آجائیں، پیدل آجائیں، جس طرح سے چاہے تُو ان کو گھبراہٹ میں ڈال کے، ان کو اِن کے موقف سے ہٹالے، اور ان کے مال و اولاد میں شریک ہو جا، مال سے بھی ان سے حصہ لے لے اور ان کی اولاد کو بھی گمراہی کا ذریعہ بنالے، جو تجھ سے ہوتا ہے تُو کر لے، اور ان سے جھوٹے وعدے کرتا رہ، ان کو تمنا دلا، وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے اوپر انکار ہے، کہ ابلیس بنی آدم کے ساتھ جو بھی وعدے کرتا ہے سب دھوکے کے لئے کرتا ہے، کہتا ہے تم ایسے کر لو تمہارا یہ نفع ہو جائے گا، ایسے کر لو اس میں یہ مزہ ہے، اوّل تو آخرت ہو گی نہیں، اگر ہو گی تو تم اس طرح سے چھوٹ جاؤ گے، جتنے اس قسم کے وعدے دلاتا ہے سب دھوکے کے وعدے ہیں جن کے اندر کوئی حقیقت نہیں ہے۔

اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ: جو میرے خاص بندے ہیں، جن کا میرے ساتھ تعلق اور ربط ہوگا تیرا ان کے اوپر کوئی زور نہیں چلے گا، ''بے شک میرے بندے، نہیں ہے تیرے لئے اُن کے اوپر کسی قسم کا زور'' وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا: اور تیرا رَبّ کارساز کافی ہے، تو جو لوگ رَبّ کو کارساز سمجھیں گے اور اپنا وکیل بنالیں گے شیطان ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔

تو پچھلے رکوع میں مشرکین کی جو حرکتیں نقل کی گئی تھیں آخرت کے انکار کی بنا پر، اور انبیاء ﷺ کے ساتھ اِستہزا، تو ان آیات میں واضح کر دیا گیا کہ یہ سارے کا سارا ابلیسی طریقہ ہے، اور جو بھی اللہ تعالیٰ کے اَحکام کو قبول نہیں کرتے وہ سب ابلیس کے بہکاوے میں آئے ہوئے ہیں، اور یہ تاریخ واضح کی گئی کہ وہ تو آدم علیہ السلام کی وجہ سے جب دھتکارا گیا تو اس نے اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہو کر اس قسم کی باتیں کہی تھیں، اور یہ نادان جو اللہ تعالیٰ کی باتیں نہیں مانتے، اللہ کے رسول کی اتباع نہیں کرتے وہ سارے کے سارے اپنے اسی قدیم دشمن کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، اور وہ آدم کی اولاد کو اپنے پیچھے لگا کے اسی طرح سے جہنم میں جھونکے گا، یہی ان کو یاد دلایا جا رہا ہے۔ اور یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ آپ کے سامنے سورۂ اَعراف میں گزر گیا، اور سورۂ بقرہ کے اندر بھی اس کے اکثر اَجزاء آ گئے۔

اثباتِ توحید ترغیب و ترہیب کے ساتھ

آگے اثباتِ توحید ہے، اللہ تعالیٰ کچھ انعام ذکر فرماتے ہیں اور کچھ اس میں ترہیب بھی ہے، رَبُّكُمُ الَّذِيْ يُزْجِيْ لَكُمُ الْفُلْكَ فِي الْبَحْرِ: تمہارا رَبّ وہ ہے جو چلاتا ہے تمہارے لئے کشتیاں سمندر میں، فلک کا لفظ واحد اور جمع دونوں کے لئے آتا ہے۔ اَزْجیٰ: چلانے کے معنی میں ہے۔ ''جو چلاتا ہے تمہارے لیے کشتیاں سمندر میں'' بحر کا لفظ سمندر کے لئے اور بڑے دریاؤں کے لئے بولا جاتا ہے، لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ: تاکہ تم طلب کرو اللہ کا رزق، فضل سے مراد رزق ہے، کہ کشتیوں پر سفر ہوتے ہیں، تجارتی سامان

اِدھر سے اُدھر جاتا ہے، کشتیاں اللہ نے چلا دیں تاکہ تم رزق طلب کرو، اِنَّهٗ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا: بے شک وہ اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ رحم کرنے والا ہے، شفقت کرنے والا ہے، مہربان ہے۔ وَاِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ: اور جس وقت تمہیں سمندر میں کوئی مصیبت پہنچ جاتی ہے، ضُر تکلیف کو کہتے ہیں نقصان کو، کوئی آفت آجاتی ہے، ''جس وقت تمہیں سمندر میں کوئی آفت چھو لیتی ہے'' ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ: گم ہوجاتے ہیں وہ سب جن کو تم پکارا کرتے ہو، اِلَّآ اِيَّاهُ: سوائے اس اللہ کے، تو پھر تمہاری امیدیں بھی اللہ کے ساتھ ہی لگ جاتی ہیں، اس وقت اصل فطرت سامنے آجاتی ہے، کہ انسان کا دل گواہی دیتا ہے کہ بڑی بڑی آفات سے بچالینا، بڑی بڑی مصیبتوں سے بچالینا یہ صرف آسمان والے اللہ تعالیٰ کا ہی کام ہے، اور یہ زمین میں جو پتھر لوہے پیتل لکڑی کے بنا رکھے ہیں، یہ ایسے وقت میں کام نہیں آتے ''گم ہوجاتے ہیں وہ سب جن کو تم پکارتے ہو سوائے اس اللہ کے'' فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ اِلَى الْبَرِّ: اور جس وقت وہ اللہ تمہیں نجات دے دیتا ہے خشکی کی طرف، یعنی دریا اور سمندر سے تم صحیح سالم بچ کے آگئے، اَعْرَضْتُمْ: تم پھر منہ موڑ جاتے ہو، اِعراض کرجاتے ہو، وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا: اور انسان انتہائی ناشکرا ہے۔ اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ: سمندر میں تو تم اس کو پکارتے تھے، خشکی میں آکے پھر غافل ہوگئے، اللہ تعالیٰ کے اَحکام سے اِعراض کرگئے، تو کیا پھر تم بےفکر ہوگئے ہو اس بات سے، اَفَاَمِنْتُمْ: کیا تم نڈر ہوگئے ہو، بےخوف ہوگئے ہو اس بات سے کہ دھنسا دے تمہیں وہ خشکی کی جانب میں ہی، تو جو اللہ سمندر میں تمہیں ڈبو سکتا ہے وہ زمین کے اندر بھی دھنسا سکتا ہے، اور ایسے واقعات تاریخ میں پیش آچکے ہیں، شہروں کے شہر زمین میں اُتر جاتے ہیں، ''کیا تم اس بات سے بےفکر ہوگئے کہ دھنسا دے وہ تمہیں خشکی کی جانب میں'' اَوْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا: یا بھیج دے تمہارے اوپر ایسی آندھی جو کنکریاں برسانے والی ہو، طوفانی ہوا تمہارے اُوپر بھیج دے، حاصب: کنکریاں برسانے والی، ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ وَكِيْلًا: پھر تم کسی کو اپنا کارساز نہیں پاؤ گے، کوئی تمہارا وکیل نہیں جس کے تم اپنا معاملہ سپرد کردو، اگر اللہ کی گرفت ہوجائے خشکی کے اندر بھی، جس طرح سے تم سمندر کے اندر گرفت میں آتے ہو تو صرف اُسی کو پکارتے ہو، زمین میں آکے غافل ہوجاتے ہو، تو تمہیں یہ یاد ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت زمین میں بھی اسی طرح سے باقی ہے جس طرح سے کہ سمندر میں تھی، اگر وہ سمندر میں ڈبو سکتا ہے تو زمین میں دھنسا بھی سکتا ہے اور کوئی طوفانی ہوا بھیج سکتا ہے، اور پھر تمہیں کوئی بچانے والا نہیں ہوگا، تمہارا کوئی کارساز نہیں ہوگا۔ ''یا تم بےفکر ہوگئے ہو اس بات سے کہ لوٹا دے وہ تمہیں پھر دوبارہ سمندر میں ہی'' ایسا بھی تو ہوسکتا ہے کہ پھر کوئی کام پیش آئے گا، پھر سمندر میں چلے جاؤ گے، اور وہاں پھر اللہ تعالیٰ کا انتقام سر پر کھڑا ہے، تَارَةً اُخْرٰى: دوسری مرتبہ، پہلی دفعہ خطرات سے تم بچ کے آئے ہو اور اگر وہ چاہے تو ایسا پھر کام پڑ جائے گا پھر سمندر میں چلے جاؤ گے، ''کیا تم بےڈر ہوگئے ہو، نڈر ہوگئے ہو اس بات سے بےخوف ہوگئے ہو؟ کہ لوٹا دے وہ تمہیں اس سمندر میں دوبارہ'' فَيُرْسِلَ عَلَيْكُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرِّيْحِ: پھر سمندر میں لے جاکے چھوڑ دے تمہارے اوپر، بھیج دے تمہارے اوپر۔ قاصف: توڑ پھوڑ کرنے والی، جسے جھکڑ ہوا کہتے ہیں۔ ''پھر تمہارے اوپر وہ ہوا میں سے توڑ پھوڑ کرنے والی ہوا بھیج دے'' فَيُغْرِقَكُمْ: پھر وہ تمہیں ڈبو دے بِمَا كَفَرْتُمْ: تمہارے کُفر کرنے کی وجہ سے، ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ عَلَيْنَا بِهٖ تَبِيْعًا: پھر نہیں پاؤ گے تم اپنے لئے ہمارے خلاف اس ہمارے غرق کردینے کی وجہ سے کوئی پیچھا کرنے والا، یعنی ہماری اس بات پر کہ ہم نے

تمہیں غرق کردیا ہمارا پیچھا کوئی نہیں کرسکتا، ہمیں آکے کوئی پوچھ بھی نہیں سکتا کہ ایسا کیوں کیا؟ تبیع: پیچھا کرنے والا، یعنی اس معاملے میں کوئی بھی ہمارا پیچھا نہیں کرسکتا، اور اس کا حاصل یہی ہے کہ تمہارا کوئی مددگار نہیں، تمہاری کوئی حمایت کرنے والا نہیں، تمہارے اس غرق ہونے کے اوپر کوئی آنسو بہانے والا نہیں ہوگا، اللہ تعالیٰ سے کوئی پوچھنے والا نہیں ہوگا، اللہ کے مقابلے میں تمہارا کوئی مددگار نہیں ہوگا، ان الفاظ کا یہی مفہوم ہے، ''نہیں پاؤ گے تم اپنے لیے ہمارے خلاف اس بات کی وجہ سے (یعنی غرق کردینے کی وجہ سے) کوئی پیچھا کرنے والا۔''

بنی آدم کے اِعزاز و اِکرام اور ان پر خصوصی اِنعامات کا ذِکر

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ: البتہ تحقیق ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی ہے، کرامت دی ہے، فضیلت دی ہے، عزت دی، بہت ساری مخلوق کے مقابلے میں جیسے آگے جا کے وضاحت کردی جائے گی، مثلاً جمادات نباتات یہ بھی تو اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے اس کے مقابلے میں انسان کو شرف حاصل ہے، حیوانات کے مقابلے میں انسان کو شرف حاصل ہے یعنی اصل خلقت کے اعتبار سے، قدوقامت کے لحاظ سے اس کو خوبصورت بنایا، عقل فہم شعور اس کو دیا جو دوسروں کو نہیں ہے، باقی کائنات سے جس طرح سے یہ فائدے اٹھا سکتا ہے کوئی دوسری چیز اس طرح سے فائدے نہیں اٹھا سکتی، لباس حسب منشا پہنتا ہے، اچھے سے اچھا بناتا ہے، خوراک حسب منشا کھاتا ہے، اچھی سے اچھی کھاتا ہے، باقی جتنے حیوانات ہیں وہ سب مفردات پر گزارہ کرتے ہیں، اور انسان اپنی غذا میں کس قسم کے مرکبات شامل کر کے کیسی کیسی لذیذ اور کیسی کیسی عمدہ غذائیں بنالیتا ہے، یہ سب عقل و شعور کی وجہ سے ہے، اور اسی طرح سے جنات کے مقابلے میں بھی انسان کو شرف حاصل ہے کہ اگرچہ عقل و شعور ان کو بھی ہے، اور شہوات وغیرہ ان میں بھی ہیں لیکن ان میں یہ اعتدال نہیں جو انسان میں رکھا گیا، ان میں شرارت اور شر کا مادہ غالب ہے، اور فرشتے اس قسم کے کمالات کے حامل نہیں جس قسم کے انسان کو دیے گئے ہیں، کیونکہ فرشتے اِبتلا میں نہیں آسکتے، ان کو چاہے عقل و شعور ہو لیکن شہوات ان میں نہیں ہیں، اس لیے وہ اِبتلا میں نہیں آسکتے، وہ اللہ کی اطاعت پر ہی پیدا کئے گئے ہیں، ان میں معصیت کا مادّہ ہی نہیں کہ وہ کسی امتحان میں آئیں، اس اعتبار سے انسان کو شرف ہے کہ انسان کے لئے ہر قسم کا میدان کھلا چھوڑ دیا گیا ہے، اور جس وقت یہ اپنے اختیار کے ساتھ اللہ کی فرمانبرداری کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں فرشتوں سے بھی زیادہ اس کی قدر کی جاتی ہے، فرشتے اِبتلا میں نہیں پڑتے چونکہ ان کے اندر کسی قسم کی شہوات ہیں ہی نہیں۔ باقی نتیجۃً آخرت کے اعتبار سے اگر انسان اللہ تعالیٰ کا مطیع اور فرمانبردار ہو تو پھر یہ خیر البریۃ ہے، ساری مخلوق سے بہتر ہے، اولیاء اور صالحین عام فرشتوں سے بہتر ہیں، انبیاء علیہم السلام خواص فرشتوں سے بہتر ہیں، اور خواص فرشتے یہ عوام مؤمنین کے مقابلے میں افضل ہیں، وہ تفصیل کی بات ہے بہرحال فی الجملہ انسان کی افضلیت کا قول کیا جاسکتا ہے۔ اور اگر یہ نافرمان ہو جائے، اللہ تعالیٰ کا باغی ہو جائے، کُفر و شرک کے اندر مبتلا ہو جائے تو پھر اسی کے لئے شر البریۃ کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے، پھر یہ کتوں اور بلوں سے بھی بدتر ہو جاتا ہے، ہر قسم کی ذلیل سے ذلیل مخلوق سے بھی ارذل بن جاتا ہے، کیونکہ جو اچھی چیز ہوا کرتی ہے جب وہ اچھی رہے تو سب سے اچھی، جب بگڑتی ہے تو سب سے زیادہ، نتیجۃً اللہ کے نزدیک جا کے یہ

خیر البریہ بھی ہوسکتا ہے شر البریہ بھی، لیکن اصل خلقت کے اعتبار سے اگر مقابلہ کریں تو اللہ تعالیٰ نے انسان کو اکثر مخلوق کے مقابلے میں اچھا بنایا ہے، اور اس کو فضیلت دی ظاہری باطنی کمالات کے اعتبار سے۔ وَحَمَلْنٰهُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ: اور ہم نے ان کو اٹھایا، سوار کیا دریا میں بھی اور خشکی میں بھی، خشکی میں بھی ان کی سواریوں کا انتظام کیا، دریا میں بھی ان کی سواریوں کا انتظام کیا، وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ: اور ہم نے ان کو پاکیزہ چیزوں سے روزی دی، وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰی كَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِیْلًا: مَنْ خَلَقْنَا: جن کو ہم نے پیدا کیا ان میں سے بہتوں پر انسان کو فضیلت دی خاص قسم کی فضیلت۔

قیامت کے دِن نیک لوگوں کا اَنجامِ خیر

یَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۭ بِاِمَامِهِمْ: جس دِن کہ بلائیں گے ہم سب لوگوں کو ان کے اِمام کے ساتھ۔ باء بمعنی مع۔ امام کا مصداق دو چیزیں ذکر کی گئی ہیں، یا تو اس سے نامۂ اَعمال مراد ہیں، اِمام کا لفظ کتاب کے معنی میں قرآنِ کریم کے اندر استعمال کیا گیا ہے، جیسے سورۂ یٰسٓ کے پہلے رکوع کے آخر میں ہے وَكُلَّ شَیْءٍ اَحْصَیْنٰهُ فِیْٓ اِمَامٍ مُّبِیْنٍ، تو اِمام کا مصداق نامۂ اَعمال بھی ہوسکتا ہے، کہ ہر شخص اپنے نامۂ اَعمال کے ساتھ آئے گا، اور اس کا مصداق مقتدیٰ اور پیشوا بھی بنایا گیا ہے کہ ہر شخص کو اس کے مقتدیٰ اور پیشوا کے ساتھ لائیں گے، جن کے پیچھے چلنے والے ہوں گے وہاں بھی انہی کے پیچھے ہی چلتے ہوئے آئیں گے، اس لیے دنیا کے اندر رہتے ہوئے ہمیشہ کسی اچھے آدمی سے تعلق رکھا جائے تو قیامت کے دِن حشر بھی انہی لوگوں کے ساتھ ہی ہوگا، لیڈر جو ہیں وہ اپنی قوم کے آگے آگے آئیں گے، تو اِمام سے مراد مقتدا، راہنما، پیشوا، متبوع، جس کو انسان اپنے لیے متبوع قرار دے دیتا ہے، وہ اس سے مراد ہوسکتا ہے، ''جس دِن کہ بلائیں گے ہم سب لوگوں کو ان کے امام کے ساتھ'' یا ان کے نامۂ اَعمال کے ساتھ یا ان کے سردار اور پیشوا مقتدیٰ کے ساتھ، فَمَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ: جس شخص کو دے دیا گیا اس کا نامۂ اَعمال اس کے دائیں ہاتھ میں، فَاُولٰٓىِٕكَ یَقْرَءُوْنَ كِتٰبَهُمْ: یہ کامیاب لوگوں کا گروہ ہے، یہ پڑھیں گے اپنے نامۂ اَعمال کو یعنی خوشی کے ساتھ، وَلَا یُظْلَمُوْنَ فَتِیْلًا: اور ان کے اوپر تاگا برابر بھی ظلم نہیں کیا جائے گا، فتیل بٹی ہوئی رسّی کو کہتے ہیں، اور اس سے شئ قلیل مراد ہوتی ہے، کچھ بھی ظلم نہیں کیا جائے گا، تاگے برابر بھی ان کے اوپر ظلم نہیں کیا جائے گا، حق تلفی نہیں کی جائے گی، کوئی نیکی انہوں نے کی ہو چاہے ذرّہ برابر ہی کیوں نہ ہو، اس کو بھی اپنے نامۂ اَعمال کے اندر لکھا ہوا پائیں گے، ایسا نہیں ہوگا کہ کوئی نیکی بلاوجہ ضائع کردی جائے، اور یہ خوش ہوں گے خوش ہوکے پڑھیں گے بلکہ دوسروں کو بھی پڑھاتے پھریں گے، هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِیَهْ (سورۃ الحاقہ) لو! یہ میرا نامۂ اَعمال پڑھو، دیکھو! اس میں کتنی اچھی اچھی باتیں ہیں۔

قیامت کے دِن بُرے لوگوں کا اَنجامِ بد

وَمَنْ كَانَ فِیْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰی: یہ مقابلۃً دوسروں کا ذکر کردیا یعنی جن کو ان کا نامۂ اَعمال ان کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا ان کے حالات یہ نہیں ہوں گے کہ وہ خوش ہوں، دوسری آیات کے اندر واضح کیا گیا کہ وہ سارے غمزدہ ہوں گے، روئیں گے، اور کہیں گے کہ ہائے کاش! موت سے ہمارا خاتمہ ہوگیا ہوتا، دوبارہ اٹھنا نصیب نہ ہوتا، اور میرا نامۂ اَعمال میرے ہاتھ میں نہ دیا جاتا، اور

میں نہ دیکھتا میں نے زندگی کے اندر کیا کچھ کیا ہے وہ میرے سامنے نہ آتا، سورۂ حاقہ کے اندر اس قسم کی باتیں ساری کی ساری نقل کی ہوئی ہیں، یٰلَیْتَنِیْ لَمْ اُوْتَ کِتٰبِیَهْ...... یٰلَیْتَهَا کَانَتِ الْقَاضِیَةَ، موت ہی خاتمہ کر دیتی، دوبارہ اٹھانا نہ ہوتا، وہ اس قسم کی باتیں کرے گا۔ وَمَنْ كَانَ فِیْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى: جو شخص اس دنیا کے اندر اندھا ہے، اللہ تعالیٰ کی آیات کو دیکھتا نہیں، نشانیوں کو دیکھتا نہیں، دیکھ کے ہدایت حاصل نہیں کرتا، یہاں اندھے سے یہی عقل کا اندھا مراد ہے، باطن کا اندھا، جو اللہ تعالیٰ کی آیات کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں دیکھ کر صحیح راستے کو اختیار نہیں کرتا، فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى: وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا، وہ اپنی کامیابی کی منزل نہیں پاسکے گا، آخرت میں وہ ایسا راستہ اختیار نہیں کر سکے گا جو اس کو کامیابی کی طرف لے جائے، وَاَضَلُّ سَبِیْلًا: اور زیادہ بھٹکا ہوا ہوگا از روئے راستے کے، کہ دنیا کے اندر بھی بھٹکتا ہے لیکن اس میں پھر بھی سیدھے راستے پر آنے کا امکان ہوتا ہے، کہ انسان متنبہ ہو کے اپنی غلطی کو چھوڑ دے اور سیدھے راستے پر آجائے، لیکن آخرت میں جو بھٹک گیا وہ تو ایسا بھٹکے گا کہ پھر سیدھے راستے پر آنے کا کوئی امکان نہیں، اس لئے اس کو اَضَلّ قرار دیا گیا ہے۔

مشرکین کا سرورِ کائنات ﷺ سے مطالبہ...... اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ

وَاِنْ كَادُوْا لَیَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِیْۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ لِتَفْتَرِیَ عَلَیْنَا غَیْرَهٗ ۖۗ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِیْلًا: آنے والی آیتوں میں دو واقعات کی طرف اشارہ ہے، اور اس میں بھی اصل میں کافروں کو ہی تنبیہ کرنی مقصود ہے کہ وہ اللہ کے نبی کو یوں بہکانے کی کوشش نہ کریں، اللہ کا نبی ان کے بہکاوے میں نہیں آسکتا، مفسرین نے لکھا ہے کہ مشرکین نے سرورِ کائنات ﷺ سے مطالبہ کیا تھا جس کا ذکر پہلے آپ کے سامنے آیا خاص طور پر سورۂ انعام میں کہ ان مساکین کو اپنی مجلس سے اُٹھا دو، تو تب ہم آپ کے پاس آکے بیٹھ سکتے ہیں، کئی آیتوں کے اندر اس کا ذکر آیا ہے، تو چونکہ سرورِ کائنات ﷺ کے دل میں بہت خواہش تھی کہ یہ لوگ ایمان لے آئیں تو اس لئے ہوسکتا ہے کہ کسی درجے میں......! جیسے کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے صحابہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کے دل میں واقع ہوا جو کچھ واقع ہوا لیکن اللہ کی طرف سے فوراً ممانعت آگئی، اور نبی کا ہر قول فعل چونکہ اللہ تعالیٰ کے نمائندہ ہونے کے طور پر ہوتا ہے، تو آپ یہ جو بھی بات کرتے منسوب اللہ کی طرف ہوتی، نبی کوئی عمل اختیار کریں تو ایسا ہوتا ہے گویا کہ اللہ کے کہنے سے کیا، کوئی بات کرتے ہیں تو ایسا ہوتا ہے گویا کہ اللہ کے کہنے سے کی، تو اگر آپ اُن کا مطالبہ مان لیتے اور ان لوگوں کو اپنی مجلس سے اُٹھا دیتے تو گویا کہ ایسے ہی ہوتا کہ دیکھنے والے کہتے کہ شاید یہ اللہ نے کہا ہے، اور یہ اللہ پر افترا ہوتا، اللہ کی طرف یہ غلط بات منسوب ہوتی، چونکہ اللہ نے تو کہا ہی نہیں، تو اگر ایسا واقعہ پیش آجاتا تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آپ کو دنیا اور آخرت میں دُگنی سزا ہوتی، کیونکہ انسان جتنا مقرب ہوتا ہے، جتنا بڑا ہوتا ہے، اس کی لغزش کے اوپر گرفت اتنی زیادہ ہوا کرتی ہے، صحیح طریقہ یہی ہے، غلط طریقہ یہ ہوتا ہے کہ مقربین کی غلطیوں سے درگزر کر لیا، کوئی تنبیہ نہ کی، جس سے وہ اور زیادہ غلطیاں کریں، اللہ تعالیٰ کے ہاں ایسا نہیں، اللہ تعالیٰ کے ہاں تو جو مقرب ہو اس کی غلطی پر گرفت زیادہ ہے، مؤاخذہ زیادہ ہوگا، چاہے بعد میں درجات بلند ملیں۔ ایک تو اس واقعے کی

طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اگر ہم آپ کو نہ سنبھالتے تو شاید آپ ان کی طرف کچھ مائل ہو جاتے، اور اگر مائل ہو جاتے تو پھر دنیا اور آخرت میں آپ کو یوں سزا ہوتی۔

اور بعض روایات کے اندر یہ ذکر کیا گیا ہے کہ بنوثقیف وغیرہ نے حضور ﷺ کے سامنے یہ پیش کیا تھا کہ اگر آپ فلاں فلاں حکم کو تبدیل کر دیں تو ہم ایمان لا سکتے ہیں، اس طرح سے جیسے مصالحانہ گفتگو ہوا کرتی ہے، کچھ لو اور کچھ دو کا اُصول آج کی سیاست میں جیسے چلتا ہے، کہ کچھ آپ ہماری مان لیں، کچھ ہم آپ کی مان لیں گے، اس طرح سے درمیان میں کوئی بات بنالی جائے، سورۂ یونس میں آیا تھا کہ انہوں نے کہا تھا اس قرآن میں کچھ تبدیلی کر دے، اور چونکہ وہ ایمان لانے کی طمع دلاتے تھے اور اپنی قوم کا ایمان نبی کو سب سے زیادہ محبوب ہوتا ہے تو وسوسے کے درجے میں کوئی خیال آ سکتا تھا کہ اگر ان کی یہ مرضی پوری کر دی جائے تو شاید یہ سیدھے راستے پر آ ہی جائیں، آہستہ آہستہ پھر ان کو ٹھیک راستے پر لے آئیں گے، پہلے یہ مانیں تو سہی، ذرا ان کو قریب کر لو، ان کی اتنی سی بات مان لو۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ نبی اگر کوئی غلط بات تسلیم کر لے تو یہ اللہ پر صراحتاً اِفترا ہے، اس لئے نبی کو تو ہر لحاظ سے کھرا ہی رہنا چاہیے تا کہ آنے والے وقت میں کوئی نہ کہہ سکے کہ دیکھو! فلاں وقت میں نبی نے بھی اللہ کی فلاں معصیت اختیار کر لی تھی، تو یہ اگرچہ تیز کلام بظاہر رسول اللہ ﷺ کی طرف توجہ کر کے کہی جا رہی ہے، لیکن اصل ان مشرکین کو روکنا مقصود ہے اور ان کی حوصلہ شکنی کرنی مقصود ہے کہ ہمارا نبی تمہارا کوئی ایسا مطالبہ نہیں مان سکتا جو اللہ کی مرضی کے خلاف ہے یا قرآنِ کریم کی ہدایات کے خلاف ہے، اور وہ کیسے مان سکتا ہے کہ جب اللہ کی طرف سے اسے ایسے دھمکایا جا رہا ہے کہ اگر تُو ایسے کرے گا تو ہم تجھے سزا دیں گے، اس میں ان کی حوصلہ شکنی ہو جائے گی جو انبیاء علیہم السلام کے اوپر اس قسم کا اثر ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

انبیاء اللہ تعالیٰ کی آخری حجّت ہوتے ہیں

اور دوسرا واقعہ تو وہی ہے کہ جو آپ ﷺ کو مکہ معظمہ سے نکالنے کے لئے کوشاں تھے تو اللہ نے فرمایا کہ یہ کوشش انہی کے لئے نقصان دہ ہے، اگر تُو یہاں سے نکل گیا تو تیرے بعد یہ زیادہ دیر تک نہیں ٹھہریں گے، کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا انبیاء علیہم السلام کے ساتھ طریقہ یہی چلا آ رہا ہے، کہ انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ کی آخری حجت ہوتے ہیں، اگر قوم تنگ کر کے ان کو نکال دیتی ہے تو اس کے بعد پھر وہ قوم تباہی کا نشانہ بن جاتی ہے، اللہ کا عذاب آ جاتا ہے، چاہے اس صورت میں آئے کہ براہِ راست عذاب آیا اور اس ڈھیر کو صاف کر گیا، کیونکہ نبی کے نکل جانے کے بعد تو ایسا ہوتا ہے جیسے حقیقت نکل گئی اور پیچھے جسد بلا رُوح رہ گیا، اور جب رُوح خارج ہو جائے تو اس کے بعد بدن بکھرنے کے لئے ہی ہوتا ہے پھر وہ محفوظ نہیں رہ سکتا، تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام تنگ آ کے نکل جائیں تو قوم کی قوم ہی اللہ کے عذاب میں گرفتار ہو جاتی ہے، یا پھر ایسا ہوتا ہے کہ نبی کو قوت دی جاتی ہے اور اس کے متبعین کے ذریعے سے ان کا سر کٹوا دیا جاتا ہے، چنانچہ یہاں بھی ایسے ہی ہوا کہ جب حضور ﷺ کو مکہ معظمہ سے نکال دیا گیا یا آپ اللہ کے اِذن سے مکہ معظمہ سے چلے گئے تو اس کے بعد کوئی زیادہ دیر نہیں لگی، اہلِ مکہ بہت جلدی برباد ہو گئے تباہ ہو گئے، آٹھ سال کے اندر اندر ہی ان کا سارا مرکز ختم ہو گیا، پہلے بدر میں پٹائی ہو گئی، پھر اُحد میں پریشان ہوئے، پھر غزوۂ اَحزاب میں ہوئے، اور ایک وقت

آیا کہ پھر ساری کی ساری قوم ہی ہاتھ باندھ کے سامنے کھڑی ہوگئی اور زیر ہوگئی۔ تو اس میں بھی انہی کو تنبیہ کرنی مقصود ہے کہ تم جو نبی کو یہاں سے نکالنا چاہتے ہو یاد رکھو! یہ تو تم اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار رہے ہو۔

مشرکین کے غلط مطالبوں پر ڈانٹ

وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ: اِنْ یہ مخففہ من المثقلہ ہے، بے شک بات یہ ہے کہ قریب ہے کہ یہ لوگ پھسلا دیں تجھے اس چیز سے جو ہم نے تیری طرف وحی کی ہے، تجھے پھسلا دیں یعنی کسی فتنے میں ڈال دیں اور آپ کو اس چیز سے ہٹا دیں جو ہم نے آپ کی طرف وحی کی ہے، لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ: جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ ہمارے اوپر وحی کے علاوہ کوئی اور بات گھڑیں گے، غَيْرَهٗ میں ''ہٗ'' ضمیر اَلَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ کی طرف لوٹ رہی ہے،'' اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ اَلَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ کے علاوہ ہماری طرف اور بات گھڑ کے منسوب کریں گے''، '' تاکہ گھڑیں آپ ہمارے ذِمّے کوئی اور بات'' وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا: اِذًا کی تنوین عوضِ مضاف الیہ ہے، جب آپ ایسا کرلیں، ان کے کہنے کے مطابق وحی شدہ اَحکام میں سے بعض کو چھوڑ دیں،'' تب یہ لوگ تجھے اپنا دوست بنالیں گے'' ان کی اس قسم کی کوشش ہے کہ آپ کو بعض اَحکام سے پھسلا دیں اور اس کے نتیجے میں یہ آپ سے دوستی لگالیں گے۔ وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ: اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ ہم نے تجھے ثابت قدم رکھا، یا، اگر ہمارا تجھ کو ثابت قدم رکھنا نہ ہوتا لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا: رُکون قلبی میلان کو کہتے ہیں۔ ''تو قریب تھا کہ آپ ان کی طرف تھوڑا سا مائل ہو جاتے'' اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ: اور اگر آپ کی طرف سے یہ رکون پایا جاتا، آپ ان کی طرف مائل ہو جاتے، تب البتہ چکھاتے ہم آپ کو ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ: ضِعف عذابِ الحیاۃ و ضِعف عذابِ المماتِ، حیاۃ سے حیاتِ دُنیوی مراد ہے، ہم دُنیوی زندگی کا بھی دوگنا آپ کو چکھاتے اور موت کے عذاب کا بھی دوگنا آپ کو چکھاتے، زندگی کا عذاب بھی دوگنا آپ کو دیتے، یعنی باقیوں کے مقابلے میں پھر سزا آپ کو زیادہ ہوتی، اسی قسم کا عنوان اختیار کیا گیا سرورِ کائنات ﷺ کی بیویوں کے متعلق، جیسے اکیسویں پارے کے آخر میں آئے گا مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ: تو وہاں بھی ایسے ہی تھا کہ اگر تم میں سے کسی نے ایسی حرکت کی تو دُگنی سزا دی جائے گی، یہ علامت ہے اس بات کی کہ جو جتنا مقرب ہوا کرتا ہے اس کی لغزش کے اُوپر گرفت اتنی ہی زیادہ ہوتی ہے، ''دُنیوی زندگی کے عذاب کا دوگنا اور موت کے عذاب کا دوگنا ہم آپ کو چکھاتے'' ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا: پھر آپ اپنے لیے ہمارے خلاف کوئی مددگار نہ پاتے اگر ایسا ہو جاتا، یہ اگرچہ کلام کی تیزی بظاہر حضور ﷺ کی طرف ہے لیکن حقیقت میں ڈانٹنا انہی کو مقصود ہے جو غلط مطالبے کرتے ہیں، کہ تمہارے مطالبے کیسے پورے کیے جاسکتے ہیں اگر ہمارا نبی ایسا کرے تو عتاب میں آجائے گا، اور تمہارے مطالبے اتنے خراب ہیں کہ اس تصور کے ساتھ ہی کتنی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے سختی کی جارہی ہے کہ اگر ایسا ہوجاتا تو ہم یوں کر دیتے، تو اس میں اصل ڈانٹ انہی کو مقصود ہے جو اس قسم کے مطالبے لے کے آئے۔ وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ: اور قریب ہے کہ یہ لوگ اکھاڑ دیتے آپ کو زمین سے، استفزاز کا لفظ وہی ہے جس کا ذِکر پچھلے رکوع میں آیا تھا، قریب

ہے کہ یہ لوگ تجھے گھبراہٹ میں ڈال کے اکھاڑ دیتے زمین سے، لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا: تاکہ نکال دیں تجھے اس زمین سے، وَاِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا: اور تب یعنی جس وقت کہ آپ کو نکالنے میں کامیاب ہو جائیں تب یہ نہیں ٹھہریں گے آپ کے پیچھے مگر بہت کم، تو گویا کہ مکہ معظمہ میں ہی کہا جا رہا ہے کہ اگر انہوں نے اسی طرح سے تنگ کر کے نکال دیا تو یہ سمجھ لیں کہ پھر ان کا وقت بھی بہت قریب ہے، پھر یہ نہیں ٹھہر سکتے، سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا: مثل طریقے ان لوگوں کے جن کو ہم نے پہلے بھیجا ہے، یعنی پہلے رسولوں کی سیرت یہی بتاتی ہے، ہمارا طریقہ ان میں یہی تھا کہ اگر انبیاء علیہم السلام کو قوم نے تنگ کر کے نکال دیا تو اس کے بعد پھر وہ قوم زیادہ دیر تک باقی نہیں رہتی۔ یاد کیجئے اُس طریقے کو، یا، جاری کیا اللہ تعالیٰ نے طریقہ، جس طرح سے چاہیں آپ سُنَّةَ کے نصب کی تاویل کر لیں۔ ”مثل طریقے ان لوگوں کے جو بھیجے ہم نے آپ سے قبل اپنے رسولوں سے، اپنے رسولوں میں سے جن رسولوں کو ہم نے آپ سے پہلے بھیجا ان کے طریقے کی طرح، یا ان کے طریقے کو یاد کیجئے۔“ وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا: اور نہیں پائیں گے آپ ہمارے طریقے کے لئے کوئی کسی قسم کی تبدیلی، جو طریقہ ہم نے ان کے بارے میں جاری کیا تھا وہ آج بھی باقی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے نکل جانے کے بعد پھر باقی لوگوں کو زیادہ دیر تک باقی نہیں رکھا جاتا۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ

قائم کرو تم نماز کو سورج کے ڈھل جانے کے وقت رات کی تاریکی تک، اور فجر کی نماز کو بھی (قائم کیجئے) بے شک فجر کی نماز ایک ایسی نماز

مَشْهُوْدًا ﴿۷۸﴾ وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا

ہے جس میں حاضری ہوتی ہے ﴿۷۸﴾ اور رات کے کچھ حصے میں بھی بیدار رہا کیجئے، اُمید ہے کہ آپ کا رَبّ آپ کو مقام محمود میں

مَّحْمُوْدًا ﴿۷۹﴾ وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ

اُٹھائے گا ﴿۷۹﴾ آپ کہیے کہ اے میرے رَبّ! داخل کر مجھ کو اچھی طرح سے داخل کرنا اور نکالیے مجھ کو اچھی طرح سے نکالنا،

وَّاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا ﴿۸۰﴾ وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ

اور آپ کر دیجئے میرے لیے اپنے پاس سے ایسا غلبہ جس میں تیری نصرت شامل ہو ﴿۸۰﴾ اور آپ کہہ دیجئے کہ حق آ گیا اور باطل چلا گیا،

اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ﴿۸۱﴾ وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ

بے شک باطل جانے والی ہی چیز ہے ﴿۸۱﴾ اُتارتے ہیں ہم وہ چیز جو کہ شفا ہے اور رحمت ہے مؤمنین کے لئے یعنی قرآن،

وَلَا یَزِیْدُ الظّٰلِمِیْنَ اِلَّا خَسَارًا ﴿۸۲﴾ وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَی الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ

اور نہیں بڑھاتا یہ قرآن ظالموں کو مگر خسارہ ﴿۸۲﴾ اور جب ہم انسان پر انعام کرتے ہیں تو یہ اعراض کر جاتا ہے اور پہلو تہی کر جاتا ہے،

وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ یَـُٔوْسًا ﴿۸۳﴾ قُلْ كُلٌّ یَّعْمَلُ عَلٰی شَاكِلَتِهٖ ؕ

اور جب اس کو کوئی تکلیف پہنچ جاتی ہے تو بالکل ہی مایوس ہو جاتا ہے ﴿۸۳﴾ آپ کہہ دیجئے ہر کوئی اپنے طریقے پر عمل کرتا ہے،

فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰی سَبِیْلًا ﴿۸۴﴾ ع

تمہارا رب خوب جانتا ہے اس شخص کو جو کہ زیادہ ہدایت یافتہ ہے از روئے راستے کے ﴿۸۴﴾

تفسیر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ: قائم کر تو نماز کو۔ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ: لام بمعنی وقت، اور دُلوك: ڈھل جانا۔ ''سورج کے ڈھل جانے کے وقت'' اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ: رات کی تاریکی تک، غسق: رات کا تاریک ہونا، رات کا تاریک ہونا اس وقت ہوتا ہے جب سورج کے غروب ہونے کے بعد سرخی ختم ہو جائے، اور سرخی کے بعد پھر اُفق کے اوپر سفیدی ختم ہو جائے اور کنارہ خالص سیاہ ہو جائے تو یہ غسقِ لیل ہو جائے گا، زوالِ شمس سے لے کر غسقِ لیل تک اس دوران میں شریعت نے چار نمازیں متعین کی ہیں، سورج کے ڈھلتے ہی ظہر کی نماز پڑھی جاتی ہے، اور پھر اس کے بعد عصر کا وقت آتا ہے، پھر غروبِ شمس کے وقت مغرب کا وقت آتا ہے، پھر جس وقت رات کی تاریکی آ جاتی ہے تو اس وقت عشاء کا وقت آتا ہے، چار نمازوں کے اوقات اس میں آ گئے، وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ: اس کا عطف الصَّلٰوةَ پر ہے، اَقِمْ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ، اور قران کا لفظ بول کر صلوٰۃ ہی مراد ہے، چونکہ نماز میں قرآنِ کریم بھی پڑھا جاتا ہے اس لئے ذِکرُ الجزءِ وارداۃُ الکلِ، جز کا ذکر کر کے کُل کا ارادہ کیا جاتا ہے، جیسے سجدے کا حکم آتا ہے تو اس سے مراد بھی نماز پڑھنا ہوتا ہے، اللہ کے سامنے رکوع کرنے کا ذکر آ جائے تو اس سے مراد بھی نماز پڑھنا ہوتا ہے، اسی طرح سے قرآنِ کریم کے تذکرے سے بھی نماز ہی مراد ہے، البتہ صلوٰۃِ فجر کو قُرْاٰنَ الْفَجْرِ کے ساتھ تعبیر کرنے میں اس بات کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے کہ باقی نمازوں کے مقابلے میں اس نماز میں قرآنِ کریم زیادہ پڑھا جاتا ہے، تو ''فجر کی نماز کو بھی قائم کیجئے''، یہ بھی ''اَقِمْ'' کا مفعول ہو گیا، اور اقامت صلوٰۃ کا ذکر آپ کے سامنے بار ہا ہو گیا کہ نماز کے اہتمام کرنے کو کہتے ہیں، صرف پڑھنا نہیں بلکہ آداب کی رعایت رکھتے ہوئے، اس کی شرائط کی رعایت رکھے ہوئے، کامل مکمل طریقے سے نماز کو ادا کیا جائے یہ ہے اقامت صلوٰۃ۔

ماقبل سے ربط

پچھلی آیات میں دشمنوں کی کارروائیوں کا ذکر تھا کہ وہ سرورِ کائنات ﷺ کو کس طرح سے شریعت کے احکام سے پھسلانے کی کوشش کرتے ہیں یا آپ کو اپنے علاقے سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں، اور قرآن کریم میں متعدد مقامات پر یہ بات

مذکور ہے کہ جہاں بھی دشمنوں کی طرف سے پریشان کرنے کا ذکر آتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے سرورِ کائنات ﷺ کو نماز اور تسبیح کی طرف متوجہ ہونے کے لئے کہا جاتا ہے، کیونکہ جب اللہ کی طرف جس وقت متوجہ ہو جائیں تو دل کو قوت حاصل ہوتی ہے، اور دشمنوں کی کارروائیوں کا مقابلہ کرنے کی طاقت ہوتی ہے، اور ویسے بھی نماز اور ذکر اللہ تعالیٰ کی نصرت اور اللہ تعالیٰ کی اعانت کے حاصل کرنے کا بھی ذریعہ بنتا ہے، اس سے بھی دشمنوں کے مقابلے میں غلبہ پانے کے اسباب حاصل ہوتے ہیں۔ تو یہ پانچ نمازوں کے اوقات اس آیت کے اندر مذکور ہو گئے ''قائم کیجئے نماز کو سورج کے ڈھلنے کے وقت رات کی تاریکی تک اور فجر کی نماز کو'' قُرْاٰنَ الْفَجْرِ سے صلوٰۃ الفجر مراد ہے۔

فجر کی نماز کی خصوصیت وبرکات

اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا: یہ فجر کی نماز کی خصوصیت کی طرف اشارہ کر دیا۔ بے شک فجر کی نماز مشہود ہے، مشہود، شَهِدَ سے اسم مفعول کا صیغہ ہے، شَهِدَ بمعنی حاضر ہونا، مشہود: جس میں حاضری ہوتی ہے، تو كَانَ مَشْهُوْدًا کا معنی ہوگا کہ فجر کی نماز ایک ایسی نماز ہے کہ جس میں حاضری ہوتی ہے، اس حاضری کا کیا مطلب؟ دو طرح سے اس مفہوم کو ذکر کیا جاتا ہے، ایک تو یہ کہ باقی نمازوں کے مقابلے میں پڑھنے والے کا دل اس میں حاضر زیادہ ہوتا ہے، کیونکہ دوسری جتنی بھی نمازیں ہیں وہ کسی نہ کسی درجے میں کاروبار میں مشغولیت یا دیگر کاموں کے وقت میں ہوتی ہے، ظہر کا وقت ہے عصر کا وقت ہے مغرب کا وقت ہے عشاء کا وقت ہے، عشاء کے وقت خصوصیت سے انسان سارے دن کا تھکا ماندہ سونے کی فکر میں ہوتا ہے، مغرب کا وقت کھانے پینے کا وقت بھی ہے کاروبار سمیٹنے کا بھی ہے، اسی طرح سے عصر کا وقت تو بہت ہی مشغولیت کا ہوتا ہے چونکہ دن ختم ہو رہا ہوتا ہے، ہر شخص کوشش کرتا ہے کہ رات کے آنے سے پہلے پہلے میں کام کو سمیٹ لوں، اور ایسے ہی ظہر بھی چونکہ دن کے وسط میں ہوتی ہے تو وہ کاروبار کا وقت بھی ہے اور اس میں دیگر مشغولیت بھی ہوتی ہے، اور فجر کا وقت ایک ایسا وقت ہے کہ انسان پوری طرح سے آرام کر کے، جس کو آپ اپنی زبان میں کہہ سکتے ہیں کہ اوور حال ہو کے اگلے دن کے لئے اُٹھتا ہے، تھکاوٹ کوئی نہیں ہوتی، دن کی ابتدا ہو رہی ہوتی ہے، اور اسی طرح سے معدے کی کیفیت بھی اس وقت ایسی ہوتی ہے کہ نہ انسان زیادہ رَجا ہوا ہوتا ہے اور نہ بھوکا ہوتا ہے، تو ایسے وقت میں دل زیادہ لگتا ہے اور طبیعت زیادہ متوجہ ہوتی ہے، تو مشہود ہونے کا یہ معنی بھی ہو سکتا ہے۔ اور مشہود ہونے کا یہ معنی بھی ہے کہ اس میں فرشتوں کی حاضری ہوتی ہے اور یہ بات صحیح روایات میں آئی ہوئی ہے سرورِ کائنات ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتے متعین ہیں انسانوں کے اعمال لکھنے پر اور دیگر امور کی نگرانی پر، اور ان کی باریاں بدلتی ہیں، جن فرشتوں نے رات یہاں گزاری ہوئی ہوتی ہے وہ بھی فجر کے وقت میں موجود ہوتے ہیں، اور جنہوں نے دن گزارنا ہوتا ہے وہ بھی آ جاتے ہیں، تو فجر کے وقت میں دونوں جماعتیں جمع ہوتی ہیں، اور فجر کی نماز سے فارغ ہو کر رات والے واپس چلے جاتے ہیں اور دن والے اپنا چارج سنبھال لیتے ہیں، اور اسی طرح سے شام کو عصر کے وقت میں دونوں جماعتیں اکٹھی ہوتی ہیں، دن والے فرشتے بھی موجود ہوتے ہیں اور رات والے بھی آ جاتے ہیں، اور عصر کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد دن والے فرشتے چلے جاتے ہیں اور رات والے را

جاتے ہیں۔[1] تو ان دو نمازوں میں بمقابلہ دوسری نمازوں کے فرشتوں کا حضور زیادہ ہوتا ہے، اسی لئے روایات میں زیادہ فضیلت بھی انہی دو نمازوں کی ہے اور تاکید بھی انہی دو نمازوں کی ہے، تو کَانَ مَشْهُوْدًا کا مطلب یہ ہوگیا کہ فجر کی نماز ایک ایسی نماز ہے جس میں فرشتوں کی حاضری کثرت سے ہوتی ہے، تو فرشتوں کی حاضری کثرت سے ہونا یہ باعث برکت ہے، اور جب یہ اللہ تعالیٰ کے پاس جاتے ہیں، تو پھر اپنے دیکھے ہوئے حالات یہ اللہ کے سامنے شہادت دیتے ہیں، تو انسان اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔

''تہجد'' کی فضیلت اور اس کا شرعی حکم

وَمِنَ الَّیْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ: یہ چھٹی نماز کا ذکر آگیا۔ مِنَ الَّیْلِ میں من تبعیضیہ ہے یعنی بعض اللیلِ، اور ''تَهَجَّدْ'' اَمر کا صیغہ ہے، مصدر اس کا تَهَجُّد ہے، اور یہ لفظ هُجُود سے لیا گیا ہے، هجود کا معنی ہوتا ہے سونا، اور تہجد باب تفعل میں سلب ماخذ ہے، نیند کو چھوڑنا، هجود: سونا، اور تہجد: ترکِ ہجود، نیند کو چھوڑنا، جاگنا۔ بِهٖ کی ضمیر میں دونوں احتمال ذکر کیے گئے ہیں کہ یہ رات کی طرف لوٹ رہی ہے یا قرآنِ کریم کی طرف، دونوں طرح سے مفہوم واضح ہے ''اور رات کے کچھ حصے میں بھی نماز قائم کیجئے'' مِن بعض کے معنی میں ہے، اور ''اَقِمْ'' والا مفہوم یہاں بھی ہے، ''رات کے کچھ حصے میں بھی نماز قائم کیجئے''، اور فَتَهَجَّدْ بِهٖ یہ اسی کا بیان آگیا، یعنی رات کے کچھ حصے میں بھی بیدار رہا کیجے، اگر بِهٖ کی ضمیر لیل کی طرف لوٹائیں گے تو مطلب یہ نکلے گا کہ رات کے کچھ حصے میں بیدار رہا کیجئے، ساری رات سو کر نہ گزارا کرو۔ اور اگر یہ ضمیر قرآنِ کریم کی طرف لوٹائیں تو پھر معنی یہ ہوگا کہ رات کو قرآنِ کریم کے ساتھ بیدار رہئے، تو قرآنِ کریم کے ساتھ بیدار رہنے کا یہی مطلب ہے کہ نماز پڑھو اور اس کے اندر قرآنِ کریم پڑھو۔

نَافِلَةً لَّكَ: نافلة زائدة کے معنی میں ہے، اس حال میں کہ یہ آپ کے لئے ایک زائد چیز ہے، یعنی فرضوں سے اللہ نے اس کو زائد بنایا، تو یہ تہجد سرورِ کائنات ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے نافلة قرار دی جارہی ہے، جس سے معلوم ہوگیا کہ حضور ﷺ پر تہجد فرض نہیں تھی لیکن آپ نے پابندی اس کی ساری زندگی کی ہے، اور اگر کسی رات آپ کسی وجہ سے اُٹھ نہیں سکے تو دِن کو نوافل پڑھے ہیں جیسا کہ روایاتِ صحیحہ میں آتا ہے۔[2] جس وقت پانچ نمازیں فرض نہیں ہوئی تھیں تو سب سے پہلے یہ تہجد کی نماز فرض تھی جیسے تفصیل آپ کے سامنے سورۂ مزمل میں آئے گی، سرورِ کائنات ﷺ پر بھی یہ فرض تھی اور صحابہ کرام پر بھی فرض، بعد میں دوسرا رکوع جو ایک سال بعد اُترا اس کے اندر پھر اس کی فرضیت کو منسوخ کر دیا گیا، اور اختیار دے دیا گیا کہ جتنا قرآن پڑھ سکو پڑھ لیا کرو اور جتنی نماز پڑھ سکو پڑھ لیا کرو، اللہ تعالیٰ نے آسانی کردی کہ بعضے تم میں سے بیمار ہوتے ہیں جو اس کو نہیں نبھا سکتے، بعض سفر پہ ہوتے ہیں، بعضے تجارت کے لئے اور رزق تلاش کرنے کے لئے سفر کرتے ہیں، بعض اللہ کے راستے میں جہاد کرتے ہیں، تو ایسے حالات میں رات کا اندازہ کرنا مشکل ہوجاتا ہے، تو اس لئے آسانی پیدا کردی گئی اور فرضیت منسوخ ہوگئی، اور یہ فرضیت صحابہ سے بھی منسوخ ہوگئی اور

---

(۱) بخاری ۷۹/۱ باب فضل صلاة العصر - ۴۵۷/۱ باب ذکر الملائکة/ مشکوٰۃ ۶۲/۱ باب فضائل الصلوٰۃ کی تیسری حدیث۔

(۲) صحیح مسلم ۲۵۶/۱ باب جامع صلاة اللیل/ مشکوٰۃ ۱۱۱/۱ باب الوتر فصل اول، عن سعد بن هشام ولفظ الحدیث: بال الشیطان فی اذنه

سرورِ کائنات ﷺ سے بھی، ایک قول یہ ہے، اور ایک قول یہ ہے کہ صحابہ کرام سے تو فرضیت منسوخ ہوگئی تھی سرورِ کائنات ﷺ پر فرضیت باقی رہی تھی، اس قول کے مطابق نَافِلَةً لَّكَ کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ کے لئے یہ فرضوں سے ایک زائد فرض ہے، تو نافلۃ کا معنی تو وہی ہے زائدۃ، لیکن مطلب یہ ہوگا کہ فرضوں سے ایک زائد فرض ہے آپ کے لئے، لیکن اس قول کو مرجوح قرار دیا گیا ہے، راجح قول یہی ہے کہ تہجد سرورِ کائنات ﷺ پر بھی فرض نہیں رہی، تو جب یہ حضور ﷺ پر بھی فرض نہیں رہی اور صحابہ پر بھی فرض نہیں رہی تو پھر شریعت میں اس نماز کا درجہ کیا ہے؟ آپ جانتے ہیں کہ سرورِ کائنات ﷺ سے جو چیز عملاً ثابت ہو اور پھر اس کے کرنے کی ترغیب بھی دی گئی ہو اور چھوڑنے پر کسی درجے میں انکار بھی کیا گیا ہو اور چھوڑنے والوں کا تذکرہ کوئی اچھے الفاظ میں نہ کیا گیا ہو، عملاً حضور ﷺ نے اس کے اوپر دوام کیا ہو، یہ ساری کی ساری چیزیں ایسی ہیں جو اصل کے اعتبار سے تو وجوب کا تقاضا کرتی ہیں، لیکن اگر اس کو واجب قرار دیتے ہیں تو وہی تنگی پھر لازم آتی ہے جس کی بناء پر اس کو منسوخ کیا گیا تھا، اس لئے علماء کے نزدیک تہجد کو سُنّتِ مؤکدہ کے درجے میں رکھا گیا ہے، سُنّتِ مؤکدہ کی تعریف اس کے اُوپر پوری پوری صادق آتی ہے کہ حضور ﷺ نے اس پر دوام بھی فرمایا اور اس کے پڑھنے کی ترغیب بھی دی، اور جو صبح نہیں اُٹھتے ان کا تذکرہ رسول اللہ ﷺ نے اچھے الفاظ میں نہیں فرمایا، جیسا کہ ''مشکوٰۃ شریف'' میں آپ کے سامنے روایت آئے گی صلوٰۃ اللیل کے باب میں، کہ حضور ﷺ کے سامنے ذکر کیا گیا کہ ایک شخص صبح ہونے تک سویا رہا، ''مَا زَالَ نَائِمًا حَتّٰى اَصْبَحَ'' (اَصْبَحَ کا لفظ آپ جانتے ہیں کہ طلوعِ فجر کے لئے بولا جاتا ہے، یہاں اَشْرَقَ نہیں ہے جو سورج نکلنے کے لئے بولا جاتا ہے) طلوعِ صبح تک وہ سویا رہا، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''ذَالِكَ رَجُلٌ بَالَ فِیْ اُذُنِهٖ الشَّیْطَانُ''، یا ''بَالَ الشیطانُ فِی اُذُنِہٖ'' او کما قال علیہ الصلوۃ والسلام[1] کہ یہ شخص تو ایسا ہے کہ اس کے کان میں شیطان نے پیشاب کردیا، تو یہ اس کے لئے ایک مذمت کا عنوان ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے آپ ﷺ نے خطاب کر کے کہا تھا کہ اے عبداللہ! فلاں شخص کی طرح نہ ہوجانا کہ جو رات کو اُٹھا کرتا تھا اور تہجد پڑھا کرتا تھا، پھر اس نے چھوڑ دی۔[2] تو یہ چھوڑ دینا یہ بھی گویا کہ حضور ﷺ نے پسند نہیں فرمایا۔ ترغیب تو بہت روایات میں دی گئی ہے، اور اولیاء اللہ کے نزدیک باطنی کمال حاصل کرنے کے لئے تو تقریباً یہ شرطِ اوّل کے طور پر ہے، کہ جس شخص کو رات کو اُٹھنے کی عادت نہ ہو، رات کو اُٹھ کے وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑگڑاتا نہیں ہے، ذکر اذکار نہیں کرتا، وہ باطنی کمالات حاصل کرنے میں بہت پیچھے رہ جاتا ہے۔ تو مستحب تو اعلیٰ درجے کی ہے، اس میں تو کوئی شک کیا نہیں جاسکتا، اور ''تفسیر مظہری'' میں قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمہ اللہ نے اس کو سُنّتِ مؤکدہ قرار دیا ہے کہ راجح یہی ہے کہ یہ سُنّتِ مؤکدہ ہے، کہ جو تعریف سُنّت مؤکدہ کی ہے وہ کامل مکمل طریقے سے تہجد کی نماز پر صادق آتی ہے۔

''مقامِ محمود'' سرورِ کائنات ﷺ کے لئے عظیم اعزاز

عَسٰۤى اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا: عَسٰى افعالِ مقاربہ میں سے ہے، ''اُمید ہے'' یعنی آپ کو اُمید رکھنے چاہیے'' کہ

---

(۱) مشکوٰۃ ۱/ ۱۰۹، باب التحریض علی قیام اللیل۔ فصل اول۔ واللفظ لہ۔ بخاری ۱/ ۱۵۳، باب اذا نام ولم یصل الخ

(۲) بخاری ۱/ ۱۵۴، باب ما یکرہ من ترک قیام اللیل الخ۔ مسلم ۱/ ۳۶۶، باب النہی عن صوم الدھر۔ مشکوٰۃ ۱/ ۱۰۹، باب التحریض علی قیام اللیل۔ فصل ثالث۔

آپ کا رَبّ آپ کو مقامِ محمود میں اُٹھائے گا۔'' مقامِ محمود کیا چیز ہے؟ یہ حدیثِ شفاعت کے اندر آپ کے سامنے تفصیل سے گزر گیا کہ جب ساری کی ساری مخلوق قیامت کے میدان میں جمع ہوگی، اور کسی کو اللہ تعالیٰ کے سامنے دَم مارنے کی طاقت نہیں ہوگی، تو مخلوق سرورِ کائنات ﷺ کے پاس آئے گی کہ اللہ سے سفارش کر کے ہمارا حساب وکتاب شروع کروادیجئے تو آپ کو جو شفاعت کرنے کی اجازت ملے گی شفاعتِ کبریٰ جس کا فائدہ ساری مخلوق کو پہنچنا ہے، اور یہ مقام ساری کائنات میں سے صرف سرورِ کائنات ﷺ کو حاصل ہوگا، حضور ﷺ نے فرمایا کہ یہی مقامِ محمود ہے،'' [1] تو اللہ تبارک وتعالیٰ شفاعت کبریٰ عطا فرمائیں گے، جیسے کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ میرے لئے وسیلے کی دُعا کیا کرو، پوچھا گیا کہ یارسول اللہ! وسیلہ کیا چیز ہے؟ فرمایا کہ جنت میں ایک اعلیٰ مقام ہے جو ساری مخلوق میں سے صرف ایک کو ہی ملنا ہے، اور میں اُمید رکھتا ہوں کہ مجھے مل جائے گا،'' [2] اس لئے اللہ تعالیٰ سے میرے لئے وسیلہ مانگا کرو، جو میرے لئے وسیلہ مانگے گا میں اس کے لئے قیامت کے دِن سفارش کروں گا (حوالہ مذکورہ)۔ تو یہ مقامِ محمود شفاعتِ کبریٰ کا مقام ہے، حضرت مجدّد الف ثانی ﷫ کی طرف سے اس آیت پر نقل کیا گیا ہے کہ آپ فرمایا کرتے تھے کہ مقامِ شفاعت یہ مقامِ محمود ہے، شفاعتِ کبریٰ تو سرورِ کائنات ﷺ کے لئے ہے، اور شفاعتِ صغریٰ تو دوسرے لوگوں نے بھی کرنی ہے، وہ فرماتے تھے کہ تہجد کی پابندی کو خاص اثر ہے مقامِ شفاعت کے حاصل ہونے کے لئے (مظہری)، اس لئے اگر کوئی شخص خود اچھا ہے، عالم ہے جیسا بھی ہے، لیکن اگر تہجد پڑھنے کی عادت نہیں تو اس کے لئے مقامِ شفاعت کے حاصل ہونے کا یقین نہیں کیا جاسکتا، ان دونوں آیتوں کا تناسب یہ بتاتا ہے کہ مقامِ شفاعت حاصل کرنے کے لئے تہجد کا پڑھنا بہت مؤثر ہے۔

مکی زندگی کی مشکلات ختم ہونے کی پیش گوئی

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ: یہ سرورِ کائنات ﷺ کو بظاہر تو ایک دُعا سکھائی گئی ہے لیکن حقیقت کے اعتبار سے یہ ایک پیش گوئی بھی ہے، اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مکی زندگی کی مشکلات اب ختم ہونے والی ہیں اور آپ کو یہاں سے نکالا جائے گا، ہجرت کا موقع آئے گا، پھر اللہ تبارک وتعالیٰ آپ کو غلبہ دیں گے، حق غالب آئے گا، باطل مٹ جائے گا، دُعا کے رنگ میں یہ پیش گوئی کی گئی ہے، جس طرح سے سورۂ آل عمران میں قُلِ اللّٰھُمَّ مٰلِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَآءُ میں یہی بات ہے کہ وہاں بھی بظاہر دُعا کی تلقین ہے لیکن حقیقت میں وہاں بھی ایک پیش گوئی ہے،'' آپ کہئے'' یعنی دُعا کیجئے رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ: مُدْخَلَ صِدْقٍ اور مُخْرَجَ صِدْقٍ میں اضافت موصوف کی صفت کی طرف ہے، اور مصدر میمی کے طور پر بھی اس کا ترجمہ ہوسکتا ہے اور ظرف کے طور پر بھی ترجمہ ہوسکتا ہے، ان دونوں کی ترکیب ایسے ہی ہے جیسے قَدَمَ صِدْقٍ (یونس: ۲)، لِسَانَ صِدْقٍ (مریم: ۵۰)، فِیْ مَقْعَدِ صِدْقٍ (القمر: ۵۵)، یہ الفاظ قرآنِ کریم کے اندر آئے ہیں۔'' آپ کہیے کہ اے میرے رَبّ! داخل کر مجھ کو اچھی داخل کرنے کی جگہ میں، ایسی جگہ میں جو اچھی ہے'' یا'' داخل کر مجھ کو اچھی طرح سے داخل کرنا'' یعنی میں خیر وعافیت کے

---

(۱) دیکھئے: بخاری ۲/ ۱۱۰۸، باب قول اللہ وجوہ یومئذ ناضرۃ مشکوۃ ۲/ ۴۸۸، باب الحوض والشفاعۃ فصل اول عن انس۔

(۲) ترمذی ۲/ ۲۰۲، کتاب المناقب مشکوۃ ۲/ ۵۱۴، باب فضائل سید المرسلین فصل ثانی، عن ابی ہریرۃ۔ نیز مسلم ۱/ ۱۶۶، باب استحباب القول مثل الخ۔

ساتھ جاؤں جدھر بھی جاؤں،''اور نکالئے مجھ کو اچھی طرح سے نکالنا'' میرا نکلنا بھی عافیت کے ساتھ ہو اور تیری رضا کے مطابق ہو، اور میرا جانا بھی عافیت کے ساتھ ہو اور تیری رضا کے مطابق ہو، نکلنا بھی میرے لئے ہر لحاظ سے مفید ہو، اور جہاں میں جاؤں وہاں جانا بھی میرے لئے ہر لحاظ سے مفید ہو، مُدْخَلَ صِدْقٍ اور مُخْرَجَ صِدْقٍ کا مفہوم یوں ہوگا۔ وَّاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا: اور میرے لئے کر دیجئے اپنے پاس سے ایسا غلبہ جس میں تیری نصرت شامل ہو (نصیر بمعنی منصور)، کیونکہ غلبہ تو بسا اوقات عارضی طور پر کافروں کو بھی حاصل ہو جاتا ہے، لیکن اس میں اللہ کی طرف سے نصرت شامل نہیں ہوتی جس کی بنا پر وہ غلبہ ان کے لئے انجام کار فتنہ بنتا ہے، چاہے دنیا میں چاہے آخرت میں، لیکن جس غلبے کے ساتھ اللہ کی نصرت ہوگی اس غلبے کا دنیا میں بھی فائدہ ہوگا، آخرت میں بھی فائدہ ہوگا۔''آپ کر دیجئے میرے لیے'' یہ بھی دُعا کا حصہ ہے،''کر دیجئے میرے لیے اپنے پاس سے ایسا غلبہ جس میں تیری نصرت شامل ہو''،''اور آپ یہ بھی کہہ دیجئے'' یعنی اعلان کر دیجئے، اس کے اعلان کرنے کا وقت آ گیا، پیش گوئی کے طور پر یہ آیات پہلے اتریں، اور فتح مکہ کے موقع پر جب سرورِ کائنات ﷺ کا داخلہ بیت اللہ میں ہوا، اور آپ اپنی چھڑی کے ساتھ بتوں کو گراتے جا رہے تھے تو اس وقت آپ یہی آیت پڑھتے تھے، جس سے معلوم ہو گیا کہ اس سے اشارہ اسی قسم کی فتح کی طرف ہی تھا، جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا یہی آیت پڑھتے جاتے تھے اور بتوں کو اپنی چھڑی کے ساتھ گراتے جا رہے تھے، ''آپ کہہ دیجئے کہ حق آ گیا اور باطل چلا گیا، بے شک باطل جانے والی ہی چیز ہے'' باطل باقی رہنے والی چیز نہیں۔

''قرآنِ کریم'' مؤمنین کے لئے نسخۂ رحمت وشفا ہے

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ: مِنَ الْقُرْاٰنِ یہ مَا هُوَ شِفَآءٌ کا بیان ہے۔ اَیْ نُنَزِّلُ مَا هُوَ شِفَآءٌ: ہم اُتارتے ہیں ایسی چیز جو کہ شفا ہے اور رحمت ہے مؤمنین کے لئے، وہ کیا چیز ہے؟ وہ قرآن ہے، یعنی قرآنِ کریم کو ہی شفا اور رحمت کہا جا رہا ہے، تو مِنَ الْقُرْاٰنِ یہ مَا هُوَ شِفَآءٌ کا بیان مقدم ہے،''اُتارتے ہیں ہم وہ چیز جو کہ شفا ہے اور رحمت ہے مؤمنین کے لئے یعنی قرآن'' یعنی قرآنِ کریم سے فائدہ اٹھائیں، یہ مؤمنین کے لئے شفا ہے، یہ اصل شفا تو ہے سینے کی بیماریوں کے لئے، کفر، شرک، بدعت، کینہ، حسد، بغض، اس قسم کی چیزیں جو انسان کی رُوحانیت کو نقصان پہنچاتی ہیں قرآنِ کریم ان کے لئے نسخۂ شفا ہے، اور جب اس کو اپنایا جاتا ہے تو رُوحانی صحت حاصل ہوتی ہے، اور اللہ کی رحمت حاصل ہوتی ہے، تو رحمت اِس کا نتیجہ ہے، اور مؤمنین کے اوپر لام انتفاع کے لئے ہے، جس سے معلوم ہو گیا کہ شفا اور رحمت والا فائدہ ایمان والے لوگ ہی اُٹھا سکتے ہیں، جو ایمان نہیں لائیں گے ان کو یہ فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور باقی! بدنی شفا بھی اللہ نے اس میں رکھی ہے، اس کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا، روایاتِ صحیحہ کے اندر موجود ہے کہ صحابہ کرام قرآنِ کریم کی آیات پڑھ کر دَم کرتے تھے شفا ہو جاتی تھی، اور اُس وقت سے لے کر اس وقت تک اولیائے اُمت کے اندر یہ تعویذ کا سلسلہ جو چلا ہوا ہے تو اس کے ساتھ ظاہری بیماریوں کا ازالہ بھی ہوتا ہے، قرآنِ کریم کی آیات پڑھنے سے، قرآنِ کریم کی آیات لکھ کر گلے میں لٹکانے سے ظاہری شفا بھی حاصل ہوتی ہے، تو بدنی شفا بھی ہے اور باطنی شفا تو ہے ہی، اس کا اصل موضوع وہی باطنی شفا ہے۔

''قرآنِ کریم'' منکرین اور ظالموں کے لئے خسارے کا باعث ہے

وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا: اور نہیں بڑھاتا یہ قرآن ظالموں کو مگر خسارہ، ظالموں کا آئے دِن خسارہ بڑھتا ہے، کیونکہ جتنا جتنا قرآنِ کریم اُترتا ہے اور وہ لوگ انکار کرتے چلے جارہے ہیں، جب انکار کرتے چلے جارہے ہیں تو اتنا ہی خسارے میں جارہے ہیں، سمجھنے کے لئے آپ اس کو بالکل اس طرح سے لیجئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے بعض غذائیں پیدا کی ہیں جو انتہائی درجے کی مقوی ہیں جیسے دُودھ، مکھن، گھی، گوشت، اور اسی طرح سے دوسری چیزیں یہ مقوی غذائیں ہیں، صحت مند انسان اگر ان کو مناسب طریقے کے ساتھ کھاتا ہے تو یہ صحت میں اضافے کا باعث بنتی ہیں، بدن میں قوت کے حاصل ہونے کا ذریعہ بنتی ہیں، لیکن اگر کسی شخص کے معدے میں نقص ہے اور وہ بیمار ہے اور وہ ان چیزوں کو کھانا شروع کردے اس کے معدے میں یہ اُتار دی جائیں تو اس میں فائدہ کی بجائے اُلٹا نقصان ہی ہوتا ہے، تو جس وقت یہ نقصان نمایاں ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ چیز بُری ہے، چیز تو اچھی ہے، اگر یہ چیز بُری ہوتی تو صحت مند انسان کے لئے مزید صحت کا باعث کیسے بنتی؟ قوت کا باعث کیسے بنتی؟ معدے میں جس وقت نقص ہوتا ہے بیماری ہوتی ہے تو اس کو ہضم نہیں کرسکتا، جب ہضم نہیں کرسکتا تو مزید بیماری کا ذریعہ بن گئی۔ اسی طرح سے ایمان لاکر اگر کسی نے اپنی رُوحانیت کا رُخ سیدھا کرلیا تو قرآنِ کریم کی تعلیمات اس کے لئے آئے دِن ترقی کا باعث ہیں، لیکن اگر کسی شخص نے تکذیب والی بیماری اختیار کرلی تو جتنا قرآنِ کریم اُترتا آئے گا جو لوگوں کے لئے شفا اور رحمت ہے اس کے لئے مزید بیماریوں کے پیدا کرنے کا سبب بنے گا۔ جس طرح سے سورۂ بقرہ کے (شروع کے) اندر آیا تھا زَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا: کہ اللہ تعالیٰ ان کی بیماری کو آئے دِن بڑھا رہا ہے، وہی حساب یہ ہے۔

اِنسان کی ناشکری، بے صبری اور مایوسی کا شکوہ

وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ: یہ انسان کی شکایت ہے، جس طرح سے اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی نعمتوں کے ذکر کرنے کے بعد عموماً انسان کی اس قسم کی شکایت کرتے ہیں، کہ کیسے کیسے ہم نے انعام دیے ہیں، جن میں سے خصوصیت کے ساتھ یہ رُوحانی اِنعام ہے جو قرآنِ کریم کی شکل میں آیا لیکن انسان اس سے فائدہ نہیں اُٹھاتا، ''اور جب ہم اِنسان پر اِنعام کرتے ہیں'' اس کو آرام پہنچاتے ہیں، خوش حالی کے حالات دے دیتے ہیں، اَعْرَضَ: تو یہ اعراض کرجاتا ہے، وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ: اور اپنا پہلو پھیر لیتا ہے، دُور ہٹ جاتا ہے اپنے پہلو کے ساتھ، پہلو تہی کرجاتا ہے، وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَئُوْسًا: اور جب اس کو کوئی تکلیف پہنچ جاتی ہے تو بالکل ہی مایوس ہوجاتا ہے، یہ ہے تھڑدلے انسان کا کام، اللہ تعالیٰ کے ساتھ اگر انسان کے دل کا تعلق ہو تو دونوں حالتوں میں وہ ثابت قدم رہتا ہے، اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے خوش حالی کے حالات آتے ہیں انعام ہوتا ہے تو شکر ادا کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی طاعت کرتا ہے شکر کے جذبے کے ساتھ، اور اس نعمت کو اللہ تعالیٰ کی معصیت اور نافرمانی کا ذریعہ نہیں بناتا، اِتراتا نہیں، فخر میں نہیں آتا، آپے سے باہر نہیں ہوجاتا، اور اگر کبھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس کی مرضی کے خلاف حالات پیش آجاتے ہیں تو پھر

مایوس نہیں ہوتا بلکہ یہ سمجھتا ہے کہ اللہ کی طرف سے بندے کے اوپر ایک امتحان ہے، گزر جائے گا، آخر آتے جاتے رہتے ہیں، تو صبر کرتا ہے، اپنے گناہوں سے توبہ کرتا ہے، استغفار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے، اور اللہ کی رحمت کو طلب کرتا ہے، مایوسی نہیں ہوتی، تو قلبی تعلق اگر اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہو تو دونوں حالتوں میں حال اس طرح سے ہوتا ہے، اور یہ لاتعلقی کی بات ہے کہ جہاں ذرا کھانے کو مل گیا اور اچھے حالات ہو گئے تو انسان پہلو تہی کرتا ہے، احکام کی پرواہ نہیں کرتا، اکڑتا ہے، اتراتا ہے، یہ سمجھتا ہے کہ میں نے اپنے کمال کے ساتھ یہ نعمت حاصل کر لی، اور جہاں ذرا تکلیف آئی تو پھر بالکل ہی مایوس ہو جاتا ہے، پچھلا بھی کھایا پیا یاد نہیں رہتا اور آئندہ بھی کوئی نعمت حاصل ہونے کی توقع نہیں رہتی، یہ بے صبری کے حالات اور ناشکری کے حالات ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق نہ ہونے کی بات ہے۔

قُلْ: آپ کہہ دیجئے کُلٌّ یَّعْمَلُ عَلٰی شَاکِلَتِهٖ: ہر کوئی اپنے طریقے پر عمل کرتا ہے، جو طریقہ کسی نے اپنا لیا اعراض کا، پہلو تہی کا، اور اسی طرح سے بے صبری کا، یہ بھی ایک طریقہ ہے، اور دوسرا طریقہ شکرگزاری کا ہے، اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا ہے، صبر و استقامت کا ہے، ہر کوئی اپنے اپنے طریقے پر عمل کرتا ہے، فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰی سَبِیْلًا: تمہارا رب خوب جانتا ہے اس شخص کو جو کہ زیادہ ہدایت یافتہ ہے از روئے راستے کے، جو زیادہ سیدھا راستہ پانے والا ہے جو زیادہ ہدایت یافتہ ہے تمہارا رب ہی جانتا ہے، جس کی وجہ سے پھر آخرت میں نتیجہ سامنے آ جائے گا کہ کون سا طریقہ ایسا تھا کہ جس کے اپنانے کے بعد اچھے نتائج نکلے اور کون سا طریقہ ایسا تھا کہ جس کے اپنانے والے آخرت میں خسارے میں رہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَیْكَ

وَیَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ وَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا

اور آپ سے سوال کرتے ہیں رُوح کے متعلق، آپ کہہ دیجئے کہ رُوح میرے رَبّ کے اَمر سے ہے، اور نہیں دیے گئے تم علم سے مگر

قَلِیْلًا ۞۸۵ وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ

تھوڑا سا ۞۸۵ اور اگر ہم چاہیں تو البتہ ضرور لے جائیں اس چیز کو جو وحی کی ہم نے تیری طرف، پھر نہیں پائے گا تو اپنے لیے اس چیز (کو

عَلَیْنَا وَكِیْلًا ۞۸۶ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَیْكَ كَبِیْرًا ۞۸۷

واپس لانے) کے لئے کوئی کارساز ہمارے خلاف ۞۸۶ مگر تیرے رَبّ کی رحمت کی وجہ سے، بے شک اُس اللہ کا فضل تیرے پہ بہت بڑا ہے ۞۸۷

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ

آپ کہہ دیجئے کہ اگر جمع ہو جائیں انسان اور جن اس بات پر کہ لے آئیں اس قرآن کی مثل تو اس کی مثل نہیں لائیں گے

وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا ﴿٨٨﴾ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِي هَٰذَا الْقُرْآنِ مِنْ كُلِّ

اگرچہ ان کا بعض بعض کے لئے مددگار ہو جائے ﴿۸۸﴾ البتہ تحقیق اس قرآن میں ہم نے لوگوں کے لئے ہر قسم کا مضمون پھیر پھیر کر بیان کیا ہے،

مَثَلٍ فَأَبَىٰ أَكْثَرُ النَّاسِ إِلَّا كُفُورًا ﴿٨٩﴾ وَقَالُوا لَنْ نُؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ تَفْجُرَ لَنَا

لوگوں کی اکثریت ناشکری کیے بغیر نہ رہی ﴿۸۹﴾ اور یہ لوگ کہتے ہیں ہم ہرگز تیری بات نہیں مانیں گے حتّٰی کہ جاری کر دے تو ہمارے لیے

مِنَ الْأَرْضِ يَنْبُوعًا ﴿٩٠﴾ أَوْ تَكُونَ لَكَ جَنَّةٌ مِنْ نَخِيلٍ وَعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْأَنْهَارَ خِلَالَهَا

زمین سے چشمہ ﴿۹۰﴾ یا ہو تیرے لیے ایک باغ کھجوروں کا اور انگوروں کا پھر جاری کر دے تو نہریں اس کے درمیان میں

تَفْجِيرًا ﴿٩١﴾ أَوْ تُسْقِطَ السَّمَاءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا أَوْ

خوب اچھی طرح سے جاری کرنا ﴿۹۱﴾ یا گرا دے تُو آسمان کو جیسا کہ تیرا خیال ہے (گرا دے) ہمارے اُوپر ٹکڑے ٹکڑے کر کے، یا

تَأْتِيَ بِاللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ قَبِيلًا ﴿٩٢﴾ أَوْ يَكُونَ لَكَ بَيْتٌ مِنْ زُخْرُفٍ أَوْ تَرْقَىٰ فِي السَّمَاءِ وَلَنْ

لے آئے تُو اللہ کو اور فرشتوں کو سامنے ﴿۹۲﴾ یا ہو تیرے لیے ایک گھر سونے کا، یا چڑھ جائے تُو آسمان میں، اور ہرگز نہیں

نُؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتَّىٰ تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتَابًا نَقْرَؤُهُ قُلْ سُبْحَانَ

ایمان لائیں گے ہم تیرے چڑھنے کے متعلق حتّٰی کہ اُتارے تُو ہمارے اُوپر ایک کتاب جس کو ہم پڑھیں، آپ کہہ دیجئے میرا رب

رَبِّي هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَسُولًا ﴿٩٣﴾ وَمَا مَنَعَ النَّاسَ أَنْ يُؤْمِنُوا إِذْ جَاءَهُمُ الْهُدَىٰ

پاک ہے، نہیں ہوں میں مگر ایک بشر رسول ﴿۹۳﴾ لوگوں کو نہیں روکا ایمان لانے سے جب ان کے پاس ہدایت آئی

إِلَّا أَنْ قَالُوا أَبَعَثَ اللَّهُ بَشَرًا رَسُولًا ﴿٩٤﴾ قُلْ لَوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ مَلَائِكَةٌ

مگر اس بات نے کہ یہ کہتے ہیں کہ کیا اللہ تعالیٰ نے بشر کو رسول بنا کے بھیجا؟ ﴿۹۴﴾ آپ کہہ دیجئے کہ اگر زمین میں فرشتے ہوتے

يَمْشُونَ مُطْمَئِنِّينَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِنَ السَّمَاءِ مَلَكًا رَسُولًا ﴿٩٥﴾ قُلْ كَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا

چلتے پھرتے رہنے بسنے والے تو ان کے اُوپر آسمان سے فرشتہ رسول اُتار دیتے ﴿۹۵﴾ آپ کہہ دیجئے کہ اللہ گواہ کافی ہے

بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ إِنَّهُ كَانَ بِعِبَادِهِ خَبِيرًا بَصِيرًا ﴿٩٦﴾ وَمَنْ يَهْدِ اللَّهُ فَهُوَ

میرے اور تمہارے درمیان، بے شک وہ اپنے بندوں کے متعلق خبر رکھنے والا ہے دیکھنے والا ہے ﴿۹۶﴾ جس کو اللہ ہدایت دے وہی

الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِهٖ ؕ وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ

ہدایت یافتہ ہے اور جس کو اللہ بھٹکا دے نہیں پائے گا تو اس کے لئے دوست، کارساز اللہ کے علاوہ، جمع کریں گے ہم ان کو قیامت کے

الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّبُكْمًا وَّصُمًّا ؕ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ كُلَّمَا خَبَتْ

دن ان کے چہروں کے بل، اندھے ہوں گے گونگے ہوں گے بہرے ہوں گے، ان کا ٹھکانا جہنم ہوگا، جب کبھی وہ آگ بجھنے لگے گی

زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا ﴿۹۷﴾ ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا

ہم ان کو زیادہ کر دیں گے از روئے بھڑکنے والی آگ کے ﴿۹۷﴾ یہ بدلہ ہے ان کا اس سبب سے کہ انہوں نے کفر کیا ہماری آیات کا

وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ﴿۹۸﴾

اور انہوں نے کہا کیا جس وقت ہم ہڈیاں ہو جائیں گے اور چورا چورا ہو جائیں گے کیا البتہ ہم اُٹھائے جائیں گے نئے سرے سے پیدا کر کے؟ ﴿۹۸﴾

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ

کیا ان لوگوں نے دیکھا نہیں کہ بے شک وہ اللہ جس نے پیدا کیا آسمانوں کو اور زمین کو وہ قدرت رکھنے والا ہے اس بات پر کہ

يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ وَجَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَيْبَ فِيْهِ ؕ

ان جیسوں کو پیدا کر دے اور ان (کے دوبارہ پیدا کرنے) کے لئے اللہ نے ایک وقت متعین کیا ہے جس (کے آنے) میں کوئی شک نہیں،

فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۹۹﴾ قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّیْٓ اِذًا

ظالم کفر کیے بغیر نہ رہے ﴿۹۹﴾ آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم مالک ہوتے میرے رَبّ کی رحمت کے خزانوں کے تب

لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا ﴿۱۰۰﴾ ع

تم ان کو روک رکھتے خرچ کرنے کے (انجام کے) اندیشے سے، انسان بہت تنگ دِل ہے ﴿۱۰۰﴾

تفسیر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۔ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ: اور آپ سے سوال کرتے ہیں رُوح کے متعلق، قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ: آپ کہہ دیجئے کہ رُوح میرے رَبّ کے اَمر سے ہے، وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا: اور نہیں دیے گئے تم علم سے مگر تھوڑا سا۔ وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِیْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ: اور اگر ہم چاہیں تو البتہ ضرور لے جائیں اس چیز کو جو وحی کی ہم نے تیری طرف، ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ

عَلَيْنَا وَكِيْلًا: پھر نہیں پائے گا تُو اپنے لیے (بِہٖ: اَیْ بِاسْتِرْدَادِہٖ) اس چیز کو واپس لانے کے لئے کوئی کارساز ہمارے خلاف، یعنی وہ وحی اگر ہم لے جائیں جو ہم نے آپ کی طرف وحی کی ہے جو علم آپ کو دیا ہے اگر لے جائیں تو اس کو واپس لانے کے لئے آپ کو کوئی کارساز نہیں ملے گا۔ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ: مگر تیرے رَبّ کی رحمت کی وجہ سے وہ چیز باقی ہے، نہیں جائے گی، اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا: بے شک اُس اللہ کا فضل تیرے پہ بہت بڑا ہے۔ قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ: آپ کہہ دیجئے کہ اگر جمع ہو جائیں انسان اور جن، عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ: اس بات پر کہ لے آئیں اس قرآن کی مثل، لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ: اس کی مثل نہیں لائیں گے، وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا: اگرچہ ان کا بعض بعض کے لئے مددگار ہو جائے۔ ظہیر: مددگار۔

شانِ نزول کے متعلق دومختلف روایات

اس رکوع میں کافروں کی طرف سے کچھ معاندانہ سوالات مذکور ہیں، اور قرآنِ کریم نے اپنے انداز کے مطابق ان کا جواب دیا ہے، پہلا سوال جو یہاں ذِکر کیا گیا وہ روح کے متعلق ہے، یہ سوال کرنے والے کون تھے؟ روایات میں دو باتوں کا ذکر آتا ہے کہ مشرکینِ مکہ جس وقت کسی طرح سے قرآنِ کریم کا مقابلہ نہ کر سکے تو انہوں نے یہودِ مدینہ سے رابطہ قائم کیا، چونکہ وہ اہلِ علم تھے، تو یہ خیال کیا کہ اہلِ علم سے کچھ سوالات پوچھ کران پہ کیے جائیں اور یہ جواب نہیں دے سکیں گے تو پھر ہم ان کو رَدّ کر دیں گے اوران کی بات رَدّ ہو جائے گی، تو یہودِ مدینہ سے جب رابطہ قائم کیا گیا تو انہوں نے تین باتیں ان کو کہیں کہ یہ ان سے پوچھو، جن میں سے ایک رُوح کے متعلق ہے اور ایک ذُوالقرنین کے متعلق ہے اور ایک اَصحاب کہف کے متعلق ہے، یہ تین سوال انہوں نے تلقین کیے، دو سوالوں کا جواب اگلی سورۃ میں آ رہا ہے اور رُوح کا تذکرہ یہاں ہے۔ تو پھر يَسْئَلُوْنَكَ کا فاعل مشرکینِ مکہ ہیں۔ اور بعض روایات میں یوں بھی آتا ہے، ''بخاری شریف'' میں صحیح روایات موجود ہیں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی، کہ مدینہ منورہ میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لے جا رہے تھے اور میں ساتھ تھا، اور آپ کے ہاتھ میں کھجور کی چھڑی تھی جس کو ٹیکتے ہوئے جا رہے تھے، چونکہ عادتِ مبارکہ تھی کہ اکثر و بیشتر عصا ہاتھ میں رکھتے تھے، تو اس دِن کھجور کی چھڑی تھی جس کو زمین کے اُوپر ٹیکتے ہوئے آپ چلے جا رہے تھے، کھیتوں میں سے گزرے تو کچھ یہود کام کر رہے تھے، انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اس سے کوئی بات پوچھو، بعض نے کہا کہ رہنے دو، کوئی ایسا جواب دے دیں گے جو تمہیں پسند نہیں ہوگا، کیا فائدہ؟ بعض نے کہا کہ نہیں! ضرور پوچھنا چاہیے، تو انہوں نے پھر سوال کیا کہ رُوح کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ رُوح کیا چیز ہے؟ تو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب انہوں نے یہ سوال کیا تو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے اُوپر وحی کے آثار نمایاں ہوئے، تو جب وحی ختم ہوئی تو آپ نے یہ آیت پڑھی جس میں ان کے سوال کا قرآنِ کریم نے اپنے انداز کے مطابق جواب دیا ہے، تو جس سے معلوم ہو گیا کہ یہ سوال کرنے والے یہودی تھے، تو پھر یہ آیت مدنی ہوگی باوجود اس بات کے کہ ساری سورت مکی ہے، تو چونکہ قرآنِ کریم کی نزولی ترتیب اور ہے اور جمع کی ترتیب اور ہے، تو مکی سورتوں کے اندر بسااوقات مدنی آیات بھی آ جاتی ہیں اور مدنی سورتوں کے اندر مکی آیات بھی آ جاتی ہیں، تو پھر یہ سورۂ بنی اسرائیل اگرچہ مکی ہے لیکن پھر اس آیت کو مدنی کہنا پڑے گا۔

اور بعض حضرات نے دونوں کے درمیان میں تطبیق بھی دی ہے، کہ بعض آیات بار بار بھی نازل ہو جاتی تھیں، جن کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے نئے سرے سے یاد دہانی کرا دی جاتی کہ اس سوال کا جواب ان آیات میں ہے، تو پہلے مشرکینِ مکہ نے بعض یہود کی تلقین سے یہ سوال کیا تو یہ آیات مکہ میں اُتر آئیں، اور بعد میں مدینہ منورہ میں یہ واقعہ پیش آیا تو مدینہ منوّرہ میں دوبارہ انہی آیات کا نزول ہوا، یعنی اس بات کی طرف متوجہ کرنے کے لئے کہ ان کے سوال کا جواب یہی ہے، یہی ان کو بتاؤ، تو دو دفعہ نزول ہو گیا ہو مکہ معظمہ میں بھی ہوا ہو اور مدینہ منوّرہ میں بھی ہوا ہو، تو پھر یہ دونوں روایتیں آپس میں جمع ہو جاتی ہیں۔

''رُوح'' کے مصداق کی تعیین کے متعلّق مفسرین کی مختلف آرا

پھر یہ رُوح جس کے متعلق سوال کیا گیا ہے اس رُوح سے کون سی رُوح مراد ہے؟ کیونکہ قرآنِ کریم میں یہ جو اللہ کی طرف سے وحی آتی ہے اس کو بھی رُوح کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے، خود یہ کتاب اللہ بھی رُوح کا مصداق ہے، جیسے بعض آیات میں ہے وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا (الشوریٰ: ۵۲) یہاں رُوح سے وہی تعلیم مراد ہے جو وحی کے ذریعے سے سرورِ کائنات ﷺ کو دی جا رہی تھی، اور یہ کتاب خود روح کا مصداق ہے، اور اسی طرح سے جبریل علیہ السلام کے لئے بھی ''رُوح القدس'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے قرآنِ کریم میں، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی رُوْحٌ مِّنْهُ کہا گیا ہے (النساء: ۱۷۱)، اور حضرت آدم علیہ السلام کے اندر جو چیز ڈالی گئی تھی ڈھانچہ بنانے کے بعد اس کو بھی رُوح کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ (الحجر: ۲۹، ص: ۷۲)۔ تو یہاں جس رُوح کے متعلق سوال کیا جا رہا ہے تو اس سے کون سی روح مراد ہے؟ بعض حضرات نے تو سیاق وسباق کی طرف دیکھتے ہوئے یہی کہا کہ یہاں اس روح سے یہی رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا یعنی قرآنِ کریم مراد ہے (آلوسی، نسفی)، اس کے متعلق آپ سے سوال کرتے ہیں کہ یہ کیا ہے، تیرا بنایا ہوا ہے یا اللہ کی طرف سے اترتا ہے؟ کون اس کو لاتا ہے؟ اس قسم کے مہمل سوالات وہ اُٹھاتے تھے، تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اگلی آیات میں ان کا جواب دیا کہ یہ جو کچھ ہے یہ خود ساختہ نہیں، کسی بشر کا بنایا ہوا نہیں، بلکہ آپ کہہ دیجئے کہ یہ میرے رَبّ کے اَمر سے ہے، میرے رَبّ کے اَمر سے یہ آنے والی چیز ہے، باقی تم اس کو نہیں پہچان سکتے، تم قلیل العلم ہو، جاہل ہو، اس کو پہچاننے کے لئے اور اس کی خوبیاں جاننے کے لئے جس قسم کے علم کی ضرورت ہے چونکہ تم ضد اور عناد کے طور پر اپنی اِستعداد کو ختم کر چکے ہو اور تمہیں وہ علم حاصل نہیں، اس لئے تم اس کی خوبیوں کو پہچان نہیں سکتے اور طرح طرح کے اِشکالات اٹھاتے ہو، باقی یہ قرآن رسول اللہ ﷺ کا اپنا بنایا ہوا نہیں، بلکہ آپ پر آپ کے اختیار سے نہیں اترا، اللہ کے حکم سے آیا، اور یہ علم اگر باقی ہے تو اللہ کی اجازت کے تحت ہی باقی ہے، جیسا کہ اگلی آیت کے اندر ذکر کر دیا گیا کہ جو کچھ آپ کو دیا گیا ہے یہ منجانب اللہ دیا گیا ہے، مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ حاصل ہوا، اور حاصل ہونے کے بعد اس کا باقی رہنا بھی آپ کے اختیار میں نہیں، اگر ہم چاہیں تو اس کو واپس بھی لے جا سکتے ہیں، اور اگر ہم اس علم کو واپس لے لیں جو ہم نے آپ کی طرف بھیجا ہے تو دنیا کے اندر کوئی شخص یہ قوت اور طاقت نہیں رکھ سکتا جو اس معاملے میں تیرے ساتھ تعاون کرے اور کارسازی کرے کہ دوبارہ آپ کے یہ علوم حاصل کروا دے، ایسا نہیں ہو سکتا۔ تو

گویا کہ قرآن کریم کی حقانیت کو واضح کیا جا رہا ہے کہ آیا بھی حضور ﷺ کے اختیار کے بغیر محض اللہ کے حکم سے، اور اگر یہ باقی ہے تو بھی محض اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور اس کی رحمت سے باقی ہے، ورنہ اگر اللہ چاہے تو اس علم کو اٹھالے، اور اس کے اٹھ جانے کے بعد پھر کوئی اس کو واپس لانے والا نہیں ہے، اور پھر یہ جو کچھ اللہ کی طرف سے آیا ان کے اختیار کے بغیر آیا، باقی ہے تو ان کے اختیار کے بغیر باقی ہے، اور معجزہ اس کا اتنا نمایاں ہے کہ اس کی مثل لانے سے ساری کائنات عاجز ہے، اس لئے صرف انسان ہی نہیں بلکہ انسان اور جن سارے کے سارے اکٹھے ہو جائیں اور اس قرآن کی مثل لانا چاہیں تو اس کی مثل نہیں لا سکتے اگرچہ بعض بعض کے معاون ہی بن جائیں مددگار ہی بن جائیں، یعنی سارے آپس میں تعاون کر کے بھی اس کی مثل نہیں لا سکتے، کتنا بھرپور چیلنج کر دیا گیا، اور چودہ سو سال اس بات کے اوپر گواہ ہیں کہ اس قرآنِ کریم کی مثل لانے کی کسی کو جرأت نہیں ہوئی۔ تو پھر رُوح سے وحی مراد ہوگی جو کہ سرورِ کائنات ﷺ پر اُتری، اور اس کے تناسب کے ساتھ ہی اگلی آیات اس طرح سے جڑ گئیں جیسے میں نے آپ کی خدمت میں عرض کیا، اور ماقبل میں اِس (تفسیر) کے لئے قرینہ ان آیات کو پیش کیا جاتا ہے کہ پیچھے بھی قرآنِ کریم کے نزول کا ہی ذکر آیا ہے وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا: کہ ایمان لانے والوں کے لئے تو یہ نسخۂ شفا ہے اور رحمت ہے، لیکن جو منکرین ہیں وہ اس قسم کے بیہودہ سوال ہی اٹھاتے پھرتے ہیں اور ابھی ان کو سمجھ ہی نہیں آئی کہ یہ قرآن ہے کیا۔ فائدہ اٹھانے والے فائدہ اٹھا کے شفایاب ہو گئے اور انہوں نے اللہ کی رحمت کو حاصل کر لیا، اور یہ (منکرین) ابھی پوچھتے ہی پھرتے ہیں۔ تو ماقبل کی طرف دیکھتے ہوئے ان آیات کا مطلب یہ ہو جائے گا۔

اور بعض مفسرین کی رائے یہ ہے کہ اس رُوح سے یہی رُوح مراد ہے جس کے ذریعے سے حیوان کو حیات ملتی ہے، آدم علیہ السلام کو بنانے کے بعد جو چیز اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام میں ڈالی تھی، اس کی حقیقت پوچھنا مقصود ہے کہ یہ کیا چیز ہے؟ اب حقیقت پر مطلع ہونے کے لئے جس قسم کے علوم کی ضرورت ہے وہ ان لوگوں کو حاصل نہیں تھے جو مخاطب ہیں، اور اس قسم کے مسائل کے اندر اُلجھانا یہ قرآنِ کریم کا موضوع بھی نہیں ہے، اگر اس قسم کی پیچیدہ چیزیں جس کو بڑے سے بڑے فلاسفر آج تک حل کرنے سے عاجز ہیں اگر اس قسم کی چیزوں کی طرف اُس وقت ان کو اُلجھا دیا جاتا تو قرآنِ کریم کا جو مقصد ہے وہ فوت ہو جاتا، قرآنِ کریم کا مقصد تو ہے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لئے طریقہ بتانا اور ان کے عقیدوں کی صحت، اور اس (انسان) کی ابتدا اور اس کی انتہا اس کے سامنے واضح کرنا کہ تو آیا کدھر سے ہے، جا کدھر کو رہا ہے، تیرا انجام کیا ہونے والا ہے، تجھے زندگی کیسے گزارنی چاہیے، اللہ کی مرضیات کیا ہیں، نامرضیات کیا ہیں، قرآنِ کریم کا موضوع یہ ہے تاکہ انسان اس دنیا میں بھی اللہ کی رحمت سے فائدہ اٹھائے اور مرنے کے بعد والی زندگی کو سنوارے، یہ ہے قرآنِ کریم کا موضوع، اور اگر کوئی شخص اس قسم کے سوالات اٹھانے شروع کر دے جو اس کے موضوع سے ہی خارج ہیں تو مختصر سا جواب دے کے اس دروازے کو بند کر دیا گیا، اور اگر اس مسئلے میں اُلجھ جاتے کہ اِس کی حقیقت کیا ہے، اُس کی حقیقت کیا ہے، پانی کی حقیقت کیا ہے، آگ کی حقیقت کیا ہے، فلاں چیز کی حقیقت کیا ہے، فلاں چیز کی حقیقت کیا ہے، تو یہ حقائق اگر واضح کرنے شروع کر دیے جاتے تو وہ ماحول اس قابل کہاں تھا کہ ان پیچیدگیوں کو اور ان باریکیوں کو

سمجھتا، وہ تو موٹی موٹی باتیں اخذ کرنے سے بھی عاجز تھے، تو اس قسم کی باریکیوں کو وہ نہ سمجھ سکتے اور مسئلہ اُلجھ جاتا، اُلجھ جانے کی وجہ سے قرآنِ کریم کے موضوع سے بات ہٹ جاتی، اس لئے قرآنِ کریم نے اپنی شان کے مطابق یہ جواب دیا کہ اس کو اتنا سا سمجھ لوکہ یہ اللہ کے امر سے آتی ہے، انسان کے اندر یا حیوان کے اندر آتی ہے تو اللہ کے امر سے آتی ہے، حادث ہے، اللہ کی مخلوق ہے، اللہ کے اُمر سے یہ آتی ہے، باقی! اس کے حقائق وغیرہ پہچاننے کے لئے تمہارے پاس اتنا علم نہیں ہے کہ جس سے تم پہچان سکو، اپنے کام کی باتوں کی طرف متوجہ رہو، فائدہ اُٹھاؤ، آخرت میں کام آنے والے اعمال کو اختیار کرو، اور اس قسم کے فضول سوالات میں اُلجھ کر اپنا وقت ضائع نہ کرو، قرآنِ کریم نے اپنے انداز کے ساتھ اس طرح سے ان کو ٹال دیا۔ باقی دوسری رُوح کی طرف متوجہ کردیا کہ جس رُوح کے ساتھ ان کو ایمانی حیات حاصل ہوسکتی ہے، اگلی آیات کے اندر بالیقین قرآنِ کریم کا تذکرہ ہے۔ تو یہ حضرات اس طرح سے فرماتے ہیں۔

حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی تفسیر میں جو میرے سامنے رکھی ہوئی ہے پورے ایک ورق میں اسی بات کے اوپر بحث کی ہے، کہ رُوحِ حیوانی کی حقیقت، کہ یہ کیا چیز ہے، آج تک سائنسدان یا فلاسفر اس کو حل نہیں کرسکے، لیکن قرآنِ کریم نے اپنے اعجاز کے طور پر جیسا یہاں تذکرہ کیا، تو اس قسم کے اشارات اس میں دے دیے ہیں کہ جس سے بہت حد تک رُوح کے اوپر روشنی پڑتی ہے (ان کی گفتگو کا حاصل یہ ہے، ساری گفتگو مفصل تو میں عرض نہیں کرسکتا، دیکھ لینا ''فوائدِ عثمانی'' کے اندر، تقریباً ایک ورق انہوں نے اس بارے میں لکھا ہے، لیکن خلاصہ سا اُس کا یہ ہے) کہ قرآنِ کریم نے اشارہ دے دیا کہ یہ رُوح اُمرِ ربّ سے آنے والی چیز ہے، (شیخ الاسلام) فرماتے ہیں کہ قرآنِ کریم میں جس وقت ہم دیکھتے ہیں تو معلوم یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں دو شعبے ہیں ایک خلق اور ایک امر، لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ جس طرح سے قرآنِ کریم میں ہے (الاعراف: ۵۴)، ایک خلق کا شعبہ ہے اور ایک اُمر کا شعبہ ہے، تو یہ رُوح عالمِ اُمر سے تعلق رکھتی ہے۔ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ کے جو اسماء ذکر کئے گئے ہیں اس میں ''خالق'' بھی ہے، ''مصوّر'' بھی ہے، اور ''باری'' بھی ہے، اور اللہ تبارک وتعالیٰ جب کسی کام کو کرنا چاہتے ہیں اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَیْءٍ اِذَآ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ (النحل: ۴۰)، یہ اُمر کا شعبہ ہے۔ تو کہتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوگیا کہ رُوح کا تعلق خلق والے شعبے سے نہیں بلکہ اُمر والے شعبے سے ہے، سمجھانے کے لئے وہ ایک مثال دیتے ہیں کہ جیسے کاریگر ایک مشین بنانا چاہتا ہے تو پہلے تو اس کے لئے مادّہ اور میٹریل اکٹھا کرتا ہے، مثلاً لوہے سے پُرزے بنانے ہیں تو لوہا آگیا، اور اگلا درجہ یہ ہے کہ پھر اس کے پُرزوں کو ڈھالتا ہے، اور پُرزوں کو ڈھالنے کے بعد تیسرا درجہ یہ ہے کہ پھر ان کو جوڑتا ہے، جوڑنے کے بعد مشین کا ڈھانچہ بن گیا، اور پھر اس سے اگلا درجہ یہ ہے کہ اس میں بجلی کا کرنٹ چھوڑا جاتا ہے جس کے ساتھ وہ مشین حرکت میں آجاتی ہے، اب یہ کرنٹ ایک خارج سے آنے والی چیز ہے، جو اس مشین کے ساتھ تعلق پکڑتی ہے، اور اس کے تعلق پکڑنے کے ساتھ وہ ساری کی ساری مشین اپنی ساخت کے مطابق حرکت میں آجاتی ہے، تو اسی طرح سے اللہ تبارک وتعالیٰ خالق ہے کہ جس چیز سے انسان بنتا ہے حیوان بنتا ہے جس کو ہم اپنی زبان میں آج کل کی اصطلاح میں میٹریل یا مادّہ کہہ سکتے ہیں، وہ بھی اللہ کا پیدا کیا ہوا ہے، اس اعتبار سے اللہ خالق

ہے، پھر اس کے علیحدہ علیحدہ اعضا بنائے، جس طرح سے مشین کے پرزے ہوتے ہیں تو اسی طرح سے انسان کے بھی اعضا ہیں، اور پھر ان سب کو جوڑ کے اس کی صورت بنائی، تو یہ خالق، باری اور مصور تینوں درجے ہو گئے، پھر عالم اَمر سے اس کے ساتھ رُوح کا تعلق لگایا، جس وقت رُوح کا تعلق لگایا تو وہ مشین متحرک ہو گئی۔ اب اس کی حقیقت کہ وہ کیا ہے؟ کس طرح سے آتی ہے؟ اس کا مرکز کیا ہے؟ ان چیزوں کو پہچاننا انسان کے بس میں نہیں۔ ہاں! البتہ آنے والی آیات میں یہ اشارہ کر دیا گیا کہ رُوح اگر چہ آتی اللہ کے اَمر سے ہے لیکن ہر رُوح کا درجہ ایک نہیں ہے، بعض رُوح اس قابل ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے اُوپر علوم فائض ہوتے ہیں سب سے زیادہ، اور وہ بھی اس کے اختیاری نہیں ہوتے، جتنا چاہے کمال کو پہنچ جائے لیکن وہ کمالات اس کے اختیاری نہیں ہوتے، نہ حاصل کرنا اس کے اختیار میں ہے اور نہ ان کمالات کا باقی رکھنا اختیار میں ہے، اور بعضی بعضی رُوحوں کو اللہ تعالیٰ اتنا کمال دے دیتا ہے کہ دوسری ساری مخلوق اگر مل کے کوشش کرنا چاہے تو اس کے کمال جیسا کمال پیدا نہیں کر سکتی، تو اس طرح سے یہ اشارات اگلی آیت سے نکل آئے۔ تو پھر (اس تفسیر کے مطابق) رُوح سے رُوحِ حیوانی مراد لی جائے جس کے ساتھ انسان زندہ ہوتا ہے، اور اگلی آیات میں قرآنِ کریم کے تذکرے کی مناسبت ماقبل کے ساتھ یوں ہو گئی، کہ اس رُوح کے کمالات کا تذکرہ ہو گیا، کہ مختلف کمالات اللہ تعالیٰ دیتے ہیں، بعضوں کو اتنے اتنے کمالات دے دیتے ہیں کہ جن کی مثال سارے اکٹھے ہو کے نہیں لا سکتے، لیکن کتنے ہی وہ کمالات حاصل کیوں نہ کر لیں لیکن وہ کمالات روح کے اختیاری نہیں ہوتے بلکہ اللہ کی دَین کے ساتھ ملتے ہیں، اور اگر چھیننا چاہے تو چھین بھی سکتا ہے، اس طرح سے مابعد والی آیات کا ربط ماقبل کے ساتھ ہو گیا۔ تو پھر رُوح سے مراد یہی رُوح ہو گی جس کے ساتھ انسان زندہ ہوتا ہے اور اگلی آیات میں قرآنِ کریم کا جو تذکرہ ہے تو اس کی ماقبل کے ساتھ مناسبت اس طرح سے ہو جائے گی۔ باقی قرآنِ کریم کا یہ اعجاز آپ کے سامنے کئی جگہ آ گیا، سورۂ بقرہ میں بھی اس کا تذکرہ آیا تھا، سورۂ یونس میں بھی آیا تھا، اور اسی طرح سے سورۂ ہود میں بھی آیا تھا، مختلف انداز کے ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کی مثل لانے سے انسانوں کا عجز نمایاں کیا ہے، اور یہ قرآنِ کریم کا بہت واضح معجزہ ہے جس کا چیلنج اُس وقت سے آج تک باقی ہے اور قیامت تک باقی رہے گا۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۫ فَاَبٰۤى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا: صَرَّفَ تصریف: پھیرنا، بار بار بیان کرنا۔ البتہ تحقیق اس قرآن میں ہم نے لوگوں کے لئے ہر قسم کا مضمون مختلف طریقوں کے ساتھ، ادل بدل کر کے، پھیر پھیر کے بیان کیا ہے، تا کہ لوگ اچھی طرح سے اس کو سمجھ جائیں، جیسے سرورِ کائنات ﷺ کی رسالت کا تذکرہ ہوا، پچھلی آیات کے اندر توحید کا بیان ہوا، اس سے پیچھے معاد کا تذکرہ بھی تھا، ان مضامین کو اللہ تعالیٰ مختلف طریقوں کے ساتھ بیان فرماتے ہیں تا کہ لوگ سمجھیں، فَاَبٰۤى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا: اَبٰی یَاْبٰی: انکار کرنا، کسی چیز سے اَڑ جانا، جیسے فَسَجَدُوْۤا اِلَّاۤ اِبْلِیْسَ ؕ اَبٰی، وہ اَڑ گیا، شدت کے ساتھ اس نے انکار کر دیا۔ اور کُفُور مصدر ہے، کُفر کرنے، یا، ناشکری کرنے کے معنی میں۔ تو ''انکار کیا اکثر لوگوں نے مگر ناشکری کا'' لفظی معنی یوں بنتا ہے، انکار کیا اکثر لوگوں نے مگر کُفر کا، یعنی کُفر کا انکار نہ کیا باقی ہر چیز کا انکار کر دیا۔ محاورے کے مطابق اس کا ترجمہ یہ ہو گا کہ ''لوگوں کی اکثریت انکار کیے بغیر نہ رہی، لوگوں کی اکثریت ناشکری اختیار کیے بغیر نہ رہی'' یعنی بس جو اختیار کرتے ہیں ناشکری ہی اختیار

کرتے ہیں، کُفر ہی اختیار کرتے ہیں، اس کے بغیر ان کا گزارہ نہیں ہے، ہر کام سے یہ اڑ جاتے ہیں سوائے اِس کام کے، کہ اِس کام کو کرتے ہیں، اس کو ترک نہیں کرتے۔ محاورے کے مطابق اس کا ترجمہ یہ ہوگا کہ ''اکثر لوگ ناشکری کیے بغیر نہ رہے، یا، اکثر لوگ کُفر کیے بغیر نہ رہے'' یعنی ہم نے بار بار اس ہدایت کے مضمون کو ذکر کیا، لوگ کو چاہیے تھا کہ اس کی قدر کرتے لیکن قدر نہیں کرتے، ناشکری کرتے ہیں۔

مشرکین کے مطالبات اور منصبِ رِسالت کی وضاحت

آگے کچھ اور سوالات ذکر کیے گئے ہیں، اور یہ سوالات کرنے والے مشرکینِ مکہ ہی ہیں، وَقَالُوْا: اور یہ لوگ کہتے ہیں لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ: ہرگز ایمان نہیں لائیں گے ہم تیرے لئے، یعنی تیری بات نہیں مانیں گے، حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا: ینبوع چشمے کو کہتے ہیں، ''حتیٰ کہ جاری کردے تو ہمارے لئے زمین سے چشمہ'' اور حتیٰ کے بعد مضارع آجائے تو عادۃً ترجمہ نفی کے ساتھ کیا جاتا ہے، تو یوں بھی کرسکتے ہیں کہ ''ہم ہرگز تجھ پر ایمان نہیں لائیں گے، تیری بات نہیں مانیں گے جب تک تو جاری نہ کردے ہمارے لئے زمین سے چشمہ'' اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ: اسی طرح سے مثبت ترجمہ کرنا چاہو تو ''ہرگز نہیں مانیں گے ہم تیری بات حتیٰ کہ ہو جائے تیرے لئے ایک باغ کھجوروں کا اور انگوروں کا، پھر جاری کردے تو نہریں اس کے درمیان میں خوب اچھی طرح سے جاری کرنا، یا گرادے تو آسمان کو جیسا کہ تیرا خیال ہے، گرادے ہمارے اوپر کِسَفًا: ٹکڑے ٹکڑے کر کے، ٹکڑے ٹکڑے کر کے تُو ہمارے اُوپر اس آسمان کو گرادے، اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ: یا لے آئے تُو اللہ کو اور فرشتوں کو، قَبِيْلًا: سامنے، یا ہو تیرے لئے ایک گھر سونے کا، یا چڑھ جائے تُو آسمان میں، اور ہرگز نہیں ایمان لائیں گے ہم تیرے چڑھنے کے متعلق حتیٰ کہ اُتارے تُو ہمارے اُوپر ایک کتاب جس کو ہم پڑھیں۔ آپ کہہ دیجئے سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا: میرا ربّ پاک ہے، نہیں ہوں میں مگر ایک بشر رسول۔ اور اگر نفی کے طور پر ترجمہ کرنا ہو تو اسی طرح سے ہو جائے گا جیسے پہلے عرض کیا ہے، ''جب تک تو جاری نہ کردے، جب تک تیرے لیے ہو نہ جائے، جب تک تُو گرا نہ دے، جب تک تُو ہمارے سامنے اللہ اور فرشتوں کو نہ لے آئے، جب تک کہ تیرے لیے کوئی گھر نہ ہو، جب تک کہ تُو آسمان پہ نہ چڑھ جائے، اور ہم تیرے آسمان پر چڑھنے کو بھی نہیں مانیں گے یقین نہیں لائیں گے جب تک تُو ہمارے اُوپر ایک کتاب نہ اُتار کے لائے کہ جس کو ہم پڑھ لیں'' کہ جس میں لکھا ہوا ہو کہ واقعی یہ ہمارے پاس سے آیا ہے، اور یہ ہمارا رسول ہے اس کو مانو، اس قسم کی تحریر جب تک نہ آئے اس وقت تک ہم آپ پر ایمان نہیں لائیں گے۔ اور ایسی واہیات باتیں وہ پہلے بھی کرتے رہتے تھے، اس کے پس منظر میں ان کا خیال یہ تھا کہ جب یہ اللہ تعالیٰ کا رسول ہے اور اپنے آپ کو اللہ کا نمائندہ کہتا ہے، تو اس کے پاس اس قسم کی قدرتیں ہونے چاہیں، وہ ایسے ایسے عجیب کارنامے سرانجام دے۔ تو جواب یہ دیا گیا کہ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا: نہیں ہوں میں مگر ایک انسان ایک بشر، ہاں رسول ہوں، جب رسول ہوں تو رسول کے ذِمّے اللہ تعالیٰ کے اَحکامات کو پہنچانا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیا جائے اس کو آگے ذکر کردیتا ہوں، باقی اس قسم کی قدرتوں کا مالک ہونا رسول کے ذِمّے نہیں، تم سوال ایسے کرنے لگ جاتے ہو گویا کہ میں نے دعویٰ کردیا ہے کہ مجھے خدائی

اختیارات حاصل ہو گئے، جو چاہو گے میں کر کے دکھادوں گا، جس چیز کا مطالبہ کرو گے میں اس کو پورا کر دوں گا، ایسی بات نہیں ہے، توھَلْ کُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا کے اندر منصبِ رسالت کو واضح کیا گیا ہے کہ رسول بشر ہی ہوتا ہے، اور اس کے ذِمّے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے دِین کو لا کر لوگوں تک پہنچانا ہوتا ہے، دِین کی باتیں دنیا اور آخرت کو سنوارنے والی، اور ایسی قدرت کا دعویٰ یا ایسے اختیارات کا دعویٰ اس کا نہیں ہوتا، نہ یہ اس کو حاصل ہوتے ہیں۔ معجزات کا جہاں تک تعلق ہے تو معجزات کے بارے میں بارہا عرض کیا جاچکا کہ ان میں اللہ کی قدرت کام کرتی ہے، نبی صرف مظہر ہوتا ہے کہ اس کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ اس قدرت کا اظہار کر دیتے ہیں، جیسے قرآنِ کریم بھی معجزہ ہے، اللہ کی جانب سے آیا، لیکن اس میں نبی کا اختیار کوئی نہیں، اسی طرح سے باقی معجزات بھی اللہ تعالیٰ دے دیں تو نبی نمایاں کر دے گا، اور اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ عطا نہ ہوں تو نبی کو یہ قدرت نہیں ہوتی کہ لوگوں کے مطالبے کے مطابق اس قسم کے کرشمے دکھادے، یا اس قسم کے تصرفات کر کے دکھادے۔

بشریت اور رِسالت میں منافات کا نظریہ مشرکین کا ہے

وَمَامَنَعَ النَّاسَ اَنْ یُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَھُمُ الْھُدٰٓی اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰہُ بَشَرًا رَّسُوْلًا: لوگوں کو نہیں روکا ایمان لانے سے جب ان کے پاس ہدایت آئی مگر اس بات نے (اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا یہ مَنَعَ کا فاعل ہے) یعنی یہ چیز مانع بن گئی ایمان سے، جب ان کے سامنے ہدایت آئی تو ان کے سامنے اور کوئی اعتراض نہ رہا کہ جس اعتراض کی بنا پر وہ کہتے کہ ہم اس کو قبول نہیں کرتے، سوائے اس کے کہ یہ کہتے ہیں کہ کیا اللہ تعالیٰ نے بشر کو رسول بنا کے بھیجا؟ یعنی ان کے ذہنوں کے اندر بشر اور رسالت کے درمیان منافات ہے، یہ کانٹا ان کے ذہنوں میں اڑا ہوا ہے جس کی بنا پر جب ہدایت ان کے پاس آتی ہے تو اسی خیال سے وہ رک جاتے ہیں کہ بھلا! بشر رسول کیسے ہوسکتا ہے؟ بشر اور رسالت کے درمیان منافات ان کے ذہن کے اندر پڑی ہوئی ہے، جیسے کہ سورۂ تغابن میں بھی ایک آیت آئے گی فَقَالُوْٓا اَبَشَرٌ یَّھْدُوْنَنَا فَکَفَرُوْا: یہ کہنے لگ گئے کہ کیا بشر ہمارے ہادی بن کے آئے ہیں؟ فَکَفَرُوْا: پھر انہوں نے انکار کر دیا کہ یہ نہیں ہوسکتا کہ ہم اپنے جیسے ایک بشر کو اللہ کا نمائندہ مان لیں اور اللہ کی طرف سے آیا ہوا مان لیں، ایسا نہیں ہوسکتا، تو اس بنا پر انہوں نے انکار کر دیا کہ اَبَشَرٌ یَّھْدُوْنَنَا۔ اور آج کل آپ کے سامنے یہ جو بشریت انبیاء کا اختلاف چلتا رہتا ہے اس میں اگر آپ غور کریں (بات کو توجہ سے سمجھ لیجئے!) اختلاف کی نوعیت کوئی ہو لیکن ذہنیت ایک ہے، وہ یہ کہ نبوّت اور بشریت میں منافات ہے، وہ کہتے تھے کہ بشر یقینی ہیں، ہمارے سامنے پیدا ہوئے، ہمارے سامنے چلتے پھرتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں، بیوی بچوں والے ہیں، (یہ ساری باتیں قرآنِ کریم میں آئی ہوئی ہیں)، ان کا باپ معلوم ہے، ان کی ماں معلوم ہے اور نبوّت کا اظہار کرنے سے پہلے ہمارے ساتھ ہی رہتے تھے، انسان ہونا تو یقیناً ان کو معلوم تھا، بشر ہونا یقینی معلوم تھا، البتہ یہ معنوی کمال رسالت والا ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ ہم سے ممتاز کیسے ہو گئے، جب دنیا کی نعمتیں ہمارے پاس ہیں اور ہر قسم کے خوش حال ہم ہیں تو یہ باطنی دولت اگر ایسی ہے تو ہمیں کیوں نہیں ملی، اس لئے وہ کہتے تھے کہ تمہارے پاس سونے کے کوٹھے ہونے چاہئیں، تمہارے پاس باغات ہونے چاہئیں، جب تم اتنی بڑی سرکار کے نمائندے بن کے آئے ہو جو ساری زمین اور آسمان کا مالک ہے تو پھر یہ کیا ہے کہ بدن پر کپڑا

نہیں، پاؤں میں جُوتی نہیں، اور کہتے ہو کہ میں اس خدا کا رسول اور اس کا نمائندہ ہوں، یہ انسان ہو کے نمائندہ کس طرح سے ہو گئے، ان کو اِشکال اس طرح سے تھا۔

بشریتِ انبیاء علیہم السلام کے متعلق موجودہ دور کے مبتدعین کا نظریہ

اور آج یہ موجودہ مبتدعین چونکہ ''لا اِلٰہ اِلا اللہ محمد رسول اللہ'' پڑھتے ہیں، اس لئے رسول اللہ تو ان کے نزدیک یقینی ہیں، اللہ کا رسول تو یقیناً مانتے ہیں، لیکن اللہ کا رسول ماننے کے ساتھ ساتھ اس کے کمالات کو جب دیکھتے ہیں تو پھر ان کے ذہن میں یہ آتا ہے کہ بھلا ایسے کمالات کسی بشر میں کیسے ہو سکتے ہیں؟ یعنی کمالات کو مان لیا، رسول اللہ تو مانتے ہیں، لیکن ان کو یہ سمجھ میں نہیں آتی کہ اتنے کمالات ایک بشر میں کیسے ہو سکتے ہیں؟ وہ سمجھتے ہیں کہ بشر تو ہم ہیں، اصل معیار ٹھہرالیا اپنے آپ کو کہ بشر تو ہم ہیں، تو جس وقت بشر ہم ہوئے تو ہمارے اندر تو ان میں سے کوئی چیز بھی نظر نہیں آتی، تو جن کے اندر یہ چیزیں پائی جاتی ہیں جن کو ہم ''کمالاتِ نبوّت'' کہتے ہیں، ''کمالاتِ رسالت'' کہتے ہیں، معلوم ہوتا ہے وہ بشر نہیں، اس لئے ان کو بشر کہنا ناگوار گزرتا ہے، کیونکہ اپنے آپ کو بشر سمجھ بیٹھے اور معیار بنالیا اپنی حالت کو، اور انبیاء کو جب ایسا نہیں دیکھتے تو کہتے ہیں کہ وہ بشر نہیں، کمالات کو چونکہ مانتے ہیں، کمالات کو ماننے کے ساتھ ساتھ پھر بشریت کا عقیدہ اس لیے ان جاہلوں کی سمجھ میں نہیں آتا، حالانکہ بنیادی طور پر غلطی یہاں بھی یہی ہے کہ اپنے آپ کو سمجھ لیا کہ صحیح بشر وہ ہے جو ہمارے جیسا ہو۔

''بشریت'' کا صحیح معیار انبیاء علیہم السلام ہیں

اور ہم یہ کہتے ہیں کہ نہیں! تمہاری صورت بشر جیسی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے بشر کو جس قسم کے ظاہری باطنی کمال دیے ہیں ان میں سے ہمیں کچھ بھی حاصل نہیں ہے، اس لئے بشر کا صحیح معیار بھی انبیاء علیہم السلام ہی ہیں، صحیح انسان کہلانے کے حق دار وہی ہیں، انبیاء بشر ہی ہیں اور ان کے کمالات کا عقیدہ رکھا جائے گا، لیکن ہم انسانیت کے معیار سے گرے ہوئے ہیں، جس طرح ایک فارسی شاعر کہتا ہے:

آناں را کہ بینی خلافِ آدم اند نیستند آدم، غلافِ آدم اند

کہ جن کو تم دیکھتے ہو کہ ان کی عادتیں آدمیوں جیسی نہیں، آدم کے خلق پر وہ نہیں ہیں، وہ آدم نہیں، ان کے اوپر آدم کا غلاف چڑھا ہوا ہے، اور انہوں نے اپنی حقیقت کو اتنا بگاڑ لیا ہے کہ انسانیت، بشریت، آدمیت کے ساتھ ان کا کوئی تعلق ہی نہیں۔ تو نقص ہوا تو ہمارے اندر ہوا، اور یہ کوئی بعید بات نہیں ہے، ایک ہی نوع کے افراد میں یا ایک ہی جنس کے افراد میں اتنا فرق ہو سکتا ہے کہ اگر اعلیٰ معیار کو دیکھا جائے تو ادنیٰ معیار اس کے مقابلے میں ایسے معلوم ہوگا جیسے وہ اس نوع کا ہے ہی نہیں، مثلاً آپ منطقی طور پر پڑھتے ہیں انسان کی جنس کیا ہے؟ (حیوان)، اور گدھے کی جنس کیا ہے؟ (حیوان)، اور کتے کی جنس کیا ہے؟ (حیوان)، تو منطقی اصطلاح کے اعتبار سے آپ، کتے اور گدھے کے ہم جنس ہیں، یا کتا اور گدھا آپ کا ہم جنس ہے، لیکن ایک جنس کے افراد ہونے کے ساتھ

ساتھ کیا گدھے میں اور انسان میں کوئی مناسبت ہے؟ (نہیں)، تو ہم جنس ہونے کے ساتھ مساواتِ کلّی کس طرح سے لازم آگئی؟ ایک جنس کے افراد کے اندر اتنا فرق ہوتا ہے کہ ایک کی طرف دیکھتے ہوئے دوسرے کو دیکھیں تو ان میں کوئی مشابہت ہی معلوم نہیں ہوتی، لیکن آپ اوّل سے جس وقت منطق کی کتابیں پڑھنا شروع کرتے ہیں، ''ایساغوجی'' سے شروع ہوتے ہیں تو آپ کہتے ہیں کہ انسان کی جنس بھی حیوان ہے، گدھے کی جنس بھی حیوان ہے، بندر اور سور کی جنس بھی حیوان ہے، گویا کہ وہ سارے کے سارے آپ کے ہم جنس ہیں، تو ہم جنس ہونے کے باوجود کتنا تفاوت ہے؟ اسی طرح سے ایک نوع کے افراد میں بھی ہوسکتا ہے، کہ ایک نوع کے افراد میں اتنا تفاوت ہو کہ اگر اعلیٰ معیار کو دیکھا جائے تو ادنیٰ اس کے ساتھ کسی قسم کا جوڑ ہی نہیں کھاتا، حالانکہ نوع کے فرد ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے، انسان ایک نوع ہے اس کے سارے افراد ہیں، ایک فرد ہے جس کو ہم ولی اللہ کہتے ہیں اور ایک فرد ہے جس کو ہم چور اور ڈاکو کہتے ہیں، ایک فرد ہے جو کہ تختِ شاہی پر بیٹھا ہوا ہے، اور ایک فرد ہے جو چوبیس گھنٹے سڑک پر پڑا ہوا ہے اور آپ سے ہاتھ پھیلا پھیلا کر ایک ایک پیسہ مانگتا ہے، اب ان دونوں کو اگر دیکھو گے تو ان میں کتنا تفاوت آپ کو نظر آتا ہے؟ تو کیا یہ دونوں ایک جیسے ہوسکتے ہیں؟ ایک نوع کے ہونے کے باجود بے اِنتہا فرق ہے، تو صرف انسان کہنے کے ساتھ مساوات کس طرح سے لازم آگئی؟ باپ اور بیٹا درجے کے اعتبار سے برابر نہیں ہوتے حالانکہ دونوں انسان ہیں، بادشاہ اور فقیر ظاہر کے اعتبار سے برابر نہیں ہوتے حالانکہ دونوں انسان ہیں، عالم اور جاہل آپس میں برابر نہیں ہوتے باوجود اس بات کے کہ دونوں انسان ہیں، شریف اور وضیع، نیک اور بد یہ دونوں آپس میں برابر نہیں ہوتے باوجود اس بات کے دونوں انسان ہیں، اسی طرح سے انبیاء ﷺ انسانیت کے گل سرسبد ہیں، بہترین اعلیٰ درجے کے پھول جس کے ساتھ انسانیت مزین ہے، اور اسی انسانیت کے افراد ہم جیسے اور تم جیسے بھی ہیں، کہ اگر اُن کے ساتھ نسبت دے کے دیکھا جاتا ہے تو ایسے معلوم ہوتا ہے کہ اگر وہ انسان ہیں تو ہم انسان ہی نہیں، اور ہم انسان ہیں تو وہ انسان ہی نہیں، فرق اتنا ہے، تو ایک نوع کے افراد قرار دینے کے ساتھ کہ ہم کہیں کہ وہ بھی انسان کا فرد اور وہ بھی انسان کا فرد، اس کے ساتھ مساوات لازم نہیں آتی، یہ مشاہدے کے خلاف ہے اور دلائل کے خلاف ہے، دو فرد کے درمیان میں بے اِنتہا تفاوت ہوسکتا ہے، جس طرح سے زمین وآسمان کے درمیان فرق ہے، ثریٰ اور ثریا کے درمیان فرق ہے، نور اور ظلمت کے درمیان فرق ہے اسی طرح سے ایک نوع کے مختلف افراد کے درمیان فرق ہوسکتا ہے، ایک نوع قرار دینے کے ساتھ مساوات لازم نہیں آتی۔ جس طرح سے ایک بزرگ کا قول ہے ''مُحَمَّدٌ بَشَرٌ لَا كَالْبَشَرِ ... بَلْ هُوَ يَاقُوْتٌ بَيْنَ الْحَجَرِ'' کہتے ہیں کہ محمد ﷺ بشر تو ہیں لیکن عام بشر کی طرح نہیں، بلکہ اس طرح سے ہے جس طرح سے پہاڑی پتھروں میں سے یاقوت نکلتا ہے، اب یاقوت بھی پتھر ہی ہوتا ہے، ایک پتھر تو یہ ہے جو سڑکوں کے ٹرک آتے ہیں اور سڑکوں پر ڈالتے ہیں اور ہر روز پاؤں کے نیچے روندے جاتے ہیں، گدھے ان کے اُوپر پیشاب کرتے ہیں، یہ بھی تو پتھر ہی ہے، اور ایک پتھر یاقوت ہے جو پہاڑوں میں سے کبھی قسمت سے نکل آتا ہے اور وہ ایک ماشے کا ہو تو اس کے مقابلے میں عام پتھر آپ پتا نہیں کتنے خرید لیں، اور دونوں کو رکھ دیں، ایک طرف اس پتھر کو رکھ دیں، ایک طرف اُس پتھر کو رکھ دیں، دیکھنے والا کہے گا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، اگر یہ پتھر ہے تو وہ پتھر نہیں، وہ پتھر ہے تو یہ پتھر نہیں، لیکن

لیکن جو شخص حالات جانتا ہے وہ کہے گا ہیں تو دونوں پتھر، نوع ایک ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے نوع کے افراد کے درمیان میں فرق اتنا رکھا ہوا ہے کہ دونوں کی آپس میں مناسبت ہی کوئی نہیں، تو یہ ذہن کہ ایک نوع کا قرار دینے کے ساتھ مساوات لازم آتی ہے یہ جاہلانہ ذہن ہے۔

''بشریتِ انبیاء'' کے منکر کا شرعی حکم

باقی رہی یہ بات کہ جو کہتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام بشر نہیں ہیں، ان کا شرعی طور پر حکم کیا ہے؟ اگرچہ فتوے لگانا ہمارا منصب نہیں ہے، لیکن آپ حضرات کی واقفیت کے لئے ایک بات عرض کر دوں، کہ صرف اتنے الفاظ کہ ''انبیاء بشر نہیں''، یا ''حضور صلی اللہ علیہ وسلم بشر نہیں''، اتنے کلمے کے اُوپر کُفر کا فتویٰ نہیں لگایا جا سکتا جب تک کہ مراد واضح نہ کر لی جائے، کیوں؟ کہ جیسے میں نے عرض کیا کہ دو اَفراد کے درمیان میں جب تفاوت ہوتا ہے تو کمال اور نقص کے اعتبار سے بعض افراد سے اس نوع کی نفی کی جا سکتی ہے جیسے کہ آپ ایک آدمی کو گھٹیا کام کرتے ہوئے دیکھتے ہیں یا کسی کو ضدی اور شرارتیں دیکھتے ہیں تو آپ کہتے ہیں یہ انسان نہیں، انسانوں کے کام ایسے نہیں ہوتے، اور جب آپ کو تنبیہ کی جاتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ انسان ہو یا ڈنگر ہو؟ اور کبھی کمال کے اعتبار سے بھی نفی کر دی جاتی ہے کہ اس میں تو اتنے کمالات ہیں جو عام افراد کے اندر نہیں پائے جاتے، معلوم ہوتا ہے کہ یہ نہیں، مَاھٰذَا بَشَرًا جس طرح سے مصر کی عورتوں نے یوسف علیہ السلام کو دیکھ کے کہا تھا یہ تو بشر نہیں ہے، اور ہم بھی یہ کہتے ہیں، جب کسی بزرگ کو دیکھتے ہیں کسی کا اچھا حال دیکھتے ہیں تو ہم کہتے ہیں کہ یہ انسان نہیں، یہ تو فرشتہ ہے، وہ تو فرشتہ ہے جو انسان کی شکل میں آ گیا، اولیاء اللہ کے لئے اور بڑے لوگوں کے لئے ہم بھی یہ لفظ بولتے ہیں، تو وہاں حقیقت کے اعتبار سے نوع کی نفی کرنی مقصود نہیں ہوتی، محاورات کے اندر ناقص چیز کو بھی نوع سے بسا اوقات خارج کر دیا جاتا ہے، اور کامل چیز جو انتہائی کامل ہوتی ہے اس کو بھی دوسرے افراد کی طرف دیکھتے ہوئے بسا اوقات اس نوع سے خارج کر دیا جاتا ہے، پاک طینت انسان کو ہم کہتے ہیں نہیں! یہ انسان نہیں، یہ تو فرشتہ ہے، مَاھٰذَا بَشَرًا اِنْ ھٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ، ہم اپنے محاورات میں یہ لفظ استعمال کرتے ہیں، اور اگر کسی کے اندر ہم شرارت کا مادّہ ضرورت سے زیادہ دیکھتے ہیں تو وہاں یہ کہہ دیتے ہیں کہ وہ انسان کہاں ہے وہ تو شیطان ہے، مجسم شیطان ہے، اس کی صرف صورت انسان جیسی ہے، یہ ہم کہتے ہیں۔ اور کوئی انسان جب شرارت کرتا ہے تو ہم کہتے ہیں یہ تو گدھا ہے، یہ انسان نہیں ہے، اس کی شکل انسانوں جیسی ہے، یہ محاورات کے اندر عام طور پر بولا جاتا ہے، تو جس سے معلوم ہو گیا کہ علمی محاورے میں ناقص فرد کو بھی اس نوع سے خارج کر دیا جاتا ہے، اور اگر کوئی اعلیٰ درجے کا کامل فرد ہوتا ہے تو اس کو بھی اس نوع سے خارج کر دیا جاتا ہے، تو صرف اتنا عنوان دیکھنے کے ساتھ یہ لازم نہیں آتا کہ سرے سے اس حقیقت کا ہی انکار ہو گیا، اس لئے اس کی وضاحت طلب کی جائے گی کہ اگر وہ کہتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام بشر نہیں، تو ان کی کیا مراد ہے؟ کیا وہ اللہ کی مخلوق ہیں؟ وہ کہتے ہیں کہ ہاں جی! اللہ کی مخلوق ہیں، کیا یہ آدم کی اولاد ہیں؟ وہ کہیں کہ ہاں جی! آدم کی اولاد ہیں، کیا یہ بھی ماں باپ سے پیدا ہوئے ہیں جس طرح سے عام آدمی پیدا ہوتے ہیں؟ وہ کہیں کہ

ہاں جی! اسی طرح پیدا ہوتے ہیں، تو پھر انہیں کہو کہ جس وقت یہ آدم کی اولاد ہیں، اللہ کی مخلوق ہیں، اُسی طرح سے ماں باپ سے پیدا ہوتے ہیں تو پھر تو وہ انسان ہی ہوئے، بشر ہی ہوئے، وہ کہتے ہیں جی! ٹھیک ہے، لیکن کہنا نہیں چاہیے، (جب ان سے بات کرو گے تو آخر وہ اس نکتے پہ آجاتے ہیں کہ کہنا نہیں چاہیے) کیونکہ بشر تو ہم ہیں، انسان تو ہم ہیں، اور ایسا کہنے کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ شاید انبیاء علیہم السلام بھی ہم جیسے ہی تھے، اگر آپ اُن میں سے سمجھ دار طبقے کے ساتھ بات کریں گے تو وہ نتیجہ یہاں لائیں گے، اور ضد بازی میں آکے پھر اس عنوان کے اوپر جو اَڑ گئے تو اَڑنے کے ساتھ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک سرے سے بشر ہی نہیں، اگر وہ یہ کہیں کہ نہیں جی! ہم ان کو اولادِ آدم نہیں مانتے، ایسی صورت میں پھر یقیناً وہ کافر ہیں، اس میں پھر کسی قسم کی تاویل کی گنجائش نہیں ہے۔ پھر وہ منافاۃ حقیقی طور پر ثابت ہوگی کہ جس طرح سے مشرک کہتے تھے کہ بشر رسول نہیں ہوسکتا، یہ کہتے ہیں کہ رسول بشر نہیں ہوسکتا، اور قرآنِ کریم میں کتنی آیات ہیں جن میں پھر ان کو تحریف کرنی پڑتی ہے اور ان کا مضمون بدلنا پڑتا ہے۔ اور اگر وہ کہیں کہ ہاں! نوعِ انسانی میں سے ہیں، آدم کی اولاد ہیں، جب آدم کی اولاد ہوئے تو آدمی ہوئے، اور ہم ان کو اللہ کی مخلوق مانتے ہیں، لیکن ہم یہ کہتے ہیں کہ بشر کہنا نہیں چاہیے، کہ اس میں توہین کا پہلو ہے چونکہ ہم جو بشر ہیں، تو ان کا یہ عنوان کسے درجے میں گوارہ ہے، اور اس تعبیر کے اوپر ضد کرنا یہ ابتداع ہے، باقی! یہ ہے کہ یہ کُفر نہیں ہے، (ارے سمجھے؟) تو اس تشریح کے ساتھ پوچھیں، اگر تو اس تشریح کو ماننے کے لئے تیار ہوجائیں تو کافر نہیں ہیں، اور اگر اس تشریح کا کوئی سرے سے انکار کردے اور کہے کہ میں تو ان کو اللہ کا جز سمجھتا ہوں، اللہ کی مخلوق ہی نہیں سمجھتا، جس طرح سے باپ سے بیٹا پیدا ہوتا ہے لیکن بیٹا باپ کی مخلوق نہیں ہے، یا، وہ کہتا ہے کہ میں ان کو نسلِ آدم سے نہیں سمجھتا، وہ آمنہ کے بیٹے ہی نہیں، وہ عبداللہ کے گھر پیدا ہی نہیں ہوئے، اس قسم کے حقائق کا میرا جہاں تک خیال ہے کہ کوئی جاہل بھی انکار نہیں کرسکتا۔ اس لیے اس عنوان کو ہم یوں تو کہہ سکتے ہیں کہ یہ کافرانہ جملہ ہے قرآنِ کریم کے حقائق کے خلاف، لیکن اس میں تاویل کی گنجائش ہے جس طرح سے ہماری گفتگو کے اندر ناقص فرد کو بھی نوع سے خارج کرنا یہ محاورہ بھی ہے، اور اعلیٰ فرد کو بھی گفتگو کے اندر نوع سے خارج کردینا یہ محاورہ بھی ہے، جس طرح سے مثالیں آپ کے سامنے ذکر کردیں۔ تو صرف اس عنوان کے اختیار کرنے کے ساتھ کُفر لازم نہیں آتا، ورنہ ہم بھی صبح شام اس قسم کے عنوان اپنی گفتگو کے اندر اختیار کرتے ہیں، تو جب تک اتنی تفصیل سامنے نہ آجائے اس وقت تک کُفر کا فتویٰ نہیں دیا جاسکتا، یہی وجہ ہے کہ علمائے دیوبند اس بارے میں ہمیشہ محتاط ہیں، اور جماعتی حیثیت سے کسی طبقے کو کافر قرار دینے میں وہ بہت متأمل ہیں، اور جو جذباتی قسم کے طالبِ علم اور جذباتی قسم کے واعظ ہوتے ہیں وہ (ہمارے متعلق) کہتے ہیں کہ دیکھو! یہ مداہن ہیں، یہ حق نہیں کہتے۔ بھائی! حق یہی تو ہے جو ہم سمجھ رہے ہیں، اور ہم جو سمجھ رہے ہیں وہ کہہ رہے ہیں، باقی جس قسم کا حق تم قرار دے رہے ہو ہم اس کے مکلف نہیں کہ جو تم عقیدہ بنالو ہم اسی کا پرچار کریں، علمی لب و لہجے کے ساتھ اور علمی تحقیق کے ساتھ اس عقیدے کی حقیقت یہ ہے۔ (یہ بات سمجھ میں آگئی؟) اس لیے صرف اس لفظ کی بنا پر کسی کو کافر نہیں قرار دیا جاسکتا کہ وہ کہتا ہے کہ انبیاء بشر نہیں، جب تک کہ اس

کی اتنی مراد واضح نہ کر دالیں کہ اس کا کیا مقصد ہے، اللہ کی مخلوق نہیں ہیں؟ آدم کی نسل نہیں ہیں؟ اگر وہ ان باتوں کا انکار کرتا ہے تو یقیناً کافر ہے، اور اگر وہ ان باتوں کو مانتا ہے، پھر وہ آگے آدمی کہنے سے جھجکتا ہے، یا بشر کہنے سے جھجکتا ہے، اور انسان کہنے سے شرماتا ہے یہ خیال کرتا ہوا کہ اس میں تو نقص کا پہلو ہے تو پھر آپ سمجھ لیجئے کہ یہ عنوان جاہلانہ ہے اور اس قسم کا انداز اختیار کرنا مبتدعانہ ہے، باقی! اس بات کے سامنے آجانے کے بعد اس کو کافر نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اسلامی عقیدے کے تحت ہم کھل کے کہہ سکتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام بشر ہیں، ہم اس میں کوئی توہین کا پہلو محسوس نہیں کرتے، واشگاف الفاظ میں کہتے ہیں کہ وہ آدمی ہیں، انسان ہیں، ہم اس میں کوئی توہین کا پہلو محسوس نہیں کرتے، انسان مان کر، آدمی مان کر، بشر مان کر پھر ہم کہتے ہیں کہ ہماری ان سے کوئی مماثلت نہیں، وہ کمال کے اتنے اعلیٰ درجے پر ہیں کہ اگر ہم صبح شام رات دن اللہ تعالیٰ کی عبادت وریاضت میں لگے رہیں تو بھی ہم ان کے قریب تک بھی نہیں پھٹک سکتے، چہ جائے کہ ان کے برابر ہو جائیں۔ ایک ماں باپ کی اولاد میں چار بیٹے ہیں، ان میں سے ایک پیغمبر بن گیا، چاہے ان کی ماں ایک ہے، چاہے ان کا باپ ایک ہے، چاہے ان کی زبان ایک ہے، چاہے ان کی بود و باش ایک ہے، ہم کہتے ہیں کہ دونوں کے درمیان فرق اتنا ہے کہ اُس فرق کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا، باوجود اس بات کہ وہ ایک دوسرے کے حقیقی بھائی ہیں۔ تو نوع اور جنس ایک ہونے کے ساتھ کوئی مساوات لازم نہیں آتی، کمالات کے اعتبار سے اتنا فرق ہوتا ہے، تو اس وضاحت کے بغیر ہم اس عقیدے کی بنا پر کسی کو کافر نہیں قرار دیتے، جذبات کی رَو میں بہنا یہ کوئی علم کا تقاضا نہیں ہے، وہ کہتے رہیں کہ دیکھو! یہ انبیاء کو بشر سمجھتے ہیں، کافر ہیں، یہ ان کی جاہلانہ بات ہے، جاہلانہ بات کے مقابلے میں عالمانہ انداز یہی ہے کہ ہم اس عقیدے کی بنا پر کافر کہنے کے لئے تیار نہیں جب تک کہ اتنی وضاحت نہ ہو جائے۔ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا: یہی بات ان کے لئے ایمان سے مانع بن گئی، کہتے ہیں کہ کیا اللہ نے بشر کو رسول بنا کے بھیجا؟

فرشتوں کو رسول بنا کر کیوں نہیں بھیجا گیا؟

آپ کہہ دیجئے کہ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا: آپ کہہ دیجئے کہ اگر زمین میں فرشتے ہوتے جو زمین میں چلتے پھرتے (مُطْمَئِنِّيْنَ کے معنی کہ یہیں رہنے اور بسنے والے ہوتے، کیونکہ ویسے تو فرشتے زمین پر آتے بھی ہیں اور چلتے پھرتے بھی ہیں، لیکن یہاں کے رہنے بسنے والے نہیں) ''اگر یہاں زمین میں فرشتے ہوتے چلتے پھرتے رہنے بسنے والے تو ہم ان کے اوپر آسمان سے فرشتہ رسول اتار دیتے'' کیونکہ رسول تو راہنمائی کے لئے آئے گا، جب راہنمائی کے لئے آئے گا تو اس کو اسی نوع میں سے آنا چاہیے جن کی طرف رسول بنا کے بھیجا ہے، تا کہ ان کے جذبات کو پہچانے، ان کے رسم و رواج کو جانے اور اس کے مطابق ان کی راہنمائی کرے، ''اگر یہاں زمین پر فرشتے رہنے بسنے والے ہوتے تو ہم ان کی طرف فرشتے کو رسول بنا کر بھیج دیتے۔'' اتنی وضاحت کے بعد بھی اگر یہ نہیں سمجھتے تو آخری بات یہ ہے: قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ: آپ کہہ دیجئے کہ اللہ گواہ کافی ہے میرے اور تمہارے درمیان، اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا: بے شک وہ اپنے بندوں

کے متعلق خبر رکھنے والا ہے دیکھنے والا ہے، اللہ جانتا ہے، اللہ گواہ ہے کہ میں بشر ہونے کے باجود اللہ کا رسول ہوں، اور اللہ کی طرف سے صحیح طور پر یہ تعلیمات لاتا ہوں، تم نہیں مانتے تو نہ مانو، اللہ گواہ کافی ہے۔

ہدایت اور گمراہی اللہ کے قبضے میں ہے...... مجرمین کا اَنجامِ بد

اور ان کے اس طرزِ عمل سے یہ بات بھی بالکل واضح ہوگئی کہ اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ: جس کو اللہ ہدایت دے وہی ہدایت یافتہ ہے،'' اور جس کو اللہ بھٹکا دے نہیں پائے گا تو اس کے لئے دوست کارساز اللہ کے علاوہ''، پھر اس کو کوئی سیدھے راستے پر نہیں لاسکتا، یعنی ان کے حالات سے یہ بات بھی سامنے آگئی کہ اللہ کی طرف سے توفیقِ ہدایت ہو تو کوئی ہدایت یافتہ ہوسکتا ہے، باقی! اللہ کس کے متعلق چاہتا ہے، کس کے متعلق اس کی طرف سے ہدایت کی توفیق ہوتی ہے، وہ بار بار واضح کر دیا گیا، کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اپنی حکمت کے مطابق بنائے ہوئے ضابطے ہیں، قاعدے ہیں، جو بندہ ان قاعدوں کے مطابق ہدایت حاصل کرنا چاہتا ہے تو اللہ کی طرف سے اِذن ہوجاتا ہے اور اللہ کی مشیت متعلق ہوجاتی ہے، اور جو ان قاعدوں کے خلاف چلتا ہے تو اللہ کی طرف سے ہدایت سے محروم ہوجاتا ہے۔ وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ: جس طرح سے آج یہ الٹی الٹی باتیں کرتے ہیں، سیدھا راستہ اختیار نہیں کرتے، اور حق دیکھنے کی کوشش نہیں کرتے، سننے کی کوشش نہیں کرتے، قیامت کے دن ان کا انجام بھی ایسے ہی سامنے آئے گا: ''جمع کریں گے ہم ان کو قیامت کے دن ان کے چہروں کے بل'' چہروں کے بل ان کو گھسیٹ کے لائیں گے، ان کا حشر ایسے ہوگا، ''اندھے ہوں گے گونگے ہوں گے بہرے ہوں گے'' عُمْيًا اَعْمٰى کی جمع اندھے ہوں گے، بُكْمًا اَبْكَم کی جمع، گونگے ہوں گے، اور صُمًّا اَصَمّ کی جمع، بہرے ہوں گے، وہاں بھی ان کی ساری کی ساری استعداد ختم ہوگی بایں معنی کہ اگر وہاں سمجھنا سوچنا چاہیں گے تو موقع ہی نہیں ہوگا، منہ کے بل ان کو گھسیٹ کے لایا جائے گا، صحابہ کرام نے سرورِ کائنات ﷺ سے سوال کیا تھا کہ یارسول اللہ! قیامت کے دن کافر اپنے چہروں کے بل چلتے ہوئے آئیں گے تو یہ کیسے ہوگا، چہرے کے بل کوئی کیسے چل سکتا ہے؟ آپ کے سامنے ''مشکوۃ شریف، باب الحشر'' کے اندر روایت آئی تھی، آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے قدموں کے بل چلا دیا وہ چہرے کے بل چلانے پر بھی قادر ہے۔[1] جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حقیقت اور واقعہ ہے کہ ان کی ٹانگیں اُوپر کو ہوں گی اور سر نیچے کو ہوگا جس وقت یہ میدان کی طرف چلتے ہوئے آئیں گے، اور اب سمجھنے کی کوئی قوت نہیں، سوچنے کی کوئی قوت نہیں، اس اعتبار سے وہ اندھے ہوں بہرے ہوں گے گونگے ہوں گے، اب موقع گزر چکا کسی حقیقت کو سمجھنے کا اور اس کے مطابق عمل کرنے کا، جیسے اگلی آیات میں ایک جگہ آپ کے سامنے آئے گا کہ جب کافر کو اندھا اٹھایا جائے گا تو وہ کہے گا لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا (سورۃ طٰہٰ: ۱۲۵) اے اللہ! دُنیا کے اندر تو میں بڑا سمجھ دار اور دیکھنے والا تھا، آج مجھے اندھا کر کے کیوں اٹھایا گیا؟ تو وہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی کیفیات اُس وقت ہوں گی، اور کافر سمجھے گا کہ دنیا کے مقابلے میں آج میری کیفیت نمایاں ہوگئی، تو وہاں اس کو یہی کہا جائے کہ تو نے وہاں (دنیا میں) حق کا راستہ نہیں دیکھا، اور وہاں تُو نے ہماری

(۱) بخاری ۲/ ۷۰۱، کتاب التفسیر سورۃ فرقان۔ مسلم ۲/ ۳۷۲، باب یحشر الکافر علی وجهه۔ مشکوۃ ۲/ ۴۸۳، باب الحشر فصل اول۔

آیات پہ توجہ نہیں کی، تو اسی طرح سے آج تجھے بدلہ دے دیا گیا۔ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ: ان کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا: جب کبھی وہ آگ بجھنے لگے گی، بجھ جائے گی نہیں!، یہ نوبت نہیں آئیگی کہ بجھ جائے، (بلکہ) جس طرح سے بھڑکایا جاتا ہے تو آہستہ آہستہ اس آگ کی تیزی میں کمی آتی ہے، اور دوبارہ پھر اس میں ایندھن ڈال کے اس کو بھڑکا دیا جاتا ہے وہی صورت یہاں ہے، "جب وہ آگ بجھنے لگے گی" زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا: ہم ان کو زیادہ کردیں گے از روئے بھڑکنے والی آگ کے، یعنی آگ ان کے اوپر بھڑکا دی جائے گی، حاصل یہ ہے کہ دیر تک جلنے کی بنا پر آگ کی تپش میں کمی نہیں آنے دی جائے گی، نئے نئے سرے کے ساتھ اس آگ کو بھڑکایا جائے گا۔

آخرت کے متعلق مشرکین کا شبہ اور اس کا جواب

ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا: یہ بدلہ ہے انکا اس سبب سے کہ انہوں نے کفر کیا ہماری آیات کا، وَقَالُوْٓا: اور کہا۔ یہی آخرت کا انکار یہی بنیاد ہے ان کے کفر کی، "انہوں نے کہا" ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا: کیا جس وقت ہم ہڈیاں ہوجائیں گے، وَّرُفَاتًا: اور چورا چورا ہوجائیں گے، ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا: کیا البتہ ہم اٹھائے جائیں گے نئے سرے سے پیدا کر کے؟ یہ وہی قدرت کا انکار ہے، اور یہ متعدد بار آپ کے سامنے ذکر کیا جاچکا کہ ان کا آخرت کا انکار اسی پر ہی مبنی تھا کہ ان کو یہ قدرت سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ مرنے کے بعد زندگی دوبارہ کیسے دی جائے گی، اور ان چورا چورا اور ریزہ ریزہ ہونے والی ہڈیوں کے اندر دوبارہ حیات کس طرح سے ڈالی جائے گی؟ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی اسی قدرت کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ جس نے پہلی دفعہ پیدا کردیا وہ دوبارہ بھی پیدا کرسکتا ہے، جو زمین و آسمان جیسی مخلوق بنا سکتا ہے تو ان ریزوں کو اکٹھا کر کے دوبارہ حیات ڈالنا اس کے لئے کیا مشکل ہے، اَوَلَمْ يَرَوْا: کیا ان لوگوں نے دیکھا نہیں اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ: کہ بے شک وہ اللہ جس نے پیدا کیا آسمانوں کو اور زمین کو، قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ: وہ قدرت رکھنے والا ہے اس بات پر کہ ان جیسوں کو پیدا کردے، وَجَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَيْبَ فِيْهِ: اور ان کے دوبارہ پیدا کرنے کے لئے اللہ نے ایک وقت متعین کیا ہے جس کے آنے میں کوئی شک نہیں۔ اس میں اس شبہ کو رد کردیا گیا کہ اگر اللہ تعالیٰ پیدا کرسکتا ہے اور پیدا کرے گا تو آج تک ہم نے تو کسی کو دوبارہ اٹھتے ہوئے دیکھا ہی نہیں، کہ مرگیا ہو اور مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہوگیا ہو، ہم نے تو ایسی کوئی مثال دیکھی نہیں، تو اس کا گویا کہ جواب ان الفاظ میں آگیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دوبارہ اٹھنے کے لئے ایک وقت متعین کیا ہے جس کے آنے میں کوئی کسی قسم کا شک نہیں۔ فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا: یہ اسی طرح سے محاورے کے مطابق ترجمہ ہوگیا کہ "ظالم بے مانے نہ رہے، ظالم کفر کیے بغیر نہ رہے، انکار کیا ظالموں نے مگر کفر کرنے کا" یعنی باقی ہر چیز سے یہ انکار کردیتے ہیں، کفر سے انکار نہیں کرتے، یہ ہر چیز کے مقابلے میں اڑ جاتے ہیں لیکن کفر کے اختیار کرنے میں نہیں اڑتے، کفر کو اختیار کرلیتے ہیں، تو محاورے کے مطابق ترجمہ یوں ہی ہوگا "ظالم ناشکری اختیار کیے بغیر نہ رہے، یا، کفر اختیار کیے بغیر نہ رہے۔"

اِنسان کی تنگ دلی

قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآىٕنَ رَحْمَةِ رَبِّیْٓ: آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم مالک ہوتے میرے رَبّ کی رحمت کے خزانوں کے، اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ: تب تم ان کو روک رکھتے، اِذًا: یعنی اگر تم مالک ہوتے تب تم ان کو روک رکھتے، خَشْیَةَ الْاِنْفَاقِ: خرچ کرنے کے اندیشے سے یعنی خرچ کرنے کے انجام کے اندیشے سے، خرچ کرنے کا انجام بظاہر کیا ہوتا ہے؟ ختم ہوجانا، یعنی تمہیں جو میری نبوت پر اعتراض ہے کہ اس کو نبی کیوں بنادیا گیا، تو کیا اللہ کی رحمت کے خزانے تمہارے پاس ہیں؟ جیسے سورۂ زُخرف کے اندر بھی یہ مضمون آئے گا، اَھُمْ یَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ: کیا تیرے رَبّ کی رحمت کا بانٹنا ان کے حصے میں آگیا؟ ان کو اختیار ہے کہ جس کو چاہیں وہ رحمت دیں؟ نَحْنُ قَسَمْنَا بَیْنَھُمْ مَّعِیْشَتَھُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا (آیت: ۳۲) دنیا کا رزق بھی ہم ان کے درمیان تقسیم کرتے ہیں، اس لیے جس کو چاہتے ہیں جتنا چاہتے ہیں دیتے ہیں، یہ اپنے اختیار کے ساتھ رزق میں کمی بیشی نہیں کرسکتے، نبوت جیسی دولت کا ڈپوان کو کس طرح سے دے دیا جائے کہ جس کو چاہیں دیں جس کو چاہیں نہ دیں، یہ تقسیم اللہ کی طرف سے ہے، تمہیں اس قسم کی چیزوں کے قابل سمجھا جو اللہ نے تمہیں دے دیں، باقی اپنی اس رحمت کو جس کو اللہ تعالیٰ مناسب سمجھتا ہے دیتا ہے۔ ”اگر یہ رحمت کے خزانے تمہارے پاس ہوتے تو تم تو ان کو روک رکھتے اس خیال سے کہ اگر ہم خرچ کریں گے تو ختم ہوجائیں گے“ جس طرح سے ظاہری خزانے اللہ نے اگر تمہیں دیے ہیں یعنی مال اور دولت کے، تو بخل کرتے ہو، ان کو خرچ نہیں کرتے اس اندیشے سے کہ کہیں ختم نہ ہوجائیں، تو اگر یہ رحمت کا خزانہ تمہارے پاس آجاتا تم اس میں بھی اسی طرح سے بخل کرتے، وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا: انسان بہت تنگ دل ہے، کسی دوسرے کو فائدہ پہنچانے کی یہ سوچتا نہیں، بلکہ ہمیشہ اپنے مفاد کو سامنے رکھتا ہے، اگر اللہ کی رحمت کے خزانے مل بھی جائیں تو یہ دوسرے کو فائدہ نہیں پہنچائے گا بلکہ اس خیال سے کہ کہیں ختم نہ ہوجائیں روک کے رکھے گا، حالانکہ اللہ کی رحمت......! اگر اس سے علم مراد لیا جائے، نبوّت مراد لی جائے، تو یہ کوئی ختم ہونے والی چیز نہیں۔ یعنی آپ دیکھتے ہیں، ایک تو پیسے ہیں، جن میں خرچ کرنے سے بظاہر کمی آتی ہے، تو انسان کا بخل اس میں کس طرح سے ہے، حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے یقین دلایا کہ صدقہ خیرات کرنے کے ساتھ مال میں کمی نہیں آتی، بظاہر تمہیں اگرچہ کمی ہوتی نظر آتی ہے لیکن حقیقت میں کمی نہیں، اور واقعہ یہ ہے کہ صدقہ خیرات کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ دنیا کے اندر وسعت بھی دیتا ہے، اور جو روک کے رکھتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ ہم سرمایہ دار ہوتے جارہے ہیں، حقیقت کے اعتبار سے ان میں کمی آتی جاتی ہے، کیونکہ مال بذاتِ خود مقصود نہیں، اگر جمع کرکے اس کے اوپر سانپ بن کے بیٹھ جاؤ گے تو کیا فائدہ؟ اگر اچھا کھایا نہ، اچھا پہنا نہ، دنیا میں اس مال کے ذریعے سے عزت نہ حاصل کی اور اپنی آخرت کو نہ بنایا تو یوں سمجھو کہ تم فقیر ہو گداگر ہو، تمہارے پاس کچھ نہیں ہے......! تو انسان اس میں تو بخل کرتا ہی ہے لیکن ایک علم کا خزانہ آپ حضرات کے پاس ہے کہ جس کو جتنا خرچ کیا جائے اتنا ہی یہ پھیلتا ہے، لیکن آپ بے شمار لوگوں کو دیکھو گے کہ اس میں بھی بخل کرتے ہیں، کسی کو علمی بات بتانے کے لئے تیار نہیں ہوتے، کسی کی اس قسم کی راہنمائی کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے، حالانکہ

اس کے ختم ہونے کا کوئی امکان نہیں، تو یہی موقع ہے جس میں انسان کی تنگ دلی کا اظہار ہوتا ہے، ''انسان تنگ دل ہے'' اس طرح کا حکم لگا دیا جاتا ہے نوع پر، باقی یہ لگا کرتا ہے بعض افراد کے اعتبار سے، یہ باتیں قضیہ مہملہ کے درجے میں ہوا کرتی ہیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍ بَيِّنٰتٍ فَسْـَٔلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِذْ جَآءَهُمْ

البتہ تحقیق ہم نے دیں موسیٰ علیہ السلام کو نو نشانیاں واضح واضح، آپ پوچھ لیجیے بنی اسرائیل سے جبکہ موسیٰ علیہ السلام ان کے پاس آئے،

فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّيْ لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا ﴿١٠١﴾ قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ

پھر فرعون نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا بے شک میں البتہ سمجھتا ہوں تجھے اے موسیٰ! جادو زدہ ﴿١٠١﴾ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ تجھے ضرور معلوم ہے نہیں اُتارا

هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَآئِرَ ۚ وَاِنِّيْ لَاَظُنُّكَ

ان (آیاتِ بینات) کو مگر آسمانوں اور زمین کے ربّ نے اس حال میں کہ یہ دل کی روشنی کا ذریعہ ہیں، اور بے شک میں البتہ سمجھتا ہوں تجھے

يٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ﴿١٠٢﴾ فَاَرَادَ اَنْ يَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ فَاَغْرَقْنٰهُ وَمَنْ

اے فرعون! ہلاک میں ڈالا ہوا ﴿١٠٢﴾ تو ارادہ کیا فرعون نے کہ ان کو گھبراہٹ میں ڈال دے اس علاقے سے، پھر فرعون کو اور اس کے سب

مَّعَهٗ جَمِيْعًا ﴿١٠٣﴾ ۙ وَّقُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اسْكُنُوا الْاَرْضَ

ساتھیوں کو ہم نے ڈبو دیا ﴿١٠٣﴾ اور کہا ہم نے اس (فرعون کے غرق ہو جانے) کے بعد بنی اسرائیل کو علاقے میں سکونت اختیار کرو،

فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِيْفًا ﴿١٠٤﴾ ؕ وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ

جس وقت آخرت کا وعدہ آ جائے گا تم سب کو لپیٹ کر ہم لے آئیں گے ﴿١٠٤﴾ اور حق کے ساتھ ہم نے اس قرآن کو اُتارا اور حق کے ساتھ

نَزَلَ ؕ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴿١٠٥﴾ ۘ وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ

ہی یہ اُترا، اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کو مگر مبشر اور نذیر بنا کر ﴿١٠٥﴾ اور قرآن کو ہم نے علیحدہ علیحدہ بنایا تا کہ آپ ٹھہر ٹھہر کر اس کو لوگوں پر

عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا ﴿١٠٦﴾ قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖٓ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ

پڑھتے رہیں، اور ہم نے اس کو تھوڑا تھوڑا کر کے اُتارا ﴿١٠٦﴾ آپ کہہ دیجیے کہ تم اس قرآن پر ایمان لاؤ یا نہ لاؤ، بے شک وہ لوگ جو علم دیے گئے

مِنْ قَبْلِهٖٓ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ

اس (قرآنِ کریم کے نازل ہونے) سے پہلے جب یہ قرآن اُن پر پڑھا جاتا ہے تو گر جاتے ہیں وہ ٹھوڑیوں کے بل

سُجَّدًا ﴿۱۰۷﴾ وَّيَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ﴿۱۰۸﴾

اس حال میں کہ سجدہ کرنے والے ہوتے ہیں ﴿۱۰۷﴾ اور کہتے ہیں کہ ہمارا ربّ پاک ہے، بے شک ہمارے ربّ کا وعدہ البتہ پورا کیا ہوا ہے ﴿۱۰۸﴾

وَيَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا ﴿۱۰۹﴾ قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ

اور گر جاتے ہیں ٹھوڑیوں کے بل روتے ہوئے اور یہ قرآن ان کو زیادہ کرتا ہے از روئے خشوع کے ﴿۱۰۹﴾ آپ کہہ دیجئے کہ تم اللہ کو پکارو یا

ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۚ وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ

تم رحمٰن کو پکارو، جس کسی کو پکارو گے اچھے اچھے نام اسی کے لئے ہی ہیں، ظاہر نہ کیا کر اپنی نماز کی قراءت کو اور نہ اس کو مخفی

بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴿۱۱۰﴾ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ

کیا کر، اور طلب کر تو اس کے درمیان راستہ ﴿۱۱۰﴾ اور آپ کہہ دیجئے سب تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس نے نہیں اختیار کی اولاد، اور نہیں

لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا ﴿۱۱۱﴾

اس کے لئے کوئی شریک سلطنت میں، اور کمزور ہونے کی وجہ سے اس کا کوئی مددگار بھی نہیں، اور بڑائی بیان کر اس کی بڑائی بیان کرنا ﴿۱۱۱﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ: لَقَدْ تاکید کے لئے۔ البتہ تحقیق ہم نے دیے موسیٰ علیہ السلام کو نو معجزات، ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو نو نشانیاں دیں، بینات: واضح واضح، فَسْئَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ: آپ پوچھ لیجئے بنی اسرائیل سے اِذْ جَآءَهُمْ: جبکہ موسیٰ علیہ السلام ان کے پاس آئے، فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ: پھر فرعون نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا، اِنِّيْ لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا: بے شک میں البتہ سمجھتا ہوں تجھے اے موسیٰ! جادو زدہ۔ مسحور: جس کے اوپر کسی نے جادو کر دیا ہو اور اس کی عقل ٹھکانے نہ رہی ہو، ایسے موقع پر مسحور مجنون کے معنی میں ہوتا ہے جیسے پیچھے لفظ آیا تھا اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا (آیت: ۴۷) وہاں اس کی مراد آپ کے سامنے ایسے ہی واضح کی گئی تھی، قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ: موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ تجھے ضرور معلوم ہے (لَقَدْ تاکید کے لئے) تُو ضرور جانتا ہے، تجھے ضرور معلوم ہے، مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَآئِرَ: نہیں اُتارا ان آیات بینات کو مگر آسمانوں اور زمین کے ربّ نے اس حال میں کہ یہ بصائر ہیں، بصائر بصیرت کی جمع، یعنی دل کی روشنی کا ذریعہ، سمجھ بوجھ کی باتیں، اس حال میں کہ یہ واضح

دلائل ہیں جن کے ذریعے سے عقل کو روشنی حاصل ہوتی ہے، دل کو بصیرت حاصل ہوتی ہے، وَاِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا: اور بے شک میں البتہ سمجھتا ہوں تجھے اے فرعون! ہلاکت میں ڈالا ہوا۔ ثُبور کہتے ہیں ہلاکت کو، اور مثبور کے معنی ہلاکت میں ڈالا ہوا۔ فَاَرَادَ اَنْ یَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ: استفزاز یہ لفظ اس سورۃ میں تیسری دفعہ آ رہا ہے، وَاسْتَفْزِزْ کا لفظ ابلیس کے قصے میں آیا تھا، وَاِنْ كَادُوْا لَیَسْتَفِزُّوْنَكَ یہ الفاظ بھی آئے تھے، اور تیسرا یہ اَنْ یَّسْتَفِزَّهُمْ، تو فَزٌّ اصل میں قطع کے معنی میں آتا ہے، قطع کرنا، گھبراہٹ میں ڈال دینا، اکھیڑ دینا۔ "تو ارادہ کیا اس فرعون نے کہ قدم اکھیڑ دے ان اسرائیلیوں کے اس علاقے سے" یہاں ارض سے ارضِ مصر مراد ہے۔ گھبراہٹ میں ڈال کے، بے چینی میں ڈال کے ان کو یہاں سے اکھیڑ دے، "ارادہ کیا فرعون نے کہ ان کو گھبراہٹ میں ڈال دے اس علاقے سے" یعنی گھبراہٹ میں ڈال کے اس علاقے سے نکال دے، فَاَغْرَقْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ جَمِیْعًا: پھر ہم نے اس فرعون کو ڈبو دیا اور ان لوگوں کو بھی جو فرعون کے ساتھ تھے سب کو، فرعون کو اور اس کے سب ساتھیوں کو ہم نے ڈبو دیا، وَّقُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ: اور کہا ہم نے اس فرعون کے غرق ہو جانے کے بعد بنی اسرائیل کو، اسْكُنُوا الْاَرْضَ: علاقے میں سکونت اختیار کرو، فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ: جس وقت آخرت کا وعدہ آ جائے گا، جِئْنَا بِكُمْ لَفِیْفًا: لَفّ لپیٹنے کو کہتے ہیں، لَفِیْفًا جمیعًا کے معنی میں ہے۔ لے آئیں گے ہم تم سب کو اکٹھا کر کے، تم سب کو لپیٹ کر ہم لے آئیں گے، وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ: اور حق کے ساتھ ہم نے اس قرآن کو اُتارا، وَبِالْحَقِّ نَزَلَ: اور حق کے ساتھ ہی یہ اُترا، یعنی یہ ہماری طرف سے اُتارا گیا اور اُترنا اول سے لے کر آخر تک حق کے ساتھ ہی متلبس رہا ہے، اس کے اندر باطل کی آمیزش ابتدا اور انتہا کے اعتبار سے کہیں نہیں ہوئی، یہ مطلب ہے اس کا۔ "ہم نے حق کے ساتھ اُتارا اور حق کے ساتھ ہی یہ اُترا" وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا: اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کو مگر مبشر اور نذیر بنا کر۔ وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ: یہ قرآنًا منصوب ہے علی شریطۃ التفسیر، ہم نے اس قرآن کو جدا جدا، ٹکڑے ٹکڑے، علیحدہ علیحدہ رکھا، علیحدہ علیحدہ بنایا، "اور قرآن، ہم نے اس کو جدا جدا کیا" لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ: تا کہ تو پڑھتا رہے اس کو لوگوں پر ٹھہر ٹھہر کر۔ مَكَثَ، یَمْكُثُ ٹھہرنے کو کہتے ہیں۔ "تا کہ آپ ٹھہر ٹھہر کے اس کو لوگوں پر پڑھتے رہیں" وَنَزَّلْنٰهُ تَنْزِیْلًا: نَزَّلَ اور اَنْزَلَ کے درمیان میں بھی فرق آپ نے کتابوں میں پڑھا کہ اَنْزَلَ دفعۃً اتارنے کو کہتے ہیں اور نَزَّلَ تھوڑا تھوڑا کر کے اتارنے کو کہتے ہیں، تو اس کا معنی ہوگا کہ ہم نے اس کو تھوڑا تھوڑا کر کے اتارا، جملۃً واحدۃً اس کو نہیں اتارا بلکہ تھوڑا تھوڑا کر کے ہم نے اس کو اتارا، قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖٓ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا: آپ کہہ دیجئے کہ تم اس قرآن پر ایمان لاؤ یا نہ لاؤ، اِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖٓ: قبلہ کی ضمیر قرآنِ کریم کی طرف لوٹ رہی ہے، بے شک وہ لوگ جو علم دیے گئے اس قرآنِ کریم کے نازل ہونے سے پہلے، اِذَا یُتْلٰى عَلَیْهِمْ: جب ان پر یہ قرآن پڑھا جاتا ہے۔ یُتْلٰی کی ضمیر قرآن کی طرف جا رہی ہے۔ "جب یہ قرآن اُن پر پڑھا جاتا ہے" یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا: گر جاتے ہیں وہ (اَذقان ذَقَن کی جمع ہے، ذَقَن کہتے ہیں ٹھوڑی کو) گر جاتے ہیں ٹھوڑیوں کے بل اس حال میں کہ سجدہ کرنے والے ہوتے ہیں، اور ذقن بول کر یہاں وجہ ہی مراد ہے، اور سجدہ پیشانی پر ہوا کرتا ہے، ٹھوڑی پر نہیں ہوتا، یہ مبالغہ ہے کہ ایسے طور پر گرتے ہیں گویا کہ ان کے منہ زمین میں ایسے لگ جاتے ہیں کہ ٹھوڑیاں بھی زمین سے لگ جاتی ہیں، بہت زاری کے ساتھ اور خشوع کے ساتھ اللہ کے سامنے گر جاتے ہیں۔

ویسے ذقن بول کر مراد چہرہ ہے،''گر جاتے ہیں وہ ٹھوڑیوں کے بل اس حال میں کہ سجدہ کرنے والے ہوتے ہیں۔''''اور کہتے ہیں کہ ہمارا ربّ پاک ہے بے شک ہمارے ربّ کا وعدہ البتہ پورا کیا ہوا ہے، گر جاتے ہیں ٹھوڑیوں کے بل روتے ہوئے اور یہ قرآن ان کو زیادہ کرتا ہے از روئے خشوع کے''یعنی یہ قرآن ان کا خشوع بڑھاتا ہے۔ قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ: آپ کہہ دیجئے کہ تم اللہ کو پکارو یا تم رحمٰن کو پکارو، اَیًّا مَّا تَدْعُوْا: جس کسی کو پکارو گے، یعنی اللہ کو یا رحمٰن کو، فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى: اچھے اچھے نام اسی کے لئے ہی ہیں، تو اللہ جس کا نام ہے رحمٰن بھی اسی کا نام ہے۔ وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ: صلوۃ بول کر یہاں قراءت مراد ہے، ظاہر نہ کیا کر اپنی نماز کی قراءت کو وَلَا تُخَافِتْ بِهَا: اور نہ اس کو مخفی کیا کر، وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا: اور طلب کر تو اس مذکور کے درمیان راستہ، یعنی زیادہ جہر بھی نہ ہو اور مخافت بھی نہ ہو، اس کے درمیان درمیان راستہ طلب کر لیجئے، تلاش کر لیجئے۔ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا: اور آپ کہہ دیجئے سب تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس نے نہیں اختیار کی اولاد، کوئی بیٹا نہیں بنایا، ولد اولاد کے معنی میں ہے، اور ایک بیٹے پر بھی بولا جاتا ہے،''جس نے اولاد اختیار نہیں کی'' وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِی الْمُلْكِ: اور نہیں اس کے لئے کوئی شریک سلطنت میں، وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ: کمزور ہونے کی وجہ سے اس کا کوئی مددگار بھی نہیں، یعنی کمزوری کی وجہ سے وہ کسی کو اپنا مددگار بنالے کہ میں اکیلا کام نہیں کر سکتا، تو کوئی دوسرا میری امداد کرے،''کمزوری کی وجہ سے، کمزور ہونے کی وجہ سے اس کا کوئی ولی بھی نہیں، کوئی اس کا کارساز کوئی مددگار نہیں'' وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا: اور بڑائی بیان کر اس کی بڑائی بیان کرنا۔ شروع میں سُبْحٰنَ الَّذِیْۤ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ میں سُبْحٰنَ کا ذکر آگیا تھا، اور (آخر میں) اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کے اندر الحمد کا ذکر آگیا، كَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا کے اندر اللہ اکبر کا ذکر آگیا، تو سبحان اللہ والحمد للہ واللہ اکبر یہ تینوں کلمے جو ذکر کا اصل ہیں گویا کہ ابتدا و انتہا کے اندر مذکور ہو گئے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط

پچھلا رکوع جو آپ کے سامنے گزرا ہے اور اس سے متصل کی آیات، اُس میں مشرکین اور منکرین کی طرف سے معجزات کے مطالبات تھے کہ یہ کر کے دکھاؤ، وہ کر کے دکھاؤ، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ کہا گیا تھا کہ بقدرِ ضرورت معجزات نمایاں کر دیے گئے ہیں، اور خصوصیت کے ساتھ یہ کتاب والا معجزہ تو اتنا بیّن ہے کہ اس میں کوئی کسی قسم کی تاویل کی بھی گنجائش نہیں، لیکن جن لوگوں کا سمجھنے کا ارادہ نہیں ہوتا ان کو ہدایت نصیب نہیں ہوتی، اسی مضمون کی تائید کے طور پر آگے یہ ذکر کیا جا رہا ہے کہ دیکھو! اگر صرف معجزات سے ہی ہدایت ہونی ہوتی، تو کیا فرعون ہدایت یافتہ نہ ہو جاتا، موسیٰ علیہ السلام کو ہم نے کتنے واضح واضح معجزات دیے تھے، لیکن جب اس فرعون نے ماننے کا ارادہ نہیں کیا تو یہ معجزات اس کو ایمان نہ بخش سکے، بلکہ ان کی مخالفت کی بنا پر آخر وہ تباہ ہوا، تو اسی طرح سے اگر تم نیک نیت نہیں ہو، ارادہ تمہارا صحیح نہیں، اور ایمان تم لانا نہیں چاہتے، تو معجزات جتنے طلب کرتے چلے جاؤ، ایمان نہیں ہوگا، نتیجۃً برباد ہو سکتے ہو۔

''تسع آیات'' کا مصداق

یہاں جو تِسْعَ اٰیٰتٍ کا ذکر کیا گیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو ہم نے نو واضح آیتیں دی تھیں اس سے مراد وہ نو معجزے ہیں جن کا ذکر آپ کے سامنے سورۂ اعراف میں گزرا، ید بیضاء، عصا، سنین، نقصِ ثمرات، طوفان، جراد، قمل، ضفادع، دَم، ان آیاتِ مفصلات کا ذکر آپ کے سامنے سورۂ اعراف میں آیا تھا، اکثر مفسرین نے تِسْعَ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ کا اسی کو ہی مصداق بنایا ہے، اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ تِسْعَ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ سے واضح اَحکام مراد ہیں جو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی وساطت سے عطا فرمائے تھے، وہ ''مشکوٰۃ شریف'' میں ''کتاب الایمان'' کے اندر آپ نے پڑھے، جہاں دو یہودیوں کا ذِکر آیا کہ وہ حضور ﷺ کے پاس آئے تھے اور انہوں نے حضور ﷺ سے ''آیاتِ بینات'' کا سوال کیا تھا، تو آپ نے جواب میں ان اَحکام کو بیان فرمایا تھا، یاد ہوگا، ''مشکوٰۃ شریف'' میں وہ روایت گزری ہے، جس میں یہ تھا کہ شرک نہ کرو، چوری نہ کرو، زِنا نہ کرو، ناحق خون مت کرو، جادو نہ کرو، سُود مت کھاؤ، بے گناہ کو مت پکڑو کہ حاکم اسے قتل کردے، عفیف عورتوں پر تہمت مت لگاؤ، جہاد سے نہ بھاگو، تو تو یہ ہو گئے، خصوصیت کے ساتھ آگے ذکر کیا گیا تھا کہ سبت کے بارے میں کوتاہی نہ کرو،[1] یہ خصوصیت کے ساتھ یہود کو خطاب کر کے کہا گیا تھا۔ تو بعض نے اس کا مصداق ان کو بنایا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کا فرعون کے ساتھ مکالمہ...... اِنکار پر فرعون کا اَنجامِ بَد

فَسْـَٔلْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اِذْ جَآءَهُمْ: یہ گویا کہ اس کی ایک سند بیان کردی کہ یہ جو کچھ کہا جارہا کہ نو معجزے دیے ہیں یہ کتنی واضح بات ہے کہ اگر آج بنی اسرائیل سے پوچھو گے تو وہ بھی تمہیں بتادیں گے، فَسْـَٔلْ یہ امر کا صیغہ ہے لیکن یہ ایجاب کے لئے نہیں کہ آپ ضرور سوال کریں، اسی لئے ترجمہ کرتے وقت حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے ''بیان القرآن'' میں ایک لفظ بڑھایا جس سے معلوم ہوجاتا ہے کہ اس اَمر سے ایجاب مقصود نہیں ہے، انہوں نے لکھا ہے ''آپ چاہیں تو بنی اسرائیل سے پوچھ لیجئے''، یہ لفظ اپنی تائید کے لئے بولا جاتا ہے، میں ایک بات کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ بھائی! اگر آپ چاہیں تو فلاں سے پوچھ لیں، اس سے صرف اپنی بات کو قوت پہنچانی مقصود ہوتی ہے، ضروری نہیں ہوتا کہ جس کو کہا جارہا ہے کہ پوچھ لیں وہ ضرور پوچھے، تو یہ لفظ اپنی زبان کے اعتبار سے بڑھا کے اس بات کی طرف اشارہ کردیا گیا کہ یہ امر ایجاب کے لئے نہیں ہے، آپ چاہیں تو بنی اسرائیل سے پوچھ لیں، کہ جب موسیٰ علیہ السلام ان کے پاس آئے تھے تو کیا ہم نے ان کو یہ معجزات نہیں دیے تھے یا یہ واضح اَحکام نہیں دیے تھے؟ اور فرعون نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا (ساری گفتگو کے بعد جس کا تفصیلی قصہ آپ کے سامنے سورۂ اعراف میں گزر چکا) کہ موسیٰ! میں تُو تجھے مجنون سمجھتا ہوں، دیوانہ سمجھتا ہوں، تجھے اپنی جان کی فکر نہیں کہ اگر میرے ہاتھ میں آگیا تو میں تجھے کیا کروں گا، جیل میں ڈال دوں گا، یہ کردوں گا، وہ کردوں گا، جیسے وہ دھمکاتا تھا، اور اگر تیرے عقل ہوش ٹھکانے ہوتے تو میرے ساتھ اس انداز سے بات نہ کرتا جس طرح سے تُو اَب کرتا ہے، یہ بہکی بہکی باتیں جو کر رہا ہے، معلوم ہوتا ہے تیرے پہ کسی نے جادو کردیا، تیرا دماغ خراب ہوگیا، کیونکہ وہ

(۱) ترمذی ۱۳۶/۲، ابواب التفسیر۔ سورۂ بنی اسرائیل/ مشکوٰۃ ص ۱۷ باب الکبائر فصل ثانی۔

دور جادو کا ہی تھا اس لئے اس کا ذہن اُدھر ہی منتقل ہوا، اور قوم کو پاگل بنانے کے لئے وہ اس قسم کے لفظ بول رہا ہے، واقعات کی تفصیل متعدد بار گزر چکی۔ تو موسیٰ علیہ السلام نے اسی وقت ترکی بہ ترکی جواب دیا کہ فرعون! تُو جانتا تو ہے کہ یہ جو کچھ میں کر رہا ہوں، جو کچھ میں دکھا رہا ہوں یہ جادو کے کرشمے نہیں ہیں اور نہ یہ بہکی ہوئی عقل کی باتیں ہیں، تجھے پتا تو ہے کہ یہ ساری کی ساری چیزیں رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ نے اتاری ہیں، ان کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکا، تیری ساری سلطنت میں ان کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکا، اگر یہ جادو کی بات ہوتی تو جادوگر اس کا مقابلہ کر لیتے، تجھے دِلی طور پر یقین ہے، جس طرح سے دوسری جگہ الفاظ ہیں جَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا اَنْفُسُهُمْ (النمل: ۱۴) انہوں نے انکار کیا (جحود کا معنی ہوتا ہے کہ دل میں عقیدہ ہو اور اُوپر سے انسان نہ مانے، دل سے جانتا ہے اور اُوپر سے اَڑی کرتا ہے اس کو جحود کہتے ہیں، کُفرِ جحود کا معنی یہی ہوتا ہے کہ جانتا بوجھتا ہوا پھر انکار کرتا ہے) وَاسْتَيْقَنَتْهَا اَنْفُسُهُمْ: ان کے دلوں کو یقین آ گیا تھا کہ جو کچھ موسیٰ علیہ السلام کہتے ہیں صحیح کہتے ہیں، یہ سب منجانب اللہ ہے...... ! تو (موسیٰ علیہ السلام کہتے ہیں کہ) تُو جانتا ہے کہ نہیں اُتارا ان کو مگر رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ نے، اور یہ سارے کے سارے بصائر ہیں، بصائر بصیرت کی جمع ہے، دل کی روشنی کو کہتے ہیں، اور ان آیات کو بصائر کہا جاتا ہے اس اعتبار سے کہ یہ دل کی روشنی حاصل کرنے کا ذریعہ ہوتی ہیں، ''اور میرا خیال یہ ہے کہ تُو ہلاکت میں ڈالا ہوا ہے'' جو اتنا سمجھانے کے باوجود سمجھتا نہیں، تیرا مقدر یہی ہے کہ تُو آخر ہلاکت میں جائے گا۔ فرعون نے پھر چاہا کہ ان کو گھبراہٹ میں ڈال دے، اس علاقے سے گھبراہٹ میں ڈال کے کسی طرح سے ان کو اکھیڑ دے، ہم نے اس کو غرق کر دیا اور اس کے ساتھیوں کو بھی غرق کر دیا، یہ واقعہ آپ کے سامنے آ چکا ہے، اور آگے اس کی کچھ تفصیل سورۂ طٰہٰ اور سورۂ قصص میں آئے گی، تو ان میں یہ واقعہ پھر مفصل آ رہا ہے۔ ''اور ہم نے اس کے غرق ہو جانے کے بعد بنی اسرائیل سے کہا کہ اب تمہیں اجازت ہے تم اس علاقے میں رہو'' یہاں اُسْكُنُوا وجوب کے لئے نہیں، کیونکہ اسی وقت فرعون کے غرق ہونے کے بعد موسیٰ علیہ السلام ان کو لے کر واپس مصر میں نہیں آئے، گویا کہ اب دشمن مر گیا، میدان صاف ہو گیا، اب چاہو تو اسی علاقے میں سکونت اختیار کر سکتے ہو، یہ تو دنیا کی بات ہے، لیکن یہ سکونت اس ارض کے اندر، اس علاقے میں عارضی ہے، ورنہ موت آ جانے کے بعد پھر اللہ تعالیٰ نے تمہیں قیامت کے دِن اکھٹا کرنا ہے، جیسے کہ کتاب اللہ کی یہ عادت ہے کہ چلتے چلتے آخرت کی تذکیر کثرت سے ہوتی ہے، واقعات کوئی بھی آ رہے ہوں لیکن کوئی نہ کوئی اشارہ آخرت کی طرف دے دیا جاتا ہے، کہ آخرت کا عقیدہ ہی تمام قسم کی نیکیوں اور حسنات کی بنیاد ہے، ''پھر جب آخرت کا وعدہ آ جائے گا ہم تم سب کو اکھٹا کر کے لے آئیں گے۔''

قرآنِ کریم کا ذِکر اور حضور ﷺ کا منصب

جیسے پہلے کتاب اللہ کا ذکر وقفے وقفے کے ساتھ متعدد بار آیا، تو آگے پھر اسی معجزے کو نمایاں کر دیا گیا کہ یہ کتاب اللہ جو اس موجود پیغمبر کو دی گئی ہے اس میں کوئی کسی قسم کی باطل کی آمیزش نہیں، ''ہم نے اس کو حق کے ساتھ ہی اُتارا ہے اور یہ حق کے ساتھ ہی اُتری ہے'' باقی ان کا نہ ماننا، اس کی ذمہ داری آپ پر نہیں کہ یہ ضرور مانیں اور آپ انہیں ضرور ایمان کی دولت سے مالا مال کریں، ہم نے آپ کو بھیجا ہے مبشر اور نذیر بنا کر، ''نہیں بھیجا ہم نے آپ کو مگر مبشر اور نذیر بنا کر'' آپ کا کام تو یہی ہے کہ

ماننے والوں کو بشارت دے دو اور نہ ماننے والوں کو ان کے برے انجام سے ڈرا دو، باقی ان کے ایمان لانے نہ لانے کی ذمہ داری آپ پر نہیں۔

قرآنِ کریم کے بتدریج نازل ہونے میں حکمت

اب اس کتاب کی ایک خصوصیت کو واضح کیا جا رہا ہے، چونکہ بسا اوقات مشرکین کی طرف سے یا مشرکین کو یہود تلقین کرتے تھے کہ اس قسم کی بات کریں کہ جیسے موسیٰ علیہ السلام کتاب یکبارگی اکٹھی لے کر آ گئے تھے تو آپ پر یہ قرآن یکبارگی کیوں نہیں اُتارا گیا، جس طرح سے ایک جگہ جُمْلَةً وَّاحِدَةً کا لفظ آئے گا (الفرقان: ۳۲)، وہ کہتے تھے کہ پوری کی پوری کتاب ایک ہی دفعہ کیوں نہیں اُترتی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تم سوچتے رہتے ہو، سوچتے رہتے ہو، جب چند باتیں بنا لیتے ہو تو آگے اس کو نقل کر دیتے ہو، ورنہ اگر یہ اللہ کی طرف سے آتی ہے تو ساری اکٹھی کیوں نہیں آ جاتی؟ تو یہ ذکر کیا جا رہا ہے کہ یہ جو تھوڑا تھوڑا کر کے اترتا ہے یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس اُمت کے اوپر ایک شفقت ہے، مہربانی ہے، یاد کرنا آسان، سمجھنا آسان، پھر ایک ہے کہ کتاب کی کتاب ہاتھ میں دے دی اور موقع کے مطابق ہدایات اس میں سے تلاش کرنی پڑیں کہ اس موقع کے متعلق کیا ہدایات اس کتاب میں ہیں، اور ایک ہے کہ واقعہ پیش آیا اور تازہ بتازہ ہدایات اللہ کی طرف سے آ جائیں، دونوں کے درمیان میں کتنا فرق ہے، موقع محل کے مطابق سمجھنا آسان، یاد کرنا آسان، تبلیغ آسان، اور پھر ہر موقع پر اللہ کی طرف سے جب وحی آتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی نصرت اور اللہ کی متوجہ ہر وقت معلوم، پھر موقع محل کے مطابق آیات اترتی ہیں تو بالکل منطبق ہو جاتی ہیں اور ان کا مفہوم اچھی طرح سے سمجھ میں آ جاتا ہے، یہ تو اس کتاب کی خوبی ہے، اور جو خوبی ہے وہی دشمن کو ایک قسم کی کمی اور نقص نظر آ رہا ہے۔ تو یہ حکمت واضح کی کہ ہم نے اس کو ایسا کیوں کیا، ''یہ قرآن، ہم نے اس کو جدا جدا کیا'' اس کے حصے بنائے، سورتیں ہیں، آیات ہیں، یہ حصے بنا دیے، ''تا کہ آپ اس کو لوگوں پر ٹھہر ٹھہر کے پڑھتے رہیں، وقفے وقفے سے پڑھتے رہیں، اور ہم نے اس کو تھوڑا تھوڑا کر کے ہی اتارا ہے'' اور اسی میں حکمت ہے، اور آنے والی امت کی شان کے یہی لائق ہے۔

حقیقی اہلِ علم کے ہاں قرآنِ کریم کا مقام و مرتبہ

باقی انہیں کہہ دیجئے کہ تم ایمان لاؤ یا نہ لاؤ......! یہ ایمان نہ لانے کی اجازت نہیں ہے، یہ بھی ایک قسم کی تہدید ہوتی، مانو یا نہ مانو، تمہارے ماننے نہ ماننے سے اس کی حقانیت میں کوئی فرق نہیں آئے گا، اہلِ علم جن کو اللہ تعالیٰ نے صحیح علم دیا ہے سابقہ کُتب کا، وہ جانتے ہیں کہ ایک پیغمبر ایسا آنے والا ہے، ایسی کتاب اُترنے والی ہے، جب ان کے سامنے یہ قرآن پڑھا جاتا ہے تو فوراً سمجھ جاتے ہیں کہ اللہ نے جو وعدہ کیا تھا وہ پورا ہو رہا ہے، تو اس کتاب کی عظمت کو محسوس کرتے ہوئے، اللہ کی عظمت کو محسوس کرتے ہوئے ان کے خشوع میں اضافہ ہوتا ہے، اور اس قرآن کو سُن سُن کے وہ روتے ہیں، جیسے کہ آپ کے سامنے پیچھے غالباً ساتویں پارے کی ابتدائی آیت تھی وَ اِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْیُنَهُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ: کہ جس وقت یہ اترا ہوا قرآن سنتے ہیں

(یہ نجاشیوں کے ساتھیوں کی طرف اشارہ ہے، اہلِ علم کی طرف، جو حضور ﷺ کی خدمت میں آئے تھے) جب اس مَآ اُنْزِلَ کو وہ سنتے ہیں تو تو دیکھتا ہے ان کی آنکھوں کو کہ وہ آنسوؤں سے بہہ رہی ہیں۔ تو وہ سنتے ہیں، سُن کر روتے ہیں، اور اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے اور اللہ کے خوف کی بنا پر اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں، تو اہلِ علم کی شہادت کافی ہے، جن کو حقیقی علم نصیب ہوا ہے، جو اہلِ علم ہیں، شہوات کے متبع نہیں ہیں، تو تمہارے ماننے نہ ماننے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، اس بارے میں اہلِ علم کی شہادت کافی ہے، جن کو اللہ نے علم دیا ہے وہ اس کو سنتے ہیں، تو سُن کر متاثر ہوتے ہیں، اور خوف کی بنا پر یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس نعمت کے حاصل ہونے پر خوشی کی بنا پر وہ روتے ہیں۔ رونا خوشی کے طور پر بھی ہوا کرتا ہے، جس وقت کوئی نعمت نصیب ہوتی ہے اس وقت بھی انسان کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑتے ہیں، اور خشوع کے طور پر بھی ہوتا ہے،

’’اُوْتُوا الْعِلْمَ‘‘ کا اعلیٰ درجے کا مصداق

تو بعض تفسیروں میں اس آیت کے اوپر لکھا ہے کہ اُوْتُوا الْعِلْمَ کا عنوان چونکہ یہاں ذکر کیا گیا تو اہلِ علم کو چاہیے کہ کتاب اللہ کو جس وقت سنیں، جس وقت ان کے سامنے تلاوت کی جائے تو ان کے اوپر بھی خشوع کے آثار نمایاں ہوں، اور اگر رِقّت طاری ہو کے رونا آجائے تو یہ بہت ہی اچھی علامت ہے، کیونکہ یہاں اللہ تعالیٰ نے ’’اولوا العلم‘‘ کا یہی حال ذکر کیا ہے کہ جن کو علم دیا گیا تھا، جو علم والے تھے، جب ان کے سامنے یہ قرآن پڑھا جاتا ہے تو ان کا خشوع بڑھتا ہے اور وہ اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں اور رونے لگ جاتے ہیں اللہ کی عظمت کو محسوس کرتے ہوئے، قرآنِ کریم کی نعمت کے اوپر شکریہ ادا کرتے ہوئے ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑتے ہیں، تو اگر کسی کے اوپر یہ کیفیت طاری ہوتی ہے تو یوں سمجھو کہ وہ اُوْتُوا الْعِلْمَ کا اعلیٰ درجہ کا مصداق ہے، تو اہلِ علم کی شان ایسی ہونی چاہیے کہ قرآنِ کریم کو سنیں تو عظمت کے ساتھ سنیں اور ان کے اوپر اس قسم کے آثار نمایاں ہوں، یہی وجہ ہے کہ ان آیات کے پڑھتے وقت سجدہ کیا جاتا ہے صرف ان کے ساتھ ظاہری مشابہت پیدا کرنے کے لئے، جب یہ آیات پڑھی جائیں تو چونکہ اس میں اہلِ علم کے سجدہ کرنے کا ذکر آ گیا تو سننے والوں کو چاہیے کہ ان آیات پر سجدہ کریں تاکہ اُن اہلِ علم کے ساتھ عملاً مشابہت پیدا ہو جائے، ’’جن لوگوں کو علم دیا گیا اس سے قبل، جب اُن پر قرآن پڑھا جاتا ہے تو اپنی ٹھوڑیوں کے بل سجدے میں گر جاتے ہیں اور کہتے ہیں ہمارا رَبّ ہر عیب سے پاک ہے، بے شک ہمارے رَبّ کا وعدہ پورا کیا ہوا ہے‘‘ یعنی اس کی طرف سے وعدہ تھا اس کتاب کے ملنے کا، وہ پورا ہو گیا، ’’اور ٹھوڑیوں کے بل وہ گر جاتے ہیں روتے ہوئے، اور یہ قرآن ان کے خشوع کو بڑھاتا ہے۔‘‘

مشرکین کے اعتراض کا جواب

کبھی کبھی مشرک شرارت کرتے تھے کہ جب حضور ﷺ یا اللہ، یا رحمٰن کہتے تو مشرک کہتے دیکھو! ہمیں تو کہتا ہے ایک کو پکارو اور خود دو کو پکار رہا ہے، کیونکہ ’’رحمٰن‘‘ کا لفظ مشرکین کے اندر معروف نہیں تھا، ’’رحمٰن‘‘ کا لفظ اہلِ کتاب میں معروف تھا، اور

جب یہ اسمائے الٰہیہ میں سے ہے تو آپ جانتے ہیں کہ ایک چیز کے متعدّد نام رکھ لئے جائیں تو اس کے ساتھ تعدّد لازم نہیں آتا، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ''اللہ'' کے لفظ کو استعمال کرو اور ''یا اللہ!'' کہو، یا ''رحمٰن'' کو پکارو، جو لفظ بھی تم بولو، اچھے اچھے نام سب اسی کے لئے ہیں، یہ بھی اسی کا نام ہے۔

قرآن کے ایک ادب کا ذِکر

اور آگے قرآنِ کریم کا ایک ادب بایں معنی ذکر کیا کہ سرورِ کائنات ﷺ جہری نمازوں میں جب جہراً قراءت کرتے تو مشرکین شور کرتے، اُتارنے والے کو گالیاں دیتے، لانے والے کو گالیاں دیتے، اس طرح سے نماز میں تشویش لازم آتی تھی، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ نماز کی قراءت میں نہ تو زیادہ جہر کیا کرو اور نہ بالکل چپکے چپکے پڑھا کرو کہ پچھلے بھی نہ سنیں، بلکہ درمیانی راستہ اختیار کرو، تا کہ پچھلے سُن بھی لیں اور زیادہ دُور تک آواز بھی نہ جائے، کیونکہ اس وقت اس کی تلاوت بطورِ عبادت کے ہے، اور جب بطورِ تبلیغ کے ہو پھر تو اُونچی آواز سے پڑھنا ہی ہے تا کہ لوگوں تک پہنچے، وہاں تو مقصد ہی یہی ہے لوگوں تک پہنچانا، لیکن جب یکسوئی کے ساتھ عبادت کرنی مقصود ہو تو ایسے وقت میں نہ زیادہ جہر کرو اور نہ بالکل مخافتت، پچھلے سنتے رہیں جو ساتھ شریک ہیں، اور دوسروں تک آواز نہ جائے کہ وہ شور مچا کے کسی قسم کی گڑبڑ کریں، یہ تو ہو جائے گا کہ جہری نمازوں میں یہ ادب سکھا دیا گیا، اور مفسرین نے یہی بات لکھی ہے۔ اور اگر یوں کہہ لیا جائے کہ بعض نمازوں میں جہر اور بعض میں مخافتت یہ بھی درمیانہ راستہ ہے تو یہ بھی صحیح ہے کہ دِن کی نمازوں[1] میں آہستہ پڑھو اور رات کی نمازوں میں جہر کرو، کیونکہ دِن میں مشرکین کی آمد و رفت ہوتی تھی اور رات کے وقت وہ غفلت میں ہوتے تھے، تو رات کے وقت ان کے مخل ہونے کا احتمال دِن کے مقابلے میں کم ہے، اس لئے جہری قراءت رات کو کرو اور سراً قراءت دِن کی نمازوں میں کرو، دونوں صحیح ہیں۔

رَدِّ شرک کے لئے صفاتِ باری تعالیٰ کا ذِکر

اور آگے اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کر کے اس کی صفات کا ذِکر کر کے اس سورۃ کو ختم کو دیا کہ آپ کہہ دیجئے کہ تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے اولاد اختیار نہیں کی، اس کی کوئی اولاد نہیں ہے، وہ اللہ اولاد سے پاک ہے، کیونکہ اللہ کی طرف اولاد کی نسبت عیب ہے اور اللہ عیب سے پاک ہے، اور اس بادشاہت اور سلطنت میں اور اس زمین و آسمان کے نظام کو قائم کرنے اور چلانے میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے، اس کو کسی شریک کی ضرورت بھی نہیں ہے، وہ ہر شریک سے پاک ہے، وہ تن تنہا اور اکیلا اس نظام کو سنبھالے ہوئے ہے اور وہ اتنا طاقتور و توانا ہے کہ کمزور ہونے کی وجہ سے اس کا کوئی معین اور مددگار بھی نہیں ہے، کوئی اس کا مددگار اور سازگار بھی نہیں ہے، اور تو اس کی بڑائی بیان کر بڑائی بیان کرنا۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

---

(۱) اس کے بعد ریکارڈنگ دستیاب نہیں ہوئی۔ مضمون کی تکمیل کے لئے اگلا حصہ تحریر کیا گیا ہے۔ ناقل۔

سُورَةُ الكَهفِ

اٰیاتها ١١٠ ١٨ سُوْرَةُ الْكَهْفِ مَكِّيَّةٌ ٦٩ رکوعاتها ١٢
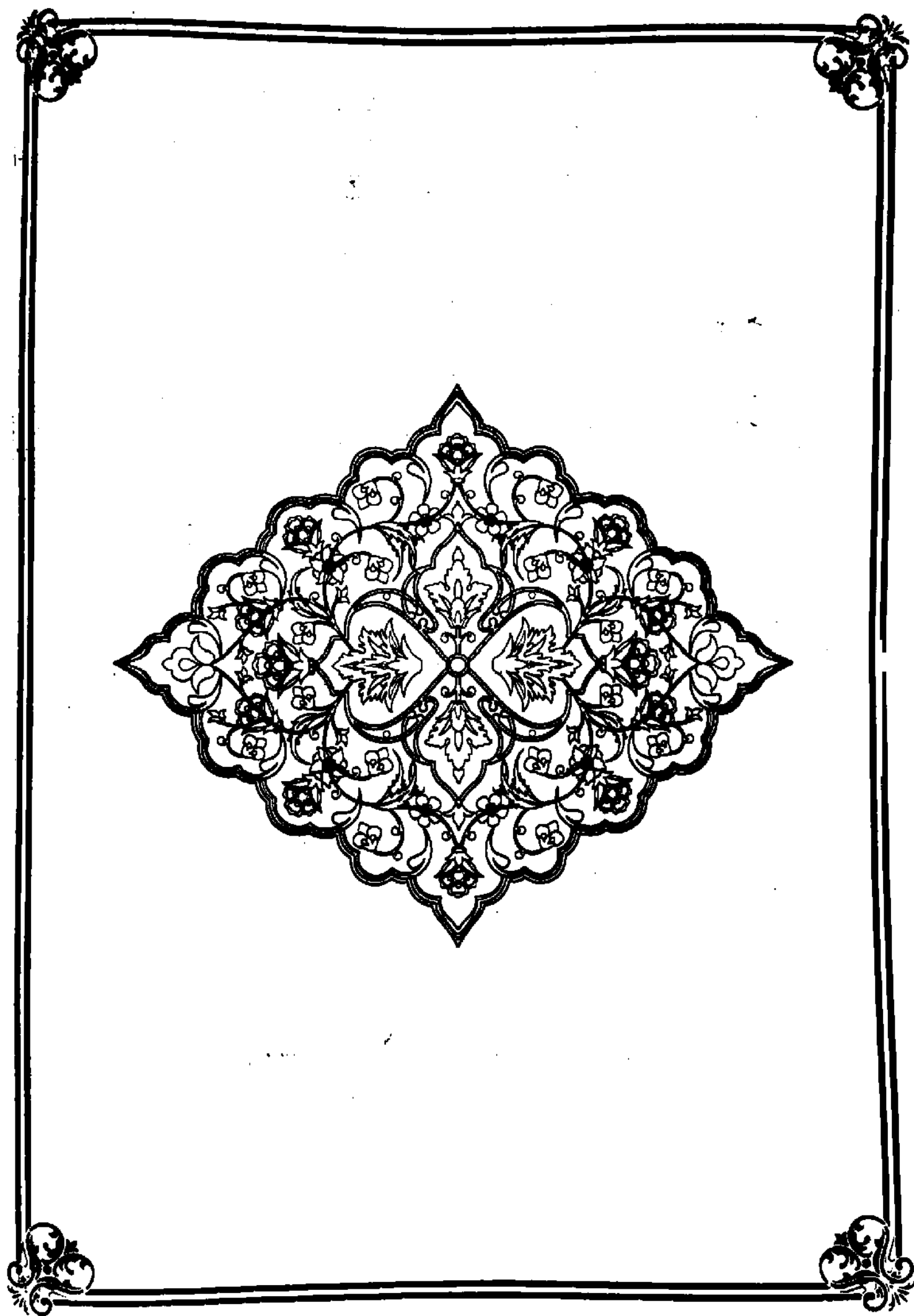
سورۂ کہف مکہ میں نازل ہوئی، اس میں ایک سو دس آیات اور بارہ رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ۟ قَیِّمًا

سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے اپنے بندے پر کتاب اُتاری، اور اس کے لیے کسی قسم کی کجی نہیں بنائی ① اس کو سیدھا بنایا ہے

لِّیُنْذِرَ بَاْسًا شَدِیْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَیُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ

تاکہ وہ ڈرائے سخت عذاب سے جو اللہ کی طرف سے آنے والا ہے، اور تاکہ بشارت سنائے مؤمنین کو جو نیک عمل

الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا ۟ مّٰكِثِیْنَ فِیْهِ اَبَدًا ۟ وَّیُنْذِرَ الَّذِیْنَ

کرتے ہیں کہ بے شک ان کے لئے بہت اچھا اجر ہے ② ٹھہرنے والے ہوں گے وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ ③ اور تاکہ ڈرائے ان لوگوں کو جو

قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۟ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآىِٕهِمْ ؕ كَبُرَتْ كَلِمَةً

کہتے ہیں کہ اللہ نے اولاد اختیار کی ④ نہیں ہے ان کو اس بات کے متعلق کوئی علم، اور نہ ان کے آباء کو، بڑی بات ہے جو

تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ؕ اِنْ یَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ۟ فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰۤی

ان کے منہ سے نکلتی ہے، نہیں بولتے یہ مگر جھوٹ ⑤ پس شاید کہ آپ ہلاک کرنے والے ہیں اپنے نفس کو

اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ یُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِیْثِ اَسَفًا ۟ اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَی الْاَرْضِ زِیْنَةً

ان کے پیچھے افسوس کرتے ہوئے، اگر یہ اس بات پر ایمان نہیں لائیں گے ⑥ بے شک ہم نے بنایا اس چیز کو جو زمین پر ہے زمین

لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَیُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۟ وَاِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَیْهَا صَعِیْدًا جُرُزًا ۟

کے لئے زینت، تاکہ ہم آزمائیں انہیں کہ ان میں سے کون شخص زیادہ اچھا ہے از روئے عمل کے ⑦ اور بے شک ہم البتہ کرنے والے ہیں اس کو جو زمین پر ہے بالکل چٹیل میدان ⑧

***

سورت کے ''مکی'' اور ''مدنی'' ہونے کا مطلب

سورۂ کہف مکہ معظمہ میں اُتری، اور اس کی ایک سو دس آیتیں ہیں، بارہ رکوع ہیں۔ مَكِّيَّة کا لفظ جو لکھا ہوا ہے، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ کی مکی زندگی میں یہ سورت اتری، ہجرت سے پہلے۔ اس کا یہ معنی نہیں ہوتا کہ خاص طور پر مکہ معظمہ میں اتری۔ بلکہ سرورِ کائنات ﷺ کی زندگی جو دو حصوں میں تقسیم ہے، اظہارِ نبوّت کے بعد آپ کے تیرہ سال مکہ معظمہ میں گزرے، اور دس سال مدینہ منورہ میں۔ قرآنِ کریم کی وہ سورتیں جو آپ کے سفرِ ہجرت سے پہلے اُتری ہیں، انہیں ''مکی'' کہا جاتا ہے۔ اور قرآنِ کریم کی وہ سورتیں جو آپ کے سفرِ ہجرت کے بعد اُتری ہیں، انہیں ''مدنی'' کہا جاتا ہے۔ تو ''مکیہ'' کا مطلب یہ ہے کہ مکہ معظمہ کے دور میں اُتری، اس کا یہ معنی نہیں ہوتا کہ مکہ شہر میں اُتری۔ ہجرت سے پہلے جو آیات اُتری ہیں، وہ ''مکی'' کہلاتی ہیں، چاہے وہ مکہ شہر میں اُتری ہوں، چاہے کہیں سفر میں نازل ہوئی ہوں، جہاں بھی اُتری ہوں انہیں ''مکی'' کہا جاتا ہے۔ اور ہجرت کر لینے کے بعد جب آپ کی مدنی زندگی شروع ہوگئی، اس وقت جو آیات اُتریں، ان کو ''مدنی'' کہیں گے، چاہے وہ مدینہ منورہ میں اُتری ہوں، چاہے کسی سفر میں، حتیٰ کہ اگر رسول اللہ ﷺ مکہ معظمہ میں تشریف لائے ہوئے ہوں، اور وہ آیات مکہ معظمہ میں اُتریں، تو بھی ان کو ''مدنی'' کہیں گے۔ کیونکہ اس اِصطلاح کا معنی یہ ہوا، کہ ''مکی دور کی آیتیں''، اور ''مدنی دور کی آیتیں''، تو یہ سورت بھی مکی دور کی ہے، ''مکیہ'' کا یہ معنی ہے۔

وجہِ تسمیہ

اور اس کا نام ''کہف'' رکھا گیا، آگے پہلے رُکوع میں ہی ذِکر آئے گا: اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ، تو چونکہ اس میں ''اصحابِ کہف'' کا واقعہ آ رہا ہے، اس لئے اس سورت کا نام بھی سورۂ کہف رکھ دیا گیا۔

سورتوں کے نام ''توقیفی'' ہیں

اور سورتوں کے نام جو رکھے گئے، یہ بھی ''توقیفی'' ہیں، یعنی سرورِ کائنات ﷺ کی طرف سے جس طرح سے نقل کئے گئے ویسے ہی متعین کر دیے گئے۔ اس لئے کوئی دوسرا واقعہ دیکھ کے اب سورت کا نام بدلا نہیں جا سکتا۔ مثلاً ذُوالقرنین کا ذِکر اس میں آئے گا، تو ہمیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہم کہیں کہ یہ ''سورۂ ذُوالقرنین'' ہے، اس طرح سے ہم نام نہیں رکھ سکتے، جس طرح سے نام متعین ہوگیا بس وہی نام رہے گا۔

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ: سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں (یوں ترجمہ کر دیا جاتا ہے) حمد تعریف کرنے کو کہتے ہیں، ویسے حدیث شریف[1] میں جس طرح سے آتا ہے کہ یہ کلمہ شکر بھی ہے: ''رَاْسُ الشُّكْرِ: الحمدُ لِلّٰهِ'' یعنی اللہ کا شکر ادا

(۱) الامثال للحکیم الترمذی ۱/۱۵۸۔ نیز مشکوٰۃ ۱/۲۰۱ باب ثواب التسبیح۔ ولفظ المشکاۃ: اَلْحَمْدُ رَاْسُ الشُّكْرِ مَا شَكَرَ اللهَ عَبْدٌ لَا يَحْمَدُهٗ

کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہو۔ تو لفظی ترجمہ اس کا یہی ہے، سب تعریف اللہ کے لئے ہے۔ لیکن اگر اس کے مفہوم کو یوں ادا کیا جائے "اللہ کا شکر ہے" تو یہ مفہوم بھی صحیح ہے۔ اللہ کا شکر ہے جس نے اپنے بندے پر کتاب اُتاری، سب تعریف اللہ کے لئے ہے جس نے اپنے بندے پر کتاب اتاری۔ عَبْدِہٖ سے محمد رسول اللہ ﷺ مراد ہیں۔ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّہٗ عِوَجًا: عوج کا لفظ بار بار قرآنِ کریم میں آئے گا، عوج کہتے ہیں کجی کو، ٹیڑھے پن کو۔ اور لَمْ یَجْعَلْ کی ضمیر اللہ کی طرف لوٹ گئی، لَہٗ کی ضمیر کتاب کی طرف لوٹ گئی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کے لئے کوئی کسی قسم کی کجی نہیں بنائی۔ عِوَجًا نکرہ ہے، لَمْ یَجْعَلْ نفی ہے، اور نکرہ تحت النفی عموم کو چاہتا ہے جیسا کہ آپ قاعدہ پڑھتے رہتے ہیں، تو اس کا معنی یہ ہوگا کہ اس کتاب میں کسی قسم کی کجی نہیں ہے۔ قَیِّمًا: یہ مستقیم کے معنی میں ہے، ٹھیک اور دُرست۔ اور یہ مفعول ہوگا جَعَلَہٗ مقدر کا۔ اس کو لَمْ یَجْعَلْ کا مفعول نہیں بنا سکتے۔ اس لئے درمیان میں "سکتہ" کا نشان دیا ہوا ہے، جس میں تھوڑی سی خاموشی اختیار کر کے پھر آگے پڑھا جاتا ہے، یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ عِوَجًا جس طرح لَمْ یَجْعَلْ کا مفعول ہے، قَیِّمًا یہ لَمْ یَجْعَلْ کا مفعول نہیں، اس کا مفہوم ہوگا جَعَلَہٗ قَیِّمًا اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو درست اور سیدھی بنایا۔ گویا کہ لَمْ یَجْعَلْ کے اندر عوج کی نفی کر دی کہ اس میں کسی قسم کا ترچھا پن، ٹیڑھا پن، اور کجی نہیں۔ اور دوسرا پہلو قَیِّمًا میں ذکر کر دیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو بالکل درست اور ٹھیک اور بالکل سیدھا بنایا ہے۔ تو یہ مثبت کا مفہوم ادا کرے گا، منفی کے نیچے داخل نہیں ہے۔ اس لیے پڑھتے وقت درمیان میں تھوڑا سا سکوت اختیار کر کے پھر آگے قَیِّمًا کو پڑھا جاتا ہے، تسلسل کے ساتھ نہیں پڑھا جاتا، آپ نے اپنے قرآنِ کریم پڑھانے والے اُستاذ سے پڑھا ہوگا، اس کو یوں روانگی سے نہیں پڑھیں گے، "لَمْ یَجْعَلْ لَّہٗ عِوَجًا قَیِّمًا" یوں نہیں پڑھیں گے، بلکہ درمیان میں تھوڑا سا سکتہ اختیار کیا جاتا ہے پھر اس کے بعد "قَیِّمًا" پڑھا جاتا ہے، تو اس میں اشارہ ہو جائے گا اس بات کی طرف کہ "قیماً" ترکیب میں "عوجاً" کی طرح نہیں ہے، بلکہ اس کا مفہوم علیحدہ ہے۔ لِّیُنْذِرَ بَاْسًا شَدِیْدًا مِّنْ لَّدُنْہُ: مِنْ لَّدُنْہُ یہ بَاْسًا کی دوسری صفت ہے۔ تا کہ ڈرائے سخت عذاب سے جو اللہ کی طرف سے آنے والا ہے، لِیُنْذِرَ کی ضمیر کس طرف لوٹ رہی ہے؟ تا کہ ڈرائے، کون ڈرائے؟ اللہ تعالیٰ ڈرائے، یا اللہ کا بندہ ڈرائے، یا اللہ کی کتاب ڈرائے، اس کی نسبت تینوں کی طرف ہو سکتی ہے۔ اِنذار کی نسبت اللہ کی طرف بھی کر سکتے ہیں، اللہ کے بندے کی طرف بھی کر سکتے ہیں، کتاب کی طرف بھی کر سکتے ہیں (آلوسی)۔ حقیقت میں تو اللہ تعالیٰ ہی "مُنذِر" ہیں، ڈرانے والے ہیں۔ لیکن اس ڈرانے کا اظہار چونکہ اللہ کے رسول کی زبان پہ ہوا، تو نسبت آپ کی طرف بھی ہو سکتی ہے، اور اس ڈرانے کا تذکرہ کتاب میں آ رہا ہے، تو نسبت کتاب کی طرف بھی ہو سکتی ہے۔ تینوں طرح اس کو بیان کیا جا سکتا ہے۔ وَیُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِیْنَ اور تا کہ بشارت سنائے مؤمنین کو جو نیک عمل کرتے ہیں، اَنَّ لَہُمْ اَجْرًا حَسَنًا بشارت سنائے کہ بے شک ان کے لئے بہت اچھا اجر ہے۔ مؤمنین کے لفظ میں عقیدے کی طرف اشارہ ہو گیا، اَنَّ لَہُمْ اَجْرًا حَسَنًا یہ بشارت کا مضمون ہے۔ مَّاکِثِیْنَ فِیْہِ اَبَدًا: مَّاکِثِیْنَ کا لفظ مَکَث سے لیا گیا ہے، مکث ٹھہرنے کو کہتے ہیں۔ مَّاکِثِیْنَ ٹھہرنے والے ہوں گے، فِیْہِ کی ضمیر اَجرِ حسن کی طرف لوٹ رہی ہے، "ٹھہرنے والے ہوں گے اس اَجرِ حسن میں ہمیشہ ہمیشہ۔" اَجرِ حسن کی صورت چونکہ جنّت کی ہوگی، اَجرِ حسن یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ جنّت میں داخل

کردیں گے، تو مطلب یہ ہوگا کہ جنت میں ہمیشہ ہمیشہ ٹھہرنے والے ہوں گے۔ لیکن بظاہر لفظی ترجمہ یہ ہوگا کہ ٹھہرنے والے ہوں گے وہ مؤمنین اس اَجرِ حسن میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔ وَّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا: اس يُنْذِرَ کا عطف اوپر والے يُنْذِرَ پر ہے۔ تاکہ ڈرائے ان لوگوں کو جو کہتے ہیں، اللہ نے اولاد اختیار کی۔ ولد لڑکے کو بھی کہتے ہیں، اولاد کے معنی میں بھی آتا ہے۔ یہاں اس کو عام ہی رکھیں گے، ولد بمعنی اولاد، تاکہ جو اللہ کے لئے بیٹے کا قول کرتے ہیں وہ بھی اس میں آجائیں، اور جو اللہ کے لئے بیٹیوں کا قول کرتے ہیں وہ بھی اس میں آجائیں، مشرکینِ مکہ کہتے تھے کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں، عیسائی کہتے تھے کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں، اور یہود کے بعض طبقے کہتے تھے کہ عزیر علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں، جیسا کہ آپ کے سامنے سورۂ براءت (آیت: ۳۰) میں اس کا تذکرہ ہو چکا ہے، تاکہ ڈرائے ان لوگوں کو جو کہتے ہیں اللہ نے اولاد اختیار کی ہے۔ اوپر جو ''يُنْذِرَ'' آیا تھا اس کا مفعول ذکر نہیں کیا گیا تھا، اور یہاں يُنْذِرَ کا مفعول ذکر کر دیا گیا کہ کن لوگوں کو ڈرائے۔ تو یہاں سے معلوم ہو گیا کہ پہلے ''يُنْذِرَ'' کا مفعول عام ہے ''تاکہ ڈرائے سب لوگوں کو۔'' اور اگلا ''يُنْذِرَ'' خاص ہے کہ خصوصیت سے ان لوگوں کو جو کہتے ہیں کہ اللہ نے اولاد اختیار کی، اس عام میں سے ان کو خاص کر لیا گیا۔ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ: نہیں ہے ان کو اس بات کے متعلق کوئی علم۔ یہاں بھی وہی بات کہ عِلْمٍ نکرہ ہے اور مَا نافیہ ہے، نکرہ تحت النفی ہو تو یہ عموم کو چاہتا ہے۔ ان کو اس کے متعلق کچھ علم نہیں۔ وَّلَا لِاٰبَآئِهِمْ اور نہ ان کے آباء کو۔ آباء اَبٌ کی جمع ہے، نہ ان کو اپنے اس عقیدے کے متعلق کچھ علم ہے، علمی دلیل ان کے پاس بھی نہیں ہے، اور نہ ان کے آباء کو کچھ علم ہے۔ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ: كَلِمَةً منصوب ہے تمیز ہونے کی بنا پر، اور یہ تمیز محول عن الفاعل ہے، اس میں فاعل والا معنی ہے، کبھی تمیز محول عن الفاعل ہوتی ہے، اور کبھی محول عن المفعول ہوتی ہے، یہاں فاعل والے مفہوم میں ہے۔ ''بڑی بات ہے جو ان کے منہ سے نکلتی ہے۔'' اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا نہیں بولتے یہ مگر جھوٹ۔ قَالَ يَقُوْلُ: بولنا، کہنا۔ نہیں کہتے یہ لوگ مگر جھوٹ، یعنی سوائے جھوٹ کے ان کے پاس کچھ نہیں، يَقُوْلُوْنَ کی ضمیر انہی لوگوں کی طرف لوٹے گی جنہوں نے اولاد کا قول کیا، تو اس کا معنی ہو گیا کہ نہیں بولتے یہ مگر جھوٹ، یعنی سوائے جھوٹ کے ان کے پلے کچھ نہیں ہے۔ ''جھوٹ'' کہتے ہیں خلافِ واقعہ بات کو، یعنی ان کی یہ بات خلافِ واقعہ ہے، اس میں واقعے کا کوئی شائبہ نہیں۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ: پس شاید کہ آپ ہلاک کرنے والے ہیں اپنے نفس کو، عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ ان لوگوں کے پیچھے۔ آثار اثر کی جمع ہے، اور اثر کہتے ہیں نقشِ قدم کو۔ شاید کہ آپ ہلاک کرنے والے ہیں اپنے نفس کو ان کے نقشِ قدم پر، ان کے پیچھے، اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ: اگر یہ ایمان نہیں لائیں گے اس بات پر۔ اور اَسَفًا کا تعلق بَاخِعٌ نَّفْسَكَ کے ساتھ ہے۔ شاید کہ آپ اپنے آپ کو ہلاک کرنے والے ہیں افسوس کرتے ہوئے، اگر یہ لوگ اس بات پر ایمان نہیں لائیں گے۔ اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا: بے شک ہم نے بنایا اس چیز کو جو زمین پر ہے زمین کے لئے زینت۔ لِنَبْلُوَهُمْ: بَلَا يَبْلُوْ: آزمانا۔ تاکہ ہم آزمائیں انہیں، اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا کہ ان میں سے کون شخص زیادہ اچھا ہے از روئے عمل کے۔ وَاِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا: اور بے شک ہم البتہ کرنے والے ہیں اس چیز کو جو زمین پر ہے، صَعِيْدًا جُرُزًا: صعید کہتے ہیں میدان کو، اور جُرُز کہتے ہیں ایسے میدان کو کہ جس میں سے نباتات

کاٹ لی گئی ہو، اور وہ چٹیل رہ جائے، گھاس پھوس نباتات جو اس پر کھڑی سب کاٹ لی جائے، کاٹ لینے کے بعد وہ میدان صاف ہو جائے۔ تو صَعِیْدًا جُرُزًا کا معنی ہوتا ہے کہ جس میں نباتات نہیں، بالکل چٹیل اور پدھرا (برابر) میدان ہے۔ بے شک ہم کرنے والے ہیں اس چیز کو جو اس زمین پر ہے، بالکل چٹیل میدان۔ آگے اَصحابِ کہف کا قصہ شروع ہو رہا ہے۔

تفسیر

سورۂ کہف کے ذریعے فتنۂ دجال سے حفاظت

یہ آیات جو آپ کے سامنے پڑھی گئیں، یہ سورۂ کہف کی ابتدائی آیتیں ہیں۔ اور سورۂ کہف کے متعلق حدیث شریف میں بعض خصوصی فضائل بھی آئے ہیں۔ سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص سورۂ کہف کی ابتدائی دس آیات یاد کرلے (یعنی ان کو پڑھتا رہے، یاد کرنے کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اس کو مستحضر رہے اور پڑھتا رہے) ''عُصِمَ مِنْ فِتْنَةِ الدَّجَّالِ''[1] وہ دجال کے فتنے سے بچالیا جائے گا، وہ دجال کے فتنے میں پھنس نہیں سکتا، دجال کا فتنہ اس پر اثر انداز نہیں ہوگا۔

سورۂ کہف کی دجال کے فتنے سے کیا مناسبت ہے؟

یہ روایت جو حدیث شریف میں آئی، اس کی طرف دیکھتے ہوئے علماء نے ایک نکتہ اُٹھایا کہ قرآنِ کریم کی سورتوں میں سے اس سورت کو فتنۂ دجال کے ساتھ کیا مناسبت ہے؟ کیونکہ دجال کا فتنہ ایک بہت بڑا فتنہ ہوگا، سرورِ کائنات ﷺ فرماتے ہیں کہ جب سے دُنیا بنی، قیامت آنے تک کوئی فتنہ دجال کے فتنے سے بڑا نہیں ہے، اور وہ دجال کا فتنہ کیا ہوگا؟ کس طرح گمراہی پھیلائے گا، اس کی تفصیل حدیث شریف میں ہے، ''مشکوٰۃ شریف'' (جلد دوم) ''باب العلامات بین یدی الساعۃ و ذکر الدجال'' میں سب روایتیں آتی ہیں، اور باقی کُتبِ حدیث میں بھی ہیں، اور آپ حضرات بھی سنتے رہتے ہیں، تفصیل اس وقت نہیں کی جاسکتی، بہرحال یہ بہت بڑا فتنہ ہوگا، جس میں دُنیا بہت گمراہ ہوگی، اور اتنا بڑا فتنہ کہ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ قیامت سے پہلے کوئی دوسرا اتنا بڑا فتنہ نہیں کہ جتنا بڑا فتنہ دجال ہے، اور اس سورت کو اس فتنے کا علاج بتایا ہے کہ اگر اس کو پڑھا جائے اور سمجھا جائے تو فتنۂ دجال اثر انداز نہیں ہوگا، اس نکتے کو سامنے رکھتے ہوئے علماء نے کلام کی ہے۔

مولانا مناظر اَحسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا تعارف اور ان کی کرامت

اور سب سے اچھی کلام ان میں حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔ یہ دیوبند کے فاضل ہیں اور سید انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے ممتاز شاگردوں میں سے ہیں، جس وقت یہ پڑھ کے فارغ ہوئے تھے تو فارغ ہونے کے کچھ عرصے بعد ان کو،

---

(۱) مَنْ حَفِظَ عَشْرَ آيَاتٍ مِنْ أَوَّلِ سُوْرَةِ الْكَهْفِ عُصِمَ مِنَ الدَّجَّالِ (مسلم ۱/۲۷۱، باب فضل سورۃ الکہف۔ مشکوٰۃ ۱/۱۸۵، فضائل القرآن) نیز ترمذی ۲/۴۸ پر ہے: فَمَنْ رَآهُ مِنْكُمْ فَلْيَقْرَأْ فَوَاتِحَ سُوْرَةِ أَصْحَابِ الْكَهْفِ۔ ترمذی ۲/۱۱۶ پر ہے: مَنْ قَرَأَ ثَلَاثَ آيَاتٍ مِنْ أَوَّلِ الْكَهْفِ عُصِمَ مِنْ فِتْنَةِ الدَّجَّالِ

دیوبند سے دو رسالے نکلتے تھے، ایک ''القاسم'' اور ایک ''الرشید'' ان رسالوں کا ان کو ایڈیٹر بنادیا گیا تھا، اس لئے لکھنے کی مشق ان کو اس دور سے ہے، بعد میں پھر یہ دیو بند کو چھوڑ کے حیدر آباد دکن میں عثمانیہ یونیورسٹی تھی، اس میں یہ دینیات کے پروفیسر ہو کے چلے گئے تھے۔ بہت محقق قسم کے آدمی ہیں، اور اہلِ دل جن کو کہا جاتا ہے..... (سبق کے اندر خصوصیت سے شخصیات کا تعارف بھی حاصل کیا کرو، کیونکہ شخصیات کا تعارف ضروری ہے، تب جا کے انسان ان کی کتابوں کی عظمت دِل میں بٹھا سکتا ہے، اور پھر ان کتابوں سے اِستفادہ کرسکتا ہے)..... تو مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ اپنے بزرگوں میں بہت عظیم المرتبت بزرگ گزرے ہیں، اور عشق ومحبت میں ان کا مقام بہت اُونچا تھا۔ جس وقت یہ بوڑھے ہو گئے اور حیدر آباد سے ریٹائرڈ ہو گئے، اور اپنے گھر جا کے رہ گئے، تعلیم وغیرہ کا سلسلہ ترک کردیا، تو کہتے ہیں کہ وفات کے قریب اکثر وبیشتر کہا کرتے تھے کہ ''اب تو بوڑھے ہو گئے ہیں، بس جنت میں جائیں گے تو جوان ہو کے جائیں گے!'' یہ اکثر وبیشتر ان کی زبان کے اُوپر بات جاری ہوتی تھی ''جنت میں جائیں گے جوان ہو کے جائیں گے!'' کیونکہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جنت میں جائیں گے تو سب لوگ جوان ہوں گے، اور ان میں کوئی بوڑھا نہیں ہوگا، بڑھاپے کی مصیبت ختم کردی جائے گی۔ تو بڑا شوق ظاہر کرتے، اس طرح سے کہ گویا جنت میں یقیناً جانا ہے، اتنا اعتماد ہوتا تھا، اور یہ کہتے کہ بس اب جوان اسی وقت ہی ہوں گے جب جنت میں جائیں گے۔ جس وقت ان کا انتقال ہوا تو ہزاروں آدمیوں نے ان کی یہ کرامت دیکھی، کتابوں میں لکھی ہوئی ہے، کہ وفات کے بعد ان کا بدن بالکل جوانوں کی طرح موٹا تازہ گٹھا ہوا، اور داڑھی جو کہ بالکل سفید تھی وفات کے بعد بالکل سیاہ ہوگئی، یعنی لوگوں نے اس زندگی کے اندر ان کو دوبارہ جوان دیکھ لیا، گویا کہ جب وہ عالمِ آخرت کی طرف منتقل کئے گئے، قبر میں اُتارے گئے تو جوان ہو چکے تھے، یہ ان کی کرامت جوان کی وفات کے ساتھ ہی ظاہر ہوئی، کتابوں میں لکھی ہوئی ہے، کہ وفات پاتے ہی ان کے اُوپر جوانی کے آثار طاری ہو گئے، ان کا بدن جوانوں کی طرح ہو گیا، بوڑھوں والا ڈھیلا پن ختم ہو گیا، اور داڑھی ساری کی ساری سیاہ ہوگئی۔ اور بھی ان کے بہت سارے واقعات ہیں، ان کی کتاب ''النبی الخاتم'' کی اِبتدا میں مولانا منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے حالات لکھے ہیں۔ بہر حال بہت اعلیٰ اور محقق قسم کے آدمی تھے..... سب سے پہلے تفصیل کے ساتھ اس موضوع پر قلم انہوں نے اُٹھایا ہے ''سورۂ کہف اور فتنۂ دجال'' یعنی ان دونوں کی آپس میں مناسبت کیا ہے؟ ان کے مضامین پہلے تو ''الفرقان'' کے اندر قسط وار چھپتے رہے، پھر جب ان کی وفات ہوگئی تو ان کی وفات والے سال میں میں ''قاسم العلوم'' میں مدرّس تھا،[1] اس وقت ''الفرقان'' نے ایک نمبر شائع کیا تھا، جس میں ان کے کچھ مضامین اکھٹے کیے تھے، خصوصیت کے ساتھ سورۂ کہف کے متعلق جو ان کے مضامین تھے، وہ اس میں جمع کردیے تھے، وہ نمبر میرے پاس ہے، اسی وقت میں نے خرید لیا تھا۔ اور اب اس تفسیر کے حصے کو مستقل کتابی شکل میں بھی شائع کردیا گیا ہے، اور اس تفسیر کا نام بھی رکھا گیا ہے ''سورۂ کہف اور فتنۂ دجال''[2] اب یہ تفسیر ملتی ہے۔ انہوں نے تفصیل کے ساتھ اس کے اوپر روشنی ڈالی، کتابی شکل میں پہلی کتاب اس سلسلے میں یہی سامنے آئی ہے۔

---

(۱) ''جامعہ قاسم العلوم'' ملتان، پنجاب، پاکستان میں واقع ایک عظیم علمی مرکز ہے، جہاں سے خود صاحبِ تفسیر حضرت حکیم العصر رحمۃ اللہ علیہ نے دورۂ حدیث کیا۔

(۲) ''ادارہ تالیفات اشرفیہ'' ملتان نے یہ کتاب ''تذکیر بسورۃ الکہف یعنی دجالی فتنے کے نمایاں خدوخال'' کے نام سے شائع کی ہے۔

مولانا ابوالحسن ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا تعارف

اور دوسرے نمبر پر مولانا ابوالحسن علی ندوی، جو آج کل کے بہت معروف صاحب قلم ہیں، اور یہ بھی صاحب دل ہیں، اپنے حضرات کے نزدیک ان کا مقام بہت اچھا ہے، دارالعلوم دیوبند کی شوریٰ کے رُکن ہیں، اور ''ندوۃ العلماء لکھنؤ'' کے مہتمم ہیں، اور آج کل کے دور کے متعلق بہت اچھی اچھی معلومات پر مشتمل کتابیں لکھ رہے ہیں،(۱) ان کی ایک کتاب بھی اسی موضوع پر ہے، جس میں انہوں نے اسی چیز کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے، انہوں نے کتاب کا عنوان اختیار کیا ہے ''معرکۂ ایمان و مادّیت'' (یہ آپ کے سامنے کچھ تفصیل آئے گی کہ اس عنوان کا کیا مطلب ہے، مادّی زندگی اور ایمانی زندگی کی کشمکش کا عنوان دے کے انہوں نے اس سورت کے مضامین کے اُوپر کچھ نظر ڈالی ہے)...... بہرحال جب اَصحابِ کہف کا واقعہ آپ کے سامنے آئے گا، اُس وقت اِس کے متعلق کچھ عرض کروں گا۔ یہ تو اس ضمن میں ذِکر آ گیا کہ حدیث شریف میں اس کی فضیلت بیان کرتے ہوئے روایات کے اندر فتنۂ دجال کا ذِکر ساتھ ساتھ آیا ہے۔

جمعہ کے دِن سورۂ کہف پڑھنے کی فضیلت

اور جمعہ کے دِن اس سورت کے پڑھنے کی فضیلت بھی بیان کی گئی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اس کو جمعہ کے دِن پڑھے، تو اگلے جمعہ تک (یعنی ایک ہفتہ) اس کے قلب کے اندر نُور اور روشنی رہتی ہے۔(۲) یعنی نُورِ ایمانی جلوہ گر ہوتا ہے، اور دِل کے اندر ایمانی صلاحیت بڑھتی ہے، تو جمعہ کے دِن اس کے پڑھنے کی فضیلت ہے۔ تو جیسے خاص خاص اوقات میں بعض بعض سورتوں کے فضائل ہیں، تو اس سورت کی فضیلت بھی ہے کہ جمعہ کے دِن اس کو پڑھا جاتا ہے۔ تو اس کو معمول میں داخل کر لینا چاہیے۔

سورۂ کہف کے مضامین پر اِجمالی نظر!

اس میں جو عمومی مضامین آئیں گے، وہ ہیں توحید، رِسالت۔ اور خصوصیت کے ساتھ فنا اور حقارتِ دُنیا کا اس میں ذِکر آئے گا، اور اسی میں حقیقت کے اعتبار سے فتنۂ دجال کا علاج ہے۔ دُنیا کے فانی ہونے کو خوب اچھی طرح سے ظاہر کیا جائے گا، اور آخرت کے مقابلے میں اس کی حقارت کو نمایاں کیا جائے گا، اور اللہ تبارک وتعالیٰ خصوصیت کے ساتھ اس بات کو ذِکر فرمائیں گے کہ دنیا کے اندر جو کچھ ہوتا ہے یہ سب کچھ اسباب کے تحت ہی نہیں، بلکہ میں اپنی قدرت کے تحت اسباب کے خلاف بھی بعض نتائج ظاہر کرتا رہتا ہوں۔ یہ اُصولی طور پر باتیں ہوں گی، جن میں اللہ تعالیٰ نے دجال کے فتنے کا علاج مضمر (پوشیدہ) رکھا ہے، کہ یہ

---

(۱) مولانا ابوالحسن علی ندوی رمضان ۱۴۲۰ھ بمطابق دسمبر ۱۹۹۹ء میں وفات پا گئے۔ اور مولانا گیلانی کی وفات ۵/ جون ۱۹۵۶ء بمطابق ۲۵/ شوال ۱۳۷۵ھ میں ہوئی۔

(۲) مَنْ قَرَأَ سُوْرَةَ الْكَهْفِ فِي يَوْمِ الْجُمُعَةِ أَضَاءَ لَهُ النُّوْرُ مَا بَيْنَ الْجُمُعَتَيْنِ (الدعوات الکبیر ۲/ ۱۳۳، رقم ۵۲۶۔ مشکوٰۃ ۱/ ۱۸۹، فضائل القرآن، فصل ثالث)۔

باتیں اگر سمجھ لی جائیں، ذہن میں بٹھالی جائیں، تو دجال جس قسم کے شکوک وشبہات پیدا کرے گا، ان کا جواب انہی اُصولوں سے نکل آئے گا، تفصیل آپ کے سامنے آئے گی۔ اور آخرت کی جزاوسزا ذکر کی جائے گی، تکبر وغیرہ کی مذمت آئے گی، ابطالِ شرک ہوگا، اور بعض قصص آئیں گے، جو توحید ورِسالت کی تائید کے لئے ذِکر کیے جائیں گے، عمومی طور پر مضامین اس میں ایسے ہی ہیں۔

ماقبل سے ربط

پچھلی سورت کا اختتام بھی توحید کے مضمون پر ہی ہوا تھا: ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا'' وہاں بھی دیکھو یہی نفی آئی کہ سب تعریف اللہ کے لئے ہے جس نے اولاد اختیار نہیں کی، وہاں بھی اولاد کی نفی آ گئی، اور یہاں بھی خصوصیت کے ساتھ اولاد کا قول کرنے والوں کو ڈرایا گیا، دھمکایا گیا، کہ ان کی یہ بات بالکل خلافِ واقع ہے، اور ان کے پاس کسی قسم کی دلیل موجود نہیں ہے، نہ اِن کے پاس کوئی دلیل ہے اور نہ ان کے بڑوں کے پاس تھی، یہ بالکل جھوٹ بولتے ہیں، اللہ نے کوئی اولاد اختیار نہیں کی۔

عقیدۂ اِتخاذِ ولد ''فتنۂ دجال'' کی بنیاد ہے

اور حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ یہیں سے بنیاد اٹھائیں گے کہ فتنۂ دجال کی بنیاد اَصل میں عقیدۂ وَلدیت پہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو قومیں اس ولدیت کے عقیدے کی حامل ہیں، وہی اس فتنۂ دجال میں سب سے زیادہ شامل ہوں گی، وہی اس فتنے کو پھیلانے اور اُٹھانے والی ہوں گی۔ تو اِتخاذِ ولد کا جو عقیدہ ہے، یہ اصل میں فتنۂ دجال کی بنیاد ہے، جس کی تردید قرآنِ کریم نے اِبتدا سے ہی کرنی شروع کردی، اور خصوصیت کے ساتھ ان کو دھمکایا ہے جو اللہ کے متعلق اولاد کا قول کرتے ہیں۔ تو جیسے پچھلی سورت کی آخری آیت توحید پر مشتمل تھی، عقیدۂ ولدیت کی نفی کے لئے تھی، اور اسی طرح شرک کی تردید کے لئے تھی، تو یہ اِبتدائی آیات بھی اسی طرح توحید پر مشتمل ہیں، اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت ورِسالت کے اظہار پر مشتمل ہیں۔

خلاصۂ آیات

ترجمہ ایک دفعہ صاف طور پر دیکھ لیجئے...... سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے اُتارا اپنے بندے پر کتاب کو، اور نہیں بنایا اس کتاب کے لئے کسی قسم کی کجی کو (نہ اس کے لفظوں میں کوئی کجی ہے، نہ معنی میں کوئی کجی ہے، اور نہ اس کے مضمون اور احکام میں کسی قسم کا ٹیڑھا پن ہے۔ بالکل ٹھیک، سیدھی، دُرست، مستقیم حالت میں اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو اُتارا ہے) تاکہ ڈرائے سخت عذاب سے (کن کو ڈرائے؟ یہاں مفعول ذکر نہیں کیا گیا) تاکہ ڈرائے سخت عذاب سے جو اللہ کی جانب سے ہے، اور تاکہ بشارت دے مؤمنین کو جو نیک عمل کرتے ہیں کہ ان کے لئے اچھا اجر ہے، اس میں ہمیشہ ہمیشہ ٹھہرنے والے ہوں گے۔ اور ڈرائے خصوصیت سے (خصوصیت پیدا ہوگئی عام کے بعد خاص کے تذکرے سے) اور ڈرائے خصوصیت سے ان لوگوں کو جنہوں نے کہا کہ اللہ نے اولاد اختیار کی ہے۔ ان کے لئے اس کے متعلق کوئی علم نہیں، اور نہ ان کے آباء واجداد کو، ان کے

باپ دادوں کو بھی اس بارے میں کوئی علم نہیں، یعنی کوئی علمی دلیل ان کے پاس موجود نہیں، بڑی بات ہے جو ان کے منہ سے نکلتی ہے، نہیں بولتے یہ مگر جھوٹ، یعنی ان کی بات بالکل خلاف واقع ہے، بہت بڑی بات زبان سے نکال دی، دلیل نہ ان کے پاس، نہ ان کے آباء واجداد کے پاس۔

حضور ﷺ کو تسلی

آگے (فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓی اٰثَارِهِمْ میں) سرورِ کائنات ﷺ کو تسلی دی ہے کہ یہ لوگ جب سمجھتے نہیں تھے، تو آپ ﷺ حد سے زیادہ غم کرتے تھے کہ میں انہیں اتنا سمجھاتا ہوں، اور اتنی ان کے اوپر شفقت کرتا ہوں، لیکن یہ میری باتوں سے متاثر نہیں ہوتے۔ تو آپ ﷺ کو تسلی دی جارہی ہے کہ آپ ﷺ ان کے پیچھے اتنا نہ گھلیے، آپ تو اتنا فکر کرنے لگ جاتے ہیں گویا کہ آپ افسوس کرتے ہوئے اپنی جان ہی دے دیں گے۔ ہم نے اس دنیا کو دارالامتحان بنایا ہے، ظاہری طور پر اس کے اوپر زیب وزینت رکھی ہے، اس لیے تاکہ دیکھیں کہ کون اس زیب وزینت میں پھنستا ہے، اور اس زیب وزینت میں پھنسنے سے ہی انسان دجال کے فتنے کا شکار ہوتا ہے، اس ظاہری زیب وزینت کو دیکھ کے دنیا کی محبت کی طرف جب راغب ہوجاتا ہے تو یہیں سے وہ فتنہ دجال میں پھنستا ہے، حضرات نے مناسبت اسی طرح سے نکالی ہے کہ جو شخص حبِّ دنیا میں مبتلا نہ ہو، اور اس کا دھیان آخرت کی طرف رہے، ممکن ہی نہیں کہ دجال کا فتنہ اس کے اوپر اثر انداز ہوجائے، دجال کے فتنے میں انسان جب پھنسے گا حبِّ دنیا کی بنا پر پھنسے گا۔ تو یہاں اللہ تعالیٰ یہ فرماتے ہیں کہ ہم نے جو کچھ بنایا ہے یہ سب زیب وزینت ہے ظاہری طور پر، تاکہ ہم آزمائش کریں کہ کون اچھا عمل کرتا ہے۔ تو جب یہ آزمائش ہے، تو آپ جانتے ہیں کہ آزمائش میں بعض پاس بھی ہوں گے، بعض فیل بھی ہوں گے، اس لئے بعض ایمان لائیں گے بعض نہیں لائیں گے۔ آپ کا فرض ہے کہ آپ تبلیغ کریں، ان کے سامنے حق کو ظاہر کردیں، انہیں سمجھائیں۔ باقی! اگر نہیں مانتے، ضد میں ہیں تو آپ کو ان کے پیچھے گھل گھل کے جان دینے کی ضرورت نہیں۔

اس سے آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو لوگوں کی ہدایت کا کتنا فکر ہوتا تھا، جہنم میں دوسروں نے جانا ہے، اور گھلتے آپ ﷺ تھے، اس خیال کے ساتھ کہ یہ لوگ اللہ کے عذاب میں مبتلا ہوجائیں گے دن رات آپ کو چین نہیں تھا، اتنے بے چین رہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تسلیاں دی جارہی ہیں کہ آپ اتنا افسوس نہ کیا کیجئے کہ اپنی جان ہی دے بیٹھیں۔

''شاید کہ آپ ہلاک کرنے والے ہیں اپنے نفس کو ان لوگوں کے پیچھے اگر یہ ایمان نہیں لائیں گے اس بات پر، ہلاک کرنے والے ہیں آپ اپنے نفس کو بطور افسوس کے۔ بے شک ہم نے بنایا اس چیز کو جو زمین پر ہے زینت اس زمین کے لئے، تاکہ ہم ان کی آزمائش کریں کہ ان میں سے کون اچھا عمل کرتا ہے۔ اور بے شک ہم البتہ کرنے والے ہیں ان سب چیزوں کو جو زمین پر ہیں چٹیل میدان'' کیا مطلب؟ کہ ظاہری طور پر زیب وزینت ہے، ایک وقت آئے گا کہ سب کچھ ٹوٹ پھوٹ کے ختم ہوجائے گا، اور ایک صاف چٹیل میدان ہوجائے گا، یہ فنائے دنیا کی طرف اشارہ ہوگیا۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

اَمۡ حَسِبۡتَ اَنَّ اَصۡحٰبَ الۡکَهۡفِ وَالرَّقِیۡمِ ۙ کَانُوۡا مِنۡ اٰیٰتِنَا عَجَبًا ۝۹ اِذۡ
اے مخاطب! کیا تُو سمجھتا ہے کہ غار والے اور رقیم والے ہماری آیات میں سے کوئی عجیب شئ تھے؟ ۝۹ جب
اَوَی الۡفِتۡیَۃُ اِلَی الۡکَهۡفِ فَقَالُوۡا رَبَّنَاۤ اٰتِنَا مِنۡ لَّدُنۡکَ رَحۡمَۃً وَّهَیِّئۡ لَنَا
ٹھکانا لیا چند جوانوں نے غار کی طرف۔ تو کہا انہوں نے: اے ہمارے پروردگار! ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا کر، اور مہیا کر ہمارے لیے
مِنۡ اَمۡرِنَا رَشَدًا ۝۱۰ فَضَرَبۡنَا عَلٰۤی اٰذَانِهِمۡ فِی الۡکَهۡفِ سِنِیۡنَ عَدَدًا ۙ ۝۱۱ ثُمَّ
ہمارے امر سے دُرستی ۝۱۰ پھر ہم نے ان کے کانوں پہ تھپکی دے دی غار میں چند گنتی کے سال ۝۱۱ پھر
بَعَثۡنٰهُمۡ لِنَعۡلَمَ اَیُّ الۡحِزۡبَیۡنِ اَحۡصٰی لِمَا لَبِثُوۡۤا اَمَدًا ۝۱۲
ہم نے انہیں اُٹھایا تا کہ ہم معلوم کرلیں کہ دونوں گروہوں میں سے کون سا گروہ ہے جس نے شمار کیا ہے ان کے ٹھہرنے کی مدت کو ۝۱۲

''کہف'' اور ''رقیم'' کا معنی ومصداق

اَمۡ حَسِبۡتَ اَنَّ اَصۡحٰبَ الۡکَهۡفِ وَالرَّقِیۡمِ: اَمۡ یہ اِستفہام کے لئے ہے، ہمزہ اِستفہام کے معنی میں ہے (مظہری)۔ حَسِبۡتَ حَسِبَ سے ہے، گمان کرنا۔ اور یہ خطاب بظاہر سرورِ کائنات ﷺ کو ہے، لیکن آپ کی وساطت سے ہر مخاطب اس کا مصداق ہوسکتا ہے۔ کہف کہتے ہیں پہاڑ کے اندر وسیع غار کو۔ پہاڑوں کے سفر میں اگر آپ جائیں تو دیکھیں گے کہ کہیں کہیں پہاڑوں کے اندر سوراخ ہوتے ہیں، اردگرد پتھر لگے ہوتے ہیں درمیان میں جگہ خالی ہوتی ہے، لمبی لمبی ہوتی ہیں، چوڑی چوڑی ہوتی ہیں، چھوٹی بڑی ہر قسم کی ہوتی ہیں، جن کو ''غار'' کہتے ہیں۔ ''غار'' کا لفظ بھی قرآنِ کریم میں آیا ہوا ہے، آپ کے سامنے سورۂ براءت (آیت: ۴۰) میں گزرا تھا: ''اِذۡ هُمَا فِی الۡغَارِ'' سرورِ کائنات ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا سفرِ ہجرت ذِکر کرتے ہوئے ''غار'' کا لفظ بھی آیا ہے۔ تو ''کہف'' بڑے غار کو کہتے ہیں، ''غار'' عام ہے اور ''کہف'' خاص ہے یعنی کھلا اور وسیع غار۔

۱- ''رقیم'' کے متعلق بعض مفسرین کا قول تو ہے کہ رقیم پہاڑ کا نام ہے (مظہری)۔

۲- اور حضرتِ شیخ (الہند رحمۃ اللہ علیہ) کے ترجمے سے معلوم ہوتا ہے کہ رقیم بھی غار کو ہی کہتے ہیں، تو یہ دو لفظ آپس میں مترادف ہوئے، جیسا کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ترجمہ کرتے ہوئے لفظ استعمال کرتے ہیں کہ ''غار اور کھوہ کے رہنے والے'' کھوہ اور غار ایک ہی چیز ہے۔

۳- اور بعض مفسرین کی رائے یہ ہے کہ وہ بستی جس میں یہ واقعہ پیش آیا تھا اس بستی کا نام رقیم ہے (عام تفاسیر)، تو غار والے اور رقیم والے، بستی کی طرف بھی نسبت ہوگئی اور اس غار کی طرف بھی نسبت ہوگئی۔

۴- اور کچھ مفسرین کا خیال یہ ہے کہ رقیم مرقوم کے معنی میں ہے، ''رَقَمَ'' کا معنی: لکھنا، اور مرقوم: لکھی ہوئی چیز۔

واقعہ آپ کے سامنے آ رہا ہے، جس وقت یہ چند نوجوان غائب ہو گئے تھے، چھپ گئے تھے، تلاش کرنے کے باوجود نہ ملے (تفصیل آگے آئے گی) تو اس وقت کی حکومت نے ان کے نام، نسب، ان کے حالات لکھوا کر خزانے میں محفوظ کر لئے تا کہ یہ یادداشت رہے، اور آئندہ کبھی بھی وہ ظاہر ہو جائیں تو معلوم ہو جائے کہ یہ وہی لوگ ہیں (قرطبی)۔ تو پھر مرقوم کے معنی میں ہو کر مطلب یہ ہوگا کہ لکھی ہوئی تختی والے، جن کے ناموں کی تختی لکھ کے رکھ لی گئی تھی۔

۵- یا ''مرقوم'' کے معنی میں لے کر یہ قول بھی نقل کیا گیا ہے کہ جس وقت ظاہر ہونے کے بعد دوبارہ غار میں گئے، اور جا کے وفات پا گئے، تو لوگوں نے ان کے نام اور حالات لکھ کر اس غار کے دروازے پر لٹکا دیے، ان کے نام کی تختی لگا دی، اس اعتبار سے بھی ان کو ''اَصحابِ رقیم'' کہا گیا کہ لکھی ہوئی تختی والے، یہ مفہوم بھی ذکر کیا گیا ہے (عام تفاسیر)۔

اور حضرت مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ جن کا ذِکر کل میں نے آپ کے سامنے کیا تھا، انہوں نے اس کا مفہوم ایک اور ذِکر کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''رقیم'' لکھی ہوئی چیز کو کہتے ہیں، اور یہاں سے مراد ہیں لکھے ہوئے صحیفے اور لکھی ہوئی کتابیں جو وہ جاتے ہوئے اپنے ساتھ لے گئے تھے، یعنی جب وہ غار میں گئے، تو غار میں جاتے ہوئے جس طرح نیک لوگوں کا کام ہے...... آج کل تو خیر ماحول ہی بدل گیا، ورنہ پاکستان جس وقت بنا تھا، یا اس سے پہلے، آپ یقین کیجئے! اپنی آنکھوں سے دیکھی ہوئی بات ہے کہ جس وقت لوگ سفر پر جایا کرتے تھے، تو جاتے وقت اپنا تلاوت کا قرآنِ کریم ساتھ رکھا کرتے تھے، اور یہ مبلغین، خاص طور پر اَحرار اور جمعیت علمائے ہند کے مبلغین، ان کی تو یہ عادت تھی کہ جدھر جاتے ان کی حمائل ساتھ ہوتی، چھوٹی ہوتی تو جیب میں ڈال لیتے، بلکہ بسا اوقات امتیازی نشان کے طور پر اس کو گلے میں لٹکا کے رکھتے تھے، تا کہ اپنے معمول میں فرق نہ آئے، جہاں جا کے ٹھہرنا ہے، وقت پر اپنی تلاوت کر لینی ہے، اور وقت پر اپنا معمول پورا کر لینا ہے۔ اسی طرح جن کو ''حزبِ اعظم'' پڑھنے کی عادت ہے، ''دلائل الخیرات'' پڑھنے کی عادت ہے، اس قسم کے وظیفے ان کے متعین ہیں، تو جب وہ سفر پر جاتے ہیں، تو اپنے وظائف کی کتاب ساتھ لے لیتے ہیں، تا کہ منزل کا ناغہ نہ ہو، جہاں موقع آئے گا اس کو پڑھ لیا جائے گا...... تو اسی طرح سے چونکہ وہ اللہ والے تھے، نیک لوگ تھے تو انہوں نے اپنا دِل بہلانے کے لئے جس وقت وہ گئے، تو جیسے مطالعے کے لئے کتاب ساتھ رکھ لی جاتی ہے، تو انبیاء علیہم السلام کی طرف سے جو صحیفے آئے ہوئے تھے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کتاب موجود تھی، جاتے ہوئے اس کو ساتھ لے گئے۔[1] تو لکھے ہوئے اوراق کے معنی میں لے کر اس کا مصداق یہ ذِکر کر دیا۔ تو گویا کہ کھوہ والے بھی تھے اور کتابوں والے بھی تھے کہ جاتے ہوئے اپنی کتابیں اور اپنا لٹریچر ساتھ لے گئے، تا کہ وہاں جو رہیں گے، تو مطالعہ کریں گے، اور اپنا دل بہلائیں گے۔ یا ذِکر اَذکار کی کتاب ساتھ لے گئے تا کہ وقت پہ اس کی تلاوت کرتے رہیں۔

اچھے اور بُرے لٹریچر کے دِل دِماغ پر اَثرات

مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ اسی قسم کے اشاروں سے ایک بات نکالیں گے کہ دجالی فتنے میں انسان کو لٹریچر کس قسم کا

---

(۱) وروی عن ابن عباس أنه كتاب كان عندهم فيه الشرع الذي تمسكوا به من دين عيسى وقيل من دين قبل عيسى (آلوسی قرطبی وغیرہ)۔

پڑھنا چاہیے، اور کون سی چیزیں مطالعہ میں رکھنی چاہئیں تو انسان دجالی فتنے سے بچ سکتا ہے۔ کیونکہ مطالعہ جس قسم کا کیا جائے انسان کا ذہن ویسا بنتا چلا جاتا ہے، جیسے صحبت ذہن بناتی ہے کہ آپ کسی کی صحبت میں رہیں تو صحبت سے ذہن بنتا ہے، جس ماحول میں آپ رہیں گے تو ماحول سے ذہن بنتا ہے، بالکل ماحول اور صحبت کی طرح لٹریچر بھی مؤثر ہے، یعنی کتابیں رسالے جس قسم کے آپ پڑھیں گے ویسے آپ کے ذہن کے اُوپر اثرات واقع ہوتے چلے جائیں گے۔ وَاتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْكَ (آیت:۲۷) کے تحت گیلانی صاحبؒ اس بات کو ذکر کریں گے کہ یہ اللہ تعالیٰ نے دجالی فتنے کے زمانے کا لٹریچر بتایا ہے، کہ جو کچھ اللہ کی طرف سے آیا ہے بس اسے پڑھو، اس کی تلاوت کرتے رہو۔ اور جو کچھ لوگ پروپیگنڈا کرتے ہیں، آئے دِن فتنہ سامانی کے طور پر مختلف کتابیں اور رسالے شائع کرتے ہیں، جس میں لوگوں کے دِلوں میں خواہ مخواہ کے شکوک وشبہات پیدا کرتے ہیں، یہ پڑھو ہی نہیں، ان کا مطالعہ ہی نہ کرو۔ تو جب آپ ان چیزوں کو پڑھو گے ہی نہیں، تو دجالی فتنے میں جس قسم کی بداعتقادیاں پھیلائی جاتی ہیں، ان سے محفوظ رہ جاؤ گے۔

باطل کا لٹریچر ہر کسی کو پڑھنے کی اجازت نہیں

چنانچہ جن لوگوں کو زیادہ تر تحقیقات کا شوق ہوتا ہے، اور وہ کہتے ہیں کہ ہر قسم کی چیز پڑھنی چاہیے اور تحقیق کرنی چاہیے، کبھی مودودی کی کتابیں اُٹھالیں، کبھی پرویز کی کتابیں اُٹھالیں، کبھی مرزے (غلام احمد قادیانی) کی کتابیں اُٹھالیں، اور ذاتی طور پر اتنی صلاحیت نہیں ہوتی کہ صحیح اور غلط میں امتیاز کرلیں، اپنے اُوپر اعتماد ضرورت سے زیادہ کرلیتے ہیں، کہ ہم ہر قسم کے خیالات معلوم کرکے تحقیق کرتے ہیں۔ تو دیکھنے میں یہی آیا ہے کہ اکثر وبیشتر وہ لوگ بگڑ جاتے ہیں، کیونکہ صحیح اور غلط میں امتیاز کر نہیں سکتے، اور اِن باطل لوگوں کے بیان میں بڑی چاشنی ہوتی ہے، اور بہت اچھے انداز کے ساتھ وہ اپنے مضمون ومفہوم کو ادا کرتے ہیں، اور ایسے طور پر دل اور دماغ میں وسوسے ڈال دیتے ہیں کہ انسان کے خیالات بگڑ جاتے ہیں۔ اور جو اس بات کی پابندی کرتے ہیں کہ غلط کتابیں نہ پڑھیں، ناول قسم کی کتابیں نہ پڑھیں، مفسد قسم کے لوگوں کی کتابیں نہ پڑھیں، مرزائیوں کی، شیعوں کی، بریلویوں کی اور اسی طرح سے مودودیوں کی، چکڑالویوں کی کتابیں اس وقت تک نہ دیکھیں جب تک کہ اپنے مسلک کو پوری طرح سے سمجھ نہ لیں، اور قرآن وحدیث کے صحیح مفہوم سے واقف نہ ہوجائیں، اس وقت تک ان سب غلط کتابوں سے احتیاط کرتے ہیں، ایسے لوگوں کا ذہن بڑا پختہ ہوتا ہے اور وہ نظریات میں بہت صحیح ہوتے ہیں۔ اور جو قبل از وقت ان کتابوں کو دیکھنے لگ جاتے ہیں، تو ان کو صحیح غلط کا پورا امتیاز تو ہوتا نہیں، بسااوقات وہ اس قسم کے خیالات میں مبتلا ہوجاتے ہیں جو قابلِ اعتراض ہیں، اور اپنے طور پر سمجھتے ہیں کہ ہم تحقیق کررہے ہیں..... حدیث شریف میں آپ پڑھیں گے کہ سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ دجال ایک بہت بڑا فتنہ پرداز ہوگا، جس وقت تم یہ سنو کہ دجال ظاہر ہوگیا تو تم اس کے قریب نہ جانا، اس سے دُور بھاگنا، کیونکہ ایک آدمی اس کے پاس جائے گا یہ سمجھتا ہوا کہ میں ایمان والا ہوں اور میرا ایمان محفوظ ہے، میرا وہ کچھ نہیں بگاڑ سکتا، لیکن جب وہاں جائے گا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو اس قسم کے شبہات دیے ہوئے ہوں گے، اس قسم کے اس کے حالات ہوں گے کہ ان کو دیکھ کے فتنے میں مبتلا ہوجائے گا، اور

ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔[1] تو آپ ﷺ نے یہ حکم نہیں دیا کہ جب دجال کو سنو تو اس کے ساتھ لڑنے کے لئے، بحث کرنے کے لئے، مجادلہ کرنے کے لئے، مناظرہ کرنے کے لئے پہنچ جاؤ، جاکے اس کے ساتھ مناظرہ کرو، یہ نہیں کہا۔ بلکہ فرمایا کہ اس سے دُور بھاگو، اس کے قریب ہی نہ جاؤ، کیونکہ وہ فتنہ اتنا شدید ہوگا کہ ہر کسی کے بس میں نہیں ہوگا۔ اور جن کو اللہ نے ہمت دی ہوگی، وہ قریب جائیں گے، جاکے گفتگو کریں گے، بحث بھی کریں گے اور ان کا ذِکر بھی روایات میں موجود ہے۔[2] لیکن عام تلقین یہی ہے کہ اس کے قریب نہ جانا...... اب آپ کو کوئی مودودی پکڑ کے آپ کے ساتھ بعض خیالات میں بحث کرنا چاہتا ہے، تو آپ کہیں کہ نہیں جی! ہمارا ابھی یہ مقام نہیں ہے، اگر آپ نے بحث کرنی ہے تو ہمارے اساتذہ سے کیجئے۔ کوئی بدعتی اور بریلوی آپ کے ساتھ اُلجھتا ہے اور آپ کے سامنے دلائل دینے کی کوشش کرتا ہے، تو آپ کہیں، نہ جی! ہم نے ابھی پوری طرح سے دِین کو سمجھا نہیں، ہم طالبِ علم ہیں، ہم ان باتوں کو پوری طرح سے نہیں سمجھتے، تو ہم اس بحث میں مبتلا نہیں ہوتے۔ اگر آپ کو زیادہ ہی شوق ہے تو ہمارے اساتذہ میں، ہمارے بزرگوں میں ایسے لوگ ہیں جو تمہیں ہر طرح سے سمجھا سکتے ہیں، ان سے بحث کیجئے۔ اگر اس طرح سے کریں گے تو خیالات بھی ٹھیک رہیں گے، نظریہ بھی پختہ رہے گا، اور بالکل صحیح انداز کے ساتھ آپ قرآن اور حدیث کو سمجھ جائیں گے۔ اور اگر دوسرا طریقہ اپنایا کہ جس کو دیکھا اس سے اُلجھ گئے، جس کو دیکھا اس سے بحث کرنے لگ گئے، تو آپ کے اپنے دِل اور دِماغ کے خیالات خراب ہوجائیں گے، پھر وہ سکون اور اطمینان نہیں رہتا، اور اپنے نظریے میں وہ پختگی نہیں ہوا کرتی...... تو گویا کہ دجالی فتنے کے زمانے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ہدایت ہوئی کہ اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْکَ جو آپ کی طرف وحی کرکے بھیجا گیا ہے، بس اسے پڑھو۔ اور اس کے خلاف جو لوگ لٹریچر دیں، پروپیگنڈے کے طور پر مختلف قسم کی کتابیں شائع کریں، آپ انہیں پڑھیں ہی نہیں۔ جب پڑھو گے نہیں، تو آپ کا دِل دِماغ ان کفریات سے محفوظ رہ جائے گا، آپ شبہات میں مبتلا ہی نہیں ہوں گے۔ تو وہ نوجوان جن کا ذِکر آپ کے سامنے کیا جائے گا، وہ بھی جاتے ہوئے اپنا نصاب اور اپنی کتابیں اور اپنے وظائف، یا جو بھی اس وقت ان کے پاس لکھا ہوا موجود تھا، انبیاء علیہم السلام کی طرف سے جو صحیفے تھے یا اس زمانے میں جو کتاب تھی اس کو جاتے ہوئے ساتھ لے گئے، تو "رقیم" سے وہ مراد ہیں...... اور اسی معنی کو راجح قرار دیا مولانا ابوالحسن ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے، جس طرح میں نے ذِکر کیا تھا کہ ان دونوں بزرگوں نے اس سورت کے اُوپر اس انداز سے قلم اُٹھایا ہے کہ اس کا فتنۂ دجال کے ساتھ ربط واضح کیا جائے، تو انہوں نے بھی اسی معنی کو ترجیح دی ہے۔

تو یہ سارے اقوال مفسرین کے موجود ہیں۔ اور ہمارے ان جدید محققین کی گویا کہ تحقیق یہ ہوئی کہ اس کا مصداق اگر ان لکھے ہوئے اوراق کو بنادیا جائے تو یہ بات بھی موقع محل کے مطابق ٹھیک ہے۔ تو آیت کا ترجمہ یوں ہوگیا، اے مخاطب! کیا تیرا

---

(۱) ابوداود ۲/ ۲۳۷ باب خروج الدجال۔ مشکوٰۃ ۲/ ۴۷۷ باب العلامات۔ فصل ثانی۔

(۲) بخاری ۱/ ۲۵۳ باب لایدخل الدجال المدینۃ۔ مشکوٰۃ ۲/ ۴۷۵ باب العلامات بین یدی الساعۃ۔ فصل اول۔

خیال ہے، کیا تُو سمجھتا ہے کہ غار والے اور رقیم والے ہماری آیات میں سے (عَجَبًا یہ کَانُوْا کی خبر ہے، اور یہ چونکہ مصدر ہے، اس کے اوپر مضاف محذوف نکالیں گے اٰیَۃً ذاتَ عَجَبٍ۔ آلوسی) ہماری آیات میں سے کوئی عجیب شئ تھے؟، عجب والے تھے؟

اِذْ اَوَی الْفِتْیَۃُ اِلَی الْکَھْفِ: اذ، یہ ظرف ہے اس کا عامل محذوف نکالیں گے ''اُذْکُرْ'' یا ''لِیَذْکُرْ''، اَلْفِتْیَۃُ جمع ہے فَتٰی کی، اور فَتٰی جوان کو کہتے ہیں۔ اَوٰی یَاْوِیْ: ٹھکانا لینا۔ قابلِ ذکر ہے وہ وقت، یا، یاد کیجئے اس وقت کو جب ٹھکانا لیا چند جوانوں نے غار کی طرف۔ فَقَالُوْا رَبَّنَآ تو کہا انہوں نے: اے ہمارے پروردگار! اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَۃً: اٰتِ: اَمر کا صیغہ ہے ''نَا'' مفعول ہے، رَحْمَۃً دُوسرا مفعول ہے۔ دے ہمیں اپنے پاس سے رحمت، ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا کر۔ وَّ ھَیِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا، اور تیار کر ہمارے لئے ہمارے اَمر سے دُرستی، یعنی دُرستی مہیا کر۔ رَشَد: دُرستی۔

فَضَرَبْنَا عَلٰٓی اٰذَانِھِمْ: ضرب مارنے کو کہتے ہیں، آذان یہ اُذن کی جمع ہے۔ پھر ہم نے مارا ان کے کانوں پر۔ ضرب علی الأذن سے مراد ہوتا ہے تھپکی دینا۔ آپ نے گھروں میں دیکھا ہوگا، جس وقت مائیں چھوٹے بچوں کو سلاتی ہیں، تو ان کے کان کو محبت اور پیار کے ساتھ تھپکاتی ہیں تو بچے کو نیند آجاتی ہے۔ تو یہاں ضرب علی الأذن سے یہی مراد ہے کہ ہم نے ان کے کان کو تھپکا دیا یعنی ان کو محبت کے ساتھ سلا دیا...... یا ضربنا کا مفعول محذوف نکال لیجئے، جیسا کہ ''بیان القرآن'' میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اختیار کیا کہ ضَرَبْنَا الحِجَابَ علی اٰذانِھِمْ، ہم نے ان کے کانوں پہ پردہ ڈال دیا (عام تفاسیر)، پھر بھی اشارہ نیند کی طرف ہی ہے، کیونکہ نیند اسی وقت ہی ہوتی ہے جب انسان کان کے راستے کچھ سنے نہیں۔ آنکھیں بند کر لینا نیند نہیں ہے، آنکھیں بند کر کے تو آپ لیٹے ہوئے ہوں لیکن باہر کا شور، باہر کی باتیں سب آپ کے کان میں پڑ رہی ہیں تو آپ جاگ رہے ہیں۔ سویا ہوا آدمی وہ ہوتا ہے جو کان سے کچھ نہ سنے، تو کان سے نہ سننا یہ گہری نیند ہوتی ہے۔ آنکھیں بند کر لینے کے باوجود دماغ بیدار رہتا ہے، باہر کی باتیں انسان سنتا رہتا ہے، لیکن جب کان میں آواز نہ جائے، انسان نہ سنے تو یہ گہری نیند ہوتی ہے۔ تو فَضَرَبْنَا عَلٰٓی اٰذَانِھِمْ کا معنی یہ ہے کہ ہم نے ان کو سلا دیا، ہم نے ان کے کانوں پہ تھپکی دے دی، ہم نے ان کے کانوں پہ پردہ ڈال دیا، جس لفظ کے ساتھ بھی آپ ادا کریں مفہوم یہی ہے کہ ہم نے ان کو سلا دیا۔ فِی الْکَھْفِ (یہ وہی لفظ آگیا تیسری دفعہ) غار میں۔ سنین: سال۔ عَدَدًا: عدد شمار کرنے کو کہتے ہیں۔ تو سِنِیْنَ عَدَدًا کا مطلب ہوگا چند گنتی کے سال، ہم نے ان کے کانوں پہ تھپکی دے دی غار میں چند گنتی کے سال، یعنی کئی سال جو معدود تھے، شمار کئے ہوئے تھے اتنے سالوں میں ہم نے ان کو سلا دیا۔ ثُمَّ بَعَثْنٰھُمْ: پھر ہم نے انہیں اُٹھایا، لِنَعْلَمَ تا کہ ہم معلوم کر لیں اَیُّ الْحِزْبَیْنِ، حزبین یہ تثنیہ ہے حزب کا، اور حزب گروہ کو کہتے ہیں۔ اُولٰٓئِکَ حِزْبُ اللّٰہِ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (سورۂ مجادلہ: ۲۲)، کُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَیْھِمْ فَرِحُوْنَ (سورۂ روم: ۳۲)، قرآنِ کریم میں کئی جگہ یہ لفظ آئے گا۔ تا کہ ہم معلوم کر لیں کہ دونوں گروہوں میں سے کون سا گروہ۔ اَحْصٰی لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا: اَمَد، مدت کو کہتے ہیں، مَا لَبِثُوْا میں ''ما'' مصدریہ ہے جو لَبِثُوْا کو مصدر کی تاویل میں کر دے گی، تو لِمَا لَبِثُوْا کا معنی ہو جائے گا: لِلُبْثِھِمْ۔ اَحْصٰی یہ ماضی کا صیغہ ہے، اَحْصٰی یُحْصِیْ اِحْصَاءً: شمار کرنا (عام تفاسیر)، دونوں گروہوں میں سے کون سا گروہ ہے جس نے شمار کیا ان کے ٹھہرنے کی مدت کو، اس مدت کو جو وہ ٹھہرے اس کو کس نے شمار کیا۔ اور مترجمین نے اَحْصٰی کو تفضیل کا صیغہ بھی بنایا ہے، یعنی باب اِفعال سے تجرید کر کے اس کو

اسم تفضیل کا صیغہ بنالیا جائے تو پھر ترجمہ یہ ہوگا کہ دونوں گروہوں سے کس گروہ نے ان کے ٹھہرنے کی مدت کو زیادہ محفوظ رکھا، زیادہ صحیح اندازہ کس نے لگایا تاکہ ہم یہ معلوم کرلیں (مظہری)۔

شانِ نزول

یہ چار آیات جو آپ کے سامنے پڑھی گئی ہیں، اِن میں اَصحابِ کہف کے واقعے کو اِجمالاً ذکر کیا گیا ہے، اور اگلے رُکوع سے پھر اس کی تفصیل شروع ہورہی ہے۔ اس واقعے کے شانِ نزول میں مفسرین نے نقل کیا ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ کی مکی زندگی میں جس وقت آپ کی تبلیغ کچھ زور پکڑ رہی تھی، اور لوگ ایمان لارہے تھے، مشرکینِ مکہ کی طرف سے مزاحمت بڑھ رہی تھی، تو مشرکین آپ کو پریشان کرنے کے لئے علمائے یہود سے بعض علمی سوالات پوچھ کے آتے، اور سرورِ کائنات ﷺ کے سامنے پیش کرتے، یہ جاننے کے لئے کہ اگر یہ نبی ہیں تو ان کا جواب صحیح دیں گے، اور اگر جواب نہیں دے سکیں گے تو ہم ان کے خلاف پروپیگنڈا کریں گے۔ اور یہ وہ جانتے تھے کہ حضور ﷺ نے کسی مدرسے میں پڑھا نہیں، کتابوں کا مطالعہ نہیں کیا، اس لئے گزرے ہوئے حالات کو یہ کہیں سے سیکھ کے تو آئے نہیں۔ تو آئے دِن کچھ نہ کچھ سوالات وہ اس قسم کے کرتے رہتے تھے، تو گویا کہ اس مقابلہ بازی میں انہوں نے یہود سے (کیونکہ اہلِ کتاب اور اہلِ علم اس علاقے میں یہی تھے) معلوم کرکے حضور ﷺ پر تین سوال کئے تھے۔ رُوح کے متعلق سوال کیا تھا، جس کا ذِکر پچھلی سورت میں آگیا۔ اور اَصحابِ کہف کے متعلق سوال کیا تھا کہ وہ نوجوان کون تھے؟ کیا تھے؟ جو غار میں چھپ گئے تھے۔ اور اسی طرح ذُوالقرنین کے متعلق سوال کیا تھا۔ ان دو باتوں کی تفصیل آپ کے سامنے اس سورت میں آرہی ہے (آلوسی)۔

واقعۂ اَصحابِ کہف کے ذِکر کرنے کا مقصد

سوال ان کے مختلف قسم کے ہوتے تھے۔ جس سوال کی وضاحت حکمت کا تقاضا ہوتی، اور اس میں کچھ عبرت کی باتیں ہوتیں، قرآنِ کریم اس کو وضاحت سے بیان کرتا ہے۔ جیسا کہ سورۂ یوسف میں بھی آپ کے سامنے آیا تھا کہ سورۂ یوسف کا شانِ نزول بھی ایسا ہی ہے کہ انہوں نے ایک سوال اُٹھایا تھا جس کا جواب مفصل دیا گیا (آلوسی)، اور اتنا مفصل دیا گیا کہ اس میں مزید وضاحت کی ضرورت ہی نہ رہی، اس لئے وہ قصہ قرآنِ کریم میں ایک ہی دفعہ آیا ہے، اور باقی قصوں کی طرح اس کو بار بار دہرایا نہیں گیا، کیونکہ اس کی جتنی ضرورت کی باتیں تھیں وہ ساری ایک ہی جگہ جمع کردی گئیں...... اور یہاں بھی سوال اُٹھایا گیا تو ان کا واقعہ بھی کچھ تفصیل کے ساتھ آیا۔ اور تفصیل کے ساتھ بیان کرنے میں بظاہر حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ ایک تو واضح طور پر ان کے سوال کا جواب آگیا، اور دوسری بات یہ ہوئی کہ اس قسم کے واقعات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لئے ہمت افزائی کا باعث تھے، کیونکہ اس میں یہ آگیا کہ عقیدۂ توحید کی پختگی جس طرح تمہیں تلقین کی گئی ہے، یہ عقیدہ پہلے سے چلا آتا ہے، اور اس عقیدے کے اختیار کرنے پر اگر تمہیں مشکلات پیش آرہی ہیں، تو پہلے لوگوں کو بھی ایسے ہی مشکلات پیش آئی تھیں، اور وہ بھی ظلم اور تشدّد کا نشانہ بنے تھے، لیکن ظلم وتشدّد کا نشانہ بننے کے باوجود وہ اس عقیدے سے پھرے نہیں، بلکہ ڈٹے رہے۔ حتیٰ کہ اس عقیدے کی بنا پر ان کو

گھربار چھوڑنا پڑا، آبادیوں سے دُور جانا پڑا، غاروں میں چھپنا پڑا، لوگوں کے ظلم وستم سے تنگ آکر یہ سب قربانیاں انہوں نے دیں۔ جب انہوں نے قربانیاں دے دیں تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی اعانت ہوئی، پردۂ غیب سے ان کی مدد ہوئی، اللہ نے ان کی حفاظت فرمائی، ان کے لئے ہر قسم کی راحت کے اسباب مہیا کئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ظالم شکست کھا گئے، ملیامیٹ ہوگئے، اور یہ لوگ قوم کے ہیرو بن گئے، اور قوم کے اندر ان کا درجہ قوم کے بزرگوں کا ہوگیا، اور لوگوں نے پھر اس واقعے کو قومی یادگار کے طور پر محفوظ رکھا، دُنیا میں اللہ نے ان کو عزّت دی، آخرت میں اپنے اِنعام سے نوازا۔ عقیدے کی پختگی آخر یہ نتیجہ دکھایا کرتی ہے..... تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس واقعے کے ضمن میں یہ سبق پڑھانا مقصود ہے کہ اگر آج یہ ظالم تم پر تشدّد کر رہے ہے اس عقیدۂ توحید کی بنا پر، اور تمہیں شرک اختیار کرنے پر مجبور کرتے ہیں تو یہ کوئی نیا واقعہ نہیں، پہلے بھی ایسے ہوتا آیا ہے۔ تمہیں بھی چاہیے کہ تم اسی طرح سے پختگی اختیار کرو، اور جب تم جم جاؤ گے اور اس عقیدے کے لئے جس قسم کی قربانیاں مطلوب ہیں جب تم قربانیاں دو گے، تو آخرکار نوازے تم ہی جاؤ گے، اور ان ظالموں کا ایک دن نام ونشان مٹ جائے گا۔

تاریخ اپنے آپ کو دوہراتی ہے

چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی اپنے گھربار چھوڑنے پڑے، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ایک یار کے ساتھ غار میں بھی جاکے چھپنا پڑا، اور ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں بھی گئے۔ آخر زیادہ مدّت نہیں گزری کہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کامیاب کیا، اور آپ کے مخالفین جتنے تھے وہ سارے کے سارے زیر ہوگئے۔ گویا کہ ان واقعات کو دوہرا کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ تلقین کرنی مقصود ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دوہراتی ہے، آج تم پر اگر اس عقیدے کی بنا پر زیادتیاں ہو رہی ہیں اور اس طرح سے یہ ظالم تم پر مسلط ہیں، اور دنیا کی جاہ اور عزت ان کو اس وقت حاصل ہے، اور تمہیں یہ ہر طرح سے ستا رہے ہیں، تو ایسا پہلے بھی ہوتا رہا ہے، تو جیسے اللہ کے اُن مقبول بندوں نے اپنے عقیدے کے لئے ہر قسم کی قربانی دی، تمہیں بھی اپنے عقیدے کے لئے ہر قسم کی قربانی دینی چاہیے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں بھی یہی سبق تھا کہ بظاہر حضرت یوسف علیہ السلام بھائیوں کے سامنے کس طرح مغلوب ہوئے؟ بھائی ان کے اوپر کس طرح سے غالب آئے؟ کس طرح سے ان کے مظالم کے نشانہ بنے؟ لیکن جب انہوں نے صبر واستقامت کو اختیار کیا تو آخر اللہ تعالیٰ نے ان کو عزت دی اور ان کے بھائی بالآخر ان کے سامنے دست بستہ کھڑے ہوگئے۔ تو اس طرح سے حق کو آخرکار غلبہ ہوا کرتا ہے، لیکن حق کے لئے کچھ مشکلات برداشت کرنی پڑتی ہیں، چونکہ اس قسم کے واقعات میں ایسے اسباق ہیں، اس لئے قرآنِ کریم ان کو وضاحت کے ساتھ بیان کرتا ہے۔

کسی واقعے کو نقل کرنے میں قرآنِ کریم کا انداز

باقی رہی یہ بات کہ یہ کون تھے؟ کتنے تھے؟ کہاں کے رہنے والے تھے؟ کس وقت یہ واقعہ پیش آیا؟ اس وقت بادشاہ کون تھا؟ ان کا علاقہ کون سا ہے؟ یہ باتیں ایسی ہیں جن کی کسی حد تک قرآنِ کریم نے وضاحت نہیں کی، اس لئے کہ قرآنِ کریم کوئی تاریخ کی کتاب نہیں ہے، یہ تاریخ والوں کا کام ہے کہ اس قسم کی چیزوں کو بیان کریں۔ قرآنِ کریم واقعے کو اس حد تک بیان کرتا

ہے جتنا کہ اس کے موضوع سے تعلق رکھتا ہے، اس کا موضوع ہے ہدایت للخلق، آخرت کی کامیابی کے لئے مخلوق کی راہنمائی کرنا، اللہ تعالیٰ کی معرفت کے راستے بتلانا، تاکہ اپنے خالق اور مالک کے ساتھ تعلق صحیح ہو جائے، تو اطاعت اور عبادت کریں، یہ قرآنِ کریم کا موضوع ہے۔ تو جتنا واقعہ اس کے موضوع سے تعلق رکھتا ہے، اتنا یہ بیان کرتا ہے، اور جو زائد تاریخی چیزیں ہیں، افسانوی قسم کی باتیں ہیں، ان کو قرآنِ کریم نہیں لیتا، اور ان باتوں میں نہیں اُلجھاتا، تاریخی واقعہ جو نقل کیا جاتا ہے، اس کی جزئیات کو اس حد تک ہی بیان کرنا چاہیے جس حد تک انسان اس سے فائدہ اُٹھا سکے۔

اب یہ واقعہ بھی ایسا تھا کہ اس میں دو پہلو ہیں، ایک پہلو تو ہے عقیدے کی وضاحت کہ وہ کون سا عقیدہ تھا جس کی بنا پر وہ ظلم کا نشانہ بنے؟ اور پھر اس عقیدے کے اُوپر ان کا جم جانا، نتیجۃً اللہ کی رحمت کے ساتھ ان کا مالا مال ہو جانا اور اہلِ حق کا غلبہ، یہ چیزیں سبق آموز ہیں، ان کو قرآنِ کریم نے وضاحت سے بیان کیا ہے۔ اور واقعات کے باقی حصے جن کے ساتھ کسی قسم کی ہدایت متعلق نہیں، اب اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ یہ لوگ ہندوستان کے رہنے والے ہوں، یا افریقہ کے رہنے والے ہوں، یا امریکا کے رہنے والے ہوں، جگہ کے بدلنے سے واقعے کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ پانچ ہوں، سات ہوں، دس ہوں، تین ہوں، چھ ہوں، جتنے بھی ہوں ان کی تعداد کے ساتھ اس واقعے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بادشاہ کون سا تھا؟ کوئی اَیرا غیرا ہو، ہمیں اس سے کیا بحث؟ بہر حال وہ مشرک تھا، جوان کو شرک پر برانگیختہ کرتا تھا، تو بادشاہ کے نام اور شخصیت کے بدلنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اور یہ کس زمانے کی بات ہے؟ ہزار سال پہلے کی ہے، دو ہزار سال پہلے کی ہے، سو سال پہلے کی ہے، چار سو سال پہلے کی ہے، اس سے واقعے کی نوعیت پہ کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اور ویسے بھی لوگوں کے اندر جس قسم کے واقعے کی شہرت ہوتی ہے تو اس قسم کی جزئیات کو بیان کرنے کے ساتھ اختلافات کے دروازے کھلتے ہیں کہ لوگوں نے اپنی تاریخ میں لکھ رکھا ہو کہ فلاں شہر کے رہنے والے تھے، قرآنِ کریم حقیقت کو نمایاں کرے کہ وہ فلاں شہر کے رہنے والے تھے، تو خواہ مخواہ آپس میں ٹکراؤ کی ایک صورت پیدا ہو گئی۔ لوگوں نے مشہور کر رکھا ہے کہ ان کی تعداد اتنی تھی اور قرآنِ کریم کہے کہ اتنی تھی، تو خواہ مخواہ بحث کا ایک دروازہ کھل گیا۔ قرآنِ کریم اس بات کو لیتا ہے جس میں کسی شخص کے لئے اُلجھنے کی گنجائش ہی نہ ہو، اور صاف ستھری بات لوگوں کے سامنے رکھ دی جائے، جس سے لوگوں کو ہدایت حاصل ہو۔ محض واقعے کو اس نوعیت سے ذِکر کرنا کہ جس طرح کوئی مجلس بازی ہوتی ہے، قصہ کہانی سنائی ہوتی ہے، جس سے کوئی مقصد نہ ہو، اس طرح سے قرآنِ کریم واقعے کو نقل نہیں کرتا۔

اَصحابِ کہف کا زمانہ، علاقہ اور بادشاہ کا نام

اور مؤرخین کا انہی چیزوں میں اختلاف ہے جو میں نے آپ کی خدمت میں عرض کیں کہ یہ کون تھے؟ کہاں کے رہنے والے تھے؟ ان کی تعداد کتنی تھی؟ اس وقت بادشاہ کون تھا؟ کس زمانے کی یہ بات ہے؟ اس بارے میں دو رائے ہیں کہ یہ واقعہ عیسیٰ علیہ السلام کے بعد کا ہے یا عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے کا ہے؟ ابنِ کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے ترجیح اس بات کو دی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے کا ہے۔ لیکن عام طور پر مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ عیسیٰ علیہ السلام کے بعد کا ہے، اور یہ لوگ عیسیٰ علیہ السلام کے متبع تھے، انہی کے دِین پر تھے۔ اور اس وقت جو

بادشاہ تھا اس کا نام ''دقیانوس'' لکھا ہے اور وہ مشرک تھا اور رُومی سلطنت کے تحت یہ واقعہ پیش آیا ہے (مظہری)، یہ لوگ رُوم کے باشندے تھے۔ جس بستی کے اندر یہ رہنے والے تھے بعض تفسیروں میں اس کا نام لکھا ہے ''اَفِیْسس'' یا بعض میں ''آفیفس'' معلوم ہوتا ہے، اور صاحب ''قصص القرآن''(۱) نے لکھا ہے کہ یہ وہ بستی ہے جس کو عربی میں ''بَطرا''، اور انگریزی میں ''پیٹرا'' کہتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ پُرانے قسم کے آثار کی کھدائی کے بعد یہ بستی ظاہر ہوئی اور اس میں وہ آثار نمایاں ہو گئے جس سے پہچان لیا گیا کہ یہ واقعہ یہیں پیش آیا، بڑی بڑی غاریں، اور غاروں کے اوپر اس قسم کے آثار نکل آئے ہیں۔ بہرحال شہر کوئی بھی ہو اس کا تعلق مشرقِ وسطیٰ کے علاقے کے ساتھ ہے، جہاں ترکوں کی حکومت تھی۔ ''بیان القرآن'' جس وقت لکھا گیا تو اس وقت انہوں نے یہی لکھا ہے کہ اب یہ علاقہ ترکوں کے قبضے میں ہے، سلطان کے قبضے میں ہے، ترکوں کے جو بادشاہ ہُوا کرتے تھے ان کو ''سلطان'' کے لفظ سے یا ''خلیفہ'' کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ بہرحال اس قسم کی باتیں مؤرخین نے قرائن اور آثار کے ساتھ مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔ عیسائی مسلک پر تھے، بادشاہ اس وقت مشرک تھا۔ پھر یہ کئی سو سال تک غائب ہوئے، بعد میں اللہ نے ان کو اُٹھایا۔ جس وقت ان کو اُٹھایا اس وقت مشرک شکست کھا چکے تھے، اور عیسائیوں کی حکومت قائم ہو چکی تھی، پھر یہ لوگ مقتدیٰ بن گئے، ان کو قوم کا بزرگ مان لیا گیا تھا، جس طرح سے قوم کے اولیاء اللہ ہوتے ہیں، ان کی وفات کے بعد ان کی یادگاریں قائم کی گئیں، اور قوم میں پیش آنے والے فخریہ واقعات میں اس واقعے کا شمار کیا گیا۔ جس طرح سے ہم اپنے مجاہدین کے واقعات یاد رکھتے ہیں کہ کالا پانی بھیجے گئے، وہاں یوں ہوا، پھانسی پہ لٹکائے گئے، انگریزوں کی جیلوں میں ڈالے گئے، وہاں انہوں نے ایسی سختیاں برداشت کیں، جس کے نتیجے میں انقلاب آیا۔ تو ان کے واقعات لوگوں کے اندر بطورِ فخر کے ذکر ہوتے ہیں کہ ہمارے اسلاف ایسے تھے، ہمارے اسلاف نے یہ مصیبتیں اٹھائیں، اور ظالموں کا مقابلہ یوں کیا۔ اسی طرح سے عیسائیوں میں یہ واقعہ ایک قومی حیثیت اختیار کر گیا، اور یہ لوگ قوم کے نزدیک باعزت قرار پائے...... اور سرورِ کائنات ﷺ کے زمانے سے پہلے یہ واقعہ پیش آیا، اور آپ کے ظاہر ہونے سے پہلے ہی یہ دوبارہ وفات پا کے ختم ہو گئے۔ گویا کہ عیسیٰ علیہ السلام کے بعد یہ واقعہ ہوا، پھر ۳۰۹ سال ان کا سونے کا عرصہ ہے، تو گویا کہ حضور ﷺ سے تھوڑا عرصہ پہلے ہی یہ واقعہ اِختتام کو پہنچا تھا، اس طرح سے مفسرین نے اس کو ترجیح دی۔

تعداد قرآنِ کریم جس طرح سے ذِکر کرے گا کہ کوئی کہتا ہے تین تھے، چوتھا ان کا کتا تھا، کوئی کہتا ہے پانچ تھے، چھٹا ان کا کتا تھا، کوئی کہتا ہے سات تھے، آٹھواں ان کا کتا تھا، لیکن پھر فرمایا: اس بحث میں اُلجھنے کی ضرورت نہیں، جتنے بھی تھے اللہ بہتر جانتا ہے، جیسے میں نے عرض کر دیا کہ تعداد کی کمی بیشی کے ساتھ واقعے کی نوعیت پہ کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اَصحابِ کہف کا اِجمالی تعارف

تو یہ واقعہ آپ کے سامنے آگے مفصل آ رہا ہے، اور یہاں اس کو بطورِ اجمال کے نقل کر دیا گیا کہ یہ سوال جو اُٹھا رہے ہیں، تو کیا انہوں نے اس واقعے کو بہت عجیب سمجھ لیا ہے؟ اللہ کی قدرت کے سامنے یہ کوئی عجیب نہیں ہے، اللہ کی قدرت میں تو اس

(۱) (ج ۳ ص ۱۸۸) اس کے مصنف مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی، جمعیت علمائے ہند کے ناظم اعلیٰ، اور تحریک آزادی کے عظیم لیڈر تھے۔ اگست ۱۹۶۲ء میں وفات پائی۔

سے بھی بڑے بڑے عجائبات موجود ہیں (مظہری)۔لیکن جب سوال اُٹھایا ہی ہے تو اس کی نوعیت اتنی ہوئی کہ چند نوجوان تھے جنہوں نے غار کے اندر ٹھکانا لیا، اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کے ساتھ ان کو سلایا اور ان کی حفاظت کی، اور انہوں نے اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلا کے دُعا کی تھی کہ یا اللہ! ہم نے ایک مقصد قرار دے لیا ہے کہ ہم نے تیری عبادت کرنی ہے اور تیری توحید کے عقیدے پر جمنا ہے، اس لئے ہمیں اس مقصد میں کامیاب فرما (جیسے دُعا میں رحمت مانگی، تو رحمت کا مطلب یہی ہے کہ ہمارے مقصد میں ہمیں کامیابی عطا فرما) اور ہمارے معاملہ میں دُرستی مہیا کردے یعنی ہمیں اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کے لئے جس قسم کے اسباب کی ضرورت ہے وہ اسباب مہیا کردے، ہمارے لیے اس معاملے کو آسان کردے۔ یہ دُعا کی، اللہ تعالیٰ نے ان کو تھپکی دے دی، اور سلا دیا، مدتِ مدید کے بعد ان کو اُٹھایا، تاکہ ظاہری طور پر معلوم ہوجائے کہ یہ مدت کس نے محفوظ رکھی، کس نے محفوظ نہیں رکھی؟ اس مدت کے بارے میں بھی آگے مفصل واقعے کے اندر ذِکر آرہا ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ ۭ اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰهُمْ

ہم بیان کرتے ہیں آپ پر ان کا واقعہ ٹھیک ٹھیک، بے شک وہ چند نوجوان تھے جو اپنے رَبّ پر ایمان لائے، اور بڑھا دیا ہم نے ان کو

هُدًى ۝۱۳ وَّرَبَطْنَا عَلٰي قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ

از روئے ہدایت کے ⑬ اور ہم نے ان کے دِلوں کو مضبوط کردیا، جب وہ کھڑے ہوئے، پھر کہا انہوں نے کہ ہمارا رَبّ آسمانوں کا

وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا۟ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلٰـهًا لَّقَدْ قُلْنَآ اِذًا شَطَطًا ۝۱۴ هٰٓؤُلَاۗءِ

اور زمین کا رَبّ ہے، ہرگز نہیں پکاریں گے ہم اس کے علاوہ کسی معبود کو، البتہ تحقیق کہی ہم نے اس وقت حد سے بڑھی ہوئی بات ⑭ یہ

قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ۭ لَوْلَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍۢ بَيِّنٍ ۭ فَمَنْ

ہماری قوم کے لوگ ہیں بنالیے انہوں نے اس کے علاوہ اور بہت سے معبود، کیوں نہیں لاتے یہ ان معبودوں پر کوئی واضح دلیل؟ پھر کون

اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَي اللّٰهِ كَذِبًا ۝۱۵ وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ

بڑا ظالم ہے اس شخص کے مقابلے میں جو اللہ پر جھوٹ گھڑے ⑮ جب تم لاتعلق ہوگئے ان سے اور ان چیزوں سے جن کو وہ پوجتے ہیں

اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗٓا اِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ

اللہ کے علاوہ، پس تم ٹھکانا لو غار کی طرف۔ پھیلائے گا تمہارے لیے تمہارا رَبّ اپنی رحمت، اور مہیا کرے گا تمہارے لیے

اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا ⑯ وَتَرَى الشَّمْسَ اِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ

تمہارے امر سے فائدے کی چیز ⑯ اور اے مخاطب! تُو دیکھتا ہے سورج کو جب وہ طلوع کرتا، تو مائل ہو جاتا ان کی غار سے

الْيَمِيْنِ وَاِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ ؕ ذٰلِكَ مِنْ

دائیں جانب، اور جب وہ غروب ہوتا تو کاٹ جاتا ان کو بائیں طرف۔ اور وہ غار سے کشادہ جگہ میں تھے۔ یہ

اٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ

اللہ کی نشانیوں میں سے ہے، جس کو اللہ تعالیٰ ہدایت دے پس وہی ہدایت یافتہ ہے، اور جس کو اللہ بھٹکا دے پس ہرگز نہیں پائے گا تُو

لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ⑰ وَتَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ ۖ وَّنُقَلِّبُهُمْ

اس کے لئے کوئی مددگار، ہدایت دینے والا ⑰ اور تُو ان کو سمجھتا ہے بیدار، حالانکہ وہ سوئے ہوئے ہیں، اور ہم ان کو پلٹے دیتے ہیں

ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ ۖ وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ ؕ

دائیں جانب اور بائیں جانب، اور ان کا کُتا پھیلانے والا ہے اپنے دونوں بازو دہلیز پر

لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا ⑱

اگر تُو جھانکتا ان پر البتہ تو پیٹھ پھیرتا ان سے بھاگتا ہوا، اور البتہ بھر دیا جاتا تُو ان کی جانب سے از روئے رُعب کے ⑱

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ: قَصَّ يَقُصُّ بیان کرنا۔ ہم بیان کرتے ہیں آپ پر نَبَاَهُمْ: نبأ خبرِ عظیم کو کہتے ہیں۔ نَبَاَهُمْ ان کا واقعہ۔ بِالْحَقِّ ٹھیک ٹھیک۔ ہم بیان کرتے ہیں آپ پر ان کا واقعہ ٹھیک ٹھیک۔ اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ: فتية کا لفظ آپ کے سامنے پہلے بھی گزرا ہے، یہ فَتًى کی جمع ہے۔ بے شک وہ چند نوجوان تھے۔ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ جو اپنے رَبّ پر ایمان لائے وَزِدْنٰهُمْ: زَادَ يَزِيْدُ: زیادہ کرنا۔ ہم نے ان کو بڑھا دیا از روئے ہدایت کے۔ هُدًى یہ زِدْنٰهُمْ سے تمیز ہے۔ اور یہ تمیز محول عن المفعول ہے، جیسے ''كَبُرَتْ كَلِمَةً'' میں بتایا تھا کہ یہ تمیز محول عن الفاعل ہے۔ تو یہاں یہ تمیز مفعول والے معنی کو ادا کرتی ہے یعنی ہم نے ان کی ہدایت بڑھا دی، ہم نے ان کی ہدایت میں اضافہ کر دیا، زیادہ کر دیا ہم نے ان کو از روئے ہدایت کے۔ وَرَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ: ربط علی القلب کا مطلب ہوتا ہے دل کو مضبوط کر دینا۔ ہم نے ان کے دِلوں پر گرہ لگا دی یعنی ان کے دِلوں کو مضبوط کر دیا، تاکہ باہر کا کوئی خوف وہراس ان کے دِلوں میں داخل نہ ہو، اور ان کے دِل میں جو ایمان ہے اس کو نقصان نہ پہنچا سکے۔ ربط علی القلب یہ دِل میں ایمان کی حفاظت کے لئے ہوتا ہے۔ سورۂ قصص (آیت: ۱۰) میں بھی یہ لفظ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے

متعلق آئے گا: لَوْلَآ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰی قَلْبِھَا، اگر ہم اس کے دل کو مضبوط نہ کر دیتے تو وہ رو پیٹ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ ظاہر کر دیتی۔ محاورے کے طور پر اس کا ترجمہ یوں ہی ہوگا کہ ہم نے ان کے دلوں کو مضبوط کر دیا۔ اور لفظی معنی ہے کہ ہم نے گرہ لگادی ان کے قلوب پر، ان کے دلوں پر۔ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا: قَامَ یَقُوْمُ: کھڑا ہونا۔ کھڑا ہونا ایک تو یہ ہوتا ہے کہ آدمی بیٹھا تھا، اُٹھ کے کھڑا ہو گیا۔ اور ایک کھڑا ہونا ہوتا ہے کہ چلا جا رہا تھا، ٹھہر گیا یا دوم ایک کھڑا ہونا ہوتا ہے کسی کام کے لئے تیار ہو جانا۔ جیسے کہتے ہیں کہ ساری قوم اُٹھ کھڑی ہوئی، مزدور اپنا مطالبہ لے کے اٹھ کھڑے ہوئے، تو وہاں ٹانگیں سیدھی کر کے کھڑا ہونا مراد نہیں ہوتا، بلکہ کسی مقصد کو طے کر کے اس کو حاصل کرنے کے لئے انسان جو پختہ ارادہ کر لیتا ہے، اس کو بھی کھڑے ہونے سے تعبیر کرتے ہیں۔ ''قوم اُٹھ کھڑی ہوئی، مزدور اُٹھ کھڑے ہوئے، لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے'' اس کا مطلب ہوتا ہے کہ شدت کے ساتھ انہوں نے اپنے کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے جدوجہد شروع کر دی، تو ''قیام'' کا یہ معنی بھی ہوتا ہے۔ یہاں ترجمہ یوں ہی کرنا ہے کہ جب وہ اُٹھے، جب وہ کھڑے ہوئے یعنی اپنے عقیدے کا انہوں نے اعلان کیا اور پختگی کے ساتھ اپنے عقیدے کو ظاہر کیا، جب وہ اُٹھے فَقَالُوْا پھر کہا انہوں نے رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ہمارا رَبّ آسمانوں کا اور زمین کا رَبّ ہے، لَنْ نَّدْعُوَا مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلٰهًا، ہرگز نہیں پکاریں گے ہم اس کے علاوہ کسی معبود کو۔ لَقَدْ قُلْنَآ اِذًا شَطَطًا: شَطَطًا کا معنی ہے حد سے بڑھنا، اور یہاں اس کے اوپر مضاف محذوف مانیں گے عبارت یوں ہوگی لَقَدْ قُلْنَآ اِذًا قولًا ذَا شَطَطٍ۔ اور اِذًا کے اوپر تنوین مضاف الیہ کے عوض ہے، جیسے ''ہدایۃ النحو'' میں مسئلہ آپ نے پڑھا ہوگا حینئذٍ یومئذٍ ای یومَ اِذْ کانَ کَذَا۔ یہ کانَ کذا اس کا مضاف الیہ نکالا جاتا ہے۔ البتہ تحقیق کہی ہم نے تب بات حد سے بڑھی ہوئی۔ اِذًا کا ترجمہ ہے تب۔ ''تب'' کا کیا مطلب؟ کہ اگر ہم نے اللہ کے علاوہ، رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کے علاوہ کسی اور الٰہ کو پکار لیا تو اس وقت ہم ایک حد سے بڑھی ہوئی بات کہیں گے، ہماری یہ بات حد سے بڑھی ہوئی ہوگی، تب کہیں گے ہم البتہ حد سے بڑھی ہوئی بات۔ اور اِذًا کو ''اس وقت'' کے ساتھ بھی تعبیر کرتے ہیں، البتہ کہی ہم نے اس وقت حد سے بڑھی ہوئی بات۔ ''اس وقت'' کا مطلب کہ جب ہم نے رَبّ السموات والارض کے علاوہ کسی دوسرے کو الٰہ کہہ دیا۔ هٰٓؤُلَآءِ قَوْمُنَا، یہ ہماری قوم ہے، یہ ہماری قوم کے لوگ ہیں۔ چونکہ ''قوم'' لفظوں میں مفرد ہے اور معنی جمع ہے۔ اس لئے اتَّخَذُوْا کی ضمیر ادھر لوٹی اور هٰٓؤُلَآءِ اسم اشارہ بھی جمع کا آ گیا، یہ ہماری قوم کے لوگ ہیں، اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً بنا لیے انہوں نے اس رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کے علاوہ اور بہت سے معبود۔ آلھہ الٰہ کی جمع ہے۔ لَوْلَا یَاْتُوْنَ عَلَیْهِمْ بِسُلْطٰنٍۭ بَیِّنٍ: لولا حرفِ تحضیض ہے۔ کیوں نہیں لاتے یہ لوگ ان معبودوں پر کوئی واضح دلیل۔ اَتٰی یَاْتِیْ آنا، اور اس کے بعد بِسُلْطٰنٍ پر جو باء ہے یہ تعدیہ کی ہے، تو اس تعدیہ کی بنا پر اس کا ترجمہ ہو گیا، لانا۔ جیسے ذَھَبَ: جانا، اور ذَھَبَ بِهٖ: لے جانا۔ ذَھَبَ زَیْدٌ بِکِتَابٍ اگر آپ اس کا ترجمہ یوں کریں کہ زید چلا گیا کتاب کے ساتھ، یہ لفظی ترجمہ ہے، لیکن با محاورہ ترجمہ اُردو زبان کے لحاظ سے یہ ہوگا، زید کتاب لے گیا۔ تو ذھب جو کہ لازم تھا، بکتاب کی باء نے آ کے اس میں متعدی کا معنی پیدا کر دیا، تو صحیح ترجمہ یہ ہوگا کہ زید کتاب لے گیا۔ اسی طرح اَتٰی یَاْتِیْ آنا اور آگے باء تعدیہ کی آ گئی تو معنی ہو گیا: لانا۔ کیوں نہیں لاتے یہ لوگ ان معبودوں پر کوئی واضح دلیل؟ فَمَنْ اَظْلَمُ پھر کون بڑا ظالم ہے مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا۔ اَظْلَمُ اسم تفضیل ہے، اور مِنْ اس کا صلہ ہے۔ کون بڑا ظالم ہے اس شخص کے مقابلے میں جو اللہ پر جھوٹ گھڑے۔ افترا کا معنی ہوتا

ہے جھوٹی بات بنالینا، بہتان تراش لینا۔ جو اللہ پر جھوٹ گھڑے اس کے مقابلے میں کون بڑا ظالم ہے؟ یعنی کوئی بڑا ظالم نہیں، سب سے بڑا ظالم وہ ہے جو اللہ کے اُوپر جھوٹ گھڑتا ہے۔ اور یہ اللہ کے اُوپر جھوٹ ہے کہ اللہ کے ساتھ کوئی اور بھی شریک ہے، اس لئے سورۂ لقمان (آیت: ۱۳) میں آپ کے سامنے ایک لفظ آئے گا: اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ، شرک بہت بڑا ظلم ہے، ظلم عظیم ہے، تو سب سے بڑا ظالم وہی ہے جو اللہ کے اُوپر جھوٹی بات گھڑتا ہے۔ وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ: اعتزال: جدا ہو جانا، علیحدہ ہو جانا۔ جب تم جدا ہو گئے، لاتعلق ہو گئے ان لوگوں سے، وَمَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ اور ان چیزوں سے جن کو وہ پُوجتے ہیں اللہ کے علاوہ، یعنی نہ تمہارا اس قوم سے کوئی تعلق رہا، اور نہ ان کے معبودوں سے کوئی تعلق رہا، تم ان سب کو چھوڑ کے علیحدہ ہو گئے۔ فَأْوٗۤا اِلَى الْكَهْفِ: یہ اَمر کا صیغہ ہے، اور یہ لفظ پہلے آپ کے سامنے گزرا ہے (قرآنِ کریم جو الفاظ بار بار آتے ہیں تو ایک دفعہ ان کے ترجمے کو سمجھ لیا جائے تو آئندہ آسانی رہتی ہے) پیچھے لفظ آیا تھا: اِذْ اَوَى الْفِتْيَةُ، اَوٰی کا معنی کیا تھا، ٹھکانا لینا۔ اور سورۂ ہود (آیت: ۴۳) میں بھی یہ لفظ گزرا ہے سَاٰوِيْۤ اِلٰى جَبَلٍ عنقریب میں ٹھکانا لوں گا پہاڑ کی طرف۔ تو فَأْوٗۤا اسی سے اَمر کا صیغہ ہے۔ پس تم ٹھکانا لو غار کی طرف۔ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ پھیلائے گا تمہارے لئے تمہارا رَبّ اپنی رحمت۔ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ اور مہیا کرے گا تمہارے لئے، تیار کرے گا تمہارے لئے مِّنْ اَمْرِكُمْ تمہارے اَمر سے، مِّرْفَقًا: نفع کی چیز، مرفق اس چیز کو کہتے ہیں جو فائدے کی ہو، راحت کی چیز۔ مہیا کرے گا تمہارے لیے تمہارا رَبّ تمہارے اَمر سے فائدے کی چیز، نفع کی چیز۔ وَتَرَى الشَّمْسَ یہ خطاب عام ہے۔ اے مخاطب! (اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی متعین آدمی کو نہیں کہا جارہا، جو بھی سنے اسی کو یہ بات کہی جارہی ہے) اے مخاطب! تُو دیکھتا ہے سورج کو، اِذَا طَلَعَتْ جب وہ طلوع کرتا ہے۔ شمس کا لفظ عربی میں مؤنث ہے، اس لئے طَلَعَتْ مؤنث کا صیغہ ہے، اور اُردو میں یہ لفظ مذکر استعمال ہوتا ہے اس لئے اس مؤنث کے صیغے کا ترجمہ ہم مذکر کے ساتھ کریں گے، یوں اگر ترجمہ کریں کہ ''دیکھتا ہے تُو سورج کو جب وہ نکلتی ہے'' تو یہ غلط ہے، پھر یہ پٹھانوں والی اُردو ہو جائے گی ''عائشہ کوٹھے پہ چڑھ گیا'' مذکر کی مؤنث اور مؤنث کی مذکر۔ تو اُردو میں چونکہ ''سورج'' کا لفظ مذکر ہے اس لئے ہم ترجمہ اس کا مذکر کے ساتھ کریں گے۔ دیکھتا ہے تُو سورج کو جب وہ طلوع کرتا۔ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ: تَزٰوَرُ اصل میں تھا: تَتَزَاوَرُ۔ ڈھلک جاتا، مائل ہو جاتا، کترا جاتا ان کی غار سے دائیں جانب۔ وَاِذَا غَرَبَتْ اور جب وہ سورج ڈُوبتا، غروب ہونے لگتا، تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ، قَرَضَ کاٹنے کو کہتے ہیں۔ کترا جاتا، کاٹ جاتا ان کو بائیں جانب، وَهُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ، فجوۃ کشادہ جگہ کو کہتے ہیں۔ اور وہ اس غار سے کشادہ جگہ میں تھے، مِّنْهُ کی ضمیر کہف کی طرف لوٹ رہی ہے۔ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ یہ جو کچھ ذکر کیا گیا، یہ اللہ کی نشانیاں میں سے ہے، یعنی اللہ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ہے، مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ جس کو اللہ تعالیٰ ہدایت دے پس وہی ہدایت یافتہ ہے یعنی اللہ کی طرف سے نشانیاں تو بہت قائم ہیں لیکن نشانیوں کو دیکھ کے ہدایت حاصل کرنا، یہ اللہ کی توفیق سے ہوتا ہے۔ وَمَنْ يُّضْلِلْ اور جس کو اللہ بھٹکا دے فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ پس ہرگز نہیں پائے گا تو اس کے لئے وَلِيًّا مُّرْشِدًا، ولی اور مرشد۔ ولی کا معنی ہے یار مددگار، اور مرشد کا معنی ہدایت دینے والا۔ اس کے لئے کوئی ولی اور مرشد نہیں ہے، اس کا کوئی یار و مددگار نہیں، کوئی اس کو ہدایت دینے والا نہیں جس کو اللہ بھٹکا دے۔ وَتَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا: اَيْقَاظًا يَقِظٌ کی جمع ہے، يَقِظٌ بیدار کو کہتے ہیں، اور تو ان کو سمجھتا ہے بیدار کہ وہ جاگ رہے ہیں۔ وَّهُمْ رُقُوْدٌ: یہ راقد کی جمع ہے۔ حالانکہ وہ سوئے

ہوئے ہیں۔ وَّنُقَلِّبُهُمْ: قَلَّبَ تَقْلِيْب: اُلٹ پلٹ کرنا۔ اور ہم ان کو پلٹاتے ہیں، پلٹے دیتے ہیں۔ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ دائیں جانب اور بائیں جانب۔ وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ: کلب کتے کو کہتے ہیں۔ اور ان کا کتا پھیلانے والا ہے۔ ذِرَاعَيْ یہ ذِرَاع کا تثنیہ ہے، اور ذراع کہتے ہیں بازو کو۔ جیسے آپ نے دیکھا ہوگا کہ کتا جب بیٹھا ہوتا ہے تو دونوں ہاتھ یوں لگا کے پڑا ہوا ہوتا ہے تو یہ ہے بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ۔ اور ان کا کتا پھیلانے والا ہے اپنے دونوں بازو، بِالْوَصِيْدِ: وصید کہتے ہیں دہلیز کو یعنی دروازے کے سامنے۔ اور ان کا کتا پھیلانے والا ہے اپنے دونوں بازو چوکھٹ پر، دہلیز پر۔ لَوِاطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ اگر تُو ان پر اطلاع پاتا، ان پر تُو جھانکتا، لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا: البتہ تُو پیٹھ پھیرتا ان سے بھاگتا ہوا۔ فرار بھاگنے کو کہتے ہیں، وَلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا: اور البتہ بھر دیا جاتا تو ان کی جانب سے از روئے رُعب کے، یعنی تیرے اُوپر رُعب طاری ہو جاتا، اور تیرا دِل ان کے رُعب سے بھر جاتا۔

تفسیر

ماقبل سے ربط

پچھلے رکوع کی آخری آیات میں اَصحابِ کہف کے واقعے کو بالاجمال ذِکر کر دیا گیا تھا، اور یہاں سے کچھ اس کی تفصیل شروع ہو رہی ہے۔

قرآنِ کریم کے واقعات حقیقت پر مشتمل ہیں

ترجمے سے بات واضح ہوگئی کہ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ کہ اس واقعے کو ہم آپ پر ٹھیک ٹھیک پڑھتے ہیں، یعنی لوگ جس قسم کے واقعات نقل کرتے ہیں ان میں سے اکثر ٹھیک نہیں، لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ مبالغہ آرائی کرتے ہیں، عجیب عجیب اس میں باتیں شامل کر لیتے ہیں، قصہ ہوتا کچھ ہے اور بنا کچھ دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا بیان کردہ واقعہ قرآنِ کریم میں جو کچھ آ گیا ہے یہ بالکل ٹھیک ہے، جس میں ایک نقطے کا فرق بھی نہیں، واقعے کے مطابق ہے، اس میں آمیزش نہیں، افسانہ طرازی نہیں۔ اور پھر یہ محض قصہ گوئی نہیں بلکہ یہ حق، حقیقت اور حکمت پر مشتمل ہے، اس لیے واقعے کو اسی انداز میں ذِکر کیا جائے گا کہ جس میں حکمت، وعظ اور کوئی مصلحت ہو۔ بلاوجہ سمع خراشی یا افسانہ گوئی مقصود نہیں ہے، بِالْحَقِّ کا یہ معنی ہے۔ ہم آپ کو ٹھیک ٹھیک ان کا واقعہ سناتے ہیں، لوگوں کے اندر جس طرح سے مشہور ہے اس میں بہت ساری باتیں خلافِ حقیقت ہیں۔

حکومت مخالف لوگوں کے لئے زندگی کے دروازے بند ہو جاتے ہیں

پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ چند جوان تھے، وقت ایسا تھا کہ حکومت مشرک تھی، بادشاہ اپنے مسلک پر لوگوں کو مجبور کرتا تھا کہ بت پرستی اختیار کریں، بتوں کو سجدہ کریں، خود مشرک تھا اور لوگوں کو شرک پر برانگیختہ کرتا تھا۔ اور آپ یہ جانتے ہیں کہ حکومت جس کی ہو، اُس کو زندگی کے وسائل کے اُوپر بظاہر قابو حاصل ہوتا ہے، اب یہ ہماری جو حکومت ہے وہ یہ تہیہ کر لے کہ ہم نے فلاں نظریے کو فروغ دینا ہے، ہم نے فلاں خیال کو شائع کرنا ہے، تو ملازمت اسے ملے گی جو ان کا ہم خیال ہوگا، اور جو ان کا ہم خیال

نہیں ہوگا اس پر ملازمت کے دروازے بند، تجارت کرنے کے لئے وہ میدان میں آئے گا تو اس کے لئے تجارت کے دروازے بند، کسی چیز کے لائسنس کی ضرورت ہوگی تو اس کو لائسنس نہیں ملے گا، آئے دِن اس کے اُوپر مقدمے کھڑے ہوجائیں گے، اس پہ چالان ہوتے چلے جائیں گے، اگر وہ کھیتی باڑی کرتا ہے تو اس کی زمین کا پانی بند کردیا جائے گا، اور اس طرح سے اس کو تنگ کردیا جائے گا کہ زندگی کے دروازے اس پر بند ہوجائیں گے۔ ظالم حکومتوں میں اس قسم کے واقعات ہوتے رہتے ہیں اور یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ جب کوئی حکومت ظلم پراُتر آئے اور وہ یہ چاہے کہ لوگ میرے ہم خیال ہوں تو جو لوگ اس کے ہم خیال ہوتے ہیں ان کے لئے تو عیاشی کے دروازے کھل جاتے ہیں، جس طرح سے آپ نے پچھلے دور میں بھٹو صاحب کے زمانے میں دیکھا، کہ جو ہم خیال تھے ان کے لئے تو عیاشی کے سب دروازے کھلے ہیں، لوٹیں، کھائیں، پئیں، جس طرح سے چاہیں کریں، کوئی پوچھنے والا نہیں ہے، لیکن اگر کوئی ان کا ہم خیال نہیں تو اس کی نہ عزت محفوظ، نہ جان محفوظ، نہ مال محفوظ، نہ اس کے لئے معاش کا کوئی ذریعہ باقی، زندگی کے دروازے اس کے لئے بند کردیتے ہیں، اور اس کے لئے جینا دوبھر ہوجاتا ہے، ظالم حکومتوں میں یہ کوئی نیا واقعہ نہیں ہے۔

دجال کے مخالفین کے لئے زندگی کے دروازے بند ہوجائیں گے

اور یہی نکتہ ہے جو قرآنِ کریم اس سورت کے اندر آپ کے ذہن میں ڈالنا چاہتا ہے، اور اسی نکتے کو سمجھ لینے کے بعد ہی دجالی فتنے سے حفاظت ہوتی ہے۔ کیونکہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب دجال کا دور آجائے گا تو وہ اس ظاہری معاشی اسباب کے اُوپر اتنا حاوی ہوجائے گا کہ جو لوگ اس کے ماننے والے ہوں گے ان کے لئے تو رزق کے دروازے کھل جائیں گے، ایسے ہوگا جیسے زمین کے خزانے ان کے پیچھے بھاگے آرہے ہیں، اور ان کی مرضی کے مطابق بارشیں ہوں گی، ان کی مرضی کے مطابق فصلیں پیدا ہوں گی، ان کے حیوانات بڑے موٹے موٹے ہوں گے، ان کی دُنیا سرسبز وشاداب ہوگی، اور وہ یہ سمجھیں گے کہ دولت ساری ہم پر عاشق ہوگئی، اور دولت اسی نظریے والوں کے لئے ہے جو دجال کو ''رَبّ'' کہہ دیں، حدیث شریف میں اس مضمون کی یہ تفصیل ہے۔ اور ایک قوم ایسی ہوگی کہ دجال اپنے آپ کو ان کے سامنے پیش کرے گا اور یہ کہے گا کہ میں تمہارا رَبّ ہوں، وہ کہیں گے کہ ہم تو تجھے نہیں مانتے، ہمارا رَبّ تو کانا نہیں ہے، ہم تو تجھے رَبّ کہنے کے لئے تیار نہیں، تو حدیث شریف میں آتا ہے کہ وہ قوم قحط میں مبتلا ہوجائے گی، بارش نہیں ہوگی، جانور ان کے مرجائیں گے، اور انتہائی درجے کی شدت میں مبتلا ہوکر وہ اپنا وقت گزاریں گے، قحط زدہ ہوجائیں گے، دنیا کی راحت کا کوئی سبب انہیں حاصل نہیں ہوگا۔[1] یہ اس فتنے کی تفصیل بیان کرتے ہوئے سرورِ کائنات ﷺ نے یہ فرمایا، جس کا حاصل یہی ہے کہ وہ دور ایسا آجائے گا کہ اسبابِ معیشت سارے کے سارے دجال کے ہاتھ میں ہوں گے، جیسے نہروں پر وہ قابض، جدھر چاہے پانی چھوڑے، جدھر چاہے نہ چھوڑے۔ مواصلات پر وہ قادر کہ جب چاہے آپ کے مواصلات کو تباہ کردے، جب چاہے باقی رکھے، یہ ٹیلی فون کا سلسلہ، ریڈیو کا سلسلہ، ٹی وی کا سلسلہ، وائرلیس کا

(۱) دیکھئے: مشکوٰۃ ج ۲ ص ۴۷۳ باب العلامات بین یدی الساعۃ فصل اول، عن النواس بن سمعان۔ مسلم ۲/ ۴۰۱ باب ذکر الدجال۔

سلسلہ یہ مواصلات ہیں۔اور اسی طرح سے آپ کا ہوائی جہاز کا سفر، ریلوے کا سفر، تو وہ دجال اسباب کے اوپر اتنا حاوی ہوجائے گا کہ جب وہ چاہے گا ساری چیزیں تباہ کر کے رکھ دے گا، نہ آپ کا ٹیلی فون ٹھیک رہے، نہ آپ کا ٹی وی ٹھیک رہے، نہ آپ کہیں وائرلیس کر سکیں، نہ کہیں کے حالات دریافت کر سکیں، نہ آپ کے ہوائی جہاز اُڑ سکیں، نہ کوئی گاڑی صحیح چل سکے، اور آپ کی زندگی کا سارا پہیہ جام ہوجائے گا۔ اور پانی پر قابض ہوجائیں گے کہ پانی نہیں چھوڑیں گے، بجلی پر قابض ہوجائیں گے کہ بجلی گھر ختم کردیں گے، آپ کو بجلی نہیں ملے گی۔ تو اس طرح سے وہ قوم سختی میں مبتلا ہوجائے گی جو دجال کا کہنا نہیں مانے گی۔ وہ وقت ہوگا انتہائی درجے کے امتحان کا کہ اس فتنے میں جو دجال کو رَبّ کہے گا وہ خوش حال، اور جو دجال کو رَبّ نہیں مانے گا وہ انتہائی درجے کا بدحال، اور معاشی اسباب سے محروم ہوجائے گا۔ سرورِ کائنات ﷺ نے اس فتنے کی نشاندہی کرتے ہوئے بتایا کہ ایسے حالات ہوجائیں گے، فرمایا کہ اس وقت جمے رہنا اور ہر قسم کی بھوک کو، پیاس کو، تنگی کو اور شدت کو برداشت کرلینا، اپنے سامنے اپنے بچوں کو تڑپتا ہوا دیکھ لینا، لیکن شرک میں مبتلا نہ ہونا، یہ اس وقت کا ایک بہت بڑا جہاد ہوگا، اور ایک بہت بڑی ہمت کی بات ہوگی، اور جو اس میں ثابت قدم رہے گا، اس پر پھر اللہ تعالیٰ کی عنایات ہوں گی، دجالی فتنے کا حاصل یہی ہے۔

اَصحابِ کہف کے لئے زندگی کے دروازے بند کردیے گئے

اور یہاں بھی یہی قصہ ہوا کہ حکومت مخالف ہے، اور جو اس حکومت سے ٹکراتا ہے اس کے لئے زندگی گزارنے کا ہر دروازہ بند ہے، تو یہ چند نوجوان تھے جنہوں نے کلمۂ حق کو قبول کیا، عقیدۂ توحید اختیار کرلیا دینِ عیسوی کے تحت (حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دور تھا جیسے راجح قول آپ کے سامنے یہی ذکر کیا) تو ان کے ساتھ بھی پھر وہی حال شروع ہوا، حکومت کی طرف سے پکڑ دھکڑ شروع ہوگئی، سختی شروع ہوگئی کہ ان کو مجبور کرو کہ یہ بھی شرک میں مبتلا ہوجائیں اور ہمارے ہم مسلک ہوجائیں، لیکن وہ اُٹھ کھڑے ہوئے، جب اُٹھ کھڑے ہوئے تو انہوں نے یہ نعرۂ مستانہ لگادیا کہ رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَاۡ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلٰهًا کہ ہم تو رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کو ہی رَبّ مانتے ہیں، اس رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کے علاوہ کوئی دوسرا اِلٰہ پکارنے کے لئے تیار نہیں۔ اگر ہم ایسی بات کہیں گے تو حد سے بڑھی ہوئی بات کہیں گے، اور حد سے بڑھی ہوئی بات کہنے کے لئے ہم تیار نہیں ہیں۔ یہ چند نوجوان اکٹھے ہوئے (تین تھے، پانچ تھے، سات تھے، جتنے بھی تھے، جمع قلت کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ دس سے کم تھے) تو مٹھی بھر نوجوان ایک مقصد لے کے کھڑے ہوگئے، اور انہوں نے نعرۂ توحید بلند کردیا، جب نعرۂ توحید بلند کیا تو ہر طرح سے انہیں مجبور کیا گیا لیکن وہ کسی طرح ماننے کو تیار نہیں۔

اَصحابِ کہف نے ہر چیز کی قربانی دے کر نظریۂ ایمان کی حفاظت کی

اب اندیشہ یہ پیدا ہوگیا کہ پکڑیں گے، پکڑ کے قتل کریں گے، سنگسار کردیں گے، جان کا خطرہ ہے، تو انہوں نے اپنے عقیدے کی خاطر یہ قربانی دی اور آپس میں مشورہ کیا کہ جب اس قوم کے ساتھ ہمارا کوئی تعلق ہی نہ رہا، یہ مشرک ہیں، ہم موحد ہیں۔ اس قوم میں ان کے باپ تھے، بھائی تھے، مائیں تھیں، بہنیں تھیں، اور اس علاقے میں ان کی جائیداد تھی، صاحبِ مکان

تھے، صاحب جائیداد تھے، سب کچھ تھا، لیکن نظریہ ایک طرف، دنیا کی عیاشی اور دنیا کے تعلقات ایک طرف، یہ مقابلہ ہوگیا۔ اب اگر اپنے نظریے کی حفاظت کرتے ہیں تو ماں باپ کی، بہن بھائیوں کی، قبیلے کی، قوم کی، اپنی جائیداد کی، مکان کی، تجارت کی، جو کچھ بھی ان کا ذریعۂ معاش تھا سب کچھ قربان کرنا پڑتا ہے، اور اگر ان چیزوں سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں تو ایمان سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ اب اس دوراہے پہ کھڑے ہوگئے کہ کدھر کو چلنا ہے، تم نے دنیا کی عیش لینی ہے، رشتہ داروں کے تعلقات بحال رکھنے ہیں، اور کھانے پینے کی وسعت تمہیں چاہیے تو بت پرست ہوجاؤ۔ اور اگر تم موحد رہنا چاہتے ہو تو پھر ہر چیز سے محروم، رشتہ داروں سے کوئی تعلق نہیں، جائیداد سے کوئی تعلق نہیں، کاروبار سے کوئی تعلق نہیں۔ جب یہ دو باتیں ہوگئیں تو ان نوجوانوں نے فیصلہ یہ کیا کہ کچھ ہوجائے، ہم ہر چیز کی قربانی دے سکتے ہیں لیکن ہم اپنے نظریہ توحید کی قربانی نہیں دیں گے۔

اِنسان کی طبیعت متأثر کب ہوتی ہے؟

بس یہ عقیدہ جس وقت پختہ ہوجائے کہ انسان اپنے عقیدے کی حفاظت کے لئے دنیا کی ہر عیش وعشرت کو لات ماردے، تو دجال کیا دجال کا باپ بھی آجائے تو متأثر نہیں کرسکتا۔ انسان متأثر اس وقت ہوتا ہے جب طبیعت میں تعیش ہو، تلذذ ہو، راحت پسندی ہو، انسان سوچے کہ نظریے کی کیا بات ہے، عقیدے کی کیا بات ہے، بس مطلب نکالو، جیسے حالات ہوں، جدھر کی ہوا ہو اُدھر کو چلو۔ جن کا نظریہ یہ ہوتا ہے وہ ہمیشہ ہر دور میں دجال کے فتنے میں مبتلا ہوں گے، اور جو بڑا دجال آئے گا اس کے فتنے میں بھی مبتلا ہوجائیں گے۔ اور جن کا نظریہ اس طرح سے پختہ ہوجائے کہ دنیا کی عیاشی کی کوئی پروا نہیں ہے، اصل عقیدہ ہے جس کے ساتھ آخرت کی نجات ہوگی۔ جب ایک آدمی اپنے عقیدے پر اتنا پختہ ہوجائے تو پھر دنیا کا کوئی فتنہ اس کے اوپر اثر انداز نہیں ہوسکتا۔ ان جوانوں نے یہی کردار دکھایا کہ اپنے عقیدے پہ پختہ ہوگئے، ایمان لے آئے، تو اللہ فرماتے ہیں کہ پھر ہم نے بھی ان کی مدد کی کہ ان میں مزید قوت پیدا کردی زِدْنٰهُمْ هُدًى، اور ہم نے ان کے دلوں کو مضبوط کردیا کہ باہر کا خوف وہراس ان کو متأثر نہ کرسکا، اور انہوں نے اپنے اس نعرے کو بلند کیا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا۟ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلٰهًا ہم اس کے علاوہ کسی الٰہ کو نہیں پکاریں گے۔ اگر ہم ایسا کریں گے تو ہماری یہ بات حد سے نکلی ہوئی ہوگی۔

اَصحابِ کہف کا اپنی قوم پر تبصرہ

اور پھر اپنی قوم پر تبصرہ ان الفاظ میں کیا کہ یہ ہماری قوم کے لوگ، انہوں نے رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کے علاوہ آلہہ بنالیے، ''آلہہ'' اِلٰہ کی جمع ہے یعنی ایک کو چھوڑ کے آگے ایک تجویز نہیں کیا، بلکہ کتنے بنالیے، کوئی بارش دینے والا ہے، کوئی اولاد دینے والا ہے، کبھی اس قبر پہ جھکتے پھررہے ہیں، کبھی اس درخت کے سامنے جھکتے پھررہے ہیں، ان کے تو جگہ جگہ آلہہ بن گئے، جگہ جگہ خدا بنائے بیٹھے ہیں، کبھی کسی چیز کے سامنے جھک گئے، کبھی کسی کو پکارنے لگ گئے، انہوں نے تو بہت سارے آلہہ بنالیے...... اور اگلے لفظ کا حاصل یہ ہے کہ انہوں نے ایک کے علاوہ اور جو بنائے، تو کیا ان کے پاس کوئی دلیل ہے؟ یہ کوئی واضح دلیل کیوں نہیں پیش کرتے جس سے معلوم ہوجائے کہ ایک کے علاوہ اور بھی ہیں۔ تو دیکھو! دلیل لانا مشرک کے ذمے ہوتا ہے، کیونکہ مشرک کا مطلب

یہ ہے کہ ایک اللہ کو ماننے کے بعد وہ اور کو بھی مانتا ہے، تو اللہ کو تو اس نے مان لیا، اب اس بات پہ دلیل دینے کی ضرورت نہیں کہ اللہ ہے، اللہ کو تو وہ مانتا ہے۔ اب اس نے ایک قدم آگے جو بڑھایا کہ کوئی اور بھی ہے، تو دلیل اس کو لانی چاہیے۔

جیسے حضرت مولانا شمس الحق صاحب افغانی اپنے بزرگوں میں سے ایک بزرگ ہیں، اب بیمار ہیں، گھر ہی ہیں۔ دارالعلوم دیوبند میں شیخ التفسیر تھے،[1] وہ کہتے ہیں کہ ''ایک دفعہ میری ایک عیسائی سے گفتگو ہوگئی، اب عیسائی تین خداؤں کے قائل ہیں، تو مجھے کہتا ہے کہ تو دلیل پیش کر کہ خدا ایک ہے۔ میں نے کہا کہ مجھے دلیل پیش کرنے کی کیا ضرورت؟ میں کہتا ہوں کہ میری جیب میں ایک روپیہ ہے، اور تو کہتا ہے کہ تیری جیب میں تین ہیں، تو ایک تُو نے مان لیا۔ تو مزید دو کا قول کرتا ہے، تو ثبوت دے کہ دو اور کہاں سے آگئے؟ ایک کہتا ہے، ایک۔ اور دوسرا کہتا ہے، تین۔ تو جو تین کہتا ہے اس نے ایک تو مان لیا۔ تو جتنا میں کہتا ہوں اتنا تو تُو بھی مانتا ہے، تُو کچھ اور آگے منوانا چاہتا ہے، اس لئے دلیل تُو دے کہ ایک کے علاوہ اور بھی ہیں.....'' اسی طرح سے یہاں یہ بات ہے کہ مشرک کے ذِمّے ہے کہ وہ دلیل لائے کہ اللہ کے علاوہ اور آلہہ بھی ہیں، رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کے علاوہ اور بھی ہیں، تو دلیل نہ ان کے پاس ہے، نہ ان کے بڑوں کے پاس۔ کیوں نہیں لاتے یہ اس پر واضح دلیل؟ جب دلیل ان کے پاس نہیں تو یہ کتنا بڑا ظلم ہے، ایک ہے کہ میرا حق تلف کر دیا، ایک ہے کہ آپ کا حق تلف کر دیا، یہ تو رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کا حق تلف کرتے ہیں، اور اس کے اوپر یہ اِفترا کرتے ہیں، جھوٹ گھڑتے ہیں، تو اس سے بڑا ظلم کیا ہوگا؟ کون بڑا ظالم ہے اس سے جو اللہ کے اوپر جھوٹ تراشے۔

یہ تو اپنی قوم پہ تبصرہ کیا کہ یہ قوم تو انتہائی گرگئی، یہ ظالم ہیں، یہ مفتری ہیں، یہ کذاب ہیں، انہوں نے جھوٹے نظریے بنالیے، بلا دلیل بنالیے، اور ایک کو چھوڑ کر کتنے آلہہ بنالیے، سمجھانے کے باوجود سمجھتے نہیں، الٹا ہمیں یہ خراب کرنا چاہتے ہیں، تو اب اس قوم میں رہنے کا فائدہ کوئی نہیں ہے۔ جس طرح سے انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کی سُنّت ہے کہ جس علاقے میں رہتے ہوئے اپنے نظریے کو بچانہ سکیں، اس علاقے کو چھوڑ دیا جائے جس کو ہجرت کرنا کہتے ہیں، اس قوم سے علیحدگی اختیار کر لی جائے۔ تو ان پر بھی یہ موقع آگیا، جس طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر یہ موقع آیا تھا کہ ان مشرکوں کے ظلم وتشدد کے نتیجے میں انہیں بھی بہت قربانیاں دینی پڑیں، جیسے میں نے ابتدا میں عرض کیا تھا کہ اس واقعہ سنانے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی ثابت قدم کرنا مقصود ہے کہ ایسے تشدّد کے وقت میں کس طرح سے قربانی دینی پڑتی ہے، جیسے نوجوانوں نے قربانی دی تھی، تمہیں بھی ایسے قربانی دینی پڑے گی، اس کے ضمن میں یہ سبق آئے گا۔

اَصحابِ کہف کا غار نشین ہونا

تو انہوں نے یہی سوچا کہ جب تم ان سے جدا ہو گئے، یہ تمہارے کچھ نہیں لگتے، موحد اور مشرک کی کوئی رشتہ داری نہیں، آپس میں کوئی تعلق نہیں، مسلمان کا اگر تعلق ہوسکتا ہے تو مسلمان سے ہی ہوسکتا ہے، ان سے ہماری کوئی محبت نہیں، ہمارا ان سے کوئی تعلق نہیں، جب تم ان سے جدا ہو گئے، اور ان کے معبودوں سے جدا ہو گئے، اللہ کے علاوہ جن کو یہ پوجتے ہیں جب ان سے تم جدا ہو گئے تو فَاْوٗٓا اِلَی الْکَھْفِ اب اس آبادی کو چھوڑ دو، کسی غار میں جا کے بیٹھ جاؤ، غار نشین ہو جاؤ، خلوت میں چلے جاؤ، علیحدگی اختیار کرلو،

---

(۱) ۱۳۳۹ھ میں دارالعلوم سے فراغت ہوئی۔ ۱۳۵۴ھ تا ۱۳۵۷ھ دارالعلوم میں اُستاذ اور شیخ التفسیر رہے۔ ذی الحجہ ۱۴۰۳ھ میں وفات پائی۔

اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اپنی رحمت پھیلائے گا، وہ تمہارا کارساز ہے اور تمہارے لیے تمہارے امر سے نفع کی چیز بنائے گا، مہیا کرے گا۔ یَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا: یہ وعدے کے اوپر اعتماد ہے، میں عرض کر رہا تھا کہ جس طرح سے ہم سوچنے لگ جاتے ہیں کہ بھئی! ماحول سارا اخلاف ہے، آخر ہم نے وقت گزارنا ہے، رشتہ داروں کو چھوڑ کے کہاں چلے جائیں، اگر ہم بازار والوں سے بنا کر نہیں رکھیں گے تو ہماری دُکان کیسے چلے گی؟ اگر ہم یہ طریقہ نہیں اپنائیں گے تو روٹی کہاں سے کھائیں گے؟ اگر ہم ایسے نہیں بنیں گے تو ہمیں رشتہ کون دے گا؟ ہمارے لیے تو زندگی کے سارے دروازے بند ہو جائیں گے، کمزور انسان اس طرح سے سوچنے لگ جاتا ہے، اور اس سوچ میں پڑا، اور گیا۔ کیونکہ اس میں اس کے سامنے اپنی مجبوریاں آئیں گی، اور جب وہ اپنے آپ کو مجبور سمجھنے لگے گا تو پھر وہ پھسل جائے گا۔ اور انہوں نے سبق کیا ظاہر کیا؟ کہ اللہ کی رحمت پر اعتماد کرو، تمہارے لیے ضرورت کی چیزیں اللہ مہیا کرے گا، اس قوم سے اس نظریے سے ہمارا کوئی تعلق نہیں، ان کو چھوڑ کے علیحدہ ہو جاؤ، اور اپنی دنیا علیحدہ بسالو۔ کہاں اپنے مکانات، کہاں اپنا کاروبار، کہاں اپنے رشتہ دار، اور کس قسم کی آرائش اور زیبائش کی چیزیں، سب کو چھوڑ کر ایک غار کے اندر جا بیٹھے، اور اس اعتماد پر جا بیٹھے کہ ہمیں اللہ کی رحمت حاصل ہوگی، اور ہمارے کام اللہ بنائے گا، جس چیز کی ہمیں ضرورت ہے وہ اللہ دے گا۔ یہی بنیاد ہے جو میں عرض کر رہا ہوں کہ جن خیالات کی بنا پر انسان فتنوں سے محفوظ رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ آپ کو یہ واقعہ اس لیے سناتا ہے کہ جب اس قسم کا دور آجائے کہ نیکی اور اچھائی اختیار کرنے پر انسان کے اوپر زندگی کے دروازے بند ہوں، تو اللہ کے اوپر اعتماد کر کے جس وقت انسان سب کو لات مار دیتا ہے، تو پھر اللہ تعالیٰ اپنے اس بندے کو ضائع نہیں ہونے دیتا، بلکہ کس طرح سے خلافِ اسباب اللہ تعالیٰ اس کو عزت بھی دیتا ہے، راحت بھی دیتا ہے، تکلیفوں سے بھی بچاتا ہے، اور آنے والے وقت میں صرف اسی کا نام رہ جاتا ہے، اور جو مخالفین ہوتے ہیں سب ذلیل ہو کر ملیامیٹ ہو جاتے ہیں، اس واقعے میں یہی سبق پڑھانا مقصود ہے، اور اسی نظریے کی مضبوطی سے انسان ہر قسم کے فتنے سے محفوظ رہتا ہے۔ ''چھوڑ دو ان سب کو، اور علیحدہ ایک غار میں چلے جاؤ، اللہ کی رحمت تمہیں مہیا ہوگی، اللہ تمہارے لیے اسباب مہیا کرے گا'' یہ اعتماد ہے، کہ اگر یہ مشرک شرک کرتے ہوئے اللہ کی زمین پہ دندناتے پھرتے ہیں، اور ان کو زندہ رہنے کا حق ہے، تو کیا ہم اللہ کے لئے قربانی دینے والے زندہ نہیں رہ سکیں گے؟ ''چھوڑ دو ان کو، علیحدہ ہو جاؤ'' آپس میں مشورہ کر کے انہوں نے یہ بات طے کر لی، یعنی ان جوانوں کے دل میں کس قسم کی قوت تھی، ان لفظوں سے وہ معلوم ہو رہی ہے، اللہ تعالیٰ کہتا ہے ہم نے ان کے دلوں کو مضبوط کر دیا، ہم نے ان کی ہدایت میں اضافہ کر دیا، یہ ہدایت کے اضافے اور دلوں کی مضبوطی کے آثار ہیں کہ سب اسباب کو چھوڑ دو، سب اسباب کو لات مار کے ایک طرف ہو کے بیٹھ جاؤ، اللہ سنبھالے گا۔

غار میں حفاظت کا اِنتظامِ الٰہی

پھر آگے کیا ہوا؟ جو غار تجویز ہوگئی تھی اس میں وہ چلے گئے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہ غار ایسی تھی کہ جس میں ان کے لئے ہر قسم کی راحت و آرام کا انتظام ہو گیا، کچھ آرام کرنے کے لئے جا کے لیٹے، تو اللہ نے نیند طاری کر دی۔ اور سوئے ہوئے آدمی

کو آپ جانتے ہیں کہ کوئی فکر ہی نہیں ہوتا کہ کیا ہو گیا؟ کیا نہیں ہوا؟ یعنی ان کو اللہ تعالیٰ نے ایک طرح سے اس ماحول سے محفوظ کر لیا، اور ان کے اُوپر نیند طاری کر دی، اور اس غار کا محل وقوع ایسا تھا کہ اس میں تازہ ہوا اور روشنی کا انتظام تو تھا، لیکن دُھوپ وغیرہ تکلیف نہیں پہنچاتی تھی...... اس کا منہ یا شمال کی طرف تھا یا جنوب کی طرف، اس لیے سورج چڑھتے وقت بھی دُھوپ ایک طرف رہ جاتی، غروب ہوتے ہوئے بھی ایک طرف رہ جاتی، اندر نہیں جاتی تھی کہ ان کے لئے باعثِ تکلیف ہوتی۔ دیکھو! اگر اس کا منہ شمال کی جانب ہو تو جب سورج نکلے گا تو دُھوپ یوں ایک طرف رہ جائے گی کمرے میں نہیں آئے گی، جب غروب ہوگا تو یوں رہ جائے گی کمرے میں نہیں آئے گی۔ باہر نکلنے کے اعتبار سے، اندر جانے کے اعتبار سے دایاں بایاں جو آپ لیں گے تو یہ دو ہی رُخ متعین ہوں گے، یا جنوب کی طرف یا شمال کی طرف، جنوب کی طرف ہونے کی صورت میں جس وقت ایک آدمی نکلے گا تو بایاں ہاتھ اس کا مشرق کی طرف ہے، دایاں ہاتھ مغرب کی طرف ہے، اور جب شمال کی طرف رُخ ہونے کی صورت میں نکلے گا تو دایاں ہاتھ اس کا مشرق کی طرف ہے بایاں ہاتھ مغرب کی طرف ہے۔ یہاں لفظ یہ آ گئے کہ تو دیکھتا ہے کہ جس وقت سورج نکلتا تو ڈھلک جاتا تھا، مائل ہو جاتا تھا ان کی غار سے دائیں جانب۔ تو مشرق ہوا دائیں جانب، تو معلوم ہوا کہ نکلنے والے کا اگر دایاں ہاتھ مراد لیا جائے تو پھر تو اس کا دروازہ شمال کی طرف تھا۔ اور اگر داخل ہونے والے کا دایاں ہاتھ مراد لیا جائے تو دروازہ جنوب کی طرف تھا، تو آدمی جب جنوب کی طرف سے داخل ہوگا تو دایاں ہاتھ مشرق کی طرف ہے بایاں ہاتھ مغرب کی طرف ہے، تو دُھوپ اِدھر رہ گئی طلوع کے وقت بھی، غروب کے وقت بھی۔ اور اگر باہر نکلنے والے کا ہاتھ مراد ہے تو دروازہ شمال کی طرف ہوگا، تو دایاں ہاتھ مشرق کی طرف ہو گیا، بایاں ہاتھ مغرب کی طرف ہو گیا...... تو شمال اور یمین یا تو داخل ہونے والے کا مراد ہے، یا نکلنے والے کا۔ نکلنے والے کا مراد ہو تو غار کا منہ شمال کی جانب ہوگا، داخل ہونے والے کا مراد ہو تو غار کا منہ جنوب کی جانب ہوگا (از بیان القرآن)۔ تو نہ طلوع کے وقت دُھوپ اندر جاتی تھی، نہ غروب کے وقت اندر جاتی تھی۔ وَهُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ: اور وہ اس غار کی کشادہ جگہ کے اندر پڑے ہوئے تھے۔

سوال:- شمال کی طرف اگر غار کا منہ ہو تو دوپہر کے وقت تو دُھوپ اندر جائے گی۔

جواب:- دوپہر کے وقت تو سورج اُوپر آ جاتا ہے، دُھوپ اندر کیسے جائے گی؟ خیر! جزئیات میں پڑنے کی ضرورت نہیں، بہر حال غار کا منہ اس طرح سے تھا کہ دُھوپ اندر نہیں جاتی تھی، اب جغرافیائی طور پر اور جیومیٹری کے طریقے سے رُخ خود متعین کر لو، یہاں سے تو اتنا معلوم ہو گیا کہ غار کے اندر دُھوپ نہیں جاتی تھی، ایک طرف کو رہ جاتی تھی طلوع کے وقت بھی اور غروب کے وقت بھی، اور صورت اس کی یہی بنتی ہے کہ غار کا منہ یا شمال کی طرف ہوگا یا جنوب کی طرف۔

(ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ) یہ جو کچھ ہو رہا ہے سب اللہ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے لئے کیسے کیسے اسباب مہیا کر دیتے ہیں، کیسی کیسی ان کے لئے صورتیں بنا دیتے ہیں، باقی! اللہ کی قدرت کی نشانیوں کو دیکھ کے ہدایت حاصل کرنا یہ ہر کسی کا کام نہیں ہے، ہدایت اسی کو حاصل ہوتی ہے جس کو اللہ توفیق دیتا ہے، اور اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی کو دھکا لگ جائے، اللہ بھٹکا دے یعنی اسے سوچنے کی توفیق نہ ملے، تو پھر کوئی دوسرا شخص نہیں جو اس کے لئے کارساز یا مرشد کا کام دے سکے، اس کو کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔ آگے (وَتَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا میں) ان کا ایک حال ہے، واقعے کا ایک حصہ چونکہ ختم ہو رہا ہے اس لیے

میں نے دو آیتیں رکوع سے اوپر پڑھ دیں۔ کہ وہ جب غار میں لیٹے ہوئے تھے تو اگر تو ان کو جھانک کے دیکھتا تو تجھے ایسے معلوم ہوتا جیسے جاگ رہے ہیں، اتنی لمبی نیند! لیکن دیکھنے والے کو ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی مسافر چلتا ہوا تھوڑی دیر کے لئے آرام کی غرض سے لیٹ گیا۔ ''تو ان کو بیدار سمجھتا، حالانکہ وہ سوئے ہوئے تھے۔'' سوئے ہوئے میں اور بیدار میں ایک فرق ہوتا ہے، آپ بھی دیکھ لیں۔ جب آدمی سویا ہوا ہو تو ڈھیلا سا ہوتا ہے، ٹانگ اس کی کدھر کو جاتی ہے، بازو اس کا کدھر کو جاتا ہے، اور اس کو کچھ پتا نہیں ہوتا، اور سوئے ہوئے آدمی کی سانس کی بھی ایک خاص رفتار ہوتی ہے۔ اور جب آدمی بیدار ہوتا ہے تو بدن چست ہوتا ہے، اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے ہوتا ہے، اور سانس کا ایک اور انداز ہوتا ہے۔ تو چار پائی پر ایک آدمی لیٹا ہوا ہو تو آپ دیکھ کے پہچان لیتے ہیں کہ یہ سویا ہوا ہے یا جاگ رہا ہے۔ اور یہ ایسے طور پر سوئے تھے کہ دیکھنے والے کو معلوم ہوتا تھا کہ یہ جاگ رہے ہیں۔ تو اس میں بھی ایک حفاظت کی تدبیر ہے، کیونکہ جاگتے انسان کے پاس جلدی سے کوئی نقصان پہنچانے کے لئے نہیں جایا کرتا، سوئے ہوئے کے پاس انسان چلا جاتا ہے...... اور پھر اللہ تعالیٰ نے وہاں ہیبت اتنی طاری کر دی کہ جو جائے اس کو ڈر لگتا ہے، اندر نہیں جاتا، اور چونکہ جاگتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں تو جلدی سے کوئی جانور بھی قریب نہیں آتا...... پھر ایک اور حفاظت کی تدبیر اللہ نے کی کہ جب وہ آبادی سے نکلے جا رہے تھے تو ایک کتا ان کے ساتھ ہو لیا، پیچھے پیچھے چلا گیا، اور جیسے کتے کی عادت ہے کہ مکان کے دروازے کے سامنے بیٹھ جایا کرتا ہے، تو وہاں جا کے وہ غار کے دروازے کے سامنے ہاتھ پھیلا کر بیٹھ گیا، اور اسی طرح سے نیند اس پر بھی طاری ہوگئی، اور جب کتا کسی دروازے کے سامنے بیٹھا ہوتا ہے، تو آپ جانتے ہیں کہ تکلیف پہنچانے والے جانور اور اس قسم کی کوئی چیز آگے نہیں آتی، یہ بھی اللہ نے حفاظت کا ایک انتظام فرما دیا۔

اَصحابِ کہف کے کتے کا اِعزاز

لیکن کتے نے اولیاء اللہ کا ساتھ جو دیا، تو اس کو بھی یہ شرف حاصل ہوگیا کہ اس کا ذکر بھی قرآن میں آ گیا، اس کو بھی یہ عزت مل گئی، جس کو ہمارے شیخ سعدیؒ کہتے ہیں کہ:

پسرِ نوح با بداں بنشست خاندانِ نبوتش گم شد
سگ اَصحابِ کہف روزے چند پے نیکاں گرفت مردم شد[1]

نوح علیہ السلام کا بیٹا بُروں کا ساتھی بنا، وہ اپنے نبوّت کے خاندان کی فضیلت ضائع کر بیٹھا، اور اَصحابِ کہف کا کتا چند دن نیکوں کے پیچھے لگا، اور آدمی بن گیا۔ آدمی بننے کا مطلب یہ ہے کہ ان نیک لوگوں کے ساتھ اس کا تذکرہ قرآن میں آ گیا، باقی! یہ کسی روایت میں نہیں آتا، لوگ جو کہہ دیا کرتے ہیں کہ آخرت میں آدمی کی شکل میں بنا کے اس کو جنت میں بھیج دیا جائے گا، یہ ''مردم شد'' سے لوگوں کی سمجھ ہے، ورنہ مطلب اس کا یہ ہے کہ اس کو یہ شرف حاصل ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر اپنے اولیاء کے ساتھ کیا ہے، اس طرح سے اس کتے کی بھی ایک قسم کی عزت نمایاں ہوگئی جس نے اولیاء اللہ کا ساتھ دیا۔

---

(۱) گلستاں، باب اوّل، حکایت ۴ کا تقریباً آخر۔

کتے کے شرعی اَحکام

باقی! کتا رکھنے کی جو ممانعت ہے کہ جہاں کتا ہو وہاں رحمت کے فرشتے نہیں آتے، یہ ہماری شریعت میں ہے، اور پہلی شریعتوں میں شاید یہ ممانعت نہ ہو، اور دوسرے حفاظت اور نگرانی کے لئے کتا رکھنے کی اجازت ہمارے ہاں بھی ہے، شوق کے ساتھ جو کتے پالتے ہیں جس طرح سے آج کل انگریزوں یا ان کی مصنوعی نسل کا رویہ ہے کہ کار ہو تو ساتھ کتا ضرور ہو، ''کوٹھی، کار، کتا'' یہ تین کاف ان کے لئے زندگی کا لازمہ ہیں، کہ کوٹھی بنالی تو کار ضرور ہونی چاہیے، کار ہو تو ساتھ کتا ضرور ہونا چاہیے، کار میں بٹھائیں گے، پیار کریں گے، محض شوق کے طور پر جو رکھتے ہیں، جس طرح سے اس جاہلیتِ جدیدہ کے اندر عام طور پر کتے سے پیار کیا جاتا ہے، جاہلیتِ قدیمہ میں بھی ایسے ہی تھا، حضور ﷺ کے زمانے میں لوگ کتے سے پیار کرتے تھے، اس وقت آپ ﷺ نے بہت شدت کے ساتھ منع کیا، تو یہ کتا ممنوع ہے جو پیار اور محبت کے ساتھ محض شوق سے رکھا جاتا ہے، اگر حفاظت کے لئے، نگرانی کے لئے رکھا جائے تو اس کی اجازت ہے، اور پھر ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ اُس شریعت میں ممانعت نہ ہو، اس لئے کتا جو سامنے بیٹھا تھا وہ بھی مستقل حفاظت کا باعث بن گیا۔

''تو گمان کرتا ہے ان کو، تو سمجھتا ہے ان کو بیدار، حالانکہ وہ سوئے ہوئے ہیں، اور ہم ان کو پلٹاتے ہیں، پلٹا دیتے ہیں دائیں طرف اور بائیں طرف'' یعنی تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ پلٹے کھاتے رہتے ہیں، جس طرح سے سویا ہوا آدمی پلٹے کھایا کرتا ہے تاکہ ایک پہلو پر لیٹے لیٹے اس پہلو کو نقصان نہ پہنچ جائے، اس طرح سے ہم ان کو اُلٹ پلٹ کرتے ہیں۔ ''اور ان کا کتا پھیلانے والا ہے اپنے بازو کو دہلیز پر، چوکھٹ پر'' یعنی غار کے سامنے۔ ''اے مخاطب! اگر تو ان کے اُوپر اطلاع پاتا، اگر تو جھانکتا البتہ پیٹھ پھیرتا ان سے بھاگتے ہوئے، اور البتہ بھر دیا جاتا تو ان کی طرف سے از روئے رُعب کے'' یعنی اگر بالفرض آپ وہاں چلے جاتے اور جا کے دیکھتے تو وہاں اتنی ہیبت طاری تھی کہ وہاں انسان ٹھہر نہیں سکتا، ڈر کر پیچھے کو بھاگ آئے، یہ مستقل حفاظت کی ایک تدبیر ہے کہ وہاں کوئی قریب نہ جاسکے، کسی قسم کا نقصان نہ پہنچا سکے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

وَكَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ ؕ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ؕ قَالُوْا

اور ایسے ہی ہم نے ان کو اُٹھایا تاکہ آپس میں وہ ایک دوسرے سے پوچھیں، کہا ان میں سے ایک کہنے والے نے: تم کتنا ٹھہرے ہو؟ دوسروں نے

لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ؕ قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ ؕ فَابْعَثُوْٓا

ہم ٹھہرے ہیں ایک دِن یا دِن کا کچھ حصہ۔ کچھ اور بولے: تمہارا رَبّ خوب جانتا ہے تمہارے ٹھہرنے کی مدت کو، پس بھیجو تم

اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖٓ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَآ اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ

اپنے میں سے ایک کو اپنی اس نقدی کے ساتھ شہر کی طرف پس چاہیے کہ وہ دیکھے کہ کون زیادہ پاکیزہ ہے ازروئے طعام کے، پھر وہ لے آئے تمہارے پاس

بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا ﴿۱۹﴾ اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ

رزق اس شخص سے، اور چاہیے کہ وہ نرم رویہ اختیار کرے اور نہ اطلاع دے تمہارے متعلق کسی کو ﴿۱۹﴾ بے شک وہ لوگ اگر اطلاع پا گئے تم پر

يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوْٓا اِذًا اَبَدًا ﴿۲۰﴾ وَكَذٰلِكَ

تو تمہیں سنگسار کردیں گے، یا تمہیں لوٹا لیں گے اپنے دین میں، اور ہرگز فلاح نہیں پاؤ گے تم اس وقت کبھی ﴿۲۰﴾ اور ایسے ہی

اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْٓا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا ۚ اِذْ

ہم نے ان پر مطلع کردیا تاکہ لوگ جان لیں کہ بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے اور بے شک قیامت، اس کے آنے میں کوئی شک نہیں، جبکہ

يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ اَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا ۭ رَبُّهُمْ

لوگ جھگڑا کررہے تھے آپس میں اصحابِ کہف کے معاملے میں، پھر کہا انہوں نے کہ بنادو ان کے اُوپر کوئی عمارت، ان کا رب

اَعْلَمُ بِهِمْ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓي اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا ﴿۲۱﴾

خوب جانتا ہے ان کو، کہا ان لوگوں نے جو اپنے اَمر پر غالب تھے: البتہ ضرور بنائیں گے ہم ان پر ایک مسجد ﴿۲۱﴾

سَيَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ

عنقریب لوگ کہیں گے کہ اصحابِ کہف تین تھے، چوتھا ان کا کُتا تھا، اور کچھ کہیں گے پانچ تھے چھٹا ان کا کُتا تھا،

رَجْمًۢا بِالْغَيْبِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ۭ قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ

بن دیکھے تیر مارتے ہوئے۔ اور کچھ کہیں گے کہ وہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کُتا تھا، آپ کہہ دیجئے کہ میرا ربّ خوب جانتا ہے

بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ ڐ فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَاۗءً ظَاهِرًا ۠

ان کی گنتی کو، نہیں جانتے ان اصحابِ کہف کو مگر تھوڑے سے لوگ، ان کے بارے میں جھگڑا نہ کیجئے مگر سرسری سی بحث،

وَّلَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا ﴿۲۲﴾

اور مت پوچھیں آپ ان کے بارے میں ان لوگوں میں سے کسی سے ﴿۲۲﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ وَکَذٰلِکَ بَعَثْنٰھُمْ: اور ایسے ہی ہم نے ان کو اٹھایا۔ بَعَثَ اٹھانے کو کہتے ہیں۔ بعث یہاں نیند کے بعد ہے، بَعثٌ بَعدَ النوم۔ جس طرح سے بعث بعد الموت ہوتا ہے مرنے کے بعد اٹھانا، تو یہ بعث بعد النوم ہے۔ ہم نے سونے کے بعد ان کو اٹھایا، جس کو ہم اپنے محاورے میں جگانے سے تعبیر کرتے ہیں۔ ''اور ایسے ہی ہم نے ان کو جگا دیا، اٹھا دیا۔'' ''ایسے ہی'' کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح سے اپنی قدرت کے ساتھ ہم نے ان کو سلایا تھا، اسی طرح سے ہم نے ان کو اپنی قدرت کے ساتھ جگا دیا، لِیَتَسَآءَلُوْا بَیْنَھُمْ: تا کہ آپس میں وہ ایک دوسرے سے پوچھیں۔ تَسَائُل: ایک دوسرے سے پوچھنا۔ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْھُمْ: کہا ان میں سے ایک کہنے والے نے، کَمْ لَبِثْتُمْ لَبِثَ یَلْبَثُ: ٹھہرنا۔ تم کتنا ٹھہرے ہو؟ قَالُوْا: دوسروں نے کہا، لَبِثْنَا یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ: ہم ٹھہرے ہیں ایک دِن یا دن کا کچھ حصہ، قَالُوْا: کچھ اور بولے، رَبُّکُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ: اس میں ''ما'' مصدریہ ہے۔ تمہارا رَبّ خوب جانتا ہے تمہارے ٹھہرنے کی مدت کو۔ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ کا مطلب ہو جائے گا اَعْلَمُ بِمُدَّۃِ لُبْثِکُمْ (نسفی)، تمہارے ٹھہرنے کو تمہارا رَبّ خوب جانتا ہے، یعنی تمہارے ٹھہرنے کی مدت کو خوب جانتا ہے، فَابْعَثُوْٓا: پس بھیجو تم، اَحَدَکُمْ: اپنے میں سے ایک کو، بِوَرِقِکُمْ ھٰذِہٖٓ: وَرِق کہتے ہیں چاندی کو۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس جو سکہ تھا وہ چاندی کا تھا، تو وِرق سے وہی سکہ مراد ہے، جس طرح سے آج کل آپ کے نوٹ کاغذ کے ہیں، تو اس سے قبل جس وقت پاکستان نہیں بنا تھا، میں نے خود اپنی چھوٹی عمر میں خالص چاندی کا روپیہ دیکھا ہے جو ایک تولہ چاندی کا ہوتا تھا، اور اس سے قبل مغلیہ دُور میں سونے کا سکہ بھی ہوتا تھا اور چاندی کا بھی ہوتا تھا، اور آپ جو فقہ کے اندر دَراہم اور دِینار کا ذِکر پڑھتے رہتے ہیں، تو دِراہم چاندی کے ہوتے تھے اور دِینار سونے کے ہوتے تھے۔ تو وِرق چاندی کو کہتے ہیں، تو یہاں چاندی کا سکہ مراد ہے۔ ''بھیجو تم اپنے میں سے ایک کو اپنی اس چاندی کے ساتھ'' یعنی اپنے اس روپے کے ساتھ، آج کے محاورے میں ہم یوں کہیں گے، اپنی اس نقدی کے ساتھ، اپنے اس سکے کے ساتھ، یا اپنے اس روپے کے ساتھ، لفظی معنی ہے اپنی اس چاندی کے ساتھ، اِلَی الْمَدِیْنَۃِ: شہر کی طرف۔ اس شہر سے وہی شہر مراد ہے جس سے وہ نکل کے آئے تھے۔ جس کا نام اَفسُوس، یا اَفیسس، یا طرطوس، یا بطرا، پیٹرا، رقیم، یہ مختلف اقوال آپ کے سامنے ابتدا میں ذکر کیے تھے۔ فَلْیَنْظُرْ اَیُّھَآ اَزْکٰی طَعَامًا: پس چاہیے کہ وہ دیکھے، غور کرے، یہاں نظر سے نظر و فکر مراد ہے، غور کرے، پس چاہیے کہ وہ دیکھے اَیُّھَآ: ھا ضمیر مدینہ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور اس کے اوپر مضاف محذوف ہے اَیُّ اَھْلِھَا اَزْکٰی (نسفی)، شہر والوں میں سے کون سا شخص اَزْکٰی طَعَامًا ہے؟ حلال کھانے والا ہے۔ کون سا ایسا شخص ہے جو زیادہ پاکیزہ ہے ازروئے طعام کے، یعنی کس کے پاس کھانا پاکیزہ اور حلال ہے، یہ خیال کرے۔ فَلْیَاْتِکُمْ بِرِزْقٍ مِّنْہُ: پھر وہ لے آئے تمہارے پاس رزق اس شخص سے، یا اس طعام سے تمہارے لیے رزق لے آئے (آلوسی)۔ اَتٰی یَاْتِیْ: آنا، اور بِرِزْقٍ میں باء تعدیہ کی ہے، تو جیسے پہلے آپ کی خدمت میں عرض کیا تھا، تو اب اس کا ترجمہ ''لانا'' ہو گیا۔ ''لے آئے وہ تمہارے پاس اس میں سے رزق۔'' وَلْیَتَلَطَّفْ: تَلَطُّف: اچھی تدبیر اختیار کرنا، باریک بینی سے کام لینا، نرم رویہ اختیار کرنا۔ چاہیے کہ وہ نرم رویہ اختیار کرے، خوش تدبیری کے ساتھ

جائے۔ تلطف مہربانی کرنے کو بھی کہتے ہیں، نرم رویہ اختیار کرنے کو بھی کہتے ہیں، اچھی تدبیر اختیار کرنے کو بھی کہتے ہیں، حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب رائے پوری ؒ کی وصیت چھپی ہوئی ہے، تو اس میں ایک شعر ہے:

راحتِ دو گیتی تفسیرِ ایں دو حرف است　　با دوستاں تلطف، با دشمناں مدارا

یعنی اگر دونوں جہانوں کی راحت چاہتے ہو، تو یہ راحت صرف دو حرفوں کی تفسیر ہے، کہ دوستوں کے ساتھ تلطف اختیار کرو، اور دشمنوں کے ساتھ مدارا اختیار کرو، ''مدارا'' کہتے ہیں ظاہری طور پر خوش اخلاقی کے برتاؤ کو، تلطف کہتے ہیں نرمی اور مہربانی کو۔ تو دوستوں کے ساتھ مہربان بن کے رہو، دشمنوں کے ساتھ بھی خوش اخلاقی سے معاملہ کرو۔

راحتِ دو گیتی تفسیرِ ایں دو حرف است　　با دوستاں تلطف، با دشمناں مدارا

تو تلطف کا وہاں معنی یہی ہے، نرمی کرنا، نرم روش اختیار کرنا، خوش تدبیری اختیار کرنا، اور مدارات کہتے ہیں ظاہری طور پر خوش اخلاقی سے پیش آنا۔ وَلْیَتَلَطَّفْ: نرمی اختیار کرے، یا خوش تدبیری اختیار کرے، اچھی تدبیر اختیار کرے، یعنی ایسے طور پر جائے جیسے آگے اس تلطف کی تفسیر آ گئی وَلَا یُشْعِرَنَّ بِکُمْ اَحَدًا: اور نہ اطلاع دے تمہارے متعلق کسی کو، کسی کو تمہارے متعلق بتلائے نہ، ایسے طور پر چھپا چھپایا جائے کہ کسی کو پتا نہ چلے کہ یہ اسی جماعت میں سے ہے جو بادشاہ سے باغی ہو کر کہیں بھاگ گئے، یہ پتا نہ چلے۔ ''نہ بتلائے تمہارے متعلق کسی کو'' اِنَّھُمْ اِنْ یَّظْھَرُوْا عَلَیْکُمْ: بے شک وہ لوگ یعنی شہر والے اگر اطلاع پا گئے تم پر، یَرْجُمُوْکُمْ: تو تمہیں سنگسار کر دیں گے، رَجَمَ یَرْجُمُ پتھر مار مار کے مار دینا، رجم کرنا، جیسے رَجمِ زانی آپ فقہ میں پڑھتے ہیں۔ تمہیں سنگسار کر دیں گے، پتھر مار مار کے مار دیں گے۔ اَوْیُعِیْدُوْکُمْ: یا تمہیں لوٹا لیں گے فِیْ مِلَّتِھِمْ: اپنے دین میں، وَلَنْ تُفْلِحُوْٓا اِذًا اَبَدًا: اِذًا کا معنی تب، یعنی اگر وہ تمہیں لوٹانے میں کامیاب ہو گئے تب تم ہرگز کامیابی حاصل نہیں کر سکو گے، لَنْ تُفْلِحُوْٓا: ہرگز نہیں فلاح پاؤ گے تم، اِذًا: تب، یعنی اگر انہوں نے تمہیں لوٹا لیا، اَبَدًا: کبھی۔ تب تم کبھی بھی ہرگز کامیابی حاصل نہیں کر سکو گے، یہ اس کا مطلب ہوگا، ہرگز فلاح نہیں پاؤ گے تم اس وقت کبھی۔ وَکَذٰلِکَ اَعْثَرْنَا عَلَیْھِمْ: اور ایسے ہی ہم نے ان پر مطلع کر دیا، اَعْثَرَ: اطلاع دینا۔ یعنی جس طرح ہم نے ان کو سلایا، پھر جگایا، ایسے ہی ہم نے ان پر مطلع کر دیا، لِیَعْلَمُوْٓا تاکہ لوگ جان لیں، اَنَّ وَعْدَ اللّٰہِ حَقٌّ کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے وَّاَنَّ السَّاعَۃَ لَا رَیْبَ فِیْھَا: اور اللہ کے وعدے کی تفسیر یہ ہے (یہ عطف تفسیری ہے) کہ بے شک قیامت، اس کے آنے میں کوئی شک نہیں۔ رَیب شک اور تردّد کو کہتے ہیں۔ اِذْ یَتَنَازَعُوْنَ بَیْنَھُمْ اَمْرَھُمْ، تنازع: جھگڑا کرنا۔ جبکہ لوگ جھگڑ رہے تھے آپس میں اُن اَصحابِ کہف کے معاملے میں، فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَیْھِمْ بُنْیَانًا: پھر کہنے لگے کہ بنادو ان کے اوپر کوئی عمارت۔ بنیان عمارت کو کہتے ہیں۔ بَنٰی یَبْنِیْ: بنانا۔ کہا انہوں نے کہ بنادو ان پر کوئی عمارت، رَبُّھُمْ اَعْلَمُ بِھِمْ: ان کا رَبّ خوب جانتا ہے ان کو، یعنی ان کے تفصیلی حالات اللہ جانتا ہے، اس میں بحث جھگڑا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، یہاں کوئی عمارت بنادو، رَبُّھُمْ اَعْلَمُ بِھِمْ کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ جب آپس میں لوگ جھگڑ رہے تھے تو ان کا ہر حال اللہ کے سامنے تھا۔ قَالَ الَّذِیْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓی اَمْرِھِمْ کہا ان لوگوں نے جنہوں نے غلبہ پایا اپنے امر پر، جو اپنے امر پر غالب تھے اس سے اہلِ حکومت مراد ہیں (مظہری)، لَنَتَّخِذَنَّ عَلَیْھِمْ مَّسْجِدًا: البتہ ضرور بنائیں گے ہم ان پر ایک مسجد، ''مسجد'' سے عبادت گاہ مراد ہے، جو اس وقت کے مذہب کے مطابق تھی۔ ''مسجد'' جیم کے کسرہ کے ساتھ

ہے۔ ویسے تو آپ پڑھتے ہیں "سَجَدَ یَسْجُدُ" باب نصر سے، اور اَمر کا صیغہ "اُسْجُدْ" آتا ہے، تو ظرف کا صیغہ قاعدے کے مطابق مَنْصَر کے وزن پر مَسْجَد ہونا چاہئے، سجدہ کرنے کی جگہ۔ تو اگر تو لغوی معنی کے طور پر سجدہ گاہ مراد لی جائے، جہاں انسان پیشانی رکھتا ہے، سجدہ کرتا ہے، تو وہاں ہم لفظ مَسْجَد ہی بولیں گے جیم کے فتحہ کے ساتھ، لیکن جب یہ لفظ عبادت خانے کے معنی میں آتا ہے تو پھر جیم کے نیچے خلاف قیاس کسرہ آتا ہے مسجِد، اور ہے یہ سَجَدَ سے، سجدہ کرنے کی جگہ، اگر لغوی معنی مراد ہو یعنی سجدہ کرنے جگہ تو ایسی صورت میں مسجَد ہوگا۔ جیسے قَبَرَ یَقْبُرُ: چھپانے کو کہتے ہیں، اگر اس سے ظرف لغوی معنی کے اعتبار سے لیا جائے تو مَقْبَر آئے گا، چھپانے کی جگہ، اور قبرستان کے معنی میں یہ لفظ استعمال ہو تو مَقْبُرَۃٌ کہتے ہیں باء کے ضمہ کے ساتھ، وہاں قبرستان والا معنی ہوتا ہے، اسی طرح سے یہاں مسجَد کی بجائے مسجِد کہیں گے جس وقت عبادت گاہ مراد ہوگی۔ سَیَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَۃٌ: عنقریب لوگ کہیں گے کہ وہ اصحابِ کہف تین تھے، رَّابِعُھُمْ کَلْبُھُمْ: چوتھا ان کا کتا تھا، وَیَقُوْلُوْنَ خَمْسَۃٌ اور لوگ کہیں گے کہ وہ پانچ تھے سَادِسُھُمْ کَلْبُھُمْ چھٹا ان کا کتا تھا۔ رَجْمًۢا بِالْغَیْبِ: یہ رجم وہی ہے جو چند آیات پہلے یَرْجُمُوْکُمْ کے اندر آپ کے سامنے آیا۔ اس کا معنی ہے یَقُوْلُوْنَ رَاجِمِیْنَ بِالْغَیْبِ (آلوسی)، اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ایسے لوگ ہیں جن کو کوئی نشانہ نظر نہیں آ رہا، اور پتھر مار رہے ہیں۔ بِن دیکھے پتھر مارنا، نشانہ کوئی سامنے ہے نہیں۔ نشانے پر جب کوئی چیز ماری جاتی ہے تو نشانے کو دیکھ غور کر کے پھر مارتے ہیں تو نشانے پہ لگتی ہے، جب بِن دیکھے مارتے چلے جائیں تو نشانے پہ کیسے لگے؟ تو یہ ان باتوں کو کہا جاتا ہے جو اٹکل پچو کے طور پر لوگ کرتے ہیں، اور انہیں کچھ پتا نہیں ہوتا، حقیقت حال واضح نہیں ہوتی، اٹکل کے تیر چلانا، کہ شاید ادھر نشانہ ہو، شاید ادھر نشانہ ہو، یوں ہی چلاتے رہیں، تو اٹکل کے تیر چلانا اس کو رجم بالغیب کہتے ہیں۔ تو رجم بالغیب کا معنی ہوگا کہ ان کی یہ سب باتیں اٹکل کے تیر ہیں، ان کے سامنے کوئی واضح نشانہ نہیں۔ اور ترکیب میں یوں ہو جائے گا یَقُوْلُوْنَ رَاجِمِیْنَ بِالْغَیْبِ یہ باتیں کرتے ہیں بِن دیکھے پتھر مارتے ہوئے، بِن دیکھے نشانہ لگاتے ہوئے، حاصل ترجمہ اس کا یہ ہوگا کہ اٹکل کے تیر چلاتے ہوئے، اٹکل پچو کے طور پر باتیں کرتے ہوئے، جن کے سامنے کوئی واضح حقیقت نہیں ہے، اپنے طور ایسے ہی تیر مار رہے ہیں۔ وَیَقُوْلُوْنَ سَبْعَۃٌ: اور لوگ کہیں گے کہ وہ سات تھے وَّثَامِنُھُمْ کَلْبُھُمْ: اور آٹھواں ان کا کتا تھا۔ قُلْ رَّبِّیْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِھِمْ: آپ کہہ دیجئے کہ میرا ربّ خوب جانتا ہے ان کی گنتی کو۔ عدت کا معنی گنتی۔ مَّا یَعْلَمُھُمْ اِلَّا قَلِیْلٌ نہیں جانتے ان اصحابِ کہف کو مگر تھوڑے سے لوگ۔ فَلَا تُمَارِ فِیْھِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاھِرًا: مِرَآءٌ قتال کے وزن پر باب مفاعلہ کا مصدر ہے۔ ان کے بارے میں آپ جھگڑا نہ کیجئے مگر ظاہری طور پر جھگڑا، سرسری سی بحث۔ ان کے بارے میں کسی سے کوئی بحث نہ کیجئے، کوئی جھگڑا نہ کیجئے مگر سرسری سی بحث۔ وَّلَا تَسْتَفْتِ فِیْھِمْ مِّنْھُمْ اَحَدًا: استفتاء: پوچھنا، اِفتاء: بتانا۔ مفتی: بتانے والا، مستفتی: پوچھنے والا، اور فتویٰ: خود حکم ہو گیا۔ استفتاء اور اِفتاء مصدر ہیں، اور مفتی، مستفتی اسم فاعل کے صیغے ہیں۔ نہ پوچھ، نہ سوال کر تو ان کے بارے میں ان میں سے کسی سے، ان لوگوں میں سے کسی سے ان کے بارے میں آپ اِستفتاء نہ کریں، مت پوچھیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَیْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط

ان آیات میں اس واقعے کی تکمیل ہے جو پیچھے سے چلا آ رہا ہے۔

اَصحابِ کہف کے قصے میں اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا اِظہار ہے

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے فضل وکرم کے ساتھ ان کے اوپر نیند طاری کی، اور وہ کتنی مدت تک ٹھہرے رہے؟ اس کا ذکر اگلے رُکوع میں آ رہا ہے وَلَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا کہ وہ اپنی غار میں تین سو سال، اور اس کے اُوپر نو کا اضافہ، یعنی تین سونو سال وہ غار میں ٹھہرے، اور اِجمالی طور پر ذِکر آپ کے سامنے پہلے رُکوع میں آ گیا تھا فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ چند سال، گنتی کے سال یعنی دِن نہیں، سالوں کا حساب تھا، ان کو سلا دیا۔ اور سِنِيْنَ عَدَدًا کی تفصیل اگلے رُکوع میں آ جائے گی کہ وہ گنے ہوئے سال کتنے تھے۔ معدود کا لفظ جس طرح سے قلیل کو بیان کرنے کے لئے ہوتا ہے، کثیر کو بیان کرنے کے لئے بھی ہوتا ہے (آلوسی)، کیونکہ کوئی چیز بہت تھوڑی ہو وہ بھی کسی شمار میں نہیں ہوتی، اور حد سے زیادہ ہوجائے وہ بھی کسی شمار میں نہیں ہوتی، تو یہاں عدد کثرت کے لئے ہے یعنی اتنے سال تھے جو شمار کیے جاتے تھے، اور اس کثرت کا مصداق آگے ظاہر ہوگیا کہ تین سو سال، یا تین سونو سال تھے، یہ اگلے رکوع میں آئے گا...... اب اتنی دیر تک کسی شخص کو سلا دینا اور پھر وہ زندہ بھی رہے، آپ جانتے ہیں کہ سویا ہوا آدمی مرا ہوا نہیں ہوتا، اس کے ظاہری حواس معطّل ہوتے ہیں کہ اس کے کان کچھ سنتے نہیں، آنکھ کچھ دیکھتی نہیں، دماغ کچھ سوچتا نہیں، ورنہ جو اس کا باطنی حال ہوتا ہے تو ساری کی ساری مشینری ویسے ہی چل رہی ہوتی ہے، دل دھڑک رہا ہوتا ہے، معدہ اپنا کام کرر ہا ہوتا ہے، آپ کھانا کھا کے سوتے ہیں اور سات آٹھ گھنٹے سونے کے بعد اُٹھتے ہیں تو بھوک لگی ہوئی ہوتی ہے، اور بسااوقات عین نیند کی حالت میں آپ کو پیشاب کا تقاضا ہوجاتا ہے، اور کبھی عین نیند کی حالت میں پیاس اتنی شدت سے لگتی ہے کہ آپ اُٹھ کے پانی پیتے ہیں، یہ اس بات کی علامت ہے کہ اندر کی مشینری ساری کی ساری چل رہی ہے، ایک وقت میں جا کے اس کا پانی بھی ختم ہوتا ہے تو آپ کو پیاس لگتی ہے، اور فضلات دفع کرنے کا تقاضا ہوتا ہے تو آپ کو پیشاب آتا ہے، اور کھانا ہضم ہوتا ہے، یہ سارے کے سارے حالات ہوتے ہیں، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے تین سونو سال تک بغیر کھانے کے اور بغیر پینے کے زندہ رکھا، اور تین سونو سال تک ان میں سے نہ کسی کو پیشاب آیا، نہ کسی کو پیاس لگی، وہ ایسے ہی لیٹے رہے، تو یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی ایک بہت بڑی نشانی ہے کہ جب وہ کسی کی حفاظت فرمانا چاہے، تو بغیر کھانے پینے کے اور بغیر کسی دوسری چیز کے بھی اتنی مدت تک اس کو زندہ رکھ سکتا ہے، یہ نہیں کہ انسان صرف روٹی سے زندہ ہے، بلکہ اللہ کی قدرت سے زندہ ہے، روٹی کھا کے بھی آدمی مرجاتا ہے اور بغیر روٹی کھانے کے بھی انسان زندہ رہ سکتا ہے، تو جیسے اپنی قدرت کے ساتھ ان کو سلایا تھا، اسی طرح سے اپنی قدرت کے ساتھ ان کو اٹھایا کہ تروتازہ اٹھ کے بیٹھ گئے۔

بیداری کے بعد اَصحابِ کہف کی آپس میں گفتگو

وَكَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ: جب وہ اٹھ کے بیٹھے، تو پھر آپس میں لگے ایک دوسرے سے پوچھنے کہ ہمیں یہاں لیٹے ہوئے کتنی دیر ہوگئی؟ اس لیے لِيَتَسَآءَلُوْا کے اوپر جو لام ہے بعض مفسرین نے اس کو لامِ عاقبت بنایا ہے، کہ اٹھنے کے بعد یہ واقعہ پیش آیا کہ انہوں نے اٹھ کے آپس میں ایک دوسرے سے سوال کیا۔ یا اٹھایا ہی اس لیے تاکہ ان میں اس قسم کی گفتگو ہو، گفتگو ہونے کے بعد وہ آگے ایک مسئلے کے طے ہونے کا ذریعہ بنے، جس طرح سے آگے ایک بات آئے گی، ان کے سامنے بھی اللہ کی قدرت آجائے (اس صورت میں لام اجلیہ ہوگا۔ مظہری)۔ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ: ان میں سے ایک بولا کہ تم کتنی دیر ٹھہرے ہو؟ یعنی سوئے ہوئے اٹھے، بیٹھ گئے اور کہتے ہیں: کتنی دیر ہوگئی سوئے ہوئے؟ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ: تو کچھ لوگ بولے کہ ایک دِن ٹھہرے ہوں گے یا بعض دِن ٹھہرے ہوں گے، ایک دِن ہوگیا ہوگا یا دِن کا کچھ حصہ ہوگیا ہوگا، بیٹھے تو غار میں ہی ہیں، مطلب اس کا یہ ہے کہ کوئی زیادہ مدت نہیں گزری، بس! ایک دِن ہوگیا ہوگا، یا دِن کا کچھ حصہ ہوگیا ہوگا، جیسے ہم کہیں کہ ۲۴ گھنٹے ہوگئے یا اس سے کم وبیش، یعنی جس وقت سوئے ہوں گے پھر جب جاگے ہوں گے تو تقریباً ویسے ہی وقت ہوگا، تو انہوں نے اندازہ کرلیا کہ کل اس وقت دِن میں سوئے تھے، اور اس وقت اٹھ گئے ہیں، تو ۲۴ گھنٹے ہوگئے ہوں گے، یا ایک دو گھنٹے کا فرق ہوگا، یعنی تین سو سال سونے کے بعد ان کا یہ احساس ہے، قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ: کچھ اور لوگ بولے کہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کتنی دیر ٹھہرے، ان باتوں کو چھوڑ دو، بھوک لگی ہوئی ہے، روٹی کا انتظام کرو، یہ جھگڑا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں کہ کتنی دیر ٹھہرے، کتنی دیر نہیں ٹھہرے، کچھ کھانے کے لئے منگواؤ۔ اب تین سو سال تو بھوک لگی نہیں، اور اُٹھتے ہی بھوک کا احساس ہوگیا۔

اَصحابِ کہف کی تعداد پر اَلفاظِ قرآن سے ایک اِستدلال

اب یہاں جو لفظ آئے ہیں، قَالَ قَآئِلٌ یہ تو ایک ہے، اس میں تو کوئی شک نہیں، اور آگے قَالُوْا لَبِثْنَا یہ کم از کم تین ہونے چاہئیں، تبھی تو جمع کا صیغہ آئے گا، اور قَالُوْا رَبُّكُمْ میں بھی کم از کم تین ہونے چاہئیں، تب جا کے جمع کا صیغہ آئے گا، تو ان لفظوں سے بھی اشارہ نکلتا ہے کہ ان کی تعداد سات تھی (نسفی) لیکن یہ یقینی اور قطعی نہیں، کیونکہ یہ ضروری نہیں کہ جو پہلے قَالُوْا کا فاعل ہیں، دوسرے قَالُوْا کا فاعل وہ نہیں ہوسکتے، یہ یقینی نہیں، ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ پہلے انہوں نے کہا ہو کہ پورا دِن ٹھہرے ہیں یا دِن کا کچھ حصہ ٹھہرے ہیں، پھر وہی کہنے لگے کہ چھوڑو اس بحث کو کہ کتنی دیر ٹھہرے ہیں، جلدی جلدی کھانے کا انتظام کرو، بھوک لگی ہوئی ہے، اس لیے یہ قطعی نہیں لیکن ظاہر کے مطابق ایسے ہی ہے کہ پہلا قائل علیحدہ، اور دوسرے قالوا کے فاعل علیحدہ، اور تیسرے قَالُوْا کے فاعل علیحدہ، تو اس میں ان کی کم از کم تعداد سات ہی نکلے گی، اس لیے آگے جو تعداد کے بارے میں اختلاف آئے گا، تو اس میں اکثر مفسرین کی رائے یہی ہے کہ وہ سات تھے، کیونکہ قرآنِ کریم نے پہلے دو قول نقل کر کے یعنی ثلاثۃ اور خمسۃ والا قول نقل کر کے کہا: رَجْمًۢا بِالْغَيْبِ، یہ تو اٹکل کے تیر ہیں، یہ تو یقیناً رَدّ ہوگئے، یہ بات تو صحیح نہیں ہے، باقی! تیسرا قول جو نقل کیا کہ وہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا، اس کے بعد کوئی ایسا لفظ نہیں بولا جس سے اس کی تردید ہوتی ہو، اس لیے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے

ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو کہا کہ ان کی صحیح تعداد بہت کم لوگوں کو معلوم ہے، میں بھی ان تھوڑے لوگوں میں سے ہوں، اور مجھے پتا ہے کہ وہ سات تھے (عام تفاسیر)، تو اِس اُسلوب سے بھی اس کی کچھ تائید ہوتی ہے۔

زیادہ مدّت کے عدمِ اِحساس کے مزید دو واقعات

ان کا احساس چونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ماؤف کر دیا تھا، تو اتنی مدت گزرنے پر ان کو پتا نہ چلا کہ ہم اتنی دیر ٹھہرے ہیں، اور ایسی باتیں قرآنِ کریم میں دو جگہ اور بھی آتی ہیں، سورۂ بقرہ (آیت:۲۵۹) میں آپ کے سامنے حضرت عُزیر علیہ السلام والا واقعہ گزرا، جن کو اللہ تعالیٰ نے سو سال تک موت دیے رکھی، اور جب اُٹھے تو ان سے پوچھا کہ تم کتنی دیر ٹھہرے ہو؟ تو انہوں نے بھی کہا تھا: دِن یا دن کا بعض حصہ! اَوْ كَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰی قَرْیَةٍ کے تحت اس واقعے کا ذِکر آیا تھا۔ اور ایسے ہی سورۂ مؤمنون کے آخر میں آئے گا کہ جب لوگ قبروں سے اُٹھیں گے، تو ان سے پوچھا جائے گا کہ تم کتنی دیر ٹھہرے؟ تو وہ بھی ایسے ہی کہیں گے کہ دِن یا دِن کا بعض حصہ ٹھہرے ہیں، اتنی مدت گزرنے کا احساس نہیں ہوگا۔

کھانا لینے کے لئے ایک شخص کو بھیجنا اور اس کو اِحتیاط کی تلقین کرنا

تو رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ کا مطلب یہ ہو گیا کہ اس بحث میں نہ پڑو، اللہ بہتر جانتا ہے جتنی دیر تم ٹھہرے ہو، اس بحث میں پڑنے کا کوئی فائدہ نہیں، فَابْعَثُوْٓا: بھیجو تم اپنے میں سے ایک کو اپنی اس چاندی کے ساتھ، اپنے اس سکے کے ساتھ، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس کچھ پیسے موجود تھے، یہ طریقہ ہے کہ جس وقت انسان چلتا ہے تو کچھ زادِراہ بھی لے لیتا ہے، تو وہ بھی جاتے ہوئے کچھ پیسے اور کچھ اس قسم کی ضرورت کی چیزیں لے گئے تھے، تو اپنے ان پیسوں کی طرف اشارہ کر کے کہتے ہیں کہ یہ پیسے دے کے کسی کو بھیجو شہر کی طرف، اور جو بھی جائے وہ اس بات کا خیال رکھے کہ حلال کھانا لے کے آئے، وہ چونکہ سمجھتے تھے کہ یہ وہی ماحول ہے، وہی سارے کے سارے حالات ہیں، بتوں کے ذبیحے عموماً بکتے تھے، لوگ حرام کھاتے تھے، تو خیال تھا کہ شاید اب بھی ویسے ہی ہوگا، تو جیسے ہم پہلے بچ بچا کے چلتے تھے اور حلال طعام تلاش کرنے کی کوشش کرتے تھے، اب بھی جو کوئی لے کے آئے حلال کھانا لے کے آئے، کہیں حرام میں مبتلا نہ ہو جائے، اپنی طرف سے پوری تحقیق کرے، جس کے پاس اچھے سے اچھا کھانا، پاکیزہ سے پاکیزہ تر کھانا ملے، وہاں سے لے کے آئے...... پہلے رکوع میں جو آیا تھا: لِنَعْلَمَ اَیُّ الْحِزْبَیْنِ اَحْصٰی لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا، تو وہاں حزبین میں جو دو گروہ ذکر کیے گئے تھے تو ہو سکتا ہے کہ ان دو گروہوں سے یہی مراد ہوں جنہوں نے آپس میں گفتگو کی ہے، ان دونوں گروہوں میں سے کون اس مدت کا زیادہ احساس کرنے والا ہے۔ تو ان لوگوں کا قول حق کے زیادہ قریب ہوا جنہوں نے کہا کہ اللہ بہتر جانتا ہے کہ تم کتنا ٹھہرے، اور ایک دِن یا دِن کا بعض حصہ قرار دینے والوں کا قول ٹھیک نہ ہوا...... فَلْیَنْظُرْ اَیُّهَآ اَزْكٰی طَعَامًا: اَیُّهَا اَیْ اَیُّ اَهْلِهَا اَزْكٰی؟ وہ غور کرے کہ شہر کے رہنے والوں میں سے کون سا شخص زیادہ پاکیزہ ہے از روئے طعام کے، تو وہ جانے والا شخص تمہارے لیے اس طعام میں سے جو اَزکیٰ ہے، جو پاک صاف ستھرا ہے، اس میں سے تمہارے لیے رزق لے آئے۔

وَلْيَتَلَطَّفْ: اور اسے چاہیے کہ وہ بہت نرم روش اختیار کرے، خوش تدبیری سے جائے، کوئی ایسا حیلہ اختیار کرے کہ نقصان نہ ہو، بچ بچا کے چلے، اسے نرمی اختیار کرنی چاہیے، خوش تدبیری اختیار کرنی چاہیے، آپ کے قرآنِ کریم کے حاشیے میں لکھا ہوا ہوگا کہ "وَلْيَتَلَطَّفْ" پر قرآنِ کریم نصف ہو جاتا ہے حروف کے اعتبار سے، یعنی قرآنِ کریم میں جتنے حروف ہیں ان کے اعتبار سے یہاں آ کے قرآنِ کریم نصف ہو جاتا ہے۔

وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ أَحَدًا: اور تمہارے متعلق کسی کو خبر نہ ہونے دے، یعنی کوئی پہچان نہ سکے کہ یہ اسی جماعت کا فرد ہے، یہ تدبیر کیوں اختیار کی جائے؟ کہ اگر ان لوگوں کو پتا چل گیا، تو ہم تو ہیں ان کے باغی، اور ان سے علیحدہ ہو گئے ہیں، اگر وہ تم پر اطلاع پا گئے تو تمہیں پکڑ لیں گے، اور پکڑ کے یا تو سختی کر کے پتھر مار مار کے ماردیں گے، یا تمہیں مجبور کر کے اپنے دین کی طرف لوٹائیں گے، اور اگر تم اُن کے دین کی طرف لوٹ گئے تو کامیابی کا تو تصور ہی نہیں کیا جا سکتا، وَلَنْ تُفْلِحُوْا إِذًا أَبَدًا: تب تم کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتے، فلاح تمہیں نہیں ملے گی۔

لوگوں کا اور وقت کے بادشاہ کا اصحابِ کہف پر مطلع ہونا

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وَكَذٰلِكَ أَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ: انہوں نے تو بہت کوشش کی چھپنے کی، لیکن جس طرح سے ہم نے اپنی قدرت سے ان کو غار میں سلایا تھا، پھر وقت پر ان کو اُٹھایا، ہم نے اسی طرح سے لوگوں کو ان پر مطلع بھی کر دیا، مطلع کس طرح سے ہو گئے؟ واقعے کی تفصیل لکھی ہے کہ جس وقت وہ شخص بازار میں گیا، تو جا کے دیکھتا ہے کہ یہ تو شہر ہی بدلا ہوا ہے، اب تین سو سال میں کتنے تغیرات ہو جاتے ہیں، حکومتیں بدل گئیں، اب اہلِ حق کی حکومت تھی، جو اس وقت میں اہلِ حق تھے ان کی حکومت ہو چکی تھی، بُت پرستوں کا دور ختم ہو گیا تھا، وہ بازار نہیں، وہ دُکانیں نہیں، وہ حالات نہیں، تو اس نے ڈرتے بچتے جا کے کسی دُکان دار کے سامنے وہ پیسے پیش کیے کہ مجھے یہ چیز دے دو، تو وہ دیکھتا ہے کہ یہ تو سکہ ہی کوئی اور ہے، یہ تو ہمارے مُلک کا سکہ ہی نہیں، معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کو کہیں سے کوئی دفن شدہ خزانہ مل گیا ہے، بات شروع ہوئی تو دوسرے لوگ بھی اکٹھے ہو گئے، آہستہ آہستہ سارے شہر میں بات پھیل گئی، بادشاہ کو پتا چلا، تو اس کو بلایا گیا، تو چونکہ اِجمالی طور پر تذکرہ چلا آتا تھا کہ کچھ نوجوان اہلِ حق ایسے تھے جو حکومت کے ساتھ ٹکرائے، پھر بعد میں پتا نہیں کہاں چلے گئے، اور ان کے کچھ حالات لکھ کے بھی رکھے ہوئے تھے، لکھ کے رکھنے کا مطلب یوں ہوتا ہے کہ جس طرح ہمارے ہاں اشتہاری ملزم کے حالات لکھ کے رکھ لیتے ہیں کہ اب تو غائب ہو گیا، لیکن اس کی رپورٹ مرتب کر کے رکھ لیں کہ کسی وقت بھی وہ پکڑا جا سکتا ہے، اسی طرح سے ان کے بھی حالات لکھ کے رکھ لیے گئے تھے (جس کی بنا پر میں نے عرض کیا تھا کہ "رقیم" سے وہ لوح مراد ہے اور "اصحابِ رقیم" سے وہ لوح والے مراد ہیں، یاد ہوگا، اِبتدا میں میں نے اس کی تفصیل ذکر کی تھی) تو بادشاہ نے ان کی مِسل منگوائی ہوگی جو لکھ کے رکھی ہوئی تھی، تو حالات کا پتا چل گیا اور پکڑے گئے، اس آدمی سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ فلاں غار میں ہیں، اور چونکہ اب حکومت ان کے حق میں تھی، اس لیے بتلانے میں بھی کوئی حرج نہیں تھا، تو اس شخص نے بھی بتلا دیا ہوگا کہ میرے دوسرے ساتھی بھی اس غار میں ہیں۔

اَصحابِ کہف کا بیدار ہونا قیامت کی حقانیت کا ذریعہ بن گیا

اور اس وقت ان کا ظاہر ہونا ایک اور وجہ سے مفید ثابت ہوا، کہ اب بحث چل رہی تھی مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے کی، تو لوگ جس طرح سے اِشکال کیا کرتے ہیں تو وہ اِشکال کرتے تھے کہ کیسے ہوگا؟ کہ انسان اتنی مدت تک مرا رہے، اور پھر اس کو اُٹھا دیا جائے، پھر اس کا بدن ویسے ہی بن جائے، اتنی مدت میں تو اس کو کیڑے کھا جائیں گے، وہ تو ریزہ ریزہ ہوجائے گا، یہ ہوجائے گا، وہ ہوجائے گا۔ اور اہلِ حق کہتے تھے کہ اللہ کی قدرت سے کوئی بعید نہیں، اللہ تعالیٰ ذرّات کو بھی محفوظ رکھ سکتے ہیں، جب چاہیں گے دوبارہ بنا دیں گے، اس قسم کے جھگڑے اس وقت بعث بعد الموت کے متعلق چلے ہوئے تھے، قیامت کے بارے میں کوئی کچھ کہتا تھا، کوئی کچھ کہتا تھا، اور یہ واقعہ سامنے آ گیا تو اس میں اہلِ حق کی تائید ہوگئی کہ اللہ کی قدرت کتنی محیط ہے کہ اللہ چاہے تو برسہابرس تک اسی طرح سے محفوظ رکھ سکتا ہے، کہ کوئی ایک ذرّہ بھی ضائع نہ ہونے دے، تو اس سے اس مسئلے کی تائید ہوگئی، کیونکہ سونے کے بعد جی اُٹھنا یہ بھی ایک طرح سے موت کے بعد اُٹھنے کے برابر ہے، خاص طور پر اتنے برس سونے کے بعد، تو اہلِ حق کے لئے یہ واقعہ تائید کا ایک ذریعہ بن گیا، یہی ہے مطلب اس کا کہ ہم نے ان پر مطلع کر دیا تا کہ لوگ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے، اور ''اللہ کے وعدے'' سے مراد یہ ہے کہ قیامت کے آنے میں کوئی شک نہیں، قیامت ضرور آئے گی، اور اس میں اللہ تعالیٰ ان مُردوں کو دوبارہ اُٹھائے گا۔

اَصحابِ کہف کے قریب مسجد کیوں بنائی گئی؟

اب وہ بن گئے اس قوم کے بزرگ، اولیاء اللہ۔ کہتے ہیں کہ ملاقات ہونے کے بعد، حالات جس وقت معلوم گئے اس کے بعد وہ پھر دوبارہ اپنی غار میں چلے گئے اور وہیں ان کا انتقال ہوگیا۔ جب انتقال ہوگیا تو اب قوم میں بحث چلی کہ ان کی کوئی یادگار بنانی چاہیے، بعض لوگوں نے کچھ اور عمارت کا مشورہ دیا، لیکن جو اہلِ حکومت تھے جو اپنے معاملے میں غالب تھے، وہ کہنے لگے کہ ہم تو یہاں مسجد بنائیں گے۔ مسجد بنانے میں حضرت حکیم الاُمت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی ﷫ کے کہنے کے موجب ایک حکمت یہ ہوگی کہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ یہ لوگ عبادت گزار تھے، تا کہ آنے والے دور میں لوگ ان کو معبود نہ بنالیں۔ جیسے آپ نے دیکھا ہوگا کہ اولیاء اللہ کے جتنے مزار اَب بھی موجود ہیں، ان میں مسجد ضرور بنی ہوئی ہے، اور وہ مسجد اسی ولی کی طرف منسوب ہے کہ یہ اس کی مسجد ہے، تو اگر کوئی سمجھ دار آدمی ہو تو یہ سوچ سکتا ہے کہ اِس کو اگر درجۂ ولایت ملا ہے تو مسجد میں عبادت کرنے کی وجہ سے ملا ہے اور یہ عبادت گزار تھے، لیکن اب بات ایسے ہوگئی کہ قبریں تو آباد ہیں لیکن جن قبر والوں نے مسجد کے اندر سجدے کر کر کے اللہ سے اس مقام کو حاصل کیا تھا، وہ مسجدیں ویران ہیں، کبھی آپ کسی مزار میں چلے جائیں، لاہور چلے جاؤ، حضرت گنج بخش ﷫ کے ہاں چلے جاؤ، کسی دُوسری جگہ چلے جاؤ، مسجد ویران، اس میں کوئی رغبت نہیں، اور لوگ اسی قبر پہ جھکے ہوئے ہیں، اور اس بات کو کوئی نہیں سوچتا کہ جس قبر والے کی عظمت ہمارے دل میں ہے وہ اس مسجد میں اللہ کے سامنے جھکنے کی وجہ سے اس کو حاصل ہوئی ہے، تو تم بھی وہی طریقہ اپناؤ جو انہوں نے اپنایا تھا، اس مسجد میں عبادت کرنے کے ساتھ ان کو مقام حاصل ہوا تو

تمہیں اس طریقے پہ چلنا چاہیے جس ذریعے سے ان کو مقام حاصل ہوا ہے، وہ تو اللہ کے سامنے جھک کے سب کچھ لے گئے، اور تم ان کے سامنے جھک کے مردود ہو رہے ہو۔ تو مسجد کا پاس موجود ہونا یہ اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ یہ لوگ عبادت گزار تھے اور ان کو جو مرتبہ حاصل ہوا، عبادت کی وجہ سے حاصل ہوا۔ تو لوگ ان کو عابد سمجھیں معبود نہ سمجھیں، اس بات کی طرف اشارہ کرنے کے لئے وہاں مسجد بنانے کو ترجیح دی گئی، تاکہ ان کے عبادت گزار ہونے کی طرف اشارہ رہے۔

''جبکہ وہ لوگ جھگڑ رہے تھے آپس میں اِن اَصحابِ کہف کے معاملے میں، کہنے لگے کہ بنادو ان پر کوئی عمارت، ان کے اَحوال کو اللہ بہتر جانتا ہے، یا جھگڑنے والوں کے اَحوال کو اللہ بہتر جانتا ہے، کہا ان لوگوں نے جو اپنے معاملے پر غالب تھے کہ ہم ضرور بنائیں گے ان پر مسجد، یعنی ان کے قریب ہم مسجد بنادیں گے۔''

اَصحابِ کہف کی تعداد کے متعلّق مختلف آرا اور راجح قول

(سَیَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَۃٌ) اب ان کی تعداد کے بارے میں جھگڑا ہو گیا۔ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ تعداد کا مسئلہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے کہ قرآن اس کو قطعی طور پر طے کرے، کیونکہ تین ہوں، پانچ ہوں، آٹھ ہوں، زیادہ ہوں، جس مقصد کے لئے اس واقعے کو ذکر کیا جا رہا ہے اس میں کوئی فرق نہیں پڑتا، اللہ کی قدرت ہر حال میں نمایاں ہے تعداد چاہے کتنی ہو۔ تو لوگ کہیں گے وہ تین تھے، چوتھا ان کا کتا تھا، کوئی کہیں گے پانچ تھے، چھٹا ان کا کتا تھا، سب بے دیکھے نشانے لگا رہے ہیں، سب رجم بالغیب ہے، اٹکل کے تیر چلا رہے ہیں، اور ان کے سامنے کوئی تحقیقی بات نہیں ہے۔ ''اور کہیں گے یہ سات تھے، آٹھواں ان کا کتا تھا'' اس کے بعد کوئی تردید نہیں کی۔ ''آپ کہہ دیجئے کہ میرا ربّ ان کی گنتی کو بہتر جانتا ہے، اور نہیں جانتے انہیں مگر تھوڑے سے لوگ'' تو مفسرین کا رُجحان زیادہ تر ادھر ہی ہے کہ سَبْعَۃٌ والی بات زیادہ صحیح ہے، کیونکہ اس کے بعد اس کی تردید نہیں کی گئی، اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی اسی کو صحیح قرار دیا۔ اور ایک قَالَ، اور دو قَالُوْا سے بھی کچھ اس طرف اشارہ نکلتا ہے، جیسے میں نے آپ کی خدمت میں پہلے عرض کر دیا۔

اَصحابِ کہف کے ناموں کی برکت

اور یہ ''عاملین'' حضرات جو تعویذ گنڈے کیا کرتے ہیں، ان کے ہاں بھی یہ (سات کی تعداد) مروج ہے، کتابوں میں اَصحابِ کہف کے نام لکھے ہوئے ہیں، اور یہ تجربہ ہے، ہمارے اپنے بزرگوں میں بھی یہ معمول ہے، یہ کوئی غلط بات نہیں ہے کہ دوسرے لوگ ہی کرتے ہوں، ہمارے بزرگوں میں بھی یہ معمول ہے، ''بہشتی زیور'' میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہ تعویذ لکھا ہے کہ اَصحابِ کہف کے نام لکھ کر کسی مکان میں لٹکا دیے جائیں تو اس مکان میں جنّات کا اثر نہیں ہوتا، وہ مکان جنّات کے اثرات سے محفوظ ہو جاتا ہے، اور جہاں اس قسم کے اثرات ہیں تو وہاں جو تعویذ دیتے ہیں، اس میں اَصحابِ کہف کے نام لکھے ہوتے ہیں، اور ان کے نام مفسرین نے نقل کیے ہیں۔

نیک صحبت کی برکت

اور یہ کتا جوان کے ساتھ مل گیا تھا، دیکھو! اس کا بھی بار بار قرآنِ کریم میں ذکر آرہا ہے، تو اس کو یہ شرف حاصل ہو گیا کہ ان کے ساتھ ملا تو اللہ کی کتاب میں اس کا ذکر آ گیا، اور بار بار اس کا ذکر آرہا ہے، یہ شرف صحبت سے اس کو حاصل ہو گیا۔

فَلَا تُمَارِ فِيهِمْ إِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا: اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو ضروری بات تھی ہم نے بتا دی، اب غیر ضروری باتوں میں لوگوں سے جھگڑنے کی کوئی ضرورت نہیں، اور جو حق تھا ہم نے ظاہر کر دیا، اب دوسرے لوگ جو اس کے خلاف اس واقعے کو بیان کرتے تھے ان کی تردید ہو گئی، تو یہ سرسری سی بحث تو ہو گئی کہ ان کے خیالات کی تردید کے طور پر آپ یہ صحیح واقعہ پڑھ کے سنا دیجئے، بس اتنی سی بحث کیجئے، باقی! اگر وہ فضول آپ سے جھگڑنا چاہیں، اور بحث کرنا چاہیں تو کوئی ضرورت نہیں، حق ہم نے واضح کر دیا، واقعے کے ضروری ضروری اجزا سامنے آ گئے، اب بحث مباحثہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، نہ ان کے بارے میں کسی سے پوچھنے کی ضرورت ہے، اہم باتیں ہم نے بتا دیں، غیر اہم باتوں کے پیچھے نہ پڑو، یہ حاصل ہے اس آیت کا۔ ''نہ جھگڑا کیجئے ان کے بارے میں مگر سرسری سا جھگڑا'' سرسری سے جھگڑے سے مراد یہ ہے کہ جب آپ یہ واقعہ پڑھ کے سنائیں گے، ان کے خیالات کی تردید ہو گی، تو ابتدائی جھگڑا تو ہو گیا، لیکن اس کے بعد اگر وہ بحث مباحثے کا دروازہ کھولنا چاہیں تو ایسا نہ کرو، اب اپنے کام میں لگو۔ ''اور نہ اُن کے بارے میں اِن لوگوں میں سے کسی سے کچھ پوچھئے!''

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ

وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ﴿٢٣﴾ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ ۫ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ

ہرگز نہ کہا کر کسی شئ کے متعلق کہ بے شک میں اس کو کرنے والا ہوں کل ﴿٢٣﴾ مگر چاہنا اللہ کا، اور یاد کر تُو اپنے رَبّ کو

اِذَا نَسِیْتَ وَقُلْ عَسٰۤی اَنْ یَّهْدِیَنِ رَبِّیْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا ﴿٢٤﴾

جب تُو بھول جائے اور کہہ: اُمید ہے کہ راہنمائی کرے گا میری میرا رَبّ اس سے زیادہ قریب کی از روئے بھلائی کے ﴿٢٤﴾

وَلَبِثُوْا فِیْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِیْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا ﴿٢٥﴾ قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا

ٹھہرے وہ اپنی غار میں تین سو سال اور زیادہ ہو گئے وہ از روئے نو کے ﴿٢٥﴾ آپ کہہ دیجئے کہ اللہ خوب جانتا ہے ان کے

لَبِثُوْا ۚ لَهٗ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَبْصِرْ بِهٖ وَاَسْمِعْ ؕ مَا

ٹھہرنے کی مدت کو، اسی کے لئے ہے آسمانوں اور زمین کا غیب، وہ کیا خوب دیکھنے والا اور کیا خوب سننے والا ہے، نہیں ہے

لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ ۫ وَّلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا ۝۲۶ وَاتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ

ان لوگوں کے لئے اللہ کے علاوہ کوئی یار، اور نہیں شریک کرتا وہ اپنے فیصلے میں کسی کو ۝۲۶ اور پڑھتا رہ اپنے رَبّ کی کتاب کو جو

مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ۝۲۷

تیری طرف وحی کی گئی، کوئی بدلنے والا نہیں اللہ کی باتوں کو، ہرگز نہیں پائے گا اس اللہ کے علاوہ کوئی پناہ گاہ ۝۲۷

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ

روک کے رکھ اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ جو پکارتے ہیں اپنے رَبّ کو صبح شام، ارادہ کرتے ہیں وہ اللہ کی رضا کا،

وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ

اور نہ تجاوز کریں تیری آنکھیں ان لوگوں سے، اس حال میں کہ تو ارادہ کرتا ہو دُنیوی زندگی کی زیب و زینت کا، اور کہنا نہ مان اس شخص کا جس کے دِل کو ہم نے غافل کر دیا

عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ۝۲۸ وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۫

اپنی یاد سے اور وہ پیچھے لگ گیا اپنی خواہش کے اور ہے اس کا کام حد سے بڑھا ہوا ۝۲۸ اور کہہ کہ سچی بات تمہارے رَبّ کی طرف سے ہے،

فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۙ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا ۙ

پس جو شخص چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کُفر کرے۔ بے شک ہم نے تیار کیا ہے ظالموں کے لئے آگ کو،

اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا ۭ وَاِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ

احاطہ کرلیں گی ان کا اس آگ کی قناتیں، اگر وہ مدد طلب کریں گے تو مدد دیے جائیں گے ایسے پانی کے ساتھ جو

كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوْهَ ۭ بِئْسَ الشَّرَابُ ۭ وَسَآءَتْ مُرْتَفَقًا ۝۲۹ اِنَّ

تلچھٹ کی طرح ہوگا، بھون دے گا چہروں کو، بُرا ہے وہ پانی، اور بُری ہے وہ جگہ از روئے آرام گاہ کے ۝۲۹ بے شک

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا ۝۳۰ۚ

وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں بے شک ہم نہیں ضائع کرتے اس شخص کے اجر کو جو اچھا عمل کرے ۝۳۰

اُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ

یہی لوگ ہیں کہ ان کے لئے ہمیشگی کے باغات ہیں، جاری ہوں گی ان کے نیچے سے نہریں، پہنائے جائیں گے وہ ان باغات میں کنگن

مِنْ ذَهَبٍ وَّيَلْبَسُوْنَ ثِيَابًا خُضْرًا مِّنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى

سونے کے، اور پہنیں گے وہ کپڑے سبز رنگ کے، باریک ریشم کے اور موٹے ریشم کے، تکیہ لگانے والے ہوں گے ان باغات میں

الْاَرَآىِٕكِ ؕ نِعْمَ الثَّوَابُ ؕ وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا ﴿۳۱﴾

مزین تختوں کے اُوپر، یہ بہت اچھا بدلہ ہے اور وہ جنت بہت اچھی ہے از روئے آرام کی جگہ کے ﴿۳۱﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَايْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا: لَا تَقُوْلَنَّ نہی مؤکد ہے۔ ہرگز نہ کہا کر کسی شے کے متعلق کہ میں اس کو کرنے والا ہوں کل۔ غَدًا آنے والے کل کو کہتے ہیں، اور اس سے مراد ہوتا ہے مستقبل کا زمانہ۔ ہرگز نہ کہا کر کسی شے کے متعلق، بے شک میں اس کو کرنے والا ہوں کل، اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ: اَن مصدریہ ہے، لفظی معنی بنتا ہے مگر چاہنا اللہ، لیکن ترکیب اس کی اس طرح سے بنے گی کہ ''اِلَّا قَوْلًا مُتَلَبِّسًا بِمَشِيَّةِ اللهِ'' نہ کہا کر مگر ایسا کہنا جو اللہ کی مشیت کے ساتھ لگا ہوا ہو، یعنی جب بھی کہو تو یوں کہو کہ ''اگر اللہ نے چاہا تو میں یوں کرلوں گا''، ''میں یہ کام کروں گا ان شاء اللہ!'' اللہ کی مشیت کے ساتھ جوڑ کے بات کیا کرو، اس کا مفہوم یہ نکلے گا: ''اِلَّا قَوْلًا مُتَلَبِّسًا بِمَشِيَّةِ اللهِ'' چونکہ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ میں جو اَن مصدریہ آ گیا تو مَشِيَّةُ اللهِ والا معنی پیدا ہو گیا، تو ''قَوْلًا مُتَلَبِّسًا بِمَشِيَّةِ اللهِ'' اس سے مفہوم مکمل ہو گیا، ''ہرگز نہ کہا کرو کسی شیٔ کے متعلق کہ بے شک میں اس کو کرنے والا ہوں کل، مگر ایسے طور پر کہنا جو اللہ کی مشیت کے ساتھ لگا ہوا ہو'' یعنی اور کسی حال میں بات نہ کیا کر، جب بات کیا کر اللہ کی مشیت کے ساتھ متلبس کر کے بات کیا کر، یوں کہا کر کہ اللہ نے چاہا تو میں ایسا کروں گا، اللہ کی مشیت ہوئی تو میں ایسا کرلوں گا۔ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ: اور یاد کر تو اپنے رَبّ کو جب تو بھول جائے۔ وَقُلْ: اور کہہ عَسٰٓى اَنْ يَّهْدِيَنِ رَبِّيْ: عَسٰى افعال مقاربہ میں سے ہے۔ اُمید ہے کہ راہنمائی کرے گا میری میرا رَبّ۔ يَهْدِيَنِ اَىْ يَهْدِيَنِيْ۔ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا، اس سے زیادہ قریب کی، رَشَدًا، رَشدًا: درستی، بھلائی، اَقْرَبَ رَشَدًا جو زیادہ قریب ہوگا از روئے درستی کے، زیادہ قریب ہوگا از روئے بھلائی کے، هٰذَا کا اشارہ ہے اَصحابِ کہف کے واقعے کی طرف (مطلب اس کا پھر عرض کرتا ہوں)۔ وَلَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ: لَبِثَ يَلْبَثُ: ٹھہرنا۔ ٹھہرے وہ اپنی غار میں۔ کہف کا لفظ کئی دفعہ گزر گیا۔ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ تین سو سال وَازْدَادُوْا تِسْعًا: اور بڑھائے انہوں نے نو سال، بڑھا دیے انہوں نے نو۔ اِزْدَادَ: زیادہ ہونا۔ زیادہ ہو گئے وہ از روئے نو کے۔ قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا: بِمَا لَبِثُوْا میں ''ما'' مصدریہ ہے۔ آپ کہہ دیجئے کہ اللہ خوب جانتا ہے ان کے ٹھہرنے کو، یعنی ان کے ٹھہرنے کی مدت کو بِمُدَّةِ لُبْثِهِمْ۔ لَهٗ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: اسی کے لئے ہے آسمانوں اور زمین کا غیب۔ غیب مصدر ہے، غَابَ يَغِيْبُ چھپنے کو کہتے ہیں، اور مصدر بول کر مغیبات مراد ہوتی ہیں۔ زمین وآسمان کی سب چھپی ہوئی چیزیں اسی کے لئے ہیں، زمین وآسمان کے بھید اسی کے لئے ہیں۔ اَبْصِرْ بِهٖ وَاَسْمِعْ: اَبْصِرْ بِهٖ یہ فعل تعجب ہے۔ فعل تعجب کے دو صیغے آپ نے نحو میں پڑھے ہیں: مَا اَحْسَنَ زَيْدًا۔ اَحْسِنْ بِزَيْدٍ۔ مَا اَفْعَلَهٗ وَاَفْعِلْ بِهٖ یہ دو صیغے فعل تعجب کے

طور پر آیا کرتے ہیں، اور تعجب کا معنی ہوا کرتا ہے: مَآ اَحْسَنَ زَیْدًا، زید کیسا ہی خوبصورت ہے، زید کتنا خوبصورت ہے، تعجب کا اظہار یوں ہوتا ہے، اگرچہ ترکیب کرتے وقت آپ یوں کریں گے: اَیُّ شَیْءٍ اَحْسَنَ زَیْدًا، اس قسم کی توجیہات کریں گے، لیکن تعجب کا معنی یوں ہوتا ہے کہ زید کتنا خوبصورت ہے، زید کیسا خوبصورت ہے، تعجب کا اظہار یوں ہوتا ہے، اور یہی معنی ہوتا ہے اَحْسِنْ بِزَیْدٍ کا۔ اَحْسِنْ اگرچہ ظاہری طور پر اَمر کا صیغہ ہے لیکن یہاں یہ فعل تعجب کے طور پر استعمال ہوا ہے، تو اَبْصِرْ بِهٖ وَاَسْمِعْ یہاں یہ دونوں صیغے فعل تعجب کے ہیں، اور بِهٖ کی ضمیر اللہ کی طرف لوٹ رہی ہے، جیسے اَحْسِنْ بِزَیْدٍ کا معنی کیا تھا: زید کتنا خوبصورت ہے، اسی طرح سے یہاں معنی ہوگا کہ وہ اللہ کتنا اچھا دیکھنے والا ہے اور کتنا اچھا سننے والا ہے، کیا خوب دیکھنے والا ہے اور کیا خوب سننے والا ہے، فعل تعجب کے طور پر اس کا ترجمہ یوں کریں گے۔ اَبْصِرْ بِهٖ وَاَسْمِعْ: کیا خوب دیکھنے والا ہے وہ اللہ، کیا خوب سننے والا ہے۔ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِیٍّ: نہیں ہے ان لوگوں کے لئے اللہ کے علاوہ کوئی یار، وَّلَا یُشْرِكُ فِیْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا: اور نہیں شریک کرتا وہ اللہ اپنے فیصلے میں کسی کو، وَاتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْكَ: اُتْلُ یہ اَمر کا صیغہ آ گیا تَلَا یَتْلُوْ سے، تلاوت کرنا، پڑھنا۔ پڑھ جو کچھ وحی کیا گیا تیری طرف، مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ تیرے رَبّ کی کتاب سے، مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ یہ مَآ کا بیان ہے، مَآ موصولہ ہے، تو جس وقت اس کو مَآ کے ساتھ جوڑ لوگے تو ترجمہ یوں ہوگا "تیرے رَبّ کی جو کتاب تیری طرف وحی کی گئی اس کو پڑھتا رہ۔" یہ اَمر گویا کہ دوام کے لئے ہے، پڑھتا رہ اپنے رَبّ کی کتاب کو جو تیری طرف وحی کی گئی، دونوں کو جوڑ کے ترجمہ یوں کریں گے لفظی ترجمہ جس طرح سے آپ کیا کرتے ہیں، یوں ہوجائے گا "تلاوت کر اس چیز کی جو وحی کی گئی تیری طرف تیرے رَبّ کی کتاب سے۔" لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ: لائے نفی جنس ہے۔ کوئی بدلنے والا نہیں اللہ کی باتوں کو، اللہ کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں، وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا: ہرگز نہیں پائے گا تو اس اللہ کے علاوہ کوئی پناہ گاہ۔ اِلْتِحَاد: لحد سے لیا گیا ہے، لحد ایک جانب ہٹنے کو کہتے ہیں، اور ملحد اسی شخص کو کہا جاتا ہے جو سیدھا راستہ چھوڑ کے ایک طرف کو ہٹ جائے، اور قبر کی جو لحد ہے اس کو بھی اسی لیے لحد کہتے ہیں کہ وہ ایک طرف کو کھودی ہوئی ہوتی ہے، تو ملتحد: ایک طرف کو ہٹنے کی جگہ، کہ اللہ کے عذاب سے تم ایک طرف کو ہٹنے کے لئے کوئی جگہ پالو، بچنے کی جگہ تمہیں مل جائے، ایسا نہیں ہوگا۔ وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِیِّ: روک کے رکھ اپنے نفس کو۔ صبر اصل کے اعتبار سے حبس اور روکنے کو کہتے ہیں، پابند رکھ اپنے آپ کو، روک کے رکھ اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ جو پکارتے ہیں اپنے رَبّ کو صبح و شام۔ غداۃ: صبح۔ عشی: شام۔ پابند کر کے رکھ اپنے آپ کو، بند کر کے رکھ اپنے آپ کو، روکے رکھ اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ جو پکارتے ہیں اپنے رَبّ کو صبح و شام۔ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَهٗ چاہتے ہیں وہ اس کی رضا۔ لفظی ترجمہ ہے "ارادہ کرتے ہیں وہ اس رَبّ کے چہرے کا" ارادۂ وجہ سے مراد ہوتا ہے کہ اس کی رضا چاہتے ہیں، ان کو اپنا رَبّ مقصود ہے، ارادہ کرتے ہیں وہ اللہ کی رضا کا، جیسے آپ کہا کرتے ہیں کہ میں نے یہ کام لوجہ اللہ کیا ہے، تو وہاں مطلب یہی ہوتا ہے کہ اللہ کی ذات کو سامنے رکھتے ہوئے میں نے یہ کام کیا ہے، میرا کوئی اور مقصود نہیں ہے، تو اللہ کی ذات کو سامنے رکھتے ہوئے کام کرنا، یعنی اللہ کو راضی رکھنے کے لئے کام کرنا، اس کے حکم کی رعایت رکھتے ہوئے کام کرنا۔ ارادہ کرتے ہیں وہ اللہ کے وجہ کا۔ وَلَا تَعْدُ عَیْنٰكَ عَنْهُمْ: عَدَا یَعْدُوْ: تجاوز کرنا۔ عَیْنٰكَ یہ لَا تَعْدُ کا فاعل ہے۔ نہ بڑھیں تیری آنکھیں، نہ تجاوز کریں تیری آنکھیں ان لوگوں سے، تُرِیْدُ زِیْنَةَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا یہ جملہ حال ہے۔ اس حال

میں کہ تو ارادہ کرتا ہو دُنیوی زندگی کی زیب وزینت کا، چاہتا ہو تو دُنیوی زندگی کی زیب وزینت۔ وَلَا تُطِعْ: یہ نہی ہے۔ اور اطاعت نہ کر، کہنا نہ مان، مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ: اس شخص کا جس کے دل کو ہم نے غافل کر دیا عَنْ ذِكْرِنَا: اپنی یاد سے، وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ: اور وہ پیچھے لگ گیا اپنی خواہش کے، ہوٰی خواہش کو کہتے ہیں، وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا: اور ہے اس کا کام حد سے بڑھا ہوا۔ فُرُط اس کام کو کہا جاتا ہے جو اعتدال پر نہ ہو، اعتدال سے نکل جائے، بے اعتدالی میں آ جائے، حد سے بڑھا ہوا، ''اس کا امر حد سے بڑھا ہوا ہے'' (نسفی)۔ اور اگر اس کو مصدر کے معنی میں لے لیں تو پھر معنی ہوگا'' ہے اس کا کام حد سے بڑھنا'' (عام تفاسیر) یعنی اس شخص کا کام ہے کہ حد سے بڑھتا ہے، حدود سے تجاوز کرتا ہے، حد پر نہیں رہتا۔ وَقُلِ: اور آپ کہہ دیجئے اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ: واقعی بات، سچی بات جو واقع کے مطابق ہے تمہارے رَبّ کی طرف سے ہے فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ: پس جو کوئی شخص چاہے ایمان لائے وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ اور جو کوئی چاہے کُفر کرلے۔ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا: بے شک ہم نے تیار رکیا ہے ظالموں کے لئے آگ کو، اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا: سرادق ''سراپردے'' کو کہتے ہیں، جس طرح سے خیمے لگا کے اردگرد قناتیں لگائی جاتی ہیں پردے کے لیے اس کو سرادِق کہتے ہیں۔ سرادِق: سراپردہ (آلوسی)۔ قنات کے ساتھ ترجمہ کرلیا جائے وہ بھی ٹھیک ہے۔ ''احاطہ کرلیں گی ان لوگوں کا اس آگ کی قناتیں'' یعنی اردگرد آگ کی دیواریں اور پردے ان کو گھیرے ہوئے ہوں گے جس سے وہ نکل نہیں سکیں گے، ''احاطہ کرلیں گی ان کو اس آگ کی قناتیں۔'' وَاِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا: اِسْتِغَاثَ: مدد طلب کرنا۔ اگر وہ فریاد کریں گے، اگر وہ غوث طلب کریں گے، اگر مدد طلب کریں گے تو مدد دیے جائیں گے، اگر وہ فریاد رسی چاہیں گے تو وہ فریاد رسی کیے جائیں گے، بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ ایسے پانی کے ساتھ جو مهل کی طرح ہوگا۔ مهل پگھلے ہوئے تانبے کو بھی کہتے ہیں، اور تیل کے نیچے جو میل کچیل بیٹھی ہوتی ہے یعنی تلچھٹ، اس کو بھی کہتے ہیں۔ جو تلچھٹ کی طرح ہوگا یا پگھلے ہوئے تانبے کی طرح ہوگا، يَشْوِي الْوُجُوْهَ بھون دے گا چہروں کو، شوٰی یشوِی شَیًّا بھوننا۔ بِئْسَ الشَّرَابُ، شراب پینے کی چیز کو کہتے ہیں اور اس سے پانی مراد ہے، بُرا ہے وہ پانی۔ وَسَآءَتْ مُرْتَفَقًا اور بُری ہے وہ آگ ازروئے آرام گاہ کے۔ مرتفق اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں انسان سہارا لیتا ہے، آرام لیتا ہے، یہ جہنّم جو ان کو آرام کے لئے جگہ ملے گی بہت بُری جگہ ہے، ''بری ہے وہ جگہ ازروئے آرام گاہ کے۔'' اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بے شک وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں، اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا بے شک ہم نہیں ضائع کرتے اس شخص کے اجر کو جو اچھا عمل کرے، جو اچھا عمل کرے ہم اس کے اجر کو ضائع نہیں کرتے۔ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ: یہی لوگ ہیں کہ ان کے لئے ہمیشگی کے باغات ہیں، تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ: جاری ہوں گی ان کے نیچے سے نہریں، يُحَلَّوْنَ فِيْهَا: حَلّٰی یُحَلِّی تَحْلِیَةً: آراستہ کرنا، زیور پہنانا، حِلیہ زیور کو کہتے ہیں۔ زیور پہنائے جائیں گے وہ ان باغات میں مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ: ذَهَب کہتے ہیں سونے کو۔ سِوار کہتے ہیں کنگن کو، اس کی جمع آتی ہے اَسْوِرَةٌ، اور اَسْوِرَةٌ کی جمع اساوِر، یہ جمع الجمع ہے۔ پہنائے جائیں گے وہ ان باغات میں کنگن سونے کے۔ وَيَلْبَسُوْنَ ثِيَابًا: اور پہنیں گے وہ کپڑے خُضْرًا سبز رنگ کے۔ یہ اخضر کی جمع ہے، سبز۔ مِّنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ، سندس کہتے ہیں باریک ریشم کو، اور استبرق کہتے ہیں موٹے ریشم کو۔ سُنْدُس: باریک ریشم، اِسْتَبْرَق: اور موٹا ریشم۔ مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا: اِتِّکَاء: ٹیک لگا کے بیٹھنا، جیسے تکیہ پڑا ہو اور اس کے ساتھ ٹیک لگا کے انسان بیٹھتا ہے تو بہت آرام کی نشست ہوتی ہے۔ ٹیک لگا کے بیٹھنے والے ہوں گے، تکیہ

لگانے والے ہوں گے ان باغات میں، عَلَی الْاَرَآئِکِ، یہ اَرِیْکَۃٌ کی جمع ہے، اریکۃ کہتے ہیں مزین تخت کو، آراستہ تخت۔ مزین تخت کے اُوپر ٹیک لگانے والے ہوں گے، تکیہ لگانے والے ہوں گے، نِعْمَ الثَّوَابُ: بہت اچھا بدلہ ہے۔ ثواب بدلے کو کہتے ہیں۔ وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا، اور وہ جنت بہت خوبصورت ہے از روئے آرام کی جگہ کے، بہت اچھی ہے از روئے آرام کی جگہ کے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط

واقعہ چلا آرہا تھا اَصحابِ کہف کا، اور پچھلی آیتوں میں ذِکر کیا گیا تھا کہ ان کی تعداد کے بارے میں لوگوں کا اختلاف ہے، کوئی تین کہتا ہے اور چوتھا اُن کا کتا قرار دیتا ہے، کوئی پانچ کہتا ہے اور چھٹا ان کا کتا قرار دیتا ہے، یہ سب بے تحقیق باتیں ہیں، رَجْمًا بِالْغَیْبِ: بے تحقیق باتیں۔ یہ انکل کے تیر ہیں، بن دیکھے یہ پتھر پھینکتے ہیں جو نشانے پہ لگنے والا نہیں ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ سات ہیں اور آٹھواں ان کا کتا ہے، اور اس کے بعد تردید نہیں ہے، تو راجح یہی قرار دیا گیا تھا کہ ان کی تعداد سات ہے۔ اور پھر منع کردیا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی بیان کردہ تعداد پر ہی بس اعتماد کریں، کسی کے ساتھ جھگڑنے کی کوشش نہ کریں۔ سرسری سی بحث تو ہوگئی، کہ ان کے خیالات کی تردید ہوگئی، بس! وہ آگے اُلجھنا چاہیں تو کہو کہ اللہ تعالیٰ ان کی گنتی کو بہتر جانتا ہے، گنتی کے اوپر مقصد موقوف نہیں، اللہ کی قدرت اور اُن کی کرامت، تین، پانچ، سات جتنے بھی ہوں، ہر صورت میں نمایاں ہے، اس لیے قرآنِ کریم نے صراحتًا اس سے تعرض نہیں کیا، اب آگے دو آیات کے بعد ان کے ٹھہرنے کی مدت کا ذِکر آرہا ہے کہ وہ اپنی غار کے اندر تین سو نو سال ٹھہرے۔

غار میں اَصحابِ کہف کی مدّتِ قیام کی تفصیل

اب یہ جو ٹھہرنے کی مدت ذکر کی گئی ہے، اس میں مفسرین کی دونوں رائے ہیں، بعض تو کہتے ہیں کہ جس طرح سے پیچھے عدد کے متعلق ذکر کیا گیا کہ یہ لوگوں کے اقوال ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے کوئی قطعی فیصلہ نہیں دیا کہ ان کی تعداد کتنی تھی، اگرچہ اشارہ نکلتا ہے، اسی طرح سے آگے وَلَبِثُوْا فِیْ کَہْفِہِمْ کا ذکر جو آرہا ہے کہ وہ اپنی غار کے اندر تین سو نو سال ٹھہرے، یہ بھی یَقُوْلُوْنَ کا مقولہ ہے کہ لوگ یوں کہتے ہیں، لوگ کہتے ہیں کہ تین سو نو سال ٹھہرے، آپ ان کے جواب میں یہ کہہ دیجئے کہ ان کے ٹھہرنے کی مدت کو اللہ بہتر جانتا ہے، تو گویا کہ ان کے ٹھہرنے کی مدت کے ساتھ بھی قرآنِ کریم نے صراحتًا تعرض نہیں کیا، بعض حضرات نے یہ تفسیر بھی کی ہے، حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے اسی طرح منقول ہے (ابن کثیر)، اور ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے بھی ایک اثر اسی طرح نقل کیا گیا ہے، کہ لَبِثُوْا اللہ کی طرف سے خبر نہیں، بلکہ یہ بھی لوگوں کا مقولہ نقل کیا جارہا ہے کہ لوگوں میں یوں مشہور ہے (آلوسی)، باقی اس مدت کے ساتھ قرآنِ کریم نے صراحتًا تعرض نہیں کیا کہ کتنی مدت وہ ٹھہرے۔ لیکن جمہور مفسرین، مفسرین کی اکثریت ادھر ہے کہ لَبِثُوْا

کَہْفِہِمْ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر دی گئی ہے کہ وہ اپنی غار کے اندر تین سو سال ٹھہرے (نسفی وغیرہ)، وَازْدَادُوْا تِسْعًا: اور انہوں نے نو کو زیادہ کر دیا۔ اب یہ مجموعہ بن گیا تین سو نو۔ وَازْدَادُوْا تِسْعًا اس کو علیحدہ کر کے ذکر کیا، کہتے ہیں کہ اگر شمسی مہینوں کی رعایت رکھی جائے تو تین سو سال، اور اگر قمری مہینوں کی رعایت رکھی جائے تو نو سال اُوپر ہیں (عام تفاسیر)۔ یہ مسئلہ آپ جانتے ہیں کہ جو سال شمسی مہینوں سے بنتا ہے، یعنی جنوری مارچ اپریل، اسی طرح چیتر، بیساکھ، جیٹھ، ہاڑ، یہ جو دیسی مہینے ہیں، یہ سال تقریباً گیارہ دن لمبا ہے (دس دِن، اکیس گھنٹے۔ ناقل)۔[1] اور جو چاند دیکھنے کے ساتھ سال بنتا ہے یہ تقریباً گیارہ دن کم ہے، یہی وجہ ہے کہ چاند کے مہینے بدلتے رہتے ہیں، گرمیوں میں سردیوں میں، اب رمضان شریف گرمیوں میں آرہا ہے، اگست سے نکل گیا جولائی میں چلا گیا، آگے جولائی سے نکلے گا جون میں آجائے گا، اور جس وقت پاکستان بنا تھا اس وقت رمضان المبارک اگست میں تھا، تو تین سال کے بعد تقریباً یہ ایک مہینے سے نکل جاتا ہے، اس نکلنے کی وجہ یہی ہے کہ چاند کا سال چھوٹا ہے اور سورج کا سال بڑا ہے، اور تقریباً تینتیس سال کے بعد ایک سال کا فرق پڑ جاتا ہے، جس وقت سورج کے مہینوں کے ساتھ تینتیس سال پورے ہوں گے تو چاند کے مہینوں کے ساتھ چونتیس سال پورے ہو جاتے ہیں، تو سو سال کے اندر تین کا اضافہ ہو گیا کسر کو حذف کر کے، تو تین سو سال کے اندر نو سال کا اضافہ ہو جائے گا کسر کو حذف کر کے، یعنی کچھ دِنوں کا اور کچھ مہینوں کا فرق پڑے گا۔[2] لیکن کسر کا اعتبار نہ کیا جائے تو سو سال میں تین سال کا فرق پڑے گا، جس وقت ۳۳ سال میں ایک سال کا فرق پڑا، تو ننانوے سال میں اصل میں تین سال کا فرق پڑا، تو یہ چند دِنوں کا فرق پڑے گا، باقی حساب ٹھیک رہ جاتا ہے، تو قمری مہینوں سے حساب کریں تو تین سو نو بن جاتے ہیں...... اور بعض حضرات یوں کہتے ہیں کہ اصل میں تین سو سال تو وہ ٹھہرے اس مدت میں جس میں وہ چھپے ہوئے تھے اور لوگوں کو پتا نہیں تھا، اور تین سو سال کے بعد ان کے اُوپر اطلاع ہوگئی، جس کا واقعہ آپ کے سامنے آیا کہ وہ کھانا لینے کے لئے گئے اور پہچانے گئے، اور لوگوں کے اطلاع پانے کے بعد پھر ان کا قیام اپنے غار کے اندر نو سال رہا تو چونکہ دو مدتوں میں یہ فرق آگیا کہ پہلا تین سو سال ٹھہرنا تو تھا چھپنے کی حالت میں، جب لوگوں کو پتا نہیں تھا، اور نو سال بعد میں رہے، اس کے بعد پھر ان کی وفات ہوگئی۔ اس لیے دونوں عددوں کو علیحدہ علیحدہ کر کے ذِکر کر دیا گیا، کہ تین سو سال ٹھہرے، پھر اس کے بعد انہوں نے اُوپر نو اور بڑھا دیے، یعنی نو سال بعد میں قیام کیا، اور اس کے بعد ان کی وفات ہوگئی۔

واقعہ ذِکر کرنے کا مقصد

تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ خبر دی گئی ہے، اور اس خبر دینے میں یہ نمایاں کرنا مقصود ہے کہ دیکھو! جو لوگ اللہ پر اعتماد کرتے ہیں، اور اللہ کے دِین کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ ان کو غیبی مدد کس طرح سے دیتا ہے، دشمنوں سے ان کی حفاظت کس طرح سے کرتا ہے، اور ان کا اچھا انجام کس طرح سے سامنے آتا ہے، اس واقعے کے ضمن میں، جیسے آپ کی

(۱) شمسی سال ۳۶۵ دن، ۵ گھنٹے، ۴۹ منٹ کا ہوتا ہے، اور ہر چوتھا سال ۳۶۶ دن کا شمار ہوتا ہے۔ اور قمری سال ۳۵۴ دن، ۸ گھنٹے، ۴۸ منٹ کا ہوتا ہے (آلوسی)۔
(۲) نو سال کے اُوپر ۳۷ دن، ۹ گھنٹے، ۴۸ منٹ بنتے ہیں (تفسیر آلوسی)۔

خدمت میں ذکر کیا گیا تھا، اور بعث بعد الموت کے لئے بھی یہ ایک دلیل بن گئی۔ بہر حال یہ لوگوں کا قول ہو یا اللہ تعالیٰ کا قول ہو، شروع میں جس وقت واقعہ آیا تھا تو وہاں تھا فَضَرَبْنَا عَلٰٓی اٰذَانِهِمْ فِی الْكَهْفِ سِنِیْنَ عَدَدًا، تو چند سال کا ذکر تو وہاں بھی ہے، اتنی بات متیقن ہے کہ ان کا سونا، اور ان کا وہاں رہنا سالوں تک محیط تھا، یہ چند گھنٹوں یا چند دنوں کی بات نہیں تھی، اور یہ سوئے کتنی مدت؟ اور جاگتے کتنی مدت رہے؟ اس کے بارے میں بھی کوئی صراحت نہیں، کیونکہ یہاں تو غار میں ٹھہرنے کا ذکر ہے، باقی! جاگنے کے بعد کتنی دیر کے بعد سو گئے تھے؟ اور اُٹھنے سے کتنی دیر بعد انہوں نے کھانا لینے کے لیے بھیجا؟ یہ گھنٹوں منٹوں کا حساب کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تو دو عدد بولنے کی یہ وجہ ہوگئی، کہ علیحدہ علیحدہ کر کے اس کو کیوں بیان کیا گیا، تین سو، اور نو، یا تو شمسی اور قمری مہینوں کے اعتبار سے فرق ڈالا گیا، یا یہ ہے کہ اطلاع ملنے کے بعد نو سال ٹھہرے، اور اطلاع سے قبل تین سو سال ٹھہرے، اس لیے دونوں عدد علیحدہ علیحدہ ذکر کر دیے گئے۔ تو وہاں دو آیات کے بعد جا کے یہ واقعہ پورا ہو جائے گا۔

''وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ'' کا شانِ نزول

اور درمیان میں سرورِ کائنات ﷺ کو ایک نصیحت کی گئی ہے، اور اس نصیحت کے بارے میں شانِ نزول یہ ذکر کیا گیا ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ سے جب لوگوں نے یہ واقعہ پوچھا تھا، تو آپ نے اس اعتماد پر کہ اللہ کی طرف سے اطلاع آ جائے گی، وعدہ کر لیا کہ میں اس کا جواب کل دوں گا، اور پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی میں تاخیر ہوگئی، جس کی بنا پر آپ کو بہت پریشانی ہوئی، پندرہ دن کے بعد یہ آیات اُتریں (ابنِ کثیر، آلوسی)، جس میں آئندہ کے لئے یہ نصیحت کر دی گئی کہ کبھی اس طرح سے وعدہ نہ کرو جس سے معلوم ہو کہ آپ کے کچھ اختیار میں ہے، یا آپ یوں کر سکتے ہیں، بلکہ آنے والے وقت کے متعلق جب بھی بات کرو، اللہ کی مشیت کو ساتھ ذکر کرو، کہ اگر اللہ نے چاہا تو میں ایسا کر لوں گا، جس سے گفتگو میں یہ معلوم ہو کہ انسان کے اپنے اختیار میں کچھ نہیں، اللہ کی طرف سے توفیق ہوگی تو کام ہو جائے گا، ورنہ نہیں۔

دورانِ کلام ''اِن شاء اللہ'' کہنے کے مسائل

اس لیے کلام کے اندر برکت کے طور پر ''اِن شاء اللہ'' کہنا مستحب ہے، اور جس وقت انسان ''اِن شاء اللہ'' کہتا ہے تو گویا کہ اپنے آپ کو بے اختیار ظاہر کرتا ہوا ہر کام کا مدار اللہ کی مشیت پر رکھتا ہے، کہ میرے بس میں کچھ نہیں، اللہ چاہے گا تو یوں ہو جائے گا، اگر اللہ نے نہ چاہا تو نہیں ہوگا۔ اور اگر کلام کرتے وقت، بات کرتے وقت کہنا یاد نہیں رہا، نسیان طاری ہو گیا تو جب یاد آ جائے اسی وقت کہہ لے، تاکہ پہلے کا تدارک ہو جائے، لیکن یہ ''ان شاء اللہ'' جو برکت کے لئے کہنا ہے وہ تو بعد میں بھی کہا جا سکتا ہے، اور آپ فقہ کے اندر پڑھیں گے کہ ایک ''ان شاء اللہ'' تعلیق کے لئے ہوتا ہے، جیسے قسم کھاتے ہوئے اور طلاق دیتے ہوئے ''ان شاء اللہ'' کہہ دیا جائے تو قسم اور طلاق واقع نہیں ہوتی، فقہ کے اندر آپ یہ مسئلہ پڑھیں گے، تو وہ کلام کے ساتھ متصل ہونا ضروری ہے، وہاں فصل جائز نہیں ہے، کہ اگر کسی نے ایک دفعہ اپنی بیوی کو کہہ دیا کہ تجھے طلاق، اور پھر بعد میں دیر کے ساتھ ''اِن شاء اللہ'' کہتا ہے تو اس کا اثر نہیں پڑے گا، وہاں متصل ہونا ضروری ہے، اگر متصل نہیں کرے گا تو ایسی صورت میں کہنا بے کار

ہو جائے گا، ہاں! البتہ جو برکت کے طور پر کہا جاتا ہے وہ بعد میں بھی کہا جا سکتا ہے، اگر بات کرتے وقت آپ کو یاد نہیں رہا تو جب دھیان آئے اسی وقت کہہ دو ''اِن شاء اللہ'' اللہ کو منظور ہوا تو ایسا کرلوں گا۔

قرآنی واقعات دلائلِ نبوّت ہیں

(وَقُلْ عَسٰۤى اَنْ یَّهْدِیَنِ رَبِّیْ) اور مشرکینِ مکہ نے چونکہ حضور ﷺ پر سوال کیا تھا، اور اس واقعے کو نبوّت کے امتحان کے طور پر پوچھنا چاہتے تھے، تو آپ ﷺ کو یہ فرما دیا گیا کہ آپ انہیں کہہ دیجئے کہ یہ اصحابِ کہف کا واقعہ کیا واقعہ ہے، مجھے تو اللہ کی رحمت سے اُمید ہے کہ میری نبوّت کی دلیل بننے کے لئے اس سے بھی زیادہ اقرب، اس سے بھی زیادہ نزدیک، جو اور زیادہ واضح دلیل ہوگی، اللہ تعالیٰ میری اس کی طرف راہنمائی کریں گے، جیسے یہ واقعہ بیان کر دیا، اور اس واقعے کی تفصیل، یہ بھی میری نبوّت کی دلیل ہے۔ لیکن اس سے زیادہ اَقرب از روئے دلیلِ نبوّت بننے کے۔ رَشَدًا کا یہاں ''بیان القرآن'' میں یہ مفہوم بیان کیا گیا ہے، میری نبوّت پر دلیل بننے کے اعتبار سے، تو رَشَدًا کا معنی ہوگا: ''اِرشادًا لِلنَّاسِ اِلٰی نُبُوَّتِیْ'' (آلوسی) لوگوں کے لئے میری نبوّت کی طرف راہنمائی کرنا۔ ارشاد کے اعتبار سے، دلیل بننے کے اعتبار سے کہ جس سے میری نبوّت ثابت ہو، اس سے بھی زیادہ اقرب واقعے کی طرف اللہ تعالیٰ میری راہنمائی فرمائیں گے۔ اور قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے اُممِ سابقہ کے جتنے واقعات بیان فرمائے ہیں، وہ سارے کے سارے اصحابِ کہف کے مقابلے میں زیادہ اَقرب ہیں دلیل بننے کے اعتبار سے، کیونکہ اصحابِ کہف کا واقعہ تو حضور ﷺ کے زمانے کے بالکل قریب پیش آیا تھا، اور حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے کے واقعات، اور اسی طرح دوسرے واقعات اس اعتبار سے زیادہ دلیل بنتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ان کو صحیح صحیح بیان کر دیا حالانکہ ان کا کسی تاریخ کے اندر ذِکر نہیں ہے، اور نہ لوگ ان واقعات کو جاننے والے ہیں، تو ان کو ایسی تفصیلات کے ساتھ ذِکر کرنا، یہ حضور ﷺ کی نبوّت کی زیادہ واضح دلیل ہے بمقابلہ اصحابِ کہف کے (آلوسی)...... بہرحال یہ درمیان میں نصیحت کر دی گئی تھی کہ جب بھی کوئی بات کرو، آنے والے وقت کے متعلق وعدہ کرو کہ میں یہ کام کروں گا تو ساتھ اللہ کی مشیت کو ضرور ذکر کر دیا کرو۔

اس عدد (۳۰۹) کے ذِکر کے بعد یہاں بھی وہی بات ہے کہ کسی سے جھگڑنے کی اور بحث کرنے کی ضرورت نہیں، جس وقت آپ یہ ظاہر کریں کہ وہ تین سو نو سال ٹھہرے، اور لوگ آپ سے جھگڑا کرنا چاہیں کہ اتنا نہیں ٹھہرے، اس سے زیادہ ٹھہرے یا اس سے کم ٹھہرے، تو آپ یہ کہہ کے بات کو ختم کر دیجئے کہ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا، ان کے ٹھہرنے کی مدت کو اللہ خوب جانتا ہے، لہٰذا جو اللہ نے بیان کر دی وہی صحیح ہے، اور تمہارے شکوک وشبہات کا کوئی اعتبار نہیں، تمہاری روایتوں کا کوئی اعتبار نہیں، گویا کہ اللہ کے علم کا حوالہ دے کے اس بحث کو ختم کر دیا گیا...... اگلے الفاظ میں اللہ کے علم کی وسعت کو ذکر کر دیا کہ زمین اور آسمان کی چھپی ہوئی چیزیں جتنی ہیں وہ سب اللہ کے لیے ہیں، اللہ کے سامنے کوئی چیز مخفی نہیں، لوگوں کے سامنے چیزیں غائب ہیں پوشیدہ ہیں، لیکن اللہ کے سامنے کوئی چیز غائب اور پوشیدہ نہیں ہے، جتنی بھی چھپی ہوئی چیزیں ہیں سب اللہ کے لیے ہیں، وہ کیا ہی اچھا دیکھنے والا ہے اور کیا ہی خوب سننے والا ہے، اَبْصِرْ بِهٖ وَاَسْمِعْ فعل تعجب ہے۔ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِیٍّ: یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے وضاحت ہو جانے

کے بعد بھی جولوگ تسلیم نہ کریں، ان کے لئے یہ دھمکی ہے کہ ان کے لئے اللہ کے علاوہ کوئی یار اور مددگار نہیں۔ولی: مختار، یار، مددگار کو کہتے ہیں۔اور اللہ تعالیٰ اپنے فیصلے میں اور حکم میں کسی کو شریک بھی نہیں کرتا، کہ اگر اللہ تعالیٰ پکڑنا چاہے تو کسی سے پوچھے کہ میں پکڑوں یا نہ پکڑوں؟ یا اللہ تعالیٰ کوئی فیصلہ کرے تو اس کا کوئی شریک آ کے اس فیصلے کو منسوخ کروالے، ایسی بات نہیں، اس لیے جب اللہ تعالیٰ گرفت کرے گا، تو کوئی چھڑا نہیں سکتا۔

فتنۂ دجال سے محفوظ رہنے کا نسخہ

اور آگے پھر حضور ﷺ کو تاکید ہے (وَاتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ) کہ آپ ان کے ساتھ الجھنے کی بجائے جو رَبّ کی کتاب آپ کی طرف وحی کر دی گئی، اس کو آپ پڑھتے رہیں، اس کی تلاوت کرتے رہیں۔اور سید مناظر احسن گیلانی ﷫ جن کا ذکر میں نے پہلے آپ کے سامنے کیا تھا، کہ انہوں نے سورۂ کہف کی تفسیر اس نکتے کو سامنے رکھتے ہوئے لکھی ہے کہ فتنۂ دجال کے ساتھ اس سورت کی مناسبت کیا ہے؟ اور اس فتنے سے بچنے بچانے کے لئے اس سورۃ نے ہمیں کیا ہدایات دی ہیں؟ وہ ان آیات کو بھی اسی فتنے کے ساتھ جوڑتے ہیں، اور فرماتے ہیں کہ یہاں اللہ تبارک وتعالیٰ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جب دجالی فتنہ آجائے تو لوگوں کے ساتھ بحث مباحثہ میں نہ پڑو، جیسا کہ اس کے آثار اب شروع ہیں، اگرچہ بڑا دجال ابھی نہیں آیا، لیکن دجال نے آ کے جس قسم کے کرتب دکھانے ہیں ان کی تمہید شروع ہو چکی ہے۔تو حضرت مناظر احسن گیلانی ﷫ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تاکید ہے کہ دجالی فتنے والے اپنے خیالات کی اشاعت کے لئے جو رسائل شائع کرتے ہیں، کتابیں شائع کرتے ہیں، لٹریچر دیتے ہیں، ان کو نہ پڑھو، اگر ان کی کتابیں پڑھو گے تو شکوک وشبہات میں مبتلا ہو جاؤ گے، اور اپنا ایمان خراب کر بیٹھو گے، اور وہ جس چیز کی طرف انسان کو لے جانا چاہتے ہیں، عیاشی بدمعاشی اور ہر قسم کی آزادی، تو اس کے متعلق انسان کے دل میں بھی خیالات آنے لگ جائیں گے اگر آپ ان کی تحریریں اور ان کا لٹریچر پڑھیں گے۔ایسے وقت میں اپنے آپ کو پابند رکھو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ہدایت آئی ہوئی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کتاب اتری ہوئی ہے، بس اسی پر ہی اپنی تلاوت کو بند رکھو، مطالعہ کرنا ہے تو اسی کا کرو، پڑھنا ہے تو اسی کو پڑھو، اسی کی ہدایات پر توجہ اور دھیان دو۔تو فتنۂ دجال سے بچنے کے لئے یہ ایک بہت بڑا کارآمد ہتھیار ہے کہ ان کی تحریرات پڑھنی ہی چھوڑ دو، جس قسم کا یہ لٹریچر دیتے ہیں ان کی کتابیں نہ پڑھو، کیونکہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ جب تم اس دجال کے متعلق سنو تو اس کے قریب نہ جاؤ، بلکہ اس سے دُور بھاگو، کیونکہ ایک شخص اس کے قریب جائے گا یہ سمجھتا ہوا کہ میں ایمان والا ہوں، اس سے متاثر نہیں ہوں گا، لیکن وہ اتنے شکوک وشبہات لے کے آیا ہوا ہوگا کہ قریب جا کے وہ انسان متاثر ہو جائے گا، اور اپنے ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔[1] اسی طرح سے جو لوگ اس قسم کے لوگوں کی کتابیں پڑھتے ہیں جو دجال کے چیلے ہیں، یا اس کے لیے ایک قسم کے مقدمۃ الجیش کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں، تو وہ اس قسم کی بے ایمانی کی باتیں کرتے ہیں، فسق وفجور کی اس طرح سے ترغیب دیتے ہیں، جیسے ناولوں میں، سینماؤں میں

---

(۱) ابوداؤد ۲/۲۳۷ باب خروج الدجال۔ مشکوٰۃ ۲/۴۷۷ باب العلامات فصل ثانی۔

جو اللہ کی نصرت اور اللہ کی رحمت کو حاصل کرتی ہے، جس کے نتیجے میں سکون اطمینان اور عافیت نصیب ہوتی ہے، اور اگر آپ دنیوی زیب وزینت چاہیں گے، دنیوی زیب وزینت کا مطلب یہ ہے کہ آپ کا خیال ہو کہ یہ بڑے بڑے لوگ اگر ایمان لے آئیں تو دنیا میں بڑی بہار آ جائے گی، اور مذہب بہت نمایاں ہو جائے گا، اس جذبے کے تحت، خبردار! آپ کی آنکھیں اِن سے ہٹ کر اُن کی طرف نہ اٹھیں، اس جذبے سے کہ سرمایہ داروں کے مسلمان ہو جانے کے ساتھ، بڑے لوگوں کے مسلمان ہو جانے کے ساتھ ظاہری طور پر زیب وزینت آ جائے گی، اس جذبے سے آپ اِن سے اپنی نظریں نہ ہٹائیں......جن لوگوں کے دلوں کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا، اور وہ خواہشات کے بندے ہیں، ظاہری طور پر ان کے پاس مال ہو، دولت ہو، اچھا لباس ہو، اچھے مکانات ہوں، رہائش گاہیں ہوں، یہ ظاہر ہی ظاہر ہے، اللہ سے غفلت اللہ تعالیٰ کی نصرت سے محروم کر دیتی ہے، اس معاشرے میں سکون اور اطمینان نصیب نہیں ہوتا جس معاشرے میں اللہ سے غفلت ہوتی ہے، آج دیکھ لیجئے! لوگ سمجھتے ہیں کہ سکون واطمینان اس میں ہے کہ انسان کا بینک بیلنس زیادہ ہو، جائیداد زیادہ ہو، اچھے مکانات ہوں، پہننے کے لئے کپڑے اچھے ملیں، سواری اچھی سے اچھی ہو، لوگ سکون اس میں تلاش کرتے ہیں اور اللہ کی یاد سے غافل ہیں، تو واقعات شاہد ہیں کہ ان لوگوں کو یہ سب کچھ مل گیا، مکان بھی اچھے مل گئے، لباس بھی اچھا مل گیا، کھانے کو وافر مل گیا، روپوں کے بھی ڈھیر لگ گئے، لیکن جس چیز کے یہ متلاشی ہیں وہ چیز نہیں ملی، بلکہ اس سے بھی زیادہ دور ہو گئے، اس معاشرے میں انسان کی بے چینی اور اضطرابی کیفیت انتہاء کو پہنچی ہوئی ہے، کسی شخص کے دل دماغ کو سکون نہیں، جس چیز کو تلاش کرنے کے لئے ان چیزوں کی طرف دوڑتے ہیں، وہ چیزیں مل جانے کے بعد بھی وہ چیز (سکون) نہیں ملتی، سامانِ تعیش حاصل ہو جانے کے بعد بھی انسان کو آرام نہیں ملتا، اس لیے ان کے ظاہر کی طرف نہ دیکھو، باطن کو دیکھو کہ ان کا دل اللہ کے ذکر سے غافل ہے، بس! ان کی بات ماننے کی ضرورت نہیں، ان کا کام حد سے بڑھا ہوا ہے، ان کا کام ہے کہ یہ ہر وقت حد سے تجاوز کرتے ہیں، ان میں بے اعتدالی ہوتی ہے، ان کی دوستی کا بھی اعتبار نہیں، دوستی لگائیں گے وہ بھی حد سے زیادہ، دشمن ہو جائیں گے تو وہ بھی بدتر قسم کے، اور اگر دنیا کمانے لگیں گے تو وہ بھی انتہائی درجے کی، اور اگر بے صبری پہ آئیں گے تو بے صبری بھی انتہائی درجے کی، ہر معاملے میں یہ حد سے بڑھے ہوئے ہیں، کسی حد کے اوپر ان کو سکون نہیں آتا، اس لیے ان دو فریقوں میں سے اپنی صحبت کے لئے آپ انہی کو منتخب کیجئے، ان کی طرف آپ نگاہ اٹھا کر نہ دیکھیں، اگر یہ حق کو قبول کرنے کے لئے آتے ہیں، تو انہی مساکین کے ساتھ شامل ہو کے بیٹھیں تو ٹھیک ہے، ان کی خاطر مساکین کو دور نہ ہٹائیے......اور مناظر احسن گیلانی ﷫ کے نکتے کے تحت یہ بات بھی آ گئی کہ فتنۂ دجال سے بچنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ انسان اس قسم کے رفقاء اختیار کرے جن کی توجہ اللہ کی طرف ہو، نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرو، دنیاداروں کی صحبت سے بچو، جتنا دنیاداروں کی صحبت میں بیٹھو گے اتنی شہوت پرستی زیادہ آئے گی، اللہ کے ذکر سے غفلت زیادہ ہوگی، اور زیادہ جلدی فتنۂ دجال کا شکار ہو جاؤ گے، اور جتنا اچھے لوگوں کے پاس بیٹھو گے جو اللہ کو یاد کرنے والے اور اللہ کی رضا کو پیشِ نظر رکھنے والے ہیں، تو ہر شیطانی اور دجالی فتنے سے محفوظ

رہ جاؤ گے، تو گویا کہ اپنے یار دوست اس فتنے میں کس قسم کے اختیار کرنے چاہئیں، ان کی نشاندہی یہاں کردی گئی، کہ ایسے لوگوں کو اپنے لیے اختیار کرو اور ایسے لوگوں کے ساتھ رہو اور ان کے ساتھ اپنے آپ کو پابند رکھو جو ہر وقت اللہ کی یاد میں ہیں، اور اللہ کی رضا کے لئے ہر وقت اللہ کو پکارتے ہیں، تو دجال کے اثرات سے، شیطانی فتنوں سے محفوظ رہ جاؤ گے، کیونکہ صحبت انسان کے دل دماغ کے اوپر بہت اثر انداز ہوا کرتی ہے، انسان جس قسم کے ماحول میں رہتا ہے اسی قسم کے خیالات بنتے چلے جایا کرتے ہیں۔

''پابند رکھیے اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ جو پکارتے ہیں اپنے رَبّ کو صبح وشام، اور چاہتے ہیں اس کی رضا۔ نہ تجاوز کریں تیری آنکھیں ان سے، ارادہ کرتا ہو تو دنیوی زندگی کی زیب وزینت کا'' دنیوی زندگی کی ٹھاٹھ باٹھ چاہتے ہوئے آپ ان مساکین سے نظریں اٹھا کے اُن کی طرف نہ دیکھئے۔ ''کہنا نہ مانیے اس شخص کا جس کے دل کو ہم نے غافل کردیا اپنے ذکر سے'' چاہے وہ ظاہری طور کتنا ہی دنیادار کیوں نہ ہو، لیکن اگر اس کا دل ہم سے غافل ہے، اور اس کے دل میں ہماری یاد نہیں، تو ایسے شخص کی بات کبھی نہ مانیے۔ ''اور وہ پیچھے لگ گیا اپنی خواہش کے، اور اس کا کام ہے حد سے بڑھنا، یا اس کا امر حد سے بڑھا ہوا ہے'' دونوں طرح سے ترجمہ ٹھیک ہے، یعنی بے اعتدالی زندگی ہے، وہ کسی نقطہ اعتدال پر نہیں ہے، جدھر کو جاتا ہے انتہا پسندی کے ساتھ جاتا ہے، تو ایسا شخص اس قابل نہیں ہے کہ اس کی بات کو مانا جائے۔

کُفّار کا انجام

ان کے سامنے آپ صاف صاف اعلان کردیں کہ حق آپ کے رَبّ کی طرف سے آ گیا، سچی بات وہی ہے جو رَبّ کی طرف سے آ گئی، جس کا جی چاہے مانے، جس کا جی چاہے نہ مانے، یہ اعلان کردیجئے، ان کی بات ماننے کی ضرورت نہیں، صاف کہہ دو، ماننا ہے تمہاری مرضی، نہیں ماننا تمہاری مرضی، نہیں مانو گے تو جوتے کھاؤ گے، اب یہ فَلْيَكْفُرْ کا امر محض تنبیہ اور تہدید کے لئے ہے، یہ نہیں کہ ان کو حکم دیا جا رہا ہے کہ تم کفر کرو، آگے اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِیْنَ نَارًا قرینہ ہے اس بات کا کہ یہ کفر کرنے کا اختیار نہیں دیا جا رہا، یہ محض سرزنش کے طور پر ہے، مانو تمہاری مرضی، نہ مانو تمہاری مرضی، نہیں مانو گے تو جوتے کھاؤ گے، اس کا مفہوم اس طرح سے ہے، ہماری طرف سے بات کا اعلان صاف صاف کردیا گیا ''حق تمہارے رَبّ کی طرف سے ہے، پس جو چاہے ایمان لے آئے، جو چاہے کفر کرے، بے شک تیار کیا ہم نے ظالموں کے لئے آگ کو، گھیر لیں گی ان کو اس کی قناتیں'' آگ کی قناتیں ان کو گھیرے ہوئے ہوں گے، یعنی نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہوگا، چاروں طرف سے وہ آگ کے پردوں میں چھپے ہوئے ہوں گے، گرمی کی شدت سے جب ان کو پیاس لگے گی تو وہ مدد طلب کریں گے کہ ہمیں پانی پلاؤ، فریاد کریں گے، ''اگر وہ مدد طلب کریں گے تو مدد دیے جائیں گے ایسے پانی کے ساتھ جو کہ تلچھٹ کی طرح ہوگا، یا پگھلے ہوئے تانبے کی طرح ہوگا''، اور وہ اتنا گرم ہوگا کہ یَشْوِی الْوُجُوْهَ: چہروں کو بھون دے گا، بہت برا پانی ہے اور بہت بُری آرام کی جگہ ہے، یعنی اِس وقت اگرچہ ان کی ٹھاٹھ باٹھ نظر آتی ہے لیکن حق قبول نہ کرنے کے نتیجے میں آخر ان کا انجام یہ ہے، چند روزہ عیش اور اس کے بعد ان کا انجام یہ ہے۔

مؤمنین کا انجام

ہاں! البتہ جو ایمان لے آئیں اور نیک عمل کریں ان کے اجر کو ہم ضائع نہیں کریں گے، لَا نُضِيْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا: جو اچھا عمل کرتا ہے ہم اس کے اجر کو ضائع نہیں کریں گے، اب ظاہری طور پر چند دن کے لئے یہ فقر و فاقہ میں مبتلا ہوں گے، چند دن کے لیے مشکلات برداشت کریں گے، لیکن انجام ان کا یہ ہے کہ ان کے لئے ہیشگی کے باغات ہیں، جاری ہوں گی ان کے نیچے سے نہریں، پہنائے جائیں گے وہ اس میں کنگن سونے کے۔ اپنے معاشرے میں چونکہ مردوں کو سونے کے کنگن پہننے کی عادت نہیں، رواج نہیں، اس لیے عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے، اور بعض علاقوں میں مرد بھی اس قسم کے زیور پہننے لگ جائیں تو وہ بھی خوبصورت لگنے لگ جاتے ہیں، جیسے آج بھی کسی قوم کا ایک لباس ہے جو ہمیں اچھا نہیں لگتا، پٹھانوں کی عورتیں یا پٹھان مرد جس قسم کا لباس پہنے ہوئے ہیں ہمیں عجیب سا معلوم ہوتا ہے، اور ہمارا لباس ان کو عجیب سا معلوم ہوتا ہے، یہ اپنے اپنے علاقے اور اپنے اپنے ماحول کا رواج ہوتا ہے، تو جنت کے اندر ماحول ایسا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ مردوں کو بھی سونا اور ریشم پہنائیں گے، جس طرح سے دنیا کے اندر سونا اور ریشم عورتیں پہنتی ہیں، مرد نہیں پہنتے۔ ''پہنائے جائیں گے ان باغات میں سونے کے کنگن، اور پہنیں گے یہ کپڑے سبز، باریک ریشم کے اور موٹے ریشم کے'' یعنی کبھی باریک کبھی موٹے، جیسے پسند ہوں، اور ''ٹیک لگانے والے ہوں گے ان باغات میں مزین تختوں پر، بہت اچھا بدلہ ہے، اور بہت اچھی آرام کی جگہ ہے۔'' یہ ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کا انجام بتادیا گیا کہ دقت اور مصیبت یا تکلیف جو پیش آتی ہے یہ عارضی ہے، مرنے کے بعد ان کے سامنے یہ انجام آجائے گا۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ اَعْنَابٍ
ان کے لئے دو آدمیوں کی مثال بیان کرو، بنائے ہم نے ان دونوں میں سے ایک کے لئے دو باغ انگوروں کے،
وَّحَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ﴿۳۲﴾ كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَلَمْ
گھیرا ہم نے ان دونوں کو کھجور کے درختوں کے ساتھ، اور بنائی ہم نے ان کے درمیان کھیتی ﴿۳۲﴾ دونوں باغ دیتے اپنا پھل اور
تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْئًا ۙ وَّفَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ﴿۳۳﴾ وَّكَانَ لَهٗ ثَمَرٌ ۚ فَقَالَ
اس میں سے کچھ بھی کمی نہ کرتے، اور جاری کی ہم نے دونوں کے درمیان نہر ﴿۳۳﴾ اور اس کے لئے ہر قسم کا پھل تھا، باغ والے نے

لِصَاحِبِهٖ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّاَعَزُّ

اپنے ساتھی سے کہا اس سے باتیں کرتے ہوئے کہ میں تجھ سے زیادہ ہوں ازروئے مال کے، اور زیادہ عزت والا ہوں

نَفَرًا ﴿۳۴﴾ وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ قَالَ مَآ اَظُنُّ اَنْ

ازروئے افراد کے ﴿۳۴﴾ اور داخل ہوا وہ شخص اپنے باغ میں اور حال یہ تھا کہ وہ اپنے نفس پہ ظلم کرنے والا تھا، اس نے کہا: میں نہیں گمان کرتا کہ

تَبِيْدَ هٰذِهٖٓ اَبَدًا ﴿۳۵﴾ وَّمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ

ہلاک ہوجائے گا یہ باغ کبھی بھی ﴿۳۵﴾ اور میں نہیں سمجھتا قیامت کو قائم ہونے والی، اور اگر میں لوٹا دیا گیا اپنے ربّ کی طرف تو

لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ﴿۳۶﴾ قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ اَكَفَرْتَ

البتہ ضرور پاؤں گا میں اس باغ سے بھی بہتر لوٹنے کی جگہ ﴿۳۶﴾ کہا اس کو اس کے دوست نے اس حال میں کہ اس سے گفتگو کر رہا تھا: کیا تُو منکر ہے

بِالَّذِيْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا ﴿۳۷﴾ لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ

اس کا جس نے تجھے پیدا کیا مٹّی سے، پھر نطفے سے، پھر برابر سرابر تجھے آدمی بنا دیا ﴿۳۷﴾ لیکن میں کہتا ہوں کہ وہ اللہ

رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ﴿۳۸﴾ وَلَوْلَآ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ

میرا ربّ ہے، اور میں شریک نہیں ٹھہراتا اپنے ربّ کے ساتھ کسی کو ﴿۳۸﴾ جب تُو اپنے باغ میں داخل ہوا تھا، تُو نے کیوں نہ کہا "ماشاء

اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۚ اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّوَلَدًا ﴿۳۹﴾ فَعَسٰى رَبِّيْٓ

اللہ لا قوۃ الا باللہ" اگر تُو مجھے دیکھتا ہے کہ میں تجھ سے کم ہوں ازروئے مال کے اور ازروئے اولاد کے ﴿۳۹﴾ تو ہوسکتا ہے

اَنْ يُّؤْتِيَنِ خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ وَيُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ فَتُصْبِحَ صَعِيْدًا

کہ میرا ربّ مجھے دے دے بہتر تیرے باغ سے، اور بھیج دے اس کے اُوپر کوئی تقدیری آفت آسمان سے، پھر ہوجائے یہ باغ ایک

زَلَقًا ﴿۴۰﴾ اَوْ يُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا فَلَنْ تَسْتَطِيْعَ لَهٗ طَلَبًا ﴿۴۱﴾ وَاُحِيْطَ

چٹیل میدان ﴿۴۰﴾ یا ہوجائے اس باغ کا پانی نیچے کو جانے والا، پھر ہرگز نہیں طاقت رکھے گا تُو اس پانی کو طلب کرنے کی ﴿۴۱﴾ اور گھیر لیا گیا

بِثَمَرِهٖ فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَآ اَنْفَقَ فِيْهَا وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا

اس شخص کے پھل کو، پھر ہو گیا وہ شخص کہ ملتا تھا اپنی ہتھیلیاں اس پر جو اس نے خرچ کیا اس باغ میں، اور وہ باغ گرنے والا تھا اپنی چھتوں پر

وَیَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّیْٓ اَحَدًا ﴿۴۲﴾ وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ یَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ

اور وہ کہہ رہا تھا، ہائے کاش! میں نہ شریک کرتا اپنے رب کے ساتھ کسی کو ﴿۴۲﴾ اور نہیں تھی اس کے لئے کوئی جماعت جو اس کی مدد کرتی اللہ

اللّٰهِ وَمَا كَانَ مُنْتَصِرًا ﴿۴۳﴾ هُنَالِكَ الْوَلَایَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ ؕ هُوَ خَیْرٌ ثَوَابًا وَّخَیْرٌ عُقْبًا ﴿۴۴﴾

کے علاوہ اور نہ وہ خود بدلہ لینے والا تھا ﴿۴۳﴾ ایسے موقع پر مدد کرنا اللہ برحق کے لئے ہے، وہ اللہ بہتر ہے از روئے بدلے کے اور وہ بہتر ہے از روئے انجام کے ﴿۴۴﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَیْنِ: ضرب مثل: مثال بیان کرنا۔ یہاں ضَرَبَ یَضْرِبُ مارنے کے معنی میں نہیں ہے، ضَرَبَ یَضْرِبُ کا معنی مارنا بھی ہوتا ہے، اور زمین پر چلنا بھی ہوتا ہے، وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ (سورۂ نساء: ۱۰۱)، اور ''ضرب مثل'' کا لفظ تو عام طور پر مشہور ہے، مثال بیان کرنا۔ بیان کیجئے ان کے لئے مثال دو آدمیوں کی۔ رَّجُلَیْنِ یہ مَّثَلًا سے بدل ہے۔ ان کے لئے دو آدمیوں کی مثال بیان کرو۔ جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَیْنِ: بنائے ہم نے ان دونوں میں سے ایک کے لئے دو باغ، جَنَّتَیْنِ جنت کا تثنیہ ہے، مِنْ اَعْنَابٍ، اعناب عِنَبٌ کی جمع ہے: انگور۔ انگوروں کے دو باغ۔ وَّحَفَفْنٰهُمَا: حَفَّ یَحُفُّ: گھیر لینا۔ گھیر لیا ہم نے ان دونوں باغوں کو بِنَخْلٍ: کھجور کے درختوں کے ساتھ۔ حَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ جب یہ دونوں لفظ اکٹھے ہو جائیں گے تو اس کا مفہوم یوں ہوگا کہ ہم نے ان دونوں باغوں کے ارد گرد کھجور کے درخت اُگائے جنہوں نے ان دونوں باغوں کو گھیر لیا تھا، ارد گرد کھجور کے درختوں کی باڑ تھی۔ گھیرا ہم نے ان دو باغوں کو کھجور کے درختوں کے ساتھ۔ وَّجَعَلْنَا بَیْنَهُمَا زَرْعًا: اور بنائی ہم نے ان دونوں باغوں کے درمیان کھیتی۔ زرع کہتے ہیں کھیتی کو، یعنی درختوں کے درمیان میں چھوٹے چھوٹے پلاٹ، چھوٹے چھوٹے قطعات تھے جن میں کھیتی ہوتی تھی، كِلْتَا الْجَنَّتَیْنِ: دونوں باغ، اٰتَتْ اُكُلَهَا: اُکُل کہتے ہیں میوے کو، پھل کو، جو چیز کھائی جاتی ہے۔ سورۂ ابراہیم (آیت: ۲۵) میں بھی یہ لفظ گزر ا تھا۔ دونوں باغ دیتے اپنا پھل، وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَیْــًٔا: اور اس میں سے کچھ بھی کم نہ کرتے، یعنی ہر ایک کو پورا پورا پھل لگتا تھا، یہ نہیں کہ کبھی پھلے کبھی نہ پھلے، کبھی کم پھل لگے کبھی زیادہ، بلکہ پورا پورا پھل دیتے تھے، ظَلَمَ یَظْلِمُ یہ نَقَصَ کے معنی میں ہوتا ہے، اور دونوں باغوں میں سے کوئی باغ نہیں گھٹاتا تھا اس پھل میں سے کسی چیز کو، یعنی پورے پورے پھلتے تھے۔ وَّفَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا: فَجَّرَ: جاری کرنا۔ اور جاری کی ہم نے دونوں باغوں کے درمیان میں نہر، دونوں باغوں کے بیچوں بیچ نہر جاری تھی، یعنی پانی کی کمی بھی نہیں تھی، پانی خوب وافر تھا۔ وَّكَانَ لَهٗ ثَمَرٌ: ثمر پھل کو بھی کہتے ہیں، اور مطلقاً مال دولت اور گھر کے سامان کو بھی کہتے ہیں، یہاں دونوں طرح سے ترجمہ کیا گیا ہے، اگر اس ثمر کا معنی پھل کریں (ابن کثیر)، تو پھر مطلب یہ ہوگا کہ اس شخص کے لئے ہر قسم کا پھل تھا، یعنی انگور اور کھجور تو ہم نے موٹی موٹی دو باتیں بتا دیں، ورنہ اور بھی جس قسم کے پھل ہوا کرتے ہیں اس کے لیے تھے، ہر قسم کا جامع باغ تھا، اور اگر ثمر سے مال دولت سامان مراد لے لیا جائے تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس

شخص کے لئے ساز وسامان مال دولت تھا، یعنی صرف یہی نہیں کہ وہ باغ کا مالک تھا، بلکہ گھر میں جس قسم کے سامان کی ضرورت ہوتی ہے، سونا، چاندی، برتن، بستر، چار پایاں، آسائش آرائش کا سامان جو بھی ہوتا ہے وہ سب اس کو مہیا تھا (عام تفاسیر)۔ فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ: کہا اس باغ والے نے اپنے ساتھی کو، وَهُوَ یُحَاوِرُهٗٓ: حَاوَرَ یُحَاوِرُ مُحَاوَرَةً: آپس میں گفتگو کرنا۔ اس حال میں کہ وہ اپنے دوست کے ساتھ باتیں کر رہا تھا، یعنی باغ والے نے اپنے ساتھی سے کہا اس سے باتیں کرتے ہوئے، یہ محاورے کے مطابق اس کا مفہوم ہوجائے گا، اس حال میں کہ اس کے ساتھ باتیں کر رہا تھا، ایسے حال میں کہا، قال کا مقولہ ہے اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّاَعَزُّ نَفَرًا: میں زیادہ ہوں تجھ سے ازروئے مال کے، اور زیادہ باعزت ہوں ازروئے جماعت کے۔ نفر کہتے ہیں افراد کو، گھر کے افراد، کنبہ، خاندان۔ معلوم ہوتا ہے کہ دوسرا شخص غریب تھا، اور اس کی جماعت، اس کا خاندان بھی کوئی بڑا نہیں تھا، تو یہ اسے بطور فخر کے کہتا ہے کہ میں تجھ سے زیادہ ہوں ازروئے مال کے، اور زیادہ باعزت ہوں ازروئے خاندان کے۔ نفر: خاندان، کنبہ۔ اصل میں اس کا معنی ہوتا ہے افراد، اور اس سے وہ افراد مراد ہوتے ہیں جو انسان کے ساتھ چلتے پھرتے ہیں اور انسان کے ساتھ معاون ہوتے ہیں، یہ اسم جمع ہے ''قوم'' کی طرح۔ وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ: اور داخل ہوا یہ شخص اپنے باغ میں، وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ: اور حال یہ تھا کہ وہ اپنے نفس پہ ظلم کرنے والا تھا یعنی کفر وشرک کے اندر مبتلا تھا، وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ: جو شخص متکبر ہو، ناشکرا ہو، کافر ہو، مشرک ہو، وہ اللہ کا کچھ نقصان نہیں کرتا، حقیقت کے اعتبار سے اپنا ہی نقصان کرتا ہے، اس لیے یہ ظلم علی النفس ہے۔ قَالَ: اس باغ والے نے کہا، مَآ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖٓ اَبَدًا: میں گمان نہیں کرتا، میں نہیں سمجھتا، میرے خیال میں یہ بات نہیں آتی، جیسا کہ ظن یظن کا معنی ہوتا ہے، میں گمان نہیں کرتا، اَنْ تَبِيْدَ: بَادَ يَبِيْدُ ہلاک ہونا۔ تَبِيْدَ کا فاعل هٰذِهٖ ہے جس کا اشارہ باغ کی طرف ہے۔ میں نہیں گمان کرتا کہ ہلاک ہوجائے گا یہ کبھی بھی، یعنی میں اس باغ کو کبھی بھی برباد ہونے والا نہیں سمجھتا، یہ ہمیشہ اسی طرح سے سرسبز وشاداب رہے گا، مجھے ہمیشہ خوش حالی حاصل رہے گی، وَّمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً: اور میں نہیں سمجھتا قیامت کو قائم ہونے والی، وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ اور اگر میں لوٹا دیا گیا اپنے رَبّ کی طرف لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا البتہ ضرور پاؤں گا میں اس باغ سے بھی بہتر لوٹنے کی جگہ، مُنْقَلَب: لوٹنے کی جگہ، یہ ظرف کا صیغہ ہے، یعنی یہاں دنیا کے اندر جس طرح سے مجھے باغ حاصل ہے، اگر بالفرض آخرت ہوئی، اوّل تو ہوگی نہیں، اور اگر ہوئی تو وہاں بھی مجھے اس سے بہتر لوٹنے کی جگہ ملے گی، قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ: کہا اس باغ والے کو اس کے دوست نے اس حال میں کہ اس سے گفتگو کر رہا تھا، یعنی گفتگو کرتے ہوئے اس نے کہا، اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ: کفر اصل کے اعتبار سے انکار کو کہتے ہیں، کیا تو منکر ہے اس کا جس نے تجھے پیدا کیا، مِنْ تُرَابٍ: مٹی سے ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ: پھر نطفے سے۔ نطفہ اصل میں ٹپکائے ہوئے قطرے کو کہتے ہیں۔ نَطَفَ: ٹپکانا۔ نطفہ: ایک دفعہ ٹپکائی ہوئی مقدار۔ فُعْلَةٌ مقدار کے لئے بولا جایا کرتا ہے، جیسے لقمہ: ایک دفعہ نگلنے کی مقدار، شُرْبَةٌ: ایک گھونٹ، ایک دفعہ پینے کی مقدار، اسی طرح سے نطفہ: ایک دفعہ ٹپکائی ہوئی مقدار، یعنی ایک قطرہ جس طرح سے ٹپکا ہوا ہوتا ہے، ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا: پھر تجھے برابر کیا ازروئے آدمی ہونے کے، برابر سرابر تجھے آدمی بنا دیا، لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ: لٰكِنَّا اصل میں ''لٰكِنْ اَنَا'' ہے، اس لیے ''لٰكِنَّا'' کے آخر میں جو الف لکھا ہوا ہے وہ پڑھنے میں نہیں آئے گا، جیسے ''اَنَا'' کا الف پڑھنے میں نہیں آیا کرتا، ''لیکن میں یہ بات کہتا ہوں'' لٰكِنْ اَنَا اَعْتَقِدُ، لٰكِنْ اَنَا اَقُوْلُ، یہ مفہوم نکلے گا، لیکن میں کہتا ہوں هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ میں تو یہ

عقیدہ رکھتا ہوں کہ وہ اللہ میرا رَبّ ہے، وَلَاۤ اُشْرِكُ بِرَبِّیْۤ اَحَدًا: اور میں اپنے رَبّ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراؤں گا، نہیں ٹھہراتا میں اپنے رَبّ کے ساتھ شریک کسی کو۔ وَلَوْلَاۤ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ: جب تُو اپنے باغ میں داخل ہوا تھا، تو نے کیوں نہ کہا، لَوْلَاۤ کا تعلق قُلْتَ کے ساتھ ہے، تُو نے کیوں نہ کہا مَاشَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ، تجھے چاہیے کہ جب تُو اپنے باغ میں داخل ہونے لگے، باغ میں آئے، اور نعمتوں کے ساتھ بھرے ہوئے باغ کو تو دیکھے تو تیری زبان پہ یہ جاری ہونا چاہیے مَاشَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ۔ ''ماشاء اللہ'' کا لفظی معنی ہے جو اللہ چاہے، مطلب یہ ہے کہ جو اللہ چاہے وہی ہوتا ہے، یہ جو کچھ ہے سب اللہ کی مشیت کے ساتھ ہے، اللہ کے چاہنے کے ساتھ ہے۔ اور نہیں قوت مگر اللہ کے ساتھ، یعنی اللہ کی مدد اور اللہ کی نصرت کے بغیر کسی کو کوئی قوت اور طاقت حاصل نہیں ہے۔ اِنْ تَرَنِ: اگر تُو مجھے دیکھتا ہے، نون کے نیچے جو کسرہ ہے وہ یائے متکلم پر دلالت کرنے والا ہے، اِنْ تَرَنِیْ اگر تُو مجھے دیکھتا ہے اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا کہ میں تجھ سے کم ہوں ازروئے مال کے وَّوَلَدًا اور ازروئے اولاد کے، اگر تُو مجھے دیکھتا ہے کہ میں تجھ سے کم ہوں ازروئے مال کے اور اولاد کے، فَعَسٰی رَبِّیْۤ اَنْ یُّؤْتِیَنِ خَیْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ: تو ہوسکتا ہے، قریب زمانے میں میرا رَبّ مجھے دے دے بہتر تیرے باغ سے، وَیُرْسِلَ عَلَیْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ، حُسْبَان حساب سے ہے محسوب کے معنی میں، آفتِ محسوبہ، مصیبتِ مقدرہ (آلوسی)۔ اس پر کوئی تقدیری آفت بھیج دے۔ حُسْبَانًا سے آفتِ مقدرہ مراد ہے، یہ بھی عسٰی کے نیچے داخل ہے۔ ہوسکتا ہے کہ میرا رَبّ دے دے مجھے بہتر تیرے باغ سے، اور بھیج دے اس کے اوپر کوئی آفتِ مقدرہ، کوئی تقدیری آفت بھیج دے آسمان سے، فَتُصْبِحَ صَعِیْدًا زَلَقًا پھر ہوجائے گا یہ باغ ایک چٹیل میدان۔ صعید کہتے ہیں میدان کو، اور زلق کا لفظ ایسی جگہ کے لئے بولا جاتا ہے جس میں نباتات نہ ہو، بلکہ وہاں پاؤں پھسلے، یعنی چٹیل میدان، ''تیرا یہ باغ چٹیل میدان ہوجائے'' اَوْ یُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا: غور غائر کے معنی میں ہے۔ یا ہوجائے اس باغ کا پانی نیچے کو جانے والا، پانی زمین میں اُتر جائے، فَلَنْ تَسْتَطِیْعَ لَهٗ طَلَبًا: پھر ہرگز نہیں طاقت رکھے گا تو اس پانی کو طلب کرنے کی، پھر تو اس پانی کے لئے طلب کی طاقت نہیں رکھے گا، پانی کو طلب نہیں کرسکے گا، کنویں خشک ہوجائیں، چشمے خشک ہوجائیں، پانی نیچے اتر جائے۔ تو یُرْسِلَ عَلَیْهَا حُسْبَانًا کا معنی یہ ہوگا کہ آسمان کی طرف سے آفت آجائے، اور یُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا کا مطلب یہ ہے کہ نیچے سے آفت آجائے، اور نیچے سے زمین کی طرف سے آفت یہی ہے کہ پانی نہ ملے اور باغ خشک ہوجائے۔ وَاُحِیْطَ بِثَمَرِهٖ: گھیر لیا گیا اس شخص کے سامان کو، ثمر کا لفظ اسی طرح سے ہے جس طرح سے پہلے یہ لفظ آیا تھا۔ اس شخص کے سامان کو گھیر لیا گیا، یعنی آفت نے آکے گھیر لیا، اس کے اوپر مصیبت آگئی، نہ اس کا باغ رہا، نہ گھر کا سامان رہا۔ ثمر کا لفظ دونوں معنوں پر دلالت کرتا ہے۔ اس شخص کے پھل کو گھیر لیا گیا، اس شخص کا پھل سمیٹ لیا گیا، احاطہ کرلیا گیا اس کے پھل کا۔ فَاَصْبَحَ یُقَلِّبُ كَفَّیْهِ: پھر ہوگیا وہ شخص کہ ملتا تھا اپنی ہتھیلیاں، یعنی افسوس کے ساتھ۔ جیسے کہتے ہیں کہ ''ہاتھ ملتارہ گیا''، تو ہاتھ ملنا اردو کا محاورہ بھی ہے، وہ اس مصیبت کو دیکھتے ہی ہاتھ ملتا رہ گیا، كَفَّیْ یہ كَفَّیْن تھا، کف کا تثنیہ ہے، کف ہتھیلی کو کہتے ہیں۔ پس ہوگیا وہ کہ اُلٹ پلٹ کرتا تھا اپنی ہتھیلیاں، یعنی وہ ہاتھ ملتا رہ گیا، عَلٰی مَاۤ اَنْفَقَ فِیْهَا اس چیز پر جو اس نے خرچ کیا تھا اس باغ میں، یعنی باغ میں جو اس کا خرچ آیا تھا تو اس پر افسوس کرتا ہوا وہ ہتھیلی ملتا رہ گیا، وَهِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰی عُرُوْشِهَا: اور وہ باغ گرنے والا تھا اپنی چھتوں پر۔ عروش عرش کی جمع ہے، عرش سے چھت مراد ہوتی ہے، اُردو میں اس کو ٹٹی کہتے ہیں، باغ اپنی ٹٹیوں پہ گرنے

والا تھا، اس سے مراد ہوتا ہے انگوروں کی بیلوں کے نیچے جو چھپر ڈال دیا کرتے ہیں، بیل اس کے اوپر پھیلاتے ہیں، عرش سے یہاں وہ مراد ہیں، یعنی وہ بھی گر گئیں اور بیلیں بھی گر گئیں، انگور کی بیل زمین پر نہیں پھیلا کرتی، اس کے نیچے سہارے دے کے اس کو پھیلانا پڑتا ہے، تو جو اس کے نیچے سہارے ہوتے ہیں، وہ عروش کا مصداق ہیں، "گرا پڑا تھا اپنی چھتریوں، اپنی تھموں پر، اپنی چھتوں پر" جو مفہوم بھی آپ لے لیں۔ کبھی آپ انگوروں کا باغ دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ چھوٹے چھوٹے چھپر ڈال کے ان کے اُوپر بیلیں پھیلائی ہوئی ہوتی ہیں۔ وَيَقُوْلُ: اور وہ کہہ رہا تھا يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا: ہائے کاش! میں نہ شریک کرتا اپنے رب کے ساتھ کسی کو۔ وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ: اور نہیں تھی اس کے لئے کوئی جماعت يَّنْصُرُوْنَهٗ: جو اس کی مدد کرتی مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ: اللہ کے علاوہ وَمَا كَانَ مُنْتَصِرًا: اور نہ وہ خود بدلہ لینے والا تھا، هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ: اَلْوَلَايَةُ واؤ کے فتح کے ساتھ، مدد کرنا۔ هُنَالِكَ ظرف کے لئے ہوتا ہے، ایسے موقع پر مدد کرنا اللہ برحق کے لئے ہے، سچے اللہ کے لیے ہے، اَلْحَقِّ کا تعلق لفظ اللہ کے ساتھ ہے، ایسے موقع پر مدد اللہ کے لئے ہے جو کہ حق ہے، برحق ہے، اور دوسرا کوئی مدد نہیں کر سکتا، ایسے موقع پر مدد کرنا سچے اللہ کے لیے ہے، هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا: وہ اللہ بہتر ہے از روئے بدلے کے اور وہ بہتر ہے از روئے انجام کے، یعنی اچھا انجام بھی اسی کے ہاتھ میں ہے، اور اچھا بدلہ بھی اسی کے ہاتھ میں ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

اکثر و بیشتر سرمایہ دار ہی سرکش ہوتے ہیں

اصحابِ کہف کا واقعہ ختم ہونے کے بعد اس کی مناسبت سے کچھ اور باتیں آ گئی تھیں۔ اب یہ دوسرا واقعہ شروع ہو رہا ہے دو شخصوں کا، جن میں سے ایک سرمایہ دار ہے، اور دنیا کی ہر آسائش اور آرائش اسے حاصل ہے، اور ایک معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسکین اور غریب آدمی ہے، اللہ تعالیٰ کی حکمت ابتدا سے کچھ ایسے چلی آ رہی ہے کہ جس کو وہ مال و دولت وسعت کے ساتھ دے دیتا ہے، اکثر و بیشتر یہ لوگ باغی اور سرکش ہو جاتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے شکر گزار ہونے کی بجائے اللہ تعالیٰ کے ناشکرے اور نافرمان بن جاتے ہیں، یہ مال کی خاصیت کچھ اس قسم کی ہے، الا ماشاء اللہ! کہ ایسی مثالیں بھی آپ کو ملیں گی کہ اللہ نے جتنا مال دیا دولت دی، اتنے ہی وہ شکر گزار ثابت ہوئے، بادشاہت بھی ملی تو اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ شکر ادا کیا، حضرت سلیمان علیہ السلام اللہ کے پیغمبر بھی تھے بادشاہ بھی تھے، حضرت داؤد علیہ السلام اللہ کے پیغمبر بھی تھے بادشاہ بھی تھے، اور سرورِ کائنات ﷺ کو بھی اللہ تعالیٰ نے آخر وقت میں پورے عرب کی بادشاہت عطا فرما دی، لیکن ان چیزوں کے باوجود اسی طرح سے مسکین بندے ہیں، اللہ تعالیٰ کے سامنے متواضع ہیں، سجدہ ریز ہیں، جس طرح سے ایک فاقہ کش آدمی ہوا کرتا ہے، اور ایسے ہی مسلمان بادشاہوں میں بے شمار اس قسم کے بادشاہ گزرے، اورنگزیب عالمگیر جیسے درویش، کہ جن کی سلطنت اتنی بڑی تھی کہ اس کے بعد تو کسی کو کیا میسر آتی، شاید اس کے آس پاس بھی اتنی بڑی سلطنت کسی بادشاہ کو میسر نہیں تھی، لیکن انتہائی درجے کے درویش، اللہ کے فرمانبردار...... لیکن عام طور پر ایسے

ہوتا ہے کہ مال ودولت کی وسعت انسان کو باغی سرکش طاغی بنادیتی ہے، انبیاء علیہم السلام کے واقعات جو آپ کے سامنے آئیں گے ان میں بھی یہ بات بہت نمایاں طور پر آپ کے سامنے آئے گی کہ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ٹکرانے والا اس وقت کا برسر اقتدار طبقہ یا خوش حال طبقہ ہی ہوتا ہے۔

ایک سرمایہ دار اور غریب کا واقعہ

یہاں بھی یہی حقیقت نمایاں ہے کہ یہ دو دوست ہیں آپس میں ملنے والے، ساتھ رہنے والے، جیسا کہ صاحبہ کے لفظ سے معلوم ہوگا کہ دونوں اکھٹے رہتے تھے، جیسے ایک قوم میں، ایک محلے میں، ایک جگہ میں۔ اور ان میں سے ایک خوش حال تھا، اس کی خوش حالی اس درجے کی تھی جو متوسط طبقے کی ایک اعلیٰ معیشت ہوتی ہے، اس کے دو باغ تھے، اور اس میں انگور کثرت سے تھے، اردگرد کھجوروں کے درخت کھڑے تھے، اور باغوں کے اردگرد کھجوروں کے درخت کھڑے ہوں تو یہ خوبصورت بھی بہت لگتے ہیں، اگر کبھی آپ کو دیکھنے کا اتفاق ہو۔ اور اس کے ساتھ انگوروں کی حفاظت بھی ہوتی ہے کہ باہر کی تیز ہوا آ کر ان بیلوں کو الٹ پلٹ نہیں کرسکتی، جب اردگرد یہ اونچے اونچے درخت کھڑے ہوتے ہیں، جس طرح سے سندھ کے علاقے میں آپ جائیں تو کیلے کے باغوں کے اردگرد بھی وہ لوگ ایک باڑسی لگاتے ہیں جو ہوا کے لئے رکاوٹ بنتی ہے، کہ زیادہ ٹھنڈی ہوا ادھر کو نہ آئے، تو اسی طرح کھجوریں جب قطار در قطار کھڑی ہوں گی تو باہر کی تیز ہوا بیلوں کو نقصان نہیں پہنچاتی، تو خوبصورتی کے ساتھ ساتھ باغ کی حفاظت بھی ہے، اور پھر انگور کے ساتھ ساتھ کھجور جو ایک بہت بڑا اہم میوہ ہے، وہ بھی اس کو وافر مقدار میں حاصل تھا، اور پھر اس باغ کے اندر چھوٹے چھوٹے قطعات تھے جن کے اندر وہ کھیتی کرتا تھا، اور اس کھیتی کے ساتھ اس کو ہر قسم کی سبزیاں اور غلہ جات میسر تھے، باغ کے اندر جو زمین کے ٹکڑے تھے ان کو آباد کر کے وہ اپنی یہ ضرورتیں پوری کرتا تھا، اور پھر باغ کے سرسبز وشاداب رہنے کے لیے پانی کی ضرورت ہوتی ہے، تو ان باغوں کے درمیان میں نہر جاری تھی جس سے وہ باغ سیراب ہوتے تھے، پانی کی کمی نہیں تھی، جس طرح آپ ایک اچھے سے اچھے باغ کا تصور کرسکتے ہیں ویسے تصور کر لیجئے، اور جس شخص کو یہ میسر ہو تو اس کو گویا کہ ضروریاتِ زندگی مہیا ہیں، پھر ساتھ ساتھ گھر کا ہر قسم کا سامان اسے میسر تھا، گھر میں جس قسم کا سامان ہوتا ہے سونا، چاندی، استعمال کرنے کے برتن، دوسری آرام کی چیزیں وہ بھی ساری کی ساری میسر تھیں، اور پھر معلوم ہوتا ہے کہ صاحبِ اولاد بھی تھا، اللہ تعالیٰ نے اولاد بھی اسے کافی دے رکھی تھی، تو اس کا سارے کا سارا خاندان باعزت تھا، اور اس کو اس بستی میں اس ماحول میں جہاں وہ رہتا تھا برتری حاصل تھی، اور اس کے مقابلے میں دوسرا شخص جو اس کے ساتھ رہنے والا ہے، اس کے پاس باغ نہیں، اور معلوم ہوتا ہے کہ اس کی اولاد بھی کوئی زیادہ نہیں تھی، خاندان بھی کوئی بڑا نہیں تھا، تو خاندان کے لحاظ سے بھی وہ پست سمجھا جارہا تھا، اور مال کے لحاظ سے بھی کم سمجھا جارہا تھا، تو کسی مجلس میں دونوں اکھٹے ہوگئے، آپس میں گفتگو چل پڑی، تو جس طرح سے سرمایہ داروں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ غریبوں کے مقابلے میں ڈینگیں مارتے ہیں، اور اپنی برتری ظاہر کرنے کے لیے اور ان کی تحقیر ظاہر کرنے کے لئے اپنی تعریف کرتے ہیں، اپنے مال ودولت کی بہتات بتاتے ہیں کہ ہماری دکان اتنی چلتی ہے، ہماری تجارت اتنی ہے، ہماری آمدنی

اتنی ہے،تم کیا ہو، مانگ مانگ کے روٹی کھانے والے،تمہارے پاس کیا رکھا ہے،اس طرح سے دوسرے کی تحقیر کرنے کے لیے باتیں کرتے ہیں۔

تو یہاں دونوں کے درمیان میں کچھ ایسی ہی گفتگو ہوئی کہ وہ جو سرمایہ دار قسم کا آدمی تھا وہ اپنے غریب ساتھی کے سامنے بات کرتا ہوا کہتا ہے، کہ دیکھ! میرے پاس کتنا مال ہے، کتنی دولت ہے، میں کتنا باعزت ہوں، تیرے مقابلے میں مجھے کتنی برتری حاصل ہے،تُو جو روز ''قیامت قیامت'' کرتا رہتا ہے کہ آخرت آئے گی، آخرت آئے گی،کوئی آخرت اُخرت نہیں آئے گی،بس یہ جس طرح سے خوش حال ہے دنیا اس طرح سے چلتی رہتی ہے، اوّل تو آئے گی ہی نہیں، اور اگر بالفرض آ بھی گئی اور میں اللہ کی طرف لوٹا بھی دیا گیا،تو وہاں مجھے اسی طرح سے خوش حالی حاصل ہوگی جیسے یہاں خوش حال ہوں، گویا کہ یہاں میرا خوش حال ہونا علامت ہے اس بات کی کہ میں اللہ کا مقبول بندہ ہوں، اللہ نے مجھے یہاں جو کچھ دے رکھا ہے یہ اللہ کے راضی اور خوش ہونے کی علامت ہے،تو اوّل تو قیامت آئے گی ہی نہیں،تُو ویسے ہی غلط کہتا ہے، اور اگر بالفرض آ بھی گئی تو وہاں بھی ہمیں اس سے اچھا باغ مل جائے گا، وہاں بھی ہم اسی طرح سے خوش حال رہیں گے، اور تم جیسے یہاں جُوتیاں چٹخاتے ہو، وہاں بھی تمہاری قسمت ایسی ہی ہوگی۔تو وہ سمجھتا تھا کہ سعادت، نیک بختی اور خوش حالی ہمارا مقدر ہے، ہم جہاں بھی رہیں گے اسی طرح سے رہیں گے، یعنی بجائے اس کے کہ وہ اللہ کا شکر ادا کرتا، اور کہتا کہ اللہ نے مجھے نعمت دی اور میں اللہ سے اُمید رکھتا ہوں، اس قسم کی بات نہیں، وہ ایسے باتیں کرتا ہے گویا کہ وہ پروانہ لے کر آیا ہے کہ تُو نے ہمیشہ خوش حال رہنا ہے، اور کبھی بھی تیرے اوپر کوئی بدبختی کے آثار نہیں آئیں گے، اور یہ مال انسان کو اسی طرح سے اس کا دماغ کچھ اونچا کر دیتا ہے، اور اس کو مستقبل میں کوئی خطرہ نظر نہیں آتا، وہ کہتا ہے جب میں خوش حال ہوں تو ایسے ہی رہوں گا، یوں ہی میرا کاروبار چلتا رہے گا، یوں ہی میری خوش حالی رہے گی۔

اس غریب نے اس کے سامنے ذکر کیا کہ بھائی! تُو انکار نہ کر اس اللہ کا جس نے تجھے پیدا کیا، دیکھ! مٹی سے تیری بنیاد اُٹھائی، پھر تجھے قطرے سے پیدا کیا، پھر تجھے کتنا بڑا انسان بنا دیا، تو ہمیشہ اس کا دھیان رکھ، تیرا وجود اس کا مرہونِ منت ہے کہ اس نے تجھے وجود بخشا، تو یہ مال بھی اسی کا مرہونِ منت ہے کہ اس نے چاہا تو دیا، اور اگر چاہے تو واپس لے لے، اس لیے تو اللہ کا شکر ادا کر، اس کی نعمت کا اور اس کی قدرت کا اقرار کر، جب بھی تو اپنے باغ میں جائے تو دیکھتے ہی یوں کہا کر مَاشَآءَ اللّٰہُ ''لَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ'' جو اللہ چاہتا ہے وہی ہوتا ہے، اللہ کے بغیر کسی کے پاس طاقت اور زور نہیں، تو یوں کہا کر، تاکہ یہ نسبت اللہ کی طرف ہو، اور اللہ کی شکر گزاری ہو۔لیکن اس کو تو اپنے اسباب پر اتنا اعتماد حاصل تھا، وہ کہتا تھا کہ اتنی دولت ہے اور اس طرح سے سارے کے سارے اسباب حاصل ہیں، کیا اللہ کی مشیت اور کیا اللہ کی قدرت؟ یہ سب اپنی ہمت، اپنی قدرت، اپنے کاروبار سے حاصل ہونے والی چیزیں ہیں، اس کا دماغ یہ تھا، اس اللہ والے نے پھر اسے ڈرایا کہ دیکھو! جب وہ دینے پر قادر ہے تو لینے پر بھی قادر ہے، میں تیری ان چیزوں کو دیکھ کے مرعوب نہیں ہوتا، میرے منہ میں پانی نہیں آتا، ٹھیک ہے کہ آج میرے پاس مال کم، آج میری اولاد کم، لیکن اللہ کو قدرت ہے کہ پانسہ پلٹ دے، پانسہ پلٹ کے کل کو مجھے خوش حال کر دے اور تجھے بدحال کر دے، جو اس باغ کو سرسبز کر سکتا ہے وہ اس کو ویران بھی کر سکتا ہے، آسمان کی طرف سے بھی آفت آ سکتی ہے جس طرح سے باغوں پر پالا پڑتا ہے اور باغ خشک

ہوجاتے ہیں، لُو چلتی ہے اور درخت خشک ہوجاتے ہیں، تو اوپر سے بھی آفت آسکتی ہے، اور زمین کی طرف سے بھی آفت آسکتی ہے کہ پانی خشک ہوجائے، قحط پڑجائے، جب پانی ہی نہیں آئے گا، چشمے خشک ہوجائیں گے، نہ نہر جاری ہوگی، نہ کنویں سے پانی نکلے گا تو پھر یہ باغ کہاں سے شاداب رہے گا؟ تو زور لگالینا، پانی کا ایک قطرہ بھی میسر نہیں آئے گا، اوپر بھی اللہ کی قدرت ہے نیچے بھی اللہ کی قدرت ہے، تو یہ فخر کیوں کرتا ہے؟ یہ چیز اللہ کے باقی رکھنے کے ساتھ باقی ہے، اس میں تیری قدرت کا کوئی کسی قسم کا دخل نہیں، اس طرح سے اس کو یاددہانی کرواتا ہے، لیکن اس کے دماغ میں یہ بات نہیں آتی۔

آخر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہی ہوا، آئے دِن جس طرح سے آپ دیکھتے ہیں، آفتیں آتی ہیں، سیلاب آتے ہیں، آبادیاں بہہ جاتی ہیں، اور اسی طرح سے آسمان کی طرف سے آفتیں آتی ہیں باغ اُجڑ جاتے ہیں، اور ایسے ہی قحط آتا ہے، پانی کا قطرہ میسر نہیں آتا، باغ سوکھ جاتے ہیں، تو ایک آفت آئی جس کے تحت اس کا سب کچھ ہی برباد ہوگیا، جب سب کچھ برباد ہوگیا تو اب وہ ہاتھ مل رہا ہے کہ میں تو بہت خسارے میں رہ گیا، میں نے تو باغ میں اتنا سرمایہ لگایا ہوا تھا، نفع تو کیا حاصل ہونا تھا اصل سرمایہ بھی گیا، ہاتھ ملتا رہ گیا، جس جتھے پر وہ اعتماد کر کے فخر کرتا تھا، آج وہ جتھہ اس کے کچھ کام نہ آیا، اور نہ وہ خود ہی کسی قسم کا بدلہ لے سکا۔

تو آخر میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایسے موقعوں پر مدد کرنا صرف اللہ کا کام ہے، اللہ کے علاوہ کوئی دوسرا ایسے موقع پر مدد نہیں کیا کرتا، اللہ کے ہاتھ میں اچھا انجام ہے، اور اللہ کے ہاتھ میں ہی اچھا بدلہ ہے، یہ ہے اس واقعہ کا حاصل جو آپ کے سامنے بیان کیا گیا۔

واقعۂ مذکور کا فتنۂ دجال سے تعلق

حضرت مناظر احسن گیلانی ﷫ نے جو تفسیر لکھی، جس کا ذکر میں بار بار آپ کے سامنے کرتا رہتا ہوں، انہوں نے اس واقعے کو بھی فتنۂ دجال کے ساتھ جوڑا ہے، کہ دجالی فتنے کی بنیاد اسی پہ ہوتی ہے کہ وہ اسباب کو زیادہ سوچتے ہیں، اور اسباب پر انہیں اعتماد زیادہ حاصل ہوتا ہے، منصوبے بناتے ہیں، اور کامیابی کے اُوپر یقین رکھتے ہیں، اور کسی وقت بھی ان کو یہ خیال نہیں ہوتا کہ اللہ کی مشیت کارفرما ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ ہم اپنی قابلیت اور اپنی اہلیت کے ساتھ کماتے ہیں، اور ہمیں ہر قسم کی وسعت حاصل ہوتی ہے، اسباب پر ان کا اعتماد سب سے زیادہ ہوتا ہے، اللہ کی طرف وہ دھیان نہیں رکھتے، اور اس دجالی فتنے سے بچنے کا طریقہ یہی ہے کہ ہر معاملے میں انسان اللہ کی طرف دھیان رکھے کہ جو اللہ چاہتا ہے وہی ہوتا ہے، اگر ایک شخص کو اسباب مہیا ہوں تو وہ اس اعتماد میں نہ رہ جائے کہ میں ہمیشہ ایسے رہوں گا، کل کو اسباب بدل بھی سکتے ہیں، اور اگر کوئی شخص آج بدحال ہے تو اللہ پر اعتماد رکھے کہ ہوسکتا ہے کہ کل کو اللہ تعالیٰ مجھے خوشحال کردے، مستقبل کے بارے میں اللہ پہ امید رکھو، اور ''ماشاء اللہ لاقوۃ الا باللہ'' یہ ایک بہت بڑا ہتھیار ہے دجالی فتنے سے بچنے کے لئے، کہ عقیدہ یہ ہو کہ جو اللہ چاہے گا وہی ہوگا، اور اللہ کے علاوہ کسی کے پاس کوئی قوت اور کوئی کسی قسم کی طاقت نہیں ہے۔ تو دجالی ذہن یہ ہے کہ اسباب پر اعتماد ہو، جس طرح سے آج کل حکومت منصوبے بناتی ہے، کہتے ہیں کہ ۱۹۸۴ء تک ہم یہ کام کرلیں گے، فلاں سن تک ہماری گندم اتنی پیدا ہونے لگ جائے گی اور ہم خودکفیل ہوجائیں گے، فلاں سن

تک ہماری کپاس اتنی پیدا ہوگی اور ہم خوش حال ہو جائیں گے، اور ان کو کوئی ''ان شاء اللہ'' ''ماشاء اللہ'' یاد نہیں آتا۔ لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے آفت آتی ہے، سیلاب جو آتا ہے تو سب کچھ ہی بہا کر لے جاتا ہے، منصوبے کامیاب تو کیا ہونے تھے پہلی رہی سہی چیز بھی ختم ہو جاتی ہے، آسمانی آفتوں کا کسی کو پتا نہیں ہوتا کہ کس وقت آ جائیں گی، اور کس وقت یہ سارے کے سارے نقصان واقع ہو جائیں گے، اس لیے دل کا سہارا اگر ہے تو اللہ کی مشیت ہے کہ انسان اللہ کے ساتھ اپنے آپ کو جوڑ کے رکھے، پھر انسان ان حالات میں پریشان بھی نہیں ہوتا، اور مغرور بھی نہیں ہوتا، اور ان چیزوں کے اوپر اعتماد کر کے اللہ سے غافل بھی نہیں ہوتا۔

شاہِ ایران کے انجام سے عبرت حاصل کرو!

پُرانے زمانے کے واقعات تو عزیزو! آپ لوگوں نے پڑھے سنے ہوں گے، اور پُرانے زمانے کے واقعات پڑھنے سننے کا طبیعت پر اتنا اثر نہیں ہوا کرتا، جتنا اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھے ہوئے واقعات کا ہوتا ہے، زیادہ دُور تک آپ کو سوچنے کی ضرورت نہیں، کیا شاہِ ایران کا قصہ پچھلے دِنوں میں آپ نے سُنا؟ اس کی فوج اتنی مضبوط تھی کہ شاید ایشیا میں کسی دوسرے کی فوج اتنی مضبوط نہ ہو، مال دولت اس کو اتنا حاصل تھا کہ اس کے حساب میں نہیں تھا کہ کتنا مال و دولت ہے، پورے ملک کا بلا شرکتِ غیر بادشاہ تھا، ہر قسم کی قوتیں اور طاقتیں اس کو حاصل تھیں، اور ہر طرح سے مغرور تھا، وہ سمجھتا تھا کہ میرے مقابلے میں کون آ سکتا ہے؟ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے جب اس کا انجام آنکھوں کے سامنے آیا، تو ایک غریب آدمی بھی عبرت پکڑتا تھا کہ یا اللہ! ایسا انجام تو کسی دُشمن کا بھی نہ ہو، ٹکنے کے لئے کہیں جگہ نہیں ملتی تھی، در بدر دھکے کھاتا ہوا آخر وہ دنیا سے چلا گیا، تو یہ دیکھنے اور سوچنے کی باتیں ہوتی ہیں کہ کتنی بڑی قوتوں اور طاقتوں کا مالک کیوں نہ ہو، جب اللہ کی طرف سے ایک تھپیڑ الگتا ہے، تو سارا نشہ ہرن ہو جاتا ہے۔

دو متضاد مثالیں

اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک آدمی مظلوم ہے، فقیر ہے، لیکن انقلاب آتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو کچھ کا کچھ بنا دیتا ہے۔ آپ کے مُلک کی مثال موجود ہے، ایک بھٹو صاحب آئے تھے آپ کے ہاں مضبوط کرسی والے، جس وقت وہ کرسی پہ بیٹھے تھے اور اپنی کرسی انہیں مضبوط نظر آ رہی تھی، تو وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ کسی وقت میں بھی اُلٹا لٹک سکتا ہوں، لیکن جب اللہ کی گرفت آئی تو دُنیا نے دیکھ لیا کہ وہ کس طرح سے لٹک گئے، اور مضبوط کرسی دھری رہ گئی، نہ فوجیں کام آئیں، نہ سیکورٹی فورس کے آدمی کام آئے، نہ مال و دولت کام آیا، نہ قابلیت کام آئی، کچھ بھی نہیں، جب اللہ کی طرف سے ایک تھپیڑ الگا تو سارا معاملہ چت ہو گیا۔ اور اس کے مقابلے میں ہمارے سامنے ہمارے اُستاذ حضرت مفتی محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ فقیر اور درویش آدمی، نہ صاحبِ جائیداد، نہ اور کچھ، ''قاسم العلوم'' میں ہمارے زمانے میں ایک مدرّس تھے، لیکن جب اللہ نے نوازا تو اتنا نوازا، عزت، راحت اور آسائش اللہ تعالیٰ نے اتنی دی کہ عام آدمی اس قسم کی بات سوچ بھی نہیں سکتا، تو ان واقعات کو اگر انسان سوچے تو دِل کو قوت حاصل ہوتی

ہے کہ واقعی اپنا فرض ہے کہ اللہ کے اَحکام کی اطاعت میں کوشش کرتے چلے جائیں، باقی! انجام اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ خوش حالوں کو بدحال بھی کر دیتا ہے، اور بدحالوں کو خوش حال بھی کر دیتا ہے، اور یہ ایک بہت بڑی غلطی ہے کہ انسان تھوڑے سے اسباب مہیا ہو جانے کے بعد مغرور ہو جائے اور اس کا دماغ اونچا ہو جائے کہ اب میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا، اور مجھے اتنا مال و دولت اور اتنے اسباب حاصل ہیں کہ میں خوش حال ہی ہوتا چلا جاؤں گا، یہ اصل میں دجال فتنے کی بنیاد ہے، اس واقعے کے ضمن میں یہی بات یہاں سمجھائی گئی ہے۔

صاحبِ باغ کا شرک ''اعتماد علی الاسباب'' تھا

ایک بات درمیان میں رہ گئی کہ یہ جو واقعہ آپ کے سامنے آیا، اس سے یہ تو آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ وہ باغ والا مشرک تھا، اس لئے آخر میں جا کے اس نے اقرار کیا کہ یٰلَیْتَنِیْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّیْٓ اَحَدًا: ہائے کاش! میں اپنے رَبّ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتا، جس سے معلوم ہوا کہ وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ وبال سارے کا سارا میرے اُوپر شرک کی بنا پر آیا ہے، لیکن اس کا شرک کیا تھا، وہ کسی بُت کو پُوجتا تھا، سورج کو پُوجتا تھا، چاند کو پُوجتا تھا، جنوں کو پُوجتا تھا، بھوتوں کو پُوجتا تھا، کیا شرک تھا؟ اس رکوع میں اس کی کوئی تفصیل ذکر نہیں کی گئی، تو یہاں مفسرین کہتے ہیں، خصوصیت کے ساتھ مولانا گیلانی رحمہ اللہ نے اس بات کی طرف متوجہ کیا، اور اسی طرح سے مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ نے بھی اپنی کتاب میں غالباً مولانا گیلانی رحمہ اللہ سے ہی یہ بات لی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ یہاں شرک ''اعتماد علی الاسباب'' کی صورت میں ہے، یعنی اپنے اسباب پر اتنا اعتماد کر لینا کہ میں سب کچھ ہو گیا، سب کچھ کر سکتا ہوں، مجھے معیشت ان اسباب کی بنا پر حاصل ہے، اور اللہ کی قدرت کو اپنے ان حالات میں دخیل نہ سمجھنا، اللہ کی مشیت کو دخیل نہ سمجھنا، بلکہ ان اسباب پر اعتماد کر کے ان کو ہی سب کچھ سمجھ لینا، یہ بھی شرک ہے۔ اور وہ فرماتے ہیں کہ پُرانے لوگوں کا شرک تو یہ تھا کہ وہ بُت پُوجتے تھے، یا جنوں اور فرشتوں کے نام پہ چڑھاوے چڑھاتے تھے، آج تعلیم یافتہ طبقہ جتنا ہے وہ اس قسم کے شرک میں مبتلا ہے کہ وہ اپنی مہارتِ فن پر، اور اسی طرح اپنے حاصل شدہ اسباب کے اوپر اعتماد کرتا ہے، اور اپنی زندگی گزرانے کے لئے کبھی بھی وہ یہ نہیں سوچتا کہ اللہ کی مشیت ہمارے معاملات میں دخیل ہے، یا اللہ کی قدرت کے ساتھ یہ سب کچھ ہوتا ہے، ان کا ذہن یہی ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے ہم قابلیت سے کرتے ہیں، ہمارے سپیشلسٹ جو ہیں ان کے مشورے اور ان کی کوشش ہمیں خوش حال کرتی ہے، اس قسم کا ذہن یہ بھی مشرکانہ ذہن ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ باغ والا اسی قسم کے شرک میں مبتلا تھا، تو جیسے بُت کو سجدہ کرنا شرک ہے، اور جس طرح سے جنوں اور بھوتوں کو اپنے اُوپر کارساز سمجھ لینا شرک ہے، اسی طرح سے معاشی اسباب کے اوپر اس طرح سے اعتماد کر لینا کہ انسان سمجھے کہ اسی سے مجھے رزق ملتا ہے، اور یہی میری خوش حالی کا باعث ہیں، اللہ کی مشیت اور اللہ کی قدرت کی طرف دھیان نہ رکھنا، یہ بھی ایک قسم کا شرک ہے، اور یہ شرک دورِ جدید کا ہے جس کو آپ ماڈرن قسم کا شرک کہہ سکتے ہیں۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ

بیان کیجئے ان کے لئے دُنیوی زندگی کی مثال، جیسا کہ پانی، ہم نے اُتارا اس کو آسمان سے

فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ ؕ وَكَانَ

پھر خلط ملط ہوگئی اس کے ذریعے سے زمین کی نباتات، پھر ہوجاتی ہے وہ چُورا چُورا، اُڑاتی پھرتی ہیں اس کو ہوائیں، اور

اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا ﴿۴۵﴾ اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ

اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے﴿۴۵﴾ مال اور بیٹے دُنیوی زندگی کی رونق ہیں

الدُّنْيَا ۚ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا ﴿۴۶﴾

اور باقی رہنے والے نیک اعمال بہتر ہیں تیرے رَبّ کے نزدیک بدلے کے اعتبار سے، اور بہتر ہیں اُمید لگانے کے اعتبار سے﴿۴۶﴾

وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَى الْاَرْضَ بَارِزَةً ۙ وَّحَشَرْنٰهُمْ فَلَمْ

اور جس دِن ہم چلادیں گے پہاڑوں کو اور تُو دیکھے گا زمین کو کھلی صاف ستھرا میدان، اور ہم ان سب کو جمع کریں گے، پھر نہیں

نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا ﴿۴۷﴾ ۚ وَعُرِضُوْا عَلٰى رَبِّكَ صَفًّا ؕ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا

چھوڑیں گے ہم ان میں سے کسی کو﴿۴۷﴾ پیش کیے جائیں گے یہ لوگ اپنے رَبّ پر صفیں بنائے ہوئے۔ البتہ تحقیق تم لوگ ہمارے پاس ایسے

كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۢ بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ نَّجْعَلَ لَكُمْ مَّوْعِدًا ﴿۴۸﴾

ہی آگئے جیسا کہ پیدا کیا تھا ہم نے تمہیں پہلی مرتبہ، بلکہ تمہارا گمان یہ تھا کہ ہم ہرگز نہیں کریں گے تمہارے لیے وعدہ﴿۴۸﴾

وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ

اور نامۂ اَعمال رکھ دیا جائے گا، پھر تُو دیکھے گا مجرموں کو ڈرنے والے اس چیز سے جو اس میں ہے، اور وہ مجرم کہہ رہے ہوں گے:

يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّا

ہائے ہمارے خرابی! اس کتاب کو کیا ہوگیا، نہیں چھوڑتی یہ کسی چھوٹی بات کو اور نہ کسی بڑی بات کو مگر

اَحْصٰىهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ؕ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ﴿۴۹﴾ ع

اس کا احاطہ کرلیا ہے، اور اپنے کیے ہوؤں کو حاضر پائیں گے، اور تیرا رَبّ کسی پر ظلم نہیں کرتا﴿۴۹﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا: یہاں ضَرَبَ مثال بیان کرنے کے معنی میں ہے جس طرح سے آپ کے سامنے پچھلے رکوع کی ابتداء میں ذکر کیا تھا (ایک دفعہ جو محاورہ آ جائے، اس کو یاد رکھا کر دتا کہ آسانی ہوتی چلی جائے) لَهُمْ کی ضمیر لوٹ رہی ہے سرورِ کائنات ﷺ کے مخاطبین یعنی مشرکینِ مکہ کی طرف۔ بیان کیجئے ان کے لئے دنیوی زندگی کی مثال۔ حیاۃ کا معنی زندگی، اور دنیا کا لفظ یہ ادنیٰ کا مؤنث ہے، دَنَا یَدْنُوْ: قریب ہونا۔ دنیا: قریب والی چیز کو کہتے ہیں، وَلَقَدْ زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا (سورۂ ملک: ۵) وہاں بھی دنیا کا لفظ آیا ہوا ہے، قریب والا آسمان۔ اور ہم اس زندگی کو دنیوی زندگی اس لئے کہتے ہیں کہ یہ آخرت کے مقابلے میں ہمارے قریب ہے، یہ گویا کہ نقد ہے اور آگے دوسرا عالم ہماری آنکھوں سے پوشیدہ ہے، اس اعتبار سے اس زندگی کو دنیوی زندگی کہا جاتا ہے، اور اس کو دنیا کہا جاتا ہے، کہ آخرت کے مقابلے میں یہ قریب ہے، كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ: بیان کیجئے ان کے لئے دُنیوی زندگی کی مثال، وہ مثال ایسے ہے جیسا کہ پانی، اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ: ہم نے اتارا اس کو آسمان سے فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ: اِخْتَلَطَ: خلط ملط ہو جانا، گتھم گتھا ہو جانا۔ پس خلط ملط ہوگئی اس کے ذریعے سے زمین کی نباتات، زمین کی نباتات خوب گنجان ہوگئی اس پانی کی وجہ سے، فَاَصْبَحَ هَشِیْمًا: هَشَمَ یَهْشِمُ چورا کر دینا، هشیم مهشوم کے معنی میں ہے، اصبح کی ضمیر نَبَاتُ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ پھر وہ زمین کی نباتات، زمین کی پیداوار، زمین کی نباتات ہو جاتی ہے چورا چورا، تَذْرُوْهُ الرِّیٰحُ: ذَرَا یَذْرُوْ: بکھیر۔ اُڑاتی پھرتی ہیں اس کو ہوائیں۔ ہُ ضمیر نَبَاتُ کی طرف لوٹ گئی ''پھر وہ نباتات چورا چورا ہو جاتی ہے، پھر اس کو ہوائیں بکھیرتی ہیں، ہوائیں اڑاتی پھرتی ہیں'' وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ مُّقْتَدِرًا: اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کے اوپر قدرت رکھنے والا ہے۔ اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ: مال اور بیٹے زِیْنَةُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا: یہ دُنیوی زندگی کی سجاوٹ ہیں۔ زینت: سجاوٹ، نمائش۔ یہ دنیوی زندگی کی سجاوٹ ہیں، رونق ہیں۔ وَالْبٰقِیٰتُ الصّٰلِحٰتُ اور باقی رہنے والے نیک اعمال خَیْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا: بہتر ہیں تیرے رَبّ کے نزدیک از روئے بدلے کے، وَخَیْرٌ اَمَلًا: اور بہتر ہیں از روئے اُمید لگانے کے، اَمَلْ اُمید کو کہتے ہیں، یعنی نیک اعمال ہی ایسی چیز ہیں جو اُمید لگانے کے اعتبار سے بہتر ہیں، اور بدلے کے اعتبار سے بہتر ہیں، وَیَوْمَ نُسَیِّرُ الْجِبَالَ: سَارَ یَسِیْرُ چلنا، قرآنِ کریم میں آئے گا: سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ (سورۂ انعام: ۱۱ وغیرہ) زمین میں چلو پھرو۔ اور سَیَّرَ تَسْیِیْرٌ: چلانا۔ وَیَوْمَ نُسَیِّرُ الْجِبَالَ جس دن کہ ہم پہاڑوں کو چلا دیں گے، یعنی ان کی جگہوں سے ہلا دیں گے، جبال جبل کی جمع، جس دن کہ ہم چلائیں گے پہاڑوں کو۔ وَتَرَى الْاَرْضَ بَارِزَةً: اور دیکھے گا تو زمین کو کھلی ہوئی، صاف ستھرا میدان۔ بارزۃ کا معنی ننگی، جس کے اوپر کوئی کسی قسم کی رکاوٹ نہیں، نہ نباتات کی، نہ باغات کی، نہ پہاڑوں کی، نہ کوئی حویلی، نہ کوئی مکان، کھلی ہوئی زمین ہوگی، صاف ستھرا میدان، وَّحَشَرْنٰهُمْ: اور ہم ان سب کو جمع کریں گے فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا: مُغَادَرَةٌ چھوڑنا۔ پھر نہیں چھوڑیں گے ہم ان میں سے کسی کو۔ وَعُرِضُوْا عَلٰى رَبِّكَ صَفًّا: صَفًّا مُصْطَفِّیْنَ کے معنی میں۔ پیش کیے جائیں گے یہ لوگ اپنے رَبّ پر قطار در قطار، صفیں باندھے ہوئے۔ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا: اس سے پہلے قُلْنَا یا نَقُوْلُ کا لفظ محذوف ہے، اگر ماضی کا صیغہ نکالیں تو بھی معنی مستقبل والا ہوگا، تحقق وقوع کی وجہ سے مستقبل کو ماضی سے

تعبیر کیا جاتا ہے، جیسے نحو میں آپ پڑھتے ہیں۔ پھر ہم کہیں گے، لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا: البتہ تحقیق تم لوگ ہمارے پاس آ گئے، کَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ: جیسے کہ پیدا کیا تھا ہم نے تمہیں پہلی مرتبہ، تم ہمارے پاس ایسے ہی آ گئے جس طرح سے ہم نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا، بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ نَّجْعَلَ لَكُمْ مَّوْعِدًا: بلکہ تمہارا گمان یہ تھا کہ ہم ہرگز نہیں کریں گے تمہارے لیے وعدہ، ہم تمہارے لئے کوئی وعدہ متعین نہیں کریں گے، کوئی وعدے کا وقت متعین نہیں، تمہارا خیال یہ تھا، وَوُضِعَ الْكِتٰبُ: کتاب سے نامۂ اعمال مراد ہے۔ کتاب رکھ دی جائے گی، نامۂ اعمال رکھ دیا جائے گا، فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ: تَرٰی کا خطاب ہر مخاطب کو ہے جو بھی سن رہا ہے۔ پھر تو دیکھے گا مجرموں کو ڈرنے والے اس چیز سے جو اس کتاب میں ہے، ما فیہ جو کچھ اس کتاب میں ہے اس سے تو مجرموں کو ڈرنے والے دیکھے گا، کانپ رہے ہوں گے کہ اس میں کیا کچھ لکھا ہوا ہے، وَيَقُوْلُوْنَ: اور وہ مجرم کہہ رہے ہوں گے يٰوَيْلَتَنَا: ہائے ہماری خرابی! مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ اس کتاب کو کیا ہو گیا لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً: يُغَادِرُ اور لم نُغَادِرْ ایک ہی چیز ہے۔ اس کتاب کو کیا ہو گیا، نہیں چھوڑتی یہ کتاب کسی چھوٹی بات کو نہ کسی بڑی بات کو، اِلَّآ اَحْصٰىهَا: مگر اس کتاب نے اس کو گھیر لیا ہے، نہیں چھوڑتی یہ کسی چھوٹی بات نہ بڑی بات کو مگر اس نے اس کا احاطہ کر لیا ہے، گھیر لیا ہے، یعنی اس میں تو سب کچھ ہی لکھا ہوا ہے۔ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا: مَا عَمِلُوْا جو کچھ انہوں نے کیا۔ پائیں گے وہ اس چیز کو جو انہوں نے کی حاضر، اپنے کیے ہوؤں کو حاضر پائیں گے۔ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا: اور تیرا رب کسی پر ظلم نہیں کرتا، لَا یَظْلِمُ ظلم نہیں کرتا تیرا رب کسی پر۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط

پچھلے رکوع میں ایک خاص مثال بیان کی گئی تھی دو افراد کی، جن میں سے ایک دو باغوں والا تھا اور ایک فقیر مسکین تھا، اور اس مثال کے تحت یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ انسان کبھی بھی اپنے اسباب پر اعتماد نہ کرے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف نظر رکھے کہ ہوتا وہی ہے جو اللہ کو منظور ہو، اور یہ اسباب ساتھ نہیں دیا کرتے، ان کا وجود بھی اس وقت تک ہی ہے جب تک ان کے ساتھ اللہ کی مشیت متعلق ہے، اور اگر ان کے ساتھ اللہ کی مشیت متعلق نہ رہے تو یہ اسباب دھرے رہ جاتے ہیں، اور ان کے ذریعے سے انسان کو روزی اور راحت نہیں ملتی، اب ایک عمومی مثال ہے دنیوی زندگی کی، اس مثال کے ذریعے سے بھی فنائے دنیا کا نقشہ پیش کرنا مقصود ہے، اور یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ دنیا فانی ہے، اس میں تم کتنے ہی بڑھ جاؤ، کتنے ہی چڑھ جاؤ، کتنے ہی اسباب جمع کر لو، آخر ایک دن یہ ختم ہو جائے گی، اور اس کے بعد ایک جہان شروع ہو گا جو ہمیشہ کے لئے باقی رہنے والا ہے، اور اس دنیا میں جو کچھ کیا ہو گا ذرہ ذرہ اس وقت آپ کے سامنے آ جائے گا، فکر کرنے کی بات وہ ہے۔

باقی اور فانی چیز کے تقابل پر پہلی مثال

اب آپ جانتے ہیں کہ اگر ایک شخص کو یہ اختیار دے دیا جائے کہ یہ کوٹھی ہے، اس میں دنیا کی ہر قسم کی راحت ہے، ایئر کنڈیشن ہے، ٹھنڈے پانی کے لیے کولر لگے ہوئے ہیں، ہوا کا انتظام ہے، سونے کے لئے بہترین بستر ہیں، نہانے کے لیے بہترین غسل خانے ہیں، جو بھی عیش آپ سوچ سکتے ہیں وہ اس کوٹھی میں موجود ہے، اگر یہ لیتے ہو تو لے لو، لیکن یہ ملے گی تمہیں صرف ایک مہینے کے لیے، اس کے بعد ہم اس کو واپس لے لیں گے، اور ایک یہ مکان ہے سادہ سیدھا سا، جس میں دنیا کی کوئی عیش و عشرت نہیں ہے، سادہ سا مکان ہے، سایہ ہے، دیواریں ہیں، پردہ ہے، اگر یہ لیتے ہو تو یہ ہم آپ کو زندگی بھر کے لیے دے دیں گے، ساری زندگی اس میں رہنا، ہم یہ واپس نہیں لیں گے۔ اگر یوں کسی کے سامنے دو مکان پیش کر دیے جائیں کہ ایک بہت بڑی کوٹھی جو ہر طرح سے مزین ہے لیکن چند روز کے لئے ہے، ایک مہینے کے بعد ہم خالی کروالیں گے، پھر ہمیں نہیں معلوم، تم فٹ پاتھوں پہ سوؤ، ہمیں نہیں معلوم سڑکوں پر دھکے کھاؤ، پھر تمہارے لیے کوئی مکان نہیں ہے، اور ایک یہ لے لو جو سادہ سیدھا سا ہے، جھونپڑی کی شکل کا، جس میں گزارہ ہے، وقت گزر جائے گا، باقی! یہ کہ رہے گا تمہارے پاس ہمیشہ، ہم اس کو واپس نہیں لیں گے۔ اگر یہ چیز آپ کے سامنے پیش کر دی جائے، تو میرا خیال ہے کہ اگر دماغ میں کچھ بھیجا موجود ہو، اور عقل ٹھکانے ہو، اور انسان میں کچھ سوچنے کا ملکہ ہو، تو وہ کہے گا بھائی! پھر ہمیں یہ سادہ سیدھا مکان ہی دے دو، کم از کم زندگی بھر ٹک کے بیٹھیں گے تو سہی، اب اس کوٹھی کو لے کر ہم کیا کریں گے کہ ایک مہینے تک تو اس میں کرلیں عیش، اور اس کے بعد دھکے کھائیں، اور کہیں سایہ بھی نصیب نہ ہو، اب اس کوٹھی میں آپ کو کیا عیب نظر آیا؟ جس کی وجہ سے آپ اس کے مقابلے میں ایک سادہ مکان کو پسند کریں گے، تو اس کوٹھی میں عیب یہی ہے کہ یہ ہمیشہ کے لئے نہیں، زندگی بھر کے لئے نہیں، اور وہ مکان چاہے سادہ ہے لیکن زندگی بھر کے لئے ہے۔ تو باقی رہنے والی چیز ہمیشہ فانی کے مقابلے میں ترجیح پا جاتی ہے۔

دُوسری مثال

آپ سے کوئی کہے کہ ہمارے پاس آ جاؤ، ایک دِن ہم آپ کو کھلائیں گے مرغ اور مرغن کھانے، پلاؤ، قورمہ، کباب، فیرنی، آئس کریم، پینے کے لئے ہر قسم کا سوڈا میسر ہوگا، صبح سے شام تک کھاتے پیتے رہنا، لیکن پھر نو دِن فاقہ کرنا پڑے گا، پھر نو دِن ہم کچھ نہیں دیں گے، ایک دِن جتنا تمہارا جی چاہے کھالو، منہ مانگی مرادیں ملیں گی، لیکن اس کے بعد نو دِن فاقہ، اور اگر تم دال روٹی پر گزارہ کرنا چاہو تو بھائی! دس دِن دو وقت لیتے رہو، تمہاری مرضی، اب اگر یہ چیز آپ کے سامنے پیش کر دی جائے، تو کیا آپ دال روٹی کو پسند کریں گے یا مرغن کھانوں کو پسند کریں گے؟ کہ ایک ہی دِن کھالیں، اور بعد میں نو دِن فاقہ کرلیں گے، کیا خیال ہے آپ کا؟ سادہ روٹی کو پسند کرو گے یا مرغن کھانوں کو پسند کرو گے؟ (سادہ روٹی) کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ اگر مرغن کھانوں کے ساتھ پیٹ بھر ہی لیا، تو پیٹ کی یہ خاصیت ہے کہ اوپر سے ڈالتے جاؤ، نیچے سے نکلتا جائے گا، جس برتن کے نیچے سوراخ ہو وہ بھرا نہیں رہتا، تو یہ آخر خالی ہو جائے گا، اور خالی ہونے کے بعد نو دِن جو تڑپنا پڑے گا، تو پھر یہ کھایا ہوا کس کام کا؟ پھر

نانی یاد آ جائے گی جس وقت بھوک لگے گی، اور اس کی بجائے بہتر ہے کہ سادہ کھاتے رہو، اور صبح وشام بوقت ضرورت کھاتے رہو تو اس میں آرام اور راحت ہے، تو عقل منداس طرح سے سوچا کرتا ہے کہ دیکھنا یہ ہے کہ دائمی راحت کس چیز میں ہے، یہ نہیں سوچا کرتے کہ عارضی طور پر عیاشی کس چیز میں ہے چاہے بعد میں پھانسی پہ لٹکنا پڑے، عارضی طور پر راحت کس چیز میں ہے، بعد میں چاہے مصیبت اٹھانی پڑے، یہ بیوقوفوں والی سوچ ہے، عقل مندوں والی سوچ نہیں ہے۔

پاگلوں کی بستی

لیکن جس بستی میں سارے ہی پاگل جمع ہو جائیں، وہاں پاگلوں والی حرکتیں تو اچھی لگتی ہیں، اور اگر کوئی عقل مند آ جائے تو عجیب سا معلوم ہوگا، جس طرح سے مشہور ہے کہ کہیں ناک کٹی عورتیں جمع تھیں، اور وہاں کہیں ایک ناک والی چلی گئی، تو اس کو ''ناکو، ناکو'' کہہ کے اس کا مذاق اڑانے لگ گئیں، یعنی وہاں اس معاشرے کے اندر ناک کا کٹا ہوا ہونا خوبی ہے، اور ناک کا ہونا عیب ہے، اب اس اُلٹے دماغ کا کیا علاج ہے، اب یہاں دنیا کی بستی میں ہر شخص نے یہ طرز اپنالیا کہ بس نقد کھاؤ جو کچھ ملتا ہے، کل کی خبر نہیں، جو ہوگا دیکھی جائے گی، ''بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست'' کھاپی لو جو کچھ کھانا ہے، دنیا میں کھانے پینے کے لئے آئے ہیں۔

دُنیا کی زندگی بھی فانی، اور اس کی رونقیں بھی فانی

لیکن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے سامنے اس حقیقت کو نمایاں کرتا ہے کہ ذرہ آنکھیں کھولو، جھانک کے دیکھو، بالکل مشاہدے کے درجے میں ہے، یہ نہیں کہ تمہیں کسی ایسی حقیقت کی طرف متوجہ کیا جا رہا ہے جو آپ کو دلائل سے سمجھانے کی ضرورت ہے۔ بلکہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے، اور ہم اپنی آنکھوں کے سامنے اس بات کو دیکھتے ہیں، لیکن لذت پرستی نے ہمارے دماغوں کے اوپر اس طرح سے پردہ ڈال رکھا ہے کہ ہم اس بات کو سمجھتے نہیں، ورنہ ہے مشاہدہ، کس چیز کا مشاہدہ ہے؟ ہر محلے میں، ہر بستی میں، ہر قصبے میں، بلکہ ہر گھر سے جنازے اٹھتے ہیں، اور یہ جنازے کا اٹھنا یہ ایک مشاہدے کی دلیل ہے کہ دنیا فانی ہے، تم چاہے کتنے ہی خزانے جمع کرلو، جس طرح سے ماں کے بطن سے ننگ دھڑنگ خالی ہاتھ آئے تھے، اسی طرح سے اس دنیا سے تمہیں ننگ دھڑنگ خالی ہاتھ آگے منتقل کر دیا جاتا ہے، جیسے آئے تھے ویسے ہی جاتے ہو۔ تو اس سے معلوم ہو گیا کہ دنیا میں انسان چاہے کچھ کرلے، لیکن یہ عارضی ہے، ایک بات یہ ہے، یہ تو ہے ایک پختہ بات، جس میں کوئی اشتباہ کی گنجائش ہی نہیں، کوئی آدمی سوچ ہی نہیں سکتا کہ میں نے دنیا میں ہمیشہ رہنا ہے، لیکن اپنا مرنا یاد نہیں رہتا، زندگی گزارتا یوں ہی ہے جس طرح سے کہ ہمیشہ رہنا ہو، اور وہ وقت اس کو یاد نہیں کہ جب اس کو کان سے پکڑ کے ان حویلیوں سے اور محلات سے منتقل کر کے باہر مٹی کے ڈھیر کے نیچے دے دیا جائے گا، وہ وقت اس کو یاد نہیں رہتا، اگرچہ بات کرو گے تو کہے گا کہ یہ تو یقینی بات ہے، لیکن یہ ایسی یقینی ہے کہ یاد نہیں رہتی۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ دوسری بات بھی ہے، فنائے دنیا کے یہ واقعات بھی آپ کے سامنے پیش آتے رہتے ہیں، کہ ایک وقت میں ہر قسم کی راحت اور آرام حاصل ہے، دوسرے وقت میں کوئی ایسی آفت آتی ہے کہ سب کچھ ہی ختم ہو جاتا ہے، اور انسان خالی ہاتھ کھڑا رہ جاتا ہے، دنیا میں بھی ایسے واقعات ہوتے ہیں، کھیتی جس وقت شباب کو پہنچی اجڑ گئی، باغ جس وقت انتہا کو

پہنچا ویران ہو گیا، جیسے اوپر مثال دی گئی تھی، محلات بنتے ہیں تو کیا آئے دن تم ان مکانوں کو گرتا ہوا نہیں دیکھتے؟ زلزلے کے ساتھ تباہ ہوتے ہوئے نہیں دیکھتے؟ آگ لگ کے ان کو جلتا ہوا آپ نہیں دیکھتے؟ چوروں کے ہاتھ میں یہ لٹتے ہوئے آپ کو نظر نہیں آتے؟ کیا یہ چیزیں اور یہ واقعات آپ کے سامنے نہیں ہیں؟ تو جب یہ سارے کے سارے واقعات ہیں، تو تمہاری آنکھیں کیوں نہیں کھلتیں؟ کہ یہ تو سارے کا سارا عارضی سا معاملہ ہے، جس طرح بچے کے سامنے کھلونا ڈال دیا جائے، تو بچہ اس سے کھیلنے لگ جاتا ہے، اسی طرح سے یہ تو ایک کھلونا ہے، اور جو لوگ اپنی صلاحتیں صرف ان فانی چیزوں کے لئے ختم کر دیتے ہیں، اس سے بڑھ کے خسارہ اور کوئی نہیں۔

عیش تو آخرت کا ہے

اللہ تعالیٰ تمہارے سامنے دوسرا رخ پیش کرتا ہے کہ ایک زندگی آگے بھی آنے والی ہے، جس میں اس زندگی کا محاسبہ ہوگا، اصل راحت وہاں کی راحت ہے، جیسے حدیث شریف میں آتا ہے، حضور ﷺ فرماتے ہیں: ''اَللّٰھُمَّ لَا عَیْشَ اِلَّا عَیْشُ الْاٰخِرَۃِ''(۱) یا اللہ! عیش اگر ہے تو آخرت کی عیش ہے، دُنیا کی عیش کوئی عیش نہیں، جو لوگ اس نکتے کو سمجھ جاتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ اس دُنیا میں تو گزارہ کرنے کی کوشش کرو، جیسے حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ میری مثال تو ایسے ہی ہے جیسے کہ راہ چلتا مسافر تھوڑی دیر کے لئے درخت کے نیچے ستانے کے لئے بیٹھ جاتا ہے، سانس لیتا ہے، آگے اپنا کام شروع کر دیتا ہے،(۲) اور اس کو دُنیا کی اردگرد کی بہار سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، دیکھنا یہ ہے کہ ہماری منزل سامنے ہے وہ سفر کٹنا چاہیے، اور اس کی ساری کی ساری توجہ آخرت کی طرف ہوگی، اللہ کے اَحکام کی رعایت رکھے گا، یہ ہے نفع کا سودا۔ اور جو دُنیا کی محبت کے اندر مبتلا ہو کے اسی میں ہی کھپ جاتے ہیں وہ اسی کے ہی ہو کے رہ گئے، اور یہاں سے جائیں گے تو خالی ہاتھ ہوں گے، پلے کچھ ہوگا نہیں، عمر اپنی ضائع کر بیٹھے، اور جو دُنیا کی محبت کے اندر مبتلا ہوتے ہیں وہی فتنوں کا شکار ہوتے ہیں، حضور ﷺ نے فرمایا: ''حُبُّ الدُّنْیَا رَاْسُ کُلِّ خَطِیْئَۃٍ''(۳) دُنیا کی محبت ہر گناہ کی بنیاد ہے، اور آخرت کی فکر ہر نیکی کی اصل ہے، جو شخص آخرت کی فکر رکھے گا ہر نیکی اس کے لئے آسان ہے، اور جو دُنیا کی محبت کے اندر مبتلا ہو گیا ہر برائی اس کے سر پہ چڑھتی جاتی ہے، اس رکوع کے اندر یہی فنائے دُنیا کی مثال دی گئی۔

کیا مال اور اولاد قابلِ اعتماد ہیں؟

خارج سے نباتات کی مثال جو دی گئی وہ بھی ایسے ہے، اور خود انسان کے متعلق بھی یوں ہی سمجھو، انسان بھی پیدا ہوتا ہے، اسی طرح سے جس طرح ایک نباتات پیدا ہوتی ہے انسان بھی یونہی پیدا ہوتا ہے، پیدا ہونے کے بعد بڑھتا ہے، چڑھتا ہے، جوان ہوتا ہے، ماں باپ توقعات لگا لیتے ہیں کہ اب بچہ جوان ہو گیا، ہم اس سے فائدہ اٹھائیں گے، یہ ہماری خدمت کرے گا، کما کے

---

(۱) بخاری ج ۱ ص ۴۱۵ باب البیعۃ فی الحرب۔ مشکوٰۃ ۲/ ۴۰۹ باب البیان والشعر فصل اول
(۲) ترمذی ج ۲ ص ۶۳ باب ماجاء فی کراھیۃ کثرۃ الاکل سے پہلے۔ مشکوٰۃ ج ۲ ص ۴۴۲، کتاب الرقاق فصل ثانی۔
(۳) مشکوٰۃ ج ۲ ص ۴۴۴، کتاب الرقاق فصل ثالث۔

لائے گا۔ تو کیا بوڑھے ماں باپ کے سامنے جوان بیٹوں کے جنازے نہیں اٹھتے؟ کیا خیال ہے آپ کا؟ بوڑھے ماں باپ کے سامنے جوان بچے نہیں مرتے؟ یہ بھی تو ایسے ہی ہے جیسے لگا ہوا باغ جس وقت پھلا اس وقت کوئی آفت آئی اور اجڑ گیا، اور جس وقت کھیتی پورے عروج پہ پہنچی، کوئی آفت آئی اور تباہ ہوگئی، سیلاب آگیا سب کو بہا کے لے گیا، یا کوئی اور کسی قسم کی آفت آئی جس نے معاملہ سرے لگا دیا، تو بیٹوں پر بھی کیا اعتماد ہے کہ جن پر تم اعتماد کر کے کہو کہ یہ ہماری عیاشی کا ذریعہ بنیں گے، جس طرح سے فصل وقت پہ اجڑ جاتی ہے اسی طرح سے جوان بیٹے بھی آنکھوں کے سامنے ختم ہو جاتے ہیں، اور اگر ختم نہ ہی ہوں تو باغی ہو کے گھر سے نکل جاتے ہیں، ماں باپ کو دھکا دے کے ایک طرف کر دیتے ہیں، تو تم نے ان بیٹوں سے کیا فائدہ اٹھایا؟ جس مال پر تم آج غرور کرتے ہو یہ مال فانی ہے، جن بیٹوں پر تم غرور کرتے ہو یہ بیٹے بھی محض دنیا کی سجاوٹ ہیں، تو ان پر اعتماد کر کے غرور کرنا اور اللہ تعالیٰ سے غافل ہو جانا عقل مندی نہیں، اس رکوع کے اندر یہی آخرت کی یاد دہانی کرائی گئی ہے اور دنیا کے فنا ہونے کا نقشہ سامنے پیش کیا گیا ہے۔

آیاتِ بالا پر ایک نظر دوبارہ

ایک دفعہ پھر ترجمہ دیکھ لیجئے...... ''بیان کیجئے ان کے لئے دنیوی زندگی کی مثال، ایسے ہے جیسا کہ پانی، اُتارا ہم نے اس کو آسمان سے پھر خلط ملط ہوگئیں اس پانی کے ذریعے سے زمین کی انگوریاں'' زمین کی نباتات خلط ملط ہوگئی، گتھم گتھا ہو کے پھوٹی، بہت گھنی پھوٹی، اس کا مفہوم یہ ہے۔ ''پھر ہو جاتی ہے وہ چُورا چُورا'' آخر ایک وقت آتا ہے، اپنا وقت گزار کے ہر سبزہ خشک ہو جاتا ہے، چُورا چُورا ہو جاتا ہے، ''ہوائیں اس کو اڑائے پھرتی ہیں'' تو یہی دُنیا کی مثال ہے کہ دنیا چاہے کتنی مزین اور آپ کو کتنی اچھی نظر آئے، لیکن آخر کار اس پہ فناء طاری ہوگا، ''اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کے اوپر قدرت رکھنے والا ہے'' مال اور بیٹے جن پر لوگ ناز کرتے ہیں، جس طرح پچھلی آیات میں دو آدمیوں کی آپس میں گفتگو نقل کرتے ہوئے، سرمایہ دار نے غریب کے مقابلے میں کہا تھا کہ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّاَعَزُّ نَفَرًا، جماعت کے اعتبار سے بھی میں زیادہ ہوں، اور اس فقیر نے مقابلے میں کہا تھا اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّوَلَدًا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سرمایہ دار مال کی وسعت اور اولاد کی کثرت پر اور اپنے خاندان کی بڑائی پر فخر کر رہا تھا، تو ''یہ مال اور یہ بیٹے دنیوی زندگی کی سجاوٹ ہیں، یہ تو ظاہری طور پر دنیوی زندگی کی زینت ہیں'' تو جب دنیوی زندگی کو دوام نہیں تو اس کی زینت کہاں رہے گی؟ جب دنیوی زندگی ختم ہونے والی ہے تو یہ زینت کب تک باقی رہے گی؟

باقیاتِ صالحات ہی قابلِ اعتماد ہیں

(وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ) اور نیک اعمال باقی رہنے والے بہتر ہیں تیرے رَبّ کے نزدیک۔ باقیاتِ صالحات سے ہر نیک عمل مراد ہے (مظہری)، خصوصیت کے ساتھ سرورِ کائنات ﷺ سے یہ کلمات منقول ہیں: ''سُبْحَانَ اللهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَاللهُ اَكْبَرُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللهِ'' گویا کہ یہ کلمات باقیاتِ صالحات کا مصداق ہیں،[1] مطلب یہ ہے

(۱) مسند احمد ۳/۷۵، رقم ۱۱۷۱۲۔ معجم صغیر طبرانی، رقم ۳۰۷۔ نیز روح المعانی۔ نوٹ: موطأ مالک، باب ذکر اللہ میں سعید بن مسیب کا قول ہے اس میں ''العلی العظیم'' بھی ہے۔

کہ یہ پڑھو، جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان میں سے ہر ایک کلمے کی برکت سے آخرت کے باغ میں ایک درخت لگا دیتے ہیں،[1] تو یہ باقی رہنے والی چیز ہے اور دائم ہے، ان سے فائدہ اُٹھاسکو گے۔ اور ہر نیکی اس میں شامل ہے، جو بھی اللہ کے لئے نیک عمل کیا جائے، ''یہ تیرے رَبّ کے نزدیک بہتر ہیں ازروئے بدلے کے اور بہتر ہیں ازروئے اُمید لگانے کے'' نہ بیٹوں پہ اُمید لگاؤ کہ آنے والے وقت میں یہ باعثِ راحت بنیں گے، نہ مال پہ اُمید لگاؤ، یہ بے وفا چیزیں ہیں، معلوم نہیں ہاتھ سے کس وقت نکل جائیں، تم زندہ رہ جاؤ اور مال لٹ جائے، تم زندہ رہ جاؤ اور بیٹے بچھڑ جائیں، چاہے چھوڑ کے چلے جائیں چاہے مر جائیں، یہ قابلِ اعتماد چیزیں نہیں ہیں، اعتماد اگر کیا جاسکتا ہے تو نیکیوں پہ کیا جاسکتا ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کا اچھا بدلہ ملنے کی توقع ہے، نیک اعمال پہ اعتماد کرو۔

قیامت کا نقشہ

(وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ) اور اس دنیا کے فنا ہونے کے بعد قیامت کا یہ نقشہ سامنے آئے گا، آج تمہیں یہ زمین بڑی مضبوط نظر آتی ہے، اور اس کے اوپر بڑے بڑے مضبوط پہاڑ نظر آتے ہیں، لیکن یہ بھی فانی ہیں۔ ''یاد کیجئے اس دِن کو، قابلِ ذکر ہے وہ دِن جس دِن ہم پہاڑوں کو ان کی جگہ سے ہلا دیں گے، چلا دیں گے'' یہ پہاڑ اپنی جگہ چھوڑ کے چل دیں گے، جس طرح سے دوسری آیات میں آتا ہے کہ یہ ہوا میں اس طرح سے اڑے پھریں گے، جس طرح سے دھنی ہوئی اون کے گالے اور ریشے اڑتے پھرتے ہیں، كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ہو جائیں گے، جیسے رنگ دار اون کو دھنکا جاتا ہے تو وہ ہلکی ہو کے اڑتی ہے، پہاڑوں کا یہ حال ہو جائے گا، ''اور تُو زمین کو دیکھے گا کھلم کھلی۔'' بارِزۃ: ننگی۔ نہ اس کے اوپر کوئی عمارت ہوگی، نہ کوئی حویلی ہوگی، نہ باغات ہوں گے، نہ درخت ہوں گے، نہ پہاڑ ہوں گے، کوئی چیز نہیں ہوگی جو اس زمین کو پردہ کر سکے، چھپا سکے، بالکل چٹیل میدان کھلا ہوگا، ''اور اس میدان میں ہم ان سب کو جمع کرلیں گے، اور ان میں سے کسی ایک کو بھی نہیں چھوڑیں گے'' جب سارے کے سارے سامنے آجائیں گے، تو اپنے رَبّ کے سامنے قطار در قطار پیش کیے جائیں گے، کوئی کسی کے پیچھے چھپ نہیں سکے گا۔

تمام لوگ قبروں سے ننگی حالت میں نکلیں گے

(لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا) اور ہم کہیں گے کہ آگئے تم ہمارے پاس ویسے ہی جیسا کہ پہلی مرتبہ ہم نے تمہیں پیدا کیا تھا، جیسے گئے تھے بغیر لباس کے، بغیر ٹوپی کے، بغیر جوتے کے اسی طرح سے واپس تشریف لے آئے۔ دُنیا میں جیسے آتے ہیں، تو قبروں سے جب اُٹھیں گے تو یہی کیفیت ہوگی، حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ سب ننگ دھڑنگ ہوں گے، حُفَاةً عُرَاةً غُرْلًا یہ لفظ حدیث شریف میں آتے ہیں کہ پاؤں ننگے، بدن ننگے، اور بے ختنہ، جس طرح سے دُنیا میں آئے تھے، جیسے آئے تھے ویسے نکلیں گے، جیسے ماں کے بطن سے جنم لیا تھا، اسی طرح سے برزخ سے جنم لیں گے، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے سامنے جس وقت یہ بات آپ ﷺ نے

(۱) ترمذی ۲ / ۱۸۳، باب ماجاء فی فضل التسبیح۔ مشکوٰۃ ۱ / ۲۰۲، باب ثواب التسبیح فصل ثانی۔ ابن ماجہ ۱ / ۲۷۰، کتاب الدعاء سے تھوڑا پہلے۔

فرمائی، تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا: یا رسول اللہ! اس میدان میں سارے ننگے ہوں گے، تو کیا مرد عورت سارے اکٹھے ہوں گے؟، تو بعض بعض کی طرف دیکھیں گے۔ آپ نے فرمایا: عائشہ! معاملہ اس سے بہت سخت ہوگا۔[1] مطلب یہ ہے کہ اتنی ہیبت اور لوگ اتنے حواس باختہ ہوں گے کہ کسی کو پتا ہی نہیں چلے گا کہ میرے پاس مرد ہے کہ عورت، اس قسم کے حالات میں کہاں توجہ ہوگی؟ اور اس کے بعد درجہ بدرجہ اللہ تعالیٰ لباس پہنائیں گے، سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو لباس پہنایا جائے گا (حوالہ مذکورہ)، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنایا جائے گا، اسی طرح آہستہ آہستہ باقیوں کو پہنا دیا جائے گا، تو قبروں سے بالکل ایسے نکلیں گے جیسے ماں کے بطن سے آئے تھے، نہ سر پہ ٹوپی، نہ پاؤں میں جوتا، تو جیسے آئے تھے ویسے ہی وہاں سارے کے سارے آجائیں گے، یہی ہے مطلب كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍۭ کا، نمونہ پیش کر دیا ''تم ہمارے پاس ویسے ہی آگئے جس طرح سے ہم نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا۔''

ساری زندگی کا ریکارڈ سامنے آجائے گا

اور تمہیں یہ دِن یاد نہیں تھا، تم یہ نہیں سمجھتے تھے کہ ہم اس طرح سے دوبارہ نکال لیے جائیں گے، بلکہ تم یہ سمجھے ہوئے تھے کہ ہم ہرگز تمہارے لیے کوئی وعدہ متعین نہیں کریں گے، تمہیں کبھی خیال ہی نہیں آتا تھا کہ ملاقات کا بھی کوئی وعدہ ہے، اور دوبارہ زندہ ہونے کا بھی کوئی وعدہ ہے۔ پھر کتاب سامنے کھول رکھ دی جائے گی، جس طرح سے قرآنِ کریم میں آتا ہے وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا (سورۂ اسراء: ۱۳) کہ کھلی کتاب سامنے آجائے گی، اور کہہ دیا جائے گا اِقْرَاْ كِتٰبَكَ، پڑھ لو، کیا کچھ کر کے آئے ہو، سوانح عمری ساری کی ساری اس میں لکھی ہوئی ہوگی، جو کچھ کیا ہے سب اس میں ضبط ہوگا، تو پھر مجرمین کانپیں گے ان باتوں سے جو اس میں لکھی ہوئی ہوں گی، مِمَّا فِيْهِ: جو کچھ اس کتاب میں ہوگا اس سے مجرمین ڈریں گے، ''دیکھے گا تو مجرموں کو ڈرتے ہوئے اس چیز سے جو اس میں ہے'' اور حسرت اور افسوس کے طور پر کہیں گے کہ ''ہائے ہماری بربادی! اس کتاب کو کیا ہو گیا، اس نے تو نہ کوئی چھوٹی بات چھوڑی نہ بڑی بات چھوڑی مگر اس کو گھیر لیا'' اس نے تو ہماری زندگی کا کوئی کام چھوڑا ہی نہیں، نہ کوئی چھوٹا نہ بڑا، سب اس میں لکھا ہوا ہے۔ آج سمجھنے کے لئے آپ اس طرح سے سمجھ لیجئے جس طرح یہ ٹیپ ریکارڈ آپ کے سامنے رکھی ہوئی ہے، اب ہم صحیح بولیں، غلط بولیں، اونچا بولیں، نیچا بولیں، کوئی کھڑکا ہو، کوئی آواز آئے، سب اس میں ریکارڈ ہوتی چلی جا رہی ہے، اور جس وقت آپ اس کیسٹ کو چلائیں گے تو ساری کیفیت آپ کے سامنے آجائے گی، تو ایک ایک لفظ چاہے غلطی سے منہ سے نکلا ہو وہ بھی اس میں ضبط ہو گیا، صحیح نکلا ہو تو بھی ضبط ہو گیا، تو اسی طرح سے آپ کا جو نامہ اعمال ہے وہ بھی آپ کی زندگی کا ایک ریکارڈ ہے، جو کچھ آپ کرتے گئے اس میں لکھا گیا، جو بولتے گئے لکھا گیا، صحیح کرتے گئے وہ بھی لکھا گیا، غلط کرتے گئے وہ بھی لکھا گیا، قیامت کے دِن وہی کھول کے سامنے رکھ دیا جائے گا۔

---

(۱) بخاری ۲/۹۶۶، باب کیف الحشر، وغیرہ۔ مشکوٰۃ ۲/ ۴۸۳، باب الحشر فصل اول۔

اِنسانی زندگی کے ریکارڈ کے مختلف اِنتظامات

اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں بتایا کہ ہمارے یہ اعضا بھی ''ٹیپ'' ہیں، ہم جو کچھ ہاتھوں سے کرتے ہیں ان کے اندر ریکارڈ ہوتا چلا جا رہا ہے، جو کچھ آنکھ سے دیکھتے ہیں اس کے اندر ریکارڈ ہوتا چلا جا رہا ہے، اور جب تم انکار کرو گے کہ ہم نے تو یہ کام نہیں کیا، تو ان ہاتھوں کو کہہ دیا جائے گا کہ بولو! تم نے کیا کیا تھا، تو یہ اس طرح سے بتانا شروع کر دیں گے جیسے کیسٹ چلائیں تو اس میں سے سب کچھ نکلنا شروع ہو جاتا ہے۔ اور جس زمین کے اوپر کوئی کام کرتے ہو، اس زمین میں سب کچھ ریکارڈ ہوتا چلا جا رہا ہے، اور حدیث شریف میں آتا ہے کہ یہ زمین بھی شہادت دے گی کہ میری پشت کے اوپر فلاں بندے نے یہ نیکی کا کام کیا تھا، فلاں بندے نے یہ گناہ کا کام کیا تھا۔[1] تو آج ان ریکارڈ مشینوں نے ہمارے سامنے اس بات کو بالکل واضح کر دیا، کہ کان میں سنا ہوا سب کچھ ریکارڈ ہوتا جا رہا ہے، آنکھ میں دیکھا ہوا سب کچھ ریکارڈ ہوتا جا رہا ہے، ہاتھوں سے کیا ہوا سب کچھ ریکارڈ ہوتا جا رہا ہے، بدن کے اعضا کے ساتھ ہم جس قسم کے اعمال کرتے ہیں وہ سب محفوظ ہوتے چلے جا رہے ہیں، اور کتاب علیحدہ مرتب ہوتی چلی جا رہی ہے، جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے پیچھے فرشتے لگا دیے، وہ کھول کے سب کچھ سامنے رکھ دیا جائے گا، اس لیے تم یہ نہ سمجھو کہ ہم چھپ کے کر لیں گے، یہ کر لیں گے، وہ کر لیں گے، کسی کو پتا نہیں چلے گا، بلکہ سارا ریکارڈ مرتب ہو رہا ہے، اس وقت پھر حسرت اور افسوس کے ساتھ ہاتھ ملو گے کہ یہ کیا ہو گیا، یہ کتاب تو کسی چیز کو نہیں چھوڑتی، نہ چھوٹی کو نہ بڑی کو، اِلَّآ اَحْصٰىهَا: مگر اس نے سب کچھ گھیر رکھا ہے۔

اَعمال قیامت کے دِن اچھی یا بُری صورت میں مل جائیں گے

وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا: جو کچھ کیا ہے سب کو حاضر پائیں گے، اپنے اعمال کو حاضر پائیں گے۔ بعض مفسرین نے تو یہاں توجیہ یہ کی کہ وَجَدُوْا جَزَآءَ مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا، اپنے کیوں کا بدلہ حاضر پائیں گے (عام تفاسیر)۔ لیکن بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل میں یہی اعمال اس وقت موجود ہوں گے، نیکی خوش حالی کی صورت میں ہوگی اور بُرائی بدحالی کی صورت میں ہوگی، یہی آپ کی حرکتیں، یہی آپ کے اعمال سانپ اور بچھو بن جائیں گے، اور یہی آپ کے اعمال جنّت کی نعمتیں ہوں گی، نیکی کے اعمال جنّت کی نعمتوں کی شکل میں موجود ہو جائیں گے، اور بُرے اعمال جہنّم کی مصیبتوں کی شکل میں موجود ہو جائیں گے، وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا: تیرا رَبّ کسی پہ ظلم نہیں کرتا، جو کچھ تم نے کمایا وہی تمہاری طرف لوٹا دیا جائے گا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی زیادتی نہیں ہوگی، زیادتی میں یہ ہوتا ہے کہ گناہ نہ کیا ہو اور سزا دے دی جائے، یا آپ نے نیکی کی ہو اور بلاوجہ ضائع کر دی جائے، اس طرح سے اللہ تعالیٰ نہیں کریں گے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○

---

(۱) ترمذی ۲/ ۱۷۳، کتاب التفسیر۔ سورۃ الزلزال۔ مشکوٰۃ ۲/ ۴۸۳ باب الحشر فصل ثانی کی پہلی حدیث۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ كَانَ

قابلِ ذکر ہے وہ وقت جب ہم نے کہا فرشتوں کو کہ آدم کو سجدہ کرو، پس ان سب نے سجدہ کر دیا سوائے ابلیس کے، ابلیس

مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ؕ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَآءَ

جنوں میں سے تھا، وہ نافرمان ہوگیا اپنے رَبّ کے حکم سے، کیا پھر تم اس ابلیس کو اور اس کی اولاد کو دوست بناتے ہو

مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ؕ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ﴿۵۰﴾ مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ

مجھے چھوڑ کر؟ حالانکہ وہ تمہارے لیے دشمن ہیں، ظالموں کے لئے ابلیس بُرا بدلہ ہے ﴿۵۰﴾ نہیں حاضر کیا میں نے انہیں

خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ ۪ وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ

زمین و آسمان کے پیدا کرنے کے وقت، اور نہ خود ان کے پیدا کرنے کے وقت، اور نہیں ہوں میں بنانے والا

الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا ﴿۵۱﴾ وَيَوْمَ يَقُوْلُ نَادُوْا شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ

گمراہ کرنے والوں کو مددگار ﴿۵۱﴾ جس دِن کہے گا اللہ تعالیٰ، پُکارو میرے ان شریکوں کو جن کو تم شریک سمجھتے تھے،

فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ مَّوْبِقًا ﴿۵۲﴾ وَرَاَ

پھر وہ ان شرکاء کو پُکاریں گے، وہ شرکاء انہیں کوئی جواب نہیں دیں گے، اور ہم ان کے درمیان آڑ قائم کر دیں گے ﴿۵۲﴾ مجرم لوگ

الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا وَلَمْ يَجِدُوْا عَنْهَا مَصْرِفًا ﴿۵۳﴾

آگ کو دیکھیں گے، پھر گمان کریں گے کہ وہ سب کے سب اس آگ میں گرنے والے ہیں اور وہ نہیں پائیں گے اس سے بچنے کی جگہ ﴿۵۳﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ: اِذْ کا عامل محذوف ہے، اُذْکُرْ یا یَذْکُرْ دونوں طرح سے نکال لیا جاتا ہے، یاد کیجئے، یا قابلِ ذکر ہے وہ وقت جب ہم نے کہا فرشتوں کو، اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ: آدم کو سجدہ کرو، فَسَجَدُوْٓا: پس ان سب نے سجدہ کر دیا اِلَّآ اِبْلِيْسَ سوائے ابلیس کے، كَانَ مِنَ الْجِنِّ: ابلیس جنوں میں سے تھا، فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ: فَسَقَ یَفْسِقُ سے ہے۔ فِسق، فُسوق: طاعت سے نکل جانا، نافرمان ہوجانا۔ وہ نکل گیا اپنے رَبّ کے حکم سے، نافرمان ہوگیا اپنے رَبّ کے حکم سے۔ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَآءَ: یہ خطاب بنی آدم کو ہے۔ کیا پھر تم بناتے ہو اس ابلیس کو اور اس کی اولاد کو، اَوْلِيَآءَ: دوست۔ اولیاء ولی کی جمع ہے۔ مِنْ دُوْنِيْ: مجھے چھوڑ کر۔ کیا پھر تم اس ابلیس کو اور اس کی اولاد کو دوست بناتے ہو مجھے چھوڑ کر، وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ: حالانکہ وہ تمہارے لیے دشمن ہیں۔

عَدُوٌّ دشمن کو کہتے ہیں، عَدُوٌّ واحد جمع سب کے لئے بولا جاتا ہے، اس لئے یہ ھُمْ کی خبر واقع ہو رہی ہے۔ ذریۃ سے حقیقی اولاد مراد لے لی جائے تو بھی ٹھیک ہے، جس طرح سے آدم کی نسل پھیلی ہے، اسی طرح سے ابلیس کی نسل بھی پھیلی ہوگی، ورنہ ذُرّیت سے اصل کے اعتبار سے تابعین مراد ہوتے ہیں، شیطان اور شیطان کے پیچھے لگنے والے لوگ، جن کو ہم اپنی زبان میں چیلے چانٹے کہتے ہیں، مطیعین متبعین کے لئے بھی ذُرّیت کا لفظ بولا جاتا ہے، یہ سب شیطان کی ذُرّیت ہے، یعنی یہ سب شیطان کے چیلے چانٹے ہیں، تو حقیقی اولاد بھی مراد ہو سکتی ہے (عام تفاسیر)، اور اس سے متبعین بھی مراد لیے جا سکتے ہیں (قرطبی)۔ بِئْسَ لِلظّٰلِمِیْنَ بَدَلًا: برا ہے ظالموں کے لئے از روئے بدلے کے۔ بِئْسَ کی ضمیر ابلیس کی طرف لوٹے گی، ظالموں کے لئے ابلیس برا بدلہ ہے، یعنی مجھے چھوڑ کے جو ابلیس کے ساتھ دوستی لگاتے ہیں یہ کوئی اچھا بدل نہیں، مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: نہیں حاضر کیا میں نے انہیں زمین و آسمان کے پیدا کرنے میں۔ اَشْهَدَ اِشْهَاد: حاضر کرنا۔ میں نے ان کو زمین اور آسمان کا پیدا کرنا دکھایا نہیں، ان کو مشاہدہ نہیں کروایا، زمین اور آسمان کے پیدا کرنے میں میں نے انہیں حاضر نہیں کیا، کہ آؤ تم بھی ساتھ شریک ہو جاؤ، آؤ دیکھو! میں کس طرح سے پیدا کرتا ہوں، کوئی مشورہ دو، کیسے بنانی چاہیے، کیسے نہیں بنانی چاہیے، میں نے اس طرح سے ان کو بلایا نہیں، موقع پر حاضر نہیں کیا۔ وَلَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ: اور نہیں دکھایا میں نے انہیں خود ان کا پیدا کرنا، ان کے پیدا کرنے کے وقت بھی ان کو نہیں بلایا کہ بعض کو پیدا کرنے کے وقت بعض کو بلا لیا ہو، وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا: اور نہیں ہوں میں بنانے والا گمراہ کرنے والوں کو بازو۔ عضد بازو کو کہتے ہیں، اور بازو سے مراد ہوتا ہے مددگار، جس طرح سے ہم کہا کرتے ہیں کہ فلاں شخص میرا دستِ راست ہے، میرا دایاں ہاتھ ہے کہ جس طرح سے ہم اپنے کام دائیں ہاتھ سے کیا کرتے ہیں، اسی طرح سے فلاں شخص میرے ساتھ معاون ہے، وہ میرا دستِ راست ہے۔ تو اِتخاذِ عضد، کسی کو اپنا بازو بنا لینا، اس سے مراد ہوتا ہے کہ اس کو اپنا مددگار ٹھہرا لیا۔ مضلین کا مصداق یہی ابلیس اور اس کی ذُرّیت ہے، یہ گمراہ کرنے والے ہیں، جب یہ مضلین ہوئے تو ضالین تو ہو ہی گئے، یہ جو گمراہ کرنے والے ہیں اور خود بھٹکے ہوئے ہیں میں ان کو بھلا! اپنا یار مددگار کہاں بناؤں گا۔ ''اور نہیں ہوں میں بنانے والا گمراہ کرنے والوں کو مددگار'' یعنی مددگار تو کوئی بھی نہیں، اور ان گمراہوں کے متعلق اور گمراہ کرنے والوں کے متعلق تو کیا ہی سوچا جا سکتا ہے کہ میرے مددگار ہوں گے، وَيَوْمَ يَقُوْلُ نَادُوْا: جس دن کہ کہے گا اللہ تعالیٰ: نَادُوْا امر کا صیغہ ہے نَادٰی یُنَادِی نِدَاءً: پکارنا۔ آواز دو، پکارو، شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ میرے ان شرکاء کو جن کو تم سمجھتے تھے شرکاء۔ شرکاء شریک کی جمع ہے۔ میرے ان شریکوں کو پکارو جن کو تم شریک سمجھتے تھے۔ اَلَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ میں یہ بات ظاہر کر دی کہ واقع کے اعتبار سے وہ شریک نہیں، جن کو تم شریک سمجھتے تھے ان کو پکارو، فَدَعَوْهُمْ: پھر وہ مشرکین ان شرکاء کو پکاریں گے، فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ: وہ شرکاء انہیں کوئی جواب نہیں دیں گے، ان کی کوئی دعوت قبول نہیں کریں گے، ان کے بلانے کو قبول نہیں کریں گے، وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ مَّوْبِقًا: موبق: ہلاکت کا گڑھا، ہلاک ہونے کی جگہ، ہلاکت کا کھڈ، آڑ کے معنی میں بھی آتا ہے، اور ہلاک ہونے کی جگہ، جس کو ہلاکت کا کھڈا، ہلاکت کے گڑھے کے ساتھ تعبیر کر سکتے ہیں، یہاں آگ کی خندق مراد ہے۔ اور بنا دی ہم نے ان کے درمیان میں خندق کہ ایک دوسرے تک پہنچ نہیں سکیں گے، ہم نے ان کے درمیان میں ہلاکت کا گڑھا بنا دیا، ان کے درمیان میں آڑ قائم کر دی۔ وَرَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ: صیغہ اگرچہ ماضی کا ہے لیکن ترجمہ

مضارع کا ہوگا، کیونکہ جو چیز یقیناً ہونے والی ہوتی ہے تو یہ فصاحت وبلاغت کا اصول ہے کہ اس کو ماضی کے صیغے سے تعبیر کرتے ہیں گویا کہ ایسا ہو ہی گیا، جس کے لئے آپ لفظ بولا کرتے ہیں کہ تحقق وقوع کی وجہ سے اس کو ماضی کے صیغے سے تعبیر کردیا، یعنی جس کام کا ہونا یقینی ہوتا ہے اس کو ماضی کے صیغے کے ساتھ تعبیر کر کے تاثر دیا جاتا ہے کہ اس کا ہونا اتنا یقینی ہے گویا کہ ہو ہی گیا، وَرَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ: مجرم لوگ آگ دیکھیں گے فَظَنُّوْٓا پھر سمجھیں گے، گمان کریں گے، ان کے خیال میں آئے گا، اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا: اَیْ مُواقِعُونَ فِیْهَا کہ وہ سب کے سب اس آگ میں گرنے والے ہیں، اس آگ میں واقع ہونے والے ہیں، اصل میں مواقعون تھا، نون اضافت کی وجہ سے گر گیا۔ وَلَمْ یَجِدُوْا عَنْهَا مَصْرِفًا: اور وہ نہیں پائیں گے اس آگ سے ہٹنے کی جگہ، مصرف: ہٹنے کی جگہ، ان کو اس آگ سے ہٹنے بچنے کی کوئی جگہ نہیں ملے گی۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط

پچھلے دو رکوع جو آپ کے سامنے گزرے ہیں، ان میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے فنائے دنیا کا نقشہ آپ کے سامنے پیش کیا تھا، ایک خصوصی مثال کے ذریعے کہ دو باغ والوں کی مثال دی تھی، اور ایک عمومی مثال کے ذریعے کہ ساری دنیوی زندگی کی ایک مثال دی تھی، اور ان مثالوں سے مقصود یہ تھا کہ لوگ اس دنیا کی محبت میں مبتلا نہ ہوں، اور دنیا کی عیش وعشرت میں مبتلا ہو کے آخرت کو نہ بھولیں، اور اگر کسی کو دنیا کے اسباب حاصل ہو جائیں تو وہ یہ نہ سمجھا کرے کہ میں اب ہمیشہ کے لئے خوش حال ہو گیا، بلکہ ہر چیز اللہ کی مشیت کے تحت ہے کہ اللہ جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے، اسباب بھی اللہ کی مشیت کے ساتھ مہیا ہوتے ہیں، اور اسباب کے مہیا ہو جانے کے بعد ان کا باقی رہنا بھی اللہ کی مشیت کے ساتھ ہوتا ہے، تو جب اللہ کی قدرت اور اللہ کی مشیت ہر وقت مستحضر رہے گی تو انسان دنیا کی محبت میں مبتلا نہیں ہوتا، اور عارضی طور پر اگر دنیا میں مسکنت آجائے، غربت آجائے، اسبابِ معیشت سے انسان کسی درجے میں محروم ہو جائے تو انسان گھبراتا نہیں، اور وہ سمجھتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ابتلاء ہے، یہ وقت ہمیں صبر کے ساتھ گزارنا چاہیے، اور اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو خوش حالی مل جائے، خوش حالی کے اسباب مل جائیں، تو وہ اتراتا نہیں، اکڑتا نہیں، اللہ سے غافل نہیں ہوتا، بلکہ شکر کی زندگی اختیار کرتا ہے، فنائے دنیا کی حقیقت سمجھ آجانے کے بعد یہ دونوں اثر انسان پر واقع ہوتے ہیں کہ غربت اور مسکنت میں گھبراتا نہیں ہے، اور خوشحالی آجانے کی صورت میں اتراتا نہیں ہے، ایک وقت میں وہ صبر کرتا ہے، اور ایک وقت میں شکر ادا کرتا ہے، دونوں صورتوں میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کا تعلق مضبوط رہ جاتا ہے، اور اگر کسی کے سامنے فنائے دنیا مستحضر نہ ہو، دنیا کی فنائیت سامنے نہ ہو، تو وہ لوگ دنیا کی محبت میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اور دنیا کی محبت میں مبتلا ہونے کا

نتیجہ یہ ہے کہ پھر اللہ سے غافل ہوجاتے ہیں، آخرت ان کو یاد نہیں رہتی، اور یہ چیز ہر برائی کی جڑ ہے، جس طرح سے سرورِکائنات ﷺ نے بیان فرمایا: ''حُبُّ الدُّنْیَا رَأْسُ کُلِّ خَطِیْئَةٍ'' (حوالہ گزر چکا)۔

اپنے اَزلی دُشمن کو پہچانو اور ہوشیار رہو!

تو بُرائی کا راستہ اختیار کرنے کے لئے ایک تو یہ چیز سبب بنتی ہے کہ انسان دنیا کی محبت میں مبتلا ہوجاتا ہے، اور دوسرے باطنی طور پر ایک دُشمن پیچھے لگا ہوا ہے شیطان، وہ مغالطے دیتا ہے، اور مغالطے دے کے بنی آدم کو اللہ کی نافرمانی میں مبتلا کرتا ہے، تو یہاں اللہ تعالیٰ اس دُشمن سے پردہ اُٹھاتے ہیں کہ جس وقت تمہیں یعنی تمہارے باپ آدم علیہ السلام کو پیدا کیا گیا تھا، اس وقت سے تمہارے پیچھے ایک دُشمن لگا ہوا ہے جس کو ابلیس کہتے ہیں، اور اختلاف کی بنیاد یہیں سے ہوئی تھی کہ اس نے تمہارے اَبا کی عزت اور وجاہت کا اقرار کرنے سے انکار کردیا تھا کہ جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا، فرشتوں کو حکم دیا، اور ساتھ یہ ابلیس بھی تھا اس کو بھی حکم دیا، جیسے کہ سورۂ اَعراف (آیت:۱۲) میں لفظ آتا ہے مَامَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ تجھے سجدہ کرنے سے کس نے روکا؟ جب میں نے تجھے حکم دیا تھا، وہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ابلیس کو اور اس کے ساتھیوں کو بھی جھکنے کا حکم تھا، یہی وجہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے گرفت ہوئی کہ تُو نے سجدہ کیوں نہیں کیا؟ تو اس نے یہ نہیں کہا کہ مجھے تو آپ نے کہا ہی نہیں، آپ نے تو فرشتوں سے کہا ہے، یہ عذر اس نے نہیں کیا، بلکہ آگے سے اپنی منطق بگاری، تو فرشتوں نے تو سجدہ کردیا، یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ آپ کے سامنے سورۂ بقرہ میں اور خصوصیت کے ساتھ سورۂ اعراف میں گزرا، اور آئندہ بھی مختلف سورتوں میں اس واقعے کے مختلف اجزا آئیں گے، سورۂ طٰہٰ کے اندر بھی اس کی کچھ تفصیل آئے گی، ابلیس نے انکار کردیا، اور اس کے انکار کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس کو مردود کردیا، مردود ہوجانے کے بعد اس نے اللہ سے مہلت مانگی تھی، اللہ تعالیٰ نے اسے مہلت دے دی، اور مہلت پاکر اس نے یہ کہا تھا کہ یہ جو آدم ہے جس کی وجہ سے تو نے مجھے ٹھکرایا، میں اس کی اولاد کو قابو کروں گا، جس طرح سے سورۂ بنی اسرائیل میں گزرا تھا لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ (سورۂ اسراء: ۶۲) میں بنی آدم کے لگام ڈال دوں گا، جس طرح سے جانور کو قابو کرنے کے لئے اس کے نچلے جبڑے کو رسہ باندھ لیا جاتا ہے، اور کوئی سرکش بیل ہو، یا کوئی اس قسم کی سرکش بھینس ہو جو قابو میں نہ آئے تو لوگوں کی عادت ہے کہ اس کے نچلے جبڑے میں رسہ باندھ لیتے ہیں، جس کو ڈانٹی مارنا کہتے ہیں، تو جس جانور کا جبڑا باندھ لیا جائے وہ جانور پھر قابو میں آجاتا ہے، تو احتناک کا یہ معنی ہوتا ہے۔ میں اس کی اولاد کے ڈانٹی ماروں گا، میں ان کے لگام دے لوں گا، دیکھوں تو بھلا یہ آپ کی فرمانبرداری کس طرح سے کرتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے کہا تھا جا، جو تجھ سے زور لگتا ہے لگالے، جو تیرے پیچھے لگ جائیں گے میرا کیا بگاڑیں گے، تجھے اور ان سب کو اکٹھا کرکے میں جہنم میں ڈال دوں گا...... تو اللہ تعالیٰ ہمیشہ قرآنِ کریم میں یہ یاد دلاتا ہے کہ آدم کے بچو! اپنے اس دُشمن کو پہچانو، جو بھی تمہیں میرے حکم کے خلاف اُکساتا ہے، اور مجھ سے تمہیں غافل کرتا ہے، سمجھ لیا کرو کہ یہ تمہارا ازلی دُشمن ابلیس ہے، یا ابلیس کی اولاد ہے، یا یہ خود ابلیس ہے یا ابلیس کا چیلا چانٹا ہے، اور ابلیس کے چیلے چانٹے جنوں میں سے بھی ہوتے ہیں، انسانوں میں سے بھی ہوتے ہیں، کہ ابلیس سے تربیت پاکر انسان بسا اوقات ابلیس کا بھی اُستاد بن جاتا

ہے۔ شرارتیں کرنے میں، برائی پھیلانے میں، فسق و فجور میں بسا اوقات انسان اتنا آگے نکل جاتا ہے کہ ابلیس کے بھی کان کترنے لگ جاتا ہے، وہ سارے کے سارے ذرّیتِ ابلیس میں شامل ہیں، تو یہ ابلیس اور اس کی ذرّیت تمہیں راستے سے بہکاتی ہے، یہ تمہارے دشمن ہیں، تم ذرا سوچو تو سہی! کہ مجھے چھوڑ کے تم ان کے ساتھ دوستی لگاتے ہو؟ میں تمہارا خیر خواہ ہوں، میں تمہارا پیدا کرنے والا ہوں، تمہاری ضروریات پوری کرنے والا ہوں، مجھے چھوڑ کے تم ابلیس اور اس کی اولاد سے دوستی لگاتے ہو؟ تو ہر وہ شخص جو اللہ کے راستے کے خلاف اُکساتا ہے، وہ یا ابلیس ہے یا ابلیس کا چیلا ہے، اگر تم ان کی بات کو ترجیح دو گے تو اس کا مطلب ہے کہ تم نے مجھے چھوڑ کے ان سے دوستی لگالی، اگر ایسا کرو تو تم نے بہت برا بدلہ حاصل کیا۔ ایک دوست کو چھوڑ کے اس سے اچھا دوست اختیار کرلو تو کہا جاتا ہے کہ اس نے اچھا کیا، لیکن ایک اعلیٰ قسم کے دوست کو چھوڑ کر ایک بدترین قسم کے آدمی کو دوست بنالیا جائے تو ہر کوئی کہے گا کہ بڑا بے وقوف ہے، کیسا پیارا دوست چھوڑا، کیسے خیر خواہ کو چھوڑا، کیسے ہمدرد کو چھوڑا، اور کس قسم کے خود غرض کے پیچھے لگ گیا، وہ تو اس کو کہیں نہ کہیں دھوکا دے گا، لوگ یوں ہی کہا کرتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو مجھے چھوڑ کے ابلیس کو اختیار کرتا ہے، ان ظالموں کو بہت برا بدلہ ملا، یہ ابلیس جوان کو میرے بدلے میں دوست مل رہا ہے، یہ کوئی اچھا بدل نہیں ہے، یہ نعم البدل نہیں، یہ بئس البدل ہے، جو مجھے چھوڑ کے اس ابلیس کو اختیار کررہے ہیں۔ یاددہانی کروانے کا مقصد یہی ہے کہ جس وقت بھی آپ کے سامنے کوئی بات آجائے، ایک طرف اللہ کی ہدایت ہو اور دوسری طرف اس کے خلاف کوئی بہکانے اکسانے والا ہو، تو فوراً سمجھ جایا کرو کہ یہ یا ابلیس ہے، یا ابلیس کا چیلا ہے، جس طرح سے مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ:

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست پس بہر دستے نباید داد دست

خبردار! کبھی کبھی ابلیس آدم کی شکل میں بھی آتا ہے، انسان کی شکل میں بھی آتا ہے، اس لیے ہر کسی کے ہاتھ میں ہاتھ نہ دے دیا کرو، کہ اس سے دوستی لگالی اور اس کی اتباع قبول کرلی، بسا اوقات ابلیس انسانی شکل میں ہوتا ہے، تو یہاں تنبیہ کرنے سے یہی مقصد ہے..... یاد کیجئے جب ہم نے کہا فرشتوں کو، سجدہ کرو تم آدم کو، انہوں نے سجدہ کردیا سوائے ابلیس کے، ابلیس جنوں میں سے تھا اور جنوں کی فطرت میں سرکشی ہے، تو وہ اپنے رب کے حکم سے نکل بھاگا، کیا تم اس کو اور اس کے چیلے چانٹوں کو دوست بناتے ہو مجھے چھوڑ کے؟ حالانکہ وہ تمہارے لیے دشمن ہیں، تمہارے باپ کو بھی انہوں نے دھوکا دیا، اور آگے تمہیں بھی یہ دھوکا دیتے ہیں، اس لیے اس بات کے اوپر اپنا یقین پختہ کرلو کہ تمہاری بھلائی اُسی میں ہے جو اللہ کا حکم ہے، اللہ کے حکم میں بھلائی ہے، اس کے اوپر جم جاؤ گے تو تم نے اللہ کے ساتھ دوستی لگالی، ہر خطرے سے محفوظ رہ جاؤ گے، اور اگر اللہ کے راستے کو چھوڑ کر کوئی دوسرا راستہ اختیار کروگے، کسی کے بہکاوے میں آجاؤ گے تو یوں سمجھو کہ آپ اپنے دشمن کے جال میں پھنس گئے، ”برا ہے ظالموں کے لئے بدلہ، برا ہے ابلیس ظالموں کے لیے ازروئے بدلے کے“ یعنی اللہ کے بدل میں کسی کو ابلیس مل جائے یہ بہت برا بدل ہے۔

شیاطین کے پلّے کچھ نہیں

باقی! ان کے پاس زور اور طاقت کوئی نہیں، جس طرح سے مشرکینِ مکہ ان کو شرکاء بنائے ہوئے تھے، ان کے نام کے

چڑھاوے دیتے تھے، ان سے فریادیں کرتے تھے، ان سے مدد مانگتے تھے جیسا کہ سورۂ جن کے اندر آئے گا، اَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ، کہ انسانوں میں سے بعض ایسے ہیں جو جنوں کی پناہ پکڑتے ہیں، جنوں سے استعاذہ کرتے ہیں، اور انسانوں کی اس عادت نے جنوں کا دماغ اور زیادہ خراب کر دیا فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا، کہ جن بھی سمجھنے لگ گئے کہ ہم بھی کچھ ہیں، کہ انسان جیسے لوگ جب ہمارے نام کے وظیفے پڑھتے ہیں، اور ہمیں نذرانے دیتے ہیں، اور ہم سے اِستعاذہ کرتے ہیں کہ ہمیں اس مصیبت سے بچالو، تو جنوں کا بھی دماغ خراب ہو گیا، سورۂ جن کے اندر یہ آیت آئے گی، تو مشرکینِ مکہ نے تو اپنے اوپر جنات کو مسلط کر رکھا تھا، وہ سمجھتے تھے کہ ان کے ہاتھ میں نفع نقصان ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بالکل ان کے ہاتھ میں کچھ نہیں، میں وحدہٗ لاشریک ہوں، زمین و آسمان کو میں نے اکیلے نے پیدا کیا ہے، میں نے ان کو پیدا کرتے وقت بلایا تک نہیں، ان کو حاضر نہیں کیا، ان سے مشورہ نہیں لیا، ان کا خدائی میں کیا دخل ہے؟ اور خود ان کا پیدا کرنا ان کی مرضی کے مطابق نہیں ہے، میں نے ان کو بھی جیسے چاہا بنایا، تو ان کے اوپر ہر طرح سے تسلط میرا ہے، ان کے متعلق یہ نہ سوچو کہ یہ تمہارا کچھ بگاڑ سکتے ہیں، بہت ڈراوے دیں گے، بہت چکمے دیں گے، کہیں حرص، کہیں لالچ، کہیں خوف دلا کے اس طرح سے تمہیں میرے راستے سے ہٹانے کی کوشش کریں گے، لیکن تم یقین کر لو کہ ان کا خدائی میں کوئی دخل نہیں ہے، یہ کچھ نہیں کر سکتے، اس لیے ان سے ڈر کر، یا ان کے وعدوں میں آکے، ان کے لالچ دلانے سے بھی میرے راستے سے نہ ہٹنا۔ اپنے دماغ کو صاف کر لو، انسان کے اوپر جن کا تسلط نہیں ہے، اور یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، تم اپنے اللہ سے تعلق رکھو، باقی! یہ ہے کہ یہ ڈراتے دھمکاتے ہیں، لالچ دلاتے ہیں، حرص دلاتے ہیں، مختلف قسم کے سبز باغ دکھاتے ہیں، تو تم ثابت قدم رہو، یہی مقصد ہے اس آیت سے۔ ''میں نے ان کو نہیں بلایا، ان کو حاضر نہیں کیا زمین و آسمان کے پیدا کرنے میں، نہ خود اِن کے پیدا کرنے میں'' ان کو بھی میں نے پیدا کیا، اور جیسے چاہا بنایا، اور زمین و آسمان کے پیدا کرنے میں بھی میں نے ان سے کوئی مشورہ نہیں لیا، اس لیے ان کا کوئی دخل نہیں ہے۔ ''اور نہ ہی میں گمراہ کرنے والوں کو بازو بنانے والا ہوں'' یعنی میرا کوئی مددگار نہیں، کوئی زمین و آسمان کے پیدا کرنے میں میرے ساتھ ہاتھ بٹانے والا نہیں، لیکن اگر بالفرض کوئی ہوتا بھی، تو کیا میں نے ان گمراہوں کو ان باغیوں کو اور سرکشوں کو مددگار بنانا تھا؟ اللہ کا کوئی مددگار نہیں ہے، کسی کام میں اللہ کسی کا محتاج نہیں ہے، تو کسی ولی کے متعلق یہ عقیدہ نہیں رکھا جا سکتا کہ یہ اللہ کا مددگار ہے، اور اللہ کے کام کرنے میں ہاتھ بٹاتا ہے، کسی نبی کے متعلق یہ عقیدہ نہیں رکھا جا سکتا کہ یہ اللہ کا مددگار ہے، اور اللہ کے کسی کام کرنے میں ہاتھ بٹاتا ہے، اور فلاں کام اللہ نے ان کی شرکت کے ساتھ کیا ہے، اگر یہ اللہ کا ساتھ نہ دیتے تو یہ کام نہ ہوتا، کسی نبی کے متعلق یہ عقیدہ رکھو تو بھی شرک، کسی ولی کے متعلق یہ عقیدہ رکھو تو بھی شرک، کسی فرشتے کے متعلق یہ عقیدہ رکھو تو بھی شرک۔ تو کسی کو بھی مددگار نہیں ٹھہرایا جا سکتا، تو پھر جو خود اللہ سے باغی ہیں، سرکش ہیں، گمراہ ہیں، گمراہ کرنے والے ہیں، ان کے متعلق تم کیسے سمجھتے ہو کہ یہ اللہ کے مددگار ہیں؟ ان کو اللہ نے مددگار کیسے بنالیا؟ یعنی ان کی نفی اور زیادہ شدت کے ساتھ ہو گئی۔ ''نہیں ہوں میں بنانے والا گمراہ کرنے والوں کو بازو'' میں ان کو اپنا مددگار بنانے والا نہیں ہوں، یعنی میں تو اپنے فرمانبرداروں کو، اپنے مقبول بندوں کو اپنا مددگار نہیں بناتا، میں ان کا محتاج نہیں ہوں کسی کام کے کرنے میں، نہ میں ان سے کوئی مشورہ لیتا ہوں، تو ان گمراہ کرنے والوں کو کہاں بناؤں گا؟

''شرکاء'' قیامت کے دن کام نہ آئیں گے

وَيَوْمَ يَقُوْلُ نَادُوْا: یہ دکھایا جارہا ہے کہ ایک وقت آئے گا جب ایک دوسرے کا عجز آنکھوں کے سامنے آجائے گا کہ یہ شرکاء کسی کام کے نہیں ہیں، آج تو تم غائبانہ طور پر ان کے لیے مختلف عقیدے بنائے ہوئے ہو، لیکن ایک دن آئے گا کہ جب اللہ تعالیٰ ان شرکاء کو بھی اور ان مشرکین کو بھی سب کو اکٹھا کرلے گا، پھر اللہ تعالیٰ کہے گا کہ اب تم مصیبت میں پھنسے ہوئے ہو ذرا ان شرکاء کو آواز دو، آج تمہاری مدد کریں، نَادُوْا شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ: بلاؤ ان شرکاء کو جن کو تم شرکاء سمجھا کرتے تھے، تو مشرکین پریشانی کی حالت میں انہیں آواز دیں گے، فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ: وہ شرکاء آواز کا کوئی جواب نہیں دیں گے، ان کی دعوت کو قبول نہیں کریں گے، اور ان کے درمیان میں ایک آڑ قائم ہوجائے گی کہ وہ ایک دوسرے تک پہنچ ہی نہیں سکیں گے، وہ آڑ آگ کی خندق ہوگی، ہلاکت کا ایک گڑھا ہوگا، اور مجرم آگ دیکھ لیں گے، یعنی اس وقت یہ شرکاء کام نہیں آئیں گے، مجرموں کے سامنے جہنم آجائے گی، اور وہ سمجھ جائیں گے کہ وہ اس جہنم میں گرنے والے ہیں، اور نہیں پائیں گے اس جہنم سے ہٹنے کی جگہ، یعنی ایسے نازک وقت میں بھی پھر مشاہدہ ہوجائے گا کہ یہ کسی کام کے نہیں ہیں، اور آج تم ان کو جو شرکاء بنائے بیٹھے ہو، اور مختلف کاموں میں ان کو اپنا مددگار سمجھتے ہو، یہ تمہاری نظریاتی غلطی ہے، یہ تمہیں بہکا کر اللہ کے راستے سے ہٹاتے ہیں، اور تمہیں ہلاکت کی طرف لے جاتے ہیں۔ تو نہ تو دنیا کی محبت میں مبتلا ہو کے تم اللہ کے احکام کو چھوڑو، اور نہ کسی ابلیس شیطان یا اس کے چیلے چانٹے کے اکسانے بہکانے کے ساتھ اللہ کے حکم کی مخالفت کیا کرو، تمہاری دینی دنیوی سعادت جو بھی ہے وہ سب اللہ کے احکام ماننے میں ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّآ أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ إِلَيْكَ

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ

بے شک پھیر پھیر کر بیان کیا ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لئے ہر قسم کے مضمون کو، اور انسان

اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ۝٥٤ وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ

ہر چیز سے زیادہ ہے از روئے جھگڑنے کے ۝٥٤ اور لوگوں کو ایمان لانے سے اور اپنے رَبّ سے استغفار کرنے سے نہیں روکا کسی چیز نے

الْهُدٰى وَيَسْتَغْفِرُوْا رَبَّهُمْ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ اَوْ

جبکہ ان کے پاس ہدایت آگئی مگر اس بات کے انتظار نے کہ آجائے ان کے پاس پہلوں کا طریقہ، یا

يَأْتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا ﴿۵۵﴾ وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ إِلَّا مُبَشِّرِيْنَ

آجائے ان کے پاس عذاب آمنے سامنے ﴿۵۵﴾ اور نہیں بھیجتے ہم رسولوں کو مگر اس حال میں کہ وہ بشارت دینے والے ہوتے ہیں

وَمُنْذِرِيْنَ ۚ وَيُجَادِلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ

اور ڈرانے والے ہوتے ہیں، اور جھگڑا کرتے ہیں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، باطل کے ذریعے سے تاکہ پھسلادیں اس باطل کے ذریعے سے

الْحَقَّ وَاتَّخَذُوْا اٰيٰتِيْ وَمَآ اُنْذِرُوْا هُزُوًا ﴿۵۶﴾ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ

حق کو، اور بنایا انہوں نے میری آیات کو اور اس چیز کو جس کے ذریعے سے وہ ڈرائے گئے ٹھٹھا ﴿۵۶﴾ اور کون بڑا ظالم ہے اس شخص سے

ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا وَنَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ ۭ

جو نصیحت کیا جائے اپنے رَبّ کی آیات کے ساتھ پھر اعراض کرے وہ ان آیات سے اور بھول جائے اس چیز کو جو اس کے ہاتھوں نے آگے بھیجی ہے

اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰي قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۭ

بے شک بنائے ہم نے ان کے دِلوں کے اُوپر پردے تاکہ وہ اس قرآن کو نہ سمجھیں، اور ان کے کانوں میں بوجھ بنایا،

وَاِنْ تَدْعُهُمْ اِلَى الْهُدٰى فَلَنْ يَّهْتَدُوْٓا اِذًا اَبَدًا ﴿۵۷﴾ وَرَبُّكَ الْغَفُوْرُ

اگر تُو انہیں دعوت دے ہدایت کی طرف تو ہرگز نہیں ہدایت پائیں گے تب کبھی بھی ﴿۵۷﴾ اور تیرا رَبّ بخشنے والا ہے

ذُو الرَّحْمَةِ ۭ لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ۭ

رحمت والا ہے، اگر مؤاخذہ کرے وہ لوگوں سے بسبب ان کاموں کے جو لوگوں نے کیے ہیں تو جلدی دے دے انہیں عذاب

بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْىِٕلًا ﴿۵۸﴾ وَتِلْكَ الْقُرٰٓى

بلکہ ان کے لئے ایک وعدے کا وقت ہے، ہرگز نہیں پائیں گے وہ اس کے وَرے کوئی پناہ گاہ ﴿۵۸﴾ اور یہ بستیاں،

اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا ﴿۵۹﴾ ع

ہم نے ان کو ہلاک کردیا جبکہ انہوں نے ظلم کیا، اور ہم نے ان کے ہلاک ہونے کے لئے بھی وعدے کا وقت متعین کیا تھا ﴿۵۹﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ۔ مَثَلٍ: مثال، عجیب مضمون۔ صَرَّفَ

تَصْرِیْف: پھیر پھیر کر بیان کرنا، لَقَدْ تاکید کے لئے ہے۔ بے شک ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لئے ہر قسم کے مضمون کو بار بار بیان کیا، صَرَّفْنَا کا معنی بار بار بیان کیا، بار بار ذکر کیا، طریقے بدل بدل کر۔ ''البتہ تحقیق'' یہ تاکید کا لفظ ہوتا ہے اور ''بے شک'' کا بھی یہی معنی ہے۔ بے شک پھیر پھیر کر بیان کیا ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لیے ہر قسم کے مضمون کو۔ وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَیْءٍ جَدَلًا: اور انسان ہر چیز سے زیادہ ہے از روئے جھگڑنے کے۔ جدل کہتے ہیں جھگڑنے کو۔ اَكْثَرَ شَیْءٍ: یعنی سب چیزوں سے زیادہ ہے۔ جَدَلًا یہ اَكْثَرَ شَیْءٍ سے بطور تمیز کے منصوب ہے، ہر چیز سے زیادہ ہے، کس اعتبار سے زیادہ ہے؟ جَدَلًا۔ تو ابہام دُور ہوگیا، اور اَكْثَرَ شَیْءٍ یہ كَانَ کی خبر ہے۔ اور انسان ہر چیز سے زیادہ ہے از روئے جھگڑنے کے۔ وَمَا مَنَعَ النَّاسَ: اور نہیں روکا لوگوں کو، اَنْ یُّؤْمِنُوْٓا: اَنْ مصدریہ ہے، مابعد والے فعل کو یہ مصدر کی تاویل میں کردے گا، تو مصدر کے ساتھ ترجمہ یوں ہوگا ''نہیں روکا لوگوں کو ایمان لانے سے۔'' اور ''نہیں روکا لوگوں کو اس بات سے کہ وہ ایمان لائیں'' یہ فعل کے طور پر ترجمہ ہوگیا، اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰى: جب ان کے پاس ہدایت آ گئی وَیَسْتَغْفِرُوْا رَبَّهُمْ: یَسْتَغْفِرُوْا کا عطف یُّؤْمِنُوْٓا کے اُوپر ہے یہ بھی اَنْ کے نیچے داخل ہے۔ نہیں روکا لوگوں کو اس بات سے کہ وہ معافی مانگیں اپنے رَبّ سے، استغفار کریں اپنے رَبّ سے۔ اور اس کو بھی جب مصدر کی تاویل میں کریں گے تو دونوں کو ملا کے ترجمہ یوں کر لیجئے کہ ''لوگوں کو ایمان لانے سے اور اپنے رَبّ سے استغفار کرنے سے نہیں روکا کسی شَے نے جبکہ ان کے پاس ہدایت آ گئی'' اِلَّآ اَنْ تَاْتِیَهُمْ سُنَّةُ الْاَوَّلِیْنَ: یہاں بھی اَنْ مصدریہ ہے، اور اس کے اوپر مضاف محذوف ہے اِلَّا انْتِظَارَ اَنْ تَاْتِیَهُمْ (نسفی)، مگر اس بات کے انتظار نے کہ آجائے ان کے پاس پہلوں کا طریقہ، اَوْ یَاْتِیَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا: قُبُلًا: سامنے۔ یا آ جائے ان کے پاس عذاب آمنے سامنے۔ ''پہلے لوگوں کے طریقے کے آنے کی انتظار نے، اور عذاب کے سامنے آنے کے انتظار نے'' یوں معنی بن جائے گا اس کا۔ ''نہیں روکا لوگوں کو مگر اس بات نے کہ وہ انتظار کر رہے ہیں کہ پہلوں کا طریقہ ہمارے سامنے آ جائے، یا عذاب ہمارے سامنے آ جائے۔'' وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِیْنَ اِلَّا مُبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ: اور نہیں بھیجتے ہم رسولوں کو مگر اس حال میں کہ وہ بشارت دینے والے ہوتے ہیں اور ڈرانے والے ہوتے ہیں۔ مُبَشِّرِیْنَ: بشارت سنانے والے، اور مُنْذِرِیْنَ: ڈرانے والے۔ وَیُجَادِلُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا: یجادل مجادلہ سے ہے، سورۂ نحل کے آخر میں لفظ آیا تھا وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ۔ جھگڑا کرتے ہیں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، بِالْبَاطِلِ باطل کے ذریعے سے لِیُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ: تا کہ پھسلا دیں اس باطل کے ذریعے سے حق کو، وَاتَّخَذُوْٓا اٰیٰتِیْ وَمَآ اُنْذِرُوْا هُزُوًا: اِتَّخَذَ بنانا۔ اور بنایا انہوں نے میری آیات کو اور اس چیز کو جس کے ذریعے سے وہ ڈرائے گئے ٹھٹھا، مَآ اُنْذِرُوْا میں اگر ''ما'' کو مصدریہ بنالیں تو ''ڈرائے جانے کو'' بنایا انہوں نے میری آیات کو اور ڈرائے جانے کو هُزُوًا: ٹھٹھا، میری آیات کو اور میرے ڈرائے جانے کو وہ مذاق سمجھتے ہیں، انہوں نے اس کا مذاق بنا رکھا ہے۔ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰیٰتِ رَبِّهٖ: کون بڑا ظالم ہے اس شخص سے جو نصیحت کیا جائے اپنے رَبّ کی آیات کے ساتھ فَاَعْرَضَ عَنْهَا: پھر وہ ان آیات سے منہ موڑ لے، وَنَسِیَ مَا قَدَّمَتْ یَدٰهُ: اور بھول جائے اس چیز کو جو آگے بھیجی اس کے ہاتھوں نے، مَا قَدَّمَتْ یَدٰهُ سے پورے اعمال مراد ہوتے ہیں، کیونکہ تمام اعمال کی نسبت انسان کے ہاتھوں کی طرف ہی ہوتی ہے، جیسے کہتے ہیں اپنے ہاتھوں کی کمائی۔ جو کچھ اس کے ہاتھوں نے آگے بھیجا اس کو وہ بھول جائے، اَعْرَضَ: اعراض کرے۔ ''کون بڑا ظالم ہے اس شخص سے جو

نصیحت کیا جائے اپنے رَب کی آیات کے ساتھ، پھر اعراض کرے وہ ان آیات سے، اور بھول جائے اس چیز کو جو اس کے ہاتھوں نے آگے بھیجی ہے" اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰی قُلُوْبِهِمْ: بے شک بنایا ہم نے ان لوگوں کے دلوں پر۔ قلوب قلب کی جمع۔ اَکِنَّۃً: یہ کِنان کی جمع ہے، پردہ۔ ہم نے ان کے دلوں کے اوپر پردے بنا دیے۔ کَنَّ اصل میں چھپانے کو کہتے ہیں تو کِنان چھپانے والی چیز ہو گئی، اَکِنَّۃً اس کی جمع آ گئی۔ بنائے ہم نے ان کے دلوں کے اوپر پردے، اَنْ یَّفْقَهُوْهُ: ہُ ضمیر قرآنِ کریم کی طرف لوٹ رہی ہے جس کے اوپر آیاتِ رَبّ کا لفظ دلالت کر رہا ہے۔ اَنْ یَّفْقَهُوْهُ: لِئَلَّا یَفْقَهُوْهُ تا کہ وہ اس قرآن کو نہ سمجھیں، کَرَاهِیَۃَ اَنْ یَّفْقَهُوْهُ اس بات کو مکروہ جاننے کی وجہ سے کہ وہ اس قرآن کو سمجھیں (آلوسی)۔ وَفِیْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا: آذان اُذن کی جمع ہے۔ اور ان کے کانوں میں بوجھ۔ وقر کہتے ہیں بوجھ کو جو کانوں میں پیدا ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے پھر وہ سنتا نہیں، جیسے کسی نے کان میں ڈاٹ دے دیا۔ وَاِنْ تَدْعُهُمْ اِلَی الْهُدٰی: تدعُ مجزوم ہے اِنْ کی وجہ سے۔ اگر تُو انہیں بلائے، اگر تو انہیں دعوت دے ہدایت کی طرف فَلَنْ یَّهْتَدُوْٓا اِذًا اَبَدًا: ہرگز نہیں ہدایت پائیں گے تب کبھی بھی، اِذًا کا معنی تب، یعنی جب تو دعوت دے، اِذًا کے آخر میں جو تنوین ہے وہ عوضِ مضاف الیہ ہے، جب تُو انہیں دعوت دے تو کبھی بھی ہدایت نہیں پائیں گے، کبھی بھی ہدایت کے مطابق سیدھا راستہ اختیار نہیں کریں گے۔ وَرَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَۃِ: اور تیرا رَبّ بخشنے والا ہے رحمت والا ہے۔ لَوْ یُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا: یُؤَاخِذُ مؤاخذہ سے ہے۔ اگر مؤاخذہ کرے وہ لوگوں سے بسبب ان کے کاموں کے جو لوگوں نے کیے ہیں، لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ: تو جلدی دے دے اُنہیں عذاب۔ بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ: بلکہ ان کے لئے ایک وعدے کا وقت ہے، لَّنْ یَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْئِلًا ہرگز نہیں پائیں گے وہ اس کے ورے کوئی پناہ گاہ۔ موئل: سرکنے کی جگہ، پناہ گاہ، جدھر وہ ہٹ کے چلے جائیں۔ وَتِلْكَ الْقُرٰٓی اَهْلَكْنٰهُمْ: اور یہ بستیاں (جو قرآنِ کریم میں پہلے متعارف کرا دی گئی تھیں، قومِ لُوط کی بستیاں، قومِ صالح کی، اور اَصحابِ مدین کی، اور یہ مکہ والے جب شام کی طرف تجارت کرنے کے لئے جاتے تھے تو یہ ویرانے ان کے سامنے آتے تھے، یہ اُجڑی ہوئی بستیاں، یہ نشانات اس وقت تک باقی تھے) یہ بستیاں، ہم نے ان کو ہلاک کر دیا، لَمَّا ظَلَمُوْا جبکہ انہوں نے ظلم کیا، بستیاں بول کے بستیوں والے مراد ہیں، اس لئے اَهْلَكْنٰهُمْ اور ظَلَمُوْا میں ھم ضمیر لوٹ رہی ہے۔ "یہ بستیاں، ہم نے ان کو ویران کر دیا، ہم نے ان کو ہلاک کر دیا ان کے ظلم کے سبب سے" وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا: اور ہم نے ان کے ہلاک ہونے کے لئے بھی وعدہ بنایا تھا، وعدے کا وقت متعین کیا تھا۔ مهلِك مصدر میمی ہے۔ ہم ان کے ہلاک ہونے کے لئے، ان کی ہلاکت کے لئے موعد متعین کیا تھا، وعدے کا وقت متعین کیا تھا۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل و مابعد سے ربط

مضمون آپ کے سامنے سلسلہ وار چلا آ رہا ہے، اصحابِ کہف کا واقعہ ختم ہونے کے بعد بطور نصیحت کے چند باتیں کہی گئی تھیں، اس کے بعد دو باغ والوں کا قصہ آیا تھا، اور اگلے رکوع میں عمومی طور پر فناء دنیا کا تذکرہ تھا، اور یہ رکوع جواب آپ کے

سامنے پڑھا گیا اس کے بعد پھر ایک قصہ شروع ہو رہا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور خضر علیہ السلام کا، دو رکوع پر وہ پھیلا ہوا ہے، اور اس کے بعد واقعہ آجائے گا ذُوالقرنین کا، اور درمیان میں یہ چند آیات بطور تنبیہ کے ہیں، جس طرح سے اَصحابِ کہف کے واقعے کے بعد کچھ نصائح کر دی گئی تھیں، ہدایات دے دی گئی تھیں، یہ دنیا کی فنائیت کو ثابت کرنے کے بعد، ایک جزوی واقعے سے بھی، دو باغوں والے کا جو واقعہ تھا، اور ایک عمومی مثال سے بھی جو فنائے دنیا کی دی گئی، اس کے بعد شیطان کا تذکرہ کیا تھا، مقصد یہ تھا کہ نہ تو دنیا کی محبت میں آ کے تم غافل ہوؤ اور اللہ کے احکام کو چھوڑو، نہ شیطان کے بہکانے سے، یہ دونوں باتیں نقصان کی ہیں۔ اب نہ ماننے والوں کے لئے اس رکوع میں کچھ تنبیہ ہے، آگے پھر واقعات کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔

اللہ تعالیٰ کا اِنسان کے ساتھ محبّت وشفقت والا معاملہ

پہلی آیت کا حاصل تو یہ ہے کہ ہم نے اس قرآن میں لوگوں کو سمجھانے کے لئے ہر قسم کی مثال بار بار بیان کی، ہر قسم کا مضمون پھیر پھیر کر بیان کیا۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی عنایت اور اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ وہ اس طرح سے اپنے بندوں کو سمجھاتا ہے جس طرح سے ایک مہربان استاذ یا شفقت کرنے والا مشفق باپ اپنی اولاد کو سمجھاتا ہے۔ ایک ہوتا ہے قانون، حکومت آرڈیننس نافذ کرتی ہے، اعلان کر دیتی ہے کہ یہ کام کرنا ہے یہ کام نہیں کرنا، اور پھر جو اس کے حکم کو مانتے ہیں وہ تو ٹھیک ہیں، اور نہیں مانتے تو فوراً پکڑ دھکڑ شروع ہو جاتی ہے، مار پٹائی شروع ہو جاتی ہے، یہ ہے قانونی معاملہ۔ اور ایک معاملہ ہوتا ہے ماں باپ کا اپنی اولاد کے ساتھ، ایک دفعہ سمجھائیں گے، سمجھ گیا تو بہتر، نہ سمجھا تو دوبارہ اور طریقے سے سمجھائیں گے، جو وہ کہہ رہے ہیں اس کا نفع بتائیں گے، جس سے روک رہے ہیں اس سے رُکنے کے فائدے سمجھائیں گے، اور اس کام کے کرنے کے نقصان بتائیں گے، ایک دفعہ نہیں سمجھے گا تو دوسری دفعہ، دوسری دفعہ نہیں سمجھے گا تو تیسری دفعہ، کبھی سختی سے کبھی نرمی سے، کبھی محبت اور پیار سے، اور کبھی ڈنڈا دکھائیں گے، کبھی جُوتا اُٹھائیں گے، بار بار تفہیم ہوتی ہے، یہ محبت اور شفقت کا تقاضا ہے، اور اسی طرح سے مہربان استاذ اپنے شاگردوں کو بار بار سمجھاتا ہے، بار بار تنبیہ کرتا ہے، کبھی محبت کے ساتھ، کبھی لالچ دلا کے، کبھی خوف سے تاکہ کسی طرح سے یہ اپنے نفع کی چیز اختیار کر لیں اور نقصان کی چیز سے بچ جائیں، تو یہ جو گفتگو میں تکرار ہے کہ بار بار ایک بات کہی جا رہی ہے یہ محبت اور شفقت کا نتیجہ ہے، ورنہ اگر قانونی معاملہ ہو تو ایک دفعہ اعلان کیا، اور جو اس اعلان کے مطابق چلے ٹھیک ہے، ورنہ پکڑو اور سزا دے دو، قانون کا تقاضا تو یہی ہوتا ہے، لیکن یہاں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ محبت اور شفقت کا معاملہ فرماتے ہیں کہ ایک بات کو مختلف پیرایوں سے، مختلف طریقوں سے اس کے مختلف پہلو واضح کر کے بیان کرتے ہیں، تو لوگوں کو چاہیے تھا کہ اس کی قدر کرتے، لیکن لوگ ہیں کہ کسی طرح سے سمجھنے کے نہیں، ہر چیز سے زیادہ جھگڑالو انسان ہے کہ جو بات اس کے سامنے رکھو، کتنی ہی صاف ستھری رکھو، لیکن اگر اس کا ماننے کا ارادہ نہیں ہے تو اس میں بیسیوں نکتے نکال لے گا ''خوئے بدرا بہانہ بسیار'' کبھی کوئی اشکال پیدا کر دیا، کبھی کوئی بہانہ کر دیا، کبھی کوئی عذر کر دیا، تو یہ جھگڑالو ہے، اس میں جھگڑنے کی عادت ہے جس کی بنا پر یہ صحیح بات کو جلدی سے قبول نہیں کرتا، اور یہ مزاج ویسے بہت سے انسانوں میں نمایاں ہوا کرتا ہے کہ جب ماننے کا ارادہ نہیں ہوتا تو کسی نہ کسی طرف سے اس میں اِشکال اُٹھا کے کوئی

نہ کوئی جھگڑا نکال ہی لیتا ہے...... تو پہلی آیت میں تو یہی شکوہ کیا گیا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اپنی اس رحمت کو واضح کیا ہے کہ ہم نے اس قرآن میں ہر قسم کے مضمون کو، ہر قسم کی مثال کو مختلف پیرایوں سے، مختلف طریقوں سے بار بار ذکر کیا ہے، اور انسان ہر چیز سے زیادہ جھگڑالو ہے، جدل جھگڑا کرنے کو کہتے ہیں، جھگڑے کا اصل مفہوم یہ ہوا کرتا ہے کہ بات کو مانا نہ جائے، اور اس میں خواہ مخواہ اِشکالات پیدا کر کے اس کو دور ہٹانے کی کوشش کی جائے، تو اسی طرح سے یہ انسان ہے کہ جب بھی اس کی سامنے بات آتی ہے تو اس کو حقیقت پسندانہ نگاہ سے دیکھنے کی بجائے اس میں جلد بازی کے ساتھ اِشکالات کر کے جھگڑنا شروع کر دیتا ہے، قبول نہیں کرتا۔

''زمانہ بے رحم اُستاذ ہے!''

اگلی آیت کا حاصل یہ ہے کہ ہم نے سمجھانے میں تو اب کسی قسم کی کمی نہیں چھوڑی، تو یہ لوگ جو مانتے نہیں ہیں تو اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ اس انتظار میں ہیں کہ ان کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے جو پہلے لوگوں کے ساتھ ہوا تھا، پہلے لوگوں سے مراد وہی پہلی قومیں جو تباہ ہوئیں برباد ہوئیں، جیسے آخر رکوع میں جا کے تِلْكَ الْقُرٰٓى کے تحت اس کو ذکر کیا جائے گا، قومِ لُوط علیہ السلام پر عذاب آیا، قومِ نوح علیہ السلام پر عذاب آیا، قومِ صالح علیہ السلام پر عذاب آیا، قومِ ہود علیہ السلام پر عذاب آیا، تو جیسے پہلے لوگوں کے ساتھ ہم نے طریقہ برتا ہے یہ اسی انتظار میں ہیں، وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ یُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰى: مفہوم اس کا یہی ہوا کہ ہدایت تو ان کے پاس آ گئی، سمجھانے میں تو ہم نے کسی قسم کی کمی چھوڑی نہیں، لیکن اس کے باوجود جو یہ نہیں مانتے تو اس کا مطلب یہی ہے، یعنی ضروری نہیں کہ اپنی زبان سے وہ کہیں کہ ہم تب مانیں گے جب عذاب ہماری آنکھوں کے سامنے آ جائے، اگرچہ بعض لوگ دلیرانہ طور پر یوں بھی کہہ دیتے تھے کہ لے آؤ ہمارے پاس عذاب اگر تم سچے ہو، یا ہمارے اوپر آسمان کے ٹکڑے گرا دو، یہ کر دو، وہ کر دو، اس قسم کی باتیں وہ اپنی زبان سے بھی کہہ دیتے تھے، اگر زبان سے نہ بھی کہیں تو جب ایک آدمی ہر طرح سے سمجھانے کے بعد بھی نہیں مانتا، بار بار اس کو تفہیم کر دی، نفع سمجھا دیا، نقصان سمجھا دیا، پھر بھی نہیں مانتا، تو پھر ہم کہا کرتے ہیں کہ بھئی! یہ ٹھوکروں کے انتظار میں ہے، جب تک اس کو کوئی ٹھوکر نہیں لگے گی اس وقت تک یہ سمجھے گا نہیں، اب اس کو زمانہ سمجھائے گا، استاذ جس وقت شاگرد کو سمجھایا کرتا ہے تو بسا اوقات یوں ہی بات ہوا کرتی ہے، اور یہ تو ہمارے بزرگوں کی ایک بات ہے اور ہر وقت یاد رکھنے کی ہے، کہا کرتے ہیں کہ ''زمانہ بے رحم اُستاذ ہے'' زمانہ اُستاذ ہے لیکن بے رحم، سمجھاتا ہے لیکن سمجھاتا شفقت کے ساتھ نہیں، بُری عادت کے نتیجے میں انسان ذلیل ہوگا، بعد میں عقل ٹھکانے آئے گی، اور کسی بُری حرکت کے نتیجے میں پٹے گا تب جا کے ہوش ٹھکانے آئے گی، والدین نرمی سے سمجھاتے ہیں، اُستاذ نرمی سے سمجھاتا ہے، لیکن اگر ان کے سمجھانے سے کوئی نہیں سمجھتا تو پھر زمانہ سمجھایا کرتا ہے، لیکن زمانہ پھر نرمی سے نہیں سمجھاتا، بہت بے رحم اُستاذ ہے، پھر چاہے انسان کی گردن ٹوٹے، چاہے ٹانگیں ٹوٹیں، چاہے ذلیل ہو، چاہے فقر و فاقہ میں مبتلا ہو، جیل میں جائے، مصیبت میں پڑے، بہر حال بُری عادت کا نتیجہ سامنے آ کے ہی رہتا ہے، تو جب کوئی سمجھایا ہوا نہیں سمجھتا تو پھر یوں ہی کہا جایا کرتا ہے کہ بھائی! یہ تو اسی وقت کا منتظر ہے، جب اس کے سر پر عذاب کا کوڑا لگے گا تب یہ سمجھے گا، اس کا حال اس بات پر دلالت کرتا ہے۔

کافر عذاب کے منتظر ہیں

تو یہاں بھی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ جو سمجھتے نہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ بھی اسی انتظار میں ہیں کہ ان کے ساتھ وہی طریقہ برتا جائے جو پہلے لوگوں کے ساتھ برتا تھا، اور جب پھر عذاب آتا ہے تو پھر چیختے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے، جیسے فرعون جب ڈوبنے لگا تھا، ناک میں پانی پڑا تو کہتا ہے کہ میں ایمان لے آیا، لیکن ایسے وقت میں ایمان لانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا، یہ بھی سمجھانے کا ایک انداز ہے کہ تم جو نہیں مانتے تو کیا اس وقت کے منتظر ہو؟ اور جب یہ وقت آجائے گا، اور پہلے لوگوں کی طرح تمہارے اوپر بھی عذاب کا کوڑا برسا، عذاب آنکھوں کے سامنے آگیا، پھر اگر مانو گے بھی تو اس ماننے کا کوئی فائدہ نہیں، ''نہیں روکا لوگوں کو ایمان لانے سے جبکہ ان کے پاس راہنمائی آگئی'' ہم نے ہر طرح سے راہنمائی کردی، اس کے باوجود یہ ایمان نہیں لاتے اور اپنے رَبّ سے اِستغفار نہیں کرتے، تو ایمان لانے سے اور اپنے رَبّ سے اِستغفار کرنے سے ہدایت کے آنے کے بعد، جب ان کے پاس ہدایت آگئی اس کے بعد بھی اگر یہ نہیں مانتے ''ایمان لانے سے اور اِستغفار کرنے سے نہیں روکا ان کو مگر اس بات کے انتظار نے کہ ان کے پاس پہلوں کا طریقہ آجائے، اور اس بات کے انتظار نے کہ ان کے سامنے عذاب آجائے'' گویا کہ یہ اس قسم کے عذاب کے منتظر ہیں جیسا عذاب پہلے لوگوں پر آیا تھا، جب وہ عذاب آجائے گا تب یہ مانیں گے، لیکن آپ جانتے ہیں کہ جب عذاب آنکھوں کے سامنے آجائے پھر ماننے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔

عذاب لانا رسولوں کے اِختیار میں نہیں

''اور نہیں بھیجا کرتے ہم رسولوں کو مگر اس حال میں کہ وہ تبشیر کرتے ہیں، اِنذار کرتے ہیں'' وہ تو مبشر اور منذر ہوتے ہیں، اس لیے عذاب لانا ان کا کام نہیں ہوتا، کوئی کہے کہ تمہیں ہم سچا تب سمجھیں گے کہ ہمارے سامنے عذاب لے آؤ، یہ بات غلط ہے۔ رسولوں کا آنا اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی رحمت ہے، وہ آتے ہیں آکے نیکی کرنے والوں کو بشارت سناتے ہیں، بُرائی کرنے والوں کو ان کے بُرے انجام سے ڈراتے ہیں، رسولوں کا کام یہی ہوتا ہے، اور نیک بخت وہ ہوتے ہیں جو ان کے سمجھانے سے سمجھ جائیں، نیکی اختیار کریں اور بُرائی سے بچ جائیں۔

کافروں کی بدکرداری

''کافر لوگ جھگڑا کرتے ہیں غلط باتوں کے ذریعے سے'' جن کی کوئی بنیاد نہیں ہوتی، باطل کو لے کے جھگڑتے ہیں ''تاکہ اس کے ذریعہ سے حق کو پھسلا دیں'' حق کو شکست دے دیں، حق کو زائل کردیں۔ اِدحاض: اپنی جگہ سے پھسلا دینا۔ کافر لوگ باطل باتوں کے ذریعے سے جھگڑا کرتے ہیں تاکہ پھسلا دیں اس کے ذریعے سے حق کو۔ ''اور بنایا ان کافروں نے (واتخذوا کی ضمیر بھی کافروں کی طرف راجع ہے) بنایا ان کافروں نے میری آیات کو (جو کہ ہدایت کے طور پر اللہ تعالیٰ اتارتے ہیں) اور میرے ڈرانے دھمکانے کو، مَآ اُنْذِرُوْا: ڈرانے جانے کو، مجہول کے طور پر یوں ترجمہ کریں گے۔ بنایا انہوں نے، ٹھہرا لیا انہوں

نے میری آیات کو اور اس چیز کو جس کے ذریعے سے یہ ڈرائے گئے، یا اپنے ڈرائے جانے کو، بنالیا انہوں نے ٹھٹھا، یعنی ہماری طرف سے جو آیات اترتی ہیں اور اسی طرح سے ان کو جو دھمکایا جا رہا ہے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ مذاق ہے، ہنسی مذاق میں جس طرح سے انسان بات ٹالتا ہے اس طرح سے اس کو ٹالنے کی کوشش کرتے ہیں، حالانکہ یہ ہنسی مذاق نہیں، یہ واقعہ ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو دھمکی دی جا رہی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو اِنذار کیا جا رہا ہے اس کو مذاق نہ سمجھو، اگر اس کو مذاق میں ٹالتے رہے تو سمجھنے کا موقع نہیں ملے گا، اور پھر جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب آ ہی جائے گا تو پھر معاملہ بس سے باہر ہو جائے گا۔

اللہ کی نصیحت سے اِعراض کرنے والا بڑا ظالم ہے

کون بڑا ظالم ہے اس شخص سے جو اپنے رَبّ کی آیات کے ساتھ نصیحت کیا جائے پھر وہ ان سے اِعراض کر جائے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے نصیحت ہو، اللہ تعالیٰ کی طرف سے بار بار سمجھایا جائے لیکن وہ منہ موڑ لیتا ہے، اور اپنے مَاقَدَّمَتْ یَدٰهُ، جو اس کے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے، اپنے ہاتھوں کی کمائی کو بھولے بیٹھا ہے، اسے یہ نہیں معلوم کہ میں کیا کیا آگے بھیجے بیٹھا ہوں، کتنی بدکاریاں، کتنا فسق و فجور، کتنے بُرے اعمال آگے بھیجے بیٹھا ہوں، اسے کچھ یاد نہیں ہے، اور اُس کو اِس کا خیال ہی نہیں ہے کہ ایک وقت اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونا ہے اور محاسبہ ہوگا اور اس کی سزا سامنے آئے گی، اس کو کچھ یاد نہیں، تو اس سے بڑھ کے ظالم اور کون ہو سکتا ہے؟ یہاں ظالم سے مراد اپنا قصور کرنے والا ہے، اپنا نقصان کرنے والا، یہ ظلم علی النفس ہے۔ ''کون بڑا ظالم ہے اس شخص سے جس کو نصیحت کی جائے اس کے رَبّ کی آیات کے ذریعے سے پھر وہ ان سے اِعراض کر جائے اور بھول جائے اس چیز کو جو اس کے ہاتھوں نے آگے بھیجی ہے۔''

حضور ﷺ کو تسلی

اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰی قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً: یہ بھی ایک قسم کی تنبیہ ہے، اور سرورِ کائنات ﷺ کے لئے تسلی ہے کہ اتنا سمجھانے کے باوجود نہیں سمجھتے تو یوں سمجھو کہ ان کی استعداد ہی ختم ہوگئی، اور جو بھی کیفیت پیدا ہوتی ہے چونکہ اس کا خالق اللہ ہوتا ہے، اس لیے اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی جاتی ہے کہ ہم نے ان کے دلوں پہ پردے ڈال دیے، ان پردوں سے مراد وہی ہے کہ ضد کرتے کرتے انسان کے قلب میں ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ پھر ماننے کی صلاحیت ہی نہیں رہتی، مخالفت کرتے کرتے انسان اتنا دُور نکل جاتا ہے کہ پھر اتفاق کرنے کی قابلیت ہی نہیں رہتی، یہاں اسی کیفیت کو بیان کرنا مقصود ہے کہ ان کی ضد اور عناد کے نتیجے میں ان کے کانوں پر اور ان کے دلوں پر یہ کیفیت طاری ہوگئی کہ نہ ان کے کان سنتے ہیں، بلکہ ایسے ہو گئے جیسے کسی کے کان میں ڈاٹ دیا ہوا ہو، اور نہ ان کے دل سمجھتے ہیں، ایسے ہو گئے جیسے دلوں کے اوپر پردہ ڈال دیا گیا ہو۔ یہ حضور ﷺ کے لئے تسلی ہے، اور اُن لوگوں کی بُرائی بیان کی جا رہی ہے، اور اس میں بھی تنبیہ کا پہلو ہے۔ ''بے شک ہم نے ان کے دِلوں کے اوپر پردے کر دیے تاکہ نہ سمجھیں وہ اس قرآن کو، اور ان کے کانوں میں بوجھ کر دیا تاکہ وہ اس کو سنیں نہیں'' یعنی ایسا سننا جس کے اوپر نفع مرتب ہو، ورنہ ان کے کان میں آواز تو جاتی تھی۔ ''اگر آپ ان کو بلائیں ہدایت کی طرف تو یہ تب بھی ہدایت نہیں پائیں گے''، فَلَنْ

يَّهْتَدُوْٓا: اهتداء: ہدایت پانا، ہدایت قبول کرنا۔ ہرگز نہیں پائیں گے کبھی بھی ہدایت، اِذًا کا معنی تب، یعنی جب تُو انہیں بلائے، جب تُو دعوت دے، تب یہ کبھی بھی ہدایت پانے والے نہیں ہیں، مخالفت کرتے کرتے اپنی استعداد اس طرح سے یہ لوگ ختم کر بیٹھے ہیں۔اور سرورِ کائنات ﷺ کے لئے ایک تسلی ہے کہ آپ کے سمجھانے پر اگر یہ سمجھتے نہیں ہیں تو آپ زیادہ فکر نہ کیجئے، اس مخالفت کے نتیجے میں اب ان میں سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں رہی۔

کافروں کو ختم کیوں نہیں کر دیا جاتا؟

جب صلاحیت نہیں رہی تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر ان کو فوراً کیوں نہیں برباد کر دیا جاتا؟ پھر ان کو باقی رکھنے کا کیا فائدہ؟ زمین پر خواہ مخواہ کا بوجھ ہیں، ان کو مٹا دیا جائے، تو اس کا جواب آگے آگیا کہ تیرا ربّ غفور ہے رحمت والا ہے، اس لئے ان کو مہلت دیے ہوئے ہے، رَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ: تیرا ربّ غفور ہے رحمت والا ہے، لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا: اگر مؤاخذہ کرے ان سے ان کے کسب کی وجہ سے، یعنی ادھر بُری حرکت کریں اور فوراً ان کو پکڑ لیا جائے، لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ: تو اللہ تعالیٰ انہیں عذاب جلدی دے دے، لیکن اللہ ایسا نہیں کرتا، یہ بُرائیاں کرتے ہیں، اور اللہ اپنے غفور رحیم ہونے کی وجہ سے ان کو پھر بھی مہلت دیے ہوئے ہے، فوراً نہیں پکڑتا بلکہ ان کے لئے موعد ہے۔ موعد: وعدہ یا وعدے کا وقت۔ ''ہرگز نہیں پائیں گے وہ اس سے مؤئل، پناہ گاہ'' پھر اللہ نے جو وعدہ کیا ہے، اس کے لئے جو وقت متعین ہے، اس سے پھر یہ کوئی پناہ گاہ نہیں پائیں گے۔اور اس کی آگے ایک دلیل دے دی واقعات کے طور پر، کہ یہ کوئی ایسے ہی باتیں نہیں، بلکہ یہ بستیاں جن کو تم آتے جاتے دیکھتے رہتے ہو، ان کے حال کو سوچو! تو یہ ہماری اس بات کی دلیل ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے گرفت آتی ہے تو پھر کسی کو سرکنے کی گنجائش نہیں ہوتی، اس لیے وقت سے پہلے پہلے سمجھ جاؤ، وَتِلْكَ الْقُرٰٓى اَهْلَكْنٰهُمْ یہ تاریخی واقعات کی طرف اشارہ کر کے گویا کہ دلیل مہیا کی گئی ہے، یہی بستیاں جو تمہاری آنکھوں کے سامنے ہیں، ہم نے ان بستیوں کے رہنے والوں کو ہلاک کر دیا جبکہ انہوں نے ظلم کیا، ظلم سے یہاں شرک مراد ہے، اور اللہ تعالیٰ کے اَحکام کی خلاف ورزی، ''اور ہم نے ان کی ہلاکت کے لئے بھی موعد متعین کیا تھا'' وعدہ متعین کیا تھا، یا وعدے کا وقت متعین کیا تھا، اس وقت پر ان کو ہلاک کر دیا گیا۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰىهُ لَآ اَبْرَحُ حَتّٰٓى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ
قابلِ ذکر ہے وہ وقت جبکہ کہا موسیٰ علیہ السلام نے اپنے جوان کو، میں ہمیشہ چلتا رہوں گا حتیٰ کہ میں پہنچ جاؤں دو دریاؤں کے جمع ہونے کی جگہ کو
اَوْ اَمْضِيَ حُقُبًا ﴿۶۰﴾ فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوْتَهُمَا
یا چلتا رہوں گا میں زمانۂ دراز تک ﴿۶۰﴾ پس جب وہ دونوں پہنچ گئے دو دریاؤں کے جمع ہونے کی جگہ کو، تو وہ دونوں اپنی مچھلی بھول گئے،

فَاتَّخَذَ سَبِیْلَهٗ فِی الْبَحْرِ سَرَبًا ﴿۶۱﴾ فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتٰىهُ

اختیار کیا اس مچھلی نے اپنا راستہ سمندر میں اس حال میں کہ وہ سرنگ تھا ﴿۶۱﴾ جب وہ دونوں آگے گزر گئے تو موسیٰ نے اپنے خادم سے کہا

اٰتِنَا غَدَآءَنَا ؗ لَقَدْ لَقِیْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا ﴿۶۲﴾ قَالَ اَرَءَیْتَ اِذْ

لے آ ہمارے پاس ہمارا ناشتہ، بے شک ہم ملے اپنے اس سفر سے مشقت کو ﴿۶۲﴾ اس جوان نے کہا: کیا آپ نے دیکھا؟ جس وقت

اَوَیْنَاۤ اِلَی الصَّخْرَةِ فَاِنِّیْ نَسِیْتُ الْحُوْتَ ؗ وَمَاۤ اَنْسٰىنِیْهُ اِلَّا الشَّیْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ ۚ

ہم نے ٹھکانا لیا تھا چٹان کی طرف، پس بے شک میں مچھلی بھول گیا، اور نہیں بھلائی مجھ کو وہ مچھلی یعنی اس کا ذکر کرنا مگر شیطان نے،

وَاتَّخَذَ سَبِیْلَهٗ فِی الْبَحْرِ ۖ عَجَبًا ﴿۶۳﴾ قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ ۖ

اور اختیار کیا اس مچھلی نے اپنا راستہ دریا میں عجیب طریقے سے ﴿۶۳﴾ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: یہی تو وہ چیز ہے جس کو ہم تلاش کرتے تھے،

فَارْتَدَّا عَلٰۤی اٰثَارِهِمَا قَصَصًا ۙ ﴿۶۴﴾ فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَاۤ

پھر وہ دونوں لوٹے اپنے پاؤں کے نشانوں پر تلاش کرتے ہوئے ﴿۶۴﴾ پھر ان دونوں نے پالیا ہمارے بندوں میں سے ایک بندے کو،

اٰتَیْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ﴿۶۵﴾ قَالَ لَهٗ مُوْسٰی هَلْ

دی تھی ہم نے اس کو اپنے پاس سے رحمت، اور سکھایا تھا ہم نے اس کو اپنی جانب سے علم ﴿۶۵﴾ موسیٰ نے اس بندے کو کہا: کیا

اَتَّبِعُكَ عَلٰۤی اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ﴿۶۶﴾ قَالَ اِنَّكَ لَنْ

میں تیری پیروی کروں اس شرط پر کہ تُو سکھائے مجھے اس علم میں سے جو تُو سکھایا گیا ہے علم نافع ﴿۶۶﴾ اس بندے نے کہا: بے شک ہرگز نہیں

تَسْتَطِیْعَ مَعِیَ صَبْرًا ﴿۶۷﴾ وَكَیْفَ تَصْبِرُ عَلٰی مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا ﴿۶۸﴾

نہیں طاقت رکھے گا تُو میرے ساتھ صبر کرنے کی ﴿۶۷﴾ اور تُو کیسے صبر کرے گا اس چیز پر جس کا تُو نے احاطہ نہیں کیا ازروئے واقفیت کے ﴿۶۸﴾

قَالَ سَتَجِدُنِیْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّلَاۤ اَعْصِیْ لَكَ اَمْرًا ﴿۶۹﴾ قَالَ

موسیٰ علیہ السلام نے کہا: عنقریب پائے گا تُو مجھے اِن شاء اللہ! صبر کرنے والا اور میں نہیں نافرمانی کروں گا تیری کسی کام میں ﴿۶۹﴾ خضر نے کہا

فَاِنِ اتَّبَعْتَنِیْ فَلَا تَسْـَٔلْنِیْ عَنْ شَیْءٍ حَتّٰۤی اُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا ﴿۷۰﴾ ع

پس اگر تُو میری اتباع کرنا چاہتا ہے تو نہ پوچھنا مجھ سے کسی چیز کے متعلق جب تک میں ہی تیرے لیے اس بات کا ذکر نہ کر دوں ﴿۷۰﴾

فَانْطَلَقَا ٚ حَتّٰٓى اِذَا رَكِبَا فِي السَّفِيْنَةِ خَرَقَهَا ؕ قَالَ اَخَرَقْتَهَا

پس وہ دونوں چل پڑے حتیٰ کہ جب یہ دونوں سوار ہو گئے کشتی میں تو خضر نے کشتی کو پھاڑ دیا، موسیٰ نے کہا: کیا تُو نے پھاڑا اس کشتی کو

لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا ۚ لَقَدْ جِئْتَ شَيْـًٔا اِمْرًا ۝۷۱ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ

تا کہ تُو اس کشتی والوں کو غرق کر دے؟ تحقیق آیا تُو برے کام پر ۝۷۱ خضر نے کہا: کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ تُو ہرگز طاقت نہیں رکھے گا

مَعِيَ صَبْرًا ۝۷۲ قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِيْ بِمَا نَسِيْتُ وَلَا تُرْهِقْنِيْ

میرے ساتھ صبر کرنے کی؟ ۝۷۲ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: نہ مؤاخذہ کر میرے پر بسبب میرے بھول جانے کے، اور نہ ڈال میرے اُوپر

مِنْ اَمْرِيْ عُسْرًا ۝۷۳ فَانْطَلَقَا ٚ حَتّٰٓى اِذَا لَقِيَا غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ ۙ

میرے معاملے میں تنگی ۝۷۳ پھر وہ دونوں آگے چلے حتیٰ کہ جس وقت ملاقات ہوئی ان دونوں کی ایک لڑکے کے ساتھ تو خضر نے اس لڑکے کو قتل کر دیا

قَالَ اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةًۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ ؕ لَقَدْ جِئْتَ شَيْـًٔا نُّكْرًا ۝۷۴

موسیٰ نے کہا: کیا تُو نے قتل کر دیا ایک پاک صاف نفس کو بغیر کسی نفس کے بدلے کے؟ آپ نے بہت بُری حرکت کا اِرتکاب کیا ہے ۝۷۴

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝۷۵ قَالَ اِنْ سَاَلْتُكَ

خضر نے کہا: کیا میں نے تجھے نہیں کہا تھا کہ تُو میرے ساتھ صبر کرنے کی طاقت نہیں رکھے گا؟ ۝۷۵ موسیٰ نے کہا: اگر میں سوال کروں تجھ سے

عَنْ شَيْءٍۢ بَعْدَهَا فَلَا تُصٰحِبْنِيْ ۚ قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّيْ عُذْرًا ۝۷۶ فَانْطَلَقَا ٚ حَتّٰٓى

کسی چیز کے متعلق اس واقعے کے بعد پھر تُو مجھے ساتھ نہ رکھنا، بے شک تُو میری طرف سے عذر کو پہنچ گیا ۝۷۶ پھر وہ دونوں چل پڑے حتیٰ کہ

اِذَآ اَتَيَآ اَهْلَ قَرْيَةِ ِۨ اسْتَطْعَمَآ اَهْلَهَا فَاَبَوْا اَنْ

جب وہ آ گئے ایک بستی والوں کے پاس، انہوں نے کھانا مانگا اس بستی والوں سے، انہوں نے انکار کر دیا اس بات سے کہ

يُّضَيِّفُوْهُمَا فَوَجَدَا فِيْهَا جِدَارًا يُّرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ ؕ قَالَ

وہ ان کی مہمانی کریں، پھر ان دونوں نے پایا اس بستی میں ایک دیوار کو جو گرنا چاہتی تھی، خضر نے اس دیوار کو سیدھا کر دیا موسیٰ نے کہا:

لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا ۝۷۷ قَالَ هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَبَيْنِكَ ۚ سَاُنَبِّئُكَ

اگر تُو چاہتا تو اس دیوار کے سنوارنے پر کوئی اُجرت لے لیتا! ۝۷۷ خضر نے کہا: یہ جُدائی ہے میرے اور تیرے درمیان! عنقریب بتاؤں گا میں تجھے

بِتَأْوِيْلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ﴿۷۸﴾ اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي

مطلب ان باتوں کا جن کے اُوپر تُو صبر نہ کرسکا ﴿۷۸﴾ کشتی! وہ ایسے مسکینوں کی تھی جو دریا میں کام

الْبَحْرِ فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا وَكَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا ﴿۷۹﴾

کرتے تھے، میں نے ارادہ کیا کہ اس کشتی کو عیب دار کردوں، اور ان کے آگے ایک بادشاہ تھا وہ لے لیتا تھا ہر دُرست کشتی کو چھین کر ﴿۷۹﴾

وَاَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَآ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ﴿۸۰﴾

اور لڑکا! اس کے والدین ایمان والے تھے، ہمیں اندیشہ ہوا کہ وہ ان کے اُوپر سختی ڈال دے گا از روئے سرکشی اور کُفر کے ﴿۸۰﴾

فَاَرَدْنَآ اَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّاَقْرَبَ

ہم نے اِرادہ کیا کہ بدل کے دے دے ان دونوں کو ان کا رَبّ اس سے بہتر بچّہ از روئے پاکیزگی کے، اور زیادہ قریب

رُحْمًا ﴿۸۱﴾ وَاَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِي الْمَدِيْنَةِ وَكَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا

از روئے شفقت کے ﴿۸۱﴾ اور دیوار! وہ دو یتیم بچّوں کی تھی شہر میں، اور اس دیوار کے نیچے ان دونوں بچّوں کا خزانہ تھا،

وَكَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا ۚ فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا ۖ رَحْمَةً

اور ان کا باپ نیک تھا، اِرادہ کیا تیرے رَبّ نے کہ پہنچ جائیں یہ دونوں بچّے اپنی جوانی کو اور نکال لیں اپنا خزانہ، تیرے رَبّ کی

مِّنْ رَّبِّكَ ۚ وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ ؕ ذٰلِكَ تَاْوِيْلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ﴿۸۲﴾

رحمت کی وجہ سے، اور میں نے یہ کام اپنے اَمر سے نہیں کیا، یہ مطلب ہے ان باتوں کا جن پر تُو صبر نہیں کرسکا ﴿۸۲﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰىهُ: قابلِ ذِکر ہے وہ وقت، یاد کیجئے اس وقت کو۔ اِذْ کا عامل اُذْكُرْ نکال لیں یا يُذْكَرْ۔ چاہیے کہ ذِکر کیا جائے اس وقت کو، قابلِ ذِکر ہے وہ وقت جبکہ کہا موسیٰ علیہ السلام نے اپنے جوان کو۔ فتیٰ جوان کو کہتے ہیں، یہاں سے خادم، شاگرد، آپ کا صحابی ''یوشع بن نون'' مراد ہے۔ اپنے خادم سے کہا: لَآ اَبْرَحُ حَتّٰٓى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ: لَآ اَبْرَحُ یہ ان افعالِ ناقصہ میں سے ہے جو دوام پر دلالت کیا کرتے ہیں، لَا اَبْرَحُ اَسِيْرُ، لا یزال لا تزال کی طرح۔ میں ہمیشہ چلتا رہوں گا۔ ترجمہ نفی کا نہیں ہوگا، بلکہ مثبت کا معنی پیدا ہوجایا کرتا ہے۔ لَا اَبْرَحُ اَسِيْرُ میں ہمیشہ چلتا رہوں گا حَتّٰٓى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ: بحرین یہ بحر کا تثنیہ ہے، بحر بڑے دریا کو بھی کہتے ہیں، اور بحر سمندر کو بھی کہتے ہیں۔ مجمع: اکٹھا ہونے کی جگہ، جمع ہونے کی جگہ۔ حتیٰ کہ پہنچ

جاؤں میں دو دریاؤں کے جمع ہونے کی جگہ کو۔ اور حتیٰ کے بعد اکثر و بیشتر محاورۃً ترجمہ نفی کے ساتھ کر دیا جاتا ہے اپنی زبان کا لحاظ کرتے ہوئے۔ میں ہمیشہ چلتا رہوں گا جب تک کہ نہ پہنچ جاؤں دو دریاؤں کے جمع ہونے کی جگہ کو، یوں نفی کے ساتھ ترجمہ ہوگا، اور اگر نفی ظاہر نہ کرنی ہو تو پھر وہی لفظ استعمال کریں گے جیسے میں نے پہلے کہا، میں ہمیشہ چلتا رہوں گا حتیٰ کہ پہنچ جاؤں دو دریاؤں کے جمع ہونے کی جگہ کو۔ اَوْ اَمْضِیَ حُقُبًا: حقب کی جمع احقاب آتی ہے، تیسویں پارے کے پہلے رکوع میں ہے لٰبِثِیْنَ فِیْهَآ اَحْقَابًا، حقب کہتے ہیں زمانہ دراز کو، بعضوں نے اس کی مدت اَسّی سال متعین کی ہے، لیکن بہر حال یہاں زمانہ دراز مراد ہے، اور وہاں بھی معنی یہی ہے کہ ٹھہرنے والے ہوں گے اس جہنم میں زمانہائے دراز تک۔ یہاں ہوگا اَمْضِیَ حُقُبًا یا چلتا رہوں گا میں زمانہ دراز تک، یا پہنچ جاؤں یا پھر چلتا رہوں گا۔ فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا: بلغا کی ضمیر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے خادم کی طرف ہے۔ پس جب وہ دونوں پہنچ گئے دونوں دریاؤں کے جمع ہونے کی جگہ کو، جہاں دونوں دریا اکٹھے ہوتے ہیں، نَسِيَا حُوْتَهُمَا: حوت مچھلی کو کہتے ہیں، اُنتیسویں پارے میں لفظ آئے گا وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ (سورۂ قلم) مچھلی والے کی طرح نہ ہونا، ''صاحبِ حوت'' سے حضرت یونس علیہ السلام مراد ہیں۔ نَسِيَا حُوْتَهُمَا: وہ دونوں اپنی مچھلی بھول گئے، فَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ: اختیار کیا اس مچھلی نے اپنا راستہ فِی الْبَحْرِ: دریا میں سَرَبًا: سرب سرنگ کو کہتے ہیں، منفذ، جیسے دیوار میں سوراخ کر لیا جاتا ہے، پہاڑ میں سوراخ کر لیا جاتا ہے، جس کو ہماری زبان میں ''سرنگ'' کہتے ہیں، پھر تو یہ اسم ہی ہو گیا، اور اس کو ''اتخذ'' کا دوسرا مفعول بنا لیجئے (عام تفاسیر)، تو ترجمہ یوں ہو جائے گا: بنا لیا اس مچھلی نے اپنا راستہ سمندر میں سرنگ، یا اختیار کیا اس نے اپنا راستہ سمندر میں اس حال میں کہ وہ سرنگ تھا، یعنی سرنگ کی طرح سوراخ ہو گیا (آلوسی)۔ اور سَرَبًا کو ''بیان القرآن'' میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے مفعول مطلق کے طور پر لیا ہے، سَرَبَ چلنے کو کہتے ہیں اور یہ لفظ بھی غالباً سورۂ رعد میں آیا تھا مُسْتَخْفٍۢ بِالَّيْلِ وَسَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ (سورۂ رعد: ۱۰) رات کو چھپنے والا اور دن کو چلنے پھرنے والا۔ سارب: چلنے والا۔ تو جس وقت یہ مفعول مطلق ہوگا پھر اس کا فعل محذوف نکالا جائے گا: سَرَبَ سَرَبًا (نسفی)۔ پھر ترجمہ یوں ہو جائے گا ''اس نے اپنا راستہ اختیار کیا سمندر میں اور چل دی چلنا''، ''بیان القرآن'' میں ترجمہ اس طرح سے کیا گیا ہے، اس نے سمندر میں اپنا راستہ اختیار کیا اور چل دی، چلتی لگی، تو سَرَبَ سَرَبًا کا ترجمہ یوں ہو جائے گا۔ فَلَمَّا جَاوَزَا: جب وہ دونوں آگے گزر گئے، قَالَ لِفَتٰىهُ: موسیٰ علیہ السلام نے اپنے خادم سے کہا۔ فتی: جوان۔ مراد خادم ہے۔ اٰتِنَا غَدَآءَنَا: غداء غین کے فتح کے ساتھ، ناشتہ، جو کھانا دوپہر سے پہلے کھایا جاتا ہے اس کو غداء کہتے ہیں۔ تَغَدِّیْ اس کے لئے مصدر آیا کرتا ہے، تَغَدّٰی یَتَغَدّٰی: ناشتہ کرنا، صبح کا کھانا کھانا۔ اور جو دوپہر کے بعد کھایا جاتا ہے دن کے دوسرے حصے میں، اس کو عَشَاء کہتے ہیں عین کے فتح کے ساتھ۔ لَقَدْ لَقِيْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا: نصب: مشقت۔ جب وہ دونوں گزر گئے، آگے تجاوز کر گئے، کہا موسیٰ علیہ السلام نے اپنے جوان سے، لے آ ہمارے پاس ہمارا صبح کا کھانا، ہمارا ناشتہ، لَقَدْ لَقِيْنَا: بے شک ہم نے ملاقات کی اپنے اس سفر سے مشقت کو، ہم ملے اپنے اس سفر سے مشقت کو، یعنی اپنے اس سفر سے ہمیں مشقت لاحق ہو گئی، ہم نے مشقت سے ملاقات کی یعنی مشقت لاحق ہو گئی۔ قَالَ: اس جوان نے کہا۔ قَالَ کی ضمیر فتی کی طرف لوٹ گئی۔ اَرَءَيْتَ: کیا دیکھا آپ نے؟ لفظی معنی یونہی بنتا ہے، اور یہ لفظ بطور محاورے کے استعمال ہوا کرتا ہے، جیسے ہم بھی کسی کے ساتھ بات کیا کرتے ہیں، تو بسا اوقات پہلے یہ لفظ بولتے ہیں ''آپ نے سنا

نہیں؟'' حالانکہ ہم پہلے ہی ان کو بتانا چاہتے ہیں، پتا ہے کہ انہوں نے نہیں سنا، لیکن گفتگو کی ابتدا ایسے ہی ہوتی ہے ''آپ نے دیکھا نہیں؟ آپ کو پتا نہیں چلا؟'' یہ بات ویسے ہی ہے۔ کیا آپ نے دیکھا؟ اِذْ اَوَيْنَآ اِلَى الصَّخْرَةِ: جس وقت ہم نے ٹھکانا لیا تھا چٹان کی طرف۔ اوی یاوی اسی سورت میں کئی دفعہ گزر گیا، فَأْوٗٓا اِلَى الْكَهْفِ وہ اسی سے تھا، اسی طرح اِذْ اَوَى الْفِتْيَةُ اِلَى الْكَهْفِ۔ جب ہم نے ٹھکانا لیا چٹان کی طرف، فَاِنِّيْ نَسِيْتُ الْحُوْتَ: پس بے شک میں مچھلی بھول گیا، وَمَآ اَنْسٰىنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ: اور نہیں بھلائی مجھ کو وہ مچھلی مگر شیطان نے۔ حوت کا لفظ عربی میں چونکہ مذکر ہے، اس لیے اَنْسٰىنِيْهُ کی ''ہٗ'' ضمیر حوت کی طرف لوٹ رہی ہے، اور جب ہم اس کا ترجمہ مچھلی کے ساتھ کریں گے تو مچھلی کا لفظ ہماری زبان میں مؤنث استعمال ہوتا ہے، اس لیے ہم ترجمہ مؤنث کے ساتھ کریں گے۔ نہیں بھلائی مجھ کو وہ مچھلی مگر شیطان نے اَنْ اَذْكُرَهٗ کہ میں اس کا ذکر کرتا۔ اس میں اَن مصدر یہ ہے، اور مصدر کی تاویل میں ہو کر یہ بدل اشتمال ہے اَنْسٰىنِيْهُ کی ''ہٗ'' ضمیر سے جو مفعول واقع ہو رہی ہے، ''نہیں بھلائی مجھ کو وہ مچھلی یعنی اس مچھلی کا ذکر کرنا مگر شیطان نے'' یعنی اس مچھلی کا ذکر کرنا مجھ کو شیطان نے بھلا دیا، مچھلی بھلا دی یعنی مچھلی کا ذکر کرنا بھلا دیا، جیسے نحو کے اندر آپ مثال پڑھا کرتے ہیں: ''سُلِبَ زَيْدٌ ثَوْبُهٗ'' چھینا گیا زید یعنی اس کے کپڑے، تو ''بھلا دی مجھ کو وہ مچھلی یعنی اس کا ذکر کرنا''، بدل اشتمال کا ترجمہ اس طرح سے ہوا کرتا ہے۔ ''نہیں بھلائی مجھ کو وہ مچھلی مگر شیطان نے کہ میں اس مچھلی کا ذکر کرتا۔'' وَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ: اور اختیار کیا اس مچھلی نے اپنا راستہ دریا میں عَجَبًا: عجیب طریقے سے۔ اِتِّخَاذًا عَجَبًا (آلوسی)، مفہوم یوں ہو جائے گا۔ اختیار کیا اس مچھلی نے اپنا راستہ سمندر میں، دریا میں عجیب طریقے سے، تو عَجَبًا یہ مصدر کی صفت ہو جائے گی۔ قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ: بَغٰى يَبْغِيْ طلب کرنا، تلاش کرنا، چاہنا۔ اور اس قال کی ضمیر موسیٰ علیہ السلام کی طرف لوٹ رہی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ: یہی تو وہ چیز ہے جس کو ہم طلب کرتے تھے، جس کو ہم تلاش کرتے تھے۔ فَارْتَدَّا: دونوں لوٹے۔ رَدَّ يَرُدُّ: لوٹانا۔ اِرْتَدَّ: لوٹنا۔ یہ لفظ جو آپ استعمال کیا کرتے ہیں کہ فلاں شخص مُرتد ہو گیا، وہاں مُرتد کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ وہ اسلام سے کُفر کی طرف لوٹ گیا، ''مرزائی مُرتد ہیں، فلاں مُرتد ہیں'' تو مُرتد کا لفظ جو آپ بولا کرتے ہیں یہ عربی کا لفظ ہے اِرْتَدَّ يَرْتَدُّ سے ہے، مُرْتَد: لوٹنے والا، یعنی جو اسلام سے کُفر کی طرف لوٹ گیا اس کو مُرتد کہتے ہیں۔ فَارْتَدَّا یہ تثنیہ کا صیغہ ہے، اب اگر آپ اس کا ترجمہ اپنے لفظوں میں یوں ادا کر دیں گے کہ وہ دونوں مُرتد ہو گئے، تو عربی لحاظ سے ترجمہ ٹھیک ہے، لیکن ہمارے محاورے میں یہ لفظ قبیح ہے، کیونکہ ہم جس وقت ''مُرتد'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس سے دین سے پھرنے والا مراد ہوتا ہے، اور عربی میں مطلقاً لوٹنے کو کہتے ہیں۔ فَارْتَدَّا کا مطلب یہ ہوا کہ جس راستے سے وہ آئے تھے اسی راستے پیچھے لوٹے، کیونکہ جگہ وہی تھی، جہاں مچھلی گم ہوئی تھی وہیں کام تھا موسیٰ علیہ السلام کو، جیسے تفصیل آپ کے سامنے آئے گی۔ پس لوٹے وہ دونوں، عَلٰٓى اٰثَارِهِمَا: آثار اثر کی جمع ہے، اثر کہتے ہیں نقش قدم کو، پاؤں کے نشان کو۔ وہ اپنے نشانوں پر لوٹے، یعنی اپنے پاؤں کے نشان دیکھتے ہوئے کہ ہم اس راستے سے آئے تھے، ادھر سے آئے تھے، ادھر سے آئے تھے، جیسے ریگستان میں کبھی آپ کو سفر کرنا پڑے، جہاں کوئی اور علامات نہ ہوں تو انسان اپنے پاؤں کے نشان دیکھتا ہوا واپس آ جاتا ہے۔ لوٹے وہ دونوں اپنے پاؤں کے نشانوں پر قَصَصًا تلاش کرتے ہوئے۔ قَصَّ يَقُصُّ اَثَرَهٗ: کسی کے نقش قدم پہ چلنا، اس کا مفہوم یہی ہوا کرتا ہے۔ اور یہ قَصَصًا مفعول مطلق ہے يَقُصَّانِ قَصَصًا، لوٹے وہ دونوں اپنے پاؤں کے نشانوں پر ان نشانوں

کی اتباع کرتے ہوئے، ان نشانوں کو طلب کرتے ہوئے۔ اِقْتَصَّ اَثَرَہٗ: کسی کے پیچھے پیچھے چلنا، اس کے نقشِ قدم کی اتباع کرنا۔ فَوَجَدَا: پھر ان دونوں نے پالیا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ: ہمارے بندوں میں سے ایک بندے کو، اٰتَیْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا: دی ہم نے اس کو اپنے پاس سے رحمت۔ رحمت سے یہاں مقبولیت مراد ہے، ہم نے اس کو اپنی طرف سے مقبولیت دی تھی، ہم نے اس کو رحمت دی تھی، وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا: اور سکھایا تھا ہم نے اس کو اپنے پاس سے علم۔ عَلَّمْنٰهُ عِلْمًا ہم نے اس کو علم سکھایا تھا، مِنْ لَّدُنَّا اپنی جانب سے، اپنی جانب سے کا مطلب ہے کہ ظاہری اسباب اختیار کیے بغیر، جس طرح سے ایک آدمی نے ظاہری طور پر پڑھا نہیں اور اس کو علم نصیب ہوجائے تو کہتے ہیں کہ اس کو لَدُنِّی علم ہے، علم لدنی یہ عام طور پر صوفیہ میں اولیاء میں مشہور ہوتا ہے کہ فلاں شخص کو علم لدنی ہے، علم لَدُنِّی کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بغیر ظاہری اسباب کے اپنی جانب سے اس کو دے دیا، مِنْ لَّدُنَّا: خاص اپنے پاس سے، یعنی بغیر ظاہری اسباب کے ہم نے اس کو ایک علم سکھایا تھا۔ قَالَ لَهٗ مُوْسٰی: موسیٰ علیہ السلام نے اس بندے کو کہا، جس بندے کا نام روایات میں ''خضر'' آیا ہے، تو اس کا مصداق خضر علیہ السلام ہیں، اب ضمیر کا مرجع ظاہر کرنے کے لئے میں ''خضر'' کا لفظ بولوں گا، کہا اس بندے کو یعنی خضر کو موسیٰ علیہ السلام نے: هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰۤى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا: رُشد: ہدایت، علمِ نافع (آلوسی)، مَا عُلِّمْتَ رُشْدًا: جو علمِ نافع تو سکھایا گیا ہے۔ هَلْ اَتَّبِعُكَ: کیا میں تیری پیروی کروں اس شرط پر کہ تو سکھائے مجھے اس علم میں سے جو تو سکھایا گیا ہے، جو علمِ نافع تو سکھایا گیا ہے اس علم میں سے تو مجھے سکھائے اس شرط پر کیا میں تیری پیروی کرسکتا ہوں؟ کیا میں تیری اتباع اختیار کرسکتا ہوں، یعنی تیرے ساتھ تابع ہو کے رہ سکتا ہوں؟ جس طرح سے شاگرد اُستاذ کے تابع ہوتا ہے، یہ مطلب ہے اس کا، کیا میں آپ کے پاس تابع ہو کے رہ سکتا ہوں اس شرط پر کہ سکھائے تو مجھ کو اس علمِ نافع میں سے جو تُو سکھایا گیا۔ قَالَ: اس بندے نے کہا یعنی خضر علیہ السلام نے: اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِیْعَ مَعِیَ صَبْرًا، بے شک تُو ہرگز نہیں صبر کرسکے گا میرے ساتھ، تُو صبر کرنے کی طاقت نہیں رکھے گا، ہرگز نہیں طاقت رکھے گا تُو میرے ساتھ صبر کرنے کی۔ وَكَیْفَ تَصْبِرُ: اور تُو کیسے صبر کرے گا عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا، خُبر: واقفیت۔ تو کیسے صبر کرے گا اس چیز پر جس کا تُو نے احاطہ نہیں کیا از روئے واقفیت کے۔ تجھے واقفیت نہیں ہوگی، تجھے پتا نہیں ہوگا کہ میں نے یہ کام کیوں کیا ہے؟ تو تُو صبر نہیں کرسکے گا اور ایسے ہی اعتراض کردے گا، اور ہر ہر بات میں اپنے معلم کے ساتھ اپنے متبوع کے ساتھ اُلجھنا، بات بات پہ اِعتراض کرنا، اس سے پھر نباہ نہیں ہوتا، تو میں پہلے ہی کہہ دیتا ہوں کہ تُو میرے ساتھ نہیں رہ سکتا، میں نے ایسے کام کرنے ہیں جن کی تجھے واقفیت نہیں ہے، اور تُو پھر میرے ساتھ اُلجھے گا، پھر میرے ساتھ رہ کے تُو صبر کیسے کرے گا؟ یہ مطلب ہے اس کا۔ کیسے صبر کرے گا تُو اُس بات پر کہ نہیں اِحاطہ کیا تُو نے اس بات کا از روئے واقفیت کے۔ یعنی جس بات کی تجھے واقفیت نہیں ہوگی تُو اس کے اُوپر صبر کیسے کرے گا؟ قَالَ: موسیٰ علیہ السلام نے کہا: سَتَجِدُنِیْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا: ''سین'' جیسے آپ نحو میں پڑھتے ہیں کہ یہ قریب زمانے کے لئے ہوا کرتا ہے، اور تاکید کے لئے بھی آجاتا ہے۔ عنقریب پائے گا تُو مجھے، یعنی تُو قریب زمانے میں دیکھ لے گا، عنقریب پائے گا تُو مجھے اگر اللہ نے چاہا صبر کرنے والا، پائے تُو مجھے صبر کرنے والا اگر اللہ نے چاہا، یہ انبیاء علیہم السلام کی کلام میں احتیاط ہوتی ہے ہر بات میں ان شاء اللہ! کیونکہ ان کو پتا ہے کہ ہر کام اللہ کی مشیت کے ساتھ ہوتا ہے، ''ان شاء اللہ! تُو مجھے صبر کرنے والا پائے گا'' وَلَاۤ اَعْصِیْ لَكَ اَمْرًا: اور میں کسی کام میں تیری نافرمانی نہیں کروں گا، لَاۤ اَعْصِیْ: نہیں عصیان کروں گا میں، نہیں

نافرمانی کروں گا میں تیری کسی کام میں۔ قَالَ فَاِنِ اتَّبَعْتَنِیْ: اس خضر نے کہا پھر اگر تُو میری اِتباع کرے، یعنی اگر تو میرے ساتھ تابع بن کے رہنا چاہتا ہے تو میری یہ بات سُن لے کہ فَلَا تَسْئَلْنِیْ عَنْ شَیْءٍ مجھ سے کسی بات کے متعلق سوال نہ کرنا، حَتّٰۤی اُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا: جب تک کہ میں ہی تیرے لیے اس بات کا ذِکر نہ کردوں۔ اِحداث: ظاہر کرنا۔ جب تک کہ میں نہ کروں تیرے لیے اس بات کا ذِکر، یعنی میں نے جو بتانا ہوگا خود بتاؤں گا، میں کوئی کام کروں اس کے اُوپر تُو نے سوال نہیں کرنا، پوچھنا نہیں ہے، اور یہ پوچھنا بطورِ اعتراض کے ہے، فَاِنِ اتَّبَعْتَنِیْ: پس اگر تُو میری اتباع کرنا چاہتا ہے تو نہ پوچھنا مجھ سے کسی چیز کے متعلق جب تک کہ میں ہی تیرے لیے اس بات کا ذِکر نہ کردوں۔ اَحدَثَ اِحداث: ظاہر کرنا۔ مُحْدَث: پیدا کی ہوئی چیز، ظاہر کی ہوئی چیز۔ بدعت کو بھی مُحدَث اس لیے کہا جاتا ہے، ''اِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْاُمُوْرِ!'' جیسے حدیث شریف میں آتا ہے۔ تو بدعت محدَثہ ہوتی ہے، یعنی دِین کی باتوں میں ایک نئی پیدا کی ہوئی بات ہوتی ہے۔ اور ''اَلْعَالَمُ حَادِثٌ'' جس طرح سے آپ کہتے ہیں۔

فَانْطَلَقَا: پس وہ دونوں چل پڑے۔ اب تیسرے یوشع بھی ساتھ ہوں گے لیکن چونکہ وہ خادم تھے، اب یہ دو بزرگ اکٹھے ہوگئے تیسرا خادم ہے تو اس کا شمار نہیں آیا، ایسے موقع پر بڑوں کو گنا جایا کرتا ہے، تو دوسرے سفر پہ گئے تو یہ دونوں چل پڑے حضرت خضر اور موسیٰ، ظاہر یہی ہے کہ خادم بھی ساتھ ہوگا۔ حَتّٰۤی اِذَا رَكِبَا فِی السَّفِیْنَةِ: حتّٰی کہ جب یہ دونوں سوار ہوگئے کشتی میں، سفینہ کشتی کو کہتے ہیں، خَرَقَهَا: خَرَق خَرْقاً: پھاڑ دینا۔ پھاڑ دیا خضر نے اس کشتی کو، اس کا کوئی پھٹا نکال دیا، خَرَقَهَا: خَرَقَهَا خضر نے اس کشتی کو پھاڑ دیا۔ قَالَ: موسیٰ علیہ السلام بول پڑے، نہ رہا جاسکا۔ اَخَرَقْتَهَا کیا تُو نے پھاڑا اس کشتی کو، لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا تاکہ تُو اس کشتی والوں کو غرق کردے، ڈبونے کا ارادہ ہے؟ یہ پھٹا کیوں نکال دیا؟ لوگوں کو ڈبونے کا ارادہ ہے؟ لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا: تاکہ غرق کرے تُو کشتی والوں کو، لَقَدْ جِئْتَ شَیْئًا اِمْرًا: اِمر: منکر۔ تُو نے بہت بُرا کام کیا، تحقیق آیا تو بُرے کام پر، یہ تُو نے اچھا کام نہیں کیا، اَمرِ منکر کیا ہے۔ اَمرِ عظیم کے معنی میں ہوجائے گا، تُو نے بہت بڑی حرکت کی، بہت بھاری حرکت کی، جس کے نتیجے میں سارے کشتی والے غرق ہوسکتے ہیں، دریا میں کشتی چل رہی ہے اور پھٹا توڑ دیا۔ قَالَ: خضر علیہ السلام نے کہا اَلَمْ اَقُلْ: میں نے نہیں کہا تھا؟ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِیْعَ مَعِیَ صَبْرًا کہ تُو ہرگز طاقت نہیں رکھے گا میرے ساتھ صبر کرنے کی۔ قَالَ: موسیٰ علیہ السلام نے کہا لَا تُؤَاخِذْنِیْ بِمَا نَسِیْتُ: نہ پکڑ مجھے، نہ مؤاخذہ کر میرے پر بسبب میرے بھول جانے کے۔ اس سے معلوم ہوگیا کہ یہ بات موسیٰ علیہ السلام سے نسیان کی بنا پر ہوئی، انہیں یاد نہیں رہا کہ انہوں نے منع کیا تھا کہ مجھ سے کچھ پوچھنا نہیں اور اعتراض نہیں کرنا، ''نہ مؤاخذہ کر مجھے نہ پکڑ مجھے میرے بھولنے کے سبب سے۔'' وَلَا تُرْهِقْنِیْ مِنْ اَمْرِیْ عُسْرًا: عسر تنگی کو کہتے ہیں، اور اَرْهَقَ اِرْهَاق: کسی کو مشقت میں ڈال دینا، کسی کے اُوپر بوجھ ڈال دینا۔ اور نہ ڈال میرے اُوپر میرے معاملے میں تنگی، میرے معاملے میں اتنی سختی نہ کیجئے کہ بھول چوک بھی اگر ہوجائے تو اُوپر سے آپ ناراض ہونا شروع ہوجائیں، میرے معاملے میں اتنی تنگی نہ ڈالیے، ذرا وسعت سے معاملہ کیجئے، کبھی کوئی اس قسم کی بات ہو ہی جائے تو اس سے درگزر کرجائیں۔

فَانْطَلَقَا: پھر وہ دونوں آگے چلے حَتّٰۤی اِذَا لَقِیَا غُلٰمًا: حتّٰی کہ جس وقت ملاقات ہوئی اِن دونوں کی ایک لڑکے کے ساتھ فَقَتَلَهٗ خضر نے پکڑ کے اس لڑکے کو قتل کردیا۔ قَالَ: موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِیَّةً: کیا تُو نے قتل کردیا ایک پاک صاف نفس کو؟

جس کے اُوپر کوئی جرم نہیں، جس نے کوئی قصور نہیں کیا، زَکِیَّۃً: پاک صاف، یعنی یہ بے قصور بچہ ہے، معصوم ہے، کوئی ایسی بات نہیں، تُو نے اس کو قتل کر دیا۔ کیا قتل کر دیا تُو نے ایک پاک صاف نفس کو بِغَیْرِ نَفْسٍ: بغیر کسی نفس کے بدلے کے، یعنی ایک یہ بات بھی ہوتی ہے کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو تم اس کے عوض میں قتل کر دو، یہاں وہ بات بھی کوئی نہیں۔ ''کیا قتل کر دیا آپ نے ایک پاک صاف نفس کو بغیر کسی نفس کے بدلے کے؟'' لَقَدْ جِئْتَ شَیْئًا نُّكْرًا: آپ نے بہت بُری حرکت کا ارتکاب کیا ہے۔ نکر مُنکَر کے معنی میں ہے۔ قَالَ: خضر علیہ السلام نے کہا اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ: کیا میں نے تجھے کہا نہیں تھا، اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِیْعَ مَعِیَ صَبْرًا کہ تُو میرے ساتھ صبر کرنے کی طاقت نہیں رکھے گا، اب ذرا کلام پہلے سے زوردار ہو گئی، پیچھے آیا تھا اَلَمْ اَقُلْ، یہاں ہے اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ: لَّكَ کے لفظ کے بڑھنے کے ساتھ اس میں اور تاکید ہو گئی، ''میں نے تجھے کہا نہیں تھا کہ تُو میرے ساتھ صبر کرنے کی طاقت نہیں رکھے گا۔'' قَالَ: موسیٰ علیہ السلام نے کہا اِنْ سَاَلْتُكَ عَنْ شَیْءٍۭ بَعْدَهَا: اگر میں پوچھوں تجھ سے کسی چیز کے متعلق اس واقعے کے بعد، اگر سوال کروں میں تجھ سے کسی چیز کے متعلق اس واقعے کے بعد فَلَا تُصٰحِبْنِیْ پھر تُو مجھے ساتھ نہ رکھنا، یعنی ایک موقع اور دے دو، قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّیْ عُذْرًا بے شک تُو میری طرف سے عذر کو پہنچ گیا، یعنی پھر اگر تُو جدا کر دے گا، تو اس میں تیرے پہ کوئی الزام نہیں، تُو معذور ہے، پھر واقعی بات ہو جائے گی کہ میں صبر نہیں کر سکتا۔ ''اگر پوچھوں میں تجھ سے کسی چیز کے متعلق اس واقعے کے بعد تو پھر مجھے ساتھ نہ رکھنا، تُو پہنچ گیا میری طرف سے عُذر کو۔''

فَانْطَلَقَا: پھر وہ دونوں چل پڑے حَتّٰۤى اِذَاۤ اَتَیَاۤ اَهْلَ قَرْیَةِ: حتیٰ کہ جب وہ دونوں آ گئے ایک بستی والوں کے پاس اسْتَطْعَمَاۤ اَهْلَهَا: ان دونوں نے کھانا مانگا اس بستی والوں سے، کھانا طلب کیا۔ جس طرح سے مسافر کسی بستی میں جاتا ہے تو انہیں کہتا ہے کہ مجھے کھانا کھلاؤ۔ ''بستی والوں سے کھانا مانگا'' فَاَبَوْا: بستی والوں نے انکار کر دیا، اَبٰی یَاْبٰی: انکار کر دینا۔ انہوں نے انکار کر دیا، اَنْ یُّضَیِّفُوْهُمَا: انکار کر دیا اس بات سے کہ وہ ان دونوں کی مہمانی کریں، ضَیف مہمان کو کہتے ہیں۔ ان دونوں کی مہمانی کرنے سے انہوں نے انکار کر دیا، فَوَجَدَا فِیْهَا جِدَارًا: پھر ان دونوں نے پایا اس بستی میں ایک دیوار کو، وَجَدَا: خضر اور موسیٰ علیہما السلام، یُّرِیْدُ اَنْ یَّنْقَضَّ: یہاں ارادے کی نسبت جدار کی طرف کی گئی ہے، لفظی معنی بنتا ہے ''وہ دیوار ارادہ کرتی تھی ٹوٹنے کا۔'' انقضاض: ٹوٹنا۔ ''وہ ارادہ کرتی تھی ٹوٹنے کا'' لفظی ترجمہ یوں ہے، اور محاورۃً اس کا مصداق یہ ہوتا ہے کہ وہ ٹوٹنے ہی والی تھی، ٹوٹنے لگی تھی، گرنے والی تھی۔ پایا ان دونوں نے اس بستی میں دیوار کو جو کہ گرنے والی تھی، گرنے لگی تھی، ہمارا محاورہ اس طرح سے ہے، جو گرنا چاہتی تھی، چاہنے کی نسبت اُدھر کر دی عربی محاورے کے اعتبار سے، ارادہ کرتی تھی وہ ٹوٹنے کا یعنی وہ گرنے والی تھی یا گرنے لگی تھی۔ فَاَقَامَهٗ: خضر علیہ السلام نے اس دیوار کو سیدھا کر دیا، دیوار ٹھیک کر دی، قَالَ: موسیٰ علیہ السلام پھر بول پڑے، موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَیْهِ اَجْرًا: اگر تُو چاہتا تو اس دیوار کے سنوارنے پر کوئی اُجرت لے لیتا، اسی اُجرت سے اپنا کام چلتا، اور ان کو تنبیہ بھی ہو جاتی، ان کو بھی پتا چلتا کہ اگر آج ہم ان مہمانوں کے ساتھ مروّت سے پیش نہیں آئے تو دیکھو! انہوں نے بھی ہمارا کام نہیں کیا، تو ان کو تنبیہ ہو جاتی، لَتَّخَذْتَ عَلَیْهِ اَجْرًا: البتہ اختیار کر لیتا تُو اس پر اُجرت، اِتَّخَذْتَ: تُو لے لیتا۔ اگر تُو چاہتا تو لے لیتا اس کے اُوپر اُجرت، یعنی دیوار کے ٹھیک کرنے پر۔ قَالَ: خضر علیہ السلام نے کہا: هٰذَا فِرَاقُ بَیْنِیْ وَ بَیْنِكَ: فراق باب مفاعلہ کا مصدر ہے، ایک دوسرے سے جدا ہو جانا،

فراق تو آپ جانتے ہی ہیں، دوستوں میں جس طرح سے ایک دوسرے سے فراق ہوجایا کرتا ہے۔ یہ جُدائی ہے میرے اور تیرے درمیان، یعنی یہ سوال جدائی کا باعث ہے میرے اور تیرے درمیان، هٰذَا السُّوَالُ الثَّالِثُ سَبَبُ الْفِرَاقِ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ (نسفی)، یہ تیسری دفعہ تیرا بول پڑنا، تیسری دفعہ تیرا سوال کرنا میرے اور تیرے درمیان فراق کا باعث ہوگیا، جُدائی کا باعث ہوگیا۔ سَاُنَبِّئُكَ بِتَاْوِيْلِ مَالَمْ تَسْتَطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا: عنقریب بتاؤں گا میں تجھے مطلب ان باتوں کا جن کے اُوپر تُو صبر نہیں کرسکا۔ تاویل: مطلب، حقیقت۔ نَبَّاَ يُنَبِّئُ تَنْبِئ: بتانا۔ ضرور بتاؤں گا میں تجھے مطلب ان باتوں کا جن کے اُوپر تُو صبر نہیں کرسکا۔

اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ: اَمَّا کے ساتھ اب تفصیل شروع ہوگئی، اَمَّا تفصیل کے لئے ہے۔ اَمَّا السَّفِيْنَةُ: کشتی، فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ: وہ مسکینوں کی تھی، يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ: ایسے مسکین جو کہ دریا میں کام کرتے تھے، مزدوری کرتے تھے، یعنی اس کشتی کے ساتھ وہ کما کے کھاتے تھے، يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ: دریا میں محنت کرتے تھے۔ فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا: میں نے ارادہ کیا کہ اس کشتی کو عیب دار کردوں، عیب لگادوں، یہ صحیح سالم نہ رہے، وَكَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ: اور ان کے آگے ایک بادشاہ تھا، جدھر یہ جارہے تھے ادھر کوئی بادشاہ تھا، يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ: یہاں سفینہ سے سفینۂ صحیحہ مراد ہے۔ وہ لے لیتا تھا ہر دُرست کشتی کو چھین کر، غَصْبًا: غصب کرلینا، چھین لینا، یعنی جدھر یہ جارہے تھے آگے ایک بادشاہ ہے، جو صحیح سالم کشتیاں چھین رہا ہے، اُس کو کشتیوں کی ضرورت ہے، تو اگر ان کی کشتی بھی صحیح سالم ہوتی تو وہ ان کی کشتی بھی چھین لیتا، اور یہی ان کے پاس ذریعہ ہے جس کے ساتھ مزدوری کرکے کماتے ہیں، تو میں نے پھٹا توڑ دیا، تاکہ وہ بادشاہ دیکھ کر کہے کہ یہ کشتی تو کام کی نہیں ہے، تو ایک پھٹا ٹوٹنے کے ساتھ ان مسکینوں کی کشتی بچ گئی، ورنہ وہ کشتی بادشاہ چھین لیتا، تو میں نے ان کے ساتھ بھلا کیا ہے، کوئی بُرائی نہیں کی۔ تو سفینہ سے سفینۂ صحیحہ مراد ہے۔ وَرَآءَ آگے پیچھے دونوں معنوں کے لیے آیا کرتا ہے۔ ''ان کے سامنے کوئی بادشاہ تھا جو لیتا تھا ہر دُرست کشتی کو چھین کر'' یعنی یہ نہیں کہ قیمتاً خریدتا، کوئی معاوضہ دیتا، بلکہ چھین لیتا ہے۔ وَاَمَّا الْغُلٰمُ: اور لڑکا! فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ: اس کے والدین ایمان والے تھے فَخَشِيْنَآ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّكُفْرًا: ہمیں اندیشہ ہوا کہ وہ ان کے اوپر سختی ڈال دے گا از روئے طغیان وکفر کے، طغیان: سرکشی۔ کُفر کا معنی کُفر۔ ان کے اوپر سختی ڈال دے گا از روئے سرکشی کے اور کُفر کے، یعنی یہ بچہ کافر ہوگا، انتہائی طاغی، باغی، سرکش ہوگا، اور ماں باپ کی زندگی دوبھر کردے گا، ان کے لئے جینا مشکل ہوجائے گا اگر یہ بچہ زندہ رہ گیا تو: فَاَرَدْنَآ اَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا: ہم نے ارادہ کیا کہ بدل کے دے دے اُن دونوں کو ان کا رَبّ خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً: اس سے بہتر بچہ از روئے پاکیزگی کے، وَّاَقْرَبَ رُحْمًا: اور زیادہ قریب از روئے شفقت کے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اس کے بدلے میں ان کو ایسی اولاد دے دے جو اس سے اچھے اخلاق کی ہو، پاکیزہ ہو، اور محبت وشفقت کے اعتبار سے بھی ماں باپ کے ساتھ زیادہ تعلق رکھنے والی ہو۔ وَاَمَّا الْجِدَارُ: اور دیوار فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ: وہ دو یتیم بچوں کی تھی فِي الْمَدِيْنَةِ شہر میں، شہر میں دو یتیم بچے تھے یہ ان کی دیوار تھی، وَكَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا: اور اس دیوار کے نیچے ان دونوں بچوں کا خزانہ تھا۔ کنز: دبایا ہوا مال، وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ (سورۂ توبہ: ۳۴) جو سونے چاندی کو زمین میں دبا کے رکھتے ہیں۔ وَكَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا: اور ان دونوں کا باپ نیک تھا، فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا: ارادہ کیا تیرے رَبّ نے کہ پہنچ جائیں یہ دونوں بچے اپنی جوانی کو، وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا: اور نکال لیں اپنا خزانہ، رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ: تیرے رَبّ کی رحمت کی وجہ

سے۔ اَرَادَ رَبُّكَ رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ، تو مِنْ رَّبِّكَ یہ وضعُ المُظْهَر موضعَ المُضمَر ہے، یعنی تیرے رَب نے اپنی مہربانی سے چاہا کہ یہ دونوں بچے اپنی جوانی کو پہنچ جائیں اور اپنا خزانہ نکال لیں، وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِیْ: میں نے یہ کام اپنے حکم سے نہیں کیا، اپنے اَمر سے نہیں کیا، ذٰلِكَ تَاْوِيْلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا: تَسْطِعْ اصل میں تَسْتَطِعْ تھا۔ تخفیف کر کے ایک تاء کو گرادیا۔ یہ مطلب ہے ان باتوں کا جن کے اُوپر تُو صبر نہیں کرسکا۔ ''مَا'' لفظاً مفرد ہے، لیکن معنیٰ یہاں تینوں باتیں مراد ہیں۔ یہ مطلب ہے اس چیز کا جس کے اُوپر تُو صبر نہیں کرسکا۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

حضرت موسیٰ وخضر علیہما السلام کا مفصل واقعہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ یہ واقعہ جو آپ کے سامنے دو رکوع میں بیان کیا گیا، سورۂ کہف کے واقعات میں سے تیسرا واقعہ ہے۔ پہلا واقعہ اصحابِ کہف کا، اور دُوسرا ان دو شخصوں کا جن میں سے ایک دو باغ والا تھا اور دوسرا مسکین تھا، اور تیسرا واقعہ یہ ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا...... ''بخاری شریف'' میں[1] صحیح روایات میں اس واقعے کی تفصیل یوں نقل کی گئی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام (''موسیٰ'' سے موسیٰ بنی اسرائیل ہی مراد ہیں) حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک دفعہ کھڑے اپنی قوم کو وعظ کہہ رہے تھے، کسی شخص نے یہ پوچھ لیا کہ اے موسیٰ! اس وقت سب سے بڑا عالم کون ہے؟ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا کہ میں! اس لحاظ سے یہ جواب صحیح تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام صاحبِ شریعت نبی ہیں، صاحبِ کتاب نبی ہیں، اور جتنے بنی آدم اس وقت رُوئے زمین پر موجود تھے سب سے زیادہ علم ان کو ہی تھا، لیکن سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو یہ جواب پسند نہیں آیا، کہ ادب کا تقاضا یہ تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام یوں کہتے کہ ''اللہ بہتر جانتا ہے!'' اللہ تعالیٰ کی طرف اس علم کی تفویض کرتے، اپنی طرف جو نسبت کرلی کہ میں بڑا عالم ہوں، تو اللہ تعالیٰ کو یہ جواب پسند نہیں آیا، اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے کہا کہ میرا ایک بندہ ایسا بھی ہے کہ جس کو میں نے اس قسم کے علوم دیے ہیں جن کی تجھے خبر ہی نہیں، اس بندے سے مُراد صحیح روایات کے مطابق خضر علیہ السلام ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے جس وقت یہ حقیقت نمایاں کی گئی کہ کوئی دوسرا شخص بھی اللہ کا مقبول بندہ ایسا ہے کہ جس کے پاس ایسے علوم ہیں جو میرے پاس نہیں ہیں، تو انہوں نے شوق ظاہر کیا کہ اے اللہ! مجھے اس تک ملاقات کا راستہ بتادیجئے تاکہ میں بھی اس سے وہ علوم حاصل کروں، اب وہ اصل بات ظاہر ہوگئی تواضع، نعوذ باللہ! موسیٰ علیہ السلام کا یہ جواب تکبّر کی بنا پر تو تھا نہیں، لیکن انبیاء علیہم السلام اور اللہ کے مقبول بندے، ان کی معمولی معمولی لغزش پر بھی اللہ کی طرف سے گرفت بسا اوقات شدید ہوجاتی ہے، اس لیے اتنی بات پر کہ ''اَللّٰهُ اَعْلَمُ!'' کی بجائے جو ''اَنَا'' کہہ دیا، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تادیب کی گئی۔ تو موسیٰ علیہ السلام نے ظاہر کیا کہ میں علم حاصل کرنا چاہتا ہوں، میں اس بندے سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں، مجھے اس تک پہنچنے کا راستہ بتادیجئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے

(۱) بخاری ۱/۲۳ باب ما یستحب للعالم الخ مختصراً۔ ۲/۶۸۸ کتاب التفسیر، سورۂ کہف کے تحت مفصلاً۔ مسلم ۲/۲۷۰ باب فضائل خضر۔

فرمایا کہ وہ بندہ ''مجمع البحرین'' میں رہتا ہے، ''مجمع البحرین'' کا لفظی معنی دو سمندروں کے اکٹھے ہونے کی جگہ، یا دو دریاؤں کے اکٹھے ہونے کی جگہ، قطعی طور پر قرآنِ کریم میں تعیین نہیں کی گئی، کیونکہ ایسے مواقع تو بہت آتے ہیں جہاں دو دریا اکٹھے ہوتے ہیں، اور جس علاقے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام رہتے تھے وہاں بھی دو سمندر آپس میں ملتے ہیں، بحرِ فارس اور بحرِ رُوم۔ اور اسی طرح سے دجلہ اور فرات جہاں جا کے سمندر میں گرتے ہیں وہ بھی ''مجمع البحرین'' ہے، تو یہ مختلف جگہیں ہوسکتی ہیں، اور ہوسکتا ہے کہ جہت متعین کردی گئی ہو کہ مشرق کی طرف، مغرب کی طرف، شمال، جنوب جو بھی ہے۔ اور ایک علامت متعین کردی گئی کہ اپنے ساتھ ایک مچھلی رکھ لیجئے، جہاں وہ مچھلی زندہ ہو کے گم ہوجائے، سمجھ لینا کہ اسی علاقے میں میرا وہ مقبول بندہ موجود ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے خادم یوشع بن نون کو ساتھ تیار کیا، اور اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق مچھلی بھون کے ساتھ رکھ لی،[1] نہ بھونی ہوئی ہو تو بھی آپ جانتے ہیں کہ اتنی دیر تک مچھلی زندہ تو رہ نہیں سکتی، اور ویسے رکھی ہوئی ہو تو اس کے خراب ہونے کا اندیشہ بھی ہوتا ہے، اور یہ بھون کے رکھ لی ہوگی تا کہ اگر ضرورت پڑے گی تو کچھ کھا بھی لیں گے۔ تو یوشع کو ساتھ لے کر چل دیے اس شوق ذوق کے ساتھ کہ میں اب اس بندے سے مل کے رہوں گا چاہے مجھے زمانہ دراز تک کیوں نہ چلنا پڑے، یا تو ملاقات ہوجائے گی، ورنہ میں بس اب چلتا ہی رہوں گا، اس بندے سے ملاقات بہرحال کروں گا، اس پختہ عزم کے ساتھ چل دیے۔ واقعے کی تفصیل جس طرح سے آگے آپ کے سامنے قرآنِ کریم میں ذکر کی گئی، کہ چلتے چلتے ایک جگہ پر پہنچے، وہاں چٹان تھی، اس کے سائے میں کچھ دیر لیٹ گئے آرام کرنے کے لئے، اور یوشع علیہ السلام جاگ رہے تھے، اور ان کے سامنے وہ مچھلی اس زنبیل میں سے، توشہ دان میں سے، ناشتہ دان جس میں کھانے پینے کا سامان رکھا ہوا تھا اس میں سے زندہ ہو کے پھڑکی، پھڑک کے دریا میں داخل ہوگئی، اور جہاں سے وہ داخل ہوئی وہاں راستہ اسی طرح سے بنا رہ گیا، تو یوشع تو چونکہ آئے دن موسیٰ علیہ السلام کے معجزات دیکھتے تھے، تو ان کو یہ دیکھ کے حیرانی تو ہوئی کہ مچھلی زندہ ہو کے کس طرح سے دریا میں داخل ہوگئی، لیکن خیالات میں کچھ ایسے کھوئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب بیدار ہوئے تو ان کو یہ ذکر کرنا یاد نہ رہا کہ مچھلی گم ہوگئی۔ واقعہ اگرچہ عجیب تھا، لیکن ان کے سامنے تو روزانہ ایسے معجزات آتے تھے، بس وہ خیالات میں کچھ اس طرح سے مشغول ہوگئے کہ موسیٰ علیہ السلام کے جاگنے کے بعد ذکر کرنا یاد نہ رہا، اور بعض احادیث سے یوں بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی اللہ کی طرف سے ایک قسم کی تنبیہ تھی، کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے یوشع سے کہا کہ مچھلی کا خیال رکھنا، یہ کہیں گم نہ ہوجائے تو یوشع نے ''ان شاء اللہ!'' کہنے کی بجائے یوں کہا کہ کوئی بات نہیں، مَا كُلِّفْتَ كَثِيْرًا، یہ کون سا بڑا کام ہے؟ میں اس کا خیال رکھوں گا تو اس پر بھی گویا کہ ایک تنبیہ ہوگئی کہ انسان اپنے حالات پر کہاں تک اعتماد کرسکتا ہے، اللہ کی مشیت جب تک نہ ہو، انسان چھوٹے سے چھوٹا کام بھی سرانجام دینے کے قابل نہیں ہے، اب مچھلی کی حفاظت بھی نہ ہوسکی، اللہ تعالیٰ نے ظاہر کردیا کہ انسان ہر کام میں اللہ تعالیٰ کی مشیت کا محتاج ہے، کہ اللہ چاہے تو کوئی کام ہوتا ہے، اگر اللہ نہ چاہے تو انسان کچھ نہیں کرسکتا...... اُٹھے، آگے چل دیے، جب آگے چلے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تھکاوٹ ہوئی، ظاہر کیا کہ اس سفر میں ہم کچھ تھک سے گئے، لاؤ، ذرا بیٹھو، ناشتہ کرلیں۔ جب ناشتے کا ذکر آیا، تو اس وقت ان کو مچھلی یاد آگئی، وہ کہنے لگے کہ جی! جہاں ہم ٹھہرے تھے وہاں تو مچھلی گم ہوگئی، اس نے عجیب

---

(۱) مسلم، ۲/۲۷۰، باب فضائل الخضر میں ہے: قَالَ یَارَبِّ فَدُلَّنِی عَلَیْہِ قَالَ فَقِیْلَ لَہٗ تَزَوَّدْ حُوْتًا مَالِحًا

طریقے سے دریا میں راستہ بنالیا، توحضرت موسیٰ علیہ السلام فرمانے لگے کہ وہی تو جگہ تھی جس کے ہم متلاشی تھے، اب معلوم ایسے ہوتا ہے کہ کوئی سڑک اور راستہ تو تھا نہیں، اپنے پاؤں کے نشان دیکھتے ہوئے کہ ہم کدھر سے آئے تھے، واپس لوٹ آئے۔ جب اس علاقے میں پہنچے جہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا تو اس علاقے میں اللہ کے ایک بندے سے ملاقات ہوگئی، حدیث شریف میں جیسے آتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام گئے تو حضرت خضر علیہ السلام چادر اوڑھے لیٹے ہوئے تھے، جس طرح سے اکیلا آدمی چادر اوڑھے ہوئے لیٹا ہوتا ہے، چادر کا ایک کنارہ پاؤں کے نیچے دبایا ہوا تھا، اور ایک کنارہ سَر کے نیچے دبایا ہوا تھا، اس طرح سے لیٹے ہوئے تھے، پوری تفصیل آتی ہے حدیث شریف میں واقعے کی، کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جا کے کہا: السلام علیکم! تو خضر علیہ السلام سُن کے حیران ہوگئے، کہنے لگے: اس علاقے میں سلام کہنے والا کون آ گیا! تو سلام کا جواب دیا اور پوچھا کہ آپ کون ہیں؟ تو انہوں نے کہا کہ میں موسیٰ ہوں، تو خضر پوچھتے ہیں کہ موسیٰ بنی اسرائیل؟ کہنے لگے کہ ہاں! موسیٰ بنی اسرائیل۔ کیسے آنا ہوا؟ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ذِکر کیا کہ مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ آپ کے پاس کوئی علم ہے، میں وہ حاصل کرنے کے لئے آیا ہوں اس شرط پر میں آپ کا تابع بن کے رہوں گا کہ آپ مجھے وہ علم سکھائیں۔

خضر علیہ السلام ''تکوینیات'' کے عالم تھے

اب واقعہ یہ ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام کو جو علم دیا گیا تھا وہ ہے ''تکوینیات'' کا علم، ''تکوینیات'' کا مطلب یہ ہے کہ دُنیا میں جو واقعات پیش آتے ہیں ان کے راز، اَسرار، رُموز ''ایسا کیوں ہوگیا، ایسا ہونا چاہیے'' یہ کونیات کا کشف، جو واقعات دنیا میں پیش آتے ہیں۔ اس کا علم شریعت سے کوئی تعلق نہیں، اور نہ اس کا انسان کی روحانی ترقی اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبولیت میں کوئی درجہ ہے، انسان مکلف ہے علم الشرائع کا، کہ ہمارے لیے اللہ تعالیٰ کے اَحکامِ تکلیفیہ کون کون سے ہیں؟ ان پر عمل کرنے کی بنا پر اللہ تعالیٰ کے ہاں انسان کو مقبولیت حاصل ہوتی ہے، باقی اس قسم کا کشف کہ ''یہ کیوں ہوگیا، ایسا ہونا چاہیے، یہ ہونے والا ہے'' اس قسم کے جو کشف ہوجایا کرتے ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کا ایک اِنعام ہے، باقی! یہ مطلوب چیز نہیں ہے، یہاں تو چونکہ موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ایک تنبیہ کرنی تھی، اس لیے بھیج دیا۔ اس لیے اس علمِ کونیات کے اعتبار سے خضر علیہ السلام کا موسیٰ علیہ السلام سے افضل ہونا لازم نہیں آتا، ہاں! البتہ خضر علیہ السلام مقبول بندے تھے جس طرح سے قرآنِ کریم میں صراحتاً آ گیا۔

خضر علیہ السلام نبی تھے یا ولی؟

اور یہ نبی تھے یا صرف ولی تھے؟ اس میں علماء کا کچھ اختلاف ہے، لیکن جمہور نے ترجیح اس کو دی ہے کہ نبی تھے، اگرچہ صاحبِ کتاب نہیں تھے، اور زیادہ تر ان کا تعلق انہی کونی اُمور سے تھا، تکوینیات کے ساتھ۔

موسیٰ علیہ السلام کا اِعتراض نہ کرنے کا وعدہ

تو خضر علیہ السلام کہنے لگے کہ موسیٰ! جو کچھ تجھے علم دیا گیا ہے تفصیل کے ساتھ، اتنا تفصیل سے مجھے علم نہیں ہے، اور ایک علم اللہ

نے مجھے دیا ہے وہ اس تفصیل کے ساتھ تیرے پاس نہیں ہے، اور دونوں کے تقاضے کچھ مختلف ہیں، میرے ساتھ تُو نہیں رہ سکے گا، میرے سامنے کچھ اس قسم کے واقعات آئیں گے جن کا ظاہر تجھے شریعت کے مطابق نظر نہیں آئے گا، اور تُو صبر نہیں کر سکے گا، ہر ہر بات میں میرے ساتھ اُلجھے گا، اور اِعتراض کرے گا۔ اور آپ جانتے ہیں کہ معلم پر، اُستاذ پر ہر ہر بات میں اعتراض کرنا، اور بداعتمادی کا اظہار کرنا، اس سے کبھی جوڑ نہیں لگا رہ سکتا، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام تو اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے تھے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ صراحت تھی کہ یہ میرا مقبول بندہ ہے، موسیٰ علیہ السلام کو تو شوق چڑھا ہوا تھا، کہنے لگے: نہیں جی! اِن شاء اللہ! میں صبر کروں گا، آپ اس بات کی پروا نہ کریں، مجھے اپنے ساتھ رکھ لیں۔ تو حضرت خضر علیہ السلام نے ساتھ رکھ لیا، کہنے لگے: بہت اچھا، بس ایک میری شرط ہے کہ کوئی واقعہ پیش آ جائے تُو نے اعتراض نہیں کرنا، میں خود ہی بتاؤں گا کہ کیا بات ہے؟ تو موسیٰ علیہ السلام نے وعدہ کر لیا اِن شاء اللہ! کے ساتھ، سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ: یہاں دیکھو! چونکہ ''اِن شاء اللہ'' کہا تو بچت ہوگئی، چونکہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ اس کو معلق کر دیا۔ ''اگر اللہ نے چاہا تو تُو مجھ کو صبر کرنے والا پائے گا۔''

کشتی توڑنے کا واقعہ

تو حضرت خضر علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام کو قدرت کے مشاہدے کروانے کے لئے ساتھ لے کے چلے، دریائی سفر تھا (پُرانے زمانے میں لمبے سفر بھی دریا میں کشتی ڈال کے کیے جاتے تھے، ایک جگہ کشتی ڈال لی جاتی، کئی میلوں پہ جہاں اُترنا ہوتا وہاں کنارے پہ اُتر جاتے، جیسے آپ کے پاس دریائے ستلج چل رہا ہے، تو حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا یعقوب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اوّل صدر مدرّس دارالعلوم دیوبند، حج کرنے کے لئے گئے ہیں، تو کشتیوں کے ذریعے سے اسی ستلج میں سے کراچی تک گئے تھے، ان کے سفرنامے میں یہ ذکر کیا گیا ہے، پاکپتن کے برابر کشتی روکی تھی، پھر پاکپتن حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر زیارت کے لئے بھی آئے ہیں، یہ ان کے سفرنامے میں مذکور ہے۔ تو پُرانے زمانے میں سفر یوں ہوتے تھے، دریا میں کشتی ڈال دی جاتی، اس پہ اپنا سامان رکھ کے بیٹھ جاتے، اور وہ کشتی پانی کے ساتھ ساتھ چلتی، اور یوں سفر قطع ہوتا چلا جاتا)...... تو جس وقت حضرت خضر علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کشتی کے اُوپر سوار ہوئے، تو جو کشتی چلانے والے تھے جن کو ہمارے ہاں ''ملاح'' کہتے ہیں، انہوں نے ان کو پہچان لیا کہ یہ شریف آدمی ہیں، بزرگی کے آثار چہرے پر تھے، اور ہو سکتا ہے کہ خضر علیہ السلام چونکہ اسی علاقے کے رہنے والے تھے تو اس لیے پہچان لیے گئے ہوں، انہوں نے کرایہ لینے سے انکار کر دیا، بغیر کرایہ کے ان کو سوار کرا لیا، جب بغیر کرایہ کے سوار کیا، تو چلے جا رہے ہیں، جاتے جاتے حضرت موسیٰ علیہ السلام کیا دیکھتے ہیں کہ خضر علیہ السلام نے کشتی کا ایک پھٹا توڑ دیا، تو موسیٰ علیہ السلام چونکہ صاحبِ شریعت تھے، اور شریعت کا تقاضا یہ ہے کہ جو تم پر احسان کرے اس کے ساتھ احسان کرو، اب انہوں نے تو بغیر کرایے کے سوار کرایا، کرایہ بھی نہیں لیا کہ یہ شریف آدمی ہیں، اور مفت میں سوار کرا لیا، اور یہ ان کا احسان تھا، اور اس احسان کے بدلے میں یہ کردار! کہ آگے سے کشتی کا پھٹا توڑ دیا؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ دیکھ کے برداشت نہ کر سکے، فوراً اعتراض کر دیا کہ یہ کیا؟ یعنی احسان کے جواب میں بھی یہ معاملہ صحیح نہیں تھا، اور دوسری بات یہ تھی کہ دریا کا

معاملہ ہے، پانی میں کشتی چل رہی ہے، انسانی جانوں کی حفاظت بھی تو ایک شرعی فرض ہے، اور ایسے خطرات پیدا کر دینا کہ انسان ڈوب جائے، یہ کہاں جائز ہے؟ اب کوئی لہر آئے اور کشتی میں پانی داخل ہو جائے، سارے ڈوب جائیں گے سارے مرجائیں گے، لوگوں کو ڈبونے کا ارادہ ہے؟ اس طرح سے حضرت موسیٰ علیہ السلام بول پڑے۔ دیکھو! یہ شرعی مزاج ہے، شرعی مزاج کے ساتھ بات یوں ہی ہوگی کہ احسان کا بدلہ نقصان پہنچا کے کیوں دیا گیا؟ یہ تو وہی بات ہوئی جو کہتے ہیں کہ ''جس ہانڈی میں کھانا اسی میں چھید کرنا'' کہ ہانڈی میں پکایا، کھایا، بعد میں اسی ہانڈی کو توڑ دیا۔ کشتی ہمارے لیے سفر کا ایک ذریعہ ہے، اور اس کے اندر جو لوگ بیٹھے ہوئے ہیں ان کی جان کی حفاظت بھی فرض ہے، اور پانی کا معاملہ ہے، تو یہ پھٹا جو آپ نے توڑ دیا تو اس کا مطلب ہے کہ آپ لوگوں کو ڈبونا چاہتے ہیں؟ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کلام شرعی مزاج سے ہے..... تو خضر علیہ السلام کہنے لگے کہ میں نے نہیں کہا؟ کہ تُو میرے ساتھ نہیں چل سکے گا، تُو صبر نہیں کر سکے گا، یہ باتیں تیری برداشت میں نہیں ہیں۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام فوراً متنبہ ہوئے اور کہنے لگے کہ جی! میں بھول گیا، میرے بھولنے کی وجہ سے گرفت نہ کریں، میرے اُوپر اتنی تنگی نہ کرو کہ بھول چوک سے بات ہو جائے تو آپ ناراض ہونا شروع ہو جائیں۔ تو حضرت خضر علیہ السلام نے درگزر کر لیا، اور خضر علیہ السلام نے اس اعتراض کا جواب نہیں دیا جو موسیٰ علیہ السلام نے کیا تھا۔

اللہ تعالیٰ کے علم کی وسعت

اسی کشتی کے سفر کے دوران میں ایک واقعہ پیش آیا کہ ایک چڑیا آئی، اور وہ کنارے پر بیٹھی، کنارے پہ بیٹھ کے اس نے چونچ میں پانی لیا، جس طرح سے جانوریوں کر کے چونچ مارتے ہیں اور پانی لیتے ہیں، تو خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کو متوجہ کیا، اور یہ کہا کہ موسیٰ! تیرا علم اور میرا علم مل کر اللہ کے علم کے ساتھ وہ نسبت بھی نہیں رکھتا جتنا اس پانی کی نسبت اس سمندر کے ساتھ ہے جو اس چڑیا نے چونچ میں لیا ہے، یعنی اس میں اللہ تعالیٰ کے علم کی وسعت بیان کی کہ تیرا علم اور میرا علم مل کے اللہ تعالیٰ کے علم کے مقابلے میں ایسی حیثیت بھی نہیں رکھتا، جیسے یہ پانی جو اس جانور کی چونچ کو لگا ہے اس کی نسبت اس سمندر کے ساتھ ہے، کتنے ہی بڑے عالم کیوں نہ ہو جاؤ، لیکن اللہ کے علم کے ساتھ انسان کے علم کی کوئی نسبت نہیں ہے، ایسی نسبت بھی نہیں جو قطرے کو سمندر کے ساتھ ہوتی ہے، اللہ کے علم کے برابر ہو جانا، یا اللہ کی معلومات کا اِحاطہ کر لینا تو دُور کی بات ہے، اتنی نسبت بھی نہیں جتنی قطرے کو سمندر کے ساتھ ہوتی ہے۔

بچّے کو قتل کرنے کا واقعہ

خیر! وہ آگے چل دیے، جہاں اُترنا تھا اُتر گئے، جیسے میں نے عرض کیا کشتی چلی جا رہی ہے، اور آپ کی منزل جہاں آگئی آپ کنارے پہ اُتر جائیں، تو کنارے پہ اُتر کے گئے، کسی آبادی میں سے گزر ہوا، تو وہاں کچھ معصوم نابالغ بچے کھیل رہے تھے، ایک بچہ جو اُن میں زیادہ ہونہار سا معلوم ہو رہا تھا، خضر علیہ السلام نے پکڑا، اور اس کے سر کو ہاتھ ڈالا، اور اس کی کھوپڑی اکھیڑ دی، اور چلتے چلتے چپکے سے اسے قتل کر دیا۔ اب دیکھو! شرعی مزاج کے تحت ایک انسان کا خون کتنا بڑا جرم ہے! اور پھر معصوم اور بے گناہ کا!!

جس نے نہ کسی کو قتل کیا نہ کسی کو نقصان پہنچایا، اس کو مفت میں پکڑ کے ایسے ہی قتل کر دیا جائے، نبی خلافِ شریعت حرکت دیکھ کے برداشت کر ہی نہیں سکتا، اس کے لئے چپ رہنا ممکن ہی نہیں، تو موسیٰ علیہ السلام پھر بول پڑے، کہنے لگے: یہ تو بہت بُری حرکت کی، بے گناہ بچہ، نہ کوئی تکلیف پہنچائی نہ کسی کو قتل کیا، اور ایسے ہی آپ نے اس کو قتل کر دیا؟ بہت بُری حرکت کی آپ نے، اب قتلِ نفس کے اُوپر، ایک انسان کے قتل پر موسیٰ علیہ السلام چپ کس طرح سے رہ جائیں۔ تو خضر علیہ السلام نے پھر کہا کہ پھر وہی بات؟ میں نے نہیں کہا تھا کہ تُو صبر نہیں کر سکے گا؟ موسیٰ علیہ السلام کہنے لگے کہ ایک موقع اور دے دو، وہ بھی سمجھ گئے کہ واقعی حالات ایسے ہیں کہ میرے لیے ناقابلِ برداشت ہیں، جیسے حضرت مولانا عثمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں ایک لفظ استعمال کیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اندازہ ہو گیا کہ حضرت خضر علیہ السلام کے تحیر خیز حالات وواقعات کا چپ چاپ مشاہدہ کرتے رہنا بہت ٹیڑھی کھیر ہے'' یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے یہ واقعات ٹیڑھی کھیر ثابت ہوئے...... ''ٹیڑھی کھیر'' کا محاورہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا، کہتے ہیں کہ ایک نابینا حافظ تھا اور اس کا ایک شاگرد تھا، شاگرد نے دعوت کر دی تو حافظ صاحب پوچھتے ہیں کہ کیا کھلاؤ گے؟ لڑکا کہتا ہے کہ جی! کھیر کھلاؤں گا۔ وہ پوچھتے ہیں کہ کھیر کیا ہوتی ہے؟ وہ کہتا ہے جی! سفید سفید ہوتی ہے۔ حافظ صاحب کہتے ہیں سفید کیسا ہوتا ہے؟ اس نے کہا بگلے جیسا، تو حافظ صاحب پوچھتے ہیں کہ بگلا کیسا ہوتا ہے؟ تو اس نے ہاتھ ٹیڑھا کر کے حافظ صاحب کا ہاتھ پھروا دیا کہ بگلا یوں ہوتا ہے، تو حافظ صاحب ہاتھ پھیر کر کہنے لگے کہ یہ کھیر تو بہت ٹیڑھی ہے، حلق سے کیسے گزرے گی...... تو بسا اوقات ایک چیز بہت لطیف ہوتی ہے لیکن اس کی تعبیر ایسی ٹیڑھی ہو جاتی ہے کہ وہ ٹیڑھی کھیر لگنے لگ جاتی ہے کہ یہ حلق سے کس طرح گزرے گی، تو یہ واقعات بھی کچھ ایسے ہی ہو گئے، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ اندازہ کر لیا، اور یہ کہا کہ جی! ایک موقع اور دے دو، اگر پھر میں نے اسی طرح سے سوال کیا تو پھر مجھے جدا کر دینا، تو خضر علیہ السلام نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ آگے چلتے چلے گئے، اس کا بھی کوئی مطلب نہیں سمجھایا کہ میں نے یہ بچہ کیوں قتل کیا؟

دِیوار کو سیدھا کرنے کا واقعہ

آگے چلے تو ایک آبادی میں پہنچ گئے، اور چلتے چلتے کھانے کا وقت ہو گیا، بھوک لگ گئی، تو جیسے زمانے کا ایک عرف ہوتا ہے کہ وہاں ٹھہرے، کہ اس بستی والوں کے پاس چلتے ہیں، چل کے وہاں کھانا کھالیں گے، پُرانے زمانے میں تو لوگ اس بارے میں بہت مروّت کرتے تھے، اب چلتے مسافر کی انسان ویسے ہی خدمت کر دیتا ہے، چہ جائے کہ وہ جائیں اور جا کے اپنی ضرورت ظاہر کریں، لیکن بستی والوں نے بے مروّتی کی، اتنے نیک آدمی، صالح آدمی، دو پیغمبر اس بستی کے اندر پہنچے لیکن اس بستی کو یہ سعادت حاصل نہ ہوئی کہ وہاں کے رہنے والے ان دو پیغمبروں کی مہمانی کر لیتے، انہوں نے مہمانی کرنے سے کھلانے پلانے سے انکار کر دیا، اب آپ اندازہ کیجئے کہ کتنی بے مروّتی ہے، کتنی بداخلاقی ہے ان لوگوں کی طرف سے، کہ مسافر ہونا ایک علیحدہ رہا، اور پھر ان کی شکل وصورت سے ان کی صالحیت جو نمایاں تھی اس کی بھی کوئی رعایت نہیں کی، کھانا نہیں دیا، اب شرعی مزاج تو یہ ہے کہ

ایسے لوگوں کی اصلاح کرنے کے لئے انہیں کوئی تنبیہ کرنی چاہیے تا کہ یہ اخلاق سیکھیں، لیکن ہوا یہ کہ اس بستی میں ایک بہت بڑی دیوار تھی، اور وہ جھکی ہوئی تھی، تو خطرہ تھا کہ ابھی گرے گی، جیسے حدیث شریف میں آتا ہے کہ وہاں سے گزرتے ہوئے لوگ خطرہ محسوس کرتے تھے کہ کہیں گر کے کسی کو مار نہ دے، اب اس بڑی دیوار کا گرانا، نئے سرے سے بنانا یہ ایک بہت بڑا کام تھا، لیکن حضرت خضر علیہ السلام نے ہاتھ کا اشارہ کر کے اپنی کرامت کے ساتھ ہی، اللہ کی طرف سے جوان کو چیز حاصل تھی، معجزے کے طور پر اس دیوار کو سیدھا کر دیا، وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہو گئی جیسے نئی بنائی ہو، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام پھر بول پڑے، کہتے ہیں کہ ایسے بداخلاق لوگوں کے ساتھ ایسا احسان؟ اگر آپ نے بنانی ہی تھی، تو پتا تو ہے کہ ہمیں کھانے کی ضرورت ہے، تو آپ ان سے کوئی اُجرت طے کر لیتے کہ ہم آپ کی دیوار ٹھیک کر دیتے ہیں، اور اس کے عوض ہم اتنی اُجرت لیں گے، اُجرت بھی مل جاتی اور ان کو تنبیہ بھی ہو جاتی کہ دیکھو! ہم نے ان کے ساتھ احسان نہیں کیا تو انہوں نے بھی ہمارے ساتھ احسان نہیں کیا، اور جو اُجرت ملتی اس سے اپنا کچھ کام چل جاتا۔ تو یہ تیسرا موقع آ گیا، جب خضر علیہ السلام نے کہا کہ بس بھئی! آگے معاملہ ختم! تیرے وعدے کے مطابق ہی یہ تیسرا موقع ہے، اس کے بعد میں آپ کو ساتھ نہیں رکھ سکتا، یہاں آ کے آپس میں دونوں کی جُدائی ہو گی۔

مذکورہ تینوں واقعات کی حقیقت

اور حضرت خضر علیہ السلام کہنے لگے کہ اب میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میں نے یہ کام کیوں کیے ہیں؟ اور یہی پردہ اُٹھوانا مقصود تھا موسیٰ علیہ السلام کے سامنے، اور یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ انسان کتنا ہی علم حاصل کر لے لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے حقائق کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے واقعات کا ظاہر کچھ اور ہوتا ہے، باطن کچھ اور ہوتا ہے، اس گتھی کو سلجھانا ہر کسی کا کام نہیں ہے، دنیا کے واقعات کا سلسلہ کچھ ایسے ہے۔ خضر علیہ السلام کی اس گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ فرمانے لگے: تجھے اعتراض یہ تھا کہ میں نے احسان کے بدلے میں احسان نہیں کیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں نے احسان کے بدلے میں احسان کیا ہے، آپ نہیں سمجھے، واقعے کا ظاہر کچھ اور ہے، کہ جس وقت انہوں نے ہم پر احسان کیا تھا کہ مفت سوار کرا لیا، اب وہ کشتی صحیح سالم تھی، یہ مسکین آدمی تھے، وہی ان کے کمانے کا ذریعہ تھا، اس میں مزدوری کرتے تھے، جدھر کو کشتی جارہی ہے آگے ایک ظالم بادشاہ ہے، اس کو اپنے کسی کام کے لئے کشتیوں کی ضرورت ہے، اور جو کشتی صحیح سالم اس کو ملتی ہے وہ چھین لیتا ہے، لوگوں کے پاس رہنے ہی نہیں دیتا، تو میں نے اس میں اتنا سا عیب پیدا کر دیا تا کہ وہ بادشاہ جس وقت دیکھے گا تو کہے گا یہ کشتی ہمارے کام کی نہیں، تو ان مسکینوں کی کشتی بچ جائے گی، تو کہاں تو ظاہری طور پر ایک عیب لگا، اور ایک نقصان ہوا، لیکن حقیقت کے اعتبار سے ان مسکینوں کا بھلا ہو گیا کہ ان کی کشتی بچ گئی۔ اس سے آپ اندازہ کر لیجئے کہ کبھی کبھی واقعے کی سطح ایسی ہوتی ہے کہ اس میں بظاہر نقصان معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ آپ کو کوئی فائدہ پہنچانا چاہتے ہیں، اس لیے نیک لوگوں کا اگر ظاہری طور پر کوئی نقصان ہو تو اس میں گھبرانا نہیں چاہیے، معلوم نہیں اللہ کی حکمت آپ کو کیا کیا فائدہ پہنچانے کی ہے، یہ تھوڑا نقصان بہت نفع پہنچنے کا ذریعہ بن جائے گا، تو جب یہ بات

سامنے آجائے گی تو یہ کتنا بڑا سبق ہے کہ جس سے انسان کو آنے والے واقعات پہ صبر کرنے کی تلقین ہوگئی، کہ ظاہری مالی نقصان کو نقصان نہ سمجھا کرو، ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے پردے میں کچھ اور فوائد آپ کو پہنچانا چاہتے ہوں، بہت بڑا سبق ہے جو اس واقعے سے مل گیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے یہ حقیقت ظاہر ہوگئی۔

اور دوسرا واقعہ یہ ہے کہ وہ بچہ جو کھیل رہا تھا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقدر یہ تھا کہ اگر یہ اسی طرح سے بڑا ہوگیا، بالغ ہوگیا، تو بہت سرکش، بہت باغی، بڑا فتنہ پرداز اور کافر ہوگا، اور اس کے والدین مؤمنین، بہت نیک، ایمان والے ہیں، اور یہ بچہ ان کے لئے فتنہ بن جائے گا، سرکشی اور کُفر کی وجہ سے ان کے اُوپر مشقت ڈالے گا، انہیں بہت پریشان کرے گا، تو ہم نے ارادہ کیا کہ اس کو ختم کردیا جائے، اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ انہیں کوئی اور نیک اولاد دے دے گا، اب والدین کی نیکی یہاں کام آئی، بظاہر اولاد فوت ہوئی، بظاہر بچہ مرا، لیکن حقیقت میں اس میں بھی والدین کا بھلا تھا، اور اس کے نتیجے میں بھی والدین کا فائدہ تھا، یہ جو کچھ کیا گیا یہ ماں باپ کی نیکی کا صلہ ہے، اگرچہ ظاہری طور پر اولاد کا مرنا ہے۔ تو کتنا بڑا پردہ اُٹھا دیا اس حقیقت سے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بسا اوقات کسی نیک آدمی کا بچہ مرتا ہے نابالغ ہونے کے زمانے میں، وہ سمجھتا ہے کہ میری اولاد مرگئی، کتنا بڑا نقصان ہوگیا، لیکن حقیقت کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ اس کو کسی بہت بڑی آفت سے بچانا چاہتا ہے، اور اس کے بدلے میں کوئی دوسری چیز دینا چاہتا ہے، تو نیک لوگوں کو یہ بات سوچ کے رکھنی چاہیے کہ چاہے مالی نقصان ہو، چاہے جانی نقصان ہو، اس کو حقیقت میں نقصان نہ سمجھیں، اللہ کی حکمت پر اعتماد کرتے ہوئے یہ عقیدہ رکھیں کہ اس کے ضمن میں پتا نہیں اللہ تعالیٰ کو ہمارے ساتھ کیا بھلائی کرنا مقصود ہے۔ ظاہری طور پر جان کا نقصان ہے، ظاہری طور پر مال کا نقصان ہے، لیکن نتیجہ انتہائی اچھا۔

تیسرا واقعہ جو پیش آیا کہ وہ بستی والے بے مروّت تھے، اور ان کی دیوار ٹھیک ہوگئی، بظاہر تو یہ ان بستی والوں کے ساتھ مروّت کی گئی، بستی والوں پہ احسان کیا گیا، لیکن حقیقت ایسی نہیں، اس دیوار کے مالک ہیں دو یتیم بچے، كَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا: ان کا باپ نیک تھا، اور اس دیوار کے نیچے ان کا خزانہ مدفون ہے، اب اگر یہ دیوار گر جاتی، خزانہ ننگا ہوجاتا، چور اُچکے لوٹ کے لے جاتے، یتیموں کا نقصان ہوجاتا، تو اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا کہ یہ جوان ہوجائیں، جوان ہونے کے بعد اپنے اختیار سے اپنا خزانہ نکال لیں، اس لیے ان کی جوانی تک اس دیوار کو محفوظ رکھنے کی ضرورت تھی، تو یہ میں نے بستی والوں پہ احسان نہیں کیا، اگر بظاہر بستی والوں پہ احسان ہے تو ان بچوں کے باپ کی نیکی کی برکت سے ہے، یہ لوگ سمجھیں یا نہ سمجھیں لیکن جو کچھ کیا گیا ہے ان بچوں کے باپ کی نیکی کی وجہ سے کیا گیا ہے، جس سے معلوم ہوگیا کہ نیک آدمی کی نیکی کی برکات یہ نہیں کہ صرف اس کی ذات تک محدود رہتی ہیں بلکہ اس کی نسلوں تک چلتی ہیں، دنیا کے اندر نیکی کی برکات اس طرح سے ہوتی ہیں کہ اس کی برکت سے بستیوں کی بستیاں بچ جاتی ہیں، اور آنے والی نسلوں تک کو فائدہ پہنچتا ہے، نیکی کے اثرات ایسے ہوتے ہیں۔ تو حضرت خضر علیہ السلام نے کہا کہ یہ وہ واقعات ہیں جن پر تُو صبر نہ کرسکا۔ اب حقیقت ظاہر ہونے کے بعد آپ جان گئے کہ خضر علیہ السلام نے جو کچھ کیا تھا ٹھیک کیا تھا، اور موسیٰ علیہ السلام نے ظاہری سطح کی طرف دیکھ کے اعتراض کیا، واقعات صحیح تھے، سب شریعت کے مطابق تھے، کوئی خلافِ شریعت نہیں تھا۔

واقعۂ مذکورہ سے حاصل شدہ اَسباق، اور فتنۂ دجال کے ساتھ اس کی مناسبت

تو یہاں یہ جو قصہ ذکر کیا جارہا ہے اس قصے کو یہاں ذکر کرنے سے مقصد ایک تو مشرکینِ مکہ کو تنبیہ ہے کہ وہ غریبوں اور مسکینوں کے ساتھ بیٹھنے کو بھی ذِلّت سمجھتے تھے، اور بیٹھنا گوارا نہیں کرتے تھے، جیسے اَصحابِ کہف کے واقعے کے اِختتام پر آیا تھا، ان کا مطالبہ تھا کہ ان مساکین کو ہٹادو، جہاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ۔ تو اُن میں تو اتنا تکبر کہ علمی مجلس کے اندر کسی غریب مسکین کے ساتھ بیٹھنا گوارا نہیں، اور اِدھر اللہ والوں کی یہ شان کہ اگر ان کو پتا چل جائے کہ کوئی دوسرا شخص ایسا ہے جس کے پاس ایسا علم ہے جو ہمارے پاس نہیں، تو حاصل کرنے کے لئے کتنے طویل طویل سفر کر لیتے ہیں، تو اللہ والوں کی شان یہ ہوتی ہے کہ علم کی بات کو حاصل کرنے کی کوشش کریں جہاں بھی ہو...... اور دوسری بات یہ ہے کہ دجالی فتنے کے ساتھ اس کی جو نسبت ہے وہ یہی ہے کہ دجالی تہذیب والے جس طرح سے آج کل آپ کے سامنے مغربی تہذیب والے ہیں، وہ چند ایک باتوں کی معلومات حاصل کر کے یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے سارا علم حاصل کر لیا، اور دنیا جو کچھ ہے وہ ہم نے سمجھ لی، اور ہر قسم کے اسباب ہمیں حاصل ہو گئے، ظاہری اسباب پر اعتماد کرتے ہیں، واقعات کے ظاہر کو دلیل بناتے ہیں، حالانکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اتنے حقائق مخفی ہیں جہاں تک انسان کی رسائی نہیں ہے، کتنا بڑا عالم کیوں نہ ہو جائے اندر کے حقائق کا احاطہ نہیں کر سکتا، نبیٔ برحق موسیٰ علیہ السلام بھی اس قسم کے حقائق سے واقف نہیں تھے، تھوڑا سا پردہ اللہ نے اٹھا کے یہ بات ظاہر کر دی کہ صرف ظاہر کو نہ دیکھا کرو، بسا اوقات ظاہر اور ہوتا ہے، باطن اور ہوتا ہے، واقعے کی ظاہری سطح کچھ اور ہوتی ہے، اور اس کے اندر کچھ اور قسم کے حقائق چھپے ہوئے ہوتے ہیں، ان واقعات کی طرف دیکھ کے انسان ان ظاہری باتوں سے متاثر نہ ہو، کبھی ایسے ہوگا کہ نیکی کی وجہ سے آپ کو تکلیف پہنچے گی، اور لوگ آپ کو طعنہ دیں گے کہ دیکھو! تم نمازیں پڑھتے ہو، روزے رکھتے ہو پھر بھی رگڑے میں ہو، اور دوسرے لوگ دیکھو! کس قسم کی عیاشی کر رہے ہیں، لیکن تم اس بات پر یقین رکھنا کہ جو کچھ ہوتا ہے اللہ کی مشیت کے تحت ہوتا ہے، اور اللہ تعالیٰ نیکوں کے لئے بہرحال اچھا انجام سامنے لاتے ہیں، چاہے اس واقعہ کی ظاہری سطح بظاہر نقصان کی ہی کیوں نہ ہو لیکن انجام بہرحال اچھا ہوگا، جانی نقصان ہو مالی نقصان ہو تو اس سے بھی نہیں گھبرانا چاہیے، بلکہ اللہ کی مشیت کے اوپر مدار رکھتے ہوئے سوچنا چاہیے کہ اس میں بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے کوئی بھلائی ہے...... اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ نیکی کے اثرات بہت طویل ہوتے ہیں، دوسرے لوگوں تک پھیلتے ہیں، اگلی نسلوں تک پھیلتے ہیں، اس لیے نیکی کو اختیار کرنا چاہیے اور ظاہری باتوں کے چکر میں آکے انسان کوئی بُرا راستہ اختیار نہ کرے جس راستے کے اندر انسان کو ظاہری خوش حالی ملتی ہے لیکن اس کا انجام برا سامنے آتا ہے، تو زندگی کے حقائق اور دنیا کے واقعات کے ظاہر کو دیکھ کے یہ یقین کر لینا کہ بس یہی کچھ ہے جو ہم نے سمجھ لیا، اور ہم ہر چیز کو معلوم کر چکے، یہ بات غلط ہے، اللہ کا علم اتنا وسیع ہے کہ سارے انسانوں کا علم مل کر اس کے سامنے ایک قطرے کے برابر نہیں ہے، تو اپنی معلومات پر اعتماد کر لینا اور واقعات کے ظاہر کو دیکھ کے اس کے اوپر مطمئن ہو جانا، یہ ٹھیک نہیں، مغربی تہذیب کی خاصیت یہی ہے کہ وہ جو کچھ حاصل کیے بیٹھے ہیں، وہ کہتے ہیں ہم نے سب کچھ جان لیا، اور جو کچھ ہم نے جان لیا یہی صحیح ہے، اور یہ واقعات بتاتے

ہیں کہ انسان کے فیصلے بسا اوقات بڑی عجلت پسندی پہ ہوتے ہیں، جلد بازی پہ ہوتے ہیں، اور جب حقائق ظاہر ہوتے ہیں تو اپنے فیصلے خود تبدیل کرنے پڑتے ہیں کہ ہم نے جو سمجھا تھا ٹھیک نہیں سمجھا تھا، یہ واقعہ آپ کے سامنے اسی چیز کی نشاندہی کرتا ہے، اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسی قسم کے سبق دینے کے لئے یہ واقعہ ظاہر کیا، چنانچہ حدیث شریف میں جب یہ واقعہ ختم ہوا، تو سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ ہمارے لئے تو یہ بات بڑی خوشی کی تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کچھ اور صبر کرتے تاکہ اور حقائق اور واقعات ہمارے سامنے آتے، دیکھو! ایک معمولی معمولی واقعے میں کتنا بڑا بڑا سبق سامنے آ رہا ہے، کہ ظاہر کچھ ہوتا ہے باطن کچھ ہوتا ہے، تو جتنے اس قسم کے واقعات نمایاں ہوتے اتنے حقائق اور نمایاں ہوتے، تو یہ علم ہے تکوینیات کا، تشریعیات کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں، انسان کے کمال حاصل کرنے میں اور مقبول عند اللہ ہونے میں اس کا کوئی کسی قسم کا دخل نہیں ہے۔ یہ ہے اس واقعے کا حاصل!

''حیاتِ خضر'' کی بحث، اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کا فیصلہ

باقی یہاں ایک بحث یہ ذکر کی گئی ہے کہ خضر علیہ السلام زندہ ہیں یا وفات پا گئے ہیں؟ مفسرین نے یہیں اس بارے میں کچھ کلام کیا ہے، صوفیہ کی اکثریت تو ان کے زندہ ہونے کی قائل ہے، اور وہ کہتے ہیں کہ ہمارے ساتھ تو ان کی ملاقات بھی ہوتی رہتی ہے، ہم ان کو وفات پایا ہوا کیسے سمجھ لیں؟ اور بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی اس قسم کی روایات آتی ہیں، یعنی قلیل من الفقهاء، قلیل من المتکلمین اور کثیر من الصوفیہ ان کی حیات کی قائل ہے، اور اس کے مقابلے میں کثیر من المتکلمین، کثیر من الفقهاء اور قلیل من الصوفیہ ان کی وفات کی قائل ہے، دونوں طرف سے دلائل کی بھرمار ہے، تفسیروں میں دلائل لکھے ہوئے ہیں، اس لیے قطعی فیصلہ کرنا تو بہت مشکل ہے کہ خضر علیہ السلام زندہ ہیں یا وفات پا گئے، نہ ان کی وفات کے اوپر یقین کیا جا سکتا ہے نہ ان کی حیات پر، اور نہ یہ مسئلہ دین کی ضروریات میں سے ہے کہ اس کا جاننا ضروری ہو۔

''تفسیر مظہری'' میں قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ ''مالا بدمنہ'' والے، یہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں، اور شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھیوں میں سے ہیں، اور حضرت شاہ عبد العزیز صاحبؒ ان کو ''بیہقیٔ وقت'' کہا کرتے تھے، بہت بڑے محدث ہیں، پانی پت کے اندر قاضی تھے اس لئے انہیں ''قاضی ثناء اللہ'' کہا جاتا ہے، کیونکہ حکومت اس وقت مغلوں کی تھی اور اس زمانے میں یہ قاضی تھے، قاضی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، اور مرزا مظہر جانِ جاناں رحمۃ اللہ علیہ جو نقشبندی خاندان کے بہت بڑے بڑے بزرگ گزرے ہیں، ان کے یہ خلیفہ تھے، اپنے پیر کے نام پر تفسیر کا نام ''تفسیر مظہری'' رکھا ہے، چونکہ یہ مرزا مظہر جانِ جاناں رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے ان کے نام پر اس کا نام رکھا گیا ہے، عربی میں ہے، اب اس کا اُردو ترجمہ بھی ہو گیا ہے، اور ہمارے حضرات نے اس تفسیر کو بہت ترجیح دی ہے کہ اس میں بڑے اچھے حقائق ہیں، اور خاص طور پر فقہی بحث بہت اچھی ہے، تصوف کے حقائق بڑے نمایاں کرتے ہیں، تو بہت قابلِ اعتماد اور اچھی تفسیر ہے۔

اس واقعے کے آخر میں انہوں نے اس سوال کو اُٹھایا، دونوں طرف کے دلائل ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ دلائل کی

طرف دیکھ کے اس کا فیصلہ بہت مشکل ہے، حضرت مجدّد الف ثانی ؒ یعنی حضرت شیخ احمد سرہندی مجدّد الف ثانی ؒ، ان کے سامنے جب یہ بحث آئی تو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوئے اور مراقب ہوئے اللہ تعالیٰ سے علم حاصل کرنے کے لئے، کہ ان دونوں باتوں میں سے صحیح بات کون سی ہے؟ یعنی اللہ کی طرف متوجہ ہوئے تا کہ اللہ کی طرف سے یہ بات دل میں ڈال دی جائے کہ ان دونوں باتوں میں سے صحیح بات کون سی ہے؟ دلائل تو دونوں طرف ہی ہیں، پتا نہیں چلتا کہ وفات پا گئے یا زندہ ہیں؟ دلائل دونوں طرف سے قوی ہیں، تو لکھتے ہیں کہ حضرت مجدّد ؒ جس وقت مراقب ہوئے تو دیکھا کہ حضرت خضر علیہ السلام ان کے پاس تشریف لے آئے، تو مجدّد صاحب پوچھتے ہیں کہ جی! بتلائیے، آپ زندہ ہیں یا وفات پا گئے ہیں؟ لوگ آپ کے متعلق اختلاف کرتے ہیں، تو حضرت خضر علیہ السلام کہنے لگے کہ میں اور الیاس ''لَسْنَا مِنَ الْاَحْیَاءِ'' ہم زندوں میں سے نہیں ہیں، ہماری وفات ہو چکی ہے، ہم دونوں وفات پا چکے ہیں، لیکن ہمارے ساتھ اللہ تعالیٰ کا ایک معاملہ ہے کہ ہماری رُوحوں کو اس نے اتنی قوت دی ہے کہ ہم جب چاہتے ہیں متشکل ہو کے نمایاں ہو جاتے ہیں، اور کچھ کام ہمارے ذِمّے لگا رکھے ہیں، بسا اوقات کسی ڈُوبنے والے کی مدد، کسی راہ بھولے ہوئے کو راہ بتانا، اس قسم کے واقعات، اور قلوب کے اندر علم لدنی کا اِلقاء، اس میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں واسطہ بنایا ہے اور اس قسم کے کام ہمارے ذِمّے ہیں، جس کی وجہ سے ہم مختلف جگہوں میں متشکل ہو کے نظر آتے رہتے ہیں، حضرت مجدّد الف ثانی ؒ نے یہ اپنے عالمِ کشف میں دیکھا، اور حضرت خضر علیہ السلام کے ساتھ ملاقات ہوگئی۔ تو قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی ؒ لکھتے ہیں کہ اگر اس کشفِ صحیح کے اُوپر اعتماد کر لیا جائے تو سارے اِشکالات دُور ہو جاتے ہیں، کہ ان کی وفات تو ہو گئی، موت کا مزہ تو انہوں نے چکھ لیا، لیکن اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کی ارواح کو تکوینیات میں لگا دیا، جس طرح سے اللہ تعالیٰ فرشتوں سے کام لیتے ہیں، اسی طرح سے ان کی ارواح کو بھی اس سلسلے میں لگا دیا، کچھ کام ان کے ذِمّے لگا دیے کہ تم نے یہ کرنا ہے وہ کرنا ہے، اور وہ متشکل ہو کے چونکہ نظر آتے رہتے ہیں، اس لیے جو لوگ کہتے ہیں کہ ہم سے ملاقات ہوئی، ہم نے خضر علیہ السلام کو دیکھا، تو وہ بھی اپنی جگہ صحیح کہتے ہیں، تو حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی ؒ نے ''تفسیر مظہری'' میں اس واقعے کے اِختتام پر سولہویں پارے کی اِبتدا میں یہ بات لکھی ہے۔

قاضی صاحب ؒ کی اصل عبارت یہ ہے:

''لا یمکن حل هٰذا الإشكال إلّا بكلام المجدد للألف الثاني رضي الله عنه فإنه حين سئل عن حياة الخضر عليه السلام ووفاته توجه إلى الله سبحانه مستعلما من جنابه عن هٰذا الأمر. فرأى الخضر عليه السلام حاضرًا عنده فسأله عن حاله فقال: أنا وإلياس لسنا من الأحياء لكن الله سبحانه أعطى لأرواحنا قوةً نتجسد بها ونفعل بها أفعالَ الأحياء من إرشادِ الضال وإغاثةِ الملهوف إذا شاء الله وتعليمِ العلم اللدني وإعطاء النسبة لمن شاء الله تعالى. وجعلنا الله تعالى معينا للقطب المدار من أولياءِ الله تعالى الّذي جعله الله سبحانه مدارًا للعالم جعل بقاء العالم ببركةِ وجوده وإفاضته. وقال الخضر: ان القطب في هٰذا الزمان في ديار اليمن متبع للشافعي في الفقه. فنحن نصلي مع القطب صلوةً على مذهب الشافعي. فبهٰذا الكشف الصحيح اجتمع الأقوال وذهب الإشكال والحمدلله الكبير المتعال۔''

''واقعۂ خضر'' پر مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا قابلِ دید تبصرہ

حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس واقعے پر اپنے انداز میں تبصرہ فرمایا، لکھتے ہیں کہ

''حضرت موسیٰ علیہ السلام اور خضر علیہ السلام کا مشہور واقعہ تین اجزاء پر مشتمل ہے:

۱۔حضرت خضر علیہ السلام کا غریب ملاحوں کی کشتی کو ایک ظالم حکمران کی دست بُرد سے بچانے کے لئے اس میں شگاف ڈالنا۔

۲۔ایک بے گناہ لڑکے کو اس اندیشے سے قتل کرنا کہ یہ اپنے کفر و سرکشی کے حال سے اپنے والدین کو مغلوب نہ کرلے۔

۳۔ایک نیک آدمی کے یتیم بچوں کے موروثی خزانے کی حفاظت کے خیال سے ایک شکستہ دیوار کی بلا معاوضہ مرمت کردینا، جس کے نیچے ان کا خزانہ دبا ہوا تھا۔''

مولانا نے قصے کے ان تینوں اجزا کو عملی درس کے تین نمونے قرار دے کر قریبی دور کی ایک مثال کے ذریعے دکھلایا ہے کہ دجالی فتنے کے عہد میں ان نمونوں کے مطابق عمل کر کے فتنے کے بعض پہلو کی پیدا کردہ مشکلات کا حل کس طرح کیا جاسکتا ہے۔

فرماتے ہیں:

''جب یورپ وامریکا سے موجودہ دجالی فتنے کا سیلاب مشرق کی طرف اُمڈا، اور اس کے روح کُش، ایمان ربا تھپیڑوں کی زد میں شاید سب سے پہلے ہمارا مُلک ہندوستان ہی آیا، اور مسلمانوں کی حکومت اس مُلک میں تہہ وبالا ہوگئی، چاہنے والوں نے پہلے تو یہی چاہا کہ ظلم ہی کا اِزالہ کیا جائے، اسی جذبے کے تحت ۱۸۵۷ء کی لڑائی لڑی گئی، لیکن تجربے نے بتایا کہ ظالم کے ہٹنے کا وقت ابھی نہیں آیا ہے۔تب کہفی زندگی کے مذکورہ بالا مشاغل کے لئے دِینی مدارس کا نظام مُلک کے مختلف گوشوں میں قائم کیا گیا، اور ایسے زمانے میں قائم کیا گیا جب اسی ہندوستان میں یورپ کے علومِ جدیدہ کی تعلیم کے لئے مُلک کے طول وعرض میں اسکولوں اور کالجوں کا جال، مختلف یونیورسٹیوں کے تحت بچھایا جارہا تھا۔ان جدید جامعات اور کلیات ومدارس کے طویل وعریض وفاقوں کے مقابلے میں غریب عربی مدارس کی جو حیثیت تھی وہ تو ظاہر تھی ہی، ماسوائے اس کے عربی کی ان تعلیم گاہوں کے قیام میں نہ اخباروں میں پروپیگنڈے سے کام لیا گیا، نہ پریس کی دُنیا میں ہلچل پیدا کی گئی، دیواروں اور نمایاں مقامات پر نہ لمبے چوڑے پوسٹر آویزاں اور چسپاں کیے گئے، نہ شہروں اور قصبوں میں کانفرنسوں اور سالانہ اجتماعات کے سالانہ تماشوں کا نظم کیا گیا، نہ ان کے لئے اپنا خاص لٹریچر تیار کیا گیا، بلکہ اِنتہائی کسمپرسی کے حالات میں، گمنام قصبوں اور دیہاتوں کی مسجدوں کے گوشوں میں، کچھ پڑھنے والے اور پڑھانے والے سمٹ گئے تھے۔تعلیمی نصاب نہ صرف نقائص وعیوب سے معمور تھا، نہ عصری تقاضوں کے مطابق علوم وفنون کی کتابیں اس میں شریک تھیں، اور نہ دُنیا کی موجود علمی زبانوں میں سے کسی زبان کو اس نصاب میں جگہ دی گئی، مَآ اُوحِیَ اِلَیْکَ مِن رَّبِّکَ یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جن علوم کی وحی کی گئی تھی، ان کے ساتھ عہدِ قدیم کے بعض قدیم فرسودہ فنون کی کتابیں اور وہ بھی انتہائی بے دِلی کے ساتھ ان عربی مدرسوں میں پڑھائی جارہی تھیں۔الغرض! ظاہر ہو یا باطن، اس کا اعتراف کرنا چاہیے کہ ان مدارس میں شگاف ہی شگاف اور خرق ہی خرق دیکھنے والی آنکھوں کو نظر آرہے تھے، اسی کا نتیجہ یہ تھا اور شاید اب تک ہے کہ یورپ وامریکا جیسے ترقی

یافتہ ممالک واقالیم تک ہی نہیں، بلکہ یہ واقعہ ہے کہ خود ہندوستان کے مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ ان سے، یا کم از کم ان کی قدر و قیمت سے ناآشنا ہی رہا، میں دوسروں کے متعلق کیا کہوں؟ اپنے دِینی مدارس کی ان شکستہ حالیوں، اور پڑھنے پڑھانے والوں کی شکستہ بالیوں، ان کی کسمپرسیوں، ناقدریوں کو دیکھ دیکھ کر خود میرا جی بھی ہمیشہ کڑھتا رہا، اور جو عیوب ونقائص ان میں ہیں، ان کو میں اب بھی عیوب ونقائص ہی سمجھتا ہوں، لیکن جیسے کھلے دماغ کے ساتھ ان کوتاہیوں کا مجھے اعتراف ہے، اسی کے ساتھ اس واقعے اور مشاہدے کا بھی کیسے انکار کروں، کہ ہمارے ان مدارس کے جن شگافوں اور کوتاہیوں کو دیکھ دیکھ کر بہی خواہوں کی طرف سے نوحہ خوانی اور ماتم سرائیوں کا سلسلہ اس قسم کے الفاظ اور تعبیروں میں جاری تھا، کہا جاتا تھا کہ یہاں سے پڑھ پڑھ کر نکلنے والے:

نہ سرکار میں کام پانے کے قابل نہ دربار میں لب ہلانے کے قابل
نہ بازار میں بوجھ اُٹھانے کے قابل نہ جنگل میں ریوڑ چرانے کے قابل

(مولانا حالیؒ)

اسی لیے بعض فیصلہ کرنے والوں نے یہ فیصلہ تک کر دیا تھا کہ:

ان سے تو اب تلافی مافات ہو چکی بس لوٹ دو بساط کہ یاں مات ہو چکی

(ڈپٹی نذیر احمد)

جہاں تک میرا خیال ہے کہ بجائے معارضانہ تعریضوں، اور رقیبانہ طنز اور طعنوں کے اس قسم کی تنقیدوں کی نوعیت بھی اگر وہی قرار دی جائے جو موسیٰ علیہ السلام کے اس اعتراض کی تھی، جب کشتی کے شگاف اور خرق کو دیکھ انہوں نے خضر علیہ السلام کو مخاطب بنا کر فرمایا تھا: أَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ أَهْلَهَا ۚ لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا إِمْرًا، کیا تم نے کشتی میں شگاف اس لیے پیدا کر دیا کہ کشتی والوں کو ڈبو دو؟ تم نے بڑا نامناسب کام کیا۔ لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ مذکورہ بالا عیوب ونقائص سے پاک کر کے ان مدارس کو بھی عصری جامعات اور کلیات کے مطابق اگر بنا دیا جاتا، اور جن صلاحیتوں کے فقدان کا مرثیہ ان کے متعلق پڑھا جارہا ہے، اگر ان میں ان صلاحیتوں کے پیدا کرنے کا سامان بھی کر دیا جاتا، تو دِینی فتنے کے پچھلے تاریک وتار دِنوں میں بچی کھچی نجات کی کچھ کشتیاں ان لوگوں کو جو میسر آتی رہی ہیں، جو ایمان اور عملِ صالح کی زندگی کے ساتھ قبر کے کناروں تک پہنچنے میں اب تک کامیاب ہوئے ہیں، کیا ہم نجات کی ان کشتیوں کو پاسکتے تھے؟ یہ انہی کسمپرس دِینی مدارس کا طفیل ہے کہ اسلامی گھرانوں کے چند ایسے افراد کی دِینی تربیت و پرداخت کا موقع مل گیا، جو سرفرازی اور سربلندی کے عصری سامانوں سے اگر لیس ہوتے تو بجائے پُرانے قصبات کی اُجڑی ہوئی مسجدوں، سُونی خانقاہوں کے، یقین جانیے کہ لندن کے انڈیا آفس اور پارلیمان میں وہ نظر آتے، یا کم از کم ہندوستان کی اسمبلیوں، کونسلوں، ہائی کورٹوں کی زیب وزینت بن کر وہ ختم ہو جاتے، بلکہ تجربہ یہ بتا رہا ہے کہ دِین کے جن مدارس میں وقت کے تقاضوں کی رعایت کی گئی، حکومت کی نگاہ میں وہ چڑھ گئے، پھر ان کے ختم ہی کر دینے کا ارادہ کیا گیا، یا ان کو بھی اپنے اغراض ومقاصد کی تکمیل کا ذریعہ بنالیا گیا، چل تو وہ رہے ہیں اب بھی ''دِینی مدارس'' ہی کے نام سے، لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ ان مدارس سے فارغ ہونے

والے کام کس کے آ رہے ہیں؟ یہ سامنے کے واقعے کے مشاہدات ہیں، ہر دیکھنے والی آنکھ ان نتائج کو دیکھ رہی ہے، اور اس وقت سمجھ میں آتا ہے کہ "کہفی رنگ" کے دینی مدارس کے "خضر صفت" بانیوں نے خرق وشگاف کے ان عیوب ونقائص کو ان میں کن مصلحتوں کے تحت باقی رکھا۔ صرف یہی نہیں، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ مسلمان باپوں اور مسلمان ماؤں کے بچوں کو ان کی گودوں سے چھین چھین کر عصری جامعات اور یونیورسٹیوں میں داخل کر کر کے طغیان وسرکشی، اِلحاد وارتداد کے کافرانہ جراثیم ان کے دِل ودماغ میں ایک طرف جہاں پرورش کرنے والے پرورش کر رہے تھے، تو دوسری طرف ان کے مقابلے میں ہمارے یہی کہفی مدارس تھے جنہوں نے مسلمانوں کی آئندہ نسلوں کے ایک طبقے کو، خواہ ان کی تعداد کتنی بھی کم ہو، اعتقادی واخلاقی گندگیوں سے پاک رکھنے کی کامیاب کوشش کی، میں کلّی طہارت وزکوٰۃ اور پاکیزگی کا مدّعی نہیں ہوں، لیکن بایں ہمہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ کہفی سلسلے کی تعلیم گاہوں (مدارس عربیہ) میں تعلیم پانے والوں میں ایسے افراد عموماً پیدا ہوتے رہے ہیں، جو قرآنی الفاظ "خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً" اِعتقادی اور اخلاقی پاکیزگی میں اس کے مصداق بن سکتے ہیں، یعنی اِعتقادی اور اخلاقی پاکیزگی جیسی چاہیے ان کے وہ مالک ہوں یا نہ ہوں، لیکن فتنہ زدہ دجالی یونیورسٹیوں کے طیلسانیوں کی اکثریت کے مقابلے میں نسبتاً اضافی پاکیزگی کے وجود سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اور گو معاشی نقطۂ نظر سے جدید تعلیم گاہوں کے پڑھنے والوں کی حالت بظاہر بہتر ہی کیوں نہ نظر آتی ہو، لیکن دِین کے متعلق ان کی کافی تعداد نے اپنے طرزِ عمل سے خود ہی یہ ثابت کر کے دکھایا کہ اسلام کے لئے ان کا عدم، ان کے وجود سے بہتر تھا، جس قسم کے شکوک وشبہات کی چنگاریاں عام مسلمانوں میں ان کی طرف سے اُڑائی گئیں، اسلامی عقائد واعمال کی تحقیر وتوہین کے سلسلے میں جن ناگفتنیوں اور ناکردنیوں کے وہ مرتکب ہوئے، خود ان ہی نے ان کو اس فیصلے کا مستحق بنادیا کہ اسلام کے ان کپوت فرزندوں کی نیستی ان کی ہستی سے یقیناً بہتر تھی......... اسی طرح خضر علیہ السلام نے اجر ومزد کے خیال سے بالاتر ہو کر تعمیرِ دیوار کا جو عملی نمونہ اس آبادی میں پیش کیا تھا، جس کے باشندوں نے ان کی تحقیر وتوہین کو آخری حدود تک پہنچادیا تھا، آپ چاہیں تو انہی کہفی مدارس میں جو دجالی فتنے کے استیلاء وتسلط کے بعد اس مُلک میں قائم ہوئے، ان میں اس نمونے اور اس کے سارے پہلوؤں کا کسی نہ کسی شکل میں مشاہدہ کرسکتے ہیں، کیسی عجیب بات ہے کہ مسلمانوں ہی کے اسلاف نے معارف وعلوم کا جو متروکہ سرمایہ دُنیا میں چھوڑا تھا، اور حکومت کی دیوار جس وقت اس مُلک میں منہدم ہو رہی تھی، اس وقت مسلمانوں کا یہ موروثی ترکہ بدترین خطرات سے دوچار ہوگیا تھا، آنے والی نسلیں جدید جامعات ویونیورسٹیوں میں بھیڑ کی شکل میں دھنستی چلی جارہی تھیں، "مسلمانان دَر گور ومسلمانی دَر کتاب" کا دردناک نظارہ بے نقاب ہو کر دھمکیاں دے رہا تھا کہ کچھ دِن اور ابھی غفلت سے اگر کام لیا گیا، تو کتابوں والی مسلمانی بھی کیڑوں کے پیٹ میں دفن ہوجائے گی (یعنی دِینی کتابوں کو بھی دیمک چاٹ جائے گی) لیکن چند خضر رَوِش، خضر خصال بزرگوں نے کمرِ ہمت چست کی، وہ یہ تو نہ کرسکے کہ جیسے تیرہ سو سال سے جو کتابیں حکومت کے آئین ودستور کی حیثیت سے استعمال ہو رہی تھیں ان کی اس حیثیت کو باقی رکھیں، لیکن مسلمانوں کے صالح اسلاف کے اس موروثی ترکے کی حفاظت اور ایک نسل سے دُوسری نسل تک اس کو مسلسل منتقل کرنے کا ایسا بندوبست بہرحال انہوں نے کردیا کہ جب کبھی مسلمانوں کی آئندہ نسلوں میں سے کسی نسل کو اپنے پاؤں

پر خود کھڑے ہو جانے کا موقع بھی مل گیا، اور ایمانی ہوش، دینی حواس پھر ان میں کبھی واپس ہوئے تو اس وقت بالکل تر و تازہ حالت میں اپنے اس موروثی ترکے کی ایک ایک چیز ان شاء اللہ تعالیٰ! ان کو مل جائے گی، جس طرح چاہیں گے وہ ان سے اس وقت مستفید ہو سکیں گے۔ اور گو خود مسلمانوں کی طرف سے ان کی عزّت و آبرو کی دھجیاں اُڑائی گئیں، ان کا نام ''مسجد کے ملّانے، خیرات کی روٹیاں توڑنے والے، قل اعوذیے'' غرضیکہ تنابز بالالقاب کی جو صورتیں بھی ممکن تھیں، شاید ہی کوئی صورت ایسی باقی رہ گئی ہے جسے اختیار کرنے والوں نے اس راہ میں اختیار نہ کیا ہو، لیکن بایں ہمہ اُجر و معاوضہ کے خیال سے بلند و بالا ہو کر، یہ میرا مشاہدہ ہے کہ اس خدمت پر جس کی قیمت دوسری جگہ سینکڑوں ہزاروں کی شکل میں مل رہی تھی، بخدا اسی خدمت کو اللہ کے یہ وفادار بندے اور رسول ﷺ کے سچے راست باز، جانباز خدام، بغیر معاوضہ یا قلیل ترین معاوضے کے ساتھ بصد خندہ جبینی انجام دینے میں مشغول رہے......۔

مثلاً حضرت الاستاذ مولانا انور شاہ کشمیری قدس سرّہٗ کو میں نے دیکھا، جب دیوبند میں حدیث کا درس بغیر کسی تنخواہ کے برسوں سے دے رہے تھے، اسی زمانے میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامیات کی صدارت ہزار روپے ماہوار کی تنخواہ کے ساتھ پیش ہوئی، لیکن یہی نہیں کہ خاموشی کے ساتھ انہوں نے اس کو مسترد کر دیا، بلکہ زمانے تک خود مدرسے کے اراکین کو بھی اس کی خبر نہ ہوئی۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق کون یہ باور کرے گا کہ ماہوار ۷۵ روپے ان کے نام سے جو درج تھے، ان میں سے کل ۵۰ روپے لے کر ۲۵ روپے بمد چندہ مدرسے کو واپس فرما دیتے تھے، اور اسی ۵۰ میں مسرت ونشاط کی قابلِ رشک زندگی تقریباً نصف صدی تک بسر کرتے رہے۔ کوئی چاہے تو طویل فہرست دیوار کے ان معماروں کی تیار کر سکتا ہے، جنہوں نے مسلمان کے صالح اسلاف کے موروثی ترکے کو آئندہ نسلوں تک بغیر کسی معاوضے کے یا قلیل ترین معاوضے کے ساتھ پہنچانے کا انتظام کیا۔ نوّر اللہ ضرائحھم۔[1]

''واقعۂ خضر'' پر مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کا تبصرہ

مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ اسی واقعے پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

''پس پردہ حقیقتیں کتنی عجیب وغریب ہوتی ہیں، صورت وحقیقت اور ظاہر و باطن میں کتنا اختلاف ہے، یہ زندگی کتنی پیچیدہ اور اس کی ڈور کتنی اُلجھی ہوئی ہے، کائنات کتنی مبہم، اور زندگی کے معمّے اور پہیلیاں کتنی مشکل ہیں، اور انسان اپنے اس دعویٰ میں کس قدر جری و بے باک ہے کہ اس کے علم نے ہر چیز کا احاطہ کر لیا ہے، اور ہر مسئلے کی حقیقت اور جڑ تک پہنچ گیا ہے۔ پہلی نظر میں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام حقیقت اور واقعے سے کتنے دُور تھے، اور ان کا رویہ اعتدال و توازن سے کتنا مختلف تھا، لیکن انجام کار ان کی فہم ورائے کتنی دُرست اور مطابقِ حقیقت تھی۔ اس سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ یہ زندگی رواں دواں ہے، اس

---

(۱) دیکھیے: ''دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال'' ص ۲۱۰ تا ۲۱۶۔

کے پاس ہر زمانے کے لئے نئے سامان اور نئے عجائبات ہیں، وہ ہر روز اپنے نئے راز کھولتی اور نئے اَسرار ظاہر کرتی ہے۔اس سے یہ بھی آشکارا ہے کہ علم کی کوئی اِنتہا نہیں اور اس کا آخری کنارہ ہماری دسترس سے بہت دُور ہے، وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ۔ یہ قصہ اپنے مضامین و معانی کے ساتھ جو اس میں وارد ہوئے ہیں، اس مادّی فلسفے کو چیلنج کرتا ہے جس کا کہنا یہ ہے کہ زندگی بس وہی کچھ ہے جو ہم نے سمجھا ہے، اور کائنات کا پورا علم ہم کو حاصل ہے، اور حقیقت صرف وہی ہے جو آنکھوں سے نظر آئے، زندگی اور کائنات میں معیار صرف ''ظاہر'' ہے، اور اس پر بے خوف و خطر رائے قائم کی جاسکتی ہے، انسان اس کا حق دار ہے کہ اس دُنیا کا انتظام اس کے حوالے کر دیا جائے، قانون سازی کا حق اس کو حاصل ہو، اس لیے کہ علم، عقل اور مطالعہ و تحقیق ہر چیز میں وہ کامل ہے، اور حقیقت اور علم کی گہرائیوں اور کائنات کی حقیقتوں تک اس کی رسائی ہو چکی۔ تمام مادّی فلسفوں کی ہمیشہ یہی بنیاد رہی، اور جدید اور معاصر تمدن بھی اسی فکر و عقیدہ پر قائم ہے، سورۂ کہف عمومی طور پر اور حضرت خضر و موسیٰ علیہما السلام کا یہ قصہ خصوصی طور پر اس بنیاد پر تیشہ چلاتا ہے، اور اس کو ختم کر دیتا ہے، یہ قصہ حضرت خضر علیہ السلام کے ان آخری الفاظ پر ختم ہوتا ہے: ذٰلِكَ تَأْوِيْلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا۔ ''تاویل'' قرآن مجید کی اِصطلاح میں حقیقت کو کہتے ہیں۔ عجلت، انکار اور غلطی انسان کے مزاج میں ہے، لیکن بالآخر حقیقت سامنے آکر اپنی بالادستی اور جہاں گیری تسلیم کرا دیتی ہے...... چوتھا قصہ جس پر اس سلسلے کا اختتام ہے، ایک ایسے شخص کا قصہ ہے جو اِیمان و صلاح، فائق و برتر قوت، قدرتی وسائل اور انسان کے لئے پیدا کردہ طاقتوں کی تسخیر، تمام چیزوں کا جامع تھا، اور جس نے مفسد و سرکش فاتحین اور ظالم و جابر بادشاہوں کے برخلاف ان وسائل کا استعمال صرف انسانی فلاح، انسانیت کی خدمت اور صالح تہذیب کے قیام کے لئے کیا۔''

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ وَاَتُوْبُ اِلَيْهِ

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ ؕ قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا ﴿٨٣﴾ اِنَّا
آپ سے سوال کرتے ہیں ذُوالقرنین کے متعلق، آپ کہہ دیجئے میں عنقریب تلاوت کرتا ہوں تم پر اس کا ذِکر ﴿٨٣﴾ بے شک ہم نے
مَكَّنَّا لَهٗ فِي الْاَرْضِ وَاٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ﴿٨٤﴾ فَاَتْبَعَ سَبَبًا ﴿٨٥﴾ حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ
اس کو قدرت دی تھی زمین میں اور ہم نے اس کو ہر قسم کا ساز و سامان دیا تھا ﴿٨٤﴾ پھر وہ ایک راستے پر چل پڑا ﴿٨٥﴾ حتّٰی کہ جب وہ پہنچ گیا
مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ وَّوَجَدَ عِنْدَهَا
سورج کے غروب ہونے کی جگہ کو، محسوس کیا ذُوالقرنین نے اس سورج کو ڈُوبتا ہوا ایک سیاہ چشمے میں، اور پایا ذُوالقرنین نے اس جگہ

قَوْمًا ۬ قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِمَّاۤ اَنْ تُعَذِّبَ وَ اِمَّاۤ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا ﴿۸۶﴾ قَالَ اَمَّا مَنْ

ایک قوم کو، ہم نے کہا: اے ذُوالقرنین! یا تُو انہیں عذاب دے یا تُو ان میں اچھا برتاؤ اختیار کر ﴿۸۶﴾ ذُوالقرنین نے کہا: جو شخص

ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا ﴿۸۷﴾

ظلم کرے گا، پس عنقریب ہم اس کو سزا دیں گے، پھر وہ لوٹایا جائے گا اپنے رَبّ کی طرف، پھر سزا دے گا وہ رَبّ اس کو سخت سزا ﴿۸۷﴾

وَ اَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءَ ۟ الْحُسْنٰى ۚ وَ سَنَقُوْلُ لَهٗ

اور جو شخص ایمان لائے اور نیک عمل کرے، اس کے لئے اچھی حالت ہوگی از روئے بدلے کے، اور عنقریب ہم بھی کہیں گے اس کو

مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًا ؕ﴿۸۸﴾ ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۸۹﴾ حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ

اپنے معاملے میں آسان بات ﴿۸۸﴾ پھر وہ ایک راستے پر چل پڑا ﴿۸۹﴾ حتّٰی کہ جب وہ پہنچ گیا سورج کے طلوع ہونے کی جگہ کو،

وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا ۙ﴿۹۰﴾ كَذٰلِكَ ؕ

پایا اس نے اس سورج کو کہ وہ طلوع ہو رہا تھا ایسے لوگوں پر کہ نہیں بنایا تھا ہم نے ان کے لئے سورج کے سامنے کوئی پردہ ﴿۹۰﴾ واقعہ ایسے ہی ہے،

وَ قَدْ اَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ﴿۹۱﴾ ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۹۲﴾ حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ

تحقیق اِحاطہ کیا ہم نے اس چیز کا جو ذُوالقرنین کے پاس تھی از روئے واقفیت کے ﴿۹۱﴾ پھر ایک راستے پر چل پڑا ﴿۹۲﴾ حتّٰی کہ جب

بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمَا قَوْمًا ۙ لَّا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ قَوْلًا ﴿۹۳﴾

وہ پہنچ گیا دو پہاڑوں کے درمیان، پایا اس نے ان دو پہاڑوں کے اِدھر ایک قوم کو جو بات سمجھنے کے قریب بھی نہیں جاتے تھے ﴿۹۳﴾

قَالُوْا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِنَّ يَاْجُوْجَ وَ مَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ

اس قوم نے کہا: اے ذُوالقرنین! بے شک یاجوج اور ماجوج زمین میں فساد مچانے والے ہیں، کیا بنا دیں ہم آپ کے لئے

خَرْجًا عَلٰۤى اَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَ بَيْنَهُمْ سَدًّا ﴿۹۴﴾ قَالَ مَا مَكَّنِّىْ فِيْهِ

خرچ اس شرط پر کہ بنا دے تُو ہمارے اور ان کے درمیان ایک دِیوار ﴿۹۴﴾ ذُوالقرنین نے کہا کہ جس چیز میں مجھے میرے رَبّ نے

رَبِّىْ خَيْرٌ فَاَعِيْنُوْنِىْ بِقُوَّةٍ اَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُمْ رَدْمًا ۙ﴿۹۵﴾

قدرت دی ہے وہ بہتر ہے، پس تم مدد کرو میری قوت کے ساتھ، بناؤں گا میں تمہارے درمیان اور ان کے درمیان ایک موٹی دِیوار ﴿۹۵﴾

اٰتُوْنِيْ زُبَرَ الْحَدِيْدِ ؕ حَتّٰۤى اِذَا سَاوٰى بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ قَالَ

لے آؤ میرے پاس لوہے کے تختے، حتیٰ کہ جب اس نے برابر کر دیا دونوں پہاڑوں کے کناروں کے درمیان والے حصے کو تو کہا:

انْفُخُوْا ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا ۙ قَالَ اٰتُوْنِيْۤ اُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا ؕ﴿۹۶﴾

اب اس کو دھونکو! حتیٰ کہ جب اس نے اس دیوار کو آگ بنا دیا تو کہا: لے آؤ میرے پاس ڈال دوں میں اس کے اُوپر پگھلا ہوا تانبا ﴿۹۶﴾

فَمَا اسْطَاعُوْۤا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ﴿۹۷﴾

پس طاقت نہ رکھی یاجوج ماجوج نے کہ اس کے اُوپر چڑھ جائیں اور نہیں طاقت رکھی انہوں نے اس دیوار کے لئے سوراخ کرنے کی ﴿۹۷﴾

قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ ۚ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ ۚ

ذُوالقرنین نے کہا: یہ میرے رَبّ کی رحمت ہے، جس وقت میرے رَبّ کا وعدہ آجائے گا تو کر دے گا اس دیوار کو ڈھا کے برابر گرا کر،

وَكَانَ وَعْدُ رَبِّيْ حَقًّا ؕ﴿۹۸﴾ وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ وَّنُفِخَ

اور میرے رَبّ کا وعدہ سچا ہے ﴿۹۸﴾ چھوڑ دیں گے ہم لوگوں کے بعض کو اس دِن کہ وہ ٹھاٹھیں مارتے ہوں گے بعض میں، اور صور میں

فِي الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا ۙ﴿۹۹﴾ وَّعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِّلْكٰفِرِيْنَ

پھونک ماری جائے گی، پھر ہم ان سب کو خوب اچھی طرح سے اکٹھا کریں گے ﴿۹۹﴾ اور ہم پیش کریں گے جہنم کو اس دِن کافروں کے لیے

عَرْضَا ۙ﴿۱۰۰﴾ الَّذِيْنَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِيْ غِطَآءٍ عَنْ ذِكْرِيْ وَكَانُوْا لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَمْعًا ؕ﴿۱۰۱﴾

پیش کرنا ﴿۱۰۰﴾ جن کی آنکھیں پردے میں تھیں میری یاد سے، اور وہ سننے کی بھی طاقت نہیں رکھتے تھے ﴿۱۰۱﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ: قرنین یہ قرن کا تثنیہ ہے، اور قرن کہتے ہیں سینگ کو۔ آپ سے سوال کرتے ہیں ذُوالقرنین کے متعلق، لفظی معنی اس کا ہے''دو سینگوں والے کے متعلق'' قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا: آپ کہہ دیجئے کہ میں عنقریب تلاوت کرتا ہوں تم پر اس ذُوالقرنین کا ذکر۔ مِنْهُ کی ضمیر ذُوالقرنین کی طرف لوٹ گئی، ذکرًا یہ اَتْلُوْا کا مفعول ہے، میں ایک یادداشت اس کی تمہارے اُوپر پڑھتا ہوں، اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ: بے شک ہم نے اس کو قدرت دی تھی، فِي الْاَرْضِ: زمین میں وَاٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا: سبب اصل کے اعتبار سے ایسی چیز کو کہتے ہیں جو دوسرے کام کرنے کا ذریعہ بنے، اس کی جمع اسباب آتی ہے۔ جو مقصد تک پہنچنے کے لئے ذریعہ ہو اس کو سبب کہا جاتا ہے، اسی لیے ہر قسم کے ساز و سامان کے لئے بھی''سبب'' کا لفظ

بول دیتے ہیں، راستے کے لئے بھی ''سبب'' کا لفظ بولتے ہیں، یہاں ''سبب'' ساز وسامان کے معنی میں ہے، وَاٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا: ہم نے اس کو ہر قسم کا ساز وسامان دیا تھا، ہر چیز سے ہم نے اس کو سبب دیا تھا، یعنی ہر چیز سے اس کو ساز وسامان دیا تھا، جو مقاصد اس کے تھے بادشاہ ہونے کی حیثیت سے ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے جس قسم کے ساز وسامان کی ضرورت تھی وہ ہم نے اسے دیا تھا۔ فَاَتْبَعَ سَبَبًا: اس کا معنی یوں بھی کیا گیا ہے: ''پھر وہ ایک راستے پہ چل پڑا'' سبب راستے کو بھی کہتے ہیں کیونکہ یہ بھی اپنی منزل تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہوتا ہے، اور اگر سبب کا معنی یہاں بھی ساز وسامان کرنا ہو تو ساز وسامان کے پیچھے لگنے کا مطلب یہ ہے کہ اس نے ساز وسامان تیار کیا، یعنی ایک لڑائی کا ارادہ کیا اور اس لڑائی کے لئے ساز وسامان تیار کیا، فَاَتْبَعَ سَبَبًا کا یہ معنی بھی کیا جاسکتا ہے۔ حضرتِ شیخ (الہند ﷫) نے یہاں ''سبب'' کا معنی سامان ہی کیا ہے ''پھر پیچھے پڑا ایک سامان کے''، اور بعض تراجم (''بیان القرآن'' وغیرہ) کے اندر ''سبب'' کا معنی راستے سے کیا گیا ہے ''پھر وہ ایک راستے کے پیچھے لگا، ایک راستے پہ چل پڑا''، اور ''پیچھے پڑا سامان کے'' اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے ساز وسامان تیار کیا لڑائی کے ارادے سے، حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ: اگر سبب کا معنی راستہ کریں تو پھر اس کا مطلب یوں ہوجائے گا کہ وہ ایک راستے کے پیچھے لگ گیا، راستے کی اس نے اتباع کی، حتیٰ کہ جب پہنچ گیا وہ سورج کے غروب ہونے کی جگہ کو۔ اور اگر ''سبب'' سے ساز وسامان مراد ہے تو پھر حتیٰ کا معنیٰ نکالنا پڑے گا کہ اس نے ساز وسامان تیار کیا اور ایک لڑائی کے ارادے سے علاقے کو فتح کرتا ہوا چلا گیا حتیٰ کہ جب سورج کے غروب ہونے کی جگہ کو پہنچ گیا۔ سورج کے غروب ہونے کی جگہ کو پہنچنے کا مطلب یہ ہے کہ مغرب کی طرف وہ چلتا گیا حتیٰ کہ خشکی کی آبادی ختم ہوگئی، آگے سمندر کا علاقہ آ گیا، وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ: محسوس کیا ذُوالقرنین نے اس سورج کو ڈوبتا ہوا ایک سیاہ چشمے میں، عین چشمے کو کہتے ہیں اور حَمِئَةٍ: سیاہ کیچڑ والا چشمہ۔ سورج کو سیاہ چشمے میں ڈوبتا ہوا پایا، وَجَدَ: یعنی یہ خود اس ذُوالقرنین کا وجدان ہے، اور آپ بھی مغرب کے وقت سمندر کے کنارے چلے جائیں، تو آپ کو بالکل اپنے سامنے مشاہدے کے طور پر یہ بات معلوم ہوجائے گی کہ سورج سمندر میں اُتر رہا ہے، اور جیسے آپ چٹیل میدان میں کھڑے ہوں اور سامنے کوئی پہاڑ یا درخت کی رکاوٹ نہ ہو، تو دیکھنے والا یوں محسوس کرتا ہے کہ جیسے سورج زمین میں دھنستا چلا جا رہا ہے، یہ اپنا وجدان ہوتا ہے، واقعہ ایسا نہیں ہوتا، نہ سورج سمندر میں ڈوبتا ہے، نہ زمین میں دھنستا ہے، سمندر میں اور سورج میں کروڑوں میلوں کا فاصلہ ہے، لیکن وجدان آپ کا یہی ہے، محسوس آپ یہی کریں گے کہ یہ دریا میں اور سمندر میں اُترتا جا رہا ہے، یہاں مقصد یہی ہے کہ اس کے آگے آبادی نہیں تھی، سورج جو غروب ہو رہا تھا تو ایسے لگتا تھا جیسے سیاہ کیچڑ والے چشمے میں اُترتا جا رہا ہے، سمندر کے کنارے اگر کھڑے ہوں تو ایسے ہی لگا کرتا ہے۔ وَّوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا: پایا ذُوالقرنین نے اس جگہ ایک قوم کو، یعنی اسی عین حمئہ کے پاس ایک قوم آباد تھی۔ قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ: ہم نے کہا کہ اے ذُوالقرنین! اِمَّاۤ اَنْ تُعَذِّبَ وَاِمَّاۤ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا: اِمَّا کا مطلب یہ ہوا کہ تجھے دو اختیار ہیں، یا تو عذاب دے، انہیں سزا دے، قتل وغارت کر، یا تو ان میں حسن اختیار کر، اچھا برتاؤ اختیار کر، اتخاذِ حسن سے اچھا برتاؤ مراد ہے، یعنی نرمی کر، سختی نہ کر، قتل وغارت نہ کر۔ یہ جو قُلْنَا ہے کہ ہم نے کہا، ذُوالقرنین کے متعلق چونکہ جمہور مفسرین یہی کہتے ہیں کہ یہ نبی نہیں تھے، اللہ کے مقبول بندے تھے، نیک تھے، مؤمن تھے، آخرت پر ان کا یقین تھا، تو قُلْنَا کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ اس وقت کے نبی کی

وساطت سے یہ بات اللہ تعالیٰ نے انہیں پہنچائی (مظہری)۔ قُلْنَا کا یہ معنی بھی ہوسکتا ہے کہ اس کے دل میں ہم نے الہام کیا، دل میں یہ بات ڈال دی (جلالین)۔ اور ''قُلْنَا'' ایک حال کی تعبیر بھی ہوسکتی ہے، کہ اس کو اس طرح سے ہم نے غلبہ دیا، گویا کہ ہم نے یوں کہہ دیا کہ اس قوم پر تجھے اختیار ہے، چاہے ان کو سزا دے، چاہے ان سے نرمی برت، تجھے کوئی روکنے والا نہیں (تفسیر عثمانی)۔ یہ ان کے ہر طرح سے غالب آنے کی طرف اشارہ ہے کہ ہماری طرف سے اس کو اختیار مل گیا، اگر وہ چاہتا تو ان کو قتل کرتا، غارت کرتا، سزا دیتا، اور چاہتا تو ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتا، تو پھر یہ قول تکوینی ہے، کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ بات ہوگئی کہ اب اس کو ہر طرح سے اختیار حاصل ہے، چاہے ان کو سزا دے چاہے تو ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے، یہ اس کے غلبے کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو مکمل تسلط اس قوم کے اوپر حاصل ہوگیا۔ ''ہم نے کہا کہ اے ذُوالقرنین! یا تو عذاب دے، یا اختیار کر ان کے بارے میں حُسن، اچھا برتاؤ۔'' قَالَ: ذُوالقرنین نے کہا أَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهُ: یہ اس کے دل کے داعیہ کا بیان ہوجائے گا، کہ جب اس کو مکمل اختیارات حاصل ہوگئے تو اس نے اپنے دل میں یہ بات طے کی۔ ''کہا اس ذُوالقرنین نے کہ جو شخص ظلم کرے گا پس عنقریب ہم اس کو سزا دیں گے'' ثُمَّ يُرَدُّ إِلَىٰ رَبِّهِ: پھر وہ لوٹایا جائے گا اپنے رَبّ کی طرف فَيُعَذِّبُهُ عَذَابًا نُّكْرًا: پھر سزا دے گا وہ رَبّ اس کو سخت سزا، عذابِ نُکر: سخت سزا۔ یعنی ہم دنیا میں بھی ظالم کو سزا دیں گے، اور پھر آخرت میں اللہ کے ہاں جا کے بھی عذاب پائے گا۔ یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آخرت کا قائل تھا۔ وَأَمَّا مَنْ آمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا: اور جو شخص ایمان لائے اور نیک عمل کرے فَلَهُ جَزَاءً الْحُسْنَىٰ: فلہ الحسنٰی جزاءً۔ جزاءً منصوب ہے، الْحُسْنَىٰ جزاء کی صفت نہیں، کیونکہ آپ پڑھتے ہیں کہ نکرہ کی صفت معرفہ نہیں آیا کرتی، جزاء نکرہ ہے اور الحسنٰی معرفہ ہے، شروع میں الف لام ہے، اس لیے معنی یہ ہوگا: فَلَهُ الْحُسْنَىٰ جزاءً، اس کے لیے اچھی حالت ہے از روئے بدلے کے، بدلے کے طور پر اس کے لئے اچھی حالت ہوگی، یعنی آخرت میں بھی وہ اچھی حالت میں ہوگا، وَسَنَقُولُ لَهُ مِنْ أَمْرِنَا يُسْرًا: اور عنقریب ہم بھی کہیں گے اس کو اپنے معاملے میں آسان بات، ہم بھی اس کے ساتھ نرم برتاؤ کریں گے۔ ثُمَّ أَتْبَعَ سَبَبًا: پھر اس نے سامان کی اتباع کی، یعنی کوئی اور ساز و سامان تیار کیا دوسری جنگ کے لئے۔ یا یہ ہے کہ ایک اور راستے پر چل پڑا، یہ سَبَبًا دوسرا راستہ ہوگا، نکرہ کا تکرار نکرہ کے ساتھ ہو تو ثانی غیرِ اُولیٰ ہوتا ہے جیسے آپ ضابطہ پڑھتے رہتے ہیں۔ تو سَبَبًا سے اگر راستہ مراد ہو تو یہ اُس راستے کے علاوہ دوسرا راستہ ہے، اور اگر سامان مراد ہو تو پھر اس کی وہی مراد ہے کہ اس نے ساز و سامان تیار کیا۔ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ: اب یہ سفر اس کا مشرق کی طرف ہوا۔ حتیٰ کہ جب پہنچ گیا وہ سورج کے طلوع ہونے کی جگہ کو، وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلَىٰ قَوْمٍ: پایا اس نے اس سورج کو کہ وہ طلوع ہو رہا تھا ایسے لوگوں پر لَّمْ نَجْعَل لَّهُم مِّن دُونِهَا سِتْرًا: نہیں بنایا تھا ہم نے ان لوگوں کے لئے سورج کے سامنے کوئی پردہ، وہ ایسے لوگ تھے کہ ان کے پاس مکانات نہیں تھے، خیمے نہیں تھے، وہ سورج کے سامنے کوئی پردہ بنانے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے، ایسے ہی میدانوں میں پڑے رہتے تھے، یعنی ان کو مکانات اور خیمے بنانے کا سلیقہ نہیں تھا، سورج اور ان کے درمیان میں کوئی اوٹ نہیں ہوتی تھی، وحشی قوموں کی طرح ایسے ہی میدان میں پڑے رہتے۔ كَذَٰلِكَ: واقعہ ایسے ہی ہے، وَقَدْ أَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا: تحقیق احاطہ کیا ہم نے اس چیز کا جو ذُوالقرنین کے پاس تھی از روئے واقفیت کے۔ خُبر کہتے ہیں واقفیت کو، جیسے یہ لفظ ابھی آپ کے سامنے خضر علیہ السلام کے واقعے میں بھی آیا تھا وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلَىٰ مَا لَمْ تُحِطْ بِهِ

خُبْرًا۔ تو خُبر واقفیت کو کہتے ہیں۔ مَا لَدَیْہِ: جو کچھ اس کے جذبات تھے، جو کچھ اس کے حالات تھے، جو کچھ اس کے پاس ساز و سامان تھا، مَا لَدَیْہِ سب کو شامل ہے، خیالات جذبات تک کے لئے یہ لفظ بولا جاتا ہے جیسے قرآن کریم میں دوسری جگہ لفظ آئے گا کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَیْهِمْ فَرِحُوْنَ (سورۂ روم: ۳۲) ہر گروہ اپنے اپنے نظریات اور اپنے اپنے عقیدوں پر خوش ہے کہ جو کچھ ہم نے اختیار کر رکھا ہے یہی بہتر ہے، تو مَا لَدَیْ سب پر بولا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ ذُوالقرنین کے پورے حالات اور اس کے ساز و سامان سے ہم پوری طرح واقف ہیں، اس لیے ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں ٹھیک کہہ رہے ہیں، اور ہم نے اگر اس کو جو یہ شان دی تھی اور اس طرح سے غلبہ جو دیا تھا، تو ہم اس کے حالات کو پوری طرح سے جانتے تھے۔ ''تحقیق احاطہ کیا ہم نے اس چیز کا جو اس ذُوالقرنین کے پاس تھی اَز روئے واقفیت کے'' ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا: یہ تیسرا سفر آ گیا۔ پھر اس نے ساز و سامان تیار کیا، کسی تیسری مہم کے لئے۔ مفسرین کہتے ہیں کہ یہ جانبِ شمال میں تھی، پہلا سفر مغرب کی جانب ہوا، دُوسرا سفر مشرق کی طرف ہوا، اور یہ سفر جانبِ شمال میں ہے۔ شمال ہوتا ہے مشرق کی طرف منہ کر کے بایاں ہاتھ، تو یہ تیسرا سفر شمال کی طرف ہوا، حَتّٰۤی اِذَا بَلَغَ بَیْنَ السَّدَّیْنِ: حتیٰ کہ جب وہ پہنچ گیا دو دیواروں کے درمیان۔ ''سدّ'' دیوار کو کہتے ہیں، یہاں دو پہاڑ مراد ہیں۔ جب وہ دو پہاڑوں کے درمیان پہنچ گیا، وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمَا قَوْمًا: پایا اس نے ان دونوں پہاڑوں کے اِدھر ایک قوم کو، مِنْ دُوْنِهِمَا: ورے، اِس طرف۔ پرلی طرف نہیں، اِس طرف۔ ''پرلی جانب اور ورلی جانب'' ورلی جانب ہوگئی اپنی طرف کی، پرلی ہوگئی دوسری طرف کی۔ پایا ان دونوں پہاڑوں کے اِدھر ایک قوم کو لَّا یَكَادُوْنَ یَفْقَهُوْنَ قَوْلًا: لا یکادون یہ افعالِ مقاربہ میں سے ہے۔ وہ بات سمجھنے کے قریب بھی نہیں جاتے تھے، نہیں قریب جاتے تھے کہ سمجھیں وہ بات، یعنی اتنی اُجڈ قوم تھی کہ وہ کوئی کسی قسم کی بات نہیں سمجھتی تھی۔ قَالُوْا یٰذَا الْقَرْنَیْنِ: اس قوم نے کہا، کسی ترجمان کی وساطت سے، کہ اے ذُوالقرنین! اِنَّ یَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ: بے شک یاجوج اور ماجوج زمین میں فساد مچانے والے ہیں، فِی الْاَرْضِ سے مراد ان کا اپنا علاقہ ہے جہاں وہ قوم آباد تھی، یعنی انہوں نے کہا کہ اے ذُوالقرنین! یاجوج اور ماجوج ہمارے علاقے میں آ کے فساد مچاتے ہیں۔ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا: خرج خرچ کے معنی میں ہے۔ کیا ہم آپ کے لئے کچھ خرچ جمع کر دیں؟ کوئی خراج جمع کر دیں؟ کیا بنا دیں ہم آپ کے لئے کوئی خرج؟ عَلٰۤی اَنْ تَجْعَلَ بَیْنَنَا وَبَیْنَهُمْ سَدًّا: اس شرط پر کہ بنا دے تُو ہمارے اور ان کے درمیان ایک دیوار، یہ جو دو پہاڑوں کے درمیان میں راستہ ہے جدھر سے وہ آ کے ہمارے اُوپر حملے کرتے ہیں، تو ان دو پہاڑوں کے درمیان میں ایک دیوار قائم کر دے، ہم تجھے کچھ خرچ دے دیتے ہیں۔ قَالَ مَا مَكَّنِّیْ فِیْهِ رَبِّیْ خَیْرٌ: ''ما'' موصولہ ہے۔ ذُوالقرنین نے کہا: جس چیز میں مجھ کو میرے رَبّ نے قدرت دی ہے وہ بہتر ہے، یعنی میرے پاس اللہ کا دیا ہوا بہت مال و دولت ہے، فَاَعِیْنُوْنِیْ بِقُوَّةٍ: پس تم میری اعانت کرو، مدد کرو میری قوت کے ساتھ، یہاں ''قوت'' سے بدنی زور مراد ہے، پیسے کی تو ضرورت نہیں البتہ مزدور مہیا کرو، لیبر مہیا کرو، بدنی قوت والے لوگ مہیا کرو جو کام کریں۔ اَجْعَلْ بَیْنَكُمْ وَبَیْنَهُمْ رَدْمًا: بنادوں گا میں تمہارے درمیان اور ان کے درمیان ایک موٹی دیوار۔ رَدم موٹی دیوار کو کہتے ہیں۔ اٰتُوْنِیْ زُبَرَ الْحَدِیْدِ: زُبَرٌ یہ جمع ہے زُبْرَۃٌ کی، زُبرۃ کہتے ہیں ٹکڑے کو، زُبَرَ الْحَدِیْدِ کا معنی لوہے کی سلیں، لوہے کے ٹکڑے، لوہے کی چادریں۔ لے آؤ میرے پاس لوہے کے تختے۔ اپنی طرف سے پیسے دیے ہوں گے کہ لوہے کی چادریں، لوہے کے تختے مہیا کرو

حَتّٰٓى اِذَا سَاوٰى بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ حتیٰ کہ جب اس نے برابر کردیا اس حصے کو جو صدفین کے درمیان تھا۔ صدفین: پہاڑوں کے دونوں کنارے۔ ایک پہاڑ ادھر آ کے ختم ہوتا ہے، ایک ادھر آ کے ختم ہوتا تھا، یہ درّہ بنا ہوا تھا، تو یہ صدفین ہیں، یہ بھی صدف اور یہ بھی صدف، اس کے درمیان والے حصے کو جب اس نے برابر کردیا۔ دونوں پہاڑوں کے دونوں کناروں کے درمیان والے حصے کو جب اس نے لوہے کی سلوں کے ساتھ بھر کے برابر کردیا، قَالَ انْفُخُوْا: پھر ذُوالقرنین نے کہا اب اس کو دھونکو، اس کو دھونی دو، اس کے اُوپر آگ جلاؤ، گرم کرو اس دیوار کو، حَتّٰٓى اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا: حتیٰ کہ جب اس نے اس دیوار کو آگ بنا دیا، یعنی اس کو اتنی آگ دی کہ وہ لوہا بالکل آگ کی طرح ہوگیا قَالَ: ذُوالقرنین نے کہا اٰتُوْنِيْٓ اُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا: لے آؤ میرے پاس، ڈال دوں میں اس کے اُوپر پگھلا ہوا تانبا۔ قطر کہتے ہیں پگھلے ہوئے تانبے کو۔ اور اٰتُوْنِيْٓ اور اُفْرِغْ یہ دونوں فعل تنازع کر رہے ہیں قِطْرًا میں، قِطْرًا دونوں کا مفعول ہے، یہاں تنازع فعلین ہے۔ لے آؤ میرے پاس پگھلا ہوا تانبا، ڈال دوں میں اس پر پگھلا ہوا تانبا۔ قِطْرًا دونوں کا مفعول ہے، ایک کا براہِ راست مفعول بنا دیں گے، دوسرے کے لئے ضمیر نکالیں گے، تو معنی یوں ہوں گا ''میرے پاس لے آؤ پگھلا ہوا تانبا، ڈال دوں میں اس کے اوپر پگھلا ہوا تانبا'' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے تانبا بھی پگھلا رکھا تھا، اور دیوار جس وقت گرم ہوگئی تو اس وقت کے آلات کے ساتھ اس تانبے کو اُٹھایا گیا، اور اس دیوار کے اُوپر ڈالا گیا، اور وہ لوہے کے سلوں کی درزوں میں داخل ہوگیا، تو اس طرح سے آپس میں جڑ گئیں جس طرح سے آج کل ویلڈ کر کے جوڑتے ہیں، جس طرح سے آپ سیمنٹ لگا کے اینٹیں جوڑا کرتے ہیں، تو وہ لوہے کی درزوں کے درمیان میں پگھلا ہوا تانبا جو ڈال دیا گیا تو وہ آپس میں اچھی طرح سے جڑ گئیں۔ فَمَا اسْطَاعُوْٓا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ: اِسْطَاعُوْا اصل میں استطاعوا تھا۔ ''تا'' تخفیفاً گرائی ہوئی ہے، اور اسْطَاعُوْٓا کی ضمیر یاجوج ماجوج کی طرف لوٹ رہی ہے۔ پس طاقت نہ رکھی یاجوج ماجوج نے کہ اس کے اوپر چڑھ جائیں، وہ دیوار کے اوپر چڑھ بھی نہ سکے، وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا، اور نہیں طاقت رکھی انہوں نے اس دیوار کے لئے سوراخ کرنے کی، نقب بھی نہ لگا سکے، نقب: سوراخ کرنا، جیسے چور مکانوں میں نقب لگایا کرتے ہیں، تو نقب لگانے کی بھی انہوں نے طاقت نہ رکھی کہ اس میں سوراخ کر لیتے۔ قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ: ذُوالقرنین نے کہا کہ یہ میرے رَبّ کی رحمت ہے، یعنی اتنا بڑا کام جو میرے ہاتھ سے ہوگیا، تو اس نے گویا کہ دجالی قسم کے لوگوں کی طرح اس کو اپنا کمال قرار نہیں دیا، بلکہ کہا کہ اللہ کی رحمت سے یہ پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا، جیسے نیک لوگوں کی اللہ والوں کی عادت ہوتی ہے کہ ان کے ہاتھ سے جو کام بھی ہوجائے اس کی نسبت اللہ کی طرف کرتے ہیں۔ یہ میرے رَبّ کی رحمت ہے۔ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّيْ جس وقت میرے رَبّ کا وعدہ آجائے گا جَعَلَهٗ دَكَّآءَ: تو کردے گا اس دیوار کو ڈھا کے برابر۔ دکاء کا معنی جس کو کوٹ کے برابر کردیا جائے۔ اصل میں عربی میں لفظ آتا ہے: نَاقَةٌ دَكَّاءُ (مظہری)، ایسی اُونٹنی جس کی کوہان کمر کے برابر ہوگئی ہو، کوہان نیچے بیٹھ گئی ہو، جس طرح سے اُونٹ کمزور ہوجاتا ہے تو اس کی کوہان ختم ہوجاتی ہے، تو ناقہ دکاء وہ ہوتی ہے جس کی کوہان بلند نہ رہے بلکہ وہ کمر کے برابر آجائے، تو دکاء معنی ہوگا کہ ڈھا کے اس کو برابر کردیں گے، یہ دیوار گر جائے گی۔ وَعْدُ رَبِّيْ: جو بھی میرے رَبّ کا وعدہ ہے، اس دیوار کے ٹوٹنے کا جب وقت آجائے گا، یا قیامت کا وعدہ جب آجائے گا تو ٹوٹ پھوٹ جائے گی، تو گویا کہ اس بات کی طرف اشارہ کردیا کہ اس کو بھی کوئی دوام نہیں، جس طرح سے باغ والے کے قصے میں آیا تھا کہ مَآ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖٓ اَبَدًا، یہ مشرکانہ ذہن

ہے، کہ جب اسباب مہیا ہیں تو یہ کبھی بھی ہلاک ہونے والا نہیں، ایسی بات نہیں، جب اللہ کے وعدے کا وقت آجائے گا تو اس کو ڈھا کے برابر کر دے گا۔ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّي حَقًّا: اور میرے رَبّ کا وعدہ سچا ہے۔ وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَمُوجُ فِي بَعْضٍ: مَاجَ يَمُوجُ موجیں مارنا۔ تَرَكْنَا ماضی کا صیغہ ہے، اور یہاں اس کا ترجمہ مضارع کے ساتھ کیا گیا ہے، تحقق وقوع کے طور پر ماضی کا صیغہ لایا گیا ہے۔ چھوڑ دیں گے ہم لوگوں کے بعض کو اس دِن کہ وہ ٹھاٹھیں مارتے ہوں گے بعض میں، چھوڑ دیں گے ہم اس دِن جس دن کہ رَبّ کا وعدہ آجائے گا ان کے بعض کو کہ وہ جوش مارتے ہوں گے بعض میں، یعنی آپس میں گڈمڈ ہو جائیں گے، گتھم گتھا ہو جائیں گے، آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ خلط ملط ہو جائیں گے، جس طرح سے سمندر میں موجیں اٹھتی ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ ٹکراتی ہیں، بس یہی کیفیت ان قوموں کی پیدا ہو جائے گی۔ وَنُفِخَ فِي الصُّورِ: اور صور میں پھونک ماری جائے گی، فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا: پھر ہم ان سب کو خوب اچھی طرح سے اکٹھا کریں گے۔ جَمْعًا یہ تاکید کے طور پر ہے۔ وَعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِّلْكٰفِرِينَ عَرْضًا: اور پیش کریں گے ہم جہنم کو اس دِن کافروں کے لئے پیش کرنا، الَّذِينَ كَانَتْ أَعْيُنُهُمْ فِي غِطَآءٍ عَنْ ذِكْرِي: وہ کافر کہ جن کی آنکھیں پردے میں تھیں میری یاد سے۔ غطاء پردے کو کہتے ہیں، سورۂ ق میں بھی یہ لفظ آئے گا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ (آیت:۲۲)۔ وَكَانُوا لَا يَسْتَطِيعُونَ سَمْعًا: اور وہ سننے کی بھی طاقت نہیں رکھتے تھے۔ نہ وہ کان سے سن سکتے تھے، نہ آنکھوں سے دیکھ سکتے تھے، آج ہم ان کو جہنم دکھا بھی دیں گے، اور وہاں کے حالات سنا بھی دیں گے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ

''ذُوالقرنین'' کا تعارف

سورۂ کہف کے واقعات میں سے یہ چوتھا واقعہ ہے جو اس رکوع میں نقل کیا گیا، یہ ہے ذُوالقرنین کا قصہ، اور يَسْـَٔلُونَكَ کے لفظ سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ سرورِ کائنات ﷺ پر یہ بھی سوال کیا گیا تھا، ذوالقرنین کے متعلق پوچھا گیا تھا۔ یہ پوچھنے والے کون تھے؟ بظاہر معلوم یہ ہوتا ہے کہ سوال کرنے والے تو مشرکینِ مکہ تھے، لیکن یہ سوال کیا گیا تھا یہود کی تلقین سے، مشرکینِ مکہ یہود سے باتیں سیکھ سیکھ کے آتے تھے، اور سرورِ کائنات ﷺ کے سامنے ذکر کرتے تھے آپ کو پریشان کرنے کے لئے، اور اس لیے کہ یہ بہت پیچیدہ پیچیدہ واقعات ہیں، اگر کسی کا جواب نہ دے سکے، تو ہم انہیں کہیں گے کہ پھر تم کیسے نبی ہوئے؟ تم جو کہتے ہو کہ اللہ کی طرف سے مجھے علم دیا جاتا ہے، تو پھر اب تمہیں علم کیوں نہیں دیا گیا؟ اصحابِ کہف کے متعلق بھی ایسے ہی پوچھا گیا، رُوح کے متعلق بھی ایسے ہی پوچھا گیا، ذُوالقرنین کے متعلق بھی ایسے ہی پوچھا گیا۔

یہ ذُوالقرنین کون ہے؟ یہ ایک معروف سوال ہے، تاریخ میں بہت سارے بادشاہ ایسے گزرے ہیں کہ جن کو بہت جاہ وجلال حاصل ہوا، اور ان کی فتوحات بہت زیادہ ہیں، جن میں سے کئی ایک تو سکندر کے نام سے مشہور ہیں، سکندر ودارا کے واقعات

تاریخ میں مذکور ہیں، بڑے بڑے بادشاہ گزرے ہیں جنہوں نے بڑے علاقے فتح کئے، لیکن یہ ذوالقرنین لقب کا جو بادشاہ ہے اس کے متعلق عام طور پر مفسرین کی رائے، خصوصیت کے ساتھ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ ''قصص القرآن'' والے، انہوں نے بہت تفصیل کے ساتھ اس واقعہ کو لکھا ہے، ''قصص القرآن'' میں دیکھیں تو اس میں تفصیل ہے، یاجوج ماجوج کی بھی، ذُوالقرنین کی بھی اور اَصحابِ کہف کی بھی، اِبتدا میں جس طرح سے میں نے آپ کو تعارف کرایا تھا۔ تو یہ کہتے ہیں کہ تاریخی روایات اور اِنجیل اور دیگر آسمانی صحف کے مطالعہ سے جو بات سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ ایران کے علاقے میں ایک بادشاہ گزرا ہے جس کا نام سائرس، اور بعض جگہ اس کو خورس کے لفظ سے ذکر کیا گیا ہے، اور بعض جگہ اس کو ''کَیخسرو'' کے لفظ کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، اور گورش کے لفظ کے ساتھ بھی اس کا ذکر کتابوں میں آتا ہے، یہ ایران کے علاقے میں ایک بادشاہ گزرا ہے۔ آپ حضرات کو شاید یاد نہیں، اس وقت ابھی آپ اتنے ہوش میں نہیں ہوں گے، ہمارے پاکستان میں جس وقت صدر یحیٰی کی حکومت تھی، اس وقت (۱۹۷۱ء میں) شاہِ ایران نے ایک جشن منایا تھا اڑھائی ہزار سالہ، تو اس نے اپنے آپ کو اس وقت سائرس کی اولاد میں ظاہر کیا کہ میں سائرس کی اولاد میں سے ہوں، اور اڑھائی ہزار سال قبل سائرس یہاں موجود تھا، اور اس نے اس ایرانی حکومت کی بنیاد رکھی تھی، تو اس نے اپنے آپ کو اس کی نسل سے ثابت کرنے کی کوشش کی تھی، تو اخبارات میں اس وقت تفصیلات آئی تھیں، تو اس بادشاہ کو سائرس کے نام کے ساتھ ہی ذکر کیا گیا تھا، اور ہمارے مفسرین بھی لکھتے ہیں کہ یہ مسیح علیہ السلام سے چھ سات سو سال پہلے کا ہے، تو اس حساب سے جب اس نے جشن منایا تھا تو اس وقت تقریباً اڑھائی ہزار سال اس کی تاریخ کو ہو جاتے ہیں، یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد اور عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے کا ہے، اور یہود کے اوپر جو شدید قسم کے واقعات آئے تھے، جن کا ذکر آپ کے سامنے سورۂ بنی اسرائیل میں آیا تھا، اللہ تعالیٰ نے کہا تھا کہ تم فساد کرو گے، میں تمہارے اوپر اپنے سخت بندے مسلط کر دوں گا، تو بخت نصر کا واقعہ جب پیش آیا، جب یہ بیت المقدس کو لوٹ گیا تھا، یہودیوں کو قتل کر گیا تھا، اور بچے کھچوں کو پکڑ کے لے گیا تھا، تو بخت نصر کے زمانے میں یہ سائرس ہوا ہے، اور اس نے بخت نصر کو شکست دے کے یہودیوں کو آزاد کروایا، اس لیے یہودی اس کو اپنا نجات دہندہ سمجھتے ہیں، اور اس کے حالات سے دلچسپی رکھتے تھے، اس وجہ سے انہوں نے یہ کہا کہ اس کے متعلق پوچھو کہ ان کو کیا معلوم ہے کہ اس کے کیا حالات ہیں؟ تو یہ صحف جس قسم کے اہل کتاب نے جمع کر رکھے ہیں، یہ جو عہد نامہ قدیم اور جدید کے ساتھ بعض صحیفے لگے ہوئے ہیں، ان میں بھی اس کا کچھ ذکر ملتا ہے، یہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہوا ہے اس لیے تورات میں تو اس کا ذکر نہیں ہو سکتا، دوسرے صحف کے اندر اس کا ذکر ہے، عیسیٰ علیہ السلام سے چھ سات سو سال پہلے کا یہ واقعہ ہے۔

اس وقت دو سلطنتیں بہت بڑی تھیں، ایک سلطنت کو ''میڈیا'' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، اور دوسری سلطنت کو ''لیڈیا'' کے نام سے تعبیر کیا ہے، یعنی ایک ترکستان کی طرف تھی، ایک عراق اور شام کی طرف تھی، اس نے ان دونوں سلطنتوں کو فتح کر کے ایک سلطنت قائم کی، جس کی بنا پر اس کو ''ذُوالقرنین'' کہتے ہیں، ''ذُوالقرنین'' کا لفظی معنی تو ہے ''دو سینگ والا''، لیکن اشارہ دو سلطنتوں کی طرف ہے جن کو فتح کر کے اس نے ایک سلطنت قائم کی، کہتے ہیں کہ کچھ زمانہ قبل ایک ''اصطخر'' نامی شہر میں کھنڈرات کی

کھدائی کی گئی، تو وہاں سے ایک بُت بنا ہوا نکلا ہے، جس طرح سے پُرانے زمانے میں بڑے لوگوں کی پتھر کی تصویریں بنا کے رکھ لیا کرتے تھے، تو اس کے سر کے اُوپر ایک تاج ہے، اور تاج کے اُوپر دو سینگ بنے ہوئے ہیں، جس سے تائید ہوتی ہے کہ یہ ذُوالقرنین کی ہی کوئی تصویر ہے جو اس زمانے میں بنائی گئی تھی، اور یہ کھنڈرات میں دبی ہوئی دریافت ہوئی ہے، تو دو سینگ والا اس کو اس لیے کہتے ہیں کہ اس نے دو بڑی بڑی سلطنتوں کی فتح کر کے ایک سلطنت قائم کی تھی، یا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مشرق اور مغرب تک اس کی سلطنت پھیلی ہوئی تھی۔ بہر حال مقبول بادشاہ تھا، اللہ کا نیک بندہ تھا، لیکن نبی نہیں، جمہور مفسرین کا خیال یہی ہے کہ یہ نبی نہیں، البتہ مقبول بندہ تھا، اور بنی اسرائیل کے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ یہ عقیدت رکھتا تھا، ایران میں ایک مذہبی راہنما گزرا ہے زردشت، جس کی طرف ایرانی منسوب تھے اور آتش پرست تھے، یہ اس کا ہم عصر ہے، کہتے ہیں کہ وہ بھی اچھا آدمی تھا لیکن اس کے مذہب کو بعد کے لوگوں نے محرف کر لیا، اور اس کی طرف غلط باتیں منسوب کر دیں، جس طرح سے اب عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف غلط مسلک کو منسوب کر کے مشرک بنے بیٹھے ہیں، تو اسی طرح سے زردشت کے ماننے والے بھی بعد میں مشرک ہو گئے، ورنہ بذاتِ خود وہ اچھا آدمی تھا، اور سائرس اور اس کا دور ایک ہے۔ یہ کچھ تاریخی معلومات ہیں۔

ذُوالقرنین کے اَسفار

بہر حال یہ بادشاہ ہوا تو اس نے ایک سفر تو کیا مغرب کی طرف، اور عراق اور شام کے علاقے کو فتح کرتا ہوا سمندر کے کنارے تک پہنچ گیا، اور وہاں اس وقت جو لوگ آباد تھے وہ کافر ہوں گے، اس لیے اس کو یہ اختیار حاصل ہو گیا کہ چاہے ان کو وہ قتل کرے، اور چاہے ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے، کہ نرمی کا معاملہ کرے، تبلیغ کرے، سمجھائے۔ تو ذُوالقرنین نے جو مسلک اختیار کیا، وہ یہی تھا کہ ہم نرمی اختیار کریں گے، البتہ اگر ان میں سے کوئی شخص ظالم رہا، کفر و شرک پر جما رہا تو اس کو ہم بھی سزا دیں گے اور آخرت میں بھی وہ عذاب پائے گا۔ اور جو نیک ہو جائے گا ہم بھی اس کے ساتھ نرم برتاؤ کریں گے اور اللہ کے ہاں بھی اچھا اَجر پائے گا، تو یہ مغرب کے سفر کا ذِکر ہوا، اَقصائے مغرب تک پہنچ گیا، جس کے بعد اس کو سورج سمندر میں یا جھیلوں میں ڈُوبتا ہوا نظر آیا، آگے کوئی آبادی نہیں تھی...... دُوسرا سفر اس کا مشرق کی طرف ہے، تو مشرق کے علاقے سارے کے سارے اس نے فتح کر لیے...... اور اس کا تیسرا سفر، اس کی قرآنِ کریم میں صراحت نہیں کی گئی کہ وہ جنوب کی طرف تھا یا شمال کی طرف، لیکن مؤرخین کہتے ہیں کہ اس وقت جنوب کی طرف آبادی نہیں تھی، اس کا یہ سفر شمال کی طرف ہوا ہے، شمال کی طرف اس کا سفر ہوا، یہ پہاڑی علاقے تک پہنچ گیا جو آج رُوس کے قبضے میں ہے، ''کوہِ قاف'' کا علاقہ، اور ''کاکیشیا'' کا علاقہ، یہ جو پہاڑی علاقہ ہے یہاں تک یہ پہنچا ہے، اور وہاں دو پہاڑوں کے درمیان میں کوئی درّہ تھا، پہاڑوں کے اِدھر جو قوم آباد تھی وہ کچھ کمزور قسم کے تھے، اور پہاڑوں کی پرلی طرف جو قوم آباد تھی وہ یاجوج ماجوج کہلاتے تھے، وہ بڑے زورآور اور خونخوار تھے، وہ اس درّے میں سے گزر کے آ کے قوم کو لُوٹتے تھے، قتل و غارت کرتے تھے، لُوٹ کر لے جاتے تھے، اور یہ بیچارے ان کے دفاع پر قادر نہیں تھے، اس لیے اس قوم

نے درخواست کی کہ اگر اس دَرّے کو بند کردیا جائے تو پھر یاجوج ماجوج ہمارے اُوپر حملہ نہیں کرسکیں گے، چونکہ اس وقت ہوائی جہاز اور ٹینک تو ہوتے نہیں تھے، اور اگر بڑی دیوار ہی کھینچ دی جائے جس طرح سے پُرانے قلعے ہوتے تھے تو باہر کا آدمی آ کے حملہ نہیں کرسکتا، اُس زمانے میں کئی دیواریں اس قسم کی بنائی گئیں ان میں سے ایک دیوار یہ بھی ہے جو ذُوالقرنین نے اس قوم کو یاجوج ماجوج کے حملوں سے بچانے کے لئے بنائی تھی۔

''یاجوج ماجوج'' کا تعارف

''یاجوج ماجوج'' کون ہیں؟ اس بارے میں روایات بہت مختلف قسم کی ہیں، لیکن محدثین کی تحقیق کے مطابق اور مؤرخین کی تحقیق کے مطابق یہ کوئی نئی قسم کی مخلوق نہیں، بلکہ انسان ہی ہیں، حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے یافث کی اولاد اس علاقے میں جو پھیلی یعنی ''کوہ قاف'' اور ''کاکیشیا'' وغیرہ کے علاقے کی طرف، تو وہ ''یاجوج ماجوج'' کہلاتے ہیں۔ جن کو کہتے ہیں کہ توارۃ وغیرہ میں ''گاگ مگاگ'' کے لفظ کے ساتھ ذِکر کیا گیا ہے، یہ دو قبیلوں اور دو خاندانوں کے نام ہیں۔ اور اکثر و بیشتر مفسرین نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ رُوسی، چینی، منگولیا کے علاقے کے آباد لوگ یہ سارے کے سارے یاجوج ماجوج کی نسل سے ہیں،[1] اور بعض نے ترکوں کو بھی ان کے ساتھ ملایا (مظہری وغیرہ)۔ اور ایک وقت آئے گا کہ جب یہ لوگ فتنے کی صورت اختیار کریں گے، ساری دُنیا کے اوپر غلبہ پانے کی کوشش کریں گے، بہت خونریزی کریں گے، عیسیٰ علیہ السلام کا زمانہ ہوگا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی ایسی آفت آئے گی کہ یہ سارے کے سارے ختم ہوجائیں گے، آخر راج حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اور مہدی کا آئے گا، جس میں عدل وانصاف قائم ہوگا، تو یہ آخری آخری فتنہ ہے ان کا، جس میں انہوں نے آ کے ساری دُنیا کو پریشان کرنا ہے، اور ساری دُنیا کو روند ڈالنا ہے، تو یہ قیامت کے قریب عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں ہوگا...... ہمارے جدید مفسرین اشارہ کرتے ہیں کہ آج کل رُوس اور اس قسم کی اقوام جو ترقی پا رہی ہیں اور جنگی سامان جمع کرتی جا رہی ہیں، یہ سب مقدمہ اور تمہید بن رہی ہیں اس فتنے کی جس کی نشاندہی روایات کے اندر کی گئی ہے، کہ آخر یہ لڑائی ہوگی، اور یہ اقوام چڑھ دوڑیں گی، اور انتہائی درجے کی خونریز جنگ ہوگی، فسادات ہوں گے، اور اس کے نتیجے میں پھر قریب ہی قیامت آجائے گی، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے اوپر کوئی اُفتاد پڑے گی، جس کی بنا پر یہ قومیں تباہ ہوجائیں گی۔ بہر حال عیسیٰ علیہ السلام کامیاب ہوں گے، اور عدل وانصاف کی حکومت قائم ہوگی، اور یہ سارے کے سارے ختم ہوجائیں گے۔ ان کی طرف سے فتنہ اُٹھے گا اور بڑے زور کے ساتھ اُٹھے گا، اور یہ سارے کے سارے حالات بنتے چلے جا رہے ہیں، جیسے کہ جدید مفسرین نے اشارہ کیا ہے۔ بہر حال یہ کوئی ایسی عجیب مخلوق نہیں، انسانوں میں سے ہی ہیں، لیکن ہیں خونریز اور خونخوار قسم کے لوگ۔

واقعے کا تتمہ

انہوں نے درخواست کی تو ذُوالقرنین نے ان کے سامنے دیوار کھڑی کردی، لوہے کی دیوار، جس کی درزوں کے اندر

(۱) ''ذخیرۃ الجنان'' از: شیخ سرفراز خان صفدر رحمۃ اللہ علیہ۔

پگھلا ہوا تانبا ڈال دیا گیا، اور وہ دیوار اس طرح سے چکنی اور اُونچی ہوگئی کہ پھر وہ اس کے اوپر چڑھ بھی نہ سکے اور اس کو توڑ بھی نہ سکے۔ جب اتنی بڑی دیوار قائم ہوگئی تو دیوار کے قائم ہونے کے بعد ذوالقرنین نے پھر کہا کہ اس میں میرا کمال کوئی نہیں، جو کچھ ہوا اللہ کی رحمت کے ساتھ ہوا، اور جب ایک وقت آجائے گا اللہ تعالیٰ اسے ریزہ ریزہ کردے گا، اور وہ وعدے کا وقت قیامت کا ہے، یا جو بھی اللہ کے علم میں ہے اس دیوار کے ٹوٹنے کا، اس وقت یہ ٹوٹ جائے گی، جس طرح سے باقی دُنیا فانی ہے یہ دیوار بھی فانی ہے، اس دیوار کو بھی کوئی کسی قسم کا بقا نہیں۔ تو قرآنِ کریم نے اتنے سے حالات ذُوالقرنین کے ذِکر کیے اور یہی یقینی بات ہے، جس کا حاصل یہ ہوا کہ عادل بادشاہ تھا، بہت بڑا فاتح تھا، مغرب کی طرف بھی اس کی فتوحات ہیں، مشرق کی طرف بھی اس فتوحات ہیں، شمال کی طرف بھی اس کی فتوحات ہیں۔ باقی! جتنی باتیں قرآنِ کریم نے نہیں بتائیں کہ اس کا علاقہ کون سا تھا؟ کہاں کا رہنے والا تھا؟ کس زمانے کا تھا؟ جو باتیں قرآنِ کریم میں صراحتاً ذکر نہیں کی گئیں، وہ سب مختلف فیہ ہیں، ہم اتنی باتوں پر یقین کر سکتے ہیں جو صراحتاً قرآنِ کریم میں آگئیں، جو قرآنِ کریم میں نہیں آئیں، تاریخی روایات ہیں، ان کو ہم اسی طرح سے دیکھیں گے جس طرح سے عام تاریخی روایات ہوتی ہیں، کہ ہوسکتا ہے صحیح ہو، اور ہوسکتا ہے غلط ہو۔ تو یہ واقعہ یہاں یہود کے سوال کرنے کی بنا پر نقل کیا گیا، ذُوالقرنین کے صحیح حالات جتنے ضروری تھے وہ نقل کردیے گئے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّآ أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ إِلَيْكَ

اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْٓ اَوْلِيَآءَ ۭ اِنَّآ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ
کیا کافر لوگوں نے سمجھ لیا ہے کہ وہ میرے بندوں کو میرے علاوہ کارساز بنالیں گے؟ بے شک ہم نے تیار کیا جہنم کو
لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا ﴿۱۰۲﴾ قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ
کافروں کے لئے مہمانی ﴿۱۰۲﴾ آپ فرما دیجئے کہ کیا ہم تمہیں خبر دیں ان لوگوں کی جو سب سے زیادہ خسارہ پانے والے ہیں
اَعْمَالًا ﴿۱۰۳﴾ ۭ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ
اعمال کے اعتبار سے ﴿۱۰۳﴾ یہ وہ لوگ ہیں جن کی کوشش ضائع ہوگئی دُنیوی زندگی میں، اور وہ سمجھ رہے ہیں کہ وہ کوئی اچھا کام
صُنْعًا ﴿۱۰۴﴾ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَاۗىِٕهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا
کر رہے ہیں ﴿۱۰۴﴾ یہی لوگ ہیں جنہوں نے انکار کیا اپنے رَبّ کی آیات کا اور اس کی ملاقات کا، پس ان کے اعمال ضائع ہوگئے پس نہیں
نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ﴿۱۰۵﴾ ذٰلِكَ جَزَاۗؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوْا وَاتَّخَذُوْٓا
قائم کریں گے ہم ان کے لئے قیامت کے دِن کوئی وزن ﴿۱۰۵﴾ یہی ان کا بدلہ ہے یعنی جہنم بسبب اس کے کہ انہوں نے کفر کیا اور بنایا

اٰيٰتِيْ وَرُسُلِيْ هُزُوًا ﴿۱۰۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ

میری آیات کو اور میرے رسولوں کو ٹھٹھا ﴿۱۰۶﴾ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے ان کے لئے فردوس کے

الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ﴿۱۰۷﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا ﴿۱۰۸﴾ قُلْ لَّوْ

باغات مہمانی ہیں ﴿۱۰۷﴾ ہمیشہ رہنے والے ہوں گے ان باغات میں، نہیں چاہیں گے ان باغات سے بدلنا ﴿۱۰۸﴾ آپ کہہ دیجئے کہ اگر

كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ

سمندر سیاہی بن جائے میرے رَبّ کے کلمات لکھنے کے لئے، البتہ ختم ہو جائے گا سمندر قبل اس کے کہ میرے رَبّ کے کلمات ختم ہوں،

وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ﴿۱۰۹﴾ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى

اگرچہ لے آئیں ہم اس کی مثل از روئے مدد کے ﴿۱۰۹﴾ آپ کہہ دیجئے اس کے سوا کچھ نہیں کہ میں تم جیسا انسان ہوں، میری طرف وحی

اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ

کی جاتی ہے کہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے، پھر جو شخص بھی اُمید رکھے اپنے رَبّ کی ملاقات کی،

فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ﴿۱۱۰﴾

اسے چاہیے کہ نیک عمل کرے، اور اپنے رَبّ کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے ﴿۱۱۰﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا: کیا گمان کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کفر کیا، اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْٓ اَوْلِيَآءَ: کہ وہ بنالیں گے میرے بندوں کو میرے علاوہ کارساز۔ اولیاء ولی کی جمع ہے۔ ولی: حمایتی، کارساز، مددگار۔ عباد عبد کی جمع ہے، اور عبد بندے کو کہتے ہیں۔ اَنْ يَّتَّخِذُوْا میں ''اَن'' مصدر یہ ہے۔ اور عِبَادِيْ، يَتَّخِذُوْا کا پہلا مفعول ہے، اور اولیاء دوسرا مفعول ہے۔ اور حسب بھی دو مفعولوں کو چاہتا ہے، یہ افعال قلوب میں سے ہے، اس کے دو مفعول ہوتے ہیں۔ اس لیے ''اَنْ يَّتَّخِذُوْا'' مابعد کے ساتھ مل کر مصدر کی تاویل میں ہو کے ایک مفعول بن جائے گا، اور اس کا دوسرا مفعول محذوف نکالنا پڑے گا، اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْٓ اَوْلِيَآءَ: میرے بندوں کو میرے علاوہ کارساز بنالینا، یہ مصدر کے طور پر ترجمہ ہے۔ ''میرے بندوں کو میرے علاوہ کارساز بنالینے کو کافر لوگ اپنے لیے مفید سمجھتے ہیں؟ نافع سمجھتے ہیں؟'' تو ''نافعاً'' یہ مفعول ثانی نکل آئے گا (مظہری) ترکیب کے لحاظ سے اگر اس کا مفہوم واضح کرنا ہو تو یوں ہی ہوگا، ''کیا کافر لوگ میرے بندوں کو میرے علاوہ کارساز

بنا لینے کو نافع سمجھتے ہیں؟'' یہ کارساز سمجھ لینا ان کا، بنا لینا ان کا ان کے لیے مفید ہوگا؟ ان کا یہ خیال ہے؟، اس طرح سے مفہوم واضح ہوگا، اور جیسے پہلا ترجمہ کیا گیا تھا وہ بھی اپنی جگہ واضح ہے ''کیا کافر لوگوں نے سمجھ لیا ہے کہ وہ میرے بندوں کو میرے علاوہ کارساز بنالیں گے؟'' تو گویا کہ ''اَن'' کا مابعد ہی دو مفعولوں کے قائم مقام ہو گیا (نسفی)، اس طرح سے بھی مفہوم واضح ہو جاتا ہے......

عِبَادِیْ: میرے بندے۔ اس سے مقبولین بھی مراد ہو سکتے ہیں، انبیاء علیہم، فرشتے، اولیاء۔ اور اگر اس ''عباد'' کو عام رکھا جائے یعنی جو اللہ کے مملوک ہیں، جو اللہ کی مخلوق ہیں تو پھر اس میں مقبولین اور غیر مقبولین سارے شامل ہو جائیں گے، فرشتے، شیاطین، اور مملوک اور مخلوق ہونے کے اعتبار سے بے جان چیزیں، بے جان تصویریں جن کو کوئی معبود بنالے وہ سب اس میں شامل ہوں گی۔

اِنَّاۤ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِیْنَ نُزُلًا: بے شک ہم نے تیار کیا جہنم کو کافروں کے لئے نزل۔ نزل کہتے ہیں اس کھانے کو جو آنے والے مہمان کے سامنے پیش کیا جاتا ہے، نزل: مہمانی۔ اور یہاں جہنم کو کافروں کے لئے جو ''نزل'' قرار دیا یہ ایک قسم کا تہکم ہے، یعنی اِستہزا کے طور پر، کہ وہ مہمان بن کے آئیں گے، اور ہم ان کے سامنے جہنم بطور مہمانی کے پیش کریں گے۔ ہم نے تیار کیا جہنم کو کافروں کے لئے مہمانی۔ قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ: نَبَّأَ: خبر دینا، یہ لفظ نَبَأٌ سے لیا گیا ہے۔ آپ فرما دیجئے کہ کیا ہم خبر دیں تمہیں، بِالْاَخْسَرِیْنَ اَعْمَالًا: ان لوگوں کی جو سب سے زیادہ خسارہ پانے والے ہیں از روئے اعمال کے، جو اپنے اعمال کے اعتبار سے سب سے زیادہ خسارے میں ہیں کیا ہم تمہیں وہ لوگ بتائیں؟ اَلَّذِیْنَ ضَلَّ سَعْیُهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا: یہ وہ لوگ ہیں، اعمال کے اعتبار سے سب سے زیادہ خسارے میں وہ لوگ ہیں کہ جن کی کوشش گم ہو گئی، ضائع ہو گئی، ضَلَّ: راستے سے بھٹک گئی۔ ضائع ہو گئی ان کی کوشش دُنیوی زندگی میں، وَهُمْ یَحْسَبُوْنَ: اور وہ سمجھ رہے ہیں اَنَّهُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا: کہ وہ کوئی اچھا کام کر رہے ہیں۔ صُنْعٌ کام کو کہتے ہیں۔ ضَلَّ سَعْیُهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا کا معنی بھی دو طرح سے ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ سَعْیُهُمْ سے مراد ان کے نیک اعمال جو بھی انہوں نے کیے وہ دُنیوی زندگی میں ہی ضائع ہو گئے، کیونکہ انہوں نے کُفر کیا، اور کُفر کے ساتھ نیکی باقی نہیں رہا کرتی، دُنیوی زندگی میں جو انہوں نے کوشش کی وہ ساری کی ساری ضائع ہو گئی، ان کے اُوپر بربادی کا حکم لگ گیا۔ اور اس کا ایک مفہوم اس طرح سے ادا کیا گیا ہے کہ ان کی ساری کی ساری کوشش دُنیوی زندگی میں ہی ضائع ہو گئی، آخرت کی انہوں نے فکر ہی نہیں کی، اپنی دُنیا کے بنانے میں، آباد کرنے میں، رہنے سہنے میں، کھانے پینے میں، پہننے میں، آرام میں، آسائش میں، تعیش میں انہوں نے اپنی ساری کوشش برباد کر دی، آخرت انہوں نے سوچی ہی نہیں، یہ لوگ ہیں جو اعمال کے اعتبار سے سخت خسارے میں ہیں۔ دونوں ترجموں کا فرق سمجھ گئے؟ پہلے ترجمے کا مطلب تھا کہ دُنیوی زندگی میں جو کوشش انہوں نے کی وہ آخرت کے اعتبار سے ضائع ہو گئی، دُنیا میں رہتے ہوئے جو کوشش وہ کرتے رہے نیکی کے کاموں میں، آخرت میں وہ ضائع ہے، کیونکہ کُفر کے ساتھ نیکی پر کوئی حکم نہیں لگا کرتا۔ اور ایک یہ ہے کہ ان کی ساری کوشش دُنیوی زندگی کے بارے میں ضائع ہو گئی، آخرت کے بارے میں انہوں نے سوچا ہی نہیں کہ اس کے لیے بھی کچھ کام کرتے، اپنی ساری محنت، اپنی ساری مشقت، اپنی ساری کوشش دُنیوی زندگی میں لگا دی (تفسیر عثمانی)۔ ''ضائع ہو گئی ان کی کوشش دُنیوی زندگی میں اور وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اچھے کام کر رہے ہیں۔'' اُولٰٓىِٕكَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ: یہی لوگ ہیں

جنہوں نے اپنے رَبّ کی آیات کا انکار کیا، وَلِقَآىٕهٖ: اور اپنے رَبّ کی ملاقات کا انکار کیا، فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ: پس ان کے اعمال ضائع ہو گئے فَلَا نُقِیْمُ لَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَزْنًا: پس نہیں قائم کریں گے ہم ان کے لیے قیامت کے دن کوئی وزن، ان کے اعمال کا کوئی وزن نہیں ہوگا قیامت کے دن، سب هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ہو جائیں گے جیسے دوسری جگہ لفظ آتا ہے (سورۂ فرقان: ۲۳)، گرد گھٹا جس طرح سے اُڑ جاتا ہے اس قسم کے ان کے اعمال ہوں گے۔ اور ایک جگہ قرآنِ کریم میں الفاظ ہیں اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّیْحُ فِیْ یَوْمٍ عَاصِفٍ (سورۂ ابراہیم: ۱۸) کہ ان کے اعمال راکھ کی طرح ہوں گے، ایندھن جلنے کے بعد جو راکھ چولہے میں پڑی ہوتی ہے، بہت ہلکی ہوتی ہے، اس میں کوئی وزن نہیں ہوتا، تو اس راکھ کی طرح ہو جائیں گے جس پر سخت ہوا چل جائے آندھی کے دن میں۔ اب آندھی چلے اور سخت ہوا ہو، تو راکھ کا پتا ہی نہیں چلتا کدھر چلی گئی، ذرہ ذرہ اُڑ جاتا ہے، اور اسی طرح سے هَبَآءً مَّنْثُوْرًا کا لفظ بھی سورۂ فرقان میں آیا تھا، هَبَآءً مَّنْثُوْرًا: بکھرا ہوا گرد وغبار۔ ان کے اعمال بکھرے ہوئے گرد وغبار کی طرح ہو جائیں گے، قیامت کے دِن ان میں کوئی وزن نہیں ہوگا۔ ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ جَهَنَّمُ: جَهَنَّمُ یہ جزاء کا بیان ہے۔ یہی ان کا بدلہ ہے یعنی جہنم، بِمَا كَفَرُوْا، ان کے کُفر کرنے کی وجہ سے وَاتَّخَذُوْۤا اٰیٰتِیْ وَرُسُلِیْ هُزُوًا: كَفَرُوْا وَاتَّخَذُوْا یہ دونوں "مَا" کے نیچے داخل ہیں۔ ان کے کُفر کرنے کی وجہ سے اور میری آیات اور میرے رسولوں کو ٹھٹھا بنانے کی وجہ سے۔ "ما" مصدریہ ہے۔ "بسبب اس کے کہ انہوں نے کُفر کیا اور بنایا میری آیات کو اور میرے رسولوں کو ٹھٹھا" یوں بھی کہہ سکتے ہیں۔ اور اگر مصدر کے ساتھ تعبیر کرو گے تو "ان کے کُفر کرنے کی وجہ سے اور میری آیات کو اور میرے رسولوں کو ٹھٹھا بنانے کی وجہ سے۔" تو نحو کے اندر جو "ما" مصدریہ پڑھا کرتے ہو تو اس کے مطابق اس کا ترجمہ کرنا بھی سیکھو۔ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا: نُزل کا لفظ پہلے بھی آپ کے سامنے آ گیا۔ ان کے لئے جنّات الفردوس مہمانی ہے۔ جنّات الفردوس: فردوس کے باغات۔ جس کو ہم "جنّت" کہتے ہیں اِصطلاحی معنی کے اعتبار سے، وہ مقام جہاں مؤمن جائیں گے، اس کا جو اعلیٰ طبقہ ہے اس کو "فردوس" کہتے ہیں۔ سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ جب بھی اللہ سے مانگو تو فردوس مانگا کرو،[1] یہ جنّت کے طبقات میں سے اعلیٰ طبقہ ہے، اور اس کے اوپر صرف اللہ کا عرش ہے، اس کے اوپر کوئی اور درجہ نہیں ہے، اور جنّت کی جتنی نہریں ہیں وہ اسی "فردوس" سے پھوٹتی ہیں، اور یہ جَنّٰتُ کا لفظ لغوی معنی میں ہے "ان کے لئے فردوس کے باغات مہمانی ہیں" خٰلِدِیْنَ فِیْهَا: ہمیشہ رہنے والے ہوں گے ان باغات میں لَا یَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا: حِوَلًا تحوّل کے معنی میں ہے۔ نہیں چاہیں گے ان باغات سے بدلنا، ان باغات سے بدل کے کسی اور طرف جانا نہیں چاہیں گے۔ قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا: آپ کہہ دیجئے کہ اگر سمندر سیاہی بن جائے، مِداد سیاہی کو کہتے ہیں، لِّكَلِمٰتِ رَبِّیْ: میرے رَبّ کے کلمات لکھنے کے لئے۔ کلمات سے یہاں مراد وہ باتیں ہیں جو اللہ کے کمالات پہ دلالت کرتی ہیں۔ "اگر سمندر سیاہی بن جائے میرے رَبّ کے کلمات لکھنے کے لئے" لَنَفِدَ الْبَحْرُ: البتہ ختم ہو جائے گا سمندر قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّیْ: قبل اس کے کہ میرے رَبّ کے کلمات ختم ہوں، وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا: اگرچہ لے آئیں ہم اس کی مثل از روئے مدد کے، اس

(۱) بخاری ج۱ ص۳۹۱ باب درجات المجاہدین۔ مشکوٰۃ ۳۲۹/۲، کتاب الجہاد کی پہلی حدیث۔

سمندر جیسا ایک سمندر اور بھی بطور مدد کے لے آئیں۔ قُلْ آپ کہہ دیجئے اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ: اِنَّمَآ حصر کے لئے ہوتا ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں کہ میں تم جیسا انسان ہوں، يُوْحٰٓى اِلَيَّ: میری طرف وحی کی جاتی ہے۔ وحی کی جاتی ہے میری طرف اس مضمون کی اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ: کہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے، فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ: پھر جو شخص بھی اُمید رکھے اپنے رَبّ کی ملاقات کی فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا: اسے چاہیے کہ نیک عمل کرے وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا: اور اپنے رَبّ کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط

یہ سورۂ کہف کا آخری رکوع ہے، پچھلے رکوع کے آخر میں ذُوالقرنین کے اس لفظ سے کہ ''جب میرے رَبّ کا وعدہ آجائے گا تو اس دیوار کو توڑ کے وہ ریزہ ریزہ کردے گا، ڈھا کے برابر کردے گا، اور میرے رَبّ کا وعدہ سچا ہے'' یہاں سے کلام منتقل ہوگئی تھی قیامت کے حالات کی طرف، کیونکہ ذُوالقرنین کی اس کلام میں قیامت کی طرف ہی اشارہ ہے، کہ ایک وقت آئے گا جبکہ اللہ تعالیٰ پہاڑوں کو اور دوسری سب چیزوں کو ڈھا کے برابر کردیں گے، تو یہ دیوار بھی ٹوٹ پھوٹ جائے گی، چونکہ وہ مؤمن بالآخرۃ تھا، آخرت پر ایمان رکھتا تھا۔ تو یہیں سے کلام منتقل ہوگئی تھی آخرت کی طرف، تو اللہ تعالیٰ نے آخرت کے حالات بیان فرمانے شروع کردیے تھے نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا، اور کافروں کے لئے وعید شروع ہوگئی تھی۔ اور آپ کو یاد ہوگا کہ سورت کا ابتدائی حصہ بھی وعید پر ہی مشتمل تھا، مؤمنین کے لئے وعد اور کافروں کے لئے وعید، تو آخر میں بھی وہی وعد و وعید ہے، کہ جب یہ جہنم سامنے آنے والی ہے، کافروں کے سامنے ہم اس کو پیش کریں گے، آج ان کی آنکھیں پردے میں ہیں میرے ذِکر سے، اور یہ سننے کی بھی کوشش نہیں کرتے، طاقت نہیں رکھتے، نہ کانوں سے حق بات کو سن سکتے ہیں، نہ آنکھوں سے دیکھتے ہیں، ایک دِن جہنم ان کے سامنے آجائے گی، پچھلی آیتوں کا مفہوم یہ تھا۔

قیامت کے دِن یہ آلہہ کام نہ آئیں گے!

تو جس وقت ہم ان کے سامنے جہنم پیش کریں گے، تو وہ ان کے لئے بہت بڑا مصیبت کا وقت ہوگا، تو ان مشرکوں نے دنیا کے اندر جس طرح سے مصیبتوں سے بچنے کے لئے مختلف قسم کے کارساز بنا رکھے ہیں، اور ان سے یہ فریاد کرتے ہیں، ان کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہیں، نہ تو یہ دنیا میں کام آتے ہیں، یہ بھی ان کا وہم ہے، لیکن آپ کے سامنے بہت ساری آیات کے اندر یہ بات واضح کردی گئی کہ قیامت کے دِن اللہ تعالیٰ کہے گا کہ اب پکارو انہیں جن کو میرا شرکاء بنا رکھا تھا، آج وہ تمہیں اس مصیبت سے

نجات دلائیں، لیکن وہ شرکاء اس وقت بولیں گے ہی نہیں، ان کی بات کا جواب ہی نہیں دیں گے، وہ وقت ایسا ہوگا کہ کھلی آنکھوں دیکھ لیں گے کہ اللہ کے علاوہ کوئی دوسرا مصیبت کے وقت میں کام آنے والا نہیں، اس وقت یہ حقیقت کھل کے سامنے آجائے گی، اب بھی بات یہی ہے کہ اللہ کے علاوہ کوئی دوسرا کارساز نہیں، لیکن اِس وقت لوگوں کی آنکھوں پہ پردہ پڑا ہوا ہے، اور وہ اس حقیقت کو سمجھتے نہیں ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمجھانے کی کوشش کی جارہی ہے تو یہ سنتے نہیں ہیں، لیکن وہ وقت ایسا ہوگا کہ سب کو مشاہدہ ہوجائے گا، اسی کے بارے میں تنبیہ ہے کہ کیا ان کافروں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ میرے بندوں کو جوانہوں نے کارساز سمجھ لیا ہے، کارساز بنالیا ہے، یہ ان کے لئے کوئی مفید ہوں گے؟ یہ اِستفہامِ انکاری ہے، یعنی ان کے لئے مفید نہیں، یہ ان کا وہم ہے کہ میرے بندوں کو کارساز سمجھ لیں میرے علاوہ، یعنی میں پکڑنا چاہوں اور میرے بندوں کو یہ مدمقابل لے آئیں اور وہ ان کو چھڑالیں، ایسا نہیں ہوسکے گا، ان کا یہ گمان غلط ہے، اگر یہ ایسا سمجھتے ہیں تو اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہی ہوا کہ اللہ پکڑے، اور اللہ کے بندوں کو تم مدمقابل لے آؤ اور وہ تمہارے کام آجائیں، تمہارا کام بنادیں، اور تمہیں چھڑالیں، ایسا نہیں ہوسکتا، اگر کافر ایسا سمجھتے ہیں تو غلط سمجھتے ہیں، یہ اپنے آپ کو دھوکے میں ڈالے ہوئے ہیں، نہ کوئی ولی مقبول، نہ کوئی نبی، نہ کوئی فرشتہ، اللہ کے مقابلے میں نہیں آسکتا، اللہ کی پکڑ سے کوئی چھڑا نہیں سکتا، اگر اللہ پکڑنا چاہے تو کوئی چھڑانے والا نہیں ہے..... اور آپ جانتے ہیں کہ سفارش کا نظریہ جو ہمارا ہے وہ سفارش بھی اللہ کے اذن کے ساتھ ہے، اور اس کے لئے ہے جس کے لئے اللہ اجازت دیں گے، تو بغیر اللہ کی اجازت کے تو کوئی بھی دَم نہیں مار سکے گا، اور مشرکین یہی سمجھتے تھے کہ ہمیں اللہ سے کیا تعلق، ہم تو ان کو خوش رکھیں گے، جب یہ چاہیں جو چاہیں کرا سکتے ہیں، اسی کی تردید کرنی مقصود ہے کہ اللہ کے بندے اللہ کے مقابلے میں نہیں آسکتے، یہ تمہارا گمان غلط ہے۔ ''کیا ان کافروں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ میرے بندوں کو میرے علاوہ کارساز بنانا ان کے لئے مفید ہے؟'' یعنی مفید نہیں۔ میری ضرورت نہیں سمجھتے، میرے بندوں کو کارساز سمجھ رہے ہیں، یہ کوئی اچھی بات ہے؟ تو اس کی تردید کرنی مقصود ہے۔ عبادی میں دونوں قسم کے بندے آگئے، مقبولین مراد لے لیے جائیں تو بھی ٹھیک ہے، جب مقبولین کو کارساز نہیں بنایا جاسکتا تو غیر مقبولین کا کیا سوال؟ یا عباد کو عام رکھو اللہ کی مخلوق ہونے کے اعتبار سے۔ ''ہم نے جہنم تیار کی کافروں کے لئے مہمانی کے طور پر۔''

کُفّار کا انجام

''آپ انہیں کہیے کہ کیا ہم تمہیں بتلائیں کہ اعمال کے اعتبار سے سب سے زیادہ خسارے میں کون ہیں؟'' یعنی اعمال تو سارے ہی کرتے ہیں، دنیا کے اندر جو بھی پیدا ہوا وہ کام کرتا ہے، آپ بھی کرتے ہیں دوسرے لوگ بھی کرتے ہیں، عملی زندگی تو دونوں کی چل رہی ہے، لیکن کون اپنے عمل کے اعتبار سے نفع میں ہے، کون خسارے اور نقصان میں ہے؟ یہ سوال اہم ہے۔ اب کافر، مشرک، دُنیادار جو دُنیا کمانے میں لگے ہوئے ہیں، صبح شام، رات دِن ان کو سوائے پیسے کمانے کے اور کوئی دھندا ہی نہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ ہماری زندگی کامیاب ہے۔ شام کو جس وقت وہ اپنا گلا کھول کے شمار کرتے ہیں، اور سو، ڈیڑھ سو، ہزار، دو ہزار روپے

جب اُن کو نفع نظر آتا ہے تو پھولے نہیں سماتے، سمجھتے ہیں کہ ہماری کوششیں بڑی کامیاب ہیں، اور اسی طرح سے دنیا میں عہدے حاصل کر لیے، بڑی بڑی تجارتیں کر لیں، بڑی بڑی زمین داریاں قائم کر لیں کوشش کر کے، انہوں نے اسی کو کامیابی کا معیار بنا رکھا ہے، اسی لیے جب وہ اپنے مدِمقابل ایسے لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ جن کے پاس کوئی زمین نہیں، کارخانہ نہیں، عہدہ نہیں، اور ان کے پاس رقوم کی بھری ہوئی تھیلیاں نہیں ہیں، تو سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ تو اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں، یہ تو خسارے میں ہیں، تو وہ ان کو خسارے میں سمجھتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ خسارے میں کون ہیں؟ اپنے اعمال کے اعتبار سے خسارے میں وہ لوگ ہیں کہ جنہوں نے اپنی ساری کوشش، ساری صلاحیتیں دنیوی زندگی کے بارے میں برباد کر دیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں عقل دی تھی، فہم دیا تھا، بدنی قوت دی تھی، سننے بولنے کی طاقت دی تھی، ہاتھوں میں کام کرنے کی طاقت رکھی تھی، انہوں نے ساری صلاحیتیں، ساری کوشش دُنیا کے بارے میں ضائع کر دی، یعنی دُنیوی زندگی کے بنانے کے لئے اپنی کوششیں صرف کر دیں۔ ''ضائع'' ان کو اس لیے کہہ دیا کہ مر گئے تو دُنیا تو چھوٹ ہی جاتی ہے، اور سارے کا سارا معاملہ خسارے میں گیا، اپنا سب کچھ دیا دُنیا کے لئے، دُنیا بنانے کے لئے اپنے آپ کو کھپا دیا، لیکن دُنیا ہاتھ سے نکل جائے گی، خالی ہاتھ رہ جائیں گے، یہ ہیں اصل کے اعتبار سے خسارے میں، وہ سمجھتے ہیں کہ ہم ڈگریاں حاصل کر کے کامیاب ہو گئے، یا ہم دولت کما کے کامیاب ہو گئے، کارخانے اور زمین داریاں حاصل کر کے ہم کامیاب ہو گئے، بالکل غلط، یہ تو بہت خسارے کا سودا ہے۔ اس لیے خسارے کا سودا ہے کہ حیاتِ دُنیا کا تو پتا ہی کوئی نہیں کہ یہ کس وقت چھوٹ جائے، اور کس وقت اس سے علیحدگی ہو جائے، اب اپنی ساری صلاحیتیں برباد کر کے ایک آدمی کارخانہ لگاتا ہے، آپ کے سامنے روز مثالیں پیش آتی ہیں، جس دِن ''عوامی'' (ریل گاڑی) کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے، میں بھی اس سے پچھلی گاڑی میں کراچی سے آ رہا تھا، تو وہیں سمہ سٹہ میں لوگ باتیں کر رہے تھے کہ سمہ سٹہ کے علاقے میں کسی نے کارخانہ لگایا تھا، اور کارخانے والے افتتاح کرنے کے لیے آئے ہوئے تھے، وہاں سے واپس بہاولپور کو جا رہے تھے، تو ڈھیر ہو گئے، اب اگر ساری زندگی کی کمائی یہی تھی کہ کارخانہ لگایا، اور ایک منٹ بھی نہیں لگا کہ وہ ہاتھ سے گیا، تو پھر سوچو گے کہ ہم نے کیا کمایا؟ زندگی اپنی برباد کر آئے، لے کے کچھ بھی نہیں آئے۔ تو اصل خسارے میں وہ لوگ ہیں کہ جن کی ساری کوشش دُنیوی زندگی کے بارے میں ضائع ہو جاتی ہے، اور وہ آخرت کے متعلق سوچتے ہی نہیں، آخرت کی طرف وہ توجہ ہی نہیں دیتے، اور وہ سمجھتے ہیں کہ ہم بڑے اچھے کام کر رہے ہیں، یعنی دِل دِماغ میں بھی یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہمارا کردار، ہماری کوشش بہت اچھی ہے، یہ کامیابی کا راستہ ہے، جبکہ حقیقت کے اعتبار سے انتہائی خسارے کا راستہ ہے۔

اور یہ کون لوگ ہیں؟ یہ کافر لوگ ہیں جن کا آخرت پہ اعتماد ہی نہیں، آخرت کا یقین ہی نہیں، کیونکہ اگر آخرت کا یقین ہو تو دُنیا کے مقابلے میں آخرت کو بھی سوچیں، مثال کے طور پر ایک جگہ آپ نے پندرہ دِن رہنا ہے اور ایک جگہ آپ نے پندرہ سال رہنا ہے، تو یقیناً جہاں آپ نے پندرہ سال رہنا ہے وہاں کے لئے آپ زیادہ سوچیں گے، بمقابلہ اس جگہ کے جہاں آپ نے پندرہ دِن رہنا ہے، اب آئے ہوئے تو آپ یہاں بھی ہیں، سال آپ نے یہاں بھی گزارنا ہے، اس میں کوئی شک نہیں، لیکن یہاں چونکہ آپ

کو پتا ہے کہ ہم عارضی طور پہ ہیں، یہ کمرہ ہمارا نہیں ہے، یہ مکان ہمارا نہیں ہے، تو آپ کوئی کوشش نہیں کرتے کہ یہ ایسا ہونا چاہیے، ویسا ہونا چاہیے، بس عارضی طور پر آرام کی جگہ بن گئی، بیٹھنے اٹھنے کے لئے کافی ہے، وقت ہی گزارنا ہے ہر شخص کا ذہن یہی ہوتا ہے۔ اور جو اپنا مستقل رہنے کا مکان ہوتا ہے اس کے متعلق انسان پائیداری سوچتا ہے، اس کی زیب زینت سوچتا ہے، اس کے لیے سازوسامان سوچتا ہے۔ یہاں تو کیا ہے کہ ایک پیالی لے لی، ایک چھابڑی لے لی، چارپائی اور بستر ہوا، کہتے ہیں بس گزارہ ہی کرنا ہے، ہو جائے گا، وقت ہی گزارنا ہے۔ تو جہاں عارضی ٹھہرنا ہوتا ہے وہاں لوگ اس طرح سے ٹھہرا کرتے ہیں، اور جہاں مستقل ٹھہرنا ہوتا ہے اس کے لیے مستقل انتظام کیا کرتے ہیں، تو اگر آخرت پر یقین ہو تو آخرت کے متعلق ایسے ہی سوچیں جیسے انسان اپنے مستقل ٹھکانے کے متعلق سوچتا ہے، اور دنیا کے متعلق ان کا طرزِ عمل ایسے ہو جیسے ایک عارضی ٹھکانے کے متعلق ہوتا ہے، لیکن انہوں نے سب کچھ جو دُنیا کو ہی سمجھ لیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ آخرت کے قائل ہی نہیں، چاہے عقیدۃً چاہے عملاً، یعنی عقیدۃً آخرت کے منکر ہوں ایسے بھی بے شمار لوگ موجود ہیں، اور عملاً انکار کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ چاہے زبان سے کہتے ہیں کہ آخرت ہے، لیکن ان کے کردار کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ آخرت کے قائل ہی نہیں، جو کچھ بھی سوچتے ہیں دُنیا کے متعلق ہی سوچتے ہیں، تو یہ عملاً گویا کہ آخرت کے منکر ہیں۔ ''یہی لوگ ہیں جنہوں نے کُفر کیا اپنی رَب کی آیات کا اور اس کی ملاقات کا، اور ان کے اعمال ضائع ہو گئے، ہم ان کے لئے قیامت کے دِن کوئی وزن قائم نہیں کریں گے'' اگر انہوں نے صورتاً کوئی نیکیاں کی بھی ہیں تو وہ بھی ضائع۔ جیسے قرآنِ کریم میں ان اعمال کی مثال راکھ کے ساتھ دے دی گئی، ایندھن جلنے کے بعد جو چولہے میں پڑی ہوتی ہے انتہائی درجے کی ہلکی، اور اس کے اُوپر آندھی چل جائے تو اس کا نام ونشان باقی نہیں رہتا، اور یا ان کی مثال هَبَآءً مَّنْثُوْرًا کے ساتھ دی گئی ہے، بکھرا ہوا گردوغبار، ان کے اعمال اس طرح کے ہوں گے جن میں کوئی وزن نہیں ہوگا'' اور یہی بدلہ ہے ان کا جہنّم ان کے کُفر کرنے کی وجہ سے اور میری آیات کو اور میرے رسولوں کو ٹھٹھا بنانے کی وجہ سے'' یہ سمجھتے تھے کہ یہ ہنسی مذاق ہے، سوائے اِستہزا کے ان کو کوئی اور چیز سوجھتی ہی نہیں تھی، اس وجہ سے ان کی جزا جہنّم ہے۔

مؤمنین کا اَنجام

اس کے مقابلے میں وعدہ آ گیا اہلِ ایمان کے لئے کہ جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں ان کے لئے فردوس کے باغات مہمانی ہیں، ہمیشہ رہیں گے ان میں، لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا وہاں سے بدلنا نہیں چاہیں گے، یہ اطمینان اور سکون کی انتہائی تعبیر ہے، دُنیا میں آپ دیکھتے رہتے ہیں کہ ایک آدمی ایک جگہ رہتا ہو، اس کو ہر قسم کی راحت اور آرام حاصل ہو، تو بھی وہ ایک جگہ پڑا ہوا اُکتا جاتا ہے، جی چاہتا ہے کہیں سیر کو چلیں، کسی دوسری جگہ چلیں، جگہ بدلنے کو اس کا جی چاہتا ہے، یعنی اچھی سے اچھی جگہ ہو تو بھی وہاں پڑا ہوا بسا اوقات انسان اُکتا جاتا ہے، تو وہ اپنے گھر سے باہر نکلتا ہے، اپنے شہر سے باہر جاتا ہے، اپنے علاقے سے باہر جاتا ہے، جگہ تبدیل کرنا چاہتا ہے، پڑا پڑا اس کو ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے جیل خانے میں پڑے ہیں، لیکن جنّت کے اندر اتنا اطمینان اور اتنا سکون ہوگا کہ انسان یہ سمجھے گا کہ اس کو چھوڑ کے جائیں گے کہاں؟ کسی اور جگہ آرام کی جگہ ہی نہیں، اس لیے وہاں وہ

پوری طرح سے مطمئن رہیں گے، کبھی وہاں سے بدلنا نہیں چاہیں گے، یعنی یہ نہیں چاہیں گے کہ ہمیں یہاں سے تبدیل کر کے کسی اور جگہ منتقل کر دیا جائے۔

کمالاتِ الٰہی اِحاطۂ تحریر میں نہیں آسکتے

آگے تینوں آیتوں میں اللہ تعالیٰ کی توحید، سرورِ کائنات ﷺ کی رسالت اور آخرت مذکور ہے، کہ اللہ تعالیٰ کے کلمات یعنی اس کے کمالات پہ دلالت کرنے والے کلمات اتنے زیادہ ہیں، اس کے مقابلے میں کوئی دوسرا کیا آسکتا ہے اور اس کے کمالات میں کوئی دوسرا کیا شریک ہوسکتا ہے، اگر سمندر کو سیاہی بنادیا جائے، اور سورۂ لقمان میں آپ کے سامنے لفظ آئیں گے کہ اگر ساتوں سمندر سیاہی بن جائیں، اور دُنیا کے اندر جتنے درخت ہیں، ان کی قلمیں بنالی جائیں، اب اندازہ کیجئے کہ ایک ہی درخت سے اگر قلمیں بنانے لگیں آپ، جس طرح سے معروف قلم ہوا کرتی ہے، تو ہزاروں قلمیں ایک ہی درخت سے نکل آئیں گی، تو سارے درخت جتنے بھی ہیں اگر قلمیں بن جائیں، اور ساتوں سمندروں کی سیاہی بنادی جائے، تو یہ سیاہی ختم ہوجائے گی، قلمیں گھس جائیں گی، لیکن اللہ تعالیٰ کے کمالات تحریر میں نہیں آسکتے، وہ ختم نہیں ہوں گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے کمالات غیر متناہی ہیں جو کہیں ختم ہونے والے نہیں، اور یہ چیزیں بہر حال ختم ہونے والی ہیں۔ تو جو ذات اتنے کمالات کی مالک ہے اس کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک ٹھہرانے کا کیا مطلب؟ "آپ کہہ دیجئے کہ اگر سمندر سیاہی ہو میرے رَبّ کے کلمات کے لئے" یعنی میرے رَبّ کے کلمات کے لکھنے کے لئے، "تو ختم ہوجائے گا سمندر قبل اس سے کہ میرے رَبّ کے کمالات ختم ہوں، اگرچہ اس کے ساتھ ہم اس جیسا اور بھی بطور مدد کے لے آئیں"، وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ: بمثل البحر اس سمندر کی طرح اگر ہم اور بھی لے آئیں اس جیسا، مَدَدًا: از روئے مدد کے۔

عقیدۂ "بشریتِ انبیاء" ضروریاتِ دِین میں سے ہے

اور آپ یہ بھی کہہ دیجئے کہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ میں تم جیسا بشر ہی ہوں یعنی میرے متعلق تم اگر یہ سوچو کہ میں یہ کر کے دِکھاؤں، وہ کر کے دِکھاؤں، جس طرح سے تم بسا اوقات باتیں کرنے لگ جاتے ہو، تو مجھے کوئی خدائی اختیارات حاصل نہیں ہیں، میں تم جیسا بشر ہی ہوں۔ "تم جیسا" ہونے کا مطلب یہ ہے کہ میں اللہ کی مخلوق ہوں، آدم کی اولاد ہوں، انسان ہوں، جس کو آپ دوسرے لفظوں میں کہہ سکتے ہیں کہ ہم جنس ہونے کے اعتبار سے تم جیسا ہوں، اس سے من کل الوجوہ برابری نہیں نکلتی، حاشا و کلا! کبھی ذہن کے اندر یہ وہم نہ آنے پائے کہ انبیاء ﷺ بھی ہماری طرح ہی ہوتے ہیں، جیسے ہم ویسے وہ، چہ نسبت خاک را با عالم پاک، انبیاء ﷺ کے ساتھ عام انسانوں کو کوئی نسبت نہیں ہے، تو یہ جو کہا جاتا ہے کہ انبیاء ﷺ بھی ہم جیسے ہیں، تو ہم جیسے ہونے سے مراد ہے صرف انسان ہونا، مخلوق ہونا، غیر خدا ہونا، آدم کی اولاد ہونا، ان باتوں میں ہم جیسے ہیں، جس کو ہم اس طرح سے کہہ سکتے ہیں کہ جنس میں ہم جیسے ہیں، ہمارے ہم جنس ہیں، باقی! کمالات کے اعتبار سے کتنا فرق ہے؟ وہ تو صرف یُوْحٰٓى اِلَيَّ سے ہی فرق

نمایاں ہوجاتا ہے کہ ان کے اُوپر اللہ کی وحی آتی ہے، اور اللہ کی وحی کے آنے کے ساتھ ان کو اتنا شرف اور اتنا کمال حاصل ہوجاتا ہے کہ ساری دُنیا کے انسان اکٹھے ہو کے اگر ان کے کمال کا مقابلہ کرنا چاہیں تو ان کی گرد کو نہیں پہنچ سکتے۔ جیسے ساری مخلوق کسی اعتبار سے بھی اللہ کے کمالات تک نہیں پہنچ سکتی، اسی طرح سے انبیاء ﷺ کے علاوہ باقی جتنے انسان ہیں وہ کسی کوشش کے ساتھ بھی انبیاء ﷺ کے کسی ادنیٰ کمال کو بھی نہیں پہنچ سکتے، تو مثلیت کا یہ معنی نہیں کہ بالکل ہم جیسے ہو گئے، برابری اس طرح سے نہیں ہے، بلکہ انسان ہونے میں ہم جیسے ہیں، آدم کی اولاد ہونے میں ہم جیسے ہیں، اللہ کی مخلوق ہونے میں ہم جیسے ہیں، اور غیرِ خدا ہونے میں ہم جیسے ہیں، باقی! جہاں تک کمالات کا تعلق ہے تو کمالات میں تو آپ جتنے بیٹھے ہیں، آپ اور آپ کے اساتذہ یہ بھی ایک جیسے نہیں، ان میں زمین وآسمان کا فرق ہے، تو نبیوں کا مقابلہ باقی انسانوں سے کیا ہی کرنا ہے، اس لیے وہ جو عربی میں فقرہ آتا ہے کہ:

مُحَمَّدٌ بَشَرٌ لَا كَالْبَشَرِ هُوَ مِثْلُ الْيَاقُوْتِ بَيْنَ الْحَجَرِ

کہ محمد ﷺ بشر تو ہیں، لیکن عام بشر جیسے نہیں، بلکہ اس طرح سے ہیں جس طرح سے پتھروں میں ''یاقوت'' ہوتا ہے۔ ''یاقوت'' بھی پتھر ہے، پتھروں میں سے ایک موتی نکلا کرتا ہے جس کو ''یاقوت'' کہتے ہیں، اب ایک پتھر تو یہ ہیں جو سڑکوں پہ کوٹے جاتے ہیں، اور ایک ''یاقوت'' ہے، ''یاقوت'' ماشوں کے حساب سے تُل کے بکتا ہے، اور یہ ٹرکوں کے حساب سے بکتے ہیں، معمولی سے ''یاقوت'' کے بدلے میں آپ ایک ٹرک عام پتھروں کا لے لیں، ہوتا وہ بھی پتھر ہے، لیکن مرتبے کے اعتبار سے دونوں میں کتنا فرق ہے۔ اور اگر اس کو آپ اپنی اصطلاحات میں سمجھنا چاہیں، تو منطق تو آپ سب نے تھوڑی بہت پڑھی ہے، منطقیوں کے ہاں انسان کی جنس کیا ہے؟ (حیوان)، اور گدھے کی جنس کیا ہے؟ (حیوان)، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ منطقیوں کے نزدیک آپ کا ہم جنس تو گدھا بھی ہے، آپ اور گدھا دونوں ہم جنس ہیں، لیکن کیا ہم جنس ہونے کی وجہ سے گدھا اور انسان برابر ہو گئے؟ (نہیں)۔ تو جس طرح سے منطقیوں کی جنس حیوان، اس میں انسان بھی شریک ہے اور گدھا بھی شریک ہے، لیکن ہم جنس ہونے کے باوجود کوئی نسبت ہی نہیں گدھے میں اور انسان میں، اسی طرح سے فقہی اصطلاح کے اعتبار سے انسان جنس ہے، اور جتنے افراد اس میں شامل ہیں ان افراد میں اس سے بھی زیادہ فرق ہوسکتا ہے جس طرح سے منطقیوں کی جنس میں گدھا اور انسان شریک ہے اور ان کا آپس میں فرق ہے، تو ہم جنس ہوجانے سے برابری لازم نہیں آیا کرتی، یہ غلط بات ہے جو لوگ کہہ دیتے ہیں کہ دیکھو! یہ اپنے جیسا سمجھتے ہیں، اور اس میں انبیاء ﷺ کی توہین کا پہلو نکلتا ہے، تو یہ بات غلط ہے، تو یہاں مثلیت اس بارے میں ہے، ہم جنس ہونے میں، انسان ہونے میں، مخلوق ہونے میں، غیرِ خدا ہونے میں، باقی! جہاں تک کمالات کا تعلق ہے، تو کمالات اللہ تعالیٰ انبیاء ﷺ کو اتنے دیتا ہے کہ کوئی انسان سوچ بھی نہیں سکتا، سارے انسان مل کر مقابلہ کرنا چاہیں تو انبیاء ﷺ کے کسی کمال کو حاصل نہیں کر سکتے۔

تو بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ یہ عقیدہ قطعی ہے، انبیاء ﷺ بشر ہیں یہ عقیدہ قطعی ہے، ضروریاتِ دین میں سے ہے، جو شخص سرے سے انکار کرے کہ نبی بشر ہوتا ہی نہیں، وہ قرآن کریم کی بیسیوں آیتوں کا منکر ہے اور بالکل کافر ہے، جس میں تاویل کی گنجائش نہیں

ہے۔انبیاء ﷺ کے متعلق بشریت کا عقیدہ رکھنا ضروریاتِ دِین میں سے ہے،اس میں نہ کوئی تاویل کی جاسکتی ہے، نہ اس کا انکار کیا جاسکتا ہے، باقی! بشر ہونے کے باوجود کمالات میں کوئی نسبت نہیں، کمالات ان کو اللہ تعالیٰ اتنے دیتا ہے کہ سارے انسان مل کر بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتے،اور ہمارا عقیدہ اسی طرح سے ہے جیسے عربی میں نقل کیا کرتے ہیں (جو گزر چکا ہے)،اور فارسی کا فقرہ بھی آتا ہے''بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر'' کہ اللہ تعالیٰ کے بعد کمالات میں ساری مخلوق میں نمبر حضور ﷺ کا آتا ہے،اور کسی کے ساتھ کمالات میں برابری سوچی ہی نہیں جاسکتی، اتنے اللہ تعالیٰ نے کمالات دیے ہوئے ہیں، تو اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ یہ مثلیت آ گئی،اور آگے وحی کا مضمون آ گیا کہ اَنَّمَآ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ میری طرف یہ مضمون وحی کیا جاتا ہے کہ تمہارا الٰہ ایک ہی الٰہ ہے۔

حضور ﷺ کی تعریف کی حدود

''وحی کیا جاتا ہے'' اس سے آپ کی رسالت کی طرف اشارہ نکل آیا، کہ آپ بشر ہیں لیکن ساتھ ساتھ رسول بھی ہیں، دونوں باتوں کی رعایت رکھنی چاہیے، حدیث شریف میں آتا ہے، سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا: ''لَا تُطْرُوْنِيْ كَمَا اَطْرَتِ النَّصَارٰى ابْنَ مَرْيَمَ فَاِنَّمَا اَنَا عَبْدُهٗ فَقُوْلُوْا: عَبْدُاللهِ وَرَسُوْلُهٗ''[1] او کما قال علیه الصلاۃ والسلام۔ میری تعریف اس طرح سے نہ کرنا جس طرح سے عیسائیوں نے ابنِ مریم کی تعریف کی، ابنِ مریم کو اُٹھا کے خدا بنا دیا، میری تعریف اس طرح سے نہ کرنا، میں تو اللہ کا بندہ ہوں، تم یوں کہا کرو کہ اللہ کا بندہ اور اس کا رسول، عَبْدُاللهِ وَرَسُوْلُهٗ یوں کہا کرو، یعنی میری تعریف یہی ہے عَبْدُاللهِ وَرَسُوْلُهٗ، اس کا مطلب یہ ہے کہ میری دونوں حیثیتوں کی رعایت رکھو، کہ میں عبد بھی ہوں اور رسول بھی ہوں، ایسی بات میری طرف منسوب نہ کرو کہ جس میں خدائی کا شبہ پڑتا ہو، یہ عبدیت کے منافی ہے، اور ایسی بات بھی میرے متعلق نہ کہو کہ جس میں کوئی گستاخی نکلتی ہو، یہ رسالت کے منافی ہے، رسول ہونے کی حیثیت کو بحال رکھو، اور عبد ہونے کی حیثیت کو بحال رکھو، اس کے درمیان میں جتنی تعریف کرو گنجائش ہے، تعریف میں ایسی بات نہیں کہنی چاہیے جو عبدیت کے منافی ہو، اور تعریف میں کوئی ایسی بات بھی نہیں کہنی چاہیے جو شانِ رسالت کے منافی ہو، اِفراط و تفریط دونوں سے بچتے ہوئے جس قدر بھی سرورِ کائنات ﷺ کی تعریف کر لی جائے اتنی ہی ٹھیک ہے، لیکن ان دونوں باتوں کی رعایت رکھنی چاہیے، نہ کوئی ایسی بات منسوب کریں جو عبدیت کے منافی ہو، نہ ایسی بات منسوب کریں جو شانِ رسالت کے منافی ہو۔

اللہ تعالیٰ سے ملاقات کی شرائط

تو یہ عقیدۂ توحید میری طرف وحی کیا گیا ہے کہ تمہارا الٰہ ایک ہی الٰہ ہے، پس جو کوئی شخص اپنے رَبّ کی ملاقات کی اُمید رکھتا ہے، جس کا عقیدہ یہ ہے کہ ایک دِن رَبّ سے ملاقات ہوگی، جس طرح سے ہم سب عقیدہ رکھتے ہیں، تو اسے چاہیے کہ نیک عمل

(۱) بخاری ج۱ ص۴۸۸ باب قول الله: واذکر فی الکتب مریم۔ مشکوۃ ۲/ ۴۱۷ باب المفاخرۃ فصل اول۔

کرے اور اپنے ربّ کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔ ایک تو شریک کرنا ہے صراحتاً جس کو حقیقی شرک کہتے ہیں کہ اللہ کی عبادت کی طرح کسی دوسرے کی بھی عبادت کرنی شروع کر دی جائے، یہ ہے شرکِ حقیقی، شرکِ جلی۔ اور ایک ہے شرکِ خفی جسے شریعت میں ''ریا'' کہا جاتا ہے، اس کو حضور ﷺ نے شرکِ اصغر کے ساتھ تعبیر کیا، کہ ریا شرکِ اصغر ہے۔ ''ریا'' کا مطلب یہ ہوا کرتا ہے کہ آپ نیکی کا کام کریں اور اس میں صرف اللہ کی رضا مطلوب نہ ہو، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ دِکھلاوا، لوگوں کے دِلوں میں عزت حاصل کرنا، اور اپنی شہرت حاصل کرنا، اس قسم کے مقاصد اگر انسان کے سامنے آ جائیں، دِکھلاوے کے طور پر نیکی کا کام کرتا ہے تو اس نے اپنے اس نیک عمل میں اللہ کی رضا کے ساتھ دوسروں کو بھی شامل کر لیا، اِس کو بھی حضور ﷺ نے شرک سے تعبیر کیا، اس لیے جو نیک کام کرو خلوص کے ساتھ کرو، اللہ کی رضا کے لئے کرو، تب آخرت میں جب اللہ تعالیٰ سے ملاقات ہوگی تو اس کے اوپر ثواب ملے گا۔ ''جو کوئی شخص اپنے ربّ کی ملاقات کی اُمید رکھتا ہے اسے چاہیے کہ نیک عمل کرے اور اپنے ربّ کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔''

سُبۡحَانَکَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمۡدِکَ اَشۡهَدُ اَنۡ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنۡتَ اَسۡتَغۡفِرُکَ وَاَتُوۡبُ اِلَیۡکَ

سورة مريم

رکوعاتها ۶ ۴۴ مَكِّيَّةٌ ۱۹ سُوْرَةُ مَرْيَمَ آیاتها ۹۸
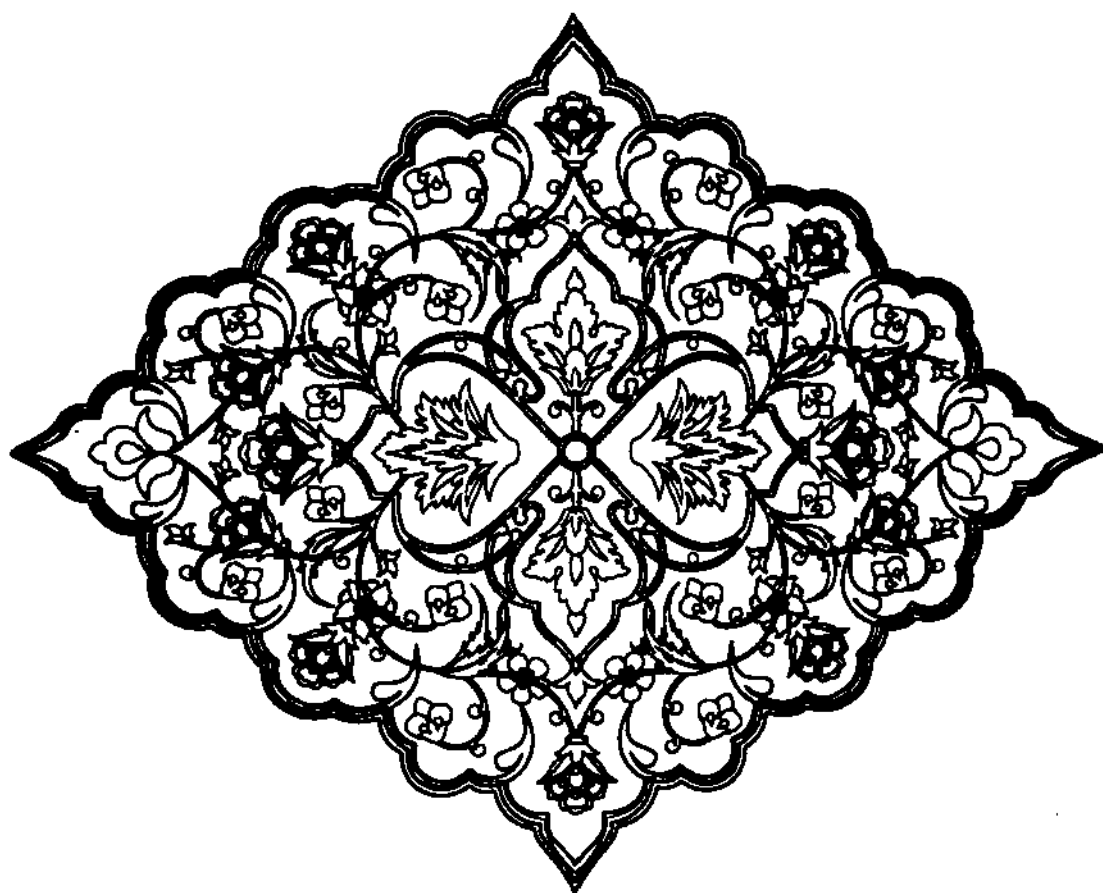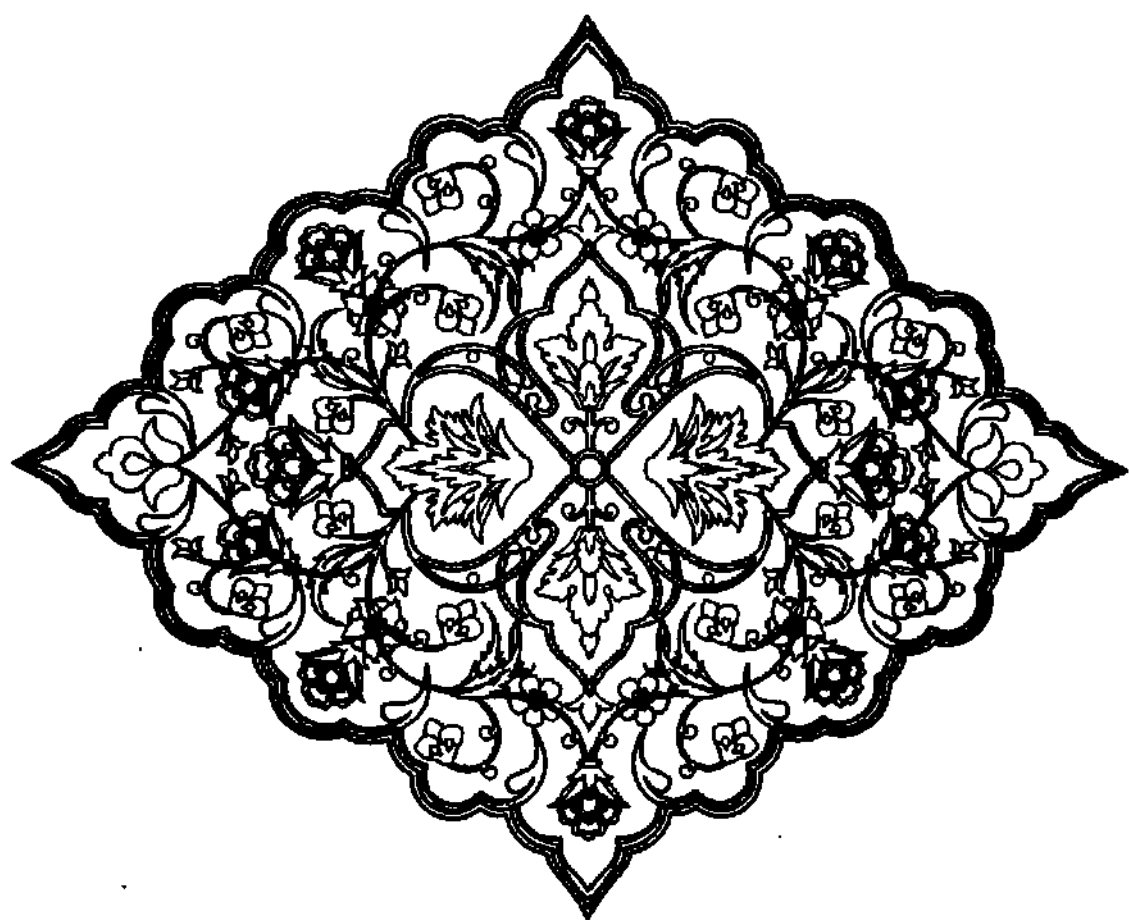
سورۂ مریم مکہ میں نازل ہوئی، اس میں ۹۸ آیات اور چھ رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے

كٓهٰيٰعٓصٓ ﴿۱﴾ ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا ﴿۲﴾ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ﴿۳﴾

كٓهٰيٰعٓصٓ ① یہ ذِکر ہے تیرے رَبّ کے اپنے بندے زکریا پر رحمت کرنے کا ② جب پُکارا زکریا نے اپنے رَبّ کو چپکے چپکے ③

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّیْ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَیْبًا وَّلَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآئِكَ

کہا زکریا نے کہ اے میرے رَبّ! میری ہڈیاں کمزور ہو گئیں اور میرے سَر میں سفیدی پھیل گئی، اور میں تجھے پُکارنے کے ساتھ

رَبِّ شَقِیًّا ﴿۴﴾ وَاِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآءِیْ وَكَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا

اے میرے رَبّ! نامراد نہیں ہوا ④ بے شک میں اندیشہ کرتا ہوں اپنے رشتہ داروں سے اپنے پیچھے، اور میری بیوی بانجھ ہے،

فَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا ﴿۵﴾ یَّرِثُنِیْ وَیَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ ۖ وَاجْعَلْهُ

پس تُو عطا کر مجھے خاص اپنے پاس سے وارث ⑤ جو میرا وارث بنے، اور آلِ یعقوب کا وارث بنے، اور بنا دے اس ولی کو

رَبِّ رَضِیًّا ﴿۶﴾ یٰزَكَرِیَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ ۨاسْمُهٗ یَحْیٰی ۙ لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ

اے میرے رَبّ! پسندیدہ ⑥ ہم نے کہا: اے زکریا! بے شک ہم بشارت دیتے ہیں تجھے لڑکے کی اس کا نام یحییٰ ہوگا، ہم نے اس کا

مِنْ قَبْلُ سَمِیًّا ﴿۷﴾ قَالَ رَبِّ اَنّٰی یَكُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّكَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا وَّقَدْ

ہم صفت اس سے پہلے نہیں بنایا ⑦ زکریا علیہ السلام نے کہا: اے میرے رَبّ! میرے لیے لڑکا کیونکر ہوگا؟ میری بیوی تو بانجھ ہے، تحقیق

بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِیًّا ﴿۸﴾ قَالَ كَذٰلِكَ ۚ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَیَّ هَیِّنٌ

میں بڑھاپے سے انتہا کو پہنچ گیا ہوں ⑧ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: واقعہ ایسے ہی ہوگا، تیرا رَبّ یہ کہتا ہے کہ یہ میرے پہ آسان ہے،

وَّقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَیْئًا ﴿۹﴾ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّیْٓ

اور میں تجھے اس سے پہلے پیدا کر چکا ہوں، اور تُو کچھ بھی نہیں تھا ⑨ زکریا علیہ السلام نے کہا کہ اے میرے رَبّ! میرے لیے کوئی نشانی

اٰيَةً ؕ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا ⑩

متعین کر دو، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تیری نشانی یہ ہے کہ تُو بات نہیں کرے گا لوگوں سے تین رات تک اس حال میں کہ تو تندرست ہوگا ⑩

فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰۤى اِلَيْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ⑪ يٰيَحْيٰى

پھر نکلے زکریا اپنی قوم پر اپنے عبادت خانے سے، اشارہ کیا لوگوں کی طرف کہ تم لوگ تسبیح بیان کرو صبح شام ⑪ (ہم نے کہا) اے یحییٰ

خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ؕ وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ⑫ وَّحَنَانًا

کتاب کو مضبوطی سے تھام لو، ہم نے اس کو فیصلے کی قوت دے دی تھی اس حال میں کہ وہ بچہ تھا ⑫ اور ہم نے اس کو رقتِ قلب دی تھی

مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً ؕ وَكَانَ تَقِيًّا ⑬ وَّبَرًّۢا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ⑭

اپنے پاس سے، اور وہ پرہیزگار تھا ⑬ اور اپنے والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرنے والا تھا، اور وہ زبردست اور نافرمان نہیں تھا ⑭

وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوْتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ⑮

اور سلام ہے اس پر جس دِن کہ وہ پیدا کیا گیا اور جس دِن کہ وہ مرے گا اور جس دِن کہ زندہ کر کے اُٹھایا جائے گا ⑮

سورۂ مریم کے مضامین

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ۔ سورت کے مضامین میں مکی سورتوں کی طرح تین مضمون ہی آ رہے ہیں، اثباتِ توحید، اِثباتِ رِسالت اور تذکیرِ آخرت۔ توحید کا تذکرہ تو اس انداز سے آئے گا، کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا وعظ نقل کریں گے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کس طرح توحید کی تلقین کی تھی۔ اور بہت زیادہ وضاحت کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا وعظ آئے گا کہ انہوں نے اپنے والد کو کس طرح نصیحت کی تھی، شرک سے روکا اور توحید کا درس دیا۔ رسالت کا مسئلہ انبیاء علیہم السلام کے تذکرے کے ساتھ واضح ہوگا جس سے معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی عادت ہے کہ اس طرح گاہے گاہے انبیاء علیہم السلام بھیجتے ہیں تو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو اگر نبی بنا دیا گیا تو یہ کوئی عجیب بات نہیں، پہلے سے ہی یہ سلسلہ جاری ہے۔ اور پھر پچھلی تاریخ کے واقعات بغیر کسی کتاب میں پڑھنے کے، بغیر کسی اُستاذ سے سننے کے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم صحیح صحیح بیان فرما رہے ہیں تو یہ علامت ہوگی کہ آپ اللہ کے نبی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ پر وحی آتی ہے۔ اور آخرت کی تذکیر بھی اسی طرح مختلف انداز سے ہوتی چلی جائے گی، پہلے رکوع میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کی ولادت کا واقعہ نقل کیا گیا ہے اور دوسرے رکوع سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قصہ شروع ہوگا، اور یہ دونوں واقعے تفصیل کے ساتھ سورۂ آل عمران میں گزر چکے ہیں۔ پہلے ان کا ترجمہ دیکھ لیں۔

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

کٓھٰیٰعٓصٓ: یہ حروف مقطعات ہیں، اَللّٰہُ اَعْلَمُ بِمُرَادِهٖ بِذٰلِكَ، مقطعات کا مطلب یہ ہے کہ ان کو جوڑ کے نہیں پڑھا جاتا بلکہ ہر حرف کو علیحدہ علیحدہ پڑھا جاتا ہے ك ه ی ع ص، اس لیے ان کو ''مقطعات'' کہا جاتا ہے۔ بعض سورتوں کے شروع میں یہ آئے ہوئے ہیں جیسے آگے آئے گا طٰہٰ۔ یٰسٓ۔ الٓمٓ۔ الٓرٰ۔ الٓمٓرٰ۔ صٓ۔ نٓ، یہ حروف مقطعات ہیں، ان کے معانی سرورِ کائنات ﷺ نے صراحتاً بیان نہیں فرمائے، اس لیے عام طور پر عربی تفسیروں میں کہہ دیا جاتا ہے: اَللّٰہُ اَعْلَمُ بِمُرَادِهٖ بِذٰلِكَ (جلالین)، اور اُردو تفسیروں میں لکھا ہوا ہوتا ہے کہ ''ان سے اللہ کی جو مراد ہے وہ اللہ ہی بہتر جانتے ہیں۔'' اور فقہاء ان کو حروفِ متشابہات میں شمار کرتے ہیں کہ جن کی مراد اللہ کے علم میں ہی ہے۔ ایمان ہم لاتے ہیں کہ اللہ کی جو مراد ہے برحق ہے، باقی! صراحت کے ساتھ یہ ذکر نہیں کیا گیا کہ ان حروف سے کیا مراد ہے؟ اور بعض مفسرین ان حروف کو سورت کا نام قرار دیتے ہیں (قرطبی، نسفی، آلوسی)۔ گویا کہ جیسے اس سورت کا نام ''مریم'' ہے، اسی طرح سے اس کا نام کٓھٰیٰعٓصٓ بھی ہے، اسمائے سُوَر کے ساتھ ان کو تعبیر کیا جاتا ہے، بہر حال یہ متشابہات میں سے ہیں، ''اَللّٰہُ اَعْلَمُ بِمُرَادِهٖ بِذٰلِكَ'' ان حروف میں جس قسم کی رمزیں ہیں وہ اللہ نے اپنے رسول کو سمجھائیں، اور اللہ کے رسول نے ہمیں صراحتاً نہیں بتایا کہ ان حروف سے اللہ کی کیا مراد ہے، ہم اس پر اجمالاً ویسے ہی ایمان لاتے ہیں جس طرح سے متشابہات پر ایمان لایا جاتا ہے، ان کا ترجمہ کچھ نہیں ہوتا۔ ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا: رَحْمَتِ مصدر ہے، اور رَبّ کی طرف اس کی اضافت مصدر کی اضافت فاعل کی طرف ہے، اور عَبْدَهٗ یہ رَحْمَتِ کا مفعول ہے، اور زَكَرِيَّا اس کا بیان ہے جیسے بدل مبدل منہ ہوا کرتے ہیں، تو زَكَرِيَّا بدل ہے، عَبْدَهٗ مبدل منہ ہے، بدل مبدل منہ کا بیان ہی ہوتا ہے۔ ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا: تیرے رَبّ کا اپنے بندے زکریا پر رحم فرمانا، یوں ترجمہ ہوگا مصدر کے ساتھ۔ ''یہ ذکر ہے تیرے رَبّ کے اپنے بندے زکریا پر رحمت کرنے کا'' یعنی یہ آیات جو آگے پڑھی جارہی ہیں، اس میں یہ ذکر آئے گا کہ تیرے رَبّ نے ایک وقت میں زکریا پر خاص رحمت کی تھی، اس رحمت کا یہ ذکر آرہا ہے۔ ''تیرے رَبّ کے اپنے بندے زکریا پر رحم فرمانے کا یہ ذکر ہے۔'' اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ: نادی یُنَادِیْ نِدَاءً: پکارنا، آواز دینا۔ اور خَفِيًّا: مخفی، یہ بات اعلان کے خلاف ہوتی ہے۔ جس وقت کہ آواز دی اس زکریا نے اپنے رَبّ کو آواز دینا خفی، یعنی چپکے چپکے پکارا۔ ہم ایک دوسرے کو بلند آواز سے پکارتے ہیں تو وجہ یہ ہوتی ہے کہ ہمارا مخاطب اس وقت تک سنتا نہیں جب تک ہم بلند آواز سے نہ بولیں، اس لیے انسان انسان کو پکارتا ہے تو اس میں جہر ہوتا ہے، جہر کے طور پر پکارا جاتا ہے، اور اللہ تعالیٰ تو چونکہ ہر چیز کو سنتے ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ کو پکارنا خفیہ طور پر ہی ہے، یعنی میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ یہاں نداء کا ترجمہ جو ہم پکارنے سے کر رہے ہیں تو اس سے جہر معلوم ہوتا ہے، اور خفی کے لفظ سے عدم جہر معلوم ہوتا ہے، تو یہ ایک عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے کہ چپکے چپکے پکارا۔ تو اللہ تعالیٰ کو جو چپکے چپکے پکارا جاتا ہے وہ اسی طرح سے سنتا ہے جس طرح سے ہم ایک دوسرے کو جہراً پکاریں تو سنا جاتا ہے۔ ''جب پکارا زکریا نے اپنے رَبّ کو چپکے چپکے، پکارنا پوشیدہ طور پر، چھپی آواز سے۔'' آگے اس پکارنے کا بیان ہے کہ پکارتے ہوئے کیا کہا، قَالَ رَبِّ اِنِّیْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّیْ: عظم: ہڈی۔ وَهن: کمزور ہو جانا۔ کہا زکریا نے کہ اے

میرے رَبّ! (رَبِّ کی باء کے نیچے جو کسرہ ہے وہ دال ہے یائے متکلم پر) اے میرے رَبّ! بے شک میں، کمزور ہوگئی میری ہڈی، وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَیْبًا: شَابَ یَشِیْبُ شَیْبًا: بالوں کا سفید ہوجانا۔ اس لیے شیب بڑھاپے کو کہہ دیتے ہیں، اصل اس کا معنی ہوتا ہے بالوں کا سفید ہوجانا۔ اشتعال: پھوٹ پڑنا، جوش مارنا۔ اور اُس کا معنی سر۔ شَیْبًا تمیز ہے۔ بھڑک پڑا میرا سر ازروئے سفیدی کے، لفظی معنی یوں بنے گا، یعنی میرے سر میں سفیدی بھڑک اٹھی، میرے سر میں سفیدی پھیل گئی۔ میری ہڈیاں کمزور ہوگئیں اور میرے سر میں سفیدی پھیل گئی یعنی میرے بال سفید ہوگئے۔ وَلَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِیًّا: دُعَائِكَ: اور نہیں ہوں میں تجھے پکارنے کے ساتھ (یہاں دعاء مصدر ہے اور اس کی اضافت مفعول کی طرف ہے) تجھے پکارنے کے ساتھ اے میرے رَبّ! میں نامراد نہیں ہوا۔ شقی یہ سعید کے مقابلے میں ہے۔ سعید: نیک بخت، جو اپنی مراد کو حاصل کرلے۔ اور شقی: نامراد، جو اپنی مراد کو حاصل نہ کرسکے۔ ''اور میں تجھے پکارنے کے ساتھ نامراد نہیں ہوا'' یعنی آج تک میں نے جس چیز کے لئے تجھے پکارا اپنی مراد پائی۔ اور اب بھی میں اُمید رکھتا ہوں کہ جب تجھے پکاروں گا تو اپنی مراد پالوں گا، میں نااُمید نہیں ہوں، نامراد نہیں رہوں گا۔ ''اے میرے رَبّ! میری ہڈیاں کمزور ہوگئیں، میرے سر میں سفیدی بھڑک اٹھی'' یعنی سر میں سفیدی پھیل گئی، ''اور میں تجھ کو پکارنے کے ساتھ اے میرے پروردگار! نامراد نہیں ہوا'' یعنی ایسا نہیں ہوا کہ میں کبھی محروم رہا ہوں۔ تو شقی یہاں سعید کے مقابلے میں ہے، سعید کا معنی ہے جو اپنے مقصد میں کامیاب ہوجائے، اور شقی کا معنی ہوگا کہ جو اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو۔ وَاِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآءِیْ: موالی مولیٰ کی جمع ہے، مولیٰ سے یہاں رشتہ دار مراد ہیں۔ بے شک میں اندیشہ کرتا ہوں اپنے رشتہ داروں سے اپنے پیچھے، اپنے پیچھے اپنے رشتہ داروں سے میں اندیشہ کرتا ہوں۔ وَكَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا: عاقر کہتے ہیں جو اولاد کی اہل نہ ہو، بانجھ، جو عورت اولاد کے قابل نہیں۔ اور میری بیوی بانجھ ہے۔ فَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا: پس تو عطا کر مجھے خاص اپنے پاس سے وارث۔ ولی یہاں وارث کے معنی میں ہے، یعنی بچہ عطا کر، جس طرح سے دوسری جگہ لفظ آئے گا هَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّیَّةً طَیِّبَةً (سورۂ آل عمران: ۳۸) پاکیزہ اولاد۔ تو یہاں ولی سے وہی اولاد مراد ہے۔ ''مجھے خاص اپنے پاس سے'' یعنی اگرچہ اسباب موجود نہیں لیکن تو اپنے پاس سے مجھے ولی عطا فرما، وارث عطا فرما، بیٹا عطا فرما، اولاد دے، ولی کا مصداق یہاں یہی ہے۔ یَّرِثُنِیْ: یہ وَلِیًّا کی صفت ہے۔ ایسا بیٹا جو میرا وارث بنے، وَیَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ: اور آلِ یعقوب کا وارث بنے، یعقوب کی اولاد، یعنی سارا اسرائیلی خاندان، کیونکہ یعقوب علیہ السلام کا نام ہی ''اسرائیل'' ہے، اور آپ کی اولاد میں جو خاندان پھیلا ہے اسی کو ''بنی اسرائیل'' کہتے ہیں، ''اسرائیل'' حضرت یعقوب علیہ السلام کا نام ہے، اور ان کے آگے بارہ بیٹے تھے تو بارہ خاندان بنے، تو یہ سارے کے سارے ''بنی اسرائیل'' کہلاتے ہیں۔ یعقوب علیہ السلام کی اولاد ''وارث بنے وہ آلِ یعقوب کا، یعقوب کی اولاد کا۔'' وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِیًّا: اور بنادے اس بچے کو، اس ولی کو، اس لڑکے کو اے میرے رَبّ! پسندیدہ۔ پسندیدہ ہو یعنی اس میں کوئی ایسی بات نہ ہو جس کی بنا پر اس سے نفرت ہو، وہ پسند نہ ہو۔ یٰزَكَرِیَّآ: اس سے پہلے قُلْنَا کا لفظ محذوف ہے۔ ہم نے کہا: اے زکریا! اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ: بے شک ہم بشارت دیتے ہیں تجھے لڑکے کی اسْمُهٗ یَحْیٰی اس کا نام یحییٰ ہوگا لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِیًّا: سمی کہتے ہیں: ہم صفت، نظیر اور مثل کو۔ جیسے آگے غالباً اسی سورت میں آئے گا هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِیًّا (آیت: ۶۵) کیا تجھے کوئی اللہ کا ہم صفت، اللہ کی نظیر، اللہ کا کوئی مثل معلوم

ہے؟ تو یہاں سمی سے نظیر، ہم صفت مراد ہے۔ ''ہم نے اس کا ہم صفت اس سے پہلے نہیں بنایا، ہم نے اس کی نظیر اس سے پہلے نہیں بنائی۔'' اور شرح تہذیب میں بھی یہ لفظ آئے گا: ''سَمِیُّ حبیبِ اللہ''، وہاں ہم نام کے معنی میں ہے، حبیب اللہ کا ہم نام، ابتدا میں خطبے کے اندر یہ الفاظ آئیں گے۔ ''نہیں بنایا ہم نے اس کے لئے اس سے قبل ہم نام'' یعنی اس کے نام کا ہم نے پہلے کوئی نہیں بنایا، اور یہاں ظاہر یہ ہے کہ اس کی صفات کا، اس کی مثل اور اس کی نظیر ہم نے کسی کو نہیں بنایا، یعنی بعض صفات میں ایسا ممتاز ہوگا کہ اس قسم کی صفت ہم نے پہلے کسی کو نہیں دی۔ قَالَ: زکریا علیہ السلام نے فرمایا، رَبِّ اَنّٰی یَكُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ: اے میرے رَبّ! میرے لیے لڑکا کیونکر ہوگا؟ وَّكَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا: اور میری بیوی تو بانجھ ہے۔ وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا: عِتِيًّا: حد سے بڑھنا۔ کبر بڑھاپے کو کہتے ہیں۔ عِتِيًّا عَتَا يَعْتُوْ سے ہے، اصل میں عُتُوْوًا تھا، بعد میں تعلیل ہو کے عِتِيًّا ہوگیا۔ ''تحقیق پہنچ گیا ہوں میں انتہا کو بڑھاپے سے، میں بڑھاپے سے اِنتہا کو پہنچ گیا ہوں'' میرا بڑھاپا اپنی حد سے تجاوز کر گیا ہے، یعنی بہت بوڑھا ہو گیا ہوں۔ قَالَ كَذٰلِكَ: اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ الأمر کذالك، واقعہ ایسے ہی ہوگا۔ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَیَّ هَیِّنٌ: فرشتے کی وساطت سے یہ بات آئی، کہ تیرا رَبّ یہ کہتا ہے کہ یہ میرے پہ آسان ہے۔ هَیِّنٌ آسان کو کہتے ہیں، یعنی بیٹا دے دینا میرے لیے آسان ہے، وَقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ اور میں تجھے اس سے پہلے پیدا کر چکا ہوں وَلَمْ تَكُ شَيْـًٔا: اور تُو کچھ بھی نہیں تھا۔ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّیْۤ اٰیَةً: زکریا علیہ السلام نے کہا کہ اے میرے رَبّ! میرے لیے کوئی نشانی متعین کر دو یعنی حمل کے ٹھہرنے کی، جس سے معلوم ہو جائے کہ بچہ اپنی ماں کے بطن میں آ گیا، بنیاد اُٹھ کھڑی ہوئی، اس کی بنیاد رکھ دی گئی، قَالَ اٰیَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَیَالٍ سَوِیًّا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تیری نشانی یہ ہے کہ تُو بات نہیں کرے گا لوگوں سے تین رات تک اس حال میں کہ تُو تندرست ہوگا۔ سوی سے تندرست مراد ہے یعنی سوی الأعضاء تیرے اعضا بالکل صحیح ہوں گے۔ صحیح الاعضا، سالم الاعضا ہوگا، اور تو سالم الاعضا، صحیح، تندرست ہونے کے باوجود تین رات تک لوگوں سے بات نہیں کر سکے گا۔ سَوِیًّا کا لفظ اگلے رکوع میں بھی آئے گا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِیًّا: ایک تندرست انسان کی شکل میں جبریل متمثل ہوئے، ظاہر ہوئے۔ یہاں لَیَالٍ کا لفظ ہے، اور دوسری جگہ ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ کا لفظ ہے (سورۂ آل عمران: ۴۱) اور یہ ایک ہی چیز ہے کیونکہ جب تین رات کہہ دیا جائے تو دِن ساتھ مراد ہوتے ہیں، تین دِن کہہ دیے جائیں تو راتیں ساتھ مراد ہوتی ہیں۔ تو اس لیے یوں کہہ سکتے ہیں کہ تین شب و روز آپ لوگوں سے بات نہیں کریں گے اس حال میں کہ آپ تندرست ہوں گے۔ فَخَرَجَ عَلٰی قَوْمِهٖ: پھر نکلے زکریا اپنی قوم پر، مِنَ الْمِحْرَابِ: اپنے عبادت خانے سے۔ محراب سے وہ حُجرہ مراد ہے جس میں وہ عبادت کرتے تھے فَاَوْحٰۤی اِلَیْهِمْ: پھر اشارہ کیا لوگوں کی طرف۔ اوحی کی ضمیر حضرت زکریا علیہ السلام کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اشارہ کیا لوگوں کی طرف اَنْ سَبِّحُوْا: یہ ''اَنْ'' اس وحی کی تفصیل ہے کہ تم لوگ تسبیح بیان کرو صبح شام۔ یعنی جیسے پہلے وعظ تلقین کیا کرتے تھے، اس دِن بول نہیں سکے، اشارے کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کی تسبیح کے لئے کہا۔ یٰیَحْیٰی خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ: اب آگے مضمون محذوف ہے کہ پھر وہ واقعہ پیش آیا، تین دِن تک وہ کلام نہیں کر سکے، جس سے سمجھ گئے کہ بچہ ہوگا، اور پھر بعد میں بچہ ہوا، تو پھر ہم نے یحییٰ سے کہا کہ اے یحییٰ! کتاب کو مضبوطی سے تھام لو۔ ''کتاب'' سے یہاں توراۃ مراد ہے۔ ''مضبوطی سے تھامنے'' کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ چھوٹنے نہ پائے، ہاتھ میں پکڑنی مراد نہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس میں جو کچھ لکھا ہے، اس کے نظریات اور اس کے عملیات کو خوب اچھی طرح سے اپنا لو، مضبوطی

سے تھام لو، نہ کوئی تمہیں ڈرا کے اس کو چھڑا سکے، نہ تمہیں کوئی لالچ دے کے چھڑا سکے، کسی صورت میں یہ کتاب ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے، نہ کسی کے خوف سے نہ کسی قسم کے لالچ سے۔"اے یحییٰ! کتاب کو مضبوطی سے لے لو"۔ وَآتَيْنَاهُ الْحُكْمَ: حکم کا معنی ہوتا ہے فیصلہ کرنا، فیصلے کی صلاحیت، حق و باطل کے درمیان امتیاز کرنے کی قوت۔ ہم نے اس کو فیصلے کی قوت دے دی تھی، ہم نے اس کو حکم دے دیا تھا۔ اس سے علم و حکمت مراد ہے جس سے حق و باطل کے درمیان فیصلہ کیا جاتا ہے۔ صَبِيًّا: اس حال میں کہ وہ بچہ تھا یعنی بچپن سے ہی وہ سمجھ دار تھا، ہم نے اس کو حق و باطل کے درمیان تمیز کا سلیقہ دے دیا تھا۔ وَحَنَانًا مِّن لَّدُنَّا: حنان کہتے ہیں رقت قلب کو، سوز و گداز، محبت، شوق۔ ہم نے اس کو رقتِ قلب دی تھی اپنے پاس سے، یعنی بہت نرم دل تھا، بہت سوز گداز والا تھا، بہت محبت اور شوق والا تھا۔ وَزَكَاةً: اور پاکیزگی دی تھی، یعنی ظاہری اخلاق میں بھی کوئی کسی قسم کی کمی نہیں تھی، باطنی کیفیات میں بھی کوئی فرق نہیں تھا۔ شوق ذوق، رقتِ قلب، سوز و گداز، دل کی نرمی، یہ حنان کا مفہوم ہے۔ اور اخلاق اور عمل کی پاکیزگی ہم نے اس کو دی۔ وَكَانَ تَقِيًّا: اور وہ پرہیزگار تھا۔ وَبَرًّا بِوَالِدَيْهِ: اور اپنے والدین کے ساتھ حُسنِ سلوک کرنے والا تھا، بِرُّ الوالدین: والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرنا۔ بَرًّا یہ صفت کا صیغہ آ گیا۔ اپنے والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرنے والا تھا۔ وَلَمْ يَكُن جَبَّارًا عَصِيًّا: اور وہ زبردست، سرکش، نافرمان نہیں تھا۔ جیسا کہ عموماً ایک بچہ تمناؤں کے بعد پیدا ہوا ہو، بڑھاپے کی اولاد عموماً سرکش ہوتی ہے، ماں باپ کے قابو میں نہیں ہوتی، ماں باپ کے ہاتھوں سے نکل جاتی ہے، اس طرح سے مانگی ہوئی اولاد جو تمناؤں کے بعد ملی ہو پھر بڑھاپے میں، وہ عموماً نافرمان ہوتی ہے وہ ایسا نہیں تھا، لَمْ يَكُن جَبَّارًا عَصِيًّا: وہ زور آور سرکش نہیں تھا، خودسر نہیں تھا۔ وَسَلَامٌ عَلَيْهِ: اور سلام ہے اس پر يَوْمَ وُلِدَ: جس دن کہ وہ پیدا کیا گیا وَيَوْمَ يَمُوتُ: جس دن کہ وہ مرے گا، وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا اور جس دن کہ زندہ کر کے اٹھایا جائے گا، یعنی پیدا ہونے میں، وفات کے وقت میں، بعث میں ان کے اوپر اللہ تعالیٰ کی طرف سے سلامتی ہی سلامتی ہے، یہ ان کو ایک بشارت ہے۔

سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ

تفسیر

یحییٰ علیہ السلام کی ولادت کا قصہ ابتدا میں ذکر کیوں کیا؟

سورۂ مریم کا خلاصہ آپ کی خدمت میں عرض کر دیا گیا، سورۂ آلِ عمران میں اس کی تفصیل گزری کہ حضرت مریم علیہا السلام کو جس وقت عبادت کے لیے وقف کر دیا گیا تھا تو حضرت زکریا علیہ السلام کو اس کا کفیل بنایا گیا تھا، اصل تو یہاں قصہ بیان کرنا ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کا، اور تردید مقصود ہے اس شرک کی جو عیسائیوں نے اختیار کیا، جیسا کہ سورۂ کہف کی ابتدا میں بھی اتخاذِ ولد کی تردید آئی تھی، یعنی اولاد والا شرک، سورۂ کہف کی ابتدا میں اسی کے اوپر وعید آئی تھی يُنذِرَ الَّذِينَ قَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا، تو عیسائی جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہتے تھے اور اللہ کی صفات میں شریک کرتے تھے، وہ زیادہ تر ان کی ولادت سے استدلال کرتے تھے، کہ یہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ براہِ راست یہ اللہ کے ہی بیٹے ہیں۔ تو وہاں آلِ عمران میں بھی

اللہ تعالیٰ نے پہلے یحییٰ علیہ السلام کی ولادت کو ذکر کیا، جس میں یہ دکھلانا مقصود ہے کہ خرقِ عادت، عام حالات کے خلاف اولاد کا ہو جانا، یہ کوئی اُلوہیت کی دلیل نہیں ہوتی، کرامات، معجزات، خرقِ عادت اس قسم کے ہوتے رہتے ہیں، حضرت مریم علیہا السلام کو اولاد اگر خرقِ عادت ملی ہے تو ان کو بچپن کے اندر رزق بھی تو خلافِ عادت ملتا رہا ہے، اور اس سے قبل زکریا علیہ السلام کو یحییٰ جو دیے گئے تھے وہ بھی تو خلافِ اسباب دیے گئے تھے، ظاہری کوئی اسباب موجود نہیں تھے، تو خرقِ عادت کے طور پر کوئی واقعہ پیش آ جائے تو اس کے اُوپر اس طرح نہیں سوچا کرتے، کہ جب ظاہر میں اس کا باپ کوئی نہیں تو معلوم ہو گیا کہ یہ اللہ کا ہی بیٹا ہے۔ جس طرح سے اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کے ساتھ بوڑھے ماں باپ کو اولاد دے دیتا ہے، جس طرح سے اللہ اپنی قدرت کے ساتھ بے موسم میوے حضرت مریم علیہا السلام کو دیتا رہا، اسی طرح سے بے موسم اولاد زکریا علیہ السلام کو دی، بے موسم مریم کو دیے، تو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کے تحت اگر مرد کی وساطت کے بغیر مریم کو بچہ دے دیا تو یہ کوئی اُلوہیت کی دلیل نہیں ہے۔ جیسے وہاں یہ بھی ذکر کیا گیا تھا کہ یہاں تو پھر بھی ماں کا واسطہ ہے، آدم علیہ السلام کے پیدا کرنے میں نہ ماں کا واسطہ تھا نہ باپ کا، تو اگر یہی اُلوہیت کی دلیل ہے تو سب سے پہلے آدم کو خدا کہو، یہاں بھی بعد میں قصہ آ رہا ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کا، ابتدا میں حضرت زکریا اور یحییٰ کا واقعہ بیان کیا جا رہا ہے۔

بیٹا مانگنے کے لئے زکریا علیہ السلام کی دُعا

اللہ تعالیٰ نے خاص معاملہ فرمایا اپنے بندے کے ساتھ، اس کو ذکر کرنا مقصود ہے، ''چپکے چپکے اللہ کو پُکارا'' کیونکہ دُعا کا ادب یہی ہے کہ انسان چپکے چپکے اللہ کو پُکارے، زیادہ چیخنا چلانا پسند نہیں، البتہ مجمع کے اندر اگر دُعا کی جائے اور اس میں اتنا جہر ہو جائے کہ جو شریک ہیں وہ سنیں، تاکہ سُن کے اپنے دل کے اطمینان کے ساتھ آمین کہیں تو اس میں کوئی حرج نہیں، بلا وجہ چیخ و پُکار کرنا اچھا نہیں ہوتا۔ اور زکریا علیہ السلام نے دُعا کے لیے ہاتھ جو اُٹھائے تو یہی کہا کہ ''اے اللہ! میری ہڈیاں کمزور ہو گئیں'' مطلب یہ ہے کہ اب اگرچہ میں اولاد کے قابل نہیں رہا، ''سر میں سفیدی پھیل گئی، اور میری بیوی بھی اولاد کے قابل نہیں، لیکن پہلے سے میں دیکھتا ہوں کہ جب بھی تیرے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہوں تو تُو نے کبھی محروم نہیں رکھا'' تو اگرچہ ظاہری اسباب نہیں ہیں لیکن تیرے فیصلے ظاہری اسباب کے محتاج نہیں، تُو جب ارادہ کر لیتا ہے تو اسباب خود بخود پیدا ہو جایا کرتے ہیں، اسباب تیری تخلیق کے محتاج ہیں، تیرے فیصلے اسباب کے محتاج نہیں ہیں، اس لیے خلافِ اسباب خاص اپنی رحمت کے ساتھ مجھے بچہ عطا کر۔ اور یہ بچہ کیوں مانگ رہا ہوں؟ اس کی آرزو میرے دل میں کیوں پیدا ہوئی؟ کہ میرے باقی رشتہ دار مجھے نالائق معلوم ہوتے ہیں، وہ میرے بعد اس علمی سلسلے کو قائم نہیں رکھ سکیں گے، وعظ و نصیحت کو قائم نہیں رکھ سکیں گے، دِین کی خدمت اور دِین کی اشاعت کا یہ سلسلہ ختم ہو جائے گا، مجھے اپنے رشتہ داروں پہ توقع نہیں ہے، اس لیے میں کہتا ہوں کہ مجھے ایک ایسا لڑکا دے جو میرا وارث بنے۔

انبیاء علیہم السلام کی وراثت علمی ہوتی ہے نہ کہ مالی

یہاں وراثت سے وراثت علمی مراد ہے، انبیاء علیہم السلام کو مالی وراثت کی فکر نہیں ہوتی اور نہ وہ اتنے بڑے سیٹھ اور مال دار ہی تھے کہ ان کو یہ خیال ہو کہ اگر اولاد نہ ہوئی تو میرے مرنے کے بعد مال میرے رشتہ دار لے جائیں گے، انبیاء علیہم السلام کے دل میں مال

کی ایسی قدر نہیں ہو، روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام نجاری کا کام کرتے تھے، یعنی لکڑی کاٹنا، لکڑی چیرنا جس کو آپ بڑھئی یا ترکھان کہتے ہیں، اس طرح سے مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالا کرتے تھے، اور باقی وقت سارے کا سارا دین کی خدمت اور وعظ ونصیحت میں گزارتے تھے، ذریعۂ معاش یہ اختیار کر رکھا تھا، تو کوئی اتنے بڑے مال دار نہیں تھے کہ اپنی جائیداد کا فکر ہو، پھر یہاں اپنی وراثت کا ذکر کیا تو ساتھ آلِ یعقوب کی وراثت کا بھی ذکر کیا، یہ خود دلیل ہے کہ یہاں علم کی وراثت مراد ہے، کیونکہ حضرت زکریا علیہ السلام کا بیٹا اکیلا آلِ یعقوب کا وارث کیسے ہوسکتا ہے؟ آلِ یعقوب کے اندر تو بارہ خاندان ہیں، ان سب کا وارث اکیلا زکریا کا بیٹا کس طرح سے ہوجائے گا؟ معلوم ہوگیا کہ یہاں آلِ یعقوب کے علوم اور معارف مراد ہیں، کہ بنی اسرائیل میں انبیاء علیہم السلام کی وساطت سے جو علم کا چرچا چلا آ رہا ہے، میرا بیٹا اس کو سنبھالے، مجھے ایسی نیک اولاد دے، جو علمی طور پر میرا وارث ہو۔ حدیث شریف میں آتا ہے، اور علم کے فضائل میں عام طور پر یہ روایت نقل کی جاتی ہے: ''اِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَۃُ الْاَنْبِيَاءِ وَاِنَّ الْاَنْبِيَاءَ لَمْ يُوَرِّثُوْا دِيْنَارًا وَلَا دِرْهَمًا وَاِنَّمَا وَرَّثُوا الْعِلْمَ ''[1] علماء انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں، اور انبیاء علیہم السلام درہم ودینار کا ورثہ نہیں چھوڑ کر جایا کرتے، انبیاء علیہم السلام علم کا ورثہ چھوڑ جاتے ہیں، تو جو علم حاصل کر لے اس نے حظِ وافر حاصل کر لیا، انبیاء علیہم السلام کی وراثت حاصل کر لی، اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم انبیاء کا گروہ جو کچھ چھوڑ کے جایا کرتے ہیں وہ پیچھے صدقہ ہوتا ہے، ہماری مالی وراثت نہیں چلا کرتی،[2] تو مال انبیاء علیہم السلام کا ورثہ نہیں ہے، اس لیے حضرت زکریا علیہ السلام جو کہتے ہیں کہ مجھے وارث دے، مجھے بیٹا دے جو میرا وارث بنے، تو یہاں سے روپوں ٹکوں کی وراثت مراد نہیں، علمی وراثت مراد ہے، جیسے کہ یہ لفظ خود قرینہ بن گیا وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ، کہ زکریا علیہ السلام کا بیٹا اگر وارث ہوتا تو حضرت زکریا کا ہی ہوتا اگر مالی وراثت مراد ہوتی، اور آلِ یعقوب میں تو سارے بنی اسرائیل آگئے، تو سارے بنی اسرائیل کا وارث زکریا علیہ السلام کا بیٹا یحییٰ علیہ السلام کس طرح سے ہوسکتا ہے؟ یہ اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ یہاں وراثت سے وراثت علمی مراد ہے۔۔۔۔۔ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا: اے اللہ! اسے پسندیدہ بنا دے یعنی اچھا ہو، جیسے آلِ عمران میں ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً کے ساتھ ذکر کیا، کہ پاکیزہ بچہ ہو، ظاہری طور پر پسندیدہ ہو، اس میں کسی قسم کی کمی نہ ہو اور نقص نہ ہو۔

اب یہاں یہ بات ہے کہ زکریا علیہ السلام نے یہ دُعا نہیں کی کہ میرے رشتہ داروں کو تو اس کا اہل کر دے کہ وہ دِین کی خدمت کریں، بلکہ اس کام کے لئے نئے سرے سے بچہ مانگا جا رہا ہے۔ تو ہوسکتا ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام ان کے حالات سے مایوس تھے اور ان کا کردار اچھا نہیں تھا، اور یہ ہمیشہ قاعدہ ہے کہ اگر کسی کی پہلی زندگی اچھی نہ گزری ہو، اس کا کردار اچھا نہ ہو، تو بعد میں اگر اچھا ہو کے دِین کا کام کرنا چاہے تو لوگوں پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا کرتا، ہاں! البتہ جس کی زندگی ابتدا سے ہی اچھی ہے اور اس کے اندر کسی قسم کا نقص اور عیب لوگوں کو معلوم نہیں، اس کی بات میں زیادہ اثر ہوتا ہے۔ تو ان رشتہ داروں کی طرف سے مایوس ہو کر انہوں نے اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ پھیلائے۔

---

(۱) ترمذی ۲/۹۷، باب ما جاء فی فضل الفقہ علی العبادۃ۔ مشکوٰۃ ص ۳۲، کتاب العلم فصل ثانی۔

(۲) لَا نُوْرَثُ مَا تَرَكْنَا صَدَقَةٌ: بخاری ۱/۴۳۶، باب فرض الخمس۔ مشکوٰۃ ۲/۵۵۰، باب مناقب قریش سے پچھلا باب۔ نیز مظہری سورۂ نساء آیت ۱۱۔

یحییٰ علیہ السلام کے ''سمی'' ہونے کا مطلب

چونکہ حضرت زکریا علیہ السلام نے اللہ کی رحمت پر اعتماد کرتے ہوئے اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلائے، تو اللہ کی طرف سے قبولیت بھی ہوگئی، جیسے میں نے پہلے عرض کیا کہ اللہ کے فیصلے اسباب کے محتاج نہیں، انہوں نے اللہ کو پکارا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب آ گیا کہ اے زکریا! ہم تجھے بشارت دیتے ہیں لڑکے کی، اور نام بھی رکھ دیا گیا کہ اس کا نام یحییٰ ہوگا، اور یہ بھی کہہ دیا کہ اس میں ایسی ایسی صفتیں ہوں گی، کہ اس سے پہلے ہم نے اس کی نظیر اور مثل نہیں بنائی۔ مثلاً اس معنی میں تو پہلے کوئی مثل موجود نہیں کہ بانجھ عورت اور بوڑھے خاوند کو اس طرح سے بچہ عطا کیا گیا ہو کہ خاوند بھی بوڑھا ہو، اور عورت بھی بانجھ ہو کہ جوانی کے زمانے میں بھی وہ اولاد جننے کے قابل نہیں تھی، پھر بڑھاپے میں اولاد دے دی جائے، اس اعتبار سے تو اس کی مثل موجود نہیں ہے (آلوسی، نسفی)، باقی! بعض بعض صفات بھی ایسی دی گئیں، رقتِ قلب ان کے اوپر انتہائی تھی، خوفِ خدا کے ساتھ یہ روتے بہت تھے، ان کے حالات میں یہ لکھا گیا ہے کہ اللہ کو یاد کر کے اتنا روتے تھے کہ ان کے رخساروں کے اوپر آنسو بہنے کے ساتھ نالیاں بن گئی تھیں، اتنا کثرت کے ساتھ یہ اللہ کے خوف سے رویا کرتے تھے (تفسیر عثمانی)، تو رقتِ قلب، سوز و گداز، اللہ کے عشق اور محبت کے اندر آنسو بہانا، ان صفات کے اندر حضرت یحییٰ علیہ السلام بہت ممتاز تھے کہ یہ صفات اتنی نمایاں طور پر کسی دوسرے میں موجود نہیں تھیں، اور نام کے اعتبار سے بھی ان کی مثل پہلے موجود نہیں تھی، کہ پہلے کوئی شخص ایسا نہیں آیا جس کا نام ''یحییٰ'' رکھا گیا ہو۔ تو یہ امتیاز ہے اس بچے کا جو دیا جائے گا، اس کا نام ایسا ہے جو پہلے کسی کا نام نہیں رکھا گیا، اور اس کی نظیر پہلے موجود نہیں، اور اس کو صفتیں ایسی دی گئیں جو پہلے کسی کو نہیں دی گئیں یعنی اس درجہ کی صفتیں پہلے کسی کو نہیں دی گئیں جس درجے کی حضرت یحییٰ علیہ السلام کو دی جائیں گی، تارک الدنیا رہے، راہب اور درویش جس طرح ہوا کرتے ہیں ایسے حضرت یحییٰ نے وقت گزارا ہے، شادی تک نہیں کی۔ بس ہر وقت دین کی خدمت، لوگوں کے سامنے وعظ و نصیحت، اور اللہ کے سامنے رونا دھونا، بس یہی شغل تھا حضرت یحییٰ علیہ السلام کا۔

زکریا علیہ السلام کا بیٹے کی خوش خبری پر تعجب

اب جس وقت بشارت ملی تو حضرت زکریا علیہ السلام تو خوش ہو گئے، خوش ہو کے پھر زیادہ تفصیل حاصل کرنے کے لئے پوچھتے ہیں کہ اے اللہ! میرے اولاد کس طرح سے ہوگی؟ میں تو بوڑھا ہوں اور میری بیوی اولاد کے قابل نہیں، مطلب یہ تھا کہ ہوگی تو ضرور، لیکن صورت کیا اختیار کی جائے گی؟ مجھے دوبارہ جوان کیا جائے گا، یا میری بیوی کو جوان کیا جائے گا، یا مجھے نئی شادی کا حکم دیا جائے گا، آخر کیا صورت اختیار کی جائے گی؟ خوشی میں آ کے انسان اس قسم کی بات پوچھا کرتا ہے، یہ اظہارِ تعجب ہے، اللہ کے وعدہ میں شک نہیں ہے، کہ ہم سے جو اولاد کا وعدہ ہو گیا تو ہوگی تو ضرور، لیکن ہوگی کس طرح سے؟ دوبارہ جوان ہوں گے؟ نئی شادی کروں گا؟ کیا صورت ہوگی؟ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بس ایسے ہی ہو جائے گی، یعنی تمہاری بیوی بھی اسی حال میں رہے گی جیسے ہے یعنی بوڑھی، بے اولاد تھی لیکن اب اولاد کے قابل کر دی جائے گی، یہ تغیر ہو جائے گا، چاہے وہ عاقر (بانجھ) چلی آ رہی ہے، لیکن اب اس بانجھ کو ہی اللہ تعالیٰ اولاد دے گا، اگرچہ اولاد ہونے کے بعد تو وہ بانجھ نہیں رہے گی، کیونکہ بانجھ تو کہتے ہی اس کو ہیں جس

کے اولاد نہ ہو یعنی جو بیوی سابق زمانے میں بانجھ تھی اب اسی سے اولاد ہوگی، اور جب اولاد ہوگی تو پھر وہ عاقر نہیں رہے گی، اور تو بھی ایسے ہی بوڑھا ہوگا، تیرے اندر بھی کسی قسم کا تغیر نہیں کیا جائے گا، اللہ کی قدرت سے کوئی چیز بعید نہیں، جیسے تجھے پہلے اللہ تعالیٰ نے پیدا کر دیا، نیست سے ہست کر دیا، عدم سے وجود میں لے آئے، تو بوڑھے ماں باپ کے ہاں اولاد دینا اللہ تعالیٰ کے لئے کیا مشکل ہے؟ ''اے میرے رَبّ! کیونکر ہوگا میرے لیے لڑکا؟ میری بیوی عاقر ہے، اور میں بھی بڑھاپے کی انتہا کو پہنچ گیا ہوں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یوں ہی ہوگا، الأمر كذالك: واقعہ ایسے ہی ہے، اور تیرا رَبّ یہ کہتا ہے کہ یہ میرے پہ آسان ہے، اور میں تجھے پیدا کر چکا ہوں اس سے قبل اور تُو کچھ بھی نہیں تھا۔''

یحییٰ علیہ السلام کی ولادت کی علامت

پھر حضرت زکریا علیہ السلام نے خوشی کی انتہا کے لئے یہ پوچھا کہ اس کی کوئی علامت بتا دیجئے، جس سے میں سمجھ جاؤں کہ اس بیٹے کی پیدائش کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے، ورنہ بیٹا جنا جانا تو ایک ظاہری چیز ہے اس کے لئے نشانی پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ نشانی پوچھی جا رہی ہے اس معاملے کی ابتدا کی، کہ جس سے مجھے پتا چل جائے کہ اس بیٹے کی تخلیق کا سلسلہ شروع ہو گیا، یعنی ماں کے رحم میں اس کا قرار ہو گیا، ایسی کوئی علامت بتا دی جائے۔ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے علامت یہ بتائی گئی کہ تُو ہوگا تندرست اور صحیح سالم، اور اللہ کے ذِکر پر تجھے قدرت ہوگی لیکن لوگوں سے تُو بات نہیں کر سکے گا، جب یہ علامت آ جائے تو سمجھ لینا کہ اب بچے کی بنیاد شروع ہو گئی۔ تو ایسے ہی ہوا کہ حضرت زکریا علیہ السلام تندرست ہونے کے باوجود لوگوں سے بات کرنے میں عجز محسوس کرتے تھے، لیکن اللہ کا ذِکر کرتے تھے، ایک دِن عادت کے مطابق اپنے عبادت خانے سے نکلے جب وہ وعظ و نصیحت کرنے کے لئے نکلا کرتے تھے، اُس دِن زبان سے نہیں بول سکے، اشارے کے ساتھ انہیں کہا کہ تم اللہ تعالیٰ کی تسبیح صبح شام کرو، جس طرح پہلے وہ لوگوں کو نصیحت کرتے تھے، تو اس سے حضرت زکریا علیہ السلام کو پتا چل گیا کہ بیٹے کی ولادت کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ ''زکریا علیہ السلام نے کہا کہ اے میرے رَبّ! میرے لیے کوئی نشانی بنا دے، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تیری نشانی یہی ہے کہ تُو بات نہیں کرے گا لوگوں سے تین راتیں، تین دِن'' (یا تین شب روز، یوں اکٹھا ترجمہ کر دیا جائے) سَوِيًّا: اس حال میں کہ تُو صحیح تندرست ہوگا۔ تو پھر جب وہ واقعہ پیش آیا، حضرت زکریا باہر آئے، زبان سے تو بات نہیں کر سکے، لوگوں کی طرف اشارہ کیا، کہ تم صبح شام اللہ کی تسبیح بیان کرو۔

یحییٰ علیہ السلام کی ولادت اور ان کی صفات

اور اس کے بعد پھر یحییٰ علیہ السلام پیدا ہو گئے، پیدا ہونے کے بعد سمجھ دار ہو گئے، پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان سے کہا گیا کہ یحییٰ! اس کتاب کو مضبوطی سے تھام لو، اس کے اوپر مضبوطی سے جمے رہنا ہے، کتاب سے تو راۃ مراد ہے، کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کا قصہ تو بعد میں آ رہا ہے، یحییٰ علیہ السلام پہلے پیدا ہو گئے تھے، اس وقت تو راۃ بنی اسرائیل میں موجود تھی، تو کتاب سے وہی مراد ہے۔ مضبوطی سے تھام لینے کا مطلب یہ ہے کہ اس کو پڑھو، سمجھو اور اس کے اوپر عمل کرو، جو کچھ اس میں سمجھایا گیا ہے اسی کے مطابق عقیدہ رکھو، نظریہ رکھو، اسی کے مطابق عمل اختیار کرو۔ اور کوئی شخص ڈرا کر، دھمکا کر، دھوکا دے کر، فریب کے ساتھ، لالچ دے کر

تمہیں اس کتاب کے نظریات اور اس کے عملیات سے ہٹانے نہ پائے، مضبوطی سے اس کو تھام لو۔ اور ہم نے اس کو سمجھ داری دے دی تھی، فیصلے کی قوت دے دی تھی، علم وحکمت دے دیا تھا بچپن سے ہی، یعنی وہ بچپن سے ہی سمجھ دار تھا اور حق وباطل کے درمیان میں فرق کرنے والا تھا۔ اور اپنی طرف سے ہم نے اس کو سوز وگداز دیا تھا، دل کی نرمی دی تھی، رقت دی تھی، اور پاکیزگی دی تھی۔ زَكٰوةً کا تعلق ظاہری اخلاق کے ساتھ ہو جائے گا، اور حَنَانًا مِّنۡ لَّدُنَّا یہ قلبی کیفیت ہے، یعنی اخلاق اور عمل کے اعتبار سے وہ بالکل پاکیزہ تھے، پرہیزگار تھے، یعنی اللہ کی نافرمانی سے بچنے والے تھے۔ اور پھر ماں باپ کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرنے والے تھے، ورنہ عموماً اس قسم کے بچے جو اتنی تمناؤں کے بعد پیدا ہوں، اور مایوس کن حالات کے بعد پیدا ہوں تو وہ ماں باپ کے سامنے سرچڑھے ہوتے ہیں، ماں باپ کے خدمت گزار یا ان کے فرمانبردار نہیں ہوتے۔ یحییٰ علیہ السلام باوجود اس بات کے کہ بہت تمناؤں کے بعد پیدا ہوئے تھے، اور مایوس کن حالات کے بعد پیدا ہوئے تھے، لیکن ماں باپ کے بڑے فرمانبردار اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے والے تھے، زورآور نافرمان سرکش نہیں تھے۔ آگے ان کے لئے بشارت ہے کہ ولادت کے دن بھی ان پہ سلامتی، وفات کے دن بھی سلامتی، قیامت کے دن جب اٹھائے جائیں گے اس دن بھی ان کے لئے سلامتی کی دعا ہو گی۔

سُبۡحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمۡدِكَ اَشۡهَدُ اَنۡ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنۡتَ اَسۡتَغۡفِرُكَ وَاَتُوۡبُ اِلَيۡكَ

وَاذۡكُرۡ فِى الۡكِتٰبِ مَرۡيَمَ‌ ۘ اِذِ انْتَبَذَتۡ مِنۡ اَهۡلِهَا مَكَانًا شَرۡقِيًّا ۙ‏ ﴿۱۶﴾ فَاتَّخَذَتۡ
ذکر کیجئے کتاب میں مریم کا، جبکہ وہ جدا ہوئیں اپنے اہل سے مشرقی مکان میں ⑯ پھر اختیار کیا مریم نے
مِنۡ دُوۡنِهِمۡ حِجَابًا ۖ فَاَرۡسَلۡنَاۤ اِلَيۡهَا رُوۡحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا
ان لوگوں کے سامنے پردہ۔ پھر بھیجا ہم نے مریم کی طرف اپنی روح (جبریل) کو، پس اس فرشتے نے مریم کے لئے تندرست آدمی کی
بَشَرًا سَوِيًّا‏ ﴿۱۷﴾ قَالَتۡ اِنِّىۡۤ اَعُوۡذُ بِالرَّحۡمٰنِ مِنۡكَ اِنۡ كُنۡتَ تَقِيًّا‏ ﴿۱۸﴾ قَالَ
مثل اختیار کی ⑰ مریم نے کہا: میں رحمٰن کی پناہ پکڑتی ہوں تجھ سے اگر تو (اللہ سے) ڈرنے والا ہے ⑱ اس فرشتے نے کہا
اِنَّمَاۤ اَنَا رَسُوۡلُ رَبِّكِ‌ ۖ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا‏ ﴿۱۹﴾ قَالَتۡ اَنّٰى يَكُوۡنُ
سوائے اس کے نہیں میں تیرے رب کی طرف سے بھیجا ہوا ہوں تا کہ عطا کروں میں تجھے ایک پاکیزہ بچہ ⑲ مریم کہنے لگی: کیونکر ہو گا
لِىۡ غُلٰمٌ وَّلَمۡ يَمۡسَسۡنِىۡ بَشَرٌ وَّلَمۡ اَكُ بَغِيًّا‏ ﴿۲۰﴾ قَالَ كَذٰلِكِ‌ ۚ
میرے لئے لڑکا حالانکہ مجھے کسی انسان نے چھوا نہیں، اور میں کوئی بدکار بھی نہیں ہوں ⑳ اس فرشتے نے کہا کہ بات ایسے ہی ہے،

قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۚ وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَكَانَ

تیرا ربّ کہتا ہے کہ یہ میرے پہ آسان ہے اور تا کہ ہم اس بچّے کو لوگوں کے لئے نشانی بنائیں، اور اپنی طرف سے رحمت بنائیں، اور یہ

اَمْرًا مَّقْضِيًّا ﴿۲۱﴾ فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ﴿۲۲﴾ فَاَجَآءَهَا

طے شدہ بات ہے ﴿۲۱﴾ پس (پیٹ میں) اُٹھایا مریم نے اس بچّے کو، پس وہ جُدا ہوگئی اس حمل کے ساتھ دُور جگہ میں ﴿۲۲﴾ لے آیا مریم کو

الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ ۚ قَالَتْ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ﴿۲۳﴾

دردِ زہ کھجور کے تنے کی طرف، مریم کہنے لگی: اے کاش! میں اس سے قبل مرگئی ہوتی، اور ہو جاتی میں بھُولی بسری ﴿۲۳﴾

فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِيْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ﴿۲۴﴾ وَهُزِّيْٓ

پس آواز دی اس فرشتے نے مریم کو اس کی نچلی جانب سے کہ تُو غم نہ کر، تحقیق بنادیا تیرے ربّ نے تیری نچلی جانب چشمہ ﴿۲۴﴾ تُو ہلا

اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا ﴿۲۵﴾ فَكُلِيْ وَاشْرَبِيْ وَقَرِّيْ عَيْنًا ۚ فَاِمَّا

اپنی جانب کھجور کے تنے کو، گرائے گا یہ تنا تیرے اُوپر عمدہ عمدہ چنی ہوئی کھجوریں ﴿۲۵﴾ پس تُو کھا اور پی اور اپنی آنکھ ٹھنڈی کر، اگر

تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا ۙ فَقُوْلِيْٓ اِنِّيْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ

تُو دیکھے انسانوں میں سے کسی کو پس تو کہہ دینا: بے شک میں نے نذر مانی ہے رحمٰن کے لئے روزے کی، ہرگز میں بات نہیں کروں گی آج

اِنْسِيًّا ﴿۲۶﴾ فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ ۭ قَالُوْا يٰمَرْيَمُ

کسی انسان سے ﴿۲۶﴾ پس لائی مریم اس بچّے کو اپنی قوم کے پاس اس حال میں کہ اس کو اُٹھائے ہوئے تھی، لوگ کہنے لگے کہ اے مریم!

لَقَدْ جِئْتِ شَيْـًٔا فَرِيًّا ﴿۲۷﴾ يٰٓاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ

تُو ایک بہت بُری چیز لائی ہے ﴿۲۷﴾ اے ہارون کی بہن! نہیں تھا تیرا باپ بُرا آدمی اور نہیں تھی تیری ماں

بَغِيًّا ﴿۲۸﴾ فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ ۭ قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ﴿۲۹﴾

بدکارہ ﴿۲۸﴾ مریم نے اس بچّے کی طرف اشارہ کیا، وہ لوگ کہنے لگے کہ ہم کیسے بات کریں اس سے جو کہ ابھی گود میں بچّہ ہے ﴿۲۹﴾

قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ۭ اٰتٰىنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا ﴿۳۰﴾ وَّجَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا

عیسیٰ علیہ السلام بول اُٹھے: میں اللہ کا بندہ ہوں، اللہ نے مجھے کتاب دی اور مجھے نبی بنایا ﴿۳۰﴾ اور بنایا اللہ تعالیٰ نے مجھے برکت والا جہاں بھی

كُنْتُ ۪ وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَیًّا ﴿۳۱﴾ وَّبَرًّۢا بِوَالِدَتِیْ

میں ہوں گا، اور اللہ نے مجھے وصیت کی ہے نماز کی اور زکوٰۃ کی جب تک میں زندہ رہوں ⑪ اور مجھے بنایا والدہ کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے والا

وَلَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا ﴿۳۲﴾ وَالسَّلٰمُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ وَیَوْمَ اَمُوْتُ وَیَوْمَ اُبْعَثُ

اور نہیں بنایا مجھے سرچڑھا، بدبخت ⑫ سلام میرے پہ جس دِن کہ میں جنا گیا اور جس دِن کہ میں مروں گا اور جس دِن کہ میں زندہ اُٹھایا

حَیًّا ﴿۳۳﴾ ذٰلِكَ عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِیْ فِیْهِ یَمْتَرُوْنَ ﴿۳۴﴾ مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ

جاؤں گا ⑬ یہ ہے مریم کا بیٹا عیسیٰ! میں سچی بات کہتا ہوں جس میں لوگ خواہ مخواہ جھگڑا کرتے ہیں ⑭ اللہ کی یہ شان نہیں کہ

یَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَهٗ كُنْ

وہ اولاد اختیار کرے، اللہ پاک ہے، جس وقت فیصلہ کرتا ہے اللہ کسی اَمر کا تو اس کے سوا کچھ نہیں کہ اسے کہہ دیتا ہے کہ ہو جا!

فَیَكُوْنُ ﴿۳۵﴾ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ﴿۳۶﴾ فَاخْتَلَفَ

پس وہ ہو جاتا ہے ⑮ بے شک اللہ میرا رَب ہے اور تمہارا رَب ہے پس تم اسی کی عبادت کرو، یہ سیدھا راستہ ہے ⑯ پس گروہوں نے

الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَیْنِهِمْ ۚ فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ مَّشْهَدِ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ﴿۳۷﴾ اَسْمِعْ بِهِمْ

آپس میں اختلاف کر لیا، پس خرابی ہے ان لوگوں کے لئے جنہوں نے کُفر کیا بڑے دِن کی حاضری سے ⑰ کتنا ہی اچھا سننے والے ہوں گے

وَاَبْصِرْ ۙ یَوْمَ یَاْتُوْنَنَا لٰكِنِ الظّٰلِمُوْنَ الْیَوْمَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿۳۸﴾

اور کتنا ہی اچھا دیکھنے والے ہوں گے جس دِن یہ لوگ ہمارے پاس آئیں گے لیکن یہ ظالم لوگ آج صریح گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں ⑱

وَاَنْذِرْهُمْ یَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِیَ الْاَمْرُ ۘ وَهُمْ فِیْ غَفْلَةٍ وَّهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۹﴾ اِنَّا

اور آپ انہیں ڈرایئے حسرت کے دِن سے جبکہ اَمر کا فیصلہ کر دیا جائے گا اور لوگ غفلت میں ہیں اور ایمان نہیں لاتے ⑲ بے شک

نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ وَمَنْ عَلَیْهَا وَاِلَیْنَا یُرْجَعُوْنَ ﴿۴۰﴾ؑ

ہم ہی وارث بنیں گے زمین کے اور جو لوگ اس کے اُوپر ہیں ان کے، اور ہماری طرف ہی یہ لوگ لوٹائے جائیں گے ⑳

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ وَاذْكُرْ فِی الْكِتٰبِ مَرْیَمَ: ذکر کیجئے کتاب میں مریم علیہا السلام کا، اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِیًّا:

انتباذ: جدا ہونا، علیحدہ ہونا۔ نَبَذَ پھینکنے کو کہتے ہیں اور اِنْتَبَذَ: علیحدہ ہو جانا، جدا ہو جانا۔ جب کہ وہ جدا ہو گئیں اپنے اہل سے مَكَانًا شَرْقِيًّا: مشرقی مکان میں، فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا: پھر اختیار کیا مریم نے ان لوگوں کے سامنے پردہ۔ حجاب کا معنی پردہ۔ فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا: پھر بھیجا ہم نے مریم کی طرف اپنی رُوح کو، رُوح سے رُوح القدس جبریل علیہ السلام مراد ہیں، فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا: سَوِيًّا کا لفظ آپ کے سامنے پچھلے رکوع میں بھی آیا تھا۔ پس متمثل ہوا مریم کے لئے ہمارا وہ فرشتہ جو رُوح کا مصداق ہے، اس حال میں کہ وہ تندرست آدمی تھا، اس فرشتے نے مریم کے لئے تندرست آدمی کی مثل اختیار کی، یعنی بشرِ سوی کی شکل میں وہ سامنے آیا۔ قَالَتْ مریم نے کہا: اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ میں رحمٰن کی پناہ پکڑتی ہوں، مِنْكَ، تجھ سے۔ عَاذَ يَعُوْذُ کے بعد جو باء کا مدخول ہوتا ہے اس کی پناہ میں آنا مقصود ہوتا ہے، اور جو ''مِن'' کا مدخول ہوتا ہے اس سے بچنا مقصود ہوتا ہے۔ رحمٰن کی پناہ پکڑتی ہوں تجھ سے، یعنی میں رحمٰن کی پناہ میں آتی ہوں تجھ سے بچنے کے لئے، اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا اگر تو متقی ہے، اللہ سے ڈرنے والا ہے۔ قَالَ: اس فرشتے نے کہا: اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ: سوائے اس کے نہیں کہ میں تیرے ربّ کا رسول ہوں، تیرے ربّ کی طرف سے بھیجا ہوا ہوں، لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا: وَهَبَ يَهَبُ هِبَةً: عطا کرنا، اور اَهَبَ یہ واحد متکلم ہے۔ تاکہ عطا کروں میں تجھے ایک پاکیزہ بچہ، صاف ستھرا بچہ تجھے عطا کروں۔ قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ: مریم کہنے لگی کیونکر ہوگا میرے لیے لڑکا؟ اَنّٰى: کیونکر، کس طرح؟ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ: بَشَرٌ یہ نکرہ ہے اور یہ نفی کے نیچے آ گیا تو آپ پڑھتے رہتے ہیں کہ نکرہ تحت النفی عموم کا تقاضا کرتا ہے۔ مجھے کسی انسان نے مس نہیں کیا۔ یعنی میرے لیے لڑکا کیسے ہوگا؟ مجھے کسی انسان نے چھوا نہیں۔ اور یہاں مَسِّ بشر جماع سے کنایہ ہے، وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا: بغی کہتے ہیں بدمعاش، بدکردار عورت کو۔ اور میں کوئی بدکردار بھی نہیں ہوں۔ تو لَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ کا مطلب یہ ہوگا کہ جائز طریقے سے میرے پاس کوئی نہیں آیا، میرا نکاح نہیں ہوا، میرا کوئی شوہر نہیں۔ اور نہ میں کوئی بدکار ہوں کہ بغیر نکاح کے کسی آدمی کے ساتھ کوئی تعلق ہو۔ تو میرے لیے لڑکا کیسے ہوگا؟ قَالَ كَذٰلِكِ: اس فرشتے نے کہا کہ معاملہ ایسے ہی ہے، ایسے ہی ہو جائے گا، بغیر مَسِّ بشر کے، كَذٰلِكِ کا یہ معنی ہے، بات ایسے ہی ہے، یوں ہی ہو جائے گا بغیر مَسِّ بشر کے، قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ: تیرا ربّ کہتا ہے کہ یہ میرے پہ آسان ہے یعنی بغیر مَسِّ بشر کے بچہ دے دینا میرے پر آسان ہے، وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ: واؤ کا معطوف علیہ ہے لِنُبَيِّنَ بِهٖ قُدْرَتَنَا (نسفی)، تاکہ ہم اس کے ذریعے سے اپنی قدرت کو واضح کریں، اور تاکہ ہم اس بچے کو لوگوں کے لئے نشانی بنائیں، وَرَحْمَةً مِّنَّا: اور اپنی طرف سے رحمت بنائیں، وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا: اور امر فیصلہ شدہ ہے۔ قَضٰى يَقْضِيْ فیصلہ کرنا۔ امر مقضی: اب یہ امر ایک ایسا امر ہے کہ جس کا فیصلہ ہو چکا ہے، ''یہ طے شدہ بات ہے'' محاورے کے مطابق اس کا ترجمہ یوں ہوگا۔ فَحَمَلَتْهُ: مریم نے اس بچے کو اُٹھایا یعنی حاملہ ہو گئی، پیٹ میں لیا، یہاں حمل سے پیٹ میں لینا مراد ہے۔ پس اُٹھایا اس مریم نے اس بچے کو۔ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا: یعنی جب وہ بچہ پیٹ میں محسوس ہوا، ثقل اور بوجھ محسوس ہوا، حضرت مریم پہچان گئیں کہ بچہ پیٹ میں آ گیا، تو فَانْتَبَذَتْ بِهٖ: یہ وہی انتبذت ہے جو ابتدائے رکوع میں آیا تھا۔ اِنْتَبَذَ: علیحدہ ہو جانا۔ پس وہ جدا ہو گئی اس حمل کے ساتھ مَكَانًا قَصِيًّا: دُور جگہ میں، آبادی سے نکل کے دُور چلی گئی۔ وہ جگہ جہاں حضرت مریم علیہا السلام تشریف لے گئی تھیں، اور جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہوئی اس کو ''بیت لحم'' کہتے ہیں۔ اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم جب معراج پر تشریف لے گئے تھے تو اسی راستے سے گزرے تھے اور اس جگہ اُترے بھی تھے، روایات میں

آتا ہے کہ جبریل علیہ السلام نے کہا تھا کہ یہاں اُتر کر دو رکعت ادا کیجئے، یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مولد ہے، تو "بیت لحم" اس جگہ کا نام ہے۔[1]
مَكَانًا قَصِيًّا: دُور جگہ۔ "جدا ہوگئی اس کے ساتھ دُور جگہ میں۔" فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ: مخاض کہتے ہیں دردِ زہ کو، جو عورت کو بچہ ہونے کے وقت ہوا کرتا ہے، بچہ جب اندر حرکت کرتا ہے اور باہر نکلنے کا تقاضا کرتا ہے تو اس وقت جو درد ہوتا ہے اس کو "دردِ زہ" کہتے ہیں، عربی میں اسی کو مخاض کہتے ہیں۔ فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ: لے آیا اس مریم کو دردِ زہ۔ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ کھجور کے تنے کی طرف۔ جذع: تنا۔ نخلہ: کھجور۔ کھجور کے تنے کی طرف لے آیا۔ کیا مطلب؟ جب اس کو تکلیف شروع ہوئی تو بے چینی کے ساتھ سہارا لگانے کے لئے وہ ایک کھجور کے تنے کے پاس آ گئیں۔ قَالَتْ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا: مریم کہنے لگی اے کاش! میں اس سے قبل مرگئی ہوتی، وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا: اور ہوجاتی میں بھولی بھلائی۔ نَسِيَ يَنْسٰى: بھولنا، اور منسی مفعول کا صیغہ ہے، بھلائی ہوئی چیز، تو نَسْيًا مَّنْسِيًّا یہ دو لفظ بول کے تاکید مقصود ہے کہ میں اس سے قبل مرگئی ہوتی، اور میرا نام ونشان مٹ گیا ہوتا، مجھے کوئی یاد بھی نہ کرتا، میں بھولی بسری ہوجاتی۔ فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ: پس آواز دی اس فرشتے نے مریم کو اس کی نچلی جانب سے۔ وہ اونچان پہ ہوں گی، بلندی پہ ہوں گی، اور وہ فرشتہ نیچے کہیں کھڑا تھا، چونکہ وہ علاقہ پہاڑی ہے، اور پردے کے ساتھ یعنی دُور کھڑے ہوکے اس نے آواز دی تسلی دینے کے لئے نچلی جانب سے اَلَّا تَحْزَنِيْ کہ تو غم نہ کر قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا: تحقیق بنا دیا تیرے رَبّ نے تیری نچلی جانب چشمہ۔ سری چھوٹی نہر اور چشمے کو کہتے ہیں۔ وَهُزِّيْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ: هَزَّ يَهُزُّ ہلانا، حرکت دینا، هُزِّيْ واحد مؤنث مخاطبہ۔ تو ہلا اپنی جانب کھجور کے تنے کو تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا گرائے گا یہ تنا تیرے اُوپر عمدہ عمدہ چنی ہوئی کھجوریں۔ جنی يَجْنِيْ جَنْيًا: چننا۔ قرآنِ کریم میں دوسری جگہ جنی کا لفظ پھل کے معنی میں آیا ہوا ہے وَجَنَا الْجَنَّتَيْنِ دَانٍ (سورۂ رحمٰن: ۵۴) دونوں باغوں کا پھل قریب ہوگا، تو پھل چونکہ چنا جاتا ہے اس لیے اس کو جَنَا سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور جَنِيّ فعیل کے وزن پر آ گیا، چنی ہوئی چیز۔ رُطب: تر بہ تر کھجوریں۔ جنی کا معنی چنی ہوئی عمدہ، یعنی ویسے درخت کو ہلائیں تو عموماً ردی قسم کی چیز اوپر سے گرا کرتی ہے، اور جو چنی جاتی ہے وہ عمدہ ہوتی ہے۔ تو یہاں رُطَبًا جَنِيًّا سے عمدہ کھجوریں مراد ہیں۔ چنی ہوئی عمدہ کھجوریں درخت تیرے اُوپر گرائے گا۔ فَكُلِيْ وَاشْرَبِيْ وَقَرِّيْ عَيْنًا: پس تو کھا اور پی اور ٹھنڈی ہوجا از روئے آنکھوں کے، اپنی آنکھ ٹھنڈی کر۔ فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا: "اِن" شرطیہ ہے، "ما" زائدہ ہے۔ اگر تو دیکھے انسانوں میں سے کسی کو فَقُوْلِيْٓ پس تو کہہ دینا اِنِّيْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا بے شک میں نے نذر مانی ہے رحمٰن کے لئے روزے کی فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا میں ہرگز آج کے دن کسی انسان سے بات نہیں کروں گی، ہرگز میں بات نہیں کروں گی آج کسی انسان سے۔ فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا: اَتٰى يَاْتِيْ آنا اور باء تعدیہ کی آ گئی تو لانے کے معنی میں ہوگا۔ پس لائی مریم اس بچے کو اپنی قوم کے پاس، تَحْمِلُهٗ اس حال میں کہ اس کو اُٹھائے ہوئے تھی، یہاں گود میں اُٹھانا مراد ہے، جیسے فَحَمَلَتْهُ میں مقام کے لحاظ سے ترجمہ کیا گیا تھا پیٹ میں اُٹھانا، کہ حاملہ ہوگئی، اور یہاں حمل سے گود میں اُٹھانا مراد ہے۔ "لے آئی اس بچے کو اپنی قوم کے پاس اس حال میں کہ اس کو اُٹھائے ہوئے تھی" یعنی گود میں اُٹھائے ہوئے تھی۔ قَالُوْا يٰمَرْيَمُ: لوگ کہنے لگے کہ اے مریم! لَقَدْ جِئْتِ شَيْـًٔا فَرِيًّا: فَرٰى يَفْرِيْ کاٹنا، تراشنا، پھاڑنا۔ "افتراء" کا لفظ اسی سے لیا گیا ہے، گھڑنا۔ شَيْـًٔا فَرِيًّا: بہت بُری تراشی ہوئی چیز، عجیب

[1] ثُمَّ قَالَ انْزِلْ فَصَلِّ فَنَزَلْتُ فَصَلَّيْتُ فَقَالَ اَتَدْرِيْ اَيْنَ صَلَّيْتَ. صَلَّيْتَ بِبَيْتِ لَحْمٍ حَيْثُ وُلِدَ عِيْسٰى (نسائی ۱/ ۵۲، کتاب الصلوۃ کا پہلا باب)۔

وغریب چیز، خلافِ عادت۔ تُو بہت ہی بُری چیز لائی ہے، ایسی چیز جس نے عادت کو قطع کر دیا، تراشیدہ ہے، گھڑی ہوئی چیز: "تو ایک بہت بُری چیز یا گھڑی ہوئی چیز لائی ہے" یٰۤاُخْتَ هٰرُوْنَ: اے ہارون کی بہن! مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ تیرا باپ کوئی بُرا آدمی نہیں تھا، نہیں تھا تیرا باپ بُرا آدمی، وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِیًّا: اور نہ تیری ماں ہی بدکارہ تھی۔ بَغِیًّا کا لفظ بھی پہلے آپ کے سامنے گزرا ہے لَمْ اَكُ بَغِیًّا، حضرت مریم نے کہا تھا کہ میں کوئی بدکار عورت نہیں ہوں۔ تو اسی طرح سے قوم ان کو طعنہ دیتی ہوئی کہتی ہے کہ تیرا بھائی نیک تھا، جس کا نام ہارون ہے، تیرا باپ بھی کوئی بُرا آدمی نہیں تھا، تیری ماں بھی بدکارہ نہیں تھی، مطلب یہ تھا کہ تُو درمیان میں ایسی کہاں سے نکل آئی، کہ بغیر خاوند کے جو کہتی ہے کہ بچہ ہو گیا؟ مطلب یہ ہے کہ انہوں نے منسوب کیا کہ یہ تُو نے کوئی بدمعاشی کی ہے اور بُرا فعل کیا ہے جس کے نتیجے میں ایسی بات ہوئی ہے۔ اس "ہارون" سے مراد مریم کے بھائی ہیں، اس سے موسیٰ علیہ السلام کے بھائی ہارون علیہ السلام مراد نہیں، انبیاء علیہم السلام کے ناموں پر چونکہ لوگ نام رکھا کرتے ہیں، تو اسی طرح سے اس لڑکے کا نام بھی موسیٰ علیہ السلام کے بھائی ہارون علیہ السلام کے نام پر ہوگا، اس لیے اس کی طرف نسبت کر دی۔ اور اگر اس سے موسیٰ علیہ السلام کے بھائی ہارون علیہ السلام ہی مراد ہوں تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مریم اس خاندان سے ہے جو ہارون علیہ السلام کی طرف منسوب ہے۔ "اے ہارون کی بہن! نہیں تھا تیرا باپ بُرا آدمی، اور نہیں تھی تیری ماں بدکارہ" فَاَشَارَتْ اِلَیْهِ: مریم نے اس بچے کی طرف اشارہ کیا، کہ اس بچے سے پوچھو کیا قصہ ہے؟ قَالُوْا كَیْفَ نُكَلِّمُ: وہ لوگ کہنے لگے کہ ہم کیسے بات کریں مَنْ كَانَ فِی الْمَهْدِ صَبِیًّا: اس سے جو کہ ابھی گود میں بچہ ہے۔ مہد گود کو کہتے ہیں، اور پنگھوڑے کو بھی کہتے ہیں جس میں بچے کو لٹایا سلایا جاتا ہے، تو جو گود میں بچہ ہے ہم اس کے ساتھ بات کس طرح سے کریں؟ قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ: یہ بات ہو ہی رہی تھی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خود بول اُٹھے، عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ: میں اللہ کا بندہ ہوں، اٰتٰىنِیَ الْكِتٰبَ: اللہ نے مجھے کتاب دی ہے، وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا: اور مجھے نبی بنایا ہے، یعنی میرے متعلق یہ فیصلہ ہے کہ میں اپنے وقت پر جا کے نبی بنوں گا اور مجھے کتاب ملے گی، یہ مطلب نہیں کہ ابھی کتاب دے دی اور ابھی نبی بنا دیا، یہ مقصد نہیں، یہ اپنے متعلق جو اللہ کے علم میں فیصلہ تھا اس کو نقل کر رہے ہیں، جیسے حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں اس وقت نبی تھا جب آدم ابھی "بین الماء والطین" کیچڑ اور پانی میں پڑے ہوئے تھے،[1] تو یہ فیصلے کا ذکر ہے کہ میرے متعلق اس وقت نبی ہونے کا فیصلہ ہو چکا تھا، اللہ کے علم میں میں نبی بن چکا تھا، تو اسی طرح سے یہ ہے "اللہ نے مجھے کتاب دی اور مجھے نبی بنایا" وَّجَعَلَنِیْ مُبٰرَكًا اَیْنَ مَا كُنْتُ: اور بنایا اللہ تعالیٰ نے مجھے برکت والا جہاں بھی میں ہوں گا، جہاں بھی میں ہوں گا برکت والا ہوں گا، میری وجہ سے لوگوں کو فائدہ پہنچے گا۔ "برکت" اصل میں خیرِ کثیر کو کہتے ہیں "یہ چیز باعثِ برکت ہے" یعنی اس کے ساتھ بہت فائدہ پہنچ رہا ہے۔ اور "اس چیز میں بے برکتی ہو گئی" یعنی اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ رہا، ضائع ہو گئی، تو "برکت" خیرِ کثیر کو کہتے ہیں۔ وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ اور اللہ نے مجھے وصیت کی ہے نماز کی اور زکوٰۃ کی مَا دُمْتُ حَیًّا جب تک میں زندہ رہوں، وَّبَرًّاۢ بِوَالِدَتِیْ: اس کا فعل یہاں محذوف نکالیں گے جَعَلَنِیْ بَرًّا بِوَالِدَتِیْ (آلوسی)، جیسا کہ آگے قرینہ ہے وَلَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا۔ اور اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنی والدہ کے ساتھ حُسنِ سلوک کرنے والا بنایا ہے۔ یہاں چونکہ والد تو ہے ہی نہیں، اس لیے "والدتی" مفرد ذکر کیا، اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کا قصہ جو آپ کے سامنے گزرا ہے وہاں آیا تھا بَرًّاۢ بِوَالِدَیْهِ

---

(۱) دیکھیے: تفسیر رازی پارہ ۳ کا شروع۔ لیکن کتبِ حدیث میں حدیث ان الفاظ سے ہے: وَآدَمُ بَیْنَ الرُّوْحِ وَالْجَسَدِ، دیکھیں: ترمذی ۲/ ۲۰۲، کتاب المناقب

یہ اپنے والدین کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے والے تھے۔ تو حضرت یحییٰ کے متعلق بَرًّا بِوَالِدَيْهِ کا لفظ آیا تھا، چونکہ ان کے والدین تھے، تو والدین کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے والے تھے، اور یہاں چونکہ ان کی والدہ ہے، والد نہیں ہے، تو اس لیے بَرًّا بِوَالِدَتِي مفرد کے لفظ کے ساتھ ذکر کیا گیا، ''مجھے بنایا والدہ کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے والا'' وَلَمْ يَجْعَلْنِي جَبَّارًا شَقِيًّا: اور مجھے اللہ تعالیٰ نے جبار، شقی نہیں بنایا۔ شقی کا معنی بد بخت۔ جبار کا معنی سر چڑھا، سینہ زور، زبردستی کرنے والا، ضدی، جبار میں یہ سارے مفہوم ہوتے ہیں، زبردستی اپنا مقصد نکلوانے والا۔ ''نہیں بنایا مجھ کو جبار، زبردست، بد بخت۔'' وَالسَّلٰمُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ: سلام میرے پہ جس دن کہ میں جنا گیا، اور جس دن کہ میں مروں گا اور جس دن کہ میں زندہ اُٹھایا جاؤں گا، یعنی قیامت کے دن، اُبْعَثُ حَيًّا سے قیامت کے دن زندہ اُٹھایا جانا مراد ہے۔ ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ: یہ ہے مریم کا بیٹا عیسیٰ، یہ مریم کا بیٹا عیسیٰ ہے، قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ: اس کا فعل محذوف ہے اَقُوْلُ قَوْلَ الْحَقِّ، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں سچی بات کہتا ہوں، الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ: جس میں یہ لوگ شک کررہے ہیں، خواہ مخواہ جھگڑے ڈال رہے ہیں، سچی بات یہی ہے جو میں نے بیان کردی، عیسیٰ علیہ السلام کا یہی قصہ ہے، کہ یہ مریم کا بیٹا عیسیٰ ہے، میں سچی بات کہتا ہوں جس میں لوگ خواہ مخواہ جھگڑا کرتے ہیں۔ مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ: اللہ کی یہ شان نہیں کہ اولاد اختیار کرے، نہیں ہے اللہ کے لیے کہ اختیار کرے وہ لڑکا، ولد اولاد کے معنی میں ہے، اللہ کی یہ شان نہیں کہ وہ اولاد اختیار کرے، سُبْحٰنَهٗ اللہ پاک ہے، اولاد کی نسبت اللہ کی طرف کرنا عیب ہے، اور اللہ ہر عیب سے پاک ہے۔ اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا جس وقت فیصلہ کرتا ہے اللہ کسی امر کا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ: اس کے سوا کچھ نہیں کہ اُسے کہہ دیتا ہے ہوجا، فَيَكُوْنُ پس وہ ہوجاتا ہے، كُنْ فَيَكُوْنُ کا یہی معنی ہے، اس کو کہہ دیتا ہے ہوجا، پس وہ ہوجاتا ہے۔ وَاِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ: بے شک اللہ میرا رب ہے اور تمہارا رب ہے پس تم اسی کی عبادت کرو۔ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ: یہ سیدھا راستہ ہے، اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول ہے، وَالسَّلٰمُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ اَمُوْتُ وَيَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا، وَاِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ، درمیان میں جملہ معترضہ کے طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ آ گئی تھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیثیت کے متعلق۔ فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ: احزاب حزب کی جمع ہے، حزب گروہ اور جماعت کو کہتے ہیں۔ پس جماعتوں نے آپس میں اختلاف کرلیا، گروہوں نے آپس میں اختلاف کرلیا۔ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا: پس خرابی ہے ان لوگوں کے لئے جنہوں نے کُفر کیا بڑے دن کی حاضری سے، بڑے دن کی حاضری ان کے لئے خرابی کا باعث بنے گی، بڑے دن سے مراد قیامت کا دن ہے۔ مشهد: حاضر ہونا۔ اَسْمِعْ بِهِمْ وَاَبْصِرْ: یہ فعل تعجب ہے، جیسے نحو کے اندر آپ پڑھتے رہتے ہیں، ما احسن زیدا، واحسن بہ۔ اَسْمِعْ بِهِمْ وَاَبْصِرْ: کتنا ہی اچھا سننے والے ہوں گے اور کتنا ہی اچھا دیکھنے والے ہوں گے يَوْمَ يَاْتُوْنَنَا جس دن یہ لوگ ہمارے پاس آئیں گے، لٰكِنِ الظّٰلِمُوْنَ الْيَوْمَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ: لیکن یہ ظالم لوگ آج صریح گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں، آج ان کو نہ کچھ سنائی دیتا ہے نہ نظر آتا ہے، جس دن ہمارے پاس آئیں گے تو خوب سنیں گے اور خوب دیکھیں گے۔ فعل تعجب کے طور اس کا ترجمہ یہ ہوگا، امر کا ترجمہ نہیں کرنا، یہ فعل تعجب ہے تو اس کا ترجمہ تعجب والا کیا جائے گا، ما احسن زیدا، احسن بزید، دونوں کا ترجمہ ایک ہے، زید کتنا ہی خوبصورت ہے، کیسا ہی خوبصورت ہے، دونوں کا معنی ایک ہی طرح سے ہوتا ہے، یہاں بھی اسی طرح سے ہے ''خوب سننے والے ہوں گے اس دن، کیسے اچھے سننے والے ہوں گے، کیسے اچھے

دیکھنے والے ہوں گے، جس دن ہمارے پاس آئیں گے، لیکن ظالم لوگ آج صریح گمراہی میں ہیں۔" وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ اور آپ انہیں ڈرایئے حسرت کے دن سے، حسرت کے دن سے قیامت کا دن مراد ہے، اس میں کافروں کو حسرت ہی حسرت ہوگی، حسرت کا معنی پچھتاوا، پچھتاوے کے دن سے ان کو ڈرایئے، اس دن چونکہ ہر انسان پچھتائے گا، بُرا پچھتائے گا کہ میں نے بُرائی کو چھوڑا کیوں نہیں، نیک بھی کسی درجے میں پچھتائے گا کہ میں نے مزید نیکی کیوں نہ کی، اس کو بھی دنیا میں ضائع کیے ہوئے وقت کے اوپر پچھتاوا ہوگا، جیسے حدیث شریف میں آتا ہے۔(1) اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ جبکہ امر کا فیصلہ کردیا جائے گا وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ: اور لوگ غفلت میں ہیں وَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ: اور ایمان نہیں لاتے۔ اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ وَمَنْ عَلَيْهَا: بے شک ہم ہی وارث بنیں گے زمین کے اور جو لوگ اس کے اوپر ہیں، مَنْ عَلَيْهَا: جو بھی زمین پر ہیں ان کے، زمین اور جو لوگ زمین پر ہیں ان کے وارث ہم ہی بنیں گے، وَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ اور ہماری طرف ہی یہ لوگ لوٹائے جائیں گے، یعنی سب کچھ فنا ہوجائے گا، پیچھے ہم ہی باقی رہ جائیں گے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کا قصہ ذِکر کرنے کا مقصد

جیسا کہ کل آپ کی خدمت میں عرض کیا گیا تھا کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کے واقعے کو بطور تمہید کے ذِکر کیا جارہا ہے، اور آگے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کا قصہ صراحت سے ذِکر کیا جارہا ہے، اور اس واقعے کے ذِکر کرنے سے مقصود ہے عیسائیوں کے شرک کو رَدّ کرنا، کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دے لیا اور یہ بھی شرک ہے، اللہ کی طرف اولاد کو منسوب کردیا، بلکہ بعد میں عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو بھی اس خدائی میں شریک کرلیا، تین بنالیے: اللہ، عیسیٰ، مریم، اور "تین" کو "ایک" قرار دے دیا، بعض مریم کی جگہ رُوح القدس کو رکھا کرتے تھے، "تین ایک" اور "ایک تین" کا فلسفہ عیسائیوں میں چلتا ہے۔ تو یہ واقعہ مفصل ذِکر کرکے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کس طرح پیدا ہوئے؟ اور انہوں نے اپنی زبان سے اپنی حیثیت کیا قرار دی؟ اللہ تعالیٰ توحید کا اثبات کرتے ہیں، اور عیسائیوں کے شرک کی تردید کرتے ہیں۔

بغیر باپ کے پیدا ہونا "اِبن اللہ" ہونے کی دلیل نہیں

عیسائیوں کو جو مغالطہ ہوا وہ یہیں سے ہوا تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام کا باپ کوئی نہیں، تو جب باپ نہیں تو انہوں نے کہا پھر لامحالہ یہ اللہ کے ہی بیٹے ہیں، آلِ عمران میں بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا: اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ کہ عیسیٰ علیہ السلام کی مثال تو آدم علیہ السلام جیسی ہے، خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ (سورۂ آل عمران:۵۹) اللہ تعالیٰ نے اس کو مٹی سے پیدا کیا، تو وہاں نہ ماں تھی نہ باپ، اگر بغیر باپ کے ہونا خدا ہونے کی دلیل ہے یا ابن اللہ ہونے کی دلیل ہے تو سب سے پہلے یہ عقیدہ آدم کے متعلق بنانا چاہیے۔ پھر آپ یہ کہ سکتے ہیں کہ

(1) لَيْسَ يَتَحَسَّرُ اَهْلُ الْجَنَّةِ اِلَّا عَلٰى سَاعَةٍ مَرَّتْ بِهِمْ لَمْ يَذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْهَا (معجم کبیر طبرانی ۹۳/۲۰ بعنوان جبیر بن نفیل عن معاذ۔ نیز مظہری)

عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت خرقِ عادت ہے، تو خرقِ عادت تو یحییٰ علیہ السلام کی ولادت بھی ہوئی، کہ نہ ماں اولاد کے قابل تھی، نہ باپ اولاد کے قابل تھا، تو بھی اللہ نے لڑکا دے دیا، تو اگر خرقِ عادت کسی کا پیدا ہونا یہی اُلوہیت کی دلیل ہے تو سب سے پہلے یہ عقیدہ تمہیں یحییٰ علیہ السلام کے متعلق بنانا چاہیے تھا۔ تو جیسے اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کے ساتھ زکریا علیہ السلام کو بڑھاپے میں بچہ دیا، تو اسی طرح سے اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کے ساتھ مریم کو بغیر خاوند کے، بغیر شوہر کے بچہ دے دیا، تو دونوں جگہ اللہ کی قدرت کام کرتی ہے۔ تو اللہ کی قدرت کا عقیدہ رکھتے ہوئے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ چاہے تو بغیر ماں باپ کے پیدا کر دے، اور اگر اللہ چاہے تو بغیر باپ کے پیدا کر دے، اللہ چاہے تو بالکل نااہل اور ناقابل زوجین کو بچہ دے دے، ہر جگہ اللہ کی قدرت کام کرتی ہے۔ تو یہاں سے تفصیل آ رہی ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کی۔

عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کا مفصل واقعہ

آلِ عمران میں آپ کے سامنے آیا تھا کہ حضرت مریم علیہا السلام جس وقت پیدا ہوئیں تو ان کی والدہ نے چونکہ نذر مانی ہوئی تھی، کہ ''جو بچہ پیدا ہوگا میں اس کو مسجد کی خدمت کے لئے وقف کردوں گی'' تو ان کو پھر بیت المقدس میں ٹھہرا دیا گیا تھا، حضرت زکریا علیہ السلام اس کے کفیل تھے، کَفَّلَهَا زَكَرِيَّا، تو وہیں یہ عبادت میں لگی رہتی تھیں، یہاں اِنْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا سے اسی بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ بیت المقدس کے مشرقی کونے میں علیحدہ ہو کر عبادت کرنے کے لئے معتکف ہوگئی تھیں، اور لوگوں کے سامنے پردہ تان لیا تھا، عبادت میں مشغول ہونے کے لئے پردہ کر لیا تھا (عام تفاسیر)، اور اس خلوت میں اللہ تعالیٰ نے رُوح القدس یعنی حضرت جبریل علیہ السلام کو بھیجا، اور وہ ایک تندرست اور صحیح سالم انسان کی شکل میں سامنے آئے، تو حضرت مریم دیکھتے ہی یہ سمجھیں کہ شاید یہ کوئی انسان میری خلوت میں آ گھسا، پردے میں شاید کوئی انسان آ گھسا، لیکن چونکہ آثار ایسے تھے جیسے کوئی نیک آدمی ہوتا ہے، بزرگ ہوتا ہے، اللہ سے ڈرنے والا ہوتا ہے، تو حضرت مریم علیہا السلام اس کو دیکھتے ہی کہنے لگیں کہ جیسی تیری شکل وصورت ہے کہ تُو متقی معلوم ہوتا ہے، تو اگر اللہ سے ڈرتا ہے تو میرے قریب نہ آ، میں اللہ کی پناہ میں آتی ہوں۔ اس طرح سے حضرت مریم علیہا السلام نے تعوّذ کیا، جیسا کہ ان کی عفت اور عصمت کا تقاضا تھا، عفیف سے عفیف عورت اسی قسم کے جذبات کا اظہار ہی کر سکتی ہے، کہ اگر کسی مرد کو اپنی طرف آتا ہوا دیکھے تو فوراً تعوّذ کرے گی، اور یہ کہے گی کہ اللہ سے ڈر، اگر تُو اللہ سے ڈرنے والا ہے تو خبردار! اگر آگے بڑھے، تو حضرت مریم علیہا السلام نے بھی اسی طرح سے اپنی عفت کا اظہار کیا۔ تو انہوں نے فوراً ظاہر کر دیا کہ میں کوئی انسان نہیں ہوں، میں تو اللہ کا بھیجا ہوا ہوں، اور اس لیے آیا ہوں تاکہ میرے توسط سے اللہ آپ کو بچہ عطا کرے۔ حضرت جبریل علیہ السلام کی طرف نسبت کہ میں ہبہ کروں تجھے ایک بچہ، وہ ظاہری سبب بننے کے طور پر ہے، جس طرح ہم سے اپنے آباء سے پیدا ہوئے تو ظاہری سبب کے طور پر نسبت اپنے باپ کی طرف کر دیتے ہیں، تو حضرت عیسیٰ کا باپ تو کوئی تھا نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے ظاہری اسباب میں واسطہ بنایا تھا جبریل علیہ السلام کو، جیسا کہ آیا ہے کہ انہوں نے پھونک ماری اور اسی کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قرار ہوگیا، اس ظاہری سبب کے طور پر نسبت حضرت جبریل علیہ السلام کی طرف کی گئی، کہ تاکہ میں تجھے بچہ عطا کروں، بچے کی بشارت دوں، اور اسی طرح سے

سبب بنوں اس بچے کے پیدا ہونے کا، غُلٰمًا زَكِيًّا میں بھی اس بات کی طرف اشارہ کر دیا کہ بچہ بڑا پاک صاف ستھرا ہوگا۔ تو حضرت مریم کو فوراً یہ خیال آیا، کیونکہ عادت یہی ہے کہ عورت کو بچہ تب ہوتا ہے جب کسی بشر کے ساتھ اس کا تعلق ہو جائے، چاہے جائز طریقے سے اور چاہے ناجائز طریقے سے، جس وقت تک مرد اور عورت کا آپس میں رابطہ نہ ہو اس وقت تک عادت یہی ہے کہ اولاد نہیں ہوتی، تو حضرت مریم علیہا السلام کو فوراً یہی اِشکال ہوا کہ میرے لیے کیونکر بچہ ہوسکتا ہے؟ اب جبریل علیہ السلام نے جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ پیغام دیا تھا تو یقین تو فوراً ہی آ گیا کہ یہ بات اللہ کی طرف سے ہے، جیسے زکریا علیہ السلام کو جب بشارت دی گئی تھی کہ اللہ تعالیٰ آپ کو لڑکا دے گا، تو انہوں نے بھی تو پوچھا تھا کہ لڑکا کیونکر ہوگا؟ مطلب یہ تھا کہ ظاہری اسباب اس میں کیا اختیار کیے جائیں گے، میں جوان ہوں گا، میری بیوی کو جوان کیا جائے گا، یا مجھے دوسری شادی کا حکم دیا جائے گا، کیا صورت ہوگی؟ تو مزید اطمینان حاصل کرنے کے لئے یہ بات ہوا کرتی ہے، تو حضرت مریم علیہا السلام نے بھی اسی طرح سے تعجب کا اظہار کیا کہ میرے لیے بچہ کیسے ہوگا؟ مجھے تو کسی بشر نے ہاتھ ہی نہیں لگایا، یہاں ہاتھ لگانا جماع سے کنایہ ہے، کسی بشر نے مجھے چھوا تک نہیں، یعنی جائز طریقے سے، اور نہ میں کوئی بدکارہ ہوں، تو جب یہ بات نہیں ہے تو پھر بچہ پیدا ہونے کی کیا صورت ہوگی؟ فرشتے نے جواب دیا کہ ایسے ہی ہو جائے گا یعنی بغیر مسِ بشر کے، جیسا کہ اس وقت حال ہے، اور تیرا رَبّ یہ کہتا ہے کہ میرے پر یہ بات آسان ہے، اور میں اس طرح سے اس کو پیدا کر کے اپنی قدرت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں، وَلِنَجْعَلَهٗۤ اٰيَةً لِّلنَّاسِ: اور تاکہ اس کو لوگوں کے لیے میں نشانی بنادوں اور اپنی طرف سے رحمت بنادوں، اور یہ بات طے شدہ ہے، اب اس میں کوئی کسی قسم کا تردّد نہیں، اللہ کی طرف سے یہ بات طے ہوگئی۔ چنانچہ ایسے ہی ہوا کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے گریبان میں دَم کیا، پھونک ماری، اور حضرت مریم کو محسوس ہو گیا کہ بچہ میرے بطن میں آ گیا، جس طرح سے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ عورت کو احساس ہوتا ہے، پیٹ میں ثقل پیدا ہوتا ہے، تو جب حضرت مریم کو یہ خیال ہوا۔ اب آپ جانتے ہیں کہ کنواری بچی، شریف خاندان کی، نیک ماں باپ کی اولاد، چاہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو مطمئن کر دیا گیا تھا، لیکن اس کو باہر ماحول کی تو خبر تھی کہ لوگ کیا کہیں گے، تو وہ شرم کے مارے اپنے آپ کو اس ماحول سے علیحدہ کرنے پر گویا کہ آمادہ ہوگئیں، اور اس آبادی کو چھوڑ کے باہر جنگل میں دُور نکل گئیں کہ جہاں کسی انسان کا گزر نہ ہو، اب اکیلی جنگل میں ہے اور کوئی انسان پاس نہیں ہے، کوئی مونس نہیں، غم خوار نہیں، اور بچہ ہونے کے وقت میں عورت کو کس قسم کے معاونین کی ضرورت ہوتی ہے، وہاں کوئی بھی موجود نہیں، جب بچہ پیدا ہونے کے آثار شروع ہوئے، دَردِ زِہ شروع ہوا، تکلیف ہوئی تو اس وقت حضرت مریم اپنی بے بسی کا اظہار ان الفاظ میں کرتی ہیں، اور پھر آگے یہ تصور بھی تھا کہ چاہے میرے سامنے حقیقت واضح ہے، لیکن لوگ کس طرح سے یقین کریں گے کہ یہ بچہ کیسے ہوگیا؟ ساری کی ساری چیزیں سامنے ہیں، تو اپنے جذبات کو ان الفاظ سے ظاہر کرتی ہیں کہ "ہائے کاش! میں اس سے قبل مرگئی ہوتی اور میرا نام ونشان مٹ گیا ہوتا، لوگ مجھے یاد تک نہ کرتے" یہ حضرت مریم علیہا السلام کی اس پریشانی کا اظہار ہے، اس قسم کے حالات میں جیسے کسی لڑکی کے اُوپر پریشانی طاری ہوسکتی ہے۔

فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ: دَردِ زِہ مجبور کر کے اس کو درخت کے تنے کی طرف لے آیا، اس وقت وہ کہنے لگی کہ ہائے کاش! میں اس سے قبل مرگئی ہوتی، اور میں بھولی بسری ہو جاتی، یعنی مجھے کوئی یاد نہ کرتا، میرا نام ونشان نہ ہوتا۔ پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جبریل علیہ السلام آئے

اور انہوں نے آ کے ان کو تسلی دی کہ غم کرنے کی کوئی بات نہیں، ایسے موقع پر پینے کے لئے پانی کی ضرورت ہے تو اللہ نے تیرے پاس چشمہ جاری کر دیا، کھانے کی ضرورت ہے تو یہی درخت جس کے اُوپر اگرچہ بظاہر کھجوریں معلوم نہیں ہوتیں، لیکن تو اس کو ذرا ہلا، تو اللہ تعالیٰ تیرے اُوپر عمدہ عمدہ کھجوریں گرائے گا۔ تو یہ حضرت مریم علیہا السلام کی کرامت ہے کہ اسی وقت وہاں پانی بھی جاری ہو گیا اور کھجور کے درخت سے کھجوریں بھی حاصل ہو گئیں۔ اگر اس کو کرامت قرار دیا جائے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسی قسم کا رزق مہیا کرنے کی صورت ہو جیسے آلِ عمران میں آیا تھا، کہ زکریا علیہ السلام جب حجرے میں جاتے حالانکہ مریم وہاں اکیلی ہوتی تھیں، كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا (سورۂ آل عمران: ۳۷) حضرت مریم کے پاس رزق پاتے تھے، بے موسم میوے ملتے تھے، اسی طرح سے بے موسم میوہ یہ بھی مل گیا، تو یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی، جیسے پہلے رزق ملتا رہا اسی طرح سے یہ مل گیا، پھر تو یہ ہو سکتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت انہی ایام میں ہو جن کو آج کل عیسائی ان کی ولادت کے دِن قرار دیتے ہیں یعنی دسمبر کا آخری ہفتہ، یہ دسمبر کے آخری ہفتے کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مولد قرار دیتے ہیں، کہ یہ ان کی ولادت کا وقت ہے، جس میں یہ بڑے دِنوں کی چھٹیاں کرتے ہیں، دسمبر کے آخری ہفتے میں حضرت عیسیٰ کی ولادت کی تاریخیں ہیں عیسائیوں کی تحقیق کے مطابق۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ دُنیا کے کسی خطے میں بھی دسمبر میں کھجوروں کا موسم نہیں ہوتا، کہ درختوں پر کھجوریں لگی ہوئی ہوں، کھجوریں تو گرمی کے موسم میں ہوتی ہیں، اور دسمبر تو سردی کا مہینہ ہے، اس میں کھجوریں نہیں ہوا کرتیں۔ تو اگر اس کو کرامت قرار دیا جائے پھر تو ممکن ہے کہ ان کی یہ تحقیق ٹھیک ہو، ورنہ اگر واقعہ ایسا تھا کہ اس کے اُوپر کھجوریں لگی ہوئی تھیں، اور اس درخت کے ہلانے کے ساتھ کھجوریں اُوپر سے گریں، ہلانا ظاہری سبب کے طور پر، کہ تُو ہاتھ لگا، یہ تو ایک ظاہری سبب ہے، باقی! اللہ تعالیٰ نے اُوپر سے کھجوریں گرانے کا تو اپنی قدرت سے معاملہ کرنا تھا، تو اگر یہ صورت ہو تو پھر ان کی یہ تاریخ غلط ہے جو عیسائی کہتے ہیں کہ ان کی ولادت دسمبر میں ہوئی، پھر ماننا پڑے گا کہ ان کی ولادت کسی ایسے مہینے میں ہوئی ہے جو کھجوروں کا موسم ہوتا ہے، اُردن کے علاقے میں، فلسطین میں جو موسم کھجوریں لگنے کا ہو گا اس موقع پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت ثابت ہو گی قرآنِ کریم کی شہادت سے، اور اگر اس کو کرامت قرار دیا جائے پھر دونوں باتیں صحیح ہو سکتی ہیں، کہ ان کی ولادت دسمبر میں ہو، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو پھل اسی طرح سے بے موسم مل گیا جس طرح سے بچپن میں بھی ان کے حجرے میں بے موسم پھل پہنچتا رہتا تھا۔

فَكُلِيْ وَاشْرَبِيْ: کھا اور پی، یعنی کھجوریں کھاؤ، پانی پیو، اور بچے کو دیکھ کے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرو، باقی رہ گیا یہ معاملہ کہ اب قوم کے پاس جاؤ گی تو قوم بدنام کرے گی، طعن و تشنیع کرنے گی، وہ کس طرح سے یقین کریں گے کہ تُو پاک صاف ہے، ان کے سامنے جو اِشکال ہو گا تو اس کا کیا جواب ہے؟ تو اس کا بندوبست آگے کر دیا گیا، کہ اگر کوئی انسان تیرے پاس آئے، اور تجھے یہ اندیشہ ہو کہ آ کے بچے کے متعلق گفتگو کرے گا، اور آپ کے اُوپر کوئی طعن و تشنیع کرے گا، تو اس کا علاج یہ ہے کہ تو روزے کی نذر مان لے۔ ان کے ہاں ایک خاموشی کا روزہ ہوا کرتا تھا، کہ صبح سے شام تک کسی کے ساتھ بولنا نہیں ہے، یہ روزہ ہماری شریعت میں منسوخ ہے، ہمارے ہاں خاموشی کا روزہ نہیں ہے، یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شریعت میں ایسے تھا، اور پھر ممکن ہے کہ ابھی نفاس والا وقت ہو تو ایسے وقت میں بھی روزہ رکھنے کی اجازت دے دی گئی، روزے کا کہہ دیا گیا، تو یہ بھی ان کی شریعت کا مسئلہ

ہے، ورنہ بچے کے پیدا ہونے کے بعد ہمارے ہاں چالیس دن تک خون آنے کی توقع ہوتی ہے، اگر خون آتا رہے تو اتنے دن تک عورت روزہ نہیں رکھ سکتی، نہ حیض کے زمانے میں، نہ نفاس کے زمانے میں، تو یہ اُن کی شریعت کا مسئلہ ہے، اس لیے اگر نفاس کے زمانے میں روزے کی نذر مان لی ہو تو بھی کوئی اشکال نہیں، اور اسی طرح سے خاموش رہنے کا جو روزہ ہے اس پر بھی کوئی اشکال نہیں، یہ ان کی شریعت کا مسئلہ ہے۔ تو اشارہ کر دینا، فَقُوْلِیْ سے مراد ہے کہ اشارہ کر دینا (مظہری)، چونکہ اس زمانے میں خاموشی کا روزہ رکھنے کا رواج تھا، تو لوگ کسی طرح سے اشارہ کرتے ہوں گے جس سے دوسرا سمجھ جاتا ہوگا کہ اس کا روزہ ہے یہ نہیں بولے گا، تو اگر کوئی قریب آئے تو بھی اسی طرح سے اشارہ کر دینا کہ میں نے رحمٰن کے لئے روزہ رکھا ہوا ہے، تو میں کسی سے بات نہیں کروں گی، یہ زبان سے نہیں کہنا، بلکہ اشارے کے ساتھ کہنا ہے، اور انہی لفظوں سے اقتضاء النص سے ثابت ہو گیا کہ روزے کی نذر بھی مان لو، تاکہ بات خلافِ واقع نہ ہو، یعنی ایسا نہیں ہو سکتا کہ روزہ نہ رکھا ہو اور کہہ دیا جائے کہ میرا روزہ ہے، اقتضاء النص کے ساتھ یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ روزے کی نذر مان لو، روزے کی نذر مان لینے کے بعد اگر کوئی آئے تو بولنا نہیں، بات نہیں کرنی، بچے کی طرف اشارہ کر دینا، پھر ہم جانیں اور وہ جانیں۔

ولادت کے بعد عیسیٰ علیہ السلام کا قوم سے خطاب

جب ان کو ہر طرح سے اطمینان ہو گیا، تو بچے کو اُٹھا کے اپنی قوم کے پاس آ گئیں، جس وقت قوم کے پاس گئیں تو وہی ہوا جو کچھ ہونا تھا، لوگ اکٹھے ہو گئے، آ کے اس کے اوپر طعن تشنیع کرنے لگ گئے کہ تُو نے یہ بہت بُری بات کا ارتکاب کیا، کبھی کہتے تھے کہ تُو ہارون کی بہن ہے اور ہارون بھی اچھا آدمی، تیرا باپ بھی اچھا آدمی، تیری ماں بھی بدکارہ نہیں، مطلب یہ کہ ایسے نیک خاندان میں سے تُو ایسی کدھر سے آ گئی؟ تو حضرت مریم نے اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق بچے کی طرف اشارہ کر دیا، جس کا مطلب یہ تھا کہ اس سے پوچھو، میں کچھ نہیں بولوں گی۔ تو وہ پھر سر چڑھے کہ جو بچہ ابھی گود میں پڑا ہوا ہے ہم اس سے کس طرح بات کر سکتے ہیں؟ یہ جھگڑا ابھی ہو ہی رہا تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خود بول پڑے، اور ان کا بولنا ہی حضرت مریم کی نظافت اور طہارت کو ثابت کرنے کے لئے کافی تھا۔ پھر انہوں نے بول کے جو اپنی حیثیت واضح کی کہ ''میں اللہ کا بندہ ہوں، آنے والے وقت میں نبی بننے والا ہوں، اللہ تعالیٰ مجھے کتاب دے گا'' تو یہ ایک ایک لفظ حضرت مریم کی صفائی دیتا ہے، کیونکہ کسی ناجائز فعل کے نتیجے میں پیدا ہونے والا بچہ اس قسم کے کمالات کا حامل نہیں ہوا کرتا، اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کی نشانی کے طور پر یہ بچہ اس طرح سے پیدا کیا ہے، تو ایک ایک لفظ گویا کہ حضرت مریم کی صفائی کا باعث ہے۔

عیسائیوں کے نظریات کی تردید

اور بعد میں عیسائیوں نے جو نظریات ان کے متعلق گھڑ لیے اس کی بھی تردید اس ساری کی ساری تقریر میں ہو رہی ہے جیسے کہ ترجمے میں آپ نے سُن لیا، عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ ''میں اللہ کا بندہ ہوں'' اس سے معلوم ہو گیا کہ اللہ نہیں ہوں، اللہ کے ساتھ شریک نہیں ہوں، اللہ کا بیٹا نہیں ہوں، ''مجھے اللہ نے کتاب دی اور نبی بنایا ہے، اور مجھے برکت والا بنایا ہے جہاں بھی میں ہوں گا،

اور مجھے نماز اور زکوٰۃ کی وصیت کی ہے کہ میں نماز اور زکوٰۃ کا پابند رہوں جب تک کہ زندہ رہوں'' یعنی وہی اَحکامِ شریعت جس طرح سے ہوا کرتے ہیں، اور پھر میں اپنی والدہ کے ساتھ حُسن سلوک کرنے والا ہوں، '' مجھے اللہ نے حُسنِ سلوک کرنے والا بنایا ہے، اور میں کوئی سرچڑھا بدبخت نہیں ہوں، میرے اُوپر ہر وقت سلامتی ہے، ولادت کے دِن بھی، وفات کے دِن بھی، قیامت کے دِن اُٹھایا جاؤں گا تو اس وقت بھی میرے پر سلامتی ہی سلامتی ہوگی'' یہ سب مقبولیت کی علامتیں ہیں۔ آخری بات آگے آئے گی کہ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّىْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ اللہ، ہی میرا رَبّ ہے اور تمہارا رَبّ ہے، اسی کی عبادت کرو، یہی صراطِ مستقیم ہے۔ تو رَبّ کی عبادت کرنا صراطِ مستقیم ہے، میں بھی اسی کی عبادت کرتا ہوں، تم بھی اسی کی عبادت کرو، مطلب یہ ہے کہ رَبّ سب کا وہی، میرا بھی اور تمہارا بھی، عبادت اسی کا ہی حق ہے، اسی کی عبادت کرنا یہی صراطِ مستقیم ہے، یہ توحید کا خلاصہ گویا کہ آخر میں جا کے پیش کر دیا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں اور وہ رَبّ سب کا رَبّ ہے اور عبادت اسی کی کرنی چاہیے، اس میں عیسائیوں کے نظریات کی پوری طرح سے تردید ہوگئی۔ اور هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ کا مطلب یہی ہے کہ رَبّ کی عبادت کرو، کسی اور کی نہ کرو، صراطِ مستقیم یہی ہے۔ تو سورۂ فاتحہ میں ہم جو دُعا مانگا کرتے ہیں کہ اے اللہ! ہمیں صراطِ مستقیم کی ہدایت دے، تو معلوم ہوگیا کہ صراطِ مستقیم اللہ تعالیٰ کی عبادت کو کہتے ہیں، '' ہمیں سیدھے راستے پہ چلا'' کہ ہم تیری ہی عبادت کریں اور شرک سے بچیں، توحید کو اختیار کریں۔ تو صراطِ مستقیم کا وہاں بھی مفہوم یہی ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ

اللہ تعالیٰ ان باتوں کو نقل کرنے کے بعد تنبیہ کرتے ہیں کہ یہ ہے مریم کا بیٹا عیسیٰ! یہی اس کی حقیقت ہے، کہ اپنی قدرت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے مریم کے بطن سے ان کو پیدا کیا، میں بالکل واقعے کے مطابق بات کہہ رہا ہوں، جس میں لوگ خواہ مخواہ کے جھگڑے نکال رہے ہیں۔ اور اللہ کی یہ شان نہیں کہ اولاد اختیار کرے، اللہ تعالیٰ اس عیب سے پاک ہے، اللہ کی طرف اولاد کی نسبت کرنا یہ عیب کی بات ہے، اولاد تو وہ چاہا کرتے ہیں کہ جن کا دُنیا میں بغیر اولاد کے کام نہیں چلتا، اولاد کی طلب، اولاد کی تڑپ، اولاد کی ضرورت یہ تو احتیاج کی علامت ہے، مجھے کیا ضرورت ہے، میں تو ہر طرح سے قادر ہوں، کہ جب بھی کوئی کام کرنے کا ارادہ کروں تو میں کہتا ہوں ہوجا پس وہ کام ہوجاتا ہے، مجھے کسی معاون کی ضرورت نہیں، کسی شریک کار کی ضرورت نہیں، تو میں اولاد کو کیوں اختیار کروں؟ آگے تو وہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وعظ کا آخری جملہ آگیا (جس کی وضاحت ہو چکی)۔

عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں یہود و نصاریٰ کا اختلاف

پھر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ حقیقت تو اتنی تھی جتنی واضح کر دی گئی، لوگوں نے آپس میں اختلاف کرلیا، کسی نے کچھ کہا، کسی نے کچھ کہا، خاص طور پر یہود و نصاریٰ کا اختلاف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق آج تک چلا آرہا ہے، یہود اب تک اسی بات پہ ہیں جو ابتدا میں کہی گئی تھی، یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ماں کو نعوذ باللہ! بداخلاق کہتے ہیں اور عیسیٰ علیہ السلام کو ناجائز اولاد قرار دیتے ہیں اور ان کو

شریف انسان بھی ماننے کے لئے تیار نہیں، تو یہودی عیسیٰ علیہ السلام کی تردید کرتے ہیں، ان کے منکر ہیں، اور عیسائیوں نے اتنا بڑھایا کہ ان کو اُٹھا کے لے جا کر اُلوہیت کی مسند پر بیٹھا دیا، یہ اختلافات اسی وقت شروع ہوئے اور آخر شدت ہی اختیار کرتے چلے گئے، پھر عیسائیوں میں مختلف فرقے بن گئے، کسی نے ان کو رسول جانا اور اللہ کا عبد سمجھا جو حق پر تھے، کسی نے ابن اللہ بنالیا (سورۂ توبہ: ۳۰)، کسی نے ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ کہا، کسی نے کہہ دیا کہ حقیقتاً اللہ وہی ہے اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ (سورۂ مائدہ: ۷۲، ۷۳) تو عیسائیوں کے بھی آپس میں فرقے بن گئے، انہوں نے بھی آپس میں اختلاف کیا۔

اِفراط وتفریط دونوں نظریے غلط ہیں

تو جتنے بھی اختلاف کرنے والے تھے، ان کو تنبیہ کی جارہی ہے کہ حقیقت اتنی ہی ہے جتنی ہم نے بیان کردی، باقی! جو کچھ لوگ کہتے ہیں سب خلافِ واقعہ ہے، اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ یہ بھی غلط ہے، ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ والا نظریہ بھی غلط، اور عیسیٰ علیہ السلام کی حیثیت کو گراتے ہوئے اگر ان کے متعلق کوئی ناجائز لفظ بولتا ہے تو وہ بھی غلط۔ افراط وتفریط دونوں نظریے غلط ہیں، حقیقت یہ ہے جو ہم نے واضح کردی، کہ ''نہ وہ اللہ ہیں، نہ اللہ کے بیٹے ہیں، نہ ثالثِ ثلاثہ ہیں، اللہ کے مقبول بندے ہیں، رسول ہیں، صاحبِ کتاب ہیں، باعثِ برکت ہیں، اللہ تعالیٰ کے عبادت گزار ہیں، توحید کا پرچار کرنے والے ہیں'' یہ حقیقت ہے جو ہم نے نمایاں کردی، لوگ اس میں اختلاف کرتے ہیں۔

کافروں کے لئے یومِ حسرت

آگے قیامت کے حالات کو ذکر کے ان کے لئے وعید ہے، کہ کافر لوگوں کے لئے خرابی ہے بڑے دِن کی حاضری سے۔ آج تو ہم سمجھاتے ہیں تو یہ نہ سنتے ہیں، نہ ان کو کوئی حقیقت نظر آتی ہے، اس دِن خوب سننے والے ہوں گے اور خوب دیکھنے والے ہوں گے جس دِن ہمارے پاس آئیں گے، لیکن یہ ظالم آج صریح گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں، آپ ان کو حسرت کے دِن سے ڈرائیے، اس دِن پچھتاوا ہی پچھتاوا ہوگا، جو آج سمجھتے نہیں اپنے اخلاق کردار کو اچھا نہیں کرتے وہ اس دِن پچھتائیں گے جب معاملہ طے کردیا جائے گا۔ اور اِذْ قُضِیَ الْاَمْرُ کا مصداق اور حسرت کے دِن کا پورا پورا ظہور اس وقت ہوگا، جیسے حدیث شریف میں آتا ہے کہ دوزخی دوزخ میں چلے جائیں گے اور جنتی جنت میں چلے جائیں گے، تو اللہ تعالیٰ موت کو ایک مینڈھے کی شکل میں موجود کریں گے، اور وہ جہنمیوں کو بھی دکھائیں گے اور پچھوائیں گے کہ یہ موت ہے، اور جنتیوں کو بھی دکھائیں گے اور پچھوائیں گے کہ یہ موت ہے، بعد میں جنت اور دوزخ کے درمیان اس کو ذبح کردیا جائے گا،[1] یعنی اس موت کو فنا کردیا جائے گا، اور اعلان کردیا جائے گا کہ جہنم والو! اس کے بعد کوئی موت نہیں، جنت والو! اس کے بعد کوئی موت نہیں، یہ وقت ہوگا جس میں جہنمیوں کے اوپر سب سے زیادہ حسرت طاری ہوگی، کیونکہ مصیبت سے چھوٹنے کا ایک تصور انسان میں ہوتا ہے کہ چلو! مرجائیں گے تو مصیبت ختم

---

(۱) یُؤْتٰی بِالْمَوْتِ کَهَیْئَةِ کَبْشٍ اَمْلَحَ ... فَیَقُوْلُ هَلْ تَعْرِفُوْنَ هٰذَا؟ فَیَقُوْلُوْنَ نَعَمْ هٰذَا الْمَوْتُ؛ وَکُلُّهُمْ قَدْ رَاٰهُ فَیُذْبَحُ. بخاری ۲/ ۶۹۱، کتاب التفسیر. سورۂ مریم۔

ہوجائے گی، اور یہ تصور بھی وہاں ختم کر دیا جائے گا۔ جنتیوں کے لئے خوشی کی کوئی انتہا نہیں ہوگی، کیونکہ جب موت کا تصور مٹ گیا تو ان کی عیش وعشرت دائمی ہوگئی، اور جہنمیوں کے لئے حسرت اور افسوس کی کوئی انتہا نہیں ہوگی، کیونکہ جب موت پر فنا طاری ہوگی، تو اب ان کی جان چھوٹنے کا کائی ذریعہ باقی نہ رہا۔ ''یہ لوگ غفلت میں ہیں اور ایمان نہیں لاتے۔''

اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ وَمَنْ عَلَیْهَا: یہ دنیا کی محبت میں مبتلا ہیں ان کو سمجھ لینا چاہیے کہ دنیا اور دنیا میں بسنے والے سب لوگ چلے جائیں گے، پیچھے ہم ہی وارث رہ جائیں گے، وَاِلَیْنَا یُرْجَعُوْنَ: اور ہماری طرف ہی سارے کے سارے لوگ لوٹائے جائیں گے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ○

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِیْمَ ۬ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّیْقًا نَّبِیًّا ﴿۴۱﴾ اِذْ قَالَ لِاَبِیْهِ

کتاب میں ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کیجئے، بے شک وہ ابراہیم صدیق، نبی تھے ﴿۴۱﴾ قابلِ ذکر ہے وہ وقت جب ابراہیم نے اپنے باپ سے کہا

یٰۤاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا یَسْمَعُ وَلَا یُبْصِرُ وَلَا یُغْنِیْ عَنْكَ شَیْــٴًـا ﴿۴۲﴾ یٰۤاَبَتِ

اے میرے اَبّا! کیوں عبادت کرتا ہے تُو ایسی چیزوں کی جو نہ سنتی ہیں، نہ دیکھتی ہیں، نہ تجھے کوئی فائدہ دیتی ہیں ﴿۴۲﴾ اے میرے اَبّا!

اِنِّیْ قَدْ جَآءَنِیْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ یَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِیْۤ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِیًّا ﴿۴۳﴾ یٰۤاَبَتِ

بے شک میرے پاس وہ علم آگیا جو تیرے پاس نہیں آیا پس تُو میری اِتباع کر، میں دِکھاؤں گا تجھے سیدھا راستہ ﴿۴۳﴾ اے میرے باپ!

لَا تَعْبُدِ الشَّیْطٰنَ ؕ اِنَّ الشَّیْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِیًّا ﴿۴۴﴾ یٰۤاَبَتِ اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ یَّمَسَّكَ

شیطان کی عبادت نہ کر، بے شک شیطان رحمٰن کے لئے نافرمان ہے ﴿۴۴﴾ اے میرے باپ! بے شک میں خوف کرتا ہوں کہ پہنچے گا تجھے

عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّیْطٰنِ وَلِیًّا ﴿۴۵﴾ قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِیْ

عذاب رحمٰن کی طرف سے، پھر تُو ہوجائے گا شیطان کا ساتھی ﴿۴۵﴾ ان کے باپ نے کہا: کیا تُو اعراض کرنے والا ہے میرے معبودوں سے

یٰۤاِبْرٰهِیْمُ ۚ لَىٕنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِیْ مَلِیًّا ﴿۴۶﴾ قَالَ سَلٰمٌ عَلَیْكَ ۚ

اے ابراہیم! اگر تُو باز نہ آیا تو میں تجھے رجم کر دوں گا اور جدا ہو جا مجھ سے زمانہ دراز تک ﴿۴۶﴾ ابراہیم نے کہا کہ آپ پر سلام ہو

سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّیْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِیْ حَفِیًّا ﴿۴۷﴾ وَاَعْتَزِلُكُمْ

عنقریب میں بخشش طلب کروں گا تیرے لئے اپنے رَبّ سے، بے شک وہ میرے ساتھ مہربان ہے ﴿۴۷﴾ اور میں جدا ہوتا ہوں تم سے

وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَاَدْعُوْا رَبِّيْ ۖ عَسٰۤى اَلَّاۤ اَكُوْنَ بِدُعَآءِ رَبِّيْ شَقِيًّا ﴿۴۸﴾

اور ان چیزوں سے جن کو تم اللہ کے علاوہ پکارتے ہو، اور میں بندگی کروں گا اپنے رَبّ کی، اور نہ رہوں گا اپنے رَبّ کی بندگی کر کے محروم ﴿۴۸﴾

فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۙ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ۭ

پھر جس وقت ابراہیم جدا ہو گئے ان سے اور ان چیزوں سے جن کی وہ اللہ کے علاوہ عبادت کرتے تھے، ہم نے عطا کیا ابراہیم کو اسحاق اور یعقوب

وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا ﴿۴۹﴾ وَوَهَبْنَا لَهُمْ مِّنْ رَّحْمَتِنَا وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا ﴿۵۰﴾

اور ہم نے ہر کسی کو نبی بنایا ﴿۴۹﴾ اور ہم نے عطا کی ان کو اپنی رحمت، اور ہم نے ان کے لئے اچھا عالی شان ذِکر بنایا ﴿۵۰﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ: کتاب میں ابراہیم کا ذِکر کیجئے، اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا: بے شک وہ ابراہیم صدیق نبی تھے، صِدِّيْقًا نَّبِيًّا: یہ دونوں کانَ کی خبر ہیں، صدیق کا لفظ صدق سے لیا گیا ہے، صدق کا معنی سچائی، اور صدیق کا معنی سچا، جو سچائی کو اختیار کرنے والا ہے، اس میں مبالغہ پایا جاتا ہے، ہر لحاظ سے سچا، زبان کا سچا، کردار کا سچا، وعدے کا پکا، سب باتیں صدیق میں آ جاتی ہیں، اور صدیق کے مفہوم میں یہ بھی ہے کہ اس کا قول اس کے عمل کے مطابق ہے، عمل قول کے مطابق ہے، جو بات زبان سے کہتا ہے عمل سے اس کو سچا کر دکھاتا ہے، اور ایسے ہی صدیق اس کو کہتے ہیں جس میں سچائی کو قبول کرنے کی صلاحیت علیٰ وجہ الکمال موجود ہو، اس میں یہ سارے پہلو ہیں۔ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ: قابلِ ذِکر ہے وہ وقت جب ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ سے کہا، اس باپ کا نام سورۂ اَنعام میں آپ کے سامنے ''آزر'' گزرا ہے، جس طرح سے لفظ آیا تھا لِاَبِيْهِ اٰزَرَ، اپنے باپ سے کہا يٰۤاَبَتِ: یہ اصل میں یَااَبِیْ ہے، اور کافیہ میں آپ نے پڑھا کہ اس میں کبھی کبھی تاء کا اضافہ بھی کر دیا کرتے ہیں، تو یَااَبَتِ کا معنی ہے اے میرے پیارے اَبا! شفقت اور محبت کے ساتھ یہ خطاب کیا جاتا ہے، ''اے میرے اَبا! اے میرے باپ!'' لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا: کیوں عبادت کرتا ہے تو ایسی چیزوں کی (مَا لفظوں میں چونکہ مذکر ہے اس لیے لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ یہ مذکر کے صیغے آئے ہیں، ضمیر مَا کی طرف لوٹ رہی ہے، اور ہم چونکہ لفظ استعمال کریں گے ''چیزیں''، اور اُردو میں یہ مؤنث استعمال ہوتا ہے، تو ہم ترجمہ مؤنث کے طور پر کریں گے) کیوں پُوجا کرتے ہیں آپ ایسی چیزوں کی جو نہ سنتی ہیں، نہ دیکھتی، نہ تجھے کوئی فائدہ دیتی ہیں۔ اَغْنٰى عَنْهُ: فائدہ دینا۔ نہ تجھے کوئی فائدہ دیتی ہیں، نہ تیرے کسی کام آتی ہیں، يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ: اے میرے اَبا! بے شک میں، قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ: میرے پاس وہ علم آ گیا جو تیرے پاس نہیں آیا، فَاتَّبِعْنِيْٓ: پس تُو میری اتباع کر اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا: میں دِکھاؤں گا تجھے سیدھا راستہ۔ سوی: دُرست۔ دُرست راستہ میں تجھے دِکھاؤں گا، میں تجھے راہنمائی کروں گا دُرست راستے کی۔ يٰۤاَبَتِ: اے میرے باپ! لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ: شیطان کی عبادت نہ کر، اِنَّ

الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا: بے شک شیطان رحمٰن کے لئے نافرمان ہے۔ عَصِيّ: سرکش، باغی، نافرمان، يٰۤاَبَتِ اِنِّيْۤ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ: اے میرے باپ! بے شک میں خوف کرتا ہوں کہ پہنچے گا تجھے عذاب رحمٰن کی طرف سے، مس کرے گا تجھے عذاب رحمٰن کی طرف سے، فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا: پھر تو ہوجائے گا شیطان کا ساتھی۔ ولی سے یہاں ساتھی مراد ہے، یعنی جس طرح شیطان عذاب میں مبتلا ہوگا تو بھی اس کا ساتھی بن جائے گا اور عذاب میں مبتلا ہوجائے گا۔ قَالَ: ان کے باپ نے کہا یعنی اس آزر نے کہا: اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰۤاِبْرٰهِيْمُ: رَغِبَ کا صلہ ''فی'' بھی آتا ہے اور ''عن'' بھی آتا ہے۔ رَغِبَ فِيْهِ یہ شوق ظاہر کرنے کے لئے ہوتا ہے، کسی چیز کا شوق ہو تو رغِب کے بعد ''فی'' صلہ آیا کرتا ہے، اور رَغِبَ کا صلہ ''عَنْ'' آجائے تو اس میں اعراض والا معنی ہوتا ہے رَغِبَ عَنْهُ: اس سے اِعراض کر گیا۔ یہاں صلہ ''عَنْ'' آیا ہوا ہے، اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ، کیا تو اعراض کرنے والا ہے میرے آلہہ سے، میرے معبودوں سے اے ابراہیم؟ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ: اِنْتَهٰى يَنْتَهِيْ: رُکنا۔ اگر تُو باز نہ آیا، لَاَرْجُمَنَّكَ: میں تجھے رجم کردوں گا، رجم کا معنی سنگسار۔ پتھر مار مار کے ماردوں گا، وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا: مَلِيًّا کہتے ہیں زمانۂ طویل کو۔ جدا ہوجا مجھ سے زمانۂ دراز تک، دُور ہوجا مجھ سے مدتِ دراز تک۔ قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ: ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ آپ پر سلام ہو، سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ: عنقریب میں بخشش طلب کروں گا تیرے لیے اپنے رَبّ سے، اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا: بے شک وہ میرا رَبّ میرے ساتھ مہربان ہے، حفی کا معنی ہوتا ہے جو کسی کی بہت خبر رکھنے والا ہو، اس کی خاطر بہت اہتمام کرنے والا ہو، اس کو حفی کہتے ہیں۔ ''میرا بہت مہربان ہے'' وَاَعْتَزِلُكُمْ: اور میں تم سے جدا ہوتا ہوں وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ: اور ان چیزوں سے جدا ہوتا ہوں جن کو تم اللہ کے علاوہ پکارتے ہو، وَاَدْعُوْا رَبِّيْ: اور میں اپنے رَبّ کو پکارتا ہوں، عَسٰۤى اَلَّاۤ اَكُوْنَ بِدُعَآءِ رَبِّيْ شَقِيًّا: اُمید ہے کہ نہیں ہوں گا میں اپنے رَبّ کو پکارنے کے ساتھ نامراد، محروم نہیں رہوں گا۔ شَقِيًّا کا لفظ پہلے بھی آپ کے سامنے ذکر کیا تھا، حضرت زکریا علیہ السلام کی دُعا میں لَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآىِٕكَ رَبِّ شَقِيًّا یہ لفظ آئے تھے، کہ اے اللہ! میں تجھے پکار کر پہلے کبھی محروم نہیں رہا، اور مجھے اب بھی اُمید ہے کہ محروم نہیں رہوں گا۔ اور ''دُعاء'' عبادت کے معنی میں ہے: اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ۔[1] یعنی میں اپنے رَبّ کی عبادت کروں گا، جن کی تم عبادت کرتے ہو ان سے میں علیحدہ ہوتا ہوں۔ قرآنِ کریم میں ''دُعاء'' کا لفظ عبادت کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، ایک آیت میں یہ لفظ آتے ہیں وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْۤ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ (سورۂ مؤمن: ۶۰) تمہارا رَبّ یہ کہتا ہے کہ مجھے پکارو، میں تمہاری دُعا کو قبول کروں گا، اور جو میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں ان کو میں جہنم میں داخل کردوں گا، تو وہاں ''دُعا'' کو عبادت کے ساتھ تعبیر کیا ہے، تو یہاں عبادت والا معنی بھی ٹھیک ہے، ''میں اپنے رَبّ کی عبادت کروں گا'' اس لیے حضرتِ شیخ (الہندؒ) نے یہاں ترجمہ بندگی کے ساتھ کیا ہے، ''میں بندگی کروں گا اپنے رَبّ کی، اور نہ رہوں گا اپنے رَبّ کی بندگی کرکے محروم۔'' فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ: پس جس وقت ابراہیم جدا ہوگئے ان سے، وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اور اور ان چیزوں سے جن کی وہ اللہ کے علاوہ عبادت کرتے تھے، وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ: ہم نے عطا کیا ابراہیم کو اسحاق اور یعقوب علیہما السلام، اسحاق بیٹے ہیں، یعقوب پوتے ہیں۔ وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا: اور ہم نے ہر کسی کو نبی بنایا، یعنی ان میں سے بھی ہر کوئی نبی تھا۔ وَوَهَبْنَا لَهُمْ مِّنْ رَّحْمَتِنَا: اور ہم نے عطا کی ان کو اپنی رحمت، لَهُمْ میں سب آگئے

(۱) ترمذی ۲/۱۷۵، کتاب الدعوات۔ مشکوٰۃ ۱/۱۹۴، کتاب الدعوات فصل ثانی۔

ابراہیم علیہ السلام، اسحاق علیہ السلام، یعقوب علیہ السلام، ان کو ہم نے اپنی رحمت دی وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا: لسان زبان کو کہتے ہیں، اور پھر لسان کا لفظ بول کر ذِکر اور شہرت مراد ہوتی ہے۔ ہم نے ان کے لئے بڑا اچھا ذِکر عالی شان کیا، یعنی ان کے بعد ان کا تذکرہ بڑی اچھی صورت میں، بہت عالی صورت میں ہم نے ان کا ذِکر باقی رکھا، بہت اچھی شہرت ہم نے ان کو عطا کی۔ لِسَانَ صِدْقٍ میں موصوف کی اضافت صفت کی طرف ہے، جس طرح سے سورہ یونس میں آپ کے سامنے قَدَمَ صِدْقٍ کی ترکیب آئی تھی، اور آگے سورۂ قمر میں فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ کا لفظ آئے گا۔ قَدَمَ صِدْقٍ: اچھا مرتبہ۔ مَقْعَدِ صِدْقٍ: اچھا ٹھکانا۔ تو لِسَانَ صِدْقٍ: اچھا تذکرہ۔ عَلِيًّا: عالی شان۔ ہم نے ان کے لئے اچھا عالی شان ذِکر بنایا، یعنی ان کے بعد ان کا ذِکر، ان کی شہرت بہت اچھی ہوئی، بہت عالی شان طریقے سے ہم نے ان کے ذِکر کو باقی رکھا۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

اِبراہیم علیہ السلام کا مقام اور ان کے تذکرے کا مقصد

حضرت زکریا، یحییٰ، عیسیٰ اور مریم علیہم السلام کا ذِکر پچھلی آیات میں ہوا تھا، اب اس رکوع میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذِکر آرہا ہے، اور رکوع کی آخری آیات میں ضمناً حضرت اسحاق علیہ السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام کا ذِکر بھی آجائے گا، آگے پھر انبیاء علیہم السلام کا تذکرہ شروع ہو رہا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک ایسے نبی گزرے ہیں کہ جن کو انبیاء کے سلسلے میں ''جدّ الانبیاء'' کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے، ''ابوالانبیاء''، ''جدّ الانبیاء''۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم بھی جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ کرتے ہیں تو ''اَب'' کے لفظ کے ساتھ ہی کرتے ہیں، یعنی اپنا باپ ظاہر کر کے، اور بات بھی ایسے ہی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو بیٹے تھے، بڑے حضرت اسماعیل علیہ السلام، جن کی اولاد میں یہ قریش اور اہلِ مکہ وغیرہ تھے، اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم بھی اُنہی کے سلسلے سے آئے، تو یہ بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد کا سلسلہ ہی ہے، اور دوسرے بیٹے اسحاق علیہ السلام تھے، اور ان کے بیٹے یعقوب، تو اسحاق بیٹے ہیں اور یعقوب پوتے ہیں، آگے یعقوب علیہ السلام سے نسل پھیلی کہ ان کے بارہ بیٹے ہوئے، بارہ خاندان بنے، یعقوب علیہ السلام کا نام ''اسرائیل'' تھا، تو وہ سارے بارہ خاندان بنو اسرائیل کہلاتے تھے، اور بنو اسرائیل میں بے شمار انبیاء آئے، وہ بھی سارے کے سارے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے ہی تھے، اس لیے عیسائی ہوں یا یہودی یا قریشِ مکہ، عرب کے مشرک، وہ سارے کے سارے اپنی نسبت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف کرتے تھے، اور ہر کوئی مدّعی تھا کہ ہم ابراہیم علیہ السلام کے طریقے پہ ہیں، مشرکینِ مکہ کہتے تھے کہ ہم ملّتِ ابراہیمی پہ ہیں، یہود و نصاریٰ کہتے تھے کہ ہم ملّتِ ابراہیمی پہ ہیں، اسی لیے تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کے سامنے یہ بات واضح کی تھی کہ مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا (سورۂ آلِ عمران: ۶۷) نہ وہ یہودی تھا، نہ نصرانی تھا، بلکہ وہ تو مخلص موحد تھا، تو مشرک بھی اس کے طریقے پر نہیں، یہود و نصاریٰ بھی اس کے طریقے پر نہیں۔ اس لیے یہاں توحید کا مسئلہ ذِکر کرتے ہوئے خصوصیت سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ذِکر کیا جا رہا ہے تاکہ یہ نصاریٰ کے لئے بھی ایک عبرت ہو، کہ اپنے آپ کو

ملتِ ابراہیمی پر قرار دیتے ہیں حالانکہ شرک میں مبتلا ہیں، اور مشرکینِ مکہ کے لئے بھی خاص طور پر تنبیہ ہو جو اپنے آپ کو ابراہیم علیہ السلام کی اولاد قرار دیتے ہیں، اور اولاد قرار دینے کے ساتھ ساتھ مدعی ہیں کہ وہ اپنے آباء کے طریقے پر ہیں، تو ان کے سامنے واضح کر دیا جائے گا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا کیا طریقہ ہے۔ تو مسئلہ توحید کی وضاحت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وعظ کے سلسلے میں ہو جائے گی۔

ابراہیم علیہ السلام کا اپنے والد کو نصیحت کرنے کا واقعہ

''کتاب میں ابراہیم کا تذکرہ کیجئے'' کتاب سے قرآنِ کریم مراد ہے کہ اپنی اس کتاب میں ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کیجئے اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا: وہ صدیق نبی تھے، ''صدیق'' کا مفہوم آپ کے سامنے ذکر کر دیا، بالکل سچے، کردار کے پکے، وعدے کے پکے، ''صدیق'' کے مفہوم میں سب کچھ ہوتا ہے، سچائی کو قبول کرنے والے، سچائی کا ساتھ دینے والے، ان میں یہ بات تھی کہ ان کا عمل قول کے مطابق تھا، جو زبان سے کہتے تھے اپنے کردار سے اس کو سچا ثابت کرتے تھے، ''صدیق'' میں یہ سارے مفہوم ہوتے ہیں۔ اور نَّبِيًّا یہ بھی كَانَ کی خبر ہے۔ وہ صدیق نبی تھے۔ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ: حضرت ابراہیم علیہ السلام جس خاندان میں پیدا ہوئے وہ مشرکین کا خاندان تھا، اور یہ عام طور پر آپ سنتے رہتے ہیں کہ ان کا باپ ''آزر'' بُت تراش تھا اور بُت فروش تھا، یعنی صرف بُت کی پُوجا ہی نہیں کرتا تھا بلکہ بتوں کا تاجر تھا، بُت تراشتا تھا اور بتوں کو بیچتا تھا، اس کی یہ پوزیشن تھی، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جس وقت ہوش سنبھالی تو اپنے گھر کے اندر انہی چیزوں کو دیکھا، پتھر کی مورتیاں جن کی پُوجا کی جارہی تھی، تو جس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے علم وحکمت دیا، آپ نے اپنے وعظ کی اِبتدا اپنے باپ کے سامنے سے کی ہے، جس طرح سے ہے: وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ (سورۂ شعراء: ۲۱۴) کہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈراؤ۔ تو گھر سے ہی اس بات کی ابتدا ہوئی، گھر میں تذکرہ کیا، پھر قوم کے سامنے کیا، پھر حکومت تک آواز پہنچی، براہِ راست بادشاہ کے ساتھ ٹکراؤ ہوا، جیسے سورۂ بقرہ (پارہ ۳) میں آپ کے سامنے آیا تھا، کہ اس وقت کے بادشاہ نمرود کے ساتھ اس کے دربار میں جا کے بحث ہوئی، مناظرہ ہوا، آخر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مُلک چھوڑنا پڑ گیا، درجہ بدرجہ اسی طرح سے آپ کی آواز مُلک میں پھیلی ہے، اور ٹکراؤ جیسے جیسے شدید ہوتا چلا گیا تو اس کے نتیجے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو وہ علاقہ چھوڑنا پڑ گیا، اور ہجرت کر کے آپ شام کے علاقے کی طرف آ گئے تھے۔

اپنے باپ کو وعظ کرتے ہوئے کتنا پیارا انداز اختیار کیا، کتنا ادب اور محبت کا، باوجود اس بات کے وہ مشرک ہے، مشرک ہونے کی بنا پر اس کے سامنے کوئی گستاخی نہیں کی، اور نہ کسی سخت لب ولہجہ کے ساتھ اسے پکارا، ''اے میرے اَبا!'' اپنے باپ سے کہا کہ اے میرے باپ! اور يٰٓاَبَتِ عرب کے اندر محبت کے ساتھ خطاب کرنے کا طریقہ ہے۔ اے میرے اَبا! لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا: اس کا مطلب یہ ہے کہ عبادت تو اس کی کی جاتی ہے جو انسان کے کام آئے، جو آپ کی دُعا کو سنے، آپ کے حالات کو دیکھے، اور آپ جس مصیبت میں اسے پکاریں وہ اس مصیبت کو دُور ہٹانے پر قادر ہو، کسی کو الٰہ مان لینا، کسی کو معبود مان لینا یہ کوئی کھیل یا کوئی تماشا تو نہیں ہے، نہ کوئی عیاشی کے طور پر مانا جاتا ہے، بلکہ یہ تو زندگی کی ایک ضرورت ہے جس

کے بغیر انسان سمجھتا ہے کہ گاڑی ہی نہیں چلتی، جب تک کسی کو اپنے اوپر وہ الٰہ نہیں مانتا، اپنا خالق مالک نہیں مانتا، تو اس وقت تک اس کی فطرت مطمئن نہیں ہوتی۔ تو الٰہ کو تو ایک ضرورت کی بنا پر مانتا ہے، مجبوری کی بنا پر مانتا ہے، فطرت کا تقاضا ہے، اس کے بغیر انسان نہ اپنی ابتدا کو سمجھ سکتا ہے نہ انتہا کو سمجھ سکتا ہے، اور بہت سارے مسائل کی گتھیاں ہیں جو اس عقیدے کے بغیر سلجھتی ہی نہیں۔ تو ایک کو تو انسان اس لیے مانتا ہے، باقی! دوسری چیزیں جو مانی جاتی ہیں، تو آخر ان کے لئے کوئی دلیل نہیں، نہ وہ کام آنے والی، نہ کوئی دُعا سُن سکیں، نہ کسی کے حالات کو دیکھ سکیں، نہ تجھ سے کچھ دُور ہٹا کر تجھے کوئی فائدہ پہنچا سکیں، تو ایسی چیزوں کی پُوجا کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ کتنی سادہ دلیل، کتنی پیاری دلیل اور کتنے اچھے انداز کے ساتھ ادا کی، یعنی اس میں بتوں کی صحیح حیثیت واضح کردی جو اپنے تراشیدہ تھے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ واقعی پتھروں کی ان مورتیوں کو پُوجتے تھے، اگر وہ صرف فرشتوں کو یا صرف جنوں کو پُوجتے ہوتے تو لَا یَسْمَعُ، لَا یُبْصِرُ، لَا یُغْنِیْ یہ باتیں ان پر صادق نہیں آتیں، اور دوسری جگہ آیا ہے اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ (سورۂ صافات:۹۵) کیا تم ان چیزوں کی پُوجا کرتے ہو جن کو خود تراشتے ہو؟ تو ان کی جو تراشی ہوئی چیزیں تھیں وہی ان کے معبود تھے، یعنی جہالت کا اتنا زور چڑھ گیا، چاہے شرک کی ابتدا اسی سے ہوئی تھی کہ بزرگوں کی تصویریں بنا کر لوگوں نے رکھنی شروع کی تھیں، لیکن بعد میں جاہلیت کے طور پر شخصیات نظروں سے اوجھل ہوگئیں، اور صرف پتھروں کی تصویریں سامنے رہ گئیں۔

تو نہ یہ سنتے ہیں، یعنی تُو دُعا کر، پکار، یہ نہیں سنتے، تیرے حالات کو دیکھتے نہیں، اور تیرے اوپر کوئی مصیبت آجائے تو تجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے، تو پھر تُو ان کی پُوجا کیوں کرتا ہے؟ ان کی عبادت کیوں کرتا ہے؟ ان کے سامنے اپنا ماتھا کیوں ٹیکتا ہے؟ ان کے سامنے عبدیت کا اقرار اور اظہار کیوں کرتا ہے؟ یہ تو تجھ سے بھی گئی گزری مخلوق ہے، کم از کم اللہ نے تمہیں سمع دیا، بصر دیا، تم ظاہری اسباب کے طور پر کسی کے کام آسکتے ہو، ان میں تو اتنی بھی صلاحیت نہیں ہے۔

اِتباع کا دارومدار علم ہے نہ کہ عمر

اے میرے اَبا! بے شک میرے پاس علم آ گیا ہے جو تیرے پاس نہیں آیا، مطلب یہ ہے کہ اس قسم کی چیز اگر اختیار کرنی چاہیے تو علمی دلیل کے تحت، اور اللہ نے مجھے علم دیا ہے، میرے پاس علم آ گیا، اور آپ کے پاس علم ہے نہیں، تو دنیا میں ہمیشہ سے عقل مندوں کا اُصول ہے اور ہمیشہ رہے گا کہ اتباع علم کی کی جاتی ہے، جہالت کی نہیں، یہاں عمر کا لحاظ نہیں ہے کہ ایک باپ ہے تو وہ لازماً متبوع ہے اور اس کی بات مانی ہے، اور ایک بیٹا ہے تو اس کو لازماً پیچھے لگنا چاہیے، یہ کوئی اصول نہیں ہے، کہ گھر میں تمہارا باپ کہے کہ میں باپ ہوں لہٰذا میری بات مان، جیسے میں کرتا ہوں تجھے ایسے ہی کرنا چاہیے، جیسے میں کہتا ہوں اسی طرح سے تجھے چلنا چاہیے، یہ کوئی اُصول نہیں ہے، کہ باپ باپ ہونے کی وجہ سے مطاع ہو، اور بیٹا بیٹا ہونے کی وجہ سے تابع ہو، یہ کوئی بات نہیں ہے، اتباع علم کی ہے، اگر باپ کے پاس علم ہے تو اولاد کو اس کے پیچھے لگنا چاہیے، اور اگر باپ جاہل ہے اور اولاد کے پاس علم ہے تو باپ کو اولاد کے پیچھے لگنا چاہیے، اصل متبوع علم ہے، جہالت نہیں، اس لیے اگر آپ اپنی برادری میں سے کچھ لوگوں کی یا اپنے

آباء واجداد میں سے کسی کی ایسی بات مانتے ہیں جو علمی دلیل کے خلاف ہے، اور آپ کے پاس علم ہے قرآن کا، حدیث کا، فقہ کا، اور آپ سمجھتے ہیں کہ یہ طریقہ غلط ہے، اگر یہ جاننے کے باوجود کہ ان کی بات جہالت پر مبنی ہے، اور آپ کے پاس علم ہے، آپ ان کے پیچھے لگ جائیں اور ان کی بات مان لیں، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے علم کو جہل کے تابع کر دیا، اور اس سے بڑھ کے علم کی توہین کوئی نہیں، بات اگر مانی جاسکتی ہے تو اہلِ علم کی مانی جاسکتی ہے۔ اب برادری کی رسمیں ہوتی ہیں، بوڑھوں اور بوڑھیوں کا تقاضا ہوتا ہے کہ یہ کام یوں کرنا ہے یوں نہیں کرنا، اور آپ کا علم کہتا ہے کہ یہ طریقہ غلط ہے، اور اس کے مقابلے میں آپ سمجھتے ہیں کہ سُنّت طریقہ یہ ہے، لیکن اس کے باوجود آپ ان بوڑھوں کے پیچھے لگ جائیں، اور اس برادری کے پیچھے لگ جائیں، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے علم کو جہل کے تابع کر دیا، اور علم کو جہل کے تابع کر دینا علم کی زبردست توہین ہے، علمی دلیل کے سامنے پھر بڑے چھوٹے کا سوال نہیں ہے، اگر علم بیٹے کے پاس ہے تو باپ مکلّف ہے کہ بیٹے کی بات مانے، وہاں عمر کا حوالہ نہیں دیا جاسکتا کہ میں بڑی عمر کا ہوں اس لیے ضروری ہے کہ تم میری بات مانو، یہ کوئی طریقہ نہیں ہے۔ تو چاہے باپ غلط ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس جب علم آیا تو اپنے باپ کو بھی کہا کہ تو غلطی پر ہے، اس لیے تجھے میرے پیچھے چلنا چاہیے۔ اور اس کے ساتھ مشرکین کی وہ دلیل ٹوٹ گئی جو ہمیشہ وہ اپنے عمل اور کردار کے لئے دیتے تھے کہ ہم نے تو اپنے آباء کو اس طرح کرتے ہوئے دیکھا ہے، ہم تو اپنے آباء کے طریقے پہ چلیں گے، انہیں کہا جارہا ہے کہ عقل کے اندھو! جس ابراہیم علیہ السلام کی طرف تم اپنے آپ کو منسوب کرتے ہو انہوں نے تو باپ کا طریقہ اپنایا نہیں، ان کی تو جب سمجھ میں آگیا کہ باپ کا طریقہ غلط ہے تو انہوں نے تو باپ کو بھی ٹوک دیا، تو اگر تم ملّتِ ابراہیمی پر ہو تو تمہیں یہ اُصول چلانا چاہیے کہ آباؤ واجداد جو جاہل ہوں ان کے طریقے پر چلنا یہ ابراہیمی اُصول نہیں ہے، بلکہ ان کے اوپر تنقید کرنا، ان کو سمجھانا، ان کو صحیح راستے پہ لانا یہ ہے اصل اُصول۔ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی تمہارے آباء میں داخل ہیں، تو اگر تم نے کسی کی تقلید کرنی ہے، کسی کے پیچھے چلنا ہے، کسی کی بات ماننی ہے، تو اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی مان لو، یا ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ اپناؤ کہ وہ تو جاہل باپ کے پیچھے نہیں لگے، علم کی بات آجانے کے بعد انہوں نے باپ کو بھی ٹوک دیا، تو پھر تم یہ اُصول کس طرح سے اپنائے بیٹھے ہو کہ ہم تو اپنے آباؤ اجداد کے طریقے پہ چلیں گے، ہم اپنے آباؤ اجداد کے طریقے کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ کتنی جان ہے اس بات میں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کہہ رہے ہیں، کہ آباء کا طریقہ جہالت پر مبنی ہے تو قابلِ قبول نہیں ہے، غلطی پر باپ بھی ہے تو اس کو سمجھاؤ، لیکن نرم لب ولہجے کے ساتھ، اور علم آجانے کے بعد کبھی جہالت کے پیچھے نہ لگو، اگر علم آجانے کے بعد تم جہالت کے پیچھے لگ گئے تو یہ علم کی زبردست توہین ہے، متبوع علم ہے عمر نہیں، کہ جس کے پاس عمر زیادہ ہو وہ کہے کہ میں مقتدیٰ ہوں میرے پیچھے لگو، اور تم چھوٹے ہو تمہیں میری بات ماننی چاہیے، یہ کوئی اُصول نہیں، دیکھنا یہ ہے کہ علم کی بات کون کہہ رہا ہے، علم کس کے پاس ہے، جس کی بات علم اور عقل کے مطابق ہوگی اس کو تسلیم کریں گے، چاہے کہنے والا چھوٹا ہو چاہے بڑا ہو، اور جس کی بات جہالت پر مبنی ہے اس کو نہیں مانیں گے چاہے کہنے والا چھوٹا ہو چاہے بڑا ہو، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس

فقرے سے یہ اُصول واضح ہوگیا، ''میرے پاس علم آگیا جو تیرے پاس نہیں آیا'' تو میری اتباع کر، تو میرے پیچھے چل، تیرا فرض ہے کہ تو میری اتباع کرے، میں تجھے سیدھا راستہ دکھاؤں گا، یعنی سیدھے راستے کی نشاندہی میں کروں گا، مجھے معلوم ہے کہ سیدھا راستہ کون سا ہے، اور سیدھا راستہ وہی توحید کا ہے۔

شیطانی طریقہ

اور جو تم نے طریقہ اپنالیا یہ تو شیطان کی عبادت ہے، شیطان نے تمہیں بہکایا ہے، اس کا کہنا تم مان رہے ہو، علمی دلیل کے خلاف دوسرے نظریہ کو جو آدمی قبول کرتا ہے وہ سب شیطانی طریقہ ہے۔ انسان کہے یا نہ کہے، کوئی انسان اپنی زبان سے اقرار نہیں کرتا کہ میں شیطان کی پُوجا کرتا ہوں، لیکن اصل کے اعتبار سے وہ پُوجا شیطان کی ہے، اللہ کی بات کے مقابلے میں کسی دوسرے کی بات کو مان لینا یہ اس کی پُوجا ہے، تو اس لیے فرمایا کہ تو شیطان کی پُوجا نہ کر، شیطان کی عبادت نہ کر، شیطان تو رحمٰن کا نافرمان ہے، اور جب تم ایک نافرمان کے پیچھے لگ جاؤ گے تو تم بھی رحمٰن کے نافرمان ہوجاؤ گے۔ اے اَبا! بے شک میں ڈرتا ہوں اس بات سے، مجھے خوف ہے کہ اگر تو اپنا طریقہ نہیں چھوڑے گا تو رحمٰن کی طرف سے تجھے عذاب آلگے گا، عذاب چھوئے گا، عذاب پہنچ جائے گا، پھر تو اس عذاب میں شیطان کا ساتھی ہوجائے گا۔ یہ انجام سے ڈرایا۔

''جاہل'' دلیل کا جواب طاقت سے دیتا ہے

تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کتنے پیارے انداز سے، کتنے نرم لب و لہجے کے ساتھ، کتنی فطری دلیل سے اپنے باپ کو سمجھا رہے ہیں۔ اور راجح یہی ہے کہ آزر باپ تھے، اگرچہ بعض نے لکھا ہے کہ چچا تھے لیکن یہ بات حقیقت پہ مبنی نہیں ہے، کیونکہ ہر جگہ ان کو ''اَب'' کے لفظ کے ساتھ ہی ذکر کیا گیا ہے، اور کسی جگہ بھی کوئی اشارہ نہیں ملتا جس سے معلوم ہو کہ یہ ان کے چچا تھے، باپ نہیں تھے۔ اب چاہیے تو یہ تھا کہ وہ بھی آگے سے وہی نرم لب و لہجہ اختیار کرتا، اپنے مسلک کو دلیل کے ساتھ سمجھانے کی کوشش کرتا کہ بیٹا! تجھے معلوم نہیں ہے، اس بات کو یوں سمجھا سکتا ہے، یوں سمجھایا جاسکتا ہے، یہ بھی علمی دلیل پہ مبنی ہے، اور اس کی یوں ضرورت ہے، تو ان کو بھی چاہیے تھا کہ اپنے مسلک کو سمجھانے کی کوشش کرتے، لیکن جاہل کے پاس دلیل تو ہوتی نہیں، اور جب وہ کسی بات کو نہیں مانتا، تو اگر اسے سمجھانے کی کوشش کی جائے تو آگے سے مکا دکھاتا ہے، جاہل آدمی کا کام یہ ہوتا ہے کہ دلیل کا جواب وہ مکے سے دیتا ہے اگر اس کے پاس کوئی زور اور طاقت ہوتی ہے تو۔ اگر طاقت کا مالک ہو تو پھر وہ آگے سے لاٹھی اٹھاتا ہے۔ یہاں بھی اس نے اتنے نرم لب و لہجہ کے جواب میں یہ سخت لب و لہجہ اختیار کیا ''اے ابراہیم!''، ''بیٹا'' نہیں کہا ''اے ابراہیم! تُو میرے معبودوں سے منہ موڑنے والا ہے؟ تُو میرے معبودوں کو چھوڑنے والا ہے؟'' اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِیْ یٰۤاِبْرٰهِیْمُ، اب یہ کوئی دلیل ہے کہ چونکہ میرے معبود ہیں اس لیے تجھے ان کی پُوجا کرنی چاہیے، یہ کوئی دلیل تو نہیں ہے، اسی کو تو پہلے توڑا ہے کہ اتباع علم کی ہے، بڑے

چھوٹے کی بات نہیں ہے۔ ’’کیا تو میرے معبودوں سے اعراض کرنے والا ہے اے ابراہیم؟‘‘ ’’اگر تُو باز نہ آیا‘‘ یعنی اس قسم کی گفتگو کرنے سے اور مجھے روکنے ٹوکنے سے ’’تو میں تجھے رجم کر دوں گا‘‘ پتھر مار مار کے تجھے مار دوں گا، تیری جان نکال دوں گا، وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا: اور زمانۂ دراز تک مجھ سے علیحدہ ہو جا۔ جس طرح سے باپ ناراض ہو جائے تو کہتا ہے کہ نکل جا میرے گھر سے، میں تیری شکل نہیں دیکھنا چاہتا۔ اسی طرح سے سختی کے ساتھ اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جواب دیا۔ یہ بات نامعلوم کتنے دِنوں چلتی رہی، اور پھر اس دوران میں قوم سے بھی بحث ہوئی، بادشاہ تک بھی نوبت پہنچی، آخر علیحدگی کی صورت بن گئی۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اتنی گفتگو ہوئی تھی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام گھر سے نکل گئے، بلکہ اس قسم کے تذکرے، بار بار سمجھانا، اور بار بار گفتگو کرنا ہوا کرتا ہے، لیکن آخر نتیجہ یہی نکلا کہ جب باپ نے اِصرار کیا کہ میرے گھر سے نکل جا اور مجھ سے جدا ہو جا زمانۂ دراز تک، مدّتِ دراز تک میرے سامنے نہ آنا، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا سَلٰمٌ عَلَيْكَ: آپ پر سلام ہو۔

ابراہیم علیہ السلام کی علیحدگی اور والد کے لئے اِستغفار کا وعدہ

یہ وہ سلام ہے جس کو سلامِ مقاطعہ کہتے ہیں، کسی سے تعلقات توڑنے ہوں تو کہتے ہیں ’’اچھا بھائی! میرا سلام‘‘ یعنی علیحدگی بھی سلامتی کے انداز میں ہوگئی۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی صفات ذِکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا (سورۂ فرقان: ۶۳) کہ اگر جاہل ان سے کسی قسم کا خطاب کرتے ہیں تو سلام کر کے گزر جاتے ہیں، سلامتی کی بات کہہ کے گزر جاتے ہیں کہ اچھا بھئی! سلام علیکم۔ تعلقات چھوڑنے اور توڑنے کا یہ بھی ایک اچھا طریقہ ہوتا ہے۔ تو ’’آپ پر سلامتی ہو اور میں آپ کے لیے اِستغفار کروں گا اپنے رَبّ سے‘‘ اس وقت تک حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سامنے مشرک کے لیے اِستغفار کی ممانعت نہیں آئی تھی، اور مشرک کے لئے زندگی میں اِستغفار یوں کیا جاسکتا ہے کہ اے اللہ! اس کو بخش دے یعنی ایمان کی توفیق دے کر اس کے لیے بخشش کا سامان پیدا کر دے، مشرک کی زندگی میں اس انداز کے ساتھ اس کے لیے دُعا کی جاسکتی ہے، لیکن جب پتا چل جائے کہ اس کا انتقال بھی شرک پہ ہو گیا ہے تو پھر اس کے لیے دُعا کرنا جائز نہیں ہے، فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ (سورۂ توبہ: ۱۱۴) جب ابراہیم علیہ السلام کو پتا چل گیا کہ وہ تو اللہ کا دشمن ہے، اور اسی طرح سے اس کی وفات ہوگئی تو پھر انہوں نے لاتعلقی کا اعلان کر دیا۔ اور اس وعدے کی بنا پر دُعا تو کرتے رہے، لیکن جب واضح ہو گیا کہ وہ ہدایت یافتہ نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کی عداوت پر ہی گیا ہے تو پھر لاتعلق ہو گئے۔ ’’میں تیرے لیے اِستغفار کروں گا اپنے رَبّ سے، بے شک وہ میرا رَبّ میرے ساتھ مہربان ہے‘‘ اُمید ہے کہ میری دُعا کی بنا پر تجھے ہدایت مل جائے گی، میں تیرے لیے اِستغفار کروں گا۔ یہ بھی وہی نرم دلی ہے۔ وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ: صاف صاف کہہ دیا جس میں کوئی کسی قسم کا خفاء نہیں ہے کہ میں تم سے بھی جدا ہوتا ہوں اور جن کو تم اللہ کے علاوہ پکارتے ہو ان سے بھی جدا ہوتا ہوں، میرا ان سے کوئی تعلق نہیں، ان کو چھوڑ کے میرا تعلق کس سے ہے؟ وَاَدْعُوْا رَبِّيْ: میں اپنے رَبّ کی عبادت کروں گا،

اپنے رَبّ کو پکاروں گا، اور مجھے اُمید ہے کہ میں اپنے رَبّ کو پکارنے کے ساتھ نامراد نہیں رہوں گا۔ جس طرح سے تم ساری زندگی بتوں کو پُوجتے رہو، پکارتے رہو، تمہاری مراد کبھی حاصل نہیں ہوتی، لیکن مجھے اُمید ہے کہ میں اپنے رَبّ کو پکاروں گا تو نامراد نہیں رہوں گا، بلکہ میری مراد مجھے مل جائے گی۔

''ایں خانہ ہمہ آفتاب است!''

فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ: جب حضرت ابراہیم علیہ السلام ان سے جدا ہو گئے، علیحدہ ہو گئے، علاقہ چھوڑ دیا، اب چونکہ اللہ کی خاطر اپنا گھر چھوڑا تھا، در چھوڑا تھا، خاندان چھوڑا تھا، ہر چیز سے علیحدگی اختیار کر لی، تو پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو نوازا کہ اولاد دی اور صالح اولاد دی۔ اولاد میں سب سے پہلے تو حضرت اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے، ان کا یہاں ضمنی ذکر نہیں کیا، بلکہ آگے مستقل عنوان کے ساتھ ان کو ذکر کیا جا رہا ہے، اور ان کے بعد اسحاق علیہ السلام، اور اسحاق علیہ السلام سے آگے یعقوب علیہ السلام، اور یہ سارے ہی نبی ہوئے، جیسے کہا کرتے ہیں کہ ''ایں خانہ ہمہ آفتاب است!'' حضرت ابراہیم علیہ السلام نبی، اسماعیل علیہ السلام نبی، اسحاق علیہ السلام نبی، یعقوب علیہ السلام نبی، اور یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں پھر یوسف علیہ السلام نبی۔ اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ بہت کریم خاندان ہے: ''یُوسُفُ نَبِيُّ اللهِ بْنُ نَبِيِّ اللهِ بْنِ نَبِيِّ اللهِ بْنِ خَلِيلِ اللهِ''[1] یعنی یوسف بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم یہ سارا سلسلہ انبیاء کا ہے۔ ''جب وہ جدا ہو گئے ان سے اور ان چیزوں سے جن کو اللہ کے علاوہ وہ لوگ پُوجتے تھے تو ہم نے عطا کیا ان کو اِسحاق اور اِسحاق کے پیچھے یعقوب'' ، پوتا، جیسے سورۂ ہود میں آیا تھا: وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ (آیت: ۷۱) یہ دونوں براہِ راست حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے نہیں ہیں، اسحاق علیہ السلام براہِ راست بیٹے ہیں اور یعقوب اولاد میں ہیں یعنی پوتے ہیں، سورۂ ہود میں اس کی صراحت ہے، انہی کا نام ''اسرائیل'' ہے، اور جو خاندان ان سے پھیلا ان کی ''بنو اسرائیل'' کہتے ہیں۔ ''اور ہر ایک کو ہم نے نبی بنایا۔''

ابراہیم علیہ السلام کی مقبولیتِ عامہ

''اور ہم نے ان کو اپنی رحمت عطا کی'' دُنیا میں مختلف قسم کے کمالات دِینی ودُنیوی عطا کیے، ''اور ان کے پیچھے ہم نے ان کا بہت عالی شان اور اچھا ذکر چھوڑا'' یعنی یہ چلے گئے، اور دُنیا کے اندر ان کی شہرت باقی ہے، اس وقت سے چلی اور قیامت تک رہے گی، کتنی بڑی بڑی اُمتیں ان کی طرف منسوب ہوئیں، مسلمان بھی ان سب کا نام عزت سے لیتے ہیں اور ان سب کی طرف انتساب پہ فخر کرتے ہیں، اور اس زمانے میں یہود تھے، نصاریٰ تھے، مشرکینِ مکہ تھے وہ سب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف اپنی نسبت کرتے تھے، بلکہ بعض حضرات[2] نے تو یہ لکھا ہے کہ ہندوستان میں ہندو بُت پرست ہیں، بہت زبردست قسم کے مشرک ہیں،

---

(۱) مصنف ابن ابی شیبہ ۶/۳۴۷ باب ماذکر فی یوسف۔ المدخل الی السنن الکبریٰ ۱/۲۵۵، رقم ۷۷۳۔ نیز تفسیر مظہری سورۂ حجرات آیت ۱۳ کے تحت۔
(۲) دیکھیے: ''گلدستۂ توحید'' ص ۹۴، از: شیخ سرفراز خان صفدر، بحوالہ علامہ عبدالکریم حنبلی۔

بت پرست ہیں، اور ان کا جو بڑا بُت ہے اس کو ''برہما'' کہتے ہیں، اور اس ''برہما'' کی طرف نسبت کی بنا پر مذہبی طبقے کو ''برہمن'' کہتے ہیں، آپ نے سُنا ہوگا، ہندوؤں میں جو مذہبی طبقہ ہے، جو ان کی کتابیں پڑھتا ہے اور لوگوں کی مذہبی راہنمائی کرتا ہے، اس کو ''برہمن'' کہتے ہیں۔ جس طرح سے علامہ اقبالؒ کا شعر آتا ہے:

سچ کہہ دوں اے برہمن! گر تُو بُرا نہ مانے — تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پُرانے

(بانگِ درا، بعنوان: نیا شوالا)

تو یہ ''برہمن'' پنڈت ہندوؤں کا مذہبی طبقہ ہے، تو بعض بزرگوں نے لکھا ہے، کہ ''برہما'' جو بت ہے، جو ان کا اصل الاصول ہے، جس کی طرف یہ مذہبی طبقہ منسوب ہے، یہ بھی اصل میں ''ابراہیم'' سے بگڑا ہوا لفظ ہے، ابراہیم کے بُت کو یہ پُوجتے ہیں، ''ابراہیم'' کے لفظ کو بگاڑتے بگاڑتے ''ابراہیم'' کی بجائے ''برہما'' کا لفظ آ گیا، جس سے معلوم یہ ہوتا ہے کہ ہندوؤں کے جو اُصل لوگ تھے انہوں نے بھی اپنی نسبت ابراہیم علیہ السلام کی طرف قائم کی، تو جیسے مشرکوں نے ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام کے بُت تراش لیے تھے اور ان کو پُوجنے لگ گئے اور مشرک بن گئے، اسی طرح سے ہندوؤں کی نسبت بھی ادھر ہوگی، ان کے بڑوں نے تعارف حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہی کرایا ہوگا، اور ان کے ساتھ نسبت قائم کی ہوگی، بعد میں ان کا بُت بنا کے رکھ لیا، بُت بنا کے رکھنے کے بعد شخصیات آنکھوں سے اوجھل ہوگئیں، اور بُت سامنے رہ گئے، انہی کو سب کچھ سمجھ کر پُوجنے لگ گئے۔ تو اگر یہ تحقیق صحیح ہو تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ ہندوؤں کی اتنی بڑی جماعت بھی اپنے آپ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف ہی منسوب کرتی ہے، تو اس طرح سے اللہ تعالیٰ نے ان کو قبولیت دی، مقبولیت دی، اور مخلوق کے دِلوں میں اس طرح سے ان کا اچھا ذِکر اور ان کی شہرت ڈال دی، یہ دُنیا میں اِنعام دیا اللہ تعالیٰ نے ان کو اس نیکی کا کہ اللہ کی خاطر انہوں نے گھر قربان کیا، اللہ کی خاطر خاندان چھوڑا، تو پھر اللہ تعالیٰ نے دِینی دُنیوی طور پر کس طرح سے نوازا، یہ سب اللہ کے لئے سب کچھ چھوڑنے کا نتیجہ ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰٓى ۫ اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴿۵۱﴾ وَنَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ

کتاب میں موسیٰ علیہ السلام کا ذِکر کیجئے، بے شک وہ موسیٰ خاص کیا ہوا تھا، اور وہ رسول نبی تھا ﴿۵۱﴾ آواز دی ہم نے موسیٰ کو طور کی

الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ وَقَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا ﴿۵۲﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا ﴿۵۳﴾

دائیں جانب سے، اور ہم نے موسیٰ کو قریب کیا سرگوشی کے لئے ﴿۵۲﴾ اور ہم نے عطا کیا موسیٰ کو اپنی رحمت سے اس کا بھائی ہارون نبی ﴿۵۳﴾

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ۡ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ۝۵۴ وَكَانَ يَاْمُرُ

اور ذکر کیجیے کتاب میں اسماعیل کا، بے شک وہ سچے وعدے والے تھے اور رسول نبی تھے ۝۵۴ اور اپنے گھر والوں کو حکم دیا

اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ ۠ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا ۝۵۵ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ ۡ

کرتے تھے نماز کا اور زکوٰۃ کا، اور وہ اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ تھے ۝۵۵ کتاب میں ادریس علیہ السلام کا ذکر کیجیے

اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ۝۵۶ وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ۝۵۷ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ

بے شک وہ صدیق نبی تھے ۝۵۶ اور ہم نے ان کو اُٹھایا بلند مرتبے میں ۝۵۷ یہ وہ لوگ ہیں جن کے اُوپر اللہ نے انعام کیا،

مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ ۗ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ۡ وَّمِنْ ذُرِّيَّةِ اِبْرٰهِيْمَ وَ

نبیوں میں سے ہیں، آدم کی اولاد سے ہیں، ان لوگوں میں سے ہیں جن کو ہم نے نُوح کے ساتھ اُٹھایا، ابراہیم اور یعقوب کی

اِسْرَآءِيْلَ ۡ وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا ؕ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ

اولاد میں سے ہیں، یہ ان لوگوں میں سے ہیں جن کو ہم نے ہدایت دی اور جن کو ہم نے چُنا، جب پڑھی جاتی ہیں ان پر رحمٰن کی آیتیں،

خَرُّوْا سُجَّدًا وَّبُكِيًّا ۩ ۝۵۸ فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ

گر پڑتے ہیں وہ سجدہ کرتے ہوئے اور روتے ہوئے ۝۵۸ ان لوگوں کے پیچھے بُرے جانشین آ گئے جنہوں نے نماز کو ضائع کر دیا،

وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ۝۵۹ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا

اور شہوات کے پیچھے لگ گئے، عنقریب وہ ملاقات کریں گے گمراہی سے ۝۵۹ مگر جو شخص توبہ کر لے اور ایمان لے آئے اور نیک عمل کرے،

فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۝۶۰ جَنّٰتِ عَدْنِ ِ الَّتِيْ وَعَدَ الرَّحْمٰنُ

پس یہ لوگ داخل ہوں گے جنت میں، اور کچھ بھی ظلم نہیں کیے جائیں گے ۝۶۰ یعنی ہمیشگی کے باغات میں جن کا رحمٰن نے اپنے بندوں سے

عِبَادَهٗ بِالْغَيْبِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ وَعْدُهٗ مَاْتِيًّا ۝۶۱ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا

وعدہ کیا ہے بن دیکھے، بے شک اللہ کا وعدہ ایسا ہے کہ جس تک رسائی ہوگی ۝۶۱ نہیں سنیں گے ان باغات کے اندر کوئی لغو بات، ہاں!

سَلٰمًا ؕ وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيْهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ۝۶۲ تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ نُوْرِثُ

سلامتی کی بات سنیں گے، اور ان کے لیے ان کا رزق ہے ان باغات میں صبح شام ۝۶۲ یہی جنت ہے جس کا وارث بنائیں گے ہم

مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا ﴿٦٣﴾ وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ۚ لَهٗ مَا

اپنے بندوں میں سے اس شخص کو جو متقی پرہیز گار ہوگا ﴿۶۳﴾ نہیں اُترتے ہم مگر تیرے رَبّ کے حکم کے ساتھ، اسی رَبّ کے لئے ہے جو کچھ

بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ ۚ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ﴿٦٤﴾

ہمارے سامنے ہے، جو کچھ ہمارے پیچھے ہے، اور جو کچھ اس کے درمیان میں ہے، اور تیرا رَبّ بھولنے والا نہیں ﴿۶۴﴾

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ ۭ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا ﴿٦٥﴾

وہ آسمانوں کا اور زمین کا رَبّ ہے، اور ان چیزوں کا رَبّ ہے جو دونوں کے درمیان میں ہیں، پس تو اسی کی عبادت کر، اور اس کی عبادت پہ جمارہ۔ کیا تو اس رَبّ کے لئے کوئی ہم صفت جانتا ہے؟ ﴿۶۵﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰٓى: کتاب میں موسیٰ علیہ السلام کا ذکر کیجئے، اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا: بے شک وہ موسیٰ چنا ہوا تھا، خاص کیا ہوا تھا۔ اَخْلَصَ: خالص کرنا، خاص کر لینا۔ مُخْلَص: چنا ہوا، خاص کیا ہوا۔ وَّكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا: اور وہ رسول نبی تھا، یعنی رسول بھی تھا نبی بھی تھا، دونوں صفتوں کا جامع تھا، رسول اور نبی میں کچھ تھوڑا سا فرق ہوا کرتا ہے، یہ آخر میں بیان کریں گے۔ وَنَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ: آواز دی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو طور کی جانب سے، الْاَيْمَنِ: یہ جانب کی صفت ہے۔ ایمن یہ یمین سے بھی ہوسکتا ہے، یُمن سے بھی ہوسکتا ہے، یمن برکت کو کہتے ہیں تو ایمن: برکت والی۔ ''طور کی برکت والی جانب سے ہم نے اس کو آواز دی'' (آلوسی) جیسا کہ دُوسری جگہ اس کو وادیٔ مقدس کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى (سورۂ طٰہٰ: ۱۲)، پھر معنی یوں ہوجائے گا کہ ہم نے اس کو طور کی برکت والی جانب سے آواز دی۔ اور اگر اَیمن دائیں جانب کے معنی میں لیا جائے تو پھر معنی یہ ہوگا کہ طور کی دائیں جانب سے آواز دی (عام تفاسیر)، یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام جس وقت طور کی طرف متوجہ ہوئے تو ان کے دائیں طرف وہ حصہ تھا جدھر سے ان کو آواز آئی۔ وَقَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا: اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو قریب کیا۔ نجی سرگوشی اور راز کی بات کو کہتے ہیں، اس میں مصدری معنی بھی ہوتا ہے، اور نجی اس شخص کو بھی کہتے ہیں جس کے ساتھ سرگوشی یا راز کی صورت میں بات کی جائے۔ تو یہاں معنی یوں کریں گے ''ہم نے اس کو قریب کیا سرگوشی کے لئے، راز کی بات کرنے کے لئے، مناجات کے لئے''[1] اور اگر صفت کا صیغہ لے لیا جائے کہ سرگوشی جس کے ساتھ کی جائے اس کو نجی کہتے ہیں، موسیٰ نجی اللہ، تو پھر معنی ہوجائے گا کہ ہم نے اس کو قریب کیا اس حال میں کہ وہ سرگوشی کیا ہوا تھا، راز کی بات کیا ہوا تھا، پھر یہ حال واقع ہوجائے گا قَرَّبْنٰهُ کی ''ہٗ'' ضمیر سے جس کا مرجع موسیٰ ہیں (عام تفاسیر)۔ اور یہ مصدر کے طور پر جو آتا ہے، تو پھر یہ فاعل اور مفعول دونوں سے بھی حال کا مفہوم ادا کرسکتا ہے ''ہم نے اس کو

(۱) لانہ مصدر بحسب الاصل کالتناجی۔ روح المعانی، سورۂ یوسف آیت ۸۰۔

قریب کیا اس حال میں کہ ہم آپس میں سرگوشی کرنے والے تھے'' یوں بھی معنی ہو سکتا ہے۔ جیسے کہ سورۂ یوسف میں یہ لفظ آیا تھا خَلَصُوۡا نَجِیًّا (آیت: ۸۰) وہاں ہم نے معنی یہی کیا تھا کہ وہ آپس میں مشورہ کرنے کے لئے، سرگوشی کرنے کے لئے، یا سرگوشی کرتے ہوئے جدا ہو گئے علیحدہ ہو گئے۔ وَوَهَبۡنَا لَهٗ مِنۡ رَّحۡمَتِنَاۤ اَخَاهُ هٰرُوۡنَ نَبِیًّا: وَهَبَ یَهَبُ هِبَةً۔ اور ہم نے عطا کیا موسیٰ علیہ السلام کو اپنی رحمت سے اس کا بھائی ہارون نبی، اَخَاهُ هٰرُوۡنَ آپس میں مبدل منہ اور بدل ہیں۔ وَاذۡکُرۡ فِی الۡکِتٰبِ اِسۡمٰعِیۡلَ: اور ذکر کیجئے کتاب میں اسماعیل علیہ السلام کا اِنَّهٗ کَانَ صَادِقَ الۡوَعۡدِ: بے شک وہ سچے وعدے والے تھے وَکَانَ رَسُوۡلًا نَّبِیًّا اور رسول نبی تھے، وَکَانَ یَاۡمُرُ اَهۡلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّکٰوةِ: اور وہ اپنے گھر والوں کو حکم دیا کرتے تھے نماز کا اور زکوٰۃ کا، وَکَانَ عِنۡدَ رَبِّهٖ مَرۡضِیًّا: اور وہ اسماعیل علیہ السلام اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ تھے۔ مرضی اسم مفعول کا صیغہ ہے، رَضِیَ یَرۡضٰی: پسند کرنا۔ وَاذۡکُرۡ فِی الۡکِتٰبِ اِدۡرِیۡسَ: کتاب میں ادریس علیہ السلام کا ذکر کیجئے، اِنَّهٗ کَانَ صِدِّیۡقًا نَّبِیًّا: بے شک وہ صدیق نبی تھے، وَّرَفَعۡنٰهُ مَکَانًا عَلِیًّا: اور ہم نے ان کو اٹھایا بلندی کے مرتبے میں، ہم نے ان کو بلند مرتبے میں اٹھایا، مَکَانًا عَلِیًّا کا معنی اونچی جگہ، علو والی جگہ۔ اٹھایا ہم نے ان کو اونچے مرتبے میں، اونچے مکان میں، یعنی ان کا درجہ ہم نے بلند کیا۔ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰهُ عَلَیۡهِمۡ: یہ وہ لوگ ہیں جن کے اوپر اللہ نے انعام کیا مِّنَ النَّبِیّٖنَ نبیوں میں سے ہیں، مِنۡ ذُرِّیَّةِ اٰدَمَ، آدم کی اولاد میں سے ہیں، وَمِمَّنۡ حَمَلۡنَا مَعَ نُوۡحٍ: ان لوگوں میں سے ہیں جن کو ہم نے نوح علیہ السلام کے ساتھ اٹھایا، وَّمِنۡ ذُرِّیَّةِ اِبۡرٰهِیۡمَ وَاِسۡرَآءِیۡلَ: ابراہیم اور یعقوب علیہما السلام کی اولاد میں سے ہیں، وَمِمَّنۡ هَدَیۡنَا: یہ ان لوگوں میں سے ہیں جن کو ہم نے ہدایت دی، وَاجۡتَبَیۡنَا: اور جن کو ہم نے چُنا۔ هَدَیۡنَا وَاجۡتَبَیۡنَا دونوں مَن کا صلہ ہیں۔ ''ان لوگوں میں سے ہیں جن کو ہم نے ہدایت دی اور جن کو ہم نے چُنا۔'' اِذَا تُتۡلٰی عَلَیۡهِمۡ اٰیٰتُ الرَّحۡمٰنِ جب پڑھی جاتی ہیں ان پر رحمٰن کی آیتیں خَرُّوۡا سُجَّدًا وَّبُکِیًّا: گر پڑتے ہیں وہ سجدہ کرتے ہوئے اور روتے ہوئے۔ سُجَّدًا ساجد کی جمع ہے، اور بُکِیًّا باکی کی جمع ہے، بَکٰی یَبۡکِیۡ: رونا، بُکاء رونے کو کہتے ہیں۔ ''گر پڑتے ہیں وہ سجدہ کرتے ہوئے روتے ہوئے'' فَخَلَفَ مِنۡ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ: خَلۡفٌ لام کے سکون کے ساتھ بُرے جانشین کو کہتے ہیں اور خلَف لام کے فتح کے ساتھ اچھے جانشین کو کہتے ہیں (مظہری)، یہاں سکونِ لام کے ساتھ آیا ہے، تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ان لوگوں کے پیچھے بُرے جانشین آ گئے، اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ جنہوں نے نماز کو ضائع کر دیا، وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ: اور خواہشات کے پیچھے لگ گئے، فَسَوۡفَ یَلۡقَوۡنَ غَیًّا: غَیّ کا لفظ رُشد کے مقابلے میں آیا کرتا ہے، سورۂ بقرہ میں آپ کے سامنے آیا تھا: قَدۡ تَّبَیَّنَ الرُّشۡدُ مِنَ الۡغَیِّ (آیت: ۲۵۶) رُشد کہتے ہیں ہدایت کو، بھلائی کو، خیر کو، اور اس کے مقابلے میں غی آ گیا، خرابی گمراہی ضلالت۔ غَوِیَ: گمراہ ہونے کے معنی میں آیا کرتا ہے۔ غَوَایَةً اس سے مصدر آتا ہے، تو غَیًّا: گمراہی، خرابی۔ ''ملاقات کریں گے وہ گمراہی سے'' یعنی اپنی گمراہی کی سزا سے ملاقات کریں گے، ''عنقریب ملیں گے وہ گمراہی کو، عنقریب ملیں گے وہ خرابی کو'' یعنی جو خرابی اور جو گمراہی انہوں نے دنیا میں اختیار کی تھی اس کے وبال اور سزا کو عنقریب وہ لوگ ملیں گے۔ اِلَّا مَنۡ تَابَ: مگر جو کوئی توبہ کر لے اور ایمان لے آئے اور نیک عمل کرے۔ اِلَّا مَنۡ تَابَ کا مطلب یہ ہوگا کہ جنہوں نے یہ گمراہی اختیار کی، اتباعِ شہوات کو اختیار کیا......

وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ: اور وہ شہوات کے پیچھے لگ گئے۔ شہوات جمع ہے شہوۃ کی، شہوت کہتے خواہش کو، یہاں نفسانی خواہش مراد ہے جو ہدایت کے خلاف ہو، یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت کو چھوڑ دیا، جو اللہ کی راہنمائی تھی اس کو اختیار نہیں کیا بلکہ خواہشاتِ نفس کے پیچھے لگ گئے۔ فَسَوْفَ یَلْقَوْنَ غَیًّا: پس عنقریب وہ ملاقات کریں گے۔ غی سے، غی کا معنی گمراہی خرابی، یہ لفظ رُشد کے مقابلے میں ہے، رُشد بھلائی کو اور ہدایت کو کہتے ہیں، اور غی: خرابی اور گمراہی۔ عنقریب ملاقات کریں گے وہ گمراہی سے، یعنی گمراہی کے وبال سے، جو دنیا میں انہوں نے خرابی اختیار کی ہے، عقائد میں، کردار میں، اور اپنے معاملات میں، اس خرابی کو وہ عنقریب پائیں گے، ان کی وہی خرابی ان کے سامنے آئے گی، یعنی اس کا وبال اور اس کی سزا، جو گمراہی اختیار کی ہے وہ اپنی گمراہی کو پالیں گے، یعنی اس کا انجام ان کے سامنے آجائے گا، اِلَّا مَنْ تَابَ: مگر جو شخص توبہ کرلے، مَن چونکہ لفظاً مفرد ہے اس لیے تَابَ، اٰمَنَ، عَمِلَ میں مفرد کی ضمیریں لوٹی ہیں، اور معنیً یہ جمع ہے تو فَاُولٰٓئِکَ یَدْخُلُوْنَ معنی کے اعتبار سے ہے، اس (مَن) کی دونوں حیثیتیں ہیں، ایک لفظی ایک معنوی، لفظی حیثیت میں یہ مفرد ہے، اس لیے تَابَ، اٰمَنَ، عَمِلَ میں مفرد کی ضمیریں ہیں، اور معنوی حیثیت میں یہ جمع ہے کیونکہ ایک فرد تو مراد نہیں، اس لیے معنوی حیثیت کی طرف دیکھتے ہوئے فَاُولٰٓئِکَ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا یُظْلَمُوْنَ شَیْئًا میں جمع کا صیغہ آ گیا۔ تو مطلب یہ ہوا کہ یہ لوگ جو تبع شہوات ہیں، جنہوں نے نماز کو ضائع کردیا، ان کے لئے بھی توبہ کا دروازہ بند نہیں۔ ''جو شخص توبہ کرلے'' یعنی اپنی پچھلی غلطی پر نادم ہوجائے، اور ایمان لے آئے اور نیک عمل کرے، شہوات کو چھوڑ دے، پس یہ لوگ داخل ہوں گے جنت میں، وَلَا یُظْلَمُوْنَ شَیْئًا: اور کچھ بھی ظلم نہیں کیے جائیں گے، ان کے اوپر کچھ ظلم وزیادتی نہیں ہوگی، جَنّٰتِ عَدْنِ ِالَّتِیْ وَعَدَ الرَّحْمٰنُ عِبَادَهٗ بِالْغَیْبِ: جَنّٰتِ عَدْنٍ یہ اَلْجَنَّةَ سے بدل ہے، جمع مؤنث سالم کا وزن ہونے کی وجہ سے جَنّٰتِ کے نیچے کسرہ آ گیا، ورنہ یہ بدل ہے اَلْجَنَّةَ سے۔ داخل ہوں گے جنت میں یعنی ہمیشگی کے باغات میں (جیسا کہ بدل کا ترجمہ ہوا کرتا ہے) جن کا رحمٰن نے اپنے بندوں سے وعدہ کیا ہے بن دیکھے، یعنی بندوں نے دیکھے نہیں ہیں، بندوں سے چھپے ہوئے ہیں، رحمٰن نے وعدہ کیا ہے۔ اِنَّهٗ کَانَ وَعْدُهٗ مَاْتِیًّا: مَاْتِیًّا یہ اتی یاتی سے اسم مفعول کا صیغہ ہے۔ اتی یاتی: آنا۔ اور ''مَاْتِی'' وہ چیز ہوا کرتی ہے جس کے اوپر ورود ہوتا ہے، جس تک کوئی شخص پہنچتا ہے، جہاں کوئی شخص آتا ہے وہ ماتی ہے۔ یہاں مطلب یہ ہوگا کہ بے شک اللہ کا وعدہ ماتی ہے، یعنی اس وعدے تک لوگوں کی رسائی ہوگی، لوگوں کا اتیان اس وعدے پہ ہوگا، لوگ وہاں پہنچیں گے، ''بے شک اللہ کا وعدہ ایسا ہے کہ جس تک رسائی ہوگی'' یوں اس کا مفہوم ادا کریں گے ہم اپنی زبان میں، یعنی اللہ کے وعدے تک لوگوں کی رسائی ہوگی، اللہ کا وعدہ ماتی ہے، ماتی کا معنی جس پر کسی کا ورود ہو، جس پہ اتیان ہو، جس پہ پہنچنا ہو، ''بے شک اللہ تعالیٰ کا وعدہ، اس تک رسائی ہوگی'' یوں اس کا مفہوم ہوجائے گا، اس تک پہنچا جائے گا، لوگ وہاں تک پہنچیں گے، لَا یَسْمَعُوْنَ فِیْهَا لَغْوًا: لغو کہتے ہیں فضول بات کو، یا ایسی بات کو جو ایک دوسرے کو تکلیف پہنچائے۔ نہیں سنیں گے ان باغات کے اندر کوئی لغو بات، فضول بات، باعثِ ایذا، باعثِ تکلیف بات نہیں سنیں گے۔ اس لیے حضرت شیخ (الہندؒ) نے اس کا ترجمہ کیا ہے بک بک، ''نہیں سنیں گے ان باغات میں بک بک''، جس طرح سے دُنیا میں آپس میں کرنے لگ جاتے ہیں۔ اِلَّا سَلٰمًا: یہ مستثنیٰ منقطع ہے، کیونکہ سَلٰمًا یہ لغو میں

شامل نہیں ہے، مستثنیٰ منقطع وہ ہوا کرتا ہے جو مستثنیٰ منہ میں شامل نہیں ہوتا، تو یہاں بھی سلامًا چونکہ لغوًا میں شامل نہیں اس لیے یہ مستثنیٰ منقطع ہے۔ ''ہاں! سلامتی کی بات سنیں گے'' لغویات نہیں سنیں گے، ہاں! سلامتی کی بات سنیں گے، جس میں یہ معروف سلام بھی ہے کہ فرشتے بھی سلام کہیں گے، آپس میں بھی ایک دوسرے کو یہ لوگ سلام کہیں گے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی ان کو سلام کہا جائے گا، تو سلامتی ہی سلامتی کی بات سنیں گے، کوئی بے ہودہ بات، بک بک نہیں سنیں گے جو باعث تکلیف ہو۔ وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا: اور ان کے لئے ان کا رزق ہے ان باغات میں صبح شام، صبح شام ان کو ان کا رزق ملے گا، صبح شام یا تو اس لیے کہا کہ عادت ہی صبح شام کی ہے، یا صبح شام بول کے تمام اوقات مراد ہیں (نسفی، آلوسی)، ہر وقت ان کو روزی میسر ہوگی، جب چاہیں مزے لیں اور کھائیں، جیسے دن رات بول کے آپ جمیع اوقات مراد لے لیتے ہیں اسی طرح سے صبح شام بول کر بھی جمیع اوقات مراد لیے جاسکتے ہیں۔ تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي نُورِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا: یہی جنت ہے جس کا وارث بنائیں گے ہم اپنے بندوں میں سے اس شخص کو جو پرہیزگار ہوگا، مَنْ كَانَ تَقِيًّا: جو کوئی متقی ہوگا، ہمارے بندوں میں سے جو شخص متقی ہوگا ہم اس کو اس جنت کا وارث بنائیں گے، یہی جنت ہے جس کا وارث بنائیں گے ہم اپنے بندوں میں سے اس شخص کو جو متقی پرہیزگار ہوگا۔ وَمَا نَتَنَزَّلُ إِلَّا بِأَمْرِ رَبِّكَ: نہیں اترتے ہم مگر تیرے رب کے حکم کے ساتھ۔ لَهُ مَا بَيْنَ أَيْدِينَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذَٰلِكَ: اسی رب کے لیے ہے جو کچھ ہمارے سامنے ہے، جو کچھ ہمارے پیچھے ہے اور جو کچھ آگے پیچھے کے درمیان ہے۔ مَا بَيْنَ أَيْدِينَا وَمَا خَلْفَنَا یہ زمان کے اعتبار سے بھی ہے کہ جو زمانہ ہمارے سامنے ہے جیسے مستقبل، جو ہمارے پیچھے ہے جیسے ماضی، اور وَمَا بَيْنَ ذَٰلِكَ حال۔ اور مکان کے اعتبار سے بھی، یہ جبریل علیہ السلام کا قول اللہ تعالیٰ نقل فرما رہے ہیں، جب جبریل آسمان سے آتے ہیں تو مَا بَيْنَ أَيْدِينَا کا مصداق زمین ہے، وَمَا خَلْفَنَا کا مصداق آسمان ہے، وَمَا بَيْنَ ذَٰلِكَ یہ فضا ہوگئی، اور جاتے ہوئے مَا بَيْنَ أَيْدِينَا آسمان ہے، پیچھے زمین ہے، مَا بَيْنَ ذَٰلِكَ فضا ہے ''جو کچھ ہمارے آگے ہے، جو کچھ ہمارے پیچھے ہے، جو کچھ اس کے درمیان میں ہے سب کچھ رب کے لئے ہے (مظہری، آلوسی)۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا: اور تیرا رب بھولنے والا نہیں، نَسِيًّا نَسِيَ يَنْسٰى سے ہے، رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وہ آسمانوں کا اور زمین کا رب ہے اور ان چیزوں کا رب ہے جو دونوں کے درمیان میں ہیں، فَاعْبُدْهُ: پس تو اسی کی عبادت کر، وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهِ: اور اس کی عبادت پہ جمارہ۔ جیسے صبر کا معنی ہوتا ہے اپنے آپ کو روک کے رکھنا، اِصْطَبَرَ میں اور زیادہ مبالغہ پیدا ہوگیا، اس لیے جمنے کے ساتھ اس کا ترجمہ کیا گیا کہ اللہ کی عبادت کے لئے جمارہ، ثابت قدم رہ، ڈٹا رہ۔ هَلْ تَعْلَمُ لَهُ سَمِيًّا: سمی کا لفظ پہلے بھی آپ کے سامنے گزرا، ہم نام یا ہم صفت، مثل اور نظیر، یہی ترجمہ اس کا کیا گیا تھا۔ کیا تو اس رب کے لئے کوئی ہم نام جانتا ہے؟ کیا تو اس رب کے لئے کوئی ہم صفت جانتا ہے؟ اس کی کوئی مثل اور نظیر تجھے معلوم ہے؟ یعنی نہیں، تو جب اس کی کوئی مثل اور کوئی نظیر نہیں، وہ بے مثال ہے، اس کا کوئی ہم نام نہیں، تو ایسی صورت میں عبادت اسی کی ہونی چاہیے، اس کی عبادت کو چھوڑ کے کسی اور طرف متوجہ نہیں ہونا چاہیے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ

تفسیر

انبیاء علیہم السلام میں موسیٰ علیہ السلام کا اِمتیاز

انبیاء علیہم السلام کا تذکرہ شروع ہوا تھا۔ اب یہاں پہلے ذکر ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا، موسیٰ علیہ السلام صاحب کتاب نبی اور رسول ہوئے ہیں، توراۃ کتاب ان کے اُوپر اُتری تھی، اور معلوم یوں ہوتا ہے کہ توراۃ کے علاوہ کچھ اور صحیفے بھی ان پہ اُترے تھے، جس طرح سے تیسویں پارے میں سورۂ اعلیٰ میں، یعنی سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى، اس کے آخر میں لفظ آتے ہیں بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۞ اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ۞ صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى، اس سے معلوم ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام پر بھی کچھ صحیفے اُترے تھے، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پر بھی کچھ صحیفے اُترے تھے۔ بہرحال کتاب جو ان کو دی گئی وہ توراۃ ہے جو ایک بہت بڑی جامع کتاب تھی۔ ان کے لئے مُخْلَص کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، ویسے تو سارے انبیاء علیہم السلام ہی مخلَص ہیں، چنے ہوئے، خاص کیے ہوئے ہیں، جیسے کہ آگے غالباً سورۂ صٓ میں لفظ آئے گا اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ (آیت: ۴۶)، ہم نے ان سب انبیاء علیہم السلام کو ایک خاص بات کے لیے چُن لیا ہے، وہ ہے آخرت کی یاددہانی، کہ ان کا جو خاص مشن ہے جس پر یہ لوگ چلتے ہیں وہ آخرت کی یاددہانی ہے، خود آخرت کو یادرکھتے ہیں، دوسروں کو آخرت یاددلاتے ہیں، یہی ان کا مشن ہے، اور اس یاددہانی کے لئے ہم نے ان کو خاص کرلیا۔ تو وہاں اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ کا یہی معنی ہے کہ ہم نے ایک خاص بات کے لئے ان کو خاص کرلیا، وہ ہے آخرت کی یاددہانی۔ تو کسی کسی نبی کی صفت نمایاں کر کے ذکر کردی گئی، ورنہ ہیں یہ سب صفات مشترکہ۔ مخلَص: چُنے ہوئے ہیں، خاص کیے ہوئے ہیں، یہاں جو خصوصی صفت موسیٰ علیہ السلام کے لئے ذکر کی جارہی ہے جس میں ان کے ساتھ کوئی دوسرا عمومی طور پر شریک نہیں، وہ اللہ تعالیٰ کی براہِ راست کلام ہے، باقی انبیاء علیہم السلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی کلام وحی کے ذریعے سے ہوئی، اور موسیٰ علیہ السلام ایک ہیں جن کو "کلیم اللہ" کہا جاتا ہے ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی کلام براہِ راست ہوئی، اور یہ دوسروں کے لئے اتنی عام نہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ براہِ راست ہوئی لیلۃ المعراج میں، یا ابتدا میں آدم علیہ السلام کے ساتھ بھی اللہ کی کلام براہِ راست ہوئی، یہ واقعات نادر ہیں، لیکن بعد میں آنے والے تمام انبیاء علیہم السلام میں سے موسیٰ علیہ السلام اس صفت کے ساتھ ممتاز ہیں، کہ ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے بغیر فرشتے کی وساطت کے براہِ راست آواز دے کے گفتگو کی، جیسے کہ آگے ذِکر کیا جارہا ہے۔

انبیائے سابقین علیہم السلام کے تذکرے کا مقصد

قرآنِ کریم میں ان انبیاء علیہم السلام کو ذِکر کیا جاتا ہے ان کے ماننے والوں کو متاثر کرنے کے لئے، کہ یہود کو کچھ شرم آئے کہ جس نبی کا وہ نام لیتے ہیں، ہم ان کا اسی طرح سے احترام کرتے ہیں جس طرح سے اپنے نبی اور اپنے پیغمبر کا کرتے ہیں، ہم ان کی عظمت کے معترف ہیں، جو کتاب وہ لے کر آئے تھے ہم اس کتاب کو مانتے ہیں۔ تو جس طرح سے ہم یہ انصاف کرتے ہیں کہ ان کے پیغمبر کو مانتے ہیں، ان کی کتاب کی ہم تصدیق کرتے ہیں، تو ان کو بھی رواداری کا ثبوت دینا چاہیے، یہ کیا ہے کہ ہم تو ان کی کتاب

کو کہیں کہ واقعی اللہ کی جانب سے ہے، اور ان کے نبی کو جن پر ان کا ایمان ہے، ہم کہیں کہ واقعی وہ اللہ کا سچا رسول ہے، لیکن ان کو ذرا حیا نہیں آتی، وہ ہمارے نبی کی بھی مخالفت کرتے ہیں، ہماری کتاب کی بھی مخالفت کرتے ہیں، لیکن پھر بھی ضد میں آ کے ہم نے ان کے نبی کا انکار نہیں کیا، نہ ان کی کتاب کا انکار کیا ہے، جب ایک واقعہ ہے تو ہم اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ یہود کا جن پر ایمان ہے یعنی موسیٰ علیہ السلام، وہ اللہ کے سچے رسول تھے، اور جو کتاب ان کو دی گئی تھی وہ اللہ کی سچی کتاب ہے۔

''رسول'' اور ''نبی'' میں فرق

وَكَانَ رَسُولًا نَّبِيًّا: اور وہ رسول نبی تھے۔ یہ دو صفتیں ذکر کی گئیں، رسول اور نبی۔ ''رسول'' اور ''نبی'' کے درمیان میں کیا فرق ہے؟ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ''بیان القرآن'' میں یہاں ذِکر کیا کہ آیات کی طرف دیکھ کے اور روایات میں غور کر کے معلوم یوں ہوتا ہے کہ رسول اور نبی میں عموم خصوص من وجہ ہے، یعنی من وجہ رسول عام ہے نبی سے، من وجہ نبی عام ہے رسول سے، تو آپ جانتے ہیں کہ جن دو چیزوں کے درمیان نسبت عموم خصوص من وجہ کی ہوتی ہے، اس میں تین مادّے نکالے جایا کرتے ہیں، دو افتراقی اور ایک اجتماعی، تو ''رسول'' کا مفہوم ہے کہ جو اپنے مخاطبین کے لئے نئی شریعت لے کر آئے (''جو اپنے مخاطبین کے لئے'' اس لفظ کا خیال رکھنا!) یعنی خود چاہے وہ صاحبِ کتاب نہ ہو، لیکن جن کی طرف وہ تبلیغ کرنے کے لئے گیا ہے ان کے لئے وہ شریعت نئی ہے، جیسے آگے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے لئے بھی ''رسول'' کا لفظ استعمال کیا جائے گا، حالانکہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کوئی مستقل شریعت نہیں لائے تھے، وہی حضرت ابراہیم علیہ السلام والی شریعت تھی، لیکن مکہ معظمہ جہاں آباد ہے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو یہاں ٹھہرایا گیا تھا، اور ایک قبیلہ بنوجرہم یہاں آ کے آباد ہو گیا تھا، ان کے سامنے حضرت اسماعیل علیہ السلام نے تبلیغ کی اور ان کو شریعت پہنچائی، تو ان لوگوں کے لئے وہ نئی شریعت تھی، جس کی بنا پر حضرت اسماعیل علیہ السلام بھی رسول ہیں، اور رسول کا صاحبِ وحی ہونا ضروری نہیں، اس لیے غیرِ نبی پر بھی ''رسول'' کا لفظ بولا جا سکتا ہے، قرآنِ کریم میں فرشتوں کو بھی ''رسول'' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، اور نبی کسی انسان کو اپنا پیغام دے کے جو کسی دوسرے کی طرف بھیجتا ہے، اس کو بھی ''رسول'' کے لفظ سے حدیث شریف میں تعبیر کیا گیا ہے ''رسولُ رسولِ الله''[1] اللہ کے رسول کا رسول، تو یہ غیرِ نبی پر بھی بولا جاتا ہے۔ اور ''نبی'' کہتے ہیں صاحبِ وحی کو، چاہے اس کے پاس شریعتِ جدیدہ ہو، چاہے شریعتِ جدیدہ نہ ہو، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام تو شریعتِ جدیدہ لائے تھے، اور بعد میں آنے والے بنی اسرائیل کے انبیاء سارے کے سارے انہی کی شریعت کے مبلغ تھے، اس لیے وہ ''نبی'' کہلائے، ''رسول'' نہیں۔ تو اب ایک تو ایسا ہوگا کہ ''رسول'' ہے ''نبی'' نہیں، جس طرح سے انبیاء علیہم السلام کسی کو اپنا قاصد بنا کے بھیج دیں، یا اللہ کے فرشتے، وہ ''رسول'' ہیں ''نبی'' نہیں کہلاتے، اور بعض ''نبی'' ہوں گے ''رسول'' نہیں، جیسے انبیائے بنی اسرائیل جو کہ توراۃ کے مبلغ تھے بنی اسرائیل کے سامنے، وہ ''انبیاء'' کہلاتے ہیں ''رسول'' نہیں کہلاتے، اور ایک ''نبی'' بھی ہوگا ''رسول'' بھی ہوگا کہ وہ صاحبِ شریعتِ جدیدہ بھی

---

(۱) مثلاً: بخاری ۲/۷۶۷، باب نهى رسول الله عن نكاح المتعة. ترمذی ۲/۲۱۱، باب مناقب عثمان. ولفظه: كَانَ عُثْمَانُ بْنُ عَفَّانَ رَسُولَ رَسُولِ اللهِ إِلَى أَهْلِ مَكَّةَ

ہے اور صاحب وحی بھی ہے، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اندر یہ دونوں باتیں پائی جاتی ہیں اس لیے ان کو یہاں جمع کر دیا گیا رَسُوْلًا نَّبِيًّا، وہ ''رسول'' بھی تھے ''نبی'' بھی تھے۔ ''ہم نے ان کو آواز دی طور کی دائیں جانب سے'' جب موسیٰ علیہ السلام جا رہے تھے تو وہ جگہ دائیں جانب تھی جہاں سے آواز آئی، یا ''برکت والی جگہ سے'' دونوں طرح سے بات ٹھیک ہے، کیونکہ اسی کو وادیٔ مقدس کے ساتھ بھی تعبیر کیا گیا ہے، آگے آئے گا فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ اپنے جوتے اتار دے، اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى (سورۂ طٰہ) آپ ایک مقدس وادی میں آگئے ہیں جس کا نام ''طویٰ'' ہے، دونوں باتیں ہی اپنی جگہ ٹھیک ہیں، واقعہ مفصل آ رہا ہے آپ کے سامنے سورۂ طٰہ میں۔ ''ہم نے اس کو سرگوشی کرتے ہوئے قریب کیا، اور اس کو اپنی رحمت کی وجہ سے ہم نے اس کا بھائی ہارون نبی عطا کیا'' یہ بھی ان کی دُعا آئے گی، سورۂ طٰہ میں مفصل واقعہ آ رہا ہے، کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے مانگا تھا کہ میرے بھائی کو کارِ نبوت میں میرا شریک کر دیا جائے، تو اللہ تعالیٰ نے وہ دُعا قبول کی، ہارون علیہ السلام کو نبی بنا کے موسیٰ علیہ السلام کا وزیر اور معاون بنا دیا، یہ واقعہ آگے آ رہا ہے۔

اسماعیل علیہ السلام کا تذکرہ

''کتاب میں اسماعیل علیہ السلام کا بھی تذکرہ کیجئے، وہ بڑے سچے وعدے والے تھے'' اب اسی طرح سچے وعدے والا ہونا یہ تمام انبیاء علیہم السلام کی صفت ہے، لیکن یہاں ان کو خصوصیت کے ساتھ نمایاں کیا گیا، کہ یہ بہت سچے وعدے والے تھے، کہ اپنے باپ کے ساتھ وعدہ کر لیا تھا کہ اگر آپ اس بات پہ آمادہ ہو جائیں کہ میری قربانی دینی ہے، اللہ کے نام پہ ذبح کرنا ہے تو میں ان شاء اللہ! ثابت قدم رہوں گا، چنانچہ جس وقت ان کے باپ نے ارادہ کر لیا تو واقعی انہوں نے اپنے وعدے کو سچا کر دکھایا، بالکل نہیں پھرے اور ذرا نہیں ڈگمگائے، اس لیے ان کی صفت صادق الوعد ذکر کی گئی۔ یہ واقعہ آپ کے سامنے سورۂ صافات میں آئے گا۔ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا: اس کی تفصیل میں نے آپ کے سامنے عرض کر دی کہ یہ رسول بھی تھے نبی بھی تھے، صاحبِ وحی تھے، اور جن لوگوں کے سامنے یہ شریعت لے کر گئے تھے ان کے سامنے وہ شریعت شریعتِ جدیدہ تھی جس کی بنا پر یہ رسول قرار پائے۔ وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ: اور یہ اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتے تھے۔ یہ بھی ہر نبی کی صفت ہے کہ اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتا ہے، تو یہ زیادہ اہتمام کرتے ہوں گے، پھر چونکہ مشرکینِ مکہ منسوب تھے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی طرف، اس لیے یہ باتیں زیادہ واضح کر کے کہی جا رہی ہیں، یہ اپنے آپ کو ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں قرار دیتے تھے بواسطہ اسماعیل علیہ السلام، اسماعیل کی اولاد میں سے بھی تھے اور ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے بھی تھے۔ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا: اور اسماعیل علیہ السلام اپنے رَبّ کے نزدیک پسندیدہ تھے، ''پسندیدہ'' ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو جیسا دیکھنا چاہتا ہے وہ ویسے ہی تھے، اور یہ بہت بڑی صفت ہے، بہت بڑی تعریف ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو جس طرح سے دیکھنا چاہتا ہے وہ اسی طرح سے ہی تھے، پسندیدہ تھے۔

اِدریس علیہ السلام کا تذکرہ

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ: کتاب میں ادریس علیہ السلام کا ذکر کیجئے۔ ادریس علیہ السلام کے حالات تاریخی طور پر زیادہ یقینی معلوم نہیں ہیں کہ یہ کس زمانے میں ہوئے؟ تفسیر کی روایات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ ان کا زمانہ حضرت نوح علیہ السلام سے پہلے کا ہے،

تو گویا کہ یہ آدم علیہ السلام اور نوح علیہ السلام کے درمیان میں ہوئے ہیں، تو ابتدا ابتدا میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی ضروریات پوری کرنے کے طریقے بھی وحی کے ذریعے سے سمجھائے ہیں انبیاء علیہم السلام کی وساطت سے، تو یہ لکھا ہے کہ لکھنے کا طریقہ حضرت ادریس علیہ السلام سے شروع ہوا، کپڑے سینے کا طریقہ بھی حضرت ادریس علیہ السلام سے شروع ہوا، اور جنگی آلات بنانا جس کے ذریعے سے شکار کیا جائے یا دشمن کا دفاع کیا جائے اس کی تعلیم بھی حضرت ادریس علیہ السلام سے شروع ہوئی، حتیٰ کہ نجوم وغیرہ کے متعلق معلومات بھی ادریس علیہ السلام کی وساطت سے ہی انسانوں کو معلوم ہوئیں (مظہری وغیرہ)، تو یہ علوم اللہ تعالیٰ نے ان کی وساطت سے انسانوں کو پہنچائے تھے اور سکھائے تھے، ان کا زمانہ نوح علیہ السلام سے پہلے اور آدم علیہ السلام کے بعد کا ہے، اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا یہ لفظ پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصے میں بھی آ چکے، صدیق تھے نبی تھے، بہت راست باز تھے، زبان کے سچے، قول کے پکے، کردار گفتار کے مطابق تھا، ہر سچائی کو قبول کرنے کے لئے ہر وقت تیار تھے، یہ صفت ان کے اوپر غالب تھی، اور نبی تھے۔ ''ہم نے ان کو اونچے مرتبے میں اُٹھایا'' وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا: ہم نے ان کو بہت اُونچا مرتبہ دیا۔ بعض غیر صحیح روایات سے معلوم یوں ہوتا ہے کہ ان کو بھی زندہ آسمان پہ اُٹھایا گیا تھا، جس طرح سے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو اُٹھایا گیا، تو پھر یہ ترجمہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم نے ان کو اونچی جگہ اُٹھایا یعنی زندگی میں ہم ان کو اُٹھا کے عالمِ بالا میں لے گئے، لیکن یہ روایات زیادہ قابلِ اعتماد نہیں، اور یہ مفہوم اپنی جگہ متعین ہے کہ ان کا درجہ بلند تھا، اس لیے یہ مطلب زیادہ واضح ہے کہ ہم نے ان کو بلند مرتبہ عطا کیا۔

گزشتہ انبیاء علیہم السلام کی عاجزی کا تذکرہ اور اس کا مقصد

''یہی لوگ ہیں جن کے اوپر اللہ نے انعام کیا، یہ نبیوں میں سے ہیں، آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں'' جتنوں کا ذکر آیا ابتدائے سورت سے لے کر اب تک وہ سارے ہی آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں۔ ''اور ان لوگوں میں سے ہیں جن کو ہم نے نوح کے ساتھ اُٹھایا'' تو حضرت ادریس علیہ السلام کے علاوہ باقی سارے ان میں سے ہیں۔ وَمِنْ ذُرِّيَّةِ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْرَآءِيْلَ: اور یہ ابراہیم اور اسرائیل کی اولاد میں سے ہیں۔ تو حضرت اسحاق، اسماعیل، یعقوب، موسیٰ، زکریا اور یحییٰ علیہم السلام جتنے انبیاء مذکور ہوئے، وہ سارے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں۔ اور اسرائیل کی اولاد میں اسماعیل نہیں، باقی اسرائیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں، حضرت اسماعیل علیہ السلام براہِ راست حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں، یہ دُوسری شاخ ہے، اور اسرائیل حضرت اسحاق کے بیٹے ہیں، اسحاق اور اسماعیل دونوں بھائی ہیں، اس لیے حضرت اسماعیل علیہ السلام مِنْ ذُرِّيَّةِ اِسْرَآءِيْلَ نہیں ہوں گے، صرف مِنْ ذُرِّيَّةِ اِبْرٰهِيْمَ ہوں گے۔ اور موسیٰ زکریا یحییٰ عیسیٰ علیہم السلام یہ سارے کے سارے مِنْ ذُرِّيَّةِ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْرَآءِيْلَ ہیں، یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں۔ ''اور یہ ان میں سے ہیں جن کو ہم نے ہدایت دی اور جن کو ہم نے چن لیا'' تو اتنے اعلیٰ درجے کے یہ لوگ تھے، صاحبِ وحی تھے، رسول تھے، نبی تھے، اتنی عالی عالی صفتیں اللہ نے ان کو دی تھیں، لیکن ان صفتوں کے باوجود وہ اللہ کے سامنے اکڑتے نہیں تھے، نہ کوئی تکبر کرتے تھے، بلکہ جب بھی اللہ تعالیٰ کی آیات ان کے سامنے پڑھی جاتیں تو وہ ان آیات سے متاثر ہو کر روتے ہوئے اللہ کے سامنے سجدے میں گر جاتے تھے، یہ ان کی تواضع ہے اور اللہ تعالیٰ کے خوف کا غلبہ ہے، اور سب انبیاء علیہم السلام کا ذکر کر کے یہ بات اس

لیے بتائی جارہی ہے کہ ان کے نام لیواؤں کو بھی چاہیے کہ وہ تکبر نہ کریں، اللہ تعالیٰ کے احکام کے سامنے سر جھکا دیں، اللہ تعالیٰ کی آیات کو سنیں تو اپنے مقتدیٰ نبیوں کی طرح وہ بھی متاثر ہوں، اب یہ کیا بات ہے کہ نام تو موسیٰ علیہ السلام کا لیتے ہو، اور نام تو ان نبیوں پیغمبروں کا لیتے ہو، جس طرح سے مشرکینِ مکہ حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کا نام لیتے تھے، اور یہود و نصاریٰ ابراہیم، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کا نام لیتے تھے، لیکن حالت یہ ہے کہ اللہ کی آیات ان کے سامنے آتی ہیں تو اکڑتے ہیں، قبول ہی نہیں کرتے، حالانکہ ان سب حضرات کی عادت تھی کہ جب ان کے سامنے اللہ کی آیات آتیں تو روتے ہوئے سجدے میں گر پڑتے۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ قرآنِ کریم پڑھتے وقت، سنتے وقت اپنے اُوپر گریہ اور بکاء کو طاری کرنا یہ انبیاء علیہم السلام کی عادت ہے، اور سورۂ بنی اسرائیل کے آخر میں بھی اس کا ذِکر آیا تھا، تو قرآنِ کریم پڑھتے ہوئے رونے کا لب ولہجہ ہو، رونے کی کیفیت ہو، آنکھوں میں آنسو آجائیں، انسان اس کے مضامین سے متاثر ہو، یہ انبیاء علیہم السلام کی عادت ہے، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی قرآنِ کریم کی آیات کو سن کے رونا، آنسو بہانا، اس کا تذکرہ حدیث شریف میں آتا ہے۔[1] اور نیک لوگوں میں، اللہ والوں میں تو یہ بات چلتی ہی رہتی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی کتاب کو پڑھتے ہیں تو ان کے اُوپر اللہ کے خوف اور محبت کے ساتھ گریہ طاری ہوتا ہے۔

''سجدۂ تلاوت'' والی آیات

تو یہاں چونکہ انبیاء علیہم السلام کا یہ حال ذِکر کیا گیا تو ضروری ہے کہ پڑھنے والے بھی انبیاء علیہم السلام کے حال کے ساتھ مطابقت اختیار کرتے ہوئے اس آیت کے اُوپر سجدہ کریں، اس لئے جن آیات کے اُوپر سجدہ کرنا ضروری ہے، ان میں سے ایک آیت یہ بھی ہے۔ تو وہ آیات اسی قسم کی ہیں، بعض میں تو انبیاء علیہم السلام کی اطاعت اور عبدیت کے اظہار کا ذِکر ہے، جیسے یہ آیت آگئی، بعض میں فرشتوں کا ذِکر ہے جیسے کہ سورۂ اَعراف کے آخر میں آیا تھا، اور کسی جگہ کُفّار کے تکبر و اِستکبار کا ذِکر ہے تو ان کی مخالفت کرتے ہوئے سجدے کا حکم آیا ہوا ہے، تو انبیاء علیہم السلام کی مطابقت کے طور پر اس آیت پر سجدہ کرنا واجب ہے۔

نااہل جانشینوں کا تذکرہ

یہ تو ایسے لوگ تھے، مقبولین کی جماعت، اللہ کے سامنے گردن جھکا دینے والے، اللہ کی کلام کو سُن کے اللہ کے خوف سے اور اللہ کی محبت میں رونے والے، لیکن ان کے بعد پھر نااہل آگئے، نااہل لوگ ان کے جانشین ہو گئے جنہوں نے ان صفات کو چھوڑ دیا، وہ اللہ کے احکام سے متاثر نہیں ہوتے، سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہر نبی کی شریعت میں جو دِین کا ستون رہا یعنی نماز، تو ان لوگوں نے نماز تک کو ضائع کر دیا۔ اب نام ان کے لیتے ہیں، گدی نشین ان کے بنے بیٹھے ہیں، روٹیاں ان کے نام پر کھاتے ہیں، لیکن نماز تک بھی نہیں پڑھتے، نماز ضائع کر دیتے ہیں، تو اس وقت انبیاء علیہم السلام کے جانشین جو بنے بیٹھے تھے یہود و نصاریٰ، ان کی بھی یہی کیفیت تھی، اور اب آپ کے سامنے تو ہے ہی، کہ اولیاء اللہ کی مسندوں پر بیٹھنے والے، ان کے گدی نشین، ان کی خانقاہوں پہ

(۱) مثلاً بخاری ۲/ ۶۵۹، کتاب التفسیر، سورۃ النساء۔ مشکوٰۃ ۱/ ۱۹۰، باب آداب التلاوۃ، فصل اول۔ ان میں ابن مسعودؓ سے سورۃ نساء سنتے ہوئے رونے کا ذکر ہے۔

قبضہ کرنے والے کس طرح سے شہوات کے متبع ہو گئے، اور کس طرح سے نماز، زکوٰۃ کو ضائع کیے بیٹھے ہیں، جب چاہیں جا کے آپ ان پرانی خانقاہوں میں دیکھ لیجئے، کہ جن خانقاہوں میں ہر وقت اللہ اللہ ہوتی تھی، اور اللہ کا خوف لوگوں کو دلایا جاتا تھا، اور اللہ سے ڈرتے ہوئے وہ راتوں کو جاگتے تھے اور اللہ کے سامنے روتے تھے، آج ان کی خانقاہوں میں جس قسم کے لوگ قابض ہیں مسند نشین ہیں، ان میں ذرا برابر بھی وہ بات باقی نہیں ہے، تو یہ نااہل جانشین ہیں جنہوں نے اس مشن کو ضائع کر دیا جس مشن کے اُوپر انبیاء علیہم السلام آئے تھے، انہی کا حال دیکھ کے تو علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے ان پیروں کے متعلق کہا تھا:

میراث میں آئی ہے انہیں مسندِ ارشاد زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

(بالِ جبریل، بعنوان باغی مرید)

یعنی مسند ارشاد ان کو وراثت میں مل گئی، یہاں جو اصل آ کے آباد ہوئے وہ تو شاہین تھے، باز جو بہت اعلیٰ درجے کا پرندہ ہے، اور اب اس کے اُوپر کوّے قابض ہو گئے، ''زاغ'' کوّے کو کہتے ہیں۔ یہ وہی بات ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی مسندوں پر بیٹھنے والے، ان کی طرف نسبت کر کے اپنے آپ کو ان کا وارث قرار دینے والے سب کچھ ہی ضائع کر بیٹھے، انہوں نے وہ دین، دیانت باقی نہیں رکھی، بڑی بات یہ ہے کہ نماز تک کو ضائع کر دیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کا ضائع کرنا اللہ تعالیٰ کے ہاں کتنا بُرا ہے، اور بھی انہوں نے بہت بُری بُری صفتیں اختیار کیں لیکن یہاں اَضَاعُوا الصَّلٰوۃَ کو خصوصیت سے ذِکر کیا، بالکل نہ پڑھی جائے یہ بھی اِضاعتِ صلوٰۃ ہے، وقت کی پابندی نہ کی جائے یہ بھی اِضاعتِ صلوٰۃ ہے، اس کے آداب اور شرائط کی رعایت نہ رکھی جائے ایسے ہی چار ٹھونگے سے مار لیے جائیں یہ بھی اِضاعتِ صلوٰۃ ہے، حتیٰ کہ ہماری شریعت میں نماز مسجد میں جا کر جماعت کے ساتھ پڑھیں تو کامل طریقے سے ادا ہوتی ہے، اگر کوئی شخص مسجد میں جا کر نہیں پڑھتا، جماعت سے نہیں پڑھتا، تو من وجہٍ اس نے بھی نماز کو ضائع کر دیا، یہ سب اس کے درجات ہیں۔ ''اور خواہشات کے پیچھے لگ گئے'' اب یہ نہیں دیکھتے کہ اللہ کا حکم کیا ہے، اللہ کیا چاہتا ہے، یوں دیکھتے ہیں کہ دل کس چیز کو چاہتا ہے، جس چیز کو دل چاہے وہ کام کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی ہدایت کو نہیں دیکھتے، اس کو اِتباعِ شہوات کہتے ہیں۔ اِتباعِ ہویٰ اور اِتباعِ ہُدیٰ یہ دو باتیں ہیں، ایک یہ ہے کہ اللہ کی راہنمائی پہ چلو، چاہے تمہارا دل چاہے یا نہ چاہے، اور ایک یہ ہے کہ یہ دیکھو کہ دِل کیا چاہتا ہے، چاہے اللہ کے حکم کے مطابق ہو یا نہ ہو۔ تو جو لوگ اپنی زندگی اس نہج پہ ڈال دیتے ہیں کہ اپنی خواہش پوری کرو، جو دِل میں آ گیا وہ کر لو، چاہے اللہ کے حکم مطابق ہو یا مطابق نہ ہو، ان کو کہا جاتا ہے کہ یہ متبعِ ہویٰ ہیں، متبعِ شہوات ہیں، اور جو اپنی زندگی کا معیار یہ رکھتے ہیں کہ جو اللہ کہے وہ کرو، چاہے اپنا دل چاہے یا نہ چاہے، یہ لوگ متبعِ ہدیٰ ہوتے ہیں، صاحبِ ہدایت یہ لوگ ہیں۔ ''عنقریب یہ خرابی کو پالیں گے'' یعنی جو خرابی انہوں نے اختیار کی ہے تو اس کا بُرا انجام ان کے سامنے آ جائے گا۔

توبہ کا اِنعام

''ہاں! جو توبہ کر لے'' یعنی ان گدی نشینوں کے لئے بھی ابھی توبہ کا دروازہ بند نہیں ہے، جو نبیوں کی مسند پہ بیٹھے ہوئے ہیں

اور اس مسند پر بیٹھ کر اس کو دُنیاداری کا ذریعہ بنالیا، شہوت پرستی کا ذریعہ بنالیا، ایسے بدکرداروں کے لئے بھی توبہ کا دروازہ بند نہیں۔ یہ راہب بنے بیٹھے تھے اور عالم بنے بیٹھے تھے اور لوگوں کو غلط فتوے دیتے تھے، جیسے قرآنِ کریم میں تعارف کرایا گیا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ (سورۂ توبہ: ۳۴) اَحبار: علماء۔ رُہبان: درویش۔ بہت سارے علماء اور بہت سارے درویش لوگوں کا مال غلط طریقے سے کھا رہے ہیں، انہوں نے مال کمانے کا اور مال کھانے کا ذریعہ بنالیا تھا اس دِین داری کو، اپنی درویشی کو اور اپنے علم کو۔ تو ان لوگوں کے لئے بھی توبہ کا دروازہ بند نہیں، ''جو بھی توبہ کرلے، ایمان لے آئے، نیک عمل کرے یہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے، اور ان پر کچھ زیادتی نہیں ہوگی'' ان کا کوئی حق ضائع نہیں کیا جائے گا، ''وہ جنت ہیشگی کے باغات ہیں جن کا رحمٰن نے اپنے بندوں کے ساتھ بن دیکھے وعدہ کیا ہے'' یعنی ابھی وہ غیب میں ہیں، آنکھوں کے سامنے نہیں ہیں، لیکن رحمٰن کا وعدہ ہے اور سچا وعدہ ہے، ''اس وعدے تک رسائی ضرور ہوگی'' رحمٰن کا وعدہ ایسا ہے کہ جہاں تک لوگ ضرور پہنچیں گے۔

پھر آگے کچھ جنت کی تعریف کردی گئی ترغیب دلانے کے لئے، کہ اس جنت میں کوئی بک بک نہیں سنیں گے، آپس میں کوئی لڑائی نہیں ہوگی، جھگڑا نہیں ہوگا، گالی گلوچ نہیں ہوگی، طعن تشنیع نہیں ہوگی، ایسی کوئی بات کان میں نہیں پڑے گی جو باعث تکلیف ہو۔ ورنہ یہاں دُنیا کے اندر رہتے ہوئے تو آپ دیکھتے ہی ہیں کہ ایک دوسرے کو ہم ایسی ایسی باتیں کہہ لیتے ہیں کہ جن کے ساتھ دوسرا یوں تڑپتا ہے جیسے کسی نے نیزہ مارا ہو، باتوں کا اثر اس طرح سے ہوا کرتا ہے، تو وہاں ایسی کوئی تکلیف دِہ بات نہیں سنیں گے۔ ہاں! سلامتی کی باتیں سنیں گے، ایک دوسرے سے محبت پیار کی باتیں، ایک دوسرے کو سلام کہیں گے، آپس میں سلام کہیں گے، فرشتے سلام کہیں گے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی جنتیوں کو سلام کہا جائے گا، سلامتی ہی سلامتی کی باتیں ہوں گے۔ وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيْهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا: وہ روحانی راحت ہوگئی سلامتی کی باتوں سے، اور صبح شام ان کو رزق بھی ملے گا، یعنی جو وقت ہے رزق حاصل کرنے کا، یا مطلب یہ ہے کہ ہر وقت روزی میسر ہوگی، وَفِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ (سورۂ زُخرف: ۷۱) جو چاہیں گے لیں گے، جب چاہیں کھائیں، جب چاہیں پئیں، کوئی کسی قسم کی پابندی نہیں ہوگی۔ ''یہی جنت ہے کہ جس کا وارث بنائیں گے ہم اپنے بندوں میں سے اس کو جو پرہیزگار ہے'' اس لیے اگر جنت حاصل کرنے کا شوق ہے تو پرہیزگاری اختیار کرو۔

''وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ'' کا شانِ نزول اور آیات کا مفہوم

اگلی آیت کے شانِ نزول میں یہ ذِکر کیا گیا ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ کو بہت اشتیاق رہتا تھا کہ جبریل جلدی جلدی آئیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی ہدایات لے کر آئیں، وحی آئے، اس شوق میں آپ ﷺ نے جبریل علیہ السلام سے کہا کہ تُو بہت دیر سے آتا ہے، تُو جلدی جلدی آیا کر (جلالین وغیرہ)، تو جبریل علیہ السلام کی کلام کو اللہ تعالیٰ یہاں نقل فرماتے ہیں کہ اس میں جبریل کا کوئی اختیار نہیں، نہ کسی دوسرے فرشتے کو کسی کام کا اختیار ہے، جب اللہ کی مرضی ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ بھیج دیتے ہیں، باقی! آپ بے فکر

رہیں، اگر کبھی دیر ہوجائے تو یہ کوئی بھول چوک کا نتیجہ نہیں، اللہ بھولا نہیں کرتے، بلکہ یہ اس کی حکمت کا تقاضا ہے، حکمت کی وجہ سے دیر ہوتی ہے، باقی! اس میں کوئی بھول چوک کا اثر نہیں ہے، تو صبر وتحمل کے ساتھ آپ وقت گزاریے، اوران کفار کے مقابلے میں ڈٹے رہیے، اللہ کی عبادت پر ڈٹے رہیے، اللہ جیسا کوئی دوسرا موجود نہیں۔ اوراس بات سے یہ نشاندہی ہوگئی کہ فرشتے بھی اللہ کے سامنے بے بس ہیں، اللہ چاہتا ہے تو یہ آسکتے ہیں، اللہ نہیں چاہتا تو نہیں آسکتے، اس میں توحید کا سبق بھی ہے، تو یہ جبریل علیہ السلام کی کلام ہے جس کو اللہ تعالیٰ یہاں نقل کررہے ہیں، ''نہیں اترتے ہم مگر تیرے رَبّ کے حکم کے ساتھ'' یعنی تیرے رَبّ کا حکم ہو تو ہم اتر سکتے ہیں ورنہ ہم نہیں اتر سکتے، ''اسی کے لیے ہے جو کچھ ہمارے سامنے ہے، جو کچھ ہمارے پیچھے ہے، جو کچھ اس کے درمیان میں ہے، اور تیرا رَبّ بھولنے والا نہیں'' یعنی اگر کبھی تاخیر ہوجاتی ہے تو یہ بھول چوک کا نتیجہ نہیں، حکمت کا تقاضا ہے، رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یہ جبریل علیہ السلام کا قول بھی ہوسکتا ہے اور براہِ راست اللہ تعالیٰ کا قول بھی ہوسکتا ہے، مفسرین نے یہاں دونوں باتیں لکھی ہیں، ''وہ آسمانوں کا اور زمین کا رَبّ ہے اور ان چیزوں کا رَبّ ہے جو ان دونوں کے درمیان میں ہیں، پس تو اسی کی عبادت کر اور اسی کی عبادت کے لئے ڈٹارہ، جمارہ'' کوئی آپ کو اس طریقے سے ہٹا نہ سکے۔ ''کیا تو اس رَبّ کے لئے کوئی ہم صفت جانتا ہے؟'' اس کی کوئی مثال اور نظیر موجود ہے کہ جس کے لئے عبادت ہو؟ جب اس کا کوئی ہم صفت نہیں، کوئی اس کی نظیر نہیں، کوئی اس کی مثال نہیں، تو عبادت صرف اسی کی ہونی چاہیے، کسی دوسرے کی نہیں ہونی چاہیے۔ اس میں حضور ﷺ کو عبادت اختیار کرنے اور عبادت پر جمے رہنے کا حکم دے کر دوسروں کو بھی سنانا مقصود ہے، اور هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا میں دلیل توحید کی طرف اشارہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرح کوئی بااختیار نہیں، کوئی مالک نہیں، کسی کو کسی کے اوپر کوئی قدرت حاصل نہیں، کوئی اس کا ہم صفت نہیں، اس کی کوئی مثال نہیں، نظیر نہیں، تو عبادت میں کسی دوسرے کو شریک نہیں کرنا چاہیے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

وَيَقُوْلُ الْاِنْسَانُ ءَاِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ اُخْرَجُ حَيًّا ﴿٦٦﴾ اَوَلَا يَذْكُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا

اور کہتا ہے انسان: کیا جس وقت میں مرجاؤں گا، البتہ پھر نکالا جاؤں گا زندہ کرکے؟ ﴿٦٦﴾ کیا انسان کو یاد نہیں ہے؟ کہ بے شک ہم نے

خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْـًٔا ﴿٦٧﴾ فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيٰطِيْنَ ثُمَّ

اس کو پیدا کیا اس سے قبل اور وہ کچھ بھی نہیں تھا ﴿٦٧﴾ پس تیرے رَبّ کی قسم! البتہ ضرور جمع کریں گے ہم ان کو اور شیاطین کو، پھر

لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا ﴿٦٨﴾ ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ

ہم البتہ ضرور حاضر کریں گے انہیں جہنم کے اردگرد اس حال میں کہ یہ گھٹنوں کے بل گرے ہوئے ہوں گے ﴿٦٨﴾ پھر البتہ ضرور نکالیں گے ہم

مِنْ كُلِّ شِيْعَةٍ اَيُّهُمْ اَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتِيًّا ﴿۶۹﴾ ثُمَّ لَنَحْنُ اَعْلَمُ بِالَّذِيْنَ هُمْ

ہر جماعت میں سے جو کوئی ان میں سے زیادہ سخت ہے رحمٰن پر از روئے سرکشی کے ﴿۶۹﴾ پھر البتہ ہم خوب جانتے ہیں ان لوگوں کو جو

اَوْلٰى بِهَا صِلِيًّا ﴿۷۰﴾ وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ

زیادہ لائق ہیں جہنم کے ساتھ از روئے داخل ہونے کے ﴿۷۰﴾ نہیں ہے تم میں سے کوئی بھی مگر اس جہنم پر وارد ہونے والا ہے، یہ بات

عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ﴿۷۱﴾ ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ

تیرے رَبّ کے ذِمّے ہے لازم فیصلہ شدہ ﴿۷۱﴾ پھر ہم نجات دیں گے ان لوگوں کو جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا، اور چھوڑ دیں گے ہم

الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا ﴿۷۲﴾ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

ظالموں کو اس جہنم میں گھٹنوں کے بل گرے ہوئے ﴿۷۲﴾ اور جب ان پر ہماری آیات پڑھی جاتی ہیں واضح واضح، کہتے ہیں کافر

لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا ۙ اَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا وَّاَحْسَنُ نَدِيًّا ﴿۷۳﴾ وَكَمْ

مؤمنوں کو: دونوں فریقوں میں سے کون فریق بہتر ہے از روئے ٹھکانے کے اور زیادہ اچھا ہے از روئے مجلس کے؟ ﴿۷۳﴾ ہم نے کتنی ہی

اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا وَّرِءْيًا ﴿۷۴﴾

جماعتوں کو ہلاک کر دیا ان سے قبل، وہ زیادہ اچھے تھے از روئے سامان کے اور از روئے نظارے کے ﴿۷۴﴾

قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلٰلَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا ۚ حَتّٰٓى اِذَا رَاَوْا مَا

آپ کہہ دیجئے کہ جو کوئی شخص گمراہی میں ہو، چاہیے کہ رحمٰن اس کو ڈھیل دے خوب ڈھیل دینا، حتّٰی کہ جب دیکھیں گے یہ لوگ اس چیز کو

يُوْعَدُوْنَ اِمَّا الْعَذَابَ وَاِمَّا السَّاعَةَ ۭ فَسَيَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا

جس کا وعدہ دیے جاتے ہیں، یا عذاب یا قیامت، پس عنقریب جان لیں گے، کون شخص زیادہ بُرا ہے از روئے مکان کے

وَّاَضْعَفُ جُنْدًا ﴿۷۵﴾ وَيَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى ۭ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ

اور زیادہ کمزور ہے از روئے لشکر کے ﴿۷۵﴾ اور بڑھاتا ہے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو ہدایت یافتہ ہیں ہدایت، باقی رہنے والے نیک اعمال

خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ مَّرَدًّا ﴿۷۶﴾ اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ

بہتر ہیں تیرے رَبّ کے نزدیک از روئے بدلے کے اور بہتر ہیں از روئے انجام کے ﴿۷۶﴾ کیا پھر آپ نے اس شخص کو دیکھا جس

كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا وَقَالَ لَاُوۡتَيَنَّ مَالًا وَّوَلَدًا ؁ اَطَّلَعَ الۡغَيۡبَ اَمِ
نے ہماری آیات کا انکار کیا، اور کہا اس نے البتہ ضرور دیا جاؤں گا میں مال اور اولاد ؁ کیا اس نے اطلاع پالی ہے غیب پر؟ یا
اتَّخَذَ عِنۡدَ الرَّحۡمٰنِ عَهۡدًا ؁ كَلَّا ؕ سَنَكۡتُبُ مَا يَقُوۡلُ وَنَمُدُّ لَهٗ مِنَ الۡعَذَابِ
اس نے رحمٰن کے ہاں کوئی عہد لے لیا ہے؟ ؁ ہرگز نہیں! ضرور لکھیں گے ہم جو کچھ وہ کہتا ہے، اور بڑھائیں گے اس کے لئے عذاب
مَدًّا ؁ وَّنَرِثُهٗ مَا يَقُوۡلُ وَيَاۡتِيۡنَا فَرۡدًا ؁ وَاتَّخَذُوۡا
بڑھانا ؁ اور وارث ہوں گے ہم اس کے اس چیز میں جو وہ کہتا ہے، اور آئے گا وہ ہمارے پاس تن تنہا ؁ ان لوگوں نے اختیار کیے
مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوۡنُوۡا لَهُمۡ عِزًّا ؁ كَلَّا ؕ سَيَكۡفُرُوۡنَ بِعِبَادَتِهِمۡ
اللہ کے علاوہ معبود تاکہ ہو جائیں وہ آلہہ ان کے لئے عزت کا باعث ؁ ہرگز نہیں! عنقریب انکار کر دیں گے وہ ان کی عبادت کا
وَيَكُوۡنُوۡنَ عَلَيۡهِمۡ ضِدًّا ؁
اور ہو جائیں گے وہ ان کے مخالف ؁

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ۔ وَيَقُوۡلُ الۡاِنۡسَانُ ءَاِذَا مَا مِتُّ لَسَوۡفَ اُخۡرَجُ حَيًّا: اور کہتا ہے انسان، کیا جس وقت میں مر جاؤں گا، البتہ پھر نکالا جاؤں گا زندہ کر کے؟ حیًا یہ اُخۡرَجُ کی ضمیر سے حال واقع ہے۔ اور انسان سے کافر انسان مراد ہے جو آخرت کا منکر ہو۔ یعنی وہ تعجب کے طور پر کہتا ہے کہ جب میں مر جاؤں گا تو کیا میں دوبارہ زندہ کر کے نکالا جاؤں گا؟ یعنی زمین سے، قبروں سے۔ ان لفظوں کے ضمن میں اللہ کی قدرت میں شک معلوم ہوتی ہے کہ مرنے کے بعد، ریزہ ریزہ ہو جانے کے بعد، بوسیدہ ہو جانے کے بعد دوبارہ زندہ کیونکر کیا جاؤں گا؟ اس لیے اگلی آیت میں اس کا جواب دیا گیا، اَوَلَا يَذۡكُرُ الۡاِنۡسَانُ: کیا انسان یاد نہیں رکھتا، اسے یاد نہیں ہے؟ اَنَّا خَلَقۡنٰهُ مِنۡ قَبۡلُ: کہ بے شک ہم نے اس کو پیدا کیا اس سے قبل وَلَمۡ يَكُ شَيۡـًٔا اور وہ کچھ بھی نہیں تھا۔ جب ہم نے پہلے اس کو عدم سے وجود دیا ہے تو ایک دفعہ موجود کر کے پھر دوبارہ موجود کرنا ہمارے لیے کیا مشکل ہے؟ کیا اس کو یہ بات یاد نہیں؟ فَوَرَبِّكَ لَنَحۡشُرَنَّهُمۡ: پس تیرے رب کی قسم! البتہ ضرور جمع کریں گے ہم انہیں، وَالشَّيٰطِيۡنَ: یہ مفعول معہ ہے، واؤ بمعنی مع ہے۔ جمع کریں گے ان سب کو شیاطین کے ساتھ۔ اور اگر عطف کرنا ہو تو وہ بھی ٹھیک ہے، البتہ ضرور جمع کریں گے ہم ان کو اور شیاطین کو۔ ''شیاطین کے ساتھ، اور شیاطین کو'' دونوں طرح سے ترجمہ صحیح ہے (آلوسی)۔ ثُمَّ لَنُحۡضِرَنَّهُمۡ: پھر ہم البتہ ضرور حاضر کریں انہیں حَوۡلَ جَهَنَّمَ: جہنم کے اردگرد جِثِيًّا: یہ جاثٍ کی جمع ہے، جَثَا يَجۡثُوۡ: گھٹنوں کے بل گرنا، قرآنِ کریم میں جیسے آتا ہے وَتَرٰى كُلَّ

اُمَّةٍ جَاثِيَةً (سورۂ جاثیہ:۲۸) تو ہر جماعت کو دیکھے گا کہ وہ گھٹنوں کے بَل گری ہوئی ہوگی۔'' البتہ ضرور حاضر کریں گے ہم انہیں جہنم کے اردگرد اس حال میں کہ یہ گھٹنوں کے بل گرے ہوئے ہوں گے'' ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيْعَةٍ: شیعہ: جماعت۔ ایسی جماعت جو کسی شخصیت پر اکٹھی ہوئی ہو یا کسی نظریہ پر، وہ ''شیعہ'' کہلاتی ہے۔ ہمارے ہاں جو ''شیعہ'' ہیں رافضی، یہ اصل کے اعتبار سے ''شیعۂ علی'' کہلاتے ہیں، علی جو کہ مضاف الیہ ہے اس کو گرادیا جاتا ہے، اور باقی صرف ''شیعہ'' ہی رہ گیا، اصل لفظ ہے ''شیعة علی''، علی کی جماعت۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں چونکہ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام لے کر اٹھے تھے اس لیے ''شیعۂ علی'' کہلاتے ہیں، جیسے دوسری جگہ ہے وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ (سورۂ صافات: ۸۳) نوح علیہ السلام کی جماعت میں سے ابراہیم علیہ السلام بھی ہیں۔ وہاں بھی ''شیعہ'' کا لفظ آیا ہے۔ نَزَعَ: کھینچنا۔ پھر البتہ ضرور نکالیں گے ہم ہر جماعت میں سے اَيُّهُمْ اَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتِيًّا: جو کوئی ان میں سے زیادہ سخت ہے رحمٰن پر از روئے سرکشی کے، دنیا کے اندر رہتے ہوئے رحمٰن کے مقابلے میں جو زیادہ سرکش تھا، پھر ان جماعتوں میں سے ہم اس کو علیحدہ کرلیں گے، جماعتیں ساری حاضر ہوں گی لیکن ان میں سے زیادہ سرکش تھے رحمٰن پر ان کو ہم علیحدہ کرلیں گے۔ ثُمَّ لَنَحْنُ اَعْلَمُ بِالَّذِيْنَ هُمْ اَوْلٰى بِهَا صِلِيًّا: صَلِیَ یَصْلٰی: آگ میں داخل ہونا۔ پھر ہم البتہ خوب جانتے ہیں ان لوگوں کو جو زیادہ لائق ہیں جہنم کے ساتھ از روئے داخل ہونے کے، جن کا جہنم میں داخل ہونا زیادہ لائق ہے ان کو ہم خوب جانتے ہیں۔ وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا: نہیں ہے تم میں سے کوئی بھی مگر اس جہنم پر وارد ہونے والا ہے۔ وَرَدَ وُرُوْد: وارد ہونا۔ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا یہ بات تیرے رَبّ کے ذمہ ہے لازم، فیصلہ شدہ۔ حتم کے معنی لازم، مَقْضِيًّا کا معنی فیصلہ شدہ۔ ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا: پھر ہم نجات دیں گے ان لوگوں کو جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا، وَنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا: اور چھوڑ دیں گے ہم ظالموں کو اس جہنم میں اوندھے گرے ہوئے، گھٹنوں کے بَل گرے ہوئے، یہ لفظ پہلے بھی آیا ہے۔ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا: اور جب ان پر ہماری آیات پڑھی جاتی ہیں بَيِّنٰتٍ: واضح واضح، قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا: کہتے ہیں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ان لوگوں کو جو ایمان لے آئے، کہتے ہیں کافر مؤمنوں کو اَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا وَّاَحْسَنُ نَدِيًّا: دونوں فریقوں میں سے کون سا فریق بہتر ہے از روئے ٹھکانے کے، اور زیادہ اچھا ہے از روئے مجلس کے؟ ندی مجلس کو کہتے ہیں۔ فریقین سے مراد کافر اور مؤمن۔ یعنی ہم میں اور تم میں کون شخص زیادہ بہتر ہے از روئے ٹھکانے کے اور زیادہ اچھا ہے از روئے مجلس کے؟ وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ: مِنْ قَرْنٍ یہ کَمْ کی تمیز ہے۔ قرن کہتے ہیں ایک زمانہ کے موجود لوگوں کو، اس لیے یہاں یہ جماعت کے معنی میں ہے۔ ہم نے کتنی ہی جماعتوں کو ہلاک کردیا ان سے قبل، هُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا وَّرِءْيًا: وہ زیادہ اچھے تھے از روئے سامان کے اور زیادہ اچھے تھے از روئے نظارے کے۔ آثاث کہتے ہیں گھر کے سامان کو، آثاثُ البیت: گھر کا سامان۔ رِءْيًا: منظر، دِکھلاوا، شو۔ رَاٰی یَرْءٰی جس کو رَءٰی یَرٰی پڑھتے ہیں، مہموز العین وناقص یائی، یہ اسی سے ہے۔ دکھلاوے کے معنی میں، شو بازی جسے کہتے ہیں۔ وہ زیادہ اچھے تھے از روئے سامان کے اور دکھلاوے کے، نظارے کے۔ نام ونمود، نمود نمائش کے اعتبار سے وہ زیادہ اچھے تھے۔ رِءْيًا: نمود، نمائش، دکھلاوا، منظر، نظارہ، جو چاہو ترجمہ کرلو۔ قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلٰلَةِ: آپ کہہ دیجئے کہ جو کوئی شخص گمراہی میں ہو، فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا: فَلْيَمْدُدْ: یہ اَمر کا صیغہ ہے۔ چاہیے کہ رحمٰن اس کو ڈھیل دے خوب ڈھیل دینا۔ اَمر کے صیغے کا مطلب یہ ہے کہ رحمٰن کی شان کے لائق یہی ہے کہ اس کی

رسّی ڈھیلی چھوڑ دے۔ چاہیے کہ ڈھیل دے اس کو رحمٰن ڈھیل دینا، مہلت دے اس کو مہلت دینا۔ اَمر کے صیغے کا مفہوم اسی طرح سے ہوا کہ اللہ کی شان کے لائق یہی ہے اللہ کی حکمت کا تقاضا یہی ہے کہ اس کی رسّی ڈھیلی چھوڑ دے۔ حَتّٰۤی اِذَا رَاَوْا مَا یُوْعَدُوْنَ: حتیٰ کہ جب دیکھیں گے یہ لوگ اس چیز کو جس کا وعدہ دیے جاتے ہیں، اِمَّا الْعَذَابَ: یا عذاب یعنی دنیا میں، وَ اِمَّا السَّاعَةَ: یا قیامت، فَسَيَعْلَمُوْنَ پس عنقریب جان لیں گے مَنْ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا: کون شخص زیادہ برا ہے از روئے مکان کے وَّ اَضْعَفُ جُنْدًا: اور زیادہ کمزور ہے از روئے لشکر کے۔ جند کہتے ہیں لشکر کو جس کی جمع جُنُوْد آتی ہے، اَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا (سورۂ توبہ:۲۶) اللہ نے ایسے لشکر اُتارے جن کو تم نے نہیں دیکھا۔ وَيَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى: اور بڑھاتا ہے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو ہدایت یافتہ ہیں ہدایت، زیادہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو ہدایت یافتہ ہیں ہدایت، یعنی اللہ ان کی ہدایت میں اضافہ کرتا ہے۔ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا: باقی رہنے والے نیک اعمال بہتر ہیں تیرے رَبّ کے نزدیک از روئے بدلے کے، وَّخَيْرٌ مَّرَدًّا: اور بہترین از روئے انجام کے۔ مَرَدًّا مصدر میمی ہے۔ رَدَّ يَرُدُّ: لوٹانا۔ یہاں مَردودًا کے معنی میں ہوگا، واپس لوٹانے کے اعتبار سے نیک اعمال اچھے ہیں، یعنی جو چیز انجام کے طور پر آپ کی طرف واپس لوٹ کے آئے گی اس اعتبار سے نیک اعمال اچھے ہیں، لوٹائے جانے کے اعتبار سے۔ اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا: کیا پھر آپ نے اس شخص کو دیکھا جس نے ہماری آیات کا انکار کیا، وَقَالَ: اور کہا اس نے لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّوَلَدًا: البتہ ضرور دیا جاؤں گا میں مال اور اولاد، یعنی اگر قیامت ہوئی، اس کا مطلب یہی ہے، کہ جس طرح سے تم کہتے ہو اگر قیامت آگئی اور عالم آخرت کوئی چیز ہے تو میں اس میں مال اور اولاد ضرور دیا جاؤں گا۔ اَطَّلَعَ الْغَيْبَ: اَطَّلَعَ، اصل میں تھا: اَاِطَّلَعَ، ہمزۂ وصلی گر گیا اور ہمزۂ استفہام کو ساتھ جوڑ کے پڑھ لیا گیا۔ کیا اس نے اطلاع پالی ہے غیب پر؟ کیا اس نے غیب کو جھانک کے دیکھ لیا ہے؟ اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا: یا اس نے رحمٰن کے نزدیک کوئی عہد لے لیا ہے؟ عہد اختیار کرلیا ہے؟ کہ اللہ نے اس سے وعدہ کرلیا ہو کہ میں تجھے ضرور دوں گا۔ ''یا اس نے لیا اللہ کے ہاں کوئی وعدہ؟'' كَلَّا: ہرگز نہیں سَنَكْتُبُ مَا يَقُوْلُ: سین تاکید کے لئے بھی ہوتی ہے جس طرح سے استقبال کے لئے ہوتی ہے (آلوسی)۔ ضرور لکھیں گے ہم جو کچھ وہ کہتا ہے وَنَمُدُّ لَهٗ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا: اور لمبا کریں گے اس کے لئے، بڑھائیں گے اس کے لئے عذاب بڑھانا، یعنی خوب بڑھانا۔ وَنَرِثُهٗ مَا يَقُوْلُ: اور ہم اس کے وارث ہوجائیں گے اس چیز کے جو وہ کہتا ہے، یعنی جو مال و اولاد یہ کہتا ہے وہ سب اس سے چھوٹ جائے گی، وہ ہمارے ہی قبضے میں ہوگی۔ وارث ہوں گے ہم اس کے اس چیز میں جو وہ کہتا ہے۔ وَيَاْتِيْنَا فَرْدًا: اور آئے گا وہ ہمارے پاس تن تنہا۔ فرد: تن تنہا، جس کے ساتھ کوئی دوسرا معاون ناصر نہ ہو۔ وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً: ان لوگوں نے اختیار کیے اللہ کے علاوہ معبود۔ اٰلِهَةً اِلٰہ کی جمع۔ لِيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا: تاکہ ہوجائیں وہ آلہہ ان کے لئے عزّت کا باعث، غلبے کا باعث۔ تاکہ وہ ان کے لئے عزّت کا باعث ہوجائیں۔ كَلَّا: یہ آلہہ ہرگز عزّت کا باعث نہیں ہوں گے، كَلَّا: ہرگز نہیں، سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ: عنقریب انکار کردیں گے وہ ان کی عبادت کا، وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا: اور ہوجائیں گے وہ ان کے خلاف، ان پر ضد ہوجائیں گے، ضد مخالف کو کہتے ہیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

”بعث بعد الموت“ پر اِشکال کا تفصیلی جواب

آیات کے ترجمے سے آپ کے سامنے یہ بات واضح ہوگئی کہ یہ رکوع تذکیرِ آخرت پر مشتمل ہے، اور جو لوگ آخرت کے منکر ہیں ان کے جس قسم کے شبہات ہیں ان کو ان آیات میں رَدّ کیا گیا ہے۔ بہت ساری آیات میں یہ مضمون ذکر کیا گیا کہ یہ مشرکین مکہ جو آخرت کے منکر تھے، عیسائی نصاریٰ منکر نہیں تھے، یہود منکر نہیں تھے، کیونکہ یہ تو اپنے آپ کو اللہ کے پیغمبروں کی طرف منسوب کرتے ہیں، اپنے آپ کو صاحبِ کتاب کہتے ہیں، ہر پیغمبر نے آخرت کی تذکیر کی، یہود بھی آخرت کے قائل ہیں اور نصاریٰ بھی قائل ہیں، البتہ مشرکینِ مکہ منکر تھے، وہ کہتے تھے کہ مرجائیں گے، مٹی ہوجائیں گے، بعد میں کہاں اٹھنا اٹھانا ہے؟ یہ ایسے ہی باتیں ہیں، جو کچھ ہے اسی زندگی میں ہے، اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ (سورۂ مؤمنون: ۳۷) بس یہی قصہ ہے دُنیا کا، پیدا ہوتے ہیں اور مرجاتے ہیں، باقی! اس کے بعد اٹھنا وٹھنا کوئی نہیں، یہ مشرکین کا نظریہ تھا۔ جب ان کے سامنے یہ بات آتی کہ اللہ تعالیٰ تمہیں مار کے دوبارہ زندہ کرے گا، تو وہ تعجب کرتے کہ جب یہ ہڈیاں چورا چورا ہوجائیں گی ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا (سورۂ اسراء: ۴۹)، ہڈیاں چورا چورا ہوجائیں گے اور ذرّے ذرّے بکھر جائیں گے، مٹی کھا جائے گی، مٹی ہوجانے کے بعد، ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا (سورۂ رعد: ۵)، جس وقت ہم مٹی ہوجائیں گے، ہماری ہڈیاں ریزہ ریزہ ہوجائیں گی، تو کیا کوئی دوبارہ بھی زندہ ہوسکتا ہے؟ ان میں پھر بھی جان ڈالی جاسکتی ہے؟ تو یہ لفظ جو بولتے تھے تو اس کے پس منظر میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کا انکار ہے، اگر اللہ تعالیٰ کے علم اور قدرت کے اوپر انسان کو اعتماد ہو کہ کوئی ذرّہ اللہ کے علم سے باہر نہیں، ذرّہ ذرّہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے، اور انسان کو اللہ کی قدرت کا خیال ہو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کے اوپر قادر ہے، تو پھر انسان آخرت کا انکار نہیں کرسکتا، کہ مرنے کے بعد دوبارہ بھی زندہ کیا جاسکتا ہے، یہ اللہ کے بس میں ہے، یہ قدرت میں ہے، اللہ کی قدرت سے باہر نہیں ہے۔ اس مسئلے کو سمجھانے کے لئے اکثر و بیشتر اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو اس کی ابتدائی پیدائش ہی یاد دلائی ہے، کہ تمہیں دوبارہ زندہ کرنے پر تعجب کیوں ہے؟ تم اپنے آپ کو دیکھتے نہیں؟ کہ پہلے بھی ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے۔ یہ بہت بڑی دلیل ہے، یہ معمولی بات نہیں، سورۂ یٰسٓ میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ۝ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ ۚ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ۝ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ ۝ یہی مضمون وہاں ہے، کہ کیا انسان دیکھتا نہیں کہ ہم نے اس کو ایک ٹپکائی ہوئی بوند سے پیدا کیا، یہ ایک بوند سے بنایا گیا ہے، فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ اب یہ بالکل کھلم کھلا جھگڑے کرتا ہے، اتنا کھلم کھلا جھگڑا کرتا ہے، ضَرَبَ لَنَا مَثَلًا ہمارے لیے مثالیں بیان کرتا ہے، وَنَسِيَ خَلْقَهٗ اور اپنے پیدا کیے جانے کو بھول گیا۔ مثالیں کیا بیان کرتا ہے؟ کہ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ کہ ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا؟ جس وقت بوسیدہ ہوجائیں گی، ان ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا؟ یہ ہمارے لیے یوں مثالیں بیان کرتا ہے، کہتے ہیں کہ ایک کافر بوسیدہ ہڈی لے کر آیا، ہاتھ کے ساتھ اس کو مسلا، بالکل چورا چورا ہوگئی، کہتا ہے یہ ہڈی بھی دوبارہ زندہ ہوسکتی ہے؟ تو یوں ہمارے سامنے مثالیں بیان کرتا ہے، اور بات وہی ہے

نَسِیَ خَلْقَهٗ اپنے پیدا کیے جانے کو بھول گیا، تو آپ ان کے جواب میں کہہ دیجئے کہ یُحْیِیْهَا الَّذِیْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ان کو وہی پیدا کرے گا جس نے ان کو پہلی دفعہ پیدا کیا تھا، وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِیْمٌ وہ ہر طرح سے پیدا کرنا جانتا ہے، ابتداءً پیدا کرنا بھی جانتا ہے، دوبارہ پیدا کرنا بھی جانتا ہے، وہ خلاق ہے، ہر چیز کو پیدا کرتا ہے، اور خوب اچھی طرح سے پیدا کرسکتا ہے، علم اس کا بہت محیط ہے۔ تو قدرت میں شک کی بنا پر وہ اس قسم کی بات کرتے تھے، تو اللہ تعالیٰ انسان کو اس کی ابتدائے خلق یاد دلاتا ہے۔ انسان کی بنیاد رکھی گئی پانی کے ایک قطرے سے، لیکن یہ پانی کا جو قطرہ ہے یہ سُلالہ ہے، یہ خلاصہ ہے ان غذاؤں کا، دواؤں کا، مشروبات کا جو آپ کے باپ نے استعمال کیے، جس سے نطفے کا قطرہ تیار ہوا، غذائیں کھائیں، مشروبات پیئے، دوائیں استعمال کیں، تو اس میں سے وہ خلاصہ نکلا۔ اب اس میں بھی معلوم نہیں کہاں کہاں کے اثرات ہیں، پہلے تو یہ ہی معلوم نہیں کہ اس میں کتنے اثرات ہیں، کہاں کہاں سے اس میں یہ اثر آیا، پھر اس پر جو تعمیر شروع ہوتی ہے اس میں ماں کا خون شامل ہوتا ہے حیض کا خون، اور وہ خون بھی غذا کا خلاصہ ہے، اب ماں نے جتنا گوشت کھایا اس میں ذرّات ہیں جو آپ کے وجود کو لگتے جارہے ہیں، جتنا دُودھ پیا اس میں ذرّات ہیں جو آپ کے وجود کو لگتے جارہے ہیں، جتنا فروٹ کھایا اس میں ذرّات ہیں جو آپ کے وجود کو لگتے جارہے ہیں، اور جتنی ادویات، مقویات، جو بھی استعمال کیا اس میں سے ذرّات آپ کے وجود کو لگتے جارہے ہیں اور آپ بنتے چلے جارہے ہیں، تھوڑی دیر کے بعد آپ دنیا میں تشریف لے آئے تو قد آپ کا نو انچ تھا، فٹ تھا، اور اس کے بعد آپ کی یہ تعمیر جو شروع ہوئی تو اسی غذا سے ہے، آپ کھاتے جاتے ہیں وہ تعمیر ہوتی چلی جاتی ہے۔ اب آپ کو معلوم ہے؟ کہ وہ گندم کے دانے کہاں کہاں سے اکٹھے ہوئے جو آپ کے اس وجود کو لگے ہوئے ہیں؟ اور دُودھ کہاں کہاں سے آیا، اور اس بھینس نے کہاں کہاں سے گھاس کھایا تھا جس کے ذرّات آپ کے وجود میں آئے؟ اور پانی کہاں کہاں سے آیا تھا جس کو آپ نے پیا تو آپ کے بدن کی تعمیر میں وہ صرف ہوا، دوائیں کہاں کہاں سے آئی تھیں؟ کیا کوئی انسان یہ تفصیل جان سکتا ہے کہ اس کے ذرّات دُنیا میں کہاں کہاں بکھرے ہوئے تھے جو اکٹھے ہو کے اس وجود میں آگئے؟ اب میں مثال کے طور پر ایک گائے کا گوشت کھاتا ہوں، تو گائے کا گوشت ان چیزوں سے تیار ہوا ہے جو گائے نے گھاس پھوس کھایا، تو جہاں جہاں سے اس نے گھاس کھایا اور اس گھاس کے ذرّات اس کے بدن میں آکے گوشت بنے، وہ گوشت میرے وجود میں آیا، اس کے ذرّات میرے وجود کو لگے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ سارے علاقے میں میرے ذرّات بکھرے ہوئے تھے، جو اس راستے سے اکٹھے ہو کے میرے وجود میں آگئے، دوائیں کہاں کہاں سے آتی ہیں، دوسرے ملکوں سے آتی ہیں، اور فروٹ کس کس علاقے سے آتے ہیں، تو جب ہم کھاتے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ جو انگور ہم نے کھائے وہ افغانستان سے آئے تھے، چمن سے کوئٹہ سے آئے تھے، تو اس میں بھی ہمارے وجود کے ذرّات تھے جو اکٹھے ہو کے ہمارے وجود میں آگئے، اور ہمارے وجود کے ساتھ لگ گئے۔ تو ابتداءً جو آپ کو پیدا کیا گیا ہے وہ بھی ساری دُنیا سے بکھرے ہوئے ذرّات اکٹھے کر کے آپ کو بنایا ہے، یہ نہیں کہ ایک ہی گڑھے سے مٹی نکالی، مٹی نکال کے اس کا بُت بنالیا اور اس میں رُوح ڈال دی، اور ایک جگہ سے آپ بنے ہوئے ہیں، ایسی بات نہیں ہے، ساری دُنیا سے بکھرے ہوئے ذرّات اکٹھے کیے جاتے ہیں اور اکٹھا کرنے کے بعد آپ کا ایک وجود بنتا ہے، ہمارا گوشت ہماری غذا کا نتیجہ ہے، اور غذا دیکھو! کہاں کہاں سے آتی ہے؟ اور

ہمیں کہاں کہاں سے ملتی ہے، بکرے کا گوشت کھایا تو بکرے نے گھاس کہاں کہاں سے کھایا، اسی طرح اگر دُودھ استعمال کیا ہے تو دُودھ جس بھینس سے تیار ہوا ہے اس بھینس نے کہاں کہاں سے چارہ کھایا، ہر جگہ آپ کے ذرّات بکھرے ہوئے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اِکٹھا کر کے آپ کا ایک وجود بنا دیتا ہے، تو اگر ایک دفعہ بکھرے ہوئے اجزا کو اِکٹھا کر کے اللہ تعالیٰ وجود بخشا ہے تو دوبارہ ان اجزا کو منتشر کرنے کے بعد کیا دوبارہ اِکٹھا نہیں کر سکے گا؟ جب ایک دفعہ اس نے اکٹھے کر کے دکھا دیے پھر یہ بات تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آتی کہ دوسری دفعہ بکھرنے کے بعد پھر بھی اکٹھے کیے جا سکتے ہیں۔ انسانوں کے عرف اور محاورے میں پہلی دفعہ کام کرنا مشکل ہوتا ہے دوبارہ کرنا آسان ہوتا ہے، جس طرح سے فرمایا: وَهُوَ أَهْوَنُ عَلَيْهِ (سورۂ رُوم: ۲۷) کہ دوبارہ اعادہ اس کے اوپر زیادہ آسان ہے، لَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ (سورۂ اَحقاف: ۳۳) اللہ تعالیٰ ان کو پیدا کر کے تھکا نہیں، أَفَعَيِينَا بِالْخَلْقِ الْأَوَّلِ (سورۂ ق: ۱۵) کیا پہلی دفعہ پیدا کر کے ہم تھک گئے؟ ایسی بات نہیں، اعادہ اوّل بار کرنے کے مقابلے میں اہون ہوتا ہے، اس لیے تمہیں بات سمجھنی چاہیے۔ تو ان مشرکین کو اسی دلیل کے ساتھ سمجھایا جا رہا ہے کہ أَوَلَا يَذْكُرُ الْإِنْسَانُ: کیا انسان کو یاد نہیں کہ ہم اس کو پیدا کر چکے ہیں اس سے قبل، وَلَمْ يَكُ شَيْئًا: اور وہ کچھ بھی نہیں تھا۔ تو جب ہم نے اس کو پہلے عدم سے موجود کیا، تو اب دوبارہ زندہ کرنا اس کی سمجھ میں کیوں نہیں آتا؟

عقیدۂ آخرت کی اہمیت

اور قرآنِ کریم میں اس عقیدے پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے یعنی آخرت کی یاد دہانی پر، کیونکہ عمل کی اصلاح کے لئے، نظریات کی اصلاح کے لئے جتنا مؤثر یہ عقیدہ ہے اتنا مؤثر کوئی عقیدہ نہیں، اگر انسان کو پتا ہے کہ میں نے کسی کے سامنے پیش ہونا ہے اور جا کے حساب کتاب دینا ہے، تو وہ اپنی زندگی سوچ سمجھ کے گزارے گا، ایک ایک لحہ میں وہ اپنی ذمہ داری محسوس کرے گا، تو اس کی زندگی کسی خاص نہج پہ آ جائے گی، فکر جس وقت لگ جائے گی کہ میں نے حساب کتاب دینا ہے تو انسان اپنے آپ کو سنبھال لے گا، سنوار لے گا۔ اور جب اس کو پتا ہے کہ نہیں، کھانے پینے کے لئے آئے ہیں، کھائیں پئیں گے، مر جائیں گے، تو وہ کون سی چیز ہے جو انسان کو سنبھالے اور نیکی کی طرف لائے؟ وہ اپنی شہوات کے پیچھے لگ جائے گا، جانوروں کی طرح کھائے گا اور اپنی زندگی گزارے گا، پتا ہے کہ بعد میں کچھ ہے نہیں، تو جس طرح سے عیش اور لذت پرستی ہوتی ہے کر لو، تو اِنسان میں کردار کی کمزوری غفلت عن الآخرۃ کے نتیجے میں ہے، اور اعمال کی اصلاح ہوتی ہے فکرِ آخرت کے ساتھ، اس لیے اللہ تعالیٰ بار بار اس عقیدے کی یاد دہانی فرماتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے خلاف کسی کو بولنے کی جرأت نہیں ہوگی

آگے تاکید کے ساتھ اس بات کو نقل کیا گیا کہ "تیرے رَبّ کی قسم البتہ ہم انہیں ضرور جمع کریں گے اور شیاطین کو بھی" شیاطین سے مراد ان کے لیڈر جو ان کو بہکاتے ہیں، یا شیاطینِ جن، دونوں مراد ہو سکتے ہیں، یعنی ان کے لیڈر جو ان کو بہکاتے ہیں اور تحریکیں اُٹھاتے ہیں اور اسلام قبول کرنے سے روکتے ہیں یہ شیاطین بھی ساتھ ہوں گے، اور ان کے جو متبعین ہیں یہ بھی، اور اس

طرح سے شیطان اور شیطان کے چیلے وہ بھی اسی طرح سے ساتھ ہوں گے، جنّات اور انسان دونوں شیاطین کا مصداق ہو سکتے ہیں۔ ''پھر ہم انہیں حاضر کریں جہنم کے ارد گرد اس حال میں کہ گھٹنوں کے بل گرے ہوئے ہوں گے'' دہشت کے مارے، ''پھر ہم جدا کریں گے ہر جماعت میں سے جو ان میں سے رحمٰن پر زیادہ سرکش ہے'' یعنی جو زیادہ سرکش ہے، محرک قسم کا آدمی، لیڈر قسم کا، قائد قسم کا، ان کو ہم علیحدہ کرلیں گے، علیحدہ کرنے کے بعد ان کی قطار آگے لگائی جائے گی، باقی پیچھے پیچھے چلیں گے۔ جیسے یہاں دُنیا میں وہ آگے آگے ہوتے ہیں اور قوم پیچھے ہوتی ہے، وہاں بھی ان کو علیحدہ کر کے آگے لگائیں گے، تاکہ جہنم میں سب سے پہلے یہی گریں، اور اپنے ساتھ پھر اپنی قوم کو بھی لے جائیں، صراحت کے ساتھ آپ کے سامنے سورہ ہود میں آیا یَقۡدُمُ قَوۡمَهٗ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ فرعون اپنی قوم کے آگے آگے چلے گا قیامت کے دِن، اور پیچھے پیچھے وہ ہوں گے، فَاَوۡرَدَهُمُ النَّارَ (سورۂ ہود: ۹۸) سب کو جہنم میں جھونک دے گا، تو وہاں ان کو جدا کرنا اس لیے ہے تاکہ ان کو وہاں بھی قیادت بخشی جائے جس طرح سے یہاں یہ قائد ہیں، لیڈر صاحب جس طرح سے یہاں آگے آگے چلتے ہیں وہاں بھی ان کو آگے لگایا جائے گا، مجمع میں سے ان کو علیحدہ کرلیا جائے گا۔

''پھر ہم خوب جانتے ہیں ان لوگوں کو جو جہنم میں جانے کے زیادہ لائق ہیں'' یعنی ہمارا فیصلہ علم پر مبنی ہوگا، یہ نہیں کہ نعوذ باللہ! جس طرح سے دُنیا میں پکڑ دھکڑ شروع ہوتی ہے تو بے گناہ بھی پکڑے جاتے ہیں، اسی لیے پھر کسی کو کہنے سننے کا موقع مل جاتا ہے کہ جی! آپ کو فلاں کے متعلق شبہ ہوگیا، یہ تو اچھا آدمی ہے یہ تو بہت نیک ہے، ہم اس کو خوب اچھی طرح سے جانتے ہیں، آپ کو غلط فہمی ہوگئی، کہ آپ نے اس کو پکڑ کے جیل میں ڈال دیا، تو حاکم کے سامنے لوگ صفائیاں دینے کے لئے چلے جایا کرتے ہیں، دُنیا میں ایسے ہوتا ہے نا؟ کہ پکڑ دھکڑ شروع ہوئی اور ایک آدمی پکڑا گیا، اس کے سفارشی چلے گئے، جا کے کہتے ہیں کہ جی! اس کے متعلق تو آپ کو غلط فہمی ہوئی، یا کسی نے غلط شکایت کردی، ورنہ یہ تو بہت اچھا آدمی ہے، اس کو جیل میں نہیں ڈالنا چاہیے، یوں کر کرا کے اس کو چھڑا کے لے آئیں گے، لیکن اللہ تعالیٰ کا فیصلہ علم پر مبنی ہوگا، وہاں کسی کو دَم مارنے کی گنجائش نہیں، کہ اللہ تعالیٰ ایک آدمی کو پکڑے اور یہ کہے کہ یہ جہنم میں جانے کے لائق ہے، اور کوئی جا کے کہے کہ نہیں جی! یہ تو بہت نیک آدمی ہے، ایسا نہیں ہوگا، اللہ تعالیٰ کا فیصلہ علم پر مبنی ہوگا جس کے خلاف کسی کو بولنے کی جرأت نہیں ہوگی، کوئی اس کی صفائی نہیں دے سکے گا جس کو اللہ تعالیٰ پکڑ لے گا، یہ مطلب ہے اس کا، کہ اللہ کے یہ فیصلے علم پہ مبنی ہوں گے، اس میں کوئی غلطی کا امکان نہیں ہے، اور کوئی دوسرا شخص جا کے اس قسم کی بات نہیں کہہ سکتا کہ جی! آپ نے غلطی سے اس کو پکڑ لیا، یہ تو اچھا آدمی تھا، اور اس کو جہنم میں ڈال دیا، جیسے دنیا میں ہوتا ہے۔ اس سے ان کے سفارش والے نظریے کو رَدّ کرنا مقصود ہے جو مشرکین کہتے تھے، کہ ہمیں چھڑا لیا جائے گا۔ چھڑائیں گے کہاں؟ جب فیصلہ علم اور حکمت پر مبنی ہوگا تو اس کے خلاف کون زبان ہلا سکے گا۔ ''ہم خوب جانتے ہیں ان لوگوں کو جو زیادہ لائق ہیں جہنم کے از روئے داخل ہونے کے۔''

جہنم پر سے ہر ایک نے گزرنا ہے

وَاِنۡ مِّنۡكُمۡ اِلَّا وَارِدُهَا: تم میں سے کوئی بھی نہیں مگر جہنم پہ وارد ہونے والا ہے۔ اس کے متعلق حدیث شریف میں آتا

ہے کہ جو بھی انسان ہے، اچھا ہے یا بُرا ہے، نیک ہے یا بد ہے، جہنّم کے اوپر ورود ہر کسی کا ہوگا، جہنّم کے اُوپر ایک پُل ہے جس کو آپ ''پُل صراط'' کہتے ہیں، اس کے اُوپر ہر کسی کو گزارا جائے گا تا کہ جہنّم کا ایک نظارہ دیکھ لیں، دیکھنے کے بعد جب جنّت میں جائیں گے تو پھر جنّت کی لذت زیادہ محسوس ہوگی۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ وہاں سے کوئی اس طرح سے گزر جائے گا جیسے آنکھ جھپکتی ہے، کوئی اس طرح سے گزر جائے گا جیسے بجلی کوندتی ہے، کہ بجلی اِدھر چمکی اور اُدھر گئی، اور کوئی یوں گزریں گے جس طرح سے تیز رفتار گھوڑے پر جاتے ہیں، یہ درجات کے اعتبار سے ہوگا، کوئی پیدل جائے گا، کوئی کبھی گرے گا، کبھی اُٹھے گا، اور کوئی ایسے ہوں گے جو وہیں سے گھسیٹ گھسیٹ کے جہنّم میں پھینک دیے جائیں گے۔ یہ ساری تفصیل احادیثِ صحیحہ میں آتی ہے۔ ''بخاری شریف'' میں ''مسلم شریف'' میں بڑی لمبی لمبی روایتیں ہیں جن میں جہنّم پر سے ہر کسی کے گزرنے کا ذکر آیا ہے،[1] انبیاء علیہم السلام اس وقت چلتے ہوئے ''اَللّٰهُمَّ سَلِّمْ سَلِّمْ'' کہیں گے، اے اللہ! بچا، اے اللہ! بچا،[2] ہر کوئی اپنی اپنی اُمّت کی فکر میں ہوگا، تو سب وارد ہوں گے، اور یہ بات اللہ تعالیٰ نے اپنے اُوپر لازم کرلی اور فیصلہ شدہ ہے، سب نے جانا ہے۔

لیکن جانے کے بعد پھر ہوگا کیا؟ ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا: جو متقی پرہیزگار ہوں گے ان کو ہم بچالیں گے، ان کو جہنّم کی گرم ہوا بھی نہیں لگے گی، اور وہ جلدی سے گزر جائیں گے، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ جنّت میں جانے کے لئے جہنّم پر سے گزر کے جانا پڑے گا تا کہ جاتے جاتے اسے بھی دیکھتے جائیں، اور پھر جب جنّت میں جائیں گے تو اس کی قدر ہوگی، جیسے برزخ کی روایات میں آتا ہے کہ نیک آدمی ہو تو پہلے اس کے سامنے جہنّم کی کھڑکی کھولی جاتی ہے اور اسے جہنّم دکھائی جاتی ہے، اور یہ کہا جاتا ہے کہ اگر تو اچھا نہ ہوتا تو یہاں آتا، اور پھر جنّت کی کھڑکی کھولتے ہیں اور دکھاتے ہیں کہ دیکھو! اللہ تعالیٰ نے اب تجھے اس کے بدلے میں یہ جگہ دی ہے۔[3] اس سے شکر کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور نعمت کا احساس اچھا ہوتا ہے، تو یہاں بھی وہی بات ہے کہ اللہ نے اپنے ذمے لازم کرلیا کہ ہر کسی کا ورود ہوگا، پھر نجات دیں گے ہم ان لوگوں کو جو متقی ہیں، اور چھوڑ دیں گے ظالموں کو جہنّم میں منہ کے بل گرے ہوئے، گھٹنوں کے بل گرے ہوئے، اوندھے گرے ہوئے، جس طرح سے پریشانی کی حالت میں انسان ہوتا ہے۔

آخرت کے متعلق کُفّار کی غلط فہمی

جب ان پہ ہماری واضح واضح آیات پڑھی جاتی ہیں اور اس میں آخرت کی یاد دہانی کروائی جاتی ہے، آخرت کا عذاب ذکر کیا جاتا ہے اور ثواب کا تذکرہ آتا ہے، تو یہ کافر ایک دوسرا تعجب کرتے ہیں، جس طرح سے پہلا تعجب تھا، تو دوسرا تعجب یہ تھا کہ وہ کہتے تھے کہ دیکھو بھائی! ایک فریق تم ہو جو کہتے ہو کہ ہم مؤمن ہیں ہم ایمان لے آئے، اور ایک فریق ہم ہیں جن کو تم کہتے ہو کہ کافر ہیں، لیکن جب ہم دیکھتے ہیں تو مال ہمارے پاس، دولت ہمارے پاس، برادری ہماری، جتھہ ہمارا، دوست ہمارے، احباب

(۱) دیکھیں: بخاری ۲/ ۱۱۰۷، باب قول اللہ وجوہ یومئذ. مسلم ۱/ ۱۰۲، باب معرفۃ طریق الرؤیۃ. مشکوٰۃ ۲/ ۴۹۰ تا ۴۹۵، باب الحوض والشفاعۃ۔ نیز مظہری وغیرہ۔

(۲) بخاری ۱/ ۱۱۱، باب فضل السجود۔ ۲/ ۹۷۳، باب الصراط. مشکوٰۃ ۲/ ۴۹۰، باب الحوض فصل اول۔

(۳) بخاری ۱/ ۱۷۸، باب المیت یسمع خفق النعال. مشکوٰۃ ص ۲۵، باب اثبات عذاب القبر فصل اول۔

ہمارے، رونق ہماری مجلسوں میں، گھر سامان سے ہمارے بھرے پڑے ہیں، تو دُنیا کی ہر نعمت سے مالا مال تو ہم ہیں۔اور اس کے مقابلے میں تمہارے پاس کیا ہے، کھانے کو روٹی نہیں، پہننے کو کپڑا نہیں، دھکے کھاتے پھرتے ہو، یہ ہے تمہاری کیفیت، تو اس طرح سے وہ مقابلہ کرتے، کیونکہ قدرتی بات ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اللہ کی حکمت یہی ہے کہ اکثر و بیشتر اہلِ ایمان اہلِ کفر کے مقابلے میں دولت میں اور دُنیاداری میں کچھ کم ہی ہوتے ہیں، اور پھر خاص طور پر ابتدائی دور میں جب حضور ﷺ نے دعوت شروع کی تھی تو اکثر و بیشتر غلام، مساکین قسم کے لوگ ماننے والے تھے، اگرچہ اچھے دولت منداور صاحب وجاہت لوگ بھی تھے لیکن زیادہ طبقہ مساکین کا تھا۔تو وہ کہتے کہ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ ساری نعمتیں ہمارے لیے ہیں اور تم ہر نعمت سے محروم ہو، اوّل تو آخرت ہوگی ہی نہیں، اگر آخرت ہوئی تو ہماری یہ حالت بتاتی ہے کہ اللہ کو ہمارے ساتھ محبت ہے، ہم اللہ کے مقبول ہیں، اور یہ ہمارا مقدر ہے کہ ہم نے خوش حال رہنا ہے، تو اگر آخرت ہوئی تو آخرت میں بھی ہمارا یہی حال ہوگا، تو دُنیا کے اندر اپنی خوش حالی کو اپنے حق ہونے کی دلیل بناتے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول ہونے کی دلیل بناتے۔اور یہی ذہن آج بھی ہے یعنی اگر کسی شخص کو نیکی کی ترغیب دو تو وہ نیکوں کے حال کو دیکھ کے کہ یہ نمازیں پڑھنے والے، یہ روزے رکھنے والے، یہ مدرسوں کے طالب علم، یہ قرآن پڑھنے والے، نہ کسی نے کپڑا ڈھنگ کا پہنا ہوا ہے، نہ ان کو نوکری ملتی ہے، نہ ملازمت ملتی ہے، نہ ان کی تجارتیں ہیں، مساکین قسم کا گروہ ہے، تو کیا اللہ کے مقبولین ایسے ہوتے ہیں؟ ہمیں اللہ نے کاریں دے رکھی ہیں، کوٹھیاں دے رکھی ہیں اور یہ سب کچھ دے رکھا ہے، یہ علامت ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے مقبول ہیں، جیسے اللہ کی عنایت ہم پر یہاں ہے، اگر آخرت ہوئی تو آخرت میں بھی ایسے ہی ہوگا، یہ ان کو دوسرا مغالطہ لگتا تھا، اور دنیا دار آدمی ہمیشہ اس قسم کے تذکرے میں اسی مغالطے میں پڑتا ہے، تو اب یہاں ان کی یہ بات ذِکر کر دی گئی، کہ جب ان کے سامنے ہماری واضح واضح آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو یہ کافر لوگ مؤمنوں کو کہتے ہیں، دونوں فریقوں میں سے کون سا فریق بہتر ہے از روئے ٹھکانے کے اور کون زیادہ اچھا ہے از روئے مجلس کے؟ مطلب کیا؟ کہ ہم اچھے ہیں، ہمارا مکان بھی اچھا ہے ہماری مجلس بھی اچھی ہے، اس سے وہ اپنے حق ہونے پر استدلال کرتے ہیں یا اپنے اچھے ہونے پر استدلال کرتے ہیں۔

کُفّار کو پچھلی تاریخ پر نظر ڈالنی چاہیے

اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب یہ ہے کہ یہ بھولے ہوئے ہیں، ان کو پچھلی تاریخ پہ نظر ڈالنی چاہیے، واقعات سب سے سچی دلیل ہوتے ہیں، واقعات جھوٹ نہیں بولا کرتے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان کو چاہیے کہ ماقبل کی طرف دیکھیں، گزشتہ تاریخ کا مطالعہ کریں، ان لوگوں سے زیادہ زیادہ مال دار لوگ، ان لوگوں سے بڑے بڑے ذی جاہ لوگ اور بڑی بڑی فوجوں والے، اور بڑے بڑے خاندانوں والے، اللہ تعالیٰ نے وہ بھی مروڑ کے رکھ دیے، اور ان کے اوپر جو عذاب آیا تو یہ قطعی دلیل ہے اس بات کی کہ دنیا میں ساز و سامان کا حاصل ہونا اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبولیت کی دلیل نہیں ہے، اگر مقبولیت کی دلیل ہوتی تو وہ دنیا میں عذاب کی گرفت میں کیوں آتے؟ اور کتنے قصے قرآنِ کریم میں بیان کیے گئے ہیں کہ اللہ نے مؤمنوں کو اس دنیوی عذاب سے بچایا، ایک

ہی بستی میں رہنے والے ہیں، ایک ہی محلے میں رہنے والے ہیں، عذاب آتا ہے، اور کافر رگڑے جاتے ہیں مؤمن بچ جاتے ہیں، تو یہاں سے یہ لوگ دلیل پکڑیں کہ مال و دولت کا حاصل ہونا اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول ہونے کی علامت نہیں ہے، اور یہ نازونخرے کرنے کی بات نہیں، ''کتنی ہی جماعتیں ہم نے ان سے پہلے ہلاک کردیں، وہ زیادہ اچھے تھے از روئے گھر کے سامان کے اور زیادہ اچھے تھے از روئے نمود و نمائش کے۔''

مال دار کافر اور غریب مؤمن میں سے حقیقتاً اچھی حالت میں کون؟

اب آگے آگیا تحقیقی جواب، کہ اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے علم وحکمت کے طور پر ایک بات اختیار کر رکھی ہے کہ جو کوئی گمراہی میں ہوتا ہے بھٹکتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے فوراً نہیں پکڑتا، بلکہ اپنے علم وحکمت کے طور پر اللہ نے یہ عادت اختیار کرلی کہ اس کی رَسّی ڈھیلی چھوڑتا ہے کہ اگر سمجھنا ہو تو سمجھ جائے، ورنہ پھر یہ انتہا کو پہنچ جائے، پکڑا جائے تو چھوٹنے کی گنجائش نہ ہو، اور یہ جو رَسّی ڈھیلی چھوڑتا ہے یہ اللہ کی طرف سے تو مہلت ہے اور وہ کافر سمجھتے ہیں کہ شاید اللہ ہم سے خوش ہے جو ہمیں کھلانا پلانا شروع کردیا۔ پتا نہیں آپ نے مچھلی کا کبھی شکار کیا ہے یا نہیں کیا، یا کسی کو شکار کرتے ہوئے دیکھا ہے یا نہیں دیکھا، جس وقت مچھلی کو پکڑنے کے لئے کانٹا پھینکا جاتا ہے تو اس کے اوپر اس کی کوئی خوراک لگادی جاتی ہے، یا تو سانپا (کیچوا) لگادیتے ہیں، یا کوئی اور چیز مثلاً گوشت کا ٹکڑا لگادیتے ہیں، کانٹا پھینک دیا جاتا ہے، اب مچھلی آتی ہے اور دیکھتی ہے کہ بہت لذیذ قسم کا لقمہ آگیا، اور وہ منہ کھول کے اس کو نگلتی ہے، تو جب نگلتی ہے اور اُوپر تاگے کو جھٹکا لگتا ہے اور اُوپر کاک تیرتا ہے، تو شکاری سمجھ جاتا ہے کہ کسی مچھلی نے منہ مارا ہے، تو جو تجربہ کار شکاری ہوا کرتا ہے وہ فوراً نہیں جھٹکا دیتا، کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس نے ابھی منہ لگایا ہی ہو اور یہاں سے جھٹکا دے دیں تو کانٹا اچھی طرح نہیں پھنسے گا، تو وہ ڈور ڈھیلی چھوڑ دیتا ہے، جب وہ ڈور ڈھیلی چھوڑ دے گا تو کانٹا اچھی طرح سے نگل جائے گی، پھر جھٹکا جو دیا جائے گا تو چھوٹنے کی گنجائش نہیں ہوگی، اور جب ڈور ڈھیلی چھوڑی تھی تو وہ خوش تھی، اسی کو کسی اُردو شاعر (اکبر اِلہ آبادیؒ) نے اپنے الفاظ میں ادا کیا ہے کہ:

مچھلی نے ڈھیل پائی ہے، لقمے پہ شاد ہے   صیاد مطمئن ہے کہ کانٹا نگل گئی!

یعنی وہ تو سمجھتی ہے کہ مجھے لقمہ مل گیا، وہ خوش ہے کہ مجھے لقمہ مل گیا، شکاری خوش ہے کہ کانٹا نگل گئی ہے، تو یہ حساب ایسے ہی ہوتا ہے کہ جس وقت پھر ایک ہی جھٹکا لگتا ہے تو پھر کانٹا حلق میں ایسے پھنستا ہے کہ پھر نکلنے کی گنجائش نہیں ہوتی، اس لیے یہ مال، یہ دولت، یہ اولاد، یہ دنیا کا جاہ جلال، یہ سارے کا سارا ایک آزمائش کی چیز ہے، اور اللہ تعالیٰ رَسّی ڈھیلی چھوڑ دیتا ہے، اب یہ لوگ کھاتے ہیں پیتے ہیں، سب کچھ کرتے ہیں، اور پھر اللہ کے سامنے غراتے ہیں تو جس دِن اللہ تعالیٰ انہیں پکڑے گا تو پھر چھوٹنے کی گنجائش نہیں ہوگی، ان کے مال و دولت کا تو انجام یہ ہوگا۔ اور جن کو اللہ تعالیٰ نیک اعمال کی توفیق دے دیتے ہیں ان کے سامنے بہترین انجام پیش ہوگا، باقیات صالحات ثواب اور مردِ انجام کے اعتبار سے اللہ کے ہاں بہت اچھے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہاں دو باتوں کا مقابلہ کیا ہے، کہ ایک کو تو اللہ تعالیٰ دنیا کے اندر مال و دولت دیتا ہے اور نیکی سے محروم کردیتا ہے، وہ گمراہی میں پڑا رہا جاتا

ہے، اور ایک کو اللہ تعالیٰ نیکی کے اعمال کی توفیق دیتا ہے، ظاہری طور پر وہ مال و دولت سے محروم ہوتا ہے، یہ دو فریق ہیں، اب سمجھنے کو تو چاہیے یہ سمجھیں کہ ہم اچھے ہیں جن کے پاس مال و دولت ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ وہ اچھے ہیں جن کو نیکی کی توفیق ہوگئی، کیونکہ دیکھنا انجام کو ہے، ظاہر کو نہیں دیکھا جایا کرتا، انجام کو دیکھا جایا کرتا ہے۔

مثال سے وضاحت

عزیزو! ایک سوچنے کی بات ہے، ایک ہی دسترخوان پر دو آدمی بیٹھے ہیں، اور ایک کے سامنے بھنا ہوا گوشت اور حلوہ رکھا ہوا ہے اور وہ مزے لے لے کر کھا رہا ہے، اور دُوسرا خشک روٹی پانی کے ساتھ کھا رہا ہے، یا بیٹھا ہوا خشک چنے چبا رہا ہے اور پانی کا گھونٹ بھر رہا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ چنے اور خشک روٹی یہ صحیح ہے، اور اس بھنے ہوئے گوشت اور حلوے میں زہرِ قاتل ملی ہوئی ہے، اب جس وقت ایک آدمی دیکھے گا، کہے گا کہ مزے تو اس کے ہیں، دیکھو! کیسا شان دار بھنا ہوا مصالحہ دار گوشت کھا رہا ہے، کس طرح سے لذیذ تر بہ تر حلوہ رکھا ہوا ہے، اور اس کی بھی کوئی زندگی ہے جو خشک ٹکڑے چبا رہا ہے اور پانی کے ساتھ ان کو نگل رہا ہے جو گلے سے اُترتے بھی نہیں، اب جس وقت تک دسترخوان پر بیٹھے ہیں تو کیفیت ایسے ہی ہے، خوش حال یہ نظر آتا ہے، اور جس وقت اُٹھ کے چلیں گے اور چند گھنٹے گزریں گے اور یہ آنتڑیاں اندر سے کٹ کٹ کے جب پاخانے کے راستے نکلنے لگیں گی، اور یہ ناک کے بل گرے گا، اور اس زہر کی وجہ سے تڑپے گا، اور وہ (دُوسرا) چنے کھا کے گھوڑے کی طرح ہنہنائے گا، اور خشک ٹکڑے کھا کے وہ صحت مند ہو کے بھاگا پھرے گا، پھر پتا چلے گا کہ یہ حلوہ اور قورمہ کیا حیثیت رکھتا تھا؟ اور یہ ٹکڑے کیا حیثیت رکھتے تھے؟ یہ دیکھنے کے بعد اِنسان کہے گا کہ اللہ! تیرا شکر ہے کہ میں نے وہ حلوہ نہیں کھایا، اے اللہ! تیرا اِحسان ہے کہ میرے سامنے وہ پلیٹ نہیں آئی جس میں بھنا ہوا گوشت تھا، اچھا ہوگیا کہ خشک ٹکڑے پر گزارہ کرلیا۔ تو چند منٹ کی لذت کے بعد جب یہ انجام سامنے آئے گا تو ٹکڑے چبانے والے اللہ کا شکر ادا کریں گے اور قورمہ کھانے والے ناک کے بل گرے ہوئے ہوں گے۔ لیکن یہ حقیقت انسان کے ذہن میں اُترتی نہیں، غفلت طاری ہے، اور اللہ تعالیٰ یہی کہتا ہے کہ دو باتیں ہیں، دُنیا کے ساز و سامان میں پھنس کے جو لوگ غافل ہوگئے ان کی کیفیت ایسی ہے کہ بعد میں جس وقت عذاب آئے گا تو اس وقت ان کے سامنے ساری حقیقت کھل جائے گی کہ ہم تو بہت بڑے دھوکے میں تھے، اور جن کو اللہ تعالیٰ نے نیکی کی توفیق دے دی وہ بظاہر اگرچہ تمہیں مال میں کم نظر آئیں، اور یہ نظر آئے کہ اِن کی کوئی عزت نہیں، ان کا کوئی جاہ و جلال نہیں، ان کا کوئی ساتھ دینے والے نہیں، اور اُن کے ہاں جاکے دیکھو! حقہ رکھا ہوا ہوگا اور بیس پچیس آدمی جھولی چک بیٹھے ہوں گے سامنے، تعریف کرنے والے، ذرا سی ضرورت پیش آجائے تو خدمت میں بھاگنے والے، اور اِن غریبوں کو پوچھنے والا کوئی نہیں۔ لیکن چند دِن ٹھہر جایئے، ذرا اس جہان سے آنکھیں بند ہونے دیجئے، اور اگلا جہان آئے گا تو تمہیں پتا چل جائے گا کہ نتیجہ کیا نکلا؟ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ باقیاتِ صالحات یہ نتیجے کے اعتبار سے اچھے ہیں، اور یہ مال و دولت اور اس قسم کا جاہ جلال نتیجے کے اعتبار سے خراب ہے۔ تو یہ مثال ویسی ہے جیسے میں نے عرض کی کہ اچھا کھاؤ زہر آلود، اور خشک کھاؤ صاف ستھرا، تو تم ہی بتادو کہ خشک کھانا بہتر ہے، یا زہر آلود لذیذ کھانا بہتر ہے کہ انسان کہے کہ چلو! مرنا تو ہی

ہے، کم از کم لذیذ تو ہے، اس لذت کو دیکھتے ہوئے کوئی کہے کہ مرنا تو ہے ہی، بعد میں جو ہوگا دیکھی جائے گی، کون جانتا ہے بعد میں کیا ہوگا؟ لیکن مزے تو لو، تو مزے لینے کے تھوڑی دیر بعد یہ عبرت ناک انجام سامنے آ جائے گا، یہاں وہی مقابلہ کر کے بتایا، کہ آپ کہہ دیجئے کہ جو کوئی گمراہی میں ہو، اللہ کی یہ عادت ہے، یہ اللہ کی شان کے لائق ہے کہ چاہیے کہ مہلت دے دے اسے رحمٰن مہلت دینا، حتیٰ کہ جب دیکھیں گے وہ اس چیز کو جس کا وعدہ دیے جاتے ہیں، یا عذاب یعنی دنیا میں، یا قیامت، پھر ان کو پتا چل جائے گا کہ کون بُرا تھا از روئے مکان کے، اور کون کمزور تھا از روئے مددگاروں کے، جُند لشکر کو کہتے ہیں، لشکر کس کا کمزور تھا اور جگہ کس کی بُری تھی، پھر ان کو پتا چل جائے گا۔ اور اس کے مقابلے میں دوسرا گروہ جس کو اَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ میں دوسری حیثیت میں رکھتے تھے، ان کے متعلق کہا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہدایت یافتہ لوگوں کی ہدایت بڑھاتا ہے، جس طرح سے دنیا میں مال و دولت والے آئے دن مال و دولت میں اضافہ کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نیکوں کو نیکی کی توفیق دے کر ان کی ہدایت میں اضافہ کرتا ہے، اور باقی رہنے والے نیک عمل بہتر ہیں تیرے رَبّ کے نزدیک از روئے ثواب کے اور بہتر ہیں از روئے انجام کے۔

اَفَرَءَیْتَ الَّذِیْ کَفَرَ بِاٰیٰتِنَا: کیا آپ نے دیکھا ایسے شخص کو جس نے ہماری آیات کا انکار کیا۔ بار بار مختلف عنوانات کے تحت وہ بات دوہرائی جا رہی ہے۔ ''اور وہ کہتا ہے کہ میں ضرور دیا جاؤں گا مال و اولاد'' یہ وہی بات ہے کہ اگر آخرت ہوئی تو مجھے وہاں مال اولاد ضرور ملے گا، جیسے یہاں ہے۔ ''کیا اس نے غیب پہ اطلاع پالی؟'' اگلا جہان اس کے سامنے آ گیا؟ اس نے جھانک کے دیکھ لیا کہ میں وہاں بھی مال دار ہوں گا اور اولاد والا ہوں گا؟'' یا اس نے رحمٰن سے کوئی عہد لے لیا ہے؟'' دونوں باتوں میں سے کوئی بھی نہیں۔ تو جو یہ بکتا ہے، بک بک کرتا ہے، ہم اس کو بھی لکھ رکھیں گے جو جھوٹ بولتا ہے اور خواہ مخواہ اللہ پر اِفترا کرتا ہے، ''ہم اس کو بھی لکھیں گے جو یہ کہہ رہا ہے، اور لمبا کریں گے اس کے لئے عذاب لمبا کرنا۔ اور جو کچھ یہ کہتا ہے مال و اولاد، ہم اس کے وارث ہو جائیں گے''۔ وَنَرِثُهٗ: وارث ہو جائیں گے ہم اس چیز میں جو وہ کہتا ہے، اور یہ ہمارے پاس تن تنہا آئے گا۔ اس کا مال بھی ہمارے قبضے میں ہوگا، اور اس کی اولاد بھی ہمارے قبضے میں ہوگی، کوئی اس کا مددگار بن کے نہیں آئے گا، تن تنہا ہمارے پاس آئے گا۔

مشرکین کے جھوٹے سہارے

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً: اور ان مشکلات سے بچنے کے لئے انہوں نے معبود تجویز کر رکھے ہیں، زندگی میں آنے والی مشکلات۔ ''اختیار کیے انہوں نے اور آلہہ تا کہ وہ ان کے لیے باعثِ عزت ہو جائیں'' باعث غلبہ ہو جائیں، ان کی ضرورتیں پوری کریں۔ ''ہرگز ایسا نہیں ہوگا، عنقریب وہ ان کی عبادت کا انکار ہی کر دیں گے'' جیسے دوسری جگہ آتا ہے مَا کَانُوْٓا اِیَّانَا یَعْبُدُوْنَ (سورۂ قصص: ۶۳) یہ لوگ ہماری تو عبادت نہیں کرتے تھے، پتا نہیں کس کی کرتے تھے؟ تو ''عبادت کا انکار کر دیں گے اور ہو جائیں گے ان کے خلاف'' تو یہ آلہہ ان کے لیے اُلٹا مصیبت کا باعث بنیں گے، ان کے لئے راحت و آرام کا باعث نہیں بن سکتے، کسی مشکل وقت میں یہ کام نہیں آ سکتے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

اَلَمْ تَرَ اَنَّاۤ اَرْسَلْنَا الشَّیٰطِیْنَ عَلَى الْكٰفِرِیْنَ تَؤُزُّهُمْ اَزًّا ﴿۸۳﴾ فَلَا تَعْجَلْ

کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ بے شک چھوڑا ہم نے شیاطین کو کافروں پر، وہ ان کو اُکساتے ہیں خوب اُکسانا ○ پس آپ ان پر

عَلَیْهِمْ ؕ اِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا ﴿۸۴﴾ یَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِیْنَ اِلَى الرَّحْمٰنِ

جلدی نہ کیجئے سوائے اس کے نہیں کہ ہم شمار کر رہے ہیں ان کے لئے شمار کرنا ﴿۸۴﴾ جس دن ہم جمع کریں گے متقین کو رحمٰن کی طرف

وَفْدًا ﴿۸۵﴾ وَّنَسُوْقُ الْمُجْرِمِیْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ وِرْدًا ﴿۸۶﴾ لَا یَمْلِكُوْنَ

اس حال میں کہ وہ معزز ہوں گے ﴿۸۵﴾ اور ہانکیں گے ہم مجرمین کو جہنم کی طرف اس حال میں کہ وہ پیاسے ہوں گے ﴿۸۶﴾ اختیار نہیں رکھیں گے

الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴿۸۷﴾ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ﴿۸۸﴾ لَقَدْ

شفاعت کا، مگر جس نے رحمٰن کے پاس عہد حاصل کر لیا ﴿۸۷﴾ اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ رحمٰن نے اولاد اختیار کی ﴿۸۸﴾ البتہ تحقیق

جِئْتُمْ شَیْـًٔا اِدًّا ﴿۸۹﴾ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ یَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ

تم نے بہت بھاری چیز کا ارتکاب کیا ﴿۸۹﴾ قریب ہے کہ آسمان پھٹ جائیں اس بات سے، اور چر جائے زمین اور گر پڑیں پہاڑ

هَدًّا ﴿۹۰﴾ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ﴿۹۱﴾ وَمَا یَنْۢبَغِیْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ یَّتَّخِذَ وَلَدًا ﴿۹۲﴾

ریزہ ریزہ ہو کر ﴿۹۰﴾ اس وجہ سے کہ یہ رحمٰن کے لئے اولاد کو پکارتے ہیں ﴿۹۱﴾ نہیں مناسب رحمٰن کے لئے کہ اختیار کرے اولاد ﴿۹۲﴾

اِنْ كُلُّ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّاۤ اٰتِی الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ﴿۹۳﴾ لَقَدْ

نہیں ہیں یہ سب لوگ جو آسمان اور زمین میں موجود ہیں مگر آنے والے ہیں رحمٰن کے پاس عبد ہونے کی حالت میں ﴿۹۳﴾ البتہ تحقیق

اَحْصٰىهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا ﴿۹۴﴾ وَكُلُّهُمْ اٰتِیْهِ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ

رحمٰن نے ان سب کو گھیر رکھا ہے اور شمار کر رکھا ہے خوب شمار کرنا ﴿۹۴﴾ اور ان میں سے ہر ایک آنے والا ہے رحمٰن کے پاس قیامت کے دن

فَرْدًا ﴿۹۵﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ﴿۹۶﴾

تن تنہا ﴿۹۵﴾ بے شک وہ لوگ جو ایمان لے آئے اور انہوں نے نیک عمل کیے عنقریب رحمٰن ان کے لئے محبت قرار دے گا ﴿۹۶﴾

فَاِنَّمَا یَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِیْنَ وَ

سوائے اس کے نہیں کہ ہم نے اس قرآن کو آسان کر دیا تیری زبان میں تا کہ بشارت دے تو اس کے ذریعے سے متقین کو اور

لِتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ﴿٩٧﴾ وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ ۭ هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ
ڈرائے تُو اس کے ذریعے سے جھگڑالو قوم کو ﴿٩٧﴾ کتنی ہی جماعتیں ہم نے ان سے قبل ہلاک کردیں، کیا تُو ان میں سے کسی کو
مِّنْ اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا ﴿٩٨﴾
محسوس کرتا ہے؟ کیا تُو ان کے لئے بھنک بھی سنتا ہے؟ ﴿٩٨﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّآ اَرْسَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ تَؤُزُّهُمْ اَزًّا: اَزَّ يَؤُزُّ اَزًّا، اُبھارنا، اُکسانا، ترغیب دے کر کسی شخص سے کوئی کام کروانا، یہ ''اَزّ'' کا مفہوم ہے۔ کیا آپ نے دیکھا نہیں، یا کیا آپ کو معلوم نہیں، کہ بے شک ہم نے بھیجا شیاطین کو کافروں پر۔ اَرْسَلْنَا یہاں چھوڑنے کے معنی میں ہے، بے شک ہم نے چھوڑا شیاطین کو کافروں پر، وہ شیاطین ان کافروں کو اُبھارتے ہیں خوب ابھارنا۔ مفعول مطلق تاکید کے لئے ہے۔ اُچھالتے ہیں خوب اُچھالنا، اُکساتے ہیں خوب اکسانا۔ ''چھوڑا ہم نے شیاطین کو کافروں پر'' یعنی ان شیاطین کو کافروں پر مسلط کردیا ہے، وہ ان کو اکساتے بہکاتے ہیں۔ فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ: پس آپ ان پہ جلدی نہ کیجئے، اِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا: عَدَّ يَعُدُّ: شمار کرنا۔ سوائے اس کے نہیں کہ ہم شمار کرتے ہیں ان کے لئے شمار کرنا، گنتے ہیں ہم ان کے لئے گننا۔ کیا گنتے ہیں؟ نَعُدُّ کا مفعول یہاں محذوف ہے، ہم ان کے سانس شمار کرتے ہیں، ان کے دِن گنتے ہیں (عام تفاسیر)، ان کی باتیں شمار کر رہے ہیں، ان کے کُفریات کو شمار کر رہے ہیں (نسفی)۔ نَعُدُّ کے مفہوم میں سب کچھ ہے، کہ ہم ان کی باتوں کو شمار کر رہے ہیں، ان کے الفاظ گن رہے ہیں، ان کے سانس شمار کر رہے ہیں، ان کی ہر چیز ہمارے احاطے میں ہے، کوئی چیز ہم سے باہر نہیں، ایک ایک بات ہماری گنی ہوئی ہے، شمار کرتے جارہے ہیں، یا ان کے لئے جتنے سانس مقدر ہیں وہ شمار کرتے جارہے ہیں۔ يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِيْنَ اِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا: وَفْد وَافِد کی جمع ہے، اور وافد اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی بڑے آدمی سے ملنے کے لئے جائے، یہ جو معزز قسم کے لوگ ہوتے ہیں جو حاکم سے ملنے کے لیے جاتے ہیں بطور ''وفد'' کے، قوم کے نمائندہ ہوتے ہیں، معزز قسم کے لوگ۔ اور آگے وِرْدًا کا لفظ آرہا ہے یہ وَرَدَ يَرِدُ وُرُوْد سے ہے، پانی پر وارد ہونا، اور پانی پر طالب اور پیاسے لوگ ہی جایا کرتے ہیں، اس لیے وِرْدًا سے یہاں پیاسے لوگ مراد ہیں، اور وفدًا سے معزز لوگ مراد ہیں۔ وِرد۔ وارد کی جمع ہے، جس دِن کہ ہم جمع کریں گے متقین کو رحمٰن کی طرف اس حال میں کہ وہ وفد ہوں گے، اور وفد کے مفہوم میں آ گیا باعزّت ہونا۔ ''جس دِن ہم جمع کریں گے متقین کو رحمٰن کی طرف اس حال میں کہ وہ معزز ہوں گے'' یہ حاصل ترجمہ ہے، ورنہ وفد کا مفہوم میں نے عرض کردیا کہ وفد ان معزز لوگوں کو کہا جاتا ہے جو کسی بڑے آدمی کے پاس ملنے کے لئے جایا کرتے ہیں، جیسے آپ کہتے ہیں علماء کا ایک وفد صدر سے ملا، طلبہ کا ایک وفد صدر سے ملا، تو یہ چنے ہوئے لوگ ہوتے ہیں، ہر طرح سے معزز، اہل، قابل، جو بڑے آدمی کے پاس بھیجے جاتے ہیں، تو اس میں اعزاز اور اکرام کا مفہوم ہے، اس لیے حضرتِ شیخ (الہندؒ) نے ترجمہ کیا ہے ''مہمان بلائے ہوئے'' یعنی وہ ایسے

آئیں گے جس طرح سے مہمان بلائے ہوئے ہوتے ہیں" جس دن کہ ہم جمع کریں گے متقین کو رحمٰن کی طرف اس حال میں کہ وہ وفد ہوں گے معزز ہوں گے"۔" اور ہانکیں گے ہم مجرمین کو" سَاقَ سَوْقًا: پیچھے سے ہانکنا، جس طرح سے قادَ یَقُوْدُ آگے سے چلانے کو کہتے ہیں۔" چلائیں گے ہم مجرمین کو جہنم کی طرف اس حال میں کہ وہ پیاسے ہوں گے۔" لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ: اختیار نہیں رکھیں گے شفاعت کا، مالک نہیں ہوں گے، شفاعت کا اختیار نہیں رکھیں گے، اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا مگر وہی لوگ جنہوں نے رحمٰن کے پاس عہد حاصل کرلیا، "مَنْ" لفظوں میں مفرد ہے اور معنیٰ جمع ہے، مگر جس نے رحمٰن کے پاس عہد حاصل کرلیا وہی سفارش کر سکے گا اور کوئی سفارش نہیں کر سکے گا، رحمٰن کے پاس عہد حاصل کرنے والے ہیں انبیاء ﷺ، شہداء، علماء، حفاظ۔ اور جن کے متعلق انہوں نے عقیدے اختیار کر رکھے ہیں وہ سفارش نہیں کر سکیں گے۔ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا: اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ رحمٰن نے اولاد اختیار کی۔ ولد اولاد کے معنیٰ میں ہے، اس کو عام رکھیں تاکہ یہ سب فرقوں کو شامل ہو جائے، عیسائیوں نے لڑکے کا قول کیا، یہودیوں نے بھی بیٹے کا قول کیا، عزیر ابن اللہ ان کا عقیدہ تھا، مسیح ابن اللہ عیسائیوں کا عقیدہ تھا، مشرکین مکہ لڑکیوں کے قائل تھے، تو ولد کا لفظ عام ہو جائے گا۔" اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ اختیار کی رحمٰن نے اولاد" لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا اِدًّا: جِئْتُمْ کا خطاب انہی لوگوں کو ہے جو اس قسم کا قول کرتے ہیں۔ اور "اِدّ" کہتے ہیں بھاری چیز کو۔ بہت بھاری بات کا تم نے ارتکاب کیا، البتہ آئے ہو تم بہت بھاری چیز کے پاس، یعنی بہت بڑی بات تم نے کہہ دی، جیسے سورۂ کہف کی ابتدا میں آیا تھا كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ "البتہ تحقیق تم نے بہت بھاری چیز کا ارتکاب کیا" تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا: كَادَ، يَكَادُ افعال مقاربہ میں سے ہے۔ تَفَطَّرَ: پھٹ جانا، اِنْشَقَّ بھی پھٹ جانے کو کہتے ہیں، خَرَّ، يَخِرُّ گرنا، هَدًّا بھی گرنے کو ہی کہتے ہیں یہ "تَخِرُّ" کا مفعول مطلق ہے۔ قریب ہے کہ آسمان پھٹ جائیں اس بات سے اور چر جائے زمین اور گر پڑیں پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر۔ هَدًّا مفعول مطلق بطور تاکید کے ہے۔ تَكَادُ کا معنیٰ "ہو سکتا ہے"، قریب ہے یہ بات کہ آسمان پھٹ جائیں اس سے، اور شق ہو جائے زمین، چر جائے زمین، ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے زمین، اور گر پڑیں پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر اس وجہ سے کہ ان لوگوں نے رحمٰن کے لئے اولاد کا قول کیا، اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا: دَعَا يَدْعُوْ: بلانا۔ پکارا انہوں نے رحمٰن کے لئے اولاد کو۔ یہ رحمٰن کے لئے اولاد کو پکارتے ہیں اس سبب سے ہو سکتا ہے کہ زمین آسمان یہ سارے کے سارے گر جائیں، پھٹ جائیں اور قیامت برپا ہو جائے، وَمَا يَنْۢبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا: نہیں مناسب رحمٰن کے لئے کہ اختیار کرے اولاد، اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: آسمان اور زمین میں جو لوگ بھی موجود ہیں، یہ كُلُّ کا مفہوم آ گیا، سب وہ لوگ جو زمین اور آسمان میں موجود ہیں۔" اِنْ" نافیہ ہے۔ نہیں ہیں یہ سب لوگ اِلَّا اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا: مگر آنے والے ہیں رحمٰن کے پاس از روئے عبد ہونے کے۔ اٰتِي مفرد کا صیغہ ہے اور عبد بھی مفرد ہے، کیونکہ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ میں "مَن" لفظوں میں مفرد ہے، "نہیں ہیں سب لوگ جو زمین اور آسمان میں موجود ہیں مگر ان میں سے ہر ایک آنے والا ہے رحمٰن کے پاس از روئے عبد کے، عبد ہونے کی حالت میں آنے والا ہے" اٰتِي: اَتٰى يَاْتِيْ سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ لَقَدْ اَحْصٰىهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا: البتہ تحقیق رحمٰن نے ان سب کو گھیر رکھا ہے اور شمار کر رکھا ہے خوب شمار کرنا، وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا: اور ان میں سے ہر ایک آنے والا ہے رحمٰن کے پاس قیامت کے دن تن تنہا۔ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: بے شک وہ لوگ جو ایمان لے آئے

اورانہوں نے نیک عمل کیے، سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا: عنقریب کرے گا اللہ تعالیٰ ان کے لئے وُد۔ ''ود'' کہتے ہیں محبت کو، اللہ تعالیٰ ان کے لئے محبت قرار دے گا، بنائے گا ان کے لئے محبت۔ ''وُدّ'' مصدر ہے۔ وَدَّ، يَوَدُّ چاہنے کے معنی میں۔ یہ لفظ پہلے بھی گزرا ہے رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (پارہ ۱۴)، يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ (سورۂ بقرہ:۹۶)، کئی جگہ یہ لفظ آتا ہے قرآنِ کریم میں۔ ''وُد'' محبت کو کہتے ہیں۔ ''رحمٰن ان کے لیے محبت قرار دے گا'' محبت کس کی کس کے ساتھ؟ فاعل اور مفعول کون ہے، کون محبت کرنے والا ہوگا اور کس کے ساتھ محبت کرنے والا ہوگا؟ یہاں اس کی تعیین نہیں کی گئی۔ اللہ تعالیٰ ان کے لئے محبت قرار دے گا، یعنی خود ان کے ساتھ محبت کرے گا، یا ان کے دل میں اپنی محبت ڈالے گا، یا مخلوق کے دل میں ان کی محبت ڈالے گا، یا ان کے دل میں مخلوق کی محبت ڈالے گا، یا ان کے دل میں آپس میں ایک دوسرے کی محبت ڈالے گا، یہ سارے مفہوم اس میں آسکتے ہیں، اور سارے کے سارے ہی روایات سے مؤید ہیں، تفصیل بعد میں عرض کرتا ہوں۔ فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ: سوائے اس کے نہیں کہ ہم نے اس قرآن کو آسان کردیا تیری زبان میں لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ: تاکہ بشارت دے تو اس کے ذریعے سے متقین کو وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُدًّا: ''لُدًّا'' یہ ''اَلَدّ'' کی جمع ہے، اَلَدّ جھگڑالو کو کہتے ہیں۔ اور ڈرائے تو اس کے ذریعے سے جھگڑالو قوم کو، جھگڑالو قوم سے یہاں وہی عربی لوگ مراد ہیں، ایک تو اُمّی ہونے کی وجہ سے، چونکہ وہ جاہل اجڈ تھے، اس لیے بھی اپنے نظریات میں ٹھوس تھے، ہر ہر بات میں جھگڑے اُٹھاتے تھے، دوسرے یہ ہے کہ مذہبی تعصب بھی ان میں تھا، جو بات بھی ان کے سامنے ذکر کی جاتی چاہے وہ کتنی ہی سیدھی کیوں نہ ہوتی، اس میں بھی الجھاؤ پیدا کر لیتے۔ ڈرائے تو اس کے ذریعے سے جھگڑالو لوگوں کو۔ وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ: مِنْ قَرْنٍ یہ کَمْ کی تمیز ہے۔ کتنی ہی جماعتیں ہم نے ان سے قبل ہلاک کردیں۔ قرن کہتے ہیں جماعت کو، ایک زمانے میں موجود لوگ قرن کا مصداق ہوتے ہیں، ''خَيْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِيْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ''[1] جیسے خطبے میں آپ الفاظ پڑھا کرتے ہیں، قرنِ صحابہ، قرنِ تابعین، قرنِ تبع تابعین۔ تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے ایک دور کے لوگ، ایک زمانے میں جو موجود ہوں وہ قرن کا مصداق ہوتے ہیں، ''کتنی ہی جماعتیں ہم نے ان سے قبل ہلاک کردیں'' هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ: کیا تو ان میں سے کسی کو محسوس کرتا ہے اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا: رِکز کہتے ہیں خفی آواز کو جو سمجھ میں نہ آئے، جس کے لئے ہم اُردو میں ''آہٹ'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں، یا ''بھنک'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ کیا تو ان کی بھنک بھی سنتا ہے؟ کیا تو ان کے لئے کوئی آہٹ سنتا ہے؟ یعنی معمولی آواز چاہے سمجھ میں نہ آئے، بھنک اور آہٹ کا یہی معنی ہوا کرتا ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

ماقبل سے ربط

رَدِّ شرک اور اِثباتِ توحید کا مضمون آپ کے سامنے آرہا ہے جس کے ساتھ ساتھ آخرت کی یاددہانی بھی ہے، پچھلی

---

(۱) احکام القرآن، ۱/۶۱۵۔ نوٹ: بخاری وغیرہ عام کتب حدیث میں اس حدیث کا ابتدائی لفظ: خیر الناس، یا: خیر امتی، یا: خیر کم ہے۔

آیت میں ذکر کیا گیا تھا کہ ان لوگوں نے اللہ کے علاوہ آلہہ اختیار کر لیے تا کہ ان کے لئے باعث عزت ہوں، ان کے لئے غلبہ حاصل ہونے کا باعث ہوں، اور ''کلا'' کے ساتھ تردید کی گئی تھی کہ ان کا یہ نظریہ صحیح نہیں، ایسا ہرگز نہیں ہوگا جیسے یہ چاہتے ہیں، یہ آلہہ ان کی عبادت کا انکار کریں گے اور ان کے مخالف ہو جائیں گے، قرآنِ کریم کی آیات میں کثرت کے ساتھ یہ مضمون ذکر کیا گیا ہے، جیسے قرآنِ کریم میں الفاظ آئے ہیں مَا كُنْتُمْ اِيَّانَا تَعْبُدُوْنَ (سورۂ یونس: ۲۸) وہ کہیں گے کہ تم تو ہماری عبادت نہیں کرتے تھے، شیطانوں کو پوجتے تھے۔

سرورِ کائنات ﷺ کے لئے تسلی کا مضمون

آگے سرورِ کائنات ﷺ کے لئے کچھ تسلی بھی ہے اور مشرکین کے لئے تنبیہ ہے۔ تسلی بایں طور کہ آپ ان کے متعلق جلدی نہ مچائیں، جلدی مچانے کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ مخالفت میں انتہا کو پہنچ گئے تھے، مکی زندگی کے آخر میں یہ سورت نازل ہوئی ہے جبکہ مخالفت انتہا کو پہنچ گئی تھی، ہر طرح سے تکلیفیں پہنچاتے تھے، تو طبعی طور پر آپ کا دل یہ چاہتا تھا کہ اب کوئی آخری فیصلہ سامنے آ جائے، یہ روز روز کا جھگڑا ختم ہو۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آپ ان کے اوپر جلدی نہ مچائیں، ہم ان کی ایک ایک بات کو شمار کر رہے ہیں، ان کی کوئی بات ہم سے مخفی نہیں ہے، اور یہ لوگ آج کل شیطان کے تسلط میں ہیں، جیسا کہ احادیث میں واضح کیا گیا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے شیاطین بھی پیدا کیے ہیں، فرشتے بھی پیدا کیے ہیں، فرشتے انسان کو خیر پر ابھارتے ہیں، شیاطین فسق وفجور پر ابھارتے ہیں، اور انسان جب پیدا ہوتا ہے تو پیدا ہوتے ہی اس کے پیچھے ایک فرشتہ اور ایک شیطان لگا دیا جاتا ہے، جب اس کے ابتلاء کا دور شروع ہوتا ہے، فرشتہ اس کو خیر پہ ابھارتا ہے، شیطان اس کو بُرائی پہ ابھارتا ہے،(۱) اور انسان درمیان میں ہچکولے لیتا ہے۔ تو یہ اپنے ارادے کے ساتھ اپنی قوتوں کو جدھر متوجہ کر دیتا ہے وہ طرف غالب آ جاتی ہے، آپ نیکی کا ارادہ کریں، اپنے ارادے میں بُرائی کی مخالفت کریں، اور پھر اس نیکی کو کرنے لگ جائیں، تو مَلَك کی قوت کو ترجیح حاصل ہوگئی، پھر فرشتوں کے ساتھ آپ کی مناسبت ہوتی چلی جائے گی، اور شیاطین سے بُعد ہوتا چلا جائے گا، آخر ایک وقت آئے گا کہ شیطان آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا، اتنا آپ ملکی قوتوں کی طرف قریب چلے جائیں گے، ہر وقت آپ کے ساتھ فرشتے ہوں گے، آپ کا تحفظ کریں گے چونکہ آپ نے دوستی ان سے لگا لی، پھر اگر انسان کوئی بُرائی کا ارادہ بھی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتوں کے ذریعے سے تحفظ ہو جاتا ہے کہ بُرائی کے اسباب ہی مہیا نہیں ہوتے، انسان بُرائی سے بچ جاتا ہے، اور شیطانی قوت بالکل ضعیف ہو جاتی ہے، پھر وہ انسان کو کسی بُرائی میں مبتلا نہیں کر سکتی۔ اور ایک ہے کہ انسان اپنے علم اور اپنے ارادے کے ساتھ گناہوں کی طرف متوجہ ہو گیا، اس نے نیکی کا ارادہ چھوڑ دیا، تو اس کی مناسبت شیطانوں کے ساتھ ہوتی چلی جاتی ہے، آخر آہستہ آہستہ وہ شیطان اس کے اوپر مسلط ہو جاتے ہیں، پھر اس کے دل میں نہ کوئی نیکی کا کوئی خیال آنے دیں، نہ اس کو نیکی کی طرف متوجہ ہونے دیں، تو ان شیطانوں کو پورا تسلط حاصل ہو جاتا ہے، پھر وہ اکسا اکسا کر، بہکا بہکا کر، ابھارا ابھار کر انسان کو بُرائی کی طرف لے جاتے ہیں، تو یہ

(۱) ترمذی ج ۲ ص ۱۲۸ کتاب التفسیر، سورۃ البقرۃ کا آخر۔ مشکوۃ ج ۱ ص ۱۹ باب الوسوسہ، فصل ثانی۔

مناسبت ہے انسان کو جدھر ہو جائے، اچھی قوت کے ساتھ مناسبت ہو جائے تو نیکی کا راستہ آسان ہوتا چلا جاتا ہے، اور بری قوت کے ساتھ مناسبت ہو جائے تو برائی کا راستہ آسان ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہی ہے مجاہدہ اور ریاضت جو ابتداء میں کروایا جاتا ہے کہ اپنے آپ کو مجبور کرو، اپنے آپ کو اپنی خواہشات کے خلاف چلاؤ، نیکی کا راستہ اختیار کرو، چند دن مزاحمت ہوگی، اس کے بعد پھر معاملہ آسان ہو جاتا ہے...... ایک آدمی جو مسجد میں بیٹھنے کا عادی ہو جائے، اپنے آپ کو مسجد میں بٹھاتا ہے، تلاوت کرتا ہے، اور اللہ کا ذکر کرتا ہے، تو اس کو وہاں سکون حاصل ہونا شروع ہو جائے گا۔ اور اگر دوست احباب اس کو مجبور کر کے، بہکا کر، کھینچ کر کبھی سینے میں لے جائیں، تو اس کو ایسے معلوم ہوگا جیسے جہنم میں آ گیا، تو وہاں سے نکلے گا، بھاگے گا، اس کے دل کو قرار نہیں آئے گا، مسجد میں پہنچے گا تو ایسے ہوگا جیسے مچھلی پانی میں پہنچ گئی، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنی استعداد و نیکی کی طرف لگا کے اس کو غلبہ دے دیا، اب اس کی طبیعت ادھر متوجہ ہے، برائی کی طرف متوجہ نہیں ہے، اور ایک آدمی بری محفلوں میں بیٹھنے کا عادی ہو گیا، تاش کھیلتا ہے، جوا کھیلتا ہے، اور اس قسم کی آوارہ مجلسوں میں بیٹھتا ہے، یا سینے میں جاتا ہے، تو دیکھ لینا! کبھی ایسے آدمی کو پکڑ کے مسجد کی طرف لے آؤ، وہ یوں ہوگا جس طرح سے اس کو جیل میں ڈال دیا گیا ہو، اور اس کی طبیعت چاہے گی کہ میں یہاں سے نکلوں اور بھاگوں، جب چاہیں آپ اس کا مشاہدہ کر سکتے ہیں، اچھی کتابوں کا مطالعہ کرنے والے ناول نہیں پڑھ سکتے، ناول پڑھنے والوں کو آپ اگر بزرگوں کے حالات کی کوئی کتاب دے دیں گے، آخرت کے حالات کی کوئی کتاب دے دیں گے، نیکی کی کتاب دے دیں گے تو اس میں ان کو مزہ ہی نہیں آئے گا، تو انسان کی یہ طبیعت ہے کہ اس کو جدھر کو چلا دیا جائے ادھر کو چل جاتی ہے...... تو یہ مشرکین چونکہ بالکل ہی مخالفت پر اترے ہوئے ہیں، تو ان کی مکمل مناسبت شیاطین کی طرف ہو گئی، اب شیاطین ان کے اوپر پوری طرح سے تسلط حاصل کر چکے ہیں، اب ان کو نیکی کی طرف آنے ہی نہیں دیتے، ان کے دل دماغ کے اندر اچھائی کا خیال ہی نہیں آنے دیتے، تو جب ان کے اوپر شیاطین اتنے مسلط ہو گئے ہیں تو آپ ان کی فکر چھوڑیے، ہم ان کے سانس شمار کر رہے ہیں، ان کے لقمے گن رہے ہیں، ان کی باتیں ہمارے شمار میں ہیں، یہ ہم سے باہر نہیں ہیں، جب ان کا وقت آ جائے گا، ان کا شمار پورا ہو جائے گا جو اللہ کے علم میں ہے تو اس وقت یہ پکڑ لیے جائیں گے، آپ ان کے بارے میں جلدی نہ مچائیے، صبر اور تحمل کے ساتھ وقت گزاریے۔ یہ ہے مفہوم اس کا کہ ہم نے ان کافروں پر شیاطین کو مسلط کر دیا ہے، لیکن مسلط ہوئے کفر کی بنا پر ہی، جیسا کہ کافرین کا لفظ بتاتا ہے، اور تفصیل اس کی یہی ہے جو آپ کی خدمت میں عرض کر دی گئی کہ برائی کا راستہ اختیار کرنے کی صورت میں فرشتوں کے ساتھ مناسبت ختم ہو جاتی ہے، شیاطین سے مناسبت بڑھتی چلی جاتی ہے، حتیٰ کہ شیاطین کو اتنا تسلط حاصل ہو جاتا ہے، کہ اس کے دل دماغ میں اچھائی کا خیال ہی نہیں آنے دیتے۔

متقین وکافرین کا انجام

آگے انجام کی خبر دے دی کہ متقین کو ہم رحمٰن کی طرف اس طرح سے لے کے جائیں گے جس طرح سے معزز لوگ بڑے آدمی کے پاس ملاقات کے لئے جایا کرتے ہیں، مہمانوں کے طور پر بلائے جاتے ہیں، متقین تو یوں جمع کیے جائیں

گے۔ اور مجرموں کو جہنّم کی طرف ہم ہانک کے لے جائیں گے اس حال میں کہ وہ پیاسے ہوں گے، جس طرح پیاسے اُونٹوں کو کوئی ہانک کے پانی کی طرف لے جاتا ہے، اس طرح سے پیاسے ہونے کی حالت میں ہم ان کو جہنّم کی طرف چلا کے لے جائیں گے، یہ ان کا انجام ہوا۔

آخرت میں شفاعت کا نظریہ

باقی! ان لوگوں نے جو سہارے تلاش کرر کھے ہیں کہ فلاں ہماری سفارش کر دے گا، چھڑا دے گا، آگے اس سے مایوس کیا جارہا ہے ''کوئی سفارش کرنے کا اختیار نہیں رکھے گا مگر وہی جس نے رحمٰن کے پاس عہد اختیار کرلیا'' اور وہ متعین لوگ ہیں یعنی مقبولین، جن کے ساتھ ان لوگوں کا کوئی تعلق نہیں ہے، اجازت سے سفارش کریں گے، بعض متعین لوگ سفارش کریں گے، ان کی سفارش کریں گے جن کی طرف رحمٰن کی رضا محسوس کریں گے، یہ نہیں کہ جس کو چاہیں چھڑا لیں، اچھائی کو بُرائی کر کے دکھادیں، بُرائی کو اچھائی کر کے دکھادیں، اچھے کو بُرا ثابت کر دیں، بُرے کو اچھا ثابت کر دیں، ایسی بات نہیں ہوگی۔ مشرکین کا جو شفاعت کا نظریہ تھا، وہ شفاعت قہری اور جبری ہے کہ جو یہ کہیں اللہ تعالیٰ کرنے پہ مجبور ہے، ایسا نہیں ہوسکتا کہ یہ چھڑانا چاہیں اور رحمٰن نہ چھوڑے، ایسی بات نہیں ہوسکتی، تو اس نظریے کی تردید کرنی مقصود ہے، ورنہ شفاعت کا عقیدہ حق ہے، ہم بھی شفاعت کا عقیدہ رکھتے ہیں، لیکن اس کے لئے یہ چند شرطیں ہیں، سفارش وہ کرے گا جو اللہ کا مقبول ہوگا، اس کی کرے گا جس کے پاس ایمان ہوگا، پھر اہلِ کبائر کی سفارش بھی ہوگی، اہلِ معاصی کی ہوگی، کُفر اور شرک کی حالت میں کسی کی سفارش نہیں ہوسکتی، اور جو خود اللہ کا مقبول نہیں ہے اس کو بھی سفارش کا کوئی حق حاصل نہیں ہوگا، اس لیے یہ کوئی اعتماد کی بات نہیں، کیونکہ ہمیں یہ نہیں معلوم کہ ہمارا خاتمہ ایمان پر ہوگا یا نہیں ہوگا، اور پھر جس کے متعلق ہم سوچے بیٹھے ہیں، پتا نہیں اس کو اجازت ہو یا نہ ہو، اس کی اپنی کیا کیفیت ہوگی آخرت میں، تو یہ اعتماد کی بات نہیں کہ جس اعتماد کی بنا پر انسان بُرائیوں کی طرف متوجہ ہو۔

اللہ تعالیٰ کے متعلق اولاد کا نظریہ اور اس کی تردید

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا: یہ آیت بھی گویا کہ نظریہ شفاعت سے ہی تعلق رکھتی ہے، مشرکین نے جن کو اپنا شفعاء سمجھا ہوا تھا ان کے متعلق وہ عقیدہ یہ رکھتے تھے کہ یہ رحمٰن کی اولاد ہیں جیسا کہ فرشتوں کو بیٹیاں کہتے تھے، اور نصاریٰ مسیح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا کہتے ہیں، یہود، عُزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہتے تھے، حقیقتاً بیٹا یا بیٹوں کی طرح دونوں مفہوم ہوسکتے ہیں، بہر حال مقصد یہ تھا کہ جب یہ اولاد ہیں یا اولاد کی طرح ہیں، تو جس طرح سے دنیا میں اولاد اپنے ماں باپ کو منوالیتی ہے اسی طرح سے یہ بھی ہمارے حق میں منوالیں گے، تو اس ولدیت والے عقیدے کا شفاعت کے عقیدے کے ساتھ بہت گہرا تعلق ہے، نصاریٰ نے بھی یوں ہی کہا تھا کہ انسان چونکہ گناہ گار ہے، اپنے عمل کے ساتھ جنّت حاصل نہیں کرسکتا، تو اللہ تعالیٰ نے اپنا بیٹا بھیجا، اور بعد میں اس کو سولی پر چڑھا کر گویا کہ اس کے ماننے والوں کی طرف سے اس کو فدیے میں قبول کرلیا، اب اس کے ماننے والے جو چاہیں کرتے رہیں بس مسیح ان

کو چھڑالے گا، کیونکہ وہ اپنے ماننے والوں کی خاطر خود اپنی جان دے چکا، اور اس قربانی کے نتیجے میں اس کے ماننے والے جتنے ہیں سب چھوٹ جائیں گے۔

تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ بہت ہی بُرا نظریہ ہے، تم نے بہت بڑی بات کا ارتکاب کیا ہے، یہ تو بہت بڑی بات ہے، اتنی بڑی بات ہے کہ زمین آسمان پہاڑ بظاہر دیکھنے میں کتنی بڑی بڑی مخلوق ہیں، لیکن اس عظیم بات کے صدمے سے ہوسکتا ہے کہ یہ بھی پھٹ جائیں، قریب ہے کہ یہ بھی ریزہ ریزہ ہوجائیں، جس سے معلوم ہوگیا کہ ساری کائنات کی فطرت ابراہیمی ہے، یہ اپنے لیے کسی دوسرے الٰہ کو، یا الوہیت میں کسی دوسرے شریک کو برداشت نہیں کرتی، زمین وآسمان کو صدمہ ہے کہ ان کے لیے کسی دوسرے کو خالق قرار دے دیا جائے، مالک قرار دیا جائے، یا اس کائنات کے اندر کسی دوسرے کو عبادت کا مستحق قرار دے دیا جائے، زمین آسمان پہاڑ تک اس چیز کو برداشت نہیں کرتے، بہت بڑی بات ہے جو تمہارے منہ سے نکلی، یہ بات صحیح نہیں، بہت عظیم اور منکر بات کا تم نے ارتکاب کیا ہے، کیونکہ اولاد اگر کوئی شخص اختیار کیا کرتا ہے تو آپ دیکھیں کہ اولاد اپنے باپ کی ہم جنس ہوتی ہے، بے جنس ہو تو ویسے عیب ہے، اگر کسی کے گھر میں اس کی جنس کے خلاف بچہ پیدا ہوجائے تو یہ عیب ہے، تو اگر اللہ کے لئے اللہ کا ہم جنس مانو گے تو وہ اسی طرح سے واجب الوجود ہوگا، اسی طرح سے اس کے اندر صفات ہوں گی جس قسم کی اللہ کی صفات ذاتیہ ہیں، علم اس میں ہوگا، قدرت اس میں ہوگی، خلق اس میں ہوگا، اور باقی اس قسم کی جتنی بھی صفات لازمہ ہیں وہ ساری کی ساری صفات اس میں پائی جانی چاہئیں، اگر وہ صفات لازمہ اس کے اندر موجود نہ ہوں تو خلاف جنس ہوا کہ لوازم اس کے لئے ثابت نہ ہوئے، اور یہ ایک عیب ہے، اور ہم جنس ماننے کی صورت میں دوسرا الٰہ ثابت ہوگیا، یہ شرک ہے۔

اور پھر اولاد کی ضرورت کیوں محسوس ہوا کرتی ہے؟ اولاد کی ضرورت یا تو اس لیے محسوس ہوتی ہے کہ انسان زندگی میں اکیلا کاروبار سنبھال نہیں سکتا، تو وہ کہتا ہے کہ کوئی بچہ ہوجائے تو کم از کم میرے کاروبار میں ہاتھ بٹائے گا، کمانے میں ساتھ شریک ہوجائے گا، یا تو اس لیے معاون کی تمنا ہوتی ہے کہ بیٹا ہوجائے گا تو میرا معاون ہوگا۔ یا اس لیے ہوتا ہے کہ میں مرجاؤں گا تو پیچھے میری جائیداد کون سنبھالے گا؟ تو اللہ تعالیٰ اولاد دے دے تا کہ میرے بعد میری جائیداد یہ سنبھال لے، کوئی دوسرے نہ لے جائیں۔ یا یہ ہوتا ہے کہ بوڑھا ہوجاؤں گا تو بڑھاپے میں خدمت کون کرے گا؟ تو اللہ تعالیٰ اولاد دے دے جو بڑھاپے میں خدمت گزار ہوگی۔ یا مرجائیں گے تو مرنے کے بعد نام کون باقی رکھے گا، اولاد ہوگی تو کم از کم نام تو زندہ رہنے گا۔ یہی نظریات ہیں جن کی بنا پر لوگ اولاد کو چاہا کرتے ہیں اور اولاد کی تمنا پیدا ہوتی ہے، اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان سب چیزوں کے اندر احتیاج کا پہلو ہے، اکیلے کاروبار نہیں چلا سکتے یہ بھی عاجز آگیا اس لیے اولاد کی طرف محتاج ہے، اسی طرح ہمیشہ اپنی جائیداد کو اپنے پاس نہیں رکھ سکتے، مریں گے، مرنے کے بعد جائیداد کے چلے جانے کا اندیشہ ہے، اس لیے اولاد کی طرف احتیاج ہے کہ یہ جائیداد اپنے گھر میں ہی رہ جائے، نام کو زندہ رکھنے کے لئے اولاد کی احتیاج ہے، بڑھاپے میں خدمت گزاری کے لئے اولاد کی احتیاج ہے، تو جو شخص بھی اولاد کا نظریہ اختیار کرتا ہے کہ اللہ کی اولاد ہے، تو آخر ان وجوہ میں سے کوئی وجہ تو بیان کرے گا ہی، اور جو وجہ بھی بیان

کریں گے اس میں عجز اور احتیاج آ گیا، اور عجز اور احتیاج اللہ تعالیٰ کی ذات میں ہے نہیں، تو پھر آپ اولاد کس لیے تجویز کرتے ہیں، کیوں اس کے لئے اولاد کا قول کرتے ہیں؟

ایک بھڑبھونجے کا عیسائی پادری کو مسکت جواب

کہتے ہیں کہ جب ابتدا ابتدا میں انگریزوں کی حکومت ہوئی ہے، تو یہ پادری عیسائیت کی تبلیغ کر رہے تھے لوگوں کو عیسائی بنانے کے لئے، بہت کثرت کے ساتھ ان کے پادری آتے تھے اور لوگوں کو مرتد کرتے تھے، کھلم کھلا تقریریں کرتے تھے، ہمارے علماء پر سختی تھی، وہ مقابلے میں آ نہیں سکتے تھے، آتے تھے تو حکومت رکاوٹ ڈالتی تھی، تو دہلی میں ایک جگہ پادری حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بیٹا ثابت کرنے کے لئے تقریر کر رہا تھا کہ عیسیٰ اللہ کا بیٹا ہے، تو ایک بھڑبھونجا (جو بھٹیاں بنائے بیٹھے ہوتے ہیں اور دانے بھونتے ہیں) تو یہ بھی اس مجمع میں تھا، بالکل جاہل اور اجڈ، تو اس نے کھڑے ہو کر پادری سے سوال کیا کہ پادری صاحب! یہ بتایئے کہ آپ جو کہتے ہیں کہ عیسیٰ اللہ کا بیٹا ہے، تو اس کے علاوہ اللہ کا کوئی اور بیٹا بھی ہے؟ وہ پادری کہنے لگا کہ نہیں، اور تو کوئی نہیں، یہ اکلوتا بیٹا ہے (عیسائی، عیسیٰ علیہ السلام کا جب بھی ذکر کرتے ہیں تو اکلوتا بیٹا کہتے ہیں، اکلوتا کا معنیٰ ''ایک ہی'')۔ وہ کہتا ہے کہ کوئی اور ہونے کی توقع ہے؟ تو پادری صاحب کہتے ہیں کہ نہیں، اور ہونے کی بھی توقع نہیں ہے۔ تو وہ جاہل بھڑبھونجا کہتا ہے کہ پادری صاحب! یہ تو پھر کوئی کمال نہ ہوا، میری اتنی عمر ہے، اور میری شادی کو اتنے سال ہو گئے ہیں، اور میرے بارہ بیٹے ہیں، اور تیرے اللہ نے اتنی مدت میں ایک ہی بنایا ہے؟ اور دوسرا ہونے کی توقع بھی نہیں؟ یہ بات اس بھڑبھونجے نے پادری سے کہی تو پادری مقابلے میں چپ ہو گیا، اس کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا، کیونکہ اس نے نکتہ ہی ایسا اٹھا دیا، کہتے ہیں کہ دیوبند میں حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ (جو دارالعلوم دیوبند کے صدرِ اوّل ہیں، یہ مولانا مملوک علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو اُستاذ تھے حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے، یہ ان کے صاحبزادے ہیں پہلے صدر مدرّس یہی ہیں، اور حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے دورہ انہی سے پڑھا ہے، اور ان کے بعد پھر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ صدر بنے تھے) اُن کے پاس بھڑبھونجے کی یہ بات پہنچ گئی، تو وہ سُن کے بہت خوش ہوئے، فرمانے لگے کہ اس نے ایک ایسی دلیل دی ہے جس کا جواب پادری کیا، پادری کے باپ کے پاس بھی نہیں ہے، لیکن وہ جاہل تھا اس نے اسی عنوان سے ادا کر دی، اور اگر آپ اس کو علمی انداز سے ادا کرنا چاہیں تو علمی انداز سے دلیل یوں ہوگی کہ اولاد کا ہونا عیب ہے یا کمال؟ اگر عیب ہے تو ایک بھی عیب ہے، کیونکہ اللہ کی ذات عیب سے پاک ہے، اس لیے جہاں اولاد کے عقیدے کا تذکرہ آتا ہے تو ''سبحانہ'' کا لفظ جو بعد میں آیا کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ہر عیب سے پاک ہے، اولاد کی نسبت اللہ کی طرف عیب ہے۔ تو اگر تو یہ عیب ہے تو پھر ایک بھی عیب ہے، اور اللہ کی ذات پاک ہے، اس میں ایک عیب بھی نہیں ہو سکتا۔ اور اگر اولاد کا ہونا کمال ہے تو جس طرح سے اللہ تعالیٰ کے باقی کمالات کی کوئی حد نہیں اور اس کی مخلوق میں اس کے کمال کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا تو پھر چاہیے تھا کہ اولاد بھی اس کی اتنی ہوتی کہ اس کی مخلوق میں سے کوئی اس کا مقابلہ نہ کر سکتا، سب سے زیادہ اس کی اولاد ہوتی، اب آپ دیکھیں! جانوروں کے کتنے کتنے بچے

ہوتے ہیں، مچھلی کتنے بچے دے دیتی ہے اور باقی جانوروں کے کتنے کتنے بچے ہوتے ہیں، اور انسانوں میں بھی ایک ایک آدمی کی کتنی کتنی اولاد ہو جاتی ہے، تو یہ کیسا کمال ہے کہ جس میں مخلوق خالق سے بڑھی ہوئی ہے، یعنی اللہ کے مقابلے میں مخلوق کے لئے یہ کمال زیادہ ثابت ہو گیا، یہ کیسے ہو سکتا ہے، یعنی اگر اس کو عیب قرار دو تو بھی اللہ کی طرف نسبت صحیح نہیں، کمال قرار دو تو بھی نسبت صحیح نہیں، کیونکہ کمال قرار دینے کی صورت میں تمہیں چاہیے کہ ساری مخلوق کے مقابلے میں زیادہ کمال ثابت کرو، تو پھر تم یہ کہو کہ مخلوق میں کسی کے جتنے بچے متصور ہیں، اللہ کے اس سے زیادہ بچے ہیں، پھر ایک کہنے کا کیا مطلب؟ تو مولانا یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تعبیر اس انداز میں کر دی، اور بات واقعی سمجھ میں آنے والی ہے، کہ عیب ہے تو ایک بھی عیب، اور اگر کمال ہے تو پھر ایک کیوں؟ پھر تو چاہیے کہ آدم علیہ السلام کی جتنی اولاد ہے، اس سے بھی زائد اولاد نعوذ باللہ! اللہ کی ہونی چاہیے، آخر آدم علیہ السلام کی اولاد پھیلتے پھیلتے کروڑوں، اربوں، کھربوں تک پہنچ گئی، نسل در نسل جس طرح سے چلی ہے۔ تو اگر اللہ کے لیے اولاد کا قول کرنا ہے تو پھر اس کی اولاد تو آدم علیہ السلام کی اولاد کے مقابلے میں زیادہ ہونی چاہیے، اور باقی حیوانات جتنے ہیں سب کے بچوں کے مقابلے میں اس کے بچے زیادہ ہونے چاہئیں، کیونکہ کمال میں مخلوق اپنے خالق کا مقابلہ نہیں کر سکتی، اللہ تعالیٰ کا ہر کمال بے انتہا ہے تو پھر اولاد بھی بے انتہا ہونی چاہیے۔

بہر حال جو نظریہ بھی اختیار کیا جائے، اولاد کی نسبت اللہ کی طرف گوارہ نہیں ہے، یہی بات یہاں اللہ تعالیٰ نے کہی کہ تم نے ایک ایسی عظیم بات کا ارتکاب کیا ہے، تم نے اتنی مُنکَر بات منہ سے نکالی، کہ قریب ہے کہ آسمان زمین ٹوٹ پھوٹ جائیں اور پہاڑ بھی ریزہ ریزہ ہو کر گر جائیں، جیسے ہمارے ہاں بھی محاورہ ہے کہ جب کوئی آدمی بہت بُری بات کہہ دے تو ہم کہتے ہیں کہ ''تیری اس بات کو سن کے زمین نہیں پھٹ گئی؟ آسمان نہیں ٹوٹ پڑا؟'' یہ کسی بات کے متعلق اس کی قباحت کو ظاہر کرنے کے لیے اس قسم کے الفاظ بولے جایا کرتے ہیں۔ اور وجہ یہی کہ یہ لوگ رحمٰن کے لئے اولاد کو پکارتے ہیں، اور ان کا رحمٰن کے لئے اولاد پکارنا اتنا عظیم جرم ہے کہ اس جرم کی بنا پر کائنات تباہ ہو سکتی ہے۔ رحمٰن کے لئے مناسب ہی نہیں کہ وہ اولاد اختیار کرے، جتنے لوگ ہیں سب کے سب اللہ کے پاس آئیں گے، اور عبد ہونے کی حیثیت میں آئیں گے، یہ مخلوق اللہ کے ساتھ عبد ہونے کا تعلق رکھتی ہے، یہ اللہ کے بندے ہیں، اللہ کی مخلوق ہیں، اللہ کے غلام ہیں، اللہ کے مملوک ہیں، اس کے علاوہ ان کی حیثیت کوئی نہیں، جتنے ہیں سب عبد ہونے کی حیثیت میں آئیں گے، اور اللہ نے سب کو شمار کر رکھا ہے اور سب کو گن رکھا ہے، کوئی اس کے احاطے سے باہر نہیں ہے، سارے کے سارے قیامت کے دن تن تنہا آئیں گے، کوئی کسی کا معاون اور مددگار بن کے نہیں آئے گا، یہ علیحدہ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ پھر کسی کو اجازت دے دیں اور کوئی کسی کی سفارش کر دے، لیکن جب آئیں گے تو ہر ایک کی حیثیت فرد کی ہوگی، تن تنہا آئیں گے۔

محبوبیت کا مقام کیسے حاصل ہوتا ہے؟

آگے مؤمنین کے لئے ایک بہت بڑی بشارت ہے کہ ''بے شک وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں،

رحمٰن ان کے لئے محبت قرار دے گا'' محبت کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ رحمٰن خود ان کے ساتھ محبت کرے گا، اور دنیا اور آخرت میں محبوبیت کا مقام ایک ایسا مقام ہے کہ جس میں راحت ہی راحت، عزت ہی عزت، بالادستی ہی بالادستی ہے، راحت اور آرام جتنا محبوبیت میں پہنچتا ہے اتنا کسی دوسری چیز میں نہیں پہنچتا، نیک لوگوں کے ساتھ اللہ محبت کرتا ہے، یہ اللہ کے محبوب بن جاتے ہیں، حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب کسی نیک بندے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو محبت ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ جبریل علیہ السلام کو بلاتے ہیں، بلانے کے بعد اس کو اطلاع دیتے ہیں کہ فلاں شخص کے ساتھ مجھے محبت ہے، اور تو بھی اس سے محبت کر، یہ ''تو بھی اس سے محبت کر'' یہ حکم تکوینی ہوتا ہے فوراً ہی جبریل کے دل میں بھی اس کی محبت پیدا ہو جاتی ہے، پھر جبریل علیہ السلام عالمین عرش میں یہ اعلان کرتے ہیں کہ فلاں شخص اللہ کا محبوب ہے تم بھی اس کے ساتھ محبت کرو، اس طرح سے ساتویں آسمان پر، چھٹے پر، پانچویں پر، چوتھے پر، تیسرے پر، دوسرے پر، آسمانِ اول پر، سب فرشتوں میں اعلان ہو جاتا ہے، اور وہ شخص تمام فرشتوں کا محبوب بن جاتا ہے، پھر یہی اعلان زمین میں اتار دیا جاتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نیک بندے کے ساتھ مخلوق محبت کرنے لگ جاتی ہے۔[1] اور یہ واقعہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کا مقبول بندہ ہوتا ہے، دلوں کی گہرائی میں اللہ تعالیٰ اس کی محبت ڈال دیتے ہیں، عداوت اور بغض جو لوگوں کے دلوں میں ہوتا ہے وہ ہے خارجی حالات کے اعتبار سے، کسی کے ساتھ خودغرضی کی بنا پر کوئی اختلاف کرتا ہے، یا نفسانیت کی بنا پر کوئی اختلاف کرتا ہے، وہ علیحدہ بات ہے، جس میں نفسانیت کی کوئی بات نہیں، خودغرضی کی بات نہیں، تو ہم جن کو اولیاء اللہ کہتے ہیں، اللہ کے نیک بندے جو اللہ کے محبوب ہیں، ان کی محبت دلوں کی گہرائی میں اتری ہوئی ہوتی ہے، مخلوق کھچی کھچی ان کی طرف جاتی ہے، زندگی میں موت میں ان کے ساتھ محبت کا مظاہرہ کرتی ہے، اولیاء اللہ کے حالات کو اگر آپ دیکھیں گے تو یہ بات آپ کے سامنے کھل کر آجائے گی۔ اللہ تعالیٰ اپنی محبت ان کے لئے کر دے گا، اپنی مخلوق کی محبت ان کے لئے کر دے گا، وہ سب مخلوق کے محبوب بن جائیں گے، یہ مقام بھی بالکل نمایاں ہے جو دنیا میں اللہ تعالیٰ انعام دیتا ہے ان ایمان اور عمل صالح کے نتیجے میں، اپنی محبت بھی ان کے دلوں میں ڈال دیتا ہے، اور اپنی محبت دلوں میں ڈالنے کا نتیجہ یہ ہوا کرتا ہے کہ طاعت آسان ہو جاتی ہے، اب آپ احکامِ شریعت پر عمل کرتے ہیں، اگر آپ کے دل میں اللہ اور اللہ کے رسول کی محبت نہیں تو یہ ضابطے کی کارروائی ہوگی، اور ضابطے کے طور پر جب کوئی کام کیا جاتا ہے تو اس میں انسان تھک بھی جاتا ہے، جی بھی چراتا ہے، دل نہیں چاہتا، طبیعت کے اوپر لذت اور سُرور محسوس نہیں ہوتا، اور اگر اللہ اور اللہ کے رسول کی محبت انسان کے قلب میں آجائے تو پھر ان کے احکام ماننے میں انسان لطف محسوس کرتا ہے، اور خلاف ورزی ناگوار گزرتی ہے...... بالکل اس طرح سے سمجھ لیجئے کہ جیسے ایک استاذ سے آپ کو دلی تعلق نہیں ہے، وہ آپ کو خدمت کے لئے بلالے تو بات اور ہوتی ہے، اور جس کے ساتھ دلی تعلق ہے وہ خدمت کے لئے بلالے تو دل کی کیفیت اور ہوتی ہے، کسی اجنبی آدمی کی خدمت کرنی پڑ جائے جس کے ساتھ آپ کو کوئی کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں تو وہاں قلب کی کیفیت اور ہوتی ہے، اور اپنے والدین کی، اپنے استاذ کی، اپنے پیر کی خدمت کرنی پڑ جائے، گھنٹوں انسان لگا رہے تو دل کی کیفیت اور ہوتی ہے۔

---

(۱) حلیۃ الأولیاء ۲۵۸/۳، بعنوان سلمہ بن دینار العلو للذہبی رقم ۷۰۔ نیز دیکھیں مختصر بخاری ج ۱ ص ۴۵۶ باب ذکر الملائکۃ مشکوٰۃ ۴۲۵/۲ باب الحب فی اللہ۔

ان دونوں باتوں کے درمیان فرق اسی وجہ سے ہے کہ ایک جگہ محبت ہے اور ایک جگہ محبت نہیں ہے۔ تو جب محبت ہو جاتی ہے، تو طاعت آسان ہو جاتی ہے، خدمت آسان ہو جاتی ہے، احکام کی بجا آوری آسان ہو جاتی ہے، اور مخالفت کی طرف انسان کی طبیعت نہیں جاتی، مخالفت مشکل ہو جاتی ہے، احکامِ شریعت جتنے بھی ہیں وہ سب انسان کے لیے ایک طبیعت بن جاتے ہیں...... اسی طرح سے نیک انسان کے دل میں مخلوق کی ہمدردی اور محبت بھی ڈال دی جاتی ہے، جس کی بنا پر مخلوق کی خدمت آسان ہو گئی، ان کے ساتھ مروّت اور احسان آسان ہو گیا، تو انسان مروّت کرتا ہے، احسان کرتا ہے، اپنی رقم ان کے اوپر خرچ کرتا ہے، تو اُلٹا لطف محسوس کرتا ہے، اس کو کوئی کسی قسم کی گرانی نہیں ہوتی، اس کے نتیجے میں دنیا میں نیکی کا راستہ آسان ہوتا چلا جاتا ہے...... اور آخرت میں پھر اس محبوبیت کا جو مظاہرہ ہوگا کہ اللہ محبت کرے گا، فرشتے محبت کریں گے، تو انسان کتنی عزت اور کتنی راحت محسوس کرے گا، تو یہ بہت بڑی بشارت ہے جو یہاں سنائی گئی کہ "بے شک وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں رحمٰن ان کے لئے محبت قرار دے گا۔"

آخری آیات کا مفہوم

ہم نے اس قرآن کو آسان کر دیا آپ کی زبان میں یعنی آپ عربی ہیں اور آپ کے مخاطبین عربی ہیں تو پہلے مخاطبین کی رعایت رکھتے ہوئے اس کو نہایت اچھے انداز کے ساتھ کامل مکمل کر کے آپ کو دے دیا گیا، تاکہ آپ اس کے ذریعے سے متقین کو بشارت دیں اور اس کے ذریعے سے اِن جھگڑالو لوگوں کو ڈرائیں، انذار اور تبشیر نبی کے یہ دونوں کام ہوتے ہیں۔ آگے پھر وعید پر اس سورت کو ختم کر دیا کہ ان سے پہلے کتنی ہی جماعتیں ہم نے ہلاک کر دیں، جیسے تفصیل پہلے آپ کے سامنے آ چکی کہ ان کے پاس مال و دولت زیادہ تھا، زیادہ جتھے والے تھے، زیادہ قوت اور طاقت والے تھے، اور اس طرح سے ہم نے ان کو بے نام ونشان کر دیا کہ تو ان میں سے کسی کو محسوس کرتا ہے؟ تجھے کوئی نظر آتا ہے ان میں؟ یا تو ان کے لئے کوئی آہٹ سنتا ہے؟ کوئی بھنبھناہٹ بھی ان کی محسوس کرتا ہے؟ یعنی ان کو بالکل بے نام ونشان کر کے رکھ دیا، اس لیے ان لوگوں کو بھی چاہیے کہ اس تاریخ سے سبق حاصل کریں، یہ اپنی قوت پر ناز نہ کریں، نہ اپنی کثرت پر ناز کریں، اگر یہ سیدھے نہیں ہوں گے تو ان کا بھی نام ونشان اسی طرح سے مٹا دیا جائے گا جس طرح سے پہلے لوگوں کا نام ونشان مٹا دیا گیا ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۝
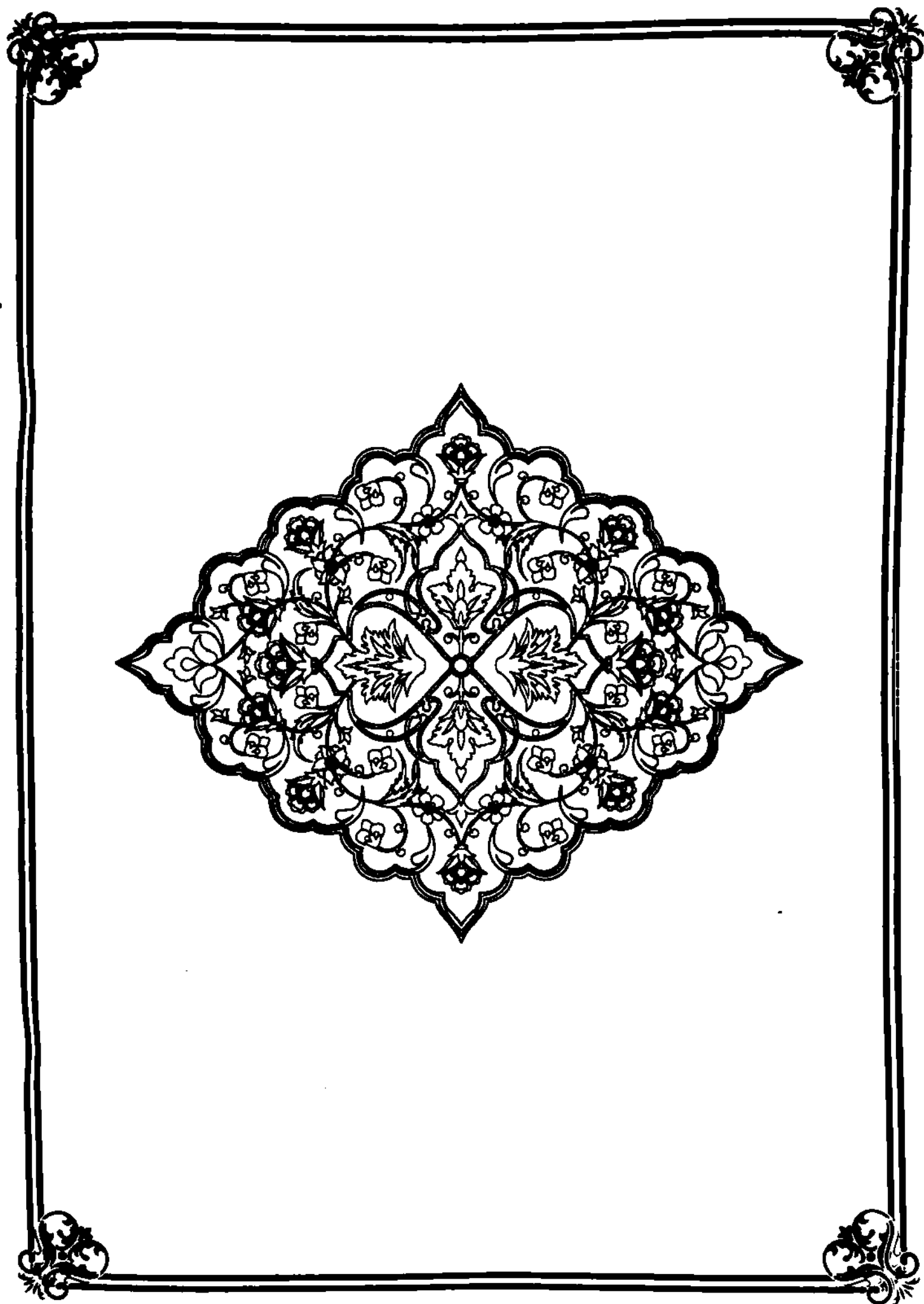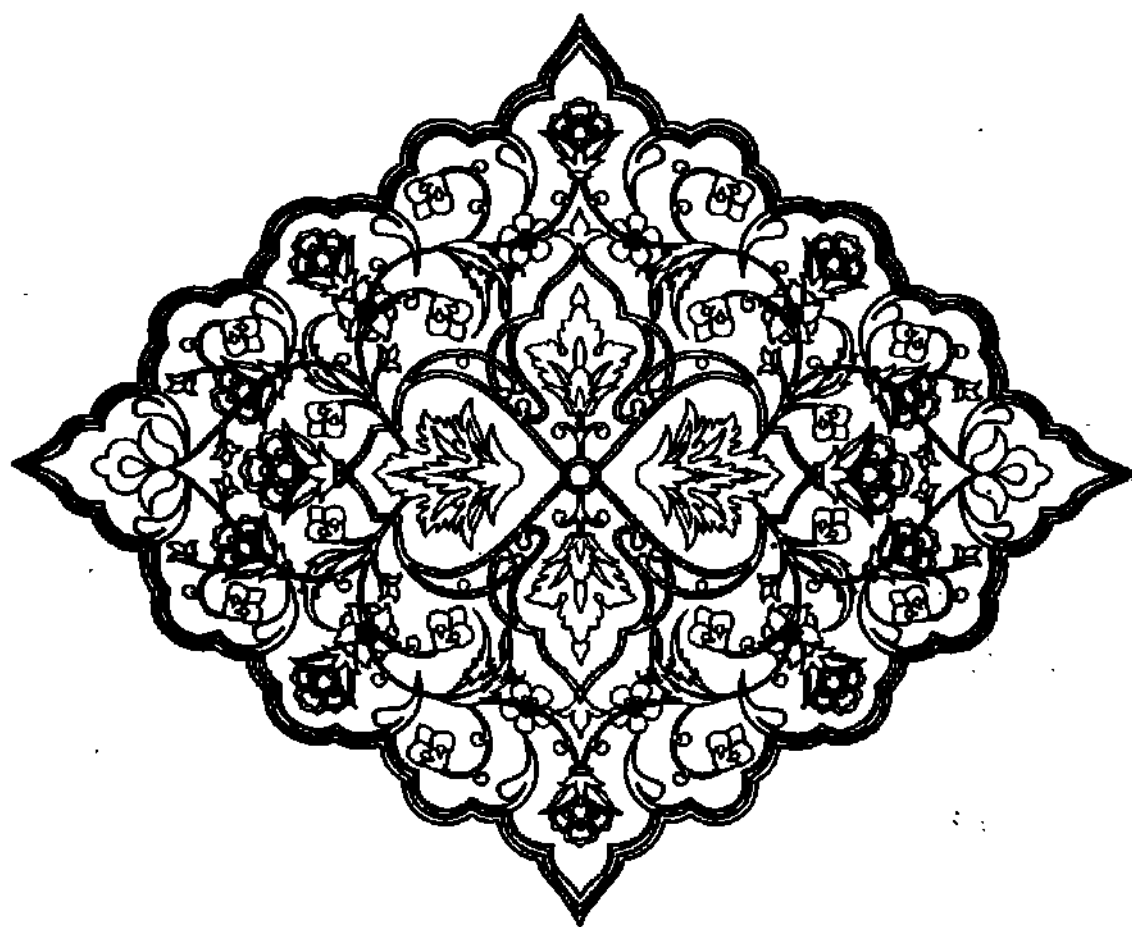
سُورَةُ طٰهٰ

آیاتها ۱۳۵ ۲۰ سُوْرَةُ طٰهٰ مَکِّیَّةٌ ۴۵ رکوعاتها ۸

سورۂ طٰہٰ مکہ میں نازل ہوئی، اور اس کی ایک سو پینتیس آیتیں ہیں، آٹھ رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے

طٰهٰ ۝١ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ۝٢ اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ۝٣

طٰہٰ ① نہیں نازل کیا ہم نے تجھ پر قرآن تاکہ تُو مشقت میں پڑ جائے ② لیکن نصیحت کرنے کے لئے اس شخص کو جو کہ ڈرتا ہے ③

تَنْزِيْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰى ۝٤ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ۝٥

اُتارا گیا یہ قرآن اُتارا جانا اس کی طرف سے جس نے پیدا کیا زمین کو اور بلند آسمانوں کو ④ وہ رحمٰن ہے عرش پر مستوی ہے ⑤

لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰى ۝٦

اسی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے، جو کچھ زمین میں ہے، جو کچھ ان دونوں کے درمیان میں ہے اور جو کچھ گیلی مٹی کے نیچے ہے ⑥

وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى ۝٧ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ

اے مخاطب! اگر تُو بات کو بلند آواز سے کہے پس بے شک وہ جانتا ہے پوشیدہ اور پوشیدہ ترین چیزوں کو ⑦ وہ اللہ ہے، کوئی معبود نہیں

اِلَّا هُوَ ۭ لَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى ۝٨ وَهَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ۝٩ اِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ

اس کے سوا، اس کے لئے اچھے اچھے نام ہیں ⑧ کیا آپ کے پاس موسیٰ علیہ السلام کی بات آئی؟ ⑨ جبکہ دیکھا تھا اس نے آگ کو پھر اس نے کہا

لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّىْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ

اپنے اہل کو تم ٹھہرو، میں نے معلوم کی ہے آگ، شاید کہ میں لے آؤں تمہارے پاس اس آگ سے کوئی سلگا ہوا شعلہ، یا پالوں میں

عَلَى النَّارِ هُدًى ۝١٠ فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ يٰمُوْسٰى ۝١١ اِنِّىْٓ اَنَا رَبُّكَ

اس آگ پر کوئی راستہ بتانے والا ⑩ پھر جب آ گئے موسیٰ اس آگ کے پاس، آواز دیے گئے اے موسیٰ ⑪ بے شک میں تیرا رب ہوں

فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۚ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝١٢ وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا

پس تُو اُتار دے اپنے دونوں جوتے، بے شک تُو پاک وادی طویٰ میں ہے ⑫ اور میں نے تجھے پسند کر لیا پس تُو توجہ سے سُن ان باتوں کو

يُوْحٰى ⑬ اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ ۙ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ⑭

جو وحی کی جاتی ہیں⑬ بے شک میں اللہ ہوں، کوئی معبود نہیں میرے سوا، پس تُو میری عبادت کر اور قائم کر نماز مجھے یاد کرنے کے لیے⑭

اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا تَسْعٰى ⑮

بے شک قیامت آنے والی ہے، میں اس کو چھپائے رکھنا چاہتا ہوں، تاکہ بدلہ دیا جائے ہر نفس اس چیز کا جو اس نے کوشش کی⑮

فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰى ⑯

پس ہرگز تجھے اس نماز سے نہ روک دے وہ شخص جو قیامت پہ ایمان نہیں رکھتا اور وہ اپنی خواہشات کے پیچھے چلتا ہے، پھر تُو ہلاک ہو جائے گا⑯

وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى ⑰ قَالَ هِيَ عَصَايَ ۚ اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَ

یہ کیا ہے تیرے دائیں ہاتھ میں اے موسیٰ!⑰ موسیٰ نے کہا کہ یہ میری لاٹھی ہے میں اس کے اُوپر سہارا لیتا ہوں اور

اَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ وَلِيَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى ⑱ قَالَ

میں اپنی بکریوں پر اس لاٹھی کے ذریعے سے پتے جھاڑتا ہوں اور میرے لیے اس لاٹھی میں اور ضروریات بھی ہیں⑱ اللہ تعالیٰ نے کہا

اَلْقِهَا يٰمُوْسٰى ⑲ فَاَلْقٰىهَا فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى ⑳ قَالَ

کہ تُو اس لاٹھی کو ڈال دے اے موسیٰ!⑲ موسیٰ نے وہ لاٹھی ڈال دی، پس اچانک وہ سانپ تھا دوڑتا ہوا⑳ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ

خُذْهَا وَلَا تَخَفْ ۫ وقفة سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْاُوْلٰى ㉑ وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ

اس کو پکڑ لے اور کوئی خوف نہ کر، عنقریب لوٹا دیں گے ہم اس کو اس کی پہلی حالت پر㉑ اور ملا تُو اپنے ہاتھ کو اپنے پہلو کی طرف،

تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ اٰيَةً اُخْرٰى ۙ ㉒ لِنُرِيَكَ مِنْ اٰيٰتِنَا الْكُبْرٰى ۚ ㉓

نکلے گا وہ چمکتا ہوا سفید بغیر کسی قسم کی بیماری کے، یہ دُوسری نشانی لے لو㉒ تاکہ دکھائیں ہم تجھے اپنی نشانیوں میں سے بڑی نشانی㉓

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۧ ㉔

جا تُو فرعون کی طرف بے شک وہ سرکش ہو گیا ہے㉔

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ طٰهٰ: یہ حروف مقطعات ہیں، اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمُرَادِهٖ بِذٰلِكَ، ان حروف سے جو اللہ کی مراد ہے وہ

اللہ ہی بہتر جانتے ہیں۔ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى: تَشْقٰى یہ شَقِیَ یَشْقٰی سے ہے، شقاء مصدر ہے، مشقت میں پڑنا، محنت میں پڑنا۔ نہیں نازل کیا ہم نے تجھ پر قرآن تاکہ تو مشقت میں پڑ جائے۔ اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى: یہ مستثنیٰ منقطع ہے لکن انزلناہ تذکرۃ لِمَنْ یَخْشٰی (جلالین)، لیکن ہم نے یہ قرآن اُتارا، تذکرۃ لمن یخشی: جو شخص ڈرتا ہے اس کے تذکرہ کے لئے، اس کی یاددہانی کے لئے، نصیحت کرنے کے لئے اس شخص کو جو کہ ڈرتا ہے۔ تَنْزِيْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰى: تَنْزِیْلًا یہ نُزِّلَ محذوف کا مفعول مطلق ہے (نسفی وغیرہ)، اُتارا گیا یہ قرآن اُتارا جانا اس کی طرف سے جس نے پیدا کیا زمین کو اور بلند آسمانوں کو۔ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى رحمٰن عرش پر مستوی ہے، وہ رحمٰن ہے عرش کے اُوپر قرار پکڑے ہوئے ہے۔ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ: اسی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے، جو کچھ زمین میں ہے، جو کچھ ان دونوں کے درمیان میں ہے اور جو کچھ گیلی مٹی کے نیچے ہے۔ ثریٰ کہتے ہیں گیلی مٹی کو۔ وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ: تَجْهَرْ کا خطاب عام مخاطب کو ہے۔ اے مخاطب! اگر تُو بات کو بلند آواز سے کہے، جہر کرے، فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى: پس بے شک وہ جانتا ہے سر اور اخفیٰ کو۔ کلام اصل میں یوں ہوگی (مقابلۃً بعض الفاظ کو حذف کر دیا جاتا ہے) اے مخاطب! اگر تُو جہر کرے بات کے ساتھ یا تُو اس کو چھپائے وہ دونوں صورتوں میں جانتا ہے، کیونکہ وہ تو سر اور اخفیٰ کو بھی جانتا ہے، تو جہر کو کیسے نہیں جانے گا؟ جہر کا جاننا بدرجہ اولیٰ ہوگیا۔ سر: چھپی ہوئی چیز۔ اَخْفٰی: اور زیادہ پوشیدہ، یہ اسم تفضیل ہے۔ پوشیدہ اور پوشیدہ ترین، مخفی اور مخفی ترین چیزوں کو جانتا ہے۔ جب وہ مخفی چیزوں کو بھی جانتا ہے، اور مخفی ترین چیزوں کو بھی جانتا ہے تو جہر کو تو بدرجہ اولیٰ جانے گا، اس طرح سے اس کا مفہوم تام ہو جائے گا، ''اگر تو بات کو جہر کرے تو اس کو تو وہ جانتا ہی ہے، کیونکہ وہ تو سر اور اَخفیٰ کو بھی جانتا ہے۔'' اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ: وہ اللہ ہے، اور کوئی معبود نہیں اس کے سوا، لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى: اس کے لئے اچھے اچھے نام ہیں۔ اور وہ نام وہی ہیں جو اس کی صفات پر دلالت کرتے ہیں۔ ''اس کے لئے اچھی اچھی صفتیں ہیں'' یوں بھی کہہ سکتے ہیں۔ وَهَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى: کیا آپ کے پاس موسیٰ علیہ السلام کی بات آئی؟ کیا آپ کو موسیٰ علیہ السلام کی بات پہنچی؟ اِذْ رَاٰ نَارًا: جبکہ دیکھا تھا اس نے آگ کو فَقَالَ لِاَهْلِهِ: پھر اس نے کہا اپنے اہل کو۔ اہل: گھر والے۔ امْكُثُوْٓا: محاورۃً ایک عورت کو بھی جمع کے صیغہ سے خطاب کر لیا جاتا ہے، اور ہو سکتا ہے کہ اس وقت کوئی خادم بھی ساتھ ہو۔ امْكُثُوْٓا جمع کا صیغہ ہے۔ تم ٹھہرو۔ اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا: میں نے معلوم کی ہے آگ، لَّعَلِّيْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ: قبس کہتے ہیں شعلے کو جو کسی لکڑی کے کنارے پر سلگا یا ہوا ہوتا ہے۔ شاید کہ میں لے آؤں تمہارے پاس اس آگ سے کوئی شعلہ سلگا کر، سلگا ہوا شعلہ لے آؤں۔ اَتٰی یَاْتِیْ: آنا۔ بِقَبَسٍ میں باء تعدیہ کی آگئی، تو یہ لانے کے معنی میں ہے۔ اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى: هُدًی مصدر ہے۔ یا پالوں میں آگ پر کوئی راہنمائی، مصدر کے طور پر ترجمہ یوں ہوگا۔ اور اگر اس کو اسم فاعل ہادی کے معنی میں لیں تو پھر ترجمہ یوں ہوگا: ''یا پالوں میں اس آگ پر کوئی راستہ بتانے والا۔'' مجھے وہاں کوئی راہنمائی حاصل ہو جائے، یا وہاں کوئی راستہ بتانے والا مجھے مل جائے۔ فَلَمَّآ اَتٰىهَا: پھر جب آ گئے موسیٰ علیہ السلام اس آگ کے پاس، نُوْدِيَ: آواز دیے گئے، يٰمُوْسٰى: اے موسیٰ! اِنِّيْٓ اَنَا رَبُّكَ بے شک میں تیرا رب ہوں فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ: پس تو اپنے دونوں جوتے اُتار دے۔ خَلَعَ یَخْلَعُ: اُتارنا۔ پس تو اُتار دے اپنے دونوں جوتے۔ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى: بے شک تو پاک وادی طویٰ میں ہے۔ طُوًی نام ہے اور بدل ہے الواد المقدس سے۔ وَاَنَا اخْتَرْتُكَ: اور میں نے تجھے پسند کر لیا، فَاسْتَمِعْ: پس تُو توجہ سے سُن، لِمَا

يُوْحٰى: ان باتوں کو جو وحی کی جاتی ہیں۔ غور سے سُن، توجہ سے سُن ان باتوں کو جو وحی کی جاتی ہیں، اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ بے شک میں اللہ ہوں، لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا کوئی معبود نہیں میرے سوا، فَاعْبُدْنِيْ: پس تو میری عبادت کر، وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ اور مجھے یاد کرنے کے لئے نماز قائم کر۔ اَقِمِ الصَّلٰوةَ: قائم کر نماز، لِذِكْرِيْ: مجھے یاد کرنے کے لئے۔ ذِکری میں مصدر کی اضافت مفعول کی طرف ہے۔ اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ: بے شک قیامت آنے والی ہے، اَكَادُ اُخْفِيْهَا قریب ہے کہ میں اس کو چھپائے رکھوں۔ اَكَادُ افعال مقاربہ میں سے ہے۔ اور ''بیان القرآن'' میں حضرت تھانوی ﷫ نے کَادَ بمعنی اَرَادَ بھی کیا ہے، تو اَكَادُ اُرِيْدُ کے معنی میں ہو جائے گا، وہ کہتے ہیں کہ عربی محاورے کے اندر کَادَ اَرَادَ کے معنی میں بھی آتا ہے (عام تفاسیر)۔ تو پھر اَكَادُ اُخْفِيْهَا کا معنی ہو جائے گا کہ میں اس کو چھپائے رکھنا چاہتا ہوں۔ لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ: اس کا تعلق اٰتِيَةٌ کے ساتھ ہے۔ بے شک قیامت آنے والی ہے تاکہ بدلہ دیا جائے ہر نفس، بِمَا تَسْعٰى: اس چیز کا جو اس نے کوشش کی۔ اور اگر ''ما'' کو مصدریہ بنالیا جائے پھر معنی ہوگا، تاکہ بدلہ دیا جائے ہر نفس اپنی سعی کا، جو سعی اس نے کی ہے جو کوشش اس نے کی ہے اس کا بدلہ دیا جائے (آلوسی)۔ فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا: پس ہرگز نہ روکے تجھے۔ عَنْهَا کی ضمیر ساعۃ کی طرف بھی جاسکتی ہے، اس قیامت سے تجھے کوئی نہ روکے، یعنی قیامت کے متعلق تیاری کرنے سے نہ روکے وہ شخص جو اس قیامت پر ایمان نہیں لاتا۔ جو شخص اس قیامت پر ایمان نہیں لاتا، ساعۃ پر ایمان نہیں لاتا، وہ تجھے اس ساعۃ سے نہ روک دے یعنی اس ساعۃ کے متعلق تیاری کرنے سے نہ روک دے۔ اور عَنْهَا کی ضمیر کا مرجع اگر صلوٰۃ کو بنالیا جائے تو بھی معنی صاف ہے (آلوسی) کہ پیچھے دو باتوں کا ذکر آیا ہے کہ نماز کو قائم کر، اور ساتھ یہ یاد دہانی کرائی گئی کہ قیامت بھی آنے والی ہے۔ تجھے اس نماز سے نہ روک دے وہ شخص جس کا قیامت پہ ایمان نہیں، جو قیامت پہ ایمان نہیں رکھتا وہ تجھے کہیں نماز سے نہ روک دے، کیونکہ جس شخص کا قیامت پہ ایمان ہوگا وہ تو نماز پابندی سے پڑھے گا، جیسے سورۂ بقرۃ میں پہلے پارے میں آیا ہے وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ کہ نماز بڑی گراں ہے، لیکن ان لوگوں پر جو ڈرنے والے ہیں، جن کا یہ خیال ہے کہ اپنے رَبّ سے ملنے والے ہیں۔ تو جن کا یہ خیال ہو کہ اپنے رَبّ سے ملنے والے ہیں، ان میں خوف اور خشیت ہوگا، وہ تو نماز کو آسان سمجھیں گے، ورنہ یہ نماز بڑی مشکل ہے، اس کی پابندی بہت مشکل ہے، تو جس کا قیامت پہ ایمان ہی نہیں وہ اتنی پابندی کہاں برداشت کرسکتا ہے، تو پھر مفہوم یہ نکل آئے گا اور یہ ترجمہ بھی اچھا ہے۔ عام طور پر مفسرین نے عَنْهَا اور بِهَا دونوں کی ضمیر قیامت کی طرف لوٹائی ہے۔ ''اس قیامت سے نہ روک دے'' مفہوم وہی کہ قیامت کی تیاری سے نہ روک دے وہ شخص جو کہ اس قیامت پہ ایمان نہیں لاتا، وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ: اور اس نے اپنی خواہش کی اتباع کی، اپنی خواہشات کے پیچھے چلتا ہے۔ فَتَرْدٰى: رَدِيَ يَرْدٰى ہلاک ہونا۔ پھر تو ہلاک ہو جائے گا، یعنی اگر کسی کے روکنے سے تو رُک گیا، قیامت سے رُک گیا، یا نماز سے رُک گیا تو تُو ہلاک ہو جائے گا، اس میں ہلاکت ہے۔ اور ابھی آپ کے سامنے سورۂ مریم میں گزرا تھا کہ فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ ان انبیاء ﷩ کے پیچھے ایسے نااہل آگئے جنہوں نے نماز ضائع کردی اور خواہشات کے پیچھے لگ گئے۔ معلوم ہوگیا کہ خواہشات کی اتباع ہو جائے تو پھر نماز ضائع ہو جاتی ہے۔ اور یہاں بھی بعد میں یہی بات آگئی وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ جو اس قیامت پہ ایمان نہیں رکھتا، خواہش کا متبع ہے، تو خود اس کو نماز سے کوئی تعلق نہیں، اور کہیں ایسا نہ ہو کہ تجھے بھی متأثر کر کے وہ نماز سے روک دے، فَتَرْدٰى: پھر تو

ہلاک ہو جائے گا۔ وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى: اے موسیٰ! یہ تیرے دائیں ہاتھ میں کیا ہے۔ یمین: دایاں ہاتھ۔ یہ کیا ہے تیرے دائیں ہاتھ میں اے موسیٰ! قَالَ هِيَ عَصَايَ: موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ میری لاٹھی ہے، اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا: میں اس کے اُوپر سہارا لیتا ہوں، میں لاٹھی کے اُوپر سہارا لیتا ہوں، وَاَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ: هَشّ پتے جھاڑنے کو کہتے ہیں۔ اور میں اپنی بکریوں پر اس لاٹھی کے ذریعے سے پتے جھاڑتا ہوں، وَلِيَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى: اور میرے لیے اس لاٹھی میں اور ضروریات بھی ہیں۔ مَآرِبُ مَأْرَبَة کی جمع، اَرَب حاجت کو کہتے ہیں، ''متنبی'' میں آپ نے پڑھا ہوگا: وَلَا انْتَهٰى اَرَبٌ اِلَّا اِلٰى اَرَبٍ: دُنیا کے اندر رہتے ہوئے حاجات ختم نہیں ہوتیں، ایک ختم ہوتی ہے دوسری سامنے آجاتی ہے۔ مَاٰرِبُ اُخْرٰى: میرے لیے اور ضروریات بھی ہیں۔ قَالَ اَلْقِهَا يٰمُوْسٰى: اللہ تعالیٰ نے کہا کہ تُو اس لاٹھی کو ڈال دے۔ اَلْقِ اَمر کا صیغہ ہے القاء سے۔ يٰمُوْسٰى: اے موسیٰ اس لاٹھی کو ڈال دے، پھینک دے۔ فَاَلْقٰهَا موسیٰ علیہ السلام نے وہ لاٹھی ڈال دی۔ فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى پس اچانک وہ سانپ تھا دوڑتا ہوا۔ سعٰی یسعٰی: بھاگنا، حَيَّةٌ سانپ کو کہتے ہیں۔ قرآنِ کریم میں دوسری جگہ ''جانّ'' کا لفظ بھی آیا ہے، اور ''جانّ'' پتلے چھوٹے سانپ کو کہتے ہیں۔ ''ثعبان مبین'' کا لفظ بھی آیا ہے، ''ثعبان'' بہت بڑے اژدہے کو کہتے ہیں، ''جانّ'' چھوٹے سانپ کو کہتے ہیں، ''ثعبان'' بڑے سانپ کو کہتے ہیں، ''حَيَّةٌ'' عام ہے ہر قسم کے سانپ کے لئے بولا جاتا ہے۔ تو بظاہر ''جانّ'' میں اور ''ثعبان'' میں تعارض معلوم ہوتا ہے۔ ''حیۃ'' اور ''جانّ'' میں، ''حیۃ'' اور ''ثعبان'' میں کوئی تعارض نہیں، کیونکہ ''حیۃ'' عام ہے ہر قسم کے سانپ کو کہتے ہیں۔ ''جانّ'' پتلے سانپ کو کہتے ہیں، ''ثعبان'' موٹے بڑے سانپ کو۔ تو پھر یا تو یوں کہہ لیجئے کہ اِبتدا میں جانّ کی طرح ہوتا تھا، آہستہ آہستہ بڑا بن جاتا، تو اس کو جانّ کہا گیا اس کی ابتدائی حالت کے اعتبار سے، اور آخر میں جا کے بہت بڑا اژدہا بن جاتا تھا، تو ثعبان اس کو آخری حالت کے اعتبار سے کہا گیا۔ یا تھا تو وہ اژدہا ہی، لیکن جو بڑا موٹا سانپ ہوتا ہے یعنی اژدہا، وہ تیزی کے ساتھ حرکت نہیں کرسکتا، تیزی سے چل نہیں سکتا، اور چھوٹا سانپ تیزی سے حرکت کرتا ہے اور چلتا ہے، تو حرکت اور تیزی کے اعتبار سے وہ جانّ تھا، جثے کے اعتبار سے ثعبان تھا، یوں بھی تطبیق دی گئی ہے (مظہری وغیرہ)۔ قَالَ خُذْهَا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس کو پکڑ لے وَلَا تَخَفْ: اور کوئی خوف نہ کر، اندیشہ نہ کر، سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْاُوْلٰى: عنقریب لوٹا دیں گے ہم اس کو اس کی پہلی حالت پر۔ سیرت سے حالت مراد ہے۔ اُولیٰ: پہلی۔ ہم اس کو اس کی پہلی حالت پہ لوٹا دیں گے، یعنی جیسے پہلے لاٹھی تھی ویسے بن جائے گی۔ وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ: اور ملا تو اپنے ہاتھ کو اپنے پہلو کی طرف، تَخْرُجْ بَيْضَآءَ: نکلے گا وہ چمکتا ہوا سفید، مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ: بغیر کسی قسم کی بیماری کے۔ اٰيَةً اُخْرٰى: اس کو یا تو تَخْرُجْ کی ضمیر سے حال واقع کرلیجئے ''نکلے گا وہ سفید چمکتا ہوا اس حال میں کہ یہ ایک اور نشانی ہے۔'' یا اس کو مفعول بنا لیجئے فعل محذوف کا خُذْ اٰيَةً اخرٰى یہ دوسری نشانی لے لو (آلوسی)، پہلی نشانی عصا والی ہوگئی اور دُوسری نشانی یہ لے لو۔ لِنُرِيَكَ مِنْ اٰيٰتِنَا الْكُبْرٰى: اور یہ ہم نے کیا جو کچھ کیا تا کہ دکھائیں تجھے اپنی آیات میں سے بڑی نشانی۔ الکبریٰ یہ نُرِیَ کا مفعول ہے، تا کہ دِکھائیں ہم تجھے بڑی نشانی اپنی نشانیوں میں سے، بعض بڑی نشانیاں دِکھائیں۔ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ: تُو چل فرعون کی طرف، جا تُو فرعون کی طرف، اِنَّهٗ طَغٰى: بے شک وہ سرکش ہوگیا ہے۔ طغٰی طغیان سے ہے، بے شک وہ طاغی ہوگیا ہے، سرکش ہوگیا ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط

پہلے آپ کے سامنے سورہ مریم گزری، اس میں کثرت کے ساتھ انبیاء علیہم السلام کے واقعات بیان کیے گئے تھے، اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے مخالفین کے مقابلے میں صبر اور استقامت کی تلقین کی گئی تھی۔ اور عیسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کے ضمن میں اور خصوصیت کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ کے ضمن میں توحید کی وضاحت کی گئی تھی۔ یہ سورت جو آپ کے سامنے آ رہی ہے اس کا زیادہ تر حصہ مشتمل ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ پر، ولادت سے لے کر آخر تک موسیٰ علیہ السلام کے حالات مختصر طور پر اس سورت میں ذکر کیے گئے ہیں۔

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی

سب سے پہلے توحید کا ذکر ہے۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ اس مسئلے کو بیان کرتے تھے، اور اس مسئلے میں کشاکشی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی، اور آپ کو غم اور صدمہ بھی تھا کہ یہ مشرکین مانتے کیوں نہیں، تو قرآنِ کریم میں جگہ بہ جگہ آپ کو تسلی دی گئی ہے کہ آپ اتنا غم نہ کریں، آپ تو اس طرح سے ان کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں گویا کہ آپ گھل گھل کے جان ہی دے دیں گے، جیسے سورۂ کہف کے شروع میں آیا تھا: فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓی اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا، اگر یہ ایمان نہیں لائیں گے تو آپ تو ان کے پیچھے اپنی جان ہی گھلا دیں گے؟ تو یہ فکر جو لگ جاتی تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پھر اس کے لئے دن رات محنت اور تبلیغ کرتے تھے، اور پھر قرآنِ کریم کی تلاوت کثرت سے کرتے تھے، رات کو قیام فرماتے اور اتنا قیام فرماتے کہ پاؤں پر ورم آ جاتے، تو مشرکین دیکھ دیکھ کر کہتے کہ قرآن اس پر کیا اُترا، یہ تو مصیبت میں پڑ گیا ہے، اس کو کسی وقت چین ہی نہیں۔ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر بھی پہلے پہلے تہجد فرض تھی، جس طرح سے سورۂ مزمل میں موجود ہے، تو رات کا اکثر حصہ صحابہ رضی اللہ عنہم بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مل کے نوافل پڑھا کرتے تھے اور قرآن پڑھتے تھے۔ تو پہلی آیت میں تو اللہ تعالیٰ نے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو تلقین کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اتنی محنت نہ کریں، نہ آپ اتنے غم میں پڑیں، یہ قرآنِ کریم آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اس لیے نہیں اتارا گیا کہ آپ اتنی مشقت اٹھائیں جتنی مشقت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پڑ گئے ہیں، اس کا مقصد تو ڈرنے والوں کے لئے تذکرہ ہے، کہ جو اللہ سے ڈرے اسے یاد دہانی کراؤ، اس کو اپنے انجام کی فکر لگے، اور اپنے انجام کی فکر کر کے وہ اپنے آپ کو سدھار لے۔ اور جس کے دل میں خوف ہی نہیں ہے، خشیت ہی نہیں ہے، اس کو انجام کی فکر ہی نہیں، وہ اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکے گا، جیسے اِبتدا اِبتدا میں آیا تھا هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ کہ یہ تو ڈرنے والوں کے لئے راہنمائی ہے، کہ پہلے کسی کے دل میں کچھ خوف اور خشیت پیدا ہو، انجام کی فکر لگے پھر قرآنِ کریم اس کی راہنمائی کرتا ہے، اور اگر خوف اور خشیت نہیں اور انجام کی فکر نہیں، تو وہ شخص قرآنِ کریم کی راہنمائی سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔

عظمتِ قرآن صفاتِ الٰہی کے ضمن میں

قرآنِ کریم کی عظمت کو ظاہر کرتے ہوئے کہہ دیا کہ یہ اس کی طرف سے اُتارا گیا ہے جس نے زمین کو پیدا کیا، اور آسمانوں کو پیدا کیا جو کہ بلند ہیں، یہ اس ذات کی طرف سے آیا ہوا ہے، اس کا اُتارا ہوا ہے، اس سے اس کی عظمت نمایاں ہے۔ اور یہ بھی عظمت کی بات ہی ہے کہ قرآنِ کریم کو اُتارنے والا رحمٰن ہے، تو قرآنِ کریم کا اُترنا اس کی رحمت کا مظہر ہے، قرآنِ کریم کا اُترنا مشقت میں ڈالنا نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت کا ظہور ہے، جیسے دوسری جگہ آتا ہے اَلرَّحْمٰنُ ۙ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۙ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ، اس سے معلوم ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا ظہور قرآنِ کریم کے ذریعے سے ہوا ہے۔ اور پھر وہ رحمٰن عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى عرش کے اُوپر قرار پکڑے ہوئے ہے۔ اس کی تفصیل آپ کے سامنے سورۂ اعراف میں گزری تھی کہ عرش پر استواء کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ زمین اور آسمان کو پیدا کرنے کے بعد فارغ ہو کے ایک طرف ہو کے نہیں بیٹھ گیا کہ زمین اور آسمان کو پیدا تو اس نے کر دیا، مخلوق تو اس میں بنادی اللہ تعالیٰ نے، اور اس کے اوپر حکومت کسی اور کی ہو جائے، جو آئے آ کے اپنا تخت بچھالے اور حکومت چلانی شروع کر دے، ایسی بات نہیں، اس کائنات کو پیدا کرنے کے بعد اس کائنات میں تخت نشین بھی اللہ ہی ہے، کوئی دوسرا تخت نشین نہیں۔ ''تخت نشین'' ہونا یہ اشارہ ہوتا ہے صاحبِ اقتدار اور صاحبِ حکومت ہونے کی طرف، کہ اس کائنات میں تخت نشین اللہ ہی ہے۔ جس طرح سے آپ کہتے ہیں چیئرمین، کرسی والا، تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اس علاقے میں اختیار اسی کا چلتا ہے، کرسی اسی نے بچھا رکھی ہے۔ تو یہاں بھی ایسے ہی ہے کہ کائنات کو پیدا کرنے کے بعد یہ نہیں کہ اب اس میں لوگوں کی حکومتیں ہو جائیں اور اپنے اپنے حکم چلاتے رہیں۔ نہیں! ساری کائنات میں حکم اسی کا چلتا ہے۔ عرش تخت کو کہتے ہیں، اس کی ظاہری صورت ہم متعین نہیں کر سکتے، کہ عرش کے اُوپر اللہ نے قرار کس طرح سے پکڑا؟ یہ متشابہات میں سے ہے، اور اس کی اس مراد کے اوپر ایمان لانا ضروری ہے کہ اس کائنات کا بادشاہ بھی اللہ ہی ہے، تخت نشین اللہ ہی ہے، جب تخت نشین وہ ہے، بادشاہ وہ ہے، تو اسی کا فرمان قرآن کی شکل میں آیا، تو اس کو نہ ماننا گویا کہ کائنات کے بادشاہ کے خلاف بغاوت ہے۔ پھر ایک ملک میں رہتے ہوئے اگر آپ بغاوت کریں تو بچنے کی کوئی صورت بھی ہو سکتی ہے، چھپ جاؤ، بادشاہ کے ہاتھ میں نہ آؤ، یا جس طرح سے باغی لوگ ملک کی حدود عبور کر کے دوسرے ملکوں میں چلے جاتے ہیں اور اس حکومت کے بس سے باہر ہو جاتے ہیں، لیکن یہ بادشاہ تو ایسا ہے کہ جس کی بادشاہت سارے زمین آسمان میں ہے، اس کا باغی نکل کے کہیں جا نہیں سکتا، اور نہ وہ کہیں چھپ سکتا ہے، اس لیے آگے مالکیت کو اور علمی احاطے کو ذکر کیا، ''اسی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے (لام ملکیت کے لئے ہے) جو کچھ آسمانوں میں ہے، جو کچھ زمین میں ہے، جو درمیان میں ہے، جو کچھ گیلی مٹی کے نیچے ہے، سب میں ملکیت اسی کی ہے دوسرا کوئی مالک نہیں، حاکم وہی ہے دوسرا کوئی حاکم نہیں، خالق وہی ہے (خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰى) دوسرا کوئی خالق نہیں، تو خالق کوئی نہیں، مالک کوئی نہیں، حاکم کوئی نہیں، ان آیتوں کا مصداق یہ ہوا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی کایا انہی آیات سے پلٹی تھی

اور آپ کو یاد ہوگا کہ یہی وہ آیات ہیں جنہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی کایا پلٹ دی تھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ جس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کے جذبے سے گھر سے نکلے تھے، تو راستے میں کوئی اور (نُعیم بن عبداللہ نحّام رضی اللہ عنہ) مل گیا تھا، اس نے پوچھا تھا کہ عمر! کہاں جارہے ہو؟ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں روز روز کا جھگڑا ختم کرنا چاہتا ہوں، جنہوں نے برادری میں تفریق ڈال دی، جنہوں نے ہمارے آباء کے مذہب کو بدل کے رکھ دیا، آج میں ان کا خاتمہ کردوں گا، ان کو قتل کرنے کی نیت سے جارہا ہوں، ان کا سر اُتارنے کے لئے جارہا ہوں۔ انہوں نے کہا آپ کس خیال میں پڑے ہوئے ہیں؟ پہلے اپنے گھر کی خبر تو لو! کہ آپ کی بہن اور بہنوئی دونوں ہی مسلمان ہوچکے ہیں۔ ان کے بہنوئی سعید بن زید رضی اللہ عنہ تھے جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، ان کو غصہ آیا تو یہ واپس چلے گئے، (یہ واقعہ آپ وعظوں اور تقریروں میں سنتے رہتے ہیں، غالباً حکایاتِ صحابہ میں بھی ہے) تو جس وقت یہ واپس گئے ہیں تو ان کی بہن اور بہنوئی بیٹھے قرآنِ کریم پڑھ رہے تھے، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھ کے انہوں نے وہ اوراق چھپا لیے۔ تو انہوں نے بہن کو پیٹا، بہنوئی کو پیٹا، لیکن جب کسی طرح سے وہ نہیں مانے اور باز نہیں آئے، تو پھر ان کا دِل نرم ہوا، پھر پوچھنے لگے کہ تم کیا پڑھ رہے تھے؟ تو بہن نے کہا کہ تُو تو ناپاک ہے، وہ چیز پاک ہے، ہم تیرے ہاتھ میں نہیں دے سکتے، پہلے غسل کرو، صفائی حاصل کرو، اس کے بعد دیں گے۔ تو انہوں نے طہارت حاصل کی، بعد میں جو اوراق ان کے ہاتھ میں دیے گئے ان میں یہی آیات لکھی ہوئی تھیں، تو انہی کو پڑھ کے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دِل دِماغ بدل گیا۔ اور وہ صحابی (خباب بن اَرت رضی اللہ عنہ) جو ان کو پڑھانے کے لئے بیٹھے ہوئے تھے، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو آتا دیکھ کے چھپ گئے تھے، وہ ظاہر ہوگئے۔ تو انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بشارت دی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کل ہی دُعا فرمائی: ''اَللّٰهُمَّ اَعِزَّ الْاِسْلَامَ بِعُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ اَوْ بِعَمْرِو بْنِ هِشَامٍ''[1] ''عمرو بن ہشام'' ابوجہل کا نام ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے دو میں سے ایک مانگا ہے کہ یااللہ! اسلام کو قوت پہنچا، یا عمر بن خطاب کو اسلام کی توفیق دے کر، یا عمرو بن ہشام کو اسلام کی توفیق دے کر۔ تو وہ دُعا تیرے حق میں قبول ہوگئی، تو اسی وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ گئے تھے اور جاکے مسلمان ہوگئے تھے۔ وہ یہی سورۂ طٰہٰ کی ابتدائی آیات تھیں جن میں شرک کی جڑ بایں انداز کاٹ دی گئی کہ اللہ کے علاوہ کوئی خالق نہیں، اللہ کے علاوہ کوئی حاکم نہیں، اور اللہ کے علاوہ کوئی مالک نہیں، اور اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اللہ تعالیٰ کا علم بہت تام ہے، تو جب اس میں اس قسم کی صفتیں جمع ہیں اور اور بھی بے شمار صفتیں جمع ہیں، تو اس کے ساتھ کوئی دوسرا شریک کس طرح سے ہوسکتا ہے، اور ایسے حاکم اعلیٰ کی طرف سے، اور ایسے مالک حقیقی کی طرف سے، اور ایسے خالق حقیقی کی طرف سے یہ کلام آیا ہوا ہے، تو اس کی عظمت کا احساس حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ہوگیا، اور ساری زندگی کا کُفر وشرک کٹ گیا۔

---

(۱) ''حیاۃ الصحابہ'' ۱ر۳۵۷، باب ثالث، بعنوان تحمل سعید۔ نیز ترمذی ج ۲ ص ۲۰۹ باب فی مناقب عمر۔ مشکوۃ ص ۵۵۷، باب مناقب عمر، فصل ثانی، مختصرًا و اللفظ مختلف۔

’’مَا تَحْتَ الثَّرٰی‘‘ کا علم اللہ کو ہی ہے

آگے یہ جو آیا کہ وَمَا تَحْتَ الثَّرٰی: اس سے مراد ہے کہ زمین کو آپ کھودتے ہیں، تو نیچے پانی کے اثر سے گیلی مٹی نکلا کرتی ہے، تو گیلی مٹی کے نیچے کیا کچھ ہے وہ سب کچھ اللہ کے قبضے میں ہے، اللہ اس کا مالک ہے۔ نیچے کیا کیا چیزیں ہیں؟ آئے دن نئی نئی چیزیں نکلتی ہیں، نئی نئی چیزیں دریافت ہوتی ہیں، اور ابھی اتنی چیزیں چھپی ہوئی ہیں کہ جتنی ظاہر ہوگئیں اس سے کروڑ ہا درجے زیادہ، آج کل چونکہ تحقیقات کا دور ہے، کہتے ہیں کہ یورپ والوں نے یہ کوشش کی کہ معلوم کیا جائے کہ زمین کا قطر کتنا ہے۔ قطر کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یوں تو زمین ماپ لی، اوپر سے جو دائرے کی شکل میں ہے، کہ اس کی مسافت کتنی ہے، ایک جگہ سے چلیں تو کتنی مسافت طے کر کے آئیں گے تو دوبارہ اسی نقطے پہ پہنچ جائیں گے، جس طرح سے دائرے کا محیط ہوا کرتا ہے وہ تو معلوم ہوگیا، پیمائش بھی کرلی، قاعدے کے لحاظ سے یہ بھی نکال لیا کہ ایک کنارے سے دوسرا کنارے کے درمیان میں کتنا فاصلہ ہے جس کو ’’قطر‘‘ کہتے ہیں، کہ اگر یہاں سے سوراخ کرنا شروع کریں اور دوسری طرف وہ سوراخ نکل جائے تو یہ کتنے میل کی مسافت ہے کہ دوسری طرف سوراخ نکل جائے، اگر ہم اتنا لمبا سوراخ کرلیں، تو حساب تو لگا لیا، لیکن جب سوراخ کرنے کی کوشش کی، برمے لگائے، تو حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں بھی ذکر کیا ہے اور کسی اور جلد کے اندر بھی ذکر کیا ہے (جلد ۸ سورۂ نجم کے تحت) کہ کوشش کرنے کے بعد زیادہ سے زیادہ چھ میل تک نیچے سوراخ کر سکے ہیں، مختلف جگہوں پر کوشش کی گئی، چھ میل سے آگے ان کا برما نہیں جاتا، ایسے معلوم ہوتا ہے کہ آگے کوئی ٹھوس اور پتھر جیسی چیز ہے، کہ ہر برما وہاں جا کے عاجز آجاتا ہے، آگے نہیں جاتا، اور بعض نے یوں ذکر کیا ہے کہ جب وہاں تک برما جاتا ہے تو نیچے حرارت اتنی ہے کہ کتنی ہی پختہ اسٹیل کا بنا ہوا ہو، وہاں جا کے پگھل جاتا ہے، آگے چلتا ہی نہیں ہے، تو آگے حجری حجاب آگیا، پتھر جیسا حجاب آگیا، یا گرمی کی اتنی شدت ہوگئی، اب اس کے آگے کیا کچھ ہے، اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں کہ زمین کے اندر کیا کچھ بھرا ہوا ہے، اور جب یہ پھٹے گی، جب قیامت آئے گی تو کس طرح سے پرزے پرزے اُڑ جائیں گے، یہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں جو کچھ حالات پیش آنے والے ہیں، اور جو کچھ اس وقت تحت الثریٰ موجود ہے، ہر چیز کے اوپر مالکیت اللہ کی ہے، کوئی چیز اللہ کی ملک سے باہر نہیں۔

اللہ کے علم کا اِحاطہ اور صفاتِ اِلٰہیہ کا مقتضا

آگے علم کا احاطہ آ گیا کہ تم جو کچھ زبان سے بول دو وہ تو اللہ جانتا ہی ہے کیونکہ وہ تو سِر اور اَخفیٰ کو جانتا ہے۔ سِر وہ ہے جو آپ کے دل میں خیال آیا اور آپ ابھی چھپائے بیٹھے ہیں، اور اَخفیٰ یہ ہے کہ جو آنے والا خیال ہے جس کا ابھی تک آپ کو بھی پتا نہیں۔ یا یوں فرق کر لیجئے کہ ’’جہر‘‘ تو وہ ہے جس طرح سے اس وقت میں بول رہا ہوں، اور ’’سِر‘‘ وہ ہوتا ہے جو چپکے چپکے آپ زبان سے الفاظ ادا کریں، جو دوسرے کو پہنچتے نہیں ہیں، لیکن آپ زبان سے ادا کرتے ہیں یہ سِر ہے، اس لیے سِری قراءت جو آپ کیا کرتے ہیں کہ یہاں آپ نے سِراً پڑھنا ہے، یہاں آپ نے جہراً پڑھنا ہے، تو سِر کا معنی یہ ہوگا کہ زبان حرکت کرتی ہے اگرچہ دوسرا آدمی آپ کے الفاظ کو سُن نہیں سکتا لیکن زبان نے حرکت کی۔ اور اَخفیٰ وہ ہے جو آپ کے دل میں خیال ہے جو ابھی تک زبان

پر بھی نہیں آیا۔ تو جہر کرو، چپکے چپکے کہو، دل میں چھپاؤ، کوئی چیز چھپی نہیں رہتی، سب کو اللہ تعالیٰ جانتا ہے، اللہ کے علم کا احاطہ یہ ہے۔ تو ان صفات کا تقاضا یہ ہوا کہ، لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ: اس کے علاوہ کوئی دوسرا معبود نہیں، کوئی الٰہ نہیں، اس کی اُلوہیت میں کوئی شریک نہیں، اس کے لئے اچھی اچھی صفتیں ہیں، یہ صفتیں بھی ہیں جو پیچھے ذکر کی گئیں، اور ان کے علاوہ بھی ہیں۔ اور یہ وہ صفتیں ہیں جو شرک کی جڑ کاٹ کے رکھ دیتی ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی عظمت اس طرح سے انسان کے ذہن میں آتی ہے کہ کسی دوسرے کو ساتھ شریک کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ ذِکر کرنے کا مقصد

آگے قصہ آ گیا حضرت موسیٰ علیہ السلام کا، اور موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو جو سنایا جا رہا ہے تو یہ آپ کے حال کے بہت مطابق تھا اس زمانے کے لحاظ سے، واقعے کے ضمن میں گویا کہ ہدایات دی جا رہی ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے کن حالات میں وقت گزارا، اور کیسی بڑی طاقت کے ساتھ آپ کی ٹکر ہوئی، اور کس طرح سے اللہ تعالیٰ کی نصرت ہر جگہ ان کے ساتھ شاملِ حال ہوئی، صبر و اِستقامت انہوں نے کیسے اختیار کیا، تو آپ کو بھی چاہیے کہ آپ بھی اسی طرح سے بڑی سے بڑی طاقت کا مقابلہ صبر و تحمل کے ساتھ کریں، جس طرح سے اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی ہر جگہ حفاظت فرمائی اور آخر کامیابی موسیٰ علیہ السلام کو ہوئی، اور جو وقت کا بڑا فرعون تھا اس کی ہر تدبیر مقابلے میں عاجز رہ گئی، اسی طرح سے آپ کے مخالفین جتنے ہیں وہ سب ناکام رہ جائیں گے، واقعے کے ضمن میں گویا کہ یہ سبق پڑھایا جا رہا ہے، مثال اور واقعے کے ذریعے سے انسان کے ذہن میں کسی حقیقت کا اُتارنا آسان ہوتا ہے، اور واقعے کے ضمن میں بات اچھی سمجھ میں آیا کرتی ہے، اس لیے جو اُصول ذکر کیے جایا کرتے ہیں، بعد میں ان کو عملی نقشے کے طور پر جب دکھایا جاتا ہے، واقعے کے طور پر دکھایا جاتا ہے، تو اچھی طرح سمجھ آ جاتے ہیں۔

موسیٰ علیہ السلام کو نبوّت ملنے کا واقعہ

یہاں سے واقعہ شروع ہوا کہ کیا آپ کے پاس حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بات آئی؟ آپ نے سنی؟ یہ بھی گفتگو کا محاورہ ہے "آپ کو پتا ہے؟ آپ کو معلوم ہوا؟ آپ نے دیکھا؟ آپ نے سُنا؟" اس قسم کے لفظ کلام کی اِبتدا میں آیا کرتے ہیں۔ واقعے کا جو اِبتدائی حصہ ہے وہ بھی آگے کچھ آ رہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تو اس وقت کیا حالات تھے؟ بعد میں کن حالات کے تحت ان کو اپنا ملک چھوڑنا پڑا؟ اس کی زیادہ تفصیل سورۂ قصص میں آئے گی، اور ملک چھوڑ کے یہ مدین میں چلے گئے تھے، وہاں شعیب علیہ السلام کے گھر ٹھہرے اور ان کی بیٹی سے شادی کی، اور آٹھ سال یا دس سال ان کے ہاں کام کرتے رہے، بکریاں چُراتے رہے، تو جب وہ اَجل پوری ہوگئی، میعاد پوری ہوگئی تو پھر موسیٰ علیہ السلام نے واپسی کا سوچا، اب یہاں مصر سے تو وہ بھاگے تھے اور ایک آدمی کو قتل کر کے بھاگے تھے، تفصیل سورۂ قصص میں آئے گی، اب واپسی کا جو سوچ رہے ہیں تو اس لیے کہ اب اتنی مدت گزر گئی، اور اب جائیں، کہیں چپکے چپکے جا کے اپنی برادری میں شامل ہو جائیں، اپنی ماں کا حال دیکھیں، اپنے دوسرے متعلقین کا حال دیکھیں، اتنے عرصے کے بعد اگر کوئی انسان مخفی طور پر چلا جائے حالات وغیرہ معلوم کرنے کے لئے، تو ضروری نہیں ہوتا کہ کسی کی گرفت میں

آ جائے۔اندریں حالات موسیٰ علیہ السلام نے مدین سے مصر کی طرف دوبارہ سفر کیا،موسم سرد تھااور رات کو رات کی تاریکی میں راستہ بھول گئے،اور ادھر سردی کی وجہ سے تکلیف،لاٹھی آپ کے ہاتھ میں ہوتی ہی تھی،بکریاں چرانے والے ویسے بھی آپ کو پتا ہے کہ ڈنڈا ہاتھ میں رکھا ہی کرتے ہیں،لیکن ہاتھ کے اندر لاٹھی کا رکھنا انبیاء علیہم السلام کی سُنّت نقل کی ہے،حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک جگہ صراحت فرمائی ہے کہ انبیاء علیہم السلام ہاتھ میں لاٹھی رکھا کرتے،اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی لاٹھی کا ذکر بھی حدیث شریف میں آتا ہے،موسیٰ علیہ السلام کے عصا کا ذکر ہے،سلیمان علیہ السلام کے عصا کا ذکر بھی قرآنِ کریم میں ہے۔تو چلتے ہوئے عام طور پر ڈنڈا ہاتھ میں رکھنا،لاٹھی ہاتھ میں رکھنا،یہ انبیاء علیہم السلام کی سُنّت ہے۔اور آپ نے اکابر کو علماء کو دیکھا ہوگا،ان کی بھی عادت ہے کہ اکثر و بیشتر لٹھیا ہاتھ میں رکھا کرتے ہیں۔اور اس میں ایک فائدہ بھی ہوتا ہے کہ مسلمان ادنیٰ سا مسلح رہے،کم از کم کوئی کتا بلی سامنے آجائے تو اس کا مقابلہ تو کر سکے،ڈنڈے میں اللہ نے ایک تاثیر رکھی ہے کہ اس کا ہر چیز پر رُعب پڑتا ہے،انسان اگر خالی ہاتھ ہو تو کتی کا بچہ بھی سامنے آجائے تو وہ بھی چھیڑنے کی جرأت کرتا ہے،اور ڈنڈا ہاتھ میں آجائے تو اس کا باپ بھی ڈر جاتا ہے،یہ ڈنڈے کی خاصیت ہے،اس لیے یہ مسلمان کے ہاتھ میں رہے تو گویا کہ ادنیٰ درجے کا اسلحہ ہر وقت موجود رہتا ہے،اور واقعی اس کا بہت فائدہ ہوتا ہے،تو انبیاء علیہم السلام کی سُنّت اسی طرح سے ہے۔

رات کو راستہ بھول گئے،سردی کی تکلیف تھی،تو طور کے اوپر اس طرح سے چمک معلوم ہوئی جس طرح سے کوئی آگ جل رہی ہے۔حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نظر پڑ گئی،گھر والوں سے کہا کہ تم تو یہاں ٹھہرو،اور میں وہاں جاتا ہوں،یا تو وہاں سے آگ لاؤں گا اور یہاں آگ جلائیں گے،اور آگ تاپیں گے، لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ (سورۂ قصص:۲۹) جس طرح سے قرآنِ کریم میں آئے گا، کہ تا کہ تم اس سے گرمی حاصل کرو،تاپو،تو سردی کا علاج ہو جائے گا۔اور عادت بھی یہی ہے کہ جہاں آگ وغیرہ جلتی ہے،وہاں کوئی نہ کوئی آدمی ہوگا،تو میں اس سے راستہ بھی پوچھ لوں گا،راہنمائی حاصل ہو جائے گی،کوئی راستہ بتانے والا مل جائے گا،اس طرح سے اپنے گھر والوں کو کہہ کے وہ طور کی طرف چلے گئے،جب وہ اس درخت کے قریب پہنچے تو جا کے عجیب نظارہ دیکھتے ہیں کہ آگ جل رہی ہے لیکن درخت بالکل سرسبز ہے،اور جیسے جیسے آگ جوش مارتی ہے تو درخت اور سرسبز ہوتا چلا جا رہا ہے،آگ کا اثر درخت پر نہیں ہو رہا۔اس وقت پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس درخت سے آواز آئی،جیسے قرآنِ کریم میں دوسری جگہ ہے: نُوْدِیَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَیْمَنِ فِی الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ (سورۂ قصص:۳۰) درخت سے آواز محسوس ہوئی کہ درخت سے آواز آ رہی ہے،جیسے آگے الفاظ آئیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ میں اللہ ہوں،میرے بغیر کوئی معبود نہیں،یہ درخت کی طرف سے جو آواز سنی گئی تھی،یہ درخت نہیں بول رہا تھا...... یہ ایسے ہی ہے جس طرح سے کہ آپ ٹیلی فون سنتے ہیں،اور آپ نے ہاتھ میں ایک ڈنڈا سا پکڑا ہوا ہوتا ہے،تو آواز اس میں سے آتی ہے،لیکن آپ جانتے ہیں کہ آواز کس کی ہے؟ آپ کے اَبّاجی بول رہے ہیں،بھائی بول رہا ہے،دوست بول رہا ہے،تو آپ اس کو اَبّاجی کہہ کے،بھائی کہہ کے خطاب کرتے ہیں تو مراد وہ نہیں ہوتا جو آپ کے ہاتھ میں ہے۔تو جیسے ٹیلی فون کی آواز ہے (آج کل یہ حقائق سمجھانا ان واقعات کے تحت آسان ہو گیا) تو اَب ٹیلی فون کی مثال بہت واضح ہے کہ کہاں سے آدمی بول رہا ہے،اور آواز کہاں آ رہی ہے،اور دیکھنے والا سمجھتا ہے کہ شاید یہ اس سے باتیں کر رہے ہیں جس کو ہاتھ میں لیے بیٹھے ہیں...... ایسے ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو درخت کی طرف سے آواز محسوس ہوئی،جو آواز آگے ذکر کی گئی،جس میں اللہ تعالیٰ نے توحید کے

عقیدے کی تلقین کی، آخرت کے عقیدے کی تلقین کی، اور خود ان کے لئے رسالت کا تذکرہ کیا کہ میں نے تجھے چن لیا اور میں تجھے یہ کلام جو پہنچا رہا ہوں اس کو توجہ کے ساتھ سنو، تو توحید، رسالت اور معاد تینوں چیزیں اس میں آ گئیں، اور یہی بنیادی عقیدے ہیں جو انبیاء علیہم السلام کو دیے جاتے ہیں، اور انبیاء علیہم السلام نے آگے قوم کو پہنچانے ہوتے ہیں۔ اور پھر خصوصیت سے نماز کا ذکر کر دیا تو اس سے آپ اندازہ کر لیجئے کہ نماز کتنی اہم چیز ہے کہ ان عقائد کے تذکرے کے ساتھ ساتھ نماز کا حکم دیا جا رہا ہے، اور پھر محتاط کیا جا رہا ہے کہ دیکھنا کہیں! وہ لوگ جو آخرت کے قائل نہیں ہیں، وہ تمہیں نماز سے باز نہ رکھیں۔ جو خواہشات پر چلتے ہیں، آخرت کے قائل نہیں ہیں وہ تمہیں کہیں نماز سے روک نہ دیں، ان کے ساتھ مل کے، ان کے پاس بیٹھ کے متاثر نہیں ہونا اور نماز سے غفلت نہیں برتنی، یہ ساتھ تاکید آ گئی۔ اور عقیدوں پر پختگی کا ذکر کر دیا کہ جن کا خود آخرت پر ایمان نہیں ہے، کہیں وہ تمہیں آخرت کی تیاری کرنے سے منع نہ کر دیں، روک نہ دیں، کہ وہ خود غافل ہیں اور ان کے ساتھ مل کے تم بھی غافل ہو جاؤ۔ تو پہلے تو عقائد کی تلقین کی۔

موسیٰ علیہ السلام کے معجزات

عقائد کی تلقین کے بعد اب موسیٰ علیہ السلام کو معجزے دیے جا رہے ہیں، معجزے دے کر موسیٰ علیہ السلام کو مسلح کیا جا رہا ہے فرعون کے مقابلے کے لئے، عام طور پر انبیاء علیہم السلام کو معجزہ اس وقت دیا جاتا ہے کہ جس وقت وہ قوم سے جا کر مخاطب ہوتے ہیں اور قوم سے مخاطب ہونے کے بعد قوم کوئی نشانی مانگتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے معجزہ ظاہر کیا جاتا ہے، لیکن یہاں قوم کے سامنے تو موسیٰ علیہ السلام ابھی گئے ہی نہیں، اور ان کو مسلح پہلے کیا جا رہا ہے، کیونکہ جس کی طرف ان کو بھیجا جا رہا تھا وہ انتہائی درجے کا سرکش تھا، وہ ایسا تھا کہ اگر موسیٰ علیہ السلام جاتے اور اس کے سامنے کوئی مرعوب کن بات نہ ہوتی، تو ممکن ہے کہ وہ موسیٰ علیہ السلام پر دست درازی کرتا، تو موسیٰ علیہ السلام کو وہاں جانے سے پہلے ہی اتنے عظیم معجزے دے دیے گئے اور موسیٰ علیہ السلام کو ان پر اتنا اعتماد دلا دیا گیا کہ فرعون کو جس طرح سے اپنی فوجوں پر اعتماد تھا، تو موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے معجزات دے کر اتنی خود اعتمادی پیدا کر دی کہ ان معجزات کو لو، اور دشمن کے مقابلے میں چلے جاؤ۔ اب ایک طرف رُوحانیت ہے اور ایک طرف مادّیت ہے کہ ایک طرف فرعون کی ساری فوجیں اور اس کی حکومت، اور دوسری طرف موسیٰ علیہ السلام کے پاس یہ اللہ کے دیے ہوئے ہتھیار، کہ یہ لے کر جاؤ اور دشمن کے مقابلے میں جب جاؤ گے تو اِن شاء اللہ! ہر جگہ تم کامیاب ہو گے، جس طرح سے آگے آیات کے اندر لفظ آئیں گے۔

پہلے متوجہ کیا کہ یہ آپ کے ہاتھ میں کیا ہے؟ موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں لاٹھی تھی۔ متوجہ اس لیے کیا کہ اب موسیٰ علیہ السلام کی اللہ تعالیٰ سے کلام ہو رہی تھی، اور آپ جانتے ہیں کہ جب یہ صورت پیش آئی ہوئی ہو گی تو موسیٰ علیہ السلام اپنے آپ سے بھی غافل تھے، انسان کی کسی اور طرف توجہ ہی نہیں ہوتی، اگر ہاتھ میں پکڑے پکڑے ویسے ہی وہ سانپ بن جاتا، تو موسیٰ علیہ السلام کو خیال ہوتا کہ شاید رات کے اندھیرے میں، میں نے پہلے ہی کوئی غلط چیز پکڑ رکھی تھی، اس لیے پہلے متوجہ کیا کہ یہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے؟ تو موسیٰ علیہ السلام متوجہ ہو گئے کہ یہ لاٹھی ہے، اور میں اس سے سہارا لیتا ہوں، جس طرح سے چلتے ہوئے انسان لاٹھی زمین پر لگا کر سہارا لیتا ہے، یا اس سہارے سے مراد یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی کا جو نقشہ نقل کیا گیا ہے وہ اس طرح سے نہیں جس طرح سے ہمارے ہاتھ میں کھونٹی

ہوتی ہے،سرورِکائنات ﷺ کی کھونٹی کا ذکر تو ایسے ہی ہے کہ پکڑنے کے لئے اوپر سے یوں مڑی ہوئی تھی،موسیٰ علیہ السلام کی جو لاٹھی ذکر کی گئی ہے اس میں کیفیت اور ہے، نیچے سے ڈنڈا،اور اس کے اوپر دوشاخا بنا ہوا، یہ بعض بعض ملنگوں کے پاس آپ نے سریے کے بنے ہوئے دیکھے ہوں گے،تو جس وقت بکریاں چرائیں، بکریاں چر رہی ہوں تو اس کو بغل میں دے کر اس پر سہارا لے کر کھڑے ہو جاتے ہیں،اور وہ ایک اچھا خاصا سہارا بن جاتا ہے،تو اس کی کیفیت ایسے تھی، کہ اوپر دوشاخا تھا،اور اس کو یوں بغل میں لیا،اس طرح سے سہارا لے کے کھڑے ہو گئے،اور عام چرواہوں کو بھی آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہ بھی لاٹھی اس طرح سے بغل میں دے کے یوں کھڑے ہو جایا کرتے ہیں،اور کھڑے ہونے میں سہولت ہو جاتی ہے،اور جہاں کہیں درخت اونچا ہو،اور بکریاں وہاں تک منہ نہ لے جا سکیں،تو اسی لاٹھی کے ذریعے سے پتے جھاڑ دیتے ہیں تاکہ بکریاں کھالیں،اور اس کے علاوہ اور ضروریات جیسے سانپ کو مارنا ہو گیا، بچھو کو مارنا ہو گیا، سامان انسان کندھے پر رکھ کے لاٹھی کے ساتھ سامان اٹھا لیتا ہے،اور بھی اس قسم کی ضرورتیں لاٹھی کے ساتھ پوری ہوتی رہتی ہیں،موسیٰ علیہ السلام نے ساری تقریر کر دی جس سے اس عصا کی ذات اور اس کی صفات موسیٰ علیہ السلام کے سامنے آ گئیں اور کامل توجہ ادھر ہو گئی،تو پھر اللہ نے کہا کہ اب اسے پھینک دو،جس وقت موسیٰ علیہ السلام نے پھینکا تو پھینکتے ہی وہ سانپ بن گیا، بڑی تیزی سے حرکت کرنے لگ گیا اور بڑا عظیم الجثہ،تو دیکھتے ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اوپر طبعی طور پر کچھ خوف ساطاری ہو گیا۔انسان ہونے کی حیثیت سے، جب ایک نئی چیز سامنے پیش آئی اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے،تو کچھ خوف ساطاری ہوا،تو اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اب اسے پکڑو، جب پکڑو گے ہم اسے پہلی صورت پر ہی لوٹا دیں گے،اسی کی پہلی حالت ہو جائے گی۔

تو بعض آثار میں نقل کیا گیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو جب پکڑنے کے لئے کہا گیا،تو موسیٰ علیہ السلام ہاتھ کے اوپر کپڑا لپیٹنے لگے تاکہ کپڑا لپیٹ کر اس کو پکڑیں۔تو کہتے ہیں کہ فرشتوں نے کہا اے موسیٰ! اگر اللہ تعالیٰ بچانا نہ چاہے تو کیا یہ کپڑا تجھے بچالے گا؟ تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ نہیں، بچا تو نہیں سکتا لیکن میں ایک ضعیف انسان ہوں،اس لیے مجھے ظاہری اسباب کی طرف دیکھنا پڑتا ہے، یہ ''فوائدِ عثمانی'' میں شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے،تو یہ ایک طبعی کیفیت ہے کہ جب وہ سانپ تھا،اور منہ کھولے ہوئے تھا، وہی جو دوشاخا تھا وہی اس کا منہ بن گیا،موسیٰ علیہ السلام کو جب پکڑنے کے لئے کہا گیا تو ایک طبعی سی ہیبت طاری ہوئی،اور جب فرشتوں کی طرف سے یہ گفتگو ہوئی تو کہتے ہیں کہ پھر موسیٰ علیہ السلام نے ہاتھ اس کے منہ میں دیا،اور منہ میں دینا ہی تھا کہ وہ ایسے ہو گیا جس طرح سے اپنا دوشاخا پکڑا ہوا ہے،جس طرح سے پہلے پکڑا کرتے تھے اسی طرح سے وہ ہاتھ میں لاٹھی بن گئی۔تو ایک یہ معجزہ دکھایا گیا،اور پھر دوسرے معجزے کے لئے کہا گیا کہ اپنے ہاتھ کو پہلو میں لگاؤ،تو جب پہلو میں لگا کر نکالا تو سفید چمکتا ہوا سورج کی طرح ہاتھ نکل آیا،اور یہ کسی بیماری کے اثر سے نہیں تھا،جس طرح سے برص ہو جاتی ہے تو ہاتھ سفید ہو جاتا ہے،ایسے نہیں، کیونکہ اگر بیماری کے اثر سے ہاتھ سفید ہو تو پھر وہ سفید ہی رہتا ہے،لیکن موسیٰ علیہ السلام جب دوبارہ ہاتھ ڈالا کرتے تو وہ صحیح کیفیت پر آجاتا تھا،جس کو ''یدِ بیضاء'' کہا جاتا ہے،تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو یہ دو معجزے دیے اور حکم دیا کہ اب تم فرعون کی طرف جاؤ کیونکہ وہ بہت سرکش ہو گیا ہے۔تو پہلے رکوع کے اختتام تک جو آپ نے پڑھا ہے اس میں یہی مضمون ذکر کیا گیا ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ﴿٢٥﴾ وَيَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ ﴿٢٦﴾ وَاحْلُلْ

موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اے میرے رب! کھول دے میرے لیے میرا سینہ ﴿٢٥﴾ اور میرے لیے میرا کام آسان کر دے ﴿٢٦﴾ اور کھول دے

عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ﴿٢٧﴾ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ﴿٢٨﴾ وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ﴿٢٩﴾ هٰرُوْنَ

میری زبان سے گانٹھ کو ﴿٢٧﴾ سمجھیں وہ لوگ میری بات ﴿٢٨﴾ اور بنا دے میرے لیے وزیر میرے اہل میں سے ﴿٢٩﴾ ہارون کو جو کہ

اَخِي ﴿٣٠﴾ اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ ﴿٣١﴾ وَاَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ ﴿٣٢﴾ كَيْ نُسَبِّحَكَ

میرا بھائی ہے ﴿٣٠﴾ مضبوط کر دے اس کے ذریعے سے میری کمر کو ﴿٣١﴾ اور شریک کر دے اس کو میرے امر میں ﴿٣٢﴾ تاکہ ہم تیری تسبیح بیان کریں

كَثِيْرًا ﴿٣٣﴾ وَّنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا ﴿٣٤﴾ اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا ﴿٣٥﴾ قَالَ قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ

بہت زیادہ ﴿٣٣﴾ اور تجھے یاد کریں بہت زیادہ ﴿٣٤﴾ بے شک تُو ہمیں دیکھنے والا ہے ﴿٣٥﴾ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تحقیق دے دیا گیا تُو اپنا مسئول

يٰمُوْسٰى ﴿٣٦﴾ وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً اُخْرٰٓى ﴿٣٧﴾ اِذْ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّكَ مَا

اے موسیٰ! ﴿٣٦﴾ البتہ تحقیق احسان کیا ہم نے تیرے اُوپر ایک اور مرتبہ ﴿٣٧﴾ جب وحی کی ہم نے تیری ماں کی طرف ایسی بات کو

يُوْحٰٓى ﴿٣٨﴾ اَنِ اقْذِفِيْهِ فِي التَّابُوْتِ فَاقْذِفِيْهِ فِي الْيَمِّ فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ

جو وحی کی جاتی ہے ﴿٣٨﴾ کہ ڈال دے تُو اس موسیٰ کو تابوت میں پھر ڈال دے تُو اس تابوت کو دریا میں، چاہیے کہ ڈال دے دریا اس کو

بِالسَّاحِلِ يَأْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّيْ وَعَدُوٌّ لَّهٗ وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ وَلِتُصْنَعَ

کنارے پر، پکڑے گا اس کو میرا دشمن اور اس کا دشمن، اور میں نے ڈال دی تیرے اُوپر اپنی طرف سے محبت، اور تاکہ تیری پرورش

عَلٰى عَيْنِيْ ﴿٣٩﴾ اِذْ تَمْشِيْٓ اُخْتُكَ فَتَقُوْلُ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى مَنْ يَّكْفُلُهٗ

کی جائے میری حفاظت میں ﴿٣٩﴾ جبکہ چلتی تھی تیری بہن پھر وہ کہتی تھی: کیا میں راہنمائی کروں تمہاری اس شخص پر جو کہ اس موسیٰ کی کفالت

فَرَجَعْنٰكَ اِلٰٓى اُمِّكَ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ وَقَتَلْتَ نَفْسًا

کرے؟ پھر ہم نے لوٹا دیا تجھے تیری ماں کی طرف تاکہ اس کی آنکھ ٹھنڈی ہو جائے اور تاکہ وہ غم نہ کرے، اور تُو نے قتل کیا ایک نفس کو

فَنَجَّيْنٰكَ مِنَ الْغَمِّ وَفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا فَلَبِثْتَ سِنِيْنَ فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ ثُمَّ جِئْتَ عَلٰى

پھر ہم نے تجھے نجات دی غم سے اور ہم نے تجھے آزمایا خوب آزمانا، پھر ٹھہرا تُو کئی سال مدین والوں میں پھر آ گیا تُو اے موسیٰ! ایک

قَدَرٍ یّٰمُوْسٰی ۝۴۰ وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِیْ ۝۴۱ اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰیٰتِیْ وَلَا تَنِیَا فِیْ

وقت مقدر پر ۝۴۰ میں نے تجھے تیار کیا ہے اپنے لیے ۝۴۱ جا تُو اور تیرا بھائی میری نشانیوں کے ساتھ اور تم دونوں سستی نہ کرنا میری

ذِكْرِیْ ۝۴۲ اِذْهَبَاۤ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی ۝۴۳ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّیِّنًا لَّعَلَّهٗ

یاد میں ۝۴۲ تم دونوں جاؤ فرعون کی طرف بے شک وہ فرعون بہت سرکش ہوگیا ہے ۝۴۳ پھر کہو تم دونوں اس کو نرم بات، ہوسکتا ہے کہ وہ

یَتَذَكَّرُ اَوْ یَخْشٰی ۝۴۴ قَالَا رَبَّنَاۤ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ یَّفْرُطَ

نصیحت حاصل کرلے یا وہ ڈر ہی جائے ۝۴۴ ان دونوں نے کہا: اے ہمارے پروردگار! بے شک ہمیں اندیشہ ہے کہ وہ زیادتی کر جائے گا

عَلَیْنَاۤ اَوْ اَنْ یَّطْغٰی ۝۴۵ قَالَ لَا تَخَافَاۤ اِنَّنِیْ مَعَكُمَاۤ اَسْمَعُ وَاَرٰی ۝۴۶

ہم پر یا وہ سرکش ہوجائے گا ۝۴۵ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم دونوں اندیشہ نہ کرو بے شک میں تمہارے ساتھ ہوں، میں سنتا ہوں اور دیکھتا ہوں ۝۴۶

فَاْتِیٰهُ فَقُوْلَاۤ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ

آؤ تم دونوں اس فرعون کے پاس، پھر کہو تم دونوں بے شک ہم تیرے رَبّ کے بھیجے ہوئے ہیں پس چھوڑ دے تُو ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو

وَلَا تُعَذِّبْهُمْ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ وَالسَّلٰمُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ

اور انہیں عذاب نہ دے، تحقیق لائے ہیں ہم تیرے پاس دلیل تیرے رَبّ کی طرف سے، سلامتی اس شخص پر ہے جو کہ ہدایت کی

الْهُدٰی ۝۴۷ اِنَّا قَدْ اُوْحِیَ اِلَیْنَاۤ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰی مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰی ۝۴۸

اتباع کرے ۝۴۷ بے شک ہماری طرف یہ بات وحی کی گئی ہے کہ بے شک عذاب اس شخص پر ہے جو کہ جھٹلائے اور پیٹھ پھیرے ۝۴۸

قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا یٰمُوْسٰی ۝۴۹ قَالَ رَبُّنَا الَّذِیْۤ اَعْطٰی كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی ۝۵۰

فرعون نے کہا کون ہے تم دونوں کا رَبّ اے موسیٰ! ۝۴۹ موسیٰ نے کہا: ہمارا رَبّ وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کا خلق دیا اور پھر راہنمائی کی ۝۵۰

قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰی ۝۵۱ قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ فِیْ كِتٰبٍ لَا یَضِلُّ

فرعون نے کہا کہ پہلی جماعتوں کا کیا حال ہے؟ ۝۵۱ موسیٰ نے کہا کہ ان کا علم میرے رَبّ کے پاس ہے ایک کتاب میں، نہ میرا رَبّ

رَبِّیْ وَلَا یَنْسَی ۝۵۲ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّسَلَكَ لَكُمْ فِیْهَا

غلطی کرتا ہے نہ بھولتا ہے ۝۵۲ (تمہارا رَبّ) وہ ہے جس نے کہ بنایا تمہارے لیے زمین کو بچھونا، اور بنائے تمہارے لیے اس زمین کے اندر

سُبُلًا وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ؕ فَاَخْرَجْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى ۞ كُلُوْا وَ

راستے اور اُتارا اس نے آسمان سے پانی پھر نکالا ہم نے اس پانی کے ذریعے سے نباتات کی مختلف قسموں کو ۞ تم کھاؤ اور

ارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّهٰى ۞ مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِیْهَا

اپنے جانوروں کو چراؤ، بے شک اس میں البتہ نشانیاں ہیں عقل والوں کے لیے ۞ اسی زمین سے ہم نے تمہیں پیدا کیا اور اسی زمین میں

نُعِیْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ۞

ہم تمہیں لوٹائیں گے اور اسی زمین سے ہم تمہیں دوبارہ نکالیں گے ۞

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ: موسیٰ علیہ السلام نے کہا اے میرے رَبّ! (رَبِّ کی باء کے نیچے جو کسرہ ہے یہ یائے متکلم پر دلالت کرتا ہے) اے میرے رَبّ! کھول دے میرے لیے میرا سینہ، سینے کے کھول دینے سے مراد یہ ہے کہ میرا حوصلہ بڑھادے، حوصلہ مضبوط کردے۔ میرے لیے میرا سینہ کھول دے۔ وَیَسِّرْ لِیْۤ اَمْرِیْ: اور میرے لیے میرا کام آسان کردے، وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ: اور کھول دے گانٹھ میری زبان سے۔ عُقدہ کہتے ہیں گانٹھ کو، اور حَلَّ یَحُلُّ کھولنا۔ میری زبان سے گانٹھ کھول دے، یعنی میری زبان میں جو رُکاوٹ ہے بیان کرنے سے اس رُکاوٹ کو دُور کردے، یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ: یہ وَاحْلُلْ کا جواب ہے۔ کھول دے میری زبان سے گانٹھ کو، سمجھیں وہ لوگ میری بات، یعنی تاکہ وہ میری بات سمجھیں، وَاجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَهْلِیْ: اور بنادے میرے لیے وزیر میرے اہل میں سے، میرے خاندان میں سے۔ وِزر کا لفظ آپ کے سامنے کئی دفعہ قرآنِ کریم میں آتا ہے تو وِزر بوجھ کو کہتے ہیں، ''لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى: کوئی نفس بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ تو وزیر اسی سے فعیل کے وزن پر ہے، اس کا لفظی معنی ہوتا ہے بوجھ اٹھانے والا، تو وزیر کا مفہوم یہی ہے کہ جو صاحبِ سلطنت کا بوجھ اُٹھاتا ہے اس کے ساتھ وہ معاون ہوتا ہے، اور اُمورِ سلطنت کی ذمہ داری سنبھالتا ہے، اس لیے حضرتِ شیخ نے ترجمہ کیا ''کام بٹانے والا''، میرے لیے کام بٹانے والا بنادے میرے اہل میں سے۔ هٰرُوْنَ اَخِی: بنادے میرے لیے وزیر میرے اہل میں سے، ہارون کو جو میرا بھائی ہے۔ اشْدُدْ بِهٖۤ اَزْرِیْ: اَزر کمر کو بھی کہتے ہیں اور مطلق قوت کو بھی کہتے ہیں، مضبوط کردے اس کے ذریعے سے میری کمر، یا یوں ترجمہ کرلیں کہ اس کے ذریعے سے میری قوت کو مستحکم کردے، دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے، کمر مضبوط کرنے کا مطلب بھی یہی ہوتا ہے کہ قوی کردینا، قوت پہنچادینا۔ ''مضبوط کردے اس کے ذریعے سے میری کمر کو، یا مستحکم کردے اس کے ذریعے سے میری قوت کو'' وَاَشْرِكْهُ فِیْۤ اَمْرِیْ: اور شریک کردے اس کو میرے امر میں یعنی یہ جو میرے ذِمّے تبلیغ کا کام لگایا گیا ہے تو اس کو اس میں شریک کردے، یعنی اس کو براہِ راست نبوّت دے کر اس تبلیغ کا ذمہ دار ٹھہرادے۔ كَیْ نُسَبِّحَكَ كَثِیْرًا: تاکہ ہم تیری تسبیح بیان کریں

بہت زیادہ، وَّنَذۡكُرَكَ كَثِيۡرًا: اور تجھے یاد کریں بہت زیادہ، اِنَّكَ كُنۡتَ بِنَا بَصِيۡرًا: بے شک تو ہمیں دیکھنے والا ہے۔ قَالَ: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قَدۡ اُوۡتِيۡتَ سُؤۡلَكَ يٰمُوۡسٰى، سُؤْل مسئول کے معنی میں ہے۔ تحقیق دے دیا گیا تُو اے موسیٰ! تیری مانگی ہوئی چیز، تُو دے دیا گیا اپنی مانگی ہوئی چیز، یعنی جو چیز تُو نے مانگی ہے جو تیرا مسئول ہے وہ تجھے دے دیا گیا، یعنی تیری دُعا قبول ہوگئی، جو کچھ تُو نے طلب کیا تجھے دے دیا گیا، سُؤْل مسئول کے معنی میں، دے دیا گیا تُو اے موسیٰ! اپنا مسئول، یعنی تیری مانگی ہوئی چیز تجھے مل گئی۔
وَلَقَدۡ مَنَنَّا عَلَيۡكَ مَرَّةً اُخۡرٰٓى: البتہ تحقیق احسان کیا ہم نے تیرے اوپر ایک اور مرتبہ۔ مَنَّ يَمُنُّ احسان کرنا۔ اِذۡ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلٰٓى اُمِّكَ مَا يُوۡحٰٓى: جبکہ وحی کی ہم نے تیری ماں کی طرف، مَايُوۡحٰى: جو وحی کی جاتی ہے، اس کا لفظی معنی یہی ہے۔ مفہوم اس کا آپ یوں ادا کرسکتے ہیں ''جب وحی کی ہم نے تیری ماں کی طرف وہ بات جو اب تیری طرف وحی کی جاتی ہے'' جو اب ہم تجھے بتا رہے ہیں یہ بات ہم نے تیری ماں کی طرف وحی کی، مَايُوۡحٰى: جو وحی کی جاتی ہے، یعنی اب ہم تیری طرف جو وحی کررہے ہیں یہی بات ہم نے تیری ماں کو پہنچائی تھی۔ اور یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ''جبکہ وحی کی ہم نے تیری ماں کی طرف ایسی بات کی جو وحی کی جاتی ہے'' یعنی جو اس لائق تھی کہ اس کو وحی کیا جائے، جو وحی کے ذریعے سے پہنچائی جاتی ہے۔ وہ کیا وحی تھی جو کی؟ ''اَنْ'' تفسیریہ ہے، نحو میں آپ پڑھتے رہتے ہیں نَادَيۡنٰهُ اَنۡ يّٰۤاِبۡرٰهِيۡمُ (سورۂ صافات: ۱۰۴)، یہ ''اَنْ'' بھی وہی تفسیریہ ہے، اَنِ اقۡذِفِيۡهِ فِى التَّابُوۡتِ: قَذَفَ يَقۡذِفُ پھینکنا، اِقۡذِفِىۡ واحد مؤنث مخاطبہ کا صیغہ ہے۔ کہ ڈال دے تُو اس موسیٰ کو تابوت میں۔ یہ ''فِيۡهِ'' علیحدہ نہیں ہے، حرف جار نہیں ہے، ''اقۡذِفِيۡهِ'' یہ اکٹھا لفظ ہے۔ ڈال دے اس موسیٰ کو تابوت میں۔ تابوت سے صندوق مراد ہے۔ فَاقۡذِفِيۡهِ فِى الۡيَمِّ: فَاقۡذِفِيۡهِ یہ وہی اَمر کا صیغہ ہے۔ پھر ڈال دے تو اس تابوت کو دریا میں۔ یَمّ: سمندر، دریا۔ اس سے دریائے نیل مراد ہے۔ فَلۡيُلۡقِهِ الۡيَمُّ بِالسَّاحِلِ: فَلۡيُلۡقِهِ یہ بھی امر کا صیغہ ہے۔ دریا کو چاہیے کہ ڈال دے اس تابوت کو کنارے پر، یعنی ہم نے دریا کو بھی حکم دے دیا ہے، وہ یونہی کرے گا۔ چاہیے کہ ڈال دے دریا اس کو کنارے پر۔ يَاۡخُذۡهُ عَدُوٌّ لِّىۡ وَعَدُوٌّ لَّهٗ: پکڑ لے گا اس تابوت کو یا اس موسیٰ کو۔ ایک ہی بات ہے، کیونکہ موسیٰ پکڑا گیا، یا تابوت پکڑا گیا، ایک ہی بات ہے۔ پکڑ لے گا اس تابوت کو یا اس موسیٰ کو، عَدُوٌّ لِّىۡ وَعَدُوٌّ لَّهٗ: لَهٗ کی ضمیر بالیقین حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف لوٹ رہی ہے۔ پکڑ لے گا اس کو میرا دُشمن اور اس کا دُشمن۔ اس کا مصداق فرعون ہے، میرا دُشمن تو اس لیے کہ مقابلے میں خدائی کا دعویٰ کیے بیٹھا ہے، اور موسیٰ علیہ السلام کا دُشمن اس لیے کہ وہ بنی اسرائیل کا دُشمن تھا اور موسیٰ علیہ السلام بھی بنی اسرائیل میں سے ہی تھے۔ وَاَلۡقَيۡتُ عَلَيۡكَ مَحَبَّةً مِّنِّىۡ: اور میں نے ڈال دی تیرے اوپر اپنی طرف سے محبت، مَحَبَّةً مصدر ہے محبوبیت کے معنی میں، میں نے تیرے اوپر اپنی جانب سے محبوبیت ڈال دی۔ وَلِتُصۡنَعَ عَلٰى عَيۡنِىۡ: لِتُحَبَّ وَلِتُصۡنَعَ تاکہ تجھ سے محبت کی جائے اور تاکہ تیری پرورش کی جائے میری حفاظت میں، عَلٰى عَيۡنِىۡ میری آنکھ کے سامنے یعنی میری حفاظت میں۔ اِذۡ تَمۡشِىۡۤ اُخۡتُكَ: جبکہ چلتی تھی تیری بہن فَتَقُوۡلُ: پھر وہ کہتی تھی، هَلۡ اَدُلُّكُمۡ عَلٰى مَنۡ يَّكۡفُلُهٗ: کیا میں راہنمائی کروں تمہاری اس شخص پر جو کہ اس موسیٰ کی کفالت کرے، جو اس موسیٰ کو سنبھالے۔ فَرَجَعۡنٰكَ اِلٰٓى اُمِّكَ: پھر ہم نے لوٹا دیا تجھے تیری ماں کی طرف، كَىۡ تَقَرَّ عَيۡنُهَا: تاکہ اس کی آنکھ ٹھنڈی ہوجائے، قرۃ العین: آنکھوں کی ٹھنڈک۔ تاکہ اس تیری ماں کی آنکھ ٹھنڈی ہوجائے، وَلَا تَحۡزَنَ اور تاکہ وہ غم نہ کرے۔ وَقَتَلۡتَ نَفۡسًا: اور تُو نے قتل کیا ایک نفس کو فَنَجَّيۡنٰكَ مِنَ الۡغَمِّ پھر ہم نے تجھے نجات دی غم سے وَفَتَنّٰكَ فُتُوۡنًا: اور ہم نے تجھے

آزمایا خوب آزمانا، آزمائشوں میں ڈالا خوب آزمائش میں ڈالنا، جانچا تجھے خوب جانچنا۔ فَتَنَ اصل کے اعتبار سے ہوتا ہے فَتَنَ الذَّهَبَ بِالنَّارِ سونے کو آگ میں ڈال کے تپانا تاکہ اس کا کھوٹ ظاہر ہوجائے اور خالص سونا علیحدہ ہوجائے۔ تو فَتَنّٰكَ فُتُوْنًا کا معنی یہی ہے کہ ہم نے تجھے خوب اچھی طرح سے ستھرا کیا، ایسی تربیت کی کہ بالکل ہر لحاظ سے تو کامل مکمل ہوگیا، آزمائشوں میں ڈالا، آزمائشوں میں ڈال کے کامیاب کیا، جس سے اعلیٰ درجے کی تربیت ہوئی۔ فَلَبِثْتَ سِنِيْنَ فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ: پھر ٹھہرا تو کئی سال مدین والوں میں، اہلِ مدین میں، ثُمَّ جِئْتَ عَلٰى قَدَرٍ يّٰمُوْسٰى: پھر آ گیا تُو اے موسیٰ! عَلٰى قَدَرٍ: ایک وقت مقدر پر، ایک مقدر وقت پر جو میری طرف سے تجویز کیا ہوا تھا آ گیا، تو تقدیری طور پر آ گیا، یعنی یہ تیرا یہاں آنا مقدر تھا، جس تقدیر کی بنا پر تُو آ گیا۔ وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ: میں نے تجھے تیار کیا ہے، بنایا ہے، تربیت دی ہے۔ میں نے تجھے تیار کیا ہے اپنے لیے، میں تجھ سے اپنا ایک خاص کام لینا چاہتا ہوں، یہ صَنَعَ سے باب افتعال ہے، اور صرف میں آپ نے قاعدہ پڑھا تھا کہ باب افتعال کی فاء میں اگر صاد، ضاد، طا، ظا، آ جائے تو تائے افتعال طاء کے ساتھ بدل جایا کرتی ہے جیسے مصطفیٰ میں آپ پڑھتے ہیں، اضطر وغیرہ میں جیسے طاء آتی ہے اسی طرح سے یہ ہے۔ میں نے تجھے تیار کیا ہے اپنے لیے۔ اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ: جا تُو اور تیرا بھائی۔ وَاَخُوْكَ کا عطف چونکہ اِذْهَبْ کے فاعل پر تھا اور ضمیر مرفوع متصل پر عطف (جب درمیان میں فاصلہ نہ ہو) بغیر اعادہ ضمیر کے نہیں ہوا کرتا، تو اس لیے اَنْتَ کو ظاہر کر دیا گیا، اُسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ (سورۂ بقرہ: ۳۴) میں جس طرح سے مسئلہ ذِکر کیا تھا۔ یہ ضمیر منفصل بطورِ تاکید کے آئی ہے اور وَاَخُوْكَ کا عطف فاعل کے اُوپر درست ہوگیا۔ جا تُو اور تیرا بھائی، بِاٰيٰتِيْ: میری نشانیوں کے ساتھ۔ وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ: لَا تَنِيَا تثنیہ کا صیغہ ہے، "وَنْيٌ" اس کا مادّہ ہے، لفیف مفروق ہے، فاء میں واؤ، اور لام میں یاء۔ اور میرے ذِکر میں سستی نہ کیجیو، تم دونوں سستی نہ کرنا میری یاد میں۔ اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ: تم دونوں جاؤ فرعون کی طرف اِنَّهٗ طَغٰى بے شک وہ فرعون بہت سرکش ہوگیا ہے، فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا: پھر کہو تم دونوں اس کو نرم بات۔ قُوْلَا تثنیہ کا صیغہ ہے۔ کہو تم اس کو نرم بات، لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ: ہوسکتا ہے کہ وہ نصیحت حاصل کرلے اَوْ يَخْشٰى: یا وہ ڈر ہی جائے۔ نصیحت حاصل کرلے یعنی بالکل ہی سیدھا جائے، یا اس کے دل میں کچھ خوف اور خشیت ہی پیدا ہوجائے۔ قَالَا: ان دونوں نے کہا: رَبَّنَآ: اے ہمارے پروردگار! اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى بے شک ہم ڈرتے ہیں، ہمیں خوف ہے، اندیشہ ہے کہ وہ زیادتی کرجائے گا ہم پر، یا وہ سرکش ہوجائے گا۔ فَرَطَ عَلَيْهِ: کسی پر جھپٹ پڑنا۔ مطلب یہ ہے کہ ہمیں دیکھے گا تو دیکھتے ہی جھپٹ پڑے گا، ہم تیری بات پہنچا ہی نہیں سکیں گے، جاتے ہی ہمیں قتل کردے گا، یا ہماری بات سننے کے بعد زیادہ سرکش ہوجائے گا، جیسے پہلے شرارتیں کرتا تھا اب اس سے بھی زیادہ شرارتیں کرنے لگ جائے گا۔ قَالَ لَا تَخَافَآ: اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم دونوں اندیشہ نہ کرو، اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ: بے شک میں تمہارے ساتھ ہوں، اَسْمَعُ وَاَرٰى: میں سنتا ہوں اور دیکھتا ہوں، تمہاری اور تمہارے دُشمن کی بات سنتا ہوں اور سب کے حال کو دیکھ رہا ہوں، فکر نہ کیجئے۔ فَاْتِيٰهُ: یہ پھر اَمر کا صیغہ آ گیا۔ آؤ تم دونوں اس فرعون کے پاس فَقُوْلَآ: پھر کہو تم دونوں اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ بے شک ہم تیرے ربّ کے بھیجے ہوئے ہیں، فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ: پس چھوڑ دے تو ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو، یعنی بنی اسرائیل کو اپنی غلامی سے آزادی دے دے۔ بھیج دے ہمارے ساتھ، چھوڑ دے ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو، وَلَا تُعَذِّبْهُمْ: اور انہیں عذاب نہ دے۔ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ: تحقیق لائے ہیں ہم تیرے

پاس دلیل تیرے رَبّ کی طرف سے، یعنی ہمارا یہ دعویٰ بلا دلیل نہیں ہے، کہ ''ہم تیرے رَبّ کے رسول ہیں'' ہماری یہ بات بلا دلیل نہیں، ہم اس بات پر تیرے رَبّ کی طرف سے دلیل لائے ہیں، وَالسَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى: سلامتی اس شخص پر ہے جو کہ ہدایت کی اتباع کرے، جو ہدایت کی اتباع کرے اس کے لیے سلامتی ہے یعنی دنیا و آخرت کے عذاب سے محفوظ رہ جائے گا، جیسا کہ اس کی وضاحت اگلے جملے میں آگئی، اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ اِلَيْنَآ: بے شک ہماری طرف یہ بات وحی کی گئی ہے اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰى مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى: کہ بے شک عذاب اس شخص پر ہے جو کہ جھٹلائے اور پیٹھ پھیرے، جو حقیقت کو جھٹلاتا ہے حق بات کو جھٹلاتا ہے اور حق بات کے قبول کرنے سے پیٹھ پھیرتا ہے عذاب اسی شخص پر ہے۔ قَالَ: فرعون نے کہا فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى: کون ہے تم دونوں کا رَبّ اے موسیٰ! قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى: موسیٰ علیہ السلام نے کہا، ہمارا رَبّ وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کا خلق دیا اور پھر راہنمائی کی۔ خلق سے بناوٹ مراد ہے، ہر چیز کو اس کی بناوٹ دی یعنی جس چیز کو جیسا بنانا چاہا اس کو بنایا، بنانے کے بعد اس کی راہنمائی کی۔ قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى: فرعون نے کہا کہ پہلی جماعتوں کا کیا حال ہے؟ بال کا معنی حال، قرون، قرن کی جمع۔ قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ: موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ ان کا علم میرے رَبّ کے پاس ہے، فِيْ كِتٰبٍ: ایک کتاب میں۔ اس ''کتاب'' سے ''لوحِ محفوظ'' یا ہر ایک کا نامۂ اعمال مراد ہے، ان کا علم میرے رَبّ کے پاس ہے ایک لکھی ہوئی کتاب میں، لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى: نہ میرا رَبّ غلطی کرتا ہے اور نہ بھولتا ہے، یعنی ہر چیز کا علم کما حقہٗ اللہ کے پاس محفوظ ہے، وہی جانتا ہے کہ پہلی جماعتوں کا کیا حال ہے، کیا نہیں ہے؟ مجھے اس سے غرض نہیں۔ نہیں بھٹکتا میرا رَبّ نہ بھولتا ہے، نہ غلطی کرتا ہے نہ بھولتا ہے۔ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا: یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اضافہ ہے موسیٰ علیہ السلام کی کلام پر۔ کہ تمہارا رَبّ وہ ہے جس نے کہ بنایا تمہارے لیے زمین کو بچھونا، وَّسَلَكَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا: اور بنائے تمہارے لیے اس زمین کے اندر راستے، جاری کیے تمہارے لیے اس زمین میں راستے، سڑکیں بنا دیں۔ سُبُل، سَبِیل کی جمع ہے۔ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً: اور اُتارا اس نے آسمان سے پانی، فَاَخْرَجْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى: پھر نکالا ہم نے پانی کے ذریعے سے۔ نَبَاتٍ: نباتات۔ ازواج، زوج کی جمع۔ شَتّٰى: مختلف۔ دوسری جگہ بھی یہ لفظ آئے گا تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّقُلُوْبُهُمْ شَتّٰى (سورۂ حشر: ۱۴) شتیت کی جمع ہے، متفرق چیز کو کہتے ہیں۔ پھر نکالا ہم نے اس پانی کے ذریعے سے نباتات کی مختلف قسموں کو۔ شَتّٰى یہ ازواج کی صفت ہے، یعنی: اَزْوَاجًا شَتّٰى (عام تفاسیر)، اور نَبَاتٍ کی صفت بھی ہو سکتی ہے (آلوسی)، لیکن چونکہ جمع ہے اس لیے اس کو اَزواج کے ساتھ لگانا بہتر ہے، اَزْوَاجًا شَتّٰى، ہم نے نباتات کی مختلف قسموں کو اگایا اس پانی کے ذریعے سے۔ كُلُوْا: کھاؤ تم، وَارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ: تم کھاؤ اور اپنے جانوروں کو چراؤ۔ رعی یرعی: چرانا۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى: بے شک اس میں البتہ نشانیاں ہیں عقل والوں کے لئے۔ نُہٰی عقل کو کہتے ہیں۔ مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ: اسی زمین سے ہم نے تمہیں پیدا کیا، وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ: اور اسی زمین میں ہم تمہیں لوٹائیں گے، وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى: اور اسی زمین سے ہم تمہیں دوبارہ نکالیں گے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط

موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ شروع ہے، اور یہ سب آیات اُسی واقعے پر ہی مشتمل ہیں۔ طور پر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام کرتے ہوئے ان کو ذمہ دار ٹھہرایا۔ جس طرح سے کہ پچھلے رکوع کی آخری آیت ہے کہ تُو فرعون کی طرف جا، وہ بہت طاغی ہے، اور اسے جا کے سمجھا۔ تو جس سے موسیٰ علیہ السلام کو یہ بات معلوم ہوگئی کہ میں پیغمبر بنادیا گیا ہوں، رسول بنادیا گیا ہوں، اور میرے ذِمّے جو کام لگایا گیا ہے، وہ ہے فرعون کو سمجھانے کا۔ اور آپ جانتے ہیں کہ یہ بہت بڑی ذمہ داری تھی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو سونپی گئی، ویسے بھی نبوّت کا بوجھ بہت ہے، پھر اتنی بڑی زبردست قوت کے ساتھ جا کے ٹکر لینا اور ان کو جا کے تبلیغ کرنا، اور پھر بظاہر وہ فرعون ان کی قوم کو غلام بھی بنائے ہوئے تھا، اور موسیٰ علیہ السلام اس کے گھر میں پلے بھی تھے، موسیٰ علیہ السلام کی پرورش بھی اسی نے کی تھی، پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے قصور ہوگیا تھا جس کی بنا پر وہاں سے نکل بھاگے تھے، گویا کہ فرعون کے سامنے ان کی حالت مجرمانہ بھی تھی، اب ایسے شخص کے سامنے جانا ہے، تو آپ اندازہ کیجئے کہ دل دماغ کے اُوپر اس ذمہ داری کا کتنا بوجھ ہوگا؟

موسیٰ علیہ السلام کی اللہ تعالیٰ سے دُعا

تو اللہ تعالیٰ نے جس وقت آپ کو نبوّت کے منصب پر فائز کیا اور یہ بات ظاہر کردی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے ہی مدد کی درخواست کی، یعنی اس کام سے انکار تو نہیں ہے، جب آپ کا حکم ہوگیا تو جاؤں گا، لیکن اب اس کے مناسب میرے ساتھ آپ کی مدد رہے۔ پہلی بات تو یہ کہی کہ میرا سینہ کھول دو، میرا حوصلہ فراخ کردو تاکہ آنے والی مشکلات میں برداشت کروں، میرے اس معاملے میں آسانی پیدا کردیجئے، کیونکہ کسی مشکل کام کو آسان کرنا یہ اللہ ہی کے بس کی بات ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسباب مہیا ہوجائیں تو مشکل سے مشکل کام آسان ہوجاتا ہے، اور اسباب مہیا نہ ہوں تو آسان سے آسان کام مشکل ہوجاتا ہے، تو انبیاء علیہم السلام ہر چیز میں اللہ کی طرف ہی رجوع کیا کرتے ہیں، کیونکہ انہیں پتا ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے اللہ کی مشیت سے ہی ہوتا ہے، اپنے عجز کا اظہار اللہ کے سامنے ہی کرتے ہیں۔ اور پھر وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کوئی بہت فصیح اللسان خطیب نہیں تھے، اور جب کسی کے سامنے جا کے تبلیغ کرنی ہے، اس کے سامنے اپنے مدعا کو ثابت کرنا ہے، تو اس میں تو بڑی صاف زبان چاہیے، زورِ بیان ہو، خوب اچھی طرح سے اپنے مدعا کو واضح کرسکیں، اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ بھی درخواست کی کہ یااللہ! میری زبان میں جو رُکاوٹ ہے کہ میں بات زیادہ کھل کے نہیں کرسکتا، اس رُکاوٹ کو دُور کردے۔ یہیں مفسرین نے لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان میں کچھ لکنت تھی، اس کے ازالے کی انہوں نے دُعا کی کہ میری زبان سے یہ رُکاوٹ اور یہ لکنت دُور ہوجائے، لیکن یہ لکنت کا قصہ اسرائیلی روایات سے ماخوذ ہے، اور قرآنِ کریم میں کوئی ایسا لفظ موجود نہیں کہ جس کا مصداق یہ ہو کہ ان کی زبان میں لکنت تھی۔ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ میں تو ایسا بھی ہوسکتا ہے جیسے اب ہم یہی دُعا پڑھا کرتے ہیں،

ہمارے مقررین بھی یہی دُعا پڑھا کرتے ہیں، تو اس کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ چاہے لکنت نہ ہو پھر بھی تو زبان کے اندر بسااوقات ایک بندش سی ہوتی ہے، کہ انسان اپنی بات واضح طور پر نہیں کہہ سکتا، جیسے الفاظ انسان بولنا چاہتا ہے بسااوقات وہ زبان پر نہیں چڑھتے، بیان میں کچھ کمزوری ہوتی ہے، تو اس کمزوری کے ازالے کے لئے بھی یہ دُعا کی جاتی ہے، اس لیے ضروری نہیں کہ لکنت ہی ہو، لکنت نہ بھی ہو لیکن بیان صاف ستھرا کرنے کے لئے، روانگی کے لئے یہ دُعا پڑھی جاتی ہے، قرآنِ کریم میں دوسری جگہ موجود ہے کہ ہارون علیہ السلام کو جس وقت وزیر یا نبی بنانے کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے درخواست کی تھی تو اس میں ایک وجہ یہ بیان کی تھی کہ لَا یَنْطَلِقُ لِسَانِیْ (سورۂ شعراء: ۱۳) میری زبان نہیں چلتی، ''زبان نہیں چلتی'' کا معنی یہی ہے کہ میں کوئی زور آور خطیب نہیں ہوں، مجھے تقریر کرنے کی عادت نہیں، کہیں کسی مجمع کے سامنے جا کے بولنے کا موقع نہیں ملا، اور جس وقت میں بولوں گا تقریر کرنا چاہوں گا تو میری زبان کماحقہ چلے گی نہیں، اور ہارون کے متعلق کہا کہ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّیْ لِسَانًا اس کی زبان بڑی صاف ہے (سورۂ قصص: ۳۴) وہ تقریر بڑی اچھی کرتے ہیں، ان کو بڑی فصاحت حاصل ہے، اس لیے ان کو میرا معاون بنا دیجئے۔ لیکن قرآنِ کریم کا واقعہ سارے کا سارا پڑھنے کے بعد اندازہ یہ ہوتا ہے کہ ہر مجمع میں، ہر موقع پر تقریر کی موسیٰ علیہ السلام نے ہی ہے، اور ہارون علیہ السلام ساتھ معاون رہے ہیں، یعنی قرآنِ کریم میں ہارون علیہ السلام کی تقریر کہیں نقل نہیں کی گئی کہ فرعون کے دربار میں کھڑے ہو کے ہارون نے یہ تقریر کی تھی، جہاں نقل کی ہے موسیٰ علیہ السلام کی کی ہے، تو ہارون علیہ السلام ساتھ معاون بن گئے۔ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ: میری زبان سے اس عقدہ کو دُور کر دیجئے، گرہ کو کھول دیجئے، رُکاوٹ دُور کر دو، تاکہ وہ میری بات اچھی طرح سمجھ لیں، مطلب یہ ہوا کہ بیان آسان ہو، ستھرا ہو، صاف ہو، اور جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں اس کو اچھے انداز کے ساتھ کہہ سکوں، مجھے اس بات کی توفیق دیجئے۔ اور میرے لیے میرے اہل میں سے ایک وزیر بنا دو، میرا بوجھ بٹانے والا، کام بٹانے والا، تاکہ ہم جس وقت جائیں دونوں جائیں، تو ایک دوسرے کی تائید کرنے کی وجہ سے قوت حاصل ہو جائے، ویسے بھی آپ کہا ہی کرتے ہیں کہ ''ایک ایک اور دو گیارہ'' یہ محاورہ ہے نا آپ کا؟ ''ایک ایک اور دو گیارہ'' کہ ایک تو ایک ہی ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ایک اور کھڑا کر دو تو گیارہ بن جاتے ہیں، گیارہ بھی دو ''ایک'' کا مجموعہ ہوتا ہے، تو اس محاورے کا مطلب یہی ہے کہ ایک ایک اور دو گیارہ، یعنی ایک ایک کے ساتھ دوسرا ایک کھڑا کر دو تو گیارہ بن جاتے ہیں، قوت میں اتنا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اتنی بڑی قوت کے سامنے اور وقت کے اتنے بڑے حاکم کے سامنے جو جانا تھا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ساتھ اپنا معاون چاہا۔ ''میری کمر اس کے ذریعے سے مضبوط کر دے یا میری قوت کو مستحکم کر دے'' یہ دُعائیہ الفاظ ہیں، ''اور ان کو میرے امر میں شریک ٹھہرا دو، شریک کر دو'' یعنی ان کو بھی نبوّت دے کر اس کا ذمہ دار ٹھہرا دو، ''تاکہ ہم مل کے تیری تسبیح بیان کریں'' اگرچہ تسبیح بیان کرنا انفراداً بھی ہوتا ہے، جیسے خلوت میں بیٹھ کے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے، سبحان اللہ سبحان اللہ جس طرح سے ہم پڑھتے ہیں، لیکن اس سے مراد وعظ ہے، کیونکہ انہوں نے جا کے جو وعظ کہنی تھی اور اللہ کی توحید پیش کرنی تھی تو اس میں دونوں باتیں ہی ہیں کہ اللہ کے متعلق بیان کیا جائے کہ اس میں کوئی نقص کی بات نہیں ہے، اور دوسرے نمبر پر ذکر کیا جائے کہ اس میں خوبیوں کی باتیں سب موجود ہیں، تو یہ تسبیح اور تحمید تبلیغ میں بھی ہوتی ہے، کہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کی جائے کہ اس کو عیوب سے پاک قرار دیا جائے، اور اللہ کا ذکر کیا جائے کہ اس کی عظمت کو بیان کیا جائے، یہ وعظ و تبلیغ بھی اسی

طرح سے ہوتی ہے۔ ''تا کہ ہم تیری تسبیح بہت بیان کریں اور تا کہ تجھے بہت یاد کریں۔ بے شک تو ہمیں دیکھنے والا ہے''، ہمارا ہر حال تیرے سامنے ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب

دُعا جو کی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے فوراً جواب مل گیا کہ اے موسیٰ! جو کچھ تو نے مانگا تجھے دے دیا گیا، تیری دُعا قبول ہوگئی، اور اس کے ساتھ ہی پھر مزید مہربانی ظاہر کرنے کے لئے، جیسے ایک حوصلہ افزائی کی جاتی ہے، کیونکہ اب آگے ان کو بھیجنا جو تھا تو حوصلہ بڑھانے کی ضرورت تھی، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم تو تیرے پہ ایک اور بھی احسان کر چکے ہیں، یہ یاددہانی کرائی محض اپنی رحمت اور مہربانی کو ظاہر کرنے کے لئے، کہ جب تو نے ابھی سوال بھی نہیں کیا تھا، تیری پیدائش کا موقع تھا، تو دیکھ! ہم نے تیرے اوپر کس طرح سے احسان کیا، تجھے دشمن سے کیسے بچایا؟ بلکہ دشمن کے گھر تیری پرورش کروائی، اور کیسے کیسے نازک موقع آئے جن میں ہم نے تجھے بچایا، اور اپنی نصرت تیرے ساتھ شامل رکھی، اب بھی تو گھبرا نہ، جب تُو جائے گا تو ہم تیرے ساتھ ہی ہوں گے، تو واقعہ یاد دلا دیا۔

موسیٰ علیہ السلام کی ولادت اور پرورِش کا قصہ

اس واقعے کا حاصل یہ ہے کہ فرعون کو کچھ آثار سے یہ معلوم ہوگیا تھا، یا بعض لوگوں نے پیش گوئی کے طور پر اس کے سامنے ذِکر کیا تھا کہ اسرائیلیوں میں کوئی بچہ پیدا ہوگا، جو تیرا تختہ اُلٹے گا، تو فرعون نے اس خطرے سے بچنے کے لئے یہ حکم دے دیا تھا کہ اسرائیلیوں کے گھر میں جو بچہ پیدا ہو اس کو قتل کر دیا جائے، قرآنِ کریم میں بھی بار بار اس بات کو ذکر کیا گیا ہے یُقَتِّلُوْنَ اَبْنَآءَکُمْ وَیَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَکُمْ (سورۂ اعراف:۱۴۱) تمہارے بچوں کو قتل کرتے تھے لڑکیوں کو زندہ چھوڑتے تھے، یہ کئی جگہ ذکر آیا ہے۔ کہتے ہیں کہ پہلے تو ہر بچے کو قتل کرتے تھے، لیکن پھر یہ خیال آیا کہ یہ قوم تو ساری کی ساری ہماری غلام ہے اور ہم سارا کام انہی سے لیتے ہیں، کاشت یہی کرتے ہیں، باقی خدمات یہی ادا کرتے ہیں، تو اگر یہ سارے کے سارے بچے قتل کرنا شروع کر دیے تو یہ بوڑھے مر جائیں گے، بچے ہوں گے نہیں، تو پھر آگے ہمارا کام کس طرح سے چلے گا؟ یہ بات زیرِ بحث آئی تو پھر ان بے وقوفوں نے یہ فیصلہ کیا کہ چلو! ایک سال کے بچے زندہ چھوڑ دیا کرو، ایک سال کے قتل کر دیا کرو، تو کام کے لئے آدمی بھی مہیا ہوتے رہیں گے اور ان کی قوت بھی کوئی بڑی نہیں ہوگی، قومی قوت بڑھے گی نہیں، جس کی بنا پر یہ اکٹھے ہو کر مقابلہ نہیں کر سکیں گے، یوں تجویز ہوگئی، کہتے ہیں کہ حضرت ہارون علیہ السلام کی ولادت اس سال ہوئی جو سال بچوں کے چھوڑنے کا تھا، اس لیے وہ تو یوں بچ گئے۔ اور موسیٰ علیہ السلام کی ولادت اس سال میں ہوئی جو بچوں کو قتل کرنے کا تھا، تو بچوں کے قتل کرنے کے سال میں جب ولادت ہوئی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے پہلے تو ان کو چھپایا، لیکن آخر کب تک چھپاتیں، اندیشہ تھا کہ ظاہر ہو جائے گا، تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں ایک بات ڈالی، یہاں ''وحی'' القاء فی القلب کے معنی میں ہے، کہ اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کی ماں کے دل میں ایک بات ڈالی، دل میں ایک

تجویز آ گئی، انہوں نے اسی تجویز کے اُوپر عمل شروع کر دیا، کہ ایک تابوت بنالیں، تابوت بنا کے اس میں بچے کو رکھ کر دریا میں ڈال دیں، ہوسکتا ہے کہ یہ دریا اس کو کسی کنارے پر ڈال دے گا، کوئی اُٹھائے گا، مہربانی کرے گا، جب پتا نہیں ہوگا کہ کس کا بچہ ہے، تو کوئی ضروری نہیں کہ وہ سمجھے کہ اسرائیلیوں کا ہے، تو کوئی پکڑ لے گا اور پکڑ کے پال لے گا، اس طرح سے بچے کی جان بچ جائے گی، یہ ساری کی ساری تدبیر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے دل میں ڈال دی کہ یوں کر، یوں کر، ایسا ہو جائے گا، تو دل میں خیال کے طور پر یہ بات آ گئی، انہوں نے ایسے ہی کیا کہ اس کو تابوت میں رکھا، رکھنے کے بعد اس کو دریا میں ڈال دیا، دریا نے وہ تابوت خشکی پر پہنچا دیا، اور خشکی پر پہنچنے کے بعد وہ تابوت فرعون کی بیوی کی نوکرانیوں کے ہاتھ میں آ گیا، اور جب کھولا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تحفظ یوں ہوا کہ ان کے اُوپر بہت محبوبیت ڈال دی گئی کہ جو دیکھتا وہی پیار کرتا، اور اس کے دل میں ان کی محبت آ جاتی، تو فرعون کی بیوی نے جب دیکھا تو اس کے دل میں بھی ان کی محبت آ گئی، وہ فرعون کے پاس لے گئی کہ دیکھو! اپنی اولاد نہیں ہے، ہم اس بچے کو لیتے ہیں، ہم اس کو اپنا بیٹا بنالیں گے قُرَّتُ عَيْنٍ لِّيْ وَلَكَ (سورۂ قصص: ۹) میرے لیے اور تیرے لیے یہ آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ فرعون نے بھی اجازت دے دی کہ اچھا! رکھ لو، اس خیال سے کہ اوّل تو یقینی نہیں کہ اسرائیلیوں میں سے ہو، اور اگر یہ اسرائیلیوں میں سے ہی ہو تو پھر جب ہمارے گھر میں پلے گا، ہمارا کھائے گا، ہم اس کی تربیت کریں گے، تو یہ ویسے ہو جائے گا جس طرح سے ہم ہیں، کوئی ضروری نہیں کہ اس کے جذبات اسرائیلیوں کے ساتھ ہوں، اس قسم کی مصلحت سوچ کے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو رکھ لیا گیا۔ اُدھر ماں کو دِل میں خیال آیا کہ میں نے ڈال تو دیا ہے، پتا نہیں کیا بنے گا؟ تو موسیٰ علیہ السلام کی بہن کو کہا کہ تو ذرا دریا کے کنارے کنارے چل، ذرا دیکھتی رہنا کہ یہ تابوت کدھر کو جاتا ہے، تو تابوت پکڑا گیا، فرعون کے محلات میں چلا گیا، بچے کے ساتھ سب کو محبت ہو گئی، فیصلہ ہو گیا کہ اس کو رکھنا ہے، قتل نہیں کرنا، تو اب فکر ہوئی کہ اس کو دُودھ پلانے کے لئے عورتیں چاہئیں، کوئی عورت ملے جو کہ اس کو دُودھ پلائے، اب بادشاہ کے لئے اس قسم کا انتظام کرنا کیا مشکل ہے، تو عورتیں اکٹھی کر لیں، جو عورت آتی ہے موسیٰ علیہ السلام کو پکڑتی ہے، موسیٰ علیہ السلام اس کے پستان کو منہ ہی نہیں لگاتے، سورۂ قصص میں لفظ آئے گا: وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ ہم نے دُودھ پلانے والی عورتوں کو اس کے اُوپر ممنوع ٹھہرا دیا، اس نے منہ نہیں لگایا، دُودھ نہیں پیا، بہت پریشان، اب محبت انتہائی درجے کی ہو گئی، بچہ کسی کا دُودھ پیتا نہیں، پریشانی ہوئی، تو اتنے میں موسیٰ علیہ السلام کی بہن بھی چلتی پھرتی اسی مجمع میں چلی گئی، تو یہ انہیں کہتی ہے کہ مجھے ایک عورت معلوم ہے، اس کو بھی بُلا کے دیکھ لو، شاید اسی کا دُودھ موسیٰ علیہ السلام پی لیں، اور اُدھر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے دل میں جو بات ڈالی تھی اس میں یہ وعدہ بھی تھا کہ ان شاء اللہ! کسی وقت موسیٰ علیہ السلام تیرے پاس واپس آئے گا، ہم اس کو تیری طرف واپس لوٹا دیں گے، اور تیری آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں گی۔ اس بہن نے جو بات کی تو وہ تو چاہتے ہی تھے کہ کوئی عورت ملے، انہوں نے فوراً کہا کہ اچھا! تُو اس کو بھی بُلا لا، شاید اسی کا دُودھ پی لے، جب وہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو بُلا کے لائیں، اور اس نے آ کر موسیٰ علیہ السلام کو اُٹھایا تو موسیٰ علیہ السلام نے فوراً دُودھ پینا شروع کر دیا، تو گویا کہ بچہ ماں کے ہاتھ میں چلا گیا۔ اب وہ اسے کہنے لگیں کہ تُو یہیں ہمارے پاس رہ کر اس کو دُودھ پلایا کر، تو وہ کہنے لگی کہ میں یہاں نہیں رہ سکتی، میں تو اپنے گھر ہی رہوں گی، تو مجبوری کی بنا پر

موسیٰ علیہ السلام کو اسی کے سپرد کرنا پڑا، اور ماں کی گود میں موسیٰ علیہ السلام کی پرورش شروع ہوئی، لیکن فرعونیوں کے انتظام کے تحت۔ اس طرح سے اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو اسی دُشمن کے ہاتھوں سے پرورش کروایا، جو دُشمن موسیٰ علیہ السلام کی خاطر پتا نہیں کتنے ہزار بچوں کا قتل کر چکا تھا، یہ اللہ کی قدرت ہے اور اللہ کی تدبیر ہے، کہ جو اللہ کرنا چاہے اس کے سامنے کوئی کسی قسم کی رُکاوٹ نہیں پیدا کی جا سکتی، انسان کی تدبیریں ساری کی ساری دھری رہ جاتی ہیں، اور ہوتا وہی ہے جو اللہ کو منظور ہوتا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ سے قبطی کے قتل کا واقعہ

تو جب دُودھ کا زمانہ گزرا تو انہوں نے بچہ واپس لے لیا، فرعون کے گھر ہی ان کی پرورش شروع ہوگئی، وہیں رہنا سہنا، لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ ان کو نبی بنانے والے تھے، اور نبی بہت فطرتِ صحیحہ پہ ہوتا ہے، اس لیے ان کی ہمدردیاں اسرائیلیوں کے ساتھ تھیں۔ جوان ہو گئے، جوان ہونے کے بعد ایک دفعہ شہر کے اندر حضرت موسیٰ علیہ السلام جا رہے تھے (یہاں اشارہ آئے گا، اس کی تفصیل سورۂ قصص میں ہے) موسیٰ علیہ السلام جا رہے تھے، وقت ایسا تھا کہ جس میں عام سڑکوں کے اُوپر آبادی نہیں تھی، جیسا کہ گرمیوں میں دوپہر کے وقت معاملہ سنسان سا ہو جاتا ہے، دیکھا کہ ایک اسرائیلی ہے اور ایک قبطی ہے یعنی فرعون کی قوم کا آدمی، یہ دونوں آپس میں لڑ رہے ہیں، قبطی اسرائیلی کی پٹائی کر رہا ہے، اور اسرائیلی ان کے غلام تھے، ان کے سامنے کیا زور اور قوت تھی، وہ اس سے کوئی بیگار لینا چاہتا تھا، کوئی کام لینا چاہتا تھا، اسرائیلی آگے اَڑ گیا، کام کرتا نہیں تھا، تو اس نے مارنا شروع کر دیا۔ موسیٰ علیہ السلام پاس سے گزرے تو جس طرح سے ایک مظلوم آدمی کسی سے فریاد کیا کرتا ہے، تو اس نے موسیٰ علیہ السلام سے فریاد کی کہ مجھے اس کے ظلم سے بچاؤ، موسیٰ علیہ السلام پہلے ہی دیکھ رہے تھے کہ فرعونی کس طرح سے اسرائیلیوں پہ ظلم کر رہے ہیں، اگرچہ نمایاں نہیں تھے، رہتے فرعون کے گھر ہی تھے، اور فرعون کے محلات میں رہنا سہنا تھا، لیکن فطرتِ صحیحہ کے طور پر ظالم اور مظلوم میں فرق تو کرتے تھے، تو موسیٰ علیہ السلام نے اسے کہا ہوگا کہ اسے چھوڑ دے، کیوں اسے مار رہے ہو؟ اور وہ حاکمانہ ذہن میں تھا، وہ آگے سے موسیٰ علیہ السلام کے سامنے اکڑا، تو موسیٰ علیہ السلام نے ایک مکا لگایا، فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى فَقَضٰى عَلَيْهِ (سورۂ قصص: ۱۵) ایک ہی مکا مارنا تھا کہ قبطی نے تو پانی نہیں مانگا، وہیں ڈھیر ہو گیا، اس کے نتیجے میں مر گیا۔ اب موسیٰ علیہ السلام کو فکر ہوئی کہ یہ کیا ہوا، قتل کرنا تو مقصود نہیں تھا، اب وہ قبطی اگرچہ ظالم تھا اور وہ لوگ کافر تھے، محارب تھے، جو کچھ بھی تھے، لیکن موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے ان کے خلاف اعلانِ جنگ تو تھا نہیں، اور پھر سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ یہ قبطی جو میرے ہاتھ سے مارا گیا، کہیں اس کے انتقام میں قبطی اسرائیلیوں پر اور ظلم نہ شروع کر دیں، فرقہ وارانہ جنگ چھڑ جائے گی، اور نقصان اسرائیلیوں کا ہوگا۔ اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے محسوس کیا کہ یہ مجھ سے غلطی ہوگئی، اور اللہ تعالیٰ کے سامنے بھی شرمسار ہوئے، اور ملکی حالات کے اعتبار سے بھی ڈرے کہ یہ کیا ہو گیا، جیسے سورۂ قصص میں لفظ آئیں گے: فَاَصْبَحَ فِي الْمَدِيْنَةِ خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ کہ شہر میں ڈرتے ہوئے صبح کی، اس انتظار میں کہ دیکھو! اس کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ لیکن اس کا پتا کسی کو نہیں چلا، دیکھنے والا کوئی نہیں تھا سوائے اس اسرائیلی کے جو لڑ رہا تھا، اور کسی تیسرے آدمی کو پتا نہیں تھا کہ اس کا قاتل موسیٰ علیہ السلام ہے۔ جب فرعون کو پتا چلا کہ میری قوم کا ایک آدمی مارا گیا تو حکومت کی سطح پہ تفتیش شروع ہو گئی کہ اس کے قاتل کو تلاش کرو، تو قاتل کی جستجو ہو رہی تھی، لیکن کوئی

ثبوت مہیا نہیں ہو رہا تھا، انہی دنوں میں پھر ایک واقعہ پیش آ گیا کہ موسیٰ علیہ السلام پھر چلے جا رہے ہیں، او ر دیکھا تو وہی اسرائیلی ایک اور قبطی سے لڑ رہا ہے، اسی کی لڑائی کسی اور سے ہو رہی ہے، اس نے پھر موسیٰ علیہ السلام کو پکارا، اب موسیٰ علیہ السلام زبان سے تو تنبیہ اس اسرائیلی کو کر رہے ہیں کہ تُو بڑا خراب ہے، ہر وقت لڑتا رہتا ہے اِنَّكَ لَغَوِيٌّ مُّبِيْنٌ (سورۂ قصص:١٨) تُو بڑا بھٹکا ہوا ہے، شرارتی ہے، جب دیکھو کسی نہ کسی کے ساتھ اُلجھا ہوا ہے۔ تو زبان سے تنبیہ کر رہے تھے اسرائیلی کو، لیکن ہاتھ ڈال کے پکڑنے لگے اس قبطی کو، ایسا ہوتا ہے نا؟ یعنی تنبیہ تو اسے کر رہے ہیں کہ تیرا ہر روز یہی حال ہے، لیکن ہاتھ ڈال کے پکڑنے اس قبطی کو لگے ہیں، جیسے قرآنِ کریم میں لفظ آئیں گے اَرَادَ اَنْ يَّبْطِشَ بِالَّذِيْ هُوَ عَدُوٌّ لَّهُمَا (سورۂ قصص:١٩) کہ اس پر گرفت کرنے کا ارادہ کیا جو دونوں کا دُشمن تھا یعنی قبطی۔ لیکن وہ اسرائیلی بے وقوف ایسا نکلا کہ اس نے سمجھا کہ جب زبان سے ڈانٹ مجھے رہے ہیں، تو شاید ہاتھ بھی میرے پہ اُٹھا رہے ہیں، تو وہ فوراً بول پڑا، کہنے لگا: موسیٰ! کیا مجھے بھی اسی طرح سے قتل کرنے کا ارادہ ہے جیسے تُو نے پہلے ایک قبطی مار دیا، یہ کوئی طریقہ ہے؟ صلح کروانی ہے تو آسانی سے کروا دے، تُو زمین کے اندر جبار بننا چاہتا ہے؟ وہ ہلکی عقل کا آدمی تھا، اس نے ساری کی ساری بات ظاہر کر دی۔ جب اس قبطی کے سامنے یہ بات آ گئی کہ پچھلا قبطی جو مرا ہے، اس کا قاتل یہ ہے تو اس نے فوراً جا کے اطلاع دے دی کہ اس کا قاتل مل گیا اور فلاں شخص اس کا قاتل ہے۔ اب فرعون کے دربار میں مشورہ ہوا کہ یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ یہی لڑکا ہے جو حکومت کے خلاف تحریک اُٹھائے گا اور حکومت کا تختہ اُلٹ دے گا، اس کے تو آثار کچھ ایسے ہی نظر آ رہے ہیں، تو فیصلہ ہو گیا کہ اس کو بھی قتل کر دیا جائے، جب یہ مشورہ ہو رہا تھا تو درمیان میں ایک آدمی ایسا تھا جو موسیٰ علیہ السلام کا ہمدرد تھا، چاہے وہ بھی قبطی تھا لیکن آخر جس ماحول میں انسان رہتا ہے تو کوئی دوستیاں ہو ہی جایا کرتی ہیں۔ وہ خفیہ طور پر آیا، اور اس نے آ کر موسیٰ علیہ السلام کو اطلاع دی (یہ سارا واقعہ سورۂ قصص میں آئے گا) کہ تیرے متعلق سرکاری دربار میں قتل کا مشورہ ہو رہا ہے، اس لیے میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ تُو یہاں سے نکل جا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام وہاں سے بھاگے، راستہ بھی معلوم نہیں تھا، مصر کی حدود سے نکل کر مدین پہنچ گئے۔

مدین پہنچنے کے بعد کے حالات

مدین ایک شہر ہے، اور وہاں جو قبیلہ آباد تھا اس کا نام بھی مدین ہی ہے، یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے مدین کی اولاد میں سے تھے۔ اس وقت وہاں مدین میں حضرت شعیب علیہ السلام اللہ کے پیغمبر موجود تھے، لیکن موسیٰ علیہ السلام کو کچھ واقفیت نہیں تھی، وہاں جاتے ہیں تو باہر ایک کنواں ہے، وہاں لوگ اپنی بکریوں کو پانی پلانے کے لئے آتے ہیں، موسیٰ علیہ السلام نے دو لڑکیوں کو دیکھا کہ وہ اپنی بکریاں علیحدہ لئے کھڑی ہیں اور آگے پانی پلانے کے لئے نہیں جاتیں، تو موسیٰ علیہ السلام نے ان سے پوچھا کہ تم یہاں کیوں کھڑی ہو؟ انہوں نے کہا کہ جب تک یہ سارے فارغ ہو کر نہیں جائیں گے، اس وقت تک ہم اپنی بکریوں کو پانی نہیں پلا سکتیں، ایک تو وہاں جو ڈول تھا اس کو کھینچنا عورت کے بس کی بات نہیں تھی، دوسرے مردوں کے ساتھ تصادم یہ بھی مشکل ہوتا ہے، تو یہ چلے جائیں گے، پیچھے بچا کھچا پانی جو ہو گا وہ ہماری بکریاں پی لیں گی، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام آگے بڑھے، جا کے ڈول کھینچ کے پانی نکالا اور ان لڑکیوں کی بکریوں کو پلا دیا، اور یہ لڑکیاں بکریوں کو پانی پلا کے وقت پر اپنے گھر چلی گئیں، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک طرف ہٹ کے سائے میں

بیٹھ گئے اور اللہ کے سامنے دُعا کی، بھوکے بھی تھے، اور بظاہر کوئی یار مددگار بھی نہیں تھا، تو دُعا کی کہ رَبِّ اِنِّیۡ لِمَاۤ اَنۡزَلۡتَ اِلَیَّ مِنۡ خَیۡرٍ فَقِیۡرٌ (سورۂ قصص: ۲۴) اے اللہ! جو خیر تُو میری طرف اُتارے میں اس کا محتاج ہوں، یوں اللہ کے سامنے دُعا کی۔ کہتے ہیں کہ یہ لڑکیاں جب بکریاں لے کر گھر میں گئیں، تو حضرت شعیب علیہ السلام نے دیکھا کہ آج یہ قبل اَز وقت اتنی جلدی فارغ ہو کے کیسے آ گئیں؟ انہوں نے پوچھا تو انہوں نے سارا واقعہ ذکر کر دیا کہ اس طرح سے ایک مسافر آیا ہے اور اس نے ہم پہ مہربانی کی، ہماری بکریوں کو پانی پلا دیا اور وہ بڑا طاقتور تھا، وہ ڈول جو کئی آدمی مل کر کھینچتے تھے اس نے اکیلے ہی کھینچ لیا، لڑکیوں نے یہ واقعہ بیان کیا۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے ایک لڑکی کو بھیجا کہ جاؤ جا کے اسے بُلا کے لاؤ، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام تشریف لے گئے اور پھر اسی وقت ایک بچی نے یہ درخواست کردی کہ اَبّا! گھر میں کام کرنے کے لئے کسی آدمی کی ضرورت تو ہے، ہم گھر میں کام کرنے کے لئے اسی کو کیوں نہ رکھ لیں، کیونکہ گھر میں جو مزدور رکھا جائے تو اس میں دو صفتیں ہونی چاہئیں، ایک وہ امانت دار ہو، دوسرا قوت والا ہو، اور وہ دونوں صفتیں اس میں نمایاں ہیں، طاقتور بھی ہے، اور چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑا شریف آدمی ہے، ہم گھر میں اسی کو رکھ لیں، چنانچہ آپس میں معاملہ طے ہو گیا، جب شعیب علیہ السلام نے حالات معلوم کر لیے کہ ایسے خاندان کا ہے، ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہے، تو کفو بھی معلوم ہو گیا، تو کہنے لگے کہ میرا ارادہ یہ ہے کہ ان دونوں بچیوں میں سے ایک بچی کا نکاح میں تجھ سے کردوں، لیکن شرط یہ ہے کہ آٹھ سال تک یا دس سال تک میرے گھر میں کام کرو۔ موسیٰ علیہ السلام نے منظور کر لیا، تو حضرت شعیب علیہ السلام کے گھر شادی ہو گئی، اور وہیں رہنا سہنا ہو گیا، بکریاں چَرانے کی خدمت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سپرد ہو گئی، تو موسیٰ علیہ السلام نے آٹھ سال یا دس سال بکریاں چرائیں۔ تو یہ سارے کا سارا اللہ کی طرف سے احسان تھا کہ کیسا واقعہ پیش آیا، اللہ تعالیٰ نے کس طرح سے ان کو مدین پہنچا دیا، کس طرح سے حضرت شعیب علیہ السلام ان کے ایک قسم کے سرپرست بن گئے، اور ان کی موجودگی میں کیسا ان کا وقت گزرا، پھر ان کا واپس آنا جیسا کہ اشارہ پہلے گزرا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے وہ احسانات یہاں یاد دِلائے ہیں، کہ تُو تو اَب دُعا کر رہا ہے اور تیری دُعا کو میں قبول کر رہا ہوں، اس سے پہلے بھی میں نے تیرے پہ احسان کیا ہے، اور وہ احسان یہی تربیت کا ہے جو واقعہ آگے نقل کیا جا رہا ہے۔

آیاتِ بالا کا خلاصہ

"جبکہ وحی کی ہم نے تیری ماں کی طرف جو وحی کی جاتی ہے" یعنی اب وحی کی جاتی ہے یا ایسی بات جو وحی کی جانی چاہیے تھی، وحی کے لائق تھی، "کہ ڈال دے اس کو تابوت میں اور پھر تابوت کو ڈال دے دریا میں، پھر چاہیے کہ دریا اس کو ڈال دے کنارے پر" "یمّ" بڑے دریا کو اور سمندر کو کہتے ہیں، یہاں دریائے نیل مراد ہے، "پکڑ لے گا اس کو میرا دشمن اور اس کا دشمن، اور میں نے تیرے اوپر اپنی طرف سے محبوبیت ڈال دی، تاکہ تو محبت کیا جائے اور تیری پرورش میری آنکھوں کے سامنے ہو" اِذۡ تَمۡشِیۡۤ اُخۡتُکَ: (یہ واقعات کی طرف اشارہ ہے) "یاد کیجئے جبکہ تیری بہن چلی جا رہی تھی، اور وہ کہتی تھی" یعنی ان فرعونیوں کو "کہ میں تمہاری راہنمائی کروں ایسے شخص پر جو اس کی کفالت کرے؟" مَنۡ یَّکۡفُلُہٗ: مَن چونکہ لفظوں میں مذکر ہے، تو یکفل میں ضمیر مذکر کی لوٹ گئی، ورنہ مراد اس سے موسیٰ علیہ السلام کی ماں ہے، یعنی ایسی عورت بتاؤں جو اس کو سنبھال لے؟ مقصد تو یہ ہے لیکن مَن چونکہ لفظوں

میں مفرد مذکر ہے تو اس لیے ضمیر مذکر کی لوٹ رہی ہے۔'' چنانچہ اس مشورہ کے بعد ہم نے تجھے لوٹا دیا تیری ماں کی طرف تا کہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں اور وہ غم زدہ نہ ہو۔'' آگے دوسرا واقعہ آ گیا کہ ''قتل کیا تُو نے ایک نفس کو، جس کے بعد تُو پریشانی میں مبتلا ہوا، پھر ہم نے تجھے غم سے نجات دی، اور خوب آزمائش میں ڈالا، پھر کئی سال تک ٹھہرا رہا تُو اہل مدین میں، پھر آ گیا تو ایک وقت مقدر پر اے موسیٰ!'' تقدیری طور پر آ گیا، جو میری طرف سے اَمرِ مقدر تھا اس کی بنا پر تُو یہاں طور پر پہنچ گیا۔ اور میں نے تجھے اپنے لیے تیار کیا ہے وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ، جا تُو اور تیرا بھائی میری آیات لے کر، اور میرے ذکر میں سستی نہ کرنا، ہر جگہ میرا ذکر کرنا، وعظ، تبلیغ، اللہ کی یاددہانی، اللہ کے اَحکام کی یاددہانی یہ سب ذِکر میں شامل ہے۔ تثنیہ کے صیغے کے طور پر ذِکر کر دیا، گویا کہ ہارون علیہ السلام کو نبی بنا دیا گیا،'' جاؤ فرعون کی طرف، وہ بڑا سرکش ہے۔''

تبلیغ کا ایک بہت بڑا اُصول

لیکن آگے دیکھئے!...... آپ حضرات کے لئے خصوصیت سے قابلِ توجہ بات ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام یہ دو پیغمبر ہیں، اور جا رہے ہیں وقت کے سب سے بڑے سرکش کے مقابلے میں، باغی کے مقابلے میں، جو رَبّ ہونے کا دعویٰ کیے بیٹھا ہے، جس کا نعرہ تھا أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلٰى (سورۂ نازعات: ۲۴)، اس کے سامنے جا رہے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے نصیحت کی جا رہی ہے کہ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا، اس کے ساتھ بات نرم لب ولہجے سے کیجیو، سخت زبان استعمال نہیں کرنی، درشت نہیں بولنا، آگے سے وہ چاہے کیسی ہی سرکشی کرے، جو بھی ہے، تم نے بات اس سے نرم لب ولہجے سے کرنی ہے۔ اب فرعونِ وقت کو بھی بات کرنے کے لئے موسیٰ علیہ السلام سے کہا جا رہا ہے کہ سخت لفظ نہیں استعمال کرنا، جس سے خواہ مخواہ اس کو اشتعال آئے، نرم گفتگو کیجیو۔ ہوسکتا ہے کہ وہ نصیحت حاصل کر لے، بالکل ہی سنبھل جائے، ورنہ اس کے دل میں کچھ خوف وخشیت ہی پیدا ہو جائے۔ اور معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ جو کچھ کہا جا رہا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مصر پہنچنے کے بعد کہا جا رہا ہے، جبکہ دونوں بھائی اکٹھے ہو گئے۔ وہ دونوں کہنے لگے کہ یا اللہ! ہمیں تو اندیشہ ہے کہ ہم اس کے سامنے جائیں گے تو وہ فوراً ہی بھڑک پڑے گا، اور ہم پر زیادتی کر گزرے گا، ہوسکتا ہے ہم تیرا پیغام پہنچا ہی نہ سکیں، یا ہماری بات سننے کے بعد وہ اور سرکشی میں آ جائے، ہمیں بھی تکلیف پہنچائے اور ہماری قوم کو بھی زیادہ تکلیف پہنچائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اب خوف کرنے کی بات نہیں، میں تمہارے ساتھ ہوں۔

سوال:- اللہ کو معلوم تھا کہ فرعون ایمان نہیں لائے گا، تو پھر موسیٰ علیہ السلام کو اس کے پاس تبلیغ کے لئے کیوں بھیجا گیا؟

جواب:- اس چیز سے بحث نہیں ہوا کرتی، تقدیر کا معاملہ آپ حضرات کے سامنے ابھی واضح طور پر ذِکر کرنے کا نہیں ہے۔ ظاہری اسباب میں بات یوں ہی ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر شخص کے لئے اسبابِ ہدایت کو نمایاں کیا جاتا ہے، اور ظاہری طور پر اس اُمید پر ہی نمایاں کیا جاتا ہے کہ اگر اس نے سمجھنا ہو تو سمجھ سکے، نہ سمجھنا ہو تو نہ سمجھے۔ یہ جو ظاہری طور پر انسان کو اختیار دیا گیا ہے، اسی کے مطابق یہ بات ہے کہ تم جا کے اس کو نرمی سے سمجھانا، اس میں پھر دونوں صورتیں ہیں، چاہے وہ نصیحت حاصل کر لے، چاہے اس کے دل میں کچھ اندیشہ پیدا ہو جائے، چاہے وہ نہ سمجھے۔

موسیٰ علیہ السلام کو جب ان کی والدہ سے واپس لے لیا گیا تھا تو رہتے تو موسیٰ علیہ السلام اسی شہر میں تھے، اور یہ بالیقین سب کو معلوم تھا، فرعونیوں کو بھی کہ یہ مرضعہ اس کی ماں ہے، چاہے وہ حقیقی ماں نہ سمجھیں، رضاعی ماں سمجھیں۔ تو رضاعی ماں کے ساتھ میل ملاقات، آنا جانا کسی کے نزدیک بھی قابلِ اعتراض نہیں ہوتا، جس کی وجہ سے موسیٰ علیہ السلام اپنی ماں کو بھی پہچانتے تھے اور اپنے بھائی کو بھی پہچانتے تھے، اور جس وقت آٹھ دس سال کے بعد واپسی کا ارادہ کیا، تو ان کو معلوم تو تھا کہ میں اسی خاندان کا ہوں، یہ تو معلوم ہو گیا کہ ہارون میرا حقیقی بھائی ہے اور یہ میری حقیقی ماں ہے، اور ان کے میل جول پر دوسرے اس لیے اعتراض نہیں کرتے ہوں گے کہ فرعونی سمجھتے تھے کہ مرضعہ ہے تو اس کی رضاعی ماں ہے، اور اس کی اولاد موسیٰ علیہ السلام کے رضاعی بھائی بہن ہو گئے، اُسی شہر میں رہتے ہوئے میل ملاپ رہتا ہوگا، اس لیے موسیٰ علیہ السلام پہچانتے تھے اپنے بھائی کو بھی اور اپنی ماں کو بھی، تو وہاں مدین سے واپس اپنے گھر پہنچ گئے ہوں گے، اور حضرت ہارون علیہ السلام کی طرف بھی وحی آچکی تھی، دونوں بھائی اکٹھے ہو گئے، اکٹھے ہونے کے بعد پھر فرعون کے پاس گئے۔

تو ظاہری اسباب کے طور پر بات اسی طرح سے اختیار کی جایا کرتی ہے، باقی! وہ سمجھے گا یا نہیں سمجھے گا، یہ اللہ کے علم میں ہے، ہم ظاہری طور پر اس کے مکلف نہیں ہیں۔ اللہ کے علم میں کیا ہے؟ ہم اس کے مکلف نہیں۔ ظاہری طور پر تبلیغ کا حکم جب ہوگا تو کٹر کافروں کو بھی تبلیغ کی جائے گی۔ سمجھنا، نہ سمجھنا، یہ معاملہ اس کا اللہ کے ساتھ ہے۔ موسیٰ علیہ السلام جائیں گے تو اسی جذبے سے جائیں گے کہ ہو سکتا ہے یہ بالکل ہی سمجھ جائے، یا ہو سکتا ہے کہ اس کے دل میں خوف وخشیت پیدا ہو جائے، کچھ ڈھیلا ہو جائے، کچھ نرم ہو جائے، تو آہستہ آہستہ سمجھ جائے گا۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام جانتے پہچانتے تھے اس لیے جاتے ہی اپنے بھائی کے ساتھ اکٹھے ہو گئے۔ تو ان دونوں نے اللہ کے سامنے یہ درخواست کی، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ڈرنے کی بات نہیں ہے، میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اور جب اللہ تعالیٰ کی معیت ساتھ ہو تو پھر کیا خوف؟

غارِ ثور میں جس وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر کچھ خوف و ہراس طاری ہوا تھا مشرکینِ مکہ کو دیکھ کر، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بھی تو یونہی کہا گیا تھا کہ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا (سورۂ توبہ: ۴۰) غم کرنے کی بات نہیں ہے، اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے، جب اللہ تعالیٰ کی معیت ساتھ ہوتی ہے تو پھر خوف کس بات کا۔ ”ڈرو نہیں، میں تمہارے ساتھ ہوں، سُن بھی رہا ہوں، دیکھ بھی رہا ہوں“ نہ کسی کی کوئی بات مجھ سے مخفی ہے، نہ کسی کا حال مخفی ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کا فرعون سے مکالمہ

اور جاؤ، جا کے یوں اس کے سامنے تبلیغ کرو کہ پہلے اپنی رسالت کا ذکر کرنا کہ ہم تیرے رَبّ کے بھیجے ہوئے ہیں، اور جیسے دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو توحید کی دعوت بھی دی گئی هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى ۙ وَ اَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى (سورۂ نازعات) تو اس کو بھی نیکی کی دعوت دی گئی، لیکن ساتھ ساتھ اس مظلوم قوم کی رہائی کا مطالبہ بھی کیا گیا، جس کو وہ غلام بنائے بیٹھا تھا، اور انتہائی درجے کے ظلم وستم کا ان کو نشانہ بنایا ہوا تھا، ان کی رہائی کا مطالبہ بھی کیا کہ ان کو چھوڑ دے، ہم لے جائیں، یعنی

ان کو غلامی سے آزاد کر دے، اور انہیں تو عذاب میں مبتلا نہ کر۔ باقی! ہمارا یہ دعویٰ کہ ہم تیرے رَبّ کی طرف سے آئے ہیں، بے دلیل نہیں، ہم تیرے رَبّ کی طرف سے واضح دلیل بھی لائے ہیں، اور اس دلیل سے وہی معجزات مراد ہیں جو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو دیے تھے، جن کے ساتھ ان کو مسلح کر کے بھیجا تھا۔ اور پھر آگے ذکر کر دیا کہ سلامتی اسی پر ہے جو ہدایت کی اتباع کرے، صحیح راستے پہ چلے، یعنی اگر تو دنیا اور آخرت کے عذاب سے بچنا چاہتا ہے اور سلامتی حاصل کرنا چاہتا ہے تو ہدایت کا راستہ قبول کر۔ اور آگے وضاحت سے کہہ دیا گیا کہ ہماری طرف یہ بات وحی کی گئی ہے کہ عذاب اسی شخص پر ہے جو جھٹلاتا ہے اور پیٹھ پھیرتا ہے۔ اب فرعون تو اپنے آپ کو رَبّ سمجھتا تھا اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى، جب انہوں نے کہا کہ ہم تیرے رَبّ کی طرف سے رسول بن کر آئے ہیں، تو اس نے پوچھا کہ وہ رَبّ کون ہے؟ فَمَنْ رَّبُّكُمَا: تم دونوں کا رَبّ کون ہے؟ اے موسیٰ! تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ ہمارا رَبّ وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی بناوٹ دی اور پھر ہدایت دی۔ اب یہ تو فرعون بھی جانتا تھا کہ یہ نباتات، جمادات، حیوانات اور دُنیا کے سارے انسان، ان کا خالق میں تو ہوں نہیں، یہ تو ایک واضح بات تھی، اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو اس کی بناوٹ دی، چڑیا کو بنایا، بنانے کے بعد اس کی جس قسم کی ضروریات تھیں وہ پورا کرنے کی اس کو ہدایت دی، انسانوں کی بناوٹ اور ان میں بھی ایک فطری ہدایت رکھی جس سے وہ اپنے نفع نقصان کو سمجھتے ہیں، اچھی چیز کو حاصل کرتے ہیں، بُری سے بچتے ہیں، اسی طرح حیوانات اپنی ضروریات پوری کرتے ہیں۔ اب بچہ پیدا ہوتا ہے، تو پیدا ہونے کے بعد دُودھ چوسنا جو اسے آتا ہے، وہ جو دُودھ چوستا ہے، اب وہ کسی مدرسے سے تو نہیں پڑھتا، نہ کوئی اُستاذ اسے پڑھاتا ہے، اگر اس کو فطری طور پر ہدایت حاصل نہ ہوتی تو دُنیا کے حکماء اکٹھے ہو کر بھی اس بچے کو طریقہ نہ بتا سکتے کہ تو اس طرح سے اپنی ماں کے پستان کو ہونٹوں میں لے کے اس طرح سے دبا، تو اس میں سے دُودھ نکلے گا، تو کوئی بچے کو سمجھا سکتا ہے؟ یہ چیز ہے فطری ہدایت جو اللہ تعالیٰ ہر چیز کو دیتے ہیں، حیوانات کو بھی دیتے ہیں، اسی طرح سے نباتات جمادات، جیسی جیسی چیز اللہ نے بنائی، اس کے لئے جو جو چیز مناسب تھی، اس کے مناسب اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے ہدایت بھی رکھی، یہ ایک بہت واضح دلیل تھی جس میں گویا کہ ساری کائنات کو فرعون کے سامنے پیش کر دیا گیا، کہ تُو بتا تو سہی کہ ان چیزوں میں سے کون کونسی چیز تیری بنائی ہوئی ہے؟ اور کس کس چیز کو تُو نے ہدایت دی ہے؟ تو رَبّ وہ ہے جو ساری کائنات کو پیدا کرنے والا، بنانے والا، اور ان کی ضرورت کے مطابق ان کو ہدایت دینے والا ہے۔

اب فرعون نے بات کو اُلجھانا چاہا، وہ کہتا ہے کہ اچھا! یہ بتاؤ جو پہلی جماعتیں گزریں ان کا کیا حال ہے؟ مطلب یہ تھا کہ اس کو پچھلی تاریخ میں اُلجھا دو، جب یہ کہے گا کہ سارے بے ایمان تھے، سب کافر تھے، سب جہنم میں گئے، تو ان لوگوں کو مشتعل کرنا آسان ہو جائے گا کہ دیکھو! تمہارے ماں باپ کو یوں کہتا ہے، اس طرح سے پچھلے واقعات میں ان کو اُلجھا دیا جائے۔ موسیٰ علیہ السلام وہاں سے بڑے اچھے طریقے سے نکل گئے، کہنے لگے: مجھے ان سے کوئی تعلق نہیں، ان کا علم میرے رَبّ کے پاس ہے، جو کچھ انہوں نے کیا ان کے سامنے آ جائے گا، نہ میرا رَبّ کسی فیصلے میں غلطی کرتا ہے نہ کسی کی بات کو بھولتا ہے، اس لیے میں کچھ تفصیل سے ذکر کرنے کے لئے تیار نہیں کہ ان کے ساتھ کیا ہوا اور کیا ہوگا؟ وہ اللہ کے علم میں ہے جو کچھ ہوگا۔ اب آگے اللہ تعالیٰ نے اس کی

کچھ وضاحت کردی جس میں توحید کی وضاحت ہوگئی کہ اللہ وہ ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا بنایا، تمہارے لیے اس میں راستے جاری کیے، آسمان سے پانی اتارا، یہ سب انسان کے لئے انعامات ہیں اور اللہ کی قدرت کے مظاہر ہیں، اور پھر اس پانی کے ذریعے سے مختلف قسم کی نباتات پیدا کی، اور پھر اللہ نے تمہیں کہا کہ کھاؤ بھی، اور اپنے جانوروں کو چراؤ بھی، اس میں نشانیاں ہیں عقل والوں کے لئے، عقل والے اگر اس بات پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ خالق اللہ، منعم اللہ، محسن اللہ، کیسے کیسے اس نے انعامات دیے، لہٰذا رَبّ کہلانے کا بھی وہی حق دار ہے، اس کے علاوہ دوسرا کوئی رَبّ نہیں۔ اس لیے فرعون یا کوئی فرعون جیسا دوسرا آدمی اگر رُبوبیت کا دعویٰ کیے ہوئے ہے تو غلط دعویٰ کیے ہوئے ہے۔ رَبّ تو وہ ہوسکتا ہے جو اس قسم کی ساری ضرورتیں پوری کرتا ہے۔ اور پھر ''اسی زمین سے ہم نے تمہیں بنایا، اسی میں ہم تمہیں دوبارہ لوٹائیں گے'' مرنے کے بعد آخر جیسا کیسا بھی ہو انسان لوٹ پوٹ کے زمین میں ہی آتا ہے۔ ''اور دوبارہ یہیں سے ہم تمہیں اُٹھائیں گے'' اس میں معاد کا تذکرہ آ گیا۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

وَلَقَدْ اَرَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَاَبٰى ﴿۵۶﴾ قَالَ اَجِئْتَنَا

البتہ ضرور ہم نے دکھائیں فرعون کو اپنی ساری نشانیاں، اس نے تکذیب کی اور ماننے سے انکار کردیا ﴿۵۶﴾ فرعون نے کہا: کیا آیا ہے تو ہمارے پاس

لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰى ﴿۵۷﴾ فَلَنَاْتِيَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهٖ

تاکہ نکال دے ہمیں ہمارے علاقے سے اپنے جادو کے زور سے اے موسیٰ! ﴿۵۷﴾ پس البتہ ضرور لائیں گے ہم تیرے پاس ایسا ہی جادو،

فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهٗ نَحْنُ وَلَآ اَنْتَ مَكَانًا سُوًى ﴿۵۸﴾ قَالَ

پس متعین کر تُو ہمارے درمیان اور اپنے درمیان ایک وعدہ، نہ ہم اس کے خلاف کریں اور نہ تُو کسی برابر میدان میں ﴿۵۸﴾ موسیٰ نے کہا

مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ وَاَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى ﴿۵۹﴾ فَتَوَلّٰى فِرْعَوْنُ فَجَمَعَ

تمہارے وعدے کا وقت زینت کا دِن ہے اور یہ کہ جمع کیا جائے لوگوں کو چاشت کے وقت ﴿۵۹﴾ فرعون نے پیٹھ پھیری پھر اس نے اپنی تدبیر

كَيْدَهٗ ثُمَّ اَتٰى ﴿۶۰﴾ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰى وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُمْ

جمع کی پھر (مقابلے میں) آ گیا ﴿۶۰﴾ موسیٰ نے ان جادوگروں سے کہا: تمہاری خرابی! اللہ کے اُوپر جھوٹی بات نہ گھڑو، پھر وہ ختم کردے گا تمہیں

بِعَذَابٍ ۚ وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى ﴿۶۱﴾ فَتَنَازَعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ وَ

عذاب کے ساتھ، تحقیق نامراد ہوا وہ شخص جس نے جھوٹ گھڑا ﴿۶۱﴾ پھر ان جادوگروں نے آپس میں اپنے معاملے میں جھگڑا کیا اور

اَسَرُّوا النَّجْوٰی ﴿۶۲﴾ قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ یُرِیْدٰنِ اَنْ یُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ

چھپایا انہوں نے سرگوشی کو ﴿۶۲﴾ کہنے لگے بے شک یہ دونوں البتہ جادوگر ہیں، ارادہ کرتے ہیں یہ دونوں کہ نکال دیں تمہیں تمہارے علاقے سے

بِسِحْرِهِمَا وَ یَذْهَبَا بِطَرِیْقَتِكُمُ الْمُثْلٰی ﴿۶۳﴾ فَاَجْمِعُوْا كَیْدَكُمْ ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا ۚ وَ قَدْ

اپنے جادو کے زور سے اور لے جائیں تمہارے اچھے طریقے کو ﴿۶۳﴾ پس تم اکٹھی کرو اپنی تدبیر پھر آؤ تم قطاریں باندھ کر، تحقیق

اَفْلَحَ الْیَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰی ﴿۶۴﴾ قَالُوْا یٰمُوْسٰۤی اِمَّاۤ اَنْ تُلْقِیَ وَ اِمَّاۤ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ

کامیاب ہوگیا آج وہ شخص جو غالب آ گیا ﴿۶۴﴾ جادوگروں نے کہا کہ اے موسیٰ! یا تُو ڈالے یا ہم ہو جائیں پہلے

اَلْقٰی ﴿۶۵﴾ قَالَ بَلْ اَلْقُوْا ۚ فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَ عِصِیُّهُمْ یُخَیَّلُ اِلَیْهِ

ڈالنے والے ﴿۶۵﴾ موسیٰ نے کہا کہ بلکہ تم ہی ڈالو! پس اچانک ان کی رسیاں اور ان کی لاٹھیاں، موسیٰ کے خیال میں ڈالی جاتی تھیں

مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰی ﴿۶۶﴾ فَاَوْجَسَ فِیْ نَفْسِهٖ خِیْفَةً مُّوْسٰی ﴿۶۷﴾ قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ

ان کے جادو کی وجہ سے کہ وہ بھاگ رہی ہیں ﴿۶۶﴾ چھپایا اپنے دل میں خوف موسیٰ نے ﴿۶۷﴾ ہم نے کہا کہ تُو خوف نہ کر بے شک تُو ہی

الْاَعْلٰی ﴿۶۸﴾ وَ اَلْقِ مَا فِیْ یَمِیْنِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا ؕ اِنَّمَا

غالب آنے والا ہے ﴿۶۸﴾ ڈال دے اس چیز کو جو تیرے دائیں ہاتھ میں ہے، نگل جائے گی یہ اس کو جو انہوں نے بنایا، بے شک جو چیز

صَنَعُوْا كَیْدُ سٰحِرٍ ؕ وَ لَا یُفْلِحُ السّٰحِرُ حَیْثُ اَتٰی ﴿۶۹﴾ فَاُلْقِیَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوْٓا

انہوں نے بنائی ہے یہ جادوگر کا مکر ہے، اور ساحر کامیاب نہیں ہوگا جہاں بھی آئے ﴿۶۹﴾ پس ڈال دیے گئے جادوگر سجدے میں، کہنے لگے

اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَ مُوْسٰی ﴿۷۰﴾ قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ

کہ ہم ایمان لے آئے ہارون اور موسیٰ کے رَبّ پر ﴿۷۰﴾ فرعون نے کہا: تم ایمان لے آئے اس موسیٰ کے لئے قبل اس کے کہ میں تمہیں

اٰذَنَ لَكُمْ ؕ اِنَّهٗ لَكَبِیْرُكُمُ الَّذِیْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَاُقَطِّعَنَّ اَیْدِیَكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ

اجازت دوں؟ بے شک یہ موسیٰ تمہارا بڑا ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا، پس البتہ میں ضرور کاٹوں گا تمہارے ہاتھوں کو اور تمہارے پاؤں کو

مِّنْ خِلَافٍ وَّ لَاُوصَلِّبَنَّكُمْ فِیْ جُذُوْعِ النَّخْلِ ۫ وَ لَتَعْلَمُنَّ اَیُّنَاۤ

مخلف جانب سے اور البتہ ضرور سولی دوں گا میں تمہیں کھجور کے تنوں پر اور البتہ ضرور جان لو گے تم کہ ہم میں سے کون زیادہ سخت ہے

اَشَدُّ عَذَابًا وَّاَبْقٰى ۝ قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا

از روئے عذاب کے اور کون زیادہ باقی رہنے والا ہے ﴿۷۱﴾ وہ جادوگر کہنے لگے: ہرگز نہیں ترجیح دیں گے ہم تجھے ان واضح دلائل پر جو

مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالَّذِيْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ؕ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ

ہمارے پاس آگئے اور اس ذات پر جس نے ہمیں پیدا کیا، کر گزر تُو جو کچھ کرنا چاہتا ہے، اس کے سوا کچھ نہیں کہ تُو کر سکتا ہے اسی دُنیوی

الدُّنْيَا ۝ اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا وَمَآ

زندگی میں ﴿۷۲﴾ بے شک ہم اپنے رَبّ پہ ایمان لے آئے تا کہ وہ ہمارے گناہوں کو بخش دے، اور (تا کہ بخش دے ہمیں) وہ جادو جس

اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۝ اِنَّهٗ مَنْ يَّاْتِ رَبَّهٗ

پر کہ تُو نے ہمیں مجبور کیا، اللہ بہتر ہے اور زیادہ باقی رہنے والا ہے ﴿۷۳﴾ بے شک بات یہ ہے کہ جو کوئی اپنے رَبّ کے پاس آئے گا

مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ ؕ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ۝ وَمَنْ يَّاْتِهٖ

مجرم ہونے کی حالت میں پس اس کے لئے جہنم ہے، نہ اس میں مرے گا نہ زندہ رہے گا ﴿۷۴﴾ اور جو کوئی اپنے رَبّ کے پاس آئے گا

مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰى ۝ جَنّٰتُ عَدْنٍ

مؤمن ہونے کی حالت میں، جس نے کہ نیک عمل بھی کیے ہوں گے پس ان کے لئے بلند درجے ہیں ﴿۷۵﴾ ہمیشگی کے باغات،

تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا مَنْ تَزَكّٰى ۝

جاری ہوں گی ان کے نیچے سے نہریں، ہمیشہ رہنے والے ہوں گے ان میں، یہ بدلہ ہے اس شخص کا جو کہ صاف ستھرا بنے ﴿۷۶﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ وَلَقَدْ اَرَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا كُلَّهَا: لَقَدْ تاکید کے لئے ہے۔ البتہ ضرور ہم نے دکھائیں اس کو اپنی ساری نشانیاں۔ كُلَّهَا یہ آیات کی تاکید ہے، اور آیات جمع مؤنث سالم کا وزن ہونے کی وجہ سے مکسور پڑھا گیا، ورنہ اصل کے اعتبار سے منصوب ہے، ارینا کا مفعول ہے، اور كُلَّهَا کے اوپر اسی لیے فتح پڑھا گیا کہ یہ منصوب کی تاکید ہے۔ ہم نے اس کو اپنی ساری نشانیاں دکھائیں، فَكَذَّبَ وَاَبٰى: فرعون نے تکذیب کی اور ماننے سے انکار کر دیا۔ اَرَيْنٰهُ کی ''ہٗ'' ضمیر بھی فرعون کی طرف لوٹ رہی ہے۔ قَالَ اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا: فرعون نے کہا کیا آیا ہے تو ہمارے پاس (جئت کا خطاب موسیٰ علیہ السلام کو ہے) کیا آیا ہے تُو ہمارے پاس تا کہ نکال دے ہمیں ہمارے علاقے سے، ہماری زمین سے بِسِحْرِكَ: اپنے جادو کے زور سے يٰمُوْسٰى:

اے موسیٰ! اے موسیٰ! کیا تُو ہمارے پاس آیا ہے تاکہ نکال دے تُو ہمیں ہمارے علاقے سے اپنے جادو کے زور سے؟ فَلَنَاْتِیَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهٖ: پس البتہ ضرور لائیں گے ہم تیرے پاس ایسا ہی جادو، فَاجْعَلْ بَیْنَنَا وَبَیْنَكَ مَوْعِدًا: پس متعین کر تُو ہمارے درمیان اور اپنے درمیان ایک وعدہ۔ مَوْعِد مصدر میمی بھی ہوسکتا ہے، ظرف کا صیغہ بھی ہوسکتا ہے، اور ظرف زمان بھی ظرف مکان بھی۔ ہمارے درمیان اور اپنے درمیان ایک وعدہ متعین کرلے۔ لَّا نُخْلِفُهٗ نَحْنُ وَلَآ اَنْتَ: نہ ہم اس کے خلاف کریں اور نہ تُو، اس وعدے کے خلاف ہم بھی نہ کریں اور تُو بھی نہ کر۔ مَكَانًا سُوًى: کسی برابر میدان میں۔ مَكَانًا سُوًى کا مفہوم دو طرح سے ہے، یا تو برابر میدان سے مراد ہے کہ برابر ہو، اس میں نشیب و فراز نہ ہو، جس کو ہم کھلا چٹیل صاف میدان کہتے ہیں (آلوسی)، کسی صاف میدان میں ہمارے ساتھ مقابلہ کرنے کے لئے تُو ہم سے کوئی وعدہ متعین کرلے، اس کے تُو بھی خلاف نہ کرنا، ہم بھی خلاف نہیں کریں گے۔ یا مَكَانًا سُوًى کا مفہوم اس طرح سے ہے کہ کوئی درمیان سی جگہ، برابر سی جگہ متعین کرلو، جہاں تیرا پہنچنا بھی آسان ہو اور ہمارا پہنچنا بھی آسان ہو (عام تفاسیر)، دونوں طرح سے اس کا مفہوم ادا کیا گیا ہے۔ قَالَ: موسیٰ علیہ السلام نے کہا: مَوْعِدُكُمْ یَوْمُ الزِّیْنَةِ: تمہارے وعدے کا وقت زینت کا دن ہے، جشن کا دن ہے۔ فرعونی کوئی میلہ منایا کرتے تھے، تو یَوْمُ الزِّیْنَةِ سے وہی میلے کا دن مراد ہے، تمہارے وعدے کا وقت جشن کا دن ہے، وَاَنْ یُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى: اور یہ کہ جمع کیا جائے لوگوں کو چاشت کے وقت، یعنی سورج جب اُونچا ہوجائے۔ تو دن بھی متعین ہوگیا، وقت بھی متعین ہوگیا، جشن کا دن، اور چاشت کے وقت لوگوں کو جمع کرنے کا دن، اَنْ یُّحْشَرَ کا عطف اگر الزِّیْنَةِ کے اوپر کردیا جائے تو یہ بھی یَوْمُ کے نیچے آجائے گا ''لوگوں کو چاشت کے وقت جمع کرنے کا دن۔'' اور اگر اس کا عطف یَوْمُ کے اوپر کردیا جائے پھر معنی یوں ہوگا مَوْعِدُكُمْ اَنْ یُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى، تمہارا وعدہ یعنی تمہارے ساتھ وعدے کا وقت یہ ہے کہ جمع کیا جائے لوگوں کو چاشت کے وقت، یَوْمُ الزِّیْنَةِ ساتھ آگیا کہ جشن کے دن، تو چاشت کے وقت اور جشن کے دن، یہ وعدے کا وقت متعین ہوگیا، دن بھی متعین ہوگیا اور وقت بھی متعین ہوگیا، کہ جس دن تم جشن منایا کرتے ہو، میلہ لگایا کرتے ہو، وہ دن، اور چاشت کے وقت مقابلے کے لئے اکٹھے ہوجائیں گے۔ ''یہ کہ جمع کیا جائے لوگوں کو چاشت کے وقت'' چاشت کا وقت یہ ہوتا ہے کہ جب سورج ادھر سے اتنا اُونچا ہوجائے جتنا شام کو عصر کے وقت اُونچا ہوتا ہے۔ فَتَوَلّٰى فِرْعَوْنُ: فرعون نے پیٹھ پھیری، یعنی پیٹھ پھیر کے چلا گیا، فَجَمَعَ كَیْدَهٗ: پھر اس نے اپنی تدبیر جمع کی ثُمَّ اَتٰى: پھر اپنی تدبیر جمع کرکے مقابلے میں آگیا، اب ''کید'' کا مصداق یہاں یہ ہے کہ اپنے جادوگروں کو اکٹھا کرکے لے آیا تھا، ''اپنی تدبیر اس نے جب جمع کی'' تو تدبیر کے جمع کرنے سے جادوگروں کو اکٹھا کرنا مراد ہے، جیسے کہ تفصیل آپ کے سامنے دوسری سورتوں میں بھی آئے گی، تو اپنی تدبیر مکمل کرکے وہ مقابلے میں آگیا، اور تدبیر کیا تھی؟ کہ جادوگر اکٹھے کرلیے، جب وہ جادوگر اکٹھے ہوکر آگئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان جادوگروں کو تبلیغ کی تو اگلے الفاظ جادوگروں کو تبلیغ کے متعلق ہیں، قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰى: ''ھم'' ضمیر جادوگروں کی طرف لوٹے گی جو کہ ''کید'' کا مصداق ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے ان جادوگروں سے کہا: وَیْلَكُمْ: تمہاری خرابی، تمہارا ستیاناس ہوجائے، کمبختی مارو! جس طرح سے ہم اپنی زبان میں ایک محاورہ استعمال کیا کرتے ہیں ''بدبختو!'' لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا: اللہ کے اُوپر جھوٹی بات نہ گھڑو، کیا مطلب؟ کہ میرے معجزے کو جھوٹ بول کے جادو نہ کہنا، یا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک قرار دے کے فرعون کو رَب

مان کر اللہ کے اُو پر اِفترا نہ کرو، فَيُسۡحِتَكُمۡ بِعَذَابٍ: پھر وہ ختم کردے گا تمہیں عذاب کے ساتھ، وَقَدۡ خَابَ مَنِ افۡتَرٰى: تحقیق نامراد ہوا وہ شخص جس نے جھوٹ گھڑا۔ خاب: نامراد ہونا۔ یہ فاز کے مقابلے میں آیا کرتا ہے۔ فاز: کامیاب ہونا۔ ''جو جھوٹ گھڑے وہ نامراد ہوا'' فَتَنَازَعُوۡۤا اَمۡرَهُمۡ بَيۡنَهُمۡ: پھر ان جادوگروں نے اپنے معاملے میں جھگڑا کیا، یعنی موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جو مقابلے کا معاملہ درپیش تھا اس میں تبادلۂ خیالات کیا، کوئی کچھ بولا، کوئی کچھ بولا۔ تنازع فی الامر سے مراد ہوتا ہے کسی امر پر بحث کرنا تا کہ اس میں ایک لائحہ عمل متعین ہو جائے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ ''انہوں نے آپس میں اپنے اُمر میں جھگڑا کیا، بحث مباحثہ کیا'' وَاَسَرُّوا النَّجۡوٰى: اور پوشیدہ کیا سرگوشی کو، چپکے سے مشورے کیے، چھپ چھپ کے مشورے کیے، چھپایا انہوں نے سرگوشی کو۔ ''نجویٰ'' کا معنی ہے آپس میں آہستہ آہستہ بات کرنا۔ قَالُوۡۤا: کہنے لگے اِنۡ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ: ساحران کے اُوپر جو لام آیا ہوا ہے وہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اِن نافیہ نہیں بلکہ مخففہ ہے مثقلہ سے، اصل میں تھا: اِنَّ هٰذٰنِ۔ اور اِنَّ کے بعد آپ کے نحوی قاعدے کے مطابق هٰذٰنِ کی بجائے هٰذَيۡنِ ہونا چاہیے کیونکہ ''اِنَّ'' کا اسم منصوب ہوا کرتا ہے لیکن یہاں مرفوع ہے، تو یہاں لکھا ہے کہ کلامِ عرب میں مُثَنّٰی کا اعراب بسا اوقات تینوں حالتوں میں الف کے ساتھ بھی ہوتا ہے، یہاں اِنۡ هٰذٰنِ اسی لغت کے اعتبار سے ہے، اس کی ایک ہی حالت ہے رفعی نصبی جری جو بھی ہو، رفعی حالت ہو تو بھی هٰذٰنِ، نصبی حالت ہو تو بھی هٰذٰنِ، یہ بھی ایک لغت ہے عرب میں، یہاں اِعراب اس کے مطابق ہے، یہ قراءت اس کے مطابق ہے (جلالین)، بے شک یہ دونوں البتہ جادوگر ہیں، هٰذٰنِ کا اشارہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کی طرف ہے، يُرِيۡدٰنِ اَنۡ يُّخۡرِجٰكُمۡ: ارادہ کرتے ہیں یہ دونوں کہ نکال دیں تمہیں مِّنۡ اَرۡضِكُمۡ: تمہارے علاقے سے، تمہارے ملک سے بِسِحۡرِهِمَا اپنے جادو کے زور سے، وَيَذۡهَبَا بِطَرِيۡقَتِكُمُ الۡمُثۡلٰى، ذھب: جانا۔ اور بطریقۃ میں باء جو آ گئی تعدیہ کی، تو لے جانے کا معنی ہو گیا۔ ''اور لے جائیں تمہارے اچھے طریقے کو۔'' مثلیٰ یہ اَمۡثَل کی مؤنث ہے، عمدہ اور بہترین۔ یعنی تمہارا طور طریقہ، تمہارا طرزِ زندگی، تمہاری تہذیب، تمہارا تمدن جو بہترین ہے یہ اس کو ختم کرنا چاہتے ہیں، ملک کو اُجاڑنا چاہتے ہیں اور تمہارے تمدن کو برباد کرنا چاہتے ہیں، ''لے جائیں تمہارے اچھے طریقے کو'' فَاَجۡمِعُوۡا كَيۡدَكُمۡ: پس تم اکٹھی کرو، پختہ کرو اپنی تدبیر، پس تم پختہ کرو اپنی تدبیر، ثُمَّ ائۡتُوۡا صَفًّا پھر آ ؤ تم قطاریں باندھ کر، ائۡتُوۡا امر کا صیغہ ہے، اور صَفًّا مُصۡطَفِّيۡنَ کے معنی میں ہو کر حال واقع ہو جائے گا۔ وَقَدۡ اَفۡلَحَ الۡيَوۡمَ مَنِ اسۡتَعۡلٰى تحقیق کامیاب ہو گیا آج وہ شخص جو غالب آ گیا، آج جو غالب آ گیا اصل کامیاب وہی ہے۔ قَالُوۡا يٰمُوۡسٰۤى: جادوگروں نے کہا کہ اے موسیٰ! اِمَّاۤ اَنۡ تُلۡقِىَ: یا تو تو ڈال۔ تُلۡقِيَ اِلقاء سے ہے، یا تو یہ بات ہونی چاہیے کہ تُو ڈالے۔ وَاِمَّاۤ اَنۡ نَّكُوۡنَ اَوَّلَ مَنۡ اَلۡقٰى: یا ہم ہو جائیں اوّل وہ شخص جو ڈالے۔ اَلۡقٰى کا مفعول محذوف ہے کیونکہ ان کو پتا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام عصا ڈالا کرتے ہیں جو کہ سانپ بن جاتا ہے، اور وہ بھی مقابلہ کرنے کے لئے اسی طرح سے لاٹھیاں اور رسیاں لے کر آئے تھے، تو ڈالنے کا مفعول وہی ہے کہ تُو چیز ڈالتا ہے کرتب دِکھانے کے لئے یا ہم ڈالیں؟ ''یا تُو ڈالے یا ہم ہو جائیں پہلے وہ شخص جو ڈالے، پہلے ڈالنے والے' مَن چونکہ لفظوں میں مفرد ہے، اس لیے القیٰ کی ضمیر مفرد لوٹی۔ قَالَ بَلۡ اَلۡقُوۡا: موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ بلکہ تم ہی ڈالو، فَاِذَا حِبَالُهُمۡ وَعِصِيُّهُمۡ: حبال حبل کی جمع ہے، حبل رَسّی کو کہتے ہیں۔ عِصِيّ یہ عصا کی جمع ہے، عصا لاٹھی کو کہتے ہیں۔ پس اچانک ان کی رسیاں اور ان کی لاٹھیاں يُخَيَّلُ اِلَيۡهِ: موسیٰ علیہ السلام کے خیال میں ڈالی جاتی تھیں

مِنْ سِحْرِهِمْ: ان جادوگروں کے جادو کی وجہ سے خیال میں ڈالی جاتی تھیں اَنَّهَا تَسْعٰى: کہ وہ بھاگ رہی ہیں، یُخَیَّلُ اِلَیْهِ: موسیٰ علیہ السلام کے خیال میں ڈالی جاتی تھیں ان کے سحر کے زور سے اَنَّهَا تَسْعٰى: کہ وہ لاٹھیاں اور رسیاں بھاگ رہی ہیں، فَاَوْجَسَ فِیْ نَفْسِهٖ خِیْفَةً مُّوْسٰى: چھپایا اپنے دل میں خوف موسیٰ علیہ السلام نے۔ قُلْنَا لَا تَخَفْ: ہم نے کہا کہ تُو خوف نہ کر اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى: تُو ہی غالب آنے والا ہے وَاَلْقِ مَا فِیْ یَمِیْنِكَ: ڈال دے اس چیز کو جو تیرے دائیں ہاتھ میں ہے، تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا: نگل جائے گی یہ اس کو جو انہوں نے بنایا، مَا صَنَعُوْا جو کچھ انہوں نے بنایا ہے اس کو یہ چیز نگل جائے گی جو تیرے ہاتھ میں ہے اِنَّمَا صَنَعُوْا كَیْدُ سٰحِرٍ: بے شک جو چیز انہوں نے بنائی ہے یہ جادوگر کا مکر ہے، یہ جادوگر کی تدبیر ہے، اِنَّمَا میں ''ما'' موصولہ ہے۔ بے شک جو چیز انہوں نے کی ہے یہ جادوگر کی خفیہ تدبیر ہے۔ وَلَا یُفْلِحُ السّٰحِرُ حَیْثُ اَتٰى: اور ساحر کامیاب نہیں ہوگا جہاں بھی آئے ''جہاں بھی آئے'' یعنی نبی کے مقابلے میں، معجزات کا معارضہ کرنے کے لیے، جہاں بھی مقابلے میں آئے گا کامیاب نہیں ہوگا۔ فَاُلْقِیَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا: پس ڈال دیے گئے جادوگر سجدے میں، السَّحَرَةُ ساحر کی جمع۔ سُجَّدًا ساجد کی جمع۔ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى کہنے لگے کہ ہم ایمان لے آئے ہارون اور موسیٰ کے رَبّ پر، قَالَ: فرعون نے کہا، اٰمَنْتُمْ لَهٗ تم ایمان لے آئے اس موسیٰ کے لئے قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ قبل اس کے کہ میں تمہیں اجازت دوں؟ اٰذَنَ یہ متکلم کا صیغہ ہے اٰذِنَ یَاْذَنُ سے، ''اَن'' کی وجہ سے آخر میں نصب آ گیا۔ اِنَّهٗ لَكَبِیْرُكُمْ بے شک یہ موسیٰ تمہارا بڑا ہے، تمہارا وڈیرا ہے، الَّذِیْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ: جس نے تمہیں جادو سکھایا، فَلَاُقَطِّعَنَّ اَیْدِیَكُمْ پس البتہ ضرور کاٹوں گا میں تمہارے ہاتھوں کو وَاَرْجُلَكُمْ: اور تمہارے پاؤں کو۔ اَرْجُل رِجل کی جمع ہے، مِنْ خِلَافٍ: مختلف جانب سے یعنی ایک طرف کا ہاتھ اور دوسری طرف کا پاؤں، وَّلَاُصَلِّبَنَّكُمْ: اور البتہ ضرور سُولی دُوں گا میں تمہیں، فِیْ جُذُوْعِ النَّخْلِ: کھجور کے تنوں پر۔ یہ ''فی'' بمعنی ''علیٰ'' ہے، جیسا کہ ''شرح مائۃ عامل'' میں آپ نے پڑھا تھا کہ ''فی'' کبھی ''علیٰ'' کے معنی میں ہوتی ہے، تو یہاں وہی ''علیٰ'' کا معنی ہے کہ میں کھجور کے تنوں پر تمہیں سُولی دُوں گا، لٹکاؤں گا۔ وَلَتَعْلَمُنَّ اور البتہ ضرور جان لوگے تم اَیُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا وَّاَبْقٰى: کہ ہم میں سے کون زیادہ سخت ہے از روئے عذاب کے، اور کون زیادہ باقی رہنے والا ہے۔ اَیُّنَآ سے مراد یہ ہے کہ میں یا ربِّ موسیٰ، جس سے ڈر کے تم مان گئے ہو۔ قَالُوْا: وہ جادوگر کہنے لگے لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا: نُؤْثِرَ ایثار سے ہے۔ ہرگز نہیں ترجیح دیں گے ہم تجھے اس چیز پر جو آ گئی ہمارے پاس بینات سے، مِنَ الْبَیِّنٰتِ یہ مَا کا بیان ہے، جو واضح دلائل ہمارے پاس آ گئے ہم ان پر تجھے ترجیح ہرگز نہیں دیں گے۔ وَالَّذِیْ فَطَرَنَا، واؤ کو اگر عاطفہ بنائیں تو مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ پر عطف ہے، اور یہ علیٰ کا مجرور ہے۔ ہرگز نہیں ترجیح دیں گے ہم تجھے ان دلائل پر جو ہمارے پاس آ گئے، اور اس ذات پر جس نے ہمیں پیدا کیا، یعنی اب اللہ کے مقابلے میں ہم تجھے ترجیح دے دیں، تجھے مانیں اللہ کو نہ مانیں، ایسا نہیں ہوگا۔ وَالَّذِیْ فَطَرَنَا: ہرگز نہیں ترجیح دیں گے ہم تجھے اس پر جس نے ہمیں پیدا کیا، پھر معنی یوں ہو گیا، دلائل کے مقابلے میں بھی تجھے ترجیح نہیں دیں گے، اور اس ذات کے مقابلے میں بھی تجھے ترجیح نہیں دیں گے۔ اور وَالَّذِیْ کے اندر واؤ قسمیہ بھی ہوسکتی ہے، پھر معنی یہ ہو جائے گا ''قسم اس ذات کی جس نے ہمیں پیدا کیا، ہم ہرگز تجھے ترجیح نہیں دیں گے ان دلائل کے مقابلے میں جو ہمارے پاس آ گئے'' فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ: قَاضٍ اصل میں تھا قاضِی، اور ''ما'' موصولہ ہے، تو اس کی طرف جو ضمیر لوٹ رہی ہے وہ محذوف ہے، فاقض ما انت قاضیه (مظہری)، کر گزر تُو جو کچھ کرنا چاہتا ہے، تُو جو کچھ

کرنے والا ہے کرگزر، کرتُو اس چیز کو جو تُو کرنے والا ہے، مطلب یہ ہے کہ جو تجھ سے ہوسکتا ہے تُو کرلے، قسم اس ذات کی جس نے ہمیں پیدا کیا، ہم تجھے ترجیح نہیں دے سکتے ان دلائل کے مقابلے میں، جو تُو کرسکتا ہے کرلے، فیصلہ کر تُو وہ جو تُو فیصلہ کرنے والا ہے۔ اِنَّمَا تَقْضِیْ هٰذِهِ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا: اس کے سوا کچھ نہیں کہ تُو کرسکتا ہے اسی دُنیوی زندگی میں، اِنَّاۤ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا: بے شک ہم اپنے رَبّ پہ ایمان لے آئے، لِیَغْفِرَ لَنَا خَطٰیٰنَا، تاکہ وہ ہمارے گناہوں کو بخش دے، وَمَاۤ اَكْرَهْتَنَا عَلَیْهِ مِنَ السِّحْرِ: مِنَ السِّحْرِ یہ "ما" کا بیان ہے، اَكْرَهَ کا معنی ہوتا ہے کسی کو مجبور کرنا۔ اور تاکہ بخش دے ہمیں وہ جادو جس پر کہ تُو نے ہمیں مجبور کیا، جس جادو کرنے پر تُو نے ہمیں مجبور کیا تھا یہ بھی ہمارا جرم ہے جو تیرے مجبور کرنے سے ہم نے کیا، ہم اللہ پہ ایمان لائے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ ہمارا یہ جرم بھی معاف کردے۔ وَاللّٰهُ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی: اللہ بہتر ہے اور زیادہ باقی رہنے والا ہے۔ یہ جواب ہے اس بات کا کہ اَیُّنَاۤ اَشَدُّ عَذَابًا وَّاَبْقٰی۔ "ہر لحاظ سے اللہ بہتر ہے اور اسی کا عذاب اور ثواب زیادہ باقی رہنے والا ہے" اِنَّهٗ مَنْ یَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا: "ہٗ" ضمیر شان ہے۔ بے شک بات یہ ہے کہ جو کوئی اپنے رَبّ کے پاس آئے گا مجرم ہونے کی حالت میں، فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ: پس اس کے لئے جہنّم ہے لَا یَمُوْتُ فِیْهَا وَلَا یَحْیٰی: نہ اس میں مرے گا نہ زندہ رہے گا، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کی زندگی بدتر ہوگی، نہ تو اس کو زندہ کہہ سکتے ہیں کہ زندوں والی راحت کوئی نہیں، نہ ان کو مرا ہوا ہی کہہ سکتے ہیں کیونکہ حقیقت میں وہ بے جان نہیں ہے، یعنی وہ زندگی تو ہوگی لیکن موت سے بدتر، نہ وہ اپنے آپ کو زندہ سمجھے گا نہ مرا ہوا سمجھے گا، "نہ اس میں مرے گا نہ زندہ رہے گا" یعنی اس کی زندگی موت سے بدتر ہوگی، یہ اس کی تعبیر ہے۔ وَمَنْ یَّاْتِهٖ مُؤْمِنًا: اور جو کوئی اپنے رَبّ کے پاس آئے گا مؤمن ہونے کی حالت میں قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ: جس نے کہ نیک عمل بھی کیے ہوں گے فَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰی: پس ان کے لئے بلند درجے ہیں۔ قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ: ہر جگہ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جو آیا کرتا ہے اس میں اس بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ آخرت میں نجات کے لئے صرف عقیدہ کافی نہیں، بلکہ نیک اعمال بھی ضروری ہیں۔ اگر کسی شخص کا عقیدہ صحیح ہے اور نیک اعمال نہیں تو اس کے لئے نجات کا وعدہ نہیں، وہ عذاب میں مبتلا ہوگا، سزا پائے گا، پھر آخرکار کہیں اللہ تعالیٰ اس کو مدّتِ مدید کے بعد معاف کردے گا، اگر کوئی نجات اِبتدائی چاہتا ہے کہ میں عذاب میں مبتلا ہی نہ ہوں، اور اِبتداءً بچ جاؤں تو پھر عملِ صالح اس کے ساتھ شرط ہے، باقی! اللہ تعالیٰ اپنی مہربانی کے ساتھ کسی کو بغیر عمل کے معاف کردے یہ اس کا اپنا کام ہے، وہ ضابطہ نہیں ہے۔ ضابطہ یہی ہے کہ ایمان لانے کے ساتھ ساتھ نیک عمل کی پابندی کروگے تب جاکے نجات ہوگی۔ باقی! اہلِ سُنّت والجماعت کی تحقیق یہی ہے کہ اگر عقیدہ صحیح ہوا اور نیک اعمال نہ ہوئے تو وہ دائمی جہنّمی نہیں، باقی! کروڑہا سال، اربہا سال پڑا رہے ایسا ہوسکتا ہے، آخرکار نجات ہوجائے گی۔ تو اگر آپ اِبتداءً نجات کی ضمانت لینا چاہتے ہیں تو اس کے لیے عملِ صالح شرط ہے۔ جَنّٰتُ عَدْنٍ: یہ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰی کا بیان ہے۔ ان کے لیے بلند درجے ہیں، ہمیشگی کے باغات، جاری ہوں گی ان کے نیچے سے نہریں، ہمیشہ رہنے والے ہوں گے ان میں۔ وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا مَنْ تَزَكّٰی: یہ بدلہ ہے اس شخص کا جو کہ صاف ستھرا بنے، جو کفر و شرک کی آلودگیوں سے، فسق و فجور کی آلودگیوں سے اپنے آپ کو صاف کرلے، جو صاف ستھرا ہو اس کا بدلہ یہی ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَیْكَ

تفسیر

فرعون کی سیاسی چالیں

واقعہ وہی چلا آ رہا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا۔ بات یہاں تک پہنچی تھی کہ موسیٰ علیہ السلام نے جا کر فرعون کو دعوت دی، ایمان لانے کے لئے بھی کہا جیسے قرآنِ کریم کی دوسری آیات میں مذکور ہے، اور ساتھ ہی بنی اسرائیل کو آزاد کرنے کے لئے بھی کہا کہ ان کو عذاب سے نجات دے دے، اپنی غلامی سے ان کو چھوڑ دے۔ اب فرعون کے سامنے جب یہ بات گئی، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے معجزات کا اظہار کیا، جیسے پیچھے کہا تھا میں دلیل بھی لے کر آیا ہوں، بلا دلیل نہیں، تو فرعون نے پوچھا تھا کہ کیا دلیل ہے؟ تو انہوں نے یہی عصا کا سانپ بنا کر دکھایا کہ عصا ڈالا، تو وہ سانپ بن گیا، اور ہاتھ بغل میں دے کر کھینچا تو یدِ بیضاء ہو گیا، چمک دار ہو کے نکل آیا، یہ نشانیاں بھی دیکھ لیں، وہ وقت ایسا تھا کہ جس میں جادوگروں کی بہت بہتات تھی اور لوگ جادو کا مشغلہ بہت رکھتے تھے، اب فرعون یا تو اتنی سی عقل کا مالک تھا کہ جادو میں اور معجزے میں فرق نہیں کر سکا، اس لیے اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس دلیل کو کمزور کرنے کے لئے اس کو جادو کا ایک کرتب قرار دیا، کہ تم جو کچھ کر رہے ہو تو ہمارے ملک میں ایسے جادوگر ہیں جو اس قسم کی چیزیں کرتے رہتے ہیں، یہ تو کوئی ایسی بات نہیں ہے، تو یا تو وہ سمجھ نہیں سکا، یا سمجھ گیا ہو تو اب اس کے بغیر اس کے پاس چارہ کوئی نہیں تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کی حیثیت کو خراب کرنے کے لئے ان کو جادوگر قرار دے دے، بہر حال اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس دعوت کو ایک سیاسی رنگ دے دیا۔ سیاسی رنگ اس طرح سے کہ پہلے اس قسم کے تذکرے تو ان کے دربار میں ہوتے ہی تھے کہ اسرائیلی زور پکڑتے جا رہے ہیں، ان کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی وقت یہ حکومت کا تختہ اُلٹ دیں، اپنی حکومت کے تحفظ کے لئے ہی تو انہوں نے قتلِ اَبناء کی سکیم جاری کی تھی کہ لڑکوں کو مارنا شروع کر دو۔

افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

چونکہ اس زمانے میں برتھ کنٹرول کی گولیاں تو ابھی نکلی نہیں تھیں، ورنہ وہ کھلانی شروع کر دیتے، کسی قوم کی طاقت کو کمزور کرنے کے لئے تو کہتے کہ برتھ کنٹرول کرو، نس بندی کرواؤ، زبردستی نس بندی شروع کر دیتے تا کہ اسرائیلیوں کی اولاد نہ ہو، برتھ کنٹرول کی ترغیب دیتے۔ یا ہمارے اکبر الٰہ آبادی کے کہنے کی طرح اس وقت اس کو کالج کھولنے کی نہیں سوجھی، ورنہ تعلیم ہی ایسی جاری کر دیتا کہ بچے اسرائیلیوں کے ہوتے اور دل اور دماغ کے اعتبار سے وہ فرعونی ہوتے، اور ان کا دماغ ہی غلامی کا بن جاتا۔ جیسے انگریز نے یہاں ہندوستان میں کیا، کہ تعلیم ایسی جاری کر دی کہ جو کالجوں میں پڑھ گیا، پڑھنے کے بعد وہ رنگ اور رُوپ کے اعتبار سے اگرچہ ہندوستانی رہا لیکن اپنے دل دماغ کے اعتبار سے انگریز ہی بنا۔ تو کالجوں کی یہی حیثیت دیکھ کے کہ کالجوں سے پیدا ہونے والی نسل کس طرح سے انگریز کی حامی ہے اور انگریز کے ٹوڈی ہیں اور ان کے فرمانبردار ہیں، ان کی ملازمت کو اور ان کی

غلامی کو کس طرح سے اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتے ہیں، تو اکبر الٰہ آبادی جو خود بھی ایک جج تھا، تعلیم یافتہ تھا، اس نے بڑی پیاری چوٹ کی، کہتا ہے کہ:

یوں قتل سے وہ بچّوں کے بدنام نہ ہوتا   افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی!

کہ اگر فرعون کو بھی یہ طریقہ سمجھ میں آ جاتا کہ کالج کھول لے اور آنے والی نسل کو وہ اپنا ہم مسلک بنا لے، تو وہ بچّوں کو قتل کر کے بدنام نہ ہوتا۔

بہرحال یہ چرچا تو ان میں رہتا تھا کہ یہ پرائی قوم ہے، بیرونی قوم ہے، جو قوت پکڑتی جا رہی ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ تختہ اُلٹ دے اور حکومت کے اوپر قبضہ کر لے، یہ ان کے اندر دہشت تو رہتی تھی، ہر وقت ڈرتے تھے، اب جب موسیٰ علیہ السلام نے اس قسم کی بات کی اور یہ تو معلوم تھا کہ یہ ہیں اسرائیلیوں میں سے ہی، اور ان کی ہمدردیاں اسرائیلیوں کے ساتھ پہلے وہ دیکھے بیٹھے تھے، اب فرعون کا دل دھڑک گیا کہ پہلے تو وہ قوم منتشر تھی، ان کے پاس کوئی ایسا راہنما، ایسا قائد اور ایسا ہادی نہیں تھا جو ان کو منظم کر کے مقابلے میں آ جائے، اب موسیٰ علیہ السلام آ گئے ہیں تو قوم کی قیادت یہ کریں گے، اور جب یہ قوم کی آزادی کا نعرہ لگائیں گے تو قوم ساری ان کے پیچھے ہو جائے گی، اور تختہ اُلٹ کے رکھ دیں گے۔ تو اب اپنی قوم کو برانگیختہ کرنے کے لئے کہ وہ لوگ اس سے متاثر نہ ہوں، اس نے یہ شوشہ چھوڑ دیا کہ میں تمہارا مطلب سمجھ گیا ہوں، تم اپنے جادو کے زور سے ہماری حکومت کا تختہ اُلٹنا چاہتے ہو، اور ہمیں مُلک سے نکالنا چاہتے ہو۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس کوشش کو اس نے ایک سیاسی تحریک بنا دیا، تاکہ قبطی قوم جو فرعون کی قوم ہے کم از کم وہ مشتعل ہو جائے اور ان کے وعظ و تبلیغ سے متاثر ہو کر یہ نہ اس کے پیچھے لگ جائے۔

مقابلے کا طے ہونا اور فرعون کا تیاری کرنا

تو اس کو سیاسی تحریک کا رنگ دے دیا کہ تم اپنے جادو کے زور سے ہمیں نکالنا چاہتے ہو۔ باقی! اس قسم کے جادو سے ہم ڈرنے والے نہیں ہیں، ہم تیرے مقابلے میں اس قسم کا جادو لا سکتے ہیں، تُو ہم سے مقابلے کا وعدہ کر لے، ایک جگہ متعین کر جو بالکل صاف ستھرا میدان ہو، اس میں کوئی کسی قسم کی رکاوٹ نہ ہو، اور درمیانی سی جگہ ہو جہاں ہر کسی کے لئے پہنچنا آسان ہو، وعدہ متعین کر لے، اور پھر تُو بھی اس کے خلاف نہ کرنا، ہم بھی خلاف نہیں کریں گے، میدان میں مقابلہ کر کے دیکھ لیتے ہیں، کون کامیاب ہوتا ہے؟ اور ہمارے پاس ایسے بڑے بڑے جادوگر ہیں جو تجھے ہرا دیں گے، اور تیری یہ دلیل ختم ہو جائے گی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تو چونکہ اعتماد تھا کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں یہ جادو نہیں، اس لیے آپ نے بلا جھجک کہا کہ بالکل ٹھیک، مقابلہ اسی دِن ہی ہوگا جو میلے کا دِن ہے، اور چاشت کے وقت میں مقابلہ ہوگا جس وقت کہ لوگ اکٹھے ہوتے ہیں، اس دِن ذرا اہتمام سے لوگوں کو اکٹھا کر لینا، تاکہ سارے لوگ مقابلہ دیکھ لیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مقابلے کا دِن بھی متعین کر دیا اور وقت بھی متعین کر دیا۔ جب مقابلے کا دِن اور وقت متعین ہو گیا تو پھر فرعون نے سارے مُلک کے اندر اپنے آدمی دوڑائے، بڑے بڑے گھاگ قسم کے جادوگر سارے کے

سارے اکھٹے کر لئے، اکھٹے کر کے ان کے سامنے یہ صورت پیش کی ہوگی، یہ ایسی بات نہیں ہوتی کہ ایک ہی مجلس میں ایک ہی منٹ میں ہوگئی، اکٹھے کرنے میں وقت لگا، اور وہ سارے شہر میں جمع ہوتے چلے گئے۔ جیسے یہاں کہروڑپکا میں مقابلہ ہو، کوئی تاریخ متعین کی ہوئی ہو، تو ملتان سے پہنچنا شروع ہو جائیں گے، دُور سے دُور سے لوگ پہلے سے آنا شروع ہو جاتے ہیں، تو لوگ اکٹھے ہوتے چلے گئے، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام چونکہ اسی شہر میں رہتے تھے، اور مختلف مجلسوں کے اندر وعظ کرتے تھے، اب جب جادوگروں کے سامنے یہ بات آئی کہ ایک عجیب قسم کا جادوگر آیا ہوا ہے جس کا مقابلہ کرنا ہے، تو آپ جانتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کے حالات جاننے کا شوق ان کے دل میں خود پیدا ہوگا، جہاں موسیٰ علیہ السلام کی وعظ ہوتی ہوگی وہیں پہنچ جاتے ہوں گے، کہ دیکھیں تو سہی یہ کہتا کیا ہے، اور کرتا کیا ہے۔ جب مقابلہ کرنا ہوتا ہے تو اپنے مدمقابل کے حالات کو انسان جانچتا ہے کہ نہیں جانچتا؟ اس لیے موسیٰ علیہ السلام سے گفتگو اور ان کے وعظ میں شمولیت یہ جادوگر کرتے رہے، حالات جانچنے کے لیے کہ جس کے مقابلے میں ہم آرہے ہیں یہ کیا چیز ہے؟ تو یہ ساری کی ساری باتیں سنتے رہے، جب وہ سارے کے سارے اکھٹے ہوگئے اور مقابلے کا دِن قریب آگیا، تو پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اجتماعی طور پر جادوگروں کو خطاب کیا، اور ان کو اجتماعی طور پر خطاب کر کے کہا کہ دیکھو! فرعون کے لئے تم اپنی آخرت برباد نہ کرو، بات صحیح صحیح کرنا، یہ نہ ہو کہ میں اللہ کی طرف سے حاصل شدہ معجزہ دکھاؤں اور تم جھوٹ بول کے اس کو جادو کہہ دو، اور قوم کو مغالطہ دے دو، یا تم سمجھ گئے ہو اور سمجھتے ہو کہ فرعون رَبّ نہیں ہے، اور تم اس کو رَبّ کا شریک قرار دے کر اللہ کے اوپر اِفترا کرو، ایسا نہ کرنا، ورنہ تمہیں اللہ کا کوئی عذاب پکڑ لے گا۔ تو فرعون کے جمع کیے ہوئے جادوگروں کو بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تبلیغ کی، جب تبلیغ کی تو اتنے دِنوں میں ویسے بھی وہ موسیٰ علیہ السلام کے حالات دیکھ رہے تھے، ان کی باتیں سُن رہے تھے، تو ان کے کان میں توحید کا مسئلہ بھی پڑ گیا، رسالت کا مسئلہ بھی پڑ گیا، آخرت کا بھی، عذاب اور ثواب یہ سب باتیں انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے سُن لیں، جس کی بنا پر ان کے دلوں میں کچھ کھٹکا سا تو پیدا ہوا کہ واقعی ان کا مقابلہ نہیں کرنا چاہیے،، ہمیں کیا ضرورت ہے کہ ان کے ساتھ ٹکرائیں، لیکن حکومت کا زور تھا اور حکومت والوں نے انہیں جمع کیا تھا، اب اگر مقابلے میں نہ آتے تو ڈر تھا کہ حکومت پکڑ لے گی، اس لئے وہ کسی درجے میں مجبور ہو کے مقابلے کے لئے تیار ہو گئے۔

نبی اور پیشہ ور آدمی میں فرق

لیکن جب مقابلے کے لئے تیار ہو رہے تھے، تو اس وقت انہوں نے فرعون سے ایک وعدہ بھی لیا تھا، اور یہیں سے پتا چلتا ہے کہ نبی میں اور جادوگر میں کتنا عظیم فرق ہے، کوئی بالکل اندھا نہ ہو جائے تو یہ فرق سمجھنا مشکل نہیں، فرعون سے گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا: اَئِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ، اگر ہم غلبہ پا گئے تو ہمیں کچھ انعام بھی ملے گا؟ تو فرعون نے کہا تھا: نَعَمْ، ہاں! انعام بھی ملے گا وَاِنَّكُمْ اِذًا لَّمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ (سورۂ شعراء: ۴۱،۴۲) اور تم میرے مقرب بن جاؤ گے، میرے درباری ہو جاؤ گے، دربار میں تمہیں کرسی ملے گی۔ یعنی اجر کے اندر مال کی طمع دلائی، اور مقرب بنانے میں جاہ کی طمع دلائی، تو پہلے قدم پر ہی

انہوں نے بتادیا کہ پیشہ ور آدمی کا کام ہوتا ہے پیسے کمانا، تعریف سننا، اور لوگوں سے انعامی سرٹیفکیٹ حاصل کرنے، پیشہ ور لوگوں کا حال یہ ہوا کرتا ہے۔ اور انبیاء علیہم السلام جس وقت آیا کرتے ہیں وہ پہلے کہہ دیا کرتے ہیں وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰي رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (سورۂ شعراء:۱۰۹، وغیرہ) ہم کوئی اُجرت نہیں مانگتے، ہم کوئی انعام کے طالب نہیں ہیں، ہمارا اَجر اللہ کے ذمے ہے۔ بہرحال یہ وعدے لے کر آخر جادوگر مقابلے کے اندر آ گئے۔

میدانِ مقابلہ

تو چونکہ ان کے علم میں آ گیا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام لاٹھی کو سانپ بناتے ہیں، تو کہتے ہیں کہ وہ جادوگر جب مقابلے میں آئے تو موسیٰ علیہ السلام جیسی شکل بنا کے آئے، اپنے طور پر انہوں نے جادو کے اوپر ایک اضافہ کیا کہ موسیٰ علیہ السلام تو صرف لاٹھی ڈالیں گے اور لوگ دیکھیں گے کہ سانپ بن گیا، تو وہ لاٹھیاں بھی لے آئے اور ساتھ رسیاں بھی لے آئے، گویا کہ اپنے طور پر یہ اضافہ کیا کہ جب ہم دو چیزوں کو سانپ بنائیں گے تو لوگ کہیں گے کہ دیکھو! اس نے ایک کو سانپ بنایا، انہوں نے دو کو بنادیا، غلبہ اس طرح سے ظاہر ہوجائے گا، تو یہ اضافہ کر کے لائے۔ جب صف بندی ہوگئی، موسیٰ علیہ السلام بھی آ گئے اور ان کے ساتھ ہارون علیہ السلام بھی ہوں گے، اور فرعون نے جادوگروں کو خوب اچھی طرح سے پکا کرلیا کہ اگر حکومت کا تختہ اُلٹا گیا تو تمہیں بھی کوئی سکون سے اس مُلک میں نہیں نکلنے دے گا، اس لیے جہاں تک ہو سکے ان کو مغلوب کرنے کی کوشش کرو، آج فیصلہ کن مقابلہ ہے، جو آج غالب آ گیا وہی ہمیشہ کے لئے غالب ہے، اس طرح سے فرعون نے ان کو متاثر کیا تھا کہ اگر اس حکومت کا تختہ الٹ گیا تو تم بھی اس ملک میں نہیں رہ سکو گے، پھر تو یہ اسرائیلی غالب آ جائیں گے، تمہیں بھی یہاں سے نکال دیں گے، ہم جائیں گے تو تم بھی ساتھ ہی جاؤ گے، اس لیے اپنے مُلک اور برادری کا تحفظ اسی میں ہے کہ تم مقابلے میں آؤ، اس طرح سے ان کو برانگیختہ کیا، اور پھر تمہاری یہ تہذیب، تمہارا تمدن، تمہارا رہن سہن کتنا عمدہ طریقہ ہے اس وقت مُلک میں جاری ہے، اور اگر یہ لوگ غالب آ گئے تو ہر چیز کو مٹا دیں گے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ فرعون نے ان کے ذہن میں یہ بات ڈالی کہ موسیٰ علیہ السلام کی کامیابی سے تمہارا ملک بھی برباد ہوگا، تمہارا دین بھی برباد ہوگا، یہاں یہ فساد اس طرح سے برپا کردے گا کہ تمہارا تہذیب و تمدن اور دین بھی خراب ہوجائے گا، اپنے آبائی دین سے تمہیں علیحدہ ہونا پڑے گا، اور تمہیں مُلک سے بھی نکال دے گا، یوں برانگیختہ کر کے ان کو مقابلے میں آمادہ کر کے لے آیا۔ اب جس وقت سارے کے سارے جادوگر سامنے کھڑے ہیں، موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام بھی کھڑے ہیں، تو جادوگر پوچھتے ہیں کہ اے موسیٰ! پہلا وار تُو کرے گا یا ہم کریں؟ ''اِلقاء'' کا لفظ اس لیے استعمال کیا کہ موسیٰ علیہ السلام بھی لاٹھی ہاتھ میں لیے کھڑے تھے، ان کو پتا تھا کہ انہوں نے یہی تو پھینکنی ہے، ''آپ پہلے ڈالتے ہیں یا ہم پہلے ڈالنے والوں میں سے ہوجائیں؟'' حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پوری لاپروائی سے جواب دیا کہ تم ہی ڈالو، یہ اس لیے کہہ دیا کہ اس قسم کے مقابلے میں بسا اوقات پہلے وار کو بہت اہمیت حاصل ہوتی ہے، کہ جو شخص پہلا وار کردے بسا اوقات کامیاب وہی ہوجاتا ہے، اور دوسرے کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملتا، تو موسیٰ علیہ السلام یہ دکھانا

چاہتے تھے کہ اگر میں نے پہلا وار کیا تو تم شاید یہ کہہ سکو گے کہ چونکہ انہوں نے پہلے وار کر دیا تھا، اس لیے ہم سنبھل نہ سکے، اس لیے تم اپنے ارمان نکال لو، حسرت نکال لو، خالی میدان میں جو کچھ تم کرنا چاہتے ہو کر لو، میں بعد میں کرلوں گا، تو یہ ایک قسم کا استغناء ہے جو موسیٰ علیہ السلام نے دِکھایا کہ مجھے اس بات کی کوئی پروا نہیں کہ پہلے وار کون کرتا ہے، تم کرلو، خالی میدان میں جو کچھ تم دکھانا چاہتے ہو پہلے دِکھالو، تا کہ بعد میں یہ نہ کہہ سکو کہ چونکہ پہل اس نے کر دی تھی اس لیے یوں ہو گیا، تو یہ موقع بھی نہیں دیا۔ تو موسیٰ علیہ السلام نے جب ان سے کہا تو انہوں نے اپنے پروگرام کے مطابق لاٹھیاں بھی میدان میں پھینک دیں اور رسیاں بھی میدان میں پھینک دیں، جب لاٹھیاں اور رسیاں میدان میں پھینکیں تو اس وقت انہوں نے جادو اس طرح سے چلایا لوگوں کی آنکھوں پر اور لوگوں کے دل دماغ پر، یہی ہوتی ہے جادو کی خاصیت کہ چیز تو ویسی ہی ہوتی ہے، لیکن دل دماغ کو اور آنکھوں کو ایسا متاثر کیا کہ سارے کا سارا مجمع بمع موسیٰ علیہ السلام کے دیکھ رہا تھا کہ لاٹھیاں بھی سانپوں کی طرح بھاگی پھر رہی ہیں اور رسیاں بھی سانپوں کی طرح بھاگی پھر رہی ہیں۔ اب جس وقت یہ واقعہ سامنے آیا تو موسیٰ علیہ السلام تو دِل میں ڈر گئے، ڈرنا ان سانپوں سے نہیں تھا، وہ جو رسیاں اور لاٹھیاں سانپ بنی تھیں موسیٰ علیہ السلام اس سے نہیں ڈرے، ڈر تو یہ ہو گیا کہ میں نے بھی تو یہی دِکھانا ہے کہ لاٹھی پھینکوں گا تو لوگ دیکھیں گے کہ وہ بھی سانپ بن گئی، اب لوگ فرق کس طرح سے کریں گے کہ یہ جادو ہے یا معجزہ؟ بظاہر دیکھنے میں تو دونوں باتیں ایک جیسی ہو گئیں، یہ تو بڑا کام خراب ہوا، اس طرح سے دِل کے اندر اندیشہ سا پیدا ہوا کہ عوام کے سامنے تو معاملہ خلط ہو جائے گا، وہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ سانپ بن گئیں اور میں لاٹھی پھینکوں گا تو وہ بھی سانپ بن جائے گی، تو لوگ فرق کس طرح سے کریں گے، کہ جادو کیا ہے اور معجزہ کیا ہے؟ یہ اندیشہ تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دِل میں آیا کہ یہ تو حق اور باطل پھر خلط ملط ہو جائے گا، تو اللہ تعالیٰ نے فوراً موسیٰ علیہ السلام کو تسلی دی کہ فکر نہ کر، ڈرنے کی بات نہیں ہے، تو ڈال دے جو کچھ تیرے ہاتھ میں ہے، یہ جو کچھ انہوں نے بنایا ہے سب کو نگل جائے گا، تو موسیٰ علیہ السلام نے جس وقت اپنے عصا کو پھینکا، تو منہ تو اس کا اس طرح سے تھا ہی، سانپ بنتے ہی اس نے منہ جو کھولا تو جتنی رسیاں جتنی لکڑیاں، جو کچھ انہوں نے پھینکا تھا سب کو نگلنا شروع کر دیا اور میدان کو صاف کر دیا۔

جادوگروں کا اِعترافِ شکست اور قبولِ ایمان

جب میدان کو صاف کر دیا، تو بات یہ ہے کہ عوام جو کسی فن کو جاننے والے نہیں ہوتے، ان کو کسی مسئلے میں اِشتباہ ہو سکتا ہے کہ یہ مسئلہ کس فن کا ہے؟ لیکن صاحبِ فن کو اِشتباہ نہیں ہوتا، اب مثال کے طور پر میں ایک صیغہ بیان کر رہا ہوں تو آپ فوراً سمجھ جائیں گے کہ یہ ''صرف'' کا مسئلہ ہے، پھر میں ایک ترکیب بتا رہا ہوں کہ یہ منصوب ہے یہ مرفوع ہے، تو آپ فوراً سمجھ جائیں گے کہ یہ ''نحو'' کا مسئلہ ہے، لیکن اگر کوئی جاٹ کاشت کار ہل چلانے والا سامنے بیٹھا ہوا ہو، جس کو پتا ہی نہیں کہ ''صرف'' کیا ہوتی ہے؟ اور ''نحو'' کیا ہوتی ہے؟ وہ نہیں سمجھ سکے گا، کہ اب یہ مسئلہ ''صرف'' کا بیان ہو رہا ہے، اب یہ مسئلہ ''نحو'' کا بیان ہو رہا ہے، اب یہ مسئلہ ''فقہ'' کا بیان ہو رہا ہے، اب یہ مسئلہ ''حدیث'' کا بیان ہو رہا ہے، اس بات کا تعلق ''فنِ تفسیر'' کے ساتھ ہے، وہ نہیں سمجھ سکے گا۔

اس لیے اب عوام سمجھ سکے یا نہیں سمجھ سکے، جادوگر سمجھ گئے کہ موسیٰ علیہ السلام نے جو کچھ کیا ہے یہ جادو نہیں ہے، جادو تو وہ ہے جو ہم نے کیا ہے، وہ تو ہے کسی اُصول کے تحت، اور موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ سے جو کچھ ظاہر ہوا یہ جادو نہیں ہے، چونکہ وہ صاحب فن تھے، وہ جانتے تھے کہ اس فن کے ساتھ کیا ہو سکتا ہے اور کیا نہیں ہو سکتا، تو ان کے اوپر رُعب پڑ گیا اور فوراً سجدے میں گر گئے، سجدے میں گرنا یہ موسیٰ علیہ السلام کی برتری کا اعتراف ہے، اس زمانے کے لحاظ سے جو شخص شکست کھا جاتا اور دوسرے کی برتری تسلیم کر لیتا تھا تو اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتا تھا، تو انہوں نے سجدہ کیا، سجدہ کر کے اپنی شکست کا زبان سے بھی اعتراف کیا کہ موسیٰ علیہ السلام صحیح کہتے ہیں، اور ان کی یہ دلیل اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ واقعی یہ اللہ کے رسول ہیں، اور جتنی باتیں ہم نے ان سے بطور دعوے کے سنی ہیں کہ اللہ ایک ہے، اس کے ساتھ رُبوبیت میں کوئی شریک نہیں، آخرت آنے والی ہے، ہم ان سب باتوں پر ایمان لاتے ہیں، موسیٰ علیہ السلام کی باتیں صحیح ہیں، تو موسیٰ علیہ السلام کے سامنے شکست کھانے کے بعد انہوں نے فوراً اپنے ایمان کا اظہار کر دیا، جیسے میں نے عرض کیا کہ شہر میں آنے کے بعد حالات معلوم کرنے کے لئے وہ موسیٰ علیہ السلام کی باتیں بھی سنتے تھے اور واقعات بھی سنتے تھے، اس لیے یہ باتیں ان کے علم میں آئی ہوئی تھیں اور ان سب کے حق ہونے کا انہوں نے اقرار کر لیا۔

فرعون کی جادوگروں کو دھمکی

اب اندازہ کیجئے! کہ فیصلہ کن مقابلہ تھا، سارے ملک کے لوگ جمع ہیں، میلے کا دِن ہے، عوام بھی خواص بھی سارے جمع ہیں، فرعون بھی موجود ہے، اور اس کی موجودگی میں اس کی لائی ہوئی فوج شکست کھا گئی، اس سے زیادہ تکلیف دہ بات فرعون کے لئے اور کیا ہو سکتی تھی! لیکن وہ بھی آخر وقت کا فرعون تھا، بادشاہوں کا دماغ بھی بادشاہوں جیسا ہوتا ہے، اس نے حوصلہ نہیں چھوڑا، وہ بھی خمینی کی طرح مضبوط اعصاب کا تھا کہ چاہے ملک سارا اُجڑ جائے، چاہے جو کچھ ہو جائے، لیکن شکست نہیں ماننی، تو فرعون بھی مضبوط اعصاب کا تھا، اس نے حوصلہ نہیں چھوڑا، اس نے فوراً وہی اپنی فرعونیت دکھائی، کہنے لگا: ہاں ہاں! میں سمجھ گیا ہوں، یہ میرے خلاف تمہاری سازش ہے، اور یہ ہے تمہارا گرو اور وڈیرا، آپس میں مل کے تم نے اندر سے سازش کی، یہ تمہارا اُستاذ ہے، اور اس نے تمہیں جادو سکھایا، پھر تم نے پروگرام بنایا کہ پہلے ایک جا کے چیلنج کرے، پھر دوسرے مقابلے میں آئیں گے، اور میدان میں شکست کا اعتراف کریں گے، تا کہ حکومت کا تختہ اُلٹنا آسان ہو جائے، یہ تو حکومت کے خلاف تمہاری سازش ہے، اس نے فوراً اس کو سازش کا عنوان دے دیا۔ یعنی فرعون کی جو اگلی تقریر ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ تم سارے کے سارے حکومت باغی ہو، اور اندر سے تم نے پروگرام بنایا، کہ پہلے اُستاذ کو بھیج دیا کہ وہ جا کے اس قسم کی باتیں کرے گا، باقی پھر مقابلے میں آئیں گے، اور جھوٹ موٹ کے ساتھ مقابلہ کر کے بعد میں شکست کا اِعتراف کر لیں گے، جب شکست کا اعتراف کر لیں گے تو عوام سارے ہمارے ساتھ ہو جائیں گے، حکومت کا تختہ اُلٹنا آسان ہو جائے گا، تمہارا یہ پروگرام اس قسم کا ہے، میں تمہیں ابھی پوچھ لیتا ہوں، تو ان کو اس قسم کی دھمکی دی جس قسم کی دھمکی حکومت کے باغیوں کو دی جاتی ہے، کہ میں تمہارے ہاتھ کاٹوں گا، تمہارے پاؤں کاٹوں

گا، اور تمہیں درخت کے اُوپر اُلٹا کر کے لٹکاؤں گا، تمہیں پتا چلے گا کہ تم جو موسیٰ کے رَبّ کے عذاب سے ڈر گئے ہو، تو میرا عذاب زیادہ سخت ہے یا اس کا عذاب زیادہ سخت ہے، تمہیں ابھی پتا چل جائے گا، یہ دھمکی دے دی ان جادوگروں کو، یعنی یہ سارے باغی ہیں، باغی ہونے کی وجہ سے ان کو گرفتار کر لیا جائے گا اور پھر ان کو یہ سزا دی جائے گی، یہ اس نے یوں ڈانٹ ڈپٹ کر دی جس سے باقی مخلوق کو بھی مرعوب کرنا مقصود تھا اور ان کے ذہن میں اُلجھاؤ بھی پیدا کر دیا کہ یہ تو سازش ہے، یہ تو سارے آپس میں اندر سے ملے ہوئے ہیں، تا کہ یہ شکست فرعون کی شکست نہ کہلائے، بلکہ یہ ایک سیاسی تحریک بن جائے، اور لوگ سمجھیں کہ ہوسکتا ہے کہ اسی طرح سے ہی ہو، کہ انہوں نے اس تدبیر کے ساتھ تختہ اُلٹنا چاہا، اور اس قوم کی حکومت کو ختم کرنا چاہا، تو یوں اس نے ایک سیاسی سا چکر چلا کے لوگوں کے ذہن میں اُلجھن پیدا کرنے کی کوشش کی۔

جادوگروں کا اِیمان افروز جواب

لیکن اِن جادوگروں کے دِل میں تو اتنے زبردست طریقے سے ایمان آ چکا تھا، اور نبی کی موجودگی میں جو شخص ایمان لاتا ہے وہ صحابی ہوتا ہے، اور ایک ہی مجلس میں ان کے وہ درجات طے ہو گئے جو آپ کے برسوں میں بھی طے نہیں ہوتے، ہم اور آپ دِن میں کتنی دفعہ ''لا اِلٰہ اِلَّا اللہ'' پڑھتے ہیں اور اِیمان کا اقرار کرتے ہیں، اور کتنی تفصیل کے ساتھ ہم آخرت کو جانتے ہیں، آخرت کا عذاب اور ثواب ہمارے سامنے ہے، لیکن ایمان کی پختگی کا یہ حال ہے کہ جہاں کہیں نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوا، یا ڈنڈا سر پہ آیا، یا چار پیسوں کا لالچ ہو گیا تو فوراً انسان ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے، ہمارے ایمان کا تو یہ حال ہے، لیکن وہ جادوگر جو نبی کے سامنے آئے تھے اور نبی کے سامنے انہوں نے ایمان قبول کیا، تو ایک ہی نظر میں ان کا ایمان کتنا پختہ ہو گیا، اور وہ ولایت کے کس اونچے درجے پر پہنچ گئے، کہ وقت کی حکومت سے ٹکر لی اور حکومت کی ہر قسم کی دھمکی سن لی، اور وہ دھمکی ان کو مرعوب نہ کر سکی، جب اس نے یہ کہا کہ میں تمہارے ہاتھ کاٹوں گا، پاؤں کاٹوں گا، اور میں تمہیں کھجور کے تنوں پر اُلٹا لٹکاؤں گا، تو آگے سے ان کا جواب یہ تھا کہ اب جو تیرا جی چاہے کر لے! فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ، ہمارے پاس تو جو دلیل آ گئی ہم اس دلیل کے مقابلے میں تجھے ترجیح نہیں دے سکتے، اپنے پیدا کرنے والے کے مقابلے میں ہم تجھے ترجیح نہیں دے سکتے (یہ مطلب واؤ عاطفہ کی صورت میں ہے) یا اس کا مطلب یہ ہے کہ قسم اس ذات کی جس نے ہمیں پیدا کیا، ہم تجھے ہرگز ترجیح نہیں دیں گے اس دلیل کے مقابلے میں جو دلیل ہمارے پاس آ گئی، جو تجھ سے ہوسکتا ہے تو کر لے، کیا کر لے گا؟ جو کچھ کرے گا اسی دنیا میں ہی کرے گا، آخر ہم مر جائیں گے، مرنا پھر بھی ہے، لیکن ہم آخرت کی سزا سے بچنا چاہتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قاعدہ یہ ہے کہ جو مجرم بن کے آئے اس کا یہ حال ہوتا ہے، جو مؤمن بن کے آئے اس کا یہ حال ہوتا ہے، ہم مؤمن بن کے جانا چاہتے ہیں، ایمان لا کے جانا چاہتے ہیں، باقی! تیری سزا تیرا عذاب جو کچھ ہو گا وہ صرف اس دُنیا میں ہے، اس سے آگے کچھ نہیں ہے، تو جو کچھ کر سکتا ہے اسی دُنیا میں کر سکتا ہے۔

نبی کے سامنے ایمان قبول کرنے کا مقام

اندازہ کیجئے کہ کتنا پختہ ایمان اور کتنا پختہ یقین آخرت کے معاملے میں آ گیا کہ فرعون کی کوئی دھمکی ان کو مرعوب نہیں کر سکی، اور ان کے قدم نہیں ڈگمگائے۔ انبیاء علیہم السلام کے سامنے ایمان لانے والوں کا یہی حال ہوا کرتا ہے کہ ایمان لاتے ہی وہ اتنے اُونچے درجے کے ولی اللہ بن جاتے ہیں کہ بعد میں آنے والے ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ آج اپنے ایمان کی حالت دیکھو اور اُن کے ایمان کی حالت دیکھو، آپ کو کتنا فرق معلوم ہوگا، اور یہی حال تھا سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا، کہ پکے پکے کٹر قسم کے مشرک، جس وقت سامنے آئے اور ایک دفعہ ایمان قبول کر لیا، بعد میں چاہے ان کو آگ کے انگاروں پر لٹایا گیا، چاہے ان کے سینوں کے اوپر پتھروں کی چٹانیں رکھی گئیں، چاہے ان کے چمڑے اتارے گئے، چاہے ان کو سُولی پہ لٹکایا گیا، لیکن کیا مجال ہے کہ کسی کا قدم ڈگمگا جائے۔ نبی کے سامنے ایمان لانے والا فوراً صحابی بن جاتا ہے، اور اس کا درجہ اتنا اونچا ہو جاتا ہے اور اس کا ایمان اتنا قوی ہو جاتا ہے کہ پھر نہ وہ دنیا کے کسی لالچ سے متاثر ہوتا ہے اور نہ کسی بڑی سے بڑی طاقت کے خوف سے متاثر ہوتا ہے، یہ ہے توحید کا اعلیٰ مقام جو کہ ان لوگوں کو حاصل ہوا۔ اور آخر میں جا کر پھر وہی انہوں نے تفصیل کی کہ جو مجرم بن کر جائے اس کا معاملہ یوں ہوگا، اور جو مؤمن بن کر جائے اس کا معاملہ یوں ہوگا، مطلب یہ ہے کہ ہمیں آخرت پہ یقین آ گیا، ہم آخرت کی نجات چاہتے ہیں، دنیا کی تکلیف کو ہم کوئی کسی قسم کی حیثیت نہیں دیتے، اس طرح سے وہ مقابلہ ختم ہوا، اور جادوگر مؤمن ہو گئے۔ آگے مزید واقعہ آئے گا۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ إِلَيْكَ

وَلَقَدْ أَوْحَيْنَآ إِلٰى مُوْسٰىٓ ۙ أَنْ أَسْرِ بِعِبَادِيْ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا ۙ لَّا

البتہ تحقیق ہم نے وحی کی موسیٰ علیہ السلام کی طرف کہ میرے بندوں کو لے کر رات کو چل، پھر بنا تُو ان کے لئے خشک راستہ سمندر میں، نہیں

تَخٰفُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰى ﴿۷۷﴾ فَأَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُوْدِهٖ فَغَشِيَهُمْ

اندیشہ کرے گا تُو پائے جانے کا، اور نہ تُو غرق ہونے سے ڈرے گا ﴿۷۷﴾ پیچھا کیا ان کا فرعون نے اپنے لشکروں سمیت پس ڈھانپ لیا ان کو

مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ ﴿۷۸﴾ وَأَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَمَا هَدٰى ﴿۷۹﴾ يٰبَنِيٓ إِسْرَآءِيْلَ

اس چیز نے جس نے ڈھانپ لیا یعنی سمندر نے ﴿۷۸﴾ فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ کیا اور سیدھا راستہ نہیں دکھایا ﴿۷۹﴾ اے اسرائیل کی اولاد!

قَدْ اَنْجَیْنٰكُمْ مِّنْ عَدُوِّكُمْ وَوٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَیْمَنَ وَنَزَّلْنَا عَلَیْكُمُ الْمَنَّ

بے شک ہم نے تمہیں نجات دی تمہارے دُشمن سے، ہم نے وعدہ کیا تم سے طور کی دائیں جانب کا اور اُتارا ہم نے تم پر مَن

وَالسَّلْوٰی ﴿۸۰﴾ كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَلَا تَطْغَوْا فِیْهِ فَیَحِلَّ عَلَیْكُمْ

وسلویٰ ﴿۸۰﴾ (ہم نے کہا) کھاؤ ان عمدہ چیزوں میں سے جو ہم نے تمہیں دی ہیں، اور اس میں سرکشی اختیار نہ کرو پھر اُتر پڑے گا تم پر

غَضَبِیْ ۚ وَمَنْ یَّحْلِلْ عَلَیْهِ غَضَبِیْ فَقَدْ هَوٰی ﴿۸۱﴾ وَاِنِّیْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ

میرا غصہ، اور وہ شخص کہ اس پر اُتر گیا میرا غصہ پس وہ تو برباد ہوگیا ﴿۸۱﴾ اور بے شک میں البتہ بہت بخشنے والا ہوں اس شخص کو جو توبہ کرے

وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰی ﴿۸۲﴾ وَمَآ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ یٰمُوْسٰی ﴿۸۳﴾

اور ایمان لے آئے اور نیک عمل کرے پھر سیدھے راستے پر چلتا رہے ﴿۸۲﴾ اے موسیٰ! تجھے کس چیز نے عجلت میں ڈال دیا اپنی قوم سے ﴿۸۳﴾

قَالَ هُمْ اُولَآءِ عَلٰٓی اَثَرِیْ وَعَجِلْتُ اِلَیْكَ رَبِّ لِتَرْضٰی ﴿۸۴﴾

موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ وہ یہی ہیں میرے نقشِ قدم پر، اور میں نے جلدی کی تیری طرف اے میرے رَبّ! تاکہ تُو راضی ہو جائے ﴿۸۴﴾

قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِیُّ ﴿۸۵﴾ فَرَجَعَ مُوْسٰٓی

اللہ تعالیٰ نے فرمایا بے شک ہم نے فتنے میں ڈال دیا تیری قوم کو تیرے بعد، اور سامری نے انہیں گمراہ کر دیا ﴿۸۵﴾ پھر موسیٰ علیہ السلام لوٹے

اِلٰی قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۚ قَالَ یٰقَوْمِ اَلَمْ یَعِدْكُمْ

اپنی قوم کی طرف غصّے سے بھرے ہوئے افسوس کرتے ہوئے، موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اے میری قوم! کیا تم سے تمہارے رَبّ نے

رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا ۚ اَفَطَالَ عَلَیْكُمُ الْعَهْدُ اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ یَّحِلَّ عَلَیْكُمْ غَضَبٌ مِّنْ

وعدہ نہیں کیا تھا اچھا وعدہ؟ کیا دراز ہوگیا تھا تم پر زمانہ؟ یا ارادہ کیا تم نے کہ اُتر پڑے تم پر غضب

رَّبِّكُمْ فَاَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِیْ ﴿۸۶﴾ قَالُوْا مَآ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا

تمہارے رَبّ کا پھر تم نے خلاف کیا میرے وعدے کے ﴿۸۶﴾ وہ کہنے لگے کہ نہیں خلاف کیا ہم نے تیرے وعدے کے اپنے اختیار کے ساتھ

وَلٰكِنَّا حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا مِّنْ زِیْنَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنٰهَا فَكَذٰلِكَ اَلْقَی

لیکن ہم اُٹھوائے گئے تھے قوم کی زینت سے بہت سارے بوجھ، پس ہم نے ان بوجھوں کو پھینک دیا، پھر اسی طرح سے سامری

السَّامِرِيُّ ﴿۸۷﴾ فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فَقَالُوْا هٰذَآ اِلٰهُكُمْ

نے ڈال دیا﴿۸۷﴾ پھر سامری نے نکالا ان کے لئے ایک بچھڑا جو ایک وجود تھا جس کے لئے گائے کی آواز تھی، تو وہ کہنے لگے: یہ ہے تمہارا الٰہ

وَاِلٰهُ مُوْسٰى ۚ فَنَسِيَ ﴿۸۸﴾ اَفَلَا يَرَوْنَ اَلَّا يَرْجِعُ اِلَيْهِمْ قَوْلًا ۙ وَّلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ﴿۸۹﴾

اور موسیٰ کا اِلٰہ، موسیٰ بھول گیا﴿۸۸﴾ کیا وہ لوگ دیکھتے نہیں تھے کہ وہ بچھڑا نہیں لوٹاتا تھا ان کی طرف کوئی بات اور نہیں اختیار رکھتا تھا وہ ان کے لئے کسی نقصان کا نہ نفع کا﴿۸۹﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ وَلَقَدْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى: البتہ تحقیق ہم نے وحی کی موسیٰ علیہ السلام کی طرف۔ لام چونکہ تاکید کے لئے ہے، اس لیے ترجمہ یونہی کر دیا جاتا ہے ''یہ پکی بات ہے کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی کی۔'' اَنْ تفسیر یہ ہے، وحی کا مضمون کیا تھا، اَسْرِ بِعِبَادِيْ: میرے بندوں کو لے کے رات کو چل، سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ میں یہی لفظ آیا تھا اَسْرٰى اِسْرَاءٌ: رات کو چلنا۔ اور باء تعدیہ کی آ گئی۔ میرے بندوں کو لے کر رات کو چل، فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا: يَبَس مصدر ہے اور یابس کے معنی میں ہے اور یہ طریق کی دوسری صفت بن رہا ہے۔ ضربِ طریق: راستہ بنانا۔ پھر بنا تو ان کے لئے خشک راستہ سمندر میں۔ گویا کہ یہ ضرب جعل کے معنی میں ہے، کہ راستہ بنا، لیکن ضرب کے ساتھ تعبیر کرنے میں یہ نکتہ بھی ہو سکتا ہے کہ چونکہ راستہ بننے کی صورت یہی پیش آئی تھی کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے عصا کو سمندر پہ مارا تھا تو اس نے راستہ چھوڑ دیا، تو صورۃً چونکہ مارنا پیش آیا اس لیے اس کو ضرب سے تعبیر کیا گیا۔ اور یوں بھی تقدیر عبارت نکالی گئی ہے اِضْرِبِ الْبَحْرَ لِيَصِيْرَ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا (آلوسی)، یعنی اپنے عصا کو سمندر پر مار، تاکہ ان کے لئے خشک راستہ سمندر میں بن جائے، پھر مفہوم یوں ہو جائے گا۔ ورنہ ضربِ طریق، جعلِ طریق کے معنی میں ہے۔ لَا تَخٰفُ دَرَكًا: نہیں اندیشہ کرے گا تو پائے جانے کا، درک پانے کو کہتے ہیں، یہ مصدر مجہول کا مفہوم ادا کرے گا، ''تُو پائے جانے کا اندیشہ نہیں کرے گا'' وَلَا تَخْشٰى: اور نہ تُو غرق ہونے سے ڈرے گا، یہ صورۃً خبر ہے اور معناً انشاء ہے کہ نہ تو اس بات سے ڈرنا کہ تجھے کوئی پکڑ لے گا، اور نہ اس بات سے ڈرنا کہ تُو ڈوب جائے گا۔ ''نہیں خوف کرے گا تُو پائے جانے کا اور نہیں ڈرے گا تُو غرق ہونے سے''، فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُوْدِهٖ: پیچھا کیا ان کا فرعون نے اپنے لشکروں سمیت۔ جنود جُند کی جمع ہے۔ فَغَشِيَهُمْ مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ: فَغَشِيَهُمْ مَا غَشِيَهُمْ۔ مِّنَ الْيَمِّ یہ ''ما'' کا بیان ہے (مظہری)، یَمّ دریا اور سمندر کو کہتے ہیں۔ پس ڈھانپ لیا ان کو اس چیز نے جس نے ان کو ڈھانپ لیا یعنی سمندر نے۔ وَاَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ: فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ کیا، وَمَا هَدٰى: اور سیدھا راستہ نہیں دکھایا۔ بھٹکا دیا فرعون نے اپنی قوم کو، ضلالت میں ڈال دیا، گمراہی میں ڈال دیا فرعون نے اپنی قوم کو اور سیدھا راستہ نہیں دکھایا۔ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ: اے اسرائیل کے بیٹو! اسرائیل کی اولاد! قَدْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ عَدُوِّكُمْ: بے شک ہم نے تمہیں نجات دی تمہارے دشمن سے، وَوٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَيْمَنَ: الْاَيْمَنَ چونکہ منصوب ہے اس لیے یہ طور کی صفت نہیں، طور تو مجرور

ہے، بلکہ یہ جانب کی صفت ہے۔ہم نے وعدہ کیا تم سے طور کی دائیں جانب کا، وَنَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى: اور اُتارا ہم نے تم پر منّ وسلویٰ۔ ''سلویٰ'' تو کوئی بٹیر جیسا پرندہ تھا، یہ کثرت کے ساتھ آتے اور آسانی سے پکڑ لیے جاتے۔ اور ''منّ'' یہ آسمان سے کوئی چیز برستی تھی یا درختوں کو لگتی تھی، میٹھی قسم کی چیز تھی۔ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ: ہم نے کہا کہ کھاؤ ان عمدہ چیزوں میں سے جو ہم نے تمہیں دی ہیں، مَا رَزَقْنٰكُمْ جو کچھ ہم نے تمہیں دیا اس میں سے عمدہ چیزیں کھاؤ، وَلَا تَطْغَوْا فِيْهِ: اور اس میں سرکشی اختیار نہ کرو، فِيْهِ کی ضمیر مَا رَزَقْنٰكُمْ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ رزق میں سرکشی اختیار نہ کرو۔ طغیان: حد سے بڑھنا۔ حد سے نہ نکلو، حدود کی رعایت رکھو، حلال طریقے سے حاصل کرو، حاصل شدہ رزق کو کھا کے اللہ کا شکر ادا کرو، اور اس رزق کو معصیت اور نافرمانی کا ذریعہ نہ بناؤ، فضول خرچی کے طور پر خرچ نہ کرو۔ حاصل شدہ رزق میں فضول خرچی کرنا، اس کو معصیت میں خرچ کرنا، شکر ادا نہ کرنا، یہ ساری کی ساری چیزیں رزق میں طغیان ہیں، کہ اس نعمت کے ملنے کی بنا پر انسان سرکش ہو جائے، شکر گزار نہ رہے، اور معصیت میں خرچ کرنے لگ جائے، اللہ کے اَحکام کی رعایت نہ رکھے، اس میں سے حقوقِ واجبہ ادا نہ کرے، یہ سب رزق میں ''طغیان'' کہلاتا ہے۔ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ: پھر اُتر پڑے گا تم پر میرا غصہ، یعنی اگر طغیان اختیار کرو گے تو میرا غصہ اُتر پڑے گا۔ وَمَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ: اور وہ شخص کہ اس پر اُتر گیا میرا غصہ، فَقَدْ هَوٰى: پس وہ تو برباد ہو گیا۔ وَاِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ: اور بے شک میں البتہ بہت بخشنے والا ہوں، بہت معاف کرنے والا ہوں، بہت درگزر کرنے والا ہوں (غفار مبالغے کا صیغہ ہے) میں بہت بخشنے والا ہوں اس شخص کو جو توبہ کرے، وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى: اور ایمان لے آئے اور نیک عمل کرے پھر سیدھے راستے پر چلتا رہے۔ ایمان وعمل اختیار کرنے کے بعد اهْتَدٰى کا لفظ جو بولا گیا یعنی اس پر پھر چلتا رہے، آخر وقت تک جس کا یہ حال رہے، میں اس کو بہت معاف کرنے والا ہوں، بہت بخشنے والا ہوں۔ وَمَآ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى: اے موسیٰ! تجھے کس چیز نے عجلت میں ڈال دیا اپنی قوم سے، کس چیز نے تجھے جلدی میں ڈال دیا، یعنی تُو اپنی قوم کو چھوڑ کے اتنی جلدی کیوں آ گیا اے موسیٰ! قَالَ هُمْ اُولَآءِ عَلٰٓى اَثَرِيْ: موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ وہ یہی ہیں میرے نقشِ قدم پر، یعنی وہ قریب ہی ہیں، میرے پیچھے ہیں۔ وَعَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى: اور میں نے جلدی کی تیری طرف اے میرے رَبّ! تاکہ تُو خوش ہو جائے، تاکہ تُو راضی ہو جائے۔ رَبِّ کی باء کے نیچے جو کسرہ ہے یہ یائے متکلم پر دلالت کرتا ہے۔ قَالَ: اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ: بے شک ہم نے فتنے میں ڈال دیا تیری قوم کو مِنْۢ بَعْدِكَ تیرے بعد، وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ: اور سامری نے انہیں گمراہ کر دیا۔ سامری کے حالات تاریخ میں مذکور نہیں، اس لیے روایات میں اختلاف ہے کہ یہ اسرائیلی تھا یا قبطی تھا؟ یا کس قوم سے تعلق رکھتا تھا؟ یہ سامری کسی سامرہ بستی کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے ''سامری'' کہلاتا ہے، یا کسی قوم اور قبیلے کی طرف سے منسوب ہونے کی وجہ سے ''سامری'' کہلاتا ہے، کہاں کا رہنے والا تھا؟ اس کے متعلق مختلف اقوال تفسیر میں نقل کیے گئے ہیں، حتیٰ کہ ایک قول یہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ یہ ہندوستانی، ہندوؤں میں سے تھا، جن کی طبیعت میں گاؤ پرستی رچی بسی ہوئی ہے، اس لیے اس نے بچھڑا بنایا اور لوگوں کو اس کے پُوجنے کے اُوپر برانگیختہ کیا، بعض تفسیروں میں یہاں تک بھی اس کے بارے میں قول موجود ہے کہ یہ ہندوستان کا کوئی ہندو تھا جو بنی اسرائیل میں شامل ہو گیا اور ظاہری طور پر موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آیا تھا لیکن مزاج اس کا مشرکانہ تھا (دیکھیں ''معارف القرآن'')، یا اسرائیلی تھا، یا قبطی تھا، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پر منافقانہ

ایمان لایا، اس قسم کی باتیں اس کے متعلق تفسیر میں موجود ہیں، بہرحال یہ کوئی شخص ہے جو بنی اسرائیل کے اندر شامل تھا، چاہے اسرائیلیوں میں سے تھا، چاہے قبطیوں میں سے تھا، اور اس زمانے کے منافقین میں سے تھا، کہ ظاہری طور پر ایمان تو لایا تھا لیکن اس کے قلب کے اندر ایمان نہیں رچا تھا، اس کا قلب مشرکانہ تھا، اس لیے جب موقع ملا اس نے قوم میں بت پرستی جاری کردی۔ فَرَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ: پھر موسیٰ علیہ السلام لوٹے اپنی قوم کی طرف غَضْبَانَ اَسِفًا: غصے سے بھرے ہوئے، افسوس کرتے ہوئے، قَالَ یٰقَوْمِ: موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اے میری قوم! اَلَمْ یَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ: کیا تم سے تمہارے رب نے وعدہ نہیں کیا تھا وَعْدًا حَسَنًا: اچھا وعدہ؟ اَفَطَالَ عَلَیْكُمُ الْعَهْدُ: کیا تم پر زمانہ دراز گزر گیا؟ یعنی وعدہ پورا ہونے میں دیر لگ گئی، جس کی وجہ سے تم گھبرا گئے کہ وعدہ تو پورا نہیں ہوتا، چلو ہم ہی کچھ کریں۔ اور اس عہد سے مراد ہے تورات دینے کا جو اللہ نے کیا تھا، کہ موسیٰ علیہ السلام وہاں آئیں اور اس طرح سے اعتکاف کریں تو میں تورات دوں گا جو تمہاری عملی زندگی کے لیے راہنمائی کا باعث ہوگی۔ تو ابھی تو زمانہ دراز نہیں گزرا تھا کہ تم نے اپنے طور پر اپنی زندگی کے لیے خود ہی ایک طریقہ ایجاد کرلیا۔ ''کیا دراز ہوگیا تھا تم پر زمانہ؟'' اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ یَّحِلَّ عَلَیْكُمْ: یا ارادہ کیا تم نے کہ اتر پڑے تم پر غضب تمہارے رب کا فَاَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِیْ: پھر تم نے خلاف کیا میرے وعدے کے۔ موعد مصدر ہے۔ اخلاف فی الوعد: وعدے کے خلاف کرنا۔ جس طرح سے حدیث شریف میں علاماتِ منافق کے اندر ذکر کیا گیا: ''اِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ'' کہ منافق جب وعدہ کرتا ہے تو پھر اس کو پورا نہیں کرتا، ''پھر تم نے میرے وعدے کے خلاف کیا۔'' قَالُوْا مَآ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا: موعد: مصدر میمی ہے، وہ کہنے لگے کہ نہیں خلاف کیا ہم نے تیرے وعدے کے اپنے اختیار کے ساتھ وَلٰكِنَّا حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا مِّنْ زِیْنَةِ الْقَوْمِ: لیکن ہم لاد دیے گئے تھے، اٹھوا دیے گئے تھے، ہم پر بوجھ ڈال دیا گیا تھا۔ اوزار، وِزر کی جمع، وِزر بوجھ کو کہتے ہیں۔ قوم کی زینت سے بہت سارے بوجھ ہم پر لاد دیے گئے تھے، ہم پر ڈال دیے گئے تھے، بے شک ہم اُٹھوائے گئے تھے قوم کی زینت سے بہت سارے بوجھ۔ فَقَذَفْنٰهَا: پھر ہم نے ان بوجھوں کو اُتار دیا، پھینک دیا فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِیُّ: پھر اسی طرح سے سامری نے ڈال دیا فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا: پھر سامری نے نکالا ان کے لئے ایک بچھڑا، جَسَدًا جو ایک وجود تھا، یعنی کمالات سے خالی ایک وجود تھا، لَّهٗ خُوَارٌ جس کے لیے گائے کی آواز تھی، خوار گائے کی آواز کو کہتے ہیں۔ فَقَالُوْا تو سامری اور اس کے ماننے والے کہنے لگے، هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى یہ ہے تمہارا الٰہ اور موسیٰ کا الٰہ، تمہارا معبود اور موسیٰ کا معبود یہ ہے، فَنَسِیَ: موسیٰ بھول گیا جو طور پر ملنے چلا گیا اللہ تعالیٰ کو، الٰہ تو یہ ہے، موسیٰ بھول گیا۔ اَفَلَا یَرَوْنَ: کیا وہ لوگ دیکھتے نہیں تھے؟ اَلَّا یَرْجِعُ اِلَیْهِمْ قَوْلًا: کہ وہ نہیں لوٹاتا تھا ان کی طرف کوئی بات، وَّلَا یَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا: اور نہیں اختیار رکھتا تھا وہ بچھڑا ان کے لئے کسی نقصان کا نہ نفع کا۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَیْكَ

موسیٰ علیہ السلام کو ہجرت کرنے کا حکم

واقعہ مسلسل چلا آ رہا ہے، مقابلے میں جادوگر شکست کھا گئے، جادوگروں کی شکست اصل میں فرعون کے لئے ایک ذلت

آمیز شکست تھی، جس کے بعد موسیٰ علیہ السلام اور آپ پر ایمان لانے والے اور فرعونیوں کی کشاکشی حد سے زیادہ بڑھ گئی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرعون کو سمجھانے کے لئے مختلف قسم کی نشانیاں پے در پے ظاہر کی گئیں، جس کی تفصیل آپ کے سامنے سورۂ اعراف میں آئی، کبھی ان کے اُوپر پانی کا سیلاب آیا، کبھی ٹڈیوں کا سیلاب بھیج دیا گیا، کبھی مینڈک کثرت سے آگئے، کبھی خون ہی خون ہو گیا، اور اس طرح سے مختلف طوفان ان کے اوپر مسلط کیے گئے، کبھی قحط پڑ گیا، پھل کم ہو گئے، پیداوار نہ ہوئی، یہ نشانیاں تھیں۔ جب ایک عذاب آتا فرعونی کچھ ڈھیلے ہوتے، درخواست کرتے کہ اے موسیٰ! اپنے ربّ سے دُعا کر کے اس کو ٹلوا دیجئے، ہم ایمان لے آئیں گے۔ موسیٰ علیہ السلام دُعا کرتے، وہ عذاب ٹل جاتا، اس کے بعد پھر ان کی وہی سرکشی شروع ہو جاتی۔ ان تمام واقعات کی تفصیل سورۂ اعراف میں گزری ہے۔ لیکن جب معاملہ انتہا کو پہنچ گیا، اور فرعون کسی صورت میں بھی ماننے کے لئے تیار نہ ہوا، تو پھر موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ آپ اپنے متبعین کو لے کر اس علاقے سے ہجرت کر جائیے، جیسے کہ انبیاء علیہم السلام کی سُنّت ہے کہ جب کسی علاقے میں ان کے لئے حالات ساز گار نہیں رہتے ہر قسم کی کوشش کرنے کے باوجود، تو پھر وہ علاقہ چھوڑ دیا کرتے ہیں، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی یہی حکم آ گیا کہ اپنی قوم کو ساتھ لیں اور اور یہاں سے کوچ کر جائیں، جو راستہ متعین کیا گیا وہ ایک سمندر میں سے گزرتا تھا، یہ وہی ہے جس کے ساتھ آج کل نہر سویز ملتی ہے، بحرِ رُوم اور بحرِ قلزم کو ملانے کے لئے جو نہر کھودی گئی ہے، جس کو آپ اخبار میں سنتے رہتے ہیں "نہرِ سویز" تو "نہرِ سویز" کا ایک کنارہ تو بحرِ رُوم کے ساتھ لگتا ہے اور دُوسرا کنارہ بحرِ قلزم کی ایک شاخ ہے جس کو "بحرِ احمر" کے ساتھ بھی تعبیر کرتے ہیں اس کے ساتھ لگتا ہے، تو یہ جو شاخ ہے اس میں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے گزرنا تھا، اور گزر کے صحرائے سینا کو طے کر کے شام کی طرف آنا تھا۔

موسیٰ علیہ السلام کا سمندر کو پار کرنا اور فرعون کا غرق ہونا

تو راستہ یہ متعین کیا گیا، درمیان میں وہ سمندر آتا تھا اور اس کو عبور کرنے کے لئے کوئی ظاہری ذریعہ نہیں تھا، تو جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو لے کر نکلے ہیں، تو ان کے نکلنے کے بعد فرعون کو پتا چلا کہ اسرائیلی تو سارے کے سارے نکل گئے تو اس نے اپنی فوجوں کے ساتھ ان کا پیچھا کیا، اب جس وقت یہ سمندر کے قریب پہنچے اور اسرائیلیوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو فرعون بھی فوجیں لیے آ رہا تھا، تو اس وقت وہ دیکھ کے گھبرا گئے، یہ لفظ آپ کے سامنے کسی سورت میں آئے گا کہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا: اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ (سورۂ شعراء:۶۱) اے موسیٰ! ہم تو پکڑے گئے، کہ اب آگے سمندر ہے اور پیچھے فرعون آ گیا، آگے راستہ کوئی نہیں، اب ہم تو پکڑے جائیں گے، اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ، جیسے حضرت مولانا غلام اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے اپنے لب و لہجے میں، جس طرح سے ان کا انداز تھا تقریر کرنے کا، کہ "اسرائیلیوں نے دیکھا کہ آگے سمندر کی موجیں، پیچھے فرعون کی فوجیں" تو وہ سمجھے کہ اب تو ہم پھنس گئے، تو موسیٰ علیہ السلام سے جب انہوں نے کہا تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا: كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ: ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم پکڑے جائیں، میرے ساتھ میرا رَبّ ہے وہ مجھے راستہ دے گا، اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم آیا کہ اپنی لاٹھی سمندر پر مارو، راستہ بن جائے گا، اور آپ اسرائیلیوں کو لے کر چلے جائیں، بالکل اندیشہ نہ کریں، تم نہ پکڑنے جاؤ گے نہ غرق ہو گے،

اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ہدایت آ گئی، جس کو یہاں ان لفظوں میں ذکر کیا گیا کہ موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ میرے بندوں کو لے کے راتوں رات چل، اور ان کے لیے سمندر میں خشک راستہ بنا۔ خشک راستہ بنانے کی صورت یہی تھی کہ اس کے اُوپر لاٹھی ماریں، راستہ بن جائے گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام تو اپنی جماعت کو لے کے آگے گزر گئے، اور پیچھے سے فرعون بھی وہیں پہنچ گیا، اب راستہ آگے بنا ہوا تھا، فرعون نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، وہ سمجھا کہ شاید اسی طرح سے ہی ہے، اور ممکن ہے کہ اس نے یہ خیال کیا ہو کہ یہ میرے لیے سمندر نے راستہ چھوڑا ہے، جلدی سے اپنی فوجیں لے کر اسی طرح سے سمندر میں داخل ہو گیا اسی راستے میں، تو اسرائیلی باہر نکل گئے اور فرعونی سارے کے سارے سمندر کے اندر آ گئے، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پانی کو ملا دیا گیا، اب وہ پانی جو کہ پہاڑوں کی طرح اِدھر اُدھر رُکا ہوا تھا، جیسا کہ قرآنِ کریم میں دوسری جگہ لفظ آئے گا: فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيمِ (سورۂ شعراء: ۶۳) کہ سمندر پھٹ گیا، اور پھٹنے کے ساتھ اس کا ہر حصہ ایسے تھا جیسے بہت بڑا ٹیلا ہوتا ہے، ٹیلے کی شکل میں پانی اِدھر بھی کھڑا ہے، اُدھر بھی کھڑا ہے، درمیان میں راستہ ہے، جس میں سے وہ گزر کے گئے تھے، بعد میں اس کو ملا دیا گیا، جس وقت ملا دیا گیا تو وہ پانی فرعونیوں کے اُوپر سے گزر گیا، اور فرعونی سارے کے سارے بمع فرعون کے غرق ہو گئے، سورۂ یونس میں بھی یہ قصہ آیا تھا۔ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُوْدِهٖ فَغَشِيَهُمْ مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ: انہی لفظوں کے اندر اس سارے قصے کو سمیٹ دیا گیا، فرعون اپنی فوجوں سمیت ان کے پیچھے لگا، پھر ڈھانپ لیا ان فرعونیوں کو جس چیز نے کہ ڈھانپ لیا سمندر سے، "جس چیز نے ڈھانپ لیا" یعنی جو چیز ان پہ چڑھنی تھی چڑھ گئی، مراد اس سے وہی پانی ہے، یعنی موجیں مارتا ہوا پانی ان کے اوپر آ چڑھا جس کی وجہ سے وہ سارے کے سارے غرق ہو گئے۔

فریقین کی قیادت کا نتیجہ

اب ایک قوم کی قیادت تو کر رہا تھا فرعون، اور ایک قوم کی قیادت کر رہے تھے حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے تعلق رکھنے والے تھے اور اللہ کے اَحکام کے مطابق قوم کو چلا رہے تھے، اور فرعون اپنی منشا کے مطابق چلا رہا تھا اپنی بادشاہت اور اپنی سرداری کو باقی رکھنے کے لیے، یہ دو طاقتیں تھیں جو آپس میں متصادم تھیں، لیکن نتیجہ سامنے آ گیا کہ وَاَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَمَا هَدٰى: فرعون نے قوم کو برباد کر دیا، بھٹکا دیا، گمراہی میں ڈال دیا، سیدھا راستہ نہیں دکھایا، تو فرعون کی قیادت غلط ثابت ہوئی، اور قیامت کے دِن جا کے بھی نتیجہ یونہی ظاہر ہوگا کہ يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ (سورۂ ہود: ۹۸) فرعون قیامت کے دِن اپنی قوم کے آگے آگے چلے گا، اور سب کو لے جا کر جہنم میں جھونک دے گا، تو دنیا کے اندر یہ سزا ملی، اس قیادت کے نتیجے میں قوم اس نتیجے پر پہنچی، اور آخرت میں اس طرح سے جہنم میں جائیں گے اور برباد ہو جائیں گے، تو فرعون کے پیچھے لگنے والے نفع میں نہ رہے بلکہ انہوں نے دنیا و آخرت کا خسارہ اُٹھایا، اس کی قیادت کا تو یہ نتیجہ نکلا، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قیادت کا یہ نتیجہ نکلا کہ قوم دُنیوی ذِلت سے بچی، اس کو آزادی نصیب ہوگئی، اور اللہ تعالیٰ نے ہر طرح سے ان کے اُوپر مہربانی فرمائی جیسے کہ اگلے الفاظ میں ذِکر فرمایا کہ "اے بنی اسرائیل! ہم نے تمہیں نجات دی تمہارے دُشمن سے" اس دُشمن سے یہی فرعون مراد ہے۔

اللہ تعالیٰ سے ملاقات کے لئے موسیٰ علیہ السلام کا طور پر جانا

اور جس وقت نجات دی اور سمندر سے پار ہو گئے تو پھر اسرائیلیوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا کہ اب ہم مطمئن ہو گئے ہیں، اب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اگر کچھ احکام آئیں گے تو ہم اس کے مطابق زندگی گزاریں گے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم اسی وادی میں آ جاؤ جہاں پہلے کلام ہوئی تھی، جو طور کی دائیں جانب وادی تھی، وہاں پہنچ جاؤ، تو وہاں آ کے اعتکاف کرو چالیس دن، جس طرح سے قرآنِ کریم میں اَرْبَعِیْنَ لَیْلَۃً کا لفظ آئے گا (سورۂ بقرہ:۵۱)، چالیس دن وہاں اعتکاف کرو، روزہ رکھو، تو اس کے اختتام پر تمہیں کتاب دی جائے گی، پہلے تیس راتوں کا وعدہ تھا پھر اس میں دس کا اضافہ کر کے چالیس پوری کر دی گئیں، تو یہ اللہ کی طرف سے ایک وعدہ ہوا، حضرت موسیٰ علیہ السلام طور کی طرف تشریف لے گئے، جس وقت طور کی طرف تشریف لے گئے ہیں تو الفاظ سے کچھ معلوم ایسے ہوتا ہے کہ قوم کے کچھ افراد کو بھی ساتھ لے جانا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں کہا کہ تم تیاری کر کے میرے پیچھے پیچھے آ جانا، میں ذرا جلدی چلتا ہوں، حضرت موسیٰ علیہ السلام پر شوق غالب تھا کہ اللہ نے بلایا ہے، اور وہاں جا کے میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کروں گا، اس ذوق شوق میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پہلے تشریف لے گئے، اور اُدھر پیچھے قصہ اور ہو گیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے جاتے ہوئے حضرت ہارون علیہ السلام کو اپنا نائب بنایا (یہ آگے تفصیل آ رہی ہے) اور انہیں تاکید کر دی کہ دیکھو! اس قوم کے اندر کچھ شریر لوگ بھی ہیں، جس طرح سے ہر جماعت میں ہر طبقے میں کچھ نہ کچھ ایسے لوگ ہوا کرتے ہیں جو کوئی نہ کوئی غلط بات، کوئی شوشہ، کوئی سازش کرتے رہتے ہیں، ان کی کچھ نشاندہی کی، کہ ان کی طرف سے ذرا ہوشیار رہیو، یہ تمہیں کسی غلطی میں نہ ڈالیں، ان کی بات نہ ماننا، اور میرے پیچھے قوم کو سنبھال کے رکھنا اور ان کے حالات کی اصلاح کرنا، حضرت ہارون علیہ السلام کو تاکید کر کے اور اپنا نائب بنا کے تشریف لے گئے تھے۔ اب پیچھے جو قوم ٹھہری ہوئی تھی، یہ بڑے سخت مزاج تھے، سخت مزاج بایں معنیٰ کہ غلامی کی زندگی گزاری تھی، جوتے کھانے کے عادی تھے، جو ہر وقت جھڑکیں کھانے کے عادی ہوں، ماریں کھانے کے عادی ہوں، اور دوسروں کے سامنے ذلیل رہیں ہوں، اور ڈنڈے سے کام کرنے کے عادی ہوں، جس وقت ان کو آزادی ملا کرتی ہے، آزادی ملنے کے بعد اگر ان کے اوپر وہ سختی بحال نہ رہے تو پہلے پہلے ان کے اندر بڑی سرکشی آتی ہے۔ جس طرح سے آپ نے دیکھا ہوگا کہ جو بکری بندھی رہے، اگر کبھی اس کو چھوڑ دیا جائے تو بمقابلہ دوسری بکریوں کے دوڑتی بھاگتی شرارتیں زیادہ کرتی ہے۔ اسی طرح سے جو لوگ سختی کے عادی ہو جاتے ہیں، ذلت کے عادی ہو جاتے ہیں، پھر ان کو عزت کی زندگی جلدی جلدی راس نہیں آتی، وہ اسی ڈنڈے کے عادی ہوتے ہیں، جب تک ڈنڈا سر پہ رہے گا تو ٹھیک رہیں گے، جب ڈنڈا ذرا دور ہوتا ہے تو گڑبڑ کرنے لگ جاتے ہیں۔ ایسے ہی حال ان اسرائیلیوں کا تھا، اب ان کو اللہ نے عزت دی، آزادی دی، دشمن سر سے اُترا، لیکن اس کے بعد ان کا دماغ وہی کمینی حرکتوں پر ہی ابھی اُترا ہوا تھا، انہوں نے اپنی عزت کا احساس نہیں کیا۔

سامری کا قوم کو بت پرستی میں مبتلا کرنا

ایک شخص تھا ان کے اندر سامری، اس کا نام بعض روایات میں تو ''موسیٰ'' ذکر کیا گیا ہے اور بعض میں ''ہارون''، بہرحال

اس کا کوئی ایسے ہی نام تھا، ظاہری طور پر اس نے اسلام قبول کیا ہوا تھا، اسرائیلی تھا یا قبطی؟ میں نے آپ کے سامنے پہلے تفصیل عرض کردی کہ اس میں کوئی بات واضح نہیں ہے، اور یہ بت گری کا ماہر تھا، تصویریں بنانا، فوٹو بنانا، کیونکہ اس وقت مصر کا معاشرہ ایسا تھا کہ اس میں یوں ہی بت بنائے جاتے تھے اور پوجے جاتے تھے، فرعون کا بت بناتے تھے، دوسری شکلوں کے بت بھی بناتے تھے۔
اب یہ اسرائیلی جس وقت مصر سے چلے ہیں تو اس سے قبل انہوں نے فرعونیوں سے کچھ زیورات مستعار لئے تھے اپنی کسی شادی وغیرہ کے بہانے سے یا کسی اور عذر سے (عام مفسرین کی روایت کے مطابق عرض کررہا ہوں) اسرائیلیوں نے کچھ فرعونیوں کے زیور لئے ہوئے تھے اور اچانک ہجرت کا حکم ہوگیا اور وہ زیور بھی ساتھ ہی لے آئے، اب یہ زیورات جو ان کے پاس تھے یہ تھا کافروں کا مال، اور وہ کافران کے لیے کافر حربی تھے، اور کافر حربی کا مال مؤمن کے لئے مباح ہے، یعنی اس کا کافر کی طرف واپس کرنا ضروری نہیں، مالِ غنیمت ہو یا اس کو ''مالِ فیٔ'' قرار دیں، جو بھی ہو، اس مال سے استفادہ اُس اُمت میں جائز نہیں تھا، حدیث شریف میں آتا ہے کہ مالِ غنیمت کو اللہ تعالیٰ نے اُمتِ محمدیہ کے لئے حلال کیا ہے،[1] یہ حضور ﷺ کی خصوصیات میں سے ہے، پہلی اُمتوں میں مالِ غنیمت حلال نہیں تھا، حتیٰ کہ اگر لڑتے ہوئے بھی کوئی مال حاصل ہوجاتا، اس کو بھی اکٹھا کر کے ایک جگہ رکھ دیا کرتے تھے، آسمان سے آگ آتی تھی اور اس کو جلا جاتی تھی، یہ علامت ہوتی تھی کہ جہاد قبول ہوگیا، اور اگر آگ آکر اس مال کو نہ جلاتی تو یہ علامت ہوتی تھی کہ یہ جہاد قبول نہیں ہے، حدیث شریف میں اس سلسلے میں واقعات بھی آتے ہیں۔ بہر حال موسیٰ علیہ السلام کے بعد وہ زیورات اکٹھے کرلیے گئے، کیونکہ ان کو اپنے پاس رکھنا دُرست نہیں تھا، اور سامری کے پاس بھی کچھ زیور وغیرہ تھا، اس نے بھی ڈال دیا، تو سامری نے ان سب کو اکٹھا کر کے پگھلایا، اور بت گری جو اس کا پیشہ تھا جس کو وہ جانتا تھا اس کے تحت اس نے بچھڑے کی ایک تصویر بنادی، بچھڑے کی تصویر ایسے طور پر بنائی جس طرح سے آج کل آپ دیکھتے ہیں جاپان کے بنے ہوئے کھلونے آتے ہیں، ان میں سیل ڈال دیا جاتا ہے، تو سیل ڈالنے کے ساتھ ان میں سے عجیب قسم کی آوازیں بھی آتی ہیں، کتا ہے تو کتے کی طرح بھونکے گا، بلی ہے تو بلی کی طرح آواز نکالے گی، اسپرنگوں کے ساتھ ہی انہوں نے اس طرح کی مختلف قسم کی آوازیں اب بھی کھلونوں میں بند کی ہوئی ہیں، تو اس نے کوئی اسپرنگ یا سیل تو نہیں ڈالا ہوگا، لیکن اس کی بناوٹ ایسی بنائی کہ ہوا اگر ایک طرف سے داخل ہوکر دُوسری طرف سے نکلے، تو جس طرح سے گائے بھاں بھاں کیا کرتی ہے تو وہ بھی اسی قسم کی آواز دیتا تھا، ''لَهٗ خُوَارٌ'' میں جس طرح سے آیا کہ اس کے لئے بچھڑے کی آواز تھی۔ تو یا تو اس کی بناوٹ ایسی تھی کہ ہوا کے گزرنے کے ساتھ آواز پیدا ہوتی تھی، جس طرح سے آپ کے باجوں کی بناوٹ ایسی ہوتی ہے کہ ادھر سے آپ پھونک مارتے ہیں اور پھونک مارنے کے ساتھ ہوا اس طرح گشت کرتی ہے کہ عجیب وغریب قسم کی آواز اس میں سے نکلتی ہے، کسی میں سے کیسی نکلتی ہے، کسی میں سے کیسی، بین بجاتے ہیں تو اس میں سے کیسی آواز نکلتی ہے، ماری اس میں بھی پھونک ہی جاتی ہے، اور اسی طرح سے دوسرے آلات جو منہ کے ساتھ لوگ بجاتے ہیں، جب اس میں پھونک ماری جاتی ہے تو جیسے اس کی بناوٹ ہوتی ہے اس کے مطابق آواز نکلتی ہے۔ یا تو اسی طرح سے اس کی بناوٹ ایسی ہوگی کہ ہوا کے گزرنے کے ساتھ اس میں گائے کی آواز پیدا ہوتی تھی ...... اور اکثر تفاسیر میں یوں ذکر کیا گیا ہے

---

(۱) واحلت لی الغنائم. مشکوٰۃ ج ۲ ص ۵۱۲ باب فضائل سید المرسلین، فصل اول۔ صحیح بخاری ج ۱ ص ۶۲ باب قول النبی جعلت لی الارض الخ.

کہ اس سامری نے ایک دفعہ دیکھا کہ جبریل علیہ السلام گھوڑے پہ سوار ہیں اور چلے جارہے ہیں، تو گھوڑا جہاں قدم رکھتا ہے وہیں سبزہ اُگ آتا ہے، تو اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ جبریل کے گھوڑے کے قدموں کی جو مٹی ہے اس میں تاثیرِ حیات ہے، وہ مٹی اس نے محفوظ رکھ لی، اور سونے کا بچھڑا بنایا، بچھڑا بنانے کے بعد اس میں وہ مٹی ڈال دی، مٹی ڈالنے کے ساتھ اس بچھڑے کے اندر اس درجے کی حیات پیدا ہوگئی کہ وہ گائے کی طرح بولنے لگ گیا، یہ بھی روایات میں مذکور ہے، گائے کی طرح بولنے لگ گیا، اتنا سا اس میں زندگی کا اثر آگیا۔ پہلے قول کا مطلب یہ تھا کہ اس میں زندگی کا اثر نہیں تھا، اس کی بناوٹ ایسی تھی کہ ہوا گزرنے کے ساتھ اس میں یوں آواز پیدا ہوتی تھی، دوسرے قول کا مطلب یہ ہے کہ اس نے وہ بچھڑا بنایا، بنانے کے بعد جبریل علیہ السلام کے گھوڑے کے قدموں کی مٹی اس میں ڈالی تو اس درجے کی اس میں زندگی آگئی، زندگی آنے کے ساتھ وہ گائے کی طرح بولنے لگ گیا، ڈکارنے لگ گیا، جس طرح سے گائے یا بچھڑا بولا کرتا ہے، جب اس نے یہ کرتب دکھایا تو اس کے ساتھ شرارتی قسم کے لوگ اور بھی مل گئے، اور وہ کہنے لگے: هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى: یہ ہے اصل میں تمہارا اور موسیٰ کا اِلٰہ۔ اور گائے پرستی مصر میں پہلے ہی تھی، لوگ گائے کے بتوں کو پُوجتے تھے اور کافروں کے گھروں میں رہنے کی وجہ سے، بُت پرست قوم کے ساتھ خلط ملط ہونے کی وجہ سے ان کا ذوق بھی گائے پرستی کا تھا، تو لوگ اسی کے پیچھے لگ گئے اور اسی کو پُوجنے لگ گئے اور اسی کو اِلٰہ بنالیا۔ اب بنی اسرائیل کے اندر پھوٹ پڑگئی، حضرت ہارون علیہ السلام ان کو ہر طرح سے سمجھاتے تھے لیکن یہ نہ سمجھے، موسیٰ علیہ السلام کے آنے تک یہ قوم فتنے میں مبتلا ہوگئی۔ اگلے رکوع کے اندر اس کی کچھ مزید تفصیل آرہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے طور کے اوپر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اطلاع دی کہ آپ کے آنے کے بعد تو ہم نے آپ کی قوم کو فتنے میں ڈال دیا اور سامری نے تیری قوم کو گمراہ کردیا، آگے اس واقعے کی طرف اشارہ ہے۔

بنی اسرائیل پر اِنعاماتِ اِلٰہی

''ہم نے وعدہ لیا تم سے طور کی دائیں جانب کا، اور اُتارا ہم نے تم پر منّ وسلویٰ'' یہ واقعات آپ کے سامنے پہلے سورۂ بقرہ میں اور سورۂ اَعراف میں گزر چکے ہیں۔ ''سلویٰ'' یہ پرندے ہیں، یہ کثرت کے ساتھ پیدا ہوگئے تھے، آسانی کے ساتھ پکڑے جاتے، اپنی ضرورت کے مطابق ان کو پکڑتے، پکڑ کے کھالیتے، یہ جو کہتے ہیں کہ بھنے بھنائے، پکے پکائے اُترتے تھے، ایسا نہیں، بلکہ بٹیر وغیرہ کثرت سے پیدا ہوگئے جن کو آسانی سے پکڑ کے بقدرِ ضرورت کھاسکتے تھے۔ اور ''منّ'' بھی کوئی ایسی چیز تھی جو درختوں پر کثرت سے پیدا ہوتی، یہ شبنم کی طرح رات کو برستی تھی اور یہ کوئی میٹھی چیز تھی۔ ''کھاؤ ان پاکیزہ چیزوں میں سے جو ہم نے تمہیں دی، اور اس میں سرکشی اختیار نہ کرو، شکرگزار رہو'' اس کو کھاکے مستیاں نہ کرنا، اللہ کی نافرمانی نہ کرنا '' پھر تم پہ میرا غضب اُتر آئے گا، جس پر میرا غضب اُتر آیا وہ برباد ہوگیا۔'' اور آگے ترغیب دے دی کہ ''جو شخص بھی توبہ اور ایمان کا راستہ اختیار کرے اور نیک عمل اختیار کرے پھر اسی پر قائم رہے تو اللہ اس کو بہت بخشنے والا ہے۔''

موسیٰ علیہ السلام طور پر جلدی کیوں گئے؟

آگے وہ واقعہ ہے جس کی کچھ تفصیل میں نے آپ کی خدمت میں عرض کی کہ موسیٰ علیہ السلام جو اللہ تعالیٰ کے متعین کیے ہوئے

وقت سے کچھ جلدی پہنچ گئے تو اللہ تعالیٰ نے پوچھا کہ اپنی قوم کو چھوڑ کے اتنی جلدی کیوں آ گئے ہو؟ کس چیز نے تمہیں براہیختہ کیا ہے؟ موسیٰ علیہ السلام کہنے لگے: یا اللہ! وہ میرے پیچھے ہی ہیں، قریب ہی ہیں، دُور نہیں ہیں، یا جن لوگوں کو آنے کے لیے کہا تھا تو ان کا خیال یہ تھا کہ وہ پیچھے قریب ہی آ رہے ہوں گے۔ اور میں جلدی جلدی اس لیے آ گیا تا کہ میرے شوق ذوق کو دیکھ کے تو خوش ہو جائے، کہ جب کسی کو بُلایا جائے اور وہ ذوق شوق کے ساتھ وقت سے پہلے پہنچ جائے تو مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ خوش ہو جائے گا کہ دیکھو! میں نے بُلایا تھا، اور یہ کتنا جلدی آ گیا۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام اسی جذبے سے جلدی پہنچ گئے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اطلاع دی کہ آپ کے آنے کے بعد تو آپ کی قوم فتنے میں پڑ گئی اور سامری نے ان کو گمراہ کر دیا، ظاہری طور پر سبب چونکہ سامری بنا تھا اس لیے ''اَضَلَّ'' کی نسبت اس کی طرف کی گئی، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ امتحان پیش آیا تھا جس کی بناء پر فَتَنَّا میں اللہ تعالیٰ نے نسبت اپنی طرف کی ہے۔ ''ہم نے فتنے میں ڈال دیا تیری قوم کو تیرے بعد، اور گمراہ کر دیا ان کو سامری نے۔''

موسیٰ علیہ السلام کا قوم کو ڈانٹنا اور قوم کی طرف سے جواب

موسیٰ علیہ السلام نے چالیس دِن وہاں گزارے، چالیس دِن کے بعد تورات مل گئی، تورات کو لے کر جب موسیٰ علیہ السلام واپس آئے ہیں، تو پہلے تو آ کے اپنی قوم کو ڈانٹا، ''لوٹے موسیٰ اپنی قوم کی طرف غصے سے بھرے ہوئے افسوس کرتے ہوئے۔'' پہلے تو قوم کو خطاب کیا کہ اے میری قوم! کیا تم سے تمہارے رَبّ نے اچھا وعدہ نہیں کیا تھا کہ میں تمہیں جلدی کتاب دوں گا، پھر تم اس کے مطابق زندگی گزارنا، کیا اس وعدے کے اوپر وقت زیادہ گزر گیا تھا کہ تم مایوس ہو گئے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تو کوئی قانون کی کتاب آتی نہیں، چلو ہم ہی اپنے لیے کوئی تجویز کر لیں۔ یا تم اس قسم کے بدبخت ہو کہ تم نے یہی چاہا ہے کہ تم پر اللہ کا غضب اُترے، تم نے میرے وعدے کے خلاف کیا، تم نے وعدہ کیا تھا کہ ہم ٹھیک رہیں گے، انتظام بحال رکھیں گے، کوئی غلط حرکت نہیں کریں، لیکن میرے بعد تم ان سب باتوں کو چھوڑ بیٹھے، میرے وعدے کے خلاف کر لیا۔ انہوں نے آگے سے عذر کیا یعنی قوم کے ان افراد نے جو کہ اس فتنے میں مبتلا ہو گئے تھے (حضرت ہارون علیہ السلام کی گفتگو آگے آ رہی ہے) یہ جو فتنے میں مبتلا ہو گئے تھے یہ کہنے لگے کہ ہم نے اپنے اختیار سے آپ کے وعدے کے خلاف نہیں کیا بلکہ حالات ہی ایسے پیدا ہو گئے تھے کہ ہم مجبور ہو گئے، یہ مجبوری ویسے ہی ہے جس طرح سے کوئی شخص دلیل کے سامنے مجبور ہو جاتا ہے دوسرے کی بات ماننے کے لئے، گویا کہ ان کے دماغ کی ساخت ایسی تھی کہ سامری کی باتیں سن کر اس بارے میں انہوں نے اپنے اندر قوت ہی نہیں پائی کہ اس کے خیالات کا دفاع کریں، اور اس کے پیدا کیے ہوئے شبہات کو دُور کر سکیں، اس کے اشکالات سے متاثر نہ ہوں، اس کی دلیل سے متاثر نہ ہوں، انہوں نے اپنے اندر اتنی قوت نہیں پائی، بلکہ جب اس نے ایک نعرہ لگایا تو بے اختیار یہ بھی اس کے پیچھے ہو لیے۔ تو یہ بے اختیاری وہی دلیل کے سامنے ہے، ایک آدمی میں اتنی قوت ہوتی ہے کہ دوسرا شخص آ کے اس کے سامنے غلط بات کرتا ہے تو یہ اس کی تردید کرتا ہے، اس کا دل دماغ اُس کو قبول نہیں کرتا، اور ایک ایسا ہوتا ہے کہ دلیل کے سامنے ایسے دب گیا کہ اس کا دماغ ماننے کے لیے مجبور ہو گیا۔

''ہم نے تیرے وعدے کے خلاف اپنے اختیار سے نہیں کیا، لیکن ہم اٹھائے گئے تھے قوم کی زینت میں سے بوجھ'' یعنی ہم پر بوجھ پڑے ہوئے تھے، ''ہم نے وہ ڈال دیے، ایسے ہی سامری نے ڈال دیے'' یہ جو لفظ ہیں ان کی تفسیر میں نے آپ کے سامنے کی کہ فرعونیوں کے زیورات ان کے پاس تھے جن کو یہ اپنے پاس رکھنا جائز نہیں سمجھتے تھے، وہ اتار کے انہوں نے پھینکے، سامری نے بھی پھینکا، بعد میں سامری نے اس کو پگھلا کر بچھڑے کی شکل بنادی۔ تو اَوۡزَارًا مِّنۡ زِیۡنَۃِ الۡقَوۡمِ کی تفسیر عام طور پر یہی کی گئی ہے۔

''لٰکِنَّا حُمِّلۡنَاۤ اَوۡزَارًا مِّنۡ زِیۡنَۃِ الۡقَوۡمِ'' کا دُوسرا مفہوم

لیکن بعض حضرات نے یوں بھی کہا کہ یہ چونکہ صرف اسرائیلی روایت ہے کہ انہوں نے فرعونیوں سے زیورات مستعار لیے تھے، اور ان مستعار زیورات کو لے کر وہ ہجرت کر گئے تھے، بعد میں اکٹھے کیے گئے، یہ اسرائیلی روایت ہے، اگر اس کا اعتبار نہ کیا جائے تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ قوم کے اپنے زیورات جو سونا چاندی کے تھے وہ بعض ذمہ دار آدمیوں کے پاس جمع تھے، جیسے سفر کے وقت میں کمزور قسم کے لوگ یا چھوٹے قسم کے لوگ بڑوں کے پاس امانت رکھ دیا کرتے ہیں، تو جب وہاں جا کے ٹھہرے تو انہوں نے وہ بوجھ ادا کر دیا، قوم کی طرف لوٹا دیا، لیکن قوم اپنے طور پر ان زیورات کو کہاں سنبھالتی، یہ ایک مسئلہ تھا۔ تو مشورہ کر کے انہوں نے کہا کہ سارے کے سارے زیورات اکٹھے کر دو، اکٹھے کرنے کے بعد پگھلا کے اس کی اینٹیں یا سلاخیں بنائی جائیں تاکہ ان کا سنبھالنا آسان ہو، اور اس سونے کے پگھلانے پر اور اس قسم کی چیز بنانے پر متعین کر دیا سامری کو، چونکہ یہ اس قسم کا کام جانتا تھا، تو اس نے ان کو پگھلا کر اس کی سلاخیں یا اینٹیں بنانے کی بجائے ایک بچھڑا بنا دیا، اور اس طرح سے قوم کے لئے ایک فتنہ کھڑا کر دیا، تو پھر زِیۡنَۃِ الۡقَوۡمِ سے اپنی قوم کے زیورات مراد ہیں، اور حُمِّلۡنَاۤ کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ذمہ دار اشخاص کہنے لگے کہ یہ ہم پر خواہ مخواہ بوجھ پڑا ہوا تھا، ہم نے وہ اتار پھینکا، قوم کو واپس کر دیا۔ اور قوم نے اس کو جمع کر کے چاہا کہ کوئی ایسی چیز بنائی جائے جس کی بنا پر اس کا سنبھالنا آسان ہو، ہر کوئی اپنے اپنے زیورات کہاں سنبھالتا پھرے گا، اور ان زیورات کو پگھلانے کے لیے متعین کر دیا سامری کو، تو اس نے یہ تماشا بنا دیا۔ تو چاہے یہ زیورات فرعونیوں کے تھے جو ان کے پاس مستعار آئے تھے، یا وہ زیوارت اپنی قوم کے ہی تھے جو ذمہ دار آدمیوں کے پاس بطور امانت کے پڑے ہوئے تھے، پھر انہوں نے اس قوم کی طرف لوٹا دیے اور قوم نے ان کو پگھلا کے سنبھالنے کے لئے کوئی آسان سی چیز بنانی چاہی، جس کو سامری نے بچھڑے کی شکل دے دی، یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سامری نے تحریک چلائی ہو اور یہ کہا ہو کہ اپنے زیورات چندے میں دو تو میں تمہیں ایک عجیب چیز بنا کے دیتا ہوں، اور قوم نے وہ سارے کے سارے اتار پھینکے سامری کے کہنے پر، یہ ساری صورتیں اس میں محتمل ہیں۔ فَکَذٰلِکَ اَلۡقَی السَّامِرِیُّ کا یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ جو زیورات سامری کے پاس تھے اس نے بھی ڈال دیے، یا اس کا مفہوم وہی ہے جو میں نے روایات کی روشنی میں عرض کیا کہ اس کے پاس کوئی ایسی مٹی تھی جس کے اندر حیات کا اثر تھا، جبریل علیہ السلام کے گھوڑے کے پاؤں کے نیچے سے اٹھائی تھی، اس نے وہ مٹی اس میں ڈال دی، اور ڈالنے کے بعد وہ ایک بچھڑا جاندار بن گیا، یا اس بچھڑے کی بناوٹ ایسی تھی کہ ہوا

کے گزرنے کے ساتھ اس میں سے گائے جیسی آواز پیدا ہوتی تھی، یہ ہے جو اس نے کرشمہ دکھایا۔ ''ایسے ہی ڈال دیا سامری نے، پھر سامری نے ان کے لئے ایک بچھڑا نکالا جو کہ ایک جسد تھا'' جسد کا معنی کمالات سے خالی، صرف ایک وجود ہی وجود تھا، لَّهٗ خُوَارٌ: اتنی بات تھی کہ اس کے لئے گائے کی سی آواز پیدا ہوگئی، آواز پیدا کیسے ہوگئی؟ اس کی دونوں صورتیں ہیں، جیسے آپ کی خدمت میں عرض کی گئیں۔ تو کہنے لگے یعنی سامری اور اس کے ساتھ والے دوسرے لوگ جو فتنہ پرداز تھے کہنے لگے هٰذَآ اِلٰـهُكُمْ وَاِلٰـهُ مُوْسٰى: یعنی وہی بت پرستانہ ذہنیت، جیسے مصر کے اندر پہلے گائے کو پوجا جاتا تھا، اور گائے کو لوگ الٰہ سمجھتے تھے، اسی طرح سے اس بنے ہوئے بچھڑے کے متعلق بھی وہی نعرہ لگا دیا گیا۔ اور موسیٰ علیہ السلام کے متعلق کہہ دیا کہ ان کو تو مغالطہ لگ گیا، وہ تو بھول گئے، کہ طور کے اوپر اپنے الٰہ سے ملنے چلے گئے، الٰہ تو یہ ہے۔

اسرائیلیوں کی حماقت کا بیان

اگلے الفاظ میں صرف ان کی حماقت بیان کی گئی ہے کہ ان احمقوں نے یہ تو دیکھ لیا کہ بچھڑے کی شکل ہے اور اس میں خُوَارٌ یعنی گائے کی آواز پیدا ہوگئی، لیکن خدا کوئی کھلونا نہیں ہوا کرتا کہ جس کو لوگ دل بہلانے کے لئے اختیار کرتے ہوں، کہ کھڑا کر لیا، بھاں بھاں کرتا ہے، دیکھ کے طبیعت خوش ہو رہی ہے کہ چلو! یہ اِلٰہ ہے۔ تو اِلٰہ دِل بہلانے کے لیے اختیار نہیں کیا جاتا، اِلٰہ کھلونا نہیں ہوتا، وہ تو زندگی کی ایک ناگزیر ضرورت ہے، کہ اس کے بغیر انسان کی ضرورت پوری نہیں ہوتی، انسان اس کی مدد کا محتاج ہے، اس سے ہدایت حاصل کرنے کا محتاج ہے، اور جو انسان کی راہنمائی نہ کر سکے اور اس کو نقصان سے بچا نہ سکے، نفع پہنچا نہ سکے، تو پھر اس کھلونے کو پُوجنے کیا فائدہ؟ اس اِلٰہ کی بندگی کرنے کا کیا فائدہ؟ اور اس کے سامنے جھکنے کا کیا فائدہ؟ اگر ہم نے کوئی اِلٰہ مانا ہے اور اس کے سامنے ہم جھک رہے ہیں، اور اس کی عبادت کر رہے ہیں تو اس ضرورت کی بنا پر کہ اس کے بغیر راہنمائی حاصل نہیں ہوتی، اور اس کے بغیر ہم نقصان سے بچ نہیں سکتے، نفع حاصل نہیں کر سکتے، دفعِ مضرّت کے لئے اور جلبِ منفعت کے لئے اِلٰہ ماننے کی ضرورت ہے، اور زندگی میں راہنمائی حاصل کرنے کے لئے اِلٰہ ماننے کی ضرورت ہے، ورنہ یہ کوئی کھیل تماشا تو ہے نہیں کہ کھیل تماشے کے طور پر کسی کو اِلٰہ مان لو۔ اب یہ دونوں باتیں ہی اس میں نہیں تھیں، اگر یہ اس سے کچھ پوچھتے تو وہ جواب نہیں دیتا تھا، اور نہ ان کے لئے دفعِ مضرّت کا اختیار رکھتا تھا نہ حصولِ منفعت کا، ان احمقوں کو یہ بات سمجھ میں نہیں آئی؟ صرف اس کی آواز سُن کے اس کو اِلٰہ مان بیٹھے، یہ تو کھلونا ہے اور اِلٰہ کوئی کھلونے کے طور پر نہیں مانا جایا کرتا، نہ وہ زندگی کا کوئی بہلاوا ہے، بلکہ وہ تو ایک ضرورت ہے جس ضرورت کی بنیاد پر اختیار کیا جاتا ہے، اور بنیادی ضرورت یہی ہے کہ ہمیں دفعِ مضرّت کے لئے اور جلبِ منفعت کے لئے وہ کام آئے، اور ہم اپنی زندگی گزارنے کے لیے اس سے ہدایت طلب کریں تو وہ ہمارے لیے ہدایت کا باعث ہو، اور یہ دونوں باتیں اس میں نہیں تھیں۔ ''کیا یہ دیکھتے نہیں تھے کہ وہ ان کی طرف کوئی بات ہی نہیں لوٹاتا'' یہ اس سے کچھ پوچھنا چاہیں تو سوائے بھاں بھاں کے اس کے پلّے ہے ہی کچھ نہیں، ان کو کوئی جواب نہیں دیتا، اور نہ وہ ان کے لئے دفعِ مضرّت کا

اختیار رکھتا ہے نہ حصول منفعت کا، تو ایک عاجز سی مخلوق اور ایک کھلونے کو ان لوگوں نے الہ کس طرح سے کہہ دیا؟ ان کو یہ بات سمجھ میں نہیں آئی؟ یہ مطلب ہے ان الفاظ کا کہ ''کیا یہ دیکھتے نہیں؟ کہ نہیں لوٹاتا وہ ان کی طرف بات، اور نہیں اختیار رکھتا ان کے لیے'' ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اس میں مضاف محذوف نکالیں گے، نقصان دفع کرنے کا اور نفع پہنچانے کا، وہ کوئی کسی قسم کا اختیار نہیں رکھتا۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ وَاِنَّ رَبَّكُمُ
ہارون نے ان لوگوں کو اس سے پہلے کہا: اے میری قوم! بے شک تم اس عجل کی وجہ سے فتنے میں ڈال دیے گئے اور بے شک تمہارا رب
الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ وَاَطِيْعُوْٓا اَمْرِيْ ﴿۹۰﴾ قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ حَتّٰى يَرْجِعَ
رحمٰن ہے پس تم میری پیروی کرو اور میرا کہنا مانو ﴿۹۰﴾ وہ کہنے لگے کہ ہمیشہ رہیں گے ہم اس پر جم کے بیٹھنے والے حتیٰ کہ لوٹ آئے
اِلَيْنَا مُوْسٰى ﴿۹۱﴾ قَالَ يٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْٓا ﴿۹۲﴾ اَلَّا
ہماری طرف موسیٰ ﴿۹۱﴾ موسیٰ نے کہا: اے ہارون! کس چیز نے روکا تجھے جس وقت تو نے دیکھا ان کو کہ یہ گمراہ ہو گئے ﴿۹۲﴾ کہ تو نے
تَتَّبِعَنِ ؕ اَفَعَصَيْتَ اَمْرِيْ ﴿۹۳﴾ قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْيَتِيْ وَلَا بِرَاْسِيْ ۚ
میری پیروی نہ کی، کیا پھر تو نے میرے حکم کی نافرمانی کی؟ ﴿۹۳﴾ ہارون نے کہا: اے میری ماں جائے! میری داڑھی نہ پکڑ اور میرا سر نہ پکڑ،
اِنِّيْ خَشِيْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِيْ ﴿۹۴﴾
بے شک میں نے اندیشہ کیا کہ تو کہے گا کہ پھوٹ ڈال دی تو نے بنی اسرائیل کے درمیان اور تو نے میری بات کی رعایت نہیں رکھی ﴿۹۴﴾
قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ ﴿۹۵﴾ قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ فَقَبَضْتُ
موسیٰ علیہ السلام نے کہا: کیا واقعہ ہے تیرا اے سامری! ﴿۹۵﴾ سامری نے کہا کہ دیکھی میں نے ایسی چیز جو ان لوگوں نے نہیں دیکھی پھر رسول کے
قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ ﴿۹۶﴾ قَالَ
نقش قدم سے میں نے مٹھی بھر لی پھر میں نے اس قبضے کو ڈال دیا، ایسے ہی بات بنائی میرے لیے میرے نفس نے ﴿۹۶﴾ موسیٰ علیہ السلام نے کہا
فَاذْهَبْ فَاِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ ۪ وَاِنَّ لَكَ مَوْعِدًا
کہ چلا جا! پس بے شک تیرے لئے زندگی میں یہ بات ہے کہ تو یہ کہتا پھرے گا کہ مجھے ہاتھ مت لگا! اور تیرے لیے ایک وعدہ ہے

لَّنْ تُخْلَفَهٗ ۚ وَانْظُرْ اِلٰٓى اِلٰهِكَ الَّذِىْ ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا ۭ لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ

جس کے تُو خلاف نہیں کیا جائے گا، اور دیکھ تُو اپنے اس الٰہ کی طرف جس کے اُوپر تُو جم کے بیٹھا ہوا تھا، البتہ ضرور جلا دیں گے ہم اسے پھر

لَنَنْسِفَنَّهٗ فِى الْيَمِّ نَسْفًا ۝۹۷ اِنَّمَآ اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِىْ لَآ اِلٰهَ

البتہ ضرور بکھیر دیں گے ہم اسے سمندر میں اچھی طرح سے بکھیرنا ۹۷ اس کے سوا کچھ نہیں کہ تمہارا معبود وہی اللہ ہے جس کے بغیر

اِلَّا هُوَ ۭ وَسِعَ كُلَّ شَىْءٍ عِلْمًا ۝۹۸ كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ مَا

کوئی دوسرا معبود نہیں، وسیع ہے وہ ہر چیز سے از روئے علم کے ۹۸ اسی طرح بیان کرتے ہیں ہم آپ پر اس کی خبروں میں سے جو

قَدْ سَبَقَ ۚ وَقَدْ اٰتَيْنٰكَ مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا ۝۹۹ مَنْ اَعْرَضَ عَنْهُ فَاِنَّهٗ يَحْمِلُ

پہلے ہو چکا اور تحقیق ہم نے آپ کو اپنی طرف سے ایک نصیحت دی ہے ۹۹ جو اس ذِکر سے اعراض کرے گا پس بے شک وہ اُٹھائے گا

يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وِزْرًا ۝۱۰۰ خٰلِدِيْنَ فِيْهِ ۭ وَسَآءَ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ حِمْلًا ۝۱۰۱ يَّوْمَ يُنْفَخُ

قیامت کے دِن بوجھ ۱۰۰ ہمیشہ رہیں گے اس بوجھ میں، اور بُرا ہے ان کے لئے قیامت کے دِن اُٹھایا ہوا بوجھ ۱۰۱ جس دِن کہ صور میں

فِى الصُّوْرِ وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ زُرْقًا ۝۱۰۲ يَّتَخَافَتُوْنَ

پھونک ماری جائے گی اور جمع کریں گے ہم مجرموں کو اس دِن اس حال میں کہ وہ نیلی آنکھوں والے ہوں گے ۱۰۲ آپس میں چپکے چپکے

بَيْنَهُمْ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا عَشْرًا ۝۱۰۳ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ اِذْ يَقُوْلُ اَمْثَلُهُمْ

باتیں کریں گے کہ نہیں ٹھہرے ہو تم مگر دس دِن ۱۰۳ ہم زیادہ جاننے والے ہیں اس بات کو جو وہ کہیں گے جبکہ کہے گا ان میں سے

طَرِيْقَةً اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا يَوْمًا ۝۱۰۴

بہتر از روئے طریقہ کے: نہیں ٹھہرے ہو تم مگر ایک دِن ۱۰۴

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۔ وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ: لَقَدْ تاکید کے لئے ہوتا ہے۔ ہارون علیہ السلام نے ان لوگوں کو اس سے پہلے کہا: يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ: اے میری قوم! بے شک تم اس عجل کی وجہ سے فتنے میں ڈال دیے گئے، وَاِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ: اور بے شک تمہارا رَبّ رحمٰن ہے فَاتَّبِعُوْنِىْ: پس تم میری پیروی کرو، وَاَطِيْعُوْٓا اَمْرِىْ: اور میرا کہنا مانو۔ قَالُوْا وہ کہنے لگے لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ

عٰكِفِيْنَ: ہمیشہ رہیں گے ہم اس بچھڑے پر ہی اعتکاف کرنے والے، جم کے بیٹھنے والے۔ عٰكِفِيْنَ یہ عکوف سے لیا گیا ہے، سورۂ بقرہ میں یہ لفظ آپ کے سامنے گزر اتھا اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ (آیت: ۱۲۵) اور آگے سورۂ انبیاء میں بھی آئے گا مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْۤ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ (آیت: ۵۲)۔ ''ہمیشہ رہیں گے ہم اس پر جم کے بیٹھنے والے'' حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْنَا مُوْسٰى، حتّٰی کے بعد محاورۂ نفی کا ترجمہ ہوتا ہے۔ جب تک کہ موسیٰ علیہ السلام ہماری طرف لوٹ کے نہ آ جائے۔ اور اگر نفی ظاہر نہ کرنی ہو تو پھر معنی یوں کریں گے: حتّٰی کہ لوٹ آئے ہماری طرف موسیٰ علیہ السلام۔ جب تک موسیٰ ہماری طرف لوٹ کر نہ آئے ہم اس بچھڑے پر ہمیشہ جمے رہیں گے۔ قَالَ: موسیٰ علیہ السلام نے کہا يٰهٰرُوْنُ: اے ہارون! مَا مَنَعَكَ: تجھے کس چیز نے روکا، اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْۤا: جب تو نے انہیں دیکھا تھا کہ یہ بھٹک گئے اَلَّا تَتَّبِعَنِ: نون کے نیچے جو کسرہ ہے وہ یائے متکلم پر دال ہے، اب یہاں بھی ''اَنْ'' کے بعد جو 'لا' ہے اس کو زائدہ قرار دیا گیا ہے، اور ''اَن'' فعل کو مصدر کی تاویل میں کر دے گا، ترجمہ یوں ہو جائے گا کہ ''کس چیز نے روکا تجھے جس وقت تو نے دیکھا ان کو کہ یہ گمراہ ہو گئے میری اتباع کرنے سے'' تجھے میری اتباع کرنے سے کس چیز نے روکا۔ اور اگر 'لا' کا معنی ظاہر کرنا ہو تو پھر بھی ترجمہ ہو سکتا ہے، تجھے کس چیز نے روکا جب تُو نے ان کو دیکھا کہ وہ گمراہ ہو گئے تھے کہ تُو نے میری پیروی نہ کی۔ اَفَعَصَيْتَ اَمْرِيْ: کیا پھر تُو نے میرے حکم کی نافرمانی کی؟ قَالَ يَبْنَؤُمَّ: ہارون علیہ السلام نے کہا: يَبْنَؤُمَّ اصل میں ''يَا ابْنَ اُمِّيْ'' ہے، اے میری ماں جائے! اے میری ماں کے بیٹے! ماں کی طرف نسبت شفقتاً ہے، ورنہ یہ نہیں کہ وہ باپ کی طرف سے بیٹے نہیں تھے، موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام حقیقی بھائی ہیں، ماں کی طرف نسبت شفقتاً ہے، شفقت ابھارنے کے لئے۔ اے میری ماں جائے! ''کافیہ'' میں آپ تاویل پڑھی ہوں گی کہ اُمِّيْ، اُمَّا، اور پھر الف کو گرا کے اُمَّ۔ یوں يَبْنَؤُمَّ ہو گیا۔ اے میری ماں جائے! لَا تَاْخُذْ بِلِحْيَتِيْ میری داڑھی نہ پکڑ، وَلَا بِرَاْسِيْ اور نہ میرا سر پکڑ، اِنِّيْ خَشِيْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ بے شک میں نے اندیشہ کیا کہ تُو کہے گا کہ پھوٹ ڈال دی تُو نے بنی اسرائیل کے درمیان، تفریق ڈال دی، ان کے فرقے بنا دیے، وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِيْ: اور تُو نے میری بات کی رعایت نہیں رکھی، میری بات کا لحاظ نہیں رکھا، خیال نہیں رکھا میری بات کا۔ یہ بھی تَقُوْلَ کے نیچے داخل ہے، ''تُو کہے گا کہ پھوٹ ڈال دی تُو نے بنی اسرائیل کے درمیان، اور میری بات کا تُو نے خیال نہیں رکھا، میری بات کا دھیان نہیں رکھا'' قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ: موسیٰ علیہ السلام نے کہا، کیا واقعہ ہے تیرا اے سامری! (سامری کا لفظ پہلے آپ کے سامنے ذکر ہو چکا) اے سامری! تیرا کیا واقعہ ہے؟ یہ تُو نے کیا کیا ہے؟ کیا کھیل کھیلا ہے؟ کیا گل کھلائے ہیں؟ خطب کہتے ہیں بڑے واقعے کو، آگے ستائیسویں پارے کی ابتدا میں بھی آئے گا قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ۔ خطب بڑے واقعے کو کہتے ہیں، ''یہ تیرا کیا واقعہ ہے؟'' یہ تُو نے کیا کیا؟ قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ: سامری نے کہا کہ دیکھی میں نے ایسی چیز جو ان لوگوں نے نہیں دیکھی۔ بصر سے یہاں بصر بالعین مراد ہے، آنکھ کے ساتھ دیکھنا۔ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ: پھر رسول کے نقش قدم سے میں نے مٹھی بھر لی۔ قبض بالید مٹھی بھرنے کے معنی میں۔ اور قبضة فَعْلَةٌ کے وزن پر ہے، جو مرۃ یعنی ایک مرتبہ کے لیے ہوتا ہے۔ اور اگر قُبضة ہو قاف کے ضمہ کے ساتھ، تو مٹھی بھر مقدار کو کہتے ہیں۔ یہ فَعلة فِعلة فُعلة یہ تین قسم کا مصدر جو آیا کرتا ہے اس کی تفصیل آپ نے ''نحو'' کے اندر پڑھی ہو گی، اَلْفَعْلَةُ لِلْمَرَّةِ وَالْفِعْلَةُ لِلْحَالَةِ وَالْفُعْلَةُ لِلْمِقْدَارِ۔ تو قَبَضَ: مٹھی بھرنا۔ قُبضة: مٹھی بھر مقدار۔ جیسے لَقَمَ: نگلنا۔ لُقمة: اتنی سی

مقدار جس کو ایک دفعہ نگلا جاسکے، اور جُرعۃ: گھونٹ، اتنا سا پانی جس کو ایک دفعہ پیا جا سکے۔ یہاں قَبْضَۃً چونکہ قاف کے فتح کے ساتھ ہے، تو اس کا معنی ہے کہ ایک مرتبہ میں نے مٹھی بھری، مِنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ: رسول کے نقشِ قدم سے۔ فَنَبَذْتُهَا: پھر میں نے اس قبضہ کو ڈال دیا۔ ''ھا'' ضمیر لفظوں میں قبضہ کی طرف لوٹ رہی ہے، اور مقصد یہ ہے کہ جس چیز کی میں نے مٹھی بھری تھی وہ مٹھی بھری ہوئی میں نے ڈال دی۔ وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ: ایسے ہی بات بنائی میرے لیے میرے نفس نے۔ سَوَّلَ تسویل، اور یہ لفظ آپ کے سامنے سورۂ یوسف میں دو دفعہ آیا تھا۔ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا۔ قَالَ فَاذْهَبْ: موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ چلا جا۔ یہ چونکہ ناراضگی کے مقام میں ہے، تو یہ دفع ہونے کے معنی میں ہے، دفع ہو، چلا جا۔ فَاِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ: پس بے شک تیرے لیے زندگی میں یہ بات ہے کہ تُو کہے گا لا مِسَاسَ۔ مساس یہ مَسّ سے ہے۔ باب مفاعلہ کا مصدر ہے قتال کی طرح، آپس میں چھونا۔ آپس میں چھونا نہیں ہے، مجھے ہاتھ مت لگاؤ، تو یہ کہتا پھرے گا کہ مجھے ہاتھ مت لگاؤ، مجھے مت چھوؤ، میرے قریب نہ آؤ۔ وَاِنَّ لَكَ مَوْعِدًا اور تیرے لیے ایک وعدہ ہے لَّنْ تُخْلَفَهٗ جس کے تُو خلاف نہیں کیا جائے گا۔ وَانْظُرْ اِلٰٓى اِلٰهِكَ الَّذِيْ ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا: اور دیکھ تو اپنے اس اِلٰہ کی طرف جس کے اوپر تُو جم کے بیٹھا ہوا تھا۔ ظَلْتَ، ظَلَّ سے ہے، جو افعال ناقصہ میں سے ہے، ظَلَّ اصل میں دِن کے وقت کام کرنے کو کہتے ہیں، ظَلَّ زَيْدٌ بَاكِيًا، زید نے روتے ہوئے دِن گزارا، جس طرح سے افعالِ ناقصہ کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔ تو جس پر تُو سارا دِن جما بیٹھا رہتا تھا اب اس کا حال دیکھ لے، لَنُحَرِّقَنَّهٗ: البتہ ضرور جلا دیں گے ہم اسے۔ تحریق: جلانا۔ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ: پھر البتہ ضرور بکھیر دیں گے ہم اسے، فِي الْيَمِّ: سمندر میں نَسْفًا: اچھی طرح سے بکھیرنا، ریزہ ریزہ اس کا بکھیر دیں گے۔ اِنَّمَآ اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ: اس کے سوا کچھ نہیں کہ تمہارا معبود وہی اللہ ہے جس کے بغیر کوئی دوسرا معبود نہیں، وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا: وہ ہر چیز سے علم کی رُو سے وسیع ہے، وسیع ہے وہ از روئے علم کے، یہ تمیز مُحَوَّلٌ عن الفاعل ہے، اس کے اندر فاعل والا معنی ہے یعنی اس کا علم ہر چیز سے وسیع ہے، ''وسیع ہے وہ ہر چیز سے از روئے علم کے'' كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ مَا قَدْ سَبَقَ: اسی طرح بیان کرتے ہیں ہم آپ پر، مَا قَدْ سَبَقَ، جو کچھ پہلے ہو چکا اس کی خبریں، اَنْۢبَآءِ نَبَأٌ کی جمع ہے، ''نبأ'' خبر کو کہتے ہیں۔ جو پہلے ہو چکا اس کی خبروں میں سے ہم آپ پر بیان کرتے ہیں، وَقَدْ اٰتَيْنٰكَ مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا: اور تحقیق ہم نے آپ کو اپنی طرف سے ایک نصیحت دی ہے، ذکر دیا ہے، یاددہانی دی ہے۔ ذکر کا مصداق یہاں یہی کتاب ہے جو کہ ذکر پر مشتمل ہے۔ مَنْ اَعْرَضَ عَنْهُ: جو اس ذکر سے اعراض کرے گا، منہ پھیرے گا، فَاِنَّهٗ يَحْمِلُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وِزْرًا: پس بے شک وہ اٹھائے گا قیامت کے دِن بوجھ، وِزر بوجھ کو کہتے ہیں، خٰلِدِيْنَ فِيْهِ: ہمیشہ رہیں گے اس بوجھ میں، وَسَآءَ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ حِمْلًا: اور بُرا ہے ان کے لئے قیامت کے دِن اُٹھایا ہوا بوجھ۔ حِمل اٹھائے ہوئے بوجھ کو کہتے ہیں۔ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ: جس دِن کہ صور میں پھونک ماری جائے گی، وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَىِٕذٍ زُرْقًا: زُرق ازرق کی جمع ہے، نیلگوں چشم، یہ بہت بدنما آنکھیں ہوتی ہیں، اور ایسا شخص دماغی طور پر انتہائی پریشان اور حیرت زدہ ہوتا ہے۔ اور جمع کریں گے ہم مجرموں کو اس دِن اس حال میں کہ وہ نیلی آنکھوں والے ہوں گے۔ يَّتَخَافَتُوْنَ بَيْنَهُمْ: آپس میں چپکے چپکے باتیں کریں گے، اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا عَشْرًا: باتیں یہ کریں گے۔ کہ نہیں ٹھہرے ہو تم مگر دس، آگے تمیز مذکور نہیں ہے، مراد ہیں دس راتیں، کیونکہ عشر کے آخر میں تاء نہ ہو تو اس کی تمیز مؤنث ہونی چاہیے، عشر لیالٍ، جیسے ثلاث

لیال۔ ثلاثۃ ایامٍ۔ یہاں بھی لَیَالٍ کا لفظ نکالیں گے۔ تو لیالٍ کا لفظ نکالو تو بھی رات دِن مراد ہیں، ایامٍ کا لفظ نکالو تو بھی رات دِن مراد ہیں۔ نہیں ٹھہرے ہو تم مگر دس دِن، یا دس راتیں، بات ایک ہی ہے، رات سے تعبیر کر دیا جائے تو بھی ٹھیک ہے، دِن سے تعبیر کر دیا جائے تو بھی ٹھیک ہے۔ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ: ہم زیادہ جاننے والے ہیں اس بات کو جو وہ کہیں گے، جو وہ کہیں گے ہم اس کو خوب جانتے ہیں، اِذْ يَقُوْلُ اَمْثَلُهُمْ طَرِيْقَةً: جبکہ کہے گا ان میں سے بہتر از روئے طریقہ کے، یعنی ایسا شخص جو طریقہ کے اعتبار سے بہتر ہے، جس کی سوچ بچار کا طریقہ بمقابلہ ان کے اچھا ہے، جس کی روش اچھی ہے، اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا يَوْمًا: نہیں ٹھہرے ہو تم مگر ایک دِن۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط

پچھلے رکوع سے واقعہ چلا آ رہا ہے بنی اسرائیل کے گمراہ ہو جانے کا سامری کے بنائے ہوئے بچھڑے کی وجہ سے، حضرت موسیٰ علیہ السلام جس وقت واپس آئے تھے تو آ کے سب سے پہلے تو قوم کو خطاب کیا تھا، اور ان کے اوپر ناراضگی کا اظہار کیا تھا، پچھلے رکوع کے آخر میں اسی بات کا ذکر تھا، اور پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام ہارون علیہ السلام کی طرف متوجہ ہوئے، ہارون علیہ السلام عمر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بڑے ہیں، یہ موسیٰ علیہ السلام کے بڑے بھائی ہیں، لیکن آپ نے پیچھے تفصیل سُن لی کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دُعا کر کے ان کو نبوّت دلائی تھی، اور اپنے لیے وزیر مانگا تھا، تو حضرت ہارون علیہ السلام کی حیثیت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ایسے تھی جس طرح سے بادشاہ کے ساتھ وزیر کی ہوتی ہے، گویا کہ تمام اُمور میں حضرت ہارون علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام کے تابع تھے۔ موسیٰ علیہ السلام اگرچہ عمر میں چھوٹے ہیں لیکن اختیار واقتدار اور عہدے کے لحاظ سے بڑے ہیں، براہِ راست اللہ تعالیٰ کا معاملہ موسیٰ علیہ السلام سے چلتا ہے، کتاب موسیٰ علیہ السلام کو ملی اور اس کے ساتھ ہارون علیہ السلام اس کتاب کے مکلّف ٹھہرائے گئے، تبلیغ کے مکلّف ٹھہرائے گئے، اور اللہ تعالیٰ سے کلام کرنے کے لئے بھی طور پر موسیٰ علیہ السلام ہی جاتے تھے۔ جب یہ طور پر جارہے تھے تو حضرت ہارون علیہ السلام کو پیچھے اپنا جانشین متعین کر گئے تھے، اور یہ تاکید کی تھی کہ قوم کی اصلاح کرتے رہیو، اور مفسدین کے راستے پر نہ چلنا، یعنی کچھ شریر لوگ درمیان میں موجود ہیں، وہ کوئی شرارت اٹھائیں تو بچ کے رہنا، ان کی شرارت کا شکار نہ ہو جانا، قوم کا خیال رکھیو۔ تو موسیٰ علیہ السلام جاتے ہوئے حضرت ہارون علیہ السلام کو یہ تاکید کر گئے تھے، تو جب موسیٰ علیہ السلام تشریف لے گئے اور پیچھے سامری نے یہ ڈھونگ رچا لیا، اور قوم اس کے فتنے میں آ گئی، تو حضرت ہارون علیہ السلام نے اپنی ذمہ داری محسوس کرتے ہوئے بہت جان سوزی کے ساتھ قوم کو سمجھایا کہ تم باز آ جاؤ، یہ فتنہ ہے، یہ بچھڑا تمہارا اِلٰہ نہیں، تمہارا ربّ رحمٰن ہے، اور میری اتباع کرو، میری بات مانو، اور اس گمراہ کے پیچھے نہ لگو، حضرت ہارون علیہ السلام نے خوب اچھی طرح سے سمجھایا لیکن حضرت ہارون علیہ السلام کا مزاج موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں کچھ نرم معلوم ہوتا ہے، اور یہ قوم سختی کی عادی تھی، یہ نرمی سے کہاں مانتی۔ تو ایسے وقت میں بعض لوگ تھے جو حضرت ہارون علیہ السلام کے ساتھ ہو لیے، اور بعض لوگ سامری کے فتنے کا شکار ہو گئے۔

ایک ہی مسئلے میں دو نبیوں کا اِختلافِ رائے

اب یہاں حضرت ہارون علیہ السلام کی سوچ کیا ہے؟ کہ ان کے ساتھ خلط ملط رہنا چاہیے یا اپنے ماننے والوں کو ان سے علیحدہ کر لینا چاہیے، حضرت ہارون علیہ السلام کا ذہن ادھر گیا کہ یوں ان کے ساتھ خلط ملط رہنا بہتر ہے، ہم اپنے طور پر ان کو سمجھاتے رہیں، اور جس وقت تک موسیٰ علیہ السلام نہیں آئیں گے ہماری اسی طرح سے کوشش جاری رہے گی، اور اگر میں نے اپنے ماننے والوں کو علیحدہ کر لیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قوم دو حصوں میں بٹ جائے گی، مستقل دو فرقے بن جائیں گے، اور ہوسکتا ہے کہ کسی مسئلے میں لڑائی ہو جائے تو قوم خونریزی میں مبتلا ہو جائے گی، جیسے کہ آثار تھے، آثار اس لیے تھے کہ حضرت ہارون علیہ السلام پر جس وقت موسیٰ علیہ السلام نے گرفت کی تو ہارون علیہ السلام نے یہ جواب دیا کہ اِنَّ الۡقَوۡمَ اسۡتَضۡعَفُوۡنِیۡ وَکَادُوۡا یَقۡتُلُوۡنَنِیۡ (سورۂ اعراف: ۱۵۰) کہ قوم نے مجھے کمزور سمجھا اور قریب تھا کہ مجھے قتل کر دیں، یعنی جب میں ان کو سمجھاتا تھا اور ان کو منع کرتا تھا تو وہ میرے ہی قتل کے درپے ہو گئے، اور مجھے انہوں نے سمجھا کہ یہ تو کمزور ہے اس کے ساتھ لوگ تھوڑے ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بچھڑا پوجنے والوں کے جذبات کیسے تھے، کہ منع کرنے والوں کے خلاف وہ کس طرح سے مشتعل تھے، تو اگر حضرت ہارون علیہ السلام ایک گروہ کو علیحدہ کر لیتے تو اندیشہ تھا کہ آپس میں اشتعال انگیزی سے لڑائی ہو جائے گی اور قوم خونریزی میں مبتلا ہو جائے گی، تو حالات کی اصلاح کے لئے تقاضا یہ ہے کہ آپس میں خلط ملط رہیں، ٹکراؤ نہ پیدا ہو، جہاں تک ہو سکے سمجھاتے رہیں، باقی! پھوٹ ڈالنا اور دو پارٹیاں بنا دینا مناسب نہیں، حضرت ہارون علیہ السلام کی سوچ اس طرح سے تھی۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سوچ یوں تھی کہ جس وقت ہارون علیہ السلام کے سمجھائے ہوئے یہ لوگ نہیں سمجھے تو ان کے ساتھ اکٹھے نہیں رہنا چاہیے تھا، اپنے ماننے والوں کو ساتھ لے کر میرے پیچھے آ جاتے، اور ان بدبختوں کو بالکل اپنے سے علیحدہ کر دیتے اور کاٹ دیتے۔ دیکھو! مسئلہ ایک ہے کہ قوم کے حالات کی اصلاح کا کیا تقاضا ہے، اور اس میں دو نبیوں کی دو رائیں ہیں، موسیٰ علیہ السلام کی رائے یہ ہے کہ ان سے بائیکاٹ کر دینا چاہیے تھا، اور اپنے ماننے والوں کو علیحدہ کر کے اس جماعت کو لے کے میرے پیچھے آ جاتے، اور ان کے ساتھ رہنا سہنا بالکل ترک کر دیتے، کھانا پینا بالکل ترک کر دیتے، ان سے علیحدگی اختیار کر لیتے، موسیٰ علیہ السلام کی سوچ یہ ہے، اور ہارون علیہ السلام کی سوچ یہ ہے کہ حالات کی اصلاح کا تقاضا یہ ہے کہ ہم ان سے ملتے جلتے رہیں، اگر ہم ملتے جلتے رہیں گے تو فساد زیادہ نہیں ہوگا، اور اگر ہم بالکل علیحدہ ہو گئے اور ان کو ہم نے بالکل علیحدہ کر دیا، ایک تو یہ پوری طرح سے شرارتیں مچائیں گے، پھر ہوسکتا ہے کہ اشتعال انگیزی کے ساتھ دونوں فریقوں میں لڑائی ہو جائے، خونریزی ہو جائے گی، بعد میں سمجھنا سمجھانا بھی ایک دوسرے کو مشکل ہو جائے گا، حضرت ہارون علیہ السلام کا ذہن ادھر چلا گیا، دونوں باتیں ہی اپنی جگہ صحیح ہیں، لیکن دونوں کی سوچ علیحدہ علیحدہ ہونے کی بناء پر ظاہری طور پر اختلاف ہوا۔

فقہاء کے اِختلافات کی حیثیت

اہلِ حق میں جو اِختلاف ہوا کرتا ہے اس کی نوعیت ایسی ہی ہے کہ نیت دونوں طرف صحیح ہوا کرتی ہے، لیکن ایک شخص بہتر یوں سمجھتا ہے، دوسرا شخص بہتر یوں سمجھتا ہے، اللہ تعالیٰ کے نزدیک دونوں ہی ٹھیک ہوتے ہیں، دونوں معذور ہوتے ہیں، کسی کے

او پر کوئی کسی قسم کا الزام نہیں ہوا کرتا، اپنے جتنے ائمہ فقہاء ان میں اختلافات اسی قسم کے ہیں، ایک ہی بات سامنے ہوتی ہے اور اس کے مطلب دو بن سکتے ہیں، ایک کے نزدیک یہ راجح ہے، دوسرے کے نزدیک وہ راجح ہے، جیسے یہاں موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کے درمیان میں اختلاف ہوا۔

موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کی گفتگو

تو حضرت موسیٰ علیہ السلام جب ہارون علیہ السلام کی طرف متوجہ ہوئے، چونکہ غصہ تو بہت چڑھا ہوا تھا، جیسے پچھلے رکوع میں لفظ آیا تھا: غَضْبَانَ اَسِفًا، اب ایک نبی اپنی قوم کو شرک میں مبتلا ہوتا ہوا دیکھ کر کیسے برداشت کرسکتا ہے، نبی کی فطرت شرک سے اتنا بُعد رکھتی ہے اور اتنی نفرت کرتی ہے کہ جتنا آپ اندازہ کرلیں۔ پہلے تو قوم پر غصہ تھا، قوم کو جھاڑا، اور حضرت ہارون علیہ السلام کو چونکہ براہِ راست ذمہ دار ٹھہرا کے گئے تھے تو غصہ حضرت ہارون علیہ السلام پر بھی ہے، حضرت ہارون علیہ السلام سامنے آئے، تو جس طرح سے دوسری جگہ ہے وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِيْهِ يَجُرُّهٗٓ اِلَيْهِ (سورۂ اعراف: ۱۵۰) کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تختیاں پکڑی ہوئی تھیں، جو تورات کی لے کر آئے تھے، اللہ تعالیٰ نے دی تھیں، جب ہارون علیہ السلام سامنے آئے تو موسیٰ علیہ السلام کو غصہ جو آیا، تو یہ ہمیشہ قاعدہ ہوتا ہے کہ آپ نے ایک چیز ہاتھ میں پکڑی ہوئی ہے اور سامنے کوئی شخص کھڑا ہے جس پر آپ کو غصہ آ گیا، تو غصہ آنے کی صورت میں یہ خیال بھی نہیں رہتا کہ میں اس کو ذرا آسانی سے رکھ دوں، بلکہ انسان اتنی تیزی سے رکھتا ہے، ایسے ہوتا ہے گویا کہ پھینک دی، اور جھپٹ پڑے حضرت ہارون علیہ السلام پر، جا کے سر سے پکڑ لیا، اور ایک ہاتھ داڑھی کی طرف بڑھایا، لگے ان کو اپنی طرف کھینچنے، کہ یہ کیا کیا؟ میں تجھے ذمہ دار ٹھہرا کر گیا تھا، یہ کیا قوم کی قوم برباد کر کے رکھ دی، تُو نے میرے قول کی رعایت کیوں نہیں کی؟ میں جو تجھے کہہ کے گیا تھا کہ قوم کی اصلاح کرنی ہے، تو میری بات کا تُو نے لحاظ کیوں نہیں رکھا؟ اب چونکہ موسیٰ علیہ السلام حاکم ہیں، ہارون علیہ السلام محکوم ہیں، موسیٰ علیہ السلام اصل ہیں اور ہارون علیہ السلام وزیر ہیں اور نائب ہیں، تو انتظامی اُمور میں چونکہ ماتحت تھے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی گرفت ہارون علیہ السلام پر ایسی ہے، جیسے کوئی شخص اپنے ماتحت پر گرفت کرتا ہے، اور غصہ اس لیے چڑھا ہوا ہے کہ شرک قابلِ برداشت نہیں، تو جس وقت سر اور داڑھی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور غصے کے ساتھ پکڑ کے اپنی طرف کھینچا تو حضرت ہارون علیہ السلام نہایت نرمی کے ساتھ کہتے ہیں کہ اے میری اَمّاں جائے! اے میرے بھائی! غصہ نہ کیجئے، مجھے آپ ظالموں کے ساتھ شامل نہ کیجئے، میرا کوئی کسی قسم کا کوئی قصور نہیں، جیسے آپ کے سامنے لفظ گزرے فَلَا تُشْمِتْ بِيَ الْاَعْدَآءَ (سورۂ اعراف: ۱۵۰) میرے ساتھ ایسا برتاؤ کر کے میرے دشمنوں کو خوش نہ کر کہ وہ کہیں دیکھو! ہم نے ان دونوں کو لڑا دیا، میری بات تو سنو، میں نے اپنی طرف سے پوری طرح انہیں سمجھایا، لیکن انہوں نے مجھے کمزور سمجھا، یہ تو میرے قتل کے درپے ہوگئے، اور انہوں نے یہ کہا کہ جب تک موسیٰ علیہ السلام واپس نہیں آئیں گے، ہم تو اپنے اسی طریقے پر رہیں گے، اب میں نے خیال کیا کہ اگر میں ان کو لے کر علیحدہ ہوگیا، تو تُو آ کے مجھے الزام دے گا کہ تُو نے پارٹی بازی کروا دی، میرا انتظار کرلیتے، جیسے کیسے تھے حالات کو برداشت کرتے، پھر تو میرے پہ یہ الزام دیتا کہ میری بات کا تُو نے خیال نہیں رکھا، قوم کے حالات کو سنوارنے کی بجائے ان میں تُو نے پارٹی بازی کروا دی، اس لیے میں ان کو لے کر علیحدہ نہیں ہوا۔

جیسے میں نے آپ کے سامنے پہلے تفصیل کی کہ حضرت ہارون علیہ السلام کی سوچ اس طرح سے تھی، تو یہ عذر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نزدیک قابلِ قبول تھا، وہ سمجھ گئے کہ حضرت ہارون علیہ السلام نے کوئی کسی قسم کی فروگزاشت نہیں کی، اور یہ لے کے علیحدہ جو نہیں ہوئے تو ان کا خیال یہ تھا کہ اس طرح سے حالات کی اصلاح ہو سکتی ہے، تو پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے لیے بھی اور اپنے بھائی کے لئے استغفار بھی کی۔

سامری کا کرتوت

یہاں سے فارغ ہو کر پھر متوجہ ہوئے سامری کی طرف جو فتنے کی اصل جڑ تھی، یعنی قوم سے خطاب کیا، وہاں سے بھی کچھ حالات معلوم ہوئے، انہوں نے بھی الزام سامری پر دھرا، اور ہارون علیہ السلام سے گفتگو ہوئی تو وہاں سے بھی حالات معلوم ہوئے تو موسیٰ علیہ السلام کو پوری طرح سے یقین آ گیا کہ اس فتنے کا سرغنہ سامری ہے، اور یہ ساری شرارت اس نے اُٹھائی ہے، تو پھر اس کی طرف متوجہ ہوئے کہ تُو بتا، یہ کیا گل کھلائے؟ اور یہ تیرا کیا واقعہ ہے؟ تُو نے یہ کیا کیا، اور کیوں کیا؟ اس طرح سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سامری کو سرزنش کی، تو سامری کہتا ہے کہ میں نے ایک بات دیکھی تھی جو ان لوگوں نے نہیں دیکھی۔ وہ کیا بات تھی؟ جمہور مفسرین کی رائے یہی ہے کہ اس کا اشارہ اس بات کی طرف تھا کہ میں نے ایک دفعہ جبریل علیہ السلام کو دیکھا، وہ گھوڑے پر سوار تھے، جہاں اس کا نقشِ قدم پڑتا تھا تو نیچے سے سبزہ اُگتا تھا، تو میں سمجھا کہ اس مٹی کے اندر حیات کی تاثیر ہے، تو میں نے وہاں سے ایک مٹھی بھر کے رکھ لی، اور پھر میں نے یہ بچھڑا بنایا تو بچھڑا بنانے کے بعد یہ مٹی میں نے اس میں ڈال دی، اور یہ جو کچھ کرشمہ بنا کہ آواز آنے لگ گئی وغیرہ، یہ سب اسی مٹی کا اثر ہے۔ اب یہ واقعہ ایسا ہے یا نہیں، قرآنِ کریم اس بات کی تصدیق نہیں کرتا کہ واقعی ایسے ہوا تھا، کہ اس نے جبریل علیہ السلام کے قدم کے نیچے سے، یا جبریل علیہ السلام کے گھوڑے کے قدم کے نیچے سے مٹی اٹھائی تھی، اور واقعی اس مٹی کے ڈالنے سے بچھڑا زندہ ہو گیا تھا، قرآنِ کریم اس بات کی تصدیق نہیں کرتا، لیکن اس کی طرف سے یہ بات بیان کرتا ہے کہ سامری نے یہ کہا، گویا کہ اس نے یہ ظاہر کرنا چاہا کہ یہ جو کچھ ہے یہ سارے کا سارا جبریل علیہ السلام کے قدموں کا فیض ہے، اور اسی سے یہ کرامت ظاہر ہوئی، اپنے فعل کے ایک بہانے کے لئے اور ایک عذر کے لئے اس نے یہ قصہ سنایا، کہ میں نے ایک چیز دیکھی جو بنی اسرائیل نے نہیں دیکھی، میں نے رسول کے نقشِ قدم سے ایک مٹھی بھر لی (''رسول'' سے مراد جبریل علیہ السلام) اور وہ مٹی میں نے ڈالی، یہ کرشمہ اس سے پیش آیا ہے، اس نے یہ بات بنائی، لیکن اس بات کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کوئی اہمیت نہیں دی، کہ چاہے وہ جبریل کے قدموں کی مٹی تھی، چاہے کسی کی تھی، لیکن فتنہ تو ہو گئی، تو اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی، نہ اس کو معذور قرار دیا۔ اور پیچھے جو لفظ آیا تھا فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِیُّ کہ ایسے ہی ڈال دیا سامری نے، تو وہاں سے مراد یہ بھی ہے کہ جس طرح سے ہم نے زیورات اُتارے تھے اس نے بھی اپنے زیورات ڈال دیے، وہاں ضروری نہیں کہ اَلْقَى السَّامِرِیُّ سے مٹی ڈالنی مراد ہو، ''کذالک'' کا لفظ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ''قذفنا ھا'' ہم نے وہ زیورات ڈالے تھے فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِیُّ اسی طرح سے سامری کے پاس جو سونا اور زیورات تھے اس نے بھی ڈال دیے، اور یہاں ''نَبَذْتُهَا'' میں ''ھا'' ضمیر مٹی کی اس مٹھی کی طرف راجع ہے، یہ سامری کا اپنا بیان ہے، باقی! ایسا ہوا ہو کہ اس نے جبریل علیہ السلام کو دیکھا، اور جبریل کے گھوڑے کے قدموں کے نیچے سبزہ اُگتا دیکھا اور اس نے

مٹی بھر لی ہو، ایسا ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، قرآنِ کریم کو اس سے بحث نہیں ہے، سامری نے بہانہ یہی کیا، کہ نتیجۃً تو سارا یوں ہوا، میرے دل میں بات یوں آئی تھی کہ میں یہاں سے مٹی اُٹھالوں، پھر جس چیز میں ڈالوں گا اس میں حیات کا اثر پیدا ہو جائے گا، تو یہ سارے کا سارا کرشمہ اس مٹی کی وجہ سے ہوا ہے، تو سامری نے اپنے فعل کی تاویل کے طور پر یہ قصہ بیان کیا، لیکن موسیٰ علیہ السلام نے اس کو کوئی اہمیت نہیں دی، بلکہ اس کے اُوپر ناراض ہوئے، اور اس کا جرم ثابت ہو گیا۔

قوم اور سامری کی سزا

جس وقت جرم ثابت ہو گیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے لئے ایک سزا تجویز کی، اور ایک سزا قوم کے لئے تجویز کی، اور حضرت ہارون علیہ السلام بری، معلوم ہو گیا کہ ان کی طرف سے کوئی قصور نہیں ہوا، نہ نبی ایسے معاملات میں قصور کر سکتا ہے، یہ دونوں پیغمبروں میں کچھ اجتہادی سا اختلاف تھا، بعد میں بات ٹھیک ہو گئی۔ قوم میں سے جنہوں نے بچھڑا پُوجا تھا ان کے لئے تو سزا قتل تجویز ہوئی، جیسے حکم آیا فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (سورۂ بقرہ: ۵۴) جنہوں نے نہیں پُوجا تھا انہیں حکم ہوا کہ پُوجنے والوں کو قتل کرو، جیسے کہ مرتد کی سزا قتل ہے، تو یہ بھی مسلمان تھے، مسلمان ہونے کے بعد بچھڑے کو پُوج کر مرتد ہو گئے، تو اس اِرتداد کی سزا کے طور پر ان کو قتل کیا گیا، اور سامری کو قتل نہیں کیا گیا، کیونکہ قتل ایک ایسی سزا ہے کہ جس سے جلدی جان چھوٹ جاتی ہے، آدمی مرا اور گیا، اس کے لئے سخت سزا تجویز کی گئی، قومی سطح پر اس کا بائیکاٹ کروا دیا گیا، کہ کوئی اس کے قریب نہ جائے، کوئی اس کے ساتھ کھانا پینا نہ رکھے، ''لَا مِسَاسَ'' اس کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ چھونا نہیں، مجھے چھوؤ نہیں، میرے قریب نہ آؤ۔ چنانچہ پاگلوں جیسی اس کی کیفیت ہو گئی، انسانوں سے بِدکتا تھا، وحشی جانوروں کی طرح جنگل کی طرف بھاگ گیا، اگر کوئی انسان اس کے قریب آتا تو وہ کہتا کہ مجھے ہاتھ نہ لگانا، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر وہ کسی کو ہاتھ لگا دیتا یا کوئی اس کو ہاتھ لگا دیتا تو دونوں کو سخت بخار چڑھتا تھا اور سخت تکلیف ہوتی تھی، زندگی بھر اس کو اس طرح سے ذلیل کر دیا گیا کہ انسانی معاشرے میں بیٹھنے کے قابل نہ رہا، اور کسی کے ساتھ ملنے جلنے کے قابل نہ رہا، ہماری کتابوں میں اس کے حالات میں یوں ہی لکھا ہے، اور بعض مفسرین نے یوں بھی لکھا کہ اس کو اس ماحول کا اچھوت بنا دیا گیا کہ اس کے ذِمّے یہ بات لگ گئی کہ جو بھی تیرے پاس آئے، تو اس کو یہ کہا کر کہ میں چھونے کے قابل نہیں، میں گناہ گار اور نالائق آدمی ہوں، مجھ سے دُور رہو، اور جب ایک آدمی کو کسی معاشرے کے اندر یوں کر دیا جائے تو وہ موت سے بدتر ہو کر رہ جاتا ہے، تو زندگی میں تو تیری یہ سزا ہے کہ تُو انسانی برادری میں بیٹھنے کے قابل نہیں، کوئی تیرے ساتھ ملے جلے گا نہیں، اور کوئی تیرے کسی معاملے میں شریک نہیں ہو گا، اور مرنے کے بعد تیری سزا جہنم ہے، اس طرح سے سامری کے لئے سزا تجویز ہو گئی اور یوں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس فتنے کے اُوپر قابو پایا۔ تو یہ قوم جو شرک میں مبتلا ہوئی تھی، تو آخر میں یہ کلام منتقل ہو گئی توحید کی طرف اور آخرت کی تذکیر کی طرف، جیسا کہ سورت کی ابتدا کے اندر بھی آیات ایسی ہی آئی تھیں۔

سامری کے بُت کا حال

سامری سے گفتگو کرنے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے یہ بھی کہا کہ یہ جو تُو نے معبود گھڑ لیا تھا، اور جس کے اُوپر تُو جم

کے بیٹھا ہوا تھا، دیکھ! میں اس کا کیا حال کرتا ہوں، جیسا کہ توحید ثابت کرنے کے لئے اور شرک کی تردید کے لئے بُت شکنی کی جاتی ہے، سرورِ کائنات ﷺ نے جب مکہ معظمہ فتح کیا، قوم کو شرک سے روکا، تو ساتھ ساتھ بیت اللہ کے اندر جو انہوں نے بُت بنا کے رکھے ہوئے تھے، چاہے وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف منسوب تھے، چاہے اسماعیل علیہ السلام کی طرف منسوب تھے، چاہے وہ فرشتوں کی طرف منسوب تھے، کسی کی طرف بھی منسوب تھے، وہ سب حضور ﷺ نے توڑے اور ریزہ ریزہ کیے، تو شرک کی بنیاد یوں ہی ختم ہوتی ہے کہ جو ان کا تجویز کیا ہوا معبود ہے اس کا بُت یا تصویر باقی نہ رہے، تو تصویر کو پھاڑ دینا، بُت کو توڑ دینا گویا کہ یہ شرک کی جڑ کاٹنے والی بات ہے، اسی طرح سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ دیکھ! جس کو تُو معبود بنائے بیٹھے تھا اس کا میں کیا حال کرتا ہوں، لَنُحَرِّقَنَّهٗ: ہم اسے جلائیں گے، اور پھر اس کی جو راکھ بنے گی ہم اس کو سمندر میں اُڑا دیں گے، ریزہ ریزہ کر کے اُڑا دیں گے، تو تمہارے سامنے آجائے گا کہ ایسی عاجز مخلوق جو اپنے آپ کو بچا نہیں سکتی اور اس طرح سے فنا ہوگئی، وہ بھلا کس طرح سے معبود بننے کے قابل ہے؟ اس کے بعد پھر آگے توحید کی تلقین ہے۔

واقعاتِ بالا میں سبق آموز پہلو

جس طرح سے عام طور پر واقعات کے بعد ان کا سبق آموز پہلو نمایاں کیا جاتا ہے یہاں بھی وہی نمایاں کیا جارہا ہے، سرورِ کائنات ﷺ کو خطاب کر کے فرماتے ہیں کہ ہم اسی طرح سے آپ پر گزرے ہوئے واقعات پڑھتے ہیں، مَاقَدْ سَبَقَ: جو کچھ گزر گیا یعنی ماضی، اس کے واقعات میں سے کچھ ہم آپ پہ بیان کرتے ہیں جس میں آپ کے لئے سبق موجود ہے، جیسے ابتدا کے اندر تقریر کی گئی تھی کہ موسیٰ علیہ السلام کی اس داستان میں حضور ﷺ کو اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کو صبر کی تلقین ہے، اور مشقت برداشت کرنے کے لئے آمادہ کرنا ہے کہ دیکھو! موسیٰ علیہ السلام نے کیا کیا برداشت کیا، اور ان کی قوم کیسی کیسی غلطیاں کرتی تھی، کن حالات میں موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو سنبھالا، یہ چیزیں حضور ﷺ کے سامنے ذکر کی جارہی ہیں کہ آپ کے سامنے بھی ایسے ہی حالات آنے والے تھے، آپ نے بھی یونہی گھر بار چھوڑنا تھا جس طرح سے موسیٰ علیہ السلام چھوڑ کر گئے تھے، اور بہت سخت قوم کے ساتھ آپ کو واسطہ تھا تو صبر و تحمل کے لئے گویا کہ یہ واقعہ سُنا کے آمادہ کیا جارہا ہے، تیار کیا جارہا ہے۔ ''اور ہم نے آپ کو ایک یادداشت دی'' ذکر: قرآن، نصیحت۔ جو کوئی اس سے اعراض کرے گا یعنی اس کو قبول نہیں کرے گا اس میں آپ کا کوئی نقصان نہیں، جس طرح سے ابتدا میں آیا تھا کہ ہم نے آپ پر قرآن اس لیے نہیں اُتارا کہ آپ مشقت میں پڑ جائیں، آپ کا فرض ہے یاد دہانی، جو اس یاد دہانی سے متاثر نہیں ہوگا، اعراض کرے گا، قیامت کے دن وہ اپنا بوجھ اُٹھائے گا اور ہمیشہ اس بوجھ میں دبا رہے گا، اور یہ بہت بُرا بوجھ ہوگا جو ان کے اُوپر پڑے گا، جو آیات سورت کی ابتدا میں آئی تھیں اسی قسم کی یہ آیات ہیں، کہ اس قرآنِ کریم کی وجہ سے آپ کے ذِمّے تذکیر ہے، یہ ذکر ہے، یاد دہانی ہے، آپ تذکیر کریں، باقی! اگر کوئی نہیں مانے گا تو نقصان اپنا کرے گا۔

''صور'' کی حقیقت و کیفیت

''پھونک ماری جائے گی صور میں'' صور اصل میں کہتے ہیں، حدیث شریف میں جس طرح سے آتا ہے کہ وہ سینگ کی

شکل کی چیز ہے،[1] جس طرح سے آپ نے دیکھا ہوگا بعض ملنگ لیے پھرتے ہیں، لمبا سا سینگ، اس میں پھونک مارتے ہیں تو آواز پیدا ہوتی ہے، جس کو آج آپ بگل کے ساتھ تعبیر کر سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ قیامت کے حالات کو، جنّت اور دوزخ کی چیزوں کو ایسے الفاظ سے بیان فرماتے ہیں کہ جس کو لوگ سمجھ سکیں، ورنہ جس وقت واقعہ سامنے آئے گا تو اس وقت آپ کو پتا چلے گا کہ یہ بگل اور دُنیا کا بگل، ان کی آپس میں کوئی مناسبت نہیں ہے، جس طرح سے جنّت کی نعمتوں کے لئے جو الفاظ استعمال کیے گئے وہ الفاظ وہی ہیں جس قسم کے لفظ ہم دنیا میں استعمال کرتے ہیں، ہم کیلا کھاتے ہیں تو وہاں بھی کیلے کا ذکر آیا، یہاں انار ہیں وہاں بھی انار کا ذِکر آیا، یہاں انگور ہیں وہاں بھی انگور کا ذکر آیا، کیونکہ ہم ان نعمتوں کو سمجھتے ہیں، تو اسی عنوان سے ان کو ذِکر کر دیا گیا۔ ورنہ جنّت کے انار میں اور دنیا کے انار میں، جنّت کے انگور میں اور دنیا کے انگور میں اتنا فرق ہوگا جتنا آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔ تو اسی طرح سے دنیا کے اندر یہ ہمیشہ قاعدہ ہے کہ لشکروں کو اکٹھا کرنے کے لئے، ان میں کوئی کسی قسم کا اعلان کرنے کے لئے بگل بجاتے ہیں، اور آج تک فوج میں یہ دستور ہے، جیسے نقارہ بجاتے ہیں، بگل بجاتے ہیں، جس میں کوئی اطلاع کرنی مقصود ہوتی ہے، آواز سنتے ہی سارے اکٹھے ہوجاتے ہیں، جس طرح سے آپ کو اکھٹا کرنا ہو تو گھنٹی بجادی جاتی ہے، گھنٹی بجادی تو آپ سارے اکٹھے ہوگئے۔ اور کھیل رہے ہیں، گھنٹی بجادی تو سارے کے سارے منتشر ہوگئے، تو یہ ایک علامت متعین کردی جاتی ہے، تو اسی طرح سے اللہ تعالیٰ بھی اس مخلوق کو توڑنے پھوڑنے کے لئے صور میں فرشتے سے پھونک مروائے گا، جب آواز پیدا ہوگی تو مخلوق کا ذرّہ ذرّہ بکھر جائے گا، اور جب اللہ تعالیٰ کا ارادہ دوبارہ زندہ کرنے کا ہوگا تو اسی صور میں پھونک ماری جائے گی تو ساری کی ساری مخلوق اکٹھی ہوجائے گی، باقی! وہ صور کیسا ہوگا، پھونک کس طرح سے ماری جائے، اس میں آواز کیسی پیدا ہوگی، اس کو مثال کے ساتھ واضح نہیں کیا جاسکتا۔

قیامت کے دِن دُنیا کی زندگی ایک دِن کے برابر معلوم ہوگی

تو جب صور میں پھونک ماری جائے گی تو ہم مجرموں کو اکھٹا کرلیں گے اور وہ اس طرح سے دہشت زدہ ہوں گے، ان کے دل دماغ پریشان ہوں گے، ان کی آنکھوں میں کوئی رونق نہیں، نیلی نیلی ان کی آنکھیں ہوں گی، نہایت بدنما۔ پریشان آدمی کی آنکھوں میں رونق نہیں رہا کرتی، جو انسان انتہائی پریشان ہوتا ہے، دہشت زدہ ہوتا ہے تو اس کی آنکھیں بےنُور ہوجاتی ہیں، جتنا دِل میں سُرور اور خوشی ہوتی ہے اتنی آنکھوں میں رونق ہوتی ہے، نیلی آنکھیں ہوں گی، آپس میں چپکے چپکے باتیں کریں گے، کہیں گے کہ ہم تو سمجھتے تھے کہ یہ دُنیا ہی دُنیا ہے، اس سے کبھی ہم نے زائل ہی نہیں ہونا، کبھی ہم پر زوال نہیں آئے گا، ہم سمجھتے تھے کہ بڑی لمبی لمبی عمریں ہم نے پائی ہیں، لیکن اب تو معلوم ایسے ہوتا ہے جیسے سارے کا سارا قصہ دس دِن میں ہی گزر گیا، اب یہ اپنی عمروں کو اور برزخ کے زمانے کو قیامت کے مقابلے میں یوں سمجھیں گے جیسے سارا قصہ دس دِن میں ہی گزر گیا، ہم تو سمجھتے تھے کہ بڑی طویل مدّت ہے، بڑی دراز عمر ہے، لیکن یہ تو ایسے تھا جیسے دس دِن میں ہی گزر گیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ دس دِن سے اندازہ

---

(1) الصور قرن ينفخ فيه مشكوٰة ص ۴۸۲، باب النفخ في الصور، فصل ثاني۔ سنن ابي داود ۲/ ۲۹۶، باب في ذكر البعث والصور

کرنے والوں سے بھی زیادہ سمجھدار آدمی وہ ہے جو صرف ایک دن سے اندازہ کرے گا، کیونکہ قیامت اور قیامت کے بعد والے حالات کے مقابلے میں دُنیا ایک دِن کے برابر بھی نہیں۔ وہ کہے گا، دس دِن کہاں، ہم تو ایک ہی دِن کے برابر رہے ہیں، اتنا سا وقت تھا جیسے ایک ہی دِن ملا ہے، تو آج یہ ان حالات پرمست ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہمیں دوام ہی دوام ہے، لیکن یہ دنیا کی زندگی اور دوسرے گزرے ہوئے حالات ایسے ہوں گے جیسا کہ ایک ہی دن کا قصہ تھا اور ختم ہوگیا، اور یہ انسان کا کچھ اس قسم کا مزاج ہے، اب آپ پندرہ پندرہ، بیس بیس، پچیس پچیس سال گزارے بیٹھے ہیں، لیکن آج اگر کسی قسم کی تکلیف آجائے تو پچھلی راحت کی گزری ہوئی عمر ایسے ہوگی جیسے خواب وخیال تھا، ایسے تھا جیسے کل آئے تھے اور آج چلے بھی گئے، گزرے ہوئے حالات پھر ایسے ہی معلوم ہوا کرتے ہیں، خاص طور پر مصیبت آجانے کے بعد راحت کے دِن ایسے معلوم ہوا کرتے ہیں جیسے چٹکیوں میں گزر گئے۔ تو یہ بھی ایک یاددہانی ہے کہ آج تم اس دنیا پرست ہو، یہ دنیا مست ہونے کی چیز نہیں، قیامت کے دِن تمہیں ایسے معلوم ہوگا جیسے چٹکیوں میں گزر گئی۔ یہی ہے مفہوم اگلے الفاظ کا۔ ''جس دِن کہ صور میں پھونک ماری جائے گی، اور ہم مجرمین کو جمع کریں گے اس دِن اس حال میں کہ نیلی آنکھوں والے ہوں گے، چپکے چپکے آپس میں باتیں کریں گے کہ نہیں ٹھہرے تم مگر دس دِن یا دس راتیں، ہم خوب جاننے والے ہیں ان باتوں کو جو وہ کرتے ہیں، جبکہ کہے گا ان میں سے افضل از روئے روش کے، از روئے طریقے کے، جس کا طریقہ بہتر ہے وہ کہے گا، کہ نہیں ٹھہرے تم مگر ایک دِن۔''

سُبۡحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمۡدِكَ اَشۡهَدُ اَنۡ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنۡتَ اَسۡتَغۡفِرُكَ وَاَتُوۡبُ اِلَيۡكَ

وَيَسۡـَٔلُوۡنَكَ عَنِ الۡجِبَالِ فَقُلۡ يَنۡسِفُهَا رَبِّىۡ نَسۡفًا ۝۱۰۵
پوچھتے ہیں آپ سے پہاڑوں کے متعلق، تو آپ کہہ دیجئے کہ میرا رَبّ ان کو اُڑا دے گا خوب اچھی طرح سے اُڑانا ۝۱۰۵
فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفۡصَفًا ۝۱۰۶ لَّا تَرٰى فِيۡهَا عِوَجًا وَّلَاۤ اَمۡتًا ۝۱۰۷ يَوۡمَئِذٍ
پھر چھوڑ دے گا اللہ تعالیٰ اس زمین کو صاف چٹیل میدان ۝۱۰۶ نہیں دیکھے گا تُو اس زمین میں کوئی کجی اور نہ کوئی بُلندی ۝۱۰۷ اس دِن
يَّتَّبِعُوۡنَ الدَّاعِىَ لَا عِوَجَ لَهٗ‌ ۚ وَخَشَعَتِ الۡاَصۡوَاتُ لِلرَّحۡمٰنِ فَلَا
لوگ بُلانے والے کی اِتباع کریں گے، اس داعی کے لئے کوئی کجی باقی نہیں رہے گی، اور دَب جائیں گی آوازیں رحمٰن کے لئے پس نہیں
تَسۡمَعُ اِلَّا هَمۡسًا ۝۱۰۸ يَوۡمَئِذٍ لَّا تَنۡفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنۡ اَذِنَ لَهُ الرَّحۡمٰنُ وَرَضِىَ لَهٗ
سنے گا تُو مگر آہٹ ۝۱۰۸ اس دِن شفاعت نہیں نفع دے گی مگر جس شخص کو رحمٰن اجازت دے دے اور اس کے لئے بولنا پسند

قَوْلًا ﴿۱۰۹﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا ﴿۱۱۰﴾

کرلے ﴿۱۰۹﴾ اللہ جانتا ہے ان چیزوں کو جو ان کے سامنے ہیں اور جو ان کے پیچھے ہیں اور نہیں احاطہ کر سکتے یہ لوگ اللہ کا از روئے علم کے ﴿۱۱۰﴾

وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ ؕ وَقَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا ﴿۱۱۱﴾ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ

جھک جائیں گے چہرے حی القیوم کے لئے، نامراد ہوگیا وہ شخص جس نے ظلم اُٹھایا ﴿۱۱۱﴾ اور جو کوئی نیک کام

الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخٰفُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا ﴿۱۱۲﴾ وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا

کرے اس حال میں کہ مؤمن ہو پس نہیں اندیشہ کرے گا وہ زیادتی کا نہ کمی کا ﴿۱۱۲﴾ ہم نے اس کتاب کو ایسے ہی قرآنِ عربی بنا کر اُتارا

وَّصَرَّفْنَا فِيْهِ مِنَ الْوَعِيْدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ اَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا ﴿۱۱۳﴾ فَتَعٰلَى اللّٰهُ

اور ہم نے اس میں وعید پھیر پھیر کر بیان کی، تا کہ لوگ ڈر جائیں یا یہ قرآن ان کے لئے یادداشت تازہ کر دے ﴿۱۱۳﴾ پس عالی شان ہے اللہ

الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ۫ وَقُلْ

حقیقی بادشاہ، جلدی نہ مچایا کیجئے قرآنِ کریم کے ساتھ قبل اس سے کہ آپ کی طرف اس کی وحی پوری کر دی جائے، اور آپ یہ دعا کرتے

رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ﴿۱۱۴﴾ وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ

رہیں کہ اے میرے رب! زیادہ کر مجھ کو از روئے علم کے ﴿۱۱۴﴾ ہم نے آدم کو وصیت کی تھی اس سے پہلے پس آدم بھول گیا، ہم نے اس

لَهٗ عَزْمًا ﴿۱۱۵﴾ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ

کے لئے کوئی پختگی نہ پائی ﴿۱۱۵﴾ یاد کیجئے جب ہم نے کہا فرشتوں کو کہ سجدہ کیجئے آدم کو تو انہوں نے سجدہ کر دیا سوائے ابلیس کے،

اَبٰى ﴿۱۱۶﴾ فَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ

ابلیس نے انکار کر دیا ﴿۱۱۶﴾ ہم نے کہا کہ اے آدم! بے شک یہ تیرا دشمن ہے اور تیری بیوی کا، پس یہ تمہیں نکال نہ دے جنت سے

فَتَشْقٰى ﴿۱۱۷﴾ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ﴿۱۱۸﴾ وَاَنَّكَ

پھر تو مشقت میں پڑ جائے گا ﴿۱۱۷﴾ بے شک تیرے لیے یہ بات ہے کہ تُو اس جنت میں بھوکا نہیں رہتا اور نہ تُو ننگا ہوتا ہے ﴿۱۱۸﴾ اور بے شک تُو

لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ﴿۱۱۹﴾ فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰٓاٰدَمُ هَلْ

پیاسا نہیں ہوتا اس جنت میں اور نہ تجھے دھوپ لگتی ہے ﴿۱۱۹﴾ آدم علیہ السلام کی طرف شیطان نے وسوسہ ڈالا، اور کہا کہ اے آدم! کیا

اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ﴿۱۲۰﴾ فَاَكَلَا مِنْهَا

میں تیری راہنمائی کروں ہمیشگی کے درخت پر اور ایسی سلطنت پر جو کبھی بوسیدہ نہیں ہوگی ﴿۱۲۰﴾ دونوں نے مل کے اس درخت کو کھالیا،

فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۚ وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ

ظاہر ہوگئی ان کے لئے ان کی شرم گاہ، اور یہ جوڑنے لگ گئے اپنے اُوپر جنّت کے پتے، آدم نے اپنے رَبّ کے حکم کے خلاف کیا

فَغَوٰى ﴿۱۲۱﴾ ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى ﴿۱۲۲﴾ قَالَ اهْبِطَا

پس وہ غلطی میں پڑ گیا ﴿۱۲۱﴾ پھر چُن لیا اس کو اس کے رَبّ نے پھر اس کے اُوپر رُجوع کیا اور اس کو سیدھا راستہ دکھایا ﴿۱۲۲﴾ اور فرمایا اُتر جاؤ

مِنْهَا جَمِيْعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ

تم سب یہاں سے، تمہارا بعض بعض کا دُشمن ہوگا، پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی راہنمائی آئے پس جو میری ہدایت کی

هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ﴿۱۲۳﴾ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا

پیروی کرے گا پس نہ وہ بھٹکے گا نہ بدبخت ہوگا ﴿۱۲۳﴾ اور جو میرے ذِکر سے اعراض کرے گا پس اس کے لئے تنگ معیشت ہوگی

وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ﴿۱۲۴﴾ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا ﴿۱۲۵﴾

اور ہم اس کو اُٹھائیں گے قیامت کے دِن اندھا ﴿۱۲۴﴾ کہے گا کہ اے میرے رَبّ! تُو نے مجھے اندھا کیوں اُٹھایا؟ میں تو بہت دیکھنے والا تھا ﴿۱۲۵﴾

قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ۚ وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ﴿۱۲۶﴾

اللہ تعالیٰ فرمائیں گے اسی طرح تیرے پاس ہماری آیات آئی تھیں، تُو نے ان کو بھلا دیا، اسی طرح آج تُو بھلا دیا جائے گا ﴿۱۲۶﴾

وَكَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ اَسْرَفَ وَلَمْ يُؤْمِنْۢ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ۭ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ

ایسے ہی بدلہ دیتے ہیں ہم اس شخص کو جو کہ حد سے تجاوز کرے اور اپنے رَبّ کی آیات پر ایمان نہ لائے، اور آخرت کا عذاب بہت سخت

وَاَبْقٰى ﴿۱۲۷﴾ اَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ

اور بہت دیر تک باقی رہنے والا ہے ﴿۱۲۷﴾ کیا یہ بات ان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتی کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی جماعتیں ہلاک کردیں،

يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى ﴿۱۲۸﴾

یہ ان کے رہنے کی جگہوں میں چلتے پھرتے ہیں، بے شک اس میں البتہ نشانیاں ہیں عقل والوں کے لئے ﴿۱۲۸﴾

تفسیر

قیامت کے مختلف احوال

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ: پوچھتے ہیں آپ سے پہاڑوں کے متعلق، فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا: نسف کا لفظ ابھی آپ کے سامنے پچھلے رکوع میں گزرا، ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِي الْيَمِّ نَسْفًا، بکھیرنا، اڑا دینا، ذرا ذرا کر کے منتشر کر دینا۔ تو آپ کہہ دیجئے کہ میرا رب ان کو بکھیر دے گا خوب اچھی طرح سے بکھیر دینا، اڑا دے گا اڑانا۔ پچھلے رکوع کے آخر میں قیامت کا ذکر شروع ہوا تھا، اور جہاں بھی قرآنِ کریم میں قیامت کا ذکر آتا ہے تو یہ بات واضح کی جاتی ہے کہ یہ کائنات ٹوٹ پھوٹ جائے گی۔ تو مشرکین جس طرح سے دوسرے اِشکالات کرتے تھے، ایک اِشکال ان کے سامنے یہ بھی آتا تھا کہ یہ پہاڑ اتنے اُونچے اتنے مضبوط، کیا یہ بھی ٹوٹ جائیں گے؟ ان کو تعجب ہوتا تھا، اس لیے وہ پوچھتے تھے کہ ان پہاڑوں کا کیا بنے گا؟ آپ جو کہتے ہیں کہ ساری کائنات ٹوٹ جائے گی، یہ پہاڑ بھی ٹوٹ جائیں گے؟ ان پہاڑوں کا کیا ہوگا؟ تو اللہ تعالیٰ نے بار بار ان پہاڑوں کے متعلق یہ ذکر کیا ہے کہ یہ بھی روئی کے گالوں کی طرح اُڑ جائیں گے، تیسویں پارے میں سورۂ قارعہ میں بھی یہ لفظ آئیں گے: وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ، عھن کہتے ہیں اُون کو، منفوش: دھنکی ہوئی، جس طرح سے مشین پہ جاکے رُوئی دھنواتے ہیں، تو دھنی ہوئی اُون کی طرح یہ اُڑ جائیں گے، پہاڑ ایسے ہوجائیں گے جس طرح سے کہ دھنی ہوئی اُون ہوتی ہے، تو یہاں بھی یہی بات کہی گئی کہ آپ سے یہ پہاڑوں کے متعلق پوچھتے ہیں، تو آپ کہہ دیجئے میرا رَبّ ان کو بکھیر دے گا بکھیرنا، ذرّہ ذرّہ کر کے ان کو اُڑا دے گا اُڑانا۔ نَسْفًا یہ مفعول مطلق تاکید کے لئے ہے۔ فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا: ''ھا'' ضمیر زمین کی طرف لوٹ رہی ہے، اس کا ذکر اگرچہ صراحتاً نہیں آیا لیکن لفظ جبال اس کے اوپر دال ہے۔ پھر چھوڑ دے گا اللہ تعالیٰ اس زمین کو قَاعًا صَفْصَفًا: صاف چٹیل میدان۔ قاع کہتے ہیں میدان کو، اور صفصف کا معنی پدھرا (برابر)، صاف ستھرا۔ اس زمین کو صاف ستھرا میدان بنا کے چھوڑ دے گا۔ لَا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَاۤ اَمْتًا: یہ گویا کہ قَاعًا صَفْصَفًا کی تفصیل ہے۔ نہیں دیکھے گا تو اس زمین میں۔ ''عوج'' کجی کو کہتے ہیں اور ''امت'' بلندی کو کہتے ہیں، پہاڑی علاقے میں کبھی آپ کا اگر جانے کا اتفاق ہوجائے تو آپ کو ''عِوَج'' اور ''امت'' خوب اچھی طرح سے سمجھ میں آئے گا، وہاں زمین اس طرح سے ہوتی ہے کہ کہیں سے تو یوں اُونچی چلی گئی پہاڑ کی شکل میں، کہیں یوں نیچی چلی گئی وادی کی شکل میں، تو یہ نشیب و فراز ہوتا ہے زمین میں، کہیں سے اُونچی کہیں سے نیچی، وادیاں گہری ہوتی ہیں اور پہاڑ اُونچے ہوتے ہیں، جیسے کپڑے کو شکن پڑا ہوا ہوتا ہے، اِدھر سے کنارہ اُونچا، اُدھر سے اُونچا، درمیان میں نیچا۔ تو لَا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَاۤ اَمْتًا کا مطلب یہ ہے کہ تجھے اس میں کوئی نشیب و فراز نظر نہیں آئے گا، نہ کہیں سے یہ نیچی ہوگی نہ کہیں سے اُونچی ہوگی، بالکل جس طرح سے کفِ دست میدان ہوتا ہے اس طرح سے اس زمین کو کر دیا جائے گا۔ ''عوج'' سے مراد ہوجائے گا نشیب، نیچان، اور ''امت'' سے مراد ہوجائے گا اُونچان (جلالین وغیرہ)۔ اس میں آپ کوئی اُونچان نیچان نہیں دیکھیں گے، اس میں کوئی کجی نہیں ہوگی، کوئی بلندی نہیں ہوگی، نہ کوئی ٹیلا ہوگا نہ کوئی گڑھا ہوگا، اس کا

یہ مفہوم بن جائے گا، توقَاعًا صَفْصَفًا کا بھی یہی مفہوم تھا کہ بالکل چٹیل میدان بنا کے اللہ تعالیٰ اس کو چھوڑ دے گا، اس میں نہ کچھ نشیب ہوگا نہ فراز، نہ نیچان ہوگا نہ اونچان، نہ گڑھا ہوگا نہ ٹیلا۔

یَوْمَئِذٍ یَّتَّبِعُوْنَ الدَّاعِیَ: یَوْمَئِذٍ: یَوْمَ اِذْ کَانَ کَذَا جب یہ حالات پیش آئیں گے یعنی قیامت قائم ہوگی، یَتَّبِعُوْنَ الدَّاعِیَ: یہ لوگ بلانے والے کی اتباع کریں گے، لَا عِوَجَ لَهٗ: اس بلانے والے کے لئے ان لوگوں میں کوئی کجی باقی نہیں رہے گی، اس داعی کے لئے کوئی کجی باقی نہیں رہے گی، وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ: اور دَب جائیں گی آوازیں رحمٰن کے لئے، فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا: پس نہیں سنے گا تو مگر آہٹ۔ ''همس'' کہتے ہیں آہٹ کو، جس طرح سے آپ چلتے ہیں تو چلتے وقت زمین پر پاؤں لگتا ہے تو اس سے معمولی سی ہلکی سی آواز پیدا ہوتی ہے اس کو ''همس'' کہتے ہیں، مطلب یہ ہوا کہ آج تو اللہ کی طرف بلانے والا انہیں بلاتا ہے، اور یہ اس کے بلانے کو قبول نہیں کرتے، اس کے سامنے ٹیڑھے ہوجاتے ہیں، ترچھے ہوجاتے ہیں، وہ کدھر کو بلاتا ہے یہ کدھر کو جاتے ہیں، اور جب اللہ کا قرآن انہیں سنایا جاتا ہے، داعی ان کے سامنے کوئی وعظ کہتا ہے تو یہ شور مچاتے ہیں اور آواز سننے نہیں دیتے، لیکن جس دن قیامت آجائے گی اس دن بلانے والا جو بلائے گا، یہ نفخِ صور ہوگا، جس کا مطلب ہوگا کہ سارے اکٹھے ہوجاؤ، تو یوں کان دبا کے چلے آئیں گے اور ان میں کوئی کجی باقی نہیں رہے گی، تکلے کی طرح سیدھے ہوجائیں گے، قیامت کا دن جس وقت آئے گا اس دن یہ سارے کے سارے داعی کی اتباع کریں گے، یہ داعی ہوگا حشر کی طرف بلانے والا، کہ آؤ اللہ کے دربار میں سارے اکٹھے ہوجاؤ، تو پھر یہ بالکل سیدھے ہوں گے، ان کی کوئی کسی قسم کی کجی اور ٹیڑھ باقی نہیں رہے گی، آج داعی کے سامنے یہ اکڑتے ہیں ٹیڑھے ہوتے ہیں، اور اس دن ان کی سب ٹیڑھ نکل جائے گی اور بولنے کی کسی میں ہمت نہیں ہوگی، آوازیں دَب جائیں گی رحمٰن کے لئے، پس نہیں سنے گا تو مگر آہٹ، یعنی صرف چلنے کی وجہ سے جو پاؤں میں کچھ آواز پیدا ہوتی ہے اس کے علاوہ کسی کے منہ سے آواز نہیں نکلے گی۔

مشرکین کے عقیدۂ شفاعت کی تردید

یَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ: جس دن ایسا ہوگا شفاعت نفع نہیں دے گی۔ یعنی مشرکین کا یہ خیال تھا کہ اوّل تو قیامت ہوگی نہیں، اگر ہوگی اور کوئی مشکل پیش آگئی تو ہمارے یہی شفعاء ہمیں وہاں چھڑا بچالیں گے، تو ان کا یہ نظریہ بھی غلط۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ شفاعت اس دن کسی کو نفع نہیں دے گی، اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِیَ لَهٗ قَوْلًا: مگر جس شخص کو رحمٰن اجازت دے دے اور اس کے لئے بولنا پسند کرلے، تو رحمٰن کی اجازت کے تحت ہوگی اور اسی کے لئے ہوگی جس کے لیے کچھ کہنا سننا اللہ کو پسند ہوگا، ہر کوئی سفارش نہیں کرسکے گا، ہر کسی کی نہیں کرسکے گا، جس کے متعلق دوسری جگہ واضح کردیا گیا کہ کافروں کے لئے کوئی شفاعت نہیں، شفاعت ہوگی مؤمنین کے لئے جس کا خاتمہ ایمان پر ہوا ہوگا، تو اگر کفر کیے ہوئے ہو تو کفر کی حالت میں شفاعت نہیں پائی جائے گی، تو تمہارا یہ سہارا بھی غلط ہے، اس کو بھی دل دماغ سے نکال دو۔ ''نہیں نفع دے گی شفاعت، مگر جس شخص کو رحمٰن اجازت دے دے اور پسند کرلے اس کے لئے بولنا۔''

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ: اللہ جانتا ہے ان چیزوں کو جو ان کے سامنے ہیں وَمَا خَلْفَهُمْ: اور جو ان کے پیچھے ہیں وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا: اور نہیں احاطہ کرتے یہ لوگ اس اللہ کا از روئے علم کے۔ اللہ نے احاطہ کیا ہوا ہے، ان سب کے اگلے پچھلے حالات جانتا ہے، لیکن یہ لوگ اللہ کا احاطہ نہیں کر سکتے از روئے علم کے۔ ایسی تو بے انتہاء اور بے شمار باتیں ہیں جو اللہ کے علم میں ہیں اور مخلوق کے علم میں نہیں، لیکن ایسی کوئی بات نہیں جو مخلوق کے علم میں ہو اور اللہ کے علم میں نہ ہو۔ شفاعت کے نظریے کو ذکر کرنے کے ساتھ ہمیشہ اللہ تعالیٰ اپنے علم کا حوالہ دیتے ہیں، جہاں بھی شفاعت کا ذکر آئے گا وہاں علم کا حوالہ آتا ہے، آیت الکرسی میں بھی اسی طرح سے ہے: مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۚ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وہاں بھی یہی بات ہے۔ تو علم کا حوالہ دے کے اللہ تعالیٰ یہ بتلاتے ہیں کہ میرا کوئی فیصلہ ناواقفی کی بنا پر ہوگا ہی نہیں کہ اس میں کسی کو کہنے سننے کی گنجائش ہو، دنیا میں تو ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی کو کوئی مجرم سمجھ کے پکڑ لیتا ہے، لیکن دوسرے لوگ پہنچ جاتے ہیں سفارش کرنے والے، اور جا کے کہتے ہیں کہ جی! آپ کو غلط فہمی ہوئی، یا اس کی شکایت آپ کے سامنے کسی نے غلط کر دی، یہ تو مجرم نہیں ہے، یہ تو بے قصور آدمی ہے جس کو آپ نے پکڑ لیا، یوں کر کے لوگ چھڑا لیتے ہیں، کہہ دیتے ہیں کہ جی! آپ کو غلط اطلاع ملی، آپ کو نشاندہی غلط ہوئی، یہ بات کسی نے جھوٹ موٹ آپ کو بتا دی، آپ نے اس کو مجرم سمجھ لیا، قصوروار سمجھ لیا، یہ تو قصوروار نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے علم میں کوئی کسی قسم کی ایسی کمی نہیں ہے، میں سب کچھ جانتا ہوں، اس لیے جس کو پکڑوں گا معلومات کی بنا پر پکڑوں گا، وہاں کسی کی سفارش کا کیا دخل جو کسی مجرم کو غیر مجرم ثابت کر دے، ایسا نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ کی پکڑ معلومات کی بنا پر ہوگی، وہاں کوئی کسی قسم کا تغیر برپا نہیں کر سکے گا، کہ اللہ کے سامنے جا کے یوں سفارش کرنے لگ جائے کہ جی! آپ کو غلط اطلاع ہوئی نعوذ باللہ! آپ نے اس کو مجرم سمجھ لیا، یہ تو مجرم نہیں ہے۔ تو کوئی سفارش کرنے والا سفارش کر کے کسی مجرم کو غیر مجرم نہیں ثابت کر سکتا، کسی غیر مجرم کو مجرم نہیں ثابت کر سکتا، اللہ تعالیٰ کو ہر قسم کی معلومات حاصل ہیں، اس لیے کسی کا زور نہیں چلے گا، کسی کی سفارش نہیں چلے گی، تو سفارش کے نظریے کو ذکر کرنے کے ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے علم کو جو ذکر فرمایا کرتے ہیں، تو اس سے مقصد یہی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معلومات بالکل صحیح ہیں اس لیے وہاں کہنے سننے کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔

صفتِ ''قیوم'' کی وضاحت

وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ: جھک جائیں گے چہرے حی القیوم کے لئے، ایسے کے لئے جو کہ زندہ ہے اور تھامنے والا ہے، ''قیوم'' کا معنی تھامنے والا۔ اس میں مشرکوں کے اس نظریے کی تردید بھی کر دی جو اللہ کو مانتے تو تھے لیکن وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مخلوق کو پیدا کر کے اب فارغ ہو کے بیٹھ گیا، اور اس نے اپنے اختیارات دوسروں کو سونپ دیے، اب یہ خدائی جو چل رہی ہے کائنات جو چل رہی ہے تو یہ شرکاء کے ذریعے سے چل رہی ہے، بس اللہ تعالیٰ تو ایسے ہے جیسے گھر کے اندر نعوذ باللہ! ایک بوڑھا آدمی ہوتا ہے جو خاندان کو بنا کے اپنے بچوں کو اختیار دے کے خود فارغ ہو کے بیٹھ جاتا ہے، وہ اپنے خاندان میں معزز ہوتا ہے، لیکن کام اس کے بس میں کوئی نہیں ہوتا۔ تو اللہ تعالیٰ اس طرح سے خاندان کے سربراہ کی طرح نہیں کہ بوڑھا ہونے کے بعد سب

کچھ اپنے بچوں کے سپرد کر کے بے کا ہو کر چارپائی کی زینت بن کے بیٹھ جائے، اس طرح سے نہیں، وہ تو ''قیوم'' بھی ہے، ''حی'' ہے اور ''قیوم'' ہے، زندہ ہے اور سارے جہان کو تھامنے والا ہے، ساری کائنات کو تھامنا اسی کا کام ہے، وہ بے کار ہو کر نہیں بیٹھ گیا، کہ دوسروں کو اختیارات دے کے خود فارغ ہو کے بیٹھ جائے، ایسی بات نہیں۔ ''جھک جائیں گے چہرے، دب جائیں گے چہرے اس اللہ کے لئے جو کہ حی القیوم ہے''، ''حی'' کا معنی زندہ، ''قیوم'' کا معنی تھامنے والا۔ وَقَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا: نامراد ہو گیا وہ شخص جس نے ظلم اٹھایا۔ جس نے ظلم کا ارتکاب کیا، جو ظلم کو اپنے اوپر لاد کر لے آیا، جس نے ظالمانہ کردار اختیار کیا وہ نامراد رہا۔

نیک مؤمنین کا انجام

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ: اور جو کوئی نیک عمل کرے گا بشرطیکہ مؤمن ہو۔ وَهُوَ مُؤْمِنٌ حال ہے، شرط کے قائم مقام ہے۔ جو کوئی نیک کام کرے اس حال میں کہ مؤمن ہو، کیونکہ ایمان کے بغیر نیکی قبول ہی نہیں ہے، اگر کفر کی حالت میں کوئی نیکی کا کام کرتا ہے تو صورۃً نیکی ہے، حقیقتاً کوئی نیکی نہیں، آخرت میں یہ اس طرح سے اُڑ جائیں گے جس طرح سے راکھ کو کوئی سخت آندھی اڑا کے لے جاتی ہے، اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ (سورۂ ابراہیم:۱۸) ان کے اعمال ایسے ہوں گے جس طرح سے راکھ ہوتی ہے، اور اس کے اوپر سخت آندھی چل جائے تو اس کا کوئی ذرہ باقی نہیں رہتا، اڑا کے لے جاتی ہے، تو کفر کی حالت میں نیکیاں ایسے ہی ہوتی ہیں، راکھ کی طرح ہلکی، ان میں کوئی وزن نہیں، وَهُوَ مُؤْمِنٌ کی قید کا یہ فائدہ ہے کہ نیک عمل قبول تبھی ہوگا جبکہ ایمان صحیح ہو، اگر ایمان صحیح نہیں تو نیک عمل بھی قبول نہیں، ''جو کوئی شخص نیک عمل کرے اس حال میں کہ مؤمن ہے'' فَلَا يَخٰفُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا: پس نہیں اندیشہ کرے گا وہ زیادتی کا نہ کمی کا، اس کے اوپر نہ کوئی زیادتی ہوگی نہ کمی ہوگی، اس پر کوئی کسی قسم کا ظلم نہیں ہوگا کہ اس کی حق تلفی کر دی جائے، کہ جس کا وہ حقدار تھا اس کو وہ نہ دیا جائے، ہضم کا معنی یہ ہے کہ اس کا دوسرا حق بھی چھین لیا جائے جو اس کے پاس ہے، غصب کر لیا جائے، تعدی کر لی جائے، حاصل اس کا یہی ہے کہ اس پر کوئی کسی قسم کی ظلم و زیادتی نہیں ہوگی، کوئی کسی قسم کی اس کے ساتھ کمی بیشی نہیں ہوگی، بلکہ اللہ تعالیٰ اس کو صحیح صحیح بدلہ دیں گے۔

قرآن کا مقصد

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا: ہم نے اس کتاب کو ایسے ہی قرآنِ عربی بنا کے اتارا۔ وَصَرَّفْنَا فِيْهِ مِنَ الْوَعِيْدِ: اور ہم نے اس میں وعید مختلف طریقوں سے، پھیر پھیر کے بیان کی، وعید ڈراوے کو کہتے ہیں، یعنی انجام سے ہم نے ڈرایا اور مختلف طریقوں سے ڈرایا، عقلی دلائل کے تحت بھی بیان کیا کہ کفر و شرک غلط راستہ ہے، نتیجہ اچھا نہیں نکلے گا، فطری دلائل کے تحت بھی سمجھایا، تاریخ کے واقعات بیان کر کے بھی سمجھایا، گزشتہ اُمتوں کے حالات بیان کر کے بھی سمجھایا، ہم نے اس کے اندر وعید بار بار بیان کر دی، لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ: تاکہ لوگ ڈر جائیں اور ڈر کے بالکل سیدھے ہو جائیں، اَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا: یا یہ قرآن ان کے لئے یادداشت تازہ کر دے، ''احداثِ ذِکر'' کا معنی نصیحت تازہ کر دینا، بات دوہرا دی، یاد دہانی کروا دی تاکہ ان کے سامنے یہ بات تازہ ہو جائے اور انہیں پتا چل جائے کہ کفر و شرک کا انجام ایسا ہوتا ہے جس طرح سے گزشتہ امتوں کا ہوا ہے۔ یا ڈر جائیں یعنی بالکل سیدھے

ہوجائیں یا یہ قرآن ان کے لئے نصیحت پیدا کردے، ظاہر کردے، یعنی ان کو یاددہانی تازہ کروادے، کچھ نہ کچھ ان کے اندر یاد پیدا ہوجائے۔ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ: پس عالی شان ہے اللہ حقیقی بادشاہ۔ الْمَلِكُ الْحَقُّ: حقیقی بادشاہ۔

''لَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ'' کے دو مفہوم

وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ: اس کے دو مفہوم ہیں:

۱۔ سرورِ کائنات ﷺ کے دل میں شوق ہوتا تھا کہ وحی جلدی جلدی آئے، کیونکہ آپ کے لئے اس علمی جنگ کے اندر ہتھیار ایک وحی ہی تو تھا، مشرکین کے جو اعتراضات ہوتے ان کا جواب آتا، حضور ﷺ کو قوت ہوتی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے نئی نئی باتیں آتیں، حضور ﷺ کو نئے نئے دلائل مہیا ہوتے، اس لیے آپ کو بہت شوق ہوتا تھا کہ وحی جلدی جلدی آئے۔ جس طرح سے پیچھے بھی آیا تھا کہ حضور ﷺ نے جبریل علیہ السلام سے کہا تھا کہ جلدی جلدی آیا کرو، انہوں نے کہا کہ ہم تو اللہ کے حکم کے تحت ہی آتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کو کوئی بات بھولتی نہیں، جو موقع محل ہوتا ہے اس کے مطابق اللہ وحی اتار دیتے ہیں۔ تو یہ بے چینی کے ساتھ انتظار جو ہوتا تھا رسول اللہ ﷺ کو، اس بارے میں اللہ تعالیٰ آپ کو بار بار یہ تلقین کرتے ہیں کہ ٹھیک ہے، شوق ہونا چاہیے، سب کچھ ہے، لیکن اتنا نہیں کہ بے چینی پیدا ہوجائے۔

۲۔ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ: جلدی نہ مچایا کیجئے قرآنِ کریم کے ساتھ قبل اس سے کہ آپ کی طرف اس کی وحی پوری کردی جائے، اور آپ یہ دُعا کرتے رہیں کہ اے میرے رَبّ! زیادہ کر مجھ کو از روئے علم، اللہ تعالیٰ سے زیادتی علم کی دُعا کرتے رہیے، زِدْنِیْ: زیادہ کردے مجھ کو، عِلْمًا: از روئے علم کے۔ اے اللہ! میرا علم بڑھادے۔ تو دُعا اللہ تعالیٰ کے سامنے کرتے رہا کیجئے۔

آدم علیہ السلام کا قصہ

وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ: ہم نے آدم کو وصیت کی تھی اس سے پہلے۔ ''عَهِدَ اِلَيْهِ'' یہ لفظ کسی تاکیدی حکم کے لئے آیا کرتا ہے۔ ہم نے اس کو تاکیداً کہا، ہم نے اس کو زوردار الفاظ میں وصیت کی، عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ: ہم نے آدم کو حکم دیا اس سے قبل، آدم کو ہم نے ایک وصیت کی، فَنَسِيَ: پس آدم بھول گیا، آدم نے وہ یاد نہ رکھی، وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا: ہم نے اس کے لئے کوئی پختگی نہ پائی، بلکہ اس بارے میں آدم کمزور ثابت ہوا۔ یہ آگے آدم علیہ السلام کا قصہ سنایا جارہا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے کو ختم کرنے کے بعد تذکیرِ آخرت کی گئی تھی، اور آگے آدم علیہ السلام کا قصہ سنایا جارہا ہے تو اس میں بھی اسی قسم کا سبق دینا مقصود ہے کہ دیکھو! آدم کو کس طرح سے شیطان نے چکر دیا تھا، اولادِ آدم کو آج بھی ہوشیار رہنا چاہیے، وہی ان کافروں اور مشرکوں کو چکر دیے ہوئے ہے، اور اگر یہ اپنا انجام اچھا چاہتے ہیں تو ان کو شیطان کے چکر سے نکلنا چاہیے، واقعات کے ساتھ ان چیزوں کو واضح کیا جارہا ہے، یہاں آدم علیہ السلام کا قصہ ذکر کیا گیا، یہ واقعہ آپ کے سامنے تفصیل سے سورۂ اعراف میں گزر چکا۔ عَهِدْنَآ سے وہی حکم دینا مراد ہے کہ اس درخت کے قریب نہ جانا، اور آدم علیہ السلام اس حکم کو بھول گئے، اور اس بارے میں ان کے اندر کوئی پختگی نمایاں نہ ہوئی، ''نہ پائی ہم نے ان کے لئے کوئی پختگی'' وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ: یاد کیجئے جب ہم نے کہا فرشتوں کو کہ سجدہ کیجئے آدم کو، تو

انہوں نے سجدہ کر دیا سوائے ابلیس کے، اَبٰی: ابلیس نے انکار کر دیا، فَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ: ہم نے کہا کہ اے آدم! اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ: یہ تیرا دشمن ہے وَلِزَوْجِكَ: اور تیری بیوی کا، فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ: پس یہ تمہیں نکال نہ دے جنت سے فَتَشْقٰى: پھر تو مشقت میں پڑ جائے گا۔ تَشْقٰى یہ لفظ شقاوت سے لیا گیا ہے، ایک تو شقاوتِ اخروی ہے کہ انسان بدبخت ہوجائے، عذاب میں مبتلا ہوجائے، ایک شقاوتِ دُنیوی ہے کہ راحت وآرام چھن جائے اور انسان مشقت میں واقع ہوجائے، تو یہاں تشقٰی سے شقاوتِ دُنیوی مراد ہے، مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى میں جس طرح سے ذکر کیا گیا تھا۔ ''تمہیں یہ جنت سے نہ نکال دے کہ پھر تُو مشقت میں پڑ جائے گا''، یہاں تجھے بڑی راحت حاصل ہے اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا: بے شک تیرے لیے یہ بات ہے کہ تُو اس جنت میں بھوکا نہیں ہوتا۔ ''جوع'' بھوک کو کہتے ہیں۔ وَلَا تَعْرٰى: اور نہ تُو ننگا ہوتا ہے، وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا: اور بے شک تُو پیاسا نہیں ہوتا اس جنت میں، وَلَا تَضْحٰى: اور نہ تجھے دُھوپ لگتی ہے۔ تو یہ راحت کا سارا سامان تجھے بلا مشقت حاصل ہے، بھوکا نہیں ہوتا کہ تُو روٹی کا محتاج ہو، یعنی روٹی تجھے وافر میسر ہے، تُو بھوک میں نہیں پڑتا، ننگا نہیں ہوتا کہ تجھے کپڑے کی ضرورت پیش آئے، پیاسا نہیں ہوتا کہ پانی کا محتاج ہو، اور دُھوپ نہیں لگتی کہ تُو مکان کا اور سائے کا محتاج ہو، یہ تیری ساری کی ساری ضروریات یہاں پوری ہیں، یہی انسان کی بنیادی ضرورتیں ہیں جس کو لوگ آج ''گل، روٹی، کپڑا'' مکان سے تعبیر کرتے ہیں، تو مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ''روٹی، کپڑا، مکان'' یہ تیری بنیادی ضرورتیں جنت میں مہیا ہیں، اس لیے تُو راحت اور آرام کے ساتھ یہاں رہ، اگر تُو یہاں سے نکل گیا پھر تو مشقت میں پڑ جائے گا، کبھی روٹی کی فکر ہوگی، کبھی پانی کی فکر ہوگی، کبھی کپڑے کی فکر ہوگی، اور کبھی مکان کی فکر ہوگی، دُھوپ سے بچنے کے لئے سائے کی فکر ہوگی، پانی میسر نہیں آئے گا تو تُو مشقت میں پڑ جائے گا، کہ پانی کا انتظام ہونا چاہیے، نکلے لگاتا پھرے گا، کنویں کھودے گا، ٹیوب ویل لگائے گا، کیا کچھ جتن کرنا پڑتا ہے، بھوک لگے گی تو بھوک کو زائل کرنے کے لئے روٹی کا محتاج ہوگا، یہ چیزیں ایسی ہیں کہ جو تجھے جنت میں میسر ہیں، اگر تُو جنت سے نکل گیا تو روٹی کپڑا مکان کا چکر تیرے گلے میں ایسا پڑے گا کہ تُو مشقت میں آ جائے گا۔

عورت کا نفقہ مرد کے ذِمّے ہے

اور پھر یہاں ذکر تو کیا ہے دونوں کا کہ یہ تیرا دشمن ہے اور تیری بیوی کا، اور اگر اس شیطان نے تجھے جنت سے نکال دیا تو تَشْقٰى کے اندر نسبت اکیلے آدم کی طرف کی کہ مشقت میں تُو پڑ جائے گا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کا روٹی، کپڑا، مکان مرد کے ذِمّے ہے، عورت کو خود اپنی فکر نہیں کرنی پڑتی، اس لیے اس نعمت سے محروم تو دونوں ہوں گے لیکن مشقت میں مرد پڑے گا، عورت کو تو کما کے دینا پڑے گا، روٹی، کپڑے، مکان کی مشقت مرد کے ذِمّے ہے، جس طرح سے فقہ کے اندر آپ پڑھتے ہیں کہ بیوی کا نفقہ اور سکنیٰ خاوند کے ذِمّے ہوتا ہے اور اس کے اندر تینوں باتیں آتی ہیں: روٹی، کپڑا، مکان! رہائش مہیا کرنی پڑے گی، لباس دینا پڑے گا، اور اس کو خوراک دینی پڑے گی۔ تو تشقٰی کے اندر نسبت اکیلے آدم علیہ السلام کی طرف کر دی۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ پہلے کہہ دیا کہ اس کا خیال رکھیو، ورنہ یہ مشقت آ جائے گی۔

شیطان کا بہکانے کا طریقہ آج بھی وہی ہے

فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ: آدم علیہ السلام کی طرف شیطان نے وسوسہ ڈالا، اور کہا کہ اے آدم! هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ: کیا میں تیری راہنمائی کروں ہمیشگی کے درخت پر، وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى: اور ایسی سلطنت پر جو کبھی بوسیدہ نہیں ہوگی۔ میں تجھے ایک ایسا درخت بتاؤں کہ اگر تو اسے کھالے گا تو ہمیشہ زندہ رہے گا، اور ایسی سلطنت تجھے مل جائے گی جو کبھی کمزور نہیں پڑے گی، کبھی بوسیدہ نہیں ہوگی۔ یہ شیطان اس نے وسوسہ ڈالا۔ فَاَكَلَا مِنْهَا: تو آدم اور حواء نے اس شجرہ سے کھالیا، اس درخت کو کھالیا۔ اب یہاں دیکھئے اللہ تعالیٰ نے جنت میں ہزاروں نعمتیں دی ہوئی تھیں، اور ایک درخت پہ پابندی لگائی تھی کہ اس کو نہیں کھانا، شیطان نے یہی سمجھایا کہ ترقی کا راز یہی ہے، یہ درخت کھاؤ گے تو تمہیں ترقی ہوگی، ہمیشہ کے لیے زندگی حاصل ہوجائے گی، اور ایسی سلطنت مل جائے گی جس میں دوام ہوگا اور وہ بوسیدہ نہیں ہوگی۔ اور آج بھی شیطان کا طریقہ یہی ہے کہ بیسیوں نہیں، سینکڑوں، ہزاروں، لاکھوں نعمتیں ہیں جن سے فائدہ اٹھانا اللہ نے ہمارے لیے حلال کردیا ہے، چند چیزیں ہیں جو اللہ نے حرام ٹھہرائی ہیں، آپ دُودھ پی سکتے ہیں، لسی پی سکتے ہیں، ہزاروں قسم کے مشروبات اللہ نے بنادیے، مختلف قسم کے شربت بنادیے، وہ آپ پی سکتے ہیں، چائے پی سکتے ہیں، سادہ پانی پی سکتے ہیں، کتنے مشروبات ہیں جو اللہ نے مہیا کردیے، ایک شراب ہے جس سے منع کیا ہے، کہ نشے والی چیز نہ پیو، لیکن آج شیطان یہی سمجھاتا ہے کہ اس وقت تک صحت ہی ٹھیک نہیں ہوگی جب تک یہ نشے والی چیز نہیں پیو گے، تو کتنے لوگ ہیں جو دُودھ کے مقابلے میں شراب میں صحت کو سمجھتے ہیں، اور کتنے لوگ ہیں جو دوسرے مشروبات کے مقابلے میں شراب کو ترجیح دیتے ہیں، یہ وہی بات ہے جس طرح سے ہمارے ''بابا'' کو اس نے غلطی میں ڈالا تھا، تو نسل کو بھی اسی طرح غلطی میں ڈالے ہوئے ہے۔ کاروبار اور خرید و فروخت کی کتنی صورتیں ہیں جو سب جائز ہیں، فائدہ اُٹھا سکتے ہو، لیکن ایک سُود ہے جس سے منع کیا ہے، لیکن آج شیطان کے پنجے میں آئے ہوئے آدم کے بچے یہ سمجھتے ہیں کہ جب تک سُودی کاروبار نہیں ہوگا ترقی نہیں ہوگی، اگر سُود کو چھوڑ دیا جائے تو تجارت ہی تباہ ہوجائے گی، تو یہ بالکل اسی قسم کی بات ہے کہ جنت کی ساری نعمتیں ایک طرف، اور ایک درخت سے منع کیا تھا، تو شیطان نے یہی سمجھایا کہ ترقی کا راز یہی ہے، اور آج جتنے بھی اللہ تعالیٰ کے اَحکام ہیں، ان اَحکام میں ہمیں ترقی نظر نہیں آتی، اور نہ ان کے اندر ہمیں کوئی بھلائی نظر آتی ہے، جن چیزوں سے روکا ہے اُدھر کو ہم دوڑتے ہیں، مسجد میں ہمارے لیے سکون نہیں، قرآنِ کریم کے مطالعے میں اور قرآنِ کریم کی تلاوت میں ہمارے لیے راحت نہیں، اب ہم راحت تلاش کرتے ہیں ناولوں میں اور سینما گھروں میں، تو کیا یہ شیطان کا وہی دِکھایا ہوا راستہ نہیں ہے؟ بیوی ایک کیا، اللہ تعالیٰ نے چار چار حلال کردیں، گھر میں خوبصورت بیوی ہو، مرضی کے مطابق سب کچھ ہے، لیکن انسان کو سکون حاصل ہوتا ہے تو بدمعاشی کے اَڈّوں میں جاکے، یہ وہی چکر ہے جو شیطان نے آدم کی اولاد کو دیا ہوا ہے کہ اللہ نے جدھر سے روکا ہے کہ یہ کام نہیں کرنا وہ چند چیزیں ہیں، اور اس کے مقابلے میں سینکڑوں ہزاروں راستے آپ کے لیے کھول دیے کہ آپ یہ کام کرسکتے ہیں، لیکن شیطان جب چکر دے گا، انسان کو یہی سمجھائے گا کہ لذت، سکون، راحت، ترقی جو کچھ ہے وہ سب انہی کاموں میں ہے جن سے روکا گیا ہے، اور آدم کے بچے ہیں کہ دھڑا دھڑ

ادھر کو دوڑے جا رہے ہیں، تو جو حال آدم کا کیا تھا وہی آدم کی اولاد کا کر رکھا ہے۔ پہننے کے لیے کتنی قسم کے کپڑے اللہ نے ہمارے لیے بنا دیے کہ پہنو، اور ایک ریشم ہے یا سونا ہے جس سے مرد کو روکا ہے، لیکن آج دیکھو! آدم علیہ السلام کے بچے کس طرح سے دوڑ دوڑ کے ریشم اور سونے کی طرف جاتے ہیں، جب تک سونے کی انگوٹھی نہ پہنیں کہتے ہیں کہ شان ہی نمایاں نہیں ہوتی، اس لیے بیاہ شادی کے موقع پر اچھے بھلے لوگ بھی لڑکے کو سونے کی انگوٹھی پہناتے ہیں، یہ راستہ وہی ہے جس کے ذریعے پہلے دن شیطان نے ہمارے ابا کو بہکایا تھا، اسی پر ہی آج اولاد بہکائی جا رہی ہے، آپ جب بھی سوچیں گے تو آپ کے سامنے یہ بات واضح ہو جائے گی، کہ نفس انسان کو یہی اُکساتا ہے، اور شیطان یہی وسوسہ ڈالتا ہے کہ جو ممنوعات ہیں، شرعی طور پر منہیات ہیں، انسان سمجھتا ہے کہ لذت اسی میں، سکون اسی میں، ترقی اسی میں، شان اسی میں، اور شوکت اسی میں نمایاں ہے، یوں کریں گے تو دُنیا کے اندر عزت حاصل ہو گی، بس یہ طمع دلا کے انسان کو بُرائی کی طرف لیے جا رہا ہے، یہ وہی وسوسہ ہے جو پہلے دن ہمارے اَبا کے دل میں ڈالا تھا، اسی وسوسے کو آج بھی وہ ہمارے دلوں میں ڈال رہا ہے، اور ہم اس سے اسی طرح متاثر ہو رہے ہیں۔

فَاَكَلَا مِنْهَا: دونوں نے مل کے اس درخت کو کھا لیا، فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا: سوءات سَوْءَة کی جمع ہے، سوءۃ سے یہاں اعضائے مستورہ مراد ہیں، جن کا کھلنا اور ننگا ہونا انسان کے لئے باعث غم ہے، یہ اَعضائے مستورہ، شرمگاہ۔ ''ظاہر ہو گئی ان کے لئے ان کی شرمگاہ'' یعنی وہ عزت کا لباس جو اللہ نے پہنا رکھا تھا وہ لباس اتار لیا، وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ: اور یہ جوڑنے لگ گئے، عَلَيْهِمَا: اپنے اوپر مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ: جنت کے پتے، جنت کے پتے جوڑنے لگ گئے یعنی جنت کے پتوں کے ساتھ اپنے بدن کو ڈھانپنے لگ گئے۔

آدم علیہ السلام کے عصیان کا مطلب

وَعَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ: آدم نے اپنے رَبّ کے حکم کے خلاف کیا، فَغَوٰى: پس وہ غلطی میں پڑ گیا۔ ''عصی'' اور ''غوی'' کا ترجمہ ہم اس طرح سے کریں گے، ادب کا تقاضا یہی ہے، کیونکہ اگر ہم کہیں کہ ''نافرمان ہو گیا اپنے رَبّ سے اور گمراہ ہو گیا'' تو یہ لفظ ہماری زبان میں سخت سمجھے جاتے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کا تذکرہ جب بھی کیا جائے تو اچھے انداز سے کیا جاتا ہے۔ اب ٹھیک ہے، کہ ان سے غلطی ہوئی تھی، اللہ نے معاف کر دی، جب معاف کر دی تو نہ ہونے کے برابر ہو گئی۔ اور پھر جو غلطی کی تھی اچھے جذبے سے کی تھی، اس کو ''معصیتِ حقیقی'' نہیں کہہ سکتے۔ ''معصیتِ حقیقی'' یہ ہوتی ہے کہ انسان کے ہوش وحواس قائم ہیں، سمجھتا ہے کہ یہ غلط کام ہے پھر بھی کر رہا ہے، یہ ہے حقیقت کے اعتبار سے گناہ۔ ورنہ آپ نے ایک کام کو اچھا سمجھ کے کیا، نتیجتاً معلوم ہوا کہ غلط تھا، تو یہ حقیقتاً گناہ نہیں ہے، صورۃً گناہ ہے، اور آدم علیہ السلام سے غلطی یونہی ہوئی، آدم علیہ السلام نے نافرمانی کے جذبے سے نہیں کیا جو کچھ کیا، اچھائی کے جذبے سے کیا، اللہ کا قُرب حاصل کرنے کے لیے، فرشتہ بننے کے لئے، دائمی زندگی حاصل کرنے کے لئے، اس قسم کے تصور کے تحت یہ قدم اُٹھایا تھا، یہ ذہن میں ہی نہیں رہا کہ اللہ نے روکا ہے، اور اس سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہو جائے گی۔ اور آپ ایک کام کریں، پتا ہے کہ یہ چیز حرام ہے، اور آپ کو ہوش ہے کہ آپ سمجھتے ہیں کہ حرام ہے، لیکن پھر آپ اس کی طرف گھستے چلے جائیں یہ حقیقتاً نافرمانی ہوتی ہے۔ کسی اچھے جذبے کے تحت کام کیا جائے لیکن بعد میں اس کا نتیجہ غلط نکل آئے، پھر پتا چلے کہ ہم نے غلط

سوچا تھا، یا ہمیں سمجھ نہیں آئی، وہ صورۃً گناہ ہوتا ہے، حقیقتاً گناہ نہیں ہوتا۔ لیکن انبیاء ﷺ چونکہ اللہ تعالیٰ کے مقرب ہوتے ہیں اس لیے ان کی معمولی سی لغزش کو بھی بہت سخت انداز میں اللہ تعالیٰ ذکر فرماتے ہیں۔

عَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ: آدم نے اپنے رَبّ کے حکم کو چھوڑ دیا، آدم نے اپنے رَبّ کا حکم نہ مانا، نافرمانی کی، فَغَوٰى: پس وہ غلطی میں پڑ گیا۔ ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ: پھر چن لیا اس کو اس کے رَبّ نے، فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى: پھر اس کے اُوپر رُجوع کیا، توجہ فرمائی، اور اس کو سیدھا راستہ دکھایا۔ اللہ نے توبہ قبول کی، بعد میں سیدھے راستے پہ چلایا۔ قَالَ: اور فرمایا، اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا: یہ خطاب آدم علیہ السلام اور اِبلیس دونوں کو ہے، دو پارٹیوں کے اعتبار سے۔ اُتر جاؤ تم سب یہاں سے۔ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ: تمہارا بعض بعض کا دشمن ہوگا، تمہاری آپس میں عداوت قائم ہوجائے گی فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى: یہ آدم علیہ السلام کی اولاد کو خطاب ہے، کیونکہ آدم علیہ السلام نمائندہ ہے اپنی ساری اولاد کا۔ پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی راہنمائی آئے، فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ: پس جو میری ہدایت کی پیروی کرے گا، فَلَا يَضِلُّ: پس وہ دنیا میں بھٹکے گا نہیں، وَلَا يَشْقٰى: آخرت میں بدبخت نہیں ہوگا، نہ وہ بھٹکے گا نہ بدبخت ہوگا، یعنی دنیا میں بھٹکے گا نہیں، سیدھے راستے پہ قائم رہے گا، اور آخرت میں بدبخت نہیں ہوگا۔

اللہ کی یاد سے اِعراض کرنے والے کی زندگی تنگ ہوجاتی ہے

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ: اور جو میرے ذِکر سے منہ موڑ لے گا، جو میرے ذِکر سے اعراض کرے گا، فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا: پس اس کے لئے تنگ معیشت ہوگی۔ ''ضنک'' کہتے ہیں تنگ کو۔ تنگ معیشت سے مراد یہ بھی لیا گیا ہے کہ قبر میں اس کو تنگی پیش آئے گی، اور اس سے یہ بھی مراد لیا گیا کہ دُنیا کے اندر بھی اس کو کوئی فراخی حاصل نہیں ہوگی۔ جو شخص ایمان نہ لائے اور اللہ کی نصیحت پر عمل نہ کرے، ظاہری طور پر وہ آپ کو کتنا مال دار، کتنا خوش حال نظر کیوں نہ آئے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس کے قلب کے اندر کبھی سکون اور اطمینان نہیں آسکتا، اس کی طبیعت ڈانواں ڈول ہوگی، ہروقت وہ حیرت زدہ ہوگا، پریشان ہوگا، ظاہری ٹیپ ٹاپ کو دیکھ کے آپ متاثر نہ ہو جایا کیجئے کہ یہ لوگ خوش حال ہیں، ان کا قلب خالی ہوتا ہے، قلب میں سکون اطمینان نہیں آسکتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت ایسی بنائی ہے کہ اس کے قلب کو اگر سکون آتا ہے تو اللہ کی یاد سے، اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ (سورۂ رعد: ۲۸) اور اگر کوئی اللہ کی یاد سے غافل ہو اور وہ بہلاوے لے لے، مال کے ساتھ دل بہلانا چاہے، بیوی کے ساتھ دل بہلانا چاہے، جائیداد کے ساتھ بہلانا چاہے، اور سیر و سیاحت کے ساتھ بہلانا چاہے، تو یہ ایسے ہی ظاہری بہلاوے ہیں، یہ دل کو سکون اور اطمینان نہیں دلا سکتے۔ بالکل آپ اس کو اس طرح سمجھیے کہ جس طرح سے چھوٹا بچہ ہے، اس کے دِل میں ماں کے دُودھ کی طلب ہے، اور وہ اس دُودھ کے لئے روتا ہے، اب جس وقت بچہ روتا ہے تو عورتوں کی عادت ہوتی ہے، یا گھر میں جو افراد موجود ہوتے ہیں کہ ماں فارغ نہیں ہے یا موجود نہیں ہے تو اس کے منہ میں چوسنی دے دیتے ہیں، اب وہ چوسنی لے کے تھوڑی دیر تو اس میں منہ مارتا ہے، اور چپ ہوتا ہے، لیکن کبھی چوسنی کے ساتھ دُودھ کی کمی پوری ہوتی ہے؟ تھوڑی دیر کے لیے وہ بہل جائے گا، لیکن وہ کمی جو اندر ہے وہ تو تبھی پوری ہوگی کہ جس وقت ماں کی چھاتی کے ساتھ لگ کے ماں کا پستان چُوسے گا۔ بالکل اسی طرح سے سمجھیے کہ یہ

مال دولت اور اس قسم کے ظاہری طور پر جو بھی اسباب راحت ہیں، اچھی سے اچھی کوٹھیاں ہیں، اچھی سے اچھی کاریں ہیں، اچھے سے اچھا لباس ہے، یہ اسی طرح سے ہے جیسے بچہ چوسنی کے ساتھ دل بہلانے کی کوشش کرے، اور جو روح کا سکون ہے وہ تو اللہ کی یاد کے ساتھ ہے، وہ ان لوگوں کو میسر نہیں ہے، واقعۃً میسر نہیں ہے، کبھی ان کے قریب جا کے دیکھیں گے تو آپ کو پتا چلے گا کہ ان کے اندرون کتنی پریشانیاں ہیں۔

چنانچہ حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ اس کے اوپر لکھتے ہیں ''جو آدمی اللہ کی یاد سے غافل ہو کر محض دُنیا کی فانی زندگی ہی کو قبلۂ مقصود سمجھ بیٹھا ہے، اس کی گزران مکدر اور تنگ کر دی جاتی ہے، گو دیکھنے میں اس کے پاس بہت کچھ مال و دولت اور سامانِ عیش و عشرت نظر آئیں، مگر اس کا دِل قناعت و توکل سے خالی ہونے کی بنا پر ہر وقت دُنیا کی مزید حرص، ترقی کی فکر، اور کمی کے اندیشے میں بے آرام رہتا ہے، کسی وقت ننانوے کے پھیر سے قدم باہر نہیں نکلتا، موت کا یقین اور زوالِ دولت کے خطرات الگ سوہانِ رُوح رہتے ہیں۔ یورپ کے اکثر متنعمین یعنی سرمایہ دار لوگ جو اپنے آپ کو بہت خوش حال سمجھتے ہیں ان کو دیکھ لیجئے، کسی کو رات دِن میں دو گھنٹے اور کسی خوش قسمت کو تین چار گھنٹے سونا نصیب ہوتا ہوگا، بڑے بڑے کروڑ پتی دُنیا کے مخمصوں سے تنگ آ کر موت کو زندگی پر ترجیح دینے لگتے ہیں، اس نوع کی خودکشی کی بہت سی مثالیں پائی گئی ہیں، (آج کل بین الاقوامی رپورٹ جو خودکشیوں کے بارے میں ہے، اس کے مطابق خودکشی کرنے والوں کا سب سے زیادہ تناسب امریکا میں ہے، اور وہ بھی کروڑ پتی لوگ، غریب آدمی خودکشی نہیں کرتے وہاں، جو بہت بڑے کاروباری اور بہت بڑے دولت مند ہوتے ہیں، اکثر و بیشتر خودکشی وہی کرتے ہیں، ان کا دِل اتنا بے چین ہوتا ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ شاید اگر ہم اپنی زندگی ختم کر دیں گے تو سکون میسر آ جائے گا، یہ واقعہ ہے) نصوص اور تجربہ اس پر شاہد ہیں کہ اس دُنیا میں قلبی سکون اور حقیقی اطمینان کسی کو بدوں یادِ الٰہی کے حاصل نہیں ہو سکتا اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔ لیکن ''ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تانہ چشی''۔ بعض مفسرین نے ''معیشتِ ضنک'' کے معنی لیے ہیں وہ زندگی جس میں خیر داخل نہ ہو سکے، گویا خیر کو اپنے اندر لینے سے تنگ ہو گئی، ظاہر ہے کہ ایک کافر جو دُنیا کے نشے میں بدمست ہے، اس کا سارا مال و دولت اور سامانِ عیش و تنعم آخر کار اس کے حق میں وبال بننے والا ہے، جس خوش حالی کا انجام چند روز کے بعد دائمی تباہی ہو، اسے ''خوش حالی'' کہنا کہاں زیبا ہے؟ بعض مفسرین نے مَعِيْشَةً ضَنْكًا سے قبر کی برزخی زندگی مراد لی ہے، یعنی قیامت سے پہلے اس پر سخت تنگی کا ایک اور دور آئے گا جبکہ قبر کی زمین بھی اس پر تنگ کر دی جائے گی۔ معیشۃ ضنک کی تفسیر عذابِ قبر سے بعض صحابہ نے کی ہے، بلکہ ''بزار'' نے باسنادِ جید ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے، بہرحال معیشۃً ضنکًا کے تحت یہ سب صورتیں داخل ہو سکتی ہیں'' (تفسیر عثمانی)۔

اللہ کی یاد سے غافل کا آخرت میں انجام

''جو کوئی میرے ذِکر سے اعراض کرے گا اس کے لیے تنگ معیشت ہوگی'' وَنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى: اور ہم اس کو جمع کریں گے، اُٹھائیں گے قیامت کے دِن اندھا، قیامت کے دِن جب اُٹھے گا تو اندھا ہوگا۔ کہے گا کہ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى:

اے میرے رَبّ! تُو نے مجھے اندھا کیوں اُٹھایا؟ وَقَدْ كُنْتُ بَصِيرًا: میں تو بہت دیکھنے والا تھا۔ دُنیا میں تو میری نظر اچھی تھی، میں تو بصیر تھا، تو آج تُو نے مجھے اندھا کیوں اُٹھایا؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيتَهَا: اسی طرح سے تیرے پاس ہماری آیات آئی تھیں، تُو نے ان کو بھلا دیا، تُو نے ان کا خیال نہیں کیا، وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى: اسی طرح سے آج تُو بھلا دیا جائے گا، تیرا کوئی خیال نہیں کرے گا۔ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي مَنْ اَسْرَفَ: ایسے ہی بدلہ دیتے ہیں ہم اس شخص کو جو کہ حد سے تجاوز کرے، وَلَمْ يُؤْمِنْ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ: اور اپنے رَبّ کی آیات پر ایمان نہ لائے، ہم اس کو بدلہ ایسا ہی دیں گے، وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰى: اور آخرت کا عذاب بہت سخت اور بہت دیر تک باقی رہنے والا ہے۔

گزشتہ قوموں کے اَنجام سے عبرت حاصل کرو

اَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ: مِنَ الْقُرُوْنِ یہ کَمْ کی تمیز ہے۔ کتنی جماعتیں ہم نے ان سے پہلے ہلاک کر دیں، کیا یہ بات اِن لوگوں کے لئے ہدایت کا باعث نہیں؟ کیا یہ بات اِن لوگوں کو ہدایت نہیں دیتی؟ ان کے لئے حقیقت کو واضح نہیں کرتی کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی جماعتیں ہلاک کر دیں، يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ: یہ ان کے گھروں میں چلتے پھرتے ہیں، ان کے رہنے کی جگہوں میں چلتے پھرتے ہیں، کیونکہ وہ جو تباہ شدہ آبادیاں تھیں ان میں یہ لوگ آتے جاتے تھے، جیسے آج ہمارے ہاں بھی کئی جگہ شہر تباہ ہوئے ہوئے ہیں، کھنڈرات پڑے ہوئے ہیں، تو لوگ سیر وغیرہ کے لئے اور دیکھنے کے لئے وہاں جاتے ہیں۔ اور یہ لوگ شام کی طرف جاتے تھے، تو قومِ لُوط، اور عاد و ثمود کی بستیوں کے پاس سے گزرتے تھے، تو کیا یہ واقعات ان کے لئے ہدایت کا باعث نہیں ہیں؟ كَمْ اَهْلَكْنَا یہ مابعد کے ساتھ مل کے يَهْدِ کا فاعل ہے۔ کیا یہ بات کہ ہم نے ان سے پہلے بہت سی جماعتوں کو ہلاک کر دیا، ان کو ہدایت نہیں دیتی؟ یہ اُن کے مساکن میں چلتے پھرتے ہیں، اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى: بے شک اس میں البتہ نشانیاں ہیں عقل والوں کے لئے۔ النُّهٰى: نُهْيَةٌ کی جمع ہے، نُہیہ عقل کو کہتے ہیں۔ عقل والے، جن کو سوچنے کی عادت ہے اُن کے لئے اس میں بہت ساری نشانیاں ہیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّاَجَلٌ مُّسَمًّى ﴿۱۲۹﴾ فَاصْبِرْ عَلٰى مَا
اگر تیرے رَبّ کی طرف سے ایک بات سبقت نہ لے گئی ہوتی اور وقت متعین نہ ہوتا تو عذاب لازم پکڑنے والا ہوتا ﴿۱۲۹﴾ سہتا رہ ان باتوں کو
يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا ۚ وَمِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ
جو یہ کہتے ہیں اور اپنے رَبّ کی حمد کے ساتھ تسبیح بیان کر سورج کے طلوع سے پہلے اور سورج کے غروب سے پہلے اور رات کی کچھ گھڑیوں میں

فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى ﴿۱۳۰﴾ وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ

پس تُو تسبیح بیان کر اور دِن کے کناروں میں تا کہ تُو خوش ہو جائے ﴿۱۳۰﴾ نہ پھیلا تُو اپنی آنکھیں اس چیز کی طرف جس کے ذریعے سے ہم

اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ؕ وَرِزْقُ

نے فائدہ پہنچایا ان میں سے مختلف لوگوں کو، یعنی دُنیوی زندگی کی رونق کے ذریعے سے، تا کہ ہم ان کی آزمائش کریں اس میں، اور تیرے رَبّ کی

رَبِّكَ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ﴿۱۳۱﴾ وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ؕ لَا نَسْئَلُكَ

دی ہوئی چیز بہتر ہے اور زیادہ باقی رہنے والی ہے ﴿۱۳۱﴾ اپنے متعلقین کو نماز کا حکم دیجئے اور خود بھی اس کے اُوپر قائم رہیے ہم آپ سے

رِزْقًا ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكَ ؕ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى ﴿۱۳۲﴾ وَقَالُوْا لَوْلَا يَاْتِيْنَا

رزق کا سوال نہیں کرتے، ہم آپ کو رزق دیں گے، اور اچھا انجام تقویٰ کے لئے ہے ﴿۱۳۲﴾ اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ کیوں نہیں لاتا ہمارے پاس

بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ اَوَلَمْ تَاْتِهِمْ بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ﴿۱۳۳﴾ وَلَوْ اَنَّاۤ اَهْلَكْنٰهُمْ

نشانی اپنے رَبّ کی جانب سے، کیا ان کے سامنے نہیں آ گئی اس کی دلیل جو کچھ پہلی کتابوں میں موجود ہے؟ ﴿۱۳۳﴾ اگر ہم انہیں ہلاک کر دیتے

بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْلَاۤ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا

کسی عذاب کے ذریعے سے اس سے قبل تو البتہ یہ لوگ کہتے: اے ہمارے رَبّ! تُو نے کیوں نہیں بھیج دیا ہماری طرف رسول

فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَنَخْزٰى ﴿۱۳۴﴾ قُلْ كُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ

کہ ہم تیری آیات کی اتباع کرتے قبل اس کے کہ ہم ذلیل ہوتے اور رُسوا ہوتے ﴿۱۳۴﴾ آپ کہہ دیجئے کہ ہر کوئی انتظار کرنے والا ہے

فَتَرَبَّصُوْا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ اَصْحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِيِّ وَمَنِ اهْتَدٰى ﴿۱۳۵﴾

پس تم بھی انتظار کرو! عنقریب تم جان لو گے کہ کون ہیں سیدھے راستے والے اور کون ہیں جو اپنی منزل مقصود تک پہنچے ﴿۱۳۵﴾

تفسیر

کُفّار کی طرف سے عذاب کا مطالبہ اور اس کا جواب

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ: اگر نہ ہوتی ایک بات جو سبقت لے گئی تیرے رَبّ کی طرف سے۔ وَاَجَلٌ مُّسَمًّى کا عطف ہے كَلِمَةٌ کے اوپر۔ اور وقت متعین نہ ہوتا۔ لَكَانَ لِزَامًا: یہ لَوْلَا کا جواب ہے، كَانَ کی ضمیر عذاب کی

طرف لوٹے گی۔ لِزَامًا: مُلَازِمًا کے معنی میں ہے، یہ باب مفاعلہ کا مصدر ہے۔ اگر تیرے رَبّ کی طرف سے ایک بات سبقت نہ لے گئی ہوتی اور وقت متعین نہ ہوتا تو عذاب لازم پکڑنے والا ہوتا، یعنی یہ جو کفر کر رہے ہیں، بار بار عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں، تو اصل بات یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے ایک بات طے شدہ ہے، اور وہ طے شدہ بات یہی ہے کہ دنیا میں مہلت دی جاتی ہے، غلطی پر فوراً نہیں پکڑلیا جاتا، یا ان کے لئے آخرت کا عذاب متعین ہے، اس لیے دنیا میں ان کی کچھ ڈوری ڈھیلی چھوڑ دی گئی، یہ بات طے شدہ ہے، اور ان کی سزا کے لئے اللہ کے علم میں وقت متعین ہے، اگر یہ باتیں نہ ہوتیں تو فوراً ان کے اوپر عذاب آجاتا، عذاب لازم پکڑنے والا ہوتا۔ تو یہ بد بخت ہیں جو اللہ کی ڈھیل کو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ہمارے لیے اچھی ہے، یا ہمارا کردار اچھا ہے، اور ہم پر کوئی کسی قسم کی گرفت نہیں ہوگی، تو اس ڈھیل سے فائدہ نہیں اُٹھاتے بلکہ یہ ڈھیل ان کے لئے مزید اکڑنے کا باعث بن گئی، یہ ان کی بدبختی ہے، اگر یہ نیک بخت ہوں تو اس مہلت سے فائدہ اُٹھائیں۔ تو ان کو جو شبہ تھا کہ جب ہم ایسے ہیں تو عذاب کیوں نہیں آتا؟ اس کا جواب ان الفاظ میں دے دیا گیا۔

''صبر'' اور ''نماز'' کا حکم اور اس کے فوائد

فَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ: آپ صبر کیجئے ان باتوں پر جو یہ کہتے ہیں، آپ ان کی باتیں برداشت کرتے رہیے، سہارا ان باتوں کو جو یہ کہتے ہیں۔ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ اور اپنے رَبّ کی حمد کے ساتھ تسبیح بیان کر۔ سَبِّحْ تسبیح بیان کر، مُتَلَبِّسًا بِحَمْدِ رَبِّكَ اس حال میں کہ تو متلبس ہے اپنے رَبّ کی حمد کے ساتھ، جیسے آپ ترجمہ کیا کرتے ہیں۔ تسبیح اور تحمید یہ دو لفظ آیا کرتے ہیں، ''تسبیح'' کا معنی ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کو نقص کی صفتوں سے پاک قرار دینا، اور ''حمد'' کا معنی ہوتا ہے صفاتِ کمال کے ساتھ اللہ کو متصف قرار دینا، تو اللہ کے ذِکر کے اندر یہ دو باتیں ہونی چاہئیں، ایک تو اللہ تعالیٰ کو صفاتِ نقص سے پاک قرار دیا جائے کہ کوئی عیب کی بات، کوئی نقص کی بات اس میں پائی نہیں جاتی، اور اچھی صفات کے ساتھ اس کو موصوف قرار دیا جائے کہ کوئی کمال ایسا نہیں جو بے انتہا اللہ تعالیٰ کی ذات میں موجود نہ ہو، تو منفی اور مثبت یہ دونوں پہلو ہو جاتے ہیں، یہی ذکر کا صحیح طریقہ ہے۔ پاکی بیان کر اپنے رَبّ کی حمد کے ساتھ، تسبیح بیان کر اپنے رَبّ کی حمد کے ساتھ، یعنی تسبیح بیان کر اور ساتھ ساتھ تعلق اپنے رَبّ کی حمد کے ساتھ بھی رکھ، دونوں کو بیان کر۔ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ: سورج کے طلوع سے پہلے، وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا: اور سورج کے غروب سے پہلے، وَمِنْ اٰنَآئِ الَّیْلِ: اور رات کی کچھ گھڑیوں میں فَسَبِّحْ: پس تو تسبیح بیان کر، وَاَطْرَافَ النَّهَارِ: اور دن کے کناروں میں لَعَلَّكَ تَرْضٰی: تاکہ تو خوش ہو جائے، تاکہ تو راضی رہے۔

پانچ نمازوں کا ثبوت قرآن سے

سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ: اس کو یہاں مفسرین نے نماز پڑھنے پہ محمول کیا ہے، کیونکہ آگے اوقات متعین کیے گئے ہیں، اور اُن اوقات سے اشارہ یہی ہے کہ یہاں تسبیح اور تحمید سے، اللہ کے ذِکر سے نماز پڑھنا مراد ہے، قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ: سورج کے نکلنے سے پہلے، یہ تو فجر کی نماز ہوگئی، قَبْلَ غُرُوْبِهَا: سورج کے غروب ہونے سے پہلے، یہ عصر کی نماز ہوگئی، اور مِنْ اٰنَآئِ الَّیْلِ: رات کے کچھ

اوقات میں، آناء جمع ہے ''اِنْیٌ'' کی۔ اور رات کے اوقات میں، یہ تہجد اور عشاء آگئی (مظہری)، اور ویسے مغرب کی نماز بھی رات میں آتی ہے، لیکن آگے لفظ جو آرہا ہے وَاَطْرَافَ النَّهَارِ: دِن کے کناروں میں، یا تو یہ صبح شام کی نماز کی تاکید ہے، یا یہ ہے کہ صبح کے کناروں پر آگئی اشراق کی نماز جس کو ہم ''صلوۃ ضحیٰ'' کہتے ہیں، اور درمیان والا کنارہ، دِن کو وسط کر لیں تو دوسرے نصف کے کنارے پر ظہر ہے، اور آخری حصہ یعنی دِن کا آخری کنارہ جو ہے اس کے ساتھ متصل مغرب ہے، تو اس طرح سے تمام نمازوں کے اوقات کی طرف اشارہ اسی آیت سے نکل آتا ہے، جیسے کہ آپ کے سامنے سورۂ بنی اسرائیل میں بھی آیت آئی تھی اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ (آیت:۷۸) دلوکِ شمس: سورج کا ڈھلنا، اس سے اشارہ ظہر کے وقت کی طرف تھا۔ یہ فَسَبِّحْ کا لفظ دوبارہ تاکید کے لئے آگیا، رات کے اوقات میں سے بعض اوقات میں بھی تو تسبیح بیان کر، اور دِن کے اطراف میں۔

''لَعَلَّكَ تَرْضٰى'' کے دو مفہوم

لَعَلَّكَ تَرْضٰى: کا مطلب یہ ہے تاکہ تُو خوش رہے، ایک تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ لوگ باتیں کرتے ہیں، طعن وتشنیع کرتے ہیں، بُرائیاں بیان کرتے ہیں، یہ بات باعثِ تکلیف ہے، تو دشمنوں کی باتوں کا علاج یہ ہے کہ آپ برداشت کیجیے، صبر کیجیے، ان کی باتوں کو محسوس نہ کیا کریں، ایک تو یہ طریقہ اختیار کریں کہ صبر کی اور برداشت کی کوشش کریں، دوسرے اپنے آپ کو نماز کی طرف متوجہ رکھیں، اللہ کے ذکر کی طرف، جب یہ دو باتیں آپ اپنا لیں گے پھر آپ کو کوئی صدمہ نہیں ہوگا، آپ راضی ہی رہیں گے، خوش ہی رہیں گے، اور دشمنوں کی دشمنی اور دشمنوں کی باتیں آپ کے لئے کوئی باعثِ تکلیف نہیں ہوں گی، اور یہ ہمیشہ قاعدہ ہے کہ یہ باتیں زیادہ تر باعثِ تکلیف اسی وقت ہوتی ہیں جب ہم وہ باتیں توجہ سے سنتے ہیں، توجہ سے سننے کے بعد فوراً اشتعال میں آجاتے ہیں، اشتعال میں آنے کے بعد انتقام کی سوچنے لگ جاتے ہیں، تو جتنا ہم دشمنوں کی باتوں کی طرف متوجہ ہوتے چلے جائیں گے، ہر وقت ہمارے دل دماغ کے اوپر وہ مسلط رہیں گی، اتنا ہی ہم پریشان زیادہ رہیں گے جب تک کہ انتقام نہیں لے لیں گے، انتقام لینے کے بعد پھر آگے ٹکراؤ اور زیادہ سخت ہو جایا کرتا ہے، تو اس تکلیف سے بچنے کا طریقہ یہی ہے کہ اوّل تو ان کی باتوں کو سہہ جاؤ برداشت کر جاؤ، اگر سنی ہیں تو اشتعال میں نہ آؤ، اور پھر اللہ کے ذِکر کی طرف متوجہ رہو، صبح شام نماز پڑھو، اللہ کا ذِکر کرو، دشمنوں کی طرف دھیان ہی نہ رکھو، دھیان اپنا اللہ کی طرف رکھو، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ خوش رہیں گے، اور یہ غم غصہ جو کچھ بھی ہے یہ دِل سے زائل ہو جائے گا...... یا لَعَلَّكَ تَرْضٰى کا مطلب یہ ہے جیسے دوسری سورت میں ذکر کیا گیا وَلَسَوْفَ یُعْطِیْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى (سورۂ ضحیٰ) کہ اللہ تعالیٰ تجھے عنقریب ایسی ایسی نعمتیں دے گا کہ تُو خوش ہو جائے گا، تو لَعَلَّكَ تَرْضٰى کا مطلب یہ ہوگا کہ جب آپ صبر کی خصلت اپنائیں گے، اور صبح شام، رات دِن اللہ کے ذِکر کی طرف متوجہ رہیں گے، ''سبحان اللہ، الحمد للہ'' آپ کی زبان پر صبح شام، رات دِن جاری رہے گا، نمازوں کی آپ پابندی کریں گے، تو اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ آپ کو اتنی دولتیں دے گا کہ آپ خوش ہو جائیں گے، لَعَلَّكَ تَرْضٰى کا یہ معنی بھی ہے۔ یعنی مستقبل بہرحال اس عادت کا اچھا ہے، خوشی کا باعث ہے، اگر آپ ان عادتوں کو اپنا لیں تو مستقبل خوشی کا باعث ہے۔

''لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ'' کے دو مفہوم

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖ: مَدَّ يَمُدُّ: لمبا کرنا۔ آپ لمبی نہ کیجیے اپنی آنکھیں، لفظی معنی یہ بنتا ہے، اپنی آنکھیں نہ پھیلائیے، آنکھیں نہ پھیلائیے کا معنی یہ ہے کہ نظر اٹھا کے نہ دیکھیے، ان کی طرف نگاہ اٹھا کر نہ دیکھیے'' نہ پھیلا تو اپنی آنکھیں اس چیز کی طرف جس کے ذریعے سے ہم نے فائدہ پہنچایا ان میں سے مختلف لوگوں کو۔'' ازواج زوج کی جمع ہے۔ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا: یہ بِهٖ کی ضمیر کے محل سے بدل ہے، یعنی دُنیوی زندگی کی رونق کے ذریعے سے، لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ: فائدہ ہم نے ان کو اس لیے پہنچایا تا کہ ہم ان کی آزمائش کریں اس میں۔ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى: اور تیرے رَبّ کی دی ہوئی چیز بہتر ہے اور زیادہ باقی رہنے والی ہے۔ اللہ کے ذِکر کی طرف آپ متوجہ رہیں، کافروں کو اگر چند روز کے لئے خوش حالی دے دی گئی، دُنیا کی رونق دے دی گئی، تو ادھر آپ آنکھ اُٹھا کے بھی نہ دیکھیں۔ آنکھ اٹھا کے دیکھنا دو طرح سے ہوتا ہے، ایک تو ہوتا ہے حرص اور لالچ کے طور پر کہ انسان آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے ان کی طرف دیکھتا ہے، بڑی للچائی ہوئی نگاہوں کے ساتھ رال ٹپکاتا ہے، اور اس کا دل چاہتا ہے کہ میرے پاس بھی ایسا ہی ہوتا، دیکھو! ان کو کتنی عیش اور دولت حاصل ہے، بسا اوقات انسان دوسرے کی اچھی چیز کی طرف یوں للچائی ہوئی نظر سے دیکھتا ہے، للچائی ہوئی نظر سے دیکھنا بھی ممنوع ہے کہ دُنیا میں اگر کسی کو آپ خوش حال دیکھیں، کسی کے اُوپر اچھا لباس دیکھیں، اس کے پاس اچھا مکان دیکھیں، اچھی کارکوٹھی دیکھیں، تو اس کی طرف للچائی ہوئی نگاہ سے نہ دیکھو، لیکن یہاں جو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا جا رہا ہے، تو اس میں حرص اور آز والا معنی نہیں ہے، آپ حریصانہ طور پر نہیں دیکھتے تھے، کہ آپ کے پاس وہ دولت نہیں تھی ان کے پاس تھی اس لیے آپ نگاہ اُٹھا اُٹھا کے دیکھتے کہ دیکھو! یہ کتنے خوش حال ہیں، نعوذ باللہ! ایسی بات نہیں، اگر سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے دِل میں دولت کی قدر ہوتی اور آپ دُنیا اکٹھا کرنا چاہتے، تو جس وقت آپ نے توحید کی آواز بلند کی تھی، تو وہ تو بڑی دولت اکٹھی کر کے آپ کو دینے کے لئے تیار تھے، جتنا چاہتے آپ سونا چاندی اکٹھا کر لیتے، اور مانگ لیتے کہ اتنا مجھے دے دو تو میں یہ تبلیغ ختم کر دیتا ہوں، اور وہ دینے کے لئے تیار تھے، اچھی سے اچھی عورت پیش کرتے تھے، زیادہ سے زیادہ سرمایہ پیش کرتے تھے، لیکن آپ نے سب کو ٹھکرا دیا، اس لیے یہاں للچائی ہوئی نظر کے ساتھ دیکھنا مراد نہیں ہے، بلکہ یہاں مقصد یہ ہے کہ آپ حسرت اور افسوس کے طور پر بھی ان کی طرف نظر نہ اُٹھائیے، حسرت اور افسوس کے طور پر نظر اُٹھانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک لڑکے کو ہم دیکھتے ہیں، ماشاءاللہ! خوب ذہین ہے، سمجھ دار ہے، صحت مند ہے، لیکن اس نے اپنی ان تمام صلاحیتوں کو بدمعاشی میں اور آوارگی میں لگا دیا ہے، تو ہم حسرت اور افسوس کے ساتھ دیکھتے ہیں کہ دیکھو! یہ کیسا جوان ہے، کیسا سمجھ دار ہے، اس کو چاہیے تھا کہ اس سے فائدہ اُٹھاتا، علم حاصل کرتا، وقت کی قدر کرتا، کیسا بدبخت ہے، کہ اپنی صلاحیتوں کو کس طرح سے برباد کر رہا ہے! تو ہمارے دِل میں حسرت آتی ہے کہ کاش! کہ یہ سمجھ جائے، اپنی ان صلاحیتوں سے فائدہ اُٹھائے، ایک دیکھنا یہ ہوتا ہے، تو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم بھی مشرکین کے دولت مندوں کی طرف یوں ہی دیکھتے تھے کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے کتنی نعمتیں دے رکھی ہیں، کیا ہی اچھا ہو کہ یہ سمجھ جائیں اور ان نعمتوں سے اپنی دُنیا اور آخرت کو آباد کریں، دُنیا میں بھی فائدہ اُٹھائیں، آخرت میں بھی فائدہ اُٹھائیں، اور یہ اپنی ان نعمتوں کو

اپنے لیے سرکشی اور کفر کا باعث بنائے ہوئے ہیں، اس طرح سے حسرت اور افسوس کے طور پر حضور ﷺ دیکھتے تھے، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اب ان کا بھی خیال چھوڑ دو، جو کچھ آپ کو آپ کے رَبّ نے دیا ہے یہی سب سے بہتر ہے، بس! آپ ادھر ہی توجہ رکھیے، ''رَبّ نے دیا ہے'' اس سے یا تو آخرت کی نعمتیں مراد ہیں، یا جو دِین اللہ نے دیا ہے یہ مراد ہے، کہ دِین کی دولت یہ ہے سب سے زیادہ قابلِ قدر، یہ دنیا کا سامان جو چند دِن کی رونق ہے یہ اس درجے کا نہیں کہ آپ سمجھیں کہ یہ لوگ بہت اچھے ہیں، خوش حال ہیں، ان کو چاہیے کہ اپنی خوش حالی سے فائدہ اٹھائیں، دنیا میں بھی فائدہ اٹھائیں، آخرت میں بھی فائدہ اٹھائیں، اس کو وہ اپنے لیے کفر اور شرک کا ذریعہ نہ بنائیں، دنیا کا سامان کوئی چیز نہیں، دنیا کے مقابلے میں جو دولت دِین کے رنگ میں اللہ تعالیٰ دیتا ہے یہی سب سے اچھی ہے...... اور سرورِ کائنات ﷺ کو سنا کر اگر باقی اُمت کو روکنا مقصود ہو، تو پھر یوں مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ اس کو للچائی ہوئی نگاہ سے نہ دیکھا کرو، اللہ کا رزق جو اللہ تعالیٰ دیتا ہے رُوحانی نعمتیں یعنی دِین، یہی سب سے بہتر، یہی سب سے زیادہ باقی رہنے والی چیز ہے۔ ''سب سے بہتر ہے باقی رہنے والی چیز ہے'' یہ اس کے اچھے ہونے کی دلیل دے دی کہ وہ ہے زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا صرف دنیا کی زندگی کی رونق، اور وہ ہے مَامَتَّعْنَابِهٖ جس کے ساتھ ہم نے ان کو تھوڑا سا فائدہ پہنچایا، ایک عارضی سی حالت ہے، اور انجام اس کا بڑا خراب نکلنے والا ہے، اور جو کچھ اللہ تمہیں دیتا ہے یہ رُوحانی دولت، یہ دِین، یہ قرآن، یہ ایمان، یہ نماز کی توفیق، یہ ذِکر کی توفیق، اس میں خیریت ہی خیریت ہے، اس میں کوئی شر کا پہلو نہیں، اور اس کا ثواب باقی رہنے والا ہے، یہ زائل ہونے والا نہیں۔ تو حضور ﷺ کو سنا کے باقی اُمت کو کہنا مقصود ہو، آپ کو خطاب کر کے باقی اُمت کو کہنا مقصود ہو تو للچائی ہوئی نظر سے دیکھنے کی بھی ممانعت ہے۔ اور سرورِ کائنات ﷺ کی طرف خطاب کرتے ہوئے حسرت اور افسوس کی نگاہ سے منع کرنا مقصود ہے کہ آپ ان کی طرف آنکھیں اٹھا کے بھی نہ دیکھیں۔ اور ہو سکتا ہے کہ یہ مقصد بھی ہو کہ حضور ﷺ کا دل یہ چاہتا تھا، آپ بار بار رُؤساء کو خطاب کرتے تھے، ان اغنیاء کو سمجھاتے تھے، کیونکہ ان کی معاشرے میں حیثیت یہ ہوا کرتی ہے کہ اگر یہ لوگ سمجھ جائیں تو نچلا طبقہ بھی جلدی سمجھ جاتا ہے، اور ان کا بگاڑ دوسرے معاشرے کے اندر بھی بگاڑ پیدا کرتا ہے، اس لیے انبیاء ﷷ نے ہمیشہ پہلے اپنی قوم کے سرداروں کو خطاب کیا ہے، مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان کے سمجھنے کے ساتھ دوسرے لوگ جلدی سمجھ جائیں گے، اور جب یہ نہیں سمجھتے تو منع کر دیا گیا کہ ان کے دولت مند ہونے کی حیثیت سے صرفِ نظر کر جاؤ، یہ چند دِن ان کو کھانے پینے کے لئے جو کچھ دیا ہوا ہے ان کو مستیاں کر لینے دو، ان کی دولت ان کے لئے انجام کے اعتبار سے بہت نقصان دہ ثابت ہوگی...... بہر حال دولت مندوں کی دولت کی طرف نہ للچائی ہوئی نظر کے ساتھ دیکھنا چاہیے، نہ حسرت و افسوس کے طور پر دیکھنا چاہیے، اللہ تعالیٰ اگر کسی کو رُوحانی رزق دے دے، دِین کی دولت دے دے تو اس کو اسی دولت پر مطمئن رہنا چاہیے۔

نماز کی تاکید

وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ: حکم دیجیے آپ اپنے متعلقین کو۔ کسی شخص کا ''اہل'' ہوتا ہے اس کے متعلقین، جس میں بیوی بھی شامل ہے، اولاد بھی شامل ہے، دوست احباب بھی شامل ہیں، اَتباع جو آپ کی اتباع کرنے والے ہیں وہ سارے کے سارے اس میں

شامل ہیں۔اپنے متعلقین کو نماز کا حکم دیجئے، وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا: اور خود بھی اس کے اوپر قائم اور دائم رہیے، لَا نَسْـَٔلُكَ رِزْقًا: ہم آپ سے رزق نہیں چاہتے، نَحْنُ نَرْزُقُكَ: ہم آپ کو رزق دیتے ہیں، وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى: اچھا انجام تقویٰ کے لئے ہے۔اپنے متعلقین کو نماز کا حکم دیجئے، پہلے بھی تاکید آ گئی پیچھے جو ذکر کیا (وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ)، اب یہاں صراحت آ گئی لفظ ''صلوٰۃ'' کے ساتھ۔''صلوٰۃ'' کا حکم دیجئے اپنے متعلقین کو، کیونکہ یہ مفید چیز ہے جیسا کہ ذکر کر دیا گیا کہ دُنیا اور آخرت کی کامیابی اسی سے متعلق ہے، پچھلی آیت میں جیسے اشارہ کر دیا گیا، اس کے مقابلے میں دُنیا کی کوئی نعمت نہیں کہ جس کی طرف انسان آنکھ اُٹھا کر دیکھے۔آپ خود بھی نماز پہ قائم رہیے، اہل وعیال کو بھی نماز کی تاکید کیجئے۔

رِزق کمانے کی وجہ سے دِین میں خلل نہیں آنا چاہیے

لَا نَسْـَٔلُكَ رِزْقًا: ہم آپ سے رزق کا سوال نہیں کرتے، یعنی ہم آپ سے روزی کموانا نہیں چاہتے ایسے طور پر جو نماز میں مخل ہو، رِزق تو سب کا ہمارے ذِمّے ہے، اس لیے اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ نماز پڑھنے سے روزی کمانے میں نقص آتا ہے، جس طرح سے آج کل تاجر طبقہ کہتا ہے کہ ''اگر اُٹھ کر نماز پڑھنے کے لئے چلے جائیں تو پیچھے گاہک آئے گا، اور واپس چلا جائے گا، تو ہماری آمدنی میں فرق آ جائے گا'' یہ نظریہ غلط ہے، ایسے طور پر روزی کمانا کہ جو نماز میں خلل ڈالے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم تمہیں نہیں کہتے، رِزق تمہارا ہمارے ذِمّے ہے، آپ اپنے طور پر نماز کی پابندی کریں، باقی! جہاں تک رِزق مقدر ہے وہ ہر صورت میں پہنچ کے رہے گا، اللہ کے ذِکر کی طرف متوجہ رہو گے تو اسباب آسانی کے ساتھ مہیا ہو جائیں گے، اور اگر اللہ کے ذِکر کی طرف متوجہ نہیں ہو گے کمانے کے پیچھے پڑ گئے تو مشغولیت بڑھتی چلی جائے گی، روزی وہی ملے گی جو مقدر ہے، آج آپ جس وقت چاہیں اس کا تجربہ کر سکتے ہیں۔

رِزق کو مقصد سمجھنے والے اور عبادت کو مقصد سمجھنے والے، دونوں کی حالت میں فرق

حدیث شریف میں آتا ہے، سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے آدم کے بچے! تُو میری عبادت کے لئے فارغ ہو جا، ''اَمْلَأْ صَدْرَكَ غِنًى''، میں تیرے سینے کو غناء سے بھر دوں گا، اور تیرے فقر کو تیری حاجات کو پورا کروں گا۔اور اگر تُو ایسا نہیں کرتا، ''مَلَأْتُ يَدَيْكَ شُغْلًا وَلَمْ اَسُدَّ فَقْرَكَ'' میں تیرے ہاتھ کو تو کام سے بھر دوں گا، کہ کسی وقت بھی تیرا ہاتھ کام سے فارغ نہیں ہوگا، جب دیکھو مشغول، جب دیکھو مشغول، صبح شام، رات دِن فرصت نہیں ہے، لیکن ضروریات پوری نہیں ہوں گی۔[1] اور سرورِ کائنات ﷺ کی اس پیش گوئی کا مشاہدہ جب چاہیں آپ کر سکتے ہیں، جو لوگ دِین سے غافل ہیں آپ ان کے کبھی حالات جا کے دیکھیں، اپنے آپ کو وہ اتنا مشغول کیے ہوئے ہیں دُنیا کمانے میں، نہ صبح چین، نہ شام چین، نہ رات، نہ دِن، ہر وقت بھاگے بھاگے پھرتے ہوں گے، کھانا کھا رہے ہوں گے تو بھی ان کی طبیعتوں کے اُوپر یہ فکر مسلط ہوتا ہے کہ وہ کام کرنا ہے، وہ کرنا ہے، یہ رہ گیا، وہ رہ گیا، وقت پہ روٹی کھانی انہیں نصیب نہیں ہوتی، وقت پہ سونا انہیں نصیب نہیں ہوتا، کام میں مشغولیت اتنی

(۱) ترمذی ۲/ ۷۳ (مطبوعہ ایچ ایم سعید کمپنی)۔مشکوٰۃ ۲/ ۴۴۰، کتاب الرقاق فصل ثانی۔

ہوتی ہے، لیکن جب بیٹھیں گے باتیں یوں ہی کریں گے کہ کیا کریں ضروریات ہی پوری نہیں ہوتیں، ہر کسی کی زبان پہ یہ ہوگا، کیا کریں اخراجات ہی پورے نہیں ہوتے، کبھی یہ اٹکا ہوا ہے، کبھی وہ اٹکا ہوا ہے، تو یہ ایک ایسی بات ہے جو چودہ سو سال پہلے حضور ﷺ نے فرمائی تھی کہ جو لوگ اللہ سے غافل ہو جائیں گے، اللہ کی عبادت کی طرف توجہ نہیں کریں گے، کام کاج تو ان کے اوپر اتنا آجائے گا کہ کبھی ان کا ہاتھ خالی نہیں رہے گا، ہر وقت محنت اور مشقت میں مبتلا ہوں گے، لیکن ضرورتیں پوری نہیں ہوں گی۔ اور اس کے برعکس وہ لوگ جو کہ اللہ کی عبادت کو اصل قرار دیتے ہیں، اپنے اصل فرائض ادا کرنے کے بعد پھر وہ کمانے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے دل کے اندر اتنا غناء بھر دیتا ہے کہ تھوڑی سی روزی بھی ان کو ایسے معلوم ہوتی ہے جیسے ہماری ضرورت کے لئے کافی ہے۔ بات سمجھ آئی؟

مولوی کو اللہ خوب کھلاتا ہے اور عزّت کے ساتھ کھلاتا ہے

ہم سے اگر کوئی پوچھتا ہے...... پچھلے دنوں میں میں اپنے ایک دوست کے پاس گیا، وہ اسٹیشن ماسٹر ہے، ہم آٹھویں تک اکٹھے پڑھتے رہے ہیں، وہ مجھ سے پوچھتا ہے کہ تنخواہ کیا ہے؟ میں نے کہا: تنخواہ چاہے کتنی ہو، اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے روٹی، کپڑا، مکان کا مسئلہ حل ہے، ہم اس سلسلے میں فکر مند نہیں ہیں، یہی ہیں ضرورتیں۔ وہ کہنے لگا: جی! اور کیا چاہیے دُنیا اسی کے پیچھے تو مرتی پھرتی ہے۔ میں نے کہا: ہمیں تو ضرورت سے زیادہ مہیا ہے، مکان اللہ نے اتنا بڑا دے رکھا ہے جو ہماری ضرورت سے زائد، اور کپڑے اللہ نے اتنے دے رکھے ہیں جو ہماری ضرورت سے زائد، اور کھانے پینے کا تو ایسا قصہ ہے کہ مولوی اکثر و بیشتر بدہضمی کا شکار تو ہوگا، فاقے میں کبھی نہیں رہے گا، کیا یہ بات غلط ہے؟ بدہضمی کا شکار تو ہوتے ہیں، لوگ منتیں کر کر کے، لجاجتیں کر کر کے، اپنے کرائے پر لے جا لے جا کے مرغے کھلاتے ہیں، حالانکہ انہیں ہم سے کوئی مطلب نہیں، نہ ہم کوئی سرکاری ملازم ہیں کہ ان کا کام کر سکتے ہیں، نہ وہ ہماری طرف کسی اعتبار سے محتاج ہیں، جتنی دعوتیں مولوی کی ہوتی ہیں کسی اور کی ہوتی ہیں؟ اور لوگ عزّت کے ساتھ لے جاتے ہیں، گھر سے کرایہ بھر کے لے جاتے ہیں، پیر بھی دبائیں گے، ہاتھ بھی دُھلوائیں گے، آگے پیچھے پھریں گے، جُوتی سیدھی کریں گے، اور اچھی سے اچھی دعوت کھلائیں گے، اچھے سے اچھا کھانا کھلائیں گے، اور پھر ساتھ ساتھ شکریہ بھی ادا کریں گے کہ آپ نے بہت مہربانی فرمائی کہ آپ ہمارے گھر آ گئے، لوگ اس بات کو سوچتے نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اتنا شان دار اور اتنا اچھا رزق، اتنی عزّت کے ساتھ دے رکھا ہے کہ شاید دُنیا کے اندر کوئی طبقہ ایسا نہیں کہ جس کو اتنی عزّت کے ساتھ اور اتنی فراغت کے ساتھ اور اتنی اعلیٰ درجے کی روزی میسّر ہو۔

مولوی کو خالص حلال رِزق ملتا ہے

اور پھر انتہائی درجے کی حلال، کیونکہ دوسرا آدمی تو ہو سکتا ہے کہ اس سے کوئی ڈر کے اس کو کھلائے، سرکاری ملازمین جتنے ہیں ان کو بھی لوگ اگر کبھی کھلائیں، تو یا پس منظر میں کوئی غرض ہوتی ہے یا کوئی خوف ہوتا ہے اس لیے لوگ انہیں کھلاتے ہیں، مولوی سے تو نہ کوئی غرض نہ کوئی خوف۔ ٹھیک ہے کہ نہیں؟ اگر کسی دوسرے کا مال طیبِ نفس کے ساتھ حلال ہوتا ہے، ''طیب نفس'' کا معنی یہ

ہے کہ کھلانے والا، دینے والا آپ کو دِل کی خوشی سے دے، دباؤ میں آ کے نہ دے، کسی ڈر کی وجہ سے نہ دے، اگر آپ کسی سے کوئی چیز ڈرا کے لیتے ہیں یا کوئی طمع دِلا کے لیتے ہیں، جس طرح سے رشوت لینے والے لیا کرتے ہیں، تو چاہے دینے والا یہی کہے کہ میں اپنی خوشی سے دیتا ہوں، لیکن حقیقت میں وہ روزی حرام ہے: "لَا یَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ اِلَّا بِطِیْبِ نَفْسِہٖ "(۱) کسی مسلمان کا مال حلال نہیں مگر اس کے دِل کی خوشی کے ساتھ۔ اگر وہ دِل سے خوش نہیں ہے دینے میں، تو وہ مال حلال نہیں ہے۔ اب یہ سرکاری ملازمین جتنا کھاتے ہیں، لوگ ان کو دیتے ہیں تو دِل کی خوشی سے نہیں، یا خوف کے مارے یا کسی لالچ میں، کوئی کام کروانا ہوتا ہے، لیکن مولوی کو جو کچھ ملتا ہے بالکل دِل کی خوشی سے ملتا ہے، ہم کسی کے گھر میں جا کے کہتے نہیں کہ ہمارے لیے گوشت بھیجو، بچوں کے لئے غلّہ بھیجو، ورنہ تمہیں یوں کر دیں گے، ورنہ یہ ہو جائے گا، بلکہ ہمیں پتا بھی نہیں ہوتا، لوگ اپنے طور پر اپنے دِل میں سوچتے ہیں، خوشی کے ساتھ خود گھر سے چیز اُٹھاتے ہیں اور آ کے پہنچا جاتے ہیں۔ بُلانے کے لئے آ جاتے ہیں، عزت کے ساتھ لے جاتے ہیں، ہمیں کوئی پتا نہیں ہوتا کہ اس مہینے میں کون ہماری دعوت کرے گا، کدھر ہم جانے والے ہیں، اللہ تعالیٰ دِل میں ڈالتا ہے، اور وہ لوگ مجبور ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے، یعنی ان کے دِل میں یہ بات ڈالی جاتی ہے اور وہ اپنی خوشی کے ساتھ اور اپنی رضا سے آتے ہیں اور آ کے عالم کو، حافظ کو، مولوی کو بُلا کے گھر میں لے جاتے ہیں، عزت کے ساتھ بٹھاتے ہیں اور اپنی حیثیت کے مطابق اچھے سے اچھا کھلاتے ہیں، اس سے زیادہ طیبِ نفس اور کیا ہو سکتا ہے! تو جو کچھ مولوی کو ملتا ہے طیبِ نفس سے ملتا ہے اور عزت کے ساتھ ملتا ہے، فراغت کے ساتھ ملتا ہے، لیکن لوگوں نے کبھی اس بات کو سوچا نہیں، اس لیے ہم تو اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ جس شخص نے دِین پڑھا، دِین کی خدمت میں لگ گیا، اللہ تعالیٰ نے اس کے رزق کا مسئلہ بھی حل کر دیا ہے، دوسرے لوگ آپ کو روٹی کمانے کے سلسلے میں جتنا پریشان نظر آئیں گے، مولوی کبھی آپ کو اتنا پریشان نظر نہیں آئے گا، ان کو فراغت کے ساتھ ملے گا، عزت کے ساتھ ملے گا اور اچھے سے اچھا ملے گا۔

ہم کبھی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہوتے

اس لیے ہم کبھی اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہوتے کہ اگر ہم مولوی نہ ہوتے تو پتا نہیں کیا ہوتے۔ کیا ہوتے؟ سڑکوں کے اُوپر دھکے کھاتے پھرتے، سارا دِن دُکانوں کے اُوپر بیٹھے ہوئے لوگوں کا منہ تکتے، اور آئے دِن کبھی ٹیکس والے پریشان کرتے، کبھی چالان کرنے والے پریشان کرتے، اور کبھی بازار میں کوئی اور جھگڑا شروع ہو جاتا، کبھی کچھ ہوتا۔ اب حال یہ ہے جیسے کہ ہمارے شیخ سعدیؒ کہتے ہیں:

کس نیاید بخانۂ درویش
کہ خراجِ زمین و باغ بدہ(۲)

شیخ کہتے ہیں کہ درویش کے گھر آ کے کوئی دروازہ نہیں کھٹکھٹاتا کہ مالیہ ادا کرو، خراج دو، زمین کا خراج دو، باغ کا خراج دو،

(۱) سنن دار قطنی ۳/ ۴۲۴، رقم ۲۸۸۵۔ نیز مشکوٰۃ ۱/ ۲۵۵، باب الغصب، فصل ثانی۔ ولفظہ: لَا یَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ اِلَّا بِطِیْبِ نَفْسٍ مِنْہُ۔

(۲) "گلستاں"، باب اوّل، حکایت ۱۷۔

فلاں چیز دو، درویش کے دروازے پہ کوئی نہیں آتا۔ تو اس قسم کے مطالبوں سے، ظالموں کے ظلم سے اللہ نے علیحدہ بچایا ہوا ہے، اور ضرورتیں جتنی ہیں وہ اللہ تعالیٰ نے علیحدہ پوری کی ہوئی ہیں، تو جہاں بھی آپ جائیں گے اہل اللہ کے پاس، اولیاء اللہ کے پاس چلے جاؤ، جو اللہ اللہ کرنے والے اور لوگوں کو نیکی کی تاکید کرنے والے ہیں، وہاں جا کے دیکھو گے کہ ان کے دروازوں کے اُوپر رزق کس طرح سے دھکے کھاتا پھرتا ہے، اور لوگ کیسے لاتے ہیں اور لجاجتیں کر کر کے دے کے جاتے ہیں، اور منتیں اور ساجتیں کر کر کے اپنی سواریوں پر سوار کرا کرا کے، کرایہ بھر بھر کے اپنے گھروں میں لے کے جاتے ہیں، اور کتنی عزت اور احترام کے ساتھ کھلاتے ہیں۔

نظر کی غلطی کا کوئی علاج نہیں

اب قصہ یہ ہے کہ ایک آدمی رشوت کے لیتا ہے پندرہ روپے، اور وہ پندرہ روپے کا فروٹ خریدتا ہے، گھر میں لے جاتا ہے تو لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ بڑا باعزت طریقے سے روزی کھا رہا ہے، اور اگر وہی پندرہ روپے کا فروٹ ایک عالم کو، ایک فاضل کو کوئی شخص آ کے ہدیے میں دے جاتا ہے تو لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ ذلت ہے، اب اس معاشرے کا کیا علاج کیا جائے؟ یعنی جہاں دینے والا دِل کی خوشی کے ساتھ دیتا ہے اس کھانے کو یہ کہتے ہیں یہ عزت کی روزی نہیں ہے، اور جہاں ڈنڈے کے ساتھ دوسرے کو ڈرا دھمکا کے چھین لیا جائے اور ان پیسوں سے خرید کے کچھ کھا لیا جائے تو کہتے ہیں یہ عزت کی روزی ہے، اب یہ پولیس والے ہو گئے، سرکاری افسر ہو گئے، بڑے چھوٹے جتنے بھی ہیں، کیا یہ ڈاکوؤں سے کم ہیں؟ ڈاکو سڑک پہ کھڑا ہو جاتا ہے رائفل لے کے، ڈرا کے چھین لیتا ہے، اور یہ اپنی قلم کے ساتھ ڈراتے ہیں لوگوں کو، یہ ہو جائے گا وہ ہو جائے گا، ہم یوں فیصلہ خلاف دے دیں گے یوں کر دیں گے، اور اس طرح سے یہ چھینتے ہیں، تو ڈاکوؤں کی کمائی تو لوگوں کو نظر آتی ہے کہ دیکھو جی! کوئی ''ڈی سی'' لگ گیا، کوئی کمشنر لگ گیا، کوئی فلاں عہدے پہ چلا گیا، اس کی آمدنی بہت ہے، اس کے پاس کار ہوتی ہے، اس کے پاس کوٹھی ہوتی ہے، حالانکہ ان کا حساب تو ڈاکوؤں والا ہے، ورنہ اگر یہ ڈاکے نہ ڈالیں، اور لوگوں سے ناجائز وصول نہ کریں تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ''اے سی'' یعنی ''اسسٹنٹ کمشنر'' جو ہوتا ہے، اس کی تنخواہ ۹۰۰ روپے ہے، اور ۹۰۰ روپے ہمارے مولانا منیر صاحب کی تنخواہ بھی ہے ''قاسم العلوم'' میں۔[1] تو اسسٹنٹ کمشنر، اے سی کے برابر تو تنخواہ ہو گئی، لیکن فرق یہ ہے کہ وہ ڈاکے ڈالتا ہے اور لوگوں سے حرام لے گا، فیصلے غلط کرے گا، رشوتیں لے گا، تو نظر آئے گا کہ بڑے ٹھاٹھ باٹھ سے ہے، اور ایک مولوی مسکین بیچارہ چونکہ حلال طریقے سے گزارہ کرتا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ یہ کچھ بھی نہیں، تو یہ نظر کی غلطی ہے۔

اپنے معیار کے لوگوں کو دیکھو تو تمہیں پتا چلے گا

یہ کھایا پیا جو ہے کہ لوگوں سے چھین کے کھاتے ہیں رشوت میں لے کے کھاتے ہیں، دھوکے کے ساتھ کما کے کھاتے ہیں، یہ ایک وقت میں ناک کے راستے نکلے گا۔ اور اللہ تعالیٰ جو رزق حلال طریقے سے دیتا ہے وہی بہتر ہے، سوچ کا فرق ہے، ورنہ اللہ کے دِین میں لگنے والا آدمی، اللہ کا دِین پڑھ کے اللہ کے دِین کی خدمت میں لگنے والا آدمی کبھی دُنیا کے اندر بدحال نہیں ہوتا،

---

(۱) جانشین حکیم العصر حضرت مولانا منیر احمد صاحب منوّر مدظلہ شیخ الحدیث ''جامعہ باب العلوم، کہروڑپکا''۔ آپ کچھ عرصہ ''جامعہ قاسم العلوم، ملتان'' میں مدرّس رہے ہیں۔

آپ اگر اپنے معیار کے لوگوں کو دیکھیں گے دُوسری جگہ، آپ کے بھائی، آپ کے معیار کے لوگ، آپ کے ہم عمر، آپ دیکھیں گے کہ ان کو وہ سکون اور راحت قطعاً میسّر نہیں، جتنی اللہ تعالیٰ نے اہلِ علم کو اور اہلِ دین کو دے رکھی ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم تم سے ایسا رزق نہیں کموانا چاہتے کہ جو ہماری عبادت میں خلل ڈالے، یہ تو ذمہ داری ہماری ہے، تم ہمارے اَحکام کے مطابق چلتے جاؤ، رزق تمہیں مہیا ہوگا۔

سکون صرف تقویٰ میں ہے

اور اچھا انجام ہمیشہ تقویٰ کے لئے ہے، جتنا تقویٰ حاصل کرو گے اتنا اچھا انجام سامنے آئے گا۔ تو یہ نماز کی بار بار جو تاکید کی جارہی ہے، صبح شام اللہ کے ذِکر کی تاکید جو کی جارہی ہے، اصل سکون اور اطمینان اسی کے ساتھ ہی میسر آتا ہے، جیسے کہ کل کے سبق میں بھی آپ کے سامنے ذکر کیا تھا مَنۡ اَعۡرَضَ عَنۡ ذِكۡرِىۡ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيۡشَةً ضَنۡكًا، اس کے لئے تنگ گزران ہے، تو یہاں اس مضمون کو دُوسرے انداز میں ادا کردیا گیا کہ جو نماز کی پابندی کریں گے، صبح شام اللہ کا ذکر کریں گے، اللہ کے اَحکام کا خیال کریں گے، جیسا کہ تقویٰ کا حاصل یہی ہے، ان کا انجام اچھا ہی اچھا ہے، دُنیا میں بھی اچھا ہے، آخرت میں بھی اچھا ہے۔

مشرکین کو تنبیہ

وَقَالُوۡا لَوۡلَا يَاۡتِيۡنَا بِاٰيَةٍ مِّنۡ رَّبِّهٖ: اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ کیوں نہیں لاتا ہمارے پاس نشانی اپنے رَبّ کی جانب سے؟ ضد اور عناد کے طور پر ہمیشہ جب کوئی اور بات نہ آئے تو یہی کہہ دیا کرتے تھے کہ جیسے پہلے انبیاء علیہم السلام معجزات لے کر آئے ہیں، تو ہمارے پاس یہ ایسا معجزہ کیوں نہیں لے کے آتا، یا جیسی نشانی ہم مانگتے ہیں ویسی نشانی کیوں نہیں لاتے۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اَوَلَمۡ تَاۡتِهِمۡ بَيِّنَةُ مَا فِى الصُّحُفِ الۡاُوۡلٰى: صحف: صحیفہ کی جمع ہے، صحفِ اُولیٰ: پہلی کتابیں، مَا فِى الصُّحُفِ الۡاُوۡلٰى: جو چیز پہلی کتابوں میں موجود ہے، یعنی پیش گوئیاں۔ ''جو کچھ پہلی کتابوں میں موجود ہے کیا اس کی دلیل ان کے سامنے نہیں آگئی؟'' تو بَيِّنَةُ مَا فِى الصُّحُفِ الۡاُوۡلٰى میں اضافت بیانی ہے، مَا فِى الصُّحُفِ الۡاُوۡلٰى کا مصداق سامنے آگیا، اس کی وضاحت ہوگئی، کہ جس قسم کی کتاب کی پیش گوئی کی گئی تھی ویسی کتاب آگئی، جس قسم کے پیغمبر کی پیش گوئی کی گئی تھی ویسا پیغمبر آگیا، تو کیا یہ دلیل کافی نہیں ہے؟ پہلی کتابوں میں جو کچھ موجود تھا اس کا بیان سامنے آگیا، اس کی وضاحت سامنے ہوگئی، اور اس کی دلیل سامنے آگئی، ان کی صداقت سامنے آگئی، کیا یہ دلیل کافی نہیں؟ ''کیا نہیں آئی ان کے پاس بینہ اس چیز کی جو کہ صحفِ اُولیٰ میں ہے۔'' وَلَوۡ اَنَّاۤ اَهۡلَـكۡنٰهُمۡ بِعَذَابٍ مِّنۡ قَبۡلِهٖ: اگر ہم انہیں ہلاک کردیتے کسی عذاب کے ذریعے سے قرآنِ کریم کے آنے سے قبل یا اس رسول کے آنے سے قبل، اس رسول کے آنے سے پہلے یا اس قرآن کے اُترنے سے پہلے، اگر ہم ان کو ہلاک کردیتے تو پھر یہ اللہ کے سامنے یوں عذر کرتے: لَقَالُوۡا رَبَّنَا لَوۡلَاۤ اَرۡسَلۡتَ اِلَيۡنَا رَسُوۡلًا: اے ہمارے رَبّ! تُو نے کیوں نہیں بھیج دیا ہماری طرف رسول، فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ: ہم تیری آیات کی اتباع کرتے، مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ نَّذِلَّ وَنَخۡزٰى: قبل اس کے کہ ہم ذلیل ہوتے اور رُسوا ہوتے۔ ذَلَّ يَذِلُّ: ذلیل ہونا۔ خَزِىَ يَخۡزٰى: رُسوا ہونا۔ دونوں کے درمیان میں فرق یوں ہے کہ ذِلّت یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو ذلیل سمجھنے لگ جائے، اپنے دِل میں آنے لگ جائے کہ میری کوئی

عزت نہیں ہے، میں ذلیل ہوں، یہ اپنا احساس ہے۔ اور خزی یہ ہے کہ دوسروں کی نظر میں ذلیل۔ تو ان کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے آپ میں ذلیل ہوتے، دوسروں کی نظر میں رُسوا ہوتے، اس سے قبل ہم تیری آیات کی اتباع کر لیتے، یعنی پھر ان کے پاس عذر ہوتا کہ اے اللہ! تو نے ہمارے پاس کوئی کتاب کیوں نہ بھیجی، کوئی رسول ہماری طرف کیوں نہ بھیج دیا کہ ہم اس ذلیل و رُسوا ہونے سے پہلے تیری آیات کی اتباع کر لیتے، تا کہ ذلت و رُسوائی سے بچ جاتے، یہ عذر کر سکتے تھے۔ اس لیے ہم نے ان کا یہ عذر زائل کر دیا، رسول ان کی طرف بھیج دیا، کتاب ان پہ اُتار دی، اب اگر یہ نہیں مانیں گے تو ان کے پاس عذر کوئی نہیں، جب اللہ کی گرفت میں آ جائیں گے تو عذر کوئی نہیں ہوگا۔ قُلْ كُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ: آپ کہہ دیجئے کہ ہر کوئی انتظار کرنے والا ہے، تم میرے انجام کا انتظار کرو، میں تمہارے انجام کا انتظار کرتا ہوں، دیکھو کیا نتیجہ نکلتا ہے، ہر کوئی انتظار کرنے والا ہے، پس تم بھی انتظار کرو۔ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ اَصْحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِیِّ وَمَنِ اهْتَدٰی: عنقریب تم جان لو گے کہ سیدھے راستے والے کون ہیں، اور سیدھے راستے پہ چلنے والا کون ہے، منزلِ مقصود تک پہنچنے والا کون ہے۔ اس کے مقابلے میں دوسری بات آ جائے گی کہ کون بھٹکا ہوا ہے، اور کون ہلاکت کے گڑھے میں گرنے والا ہے، عنقریب تمہیں پتا چل جائے گا، انتظار کرو تم بھی، سارے انتظار کر رہے ہیں تم بھی انتظار کرو، عنقریب تمہیں پتا چل جائے گا کہ سیدھے راستے والے کون لوگ ہیں اور کون لوگ ہیں جو منزلِ مقصود تک پہنچے، سیدھے راستے والے کون ہیں اور منزلِ مقصود تک پہنچنے والے کون ہیں، اور اس کے مقابلے میں دوسری بات آ گئی کہ بھٹکنے ہوئے کون ہیں اور ہلاکت کے گڑھے میں گرنے والے کون ہیں، تمہیں خود پتا چل جائے گا۔ جیسے ایک شق کو ذکر کر دیا جاتا ہے اور دوسری شق مقابلۃً محذوف ہوتی ہے۔

رُکوع کی اِبتدائی آیات کا حاصل

ترجمہ دیکھ لیجئے ایک دفعہ...... اگر نہ ہوتی ایک بات جو سبقت لے گئی تیرے رَبّ کی طرف سے اور نہ ہوتا وقت متعین (اَجَلٌ مُّسَمًّى کا عطف كَلِمَةٌ پر ہے) تو عذاب لازم ہونے والا ہوتا (لِزَامًا ملازمًا کے معنی میں ہے، باب مفاعلہ کا مصدر ہے) فَاصْبِرْ عَلٰی مَا يَقُوْلُوْنَ: صبر کیجیے ان باتوں پر جو یہ کہتے ہیں، اور تسبیح بیان کیجیے اپنے رَبّ کی حمد کے ساتھ سورج کے طلوع سے پہلے اور سورج کے غروب سے پہلے اور رات کے مختلف اوقات میں سے بعض اوقات میں آپ تسبیح بیان کریں، اور دِن کے کناروں میں تا کہ آپ خوش رہیں یا تا کہ اللہ کی طرف سے ثواب حاصل ہو جانے کے بعد آپ خوش ہو جائیں، دونوں مفہوم سمجھ میں آ گئے اس کے؟ ایک تو یہ ہے کہ جب اللہ کے ذِکر میں لگو گے تو یہ غم غصہ سب دُور ہو جائے گا، راضی رہو گے، ہمیشہ خوش رہو گے، دِل مطمئن رہے گا، جب صبر اور ذکر کی دو صفتیں اپنا لو گے تو تو راضی رہے گا، دُنیا کا غم غصہ سب نکل جائے گا، ایک صبر کی خصلت اپنا لو اور ایک ذِکر کی ان اوقات میں، نماز کی پابندی اور اللہ کا ذِکر، تو دُنیا کے اندر بھی راضی اور خوش رہنے کا یہی طریقہ ہے۔ یا مطلب یہ ہوا کہ جب اس کا ثواب ملے گا تو تُو خوش ہو جائے گا۔

''خوش حالی'' فقر سے بڑا فتنہ ہے!

اور آپ اپنی آنکھیں نہ اُٹھائیے وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ: آپ اپنی آنکھیں نہ پھیلائیے، آپ اپنی نظر نہ اُٹھائیں، آنکھیں

اُٹھا کے نہ دیکھیں، یہ مفہوم ہے اس کا۔ نہ پھیلائیں آپ اپنی آنکھیں اس چیز کی طرف جس کے ذریعے سے ہم نے فائدہ پہنچایا ان میں سے مختلف لوگوں کو، یعنی دُنیوی زندگی کی رونق کے ذریعے سے۔ ''''دُنیوی زندگی کی رونق'' کہہ کر اس کے فانی ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ چندروزہ ہے۔ اور یہ دیا بھی اس لیے، فائدہ بھی اس لیے پہنچایا لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ: تاکہ ہم ان کو اس میں آزمائیں، آزمانا اللہ کی طرف سے تکالیف بھیج کے بھی ہوتا ہے، خوش حالی کے ساتھ بھی ہوتا ہے، بلکہ اگر آپ حقیقت سمجھیں تو خوش حالی کا فتنہ تنگی کے فتنے سے زیادہ شدید ہے، کوئی تکلیف کی بات آجائے، رِزق کی تنگی آجائے تو وہ اتنا فتنہ نہیں بنتی جتنا خوش حالی فتنہ بنتی ہے، اس لیے حدیث شریف میں آتا ہے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے اس وقت سے بڑا ڈر لگتا ہے جب تم پر دُنیا کے دروازے کھول دیے جائیں گے، اور تمہیں دُنیا کے اندر کشادگی حاصل ہو جائے گی، مجھے بڑا ڈر لگتا ہے کہ تم اس کی طرف رغبت کرنے لگ جاؤ گے، پھر یہ دُنیا تمہیں اس طرح سے ہلاک کردے گی جس طرح سے پہلے لوگوں کو ہلاک کیا ہے۔ ''لَا الْفَقْرَ اَخْشٰى عَلَيْكُمْ '' فقر ایسی چیز نہیں ہے کہ جس سے میں اندیشہ کروں کہ تم فقیر ہو جاؤ گے، میں تم پہ فقر کا اندیشہ نہیں کرتا، یہ اتنی ڈرنے کی بات نہیں، ''وَلٰكِنْ اَخْشٰى عَلَيْكُمْ اَنْ تُبْسَطَ عَلَيْكُمُ الدُّنْيَا'' میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ تمہارے اُوپر دنیا پھیلادی جائے گی۔[1] حضور صلی اللہ علیہ وسلم دُنیا کے پھیلائے جانے سے اس لیے اتنا ڈرتے تھے کہ یہ فتنہ بہت شدید ہے، جب انسان کو کھانے کے لئے اچھا ملے، پہننے کے لئے اچھا ملے، خرچ وافر ہو، پھر بدمعاشی کے راستے سوجھتے ہیں، اور ایسی ایسی شرارتوں اور ایسے ایسے فتنوں میں انسان مبتلا ہوتا ہے کہ فقروفاقہ والے اس قسم کے گناہ کہاں کرسکتے ہیں جیسے گناہ سرمایہ دار لوگ کرتے ہیں، جس قسم کی عیاشیاں، بدمعاشیاں یہ لوگ کرتے ہیں۔ اس لیے خوش حالی مستقل فتنہ ہے اور فقر کے فتنے کے مقابلے میں یہ بڑا فتنہ ہے، اور اس میں بہت کم لوگ سنبھلتے ہیں، ورنہ سرمایہ وافر مل جانے کی صورت میں پھر انسان شرارتوں پہ اُتر آتا ہے۔

''تیرے رَبّ کا دِیا ہوا رِزق بہتر ہے''

وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى: تیرے رَبّ کا رِزق بہتر ہے اور باقی رہنے والا ہے۔ تیرے رَبّ کا رِزق، یعنی جو حلال طریقے سے تجھے مل جائے، پھر اس صورت میں رزق سے مادی رزق بھی مراد ہوسکتا ہے کہ حلال طریقے سے کماؤ، جو تیرے رَبّ کا دیا ہوا رزق ہے وہی بہتر اور وہی زیادہ باقی رہنے والا ہے، یا ''رزقِ رَبّ'' سے یہاں رُوحانی رِزق مراد ہے کہ اس زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا کے مقابلے میں جو آپ کو اللہ نے دِین کی دولت دے دی، صبح شام، رات دِن اپنے ذِکر کی توفیق دے دی، نماز پڑھنے کی توفیق دے دی، یہ رُوحانی رِزق جو تمہیں ملا، رُوحانی نعمت جو ملی ہے، یہ بہت بہتر اور بہت باقی رہنے والی ہے، تو دُنیوی ساز وسامان کے مقابلے میں یہ نعمت بڑی نعمت ہے، اور صاف الفاظ کے اندر اعلان فرمایا، یہ آپ پہلے سورۂ یونس میں پڑھ چکے: قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ۭ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ (آیت:۵۸)، ما یجمعون یعنی جو کچھ لوگ اکٹھا کرتے ہیں اس کے مقابلے میں یہ دولت بہتر ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل ورحمت سے تمہیں عنایت فرمائی۔ ادر پیچھے (سورۂ یونس والی آیت سے پہلے) قرآنِ کریم

---

(۱) بخاری ۱/۴۴۷، باب الجزیة والموادعة مع اهل الحرب۔ مشکوٰۃ ۲/۴۴۰، کتاب الرقاق، فصل اوّل۔

کا ذکر ہے، تو مراد اس سے قرآن ہے، لیکن اس کی قدر وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اس طرح سے سوچیں، جس طرح سے میں نے آپ کے سامنے یہ مقابلہ ذکر کیا، کہ رُوحانی نعمت کے بعد اِنسان کو کس طرح سے سکون اور اطمینان آتا ہے، انسان کو اس رُوحانی نعمت کے ساتھ عزت راحت سب کچھ حاصل ہوتی ہے، دُنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

آخری آیات کا خلاصہ

وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا: اپنے اہل وعیال کو نماز کا حکم دیجئے اور خود بھی اس کے اوپر قائم رہیے۔ ہم آپ سے رزق کا مطالبہ نہیں کرتے، ہم آپ کو رزق دیں گے، اور اچھا انجام تقویٰ کے لئے ہے...... اور یہ کہتے ہیں کہ کیوں نہیں لے آتا ہمارے پاس نشانی اپنے رَبّ کی جانب سے، نشانی سے مراد ایسی نشانی جیسے وہ خود مطالبہ کرتے تھے۔ کیا ان کے پاس اس چیز کی ''بیّنہ'' نہیں آگئی جو کہ صحفِ اُولیٰ میں ہے؟ جو کچھ پہلی کتابوں میں ہے کیا اس کی دلیل ان کے سامنے نہیں آگئی؟ یعنی ان بشارتوں کا ان پیش گوئیوں کا مصداق سامنے آگیا، یہ دلیل کافی ہے...... اور اگر ہم انہیں ہلاک کردیتے عذاب کے ساتھ اس قرآن سے پہلے یا اس رسول کے آنے سے پہلے تو یہ کہتے کہ اے ہمارے پروردگار! کیوں نہ بھیجا تو نے ہماری طرف کوئی رسول کہ ہم تیری آیات کی اتباع کر لیتے قبل اس کے کہ ہم اپنی نظروں میں ذلیل ہوتے اور دوسروں کے ہاں رُسوا ہوتے۔ نَّذِلَّ وَنَخْزٰى کا فرق آگیا، ہم اپنے آپ میں ذلیل ہوتے، یعنی ہمیں خود سمجھ میں آگیا کہ ہم بے قدرے ہیں ذلیل ہیں، یہ اپنی نظر میں ذلیل ہو گئے، اور نَخْزٰى یعنی لوگوں کی نظر میں بھی رُسوا ہو گئے۔ ''قبل اس کے کہ ذلیل ہوتے اور رُسوا ہوتے''...... آپ کہہ دیجئے کہ ہر کوئی انتظار کرنے والا ہے پس تم بھی انتظار کرو، عنقریب تم جان لو گے کہ کون ہیں سیدھے راستے والے اور کون ہیں جو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچے، اور مقابلۃً دوسری بات آگئی کہ کون ہیں جو کہ بھٹکے اور کون ہلاکت کے گڑھے میں گرے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ إِلَيْكَ

سورة الانبياء
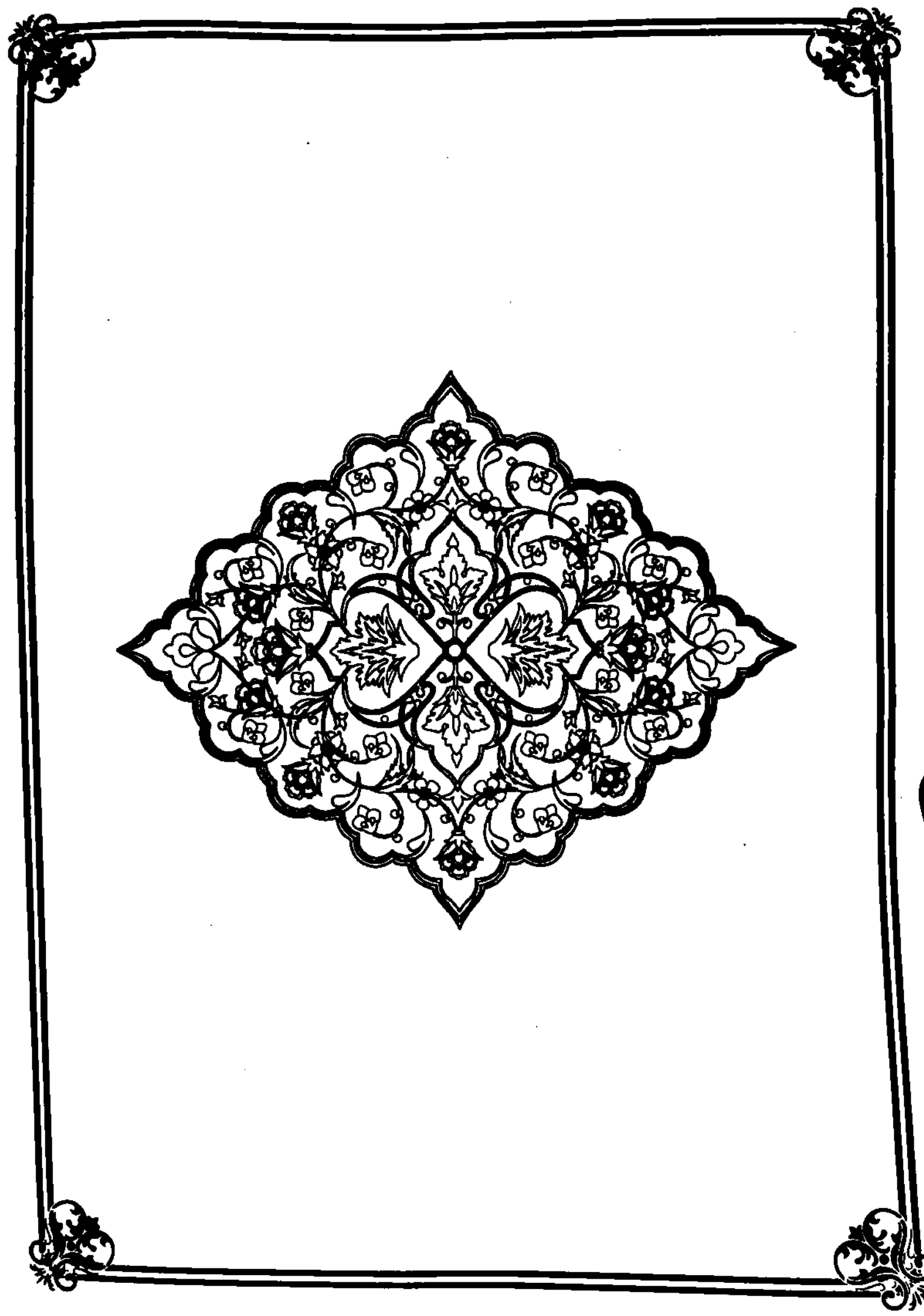
اٰیاتھا ۱۱۲ ۲۱ سُوْرَةُ الْاَنْبِيَآءِ مَكِّيَّةٌ ۷۳ رکوعاتھا ۷

سورۂ انبیاء مکہ میں نازل ہوئی، اس میں ایک سو بارہ آیتیں اور سات رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ۟ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ

لوگوں کے لئے ان کا حساب قریب آ گیا اور وہ غفلت میں ہیں اعراض کرنے والے ہیں ① نہیں آتی ان کے پاس ان کے رَبّ

مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ ۟ لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ ۭ

کی طرف سے کوئی نئی نصیحت مگر یہ لوگ اس کو سنتے ہیں اس حال میں کہ وہ کھیلتے ہیں ② غفلت میں پڑے ہوئے ہیں ان کے دِل،

وَاَسَرُّوا النَّجْوَى ڰ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ڰ هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۚ اَفَتَاْتُوْنَ

سرگوشی کو چھپایا ان لوگوں نے جنہوں نے ظلم کیا، نہیں ہے یہ شخص مگر تم جیسا انسان، کیا پھر تم آتے ہو

السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ۝ قٰلَ رَبِّيْ يَعْلَمُ الْقَوْلَ فِي السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ ۡ وَهُوَ

جادو کے پاس حالانکہ تم سمجھ دار ہو ③ کہا رسول نے: میرا رَبّ جانتا ہے قول کو جو آسمان میں ہے اور جو زمین میں ہے اور وہ

السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۢ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ ښ

سننے والا ہے علم والا ہے ④ بلکہ ان ظالموں نے کہا کہ یہ تو پراگندہ خیالات ہیں بلکہ اس نے اس بات کو گھڑ لیا ہے بلکہ یہ تو شاعر ہے

فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ ۝ مَآ اٰمَنَتْ قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْيَةٍ

چاہیے کہ لے آئے ہمارے پاس کوئی نشانی جس طرح سے کہ پہلے لوگ بھیجے گئے تھے ⑤ نہیں ایمان لائی ان سے پہلے کوئی بستی

اَهْلَكْنٰهَا ۚ اَفَهُمْ يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ

جس کو ہم نے ہلاک کر دیا، کیا پھر یہ ایمان لے آئیں گے؟ ⑥ نہیں بھیجا ہم نے آپ سے قبل مگر مردوں کو ہی، ہم وحی کرتے تھے

اِلَيْهِمْ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ

ان کی طرف، پس پوچھ لو تم اہلِ علم سے اگر تمہیں پتا نہیں ⑦ نہیں بنایا ہم نے ان رسولوں کو ایسے بدن جو کھانا نہ

الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ ⑧ ثُمَّ صَدَقْنٰهُمُ الْوَعْدَ فَاَنْجَيْنٰهُمْ وَمَنْ نَّشَاءُ

کھاتے ہوں، اور نہ وہ ہمیشہ رہنے والے تھے ⑧ پھر ہم نے سچا کیا ان سے وعدے کو پھر ہم نے نجات دے دی ان کو اور جن کو ہم نے چاہا

وَاَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِيْنَ ⑨ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ⑩

اور حد سے بڑھنے والوں کو ہم نے ہلاک کر دیا ⑨ البتہ تحقیق اُتاری ہم نے تمہاری طرف کتاب اس میں تمہارا ذکر ہے، کیا تم سوچتے نہیں ہو؟ ⑩

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ: لوگوں کے لئے ان کا حساب قریب آ گیا، حساب کے قریب آنے سے مراد یہ ہے کہ وقتِ حساب قریب آ گیا، وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ: فِيْ غَفْلَةٍ پہلی خبر ہے اور مُعْرِضُوْنَ دوسری خبر ہے۔ اور وہ لوگ غفلت میں ہیں، اعراض کرنے والے ہیں۔ غفلت کا مطلب یہ ہے کہ خود متوجہ نہیں، بے فکری میں پڑے ہوئے ہیں، اور اِعراض کا معنیٰ یہ ہوتا ہے کہ دوسرے کے متوجہ کرنے سے بھی متوجہ نہیں ہوتے، تو اعراض غفلت سے اگلا درجہ ہو گیا۔ یعنی از خود بھی یہ نہیں سوچتے فکر نہیں کرتے، ادھر متوجہ نہیں، اور جب کوئی دوسرا جھنجھوڑتا ہے متوجہ کرتا ہے تو بھی متوجہ نہیں ہوتے، اِعراض کر جاتے ہیں، بات کو ٹلا جاتے ہیں۔ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ: محدَث یہ ذِکْرٍ کی صفت ہے، اَحْدَثَ اِحْدَاث کا معنیٰ ہوتا ہے کوئی نئی بات ظاہر کرنا، بدعت کو مُحْدَث اس لیے کہتے ہیں کہ اس کا نمونہ پہلے کوئی موجود نہیں ہوتا، لوگ اپنی طرف سے ایک نئی بات نکال لیتے ہیں۔ تو یہاں مُحْدَثٍ سے مراد ہے نئی ظاہر کی ہوئی بات۔ ذکر: نصیحت۔ نہیں آتی ان کے پاس ان کے رَبّ کی طرف سے کوئی نئی نصیحت، کوئی تازہ بہ تازہ نصیحت، اس کا مفہوم یہ ہو جائے گا، نہیں آتی ان کے پاس ان کے رَبّ کی طرف سے کوئی تازہ بہ تازہ نصیحت، اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ: مگر یہ لوگ اس کو سنتے ہیں اس حال میں کہ کھیلتے ہیں، يَلْعَبُوْنَ: لعب سے لیا گیا ہے، کھیل کود میں لگے ہوئے ہوتے ہیں، کھیل تماشا کرتے ہیں، "مگر سنتے ہیں یہ اس نصیحت کو اس حال میں کہ وہ کھیلتے ہیں" یعنی اس نصیحت کو کھیل بنا لیتے ہیں، یا مطلب یہ ہے کہ اپنے کھیل کی طرف لگے رہتے ہیں، اور سمجھنے کی نیت سے نہیں سنتے۔ لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ: قُلُوْبُهُمْ یہ لَاهِيَةً کا فاعل ہے، یہ لفظ لہو سے لیا گیا ہے۔ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں ان کے دِل۔ لہو ولعب دونوں لفظ اکٹھے آیا کرتے ہیں، اور ان دونوں کے مفہوم میں تھوڑا سا فرق ہوا کرتا ہے، ضروری اور اہم بات سے غفلت کرنا یہ لہو ہے، اور غیر ضروری چیزوں کی طرف متوجہ ہونا یہ لعب ہے۔ تو لہو ولعب دونوں لفظ اکٹھے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جو کام کرنے کے ہیں وہ کرتے نہیں، اور جو نہ کرنے کے ہیں وہ کرتے ہیں، جن کی طرف متوجہ ہونا چاہیے جن میں فائدہ ہے ادھر متوجہ ہوتے نہیں، اور بے کار کام جن کا کوئی نتیجہ نہیں، جو ان کے لئے مفید نہیں، اس کی طرف لگے ہوئے ہیں، "ان کے دل لہو میں پڑے ہوئے ہیں، غفلت میں پڑے ہوئے ہیں" وَاَسَرُّوا النَّجْوَى: نجویٰ کا لفظ آپ کے سامنے پہلے کئی دفعہ گزرا، خفیہ خفیہ بات کرنے کو کہتے ہیں، سرگوشی کرنا۔ اور چھپایا انہوں نے سرگوشی کو الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا: یہ اَسَرُّوا کی ضمیر سے بدل ہے، نحو کے اندر آپ نے قاعدہ پڑھا کہ جس وقت کسی فعل کا فاعل ظاہر ہو تو اس

وقت فعل ہمیشہ واحد کا صیغہ ہی آیا کرتا ہے جیسے: ذھب زید، ذھب الزیدان، ذھب الزیدون، یوں نہیں کہیں گے ذھب زید، ذھبا الزیدان، ذھبوا الزیدون کیونکہ ذھبا کے اندر جو ضمیر ہے وہ فاعل کی ہے پھر آگے الزیدان فاعل آرہا ہے، اور اسی طرح ذھبوا کے اندر ضمیر فاعل کی ہے پھر آگے الزیدون فاعل آرہا ہے۔ تو جس وقت فاعل ظاہر آ جائے اس وقت فعل ضمیر سے خالی ہوتا ہے، اور جب فعل ضمیر سے خالی ہوگا تو وہ واحد کی شکل میں رہے گا، اس میں تغیر نہیں آئے گا، اور یہاں الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا یہ آگے فاعل آیا ہوا ہے، اور اَسَرُّوْا یہ جمع کا صیغہ ہے، تو یہ اس نحوی قاعدے کے خلاف ہے، اس کی توجیہ کی طرف میں نے اشارہ کیا کہ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا یہ فاعل سے بدل ہے۔ "نحو" کے اندر آپ نے ایک مثال پڑھی ہوگی: اَكَلُوْنِي الْبَرَاغِيْثُ، مجھے پسو کھا گئے، مچھر کھا گئے۔ البراغیث آگے فاعل آیا ہوا ہے اور اکلوا یہ جمع کا صیغہ ہے، تو وہاں یہ قاعدہ بتایا کرتے ہیں کہ جہاں اس قسم کی صورت پیدا ہو جائے تو وہاں اسم ظاہر کو بدل بنالیا جاتا ہے فاعل کی ضمیر سے، تو یہاں اسی طرح سے اَسَرُّوْا کے اندر فاعل ضمیر ہے اور الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اس سے بدل ہوگیا۔ "انہوں نے سرگوشی کو چھپایا" یہ اَسَرُّوا النَّجْوَى کا ترجمہ ہوگیا، "انہوں نے" سے کون مراد ہیں؟ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا: جنہوں نے ظلم کیا، جو لوگ ظالم ہیں، اپنے نفس پر ظلم کرنے والے ہیں انہوں نے سرگوشی کو چھپایا، یعنی چپکے چپکے باتیں کیں۔ کیا بات کی؟ وہ بات آگے مذکور ہے، خفیہ میٹنگیں کرتے ہیں، خفیہ میٹنگیں کر کے اس قسم کی باتیں کرتے ہیں اور پروپیگنڈا کرتے ہیں: هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ: نہیں ہے یہ شخص مگر تم جیسا انسان، اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ: کیا پھر تم آتے ہو جادو کو؟ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ: حالانکہ تم صاحب بصیرت ہو۔ اَبْصَرَ: دیکھنا۔ اِبْصَار مصدر ہے۔ مُبْصِر کہتے ہیں صاحبِ بصیرت کو، دیکھنے والا آدمی۔ اور دیکھنا ایک ہوتا ہے دل کا اور ایک ہوتا ہے آنکھ کا، جو دل کا دیکھنے والا ہوتا ہے اسے سمجھ دار کہتے ہیں، مبصر کے دونوں مفہوم آیا کرتے ہیں۔ مبصر: دیکھنے والا، آنکھ سے دیکھنے والا، دل سے دیکھنے والا۔ "دل سے دیکھنے والا" جس کو ہم کہتے ہیں کہ بڑا سمجھ دار ہے، اس کی دل کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں، دل کی آنکھیں روشن ہیں۔ تو یہاں اس کا ترجمہ یوں ہی کرنا ہے وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ: کیا پھر تم آتے ہو جادو کے پاس حالانکہ تم سمجھ دار ہو، حالانکہ تم صاحبِ بصیرت ہو۔ اور ہم بھی اپنی اُردو زبان میں ایسا لفظ بولا کرتے ہیں "تم دیکھتے بھالتے اس بات کو اختیار کر رہے ہو؟" یہ حقیقت تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے۔ تو اس لیے اگر آنکھوں سے دیکھنے کے ساتھ تعبیر کر دیا جائے تو بھی محاورۃً بات ٹھیک ہے، "حالانکہ تم دیکھ رہے ہو" اس میں دونوں مفہوم آسکتے ہیں، آنکھوں سے دیکھنا بھی، دل سے سمجھنا بھی۔ قٰلَ رَبِّيْ يَعْلَمُ الْقَوْلَ فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ: قٰلَ کی ضمیر رسول کی طرف لوٹ گئی جس کی طرف اشارہ هَلْ هٰذَآ میں آیا تھا "نہیں ہے یہ شخص جو تمہارے سامنے آکے باتیں کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اللہ کی طرف سے نصیحت آئی ہے، یہ بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ہے"، تو اسی شخص نے کہا، مصداق اس کا رسول ہے۔ کہا رسول نے: میرا ربّ جانتا ہے قول کو جو آسمان میں ہے اور جو زمین میں ہے، جو بات بھی آسمان میں ہے زمین میں ہے میرا ربّ اس کو جانتا ہے، اور وہ سننے والا علم والا ہے۔ بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ: بلکہ ان ظالموں نے کہا، اَحْلَام جمع ہے حُلُمٌ کی اور حُلم کہتے ہیں خواب کو، اور اَضْغَاثٌ یہ ضِغْثٌ کی جمع ہے۔ ضِغث کہتے ہیں اصل میں مختلف تنکوں کے مٹھے کو، ایک مٹھی بھر لی جائے مختلف تنکوں کی جس میں تر خشک چھوٹا بڑا ہر قسم کا تنکا آ جائے، اور یہ لفظ آپ کے سامنے سورۂ یوسف میں گزرا ہے، اور ضغث کا لفظ بھی آگے آئے گا سورۂ صٓ میں: خُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا (آیت: ۴۴) اپنے ہاتھ میں ایک مٹھا لے لو۔ تو اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ جہاں اکٹھا لفظ آ جائے تو

اس کا معنی ہوتا ہے پراگندہ خواب، پریشان خیالات، اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ کا یہ معنی ہوتا ہے، یعنی ایسے خیالات جو سوئے ہوئے انسان کو بے ترتیب سے آتے رہتے ہیں، جن کی کوئی تعبیر نہیں ہوتی، کوئی مطلب نہیں ہوتا، جس طرح سے آپ لوگ بھی دیکھتے ہیں کہ جس وقت معدہ خراب ہو یا معدے میں بخارات ہوں تو سویا ہوا آدمی بس ایسے ہی بے ربط سی باتیں خواب میں دیکھتا رہتا ہے، ان کو اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ کہا جاتا ہے۔'' بلکہ ان ظالموں نے کہا کہ یہ تو پراگندہ خیالات ہیں۔'' اور اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ کہا جا رہا ہے ان نصیحتوں کو جو رسول ان کے سامنے بیان کرتا تھا'' یہ پراگندہ خیالات ہیں'' بَلِ افْتَرٰىهُ: بلکہ اس نے اس بات کو گھڑ لیا ہے، جھوٹ بنایا ہے، یعنی اضغاث احلام ٹھیک ہے فضول سی باتیں ہوتی ہیں، پراگندہ سے خیالات ہوتے ہیں، لیکن اس میں بسا اوقات انسان معذور ہوتا ہے، اس کے اختیار میں نہیں ہوتیں، دماغ میں آتی رہتی ہیں، اور افترا اس سے بھی بڑھ کے ہے۔'' بلکہ اس نے اس کو گھڑ لیا ہے، جھوٹ باندھا ہے، جھوٹ بنایا ہے'' بَلْ هُوَ شَاعِرٌ: بلکہ یہ تو شاعر ہے اس کی سب باتیں ہی خیالی ہیں، جس طرح سے شاعر خیالی پلاؤ پکایا کرتے ہیں، اور ادھر ادھر سے باتیں جوڑ کے ایک مؤثر کلام بنا لیتے ہیں،'' بلکہ یہ تو شاعر ہے'' فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ: چاہیے کہ لے آئے ہمارے پاس کوئی نشانی كَمَاۤ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ: جس طرح سے کہ پہلے لوگ بھیجے گئے تھے۔ مَاۤ اٰمَنَتْ قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا: نہیں ایمان لائی ان سے پہلے کوئی بستی جس کو ہم نے ہلاک کر دیا، اَفَهُمْ يُؤْمِنُوْنَ: کیا پھر یہ ایمان لے آئیں گے؟ ایمان کی نسبت قریہ کی طرف کی جا رہی ہے مجازاً، اصل میں اہلِ قریہ مراد ہوتے ہیں، یعنی جتنی بستیاں ہم پہلے برباد کر چکے ہیں ان بستیوں میں بسنے والے وہ بھی اسی طرح سے انبیاء علیہم السلام سے معجزات مانگتے تھے، اور ان کی مرضی کے مطابق معجزات دکھائے گئے، پھر بھی وہ ایمان نہیں لائے، تو اب اگر ان کو ان کی مرضی کے مطابق معجزہ دکھا دیا جائے تو کیا یہ مان جائیں گے؟ یعنی یہ بھی نہیں مانیں گے، اگر ماننا ہو تو انسان ہر دلیل سے مان سکتا ہے، نہ ماننا ہو تو لاکھوں دلیلیں اس کے سامنے واضح کر دو وہ ہر بات میں کوئی نہ کوئی عذر کرتا چلا جائے گا۔'' نہیں ایمان لائی ان سے قبل کوئی بستی جس کو کہ ہم نے ہلاک کر دیا، کیا پھر یہ ایمان لے آئیں گے؟'' وَمَاۤ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا: نہیں بھیجا ہم نے آپ سے قبل مگر مردوں کو ہی، رجال رجل کی جمع ہے۔ نہیں بھیجا ہم نے آپ سے قبل یعنی رسول بنا کر، مگر مردوں کو، نُّوْحِيْۤ اِلَيْهِمْ: ہم ان کی طرف وحی کرتے تھے، فَسْـَٔلُوْۤا اَهْلَ الذِّكْرِ: پس پوچھ لو تم اہلِ علم سے۔ یہاں ذکر سے علم مراد ہے، اور اہل ذکر کا لفظ بول کے اہلِ کتاب مراد ہیں، لفظی معنی بنتا ہے: یاد والے، جن کو کچھ آسمانی باتیں یاد ہیں، اہلِ علم، اور یہاں مراد اہلِ کتاب ہیں، کیونکہ اس مسئلے میں اہلِ کتاب متفق تھے اہلِ اسلام کے ساتھ کہ رسول بشر ہوتا ہے، اور پہلے بھی جو انبیاء علیہم السلام آئے ہیں وہ بشر ہی تھے، یہ مسئلہ اہلِ کتاب کے نزدیک بھی مسلّم تھا، اس لیے کہا جا رہا ہے کہ اگر تمہیں پتا نہیں، تم اُمّی ہو، اَن پڑھ ہو، پچھلی تاریخ سے تم واقف نہیں ہو، تو تم ان اہلِ علم سے پوچھ لو، اہلِ کتاب سے پوچھ لو، وہ اگرچہ اسلام کے اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالف تھے لیکن اس مسئلے میں تو انکار نہیں کر سکتے تھے، کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام ہو گئے، موسیٰ علیہ السلام ہو گئے، اور پہلے جتنے انبیاء علیہم السلام ہیں جن کو اہلِ کتاب مانتے تھے، تو اہلِ کتاب ان سب کو بشر اور انسان کہتے تھے، اس لیے ان کا حوالہ دیا گیا ہے کہ یہ مسئلہ ایسا ہے جو ان کے اور ہمارے درمیان متفق علیہ ہے، اور مشرکین اسلام کے مقابلے میں اُن پر اعتماد کرتے تھے، اس لیے متوجہ کیا کہ تم ان سے پوچھ لو، اگر تمہیں پتا نہیں۔ وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ: لَا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ یہ جَسَدًا کی صفت ہے۔ ہم نے ان رسولوں کو، ان مردوں کو جن کو

ہم نے رسول بنا کے بھیجا، ہم نے ان کو ایسے بدن نہیں بنایا جو کھانا نہ کھاتے ہوں، نہیں بنایا ہم نے ان کو ایسے بدن کہ نہ کھاتے ہوں کھانا، وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ: اور نہ وہ ہمیشہ رہنے والے تھے، ان کے ایسے بدن تھے جو کھانے پینے کے محتاج تھے، وہ کھاتے پیتے تھے، اور ہمیشہ بھی نہیں رہے، جس طرح سے عام انسانوں کو موت آتی ہے اسی طرح سے ان کو بھی موت آ گئی، وہ بھی اپنا وقت گزار کے چلے گئے۔ ثُمَّ صَدَقْنٰهُمُ الْوَعْدَ: پھر ہم نے سچا کیا ان سے وعدے کو، فَاَنْجَيْنٰهُمْ: پھر ہم نے انہیں نجات دیدی، وَمَنْ نَّشَآءُ: اور جن کو ہم نے چاہا نجات دے دی۔ مَنْ نَّشَآءُ کا عطف فَاَنْجَيْنٰهُمْ کی ھم ضمیر پر ہے، ہم نے ان رسولوں کو نجات دی اور جن کو ہم نے چاہا انہیں نجات دی۔ وَاَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِيْنَ: اور حد سے بڑھنے والوں کو ہم نے ہلاک کر دیا۔ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا: البتہ تحقیق اتاری ہم نے تمہاری طرف کتاب، فِيْهِ ذِكْرُكُمْ: اس میں تمہارا ذکر ہے۔ ذِکر سے نصیحت بھی مراد ہو سکتی ہے کہ تمہاری نصیحت ہے اس میں، اور ذِکر سے شہرت بھی مراد ہو سکتی ہے، شرف بھی مراد ہو سکتا ہے، کہ اس کتاب میں تمہارا شرف ہے، تمہاری شہرت ہے، تم اس کو قبول کرو، تمہاری زبان میں اُتری ہے، رسول تمہارا ہم زبان ہے، اور آگے جتنا اسلام پھیلتا چلا جائے گا اس میں تمہاری ہی شہرت ہے، اور یہ واقعہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عرب کو اور عربی کو قرآنِ کریم کی وجہ سے جو عظمت دی ہے اور جو دوام بخشا ہے وہ کسی اور صفت کے اعتبار سے نہیں ہو سکتا تھا، اب جہاں جہاں بھی دُنیا کے کسی کونے میں مسلمان آباد ہیں وہ عربی پڑھتے ہیں، عربی سمجھتے ہیں، تو عربی کی قدر و قیمت اسی طرح سے باقی ہے صرف اللہ کی کتاب کی وجہ سے، تو دِل میں عربی کی قدر بھی ہے اور اہلِ عرب کی قدر بھی ہے، ان کی ساری کی ساری تاریخ محفوظ ہو گئی، تو فِيْهِ ذِكْرُكُمْ کا یہ معنی ہو گا کہ اس میں تمہارا شرف ہے، اس میں تمہاری شہرت ہے۔ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ کیا تم سوچتے نہیں ہو؟

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

مکی سورتوں کے مضامین

یہ سورت بھی مکی ہے اور آپ کی خدمت میں بار بار عرض کیا جا چکا کہ مکی سورتوں میں زیادہ تر اُصول کا ذکر آیا کرتا ہے، اور اُصولی طور دِین کی تین باتیں مذکور ہوتی ہیں، اثباتِ توحید، اثباتِ رسالت اور اثباتِ معاد۔ توحید کو ثابت کیا جاتا ہے کہ اللہ وحدہٗ لاشریک ہے، اور رسالت کو ثابت کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ رسول بھیجا کرتے ہیں اور یہ حاملِ کتاب محمد ﷺ یہ بھی اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں، اور معاد کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ تم نے لوٹ کے پھر اللہ کی طرف جانا ہے، مرو گے اور دوبارہ زندہ کیے جاؤ گے، یہ تین باتیں بنیادی ہیں، ان کے اوپر مذہب کی بنیاد ہے، عمارت ساری کی ساری ان تین باتوں پہ کھڑی ہے، تو جس وقت اثباتِ توحید کیا جائے تو ساتھ ساتھ رَدِّ شرک بھی آتا ہے، توحید کی دلیل واضح کی جاتی ہے تو مشرکین کے دِل میں جو کوئی وسوسہ ہو اس کو بھی رَدّ کیا جاتا ہے، اور اسی طرح سے رسالت کا ذکر آتا ہے تو رسالت کے متعلق جو ان کے شبہات ہیں ان کا بھی ازالہ کیا جاتا ہے، معاد کا ذکر آتا ہے تو معاد کے متعلق ان کے دِل میں جو شبہات تھے تو ان کو بھی دُور کیا جاتا ہے، اور پھر پچھلی تاریخ یعنی انبیاء ﷺ کا حوالہ دے کے ان

اُصولوں کو پکا کیا جاتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام پہلے بھی آئے تھے، اس سے رسالت کے مسئلے کی تائید ہوگئی، انہوں نے آ کر توحید اور آخرت کا وعظ کہا جس سے توحید اور معاد کا مضمون بھی واضح ہو گیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نتیجہ ذکر فرماتے ہیں دنیا اور آخرت کے اعتبار سے، کہ دنیا میں بھی ماننے والے کس طرح سے اللہ کے عذاب سے محفوظ رہے، اللہ کی رحمت ان کو شامل رہی، اور جو نہ ماننے والے تھے وہ کس طرح سے تباہ کیے گئے، اور آخرت میں بھی ماننے والوں کے لیے اس قسم کی نعمتیں ہوں گی، اور نہ ماننے والوں کے لیے ایسے عذاب ہوں گے۔ تو قرآنِ کریم کی مکی سورتوں کے اندر یہی مضامین سارے کے سارے خلط ملط ہو کے آتے ہیں۔ ہاں! البتہ بعض سورتوں میں توحید کا مضمون غالب ہوتا ہے، بعض میں رسالت کا مضمون غالب ہوتا ہے اور بعض میں معاد کا مضمون غالب ہوتا ہے۔ یہ ابتداءً آپ کے سامنے جو آیات پڑھی جا رہی ہیں، ان میں پہلے معاد کا ذکر ہے، اور پھر رسالت کا ذکر ہے، اور آگے انبیاء علیہم السلام کے واقعات آئیں گے، ان کے اندر انہی اُصول کی تائید ہوگی۔

ماقبل سے ربط

اور پچھلی سورت جو آپ کے سامنے گزری ہے اس کی آخری آیات میں مشرکینِ مکہ کو یہ تنبیہ کی گئی تھی کہ اب وقت ہے سمجھ جاؤ، اگر اس کتاب کے اُتارنے سے پہلے ہم تمہیں ہلاک کر دیتے تو تم یہ بہانہ کرتے کہ اے اللہ! تو نے ہماری طرف رسول کیوں نہ بھیجا، کہ ہم ذِلت اور رُسوائی سے بچ جاتے، تیرے رسول کی اتباع کر لیتے۔ اب اسی کے مطابق آگے کلام چلائی جا رہی ہے کہ سمجھنے کا وقت ہے، سمجھ جاؤ، حساب سر پہ کھڑا ہے اور وہ وقت بہت قریب آ رہا ہے۔ اس وقتِ حساب سے مراد یا تو قیامت ہے، اور آنے والی چیز قریب ہی ہوتی ہے، وقت گزرتے ہوئے کون سی دیر لگتی ہے۔ اور اگر وقتِ حساب سے موت مراد لے لی جائے تو وہ تو واقعی بہت قریب ہے، اتنی قریب ہے کہ آپ سوچ ہی نہیں سکتے۔ تو دونوں اس سے مراد ہو سکتے ہیں، کیونکہ مرنے کے ساتھ حساب وکتاب شروع ہو جاتا ہے، اگرچہ ابتدائی طور پر مختصر باتیں ہوتی ہیں، تفصیلی حساب کتاب آخرت میں ہوگا، تو حدیث شریف میں آتا ہے: ''مَنْ مَاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهٗ''(۱) جو شخص مر گیا اس کی تو قیامت قائم ہوگئی، کیونکہ حساب وکتاب بھی شروع ہو گیا، عذاب وثواب بھی شروع ہو گیا، اگرچہ وہ ابتدائی اور ہلکا درجہ ہوتا ہے، جس کو ہم برزخ کا عذاب یا برزخ کا ثواب کہتے ہیں، تو حساب کا وقت سر پہ کھڑا ہے اور یہ لوگ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں، انہیں کوئی کسی قسم کی ہوش ہی نہیں، تو یہ بھی ان کو تنبیہ کرنا، اور متوجہ کرنا مقصود ہے کہ نفع نقصان سوچو، اور جب یہ وقت آ جائے گا، پکڑ میں آ جاؤ گے، پھر کچھ نہیں ہو سکے گا۔ جیسے ایک شاعر کہتا ہے کہ:

اَلنَّاسُ فِيْ غَفَلَاتِهِمْ وَرَحَى الْمَنِيَّةِ تَطْحَنُ
(ابن کثیر)

کہ لوگ اپنی غفلتوں میں پڑے ہوئے ہیں، اور موت کی چکی چل رہی ہے، اور پیس پیس کے ڈالتی چلی جا رہی ہے، صبح شام لوگ مرتے ہیں، جو مر جاتا ہے اس کے حساب کا وقت آ گیا۔ تو جیسے پچھلی سورت کے آخر میں یہ تنبیہ کی گئی تھی، ان کو جھنجھوڑا گیا تھا، تو یہ ابتدائی آیات بھی ایسی ہی ہیں۔

---

(۱) احیاء علوم الدین ۶۴/۴ بعنوان "بیان حقیقۃ الصبر ومعناہ" وغیرہ۔ تفسیر رازی سورۃ آل عمران آیت ۱۷۱ کے تحت وغیرہ۔ یہ حدیث با سند نہیں ملی۔

کلام اللہ قدیم ہے

لوگوں کے لئے ان کے حساب کا وقت قریب آ گیا اور وہ غفلت میں ہیں اور بات کو ٹلا رہے ہیں، جب ان کو متوجہ کیا جاتا ہے تو متوجہ نہیں ہوتے، دونوں میں فرق میں نے آپ کی خدمت میں عرض کر دیا، یہ شکوہ شکایت ہے ان کی اس غفلت کی، کہ جب بھی ان کے سامنے کوئی نئی نصیحت آتی ہے، نئی یعنی تازہ بتازہ اللہ کی طرف سے جو ظاہر ہوتی ہے، ہمارے سامنے ظاہر ہونے کے اعتبار سے اس کو مُحدَث اور نئی کہہ دیا گیا، ورنہ اللہ کی کلام قدیم ہے، جس طرح سے اللہ تعالیٰ قدیم ہیں اللہ کی کلام بھی قدیم ہے، قرآنِ کریم کو حادث نہیں کہا جا سکتا، اس اعتبار سے یہ حادث ہے کہ ہمارے سامنے نمایاں ہوا، پہلے نہیں تھا، اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا، اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ قائم تھا، تو یہ حدوث کی صفت اس کے ساتھ جو لگائی جا رہی ہے یہ ہمارے سامنے ظاہر ہونے کے اعتبار سے ہے، اس اِتیان کے اعتبار سے ہے، ان کے پاس آئی نئی نئی نصیحت جو ان کے علم میں پہلے نہیں تھی، ورنہ واقع کے اعتبار سے اللہ کی کلام قدیم ہے، جس طرح سے اللہ قدیم اس کی کلام بھی قدیم، قرآنِ کریم کو حادث نہیں کہا جا سکتا، قرآنِ کریم کلام اللہ ہے اور کلام اللہ قدیم ہے۔ اور یہ مسئلہ پہلے زمانے میں اٹھا تھا جس سے اہلِ حق بہت بڑی آزمائش میں پڑ گئے تھے، ''معتزلہ'' قرآنِ کریم کو حادث کہتے تھے اور اہلِ حق کا مسلک تھا کہ قرآنِ کریم اللہ کی کلام ہے اور قدیم ہے، حضرت امام احمد بن حنبل ﷫ اسی مسئلے پر ہی آزمائش میں ڈالے گئے تھے، حکومت کا خیال چونکہ ''معتزلہ'' کے موافق تھا تو اس لیے بہت سختیاں ہوئی تھیں ان کے اُوپر، مشہور واقعات ہیں، تو اہلِ حق کا مسلک یہی ہے کہ کلام اللہ قدیم ہے، اور اس کو جو مُحدَث کہا جا رہا ہے وہ اس اِتیان کے اعتبار سے، کہ ہمارے سامنے نئی نئی بات آئی، جس کو ہم پہلے نہیں جانتے تھے، ورنہ یہ نہیں کہ پہلے اللہ کی یہ کلام موجود نہیں تھی، بعد میں اس کو تیار کیا گیا، کسی وقت یہ نہیں تھی، جس طرح سے حادث ہوتا ہے، ایسا نہیں، اللہ کی کلام قدیم ہے، ہاں! البتہ لوگوں کے علم میں نہیں تھی، ان کے سامنے یہ بات نئی آئی، تو مُحدَث اس کو اس اِتیان کے اعتبار سے کہا جا رہا ہے، ''جب ان کے سامنے کوئی نئی نصیحت آتی ہے، کوئی تر و تازہ نصیحت آتی ہے، تازہ بتازہ نصیحت ان کے سامنے آتی ہے، تو اس کو یہ توجہ سے نہیں سنتے، بلکہ ایسے حال میں سنتے ہیں کہ جب یہ کھیل تماشے میں لگے ہوئے ہوتے ہیں۔''

''لہو'' و ''لعب'' میں فرق

تو یَلْعَبُوْنَ کے اندر ''لعب'' کا ذکر آ گیا، لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ میں ''لہو'' کا ذکر آ گیا، اور ''لہو ولعب'' یہ دونوں لفظ اکٹھے آیا کرتے ہیں، جس کو ہم اُردو میں ''کھیل کُود'' کہہ دیتے ہیں۔ تو عربی میں ''لہو ولعب'' یہ دو لفظ اسی طرح سے آتے ہیں، دونوں کے درمیان میں فرق کرنے کے لیے کہہ دیتے ہیں کہ ضروری کاموں سے غفلت یہ ''لہو'' ہے، کہ جن کاموں میں فائدہ ہے دِین کا، دُنیا کا، ادھر سے تو غافل ہو گئے، وہ کام تو کیے نہیں، اس اعتبار سے ''لہو'' ہے۔ غیر ضروری باتیں جن کا فائدہ کوئی نہیں، وقت ضائع کرنے والی ہیں، تو غیر ضروری باتوں کی طرف متوجہ ہونا، غیر ضروری کاموں میں مشغول ہونا جو غیر مفید ہیں، جن میں کوئی کسی قسم کا فائدہ نہیں اس کو ''لعب'' کہہ دیتے ہیں۔ تو ''لہو ولعب'' یہ دونوں لفظ اکٹھے آتے ہیں تو یہاں بھی وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ کے اندر ''لعب'' کا ذکر آ گیا،

لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ کے اندر "لھو" کا ذکر آ گیا، یعنی یہ لوگ لہو ولعب میں مبتلا ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو نئی نصیحت ان کے سامنے آتی ہے اس کو توجہ سے نہیں سنتے۔

بُری عادت پر لگانے والا بڑا ظالم ہے

اور چپکے چپکے خفیہ میٹنگیں کرتے ہیں، اور اللہ کی کتاب پر اور اللہ کے رسول پر یوں تبصرے کرتے ہیں، جس طرح سے لوگوں کی عادت ہوتی ہے، خاص طور جو رؤساء تھے وہ سمجھتے تھے کہ اگر یہ دین اس طرح سے پھیل گیا، اور سرورِ کائنات ﷺ پر لوگ ایمان لے آئے اور انہوں نے اس کتاب کو مان لیا تو ہماری تو سرداری گئی، تو پھر وہ بیٹھ کر سازشیں کیا کرتے ہیں، مشورے کیا کرتے ہیں، کہ یہ پروپیگنڈا کرو، تاکہ ان کو نقصان پہنچے، یہ بات مشہور کر دو، تاکہ لوگ اس بات کی وجہ سے ہمارے ساتھ رہ جائیں، دوسری طرف متوجہ نہ ہوں، تو جس طرح سازشیں کی جاتی ہیں، پروگرام بنائے جاتے ہیں تو اَسَرُّوا النَّجْوٰى سے اسی قسم کی مجلسیں مراد ہیں، یہ اپنی مجلسوں میں بیٹھ کے یوں پروپیگنڈا کرتے ہیں، یوں سازشیں کرتے ہیں، اور ایک دوسرے سے کہتے ہیں، الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا یہ اَسَرُّوا کی ضمیر سے بدل لا کر ان کی حیثیت واضح کر دی کہ یہ پوشیدہ پوشیدہ باتیں کرنے والے، خفیہ میٹنگیں کرنے والے ظالم لوگ ہیں، اپنے آپ پر بھی ظالم کہ اپنے نفع کی بات قبول نہیں کرتے، اور لوگوں کے لیے بھی ظالم کہ ان کو ان کو نفع کی بات قبول نہیں کرنے دیتے۔ کسی کو ہدایت سے محروم کر دینا، کسی بُری عادت میں ڈال دینا، بُرا نظریہ اختیار کرنے پر مجبور کر دینا، یہ بہت بڑا ظلم ہے جو ایک شخص کسی دوسرے پہ کرتا ہے۔ جیسے حدیث شریف میں آتا ہے کہ کوئی باپ اپنے بیٹے کو اچھی خصلت سکھا دے، اچھا ادب سکھا دے، یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ ایک صاع صدقہ کرے۔[1] ایک صاع صدقہ کرنے میں اتنا فائدہ نہیں اور اتنا ثواب نہیں، جتنا کسی کو اچھی عادت سکھا دینے میں ثواب ہے، کیونکہ ایک صاع صدقہ جو دیا ہے وہ تو کھا لو گے، کھا کے ختم کر دو گے، اور اگر آپ کو کوئی اچھی عادت سکھا دی گئی تو زندگی بھر کے لئے اس سے فائدہ اُٹھاؤ گے۔ اور اسی طرح سے یہ بدترین قسم کی دشمنی ہے کہ کسی کو کوئی بُری عادت ڈال دی جائے، ایک تو ظلم یہ ہے کہ آپ کے کسی نے تھپڑ مار دیا، کوئی بات نہیں، ایک منٹ کے بعد ٹھیک ہو جائے گا، وقتی سی تکلیف ہے ہٹ جائے گی، لیکن اگر آپ کو کسی بُری عادت میں ڈال دیا گیا تو یہ زندگی بھر کے لئے آپ کے پیچھے ایک خطرناک قسم کا دشمن لگا دیا گیا، جو ہر جگہ آپ کو رُسوا کرے گا، ہر جگہ آپ کو تکلیف اور نقصان پہنچائے گا، اس لیے بُری عادت بدترین قسم کا دشمن ہے۔ تو یہ لوگ جو حق قبول کرنے سے روکتے ہیں، اور لوگوں کو انہی بُرے نظریات کے اوپر پابند رکھنے کی کوشش کرتے ہیں، یہ بدترین قسم کے ظالم ہیں، انسانی معاشرہ انہی لوگوں کی وجہ سے تباہ ہوتا ہے، اپنے پر بھی ظالم ہیں کہ نفع کی بات کو قبول نہیں کرتے، اپنا نقصان کر رہے ہیں، اور باقی بنی آدم کے لیے بھی ظالم ہیں کہ حق کو قبول نہیں کرنے دیتے، اس لیے اَسَرُّوا میں پہلے ان کو اجمالاً ذکر کیا، الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا کے ساتھ ان کا تعارف کرا دیا، ان کی حیثیت واضح کر دی، یہ لوگ یعنی پیچھے جن کا ذکر آیا يَلْعَبُوْنَ کے اندر، لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ کے اندر، یہ لوگ چپکے چپکے سرگوشیاں کرتے ہیں، اور الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا سے ان کی حیثیت متعین ہو گئی، یعنی ظالم لوگ۔

---

(۱) ترمذی ۲/ ۱۶، باب ماجاء فی ادب الولد۔ مشکوٰۃ ۲/ ۴۲۳، باب الشفقة، فصل ثانی۔ ولفظہ: لَاَنْ يُّؤَدِّبَ الرَّجُلُ وَلَدَهٗ خَيْرٌ مِّنْ اَنْ يَّتَصَدَّقَ بِصَاعٍ

مشرکین کی سرگوشی

اور وہ سرگوشی یوں کرتے ہیں کہ ایک دوسرے کو کہتے ہیں کہ نہیں ہے یہ مگر انسان تم جیسا، یہ تم جیسا بشر ہی تو ہے، باقی رہی یہ بات کہ یہ باتیں کرتا ہے تو اس میں اثر بہت ہے، تو اثر تو اس میں ایسے ہے جس طرح سے جادو میں ہوتا ہے، جو بات دوسرے کے اُوپر اثر ڈالے اور دوسرے کو متاثر کر کے قائل کر لے، اس کو ہمارے ہاں بھی جادو سے تعبیر کیا جاتا ہے، کہتے ہیں: فلاں مقرر، فلاں خطیب جادو بیان ہے، اس کا بیان ایسے ہے جیسے جادو، کہ جب وہ بیان کرتا ہے تو جو سامنے بیٹھنے والے لوگ ہوتے ہیں ان کو جو منوانا چاہے منوالیتا ہے، تو اس کو کہتے ہیں کہ یہ خطیب بڑا جادو بیان ہے۔ تو یہ اثر کے اعتبار سے اللہ کی کلام کو جادو کہتے تھے کہ جب یہ بیان کرتے ہیں تو اس طرح سے ہے جیسے کسی کے اُوپر جادو ہی کرتے ہیں۔ ''کیا تم اس جادو کے پاس آتے ہو حالانکہ تم سمجھ دار ہو'' یعنی دیکھتے بھالتے ہوئے سمجھتے ہوئے تم ان کو اگر قبول کرو گے، تو ایسا ہے جیسے تم کسی جادو کے سامنے مرعوب ہو گئے۔ کتاب اللہ کی حیثیت کو ختم کرنے کے لئے اور سرورِ کائنات ﷺ کی باتوں کی اہمیت گھٹانے کے لئے وہ اس قسم کے تبصرے کرتے تھے۔

اللہ کی طرف سے دھمکی

تو اللہ کے رسول کے سامنے جب کوئی بات آتی تو اللہ کا رسول کہتا کہ اللہ کو سب کچھ معلوم ہے جو آسمان میں ہے اور جو زمین میں ہے، تم چھپ چھپ کے جتنی چاہو سازشیں کرلو، پروپیگنڈے کرلو، کوئی بات اللہ سے مخفی نہیں، وہ سننے والا جاننے والا ہے۔ تو خفیہ کارروائیاں کرنے والوں کے لئے یہ ایک بڑی دھمکی ہوتی ہے کہ ہمیں پتا ہے جو تم کر رہے ہو۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم چھپ چھپ کے کر رہے ہیں، کسی کو پتا نہیں، لیکن جب یہ بتادیا جائے کہ ہمیں پتا ہے، ہمارے سامنے کوئی بات مخفی نہیں، تو یہ ان کے لئے ایک بہت بڑی تنبیہ ہوتی ہے۔ ''اللہ کے رسول نے کہا کہ میرا رَبّ جانتا ہے ہر بات کو جو آسمان میں ہے اور زمین میں ہے، وہ سننے والا جاننے والا ہے۔''

مشرکین کے مزید پروپیگنڈے

(بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ) یہ اسی نجویٰ کا آگے ذکر آگیا، چپکے چپکے باتیں کرنے میں ایک تو یہ آگیا کہ کہتے ہیں یہ تم جیسا انسان ہے، اس میں اور تم میں کیا فرق ہے؟ اور پھر کہتے ہیں یہ باتیں جو لوگوں کو سناتا ہے، آخرت کی اور اس قسم کی دوسری باتیں، یہ پریشان خیالات ہیں، کوئی ربط تو ان میں ہے نہیں، جس طرح سے ایک آدمی کے دماغ میں خشکی ہو جائے تو اس کو خیالات ستاتے ہیں، سوئے ہوئے بھی اس قسم کے خواب آتے رہتے ہیں، اس قسم کی اس کی باتیں ہیں، بے کار، نہ ان کی کوئی تعبیر ہے، نہ ان کا کوئی مصداق ہے، بس یہ باتیں ہی باتیں ہیں، تو یوں بھی حیثیت گھٹاتے تھے، لوگوں کے دلوں میں اہمیت نہیں پیدا ہونے دیتے تھے...... بلکہ یہ جھوٹ ہی گھڑتا رہتا ہے، کیونکہ خیالات جو دماغ میں آتے ہیں، اس میں تو بسا اوقات انسان معذور ہوتا ہے، کہ بلا اختیار آتے رہتے ہیں، اور یہ تو ایسا مفتری ہے، کذاب ہے، نعوذ باللہ! کہ یہ اپنی طرف سے باتیں بناتا رہتا ہے، یہ نہیں کہ

اس کو خواب میں معلوم ہوتی ہوں گی، یہ ایسے ہی بنالیتا ہے...... بَلْ هُوَ شَاعِرٌ میں اور زیادہ ترقی کردی، کہ یہ تو ہے ہی شاعر جس طرح سے شاعر ہر وقت خیال بندی کرتا ہے، مختلف قسم کے خیالات جوڑ کے اپنی کلام میں تاثیر پیدا کرلیتا ہے، اسی قسم کے یہ ہیں کہ جو کلام یہ اللہ کی طرف منسوب کر کے بیان کرتے ہیں، صرف یہی نہیں، بلکہ یہ تو ہیں ہی شاعر، ان کی ہر بات ہی شاعرانہ ہوتی ہے جس میں مبالغہ آمیزی ہوتی ہے، اور ایسی باتیں بیان کردی جاتی ہیں کہ جن میں اصلیت کچھ نہیں ہوتی، شاعرانہ خیالات۔

منہ مانگی نشانی نہ دینے میں حکمت

فَلْيَأْتِنَا بِاٰيَةٍ: ہمارے پاس یہ نشانی لے آئے، جس طرح سے پہلے رسول بھیجے گئے تھے اور ان کی قوم نے جو نشانی مانگی وہ نشانی لے کے آئے، تو اسی طرح سے چاہیے کہ یہ بھی نشانی لے آئے۔ نشانی سے ان کی مراد ایسی نشانی تھی جس کا وہ مطالبہ کیا کرتے تھے، ورنہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے معجزات تو بے شمار ظاہر کئے گئے، ہر ہر بات کو مدلل کر کے ذکر کیا گیا، لیکن وہی مرغی کی ایک ٹانگ، کہ جب تک فلاں کام نہ کر کے دکھاؤ ہم نہیں مانیں گے، قرآنِ کریم کی مختلف آیات میں یہ مضمون ذکر کیا گیا ہے۔ اگلی بات کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ پہلی اُمتیں جن کی طرف رسول آئے تھے انہوں نے نشانی مانگی، اور ہم نے انہیں دکھائی، وہ ایمان نہیں لائے، نتیجہ یہ ہوا کہ ہلاک کردیے گئے۔ اور اِن لوگوں کو ہلاک کرنا ابھی مصلحت نہیں ہے، جس طرح سے یہ ضد میں آئے ہوئے ہیں، تو اگر ان کے سامنے ان کی منہ مانگی نشانی بھی ظاہر کردی جائے تو بھی یہ نہیں مانیں گے، پہلے سے انسانوں کا رواج یہی چلا آتا ہے، ''نہیں ایمان لائی اِن سے قبل کوئی بستی جس کو ہم نے ہلاک کردیا'' یعنی جتنی بستیوں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں اُن کے رہنے والے منہ مانگی نشانیاں دیکھ کے بھی ایمان نہیں لائے، تو کیا یہ ایمان لے آئیں گے؟ یعنی جیسے وہ نہیں مانیں اسی طرح سے یہ بھی نہیں مانیں گے۔

انبیاء علیہم السلام سب بشر ہی تھے

باقی رہا ان کا یہ کہنا کہ ''یہ تو تم جیسا انسان ہی ہے، تم جیسا بشر ہی ہے'' تو اس میں کوئی بات نہیں ہے بشر تو واقعی ہیں، اور پہلے جتنے بھی رسول آئے تھے سارے ہی بشر تھے، سارے رجل تھے، سارے مرد تھے، سارے بنی آدم میں سے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے پاس وحی آتی ہے، جس کی وجہ سے وہ باقی انسانوں سے ممتاز ہوجاتے ہیں، اس لیے ان کو اپنے جیسا بشر سمجھ کر ان کی بات کو ٹھکرانا، یا ان کی بات کی اہمیت گرانا یہ حماقت ہے، ان میں امتیاز یہ آگیا کہ اللہ کی طرف سے ان کے پاس وحی آتی ہے، تو جیسے پہلے انبیاء علیہم السلام تھے ویسے یہ ہیں، ہم نے پہلے بھی ہمیشہ رجل ہی بھیجے، مرد ہی بھیجے، انسان ہی بھیجے، بنی آدم میں سے بھیجے۔ ''نہیں بھیجے ہم نے آپ سے قبل مگر آدمی، وحی کرتے تھے ہم ان کی طرف۔''

مسئلہ بشریت اہلِ کتاب سے پوچھ لو

''اور پوچھ لو اہلِ ذکر سے اگر تمہیں پتا نہیں۔'' اہلِ ذکر سے مراد اہلِ علم ہیں، اور یہاں اہلِ علم کا مصداق اہلِ کتاب ہیں،

چونکہ پیچھے مسئلہ بشریت کا ہے، کہ انبیاء علیہم السلام بشر ہوتے ہیں یا نہیں، یہ مسئلہ ایسا ہے جس کے اُوپر اہلِ کتاب کو بھی اتفاق تھا اور اس کا وہ انکار نہیں کر سکتے تھے، اور یہ بات تواتر کے ساتھ ثابت تھی کہ انبیاء علیہم السلام بشر ہوتے ہیں، اور جب کوئی بات متواتر ہو جائے تو وہاں راوی کی عدالت یا اس کا کُفر و ایمان بھی زیرِ بحث نہیں آیا کرتا، جب کوئی روایت تواتر کے درجے میں پہنچ جائے تو پھر راویوں کی صفات نہیں دیکھی جایا کرتیں کہ یہ کافر ہیں یا مؤمن ہیں، عادل ہیں یا نہیں، اس لیے اہلِ کتاب باوجودیکہ اس وقت کافر ہو چکے تھے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کرنے کی وجہ سے، لیکن یہ مسئلہ چونکہ متواتر تھا، ان کی کتابوں میں مذکور تھا، اس لیے کہا کہ اگر تمہیں ہم پر اعتبار نہیں تو جو تمہارے یار دوست ہیں، جن پر تم اعتبار کرتے ہو، جن کے ساتھ مل کے تم اسلام کے خلاف سازشیں کرتے ہو، یہ مسئلہ ان سے پوچھ لو، اس کا وہ بھی انکار نہیں کر سکتے، ان سے پوچھو تو وہ بھی کہیں گے کہ ہاں! انبیاء علیہم السلام بشر ہی ہوتے ہیں۔ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔

''تقلید'' کی دلیل

تو یہاں تو اس آیت کا موقع محل یہی ہے کہ مسئلۂ بشریت اہلِ کتاب سے پوچھ لو۔ اور ویسے چونکہ الفاظ کا عموم مراد ہوا کرتا ہے تو اس سے یہ بات بھی نکل آئی کہ جو لوگ خود علم نہ رکھتے ہوں انہیں چاہیے کہ اہلِ علم سے پوچھ پوچھ کے کام کریں، چنانچہ تقلید کے وجوب کے لئے ہمیشہ حضرات اسی آیت سے استدلال کیا کرتے ہیں فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ، کہ جو لوگ علم نہیں رکھتے ان کے لئے ضروری ہے کہ جو مسئلہ بھی پیش آ جائے وہ اہلِ علم سے پوچھ کے کریں۔ [1]

انبیاء علیہم السلام کھانا بھی کھاتے تھے اور ان پر موت بھی آئی

تو انبیاء علیہم السلام بشر تھے، رجل تھے، ہم نے ان کو ایسا نہیں بنایا تھا کہ ان کو کھانے کی ضرورت نہ ہوتی۔ جیسے مشرکینِ مکہ اِعتراض کرتے تھے مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ (سورۂ فرقان: ۷) اس رسول کو کیا ہو گیا یہ تو کھانا کھاتا ہے، اللہ کا رسول ہوتا تو اس کو کھانے کی کیا ضرورت تھی، وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ، یہ تو بازاروں میں چلتا پھرتا ہے، تو وہاں سورۂ فرقان میں بھی اللہ تعالیٰ نے آگے جا کر یہی جواب دیا کہ پہلے جتنے رسول آئے تھے، لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ وہ کھانا بھی کھاتے تھے، بازاروں میں بھی چلتے پھرتے تھے، تو یہ سارے کے سارے اعتراض تبھی ہوتے تھے کہ وہ سمجھتے تھے کہ اللہ کا رسول بشر نہیں ہونا چاہیے، فرشتہ ہونا چاہیے، اس لیے نہ اس کو کھانے کی ضرورت پیش آئے، نہ اس کو اپنی معاشی ضروریات کے لیے چلنے پھرنے کی ضرورت ہو۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے انہیں پہلے رسولوں کو ایسے بدن نہیں دیے، ان کے ایسے بدن نہیں بنائے جو کھانا نہ کھاتے ہوں، اور نہ ہی وہ ہمیشہ رہنے والے تھے، جس طرح سے انسانوں کو وقت پہ موت آتی ہے موت انبیاء علیہم السلام کو بھی آئی، تو انبیاء علیہم السلام کو موت آئی تو

---

(۱) المدخل الی السنن الکبریٰ للبیہقی ص ۲۱۲۔ الفقیہ والمتفقہ للبغدادی ۲/ ۱۳۲۔ جامع بیان العلم لابن عبد البر ۲/ ۹۸۹۔ شرح السنۃ للبغوی ۱/ ۲۹۰۔ تفسیر قرطبی وغیرہ۔ نیز دیکھیں: ''معیار الحق'' لنذیر حسین الدہلوی ص ۷۴۔ الحدیث حجۃ بنفسہ للألبانی ص ۸۵۔

اسی طرح سے سرورِ کائنات ﷺ بھی وقت پہ فوت ہو جائیں گے، جس طرح سے وہ کفار انتظار کرتے تھے کہ ایک دن مر جائے گا، قصہ ختم ہو جائے گا، تو فرمایا کہ مرنے کی کون سی بات ہے، مرتے تو پہلے انبیاء علیہم السلام بھی رہے ہیں، تو موت کا ورود انبیاء علیہم السلام پہ ہوتا ہے۔

عقیدۂ حیاتِ انبیاء علیہم السلام

باقی مرنے کے بعد کیا کیفیت ہوتی ہے؟ وہ عام انسانوں کی طرح ہوتے ہیں یا ان کو خاص قسم کی حیات حاصل ہے؟ وہ مسئلہ علیحدہ ہے، باقی جہاں تک موت کے وارد ہونے کی بات ہے اس میں کوئی کسی قسم کا اختلاف نہیں، مَاتَ الْاَنْبِیَاءُ کہہ سکتے ہیں، کہ انبیاء علیہم السلام مر گئے، ان کو موت آ گئی، تو موت انبیاء کو آتی ہے، اسی طرح سے ''مات النبی ﷺ'' بھی کہہ سکتے ہیں، حضور ﷺ پر بھی موت آئی، موت کے ورود پر کسی قسم کا اختلاف نہیں، موت آتی ہے، لیکن آگے یہ بحث کہ موت کے آنے کے بعد پھر کیفیت کیا ہوتی ہے کہ عام انسانوں کی طرح ہوتے ہیں یا ان کو کوئی خاص قسم کی حیات حاصل ہے، تو اہلِ سُنّت والجماعت کا عقیدہ، خصوصیت سے ہمارے اکابر کا عقیدہ یہی ہے کہ مرنے کے بعد انبیاء علیہم السلام کو خاص حیات حاصل ہے جس کی وجہ سے ''النبیُّ حیٌّ'' کہا جا سکتا ہے، کہ نبی زندہ ہے، جس طرح سے شہداء کے بارے میں قرآن میں آیا ہے: وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ (سورۂ بقرہ: ۱۵۴) کہ ان کو اموات نہ کہو بلکہ یہ تو زندہ ہیں، یہاں تو اموات کہنے کی ممانعت ہے، اور دوسری جگہ ہے: وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا (سورۂ آل عمران: ۱۶۹) جو اللہ کے راستے میں قتل کیے گئے انہیں اموات سمجھو بھی نہیں، بَلْ اَحْيَاۗءٌ بلکہ وہ تو زندہ ہیں۔ تو جس طرح سے شہداء کو خاص حیات حاصل ہوتی ہے جس کی بنا پر ان کو زندہ کہا جاتا ہے، انبیاء علیہم السلام کو بھی اسی طرح سے حیات حاصل ہوتی ہے بلکہ شہداء سے بھی اعلیٰ اور برتر، اس لیے حدیث شریف میں آتا ہے: ''اَلْاَنْبِيَاءُ اَحْيَاءٌ فِيْ قُبُوْرِهِمْ يُصَلُّوْنَ''[1] انبیاء زندہ ہیں اور اپنی قبروں میں نماز پڑھتے ہیں۔ ''فَنَبِيُّ اللّٰهِ حَيٌّ يُرْزَقُ''[2] اللہ کا نبی زندہ ہوتا ہے اور اس کو برزخ میں رزق ملتا ہے۔ تو موت کے ورود میں اختلاف نہیں، یہ ''حیاتِ انبیاء'' کا لفظ جو بولا جاتا ہے تو وہ ہے بعد الموت، کہ مرنے کے بعد ان کی کیفیت عام لوگوں کی طرح ہوتی ہے یا ان کو خاص قسم کی حیات حاصل ہے، تو اہلِ سُنّت والجماعت کے نزدیک، خصوصیت سے ہمارے علماء اور اکابر کے نزدیک انبیاء علیہم السلام کو اتنی حیات حاصل ہے کہ ان کو بالکل زندہ کہا جا سکتا ہے، ان کے بدن پر بھی حیات کے آثار ہیں، اور اسی طرح سے ان کو پوری طرح سے شعور حاصل ہے، عام اموات کی طرح ان کو نہیں قرار دیا جا سکتا، لیکن موت کے ورود میں کوئی اختلاف نہیں، ''مات النبی'' کہہ سکتے ہیں، اس لیے بسا اوقات یہ (منکرینِ حیات) لوگ بحث کرتے ہوئے اس قسم کی آیتیں اور حدیثیں پڑھنی شروع کر دیتے ہیں جن میں موت کا لفظ آیا ہوا ہوتا ہے، تو اس میں تو کوئی جھگڑا ہی نہیں۔ مثلاً: اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ (پارہ ۲۳ کا آخر) کہتے ہیں دیکھو! نبی میت ہے، یہاں ''میت'' کا لفظ بولا گیا ہے، تو

(۱) مسند ابی یعلی، ۶/ ۱۴۷، رقم الحدیث ۳۴۲۵، ثابت بنانی عن انس۔

(۲) سنن ابن ماجہ ص ۱۱۸، باب ذکر وفاته ﷺ ودفنه۔ مشکوٰۃ ۱/ ۱۲۱، باب الجمعة، فصل ثالث، عن ابی الدرداء۔

یہ آیت ہمارے خلاف نہیں، ''مات'' کہہ سکتے ہیں، ''میّت'' کہہ سکتے ہیں، اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ اختلاف اس بارے میں ہے کہ موت کے ورود کے بعد پھر کیا کیفیت ہے؟ عام اموات کی طرح ہیں یا ان کو خصوصی حیات حاصل ہے، ہمارے نزدیک انبیاء ﷺ کو خصوصی حیات حاصل ہے، اور شہداء سے بھی زیادہ۔ تو جس طرح سے شہداء کے بارے میں ممانعت ہے کہ ان کو اَموات نہ کہو، یعنی باقی اَموات کی طرح، ان کو اَموات نہ سمجھو، بلکہ یہ زندہ ہیں، اسی طرح سے روایات کے اندر انبیاء ﷺ کے لیے بھی یہی عنوان آیا ہے: ''نَبِيُّ اللهِ حَيٌّ يُرْزَقُ... اَلْاَنْبِيَاءُ اَحْيَاءٌ فِي قُبُوْرِهِمْ يُصَلُّوْنَ'' روایات کے اندر یہ الفاظ آتے ہیں۔

''نبی'' عام بشر کی طرح نہیں ہوتا

وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ: یہ ہمیشہ رہنے والے نہیں تھے۔ انسان ہی تھے، فرق یہی تھا کہ نُوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ ہم ان کی طرف وحی کرتے تھے، اس وحی نے آ کر ان کو عام انسانوں سے ممتاز کر دیا کہ ان کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ربط ہوتا ہے، ان کے اوپر علوم براہِ راست آتے ہیں، اس لیے ان کو اس اعتبار سے عام انسانوں سے بہت ممتاز کر دیا گیا۔ تو ہم جو کہتے ہیں کہ ہم جیسے بشر ہیں، اور حضور ﷺ نے خود فرمایا، قرآنِ کریم نے اعلان کروایا: قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (سورۂ کہف: ۱۱۰، سورۂ حم سجدہ: ۶) تو یہ مثلیت صرف انسان ہونے میں ہے، بنی آدم ہونے میں ہے، بشر ہونے میں ہے، غیرِ خدا ہونے میں ہے، باقی! جہاں تک علوم کی بات ہے، فضیلت کی بات ہے، مرتبے کی بات ہے دُنیا اور آخرت میں، تو انبیاء ﷺ کی ہوا کو بھی کوئی شخص نہیں پہنچ سکتا، وہ ایک بات علیحدہ ہے، تو مثلیت ان باتوں میں ہے، تو جب اللہ کی طرف سے ان کے پاس وحی آ گئی تو یہ عام انسانوں سے بہت ممتاز ہو گئے۔

''نبی'' پر ایمان لانے والوں کا اور منکروں کا اَنجام

ثُمَّ صَدَقْنٰهُمُ الْوَعْدَ: پھر ہم نے ان سے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا۔ وعدہ ان سے یہ تھا کہ جو تمہیں نہیں مانیں گے وہ گرفت میں آ جائیں گے، تو وعدہ سچا ہوا، ہم نے ان انبیاء ﷺ کو بھی نجات دی اور ان کے ساتھ جو لوگ دوسرے تھے ان کو بھی نجات دی، وَاَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِيْنَ: جو حد سے بڑھنے والے لوگ تھے ان کو ہم نے ہلاک کر دیا۔ یہ اجمالی طور پر ذکر آ گیا انبیاء ﷺ کی نجات کا اور دوسرے ماننے والوں کی نجات کا، واقعات کے اندر تفصیل موجود ہے کہ دیکھو! فلاں نبی کی مخالفت کرنے والے یوں برباد ہوئے، نبی کے ماننے والے یوں نجات پا گئے، واقعات قرآنِ کریم میں متعدد جگہ آتے ہیں ان میں اس کی تفصیل آ جائے گی۔

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا: البتہ تحقیق ہم نے تمہاری طرف یہ کتاب اُتاری۔ اس سے اہلِ مکہ مراد ہیں۔ ''جس میں تمہارا شرف ہے، جس میں تمہارے لیے نصیحت ہے، جس میں تمہاری شہرت ہے'' اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ: کیا تم سوچتے نہیں ہو؟

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّاَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ⑪ فَلَمَّآ

کتنی بستیاں جو کہ ظالم تھیں ہم نے نیست ونابود کردیں، اور اُٹھایا ہم نے ان بستیوں کے بعد اور لوگوں کو ⑪ جب ان لوگوں

اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ ⑫ لَا تَرْكُضُوْا وَارْجِعُوْٓا اِلٰى مَآ

نے ہمارے عذاب کو محسوس کیا اچانک وہ لوگ ان بستیوں سے بھاگنے لگے ⑫ مت بھاگو، لوٹو اسی سازوسامان کی طرف

اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَمَسٰكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ ⑬ قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا

جس میں تم خوش حالی دیے گئے تھے، اور لوٹو اپنی حویلیوں کی طرف، شاید کہ تم سے پوچھا جائے ⑬ وہ کہنے لگے: ہائے ہماری خرابی! بے شک ہم

ظٰلِمِيْنَ ⑭ فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ ⑮ وَمَا

ہی قصور وار تھے ⑭ پس ہمیشہ رہی ان کی یہی چیخ وپکار حتیٰ کہ ہم نے ان کو کردیا کٹے ہوئے بجھے ہوئے ⑮ نہیں

خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ⑯ لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ

پیدا کیا ہم نے آسمان کو اور زمین کو اور ان چیزوں کو جو ان دونوں کے درمیان میں ہیں کھیلتے ہوئے ⑯ اگر ہم ارادہ کرتے کہ

نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ ۖ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ⑰ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ

اختیار کریں کوئی کھیل تو ہم اختیار کرلیتے اس کھیل کو اپنے پاس سے ہی اگر ہم کرنے والے ہوتے ⑰ بلکہ پھینکتے ہیں ہم حق کو

عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ۭ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا

باطل پر پس حق باطل کا بھیجا نکال دیتا ہے پس اچانک وہ باطل جانے والا ہوتا ہے، تمہارے لئے خرابی ہے ان باتوں کی وجہ سے

تَصِفُوْنَ ⑱ وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ

جو تم بیان کرتے ہو ⑱ اور اسی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے، اور جو لوگ اللہ کے مقرب ہیں نہیں تکبر کرتے وہ

عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ ⑲ۚ يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ ⑳ اَمِ اتَّخَذُوْٓا

اللہ کی عبادت سے اور نہ وہ تھکتے ہیں ⑲ تسبیح پڑھتے ہیں رات دن، سستی نہیں کرتے ⑳ کیا ان لوگوں نے اختیار کیا

اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ ㉑ لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ

ایسے معبودوں کو زمین سے جو بے جان چیزوں میں جان ڈالتے ہوں؟ ㉑ اگر زمین وآسمان میں آلہہ ہوتے اللہ کے علاوہ تو

لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۲۲﴾ لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ

تو یہ دونوں خراب ہو جاتے، پس پاک ہے اللہ، عرش کا رب ان باتوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں ﴿۲۲﴾ نہیں پوچھا جاتا وہ اس کام کے متعلق جو وہ کرتا ہے

وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ ﴿۲۳﴾ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ ۚ هٰذَا

اور وہ سب پوچھے جائیں گے ﴿۲۳﴾ کیا ان لوگوں نے اللہ کے علاوہ آلہہ اختیار کئے؟ آپ کہہ دیجئے کہ تم اپنی برہان لاؤ، یہ

ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ الْحَقَّ فَهُمْ

ذکر ہے ان لوگوں کا جو میرے ساتھ ہیں اور ذکر ہے ان لوگوں کا جو مجھ سے پہلے ہیں بلکہ ان میں سے اکثر حق کو جانتے نہیں پس وہ

مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۴﴾ وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْۤ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ

اعراض کرنے والے ہیں ﴿۲۴﴾ نہیں بھیجا ہم نے آپ سے قبل کوئی رسول مگر ہم اس کی طرف وحی کرتے تھے کہ میرے بغیر کوئی

اِلَّاۤ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴿۲۵﴾ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ عِبَادٌ

معبود نہیں پس تم میری ہی عبادت کرو ﴿۲۵﴾ اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ رحمٰن نے اولاد اختیار کی ہے، وہ رحمٰن پاک ہے، بلکہ وہ باعزت

مُّكْرَمُوْنَ ۙ﴿۲۶﴾ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۷﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ

بندے ہیں ﴿۲۶﴾ نہیں سبقت لے جاتے وہ اللہ پر بات کے ساتھ اور وہ اللہ کے حکم کے مطابق عمل کرتے ہیں ﴿۲۷﴾ جانتا ہے اللہ ان سب حالات کو جو

اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ

ان کے سامنے ہیں اور جو ان کے پیچھے ہیں اور وہ سفارش نہیں کریں گے مگر اسی شخص کے لئے جس کے متعلق اللہ کی رضا ہوگی اور وہ

مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ﴿۲۸﴾ وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْۤ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ

اللہ کی ہیبت سے ڈرنے والے ہیں ﴿۲۸﴾ اور جو کوئی کہہ دے ان میں سے کہ میں الٰہ ہوں اللہ کے علاوہ پس یہی شخص ہے

نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۹﴾

کہ جس کو بدلہ ہم جہنم دیں گے اور اسی طرح سے ہم ظالموں کو بدلہ دیا کرتے ہیں ﴿۲۹﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ: مِنْ قَرْيَةٍ یہ کَمْ کی تمیز ہے۔ قَصَمَ يَقْصِمُ: پیس ڈالنا، نیست و نابود

کر دینا، توڑ پھوڑ دینا۔ کتنی ہی بستیوں کو ہم نے نیست و نابود کر دیا۔ مِنْ قَرْيَةٍ تو یہ کم کے ساتھ جڑ گیا۔ کَانَتْ ظَالِمَةً: یہ قریۃ کی صفت ہے۔ ایسی بستی جو کہ ظالمہ تھی، یعنی اس کے رہنے والے ظلم کا ارتکاب کرنے والے تھے۔ اور ظلم کا اعلیٰ فرد شرک ہے اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (سورۂ لقمان: ۱۳)۔ کتنی ہی بستیاں جو کہ ظالم تھیں ہم نے پیس ڈالیں، ہم نے نیست و نابود کر دیں۔ وَّ اَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ: اور اُٹھایا ہم نے ان بستیوں کے بعد اور لوگوں کو، ان بستیوں کو تباہ کرنے کے بعد ہم نے اور لوگوں کو اٹھا کھڑا کیا۔ فَلَمَّاۤ اَحَسُّوْا بَاْسَنَاۤ: اَحَسُّوْا یہ اہلِ قریہ کی طرف ضمیر لوٹ رہی ہے جن کے ہلاک کرنے کا ذکر آیا، جب اُن لوگوں نے ہمارے عذاب کو محسوس کیا، ہمارے عذاب کی آہٹ پائی، اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ: اچانک وہ لوگ ان بستیوں سے بھاگنے لگے۔ رَكْض تو رَكْض اصل میں ایڑی مارنے کو کہتے ہیں۔ رکض دابہ: گھوڑے پر جب آدمی بیٹھا ہوتا ہے تو گھوڑے کو بھگانے کے لئے ایڑ ہی لگایا کرتا ہے، تو یہاں وہی دوڑنے بھاگنے کے معنی میں ہے۔ اچانک وہ لوگ ان بستیوں سے بھاگنے لگے۔ لَا تَرْكُضُوْا: اس سے پہلے قِيْلَ لَهُمْ محذوف ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو کہا گیا تکوینی طور پر کہ مت بھاگو، جس طرح سے ہماری زبان میں ایسے موقع پر کہتے ہیں کہ اب کہاں بھاگے جا رہے ہو؟ کدھر دوڑے جا رہے ہو؟ مت بھاگو۔ وَارْجِعُوْۤا اِلٰى مَاۤ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ: لوٹو اسی ساز و سامان کی طرف جس میں تم خوش حالی دیے گئے تھے، مَاۤ سے مراد ساز و سامان ہے، لوٹو اس چیز کی طرف جس میں تم خوش حالی دیے گئے تھے۔ وَمَسٰكِنِكُمْ: اور لوٹو اپنی حویلیوں کی طرف، اپنے ایوانوں کی طرف، اپنے مکانوں کی طرف، لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ: شاید کہ تم سے پوچھا جائے، یا تاکہ تم سے سوال کیا جائے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ تاکہ تمہاری مزاج پرسی کی جائے، کہ سنائیے بھیا! کیا حال ہے؟ یا مطلب یہ ہے کہ وہیں چل کے بیٹھو، جس طرح سے لوگ اپنی ضروریات کے لئے تمہارے پاس آیا کرتے تھے، اسی طرح ٹھاٹھ باٹھ کے ساتھ بیٹھو، تاکہ لوگ تمہارے پاس سوال کرنے کے لیے آئیں۔ یہ ان کے ساتھ استہزا اور تہکم ہے، کہ اب کہاں بھاگے جا رہے ہو، چلو، وہیں چل کے بیٹھو، لوگ تم سے پوچھے پاچھنے کے لئے آئیں گے، حال چال پوچھنے کے لیے آئیں گے جس طرح سے پہلے آتے تھے۔ قَالُوْا: وہ کہنے لگے، يٰوَيْلَنَاۤ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ: ہائے ہماری خرابی! بے شک ہم ہی قصور وار تھے، فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ: پس ہمیشہ رہی ان کی یہی چیخ و پکار، حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ: حتّٰی کہ بنا دیا ہم نے ان کو، حصید: کٹی ہوئی کھیتی، خٰمِدِيْنَ یہ لفظ خمود سے لیا گیا ہے، آگ کا بجھنا۔ خامدین: بجھنے والے، حَصِيْدًا: کٹے ہوئے۔ ہم نے ان کو ایسے کر دیا جس طرح سے کہ کٹی ہوئی کھیتی ہوتی ہے اور جس طرح سے بجھی ہوئی آگ ہوتی ہے، یعنی جیسے کوئی چیز جل کے راکھ ہو جائے آگ بجھ جائے مطلب ہے کہ اس کا کوئی نام و نشان نہیں رہتا، اور اسی طرح سے کھیتی لہلہاتی ہوئی کاٹ ڈالی جائے تو کاٹنے کے بعد وہ ذرات ہو جاتی ہے، منتشر ہو جاتی ہے، ہم نے ان کو اسی طرح سے ہی کر دیا جیسے کٹی ہوئی کھیتی ہوتی ہے اور بجھی ہوئی آگ ہوتی ہے۔ یہ اس کا مفہوم ہو گیا۔ خامدین کے معنی بجھنے والے، حَصِيْدًا کے معنی کٹے ہوئے، ''ہم نے ان کو کر دیا کٹے ہوئے بجھے ہوئے'' وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ: نہیں پیدا کیا ہم نے آسمان کو اور زمین کو اور ان چیزوں کو جو ان دونوں کے درمیان میں ہیں کھیلتے ہوئے۔ لٰعِبِيْنَ یہ خَلَقْنَا کی ضمیر سے حال ہے۔ ہم نے لہو و لعب کرتے ہوئے ان کو نہیں پیدا کیا۔ لَوْ اَرَدْنَاۤ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا: اگر ہم ارادہ کرتے

کہ اختیار کریں کوئی کھیل، لہو: یہ وہی لہوولعب کا لفظ جیسے آیا کرتا ہے۔ اگر ہم ارادہ کرتے کہ اختیار کرتے کوئی کھیل، لَاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ: تو ہم اختیار کر لیتے اس کھیل کو اپنے پاس سے ہی، اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ: اگر ہم کرنے والے ہوتے، بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ: بلکہ پھینکتے ہیں ہم حق کو باطل پر، فَيَدْمَغُهٗ: پس وہ حق اس باطل کا بھیجا نکال دیتا ہے، اس کا دماغ کوٹ دیتا ہے۔ دَمَغ کا معنی ہوتا ہے کسی چیز کے دماغ پہ مارنا، کسی چیز کا سر پھوڑ دینا۔ وہ حق اس باطل کا بھیجا نکال دیتا ہے، اس کا دماغ پھوڑ دیتا ہے، مراد اس سے ہے مطلقاً فنا کر دیتا ہے، فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ: پس اچانک وہ باطل جانے والا ہوتا ہے۔ زاھق کا لفظ پہلے سورۂ اسراء میں بھی آیا تھا قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ (آیت: ۸۱)۔ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ: تمہارے لیے خرابی ہے ان باتوں کی وجہ سے جو تم بیان کرتے ہو۔ وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: اور اسی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے۔ وَمَنْ عِنْدَهٗ: اور جو لوگ اللہ کے پاس ہیں یا اللہ کے مقرب ہیں، اس سے فرشتے مراد ہیں، لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ: نہیں تکبر کرتے وہ اس اللہ کی عبادت سے، وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ: نہ وہ تھکتے ہیں، اللہ کی عبادت کرتے ہوئے تھکتے نہیں، يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ: دن رات اللہ کی تسبیح بیان کرتے ہیں، تسبیح پڑھتے ہیں رات دن، یعنی ہر وقت۔ لَا يَفْتُرُوْنَ: سستی نہیں کرتے، ان کے اوپر کوئی سستی طاری نہیں ہوتی، اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً: کیا ان لوگوں نے اختیار کیا معبودوں کو، مِّنَ الْاَرْضِ: زمین سے، هُمْ يُنْشِرُوْنَ، یہ لفظ اِنشار سے لیا گیا ہے، اِنشار کا معنی ہوتا ہے کسی بے جان چیز کو جان ڈال کر اٹھا دینا، اس اعتبار سے اس کا معنی یوں بھی کیا گیا ہے کہ وہ بے جان چیزوں میں جان ڈالتے ہوں؟ ''کیا اختیار کیے انہوں نے زمین سے آلہہ جو بے جان چیزوں میں جان ڈالتے ہوں؟'' مُردوں کو زندہ کر کے کھڑا کر دیتے ہوں، یا اللہ تعالیٰ انہیں مارے تو وہ ان کو دوبارہ زندہ کر دیں؟ اور ''انشار'' کا لفظ ارض کے لئے بھی بولا جاتا ہے، زمین کے ساتھ بھی اس کا استعمال ہوتا ہے، سورۂ زخرف میں ہے: وَالَّذِيْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ ۚ فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا (آیت: ۱۱) وہاں اس کا معنی یہی ہے کہ ہم نے اس پانی کے ذریعے سے بنجر علاقے کو آباد کر دیا، شاداب کر دیا، کیونکہ احیائے ارض، زمین کو زندہ کرنا بَعْدَ مَوْتِهَا، یہ لفظ قرآنِ کریم میں استعمال کیے گئے ہیں، زمین کے مرنے کے بعد زمین کو زندہ کرنا، موت وحیات کا لفظ زمین کے متعلق بھی استعمال کیا گیا ہے، اور زمین کی موت یہ ہوتی ہے کہ وہ بنجر ہو جائے اس میں کوئی نباتات نہ اُگے، اور اس کی زندگی یہ ہوتی ہے کہ وہ سرسبز وشاداب ہو جائے، احیائے ارض کا یہ معنی ہے، يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا (سورۂ روم: ۱۹) قرآنِ کریم میں بہت جگہ یہ لفظ آیا ہے،[1] زندہ کرتا ہے زمین کو اس کی موت کے بعد، یعنی آباد کرتا ہے اس کے بنجر اور ویران ہو جانے کے بعد۔ تو یہاں چونکہ پیچھے ارض کا ذکر آیا ہے تو اس کا معنی یوں کر سکتے ہیں، ''کیا اختیار کیے انہوں نے معبود زمین سے، وہ معبود اس زمین کو سرسبز وشاداب کرتے ہوں؟ اس زمین کو آباد کرتے ہوں، سرسبز وشاداب کرتے ہوں؟ ان کے اختیار میں ہو زمین سے نباتات کا اُگانا، بنجر زمین کو آباد کرنا ان کے اختیار میں ہو، لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ: فِيْهِمَآ کی ضمیر زمین وآسمان کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اگر زمین وآسمان میں آلہہ ہوتے اللہ کے علاوہ، اللہ کے سوا اگر آلہہ ہوتے، لَفَسَدَتَا: تو یہ زمین وآسمان دونوں خراب ہو جاتے، ان میں فساد برپا ہو جاتا۔ لَوْ کے متعلق آپ ''نحو'' میں

(۱) اس قسم کی آیات دیکھیں: بقرہ: ۱۶۴، نحل: ۶۵، عنکبوت: ۶۳، روم: ۲۴، روم: ۵۰، فاطر: ۹، جاثیہ: ۵، حدید: ۱۷۔

پڑھتے رہتے ہیں کہ اس میں انتفاءِ ثانی دلیل بنا کرتا ہے انتفاءِ اوّل کے لئے۔ یہاں دوسرا جزء ہے لَفَسَدَتَا، اور ہم زمین وآسمان کو دیکھتے ہیں کہ یہ صحیح نظم کے ساتھ چل رہے ہیں، ان میں کوئی فساد نہیں، یہ دلیل ہے اس بات کی کہ اللہ کے علاوہ اور آلہہ نہیں تو اس میں انتفاء ثانی کے ساتھ انتفاء اوّل کے اوپر استدلال لایا جاتا ہے،''اگر ہوتے ان میں آلہہ اللہ کے سوا تو یہ زمین وآسمان فاسد ہوجاتے، پس پاک ہے اللہ عرش کا رَبّ ان باتوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں'' لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ: نہیں پوچھا جاتا وہ اس چیز کے متعلق جو وہ کرتا ہے، جو کچھ وہ کرے وہ پوچھا نہیں جاتا، اس سے کوئی پوچھنے والا نہیں، وہ غیر مسئول ہے،''نہیں پوچھا جاتا اس کام کے متعلق جو وہ کرتا ہے'' وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ: اور اس کے علاوہ جتنے بھی ہیں سب پوچھے جائیں گے، سب مسئول ہیں، اللہ تعالیٰ سب سے پوچھے گا کہ تم نے یہ کام کیوں کیا، ایسا کیوں نہیں کیا؟ هُمْ يُسْـَٔلُوْنَ: وہ سب پوچھے جائیں گے، ان سے سوال کیا جائے گا۔ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً: کیا ان لوگوں نے اللہ کے علاوہ آلہہ اختیار کیے؟ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ: آپ کہہ دیجئے کہ تم اپنی بُرہان لاؤ، بُرھان دلیل کو کہتے ہیں، سند لاؤ۔ هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ: یہ ذکر ہے ان لوگوں کا جو میرے ساتھ ہیں، اور ذکر ہے ان لوگوں کا جو مجھ سے پہلے ہیں۔ یہ بات ہے ان کی جو میرے ساتھ ہیں، یہ کتاب ہے ان کی جو میرے ساتھ ہیں اور ان لوگوں کی جو مجھ سے پہلے ہیں، مطلب یہ ہے کہ یہ قرآنِ کریم اور پہلے لوگوں پر اُتری ہوئی کتابیں، توراۃ، اِنجیل، زَبور، وہ ساری کی ساری موجود ہیں، ان کو دیکھ لو، کیا کسی کے اندر کوئی نقلی دلیل موجود ہے کہ اللہ کے علاوہ کوئی اور آلہہ بھی ہیں، توراۃ، اِنجیل، زَبور اگرچہ ان میں کتنی ہی تحریف ہوگئی لیکن آج بھی وہ کتابیں توحید کے مضمون پر ہی مشتمل ہیں، باوجود محرف ہوجانے کے شرک کی تعلیم کسی کتاب میں نہیں، تو یہ نقلی دلیل کی طرف اشارہ ہے کہ ہماری تو دلیل یہ لے لیجئے۔ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ: بلکہ ان میں سے اکثر علم نہیں رکھتے، یعنی یہ جو شرک کا قول کرتے ہیں ان کے پاس کوئی دلیل وغیرہ نہیں، بلکہ اکثر ان میں سے بے علم ہیں۔ لَا يَعْلَمُوْنَ الْحَقَّ: وہ حق کو جانتے نہیں، فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ: پس وہ اعراض کرنے والے ہیں، منہ موڑنے والے ہیں۔ وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ: نہیں بھیجا ہم نے آپ سے قبل کوئی رسول اِلَّا نُوْحِيْۤ اِلَيْهِ: مگر ہم اس کی طرف وحی کرتے تھے اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا: کہ میرے بغیر کوئی معبود نہیں، فَاعْبُدُوْنِ: فاعبدونی پس تم میری ہی عبادت کرو۔ ن کے نیچے جو کسرہ ہے وہ یائے متکلم پر دال ہے۔ وَقَالُوا: اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا: رحمٰن نے اولاد اختیار کی ہے۔ سُبْحٰنَهٗ: وہ رحمٰن پاک ہے اس عیب سے کہ اولاد اختیار کرے۔ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ: وہ اولاد کا قول کرتے تھے فرشتوں کے متعلق کہ فرشتے اللہ کی اولاد ہیں، تو عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ انہی فرشتوں کو کہا جارہا ہے کہ وہ اولاد نہیں بل هُمْ عباد مکرمون بلکہ وہ باعزت بندے ہیں، عباد عبد کی جمع ہے، صاحبِ کرامت بندے ہیں، یعنی ایسے بندے ہیں جن کو اللہ کے ہاں عزت دی گئی ہے، لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ: نہیں سبقت لے جاتے وہ اللہ پر بات کے ساتھ یعنی اللہ کے سامنے بڑھ کے بات نہیں کرسکتے، وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ: اور وہ اللہ کے حکم کے مطابق ہی عمل کرتے ہیں۔ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ: جانتا ہے اللہ ان سب حالات کو جو ان کے سامنے ہیں وَمَا خَلْفَهُمْ: اور جو ان کے پیچھے ہیں، وَلَا يَشْفَعُوْنَ: اور وہ سفارش نہیں کریں گے، شفاعت نہیں کریں گے، اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى: مگر اسی شخص کے متعلق جس کے متعلق اللہ کی رضا ہو، مگر جس کو اللہ پسند کرے، جس سے اللہ راضی ہو، وَهُمْ مِّنْ

خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ: اور وہ اللہ کی ہیبت سے ڈرنے والے ہیں ۞ وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْٓ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ: اور جو کوئی کہہ دے اُن میں سے کہ میں الٰہ ہوں اللہ کے علاوہ، ان فرشتوں میں سے اگر کوئی ایسی بات کہہ دے، اگر کوئی کہہ دے ان میں سے کہ میں الٰہ ہوں اللہ کے علاوہ، فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ: پس یہی شخص ہے کہ جس کو بدلہ ہم جہنم دیں گے، كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ: اور اسی طرح سے ہم ظالموں کو بدلہ دیا کرتے ہیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط

اس رکوع کی پہلی آیات حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ تک، اس میں تو پہلی تاریخ کا حوالہ دے کے اللہ تعالیٰ نے دنیوی عذاب سے وعید کی ہے، جیسے کہ پچھلے رکوع میں بھی ذکر آیا تھا مَآ اٰمَنَتْ قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا، اُس میں بیان تھا کہ بعض بستیاں ہیں جن کو ہم نے ہلاک کیا، اور باوجود آیاتِ بینات ان کے سامنے آنے کے وہ مانے نہیں، ان کے منہ مانگے معجزے دکھائے گئے تو بھی نہیں مانے، اسی کی کچھ تفصیل کی طرف یہ اشارہ کردیا۔ اور ایسے ہی اُس رکوع کے آخر میں لفظ آئے تھے اَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِيْنَ ہم نے مسرفین کو ہلاک کیا، یہ دنیوی عذاب ذکر کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ترہیب ہے، اُسی کی کچھ وضاحت ان آیات میں ہے۔

عذاب کے وقت مشرکین بھاگنے لگے تو انہیں کیا کہا گیا؟

کہ کئی ساری بستیاں جو کہ ظالمہ تھیں، اللہ کا حق پہچاننے والی نہیں تھیں، اور ظلم کا اعلیٰ مصداق شرک ہے، یعنی مشرکہ تھیں، ہم نے ان کو توڑ پھوڑ دیا، پیس ڈالا، اور ان کے پیسنے کے ساتھ، ہلاک کرنے کے ساتھ ہمارا کوئی نقصان نہ ہوا، نہ ہماری زمین بے آباد ہوئی، زمین پر کوئی بے رونقی نہیں ہوئی، ہم نے ان کے بعد اور لوگوں کو اٹھا دیا، ان کے ہلاک کرنے کے بعد ہماری زمین میں کوئی بے رونقی نہیں ہوگئی بلکہ اس کے بعد ہم نے اور لوگوں کو اٹھا دیا، اور لوگ پیدا کردیے، زمین ویسی کی ویسی آباد رہی۔ اور جن کو ہم نے پیسا اور ریزہ ریزہ کیا، ان کا حال یہ تھا کہ بڑے بڑے ایوانوں والے تھے، بڑے بڑے محلات والے تھے، مجلسیں لگاتے، لوگ ان کے پاس ان کی مزاج پرسی کے لئے آتے، حال چال پوچھنے کے لیے آتے، جس طرح سے وڈیروں کا حال ہوتا ہے، اپنے کاموں میں مشورے لینے کے لئے آتے، اس طرح سے وہ گویا کہ صاحبِ مجلس ہوتے تھے، اور رسول جس وقت ان کو سمجھاتے تو آگے سے اکڑتے تھے، اپنی سرداری کے غرور میں وہ بات کو مانتے نہیں تھے، لیکن جب عذاب کے آثار ظاہر ہوئے تو پھر وہ ان بستیوں سے نکل کر بھاگنے لگے کہ بھاگ کر کہیں جان بچالیں، تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تکویناً کہا گیا، ضروری نہیں کہ ان کے سامنے آ کے کسی نے کہا ہو، جب ایک آدمی گرفت میں آتا ہے، تو گویا کہ اللہ کی طرف سے تکویناً اسے کہا جاتا ہے کہ کہاں بھاگے جارہے ہو، اب کون سی بھاگنے کی جگہ ہے، مت بھاگو، وہیں چلو اپنی عیش وعشرت کی جگہ میں جہاں بیٹھ کے تم عیش وعشرت کرتے

تھے، وہیں جا کے ویسے ہی ٹھاٹھ باٹھ سے بیٹھو، لوگ تمہارے پاس تمہاری مزاج پرسی کے لئے آئیں، تمہارے پاس مشوروں کے لئے آئیں، یہ ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہے، کہ جس حالت کے اوپر تم پہلے نازاں تھے اب ادھر ہی چلو، اپنی حویلیوں میں جا کے بیٹھو، اپنی مجلسوں میں بیٹھو تا کہ تم سے پوچھا جائے، تو پوچھنے کا مفہوم وہ بھی ہو سکتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تا کہ تم سے پوچھا جائے کہ جس ساز و سامان پر تم ناز کرتے تھے کیا آج وہ تمہارے کام آ رہا ہے؟ اللہ نے جو تمہیں نعمتیں دی تھیں ان کو تم نے کہاں تک شکرگزاری کی؟ یہ تم سے پوچھا جائے، چلو اپنے ساز و سامان کے پاس ہی۔ لیکن وہ آگے سے پھر یوں چیخنے لگ گئے کہ جی! واقعی قصور ہمارا تھا، انبیاء ﷺ نے تو ہمیں سمجھایا، ہم نہیں سمجھے، قصوروار ہم تھے۔

توبہ کب تک قبول ہوتی ہے؟

اور ایسے موقع پر انسان توبہ کرتا ہے، استغفار کرتا ہے، چیخ و پکار کرتا ہے، لیکن یہ مسئلہ آپ کے سامنے بار بار واضح کر دیا گیا کہ جب عالمِ آخرت منکشف ہو جائے یا عذاب آ جائے تو اس کے بعد پھر توبہ، استغفار کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا، جب شخص موت آتی ہے اور غرغرے کی کیفیت شروع ہو جاتی ہے، سانس اکھڑ جاتا ہے، اس کے بعد انسان کو برزخ نظر آنے لگ جاتا ہے، آپ نے بہت سارے لوگوں کے متعلق سنا ہوگا، یا اگر ابھی تک سننے کی نوبت نہیں آئی تو آئندہ سُن لیں گے، اپنے گھروں میں ہی، مرنے والے لوگ اکثر و بیشتر یوں بولنے لگ جایا کرتے ہیں کہ یہ فلاں آ گیا، یہ فلاں آ گیا، اس طرح سے وہ بتانے لگ جایا کرتے ہیں، اپنے پہلوں کی ان کو شکلیں نظر آنے لگ جاتی ہیں، فرشتے نظر آنے لگ جاتے ہیں، باتیں اس قسم کی کرنے لگ جاتے ہیں کہ مہمان آئے ہیں ان کو بٹھاؤ، یا، یہ فلاں آ گیا، اس طرح سے باتیں بہت کرتے ہیں، اکثر و بیشتر مُردوں کے اُوپر یہ کیفیت طاری ہوتی ہے، وہ علامت ہوتی ہے کہ اب ان کے سامنے برزخ نمایاں ہو گیا، فرشتے ان کو نظر آنے لگ گئے، اور پہلے فوت ہونے والوں کی رُوحیں ان کو نظر آنے لگ گئیں، اس قسم کی باتیں وہ کرتے ہیں، جب یہ کیفیت طاری ہو جائے اس وقت توبہ، استغفار یا کلمہ پڑھنے کا کوئی اعتبار نہیں، کافر ایسے وقت میں کلمہ پڑھے تو وہ مؤمن نہیں ہوتا، کوئی گناہ گار توبہ اور استغفار کرے تو اس کی توبہ اور استغفار قبول نہیں ہے۔ اسی طرح سے جب ایک عمومی عذاب آ گیا، اور عمومی عذاب آنے کے بعد انسان کی عقل ٹھکانے آ گئی، فرعون ڈُوبنے لگا تھا تو اس نے بھی تو کہہ دیا تھا: اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْۤ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْۤا اِسْرَآءِیْلَ وَ اَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ (سورۂ یونس: ۹۰) میں بنی اسرائیل کے رَبّ پہ ایمان لے آیا، اس نے بھی تو یہ نعرہ لگا دیا تھا، لیکن اس کا کوئی اعتبار نہیں کیا گیا، تو اجتماعی طور پر جب عذاب آ جائے تو عذاب آنے کے بعد پھر اگر کوئی چیخ و پکار کرتا ہے تو اس کی چیخ و پکار کا کوئی اعتبار نہیں، توبہ، استغفار کرے ایمان لائے اس کا کوئی اعتبار نہیں۔ اور یہ جو آپ پڑھتے رہتے ہیں کہ مغرب کی طرف سے جب سورج نکل آئے گا تو اس کے بعد توبہ قبول نہیں، اس کا بھی یہی معنی ہے کہ مغرب کی طرف سے سورج کا طلوع کرنا یہ علامت ہے اس بات کی کہ اب یہ جہان ٹوٹنے پھوٹنے کے قریب آ گیا، گویا کہ اس عالَم کے اُوپر جان کنی طاری ہو گئی، اور جب جان کنی طاری ہو جائے تو اس کے بعد ایمان کا کوئی اعتبار نہیں، کیونکہ اب تو مشاہدہ ہو گیا، تو ''توبہ کا دروازہ بند ہو جائے گا'' اس کا یہی معنی ہے کہ اس وقت آثار اتنے نمایاں ہو جائیں گے کہ اب ایسا ہو گیا جیسے

سب کچھ آنکھوں سے نظر آ رہا ہے، اور آنکھوں سے نظر آنے کے بعد اگر مانا جائے تو یہ اللہ کے ہاں معتبر نہیں ہے۔ تو وہ یونہی چیختے رہے کہ ہم قصوروار تھے، اور یہی چیخ و پکار ان کی جاری رہی، دعویٰ سے یہاں ان کی پکار مراد ہے، ان کی یہی پکار جاری رہی حتیٰ کہ ہم نے ان کو ایسے کردیا جس طرح سے کہ کٹی ہوئی کھیتی ہوتی ہے اور جلی ہوئی چیزیں بجھی ہوئی ہوتی ہیں، خامدین کے معنی بجھے ہوئے، حصید کے معنی کٹے ہوئے۔ ہم نے کٹے ہوئے بجھے ہوئے کردیے۔ جس طرح سے لہلہاتی ہوئی کھیتی کاٹ دی جائے تو ذرّات کی شکل میں خشک ہو کے منتشر ہو جاتی ہے، اور اسی طرح سے جب لکڑیاں وغیرہ جل جائیں، جلنے کے بعد بجھ جائیں تو جواُن کی کیفیت ہوتی ہے وہ ایسے ہوگئے، سب جوش وخروش ختم ہوگیا، آن بان جتنی تھی سب خاک ہوگئی، یہاں تک تو اس عذاب کا ذکر ہے۔

مشرکین کے عقیدۂ شفاعت کا نقصان اور اس کی تردید

آگے توحید کو ذکر کیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ کے علاوہ نہ زمین میں کوئی معبود نہ آسمان میں، اور خصوصیت کے ساتھ ان آیات میں رد کیا گیا ہے شفاعت کے نظریہ کو، کہ مشرکین نے جو اپنے لیے آلہہ تیار کر رکھے تھے ان کو وہ سمجھتے تھے کہ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ (سورۂ یونس: ۱۸) یہ ہمارے شفعاء ہیں سفارشی ہیں، اور سفارشی کا مفہوم ان کے ذہن میں یہ تھا جیسے آج کل لوگوں نے سفارشی بنا رکھے ہیں دُنیوی عدالتوں کے لئے، کہ ایک آدمی کا کوئی سہارا ہوتا ہے جس کو وہ سمجھتا ہے کہ حاکم اس کے سامنے دَم نہیں مار سکتا، تو اس قسم کے لوگ جرائم کرنے میں بڑے بے باک ہوتے ہیں، جس کو چاہا پکڑ کے پیٹ دیا، جس کا چاہا لوٹ لیا، جس کو چاہا قتل کر دیا، جس کا چاہا کوئی اور نقصان کر دیا، اور یہ دلیری اس وجہ سے ہوا کرتی ہے کہ اوّل تو ہمارے اس بڑے کا لحاظ کرتے ہوئے حکومت ہمیں پکڑے گی نہیں، کہ یہ فلاں کا بھائی ہے فلاں کا بیٹا ہے، اور اگر پکڑ بھی لے گی تو کیا ہے، وہ آئے گا آ کر چھڑا کے لے جائے گا، جس شخص کا یہ نظریہ اس دنیا کے اندر رہتے ہوئے کسی شخص کے متعلق بھی ہے، وہ کبھی قانون کی پابندی نہیں کرتا، وہ لاقانونیت کے ساتھ زندگی گزارتا ہے اور فتنہ وفساد کا ذریعہ بنتا ہے، اور اس کی زندگی مجرمانہ ہوتی ہے، کیونکہ وہ بے فکر ہوتا ہے کہ اوّل تو مجھے کوئی ہاتھ ڈالے گا نہیں، اگر کسی نے ڈال بھی لیا تو فلاں مجھے چھڑا کے لے آئے گا۔ اور جن عدالتوں میں اس قسم کی سفارشیں مانی جانے لگ جائیں، آپ جانتے ہیں کہ ان عدالتوں میں عدل وانصاف کا خون ہو جاتا ہے، وہاں حق اور باطل کی تمیز نہیں رہتی، سفارش کرنے والے سفارش کر کے حق کو باطل ثابت کر دیتے ہیں، باطل کو حق ثابت کر دیتے ہیں۔ تو مشرکین اللہ تعالیٰ کے متعلق بھی ایسے عقیدہ رکھتے تھے کہ جن کی ہم پُوجا کر رہے ہیں، یا فرشتے ہیں یہ اللہ کی اولاد ہیں، اللہ کی بیٹیوں کی طرح ہیں، اللہ ان کی موڑتا نہیں ہے، یہ جو چاہیں اللہ کو منوالیں، اس لیے ان کو خوش رکھو، جب یہ خوش ہوں گے تو دنیوی ضرورتیں بھی پوری کروائیں گے، اور آخرت میں بھی اگر کسی قسم کی گرفت ہوئی تو چھڑالیں گے، تو آپ جانتے ہیں کہ اگر یہ نظریہ صحیح ہو تو پھر اللہ تعالیٰ کے ہاں عدالت کیا ہوئی؟ انصاف کیا ہوگا؟ حق اور باطل کا امتیاز کیا ہوگا؟ اور پھر کون شخص اللہ کے احکام کی پابندی کرے گا؟ ایسا نظریہ رکھنے والے ہر قسم کی بدعملی میں مبتلا ہوں گے۔

آج کل کے ''سجادہ نشینوں'' کی حالت!

یہ واقعہ ہے کہ آج بھی جو اپنے آپ کو بزرگوں کی اولاد قرار دیتے ہیں، یہ سجادہ نشین اور ان کی نسل، جو بزرگوں کی طرف انتساب رکھتی ہے، وہ آج بھی یہی ذہن لیے ہوئے ہیں کہ ہمارا تو فلاں ولی اللہ تھا، اللہ کا مقبول بندہ تھا، ہمیں کیا پرواہ ہے؟ ہم اس کی اولاد ہیں، وہ ہمیں چھڑا لیں گے، اگر کوئی ایسی بات ہو بھی گئی تو اللہ تعالیٰ ہمارا لحاظ کرے گا، اوّل تو پکڑے گا نہیں، پکڑ لیا تو وہ چھڑا لیں گے۔ ان لوگوں کی زندگی انتہائی مجرمانہ ہوا کرتی ہے، یہ اللہ تعالیٰ کے اَحکام کی رعایت نہیں رکھتے، ان کے ذہن کے اُوپر کسی قسم کی پابندی نہیں ہوتی، تو یہ نظریہ باطل ہے، اور وہ لوگ اس دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں۔

فرشتوں کے اندر کیا ہمت کہ مشرکین کی سفارش کریں؟

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے ساتھ کوئی دوسرا اِلٰہ نہیں، نہ میری کوئی اولاد ہے، نہ میرے سے کوئی پوچھ سکتا ہے کہ تُو نے یہ کیوں کیا؟ اور باقی جتنے ہیں وہ سارے کے سارے میرے محکوم ہیں، اور جن کے متعلق تم یہ عقیدہ رکھتے ہو کہ یہ فرشتے اولاد ہیں، یا اللہ کے سامنے یہ اولاد کی طرح ناز کرتے ہیں اور اللہ کو منوا لیتے ہیں، یہ تو میرے سامنے میری اجازت کے بغیر بول نہیں سکتے، اور جو میں کہوں وہی کام کرتے ہیں، صبح شام تسبیح میں لگے ہوئے ہیں، کسی وقت یہ تھکتے نہیں، جس طرح سے انسانوں کا سانس چلتا ہے، اور ہم ہر کام کرتے ہوئے سانس لیتے رہتے ہیں، فرشتے اسی طرح سے ہر کام کرتے ہوئے بھی اللہ کی تسبیح بیان کرتے رہتے ہیں، جیسے ہم سانس لیتے ہوئے تھکتے نہیں اور کسی وقت دِن رات میں ہمارا سانس رُکتا نہیں ہے، اسی طرح سے فرشتے اللہ کی تسبیح میں لگے ہوئے ہیں، کبھی ان کی تسبیح رُکتی نہیں ہے۔ تو وہ تو ایسے اللہ کے فرمانبردار، ایسے اللہ کے سامنے ڈرے ہوئے، اور دبے ہوئے کہ بات کرنے کی جرأت نہیں، اور اگر ان میں سے کسی کے منہ سے یہ نکل جائے کہ ہمیں بھی کوئی اختیار حاصل ہے، تو آج ہی اٹھا کے جہنم میں پھینک دوں، اس قسم کے ظالموں کا میرے ہاں ٹھکانا جہنم ہے، اگر کوئی یوں منہ سے کہہ دے کہ میں بھی اِلٰہ ہوں۔ تو جن کے متعلق تم یہ عقیدہ رکھے ہوئے ہو وہ تو اس قسم کی مخلوق ہے، اللہ کے بندے ہیں، باعزت بندے ہیں، اللہ نے ان کو کرامت دی ہے، عزت دی ہے، لیکن یہ نہیں کہ ان کو خدائی میں شریک کر لیا، یا ان کی بات اللہ ضرور مانتا ہے، یا اللہ کچھ کرنا چاہے تو پوچھ سکیں کہ تُو نے ایسا کیوں کیا؟ یا ایسا کرنا چاہیے تھا اور کیوں نہیں کیا؟ یہ بات کرنے کی ان میں جرأت نہیں ہے، اس طرح سے شفاعت کے عقیدے کو رَدّ کیا جا رہا ہے، کیونکہ یہ عقیدہ انسان کو بدعملی کی طرف لے جاتا ہے، جو یہ سمجھے کہ مجھے فلاں چھڑا لے گا وہ کبھی قاعدہ وقانون کی پابندی نہیں کیا کرتا۔ تو شفاعت والے عقیدے کی تردید ان آیات میں خصوصیت کے ساتھ کی جا رہی ہے۔

آسمان وزمین کی تخلیق عبث نہیں

پہلے اللہ تعالیٰ نے یہی بیان فرمایا کہ زمین وآسمان کو ہم نے کوئی کھیل تماشے کے طور پر نہیں بنایا، کہ دل بہلانے کے لیے بنایا ہے اس لیے ہم نے تماشا دیکھا کہ اس کو اس سے لڑا دیا، اس سے اس کو لڑا دیا، یہ کر دیا، وہ کر دیا، تھوڑی دیر کے لیے دل بہلا لیا،

یہ دنیا ہم نے اس طرح سے نہیں بنائی، بلکہ اس میں اگر حق اور باطل کی کشاکشی ہے، کشمکش ہے، اہل حق کے سامنے ان کا نتیجہ آئے گا، اہل باطل کے سامنے ان کے نتیجہ آئے گا، اگر ظالم اور مظلوم میں فرق نہ ہو، باغی اور فرماں بردار میں فرق نہ ہو، تو پھر تو یہ کھیل تماشا ہی ہے، جیسے مداری ایک کھیل بناتا ہے، تھوڑی دیر کے لیے دِل بہلایا، بہلانے کے بعد کھیل ختم کر دیا۔ تاریخ کے اندر مذکور ہے، پُرانے زمانے میں بادشاہ لوگ، خاص طور پر رُومیوں کے متعلق، اپنا دِل بہلانے کے لیے وہ تھیٹر بنایا کرتے تھے، جس طرح سے آج کل تھیٹر چلتے ہیں، تو اپنا دِل بہلانے کے لیے وہ اس قسم کے تھیٹر بھی بناتے تھے، شیر کو چار دِن بھوکا رکھا، اس کو کچھ کھلایا نہیں، اور بعد میں اپنے کسی غلام کو میدان میں چھوڑا، اور اس کے اوپر وہ شیر چھوڑ دیا، اور ان کی لڑائی کروادی، اور یہ دیکھا کہ غلام اس شیر پہ غالب آتا ہے، یا شیر اس غلام کو نوچتا ہے، وہ شیر اس کو پھاڑتا، نوچتا، آپس میں اس طرح سے لڑتے، وہ تماشا دیکھتے اور ان کی دل لگی ہوتی، اب ان کو اس چیز سے بحث نہیں کہ کون تکلیف میں ہے، کون ظالم ہے، کون مظلوم ہے، انہوں نے تو دِل بہلانا ہے، اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا ایسے نہیں بسائی کہ صرف دِل بہلانے کے لیے بنائی ہے، اور اس کا کوئی اچھا نتیجہ نکلنے والا نہیں، ایسی بات نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ اگر میں نے کوئی کھیل اختیار کرنا ہوتا تو لوگوں کو مکلف کرنے کی، آپس میں لڑانے بھڑانے کی کیا ضرورت تھی؟ ہم اپنے پاس کوئی اور مشغلہ اختیار کر لیتے۔ اگر ہم نے اپنا دِل بہلانے کے لیے کوئی مشغلہ کرنا ہی ہوتا تو پھر تمہیں مکلف بنانے کی، اور اسی طرح سے زمین اور آسمان بنانے کی، اور مخلوق بسانے کی، اور اس طرح سے سارے کے سارے اَحکام دینے کی کیا ضرورت تھی، اگر ہم نے ایسا کرنا ہی ہوتا تو ہم اپنے پاس کوئی اپنے دِل بہلانے کی چیز اختیار کر لیتے، اور آپ جانتے ہیں کہ "لَوْ"، "بالفرض" کے لئے ہوتا ہے، "بالفرض اگر ہم ایسا کرنا چاہتے، اگر ہم ارادہ کرتے" لیکن ایسا نہیں، اللہ تعالیٰ جو حکیم مطلق ہے، اس کی شان سے یہ بعید ہے کہ محض فضول کوئی کام کرے کھیل تماشے کے طور پر جس میں کوئی اچھا نتیجہ نکلنے والا نہ ہو، یہ زمین وآسمان کوئی کھیل تماشا نہیں ہے، اس لیے یوں نہ سمجھو! کہ آخرت نہیں آئے گی اور کوئی فیصلہ نہیں ہوگا، تھوڑی دیر کے لیے کھیل رچایا اور ختم کر دیا، ایسا نہیں، بلکہ اس میں حق اور باطل کی لڑائی ہے، اللہ تعالیٰ دلائل کے ساتھ حق کو غالب کرتا ہے، باطل اس کے سامنے فنا ہوتا ہے، اور دلائل قائم کیے جاتے ہیں، آفاق میں، زمین میں، آسمان میں، اور اسی طرح سے دلائل تنزیلی جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اترتے ہیں وہ سب حق کو غلبہ دینے کے لئے ہیں۔

مشرکین کو تنبیہ

وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنی زبان سے جو اس قسم کی باتیں کرتے ہو کہ آخرت نہیں ہے، بس یہ دنیا ہی ہے، اس میں جو کچھ کرنا ہے کرلو، یا سفارش کے متعلق تم نے عقیدے اختیار کر لیے، اس قسم کی باتیں جو تم کرتے ہو، یہی تمہارے لیے خرابی کا باعث بنیں گی، وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: جو کچھ زمین اور آسمان میں ہے سب اسی کا مملوک ہے، جس میں فرشتے بھی آ گئے، اور ان کا خصوصیت سے ذکر کر دیا کہ اللہ کے پاس جو فرشتے ہیں اللہ کے مقرب، وہ تو اس کی عبادت سے اکڑتے نہیں، وہ تو ہمیشہ اس کی عبادت کرتے ہیں، اور نہ تھکتے ہیں۔

نظامِ کائنات چلانے میں اللہ تعالیٰ ہی خود مختار ہے

اَمِ اتَّخَذُوْۤا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ: آسمان والوں کا تو یہ حال ہے جس کا اُوپر ذکر کر دیا، باقی رہے زمین والے، کیا انہوں نے زمین سے کچھ آلہہ بنا لیے ہیں، جو زمین کو آباد کرتے ہوں؟ اس کو شاداب کرتے ہوں؟ اس قسم کے اختیارات کسی کے لئے ہیں؟ یا کوئی ایسے آلہہ ہیں جو کہ بے جان چیزوں میں جان ڈال کے ان کو اٹھا کھڑا کریں؟ یعنی ایسے بھی کوئی نہیں۔ مشرکین یہ سمجھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ تو ہے آسمانوں کے اوپر، گویا کہ اس کا دار السلطنت زمین سے بہت دور ہے، اور اتنے دُور دراز علاقے کا انتظام کرنے کے لئے اس نے کچھ اور منتظمین اپنے ماتحت بنا لیے ہیں، تا کہ اس علاقے کو سنبھالیں، اس قسم کے ان کے نظریے تھے، جس میں اللہ کی قدرت کے اندر خلل پڑتا تھا، اور اللہ کے علم میں کمی، اس قسم کی چیزیں لازم آتی تھیں، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہ تو زمین کا ذرّہ ذرّہ، آسمان کا ذرّہ ذرّہ جو کچھ بھی ہے وہ سب میرے سامنے ہے، سب میرے علم میں ہے، تو اس قسم کا نظریہ جیسے کیسے بھی بنایا جائے، یہ غلط ہے، اللہ تعالیٰ نے کسی علاقے کی حکومت کسی کو ایسے طور پر نہیں دی کہ وہ خود مختار ہو کے جو چاہے کرتا رہے۔

تعدّدِ آلہہ کے اِبطال پر اِنتہائی پختہ دلیل

''کیا انہوں نے زمین سے آلہہ اختیار کر لیے کہ وہ اٹھاتے ہیں، یا زمین کو آباد کرتے ہیں؟'' بالکل غلط، نہ کوئی آسمان میں اِلٰہ ہے نہ زمین میں، اگر اللہ تعالیٰ کے علاوہ اس زمین میں یا آسمان میں کوئی آلہہ ہوتے تو ان میں انتظام کبھی برپا نہ رہتا، فساد برپا ہو جاتا، انتظام بحال نہ رہتا، یہ ٹوٹ پھوٹ جاتے، ان میں فساد برپا ہو جاتا، یہ دلیل ایک بہت سادہ سی دلیل ہے، مطلب اس کا یوں سمجھئے جیسا کہ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب ﷫ نے کچھ تھوڑی سی وضاحت فرمائی ''تعدّدِ آلہہ کے اِبطال پر یہ نہایت پختہ اور واضح دلیل ہے جو قرآنِ کریم نے اپنے مخصوص انداز میں پیش کی۔ اس کو یوں سمجھو کہ 'عبادت' نام ہے کامل تذلل کا (کہ کسی کے سامنے پوری طرح سے ذِلّت اختیار کر لینا، پست ہو جانا) اور کامل تذلل صرف اسی ذات کے سامنے اختیار کیا جا سکتا ہے جو اپنی ذات وصفات میں ہر طرح کامل ہو، اسی کو ہم 'اللہ' یا 'خدا' کہتے ہیں۔ ضروری ہے کہ خدا کی ذات ہر قسم کے عیوب ونقائص سے پاک ہو، نہ وہ کسی حیثیت سے ناقص ہو، نہ بیکار، نہ عاجز ہو، نہ مغلوب، نہ کسی دُوسرے سے دبے، نہ کوئی اس کے کام میں روک ٹوک کر سکے۔ اب اگر فرض کیجئے کہ آسمان وزمین میں دو خدا ہوں تو دونوں اسی شان کے ہوں گے، اس وقت دیکھنا یہ ہے کہ عالم کی تخلیق اور علویات وسفلیات کی تدبیر دونوں کے کلی اتفاق سے ہوتی ہے یا گاہ بگاہ باہم اختلاف بھی ہو جاتا ہے اتفاق کی صورت میں دو احتمال ہیں، یا تو اکیلے ایک سے کام نہیں چل سکتا تھا اس لیے دونوں نے مل کر انتظام کیا تو معلوم ہوا کہ دونوں میں سے ایک بھی کامل قدرت والا نہیں، اور اگر تنہا ایک سارے عالم کا کامل طور پر سرانجام کر سکتا تھا تو دوسرا بیکار ٹھہرا حالانکہ خدا کا وجود اسی لیے ماننا پڑا ہے کہ اس کے مانے بدون چارہ ہی نہیں ہو سکتا، اور اگر اختلاف کی صورت فرض کریں تو لامحالہ مقابلہ میں یا ایک مغلوب ہو کر اپنے ارادہ اور تجویز کو چھوڑ بیٹھے گا، وہ خدا نہ رہا، اور یا دونوں بالکل مساوی ومتوازی طاقت سے ایک دوسرے کے خلاف اپنے ارادہ اور تجویز کو عمل میں لانا چاہیں گے، اول تو خداؤں کی اس رسہ کشی میں سرے سے کوئی چیز موجود ہی نہیں ہو سکے گی اور موجود چیز پر زور

آزمائی ہونے لگی تو اس کشمکش میں ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہو جائے گی، یہاں سے یہ نتیجہ نکلا کہ اگر آسمان وزمین میں دو خدا ہوتے تو آسمان وزمین کا یہ نظام کبھی کا درہم برہم ہو جاتا۔ ورنہ ایک خدا کا بیکار یا ناقص وعاجز ہونا لازم آتا ہے جو خلاف مفروض ہے (الٰہ ہونے کے منافی ہے) (تفسیر عثمانی)۔ یعنی اگر دو یا اس سے زائد آلہہ مانیں گے تو یا تو یہ نظم ہی بحال نہیں رہ سکتا، یہ مشکل ہے کہ دو بااختیار ہستیاں ہوں اور ہمیشہ ان میں اتفاق رہے کبھی اختلاف نہ ہو، ایک گھر کے اندر اگر دو کا اختیار چلنے لگ جائے تو گھر کا نظم ٹھیک نہیں رہتا، ایک ملک کے اندر اگر دو حاکم برابر کی سطح کے ہو جائیں تو کسی صورت میں بھی ملک کا نظم بحال نہیں رہ سکتا، یہاں بھی ایسے ہی ہے کہ اگر اِلٰہ متعدد مان لیے جائیں تو اگر اتفاق سے رہیں گے تو یہ عادۃً محال ہے، لیکن اگر اتفاق ہو تو پھر پوچھا جا سکتا ہے کہ کیا ایک کافی تھا یا نہیں؟ اگر ایک کافی نہیں تو وہ کامل القدرۃ نہ ہوا، اور اگر کافی تھا تو دوسرا بے کار ٹھہرا، پھر اس کی کیا ضرورت؟ اور اختلاف ہونے کی صورت میں تو ایک غالب اور ایک مغلوب، جو مغلوب ہوگا وہ خدا نہیں، اور اگر مغلوب کسی کو بھی نہ مانیں تو دو برابر کی قوتیں جب آپس میں ٹکرائیں گی، ایک کہے گا پیدا کرنا ہے، دوسرا کہے گا نہیں کرنا، یا ایک چیز جو پیدا ہو چکی ایک کہے گا اس کو فنا کرنا ہے، دوسرا کہے گا کہ نہیں کرنا، تو یہ دنیا کا نظم کس طرح سے چل سکتا ہے؟ تو یہ ساری کی ساری کائنات جو ایک نظم اور ضبط کے تحت چل رہی ہے، یہ علامت ہے اس بات کی کہ اس کے اوپر کنٹرول ایک کا ہی ہے، اس میں متعدد کنٹرول کرنے والے نہیں ہیں۔

فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ: اس میں اشارہ کر دیا کہ عرش کا مالک وہ ایک ہی ہے، عرش کا مالک یعنی حاکم اعلیٰ جس کی حکومت چلتی ہے، تخت نشین، رَبِّ عرش اس میں ایک ہی ہے، پاک ہے اللہ جو کہ عرش کا رَبّ ہے ان باتوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں، اور اس کی شان یہ ہے کہ اس سے کوئی پوچھ نہیں سکتا کہ تو نے یہ کام کیوں کیا؟ یا فلاں کام کیوں نہیں کیا؟ اس کے اوپر کوئی نہیں جو اس سے پوچھ سکے، اور باقی جتنے ہیں وہ سب اس کے ماتحت ہیں، پوچھے جائیں گے۔

مشرکین اپنے دعویٰ پر دلیل لائیں

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً: یا اللہ کے علاوہ انہوں نے کچھ آلہہ اختیار کیے ہیں، یعنی یہ کہتے ہیں کہ اللہ کے برابر کے نہیں، اللہ کے ماتحت ہیں، لیکن ہیں آلہہ، وہ بھی بااختیار ہیں، یہ ان کا ایک دعویٰ ہے، (قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ) آپ ان سے کہیے کہ اس کے اوپر دلیل لاؤ، ایک اللہ کو تو مان لیا، مشرک نے بھی مان لیا، موحد نے بھی مان لیا، لیکن اب اس کے ماتحت چھوٹے چھوٹے اور آلہہ بھی ہیں یا نہیں؟ وہ کہتے ہیں کہ ہیں، ہم کہتے ہیں کہ نہیں، جو کہتا ہے کہ نہیں، اس کے ذمے تو دلیل نہیں ہے، دلیل اس کے ذمے ہوتی ہے جو ثابت کرنا چاہے، اب ایک کے اوپر اضافہ کرنے والوں سے پوچھو کہ بُرہان لاؤ، دلیل لاؤ، ان کے وجود پر تمہارے پاس کیا دلیل ہے؟

دلیلِ توحید

هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ: یہ اپنی دلیل کی طرف اشارہ کر دیا کہ عقلی دلیل اوپر آ گئی اور نقلی دلیل یہ آ گئی کہ یہ کتاب ہے میرے ساتھیوں کی اور پہلے لوگوں کی جو پہلے لوگ موجود ہیں، ان میں دیکھ لو کہ کیا کسی کتاب میں کوئی تذکرہ ہے، کہ اللہ نے اختیارات دے کے زمین میں یا آسمان میں کوئی اور آلہہ اپنے ماتحت ہی بنا لیے ہیں، کسی میں کوئی تذکرہ نہیں ہے، ان کے پاس

دلیل کوئی نہیں بلکہ ان میں سے اکثر حق کو جانتے نہیں، فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ: اور اعراض کرنے والے ہیں، منہ موڑتے ہیں، حق کو قبول نہیں کرتے، یہ ان کی بے علمی ہے، جہالت ہے، جہالت کی وجہ سے ایسا کر رہے ہیں۔

''عقیدۂ توحید'' تمام انبیاء علیہم السلام کا اجماعی عقیدہ ہے

اور آگے بھی اسی طرح سے نقلی دلیل کی طرف اشارہ ہے کہ یہ توحید کا دعویٰ صرف سرورِ کائنات ﷺ نے ہی نہیں کیا، بلکہ جتنے بھی رسول پہلے آئے ہیں سب کا متفق علیہ مسئلہ ہے۔ ''نہیں بھیجا ہم نے آپ سے قبل کسی رسول کو مگر اس کی طرف یہی وحی کی کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ '' گویا کہ یہ مسئلہ ایسا ہے جس کے اوپر ایک لاکھ چوبیس ہزار یا کم وبیش جو اللہ کے علم میں ہیں سب پیغمبروں کا اتفاق ہے، شہر کے مفتی ایک مسئلے پہ اتفاق کر لیں تو مسئلے میں کتنی قوت پیدا ہو جاتی ہے، اور اگر ایک ملک کے مفتی اکٹھے ہو جائیں کسی مسئلے پر تو اس میں کتنی قوت ہوتی ہے، اور یہ مسئلہ ایسا ہے کہ جس زبان میں جس علاقے میں جس قوم میں بھی پیغمبر آیا اس نے مسئلہ یہی ذکر کیا کہ اللہ کے علاوہ کوئی دوسرا معبود نہیں، عبادت کا حقدار صرف وہی ہے، تو اس مسئلے میں کتنی پختگی ہو گئی۔

فرشتوں کے متعلق مشرکین کا نظریہ اور اس کی تردید

''اور یہ مشرک کہتے ہیں کہ اللہ نے اولاد اختیار کر رکھی ہے'' اس کی وضاحت پہلے میں نے آپ کے سامنے کر دی ہے، فرشتوں کو وہ اولاد قرار دیتے تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ جس طرح سے اولاد اپنے ماں باپ کو منوا لیتی ہے اور اپنی مرضی کے مطابق ان سے فیصلے کروا لیتی ہے، تو اسی طرح سے فرشتے بھی اللہ کی اولاد ہیں اور یہ ہمارے شفعاء ہیں، جو چاہیں اللہ سے کروا سکتے ہیں، تو اس کی تردید ان الفاظ میں کی گئی ہے ''یہ کہتے ہیں کہ رحمٰن نے اولاد اختیار کی، رحمٰن پاک ہے اس عیب سے'' اولاد کی نسبت رحمٰن کی طرف عیب ہے، اس کی تفصیل کئی دفعہ ہو چکی ''بلکہ وہ تو باعزت بندے ہیں'' آگے بڑھ کے بات نہیں کر سکتے رحمٰن کے سامنے، لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ: نہیں سبقت لے جا سکتے اس سے بات کے ساتھ، اور وہ اس کے حکم کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ان کے سب حالات کو جانتا ہے اگلے پچھلے جتنے بھی ہیں۔ اور وہ یعنی ''عباد مکرمون'' وہ فرشتے جن کے متعلق یہ اولاد ہونے کا خیال کیے ہوئے ہیں اور ان کو شفعاء سمجھتے ہیں، وہ سفارش نہیں کریں گے مگر اسی کے متعلق جس کے متعلق اللہ کی رضا ہو گی، اللہ کی رضا محسوس کریں گے، اللہ کا اذن ہو گا تو وہ بولیں گے، اور اگر اللہ کا اذن نہیں ہو گا یا اللہ کی رضا معلوم نہیں ہو گی تو وہ بول نہیں سکیں گے، تو پھر تم ان پر اعتماد کس طرح کیے ہوئے ہو؟ ''اور وہ اللہ کی ہیبت کے سامنے ڈرنے والے ہیں، اور اگر ان میں سے کوئی یہ بول دے کہ وہ الٰہ ہے اللہ کے علاوہ'' مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے متعلق کبھی ایسی بات نہیں کہہ سکتے، اگر کہیں گے تو وہ بھی جہنم میں جائیں گے، ''اگر ان میں سے کوئی کہہ دے کہ میں الٰہ ہوں اللہ کے علاوہ، پس یہی ہے کہ جس کو ہم بدلہ دیں گے جہنم، اور اسی طرح سے بدلہ دیا کرتے ہیں ہم ظالمین کو'' یعنی ایسا کہنے والے ظالم ہیں، اور ان کا انجام وہ ہو گا جو ظالموں کا ہوا کرتا ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ۭ وَجَعَلْنَا

کیا کافروں کو معلوم نہیں کہ آسمان اور زمین دونوں بند تھے پھر ہم نے ان دونوں کو کھول دیا اور بنایا ہم نے

مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۭ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۳۰ وَجَعَلْنَا فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ

پانی سے ہر زندہ چیز کو، کیا پھر وہ ایمان نہیں لاتے ۝۳۰ اور بنائے ہم نے زمین میں بوجھل پہاڑ تاکہ وہ زمین ہچکولے نہ لینے لگ جائے

بِهِمْ ۠ وَجَعَلْنَا فِيْهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ۝۳۱ وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا

ان لوگوں کے ساتھ، ہم نے بنائے زمین میں راستے کھلے کھلے تاکہ وہ لوگ راہ پائیں ۝۳۱ اور ہم نے آسمان کو محفوظ چھت بنایا

وَّهُمْ عَنْ اٰيٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ ۝۳۲ وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ

اور یہ لوگ اس آسمان کی نشانیوں سے اِعراض کرنے والے ہیں ۝۳۲ اور اللہ وہ ہے جس نے پیدا کیا رات کو اور دِن کو اور سورج کو

وَالْقَمَرَ ۭ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۝۳۳ وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ۭ

اور چاند کو ان میں سے ہر ایک اپنے دائرے میں تیرتا ہے ۝۳۳ اور نہیں بنایا ہم نے کسی انسان کے لئے آپ سے پہلے ہیشگی کو،

اَفَا۟ىِٕنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ ۝۳۴ كُلُّ نَفْسٍ ذَاۗىِٕقَةُ الْمَوْتِ ۭ وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ

کیا پھر اگر آپ وفات پا جائیں گے تو پھر یہ لوگ ہمیشہ رہنے والے ہیں؟ ۝۳۴ ہر نفس موت کا مزہ چکھنے والا ہے اور ہم آزماتے ہیں تمہیں شر

وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ۭ وَاِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ۝۳۵ وَاِذَا رَاٰكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ

اور خیر کے ساتھ اور ہماری طرف ہی تم سب لوٹائے جاؤ گے ۝۳۵ جس وقت دیکھتے ہیں آپ کو وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، نہیں

يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ۭ اَھٰذَا الَّذِيْ يَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ ۚ وَهُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝۳۶

بناتے وہ آپ کو مگر ٹھٹھا کیا ہوا، کیا یہ وہ شخص ہے جو تمہارے آلہہ کا ذکر کرتا ہے۔ اور وہ خود رحمٰن کے ذکر کا انکار کرنے والے ہیں ۝۳۶

خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ۭ سَاُورِيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنِ ۝۳۷ وَيَقُوْلُوْنَ

انسان جلد بازی سے بنایا گیا ہے، عنقریب دِکھاؤں گا میں تمہیں اپنی نشانیاں پس تم مجھ سے جلدی مطالبہ نہ کرو ۝۳۷ اور یہ لوگ کہتے ہیں

مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۳۸ لَوْ يَعْلَمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا حِيْنَ لَا يَكُفُّوْنَ

کہ یہ وعدہ کب ہوگا اگر تم سچے ہو؟ ۝۳۸ اگر جان لیں یہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اس وقت کو جب نہیں روک سکیں گے یہ

عَنْ وُّجُوْهِهِمُ النَّارَ وَلَا عَنْ ظُهُوْرِهِمْ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝۳۹ بَلْ تَاْتِيْهِمْ بَغْتَةً

اپنے چہروں سے آگ کو اور نہ اپنی پشتوں سے اور نہ یہ مدد کیے جائیں گے ۝۳۹ بلکہ وہ آگ ان کے پاس اچانک آئے گی

فَتَبْهَتُهُمْ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ رَدَّهَا وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ۝۴۰ وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ

پھر وہ ان کو حیرانی میں ڈال دے گی پھر یہ نہیں طاقت رکھیں گے اس کو رد کرنے کی اور نہ یہ مہلت دیے جائیں گے ۝۴۰ البتہ تحقیق استہزا کیا گیا

بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۴۱

ان رسولوں کے ساتھ جو تجھ سے پہلے ہیں، پھر گھیر لیا ان لوگوں کو جنہوں نے ان میں سے ٹھٹھا کیا تھا اس چیز نے جس کے ساتھ وہ ٹھٹھا کیا کرتے تھے ۝۴۱

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا: لَمْ يَرَ کے اندر رؤیت یہ فعلِ قلب ہے، فعلِ بصر نہیں۔ کیا کافروں کو معلوم نہیں؟ کیا ان لوگوں نے دیکھا نہیں؟ اگر ''دیکھنے'' کا لفظ بولیں گے تو یہ آنکھ کا فعل بنتا ہے۔ ''کیا ان لوگوں کو معلوم نہیں'' یہ ترجمہ کریں گے تو پھر یہ دل کا فعل ہے، ''نحو'' کے اندر آپ مثال پڑھا کرتے ہیں: ''رَاَيْتُ زَيْدًا عَالِمًا'' اس کا ترجمہ یوں ہی ہوتا ہے: ''میں نے زید کو عالم جانا'' یوں ترجمہ نہیں کیا جاتا ''میں نے زید کو عالم دیکھا''، کیونکہ زید کا عالم دیکھنے کی چیز نہیں ہے، جاننے کی چیز ہے۔ تو یہاں اگر فعل بصر کے طور پر ترجمہ کرو گے تو یوں ہوگا ''کیا نہیں دیکھا ان لوگوں نے جنہوں نے کفر کیا''، اور اگر رؤیت قلبی کے طور پر ترجمہ کرو گے تو معنی ہوگا ''کیا نہیں جانا ان لوگوں نے جنہوں نے کفر کیا''۔ اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا: ''رتق'' بند کرنے کو کہتے ہیں، اور ''فتق'' کھولنے کو کہتے ہیں۔ اور ''رتق'' مصدر ہے اس لیے كَانَتَا یہ تثنیہ کا صیغہ ہے، آگے اس کی خبر مفرد ذکر کی گئی، چونکہ مصدر کو تثنیہ اور جمع نہیں لایا کرتے۔ جس وقت اس کا معنی کریں گے تو معنی تثنیہ والا ہوگا، یہ ''رتق'' مصدر اسم مفعول کے معنی میں ہے، كَانَتَا مَرْتُوْقَتَيْنِ مفعول کے معنی میں جس وقت آجائے گا تو تثنیہ کے طور پر اس کو ذکر کریں گے، ''آسمان اور زمین دونوں بند تھے''۔ فَفَتَقْنٰهُمَا: پھر ہم نے ان دونوں کو کھول دیا۔ ''رتق'' کے مقابلے میں فتق آگیا۔ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ: حَيٍّ یہ شَيْءٍ کی صفت ہے۔ اور ہم نے ہر زندہ چیز کو پانی سے بنایا، بنایا ہم نے پانی سے ہر زندہ چیز کو۔ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ: کیا پھر وہ ایمان نہیں لاتے؟ وَجَعَلْنَا فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ: رَوَاسِيَ یہ رَاسِيَةٌ کی جمع ہے، اور یہ لفظ کئی دفعہ گزر چکا، رَوَاسِيَ ثوابت کے معنی میں ہے، یہ صفت ہے جبال کی جِبَالًا رَوَاسِيَ جمنے والے پہاڑ، بوجھل پہاڑ، جن کو آپ ٹھوس کہہ سکتے ہیں، ''اور بنائے ہم نے زمین میں بوجھل پہاڑ'' اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ: لِئَلَّا تَمِيْدَ بِهِمْ، تَمِيْدَ یہ مَيد سے ہے، حرکت کرنا، اور اور یہاں حرکت اضطرابی مراد ہے۔ ایک حرکت ہوتی ہے جس طرح سے کشتی ایک کنارے سے دوسرے کنارے کی طرف چلتی ہے، اور ایک حرکت ہوتی ہے کہ پانی کے اندر ہچکولے لینے لگ جاتی ہے، تو مَید ہچکولے والی حرکت کو کہتے ہیں، تو اس کا معنی ہوگیا ''تاکہ وہ زمین ان لوگوں کے ساتھ ہچکولے نہ لینے لگ

جائے۔" وَجَعَلْنَا فِیْهَا فِجَاجًا: فجاج یہ فج کی جمع ہے، فج کہتے ہیں کشادہ راستے کو، پہاڑوں کے درمیان جو درّے ہوتے ہیں، ہر درّے کو "فج" کہا جاتا ہے۔ اور سُبُلًا سبیل کی جمع ہے یہ بھی راستہ ہو گیا، اب فِجَاجًا سے بھی کشادہ راستے مراد لے لیے جائیں اور سُبُلًا کا معنی بھی راستے، تو سُبُلًا یہ فِجَاجًا سے بدل ہو جائے گا، یا سُبُلًا ذوالحال ہے اور فِجَاجًا حال ہے (آلوسی، مظہری)، اور "نحو" کے اندر آپ نے مسئلہ پڑھا کہ جس وقت ذوالحال نکرہ ہو تو اس وقت حال کو مقدم کر دیا جاتا ہے، کیونکہ اگر ہم اس کو مؤخر کریں گے پھر یہ صفت موصوف بن جائیں گے، حال ذوالحال نہیں ہوں گے، مقدم کرنے کی صورت میں یہ حال بن جائے گا، تو پھر ترجمہ یوں ہوگا "ہم نے بنائے زمین میں راستے کھلے کھلے، اس حال میں کہ وہ فراخ ہیں، کھلے کھلے ہیں" تو فِجَاجًا کا ترجمہ یوں ہو جائے گا، فجاج فج کی جمع، اور سبلاً سبیل کی جمع۔ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ یہ آگے سورۂ حج میں بھی لفظ آئے گا (آیت: ۲۷)۔ لَعَلَّهُمْ یَهْتَدُوْنَ: تاکہ وہ لوگ راہ پائیں۔ هَدٰی یَهْدِیْ: راستہ دکھانا۔ اِهْتَدٰی یَهْتَدِیْ: راستہ پانا۔ تاکہ وہ لوگ راہ پالیں۔ راہ پانے کے یہاں دونوں معنی ہیں، یا تو ان راستوں کے ذریعہ سے اپنے منزلوں تک راستہ پالیں، جہاں جانا ہو ادھر سے ادھر، ان راستوں کے ذریعے سے چلے جائیں، درّوں کے ذریعے سے چلے جائیں جو پہاڑوں میں موجود ہیں، اور یا یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی آیات کو دیکھ کے ہدایت حاصل کریں، کفر اور شرک کو چھوڑیں، تو ہدایت سے معنوی ہدایت بھی مراد ہو سکتی ہے اور ظاہری ہدایت بھی مراد ہو سکتی ہے، "تاکہ وہ لوگ اپنی منزل مقصود تک راستہ پائیں، اور، تاکہ وہ لوگ ہدایت حاصل کریں، یہ دوسری ہدایت ایمان کے معنی میں، یعنی ان علامات کو دیکھ کر قدرت کی نشانیوں کو دیکھ کر ہدایت حاصل کریں۔ وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا: سقف کہتے ہیں چھت کو۔ اور ہم نے آسمان کو محفوظ چھت بنایا، جو ٹوٹنے پھوٹنے سے محفوظ ہے، اور شیاطین سے بھی محفوظ ہے۔ وَّهُمْ عَنْ اٰیٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ: اور یہ لوگ اس آسمان کی نشانیوں سے اِعراض کرنے والے ہیں، اُن نشانیوں کے اندر یہ غور نہیں کرتے، تفکر، تدبر نہیں کرتے۔ وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ: اور اللہ وہ ہے جس نے پیدا کیا رات کو اور دن کو وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ: اور سورج کو اور چاند کو۔ كُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ: "فلک" کہتے ہیں گول دائرے کو، یہ آپ نے چرخہ دیکھا ہوگا جو عورتیں کاتا کرتی ہیں، اس کے تکلے کے اوپر ایک ٹکڑا چڑھا ہوا ہوتا ہے چمڑے کا، جس کے ساتھ دھاگا اکٹھا ہو جاتا ہے، بعد میں اس کو کھینچ کے دھاگے کو اتارا کرتے ہیں، تو وہ جو ٹکڑا ہوتا ہے اس کو بھی عربی میں "فَلْكَةُ الْمِغْزَلِ" کہتے ہیں، وہ گول ٹکڑا جو چڑھا ہوا ہوتا ہے، كُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ کا معنی ہو گیا کہ ان میں سے ہر ایک اپنے دائرے میں تیرتا ہے، یَّسْبَحُوْنَ: تیز چلنا اس طرح سے جس طرح سے تیر رہے ہیں۔ چلتے ہیں، تیرتے ہیں۔ ہر کوئی اپنے دائرے میں تیرتا ہے، یہ سب اپنے دائرے میں تیرتے ہیں۔ وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ: اور نہیں بنایا ہم نے کسی انسان کے لئے تیرے سے قبل خلد کو۔ خلد: ہیشگی، ہمیشہ زندہ رہنا۔ ہم نے تجھ سے قبل کسی انسان کے لئے ہیشگی قرار نہیں دی، کہ اس کو موت نہ آئے، ہمیشہ زندہ رہے۔ اَفَاۡئِنْ مِّتَّ کیا پھر اگر آپ وفات پا جائیں گے، آپ مر جائیں گے، آپ کو موت آ جائے گی، فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ: پھر یہ لوگ ہمیشہ رہنے والے ہیں؟ ہمزہ استفہام کا آگے جا کے ظاہر ہوگا۔ اگر آپ مر جائیں گے تو کیا یہ لوگ ہمیشہ رہنے والے ہیں؟ یہ مفہوم نکلے گا اس کا، یعنی جیسے آپ کو موت آنے والی ہے ان کو بھی موت آنے والی ہے، اس لیے آپ کی موت پہ خوشی کرنے کا کیا موقع ہے؟ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ: ہر نفس موت کا مزہ چکھنے والا ہے۔ وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَیْرِ: اور ہم

آزماتے ہیں تمہیں شر اور خیر کے ساتھ۔ ''شر'' بری چیز کو کہتے ہیں، ''خیر'' بھلی چیز کو کہتے ہیں۔ ''شر'' سے مراد ہوتے ہیں وہ حالات جو اِنسان کی اپنی خواہش کے خلاف پیش آجائیں، جیسے آپ کی خواہش صحت کی ہے لیکن آپ بیمار ہوجاتے ہیں، آپ کی خواہش غنا کی ہے لیکن آپ فقیر ہوجاتے ہیں، آپ کی خواہش دُشمن پر غلبہ پانے کی ہے لیکن آپ مغلوب ہوجاتے ہیں، تو ''شر'' سے مراد ہوتے ہیں وہ حالات جو خواہش کے خلاف پیش آئیں، اور ''خیر'' سے مراد ہوتے ہیں وہ حالات جو انسان کی خواہش کے موافق پیش آتے ہیں، غنا حاصل ہوگیا، رزق کی وسعت ہوگئی، مال اولاد ہوگیا، جائیداد ہوگئی، صحت ہوگئی، دُشمنوں کے مقابلے میں عزت اور غلبہ حاصل ہوگیا، یہ خیر ہے۔ ''ہم آزماتے ہیں تمہیں شر اور خیر کے ساتھ'' اچھے حالات کے ذریعے سے اور بُرے حالات کے ذریعے سے، فِتْنَةً یہ نَبْلُو کا مفعول مطلق ہے مِنْ غَيْرِ لَفْظِهٖ، خوب آزمانا۔ اور اگر مفعول لہٗ کے طور پر ترجمہ کرنا چاہیں تو بھی ہوسکتا ہے (آلوسی)، ہم تمہیں آزماتے ہیں خیر اور شر کے ذریعے سے پرکھنے کے لئے، یوں بھی ترجمہ کرسکتے ہیں۔ وَاِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ: اور ہماری طرف ہی تم سب لوٹائے جاؤ گے۔ وَاِذَا رَاٰكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا: جس وقت دیکھتے ہیں آپ کو وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا: نہیں بناتے وہ آپ کو مگر ٹھٹھا، آپ سے ٹھٹھا کرنا شروع کردیتے ہیں۔ هُزُوًا: مَهْزُوًّا بِهٖ کے معنی میں ہے، نہیں بناتے وہ آپ کو مگر ٹھٹھا کیا ہوا، یعنی آپ کو ایسا شخص بنادیتے ہیں جس کے ساتھ مذاق کیا جاتا ہے۔ اَهٰذَا الَّذِيْ يَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ: اور یوں کہتے ہیں، کیا یہ وہ شخص ہے جو تمہارے آلہہ کا ذکر کرتا ہے، تمہارے بتوں کا، تمہارے معبودوں کا ذکر کرتا ہے یعنی بُرائی کے ساتھ، یہاں ذکرِ آلہہ بُرائی کے ساتھ مراد ہے، يَذْكُرُ: يَسُبُّ کے معنی میں ہے۔ یعنی وہ اشارے کرکر کے کہتے ہیں کہ کیا یہ شخص ہے جو تمہارے بتوں کو بُرا بھلا کہتا ہے، بُرائی کے ساتھ ذِکر کرتا ہے۔ وَهُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ: اور وہ خود رحمٰن کے ذکر کا انکار کرنے والے ہیں۔ خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ: عجل کہتے ہیں جلد بازی کو۔ انسان جلد بازی سے بنایا گیا ہے، یعنی جلد بازی اس کے خمیر میں داخل ہے، ہر بات میں یہ جلد بازی کرتا ہے، یوں سمجھو کہ اس کی فطرت میں جلد بازی داخل ہے، ''پیدا کیا گیا انسان جلد بازی سے'' یہ عنوان ہوتا ہے کسی چیز کے فطرت میں داخل ہونے کے لئے، یعنی انسان کی فطرت میں جلد بازی داخل ہے، ایسے ہے جیسے یہ جلد بازی سے بنا ہے۔ سَاُورِيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنِ: عنقریب دکھاؤں گا میں تمہیں اپنی نشانیاں پس تم مجھ سے جلدی مطالبہ نہ کرو۔ فلا تستعجلونِ: ''ن'' کے نیچے جو کسرہ ہے یہ یائے متکلم پر دال ہے۔ پس تم مجھ سے جلدی مطالبہ مت کرو۔ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ: اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ وعدہ کب ہوگا یعنی یہ وعدہ واقع کب ہوگا؟ اگر تم سچے ہو۔ لَوْ يَعْلَمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا حِيْنَ لَا يَكُفُّوْنَ عَنْ وُّجُوْهِهِمُ النَّارَ: اگر جان لیں یہ لوگ جنہوں نے کُفر کیا اس وقت کو جب نہیں روکیں گے یہ اپنے چہروں سے آگ کو اور نہ اپنی پشتوں سے اور نہ یہ مدد کیے جائیں گے، یعنی کیا ہی اچھا ہو کہ ان لوگوں کو اس وقت کا علم حاصل ہوجائے جس وقت نہ یہ اپنے چہروں سے آگ کو روک سکیں گے نہ اپنی پشتوں سے، یعنی آگے پیچھے دونوں طرف سے آگ میں گھرے ہوئے ہوں گے، نہ سامنے سے آگ کو ہٹا سکیں گے نہ پیچھے سے ہٹا سکیں گے، اگر اس وقت کا علم انہیں حاصل ہوجائے اس وقت کا یقین آجائے تو پھر یہ اس قسم کی شرارتیں نہ کریں، اور اس طرح سے پھر جلدی جلدی یہ مطالبہ نہ کریں۔ ''اگر جان لیں یہ لوگ جنہوں نے کُفر کیا اس وقت کو جبکہ نہیں روکیں گے اپنے چہروں سے آگ کو اور نہ اپنی پشتوں سے اور نہ یہ مدد کیے جائیں گے''۔ ''اگر جان لیں'' اس کا جواب

محذوف ہے ''تو پھر یہ ایسی شرارتیں نہ کریں'' اگر ان کو اس وقت کا علم حاصل ہو جائے۔ بَلْ تَاْتِيْهِمْ بَغْتَةً: بلکہ وہ آگ ان کے پاس اچانک آئے گی، فَتَبْهَتُهُمْ پھر وہ آگ ان کو حیرانی میں ڈال دے گی، جب اچانک پیش آئے گی تو حیران پریشان رہ جائیں گے۔ یہ لفظ سورۂ بقرہ میں بھی آیا تھا فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ (آیت: ۲۵۸) کافر کو حیرانی میں ڈال دیا گیا، وہ پریشان ہو گیا۔ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ رَدَّهَا: پھر نہیں طاقت رکھیں گے یہ اس آگ کو رَدّ کرنے کی، وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ: نہ یہ مہلت دیے جائیں گے، نہ یہ ڈھیل دیے جائیں گے، وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ: لقد: یہ تاکید کے لئے ہوتا ہے۔ یہ بات پکی ہے، بے شک، اس میں کوئی شک کی گنجائش نہیں، آپ جو لفظ بولا کرتے ہیں ''البتہ تحقیق'' تو یہ اسی تاکید کو ظاہر کرنے کے لیے ہے، ''ضرور بالضرور'' یہ بھی اسی کا مفہوم ہے،'' یہ بات بالکل صحیح اور پکی ہے کہ استہزا کیا گیا ان رسولوں کے ساتھ جو تجھ سے پہلے ہیں'' فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ: پھر گھیر لیا ان لوگوں کو جنہوں نے ٹھٹھا کیا تھا، جنہوں نے ہنسی مذاق کی تھی ان میں سے، ان میں سے جن لوگوں نے ٹھٹھا کیا تھا ان کو گھیر لیا اس چیز نے جس کا وہ استہزا کیا کرتے تھے۔ استہزا اور مذاق اُڑاتے تھے وہ عذاب کی خبروں کا، کہ جب انبیاء علیہم السلام ان کے سامنے ذکر کرتے کہ یوں تم تباہ ہو جاؤ گے، یوں آگ آئے گی، یوں تم جلو گے، تو ان باتوں کا مذاق اُڑاتے۔ تو جن باتوں کے ساتھ وہ استہزا کیا کرتے تھے یعنی وہ عذاب جس کے ذریعے سے وہ استہزا کرتے تھے، جس کے ساتھ وہ مذاق اُڑاتے تھے اس نے ان لوگوں کو گھیر لیا۔ ''گھیر لیا ان لوگوں کو جنہوں نے ان میں سے تمسخر کیا ٹھٹھا کیا اس چیز نے جس کے ساتھ وہ استہزا کیا کرتے تھے۔''

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط اور آیات بالا کا مضمون

پچھلے رکوع میں توحید کا مضمون چلا آ رہا ہے، خاص طور پر مشرکین کا جو عقیدہ تھا شفاعت کا، اس کو رَدّ کیا گیا تھا۔ اگلی آیات میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے کچھ آیاتِ توحید کو، یا دلائل توحید کو واضح کیا ہے، خاص طور پر اپنی قدرت نمایاں کی ہے جس میں بہت سارے احسانات کے پہلو بھی ہیں، یعنی یہ باتیں جو آگے آ رہی ہیں ان میں اللہ کی قدرت بھی نمایاں ہے، کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ایسی ہے، اس کے ساتھ کسی دوسرے کو تم کیا شریک کرتے ہو، اور اس کے متعلق تم کیا سوچتے ہو کہ کوئی اس سے کہہ سُن کے کوئی فیصلہ غلط کروا سکتا ہے۔ اور ان میں احسانات کے پہلو بھی ہیں جس میں انسان کی ضروریات پوری ہوتی ہیں، دونوں باتیں ہی انسان کے نظریے کو صحیح کرنے والی ہیں، اور اطاعت اور عبادت کے اوپر برانگیختہ کرنے والی ہیں۔

''رتق'' اور ''فتق'' کے دو مفہوم

پہلی بات جو کہی اس کا حاصل یہ ہے کہ آسمان اور زمین کو اللہ نے پیدا کیا تو یہ بند تھے، مرتوقتین تھے، بند ہونے کا کیا مطلب؟ بند ہونے کا مطلب یہ ہے کہ زمین اور آسمان پہلے آپس میں خلط ملط تھے جس طرح سے ایک ہی مادہ کسی چیز کا تیار کیا جاتا

ہے، اور پھر بعد میں اللہ نے ان کو کھول دیا کہ زمین علیحدہ کردی، آسمان علیحدہ کر دیا۔ اگر ''رتق'' اور ''فتق'' کا یہ معنی مراد لیا جائے تو پھر رُؤیت سے رُؤیتِ علمی مراد ہے کہ ان کافروں کو پتا نہیں؟ کہ پہلے زمین اور آسمان ایسے تھے، کیونکہ یہ کوئی دیکھنے کی چیز نہیں، ان کافروں نے اس چیز کو دیکھا نہیں، یہ اللہ تعالیٰ کے وضاحت کرنے کے ساتھ پتا چلا کہ پہلے زمین و آسمان بند تھے، اور پھر بعد میں ان کو کھولا گیا، پہلے ایک ہی مادے کی شکل میں تھے، بعد میں اللہ نے اپنی قدرت کے ساتھ ان کو علیحدہ علیحدہ کیا۔ اور اگر ''فتق'' اور ''رتق'' کا یہ معنی لیا جائے کہ زمین بند ہے، اس میں سے نباتات نہیں اُگتی، اور آسمان بند ہے اس میں سے بارش نہیں اُترتی، اور پھر اللہ تعالیٰ زمین کو کھول دیتے ہیں کہ اس میں سے نباتات اُگنے لگ جاتی ہے، پودے اُگتے ہیں، درخت نکلتے ہیں، پھل وغیرہ پیدا ہوتے ہیں، اور آسمان کو کھول دیتے ہیں کہ اوپر سے بارش اترتی ہے، تو یہ چیز ایسی ہے جو وقتاً فوقتاً دیکھنے کی ہے، ہم بھی دیکھتے ہیں کہ ایک زمین بنجر پڑی تھی، اور ایسی تھی بے جان کہ اس میں نباتات نہیں، دوسرے وقت میں اللہ نے اس کا منہ کھول دیا، اور نباتات ہی نبات اُگ آئی، اور ہم بھی دیکھتے ہیں کہ ایک وقت میں آسمان کے دہانے بالکل بند ہوتے ہیں اور ایک قطرہ نہیں گرتا، اور پھر جب اللہ کا حکم ہوتا ہے تو اوپر سے کس طرح سے بارش برستی ہے، تو یہ اللہ تعالیٰ کے تصرف کے آثار ہیں کہ کبھی زمین بنجر، کبھی آباد ہوگئی، کبھی آسمان کی طرف سے پانی کا قطرہ نہیں آتا اور کبھی پانی برستا ہے، یہ ''فتق'' اور ''رتق'' ایسا ہے جو روز مشاہدے میں آتا ہے، تو پھر یہاں رُؤیتِ بصری بھی مراد لی جاسکتی ہے، ''کافر دیکھتے نہیں؟ کہ زمین بند ہے، آسمان بند ہے، پھر ہم ان کو کھول دیتے ہیں'' کہ آسمان سے پانی برستا ہے، زمین سے نباتات نکلتی ہے، تو اس میں جیسے اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانی ہے ویسے اللہ تعالیٰ کا احسان بھی ہے۔

مشرکین کا ''اللہ کی سلطنت'' کو عام بادشاہوں پر قیاس کرنا غلط ہے!

اور ساتھ ساتھ یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ زمین اور آسمان دونوں ہی اللہ کے کنٹرول میں ہیں، جو پیچھے آیا تھا کہ اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ کہ انہوں نے زمین میں کوئی خدا بنا رکھے ہیں، زمین کی طرف سے کوئی آلہہ قرار دے لیے؟ جیسے میں نے عرض کیا کہ بعض مشرک یوں سمجھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ تو عرش پر ہے اور زمین یہ بہت دور دراز کا علاقہ ہے، تو جس طرح سے ایک بادشاہ اپنے دارالسلطنت سے دُور دراز علاقوں کا کنٹرول نہیں کرسکتا، بلکہ وہاں وہ دوسروں کو بٹھا دیتا ہے تاکہ اس علاقے کو سنبھالیں، تو گویا کہ اللہ تعالیٰ نے بھی زمین کو جو ایک دور دراز علاقہ ہے اس کے عرش سے، یہ بھی دوسروں کے سپرد کردیا، اور اس کا انتظام دوسروں کے ہاتھ میں ہے، اس نظریے میں اللہ تعالیٰ کا عجز اور اللہ تعالیٰ کے علم کا نقص معلوم ہوتا ہے، کہ نہ وہ اللہ کے علم کو محیط سمجھتے ہیں نہ وہ اللہ کی قدرت کو محیط سمجھتے ہیں، اس لیے وہ ظاہری بادشاہوں کے اوپر قیاس کرکے یوں سمجھتے ہیں کہ جیسے دور دراز کے علاقے دوسروں کے سپرد کردیے جاتے ہیں اس طرح سے زمین بھی چونکہ اللہ کے عرش سے بہت دُور علاقہ ہے، تو یہ بھی اللہ نے دوسرے خداؤں کے سپرد کردی ہے، اپنے ماتحت وہاں بٹھادیے ہیں جن کے ذمے انتظام لگادیا ہے۔ تو یہاں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ زمین ہے یا آسمان، دونوں پر تصرف اسی کا چلتا ہے، زمین اس کی اجازت کے بغیر ایک پتا اُگا نہیں سکتی، اور آسمان اس کی اجازت کے بغیر ایک قطرہ گرا نہیں سکتا، یہ اللہ کی قدرت ہے، دونوں کے اوپر کنٹرول ہے۔

زمین وآسمان دونوں کی آپس میں موافقت ہے

اور پھران دونوں کی آپس میں موافقت ہے کہ زمین اورآسمان کے اثرات آپس میں ملتے ہیں تو انسان کی زندگی کی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں، نہ اکیلی زمین سے انسان کی ضرورت پوری ہوتی ہے نہ اکیلے آسمان سے،اسی لیے اگرآسمان کی حکومت کسی اور کے پاس ہوزمین کی حکومت کسی اور کے پاس ہواوران کی آپس میں موافقت نہ ہو،تو پھر یہ نظم کس طرح سے ٹھیک رہ سکتا ہے؟ یہ فتق اور رتق کا معنی ایسا ہے جومشاہدے میں آتا رہتا ہے۔''کیا کافروں نے دیکھانہیں؟ کہ آسمان اورزمین بند تھے پھر ہم نے ان دونوں کوکھول دیا''۔''بند تھے''یہ آپ کے سامنے آتا رہتا ہے۔

ہرزندہ چیز پانی سے پیدا کی گئی

''اورہم نے ہرزندہ چیز کو پانی سے بنایا''زندہ چیز جس میں حیات ہے،اس میں کسی نہ کسی درجے میں رطوبت ضرور ہوتی ہے،جو پانی کا اثر ہے، پیدا ہونے میں پانی کا اثر ہے، باقی رہنے میں پانی کا اثر ہے،حیوانات اورانسانوں میں تو آپ دیکھتے ہی ہیں کہ پانی کے بغیران کی زندگی کیسے گزرسکتی ہے، پانی کے ساتھ ہی نباتات اگتی ہے،نباتات کے ساتھ ہی انسان وحیوان غذائیں حاصل کرتے ہیں، اور یہ جتنے کیڑے مکوڑے ہیں اکثر وبیشتر یہ رطوبت سے ہی پیدا ہوتے ہیں،''کیا یہ لوگ ایمان نہیں لاتے؟''یعنی قدرت کی نشانیاں دیکھ کےاوراللہ تعالیٰ کے انعامات اوراحسانات کومحسوس کرکے یہ یقین نہیں کرتے؟

پہاڑوں کی تخلیق میں حکمت

''اورہم نے زمین میں بوجھل پہاڑ ڈال دیئے''یہ بھی آپ کے سامنے ہے،اوراتنے بڑے بڑے پہاڑ،ثوابت جس کو کہہ سکتے ہیں، جمے ہوئے، جوہلائے نہیں ہلتے، یہ ڈال دیے۔ان میں اللہ کی قدرت بھی نمایاں ہے کہ کتنے بڑے بڑے بنائے،اوراس میں یہ احسان کا پہلوبھی ہے کہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ زمین کا اکثر حصہ پانی کے ساتھ ملا ہوا ہے،جغرفیائی طور پراگرآپ کبھی نقشے پہ اس زمین کے کرے کودیکھیں گے،تو بڑی مشکل سے تہائی حصہ زمین کا ننگا ہےجس کے اوپرآبادی ہے،جس کوربعِ مسکون کہتے ہیں، جس میں سکونت ہے، یہ چوتھا حصہ ہے، تین حصے پانی ہے،اوریہ ساری کی ساری زمین آسمانوں کے درمیان میں کرے کی شکل میں ہواکے اوپر ہے، اس کے اردگرد ساری ہوا ہے، اورتین حصے اس میں پانی ہی پانی، اوراتنا گہرا پانی، میلوں گہرا، ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر، اور یہ تھوڑا سا حصہ خشکی میں نمایاں ہے جوکل زمین کا بڑی مشکل سے چوتھا حصہ ہے۔[1] اب پانی اس قدر،اورپھرہوا کے درمیان میں یہ کرہ لٹکا ہوا ہے،تواس میں اگراضطرابی حرکت پیدا ہوجائے،جس طرح سے کشتی ڈولتی ہے،ایک طرف کوڈھلکتی ہے،تو آپ جانتے ہیں کہ اس کے اوپرانسان کی زندگی مشکل ہوجائے۔تواللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے اتنے بڑے بڑے وزنی پہاڑ جوقائم کیے ہیں تواس سے مقصد یہ ہے کہ تاکہ یہ اضطرابی حرکت نہ کرے، زمین کا توازن بحال ہوگیا،اورتوازن کے بحال ہونے

(۱) ۷۰.۸ فیصد پانی ہے،اور ۲۹.۲ فیصد خشکی ہے۔ یہ چوتھائی سے کچھ زیادہ اورتہائی سے کچھ کم بنتا ہے۔

کے ساتھ انسان کا اس کے اوپر رہنا ممکن ہوگیا، ورنہ اگر یہ یوں ہلتی اور اس میں ہچکولے ہوتے تو اس کے اوپر آبادی نہ ہوسکتی، تو پہاڑوں کے قائم کرنے میں اللہ کی قدرت بھی نمایاں ہے اور ساتھ ساتھ یہ احسان بھی ہے کہ اس کے ساتھ زمین کی اضطرابی حرکت ختم ہوگئی۔ یہ اضطرابی حرکت ایسے سمجھئے جس طرح سے اللہ تعالیٰ کبھی کبھی اپنی قدرت کو ظاہر کرنے کے لئے زلزلہ بھیج دیتا ہے، وہ زلزلہ ایک قسم کی اضطرابی حرکت ہوتی ہے، اور جہاں زلزلہ آتا ہے زمین ٹوٹ پھوٹ جاتی ہے، آبادیاں غرق ہوجاتی ہیں، تو کبھی کبھی اللہ تبارک وتعالیٰ اس قسم کے آثار نمایاں کردیتے ہیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ اگر یہ پہاڑ نہ ہوتے تو پھر یہ زمین کسی صورت میں بھی قرار نہ پکڑتی بلکہ اس میں ہچکولے ہوتے، تو یہ اس میں احسان کا پہلو بھی ہے کہ ہم نے اس میں بڑے بڑے بوجھل پہاڑ ڈال دیے تاکہ وہ زمین ان لوگوں کو لے کے اضطرابی حرکت نہ کرے، ہچکولے نہ کھائے، یہ ہچکولوں کی نفی کرنی مقصود ہے، باقی! اگر وہ یوں چلتی ہو جس طرح سے سائنس دان کہتے ہیں کہ یہ زمین بھی گھومتی ہے سورج کے اردگرد، تو یہ حرکت ایسی ہے جس طرح سے ریل گاڑی چلتی ہے یا کشتی ایک کنارے سے دوسرے کنارے کی طرف چلتی ہے، اس حرکت کی نفی کرنا یہاں مقصود نہیں ہے، کیونکہ وہ حرکت انسانی آبادی کے لئے کوئی نقصان دینے والی نہیں، ہچکولوں والی حرکت نقصان دینے والی ہے، پہاڑ ڈال کر اس کا روکنا مقصود ہے۔

پہاڑوں کے اندر راستے بھی اللہ کا اِنعام ہیں

پھر اگر یہ پہاڑ اس طرح سے ڈال دیے جاتے کہ ان میں کوئی راستہ نہ ہوتا ایک طرف سے دوسری طرف جانے کو، تو پھر بھی انسان کے لئے مشکلات پیش آتیں، اب اللہ تعالیٰ نے اتنے بڑے بڑے پہاڑ بنائے کہ یوں جھانکیں گے تو ان کی چوٹی نظر نہیں آتی، اتنے اونچے اونچے ہوتے ہیں، لیکن تھوڑی تھوڑی جگہ پر جاکر پھر دَرّے اور راستے بنے ہوئے ہیں، تاکہ ایک طرف سے دوسری طرف اگر آپ جانا چاہیں تو راستہ موجود ہے، یہ بھی اللہ تعالیٰ کا احسان ہے۔ ورنہ اگر ان کو اس طرح سے بنادیا جاتا کہ ان میں راستہ کوئی نہ ہوتا تو اِدھر والے اِدھر بند رہ جاتے، اُدھر والے اُدھر بند رہ جاتے، ایک دوسرے تک پہنچنا ممکن نہ ہوتا، جیسے سمندروں کو آپ نے کشتیوں کے ذریعے سے عبور کرلیا، اس کا بھی اللہ نے بار بار احسان جتلایا، اسی طرح سے پہاڑوں کے اندر یہ راستے بھی اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا اِنعام ہیں کہ ایک وادی سے دوسری وادی میں پہنچنا آسان ہوگیا۔ وَجَعَلْنَا فِيْهَا فِجَاجًا سُبُلًا: بنادیے اللہ تعالیٰ نے زمین میں یا بنادیے اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں میں کھلے کھلے راستے۔ فِيْهَا کی ضمیر رواسی کی طرف بھی لوٹ سکتی ہے، ارض کی طرف بھی لوٹ سکتی ہے، لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ میں دونوں مطلب آگئے جیسے میں نے پہلے عرض کیا تاکہ یہ لوگ اپنی منزل مقصود تک راستہ پائیں، اور، تاکہ یہ لوگ ہدایت حاصل کریں۔ یہ تو نیچے والے جہان کی کچھ علامات بتائیں۔

آسمان اور رَات دِن میں دلائلِ قدرت

''اور ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت بنادیا'' یہ زمین کے اوپر ایسے ہے جیسے چھت، اور یہ محفوظ ہے ٹوٹنے پھوٹنے سے اور اسی طرح سے شیاطین کے تصرف سے، اور یہ لوگ اس کی نشانیوں سے اعراض کیے ہوئے ہیں، کہ اِدھر غور کرکے، تدبر کرکے ان

نشانیوں سے اللہ کی قدرت کو نہیں سمجھتے۔ آگے زمانے کی بات آ گئی جس طرح سے پہلے مکان کا تذکرہ تھا، کہ اللہ وہ ہے جس نے رات اور دِن کو بنایا، یہ دونوں کس طرح سے آپس میں متضاد ہیں، لیکن متضاد ہونے کے باوجود کس طرح سے موافقت کے ساتھ آتے جاتے ہیں۔ ’’بنایا اس نے رات اور دِن کو، سورج اور چاند کو، ہر کوئی اپنے دائرے میں تیرتا ہے‘‘ یعنی تیزی کے ساتھ چلتا ہے، جہاں جہاں اللہ نے کسی کو قائم کر دیا وہیں وہیں وہ گھوم رہا ہے۔ یہ سب آیاتِ قدرت تھیں جن میں احسانات کے پہلو بھی ہیں۔

کیا آپ ﷺ کے جانے کے بعد آپ کا کام ختم ہو جائے گا؟

اور آپ کو معلوم ہوگا کہ پیچھے رسالت کا تذکرہ بھی تھا کہ یہ لوگ حضور ﷺ کی رسالت کا انکار کرتے تھے، اور کہتے تھے کہ یہ تو ہماری طرح بشر ہی ہے، پہلے رکوع کے اندر اس کا ذکر آیا تھا، اور اللہ تعالیٰ نے اس کی وضاحت وہاں بھی کی تھی، اور پھر جب وہ حضور ﷺ کے دلائل کا جواب نہ دے سکتے یا آپ کی باتوں کے سامنے مرعوب ہوتے، تو پھر آپس میں بیٹھ کے یوں کہتے کہ کوئی بات نہیں، جب تک یہ زندہ ہے اس وقت تک شور ہے، آخر ایک دِن مرجائے گا تو یہ بات ختم ہو جائے گی، نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ (سورۂ طور: ۳۰) موت کے حادثے کا انتظار کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ مرے گا، مرنے کے ساتھ قصہ ختم ہو جائے گا۔ تو موت کا تذکرہ جو وہ کرتے تھے رسول اللہ ﷺ کا، اگر تو وہ اس لیے کرتے تھے کہ مرجانا علامت اس بات کی ہے کہ نبی نہیں، اگر نبی ہوتا تو موت نہ آتی، تو یہ بات بھی غلط، کیونکہ پہلے جتنے انبیاء بھیجے گئے ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ہم نے کسی کے لئے خلد نہیں قرار دیا، بلکہ وہ بھی اپنا اپنا وقت گزار کے اپنی حیثیت کے مطابق موت کے دروازے سے گزر گئے، اسی طرح سے اگر آپ کی وفات ہو جائے گی تو یہ آپ کی نبوت کے منافی نہیں ہے، جس طرح سے پہلے انبیاء ﷩ تھے ان کو وقت پر موت آئی تو آپ کو بھی آ جائے گی، اور اگر یہ موت کا تذکرہ خوشی کے طور پر کرتے ہیں کہ مرے گا تو یہ کام ختم ہو جائے گا، تو ان سے پوچھو کہ اگر میں نے مرنا ہے تو تم نے کوئی ہمیشہ زندہ رہنا ہے؟ اس لیے کسی کی موت یہ کوئی خوشی کی بات نہیں ہے، یعنی کسی کی موت کی تمنا کرنا کہ یہ مرے تاکہ یہ قصہ ختم ہو جائے، یہ کوئی ایسی بات نہیں۔ جیسا کہ ہمارے شیخ سعدی ﷫ کہتے ہیں، ’’گلستان‘‘ (باب اوّل، حکایت ۲۷) کے اندر آپ نے پڑھا ہوگا کہ:

اگر بمُرد عدو جائے شادمانی نیست   کہ زندگانیٔ ما نیز جاودانی نیست

کہ دشمن اگر مرجائے تو یہ کوئی خوشی کی بات نہیں ہے، کیونکہ ہم نے بھی تو آخر مرنا ہی ہے، ہمیشہ زندہ تو نہیں رہنا، تو جو چیز ہم پر بھی وارد ہونے والی ہے، اگر ہمارے مخالف پر وارد ہو جائے تو یہ کون سا خوشی کا مقام ہے۔ تو آگے اسی شبہ کو دور کیا جا رہا ہے کہ وہ سرورِ کائنات ﷺ کی موت کا انتظار کرتے تھے، اگر تو یہ نبوّت کے انکار کے طور پر کرتے تھے کہ اگر مر گئے تو معلوم ہو گیا کہ نبی نہیں، تو پہلے انبیاء ﷩ کا حوالہ آ گیا، اور اگر وہ اس خوشی کے طور پر کرتے تھے کہ ایک دِن مرجائیں گے، قصہ ختم ہو جائے گا، پھر ان کو ان کی موت یاد دلائی جا رہی ہے، کہ مرنا کوئی اکیلا انہوں نے نہیں، تم نے بھی مرنا ہے، ’’نہیں بنایا ہم نے کسی انسان کے لئے آپ سے قبل ہمیشگی کو کہ وہ ہمیشہ رہے، کیا اگر آپ مرجائیں گے تو یہ ہمیشہ رہنے والے ہیں؟ ہر نفس موت کا مزہ چکھنے والا ہے۔‘‘

اچھے بُرے حالات مقبول یا مردود ہونے کی دلیل نہیں

باقی رہے اچھے بُرے حالات کہ کوئی فقیر ہے کوئی غنی ہے، جس طرح سے وہ لوگ کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اگر کوئی رسول بنانا تھا تو طائف اور مکہ میں بڑے بڑے رئیس بڑے بڑے دولت مند پڑے ہوئے تھے، ان میں سے کسی کو بنادیتا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ (سورۂ زخرف:۳۱) قریتین سے طائف اور مکہ مراد ہیں، یہ دونوں شہر ہیں۔ عظیم یہ رجل کی صفت ہے۔ کیوں نہ اتارا گیا یہ قرآن دونوں شہروں میں سے کسی بڑے آدمی پر؟ بڑے سے مراد، صاحب عظمت سے مراد ان کے ہاں مال دار سردار قسم کے لوگ تھے، کہ اللہ نے اگر رسول بنانا ہی تھا تو کسی بڑے آدمی کو بناتا، یہ کیا ہے کہ رسول کے پاس کھانے کو روٹی نہیں، رہنے کے لیے کوئی خاص مکان نہیں، کوئی جائیداد نہیں، کوئی فوجیں ساتھ نہیں، کوئی خزانہ نہیں، یہ کیسا اللہ کا رسول ہے؟ یہ مشرکین کا ذہن تھا، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ دنیا کے اندر جو اچھے بُرے حالات آتے ہیں کہ کوئی فقیر ہے کوئی غنی ہے، کوئی مال دار ہے کوئی نادار ہے، یہ حالات عظمت کی دلیل نہیں ہیں، کوئی شخص مال دار ہو تو اللہ کا منظورِ نظر ہو، اور اللہ کے ہاں مقبول ہو، محبوب ہو، ایسی بات نہیں، اور اگر کوئی مال سے محروم ہو جائے تو نعوذ باللہ! اللہ کے ہاں مردود ہو، ایسی بات نہیں، مال کی کثرت یا قلت اور اسی طرح سے دوسرے حالات یہ تو سب آزمائش کے لئے ہیں، اللہ تعالیٰ کے ہاں مرتبہ اسی شخص کا ہوگا جو اللہ کے اَحکام کے مطابق چلتا ہے، دنیا کے یہ نشیب وفراز نہ مقبول ہونے کی علامت ہیں نہ مردود ہونے کی، اس لیے مال دولت پا کے کوئی یہ سمجھے کہ میں اللہ تعالیٰ کا محبوب ہوں، رسول بھی مجھے بننا چاہیے تھا، یہ حماقت ہے، دنیا کے حالات کوئی معیار نہیں ہیں کہ یہ اللہ کے نزدیک مقبول ہے یا مردود، اللہ کے ہاں مقبول اور مردود ہونے کا معیار اس کے اَحکام کی اطاعت اور تقویٰ پر ہے، باقی! یہ نشیب وفراز آزمائش کے لئے آتا رہتا ہے، اچھے حالات میں بھی اللہ تعالیٰ آزماتے ہیں، بُرے حالات میں بھی آزماتے ہیں۔ اور پھر تم سب ہماری طرف ہی لوٹ کے آؤ گے، وہاں جا کے پتا چلے گا کہ اس آزمائش میں تم کتنے پورے اترے؟

حضور ﷺ کو تسلی

''اور یہ کافر جس وقت آپ کو دیکھتے ہیں تو مذاق اڑاتے ہیں'' یہ ابتدا سے ہی انبیاء علیہم السلام کے ساتھ کُفّار کا معاملہ قرآنِ کریم میں ذکر کیا گیا، جیسے آگے حوالہ آئے گا کہ آپ سے پہلے رسولوں کے ساتھ بھی یونہی اِستہزا کیا گیا۔ یہ آیات سرورِ کائنات ﷺ کی تسلی کے لئے ہیں، کیونکہ عام آبادی خواہشات کے پیچھے چلنے والی ہوتی ہے، انبیاء علیہم السلام ان کو خواہشات سے موڑ کے اللہ کی اطاعت اور عبادت کی طرف لانا چاہتے ہیں، اطاعت اور عبادت نفس کو گراں گزرتی ہے، اس لیے لوگ انبیاء علیہم السلام کی بات کو مانتے نہیں، پھر جس کی بات کو نہ ماننا ہو تو پھر انسان اس کی ہنسی بھی کرتا ہے، مذاق بھی اڑاتا ہے، تکلیف بھی پہنچاتا ہے، اس قسم کی باتیں ہوتی رہتی ہیں، تو سرورِ کائنات ﷺ کے ساتھ بھی وہ ایسا معاملہ کرتے تھے، تو اللہ تعالیٰ آپ کو تسلی دے رہے ہیں، ''جس وقت دیکھتے ہیں یہ کافر لوگ آپ کو تو نہیں بناتے آپ کو مگر هُزُوًا یعنی مَهْزُوًّا بِهٖ جس کے ساتھ ٹھٹھا مذاق کیا جاتا ہے۔

مشرکین بتوں کو اللہ پر ترجیح دیتے ہیں

مذاق بھی کرتے ہیں اور پھر ساتھ لوگوں کو ایک دوسرے کو کہتے بھی ہیں ''کیا یہ ہے جو تمہارے بتوں کا تذکرہ کرتا ہے؟ تمہارے آلہہ کا تذکرہ کرتا ہے؟'' یعنی بُرائی کے ساتھ، تو بتوں کے تذکرے پر تو وہ یوں چڑتے ہیں، لیکن خود رحمٰن کے ذکر کا انکار کرنے والے ہیں، اس پر ان کو حیا نہیں آتی، یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کا جو معاملہ ہے اس کو تو وہ محسوس نہیں کرتے رحمٰن کے ساتھ جو کچھ وہ کررہے ہیں، اور اگر ان کے بتوں کے ساتھ کوئی اس قسم کی بات کرتا ہے تو اس پر یہ چڑتے ہیں، تو کتنی ناانصافی ہے؟ کہ بتوں کی حمایت میں اس طرح سے بازو چڑھائے ہوئے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے حقوق کو تلف کررہے ہیں اور ادھر خیال ہی نہیں ہے۔

اِنسان بڑا جلد باز ہے

یہ اور پھر یہ جو کہتے ہیں کہ اگر عذاب آنے والا ہے تو جلدی لے آؤ، یہ جلد بازی انسان کی خصلت ہے، انسان اس سے پیدا کیا گیا ہے، اس کی سرشت میں داخل ہے۔ ''پیدا کیا گیا'' کا یہ معنی نہیں کہ جلد بازی کوئی ایسی چیز ہے جس سے انسان کو بنایا گیا ہو، بنا تو انسان مٹی سے ہے، جس میں پانی کا عنصر ہے، ہوا ہے، آگ ہے، یہ ہیں عناصر جن سے انسان کو بنایا گیا، جب کوئی عادت کسی شخص کے اوپر غالب آجاتی ہے تو یہ عرب کا محاورہ ہے کہ یوں کہتے ہیں کہ یہ تو فلاں چیز سے پیدا ہوا ہے، جیسے کوئی بہت غصے والا آدمی ہو تو کہتے ہیں کہ یہ تو مجسم غصہ ہے، یہ تو ایسے ہے جیسے غصے سے ہی بنا ہے، تو اس محاورے کے تحت یہ بات ہے، عام طور پر انسان جلد باز ہے جیسے قرآنِ کریم میں دوسری جگہ ہے كَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا (سورۂ اسراء:۱۱) مطلب یہ ہے کہ جلد بازی کرنے کی ضرورت نہیں، تم اپنے علم اور سوچ سمجھ سے چلتے رہو، جو انجام تمہیں بتایا جارہا ہے وہ بہت جلدی تمہارے سامنے آجائے گا۔ سَاُورِيْكُمْ اٰيٰتِيْ: میں جلدی ہی تمہیں اپنی نشانیاں دکھاؤں گا، قدرت کی نشانیاں، پس تم مجھ سے جلدی طلب نہ کرو۔ اور یہ ان کی وہی جلدی کی بات ہے، کہتے ہیں کہ یہ وعدہ کب ہوگا؟ یعنی اس وعدے کے پورا ہونے کا وقت کب آئے گا؟ اگر تم سچے ہو تو عذاب ہمارے سامنے لے آؤ۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ مہلت جو دی گئی ہے تمہارے فائدے کے لیے ہے اور اس سے تم فائدہ اٹھا سکتے ہو، ورنہ اگر تمہیں اس وقت کا پتا چل جائے جس وقت تمہارا یہ حال ہوگا کہ چاروں طرف سے تمہیں آگ گھیرے ہوئے ہوگی، نہ تم اپنے سامنے سے ہٹا سکو گے، نہ پیچھے سے ہٹا سکو گے، نہ تمہاری کوئی مدد کرنے کے لئے آئے گا، اگر اس وقت کا تمہیں اندازہ ہوجائے تو پھر تم اس طرح سے جلدی نہ مچاؤ، اس آخرت کو پھر تم جلدی طلب نہ کرو، یہ مفہوم ہے اگلی آیات کا، ''اگر جان لیں یہ لوگ جنہوں نے کُفر کیا اس وقت کو جبکہ نہیں ہٹائیں گے، نہیں روکیں گے، (كَفَّ يَكُفُّ: روکنا) نہیں روکیں گے اپنے چہروں سے آگ کو، اور نہ اپنی پشتوں سے، یعنی آگے سے بھی نہیں ہٹا سکیں گے، پیچھے سے بھی نہیں ہٹا سکیں گے، اور نہ یہ مدد دیے جائیں گے۔'' ''لَو'' کا جواب محذوف ہے ''اگر جان لیں تو پھر یہ جلدی نہ مچائیں''، یا ''اس قسم کی شرارتیں نہ کریں۔'' بلکہ وہ آگ ان کے سامنے اچانک آجائے گی، پھر ان کو حیران کردے گی، اور پھر یہ اس کو دور نہیں ہٹا سکیں گے، نہ ان کو مہلت ملے گی، فوراً اس عذاب کے اندر مبتلا ہوجائیں گے۔

انبیاء علیہم السلام کی وراثت میں اِستہزا بھی برداشت کرنا پڑے گا

تسلی کے الفاظ یہ ہیں کہ اس قسم کے حالات پہلے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ بھی گزرے، لوگوں نے ان کا بھی استہزا کیا۔ جب بھی کوئی عذاب کی خبر آتی تھی کہ اگر تم اپنے طریقے سے باز نہیں آؤ گے تو اللہ کی گرفت میں آ جاؤ گے، عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے، تو لوگ اس پہ ہنستے اور مذاق اڑاتے کہ لو! یہ کہتے ہیں کہ یوں پکڑے جائیں گے، یہ ہوگا، وہ ہوگا، تو پھر جس عذاب کا وہ مذاق اڑاتے تھے اسی عذاب نے ان کو گھیر لیا۔ تو پہلے رسولوں کا حوالہ دے کے تسلی دینی مقصود ہے، جیسے بار بار آپ کی خدمت میں عرض کیا کرتا ہوں کہ اس منصب کو بھولا نہ کیجئے۔ علماء، اہلِ علم، یہ ورثۃ الانبیاء ہیں، تو جس قسم کے حالات انبیاء علیہم السلام پہ گزرے ہیں، علماء پر بھی گزریں گے، اگر کافر لوگ انبیاء علیہم السلام کا مذاق اڑاتے تھے تو آج فاسق فاجر اور جاہل اگر علماء کا مذاق اڑاتے ہیں تو اس میں کون سی تعجب کی بات ہے، جاتے ہوئے فقرے کس دینا، اور اس طرح سے مذاق اُڑانا، جس طرح سے پیچھے ذکر آیا کہا اپنے آلہہ کا تذکرہ کرتے تھے کہ ''کیا یہ ہے جو تمہارے آلہہ کا برائی کے ساتھ ذکر کرتا ہے؟'' یوں کہہ کے وہ چھیڑتے بھی تھے اور مذاق بھی اڑاتے تھے، انبیاء علیہم السلام کے ساتھ یہ گزرتی رہی، تو علماء جو ورثۃ الأنبیاء ہیں، اور اسی طرح سے دین کا علم حاصل کرنے والے جو انبیاء علیہم السلام کی وراثت کو حاصل کر رہے ہیں، تو اگر جاہل فاسق فاجر لوگ ان کے ساتھ استہزا کرتے ان کا مذاق اڑاتے ہیں تو یہ تو تمہاری وراثت کے صحیح ہونے کی علامت ہے، اور لوگوں کی ہنسی مذاق سے اگر تم نے ڈرنا ہو، اور بچنا ہو کہ یہ لوگ ہمارا مذاق نہ اڑائیں تو انبیاء علیہم السلام کا راستہ چھوڑ دو، اور انہی فساق فجار کے ساتھ شامل ہو جاؤ، جب ان فساق فجار میں شامل ہو جاؤ گے پھر تمہارا کوئی مذاق نہیں اڑائے گا، اور اگر اس راستے کے اوپر چلنا ہے تو یہ باتیں سنی پڑیں گی، سہی پڑیں گی، انبیاء علیہم السلام کی وراثت کے ساتھ پھر یہ بات بھی آئے گی۔ ہمارے شیخ (سعدی رحمۃ اللہ علیہ) کہتے ہیں کہ:

یا مکن با پیلباناں دوستی   یا بنا کن خانہ در خوردِ پیل

(گلستاں، باب ۸)

کہ یا تو ہاتھی والوں سے یاری نہ لگایا کرو، اور اگر ہاتھی والوں کو یار بنانا ہے تو پھر گھر اونچے اونچے بنایا کرو، کیونکہ جب وہ دوست ہاتھیوں پہ چڑھ کے آئیں گے تو کم از کم ہاتھی ٹھہرنے کی گنجائش تو ہو۔ اور پنجابی کا محاورہ کہ ''اُٹھاں والاں نال یاری لا کے دروازے چھوٹے نہیں رکھی دے'' اگر اُونٹوں والوں کے ساتھ یاری لگائی ہے تو دروازے اونچے اونچے رکھو، کہ جب وہ یار اونٹوں پہ بیٹھ کے آئیں تو کم از کم گزرنے کی گنجائش تو ہو، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جس پارٹی اور جس جماعت کے ساتھ انسان کا تعلق ہو تو پھر اس کے مطابق انسان کو رہنا سہنا چاہیے، انبیاء علیہم السلام کے ساتھ اگر تعلق ہے اور ان کی وراثت آپ سمیٹ رہے ہیں، تو آپ کو دنیا میں فقر بھی برداشت کرنا پڑے گا، فاقہ بھی برداشت کرنا پڑے گا، لوگوں کے طعن بھی سننے پڑیں گے، استہزا بھی سنا پڑے گا، یہ ساری کی ساری چیزیں برداشت کرنی ہوں گی، انبیاء علیہم السلام جس طرح سے برداشت کرتے چلے آئے، یہ جاہل لوگوں کا، فاسق فاجر لوگوں کا،

کافروں کا ابتدا سے طریقہ چلا آرہا ہے کہ اہلِ علم کا مذاق اڑاتے ہیں۔تو پچھلی تاریخ کا حوالہ دے کے سرورِ کائنات ﷺ کو تسلی دی جارہی ہے کہ آپ سے قبل بھی رسولوں کے ساتھ استہزا کیا گیا تھا، اس لیے اگر آپ کے ساتھ استہزا کیا جارہا ہے تو آپ اس کو محسوس نہ کریں، جیسے وہ استہزا کرنے والے عذاب کے چکر میں آگئے، اور اس عذاب نے جس کی خبر سن کر وہ مذاق اڑایا کرتے تھے اس عذاب نے ان کو گھیر لیا، اسی طرح سے آپ کے ساتھ استہزا کرنے والے بھی بچیں گے نہیں، اپنے وقت پر یہ بھی اسی طرح سے عذاب کی گرفت میں آجائیں گے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

قُلْ مَنْ يَّكْلَؤُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ مِنَ الرَّحْمٰنِ ؕ بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۴۲﴾

آپ کہہ دیجئے کون حفاظت کرتا ہے تمہاری رات میں اور دن میں رحمٰن سے، بلکہ یہ اپنے رَبّ کے ذِکر سے اعراض کرنے والے ہیں ﴿۴۲﴾

اَمْ لَهُمْ اٰلِهَةٌ تَمْنَعُهُمْ مِّنْ دُوْنِنَا ؕ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَ اَنْفُسِهِمْ وَلَا هُمْ مِّنَّا

کیا ان کے لئے کچھ آلہہ ہیں جو انہیں بچاتے ہیں ہمارے علاوہ، نہیں طاقت رکھتے وہ اپنے نفسوں کی مدد کرنے کی اور نہ وہ ہماری طرف سے

يُصْحَبُوْنَ ﴿۴۳﴾ بَلْ مَتَّعْنَا هٰٓؤُلَآءِ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ؕ اَفَلَا يَرَوْنَ

ساتھ دیے جاتے ہیں ﴿۴۳﴾ بلکہ فائدہ پہنچایا ہم نے ان کو اور ان کے آباء کو حتّٰی کہ دراز ہوگئی ان کے اوپر عمر، کیا پھر یہ دیکھتے نہیں

اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ؕ اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۴۴﴾ قُلْ اِنَّمَآ

کہ ہم آتے ہیں ان کی زمین کو گھٹاتے ہوئے اس کے کناروں سے، کیا پھر یہ غالب آنے والے ہیں؟ ﴿۴۴﴾ آپ کہہ دیجئے کہ

اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ ۖ وَلَا يَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَآءَ اِذَا مَا يُنْذَرُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَلَئِنْ مَّسَّتْهُمْ

میں تمہیں ڈراتا ہوں وحی کے ذریعے سے، اور نہیں سنتے بہرے پکار جس وقت ان کو ڈرایا جاتا ہے ﴿۴۵﴾ اگر چھولے انہیں

نَفْحَةٌ مِّنْ عَذَابِ رَبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۴۶﴾ وَنَضَعُ

تیرے رَبّ کے عذاب کا ایک جھونکا البتہ ضرور کہنے لگ جائیں گے ہائے ہماری بدبختی! بے شک ہم ہی قصوروار تھے ﴿۴۶﴾ اور ہم رکھیں گے

الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا ؕ وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ

انصاف والی ترازو قیامت کے دن پھر نہیں ظلم کیا جائے گا کوئی نفس کچھ بھی، اگر کوئی عمل رائی کے دانے کے

مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ؕ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ﴿۴۷﴾ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ

برابر بھی ہوگا تو ہم اس کو لے آئیں گے، اور ہم کافی ہیں حساب کرنے والے ﴿۴۷﴾ البتہ تحقیق ہم نے موسیٰ اور ہارون کو فرقان

وَضِيَآءً وَّذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۸﴾ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَهُمْ مِّنَ السَّاعَةِ

اور ضیاء اور ذکر دیا متقین کے لئے ﴿۴۸﴾ جو بن دیکھے اپنے رَبّ سے ڈرتے ہیں اور وہ قیامت سے

مُشْفِقُوْنَ ﴿۴۹﴾ وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ ؕ اَفَاَنْتُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿۵۰﴾

بھی ڈرتے ہیں ﴿۴۹﴾ یہ نصیحت ہے برکت دی ہوئی، ہم نے اس کو اُتارا، کیا پھر تم اس کا انکار کرنے والے ہو؟ ﴿۵۰﴾

تفسیر

مشرکین کی ناشکری

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ قُلْ مَنْ يَّكْلَؤُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ مِنَ الرَّحْمٰنِ: كَلَأَ يَكْلَأُ: حفاظت کرنا۔ آپ پوچھئے، کہہ دیجئے آپ، کہنے سے مراد یہاں پوچھنا ہے، کون حفاظت کرتا ہے تمہاری رات میں اور دِن میں رحمٰن سے؟ یعنی رحمٰن کے عذاب سے۔ رحمٰن کی پکڑ سے، رحمٰن کے عذاب سے تمہاری دِن رات کون حفاظت کرتا ہے؟ بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ مُّعْرِضُوْنَ: بل اِضراب کے لئے آیا کرتا ہے، ''نحو'' میں آپ پڑھتے ہیں، تو یہاں اِضراب یوں ہوجائے گا کہ اس احسان پر چاہیے تو تھا کہ وہ شکر ادا کرتے اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے قائل ہوجاتے، کہ اللہ تعالیٰ نے دِن رات عافیت دے رکھی ہے، عذاب سے یہ محفوظ ہیں، باوجود اس کے کہ یہ ہر قسم کی سرکشی کا ارتکاب کرتے ہیں، لیکن یہ متاثر نہیں ہوتے اور اس عافیت کی قدر نہیں کرتے اور اس عافیت پہ شکر ادا نہیں کرتے، بلکہ اپنے رَبّ کے ذکر سے اعراض کرنے والے ہیں، اپنے رَبّ کے ذکر کی طرف متوجہ نہیں ہوتے جو ان کی حفاظت کرتا ہے، صبح شام رات دِن ان کو عذاب سے بچائے ہوئے ہے، عافیت دیے ہوئے ہے۔ ''بلکہ یہ اپنے رَبّ کے ذکر سے اعراض کرنے والے ہیں۔''

مشرکین کے آلہہ بے بس ہیں

اَمْ لَهُمْ اٰلِهَةٌ تَمْنَعُهُمْ مِّنْ دُوْنِنَا: کیا ان کے لئے کچھ آلہہ ہیں جو انہیں بچاتے ہیں ہمارے علاوہ؟ ہمارے علاوہ کوئی اور ان کے آلہہ ہیں جو انہیں بچاتے ہیں؟ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَ اَنْفُسِهِمْ: اگر ان کے آلہہ ہیں جس طرح سے انہوں نے بنا رکھے ہیں، وہ ان کو بچا نہیں سکتے۔ ان کا تو حال یہ ہے کہ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَ اَنْفُسِهِمْ نہیں طاقت رکھتے وہ اپنے آپ کی مدد کرنے کی، وہ اپنے نفسوں کی مدد کرنے کی طاقت نہیں رکھتے، مطلب واضح ہے، یعنی وہ بے جان ہیں، بے اختیار ہیں، اگر ان کو کوئی توڑنا چاہے پھوڑنا چاہے تو اپنے

آپ کو بچا نہیں سکتے، ان کا کوئی نقصان کرنا چاہے تو وہ اپنے آپ کو بچا نہیں سکتے۔ وَلَا هُمْ مِّنَّا يُصْحَبُوْنَ: اور نہ وہ ہماری طرف سے ساتھ دیے جاتے ہیں۔ صَحِبَ: ساتھی بننا۔ اور یہاں محاورے کے تحت ایک ترجمہ ہوگا: اَنَا صَاحِبُكَ مِنْ فُلَانٍ، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ فلاں سے بچانے کے لئے میں تیرا ساتھی ہوں، یعنی فلاں کے مقابلے میں تیرے ساتھ ہوں، مِنْ فُلَانٍ کا معنی فلاں سے بچانے کے لئے، فلاں کے بالمقابل میں تیرا ساتھی ہوں، تو یہاں اس محاورے کے مطابق ترجمہ ہوگا کہ ہمارے مقابلے میں وہ ساتھ نہیں دیے جائیں گے، ہمارے مقابلے میں ان کا کوئی ساتھی نہیں ہوگا، نہ یہ معبود ہی ان کو بچا سکتے ہیں، یہ تو خود اپنی مدد کرنے کی طاقت نہیں رکھتے، اور ہمارے مقابلے میں ان معبودوں کے علاوہ اور بھی کوئی ان کا ساتھی نہیں ہوگا، یہ مقابلے والا ترجمہ ''بیان القرآن'' میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا ہے، اور وہ اسی محاورے کے مطابق، اَنَا صَاحِبُكَ مِنْ فُلَانٍ، فلاں کے مقابلے میں میں تیرا ساتھی ہوں۔ تو ہمارے مقابلے میں یہ ساتھ نہیں دیے جائیں گے، یعنی یہ آلہہ جو انہوں نے تجویز کر رکھے ہیں وہ بھی ان کو نہیں بچا سکتے، وہ تو خود اپنی مدد بھی نہیں کر سکتے، اور نہ ان آلہہ کے علاوہ کوئی دوسرا شخص ہمارے مقابلے میں ان کا ساتھی بنے گا، جب ہماری گرفت آ جائے گی تو چھوٹنے کی کوئی صورت نہیں ہوگی۔ بَلْ مَتَّعْنَا هٰۤؤُلَآءِ وَاٰبَآءَهُمْ: یہاں بھی بل اضراب کے لئے ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ جو توحید کو اختیار نہیں کرتے تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ ہمارے اس دعوے میں یا دلیل میں کوئی خلل ہے، اور یہ دعویٰ اور دلیل ان کے نزدیک صحیح نہیں، یا شرک کے اوپر ان کے پاس کوئی قوی دلیل ہے، یہ وجہ نہیں ہے، بلکہ ہم نے نفع پہنچایا ان کو اور ان کے آباء کو حتی کہ دراز ہوگئی ان کے اوپر عمر، اصل بات یہ ہے کہ لمبی لمبی عمریں ان کی گزر گئیں، ہم نے ان کو عیش وعشرت دے رکھی ہے، ان کو بھی اور ان کے آباء کو بھی، یہ سمجھتے ہیں کہ شاید اسی طرح سے خوش حالی ہماری وراثت میں آ رہی ہے، اور ہم ہمیشہ خوش حال ہی رہیں گے، اس لیے ان کو یہ فکر نہیں کہ کوئی ہمیں پکڑ بھی سکتا ہے، نعمتوں کو کھاتے کھاتے ان کا دل دماغ خراب ہوگیا ہے، ابھی انہوں نے عذاب کا دھکا دیکھا نہیں، یہ خوش حالی کی وجہ سے ہے کہ خاندانی طور پر جو خوش حال چلے آ رہے ہیں، ان کے آباؤ اجداد خوش حال تھے، ان کے بعد یہ خوش حال ہو گئے، ان کے اوپر مدت دراز گزر گئی کہ انہوں نے عذاب کا نمونہ نہیں دیکھا، اس لیے ان کے دل دماغ ٹھکانے نہیں، یہ مطلب ہے اس کا، یعنی یہ کھا کھا کے مستے ہوئے ہیں، ورنہ یہ نہیں کہ ان کے پاس اپنے کردار کے لئے کوئی دلیل ہے، یا توحید کے رد کرنے کے لئے ان کے پاس کوئی دلیل موجود ہے، نہیں، نعمتیں کھا کھا کے یہ مست ہوگئے، خاندانی طور پر خوش حال چلے آ رہے ہیں، اس لیے ان کو یہ فکر ہی نہیں کہ ہمارے اوپر کوئی دوسرا بھی ہے جو ہمیں پکڑ سکتا ہے۔ ''بلکہ فائدہ پہنچایا ہم نے ان کو اور ان کے آباء کو حتی کہ طویل ہوگئی، دراز ہوگئی ان کے اوپر عمر۔''

''کیا یہ دیکھتے نہیں کہ ان کا گھیرا تنگ ہو رہا ہے؟''

اَفَلَا يَرَوْنَ: کیا پھر یہ دیکھتے نہیں، اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا: الْاَرْضَ پر الف لام عہد کا ہے، اس سے مراد ہے ان کا اپنا علاقہ، مکہ معظمہ اور اس کے ارد گرد جو مشرکین کا علاقہ تھا، ''ہم آتے ہیں ان کی زمین کو گھٹاتے ہوئے، ہم آ رہے ہیں ان کی زمین پر اس حال میں کہ ہم اس زمین کو گھٹاتے چلے جا رہے ہیں'' یعنی ان کا علاقہ تنگ ہوتا چلا جا رہا ہے، اسلام آہستہ آہستہ پھیلتا

چلا جارہا ہے اور یہ سمٹتے چلے جارہے ہیں، تو ان کو یہ مستقبل اپنا نظر نہیں آتا؟ کہ کس طرح سے ان کی زمین گھٹتی چلی آرہی ہے، ان کا علاقہ سمٹتا چلا آرہا ہے۔ مِنْ اَطْرَافِهَا: ہم آتے ہیں زمین کو اس حال میں کہ ہم اسے گھٹاتے ہیں اس کے کناروں سے، جس طرح سے ہم کہتے ہیں کہ چاروں طرف سے اب ان کے اوپر گھیرا تنگ ہوتا چلا جارہا ہے، جیسے جیسے اسلام پھیلتا چلا جارہا ہے ان کے اختیارات ختم ہوتے چلے جارہے ہیں، اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ: کیا پھر یہ غالب آنے والے ہیں؟ یعنی یہ اپنے آثار نہیں دیکھتے؟ اپنے مستقبل کو محسوس نہیں کرتے؟ کیا یہ غالب آتے چلے جارہے ہیں؟ یعنی یہ نہیں غالب آرہے، غالب اسلام آرہا ہے، جس کی وجہ سے ان کا علاقہ گھٹتا چلا جارہا ہے، ان کی عمل داری ختم ہوتی چلی جارہی ہے، آخر گھٹتے گھٹتے سارا علاقہ ان کا ختم ہوجائے گا، جیسے واقعہ یہی پیش آیا کہ اسلام اردگرد پھیلنا شروع ہوا، مشرکوں کا علاقہ سمٹنے لگ گیا، مکہ معظمہ کے اردگرد چاروں طرف سے گھیرا پڑ گیا، آخر ایک وقت آیا کہ مکہ بھی فتح ہوگیا، تو جو زمانہ دراز تھا، جس میں عیش وعشرت کرتے رہے تھے وہ سارے کا سارا ختم ہوگیا۔ اَفَلَا يَرَوْنَ: کیا یہ دیکھتے نہیں، اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا: کہ ہم آتے ہیں زمین کو گھٹاتے ہوئے، ہم آتے ہیں زمین کو اس حال میں کہ ہم اس کو گھٹاتے چلے جارہے ہیں مِنْ اَطْرَافِهَا: اس کے اطراف سے، یعنی چاروں طرف سے ان کا علاقہ کم ہوتا چلا جارہا ہے، زمین کے گھٹنے کا یہ معنی ہے کہ ان کی عملداری ختم ہوتی چلی جارہی ہے، جیسے جیسے اسلام پھیلتا چلا جارہا ہے وہ علاقہ ان کے قبضے سے نکلتا چلا جارہا ہے، ''کیا پھر یہ غالب آنے والے ہیں؟'' یعنی آثار کیا کہتے ہیں کہ غلبہ ان کو حاصل ہورہا ہے، یا اسلام کو غلبہ حاصل ہورہا ہے؟ یہ اِستفہام ہے، بات واضح ہے کہ اسلام کو غلبہ حاصل ہوتا چلا جارہا ہے، اور واقعہ ایسے ہوا کہ چند دنوں میں سب کچھ ختم ہوگیا۔

سمجھدار آدمی خبر سُن کر ہی ڈر جاتا ہے

قُلْ اِنَّمَآ اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ: آپ کہہ دیجئے کہ میں تمہیں ڈراتا ہوں وحی کے ذریعے سے، یعنی جو باتیں وحی کے ذریعے سے میرے سامنے بیان کی جاتی ہیں، میں ان باتوں کو ذکر کر کے تمہیں ڈرا رہا ہوں۔ ڈرانا دو طرح سے ہوگیا، ایک ہے کہ عذاب دِکھا کے ڈرایا جائے، اور ایک ہے کہ خبر دے کے ڈرایا جائے کہ یوں ہوجائے گا، تو میں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ اللہ کی طرف سے جو عذاب کے متعلق وحی آئی ہے وہ میں ذکر کر کے ڈراتا ہوں، تم اس سے ڈر جاؤ، متاثر ہوجاؤ، ورنہ اگر عذاب آنے پر ہی ڈرے تو کیا ڈرے؟ پھر اس کے بعد سمجھنے کا موقع نہیں ہوتا، سمجھدار آدمی وہی ہوتا ہے جو خبر سُن کے متاثر ہوجائے، اور اگر واقعے میں مبتلا ہوگئے تو واقعے میں مبتلا ہونے کے بعد کوئی سمجھے گا بھی تو سمجھنے کا کون سا موقع رہا؟ ''آپ کہہ دیجئے کہ میں تمہیں ڈراتا ہوں وحی کے ساتھ'' یعنی وحی کے حکم کے مطابق۔

کافر بہرے ہیں

وَلَا يَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَآءَ: صُمٌّ اَصَمُّ کی جمع ہے، ''اَصَم'' کہتے ہیں بہرے کو، جو کانوں سے سنتا نہیں، ''اور نہیں سنتے بہرے پکار''، اِذَا مَا يُنْذَرُوْنَ جس وقت ان کو ڈرایا جاتا ہے۔ تو ''صم'' سے یہاں مشرکین مراد ہیں یعنی یہ بالکل بہرے بنے ہوئے ہیں،

جب ان کو ڈرایا جاتا ہے اور ان کو مستقبل کے خطرے سے آگاہ کیا جاتا ہے، تو ایسے بہرے ہیں گویا کہ سنتے ہی نہیں، سنی اَن سنی کردیتے ہیں، تو ان کو بہرے اس اعتبار سے کہا جارہا ہے، جس طرح سے آپ کو ایک بات بار بار سمجھائی جائے اور آپ نہ سمجھیں تو یوں ہی کہا جاتا ہے کہ میں نے تمہیں کتنی دفعہ کہا، تم میری سنتے ہی نہیں، بالکل ہی بہرے بن گئے ہو، تو اس کا معنی یہی ہوتا ہے کہ بہروں کی طرح ہوگئے، جس طرح سے بہرا نہیں سنتا اور متاثر نہیں ہوتا، اسی طرح سے مشرکین بھی گویا کہ ان کے متاثر نہیں ہوتے، تو ایسے ہیں گویا کہ سنتے ہی نہیں، ورنہ وہ حقیقت میں بہرے نہیں تھے، ''نہیں سنتے بہرے پکار کو جبکہ وہ ڈرائے جائیں۔''

''اب پچھتائے کیا ہوت''

وَلَئِنْ مَّسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ: نفحہ کہتے ہیں اصل کے اعتبار سے تو خوشبو کے پھیلنے کو، پھول جہاں کھلے ہوئے ہوتے ہیں تو ہوا سی آتی ہے تو خوشبو پھیلتی ہے وہ نفحہ ہے، اور یہاں اس کا معنی ہم کریں گے جھونکا، جیسے ہوا کا جھونکا ہوتا ہے، ایک لپٹ سی آتی ہے، ''اگر ان کو عذاب کا ایک جھونکا چھو جائے'' وَلَئِنْ مَّسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ مِّنْ عَذَابِ رَبِّكَ اگر چھو لے ان کو تیرے رَبّ کے عذاب سے ایک جھونکا، لَيَقُوْلُنَّ: البتہ ضرور کہنے لگ جائیں گے ہائے ہماری خرابی! بے شک ہم ہی قصور وار تھے، یعنی یہ اکڑفوں اس وقت تک ہی ہے جب تک کہ عذاب کی ان کو ہوا نہیں لگتی، اور اگر ان کو عذاب کی ذراسی ہوا بھی لگ جائے اسی وقت ہی ساری شیخی کرکری ہوجائے گی اور فوراً اپنے قصور کا اعتراف کرنے لگ جائیں گے، لیکن عذاب کے آجانے کے بعد، عذاب میں مبتلا ہوجانے کے بعد اپنی غلطی کا احساس کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا، جس طرح سے فرعون ساری زندگی تو رَبّ بنا رہا، اتنے بڑے بڑے دعوے کرتا رہا، اور جب ذرا ناک میں پانی پڑا تو فوراً شیخی نکل گئی، اور کہتا ہے کہ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْۤ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْۤا اِسْرَآءِيْلَ (سورۂ یونس: ۹۰) میں بنی اسرائیل کے رَبّ پہ ایمان لایا، تو ایک گھونٹ ہی پانی ناک میں گیا تھا، جیسے کہتے ہیں:

اب پچھتائے کیا ہوت ۔۔۔ جب چڑیاں چُگ گئیں کھیت

یعنی چڑیاں جب کھیت چُگ گئیں تو اب اگر پچھتائیں گے بھی تو کیا ہوگا، اب وقت گزر گیا، تو یہ ان کو تنبیہ کی جارہی ہے کہ تمہاری یہ اکڑ اس وقت تک ہی ہے جب تک کہ تم نے عذاب کا نمونہ نہیں دیکھا، اگر عذاب کی ذراسی ہوا لگ جائے تو ساری ہوا نکل جائے گی، ''اگر چھو لے انہیں تیرے رَبّ کے عذاب کا جھونکا، البتہ ضرور کہنے لگ جائیں گے کہ ہائے ہماری بدبختی! ہائے ہماری کم بختی! بے شک ہم ہی قصور وار تھے۔''

اللہ کی ترازو میں بے انصافی نہیں ہوگی

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ: موازین یہ میزان کی جمع ہے، میزان کہتے ہیں ترازو کو۔ اور قسط کہتے ہیں انصاف کو۔ یہاں اَلْقِسْطَ یہ اَلْمَوَازِيْنَ کی صفت ہے، مصدر ہونے کی وجہ سے اس کو مفرد لایا گیا اگرچہ موصوف جمع ہے، اور یہ حمل مبالغۃً ہے زَيْدٌ عدلٌ کی طرح، اور جب مصدر آئے تو مصدر میں تثنیہ جمع لانے کی ضرورت نہیں ہوتی، اور یوں بھی کرسکتے ہیں کہ اس کے اوپر مضاف

محذوف نکال لیجئے نَضَعُ الْمَوَازِيْنَ ذَوَاتِ الْقِسْطِ (مظہری)، پھر یہ مجرور ہوجائے گا، اور مضاف کو محذوف کرنے کے بعد مضاف الیہ کو مضاف کے قائم مقام جو کیا تو وہی اِعراب اس کو دے دیا، ''ہم انصاف والی ترازو رکھیں گے، رکھیں گے ہم ترازو انصاف والی قیامت کے دن'' لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ: یہ لام ''فی'' کے معنی میں ہے۔ قیامت کے دن۔ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا پھر نہیں ظلم کیا جائے گا کوئی نفس کچھ بھی، ہر کسی کے ساتھ انصاف ہوگا، کسی پہ ظلم نہیں کیا جائے گا، وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ: ''خردل'' کہتے ہیں رائی کو، ''حبہ'' کہتے ہیں دانے کو، مثقال کا معنی وزن، اور ''كَانَ'' کی ضمیر لوٹ گئی عمل کی طرف، جیسے کہ ترازو میں تولنے کا ذکر آیا (آلوسی)۔ اگر کوئی عمل رائی کے دانے کے برابر بھی ہوگا، اَتَيْنَا بِهَا: تو ہم اس کو لے آئیں گے، ''ھا'' ضمیر مؤنث کی ہوجائے گی خصلت کی تاویل میں، ''اگر کوئی فعل، کوئی خصلت رائی کے دانے کے برابر بھی ہوئی تو ہم اس کو لے آئیں گے'' وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ اور ہم کافی ہیں حساب کرنے والے، یعنی اصل محاسبہ آخرت میں ہوگا اور پورا پورا ہوگا، کسی نفس کے اوپر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا، اللہ کی ترازو بڑی انصاف والی ترازو ہوگی، یہ نہیں جس طرح سے دنیا میں ترازو ہے، اس میں کبھی کبھی بے انصافی بھی ہوجاتی ہے، پتا نہیں چلتا، کوئی پلڑا وزنی ہوتا ہے، کوئی پلڑا ہلکا ہوتا ہے، اور دکاندار ہلکے پلڑے میں بٹہ رکھ لیتا ہے، تو وزنی پلڑے میں پاؤ ڈیڑھ پاؤ کا فرق ویسے ہی پڑ جاتا ہے، جب کم تولنے کی عادت ہوتی ہے تو اس قسم کے حالات ہوجاتے ہیں، تو ترازو غلط ہوسکتی ہے کہ وزن ٹھیک نہ کرے، لیکن اللہ تعالیٰ کے ترازو بہت انصاف والے ہوں گے، ان میں کوئی کمی بیشی کا امکان نہیں، ہر کسی کے اعمال کو تولا جائے گا۔

وزنِ اعمال کا عقیدہ اور وزن کی کیفیت کی تفصیل

باقی! اعمال کو کیسے تولا جائے گا؟ یا تو وہ نامہ اعمال تولے جائیں گے جن کے اندر عمل درج کیے ہوئے ہیں، یا یہ اعمال ہی متشکل ہوجائیں گے اور ان اعمال کو شکل دے کر ترازو کے اندر ڈال کے تولا جائے گا، ورنہ آج دنیا میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ ایسی چیزیں جن کا ظاہری وجود بھی معلوم نہیں ہوتا، اَعراض ہیں، ان کے تولنے کے لئے بھی مختلف ترازو بن گئے، آپ کے بدن میں حرارت ہے اس کو تولنے کے لئے تھرمامیٹر بن گیا، آج تو لوگ ہوا کو بھی ماپتے ہیں، سردی کو بھی ماپتے ہیں، گرمی کو بھی ماپتے ہیں، تو یہ اَعراض جن کا کوئی وجود علیحدہ معلوم نہیں ہوتا، ان کا اندازہ کرنے کے بھی ترازو بن گئے، تو اب اعمال کا وجود اگر ہمیں علیحدہ محسوس نہیں ہوتا تو ان کو ماپنے اور تولنے کے لئے اللہ کے ترازو میں بھی کوئی شبہ نہیں رہ گیا، آج یہ بات سمجھنی مشکل نہیں ہے۔ مقیاس المطر: پانی کو ماپنے کا آلہ، بارش جو ہوتی ہے تو اندازہ لگاتے ہیں کہ کتنی بارش ہوئی۔ مقیاس الھواء: ہوا کو جانچتے ہیں کہ کس رفتار سے چل رہی ہے، یہاں ہوا کا دباؤ کتنا ہے۔ مقیاس الحرارۃ: جس کو آپ تھرمامیٹر کہتے ہیں، آپ کے بدن کے اندر کتنی حرارت موجود ہے، یا آج باہر کتنی حرارت ہے، کتنی سردی ہے، ہوا کے اندر کتنی نمی ہے، تو کون سی بات ایسی ہے جس کو آج ماپ نہیں لیا گیا، اور اس کا اندازہ نہیں کرلیا گیا، تو اسی طرح سے ہمارے اعمال اقوال افعال جو کچھ ہیں اگرچہ بظاہر ان کا وجود کوئی علیحدہ معلوم

نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ کی میزان ان سب کا اندازہ کرلے گی، یا ان عملوں کو ظاہری کوئی شکل دے دی جائے گی، اور ان کو شکل دینے کے بعد پھر ترازو میں رکھا جائے گا، روایات سے ساری باتیں معلوم ہوتی ہیں، بعض روایات میں نامۂ اعمال کے تلنے کا ذکر بھی آتا ہے، ''مشکوٰۃ شریف'' میں روایت ہے، سرورِ کائنات ﷺ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی اللہ کے سامنے آئے گا جس کے پاس ننانوے دفتر ہوں گے اس کی بداعمالیوں کے اور گناہوں کے، اور اتنے لمبے لمبے کہ جہاں تک اس کی نظر جائے گی، وہ ان کو دیکھے گا تو اللہ تعالیٰ پوچھیں گے کہ کیا میرے حافظین، کراماً کاتبین نے تیرے پر کوئی زیادتی تو نہیں کی، کہ ان میں کوئی ایسا گناہ لکھ دیا گیا ہو جو تُو نے نہ کیا ہو؟ وہ کہے گا کہ نہیں، یا اللہ! بالکل ٹھیک لکھا ہے۔ تو پھر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ ایک تیری نیکی بھی ہے ہمارے پاس، پھر اس کو کاغذ کا ایک پرزہ دیا جائے گا، جس کے اُوپر کلمہ لکھا ہوا ہوگا: ''اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ'' لکھا ہوا ہوگا، وہ دے کے اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ جاؤ، ترازو کے پاس جا کر وزن کروا کے لاؤ، وہ کہے گا کہ یا اللہ! وزن کروانے کی کیا ضرورت ہے؟ نتیجہ تو معلوم ہے، کہ ننانوے دفتر کے مقابلے یہ کاغذ کا ایک پرزہ کیا کام آئے گا، تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ نہیں! آج کسی پہ ظلم نہیں ہوگا، جاؤ، جا کر وزن کرواؤ، جب وہ جا کے ننانوے دفتر گناہوں کے ایک طرف رکھے گا، اور وہ کاغذ کا پرزہ جس پہ کلمہ لکھا ہوا ہوگا وہ ایک طرف رکھے گا، تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ وہ کاغذ کا پرزہ وزنی ثابت ہوگا ننانوے دفتروں کے مقابلے میں، وہ ایک ہی کلمہ سب پہ غالب آجائے گا،[1] جس سے اس کی جان چھوٹ جائے گی، اور وہ نجات پا جائے گا، یہ ایسی صورت میں ہے کہ جب ایک انسان زندگی بھر بدکاری کرتا رہا، لیکن آخر عمر میں توبہ کر کے کلمہ پڑھ گیا، تو آپ جانتے ہیں کہ توبہ پچھلے گناہوں کو مٹا دیتی ہے، ساری زندگی کوئی کفر شرک کرتا رہے لیکن آخر عمر میں اس کو کلمہ نصیب ہوگیا، تو وہ کلمہ سب پہ بھاری اور وزنی ہے، تو یہ صورت پیدا ہو جائے گی۔ تو اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کاغذ کے وہ پرزے تلیں گے جن کے اُوپر نیکیاں لکھی ہوئی ہیں، اور اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے ساتھ ان میں اسی طرح سے وزن کو نمایاں کرے گا۔

اور ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ ان اعمال کو علیحدہ علیحدہ شکل دے دی جائے، نیک عمل کسی اچھی شکل میں آجائے، بُرا عمل بُری شکل میں آجائے، جیسے کہ آپ کے سامنے سورۂ کہف میں ذکر کیا گیا تھا کہ وَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا (آیت:۴۹) وہ لوگ اپنے کیے کو حاضر پائیں گے، وہاں مفسرین نے یہی لکھا ہے کہ ہر ایک کا عمل خود موجود ہوگا، نیک عمل کی اچھی صورت ہوگی، کوئی عمل آپ کو دُودھ کی شکل میں ملے گا، کوئی عمل آپ کو پھلوں کی شکل میں ملے گا، کوئی عمل آپ کا حور کی شکل میں سامنے آئے گا، یہ مختلف اعمال ہوں گے جو مختلف شکلوں میں سامنے آجائیں گے، اور بُرے اعمال سانپ بچھو کی شکل اختیار کریں گے، کوئی عمل آپ کا سانپ بن کے جائے گا، کوئی عمل آپ کا بچھو بن کے آجائے گا، کوئی عمل آپ کا آگ بن کے آجائے گا، اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ

(۱) مشکوٰۃ ۲/ ۴۸۶، باب الحساب، فصل ثانی۔ ترمذی ۲/ ۹۲، باب ما جاء فی من یموت وھو یشھد ان لا الٰہ الا اللہ۔ ابن ماجہ ص ۳۱۸، باب ما یرجی من رحمۃ اللہ۔

فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا (سورۂ نساء:۱۰) جو یتیموں کا مال کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں، تو گویا کہ یتیم کا مال جو کھایا وہی آگ کے انگارے بن جائیں گے، تو اسی طرح سے نیک اعمال نعمتوں کی صورت میں سامنے آجائیں گے اور بُرے اعمال عذاب کی شکل میں سامنے آجائیں گے، تو یہ اعمال ہی ہیں جو انسان کے سامنے آئیں گے، اس وقت ان کو کوئی نہ کوئی وجود دے دیا جائے گا جس کے ساتھ ان کا وزن بھی اچھی طرح نمایاں ہو جائے گا۔

بہرحال جو بھی اللہ کے علم میں ہے، اتنی بات قطعی ہے کہ اعمال کا وزن کیا جائے گا، یہ ضروریاتِ دین میں سے ہے، اس کا انکار کُفر ہے، باقی! تولے کس طرح سے جائیں گے؟ ترازو کی شکل صورت کیا ہوگی؟ یہ چیزیں ایسی ہیں کہ جس طرح سے ہم آخرت کی دوسری نعمتوں کی کیفیات متعین نہیں کر سکتے، اس کی کیفیت کا متعین کرنا بھی مشکل ہے، اتنا عقیدہ رکھنا ضروری ہے کہ میزانِ عدل ہے، اللہ تعالیٰ میزان قائم کریں گے، جس میں اعمال تلیں گے، اور تلنے کے ساتھ نیکیوں اور برائیوں کا فیصلہ ہوگا۔

اعمال صرف مؤمنوں کے تولے جائیں گے

خصوصیت کے ساتھ مؤمنوں کی نیکیاں اور بدیاں تولی جائیں گی، کافروں کے لیے میزان قائم کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی، کیونکہ ان کی تو نیکیوں کا اعتبار ہی کوئی نہیں، ان کے پاس تو بُرائیاں ہی بُرائیاں ہیں، جیسے سورۂ کہف کے آخر میں آیا تھا فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا (آیت:۱۰۵) کہ ہم ان کے لیے قیامت کے دن کوئی وزن قائم نہیں کریں گے، کیونکہ جب پتا ہے کہ نیکی کا نام ونشان ہی نہیں، سارا کُفر ہی کُفر ہے، تو وہاں تولنے کی کیا ضرورت ہے، تلیں گے تو وہاں جہاں نیکیاں بھی ہوں بُرائیاں بھی ہوں، پھر اگر نیکیوں کو غلبہ حاصل ہوگیا تو بُرائیاں معاف ہو جائیں گی، بُرائیوں کو غلبہ حاصل ہوگیا تو جہنّم میں چلے جائیں گے، اور وہاں بُرائیوں کی سزا بھگت کے ایمان کی برکت سے آخرکار جان چھوٹ جائے گی۔ وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ: خردل رائی کو کہتے ہیں، اگر کوئی فعل (''ھا'' ضمیر لوٹانے کے لئے فعل کی بجائے عربی میں فِعلة کا لفظ نکل آئے گا خصلت کے معنی میں) اگر کوئی فعل رائی کے دانے برابر بھی ہوا، اَتَيْنَا بِهَا: ہم اس کو لائیں گے، وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ: اور ہم حساب کرنے والے کافی ہیں، تو یہ آخرت کا محاسبہ ذکر کر کے ڈرایا جا رہا ہے، جس طرح سے پہلے دُنیوی عذاب کو ذکر کر کے ڈرایا تھا، تو عذاب ایسی چیز ہے کہ اگر اس کی ہوا بھی انسان کو لگ جائے تو ساری شیخی نکل جاتی ہے، اور یہ اتنی دیر تک بڑکیں مارتے ہیں جب تک کہ عذاب دیکھا نہیں۔

نصیحت سے فائدہ متقین اُٹھاتے ہیں

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِيَآءً وَّذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ: یہاں سے انبیاء ﷺ کا ذکر شروع ہو رہا ہے، اور انبیاء ﷺ کے ذکر میں توحید کا تذکرہ بھی ہوتا ہے، رسالت کا بھی ہوتا ہے، اور آخرت کا بھی ہوتا ہے، ان سارے مضمونوں کی تائید ہوتی ہے انبیاء ﷺ کے واقعات سے، رَدِّ شرک، اثباتِ توحید، رسالت کا تذکرہ، آخرت کے عذاب کا تذکرہ، یہ ساری چیزیں آجایا کرتی ہیں، تو یہاں سے انبیاء ﷺ کا ذکر شروع ہو رہا ہے۔ ''البتہ تحقیق ہم نے موسیٰ اور ہارون کو فرقان، ضیاء اور ذِکر دیا متقین کے لئے۔'' فرقان: حق اور باطل میں فرق کرنے والی چیز۔ ضیاء: روشنی کو کہتے ہیں۔ ذِکر: نصیحت کو کہتے ہیں، لِلْمُتَّقِيْنَ کا تذکرہ اس لیے آگیا

کہ اگر چہ یہ نصیحت ہر کسی کے لئے ہوتی ہے، لیکن فائدہ وہی اُٹھاتے ہیں جو اللہ سے ڈرنے والے ہوتے ہیں، تو فائدہ اُٹھانے کے اعتبار سے متقین کی تخصیص آ گئی۔ تو فرقان، ضیاء، ذکر ان تینوں کا مصداق ''توراۃ'' ہو سکتی ہے، کیونکہ اللہ کی کتاب یہی حق اور باطل کے درمیان میں فیصلہ کرنے والی ہوتی ہے، اللہ کی کتاب ہر قسم کے کُفر شرک فسق کی ظلمت سے انسان کو روشنی مہیا کرتی ہے، وہاں سے نکالتی ہے، کُفر شرک ایک ظلمت کی طرح ہے، ایک روشن کتاب آتی ہے وہی انسان کو وہاں سے نکالتی ہے، اللہ کا دیا ہوا علم، اللہ کی اُتاری ہوئی کتاب یہ ایک نور ہے جو انسان کو کفر و شرک کی ظلمت سے نجات دلاتا ہے، اور یہ نصیحت اور یاد دہانی بھی ہے، آنے والے حالات کی یاد دہانی ہے، اور اس بات کی یاد دہانی ہے کہ تمہیں اللہ نے پیدا کیا، تم اس کو کیوں بھول گئے، تم اللہ کے بندے ہو، تم اس بات کو کیوں بھول گئے ہو؟ یہ باتیں یاد رکھو، ذکر کے اندر یہ ساری باتیں ہوتی ہیں، اور متقین کا ذکر اِنتفاع کے لئے ہو گیا کہ فائدہ یہ لوگ اٹھاتے ہیں، اور فرقان سے معجزات بھی مراد ہو سکتے ہیں جن کے ساتھ سچے اور جھوٹے میں فرق ہوتا ہے، ضیاء اور ذکر کا مصداق بہر حال توراۃ ہے۔

متقین کی صفات

المتقین کی آگے صفت ذکر کر دی گئی اَلَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ: متقین وہ لوگ ہوتے ہیں جو بن دیکھے اپنے رَبّ سے ڈرتے ہیں، غیب میں ڈرتے ہیں، غیب کا یہ معنی ہوتا ہے کہ رَبّ کو دیکھا نہیں، رَبّ کے عذاب کو دیکھا نہیں، صرف انبیاء علیہم السلام کی زبان سے سن کر ڈرتے ہیں۔ یا بِالْغَيْبِ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جب تنہائی میں ہوتے ہیں، لوگوں سے چھپے ہوئے ہوتے ہیں، اس وقت بھی رَبّ سے ڈرتے ہیں، کیونکہ بسا اوقات لوگوں کے سامنے انسان بڑا متقی پرہیزگار ہوتا ہے، اور جب خلوت میں چلا جاتا ہے تو سارے خوف اتر جاتے ہیں، جیسے حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں:

واعظاں کیں جلوہ در محراب و منبر مے کنند چوں بہ خلوت مے روند، کارے دیگر مے کنند

کہ یہ واعظ لوگ جو محراب و منبر پہ جلوے دکھاتے ہیں، جب تنہائی میں چلے جاتے ہیں تو پھر یہ اور ہی کچھ کرتے ہیں، تو اصل متقی وہ ہوتا ہے جو غیبوبت میں، تنہائی میں، خلوت میں بھی اللہ تعالیٰ سے ڈرے، اور جہاں حدیث شریف میں آتا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ''سَبْعَةٌ يُظِلُّهُمُ اللهُ تَعَالٰى فِيْ ظِلِّهٖ يَوْمَ لَا ظِلَّ اِلَّا ظِلُّهٗ'' سات آدمی ایسے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اپنے سائے میں جگہ دے گا، جس دن کہ اس کے سائے کے علاوہ کوئی سایہ نہیں ہوگا، اس میں بھی لفظ یہی آئے ہیں کہ ''وَرَجُلٌ ذَكَرَ اللهَ خَالِيًا فَفَاضَتْ عَيْنَاهُ''[1] خالیا: خلوت میں، ایک وہ شخص جو خلوت میں اللہ کو یاد کرے، اور اللہ کو یاد کرنے کے بعد اللہ کی ہیبت سے، اللہ کے خوف سے، اللہ کی محبت سے اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑیں، تو جو خلوت میں بیٹھ کے اللہ کو یاد کر کے روتا ہے وہ بھی ان سات نیک بختوں میں ہے جن کو اللہ تعالیٰ اپنے سائے میں جگہ دے گا جس دن کہ کوئی سایہ نہیں ہوگا اس کے سائے کے علاوہ، تو بالغیب کا یہ مفہوم بھی ہوتا

(۱) بخاری ۹۱/۱، باب من جلس فی المسجد الخ۔ مشکوٰۃ ۶۸/۱، باب المساجد، فصل اول، عن ابی ھریرۃؓ

ہے، کہ غیوبت میں، تنہائی میں جب کوئی نہ دیکھ رہا ہو، ایسے وقت میں وہ اللہ سے ڈرتے ہیں۔ اصل تقوے کا مدار اسی پہ ہے۔......
وَهُمْ مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُوْنَ: اور وہ قیامت سے بھی ڈرتے ہیں، اور قیامت سے ڈرنا بھی اصل میں اللہ سے ڈرنے کی وجہ سے ہے، ان کو ہر وقت یہ خوف لگا رہتا ہے کہ ایک وقت اللہ کے سامنے جانا ہے اور وہاں جا کے حساب کتاب دینا ہے، قیامت کا خوف بھی اصل میں اللہ کا خوف ہی ہے، کیونکہ سامنے جانے سے ڈرتے ہیں۔

قرآن بہت بابرکت ہے

وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ: جس طرح سے موسیٰ اور ہارون کو یہ کتاب دی گئی تھی، اور ان کے اوپر یہ نصیحت اتاری گئی تھی، اسی طرح سے یہ ذکر مبارک ہے، مبارک کا معنی کثیر النفع، جس میں بہت نفع ہو''فلاں چیز بڑی برکت والی ہے'' برکت کا معنی نفع ہی ہوتا ہے، یعنی وہ چیز بہت باعث نفع ہے، دنیا میں بھی باعث نفع ہے، آخرت میں بھی باعث نفع ہے۔ ''فلاں شخص بڑا برکت والا ہے'' کہ اس کے آنے سے لوگوں کو بڑا فائدہ پہنچا، اور ''یہ چیز برکت دی ہوئی ہے'' اس کو اللہ نے بہت مفید بنایا ہے، اس سے بڑا فائدہ پہنچتا ہے۔ ''یہ نصیحت ہے برکت دی ہوئی، ہم نے اس کو اتارا''۔ هٰذَا ذِكْرٌ یہ قرآنِ کریم کی طرف اشارہ ہے۔ اَفَاَنْتُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ: کیا پھر تم اس کا انکار کرنے والے ہو؟ اس نصیحت کا انکار کرتے ہو؟ اور اس نصیحت کو ماننے والے نہیں ہو؟ گویا کہ توراۃ کا ذکر کرنے کے بعد پھر اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کا ذکر کر دیا۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ ﴿۵۱﴾ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ

البتہ تحقیق ہم نے ابراہیم کو ان کا رُشد دیا تھا اس سے پہلے اور ہم ابراہیم کے متعلق علم رکھنے والے تھے ﴿۵۱﴾ جب کہا اس نے اپنے باپ

وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ﴿۵۲﴾ قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا

اور اپنی قوم کو: کیا ہیں یہ مورتیاں جن کے لئے تم جم کے بیٹھنے والے ہو؟ ﴿۵۲﴾ وہ کہنے لگے: پایا ہم نے اپنے آباء کو ان مورتیوں

عٰبِدِيْنَ ﴿۵۳﴾ قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۵۴﴾ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا

کی پُوجا کرنے والے ﴿۵۳﴾ ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ تم اور تمہارے آباء صریح گمراہی میں ہو ﴿۵۴﴾ ان لوگوں نے کہا کہ کیا تُو واقعی بات

بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِيْنَ ﴿۵۵﴾ قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

لایا ہے یا تُو کھیلنے والوں میں سے ہے؟ ﴿۵۵﴾ انہوں نے کہا: بلکہ تمہارا رَبّ آسمانوں اور زمین کا رَبّ ہے

الَّذِیْ فَطَرَهُنَّ ۖ وَاَنَا عَلٰی ذٰلِكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِیْنَ ﴿۵۶﴾ وَتَاللّٰهِ لَاَكِیْدَنَّ

جس نے ان سب کو پیدا کیا اور میں اس بات پر گواہی دینے والوں میں سے ہوں ﴿۵۶﴾ اللہ کی قسم! البتہ ضرور خفیہ تدبیر کروں گا میں

اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِیْنَ ﴿۵۷﴾ فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِیْرًا لَّهُمْ

تمہارے بتوں کے متعلق بعد اس کے کہ تم پیٹھ پھیر کر چلے جاؤ گے ﴿۵۷﴾ ابراہیم علیہ السلام نے ان کو ریزہ ریزہ کر دیا مگر ان کے بڑے بت کو

لَعَلَّهُمْ اِلَیْهِ یَرْجِعُوْنَ ﴿۵۸﴾ قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَاۤ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۵۹﴾

تاکہ وہ لوگ اس کی طرف لوٹیں ﴿۵۸﴾ کہنے لگے کہ کس نے کیا یہ کام ہمارے آلہہ کے ساتھ؟ بے شک وہ تو البتہ ظالموں میں سے ہے ﴿۵۹﴾

قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًی یَّذْكُرُهُمْ یُقَالُ لَهٗۤ اِبْرٰهِیْمُ ﴿۶۰﴾ قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ

کچھ بولے کہ سنا ہم نے ایک جوان کو جو ان بتوں کا تذکرہ کرتا تھا، اس کو ابراہیم کہا جاتا ہے ﴿۶۰﴾ پھر کچھ کہنے لگے: لے آؤ اسے

عَلٰۤی اَعْیُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَشْهَدُوْنَ ﴿۶۱﴾ قَالُوْۤا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا یٰۤاِبْرٰهِیْمُ ﴿۶۲﴾

لوگوں کی آنکھوں کے سامنے تاکہ لوگ گواہ ہو جائیں ﴿۶۱﴾ کہنے لگے کہ کیا تُو نے کیا یہ کام ہمارے آلہہ کے ساتھ اے ابراہیم؟ ﴿۶۲﴾

قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِیْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا یَنْطِقُوْنَ ﴿۶۳﴾ فَرَجَعُوْۤا

ابراہیم نے کہا: بلکہ کیا ہے یہ ان کے اس بڑے نے، پس ان چھوٹوں سے پوچھ لو اگر یہ بولتے ہیں ﴿۶۳﴾ پس رجوع کیا ان لوگوں نے

اِلٰۤی اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْۤا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۶۴﴾ ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰی رُءُوْسِهِمْ ۚ لَقَدْ

اپنے دلوں کی طرف، پھر اپنے دلوں میں کہنے لگے: بے شک تم ہی لوگ قصوروار ہو ﴿۶۴﴾ پھر وہ اُلٹے کر دیے گئے اپنے سروں پر، بلا شک وشبہ

عَلِمْتَ مَا هٰۤؤُلَآءِ یَنْطِقُوْنَ ﴿۶۵﴾ قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَنْفَعُكُمْ

تُو جانتا ہے کہ یہ تو بولتے نہیں ﴿۶۵﴾ ابراہیم علیہ السلام نے کہا: کیا پھر تم پوجا کرتے ہو اللہ کے علاوہ ایسی چیزوں کی جو تمہیں فائدہ نہیں پہنچا سکتیں

شَیْـًٔا وَّلَا یَضُرُّكُمْ ﴿۶۶﴾ اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا

کچھ بھی اور نہ تمہیں نقصان پہنچا سکتی ہیں ﴿۶۶﴾ تُف ہے تمہارے لئے اور تمہارے ان معبودوں کے لئے جن کو تم اللہ کے علاوہ پوجتے ہو، کیا تم

تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۷﴾ قَالُوْا حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْۤا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِیْنَ ﴿۶۸﴾ قُلْنَا

سوچتے نہیں ہو؟ ﴿۶۷﴾ کہنے لگے کہ جلا دو اس کو اور مدد کرو اپنے خداؤں کی اگر تم کرنے والے ہو ﴿۶۸﴾ ہم نے کہا:

يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ﴿۶۹﴾ وَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ

اے آگ! ہو جا تو ٹھنڈی اور سلامتی والی ابراہیم پر ﴿۶۹﴾ انہوں نے ارادہ کیا ابراہیم کے متعلق تدبیر کا، ہم نے انہی کو

الْاَخْسَرِيْنَ ﴿۷۰﴾ وَنَجَّيْنٰهُ وَلُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا

خسارے میں پڑنے والے بنا دیا ﴿۷۰﴾ اور ہم نے نجات دی ابراہیم کو اور لُوط کو ایسی زمین کی طرف کہ جس میں ہم نے برکت دے رکھی ہے

لِلْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۱﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ ﴿۷۲﴾

جہان والوں کے لئے ﴿۷۱﴾ اور ہم نے عطا کیا ابراہیم کو اِسحاق اور یعقوب پوتا، ہم نے سب کو نیک بنایا ﴿۷۲﴾

وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ

اور ہم نے بنایا ان کو ایسے اِمام جو کہ ہمارے حکم کے مطابق راہنمائی کرتے تھے اور ہم نے حکم بھیجا ان کی طرف نیکیوں کے کرنے کا

وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ﴿۷۳﴾ وَلُوْطًا

اور نماز کے قائم کرنے کا اور زکوٰۃ کے دینے کا، اور وہ لوگ ہماری عبادت کرنے والے تھے ﴿۷۳﴾ اور لُوط کو ہم نے نبی بنایا

اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا وَّنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰٓئِثَ اِنَّهُمْ

اس کو علم وحکمت دی، اور ہم نے نجات دی اس کو ایسی بستی سے جو خبیث کام کیا کرتی تھی، بے شک وہ

كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فٰسِقِيْنَ ﴿۷۴﴾ وَاَدْخَلْنٰهُ فِيْ رَحْمَتِنَا اِنَّهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۷۵﴾

بُرے لوگ تھے بدمعاش تھے ﴿۷۴﴾ اور ہم نے اس لُوط کو داخل کیا اپنی رحمت میں، بے شک وہ شائستہ آدمیوں میں سے تھا ﴿۷۵﴾

تفسیر

ابراہیم علیہ السلام کی اپنے باپ اور قوم سے گفتگو

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ: قَبْلُ یہ مبنی بر ضم ہے، اور مضاف الیہ اس کا محذوف منوی ہے، اصل میں عبارت ہے من قبل موسیٰ وھارون، جن کا ذکر اوپر آیا ہوا ہے۔ البتہ تحقیق یعنی یہ پکی بات ہے، بلاشک وشبہ ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو ان کا رُشد دیا تھا، موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام سے پہلے، ہارون علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کے زمانے سے پہلے ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو اس کا رُشد دیا تھا، رُشد یہ ہدایت کے معنی میں ہوتا ہے، یہاں فہم وفراست مراد ہے، دانش مندی، فہم وفراست، ہر معاملے میں صحیح

راستہ معلوم کر لینا، صحیح راستے پہ چلنا، یہ سب رُشد کا مصداق ہے۔ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ: اور ہم ابراہیم علیہ السلام کے متعلق علم رکھنے والے تھے، یعنی ان کے کمالات، ان کی استعداد ہر قسم کی ہمیں معلوم تھی۔ ''بِہٖ'' کی ضمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ: قابلِ ذکر ہے وہ وقت، یاد کیجئے اس وقت کو جب کہا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کو اور اپنی قوم کو، مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ: تماثیل تمثال کی جمع ہے، تمثال: مورتی، تصویر، جو کسی دوسری چیز کی مثال بنائی گئی ہو، جیسے پتھر سے انسان کی مثال تراش لی گئی تو وہ انسان کی تمثال ہے، یا لکڑی کے ساتھ گھوڑے کی شکل بنالی گئی تو وہ گھوڑے کی تمثال ہے۔ ''کیا ہیں یہ مورتیاں؟'' اور یہ استفہام تحقیر کے لئے ہے، اسی تحقیر کو ظاہر کرنے کے لئے ''بیان القرآن'' میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے لفظ استعمال کیا کہ: ''یہ کیا واہیات مورتیاں ہیں'' اب ''واہیات'' کا لفظ جو آپ وہاں لکھا ہوا دیکھیں گے وہ کسی لفظ کا ترجمہ نہیں ہے، وہ اس استفہام کی تعبیر ہے، کیونکہ یہ استفہام تحقیر کے لئے ہے۔ ''کیا ہیں یہ مورتیاں جن کے لئے تم جم کے بیٹھنے والے ہو'' عٰكِفُوْنَ یہ عُكُوف سے ہے، یہ عکوف وہی ہے جس سے لفظ اعتکاف بنا ہے۔ ''جن کے لیے تم جم کے بیٹھے ہو یہ مورتیاں کیا ہیں؟'' ان کی کیا حیثیت ہے؟ کیا واہیات ہیں یہ مورتیاں؟ قَالُوْا: وہ کہنے لگے وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ: پایا ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو (آباء کا لفظ سب کو شامل ہے) پایا ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو ان مورتیاں کی پُوجا کرنے والے۔ یہ شروع میں جو لفظ اِذْ آیا ہے اس کا عامل محذوف بھی نکالا جاسکتا ہے جس طرح سے میں نے آپ کی خدمت میں عرض کر دیا، ''اُذْكُرْ'' یا ''لِيَذْكُرْ'' کے متعلق اس کو کر دیا جائے، یاد کیجئے، یاد کرنے کے قابل ہے وہ وقت۔ اور اس اِذْ کا تعلق قَالُوْا وَجَدْنَآ کے ساتھ بھی لگایا جاسکتا ہے، ''ان لوگوں نے کہا کہ ہم نے اپنے آباء کو پایا ہے کہ ان مورتیوں کی پُوجا کرنے والے تھے'' یہ ان لوگوں نے کب کہا تھا؟ جب ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا کیا ہیں یہ مورتیاں جن کے لیے تم جم کے بیٹھنے والے ہو؟ یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس سوال کے وقت انہوں نے یوں کہا۔ تو پھر ''اِذْ'' کا عامل محذوف نکالنے کی ضرورت نہیں، بات یہیں محذوف نکالے بغیر پوری ہو جاتی ہے۔ جب ابراہیم نے کہا تو قوم نے یہ جواب دیا، تو قوم کا جواب اس وقت ہوا جس وقت ابراہیم علیہ السلام نے یہ بات کہی۔ اور باپ کا مصداق ''آزر'' ہے، جس کے متعلق میں نے عرض کیا تھا کہ اگرچہ علماء کی دو رائیں ہیں، بعض آزر کو چچا کہتے ہیں، بعض حقیقی باپ کہتے ہیں، لیکن قرآنِ کریم کی آیات کے تبادر کا تقاضا یہ ہے کہ وہ باپ تھا، ہر جگہ اس کو ''اَب'' کے لفظ کے ساتھ ہی ذکر کیا ہے، ''عم'' کا لفظ اس کے لئے کہیں استعمال نہیں ہوا، نہ قرآن میں نہ حدیث میں۔

قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ: جس وقت انہوں نے اپنے آباء کا حوالہ دیا کہ ہم نے اپنے آباء کو پایا کہ ان کی پُوجا کرنے والے تھے، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ تم اور تمہارے آباء صریح گمراہی میں ہیں، ''کَانَ'' جس طرح سے ماضی کے لئے ہوتا ہے، خبر کو اسم کے لئے محض ثابت کرنے کے لئے بھی ہوتا ہے، كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا، اب اس کا معنی یوں نہیں کیا جایا کرتا کہ اللہ علیم حکیم تھا، جس میں خواہ مخواہ یہ شبہ پڑے کہ اب نہیں ہے، بلکہ وہاں صرف خبر کو اسم کے لیے ثابت کرنا مقصود ہوتا ہے کہ اللہ کے لیے علم و حکمت ثابت ہے، اس لیے وہاں ترجمہ کیا جاتا ہے کہ اللہ علیم حکیم ہے، ''تم اور تمہارے آباء صریح گمراہی میں ہو'' یہاں ترجمہ یوں کریں گے، یعنی اپنے اپنے وقت میں تمہارے آباء بھی گمراہی میں تھے، اور تم بھی گمراہی میں ہو، اس میں صرف خبر کو

اسم کے لیے ثابت کرنا مقصود ہے، ماضی کا ذکر کرنا مقصود نہیں کہ تم ماضی میں تھے، بلکہ یہ ایک حال ذکر کرنا مقصود ہے کہ یہ خبر تمہارے لیے ثابت ہے، صریح گمراہی میں ہونا تمہارے لیے اور تمہارے آباء کے لیے ثابت ہے۔ ''تم اور تمہارے آباء صریح گمراہی میں ہو''۔ ان دو آیتوں میں گویا کہ اس ساری کشمکش کی تعبیر ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بار بار قوم کو سمجھایا، اپنے باپ کے سامنے توحید کا وعظ کہا جیسے سورۂ مریم میں آیا، اور ان کی دلیل اپنے لیے یہی تھی کہ ہمارے آباء کا یہ طریقہ ہے، ہم تو اپنے آباء کے طریقے پہ چلنے والے ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کے سامنے یہ ثابت کرتے تھے کہ تم بھی غلطی پہ ہو اور تمہارے آباء بھی غلطی پہ تھے، یعنی یہ صرف ایک ہی مجلس کی بات نہیں، پوری کشمکش جتنی قوم اور ابراہیم علیہ السلام کے درمیان میں ہوئی یہ اس کی تعبیر ہے۔ حاصل اور خلاصہ اس بحث کا اس گفتگو کا جو ان کے درمیان ہوتی رہتی تھی، یہی ہے جو ذکر کر دیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا موقف یہ تھا، قوم کا موقف یہ تھا۔ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ: ان لوگوں نے کہا ابراہیم علیہ السلام سے کہ کیا تو واقعی بات لایا ہے؟ یا تو کھیلنے والوں میں سے ہے؟ لعب کرنے والوں میں سے ہے؟ یعنی جس وقت بار بار حضرت ابراہیم علیہ السلام اس قسم کی باتیں کرتے، ان کو بھی اور ان کے آباء کو بھی غلطی پہ بتاتے، تو لوگ پوچھتے کہ ابراہیم! واقعی تم اپنے خیال کے مطابق سچی بات کہہ رہے ہو، یا ہنسی مذاق کر رہے ہو؟ بسا اوقات اس قسم کی باتیں ہنسی مذاق میں بھی تو ہو جاتی ہیں، یعنی تم دل سے ایسے ہی سمجھتے ہو؟ تم اپنی طرف سے واقعی بات کرتے ہو؟ یا یہ آپ کی طرف سے محض کھیل ہے، اور ہنسی مذاق کے طور پر ایسی بات کرتے ہو، ہنسی مذاق کے طور پر بھی انسان اس قسم کی باتیں کر لیا کرتا ہے جہاں واقعہ نہیں ہوتا، یہ قوم کا سوال ہے، ''انہوں نے کہا کیا کہ لایا تو حق؟'' حق کا معنی ہوتا ہے واقعی بات، کیا تو واقعی بات ہمارے سامنے ذکر کر رہا ہے کہ تو یوں ہی سمجھ رہا ہے، اور واقعہ اسی طرح سے ہے کہ تو ہمیں بھی غلطی پہ سمجھ رہا ہے اور ہمارے آباء کو بھی غلطی پہ سمجھ رہا ہے؟ یا تو محض کھیل کرنے والوں میں سے ہے، دل لگی کے طور پر، کھیل اور مشغلے کے طور پر تو اس قسم کی باتیں کرتا ہے۔ قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِیْ فَطَرَهُنَّ: انہوں نے کہا یہ لعب نہیں ہے، مشغلہ اور دل لگی نہیں ہے، بلکہ تمہارا رب آسمانوں اور زمین کا رب ہے جس نے ان سب کو پیدا کیا، وَاَنَا عَلٰی ذٰلِكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِیْنَ: اور میں اس بات پر گواہی دینے والوں میں سے ہوں، میں تمہارا رب نمرود کو نہیں سمجھتا، میں تمہارا رب ان ستاروں کو نہیں سمجھتا، میں تمہارا رب ان پتھر کی مورتیوں کو نہیں سمجھتا، تمہارا رب وہ ہے جس نے ان سب چیزوں کو پیدا کیا اور میں اس پر شاہد ہوں، اس پر گواہ ہوں، میں واقعی بات کہہ رہا ہوں، جس طرح ہم کہتے ہیں کہ میں اللہ کو گواہ کر کے یہ بات کہتا ہوں، گواہی دینا یہ قسم کے قائم مقام ہوتا ہے، میں اس بات پہ شہادت دیتا ہوں کہ ان چیزوں میں سے کوئی چیز تمہارا رب نہیں ہے، ''تمہارا رب وہ ہے جو آسمانوں کا اور زمین کا رب ہے جس نے ان سب کو پیدا کیا، اور میں اس بات پر گواہی دینے والوں میں سے ہوں''، گویا کہ اپنی طرف سے بات واضح کر دی کہ یہ میں واقعی بات کہہ رہا ہوں، میں اس کو حقیقت سمجھ رہا ہوں، اور واقعہ بھی یہی ہے، حقیقت بھی یہی ہے، میں کوئی ٹھٹھا مذاق کے طور پر اور ہنسی کے طور پر نہیں کہہ رہا۔

بتوں پر حملے کی دھمکی کو قوم نے اہمیت نہ دی

وَتَاللّٰهِ لَاَكِیْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِیْنَ: تَاللّٰهِ یہ قسم ہے۔ اللہ کی قسم! لَاَكِیْدَنَّ: كَادَ يَكِيْدُ: خفیہ تدبیر کرنا۔ لام

تاکید کا آ گیا۔ البتہ ضرور خفیہ تدبیر کروں گا میں، اَصْنَامَكُمْ: اصنام صنم کی جمع ہے۔ تمہارے بتوں کے متعلق بعد اس کے کہ تم پیٹھ پھیر کے چلے جاؤ گے، میں تمہارے بتوں کے متعلق کوئی تدبیر کروں گا۔ یہ قسم کھا کے کہا اور تاکید سے کہا۔ لَاَكِيْدَنَّ: اس کا مطلب یہ ہے کہ اب تو تم بیٹھے ہو، میں اب اگر ان بتوں کو چھیڑوں، تم ان کا دفاع کرو گے، تم ذرا جاؤ، جس وقت تم موجود نہیں ہو گے تو میں ان کی خبر لوں گا، میں ان کی مرمت کروں گا، ''میں ان سے پوچھ لوں گا'' جس طرح آپ اپنے محاورے میں کہا کرتے ہیں۔ میں ان کی مرمت کروں گا تمہارے جانے کے بعد، لَاَكِيْدَنَّ کا مفہوم یہ ہے، کہ جس وقت تم یہاں موجود نہیں ہو گے تو میں ان کی خبر لوں گا، ہم اپنے محاورے میں اس بات کو انہی الفاظ کے ساتھ ادا کر سکتے ہیں، لفظی معنی یوں ہی کریں گے، حضرتِ شیخ (الہند رحمہ اللہ) نے جو ترجمہ کیا ہے وہ بھی محاورے کی رعایت سے ہے، حضرت شیخ الہندؒ لکھتے ہیں کہ ''اللہ کی قسم میں علاج کروں گا تمہارے بتوں کا'' اب یہ علاج کرنا، یہ بھی اسی محاورے کے مطابق ہی ہے، میں ان کی خبر لوں گا، میں ان کی گت بناؤں گا، حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے ترجمہ گت بنانے کے ساتھ کیا، تمہارے چلے جانے کے بعد میں ان کی گت بناؤں گا، یہ سب لفظ ایک ہی مفہوم کو ادا کرتے ہیں، فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا: اب قرآنِ کریم نے تو اپنے انداز کے مطابق مختصر الفاظ میں ساری حکایت کو سمیٹنا ہے، یہ پہلے جو میں نے ابتدائے رکوع میں آپ کو متوجہ کیا، کہ یہ ساری کی ساری باتیں ایک ہی مجلس میں نہیں ہو گئیں، یہ برسوں کی کشاکشی کی داستان ہے، جس کا حاصل یہی ہے کہ ابراہیم یوں کہتے تھے، وہ یوں کہتے تھے، اس طرح سے ہوتا رہا، یہ ایک ہی دِن کا قصہ نہیں ہوتا، یہ جو برسوں میں حالات پیش آئے ہیں، قرآنِ کریم مختصر الفاظ میں اس کو تعبیر کرتا ہے کہ گفتگو چلتی رہی، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دھمکی دے دی، انہوں نے سمجھا ہو گا کہ ساری قوم کے مقابلے میں یہ ایک ہے، کیا کرے گا؟ اس کی دھمکی کی کوئی پرواہ نہیں کی، کہ کیا کر سکتا ہے، چھوڑو! ایسے ہی باتیں ہیں۔ دوسرا یہ کہ وہ سمجھتے تھے کہ ایسی جرأت کون کر سکتا ہے ان خداؤں کو ہاتھ ڈالنے کی، یعنی وہ سمجھتے تھے کہ جیسے ہم ان سے ڈرتے ہیں، شاید یہ بھی ایسے ہی باتیں بناتا ہے، ایسا نہیں ہو سکتا، اور ساری قوم کے مقابلے میں یہ یوں کیسے کرے گا، تو قوم نے ان کی باتوں کو اہمیت نہیں دی، ورنہ اگر اہمیت دیتے تو ہر وقت ڈنڈے لے کے وہاں پہرہ دیا کرتے کہ کہیں ابراہیم کسی موقع پہ آ کے ان کی گت نہ بنا جائے، بُت خانوں کو تالے لگا کے رکھتے، اپنے خداؤں کی حفاظت کرتے، لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔

میلے پر جانے سے ابراہیم علیہ السلام نے عذر کر دیا

تو آخر ایک دِن آ گیا، قوم کسی میلے میں گئی ہوئی تھی باہر، ابراہیم علیہ السلام کو ساتھ لے جانا چاہا، انہوں نے عذر کر دیا کہ میری تو طبیعت خراب ہے، میں تو نہیں جاتا، جس طرح سے لفظ آئے گا اِنِّیْ سَقِیْمٌ (سورۂ صافات:۸۹) میری تو طبیعت خراب ہے، اب وہ طبیعت خراب کیسے تھی؟ یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی واقعی بدن میں تکلیف ہو، آخر انسان ہے، بخار بھی ہوتا ہے، درد بھی ہوتا ہے، مزاج بگڑا ہوا ہو کسی اعتبار سے، طبی نقطۂ نظر سے تو اس کی بھی کوئی تردید نہیں ہے، لیکن اگر کچھ بھی نہ ہو تو ہر وقت کڑھتے رہنا، ہر وقت طبیعت میں

غصہ یہ بھی مزاج کو کہاں ٹھیک ہونے دیتا ہے، طبیعت خراب ہونے کا مطلب یہ تھا کہ تمہارے حالات دیکھ دیکھ کے میری طبیعت میں بشاشت نہیں، تم جاؤ، میں نہیں جاتا، میری طبیعت اچھی نہیں ہے، یہ کہہ کر عذر کر دیا۔

ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں بتوں کی بربادی

وہ سارے کے سارے چلے گئے، بُت خانہ ہو گیا خالی، مجاور وہاں رہے نہیں، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام تشریف لے گئے، کلہاڑا لیا، یا ہتھوڑا لیا، دونوں لفظ ہیں، ہاتھ میں کلہاڑا تھا یا ہتھوڑا تھا، ایک طرف سے جو شروع ہوئے، تو پھر اس دِن خوب غصہ نکالا، مارتے بھی جاتے تھے، ساتھ ساتھ انہیں تنبیہ بھی کرتے جاتے تھے اَلَا تَاْكُلُوْنَ، مَالَكُمْ لَا تَنْطِقُوْنَ (صافات: ۹۱، ۹۲) جس طرح سے قرآنِ کریم میں الفاظ آتے ہیں، ایک کو ادھر سے لگائی، اور ساتھ کہا کہ او! تُو بولتا کیوں نہیں؟ دوسرے کو ادھر سے لگائی اور ساتھ کہا کہ یہ تیرے سامنے رکھا ہے، تُو کھاتا کیوں نہیں؟ جیسے کسی کو ذلیل کرنا ہوتا ہے، تو وہاں سے حکایت ساری یوں ہی مرتب ہوتی ہے کہ زبان سے ان کو ذلیل بھی کرتے گئے، تنبیہ بھی کرتے گئے، جس سے ان کا عجز اچھی طرح سے نمایاں ہو گیا، اور مارتے بھی چلے گئے، فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًا بِالْيَمِيْنِ (سورۂ صافات: ۹۳) دائیں ہاتھ کے ساتھ ان کی پٹائی بھی شروع کر دی اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہتے جا رہے تھے، تمہیں کیا ہو گیا، تم بکتے کیوں نہیں؟ بولتے کیوں نہیں؟ کیا قصہ ہے تمہارا؟ تمہیں کیا ہو گیا، تم کھاتے کیوں نہیں؟ تمہارے سامنے جو چڑھاوے رکھے ہوئے ہیں، یہ کہتے جاتے تھے، اور پٹائی کرتے جاتے تھے۔

بڑے بُت کو کیوں چھوڑ دیا؟

تو نتیجہ یہ ہوا کہ فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا: سارے ریزہ ریزہ کر دیے۔ جُذاذ جِذّ کی جمع ہے، جِذّ ٹکڑے کو کہتے ہیں۔ وہ سارے کے سارے ٹکڑے بنا دیے۔ اور جو ان کا بڑا بُت تھا بُت خانے کے اندر، بڑا دونوں اعتبار سے ہو سکتا ہے، یا تو جثّے کے اعتبار سے بڑا تھا کہ باقی چھوٹے چھوٹے بنا کے رکھے ہوئے ہوں گے اور ایک بہت بڑا بنا کے رکھا ہوا ہوگا، اور اس کو ان بتوں کے اندر سرداری بھی حاصل ہوگی، جس کی وجہ سے وہ مرتبے کے لحاظ سے بھی بڑا تھا۔ یا قد کے لحاظ سے بڑا ہو یا نہ ہو، وہ سمجھتے تھے کہ ان سب کے اُوپر بڑا یہ ہے، سرداری اس کو حاصل ہے، چاہے قد کے اعتبار سے چھوٹا ہی ہو، جیسے انسانوں کے قد قامت تو ایک جیسے ہوتے ہیں لیکن انسانوں میں سے ایک انسان کو بڑا کہا جاتا ہے مرتبے کے لحاظ سے، عہدے کے لحاظ سے، ممکن ہے اس کو کوئی اختیارات زیادہ دے رکھے ہوں گے کہ باقیوں کے مقابلے میں یہ زیادہ اختیارات کا مالک ہے اس لیے یہ بڑا ہے۔ تو جس کو اس بُت خانے کے اندر بڑائی حاصل تھی اسے چھوڑ دیا، اسے کچھ نہیں کہا۔ جیسے تاریخی روایات میں آتا ہے کہ وہ کلہاڑا یا ہتھوڑا جو ان کے ہاتھ میں تھا وہ اس کے کندھے پہ رکھ آئے، یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایک ذہنی منصوبہ تھا، کہ باقیوں کو توڑ دیا اور اس کو چھوڑ دیا، اور وہ کلہاڑا، یا تبر جو تھا وہ اس کے کندھے پہ رکھ دیا، مقصد کیا تھا؟ کہ جب وہ لوگ آئیں گے اور اس حالت میں دیکھیں گے تو دفعۃً ان کو خیال یہ آئے گا کہ شاید یہ بڑا خدا جو تھا یہ باقی چھوٹوں پہ ناراض ہو گیا، اور اس نے مار مار کے سارے توڑ دیے، اور پھر بعد میں خود ہی سوچیں گے کہ یہ تو حرکت بھی نہیں کر سکتا، اس طرح سے ممکن ہے ان کا ذہن حرکت کرے، اور ان کا عجز اور عاجزی ان کے

سامنے نمایاں ہوجائے، یا وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف لوٹ کر آئیں، تو ابراہیم علیہ السلام کہہ سکیں گے کہ مجھ سے کیوں پوچھتے ہو؟ جس کے کندھے پہ ہتھوڑا ہے اسی سے پوچھو، اسی نے کیا ہوگا، اور یہ کہنا اسی لیے تھا تاکہ وہ ازخود کہیں کہ یہ تو کر نہیں سکتا، تو اپنی زبان سے اقرار کرلیں گے، جیسے ایک بہت مشکل کام ہو، اور میں اس کو کرلوں، اور قاری صاحب کے متعلق مجھے پتا ہے کہ یہ نہیں کر سکتے، اور بعد میں قاری صاحب آئیں اور پوچھیں کہ یہ کام کس نے کیا؟ میں کہوں آپ نے کیا، اب وہ بھی سمجھتے ہیں کہ یہ طنز ہے، اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ تاکہ یہ زبان سے خود ظاہر کردیں کہ نہیں جی! میں یہ کام کہاں کرسکتا ہوں، اپنی زبان سے اقرار کرلیں کہ یہ میرے بس سے باہر ہے، تو یہ بات جو ایسے موقع پہ ہوا کرتی ہے، مناظرے کے اُصول سے اس کو جھوٹ نہیں کہتے، یہ دوسرے کو مجبور کرنا ہوتا ہے اپنی شکست تسلیم کرنے کے لیے۔ بوجھ آپ اُٹھا کے لے آئے، تو کوئی پوچھتا ہے کہ اس کو کون اُٹھا کے لے آیا؟ تو آپ کہیں کہ تو لایا ہے، یا تیرا باپ لایا ہے۔ تو کون سمجھتا ہے کہ انسان جھوٹ بول رہا ہے، سارے سمجھتے ہیں کہ مقصد صرف طنز ہے، کہ نہ یہ تیرے اٹھانے کی بات تھی، نہ تیرے باپ کے اٹھانے کی بات تھی، میں اٹھا کے لایا ہوں، یہ مطلب خود نکل آتا ہے۔

تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے باقی سارے چھوٹے چھوٹے توڑ کر اس بڑے کو جو چھوڑ دیا، تو یہ ذہنی منصوبہ تھا حضرت ابراہیم علیہ السلام کا، کہ وہ آئیں، آنے کے بعد یہ نقشہ جو ان کے سامنے آئے گا، تو وہ ابراہیم علیہ السلام سے پوچھیں گے، یا جس سے بھی پوچھیں گے، سوچیں گے کہ یہ کیا ہوا، خود ان کا ذہن حرکت کرے گا کہ یہ جو توڑ دیے گئے، یہ تو اپنے آپ کو نہیں بچا سکے، اور یہ ہتھوڑا جو لیے کھڑا ہے، بظاہر معلوم ایسے ہوتا ہے جیسے اس نے توڑ دیے ہوں، لیکن یہ تو حرکت نہیں کرسکتا، اس نے کیسے توڑ دیے؟ تو جب وہ یوں غور کریں گے تو غور کرنے کے ساتھ ان کا عجز خود سمجھ میں آجائے گا، اور وہ سوچیں گے۔ اور ہوسکتا ہے کہ چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام وعظ تو کہتے رہتے تھے، باتیں تو لوگوں کے ذہن میں ڈالی ہوئی تھیں، تو ہوسکتا ہے کہ ادھر بھی ان کا ذہن چلا جائے کہ دیکھو! متعدد خدا ایک جگہ گزارہ نہیں کر سکتے، کبھی کبھی بڑا ناراض ہو کر سب کا رگڑا نکال دیتا ہے، تو اس لیے خدا ایک ہی رہ سکتا ہے، زیادہ نہیں رہ سکتے، ہوسکتا ہے ان کا ذہن ادھر منتقل ہوجائے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام جو توحید کا درس دیتے رہتے ہیں، تو کچھ وہ سوچنے لگ جائیں، کئی مقصد ہوسکتے ہیں۔

بتوں کی حالت دیکھ کر قوم کی حیرانگی اور تفتیش

تو ان کے منصوبے کے مطابق ہی واقعہ پیش آیا کہ جب وہ سارے کے سارے لوگ باہر سے آئے، اور انہوں نے آکے اپنے بت خانے میں یہ حال دیکھا، تو حیران ہوگئے، پریشان ہوگئے سارے، اور یہ لفظ جو آگے آئیں گے آپ کے سامنے کہ مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ یہ اسی حیرانی کا اظہار ہے، کہنے لگے ہمارے خداؤں کا یہ حال کس نے کردیا؟ یا پھر آپس میں ایک دوسرے پہ سوال کرتے ہیں: مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ: ہمارے آلہہ کا یہ حال کس نے کردیا؟ ہمارے آلہہ کے ساتھ یہ برتاؤ کس نے کیا ہے؟ اور اگلے لفظ جو ہیں جس میں آئے گا کہ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ تو کوئی بہت ہی بڑا ظالم ہے جس نے خداؤں پہ

ہاتھ اٹھالیا، یعنی عام ظلم تو وہ ہے جو انسان انسان پہ دست درازی کرتا ہے، اور جس نے خداؤں پر ہی دست درازی کردی، اور ان کو ریزہ ریزہ کر کے رکھ دیا، یہ تو کوئی بہت بڑا ظالم ہے۔ تو آپس میں حیران ہو کے پریشان ہو کے انہوں نے سوچنا شروع کر دیا، کہ یہ حرکت کس کی ہے؟ جب اس طرح سے سب کے علم میں یہ بات آگئی تو سوچنے لگ گئے کہ آخر یہ حرکت کون کر سکتا ہے؟ تو پھر بعض نے کہا کہ بھئی! ایک جوان ہے جو ہمیشہ ان بتوں کا ذکر برائی سے کرتا رہتا ہے، ہمیں تو شک ہے کہ یہ حرکت اسی نے کی ہے، کیونکہ باقی تو سارے سجدے کرنے والے تھے تو ان میں کون بتوں پر ہاتھ اٹھا سکتا تھا، اور یہ ان کے ذہن میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ اس بڑے نے ان کو توڑ دیا، جن کے سامنے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بات تھی، اور جنہوں نے یہ سنا تھا کہ ابراہیم علیہ السلام نے قسم کھا کے کہا ہے کہ میں ان کی گت بناؤں گا، یہ ساری قوم نے نہیں سنا ہوگا، بعض افراد نے سنا ہوگا، جیسے کبھی کسی مجمع میں گفتگو ہوتی ہے، کبھی کسی ٹولی کے سامنے ہوتی ہے، کبھی کسی جگہ ہوتی ہے، تو جن لوگوں کے سامنے یہ بات ہوئی تھی انہوں نے کہا کہ ایک جوان ہے جس کو ابراہیم کہتے ہیں، وہ ہمیشہ ان بتوں کا ذکر برائی سے کرتا رہتا ہے، معلوم ہوتا ہے یہ حرکت اس کی ہے، اب جس وقت انسان عقل کا اندھا ہوتا ہے پھر اپنے لیے اس قسم کا طریق اختیار کرتا ہے، کہ پستی کی طرف لڑھکتا ہی چلا جاتا ہے، اب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ کوئی ایک آدھ آدمی جا کے تنہائی میں گفتگو کر لیتا تو سب کی رسوائی نمایاں نہ ہوتی، تو سارے اسی جوش وخروش میں کہنے لگے کہ لاؤ پکڑ کے اسے، سب کے سامنے لاؤ، تاکہ شہادت ہو جائے، لوگ اقرار کریں کہ واقعی یہ برائی کا قول کرتا تھا یا اس نے قسم کھائی تھی کہ میں ایسے کروں گا، تاکہ جرم سب کے سامنے ثابت ہو جائے، اور ہم جو سزا بھی دیں تو کسی کو اعتراض نہ ہو، اور پھر سب کے سامنے سزا دی جائے تاکہ آئندہ کے لئے لوگوں کو عبرت ہو جائے کہ ان بتوں کی گستاخی نہیں کرنی چاہیے، اس قسم کے مقاصد سوچ کے انہوں نے سارے مجمع کے اندر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بلالیا، یہ ایسے ہوا جیسے فرعون نے یہ خیال کر کے کہ موسیٰ کو شکست دینے کے لیے سارے ملک کے لوگ میں اکٹھے کرلوں تاکہ شکست کھا جائے تو اس کی تحریک ختم ہو جائے گی، جادوگروں کو اکٹھا کرلیا، موسیٰ کو بلالیا، لیکن یہ تدبیر الٹی فرعون کے گلے میں پڑ گئی، کہ سارے مجمع کے اندر جادوگروں کی شکست نمایاں ہوگئی، تو فرعون کا منصوبہ خاک میں مل گیا۔ اسی طرح سے انہوں نے بھی سب کے سامنے ابراہیم علیہ السلام کو بلایا، اب آپ اندازہ کریں کہ جس قوم کے خداؤں کا ستیاناس کر دیا گیا ہو، وہ قوم کتنی مشتعل ہوگی، اور بچہ بچہ وہاں اکٹھا ہوگا۔

''بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا'' کا مفہوم

اکٹھے ہونے کے بعد ابراہیم علیہ السلام بھی پکڑ لیے گئے، لائے گئے، لانے کے بعد ان کے بڑوں نے، وڈیروں نے، مذہبی پیشواؤں نے یہ سوال کیا ہوگا، جیسے کہ تحقیق کرنے کا انداز ہوتا ہے کہ بڑے لوگ ہی پوچھا کرتے ہیں، ان سے پوچھتے ہیں کہ ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ابراہیم! ہمارے خداؤں کا یہ حال تُو نے کیا ہے؟ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بڑے اطمینان سے جواب دیا: بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا بَل کا مطلب یہ ہے کہ میں نے نہیں کیا، اس نے کیا ہے، یہ جو بڑا ہے اس نے کیا ہے، جس کے

پاس ہتھیار ہے توڑنے پھوڑنے کا، کھڑا ہے، تم اس کی طرف نسبت کیوں نہیں کرتے؟ اور اگر اس کے سامنے تم نہیں بول سکتے، اس سے نہیں پوچھ سکتے، تو یہ ٹوٹے پڑے ہیں، ان سے پوچھ لو، یہ تمہیں خود بتا دیں گے کہ ان کا یہ حال کس نے کیا ہے؟ اب آپ اندازہ کیجئے کہ کیا پتھروں کی طرف اشارہ کر کے حضرت ابراہیم علیہ السلام دل سے سمجھتے تھے کہ یہ پوچھیں گے تو جواب دے دیں گے؟ ایسا نہیں، یہ دوسرے پر الزام دینے والی بات ہے، ان سے پوچھو جن کے مار پڑی ہے، ان سے پوچھو تمہیں کس نے مارا ہے؟ اور اگر ظاہری علامت دیکھنا چاہتے ہو تو یہ کھڑا ہے۔ تو یہ الزام دینے والی بات ہے، نہ سننے والوں نے اس کو جھوٹ سمجھا ہے، نہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ارادہ جھوٹ بولنے کا ہے، یہ تو ایک منصوبہ تھا کہ اس طرح سے توحید کو عملاً ثابت کروں گا، غصہ نکالنے کا موقع تو ابھی ملا تھا، ورنہ سیدھی بات ہے آگے سے کوئی بولتا کہ ابراہیم! جھوٹ کیوں بولتے ہو؟ ایسے تو کسی نے نہیں کہا، وہ سمجھ گئے کہ یہ گفتگو کا ایک اُصول ہے، اور ہر زبان کے اندر یہ اُصول ہے، جیسے میں نے پہلے آپ کے سامنے مثالیں دیں۔

ابراہیم علیہ السلام کے جواب سے کافر شرمسار ہو گئے

تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کہنے لگے: میں نے نہیں کیا، اس نے کیا ہے، یہ ان کا بڑا ہے، اور ان سے پوچھ لو، جب یہ بات حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہی، تو وہ لوگ تھوڑی دیر کے لئے شرمسار ہو گئے، شرمسار ہونے کے بعد دِل میں سوچنے لگے کہ واقعی یار! غلطی تو ہماری ہے۔ ''غلطی ہماری ہے'' سے ان کا کیا مطلب تھا؟ یا تو یکدم ان کے سامنے ایک حق نمایاں ہوا، حق کی روشنی آئی کہ واقعی یہ چیزیں تو پوجنے کے قابل نہیں ہیں، ہم ہی غلط کار ہیں، لیکن جاہل آدمی جس وقت اپنی ہٹ پہ پکا ہوتا ہے، تو اس کو یکدم اگر حق کی روشنی آتی بھی ہے تو اپنی جاہلی عصبیت میں وہ پھر اس کو دبا دیتا ہے، تو حق کی روشنی ان کے سامنے آئی، دل میں خیال آیا کہ واقعی غلطی ہماری ہے، اور شرم کے مارے سر جھکا لیا، سر جھکانے کے بعد شرمیلے سے ہو کے، جس طرح سے ایک مغلوب آدمی، دبا ہوا آدمی گفتگو کرتا ہے، تو وہ آہستہ سے کہتے ہیں کہ ابراہیم! تجھے پتا ہے کہ یہ تو بول نہیں سکتے! اور یہی بات نکلوانا چاہتے تھے حضرت ابراہیم ان کے منہ سے، فرمایا کہ بدبختو! تم پر بھی لعنت، تمہارے ان معبودوں پر بھی لعنت، جن میں اتنی طاقت بھی نہیں ہے کہ اپنے آپ کو بچالیں، اور کسی تکلیف میں مبتلا ہو جائیں اور تم ان سے پوچھو تو بتا بھی نہیں سکتے۔ اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ: اُف ہے تم پر اور تمہارے معبودوں پر، تف ہے، یہ تف اور اُف ویسے ہی ہے جیسے پچھلی تحریک میں تم کہتے تھے ''بھٹو اتھک ہے، بھٹو اتھک ہے'' تو یہ وہی ''تھک ہے'' والی بات ہے، تمہارے لیے بھی اور تمہارے معبودوں کے لیے تف، یعنی تم اس قابل ہو کہ تم پہ اور تمہارے معبودوں پہ تھوک دیا جائے کہ تمہیں اتنی عقل نہیں ہے کہ جو بول نہیں سکتے اپنے آپ کو بچا نہیں سکتے، تم ان کی پوجا کرتے ہو؟ اور یہی حضرت ابراہیم علیہ السلام سمجھانا چاہتے تھے۔

آیتِ بالا کا ایک اور مفہوم

ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ کا ایک مطلب تو وہی ہے جو میں نے عرض کیا کہ شرم کی بنا پر سر جھکا لیے، شرمسار ہو گئے، اور منہ نیچا

کرلیا، گردن جھکالی، اور پھر کہنے لگے کہ ابراہیم! تجھے پتا ہے کہ یہ تو بول نہیں سکتے۔ اور ایک مطلب یہ بھی ہے کہ پہلے ان کے دل میں کوئی حق کی کرن آئی، جس کی بنا پر ان کو خیال آیا کہ واقعی غلطی پر ہم ہیں، لیکن پھر اُلٹے ہو گئے، اُلٹے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ پھر وہی فہم اُلٹا ہو گیا، پھر وہی جاہلیت والی اَڑی میں آ گئے، اُلٹ دیے گئے، چکر کھا گئے، چکر کھا کے دوبارہ اسی ڈگر پہ پھر آ گئے، اس لئے پھر حمایت کرنے لگے، کہنے لگے کہ یہ تو بول نہیں سکتے، تُو بتا، کیا بات ہے؟ تو پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنا مدعا صاف الفاظ میں بیان کیا۔ اور یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ یہ جو کہہ رہے تھے کہ غلطی تمہاری ہے، اس غلطی سے ان کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ہم ان کی جو پُوجا کر رہے ہیں تو وہ غلطی ہے، بلکہ ان کا مطلب یہ تھا کہ جب تم سُن رہے تھے کہ ابراہیم دھمکیاں دے رہا ہے تو پھر تم نے بُت خانہ خالی کیوں چھوڑا؟ اس میں تو غلطی تمہاری ہے، جس طرح سے ایک دوسرے کو الزام دیا جاتا ہے۔ تو اس غلطی کے اقرار میں یہ بات بھی ہے کہ یکدم ان کے دل میں خیال آیا ہو کہ ہمارا طریقہ غلط ہے، ہم نے جو ان کو مختار سمجھ لیا، کارساز سمجھ لیا، یہ غلط ہے، یہ ٹھیک نہیں ہے، لیکن پھر اُلٹے ہو گئے، اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ غلطی تمہاری ہے، کہ جب تمہیں پتا تھا کہ یہ شرارت کرنا چاہتا ہے اور ان کے ساتھ کوئی چھیڑ چھاڑ کرے گا، ان کی گت بنائے گا، ان کی خبر لے گا، ان کا علاج کرے گا، تم اس قسم کی باتیں اس کی سُن رہے تھے، پھر تمہاری غلطی ہے کہ تم نے ان کو خالی کیوں چھوڑا؟

دلیل کا جواب نہ رہے تو باطل لڑائی پر اُتر آتا ہے

بہر حال وہ اپنی جاہلانہ ہٹ کے اوپر آ گئے، تو پھر وہ کہنے لگے جب کوئی دلیل نہیں رہی..... تو جاہل آدمی کا یہی کام ہوتا ہے کہ جب زبان سے کوئی دلیل قائم نہ کر سکے، یا دوسرے کی دلیل کا جواب نہ دے سکے تو پھر وہ مُکّا نکالتا ہے، جیسے ہمارے شیخ (سعدی رحمۃ اللہ علیہ) کہتے ہیں کہ:

چوں حُجت نماند جفا جوئے را بہ پرخاش درہم کشد روئے را[1]

کہ جب ظالم کے لئے، جفاور کے لئے، جفا کرنے والے کے لئے جب حُجت نہیں رہتی تو لڑائی پہ اُتر آتا ہے۔ اب دلیل تو کوئی تھی نہیں، اب ساری قوم نے اتفاق کرلیا کہ اپنے معبودوں کا بدلہ لینے کے لئے اس کو جلا دو، آگ میں ڈال دو، ساری قوم اس بات پہ متفق ہو گئی، گویا کہ ان کے نزدیک یہ سخت سے سخت سزا تھی جو کسی مذہبی مجرم کو دی جا سکتی تھی، اور وہ سمجھتے تھے کہ اس سے بڑا مجرم کون ہو سکتا ہے کہ جو خداؤں کی توہین کرے اور ان کے اوپر بھی ہاتھ اُٹھاتا ہے، اس لیے تم اپنے آلہہ کی مدد کرو، اگر تم نے کرنی ہے تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو آگ میں جلا دو۔

آگ میں حفاظت اور شام کی طرف ہجرت

تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جلانے کا پروگرام بن گیا، ایندھن اکٹھا کیا گیا، آگ جلائی گئی، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اُٹھا کے اس میں پھینک دیا گیا، لیکن اللہ کی طرف سے یہاں پھر معجزہ نمایاں ہوا، جس سے ساری کی ساری قوم شکست کھا گئی، کہ

(۱) ''بوستاں''، باب اوّل، بعنوان: حکایت حجاج یوسف۔

آگ میں جلانے کی صلاحیت ہی ختم ہوگئی، دیکھنے میں وہ آگ ہے سب کچھ ہے لیکن جلانے کی صلاحیت ختم ہوگئی، اللہ تعالیٰ نے اس کو ''بَردوسلام'' کردیا، ٹھنڈی ہوگئی، سلامتی والی ہوگئی، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس سے کوئی تکلیف نہ ہوئی، تو وہ مغلوب کرنا چاہتے تھے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو، اور اس مقابلے میں مغلوب خود ہوگئے، یہاں تک جب بات پہنچی تو آپ جانتے ہیں کہ کشاکشی انتہا کو پہنچ جاتی ہے، باپ سے کشاکشی، قوم سے کشاکشی، حکومت سے کشاکشی، اور سمجھنے کا انہوں نے نام نہیں لیا، تو پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ارادہ کرلیا کہ اب اس علاقے میں رہنے کا فائدہ کوئی نہیں، یہاں سے ہجرت کرجانی چاہیے، کسی دوسرے علاقے میں جاکر امن سے وقت گزاریں، پھر یہ عراق کے علاقے سے (حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اصل علاقہ عراق کا ہے) عراق کے علاقے سے حضرت ابراہیم علیہ السلام ہجرت کرکے شام کی طرف تشریف لے گئے، پھر جاکے شام میں ٹھہرے ہیں، وہیں جاکے پھر آپ کی اولاد ہوئی ہے، اور پھر وہیں حضرت اسحاق علیہ السلام اور ان کے بیٹے یعقوب علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام کی اولاد بنی اسرائیل، پھر شام کے اندر یہ قبائل پھیلے ہیں، اس رکوع کے اختتام تک یہ واقعہ آرہا ہے۔

آیاتِ بالا کا خلاصہ

دیکھیے...... فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا: ابراہیم علیہ السلام نے ان کو ریزہ ریزہ کردیا مگر ان کے بڑے بت کو، یعنی جو ان کا بڑا اِلٰہ تھا، چاہے جثے میں، چاہے مرتبے میں، اور چاہے دونوں باتوں میں کہ جثے میں بھی بڑا ہو اور مرتبے میں بھی بڑا ہو۔ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ: تاکہ وہ لوگ ابراہیم علیہ السلام کی طرف لوٹیں اور آکے بات کریں، یا تاکہ وہ لوگ اس بڑے کی طرف لوٹیں اور دیکھیں کہ یہ کھڑا ہے، باقی ٹوٹے ہوئے ہیں، اور توڑنے کا ہتھیار بھی اس کے ہاتھ میں ہے، تو کیا اس نے توڑ دیے؟ کیا یہ توڑ سکتا ہے؟ ادھر رجوع کرکے وہ ان باتوں کو سوچیں، یا تاکہ وہ ابراہیم علیہ السلام کی طرف رجوع کریں اور ابراہیم علیہ السلام کو ان کے اوپر الزام قائم کرنے کا موقع مل جائے۔ قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا: کہنے لگے کہ کس نے کیا یہ کام ہمارے آلہہ کے ساتھ بے شک وہ تو البتہ ظالموں میں سے ہے، پھر کچھ بولے: سَمِعْنَا فَتًى: سنا ہم نے ایک جوان کو يَذْكُرُهُمْ: جو ان بتوں کا تذکرہ کرتا تھا، یعنی بُرائی کے ساتھ، يُقَالُ لَهٗٓ اِبْرٰهِيْمُ: اس کو ابراہیم علیہ السلام کہا جاتا ہے، یعنی اس کا نام ابراہیم ہے۔ قَالُوْا: پھر کچھ لوگ کہنے لگے کہ فَاْتُوْا بِهٖ: لے آؤ اسے، عَلٰٓى اَعْيُنِ النَّاسِ: لوگوں کی آنکھوں کے سامنے، لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ: تاکہ لوگ گواہ ہوجائیں، لوگوں کے سامنے جرم ثابت ہوجائے، لوگ گواہیاں دیں کہ واقعی اس نے ہمارے سامنے کہا تھا کہ میں یوں کروں گا، یعنی لوگوں کی شہادت کے ساتھ اس کا جرم ثابت ہوجائے گا، جنہوں نے اس کی بات یہ سنی تھی وہ گواہی دیں لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ کا یہ معنی بھی ہے، تاکہ وہ لوگ جنہوں نے یہ بات سنی تھی کہ ابراہیم نے کہا کہ میں ان کو توڑوں پھوڑوں گا، وہ گواہی دے دیں، اور جب گواہی دے دیں گے، جرم ثابت ہوجائے گا، اور جب سب کے سامنے جرم ثابت ہوجائے گا تو سزا دینے میں کسی کو اعتراض نہیں ہوگا، اور باقی لوگوں کے لیے عبرت بھی ہوجائے گی کہ دیکھو! اس گستاخی کی کتنی سخت سزا ملتی ہے۔ ''لے آؤ لوگوں کے سامنے تاکہ وہ لوگ گواہی دیں، یا تاکہ وہ لوگ مشاہدہ کرلیں، دیکھ لیں، گواہ بن جائیں۔'' قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا: اب ابراہیم علیہ السلام پکڑے ہوئے آگئے، بلا لیے گئے، اب اس قَالُوْٓا کا فاعل ہوں گے ان میں سے معتبر قسم کے لوگ جو

تحقیقات کر رہے ہیں، کہنے لگے کہ کیا تُو نے کیا یہ کام ہمارے آلہہ کے ساتھ اے ابراہیم؟ قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا: ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ بلکہ کیا ہے یہ ان کے اس بڑے نے، فَسْـَٔلُوْهُمْ: پس ان چھوٹے چھوٹوں سے پوچھ لو اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ: اگر یہ بولتے ہیں۔" بلکہ کیا ہے یہ کام ان کے اس بڑے نے، پس پوچھ لو ان سے اگر یہ بولتے ہیں۔" فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ: پس رجوع کیا ان لوگوں نے اپنے دلوں کی طرف، دلوں میں سوچنے لگ گئے، فَقَالُوْٓا: پھر اپنے دلوں میں کہنے لگے: اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ: بے شک تم ہی لوگ قصوروار ہو، اب اس کے دو مطلب میں نے آپ کی خدمت میں عرض کیے ہیں، "تم ہی لوگ قصوروار ہو" کیا مطلب؟ کہ ان کی پُوجا کر کے تم ہی قصوروار ہو، یہ یکدم حق کی ایک کرن ان کے دلوں میں آئی، یا وہ دلوں میں یوں سوچنے لگ گئے کہ غلطی تمہاری ہے، قصوروار تم ہو، جب تمہیں پتا ہے کہ یہ ارد گرد چکر لگاتا پھرتا تھا، اور یوں دھمکیاں بھی دیتا ہے، اس نے گڑبڑ کرنی ہے، تو تم نے بت خانے کی حفاظت کا انتظام کیوں نہیں کیا؟ اپنے دلوں میں خود شرمسار ہو کے یوں سوچنے لگ گئے۔ ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ: پھر وہ سروں پر اُلٹے کر دیے گئے، اُلٹے کر دیے گئے اپنے سروں پر، "سروں پر اُلٹے کر دیے" کے بھی دو مفہوم میں نے آپ کی خدمت میں عرض کیے، یا تو یہ ہے کہ شرم کے مارے سر جھکا لیے، یوں ہو گئے جیسے سر نیچے کو کر لیا، یا اُلٹے کر دیے گئے معنوی طور پر، کہ صحیح سمجھ پیدا ہونے لگی تھی پھر اُلٹے ہو گئے، اور پھر وہی اُلٹی چال چل دی۔ کہنے لگے: لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ: البتہ تجھے معلوم ہے، بے شک تجھے معلوم ہے، بلاشک وشبہ تُو جانتا ہے کہ یہ تو بولتے نہیں، اسی طرح سے اس میں یہ بھی ہے کہ بڑے سے کیا پوچھیں وہ بھی نہیں بولتا، چھوٹوں سے کیا پوچھیں یہ بھی نہیں بولتے، یعنی بڑے سے بھی تو تبھی پوچھ سکتے تھے نا، کہ ان کا خیال ہو کہ ہم پوچھیں گے تو وہ بتا دے گا، جب بولتے ہی نہیں، نہ بڑا بولے نہ چھوٹے بولیں تو ان سے کیا پوچھیں، اور فعل کی نفی تو ظاہر ہی ہے، کہ یہ تو ممکن ہی نہیں کہ کیا اس نے ہو، جب بول ہی نہیں سکتے تو کرنا اس نے کیا ہے، وہ بات خود واضح ہے کہ نہ وہ توڑ سکتا ہے، اور نہ یہ بول کے بتا سکتے ہیں۔ قَالَ: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ: کیا پھر تم پُوجا کرتے ہو اللہ کے علاوہ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْـًٔا: ایسی چیزوں کی جو تمہیں فائدہ نہیں پہنچا سکتیں کچھ بھی اور نہ تمہیں نقصان پہنچا سکتی ہیں، اور یہ بات خود واضح ہو گئی کہ جو اپنے نفع نقصان کے مالک نہیں وہ تمہیں نفع نقصان کس طرح سے پہنچائیں گے، تم ایسی بے جان چیزوں کی بے اختیار چیزوں کی پُوجا کرتے ہو؟ اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ: تمہارے لیے اور تمہارے ان معبودوں کے لئے جن کو تم اللہ کے علاوہ پُوجتے ہو اُف ہے، تف ہے، تھک ہے، یہ مفہوم ہے اس کا۔ اُف کے لفظ میں بے زاری اور نفرت کا اظہار ہوتا ہے۔ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ: کیا تم سوچتے نہیں ہو؟ تمہاری عقلیں ماری گئیں؟ ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہو پُوجا کرتے ہو جو تمہیں نہ نفع پہنچا سکتی ہیں نہ کوئی نقصان پہنچا سکتی ہیں۔ قَالُوْا حَرِّقُوْهُ: اب وہی جاہلوں والی بات آ گئی، کہ جب دلیل سے مقابلہ نہ ہو سکا، تو چلو قوت ہی سہی، طاقت ہی سہی، کہنے لگے کہ جلا دو اس کو، یہ جلانا ان کے نزدیک گویا کہ مذہبی مجرم کی سب سے بڑی سزا تھی، اور مذہبی طور پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو انہوں نے سب سے بڑا مجرم قرار دیا، اور یہ سزا تجویز کر دی۔ "جلا دو اس کو اور مدد کرو اپنے خداؤں کی اگر تم کرنے والے ہو" یہاں مدد کرنا بدلہ لینے کے معنی میں ہے، اپنے خداؤں کا بدلہ لو۔ قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا: اس میں دیکھو! حکایت ساری سمٹ گئی کہ فیصلہ ہو گیا، قوم کا اتفاق

ہوگیا، حکومت ساتھ ہوگئی، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جلانے کا فیصلہ ہوگیا، حتیٰ کہ ایندھن اکٹھا کر کے آگ لگا کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس میں پھینک دیا گیا، تو ہم نے کہہ دیا کہ اے آگ! ٹھنڈی اور سلامتی ہو جا، قُلْنَا يٰنَارُ: ہم نے کہا کہ اے آگ! ہو جا تُو ٹھنڈی اور سلامتی والی۔ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ: ابراہیم علیہ السلام پر، معلوم ہوگیا کہ اس کی بے اثری ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں تھی، اور اگر کوئی دوسرا آدمی جا گھستا تو جل جاتا، لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حق میں وہ ٹھنڈی ہوگئی اور سلامتی والی ہوگئی، آخر جس اللہ نے آگ کے اندر جلانے کا اثر پیدا کیا ہے وہ اللہ اس اثر کو ختم بھی کر سکتا ہے، وَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا: انہوں نے ارادہ کیا ابراہیم علیہ السلام کے متعلق تدبیر کا، کید کا لفظ وہی جس طرح سے لَاَكِيْدَنَّ میں آیا، انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق ایک تدبیر کا ارادہ کیا، فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ: ہم نے انہی کو خسارے میں پڑنے والے بنا دیا، اس مقابلے میں بھی خسارے میں وہی رہے۔

مُلکِ شام میں ظاہری و معنوی برکات

وَنَجَّيْنٰهُ: اور ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو نجات دی، وَلُوْطًا: یہ لُوط حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے ہیں، سورۂ عنکبوت میں آئے گا فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ (آیت:۲۶) گویا کہ اس قوم میں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر صرف حضرت لُوط علیہ السلام ایمان لائے، اور ہجرت انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ کی، ''اور لُوط کو بھی ہم نے نجات دی'' اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ ایسی زمین کی طرف کہ جس میں ہم نے برکت دی تھی، اس سے شام کا علاقہ مراد ہے، اس میں برکت ظاہری بھی تھی اور باطنی بھی، ظاہری برکت یہ کہ تمام علاقوں کے مقابلے میں بہت شاداب علاقہ ہے، اردگرد کوئی علاقہ اتنا آباد نہیں، جتنا شام کا علاقہ آباد اور شاداب ہے، اور معنوی برکت اس میں یہ تھی کہ اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد اس میں بہت سارے انبیاء علیہم السلام بھیجے، ''جس میں ہم نے برکت دے رکھی ہے لوگوں کے لئے، عالمین کے لئے، جہان والوں کے لیے۔''

وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً: اور ہم نے عطا کیا ابراہیم علیہ السلام کو اسحاق اور یعقوب، نافلہ پوتے کے معنی میں ہے، جو اپنی اولاد سے زائد اولاد مل گئی، نافلہ: زائد چیز کو کہتے ہیں، اور یہاں پوتے کا مفہوم ہے، اسحاق بیٹا دیا، یعقوب پوتا دیا، یہ زائد اِنعام دیا، اولاد سے اوپر دوسری اولاد۔ وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ: ہم نے سب کو نیک بنایا، بڑے شائستہ لوگ تھے۔ وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا: اور ہم نے بنایا ان کو ایسے اِمام جو کہ ہمارے حکم کے مطابق راہنمائی کرتے تھے، وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ: اور ہم نے حکم بھیجا ان کی طرف نیکیوں کے کرنے کا اور نماز کے قائم کرنے کا، اور زکوٰۃ کے دینے کا، اور وہ لوگ ہماری عبادت کرنے والے تھے، علمی عملی ہر قسم کے کمالات ان کو حاصل تھے۔

لفظ ''لواطت'' کے بارے میں ایک اہم نوٹ!

وَلُوْطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا: یہ لُوْطًا منصوب علی شریطۃ التفسیر ہے، بعد میں اٰتَيْنٰهُ یہ فعل آ گیا۔ یعنی لُوط علیہ السلام کو ہم نے نبی بنایا اس کو علم وحکمت دی، وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْقَرْيَةِ: اور ہم نے نجات دی اس کو ایسی بستی سے الَّتِيْ كَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰٓئِثَ: جو بستی خبیث کام کیا کرتی تھی، بستی کی طرف نسبت مجازاً ہے، ورنہ بستی والے خبیث کام کرتے تھے، خبیث کام کئی سارے تھے جو کرتے تھے، بدعملی

میں مبتلا تھے، لیکن ان میں سے جو سرفہرست کام تھا وہ تھا مردوں کا مردوں کے ساتھ قضائے شہوت کرنا، جس کو آج کی زبان میں آپ لوگ ''لواطت'' کہتے ہیں، یہ ''لواطت'' کا لفظ بہت بعد کا پیدا شدہ ہے، پُرانی تاریخ میں یہ لفظ نہیں ہے، سرور کائنات ﷺ نے روایات میں یہ لفظ استعمال نہیں کیا، جہاں اس فعل کا تذکرہ آیا ہے تو حضور ﷺ اس کے لیے اتنے لمبے الفاظ استعمال فرماتے ہیں: ''مَنْ عَمِلَ عَمَلَ قَوْمِ لُوطٍ فَاقْتُلُوا الْفَاعِلَ وَالْمَفْعُولَ بِهِ''(۱) جو قومِ لُوط والا عمل کرے تو فاعل اور مفعول بہ دونوں کو قتل کردیا کرو، حدیث شریف میں یہ روایت موجود ہے۔ تو ''من عمل عمل قوم لوط'' اتنی لمبی ترکیب ہے، اور ایک روایت میں ہے حضور ﷺ نے فرمایا کہ جن چیزوں کا مجھے اپنی اُمّت کے اوپر اندیشہ ہے ان میں سے اَخْوَف یعنی سب سے زیادہ ڈر کی چیز جو ہے وہ ''عَمَلُ قَوْمِ لُوطٍ''(۲) قومِ لُوط کے عمل کا مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں میری اُمّت اس فعل میں مبتلا نہ ہوجائے، یہ بہت ڈرنے کی بات ہے۔ تو ''لواطت'' کا لفظ حضور ﷺ نے استعمال نہیں فرمایا، یہ لفظ ''مُوَلَّد'' ہے کہ بعد میں لوگوں نے پیدا کرلیا، اور جس نے بھی یہ لفظ بنایا اس نے بہت بڑی زیادتی کی، کیسے زیادتی کی؟ کہ یہ لفظ بنالیا گیا حضرت لُوط علیہ السلام کے نام سے، حالانکہ حضرت لُوط علیہ السلام کا اس فعل سے کیا تعلق؟ فعل تو ان کی قوم کا تھا، اور یہ بنالیا ''لاط یلوط''، ''لاط یلوط'' بنا کے اس سے ''لواطت'' مصدر بنالیا، پھر یہ ادب کی کتابوں میں بھی آیا، مفسرین بھی لکھ دیتے ہیں، شارحینِ حدیث بھی لکھ دیتے ہیں، اب سب کتابوں کے اندر یہی لفظ رائج ہے، اور قباحت اس لفظ کی اس طرح سے ہے کہ جتنے انبیاء علیہم السلام ہیں ان سب کی طرف نسبت لوگ کرلیتے ہیں، کوئی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف نسبت کی بنا پر ''موسوی'' کہلاسکتا ہے، عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت کے ساتھ ''عیسوی'' کہلاسکتا ہے، ہود علیہ السلام کی طرف نسبت کی بنا پر ''ہودی'' کہلاسکتا ہے، محمد ﷺ کی طرف نسبت کی بنا پر ''محمدی'' کہلاسکتا ہے، ''ابراہیمی'' کہلاسکتا ہے، ''اسحاقی'' کہلاسکتا ہے، ''اسماعیلی'' کہلاسکتا ہے، ''یعقوبی'' کہلاسکتا ہے، لیکن حضرت لُوط علیہ السلام کی طرف نسبت کی کوئی جرأت کرسکتا ہے کہ اپنے آپ کو کہے کہ میں ''لُوطی'' ہوں؟ کیونکہ ''لُوطی'' کا لفظ اب اس طرح بن گیا کہ اس کا معنی یہ ہے کہ جو عمل قومِ لُوط کرے، تو یہ نسبت اتنی قبیح ہوگئی، اس لیے میں کہہ رہا ہوں کہ یہ لفظ جنہوں نے بنایا، جنہوں نے اختیار کیا، انہوں نے اچھا نہیں کیا، کہ نبی کے نام سے اس فعل کی ترجمانی کرلی، حدیث شریف میں یہ لفظ نہیں آتا، قرآنِ کریم نے یہ لفظ اختیار نہیں کیا، یہ بعد میں لوگوں نے بنایا اور لُوط علیہ السلام کے نام سے بنالیا، ان کے نام کو اس فعل کی ترجمانی کے لیے اختیار کرلیا گیا، یہ اچھا نہیں ہوا۔

تو وہ قریہ والے جو خباثتیں کرتے تھے ان خباثتوں میں سے سرفہرست یہ خباثت تھی، پھر ان کے اوپر عذاب آیا، دوسری آیات میں اس کی تفصیل آئے گی، اور گزر بھی چکی کئی جگہ، تو جو بستی خبیث کام کرتی تھی، اس بستی سے ہم نے انہیں نجات تھی، اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فٰسِقِيْنَ: بے شک وہ بُرے لوگ تھے بدمعاش تھے، بڑے بدمعاش اور بڑے بدکردار تھے، ان سے ہم نے اس کو نجات دی، وَاَدْخَلْنٰهُ فِيْ رَحْمَتِنَا: اور ہم نے اس لُوط کو داخل کیا اپنی رحمت میں، اِنَّهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ: وہ بہت ہی اچھے آدمیوں میں سے تھا، بے شک وہ شائستہ اور لائق آدمیوں میں سے تھا۔

---

(۱) مسند بزار ۱۶/۴۳، رقم ۹۰۷۹۔ نیز ترمذی ۱/۲۷۰، باب ماجاء فی حد اللوطی۔ مشکوٰۃ ۲/۳۱۲، کتاب الحدود۔ ولفظھما: مَنْ وَجَدْتُمُوْهُ يَعْمَلُ عَمَلَ قَوْمِ لُوطٍ الخ۔

(۲) ترمذی ۱/۲۷۰، باب ماجاء فی حد اللوطی۔ مشکوٰۃ ۲/۳۱۲، کتاب الحدود، فصل ثانی۔ ولفظ الحدیث: اِنَّ اَخْوَفَ مَا اَخَافُ عَلٰى اُمَّتِيْ عَمَلُ قَوْمِ لُوطٍ

توحیداور شرک کی حقیقت

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ جو آپ کے سامنے آیا اس کا نمایاں پہلو اثباتِ توحید اور رَدِّ شرک ہے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام انبیاء علیہم السلام میں بہت نمایاں شخصیت ہیں، بلکہ جدالانبیاء ہیں کہ آپ کے بعد جتنے انبیاء علیہم السلام آئے سب آپ کی ہی اولاد سے ہیں، آپ کے دو بیٹے تھے اسماعیل علیہ السلام اور اسحاق علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد میں حضرت یعقوب علیہ السلام، اور ان کا نام تھا اسرائیل، اور آگے انبیائے بنی اسرائیل جتنے ہیں وہ سب حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں، اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام جدالانبیاء ہیں، اور اثباتِ توحید میں جتنا واضح واقعہ ان کا ہے اتنا واضح واقعہ دوسرا قرآنِ کریم میں مذکور نہیں، تو خیال ہوا کہ اس وقت توحید اور شرک کے متعلق کوئی بات واضح کردی جائے کہ شرک کا مفہوم کیا ہے؟ اور توحید کا حاصل کیا ہے؟ توحید اسلام کے بنیادی عقیدوں میں سے اہم عقیدہ ہے کہ جس میں ذرا سا بھی خلل واقع ہوجائے تو انسان ایمان سے خارج ہوجاتا ہے، اور اس کے مقابل ہے شرک، تو ان دونوں لفظوں کے مفہوم کو خوب اچھی طرح سے ذہن نشین کرلیجئے۔

''توحید'' کا مفہوم

توحید کا لفظی معنی ایک قرار دینا، اللہ کی توحید یعنی اللہ کو ایک قرار دینا، موٹی سی بات یہ ہے کہ یہ عقیدہ رکھئے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ جو کچھ ہے، چاہے اس کا تعلق عالم بالا کے ساتھ ہے چاہے عالم سفلی کے ساتھ، اور چاہے زمین اور آسمان کے مابین کے ساتھ، جو بھی ماسوی اللہ ہے، اللہ کے سوا جو کچھ ہے ہر چیز کا خالق اللہ ہے دوسرا کوئی خالق نہیں، خلق میں اس کا کوئی دوسرا شریک نہیں ہے، اور مالک اللہ ہے اس کے علاوہ کوئی دوسرا مالک نہیں، ملکیت میں اس کے ساتھ کوئی دوسرا شریک نہیں، پھر اس مخلوق کو پیدا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی اس پر مالکیت قائم ہے، اور ذرہ ذرہ جہاں کہیں بھی موجود ہے وہ اللہ کے علم میں ہے، اللہ ہر وقت ہر چیز کو جانتا ہے، اللہ تعالیٰ کا علم محیط ہے، اس علم میں اس کا کوئی دوسرا شریک نہیں، کہ کوئی دوسری شخصیت ایسی ہو جو کائنات کے ذرہ ذرہ کو ہر وقت جانتی ہو، کوئی ایسی شخصیت نہیں، اللہ تعالیٰ کا علم محیط ہے، اور اللہ تعالیٰ کی قدرت محیط ہے، ہر چیز کے اوپر وہ قادر ہے، فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ اسی کی شان ہے، جو چاہے کرے، یہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی دوسرے کی شان نہیں، اور اس کائنات کے اندر حکومت اسی کی ہے، اس کائنات میں حاکم اعلیٰ اللہ تعالیٰ ہے، اور اس کائنات کے اندر تصرف اسی کا ہے، مارنا، جلانا، رزق کا دینا، عزت کا دینا، بیماری، موت، یہ تو شخصی حالات کے تحت ہوگئے، اور اسی طرح سے باہر کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے، سورج کا چڑھانا اور ہواؤں کا چلانا، بارش کا بھیجنا، جتنے بھی حالات کائنات میں پیش آتے ہیں، سب کے سب اللہ تعالیٰ کے تصرف سے پیش آتے ہیں، متصرف ہر چیز کے اندر اللہ ہے، دوسرا کوئی متصرف نہیں، یہ دنیا میں جو کچھ واقعات پیش آتے ہیں، چاہے انسان کے وجود میں، چاہے کائنات کے باقی کسی حصے میں، کسی دوسرے کے اختیار سے پیش آتے ہوں، ایسا نہیں۔ مالک وہی ہے، مختار وہی ہے، متصرف وہی

ہے۔اللہ تعالیٰ کے متعلق تو اس طرح سے عقیدہ رکھا جاتا ہے، اور ان سب چیزوں کے اندر اللہ تعالیٰ یکتا ہے، قدیم ہے جس طرح سے لفظ آپ بولا کرتے ہیں کہ کوئی ایسا وقت نہیں آیا کہ جب وہ موجود نہ ہو، اور کوئی ایسا وقت نہیں آئے گا کہ جس وقت وہ موجود نہ ہو، ہمیشہ سے ہے ہمیشہ رہے گا، اس کا کوئی باپ نہیں، اس کا کوئی بیٹا نہیں، یہ واضح باتیں ہیں جو اللہ تعالیٰ کے متعلق ہمیں عقیدے رکھنے چاہئیں، اور قرآنِ کریم میں بار بار ان باتوں کا تکرار آیا ہے، تو جو شخص اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ عقیدہ رکھتا ہے، یوں سمجھئے کہ وہ اللہ کو یکتا قرار دیتا ہے، اللہ کو واحد قرار دیتا ہے، اور ایسا قرار دینے والا موحد ہے۔

''شرک'' کا مفہوم

اور شرک کا مطلب ہوتا ہے شریک کر دینا، دوسرے کو حصہ دار بنا دینا، جیسے آپ دو شخص مل کے کاروبار کرتے ہیں، تو اب دونوں ایک دوسرے کے ساتھ شریک ہیں، باپ کے اگر چار بیٹے ہیں، تو باپ کی متروکہ جائیداد میں چاروں شریک ہیں حصے دار ہیں، تو شرک کا مفہوم ہے کسی کو حصے دار بنا دینا، اب اس درجے میں حصہ دار کہ جس طرح سے اللہ خالق ہے ایسے ہی زمین و آسمان کا خالق کوئی اور ہو، یا جس طرح سے اللہ بادشاہ ہے، ساری کائنات کے اندر وہ حاکم اعلیٰ ہے، مالک حقیقی ہے، اس طرح سے کوئی دوسرا بھی مالک ہو، ایسا عقیدہ غالباً دنیا کے اندر کسی مشرک قوم کا نہیں رہا، شرک کے اندر قیادت اور سیادت حاصل ہے مشرکینِ مکہ کو، اور مشرکینِ مکہ کا بھی یہ عقیدہ نہیں تھا کہ اللہ کے علاوہ کوئی دوسرا خالق ہے، یا اللہ کے علاوہ کوئی دوسرا مالک ہے، یا اللہ کے علاوہ اس کائنات کے اوپر کسی دوسرے کو بادشاہت حاصل ہے، مشرکین مکہ کا بھی یہ عقیدہ نہیں تھا، تو پھر وہ حصے دار کس چیز میں بناتے تھے؟ اور شرک کیسے ہوتا ہے؟ یہ بات سمجھنے کی ہے، اللہ تعالیٰ کے برابر کی سطح پر تو اس کی صفات میں کوئی شریک نہیں، اس کے اختیار میں کوئی شریک نہیں، تو کیا اللہ تعالیٰ نے اپنے ماتحت قرار دیتے ہوئے کسی کو اپنی حکومت میں شریک کر لیا ہو، اور اس کے لئے کوئی شعبہ قرار دے دیا ہو، اور اس شعبے میں اسے بااختیار کر دیا ہو، کیا اللہ تعالیٰ کی ماتحتی کے اندر اس کائنات میں کوئی ایسے مختار موجود ہیں؟ یہ سوال ہے، مشرکین کا جواب یہ ہے کہ ہیں، اور موحد کا جواب یہ ہے کہ نہیں۔

''تصرفاتِ اِلٰہی'' میں واسطے ہم بھی مانتے ہیں، لیکن...!

لیکن یہ واقعہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس دنیا کے اندر جس قسم کا تصرف کرتا ہے، اس تصرف کرنے میں اللہ تعالیٰ نے واسطہ بنایا ہوا ہے اپنے فرشتوں کو، آپ بھی کہتے رہتے ہیں کہ بارش اور ہواؤں کے اوپر میکائیل علیہ السلام متعین ہیں، اور موت دینے کے لیے عزرائیل علیہ السلام متعین ہیں، اور خود عزرائیل کی طرف نسبت قرآنِ کریم میں موجود ہے، قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ (سورۃ الم سجدہ:۱۱) کہہ دیجئے کہ تمہیں ملک الموت وفات دیتا ہے، تو ملک الموت کی طرف نسبت موجود ہے، اور اسی طرح سے اس عالم کی توڑ پھوڑ کے لئے اسرافیل علیہ السلام واسطہ بنیں گے، صور پھونکیں گے تو یہ عالم ٹوٹ پھوٹ جائے گا، تو ہوائیں چلانے پر فرشتے متعین ہیں، بارش اتارنے پہ فرشتے متعین ہیں، رزق اُتارنے پہ فرشتے متعین ہیں، بچوں کے اندر رُوح ڈالنے پہ فرشتے متعین ہیں، یہ سب

تفصیل روایات میں موجود ہے، روح نکالنے کے لیے فرشتے متعین ہیں، حفاظت کے لیے فرشتے متعین ہیں، حدیث شریف کے اندر یہ ساری کی ساری تفصیل موجود ہے اور اس کو ہم بھی مانتے ہیں، گویا کہ یہ واسطے اللہ تعالیٰ کے تصرف کے کہ اللہ تعالیٰ کا تصرف ان واسطوں کے ساتھ نمایاں ہوتا ہے اس کو ہم بھی مانتے ہیں، مشرکین بھی واسطہ مانتے تھے تو ہمارے عقیدے میں اور مشرکین کے عقیدے میں کیا فرق ہے؟

مثال سے وضاحت

مشرکین کس قسم کے مختار مانتے تھے، اور ہم نسبت کس قسم کی مانتے ہیں، اس کو ایک موٹی سی مثال سے سمجھئے، پاکستان میں آج کل ظاہری حکومت میں اقتدارِ اعلیٰ کسے حاصل ہے؟ ہمارے صوفی ضیاء الحق صاحب کو، یہ صدر ہیں اور مُلک میں صدر ایک ہی ہوتا ہے، مُلک میں صدر دو نہیں ہوتے، تو گویا کہ اقتدارِ اعلیٰ ایک ہی شخص کے پاس ہے، اب اتنے بڑے مُلک کو اکیلا آدمی کس طرح سے سنبھالے؟ تو اس نے اس مُلک کو سنبھالنے کے لئے اپنے چار تو گورنر بنائے ہوئے ہیں، ایک صوبہ سرحد میں، ایک پنجاب میں، ایک سندھ میں، ایک بلوچستان میں، تو چار گورنر اپنے نائب بنا دیے، اور ہر گورنر نے آگے کام چلانے کے لئے ڈویژنوں کے اندر کمشنر بنائے ہوئے ہیں، اور کمشنروں کے تحت ہر ضلع کے اندر ڈپٹی کمشنر ہے، اور ڈپٹی کمشنر کے ماتحت ہر تحصیل کے اندر حکومت کا عملہ ہے، اور ہر تحصیل دار کے تحت پٹواری ہیں، کن گو ہیں، اس قسم کے جتنے افسر ہوتے ہیں وہ ان کے ماتحت ہیں، یہ سلسلہ صدر سے لے کر اسی طرح نیچے تک چلتا آیا، اور آپ جانتے ہیں کہ حکومت کے آدمی انہیں سمجھا جاتا ہے جو یہ عہدیدار ہیں، جس طرح سے ہم صدر کو سمجھتے ہیں کہ یہ حاکم ہے، اسی طرح سے گورنر کو سمجھتے ہیں کہ یہ حاکم ہے، اور اسی طرح سے کمشنر کو سمجھتے ہیں کہ یہ حاکم ہے، اسی طرح سے ڈپٹی کمشنر کو سمجھتے ہیں کہ حاکم ہے، جو جو بھی حکومت کے عہدیدار ہیں ہم ان کو حاکم سمجھتے ہیں، یہ حکومت میں حصے دار ہیں، یہ اصحابِ اقتدار سمجھے جاتے ہیں، یہ حکومت میں حصے دار ہیں، یہ صدر ضیاء کی حکومت کے اندر شریک ہیں، یہ صدر کے شرکاء ہیں حکومت کے اندر۔ اور ایک ہوتا ہے صدر کا خادم جو سامنے کھڑا ہے، اس کا کوئی عہدہ نہیں ہوتا، چاہے اس کے چار خادم ہیں، دس خادم ہیں، کارکن کھڑے ہیں، اور صدر حکم دے گا کہ جاؤ فلاں شخص کو بلا کے لاؤ، وہ جائے گا، جا کے بلا لائے گا، اس کو یہ اختیار نہیں ہے کہ اس کے علاوہ کسی دوسرے کو بلا لائے، یا صدر کسی کو ۱۰۰ روپے دیتا ہے کہ جاؤ، جا کے یہ فلاں کو پہنچا آؤ، وہ جا کے پہنچا آئے گا، اس کو یہ اختیار نہیں کہ ۱۰۰ کی بجائے ۱۰۱ یا ۹۹ دے دے، یا جس کا نام صدر نے لیا ہے اس کے علاوہ کسی دوسرے کو دے دے، ایسے کارکن بھی ہر حاکم کے نیچے ہوتے ہیں، کمشنر کے دفتر میں بھی خادم ہیں اور اس قسم کے کارکن ہیں، اور ڈپٹی کمشنر کے ماتحت بھی اس قسم کے خادم ہیں اور کارکن ہیں، یہ کارکن بھی ساتھ ہاتھ بٹاتے ہیں، جس طرح سے گورنر ہاتھ بٹاتا ہے حکومت میں، اسی طرح سے گورنر کے ماتحت یہ عملہ جس کو ہم ''چپڑاسی'' کہتے ہیں، ''بواب'' کہتے ہیں، ''دربان'' کہتے ہیں، اور اس قسم کے ملازم جو ہوا کرتے ہیں، یہ بھی ہاتھ بٹاتے ہیں، ان کے بغیر بھی کام نہیں چلتا، یعنی گورنروں اور کمشنروں کا، کام میں واسطہ یہ بھی بنتے ہیں، لیکن آپ

دونوں کی حیثیت میں فرق سمجھتے ہیں، گورنر کی حیثیت تو حکومت میں یہ ہے کہ صدر نے ایک صوبہ متعین کر کے اسے دے دیا، پنجاب کے گورنر کو کہہ دیا کہ یہ صوبے کی حدود ہیں، یہاں تو حاکم ہے، اب بنانا بھی صدر کے اختیار میں، جب چاہے ہٹادے یہ بھی صدر کے اختیار میں، بنانا بھی صدر کے اختیار میں ہٹانا بھی صدر کے اختیار میں، جب چاہے بنادے جب چاہے ہٹادے، اتنا یہ گورنر صدر کے ماتحت ہے، لیکن جس وقت صدر نے اس کو گورنر بنا دیا، تو گورنر رہنے کے زمانے میں یہ اپنے حدودِ اختیار میں رہتا ہوا جو چاہے کرتا ہے، صدر سے پوچھنے کی ضرورت نہیں، ہر ہر بات میں صدر سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے، یہ اپنے صوبے کے اندر دورہ کرے گا، ضروری نہیں کہ صدر سے پوچھے، اور اپنے نیچے اَحکامات جاری کرے گا، ضروری نہیں کہ صدر سے پوچھے، جس درجے کے اختیارات اس کو دے دیے گئے ہیں اب ان اختیارات کے تحت یہ جو چاہے کرتا ہے، صدر کا اس میں کوئی کسی قسم کا دخل نہیں بلکہ ضروری نہیں کہ صدر کو علم بھی ہو۔ گورنر نے کمشنر کو اختیارات دے دیے، اپنے اختیارات کے تحت جب تک وہ کمشنر ہے، اگرچہ اس کا بنانا بھی گورنر کے ہاتھ میں، ہٹانا بھی گورنر کے ہاتھ میں، لیکن جس وقت تک وہ کمشنر اپنی کرسی کے اوپر بیٹھا ہے اپنے اختیارات کے تحت وہ جو عمل کرتا ہے اس کے لیے اجازت ہے، وہ ہر ہر بات گورنر سے نہیں پوچھے گا، اور جو کرنا چاہے گا گورنر کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ ڈپٹی کمشنر کے نیچے جو عملہ ہے، جو شعبہ ان کے سپرد کر دیا گیا، مثال کے طور پر لودھراں میں جو تحصیل دار ہے، تو وہ اپنی تحصیل داری کی حدود کے تحت جس قسم کے تصرفات کرتا ہے، جو فیصلہ کرے، کسی کو سزا دے، کسی کو انعام دے، مقدمے میں کسی کو کامیاب کرے، کسی کو ناکام کرے، یہ اسی کے اختیار میں ہے، ضروری نہیں کہ ہر ہر بات ڈپٹی سے پوچھے، ڈپٹی کمشنر کو علم بھی نہیں، جو چاہے کرتا ہے۔ اس کا پھر اثر کیا ہوتا ہے؟ اس تقسیم کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ہمیں ایک کام پیش آگیا، اور اس کام کا تعلق ہے مثال کے طور پر کسی چیز کے لینے کے ساتھ، یا ہم کوئی اور کسی قسم کی مدد چاہتے ہیں، اپنا تحفظ چاہتے ہیں، تو ہم کسی کام کے لئے درخواست جو لکھیں گے، تو ہم براہِ راست صدر کے دروازے پر نہیں جائیں گے، اور اگر جائیں گے بھی تو صدر دھتکار دے گا، صدر کے کارکن دھتکار دیں گے، چلو! صدر نے یہ اختیار فلاں کو دے دیا ہے، جا کے اس سے بات کرو، اب ہم وہ درخواست یہیں پولیس والوں کے پاس لے جائیں گے، براہِ راست ہم پنجاب کے افسرِ اعلیٰ کے پاس نہیں جائیں گے، یا مُلک کے افسرِ اعلیٰ کے پاس نہیں جائیں گے، ہم نے کوئی چیز حاصل کرنی ہے تو اسی جگہ کے جو حکام ہیں انہیں درخواست دیں گے، یہ حکام اس کو پاس کریں گے، دستخط کریں گے، سفارش کریں گے، تو اوپر والی حکومت اس کو منظور کرے گی، وہ چیز آپ کو دے دے گی، اور آپ جس چیز کا مطالبہ کر رہے ہیں وہ آپ کو حاصل ہو جائے گی، اور اگر نیچے والے حاکم اس درخواست کو منظور نہیں کرتے تو آپ کی درخواست اس دفتر سے اگلے دفتر میں جاتی ہی نہیں ہے، بات اسی طرح سے ہے نا؟ اگر آپ نے اوپر درخواست کسی طرح سے بھیج بھی دی، تو طریقہ یہ ہے کہ وہ فوراً وہ درخواست علاقائی دفتر میں بھیجتے ہیں، تا کہ نیچے والا حاکم حالات کی تحقیق کر کے سفارش لکھے، جس وقت تک نیچے والا حاکم سفارش نہیں لکھے گا اوپر والا حاکم کوئی کارروائی نہیں کرتا، وہ درخواست نیچے آئے گی، نیچے والا حاکم اس کو منظور کرے گا، اس کے اوپر سفارش کرے گا، پھر یہ اس سے اُوپر والے دفتر میں جائے گی، پھر اس سے اُوپر والے دفتر میں جائے گی، حتیٰ کہ ٹھکانے لگ جائے

گی، اور اگر نیچے والا حاکم اس کو رَدّ کر دیتا ہے، ہماری درخواست کو قبول نہیں کرتا تو براہِ راست اُوپر درخواست قبول نہیں ہوتی، اس نظامِ حکومت کا یہ اثر پڑتا ہے، اس لیے یہاں والے لوگ، کھروڑ پکا کے لوگ موجودہ پولیس کو خوش رکھنے کی کوشش کریں گے، تاکہ جب ضرورت پیش آئے تو یہ ہمارے کام آئیں، جیسے کہ زمین داروں کا طریقہ ہے، یہاں کے حکام کے ساتھ بنا کے رکھنے کی کوشش کریں گے کہ اگر یہ حکام خوش رہیں، ہمارا واسطہ تو ان کے ساتھ ہے، ہمیں کیا کہ صدر ضیاء الحق ہے یا کوئی دوسرا ہے، ہمارا واسطہ تو ان کے ساتھ ہے، اگر یہ حاکم ہمارے اوپر خوش رہیں گے ہمارا کام ہوتا رہے گا، اور اگر یہ موجودہ حاکم جو ہمارے شہر میں ہمارے اوپر مسلط ہیں اگر یہ ناراض ہو گئے، انہوں نے ہمیں نقصان پہنچانا چاہا تو اوپر والے ہمیں کسی قسم کی امداد مہیا نہیں کر سکتے، کیونکہ جو کچھ ہونا ہے انہی کی وساطت سے ہونا ہے، پھر ہم چکر لگائیں گے تو ان کے دروازوں پہ جائیں گے، زمین دار لوگ جن کو حکومت کے دفاتر سے واسطہ پڑتا رہتا ہے وہ ان کے ساتھ اپنے تعلقات کو درست رکھتے ہیں، ضرورت ہی نہیں سمجھتے کہ اوپر صدر سے کبھی ملاقات کے لیے جائیں، کبھی اس کو ہدیہ دینے کے لیے جائیں، کبھی اس کو رشوت دینے کے لیے جائیں، ان حاکموں کو خوش رکھیں گے، کبھی ان کے گھر میں بھینس باندھ دیں گے، کبھی ان کے گھر میں کوئی کھانے پینے کی چیز بھیج دیں گے، مقصد یہ ہوگا کہ جب یہ خوش رہیں گے تو ہمارا کام ان کی وساطت سے نکلتا رہے گا، تو حکومت کے شعبوں کی اس تقسیم کا یہ نتیجہ نکلا۔

''واسطوں'' کے متعلق مشرک اور موحد کے نظریے میں فرق

مشرکین اللہ تعالیٰ کی حکومت میں اس قسم کے حصے دار بناتے تھے، اور وہ کہتے تھے کہ ہیں سارے کے سارے یہ اللہ کے مملوک، یہ اللہ کے ماتحت ہیں، جب چاہے اللہ ان کو بنائے جب چاہے ہٹائے، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے ان کو اختیارات دے دیے تو دینے کے بعد اب ہمارا تعلق ان سے ہے اوپر نہیں ہے، اس لیے وہ طواف کریں گے تو ان کا کریں گے، سجدہ کریں گے تو ان کے سامنے کریں گے، چڑھاوے چڑھائیں گے تو ان کے سامنے چڑھائیں گے، اور کہیں گے کہ یہ ہمارے شفعاء ہیں، یہ ہمارے سفارشی ہیں، اگر یہ ہم پر خوش رہیں، خوش ہونے کے ساتھ ہماری سفارش کریں تو اوپر قبول ہی قبول ہے، اور اگر یہ ناراض ہو گئے تو اوپر کوئی کسی قسم کی رسائی نہیں، یہ تھا مشرکین کا نظریہ، اس طرح سے انہوں نے دوسری چیزوں کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرا رکھا تھا۔ اور ہم جو اللہ تعالیٰ کے ہاں واسطے مانتے ہیں کام میں، وہ فرشتے جس طرح سے ہیں، ہمارے عقیدے کے مطابق ان کی حیثیت وہ ہے جو دفتر میں خادم کی ہوتی ہے، کہ ان کے ہاتھ میں اختیار کچھ نہیں، حاکم جو کہہ دے گا انہوں نے وہی کرنا ہے، اور جس سے روک دے گا وہاں سے انہوں نے رک جانا ہے، اگر حاکم سو روپیہ دینا چاہتا ہے تو ان میں جرأت نہیں کہ اس کا ایک سو ایک بنا دیں، یا سو کا ننانوے کر دیں، اگر حاکم نے زید کا نام لے دیا تو ان میں جرأت نہیں کہ یہ بکر کو دے دیں، اور اگر بکر کا نام لے دیا تو ان میں ہمت نہیں کہ یہ زید کو دے دیں۔ نیچے والے حاکم جو ہیں، وہ تو اگر پیسے تقسیم ہونے کے لئے اوپر سے حکومت کی طرف سے آ جائیں، تو آپ کو معلوم ہے کہ تعلقات کی بنا پر کسی کو دے دیے، کسی کو نہیں دیے، مستحق کو نہیں دیے، غیر مستحق کو دے دیے، جن سے

تعلقات ہوتے ہیں ان کو فائدہ پہنچا دیتے ہیں، جن سے تعلقات نہیں ہوتے ان کو فائدہ نہیں پہنچاتے۔ یہ ہے اصل کے اعتبار سے شرک کہ یوں مان لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی شعبہ کسی کے سپرد ایسے طور پر کردیا ہے کہ اب وہ کام کرنے میں ہر ہر جزئیہ کے اندر اللہ تعالیٰ سے پوچھنے کا مجاز نہیں ہے، بلکہ اس کے اپنے اختیار میں ہے جو چاہے کرے، چاہے اصل کے اعتبار سے اس شخصیت کو اللہ کے ماتحت ہی مانا جائے کہ اللہ ہی اس کو بناتا ہے اور اللہ ہی اس کو ہٹا سکتا ہے، اس عقیدے کے باوجود اس قسم کا حصے دار حکومت میں یہ شریک بن گیا، اور ایسا نظریہ رکھنے والے مشرکین ہوگئے۔ اور اگر یہ عقیدہ رکھا جائے کہ حکم سارا اللہ کا ہی چلتا ہے، اللہ چاہے تو کسی کو دے، اللہ چاہے تو نہ دے، اور یہ کارکن کچھ نہیں کرسکتے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو اجازت ملے گی وہی یہ کام کریں گے، جس کی اجازت نہیں ملتی وہ نہیں کرسکتے، تو اس صورت میں واسطے ماننے کے باوجود آپ موحد ہیں مشرک نہیں ہیں، یہ بنیادی طور پر فرق ہے ہمارے عقیدے میں اور مشرکین کے عقیدے میں، کہ مشرکین شرکاء کو مانتے تو تھے اللہ کے ماتحت، لیکن اللہ کی حکومت میں اس طرح حصے دار مانتے تھے جس طرح سے دنیوی بادشاہت کے اندر اس کے عہدیدار حصہ دار ہوتے ہیں کہ اپنے عہدے کے زمانے میں جو چاہیں کرتے رہیں، وہ اوپر والے حاکم سے پوچھنے کے محتاج نہیں ہوتے، یہی وجہ ہے کہ مشرکین اپنے تجویز کردہ لوگوں کو آلہہ کہتے تھے، اور آلہہ اِلٰہ کی جمع ہے، تو جیسا لفظ وہ اللہ کے لئے بولتے تھے یعنی اِلٰہ کا، ویسے ان کے لئے بولتے تھے، کیونکہ ان کے اندر بھی مستقل ہونے کی حیثیت مانتے تھے، اور مستقل چاہے اللہ تعالیٰ کے کرنے کے ساتھ لیکن جب کردیئے تو اپنی جگہ مستقل ہوگئے، اور پھر جو معاملہ ان کے ساتھ کرتے تھے اس کو وہ عبادت کہتے تھے، جیسے قرآنِ کریم میں ہے اَتَنْهٰىنَاۤ اَنْ نَّعْبُدَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا (سورۂ ہود: ٦٢) وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِیْنَ (سورۂ انبیاء: ٥٣) ہم نے اپنے آباء کو ان کی عبادت کرنے والے پایا، تو جو معاملہ یہ ان کے ساتھ کرتے تھے اس کو عبادت کہتے تھے، تو اللہ تعالیٰ کے سامنے تذلل اختیار کیا وہ بھی عبادت، ان کے سامنے تذلل اختیار کیا وہ بھی عبادت۔ اور فرشتوں کو واسطہ ہم بھی مانتے ہیں لیکن ہم نہ تو فرشتوں کو اِلٰہ کہتے ہیں اور نہ فرشتوں کے ساتھ کوئی ایسا معاملہ کرتے ہیں کہ جس معاملے کی بنا پر ہم یہ کہیں کہ ہمارا معاملہ ان کے ساتھ عبادت کا معاملہ ہے، علم میں ہم اساتذہ کو واسطہ سمجھتے ہیں، پیدا ہونے میں والدین کو واسطہ سمجھتے ہیں۔ والدین کو، اساتذہ کو، مشائخ کو نہ ہم اِلٰہ کہتے ہیں، نہ ان کے ساتھ جو معاملہ ہم کرتے ہیں اس کو عبادت قرار دیتے ہیں، مثلاً یوں سمجھئے کہ آپ کے پاس گھر سے خرچ کے پیسے آتے ہیں، لے کے آتا ہے ڈاکیا، اب اگر ایک شخص عقل کا اندھا یہ سمجھے کہ فلاں کو جو ١٠٠ روپے کا منی آرڈر آیا یہ ڈاکیے نے دیا ہے، اور وہ ہر روز ڈاکیے کے آگے پیچھے پھرے، کہ مجھے ١٠٠ روپے کا منی آرڈر لا دو، مجھے ١٠٠ روپے کا منی آرڈر لا دو، اس کو چائے پلائے، اس کو فروٹ کھلائے، اور اس کی چاپلوسی کرے، تو کیا اس ڈاکیے کی ہمت ہے کہ اس کے لئے ١٠٠ روپے کا منی آرڈر لا دے؟ اگر آپ کو پیسے چاہئیں تو آپ کن کو لکھیں گے؟ اپنے والدین کو۔ اگر والدین نے بھیج دیے تو ڈاکیے کا باپ بھی پہنچائے گا، اور اگر والدین نے نہیں بھیجے تو یہ ڈاکیا آپ کو کہاں سے دے دے گا؟ تو اللہ تعالیٰ رزق دیتا ہے، تو فرشتوں کی وساطت سے پہنچ جاتا ہے، اور اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی کے لئے رزق مقدر نہیں ہے تو تم ان کے سامنے ہزار سجدے کرتے رہو، یہ تمہیں کچھ نہیں دے سکتے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آگیا تو یہ روک نہیں

سکتے ، نہ آیا تو یہ دے نہیں سکتے ، ہمارا عقیدہ ان واسطوں کے متعلق یہ ہے کہ اصل تصرف اللہ کا ہے ، یہ تو محض واسطہ ہیں بایں معنیٰ کہ غیر مختار واسطہ ، کہ خود کسی قسم کا تصرف نہیں کر سکتے ، يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (سورۂ تحریم:٦) جو اللہ کی طرف سے حکم آتا ہے انہوں نے تو وہی کام کرنا ہوتا ہے۔

''شرک'' کی تاریخ

''شرک'' کی ابتدا حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے سے ہوئی ہے ، ابتدا ابتدا میں نیک لوگوں کی ، صالحین کی تصویریں لوگوں نے بنا کے رکھیں ، اس خیال سے کہ ان کو ہم دیکھیں گے تو ان کے دیکھنے کے ساتھ ہمیں بھی اللہ یاد آتا رہے گا ، یہ پانچ پیر جن کا ذکر سورۂ نوح میں آیا ہوا ہے: وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا ۙ وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا ، یہ پانچ جو ذکر ہوئے ہیں ، ''بخاری شریف'' میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول آتا ہے کہ یہ اس قوم کے بزرگ تھے ، جب یہ فوت ہو گئے تو ان کی محبت میں آ کے ان کے فوٹو اور تصویریں لوگوں نے بنا کے رکھ لیں (بخاری)۔ اور اس طرح سے لوگوں نے کوئی تصور جمانے کے لئے فرشتوں کے فوٹو بنا لیے ، جنّات کے بنا لیے ، ابتدا ابتدا کے اندر تو شخصیات مراد ہوتی تھیں ، یہ محض تصویریں تھیں ان کی یاد دلانے کے لئے ، تو شریک اگر ٹھہرائے ہیں لوگوں نے تو انسان ٹھہرائے ہیں ، جن ٹھہرائے ہیں ، فرشتے ٹھہرائے ہیں ، لیکن بعد میں ایسا خلطِ عظیم واقع ہوا کہ لوگوں کے سامنے صرف یہ پتھر کی مورتیاں رہ گئیں ، شخصیات کا تصور ہی ذہن سے نکل گیا ، اب شرک دنیا میں کیسا تھا کہ انبیاء علیہم السلام کو شریک کرنے والے بھی موجود تھے جیسا کہ عیسائی یا بعض یہودی ، فرشتوں کو اللہ کے ساتھ شریک کرنے والے بھی موجود تھے ، جنّات کو اللہ کے ساتھ شریک کرنے والے بھی موجود تھے ، پیروں ، فقیروں ، اولیاء اللہ کو اللہ کے ساتھ شریک کرنے والے بھی موجود تھے۔

''شخصیات پرستی'' سے ''بُت پرستی'' تک

لیکن یہ واقعہ ہے کہ بے جان چیزوں کو پُوجنے والے بھی دنیا میں موجود تھے ، جن کے سامنے صرف پتھر کا بُت ہے اور شخصیت وغیرہ کوئی نہیں ، اُن کی طرف نسبت کرتے تھے ان چیزوں کی کہ ان کو اللہ نے اختیارات دے رکھے ہیں ، یہ جہلِ عظیم واقع ہو گیا ، جہالت کے ساتھ شخصیات اوجھل ہو گئیں اور محض پتھروں کو پُوجنے والے بھی آ گئے ، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم کا شرک اسی درجے کا ہے ، وہ جہالت کی اِنتہا پر تھے ، ستاروں کو بھی پُوجتے تھے ، لیکن ساتھ پتھر کے بتوں کو بھی پُوجتے تھے ، پتھر یا بُت یہ کسی شخصیت کی علامت تھے؟ ایسی بات نہیں ہے ، قرآنِ کریم میں آیا ہے: اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ (سورۂ صافات:٩٥) کیا پُوجتے ہو تم ان چیزوں کو جن کو خود تراشتے ہو؟ اگر حقیقتاً ان کے معبود فرشتے تھے وہ ان کے تو تراشے ہوئے نہیں تھے ، اگر حقیقتاً ان کے معبود جنّات تھے تو وہ ان کے تراشے ہوئے تو نہیں تھے ، فرشتے اور جنّات قومِ ابراہیم کے تراشے ہوئے تھے؟ (نہیں) ، مَا تَنْحِتُوْنَ تو وہی ہیں جو لکڑی کے بنا لیے ، پیتل کے بنا لیے ، پتھر کے بنا لیے ، اور ان کو بنانے کے بعد ان کی پُوجا شروع کر دی تو اس کے اوپر صادق آئے گا کہ اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ ۔ دوسری بات یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان معبودوں کا جو عجز ثابت کیا کہ یہ سنتے نہیں ، یہ دیکھتے نہیں ، یہ بولتے نہیں ، اور یہ کچھ کر نہیں سکتے ، نفع نہیں دے سکتے ، نقصان نہیں دے سکتے ، تو ان کو عاجز ثابت کرنے کے لئے کیا

طریقہ اختیار کیا؟ ان پتھر کی مورتیوں کو توڑا، انہی کے مارتے جاتے تھے، اور انہی سے کہتے تھے کہ تم کھاتے کیوں نہیں ہو؟ اور انہی سے کہتے تھے کہ تم بولتے کیوں نہیں ہو؟ اور ان لوگوں سے کہا تھا کہ تم انہی سے پوچھو۔ اب اگر یہ کوئی شخصیات کی تصویریں ہو تیں تو پھر یہ برتاؤ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا کیسے صحیح ہوتا؟ وہ کہتے جی! یہ تو محض تصویر ہے..... جیسے قائداعظم کی تصویر لگی ہوئی ہے، مراد تو وہ شخصیت ہے، تو اگر مثلاً قائداعظم کو کوئی پُوجنے والا ہو اور اس تصویر کے متعلق آپ یہ کہیں، یہ تو سنتا بھی نہیں، یہ تو دیکھتا بھی نہیں، تم اس کی پُوجا کیسے کرتے ہو؟ تو کوئی کہہ سکتا ہے ہم تو اس تصویر کی پُوجا نہیں کرتے، ہم تو قائداعظم کی پُوجا کرتے ہیں، ہم تو ڈاکٹر اقبال کو مانتے ہیں، ڈاکٹر اقبال کی پُوجا کرتے ہیں، ہم تو بھٹو صاحب کی پُوجا کرتے ہیں، اور یہ تو اس کا فوٹو ہے، تو آپ کا یہ کہنا کہ یہ سنتا نہیں، یہ دیکھتا نہیں، یہ کچھ کر نہیں سکتا، اس میں کون سا عجز کا اثبات ہے، یہ کوئی میرا معبود ہے؟ یہ تو معبود کی نشانی کے طور پر رکھا ہوا ہے..... تو پھر ان بتوں کی طرف نسبت کر کے اس قسم کی باتیں کرنا کہ یہ تو بول نہیں سکتا، یہ تو سُن نہیں سکتا، یہ تمہیں کسی بات کا جواب نہیں دے سکتا، یہ بات صادق نہیں آتی، کیونکہ وہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ تو ہماری مراد ہی نہیں، یہ تو محض یاددہانی کے لئے سامنے رکھے ہوئے ہیں، اصل کے اعتبار سے تو ہمارے معبود وہ ہیں، اور ان سے جا کر بات کرو، وہ بات بھی کریں گے اور وہ سنتے بھی ہیں۔ اور پھر کسی کی تصویر کو پھاڑ دینا اس کے عاجز ہونے کی دلیل نہیں ہے، اب بھٹو صاحب کی تصویر کو کوئی پھاڑ دے، یا بازار میں پڑی ہو اس کے اوپر پاؤں دے دے، اور کہے کہ دیکھو! بھٹو کچھ نہیں کر سکتا، اس میں تو طاقت ہی نہیں، وہ اپنے آپ کو بھی نہیں بچا سکتا، دیکھو! میں نے اس کی تصویر پھاڑ دی، تو یہ دلیل مدعا کو ثابت نہیں کرتی، کسی کی تصویر کے پھاڑ دینے کے ساتھ اس شخصیت کا عاجز ہونا لازم نہیں آتا، اب یہ بھی اگر محض تصویریں تھیں، اور وہ پُوجنے والے کسی دوسری چیز کو پُوجتے تھے تو ان تصویروں کا پھاڑ دینا ان کے عاجز ہونے کی دلیل کس طرح سے ہو گیا؟ تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے جیسے لکھا وہ صحیح بات ہے[1] کہ پہلے شرک اگرچہ اسی طرح سے شروع ہوا کہ شخصیات کی تصویریں بنائی گئیں، لیکن بعد میں ایسا جہلِ عظیم واقع ہوا، ایسا خلطِ عظیم واقع ہوا کہ لوگوں کے سامنے صرف تصویریں ہی رہ گئیں، شخصیات اوجھل ہو گئیں، اس لیے قرآنِ کریم میں ان کی تردید کرتے ہوئے بتوں کو سامنے رکھتے ہوئے کہا ہے کہ کیا ان کی آنکھیں ہیں جن کے ساتھ یہ دیکھتے ہیں؟ کیا ان کے کان ہیں جن کے ساتھ یہ سنتے ہیں؟ کیا ان کے ہاتھ ہیں جن کے ساتھ یہ پکڑتے ہیں؟ کیا ان کی ٹانگیں ہیں جن کے ساتھ چلتے ہیں؟[2] یہ باتیں جنّات پر یا فرشتوں پر صادق نہیں آتیں، اگر کوئی شخص زندہ معبود کو پُوجنے لگ جائے، جس طرح سے فرعون کو لوگ پُوجتے تھے، اس پر یہ بات کس طرح سے صادق آ سکتی ہے، وہ تو کہیں گے کہ اس کی تو آنکھیں ہیں دیکھتا بھی ہے، اس کے تو کان ہیں تو یہ سنتا بھی ہے، اس کے تو ہاتھ ہیں پکڑتا بھی ہے، اس کی تو ٹانگیں ہیں چلتا بھی ہے، تو یہ باتیں جو صادق آتی ہیں تو انہی تصویروں پر صادق آتی ہیں، وَتَرٰىهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ۝ (سورۂ اعراف: ۱۹۸) تُو دیکھ رہا ہے کہ تیری طرف جھانک رہے ہیں لیکن ان کو نظر کچھ

(۱) رابعاً: بيان شناعة عبادة الاصنام. وان الاحجار ساقطة عن مرتبة الكمال الانساني فكيف تظل عمرتبة الالوهية يسجد لها ويتوجه اليها ومثل هذا الرد والتفنيد لاولئك المشركين الذين كانوا يعتقدون هذه الاصنام آلهة معبودة لذاتها (الفوز الكبير)

(۲) اَلَهُمْ اَرْجُلٌ يَّمْشُوْنَ بِهَآ اَمْ لَهُمْ اَيْدٍ يَّبْطِشُوْنَ بِهَآ اَمْ لَهُمْ اَعْيُنٌ يُّبْصِرُوْنَ بِهَآ اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا (سورۂ اعراف: ۱۹۵)

نہیں آ رہا، جیسے آنکھیں بنی ہوئی ہوتی ہیں، تو جس وقت آپ اس تصویر کو دیکھیں گے تو ایسے معلوم ہوگا جیسے تیری طرف جھانک رہے ہیں، لیکن ان کو نظر کچھ نہیں آ رہا، تو مشرکینِ مکہ کے شرک کے اندر یہ بات تھی کہ وہ فرشتوں کو بھی شریک ٹھہراتے تھے، اور اسی طرح سے انبیاء علیہم السلام کو بھی بعض مشرک شریک ٹھہراتے تھے، اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا، لوگوں نے مریم علیہا السلام کو بھی شریک ٹھہرایا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی شریک ٹھہرایا، لوگوں نے اپنی قوم کے صالحین کو اور اولیاء اللہ کو بھی شریک ٹھہرایا، لیکن ہر مشرک کا شرک اس درجے کا نہیں ہوتا، بعضے مشرک ایسے بھی ہیں جو حیوانات کو بھی پُوجتے ہیں، اور بعضے مشرک ایسے بھی ہیں جو کہ بے جان چیزوں کو بھی پُوجتے ہیں، درختوں کو سجدے کرتے ہیں اور ان کے سامنے وہ درخت ہی سب کچھ ہو گیا، اسی طرح سے بے جان چیزوں کو پُوجنے والے مشرک بھی موجود تھے، یہ جہلِ عظیم ہے، خلطِ عظیم ہے جو ان لوگوں کے لئے واقع ہوا، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم کا شرک تو اسی قسم کا معلوم ہوتا ہے، یہ عام طور پر جو لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ بے جان چیز کو کسی نے نہیں پُوجا، یہ بات خلافِ واقع ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم کا جو شرک ہے وہ ایسے ہی معلوم ہوتا ہے۔

ہمارا عقیدہ

اب ہمارا یہ عقیدہ جس طرح سے میں نے آپ کے سامنے واضح کر دیا اسی درجے کا ہے، ہم کہتے ہیں کوئی ہو اللہ کے سوا، جاندار ہو، بے جان ہو، فرشتہ ہو، جن ہو، ولی ہو، نبی ہو، غیر نبی ہو، کوئی ہو، سب کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ اس کو کوئی کسی قسم کا مستقل اختیار حاصل نہیں ہے، بس وہی ہوگا جو اللہ چاہے گا، کسی دوسرے کی مشیت نہیں چلتی، اللہ مارنا چاہے تو کوئی بچا نہیں سکتا، اللہ زندہ کرنا چاہے تو کوئی روک نہیں سکتا، اللہ صحت دینا چاہے تو کوئی بیمار نہیں کر سکتا، بیماری بھیجنا چاہے تو کوئی صحت نہیں دے سکتا، تصرف پورے کا پورا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، کوئی دوسرا اللہ کے ساتھ متصرف نہیں، چاہے کوئی بزرگ ہو چاہے کوئی فرشتہ ہو، اگر وہ واسطہ ہے تو اس درجے کا واسطہ ہے کہ وہ اللہ کے حکم کی تنفیذ آگے کرے گا، اللہ نے کہہ دیا یہ چیز فلاں کو دے دو، وہ دے دیں گے، اللہ نے کہہ دیا وہ چیز فلاں سے چھین لو وہ چھین لیں گے، اپنے طور پر اس میں کوئی کسی قسم کا تصرف نہیں کر سکتے، اس لیے کوئی کسی فرشتے کو واسطہ مانتا ہے یا کسی بزرگ کو مانتا ہے، اگر اس درجے میں مانتا ہے تو مشرک نہیں، اُس درجے میں مانتا ہے تو مشرک ہے۔

حدیث ''ثَلَاثَ کَذَبَاتٍ'' بالکل صحیح ہے اور مودودی صاحب کا اِنکار غلط ہے!

دوسری بات جو آپ کی خدمت میں عرض کرنی تھی وہ یہ تھی کہ ایک حدیث میں آتا ہے، سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا: ''لَمْ يَكْذِبْ اِبْرَاهِيْمُ اِلَّا ثَلَاثًا''(١) جس کا لفظی ترجمہ بظاہر یوں ہوتا ہے کہ ابراہیم نے جھوٹ نہیں بولا مگر تین مرتبہ ہی، تین ہی جھوٹ ہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بولے ہیں، اس لفظ کے ظاہر میں بڑی شدت معلوم ہوتی ہے، ''مشکوٰۃ شریف'' میں یہ روایت ہے، صحاح میں موجود ہے، ''بخاری'' میں بھی ہے، ''مسلم'' میں بھی ہے، کہ ابراہیم علیہ السلام نے تین ہی جھوٹ بولے جن میں سے ایک یہ

---

(١) بخاری ١/٤٧٣، باب قول الله واتخذ الله ابراهيم خليلا- نیز ١/٤٧٣- ٢/٧٦١- مسلم ٢/٢٦٦، باب فضائل ابراهيم ترمذی ٢/١٥٠- مشکوٰۃ ٢/٥٠٦ باب بدء الخلق

مقام بھی شمار کیا ہوا ہے بَلْ فَعَلَهٗ ۗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا، اور کل آپ کے سامنے تقریر کرتے ہوئے میں نے عرض کیا تھا کہ یہ جملہ جھوٹ نہیں ہے کسی صورت میں بھی، نہ بولنے والے نے جھوٹ کی نیت سے بولا، نہ سننے والے والوں نے اس کو جھوٹ سمجھا، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے آگے سے یہ نہیں کہا کہ تو جھوٹ بولتا ہے، کسی نے یہ الزام نہیں لگایا، پھر حدیث شریف میں یہ جو لفظ آیا ہے تو اس کا کیا مطلب؟ بعض حضرات نے تو صرف اس ''کذب'' کے لفظ کو دیکھ کے اس حدیث کو غلط اور باطل قرار دے دیا، چاہے یہ حدیث ''بخاری'' کی ہے، اور مودودی صاحب بھی انہی میں شامل ہیں جنہوں نے کہا کہ صحتِ سند کو ہم کیا کریں، اس حدیث کا مضمون بالکل باطل ہے، قرآنِ کریم کے خلاف ہے، نبی کی شان کے خلاف ہے، ابراہیم علیہ السلام تو كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا (سورۂ مریم:۴۱) وہ تو سچے تھے، راست باز تھے، ان کی طرف کس طرح سے نسبت کی جاسکتی ہے کہ انہوں نے جھوٹ بولے، اور یہ واقعات بھی ایسے ہیں جن میں کوئی جھوٹ نہیں، جس طرح سے یہ واقعہ آپ کے سامنے آ گیا، اسی طرح سے اِنِّيْ سَقِيْمٌ (سورۂ صافات:۸۹) اور ایسے ہی حدیث شریف میں ایک اور واقعہ آتا ہے جہاں حضرت ابراہیم کی بات کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ''کذب'' کے لفظ ساتھ تعبیر کیا ہے۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ حدیث صحیح ہے اور مضمون بھی اس کا اپنی جگہ صحیح ہے، بیان کرنے کی اپنی انسان کی غلطی ہے کہ جس طرح سے چاہے اس کو ادا کر لیتا ہے، كَذَبَ کا لفظ ہم جو بولتے ہیں اس کا ترجمہ صرف وہی نہیں ہوتا جس کو ہم اُردو میں جھوٹ بولنا کہتے ہیں، كَذَبَ کا مطلب یہ بھی ہوتا ہے کہ جھوٹ بولا، اور كَذَبَ کا معنی یہ بھی ہوتا ہے کہ اس نے غلطی کی، اور كَذَبَ کا لفظ اس کے لئے بھی بولا جاتا ہے جس کے لئے عربی میں ''توریہ'' کا لفظ بولتے ہیں، وَرّٰى تَوْرِيَةً: ایسے انداز میں بات کرنا کہ دوسرا انسان اس کے ظاہر سے کچھ سمجھے اور حقیقت میں مراد کچھ ہو، یہ بوقتِ ضرورت اس طرح سے کلام کر لی جاتی ہے کہ سننے والا اس کا مطلب کچھ اور سمجھے، متکلم کی مراد کچھ اور ہو، تو یہ جو متکلم کی مراد کے خلاف دوسرا آدمی سمجھتا ہے اس لحاظ سے اس کو كَذَبَ سے تعبیر کر دیا جاتا ہے، كَذَبَ فُلَانٌ یعنی اس نے بات ایسی کہی کہ جو اس سے مطلب سمجھ میں آیا حقیقت میں مراد وہ نہیں تھا، اس کو توریہ کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے۔ تو تمام شارحین نے، اہلِ حق نے، اہلِ سُنّت والجماعت نے اس کو ''توریہ'' پر محمول کیا ہے، جب كَذَبَ کا مصداق توریہ بھی ہوسکتا ہے تو صرف لفظ کذب کی طرف دیکھ کے اس حدیث کی تکذیب نہیں کرنی چاہیے، موقع محل پر صحیح مقصد کے تحت اس قسم کے الفاظ بول لیے جاتے ہیں، کہ جس سے دوسرا سننے والا مطلب کچھ اور سمجھ لے، اور متکلم کی مراد کچھ اور ہو، تو چونکہ وہ مراد خلافِ ظاہر ہے، ظاہر سے دوسرے نے کچھ اور سمجھا، اس اعتبار سے اس مضمون کو ادا کر کے یوں کہہ دیتے ہیں کہ فلاں شخص نے، جیسے ہم اپنی زبان میں کہیں کہ اس نے غلط بیانی کی، لیکن حقیقت کے اعتبار سے وہ غلط بیانی کے درجے کی بات نہیں ہوتی، جو اس کی مراد تھی وہ اپنی جگہ حق ہے، لیکن لفظ اس میں ایسے استعمال کیے گئے ہیں کہ جس سے بظاہر مراد دوسری معلوم ہوتی ہے، تو اس لیے صرف کذب کے لفظ کی طرف دیکھتے ہوئے اس حدیث کی تکذیب نہیں کی جاسکتی۔

مذکورہ حدیث ابراہیم علیہ السلام کے کمال پر دال ہے

اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا کمال بایں معنیٰ نمایاں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی سو سال ہوئی یا سو سال سے بھی

زیادہ ہوئی، ساری زندگی میں تین باتیں اس قسم کی ہیں جو ظاہری مطلب کے اعتبار سے خلاف واقع معلوم ہوتی ہیں، اور زندگی میں دوسرا کوئی واقعہ ایسا نہیں کہ جس میں ظاہری مطلب کے طور پر بھی وہ خلاف واقع معلوم ہو، تو اس میں تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صدق کو نمایاں کیا گیا، ہم اگر دیکھیں! صبح سے لے کے شام تک ہم واقعتاً کتنی غلط بیانیاں کرتے ہیں، اور ادھر سو سال کی زندگی میں صرف ان سے تین باتیں ایسی صادر ہوئیں کہ جو ظاہری مطلب کے اعتبار سے یعنی جو دوسرا آدمی سمجھتا ہے اس کے اعتبار سے وہ خلاف واقع معلوم ہوتی ہے، لیکن جب حقیقت دیکھی گئی تو وہ بات بھی خلاف واقع نہیں۔

قیامت کے دِن ابراہیم علیہ السلام پر مذکورہ تین باتوں کا اثر

لیکن یہ تین باتیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے صادر ہوئیں، ان کو بھی آپ نے اپنے حق میں بہت شدید سمجھا، حضور ﷺ فرماتے ہیں، قیامت کے دِن جس وقت ساری کی ساری مخلوق جمع ہوگی، اور انسان یہ چاہیں گے کہ ہم کسی کو اللہ کے دربار میں سفارشی بنا کر لے جائیں جو سفارش کرے اور ہمارا حساب شروع ہو جائے، تو ہر نبی کے پاس جائیں گے، حضرت آدم علیہ السلام کے پاس جائیں گے وہ عذر کر دیں گے، کہ میں نے تو ایک غلطی ایسی کی تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے اسی پر پکڑا تو میں کیا کروں گا؟ ڈرتے ہوئے اللہ کے دربار میں نہیں جائیں گے، وہ جو جنت میں درخت سے کھا لیا تھا۔ اسی طرح سے ہر نبی کوئی نہ کوئی عذر کرے گا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس جب لوگ جائیں گے تو وہ یہی عذر کریں گے کہ نہ بھائی! مجھ سے تو تین باتیں ایسی صادر ہوئی ہیں، اس حدیث میں بھی ''کذب'' کا لفظ ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اوپر گرفت کر لی تو میں کیا کہوں گا؟[1] تو یوں سمجھئے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی فطرت اتنی پاکیزہ تھی کہ یہ تین ہی باتیں جو بظاہر، ظاہری مطلب کے اعتبار سے خلاف واقع معلوم ہوتی ہیں، ان کی کڑواہٹ بھی وہ قیامت کے دِن تک بھی محسوس کرتے رہیں گے، تو یہ ان کی پاک فطرت کی اور ان کی سچی فطرت کی ایک بہت ہی واضح نشانی ہے، کہ حقیقت کے اعتبار سے وہ باتیں غلط نہیں، جیسے آپ کے سامنے واضح کر دی گئیں، باتیں صحیح ہیں، لیکن ظاہری مطلب ان کا جو سمجھ میں آتا ہے تو تبادراً انسان سمجھتا ہے کہ شاید یہ خلاف واقع بات کہہ دی، اتنی سی بات بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام پر اس قدر گراں گزری کہ قیامت تک اس کی کڑواہٹ محسوس کر رہے ہیں۔ تو اس حدیث میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نقص کا پہلو کوئی نہیں، بلکہ اس سے ان کی صداقت کی اعلیٰ شان نمایاں ہوتی ہے، اور ہم صبح شام رات دِن غلط بیانیاں کرتے ہیں، اور صراحتاً غلط بیانیاں کرتے ہیں، اور ان سے اتنی بڑی عمر کے اندر تین ہی باتیں صادر ہوئیں، جو حقیقت کے اعتبار سے صحیح ہیں، لیکن سننے والا ان کو ظاہری طور پر ایسا سمجھ لیتا ہے کہ خلاف واقع کہی گئی، تو اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی صداقت کے اوپر کوئی کسی قسم کا دھبا نہیں آتا۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

---

(۱) بخاری ج ۲ ص ۶۸۵، کتاب التفسیر۔ سورۃ بنی اسرائیل۔ باب ذریۃ من حملنا مع نوح۔ مشکوۃ ۲/۴۸۸ باب الحوض، فصل اول۔

وَنُوْحًا اِذْ نَادٰى مِنْ قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ

یاد کیجئے نوح کو جس وقت پکارا اس نے (ابراہیم سے) پہلے، ہم نے اس کی دعا قبول کر لی، پھر ہم نے نجات دی اس کو اور اس کے متعلقین کو

مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ﴿۷۶﴾ وَنَصَرْنٰهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ؕ اِنَّهُمْ

بہت بڑی بے چینی سے ﴿۷۶﴾ ہم نے اس کی مدد کی انتقام لیتے ہوئے ان لوگوں سے جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا، بے شک وہ

كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۷۷﴾ وَدَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِى الْحَرْثِ

بُرے لوگ تھے پھر ہم نے ان سب کو ڈبو دیا ﴿۷۷﴾ اور یاد کیجئے داؤد اور سلیمان کو جبکہ وہ دونوں فیصلہ کر رہے تھے ایک کھیت کے بارے میں

اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ۚ وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ ﴿۷۸﴾ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ

جبکہ اس کھیت میں جا پڑی تھیں قوم کی بکریاں اور ہم ان کے فیصلے کا مشاہدہ کرنے والے تھے ﴿۷۸﴾ ہم نے وہ فیصلہ سلیمان کو سمجھا دیا

وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا ؗ وَّسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ ؕ

اور ان دونوں میں سے ہر ایک کو ہم نے حکمت اور علم دیا تھا، اور مسخر کر دیا ہم نے داؤد کے ساتھ پہاڑوں کو اور پرندوں کو یہ سب تسبیح پڑھتے تھے

وَكُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿۷۹﴾ وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ

اور ہم کرنے والے ہیں ﴿۷۹﴾ اور ہم نے سکھایا داؤد کو زرہ کا بنانا تمہارے نفع کے لئے تاکہ وہ تمہاری حفاظت کرے آپس کی لڑائی سے، پھر کیا تم

شٰكِرُوْنَ ﴿۸۰﴾ وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِىْ بِاَمْرِهٖۤ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِىْ

شکر گزار ہو؟ ﴿۸۰﴾ اور مسخر کیا ہم نے سلیمان کے لئے ہوا کو اس حال میں کہ وہ تیز چلنے والی تھی، چلتی تھی وہ سلیمان کے حکم سے اس علاقے

بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ وَكُنَّا بِكُلِّ شَىْءٍ عٰلِمِيْنَ ﴿۸۱﴾ وَمِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ

کی طرف جس میں ہم نے برکت دی ہے، اور ہم ہر چیز کا علم رکھنے والے ہیں ﴿۸۱﴾ اور مسخر کیا ہم نے شیاطین میں سے ان کو جو غوطہ لگاتے تھے

لَهٗ وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ ۚ وَكُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ ﴿۸۲﴾ وَاَيُّوْبَ اِذْ

سلیمان کے لئے اور کرتے تھے وہ کام اس کے علاوہ بھی اور ہم ان شیاطین کی نگرانی کرنے والے تھے ﴿۸۲﴾ اور یاد کیجئے ایوب کو جب کہ

نَادٰى رَبَّهٗۤ اَنِّىْ مَسَّنِىَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۸۳﴾ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ

پکارا اس نے اپنے رب کو بے شک مجھے تکلیف نے چھوا ہے اور تو تمام رحم کرنے والوں سے بڑا رحم کرنے والا ہے ﴿۸۳﴾ ہم نے اس کی بھی دعا قبول کر لی

فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ وَّاٰتَيْنٰهُ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا

دُور کردی ہم نے اس سے جو تکلیف اسے تھی، اور دیا ہم نے ایوب کو اس کا اہل وعیال اور ان جیسے اور بھی ان کے ساتھ اپنی طرف سے رحمت کی وجہ سے

وَذِكْرٰى لِلْعٰبِدِيْنَ ﴿۸۴﴾ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِدْرِيْسَ وَذَا الْكِفْلِ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۸۵﴾

اور عابدین کی نصیحت کے لئے ﴿۸۴﴾ اور یاد کیجئے اسماعیل کو اور ادریس کو اور ذاالکفل کو، ان میں سے ہر کوئی صبر کرنے والوں میں سے تھا ﴿۸۵﴾

وَاَدْخَلْنٰهُمْ فِيْ رَحْمَتِنَا ؕ اِنَّهُمْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۶﴾ وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ

اور ہم نے داخل کیا ان کو اپنی رحمت میں، بے شک وہ اچھے لوگوں میں سے تھے ﴿۸۶﴾ اور یاد کیجئے مچھلی والے کو جب چلا گیا وہ

مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ

غصے کا اظہار کرتا ہوا، پھر اس نے خیال کیا کہ ہم ہرگز تنگی نہیں کریں گے اس پر، پھر پکارا اس نے تاریکیوں میں کہ تیرے علاوہ کوئی معبود نہیں

سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۷﴾ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۙ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ؕ

تُو ہر عیب سے پاک ہے بے شک میں ہی قصورواروں میں سے ہوں ﴿۸۷﴾ ہم نے اس کی بھی دُعا قبول کر لی اور اس کو اس گھٹن سے نجات دی،

وَكَذٰلِكَ نُـْۨجِي الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۸﴾ وَزَكَرِيَّآ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرْنِيْ فَرْدًا

اور ہم مؤمنوں کو ایسے ہی نجات دیا کرتے ہیں ﴿۸۸﴾ اور زکریا کو یاد کیجئے جب انہوں نے اپنے رَبّ کو پکارا تھا اے میرے رَبّ! مجھے اکیلا نہ چھوڑ

وَّاَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿۸۹﴾ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۫ وَوَهَبْنَا لَهٗ يَحْيٰى وَاَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ ؕ

اور تُو سب سے اچھا وارث ہے ﴿۸۹﴾ پھر ہم نے اس کی دُعا بھی قبول کر لی اور ہم نے اس کو یحیٰی دے دیا اور ہم نے دُرست کر دیا اس کے لئے اس کی بیوی کو،

اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا ؕ وَكَانُوْا

بے شک یہ سارے کے سارے لوگ نیکیوں میں جلدی کرنے والے تھے اور ہمیں پکارا کرتے تھے رغبت کرتے ہوئے اور ڈرتے ہوئے اور یہ

لَنَا خٰشِعِيْنَ ﴿۹۰﴾ وَالَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ

سارے کے سارے ہم سے ڈرنے والے تھے ﴿۹۰﴾ اور یاد کیجئے اس عورت کو جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی پھر ہم نے اس میں پھونک دی

رُّوْحِنَا وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۱﴾ اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ

اپنی رُوح اور بنایا ہم نے اس عورت کو اور اس کے بیٹے کو جہانوں کے لئے نشانی ﴿۹۱﴾ بے شک یہ تمہاری جماعت ایک ہی جماعت ہے

وَاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ﴿۹۲﴾ وَتَقَطَّعُوْۤا اَمْرَهُمْ بَیْنَهُمْ ؕ كُلٌّ اِلَیْنَا رٰجِعُوْنَ ﴿۹۳﴾

اور میں تمہارا رب ہوں پس تم میری ہی عبادت کرو ﴿۹۲﴾ لوگوں نے اپنے دینی معاملے کو آپس میں ٹکڑے ٹکڑے کرلیا ہر کوئی ہماری طرف لوٹ کر آنے والا ہے ﴿۹۳﴾

فَمَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْیِهٖ ۚ وَاِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ ﴿۹۴﴾

پھر جو کوئی نیک عمل کرے گا اس حال میں کہ مؤمن ہو اس کی کوشش کی ناقدری نہیں کی جائے گی اور ہم اس کی کوشش کو لکھنے والے ہیں ﴿۹۴﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

نوح علیہ السلام کا تذکرہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ وَنُوْحًا اِذْ نَادٰى مِنْ قَبْلُ: نُوْحًا یہ منصوب ہے فعل محذوف کی وجہ سے، اور اس کا عطف ہے لُوطاً کے اوپر، یا تو معنی یوں ظاہر کریں گے کہ ہم نے نوح علیہ السلام کو بھی علم وحکمت دیا، جس طرح سے پیچھے آیا تھا کہ لُوط علیہ السلام کو بھی ہم نے علم وحکمت دی (مظہری)، اور یا اس کو "اُذْكُرْ" کا مفعول بنالیجئے (عام تفاسیر)، نوح کا تذکرہ کیجئے، نوح علیہ السلام کو یاد کیجئے، اس طرح سے یہ منصوب ہوجائے گا۔ اِذْ نَادٰى مِنْ قَبْلُ: قَبْلُ یہ مبنی برضم ہے، مضاف الیہ اس کا محذوف منوی ہے، یعنی من قبلِ ابراھیمَ یاد کیجئے جس وقت پکارا نوح علیہ السلام نے ابراہیم علیہ السلام سے پہلے۔ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ: ہم نے اس کی دُعا قبول کرلی، فَنَجَّیْنٰهُ: پھر ہم نے اس کو نجات دی، وَاَهْلَهٗ: اور اس کے متعلقین کو۔ "اہل" کا لفظ یہ عام ہوتا ہے، صرف اولاد پر ہی نہیں بولا جاتا، بلکہ جتنے تبعین متعلقین ہوتے ہیں سب کے لئے یہ لفظ بولا جاتا ہے، اہل اور آل ایک ہی چیز ہے۔ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِیْمِ: کرب کہتے ہیں بے چینی کو، غم کو، تکلیف کو۔ "بہت بڑی تکلیف سے، بہت بڑی بے چینی سے"۔ اور اس "کربِ عظیم" کا مصداق یا تو قوم کا وہ برتاؤ ہے جو حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ وہ کرتے تھے، "ہم نے اس کو بہت بڑی مصیبت سے نجات دی" یعنی قوم کی طرف سے جو تکلیفیں پہنچ رہی تھیں تو ہم نے نوح علیہ السلام کو ان تکلیفوں سے نجات دے دی، اور یا "کربِ عظیم" سے مراد وہ عذابِ الٰہی ہے جو اس قوم پر آیا تھا کہ باقی ساری قوم کربِ عظیم کی لپیٹ میں آ گئی، اور نوح علیہ السلام کو ہم نے کربِ عظیم سے بچالیا، اس لفظ کا مصداق دونوں ہو سکتے ہیں (عام تفاسیر)۔ وَنَصَرْنٰهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا: ہم نے اس کی مدد کی۔ آگے صلہ "مِنْ" آ گیا، عام طور پر نصرت کا صلہ "علیٰ" آیا کرتا ہے، فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِیْنَ (سورۂ بقرہ کا آخر) اے اللہ! تُو ہماری مدد کر کافروں کے خلاف۔ اور یہاں صلہ "مِن" آ گیا، تو یہ "مِنْ" بتاتا ہے کہ نصرت کے اندر یہاں انتقام والا معنی ہے، انتقام والے معنی کی تضمین کر کے "مِن" کو اس کا صلہ بنایا جائے گا، "ہم نے اس کی مدد کی انتقام لیتے ہوئے ان لوگوں سے جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا" تو یہ "مِنْ" اصل کے اعتبار سے صلہ انتقام کا ہوگیا، اور انتقام کا معنی نصرت کے اندر مضمن ہے۔ اور نوح علیہ السلام کی دُعا جو انہوں نے کی تھی اور اللہ تعالیٰ نے قبول کی اس کا ذکر سورۂ قمر میں بھی ہے اَنِّیْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ، اے اللہ! میں ان کے سامنے مغلوب ہوگیا، اب تُو ہی بدلہ لے، اور سورۂ نوح کے اندر بھی اس کا ذکر آئے گا رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ دَیَّارًا، اے اللہ! زمین کے اوپر کافروں میں سے کسی چلنے پھرنے والے کو نہ

چھوڑ، یہ دُعائیں حضرت نوح علیہ السلام کی مختلف سورتوں میں ذکر کی گئی ہیں، اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ: بے شک وہ بُرے لوگ تھے، فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ: پھر ہم نے ان سب کو ڈبو دیا۔

داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام کا تذکرہ

وَدَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ: اور یاد کیجئے داؤد علیہ السلام کو اور سلیمان علیہ السلام کو۔ داؤد علیہ السلام سلیمان علیہ السلام کے باپ ہیں، یہ باپ بیٹے کا ذکر ہے، اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ: حرث یہ مصدر بھی ہے حَرَثَ يَحْرُثُ: بونا۔ جس طرح سے سورۂ واقعہ میں لفظ آتے ہیں اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ۞ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ، جو چیز تم بوتے ہو، بتلاؤ! اس کو تم اگاتے ہو یا ہم اُگاتے ہیں، اور حرث بول کر کھیتی بھی مراد لی جاتی ہے جو بوئی ہوئی ہوتی ہے، اور حرث بول کر کھیت بھی مراد لے لیتے ہیں جو موضع حرث ہوتا ہے، بونے کی جگہ، جیسے نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۠ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ (سورۂ بقرہ: ۲۲۳) تمہاری بیویاں تمہارے کھیت ہیں، تم اپنے کھیتوں کے پاس جس طرح سے چاہو آیا کرو، تو یہ گویا کہ موضع حرث کے معنی میں ہے۔ تو یہاں حرث سے کھیتی مراد ہے، کھیت بھی کہہ سکتے ہیں، کھیتی بھی کہہ سکتے ہیں، بات ایک ہی ہے، ''جب کہ وہ دونوں فیصلہ کررہے تھے ایک کھیت کے بارے میں، یا کھیتی کے بارے میں'' اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ: جب کہ اس کھیت میں جا پڑی تھیں قوم کی بکریاں۔ نفش کہتے ہیں جانوروں کا چُرنا، رات کے وقت خصوصیت سے، ''جبکہ جا پڑی تھیں اس میں قوم کی بکریاں'' وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ: هِمْ ضمیر ان اہلِ مقدمہ کی طرف لوٹ رہی ہے جو جھگڑا لے کے آئے تھے، یعنی ایک بکریوں والے لوگ ہو گئے، اور ایک کھیت والے ہو گئے۔ اگر سلیمان علیہ السلام اور داؤد علیہ السلام کی طرف ضمیر لوٹائیں تو پھر لِحُكْمِهِمَا ہونا چاہیے تھا قاعدے کے مطابق، کہ ہم ان دونوں کے فیصلے کا مشاہدہ کرنے والے تھے، ان کے فیصلے کو دیکھنے والے تھے، ان کا فیصلہ ہمارے سامنے تھا۔ اور یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ تثنیہ کو جمع سے تعبیر کردیا، ایسا بھی ہوتا رہتا ہے، جیسے مفرد کو بھی کبھی تعظیم کے طور پر جمع سے تعبیر کر دیتے ہیں، تو تثنیہ کو، مافوق الواحد کو جمع سے تعبیر کر دیتے ہیں۔ اس لیے هِمْ ضمیر ان دونوں کی طرف لوٹا دی جائے، تو بھی قاعدے کے لحاظ سے گنجائش ہے، ورنہ یہ هِمْ ضمیر لوٹے گی ان لوگوں کی طرف جو کہ اہلِ مقدمہ تھے، اور حکم کی اضافت ان کی طرف ہوگی بِاَدْنٰى مُلَابَسَةٍ، یعنی ان لوگوں کے بارے میں جو فیصلہ تھا، ہم اس فیصلے کو دیکھنے والے تھے، اس فیصلے کے اوپر ہم شاہد تھے، گواہ تھے، وہ فیصلہ ہمارے سامنے تھا۔

فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ: ہم نے وہ فیصلہ سلیمان کو سمجھا دیا، وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا: اور ان دونوں میں سے ہر ایک کو ہم نے حکمت اور علم دیا تھا، وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ: اور مسخر کردیا، تابع کردیا ہم نے داؤد کے ساتھ پہاڑوں کو، يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ: اَلطَّيْرَ کا عطف اَلْجِبَالَ پر ہے، مسخر کردیا ہم نے داؤد کے ساتھ پہاڑوں کو اور پرندوں کو، يُسَبِّحْنَ: یہ سب تسبیح پڑھتے تھے۔ جس وقت داؤد علیہ السلام اللہ کی حمد و ثناء کرتے، تسبیح پڑھتے، تو پرندے اور پہاڑ بھی ان کے ساتھ تسبیح پڑھتے تھے۔ وَكُنَّا فٰعِلِيْنَ: اور ہم کرنے والے ہیں، یعنی یہ کام کسی اور کے کرنے کا نہیں، ہمارے کرنے کا ہے، ہم نے کیا۔ پہاڑوں کو بھی مسخر کردیا، پرندوں کو بھی مسخر کر دیا، اور وہ داؤد علیہ السلام

کے ساتھ مل کر تسبیح پڑھتے تھے۔ وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ: اور سکھایا ہم نے داؤد کو، لَبُوْس یہ لباس کے معنی میں ہے، لَبِسَ يَلْبَسُ: پہننا، تو لبوس سے ''لباس'' مراد ہے، ''ہم نے لباس کا بنانا داؤد کو سکھایا''، لیکن لباس یہ نہیں جو عام طور پر ہم کپڑے پہنتے ہیں، اس سے مراد لوہے کا لباس ہے، جس کو دوسری جگہ زرہ سے تعبیر کیا گیا ہے، سورۂ سبا میں آئے گا: اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّقَدِّرْ فِي السَّرْدِ (سورۂ سبا:۱۱) وہاں کامل کامل زرہیں مراد ہیں۔ زرہیں: جو لڑائی کے وقت پہنی جاتی ہیں، جو انسان کے سینے کی حفاظت کرتی ہیں، تیر سے، تلوار سے، دوسری چوٹ سے۔ پرانے زمانے کے اندر لڑائی میں زرہیں پہنی جاتی تھیں، لوہے کی قمیصیں، جن کے اُوپر تلوار اثر نہ کرتی، تیر اثر نہ کرتا، تو حفاظت کے لئے پہنی جاتی تھیں۔ آج کل عجائب گھروں میں نمونے کے طور پر رکھی ہوئی ہیں، جب تیر تلوار کی لڑائی ہوتی تھی اس وقت یہ پہنی جاتی تھیں، تو یہاں لبوس سے وہی زرہیں مراد ہیں۔ ''ہم نے سکھایا داؤد کو زرہ کا بنانا تمہارے نفع کے لیے'' لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ: تاکہ وہ حفاظت کرے تمہاری آپس کی لڑائی سے، باس لڑائی کو کہتے ہیں۔ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ یہ قرینہ ہے اس بات کا کہ لبوس سے عام قمیص مراد نہیں ہے، بلکہ وہی لوہے کی قمیصیں مراد ہیں، جس کو درع یا زرہ سے تعبیر کیا جاتا ہے، وہی لڑائی میں حفاظت کرتی ہیں، ''تاکہ بچائیں وہ تمہیں تمہاری لڑائی سے'' فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ: پھر کیا تم شکر گزار ہو۔

وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ: اور مسخر کیا ہم نے سلیمان علیہ السلام کے لئے ہوا کو، عَاصِفَةً: اس حال میں کہ وہ تیز چلنے والی تھی۔ عاصفہ وہ ہوا ہُوا کرتی ہے جو جھکڑ کی شکل میں آتی ہے، آندھی کی شکل میں، توڑ پھوڑ کرنے والی، تیز و تند ہوا، ''اس حال میں کہ وہ تیز و تند چلنے والی تھی'' تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ: چلتی تھی وہ سلیمان علیہ السلام کے حکم سے، اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا: اس علاقے کی طرف جس میں ہم نے برکت دی ہے۔ اس سے شام کا علاقہ مراد ہے، جہاں بھی قرآنِ کریم میں یہ الفاظ آتے ہیں وہاں سے یہی علاقہ شام کا مراد ہوتا ہے، ''تفسیرِ مظہری'' وغیرہ میں ہے کہ سلیمان علیہ السلام کا ٹھکانا شام میں تھا اور ''تفسیرِ عثمانی'' کے مطابق ہوا تختِ سلیمانی کو یمن سے شام اور شام سے یمن تک دوپہر میں پہنچا دیتی جبکہ دونوں کے درمیان ایک مہینے کی مسافت ہے، وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ: اور ہم ہر چیز کا علم رکھنے والے ہیں۔ وَمِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ: غَاصَ يَغُوْصُ: غوطہ لگانا۔ مِنَ الشَّيٰطِيْنِ یہ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔[1] اور مسخر کیا ہم نے شیاطین میں سے ان کو جو غوطہ لگاتے تھے سلیمان علیہ السلام کے لئے، یعنی سمندروں میں گھستے تھے، پانی کے نیچے جاتے تھے، ان کے لیے موتی نکالتے تھے، جواہرات نکالتے تھے، وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ، اور کرتے تھے وہ کام اس کے علاوہ بھی، وہ جنات ان کے علاوہ اور بھی کام کرتے تھے، اور ان کاموں کی تفصیل آپ کے سامنے سورۂ سبا میں آئے گی، يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ بڑے بڑے محراب، بڑی بڑی عمارتیں، اور بڑے بڑے تمثال، اور لگن، جس کو ہمارے ہاں ''پرات'' کہتے ہیں، تالابوں جتنی بڑی بڑی پراتیں، اور اتنی بڑی بڑی ہانڈیاں جو کسی سے ہلائے نہ ہلیں، یہ سارے کام کرتے تھے، تو ان کاموں کی تفصیل وہاں آئے گی۔ وَكُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ: اور ہم ان شیاطین کی نگرانی کرنے والے تھے، ان کی حفاظت کرنے والے ہم تھے۔

(۱) مِنَ الشَّيٰطِيْنِ حال مقدم ہے مَنْ يَّغُوْصُوْنَ سے، یا مِنَ الشَّيٰطِيْنِ خبر مقدم اور مَنْ يَّغُوْصُوْنَ مبتدا مؤخر ہے (مظہری)۔

ایوب علیہ السلام کا تذکرہ

وَاَيُّوْبَ: اور یاد کیجئے ایوب علیہ السلام کو، اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ: جبکہ پکارا اس نے اپنے رَبّ کو، اَنِّىْ مَسَّنِىَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ یہ ان کی دُعا کے الفاظ ہیں۔ بے شک میں، مجھے تکلیف نے چھوا ہے، مجھے تکلیف پہنچی ہے، اور تُو تمام رحم کرنے والوں سے بڑا رحم کرنے والا ہے۔ یہ آواز دی ایوب علیہ السلام نے اپنے رَبّ کو اَنِّىْ مَسَّنِىَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ: اے میرے پروردگار! مجھے تکلیف پہنچی ہے، میں مصیبت زدہ ہوں، اور تُو ارحم الراحمین ہے۔ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ: ہم نے اس کی بھی دُعا قبول کرلی، فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ: دُور کردی ہم نے اس سے جو تکلیف اسے تھی۔ ضُر تکلیف کو کہتے ہیں۔ وَاٰتَيْنٰهُ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ: اور دیا ہم نے ایوب علیہ السلام کو اس کا اہل وعیال، اور ان جیسے اور بھی ان کے ساتھ، رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا: اپنی طرف سے رحمت کی وجہ سے، وَذِكْرٰى لِلْعٰبِدِيْنَ: اور عابدین کی نصیحت کے لئے، عبادت گزاروں کی نصیحت کے لئے، تاکہ اس سے عبادت گزاروں کو نصیحت ہو کہ جو لوگ صبر کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیش آمدہ امتحان میں ثابت قدم رہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کو پھر اس طرح سے نوازتا ہے۔" عابدین کی یاددہانی کے لئے، نصیحت کے لیے"...... وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِدْرِيْسَ وَذَا الْكِفْلِ: اور یاد کیجئے اسماعیل کو اور ادریس کو اور ذاالکفل کو، كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ: ان میں سے ہر کوئی صبر کرنے والوں میں سے تھا، وَاَدْخَلْنٰهُمْ فِىْ رَحْمَتِنَا: اور ہم نے داخل کیا ان کو اپنی رحمت میں، اِنَّهُمْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ: بے شک وہ اچھے لوگوں میں سے تھے۔

یونس علیہ السلام کا تذکرہ

وَذَا النُّوْنِ: "نون" کہتے ہیں مچھلی کو۔ اور یاد کیجئے مچھلی والے کو۔ اور اس سے حضرت یونس علیہ السلام مراد ہیں، جس طرح سے بعض آیات میں ان کو "صاحبُ الحوت" کے لفظ کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، "حوت" بھی مچھلی کو کہتے ہیں، سورۂ نٓ میں آئے گا: وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ، اور اسی طرح فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ (سورۂ صافات: ١٤٢) ان کو مچھلی نگل گئی۔ تو "ذاالنون" اور "صاحب الحوت" یہ لقب ہیں حضرت یونس علیہ السلام کے۔ "یاد کیجئے مچھلی والے کو" اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا: جس وقت وہ چلا گیا غصے کا اظہار کرتا ہوا، غصے سے بھرا ہوا، جب چلا گیا وہ غصے کا اظہار کرتا ہوا۔ کس پر؟ اس کا مفعول محذوف ہے یعنی اپنی کافر قوم پر، فَظَنَّ: پھر اس نے خیال کیا، اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ: قَدَرَ يَقْدِرُ: قدرت پانے کو بھی کہتے ہیں، پھر اس کا معنی یہ ہوگا کہ اس نے خیال کیا کہ ہم ہرگز اس پہ قدرت نہیں پائیں گے۔ اگر معنی یہ ہو تو پھر اس کی تعبیر کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی جس طرح سے عادت ہے کہ اپنے پاکیزہ لوگوں کی معمولی لغزش کو بھی اس طرح سے سختی سے ادا کرتے ہیں جیسے انہوں نے کوئی بہت بڑی غلطی کی ہو، تو حضرت یونس علیہ السلام چونکہ چلے گئے تھے غصے ہوتے ہوئے اپنی قوم پر، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس نے یہ سمجھا تھا کہ ہم اس کو پکڑ ہی نہیں سکیں گے، یہ ان کے حال کی ایک تعبیر ہے، حالانکہ یونس علیہ السلام کا یہ واقعہ اس طرح سے نہیں ہوا، یہ تو کسی مؤمن کے دل میں بھی بات نہیں آسکتی کہ اللہ مجھے پکڑ نہیں سکے گا اگر میں بھاگ جاؤں، نبی کے دل میں کیسے خیال آسکتا ہے؟ یہ ایسے ہی ہے جس طرح سے آپ کوئی کام کریں آپ کے دل میں

خیال نہیں ہوتا، لیکن آپ کے حال کی شدت کی تعبیر یوں کرتے ہیں "تو نے کیا سمجھ لیا تھا کہ ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے؟" حالانکہ جس وقت آپ وہ غلطی کرتے ہیں تو آپ کو یہ خیال نہیں ہوتا کہ ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے، لیکن جب ایک چیز سے غفلت برتتے ہوئے آپ ایک کام کرتے ہیں تو آپ کا استاذ آپ کے اوپر جو حاکم ہے، وہ یونہی کہتا ہے کہ تو نے سمجھ لیا تھا کہ ہم تجھے کچھ نہیں کہیں گے؟ تو یہ سمجھا تھا کہ تو ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا؟ پکڑا نہیں جائے گا؟ تو یہ واقعے کی شدت کی ایک تعبیر ہوتی ہے، اگرچہ وہ دل میں خیال ہوتا نہیں، محاورے کے طور پر اس حال کی شدت کی تعبیر اسی طرح سے ہوتی ہے، اگر قدر کا معنی یہ قدرت والا کریں، "اس نے یہ سمجھا کہ ہم اسے پکڑ نہیں سکیں گے، ہم اس کے اوپر قدرت نہیں پائیں گے"۔ لفظی دلالت کے تحت اگر ترجمہ کرنا ہو تو پھر مراد اس کی محاورے کے تحت ہے، واقعہ میں اس کی تفصیل آپ کے سامنے آئے گی۔ اور قَدَرَ تنگی کرنے کو بھی کہتے ہیں، وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰىهُ اللّٰهُ (سورۂ طلاق: ۷)، يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ (سورۂ رعد: ۲۶، وغیرہ) اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہتا ہے رزق کشادہ کرتا ہے، جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ تو قَدَرَ تنگی کرنے کو بھی کہتے ہیں، پھر اس کا معنی یہ ہوگا کہ اس نے خیال کیا کہ ہم اس کے اوپر کوئی گرفت نہیں کریں گے، ہم اس کے اوپر کوئی تنگی نہیں ڈالیں گے، یعنی وہ یوں وہاں سے نکل گئے قوم سے غصہ کرتے ہوئے، اور ان کو یہ خیال تھا کہ میرا یہ نکلنا میرے عذر کی بنا پر ہے، اللہ تعالیٰ میرے اوپر کوئی گرفت نہیں کرے گا اس معاملے میں، اپنے آپ کو معذور سمجھتے ہوئے نکل گئے، اور یہی معنی سب سے اچھا ہے، یعنی ان کا خیال یہ تھا کہ ہم ان کے اوپر گرفت نہیں کریں گے، ہم ان کے اوپر تنگی نہیں ڈالیں گے، یعنی وہ حالات کے تحت یہ سمجھتے تھے کہ اب اگر میں اس قوم کو چھوڑ کے چلا جاؤں، نکل کے چلا جاؤں تو اللہ مجھے پکڑے گا نہیں، میرے اوپر کوئی تنگی نہیں کرے گا، کیونکہ میں نے اِتمامِ حُجّت کر دیا، جس طرح سے تبلیغ کرنی چاہیے تھی میں نے کر دی، اب ان نالائقوں کو، ناقدروں کو، ہٹ دھرموں کو اگر میں چھوڑ کے چلا جاؤں تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہوگا، اور اللہ تعالیٰ مجھے نہیں پکڑے گا، ان کا خیال یہ تھا، یہ مفہوم سب سے اچھا ہے، اور عین محاورے کے بھی مطابق ہے اور لغت کے بھی مطابق ہے۔ فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ: پھر پکارا اس یونس علیہ السلام نے تاریکیوں میں۔ واقعے کی تفصیل جب آئے گی آپ کے سامنے تو بات کھل جائے گی، ظلمات ظلمۃ کی جمع ہے، ظلمت: تاریکی کو کہتے ہیں، کہ مچھلی نے ان کو نگل لیا تھا، اور نگل کے جس طرح مچھلی کی عادت ہے کہ سمندر کے نیچے لے گئی، اب سمندر کی تہہ میں بھی تاریکی، مچھلی کے پیٹ میں بھی تاریکی، اور پھر اگر اُوپر سے رات کا وقت بھی آجائے تو تاریکیاں کتنی جمع ہو جاتی ہیں، اور اگر اس طرح سے متعدد تاریکیاں نہ بنائی ہوں تو جب کوئی اندھیرا بہت گھٹاٹوپ ہوتا ہے تو یوں ہی کہا جاتا ہے کہ وہ ایک اندھیرا نہیں، بہت سے اندھیرے ہیں، یعنی تہہ بہ تہہ اندھیرے تھے، تو اس اندھیرے کی شدت کو بھی لفظِ جمع سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ سمندر کی تہہ کا اندھیرا، مچھلی کے پیٹ کا اندھیرا، پھر اس کے اوپر اگر رات بھی ہو، تو یہ تہہ بہ تہہ اندھیرے ہو گئے، ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ (سورۂ نور: ۴۰) یہ ایسی ظلمتیں ہیں جو بعض بعض پہ چڑھی ہوئی ہیں، تہہ بہ تہہ اندھیرے، اور ایک ہی اندھیرا شدت کا ہو تو اس کو بھی کہتے ہیں کہ اس طرح سے اندھیرا تھا جیسا کہ تہہ بہ تہہ اندھیرا چڑھا ہوا ہو، اس کی شدت کو ظاہر کرنے کے لیے بھی ظلمت کو ظلمات کے ساتھ تعبیر کر دیا جاتا ہے، گویا کہ وہ ایک اندھیرا نہیں تھا،

بہت سارے اندھیرے اکٹھے ہو گئے تھے، اور واقعہ بھی ایسے تھا کہ بہت سارے اندھیرے اکٹھے ہو گئے۔ ''تاریکیوں میں انہوں نے پکارا'' لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ: تیرے علاوہ کوئی معبود نہیں، کوئی عبادت کے لائق نہیں، اور جب اس قسم کی مصیبت کے وقت میں لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ کہا جا رہا ہے، تو اس میں خاص طور پر اس معنی کی طرف اشارہ ہے کہ تیرے بغیر اس مصیبت سے نجات دِلانے والا کوئی نہیں، کوئی نجات دہندہ نہیں ہے، اِلٰہ کے اندر یہ مفہوم یہاں خصوصیت سے نمایاں ہے، کوئی فریادرس نہیں، کوئی مشکل کشا نہیں، کوئی اس مصیبت کو ٹالنے والا نہیں تیرے بغیر، کوئی معبود نہیں تیرے بغیر، سُبْحٰنَكَ: تو ہر عیب سے پاک ہے، اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ: بے شک میں ہی قصور واروں میں سے ہوں۔ ظالمین کا لفظ یہاں ایسے ہی ہے جس طرح سے آدم علیہ السلام نے اپنے متعلق استعمال کیا، رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا (سورۂ اعراف: ۲۳) اے اللہ! ہم نے اپنے نفس پہ ظلم کیا۔ تو ظلم علی النفس وہی ہے جس کو ہم محاورۃً قصور سے تعبیر کرتے ہیں، میں نے اپنا قصور کر لیا، ہم نے اپنا قصور کر لیا، اگر تُو معاف نہیں کرے گا تو ہم تو بہت خسارے میں چلے جائیں گے، ''اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ ظُلْمًا كَثِیْرًا'' یہ آپ دُعا پڑھتے ہیں، اے اللہ! میں نے اپنے آپ پہ بہت ظلم کیا، اس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے اپنے آپ پر بہت زیادتیاں کی ہیں، بہت کوتاہیاں کی ہیں، بہت قصور کیے ہیں، جس کی بنا پر میں اپنا نقصان کر بیٹھا ہوں، تُو مجھے معاف کر دے۔ ''میں ہی قصور واروں میں سے ہوں'' فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ: ہم نے اس کی بھی دُعا قبول کر لی وَنَجَّیْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ: اور اس کو اس گھٹن سے نجات دی، اس غم سے نجات دی۔ غم گھٹن کو کہتے ہیں، یہ جو آپ پر غم طاری ہوا کرتا ہے وہ بھی ایک گھٹن ہی ہوتی ہے، دل میں بشاشت نہیں رہتی، طبیعت میں خوشی نہیں رہتی، مزاج گھٹ سا جاتا ہے۔ ''ہم نے اس گھٹن سے اس کو نجات دے دی'' وَكَذٰلِكَ نُـْۨجِی الْمُؤْمِنِیْنَ: اور ہم مؤمنوں کو ایسے ہی نجات دیا کرتے ہیں۔

زکریا علیہ السلام کا تذکرہ

وَزَكَرِیَّآ: اور زکریا علیہ السلام کو یاد کیجئے اِذْ نَادٰی رَبَّهٗ: جب انہوں نے اپنے رَبّ کو پکارا تھا، رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا: اے میرے رَبّ! مجھے اکیلا نہ چھوڑ۔ اکیلے ہونے سے مراد یہ ہے کہ اولاد نہیں ہے گھر میں۔ اے میرے رَبّ! مجھے اکیلا نہ چھوڑ، وَاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ اور تو وارثین میں سے بہتر وارث ہے، تو سب سے اچھا وارث ہے، فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ: پھر ہم نے اس کی دُعا بھی قبول کر لی، وَوَهَبْنَا لَهٗ یَحْیٰی: اور ہم نے اس کو یحییٰ علیہ السلام دے دیا، جیسا کہ سورۂ مریم میں آپ کے سامنے تفصیل آ چکی۔ ہم نے عطا کیا اسے، ہم نے بخشا اس کے لئے یحییٰ، وَاَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ: اور ہم نے اس کے لئے اس کی بیوی کو درست کر دیا، جو قابلِ اولاد نہیں تھی وہ اولاد والی ہوگئی، اولاد کے قابل ہوگئی، ''ہم نے اصلاح کر دی اس کے لیے اس کی بیوی کی'' اِنَّهُمْ كَانُوْا یُسٰرِعُوْنَ فِی الْخَیْرٰتِ: بے شک یہ سارے کے سارے لوگ نیکیوں میں جلدی کرنے والے تھے۔ یُسٰرِعُوْنَ: مسارعت سے ہے، مسارعت. سرعت سے لیا گیا ہے، سرعت کا معنی تیزی، بے شک یہ لوگ نیکیوں میں مسارعت کرنے والے تھے، نیکیوں کی طرف بھاگ بھاگ کے جانے والے تھے۔ وَیَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا، اور ہمیں پکارا کرتے تھے رغبت کرتے ہوئے اور ڈرتے ہوئے۔ رغبت میں اُمید آ گئی اور رہبت میں خوف آ گیا۔ ہم سے اُمید رکھتے ہوئے اور ہم سے ڈرتے ہوئے ہمیں یہ پکارا کرتے تھے۔ خوف اور رجاء دونوں باتیں ہوگئیں،

جس طرح سے کہا کرتے ہیں، ''اَلۡاِیۡمَانُ بَیۡنَ الۡخَوۡفِ وَالرَّجَاءِ'' ایمان خوف اور رجاء کے درمیان درمیان ہے، دونوں کیفیتیں ہونی چاہئیں، وَكَانُوۡا لَنَا خٰشِعِيۡنَ: اور یہ سارے کے سارے ہم سے ڈرنے والے تھے۔

حضرت مریم علیہا السلام کا تذکرہ

وَالَّتِىۡۤ اَحۡصَنَتۡ فَرۡجَهَا، اور یاد کیجئے اس عورت کو جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی، احصانِ فرج سے عصمت مراد ہے، اپنے گریبان کی حفاظت کی، پاک دامن کا لفظ جس طرح سے بولا جاتا ہے، احصانِ فرج اسی مفہوم میں ہے، جس نے اپنی عفت کی حفاظت کی، جس نے اپنے گریبان کی حفاظت کی، فَنَفَخۡنَا فِيۡهَا مِنۡ رُّوۡحِنَا: پھر ہم نے اس عورت میں پھونک دی اپنی روح، اپنی روح سے یہاں عیسیٰ علیہ السلام مراد ہیں، اس لیے ان کا لقب ہے ''روح اللہ''، چونکہ ظاہری اسباب کے خلاف ان کی ولادت ہوئی اس لیے براہِ راست ان کی نسبت اللہ کی طرف ہے، ''ہم نے پھونک دی اس عورت میں اپنی روح'' وَجَعَلۡنٰهَا وَابۡنَهَاۤ اٰيَةً لِّـلۡعٰلَمِيۡنَ: اور بنایا ہم نے اس عورت کو اور اس کے بیٹے کو جہانوں کے لئے نشانی، اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمۡ اُمَّةً وَّاحِدَةً: بے شک یہ تمہاری جماعت ایک ہی جماعت ہے، وَّاَنَا رَبُّكُمۡ فَاعۡبُدُوۡنِ: اور میں تمہارا ربّ ہوں پس تم میری ہی عبادت کرو، وَتَقَطَّعُوۡۤا اَمۡرَهُمۡ بَيۡنَهُمۡ: لوگوں نے اپنے دینی معاملے کو آپس میں ٹکڑے ٹکڑے کرلیا، كُلٌّ اِلَيۡنَا رٰجِعُوۡنَ: ہر کوئی ہماری طرف لوٹ کے آنے والا ہے، سب کے سب لوگ ہماری طرف لوٹ کے آنے والے ہیں۔

سُبۡحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمۡدِكَ اَشۡهَدُ اَنۡ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنۡتَ اَسۡتَغۡفِرُكَ وَاَتُوۡبُ اِلَيۡكَ

تفسیر

انبیاء علیہم السلام کے واقعات بیان کرنے سے مقصود

انبیاء علیہم السلام کے تذکرے آپ کے سامنے ہو رہے ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کا ذِکر اجمالاً آیا تھا، اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعے کی کچھ تفصیل آئی تھی، اور اس کے بعد حضرت لُوط علیہ السلام کا ذکر ہوا تھا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے ہیں، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے اسحاق و یعقوب علیہما السلام کا ذِکر تھا۔ اور اس رکوع میں متعدّد انبیاء علیہم السلام کا ذکر کیا گیا، اور یہ انبیاء علیہم السلام کے واقعات جو ذکر کیے جارہے ہیں ان میں دِین کے مختلف پہلو نمایاں کرنے مقصود ہیں، جس طرح سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ ذِکر کر کے توحید کے مضمون کو واضح کیا اور شرک کی تردید کردی، اور اسی طرح سے لُوط علیہ السلام کے واقعے کے ضمن میں ان خباثتوں کی طرف اشارہ کردیا جن میں ان کی قوم مبتلا تھی، اور اس کے نتیجے میں وہ تباہ ہوئے، یہ واقعات بیان کرکے سننے والوں کے لئے ایک نصیحت مہیا کرنا مقصود ہے کہ اس طرزِ عمل کا یہ نتیجہ ہوتا ہے، اور انبیاء علیہم السلام ان کاموں کے متعلق کہتے رہے ہیں، اور ان کاموں سے روکتے رہے ہیں۔

نوح علیہ السلام نے سب سے زیادہ عرصہ تبلیغ کی

اب آگے ذکر آ گیا حضرت نوح علیہ السلام کا۔ان کا زمانہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے ہے،اب ان کو یہاں ذکر کیا جا رہا ہے ان کے صبر و استقامت کو دکھاتے ہوئے، کہ جتنا طویل عرصہ حضرت نوح علیہ السلام نے قوم سے مصیبتیں اُٹھائی ہیں اور قوم کو سمجھایا ہے اور ہر پہلو سے سمجھایا ہے، اتنا طویل زمانہ شاید کسی قوم کے ساتھ جہاد کرنے کا کسی نبی کو نہیں ملا، قرآنِ کریم کہتا ہے کہ فَلَبِثَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا (سورۂ عنکبوت: ۱۴) نوح علیہ السلام اپنی قوم میں پچاس کم ایک ہزار سال ٹھہرے تھے،یعنی ساڑھے نوسو سال نوح علیہ السلام اپنی قوم میں وعظ و تبلیغ کرتے رہے اوران کی طرف سے مصیبتیں سہتے رہے۔

نوح علیہ السلام کی بدُدعا ذاتی غصے کی وجہ سے نہیں تھی

جب ہر طرح سے مایوسی ہوگئی، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اطلاع مل گئی کہ جنہوں نے ایمان لانا تھا وہ ایمان لے آئے،اب اور کوئی ایمان نہیں لائے گا،تو پھر حضرت نوح علیہ السلام کے اندر اللہ تعالیٰ کے لئے غصہ اور غضب اس قوم پہ آیا، یہ بغض للہ ہے، بغض للنفس نہیں، اگر اپنے نفس کی وجہ سے غصے میں آتے تو ساڑھے نوسو سال کیسے گزارتے، وہ تو مصیبتیں سہتے رہے، لیکن جب پتا چلا کہ اب کُفر ہی کُفر ہی ،شرک ہی شرک ہے، اب اور کوئی ایمان لانے والا نہیں، تو پھر اللہ کے لئے غصہ آیا ان کی طبیعت میں، اپنے نفس کے لیے نہیں، پھر اللہ سے دُعا کی کہ یا اللہ! یہ گندگی کا ڈھیر صاف کردے، تاکہ تیری زمین پاک ہوجائے، اگر تُو ان کو چھوڑے گا تو وَلَا يَلِدُوا إِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا (سورۂ نوح) یہ تو فاجر اور کُفار کو ہی جنیں گے، فاسقوں فاجروں میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا، ان کو رکھنے کا کیا فائدہ؟ اور میں ان کے سامنے مغلوب ہوگیا ہوں، یہ میرے اوپر غالب آگئے ہیں، میری بات مانتے نہیں، میرے پہ زیادتیاں کرتے ہیں، فَانْتَصِرْ (سورۂ قمر) اب تو ہی ان کو سنبھال لے، تو جب یہ دُعائیں کیں حضرت نوح علیہ السلام نے تو اللہ نے دُعا قبول کرلی۔

انبیاء علیہم السلام ہر مشکل میں اللہ کو ہی پُکارتے تھے

حضرت نوح علیہ السلام کا واقعہ آپ کے سامنے مفصل سورۂ ہود میں گزر چکا، اس سے بھی اثباتِ توحید اور ردِّ شرک، اور اللہ کے راستے میں تکلیفیں اٹھانے کا اچھا انجام، اور اللہ کی بات نہ ماننے کا بُرا انجام اس واقعہ کے ضمن میں نمایاں ہے، اور ساتھ ساتھ حضرت نوح علیہ السلام کے اس عمل سے یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ دشمنوں سے نجات پانے کا ذریعہ اللہ تعالیٰ کے سامنے دعا کرنا ہی ہے، انبیاء علیہم السلام جس وقت دشمنوں کے سامنے مغلوب ہونے لگیں، دشمنوں کا زور چڑھنے لگے، تو بھی وہ اللہ کو ہی پکارا کرتے ہیں، اللہ کے سامنے ہی ہاتھ اٹھاتے ہیں، یہ پہلو بھی اس میں نمایاں ہوگیا، جیسا کہ أَنِّي مَغْلُوبٌ (سورۂ قمر) میں بتایا کہ یہ قوم میرے پہ غالب آرہی ہے، میں ان کے سامنے مغلوب ہوگیا، اب میرے اندر تو کوئی زور طاقت نہیں ہے کہ میں ان کو مغلوب کرلوں، تو ہی ان سے بدلہ لے، تو ایسی مصیبت کے وقت میں انبیاء علیہم السلام ہاتھ اللہ کے سامنے ہی پھیلاتے ہیں۔

داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام کے تذکرے سے مقصد

آگے ذکر آ گیا داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام کا، یہ دونوں پیغمبر بھی ہیں بادشاہ بھی ہیں، تو یہاں ان کا جو ذکر کیا جارہا ہے اس میں شکرگزاری ظاہر کرنے کے لئے کہ یہ بادشاہ ہونے کے باوجود اللہ کے سامنے اکڑتے نہیں تھے، اور ایسی بے مثال اللہ نے ان کو سلطنت دی تھی، اس کے باوجود وہ شکرگزار تھے اور اللہ تعالیٰ کے عبادت گزار تھے، گویا کہ بادشاہی میں فقیری اور بادشاہی میں درویشی ان کی شان تھی، تو انبیاء علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ اگر دنیا دیتے ہیں، اور دنیا میں ہر قسم کے وسائل دیتے ہیں، تو ان وسائل کے حاصل ہوجانے کے بعد ان میں کوئی بڑائی اور تکبر نہیں پیدا ہوا کرتا، بلکہ وہ اللہ کے شکرگزار رہتے ہیں، تو اس میں یہ نصیحت کا پہلو ہے کہ انسان میں یہ کمزوری ہے کہ ذرا سی خوش حالی آتی ہے تو اس کی گردن اکڑ جاتی ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ میں ہی سب سے بڑا ہوں، میرے اوپر کسی کی گرفت نہیں ہے، لیکن جو اللہ کے نیک بندے ہوتے ہیں ان کا یہ حال نہیں ہوتا، وہ اگر دن کو بادشاہی کرتے ہیں تو رات کو اللہ کے سامنے روتے ہیں، اور ذرا ذرا بات میں اللہ کے احکام کی رعایت رکھتے ہیں۔

باپ بیٹے کی آپس میں بے مثال معاونت

اور پھر ایک پہلو اس میں خصوصیت سے نمایاں کیا جارہا ہے کہ سلیمان علیہ السلام یہ بیٹے ہیں داؤد علیہ السلام کے، اور وہ باپ بڑا خوش قسمت باپ ہوتا ہے کہ جس کو ایسی اولاد مل جائے جو نیکی میں اس کے ساتھ معاون ہو، کہ داؤد علیہ السلام حکومت پر تھے، لوگوں کے درمیان میں فیصلے کرتے تھے، ایک واقعہ ان کے سامنے آیا، کوئی جھگڑا تھا بکریوں والوں کا اور کسی کھیتی والے کا، کہ بکریوں نے کھیتی اجاڑ دی تھی، یہ مقدمہ آیا داؤد علیہ السلام کے سامنے، تو داؤد علیہ السلام فیصلہ کرتے ہوئے اس کی تہہ تک نہ پہنچ سکے، ان کے فیصلے میں کوئی کمی رہ گئی، تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے فوراً ان کو متوجہ کیا، تو اولاد کا کام ہے کہ باپ میں کوئی غلطی ہو، کوئی لغزش ہو تو اس کی راہنمائی کریں، یہی معاونت ہوتی ہے دینی معاملات میں، اور داؤد علیہ السلام ایسے خوش قسمت تھے اور ایسے نیک سلیقے والے تھے کہ انہوں نے یہ خیال نہیں کیا کہ میں باپ ہوں، اور میرے سامنے یہ بات اس طرح سے کیوں کرتا ہے؟ یا میری بات میں اگر کوئی کمی کا پہلو رہ گیا ہے تو اس میں یہ نشاندہی کیوں کرتا ہے؟ انہوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی بات کو مان لیا اور قبول کر لیا، تو باپ بیٹا اس طرح سے ایک دوسرے سے معاونت کرتے تھے، داؤد علیہ السلام بادشاہ ہونے کے باوجود یہ دماغ نہیں رکھتے تھے کہ میری بات پہ دوسرا بات کیوں کرے؟ اور سلیمان علیہ السلام نے یہ خیال نہیں کیا کہ یہ میرے باپ ہیں، میں ان کی بات کے آگے بات کیوں کروں، بلکہ حق کے متعلق بات باپ کے سامنے بھی کرنی چاہیے، اور باپ کا اچھا سلیقہ یہ ہوا کرتا ہے کہ بیٹا بھی نشاندہی کرے تو اس کو قبول کر لینا چاہیے، اور یہ باپ بیٹا ایسے ہی تھے، ایک دوسرے کے ساتھ دینی معاملات میں معاونت کرتے تھے۔

وہ جھگڑا کیا تھا جس کے بارے میں داؤد علیہ السلام نے فیصلہ کیا تھا

اب وہ مقدمہ کیا تھا؟ اور داؤد علیہ السلام نے کیا فیصلہ کیا؟ سلیمان علیہ السلام نے کس طرح سے بات بتائی؟ اس کی تفصیل قرآنِ کریم

میں نہیں ہے، کیونکہ قرآنِ کریم کوئی قصہ گوئی کی کتاب نہیں، اس میں تو اتنا بتایا کہ بادشاہ ہونے کے باوجود چھوٹے چھوٹے معاملات کی طرف توجہ کرتے تھے جو مخلوق کو پیش آتے، اور اگر کہیں ان کو کسی طرف سے اچھا مشورہ مل جاتا تھا تو فوراً قبول کر لیتے تھے، اور سلیمان علیہ السلام نے ایک اچھا مشورہ محسوس کیا تو فوراً اپنے باپ کے سامنے ذکر کر دیا، تو نیکی میں تعاون یوں ہوا کرتا ہے، اس پہلو کو نمایاں کرنے کے لئے اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے، ویسے مفسرین نے لکھا ہے، اور فوائد عثمانی میں حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی لکھا ہے، کہ صورت واقعہ کچھ ایسی تھی کہ رات کو کسی کی بکریاں چھوٹیں، کسی کے کھیت میں جا پڑیں، اور وہ کھیت انہوں نے اجاڑ دیا، انگور کی بیلیں تھیں یا کچھ اور تھا، کھیت خراب ہو گیا، اب وہ کھیت والے بکریوں والوں کو پکڑ کے آ گئے داؤد علیہ السلام کے سامنے، تو داؤد علیہ السلام نے اندازہ لگایا کہ کھیت کا کتنا نقصان ہوا ہے، اور وہ نقصان بکریوں کی قیمت کے برابر تھا، تو آپ نے فیصلہ دے دیا کہ بکریاں کھیت والے کو دے دی جائیں، اس طرح سے ان کے نقصان کی تلافی ہو جائے گی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام بھی کہیں بیٹھے ہوئے تھے، وہ فرمانے لگے کہ جی! اگر اس طرح سے کر لیا جائے تو اس میں کیا حرج ہے، کہ بکریاں کھیت والے کے سپرد کر دی جائیں، یہ ان کا دودھ پیتا رہے ان سے فائدہ اٹھاتا رہے، اور کھیت بکریوں والے کو دے دیا جائے کہ اس پر محنت کریں، تاکہ ان کی فصل پہلی حالت پر آ جائے، جس وقت وہ کھیت پہلی حالت پر آ جائے تو کھیت کھیت والوں کو دے دیا جائے اور بکریاں بکریوں والوں کو واپس لوٹا دی جائیں، یوں نقصان کی تلافی کرا دی جائے، تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ مشورہ دیا تو داؤد علیہ السلام نے اس کو قبول کر لیا (طبری، مظہری وغیرہ)۔ اور یہ ایسے ہی ہے جس طرح سے ہمارے فقہاء قیاس کے مقابلے میں استحسان کو لے لیا کرتے ہیں، قیاس بھی اپنی جگہ غلط نہیں ہوتا، قیاس بھی صحیح ہوتا ہے، لیکن استحسان میں قیاس کے مقابلے میں ذرا باریکی کی رعایت زیادہ ہوتی ہے، اس لیے قیاس اور استحسان کا کہیں مقابلہ اگر آ جائے تو فقہاء قیاس کے مقابلے میں استحسان کو لے لیتے ہیں، اور ایسے موقع نادر ہیں کہ استحسان کے مقابلے میں قیاس کو ترجیح ہو، تو ان دونوں کا اختلاف بھی کچھ اسی قسم کا ہے۔

تو ایسا ہو جاتا کہ ایک واقعہ کی نوعیت چھوٹا اچھی طرح سے سمجھ جائے، اور اس میں فائدے کا پہلو زیادہ ہو، اور بڑے کا ذہن ادھر نہ جائے تو ایسا ہو جاتا ہے، تو بڑے کی شائستگی یہ ہے کہ چھوٹے کے مشورے کو مان لے، اور چھوٹے کی شائستگی یہ ہے کہ اگر کوئی اس قسم کی بات محسوس کرتا ہے تو ادب کے ساتھ اپنے بڑے کے سامنے کہہ دے، اور اس باپ بیٹے کے معاملے میں یہ بات نمایاں ہوگئی کہ حق پرستی اور حق کو قبول کرنا باوجود بادشاہ ہونے کے ان لوگوں میں کس طرح سے تھا، اور عدل و انصاف کی کتنی رعایت رکھتے تھے۔

سلیمان علیہ السلام کا ایک اور شاندار فیصلہ

ایسا ہی ایک واقعہ حدیث شریف میں بھی ہے، اس کا تعلق اس آیت سے نہیں، ویسے ذکر کرتا ہوں، کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دو عورتیں تھیں، دونوں کے پاس اپنا اپنا بچہ تھا، ایک عورت کا بچہ بھیڑیا لے گیا، اور ایک کا باقی رہ گیا، تو صورتِ حال ایسی بنی کہ اس بچے کے بارے میں بڑی اور چھوٹی کا نزاع ہو گیا، بڑی کہتی تھی یہ میرا ہے، چھوٹی کہتی تھی میرا ہے، اور وہ بچہ لے کر داؤد علیہ السلام

کے سامنے آ گئیں، تو داؤد علیہ السلام نے آثار دیکھے، قرائن دیکھے، ہوسکتا ہے بچہ اس وقت بڑی کے ہاتھ میں ہو، تو انہوں نے فیصلہ کر دیا کہ یہ بڑی کا ہے، چھوٹی کا نہیں، وہ بچہ بڑی کو دلا دیا، باہر نکل رہی تھیں تو سلیمان علیہ السلام سے ملاقات ہوگئی، تو سلیمان علیہ السلام نے پوچھا کیا بات ہے؟ تو انہوں نے واقعہ سنایا، واقعہ سننے کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام کہنے لگے، میں فیصلہ کروں اگر تم چاہو تو، وہ کہنے لگیں جی! آپ فیصلہ کر دیں، فرمایا کہ بچے کو یہاں رکھو، چھری لے آؤ، میں اس کو کاٹ کے دو حصوں میں کر کے آدھا آدھا دونوں کو دے دیتا ہوں، جب سلیمان علیہ السلام کی زبان سے یہ لفظ نکلا تو چھوٹی جلدی سے بول پڑی کہ نہیں حضور! یہ بچہ اسی کا ہی ہے، میرا نہیں، اور بڑی رہ گئی چپ، تو حضرت سلیمان علیہ السلام فرمانے لگے کہ یہ بچہ چھوٹی کا ہے، بڑی کا نہیں، یعنی جو حقیقتاً ماں تھی وہ تو اس بات کو سُن کر پھڑک اٹھی کہ میرے بچے کو کاٹ دیا جائے گا، اور بڑی یہ سمجھی کہ میرا بھیڑیا لے گیا، اس کا چھری سے کٹ جائے گا، اچھا ہے دونوں برابر ہو جائیں گی، یعنی یہ لفظ سُن کے بڑی کی طبیعت پہ اثر نہیں ہوا، وہ تو خاموش رہ گئی، اور چھوٹی پھڑک اٹھی، کہنے لگی نہیں حضور! یہ بچہ اسی کا ہی ہے، میرا نہیں، مطلب کیا تھا؟ کہ زندہ رہے چاہے اسی کے پاس ہی ہو، تو یہ ماں تا جو تھی برانگیختہ ہوگئی اس بات کے سننے کے بعد، تو حضرت سلیمان علیہ السلام پہچان گئے کہ ماں یہ ہے جو پھڑک اٹھی، اور جس کے قبضے میں بچہ ہے یہ ماں نہیں ہے، چنانچہ بات ایسے نکلی اور وہ بچہ چھوٹی کو دلا دیا گیا۔ تو ظاہری دلیل کے ساتھ حضرت داؤد علیہ السلام کا فیصلہ بھی اپنی جگہ صحیح تھا، لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام کی تدبیر سے بہت باریکی نیچے سے نکل آئی، اور بڑی کا جھوٹا ہونا ثابت ہوگیا کہ اس کا بیان غلط تھا۔ [1]

قاضی نے ظاہر کو دیکھ کر حقیقت کے خلاف فیصلہ کر دیا تو کیا حکم ہے؟

تو اس طرح سے کسی میں فیصلے کی قوت زیادہ ہوتی ہے، جس کی بنا پر وہ زیادہ باریکیوں کی رعایت رکھ لیتا ہے، تو ایک دلیل کے اعتبار سے بات ہمارے سامنے آئی...... دیکھو! حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو، کہ تم میرے پاس جھگڑے لے کر آتے ہو، ایسا ہوسکتا ہے کہ تم میں سے ایک زیادہ بولنے والا ہو، "اَلْحَنَ بِحُجَّتِہٖ" ہو، جو اپنی دلیل کو زیادہ اچھی طرح سے واضح کر دے، اور ہو حقیقت میں غلطی پہ، میں اس کے ظاہری بیان کو سُن کے فیصلہ دے دُوں گا کہ حق اس کا ہے، اور حقیقت میں حق اس کا نہیں ہوگا، تو میرے فیصلہ کرنے کے بعد وہ چیز تمہارے لیے حلال نہیں ہوگی، بلکہ یوں سمجھو جس طرح سے میں دوزخ کی آگ کاٹ کے تمہیں دے رہا ہوں،" [2] اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ حاکم نے تو ظاہری بیان سن کر فیصلہ کرنا ہے، اور اگر ایک آدمی زورِ زبان کے ساتھ اپنے مدعا کو اچھی طرح سے واضح کر دیتا ہے، اور دوسرا واضح نہیں کر سکتا، تو حاکم اس دلیل سے متاثر ہو کے فیصلہ اس کے حق میں دے دے گا، لیکن اگر وہ دل سے جانتا ہے کہ میں نے غلط بیانی کی ہے، تو وہ چیز اس کے لئے ویسے ہی حرام ہے۔ تو یوں ہو جاتا ہے۔

تو انبیاء علیہم السلام بھی ظاہر کو دیکھ کے فیصلہ دیتے ہیں، اور ہوسکتا ہے کہ حقیقت کے اعتبار سے بیان دینے والے نے بیان غلط

---

(۱) بخاری ۱/ ۴۸۷، باب قول اللہ ووھبنا لداود سلیمان مسلم ۲/ ۷۷، باب بیان اختلاف المجتہدین مشکوۃ ۲/ ۵۰۸، باب بدء الخلق فصل اول۔

(۲) بخاری ۱/ ۳۳۲، باب اثم من خاصم فی باطل۔ نیز ص ۳۶۸۔ مشکوۃ ۲/ ۳۲۷، باب الأقضیۃ، فصل اول۔

دیا ہو، اور اس بیان غلط دینے کی بناء پر یہ فیصلہ غلط ہو گیا ہو، لیکن اس کی ذمہ داری فیصلہ کرنے والے پہ نہیں ہوتی، بیان دینے والے پہ ہوتی ہے۔ تو یہ ہے حضرت سلیمان علیہ السلام کی صلاحیت کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ علم وحکمت تو داؤد علیہ السلام کو بھی دیا تھا، سلیمان علیہ السلام کو بھی دیا تھا، لیکن فیصلے کی صلاحیت سلیمان علیہ السلام کے اندر بمقابلہ داؤد علیہ السلام کے زیادہ نمایاں تھی، یہ واقعہ پیش آیا تو ہم نے یہ واقعہ سلیمان علیہ السلام کو سمجھا دیا، یعنی ان کا فہم زیادہ تام نکلا، اور جس وقت وہ فیصلہ کر رہے تھے ہم اس وقت موجود تھے، سب کچھ دیکھ رہے تھے، ''اور ہر ایک کو ہم نے علم وحکمت دی'' تو مشترکہ بات ہو گئی کہ علم وحکمت میں دونوں مشترکہ تھے، لیکن فہم میں اور فیصلے کی قوت میں حضرت سلیمان علیہ السلام بعض دفعہ زیادہ ممتاز ہو جاتے تھے۔

داؤد علیہ السلام کے ساتھ پہاڑ اور پرندے بھی اللہ کی تسبیح پڑھتے

وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوُدَ الْجِبَالَ: اب دونوں کے امتیازات علیحدہ علیحدہ آ گئے، کہ حضرت داؤد علیہ السلام بادشاہ تھے، بادشاہ ہونے کے باوجود بڑے ذاکر شاغل تھے، بہت اللہ کی عبادت کرتے تھے، دِن کو حکومت کرتے، لوگوں کے درمیان میں فیصلے کرتے، راتوں کو پہاڑوں میں نکل جاتے، وہاں بیٹھ کے اللہ کا ذکر کرتے، اور یہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام بہت خوش آواز تھے، ''لحنِ داؤدی'' ایک محاورہ ہے، یعنی اس کا گلا ایسا جیسے داؤد علیہ السلام کا، تو داؤد علیہ السلام بہت خوش آواز تھے، اور ان کے اوپر جو کتاب اتری تھی زَبور، اس کے اندر زیادہ تر اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا شعروں کی شکل میں تھی، گیت اور نغمے تھے، نظموں کی شکل میں وہ اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کیا کرتے تھے، پھر ایک پڑھنے والا نبی ہو، اور انتہائی درجے کا خوش آواز ہو، پہاڑوں میں خلوت میں بیٹھا ہوا پڑھ رہا ہو، اور دل کا سوز اور دل کا جذبہ پوری طرح سے ساتھ شامل ہو، تو اندازہ کیجئے کہ فضا کس طرح سے جھوم اٹھتی ہو گی؟ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ بات نمایاں تھی کہ ویسے تو ہر چیز تسبیح پڑھتی ہے، پہاڑ بھی تسبیح پڑھتے ہیں، پرندے بھی تسبیح پڑھتے ہیں، ہم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں، لیکن اس وقت کیفیت ایسی ہو جاتی کہ پہاڑوں کی تسبیح اور پرندوں کی تسبیح بھی اچھی طرح سے نمایاں ہوتی، اور داؤد علیہ السلام اس کو سنتے تھے۔ تو اب ایک آدمی بیٹھا اللہ اللہ کر رہا ہو، اس کے ساتھ چار آدمی اور مل جائیں اللہ اللہ کرنے والے، تو یہ اللہ اللہ کرنے والوں سے پوچھو کہ دوسروں کی آواز جب اپنے کان میں آتی ہے تو اپنی طبیعت میں بشاشت زیادہ پیدا ہوتی ہے، یہ اولیاء اللہ کے ہاں جو مل کے بیٹھ کے ذکر کرنے کی بات ہے، اس میں یہی قصہ ہے کہ کان دوسرے کی آواز کے ساتھ جب مشغول ہوتے ہیں، اور اپنی آواز بھی ہوتی ہے، تو اس میں انسان کے حواس زیادہ بیدار ہوتے ہیں، اور اللہ کا ذکر زیادہ اثر انداز ہوتا ہے، تو داؤد علیہ السلام جب اللہ کا ذکر کرنے کے لئے بیٹھتے تو ان کے ساتھ مل کے ''سبحان اللہ، الحمد للہ'' پہاڑ بھی پڑھتے اور پرندے بھی پڑھتے، اس طرح سے ساری کی ساری فضا اللہ کے ذکر کے ساتھ گونج اٹھتی۔ اب ہم پہاڑوں کی تسبیح نہیں سمجھ سکتے، اور پرندوں کی تسبیح نہیں سن سکتے، انبیاء علیہم السلام سنتے تھے، اور سلیمان علیہ السلام کو تو ویسے ہی منطق الطیر جانوروں کی بولی پوری کی پوری دے دی گئی تھی۔ یہ حقیقتاً تسبیح جو پہاڑ اور پرندے پڑھتے تھے، اور داؤد علیہ السلام ان کو سمجھتے تھے اور سنتے تھے، اس کے ساتھ طبیعت میں نشاط اور بشاشت اور ذکر کی برکات زیادہ نمایاں ہوتی ہیں، ایک تو ان کی یہ خصوصیت ظاہر کی، وَكُنَّا فٰعِلِيْنَ میں یہ بتا دیا کہ یہ ہم کرنے والے تھے، اس لیے تمہیں کوئی

تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ پہاڑ اور پرندے داؤد علیہ السلام کے ساتھ مل کر ذکر کس طرح سے کرتے تھے، ہم کرنے والے تھے، ہمارے تصرف سے ہوا جو کچھ ہوا۔

اللہ نے داؤد علیہ السلام کو زرہ بنانے کی صنعت سکھادی

اور پھر ساتھ ساتھ بادشاہوں کو جس طرح سے اپنی فوجوں کو مسلح کرنے کے لئے ہتھیاروں کی ضرورت ہوتی ہے، اور دوسروں کے مقابلے میں غلبہ نمایاں کرنے کے لئے اسلحہ چاہیے، تو حضرت داؤد علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں بھی خاص سلیقہ دیا، یہ زرہ اس وقت تک مروج نہیں تھی، اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کو سکھائی، اور داؤد علیہ السلام نے زرہیں بنائیں، جن کے ساتھ ان کی فوجی قوت اور ان کا فوجی اسلحہ دوسروں کے مقابلے میں نمایاں ہوا، یہ ایک ظاہری غلبے کی بات ہے، کہ زرہ بنانی ان کو سکھادی جو لڑائی میں کام آتی ہے، جیسے اَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ (سورۂ سبا: ۱۰) کا لفظ آئے گا کہ ہم نے لوہا ان کے لیے نرم کر دیا، آج بھی لوگ لوہے کو نرم کرتے ہیں لیکن اسباب کے تحت، بھٹیوں میں چڑھا دیتے ہیں، لوہا پانی بن جاتا ہے، پانی بن جانے کے بعد پھر اس کو جس طرح سے چاہتے ہیں ڈھال لیتے ہیں، کبھی انڈسٹریوں میں جا کے دیکھیں جہاں لوہے کی صنعت وغیرہ ہے جہاں ڈھلائی کا کام ہوتا ہے، وہاں لوہے کو نرم کیا جاتا ہے، لوہا پانی کی طرح ہو جاتا ہے، اور پھر اس کو جس سانچے میں ڈھالتے ہیں وہ ویسے بن جاتا ہے، جہاں لوہے کی بھٹیاں لگی ہوئی ہیں، وہاں جا کے دیکھیں، یہ چھوٹا چھوٹا کام تو آپ نے بھی دیکھا ہوگا کہ لوہار لوہے کو تپا کے نرم کر لیتے ہیں، پھر اس کو کوٹ کے، رمبیاں درانتیاں جو کچھ بناتے ہیں وہ بھی اسی طرح سے کرتے ہیں، اور بڑی بھٹیوں میں تو اس کو ویسے ہی پانی کی طرح پتلا کر دیتے ہیں، پھر جس سانچے میں ڈالیں ویسے بن جاتا ہے، یہ آج اسباب کے تحت ہے، اور اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کو معجزہ دیا تھا کہ لوہا ان کے سامنے اس طرح سے تھا جس طرح سے آپ کے سامنے موم ہے، جدھر کو چاہیں موڑ لیں، جیسے چاہیں کر لیں، اَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ ہم نے لوہا ان کے لیے نرم کر دیا تھا، یہ معجزہ ہے، تو جو چیز آج اسباب کے تحت ہو رہی ہے اس وقت داؤد علیہ السلام کو بطور معجزے کے حاصل تھی، "سکھادی ہم نے زرہ کی صنعت تمہارے فائدے کے لئے تاکہ وہ تمہیں تمہاری لڑائی سے بچائے، تو کیا تم شکر گزار ہو؟" ان کی وساطت سے اللہ نے تم پر یہ انعام کیا، تو تمہیں شکر ادا کرنا چاہیے، یا وہ تو بادشاہ ہو کر بھی بہت شکر گزار تھے اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ۭ وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ (سورۂ سبا: ۱۳) اے آلِ داؤد! اللہ کا شکر ادا کرو، میرے شکر گزار بندے بہت تھوڑے ہیں، تو حضرت داؤد علیہ السلام، سلیمان علیہ السلام، یہ آلِ داؤد جتنے تھے بہت شکر گزار تھے، تو تمہیں بھی اسی طرح سے شکر گزار ہونا چاہیے۔

سلیمان علیہ السلام کے معجزات

آگے خصوصیت آ گئی حضرت سلیمان علیہ السلام کی، کہ سلیمان علیہ السلام کو اللہ نے بادشاہت بے مثال دی تھی، اور انہوں نے دعا کی تھی هَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ (سورۂ ص: ۳۵) اے اللہ! مجھے ایسی حکومت دے جو میرے بعد کسی کی شان کے لائق نہ ہو، بے مثال حکومت، یہ سلیمان علیہ السلام نے مانگی تھی، تو اللہ تعالیٰ نے پھر ان کو اس طرح سے حکومت دی کہ انسانوں پر بھی حکومت، جنات پر بھی حکومت، ہوا پر بھی حکومت، پرندوں پر بھی حکومت، حتیٰ کہ چیونٹیوں تک کی بولی حضرت سلیمان علیہ السلام سمجھتے تھے، جیسے

سورۂ نمل میں آئے گا، اور پرندوں کے ساتھ باتیں کرتے تھے، پرندے ان کے ساتھ باتیں کرتے تھے، جس طرح سے قرآنِ کریم میں آتا ہے کہ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ (آیت:۱۶) ہمیں پرندوں کی بولی سکھادی گئی، یہ ساری کی ساری زبانیں حضرت سلیمان علیہ السلام جانتے تھے، تو یہاں ہوا کے مسخر ہونے کا ذکر ہے کہ تیز و تند چلنے والی ہوا ہم نے ان کے لیے مسخر کردی، ان کے حکم کے تحت چلتی تھی، کہتے ہیں تخت بچھالیتے، اس کے اوپر خود بیٹھ جاتے، ہوا کو حکم دیتے، ہوا اٹھاتی اور اٹھا کے ان کو ملک شام تک لے جاتی، صبح لے جاتی، شام کو واپس لے آتی، غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ (سورۂ سبا: ۱۲) صبح کو اس کا چلنا بھی ایک مہینے کی مسافت ہوتا تھا، شام کو اس کا چلنا بھی ایک مہینے کی مسافت، یعنی عام قافلے اور عام سوار جتنی مسافت ایک مہینے میں طے کرتے تھے سلیمان علیہ السلام اس ہوا کے ذریعے سے صبح کے وقت ہی طے کر لیتے تھے، جیسے صبح کو سفر شروع ہوا تو دوپہر سے پہلے پہلے ایک مہینے کی مسافت ختم ہوجاتی، اور شام کو سفر شروع ہوا تو سورج کے غروب ہونے سے پہلے پہلے ایک مہینے کی مسافت ختم ہوجاتی، اب پرانے زمانے میں لوگ اس کے اوپر تعجب کرتے تو کرتے، آج کوئی تعجب نہیں ہے، عام انسانوں نے مادی اسباب کو اختیار کر کے مہینوں کی مسافت گھنٹوں میں کرلی، یہ واقعہ ہے، یہ ہوائی جہاز آپ کے سامنے اڑتے ہیں اور یہ مہینوں کی مسافت گھنٹوں میں طے کرتے ہیں، تو آج جو چیز مادی وسائل کے ساتھ حاصل ہوگئی وہ سلیمان علیہ السلام کو معجزے کے ساتھ حاصل تھی، اللہ تعالیٰ نے تمہیں قدرت دی کہ تم نے اس طرح سے لوہے میں اور پانی میں تصرف کر کے بجلی پیدا کر کے، بھاپ پیدا کر کے اس مسافت کو قطع کیا، یہ ریل گاڑی پہلے بھاپ کے ذریعے سے چلتی تھی، اب پٹرول کے ذریعے سے چلتی ہے، آگ اور پانی کے اثر سے یہ لوہا بھاگا، اور یہ بھی گھنٹوں میں مہینوں کی مسافت قطع کرتا ہے، مثال کے طور پر آپ نے یہاں سے کراچی جانا ہوتا تو کتنے دِن لگتے، اور اب چند گھنٹوں میں پہنچ جاتی ہے، یہ ہے مادی اسباب کے تحت، تو جو کام مادی اسباب کے تحت ہوسکتے ہیں اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کے ہاتھ پر وہ معجزات کے طور پر ظاہر کیے ہیں، تو آج آپ کا ہوائی جہاز مشینری سے اڑتا ہے، ظاہری اسباب سے اڑتا ہے، اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا جہاز اِعجاز کے ساتھ اڑتا تھا، معجزے کے طور پر اڑتا تھا، تو آج اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں...... اور اسی طرح سے سمندر میں جہازوں کا چلانا، اور اس ہوا کو بادبانوں کے ذریعے سے مسخر کرنا، کہ ایک کشتی کو ویسے ہی چھوڑ دیا جائے، یا چپو کے ذریعے سے چلائی جائے تو اس کی رفتار کیا ہوگی، اور بادبان کے ذریعے سے اس کو چلایا جائے تو اس کی رفتار کیا ہوجاتی ہے۔ تو بحری جہازوں کا سفر، اور ہوائی جہازوں کا سفر حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے اللہ نے ہوا کے ذریعے سے آسان کردیا، ان کے تخت ہوا میں ایسے اڑتے تھے جس طرح سے آج ہوائی جہاز اڑتے ہیں، تو آج یہ نمونہ موجود ہے۔ ''ہوا جو تیز و تند چلنے والی تھی ہم نے ان کے لیے مسخر کردی، چلتی تھی وہ ان کے حکم کے ساتھ ایسے علاقے کی طرف جس میں کہ ہم نے برکت دی ہے، اور ہم ہر چیز کا علم رکھنے والے ہیں۔''

انبیاء علیہم السلام ہر کام کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں

ہر جگہ یہ بات نمایاں کی جارہی ہے کہ جو کچھ ہوا ہمارے تصرف سے ہوا، آج کل کے بددین لوگ جس وقت اس قسم کی

کسی چیز کو اپنے قابو میں لے آتے ہیں، جیسے ہوا قابو میں کرلی، آگ قابو میں کرلی، بجلی پہ قدرت حاصل کرلی، تو کہتے ہیں ہم نے کیا، ہم نے اپنے زور سے، اپنے علم سے، اپنی حکمت سے ان کو قابو میں کرلیا ہے، اب یہ ہمارے ہو کے رہ گئے، ہم ان کے اوپر حاکم ہیں، اللہ والوں کی شان یہ نہیں ہوتی، ان کو سب کچھ ملتا ہے تو وہ یوں ہی کہتے ہیں کہ بس جو کچھ ہوا اللہ کی طرف سے ہوا، اور اللہ تعالیٰ یہی بتاتے ہیں کہ جو کچھ کیا میں نے کیا، یہی وجہ ہے کہ جب تک اللہ کی توفیق ہوتی ہے تو یہ چیزیں کام آتی ہیں، اور جس دن اللہ کی توفیق نہیں ہوتی یہی چیزیں مصیبت بن جاتی ہیں۔

آج کی جدید مشینری بھی اللہ کی مشیت کے بغیر کام نہیں آسکتی

آج ہوائی جہاز اڑتے ہیں، جب تک اللہ کو منظور ہے اڑتے ہیں، جب اللہ کو منظور نہیں ہوتا تو کلابازیاں کھاتے ہوئے نیچے کو آتے ہیں، اس وقت ان کی قابلیت اہلیت حکمت سائنس جو کچھ ہے سب دھری رہ جاتا ہے، کلابازیاں کھاتے ہیں یا نہیں؟ اور ایسے کھاتے ہیں کہ کوئی پرزہ بھی نہیں ملتا، نہ جہاز کا نہ انسان کا، بوٹی بوٹی ہو جاتے ہیں، اور ایسے ہی سمندروں میں چلنے والے جہاز بڑے تیرتے پھرتے ہیں لیکن جس وقت اللہ کی مشیت نہیں ہوتی تو ایسے غرق ہوتے ہیں کہ نام ونشان نہیں ملتا، گاڑیوں پہ بھاگتے ہیں سب کچھ ہے لیکن جب اللہ تعالیٰ کی مشیت نہیں ہوتی تو ایسے ٹکراتے ہیں کہ چکنا چور ہو کے رہ جاتے ہیں، پھر ان کی حکمت، ان کی سائنس، ان کا علم سب دھرا رہ جاتا ہے۔ تو اللہ کی مشیت جب تک ہے اس وقت تک یہ چیزیں کام آتی ہیں، انبیاء علیہم السلام کے دین میں یہی چیز نمایاں ہے کہ وہ ہر کام کو اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں اور اللہ کا انعام سمجھتے ہیں، اس قسم کی چیزوں پر تصرف حاصل ہوجانے کے بعد وہ اکڑتے نہیں اور اللہ کے سامنے غرور میں نہیں آتے، جگہ جگہ یہی چیز نمایاں ہے۔

تو جیسے ہوا پر ان کو حکومت دے دی تھی، ہوا مسخر کردی تھی، ایسے ہی جنات بھی ان کے لئے مسخر کردیے تھے، اور ان کے لئے کام کرتے تھے سرکش قسم کے جن، سمندروں میں غوطے لگاتے، ان کے لئے موتی نکال کے لاتے، اس کے علاوہ اور کام بھی کرتے تھے جیسے سورۂ سبا میں تفصیل آئے گی، بڑی بڑی عمارتیں بناتے تھے، بڑی بڑی دیگیں بناتے تھے، بڑے بڑے لگن اور پراتیں بناتے تھے، اس قسم کے کام بھی ان سے لیے جاتے تھے، ''اور ہم ان کی نگرانی کرنے والے تھے''، ہماری حفاظت میں ہوا جو کچھ ہوا، اس لیے وہ جنات سلیمان علیہ السلام کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

ایوب علیہ السلام کا واقعہ اور اس کے ذِکر کا مقصد

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے واقعہ کے بعد حضرت ایوب علیہ السلام کا ذکر آ رہا ہے، اوپر ان دونوں پیغمبروں کا ذکر جو آیا تو وہ شکر گزاری میں ممتاز ہیں جیسے کہ تفصیل آپ کے سامنے آچکی، اب آگے ذکر آ رہا ہے اس پیغمبر کا جو صبر میں ممتاز ہے، حضرت ایوب علیہ السلام کے متعلق روایات میں موجود ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے انہیں بہت خوش حالی دے رکھی تھی، اور اس خوش حالی میں وہ شکر گزار تھے، پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر امتحان آیا، مال بھی سارے کا سارا چھن گیا،

اہل وعیال فوت ہو گئے، مال مویشی جتنا تھا وہ سارا ضائع ہو گیا، اور پھر بدنی تکلیف میں بھی مبتلا ہو گئے، اور بدنی تکلیف کوئی سخت قسم کی تھی، بعض آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح سے سارے بدن پر خارش ہو جاتی ہے، پھوڑے اور دانے نکل آتے ہیں، جس کے ساتھ سارا بدن گل سڑ گیا، انتہائی تکلیف میں مبتلا ہوئے، اور خوش حالی کے بعد سخت سے سخت بدحالی اور سخت سے سخت آزمائش میں بھی اللہ تعالیٰ کے سامنے صابر رہے، اور شکایت کا حرف اپنی زبان پر نہیں لائے، اور جب تکلیف انتہا کو پہنچی تو اللہ تعالیٰ کے سامنے یہ دُعا کی جو آگے الفاظ میں آپ کے سامنے آ رہی ہے۔

وَاَیُّوۡبَ: یاد کیجئے ایوب کو جب کہ انہوں نے اپنے رَبّ کو پکارا، اور رَبّ کو پکارتے ہوئے یہ بات کہی اَنِّیۡ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنۡتَ اَرۡحَمُ الرّٰحِمِیۡنَ کہ بے شک مجھے تکلیف پہنچی ہے اور تو اَرۡحَمُ الرّٰحِمِیۡنَ ہے، دعا کے الفاظ پر غور فرمایئے کہ اپنے دکھ کا اظہار تو کیا ہے اللہ تعالیٰ کے سامنے، اور اللہ تعالیٰ کے اَرۡحَمُ الرّٰحِمِیۡنَ ہونے کا ذکر کر دیا، اپنی طرف سے کچھ مانگا نہیں، اے اللہ! میں تکلیف میں ہوں تو اَرۡحَمُ الرّٰحِمِیۡنَ ہے، دعا کے دونوں جزءوں کا یہ ترجمہ ہے، تو جس کا مطلب یہ ہوا کہ اپنا عجز تو اللہ کے سامنے نمایاں کیا، تکلیف تو ذکر کی، باقی! آگے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیا برتاؤ ہونا چاہیے، جو اس کی رحمت کا تقاضا ہے، میں اپنے لیے کچھ تجویز نہیں کرتا، جو تیری طرف سے معاملہ ہوگا، وہ تیری رحمت کا تقاضا ہے، تو ارحم الراحمین ہے، انہی الفاظ کے ساتھ بس اپنے دکھ کا اظہار کیا ہے کہ بے شک مجھے تکلیف پہنچی ہے اور تو ارحم الراحمین ہے، جب اللہ تعالیٰ کو پکارا تو اللہ تعالیٰ نے دُعا قبول کر لی، تفصیل آگے آئے گی کہ اللہ کی طرف سے اطلاع ملی اُرۡکُضۡ بِرِجۡلِكَ اپنا پاؤں مارو، پاؤں کا مارنا تھا کہ وہاں سے ایک چشمہ پھوٹا، جس کے متعلق آ گیا کہ هٰذَا مُغۡتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّشَرَابٌ (سورۂ ص: ۴۲) یہ نہانے کی ٹھنڈی جگہ ہے (مغتسل: نہانے کی جگہ) اور پینے کی چیز ہے، تو اس پانی کو پیو اور اس میں نہاؤ، اسی چشمے سے پانی پینے اور نہانے کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو شفا دے دی، اور پھر وہ جو مالی مشکلات تھیں وہ بھی دُور کر دی گئیں، ان مشکلات کے اندر یا تو ان کے اہل وعیال وفات پا گئے تھے یا منتشر ہو گئے تھے، تو جو منتشر ہو گئے تھے اللہ تعالیٰ نے جمع کر دیے، وفات پا گئے تھے تو اللہ تعالیٰ نے مزید اولاد دے دی، پہلے سے بھی زیادہ دگنی دے دی، دونوں طرح سے نوازا، صحت بھی اچھی ہو گئی، مال میں بھی وسعت ہو گئی، دنیا اور آخرت میں اللہ تعالیٰ نے کامیابی نصیب فرمائی۔ ''ہم نے اس کی دُعا کو قبول کر لیا، پھر جو تکلیف اسے تھی ہم نے دُور ہٹا دی' مِنۡ ضُرٍّ یہ ما کا بیان ہے، ''اور ہم نے اس کو اس کا اہل دیا اور اتنے اور بھی ساتھ دیے'' ان کے اہل وعیال واپس کر دیے، اگر منتشر ہو گئے تھے تو پھر جمع ہو گئے، یا مزید اولاد جو دی گئی تو وہ سمجھو اس اہل وعیال کے برابر بھی تھی اور زائد بھی ہو گئی، ''اپنی طرف سے رحمت کی وجہ سے اور عابدین کے لئے نصیحت کے واسطے'' کہ تاکہ عبادت گزاروں کو نصیحت ہو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو معاملہ ہو اس کو صبر و شکر کے ساتھ گزارنا چاہیے، جلدی سے گھبرانا نہیں جانا چاہیے، نہ خوش حالی میں انسان اکڑے اور نہ کسی مشکل میں مبتلا ہو جانے کے بعد شکوہ شکایت کرنے لگ جائے، پھر اللہ تعالیٰ کی رحمت انسان کو نوازتی ہے، دنیا اور آخرت میں کامیابی نصیب فرماتی ہے، اور اس میں یہ بات بھی آ گئی کہ انبیاء علیہم السلام کی یہ عادت ہے کہ مشکل سے مشکل ترین وقت میں وہ اللہ تعالیٰ کو ہی پکارتے ہیں، اور ان کے دل میں کوئی اور خیال یا وسوسہ نہیں آتا، اور یہ مضمون توحید سے مناسبت رکھتا ہے کہ حل مشکلات کے لیے اللہ تعالیٰ کو ہی پکارا جائے۔

اِسماعیل، اِدریس اور ذُوالکفل علیہم السلام کا تذکرہ

"اور یاد کیجئے اسماعیل اور ادریس اور ذاالکفل کو" ذاالکفل: کا لفظی معنی تو ہے صاحبِ نصیب، اور ان کے حالات روایات میں مذکور نہیں ہیں، صرف نام ہی قرآنِ کریم نے ذکر کیا، باقی! ان کے کیا واقعات تھے؟ کن کی طرف یہ مبعوث ہوئے تھے؟ اور اُمت کے ساتھ ان کا کیا واقعہ پیش آیا؟ وہ روایات میں ذکر نہیں کیا گیا، بس اتنی بات ہی ہوئی کہ کُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِیْنَ یہ سارے صبر کرنے والوں میں سے تھے، جس سے معلوم ہوا کہ ان کی زندگی میں بھی امتحانات پیش آئے تھے اور یہ ثابت قدم رہے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام پر جو امتحان آیا تھا اس کا ذکر تو قرآن میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کو ذبح کرنے کا ارادہ کیا، اور یہ ذکر کیا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ تجھے ذبح کر رہا ہوں تو ثابت قدم رہے، وہاں بھی الفاظ یہی آئے ہیں کہ یٰۤاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِیْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ (سورۂ صافات: ۱۰۲) اے ابا! تو کر گزر جو تجھے حکم دیا گیا ہے، مجھے تو برداشت کرنے والوں میں سے پائے گا، صبر کرنے والوں میں سے پائے گا، جو حکم آپ کو دیا گیا ہے آپ کر گزریں۔ تو یہ واقعہ تو قرآنِ کریم میں مذکور ہے، اور حضرت ادریس علیہ السلام اور ذاالکفل علیہ السلام کے واقعات مذکور نہیں ہیں، اجمالاً اتنا پتا چل گیا کہ زندگی میں ان کو بھی کوئی مشکلات پیش آئی تھیں، جس میں یہ ثابت قدم رہے۔ وَاَدْخَلْنٰهُمْ فِیْ رَحْمَتِنَا: ہم نے ان کو اپنی رحمت میں داخل کیا، بے شک یہ اچھے لوگوں میں سے تھے، شائستہ لوگوں میں سے تھے۔

یونس علیہ السلام کا واقعہ

آگے حضرت یونس علیہ السلام کا واقعہ آ گیا، کچھ ذکر ان کا پہلے سورۂ یونس میں ہو چکا، حضرت یونس علیہ السلام، عراق کے علاقے میں ایک شہر تھا جس کا نام نینوی ہے، اور آج کل اس کے کھنڈرات معلوم ہیں، یہ موصل شہر جو کہ دریائے فرات کے کنارے پر ہے اس کے بالمقابل دوسری طرف یہ شہر تھا، اس کے تباہ ہونے کے بعد اس کے آثارِ قدیمہ کھنڈرات وغیرہ نمایاں ہیں، جگہ معلوم ہے، یہ جگہ عراق میں ہے نینوی کے نام سے، اور قرآنِ کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت اس کی آبادی ایک لاکھ سے زائد تھی، اس زمانے کے لحاظ سے بہت بڑا شہر تھا، جبکہ عام طور پر دنیا میں آبادی کم تھی، تو وہ ایک لاکھ سے زائد افراد پر مشتمل تھا، قرآنِ کریم میں سورۂ صافات میں اس کا ذکر آئے گا۔ تو حضرت یونس علیہ السلام اس قوم کو ڈراتے رہے سمجھاتے رہے، جس طرح سے انبیاء علیہم السلام کی عادت ہے، ہر طرح سے ان کے اوپر اتمامِ حجت کر دی، کوئی طریقہ نہیں چھوڑا کہ جس سے سمجھایا جا سکتا ہو اور نہ سمجھایا ہو، لیکن وہ قوم کسی طرح سے ماننے میں نہ آئی، جیسے پتھر پہ جونک نہیں لگتی اسی طرح سے ان لوگوں پر بھی اس نصیحت کا کوئی اثر نہیں ہوا، اور حضرت یونس علیہ السلام کو وہ ہر طرح سے پریشان کرتے تھے، جیسے کہ کافر اور مشرک قوموں کی عادت ہے، انبیاء علیہم السلام کے ساتھ استہزا اور ان کو تکلیف پہنچانا یہ قدیم زمانے سے مشرک قوم کا رویہ رہا ہے، آخر حضرت یونس علیہ السلام ان کے ہاتھوں سے تنگ آئے، اور خیال یہ کیا کہ اب ان کے اوپر چونکہ ہر طرح سے حجت تام ہو چکی، کوئی کسی قسم کی کمی نہیں رہی، اور یہ آئے دن مجھے پریشان کرتے ہیں، تو اس

لیے میں اگر ان سے علیحدہ ہو جاؤں تو اپنا وقت عافیت سے گزاروں گا، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے میرے پر کوئی اور مزید آزمائش نہیں ڈالی جائے گی۔

کیا یونس علیہ السلام نے تبلیغ میں کوتاہی کی تھی؟

اب یہ بات تو بالکل ٹھیک تھی کہ کافروں سے آزردہ ہو کر، ان کے اوپر ناراض ہو کر ان سے علیحدگی اختیار کر لی جائے، یہ علیحدگی بھی اللہ تعالیٰ کے لئے ہی ہے، دین کے جذبے سے ہے، کہ جب یہ کسی طرح سے مانتے نہیں اور اپنے کفر و شرک کو چھوڑتے نہیں ہیں تو اب ان میں رہنے کا کوئی فائدہ نہیں، لیکن اس غصے میں حضرت یونس علیہ السلام کی نظر سے ایک بات اوجھل ہو گئی، وہ یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام مشرک قوموں کو چھوڑا تو کرتے ہیں اور ہجرت کیا کرتے ہیں، یہ ہجرت کرنا انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے، جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی ہجرت کی، اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ہجرت کی، لیکن جب تک صراحتاً اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت نہ آ جائے اس وقت تک انبیاء علیہم السلام اس علاقے کو چھوڑتے نہیں، اور حضرت یونس علیہ السلام سے یہی لغزش ہوئی کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے صراحتاً اجازت آنے کا انتظار نہیں کیا، بلکہ اپنے خیال سے کہ اب ان میں رہنے کا فائدہ کوئی نہیں، جتنا سمجھانا تھا سمجھا لیا، اور آئے دن یہ پریشان کرتے ہیں، غصے میں آ کے ان سے علیحدگی اختیار کر لی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے صراحتاً اجازت آنے کا انتظار نہیں کیا، بس اتنی سی بات ہے جس کے اوپر یونس علیہ السلام پہ گرفت ہوئی، کہ وہ نکلتے ہوئے انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ اللہ تعالیٰ مزید تنگی نہیں ڈالیں گے، مزید آزمائش میں مبتلا نہیں کریں گے، اس لیے اگر میں ان سے علیحدہ ہو جاؤں، حجت ان پہ تمام ہو چکی ہے، اور میں کہیں اپنا عافیت سے وقت گزار لوں گا، اس خیال کے تحت وہ علیحدہ ہو گئے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے صراحتاً اجازت کا انتظار نہیں کیا، ورنہ تبلیغ میں کوئی کوتاہی نہیں ہوئی، نہ کوئی پیغمبر تبلیغ میں کوتاہی کر سکتا ہے، تبلیغ پوری کی، اتمامِ حجت کامل طریقے سے کیا، لیکن ہجرت کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے صراحتاً اجازت نہیں آئی تھی اور یہ چل دیے، غصے کی وجہ سے قوم کو چھوڑ دیا، یہ انتظار نہیں کیا۔

یونس علیہ السلام مچھلی کے پیٹ میں

شہر سے نکلے، کشتی میں سوار ہو گئے...... پہلے زمانے میں لمبے لمبے سفر لوگ کشتیوں میں کیا کرتے تھے، کشتی میں دو قسم کا سفر ہوتا ہے، ایک کنارے سے دوسرے کنارے کو پہنچنا، جیسے دریاؤں کو عبور کیا جاتا ہے، اور ایک علاقے سے دوسرے علاقے کی طرف جانے کے لیے بھی اس وقت کشتی میں سفر ہوتا تھا کہ ایک طرف سے کشتی ڈال دی جاتی، دریا کے پانی کے ساتھ وہ بہتی جاتی، اور آگے جس منزل پہ پہنچنا ہوتا پہنچ جاتے، پرانے زمانے میں یوں سفر بھی ہوتا تھا، جیسے سمندروں میں اب بھی ایسے سفر ہوتا ہے۔ بھری ہوئی کشتی تھی، اس میں سوار ہو گئے، کشتی چلی جا رہی تھی، آگے وہ طوفان کی نذر ہو گئی، اندیشہ پیدا ہو گیا کہ یہ کشتی ڈوب جائے گی، اس زمانے کے خیال کے مطابق ملاحوں نے ذکر کیا کہ معلوم یوں ہوتا ہے کہ اس کشتی میں کوئی ایسا غلام سوار ہے جو اپنے آقا سے بغیر اجازت کے بھاگ آیا ہے، اس کو متعین کرنے کے لئے کہ وہ کون ہے قرعہ اندازی تجویز ہو گئی، اور قرعہ ڈالنے کے لیے متعین بھی حضرت یونس علیہ السلام کو ہی کر دیا گیا، کیونکہ کشتی میں جتنے لوگ سوار تھے ان سب میں سے دیکھنے میں ثقہ یہی معلوم ہوتے

تھے، قابلِ اعتماد یہی معلوم ہوتے تھے، انہیں کہا گیا کہ آپ قرعہ ڈالیں، قرآنِ کریم میں لفظ آئے گا: فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِينَ (سورہ صافات: ۱۴۱) یونس علیہ السلام نے قرعہ ڈالا تو یہی شکست خوردہ لوگوں میں سے تھے، یعنی انہی کا نام ہی نکل آیا، جب انہی کا نام نکل آیا تو یہ دریا میں کُود گئے، کشتی کو خالی کرنے کے لئے کشتی سے نیچے اتر گئے، اور دل میں خیال بھی آ گیا ہوگا، تنبیہ بھی ہوگئی ہوگی کہ میں ہی وہاں سے بغیر اجازت کے آیا ہوں، کہیں ایسا نہ ہو کہ میری وجہ سے یہ ساری کشتی مصیبت میں آرہی ہو؟ یہ سوچ کر اپنے آپ کو دریا میں یا سمندر میں ڈال دیا...... اور مچھلیاں آپ جانتے ہیں کہ بعض بہت بڑی بڑی ہوا کرتی ہیں، بعض مچھلیاں دیکھنے میں یوں معلوم ہوتی ہیں جیسے سمندری جہاز ہے بلکہ اس سے بھی بڑی، حدیث شریف میں بھی ایک مچھلی کا ذکر آتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے سمندر سے باہر پھینکی تھی، حضرت ابوعبیدۃ بن الجراح رضی اللہ عنہ امیرِ جیش تھے، کسی قافلے کے انتظار میں سمندر کے کنارے پہ ٹھہرے ہوئے تھے، زادِ راہ ختم ہوگیا، پتے جھاڑ کے کھانے کی نوبت آئی، آخر سمندر سے ایک مچھلی باہر نکلی، جس کو اس زمانے میں ''عنبر'' کہتے تھے، تین سو کا قافلہ تھا، کئی دن تک اس مچھلی کو کھاتا رہا، اس کی دو ہڈیاں لے کر، یہ جو کانٹے ہوا کرتے ہیں، یہ دو ہڈیاں لے کر کھڑی کی گئیں، اور قافلے میں جو بڑے سے بڑا اُونٹ تھا وہ لیا گیا، اور اس کے اوپر سوار ہو کے ایک آدمی ان ہڈیوں کے نیچے سے گزر گیا، اتنی بڑی وہ مچھلی تھی۔[1] اور ایک مچھلی کا نام آج کل لیتے ہیں ''وہیل''، اور وہ سب سے بڑی مچھلی ہے جو سمندر میں ہوتی ہے، کراچی کے اندر گارڈن میں، چڑیا گھر میں اس کی ہڈیاں بطور نمونے کے رکھی ہوئی ہیں، اور اس پہ لکھا ہوا ہے کہ یہ سمندر کا سب سے بڑا جانور ہے، آپ یقین کیجئے کہ اس کے یہ جو کانٹے ہیں جو اس کی پسلیاں ہوتی ہیں، وہ ایک ایک فٹ چوڑے ہوں گے، یعنی اُونٹ کی پسلیاں بھی اتنی چوڑی نہیں ہوتیں، تو تقریباً ایک ایک فٹ چوڑی ہیں اس کی پسلیاں جن کو ہم کانٹے کہتے ہیں، اور درمیان والی ہڈی اس کی اتنی لمبی ہے، کہ یہاں سے لے کے یوں سمجھو! قاری احمد صاحب[2] کی درس گاہ کے پرلے کنارے تک، تو اتنی بڑی بڑی مچھلیاں ہوتی ہیں...... اب چونکہ اللہ کی طرف سے ایک آزمائش پیش آئی تھی تو جس وقت وہ سمندر میں اترے تو مچھلی مامور تھی اللہ کی طرف سے، اس نے ان کو نگل لیا، مچھلی کے پیٹ میں چلے گئے، تو یوں سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ نے یونس علیہ السلام کے لیے مچھلی کے پیٹ کو ایک جیل خانہ بنا دیا (تفسیر عثمانی)، اب مچھلی نے نگلا، ہضم تو وہ کر نہیں سکتی تھی، پیغمبر کو ہضم کرنا اس کے بس کی بات تو تھی نہیں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور بھی ایسے ہی تھی، جس وقت حضرت یونس علیہ السلام اس کے پیٹ میں چلے گئے، ہوش وحواس قائم ہیں، فوراً سمجھ گئے کہ یہ مجھ سے لغزش ہوئی، اور اللہ کی طرف سے میں گرفت میں آ گیا، میں سمجھتا تھا کہ مزید آزمائش میں میں نہیں ڈالا جاؤں گا، اور میرے اوپر کوئی تنگی نہیں ڈالی جائے گی، میں تو قوم کی مصیبت سے چھوٹنا چاہتا تھا، کہ آئے دن پریشان کرتے ہیں، یہ تو اور مصیبت آ گئی، اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آ کے اپنی کوتاہی کا احساس ہو گیا، تو تاریکیوں میں، جس طرح سے تفصیل آپ کے سامنے ترجمے میں عرض کر دی گئی تھی کہ مچھلی کے پیٹ کی تاریکی، سمندر کی تہہ کی تاریکی، اور اگر اوپر سے رات

---

(۱) بخاری ۱/ ۳۳۵، باب الشرکۃ فی الطعام۔ ۲/ ۶۲۵، باب غزوۃ سیف البحر. مسلم ۲/ ۱۴۷، باب اباحۃ میتات البحر مشکوٰۃ ۲/ ۳۶۰، باب ما یحل اکلہ

(۲) اُستاذ الحدیث حضرت مولانا مفتی محمد احمد صاحب مدظلہ، رئیس دار الافتاء جامعہ باب العلوم کہروڑ پکا۔

بھی آ جائے تو یہ تہہ بہ تہہ تاریکیاں ہو جاتی ہیں، ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ، یا شدتِ تاریکی کو جمع کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے، جمع کے ساتھ یہ تأثر دیا گیا ہے کہ یوں تھا جیسے تاریکی کی تہیں بیٹھی ہوئی ہوں۔

یونس علیہ السلام نے مچھلی کے پیٹ میں بھی اللہ کو ہی پکارا

وہاں سے پھر اللہ کو پکارا، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کو سنانے کے لئے کوئی لاؤڈ سپیکر کی ضرورت نہیں، نہ ریڈیو پہ بیان دینے کی ضرورت، نہ ٹی وی پہ بیان دینے کی ضرورت، نہ اسٹیج لگانے کی ضرورت، سمندر کی گہرائیوں میں بھی اللہ سنتا ہے، جانوروں کے پیٹوں میں بھی اللہ سنتا ہے، کوئی جگہ ایسی نہیں کہ جہاں سے فریاد کی جائے اور اللہ نہ سنے، تو ان تاریکیوں میں اللہ کو پکارا، اور یہاں بھی پکارنے میں وہی بات آئی کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ، پہلے تو توحید کا اقرار کیا کہ اے اللہ! تیرے بغیر کوئی معبود نہیں، سُبْحٰنَكَ تو ہر عیب سے پاک ہے، اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ بے شک میں قصورواروں میں سے ہوں، یہاں بھی وہی بات ہے کہ اپنے قصوروار ہونے کا ذکر کیا، اور اللہ تعالیٰ کی الوہیت کا اور اللہ تعالیٰ کے عیوب سے پاک ہونے کا تذکرہ کیا، حاصل خود یہی ہو گیا کہ میں قصوروار ہوں، اور تو تمام خوبیوں کا مالک ہے، تیرے اندر کوئی کسی قسم کا عیب اور نقص نہیں، معبود تو ہی ہے کوئی دوسرا معبود نہیں، مطلب یہ تھا کہ میرا قصور معاف کر دے۔

آیتِ کریمہ کی فضیلت

یہ حضرت یونس علیہ السلام کی دُعا ہے، اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دُعا کو بھی اسم اعظم قرار دیا ہے، کہ اس کو پڑھ کے جو کچھ اللہ سے مانگا جائے اللہ قبول کرتے ہیں،[1] مصیبت کے وقت میں اس کا پڑھنا مجرب ہے، حل مشکلات کے لیے، مصیبت کے ازالے کے لیے اُمت کے اندر ہمیشہ سے اس آیتِ کریمہ کا ختم چلا آتا ہے، جب کوئی مشکل میں مبتلا ہوتا ہے تو آیتِ کریمہ کا ختم کرتے ہیں۔ لاکھ دفعہ، سوا لاکھ دفعہ پڑھنا، یہ تجربے سے ثابت ہے کہ اگر اتنی مرتبہ اس کو پڑھا جائے تو جو مصیبت آئی ہوئی ہوتی ہے ٹل جاتی ہے، تو یہ بہت بڑی مجرب دُعا ہے، اس کو عام طور پر پڑھنا چاہیے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روایت میں اس کو ''اسم اعظم'' قرار دیا ہے۔ تو جب یہ دُعا کی، تو: فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ہمیں تاریکیوں میں پکارا، ہم نے اس کی دُعا کو قبول کر لیا، اور اس کو اس گھٹن سے نجات دے دی۔

واقعۂ یونس علیہ السلام سے حاصل شدہ سبق

''اور ہم ایسے ہی مؤمنوں کو نجات دیا کرتے ہیں'' یہ فقرہ بڑھا دیا آپ کے سبق کے لئے، کہ اس سے سبق سیکھو کہ انبیاء علیہم السلام نے کیا نمونہ قوم کے سامنے رکھا ہے، کیسی ہی مشکل میں پھنس جائیں، کتنی ہی تاریکیاں سامنے آ جائیں، لیکن وہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتے، اللہ کو پکارتے ہیں، جب اللہ کو پکارتے ہیں تو اللہ کی رحمت ان کی دستگیری کرتی ہے، تو مؤمنین کو بھی

---

(1) سمعت رسول الله ﷺ يقول: هل ادلكم على اسم الله الأعظم الذى إذا دعى به أجاب وإذا سئل به أعطى. الدعوة التى دعا بها يونس حيث ناداه فى الظلمات الثلاث (مستدرك حاكم، رقم ۱۸۶۵۔ نیز دیکھیں: مشکوٰۃ ۱/ ۲۰۰، باب اسماء اللہ، فصل ثانی۔ ترمذی ۲/ ۱۸۸)

ایسے ہی طریقہ اپنانا چاہیے، کسی مشکل میں گھبرائیں نہیں اور مایوس نہ ہوں، بس اپنی غلطی کا اقرار کریں، اعتراف کریں، اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلائیں، اللہ سے اس کی رحمت مانگیں، اللہ کی رحمت دستگیری کرتی ہے، تو اس میں توحید کا پہلو بھی نمایاں ہے، کہ آفت کے اندر، مصیبت میں، مشکلات میں، مایوس کن حالات میں اللہ کو ہی پکارا جاتا ہے۔

زکریا علیہ السلام کا تذکرہ

''اور زکریا کو یاد کیجئے'' انہوں نے طلب اولاد کے لئے اپنے رَبّ کو پکارا تھا، بیوی بانجھ تھی، خود بھی بوڑھے ہو گئے تھے، ظاہری اسباب بالکل نہیں تھے، لیکن پھر بھی اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوئے، طلب اولاد کے لئے انہوں نے اللہ کو پکارا، اور یہ کہا کہ اے میرے رَبّ! مجھے اکیلا نہ چھوڑ، یعنی میرے گھر میں اولاد دے، کیونکہ جس دِین کا میں وارث ہوں اس دِین کو آگے سنبھالنے والا میرے گھر میں کوئی نہیں ہے، ''اور تو بہترین وارث ہے'' کیا مطلب؟ کہ تو اپنے دِین کا وارث ہے، اگر میرے کوئی وارث پیدا نہیں ہوگا، تو تو بہترین وارث ہے، لیکن میں ظاہری سبب کے طور پر ایک چیز طلب کرتا ہوں کہ مجھے ایک ایسا بچہ دے دے لائق فائق جو اس دِینی وارثت کو سنبھالے'' ہم نے اس کی بھی دُعا قبول کر لی اور اسے یحییٰ دے دیا'' اس کی تفصیل آپ کے سامنے سورۂ مریم میں آ چکی، ''اور اس کی بیوی کو اس کے لیے درست کر دیا، ٹھیک کر دیا'' جو قابل اولاد نہیں تھی اس کو اولاد کے قابل بنا دیا۔

تمام انبیاء علیہم السلام کی مجموعی شان

اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ: یہ جتنے انبیاء علیہم السلام کا ذکر آیا یہ سارے کے سارے نیکیوں کی طرف بھاگ کے جانے والے تھے، مسارعت فی الخیرات کرنے والے تھے، مسارعت سرعت سے ہے، جلدی جلدی جاتے تھے نیکیوں کی طرف۔ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا: اور پکارتے تھے ہمیں رغبت کرتے ہوئے اور ڈرتے ہوئے، اُمید وخوف کے درمیان درمیان ہمیں پکارتے تھے، جس میں یہ بات آ گئی کہ کیسے ہی حالات ہوں اللہ تعالیٰ کو پکارنا چاہیے، اور پھر اللہ کی رحمت سے اُمید بھی رکھنی چاہیے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہماری اپنی کوتاہیوں کے اوپر گرفت سے ڈرنا بھی چاہیے، اور یہی ایمان کی شان ہے، اَلْاِیْمَانُ بَیْنَ الْخَوْفِ وَالرَّجَاءِ، ایمان رجاء اور خوف کے درمیان درمیان ہوتا ہے، اُمید بھی رکھی جائے اور اللہ تعالیٰ کی گرفت سے ڈرا بھی جائے، وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ: وہ ہمارے لیے دَبنے والے تھے، ہمارے سامنے دَب کے رہتے تھے، خوف اور اندیشہ کرنے والے تھے۔

آگے حضرت مریم علیہا السلام کا ذکر آ گیا، وَالَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا: جنہوں نے اپنی عصمت کی حفاظت کی، احصانِ فرج یہ کنایہ ہے عصمت سے، جنہوں نے اپنی فرج کی حفاظت کی، عصمت کی حفاظت کی، پھر ہم نے اس عورت میں اپنی رُوح پھونک دی، اور اس عورت کو اور اس کے بیٹے کو جہانوں کے لئے نشانی بنا دیا، یہ اللہ کی قدرت کی نشانی بھی تھے، اور اللہ تعالیٰ نے اُن (عیسیٰ علیہ السلام) کو پیغمبر بنایا، اور پیغمبر مخلوق کے لئے اللہ تعالیٰ کی رحمت اور قدرت کی مستقل نشانی ہوتا ہے۔

تمام انبیاء علیہم السلام کے اُصول ایک ہی تھے

ان سب کا ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ جماعت ایک ہی جماعت ہے جو ابتدا سے چلی آرہی ہے، ''تمہاری یہ جماعت ایک ہی جماعت ہے'' یہ انسانوں کو خطاب کیا ہے، دین کے اعتبار سے، اصل کے اعتبار اللہ نے تمام انسانوں کو ایک ہی جماعت بنایا ہے، اور انبیاء علیہم السلام سب ایک ہی طریقے پر تھے، یعنی اصول سب کے ایک ہیں، چاہے وقتی مصلحت کے طور پر فروعی احکام علیحدہ علیحدہ ہوں، لیکن دین اصل کے اعتبار سے اصول کا ہی نام ہے، اصول میں کوئی اختلاف نہیں آیا، توحید رسالت معاد جنّت دوزخ اور اس قسم کی دوسری باتیں، اللہ کی صفات کے متعلق، ذات کے متعلق، وہ سب دین میں ایک ہیں، ان کوئی میں کسی قسم کا اختلاف نہیں۔ امت طریقے کے معنیٰ میں بھی آسکتا ہے، ان انبیاء علیہم السلام کے طریقے کو ذکر کے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ تمہارا طریقہ ایک ہی طریقہ ہے، اور حاصل سب کا یہی ہے کہ میں تمہارا رب ہوں پس تم میری ہی عبادت کرو، جیسے انبیاء علیہم السلام کے واقعات میں نمایاں کیا گیا کہ ہر حال میں ہر وقت انہوں نے اللہ کو ہی پکارا، اللہ کی ہی عبادت کی، اسی طرح سے میں تمہارا رب ہوں، تم میری ہی عبادت کرو۔

وَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ: لوگوں نے اپنے دینی امر کے ٹکڑے ٹکڑے کر لیے، کسی نے کوئی راہ نکال لی، کسی نے کوئی راہ نکال لی، سارے ہماری طرف لوٹ کے آنے والے ہیں، اور ہم ان سب کو پوچھیں گے، ہر ایک کے ساتھ اس کے حال کے مطابق معاملہ کریں گے، ایک آیت ! فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ : پھر جو کوئی نیک عمل کرے گا اس حال میں کہ مؤمن ہو، اس کی کوشش کی ناقدری نہیں کی جائے گی، وَاِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ: اور ہم اس کی کوشش کو لکھنے والے ہیں، یعنی جو نیک عمل کرے بشرطیکہ مؤمن ہو، ہمارے پاس یہ سب کچھ لکھا ہوا ہوگا کہ کس نے نیک عمل کیا اور کون ایمان کی حالت میں ہے، تو ہم اس کی کوشش کی قدر کریں گے، اس کو جزا دیں گے، وَاِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ: ہم اس کی کوشش کو لکھنے والے ہیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۹۵﴾ حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ
ممنوع ہے اس بستی پر جس کو ہم ہلاک کر دیا کہ وہ لوٹ کے آئیں ﴿۹۵﴾ حتیٰ کہ جب کھول دیے جائیں گے
يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ﴿۹۶﴾ وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِيَ
یاجوج اور ماجوج اور وہ ہر اُونچی جگہ سے پھیل رہے ہوں گے ﴿۹۶﴾ سچا وعدہ قریب آگیا ہوگا، اچانک واقعہ یہ ہوگا کہ

شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ يٰوَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا

پھٹنے والی ہوں گی آنکھیں ان لوگوں کی جنہوں نے کُفر کیا، (کہیں گے:) اے ہماری بدبختی! ہم اس سے غفلت میں تھے بلکہ ہم

ظٰلِمِيْنَ ۝۹۷ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ۭ اَنْتُمْ لَهَا

قصور وار تھے ۝۹۷ بے شک تم اور وہ چیزیں جن کو تم اللہ کے علاوہ پُوجتے ہو جہنّم کا ایندھن ہے، تم سب اس جہنّم میں

وٰرِدُوْنَ ۝۹۸ لَوْ كَانَ هٰٓؤُلَاۗءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا ۭ وَكُلٌّ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۹۹

وارد ہونیوالے ہو ۝۹۸ اگر یہ سارے آلہہ ہوتے تو یہ جہنّم میں وارد نہ ہوتے اور یہ سارے کے سارے اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ۝۹۹

لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّهُمْ فِيْهَا لَا يَسْمَعُوْنَ ۝۱۰۰ اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى ۙ

ان کے لئے اس میں چیخنا چلانا ہے، اور وہ اس جہنّم میں نہیں سنیں گے ۝۱۰۰ بے شک وہ لوگ جن کے لئے ہماری طرف سے حسنیٰ سبقت لے گئی

اُولٰۗىِٕكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ۝۱۰۱ۙ لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا ۚ وَهُمْ فِيْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ

یہ لوگ اس جہنّم سے دُور ہٹائے جائیں گے ۝۱۰۱ نہیں سنیں گے اس جہنّم کی آہٹ اور وہ اس چیز میں جس کو ان کا جی چاہے گا

خٰلِدُوْنَ ۝۱۰۲ۚ لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰىهُمُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ ۭ هٰذَا

ہمیشہ رہنے والے ہوں گے ۝۱۰۲ بڑی گھبراہٹ ان کو غم میں نہیں ڈالے گی، فرشتے آگے بڑھ کے ان سے ملاقات کریں گے، یہی ہے

يَوْمُكُمُ الَّذِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝۱۰۳ يَوْمَ نَطْوِي السَّمَاۗءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ ۭ

تمہارا وہ دِن جس کا تم وعدہ دیے جاتے تھے ۝۱۰۳ جس دِن ہم لپیٹیں گے آسمانوں کو مثل لپیٹنے لکھے ہوئے مضمونوں کے کاغذ کو،

كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ ۭ وَعْدًا عَلَيْنَا ۭ اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ ۝۱۰۴ وَلَقَدْ

جس طرح سے ہم نے پہلی مرتبہ پیدا کرنا شروع کیا اسی طرح سے ہم اس کو لوٹائیں گے یہ وعدہ ہے ہمارے ذِمّے بے شک ہم کرنے والے ہیں ۝۱۰۴ البتہ

كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ۝۱۰۵ اِنَّ فِيْ هٰذَا

تحقیق لکھا ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد کہ بے شک اس زمین کے وارث ہوں گے میرے نیک بندے ۝۱۰۵ بے شک اس بات میں

لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ ۝۱۰۶ۭ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝۱۰۷

البتہ کافی مضمون ہے عابد لوگوں کے لئے ۝۱۰۶ اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کو مگر عالمین پر رحمت کرنے کے لیے ۝۱۰۷

قُلْ اِنَّمَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۸﴾

آپ کہہ دیجئے اس کے سوا کچھ نہیں کہ میری طرف یہ وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے تو کیا تم فرماں بردار بننے والے ہو؟ ﴿۱۰۸﴾

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ اٰذَنْتُكُمْ عَلٰى سَوَآءٍ ۭ وَاِنْ اَدْرِيْٓ اَقَرِيْبٌ اَمْ بَعِيْدٌ مَّا

اگر یہ لوگ پیٹھ پھیر جائیں تو آپ کہہ دیجئے میں نے تمہیں اطلاع دے دی برابر سرابر، اور نہیں جانتا میں کہ قریب ہے یا دور ہے وہ چیز

تُوْعَدُوْنَ ﴿۱۰۹﴾ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ وَيَعْلَمُ مَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ وَاِنْ اَدْرِيْ

جس کا تم وعدہ دیئے جاتے ہو ﴿۱۰۹﴾ بے شک وہ اللہ جانتا ہے ظاہر بات کو بھی اور اس کو بھی جس کو تم چھپاتے ہو ﴿۱۱۰﴾ اور میں نہیں جانتا

لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۱۱۱﴾ قٰلَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ ۭ

شاید کہ یہ تاخیر آزمائش ہو تمہارے لئے اور فائدہ پہنچانا ہو ایک وقت تک ﴿۱۱۱﴾ رسول نے کہا: اے میرے رَبّ فیصلہ کر دے حق کے ساتھ

وَرَبُّنَا الرَّحْمٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

اور ہمارا رَبّ رحمٰن ہے مدد طلب کیا ہوا ہے ان باتوں کے خلاف جو تم بیان کرتے ہو ﴿۱۱۲﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۔ وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ: حرام یہاں ممتنع کے معنی میں ہے، یعنی ممنوع ہے، ممتنع شرعی، جیسے کہ قرآنِ کریم میں دوسری جگہ بھی یہ لفظ موسیٰ علیہ السلام کے ذکر میں آئے گا حَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ (سورۂ قصص: ۱۲) ہم نے دودھ پلانے والی عورتوں کو موسیٰ علیہ السلام پر حرام ٹھہرا دیا، تو وہاں بھی حرام ٹھہرانے سے ممنوع ٹھہرانا مقصود ہے۔ ''حرام ہے اس بستی پر جس کو ہم نے ہلاک کر دیا، ممنوع ہے اس بستی پر جس کو ہم نے ہلاک کر دیا'' اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ: اس میں لا زائدہ ہے، ''کہ وہ لوٹ کر آئیں'' ان کا لوٹ کے آنا ممنوع ہے جن کو ہم نے ہلاک کر دیا، ہلاک کرنا عام ہے موت کے ساتھ ہو یا عذاب کے ساتھ ہو، یعنی جن بستیوں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں، چاہے طبعی موت سے چاہے عذاب کے ساتھ اب وہ دنیا کی طرف لوٹ کے نہیں آ سکتے، یہ چیز ممنوع ہے۔ اور اگر لَا يَرْجِعُوْنَ سے مراد یہ لیا جائے کہ وہ سیدھے راستے کی طرف نہیں لوٹ سکتے، جس غلط راستے پر چل گئے اس راستے پر چلتے رہیں گے، واپس لوٹ کے نہیں آئیں گے، تو پھر اَهْلَكْنٰهَآ کا ترجمہ یوں کریں گے کہ جس کا ہلاک کرنا ہم نے مقدر کر دیا ہے ''ممنوع ہے اس بستی پر جس کا ہلاک کرنا ہم نے مقدر کر دیا، یعنی ہماری طرف سے جن کا اہلاک مقدر ہو گیا ان پر ممنوع ہے کہ وہ سیدھے راستے کی طرف لوٹ کے آئیں۔'' حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ: اور یہ ان کا لوٹ کے نہ آنا اس وقت تک ہے جب تک کہ قیامت نہیں آ جاتی، اور آگے یہ قیامت کے مبادیات ہیں، قیامت کی بڑی بڑی علامات۔ حتّٰی کہ جب یاجوج ماجوج کھول دیئے جائیں

گے، وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ: حدب کہتے ہیں اونچی جگہ کو، ٹیلے کو۔ ''وہ ہر ٹیلے سے پھیل رہے ہوں گے، ہر اونچی جگہ سے پھیلنے والے ہوں گے، پھیل رہے ہوں گے'' وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ: سچا وعدہ قریب آ گیا، فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ''هی'' ضمیر قصہ ہے جس طرح سے ضمیر شان ہوتی ہے، مذکر کی ضمیر ہو تو اس کو ضمیر شان کہہ دیا جاتا ہے، اور مؤنث کی ضمیر ہو تو اس کو ضمیر قصہ کہہ دیا جاتا ہے، ''اچانک واقعہ یہ ہوگا (ضمیر شان اور ضمیر قصہ کا مفہوم یوں واضح کیا جاتا ہے) اچانک واقعہ یہ ہوگا کہ پھٹنے والی ہوں گی آنکھیں ان لوگوں کی جنہوں نے کفر کیا'' شَاخِصَةٌ: اوپر کو اٹھی ہوئی ہوں گی، اوپر کو ٹکی ہوئی ہوں گی، پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔ ''اٹھنے والی ہوں گی نگاہیں ان لوگوں کی جنہوں نے کفر کیا'' يَقُوْلُوْنَ یہ لفظ یہاں محذوف نکالیں گے، وہ کافر لوگ کہہ رہے ہوں گے يٰوَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا: اے ہماری بربادی! اے ہماری بدبختی! ہم غفلت میں تھے اس سے، بَلْ كُنَّا ظٰلِمِيْنَ: بل اضراب کے لئے ہے، یعنی غفلت میں بھی نہیں، کیونکہ رسولوں نے ہمیں بہت سمجھایا، اللہ کی طرف سے تبلیغ کرنے والے ہمارے پاس بہت آئے، انہوں نے ہمیں بہت متوجہ کیا، غافل بھی کیا تھے، بلکہ ہم قصوروار تھے کہ ان کے تنبیہ کرنے کے باوجود ہم سمجھے نہیں۔ حیرانی پریشانی کی حالت میں نظریں اوپر کو ٹکی ہوئی ہوں گی، اوپر کو جھانک رہے ہوں گے، جس طرح سے نظر پھٹی کی پھٹی رہ جاتی ہے اور زبان سے یوں کہہ رہے ہوں گے يٰوَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِيْنَ: اے ہماری بدبختی! ہم اس سے غفلت میں تھے بلکہ ہم قصوروار تھے۔ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ: حصب ایندھن کو کہتے ہیں، حصب اور حطب ایک ہی چیز ہے۔ بے شک تم اور وہ چیزیں جن کو تم اللہ کے علاوہ پوجتے ہو جہنم کا ایندھن ہے۔ حطب کا لفظ بھی قرآنِ کریم میں ہے جیسے سورۂ جن میں آئے گا، ''ایندھن'' کو کہتے ہیں، اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ: تم سب اس جہنم کے لئے وارد ہونے والے ہو، لَوْ كَانَ هٰٓؤُلَآءِ اٰلِهَةً اگر یہ سارے آلہہ ہوتے، آلہہ اِلٰہ کی جمع، اگر یہ معبود ہوتے، مَّا وَرَدُوْهَا: تو یہ جہنم میں وارد نہ ہوتے، وَكُلٌّ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ: اور یہ سارے کے سارے اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں، یعنی عابدین بھی اور معبودین بھی، لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّهُمْ فِيْهَا لَا يَسْمَعُوْنَ: زفیر چیخنے چلانے کو کہتے ہیں، دوسری جگہ قرآنِ کریم میں لفظ آئے گا زَفِيْرٌ وَّشَهِيْقٌ (سورۂ ہود: ۱۰۶) زفیر اور شہیق دونوں کا معنی چیخنا چلانا ہوتا ہے، اور یہ لفظ اصل کے اعتبار سے گدھے کی آواز کے لئے بولا جاتا ہے، گدھے کی آواز دو طرح سے آیا کرتی ہے، جب وہ سانس باہر کو نکالتا ہے تو بھی آواز آتی ہے، جب پیچھے کو لوٹاتا ہے تو بھی آواز آتی ہے، اس کی سیٹی دونوں جانب بجتی ہے، تو باہر نکالتے وقت جو آواز آتی ہے اس کو ''زفیر'' کہہ دیں گے، جب وہ سانس پیچھے کو لوٹاتا اس وقت جو آواز آتی ہے اس کو ''شہیق'' کہہ دیں گے (مظہری)۔ بہرحال یہ گدھے کی ابتدائی اور آخری آواز ہے، تو یہاں ان کے چیخنے کو جو ''زفیر'' کے لفظ کے ساتھ تعبیر کیا گیا اس میں تحقیر کا پہلو ہے، کہ وہ گدھے کی طرح وہاں آوازیں نکالیں گے، چیخیں گے، چنگھاڑیں گے۔ ''ان کے لیے اس میں چیخنا چلانا ہے'' وَّهُمْ فِيْهَا لَا يَسْمَعُوْنَ: اور وہ اس جہنم میں نہیں سنیں گے، یعنی اتنا شور ہوگا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے گی (جلالین وغیرہ)۔ یا پھر لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ یہ عابدین کے متعلق ہو جائے، کہ یہ پوجنے والے گدھوں کی طرح چیخیں گے، چلائیں گے، اور اپنے ان معبودوں کو فریاد کریں گے، بلائیں گے، اور وہ معبود جہنم میں پڑے ہوئے کچھ سنیں گے ہی نہیں، یوں بھی مفہوم ہو سکتا ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى: بے شک وہ لوگ جن کے لیے ہماری طرف سے حسنیٰ سبقت لے گئی۔ الحسنیٰ یہ احسن کی مؤنث ہے، اسم تفضیل

مؤنث، اس کا موصوف نکالیں گے العاقبۃُ الحسنٰی، جن کے لیے ہماری طرف سے اچھا انجام سبقت لے گیا، اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ: یہ لوگ اس جہنم سے دور ہٹائے جائیں گے، لَا یَسْمَعُوْنَ حَسِیْسَهَا: نہیں سنیں گے اس جہنم کی آہٹ، حسیس کہتے ہیں محسوس کرنے کی چیز کو، وَهُمْ فِیْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ خٰلِدُوْنَ: اور وہ اس چیز میں جس کو ان کا جی چاہے گا ہمیشہ رہنے والے ہوں گے، اس چیز میں جس کو ان کا دل چاہے گا ہمیشہ رہنے والے ہوں گے، لَا یَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ: بڑی گھبراہٹ ان کو غم میں نہیں ڈالے گی۔ بڑی گھبراہٹ: میدانِ قیامت میں جمع ہونا، کھڑا ہونا، اللہ کے سامنے پیش ہونا، جہنم کے حالات، جہنم جو دکھائی جائے گی تو اس سے بہت بڑی گھبراہٹ طاری ہوگی، لیکن ان نیک لوگوں کو وہ بڑی گھبراہٹ بھی غم میں نہیں ڈالے گی۔ وَتَتَلَقّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ: لَقِیَ یَلْقٰی: ملنا۔ تَلَقّٰی یَتَلَقّٰی کا معنی ہوتا ہے آگے بڑھ کے ملنا، جس کو ہم استقبال کرنا کہتے ہیں، جب کوئی معزز آدمی آرہا ہوتا ہے تو دوسرے لوگ اس کو آگے بڑھ کے ملتے ہیں، اسی کو استقبال کرنا کہتے ہیں، تو یہ تلقی استقبال کے معنی میں ہے۔ فرشتے آگے بڑھ کے ان سے ملاقات کریں گے، فرشتے ان کا استقبال کریں گے، اور استقبال کرتے ہوئے جس طرح سے ہم خوش آمدید کہتے ہیں فرشتے ان سے کہیں گے هٰذَا یَوْمُكُمُ الَّذِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ: یہی ہے تمہارا وہ دِن جس کا تم وعدہ دیے جاتے تھے۔ یَوْمَ نَطْوِی السَّمَآءَ كَطَیِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ: طَوٰی یَطْوِیْ: لپیٹنا۔ اور آگے طیّ یہ مصدر ہے۔ سجل کہتے ہیں دفتر کو یا فائل کو جس میں کاغذات وغیرہ رکھے جاتے ہیں، کاغذات کے لیے یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ اور کتب کتاب کی جمع ہے مکتوب کے معنی میں، لکھے ہوئے مضامین، سجل للکتب کا معنی ہوگا لکھے ہوئے مضامین کا کاغذ، ''جس دِن ہم لپیٹیں گے آسمانوں کو مثل لپیٹنے لکھے ہوئے مضمونوں کے کاغذ کو'' جس طرح سے لکھے ہوئے مضمون کا کاغذ لپیٹ کے رکھ لیا جاتا ہے اسی طرح سے ہم آسمانوں کو لپیٹ لیں گے، دوسری جگہ قرآنِ کریم میں لفظ آئے گا: وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِیّٰتٌۢ بِیَمِیْنِهٖ (سورۂ زُمر: ۶۷) آسمان سارے کے سارے لپیٹے ہوئے ہوں گے، تو مَطْوِیّٰتٌ اسی سے اسم مفعول کا صیغہ ہے۔ لپیٹ کے اللہ کے دائیں ہاتھ میں رکھے ہوئے ہوں گے، جیسے آپ ایک کاغذ لکھتے ہیں، بعد میں اس کو یوں کر کے لپیٹ لیتے ہیں، لپیٹ کے اس کو ہاتھ میں پکڑ لیتے ہیں، اسی طرح سے آسمان سارے کے سارے اکٹھے کر لیے جائیں گے ''جس دِن کہ لپیٹیں گے ہم آسمان کو مثل لپیٹنے لکھے ہوئے مضامین کے کاغذ کو'' كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِیْدُهٗ: بَدَاَ: شروع کرنا۔ جس طرح سے ہم نے شروع کیا پہلی مرتبہ پیدا کرنے کے وقت۔ بَدَاْنَا کا مفعول محذوف نکال لیجئے ''كَمَا بَدَاْنَا كُلَّ شَیْءٍ اَوَّلَ خَلْقٍ نُعِیْدُ كُلَّ شَیْءٍ'' ''جس طرح سے ہم نے شروع کیا ہر چیز کو پہلی مرتبہ پیدا کر کے اسی طرح سے ہم ہر چیز کو لوٹائیں گے، یا، جس طرح سے ہم نے پہلی مرتبہ پیدا کرنا شروع کیا اسی طرح سے ہم اس پیدا کرنے کو لوٹائیں گے، یعنی دوبارہ بھی پیدا کریں گے، ''جیسے شروع کیا ہم نے ہر چیز کو پہلی مرتبہ پیدا کرنے کے وقت ایسے ہی ہم ہر چیز کو لوٹائیں گے'' وَعْدًا عَلَیْنَا: یہ وعدہ ہے ہمارے ذِمے، یعنی وَعَدْنَا وعدًا، ہم نے یہ وعدہ اپنے ذِمے لے رکھا ہے، اِنَّا كُنَّا فٰعِلِیْنَ: بے شک ہم کرنے والے ہیں۔ وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِی الزَّبُوْرِ: البتہ تحقیق لکھا ہم نے زبور میں مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ ذکر کے بعد اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُهَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ: کہ بے شک زمین، وارث ہوں گے اس زمین کے میرے نیک بندے۔ زبور سے حضرت داؤد علیہ السلام کی کتاب مراد لے لی جائے تو مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ کا یہ معنی بھی کیا گیا ہے کہ تورات کے بعد جو زبور اُتری ہم نے اس میں یہ مضمون لکھا (مظہری وغیرہ)۔ اور زبور سے مطلقاً آسمانی کتابیں مراد لے لی جائیں تو ذکر سے مراد لوحِ محفوظ

بھی لیا جاسکتا ہے (عام تفاسیر) کہ لوحِ محفوظ کے بعد ہم نے ہر کتاب میں جو آسمان سے اُتری یہ بات لکھی کہ زمین، اس زمین کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے۔ اور اگر واقع کے لحاظ سے زَبور کا مطالعہ کیا جائے جو حضرت داؤد علیہ السلام پر اُتری ہے، تو مفسرین لکھتے ہیں کہ اس میں ایک بہت لمبی نظم ہے (کیونکہ زَبور نظموں کی شکل میں تھی) کہ جس میں بار بار اس مضمون کو دہرایا گیا، کچھ نصیحتیں کی گئی ہیں اچھائی اختیار کرنے کے لئے اور بُرائی سے بچنے کے لئے، اور پھر بار بار اس قسم کی بات کو دہرایا گیا ہے کہ میری زمین کے وارث نیک لوگ ہی ہوں گے، تو اگر اس مضمون کو دیکھ لیا جائے، اس نغمے کو دیکھ لیا جائے، تو پھر ذکر سے نصیحت بھی مراد ہوسکتی ہے کہ ہم نے وعظ و نصیحت کرنے کے بعد زبور میں یہ بات لکھی ہے کہ زمین، اس کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے۔ اور بعض حضرات نے وہ سارے کا سارا مضمون زَبور سے نقل کیا ہے، جس طرح سے ہمارے ہاں سورۂ رحمٰن میں ایک ایک دو دو آیات کے بعد اس مضمون کو لوٹایا گیا، فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ، تو اسی طرح سے اس میں بھی یہ فقرہ بار بار لوٹایا گیا ہے کہ ''زمین کے وارث نیک بندے ہوں گے'' تو پھر واقع کے لحاظ سے معنی یہ ہوجائے گا کہ نصیحت کرنے کے بعد ہم نے زَبور میں یہ بات لکھی، یعنی نصیحت بھی کی ہے اور نصیحت کے بعد یہ بات لکھی ہے کہ زمین، اس کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے...... اور اس زمین سے مراد ہے جنّت کی زمین، کیونکہ یہ زمین جس کے اوپر ہم بستے ہیں اس کے تو کافر بھی مالک بنتے ہیں غیر کافر بھی بنتے ہیں، نیک بھی بنتے ہیں بد بھی بنتے ہیں۔ اور یہ وراثت جو دائمی ہوگی، ہمیشہ کے لیے ملے گی، یہ بات جنّت کی زمین پر صادق آتی ہے، اور خود قرآنِ کریم میں بھی جنّت کے لئے ارض کا لفظ سورۂ زُمر (آیت: ۷۴) میں استعمال ہوا ہے وَاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَیْثُ نَشَآءُ: اللہ تعالیٰ نے اس زمین کا ہمیں وارث بنا دیا، ہم جنّت سے جہاں چاہیں رہتے ہیں۔ تو وہاں ارض سے جنّت ہی مراد ہے، تو یہاں بھی ارض سے ارضِ جنّت مراد لے لی جائے گی، آخرت کی زمین، اِنَّ فِیْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِیْنَ: بے شک اس بات میں البتہ کافی مضمون ہے جو مقصد تک پہنچانے والا ہے، اس مضمون میں البتہ منادی ہے اعلان ہے عابد لوگوں کے لئے، یعنی اس میں کافی مضمون ہے عبادت گزاروں کی تسلی کے لئے اور ان کی بشارت کے لئے کہ زمین کے وارث یہی نیک لوگ ہوں گے۔

سَرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ''رحمۃ للعالمین'' ہونے کا مفہوم

وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ: نہیں بھیجا ہم نے آپ کو کسی مقصد کے لئے اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ: مگر عالمین کے لئے رحمت کے واسطے۔ رَحْمَةً یہ مفعول لہٗ ہے، عالمین پر رحمت کرنے کے لیے ہم نے آپ کو بھیجا ہے، اور ''نحو'' کے اندر آپ قاعدہ پڑھتے رہتے ہیں کہ مفعول لہٗ جس وقت بتقدیرِ لام منصوب ہو تو جس فعل کا وہ مفعول لہٗ ہے اس کا فاعل اور خود اس مفعول لہٗ کا فاعل ایک ہوتا ہے، جو فعل معلل بہ ہے، جس فعل کی علت کے طور پر اس کو لایا گیا ہے اس کا فاعل اور خود مفعول لہٗ کا فاعل ایک ہوتا ہے، یعنی وہ مفعول لہٗ بھی اسی فاعل کا فعل ہوتا ہے جس فاعل کا فعل وہ ہے جس کے لئے اس کو بطور علت کے لایا گیا ہے، مثال آپ نے پڑھی تھی: ضربتُ زیدًا تادیبًا، یا ضربتُہٗ تادیبًا، میں نے اس کو مارا ادب سکھانے کے لیے، تو جیسے مارنا میرا فعل ہے اسی طرح سے ادب سکھانا بھی میرا فعل ہے، اگر لام ظاہر کردیا جائے تو اس میں تو ہوسکتا ہے کہ مفعول لہٗ جو لام کا مجرور ہے وہ کسی اور کا فعل ہو، لیکن

جس وقت لام مقدر ہو اور اس کو منصوب کیا جائے تو پھر فاعل ایک ہی ہوتا ہے، جیسے مذکورہ مثال میں مارنا بھی میرا فعل اور ادب سکھانا بھی میرا فعل، اسی طرح سے یہاں ارسلنا یہ فعل معلل ہے اور رَحْمَةً مفعول لہ ہے، لام مقدر ہے، تو جس کا مطلب یہ ہوگا کہ ارسال جس کا فعل ہے رحمت بھی اسی کا فعل ہے۔ ہم نے آپ کو بھیجا، کس لیے بھیجا؟ تا کہ ہم جہانوں پر رحمت کریں، یعنی آپ کو ہم نے اپنی رحمت کرنے کا ذریعہ بنا کر بھیجا ہے، آپ کے ذریعے سے ہم جہانوں پہ رحمت کرنا چاہتے ہیں، تو گویا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی رحمت کی نشانی ہوئے، اللہ کی رحمت کے حاصل ہونے کا ذریعہ ہوئے، اور مبالغۃً کہہ دیا جاتا ہے کہ آپ بذاتِ خود ہی مجسمۂ رحمت ہیں، یعنی اللہ کی رحمت، رحمت فعل اللہ کا ہے، جہانوں پر رحمت اللہ نے بھیجی، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا ذریعہ بنایا، ورنہ رحم کرنا یہ فعل اللہ کا فعل، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ اس رحمت کے حاصل ہونے کا ذریعہ بنے اس لیے آپ کو کہہ دیا جاتا ہے کہ آپ سب جہانوں کے لیے رحمت ہیں۔ ''ہم نے جہانوں پر رحم کرنے کے لئے آپ کو بھیجا'' کہ تا کہ ہم جہانوں پر رحم کریں، آپ کو بھیجنا ہماری رحمت ہے جہانوں کے لیے، اور وہ کس طرح سے؟ کہ کفر و شرک کے اندر دنیا مبتلا تھی، حق بالکل مٹ چکا تھا، نشان تک باقی نہیں تھا، اگر یہ دنیا اسی طرح سے رہ جاتی تو سارے کے سارے جہنم میں جاتے، کوئی ایک فرد بھی آخرت میں نجات نہ پاتا، دنیا میں بھی اللہ کے عذاب کا نشانہ بنتے اور آخرت میں بھی، ہم نے آپ کو بھیج کے جہانوں پر رحم کیا ہے، کہ آپ کے ذریعے سے حق کو واضح کر دیا، اب جہان والوں کو چاہیے کہ اس رحمت سے فائدہ اٹھائیں، آپ کی تعلیمات کو قبول کریں، اللہ کی رحمت سے مالا مال ہو جائیں، یہ ہے جہانوں پر رحمت کرنے کا مطلب، کہ آپ کے ذریعے سے حق کو نمایاں کیا گیا، باطل اور حق کے درمیان میں امتیاز کیا گیا، اب لوگوں کو چاہیے کہ اس رحمت سے فائدہ اٹھائیں، ہم نے تو اپنی طرف سے رحمت کر دی کہ حق اور باطل نمایاں کر دیا، اب جو لوگ اس سے فائدہ اٹھائیں گے، حق کو معلوم کریں گے، وہ دنیا میں بھی مرحوم ہوں گے، اور آخرت میں بھی مرحوم ہوں گے، ان کے اوپر رحمت ہوگی، اور جو اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے، آنکھیں بند کرتے ہیں تو چڑھے سورج میں اگر کوئی آنکھیں بند کر لے، اور خود اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتا پھرے تو اس میں کسی کا کیا قصور، یہ سارے جہانوں کے لیے رحمت اس طرح سے ہوگی، کہ اگر حق نمایاں نہ کیا جاتا تو باطل کی وجہ سے دنیا برباد ہو جاتی، اس دنیا کے باقی رہنے کی کوئی صورت نہیں تھی، جیسا کہ اب بھی سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات جب تک باقی ہیں، اور اس دنیا کے اندر حق کا نام ہے، اللہ اللہ کہنے والے موجود ہیں (اللہ اللہ کہنے والوں سے مراد اہل حق ہیں) اس وقت تک یہ دنیا قائم ہے، اور جس دن یہ اللہ اللہ کہنے والے ختم ہو جائیں گے، اور کوئی اللہ کا صحیح نام لینے والا نہیں رہے گا، اس وقت یہ ساری کی ساری دنیا توڑ پھوڑ دی جائے گی، قیامت آ جائے گی، احادیث میں جس طرح سے ذکر کیا گیا ہے، تو اب بھی عالم کی بقاء گویا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے میں ہی ہے، کہ آپ کی تعلیمات باقی ہیں تو یہ جہان باقی ہے، جب آپ کی تعلیمات ختم ہو جائیں گی اور حق مٹ جائے گا، باطل غالب آ جائے گا، کوئی صحیح طریقے سے اللہ کا نام لینے والا نہیں رہے گا، تو اس وقت یہ جہان فنا ہو جائے گا، تو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا تشریف لانا اس طرح سے سارے جہانوں کے لئے رحمت بن گیا۔

اور آپ کہہ دیجئے اِنَّمَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ: اس کے سوا کچھ نہیں کہ میری طرف یہ وحی کی جاتی ہے، اور یہی مضمون ہے وہ رحمت جو

اللہ تعالیٰ نے آپ کے ذریعے سے اس دنیا میں تقسیم کروائی جبکہ ہر طرف کفر و شرک ہوگیا،'' آپ کہہ دیجئے کہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے، تو کیا تم فرمانبردار بننے والے ہو؟'' فَاِنْ تَوَلَّوْا: اگر یہ لوگ پیٹھ پھیر جائیں، فَقُلْ: تو آپ کہہ دیجئے اٰذَنْتُكُمْ عَلٰى سَوَآءٍ: میں نے تمہیں اطلاع دے دی برابر سرابر، سب کو برابر سرابر اطلاع دے دی، امیر غریب لیڈر مقتدی امام جتنے تھے سب کے سامنے میں نے بات واضح کر دی۔ وَاِنْ اَدْرِيْۤ اَقَرِيْبٌ اَمْ بَعِيْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ، ''اِنْ'' نافیہ ہے۔ نہیں جانتا میں کہ قریب ہے یا دُور ہے وہ چیز جس کا تم وعدہ دیے جاتے ہو، یعنی نہ ماننے کی صورت میں جس عذاب کا تم وعدہ دیے جا رہے ہو، مجھے نہیں معلوم کہ وہ جلدی آنے والا ہے یا دیر سے آنے والا ہے، آئے گا ضرور۔ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ وَيَعْلَمُ مَا تَكْتُمُوْنَ: بے شک وہ اللہ جانتا ہے ظاہری بات کو بھی، اور جانتا ہے اس کو بھی جس کو تم چھپاتے ہو۔ جھر من القول: بات میں سے جس بات کو جہر کر دیا جائے، ظاہر کر کے کہہ دیا جائے، بول دیا جائے زبان سے، اللہ تعالیٰ اس کو بھی جانتا ہے، اور جو کچھ تم چھپاتے ہو اس کو بھی جانتا ہے۔ وَاِنْ اَدْرِيْ لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ: اور میں نہیں جانتا شاید کہ یہ تاخیر (عذاب میں جو دیر ہو رہی ہے) شاید کہ یہ تاخیر آزمائش ہو تمہارے لیے، اور فائدہ پہنچانا ہو ایک وقت تک، ایک وقت تک فائدہ پہنچانے کے لیے آزمائش کے طور پر یہ تاخیر ہو رہی ہو، مجھے نہیں معلوم، حقیقت کیا ہے؟ قٰلَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ: رسول نے کہا اے میرے رَبّ! فیصلہ کر دے حق کے ساتھ، واقع کے مطابق فیصلہ کر دے، حق کے مطابق فیصلہ کر دے۔ وَرَبُّنَا الرَّحْمٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ: اور ہمارا رَبّ رحمٰن ہے مدد طلب کیا ہوا ہے اس بات پر جو تم بیان کرتے ہو، یعنی شرک کی باتیں بیان کرتے ہو، یا مسلمانوں کے متعلق تم کہتے ہو کہ عنقریب مٹ جائیں گے، یہ باقی نہیں رہ سکتے، ان باتوں کے خلاف رحمٰن سے ہی استعانت کی ہوئی ہے، اسی سے ہی مدد طلب کی ہوئی ہے، یعنی ہم اسی سے ہی مدد چاہتے ہیں ان باتوں کے خلاف جو تم بیان کرتے ہو۔

سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط اور اِبتدائی آیات کا مضمون

پیچھے مضمون آیا تھا كُلٌّ اِلَيْنَا رٰجِعُوْنَ، سارے کے سارے لوگ ہماری طرف لوٹ کے آنے والے ہیں، اس مضمون پر اگر کافروں کو شبہ ہو کہ سینکڑوں نہیں ہزاروں برس گزر گئے، دنیا مرتی جا رہی ہے، کوئی واپس لوٹ کے تو کبھی آیا نہیں، اور اس کو شبہ کا باعث بنالیں، تو اگلے الفاظ میں اس کا جواب ہے کہ جن کو ہم ہلاک کر چکے یا فنا کر چکے، موت کے ساتھ یا عذاب کے ساتھ، وہ اس دنیا کی طرف لوٹ کر نہیں آئیں گے، یہ اللہ کی طرف سے ممنوع ہے، ان کے لوٹ آنے کا وقت قیامت کے بعد ہوگا، جس کی علامات خاص خاص یہ ہوں گی کہ یاجوج ماجوج کھول دیے جائیں گے اور اس قسم کے آثار پیدا ہو جائیں گے، جب قیامت آئے گی تب یہ لوٹ کے آئیں گے۔ پھر تو اس کا تعلق اُس (پچھلے مضمون) کے ساتھ ہو جائے گا...... اور اگر اس کے ساتھ لگا دیا جائے کہ نیکیاں کرنے والے جو مؤمن ہوں ان کی کوشش کی قدر کی جائے گی، لیکن جن کا مقدر ہو گیا ہے ہلاک ہونا کہ یہ برباد ہوں گے، ان کی ضد

اوران کے عناد کی بنا پر اللہ کی طرف سے فیصلہ ہو گیا کہ اب ان کے حق میں کامیابی نہیں، یہ ہلاک ہونے والے ہیں، یہ کبھی اس بات کی طرف رجوع نہیں کریں گے، وہ اندھا دھند بھاگتے چلے جائیں گے جس غلط راستے پہ لگ گئے ہیں، لوٹ کے نہیں آئیں گے، جس طرح سے آپ کے سامنے سورۂ بقرہ میں آیا تھا صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ (آیت:۱۸) یہ کافر تو بہرے ہو چکے ہیں، گونگے ہو چکے ہیں، اندھے ہو چکے ہیں، اب یہ لوٹ کے نہیں آئیں گے، جدھر کو جا رہے ہیں ادھر ہی جائیں گے، پھر یہ بات ہو جائے گی۔ اور سرورِ کائنات ﷺ کے لئے ان الفاظ میں تسلی ہو جائے گی کہ آپ کے سمجھانے پر اگر یہ نہیں سمجھتے تو ان کو چھوڑیں، ان کا ہلاک ہونا مقدر ہو چکا ہے، اب یہ باز نہیں آئیں گے۔ اور پہلے مطلب کے لحاظ سے شبہ کا جواب ہے، کہ کوئی کہے کہ لوگ واپس تو آئے نہیں؟ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں جن کو ہم ہلاک کر چکے، ختم کر چکے، فنا کر چکے، وہ واپس نہیں آئیں گے، یہ ممنوع ہے، اور ان کا واپس آنا قیامت کو ہوگا، جس کی بڑی بڑی علامات یہ ہیں جن کو آگے ذکر کیا جا رہا ہے۔ حَتّٰی سے غایت بھی واضح ہو گئی، واپس نہیں آئیں گے حتیٰ کہ قیامت آجائے، اور قیامت کے بعد واپس آنے کا سوال ہی نہیں اگر وہ ہدایت والا معنی لیا جائے، اور یا یہ ہے کہ اس دنیا کی طرف لوٹ کے نہیں آئیں گے دوبارہ زندہ ہو کے جس وقت تک کہ قیامت نہ آجائے، حَتّٰی کا مفہوم دونوں طرح سے واضح ہو جاتا ہے۔ ایک آدمی بگڑا ہوا ہو اور وہ بدکرداری کے راستے کو اختیار کر لے، ہم کہیں گے ''قیامت سے پہلے یہ نہیں سمجھنے کا'' مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کے سمجھنے کی کوئی توقع نہیں، کیونکہ قیامت آنے کے بعد تو سمجھنے کا سوال ہی نہیں، اور دوسرا مضمون واضح ہے کہ دنیا کی طرف لوٹ کے نہیں آئیں گے جب تک کہ قیامت نہ آجائے، قیامت آئے گی تو لوٹ کے آئیں گے، یہ جو وعدہ ہے لوٹنے کا، دوبارہ زندہ کرنے کا، یہ قیامت میں ہے، اور قیامت کی علامات یہ ہیں، جب یہ علامات شروع ہو جائیں گی گویا کہ قیامت ہی آگئی، کیونکہ حدیث شریف میں قیامت کی جو بڑی بڑی علامات ذکر کی گئی ہیں ان میں یاجوج ماجوج کا نکلنا بھی ہے۔

''یاجوج ماجوج'' کا تعارف

''یاجوج ماجوج'' کا تذکرہ آپ کے سامنے پہلے سورۂ کہف میں آیا تھا، اکثر و بیشتر مفسرین اور مؤرخین کا رُجحان یہی ہے کہ یاجوج ماجوج کا علاقہ یہی ہے جس میں آج کل رُوس ہے، یہ ''کوہِ قاف'' اور ''کاکیشیا'' کا علاقہ، ان پہاڑوں میں ہی وہ درّہ تھا جس کو ذُوالقرنین نے بند کیا تھا، تفصیل آپ کے سامنے پہلے آئی تھی، حتیٰ کہ بعض جدید مفسرین نے یاجوج ماجوج کے متعلق جو کُتبِ سابقہ سے حوالے نقل کیے ہیں اس میں حزقیل علیہ السلام کے صحیفے سے ایک حوالہ نقل کیا ہے، جس میں ان کے علاقے کو بیان کرتے ہوئے ''مَسَك'' کا لفظ بھی آیا ہے کہ ان کا علاقہ مسک ہے، اور مسک کو آج کل ماسکو کے ساتھ پڑھا گیا ہے، اور ''ماسکو'' آپ جانتے ہیں کہ یہ رُوس کا دارالحکومت ہے، تو یہ علاقہ جو ہم سے شمال میں واقع ہے اس شمالی علاقے کے اندر یہ قوم آباد ہے یاجوج ماجوج، یہ عام انسان ہیں جیسے پہلے واضح کیا تھا کہ اسرائیلی روایات میں تو افسانہ نگاری کرتے ہوئے پتا نہیں ان کو کیا کچھ بنایا ہوا ہے، ویسے یہ عام انسان ہیں، نوح علیہ السلام کے بیٹے یافث کی اولاد میں سے ہیں، یاجوج ماجوج قبائل کا نام ہے۔ تو مطلب یہ ہوگا، اس میں یہ نشاندہی کی گئی ہے، جس طرح سے احادیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ آخر وقت میں قیامت کے قریب جا کے یہ

قومیں جہان کے اوپر ٹوٹ پڑیں گی، اور اتنا زبردست طریقے سے ان کا حملہ ہوگا کہ آگے ان کی مدافعت نہیں ہو سکے گی، اور وہ علامت ہوگی اس دنیا کے برباد ہونے کی، جس وقت ان قوموں کا حملہ لوگوں پہ ہوگیا اور یہ فاتحانہ طور پر دنیا کو روند گئے تو سمجھو کہ قیامت آگئی، اس کے بعد پھر دنیا کا بقاء نہیں ہے، اور حالات اس قسم کے بنتے چلے آرہے ہیں، اور مِنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ سے بھی اشارہ اس بات کی طرف نکلتا ہے کہ یہ پہاڑوں کی طرف سے پھیلیں گے، حدب کہتے اونچی جگہ کو، اور یہ شمالی علاقہ جتنا ہے وہ سب پہاڑی ہے، اور ہمارا صوبہ سرحد جو ہے یہ بھی شمالی صوبہ سرحد کہلاتا ہے، پاکستان کا شمالی سرحدی صوبہ، اور اس سے آگے افغانستان ہے وہ سب پہاڑی علاقہ ہے، تو اگر یہ بدبخت ادھر سے آئے تو وہی مِنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ والی بات ہی ہوگی، مِنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ کی صورت یہ ہوتی ہے کہ جس وقت آپ میدان میں ہوں اور آپ کے سامنے اونچے اونچے ٹیلے ہوں یا پہاڑ ہوں، اور پہاڑوں کی طرف سے کوئی فوج آئے، تو پہلے تو چونکہ وہ نظر نہیں آتی، جب وہ پہاڑ پہ چڑھیں گے تو آہستہ آہستہ ان کے سر پھوٹتے ہوئے نظر آئیں گے، پھر اتر کے پھیلتے ہوئے نظر آئیں گے، ایسے معلوم ہوگا جیسے انہی ٹیلوں سے نکل نکل کے آئے ہیں، مثال کے طور پر یہ دیوار ہے، دیوار کے پیچھے ایک فوج کھڑی ہے، اور آپ کو یہاں سے نظر نہیں آرہی، وہ دیوار پر چڑھیں گے تو ایسے معلوم ہوگا جیسے یہیں سے نکلتے ہوئے آرہے ہیں، تو مِنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ کا مطلب یہ ہوگا کہ ہر ٹیلے سے پھیلتے ہوئے نظر آئیں گے جیسے اس ٹیلے پر بھی چڑھ کے آرہے ہیں، اس ٹیلے پر سے بھی نکل کے آرہے ہیں، اس طرح سے ان کا پھیلاؤ ہوگا، اس میں خود اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ ان کا پھیلاؤ پہاڑی علاقے کی طرف سے ہوگا، اور اس طرح سے یہ مخلوق کے اوپر یورش کریں گے، تو یورپین اقوام اور روسی اقوام جس طرح سے آج کل تلی ہوئی ہیں، اور یہ دونوں مل کے دنیا کو روند ڈالیں یہ حالات بھی بنتے چلے آرہے ہیں، اور ان کی آپس میں اگر لگ گئی تو اس لگنے کی صورت میں بھی دنیا روندی جائے گی۔ پہلے دو دفعہ جنگ عظیم ہو چکی ہے، عالمگیر جنگ، جس کی لپیٹ میں ساری دنیا آئی، ایک ۱۹۱۴ء میں ہوئی اور وہ بھی چار پانچ سال جاری رہی، اور ایک ۱۹۳۸ء سے شروع ہوئی تھی جو تقریباً چار یا پانچ سال وہ بھی جاری رہی، اس کے بعد تیسری جنگ عظیم اگر آگئی اور آپس میں لڑائی لگ گئی تو اب وہ پہلے والے حالات نہیں ہیں، اب بربادی ساری دنیا پہ آئے گی، حالات کچھ اس قسم کے ہی ہیں، تو یہ قرب قیامت کی علامت ہوگی، لیکن یہ معاملہ پیش اس وقت آئے گا جبکہ مشرق وسطیٰ میں یہودیوں کے ساتھ فیصلہ کن لڑائی ہو چکی ہوگی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہوگیا ہوگا، اور مشرق وسطیٰ میں بھی آئے دن جس قسم کے لڑائی کے حالات بنتے جارہے ہیں وہ بھی آپ کے سامنے ہیں، اور یہودی سارے کے سارے اسرائیل ریاست میں اکٹھے ہوگئے، اور روایات سے معلوم یہی ہوتا ہے کہ یہی مقابلہ ہے آخری آخری، دمشق کے ارد گرد، شام کے علاقے میں، اسرائیل وغیرہ کی جگہ، آخری آخری مقابلہ یہیں ہوگا، اور حضرت مہدی اور عیسیٰ علیہ السلام دونوں مل کر یہود کا مقابلہ کریں گے، اور ان کا بڑا لیڈر دجال ہوگا، اور یہ قتل ہوگا تو اس کے قتل ہونے کے بعد پھر یہودیوں کا نام ونشان مٹا دیا جائے گا، اور ان کا نام ونشان مٹنے کے ساتھ ہی پھر یہ یاجوج ماجوج کا فتنہ ہے، جبکہ عیسیٰ علیہ السلام ابھی زندہ ہوں گے، اور اتنے میں یہ دنیا کے اندر یورش کر دیں گے، روایات سے حالات کچھ ایسے معلوم ہوتے ہیں، لیکن یہ اللہ کے علم میں ہے کہ ابھی کتنا وقت باقی ہے، کتنا نہیں، کب حضرت عیسیٰ علیہ السلام

تشریف لائیں گے، کب یہ یہودیوں کا فتنہ انتہا کو پہنچے گا، اوران کے لیڈر پر دجال کی پوری صفات صادق آئیں گی، اور کب یہ مقابلہ ہوگا اور دجال قتل ہوگا، یہ اللہ کے علم میں ہے، حدیث شریف میں جیسے آتا ہے کہ مقامِ لُد پہ قتل کیا جائے گا، تو یہ جگہ اسرائیل میں ہے، اور تل ابیب کا ہوائی اڈا ''لُد'' کے قریب ہے، یہ آثار سارے کے سارے اسی پہ صادق آتے ہیں۔ ''حتیٰ کہ جب یاجوج ماجوج کھول دیے جائیں گے'' کھولنے سے اس بات کی طرف اشارہ ہوگیا کہ جیسے یہ مرغیاں نہیں بند کی ہوئی ہوتیں؟ جب ان کا ڈر بہ کھولیں تو یکدم بھاگتی ہیں نکلتی ہیں، تو یہ بھی ایسے ہیں کہ گویا اب ان پر پابندی لگی ہوئی ہے، جب کھلیں گے تو ایسے ہوگا جیسے کہ دروازہ ہی کھل گیا، اور یکبارگی سارے کے سارے حملہ کریں گے اور زور دے کے نکل آئیں گے،'' ہر ٹیلے سے پھیل رہے ہوں گے'' اور وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ کا معنی ہوگا'' حق کا وعدہ قریب آ گیا ہوگا''، یعنی اس وقت جبکہ اس قسم کے حالات پیش آئیں گے، یا اب بھی وہ قریب ہے اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ میں جس طرح سے نقل کیا گیا، یہ سچا وعدہ قریب ہی ہے، یعنی دُور نہیں، ''پس جس وقت وہ سچا وعدہ پیش آئے گا پس اچانک پھٹنے والی ہوں گی آنکھیں ان لوگوں کی جنہوں نے کفر کیا'' یعنی وہ حیران ہو کے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھ رہے ہوں گے، ان کی آنکھیں اوپر کو اٹھی ہوئی ہوں گی اور یوں کہہ رہے ہوں گے کہ ہائے ہماری بدبختی! ہم تو اس سے غفلت میں تھے۔ غفلت میں کیا، بلکہ ہم تو قصوروار ہی تھے، کیونکہ غفلت میں تو تب ہوتے کہ اگر کسی نے متوجہ نہ کیا ہوتا، متنبہ نہ کیا ہوتا، ہمیں تو بہت لوگوں نے متنبہ کیا لیکن ہم نہیں سمجھے۔

مشرکین اور ان کے معبودانِ باطلہ جہنّم کا ایندھن ہیں

اب اللہ تعالیٰ مشرکین کا انجام بتاتے ہیں۔ تم (یہ خطاب مشرکین مکہ کو ہے) تم اور تمہارے معبود اللہ کے علاوہ جتنے بھی ہیں (کیونکہ وہ اکثر و بیشتر بے جان چیزوں کو پُوجتے تھے اَحجار کو، یا شیاطین کو پُوجتے تھے) وہ سارے کے سارے جہنّم میں جائیں گے۔ باقی معبودوں کی فہرست میں انبیاء بھی ہیں، فرشتے بھی ہیں، اولیاء بھی ہیں، حضرت مریم وغیرہ بھی ہیں، ان کے لئے یہ وعید نہیں، بلکہ وہ اس آیت میں آجائیں گے اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى، وہ مستثنیٰ ہیں، اور ان کے علاوہ باقی شیاطین یا اَشجار، اَحجار جن کی پُوجا کرتے تھے وہ سارے کے سارے جہنّم میں ڈال دیے جائیں گے، اور اصل کے اعتبار سے ان اَشجار یا اَحجار کو سزا دینی مقصود نہیں ہوگی بلکہ مشرکین کے سامنے یہ ظاہر کرنا مقصود ہوگا کہ یہ ہیں جن کے سامنے تم نے پیشانیاں رگڑیں، آج یہ بھی اسی معیبت میں مبتلا ہیں، تمہیں کیا چھڑائیں گے؟ یہ مشرکین کو زیادہ ذلیل کرنے کے لیے ان کے معبودوں کو جہنّم میں ڈال دیا جائے گا، تو اس سے غیر مسلم معبود مراد ہیں جیسے شیاطین، یا بے جان چیزیں مراد ہیں۔ باقی! جو انبیاء، اولیاء کو پُوجتے ہیں اس میں ان کا کوئی قصور نہیں، پُوجے کوئی اور جہنّم میں کوئی جائے ایسا نہیں ہوتا، انبیاء ﷺ تو ہمیشہ سمجھاتے رہے، اولیاء سمجھاتے رہے، تو ان کی جو پُوجا لوگ کرتے ہیں وہاں بھی حقیقتاً شیاطین کی پُوجا ہے، انبیاء ﷺ کا تو نام استعمال کرتے ہیں، وہ تو اپنی زندگی میں ممانعت کرتے رہے، لہٰذا حقیقتاً ان کے معبود انبیاء ﷺ نہیں، بلکہ ان کے معبود بھی شیاطین ہیں، نام چاہے وہ کسی کا لیں۔ ''وہ جہنّم سے دُور رکھیں جائیں گے'' وہ جہنّم میں نہیں ڈالے جائیں گے۔

''بے شک تم اور وہ چیزیں جن کو تم اللہ کے علاوہ پُوجتے ہو جہنم کا ایندھن ہے، تم اس کے لئے وارد ہونے والے ہو'' اس وقت جہنم میں تمہیں ڈال کر اور تمہارے معبودوں کو ڈال کر پھر کہا جائے گا کہ اگر یہ معبود ہوتے تو اس جہنم میں کیوں گرتے؟ لَوْ كَانَ هٰٓؤُلَآءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا: اگر یہ آلہہ ہوتے تو جہنم میں وارد نہ ہوتے، كُلٌّ کا معنی عابدین معبودین سارے کے سارے جہنم میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے، لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ: اور ان کے لیے اس میں چیخنا چلانا ہوگا، ''ھُم'' ضمیر عابدین کی طرف ہی راجع ہے، کیونکہ جب ہم نے معبودوں سے بے جان معبود مراد لے لیے تو ان کا چیخنا کیسے ہو سکتا ہے؟ ''ان کے لیے اس میں چیخنا ہوگا اور سنتے نہیں ہوں گے'' جس طرح سے شور برپا ہو جاتا ہے، جیسے کہتے ہیں ''اتنا شور تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی''، کوئی ایک دوسرے کی بات نہیں سنے گا، اس طرح سے چیخنے چلانے میں لگے ہوئے ہوں گے پھر یہ مفہوم ہو جائے گا۔ یا پھر وہی تقسیم کر لی جائے کہ عابدین چیخ رہے ہوں گے اور معبودین سنیں گے ہی نہیں، کیونکہ ان میں سننے کی صلاحیت ہی نہیں ہوگی۔

انبیاء علیہم السلام و مقبولین جہنم سے دُور رکھے جائیں گے

''اور جن لوگوں کے لئے ہماری طرف سے اچھا انجام سبقت لے گیا'' اس میں انبیاء آ گئے، اولیاء آ گئے، مقبولین آ گئے، چاہے دنیا ان کو کچھ کہتی رہے اس کی ذمہ داری ان پہ نہیں ہے، ''جن کے لئے ہماری طرف سے اچھا انجام سبقت لے گیا وہ اس جہنم سے دُور ہٹائے جائیں گے، اس کی آہٹ بھی نہیں سنیں گے، اور اپنے دل کی چاہی ہوئی چیزوں میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے'' ان کو وہ زندگی نصیب ہوگی جو ان کی خواہش کے بالکل مطابق ہوگی۔ ''اس چیز میں جس کو ان کے دل چاہیں گے ہمیشہ رہنے والے ہوں گے، بڑی گھبراہٹ ان کو غم میں نہیں ڈالے گی'' ساری مخلوق گھبرائے گی قیامت کے میدان میں، جہنم کو دیکھ کے، لیکن وہ گھبراہٹ ان کو غم میں نہیں ڈالے گی۔ فرشتے ان کا استقبال کریں گے اور استقبال کرتے ہوئے انہیں کہیں گے کہ یہی وہ دن ہے جس کا تم وعدہ دیے جاتے تھے۔

''یَوْمَ نَطْوِی السَّمَآءَ'' سے آخر تک کی آیات کا خلاصہ

اور یہ واقعات کب پیش آئیں گے؟ جس دن ہم آسمان کو لپیٹ لیں گے جس طرح سے لکھے ہوئے مضمونوں کے کاغذ کو لپیٹ لیا جاتا ہے۔ جیسے ہم نے پہلی مرتبہ ہر چیز کو پیدا کیا اسی طرح سے ہم دوبارہ لوٹائیں گے، اور یہ سچا وعدہ ہمارے ذمے ہے، ہم ہی اس کو کرنے والے ہیں...... اگلی بات بھی آ گئی اس کی تفصیل پہلے آپ کے سامنے کی جا چکی کہ زبور میں یہ بات لکھ دی گئی ذکر کے بعد، (یہ ساری تفصیل ترجمے میں آ گئی) کہ زمین کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے، ارض سے یہاں ارضِ جنت مراد ہے جس طرح سے دوسری جگہ جنت کے لیے ارض کا لفظ بولا گیا...... اِنَّ فِيْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ: اس میں عابدین کو متوجہ کرنا مقصود ہے کہ یہ بشارت جو سنا دی گئی اس میں کافی مضمون ہے تمہارے لیے جو تمہیں مقصد تک پہنچانے والا ہے، یا اس میں بلاغ ہے، بلاغ مبالغۃً کہا گیا ہے، اس مضمون میں منادی ہے، اعلان ہے عابدین لوگوں کے لئے کہ اس فضیلت کو حاصل کرنے کے لئے عابدین آگے بڑھیں، عبادت گزاروں کے لیے ایک بشارت ہے، اس کا مفہوم یوں ہو جائے گا۔ بلاغ: کافی مضمون۔ اس میں البتہ

کافی مضمون ہے جو مقصد تک پہنچانے والا ہے ان لوگوں کے لئے جو عبادت گزار ہیں...... آگے حضور ﷺ کی حیثیت کو واضح کر دیا کہ ہم نے آپ کو جہانوں پر رحمت کرنے کے لئے بھیجا ہے، آپ مجسمۂ رحمت ہیں لیکن رحمت اللہ کی، رحم کرنے والا اللہ ہے، آپ کے ذریعے سے اللہ نے جہانوں پر رحم کیا، اور اس کی صورت آپ کے سامنے میں نے واضح کر دی کہ اگر آپ تشریف نہ لاتے، تو اس وقت حق ختم ہو چکا تھا اور باطل ہی باطل رہ گیا تھا، تو آخر اللہ کا غضب ٹوٹتا اور سارے جہان کو توڑ پھوڑ کے رکھ دیتا، اور ساری مخلوق جہنم میں جاتی، کوئی بھی نجات پانے والا نہیں تھا، تو اللہ تعالیٰ نے رحم فرمایا، آپ ﷺ کی صورت میں اللہ کی رحمت نازل ہوئی، حق واضح ہوا، اب جو لوگ اس کو قبول کریں گے وہ دنیا اور آخرت میں مرحوم ہیں، ان پہ اللہ کی رحمت ہوگی، اور جو لوگ اس کو قبول نہیں کرتے وہ اللہ کی رحمت سے محروم ہیں۔ اور سارے جہان ہی فائدہ اٹھا رہے ہیں حضور ﷺ کی ذات سے کہ آپ کی ذات کی برکت سے اس عالم کو بقاء نصیب ہو گیا، ورنہ تو جب حق مٹ گیا تھا تو اس عالم کے باقی رہنے کی کوئی صورت نہیں تھی، اب بھی جس وقت تک حق باقی ہے یہ عالم باقی ہے، جب حق ختم ہو جائے گا عالم ختم ہو جائے گا...... اپنی تعلیمات کا خلاصہ آپ ﷺ نے ان الفاظ میں نقل کیا کہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ میری طرف وحی کی جا رہی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے، تو کیا تم ماننے والے ہو؟ فرمانبردار بننے والے ہو؟ اگر فرمانبردار بن جائیں، مان جائیں تو فبہا، بڑی اچھی بات ہے۔ اور اگر وہ پیٹھ پھیریں تو آپ کہہ دیجئے کہ میں تو برابر سرابر اعلان کر چکا، اب ذمہ داری تم پہ ہے میرے پہ نہیں، اب اگر قبول نہیں کرو گے اور عذاب کا نشانہ بن جاؤ، تو اب ذمہ داری تم پہ ہے۔ ''برابر سرابر'' یعنی ہر کسی کے لیے، کسی سے چھپایا نہیں، کسی کو خاص طور پر بتایا نہیں، بلکہ عام طور پر سب کے سامنے اعلان کر دیا ہے۔

باقی رہی یہ بات کہ وہ عذاب آتا کیوں نہیں؟ کب آئے گا؟ یہ مجھے معلومات نہیں ہیں، میں نہیں جانتا کہ وہ قریب ہے یا دور جس کا تم وعدہ دیے جا رہے ہو، اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جانتا ہے، اس کے سامنے تمہاری ہر حرکت ہے، جو بات تم منہ سے نکالتے ہو، جو بات جہری طور پر کرتے ہو وہ بھی جانتا ہے، جس کو چھپاتے ہو وہ بھی جانتا ہے، جب تمہارے سب اعمال، اقوال، ذرہ ذرہ اللہ کے سامنے ہے تو اس کے اُوپر اللہ محاسبہ کرے گا اور عذاب ضرور آئے گا۔ ''اور میں نہیں جانتا کہ شاید یہ تاخیر، اس کا دیر کرنا اور جلدی نہ آنا تمہارے لیے آزمائش ہو، اور ایک وقت تک فائدہ پہنچانا ہو...... آگے نبی کی دُعا نقل کی ہے کہ جب بار بار سمجھانے کے باوجود نہیں سمجھتے تو آخر اللہ کے رسول نے یہ دُعا کی کہ اے اللہ! فیصلہ کر دے ٹھیک ٹھیک، یعنی ہمارے اور ان کے درمیان۔ ''اور ہمارا رَبّ رحمٰن ہی مدد طلب کیا ہوا ہے اس بات پر جو تم بیان کرتے ہو۔''

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ
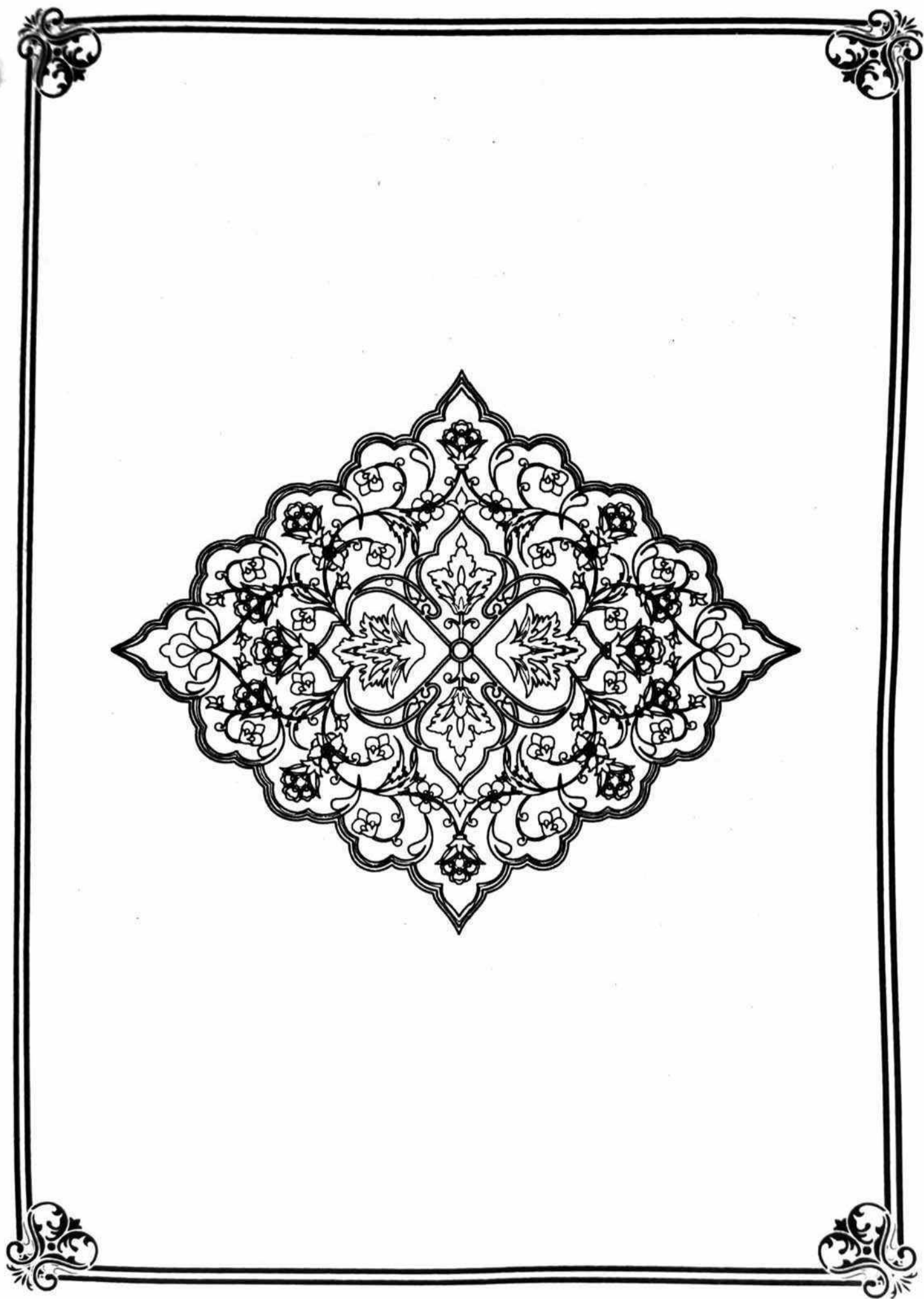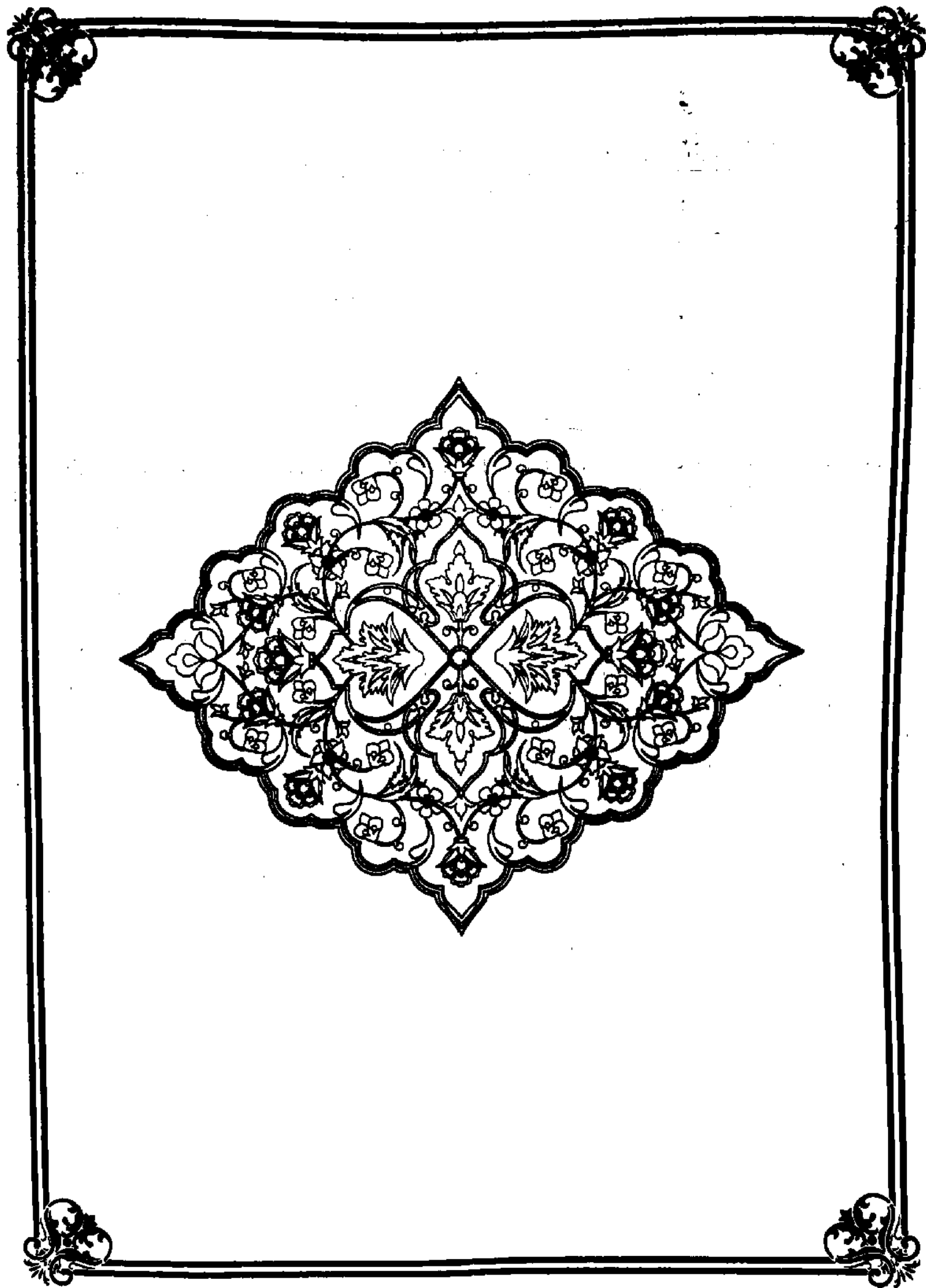
سورة الحج

آیاتھا ۷۸ ۲۲ سُوْرَۃُ الْحَجِّ مَدَنِیَّۃٌ ۱۰۳ رکوعاتھا ۱۰

سورۂ حج مدینہ میں نازل ہوئی، اس میں اٹھتر (۷۸) آیتیں اور دس رُکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ ① یَوْمَ تَرَوْنَهَا

اے لوگو! اپنے رَبّ سے ڈرو بے شک قیامت کا زلزلہ بہت بڑی چیز ہے① جس دِن تم اس زلزلے کو دیکھو گے

تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّاۤ اَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا

غافل ہوجائے گی ہر دُودھ پلانے والی عورت اس بچّے سے جس کو اس نے دُودھ پلایا، اور گرادے گی ہر حمل والی عورت اپنے حمل کو

وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِیْدٌ ② وَمِنَ النَّاسِ

اور دیکھے گا تُو لوگوں کو نشے والے اور وہ نشے والے نہیں ہوں گے لیکن اللہ کا عذاب ہی سخت ہے② اور لوگوں میں سے بعض

مَنْ یُّجَادِلُ فِی اللّٰهِ بِغَیْرِ عِلْمٍ وَّیَتَّبِعُ كُلَّ شَیْطٰنٍ مَّرِیْدٍ ③ كُتِبَ عَلَیْهِ

وہ ہے جو جھگڑتا ہے اللہ کے بارے میں بغیر علم کے اور پیروی کرتا ہے ہر سرکش شیطان کی③ اس شیطان پر لکھ دیا گیا ہے کہ

اَنَّهٗ مَنْ تَوَلَّاهُ فَاَنَّهٗ یُضِلُّهٗ وَیَهْدِیْهِ اِلٰى عَذَابِ السَّعِیْرِ ④ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ

بے شک بات یہ ہے کہ جو شخص اس سے دوستی لگائے گا پس بے شک وہ تو اسے بھٹکائے گا اور اس کی راہنمائی کرے گا جہنّم کے عذاب کی طرف④ اے لوگو!

اِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ

اگر تم تردّد میں ہو بعث کی طرف سے تو بے شک ہم نے تمہیں پیدا کیا مٹّی سے پھر نطفے سے پھر جمے ہوئے خون سے

ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَیْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَیِّنَ لَكُمْ ؕ وَنُقِرُّ فِی الْاَرْحَامِ

پھر گوشت کے لوتھڑے سے جو پورا بنایا ہوا ہے اور جو پورا بنایا ہوا نہیں، تاکہ ہم تمہارے سامنے واضح کریں اور ٹھہراتے ہیں ہم رحموں میں

مَا نَشَآءُ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْۤا اَشُدَّكُمْ ۚ وَمِنْكُمْ

جو چاہتے ہیں ایک وقت معین تک پھر ہم تمہیں نکالتے ہیں اس حال میں کہ تم بچّے ہوتے ہو پھر تاکہ تم اپنی جوانی کو پہنچ جاؤ اور تم میں سے بعض

مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا

وہ ہے جو وفات دے دیا جاتا ہے اور تم میں سے بعض وہ ہے جو لوٹا دیا جاتا ہے رذی عمر کی طرف تا کہ نہ جانے وہ جاننے کے بعد کسی چیز کو،

وَتَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَاَنْۢبَتَتْ

اور دیکھتا ہے تُو زمین کو خشک پڑی ہوئی پھر جب ہم اس کے اُوپر پانی اُتارتے ہیں تو وہ حرکت میں آتی ہے اور پھولتی ہے اور وہ اُگاتی ہے

مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ۝۵ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّهٗ يُحْيِ الْمَوْتٰى وَاَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ

ہر پُر رونق قسم کو ⑤ اور یہ اس سبب سے ہے کہ بے شک اللہ وہ حق ہے اور بے شک وہ زندہ کرتا ہے مُردوں کو اور بے شک وہ ہر چیز پر

قَدِيْرٌ ۝۶ وَّاَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا وَاَنَّ

قدرت رکھنے والا ہے ⑥ اور اس سبب سے ہے کہ بے شک قیامت آنے والی ہے جس کے آنے میں کوئی شک نہیں۔ اور اس سبب سے

اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ ۝۷ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ

ہے کہ اللہ تعالیٰ اُٹھائے گا ان کو جو قبروں میں ہیں ⑦ اور لوگوں میں سے بعض وہ ہے جو اللہ کے بارے میں جھگڑتا ہے بغیر علم کے،

وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ۝۸ ثَانِيَ عِطْفِهٖ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

بغیر ہدایت کے اور بغیر روشن کتاب کے ⑧ اس حال میں کہ موڑنے والا ہے اپنے پہلو کو تا کہ اللہ کے راستے سے لوگوں کو بھٹکائے،

لَهٗ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّنُذِيْقُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝۹ ذٰلِكَ بِمَا

اس کے لئے دنیا میں رُسوائی ہے اور چکھائیں گے ہم اس کو قیامت کے دن جلنے والی آگ کا عذاب ⑨ یہ ان اعمال کی وجہ سے ہے

قَدَّمَتْ يَدٰكَ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝۱۰

جو تیرے ہاتھوں نے آگے بھیجے اور یہ بات تو ہے ہی کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پہ ظلم کرنے والا نہیں ⑩

سورہ حج ''مکی'' ہے یا ''مدنی''؟ ماقبل سے ربط

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ سورۂ حج، یہاں لکھا ہے ''مدنیہ''، اور واقع کے اعتبار سے اس میں بعض آیات ''مدنی'' ہیں اور بعض آیات ''مکی'' ہیں، نہ یہ ساری سورت ''مکی'' ہے نہ یہ ساری سورت ''مدنی'' ہے، بلکہ تعداد کے لحاظ سے اکثر آیات ''مکی'' ہیں، اس کی ۷۸ آیتیں ہیں اور ۱۰ رُکوع ہیں، مضامین اس میں اس قسم کے بھی ہیں جیسے کہ ''مکی'' سورتوں میں ہوتے ہیں یعنی

اثباتِ توحید، اثباتِ رسالت، اثباتِ معاد، اور کفّار کے لئے اِنذار، ڈرانا۔ جیسے پچھلی سورت کا اختتام بھی اِنذار کے مضمون پر تھا تو اس کی ابتدا بھی انذار کے مضمون سے ہی ہے، اور حج کے احکام بھی مذکور ہوں گے، جہاد کرنے کی اجازت آئے گی، اور جن آیات میں جہاد کرنے کی اجازت آئے گی وہ یقیناً ''مدنی'' ہیں، کیونکہ مکہ معظمہ میں رہتے ہوئے جہاد کی اجازت نہیں تھی۔ پہلی آیات میں اثباتِ معاد ہے اور انذار کا مضمون بھی ہے۔

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اے لوگو! اتَّقُوْا رَبَّکُمْ: اپنے رَبّ سے ڈرو، اِنَّ زَلْزَلَۃَ السَّاعَۃِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ: بے شک قیامت کا زلزلہ بہت بڑی چیز ہے، یَوْمَ تَرَوْنَھَا: جس دِن تم اس زلزلے کو دیکھو گے تَذْھَلُ کُلُّ مُرْضِعَۃٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ: غافل ہوجائے گی ہر دودھ پلانے والی عورت، عَمَّآ اَرْضَعَتْ: اس بچّے سے جس کو وہ دودھ پلا رہی ہے، جس کو اس نے دودھ پلایا۔ مُرْضِعَۃ: جس کے آخر میں ''ۃ'' ہے اس سے وہ عورت مراد ہوتی ہے جو بالفعل دودھ پلا رہی ہو، اور اگر بغیر تاء کے ہو مرضع، تو اس کا معنی ہے دودھ پلانے والی عورت اگرچہ اس وقت پلا نہیں رہی، یعنی ایسے وقت میں ہے جس میں کہ اس کا بچّہ دودھ پیتا ہے، اور مرضعہ اسی کو کہیں گے جو اس وقت فی الحال دودھ پلا رہی ہے، جیسے حائض بالغ عورت کو کہتے ہیں، جو اس عمر کو پہنچ گئی ہو جس میں حیض آتا ہے، اور حائضہ (آخر میں تاء اگر ذکر کریں گے تو) اس عورت کو کہیں گے جس کو بالفعل حیض آ رہا ہے، یہی فرق یہاں ہے کہ مرضع وہ عورت ہے جس کا بچّہ دودھ پیتا ہے، چاہے وہ اس وقت نہ پلا رہی ہو، اور مرضعہ اس کو کہیں گے جو اس وقت بچّے کو سینے سے لگا کے دودھ پلا رہی ہے۔ ''غافل ہوجائے گی ہر دودھ پلانے عورت اس بچّے سے جس کو اس نے دودھ پلایا'' وَتَضَعُ کُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَھَا: وَضَعَ یَضَعُ: وضع کرنا، گرانا۔ گرا دے گی ہر حمل والی عورت اپنے حمل کو، وَتَرَی النَّاسَ سُکٰرٰی: سُکٰرٰی سَکران کی جمع ہے، نشے والا۔ دیکھے گا تو لوگوں کو نشے کی حالت میں، یعنی سب کے سب لوگ ایسے ہوں گے جیسے نشہ پیا ہوا ہو، دیکھے گا تو لوگوں کو نشے والے، وَمَا ھُمْ بِسُکٰرٰی: اور وہ نشے والے نہیں ہوں گے۔ وَلٰکِنَّ عَذَابَ اللّٰہِ شَدِیْدٌ: لیکن اللہ کا عذاب ہی سخت ہے۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یُّجَادِلُ فِی اللّٰہِ بِغَیْرِ عِلْمٍ: لوگوں میں سے بعض وہ شخص ہے (مَن اگرچہ لفظوں میں مفرد ہے جس کی وجہ سے یُجَادِلُ کی ضمیر اس کی طرف مفرد لوٹائی گئی، لیکن کوئی متعین آدمی مراد نہیں ہوتا، اس لیے معنی یہ جمع ہے) لوگوں میں سے بعض وہ ہے جو جھگڑتا ہے اللہ کے بارے میں۔ اللہ میں جھگڑنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے توحید کے مسئلے میں جھگڑا کرتا ہے۔ ''جو جھگڑتا ہے اللہ کے بارے میں بغیر علم کے'' وَّیَتَّبِعُ کُلَّ شَیْطٰنٍ مَّرِیْدٍ: مرید میم کے فتح کے ساتھ مَرَدَ سے ہے، سرکش۔ ''پیروی کرتا ہے ہر سرکش شیطان کی'' کُتِبَ عَلَیْہِ: اس شیطان کے ذِمّے لگا دیا گیا ہے، اس پر لکھ دیا گیا ہے، اس پر فرض ہے اَنَّہٗ مَنْ تَوَلَّاہُ: ''ہٗ'' ضمیر شان ہے۔ بے شک بات یہ ہے کہ جو شخص اس سے دوستی لگائے گا فَاَنَّہٗ یُضِلُّہٗ: پس بے شک وہ تو اسے بھٹکائے گا، فَاَنَّہٗ یُضِلُّہٗ: فَالْاَمْرُ اَنَّہٗ یُضِلُّہٗ، یا اَمْرُہٗ اَنَّہٗ یُضِلُّہٗ، اس کا کام یہی ہے کہ اس کو گمراہ کرے گا، بھٹکائے گا، وَیَھْدِیْہِ اِلٰی عَذَابِ السَّعِیْرِ: اور اس کی راہنمائی کرے گا جہنم کے عذاب کی طرف۔ سعیر: بھڑکنے والی آگ۔ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ: اے لوگو! اِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ: اگر تم تردّد میں ہو بعث کی طرف

سے،بَعَثَ یَبْعَثُ: اٹھانا۔یعنی مرنے کے بعد جو اُٹھانے کا تذکرہ ہے اگر تم اس کی طرف سے تردّد میں ہو، فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ: تو تم اس بات میں غور کرو، بے شک ہم نے تمہیں پیدا کیا مٹی سے، ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ: پھر نطفے سے، نُطفه یہ فُعلہ کا وزن ہے، نَطَفَ ٹپکانے کو کہتے ہیں، نُطفة: اتنی مقدار جو ایک دفعہ ٹپکا دی جائے، جس کو آپ قطرہ یا بوند کہہ لیجئے، ایک دفعہ ٹپکائی ہوئی مقدار، فُعلہ کے وزن پر، جیسے لُقمہ: ایک دفعہ نگلنے کی مقدار، جُرعه: ایک گھونٹ، ایک دفعہ پینے کی مقدار۔ فُعلہ مقدار کے لئے آیا کرتا ہے، قُبضه: اتنی مقدار جو مٹھی میں آ جائے۔ ''بے شک ہم نے تمہیں پیدا کیا مٹی سے پھر نطفے سے'' ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ: پھر جمے ہوئے خون سے، ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ: پھر گوشت کے لوتھڑے سے، مُّخَلَّقَةٍ: جو پورا بنایا ہوا ہے، وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ: جو پورا بنایا ہوا نہیں، لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ: لِنُبَيِّنَ لَكُمْ قُدْرَتَنَا تاکہ ہم تمہارے سامنے اپنی قدرت کو واضح کریں، وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى: اور ٹھہراتے ہیں ہم، برقرار رکھتے ہیں ہم رحموں میں، اَرحام رِحم کی جمع ٹھہراتے ہیں ہم رحموں میں جو چاہتے ہیں ایک وقتِ معین تک، ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا: پھر ہم تمہیں نکالتے ہیں اس حال میں کہ تم بچے ہوتے ہو، طِفل اَطفال کے معنی میں ہے، بطورِ جنس کے استعمال ہوا ہے، اس لیے جمع سے حال واقع ہو رہا ہے، یا اصل میں تھا: طِفلاً طِفلاً تکرار کے ساتھ، ایک طِفل کو گرا دیا گیا (آلوسی)۔ ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ: ثُمَّ نُمْهِلُكُمْ لِتَبْلُغُوْا پھر ہم تمہیں مہلت دیتے ہیں تاکہ تم اپنی جوانی کو پہنچ جاؤ۔ اَشُدّ: قوتیں، کمالِ قوت۔ یہ اگر شِدَّة کی جمع ہو تو اس میں قوتوں والا معنی ہو جائے گا، یعنی ہم تمہیں ڈھیل دیتے ہیں تاکہ تمہاری ہر قسم کی قوت کمال کو پہنچ جائے۔ ویسے اس کا ترجمہ مفرد کے طور پر جوانی سے کر دیا جاتا ہے۔ تاکہ تم پہنچ جاؤ اپنی جوانی کو، وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ: تم میں سے بعض وہ ہے جو وفات دیا جاتا ہے، یعنی بچپن میں یا جوانی میں۔ اور تم میں سے بعض وہ ہے جو لوٹا دیا جاتا ہے ردّی عمر کی طرف، مِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ سے مقابلہ ظاہر کرتے ہوئے مَّنْ يُّتَوَفّٰى کے بعد میں نے یہ لفظ بولے ہیں کہ تم میں سے بعض وہ ہیں جو بچپن میں یا جوانی میں وفات دے دیے جاتے ہیں، اور تم میں سے بعض وہ ہیں جن کو ردّی عمر کی طرف لوٹایا جاتا ہے، یعنی ان کو اتنی مہلت دے دی جاتی ہے کہ وہ بالکل ردّی عمر کی طرف آ جاتے ہیں، ردّی عمر سے بڑھاپے کی عمر مراد ہے جس میں انسان کے اعضا جواب دے دیتے ہیں، نہ آنکھیں کام دیتی ہیں، نہ کان کام دیتے ہیں، نہ ٹانگیں اور بازو کام دیتے ہیں، نہ معدہ کام دیتا ہے، باطنی اور ظاہری اعضا سب بے کار ہو جاتے ہیں، انسان اُٹھنے بیٹھنے سے عاجز آ جاتا ہے، پیشاب پاخانے میں، کھانے پینے میں، ہر چیز میں دوسرے کا محتاج ہو جاتا ہے، اس عمر کو ''ردّی عمر'' کہا جاتا ہے۔ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا: تاکہ نہ جانے وہ جاننے کے بعد کسی چیز کو۔ یہ لام، لامِ عاقبت ہے یعنی اس ردی عمر کی طرف لوٹائے جانے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جاننے کے بعد انسان پھر اَنجان بن جاتا ہے، جوانی کے زمانے میں جو علوم حاصل کیے تھے وہ دماغ سے نکل جاتے ہیں، معلومات ختم ہو جاتی ہیں، حافظہ جواب دے دیتا ہے، جانی ہوئی چیزوں کو بھی انسان بھول جاتا ہے، حتّٰی کہ آخر عمر میں جا کے جانے پہچانے انسانوں کو پہچانتا تک نہیں۔ ''تاکہ نہ جانے وہ جاننے کے بعد کسی شی کو۔'' وَتَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً: هامدة: یابسہ، خشک پڑی ہوئی، ساکن، جس میں کوئی حیات کے آثار نہیں۔ اور دیکھتا ہے تو زمین کو خشک پڑی ہوئی، فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ: پھر جب ہم اس کے اوپر پانی اتارتے ہیں، اهْتَزَّتْ: وہ حرکت میں آتی ہے، وَرَبَتْ: اور پھولتی ہے۔ اذا کے بعد ماضی آ گئی اس لیے اس کا ترجمہ مضارع والا کر رہا ہوں، ماضی کے طور پر اگر ترجمہ کرو ''پھر جس

وقت ہم نے اس پہ پانی اتاراتو اس نے حرکت کی اور وہ پھولی۔''''جب ہم اس کے اوپر پانی اتارتے ہیں تو وہ حرکت کرتی ہے اور پھولتی ہے'' وَاَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ: بَهِيْجٍ: رونق والی، پُررونق، جیسے دوسری جگہ قرآنِ کریم میں لفظ آیا ہوا ہے حَدَآىِٕقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ (پارہ ۲۰ کا شروع) رونق والے باغات۔''ہر پررونق قسم کو وہ اگاتی ہے۔'' زوج قسم کو کہتے ہیں، ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ: ''یہ اس سبب سے ہے کہ بے شک اللہ وہ حق ہے اور بے شک وہ زندہ کرتا ہے مُردوں کو اور بے شک وہ ہر چیز پہ قدرت رکھنے والا ہے، اور اس سبب سے ہے کہ بے شک قیامت آنے والی ہے جس کے آنے میں کوئی شک نہیں، کوئی تردد نہیں، اور اس سبب سے ہے کہ اللہ تعالیٰ اٹھائے گا ان کو جو قبروں میں ہیں۔'' گویا کہ ان تصرفات کی تین علتیں اور دو حکمتیں بیان کردیں، ''اللہ تعالیٰ حق ہے'' یہ اس کا ذاتی کمال ہے، يُحْيِ الْمَوْتٰى یہ اس کا فعلی کمال ہے، وَاَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ یہ اس کا صفتی کمال ہے، وصف کے اعتبار سے کامل، ذات کے اعتبار سے کامل، فعل کے اعتبار سے کامل۔ اور اوپر جو تصرفات بیان کیے گئے ہیں ان کے بیان کرنے میں حکمت یہ ہے کہ تاکہ قیامت کی طرف راہنمائی ہو، یہ نتیجہ سامنے آئے گا، قیامت آنے والی ہے، اس کے آنے میں کوئی تردد نہیں، اور بے شک اللہ تعالیٰ اُٹھائے گا ان کو جو قبروں میں ہیں۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ: لوگوں میں سے بعض وہ ہے جو جھگڑتا ہے اللہ کے بارے میں، یعنی اللہ کے اَحکام کے بارے میں، اللہ کی باتوں کے بارے میں، اللہ کی توحید کے بارے میں، ''بغیر علم کے اور بغیر ہدایت کے اور بغیر روشن کتاب کے'' یہ ''لَا'' جو بار بار آیا ہے، بِغَيْرِ عِلْمٍ میں جو نفی کا معنی ہے یہ ''لَا'' اسی کی تاکید ہے، یعنی نہ تو اس کے پاس علم ہے، نہ اس کے پاس ہدایت ہے، نہ اس کے پاس کتابِ منیر ہے، تو یہ ''لَا'' اسی نفی کی تاکید ہے، اس لیے میں نے ترجمہ اس طرح سے کیا کہ ''بغیر علم کے، بغیر ہدایت کے، بغیر کتابِ منیر کے'' یعنی اس کے پاس کوئی چیز نہیں، نہ علم ہے، نہ ہدایت ہے، نہ کتابِ منیر ہے، ان تینوں لفظوں کے درمیان میں فرق یہ ہے کہ ''علم'' سے مراد علم بدیہی ہے جو اِنسان کو فطری طور پر حاصل ہوتا ہے، جس کے لیے کسب اور اِستدلال کی ضرورت نہیں ہوتی، اور ''هُدًى'' سے مراد ہوجائے گا اِستدلالِ عقلی، یعنی ایسی معلومات جو اِستدلالِ عقلی کے ساتھ حاصل ہوتی ہیں، انسان ان کو عقلی دلیل سے اخذ کرتا ہے، اور کتابِ منیر سے مراد ہوجائے گا ایسا علم جو نقلی دلیل سے حاصل ہوتا ہے، تو جس کا مطلب یہ ہوا کہ نہ تو اس کے پاس کوئی فطری علم ہے جو بدیہی طور پر حاصل ہوتا ہے، اور نہ وہ اِستدلالِ عقلی پر ہی قادر ہے، نہ اِستدلالِ نقلی پر ہی قادر ہے، نہ کوئی عقلی دلیل نہ کوئی نقلی دلیل، کوئی چیز بھی اس کے پاس نہیں، اور ایسے خواہ مخواہ جھگڑے ڈال رہا ہے، ثَانِيَ عِطْفِهٖ: عِطف پہلو کو کہتے ہیں، ثنی يَثْنِي: موڑنا۔ اس حال میں کہ موڑنے والا ہے وہ اپنے پہلو کو، پہلو تہی کرنے والا ہے، پہلو تہی کرنے والے کا مطلب یہ ہے کہ متکبر ہے، اگر کوئی اس کو علم کی بات بتاتا ہے، دلیل عقلی سے کسی بات کو ثابت کرتا ہے یا دلیل نقلی سے اس کے سامنے کسی بات کو ثابت کرتا ہے، یا فطری دلائل اس کے سامنے نمایاں ہوتے ہیں تو پہلو تہی کر جاتا ہے، توجہ نہیں کرتا، متکبر ہے، یعنی نہ خود علم عقل ہے نہ کسی دوسرے کی سنتا ہے، اسی لیے حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے بیان القرآن میں اس کا ترجمہ کرتے ہوئے دو لفظ بڑھائے ہیں کہ نہ ''کسی محقق کی پیروی اور تقلید کرتا ہے'' کہ محقق کی پیروی اور تقلید کرنے سے تکبر کرتا ہے، یعنی یا تو خود علم ہو کہ انسان خود دلیل لاسکے، استدلال کرسکے، یا پھر کسی دوسرے کے پیچھے لگے، خود علم بھی ہے نہیں، اور دوسرا کوئی بات کرنا چاہتا ہے تو اس سے پہلو تہی کرجاتا ہے۔ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: مقصد اس کا یہ ہے

کہ تاکہ اللہ کے راستے سے لوگوں کو بھٹکائے، گمراہ کرے، لَهُ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ: اس کے لئے دنیا میں رسوائی ہے، وَّنُذِيقُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَذَابَ الْحَرِيقِ: اور چکھائیں گے ہم اس کو قیامت کے دن جلنے والی آگ کا عذاب۔ حریق: جلنے والی آگ، اور اگر اس کو مصدر کے معنی میں کریں تو معنی ہوگا جلنے کا عذاب، بات ایک ہی ہے، ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدٰكَ: یہ کہا جائے گا کہ یہ ان اعمال کی وجہ سے ہے جو تیرے ہاتھوں نے آگے بھیجے، وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ: وَالْاَمْرُ اَنَّ اللّٰهَ اور یہ بات تو ہے ہی کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پہ ظلم کرنے والا نہیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

”تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ... الخ“ کے دو مفہوم

پہلی آیت میں تو وہی اِنذار کا مضمون ہے آخرت کا ذکر کر کے، کہ قیامت کا زلزلہ ایک ایسا زلزلہ ہوگا کہ جس میں دودھ پلانے والی عورتیں اپنے بچوں کو بھول جائیں گی اور حاملہ عورتیں حمل گرادیں گی، اور لوگ اس طرح سے مدہوش نظر آئیں گے، ان کے ہوش ٹھکانے نہیں ہوں گے، کہ دیکھنے والا سمجھے گا کہ انہوں نے نشہ پیا ہوا ہے، حالانکہ وہ نشے والے نہیں ہوں گے، عذاب کی شدت کی وجہ سے ان کے حواس باختہ ہوں گے، یہ اللہ تعالیٰ نے قیامت کا ایک نقشہ بتایا، باقی! یہ کہ دودھ پلانے والی عورتیں اپنے بچوں سے غافل ہوجائیں گی یا حاملہ عورتیں اپنے حمل کو گرادیں گی، یہ کسی خوفناک حادثے کے بیان کرنے کے لئے ایک تمثیل بھی ہوسکتی ہے، کہ اتنا ہیبت ناک حادثہ ہوگا، اتنا ہیبت ناک واقعہ پیش آئے گا کہ اگر فرض کرو کہ اس وقت دودھ پلانے والی عورتیں موجود ہوں تو ان کو اپنے بچوں کا خیال نہیں رہے گا، اور اس وقت حاملہ عورتیں موجود ہوں تو ان کے حمل ساقط ہوجائیں گے، اس دہشت اور اس ہیبت کی وجہ سے، اور اگر اس کو واقع پر محمول کیا جائے تو بھی اس میں کوئی اِشکال نہیں، کیونکہ جس حال میں کوئی مرے گا اسی حال میں اٹھایا جائے گا، تو ایسے حال میں بھی عورتیں مرتی ہیں کہ دودھ پلا رہی ہوتی ہیں، اور ایسے حال میں بھی عورتیں مرتی ہیں کہ حاملہ ہوتی ہیں، تو جب قیامت کا واقعہ سامنے آئے گا تو اس طرح سے دہشت طاری ہوجائے گی کہ عورتوں کو اپنے بچوں کا خیال نہیں رہے گا، اور یہ واقعہ ہے کہ حاملہ عورت کے سامنے اگر کوئی بہت ہی دہشت ناک واقعہ پیش آجائے تو خوف کے ساتھ بسااوقات حمل ساقط ہوجاتا ہے، جس طرح سے مردوں کا پیشاب خطا ہوجاتا ہے، پیشاب چھوٹ جاتا ہے، بچوں میں تو عام واقعات پیش آتے ہیں، بڑوں کے ساتھ بھی یہ واقعہ پیش آجاتا ہے، کہ جب بہت ہیبت ناک چیز سامنے آجائے تو کسی کا پاخانہ نکل جاتا ہے، کسی کا پیشاب نکل جاتا ہے، اسی طرح سے بسااوقات عورتوں کا حمل بھی ساقط ہوجاتا ہے، تو بہرحال یا تو شدت بیان کرنا مقصود ہے، اور اگر واقعہ بھی ایسا ہو تو اس میں بھی کوئی اِشکال نہیں۔

ہزار میں سے ۹۹۹ جہنم میں!

خاص طور پر حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن آدم علیہ السلام سے کہیں گے، جب سب بنی آدم کو جمع کیا ہوا ہوگا تو آدم علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ فرمائیں گے، کہ جہنم کا لشکر اپنی اولاد میں سے علیحدہ کردے، اپنی اولاد میں سے وہ گروہ علیحدہ کردے جنہوں نے جہنم میں جانا ہے، تو آدم علیہ السلام پوچھیں گے کہ یَارَبِّ وَمِنْ کَمْ؟ کتنوں میں سے کتنے؟ جہنم میں جانے والے جنتیوں سے کس تناسب کے ساتھ علیحدہ کیے جائیں گے؟ تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ ہزار میں سے نوسوننانوے، ایک آدمی جنت کے لئے اور نوسوننانوے جہنم کے لئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جب یہ اعلان ہوگا تو اس وقت بنی آدم اس طرح سے دہشت ناک ہوجائیں گے، اس طرح سے ان پر ہیبت طاری ہوجائے گی کہ بچے بوڑھے ہوجائیں گے اور ہیبت کی وجہ سے لوگوں کے سیاہ بال سفید ہوجائیں گے، جب وہ یہ سنیں گے کہ ہزار میں سے ۹۹۹ جہنم میں جانے ہیں اور ایک جنت میں جائے گا۔ چنانچہ جب یہ بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کہنے لگے: یارسول اللہ! اس ہزار میں ہم میں سے کون ایک ہوگا؟ مطلب یہ ہے کہ اس طرح تو بہتوں کا رگڑا نکل جائے گا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم بے فکر ہوجاؤ، میری اُمت کا حساب تو اللہ تعالیٰ یاجوج ماجوج سے ہی بے باق کردیں گے، کہ یاجوج ماجوج کی اتنی زیادہ تعداد ہے کہ ان میں سے نوسوننانوے اور میری اُمت کا ایک، میری اُمت کا حساب تو اسی طرح سے پورا ہوجائے گا (ابن کثیر و مظہری)۔ اور پھر فرمایا کہ تمہاری تعداد تو لوگوں میں ایسی ہے جیسے سفید رنگ کا بیل ہو اور اس کے اندر ایک سیاہ بال ہو، یا فرمایا کہ سیاہ رنگ کا بیل ہو اور اس میں ایک سفید بال ہو، تمہاری تعداد تو لوگوں کے مقابلے میں ایسی ہے۔[1] یعنی آدم علیہ السلام سے لے کر قیامت تک جتنی مخلوق آئے گی ان میں کفار زیادہ ہیں، مؤمن کم ہیں، کفار کی تعداد مؤمنوں کے مقابلے میں زیادہ ہے، تو یہ وقت ہوگا جس وقت لوگوں پر ایک ہیبت طاری ہوجائے گی، اور اس طرح کے اور بھی متعدد واقعات پیش آئیں گے۔

قیامت کی ہولناکی

اور فی الواقع زمین پر زلزلہ بھی آئے گا جیسے قرآن میں ذکر کیا گیا: اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا (سورۂ زلزال)، یہ نفخۂ اُولیٰ کے وقت بھی ہوسکتا ہے اور بعد میں بھی ہوسکتا ہے، اور یہ اس کی ایک ڈراؤنی صورت پیش کی ہے کہ اس طرح سے ہیبت ناک ہوگا کہ لوگوں کے ہوش اڑ جائیں گے، جس طرح سے نشہ پینے کے بعد لوگ لڑکھڑاتے پھرتے ہیں، کوئی کدھر کو گر رہا ہے، کوئی کدھر کو گر رہا ہے، ہوش ٹھکانے نہیں ہوتے، اسی طرح سے جب بہت افسوسناک واقعہ پیش آجائے تو بھی لوگوں کے دماغ ایسے ہوجایا کرتے ہیں گویا کہ پاگل ہوگئے، عقل ٹھکانے نہیں رہی۔ تو دیکھنے میں ایسے نظر آئیں گے جیسے نشہ پیا ہوا ہو، لیکن اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ انہوں نے نشہ نہیں پیا ہوا ہوگا بلکہ عذاب سخت ہوگا جس کی بنا پر یہ صورت حال پیدا ہوجائے گی۔

---

(۱) دیکھیں: بخاری ج ۱ ص ۴۷۲ باب قصة یأجوج۔ ج ۲ ص ۶۹۳۔۹۶۶۔ مسلم ۱/ ۱۱۷ باب قوله یقول الله لآدم. مشکوٰۃ ۲/ ۴۸۳ باب الحشر۔

جاہلوں کا طرزِ عمل

اب بنی آدم کا انجام تو ایسا ہونے والا ہے، اس انجام کو سوچ کے اللہ سے ڈرنا چاہیے، اپنے رَبّ سے ڈرنا چاہیے، اس کی نافرمانی نہ کی جائے، اس کی اطاعت کی جائے، تاکہ ایسے وقت میں اللہ تعالیٰ اس عذاب سے محفوظ رکھے، لیکن لوگوں کا حال یہ ہے کہ بعض لوگ ایسے ہیں (ومن الناس میں مِن تبعیضیہ ہے، یہ ایسے ہی گفتگو ہے جیسے ہم کہیں کہ حال تو یہ ہے اور لوگوں میں سے بعض ایسے بدھو، ایسے جاہل، ایسے اکھڑ مزاج ہوتے ہیں جن کا طرزِ عمل یہ ہے، تو ایسا طرزِ عمل اختیار کرنے والے بدھو، جاہل، احمق، آگے ان کا ذکر کیا گیا ہے) کہ لوگوں میں سے بعض ایسے ہیں جو جھگڑا کرتے ہیں اللہ کے بارے میں، اللہ کے اَحکام کے بارے میں جھگڑتے ہیں اور علم ہے نہیں، اور ان کی اپنی طبیعت میں ایسی صلاحیت ہوتی ہے گمراہی کو قبول کرنے کی کہ کوئی نیک بات کہے تو اس کو تو ماننے کے لئے تیار نہیں، صحیح بات ان کو بتائی جائے تو اس کو توسنیں گے نہیں، لیکن ہر سرکش شیطان کے پیچھے لگ جائیں گے، اور آپ دیکھیں گے کہ جاہلوں میں اکثر ایسے ہوتا ہے، کہ شرارت اٹھانے کے لیے کوئی آجائے تو سب اس کے پیچھے ہو جائیں گے، اور اگر کوئی نیکی کی بات کرے تو اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا، بازار کے اندر کوئی شخص تماشا کرنے لگ جائے، بندر نچانے لگ جائے تو وہاں تو مجمع لگ جائے گا، اور یہ بے چارے تبلیغی جماعت والے کلمہ صحیح کرانے کے لئے آتے ہیں تو ان کے قریب کوئی نہیں لگتا، تو یہ انسانوں کی صلاحیت ہوتی ہے، بغیر علم کے جھگڑا کرنے والے اکثر و بیشتر خیر کی صلاحیت سے محروم ہو جاتے ہیں، یہ بالکل گمراہ قسم کے لوگ اور لاخیرے ہوتے ہیں، جن میں کسی قسم کی خیر نہیں ہوتی، اور ان میں ضلالت اور گمراہی کی اتنی صلاحیت ہوتی ہے کہ جو شخص بھی ان کو بھٹکانا چاہے، جو سرکش شیطان آجائے اس کے پیچھے سب لگ جائیں گے۔ اس میں جاہلوں اور احمقوں کا شکوہ ہے کہ انجام کیسا آنے والا ہے لیکن لوگوں میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں (اس میں معنیٰ جمع کا ہے اگرچہ لفظ مفرد ہے، کیونکہ ایک متعین آدمی مراد نہیں ہے) بغیر علم کے اور ہر سرکش شیطان کی اتباع کرتے ہیں۔

شیطان سیدھا راستہ کبھی نہیں دکھا سکتا

اور شیطان کا تو حال یہ ہے، اس کی تو ڈیوٹی یہی ہے، اس کے تو ذِمے یہی لگا ہوا ہے کہ جو بھی اس سے تعلق پیدا کرے گا، وہ تو اس کو سیدھے راستے سے بھٹکا دے گا، تو جو اس سے دوستی لگائیں گے بھٹک جائیں گے، کُتِبَ علیہ: اس پر یہ بات لکھ دی گئی ہے، لازم کردی گئی ہے یعنی اس کی ڈیوٹی یہی ہے کیونکہ شیطان کو جو انسانوں پر مسلط کیا گیا تو امتحان ہی مقصود ہے، اس نے تو لوگوں کو گمراہ ہی کرنا ہے۔ جس طرح سے زہر کوئی کھائے گا تو مر جائے گا، اللہ تعالیٰ نے زہر کی فطرت ہی اس قسم کی بنائی ہے، تو شیطان کو تو مسلط ہی اسی لیے کیا گیا تاکہ انسانوں کو آزمایا جائے، وہ کبھی سیدھا مشورہ نہیں دے سکتا، سیدھا راستہ نہیں دکھا سکتا، اس پر لکھ دیا گیا ہے کہ جو شخص بھی اس سے دوستی لگائے گا پس بے شک وہ اس کو بھٹکائے گا اور اس کو عذابِ سعیر کا راستہ دکھائے گا، یعنی بھڑکنے والی آگ کا۔ سعیر بھڑکنے والی آگ کو کہتے ہیں، عذابِ سعیر: آگ کا عذاب۔ ہدایت دے گا وہ اس کو، راہنمائی کرے گا وہ اس کی آگ کے عذاب کی طرف۔

اِمکانِ قیامت پر دلیل

اب آگے دلیل دی جارہی ہے قیامت کے امکان پر، کیونکہ مشرکین سمجھتے تھے کہ ایسا نہیں ہوسکتا کہ مرنے کے بعد دوبارہ اٹھایا جائے، تو اللہ تبارک وتعالیٰ جہاں بھی قیامت کا تذکرہ کرتے ہیں، تو ساتھ اپنی قدرت کو واضح کر کے لوگوں کے سامنے یہ امکان پیش کرتے ہیں کہ جب میری قدرت ایسی ہے تو اس قدرت کے بعد تمہیں کیا شک ہے اس بات میں کہ اگر میں زندہ کرنا چاہوں گا تو کیا زندہ نہیں کرسکوں گا؟ جب بھی معاد کا تذکرہ ہوتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ دلیل اسی انداز سے بیان فرمایا کرتے ہیں۔ ''اے لوگو! اگر تم بعث سے تردّد میں ہو'' یعنی تمہارا دل مطمئن نہیں ہوتا کہ مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنا بھی ہے، اور تمہارے دل میں یہ وسوسہ آتا ہے کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے، تو تم اس بات کی طرف غور کرو، تمہیں پتا چل جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کیسی کیسی ہے۔

اِنسان کی پہلی منزل مٹی کیسے ہے؟

''بے شک ہم نے تمہیں پیدا کیا مٹی سے'' پہلی منزل انسان کی مٹی ہے، اس کو آپ دو طرح سے سمجھ سکتے ہیں، یا تو آدم علیہ السلام کو براہِ راست مٹی سے بنایا گیا اور آدم علیہ السلام ہماری اصل ہیں، تو جب وہ مٹی سے بنے پھر آگے نسل چلی تو ابتدا تو مٹی سے ہی ہوئی، اور یا آج بھی ہم مٹی سے ہی بنتے ہیں، کیونکہ ہماری غذا زمین سے اخذ کی جاتی ہے، زمین سے نباتات اگتی ہے، اس سے ہم غذا حاصل کرتے ہیں، غذا ہو، دوا ہو، جو چیز بھی ہے سب زمین سے ہی حاصل ہوئی، اس کو کھانے کے بعد اسی سے خون بنتا ہے، اسی سے نطفہ تیار ہوتا ہے، اور وہی نطفہ ہے جو رحمِ مادر میں ڈالا جاتا ہے، پھر ماں کا خون بھی اسی نباتات سے اخذ ہوتا ہے، جس خون کی آمیزش کے ساتھ انسان کو آگے بنایا جاتا ہے، تو یوں سمجھو کہ اب بھی ہماری ابتداء زمین سے ہی ہے، تو مٹی تھے، اللہ نے اس کو نباتات کی شکل میں تبدیل کیا، بعد میں انسان کے پیٹ میں ڈالا، پیٹ میں ڈالنے کے بعد وہی خون، وہی نطفہ، وہی سب کچھ بنتا چلا گیا، اور پیدا ہونے کے بعد جس وقت کہ ہم ایک فٹ یا نو انچ کے ہوتے ہیں، اس کے بعد بھی ہم یہی زمینی غذا کھاتے ہیں جس کے ساتھ ہماری نشوونما ہوتی چلی جاتی ہے، تو ہمارا یہ وجود جتنا بھی ہے سارا ہماری اسی غذا کا نتیجہ ہے جو ہم کھاتے ہیں، اور غذا مٹی سے حاصل ہوتی ہے، تو مٹی سے اللہ نے ہماری یہ شکل بنائی، تو اگر مارنے کے بعد دوبارہ مٹی بنا دے، پھر دوبارہ اس کے لئے ایسی شکل میں اٹھانا کیا مشکل ہے؟ اس میں اگر تدبر کرو گے غور کرو گے تو یہ بات تمہیں اچھی طرح سے سمجھ میں آسکتی ہے، پہلے بھی مٹی کے ہی ذرّات بکھرے ہوئے ہیں، کہاں کہاں سے ہماری غذا آتی ہے، کہاں کہاں سے ہماری دوا آتی ہے، کہاں کہاں سے پانی آتا ہے، کہاں کہاں سے پھل آتے ہیں، جو ہم کھاتے ہیں تو ذرّے ذرّے جمع ہو کے ہمارا یہ وجود بنتا چلا جاتا ہے۔

''مخلّقہ'' اور ''غیر مخلّقہ'' کے دو مفہوم

ہم نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا، پہلی منزل تمہاری مٹی ہے، دوسری منزل نطفہ ہے، اور پھر اس کے بعد وہ جمے ہوئے خون کی شکل اختیار کرتا ہے، پھر اس کے بعد گوشت کا لوتھڑا بنتا ہے، پھر کبھی اس کو پورا بنا دیا جاتا ہے، کبھی ناقص رہنے دیا جاتا ہے، کبھی تو

بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کا ہر عضو صحیح بنا ہوا ہوتا ہے، کبھی کسی کی ایک ٹانگ ہوتی ہے دوسری نہیں ہوتی، کبھی کسی کا ایک بازو ہوتا ہے دوسرا بازو نہیں ہوتا، کبھی کسی کی دونوں ٹانگیں نہیں ہوتیں، کبھی کسی کی آنکھیں نہیں ہوتیں، تو کسی کو پورا پورا بنا دیا جاتا ہے، کسی کو ناقص رہنے دیا جاتا ہے، یہ مفہوم بھی اس کا ہے۔ اور دوسرا یہ مفہوم بھی ہے کہ مضغہ بننے کے بعد کوئی تو مخلقہ ہوتا ہے کہ جس کے متعلق مقدر ہے کہ اس کو پورا بنا دیا جائے، اور کوئی غیر مخلقہ ہوتا ہے کہ لوتھڑے کی شکل میں بن جانے کے بعد اس کو ساقط کر دیا ہوتا ہے، اس کو پورا بچہ نہیں بنایا جاتا، تو ایسا بھی ہوتا رہتا ہے کہ گوشت کا لوتھڑا بننے کے بعد پورا بچہ نہیں بننے پاتا کہ پہلے ہی ساقط ہو جاتا ہے۔

اور یہ ساری باتیں جو تمہارے سامنے کی جا رہی ہیں، تمہیں دکھائی جا رہی ہیں، وہ اس لیے تاکہ ہماری قدرت تمہارے سامنے واضح ہو جائے کہ ہم اس طرح سے ذرات کو اکٹھا کر کے دوبارہ بھی زندہ کرنے پر قادر ہیں۔ ’’اور ہم ٹھہراتے ہیں رحموں میں جو چاہتے ہیں جب تک چاہتے ہیں‘‘ بچہ بنا کے، بچی بنا کے، جیسی کیسی، خوبصورت، بدصورت، جو صورت بھی ہو، جب تک چاہتے ہیں ہم ٹھہراتے ہیں۔ ’’پھر تمہیں بچے بچے بنا کر نکالتے ہیں، اور پھر تمہیں مہلت دیتے ہیں تاکہ تم اپنی جوانی کو پہنچ جاؤ۔‘‘

اِنسان کی صلاحیتیں اللہ واپس بھی لے سکتا ہے

اور تم میں سے بعض وہ ہیں جن کو بچپن میں یا جوانی میں موت آ جاتی ہے، اور بعض وہ ہیں جو رذی عمر کی طرف لوٹا دیے جاتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سب کچھ جانی ہوئی باتیں بھی بھول جاتی ہیں۔ تو جو علم اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہیں ملا تھا...... بچپن میں تھے تو کچھ نہیں جانتے تھے وَاللّٰہُ اَخْرَجَکُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّھٰتِکُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَیْئًا (سورۂ نحل: ۷۸) اللہ نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے نکالا تھا تو تم کچھ نہیں جانتے تھے، اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے تمہیں قوتیں دیں صلاحیتیں دیں، تم نے علم بھی حاصل کیا، تو ایسا بھی واقعہ ہوتا ہے کہ جب رذی عمر کو پہنچ جاتے ہو تو جانا ہوا سب بھول جاتا ہے، تو یہ جو کہتے ہیں کہ علم ایک ایسی دولت ہے جو لازوال ہے، ایک دفعہ آ جائے تو جاتی نہیں، یہ بھی اکثری عادت کے اعتبار سے ہے، ورنہ جس طرح سے باقی قوتیں، صلاحیتیں اللہ کی دی ہوئی ہیں اور جب چاہے وہ واپس لے لے، آنکھ میں بینائی اللہ نے دی جب چاہے وہ واپس لے لے، کان میں شنوائی اللہ نے دی جب چاہے واپس لے لے، آپ کے سامنے یہ نمونے آتے رہتے ہیں کہ دیکھنے والے لوگ نابینا ہو جاتے ہیں، سننے والے لوگ بہرے ہو جاتے ہیں، کیا یہ مثالیں دنیا میں موجود نہیں؟ اسی طرح سے علم اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ایک انعام ہے، اس پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے، یہ نہیں کہ آنے کے بعد یہ جاتا نہیں، آیا ہوا علم بھی چلا جاتا ہے، مثلاً دماغ پر فالج کا اٹیک ہو جائے تو کچھ بھی پلے نہیں رہتا، سب کچھ ہی ضائع ہو جاتا ہے، نسیان کی بیماری لگ جائے تو پڑھا پڑھایا سب بھول جاتا ہے، اور بوڑھا ہونے کے بعد تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ کوئی بات ہی یاد نہیں رہتی، لوگ بوڑھے ہونے کے بعد اپنے بچوں تک کو نہیں پہچانتے، اس طرح سے صلاحیتیں ختم ہو جاتی ہیں، تو جس طرح سے باقی صلاحیتیں ہیں کہ اللہ کے دینے سے آتی ہیں اور اللہ کے باقی رکھنے سے رہتی ہیں، اسی طرح سے یہ ہے۔ یہ تو دلیل پیش کی آپ کے نفسوں سے ہی کہ آپ اپنی خلقت میں اگر غور کریں کہ تم کس طرح سے پیدا ہوئے ہو، تو تمہیں اللہ کی قدرت سمجھ میں آئے گی۔

اِثباتِ بعث کے لئے دوسری مثال

دوسری مثال زمین کی دے دی کہ باہر نظر اٹھا کر دیکھو! وہاں بھی اللہ کی قدرت اسی طرح سے ہی ہے۔ اور اِثباتِ بعث کے لئے اِحیائے ارض کی مثال بھی ہمیشہ دی جاتی ہے، کہ دیکھو! اللہ تعالیٰ مردہ زمین کو کس طرح سے زندہ کرتا ہے؟ ھامدۃ: خشک پڑی ہوئی، جس میں کسی قسم کے حیات کے آثار نہیں، اور ہم اس کے اوپر پانی اتارتے ہیں تو حرکت میں آتی ہے پھولتی ہے اور ہر قسم کی پررونق نباتات کو اگاتی ہے، تو ویران زمین کو جو کہ میتہ کے حکم میں ہے، اس کو پھر اللہ تعالیٰ اس طرح سے زندہ کر دیتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ اسی لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ کامل الذات ہے، کامل الافعال ہے، کامل الصفات ہے، اور یہ سارا اسی لیے کیا جا رہا ہے کہ قیامت ایک دِن آئے گی، اور آنے کے بعد اللہ تعالیٰ ہر قسم کا فیصلہ فرمائیں گے، ہر کسی سے محاسبہ ہوگا۔

ضدی اِنسان سے شکوہ

آگے پھر شکوہ ہے اسی قسم کے ضدی انسان کا، کہ باتیں تو بالکل واضح ہیں، اللہ کی قدرت کے دلائل دونوں طرح سے ہی ہیں، زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں، اپنے گریبان میں منہ ڈال کے جھانکو، تمہارا بدن تمہیں بتاتا ہے کہ اللہ کس طرح سے قادر ہے؟ اور ذرا نظر اُٹھاؤ تو چاروں طرف اللہ کی قدرت کے دلائل جو اللہ کی وحدانیت پر دلالت کرتے ہیں، وہ سارے کے سارے واضح طور پر بکھرے ہوئے ہیں، لیکن اس کے باوجود بھی بعض لوگ ایسے بے علمے بے عقلے اور بے ہدایتے ہیں کہ پھر بھی وہ جھگڑے ڈال رہے ہیں، اور مقصد ان کا صرف بھٹکانا ہوتا ہے، اور کوئی مقصد نہیں، نہ خود ان کو ذاتی طور پر علم ہے نہ کوئی دوسرا سمجھائے تو سمجھنے پاتے ہیں، اپنی رَٹ ہی لگائے چلے جاتے ہیں۔ ''لوگوں میں سے بعض وہ ہے جو جھگڑا کرتا ہے اللہ کے بارے میں بغیر علم کے، بغیر ہدایت کے، بغیر کتابِ منیر کے'' تینوں لفظوں میں فرق آپ کے سامنے آ گیا ہے۔ ''تکبر کے طور پر پہلو تہی کرنے والا ہے، موڑنے والا ہے وہ اپنے پہلو کو'' پہلو تہی کرتا ہے، اور مقصد اس کا صرف اللہ کے راستے سے بھٹکانا ہے، ''اس کے لئے دنیا میں رسوائی ہے'' جو ایسا ضدی ہو وہ دنیا میں بھی رسوا ہوتا ہے، اللہ کے کسی عذاب کی گرفت میں آ جائے گا، اہلِ حق کے مقابلے میں شکست کھا کے ذلیل ہوگا۔ اور قیامت کے دِن اللہ تعالیٰ اس کو جلنے والی آگ کا مزہ چکھائیں گے، اور اس وقت پھر کہا جائے گا (یُقَالُ یا قِیلَ یہاں محذوف مانیں گے) کہ یہ عذاب انہی اعمال کی وجہ سے ہے جو تیرے ہاتھوں نے آگے بھیجے تھے، والأمر ان اللہ...إلخ اور یہ بات تو واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں، بلاوجہ کسی کو سزا نہیں دیتا، تمہارے اپنے کرتوت اور اپنی حرکتیں ہیں جو عذاب کی شکل میں سامنے آ جائیں گی۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّعۡبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرۡفٍ ۚ فَاِنۡ اَصَابَهٗ خَيۡرُ ۨاطۡمَاَنَّ بِهٖ ۚ

لوگوں میں سے بعض وہ ہے جو عبادت کرتا ہے اللہ کی کنارے پر، اگر اسے بھلائی پہنچ گئی تو وہ مطمئن ہو جاتا ہے اس بھلائی کے ساتھ

وَاِنۡ اَصَابَتۡهُ فِتۡنَةُ ۨانۡقَلَبَ عَلٰى وَجۡهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةَ ؕ ذٰلِكَ هُوَ

اور اگر اسے کوئی آزمائش پہنچ گئی تو لوٹ جاتا ہے اپنے چہرے کے بل، اس شخص نے دنیا اور آخرت میں خسارہ پایا، یہ بہت

الۡخُسۡرَانُ الۡمُبِيۡنُ ۞ يَدۡعُوۡا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهٗ وَمَا لَا يَنۡفَعُهٗ ؕ ذٰلِكَ هُوَ

واضح خسارہ ہے ⑪ پکارتا ہے اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیز کو جو نہ اس کو نقصان پہنچا سکتی ہے اور نہ اس کو نفع پہنچا سکتی ہے، یہ بہت

الضَّلٰلُ الۡبَعِيۡدُ ۞ يَدۡعُوۡا لَمَنۡ ضَرُّهٗۤ اَقۡرَبُ مِنۡ نَّفۡعِهٖ ؕ لَبِئۡسَ الۡمَوۡلٰى وَلَبِئۡسَ

دُور کی گمراہی ہے ⑫ پکارتا ہے یہ شخص اس چیز کو کہ جس کا نقصان زیادہ قریب ہے اس کے نفع سے، البتہ بُرا مولا ہے اور بُرا

الۡعَشِيۡرُ ۞ اِنَّ اللّٰهَ يُدۡخِلُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ

ساتھی ہے ⑬ بے شک اللہ تعالیٰ داخل کرے گا ان لوگوں کو جو ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں ایسے باغات میں کہ جن کے

مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَفۡعَلُ مَا يُرِيۡدُ ۞ مَنۡ كَانَ يَظُنُّ اَنۡ لَّنۡ يَّنۡصُرَهُ اللّٰهُ

نیچے سے نہریں جاری ہیں، بے شک اللہ تعالیٰ کرتا ہے جو چاہتا ہے ⑭ جو شخص یہ گمان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہرگز اس کی مدد نہیں کرے گا

فِى الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةِ فَلۡيَمۡدُدۡ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ ثُمَّ لۡيَقۡطَعۡ فَلۡيَنۡظُرۡ هَلۡ

دنیا اور آخرت میں، چاہیے کہ وہ پھیلا لے ایک رسّی آسمان کی طرف پھر اس کو چاہیے کہ قطع کر دے پھر دیکھے یہ شخص، کیا

يُذۡهِبَنَّ كَيۡدُهٗ مَا يَغِيۡظُ ۞ وَكَذٰلِكَ اَنۡزَلۡنٰهُ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۙ

اس کی تدبیر لے جائے گی اس چیز کو جو اس کو غصے میں ڈالتی ہے؟ ⑮ اور ایسے ہی اُتارا ہم نے کتاب کو اس حال میں کہ واضح آیات ہیں

وَّاَنَّ اللّٰهَ يَهۡدِىۡ مَنۡ يُّرِيۡدُ ۞ اِنَّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَالَّذِيۡنَ هَادُوۡا وَالصّٰبِـِٕـيۡنَ

اور یہ بات تو ہے ہی کہ اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے ⑯ بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور وہ لوگ جو یہودی ہوئے اور صابی لوگ

وَالنَّصٰرٰى وَالۡمَجُوۡسَ وَالَّذِيۡنَ اَشۡرَكُوۡۤا ۖ اِنَّ اللّٰهَ يَفۡصِلُ بَيۡنَهُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ ؕ

اور نصاریٰ اور مجوس اور وہ لوگ جنہوں نے شرک کیا بے شک اللہ تعالیٰ ان کے درمیان فیصلہ کر دے گا قیامت کے دن

إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿۱۷﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ

بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کے اوپر گواہ ہے ﴿۱۷﴾ کیا تُو نے دیکھا نہیں کہ بے شک اللہ، سجدہ کرتی ہے اس کو ہر وہ چیز جو آسمان میں ہے اور

مَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ

جو زمین میں ہے اور سورج اور چاند، ستارے اور پہاڑ، درخت اور چوپائے اور لوگوں میں سے بھی بہت سے اللہ کو سجدہ کرتے ہیں

مِّنَ النَّاسِ ۭ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ۭ وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ

اور بہت سارے لوگ ایسے ہیں کہ ان کے اوپر عذاب ثابت ہو گیا، اور جس کو اللہ ذلیل کر دے اس کو کوئی عزت دلانے والا نہیں،

اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ﴿۱۸﴾ هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِيْ رَبِّهِمْ ۡ فَالَّذِيْنَ

بے شک اللہ تعالیٰ کرتا ہے جو چاہتا ہے ﴿۱۸﴾ یہ دو جھگڑنے والے ہیں جنہوں نے جھگڑا کیا اپنے رَبّ کے بارے میں، پس وہ لوگ

كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ ۭ يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ ﴿۱۹﴾

جنہوں نے کفر کیا کاٹے جائیں گے ان کے لئے کپڑے آگ کے، ڈالا جائے گا ان کے سروں کے اُوپر سے گرم پانی ﴿۱۹﴾

يُصْهَرُ بِهٖ مَا فِيْ بُطُوْنِهِمْ وَالْجُلُوْدُ ﴿۲۰﴾ وَلَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ ﴿۲۱﴾

اس کے ذریعے سے پگھلا دیا جائے گا جو کچھ ان کے پیٹوں میں ہے اور ان کی جلدوں کو ﴿۲۰﴾ ان کے لئے لوہے کے ہتھوڑے ہوں گے ﴿۲۱﴾

كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا ۤ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۲۲﴾

جب کبھی ارادہ کریں گے اس آگ سے نکلنے کا گھٹن کی وجہ سے تو ان کو پھر اسی میں لوٹا دیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ چکھو جلنے کا عذاب ﴿۲۲﴾

اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ

بے شک اللہ تعالیٰ داخل کرے گا ان لوگوں کو جو ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں باغات میں، جاری ہوں گی ان کے نیچے سے نہریں،

يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ۭ وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ﴿۲۳﴾ وَ

پہنائے جائیں گے وہ ان باغات میں سونے کے کنگن اور موتی، اور ان کا لباس ان باغات میں ریشم ہوگا ﴿۲۳﴾ اور

هُدُوْٓا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ ۚ وَهُدُوْٓا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ ﴿۲۴﴾

وہ لوگ ہدایت دیے گئے پاکیزہ بات کی طرف اور راہنمائی کیے گئے حمید کے راستے کی طرف ﴿۲۴﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ: حرف کنارے کو کہتے ہیں۔ لوگوں میں سے بعض وہ ہے جو عبادت کرتا ہے اللہ کی کنارے پر، یعنی کنارے پہ کھڑا ہے، فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ اطْمَاَنَّ بِهٖ: اگر اسے بھلائی پہنچ گئی تو وہ مطمئن ہوجاتا ہے اس بھلائی کے ساتھ، وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةٌ: اور اگر اسے کوئی آزمائش پہنچ گئی، انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ: تو لوٹ جاتا ہے اپنے چہرے کے بل، خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ: اس شخص نے دنیا اور آخرت میں خسارہ پایا، گھاٹے میں رہ گیا وہ دنیا میں اور آخرت میں، ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ: یہ بہت واضح خسارہ ہے۔ يَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهٗ وَمَا لَا يَنْفَعُهٗ: پکارتا ہے اللہ کے علاوہ، اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیز کو جو نہ اس کو نقصان پہنچا سکتی ہے اور نہ اس کو نفع پہنچا سکتی ہے، مَا موصولہ ہے، ایسی چیز کو پکارتا ہے جو اس کو نقصان نہیں دیتی، اور ایسی چیز کو پکارتا ہے جو اس کو نفع نہیں دیتی، یعنی عبادت کرنے کی صورت میں اس کو نفع نہیں پہنچا سکتی، عبادت نہ کرنے کی صورت میں اسے نقصان نہیں پہنچا سکتی، ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ: یہ بہت دُور کی گمراہی ہے، دُور سے مراد ہوتا ہے کہ ہدایت سے بہت دُور ہے، ایک قریب کی گمراہی ہوتی ہے کہ انسان ہدایت کے قریب ہے، جلدی لوٹ کے آجائے، اور ایک بہت دُور کی گمراہی ہے، ایسی گمراہی ہے جو ہدایت سے بہت دُور نکل گئی۔ يَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗۤ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ: پکارتا ہے یہ شخص اس چیز کو کہ جس کا نقصان زیادہ قریب ہے اس کے نفع سے۔ لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ: البتہ بُرا مولا ہے اور بُرا ساتھی ہے۔ عشیر: یہ معاشر، رفیق، ساتھی کے معنی میں، اور مولیٰ: کارساز۔ کارساز بھی بُرا اور رفیق بھی بُرا، یعنی اگر اس کو کارساز سمجھیں تو بھی بُرا ہے، اور اگر اپنا عشیر اور ساتھی سمجھیں تو بھی بُرا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: بے شک اللہ تعالیٰ داخل کرے گا ان لوگوں کو جو ایمان لاتے ہیں، وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: اور نیک عمل کرتے ہیں، جَنّٰتٍ: یہ يُدْخِلُ کا مفعول فیہ ہے، اور تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ یہ جَنّٰتٍ کی صفت ہے۔ داخل کرے گا ایسے باغات میں کہ جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں، بے شک اللہ تعالیٰ کرتا ہے جو چاہتا ہے۔ مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ: جو شخص یہ گمان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہرگز اس کی مدد نہیں کرے گا دنیا اور آخرت میں، لَنْ يَّنْصُرَهٗ کی "ہ" ضمیر اَشہر روایات کے مطابق سرور کائنات ﷺ کی طرف لوٹ رہی ہے، جو شخص یہ گمان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہرگز مدد نہیں کرے گا اپنے رسول کی دنیا میں اور آخرت میں، فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ: مَدَّ يَمُدُّ: لمبا کرنا۔ سبب کا معنی یہاں ہے رَسّی، حبل۔ چاہیے کہ وہ پھیلا لے، لمبی کرلے ایک رَسّی آسمان کی طرف، آسمان تک ایک رَسّی تان لے، ثُمَّ لْيَقْطَعْ: پھر اس کو چاہیے کہ قطع کردے، لْيَقْطَعْ کا مفعول یہاں محذوف ہے، تشریح آپ کے سامنے آجائے گی، لْيَقْطَعْ کا معنی یہ ہے کہ آسمان سے جا کر وحی کو منقطع کرآئے، کیونکہ جب تک ان پر وحی اترتی رہے گی، اللہ تعالیٰ کی نصرت ان کے شاملِ حال رہے گی، اگر وہ یہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی مدد نہیں کرے گا تو اس کو چاہیے کہ آسمان پہ چڑھ کے وحی کا سلسلہ روک آئے، اور یہ کسی کے بس میں نہیں، جب کسی کے بس میں نہیں تو اللہ تعالیٰ کی نصرت کا روکنا بھی کسی کے اختیار میں نہیں، مطلب یہ ہے کہ جب تک یہ اللہ کے رسول ہیں مدد ان کے ساتھ شامل رہے گی، اور اگر ان کو اللہ کی مدد سے محروم کرنا چاہتے ہو تو آسمان سے جا کے وحی کا سلسلہ منقطع کرآؤ، اگر تمہارے بس میں ہے تو یوں کرلو،

رسیاں تان کے آسمان پہ چڑھ جاؤ، اور اوپر سے جا کر وحی کا سلسلہ منقطع کرآؤ، اور آپ جانتے ہیں کہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا، جب نہیں ہوسکتا تو اللہ کی نصرت شامل رہے گی، ''بیان القرآن'' میں اسی تفسیر کو اختیار کیا گیا ہے اور تفسیری روایات کی طرف دیکھتے ہوئے اسی کو اَصح قرار دیا گیا ہے، ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے یہی تفسیر منقول ہے۔ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ: پھر دیکھے یہ شخص کیا اس کی تدبیر لے جائے گی اس چیز کو جو اس کو غصے میں ڈالتی ہے؟ جس چیز پر اس کو غصہ آرہا ہے کیا اس تدبیر کے ساتھ وہ چیز ختم ہوجائے گی؟ وہ چیز وہی یعنی اللہ کی نصرت جس کی طرف دیکھ دیکھ کے اس کو غصہ چڑھ رہا ہے، تو یہ دیکھ لے کہ اس تدبیر کے ساتھ وہ چیز ختم ہوجائے گی؟ یعنی نہیں ختم ہوگی۔ ''چاہیے کہ دیکھے یہ شخص کہ کیا لے گئی اس کی تدبیر اس چیز کو جو اس کو غصہ چڑھاتی ہے، جس پہ اس کو غصہ آتا ہے۔'' اور دُوسرا یوں بھی ترجمہ کیا گیا ہے کہ لِيَقْطَعْ سے وحی کا قطع کرنا مراد نہیں، بلکہ اس سے مراد ہے اپنا گلا کاٹنا اور اپنے آپ کو پھانسی دینا، اور سماء سے آسمان مراد نہیں بلکہ اس سے چھت مراد ہے، کیونکہ آپ کتابوں میں پڑھتے رہتے ہیں کہ ''كُلُّ مَا عَلَاكَ وَاَظَلَّكَ فَهُوَ سَمَاءٌ'' جو چیز تیرے اُوپر ہے، تجھے سایہ کرتی ہے وہ سماء کا مصداق ہے، اس کو سماء کہہ سکتے ہیں، جس طرح سے سائبان ہے اس کو بھی سماء کے لفظ سے تعبیر کرسکتے ہیں، تو پھر یہ ویسے محاورہ ہے کہ جس طرح سے کوئی آدمی کسی بات پہ چڑے، تو ہم کہتے ہیں کہ بھائی! یہ تو ایسے ہو کے رہے گا، تُو جا کے پھانسی لے لے، یعنی تُو چاہے لٹک ہی جائے پھانسی لے لے تو بھی یہ چیز ختم نہیں ہوگی، ایسا ہو کے رہے گا۔ ''جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ اللہ اس کی مدد نہیں کرے گا دنیا میں اور آخرت میں، اسے چاہیے کہ چھت کی طرف ایک رَسّی تان لے اور پھر اپنے گلے کو کاٹ لے، اپنے آپ کو پھانسی دے دے، پھر دیکھے کیا اس کی تدبیر اس چیز کو لے جائے گی جو اسے غصہ چڑھا رہی ہے؟'' یعنی تم اگر اُلٹے بھی لٹک جاؤ تو بھی یہ کام ہو کے رہے گا (مظہری)، تمہارے اُلٹے لٹکنے کے ساتھ بھی یہ چیز رُکے گی نہیں، پنجابی میں ایسے موقع پر کہتے ہیں کہ اگر یہ چیز تمہیں پسند نہیں ہے تو ''جا کے پھالے لو'' یہ ویسی بات ہے، دوسری جگہ قرآنِ کریم میں ایسے موقع پر کہا گیا ہے مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ (سورۂ آلِ عمران: ۱۱۹) تم اپنے غصے میں مرجاؤ، جل جاؤ، جلتے رہو، ایسا ہو کے رہے گا۔

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ: اور ایسے ہی اتارا ہم نے اس کتاب کو، اس قرآن کو اس حال میں کہ وہ واضح آیات ہیں۔ ''ہٗ'' ضمیر قرآنِ کریم کی طرف لوٹ گئی۔ وَاَنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ: وَالأمْرُ اَنَّ اللهَ...الخ۔ اور یہ بات تو ہے ہی کہ اللہ جس کو چاہتا ہے اس کو ہدایت دیتا ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا: بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور وہ لوگ جو یہودی ہوئے، وَالصّٰبِئِيْنَ: اس کا عطف اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا پر ہے، یہ بھی ''اِنَّ'' کا اسم ہے اس لیے یہ منصوب ہے۔ ''اور صابی لوگ'' یہ ستارہ پرست تھے، اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ حضرت داؤد علیہ السلام کی یا ان کی کتاب زَبور کی طرف اپنی نسبت کرتے تھے، اس لیے فقہ میں ''ہدایہ اولین'' میں آپ پڑھیں گے کہ صابی اہلِ کتاب میں شامل ہیں یا نہیں؟ اس میں فقہاء کا اختلاف ہے، ''کتاب النکاح'' کے اندر یہ مسئلہ آتا ہے کہ اہلِ کتاب کی لڑکیوں سے نکاح جو دُرست ہے، تو کیا صابیوں کی لڑکیوں سے نکاح دُرست ہے یا نہیں؟ یہ مسئلہ فقہ کے اندر آیا کرتا ہے، تو وہاں کچھ اختلاف نقل کیا جاتا ہے، کہ بعض لوگ ان کو اہلِ کتاب میں شامل کرتے ہیں اور بعض شامل نہیں کرتے، عراق وغیرہ میں یہ لوگ رہتے تھے، بعد میں انہوں نے ستارہ پرستی شروع کردی، پہلے ہوسکتا ہے کہ کسی نبی کی طرف منسوب ہوں، وَالنَّصٰرٰى

وَالْمَجُوْسَ: اَلنَّصٰرٰی کا عطف اَلصّٰبِئِیْنَ پر ہے، تو یہ بھی اِنَّ کا اسم ہے۔ نصاریٰ، یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ماننے والے ہوگئے، نصرانی۔ اور مجوس یہ آتش پرست ہیں، جیسے ایران کے لوگ آگ کو پوجنے والے تھے، ان کا پیشوا ''زردشت'' گزرا ہے جس کے حالات معلوم نہیں۔

''رام چندر'' وغیرہ کے متعلق غیر مقلد عالم وحید الزماں کا نظریہ اور اس کا رَدّ

اور جمعے کے دن جو مولانا امین صاحب[1] نے حوالہ پڑھ کے سنایا تھا کہ وحید الزمان صاحب نے جونبیوں کی فہرست دی ہے کہ ہم ان کو بھی نبی مانیں اور ان کے متعلق بھی نبی ہونے کا خیال رکھیں، جن میں ''کشن جی، رام چندر، بدھ'' وغیرہ کے نام ہیں، اور ان میں ایرانیوں کے زردشت کا ذکر بھی تھا۔[2] تو یہ ''زردشت'' وہی ہیں جو اسی فرقے کے بانی ہیں، ان کے حالات معلوم نہیں، اور جن شخصیات کے حالات معلوم نہ ہوں ان کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا، زیادہ سے زیادہ ہم احتیاط یہ کریں گے کہ بُرا نہیں کہیں گے، کیونکہ بعد والی جو ان کی اُمتیں ہیں ان کی طرف دیکھ کے ہم کسی کی شخصیت متعین نہیں کرسکتے...... ''رام چندر''، ''کشن جی''، اس قسم کے جو لوگ گزرے ہیں جن کی طرف بڑی بڑی جماعتیں منسوب ہیں، مثلاً ہندوستان کے ہندو جتنے ہیں وہ سب ''رام چندر'' کی طرف اپنی نسبت کرتے ہیں، اُن کے حالات معلوم نہیں، ہوسکتا ہے کہ وہ مصلح ہوں، اچھے لوگ ہوں، اور ہوسکتا ہے کہ اچھے نہ ہوں، جب قرآنِ کریم نے ان کی تفصیل نہیں بتائی تو ہم کچھ نہیں کہہ سکتے، باقی رہا کہ موجودہ ہندوؤں کو دیکھ کے ہم ان کی پوزیشن سمجھیں کہ وہ ایسے تھے، یہ بات غلط ہے۔ اگر قرآنِ کریم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پوزیشن ہمارے سامنے واضح نہ کرتا، تو کیا موجودہ عیسائیوں کو دیکھ کے کوئی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پوزیشن سمجھ سکتا؟ لوگ تو یہی سمجھتے کہ شاید واقعی وہ اپنے آپ کو اللہ کا بیٹا کہلواتے تھے نعوذ باللہ! شاید واقعہ انہوں نے صلیب پرستی کی تعلیم دی، شاید واقعی وہ یوں ہی کہتے تھے کہ میری ماں بھی اِلٰہ ہے، اِن عیسائیوں کی باتیں سُن کے تو پھر یہی ہوتا، آج جن بزرگوں کے حالات محفوظ نہیں ہیں ان کے ماننے والے ان کی طرف اگر غلط باتیں منسوب کرتے ہیں، تو ہم کس طرح سے صفائی دے سکتے ہیں کہ وہ ایسے نہیں تھے، یہ تو قرآنِ کریم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صفائی دے دی تو ہم کہتے ہیں کہ یہ سب بعد والوں کی جہالتیں ہیں، اسی طرح سے ممکن ہے کہ وہ اچھے لوگ ہوں اور بعد والوں نے ان کی طرف غلط باتیں منسوب کردی ہوں، اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہی غلط ہوں، اس لیے نہ ہم ان کو بُرا کہتے ہیں، نہ ہم ان کو اچھا کہتے ہیں، ان کا معاملہ اللہ کے سپرد کرتے ہیں، ان شخصیات کے متعلق ہمارا نظریہ یہ ہے کہ ان کا معاملہ ہم اللہ کے سپرد کرتے ہیں، ہوسکتا ہے کہ وہ مُصلح ہوں، اچھے ہوں، مامور من اللہ ہوں، اور ہوسکتا ہے کہ اُن کی یہ پوزیشن نہ ہو، تو جن کی تفصیل قرآن میں یا حدیث میں نہیں کی گئی، ہم اُن کے متعلق نبی ہونے کا عقیدہ نہیں رکھ سکتے، بلکہ یہ کہیں گے کہ ہم اُن نبیوں پر ایمان لائے جو اللہ کی طرف سے آئے، ایک لاکھ چوبیس ہزار ہوں، یا اس سے کم ہوں، یا اس سے بیش ہوں، جتنے بھی نبی اللہ کی طرف سے آئے ہم اُن کو مانتے ہیں، اور بالتعیین ہم

(۱) رئیس المناظرین حضرت مولانا محمد امین صفدر اوکاڑوی رحمۃ اللہ علیہ۔ آپ تمام فرقِ باطلہ کے خلاف سیف بے نیام تھے۔ ۳ رشعبان ۱۴۲۱ھ میں وفات پائی۔

(۲) دیکھئے: وحید الزمان صاحب کی کتاب ''ہدیۃ المہدی'' ص ۸۵۔

انہی کو نبی مانتے ہیں جن کا ذکر قرآن میں آ گیا یا حدیث میں آ گیا، اور جن کا ذکر قرآن میں یا حدیث میں نہیں آیا، ہم ان کے متعلق قطعی طور پر کوئی عقیدہ نہیں رکھ سکتے، تو ایسی شخصیات کے متعلق ہمارا سکوت ہے، نہ ہم انہیں بُرا کہیں، نہ اچھا کہیں، نہ ہم انہیں نبی کہیں، نہ انہیں گمراہ کہیں۔

''بدھ'' کا تعارف

اسی طرح بدھ کی طرف بھی بہت بڑی جماعت منسوب ہے، یہ ویت نام کے علاقے کے، چین کے، تبت کے لوگ اکثر ''بدھ مذہب'' کے ہی ہیں، اور وہ ''بدھ'' تو ہوا بھی اپنے علاقے میں ہی ہے، راولپنڈی کے ساتھ پرلی طرف پشاور کو جاتے ہوئے ایک شہر آتا ہے ٹیکسلا، تو ٹیکسلا کے پاس پہاڑوں کا سلسلہ ہے، اس میں بہت بڑی بڑی غاریں ہیں، اور ان غاروں میں ''بدھ'' کے بڑے بڑے مجسمے دریافت ہوئے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہی غاروں کے اندر وہ مجاہدے کرتا رہا ہے۔ اس لیے چائنا کے لوگ چونکہ ''بدھ'' کے معتقد ہیں، تو جب وہ آتے ہیں تو ٹیکسلا میں ان غاروں کی زیارت کے لیے ضرور جاتے ہیں، اور وہاں عجائب گھر بنا دیا گیا ہے جس میں دریافت ہونے والی چیزیں ساری رکھ دی گئی ہیں، تو اس قسم کے آثار ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ''بدھ'' اسی علاقے کا رہنے والا ہے، چائنا نے جو آپ کو اسٹیل مل لگا کے دی ہے آپ کو معلوم ہوگا وہ بھی ٹیکسلا میں لگا کے دی ہے، کیونکہ اس علاقے کے ساتھ اس کو عقیدت ہے۔ اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب لکھی ہے ''حقانیتِ اسلام'' اس میں ایک حوالہ دیا ہے کہ ''بدھ'' کی کتابوں کے اندر سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق پیش گوئی موجود ہے کہ اِس نام کے اور ان کی والدہ کا یہ نام ہوگا، وہ آنے والے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہوسکتا ہے وہ اچھے آدمی ہوں اور اللہ تعالیٰ انہیں علم سماوی دیا ہوا ہو، کسی نبی کے ماننے والے ہوں اور اس نبی کے علوم کے حامل ہوں، اس لیے ہم ان کو بُرا بھی نہیں کہہ سکتے، ہاں! سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کی جو شخصیات ہیں ان کے متعلق تو واضح عقیدہ ہے کہ اگر ان کا ایمان معلوم نہیں تو وہ کافر ہیں، اور یہ (بدھ، رام چندر وغیرہ) بہت پہلے کے لوگ ہیں اور اس وقت کی تاریخ اچھی طرح سے محفوظ نہیں ہے، اس لیے ان کے متعلق نہ بُرا عقیدہ رکھیں نہ اچھا عقیدہ رکھیں، اللہ کے علم میں ہے کہ وہ کیسے لوگ تھے، اور پچھلی جماعتوں کو اور پچھلی امتوں کو دیکھ کے ہم صحیح اندازہ نہیں کر سکتے کہ اس شخص کے نظریات اور حالات کیا تھے، جیسے میں نے مثال دے دی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پوزیشن اگر قرآنِ کریم واضح نہ کرتا تو موجودہ عیسائیوں کے حالات دیکھ کے آپ عیسیٰ علیہ السلام کے صحیح مقام کو نہیں سمجھ سکتے تھے۔ تو یہ بات غلط ہے کہ اُن کے متعلق نبی ہونے کا عقیدہ رکھا جائے، وحید الزماں نے جس طرح سے لکھا ہے۔ اُس دِن آپ نے بات سمجھ لی تھی؟ یہ غیر مقلدوں کے پاس جتنی اُردو کی کتابیں حدیث شریف کی جو اُٹھائے پھرتے ہیں، وہ سارے ترجمے وحید الزماں کے ہیں، آپ دیکھ لینا، ہمارے پاس بھی بعض ترجمے ہیں جو وحید الزماں کے کیے ہوئے ہیں۔ اور یہ کتاب ''ہدیۃ المہدی'' بھی اسی کی ہے جس کے انہوں (مولانا امین صفدر اکاڑوی رحمۃ اللہ علیہ) نے حوالے پڑھ کے سنائے تھے..... تو بہر حال یہ مجوس، زردشت کی طرف منسوب ہیں، ان (زردشت) کے حالات ہم سے مخفی ہیں، اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ اصل میں کیا تھے؟ لیکن بعد میں آنے والے لوگوں نے آتش پرستی کو اپنا مسلک بنا لیا، اور یہ مجوس

آتش پرست لوگ دو خداؤں کو مانتے تھے، یزدان اور اَہرمن، ''یزدان'' کو خالقِ خیر کہتے تھے، اور ''اَہرمن'' کو خالقِ شر کہتے تھے۔ ......وَالَّذِیْنَ اَشْرَكُوْا: اس سے مراد مشرکینِ مکہ ہیں۔ ''اور وہ لوگ جنہوں نے شرک کیا۔''

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا: بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے، یہ تو ایک فریق ہو گیا۔ اور بعد والے سارے ایک فریق ہیں ''اَلْكُفْرُ مِلَّةٌ وَّاحِدَةٌ''[1] ان کے مختلف طبقات کی طرف اشارہ کر دیا، کہ ان میں یہودی بھی ہیں، صابی بھی ہیں، نصرانی بھی ہیں، مجوسی بھی ہیں اور مشرک بھی ہیں، یہ مختلف طبقے ہیں لوگوں کے۔ یہ دو اس طرح سے تقسیم ہو گئے کیونکہ آگے آ رہے گا خصمان کا ذکر، ان کو دو جھگڑنے والے قرار دیا جائے گا: هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا، معلوم ہو گیا کہ یہ دو فریق ہیں، دو فریق اسی طرح سے بنتے ہیں کہ مؤمنین کا گروہ علیحدہ ہے اور باقی فرقے جتنے ہیں وہ سارے کے سارے علیحدہ ہو گئے، اس طرح یہ دو فریق بن گئے ''الکُفر ملة واحدة'' کفر ایک ہی ملت سمجھا جاتا ہے، چاہے وہ یہودی ہیں، چاہے نصرانی ہیں، چاہے صابی ہیں، چاہے مجوس ہیں، چاہے مشرک ہیں۔ اِنَّ اللّٰهَ یَفْصِلُ بَیْنَهُمْ: بے شک اللہ تعالیٰ ان کے درمیان فیصلہ کرے گا قیامت کے دن، بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کے اوپر گواہ ہے۔

''کیا تُو نے دیکھا نہیں کہ بے شک اللہ، سجدہ کرتی ہے اس کو ہر وہ چیز جو آسمان میں ہے اور جو زمین میں ہے'' قرآنِ کریم میں اس موقع پر کہیں 'مَن'' آیا ہوا ہے، کہیں 'مَا'' آیا ہوا ہے، مراد ہر چیز ہے، چاہے جاندار ہو، چاہے بے جان ہو، چاہے ذوی العقول ہو، چاہے غیر ذوی العقول ہو، جو کوئی بھی آسمان میں ہے اور جو کوئی بھی زمین میں ہے، وہ اسی اللہ کو سجدہ کرتا ہے، اور سورج اور چاند، ستارے اور پہاڑ، شجر اور دواب یعنی درخت اور چوپائے (یہ عام کے بعد خاص کا ذکر آ گیا) اور لوگوں میں سے بھی بہت سے اللہ کو سجدہ کرتے ہیں، اور بہت سارے لوگ ایسے ہیں کہ ان کے اوپر عذاب ثابت ہو گیا۔ یہاں سجدہ کرنا مراد ہے اپنی اپنی شان کے لائق اللہ کے سامنے اطاعت اور فرمانبرداری کا اظہار، ہر چیز اپنی اپنی شان کے لائق اللہ کے سامنے فرمانبرداری کا اظہار کرتی ہے جیسے اس میں صلاحیت ہے، جس کے وہ لائق اور قابل ہے، اور انسانوں کے لائق چونکہ اختیاری سجدہ ہے کہ اللہ کے سامنے جھکیں اور پیشانی رکھیں، تو اس لیے کہا کہ بہت سارے انسان اللہ کو سجدہ کرتے ہیں اور بہت سارے ایسے ہیں جن کے اوپر عذاب ثابت ہو گیا، یعنی تکوینی طور پر اگرچہ سارے انسان مطیع ہیں لیکن اختیاری سجدہ جو انسان کی شان کے لائق ہے وہ بہت سارے کرتے ہیں بہت سارے نہیں کرتے۔ وَمَنْ یُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ: جس کو اللہ تعالیٰ ذلیل کر دے اس کو کوئی عزت دلانے والا نہیں، وہ شخص کہ اللہ اسے ذلیل کر دے یعنی نیکی سے اس کو محروم کر دے، کہ اس کو سجدے کی توفیق نہ ہو۔ ''جس کو اللہ ذلیل کر دے اس کی کوئی عزت کرنے والا نہیں، اس کو کوئی عزت دلانے والا نہیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ کرتا ہے جو چاہتا ہے۔''

''یہ دو فریق ہیں، دو خصم، جھگڑنے والے جنہوں نے جھگڑا کیا اپنے رَبّ کے بارے میں، پس وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، کاٹے جائیں گے ان کے لیے کپڑے آگ کے'' قُطِّعَتْ: جس طرح سے آپ کپڑا سینے کے لیے کاٹا کرتے ہیں تو یہاں قُطِّعَتْ سے یہی مراد ہے کہ ان کے لئے آگ کے کپڑے تیار کیے جائیں گے، قطع کیے جائیں گے ان کے لئے کپڑے آگ کے،

(۱) عن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ انہ قال: اَلْكُفْرُ كُلُّهُمْ مِلَّةٌ وَّاحِدَةٌ. (کتاب الآثار لأبی یوسف، باب فی الفرائض کا آخر ہو وغیرہ)

مطلب یہ ہے کہ جس طرح سے کپڑا آپ کے بدن کو گھیرے ہوئے ہے، محیط ہے، اسی طرح سے ان کے بدنوں کو آگ لپٹی ہوئی ہوگی جس طرح کپڑے لپٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ یُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ: اَلْحَمِيْمُ یہ یُصَبُّ کا نائب فاعل ہے۔ صَبَّ یَصُبُّ: پھینکنا۔ ڈالا جائے گا اُن کے سروں کے اوپر سے گرم پانی، یُصْهَرُ بِهٖ مَا فِيْ بُطُوْنِهِمْ وَالْجُلُوْدُ: صہر کہتے ہیں پگھلا دینے کو۔ جو کچھ ان کے پیٹوں میں ہے اس گرم پانی کے ذریعے سے اس کو پگھلا دیا جائے گا، حدیث شریف میں جیسے تفصیل آتی ہے کہ آنتریاں کٹیں گی، کٹ کے نیچے سے نکلیں گی۔[1] وَالْجُلُوْدُ اور ان کی جلدوں کو پگھلا دیا جائے گا۔ جُلود۔ جِلد کی جمع ہے چمڑے، یعنی بدن کا ظاہری چمڑا اور بدن کے اندر کی چیزیں انتڑیاں ونتڑیاں سب اس گرم پانی کے اثر سے پگھلیں گی، اس طرح سے تکلیف ہوگی۔ وَلَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ: مَقَامِع. مِقْمَع کی جمع ہے، ''قمع'' کا معنی ہوتا ہے توڑ پھوڑ دینا، کہتے ہیں ''فلاں چیز کا قلع قمع کر دیا'' اُردو میں یہ لفظ آیا کرتا ہے، قلع قمع کر دیا، اکھیڑ ڈالی، ریزہ ریزہ کر دی، توڑ پھوڑ کر دی، اس کو کہتے ہیں کہ قلع قمع کر دیا، تو ''قمع'' اصل میں توڑنے پھوڑنے کو کہتے ہیں، تو مِقمع ہو گیا توڑنے پھوڑنے کا آلہ، جس کو آپ ہتھوڑے کے ساتھ تعبیر کر سکتے ہیں کہ جب ہتھوڑے کے ساتھ کسی چیز کو کوٹ دیا جائے تو وہ ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے۔ ''اُن کے لیے لوہے کے ہتھوڑے ہوں گے'' لوہے کی گرزیں۔ مقامع کو اس طرح سمجھ لیجئے کہ جس وقت عمارت بنایا کرتے ہیں تو فرش کو کوٹنے کے لئے جو جھرمٹ ہوتے ہیں جن کے ساتھ کوٹتے ہیں، تو یہ اسی قسم کی چیز ہے۔ یا یہاں حضرتِ شیخ (الہندؒ) نے اس کو ہتھوڑے سے تعبیر کیا ہے، ''بیان القرآن'' میں گرز سے تعبیر کیا ہے، بات ایک ہی ہے، کوٹنے کا آلہ۔ ''اُن کے لیے لوہے کے ہتھوڑے ہوں گے'' یعنی جن کے ساتھ اُن کو کوٹا پیٹا جائے گا۔ كُلَّمَا أَرَادُوْا أَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا: جب کبھی ارادہ کریں گے اس آگ سے نکلنے کا، مِنْ غَمٍّ: گھٹن کی وجہ سے، یعنی جہنم میں ان پر گھٹن طاری ہوگی تو بھاگ کے باہر نکلنا چاہیں گے، اُعِيْدُوْا فِيْهَا: ان کو پھر اسی میں لوٹا دیا جائے گا، یعنی جیسے ایک آدمی تنگ ہوتا ہے، پریشانی کے ساتھ نکل کر بھاگتا ہے دروازوں کی طرف، تو فرشتے دھکے دے کر پیچھے ہٹا دیں گے۔ اور کہا جائے گا (یہاں بھی قِیْلَ کا لفظ محذوف ہے) کہا جائے گا کہ چکھو جلنے کا عذاب، یا جلنے والی آگ کا عذاب۔

''بے شک اللہ تعالیٰ داخل کرے گا ان لوگوں کو جو کہ ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں باغات میں، جاری ہوں گی ان کے نیچے سے نہریں'' يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا: ذھب: سونا۔ اَساوِر. اَسوِرۃ کی جمع ہے، اَسوِرۃ سِوار کی جمع ہے، سِوار کنگن کو کہتے ہیں۔ ان کو جنت میں سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے۔ جس وقت قرآنِ کریم اتر رہا تھا اُس وقت بادشاہی کا دور تھا، ہر طرف بادشاہ ہی بادشاہ تھے، اس زمانے میں مروج تھا کہ یہ بادشاہ لوگ جس وقت اپنی زیب وزینت اختیار کرتے تو تختوں پہ بیٹھتے تھے اور سونے کے زیورات پہنتے تھے، عوام کی عادت نہیں تھی، بادشاہوں کی عادت تھی، تو اللہ تعالیٰ نے انسان کے سامنے جنت کی نعمتوں کا ایسے انداز میں ذکر کیا کہ جتنا اچھے سے اچھا انداز انسان سوچ سکتا ہے۔ اُس زمانے میں یہ بہت شان وشوکت کی چیز سمجھی جاتی تھی، یہ قیصر وکسریٰ وغیرہ جتنے تھے یہ تختوں پہ بیٹھتے، تاج پہنتے، موتی پہنتے، اور اسی طرح سے ہاتھ میں سونے کے کنگن ڈالتے، جس طرح سے آج لوگ سونے کی انگوٹھی ڈالتے ہیں اور اس کے اوپر فخر کرتے ہیں، تو اُس زمانے میں یہ رواج تھا۔

---

(۱) ترمذی، ۲/ ۸۵، باب ما جاء فی صفۃ شراب اھل النار۔ مشکوۃ ۲/ ۵۰۳، باب صفۃ النار فصل ثانی

''پہنائے جائیں گے وہ سونے کے کنگن''، وَلُؤْلُؤًا: لؤلؤ موتی کو کہتے ہیں، اور موتی پہنائے جائیں گے، موتی پہنانے کے مطلب یہ ہے کہ موتیوں کے ہار پہنائے جائیں گے، موتی پہننے کا طریقہ یہی ہوتا ہے، ہار کی شکل میں پرو کے ان کو پہنتے ہیں۔ یُحَلَّوْنَ: عَلٰی تَحْلِیَۃٌ: آراستہ کرنا، زیور پہنانا۔ ''زیور پہنائے جائیں گے وہ سونے کے کنگنوں سے، اور زیور پہنائے جائیں گے وہ موتی'' یعنی موتیوں کے ہار۔ وَلِبَاسُهُمْ فِيهَا حَرِيرٌ: اوران کا لباس اُن باغات میں ریشم ہوگا۔ وَهُدُوٓا إِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ: وہ لوگ ہدایت دیے گئے پاکیزہ بات کی طرف، پاکیزہ بات سے یا تو دنیا میں کلمہ مراد ہے کہ اُن کو ''لا إله إلا الله'' کی توفیق ہوگئی جس کے نتیجے میں یہ نعمتیں مل رہی ہیں۔ یا آخرت میں پاکیزہ کلمات ان کی زبان پر جاری ہوں گے، وقتاً فوقتاً اللہ کی حمد کریں گے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰىنَا لِهٰذَا (سورۂ اعراف: ۴۳)، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ (سورۂ فاطر: ۳۴)، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ (سورۂ زمر: ۷۴) اس قسم کے الفاظ مختلف جگہ آئے ہیں، اور اسی طرح سے جب بھی اللہ کی نعمت ملے گی تو اللہ کا شکر ادا کریں گے، تسبیح کریں، تحمید کریں گے، جہنمیوں کی طرح لعنت پھٹکار میں نہیں لگے ہوئے ہوں گے۔ ''پاکیزہ بات کی طرف راہنمائی کیے گئے'' وَهُدُوٓا إِلَى صِرَاطِ الْحَمِيدِ: اور حمید کے راستے کی طرف وہ راہنمائی کیے گئے۔ حمید اللہ تعالیٰ کا نام ہے، حمید کہتے ہیں جس کی صفت بیان کی گئی ہو، جس کی تعریف کی گئی ہو، یہ لفظ حمد سے لیا گیا ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

ماقبل سے ربط

پچھلے رکوع میں مجادلین کا ذکر آیا تھا جو بغیر علم کے بغیر ہدایت کے بغیر کتاب منیر کے اللہ کے معاملے میں جھگڑا کرتے ہیں، یہ تو تھے جاہل اجڈ قسم کے لوگ، ضدی، اور پکے چٹے کافر، بلکہ پکے کالے کافر، کافر چٹا کیوں ہوگا، کافر کالا ہی ہوگا، یعنی صاف ستھرے کہہ لیجئے جن میں کوئی کسی قسم کی شک شبہ کی بات نہیں، کُفر میں وہ پکے تھے۔ اور دوسرے نمبر پر ذکر کیا جا رہا ہے منافقین کا کہ یہ اللہ کی عبادت کنارے پر کھڑے کرتے ہیں۔

''کنارے پر کھڑے ہوکر'' عبادت کرنے کا مطلب

یہ ایسے ہے جس طرح سے کہیں جہاد اور لڑائی جاری ہو، اور ایک شخص کنارے پر کھڑا ہے، وہ دیکھتا ہے کہ اگر تو اپنی جماعت کی فتح محسوس کرے گا تو برقرار رہے گا، شکست محسوس کرے گا تو بھاگ جائے گا، اس قسم کے آدمیوں کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ کنارے پر کھڑا ہے، کبھی اِدھر کو ہو گیا کبھی اُدھر کو ہو گیا، مُذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ (سورۂ نساء: ۱۴۳) یعنی یہ وہ گروہ تھا کہ جس وقت اسلام کی طاقت اُبھری تو وہ متردد ہو گئے کہ فائدہ ادھر ہے یا اُدھر؟ اگر وہ مسلمانوں کی طرف فائدہ محسوس کرتے تو اِدھر کو ہو جاتے، اور اگر کسی وقت وہ کافروں کی طرف فائدہ محسوس کرتے تو اُدھر کو ہو جاتے، ان کو قرار نہیں تھا، فائدہ

اُٹھانے کے حق میں تھے، اور کوئی کسی قسم کی کلفت اور مشقت اُٹھانے کے حق میں نہیں تھے، نہ یہ کفر کے حق میں مخلص اور نہ اسلام کے حق میں مخلص۔

نفاق عقل مندی نہیں ہے

عقل مند آدمی کا کام یہ ہوا کرتا ہے کہ جو نظریہ اختیار کر لے پھر اس کے اُوپر پکا رہے، چاہے نفع ہو چاہے نقصان ہو، پھر اس میں اللہ کی طرف سے راحت آئے تو اس پر شکر ادا کرے، کوئی آزمائش آ گئی تو اس کو برداشت کرے، اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کردے، جس طرح سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بلکہ صحابہ سے پہلے انبیاء علیہم السلام کے واقعات ہیں، کہ اللہ کے سپرد ہو جانے کے بعد پھر اللہ تعالیٰ پھولوں کی سیج پر لٹا دے تو اس کی مہربانی، اور اگر آزمائش کے طور پر سروں پہ آرا چلوا دے تو اس کی ایک آزمائش ہے، جیسے بھی حالات آئیں گے برداشت کرنے پڑیں گے، جیسے صحابہ اور صحابہ سے پہلے انبیاء کے ساتھ راحت کے واقعات بھی پیش آئے، مصیبت کے بھی پیش آئے۔ لیکن یہ متردِّدین کا گروہ ایسا تھا جو اپنے مفاد کو دیکھتا تھا، کنارے پر کھڑے ہیں، اِدھر مفاد محسوس کرتے ہیں تو اِدھر کو ہو جاتے ہیں، اُدھر مفاد محسوس کرتے ہیں تو اُدھر کو ہو جاتے ہیں، مُذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ دونوں حالتوں کے درمیان میں متردد ہیں، نہ پورے اِدھر ہیں نہ پورے اُدھر، ان کو دوغلے یا دورُخے کہہ لیجئے۔ اور ان کا حال کیا ہے؟ کہ اگر ان کو خیر پہنچ جائے پھر تو مطمئن ہو جاتے ہیں خیر کی وجہ سے، اور اگر ان کو کوئی آزمائش پہنچ جائے تو منہ اٹھا کے بھاگ جاتے ہیں، اِنْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ کا یہ معنی ہے، منہ کے بَل لوٹ جاتے ہیں، "منہ کے بَل لوٹنے" کا مطلب یہ ہوتا ہے جس کو ہم اپنی زبان میں کہتے ہیں کہ منہ اٹھا کے چل دیتے ہیں، پھر یہ پرواہ ہی نہیں کرتے کہ ہمارا کسی سے تعلق ہے یا نہیں، بھاگ جاتے ہیں۔

منافق دنیا و آخرت میں خسارے میں ہے

خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ: ایسا شخص دنیا اور آخرت میں خسارے میں ہے، دنیا اور آخرت میں اس کا خسارہ واضح ہے کہ آزمائش پیش آ گئی فتنہ پیش آ گیا، یہ تو دنیا میں تکلیف پہنچ گئی، اور منہ اٹھا کے چل دیا، ہدایت سے محروم ہو گیا تو آخرت کا بھی خسارہ ہو گیا۔ اور اس قسم کے آدمی جو ہوا کرتے ہیں جو تکلیف پہنچنے کے وقت منہ اٹھا کے چل دیں، نفع کے وقت میں چوکڑی مار کے بیٹھ جائیں، اس قسم کے لوگ دنیا میں ویسے بھی لوگوں کی نگاہ میں ذلیل ہو جاتے ہیں، یہ دنیا کا خسارہ ہے، اور آخرت میں تو اللہ تعالیٰ نے خبر دے ہی دی کہ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (سورۂ نساء: ۱۴۵) یہ جہنم کے نچلے طبقے میں جائیں گے، اور یہ بہت بڑا خسارہ ہے کہ ایک آدمی دنیا میں بھی برباد ہو جائے اور آخرت میں بھی برباد ہو جائے۔ تو ایسے مفاد پرست جو ہوا کرتے ہیں، دنیا و آخرت کی ناکامی ان کے پلے پڑتی ہے، یہ کامیابی کا راستہ نہیں ہوا کرتا۔ اور پھر کتنے افسوس کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش آئی تو وہاں سے تو بھاگا، اور مبتلا ہو گیا جا کے شرک میں، تو اللہ کو چھوڑ کے ایسی چیزوں کو پکارنے لگ گیا جو نہ اس کے نفع کا اختیار رکھتی ہیں نہ نقصان کا اختیار رکھتی ہیں، کتنی بڑی گمراہی ہے، یعنی اگر اللہ کو چھوڑ کے کسی ایسے کے دامن میں جاتا جو اللہ کی طرح اختیار رکھتا، اور اس کا کام بنا سکتا، وہ جو سمجھا کہ یہاں تو کام بنتا نہیں، پھر بھاگ کے گیا تو کسی ایسے کے پاس جائے جس کے پاس کام

بنانے کی قوت تو ہو، لیکن یہ بھاگا، اور جا کے پڑ گیا پتھروں کے سامنے جن کے اندر اپنے منہ سے مکھی ہٹانے کی طاقت نہیں ہے، تو وہاں جا کے یہ کیا نفع حاصل کر لے گا، اس سے زیادہ بدتمیزی اور گمراہی کیا ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے بھاگے اور پتھروں کے سامنے جا گرے، یہ تو اور زیادہ خسارے کی طرف جانا ہو گیا، یا تو کوئی ایسی ہستی تلاش کرتے جو ان کا کام بناتی، یہ جو سمجھتے ہیں کہ اللہ سے تو کام بنا نہیں، اللہ کی اطاعت اور عبادت کے ساتھ تو ہمارا کام بنا نہیں، اب ہم کسی اور کو تلاش کریں جو ہمارا کام بنا دے، اور یہ جا گرے ان کے سامنے جن کے اندر کچھ بھی طاقت نہیں، اس لیے اس کو ضلال بعید قرار دیا کہ یہ بہت دور بھٹک گئے، کہاں چلے گئے۔ پھر اگر دیکھیں تو ان (بتوں) سے نقصان پہنچنے کا تو احتمال ہے، نفع کی توقع نہیں ہے، نقصان بایں طور کہ یہ نقصان پہنچنے کا سبب بنیں گے، جب انسان شرک میں مبتلا ہو جائے گا تو اللہ کی گرفت میں آ جائے گا، تو بت انسان کے لیے ضرر کا باعث تو ہو سکتے ہیں، نفع کا تو محض وہم ہی وہم ہے، نفع ان سے کیا حاصل ہونا ہے، اس لیے فرمایا کہ یہ پکارتے ہیں اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیز کو کہ جو ان کو نقصان نہیں پہنچا سکتی اور جو ان کو نفع نہیں دے سکتی، یعنی اس کو کچھ اختیار نہیں، اور یہ بہت دور کی گمراہی ہے، یعنی یہ اللہ کو چھوڑ کے ایسی چیزوں کی طرف بھاگ گئے، اور ایسی چیزوں کو پکارنے لگ گئے جن کا نقصان اقرب ہے، اقرب بایں معنی کہ یہ نقصان پہنچنے کا سبب بن سکتے ہیں، بخلاف نفع کے کہ نفع کا محض وہم ہی وہم ہے، مشرک کو اس شرک کی وجہ سے نقصان تو پہنچے گا، باقی! وہ جو نفع کی توقع لیے بیٹھا ہے تو یہ وہم ہے، تو ضرر اقرب ہے نفع کے مقابلے میں، تو یہ مولا بھی بُرا جس کو انہوں نے اختیار کیا، اور کارساز سمجھا تو وہ بھی بُرا، اور اس کو اپنا ساتھی اور رفیق بنایا تو وہ بھی بُرا۔ دوست ہونے کی حیثیت میں بھی بُرا، کارساز ہونے کی حیثیت میں بھی بُرا، اس کے اندر اچھائی کا کوئی پہلو نہیں ہے۔

منافق کی ایک عجیب مثال

تو یہ مذمت ہو گئی ان لوگوں کی جو کہ دلی طور پر اسلامی نظریے پر مطمئن نہیں ہیں، اپنا مفاد دیکھتے ہیں، منہ ایک طرف کو کیا ہوا ہے تو ہاتھ دوسری طرف کو بڑھایا ہوا ہے، اور اُدھر کو منہ کر لیا تو ہاتھ اِدھر کو بڑھا لیا، نہ تعلق اِن سے توڑنا ہے نہ اُن سے توڑنا ہے، ہر وقت اپنے مفاد کو سامنے رکھنا ہے، اور یہی بدترین قسم کا نفاق ہوتا ہے کہ انسان کسی نظریے پر پکا نہ ہو، بس اپنے مطلب پرستی اور مفاد پرستی میں ہر وقت لگا رہے، اسی لیے سرورِ کائنات ﷺ نے منافق کی مثال شہوتی بکری کے ساتھ دی ہے، یعنی وہ بکری جس کی شہوت اُبھری ہوئی ہو، کبھی بکرے کی تلاش میں اِس ریوڑ کی طرف دوڑتی ہے، کبھی اس ریوڑ کی طرف دوڑتی ہے،(۱) ایسا ہی حال ان منافقوں کا ہوتا ہے کہ ان کو تو نفع چاہیے مفاد چاہیے، چاہے کسی حالت میں ملے۔ انسان کا کمال یہی ہوا کرتا ہے کہ جس نظریہ کو قبول کرے اس میں مخلص ہو جائے اندر اور باہر دونوں طرح سے۔ ''سرمد'' ایک شاعر گزرے ہیں ہندوستان میں، ان کے دو شعر مشہور ہیں فارسی میں اسی مضمون کو اَدا کرنے کے لیے:

---

(۱) مَثَلُ الْمُنَافِقِ كَمَثَلِ الشَّاةِ الْعَائِرَةِ الخ (مسلم ج۲ ص۳۷۰، کتاب صفات المنافقین کا آخر۔ مشکوۃ ص۱۷ باب الکبائر فصل اول۔ مفہوم ''مرقاۃ'' میں دیکھیں)

سرمد! گلہ اختصار می باید کرد | یک کار ازیں دو کار می باید کرد
یا تن برضائے دوست می باید داد | یا قطع نظر ز یار می باید کرد

اے سرمد! شکوہ شکایت کو مختصر کر دینا چاہیے، اور دو کاموں میں سے ایک کام کرنا چاہیے، یا تو اپنا بدن دوست کی رضا میں دے دو، جس طرح سے دوست چاہے کرے، یا پھر دوست سے بالکل ہی قطع نظر کر لینی چاہیے۔ یہ کیا کہ جس وقت نفع کی، یا لذت کی بات ہو تو دوست کے ساتھ دوستی ہے، اور جہاں کوئی تکلیف اور آزمائش کی بات آئی تو چھوڑ کے چل دیے، ایسی بات اچھی نہیں۔

آگے مخلصین کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ مخلصین کو کیسی جزا دیں گے۔ منافقین کا خسران تو اوپر آ گیا، جو دل سے مخلص نہیں ہیں ان کا خسران تو واضح ہو گیا، آگے مخلصین کی جزا کا ذکر ہے۔ اس میں کوئی نئی بات نہیں ہے، عام طور پر آپ سنتے رہتے ہیں۔ "بے شک اللہ داخل کرے گا ان لوگوں کو جو ایمان لے آئے اور انہوں نے نیک عمل کیے، باغات میں جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں، بے شک اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے۔"

حضور ﷺ کی نصرت جاری رہے گی، اور دشمن جلتا رہے گا

اگلی آیت کا ترجمہ آپ کی خدمت میں عرض کر دیا، جس میں خصوصیت کے ساتھ سرورِ کائنات ﷺ کی نصرت کا ذکر ہے کہ مشرکین اگر اس بات پہ چڑتے ہیں کہ ان کو دن بدن یہ نصرت کیوں حاصل ہوتی ہے؟ تو یہ نصرت کو روکنے کے لئے اگر کوئی تدبیر کر سکتے ہیں تو کر لیں، یعنی یہ نہیں کر سکتے۔ جب تک اللہ کی وحی آتی رہے گی یہ نبی ہیں، اللہ کی وحی کا سلسلہ جب تک ان کے ساتھ قائم ہے یہ نبی ہیں، تو اللہ کی نصرت بھی رہے گی۔ اگر تمہارے بس میں ہے تو جاؤ، آسمان پر چڑھو، جا کے وحی کا سلسلہ منقطع کر آؤ، اور پھر دیکھو کہ تمہاری کوئی تدبیر اس چیز کو ختم کر دے گی جو تمہیں غصہ چڑھا رہی ہے؟ مطلب یہ ہے کہ تمہارے بس کی بات نہیں، اللہ کی نصرت ان کے ساتھ شامل رہے گی، تم اپنے غصے میں مرتے ہو تو مرتے رہو، جلتے ہو تو جلتے رہو، یہ اس کا مفہوم ہے، اس آیت کا ترجمہ میں نے اچھی طرح سے کر دیا تھا۔ "جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہرگز مدد نہیں کرے گا اپنے اس رسول کی دنیا میں اور آخرت میں، اسے چاہیے کہ رسی پھیلا لے آسمان تک پھر جا کے وحی کا سلسلہ منقطع کر دے، پھر دیکھے کہ کیا اس کی یہ تدبیر لے جائے گی اس چیز کو جو اس کو غصہ چڑھاتی ہے؟ اور ایسے ہی ہم نے اس قرآن کو واضح آیات کے طور پر اتارا۔ اور بے شک اللہ تعالیٰ ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے۔"

مؤمنوں اور کافروں کا تذکرہ

آگے انہی دو گروہوں کا ذکر آ گیا، ایک مؤمنین کا اور ایک کافروں کا۔ کافروں کے گروہ کے اندر یہ پانچ ذکر کر دیے گئے: یہودی، صابی، نصرانی، مجوسی، مشرک، کیونکہ اسلام کے مقابلے میں سب ایک ہی ہیں، دنیا کے اندر دلیل کے ساتھ فیصلہ کر دیا گیا، لیکن اگر دلیل کے ساتھ یہ لوگ نہیں مانتے تو قیامت کے دن عملی فیصلہ ہو جائے گا، جب فیصلے کا ذکر قیامت کے دن کے متعلق ہوتا ہے تو اس سے عملی فیصلہ مراد ہوتا ہے، عملی فیصلے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مؤمنین مخلصین کو اچھی حالت میں کر دے گا، جنت

میں چلے جائیں گے، اور کافر سارے کے سارے جہنم میں چلے جائیں گے، تو عملاً فیصلہ ہو جائے گا کہ یہ ٹھیک ہیں، یہ غلط۔ ورنہ دلیل کے ساتھ فیصلہ تو دنیا میں بھی ہوتا ہے۔

ہر چیز میں شعور ہے

آگے پھر انسان کو کچھ تفکر و تدبر کی طرف متوجہ کیا ہے کہ کائنات کی چیزوں میں غور کرو، جو کچھ ہے سب اللہ کے حکم کے تابع ہے جو اس کی شان کے لائق ہے، نباتات ہوں پتھر ہوں، اگرچہ یہ اپنی زبان جو ان کی ہے اللہ کی تسبیح تحمید کرتے ہیں، ہمیں محسوس نہیں ہوتا، آپ کے سامنے سورۂ بنی اسرائیل میں گزرا تھا تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ۚ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ (آیت: ۴۴) جو چیز بھی زمین آسمان میں موجود ہے وہ اللہ کی تسبیح کرتی ہے، لیکن تم اس کی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو، اور حدیث شریف میں بھی آتا ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ کے زمانے میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب ہم آپ ﷺ کے ساتھ کھانا کھاتے تو کھانے کی تسبیح ہم اپنے کانوں سے سنا کرتے تھے کہ کھانا بھی ''سبحان اللہ، سبحان اللہ'' پڑھ رہا ہے،[1] تو یہ انکشاف جو بعض واقعات میں ہوتا ہے یہ علامت ہے اس بات کی کہ یہ چیزیں بھی کسی درجے میں حیات اور شعور رکھتی ہیں جس کی بنا پر وہ اللہ کی حمد و ثنا کرتی ہیں، مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی معنی کی طرف اشارہ کیا:

باد و خاک و آب و آتش بندہ اند ۔۔۔ با من و تو مردہ، با حق زندہ اند

کہ یہ ہوا ہے، مٹی ہے، پانی ہے، آگ ہے، یہ سب بندہ ہیں، میرے اور تیرے ساتھ تو یہ ایسے ہیں جیسے یہ بے جان ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کا تعلق ایسے ہی ہے جیسے زندہ چیز کا ہوتا ہے، اس لیے یہ احکام کی اطاعت کرتی ہیں، جس طرح سے اللہ کا حکم آتا ہے اسی طرح سے ہو جاتی ہیں، يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا، تو اللہ کے احکام آتے ہیں اور یہ چیزیں ان کو تسلیم کرتی ہیں، تو جیسے ان کی شان کے لائق ہے وہ اطاعت اور بندگی کا اظہار کرتی ہیں، سورج چاند کا ذکر اس لیے کر دیا کہ بعض لوگ ان کی بھی عبادت کرتے ہیں، اور اسی طرح چوپایوں اور درختوں کو خاص طور پر ذکر کر دیا، ''مَا'' پہلے عام تھا۔

آیت میں اِنسان کی تقسیم ''تشریعی اَحکام'' کے اِعتبار سے ہے

اور انسانوں کے متعلق کہا کہ بہت سے ایسے ہیں جو اللہ کو سجدہ کرتے ہیں، یعنی جس قسم کی اطاعت اور عبادت انسان کی شان کے لائق ہے وہ بعض کرتے ہیں اور بعض نہیں کرتے۔ باقی! تکوینی انقیاد تو ہر انسان کرتا ہے کہ اللہ کے احکام دو قسم کے ہیں، بعض ایسے ہیں جو آپ کے اختیار میں دے دیے گئے، اور بعض ایسے ہیں جو آپ کے اختیار میں نہیں، ان میں کُن فیکون والا قصہ ہوتا ہے، ان کو تکوینی احکام کہتے ہیں، مثلاً اللہ تمہیں کہے کہ مر جاؤ، تم مر جاؤ گے، اللہ نے تمہیں زندہ ہونے کے لئے کہا، تم زندہ ہو گئے، بیماری کے لیے اللہ کا حکم آتا ہے، تم بیمار ہو جاتے ہو، اور اسی طرح سے دوسرے تصرفات جن میں انسان کا کوئی اختیار نہیں، تکوینی احکام، ان میں تو انسان بھی تابع ہے، چاہے کافر ہو چاہے مسلمان ہو، لیکن دوسرے احکام جن کو احکام تشریعی کہا جاتا ہے،

---

(۱) بخاری، ج ۱ ص ۵۰۵ باب علامات النبوۃ مشکوۃ ج ۲ ص ۵۳۸ باب فی المعجزات، فصل اول۔ ولفظہ: وَلَقَدْ كُنَّا نَسْمَعُ تَسْبِيْحَ الطَّعَامِ وَهُوَ يُؤْكَلُ

شرعی احکام جن کے قبول کرنے نہ کرنے کا انسان کو امتحان کے طور پر اختیار دے دیا گیا ہے، ان احکام کو بہت سارے لوگ قبول کرتے ہیں اور بہت سارے قبول نہیں کرتے، تو یہاں انسان کی جو تقسیم کی گئی ہے کہ بعض سجدہ کرتے ہیں اور بعض نہیں کرتے، یہ اَحکامِ اِختیاریہ کے اعتبار سے ہے، ورنہ تکوینی اَحکام میں کسی کا اختیار نہیں، کافر ہو مسلم ہو، ہر ایک اللہ کے اَحکام کا تابع ہے، جہاں اللہ کی طرف سے کُن ہوا، تو فَیَکُون وہ کام ہو کے رہتا ہے، کسی کے چاہنے نہ چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ تو یہ تقسیم اَحکامِ اِختیاریہ کے اِعتبار سے ہے۔

''توحید'' میں عزّت ہی عزّت، اور ''شرک'' میں ذِلّت ہی ذِلّت ہے

اور آگے فرمادیا کہ اللہ کی اطاعت کرنا ہی عزت ہے، یہی انسان کے لئے اعزاز ہے، اگر اللہ تعالیٰ کسی کو اس عزت سے محروم کردے، اور اسے بے قدر اور ذلیل کردے تو کوئی اس کو عزت دلانے والا نہیں، اور اللہ جو چاہے کرتا ہے۔ اس لیے اللہ کی عبادت کر کے انسان کو محسوس کرنا چاہیے کہ اس میں عزت ہے، ایک اللہ کے سامنے جھکنے کا نتیجہ یہ ہے کہ ساری کائنات سے جان چھوٹتی ہے، اور جو لوگ اللہ کے سامنے نہیں جھکتے، پتا نہیں وہ کس کس چیز کے سامنے ماتھے ٹیکتے پھرتے ہیں اور کہاں کہاں ذلیل ہوتے پھرتے ہیں۔ اور جس کو اللہ کے سامنے جھکنے کی توفیق ہوگئی وہ ہر چیز سے مستغنی ہوگیا، ہر جگہ وہ عزت پا گیا۔ درختوں کو جا کے سجدے کرتے ہیں، جانوروں کو سجدے کرتے ہیں، پتھروں کو کرتے ہیں، پانی کو کرتے ہیں، آگ کو کرتے ہیں، کہاں کہاں انسانیت ذلیل ہوتی پھرتی ہے، حتیٰ کہ سانپوں کو لوگوں نے معبود بنایا، جب معبود بنانے پہ آئے کس کس چیز کو معبود نہیں بنایا، آپ سُن کے حیران ہوں گے کہ مشرکوں کا ایک فرقہ ایسا بھی ہے جو مرد اور عورت کے اعضائے تناسل کی پُوجا کرتا ہے، اور ان کو سجدہ کرتے ہیں، ان کی تصویریں بنا کے سامنے رکھ کے پُوجتے ہیں، کہتے ہیں کہ انہوں نے ہمیں پیدا کیا ہے، تو جب انسان بھٹکنے لگتا ہے تو کہاں تک جاتا ہے! تو ایک اللہ کو چھوڑا، کائنات کی ہر چیز کے سامنے ذلیل ہو گئے، سورج کے سامنے ذلیل، چاند کے سامنے ذلیل، درختوں کے سامنے ذلیل، جانوروں کے سامنے ذلیل، یہ گائے کو پُوجنے والے تو آپ نے دیکھے ہی ہوں گے، اسی طرح سے ابھی پچھلے دِنوں ہندوؤں کے ایک فرقے کا ذِکر اخبار میں آیا ہوا تھا کہ جو ناگوں کی پُوجا کرتے ہیں، سانپ کو پُوجتے ہیں، ''نوائے وقت'' میں آیا ہوا تھا، اور اس میں فوٹو بھی دیے ہوئے تھے، تو ایک اللہ کا در چھوڑ کے انسان در بدر ذلیل ہوتا ہے، اور اگر ایک اللہ کے سامنے جھکنے کی توفیق ہو جائے تو ساری کائنات سے جان چھوٹتی ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کی عبادت توحید کے رنگ میں جتنی عزت انسان کو دلاتی ہے دنیا کی کوئی چیز اتنی عزت نہیں دلاتی، اور جو اس سے محروم ہوگیا وہ ذلیل ہوگیا ''جس کو اللہ ذلیل کردے اس کو کوئی عزت دلانے والا نہیں، اللہ جو چاہے کرتا ہے اس کو کوئی پوچھنے والا نہیں'' مطلب یہ ہے کہ جو کرتا ہے خود مختار ہو کے کرتا ہے۔

''کافروں'' کا اُخروی اَنجام

اور یہ دونوں گروہ جن کا ذکر آیا، ایک مؤمنین کا گروہ، ایک کافروں کا، کہ یہ اپنے رَبّ کے بارے میں جھگڑا کرتے ہیں،

تو یہ جو پیچھے آیا تھا کہ قیامت کے دن اللہ عملی فیصلہ کرے گا، اس کی اگلی آیات میں تفصیل ہے کہ وہ فیصلہ یہ ہوگا، کافروں کے ساتھ یہ معاملہ ہوگا، مؤمنوں کے ساتھ یہ معاملہ ہوگا، دیکھنے والے دیکھ لیں گے کہ اچھا کون تھا، بُرا کون تھا، حق پہ کون تھا، باطل کون تھا تو ان آیات میں اُس عملی فیصلے کی تفصیل ہے۔ کافروں کے لئے آگ کے کپڑے کاٹے جائیں گے، ان کے سروں پر گرم پانی ڈالا جائے گا، اس پانی کے ذریعہ سے جو کچھ ان کے پیٹوں میں ہوگا اس کو گلا دیا جائے گا، اور چمڑوں کو گلا دیا جائے گا، اور لوہے کی گرزوں کے ساتھ ان کو پیٹا جائے گا، جس طرح سے آپ جانوروں کو کہیں روکے ہوئے ہوں، کوئی جانور نکل کے بھاگنا چاہے تو آپ اس کے ڈنڈا مارتے ہیں، اسی طرح سے فرشتوں کے ہاتھ میں یہ گرزیں ہوں گی، یہ ہتھوڑے ہوں گے، اور ان کے ذریعے سے اِن کو پیٹیں گے، ''جب کبھی ارادہ کریں گے اس سے نکلنے کا گھٹن کی وجہ سے''، یعنی تنگ آ گئے، وہاں سے بھاگنا چاہتے ہیں بے اختیاری کے ساتھ، ''تو اسی آگ میں ان کو لوٹا دیا جائے گا، اور یہ کہا جائے گا کہ جلنے والی آگ کا مزہ چکھو۔''

''فاسق مؤمنین'' کے اُخروی اَنجام کی تفصیل

اور آگے دوسرے فریق کی جزا آ گئی، کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے داخل کرے گا باغات میں کہ جن کے نیچے سے نہریں چل رہی ہوں گی...... جہاں بھی اچھی جزا کا ذکر آتا ہے وہاں ایمان کے ساتھ عملِ صالح بھی مذکور ہوتا ہے، جس سے معلوم ہو گیا کہ ایمان میں چمک، ایمان میں نُور، ایمان میں شان اگر پیدا ہوتی ہے تو اَعمالِ صالحہ کے ساتھ ہی پیدا ہوتی ہے، تو اگر ایمان کے ساتھ اَعمالِ صالحہ ہوئے تو اللہ کی طرف سے جزا کا وعدہ ہے، اب درمیان میں ایک تیسری شق نکل آئی، ایک تو ہے کہ انسان مؤمن ہی نہ ہو، اور ایک ہے کہ مؤمن صالح ہو، ان دونوں کی جزا تو واضح ہو گئی، اب ایک تیسری شق نکل آئی کہ مؤمن ہے لیکن عمل صالح نہیں، اس کا ذکر قرآنِ کریم میں نہیں ہے، احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے لیے اِبتداءً نجات کا وعدہ نہیں، اِبتداءً نجات کا وعدہ انہی لوگوں کے ساتھ ہے جو ایمان کے ساتھ عمل صالح بھی رکھتے ہیں، تو یہ تیسری شق والے لوگ جہنم میں جائیں گے، جانے کے بعد اپنے گناہوں کی سزا بھگت کے آخر کار بخشے جائیں گے، جس کے پاس ایمان ہوگا وہ دائمی جہنمی نہیں ہے، البتہ اِبتداءً نجات کا وعدہ نہیں ہے، اس لفظ کو یاد رکھئے! ویسے اللہ اپنے فضل سے معاف فرما دے تو ابتداءً بھی معاف فرما سکتا ہے، یہ اس کے اختیار میں ہے، کُفر کو تو اللہ نے معاف کرنا نہیں، اس کے متعلق تو صاف جواب دے دیا، تو جس کے پاس ایمان ہے اور عملِ صالح نہیں ہے اس کا معاملہ بین بین ہے، ہوسکتا ہے کہ اللہ اسے معاف کر دیں اور اس کی جان اِبتداءً ہی چھوٹ جائے، سزا نہ ہو، ورنہ قاعدے کا تقاضا یہی ہے کہ یہ جہنم میں جائیں گے لیکن ایمان کی برکت سے آخر کار نکل آئیں گے، چاہے کسی کی سفارش سے، چاہے جیسے بھی ہو، بہر حال یہ دائمی جہنمی نہیں ہیں، تو وہ بین بین والا درجہ یہاں مذکور نہیں ہے۔

''اَعمالِ صالحہ'' کے بغیر ''اِیمان'' کی حیثیت

جن کے ساتھ وعدہ ذکر کیا جا رہا ہے وہ وہی ہیں جو ایمان کے ساتھ اعمالِ صالحہ بھی رکھتے ہوں، جہاں بھی اچھی جزا کا ذکر

آتا ہے ایمان کے ساتھ عملِ صالح کا بھی ذکر آتا ہے، تو عملِ صالح کے بغیر ایمان بےنور ہے، یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ انسان تو ہے، زندہ تو ہے، سانس تو اس کو آتا ہے، لیکن نہ ٹانگیں کام کی، نہ ہاتھ کام کے، نہ آنکھیں کام کی، نہ کان کام کے، اب ایک اندھا بہرا لنگڑا لولا، بس ایک وجود پڑا ہوا ہے، سانس اس کو آتا ہے، یہ ایک انسان تو ہے لیکن یہ کیا انسان ہے، تو جس وقت ایمان کے ساتھ اعمالِ صالحہ نہ ہوں وہ ایسا ہی لنگڑا لولا ایمان ہوگا، اگرچہ اس کو ایمان تو کہیں گے لیکن بالکل ناقص ناکارہ، اور تنزیلُ الناقص منزلۃَ المعدوم کے اُصول سے کہہ سکتے ہیں کہ ایمان ہے ہی نہیں۔ لا ایمانَ لِمن لا امانۃَ لہ، جو امانت دار نہیں اس کا کیا ایمان ہے؟ لا دینَ لِمن لا عھدَ لہ، جو اپنے عہد کا پابند نہیں اس کا کیا دِین ہے؟ یعنی وہ ایسے ہے جیسے اس کا کوئی دِین ہی نہیں ہے، تو تنزیلُ الناقص منزلۃَ المعدوم کے اُصول سے سرے سے نفی بھی کردی جاتی ہے۔

''نیک مؤمنین'' کا اَنجام

آگے ان کے زیورات کا ذکر آگیا کہ ان کو سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے، موتیوں کے ہار پہنائے جائیں گے، موتی پہنانے کا مطلب یہ ہے کہ ہار کی شکل میں پہنائے جائیں گے، ان کا لباس ریشمی ہوگا۔ اس زمانے میں عیاش سے عیاش لوگ جن کو دنیا کے اندر اللہ نے راحت آرام انتہائی دیا ہوا تھا، جیسے بادشاہ قسم کے لوگ، ان کا حلیہ، لباس، شکل ایسی ہی ہوتی تھی جو یہاں ذِکر کی جارہی ہے، اور انسان کو وہی چیز سمجھائی جاسکتی ہے جو کچھ نہ کچھ وہ جانتا ہے، باقی! جنّت کے ریشم کی دنیا کے ریشم سے کوئی نسبت نہیں، جنّت کی نعمتوں کی دنیا کی نعمتوں سے کوئی نسبت نہیں، اگر ایسے لفظ بول دیے جاتے جن کو آپ جانتے پہچانتے نہیں تو ان کا سمجھنا آپ کے لئے مشکل ہوجاتا۔ اب یہ کیلا ہوگیا، بیر ہوگئے، اس قسم کی دوسری نعمتیں ہوگئیں، تو جو نعمتیں انسان جانتا ہے، پہچانتا ہے انہی ناموں کے ساتھ ہی ترغیب دی گئی ہے۔ تو لباس اچھے سے اچھا اس وقت یہی سمجھا جاتا تھا جیسے ریشم کا ہوتا ہے، زینت اچھی سے اچھی یہی سمجھی جاتی تھی کہ سونے کے زیور ہوں موتیوں کے ہار ہوں، تو اللہ تعالیٰ نے انہی الفاظ کے ساتھ آپ کو سمجھایا، حاصل یہی ہے کہ جنّت میں انتہائی درجے کی راحت آرائش زیبائش ہوگی، جتنا آپ سوچ سکتے ہیں اس سے بھی زائد۔

''راہنمائی کی گئی ان کی پاکیزہ بات کی طرف'' یا تو جنّت میں پاکیزہ بات ان کی زبان پر جاری ہوگی، ہر وقت اللہ کی حمد، شکر، جیسے میں نے آیات پڑھ کے آپ کو سنائیں، اور یہ اللہ کے راستے کی طرف ہدایت دے دیے گئے، یعنی دنیا میں ان کو سیدھے راستے پر چلنے کی توفیق ہوئی، اور آخرت میں بھی یہ جنّت میں پہنچے۔ یا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں ان کو اچھی بات کی ہدایت ہوگئی، یعنی کلمہ نصیب ہوگیا، اور اللہ تعالیٰ کے راستے کی طرف یہ چلادیے گئے، جس کے نتیجے میں یہ آخرت میں جنّت میں پہنچ گئے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِیْ

بے شک وہ لوگ جنہوں نے کُفر کیا اور وہ روکتے ہیں اللہ کے راستے سے اور مسجدِ حرام سے، ایسی مسجدِ حرام جس کو

جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ ِ الْعَاكِفُ فِیْهِ وَ الْبَادِ ؕ وَ مَنْ یُّرِدْ فِیْهِ

بنایا ہم نے لوگوں کے لئے اس حال میں کہ برابر ہے اس میں وہاں کا رہنے والا اور باہر سے آنے والا، اور جو شخص ارادہ کرے اس میں

بِاِلْحَادٍۭ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ﴿۲۵﴾ وَ اِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِیْمَ مَكَانَ الْبَیْتِ

کج روی کا اس حال میں کہ وہ شخص ظلم سے متلبس ہو، ہم اُس کو چکھائیں گے دردناک عذاب ﴿۲۵﴾ اور جب ہم نے ابراہیم کو ٹھہرایا بیت اللہ کی جگہ

اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِیْ شَیْـًٔا وَّ طَهِّرْ بَیْتِیَ لِلطَّآىِٕفِیْنَ وَ الْقَآىِٕمِیْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۲۶﴾

کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا اور پاک صاف رکھ میرے گھر کو طواف کرنے والوں کے لئے اور قیام اور رکوع سجدہ کرنے والوں کے لئے ﴿۲۶﴾

وَ اَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّ عَلٰی كُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ

اور اعلان کردے لوگوں میں حج کا، آئیں گے لوگ تیرے پاس پیدل چلتے ہوئے اور ہر لاغر اُونٹنی پر، آئیں گی وہ اُونٹنیاں ہر دُور کے

عَمِیْقٍ ﴿۲۷﴾ لِّیَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَ یَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِیْۤ اَیَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰی مَا

راستے سے ﴿۲۷﴾ تاکہ وہ لوگ حاضر ہوجائیں اپنے منافع کو اور یاد کریں اللہ کا نام چند معلوم دِنوں میں ان مخصوص چوپایوں پر

رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِیْمَةِ الْاَنْعَامِ ۚ فَكُلُوْا مِنْهَا وَ اَطْعِمُوا الْبَآىِٕسَ الْفَقِیْرَ ﴿۲۸﴾ ثُمَّ لْیَقْضُوْا

جو اللہ نے انہیں دیے ہیں، پھر کھاؤ ان مخصوص چوپایوں سے اور کھلاؤ بدحال محتاج کو ﴿۲۸﴾ پھر لوگوں کو چاہیے کہ اپنی میل کچیل

تَفَثَهُمْ وَ لْیُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَ لْیَطَّوَّفُوْا بِالْبَیْتِ الْعَتِیْقِ ﴿۲۹﴾ ذٰلِكَ ۗ وَ مَنْ یُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ

دُور کریں، اور اپنی نذریں پوری کریں اور طواف کریں بیتِ عتیق کا ﴿۲۹﴾ یہ بات تو ہو چکی اور جو کوئی تعظیم کرے گا اللہ کی حرمتوں کی

فَهُوَ خَیْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ؕ وَ اُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا یُتْلٰی عَلَیْكُمْ

پس وہ اس کے لئے بہتر ہے اس کے رَبّ کے نزدیک، اور حلال کردیے گئے تمہارے لئے مخصوص چوپائے مگر جو پڑھے جاتے ہیں تم پر

فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَ اجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ﴿۳۰﴾ حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَیْرَ

پس بچو تم پلیدی سے یعنی بتوں سے اور بچو تم جھوٹی بات سے ﴿۳۰﴾ اس حال میں کہ اللہ کے لئے مخلص ہونے والے ہو، اس کے ساتھ

مُشْرِكِيْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ

شریک ٹھہرانے والے نہ ہو، اور جو کوئی شخص اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتا ہے گویا کہ وہ آسمان سے گر گیا پھر پرندے اس کو اُچکتے ہیں یا

تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ﴿۳۱﴾ ذٰلِكَ ۗ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى

گرا دیتی ہے اس کو ہوا کسی دُور کی جگہ میں ﴿۳۱﴾ یہ بات بھی ہو چکی اور جو کوئی تعظیم کرتا ہے اللہ کے شعائر کی پس بے شک یہ دل کے

الْقُلُوْبِ ﴿۳۲﴾ لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴿۳۳﴾

ڈرنے کی وجہ سے ہے ﴿۳۲﴾ تمہارے لئے ان حیوانات میں منافع ہیں ایک معین مدت تک پھر ان کے حلال ہونے کی جگہ بیتِ عتیق کی طرف ہے ﴿۳۳﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: بے شک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور وہ اللہ کے راستے سے روکتے ہیں، وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ: اس کا عطف سَبِيْلِ اللّٰهِ پر ہے۔ اور مسجد حرام سے روکتے ہیں، الَّذِيْ جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ یہ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کی صفت ہے۔ ایسی مسجد حرام جس کو ہم نے لوگوں کے لئے بنایا، سَوَآءَ ۨالْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ: الْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ یہ دونوں مل کر سَوَآءً کا فاعل ہیں، اور سَوَآءً یہ جَعَلْنٰهُ کے مفعول سے حال واقع ہو رہا ہے۔ عاکف کا معنی جم کے بیٹھنے والا، پہلے بھی یہ لفظ آیا تھا اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ (سورۂ انبیاء: ۵۲) اور سورۂ اعراف میں آیا تھا: يَّعْكُفُوْنَ عَلٰٓى اَصْنَامٍ لَّهُمْ (آیت: ۱۳۸) اور الْبَادِ اصل میں تھا الْبَادِيْ، آخر سے یاء گری ہوئی ہے، یہ داعی کی طرح ہے، یہ لفظ بَدْو سے لیا گیا ہے، شہر سے باہر والی جگہ جس کو آپ جنگل سے تعبیر کرتے ہیں، بَدَوِيّ اسی سے بنا ہے، جس کا مصدر بَدَاوَة آتا ہے، دیہاتی زندگی اختیار کرنا، جنگلی زندگی اختیار کرنا، تو یہاں عاکف سے مراد ہے مکہ معظمہ کا رہنے والا باشندہ، اور بادی سے مراد ہے باہر سے آنے والا۔ ''بنایا ہم نے اس مسجد کو لوگوں کے لیے اس حال میں کہ برابر ہے اس مسجد میں وہاں کا مقیم اور باہر سے آنے والا'' یعنی سب کا حق برابر ہے، وہاں کے رہنے والے جس طرح سے وہاں عبادت کر سکتے ہیں، باہر سے آنے والے بھی عبادت کر سکتے ہیں، اس میں کوئی فرق نہیں کہ یہ شہری ہے، یہ جنگلی ہے، یہ عربی ہے، یہ عجمی ہے، یہ وہاں کا ہے، یہ باہر کا ہے، کوئی فرق نہیں، مسجد سب کے لیے برابر ہے۔ ''برابر ہے اس مسجد میں عاکف اور بادی'' وہاں کا رہنے والا باشندہ، اور باہر سے آنے والا، شہری دیہاتی، شہری جنگلی، عربی عجمی، سب اس میں آ گئے۔ وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍ: جو کوئی شخص ارادہ کرے اس مسجد حرام میں اِلحاد کا۔ اِلحاد باب افعال کا مصدر ہے، اَلْحَدَ اِلْحَادً: کج روی اختیار کرنا، سیدھے راستے سے ایک طرف کو ہٹ جانا۔ مُلْتَحَدًا کا لفظ بابِ افتعال سے قرآنِ کریم میں آیا ہوا ہے، ایک طرف ہٹنے کی جگہ (سورۂ کہف: ۲۷، وغیرہ)۔ اور یہ جو''لحد'' آپ قبر میں کھودا کرتے ہیں وہ بھی اسی سے ہی ہے، وہ بھی ایک طرف کو ہٹی ہوئی ہوتی ہے۔ ''جو ارادہ کرے اس مسجد حرام میں الحاد کا'' یعنی کج روی کا، سیدھے راستے سے ہٹ جانے کا، جس میں ہر معصیت آ گئی، بِظُلْمٍ: اس حال میں کہ وہ شخص

ظلم سے متلبس ہو، ظلم والا حال اس پہ طاری ہے، تو ظلم کا لفظ بڑھانے سے یا تو یہ مقصد ہے کہ شرک کے ساتھ بھی متلبس ہے، ظلم کا مصداق شرک بھی ہوسکتا ہے، اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (سورۂ لقمان: ۱۳) جو ارادہ کرے اِلحاد کا اس حال میں کہ وہ متلبس ہے شرک کے ساتھ۔ اور ظلم عام بھی مراد ہوسکتا ہے۔ نُذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ: ہم اس کو چکھائیں گے دردناک عذاب۔ شروع میں جو لفظ آئے تھے اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا، تو اِنَّ کی آگے خبر مذکور نہیں ہے، مَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍۢ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ یہ جملہ پورا ہے۔ اور اِنَّ کی خبر مذکور نہیں ہے، تو اس کی خبر آپ یوں محذوف نکال سکتے ہیں کہ وَالْبَادِ کے بعد يُعَذَّبُوْنَ کا لفظ محذوف نکال لیجئے، مابعد والا جملہ اس کے اوپر دال ہے۔ جو ایسے لوگ ہیں وہ عذاب دیے جائیں گے، ''جو کُفر کرتے ہیں، اللہ کے راستے سے اور مسجدِ حرام سے روکتے ہیں وہ عذاب دیے جائیں گے۔'' یا خبر نکال لیں هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ایسے لوگ بڑے ظالم ہیں۔ اور اگلا جملہ اس پر دلالت کرے گا کہ جو بھی ظلم کرتا ہوا اس میں کوئی کجروی کا ارادہ کرے گا ہم اسے دردناک عذاب دیں گے، اس طرح سے بات پوری ہوجائے گی۔ اور مسجدِ حرام سے خاص وہی حصہ مراد نہیں جو نماز پڑھنے کے لیے استعمال ہوتا ہے بلکہ اس سے اشارہ سارے حرم کی طرف ہے، ان اَحکام میں سارا حرم ایک ہی ہے، حرم تو کئی میلوں تک پھیلا ہوا ہے، مسجدِ حرام اس میں سے ایک خاص حصہ ہے، مکہ شہر سارا حرم میں ہے، اور اس سے بھی کئی کئی میل باہر تک حرم کی حدود ہے۔ وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ: بَوَّاَ: ٹھکانا دینا، کسی کو کسی جگہ ٹکانا۔ قابلِ ذکر ہے وہ وقت جب ہم نے ابراہیم کو ٹھہرایا بیت اللہ کی جگہ، جب ہم نے ابراہیم کو بیت اللہ کے مکان میں ٹھہرایا، وہ جگہ ابراہیم علیہ السلام کے لیے واضح کی، اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا: اَمَرْنَا، قِيْلَ، قُلْنَا، جس طرح سے یہ لفظ محذوف ہوا کرتے ہیں ویسے یہاں ہے۔ ہم نے اسے حکم دیا، ہم نے اسے کہا کہ لَا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا: میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا۔ وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ: اور پاک صاف رکھ میرے گھر کو۔ عربی میں تو اَمر کا صیغہ ایک ہی طرح آتا ہے، اور اس کے مفہوم دونوں ہوتے ہیں ایجادِ فعل یا ابقائے فعل، جیسے بیٹھے ہوئے آدمی کو ہم کہتے ہیں ''قُمْ'' اس کا معنی ہے کہ اُٹھ کے کھڑے ہوجاؤ، یہ ایجادِ فعل ہے، اور ایک آدمی کھڑا ہے اور ہم اسے کہتے ہیں ''قُمْ'' تو اس کا معنی ہوتا ہے کھڑا رہ، یہ ابقائے فعل ہے، اردو میں ہمارے ہاں ''رکھنا'' کا لفظ جو ہم ساتھ بولتے ہیں، یہ اس فعل کو باقی رکھنے کے مفہوم میں ہے۔ اگر طَهِّرْ کا ترجمہ یوں کریں کہ میرے گھر کو پاک کر، تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا، اشارہ اس بات کی طرف ہوگا، کہ گویا کہ وہ پہلے پاک نہیں تھا اب اسے پاک کرو، اور ایک اس کا ترجمہ ہے کہ میرے گھر کو پاک صاف رکھو، جس کا مطلب یہ ہوا کہ جیسے پہلے پاک صاف ہے آئندہ بھی اس کو آلودہ نہ ہونے دینا، تو یہاں وہی اِبقائے فعل اور دوامِ فعل والی بات ہے، اس لیے ترجمہ میں یوں کررہا ہوں ''پاک صاف رکھو میرے گھر کو'' یعنی جیسے یہ اب تک پاک صاف ہے، اور اس میں کسی قسم کی ظاہری اور باطنی نجاست نہیں آئی (نجاستِ ظاہری سے مراد ظاہری آلودگی، اور نجاستِ باطنی سے مراد شرک وغیرہ) ایسے ہی اس کو پاک صاف رکھو طواف کرنے والوں کے لئے اور نماز پڑھنے والوں کے لئے، نماز پڑھنے والوں کو ذکر کردیا الْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ کے ساتھ، قیام کرنے والے، رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے۔ وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ: اَذَّنَ: اعلان کرنا۔ اور اعلان کردے لوگوں میں حج کا، يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ: رِجَالًا: راجل کی جمع ہے بمعنی پیدل۔ ضامر کہتے ہیں لاغر کو، جو سفر کی مشقت سے لاغر ہوگئی ہو، اونٹنی ہو، گھوڑی ہو، جو جانور بھی ہو۔ فج کہتے ہیں پہاڑی راستے کو۔ عمیق عُمق سے لیا گیا ہے بمعنی گہرا ہونا، اصل

میں تو اس کا مطلب ہے کہ جس میں گہرائی کی طرف بعد پیدا ہو جائے، لیکن بعد میں مطلق بعید کے معنی میں آ گیا۔ آئیں گے لوگ تیرے پاس پیدل چلتے ہوئے اور ہر لاغر اونٹنی پر، آئیں گی وہ اونٹنیاں ہر دُور کے پہاڑی راستے سے۔ پھر ''فج'' بھی عام راستے کے لیے بولا جاتا ہے، ''دُور دُور کے راستوں سے جو زیادہ چلنے کی وجہ سے گہرے ہو گئے ہوں گے'' یہ آپ نے دیکھا ہوگا، جن سڑکوں پر آمدورفت زیادہ ہوتی ہے، اب تو پکی سڑکیں بن جاتی ہیں ان میں تو ایسی بات نہیں، جو کچی سڑکیں ہیں پرانے زمانے کی جن کے اوپر آمدورفت ہوتی ہے تو اردگرد کی زمین سے وہ بہت گہری ہو جاتی ہیں، کثرت سے چلنے کی وجہ سے سڑک نیچی ہو جاتی ہے، وہاں سے مٹی اڑتی ہے کچھ ادھر کو چلی گئی، کچھ ادھر کو چلی گئی، پرانی سڑکوں کو آپ جا کے دیکھیں گے تو وہ بہت گہری ہیں، جب نئی سڑکیں بنائی جاتی ہیں تو ان میں بہت مٹی ڈالنی پڑتی ہے، اور ان کو اونچا کر کے بناتے ہیں، تو فج عمیق کا یہی معنی ہے، جس میں اشارہ ہے کہ آمدورفت اس میں کثرت سے ہوگی، دُور دُور سے لوگ آئیں گے، اور ان کے چلنے کی وجہ سے ان راستوں کے اندر گہرائی پیدا ہو جائے گی۔ آمدورفت اتنی کثرت سے ہوگی کہ مکہ کی طرف آنے والے راستے زیادہ آمدورفت کی وجہ سے گہرے ہو جائیں گے۔

لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ: تا کہ وہ لوگ حاضر ہو جائیں اپنے منافع کو، اپنے منافع پر پہنچ جائیں، منافع مَنْفَعَة کی جمع۔ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ: اور یاد کریں اللہ کا نام، ذِکر کریں اللہ کا نام چند معلوم دِنوں میں، عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ: مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ یہ مَا کا بیان ہے، بہیمہ: عام ہے چوپائے کو کہتے ہیں، اور اَنعام: خاص قسم کے چوپائے ہیں جن کی قربانی دی جاتی ہے، بھیڑ، بکری، گائے، بھینس، اونٹ، ان کے لیے اَنعام کا لفظ بولا جاتا ہے۔ اس لیے بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ کا ترجمہ کریں گے، خاص چوپائے، کیونکہ ہر چوپائے کی قربانی نہیں دی جاتی۔ تا کہ ذِکر کریں اللہ کا نام چند معلوم دِنوں میں مخصوص مویشیوں پر جو اللہ نے انہیں دیے ہیں، مخصوص چوپایوں پر جو اللہ نے انہیں دیے ہیں، مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ یہ ''مَا'' کے ساتھ اکٹھا ہو گیا۔ فَكُلُوْا مِنْهَا: پھر کھاؤ ان مویشیوں سے، ان مخصوص چوپایوں سے، یعنی خود بھی کھاؤ۔ وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ: بائس: بُؤس میں پڑنے والا، تختی میں پڑنے والا۔ فقیر: محتاج۔ اور کھلاؤ تختی میں پڑنے والے محتاج کو، بدحال محتاج کو۔ خود بھی کھاؤ اور ان کو بھی کھلاؤ۔ ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ: تفث کہتے ہیں میل کچیل کو۔ پھر لوگوں کو چاہیے کہ اپنی میل کچیل دُور کریں، وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ: اور چاہیے کہ اپنی نذریں پوری کریں۔ ''میل کچیل دُور کرنے'' کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح سے حج میں آپ پڑھتے ہیں کہ قربانی کرنے کے بعد پھر انسان سر منڈاتا ہے، نہاتا ہے، اِحرام کھولتا ہے، سلے ہوئے کپڑے پہنتا ہے، جس وقت تک اِحرام باقی ہے اس وقت تک انسان بال نہیں منڈواتا، اور اسی طرح سے صابن کے ساتھ نہاتا نہیں، میل نہیں اتارتا، آدمی حج کے دنوں میں میلا کچیلا ایسے ہو جاتا ہے جیسے ملنگ ہو، تو قربانی سے فارغ ہونے کے بعد پھر صفائی کی جاتی ہے، اور یہی مقصود ہے کہ حج میں انسان فقیرانہ جائے، اور اس کی حالت دیکھ کے معلوم ہو جیسے کوئی عاشق کسی کی تلاش میں سرگشتہ اور حیران پھر رہا ہے، یہ عاشقانہ حرکات ہیں ساری کی ساری جو حج میں کی جاتی ہیں، کبھی اس میدان کی طرف بھاگ گئے، کبھی اس پہاڑ کی طرف بھاگ گئے، بس ایسے ہی بھاگے پھرتے ہیں دیوانوں کی طرح، نہ کپڑے کی خبر، نہ نہانے کی، نہ بال سنوارنے کی، نہ کسی اور چیز کی، یہ ساری کی ساری کیفیت عاشقانہ ہوتی ہے۔ ''تو چاہیے کہ دُور کریں اپنی میل کچیل کو، اور چاہیے کہ پوری کریں اپنی نذریں'' اگر کوئی نذر مانی ہوئی ہے تو پوری کریں، یا نذور سے مطلقاً واجبات

مراد ہیں جو احکام ذمے لگے ہوئے ہیں، واجبات کو پورا کریں، وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ: قربانی سے فارغ ہونے کے بعد پھر ''طوافِ زیارت'' کیا جاتا ہے، یہاں وہی ''طوافِ زیارت'' مراد ہے۔ اور چاہیے کہ طواف کریں بیتِ عتیق کا۔ عتیق: پرانا، قدیم، یا اس کا معنی ہے آزاد کیا ہوا۔ پرانے گھر کا طواف کریں، کیونکہ بیت اللہ یہی قدیم گھر ہے اللہ تعالیٰ کا، اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ (سورۂ آل عمران:۹۶) عبادت کے طور پر سب سے پہلے گھر جو بنایا گیا وہ وہی ہے جو مکہ معظمہ میں ہے، تو یہ بیتِ قدیم ہے۔ یا ''بیتِ عتیق'' کا معنی ہے بیتِ مامون، جو آزاد کردہ ہے، اس کے اوپر کوئی ظالم کوئی جابر حملہ کر کے اس کو نیست و نابود نہیں کر سکتا، زبردستی اس پر قبضہ نہیں کر سکتا، مامون گھر۔ ذٰلِكَ: یہ بات تو تم نے سُن لی، یا اس بات کو یاد رکھو، یہ مبتدأ ہے، اس کی خبر محذوف ہے، الأمر ذالك یہ بات تو ہو چکی، یہ بات تو ہو گئی، اس بات کو تو آپ سُن چکے، وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ: اور جو کوئی تعظیم کرے گا اللہ کی حرمتوں کی، حرمات، حرمة کی جمع، قابلِ احترام چیزیں۔ اللہ تعالیٰ کی قابلِ احترام چیزوں کی جو شخص تعظیم کرے گا، فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ: پس وہ اس کے لئے بہتر ہے اس کے رَبّ کے نزدیک۔ وَاُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ: اَنعام خاص چوپائے ہیں، چند مخصوص چوپایوں کو کہتے ہیں، جو گھروں میں پالے جاتے ہیں بھیڑ بکری گائے اونٹ وغیرہ۔ اور حلال کر دیے گئے تمہارے لیے چوپائے اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ: مگر جو پڑھے جاتے ہیں تم پر، یعنی ان چوپایوں میں سے جو تم پہ پڑھے جاتے ہیں ان کو چھوڑ کے۔ ''پڑھے جاتے ہیں'' یعنی مختلف آیات میں آپ کے سامنے آ چکے، سورۂ اَنعام میں بھی اس کا ذکر آیا تھا، سورۂ مائدہ میں بھی ذکر آیا تھا حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ، کہ میتہ اگرچہ اَنعام میں سے ہو وہ حلال نہیں ہے، خون چاہے ان اَنعام کا ہی ہو وہ حلال نہیں ہے، اور مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ چاہے ان چوپایوں میں سے ہی ہو وہ حلال نہیں ہے، تو یہ جو قرآنِ کریم میں پڑھ کے سنا دیے گئے ان کو چھوڑ کر باقی تمہارے لیے حلال ہیں، اور کچھ تفصیل سورۂ مائدہ میں آئی تھی، گلا گھونٹ کے مرنے والا جانور، جس کو درندے پھاڑ جائیں، بلندی سے گر کے مر جائے، منخنقه، متردیه یہ ساری تفصیل اس میں ہے، ''مگر جو تم پڑھے جاتے ہیں'' یعنی ان کے علاوہ باقی چوپائے حلال ہیں۔ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ: مِنَ الْاَوْثَانِ یہ بیان ہے الرِّجْسَ کا۔ بچو تم پلیدی سے یعنی بتوں سے، بتوں کی پلیدی سے بچو، شرک سے بچو، شرک نجاست ہے، رجس ہے، بچو تم بتوں کی پلیدی سے، وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ اور بچو تم جھوٹی بات سے۔ قولِ زور: جھوٹی بات، عام جھوٹ کو بھی کہتے ہیں، اور جھوٹی گواہی دی جائے وہ بھی اس کا مصداق ہے، اور یہ جو شرک کی باتیں ہیں یہ بھی سب اِفتراء علی اللہ ہے، حَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ (سورۂ اَنعام:۱۴۰) اللہ پر اِفترا کرتے ہوئے انہوں نے مختلف چیزوں کو حرام ٹھہرا لیا، یہ سب جھوٹ ہے جھوٹ ہی جھوٹ ہے، قَوْلَ الزُّوْرِ سب کو شامل ہے، ''بچو جھوٹی بات سے'' حُنَفَآءَ لِلّٰهِ: یہ حنیف کی جمع ہے۔ اس حال میں کہ اللہ کے لئے مخلص ہونے والے ہو، سب کی طرف سے ہٹ کے اللہ کے لیے یکسو ہونے والے ہو، غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ: اس حال میں کہ اس کے ساتھ شریک ٹھہرانے والے نہیں۔ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ: اور جو کوئی شخص اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتا ہے فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ گویا کہ وہ آسمان سے گر گیا، فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ: پھر پرندے اس کو اُچکتے ہیں، خطف کا معنی ہوتا ہے جس طرح پرندہ جھپٹ کر کسی چیز کو لے جاتا ہے، اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ: مکانِ سحیق: مکانِ بعید، سُحق دُور ہونے کو کہتے ہیں۔ یا گرا دیتی ہے اس کو ہوا کسی دُور کی جگہ میں، جیسے ہوا کا جھکڑ آیا اور اس کو دھکا دے کے کسی گہرے کھڈ میں گرا دیا، ذٰلِكَ:

یہ بات بھی ہو چکی، وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآىِٕرَ اللّٰهِ: شعائر، شعیرۃ کی جمع ہے ''شعیرہ'' علامت کو کہتے ہیں، وہ علامات جو دین کے لیے متعین کی گئی ہیں وہ سب ''شعائر'' ہیں، جیسے صفا مروہ، بیت اللہ اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کے دین کی جو خاص خاص علامات ہیں۔ ''جو کوئی تعظیم کرتا ہے اللہ کے شعائر کی، اللہ کی متعین کی ہوئی علامات کی'' فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ: پس بے شک یہ دل کے ڈرنے کی وجہ سے ہے، یعنی شعائر اللہ کی تعظیم دل میں تقویٰ کی وجہ سے ہے، دل میں خوف ہو تو صحیح تعظیم ہوتی ہے، اگر دل میں تقویٰ نہیں تو صحیح تعظیم نہیں ہوتی، یعنی اللہ کے شعائر کی تعظیم کرنا یہ تقویٰ کی علامت ہے۔ لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى: تمہارے لیے ان حیوانات میں منافع ہیں ایک وقت معین تک، یعنی گھروں میں یہ جو چوپائے رکھے ہوئے ہیں ان سے تم فائدہ اٹھا سکتے ہو، دُودھ پی سکتے ہو، سواری کر سکتے ہو، اور بھی ان سے کام لے سکتے ہو، جب تک کہ ان کو باقاعدہ ہدی نہ بنایا جائے، اور جب ہدی بنا دی جائے پھر اس سے منافع نہیں لینے چاہئیں، اِلَّا بضرورۃٍ شدیدۃٍ، سواری ہدی پر جائز ہے، لیکن بہت سخت ضرورت کے وقت میں، تو اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى سے یہی مراد ہے کہ ایک وقت تک تم ان سے منافع اُٹھا سکتے ہو جب تک کہ ان کو باقاعدہ قربانی کے لیے یا ہدی کے طور پر متعین نہ کیا جائے۔ ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ: مَحِلّ: حلال ہونے کی جگہ۔ پھر ان کے حلال ہونے کی جگہ بیتِ عتیق کی طرف ہے، یعنی پھر ان کو بیتِ عتیق کی طرف لے جا کر حلال کرنا چاہیے، ذبح کرنا چاہیے۔ تو اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ کا مفہوم یہ ہو جائے گا کہ ہدی کے جانور حرم میں ہی ذبح کیے جا سکتے ہیں، کسی اور جگہ ذبح نہیں کیے جا سکتے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

ماقبل سے ربط

پیچھے دو گروہوں کا آپس میں اختصام اور جھگڑنے کا ذکر تھا، جس میں ایک گروہ تو مؤمنین کا تھا اور دوسرا گروہ کُفار کا۔ کُفار میں پانچ طبقے ذِکر کیے گئے تھے: یہودی، صابی، نصرانی، مجوس، اور مشرکین۔ اب خصوصیت کے ساتھ ایک جھگڑا جو مشرکین کے ساتھ تھا اس کو ذکر کر کے مشرکین کی مذمت کرتے ہیں۔

مشرکینِ مکہ کا ''ملتِ اِبراہیمی'' سے کوئی تعلق نہیں

وہ جھگڑا یہ تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کی تعمیر کروائی، یہ بیت اللہ کی جگہ پہلے سے متعین تھی، لیکن طوفانِ نوح میں اور اس طرح سے مختلف حوادثات میں مٹی وغیرہ پڑ کے دَب گئی تھی، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس جگہ کو نمایاں کیا، نمایاں کرنے کے بعد یہاں اپنا گھر بنوایا، اور لوگوں کو اعلان کروایا کہ آئیں اور اس کا حج کریں، اور اللہ نے فرمایا جب تم اعلان کرو گے تو اللہ تعالیٰ یہ آواز ہر جگہ پہنچا دے گا، تو لوگ سنیں گے اور سننے کے بعد بیت اللہ کی طرف بھاگے ہوئے آئیں

گے، پیدل بھی آئیں گے، سواریوں پر بھی آئیں گے، اور اتنے دور دراز راستے سے آئیں گے کہ سفر کرتے ہوئے ان کی سواریاں بھی لاغر ہوجائیں گی، اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ کثرت سے آئیں گے، بہت دور دراز علاقے سے آئیں گے، پیدل بھی آئیں گے، سواریوں پر بھی آئیں گے۔ اور اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا کہ اس گھر کو طواف کرنے والوں کے لئے اور نماز پڑھنے والوں کے لئے صاف ستھرا رکھنا ہے، اور اس کو سب لوگوں کے لئے عام قرار دیا تھا، سب لوگوں کو آوازیں دے دے کے بلایا تھا کہ آؤ، یہ اللہ کے گھر ہے، اس میں آ کے عبادت کرو، اب یہ مشرکین مکہ اپنے آپ کو کہتے تو ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا وارث، لیکن اس وراثت میں انہوں نے اتنی گڑبڑ مچا رکھی ہے کہ جن مقاصد کے لیے بیت اللہ کو بنایا گیا تھا وہ سب انہوں نے ختم کر دیے، بیت اللہ تو اس لیے بنایا گیا تھا کہ اس میں آ کر لوگ عبادت کریں، اور جہاں سے چاہیں آئیں، اور یہ روکتے ہیں، کسی کو آنے نہیں دیتے، خاص طور پر اہل اسلام کے لئے تو انہوں نے پابندی لگا رکھی تھی، جو وہاں رہتے تھے ان کو بھی مار مار کے بھگا دیا، سختی کر کے نکلنے پہ مجبور کر دیا، اور باہر سے جب آنا چاہتے تھے تو ان کو آنے نہیں دیتے تھے، جیسے حدیبیہ کے مقام میں حضور ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو روک لیا گیا تھا۔ اب آگے ان کی مذمت ہے کہ یہ نااہل وارث ہیں، اب یہ وراثت ان سے چھن جانی چاہیے، چونکہ انہوں نے ان حقوق کی رعایت نہیں رکھی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے اس بیت اللہ کے لیے متعین کیے گئے تھے۔ یہ ملحد ہیں، بے دین ہیں، شرک کا ارتکاب کرتے ہوئے اس میں بے دینی اختیار کیے ہوئے ہیں، کہاں تو اعلان کر کر کے لوگوں کو بلایا تھا کہ آؤ، اللہ کے گھر کا حج کرو، کہاں یہ لوگوں کو آنے نہیں دیتے اور روکتے ہیں، تو ان کی ان خباثتوں کی طرف اشارہ ہے، اور پھر بیت اللہ سے متعلق بعض احکام جو حج میں ادا کیے جاتے ہیں کچھ ان احکام کی تفصیل ہے، یہ ہے مضمون جو اس رکوع میں آپ کے سامنے آیا، پہلے تو وہی مذمت ہے اس گروہ کی جو اللہ کے راستے سے روکتے تھے، گویا کہ خصمان جن کا ذکر آیا تھا، ان میں سے ایک خصم، ایک فریق جھگڑنے والا، ان کا اعلیٰ فرد مشرکین، جو اَلَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا کا مصداق تھے، ان کا جو مسلمانوں کے ساتھ جھگڑا تھا کہ مسلمانوں کو بیت اللہ کے پاس نہیں آنے دیتے تھے، عبادت نہیں کرنے دیتے تھے، آگے ان کے لیے وعید ہے۔

بے شک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا یعنی جو کافر ہیں، اور اللہ کے راستے سے روکتے ہیں اور مسجد حرام سے روکتے ہیں، مسجد حرام ذکر کر کے سارا حرم مراد ہے، حالانکہ اس مسجد حرام کا تو مقام یہ ہے کہ اس میں باہر سے آنے والے، وہاں کے رہنے والے، شہری، بدو، دیہاتی، جتنے ہیں سب برابر کا حق رکھتے ہیں، کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ روکے، جو چاہے اس میں آ کے عبادت کر سکتا ہے، تو وہاں سے ان کو روکنے کا حق کس طرح سے حاصل ہو جائے گا؟ اور جو بھی اس مسجد حرام میں یعنی پورے حرم میں، کسی بے دینی کا ارادہ کرے، ظلم کا اِرتکاب کرتا ہوا، تو ہم اس کو سخت عذاب دیں گے۔ تو یہ روکنے والے بھی ظالم ہیں، یہ بھی کج رو ہیں، یہ بھی عذاب دیے جائیں گے، اس لیے خبر "مُعَذَّبُوْنَ" نکال لی جائے گی۔ یا خبر یوں نکال لیں کہ ایسا کرنے والے ظالم ہیں جنہوں نے بیت اللہ کے حقوق تلف کر دیے، اور لوگوں کو بھی ان کے حقِ عبادت سے محروم کر دیا، جب یہ ظالم ٹھہرے تو جو بھی ظالم ہوگا ہم اس کو عذاب الیم دیں گے۔ تو دونوں طرح سے مفہوم ہو گیا۔

''بیت اللہ'' کی تاریخ اور آداب

آگے بیت اللہ کی اس تاریخ کی طرف اشارہ ہے جس میں اس کا مقام واضح ہوتا ہے، اور یہ لوگ اپنے آپ کو ابراہیم علیہ السلام کی طرف منسوب کرتے تھے، اور واقعہ بھی یہی ہے کہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے، اسی وجہ سے اپنے آپ کو بیت اللہ کا مجاور اور بیت اللہ کا متولی قرار دیے ہوئے تھے، تو ان کو بتایا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بیت اللہ جو تعمیر کروایا تھا، تو کن مقاصد کے لئے تعمیر کروایا تھا، اور تم نے وہ مقاصد کس طرح سے ضائع کر دیے۔ بَوَّاْنَا کا معنی آپ کے سامنے ذکر کر دیا کہ ہم نے جگہ دی ابراہیم علیہ السلام کو بیت کی جگہ پر، ٹھہرایا ہم نے، اس میں تجرید کرلی جائے گی۔ ''ہم نے ٹھہرایا ابراہیم علیہ السلام کو بیت کی جگہ میں، یہ کہتے ہوئے'' یعنی ساتھ اس کو حکم یہ دیا تھا، اور پہلا حکم یہ تھا کہ دیکھو! میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرانا، اور مشرکینِ مکہ اسی کی مخالفت کیے بیٹھے ہیں، اور ''بیت اللہ کو صاف ستھرا رکھنا'' یعنی اس میں کوئی کفر و شرک کی حرکت نہ ہونے پائے، ظاہری نجاست بھی اس میں کوئی نہ آئے، اور معنوی نجاست بھی نہ ہو، ''طواف کرنے والوں کے لئے، قیام کرنے والوں کے لئے، رکوع سجدہ کرنے والوں کے لئے۔''

ابراہیم علیہ السلام کو اعلانِ حج کا حکم

اور یہ اعلان کروایا تھا لوگوں میں کہ آؤ، اللہ کے گھر کا حج کرو، اللہ نے حکم دیا تھا کہ حج کا اعلان کر دو، چنانچہ جس وقت یہ حکم آیا ہے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جبلِ اَبی قُبَیس پر چڑھ کے...... یہ پہاڑ حرم شریف کے متصل ہے اور بہت اونچا ہے، یہ جو فوٹو آیا کرتے ہیں ان میں ایک طرف کو یہ پہاڑ نمایاں ہے یعنی اب بھی جو مسجدِ حرام بنی ہوئی ہے اور اس کے منارے، ان سے بھی زیادہ بلندی ہے اس کی، اور اس کی چوٹی کے اوپر ایک مسجد بنی ہوئی ہے جس کو آج کل لوگ ''مسجدِ بلال'' کہتے ہیں، اور اصل بات یہ ہے کہ وہ ''مسجدِ بلال'' نہیں بلکہ ''مسجدِ ہلال'' ہے، کہ اس پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم چاند دیکھا کرتے تھے، اس لیے اس کو ''مسجدِ ہلال'' کہتے ہیں، اس کے اُوپر بہت زیادہ آبادی تھی، اب سنا ہے کہ وہ آبادی ہٹا دی گئی، اور شاہ خالد نے وہاں اپنا محل بنوالیا ہے...... اللہ کی طرف سے جس وقت یہ حکم آیا کہ لوگوں میں حج کا اعلان کرو، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام اس پہاڑ پر چڑھ گئے، ''ابوقبیس'' اس پہاڑ کا نام ہے، آس پاس کے پہاڑوں سے وہ سب سے زیادہ اونچا ہے، تو اس کے اوپر چڑھ کے اعلان کیا کہ اے لوگو! اللہ کا گھر بن گیا ہے، اور اس کے حج کے لئے آؤ، تو روایات میں آتا ہے (اس کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا معجزہ کہیں گے، اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اظہار ہے) کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آواز ہر جگہ پہنچا دی (عام تفاسیر)۔

جدید ایجادات نے بہت سارے حقائق نمایاں کر دیے ہیں

اور اس زمانے میں یہ چیز لوگوں کے لئے باعثِ تعجب ہوگی کہ ایک جگہ آدمی بولے اور ساری دنیا میں آواز کیسے گونج سکتی ہے؟ لیکن آج کل کوئی تعجب نہیں ہے، امریکا میں ایک آدمی بیٹھ کے بات کرتا ہے اور ہم یہاں بیٹھے ہوئے سنتے ہیں، لندن میں

بی بی سی والے بولتے ہیں اور ساری دنیا کے لوگ اپنے اپنے گھروں میں بیٹھے ہوئے سنتے ہیں، تو جیسے آج ان اسبابِ ظاہرہ کے ساتھ ایک جگہ کی بات دنیا کے ہر کونے میں پہنچادی گئی تو اسی طرح سے محض اللہ کی قدرت کے ساتھ بغیر اسباب کے جو کام ہوا کرتا ہے اس کو معجزہ کہتے ہیں، اب اتنی بات تو ہوگئی کہ واقعی ایک جگہ کی آواز ساری دنیا میں پہنچ سکتی ہے، کسی نے اس ذریعے سے پہنچادی، کسی نے روحانی قوت کے ساتھ اللہ کے اعجاز کے ساتھ پہنچادی، بہرحال امکان ثابت ہوگیا، اب یہ نہیں کہہ سکتے کہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک آدمی مکہ معظمہ میں بولے اور ساری دنیا آواز سن لے؟ آج کل کی ایجادات نے بہت سارے حقائق نمایاں کردیے، جو پہلے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آسکتے تھے، وہ محض ایمان بالغیب کے طور پر مانتے تھے، ان میں ایمان کی قوت تھی، ان کو کسی مثال کی ضرورت نہیں تھی، نظیر کی ضرورت نہیں تھی کہ کوئی نظیر واضح کی جائے تو پھر مانیں گے، وہ اپنی ایمانی قوت کے ساتھ مانتے تھے، اور اب جیسے جیسے زمانہ دور چلا گیا، ایمانی قوت کم ہوگئی، تو اللہ تعالیٰ نے اس کو سمجھانے کے لیے کتنی مثالیں نمایاں کردیں......

اب قرآنِ کریم میں آتا ہے، حدیث شریف میں واضح ہے کہ قیامت کے دن انسان کے اعضا بولیں گے، پرانے زمانے میں جب یہ بات آئی تو لوگوں نے کہا کہ اٰمَنَّا وَصَدَّقْنَا، ٹھیک ہے، جب اللہ کہتا ہے تو یقینی بات ہے بولیں گے، کیسے بولیں گے، ہمیں سمجھ میں نہیں آتی تو کوئی بات نہیں، کوئی ملحد کوئی دہریہ کوئی بے دین کہتا کہ کیسے بولیں گے؟ بولنے کے لیے تو زبان چاہیے ان کو تو زبان ہی نہیں، تو یہ کیسے بولیں گے؟ وہ یہ اشکال کرتا۔ لیکن اب تو صبح شام رات دن بے زبان چیزوں کو بھی بولتا ہوا دیکھتے ہیں، اسی طرح ٹیپ ریکارڈ میں جو کچھ بھرا ہوا ہے یہ بولتی ہے اور سب باتیں بتاتی ہے، کیا اس کی کوئی زبان ہے؟ یہ ایک فیتہ ہی تو ہے، اسی میں سب کچھ آگیا، تو اگر انسان اللہ کی دی ہوئی عقل اور سمجھ کے ساتھ ایک مسالے کے فیتے میں ساری آوازیں بند کردے، تو کیا اللہ کو قدرت نہیں کہ ہاتھ کے چمڑے میں سب کچھ بند کردے، اس فیتے میں اور اس میں کیا فرق ہے؟ جس طرح سے میری آواز اب ریکارڈ ہوتی جارہی ہے، جس وقت آپ اس کو اُلٹا چلائیں گے، تو ایک ایک لفظ پورے کا پورا موجود ہے، کیا مجال ہے کہ ایک لفظ آگے پیچھے ہوجائے، سارے کا سارا سامنے آجائے گا، تو اسی طرح جو کچھ اس (بدن) نے زندگی بھر کیا ہے اس میں ریکارڈ ہوتا جارہا ہے، تو یہ بھی اسی طرح سے سب کچھ بتائے گا کہ میرے ساتھ یہ کیا تھا، یہ کیا تھا۔ یہ اُنگلیاں بولیں گی کہ ہمارے ساتھ یہ تسبیح پڑھا کرتا تھا، یہی اُنگلیاں بولیں گی کہ ہمارے ساتھ یہ جیب تراشی کیا کرتا تھا، جو کچھ ہوگا بولتی چلی جائیں گی۔ تو اب بے جان چیزیں بولنے لگ گئیں، زبان کی ضرورت ہی نہیں رہی، تو اسی طرح سے انسان کا چمڑا بولے گا، انسان کے اعضاء بولیں گے، تو اس میں کیا اشکال ہے؟ کوئی اشکال نہیں، ان مثالوں نے آکے بات واضح کردی، کیمرے نے آکے واضح کردیا کہ آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے اس میں سب کچھ محفوظ ہے، یہ آنکھ بھی ایک کیمرہ ہے، جو کچھ اس کے سامنے گزرتا جارہا ہے اس کا عکس آتا چلا جارہا ہے، یہ علیحدہ بات ہے کہ تمہیں سمجھ میں نہیں آتا، لیکن جس دن آپ کے سامنے یہ بات آئے گی اور آپ انکار کریں گے کہ ہم نے تو ادھر آنکھ نہیں اُٹھائی تھی، تو اللہ تعالیٰ یہی بنی بنائی فلم آپ کے سامنے سے گزاردے گا، کہ دیکھ! تیری آنکھ نے یہ کچھ کیا تھا، یہ سب کچھ آنکھ میں محفوظ ہے۔ اور یہ زمین جو ہے اس میں بھی یہی اخذ کی قوت ہے، جو کچھ اس کے اوپر آپ کررہے ہیں، جو کچھ یہاں بول رہے ہیں، اس میں بھی ریکارڈ ہوتا چلا جارہا ہے، اور جب اللہ چاہے گا اس کو بلوالے گا، اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ۝ وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ۝ وَقَالَ الْاِنْسَانُ

مَالَهَا ۚ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا، تو اس دن یہ زمین بھی اپنی سب خبریں سنا دے گی، حدیث شریف میں آتا ہے کہ زمین کی خبریں یہی ہیں کہ بتائے گی کہ میری پشت پر فلاں نے نماز پڑھی تھی، فلاں نے بدمعاشی کی تھی، اگر ضرورت پیش آئے گی تو ایسا ہوگا، کیونکہ ہر کسی کے سامنے یہ چیزیں پوری نہیں آئیں گی۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کو بلانا وہیں ہے جس وقت انسان بڑبڑ کرنے سے باز نہیں آئے گا، کہے گا نہیں جی! میں نے تو یہ کیا ہی نہیں، تو جس وقت وہ اس طرح انکار کرے گا تو پھر اللہ تعالیٰ اس کے منہ کو بند کر دیں گے کہ اچھا! تو تھوڑی دیر کے لیے چپ ہو جا، اور اس کے اعضاء کو کہیں گے: اِنْطِقِيْ! بولو، اور وہ سب کچھ بتا دیں گے،[۱] زمین کے جس قطعے پر جو کچھ کیا تھا وہ بتا دے گا، اس طرح سے اللہ تعالیٰ اِتمامِ حُجّت کرے گا، یہ چیزیں ہر کسی کے سامنے نہیں آئیں گی، بلکہ منکرین، اَڑی کرنے والے، ایسے جو لوگ ہوں گے ان کے سامنے یہ چیزیں آئیں گی، جہاں ضرورت پیش آئے گی اس کا ریکارڈ کھول دیا جائے گا۔ اور ایسے ہی ٹیلی ویژن نے آ کر کیا کچھ ہمارے سامنے نمایاں کر دیا کہ واقعہ ایک جگہ پیش آتا ہے، دوسری جگہ ویسے دیکھ لیا جاتا ہے جیسے پیش آیا، تو اب اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مدینہ منورہ میں منبر پر کھڑے ہو کے ایک جنگ کا نقشہ دیکھ لیا، جس جنگ میں حضرت ساریہ رضی اللہ عنہ امیر تھے، اور یہاں کھڑے ہوئے انہیں ہدایات دیں: "یَا سَارِيَ الْجَبَلَ یَا سَارِيَ الْجَبَلَ"[۲] اے ساریہ! پہاڑ کا خیال کرو، اے ساریہ! پہاڑ کا خیال کرو، پہاڑ کو لازم پکڑو، تو یہ ہدایات دیں اور وہاں تک آواز پہنچ گئی، اب دیکھنا آنکھوں کا فعل ہو گیا، اور زبان کے ساتھ بول کر آواز بھی پہنچا دی، دونوں باتیں ہو گئیں، دیکھ بھی لیا اور آواز بھی پہنچا دی اور وہاں انہوں نے سن بھی لی، اور بعد میں انہوں نے آ کر بتایا کہ ایسے آواز آئی تھی، تب ہم نے پہاڑ کا خیال کیا، پہاڑ کی طرف پشت کر کے پھر حملہ کیا تو اللہ نے کامیابی دے دی، گویا کہ یہ جنگ کے میدان میں ہدایات دے دیں۔ اب یہ ریڈیو ٹیلی ویژن کے آنے کے بعد اس میں کیا اِشکال ہے؟ اگر یہ لوگ اللہ کی دی ہوئی عقل اور فہم کے ساتھ سائنسی طور پر کچھ ترتیب ایسی دیدیتے ہیں کہ ہوا کی لہروں پر قبضہ کر لیا، اور ہوا کے ذریعے وہاں کی تصویر یہاں بھیج دی، درمیان میں کوئی تار تو ہے نہیں، ہوا کی لہروں پر قبضہ جما کے ہی آواز بھیجی جاتی ہے، اور ہوا کی لہروں پر قبضہ جما کر ہی تصویر بھیج جاتی ہے، تو یہی ہوا اس وقت بھی موجود تھی، اگر اللہ تعالیٰ نے اسی کے ذریعے سے سب کچھ نمایاں کر دیا تو کوئی بڑی بات نہیں۔ معراج سے جب حضور ﷺ واپس تشریف لائے تھے تو حدیث شریف میں آتا ہے کہ مشرکین نے پوچھنا شروع کر دیا کہ اچھا! اگر آپ بیت المقدس گئے تھے تو فلاں چیز بتاؤ کیسی ہے؟ فلاں چیز بتاؤ کیسی ہے؟ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ میں نے وہ چیزیں ضبط نہیں کی تھیں، اب آپ چار سال "باب العلوم" میں رہ کے چلے جائیں اور جب آپ جا کے کسی سے کہیں گے کہ میں "باب العلوم، کہروڑ پکا" میں پڑھتا رہا ہوں، تو وہ پوچھے کہ بتاؤ، مسجد کے دروازے کتنے ہیں؟ مسجد کی چھت میں شہتیر کتنے ہیں؟ تو ضروری نہیں کہ آپ نے ضبط کیا ہوا ہو، اسی طرح وضوخانے میں ٹونٹیاں کتنی ہیں؟ اس قسم کی چیزیں آدمی ضبط نہیں کیا کرتا، بلکہ آیا اور چکر لگا کے چلا گیا، تو رسول اللہ ﷺ نے بھی ایسی چیزیں ضبط نہیں کی تھیں اور انہوں نے پوچھنی شروع کر دیں، تو آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ مجھے اتنی تکلیف ہوئی کہ اتنی تکلیف کبھی نہیں

---

(۱) مشکوٰۃ ۲/ ۴۸۵ باب الحساب فصل اول۔ مسلم ۲/ ۴۰۹۔

(۲) مشکوٰۃ ص ۵۴۶، ج ۲ باب الکرامات فصل ثالث۔ فضائل الصحابۃ لابن حنبل، ج ۱ ص ۲۶۹، رقم ۳۵۵۔

ہوئی تھی، کیونکہ اگر اب میں نہیں بتاؤں گا تو یہ مجھے جھٹلائیں گے کہ کہتا ہے میں بیت المقدس سے ہو کر آیا ہوں اور فلاں چیز کا اس کو پتا نہیں ہے، تو فرماتے ہیں: ''جَلَّی اللّٰهُ لِیْ بَیْتَ الْمُقَدَّسِ'' اللہ تعالیٰ نے میرے لیے بیت المقدس روشن کردیا نمایاں کردیا، جو پوچھتے تھے میں دیکھ دیکھ کے بتاتا جا رہا تھا،[1] اب بیت المقدس وہاں سے سینکڑوں میل کے فاصلے پر ہے، مدینہ منورہ سے تقریباً ایک مہینے کی مسافت ہے، اور وہ اس طرح نمایاں ہوگیا، کہ جو پوچھتے، آپ دیکھتے، دیکھ کے بتادیتے، تو اب دُور پڑی ہوئی چیز کو سامنے نمایاں کردینا، تو موجودہ ایجادات نے اس کو آسان نہیں کردیا؟ یقیناً آسان کردیا۔

ابراہیم علیہ السلام کی آواز ساری دُنیا میں پہنچ گئی

اسی طرح سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اگر پہاڑ کے اوپر کھڑے ہو کر اعلان کیا، اور انہی ہوا کی لہروں سے اللہ تعالیٰ نے یہ آواز دنیا کے کونے کونے میں پہنچادی جہاں جہاں انسان بستے تھے، بلکہ یہاں تک ہی نہیں، روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عالمِ ارواح میں بھی یہ آواز پہنچی، جو روحیں دنیا میں آنے والی تھیں انہوں نے بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ اعلان سنا، انہی روایات میں یہ مذکور ہے کہ اس اعلان کو سننے کے بعد جو تو چپ کر کے بیٹھے رہے، توجہ ہی نہیں کی، ان کو حج نصیب نہیں ہوا، اور جنہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آواز کو سنا اور لبیک لبیک پکار اٹھے، ہم حاضر ہیں ہم حاضر ہیں، تو ان کو اللہ نے حج کی توفیق دے دی (جلالین وغیرہ)، روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے، یہ اسی وقت ہی گویا کہ فیصلہ ہوگیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کو عملاً کس نے قبول کرنا ہے، کس نے قبول نہیں کرنا، جو ان کے بلانے پر ''لبیک لبیک'' کہنے لگ گئے، جب ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ آؤ لوگو! اللہ کے گھر کا حج کرو، تو کہنے لگے لبیک ہم حاضر ہیں، ان کو وہاں جانے کا موقع مل گیا، اور جو اس وقت بھی منہ بند کر کے چپ کر کے بیٹھے رہے، کوئی توجہ ہی نہیں کی، ان کو یہ نصیب نہیں ہوا۔ تو اَذِّنْ فِی النَّاسِ کا یہ مطلب ہے کہ لوگوں میں حج کا اعلان کردو، تو وہاں کھڑے ہو کے اعلان کیا، ہر جگہ آواز پہنچ گئی۔

''بیت اللہ'' کی کشش

اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس بیت اللہ میں ایسی کشش رکھ دی گئی، اور یہ بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا کے صدقے، سورۂ ابراہیم میں آپ کے سامنے گزرا فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیْۤ اِلَیْهِمْ (آیت: ٣٧) لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل کردے، اور وہ ایسے مائل ہوئے کہ کہاں کہاں سے دُنیا بھاگی آرہی ہے، اسلام کے آنے سے قبل بھی بھاگے آتے تھے، اسلام کے آنے کے بعد بھی، اتنی کشش پیدا کردی۔ ''آئیں گے تیرے پاس پیدل بھی اور ہر قسم کی لاغر سواری پر بھی، جو آئیں گی دُور دراز راستوں سے'' جو پہاڑوں کے درّوں میں سے آتے ہیں، زیادہ چلنے کی وجہ سے نیچے ہوگئے ہیں، اس میں ان کی کثرت سے آمد و رفت اور دُور سے آنے کی طرف اشارہ ہے۔ ''آئیں گے وہ تاکہ حاضر ہوجائیں وہ اپنے منافع پر'' وہاں دینی دُنیوی دونوں قسم کے منافع حاصل کریں، ''اور چند مخصوص دنوں میں اللہ کا نام ذکر کریں اُن مخصوص چوپایوں پر جو اللہ نے انہیں دیے ہیں'' اللہ کے

---

(١) بخاری ١/٥٤٨۔ مسلم ١/٩٦ باب ذکر المسیح ابن مریم۔ مشکوٰۃ ٢/٥٢٩-٥٣٠ باب المعراج۔

دیے ہوئے چوپایوں پر اللہ کا نام لیں، یہ بھی ایک مشرکانہ رسم کی تردید ہوگئی کہ مشرک بھی وہاں قربانی کرتے تھے لیکن بتوں کے نام پر، اللہ کے پیدا کیے ہوئے چوپائے، اللہ کے دیے ہوئے چوپائے جا کے قربان کرتے تھے بتوں کے نام پہ، اور پھر ان کو اپنے لیے حرام ٹھہراتے، خود نہیں کھاتے تھے، کسی پر سواری نہیں کرتے تھے، کسی کا دودھ نہیں پیتے تھے، کسی کا گوشت نہیں کھاتے تھے، جیسے تفصیل آپ کے سامنے سورۂ اَنعام میں آ گئی۔

اَحکامِ حج

لیکن یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے نام پر قربانی لی، قربانی لینے کے بعد اسی کے ساتھ آپ کی دعوت کر دی، خود بھی کھائیں اور محتاج مصیبت زدہ فقیر کو بھی کھلائیں، بدحال فقیر کو بھی کھلائیں، دونوں باتیں ٹھیک ہیں، قربانی میں سے کھاؤ بھی، کھلاؤ بھی۔ قربانی کرنے کے بعد پھر اپنی میل کچیل دُور کر لیں، جیسے حج کے احکام میں آپ پڑھتے ہیں کہ قربانی سے فارغ ہو کے سر منڈایا جاتا ہے، ناخن کاٹے جاتے ہیں، صفائی کی جاتی ہے، اور اس کے بعد کپڑے پہن کے پھر بعد میں طوافِ زیارت کیا جاتا ہے، تو وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ یہ طوافِ زیارت کی طرف اشارہ ہے۔

''مشرک'' کی مذمت

یہ باتیں ہو چکیں۔ آگے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اللہ کی طرف جتنی بھی قابلِ احترام چیزیں منسوب ہیں سب کی تعظیم کرنی چاہیے، جو ان کی تعظیم کرے گا یہ اس کے لیے بہتر ہے، اور یہ مخصوص چوپائے سوائے ان کے جن کو تمہیں پڑھ کے سنا دیا گیا، جو تمہارے اوپر پڑھ دیے گئے ہیں مختلف سورتوں میں ان کے علاوہ یہ چوپائے حلال کر دیے گئے، لہٰذا ان کو بتوں کی طرف منسوب کر کے حرام ٹھہرانا یہ ایک نجاست اور پلیدی ہے جس کو تم اپنے اوپر مسلط کر لیتے ہو، اس قسم کی پلیدی سے بچو، جانوروں کی تحلیل وتحریم کے بارے میں شرک کا ارتکاب نہ کرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف اللہ کی حلال ٹھہرائی ہوئی چیز کو حرام ٹھہرانا، حرام ٹھہرائی ہوئی چیز کو حلال ٹھہرانا یہ سب شرک ہے، اور وہ بتوں کے نام پر کرتے تھے، تو یہاں خاص طور پر اسی پلیدی کا ذکر ہے جو کہ تحلیل وتحریم کے سلسلے میں وہ کرتے تھے، بتوں کی پلیدی سے بچو، بتوں کے نام پر یہ شرک نہ کرو کہ اللہ کے حلال ٹھہرائے جانوروں کو حرام ٹھہرالو، اور جھوٹ بولنے سے بچو، جھوٹی بات سے بچو، کہ کرتے خود ہو، باتیں خود بناتے ہو، پھر منسوب اللہ کی طرف کر دیتے ہو کہ یہ اللہ کا حکم ہے، جیسے سورہ انعام میں اِفْتِرَآءً عَلَيْهِ، اِفْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ کے الفاظ بار بار ذکر کیے گئے ہیں، کہ جانوروں کو حرام ٹھہراتے ہیں اللہ پر جھوٹ باندھتے ہوئے، تو ایسی جھوٹی باتوں سے بچو، مخلص ہو جاؤ اللہ کے لئے، اس کے ساتھ شریک نہ کرو۔

آگے شرک کی مذمت اور مشرک کی بدحالی کا ذکر ہے کہ توحید کا مقام ایک بہت باعظمت اور باعزت مقام ہے جو اللہ نے انسان کو دیا، توحید میں بہت بلندی ہے، اور جو شخص شرک کرتا ہے وہ ایسے ہے جیسے اس عزت کی بلندی سے گرتا ہے، پھر چاہے اس کو جانور نوچ کر کھا جائیں، چاہے کوئی ہوا اس کو لے جا کے کسی گہرے کھڈ میں گرا دے، طبعی موت مر جائے یا مسلمانوں کے ہاتھوں مارا جائے، بہرحال آگے ذلت ہی ذلت ہے، وہ انسان عزت کے مقام سے گر جاتا ہے جو شرک میں مبتلا ہو گیا۔ آگے وہی مشرک کی

بدحالی ذکر کرنی مقصود ہے'' جو کوئی اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتا ہے گویا کہ وہ گر گیا آسمان سے پھر اس کو اُچک لیتے ہیں پرندے یا گرا دیتی ہے اس کو ہوا دور جگہ میں۔ یہ بات بھی ہو چکی، اور جو شخص بھی اللہ کے شعائر کی تعظیم کرتا ہے تو یہ تعظیم کرنا دل کے تقویٰ کی وجہ سے ہی ہو سکتا ہے''، یعنی دلوں میں تقویٰ ہوگا تبھی جا کے شعائر کی تعظیم ہوگی، ''پس بے شک یہ دلوں کے تقوے کی وجہ سے ہے۔''

''ہدی کے جانور'' کے اَحکام

''اور تمہارے لیے ان جانوروں میں منافع ہیں اجل مسمّٰی تک'' اس کی وضاحت بھی میں نے کر دی کہ ان جانوروں سے فائدہ اٹھاؤ جس وقت تک ان کو باقاعدہ ہدی نہ بنالیا جائے، یا جب تک ان کو باقاعدہ قربانی کے لیے متعین نہ کر لیا جائے، اس وقت تک آپ ان سے ہر قسم کا فائدہ اٹھا سکتے ہیں، جب ان کی ہدی بنالی اور تعیین کر لی کہ ہم نے اس کو قربان کرنا ہے تو پھر اس کی اُون سے، دودھ سے، سواری سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہیے۔ ہاں! البتہ ذبح ہونے کے بعد پھر اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہو، جب ذبح ہو جائے تو اس کے بعد اس کا چمڑا بھی استعمال کر سکتے ہو، بال بھی استعمال کر سکتے ہو، گوشت بھی کھا سکتے ہو، اس سے قبل استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہے، اگر دودھ نکالو تو وہ بھی خیرات کر دو، اس کے بدن سے اُون اترے تو وہ بھی اللہ کے راستے میں دے دو، اس پر سواری بھی بلا ضرورت نہ کرو، ضرورتِ شدیدہ پیش آجائے تو اجازت ہے، تو ''ایک وقت تک ان میں منافع ہیں، پھر ان کا حلال ہونا ہے بیت عتیق کی طرف جا کر''، یعنی پھر وہ بیت اللہ کی طرف جائیں گے، اور وہاں ان کے حلال ہونے کی جگہ ہے، جس میں اشارہ ہو گیا کہ ہدی کے جانور حرم کے اندر جا کر ذبح کیا جا سکتے ہیں، حرم سے باہر ذبح نہیں ہونے چاہئیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيْمَةِ الْأَنْعَامِ
ہر اُمت کے لئے ہم نے قربانی کرنا متعین کیا تاکہ اللہ کا نام ذکر کریں ان مخصوص چوپایوں پر جو اللہ نے انہیں دیے ہیں
فَإِلٰهُكُمْ إِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗٓ أَسْلِمُوْا ۗ وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ ﴿۳۴﴾ الَّذِيْنَ إِذَا
پس تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے، اس کے لئے فرماں بردار ہو جاؤ اور بشارت دے دیجئے عاجزی کرنے والوں کو ﴿۳۴﴾ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب
ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ عَلٰى مَآ أَصَابَهُمْ وَالْمُقِيْمِي الصَّلٰوةِ ۙ وَ
اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور وہ صبر کرنے والے ہیں ہر اس تکلیف پر جو انہیں پہنچے اور وہ نماز کو قائم کرنے والے ہیں اور
مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا
جو کچھ ہم نے ان کو دیا اس میں سے خرچ کرتے ہیں ﴿۳۵﴾ اور ہدی کے اُونٹ ہم نے ان کو تمہارے لیے اللہ کے شعائر میں سے بنایا، تمہارے لئے ان میں

خَيْرٌ ۖ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ ۚ فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا

بھلائی ہے پس اللہ کا نام ذکر کیا کرو ان پر اس حال میں کہ وہ قطاریں باندھنے والے ہوں اور جب وہ اپنے پہلو پر گر پڑیں

فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ۚ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ

تو پھر خود بھی اس میں سے کھایا کرو اور قناعت کرنے والے اور سوال کے لئے سامنے آنے والے کو بھی کھلاؤ۔ ہم نے ایسے ہی ان کو تمہارے مطیع کر دیا

لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۳۶﴾ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ

تاکہ تم شکر گزار ہو جاؤ ﴿۳۶﴾ ہرگز نہیں پہنچتے اللہ کو ان قربانیوں کے گوشت اور نہ ان کے خون لیکن پہنچتا ہے اللہ کو

التَّقْوٰى مِنْكُمْ ۚ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ۚ

تمہاری طرف سے تقویٰ، ایسے ہی تابع کر دیا ہم نے ان کو تمہارے لئے تاکہ تم اللہ کی بڑائی بیان کرو اس بات پر کہ اللہ نے تمہیں ہدایت دی

وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۳۷﴾

اور محسنین کو بشارت دے دیجئے ﴿۳۷﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا: منسك: قربانی کرنا، یہ مصدر میمی ہے، قرآنِ کریم میں دوسری جگہ ''نُسُك'' کا لفظ بھی آیا ہے، اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ (سورۂ انعام: ۱۶۲) میری نماز اور میری قربانی۔ اور ''منسك'' کی جمع مناسك یہ لفظ بھی قرآنِ کریم میں آیا ہے وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا (سورۂ بقرہ: ۱۲۸) تو منسك قربانی کرنے کو بھی کہتے ہیں، اور مطلقاً عبادت کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے، اور خاص طور پر احکامِ حج کے لئے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے، اَرِنَا مَنَاسِكَنَا کے اندر احکامِ حج ہی مراد ہیں جو سورۂ بقرۃ میں آیا تھا۔ اور یہاں اس کا ترجمہ قربانی کرنے کے ساتھ کیا گیا ہے۔ ''ہر اُمت کے لئے ہر جماعت کے لیے ہم نے قربانی کرنا متعین کیا'' لِيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ: مِنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ یہ مَا کا بیان ہے، اسی قسم کی ترکیب پہلے بھی آپ کے سامنے گزر چکی، بہیمہ چوپائے کو کہتے ہیں یہ عام ہے، اور انعام یہ خاص چوپائے ہو گئے، بھیڑ بکری گائے اونٹ، اور بھینس گائے کے حکم میں ہے، تو بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ کا ترجمہ کر دیا جاتا ہے مخصوص چوپائے۔ ''تاکہ اللہ کا نام ذکر کریں ان مخصوص چوپایوں پر جو اللہ نے انہیں دیے ہیں'' فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ: پس تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے فَلَهٗٓ اَسْلِمُوْا: اسی کے لئے فرمانبردار ہو جاؤ۔ اسلام کا معنی ہوتا ہے گردن بطاعت نہادن، کسی کے حکم کے سامنے گردن جھکا دینا۔ ''اسی کے لیے مطیع اور فرمانبردار ہو جاؤ'' وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ: مخبتین اَخْبَتَ سے ہے بمعنی تواضع کرنا، متواضع ہونا، خبت کہتے ہیں پست زمین کو، اور اَخْبَتَ کا لفظی معنی بنتا ہے

پستی کی طرف اُترنا، اور اسی سے یہ معنی لیا گیا ہے، جو لوگ متکبر نہیں بلکہ اپنے آپ کو جھکا کے رکھتے ہیں، پست رکھتے ہیں ان کو مخبت کہا جاتا ہے۔ ''مخبتین کو بشارت دے دیجئے'' جو تکبر نہیں کرتے، عاجزی کرنے والے ہیں، تواضع کرنے والے ہیں ان کو بشارت دے دیجئے۔ ان مخبتین کی صفات یہ ہیں جن کے ساتھ مخبتین پہچانے جاتے ہیں، الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ: مخبتین وہ لوگ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں۔ وَجِلَ باب سمع سے ہے، دوسری جگہ اسی سے نہی آئے گی لَا تَوْجَلْ (سورۂ حجر: ۵۳)۔ وَالصّٰبِرِيْنَ عَلٰى مَاۤ اَصَابَهُمْ: اور وہ صبر کرنے والے ہیں ہر اس تکلیف پر جو انہیں پہنچے، وَالْمُقِيْمِي الصَّلٰوةِ: اور وہ نماز کو قائم کرنے والے ہیں، وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ: اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ: اَلْبُدْنَ یہ بَدَنَۃ کی جمع ہے، ''ۃ'' کے ساتھ اس میں وحدت کا معنی پیدا ہو جائے گا، یہ لفظ اُونٹ کے لیے بولا جاتا ہے، اور اسی کے حکم میں ہے ہر وہ جانور جس کو ''ہدی'' بنایا جائے، چاہے وہ بکری ہو بھیڑ ہو گائے ہو، لیکن بعض اَحکام اُونٹ کے ساتھ خاص ہیں جیسے آگے ذکر کیا جا رہا ہے۔ یہاں ''بُدن'' کا مفہوم ہے ہدی کے اُونٹ، ''ہدی کے اونٹ، ہم نے ان کو تمہارے لیے اللہ کے شعائر میں سے بنایا'' اللہ کے دِین کی خصوصی علامات میں سے بنایا، شعائر شعیرہ کی جمع ہے، یہ لفظ آپ کے سامنے پیچھے بھی گزرا ہے۔ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ: تمہارے لئے ان میں بھلائی ہے، فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ: پس اللہ کا نام ذکر کیا کرو ان ہدی کے اونٹوں پر، صَوَآفَّ: یہ جمع ہے صافۃ کی۔ اس حال میں کہ وہ قطاریں باندھنے والے ہوں، قطاروں میں کھڑے کر کے پھر ان کے اوپر اللہ کا نام لیا کرو۔ اور صَوَآفَّ کا ترجمہ قائمات کے ساتھ بھی کیا گیا ہے، اس حال میں کہ وہ کھڑے ہوں، اور کھڑے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ قَدْ صَفَفْنَ اَيْدِيَهُنَّ وَاَرْجُلَهُنَّ (نسفی، آلوسی)، یعنی اپنے ہاتھوں کو اور اپنے پاؤں کو سیدھی قطار میں کھڑے کیے ہوئے ہوں، فقہ کے اندر آپ نے پڑھا ہے کہ اُونٹوں کے بارے میں خصوصیت کے ساتھ ''نحر'' سُنّت ہے، اور گائے اور بھیڑ میں ''ذبح'' سُنّت ہے۔ ''ذبح'' اور ''نحر'' میں فرق یہ ہے کہ ''ذبح'' لٹا کے کیا جاتا ہے، اور حلق کی رگیں کاٹیں جاتی ہیں، اور ''نحر'' کھڑا کر کے کیا جاتا ہے، اس کا ایک اگلا ہاتھ دایاں یا بایاں باندھ لیا جاتا ہے، وہ تین ٹانگوں پہ کھڑا ہو جاتا ہے، اور اُونٹ کی گردن اُونچی تو ہوتی ہی ہے، تو یہ جگہ جو ہے (گردن کی نچلی جگہ) اس پر نیزے کی طرح چھری مار کے اس کی رَگوں کو کاٹا جاتا ہے، اصل میں اُونٹ کی رگیں اس جگہ پر جمع ہوتی ہیں تو یہاں سے ان کو کاٹنا آسان ہے، چھری پھیرنے کی بجائے نیزے کی طرح مارنے کے ساتھ وہ رگیں جلدی کٹ جاتی ہیں، اور گائے بھینس بھیڑ بکری وغیرہ کو لٹانے کی صورت میں ان کا مذبح زیادہ واضح ہوتا ہے، کیونکہ حلق کے درمیان سے اس کی رگیں کاٹی جاتی ہیں، اور اُونٹ کی رگیں گردن کے اس حصے میں اتنی واضح نہیں ہیں، بلکہ نچلے حصے میں جا کے جمع ہوتی ہیں تو یہاں چھری یوں ماری جاتی ہے جس طرح سے نیزہ مارا جاتا ہے، اس طرح مارنے کے ساتھ جب رگیں کٹ جاتی ہیں تو خون نکلتا ہے، خون نکلنے کے بعد وہ گر جاتا ہے، جدھر کا پاؤں باندھا ہوا ہوتا ہے اُدھر کو گر جاتا ہے، تو اُونٹ میں سُنّت یہی ہے کہ اس کو کھڑا کر کے ''نحر'' کیا جائے، اور اگر لٹا کے ذبح کیا جائے تو اس میں کراہت ہے اگرچہ ذبح ٹھیک ہے، جس طرح سے بھیڑ بکری وغیرہ کو لٹا کے ذبح کرنا سُنّت ہے اور اگر ان کو کھڑا کر کے ان کی رگیں کاٹی جائیں تو خلافِ سُنّت ہے، اگرچہ رگیں کٹ جانے کی صورت میں ذبح ٹھیک ہو جاتا ہے، تو صَوَآفَّ کا معنی یہی ہے قائمات، جبکہ وہ کھڑے

ہوں، یعنی اپنے ہاتھوں اور پاؤں کو قطار میں کیے ہوئے کھڑے ہوں، قَالَہُ ابْنُ عُمَرَ قَدْ صَفَفْنَ اَیْدِیَھُنَّ وَاَرْجُلَھُنَّ، یہ مفہوم اس کا بیان کیا گیا ہے، اس کو ''نحر'' کرنا کہتے ہیں، اور یہ حکم اونٹوں کے ساتھ ہی خاص ہے، اور اللہ کا نام ذکر کرنا یہ سب ہدی کے جانوروں کے لیے ہے چاہے وہ بکری ہو چاہے بھیڑ وغیرہ ہو۔ فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا: جنوب جنب کی جمع ہے، جنب پہلو کو کہتے ہیں۔ جب وہ ہدی کے جانور اپنے پہلو پہ گر پڑیں، جب ان کی رگیں کٹ جائیں گی، خون نکل جائے گا، اور وہ اپنے پہلو پہ گر پڑیں، فَكُلُوْا مِنْهَا: تو پھر خود بھی اس میں سے کھایا کرو، وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ: قانع: قناعت کرنے والا۔ اور معتر کا معنی اصل میں ہوتا ہے پیش ہونے والا، تو معتر سے مراد ہے: مُتَعَرِّضٌ لِلسُّوَالِ جو مانگنے کے لیے سامنے آتا ہے، اور قانع سے مراد ہوگا جو قناعت کر کے گھر میں بیٹھا ہوا ہے لیکن ہے وہ ضرورت مند، جیسے پیچھے بائس فقیر کا لفظ آیا تھا، بدحال محتاج، تو گویا کہ بدحال محتاج کی دو قسمیں ہو گئیں، ایک بدحال محتاج تو وہ ہے جو اپنی خودداری کی بنا پر کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کرتا، گھر میں قناعت کر کے بیٹھا ہوا ہے، ان کو بھی تلاش کر کر کے دو، اور ایسوں کو دینا زیادہ فضیلت ہے، اور دوسرا وہ ہے جو سامنے آتا ہے، پھر پھر کے مانگتا ہے، لوگوں سے سوال کرتا ہے وہ معتر ہے، تو ان دونوں قسموں کو دینا ٹھیک ہے، بلکہ یہ قربانی کا گوشت تو جیسے آپ مسائل پڑھتے رہتے ہیں، غنی کو بھی دینا ٹھیک ہے، جب قربانی کرنے والا غنی خود کھا سکتا ہے تو دوسرے غنی کو کھلا بھی سکتا ہے، یہاں تو اِستحباب کی طرف اشارہ ہے کہ ضرورت مندوں کو دو، جنہوں نے قربانی نہیں کی اور ان کے پاس گوشت نہیں ہے انہیں دو، ورنہ غنی کو بھی وہ گوشت کھلایا جا سکتا ہے، جس کی واضح دلیل یہ ہے کہ قربانی کرنے والا جو خود غنی ہے جب وہ کھا سکتا ہے تو دوسرے کو بدرجہ اولیٰ کھلایا جا سکتا ہے۔ فَكُلُوْا مِنْهَا: پس تم خود بھی اس میں سے کھاؤ اور قناعت کرنے والے یعنی صبر سے بیٹھنے والے کو اور سوال کے لئے سامنے آنے والے کو بھی کھلاؤ، كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ: ہم نے ایسے ہی ان اونٹوں کو تمہارے مطیع کر دیا، تمہارے لیے مسخر کر دیا، لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ: تاکہ تم شکر گزار ہو جاؤ۔ یہ جانور تمہارے قابو میں کر دیا، ورنہ کتنا بڑا طاقتور جانور ہے، اگر آپ اپنے زور سے اس کو قابو میں لانا چاہتے تو قابو میں نہ آتا، یہ اللہ کی طرف سے تسخیر ہے۔ ''مسخر کر دیا ہم نے ان کو تمہارے لیے تاکہ تم شکر گزار ہو جاؤ'' لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا: لُحوم لحم کی جمع ہے، دِماء دم کی جمع ہے، اور دِماء سے پہلے جو ''لا'' ہے یہ لَنْ يَّنَالَ میں جو نفی کا معنی ہے اس کی تاکید کے لئے ہے۔ ہرگز نہیں پہنچتے اللہ کو ان قربانیوں کے گوشت اور نہ ان کے خون، وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ: لیکن پہنچتا ہے اس اللہ کو تمہاری طرف سے تقویٰ، اللہ تعالیٰ تو تمہارے تقوے کو دیکھتے ہیں کہ تم کتنا اللہ سے ڈرتے ہو، اور کتنی اس کے احکام کی پابندی کرتے ہو، باقی! یہ خون اور گوشت اللہ کو نہیں پہنچتے، كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ: ایسے ہی تابع کر دیا ہم نے ان کو تمہارے لیے، لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ: ''ما'' مصدر یہ ہے، هَدٰى يَهْدِي: طریقہ بتانا۔ تاکہ تم اللہ کی بڑائی بیان کرو اس بات پر کہ اللہ نے تمہیں ہدایت دی، اللہ نے تمہیں ہدایت دی اس ہدایت دینے پر تم اللہ کی بڑائی بیان کرو، اللہ نے تمہیں طریقہ بتایا کہ کس طرح سے ان کو ذبح کرنا ہے، کس طرح سے اللہ کے نام پہ ان کو دینا ہے، قربانی کا کیا طریقہ ہے، یہ جو اللہ نے تمہیں طریقہ بتا دیا اس طریقے پر تم اللہ کی بڑائی بیان کرو۔ اور اگر اس سے عام ہدایت مراد لے لی جائے کہ اللہ نے تمہیں سیدھا راستہ دکھا دیا، شرک سے بچا لیا، مشرکین یہی جانور اپنے بتوں کے نام پر ذبح کرتے تھے، پھر ان کا خون اور گوشت ان بتوں پہ جا کے چڑھاتے تھے، اور ان کا خیال یہ تھا کہ اس خون اور گوشت سے

ہمارے بت خوش ہوتے ہیں، ان سے تلذذ کرتے ہیں، ''اللہ تعالیٰ کو ان کے خونوں اور گوشتوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے'' اللہ تو یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ تم اس کا حکم کہاں تک مانتے ہو، تمہاری فرمانبرداری اور تمہارا تقویٰ یہ ہے جو اللہ تک پہنچتا ہے، باقی! ان کے خونوں اور گوشتوں کی کوئی ضرورت نہیں، ذبح کرو اور خود کھا جاؤ، اور مشرک جو بتوں کے نام پہ ذبح کرتے تھے وہ خود نہیں کھاتے تھے، کہتے تھے انہی بتوں کا حصہ ہے، اور بتوں کا حصہ بتوں نے تو کیا کھانا تھا، بتوں کے مجاور کھا جاتے تھے یا جنگلی جانور جو ادھر ادھر چھپے رہتے تھے وہ آ کے کھا جاتے تھے، اور مسلمانوں کو اللہ نے یہ طریقہ بتایا کہ صرف فرمانبرداری دیکھنی مقصود ہے کہ اللہ کے دیے ہوئے مال میں سے تم کتنے خلوص کے ساتھ اللہ کے نام پہ خرچ کرتے ہو، باقی! اللہ کو نہ ان کے گوشتوں کی ضرورت ہے نہ ان کے خونوں کی ضرورت ہے۔ یہ جو طریقہ اللہ نے تمہیں بتایا اپنی عبادت کا یا قربانی کرنے کا، ان کو ذبح کرنے کا، اللہ کے اس بتائے ہوئے طریقے کی بنا پر تم اللہ کی بڑائی بیان کرو۔

وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ: اور محسنین کو بشارت دے دیجئے، محسنین کا لفظ احسان سے لیا گیا ہے، ایسے موقع پر اس کا مطلب یہ ہوا کرتا ہے کہ جو نیکوکار ہیں، خوب کار ہیں، اور احسان کا مفہوم جیسے کہ حدیث جبریل میں آتا ہے، حضرت جبریل علیہ السلام حضور ﷺ کی خدمت میں ایک دفعہ آئے تھے اور آ کے چند سوال کیے تھے، ما الایمان؟ ما الاسلام؟ ما الاحسان؟ تو احسان کے متعلق جو سوال کیا تھا تو حضور ﷺ نے اس کا جواب یہ دیا تھا کہ ''اَنْ تَعْبُدَ اللهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ'' احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت ایسے کیا کر گویا کہ تُو اللہ کو دیکھ رہا ہے، کیونکہ تُو اگر نہیں دیکھ رہا تو وہ تو دیکھ ہی رہا ہے۔ تو یہ تصور قائم ہو جائے کہ ہم اللہ کے سامنے ہیں، اللہ ہمارے سامنے ہے، تو اس سے اخلاص پیدا ہوگا، اور وہی اخلاص اصل میں احسان ہے، ہر نیکی کے کام کو یوں کرو کہ اس میں ریاکاری بالکل نہ ہو، بس یوں ہو جیسے اللہ آپ کے سامنے ہے اور آپ اللہ کے سامنے ہیں، تو یہ تصور کرنے کے بعد خالصتاً ظاہر اور باطن اللہ کے سامنے جھک جائے، یہ ہے احسان۔ تو جو نیکی کے کاموں میں اس احسان کی صفت کے حامل ہیں، خلوص کے ساتھ، ریاکاری سے دُور ہو کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں، انہیں بشارت دے دیجئے کہ ان کا انجام بڑا اچھا ہے، انہیں خوشخبری سنا دیجئے۔ آگے جہاد کا مضمون شروع ہو رہا ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط

پیچھے سے قربانی کا مسئلہ ذکر ہوتا چلا آ رہا ہے، اور اس رُکوع میں بھی اسی کے متعلق ہی کچھ ہدایات ہیں۔

''قربانی'' کی تعریف، تاریخ، مقصد اور نتیجہ

پہلی آیت کا حاصل یہ ہے کہ قربانی کے لئے جو کہا گیا یہ تمہارے ساتھ ہی خاص نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے پہلی امتوں پر بھی

قربانی کرنے کا طریقہ رکھا تھا، قرآنِ کریم میں سورۂ مائدہ میں آپ نے پڑھا کہ آدم علیہ السلام کے بچوں میں جو اختلاف ہوا تھا، ہابیل اور قابیل میں، تو ان کے اختلاف کا فیصلہ بھی تو قربانی پہ ہی کیا گیا تھا، وہاں بھی قُربان کا لفظ آیا ہوا ہے، اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ (سورۂ مائدہ: ۲۷) ان دونوں نے قربانی پیش کی، ایک کی قبول ہوگئی، دوسرے کی قبول نہیں ہوئی، معلوم ہوگیا کہ حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے سے ہی قربانی مشروع ہے، اللہ نے اس وقت سے یہ طریقہ متعین کیا ہوا ہے۔ اور قربانی کا معنی اصل میں کیا ہوتا ہے؟ قربان قُرْبٌ: قریب ہونا، قُربان اس چیز کو کہا جاتا ہے جس کے ذریعے سے کسی کا تقرّب حاصل کیا جائے، بتوں کے نام پر جو قربانی دیتے تھے تو اس کا مطلب بھی یہی تھا کہ بتوں کے نام پر چڑھاوا چڑھا کے قربانی دے کے وہ ان کا تقرّب تلاش کرتے تھے، تو اللہ کا قُرب طلب کرنے کے لئے جو مال دیا جاتا ہے یا جان دی جاتی ہے اس کو بھی ''قربانی'' کہتے ہیں، یہ بھی ''قربان'' ہے۔ پہلے انبیاء علیہم السلام کی امتوں میں بھی اسی طرح سے رہا ہے، تو ہم نے تمہارے لیے بھی یہ طریقہ متعین کیا، اور جس جس اُمت میں قربانی دینے کا طریقہ تھا وہ یہی تھا کہ خالصتاً اللہ کے لئے ہونی چاہیے، جب جانور پیدا اللہ نے کیے ہیں تو ان کی جان بھی اسی کے نام پر نکالی جاسکتی ہے، کسی دوسرے کا تقرّب حاصل کرنے کے لئے اگر جانور کی جان نکال دی جائے اِس نیت کے ساتھ کہ اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کا قُرب حاصل کرنا مقصود ہے، جیسے پیروں کے نام پر لوگ ذبح کرتے ہیں، جنوں کے نام چڑھاوے چڑھاتے ہیں، تو وہ جانور جو اللہ نے پیدا کیا ہوا تھا اس کی جان آپ نے لے لی کسی دوسرے کے لئے، یہ مردار کے حکم میں ہے، جیسے اس کی تفصیل مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کے تحت ذکر کی گئی تھی، تو جانور کی جان اگر لی جائے تو اسی کے نام پر لی جائے، اسی کے تقرّب کے لیے لی جائے، اسی کے حکم کے مطابق لی جائے جس نے ان جانوروں کو پیدا کیا، تو یہ طریقہ اللہ تعالیٰ نے ہر جماعت میں رکھا ہے، جس سے معلوم ہوگیا کہ عبادت ساری اُمتوں میں صرف اللہ کے لئے ہی تھی، چاہے وہ عبادت بدنی ہو چاہے مالی، یہاں خصوصیت کے ساتھ مالی عبادت اور وہ بھی ذبح، اس کا ذکر آ گیا۔ ''ہر اُمت میں اس کا طریقہ اللہ نے بتایا جس سے ثابت ہوا الٰہکم سب کا ایک ہی اِلٰہ ہے، اور اسی کی فرماں برداری کرنی چاہیے۔'' تو گویا کہ اِبتدا سے اس قربانی کے طریقے کا مشروع ہو کے آنا یہ بھی توحید کی دلیل ہے کہ ہر نبی نے یہ طریقہ بتایا کہ اللہ کے نام پر جانور قربان کیا کرو، تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے، اسی کے فرمانبردار ہو جاؤ، اور اسی کے سامنے جھکو۔

اللہ کی محبت وعظمت کی بنا پر ڈرنے والوں کے لئے خوش خبری

بَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ جو اس کے سامنے تواضع اختیار کرتے ہیں، اس کے حکموں کے سامنے جھک جاتے ہیں ان کو اچھے انجام کی بشارت دے دیجئے، اور یہ مخبتین کی جو تعریف کی جارہی ہے تو اس میں وہی ترغیب دینا مقصود ہے کہ ان صفتوں کو اپناؤ، جب ان صفتوں کو اپنالو گے تو تم مخبت بن جاؤ گے، اور مخبتوں کے لئے اچھے انجام کی بشارت ہے۔ اللہ کا ذکر آ جائے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں، یہ ڈرنا عظمت کی بنا پر ہے، محبت اور عظمت بھی دلوں کے اندر خوف پیدا کرتی ہے، جس کے ساتھ آپ کو محبت ہو جائے آپ ہمیشہ اس سے ڈرتے ہیں کہ کہیں اس کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہ ہو جائے، بلکہ جس کے ساتھ محبت ہوتی ہے انسان اس کی

نافرمانی سے ناراضگی سے زیادہ ڈرتا ہے، اگر کوئی آپ کا پہلے ہی دشمن ہے وہ آپ پر ناراض ہوتا پھرے تو آپ کو کوئی پروانہیں ہوتی، لیکن جن کے ساتھ آپ کو محبت ہے ان کے متعلق آپ یہ سوچیں کہ اگر میں نے یہ کام یوں نہ کیا تو ناراض ہو جائے گا، تو محبوب کی ناراضگی بہت ناگوار گزرا کرتی ہے، محبت کی بناء پر ناراضگی سے زیادہ ڈر لگتا ہے، اس لیے کہا کرتے ہیں کہ "خوف العبد قدر التقرب" بندہ جتنا مقرب ہوتا چلا جائے اتنا اس کے اوپر خوف زیادہ طاری ہوتا چلا جاتا ہے، اور اسی طرح سے عظمت، کہ جب دل کے اندر عظمت ہوتی ہے تو تب بھی انسان اس کی نافرمانی کرنے سے ڈرتا ہے۔ تو عظمت اور محبت کی بنا پر ان کے دلوں میں خوف آجاتا ہے جس وقت اللہ کا ذکر ہوتا ہے، اللہ کا نام آیا اور ان کے دل کانپ اٹھے، پھر نافرمانی کرنے کی ان میں طاقت نہیں ہوتی، تو یہ وجل اور خوف وہی محبت اور عظمت کا ہے۔

"مُخْبِتِیْن" کی کچھ مزید صفات

وَالصّٰبِرِیْنَ عَلٰی مَاۤ اَصَابَهُمْ: اور پھر اللہ کے راستے میں جو بھی ان کو تکلیف پہنچے، چاہے مالی ہو چاہے جانی ہو، اس کو برداشت کرتے ہیں، شکوہ شکایت نہیں کرتے، وہ سمجھتے ہیں کہ محبوب کے راستے میں جو بھی آزمائش پیش آئے اس کو خوشی سے برداشت کرنا چاہیے، اور پھر بدنی عبادات میں سے خصوصیت کے ساتھ نماز کا ذکر کر دیا، صبر و صلوٰۃ یہ ہر شریعت کا بہت بڑا اہم اُصول ہے، تو فرمایا کہ نماز کی پابندی کرنے والے ہیں، اور پھر مالی عبادت کا خصوصیت سے ذکر کر دیا، تو یہ وجل یعنی قلوب کے اندر خوف کا ہونا اور صبر یہ دونوں باطنی خلق ہیں، قلب کی صفات ہیں، اور "الْمُقِیْمِی الصَّلٰوةِ" بدنی عبادت ہوگئی، "وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ" مالی عبادت ہوگئی۔

"مِمَّا رَزَقْنَا" کا تصوّر

اور جہاں بھی اللہ تعالیٰ انفاق کا ذکر کیا کرتے ہیں وہاں اکثر و بیشتر "مِمَّا رَزَقْنَا" کا لفظ ساتھ آیا کرتا ہے، قرآنِ کریم میں آپ غور کریں گے تو آپ کے سامنے یہ بات آجائے گی کہ جہاں بھی خرچ کرنے کا حکم آتا ہے وہاں یہ لفظ آتا ہے، تو مِمَّا رَزَقْنَا میں اگر غور کریں تو خرچ کرنا آسان ہو جاتا ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ ہمارے دیے میں سے خرچ کرو، یہ تصور ہے کہ تم نے کوئی اپنے ذاتی کمال سے نہیں کمایا، بہتیرے کمالوں والے آپ کے سامنے جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں جن کو وقت پہ روٹی بھی نہیں ملتی، اور کئی سارے بے وقوف احمق جن کی عقل بھی ٹھکانے نہیں، وہ لاکھوں کے مالک بنے بیٹھے ہیں، رزق کی تقسیم آپ کی عقل و فہم پہ نہیں ہے، یا آپ کے سلیقے پہ نہیں ہے، یہ اللہ کے دینے سے ملتا ہے، واقعات میں اگر غور کریں گے تو آپ کو یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ اچھے بھلے سمجھدار لوگ بسا اوقات بھوکے مرتے ہیں، اور بے وقوف قسم کے لوگ دنیا میں خوش عیش ہوتے ہیں، اس میں سلیقہ کوئی کام نہیں آتا، سلیقے والے دھرے رہ جاتے ہیں، جیسا کہ حضرت شیخ (سعدی رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ:

اگر روزی بدانش در فزودے ز ناداں تنگ روزی تر نبودے

بناداں آں چناں روزی رساند | کہ دانا اندر آں حیراں بماند[1]

کہ اگر روزی عقل کے ساتھ ملتی تو بے وقوف بھوکے مرتے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نادانوں کو ایسے روزی پہنچاتا ہے کہ عقل مند حیران رہ جاتے ہیں۔تو اس لئے مِمَّا رَزَقْنٰا یہ بہت بڑی حقیقت ہے کہ جو کچھ ہے اللہ کا ہی دیا ہوا ہے۔ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے تو تمہارے پاس کچھ نہیں تھا، اور اب جو کچھ تم کماتے ہو اللہ کی دی ہوئی صلاحیتوں سے کماتے ہو، اگر آپ کی آنکھیں ٹھیک نہ ہوتیں، آپ کے ہاتھ ٹھیک نہ ہوتے، پاؤں ٹھیک نہ ہوتے، یا عقل ٹھکانے نہ ہوتی، کوئی چیز آپ کی سمجھ میں نہ آتی تو آپ کیسے کام کرتے، اس لیے بظاہر اگر چہ آپ اپنے ان اعضا سے ہی کماتے ہیں لیکن پھر بھی یہ اللہ کا دیا ہوا ہے، کیونکہ یہ اعضا بھی اللہ کے دیے ہوئے ہیں اور ان میں قوت بھی اللہ کی دی ہوئی ہے، ورنہ اگر ایک آدمی مثلاً درزی ہاتھ سے کماتا ہے تو اگر آج اس کا ہاتھ ضائع ہو جائے تو کہاں سے کمالے گا؟ تو اللہ نے جو اس کو ہاتھ دیا ہے اور وہ ہاتھ کے ذریعے کما رہا ہے تو جو اس نے کمایا یہ اللہ کا ہی دیا ہوا ہے۔تو خرچ کرنے کا حکم جہاں بھی آئے وہاں مِمَّا رَزَقْنٰا کہہ کے یہی تصور دیا جاتا ہے کہ اللہ کے راستے میں خرچ کرنے سے بخل نہ کیا کرو، ڈرا نہ کرو، یہ تو اسی کا دیا ہوا ہے، اسی میں سے کچھ تھوڑا سا اس کے نام پہ دے دو، یہ تو تمہاری آزمائش ہے۔تو مِمَّا رَزَقْنٰا کے ذکر میں یہی حکمت ہے۔

''قُربانی'' کے بعض اَحکام کا ذِکر

آگے پھر قربانی کے بعض احکام آگئے کہ یہ 'ہدی' کے اُونٹ شعائر ہیں، ان کی تعظیم کرو، یہ اللہ کے دِین کی خاص علامات ہیں، ان میں تمہارے لیے فوائد ہیں دِینی بھی اور دُنیوی بھی، اور ان کو کھڑا کر کے ان کے اُوپر اللہ کا نام لیا کرو، پھر جس وقت یہ ذبح ہو جائیں اور اپنے پہلوؤں کے بل گر جائیں تو تمہیں بھی کھانے کی اجازت ہے، یہیں سے فرق ہے مشرکین کی قربانی میں اور موحدین کی قربانی میں، مشرک اللہ کا نام لے کر ذبح نہیں کرتے تھے، بتوں کے نام پر ذبح کرتے تھے، ذبح ہو جانے کے بعد پھر خود اس کو کھاتے نہیں تھے، وہ سمجھتے تھے کہ یہ بتوں کا ہو گیا، وہ گوشت وہاں لے جا کر ڈالتے، خون ان کے اوپر ڈالتے اور سمجھتے اس طرح سے ہمارے یہ معبود خوش ہوتے ہیں، لیکن اللہ نے فرمایا کہ خود بھی کھاؤ اور دوسروں کو بھی کھلاؤ۔آگے اس نعمت کی طرف متوجہ کیا کہ دیکھو! کتنے بڑے بڑے جانور اللہ نے پیدا کر کے تمہارے تابع کر دیے، اس پر اللہ کا شکر ادا کیا کرو، ہر وقت اس چیز کا اِستحضار رکھو کہ یہ اللہ نے ہمارے تابع کر دیے، ورنہ اگر طاقت کے ساتھ مقابلہ ہوتا تو یہ جانور کسی کے سنبھالنے کے نہیں۔

''قُربانی'' کا مقصد

اور پھر آگے وہی خلوص پیدا کرنے کے لئے فرمایا کہ یہ گوشت اور خون، اس کی اللہ کو کوئی ضرورت نہیں، یہ اللہ تک نہیں پہنچتے، اللہ تک تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے، لہٰذا ہر وقت یہ خیال رکھا کرو کہ تم میں تقویٰ کتنا ہے، جتنی محبت اور شوق کے ساتھ اللہ کا حکم

---

(۱) گلستاں، باب اول کا تقریباً آخر

مانو گے اتنا ہی اجر پاؤ گے، باقی! یہ گوشت اور خون اللہ تک نہیں پہنچتے...... اور ایسے ہی ہم نے ان کو تمہارے تابع کر دیا تا کہ اس بتلائے ہوئے طریقے پر تم اللہ کی بڑائی بیان کرو۔ اور جو ہر کام میں اخلاص پیدا کرتے ہیں اچھے طریقے سے کام کیا کرتے ہیں انہیں اچھے انجام کی بشارت دید یجئے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

اِنَّ اللّٰهَ يُدٰفِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ ﴿٣٨﴾

بے شک اللہ دُور ہٹائے گا ان لوگوں سے جو ایمان لے آئے، بے شک اللہ نہیں پسند کرتا کسی خیانت کرنے والے، کسی ناشکرے کو ﴿٣٨﴾

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۙ ﴿٣٩﴾

اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو جن سے قتال کیا جاتا ہے اس سبب سے کہ وہ ظلم کئے گئے اور بے شک اللہ تعالیٰ ان کی مدد کرنے پر البتہ قادر ہے ﴿٣٩﴾

الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ؕ وَلَوْلَا

یہ وہ لوگ ہیں جو نکال دیے گئے اپنے گھروں سے بلا وجہ مگر اس سبب سے کہ انہوں نے کہا ہمارا رَبّ اللہ ہے، اگر نہ ہوتا

دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ

اللہ تعالیٰ کا دُور ہٹانا بعض لوگوں کو بعض کے ذریعے سے البتہ گرادی جاتیں راہبوں کی خلوت گاہیں اور گرجا گھر اور یہود کی عبادت گاہیں

وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ؕ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

اور مسجدیں جن میں اللہ کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے، اور البتہ ضرور مدد کرے گا اللہ تعالیٰ اس شخص کی جو اللہ کی مدد کرے گا۔ بے شک اللہ

لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿٤٠﴾ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ

البتہ قوت والا غلبے والا ہے ﴿٤٠﴾ یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں قدرت دے دیں زمین میں تو یہ لوگ نماز قائم کریں گے اور زکوٰۃ ادا کریں گے

وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴿٤١﴾ وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ

اور نیکی کا حکم کریں گے اور بُرائی سے روکیں گے اور سب کاموں کا انجام اللہ ہی کے لئے ہے ﴿٤١﴾ اگر یہ لوگ آپ کو جھٹلائیں

فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّعَادٌ وَّثَمُوْدُ ۙ ﴿٤٢﴾ وَقَوْمُ اِبْرٰهِيْمَ وَقَوْمُ لُوْطٍ ۙ ﴿٤٣﴾

تو تحقیق جھٹلایا ان سے پہلے نوح کی قوم نے اور عاد نے اور ثمود نے ﴿٤٢﴾ اور ابراہیم کی قوم نے اور لوط کی قوم نے ﴿٤٣﴾

وَاَصْحٰبُ مَدْيَنَ ۚ وَكُذِّبَ مُوْسٰى فَاَمْلَيْتُ لِلْكٰفِرِيْنَ ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ ۚ فَكَيْفَ

اور مدین والوں نے اور موسیٰ کو بھی جھوٹا قرار دیا گیا، پھر میں نے ڈھیل دی کافروں کو، پھر میں نے انہیں پکڑا، تو کیسے تھا

كَانَ نَكِيْرِ ﴿۴۴﴾ فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَهِىَ ظَالِمَةٌ فَهِىَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا

میرا انکار کرنا؟ ﴿۴۴﴾ کتنی ہی بستیاں، ہم نے ان کو ہلاک کر دیا اس حال میں کہ وہ ظالمہ تھیں پس وہ گری پڑی ہیں اپنی چھتوں پر

وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّقَصْرٍ مَّشِيْدٍ ﴿۴۵﴾ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ

اور کتنے ہی کنویں بے کار پڑے ہوئے اور کتنے ہی مضبوط محل ﴿۴۵﴾ کیا پھر یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں پھر ہو جاتے ان کے لئے دِل

يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ۚ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ

جن کے ذریعے سے یہ سوچتے، یا ہو جاتے ان کے لئے کان جن کے ذریعے سے یہ سنتے، پس بے شک واقعہ یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں

وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِىْ فِى الصُّدُوْرِ ﴿۴۶﴾ وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ يُّخْلِفَ

لیکن اندھے ہو جاتے ہیں دِل جو کہ سینوں میں ہیں ﴿۴۶﴾ جلدی طلب کرتے ہیں آپ سے عذاب کو اور ہرگز خلاف نہیں کرے گا

اللّٰهُ وَعْدَهٗ ؕ وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ﴿۴۷﴾

اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کے، بے شک ایک دِن تیرے رَبّ کے نزدیک مثل ایک ہزار سال کے ہے ان سے جن کو تم شمار کرتے ہو ﴿۴۷﴾

وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ لَهَا وَهِىَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ اَخَذْتُهَا ۚ وَاِلَىَّ الْمَصِيْرُ ﴿۴۸﴾

اور کتنی ہی بستیاں ہیں کہ میں نے ان کو مہلت دی اس حال میں کہ وہ ظالمہ تھیں پھر میں نے ان کو پکڑا اور لوٹنا میری طرف ہی ہے ﴿۴۸﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ اِنَّ اللّٰهَ يُدٰفِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: بے شک اللہ تعالیٰ دُور ہٹائے گا۔ دافَعَ يدافِعُ مدافعةً: دِفاع کرنا، دفاع کا لفظ عام طور پر آپ سنتے رہتے ہیں، دفاع قتال کے وزن پر ہے، اور مدافعہ مقاتلہ کے وزن پر ہے باب مفاعلہ۔ بے شک اللہ تعالیٰ مدافعت کرے گا، دفاع کرے گا ان لوگوں سے جو ایمان لے آئے، دُور ہٹادے گا ان لوگوں سے جو ایمان لے آئے۔ کن کو دُور ہٹادے گا، تو يُدٰفِعُ کا مفعول المشرکین، الکُفّار، الأعداء جو بھی نکال لیجئے، مشرکین کو، کافروں کو، دشمنوں کو دُور ہٹادے گا۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ: خَوَّانٍ مبالغہ ہے خائن کا، خیانت کرنے والا، اور كَفُوْرٍ کُفران سے مبالغے کا صیغہ ہے، زیادہ ناشکری کرنے والا، معنی یوں ہوگا، بے شک اللہ تعالیٰ کسی خیانت کرنے والے کسی ناشکرے کو پسند نہیں کرتا۔ اور

كُلّ کا لفظ صفت میں مبالغہ کے طور پر بھی آجایا کرتا ہے جیسے کہا کرتے ہیں "هو العالم كل العالم" وہ بہت بڑا عالم ہے، تو اس معنی کو ظاہر کرنے کے لئے لفظ کُل کو لے آیا کرتے ہیں۔ تو پھر اس کا معنی ہو جائے گا بڑا خیانت کرنے والا، بڑا ناشکرا، اس سے پھر مبالغہ پیدا ہو جائے گا۔ اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ: اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو جن سے قتال کیا جاتا ہے، جن سے لڑائی لڑی جاتی ہے، بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا: اجازت دے دی گئی اس سبب سے کہ وہ ظلم کیے گئے۔ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرٌ: اور بے شک اللہ تعالیٰ ان کی مدد کرنے پر البتہ قادر ہے۔ نَصْرِهِمْ میں مصدر کی اضافت مفعول کی طرف ہے۔ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ: یہ وہ لوگ ہیں یعنی جن کو مظلوم قرار دیا گیا، جن کو لڑنے کی اجازت دی گئی یہ وہ لوگ ہیں جو نکال دیے گئے اپنے گھروں سے ناحق، بلاوجہ، اِلَّاۤ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ: مگر اس سبب سے کہ انہوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے، یعنی ان کے نکالے جانے اور کوئی وجہ نہیں سوائے اس کے کہ انہوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے۔ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ: اگر نہ ہوتا اللہ تعالیٰ کا دور ہٹانا لوگوں کو یعنی بعض کو بعض کے ذریعے سے۔ بَعْضَهُمْ یہ النَّاسَ سے بدل ہے۔ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا: صَوَامِعُ یہ صَوْمَعَةٌ کی جمع ہے، صومعة کہتے ہیں راہب کی کُٹیا کو، عیسائیوں میں تارک الدنیا لوگ جو دنیا سے الگ تھلگ ہو کے جنگلوں میں اپنے رہنے کی جگہ بنا لیتے تھے، خلوت خانے، یا خانقاہ کہہ لیجئے، درویشوں کے خلوت خانے، راہب کی کُٹیا، صوامع کا یہ مفہوم ہے۔ اور بِيَعٌ یہ بِيْعَةٌ کی جمع ہے، عیسائیوں کا عبادت خانہ جس کو "کنیسہ" کہتے ہیں، یا "گرجا گھر" کہتے ہیں۔ اور صلوات یہ صلوٰۃ کی جمع ہے اس سے یہود کے عبادت خانے مراد ہیں، کہتے ہیں کہ یہود اپنی عبادت گاہ کے لئے "صَلُوتا" کا لفظ استعمال کیا کرتے تھے جس کو عربی میں صلاۃ کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے۔ اور مساجد، مسجد کی جمع ہے۔ "البتہ ڈھا دیے جاتے، گرا دیے جاتے صوامع یعنی راہبوں کی خلوت گاہیں، اور کنیسے یعنی گرجا گھر اور یہود کی عبادت گاہیں اور مسجدیں، ایسی مسجدیں جن میں اللہ کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے"، تو يُذْكَرُ والا جملہ مساجد کی صفت ہے۔ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ: اور البتہ ضرور مدد کرے گا اللہ تعالیٰ اس شخص کی جو اللہ کی مدد کرے گا یعنی اللہ کے دین کی مدد کرے گا۔ بے شک اللہ تعالیٰ البتہ قوت والا ہے غلبے والا ہے۔ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ: تمکین: ٹھہرا دینا، ثابت کر دینا، قدرت دے دینا۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ انہیں قدرت دے دے زمین میں تو یہ لوگ نماز قائم کریں گے اور زکوٰۃ ادا کریں گے اور نیکی کا حکم کریں گے اور برائی سے روکیں گے اور سب کاموں کا انجام اللہ کے لئے ہے۔ وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ: اگر یہ لوگ آپ کو جھٹلائیں تو فلا عجب یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، یہ تکذیب کا سلسلہ پہلے سے چلا آ رہا ہے، "تحقیق جھٹلایا ان سے پہلے نوح علیہ السلام کی قوم نے اور عاد نے اور ثمود نے" عاد کی طرف ہود علیہ السلام نبی بن کر گئے تھے اور ثمود کی طرف حضرت صالح علیہ السلام، وَقَوْمُ اِبْرٰهِيْمَ: اور ابراہیم علیہ السلام کی قوم نے، وَقَوْمُ لُوْطٍ: اور لوط علیہ السلام کی قوم نے، وَّاَصْحٰبُ مَدْيَنَ: اور مدین والوں نے، جن کی طرف حضرت شعیب علیہ السلام تشریف لے گئے تھے، مدین شہر کا نام ہے، قبیلے کا نام بھی مدین تھا، اصل میں مدین حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے تھے، ان کی اولاد آگے پھیلی تو وہ سب مدین کہلاتے تھے، اور جس جگہ وہ آباد ہوئے تو اس شہر کو بھی مدین کہتے تھے، یہاں شہر مراد ہے، وَكُذِّبَ مُوْسٰى: اور موسیٰ علیہ السلام کو بھی جھوٹا قرار دیا گیا، فَاَمْلَيْتُ لِلْكٰفِرِيْنَ: پھر میں نے ڈھیل دی کافروں کو، ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ پھر میں نے انہیں پکڑ لیا، فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ: نَكِيْرِىْ، راء کے نیچے جو کسرہ ہے یہ دال بر یائے متکلم ہے۔ تو

میرا انکار کرنا کیسے تھا؟ یعنی دیکھا؟ جب میں نے ان کے حال پر انکار کیا تو کیسی شدت سے انکار کیا، یہ عملی انکار ہے، ورنہ قولی انکار تو ہوتا ہی ہے، انبیاء ﷺ کی زبان سے جو بات آتی ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انکار ہے کہ تمہارا یہ کام ٹھیک نہیں، تمہارے عقیدے ٹھیک نہیں، اور ایک عملی انکار ہوتا ہے، وہ یہی عذاب کی شکل میں ہوتا ہے۔ ''پھر کیسا تھا میرا انکار کرنا'' فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَهِىَ ظَالِمَةٌ: کتنی ہی بستیاں، ہم نے ان کو ہلاک کر دیا اس حال میں کہ وہ ظالمہ تھیں، قریہ ظالمہ تھیں یعنی قریہ والے ظالم تھے، ''اس حال میں کہ وہ ظالمہ تھیں'' مشرکہ تھیں۔ فَهِىَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا: عروش عرش کی جمع ہے، عرش چھت کو کہتے ہیں۔ پس وہ بستیاں گری پڑی ہیں اپنی چھتوں پر۔ مکانوں کے گرنے کا طریقہ عموماً یہی ہوا کرتا ہے، پہلے چھت گرا کرتی ہے دیواریں کھڑی رہ جاتی ہیں، پھر آہستہ آہستہ دیواریں گرنی شروع ہو جاتی ہیں، تو چھتوں پر گرنے کا یہی معنی ہوتا ہے، چھت پہلے گرتی ہے دیواریں بعد میں گرتی ہیں، جب مکان ویران ہوا کرتے ہیں تو طریقہ یہی ہوتا ہے۔ ''پس گری پڑی ہیں وہ بستیاں اپنی چھتوں پر'' وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ: بئر کنویں کو کہتے ہیں، معطلہ کا معنی بے کار چھوڑا ہوا، نکما چھوڑا ہوا، جس کو کام میں نہیں لایا جا رہا، اور بِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ کا عطف ہے قَرْيَةٍ پر۔ ''اور کتنے ہی کنویں بے کار پڑے ہوئے'' وَقَصْرٍ مَّشِيْدٍ اس کا عطف بھی قریہ پر ہے۔ ''اور کتنے ہی مضبوط محل'' جو کھنڈرات کی شکل میں ہیں، کتنے ہی بے کار پڑے ہوئے کنویں ہیں جن کو ہم نے ویران کر دیا۔ قریہ اور کنواں یہ دونوں لفظ قریب قریب ہی ہوتے ہیں، کیونکہ پرانے زمانے میں جہاں بستی ہوتی تھی تو وہاں کنواں ہوتا تھا، جس سے پانی نکال کے وہ اپنا کام چلاتے تھے، اور آج کل بھی اردگرد جو چھوٹی چھوٹی بستیاں ہوتی ہیں وہ کنویں کے نام سے مشہور ہوتی ہیں، فلاں کا کنواں، فلاں کا کنواں، تو کنووں کے بے کار ہو جانے کا مطلب یہی ہے کہ وہاں کی آبادی اجڑ گئی، کیونکہ جب تک آبادی رہے گی کنواں آباد رہے گا، جب آبادی اجڑ جاتی ہے تو کنواں بے کار ہو جاتا ہے۔ مَشِيْدٍ اسم مفعول کا صیغہ ہے، شِید کہتے ہیں چونے کو، اور شَيَّدَ کا معنی ہوتا ہے چونے کے ساتھ مضبوط کرنا، قرآنِ کریم میں دوسری جگہ یہ لفظ بھی آیا ہوا ہے وَلَوْ كُنْتُمْ فِىْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ (سورۂ نساء: ۷۸) چونا گچ قلعے۔ اور مَشِيْدٍ مجرد سے ہے، اور مُشَيَّدَةٍ مزید سے ہے، یعنی چونا لگا لگا کے مضبوط کیے ہوئے محلات تھے، جس کو آج کل آپ سیمنٹ کہتے ہیں اس کی جگہ پرانے زمانے میں چونا استعمال ہوتا تھا، پرانی عمارتیں اگر اب بھی دیکھیں تو ان میں چونا ہی استعمال ہوا ہوا ہے۔ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ: کیا پھر یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں، انہوں نے سیر نہیں کی زمین میں؟ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ: پھر ہو جاتے ان کے لئے دل جن کے ذریعے سے یہ سمجھتے سوچتے، اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا: یا ہو جاتے ان کے لئے کان جن کے ذریعے سے یہ سنتے، یعنی ان کی آنکھیں کھل جاتیں، ان کے کان کھل جاتے اگر یہ چل پھر کے وہ واقعات دیکھیں جو دنیا میں پیش آئے ہیں۔ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ: ''ھا'' ضمیر قصہ ہے۔ پس بے شک واقعہ یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں، وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِىْ فِى الصُّدُوْرِ لیکن اندھے ہو جاتے ہیں وہ دل جو سینوں میں ہیں، اکثر و بیشتر کافروں کی منکروں کی مشرکوں کی آنکھیں اندھی نہیں، سب کچھ ان کے سامنے ہے، لیکن دل اندھے ہیں جن کے ذریعے سے سوچتے سمجھتے نہیں۔ ''اندھی نہیں ہوتیں آنکھیں لیکن اندھے ہو جاتے ہیں دل جو کہ سینوں میں ہیں'' وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ: جلدی طلب کرتے ہیں آپ سے عذاب کو، وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ: اور ہرگز خلاف نہیں کرے گا اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کے، اللہ تعالیٰ ہرگز وعدہ خلافی نہیں کرے گا۔ وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ

مِّمَّا تَعُدُّوْنَ: بے شک ایک دِن تیرے رَبّ کے نزدیک مثل ایک ہزار سال کے ہے، مِّمَّا تَعُدُّوْنَ: ان سے جن کو تم شمار کرتے ہو، یعنی تمہارے شمار کرنے کے اعتبار سے ایک ہزار سال کی طرح ہے اللہ کے نزدیک ایک دن، وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ: اور کتنی ہی بستیاں ہیں کہ میں نے ان کو مہلت دی، ان کی رسی ڈھیلی چھوڑی، میں نے ان کو مہلت دی ڈھیل دی اس حال میں کہ وہ ظالمہ تھیں، ثُمَّ اَخَذْتُهَا: پھر میں نے ان کو پکڑا، وَاِلَيَّ الْمَصِيْرُ: اور لوٹنا میری طرف ہی ہے، الْمَصِيْرُ: لوٹنا۔ مصدر میمی ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط

دو رکوع قبل آپ کے سامنے یہ آیت آئی تھی اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ، جس میں اشارہ تھا اس شدید کشمکش کی طرف جو کہ مشرکینِ مکہ اور سرورِ کائنات ﷺ اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے درمیان برپا تھی کہ اللہ کے گھر کی زیارت سے محروم کردیا، راستے روک لیے، وہاں تک نہیں جانے دیتے تھے، اور ظاہری طور پر غلبہ تھا مشرکین کو، اس لیے وہ رکاوٹ پیدا کر کے کھڑے ہوگئے۔

مکہ میں جہاد کی اجازت کیوں نہیں تھی؟

مکہ معظمہ میں رہتے ہوئے جب آپس میں کشمکش چلتی تھی، مشرکین کی طرف سے مسلمانوں پر تشدد ہوتا تھا، تو آخر آدمی چاہے کمزور ہی ہو، اس کا جی تو چاہتا ہے کہ جو مجھے چھیڑ رہا ہے، مجھے تنگ کر رہا ہے، میرے پتھر مار رہا ہے تو میں بھی آگے سے ہاتھ اُٹھاؤں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو شدت کے ساتھ منع کردیا گیا تھا کہ مقابلے میں ہاتھ نہیں اُٹھانا، اس لیے تیرہ سال تک مکہ معظمہ میں مسلمانوں نے مشرکین سے مار کھائی ہے اور آگے سے ہاتھ نہیں اُٹھایا، یہ اللہ تعالیٰ کی ایک حکمت تھی، کیونکہ اگر پہلے دِن سے لڑنا شروع کردیتے، تو پھر یہ نہ پوری طرح سے جماعت بنتی، اور نہ جماعتی حیثیت میں جہاد ہوتا، ایک ایک آدمی اسلام قبول کرتا اور لڑلڑ کے شہید ہوتے چلے جاتے، تو پھر اس طرح سے جماعتی صورت اختیار نہ ہوتی، تو وہاں تو جماعت بنائی جارہی تھی، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ابتدائی دور میں آزمائش تھی کہ لوگوں کے جذبات پختہ ہوجائیں اور ٹھوس ہوجائیں، تیرہ سال تک ماریں کھائیں، جو زیادہ تنگ آجاتا تو وہ علاقہ چھوڑ کر ہجرت کر کے چلا جاتا تھا، اور دوسری جگہ ٹھکانہ بنالیتا، مکہ معظمہ سے حبشہ کی طرف دو دفعہ ہجرت ہوئی، آخر آہستہ آہستہ لوگ وہاں سے مدینہ منورہ آنے لگے۔

مدینہ میں جہاد کی اِجازت اور حوصلہ افزائی

مدینہ منورہ میں جس وقت آگئے، پھر وہاں ایک جماعت بن گئی، اور مدینہ منورہ ایک مرکز بن گیا، چھوٹی سی ریاست کی شکل ہوگئی، اب اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کو اجازت دی گئی کہ اب تم مقابلے میں ہاتھ اٹھا سکتے ہو۔ پہلے اجازت دی

گئی گویا کہ وہ رکاوٹ جو لگی ہوئی تھی اس کو دُور ہٹا دیا گیا، اور پھر بعد میں تو جہاد کرنے کے شدید سے شدید تر تاکیدی احکام آئے۔ جس وقت یہ اجازت دی جا رہی تھی اس وقت بھی مشرکین کے مقابلے میں مسلمان مٹھی بھر تھے، ایک ہی شہر تھا جس میں ان کا اثر تھا، باقی سارے کا سارا ملک اُن کا تھا، تعداد کے لحاظ سے بھی کم تھے، تو اللہ اجازت بھی دے رہے ہیں، ساتھ ساتھ حوصلہ افزائی بھی کر رہے ہیں، کہ ان کو اجازت دی جا رہی ہے ان کے مظلوم ہونے کی وجہ سے، اب ان کو حق دے دیا گیا کہ ظالموں کے مقابلے میں ہاتھ اُٹھالیں، یہ مظلوم ہیں کمزور ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ جو ان کا مددگار ہے وہ بڑا قوی اور بڑا عزیز ہے، ان کے مدد کرنے پہ اللہ قادر ہے۔ مظلوم ہونے کا ذکر کیا کہ ناحق ان کو گھروں سے نکالا گیا یہ کتنا بڑا ظلم ہے، ورنہ آپ جانتے ہیں کہ کوئی شخص جیتے جی اپنا گھر چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوا کرتا، اپنا گھر اور علاقہ انسان اسی وقت ہی چھوڑتا ہے، اپنی جائیداد کو اپنے رشتہ داروں کو اسی وقت ہی قربان کرتا ہے جب اس کے لئے وہاں جینا دوبھر ہو جائے، اور وہ علاقہ اور زمین اس کے لیے تنگ ہو جائے، تب انسان گھر سے نکلا کرتا ہے، تو اسی سے آپ اندازہ کیجئے کہ کتنی ان کے اوپر زیادتیاں ہوئی ہوں گی؟ کتنا ان کے اوپر ظلم ہوا؟ کہ یہ لوگ اپنے گھروں سے نکلنے پر مجبور ہو گئے، اور پھر بلا قصور، قصور ان کا صرف اتنا تھا کہ انہوں نے رَبُّنَا اللہُ کا نعرہ لگایا، کہ وہ اللہ کے علاوہ کسی اور کو رَبّ نہیں مانتے تھے، صرف اللہ کو رَبّ مانتے تھے، یہ قصور تھا جس کی بناء پر ان کو نکالا گیا، اور آپ جانتے ہیں کہ یہ تو کوئی قصور کی بات نہیں تھی، یعنی ان کی مظلومیت کی انتہاء ہے، ایک تو ہے کہ چلو ایک آدمی سے کچھ قصور ہوا، اور دوسرے نے سزا کچھ زیادہ دیدی تو وہ زیادہ سزا بھی ظلم ہے، لیکن بنیاد اِس کی اپنی شرارت بنی، شرارت تھوڑی تھی مار زیادہ دیا اس کو بھی زیادتی کہہ سکتے ہیں، لیکن ایک آدمی کا قصور ہے ہی کوئی نہیں بلکہ اس کی ایک نیکی اور خوبی کی بناء پر اس کو پیٹ دیا جائے تو یہ کتنی بڑی زیادتی ہے؟ یہ ایسے ہی ہے جس طرح سے آپ کہیں کہ جی! میرا اور تو کوئی قصور نہیں تھا، صرف یہ ہے کہ میں نماز پڑھ رہا تھا، اب نماز پڑھنا تو کوئی قصور کی بات نہیں ہے، تو یہاں بھی اسی طرح سے ہے کہ ان کا کوئی قصور نہیں تھا، صرف یہی بات تھی کہ انہوں نے کہا رَبُّنَا اللہُ، بس اسی بات پر جھگڑا ہو گیا کہ تم رَبُّنَا اللہُ کیوں کہتے ہو، ان پتھروں کو ان بتوں کو تم کیوں نہیں پوجتے، ان کے سامنے تم پیشانی کیوں نہیں رکھتے، تم اللہ کو کیوں ماننے لگ گئے، اس قصور کی بناء پر ان کو نکال دیا گیا، اور یہ کوئی قصور تھا ہی نہیں، تو یہ مظلومیت کی انتہاء ہے کہ گھروں سے نکالے گئے اور بلا وجہ، بلا وجہ بھی کیا بلکہ خوبی کی وجہ سے کہ انہوں نے یہ خوبی اختیار کیوں کرلی۔

اِبتدا میں جہاد کا طریقہ کیا اِختیار کیا گیا؟

اس طرح سے اللہ نے ان کو جہاد کی اجازت دی، یہ پہلی آیت ہے جو جہاد کی مشروعیت کے متعلق اتری، جس میں مسلمانوں کو اجازت دی کہ اب ہاتھ اٹھاؤ، اب تمہیں حق ہے، بہت ماریں کھالیں، اب بدلے کا وقت آ گیا، اور اللہ کی نصرت اور اللہ کی مدد پر اعتماد کرو، جتنا تم اللہ کے دِین کے مددگار رہو گے اتنی ہی اللہ تعالیٰ تمہیں مدد دے گا۔ چنانچہ اس اجازت کے آ جانے کے بعد پھر سرورِ کائنات ﷺ نے چھوٹی چھوٹی جماعتیں اِدھر اُدھر بھیجنی شروع کیں، جیسے ابتدائی طور پر چھوٹی چھوٹی جھڑپیں ہوتی ہیں، جنگ کی ابتدا ہوئی تو جھڑپوں کی شکل تھی، دس آدمی اِدھر کو بھیج دیے کہ دیکھو! کوئی مشرکوں کا قافلہ جا رہا ہو تو اس کا راستہ روکنا، کیونکہ

ان کے قافلے تجارت کے لئے مکہ معظمہ سے اکثر و بیشتر مدینہ منورہ کے آس پاس سے گزر کے شام کو جایا کرتے تھے، تو تجارتی قافلوں کے راستے روکنے کے ساتھ تصادم کی ابتدا ہوئی ہے، جس کو آج کل کی اصطلاح میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ حضور ﷺ نے اہلِ مکہ کا اقتصادی بائیکاٹ شروع کیا، ان کی سڑکیں روک لیں کہ یہ کہیں ادھر ادھر جا نہ سکیں، ان کی تجارت بند ہو جائے اور ان کا گزارہ صرف تجارت پر ہی تھا۔

مشروعیتِ جہاد کے بعد پہلا تیر کس نے چلایا؟

سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ یہ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، حضور ﷺ کی والدہ کے خاندان میں سے ہیں، اس لیے حضور ﷺ نے فرمایا، حدیث شریف میں آتا ہے: یہ میرے ماموں ہیں، دِکھائے کوئی شخص میرے ماموں جیسا ماموں، انسان کو چاہیے کہ اپنے ماموں کی عزت کرے۔[1] یہ الفاظ حدیث شریف میں ہیں، اور یہی وہ نیک بخت ہیں جن کے متعلق حضور ﷺ نے فرمایا تھا: ''یَا سَعْدُ! اِرْمِ فِدَاكَ أَبِي وَأُمِّي!''، ''اے سعد! تیر چلا، تیرے اُوپر میرے ماں باپ فدا!''[2] تو ماں باپ کے فدا ہونے کا تذکرہ ان کے متعلق ہے اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے متعلق ہے۔[3] ...... (درمیان میں بات یاد آ گئی) حضرت سعد رضی اللہ عنہ جو کمان استعمال کیا کرتے تھے، یا اُحد کے میدان میں جو کمان انہوں نے استعمال کی تھی وہ اب تک محفوظ ہے، جب تین چار سال پہلے جانے کا اتفاق ہوا تھا تو اس وقت تک حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ والے مکان کی جگہ میں جو مسجدِ نبوی کے قریب ہے، لکڑی کے ایک بکس میں رکھی ہوئی تھی، اور لوگ اس کی زیارت کرنے جاتے تھے، میں نے بھی اسے دیکھا ہے، اور اس لکڑی کے بکس کے اُوپر لکھا ہوا تھا: ''اِرْمِ یَا سَعْدُ! فِدَاكَ أَبِي وَأُمِّي!'' تو وہ اسی بات کی طرف اشارہ تھا کہ یہ انہی کی کمان ہے جو وہ استعمال کرتے تھے۔ اب اس کو وہاں سے اُٹھا دیا گیا ہے، اس دفعہ ہم گئے ہیں تو وہ وہاں موجود نہیں تھی، پہلے تھی، لوگ زیارت کے لیے جاتے تھے، میں نے خود دیکھا ہے اس کو، اس کی شکل ہی بتاتی تھی کہ واقعی یہ بہت قدیم ہے، قریب قریب زمانے کی کمانیں جو ہمارے عجائب گھروں میں رکھی ہوئی ہیں وہ ویسی نہیں ہے...... تو سب سے پہلا تیر اللہ کے راستے میں جہاد کی مشروعیت کے بعد اس نیک بخت نے چلایا ہے، سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے،[4] چنانچہ جب کبھی کوئی بات ہوا کرتی تھی، صحابہ بھی ان کا تعارف اسی طرح کراتے تھے: ''أَوَّلُ مَنْ رَمٰى فِي سَبِيلِ اللہِ!'' اور ایک دو جگہ انہوں نے خود انہوں نے بھی اپنے متعلق کہا کہ سب سے پہلے اللہ نے مجھے توفیق دی کہ جہاد کی مشروعیت کے بعد پہلا تیر میری کمان سے نکلا...... تو پھر یہ جھڑپیں شروع ہو گئیں، سال کے اندر اندر ہی غزوۂ بدر کی نوبت آ گئی، پھر بھرپور جنگیں ہوئیں، آہستہ آہستہ اللہ تعالیٰ نے مشرکین کا زور توڑ دیا، اور مکہ معظمہ مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا، تو ان آیات کے اندر جو پیش گوئی کی گئی

---

(۱) ترمذی ج ۲ ص ۲۱۶ باب مناقب سعد. مشکوٰۃ ج ۲ ص ۵۶۷ باب مناقب العشرۃ فصل ثانی۔
(۲) بخاری ۵۸۱/۲، کتاب التفسیر. آل عمران، باب اذھمت طائفتان. مشکوٰۃ ۵۶۵/۲، باب مناقب العشرۃ فصل اول
(۳) بخاری ۵۲۷/۱، باب مناقب الزبیر. مشکوٰۃ ۵۶۵/۲، باب مناقب العشرۃ فصل اول
(۴) بخاری ۵۲۸/۱، باب مناقب سعد. مشکوٰۃ ۵۶۷/۲، باب مناقب العشرۃ فصل ثالث

تھی کہ اب وقت آ گیا، یہ مظلوم اُٹھیں گے اور اللہ کی نصرت ان کے ساتھ ہوگی، اور اللہ تعالیٰ آہستہ آہستہ ان ظالموں کا زور توڑ دیں گے اور ان کا دفاع کریں گے، یہ سب باتیں دُنیا کے سامنے آ گئیں، اور ایک ایک لفظ پورا ہو گیا۔

''خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم'' کی منقبت

پھر یہ قبل از وقت پیش گوئی کی جا رہی ہے کہ یہ مظلوم جن کو دنیا پیٹ رہی ہے، ان کی پوزیشن اور ان کی حیثیت یہ ہے کہ اگر ان کو ہم نے قدرت دے دی تو یہ مشرکینِ مکہ کی طرح ناشکری نہیں کریں گے، اللہ کے احکام میں غداری اور خیانت نہیں کریں گے، بلکہ اگر ہم نے ان کو قدرت دے دی تو یہ خود بھی نمازیں پڑھیں گے، زکوتیں دیں گے، نیکی پھیلائیں گے، برائی سے روکیں گے، یہ اللہ تعالیٰ نے قبل از وقت ان کی تعریف کی ہے۔ چنانچہ سرورِ کائنات ﷺ کے زمانے میں اور آپ کے بعد خلفاء کا جو زمانہ آیا اس میں ایک ایک لفظ حقیقت بن کے سامنے آ گیا کہ واقعی انہوں نے نماز کا نظام بھی قائم کیا، زکوٰۃ کا نظام بھی قائم کیا، نیکی پھیلائی اور برائی سے روکا، تو خلفائے راشدین کے لئے یہ آیت منقبت میں شمار ہوتی ہے، کیونکہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی جماعت حضور ﷺ کے ساتھ جو تشکیل پائی تھی، تو حضور ﷺ کے بعد حکومت انہی لوگوں کو ملی ہے، اور اگر یہ لوگ ایسے نہیں تھے کہ نماز قائم کرتے، زکوٰۃ دیتے، نیکی پھیلاتے، برائی سے روکتے، تو پھر اس آیت کا مصداق گویا کہ متحقق ہی نہیں ہوا، اس لیے خلفاء کی منقبت کے اندر اس آیت کو شمار کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے قبل از وقت تعریف ہے کہ ہم جس وقت ان کو یہ قدرت دیں گے تو ان کا کام یہ ہوگا کہ نمازیں پڑھیں گے، زکوتیں دیں گے، نیکی پھیلائیں گے، برائی سے روکیں گے، اور واقعۃً ایسا ہی ہوا۔ تو یہ آیات ہیں جو جہاد کے متعلق آئیں۔

مشرکینِ مکہ خائن اور ناشکرے ہیں

''بے شک اللہ تعالیٰ دُور ہٹا دے گا مؤمنوں سے'' یعنی ان دشمنوں کو مشرکوں کو کافروں کو اللہ تعالیٰ دُور ہٹا دے گا، ان کو دفع کر دے گا، مؤمنوں کو بچائے گا۔ ''بے شک اللہ تعالیٰ کسی خائن کسی ناشکرے کو پسند نہیں فرماتے'' یعنی یہ مشرکین مکہ خائن بھی ہیں اور کفور بھی ہیں، ان کو اللہ کے گھر کی مجاورت ملی تھی اور اللہ کے گھر کی وجہ سے انہوں نے دنیا کی نعمتوں سے فائدہ اٹھایا، ساری دنیا ان کی عزت کرتی تھی کہ یہ بیت اللہ کے مجاور ہیں، تو شکر گزاری کی بجائے یہ ناشکرے ہو گئے، اُسی اللہ کے خلاف انہوں نے بغاوت کی، اور پھر بیت اللہ کے متعلق جس قسم کے عہد معاہدے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد سے لیے تھے یا اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ جو عہد کیے تھے کہ یوں کرنا ہے، یوں نہیں کرنا (جیسے تفصیل آپ کے سامنے پہلے آ گئی) ان سب میں انہوں نے خیانتیں کیں، بیت اللہ سے فائدہ تو اٹھایا لیکن جہاں تک بیت اللہ کے حقوق کا تعلق ہے اس میں خیانت ہی خیانت ہے، کوئی حق ادا نہیں کیا، تو ایسے خائن ایسے غدار ایسے ناشکرے اللہ کو پسند نہیں۔ اب وقت آ گیا کہ اللہ تعالیٰ ان سے اپنے گھر کو خالی کرا دے، اور جو اس کے اہل ہیں امانت دار ہیں اللہ کے حقوق اور بیت اللہ کے حقوق کی نگہداشت کرنے والے ہیں، اب اللہ تعالیٰ انہیں تسلط دے گا، یہ ایک قسم کی پیش گوئی ہو گئی کہ مشرکوں کا زور اب ٹوٹ جائے گا، یہ خائن ہیں غدار ہیں ناشکرے ہیں انہوں نے اللہ کی

نعمتوں کی شکر گزاری نہیں کی بلکہ ناشکری کی، اب اللہ تعالیٰ ان کی جگہ وفاداروں کو دیانت داروں کو اور شکر گزاروں کو اس مرکز کے اندر لے آئے گا، تو یہ ایک قسم کی پیش گوئی ہوگئی، اور ایسے ہی ہوا، چند دنوں کے اندر ہی حالت بدل گئی۔

''اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو جن سے لڑائی کی جاتی ہے'' یعنی دوسروں کی طرف سے چھیڑ چھاڑ ہوتی تھی، انہوں نے اوّلاً چھیڑ چھاڑ نہیں کی، اس لیے یُقٰتَلُوْنَ کہا، جن کے ساتھ قتال کیا جاتا ہے، جن کے ساتھ لڑائی لڑی جاتی ہے، ان کو اجازت دے دی گئی اس وجہ سے کہ وہ مظلوم ہیں، اور ان کے مدد کرنے پر البتہ اللہ قدرت رکھنے والا ہے، اور ان کی مظلومیت یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کو گھروں سے نکال دیا گیا ناحق، صرف اس وجہ سے کہ انہوں نے کہا رَبُّنَا اللّٰہُ۔

جہاد کی حکمت

آگے جہاد کی حکمت ہے کہ اللہ تعالیٰ جو جہاد کو مشروع کرتے ہیں اور اہلِ حق کو گاہے بگاہے اہلِ باطل کے اوپر غلبہ دیتے رہتے ہیں، اس میں حکمت یہ ہے کہ اگر یہ سلسلہ نہ کیا جائے تو دنیا سے خیر مٹ جائے اور شر ہی شر غالب آجائے۔ خیر کے نشان اپنے اپنے وقت میں مختلف تھے، جیسا کہ اپنے وقت میں یہ راہب اہلِ حق تھے، ان کی خانقاہیں ان کے خلوت خانے ایک وقت میں یہ بھی حق کا نشان تھے، عیسائیوں کے عبادت خانے جن کو گرجا گھر یا کنیسہ کہتے ہیں، یہودیوں کے عبادت خانے جن کو صلوتا یا صلوات کہتے ہیں، اور مسلمانوں کی مسجدیں، اگر اللہ تعالیٰ اس طرح سے گاہے بگاہے لوگوں کا زور نہ توڑتا رہے، اس شر کو خیر کے ذریعے سے نہ مٹاتا رہے تو لوگ تو یہ ہدایت کے نشان ہی مٹا دیں، کیونکہ دنیا کے اندر اکثریت ہمیشہ بد دینوں کی رہی ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ گاہے گاہے بُروں کا زور توڑتے ہیں اور نیکی کو غلبہ دیتے ہیں۔ ''اگر نہ ہوتا اللہ کا دفع کرنا لوگوں کو یعنی بعض کو بعض کے ذریعے سے تو البتہ گرا یے جاتے راہبوں کی خلوت گاہیں اور کنیسے اور صلوات اور مسجدیں جن میں اللہ کا ذکر کثرت سے کیا جاتا ہے۔ اور اللہ ضرور مدد کرے گا ان کی جو اللہ کے دِین کے مددگار ہیں'' مشرکین اب اللہ کی نصرت سے محروم ہوگئے کیونکہ انہوں نے اللہ کے دِین کی مخالفت کی، اور سرورِ کائنات ﷺ کی اُمت اب مدد کی حق دار ہے۔ ''بے شک اللہ قوی اور عزیز ہے۔'' اب آگے ان کی اس نیکی کی شہادت ہے کہ جن کے ساتھ اب اللہ کی نصرت شامل ہو رہی ہے یہ خوان کفور نہیں، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار، اللہ کے شکر گزار، دیانت دار، امانت دار لوگ ہیں کہ اگر اللہ انہیں حکومت دے گا، انہیں زمین میں قدرت دے گا تو یہ عبادات کا نظام قائم کریں گے، بدنی عبادت آگئی کہ نمازیں پڑھیں گے، مالی عبادت آگئی کہ زکوٰۃ دیں گے، اور آگے عام آگیا کہ نیکی پھیلائیں گے اور بُرائی سے روکیں گے۔ ''ہر کام کا انجام اللہ ہی کے لئے ہے'' یعنی ظاہری طور پر حالات چاہے کسی کے لئے سازگار ہوں، چاہے کسی کے لئے ناسازگار، لیکن انجام ہر چیز کا اللہ کے ہاتھ میں ہے، انجام کار اللہ تعالیٰ کمزوروں کو غلبہ دے دے اور طاقتوروں کو مغلوب کر دے ایسا ہوتا رہتا ہے، ''اللہ ہی کے لیے ہے اُمور کا انجام۔''

پچھلی تاریخ کا حوالہ اور اس کا مقصد

آگے پھر مشرکین کے لیے ایک وعید اور سرورِ کائنات ﷺ کے لئے تسلی ہے کہ یہ لوگ اگر آپ کی تکذیب کرتے ہیں تو

آپ اس میں کسی حیرانی یا پریشانی میں مبتلا نہ ہوں، یہ کوئی تعجب کی بات نہیں، پہلے سے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ایسے ہی ہوتا آیا ہے، قومِ نوح نے تکذیب کی، عاد نے کی، ثمود نے کی، قومِ ابراہیم نے کی، قومِ لوط نے کی، اَصحابِ مدین نے کی، موسیٰ علیہ السلام کو بھی جھوٹا کہا گیا، ان کی تکذیب کی گئی، وہاں بھی میں نے تکذیب کرنے والوں کو فوراً نہیں پکڑا، انہیں بڑی مہلت دی، بڑی ڈھیل دی، بہت موقع دیا انہیں سمجھنے کا اور سنبھلنے کے، لیکن جب حد ہی ہوگئی پھر ان کو پکڑا، تو کیسا پکڑا؟ یہ پچھلی تاریخ کی طرف گویا کہ متوجہ کیا، کیونکہ تاریخ بھی ایک طرح سے حق و باطل کے جانچنے کا ذریعہ بن جاتی ہے، کہ فلاں قوم نے ایسے حالات اختیار کیے تو وہ ترقی کرگئی، فلاں قوم نے ایسے حالات اختیار کیے تو وہ زوال میں چلی گئی، تاریخ کو اگر پڑھا جائے تو اسی نظریے سے پڑھنا چاہیے کہ اس میں عروج و زوال کی بڑی داستان ہے، اور جس وقت آپ دیکھیں گے تو معلوم ایسے ہوگا کہ جب کوئی قوم اچھے اخلاق اپناتی ہے اچھا طریقہ اختیار کرتی ہے اس کو عروج نصیب ہوتا ہے، اور جب وہ بداخلاقی اور بُرے طریقوں میں مبتلا ہو جاتی ہے تو زوال پذیر ہوجاتی ہے، تو یہ تاریخ کی طرف متوجہ کیا ہے ''میں نے ڈھیل دی کافروں کو پھر ان کو پکڑا، تو میرا پکڑنا، میرا انکار کرنا کیسے تھا؟ یہ انکار عملی انکار ہے، جیسے ڈنڈے کے ساتھ کسی کو پیٹ دیا یہ عملاً انکار ہے، باقی! زبانی کہنا اور دلائل قائم کرنا وہ بھی ایک انکار ہوتا ہے لیکن یہاں عملی انکار ہے۔ آگے انہی واقعات کی طرف متوجہ کیا: ''کتنی ہی بستیاں ہیں جن کو ہم نے برباد کردیا اس حال میں کہ وہ مشرکہ تھیں، گری پڑیں ہیں وہ اپنی چھتوں پر'' دنیا میں بڑے کھنڈرات ایسے ہیں، بڑے آثارِ قدیمہ ہیں، وہاں جا کے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ شہروں کے شہر برباد ہوئے ہوئے ہیں۔ ''گری پڑیں ہیں وہ اپنی چھتوں پر، اور کتنے ہی بے کار کنویں اور کتنے ہی مضبوط محلات'' جو اَب کھنڈرات کی شکل اختیار کرگئے، یہ مفہوم ہے اس کا۔ مضبوط محلات، جیسے اپنے اپنے وقت میں خوشحال لوگ مضبوط سے مضبوط تر عمارتیں بناتے ہیں لیکن اللہ کے عذاب کے تھپیڑے کے سامنے وہ ریت کی دیوار ہیں۔

دِل کی توجہ کے بغیر آنکھ، کان کام نہیں دیتے

''یہ لوگ زمین میں چلتے پھرتے نہیں؟'' یعنی مشرکینِ مکہ سے کہا جارہا ہے کہ یہ چلتے پھرتے نہیں؟ کہ یہ دیکھیں، زمین کے اُوپر بکھرے ہوئے واقعات پڑھیں، انہیں پتا چلے کہ کیسی کیسی بستیاں کیسے کیسے حالات میں ہلاک ہوگئیں؟ اگر یہ جائیں اور جا کے سوچیں تو ممکن ہے ان کے دلوں میں سمجھنے کا مادہ پیدا ہوجائے، سمجھنے کی نسبت عام طور پر محاورۃً قلب ہی کی طرف کی جاتی ہے، اگرچہ دِل سمجھتا ہے بذریعہ دماغ، سوچنے کی نسبت دل کی طرف ہی ہوتی ہے، یہ علیحدہ بات ہے کہ عقل کا مرکز دماغ ہو، لیکن دل کام لے تو عقل کام دیتی ہے، اگر دل کام نہ لے تو کچھ بھی نہیں، جیسے دیکھتے تو آپ آنکھ سے ہیں لیکن دیکھیں گے اسی وقت جب دل دیکھنا چاہے گا، دل متوجہ ہوگا، بسا اوقات آپ یہاں بیٹھے ہوتے ہیں اور آپ کا خیال گھر کی طرف چلا گیا، تو آپ کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں لیکن آپ کو یہاں بیٹھے ہوئے گھر کے حالات نظر آرہے ہیں، درسگاہ کا آپ کو کچھ پتا نہیں کہ آپ کے سامنے کون بیٹھا ہے، دائیں کون ہے، بائیں کون ہے۔ جب دل کا خیال کسی اور طرف چلا جاتا ہے تو آنکھ چاہے کھلی ہوئی ہوتی ہے، لیکن اس وقت آپ کو گھر کے اندر بھینس بندھی ہوئی نظر آرہی ہے، دودھ دوہا جارہا ہے، بچے اُچھلتے کودتے نظر آتے ہیں، گھر کے سارے حالات یہاں بیٹھے

ہوئے دیکھتے ہیں، اور درسگاہ میں جو کتاب سامنے ہوتی ہے اس کا پتا ہی نہیں ہوتا، اور یہاں درسگاہ میں تقریر ہو رہی ہے تو کان میں ایک لفظ ہی نہیں جاتا، ایسے معلوم ہوگا جیسے گھر بیٹھے اپنے ماں باپ کی باتیں سن رہے ہیں، تو دل جس وقت متوجہ ہوتا ہے تبھی جا کے انسان بات سنا کرتا ہے، دل متوجہ نہ ہو تو نہ آنکھ کام دیتی ہے نہ کان کام دیتا ہے، اسی طرح سے عقل اور دماغ کے ساتھ سوچنا بھی تبھی ہوتا ہے جب دل متوجہ ہو، تو اسی لیے نسبت قلب کی طرف کی گئی، مطلب یہ ہے کہ اگر یہ چلیں پھریں اور جا کر ان آثار کو دیکھ کے کھڑے ہو کے تدبر کریں کہ یہ کون لوگ تھے کیسے حالات میں تباہ ہوئے، تو تمہارے دلوں میں کچھ سوچ کا مادہ پیدا ہو جائے گا، تمہارے کانوں میں کچھ سننے کا مادہ پیدا ہو جائے گا، تو واقعہ یہی ہے کہ آنکھوں میں تو اللہ نے بینائی دی ہے لیکن ان لوگوں کے دل اندھے ہیں، یہ دل نہیں دیکھتے سمجھتے، اگر دلوں کی بینائی ٹھیک ہو جائے تو یہ سارا معاملہ ٹھیک ہو جائے، ان کے دل اندھے ہو چکے ہیں جس کی بنا پر یہ کچھ نہیں دیکھتے سنتے۔ ''کیا یہ لوگ چلے پھرے نہیں زمین میں کہ ہو جاتے ان کے لیے دل جن کے ذریعے سے یہ سوچتے، ہو جاتے ان کے لیے کان جن کے ذریعے سے یہ سنتے'' یعنی ان کے دل اور کان ان کو کام دینے لگ جاتے۔ ''پس بے شک قصہ یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں'' یعنی ایسے منکرین مشرکین کی آنکھیں تو ٹھیک ہیں، ''لیکن اندھے ہو جاتے ہیں دل جو کہ سینوں میں ہیں۔''

قیامت کے دِن کی لمبائی کی کیفیت

یہ عذاب کی ساری داستان سنانے کے بعد اب آگے انہیں پھر دھمکایا کہ یہ کہتے ہیں عذاب جلدی جلدی لے آؤ، جیسے مشرک قومیں اپنے رسول سے مطالبہ کرتی تھیں کہ فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا جس چیز سے ہمیں ڈراتے ہو وہ لے آؤ۔ ''یہ جلدی طلب کرتے ہیں عذاب، اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرے گا'' اللہ کا وعدہ ہے اہل حق کے لئے اچھے حالات کا اور مشرکین کے لئے عذاب کا، اللہ وعدہ خلافی نہیں کرے گا، لیکن جس طرح سے تم جلدی مچاتے ہو اللہ تعالیٰ کی حکمت کا یہ تقاضا نہیں ہے، تم سمجھتے ہو اتنے دِن ہو گئے عذاب کیوں نہیں آتا؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ کے حساب میں تو تمہارے ہزاروں سال بھی ایک دِن کی طرح ہیں، کبھی اللہ تعالیٰ پانچ پانچ سو سال برائی کو مہلت دے دیتا ہے، لوگ سمجھتے ہیں کہ ہماری تاریخ تو بڑی پرانی ہے حالانکہ اللہ کے نزدیک وہ ایسے ہی ہے جیسے ایک ہی دِن گزر رہا ہے، تو آخرت کا دِن ہزار سال کے برابر ہے كَأَلْفِ سَنَةٍ اس پر کاف داخل کیا گیا، گویا کہ وہ ہزار سال ہے، تمہارے ہزار سال کی طرح ہے، مِمَّا تَعُدُّونَ جس کو تم شمار کرتے ہو، یا تو دِن واقعی اسی طرح لمبا ہوگا یا سختیوں کی وجہ سے اس کو ہزار سال کے برابر قرار دیا، کیونکہ خوشحالی کا دِن جلدی گزر جاتا ہے اور جس میں سختی ہو تو ایسے لگتا ہے جیسے ایک دِن ایک ہزار سال کے برابر ہو گیا۔ تو قیامت کا دِن واقعہ کے لحاظ سے بھی لمبا ہوگا، اور سختی کے اعتبار سے بھی وہ زیادہ معلوم ہوگا، جیسے دوسری جگہ قرآنِ کریم میں اس کو خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ (سورۂ معارج) کے ساتھ تعبیر کیا گیا، ایسا دِن جو پچاس ہزار سال کے برابر ہوگا، جیسے دنیا میں رہتے ہوئے بھی اسی زمین پر رہتے ہوئے بھی آپ جانتے ہیں کہ ایک دِن تو یہ ہے جو ہمارے پاس ہے کہ چوبیس گھنٹے میں دِن اور رات کا چکر پورا ہو جاتا ہے، اور اسی دنیا میں ایسے علاقے بھی ہیں جہاں سال میں ایک دِن اور ایک رات گزرتے ہیں، چھ مہینے کا

دِن، چھ مہینے کی رات، قطب شمالی میں دِن چوبیس گھنٹے کا نہیں ہے، بلکہ آپ کا ایک سال اور وہاں کا ایک دِن اور ایک رات، تو اسی طرح سے ہوسکتا ہے کہ قیامت میں بھی بعض جگہوں کے اندر دِن زیادہ لمبا ہوجائے اور بعض میں کم ہو، آپ جغرافیہ پڑھیں گے تو یہ چیزیں سامنے آئیں گی کہ دنیا کے اندر وقت ایک ہی جیسا نہیں ہے، جس طرح ہمارے ہاں طلوع وغروب کا چکر چوبیس گھنٹے میں پورا ہوجاتا ہے، ہر جگہ ایسے نہیں۔ اور یا یہ ہے کہ بعض کے لیے وہ ایسے ہوگا جیسے پچاس ہزار سال کا، بعض کے لیے ایسے ہوگا جیسے ہزار سال کا، اور اسی دِن کے متعلق ہی حدیث شریف میں آتا ہے کہ مؤمن کے سامنے وہ ایسے گزر جائے گا جس طرح سے ایک نماز کا وقت گزرتا ہے، چونکہ مؤمن کسی پریشانی میں مبتلا نہیں ہوگا، تو اس کے لیے اس طرح سے گزرے گا جیسے ایک نماز کا وقت آیا تھا اور گزر گیا،(۱) تو مختلف لوگوں کے اعتبار سے اس دِن کے مختلف حالات ہوں گے۔ ''بے شک ایک دِن تیرے رَبّ کے نزدیک ہزار سال کی طرح ہے ان سالوں سے جن کو تم شمار کرتے ہو۔'' اور حدیث شریف میں حضور ﷺ نے مساکین کو خاص طور پر اَصحابِ صفہ، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی پارٹی کو حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ یہ اغنیاء سے نصف دِن پہلے جنت میں جائیں گے، آدھا دِن پہلے، اور آدھے دِن پہلے سے مراد وہاں پانچ سو سال ہے،(۲) یعنی اغنیاء اور دولت مند لوگ جنہوں نے جنت میں جانا ہے، فقراء ان سے پانچ سو سال پہلے جنت میں چلے جائیں گے، اور اس کو آدھے دِن کے ساتھ ہی تعبیر کیا۔

آگے پھر اجمال کے طور پر متوجہ کیا انہی واقعات کی طرف کہ کتنی ہی بستیاں ہیں جن کو میں نے ڈھیل دی، اس لیے تمہیں بھی ڈھیل دے رکھی ہے تم اس ڈھیل سے فائدہ اٹھاؤ، جلدی مطالبہ نہ کرو، ''کتنی ہی بستیاں ہیں کہ میں نے ان کو ڈھیل دی اس حال میں کہ وہ مشرکہ تھیں، پھر میں نے ان کو پکڑ لیا اور میری طرف ہی لوٹنا ہے۔''

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَاۤ اَنَا لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۴۹﴾ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ
آپ کہہ دیجئے اے لوگو! اس کے سوا کچھ نہیں کہ میں تمہارے لئے کھلم کھلا ڈرانے والا ہوں ﴿۴۹﴾ پھر جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور
عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿۵۰﴾ وَالَّذِيْنَ سَعَوْا فِيْۤ اٰيٰتِنَا
نیک عمل کرتے ہیں ان کے لئے بخشش ہے اور باعزت رزق ہے ﴿۵۰﴾ اور جو لوگ کوشش کرتے ہیں ہماری آیات (کے باطل کرنے) میں
مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿۵۱﴾ وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ
اس حال میں کہ وہ عاجز کرنے والے ہیں وہ جہنم والے ہیں ﴿۵۱﴾ اور نہیں بھیجا ہم نے آپ سے قبل کوئی رسول نہ کوئی نبی

(۱) مسند احمد رقم ۱۱۷۱۷۔ نیز: مظہری، ابن کثیر وغیرہ سورۃ معارج کے تحت۔ ولفظ الحدیث: حَتّٰى يَكُوْنَ اَخَفَّ عَلَيْهِ مِنْ صَلَاةٍ مَكْتُوْبَةٍ يُصَلِّيْهَا فِي الدُّنْيَا۔
(۲) ترمذی ۶۰/۲ باب ما جاء ان فقراء الخ۔ مشکوٰۃ ۴۴۷/۲ باب فضل الفقراء، فصل ثانی۔

اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِى الشَّيْطٰنُ

مگر جس وقت وہ نبی کوئی خواہش کرتا ہے تو شیطان اس کی خواہش میں رُکاوٹیں ڈالتا ہے، پھر زائل کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ اس چیز کو جو شیطان ڈالتا ہے

ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۵۲﴾ لِّيَجْعَلَ مَا يُلْقِى الشَّيْطٰنُ فِتْنَةً

پھر اللہ تعالیٰ اپنی آیات کو محکم کر دیتا ہے، اللہ تعالیٰ علم والا ہے حکمت والا ہے ﴿۵۲﴾ تاکہ کر دے اللہ تعالیٰ اس چیز کو جس کو شیطان ڈالتا ہے آزمائش

لِّلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ ۗ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَفِيْ شِقَاقٍۭ بَعِيْدٍ ﴿۵۳﴾

ان لوگوں کے لئے جن کے دِلوں میں بیماری ہے اور جن کے دِل سخت ہیں اور بے شک ظالم البتہ دُور کی ضد میں ہیں ﴿۵۳﴾

وَّلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَيُؤْمِنُوْا بِهٖ فَتُخْبِتَ لَهٗ

اور تاکہ جان لیں وہ لوگ جو علم دیے گئے کہ یہ حق ہے تیرے رَبّ کی طرف سے پھر وہ لوگ ایمان لے آئیں اس پر، پھر جھک جائیں اس حق کے لئے

قُلُوْبُهُمْ ۗ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۵۴﴾ وَلَا يَزَالُ

ان کے دل، اور بے شک اللہ تعالیٰ البتہ راہنمائی کرتا ہے ان لوگوں کی جو ایمان لے آئے صراطِ مستقیم کی طرف ﴿۵۴﴾ اور ہمیشہ رہیں گے

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً اَوْ يَاْتِيَهُمْ عَذَابُ

وہ لوگ جنہوں نے کُفر کیا تردّد میں اس حق کی طرف سے حتّٰی کہ ان کے پاس قیامت آجائے اچانک یا ان کے پاس عذاب آجائے

يَوْمٍ عَقِيْمٍ ﴿۵۵﴾ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ۗ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ ۗ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

بے برکت دِن کا ﴿۵۵﴾ حکومت اس دِن اللہ ہی کے لئے ہوگی اللہ تعالیٰ ان کے درمیان فیصلہ کرے گا، پھر جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں

فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۵۶﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۵۷﴾

وہ تو خوش حالی کے باغات میں ہوں گے ﴿۵۶﴾ اور وہ لوگ جنہوں نے کُفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا ان کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب ہوگا ﴿۵۷﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ: آپ کہہ دیجئے اے لوگو! اِنَّمَآ اَنَا لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ: اِنَّمَا حصر کے لیے ہوتا ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں یعنی بات صرف یہ ہے کہ میں تمہارے لیے ڈرانے والا ہوں، کھول کھول کے بیان کرنے والا ہوں، مبین کا مفہوم یہ ہے، اور حاصل ترجمہ کے طور پر یوں کہہ دیا جاتا ہے کہ واضح ڈرانے والا ہوں، کھلم کھلا ڈرانے والا ہوں۔ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: پھر جو

لوگ ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں، لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ: ان کے لئے بخشش ہے اور باعزت رزق ہے۔ رزقٍ کریم: باعزت رزق۔ وَالَّذِيْنَ سَعَوْا فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ: فِيْٓ اٰيٰتِنَا: فی ابطالِ آیاتِنا۔ سَعٰی یَسْعٰی: کوشش کرنا۔ اور جو لوگ کوشش کرتے ہیں ہماری آیات کے باطل کرنے میں اس حال میں کہ وہ ہرانے والے ہیں، عاجز کرنے والے ہیں، اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ: وہ جہنم والے ہیں، یعنی مؤمنین کو یا اللہ کے رسول کو عاجز کرنے کے لیے ہرانے کے لیے ان آیات کے ابطال میں کوشش کرتے ہیں یہی لوگ جہنم والے ہیں۔ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ: اور نہیں بھیجا ہم نے آپ سے قبل کوئی رسول نہ کوئی نبی۔

''نبی'' اور ''رسول'' میں فرق

''رسول'' اور ''نبی'' کے درمیان میں فرق پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے کہ ''نبی'' اس انسان اور بشر کو کہتے ہیں جس پر اللہ کی طرف سے وحی آتی ہو اور وہ مکلف بالتبلیغ ہو، لیکن ضروری نہیں کہ اس کے پاس جدید شریعت ہو یا کوئی کتاب ہو، یہ عام ہے ''رسول'' کے مقابلے میں۔ اور ''رسول'' وہ ''نبی'' ہوتا ہے جس کے پاس مستقل شریعت ہوتی ہے، یا صاحبِ کتاب ہوتا ہے۔ یا مخاطبین کے لیے نئی شریعت لے کے آئے، چاہے واقع کے اعتبار سے وہ شریعت نئی نہ ہو لیکن جن کی طرف اس کو مبعوث کیا گیا ہے ان کے حق میں وہ نئی شریعت ہو۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کو قرآنِ کریم میں ''رسول'' کے لفظ کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے، جیسے کہ آپ کے سامنے سورۂ مریم میں گزرا، وہاں یہ بات آپ کی خدمت میں عرض کی تھی کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام ابراہیمی شریعت کے حامل تھے لیکن بنی جرہم قبیلہ جس کی طرف اُن کو مبعوث کیا گیا تھا اس قبیلے کے لیے وہ نئی شریعت تھی، بخلاف اس کے موسیٰ علیہ السلام صاحبِ کتاب ہیں مستقل ''رسول'' ہیں اور بعد میں بنی اسرائیل میں جو انبیاء علیہم السلام آئے وہ اکثر و بیشتر بنی اسرائیل کے سامنے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کو پیش کرتے تھے، تورات کی تبلیغ کرتے تھے، اس لیے وہ ''نبی'' ہیں اور موسیٰ علیہ السلام ''رسول'' ہیں، اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے پاس مستقل شریعت نہ ہونے کے باوجود ''رسول'' ہیں کیونکہ ان کے مخاطبین کے لیے وہ شریعت نئی تھی۔ انسانوں کے اندر تو ان کی تقسیم اسی طرح سے ہے، باقی! فرشتوں کے لیے بھی ''رسول'' کا لفظ استعمال ہوا ہے، فرشتوں کو ''نبی'' نہیں کہا جاتا، اس لیے بعض حضرات نے ''رسول'' اور ''نبی'' میں عام خاص مطلق کی بجائے عموم وخصوص من وجہٍ کی نسبت ذکر کی ہے، اس کی وجہ یہی ہے کہ فرشتوں میں ''رسول'' ہوتا ہے، ''نبی'' نہیں ہوتا، بعض ''نبی'' ہوتے ہیں، ''رسول'' نہیں ہوتے، اور بعض انسان جو ''رسول'' بھی ہیں، ''نبی'' بھی ہیں، تو اس طرح سے تین مادّے نکل آتے ہیں جیسے کہ عموم وخصوص من وجہٍ کی نسبت میں نکالے جایا کرتے ہیں، اور عموم وخصوص مطلق ہو تو اس میں صرف دو ہی مادّے ہوتے ہیں، ایک اجتماعی کہ ''نبی'' بھی ہو اور ''رسول'' بھی ہو۔ اور ایک افتراقی کہ ''نبی'' ہو، ''رسول'' نہ ہو، تو انسانوں کی طرف دیکھتے ہوئے ''نبی'' اَعم ہے، ''رسول'' اَخص ہے۔

شیاطین رُکاوٹیں کب پیدا کرتے ہیں؟

''نہیں بھیجا ہم نے آپ سے قبل کوئی رسول نہ کوئی نبی'' اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ: تَمَنّٰی: خواہش کرنا، آرزو

کرنا۔ اور اُمنیہ کہتے ہیں خواہش کو۔ تَمَنّٰی یَتَمَنّٰی تَمَنِّیْ یہ لفظ عام طور پر استعمال ہوتے رہتے ہیں، اور اُمنیہ کی جمع اَمانی قرآنِ کریم میں دوسری جگہ ہے تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ (سورۂ بقرہ:۱۱۱) یہ ان کی خواہشات ہیں، دل کے خیالات ہیں، تو اُمنیہ خواہش کے معنی میں ہے۔ اِلَّاۤ اِذَا تَمَنّٰۤى: مگر جس وقت وہ نبی کوئی خواہش کرتا ہے، کوئی تمنا کرتا ہے یعنی لوگوں کے درمیان دین کی اشاعت کی، دین پھیلانے کی، لوگوں کو ہدایت پہ اکٹھا کرنے کی جب وہ تمنا کرتا ہے، خواہش کرتا ہے، حوصلہ کرتا ہے تو اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْۤ اُمْنِيَّتِهٖ: شیطان اس کی خواہش میں رکاوٹیں ڈالتا ہے، اس کی خواہش پوری نہیں ہونے دیتا، مقابلے شبہات پیدا کرتا ہے، رکاوٹیں پیدا کرتا ہے، رخنہ اندازی کرتا ہے، ان کے مقابلے میں نئے نئے فتنے اٹھاتا ہے، مطلب یہ ہوا کہ جس وقت تک تو اللہ کی طرف سے لوگوں کے سامنے ہدایت نہ آئے اس وقت تک شیطان بھی سوتے ہیں، کیونکہ انہیں پتا ہوتا ہے کہ انسان بھٹکے ہوئے ہیں، ہمیں کیا ضرورت ہے اپنا وقت ضائع کرنے کی، تو یہ شیاطین بھی شرارت کرنے میں چست چالاک اور ہوشیار واقع نہیں ہوتے، اور جہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی حق کی آواز بلند ہوتی ہے، اور کوئی اللہ کا نیک بندہ ''نبی'' یا ''رسول'' یہ خواہش لے کے اُٹھتا ہے کہ لوگوں کو سیدھے راستے پہ لے آئے تو پھر شیطانی قوتیں مجتمع ہو کے اسی طرح سے مقابلے میں آجاتی ہیں، ان کی خواہش کے مقابلے میں رکاوٹیں پیدا کرتی ہیں، رخنہ اندازی کرتی ہیں تا کہ یہ ہدایت نہ پھیلے، اس طرح سے حق اور باطل کا ٹکراؤ شروع ہو جاتا ہے۔ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ: نَسَخَ: زائل کرنا۔ پھر زائل کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ ان رکاوٹوں کو جو شیاطین ڈالتے ہیں، جو رکاوٹیں شیطان ڈالتا ہے اللہ تعالیٰ انہیں زائل کر دیتا ہے، یعنی حق و باطل کے ٹکراؤ میں آہستہ آہستہ باطل مٹتا چلا جاتا ہے اور حق نمایاں ہوتا چلا جاتا ہے، ''جو چیز شیطان ڈالتا ہے اللہ تعالیٰ اسے زائل کر دیتا ہے'' ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ: پھر اللہ تعالیٰ اپنی آیات کو محکم کر دیتا ہے، آیات کی مراد بالکل واضح ہو جاتی ہے، محکم ہو جاتی ہیں، جس میں کوئی کسی قسم کا شبہ ڈالنے کی گنجائش نہیں رہتی، وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ: اللہ تعالیٰ علم والا ہے حکمت والا ہے۔

شیاطین کو رخنہ اندازی کا موقع کیوں دیا جاتا ہے؟

باقی! ایسا کیوں ہوتا ہے؟ شیطانوں کو یہ موقع کیوں دیا جاتا ہے کہ وہ رخنہ اندازی کریں، دخل اندازی کریں، رکاوٹیں ڈالیں، شبہات پیدا کریں؟ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ حق و باطل کے اس تصادم میں دو فائدے ہوتے ہیں، ایک تو لوگوں کے لیے آزمائش کہ جن کے دلوں میں بیماری ہوتی ہے، جن کے دلوں میں قساوت ہے، جو اللہ کی باتوں سے متاثر نہیں ہوتے، ان کے دل زیادہ سخت ہیں، وہ تو اس قسم کی رخنہ اندازیوں سے متاثر ہو کے گمراہ ہو جاتے ہیں، اور جن کو اللہ تعالیٰ نے علم اور فہم دیا ہوا ہوتا ہے تو ان رخنہ اندازیوں کا جب مقابلہ ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے شبہات کو زائل کیا جاتا ہے تو ان کا ایمان اور پختہ ہو جاتا ہے۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھئے کہ تصادم میں حقیقت زیادہ نمایاں ہوتی ہے، عربی میں آپ محاورہ پڑھتے رہتے ہیں: ''بِضِدِّهَا تَتَبَيَّنُ الْاَشْيَاءُ''، ''اَلْاَشْيَاءُ تَتَبَيَّنُ بِاَضْدَادِهَا'' کہ چیزیں ہمیشہ اپنی ضد کے ساتھ واضح ہوا کرتی ہیں، تاریکی کی حقیقت روشنی سے سمجھ میں آتی ہے، روشنی کی حقیقت تاریکی سے سمجھ میں آتی ہے، اسی طرح سے اگر صرف حق بات ہی انسان کے سامنے رہے تو وہ حق قلب

میں اتنا راسخ نہیں ہوتا، اندیشہ رہتا ہے کہ کبھی کسی شخص نے آ کے شبہ پیدا کر دیا تو یہ متزلزل ہو جائے گا، اور اگر حق کے مقابلے میں باطل بھی پوری طرح سے مسلح ہو کے آ جائے اور باطل اپنے شبہات پھیلا دے، اپنے دلائل ذکر کر دے، پھر ان دلائل کو رد کرتا ہوا جو شخص حق کو قبول کیا کرتا ہے وہ حق راسخ ہوتا ہے، اس حق کے مقابلے میں جتنے شبہات پیدا کیے جا سکتے ہیں وہ پیدا کر دیے گئے، جتنے دلائل دیے جا سکتے تھے وہ دے دیے گئے اس کے باوجود آپ اس حق کو قبول کر رہے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ بعد میں باطل کی کوئی ایسی آندھی آنے والی نہیں جو آپ کو متزلزل کر دے، اس طرح سے حق زیادہ راسخ ہو جاتا ہے۔ ہاں! البتہ جن کی فطرت خراب ہوتی ہے، ان کے سامنے جب دو قسم کی باتیں آتی ہیں، ایک حق کی اور ایک باطل کی، تو وہ باطل کی طرف چلے جاتے ہیں، ان کے لیے امتحان ہو جاتا ہے، تو یہ موقع جو دیا جاتا ہے شیاطین کو، چاہے شیاطین سے شیاطین جن مراد ہوں چاہے شیاطین انس، وہ اس لیے دیا جاتا ہے کہ حق اور باطل کے ٹکراؤ میں آ کے اہل حق حق پر زیادہ جمتے ہیں، اور جن کی فطرت مسخ ہوئی ہوتی ہے وہ حق کے مقابلے میں باطل کو قبول کرتے ہیں، سچائی کے مقابلے میں جھوٹ کو قبول کرتے ہیں، اچھی اور پاکیزہ چیز کے مقابلے میں گندی چیز کی طرف ان کا میلان ہوتا ہے، ان کا باطن یوں ظاہر ہو جاتا ہے، تو حق اور باطل کی اس کشمکش میں یہ فائدہ ہو جاتا ہے، آگے اسی فائدہ کی طرف اشارہ کیا ہے لِيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ: یہ اس لیے کیا جاتا ہے تاکہ کر دے اللہ تعالیٰ اس چیز کو جس کو شیطان ڈالتے ہیں لوگوں کے لئے آزمائش، فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ: آزمائش بنا دے ان لوگوں کے لئے جن کے دلوں میں بیماری ہے، وَّالْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ: اور ان لوگوں کے لئے جن کے دل سخت ہیں۔ قُلُوْبُهُمْ یہ الْقَاسِيَةِ کا فاعل ہے۔ اور الْقَاسِيَةِ قسوت سے لیا گیا ہے، سورۂ بقرہ میں لفظ آیا تھا فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً (آیت: ۷۴) جن کے دل زیادہ سخت ہیں۔ تو پہلا درجہ ہو گیا متردّدین کا، جن کو حق پر قرار نہیں، تردد ہے، ان میں تردد والی بیماری ہے، اور الْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ سے مراد ہیں کٹر قسم کے لوگ جو باطل کے اوپر پختہ ہوتے ہیں ان کے لیے بھی یہ باتیں مزید امتحان بن جاتی ہیں، وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَفِيْ شِقَاقٍۭ بَعِيْدٍ: اور بے شک ظالم البتہ دور کی ضد میں ہیں، یعنی حق واضح ہو جانے کے باوجود وہ باطل کی باتوں کو قبول کرتے ہوئے بہت زیادہ ضد میں پڑ جاتے ہیں۔ شِقَاقٍ یہ باب مفاعلہ کا مصدر ہے۔ شَاقَّ مُشَاقَّةً وَشِقَاقًا: ایک دوسرے کے مقابلے میں مخالفت کرنا، سختی اختیار کرنا۔ وَّلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ: اور دوسرا مقصد یہ ہوتا ہے کہ تاکہ جان لیں وہ لوگ جو علم دیے گئے (الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ یہ يَعْلَمَ کا فاعل ہے) تاکہ جان لیں وہ لوگ جو علم دیے گئے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ نبی نے بیان کیا ہے جو کچھ نبی پیش کر رہے ہیں یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے، فَيُؤْمِنُوْا بِهٖ: پھر وہ لوگ ایمان لے آئیں اس پر۔ یہاں ایمان لانا کمال کے معنی میں ہے، کامل طریقے سے ایمان لے آتے ہیں، پختہ طریقے سے ایمان لے آئیں، فَتُخْبِتَ لَهٗ قُلُوْبُهُمْ: پھر ان کے دل اس حق کے لئے جھک جائیں۔ بَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ کا لفظ اسی سورت میں آپ کے سامنے گزرا، تو مخبتین اسی اخبات سے لیا گیا ہے اور آپ کے سامنے معنی ذکر کیا تھا کہ اصل میں خَبْت کہتے پست جگہ کو، خبیت ہوتا ہے پست جگہ میں اترنے والا، تو مُخْبِت متواضع کو کہتے ہیں جو اپنے آپ کو پستی کی طرف اتارتا ہو۔ "ان کے دل اس حق کے سامنے جھک جاتے ہیں" وَاِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ: بے شک

اللہ تعالیٰ البتہ راہنمائی کرتا ہے ان لوگوں کی جو ایمان لے آئے صراطِ مستقیم کی طرف، یعنی آئے دن ان کو ترقی ہوتی رہتی ہے اور صراطِ مستقیم پر وہ راسخ القدم ہوجاتے ہیں، پختہ رہتے ہیں۔

کافر عذاب آنے تک تردّد میں رہیں گے، اور لفظِ ''عقیم'' کی وضاحت

وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ: مِنْهُ کی ضمیر ''حق'' کی طرف راجع ہے جس کا ذکر اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ میں آیا ہے۔ اور ہمیشہ رہیں گے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا تردّد میں، شک میں اس حق کی طرف سے حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً اَوْ يَاْتِيَهُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيْمٍ: حتیٰ کہ ان کے پاس قیامت آجائے یا ان کے پاس عذاب آجائے بے برکت دِن کا۔ عقیم کہتے ہیں جس میں کوئی نفع کوئی فائدہ کوئی برکت نہ ہو، جس عورت کو اولاد نہ ہو اس کو بھی عقیم کہا جاتا ہے، اس کا بھی معنی یہی ہوتا ہے: لا خیرَ فیھا، اور ریحٌ عقیمٌ کا لفظ قرآنِ کریم میں آیا ہے جو اللہ تعالیٰ نے قومِ عاد پر مسلط کی تھی، اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيْحَ الْعَقِيْمَ (سورۂ ذاریات: ۴۱) تو وہاں بھی مطلب یہی ہے کہ ایسی آندھی آئی جس میں خیر اور برکت کا کوئی پہلو نہیں تھا، نفع سے خالی تھی، ان کے لیے تباہی کا باعث بن گئی، تو یومِ عقیم سے مراد بھی ایسا دِن ہے جس کے اندر کوئی کسی قسم کا خیر کا پہلو نہیں، ان کے لیے وہ دِن خیر و برکت سے خالی ہوگا۔ ''حتیٰ کہ آجائے ان کے پاس بے برکت دِن کا عذاب'' یعنی اس وقت تک تردّد میں رہیں گے، اور جب اچانک قیامت آجائے گی پھر ان کا تردّد دُور ہوگا، یا جس وقت یہ بے برکت دِن کے عذاب کی گرفت میں آجائیں گے پھر ان کا تردّد دُور ہوگا، لیکن آپ جانتے ہیں کہ اس وقت پھر تردّد دُور ہونے اور یقین آنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا، اس وقت کا ایمان معتبر نہیں ہے۔

عملی فیصلہ قیامت کے دِن ہوگا

اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ: سلطنت، حکومت اس دِن اللہ ہی کے لئے ہوگی، ظاہری طور پر بھی کسی کے لئے کوئی سلطنت اور حکومت باقی نہیں رہے گی، راج اس دِن اللہ ہی کے لیے ہوگا، يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ: اللہ تعالیٰ ان کے درمیان عملاً فیصلہ کرے گا، جب قیامت کے دِن کی طرف فیصلے کی نسبت آئے تو اس فیصلے سے عملی فیصلہ مراد ہوتا ہے، قولی فیصلہ یعنی دلائل کے ساتھ یہ تو دنیا میں بھی ہوجاتا ہے، عملاً کا مطلب یہ ہے کہ مجرموں کو ایک صف میں کھڑا کر کے کہہ دیا جائے کہ یہ مجرم ہیں اور ان کو عذاب میں ڈال دیا جائے، اور صالحین اور نیکوں کو ایک طرف ممتاز کر دیا جائے، اور انہیں جنّت میں بھیج دیا جائے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ عملاً فیصلہ ہوگیا کہ یہ اہلِ حق ہیں اور یہ اہلِ باطل ہیں۔ باقی! دلائل کے ساتھ فیصلہ، وہ تو دنیا میں بھی ہوجاتا ہے۔ وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ (سورۂ یٰس: ۵۹) جو قرآنِ کریم میں ذکر کیا گیا کہ اس دِن مجرموں کو علیحدہ کر دیا جائے گا، مؤمنین کو علیحدہ کر دیا جائے گا، تو عملی طور پر نمایاں ہوجائے گا کہ اہلِ حق کون ہیں، اہلِ باطل کون ہیں، دنیا میں تو یہ حساب خلط ملط سارہ جاتا ہے، اگرچہ دلائل کے ساتھ فیصلہ ہوجاتا ہے لیکن دلائل ہر شخص کی سمجھ میں نہیں آتے، دلائل پر اعتماد کر کے ہر شخص حق کو قبول نہیں کرتا۔

آگے اس عملی فیصلے کی تھوڑی سی تصویر ہے، اور اس فیصلے کا بیان ہے، فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: پھر جو لوگ ایمان لاتے ہیں نیک عمل کرتے ہیں فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ وہ تو خوش حالی کے باغات میں ہوں گے، نعیم خوش حالی کو کہتے ہیں۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا

وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا: اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا، فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ: ان کے لئے عذاب ہوگا ذلیل کرنے والا، ذلیل کرنے والا عذاب ان کے لئے ہوگا، یعنی اس عذاب میں ڈال کے ان کو ذلیل کر دیا جائے گا۔

"تَمَنّٰی" کا ایک اور مفہوم

یہ جو آپ کے سامنے آیت آئی وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ: تو تَمَنّٰی کا ترجمہ میں نے کیا، خواہش کرنا، آرزو کرنا، حوصلہ کرنا۔ "جس وقت نبی کوئی آرزو کرتا ہے لوگوں میں ہدایت پھیلانے کی تو شیطان آگے سے رکاوٹیں ڈالتا ہے۔" اور ہمارے ان مفسرین نے جیسے حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی ؒ ہیں یا حضرت تھانوی ؒ نے "بیان القرآن" میں تَمَنّٰی کا ترجمہ یہاں قَرَءَ کے ساتھ کیا ہے کہ نبی جس وقت اللہ کی آیات پڑھ کے سناتا ہے (اور اُمنیہ کا معنی اس کی پڑھی ہوئی باتیں) تو شیطان ان کی پڑھی ہوئی باتوں میں شبہات ڈالتا ہے، اور شبہات ڈال ڈال کے لوگوں کو گمراہ کرتا ہے، مثال کے طور پر جس وقت یہ آیت آئی حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ (سورۂ مائدہ: ۳) لوگوں کے سامنے یہ آیت پڑھی گئی تو مشرکین نے ایک بات اُڑائی تھی جس کا ذکر پیچھے آپ کے سامنے غالباً سورۂ انعام میں آیا تھا کہ یہ دیکھو! عجیب بات ہے کہ جس کو یہ لوگ خود ذبح کر لیتے ہیں خود مار لیتے ہیں اس کو کہتے ہیں حلال، اور جو اللہ کی ماری ہوئی ہے اسے کہتے ہیں حرام۔ یوں شبہات ڈالتے ہیں، کہ اللہ کی ماری ہوئی کہ یہ حرام کہتے ہیں اور اپنی ماری ہوئی کو حلال کہتے ہیں (اس القائے شیطانی کے ابطال ورد میں پیغمبر ﷺ اللہ تعالیٰ کی وہ آیات سناتے ہیں جو بالکل صاف اور محکم ہوں اور ایسی پکی باتیں بتلاتے ہیں جن کو سن کر شک وشبہ کی قطعاً گنجائش نہ رہے، گویا متشابہات کی ظاہری سطح کو لے کر شیطان جو اغوا کرتا ہے آیات محکمات اس کی جڑ کاٹ دیتی ہیں جنہیں سن کر تمام شکوک وشبہات ایک دم کافور ہو جاتے ہیں)۔[1]

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْٓا اَوْ مَاتُوْا لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقًا
اور جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی پھر وہ قتل کیے گئے یا طبعی موت سے وفات پا گئے اللہ انہیں ضرور عطا فرمائے گا اچھا
حَسَنًا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۵۸﴾ لَيُدْخِلَنَّهُمْ مُّدْخَلًا يَّرْضَوْنَهٗ ۭ وَاِنَّ
رزق، اور یہ بات یقینی ہے کہ اللہ خیر الرازقین ہے ﴿۵۸﴾ وہ انہیں ضرور ایسی جگہ میں داخل فرمائے گا جس سے وہ خوش ہوں گے اور بلاشبہ
اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ﴿۵۹﴾ ذٰلِكَ ۚ وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ ثُمَّ
اللہ خوب جاننے والا ہے بہت حلم والا ہے ﴿۵۹﴾ یہ بات یوں ہی ہوگی، اور جو شخص اس قدر بدلہ لے جس قدر اسے تکلیف پہنچائی گئی پھر

(۱) ریکارڈ تک دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے بین القوسین "تفسیر عثمانی" سے نقل کیا گیا ہے۔ اور آیت ۵۸ تا ۸۷ کا ترجمہ وتفسیر "انوار البیان" سے ماخوذ ہے۔

بُغِیَ عَلَیۡهِ لَیَنۡصُرَنَّهُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوۡرٌ ﴿۶۰﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ

اس پر زیادتی کی جائے تو اللہ تعالیٰ ضرور ضرور اس کی مدد فرمائے گا بے شک اللہ تعالیٰ معاف فرمانے والا بخشنے والا ہے ﴿۶۰﴾ یہ اس وجہ سے ہے کہ بلاشبہ

اللّٰهَ یُوۡلِجُ الَّیۡلَ فِی النَّهَارِ وَیُوۡلِجُ النَّهَارَ فِی الَّیۡلِ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِیۡعٌۢ بَصِیۡرٌ ﴿۶۱﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ

اللہ رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل فرماتا ہے اور بلاشبہ اللہ دیکھنے والا اور سننے والا ہے ﴿۶۱﴾ یہ اس وجہ سے ہے کہ بے شک

اللّٰهَ هُوَ الۡحَقُّ وَاَنَّ مَا یَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِهٖ هُوَ الۡبَاطِلُ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الۡعَلِیُّ الۡكَبِیۡرُ ﴿۶۲﴾ اَلَمۡ تَرَ

اللہ حق ہے اور اس کے علاوہ جو دوسروں کو پکارتے ہیں وہ باطل ہیں، اور اللہ برتر سب سے بڑا ہے ﴿۶۲﴾ اے مخاطب! کیا تو نے نہیں دیکھا

اَنَّ اللّٰهَ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۫ فَتُصۡبِحُ الۡاَرۡضُ مُخۡضَرَّةً ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَطِیۡفٌ خَبِیۡرٌ ﴿۶۳﴾

کہ اللہ نے آسمان سے پانی اُتارا پھر زمین ہری بھری ہوگئی بلاشبہ اللہ بہت مہربان ہے خبر رکھنے والا ہے ﴿۶۳﴾

لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الۡغَنِیُّ الۡحَمِیۡدُ ﴿۶۴﴾

جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمینوں میں ہے سب اسی کا ہے اور بلاشبہ اللہ غنی ہے تعریف کا مستحق ہے ﴿۶۴﴾

تفسیر

ابتدائے اسلام میں مکہ مکرمہ کے اندر مسلمانوں کو طرح طرح کی تکالیف دی جاتی تھیں جس کی وجہ سے بہت سے صحابہ کرامؓ نے مکہ مکرمہ سے حبشہ کی طرف ہجرت کی اور بعض نے مدینہ منورہ کی طرف۔ لیکن جنہوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی وہ بھی آہستہ آہستہ مدینہ منورہ آنے لگے۔ یہاں تک کہ مدینہ منورہ اسلام کا ایک مضبوط قلعہ بن گیا۔ تو جب مدینہ منورہ اسلام کا قلعہ بن گیا، تو پھر مختلف علاقوں کے اور لوگ بھی مدینہ منورہ آگئے انہوں نے محض اللہ کے لئے اپنے وطن کو چھوڑا۔ اموال واملاک، گھر، جائیداد، ساز وسامان جو کچھ بھی تھا اس کو صرف اللہ کے لئے چھوڑ دیا۔ اور اس میں اللہ کی طرف سے بہت بڑا امتحان تھا۔ بعد میں جو لوگ مختلف علاقوں میں مسلمان ہوئے ان میں سے بھی بہت بڑی تعداد میں مسلمانوں کو ہجرت کرنی پڑی اور اس کا سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ ہجرت کا ثواب بہت زیادہ ہے اگر ہجرت کرنے والا مقتول ہوجائے تو اس کو مزید ثواب ہوگا۔ اگر مقتول نہ ہوا اپنی طبعی موت مرجائے تو اللہ تعالیٰ کے پاس اس کی بھی بہت قدر وقیمت ہے اسی کو فرمایا

''ہجرت'' کی فضیلت

وَالَّذِیۡنَ هَاجَرُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ: اور وہ لوگ جنہوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی پھر مقتول ہوگئے یا اپنی طبعی موت مرگئے تو اللہ تعالیٰ انہیں ضرور بالضرور عمدہ رزق عطا فرمائے گا اس سے مراد کیا ہیں؟ اس سے مراد جنت کے ماکولات، یعنی کھانے کی چیزیں،

مشروبات یعنی پینے کی چیزیں اور دوسری نعمتیں ہیں۔ پھر آگے فرمایا لَيُدْخِلَنَّهُمْ مُّدْخَلًا يَّرْضَوْنَهٗ: اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو ایسی جگہ میں داخل کرے گا کہ وہ لوگ اس کے اندر خوش ہوں گے۔ اس جگہ سے کیا مراد ہے؟ یعنی انہیں جنت نصیب کرے گا۔ اور جو کچھ انہیں پسند ہوگا وہ انہیں عطا کرے گا۔ اور وہ لوگ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ وہاں سے کسی اور جگہ جانے کی خواہش نہیں کریں گے۔ اور پھر آگے فرمایا وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ حَلِيْمٌ: بے شک اللہ تعالیٰ علم والا ہے اور حلم والا ہے۔ علیم سب کے اعمال کو جاننے والا ہے اور اپنے علم کے مطابق جزا سزا دے گا۔ اور حلیم بردبار ہے سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا۔ جب وقت معین آئے گا تو پھر اس کے موافق جزا سزا دے گا۔

ایک اِشکال کا جواب

اب شاید کسی کو اِشکال ہو کہ مقتول اور طبعی موت مرنے والے کے درمیان بظاہر فرق ہونا چاہیے لیکن چونکہ یہ آیتِ شریفہ کے ظاہری الفاظ سے مساوات مفہوم ہو رہی ہے، اس لیے یہ اشکال واقع نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ آیتِ کریمہ میں یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ انہیں رزق حسن عطا کرے گا۔ برابری کا ذکر نہیں ہے جس کو جتنا بھی ملے گا وہ رزق حسنہ ہی ہوگا۔ اگرچہ مراتب کا فرق ہو۔

بدلہ لینے کی اجازت اور اس کی حد بندی

اس کے بعد فرمایا: ذٰلِكَ یہ مبتدأ ہے اور اس کی خبر محذوف ہے، یعنی یہ بات جو اُوپر بیان ہوئی یہ طے شدہ ہے اللہ تعالیٰ نے جیسے فرمایا ہے ویسا ہی ہوگا۔ وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ: اور جو شخص اس قدر بدلہ لے جس قدر اسے تکلیف پہنچائی گئی پھر اس پر زیادتی کی جائے تو اللہ تعالیٰ ضرور بالضرور اس کی مدد فرمائے گا۔ اس آیت سے زیادتی کرنے والے سے بدلہ لینے کی اجازت معلوم ہوئی۔ بشرطیکہ بدلہ لینے میں برابری کا خیال رہے۔ یعنی جتنی تکلیف پہنچائی گئی ہو اس قدر تکلیف پہنچا سکتا ہے اگر کسی نے اتنا ہی بدلہ لیا جتنا بدلہ لینے کا اختیار تھا پھر اس پر اس شخص کی طرف سے زیادتی کی گئی جس شخص نے پہلے زیادتی کی ابتدا کی تھی۔ تو اللہ تعالیٰ ضرور بہ ضرور اس شخص کی مدد فرمائے گا جس پر دوبارہ زیادتی کی گئی۔

معاف کرنے کی فضیلت

اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ: بے شک اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا بخشنے والا ہے یعنی اللہ تعالیٰ تو معاف فرما دیتا ہے لیکن بندے بدلہ لے لیتے ہیں اگر بندے بھی معاف کر دیا کریں۔ تو اللہ تعالیٰ کے پاس اس کا بھی ثواب پائیں گے جیسا کہ سورۂ شوریٰ میں ہے فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ (آیت: ۴۰) پس جس شخص نے معاف کیا اور صلح کی تو اس کا اجر اللہ تعالیٰ پر ہے۔

قدرتِ اِلٰہی کا بیان

پھر آگے فرما رہے ہیں کہ یہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کی وجہ سے ہو رہا ہے اوپر والے

عالم میں، نیچے والے عالم میں نیز ہر جگہ پر تصرف اسی اللہ کا ہے، ہر بات کو سنتا ہے، ہر چیز کو دیکھتا ہے، وہی حق ہے اس کے علاوہ جو لوگوں نے معبود بنائے ہوئے ہیں، وہ سب باطل ہیں۔ وہی برتر ہے، بڑا ہے وہی آسمان سے بارش اتارتا ہے۔ جس سے زمین ہری بھری ہو جاتی ہے، وہی لطیف یعنی مہربان ہے اور خبیر بھی ہے جو ساری مخلوق کی خبر رکھنے والا ہے وہ غنی یعنی بے نیاز ہے حمید بھی یعنی تعریف کا مستحق ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ وَالْفُلْكَ تَجْرِيْ

اے مخاطب! کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے تمہارے لئے وہ سب کچھ مسخر فرما دیا جو زمین میں ہے اور کشتی کو مسخر فرما دیا وہ چلتی ہے

فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ؕ وَيُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

سمندر میں اس کے حکم سے، اور وہ آسمان کو زمین پر گرنے سے تھامے ہوئے ہے مگر یہ کہ اسی کا حکم ہو جائے، بلاشبہ اللہ

بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿٦٥﴾ وَهُوَ الَّذِيْٓ اَحْيَاكُمْ ۫ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ؕ

لوگوں پر بہت مہربان ہے نہایت رحم فرمانے والا ہے ﴿٦٥﴾ اور اللہ ہی ہے جس نے تمہیں زندہ کیا پھر تمہیں موت دے گا پھر تمہیں زندہ فرمائے گا

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ ﴿٦٦﴾ لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ

بلاشبہ انسان بڑا ناشکرا ہے ﴿٦٦﴾ ہم نے ہر امت کے لئے عبادت کے طریقے مقرر کیے ہیں جن کے مطابق وہ عبادت کرتے تھے

فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْاَمْرِ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ ؕ اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٦٧﴾

سو اس امر میں وہ آپ سے جھگڑا نہ کریں، اور آپ ان کو اپنے رب کی طرف بلاتے رہیں بلاشبہ آپ ہدایت پر ہیں جو سیدھا راستہ ہے ﴿٦٧﴾

وَاِنْ جٰدَلُوْكَ فَقُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿٦٨﴾ اَللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ

اور اگر یہ لوگ آپ سے جھگڑا کریں تو آپ فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو خوب جانتا ہے ﴿٦٨﴾ اللہ فیصلہ فرما دے گا تمہارے درمیان

يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿٦٩﴾ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي

قیامت کے دن ان چیزوں میں جن میں تم اختلاف کرتے تھے ﴿٦٩﴾ اے مخاطب! کیا تجھے معلوم نہیں کہ بلاشبہ اللہ جانتا ہے اس سب کو جو کچھ

السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ فِيْ كِتٰبٍ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴿٧٠﴾ وَيَعْبُدُوْنَ

آسمان اور زمین میں ہے، سب کچھ کتاب میں لکھا ہے، بلاشبہ یہ اللہ پر آسان ہے ﴿٧٠﴾ اور یہ لوگ عبادت کرتے ہیں

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّمَا لَيْسَ لَهُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ

اللہ کو چھوڑ کران چیزوں کی جن کے بارے میں اللہ نے کوئی دلیل نازل نہیں فرمائی، اور نہ ان کے پاس اس کی کوئی عقلی دلیل ہے، اور ظالموں کے لیے

مِنْ نَّصِيْرٍ ۝٧١ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا

کوئی مددگار نہیں ہوگا ۝٧١ اور جب ان پر ہماری آیات تلاوت کی جاتی ہیں جو خوب واضح ہیں تو اے مخاطب! تُو کافروں کے چہروں میں

الْمُنْكَرَ ؕ يَكَادُوْنَ يَسْطُوْنَ بِالَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ؕ قُلْ اَفَاُنَبِّئُكُمْ

ناگواری کو پہچان لے گا، قریب ہے کہ ان لوگوں پر حملہ کر بیٹھیں جو ان کے سامنے ہماری آیات پڑھتے ہیں، آپ فرما دیجئے کیا میں

بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ اَلنَّارُ ؕ وَعَدَهَا اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝٧٢

اس سے زیادہ ناگوار چیز نہ بتادوں؟ وہ دوزخ ہے جس کا اللہ نے کافروں سے وعدہ فرمایا ہے اور وہ بُرا ٹھکانا ہے ۝٧٢

تفسیر

ماقبل سے ربط

پچھلے رُکوع میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ کا ذکر فرمایا تھا، اِس رُکوع میں بھی اُسی مضمون کو مزید تفصیل سے بیان کیا جارہا ہے۔

اِنعاماتِ الٰہی

وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں اے مخاطب! اللہ تعالیٰ نے وہ سب کچھ تمہارے لیے مسخر یعنی تابع فرمادیا۔ جو کچھ زمین میں ہے، کشتیاں اسی کے حکم سے چلتی ہیں اور یہ آسمان جو تمہیں اتنا بڑا نظر آرہا ہے یہ اللہ کی بہت بڑی مخلوق ہے اللہ تعالیٰ نے اسے محض اپنی قدرت سے روک رکھا ہے اور وہ اسے اپنی قدرت سے تھامے ہوئے ہے، اللہ تعالیٰ بہت بڑا مہربان اور رحم والا ہے۔ اگر وہ آسمان کو نہ روکے اور آسمان زمین پر گر پڑے تو کوئی بھی زندہ نہیں بچ سکتا۔ اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے کہ کافروں اور فاسقوں کو بھی زندہ رکھتا ہے اور سب کے لئے زندگی کے اسباب مہیا کرتا ہے۔ اسی نے پہلی بار زندگی بخشی اس زندگی کے بعد وہی موت دیتا ہے پھر دوبارہ زندہ فرمائے گا۔ انسان دنیا کے انقلابات کو دیکھتا ہے اللہ کی نعمتوں کو استعمال کرتا ہے لیکن ناشکری اختیار کرتا ہے۔ یہ سب کچھ ہوتے ہوئے آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کُفر و شرک سے باز نہیں آتا۔

اللہ نے ہر اُمّت کے لئے عبادت کے طریقے متعین کیے

اب اگلی آیات میں اللہ تبارک وتعالیٰ اس بات کو بیان فرمارہے ہیں کہ میں نے ہر اُمّت کے لئے عبادت کے طریقے

متعین کیے۔ مشرکین اور دُوسرے کُفار جو حضور ﷺ پر اور آپ کے بیان کردہ اعتقادات اور اَحکام شرعیہ پر اعتراض کرتے تھے ان میں یہود و نصاریٰ بھی تھے۔ یہ لوگ یوں کہتے کہ یہ اَحکام اور اعمال ہم نے پہلے کسی سے نہیں سنے، آپ کی بتائی ہوئی ایسی چیزیں بھی ہیں جن کا پُرانی اُمتوں کے اعمال و احکام میں کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ مقصد یہ تھا کہ جھگڑے کرتے رہیں اور انکار پر تلے رہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو جواب دیدیا۔ لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ: ہم نے ہر امت کے لئے عبادت کے طریقے مقرر کردیئے جن کے مطابق وہ عمل کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ احکم الحاکمین ہے مالک الملک ہے آمرِ مطلق ہے اسے اختیار ہے کہ جس اُمت کو جو چاہے حکم فرمائے۔ انبیائے سابقین کی اُمتوں کو جو اَحکام عطا فرمائے ان کے ذمہ ان پر عمل کرنا تھا اور آخری نبی کی اُمت کو جو اَحکام دیئے ان پر عمل کرنے کی ذمہ داری ان پر ڈال دی گئی ہے۔ کسی مخلوق کو کوئی حق نہیں کہ اللہ تعالیٰ پر اعتراض کرے اور یوں کہے کہ آخری نبی جو آئے ہیں ان کی شریعت میں بہت سی وہ چیزیں ہیں جو اَنبیائے سابقین کی شریعت میں نہیں ہیں۔ معاندین کو جواب دینے کے بعد ارشاد فرمایا: فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْاَمْرِ: سو وہ اس اَمر میں آپ سے جھگڑا نہ کریں۔ حضور ﷺ مستقل شریعت لے کر تشریف لائے، آپ کے تشریف لانے پر تمام اَحکام شرعیہ فرعیہ سابقہ منسوخ ہوگئے، جو شخص آپ کے ارشاد کردہ اَحکام پر اِعتراض کرتا ہے اور جھگڑا کرتا ہے، اس کا اِعتراض کرنا اللہ پر اِعتراض ہے، جو کفر در کُفر ہے، یہ لوگ جھگڑے بازی سے دُور رہیں۔

کافروں کو ان کے حال پر چھوڑ دیں

وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ ؕ اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ: اور آپ ان کو اپنے رَبّ کی طرف بلاتے رہیے بے شک آپ ہدایت پر ہیں جو سیدھا راستہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے کام میں لگے رہیں۔ حق کی دعوت دیتے رہیں کوئی کچھ بھی اعتراض کرے کسی کے اِعتراض سے متاثر نہ ہوں۔ اللہ کی طرف سے آپ کو ہدایت والا راستہ بتایا گیا ہے اور اس کے حق ہونے کی اللہ کی طرف سے ضمانت دی گئی ہے وہ آپ کے لئے کافی ہے۔ وَاِنْ جٰدَلُوْكَ فَقُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ: اور اگر یہ لوگ آپ سے جھگڑا کریں تو آپ فرمادیجئے کہ اللہ تمہارے کاموں کو بہتر جانتا ہے وہ تمہارے اعمال کی سزا دے گا۔ مزید فرمایا اَللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ: اللہ تعالیٰ قیامت کے دِن فیصلہ کرے گا تمہارے درمیان ان چیزوں کے بارے میں جن میں تم اختلاف کرتے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ فیصلہ فرمائے گا تو سب کچھ ظاہر ہوجائے گا۔ مگر اس وقت منکرین کو حق واضح ہوجانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے ذریعہ سے جو حکم بھیجا ہے يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ کے طور پر یہیں اسی دنیا میں تسلیم کرلیں تو یہ ایمان لانا آخرت کے دِن مفید ہوگا۔ پھر آگے فرمایا: اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ: اے مخاطب! کیا تو نہیں جانتا جو کچھ زمین وآسمان میں ہے اللہ اس سب کو جانتا ہے۔ اِنَّ ذٰلِكَ فِيْ كِتٰبٍ: بے شک یہ کتاب میں لکھا ہوا ہے یعنی لوحِ محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ: بے شک یہ اللہ پر آسان ہے یعنی لوحِ محفوظ میں سب کچھ محفوظ فرمانا اس کے لئے ذرا بھی مشکل نہیں۔ کہ کوئی منکر اور معاند یہ نہ سمجھے کہ اتنی زیادہ مخلوق کے حالات ایک ہی کتاب میں کیسے سمائیں گے۔

قرآن سنتے وقت کفار کی حالت

اگلی آیات میں اللہ تعالیٰ اس چیز کو بیان فرمارہے ہیں کہ کافر جب قرآن سنتے ہیں تو ان کے چہروں سے ناگواری محسوس ہوتی ہے، ان آیات میں مشرکین کی تردید بھی ہے، ان کا طریقہ کار بھی بیان فرمایا ہے اور ساتھ ہی عذاب کا تذکرہ بھی فرمادیا، جو آخرت میں ہوگا۔ اوّل تو یہ فرمایا کہ یہ لوگ ان چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جن کے معبود ہونے کی اللہ نے کوئی دلیل نازل نہیں فرمائی اور ان کے پاس کوئی عقلی دلیل بھی نہیں ہے جس سے شرک کرنے کا جواز معلوم ہوتا ہو، یہ لوگ شرک کرکے ظالم بنے ہوئے ہیں اور اس ظلم کی سزا انہیں مل جائے گی۔ جب انہیں عذاب ہونے لگے گا تو ان کے لئے کوئی مددگار بھی نہیں ہوگا۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ جب ان مشرکین کو ہماری آیات سنائی جاتی ہیں جن کے مضامین خوب واضح ہیں تو کافروں کے چہرے بدل جاتے ہیں اور چہروں پر ناگواری محسوس ہونے لگتی ہے ناگواری کا یہ عالم ہے کہ جو اہل ایمان انہیں ہماری آیات سناتے ہیں ان پر حملہ کرنے کو تیار ہوجاتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ابھی حملہ کردیں گے۔ ان کی یہ حالت بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ اے نبی! آپ ان سے کہہ دیں کہ دنیا میں تمہیں ناگواری محسوس ہوتی ہے یہ تو ہلکی ناگواری ہے اس سے بڑھ کر وہ ناگواری ہوگی جو دوزخ میں داخل ہوکر پیش آئے گی۔ دوزخ کی آگ کا عذاب بہت برا ہے۔ وہ کافروں کو ناگوار ہوگا لیکن اس سے چھٹکارے کا کوئی راستہ نہ ہوگا۔ دُنیا میں قرآن سن کر جو ناگواری ہوتی ہے اس کا تو کچھ غصّے والا منہ بنا کر تدارک کر بھی لیتے ہو۔ آخرت میں جو عذاب ہوگا، نہ ہلکا ہوگا، نہ قابل برداشت ہوگا، دوزخ کی اس آگ کا اللہ نے کافروں سے وعدہ فرمایا ہے یعنی دنیا میں پہلے سے بتادیا ہے کہ کُفر کی سزا دوزخ ہے اس سے کبھی چھٹکارا نہ ہوگا۔ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ: اور دوزخ برا ٹھکانا ہے۔

يَاأَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوا لَهُ ۚ إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ
اے لوگو! ایک مثال بیان کی گئی ہے، سو تم اسے دھیان سے سُن لو، بلاشبہ جن کی تم عبادت کرتے ہو اللہ کے سوا
لَنْ يَخْلُقُوا ذُبَابًا وَلَوِ اجْتَمَعُوا لَهُ ۖ وَإِنْ يَسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَا يَسْتَنْقِذُوهُ مِنْهُ ۚ
وہ ہرگز مکھی بھی پیدا نہیں کرسکتے اگرچہ اس کے لئے وہ سب اکٹھے ہوجائیں، اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے تو اسے چھڑا نہیں سکتے،
ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوبُ ﴿٧٣﴾ مَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ
طالب بھی کمزور اور مطلوب بھی کمزور ﴿۷۳﴾ لوگوں نے اللہ کی ایسی تعظیم نہیں کی جیسا کہ اس کی تعظیم کا حق ہے، بلاشبہ اللہ بڑی قوت والا ہے
عَزِيزٌ ﴿٧٤﴾ اللَّهُ يَصْطَفِي مِنَ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا وَمِنَ النَّاسِ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ
زبردست ہے ﴿۷۴﴾ اللہ تعالیٰ فرشتوں میں سے پیغام پہنچانے والوں کو چُن لیتا ہے اور آدمیوں میں سے بھی، بلاشبہ اللہ تعالیٰ سننے والا

بَصِيْرٌ ۝ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۗ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝
دیکھنے والا ہے ۝ وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے، اور اللہ ہی کی طرف تمام اُمور لوٹائے جاتے ہیں ۝
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝
اے ایمان والو! رکوع کرو اور سجدہ کرو اور اپنے ربّ کی عبادت کرو اور خیر کے کام کرو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ ۝
وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ۗ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ۗ
اور اللہ کے بارے میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے، اس نے تمہیں چُن لیا اور اس نے تم پر دین میں تنگی نہیں رکھی،
مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ۗ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ
اپنے باپ ابراہیم کی ملّت کی اتباع کرو، اس نے تمہارا نام مسلمین رکھا اس سے پہلے اور اس قرآن میں تاکہ
الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ
رسول تمہارے بارے میں گواہ بن جائے، اور تم لوگوں کے مقابلے میں گواہ بن جاؤ سو نماز قائم کرو
وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ۗ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ۝
اور زکوٰۃ ادا کرو، اور اللہ کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لو، وہ تمہارا مولیٰ ہے، سو وہ خوب مولیٰ ہے اور خوب مددگار ہے ۝

تفسیر

بتوں کا عجز

اس رکوع میں اللہ تعالیٰ مشرکین کے معبود کی عاجزی کا حال بیان فرمارہے ہیں، غیر اللہ کی عبادت کرنے والوں اور ان کے معبودوں کے بارے میں عجیب بات بیان فرمائی ہے اور اس کو مثال سے تعبیر فرمایا یعنی یہ ایسی بات ہے جس کو مشرکین کے سامنے بار بار ذکر کرنا چاہیے۔ مشرکوں کو سنائیں اور ان سے کہیں کہ خوب دھیان سے سنو تاکہ تمہیں اپنی حماقت اور گمراہی کا خوب پتا چل جائے۔ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر تم جن کی عبادت کرتے ہو اور جنہیں مدد کے لئے پکارتے ہو یہ ایک مکھی بھی پیدا نہیں کرسکتے سب مل کر ایک مکھی بھی پیدا کرنا چاہیں تو عاجز ہو کر رہ جائیں گے۔

مشرک کی ذلت

اللہ تعالیٰ کے سوا تم نے جتنے بھی معبود بنا رکھے ہیں یہ مکھی پیدا تو کیا کرتے، اگر مکھی ان سے کچھ چھین لے تو اس سے چھڑا

نہیں سکتے۔ جو شخص حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کی دعوتِ توحید سے منہ موڑے گا وہ اس طرح عاجز مخلوق کے سامنے ذلیل ہوگا۔ جو لوگ خالق و مالک کی توحید کے قائل نہیں ہوتے۔ اور اس کو سجدہ نہیں کرتے تو وہ یونہی مارے پھرتے ہیں اور اپنے سے بھی زیادہ عاجز مخلوق کے سامنے سجدہ کرتے ہیں، اسی کو اللہ نے فرمایا ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ: طالب سے مشرک اور مطلوب سے معبود باطل مراد ہیں۔ اور مطلب یہ ہے کہ جیسا عابد ویسا ہی معبود دونوں ہی ضعیف ہیں۔ معبود تو ضعیف اس لیے ہیں کہ وہ مکھی تک سے مٹھائی بھی نہیں چھڑا سکتے۔ اور اس کی عبادت کرنے والا اس لیے کمزور ہے اس کی کمزوری عقل کے اعتبار سے ہے وہ ایسی چیز سے نفع کا اُمیدوار ہے جو اپنے چڑھاوے کی چیز کو مکھی تک سے نہیں چھڑا سکتا۔

لوگوں نے اللہ کی تعظیم نہیں کی جیسا کہ حق ہے

مَاقَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ: لوگوں نے اللہ کی وہ تعظیم نہ کی جو اس کی شان کے لائق ہو۔ اللہ تعالیٰ اپنی ذات وصفات میں یکتا ہے۔ خالق و مالک ہے تنہا عبادت کا مستحق ہے وہ نفع بھی دیتا ہے اور ضرر بھی۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے ہر چیز کو دیکھتا ہے ہر اونچی اور ہلکی سے ہلکی آواز کو سنتا ہے سب بندوں پر لازم ہے کہ اسے وحدہ لاشریک مانیں۔ اور اس کی تمام صفات جلیلہ پر ایمان لائیں جو قرآن وحدیث میں مذکور ہیں۔ ایسی ذات کو چھوڑ کر اس کی پیدا کی ہوئی مخلوق کو معبود بنا لینا اللہ کی تعظیم سے بہت بعید ہے اور گمراہی ہے۔ جب مشرکین سے مسلمان کہتے ہیں کہ تم خالق کائنات کو نہیں مانتے۔ تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو مانتے ہیں۔ جھوٹی زبان سے اللہ کے ماننے کا دعویٰ کر دیتے ہیں لیکن ساتھ ہی اس کی عبادت میں دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہیں، یہ ماننا اس کی شان کے لائق نہیں ہے کہ اس کی مخلوق میں سے خدا تراش لیے جائیں۔ اور ان کے لیے جانور ذبح کیے جائیں اور ان کو سجدے کیے جائیں، یہ اللہ تعالیٰ کا ماننا کہاں ہوا؟ اور اس کے شایانِ شان اس کی تعظیم کہاں ہوئی؟ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ: بے شک اللہ تعالیٰ بڑی قوت والا غلبے والا ہے، ایسے قوی اور عزیز کو چھوڑ کر ضعیف چیز کی عبادت کرنا جو اس کی مخلوق ہے، بہت بڑی گمراہی ہے۔

اللہ نے جیسے چاہا اپنی حکمت کے مطابق ہر ایک کو مرتبہ عطا فرمایا

اگلی آیات میں اس چیز کو بیان کیا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں سے اور انسانوں میں سے پیغام پہنچانے والے چُن لیتا ہے اور وہ سب کچھ جانتا ہے، ساری مخلوق اللہ ہی کی مخلوق ہے اس نے اپنی مخلوق میں سے جسے چاہا جو مرتبہ دے دیا۔ اور جیسے چاہا کسی بڑے اور برتر کام کے لئے چُن لیا۔ رسالت اور نبوّت بہت بڑا مرتبہ ہے، رسول کا کام یہ ہے کہ اللہ کے احکام اور پیغام اس کے بندوں تک پہنچائے۔ فرشتوں کو اللہ تعالیٰ نے سفارت اور رسالت کی یہ عزت بخشی کہ ان کے ذریعے اپنے نبیوں اور رسولوں کی طرف پیغام بھیجے صحیفے اور کتابیں نازل فرمائیں۔ جنہیں انسانوں میں سے منتخب فرما کر نبوت اور رسالت سے نوازا۔ پھر ان نبیوں اور رسولوں نے انسانوں تک وہ احکام پہنچائے جو فرشتوں کے ذریعے سے اللہ کی طرف سے ان کے پاس پہنچے۔ فرشتے بھی اللہ کی مخلوق ہیں جن میں سے جنہیں چاہا پیغمبر بنایا۔ اور اپنی حکمت کے مطابق جسے چاہا یہ رتبہ عطا کیا۔ کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ یوں سوال کرے کہ فلاں کو کیوں نہیں بنایا۔ اللہ سمیع ہے بصیر ہے وہ سب کی باتیں سنتا ہے سب کے احوال دیکھتا ہے، جو اس کے فیصلوں کو

قبول کرے گا اسے اس کا بھی علم ہے اور جو اس کے فیصلوں پر اعتراض کرے گا تو وہ اس سے باخبر ہے اور جس جس میں اللہ نے جو استعداد رکھی ہے اسے اس کا بھی پتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہر قسم کے اَحوال سے واقف ہے

یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ: وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے اور پیچھے ہے یعنی اسے انسانوں کے اگلے پچھلے احوال واعمال سب معلوم ہیں وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ: اور تمام امور اللہ ہی کی طرف لوٹتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو ہر طرح کا اختیار ہے دُنیا میں جو کچھ ہوتا ہے وہ بھی اس کی مشیت اور ارادے سے ہوتا ہے اور آخرت میں بھی سب کچھ اسی کے ارادے اور مشیت سے ہوگا اور اس کا حکم چلے گا۔ اور سارے فیصلے اسی کے ہوں گے اور حق ہوں گے۔

کامیابی نیک اعمال میں ہے

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا: اے ایمان والو! رکوع کرو، اور سجدہ کرو، یعنی نماز پڑھو۔ کیونکہ رکوع سجدہ دو بڑے رکن ہیں۔ اس لیے ان کا خصوصی حکم دیا جس میں پوری نماز پڑھنے کا حکم آ گیا۔ وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ: اور اپنے رَبّ کی عبادت کرو۔ نماز کے علاوہ جو دیگر عبادات ہیں یہ حکم ان سب عبادات کو شامل ہوگیا۔ وَافْعَلُوا الْخَیْرَ: اور خیر کے کام کرو اس کا عموم تمام نیک اعمال کو شامل ہے۔ اور عبادات، فرائض، واجبات، مکارم اخلاق، محاسن افعال، محاسن آداب، انفرادی اور اجتماعی زندگی کے احکام سب کو حکم شامل ہے۔ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ: تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔ یعنی تمام مامورات پر عمل کرتے ہوئے اللہ سے کامیابی کی امید رکھو۔

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ سجدہ کی آیت ہے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس آیت پر سجدۂ تلاوت نہیں ہے۔

نفس کی ناگواریوں کے باوجود نیک کاموں میں لگے رہنا

وَجَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ: لفظ ''جہاد'' جُهد سے مشتق ہے عربی زبان میں محنت ومشقت اور کوشش کو جہد کہتے ہیں، یہ لفظ اپنے عام معنی کے اعتبار سے ہر اس محنت وکوشش کو شامل ہے جو اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے ہو۔ جہاد جو قتال یعنی جنگ کرنے کے معنی میں مشہور ہے، وہ بھی اس محنت وکوشش کا ایک شعبہ ہے، مسلمان اپنے نفس سے جہاد کرتا ہے یعنی نفس کی ناگواریوں کے باوجود نیک کاموں میں لگتا ہے، گناہوں کو چھوڑتا ہے، نفس روڑے اٹکاتا ہے اور چاہتا ہے کہ جو بھی عمل ہو دنیاداری کے لیے ہو، ذاتی شہرت اور حصول جاہ اور لوگوں سے تعریف کرانے کے لئے ہو، اس موقع پر نفس سے جہاد کرنا ہوتا ہے، پوری طرح اس کے تقاضوں کو دبا کر صرف اللہ کے لئے جو کام کیا یہ سب جہاد ہے۔ خلاصہ یہ کہ جو بھی کوئی مومن اللہ کی رضا کے لئے اور اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لئے جس طرح کی بھی محنت کرے گا وہ جہاد ہوگا۔ پھر مختلف احوال کے اعتبار سے درجات بھی مختلف ہیں ہر شخص اپنی استطاعت کے بقدر اخلاص کے ساتھ اعمال واشغال میں لگے۔

اُمّتِ محمدیہ کی فضیلت

هُوَاجْتَبٰكُمْ: اللہ تعالیٰ نے تمہیں چُن لیا سابقہ تمام اُمتوں پر، اللہ نے تمہیں یعنی اُمتِ محمدیہ کو فضیلت بخشی، تمہیں حضور ﷺ کی اُمت ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ ان پر اللہ تعالیٰ نے قرآن نازل فرمایا جسے بآسانی حفظ کر لیتے ہیں، دنیا میں آخر میں آئے اور جنت میں پہلے داخل ہوں گے۔

دِین آسان ہے، لیکن ماحول کی خرابی کی وجہ سے مشکل محسوس ہوتا ہے

(۱) وَمَاجَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ: اللہ تعالیٰ نے تم پر دِین میں کوئی کسی قسم کی تنگی اور مشکل نہیں بنائی، دِین میں آسانی کی رعایت رکھی ہے۔ ہم اپنے ماحول میں رہتے ہوئے بعض احکام پر عمل کرنا مشکل سمجھتے ہیں، جیسے کاروباری دنیا ہے، جب ان کے سامنے کسی چیز کا تذکرہ آتا ہے تو وہ کہتے ہیں جی! کیا کریں آج کل تو ان چیزوں کی رعایت رکھنی بڑی مشکل ہے، تو یہ جو مشکل پیش آتی ہے یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ دِین میں مشکل ہے، یہ ہمارے ماحول کی تنگی ہے، اور ماحول کی خرابی ہے، جس کی بنا پر آسان سے آسان حکم پر عمل کرنا بھی ہمارے لیے مشکل ہو گیا، اس کا الزام دِین پر نہیں دیا جا سکتا بلکہ اس کا الزام اپنے ماحول پر ہے۔ جیسے ایک شخص طبیب کے پاس جائے اور طبیب اس کی نبض دیکھ کے اس کے لئے کوئی علاج تجویز کرے، پھر وہ مریض پوچھے کہ میں کھاؤں کیا؟ طبیب اسے کہے کہ کدو کھالینا۔ وہ کہے: جی! میری بستی میں تو کدو نہیں ملتا۔ تو طبیب کہے کہ اچھا! مونگی کی دال کھالینا، وہ کہتا ہے: جی! مونگی کی دال بھی ہمارے ہاں موجود نہیں ہے۔ طبیب کہے کہ چوزہ لے کے اس کا شوربہ بنالینا، یخنی بنالینا، وہ کہتا ہے کہ یہ بھی دستیاب نہیں ہے۔ تو طبیب پوچھتا ہے کہ پھر تمہارے ہاں ملتا کیا ہے؟ وہ کہتا ہے: جی! ہمارے ہاں تو مسری کی دال ہوتی ہے، طبیب کہتا ہے کہ وہ نہیں کھانی۔ اور کیا ہوتا ہے؟ جی! بینگن ہوتے ہیں، کہتا ہے: یہ بھی نہیں کھانے۔ اس طرح سے دو تین چیزوں کا نام لیتا ہے، طبیب ہر ایک سے روکتا چلا جاتا ہے۔ اب وہ مریض طبیب کو الزام دے کہ آپ کی طب میں بڑی تنگی ہے، کہ عام آدمی کے بس میں نہیں کہ علاج کروالے۔ تو بتائیے! یہ طب پر الزام ہے یا اس کی اپنی بستی اور ماحول پر الزام ہے؟ کہ وہ رہتا ہی ایسی جگہ ہے جہاں کوئی مفید چیز ملتی ہی نہیں، اور نقصان دِہ چیزیں ملتی ہیں، طب میں تو وسعت آگئی کہ تم ٹینڈے کھالو، کدو کھالو، مونگی کی دال کھالو، یخنی پی لو، اور اس قسم کی کئی متعدد چیزیں طبیب بتادے گا، اب اگر تم نے رہائش ہی ایسی جگہ اختیار کر رکھی ہے کہ وہاں ان میں سے کوئی چیز نہیں ملتی، اور جو چیزیں ملتی ہیں وہ صحت کے لیے نقصان دِہ ہیں، تو اس کا الزام طبیب پر نہیں، بلکہ تمہاری اپنی بستی اور تمہارے اپنے ماحول پر ہے۔ اسی طرح سے شریعت کا کوئی حکم فی حدذاتہٖ مشکل نہیں ہے، لیکن اگر انسانوں نے مل کر اپنی آبادی اس قسم کی کر لی اور حالات اس قسم کے پیدا کر لیے کہ اس میں بُرائی اختیار کرنی آسان ہو گئی اور نیکی اختیار کرنی مشکل ہو گئی، تو اس کا الزام انسانوں کی آبادی پہ ہے شریعت پہ نہیں۔ فی حدذاتہٖ اللہ تعالیٰ کے جتنے بھی احکام ہیں سب انسان کے لیے خوشگوار ہیں، نہایت آسانی کے ساتھ ان کے اوپر عمل کیا جا سکتا ہے، اب اگر تم بُری عادتیں خود ڈال لو، مثلاً ایک آدمی سگریٹ کی

(۱) یہاں سے حضرت حکیم العصرؒ کی تقریر ہے۔

عادت ڈال لیتا ہے، بعد میں کہتا ہے کہ جی! اس کے بغیر تو گزارہ بہت مشکل ہے، اب ''یہ بہت مشکل ہے'' یہ تو اپنی بگڑی ہوئی عادت کی وجہ سے مشکل ہے نا! ورنہ آپ کو سینکڑوں، ہزاروں بلکہ لاکھوں انسان ایسے مل جائیں گے جو کبھی بھی سگریٹ نہیں پیتے، ان کا بھی تو گزارہ ہو ہی رہا ہے، اپنے ہاتھ سے عادت بگاڑ لینے کے بعد پھر کہنا کہ ''اب اس کا چھوڑنا مشکل ہے اور شریعت کا یہ حکم بہت مشکل ہے'' یہ دُرست نہیں ہے۔ شراب کا عادی ہو جانے کے بعد جب اس کے سامنے شریعت کا حکم آئے کہ شراب نہیں پینی، یہ حرام ہے، وہ کہے یہ تو بہت مشکل دین ہے، اس کے بغیر تو گزارہ ہی نہیں ہو سکتا، تو یہ درحقیقت الزام اپنے آپ پہ ہے، کہ تم نے اپنی عادت بگاڑی کیوں؟ ورنہ عادت بگاڑنے کے بعد تو آپ جانتے ہیں کہ ہر عیاشی، بدمعاشی اس قسم کی عادت بن جاتی ہے کہ اس کا ترک کرنا انسان کے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔ تو اگر اس قسم کی آسانیاں پیدا کرنا شروع کر دیں تو پھر تو کوئی جرم ہی نہیں جس سے انسان کو روکا جا سکے، کوئی بُری عادت ہی نہیں جس سے روکا جا سکے، ہر بُری عادت اختیار کرنے والا آدمی اپنی جگہ اپنے آپ کو مجبور سمجھتا ہے، اور وہ کہتا ہے کہ اس کے بغیر گزارہ نہیں ہے، افیون کھانے والا کہتا ہے کہ افیون کے بغیر گزارہ نہیں، شراب پینے والا کہتا ہے کہ شراب کے بغیر گزارہ نہیں، جب انہیں چھوڑنے کے لیے کہیں اور بتائیں کہ یہ شریعت کے حکم کے خلاف ہے، تو وہ کہیں کہ ''جی! شریعت تو بڑی مشکل ہے، اس پر تو عمل نہیں ہو سکتا!'' تو درحقیقت شریعت مشکل نہیں ہے، تم نے اپنی عادت بگاڑ کے اپنے لیے مشکلات پیدا کر لی ہیں۔ اب جو لوگ نماز کی عادت ڈال لیتے ہیں ان کے لیے نماز پڑھنی کتنی آسان، کہ نہیں پڑھتے تو ان کو بے چینی ہوتی ہے، اور پڑھتے ہیں تو طبیعت کو راحت اور سکون حاصل ہوتا ہے، تو نماز کا حکم کیسے مشکل ہوا، اور ایک آدمی نے اپنی عادت بگاڑ لی اور عادت بگاڑنے کی وجہ سے اللہ کا نام اس کی زبان پر آتا نہیں، اسے ناگوار گزرتا ہے، گالیاں چاہے سو دفعہ اس سے سُن لو، تو یہ انسان کا اپنا بگڑا ہوا مزاج ہے، فی حد ذاتہ اس حکم میں کسی قسم کی مشکل نہیں۔ فضول خرچیاں اپنے اوپر مسلط کر لیں جس کی بنا پر اللہ کے راستے میں خرچ کرنا مشکل ہو گیا، اگر تم فضول خرچی نہ کرتے، تمہارے پاس پیسے جمع ہوتے تو اللہ کے راستے میں خرچ کرنا آسان ہوتا، تمہیں بیسیوں آدمی اس قسم کے مل جائیں گے جو اپنی کمائی کا معتدبہ حصہ اللہ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں، لیکن جنہوں نے اپنے اُوپر لغو کام سوار کر لیے، فضول خرچی کی عادت ڈال لی وہ کہتے ہیں کہ ہماری ضروریات ہی پوری نہیں ہوتیں، ہم اللہ کے راستے میں کہاں سے خرچ کریں، تو یہ سارے کا سارا مزاج اپنا بگڑا ہوا ہے، ورنہ اللہ کے دِین میں کسی قسم کی تنگی نہیں ہے۔ جو اللہ نے احکام دیے ہیں وہ عین فطرت کے مطابق اور انسان کے مزاج کے موافق ہیں، اور اگر واقعی کسی جگہ دقت پیش آ جائے جس طرح سے آپ بیمار ہو گئے، کھڑے ہو کے نماز نہیں پڑھ سکتے، تو رخصت موجود ہے کہ بیٹھ کے پڑھ لو، بیٹھ کے نہیں پڑھ سکتے تو لیٹ کر اشارے سے پڑھ لو، اور اگر اشارہ کرنے کی بھی طاقت نہیں رہی تو اللہ کی طرف سے نماز بھی معاف ہے، تو اس میں کیا تنگی ہوئی؟ اسی طرح سے باقی احکام ہیں، عزیمت کے ساتھ ساتھ رخصت کا باب چلتا ہے۔

''اِسلام'' کا لفظ بطورِ لقب کے اس اُمّت کو ملا ہے، تو اس نام کی لاج بھی رکھنی چاہیے

مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ: اپنے باپ ابراہیم کے طریقے کو لازم پکڑو، گویا کہ یہ ملّتِ اسلامیہ ملّتِ ابراہیمیہ ہے۔ فعل یہاں

محذوف ہے، یا تو یوں کہہ لیجئے: رَضِیْتُ لَکُمْ مِلَّةَ اَبِیْکُمْ اِبْرٰهِیْمَ۔ یا اَمر کا صیغہ یہاں نکال لیجئے (نسفی وغیرہ)۔ ”میں نے تمہارے لیے ملت ابراہیمی کو، تمہارے باپ کے طریقے کو پسند کیا ہے، اسی کو اختیار کرو“ تو یہ تمہارا خاندانی طریقہ ہے جس کا اپنانا اور بھی زیادہ آسان ہوگیا، اسی کو لازم پکڑو۔ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِیْنَ: اسی نے تمہارا نام مسلمین رکھا، یہ اس دُعا کی طرف اشارہ ہے، انہوں نے ایک دُعا کی تھی کہ ہماری اولاد میں سے ایک اُمتِ مسلمہ اُٹھائیے۔ اور مسلمہ: فرمانبردار۔ اسلام کا لفظ اگرچہ سب دینوں کے لئے بولا گیا ہے، اور باقی کائنات کے لیے بھی یہ لفظ بولا گیا ہے، جیسے دوسری جگہ ہے وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (سورۃ آل عمران: ۸۳) آسمان اور زمین میں جو کچھ بھی ہے سب اسی کا تابع ہے مطیع ہے۔ لیکن لقب کے طور پر یہ لفظ ”مسلم یا اُمتِ مسلمہ“ اسی اُمت کے لئے اختیار کیا گیا ہے، پہلی اُمتوں کے لئے یہ لفظ بطور لقب کے نہیں تھا، اگرچہ لغوی طور پر وہ بھی سارے کے سارے مسلم تھے اور اللہ کے فرمانبردار تھے لیکن یہ لقب اسی اُمت کو ملا، تو یہ لقب اسی جماعت کا ہے، اور یہ نام جو رکھا گیا ”مسلمہ“، اس کا معنی ہے فرماں بردار جماعت، تو جب نام تمہارا فرماں بردار رکھا گیا ہے تو تمہیں چاہیے کہ اس نام کی لاج رکھو، وہ بات نہ ہو کہ نام تو مسلم، اور کام فاسقوں والے، باغیوں والے، سرکشوں والے، تو پھر تو وہی بات ہو جائے گی جیسے آپ محاورہ استعمال کیا کرتے ہیں کہ ”برعکس نہند نامِ زنگی کافور“ زنگی کہتے ہیں حبشی کو، اور کافور کی حکایتیں آپ متنبی میں پڑھتے ہیں، وہ حبشی تھا، انتہائی درجے کا کالا، اور کافور انتہائی سفید اور خوشبودار چیز کو کہتے ہیں تو برعکس نہند نامِ زنگی کافور، کہ اُلٹے طریقے سے زنگی کا نام کافور رکھ دیتے ہیں، اب زنگی اور کافور دونوں میں منافات ہے کہ زنگی انتہائی درجے کا کالا، اور کافور انتہائی درجے کا سفید، تو نام کافور اور خود انتہائی سیاہ۔ اور جیسے کہا کرتے ہیں کہ ”پڑھے نہ لکھے نام محمد فاضل“ کہ لکھنا پڑھنا تو آتا نہیں اور نام ”محمد فاضل“۔ پنجابی کا محاورہ ہے ”اَکھاں تو اَنہی نام نور پری“ کہ نظر تو آتا نہیں، آنکھوں سے تو اندھی ہے لیکن نام ”نور پری“ ہے۔ تو یہ ہوتے ہیں اُلٹے نام، کہ اس کا اسم بامسمّٰی نہیں ہے، جس قسم کا نام ہے حقیقت وہاں موجود نہیں ہے۔ اب نام تو مسلم، کوئی پوچھے کہ کون ہو، تو کہیں گے کہ مسلم، اور مسلم کا معنی ہے فرماں بردار، گردن جھکا دینے والا، اور کردار دیکھو تو باغیوں والا، سرکشوں والا، فاسقوں فاجروں والا، تو یہ بات نام کے ساتھ جچتی نہیں ہے، یہ اسم بامسمّٰی نہیں ہے، یہ تو برعکس معاملہ ہو جائے گا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ ذکر فرماتے ہیں کہ تمہارا نام تو ابراہیم علیہ السلام نے ”مسلم“ رکھا ہے، تم فرماں بردار ہو، یہ تمہاری جماعت کا لقب ہے، تمہیں اس نام کی لاج رکھنی چاہیے کہ اللہ کے احکام کے سامنے گردن جھکاؤ اور فرماں بردار بن کے رہو۔ اس سے قبل بھی تمہارے لیے یہی لقب استعمال کیا گیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دُعا میں ذکر کیا، قرآنِ کریم میں بھی چونکہ اس اُمت کو اُمتِ مسلمہ قرار دیا گیا، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام ذکر کرنے کی وجہ سے ہے، تو گویا کہ قرآنِ کریم میں تمہارا اُمتِ مسلمہ جو نام ہے یہ بھی ابراہیم کا رکھا ہوا ہے، ”اس سے قبل اور اس قرآن میں۔“

اُمتِ محمدیہ کے لئے شرف واِعزاز

لِیَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِیْدًا عَلَیْكُمْ: اس کا مطلب دو طرح سے ادا کیا گیا ہے، یہی آیت پہلے آپ کے سامنے سورۃ بقرہ میں

دوسرے پارے کے شروع میں آئی تھی۔ یا تو رسول ہماری شہادت دے گا جس طرح سے تزکیہ کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ معتبر ہیں، اور ہم گواہ ہوں گے انبیاء علیہم السلام کے حق میں ان کی امتوں کے خلاف۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ قیامت کے میدان میں اللہ تعالیٰ نبیوں کو اور ان کی اُمتوں کو آپس میں بالمقابل کھڑا کرے گا، امتوں سے سوال کرے گا کہ تم نے کفر وشرک کیوں اختیار کیا؟ میری عبادت کیوں نہیں کی؟ وہ کہیں گے کہ ہمارے پاس تو کوئی ڈرانے والا ہی نہیں آیا تھا۔ انبیاء علیہم السلام سے پوچھا جائے گا کہ کیا تم نے میرا دین ان کو پہنچایا نہیں تھا؟ وہ کہیں گے کہ پہنچایا تھا، اور کافر قومیں انکار کریں گی کہ تیرا دین ہمیں کسی نے پہنچایا ہی نہیں۔ تو پھر اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام سے پوچھیں گے کہ تمہارا گواہ کون ہے؟ تو انبیاء علیہم السلام سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کو گواہی میں پیش کریں گے، اور ہم گواہی دیں گے انبیاء علیہم السلام کے حق میں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری تصدیق کریں گے کہ یہ ٹھیک کہتے ہیں،[1] اور ان کو ساری کی ساری معلومات اللہ کی کتاب سے حاصل ہوئیں، یعنی ہمارے پاس شہادت کی جو سند ہوگی وہ اللہ کی کتاب ہے۔ تو یہ ایک بہت بڑا شرف اور بہت بڑا اعزاز ہے جو اللہ تعالیٰ اس اُمت کو دے گا۔ یہ تو آخرت میں جا کے ظاہر ہوگا، باقی! دنیا کے اندر گواہ ہونے کا یہ مطلب بھی ہے (اور شاہ عبدالقادر صاحب رحمہ اللہ نے یہاں یہی مطلب لیا ہے جو دوسرا ذکر کر رہا ہوں) کہ یہاں گواہ سے مراد ہے دین کے گواہ۔ ہم لوگوں کے سامنے دین کے گواہ ہوں اور ان کو بتائیں کہ اللہ کا یہ حکم ہے، اللہ کا یہ حکم ہے، یہ چیز اللہ کو پسند نہیں، یہ چیز اللہ کو پسند نہیں، لوگوں کے سامنے ہم شہادت دیں گے، اور ہمارے سامنے اللہ کا رسول شہادت دیتا ہے، اللہ کا رسول ہمارے سامنے اپنا دین بیان کرے، ہم لوگوں پر اپنا دین بیان کریں، اس کام کے لئے اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کے لئے اس اُمت کو چُن لیا ہے۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی ملت پر مضبوطی سے جمے رہیں۔ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ جو کہا اس کا اولین خطاب چونکہ عرب کو ہے اور عرب حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں خصوصیت سے قریش، اور رُوحانی باپ تو ہم سب مانتے ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو، جیسے اُمہات المؤمنین یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کو ہم سب ماں کہتے ہیں، تو نبی اُمت کا رُوحانی باپ ہوتا ہے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نسبی باپ بھی ہیں اور ہم سب کے رُوحانی باپ بھی ہیں، اور عرب کے اکثر قبائل حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے تھے، جس کی وجہ سے نسباً بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کے باپ ہیں۔

اللہ کے علاوہ کوئی دوسرا سہارا تلاش کرنے کی ضرورت نہیں

فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ: تو جب یہ شرف تمہیں حاصل ہونے والا ہے، یا دنیا کے اندر تمہیں شہداء علی الناس بنایا گیا تو تم خود اللہ کے عبادت گزار رہو، نماز پڑھو اور زکوٰۃ دیتے رہو، کیونکہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ یہ عبادت کے بنیادی اُصول ہیں، اور اللہ کو مضبوطی سے تھام لو، یعنی اللہ کی کتاب کو مضبوطی سے تھام لو، اس پر عمل کرو، یا مطلب یہ ہے کہ اللہ کا ہی سہارا لو، کوئی دوسرا سہارا

---

(۱) ابن ماجہ ص ۱۷ ۳ باب صفۃ امۃ محمد ﷺ۔ نیز دیکھیں: بخاری ۲/ ۶۴۵ کتاب التفسیر سورہ بقرہ باب و کذالک جعلنا کم امۃ وسطا

تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہی تمہارا مولیٰ ہے مالک ہے کارساز ہے، اور مددگار ہے، مولیٰ مددگار کو بھی کہتے ہیں، مالک کو بھی کہتے ہیں، فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ: وہ بہت اچھا کارساز ہے، بہت اچھا مولیٰ ہے مالک ہے، اور بہت اچھا مددگار ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

(کسی کے سوال پر فرمایا)...... وحی لے کر تو اکثر و بیشتر انبیاء علیہم السلام پر جبریل علیہ السلام ہی آئے ہیں، اور قرآنِ کریم سارے کا سارا جبریل علیہ السلام کی وساطت سے ہی اُترا ہے، لیکن روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ دیگر پیغامات کے لئے اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کو بھی بھیجتا رہتا ہے، اور جبریل علیہ السلام کے ساتھ محافظِ وحی بنا کر بھی بہت سارے فرشتوں کو بھیجا جاتا ہے، جس طرح سے سورۂ جنّ کی آخری آیت کے اندر اس کا ذکر آئے گا۔ تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے بھی رسول چنتا ہے اور انسانوں سے بھی۔ تو ان کی حیثیت ایک رسول ہونے کی ہے، جس کو اللہ تعالیٰ چاہے جدھر پیغمبر بنا کر بھیج دے، تو ''رسول'' کا لفظ فرشتے پر بھی بولا جاتا ہے، ''نبی'' کا لفظ فرشتے پر نہیں بولا جاتا۔ اس لیے جہاں آپ کے سامنے ''رسول'' اور ''نبی'' میں نسبت ذکر کی گئی تھی، تو وہاں ایک عموم خصوص من وجہ کی نسبت بھی بیان کی گئی تھی، کہ فرشتہ ''رسول'' ہے، ''نبی'' نہیں، اور بعض انسان ''نبی'' ہیں، ''رسول'' نہیں، اور بعض انسان ''رسول'' بھی ہیں اور ''نبی'' بھی ہیں۔ تو تین مادّے نکل آئیں گے، دو افتراقی اور ایک اجتماعی، جس طرح سے عموم خصوص من وجہ میں ہوتا ہے۔

سورة المؤمنون

آیاتھا ۱۱۸ ۲۳ سُوْرَۃُ الْمُؤْمِنُوْنَ مَکِّیَّۃٌ ۷۴ رکوعاتھا ۶
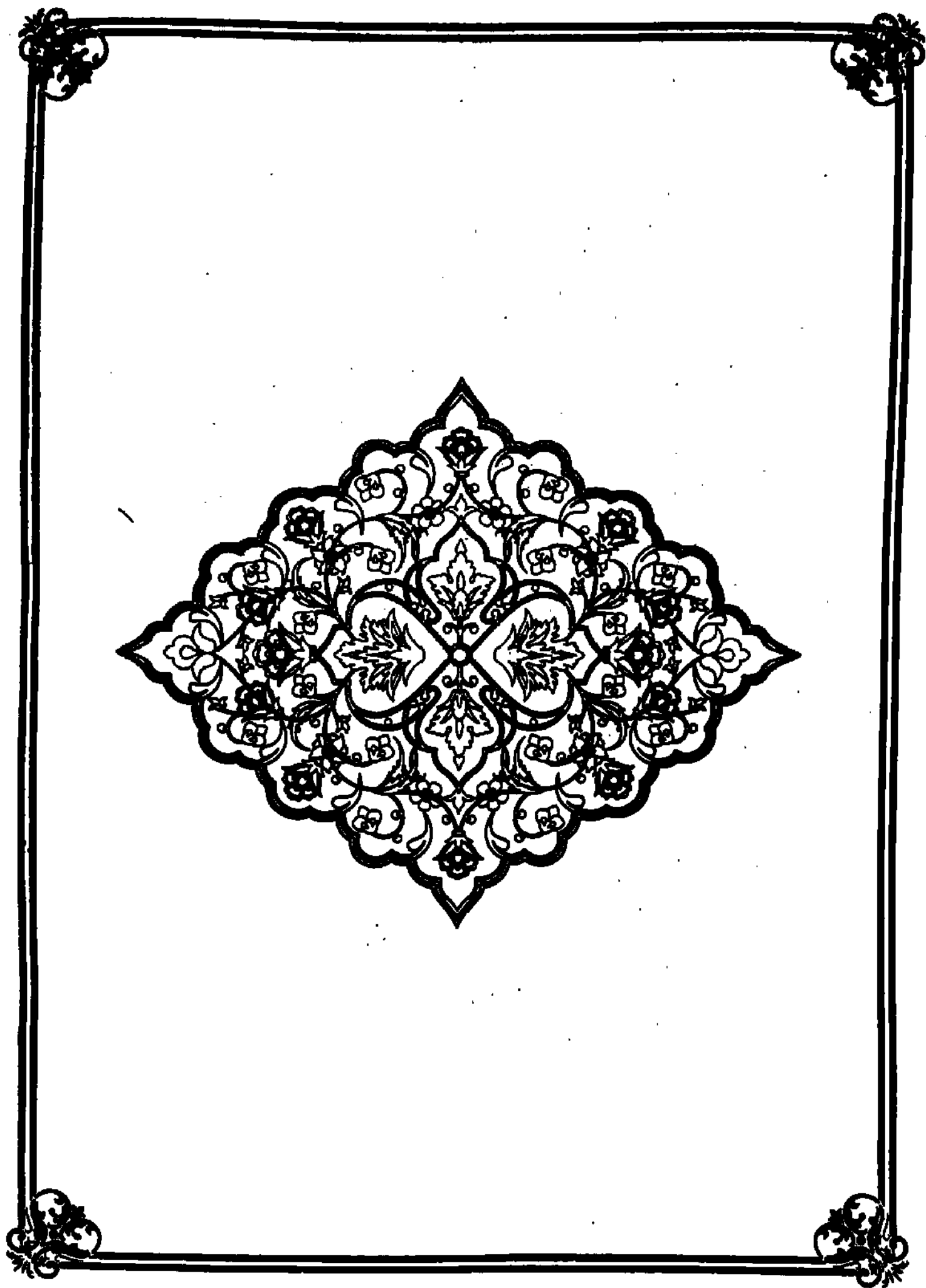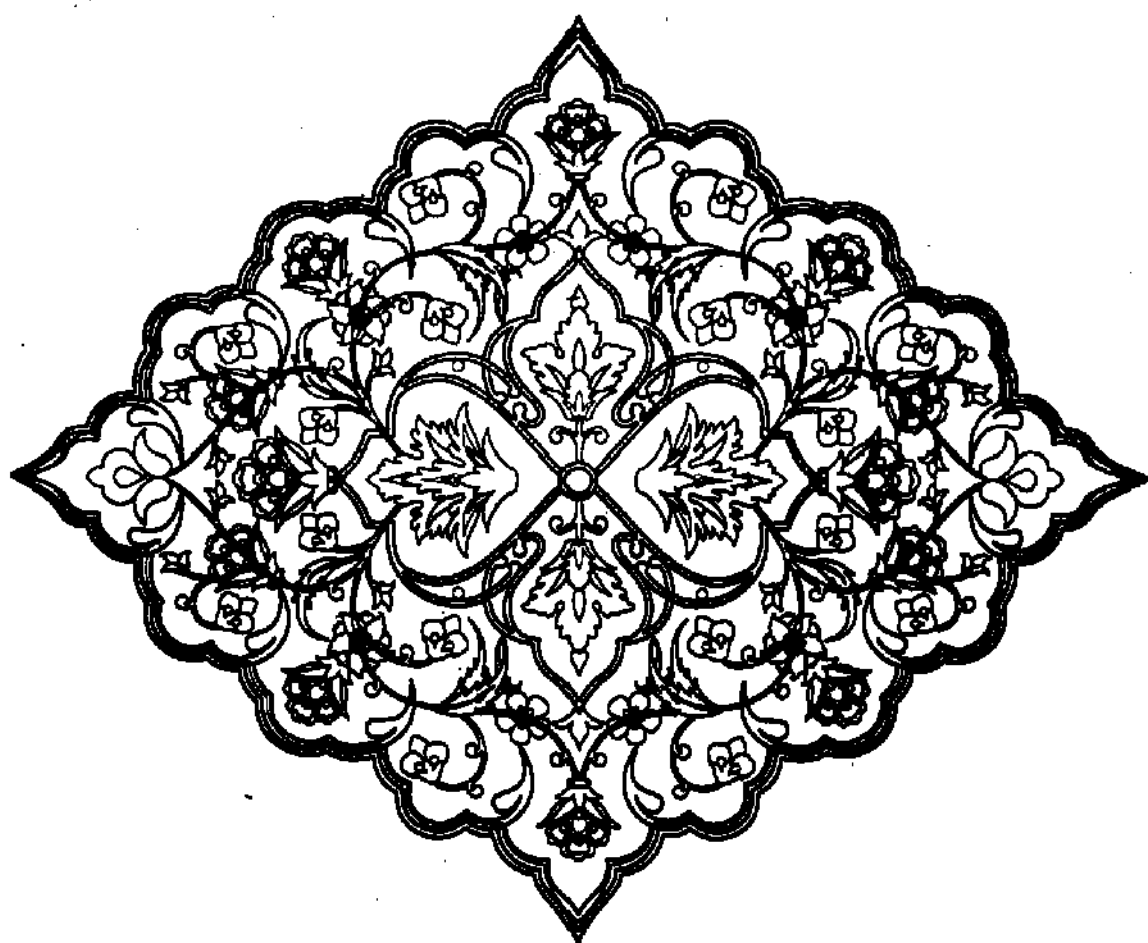
سورۂ مؤمنون مکہ میں نازل ہوئی، اس میں ایک سو اٹھارہ (۱۱۸) آیتیں اور چھ رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝ وَ الَّذِیْنَ هُمْ عَنِ

پکی بات ہے کامیاب ہو گئے وہ لوگ جو ایمان لانے والے ہیں ① جو اپنی نمازوں میں خشوع اختیار کرنے والے ہیں ② اور وہ لوگ

اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ

جو کہ لغو سے اِعراض کرنے والے ہیں ③ وہ لوگ جو زکوۃ کے لئے فعل کرنے والے ہیں ④ اور وہ لوگ جو کہ اپنی شرمگاہوں کی

حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰۤى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ ۝

حفاظت کرنے والے ہیں ⑤ مگر اپنی بیویوں پر یا اپنی باندیوں پر، بے شک یہ لوگ ملامت کیے ہوئے نہیں ہیں ⑥

فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ

جو کوئی شخص طلب کرے اس کے علاوہ کو پس یہی لوگ حد سے تجاوز کرنے والے ہیں ⑦ اور وہ لوگ جو کہ اپنی امانتوں اور اپنے عہد کی

رٰعُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ ۝ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۝

رعایت رکھنے والے ہیں ⑧ اور وہ لوگ جو کہ اپنی نمازوں پر محافظت کرتے ہیں ⑨ یہی لوگ وارث بننے والے ہیں ⑩

الَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ؕ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ

جو کہ فردوس کے وارث بنیں گے، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے ⑪ اور پیدا کیا ہم نے انسان کو مٹی کے

مِّنْ طِیْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِیْ قَرَارٍ مَّكِیْنٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً

خلاصے سے ⑫ پھر ہم نے اس انسان کو نطفہ بنایا ایک مضبوط محفوظ ٹھہرنے کی جگہ میں ⑬ پھر ہم نے نطفے کو جما ہوا خون بنا دیا

فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۗ ثُمَّ

پھر ہم نے بنا دیا جمے ہوئے خون کو گوشت کا لوتھڑا، پھر ہم نے اس گوشت کے لوتھڑے کی ہڈیاں بنا دیا، پھر ہم نے ہڈیوں پر گوشت چڑھا دیا پھر

اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ ؕ﴿۱۴﴾ ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ

ہم نے اس کو ایک اور ہی مخلوق بنا کر کھڑا کر دیا، اللہ تعالیٰ تمام بنانے والوں سے بہترین بنانے والا ہے ﴿۱۴﴾ پھر بے شک تم اس کے بعد

لَمَیِّتُوْنَ ؕ﴿۱۵﴾ ثُمَّ اِنَّكُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ﴿۱۶﴾ وَ لَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآىِٕقَ ۖۗ

البتہ مرنے والے ہو ﴿۱۵﴾ پھر بے شک تم قیامت کے دِن اُٹھائے جاؤ گے ﴿۱۶﴾ اور ہم نے تمہارے اُوپر سات راستے بنائے

وَ مَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِیْنَ ﴿۱۷﴾ وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِی الْاَرْضِ ۖۗ

اور ہم مخلوق سے بے خبر نہیں ہیں ﴿۱۷﴾ اور ہم نے آسمان سے پانی اُتارا اندازے کے ساتھ پھر ہم نے اس پانی کو زمین میں ٹھہرایا،

وَ اِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۭ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ۚ﴿۱۸﴾ فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ بِهٖ جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِیْلٍ وَّ اَعْنَابٍ ۘ

اور بے شک ہم اس کے لے جانے پر البتہ قادر ہیں ﴿۱۸﴾ پھر ہم نے پیدا کیے تمہارے لئے اسی پانی کے ذریعے سے کھجوروں اور انگوروں کے باغات،

لَكُمْ فِیْهَا فَوَاكِهُ كَثِیْرَةٌ وَّ مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۙ﴿۱۹﴾ وَ شَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَیْنَآءَ

تمہارے لئے ان میں بہت میوے ہیں اور اس سے تم غذا کے طور پر بھی کھاتے ہیں ﴿۱۹﴾ اور اُگایا ہم نے ایک درخت جو طورِ سیناء سے نکلتا ہے،

تَنْۢبُتُ بِالدُّهْنِ وَ صِبْغٍ لِّلْاٰكِلِیْنَ ﴿۲۰﴾ وَ اِنَّ لَكُمْ فِی الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ؕ

اُگتا ہے وہ درخت تیل لے کر اور کھانے والوں کے لئے سالن لے کر ﴿۲۰﴾ اور بے شک تمہارے لیے چوپایوں میں بھی البتہ غور کرنے کا مقام ہے

نُسْقِیْكُمْ مِّمَّا فِیْ بُطُوْنِهَا وَ لَكُمْ فِیْهَا مَنَافِعُ كَثِیْرَةٌ وَّ

جو کچھ ان کے پیٹوں میں ہے اس میں سے ہم تمہیں پلاتے ہیں اور ان چوپایوں میں تمہارے لئے اور بھی بہت نفع ہیں اور

مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَ عَلَیْهَا وَ عَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ﴿۲۲﴾

ان میں سے بعض کو تم کھاتے بھی ہو ﴿۲۱﴾ اور ان چوپایوں اور کشتیوں پر تم اُٹھائے جاتے ہو ﴿۲۲﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ: قَدْ تاکید کے لئے ہے۔ اَلْمُؤْمِنُوْنَ صفت کا صیغہ ہے، اور اس کے شروع میں الف لام اَلَّذِیْنَ کے معنی میں ہے۔ پکی بات ہے ٹھوس بات ہے کہ کامیاب ہو گئے وہ لوگ جو ایمان لانے والے ہیں، اَلَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ: جو لوگ اپنی نمازوں میں خشوع اختیار کرنے والے ہیں، خشوع کا لفظ دوسری جگہ بھی ہے خَشَعَتِ

الْاَصْوَاتُ (سورۂ طٰہٰ:۱۰۸) آوازیں دب گئیں، تو خشع اصل میں جھکنے اور دبنے کو کہتے ہیں۔ اور خشوع قرآنِ کریم میں وجوہ کی صفت بھی آئی ہے، اصوات کی صفت بھی آئی ہے، زمین کی صفت بھی آئی ہے، اس کا مطلب ہوتا ہے جھک جانا، دب جانا۔ اور نماز میں خشوع اختیار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے قلوب میں خشوع ہے، اللہ کے سامنے جھکے ہوئے ہیں، دبے ہوئے ہیں، اور جب دل میں خشوع ہوتا ہے تو ظاہری بدن پر بھی اس کے اثرات طاری ہوتے ہیں، کہ کوئی ایسی حرکت نہ کی جائے جس سے یہ سمجھا جائے کہ یہ شخص نماز کی طرف متوجہ نہیں ہے، اللہ کے سامنے باادب کھڑا ہوا نہیں ہے، جس حرکت سے ایسی بات سمجھی جائے وہ حرکت نماز میں خشوع کے خلاف ہے، جیسے نماز میں بیٹھا ہوا آدمی اپنے کپڑوں کے ساتھ کھیلتا رہے، یا داڑھی کے ساتھ کھیلتا رہے، یا اِدھر اُدھر جھانکے، اس قسم کی حرکتیں اس بات کی علامت ہوتی ہیں کہ اس کا دل اللہ کے سامنے جھکا ہوا نہیں ہے، اگر اللہ کی طرف پوری توجہ ہو، نماز کی طرف دھیان ہو تو پھر ظاہری بدن پر بھی خشوع کے آثار طاری ہوا کرتے ہیں، تو اصل خشوع ہوتا ہے قلب میں، اور اس کے آثار ظاہر ہوا کرتے ہیں بدن پر، سکون واطمینان، باادب طریقے سے کھڑے ہونا، نظر جھکی ہوئی ہو، اور بدن کے اوپر بھی انکسار طاری ہو، یہ خشوع کی ظاہری علامات ہیں، ورنہ اصل کے اعتبار سے خشوع قلب کی صفت ہے...... وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ: اور وہ لوگ جو کہ لغو سے اعراض کرنے والے ہیں۔ ''لغو'' کا معنی ہے بے ہودہ بے فائدہ چیز، خواہ قول ہو خواہ فعل ہو، ایسی بات جس میں دین ودنیا کا کوئی فائدہ نہیں، ایسا فعل جس میں دین ودنیا کا کوئی فائدہ نہیں، اس کو ''لغو'' کہتے ہیں، اور اس ''لغو'' کا اعلیٰ فرد ''معصیت'' ہے، گناہ کی بات کی جائے، گناہ کا کام کیا جائے، تو وہ مفید ہونے کی بجائے مضر ہے، اس لیے وہ ''لغو'' کا اعلیٰ فرد ہے، اور ادنیٰ فرد اس کا یہی ہے کہ بے فائدہ بے کار بات، فضول کام۔ ''لغو'' سے اعراض کرنے والے ہیں یعنی کسی بے ہودہ کام اور بے ہودہ بات میں وہ دلچسپی نہیں لیتے، نہ تو وہ خود کرتے ہیں اور نہ کوئی دوسرا کر رہا ہو تو اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، بلکہ منہ موڑ کر چل دیتے ہیں، وہ جو بات کریں گے جو کام کریں گے تو وہی کریں گے جس میں دین کا یا دنیا کا فائدہ ہو...... وَالَّذِیْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ: اور وہ لوگ جو کہ زکوٰۃ کے لئے فعل کرنے والے ہیں۔ لفظی معنی یہی ہے زکوٰۃ کا کام کرنے والے ہیں۔ زکوٰۃ سے مراد یہاں ''بیان القرآن'' میں تزکیۃ النفس لیا گیا ہے یعنی اپنی عادات کو اپنی خصلتوں کو پاک صاف کرنے والے ہیں۔ تزکیہ نفس: اپنی طبیعت کو ستھرا کرنا، تو یہاں فعل زکوٰۃ سے فعل تزکیہ مراد ہے اس کی وجہ یہ ذکر کی ہے کہ وہ زکوٰۃ جو نماز کی طرح فرض ہے، اس کی پوری تفصیلات مدینہ منورہ میں جا کے مرتب ہوئی ہیں، مکہ معظمہ میں زکوٰۃ فرض تو ہوگئی تھی لیکن اس کا یہ نظم قائم نہیں کیا گیا تھا، کتنے میں سے کتنی ادا کی جائے؟ کس کو دی جائے؟ وغیرہ، اس قسم کی چیزیں جتنی تھیں سب مدینہ منورہ میں ہوئی ہیں، تو زکوٰۃ سے اگر وہی فرض زکوٰۃ مراد لی جائے تو پھر فٰعِلُوْنَ سے مؤدون مراد ہیں زکوٰۃ کو ادا کرنے والے، اور اور زکوٰۃ سے اگر تزکیۂ نفس مراد لے لیا جائے تو پھر معنی یہ ہوگا کہ فعل زکوٰۃ کرنے والے ہیں یعنی اپنے نفس کا تزکیہ کرنے والے ہیں، اپنی عادتوں کو سدھارنے والے ہیں، اپنے آپ کو پاک صاف کرنے والے ہیں، دونوں طرح سے ہی تفاسیر میں اس کا مطلب واضح کیا گیا ہے (مظہری)...... وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ: اور وہ لوگ جو کہ اپنی شرم گاہوں کی نگہداشت کرنے والے ہیں، حفاظت کرنے والے ہیں، فروج فرج کی جمع ہے، اس سے شرم گاہ مراد ہے، تو حفاظت کرنے والے ہیں اِلَّا عَلٰۤی اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ: ازواج زوج کی جمع ہے بمعنی بیوی،

اور مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ یعنی وہ چیزیں جن کے مالک ہیں ان کے داہنے ہاتھ، اس سے باندیاں مراد ہیں۔ مگر اپنی بیویوں پر یا اپنی باندیوں پر۔ یعنی اپنی فرج کے وہ محافظ ہیں لیکن ان سے محافظ نہیں ہیں، یہاں وہ اپنی شہوت کو پورا کر لیتے ہیں۔ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ: ملوم اسم مفعول کا صیغہ ہے۔ بے شک یہ لوگ ملامت کیے ہوئے نہیں ہیں یعنی اگر اپنی بیویوں سے وہ قضائے شہوت کرتے ہیں یا باندیوں سے قضائے شہوت کرتے ہیں تو پھر ان پر کوئی الزام نہیں کوئی ملامت نہیں۔ اور اِلَّا عَلٰۤى اَزْوَاجِهِمْ میں علیٰ یہ من کے معنیٰ میں ہو، مگر اپنی بیویوں سے یا اپنی باندیوں سے یعنی ان دو کو چھوڑ کر باقی ہر جگہ سے اپنی فرج کی حفاظت کرتے ہیں، کسی جگہ اپنی فرج کو استعمال نہیں کرتے...... فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ: جو کوئی شخص طلب کرے اس کے علاوہ کو، یعنی بیوی اور باندی کے علاوہ کسی چیز کو طلب کرے قضائے شہوت کے لیے فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ: پس یہی لوگ حد سے تجاوز کرنے والے ہیں۔ وَرَآءَ ذٰلِكَ یعنی بیویوں اور باندیوں کے علاوہ جو چیز بھی ہو، جس میں غیر منکوحہ یا غیر مملوکہ کے ساتھ وطی کرنا جس کو ''زنا'' کہتے ہیں وہ بھی آ گیا، اور ''لواطت'' بھی اس میں داخل ہو گئی، حیوانات کے ساتھ قضائے شہوۃ بھی اس میں آ گئی، حتیٰ کہ مفسرین نے یہاں صراحت کی ہے کہ ''استمناء بالید'' بھی اس میں داخل ہو جائے گا، تو یہ ساری صورتیں حد سے تجاوز ہیں اور حرام ہیں...... وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ: رٰعُوْنَ اسم فاعل کا صیغہ ہے، رَعٰى يَرْعٰى: رعایت رکھنا۔ اور وہ لوگ جو کہ اپنی امانتوں اور اپنے عہد کی رعایت رکھنے والے ہیں۔ امانات امانت کی جمع ہے، امانت ہر اس حق کو کہا جاتا ہے جو کسی انسان کے ذمے لگا ہوا ہو، اور اس کا ادا کرنا ضروری ہو، امانت صرف مالی نہیں ہوا کرتی، کہ آپ نے ایک مال دوسرے کے سپرد کر دیا کہ میں بوقت ضرورت لے لوں گا، یہ مالی امانت ہے، صرف اسی کو امانت نہیں کہتے بلکہ تمام حقوق اس میں داخل ہوتے ہیں جو آپ کے ذمے لگے ہوئے ہیں اور ان کا ادا کرنا آپ پر ضروری ہے، اس لیے ملازم آدمی جو تنخواہ لیتا ہے، جس کام کی تنخواہ لیتا ہے اگر وہ کام نہیں کرے گا تو ایسی صورت میں یہ بھی خیانت سمجھی جائے گی، اور اسی طرح جو حق بھی ہے، حقوق اللہ اور حقوق العباد سارے اس میں آ جاتے ہیں، جیسے مزدور لوگ یا ملازم لوگ اپنے کام میں چوری کرتے ہیں تو ایسی صورت میں یہ خیانت ہے۔ اور اپنے عہد کی رعایت رکھتے ہیں، عہد وہ ہوتا ہے جو دو طرف سے ایک دوسرے کے ساتھ کر لیتے ہیں کہ تو یہ کر، میں یہ کروں گا، اس کو عہد کہا جاتا ہے، تو اس کی بھی رعایت رکھتے ہیں یعنی اس کو وفاء کرتے ہیں، عہد کے خلاف نہیں کرتے۔ عہد کے خلاف کرنے کو غدر کہا جاتا ہے۔ تو غداری نہیں کرتے، جو معاہدہ کسی کے ساتھ کر لیتے ہیں اس پر پورا اُترتے ہیں...... وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ: اور وہ لوگ جو کہ اپنی نمازوں پر محافظت کرتے ہیں، ان کی نگہداشت کرتے ہیں، یہاں نگہداشت کرنے کا معنی یہ ہے کہ پابندی سے پڑھتے ہیں، جیسے دوسری جگہ آیا ہے اَلَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ (سورۂ معارج) کہ اپنی نمازوں پر دوام اختیار کرتے ہیں، اور اسی طرح اوقات کی پابندی اور ان کے آداب اور شرائط کی پابندی، ان سب پابندیوں کی رعایت رکھتے ہوئے جو نماز پڑھی جاتی ہے وہ محافظت علی الصلوٰۃ ہے، اگر نماز تو پڑھی لیکن وضو ٹھیک طریقے سے نہیں کیا، یا اوقات کی رعایت نہیں رکھی، کسی کو مؤخر کر دیا، کسی کو مقدم کر دیا، لاپروائی کے ساتھ پڑھی، تو چاہے اس پر نماز پڑھنا صادق آ جائے لیکن یہ محافظت نہیں ہے، نگہداشت کا مطلب یہ ہے کہ اس کے پورے حقوق کی رعایت رکھی جائے، ادب آداب اور شرائط کی رعایت رکھتے ہوئے پابندی کے ساتھ وقت پر ادا کی جائے...... اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ: یہی لوگ

وارث بننے والے ہیں، اَلَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ: جو کہ فردوس کے وارث بنیں گے، فردوس جنت کا اعلیٰ حصہ ہے، جنت کے مختلف طبقات ہیں، اور سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ فردوس ان میں سے سب سے اوپر والا حصہ ہے، جہاں سے جنت کی نہریں پھوٹتی ہیں اور فردوس کے اوپر اللہ کا عرش ہے، سب سے اعلیٰ درجہ یہ ہے۔ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ: اس میں وہ ہمیشہ رہنے والے ہوں گے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ: طین کہتے ہیں گیلی مٹی کو، کیچڑ کو، اور سُلالہ کہتے ہیں خلاصے کو۔ سَلَّ يَسُلُّ کا اصل معنی ہوتا ہے ایک چیز میں سے کسی دوسری چیز کو کھسکانا، جیسے سَلَّ السَّيْفَ: تلوار کو نیام سے نکال لیا، تو اسی طرح چھانٹی ہوئی چیز کو بھی سُلالہ کہہ دیا جاتا ہے، تو آیت کا مطلب ہوگا کہ مٹی کے خاص خاص اجزا چھانٹ کر اس سے ہم نے انسان کو بنایا، پیدا کیا ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصے سے، ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً: پھر ہم نے اس انسان کو نطفہ بنایا فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ: قَرَار بمعقر کے معنی میں ہے ٹھہرنے کی جگہ، اور مکین کا معنی مضبوط۔ ایک مضبوط محفوظ ٹھہرنے کی جگہ میں، اس سے رحم مادر مراد ہے، یعنی نطفے کی شکل میں اس انسان کو رحم مادر میں ٹھہرایا۔ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً: خلق یہاں جعل کے معنی میں ہے۔ پھر ہم نے نطفے کو جما ہوا خون بنا دیا، فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً: پھر ہم نے جمے ہوئے خون کو گوشت کی شکل دے دی۔ مُضْغَةً: مَضَغَ اصل میں چبانے کو کہتے ہیں، مَضَغَ يَمْضَغُ: چبانا، اور مُضغہ فُعلہ کے وزن پر ہے، اور یہ آپ کی خدمت میں کئی دفعہ عرض کیا جا چکا ہے کہ فُعلہ کا وزن مقدار بیان کرنے کے لیے ہوتا ہے، جیسے فَعلہ مرۃ کے بیان کرنے کے لئے ہے جَلسةً ایک مرتبہ بیٹھنا، جلستین دو دفعہ بیٹھنا، اور فِعلہ حالت بیان کرنے کے لیے ہوتا ہے جِلسۃ القاری پڑھنے والے کی طرح بیٹھنا، اور فُعلہ مقدار بیان کرنے کے لیے ہوتا ہے، جیسے لُقمہ ایک دفعہ نگلنے کی مقدار، اور ایسے نُطفہ ایک دفعہ ٹپکائی ہوئی مقدار، اور مُضغہ کا معنی ہو گیا اتنی سی مقدار جس کو ایک دفعہ چبایا جا سکے، اس لیے اس کا ترجمہ کیا گیا ہے گوشت کی بوٹی، اتنی سی جس کو ایک دفعہ چبایا جا سکے، یعنی علقہ کو اتنی سی بوٹی بنا دیا، تو گوشت کا لوتھڑا مُضغہ کا حاصل معنی ہے، ورنہ لفظی معنی ہے اتنی مقدار جس کو ایک دفعہ چبایا جا سکے۔ پھر ہم نے بنا دیا اس علقہ کو گوشت کی بوٹی، گوشت کا لوتھڑا۔ فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا: پھر ہم نے اس گوشت کے لوتھڑے کی ہڈیاں بنا دیں، فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا: پھر ہم نے ہڈیوں پر گوشت چڑھا دیا، كَسَا يَكْسُوْ: پہنانا، پھر ہم نے ہڈیوں کو گوشت پہنایا۔ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ: پھر ہم نے اس کو ایک اور ہی مخلوق بنا کے کھڑا کر دیا یعنی پہلے وہ جماد تھا، اس میں کوئی حرکت نہیں تھی، رُوح ڈالنے کے بعد وہ ایک اور ہی مخلوق بن گئی، پھر اٹھایا ہم نے اس کو اس حال میں کہ وہ ایک اور ہی مخلوق ہے۔ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ: خالقین یہاں جمع کا صیغہ آ گیا، یہ لفظ خلق سے ہی لیا گیا ہے، خلق کا ایک معنی تو ہے پیدا کرنا یعنی معدوم چیز کو وجود میں لانا، یہ تو اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے، اس لیے خالق وہی ہے، لا خالق الا اللہ، اور خلق کا لفظ کبھی کبھی جعل کے معنی بھی آ جاتا ہے یعنی بنانا، جس طرح سے اوپر بھی خلقنا کا ترجمہ ہم نے صَيَّرْنَا کے ساتھ کیا تھا، یہ صنعت کے معنی میں ہوتا ہے کہ مختلف چیزوں کو، مواد کو اکٹھا کر کے کوئی نئی چیز بنا دی، اس کو بھی خَلق کہہ دیا جاتا ہے، جب اس کا یہ معنی ہو تو پھر یہ اللہ تعالیٰ کی خصوصی صفت نہیں، پھر اس کی نسبت غیر اللہ کی طرف بھی ہوتی ہے، قرآن کریم میں ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات میں تذکرہ آیا تھا اَنِّيْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ (سورۂ آل عمران: ۴۹) تو وہاں خلق کی نسبت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی طرف کی ہے، تو وہاں یہی معنی ہے کہ میں تمہارے لیے بناتا ہوں مٹی سے پرندے کی شکل پھر اس میں

پھونک مارتا ہوں تو وہ اللہ کے اذن کے ساتھ پرندہ بن جاتا ہے، اسی طرح ایک اور جگہ ہے تَخْلُقُوْنَ اِفْكًا (سورۂ عنکبوت:۱۷) تم جھوٹ گھڑتے ہو، وہاں بھی خلق کی نسبت عام لوگوں کی طرف کی گئی، اسی اعتبار سے یہاں خالقین جمع کا صیغہ آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام بنانے والوں سے بہترین بنانے والا ہے، یعنی لوگ مختلف چیزیں بناتے ہیں لیکن اللہ کی طرح کوئی نہیں بنا سکتا کہ کوئی اس طرح سے مٹی کا خلاصہ لے کے اس کو انسان بنا لے، ایسا نہیں ہو سکتا، اللہ تعالیٰ احسن الخالقین ہے، تمام بنانے والوں سے بہترین بنانے والا ہے۔ تو اس معنی کے اعتبار سے یہ صفت اللہ کا خاصہ نہیں، بلکہ اس کا اطلاق دوسروں پر بھی ہوتا ہے، اسی مفہوم کے اعتبار سے ہی لوگ کُفر سے بچتے ہیں جو کہتے ہیں کہ قائد اعظم خالقِ پاکستان ہے، آپ نے اخباروں میں دیکھا ہو گا کہ اکثر و بیشتر قائد اعظم کا جب ذِکر کرتے ہیں تو اس کو ''خالقِ پاکستان'' کہتے ہیں، تو اگر خلق کا دوسرا معنی مراد نہ لیا جائے تو کہنے والے سارے مشرک ہو جائیں گے جو پاکستان کا خالق قائد اعظم کو قرار دیتے ہیں تو گویا کہ پاکستان قائد اعظم کی مخلوق ہوئی، تو وہاں اس دوسرے معنی کے ساتھ تاویل کی جا سکتی ہے، تو پھر یہ کلمہ کُفر سے نکل جاتا ہے، لیکن یہ لفظ استعمال کرنا بہتر نہیں کیونکہ اس میں اشتباہ ہے۔ ''مصورِ پاکستان'' کہا کرتے ہیں حکیم الاُمت ڈاکٹر اقبال کو، اور ''خالقِ پاکستان'' کہا کرتے ہیں قائد اعظم کو، بہرحال یہ لفظ مشرکانہ ہے، اگرچہ ہم اس کو صریحاً شرک نہیں کہیں گے کیونکہ دوسرے معنی کا احتمال ہے، اس لیے یہ لفظ استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ ہاں! آپ ''بانی'' کہہ سکتے ہیں، جیسے کہا جاتا ہے کہ اس مدرسے کا بانی فلاں ہے، اس کی بنیاد فلاں نے رکھی۔ تو چونکہ یہ ملک بھی اسی کی قیادت میں معرضِ وجود میں آیا ہے تو اس لیے آپ ''بانی'' کہہ سکتے ہیں، ''بانی'' کہنے میں کوئی حرج نہیں۔ تو احسن الخالقین کا معنی یہ ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ تمام بنانے والوں سے بہترین بنانے والا ہے۔ ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ۞ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ: پھر بے شک تم اس کے بعد البتہ مرنے والے ہو، پھر بے شک تم قیامت کے دِن اٹھائے جاؤ گے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ: طرائق طریقہ کی جمع ہے طریقہ راستے کو کہتے ہیں۔ ہم نے تمہارے اوپر سات راستے بنائے لفظی معنی یوں بنتا ہے، اور عام طور پر مفسرین نے طرائق سے طبقات مراد لیے ہیں، جیسے دوسری جگہ قرآن کریم میں اس کے ساتھ طباقًا کا لفظ آیا ہے طبقۃً طبقۃً کے مفہوم میں (سورۂ ملک:۳، سورۂ نوح:۱۵)، تو یہ جو سات آسمان ہیں یہ سات طبقے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے اوپر بنائے ہیں، اور اگر طرائق سے راستے مراد لیے جائیں تو پھر بھی اس سے مراد آسمان ہی ہیں لیکن ان کو طرائق اس لیے کہا گیا کہ وہ فرشتوں کی گزرگاہیں ہیں، ہم نے تمہارے اوپر سات گزرگاہیں بنائیں۔ اور بعض مفسرین نے سبع طرائق سے سبعہ سیارہ کی گزرگاہیں مراد لی ہیں، یہ سات سیارے بڑے بڑے جو گھومتے رہتے ہیں تو ان کی گزرگاہیں وہ بھی مراد ہو سکتی ہیں (مظہری، آلوسی)۔ وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ: اور ہم مخلوق سے بے خبر نہیں ہیں، ہمیں ہر کسی کی خبر ہے۔ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ: اور ہم نے آسمان سے پانی اتارا اندازے کے ساتھ، فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ پھر ہم نے اس پانی کو زمین میں ٹھہرایا، وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۢ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ اور بے شک ہم اس کے لے جانے پر البتہ قادر ہیں یعنی نہ برسائیں، اور جو برس چکا ہے اسے بھی ناپید کر دیں، کیونکہ پانی یہ بخارات بن کر اڑ جائے تو اس کا نام و نشان نہیں رہتا۔ یہ بہت بڑا انعام ہے اللہ تعالیٰ کا، ایک تو پانی اندازے کے ساتھ اتارتا ہے یعنی وقفے وقفے کے ساتھ، اور پھر اُتارنے کی کیسی بہترین صورت ہے کہ قطرہ قطرہ کر کے زمین تک پہنچایا، ورنہ

پانچ منٹ میں جتنی بارش ہو جاتی ہے یہ لاکھوں من پانی جو آسمان سے برستا ہے، اگر اس کو اکٹھا ہی نہر کی آبشار اور دھار کی طرح کہیں زمین پر برسا دیا جائے تو جہاں گرے گا وہاں تو نیچے تک گڑھا ہو جائے گا، آبادیوں کا نام ونشان مٹ جائے، تو قطرہ قطرہ کر کے کس طرح سے اس کو زمین پر پہنچایا جاتا ہے۔ پھر اگر آپ سے کہہ دیا جاتا کہ دیکھو! ہم نے پانی اتار دیا، اور اب چھ مہینے کے بعد پانی اُترے گا، اپنے اندازے کا پانی جتنا تمہیں چاہیے جمع کر لو، بعد میں پانی نہیں ملے گا، تو اب چھ مہینے کے لئے اپنی ضرورت کا پانی کون اکٹھا کر کے رکھے؟ اور اگر تالابوں کی شکل میں بھر کر رکھو تو سڑ جاتا ہے، اس میں کیڑے پڑ جاتے ہیں، اور وہ بھی کتنا رکھ لیں گے، لیکن یہ اللہ تعالیٰ کی کتنی بڑی مہربانی ہے کہ وقفے وقفے سے اتارتا رہتا ہے، اور اپنی ضرورت آپ فوری پوری کر لیتے ہیں، تھوڑا بہت تالابوں میں جمع ہو جاتا ہے، باقی سب کو اللہ زمین میں ٹھہرا دیتا ہے، تاکہ جس وقت آپ چاہیں تازہ بہ تازہ صاف ستھرا ٹیوب ویلوں کے ساتھ، نلکوں کے ساتھ، کنووں کی شکل میں آپ اس کو نکالتے رہیں۔ اور ایک اور ٹھہرانے کی بہت بہترین صورت ہے جو آپ کے سامنے نہیں، وہ یہ ہے کہ کروڑ ہا من پانی اللہ تعالیٰ آسمان سے اتارتا ہے، اور اس کو برف کی شکل میں جما کر پہاڑوں کی چوٹیوں پر رکھ دیتا ہے، وہ برف کی شکل میں ذخیرہ محفوظ ہو گیا، اب نہ اس میں گرد وغبار جائے نہ اس میں کیڑے پڑیں نہ کوئی اور چیز ہو، پھر بقدرِ ضرورت وہ پگھلتی رہتی ہے، اور دریاؤں کی شکل میں، نہروں کی شکل میں، چشموں کی شکل میں وہی پانی نکلتا ہے اور ساری دنیا میں تقسیم ہو رہا ہے، اور پھر وہیں سے سرایت کر کے زمین کے نیچے سے پانی کی لہریں جاری ہیں اس لیے آپ کہیں سے کھودتے ہیں تو پانی کیسا نکل آتا ہے، اور کہیں سے کھودتے ہیں تو پانی کیسا نکل آتا ہے۔ یہ نظام آب پاشی جو اللہ نے قائم کیا ہے اور انسانوں کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے پانی کا جو نظم قائم کیا ہے اسی پر ہی اگر انسان غور کرے تو اللہ تعالیٰ کے اس احسان کا شکریہ نہیں ادا کیا جا سکتا، ورنہ اگر یہ پانی زمین میں نہ ٹھہرتا، آسمان سے برستا، آپ استعمال کر لیتے، بعد میں دُھوپ کے ساتھ یہ اُڑ جایا کرتا، تو آپ پانی کہاں سے نکالتے؟ تو یہ بہت بڑا احسان ہے اللہ تعالیٰ کا کہ اس نے زمین میں پانی کے ذخیرے ٹھہرا دیے جن سے انسان بوقتِ ضرورت اِستفادہ کرتا رہتا ہے۔ اور اگر ہم چاہتے تو اس کو لے جاتے، ہم اس کے لے جانے پر بھی قادر ہیں، اگر اُتارنے پر قادر ہیں تو لے جانے پر بھی قادر ہیں، پہاڑوں سے برف بھی خشک ہو سکتی ہے، دریا بھی خشک ہو سکتے ہیں، زمین کے نیچے والا پانی بھی خشک ہو سکتا ہے، یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ بِهٖ جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ: پھر ہم نے پیدا کیے تمہارے لیے اسی پانی کے ذریعے سے کھجوروں اور انگوروں کے باغات، لَكُمْ فِيْهَا فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ: تمہارے لیے ان میں بہت میوے ہیں، فَوَاكِهُ فاکہہ کی جمع ہے، فاکہہ کہتے ہیں جو تفکّہ اور تلذذ کے طور پر کھایا جائے۔ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ: اور اس سے تم غذا کے طور پر بھی کھاتے ہو، جیسے کھجوریں خشک کر کے رکھ لیے جاتے ہیں، انگور خشک کر کے رکھ لیے جاتے ہیں، تو دوسرے موقع پر بطورِ غذا کے بھی کھائے جاتے ہیں، تو تلذذ کے لیے بھی کھائے جاتے اور غذا کے طور پر بھی کھائے جاتے ہیں، خاص طور پر عرب کی تو معیشت زیادہ تر انہی چیزوں سے تھی، انگوروں اور کھجوروں پر ہی وہ لوگ گزارہ کرتے تھے۔ وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَآءَ: اور اُگایا ہم نے ایک درخت جو کہ طورِ سیناء سے نکلتا ہے، اس سے وہی حضرت موسیٰ علیہ السلام والا پہاڑ مراد ہے جس کو طورِ سینین بھی کہتے ہیں، درخت طورِ سیناء سے نکلتا ہے یعنی وہاں کثرت سے پیدا ہوتا ہے، عرب کی سرزمین میں (مکہ مدینہ اور ان کے اردگرد) زیتون کے درخت نہیں ہیں، اور

اس درخت سے زیتون کا درخت مراد ہے، یہ فلسطین میں زیادہ ہوتا تھا، جس طرف یہ طور سیناء ہے ادھر یہ کثرت سے ہے، تَنْۢبُتُ بِالدُّهْنِ: اُگتا ہے وہ درخت تیل لے کر، دُھن تیل کو کہتے ہیں، زیتون کا تیل مراد ہے۔ اُگتا ہے وہ تیل کے ساتھ، وَصِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ: صِبغ کہتے ہیں سالن کو جو روٹی کے ساتھ لگایا جاتا ہے، صَبَغَ اصل میں رنگنے کو کہتے ہیں، تو صِبغ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس میں روٹی ڈبوئی جائے اور اس کا رنگ بدل جائے، جیسے شوربا وغیرہ آپ بناتے ہیں، تو اس علاقے میں تیل کے ساتھ بھی روٹی کھانے کا رواج ہے، اس میں لقمہ ڈبو کے کھاتے ہیں تو اس اعتبار سے اس کو صِبغ کہا، لہٰذا یہاں عام طور پر مترجمین نے صِبغ کا ترجمہ سالن کے ساتھ کیا ہے۔ اور کھانے والوں کے لیے سالن لے کر اُگتا ہے، ذہن میں باقی ضروریات کی طرف اشارہ ہوگیا، جلانا، مالش کرنا وغیرہ۔ وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً: اور بے شک تمہارے لیے البتہ چوپایوں میں بھی غور کرنے کا مقام ہے، عبرت اور نصیحت کا معنی ہوتا ہے غور کرنے کا مقام، یعنی یہ سوچو کہ چوپایوں میں اللہ تعالیٰ کا کتنا انعام اور کتنا احسان نظر آتا ہے، نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهَا: جو چیزیں ان کے پیٹوں میں ہیں اس میں سے ہم تمہیں پلاتے ہیں۔ کیا چیز پلاتے ہیں؟ اس کا ذکر دوسری جگہ ہے لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ (سورہ نحل:۶۶) یعنی خالص دودھ جو پینے والوں کو بڑا لذیذ لگتا ہے۔ وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ كَثِيْرَةٌ: اور ان اَنعام میں چوپایوں میں تمہارے لیے اور بھی بہت نفع ہیں، چمڑے سے فائدہ اٹھاتے ہو، بالوں سے فائدہ اٹھاتے ہو، ہڈیوں سے فائدہ اٹھاتے ہو، آنتوں سے فائدہ اٹھاتے ہو، کوئی جز ایسا نہیں جو انسان کے کام نہیں آتا، وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ اور ان میں سے بعض کو تم کھاتے بھی ہو۔ وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ: اور ان چوپایوں اور کشتیوں پر تم اٹھائے جاتے ہو، یعنی خشکی میں سواری کے لیے جانور کام آتے ہیں اور سمندر میں کشتیاں کام آتی ہیں، تو جدھر دیکھو، اللہ تعالیٰ کے احسانات کی بارش ہے، اور اتنی کثرت کے ساتھ احسانات ہیں کہ جن کا شکر انسان ادا نہیں کر سکتا۔

تفسیر

ماقبل سے ربط

سورۂ حج کی آخری آیات میں خصوصیت کے ساتھ عبادت کی ترغیب دی گئی تھی، اور نیکی کرنے کی ترغیب دی گئی تھی، جیسے آیا تھا: وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ، اور نماز کی تاکید تھی اور زکوٰۃ ادا کرنے کی تاکید تھی، جس کو علی الاجمال آپ یوں کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کی ترغیب دی گئی تھی، اب اس سورت کی ابتدائی آیات بھی عبادت کی ترغیب کے لیے ہی ہیں۔

کامیابی کیا ہے؟

مفہوم سب کا واضح ہے، کچھ تفصیل آپ کی خدمت میں عرض کر دی گئی، پہلا لفظ جو آیا ہے اَفْلَحَ، اس کا معنی ہے فلاح پانا۔ ''فلاح'' کہتے ہیں ''کامیابی'' کو، ''کامیابی'' فارسی کا لفظ ہے، ''کام'' کہتے ہیں مقصد کو، اور ''یاب'' یافتن سے ہے، ''یافتن'' کا معنی پالینا، کام یاب: وہ شخص جو اپنے مقصد کو پالے۔ فلاں شخص کامیاب ہوگیا یعنی اس نے اپنے مقصد کو پالیا۔ وہ مقصد کیا چیز ہے؟ یہاں جو ذکر کیا گیا کہ جن میں یہ صفتیں پائی جائیں گی وہ لوگ کامیاب ہیں، وہ اپنے مقصد کو پہنچ گئے، اور مقصد کو پہنچنے کا

آ گے عنوان اختیار کیا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ، یہی لوگ وارث ہیں جو فردوس کے وارث بنیں گے، ان کو فردوس ملے گی، گویا کہ فردوس کا مل جانا یہ مقصد کو پالینا ہے، اس مقصد کو وہ لوگ پائیں گے جن کے اندر یہ ساری کی ساری صفات پائی جائیں گی، اور فردوس ہے جنّت کا اعلیٰ حصہ، توان صفات کی وجہ سے جنّت کا اعلیٰ حصہ ملے گا، اور اگر ان صفات میں سے کسی صفت کے اندر کوئی نقص اور کمی آ گئی تو اعلیٰ حصے سے انسان محروم ہو جائے گا، درجات کے طور پر یہ بات نکل آئے گی، جتنا ان صفات کے اندر کمال حاصل اتنا ہی کمال کی جنّت ملے گی۔

انسانیت کے مجموعی مقاصد

البتہ یہ بات اب قابلِ غور رہ گئی کہ جنّت کے پالینے کو مقصد کا پالینا کس طرح سے قرار دیا؟ اس کو مختصر انداز میں یوں سمجھ لیجئے کہ انسان کا مقصد کیا ہے؟ ایک تو ہمارے مقاصد ہیں چھوٹے چھوٹے شخصی، ذاتی، مثلاً آپ کو وہ مقصود ہیں مجھے مقصود نہیں، ایک چیز میں چاہتا ہوں آپ نہیں چاہتے، اس لیے مجموعی طور پر انسان کا مقصد اس کو نہیں قرار دیا جاسکتا کہ جس میں انسان آپس میں اختلاف کرتے ہیں، ایک شخص کہتا ہے کہ میرا مقصود تو اولاد ہے لیکن دوسرا کہے گا کہ اولاد بھی کوئی چاہنے کی چیز ہے؟ ایک کہے گا کہ میں تو چاہتا ہوں مجھے بہت بڑی جائیداد مل جائے زمین مل جائے تو دوسرا کہے گا کہ زمین بھی کوئی چاہنے کی چیز ہے؟ ایک آدمی کارخانے کی شوق رکھتا ہے اسے بہت چاہت ہے کہ مجھے کوئی کارخانہ مل جائے، لیکن ایک آدمی ایسا ہوگا جو اس زندگی سے ویسے ہی نفرت کرتا ہے، تو کوئی ایسی چیز جس میں سارے انسان اپنی خواہش کے طور پر متفق ہوں وہ انسان کا اصل مقصود کہہ سکتے ہیں، باقی! یہ شخصی چیزیں ہیں، ایک کو مطلوب ہیں، دوسرے کو مطلوب نہیں، ان کو انسانیت کا مجموعی طور پر مقصود قرار نہیں دیا جاسکتا۔

مجموعی طور پر مقصود کیا ہے؟ آپ جانتے ہیں کہ ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ میں صحت مند رہوں بیمار نہ ہوں، کیا اس میں بھی کسی انسان کو اختلاف ہے؟ کہیں کا رہنے والا ہو، مشرق کا ہو، مغرب کا ہو، شمال کا ہو، جنوب کا ہو، مسلمان ہو، کافر ہو، چھوٹا ہو، بڑا ہو، جس کے بھیجے میں عقل ہو، اس کے ہوش وحواس ٹھیک ہوں، اس میں یہ خواہش یقیناً ہے کہ میں تندرست رہوں بیمار نہ ہوں، لیکن یہ مقصد اس دنیا کے اندر رہتے ہوئے کسی انسان کو حاصل ہے؟ (نہیں)...... موت سے ہر انسان ڈرتا ہے، ہر انسان میں زندگی کی خواہش ہے، موت سے بچنے کے لئے ہر انسان ہزار ہا تدبیر کرتا ہے، کہ میں نہ مروں، اس میں کسی کا اختلاف ہے؟ (نہیں)، بات وہی ہے کہ بھیجے میں عقل ہو، ورنہ اگر دماغ خراب ہو جائے اور اسی طرح پریشانی کے ہجوم میں قوتِ فکر یہ جواب دے دے تو لوگ خودکشی بھی کر لیتے ہیں جہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید ان کو موت مطلوب ہے، لیکن ایسا نہیں، وہ عوارض ہیں، ورنہ اصل کے اعتبار سے انسان اپنی جان بچانے کے لیے ہزار جتن کرتا ہے، لیکن اس مقصد میں کوئی کامیاب ہے؟ موت سے کوئی بچ جاتا ہے؟ (نہیں)

...... جوان ہونے کے بعد بڑھاپے سے ہر کوئی ڈرتا ہے، ہر کوئی یہ چاہتا ہے کہ میں جوان رہوں بوڑھا نہ ہوں، جب انسان بڑھاپے کا تصور کرتا ہے تو سمجھتا ہے کہ یہ تو بہت بڑی مصیبت آنے والی ہے۔ تو کیا کسی انسان کو یہ مقصد حاصل ہے؟ اور اس مقصد میں کسی کا اختلاف ہے؟ کوئی جوان ایسا ہوگا جو فطری طور پر بڑھاپے کو پسند کرتا ہو؟ (نہیں) ہر کوئی چاہتا ہے کہ جوانی کی قوتیں بحال

رہیں...... اسی طرح سے اپنی مرضی کے مطابق کہ جو چاہے ہو جائے، ہر انسان اپنی خواہش کو کامل مکمل طریقے سے پورا کرنے پر قادر ہو، یہ بھی انسانیت کا مجموعی طور پر ایک مقصد ہے، لیکن انسان کو یہاں دنیا میں حاصل نہیں...... اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا تو کر دیا، اور اس کی فطرت کے اندر کچھ خواہشات بھی ڈال دیں، لیکن ان خواہشات کو پورا کرنے کی اس دنیا کے اندر کوئی صورت نہیں ہے، تو پھر انسان سے زیادہ ناکام زندگی، انسان سے زیادہ پریشان، مخلوق میں سے کوئی ہو سکتا ہے؟ یعنی جو اپنے مقصد کے پانے میں کلیتاً ناکام ہے، اپنے مقصد کے پانے کے لیے وہ کلیتاً پریشان بھی ہے اور ناکام بھی ہے، ایسی چیز مخلوق میں دوسری کوئی آپ کو کوئی نظر نہیں آئے گی، تو کیا پھر یہ بھٹکنے کے لئے پریشان ہونے کے لئے ہر وقت حیران رہنے کے لئے اللہ نے اس کو بنایا ہے؟ اشرف المخلوقات کا انجام یہی ہے کہ ہر طرف بھٹکتا ہوا پریشان اور لڑھکتا پھرے، اور کبھی بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو؟ ایسا نہیں۔

تصورِ آخرت کے بغیر اِنسان ناکام ہے

یہ مقصد میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ اس انسان کی فطرت کی بے چینی کا علاج سوائے تصورِ آخرت کے کوئی نہیں، یہ ماننا پڑتا ہے کہ مرنے کے بعد ایک اور زندگی بھی آئے گی جس میں جا کر انسان اس مقصد کو حاصل کر سکتا ہے، تب جا کر آپ کہیں گے کہ واقعی انسان کا اچھا انجام سامنے آنے والا ہے، اگر آخرت کا تصور نہ ہو تو دنیا کے اندر کسی انسان کی زندگی با مقصد نہیں، سب بے مقصد ہے، ایسے ہی پریشان ہوتے ہوئے انسان اپنا وقت گزار دے، یعنی اگر آخرت کا تصور نہ کیا جائے تو انسان کا حاصل جو ہے وہ یوں کہہ لیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک پاخانہ بنانے والی مشین بنائی ہے، جس کا کام یہی ہے کہ ادھر سے ڈالتے جاؤ، اُدھر سے نکالتے جاؤ، باقی کچھ نہیں ہے، یہی حاصل ہوا نا؟ کہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا پاکیزہ رزق کھاؤ اور اس کا پیشاب پاخانہ بنا کے ڈالتے چلے جاؤ۔ ایسا نہیں

اِنسان کے مجموعی مقاصد جنّت میں ہی پورے ہوں گے

انسان بہت کامیاب مخلوق ہے، اور وہ اسی طرح سے ہے کہ آخرت اللہ تعالیٰ نے بنائی، جس کے متعلق آپ کو ہدایات دے دیں، اب صحیح معنی میں اگر آپ کامیاب ہونا چاہتے ہیں، تو اس فردوس کو حاصل کرنے کی کوشش کرو، کیونکہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جنت میں جس وقت جنتی چلے جائیں گے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعلان ہوگا کہ آج کے بعد سن لو: ''اِنَّ لَكُمْ اَنْ تَصِحُّوْا فَلَا تَسْقَمُوْا اَبَدًا'' تم ہمیشہ تندرست رہو گے کبھی بیمار نہ ہو گے، ''وَاِنَّ لَكُمْ اَنْ تَحْيَوْا فَلَا تَمُوْتُوْا اَبَدًا'' ہمیشہ زندہ رہو گے کبھی تمہیں موت نہیں آئے گی، ''وَاِنَّ لَكُمْ اَنْ تَشِبُّوْا فَلَا تَهْرَمُوْا اَبَدًا'': ہمیشہ جوان رہو گے کبھی بوڑھے نہیں ہو گے،(۱) یہ اعلان جنت میں جانے کے بعد کر دیے جائیں گے، موت سے تحفظ ہو جائے گا، بڑھاپے سے تحفظ ہو جائے گا، بیماری سے تحفظ ہو جائے گا۔ اور پھر جنّت میں ہر خواہش پوری ہوگی،(۲) اس لیے انسان کا مقصد جنّت کو حاصل کرنے سے پورا ہوتا ہے، اگر کوئی شخص جنت کو حاصل نہیں

---

(۱) مسلم ۲/ ۳۸۰ باب فی دوام نعیم اھل الجنة۔ مشکوۃ ج ۲ ص ۴۹۶ باب صفة الجنة

(۲) وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ (فصلت: ۳۱)، وَهُمْ فِيْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ خٰلِدُوْنَ (انبیا: ۱۰۲)، وَفِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ (زخرف: ۷۱) وغیرہ۔

کرسکا تو یوں سمجھو کہ وہ اپنے مقصد میں ناکام ہے، اس جنت کو حاصل کرنے کا یہ طریقہ جو بتایا گیا، یہی کامیابی کا طریقہ ہے، اب وجہ سمجھ میں آ گئی؟ کہ اس کو کامیابی کیوں قرار دیا گیا، وہ اس لیے کہ اس کے بغیر کوئی شخص بھی اپنے مقاصد کو حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتا، ساری کی ساری دنیا ناکام ہے اس بات میں کہ انسان کی فطرت کی جو آواز ہے، انسان کے دل میں جو اللہ نے خواہش پیوست کی ہے کہ اس طرح سے ہو جائے، وہ خواہش یہاں پوری ہونے کی نہیں، ساری زندگی کے تجربے اس بات پر شاہد ہیں کہ انسان کے مقاصد دنیا میں حاصل نہیں ہوتے، یعنی جو فطری مقاصد ہیں، ان کو اگر حاصل کرنا ہے تو اس کا راستہ یہ ہے جو آپ کے سامنے ذکر کر دیا۔

جنّت میں لے جانے والے اعمال

سب سے پہلی اور بنیادی بات تو یہ ہے کہ ایمان لاؤ، اور ایمان لانے کے بعد پھر ان اعمال کو اختیار کرو، جن میں سے پہلے بھی نماز کا ذکر آیا، اور آخر میں پھر نماز کا ذکر آیا، معلوم ہو گیا کہ اس فلاح اور کامیابی کے حاصل کرنے میں نماز کی حیثیت بہت زیادہ ہے، اس میں نماز بہت زیادہ اثر انداز ہے، خشوع وخضوع کے ساتھ پڑھیے، پابندی کے ساتھ پڑھیے، اس کے آداب شرائط کی رعایت رکھتے ہوئے پڑھیے، اور بے کار اور بے ہودہ کاموں سے بچیے، اور فعلِ زکوۃ بھی کرتے رہیے، اپنے نفس کا بھی تزکیہ کر لیجیے، اور مال کو بھی پاک صاف کرنے کی کوشش کیجیے، اس میں سے بھی متعین زکوۃ ادا کرو۔

''فرج'' ایک بہت بڑا فتنہ ہے!

اور پھر آگے یہ اہم بات ذکر کر دی گئی کہ شہوت پرستی سے انسان کو بچنا چاہیے، ''فرج'' کا گناہ نہ کرنے پائے۔ یہ ''فرج'' ایک بہت بڑا فتنہ ہے، اس میں اللہ تعالیٰ نے جس قسم کی صلاحتیں رکھی ہیں ان میں بڑی حکمت ہے، نسل آخر اسی سے چلتی ہے، اگر یہ خواہش نہ ہوتی تو نسل کیسے چلتی؟ تو اللہ تعالیٰ نے یہ رکھی تو بہت حکمت کے تحت ہے، لیکن اگر اس میں بے راہ روی اختیار کر لی جائے تو پھر یہ دنیا میں فساد ہی فساد ہے۔ تو جائز مواقع اس کے بتا دیے گئے کہ بیویوں اور باندیوں پر آپ اس ''فرج'' کو استعمال کر سکتے ہیں، قضائے شہوت کر لیں تو تم پر کوئی الزام نہیں، ''الزام نہیں'' سے یہ بات نکل آئی کہ اس کو بھی انسان زندگی کا مقصد نہ بنالے کہ ہر وقت یہی مزے لوٹتا رہے، بلکہ یہ بھی ضرورت کے تحت ہے، جب ضرورت کے تحت یہ کام کرو گے تو کوئی ملامت نہیں ہے، کوئی الزام نہیں ہے، لیکن اگر اس کے علاوہ کسی اور جگہ اس خواہش کو پورا کرنے کی کوشش کرو گے تو پھر حد سے تجاوز کرنے والے ہو گے، تو قضائے شہوت کی جتنی بھی ناجائز صورتیں ہیں سب اس میں داخل ہو گئیں۔

''فرج'' اور ''زبان'' کی حفاظت پر جنّت کی ضمانت

تو فرج کی حفاظت بھی جنت کے حاصل کرنے کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ

سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ زبان اور فرج ان دو چیزوں کی حفاظت کی کوئی شخص ذمہ داری لے لے کہ زبان سے کسی گناہ میں مبتلا نہیں ہوگا جیسے جھوٹ بولنا غیبت کرنا، اور کسی پر الزام لگانا، غلط بیانی کرنا، کتنے گناہ ہیں جو انسان زبان سے کرتا ہے۔ اور ایک فرج، ان دونوں کی حفاظت کی ذمہ داری کوئی شخص لے لے تو اس کے لیے جنت کا میں ضامن ہوں۔[1] اکثر و بیشتر انسانی زندگی میں فساد انہی دو چیزوں سے آتا ہے۔

ادائے امانت کی اہمیت

اور آگے آ گئی معاملات کی اصلاح کہ امانت کی حفاظت کریں، آپ کے ذِمّے جو حق لگا ہوا ہے اس کو پورا پورا اَدا کریں، دوسرے کے حقوق کی رعایت رکھیں، عہد معاہدے کی رعایت رکھیں، اب یہ امانت بھی دنیوی نظام کو برقرار رکھنے کے لئے بہت ضروری ہے، اس لیے حدیث شریف میں آتا ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ سے پوچھا گیا کہ قیامت کب آئے گی؟ تو آپ نے فرمایا: جب امانتیں ضائع ہوجائیں گی تو قیامت آجائے گی۔ پوچھا گیا کہ امانت کے ضائع ہونے کا کیا مطلب؟ فرمایا: جب کام نااہلوں کے سپرد ہونے لگ جائیں تو سمجھ لینا کہ قیامت آنے والی ہے۔[2] کیونکہ جب کام نااہلوں کے ذِمّے لگیں گے، وہ اس امانت کو کیسے ادا کریں گے؟ جب وہ ادا نہیں کریں گے تو فساد ہی فساد ہوگا۔ آج آپ اپنے ملک میں دیکھ لیجئے، سفارشوں سے عہدے ملتے ہیں، رشوتوں سے عہدے ملتے ہیں، قابلیت اور اہلیت نہیں دیکھی جاتی، تو تمام کے تمام شعبے جتنے بھی ہیں ان میں جو کچھ چاند چڑھ رہے ہیں وہ آپ کے سامنے ہیں، یہ ساری کی ساری بربادی اس لیے آرہی ہے کہ کام نااہلوں کے ہاتھ چڑھ جاتے ہیں، اہلیت کی بنا پر یہاں عہدے نہیں ملتے، کام سپرد نہیں کیے جاتے، بس! جس کے تعلقات ہیں جس کی سفارش ہے جو رشوت دے دے وہی کوئی نہ کوئی عہدہ حاصل کرلیتا ہے، کسی نہ کسی شعبے کا انچارج بن جاتا ہے، قابلیت ہوتی نہیں، جس کی وجہ سے پھر آگے بربادی ہی بربادی ہوتی ہے۔ اسی طرح سے آپس میں عہد معاہدے کی رعایت رکھنا یہ بھی ضروری ہے۔ آگے جا کر پھر نماز کی تاکید آ گئی۔

اِحسانات خداوندی اور دلائلِ قدرت

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ الخ: آخرت کا ذکر جو آیا تھا تو اس کی مناسبت سے آگے مبدأ کو ذِکر کردیا گیا، آپ کو اپنی ابتدا کی طرف متوجہ کردیا گیا۔ یہ جو چیزیں اب آگے ذکر کی جارہی ہیں ان میں احسانات بھی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کے دلائل بھی ہیں، کہ جب پیدا کرنے والا وہی ہے اور تمہاری ضرورتیں پوری کرنے والا وہی ہے تو پھر عبادت بھی اسی کی کرنی چاہیے، اس اعتبار سے یہ آیات عبادت کی تاکید کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں، ان کی تفسیر بار بار آپ کے سامنے ذکر کردی گئی، کوئی خاص بات ان میں نہیں ہے...... پہلے انسان کی خلقت کو ذکر کیا، اور پھر اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ میں مرنے کا ذکر آ گیا، یہ بھی آنکھوں کے سامنے ہے، اور اصل

---

(۱) مَنْ يَضْمَنْ لِي مَا بَيْنَ لَحْيَيْهِ وَمَا بَيْنَ رِجْلَيْهِ أَضْمَنْ لَهُ الْجَنَّةَ (مشکوٰۃ ج ۲ ص ۴۱۱ باب حفظ اللسان۔ بخاری ج ۲ ص ۹۵۸ باب حفظ اللسان)

(۲) بخاری ج ۱ ص ۱۴ باب من سئل علما. مشکوٰۃ ج ۲ ص ۴۶۹، باب اشراط الساعۃ

زور اس بات پر دینا مقصود ہے کہ پھر مرنے کے بعد تم ایک دن اٹھائے بھی جاؤ گے، تو یہ بعثت کا ذکر آ گیا...... یہ تو اپنے نفس کی طرف متوجہ کیا کہ اس میں بھی دیکھو! کتنے اللہ تعالیٰ کے احسان اور کتنے قدرت کے دلائل ہیں،......اور آگے عالم بالا کی طرف متوجہ کر دیا کہ تمہارے اوپر ہم نے کس طرح یہ سات طبقے بنائے ہیں، اور ہم مخلوق سے ہر طرح باخبر ہیں، بے خبر نہیں پھر زمین اور آسمان کے مابین کی بات آ گئی کہ بارش کس طرح سے اندازے کے ساتھ اترتی ہے، کس طرح سے یہ پانی اترتا ہے، اللہ تعالیٰ اس پانی کو زمین میں کس طرح ٹھہراتے ہیں...... آگے پھر قدرت کا اظہار ہے کہ اگر ہم چاہیں تو اس کو لے جا بھی سکتے ہیں، جیسے سورۂ واقعہ میں آئے گا: اَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِىْ تَشْرَبُوْنَ ۞ ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ۞ لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا کہ اس پانی کو بادلوں سے تم اتارتے ہو یا ہم اتارتے ہیں، اگر ہم چاہتے تو اسے کڑوا کر دیتے۔ کڑوا کر دیا جائے اور استعمال کے قابل نہ رہے تو یہ بھی ایسے ہے کہ گویا آپ کے حق میں پانی ختم ہو گیا، ویسے خشک کرنا چاہیں تو خشک بھی کر سکتے ہیں، جیسے سورۂ ملک کی آخری آیت میں آئے گا: قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ کہ اگر تمہارا پانی زمین کی گہرائی کی طرف چلا جائے تو پھر تم جاری پانی کہاں سے لے آؤ گے۔ تو یہ اللہ کا احسان ہے کہ اس نے پانی کو اس طرح سے باقی رکھا ہوا ہے کہ انسان اس کے نکالنے پر قادر ہے...... پھر آگے نباتات کا احسان آ گیا کہ اسی پانی کے ذریعے سے ہم باغات اگاتے ہیں کھجوروں کے اور انگوروں کے، دو کا ذکر اس لیے کر دیا کہ عرب میں زیادہ تر یہی چیزیں استعمال میں آتی ہیں، مدینہ منورہ میں بھی اور مدینہ سے باہر جو باغات ہیں ان میں کھجور اور انگور بہت زیادہ ہیں، اور ان کو انسان تر د تازہ بطور تلذذ کے بھی کھاتا ہے اور بطور غذا کے بھی استعمال کرتا ہے......اور خصوصیت کے ساتھ زیتون کا ذکر کر دیا، چونکہ اس میں بھی فوائدِ کثیرہ ہیں، وہ لوگ اسی کا تیل استعمال کرتے تھے، اسی کو بطور سالن کے بھی کھاتے تھے، مالش کرتے تھے، جلاتے تھے، اسی طرح کتنے فوائد ہیں جو ہم تیل سے حاصل کرتے ہیں، تو اس لیے یہاں زیتون کا ذکر آ گیا، سورۂ تین میں بھی اس کا ذکر ہے وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ، اور طور سیناء کے علاقے میں چونکہ کثرت سے پیدا ہوتا ہے اس لیے اس کا ذکر کر دیا...... آگے حیوانات کا احسان آ گیا کہ ان میں بھی غور کرو، تمہیں کس طرح سے اللہ کے احسانات اور قدرت نظر آئے گی کہ ان کے پیٹوں سے جو کہ خون اور گوبر کا مجموعہ ہے اسی میں سے ہم دودھ نکالتے ہیں اور تمہیں پلاتے ہیں، کتنا لذیذ اور خوشگوار، اور کتنا صحت کے لیے مفید ہے، اور انہی حیوانات کے پیٹ سے نکال کے ہم نے پلایا، اور اس کے علاوہ بھی ان میں تمہارے لیے بہت نفع ہیں، ان کے چمڑے استعمال کرتے ہو، ان کے بال اون وغیرہ استعمال کرتے ہو، ان کی ہڈیوں سے فائدہ اٹھاتے ہو، ان کی آنتوں سے فائدہ اٹھاتے ہو، اور ان میں سے بعض کو کھاتے بھی ہو۔ اور پھر سواری کا کام بھی انہی سے لیا جاتا ہے ان پر خشکی میں، اور کشتیوں پر سمندر میں، دریاؤں میں تم اٹھائے جاتے ہو، سواری کے لیے یہ چیزیں اللہ نے تمہیں دے دیں...... اب چونکہ کشتی کا ذکر آ گیا تو اسی مناسبت سے آگے حضرت نوح علیہ السلام کا واقعہ آ رہا ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ

اور البتہ تحقیق ہم نے نوح علیہ السلام کو ان کی قوم کی طرف بھیجا، پھر نوح نے کہا: اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، نہیں ہے تمہارے لیے کوئی معبود

غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۲۳﴾ فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ

اس کے علاوہ، کیا پھر تم ڈرتے نہیں ہو؟ ﴿۲۳﴾ کہا سرداروں نے جنہوں نے کفر کیا تھا نوح علیہ السلام کی قوم میں سے کہ نہیں ہے یہ مگر انسان

مِّثْلُكُمْ ۙ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً ۖۚ مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا

تم جیسا، ارادہ کرتا ہے تم سے بڑا بننے کا، اگر اللہ چاہتا تو اُتار دیتا فرشتے، نہیں سنی ہم نے یہ بات

فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۴﴾ ۚ اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ فَتَرَبَّصُوْا بِهٖ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۲۵﴾

اپنے پہلے آباء میں ﴿۲۴﴾ نہیں ہے یہ مگر ایک آدمی جس کو جنون ہوگیا ہے، پس اس کے متعلق تم انتظار کرو ایک وقت تک ﴿۲۵﴾

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ﴿۲۶﴾ فَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا

نوح علیہ السلام نے کہا اے میرے رَبّ! میری مدد کر ان کے مجھ کو جھٹلانے کی وجہ سے ﴿۲۶﴾ پھر ہم نے حکم بھیجا نوح کی طرف کہ بنا تو کشتی ہماری آنکھوں کے سامنے

وَوَحْيِنَا فَاِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ فَاسْلُكْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ

اور ہمارے حکم کے مطابق، پھر جس وقت ہمارا حکم آ جائے اور تنور جوش مارے پس داخل کر لینا تو اس کشتی میں ہر قسم کے حیوانات سے نر اور مادہ یعنی دو دو

وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ ۚ وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ

اور اپنے گھر والوں کو سوائے ان کے جن پر بات سبقت لے گئی ان میں سے، اور مجھے خطاب نہ کرنا ان لوگوں کے بارے میں جنہوں نے ظلم کیا

اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ﴿۲۷﴾ فَاِذَا اسْتَوَيْتَ اَنْتَ وَمَنْ مَّعَكَ عَلَى الْفُلْكِ فَقُلِ الْحَمْدُ

یہ سب ڈبوئے جائیں گے ﴿۲۷﴾ جس وقت تُو اور تیرے ساتھی دُرست ہو جائیں کشتی پر تو پھر یہ دُعا کرنا کہ اللہ کا

لِلّٰهِ الَّذِيْ نَجّٰىنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۸﴾ وَقُلْ رَّبِّ اَنْزِلْنِيْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا

شکر ہے جس نے ہمیں نجات دی ظالم لوگوں سے ﴿۲۸﴾ اور یہ بھی دُعا کرنا اے میرے پروردگار! اُتار مجھ کو اُتارنا برکت والا

وَّاَنْتَ خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ﴿۲۹﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ وَّاِنْ كُنَّا لَمُبْتَلِيْنَ ﴿۳۰﴾ ثُمَّ اَنْشَاْنَا

اور آپ بہت اچھا اُتارنے والے ہیں ﴿۲۹﴾ بے شک اس میں البتہ نشانیاں ہیں اور بے شک ہم البتہ آزمانے والے ہیں ﴿۳۰﴾ پھر ہم نے اُٹھایا

مِنۢ بَعۡدِهِمۡ قَرۡنًا اٰخَرِيۡنَ ﴿۳۱﴾ فَاَرۡسَلۡنَا فِيۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ

قوم نوح کے بعد ایک اور جماعت کو ﴿۳۱﴾ پھر ہم نے ان میں بھی رسول بھیجا انہی میں سے ہی، کہ عبادت کرو تم اللہ کی،

مَا لَكُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَيۡرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوۡنَ ﴿۳۲﴾

تمہارے لیے اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، کیا پھر تم ڈرتے نہیں ہو؟ ﴿۳۲﴾

وَقَالَ الۡمَلَاُ مِنۡ قَوۡمِهِ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَكَذَّبُوۡا بِلِقَآءِ الۡاٰخِرَةِ وَاَتۡرَفۡنٰهُمۡ

اور کہا سرداروں نے ان کی قوم میں سے جنہوں نے کفر کیا تھا اور آخرت کی ملاقات کی تکذیب کی تھی اور ہم نے ان کو خوش حالی دی تھی

فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ۙ مَا هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُكُمۡ ۙ يَاۡكُلُ مِمَّا تَاۡكُلُوۡنَ مِنۡهُ وَيَشۡرَبُ

دُنیوی زندگی میں کہ نہیں ہے یہ مگر انسان تم جیسا، کھاتا ہے انہی چیزوں میں سے جن سے تم کھاتے ہو، اور پیتا ہے

مِمَّا تَشۡرَبُوۡنَ ﴿۳۳﴾ وَلَئِنۡ اَطَعۡتُمۡ بَشَرًا مِّثۡلَكُمۡ اِنَّكُمۡ اِذًا لَّخٰسِرُوۡنَ ﴿۳۴﴾

انہی چیزوں میں سے جن سے تم پیتے ہو ﴿۳۳﴾ اگر تم نے اطاعت کی اپنے جیسے انسان کی پھر تم البتہ خسارے والے ہو جاؤ گے ﴿۳۴﴾

اَيَعِدُكُمۡ اَنَّكُمۡ اِذَا مِتُّمۡ وَكُنۡتُمۡ تُرَابًا وَّعِظَامًا اَنَّكُمۡ مُّخۡرَجُوۡنَ ﴿۳۵﴾ هَيۡهَاتَ هَيۡهَاتَ

کیا یہ تمہیں ڈراتا ہے اس بات سے کہ جب تم مر جاؤ گے اور مٹی اور ہڈیاں ہو جاؤ گے کہ پھر تم نکالے جاؤ گے؟ ﴿۳۵﴾ دُور ہے واقع ہونا

لِمَا تُوۡعَدُوۡنَ ﴿۳۶﴾ اِنۡ هِىَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنۡيَا نَمُوۡتُ وَنَحۡيَا وَمَا نَحۡنُ

اس چیز کا جس سے تم ڈرائے جاتے ہو ﴿۳۶﴾ نہیں ہے یہ مگر ہماری دُنیوی زندگی، مرتے ہیں زندہ ہوتے ہیں اور ہم نہیں اُٹھائے

بِمَبۡعُوۡثِيۡنَ ﴿۳۷﴾ اِنۡ هُوَ اِلَّا رَجُلُ ٱفۡتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا وَّمَا نَحۡنُ لَهٗ بِمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۳۸﴾

جائیں گے ﴿۳۷﴾ نہیں ہے یہ مگر ایک آدمی جس نے گھڑ لیا اللہ پر جھوٹ اور نہیں ہیں ہم اس پر ایمان لانے والے ﴿۳۸﴾

قَالَ رَبِّ انۡصُرۡنِىۡ بِمَا كَذَّبُوۡنِ ﴿۳۹﴾ قَالَ عَمَّا قَلِيۡلٍ لَّيُصۡبِحُنَّ نٰدِمِيۡنَ ﴿۴۰﴾

اس رسول نے کہا: اے میرے رَبّ! میری مدد کر ان کے مجھ کو جھٹلانے کی وجہ سے ﴿۳۹﴾ اللہ نے فرمایا: تھوڑی دیر کے بعد البتہ یہ شرمسار ہو جائیں گے ﴿۴۰﴾

فَاَخَذَتۡهُمُ الصَّيۡحَةُ بِالۡحَـقِّ فَجَعَلۡنٰهُمۡ غُثَآءً ۚ فَبُعۡدًا لِّلۡقَوۡمِ الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۴۱﴾ ثُمَّ

پس پکڑ لیا ان کو چیخ نے ٹھیک ٹھیک، پھر بنا دیا ہم نے ان کو کوڑا کرکٹ، پس ظالم لوگوں کے لئے اللہ کی رحمت سے دُوری ہے ﴿۴۱﴾ پھر

اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قُرُوْنًا اٰخَرِیْنَ ﴿۴۲﴾ مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَ مَا یَسْتَاْخِرُوْنَ ﴿۴۳﴾

ہم نے ان کے بعد اور جماعتیں پیدا کیں ﴿۴۲﴾ نہیں سبقت لے گئی کوئی اُمت اپنے وقت معین سے اور نہ وہ پیچھے ہٹی ﴿۴۳﴾

ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا ؕ كُلَّمَا جَآءَ اُمَّةً رَّسُوْلُهَا كَذَّبُوْهُ فَاَتْبَعْنَا بَعْضَهُمْ

پھر ہم نے اپنے رسولوں کو پے در پے بھیجا، جب بھی کسی جماعت کے پاس اس کا رسول آیا تو انہوں نے اس کو جھٹلایا پھر ہم نے بھی بعض کو

بَعْضًا وَّ جَعَلْنٰهُمْ اَحَادِیْثَ ۚ فَبُعْدًا لِّقَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۴۴﴾ ثُمَّ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى وَ

بعض کے پیچھے لگا دیا اور بنا دیا ہم نے ان کو قصے کہانیاں، پس دُوری ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان نہیں لاتے ﴿۴۴﴾ پھر بھیجا ہم نے موسیٰ اور

اَخَاهُ هٰرُوْنَ ۙ۬ بِاٰیٰتِنَا وَ سُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ﴿۴۵﴾ۙ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۟ئِهٖ فَاسْتَكْبَرُوْا وَ

اس کے بھائی ہارون کو اپنی نشانیوں کے ساتھ اور واضح دلیل کے ساتھ ﴿۴۵﴾ فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف پس انہوں نے تکبر کیا اور

كَانُوْا قَوْمًا عَالِیْنَ ﴿۴۶﴾ۚ فَقَالُوْۤا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَیْنِ مِثْلِنَا وَ قَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ ﴿۴۷﴾ۚ

وہ بہت سر چڑھے لوگ تھے ﴿۴۶﴾ کہنے لگے: کیا ہم ایمان لے آئیں اپنے جیسے دو انسانوں پر حالانکہ ان کی قوم ہماری غلام ہے؟ ﴿۴۷﴾

فَكَذَّبُوْهُمَا فَكَانُوْا مِنَ الْمُهْلَكِیْنَ ﴿۴۸﴾ وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ لَعَلَّهُمْ یَهْتَدُوْنَ ﴿۴۹﴾

انہوں نے ان دونوں کو جھٹلایا پس ہو گئے یہ بھی ہلاک کیے ہوؤں میں سے ﴿۴۸﴾ البتہ تحقیق ہم نے موسیٰ کو کتاب دی تا کہ یہ لوگ ہدایت پائیں ﴿۴۹﴾

وَ جَعَلْنَا ابْنَ مَرْیَمَ وَ اُمَّهٗۤ اٰیَةً وَّ اٰوَیْنٰهُمَاۤ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّ مَعِیْنٍ ﴿۵۰﴾

اور بنایا ہم نے مریم کے بیٹے کو اور اس کی ماں کو نشانی اور ہم نے ان دونوں کو ٹھکانا دیا اُونچی جگہ کی طرف جو قرار والی اور جاری پانی والی تھی ﴿۵۰﴾

تفسیر

نوح علیہ السلام کی تبلیغ اور قوم کی طرف سے تکذیب

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ: لقد تاکید کے لئے ہے۔ یہ پکی بات ہے، ''البتہ تحقیق'' یہ لفظ جو آپ بولا کرتے ہیں یہ دونوں لفظ ہی تاکید کے ہیں۔ ہم نے نوح علیہ السلام کو ان کی قوم کی طرف بھیجا، فَقَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ: پھر نوح علیہ السلام نے کہا: اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو۔ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ: نہیں ہے تمہارے لیے کوئی معبود اس کے علاوہ، اَفَلَا تَتَّقُوْنَ کیا پھر تم ڈرتے نہیں ہو؟ یعنی اللہ کے غضب سے۔ اِتِّقَاء: ڈرنے کے معنی ہے یا بچنے کے معنی میں ہے، کیا پھر تم غیر کو اللہ کا

شریک کرنے سے بچتے نہیں ہو؟ یا معنی یہ ہے کہ تم شرک کرتے ہوئے اللہ کے غضب سے ڈرتے نہیں ہو؟ جس طرح سے چاہیں اس کا مفہوم واضح کردیں۔ یہ واقعات چونکہ بار بار گزر چکے ہیں، اس لیے اب اس میں زیادہ وضاحت کی ضرورت نہیں، ترجمہ دیکھتے چلیے۔ فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ: ملأ: قوم کے سردار، اعیان، لیڈر، قائدین، جن کو بڑے لوگ کہا جاتا ہے، وقت کے چوہدری، ملأ کا مصداق ایسے لوگ ہوتے ہیں۔ کہا سرداروں نے جنہوں نے کفر کیا تھا نوح علیہ السلام کی قوم میں سے، یعنی کافر سردار، کافر لیڈر، کافر قائدین، کافر وڈیرے، انہوں نے کہا مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ یہ قال کا مقولہ ہے۔ کافر وڈیروں نے یہ بات کہی کہ نہیں ہے یہ مگر بشر تم جیسا، انسان تم جیسا، يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ: اَنْ مصدریہ ہے۔ ارادہ کرتا ہے تم سے بڑا بننے کا، یعنی یہ تم جیسا ہی انسان ہے، اور یہ جو دعویٰ کرتا ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں، اللہ میرے اوپر وحی بھیجتا ہے، یہ بڑا بننے کا ارادہ کرتا ہے، قوم کی قیادت چاہتا ہے، وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً: اگر اللہ چاہتا تو اُتار دیتا فرشتے۔ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ: نہیں سنی ہم نے یہ بات اپنے پہلے آباء میں، یعنی ہم نے اپنے آباواجداد میں یہ بات نہیں سنی کہ ''اللہ کی طرف سے کوئی رسول بھی آیا کرتا ہے، یا اللہ کے علاوہ کے کوئی دوسرا معبود نہیں، یا جس طرح سے ہم نے ان کو شرکاء شفعاء بنایا ہوا ہے یہ ٹھیک نہیں'' ہم نے اپنے آبائے اوّلین میں یہ بات نہیں سنی، اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ: نہیں ہے یہ مگر ایک آدمی جس کو جنون ہوگیا ہے، اس کا دماغ خراب ہوگیا، جس کی وجہ سے اس کو ایسے خیالات آرہے ہیں اور ساری دنیا کے خلاف، ساری برادری اور ساری قوم کے خلاف اس نے باتیں کرنی شروع کردیں، یہ تو ایک ایسا آدمی ہے جس کو جنون ہوگیا ہے، فَتَرَبَّصُوْا بِهٖ حَتّٰى حِيْنٍ: پس اس کے متعلق تم انتظار کرو ایک وقت، اسی بیماری میں مرجائے گا، ایسے ہی بولتا بولتا اپنا وقت گزار لے گا۔

نوح علیہ السلام کی دُعا

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ: نوح علیہ السلام نے کہا، اے میرے رَبّ! میری مدد کر، بِمَا كَذَّبُوْنِ: اَيْ كَذَّبُوْنِيْ۔ مَا اگر مصدریہ ہو تو معنی ہوگا ''ان کے مجھ کو جھٹلانے کی وجہ سے'' کہ چونکہ انہوں نے میری تکذیب کی ہے تو اب تو میری مدد کر، تو میرا انتقام لے۔ یہ خلاصہ ہے واقعہ کا، تفصیل کے ساتھ واقعہ پہلے آپ کے سامنے گزر چکا۔ یعنی صرف اتنی بات نہیں ہوتی کہ نوح علیہ السلام نے رسالت کا دعویٰ کیا، توحید کی دعوت دی، اور ان لوگوں نے یہ تبصرہ کیا، فوراً نوح علیہ السلام نے یہ دُعا کردی، ایسا نہیں، یہ ساڑھے نو سو سال پر پھیلی ہوئی داستان ہے، جیسے آپ کے سامنے پہلے مفصل واقعہ گزر چکا ہے، یہاں تو چونکہ ایک نقل ہے خلاصے کے طور پر، تو یکے بعد دیگرے باتیں نقل کردیں، ورنہ یہ ایک دو دِن کی بات نہیں ہے، ان کا آپس میں بہت لمبا جھگڑا رہا۔

کشتی بنانے کا حکم اور اس کے متعلق ہدایاتِ رَبانی

فَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ: پھر ہم نے حکم بھیجا نوح علیہ السلام کی طرف، وحی کی نوح علیہ السلام کی طرف، اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا: یہ اَن تفسیر یہ ہے، جو وحی کی تفسیر کررہا ہے کہ وہ کیا وحی کی؟ کہ بنا تو کشتی ہماری آنکھوں کے سامنے اور ہمارے حکم کے مطابق، بعینہٖ یہی الفاظ آپ کے سامنے سورۂ ہود میں گزرے ہیں، فَاِذَا جَآءَ اَمْرُنَا پھر جس وقت ہمارا حکم آجائے، اس اَمر سے اَمرِ عذاب مراد ہے،

وَفَارَ التَّنُّوْرُ: تنور ایک تو یہی ہوتا جس کو آپ روٹیاں پکانے کے لیے استعمال کرتے ہیں، عربی میں اسے تنور ہی کہتے ہیں، اور تنور کا معنی وجہ الأرض بھی کیا گیا ہے یعنی زمین کی سطح۔ تو تنور کے جوش مارنے سے مراد یہ ہے کہ تنور میں سے پانی نکلنا شروع ہوجائے، اُبلنا شروع ہوجائے تو کوئی تندور متعین کردیا گیا ہوگا کہ جس وقت اس میں سے پانی نکلنا شروع ہوجائے تو فوراً کشتی میں سوار ہوجانا، یہ علامت ہوگی اس بات کی کہ عذاب آنے والا ہے، یا جس وقت زمین کی سطح جوش مارے زمین سے پانی نکلنا شروع ہوجائے...... یا فَارَ التَّنُّوْرُ بطور محاورے کے ہے ''جس وقت تنور گرم ہوجائے جوش مارے'' یعنی بالکل عذاب سر پر آجائے تو اس وقت فوراً اپنے اہل وعیال کو متعلقین کو کشتی میں سوار کرلینا۔ جب لڑائی شدت کی چھڑ جایا کرتی ہے دونوں طرف سے شدید حملہ ہوجائے تو عربی میں اس کو بھی حَمِيَ الْوَطِيْسُ کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں کہ تنور گرم ہوگیا، وہاں بھی یہی مطلب ہوتا ہے، اسی طرح ہمارے ہاں کہتے ہیں، آگ بھڑک اُٹھی، اس سے شدت کے ساتھ لڑائی چھڑنے کی طرف اشارہ ہوتا ہے، یعنی لڑائی کی آگ بھڑک اُٹھی۔ تو یہاں عذاب مراد ہے۔ جس وقت تنور جوش مارے فَاسْلُكْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ: پس داخل کرلے تُو اس کشتی میں ہر قسم کے حیوانات سے زوجین نر اور مادہ یعنی دو دو۔ ہر قسم کے حیوانات میں سے دو دو چڑھالینا، ایک نر اور ایک مادہ دو حیوان ہر نوع کے چڑھالینا جس کے ساتھ آگے نسل چلے گی، جیسے گائے، بھینس، بکری، بھیڑ، اُونٹ وغیرہ جن کے ساتھ انسان کی ضروریات متعلق ہیں ان میں سے دو دو جانور ایک نر اور ایک مادہ کشتی میں ساتھ چڑھالینا، وَاَهْلَكَ: اہل سے مراد اپنے گھر والے اور متعلقین جنہوں نے آپ کا کلمہ پڑھا ہے اور آپ پر ایمان لائے ہیں، ''اہل'' اور ''آل'' کا لفظ متعلقین کے لئے بولا جاتا ہے جس میں بیویاں اولاد متبعین سارے شامل ہوتے ہیں، اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ: سوائے ان کے جن کے اوپر بات سبقت لے گئی (سارے کے سارے الفاظ اسی ترتیب کے ساتھ سورۂ ہود میں آئے تھے) یعنی جن کے متعلق غرق کرنے کا فیصلہ ہوگیا ان کو اپنے ساتھ نہ چڑھانا، اہل وعیال میں سے بھی جو کافر ہیں ان کو ساتھ نہ رکھنا، داخل کردے اس کشتی میں ہر قسم کے حیوان سے دو یعنی نر اور مادہ، یا نر اور مادہ یعنی دو جس طرح سے چاہیں کہہ لیں، زوجین سے زوجہ اور زوج، نر اور مادہ مراد ہیں اور اثنین اسی کی تاکید ہے، اور اپنے گھر والوں کو سوائے ان کے جن پر بات سبقت لے گئی ان میں سے۔ وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا: اور مجھے خطاب نہ کرنا ان لوگوں کے بارے میں جنہوں نے ظلم کیا، یعنی ظالموں کے بارے میں اب مجھ سے کوئی بات نہ کیجیو، اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ان کے متعلق فیصلہ ہوگیا ہے، یہ سب ڈبوئے جائیں گے، غرق کیے جائیں گے، اس لیے جب یہ اللہ کے عذاب کی گرفت میں آجائیں تو پھر میرے سامنے ان کے متعلق کوئی بات نہ کرنا۔

فَاِذَا اسْتَوَيْتَ اَنْتَ وَمَنْ مَّعَكَ عَلَى الْفُلْكِ: اسْتَوَيْتَ میں ''ت'' ضمیر متصل فاعل کی ہے، اور مَنْ مَّعَكَ کا اس پر عطف ہورہا ہے، اور ''نحو'' کے اندر آپ قاعدہ پڑھا کرتے ہیں کہ ضمیر مرفوع متصل پر جب عطف کیا جائے تو اس کو ضمیر منفصل کے ساتھ مؤکد کیا جاتا ہے، اس لئے اَنْتَ اس کی تاکید کے طور پر آگیا۔ جس وقت تو اور تیرے ساتھی درست ہوجائیں کشتی پر، ٹھیک ہو کے بیٹھ جائیں کشتی پر، فَقُلِ تو پھر یہ دُعا کرنا، یوں کلمہ شکر اَدا کرنا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ نَجّٰىنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ، اللہ کا شکر ہے جس نے ہمیں

نجات دی ظالم لوگوں سے، تو کشتی پر سوار ہو کے اس طرح سے شکر ادا کرنا، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ سب تعریف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے، یہ کلمہ بطور شکر کے بولا جایا کرتا ہے، جیسے حدیث شریف میں آتا ہے: ''رَأْسُ الشُّكْرِ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ''[1] یعنی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کا اصل طریقہ یہی ہے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کہو، اللہ کے لیے ہر قسم کے کمالات کا اعتراف کرو، تعریف کرنا یہی شکر یہ ادا کرنا ہوتا ہے، اور ''اللہ کا شکر ہے'' یہ حاصل ترجمہ ہے، اللہ کا شکر ہے جس نے ہمیں نجات دی ظالم لوگوں سے۔ اور یہ بھی دُعا کرنا: رَّبِّ اَنْزِلْنِيْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا، اے میرے پروردگار! اُتار مجھ کو اُتارنا برکت والا، یعنی اب جس وقت ہم کشتی سے اُتریں تو یہ ہمارا اُترنا برکت والا ہو، جس میں ہمارے لیے خیر و عافیت ہو، نفع کی بات ہو، وَّاَنْتَ خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ، اور آپ بہت اچھا اُتارنے والے ہیں، مُنْزِل: اُتارنے والا، جیسے میزبان ہوتا ہے، نزیل: اُترنے والا، اور یہ مہمان کو کہا کرتے ہیں، تو آپ بہت اچھے میزبان ہیں، کہ باقی جتنے میزبان ہوتے ہیں وہ مہمان کی ضروریات پورا کرنے پہ قادر نہیں ہوتے، اور آپ ایسے میزبان ہیں کہ ہر ضرورت کو پورا کرنے پہ قادر ہیں۔ تو جس وقت حضرت نوح علیہ السلام کشتی میں سوار ہو گئے، تو گویا کہ یہ بھی ایک قسم کی ہجرت تھی کہ اپنی قوم سے علیحدگی ہو گئی۔ اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کر کے جارہے تھے تو آپ کو بھی ایسی ہی دُعا کی تلقین کی گئی تھی: رَّبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا (سورۂ بنی اسرائیل: ۸۰) یہ دُعا بھی ویسی ہی ہے، اس کا حاصل بھی یہی ہے کہ اے اللہ! مجھے اچھی طرح داخل کرنا، اچھی طرح نکالنا۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ: بے شک اس میں البتہ نشانیاں ہیں، وَّاِنْ كُنَّا لَمُبْتَلِيْنَ: یہ ''اِن'' شرطیہ نہیں ہے، مخففہ من المثقلہ ہے، بے شک ہم البتہ آزمانے والے ہیں، یعنی جس طرح سے نوح علیہ السلام کی قوم کو آزمایا تھا اسی طرح سے ہم آزمانے والے ہیں، اور اس قسم کے واقعات پیش کرنا اور سنانا بھی لوگوں کے لئے ایک آزمائش ہے کہ کون اس سے متاثر ہوتا ہے اور کون نہیں ہوتا۔

قومِ نوح کے بعد ایک اور قوم کا تذکرہ

ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ: پھر ہم نے اٹھایا قومِ نوح کے بعد اور جماعت کو۔ قرن اصل کے اعتبار سے ایک زمانے کے اندر موجود لوگوں کو کہتے ہیں، جیسے حدیث میں ہے اور جمعے کے خطبے میں بھی وہ الفاظ پڑھے جاتے ہیں: ''خَيْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِيْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ''[2] سب سے اچھے لوگ وہ ہیں جو میرے زمانے میں موجود ہیں، پھر متصل زمانے میں جو موجود ہوں گے، پھر متصل زمانے میں جو موجود ہوں گے۔ تو صحابہ تابعین تبع تابعین ان تین جماعتوں کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خیریت کی شہادت دی۔ تو قرن سے وہ لوگ مراد ہوتے ہیں جو ایک وقت میں موجود ہوں یعنی یہ قوم ختم ہو گئی، اس کے بعد پھر ہم نے ایک اور جماعت اٹھائی، اس جماعت کا مصداق کون ہے؟ واقعات کے سلسلے میں نوح علیہ السلام کے بعد قوم عاد قوم ثمود ہی آتی ہیں، تو انہی میں سے کسی قوم کا یہ تذکرہ ہے، ان کا نام نہیں لیا گیا، فَاَرْسَلْنَا فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ: پھر ہم نے ان میں بھی رسول بھیجا انہی میں سے ہی،

---

(۱) الامثال حکیم ترمذی ص ۱۵۸۔ نیز مشکوٰۃ ۱/۲۰۱ باب ثواب التسبیح فصل ثانی۔ ولفظہ: اَلْحَمْدُ رَأْسُ الشُّكْرِ
(۲) احکام القرآن للجصاص ۱/۶۱۵۔ نوٹ: بخاری مسلم و عام کتب حدیث میں ''خیر الناس'' یا ''خیر امتی'' یا ''خیرکم'' کے الفاظ ہیں۔

یعنی انہی میں سے ہی ایک آدمی کو رسول بنا کے اٹھایا۔ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ: اس رسول نے یہ کہا، یا مطلب یہ ہے کہ ہم نے بھیجا یہ حکم دیتے ہوئے کہ عبادت کرو تم اللہ کی، تمہارے لیے اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، اَفَلَا تَتَّقُوْنَ: کیا تم شرک کر کے اللہ کے غضب سے ڈرتے نہیں ہو؟ کیا تمہیں اللہ سے ڈر نہیں لگتا؟

رسالت اور بشریت میں منافات کا عقیدہ مشرکانہ ہے

وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا: یہ وہی الفاظ آ گئے، اب بار بار وہی باتیں آئیں گی، اور کہا سرداروں نے ان کی قوم میں سے جنہوں نے کفر کیا تھا، وَكَذَّبُوْا بِلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ: اور آخرت کی ملاقات کی تکذیب کی تھی، آخرت کے قائل نہیں تھے، وَاَتْرَفْنٰهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا: اَتْرَفَ اِتراف: خوش حال کرنا۔ اور ہم نے ان کو خوش حالی دی اس دُنیوی زندگی میں، یعنی وہ سردار خوش حال تھے، مال دار، سرمایہ دار، بہت ساز و سامان والے، جائیدادوں والے، اور تھے کافر، اور آخرت کے قائل نہیں تھے، انہوں نے یہی بات کہی: مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ کہ نہیں ہے یہ مگر انسان تم جیسا، یہ بات آپ انبیاء ﷩ کے واقعات میں اکثر و بیشتر پڑھتے ہیں کہ مشرکین کے سامنے جس وقت بھی اللہ کا رسول آ کے اپنی رسالت کو پیش کرتا ہے تو مشرک یہی کہتے ہیں کہ تم تو ہم جیسے انسان ہو، یعنی بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ہونا تو ایک بدیہی مسئلہ تھا، جس میں انکار کی گنجائش ہی نہیں تھی، کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ ہماری طرح یہ ماں کے بطن سے پیدا ہوا، ہماری طرح اس کا باپ موجود ہے، ہماری طرح یہ کھاتا ہے پیتا ہے سوتا ہے پہنتا ہے جس طرح سے ہمیں عوارض پیش آتے ہیں، کبھی بخار ہو گیا، کبھی چوٹ لگ گئی وغیرہ، وہ سارے واقعات اس کے ساتھ پیش آتے ہیں، تو جب یہ ہم جیسا ہی انسان ہے تو پھر اللہ کا رسول کس طرح سے ہو گیا؟ جیسے آگے بھی تفصیل اس بات کی آئے گی، تو انہوں نے بھی یونہی کہا، يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ، کھاتا ہے انہی چیزوں میں سے جن سے تم کھاتے ہو، وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ، اور پیتا ہے اسی چیز میں سے جو تم پیتے ہو، یعنی اس کا کھانا پینا بالکل تمہاری طرح ہے، تو یہ تم جیسا بشر ہے، ذرا ذہنیت دیکھو! اپنے جیسا بشر تو وہ بداہۃً سمجھتے تھے کہ یہ بشر ہے، انسان ہے، دلیل یہ کہ دیکھو! وہی کھاتا ہے وہی پیتا ہے جو تم کھاتے پیتے ہو، اس کا پیدا ہونا، رہنا سہنا سب تمہاری طرح ہے، تو ایسا بشر اللہ کا رسول کس طرح سے ہو سکتا ہے؟ یہ ممتاز کس طرح سے ہو گیا؟ اس ذہن میں در اصل بات یہ ہے کہ بشریت اور رسالت دونوں میں منافات ہے، وہ چونکہ سمجھتے تھے اور آنکھوں سے دیکھتے تھے کہ یہ انسان تو ہے، لہٰذا رسول نہیں۔ اب یہ جو لوگوں کے ذہنوں میں بات آئی ہوئی ہے کہ رسول ہے تو بشر نہیں، یہ اصل کے اعتبار سے اسی مشرکانہ نظریے کا چربہ ہے، لیکن بات اُلٹ ہو گئی کہ اب یہ رسول تو سمجھتے ہیں، کلمہ پڑھ بیٹھے، ''محمد رسول اللہ'' کہہ بیٹھے، اب رسول مان لینے کے بعد بشر ماننے کو طبیعت نہیں چاہتی، وہ کہتے ہیں کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ کا رسول ہو اور بشر ہو؟ تو گویا کہ انہوں نے رسول مان کر بشریت کا انکار کر دیا، اور وہ آنکھوں کے سامنے ہونے کی وجہ سے بشر تو مانتے تھے، لیکن وہ یہ کہتے تھے کہ یہ بشر رسول کیسے ہو گیا؟ دونوں طرف سے بات ایک ہی ہے یعنی بشریت اور رسالت کے درمیان میں منافات، بشر رسول نہیں ہو سکتا، رسول بشر نہیں ہو سکتا، وہ اس بات کے قائل تھے کہ یہ بشر ہے، اس لیے کہتے تھے کہ یہ رسول نہیں ہو سکتا، اور یہ اس بات کے قائل ہیں کہ رسول ہے، تو بشر ہونے کو ان کا ذہن قبول نہیں کرتا، تو اصل کے

اعتبار سے گمراہی کی بنیاد ایک ہی ہے کہ بشریت اور رسالت میں منافات ہے، یہ دونوں اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ چاہے اس طرح کہہ لو، چاہے اُس طرح کہہ لو، بات ایک ہی ہے۔

بشر ہونے کے باوجود انبیاء علیہم السلام کا مرتبہ تمام انسانوں سے بلند ہے

تو یہ وہی جہالت والا نظریہ ہے جو پرانے زمانے سے چلا آ رہا ہے، قرآنِ کریم یہ تسلیم کرتا ہے کہ واقعی انبیاء علیہم السلام بشر ہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ فضیلت بیان کرتا ہے کہ جب اللہ کی طرف سے وحی آ گئی تو پھر ان کا درجہ بہت اونچا ہو گیا، اب ان کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے، اور ان کا کہنا ماننا اللہ کے کہنا ماننے کے قائم مقام ہے۔ بس یہ فرق جو ہے اس سے لوگ غافل ہو جاتے ہیں، اس فرق کو لوگ کافی نہیں سمجھتے کہ کسی بشر کو اللہ کا رسول مان لیا جائے تو بشر ہونے کے باوجود اس کو اتنی فوقیت ہو جاتی ہے کہ باقی انسان سارے کے سارے مل کر اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے، یہ بات ان کا ذہن قبول نہیں کرتا، وہ کہتے ہیں کہ یہ بڑائی کوئی بڑائی نہیں ہے، رسول ہو تو اس کو بشر نہیں ہونا چاہیے، تو یہ وہی پرانی جاہلیت ہے جس کا انداز بدل جاتا ہے، کبھی وہ جہالت کسی رنگ میں آ جاتی ہے کبھی کسی رنگ میں آ جاتی ہے، بات وہی ہے۔

اب یہاں ان کی نظر یہاں تک تو جاتی تھی کہ یہ ہماری طرح کھاتا ہے، ہماری طرح پیتا ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر طرح سے ہماری مثل ہو گئے، ایک بات میں اگر مثل ہو تو ضروری نہیں کہ ہر بات میں مثل ہو گئے، اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ سے اعلان کروایا قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (سورۂ حم سجدہ: ۶) آپ کہہ دیجئے کہ میں تم جیسا بشر ہوں، لیکن آگے کہہ دیا: يُوْحٰٓى اِلَيَّ، تو یہاں سے فرق آ گیا کہ ہوں تو میں تم جیسا بشر، لیکن میری طرف وحی آتی ہے، اور اس وحی کے آنے کے ساتھ ایک بشر کو اتنی فوقیت ہو جاتی ہے، اتنی بڑائی نصیب ہو جاتی ہے کہ ہم انسان ہونے کے باوجود اس کے ساتھ جنس میں شریک ہونے کے باوجود اس کی گرد کو نہیں پہنچ سکتے۔

اور ایک جنس کے افراد میں اتنا تفاوت یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ منطق میں آپ نے کیا پڑھا ہے کہ انسان کی جنس کیا ہے؟ (حیوان) تو یہ ساری دنیا کا مسلمہ عقیدہ ہے جو منطقی اُصول کے ساتھ سوچتے ہیں کہ انسان کی جنس حیوان ہے، کہیں چلے جاؤ اس میں آپ فرق نہیں پائیں گے، ساری دنیا اس کو تسلیم کیے بیٹھی ہے، عقلاء سب تسلیم کیے بیٹھے ہیں کہ انسان کی جنس قریب حیوان ہے، ٹھیک ہے؟ اچھا! اب انسان بھی حیوان ہو گیا، کلُّ انسانٍ حیوانٌ، اور اس حیوان ہونے میں آپ کے ساتھ کون کون شریک ہیں، کُتا حیوان ہے یا نہیں؟ (ہے)، تو منطقیوں کے اُصول کے مطابق تو کُتا بھی آپ کا ہم جنس ہے، گدھا حیوان ہے یا نہیں؟ (ہے)، کل حمارٍ حیوانٌ، اس کا کوئی انکار کر سکتا ہے؟ (نہیں)، تو منطقیوں کے اُصول کے مطابق جنس ہونے کے اعتبار سے گدھا بھی آپ کے ساتھ شریک ہو گیا، سُور اور خنزیر حیوان ہے یا نہیں؟ اس لیے آپ کہہ سکتے: کل خنزیرٍ حیوانٌ، اس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا، تو حیوان ہونے میں خنزیر بھی آپ کا ہم جنس ہو گیا، اسی طرح سانپ بچھو وغیرہ سب حیوان کا مصداق ہیں اور حیوان ہونے میں آپ کے ساتھ یہ بھی شریک ہیں، تو ایک جنس کے افراد میں دیکھو! کتنا فرق ہے، آپ بھی حیوان، کُتا بھی حیوان، گدھا بھی

حیوان، اب کوئی جاہل مُن کے یہ کہے کہ کتے اور گدھے کو جو انسان کا ہم جنس قرار دیا جا رہا ہے تو اس میں انسان کی توہین ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو منطق کی الف با بھی نہیں آتی، ورنہ منطق پڑھنے کے بعد تو ہر کسی کا ذہن اس بات کو قبول کرتا ہے کہ واقعی کتا بھی ہمارے ساتھ جنس ہونے میں شریک ہے، اور گدھا بھی ہمارے ساتھ جنس ہونے میں شریک ہے، لیکن ایک جنس کے افراد میں اتنا فرق ا کہ ایک انسان اور ایک گدھا، ایک انسان اور ایک کتا، جس طرح سے آپ ان کے درمیان میں فرق محسوس کرتے ہیں، بالکل اسی طرح سے بشر ہونے میں اگرچہ انبیاء ﷺ باقی انسانوں کے ساتھ شریک ہیں لیکن ان افراد کے درمیان اس سے زیادہ فرق ہے جتنا گدھے اور انسان میں ہوتا ہے، اور اس سے زیادہ فرق ہے جتنا کتے اور انسان میں ہوتا ہے، تو اگر ایک نکتے میں شریک ہو جائیں تو اس سے برابری کس طرح سے لازم آتی ہے، یہ سمجھ لینا کہ یہ تو بالکل ہی برابر ہو گئے یہ غلط ہے، جیسے کسی بزرگ کا قول آتا ہے:

محمدٌ بشرٌ لا کالبشرِ بل ھُوَ یاقوتٌ بینَ الحجرِ

یعنی محمد ﷺ بشر تو ہیں لیکن عام بشروں کی طرح نہیں، وہ تو اس طرح سے ہیں جس طرح پتھر کے درمیان میں یاقوت ہوتا ہے۔ یاقوت بھی پتھر ہے، لیکن ایک پتھر تو وہ کہ چند روپوں میں ٹرک بھر جائے، اور سڑکوں پہ لا کے لوگ ڈھیر کر دیتے ہیں، جن پر کتے وغیرہ پیشاب کرتے پھرتے ہیں، اور ایک یاقوت ہے جو اسی پتھر کی ایک قسم ہے، پتھر میں سے نکلتا ہے، لیکن وہ اتنا قیمتی ہوتا ہے، میرا خیال ہے کہ آپ میں سے کسی نے آج تک دیکھا ہی نہیں ہوگا۔ اب کوئی کہے کہ یاقوت کو پتھر کہنے سے اس کو توہین ہوگئی، یہ غلط ہے۔ پتھر تو وہ ہے، اس کا کون انکار کر سکتا ہے، پتھروں میں سے وہ نکلتا ہے، لیکن یاقوت میں اور ایک عام پتھر میں کتنا فرق ہے، اسی طرح یہاں بھی یہی بات ہے۔

تو یہ مشرکانہ ذہن ابتدا سے چلا آ رہا ہے کہ بشریت اور رسالت یہ دونوں اکٹھے نہیں ہو سکتے، وہ چونکہ بشر سمجھتے تھے، معاملہ ان کی آنکھوں کے سامنے تھا، اس لیے رسول ہونے کو وہ تسلیم نہیں کرتے تھے، اور آج رسول ہونے کو تسلیم کر لیا تو بشر ہونے کو ذہن قبول نہیں کرتا، تو دونوں کے درمیان منافات یہ وہی قدیم جاہلیت ہے، جس نے صرف رنگ اور عنوان بدلا ہے، ورنہ دونوں میں فرق کوئی نہیں ہے۔ آگے سورۂ تغابن میں بھی یہی لفظ آئے گا کہ جب اللہ کے رسول آئے تو کہنے لگے: اَبَشَرٌ یَّهْدُوْنَنَا کیا بشر ہمارا ہادی بن کے آ گیا؟ تو وہاں بھی یہی بات ہے کہ بشر ہو اور ہمارا ہادی بن کے آ جائے، یہ کیسے ہو سکتا ہے، یہ تو ہماری طرح ہی ہے۔ مولانا رُومی ﷫ نے اپنے الفاظ میں اسی بات کو ادا کیا ہے، مولانا کہتے ہیں کہ کافر سارے کے سارے اسی وجہ سے گمراہ ہو گئے کہ:

ہمسری با انبیاء برداشتند اولیاء را ہمچو خود پنداشتند[1]

انہوں نے انبیاء ﷩ کو بھی اپنے جیسا سمجھ لیا، اور اولیاء کو بھی اپنے جیسا سمجھ لیا، ان کے ساتھ بھی ہمسری کا دعویٰ کر دیا کہ جیسے یہ ہیں ویسے ہی ہم ہیں۔ مولانا کہتے ہیں:

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

(حوالہ مذکورہ)

(۱) ''مثنوی'' دفتر اول، حکایت:۱۱، شعر:۲۱۔

نیک لوگوں کے کاموں کو اپنے جیسا نہیں سمجھنا چاہیے، دیکھو! لکھنے کے اندر شیر اور شیر میں کوئی فرق نہیں ہے، ''ش ی ر'' اس میں بھی آتا ہے اور اس میں بھی آتا ہے، شکل دونوں کی بالکل ایک جیسی ہے:

شیر آں باشد کہ مردم را درد شیر آں باشد کہ مردم مے خورند

شیر وہ ہوتا ہے جو آدمیوں کا پھاڑتا ہے، اور دُودھ وہ ہوتا ہے جس کو انسان پیتے ہیں، یعنی شیر (دُودھ) کو انسان پیتا ہے، اور شیر انسانوں کو پھاڑتا ہے، اور دونوں کی شکل ایک جیسی ہے۔ اسی طرح سے انبیاء علیہم السلام اور اولیاء رحمہم اللہ اگرچہ انسان ہونے میں تم جیسے ہی ہیں لیکن ان کو اپنی طرح نہ سمجھو، ان میں اور تمہارے درمیان میں اتنا فرق ہے جس طرح سے شیر اور شیر کی شکل ایک ہے، لیکن حقیقت میں کتنا فرق ہے! تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء علیہم السلام کو جب وحی آ گئی تو ان کو اتنا امتیاز دے دیا گیا کہ سارے انسان مل کے بھی ان کی گرد کو نہیں پہنچ سکتے، صرف یہ دیکھ لینا کہ ہماری طرح سوتے ہیں، ہماری طرح اٹھتے ہیں، ہماری طرح کھاتے پیتے ہیں، اور پھر ساتھ رسالت کا انکار کرنا، یہ پُرانی مشرکانہ ذہنیت ہے۔ اور حق یہ ہے کہ بشر ہیں، بشر ہونے کے باوجود اللہ نے ان کو اتنا امتیاز دیا ہے کہ ان کی اطاعت ہم پہ فرض ہے، اور ان کی اطاعت ایسے ہی ہے جیسے ہم نے اللہ کی اطاعت کر لی۔

مخالفین کی طرف سے لوگوں کو انبیاء علیہم السلام سے دُور کرنے کے مختلف طریقے

تو سب قوموں کے درمیان یہ مشترکہ بات چلی آ رہی ہے جتنے آپ کے سامنے واقعات آ رہے ہیں۔ تو یہ کہتے تھے کہ يَأْكُلُ مِمَّا تَأْكُلُونَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُونَ کھاتا ہے یہ اسی چیز میں سے جس سے تم کھاتے ہو، اور پیتا ان چیزوں میں سے جن سے تم پیتے ہو، یہ گویا کہ مثل ہونے کی دلیل دی، اور آگے نتیجہ نکال لیا: وَلَئِنْ أَطَعْتُمْ بَشَرًا مِثْلَكُمْ: اگر تم نے اطاعت کی اپنے جیسے انسان کی إِنَّكُمْ إِذًا لَخَاسِرُونَ پھر تم البتہ خسارے والے ہو جاؤ گے۔ یہ بھی دیکھو! عوام کی جہالت سے فائدہ اٹھانے والی بات ہے، اپنے پیچھے تو وہ لگائے بیٹھے تھے، اور خود مقتدیٰ بنے بیٹھے تھے، اور کسی ماتحت کو حق نہیں تھا کہ ان کی رائے سے اختلاف کرے، اپنے پیچھے لگنے میں تو ان کو کوئی اعتراض نہیں ہے، لیکن اِن (انبیاء) کے پیچھے تم لگ گئے تو پھر خسارہ ہی خسارہ ہے۔ سیاسی لیڈروں کا یہی حال ہوا کرتا ہے کہ قوم کو اپنے پیچھے تو لگائیں گے، ان کو تو جس طرح سے چاہیں گے استعمال کریں گے، لیکن ان کے مقابلے میں اگر کوئی دوسرا اٹھ کے کھڑا ہو جائے تو پھر اس کی اطاعت کے نقصان ہی گنوانے شروع کر دیتے ہیں، کہ تم بے وقوف ہو جو اس کے پیچھے لگ رہے ہو؟ تمہارے بھیجے میں عقل نہیں؟ تم خود نہیں سوچتے؟ اور اپنی بات کے متعلق کہیں گے کہ بلا سوچے سمجھے ماننی ضروری ہے۔ تو یہاں بھی ان جاہل لیڈروں کا یہی حال تھا کہ اپنے پیچھے تو ساری قوم کو لگائے بیٹھے تھے لیکن جب انبیاء علیہم السلام کے پیچھے لگنے کو قوم تیار ہوتی تو کہتے کہ یہ تو خسارہ ہی خسارہ ہے، اگر تم اپنے جیسے انسان کے پیچھے لگ جاؤ گے، یہ جذبات بھڑکانے والی بات ہے۔ أَيَعِدُكُمْ أَنَّكُمْ إِذَا مِتُّمْ وَكُنْتُمْ تُرَابًا وَعِظَامًا أَنَّكُمْ مُخْرَجُونَ: يَعِدُ وعید سے ہے، وعید ڈرانے کو کہتے ہیں۔ کیا یہ تمہیں ڈراتا ہے اس بات سے کہ جب تم مر جاؤ گے اور مٹی ہو جاؤ گے اور ہڈیاں ہو جاؤ گے، کہ تم پھر نکالے جاؤ گے؟ تمہیں اس بات سے ڈراتا ہے؟ هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا

تُوْعَدُوْنَ: هَيْهَاتَ اسم فعل ہے بَعُدَ کے معنی میں، بَعُدَ بَعُدَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ، یعنی بَعُدَ الْوُقُوْعُ لِمَا تُوْعَدُوْنَ، دُور ہے واقع ہونا اس چیز کا جس سے تم ڈرائے جاتے ہو، اس کا واقع ہونا بہت دُور ہے، نہیں ہوسکتا، نہیں ہوسکتا یہ کام جس سے تم ڈرائے جاتے ہو، تاکید کے طور پر اس طرح سے ذکر کرتے ہیں۔ لام کو اگر زائدہ بنالیجئے تو مَا تُوْعَدُوْنَ یہی فاعل بن جائے گا هَيْهَاتَ کا، اَیْ بَعُدَ مَا تُوْعَدُوْنَ، جس چیز سے تم ڈرائے جاتے ہو اس کا واقع ہونا بعید ہے یہ نہیں ہوسکتی، یا مطلب ہے کہ بَعُدَ الْوُقُوْعُ لِمَا تُوْعَدُوْنَ، تو مَا تُوْعَدُوْنَ بعید ہے، یا مَا تُوْعَدُوْنَ کا وقوع بعید ہے، مفہوم دونوں کا ایک ہی ہے۔ اور دوسرا هيهات تاکید کے لئے ہے، جس کا مطلب یہ ہوگیا کہ ممکن ہی نہیں، ممکن ہی نہیں وہ چیز جس سے تم ڈرائے جاتے ہو، اس کا واقع ہونا بہت بعید ہے، یہ بات نہیں ہوسکتی۔ اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا: نہیں ہے یہ مگر ہماری دنیوی زندگی، نَمُوْتُ وَنَحْيَا، مرتے ہیں زندہ ہوتے ہیں، یہیں پیدا ہونا یہیں مرنا ہے اور کچھ بھی نہیں، وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ اور مرنے کے بعد ہم نہیں اٹھائے جائیں گے، یہ آخرت کا یوں انکار کرتے تھے۔ اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلُ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا وَّ مَا نَحْنُ لَهٗ بِمُؤْمِنِيْنَ: نہیں ہے یہ مگر ایسا آدمی جس نے گھڑ لیا اللہ پر جھوٹ، اور نہیں ہیں ہم اس پر ایمان لانے والے، قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ اس رسول نے کہا (جو بھی رسول آیا تھا اس نے کہا) اے میرے رَبّ! میری مدد کر ان کے مجھ کو جھٹلانے کی وجہ سے۔ بِمَا كَذَّبُوْنِ میں مَا مصدریہ ہے اور نون کے نیچے جو کسرہ ہے یہ دال ہے یائے متکلم پر۔ قَالَ عَمَّا قَلِيْلٍ لَّيُصْبِحُنَّ نٰدِمِيْنَ: اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھوڑی مدت کے بعد یہ شرمسار ہوجائیں گے، عَمَّا قَلِيْلٍ میں مَا زائدہ ہے، اَیْ عَنْ قَلِيْلٍ تھوڑی مدّت کے بعد البتہ ضرور ہوجائیں گے یہ شرمسار۔ یعنی کوئی زیادہ دیر نہیں ہے، بہت قریب وقت آرہا ہے۔

رسول کی بات جھٹلانے والوں کا انجام

فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ بِالْحَقِّ: پس پکڑ لیا ان کو صیحہ نے۔ صیحہ کا لفظی معنی ہے: چیخ، اور یہاں سے مراد ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈانٹ جو آتی ہے، وہ چاہے کسی شکل میں آئے، اس لیے صیحہ کا مصداق ہر قسم کا عذاب ہوتا ہے۔ تو پکڑ لیا ان کو عذاب نے، ایک چیخ نے، ڈانٹ نے جو اللہ کی طرف سے پڑی بِالْحَقِّ جو کہ ایک امر واقعی تھی، صرف وہم نہیں تھا۔ پکڑ لیا ان کو چیخ نے ٹھیک ٹھیک۔ فَجَعَلْنٰهُمْ غُثَآءً: پھر بنا دیا ہم نے ان کو تنکے، غثاء کہتے کوڑا کرکٹ، سیلاب جس وقت آتا اور پانی بہتا ہے تو آگے جو کوڑا اکٹھا ہوتا چلا جاتا ہے اسے غثاء کہتے ہیں۔ ہم نے ان کو ڑا کرکٹ بنا دیا، فَبُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ: پس ظالم لوگوں کے لئے بُعد ہے، یعنی اللہ کی رحمت سے دوری ہے، یعنی ان ظالموں پر اللہ کی پھٹکار، اللہ کی لعنت، یہ 'بُعد' 'لعنت کے معنی میں ہے۔

ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قُرُوْنًا اٰخَرِيْنَ: پھر ہم نے ان کے بعد اور جماعتیں پیدا کیں، مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا: نہیں سبقت لے گئی کوئی اُمت اپنے وقت معین سے، وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ: اور نہ وہ پیچھے ہٹی، یعنی جو وقت ہم نے ان کے لیے متعین کیا اسی وقت ہی وہ ہلاک ہوئی، نہ پہلے نہ پیچھے۔ نہیں سبقت لے گئی اپنے وقت سے یعنی وقت سے پہلے نہیں مری، وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ نہ وہ پیچھے ہٹتے تھے یعنی معین وقت پر ان کو پکڑا گیا، نہ وہ آگے سرکے، نہ پیچھے۔

ہر دور میں جھٹلانے والے برباد ہوئے

ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا: پہلی "ت" واؤ سے بدلی ہوئی ہے اصل میں تھا: وَتْرًا اَیْ مُتَوَاتِرِیْنَ۔ پھر ہم نے اپنے رسولوں کو پے در پے بھیجا، یکے بعد دیگرے، تسلسل کے ساتھ۔ كُلَّمَا جَآءَ اُمَّةً رَّسُوْلُهَا: جب کبھی کسی جماعت کے پاس اس کا رسول آیا، كَذَّبُوْهُ فَاَتْبَعْنَا بَعْضَهُمْ بَعْضًا تو انہوں نے اس کو جھٹلایا پھر ہم نے بھی بعض کو بعض کے پیچھے لگا دیا، یعنی جس طرح رسول مسلسل آئے اور لوگوں نے جھٹلایا تو ہم نے بھی ایک قوم برباد کی، دوسری آئی اس کو برباد کیا، تیسری آئی اس کو برباد کیا، پھر ہم نے بھی ایک دوسرے کے پیچھے ان کو چلتا کر دیا، جیسے جیسے یہ جھٹلاتے گئے مسلسل ہم ایسے ہی ان کو ترتیب وار ہلاک کرتے چلے گئے۔ پیچھے لگا دیا ہم نے ان میں سے بعض کو بعض کے، وَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِیْثَ: اور بنا دیا ہم نے ان کو قصے کہانیاں، آج تاریخ میں ان کے واقعات لکھے ہوئے ہیں، باقی کچھ بھی نہیں، یعنی ان کی کر و فر اور جتنی ٹھاٹھ باٹھ تھی سب گئی۔ بنا دیا ہم نے ان کو قصے کہانیاں، اَحَادِیْث اُحدوثہ کی جمع ہے (آلوسی)، ویسے "حدیث" کی جمع بھی "احادیث" آتی ہے، مطلب یہ ہے کہ ہم نے ان کو کہانیاں بنا دیا۔ فَبُعْدًا لِّقَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ: پس دُوری ہے ان لوگوں کے لئے جو ایمان نہیں لاتے، ان بے ایمانوں پر اللہ کی پھٹکار، اس کا حاصل یہی ہے، ایمان نہ لانے والے جتنے تھے سب کے سب اللہ کی رحمت سے دور ہوئے، سب کے سب پر اللہ کی لعنت ہوئی۔

فرعونیوں کی سرکشی اور انجام

ثُمَّ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى وَاَخَاهُ هٰرُوْنَ ۙ بِاٰیٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ: پھر بھیجا ہم نے موسیٰ علیہ السلام اور اس کے بھائی ہارون علیہ السلام کو اپنی نشانیوں کے ساتھ اور واضح دلیل کے ساتھ، واضح دلیل سے معجزۂ عصا مراد ہے، اور آیات سے باقی عام معجزات مراد ہیں، یہ الفاظ بہت دفعہ گزر گئے ہیں، اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف، فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا عَالِیْنَ پس انہوں نے تکبر کیا اور وہ بہت سرچڑھے لوگ تھے، بہت عُلو والے، بلندی والے، بہت اونچے ہونے والے لوگ تھے، اپنے آپ کو سمجھتے تھے کہ ہم بہت بلند ہیں، بہت اونچے ہیں۔ "اور تھے وہ سرچڑھے" یعنی اوپر چڑھنے والے، بلندی کی طرف جانے والے، متکبر، عُلو والے۔ فَقَالُوْۤا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَیْنِ مِثْلِنَا: دیکھو! سب کی سُر ایک ہی ہے، سب ایک ہی لَے میں بات کرتے ہیں۔ کہنے لگے کہ کیا ہم ایمان لے آئیں اپنے جیسے دو انسانوں پر، وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ: حالانکہ ان کی قوم ہماری غلام ہے، یعنی غلاموں میں سے دو آدمی اُٹھ کھڑے ہوئے اور ہمیں کہتے ہیں کہ ہماری بات مانو، جس طرح سے عام طور پر دنیادار سرمایہ دار لوگ کہتے ہیں، لو! یہ آ گیا ہمیں سمجھانے کے لیے، مولوی، قوم کا جولاہا، مراثی، تیلی، موچی، یعنی موچیوں میں سے، تیلیوں میں سے، جولاہوں میں سے، مراثیوں میں سے اگر کوئی عالم بن جائے اور پھر کسی زمین دار کے سامنے، سرمایہ دار کے سامنے، کسی بڑے آدمی کے سامنے جائے تو یہ لوگ قوم کا حوالہ دے کے تحقیر کرتے ہیں۔ تو چھوٹی قوم میں سے ہونے کی وجہ سے، یوں کہتے ہیں، اس کی بات مان لیں؟ یہ آ گیا ہمیں سمجھانے کے لیے؟ یہاں بھی یہی بات ہے، کہنے لگے کہ ان کی قوم ہماری غلام ہے، کام تو ہمارے گھروں میں کرتے ہیں، برتن تو

ہمارے دھوتے ہیں، اور یہ دو آ گئے ہیں کہ ہم پہ ایمان لاؤ اور ہماری بات مانو۔ تو یہ گھٹیا قوم کے لوگ ہیں، ہمارے غلاموں میں سے ہیں، ہم ان کو کس طرح سے تسلیم کر سکتے ہیں؟

یہی فرعونیت ہے جو انسان کا دماغ خراب کرتی ہے اور انسان کے لئے ہلاکت کو مہیا کرتی ہے۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ بات جو کہی جارہی ہے مدلل ہے یا نہیں؟ چاہے کہنے والا مراثی ہو، اگر بات تمہارے نفع کی کہی جارہی ہے اور اللہ تعالیٰ کی بات پہنچائی جارہی ہے، پھر چاہے پہنچانے والا جولاہا ہو، تمہیں اس سے کیا؟ اللہ تعالیٰ نے بڑائی کو تو نہیں دیکھنا، بلکہ اس نے تو دیکھنا ہے کہ بات کس کی صحیح ہے، اور کس نے میری بات مانی۔ تو لوگ جو گھٹیا قوم کا حوالہ دے تحقیر کرتے ہیں یہ وہی فرعونی ذہنیت ہے کہ ان کی تو قوم ہماری غلام ہے، ان کی تو ساری برادری، بڑے چھوٹے جتنے ہیں سب ہماری جوتیاں صاف کرتے ہیں، اور یہ کہتے ہیں کہ ہم پہ ایمان لے آؤ، ہماری بات مان لو، فَكَذَّبُوْهُمَا: انہوں نے ان دونوں کو جھٹلایا، فَكَانُوْا مِنَ الْمُهْلَكِيْنَ پس ہو گئے یہ بھی ہلاک کیے ہوؤں میں سے۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ: البتہ تحقیق ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی تاکہ یہ لوگ ہدایت پائیں، لَعَلَّهُمْ سے موسیٰ علیہ السلام کی قوم مراد ہے، یعنی تاکہ اس کتاب کے ذریعے سے سیدھا راستہ اختیار کریں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ کا ذکر

وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗۤ اٰيَةً: اور بنایا ہم نے مریم کے بیٹے کو اور اس کی ماں کو نشانی۔ اس کی تفصیل سورۂ مریم میں گزر چکی، یہ اللہ کی قدرت کی نشانی تھے، وَّاٰوَيْنٰهُمَاۤ اِلٰى رَبْوَةٍ: اور ہم نے ان دونوں کو ٹھکانا دیا ایک اونچی جگہ کی طرف، رَبوہ اُونچی جگہ کو کہتے ہیں، یا تو اس سے وہی ٹیلہ مراد ہے جس پر عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہوئی تھی، یا بعض نے مصر کا علاقہ مراد لیا ہے، یا فلسطین اور شام جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام رہتے ہوں گے وہ اردگرد کی جگہوں سے اونچی ہوگی، اور ذَاتِ قَرَارٍ کا معنی ہے ٹھہرنے کے قابل، اور مَعِيْنٍ کے معنی ہیں جاری پانی۔ قرار والی تھی اور جاری پانی والی تھی یعنی وہ ٹھکانا اچھا تھا، اس کے پاس نہریں بہتی تھیں جس کی وجہ سے وہ سرسبز و شاداب علاقہ تھا۔

اپنے شہر کا نام ''رَبوہ'' رکھنے میں مرزائیوں کا مقصد

آپ نے دیکھا ہوگا کہ مرزائیوں نے پاکستان میں آ کے جو شہر آباد کیا ہے اس کا نام بھی ''رَبوہ'' رکھا ہے،(۱) وہ اسی التباس کی بنا پر رکھا ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو رَبوہ کی طرف ٹھکانا دیا تھا، تو مرزے کی اُمت کو بھی رَبوے میں ٹھکانا مل گیا، آنے والے وقت میں التباس پیدا کرنے کے لیے اس طرح کی حرکتیں کرتے ہیں، اور یہ ان کی گمراہیوں میں سے ایک گمراہی ہے، اور چاہیے یہ تھا کہ حکومت ان کو اس لفظ کے استعمال کرنے کی اجازت نہ دیتی، کیونکہ یہی التباس پیدا کرنے کے لیے

(۱) الحمد للہ! مولانا منظور احمد چنیوٹی رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر علماء کی کوششوں سے ۴؍فروری ۱۹۹۹ء کو حکومت پاکستان کی طرف سے اس شہر کا نام ''ربوہ'' ختم کر کے ''چناب نگر'' رکھ دیا گیا ہے۔

ایسا کیا گیا ہے، یہ سمجھا جائے کہ قادیان سے بھاگے اور آ کے رَبوے میں ٹھکانا لے لیا، تو جس طرح عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے رَبوہ میں جگہ دی تھی، رَبوہ کا معنی ہے اونچی جگہ، اور یہ بھی دریا کے کنارے پر ہے، دریائے چناب جو پاس بہتا ہے اس کے مقابلے میں یہ جگہ اُونچی ہے، تو قادیانیوں کی یہ گمراہی اسی لفظ سے ماخوذ ہے، گویا کہ اپنے آپ کو یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے رَبوے میں ٹھکانا دیا، جس طرح عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ کے متعلق قرآنِ کریم میں آیا ہے۔

تو یہاں رَبوہ سے جہاں ولادت ہوئی تھی یعنی بیت لحم، وہ جگہ مراد ہے، یا جہاں پہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے رہائش اختیار کی تھی، بعض نے مصر کا علاقہ مراد لیا ہے بعض نے فلسطین کا علاقہ مراد لیا ہے۔ ذَاتِ قَرَارٍ کا معنی ہے کہ وہ ٹھہرنے کا موقع تھا، ٹھہرنے کی اچھی جگہ تھی، اور مَعِین جاری پانی کو کہتے ہیں، یعنی وہ جاری پانی والی تھی۔

کیا ''رَبوہ'' کا مصداق کشمیر ہے؟

حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں ''اہلِ اسلام میں کسی نے ربوہ سے مراد کشمیر نہیں لیا۔ نہ حضرت مسیح (علیہ السلام) کی قبر کشمیر میں بتلائی۔ البتہ ہمارے زمانے کے بعض زائغین نے ربوہ سے کشمیر مراد لیا ہے اور وہیں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی قبر بتلائی ہے جس کا کوئی ثبوت تاریخی حیثیت سے نہیں۔ محض کذب و دروغ بافی ہے۔ محلہ خان یار شہر سری نگر میں جو قبر ''یوز آسف'' کے نام سے مشہور ہے اور جس کی بابت ''تاریخِ اعظمی'' کے مصنف نے محض عام افواہ نقل کی ہے کہ ''لوگ اس کو کسی نبی کی قبر بتاتے ہیں، وہ کوئی شہزادہ تھا اور دوسرے مُلک سے یہاں آیا'' اس کو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی قبر بتانا پرلے درجے کی بے حیائی اور سفاہت ہے۔ ایسی اٹکل پچوں قیاس آرائیوں سے حضرت مسیح (علیہ السلام) کی حیات کو باطل ٹھہرانا بجز خبط اور جنون کے کچھ نہیں، اگر اس قبر کی تحقیق مطلوب ہو اور یہ کہ ''یوز آسف'' کون تھا؟ تو جناب منشی حبیب اللہ صاحب امرتسری کا رسالہ دیکھو جو خاص اس موضوع پر نہایت تحقیق و تدقیق سے لکھا گیا ہے۔ اور جس میں اس مہمل خیال کی دھجیاں بکھیر دی گئی ہیں''.... تو مرزائیوں نے اس قسم کا پروپیگنڈا کیا تھا، حضرت شیخ الاسلام نے اس عبارت میں اسی کی تردید کی ہے، کہ ربوہ سے کشمیر مراد نہیں، اور وہاں جو قبر ہے جس کو یہ لوگ عیسیٰ علیہ السلام کی قبر بتاتے ہیں یہ بات بھی صحیح نہیں ہے۔

هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ یہ بَعُدَ کے معنی میں ہے، اس کا ترجمہ یوں بھی کیا جا سکتا ہے کہ بَعُدَ التَّصدِیقُ لِمَا تُوعَدُونَ جن باتوں سے تمہیں ڈرایا جا رہا ہے ان کی تصدیق بہت بعید ہے، یعنی ان کی تصدیق نہیں کی جا سکتی۔ یا وہی ترجمہ جو پہلے کیا گیا تھا بَعُدَ الوُقُوعُ لِمَا تُوعَدُونَ۔ یا لِمَا تُوعَدُونَ پر لام زائدہ ہے، اور مَا تُوعَدُونَ یہی ''بَعُدَ'' کا فاعل بن جائے گا، جن چیزوں سے تمہیں ڈرایا جا رہا ہے یہ چیزیں بعید ہیں، ان کا وقوع ممکن نہیں، حاصل سب ترجموں کا ایک ہی ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ

يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۭ اِنِّىْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ۝ؕ۵۱ وَاِنَّ هٰذِهٖٓ

اے رسولو! کھاؤ پاکیزہ چیزوں سے اور نیک عمل کرو بے شک میں تمہارے عملوں کو جاننے والا ہوں ۝۵۱ اور بے شک یہی

اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ۝۵۲ فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا ۭ

تمہارا طریقہ ہے ایک ہی طریقہ، اور میں تمہارا رَبّ ہوں پس تم مجھ ہی سے ڈرو ۝۵۲ پس لوگوں نے اپنے اَمرِ دینی کو آپس میں ٹکڑے ٹکڑے کرلیا

كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ۝۵۳ فَذَرْهُمْ فِىْ غَمْرَتِهِمْ حَتّٰى حِيْنٍ ۝۵۴ اَيَحْسَبُوْنَ

ہر گروہ اپنے اپنے خیالات پر خوش ہے ۝۵۳ آپ ان کو ان کی جہالت میں چھوڑ دیجئے ایک وقت تک ۝۵۴ کیا وہ لوگ یہ سمجھتے ہیں

اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ ۝ۙ۵۵ نُسَارِعُ لَهُمْ فِى الْخَيْرٰتِ ۭ بَلْ

کہ وہ چیز جس کے ذریعے سے ہم انہیں اِمداد دے رہے ہیں یعنی مال اور بیٹے ۝۵۵ ہم ان کے لئے جلدی کر رہے ہیں بھلائیوں میں؟ بلکہ

لَّا يَشْعُرُوْنَ ۝۵۶ اِنَّ الَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ۝ۙ۵۷ وَالَّذِيْنَ هُمْ

یہ سمجھتے نہیں ۝۵۶ بے شک وہ لوگ جو اپنے رَبّ کی ہیبت سے ڈرنے والے ہیں ۝۵۷ اور وہ لوگ جو

بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ ۝ۙ۵۸ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُوْنَ ۝ۙ۵۹ وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ

اپنے رَبّ کی آیات پر اِیمان لاتے ہیں ۝۵۸ اور وہ لوگ جو اپنے رَبّ کے ساتھ شریک نہیں ٹھہراتے ۝۵۹ اور وہ لوگ جو دیتے ہیں

مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ۝ۙ۶۰ اُولٰٓئِكَ

جو کچھ دیتے ہیں اس حال میں کہ ان کے دل ڈرنے والے ہوتے ہیں اس بات سے کہ وہ اپنے رَبّ کی طرف لوٹنے والے ہیں ۝۶۰ یہی لوگ

يُسٰرِعُوْنَ فِى الْخَيْرٰتِ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ ۝۶۱ وَلَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا

بھلائیوں میں جلدی کرتے ہیں اور وہ ان بھلائیوں کے لئے سبقت لے جانے والے ہیں ۝۶۱ اور نہیں تکلیف دیتے ہم کسی نفس کو مگر اس کی وسعت کے مطابق

وَلَدَيْنَا كِتٰبٌ يَّنْطِقُ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝۶۲ بَلْ قُلُوْبُهُمْ فِىْ غَمْرَةٍ مِّنْ

اور ہمارے پاس ایک کتاب ہے جو ٹھیک ٹھیک بولے گی اور وہ لوگ ظلم نہیں کیے جائیں گے ۝۶۲ بلکہ ان کے دل جہالت میں ہیں اس کی

هٰذَا وَلَهُمْ اَعْمَالٌ مِّنْ دُوْنِ ذٰلِكَ هُمْ لَهَا عٰمِلُوْنَ ۝۶۳ حَتّٰٓى اِذَآ اَخَذْنَا مُتْرَفِيْهِمْ

طرف سے، اور ان کے لئے اعمال ہیں اس کے علاوہ بھی، وہ لوگ ان عملوں کو کرنے والے ہیں ۝۶۳ حتیٰ کہ جب ہم پکڑ لیں گے ان کے خوش حال لوگوں کو

بِالْعَذَابِ اِذَا هُمْ يَجْـَٔرُوْنَ ﴿۶۴﴾ لَا تَجْـَٔرُوا الْيَوْمَ ۫ اِنَّكُمْ مِّنَّا لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۶۵﴾ قَدْ

عذاب کے ساتھ اچانک وہ چلائیں گی ﴿۶۴﴾ انہیں کہا جائے گا کہ آج مت چلاؤ، بے شک تم ہماری طرف سے مدد نہیں کیے جاؤ گے ﴿۶۵﴾ تحقیق

كَانَتْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ تَنْكِصُوْنَ ﴿۶۶﴾ مُسْتَكْبِرِيْنَ ۖ بِهٖ

میری آیات پڑھی جاتی تھیں تم پر، پھر تم اپنی ایڑیوں کے بَل لوٹتے تھے ﴿۶۶﴾ تکبّر کرتے ہوئے، اس رسول کے متعلق

سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ ﴿۶۷﴾ اَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ اَمْ جَآءَهُمْ مَّا لَمْ يَاْتِ اٰبَآءَهُمُ

قصہ گوئی کرتے ہوئے، ہذیان بکتے ہوئے ﴿۶۷﴾ کیا ان لوگوں نے قول میں تدبر نہیں کیا؟ یا آ گئی ان کے پاس وہ چیز جو نہیں آئی تھی ان کے پہلے

الْاَوَّلِيْنَ ﴿۶۸﴾ اَمْ لَمْ يَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ فَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿۶۹﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ بِهٖ جِنَّةٌ ۭ

آباء کے پاس؟ ﴿۶۸﴾ یا نہیں پہچانا انہوں نے اپنے رسول کو پس وہ اس رسول کو اُوپرا جاننے والے ہیں ﴿۶۹﴾ یا یہ کہتے ہیں کہ اس کو جنون ہے؟

بَلْ جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ وَاَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ ﴿۷۰﴾ وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ

بلکہ رسول ان کے پاس حق لے کر آیا ہے اور ان میں سے اکثر حق سے کراہت کرنے والے ہیں ﴿۷۰﴾ اگر حق ان کی خواہشات کا تابع ہو جائے

لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ۭ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ

البتہ فاسد ہو جائیں گے آسمان اور زمین اور وہ سب چیزیں جو ان میں ہیں، بلکہ ہم ان کے پاس ان کی نصیحت لائے ہیں اور یہ لوگ اپنی نصیحت سے

مُّعْرِضُوْنَ ﴿۷۱﴾ اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ خَرْجًا فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ ڰ وَّهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۷۲﴾

اِعراض کرنے والے ہیں ﴿۷۱﴾ یا تو ان سے کوئی خراج مانگتا ہے؟ تیرے رَبّ کا خراج بہتر ہے اور وہ بہترین رزق دینے والا ہے ﴿۷۲﴾

وَاِنَّكَ لَتَدْعُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۷۳﴾ وَاِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ

اور بے شک آپ البتہ انہیں دعوت دیتے ہیں صراطِ مستقیم کی طرف ﴿۷۳﴾ اور بے شک وہ لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے،

عَنِ الصِّرَاطِ لَنٰكِبُوْنَ ﴿۷۴﴾ وَلَوْ رَحِمْنٰهُمْ وَكَشَفْنَا مَا بِهِمْ مِّنْ ضُرٍّ لَّلَجُّوْا

وہ راستے سے ایک طرف کو ہٹنے والے ہیں ﴿۷۴﴾ اور اگر ہم ان پر رحم کریں اور دُور ہٹا دیں اس تکلیف کو جو ان کو ہے تو البتہ اصرار کریں گے یہ

فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۷۵﴾ وَلَقَدْ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ فَمَا اسْتَكَانُوْا لِرَبِّهِمْ وَمَا يَتَضَرَّعُوْنَ ﴿۷۶﴾

اپنی سرکشی میں بھٹکتے ہوئے ﴿۷۵﴾ اور البتہ تحقیق ہم نے انہیں عذاب میں پکڑا پس یہ نہ دبے اپنے رَبّ کے لئے اور نہ یہ گڑگڑاتے ہیں ﴿۷۶﴾

حَتّٰۤی اِذَا فَتَحْنَا عَلَیْهِمْ بَابًا ذَا عَذَابٍ شَدِیْدٍ اِذَا هُمْ فِیْهِ مُبْلِسُوْنَ۝

حتیٰ کہ جب کھول دیں گے ہم ان کے اوپر دروازہ سخت عذاب کا، اچانک وہ اس عذاب میں مایوس ہونے والے ہوں گے ﴿۷۷﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ یٰۤاَیُّهَا الرُّسُلُ: رُسل رَسول کی جمع ہے، اور رسول مُرسَل کے معنی میں ہوتا ہے، بھیجا ہوا۔ اے رسولو! اے بھیجے ہوئے لوگو! كُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ: طیبات: عمدہ پاکیزہ حلال چیزیں، کیونکہ جو چیز حلال نہ وہ شرعی نقطۂ نظر سے پاکیزہ اور عمدہ نہیں ہوتی، اس لیے یوں ترجمہ کریں کہ عمدہ اور پاکیزہ چیزیں کھاؤ تو بھی بات صحیح ہے، اور یوں ترجمہ کریں کہ حلال کھاؤ تو بھی بات صحیح ہے، کیونکہ شرعی نقطۂ نظر سے عمدہ اور پاکیزہ چیز وہی ہے جو حلال بھی ہو۔ کھاؤ پاکیزہ چیزوں سے، وَاعْمَلُوْا صَالِحًا: اور نیک عمل کرو، اِنِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِیْمٌ: بے شک میں تمہارے عملوں کو جاننے والا ہوں، جاننے والا ہوں ان کاموں کو جو تم کرتے ہو، وَاِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً: اُمت جماعت کو بھی کہتے ہیں اور یہ لفظ ''طریقہ'' کے معنی میں بھی آتا ہے، اِنَّا وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤی اُمَّةٍ (سورۂ زُخرف: ۲۲) ہم نے اپنے آباء کو ایک طریقے پر پایا، تو یہاں ''طریقہ'' والا معنی زیادہ صحیح ہے۔ اور بے شک یہی تمہارا طریقہ ہے ایک ہی طریقہ، یعنی حلال کھانا اور نیک عمل کرنا جس کا ذکر پیچھے آیا ہے۔ وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ: یہ اس طریق کا حاصل ہے۔ اور میں تمہارا رَبّ ہوں، فَاتَّقُوْنِ، ن کے نیچے جو کسرہ ہے وہ یائے متکلم پر دلالت کرتا ہے، اَیْ فَاتَّقُوْنِیْ، پس تم مجھ ہی سے ڈرو۔ فَتَقَطَّعُوْۤا اَمْرَهُمْ بَیْنَهُمْ زُبُرًا: زُبُر ''زبور'' کی جمع ہو تو کتاب کے معنی میں ہوتا ہے، اور ''زُبرۃ'' کی جمع ہو تو ٹکڑے کے معنی میں، جیسے یہ لفظ آپ کے سامنے سورۂ کہف میں آیا تھا: اٰتُوْنِیْ زُبَرَ الْحَدِیْدِ، لوہے کے ٹکڑے، لوہے کی سِلیں، لوہے کی تختیاں میرے پاس لاؤ۔ تو یہاں بھی وہی مفہوم ہے ٹکڑے ٹکڑے۔ پس لوگوں نے اپنے اَمرِ دینی کو آپس میں ٹکڑے ٹکڑے کرلیا، كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَیْهِمْ فَرِحُوْنَ: کُلّ کے اندر چونکہ جمع والا معنی ہے اس لیے اس کی خبر فرحون جمع ہے۔ بِمَا لَدَیْهِمْ جو خیالات جو عقائد ان کے پاس ہیں ہر گروہ ان کے ساتھ خوش ہونے والا ہے، یعنی جو خیالات اس نے دینی طور پر اختیار کرلیے، جو عقیدے دینی طور پر اختیار کرلیے، جو طرزِ عمل دینی طور پر اختیار کرلیا، ہر کوئی اس کے ساتھ خوش ہونے والا ہے، سب اپنے اپنے خیالات میں خوش ہیں۔

فَذَرْهُمْ آپ انہیں چھوڑ دیجیے، ذَرْ اَمر کا صیغہ ہے، فِیْ غَمْرَتِهِمْ: غمرہ اصل کے اعتبار سے تو اس گہرے پانی کو کہتے ہیں جس میں انسان ڈوب جائے اور پانی میں چھپ جائے، پھر اس سے مراد جہالت، مدہوشی، غفلت، یہ چیزیں مراد لے لی جاتی ہیں جو انسان کے اوپر طاری ہو جائیں اور انسان ان میں مست ہو جائے مگن ہو جائے اور مغلوب ہو جائے، تو فِیْ غَمْرَتِهِمْ کا معنی یہ ہو جائے گا، ان کو ان کی جہالت میں چھوڑ دیجیے، ان کو ان کی گمراہی میں چھوڑ دیجیے، یہ حاصل ترجمہ ہے، ورنہ غمرہ اس گہرے پانی کو کہتے ہیں جو انسان کے اوپر طاری ہو جاتا ہے اور انسان اس میں ڈوب جاتا ہے۔ چھوڑ دیجیے انہیں ان کی بیہوشی میں ان کی جہالت میں ایک وقت تک۔ اَیَحْسَبُوْنَ: کیا ان لوگوں کا خیال ہے، یہ لوگ سمجھتے ہیں اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِیْنَ: مِنْ مَّالٍ میں جو مِن ہے یہ مَا

کا بیان ہے، اور بِہٖ کی ضمیر "مَا" کی طرف لوٹ رہی ہے، اور "مَا" موصولہ ہے۔ کیا وہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ چیز جس کے ذریعے سے ہم ان کو امداد دے رہے ہیں یعنی مال اور بیٹے، نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرٰتِ: ہم ان کے لیے جلدی کر رہے ہیں بھلائیوں میں؟ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ بلکہ یہ سمجھتے نہیں یعنی اگر ان کا خیال یہ ہے کہ یہ مال اور بیٹے جو ہم انہیں دیتے جارہے ہیں، تو ہم انہیں جلدی جلدی فائدے پہنچارہے ہیں، یہ انکا خیال غلط ہے، یہ صحیح نہیں سمجھتے، اگر ان کا ایسا خیال ہے تو یہ صحیح نہیں ہے۔ یہ مال اور بیٹے جو ہم ان کو کثرت کے ساتھ دیتے جارہے ہیں، یہ ہم ان کو بھلائیاں نہیں پہنچارہے، بلکہ یہ تو سارے کا سارا عذاب کا سامان ہے۔ کیا سمجھتے ہیں کہ جو کچھ ہم انہیں دے رہے ہیں مال اور بیٹے (یہ حاصل ترجمہ ہے کیونکہ "مِن" یہ "مَا" کا بیان ہے اور "بِہٖ" کی ضمیر "مَا" موصولہ کی طرف لوٹ گئی) وہ چیز جس کے ذریعے سے ہم انہیں امداد دے رہے ہیں یعنی مال اور بیٹے، ہم جلدی کر رہے ہیں ان کے لیے بھلائیوں میں؟ نہیں نہیں! ایسا نہیں! ("یہ بَلْ" کا مفہوم ہے، کیونکہ "بَلْ" کے ذریعے ماقبل والی کلام سے اضراب ہوتا ہے) بلکہ یہ لوگ سمجھتے نہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ: بے شک وہ لوگ جو اپنے رَبّ کی خشیت سے ڈرنے والے ہیں۔ خَشِيَ يَخْشٰى کا معنی بھی ڈرنا ہے اور یہاں اس کا ترجمہ "ہیبت" کے ساتھ کرلیں گے جیسے "بیان القرآن" میں کیا گیا ہے، بے شک وہ لوگ جو اپنے رَبّ کی ہیبت سے ڈرنے والے ہیں، وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ: اور وہ لوگ جو اپنے رَبّ کی آیات پر ایمان لاتے ہیں۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُوْنَ: اور وہ لوگ جو اپنے رَبّ کے ساتھ شریک نہیں ٹھہراتے، وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا: اور وہ لوگ جو دیتے ہیں جو کچھ دیتے ہیں، وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ: اس حال میں کہ ان کے دل ڈرنے والے ہوتے ہیں، اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ اس بات سے کہ وہ اپنے رَبّ کی طرف لوٹنے والے ہیں، اُولٰٓئِكَ يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ یہی لوگ بھلائیوں میں جلدی کرتے ہیں، بھلائیوں میں مسارعت کرتے ہیں، ایک دوسرے سے جلدی جلدی جاتے ہیں، وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ: اور وہ ان بھلائیوں کے لئے سبقت لے جانے والے ہیں۔ وَلَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا: اور نہیں تکلیف دیتے ہم کسی نفس کو مگر اس کی وسعت کے مطابق، وَلَدَيْنَا كِتٰبٌ يَّنْطِقُ بِالْحَقِّ: اور ہمارے پاس ایک کتاب ہے جو ٹھیک ٹھیک بولے گی، وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ اور وہ لوگ ظلم نہیں کیے جائیں گے، یعنی جو کچھ اعمال کیے جارہے ہیں تو ہمارے پاس ایک کتاب ہے جس میں لکھے جارہے ہیں اور جب وقت آئے گا تو کتاب ٹھیک ٹھیک بیان کرے گی اور ان لوگوں پر کچھ زیادتی نہیں کی جائے گی۔

بَلْ قُلُوْبُهُمْ فِيْ غَمْرَةٍ مِّنْ هٰذَا: یہ غَمْرَة وہی لفظ آ گیا جو ابھی گزرا ہے، بل کا مطلب یہ ہے کہ ان مؤمنین صالحین کی طرح یہ مشرکین کافرین نہیں سمجھتے، اور ان نیکیوں کی طرف نہیں آتے، بلکہ ان کے دل غفلت میں ہیں، جہالت میں ہیں، بے ہوشی میں ہیں، ان کو دنیا کی محبت کا اور اپنی خوش حالی کا نشہ چڑھا ہوا ہے۔ بلکہ ان کے دل گمراہی میں ہیں ان اعمال کی طرف سے، هٰذَا کا اشارہ مذکور کی تاویل میں ہو کر ماقبل کی طرف ہے، بلکہ ان کے دل اس کی طرف سے جہالت میں ہیں، وَلَهُمْ اَعْمَالٌ مِّنْ دُوْنِ ذٰلِكَ: اور ان کے لئے اعمال ہیں اس کے علاوہ بھی، هُمْ لَهَا عٰمِلُوْنَ: وہ لوگ ان عملوں کو کرنے والے ہیں، یعنی صرف ایک جہالت، مدہوشی اور غفلت ہی ان کا جرم نہیں، بلکہ ان کے علاوہ اور اعمال بھی ہیں جو یہ کر رہے ہیں۔

حَتّٰٓى اِذَآ اَخَذْنَا مُتْرَفِيْهِمْ بِالْعَذَابِ: اور ان کی یہ مدہوشی، یہ غفلت یہ جہالت اس وقت تک جاری رہے گی جب تک ہمارا

عذاب نہیں آتا حتیٰ کہ جب ہم پکڑلیں گے ان کے خوش حال لوگوں کو، مُتْرَفِيْهِمْ میں فی جارہ نہیں، مُتْرَفِيْهِمْ اکٹھا لفظ ہے، اصل میں مُتْرَفِيْنَ تھا، اضافت کی وجہ سے نون گر گیا، اور ترف خوش حالی کو کہتے ہیں، اور اسی سورت میں پہلے لفظ آیا ہے اَتْرَفْنٰهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا، تو یہ بھی اسی سے ہے، جب پکڑلیں ہم ان کے خوش حال لوگوں کو عذاب کے ساتھ، اِذَا هُمْ يَجْـَٔرُوْنَ: اچانک وہ چلائیں گے، لَا تَجْـَٔرُوا الْيَوْمَ: اَيْ يُقَالُ لَهُمْ پھر انہیں کہا جائے گا کہ آج مت چلاؤ، اِنَّكُمْ مِّنَّا لَا تُنْصَرُوْنَ: بے شک تم ہماری طرف سے مدد نہیں کیے جاؤ گے، قَدْ كَانَتْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ: تحقیق میری آیات پڑھی جاتی تھیں تم پر، فَكُنْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ تَنْكِصُوْنَ: پھر تم اپنی ایڑیوں پہ لوٹتے تھے، ایڑیوں کے بل لوٹتے تھے یعنی پیچھے کو بھاگ جاتے تھے، پیچھے کو رجحان کر لیتے تھے، اپنے سابق خیالات کی طرف لوٹ جاتے تھے، یہ بھی ایڑیوں کے بل لوٹنا ہوتا ہے۔ آعقاب عَقِبٌ کی جمع ہے بمعنی ایڑی۔

مُسْتَكْبِرِيْنَ ۖ بِهٖ سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ: بِهٖ کی ضمیر اکثر مفسرین نے بیت اللہ اور حرم کی طرف لوٹائی ہے، یہ اگرچہ پیچھے الفاظ میں مذکور نہیں لیکن چونکہ یہ آیات مکہ میں اُتری ہیں اور مخاطب بھی مشرکینِ مکہ ہیں، اور حرم اور بیت اللہ یہ چیزیں ایسی ہیں جو ہر وقت مستحضر فی الذہن ہوتی ہیں، یوں سمجھو کہ جب بیت اللہ کے آس پاس یہ آیات پڑھی جا رہی ہیں تو وہاں اس کا مصداق بہت جلدی سمجھ میں آجاتا ہے، انہیں یہ کہا جارہا ہے کہ تم اس بیت اللہ کی وجہ سے تکبّر کر رہے ہو کہ ہم اس بیت اللہ کے مجاور ہیں، اور اس کی وجہ سے ہمیں عزت حاصل ہے، یہی فخر، یہی تکبّر تمہارے لیے حق کے قبول کرنے سے مانع بنا ہوا ہے، تو جب بیت اللہ سامنے ہو یا قریب ہو تو مُسْتَكْبِرِيْنَ بِهٖ اس طرح سے پڑھتے ہوئے بِهٖ کی ضمیر کے مرجع کا جلدی سے ذہن میں آجانا کوئی بڑی بات نہیں ہے، تو مُسْتَكْبِرِيْنَ بِهٖ کا معنی یہ ہو جائے گا کہ تم اس بیت اللہ کی وجہ سے تکبّر کرنے والے ہو، تم سمجھتے ہو کہ ہم اس بیت اللہ کے مجاور ہیں، جب ہم مجاور ہیں تو دنیا اور آخرت کی عزت ہمارے لیے ہی ہے، تو ''ہٖ'' ضمیر لوٹ جائے گی حرم یا بیت اللہ کی طرف، جس کے مجاور ہونے کی وجہ سے، جس حرم کے سُکان ہونے کی وجہ سے، رہائشی ہونے کی وجہ سے، باشندے ہونے کی وجہ سے ان لوگوں میں تکبّر اور غرور تھا، وہ سمجھتے تھے کہ دنیا اور آخرت کی عزت ہمارے لیے ہی ہے اگر آخرت ہوئی، جیسے دنیا میں ہمیں خوش حالی ملی ہوئی ہے اسی گھر کی وجہ سے، تو اگر ایسا ہوا یعنی آخرت ہوئی تو چونکہ ہم اللہ کے گھر کے مجاور ہیں تو آخرت میں بھی ہمیں اسی طرح سے بڑائی ملے گی، تو تم اس بیت اللہ کی وجہ سے تکبّر کرنے والے ہو، ''ہٖ'' ضمیر حرم یا بیت اللہ کی طرف لوٹائیں تو ترجمہ یوں ہو جائے گا...... اور ''ہٖ'' ضمیر کو اگر اللہ کے رسول کی طرف لوٹائیں تو بھی ٹھیک ہے پھر مُسْتَكْبِرِيْنَ تکذیب والے معنی کو متضمن ہوگا، کیونکہ استکبار کا صلہ اصل میں عن آتا ہے، تو ''بِہٖ'' کی ''ب'' متعلق ہو جائے گی استکبار کے تکذیب والے معنی کے اعتبار سے، جس کا معنی یہ ہو جائے گا کہ تم تکبّر کرتے ہو اس رسول کی تکذیب کرتے ہوئے...... اور اگر قرآن کی طرف لوٹائیں تو بھی وہ وہی تکذیب والا معنی ہو جائے گا، اپنی ایڑیوں کے بل لوٹ جاتے ہو اس حال میں کہ تکبّر کرنے والے ہو اس قرآن کی تکذیب کرتے ہوئے یعنی اس قرآن کو قبول کرنے سے تکبّر کرتے ہو، یعنی اس قرآن کو قبول کرنے سے تکبّر کرتے ہو، تو اس میں تکذیب والا معنی آ گیا بہرحال ''ہٖ'' ضمیر بیت اللہ یا حرم کی طرف لوٹائیں تو بھی گنجائش ہے، اللہ کے رسول کی طرف لوٹائیں تو بھی گنجائش ہے، اور قرآن کی طرف

لوٹائیں تو بھی گنجائش ہے (آلوسی)۔ اگر رسول اور قرآن کی طرف لوٹائیں گے تو مُسْتَكْبِرِيْنَ میں تکذیب والا معنی مانیں گے، تب جا کے حرف جر کا تعلق اس کے ساتھ اچھی طرح سے واضح ہو جائے گا...... سٰمِرًا: یہ لفظ سمر سے لیا گیا ہے اور سمر کہتے ہیں قصہ گوئی کو، عرب عجم سب میں رواج ہے کہ کام کاج سے فارغ ہو کے رات کو اکٹھے ہو کے بیٹھ جاتے ہیں اور ادھر ادھر کے قصے کہانیاں افسانے سناتے ہیں، پُرانے بوڑھے تو بہت لمبی لمبی باتیں سنایا کرتے تھے، اور چھوٹے چھوٹے بچے بھی رات کو اکٹھے ہو کے بیٹھ جاتے ہیں اور ایک دوسرے کو باتیں سناتے ہیں، تو یہ قصہ گوئی پُرانا رواج ہے، رات کے اوّل حصے میں جمع ہو کے بیٹھ جاتے ہیں اور دیر تک باتوں میں گپ شپ میں اپنا وقت گزارتے ہیں، تو سمر کہتے ہیں اس قصہ گوئی کو، اور سامر کا معنی ہے قصہ گوئی کرنے والا...... اور تَهْجُرُوْنَ یہ لفظ هَجر سے بھی ہو سکتا ہے اور هُجر سے بھی ہو سکتا ہے...... ذرا خیال کریں، یہ آیت ان آیات میں سے ہے جن کی ترکیب متعدد طریقوں سے ہو سکتی ہے، جن کا مفہوم کئی طرح سے واضح کیا جا سکتا ہے، چند ایک آیتیں ایسی ہیں جو ترجمہ وترکیب کے لحاظ سے مشکل ہوتی ہیں، تو ان میں سے ایک آیت یہ بھی ہے۔ تو تَهْجُرُوْنَ هِجر سے ہے یا هُجر سے ہے، اگر هِجر سے ہو تو چھوڑنے کے معنی میں ہے، اور هُجر کہتے ہیں بکواس کرنے کو، ہذیان کو، بدگوئی کرنے کو...... اب سٰمِرًا سے کیا مراد ہے، اس کا لفظی معنی تو ہے قصہ گو، اگر سٰمِرًا کو تَهْجُرُوْنَ کا مفعول بنائیں تو معنی یہ ہوگا کہ تم اس رسول کی تکذیب کرتے ہوئے تکبّر کرنے والے، اور ایک قصہ گو کو چھوڑنے والے، یعنی رسول کو تم ایک قصہ گو سمجھتے ہو، اور اس کو اس طرح سے چھوڑ کر چلے جاتے ہو جیسے کوئی آدمی بیٹھا ایسے ہی حکایتیں سنا رہا ہے، کہانیاں سنا رہا ہے، باتیں سنا رہا ہے، تو جب انسان کا جی چاہا، لاپروائی کے ساتھ اٹھا، اٹھ کر چل دیا، اس کو چھوڑ کر چلے گئے، اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی، تو گویا کہ رسول کو تم "سامر" سمجھتے ہو، اور رسول کو چھوڑ کے جاتے ہو تو یہ ایسے ہے جیسے قصہ گو کو چھوڑ کر چلے گئے، اگر تَهْجُرُوْنَ "هجر" سے لیں اور "سامراً" کو اسی کا مفعول بنائیں تو معنی یوں ہو جائے گا (دیکھیں تفسیر عثمانی)...... اور سٰمِرًا کو مفرد کی بجائے جمع کے معنی میں بھی لیا جا سکتا ہے، اور پھر بِهٖ کو مُسْتَكْبِرِيْنَ کی بجائے سٰمِرًا کے متعلق بھی کر سکتے ہیں، اس حال میں کہ تم تکبّر کرنے والے ہو، اور اس اللہ کے رسول یا قرآن کے متعلق تم قصہ گوئی کرنے والے ہو، اور بکتے ہو، تَهْجُرُوْنَ کا مفہوم پھر یوں ہو جائے گا، ہذیان بکتے ہو، فضول بولتے ہو اس رسول کے متعلق گھڑ کے تم کہانیاں بناتے ہو، قصے کرتے ہو، اکٹھے ہو کے بیٹھ جاتے ہو، اور اس رسول کے متعلق تم قصے بناتے ہو، افسانے بناتے ہو، اور اس طرح سے تم یاوہ گوئی کرتے ہو، لغو باتیں بکتے ہو، پھر مفہوم یہ ہو جائے گا...... یا تو بِهٖ کا تعلق ماقبل کے ساتھ ہے، کہ مُسْتَكْبِرِيْنَ بِهٖ ایک طرف، اور سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ ایک طرف، اب تَهْجُرُوْنَ کا معنی ہوگا چھوڑنا۔ مطلب یہ ہوگا کہ تم تکبّر کرنے والے ہو اس اللہ کے رسول کے متعلق اس کی تکذیب کرتے ہو، اور ایک قصہ گو کو چھوڑ جاتے ہو، یعنی رسول کو ایک قصہ قرار دے کے اس کو چھوڑ کے چل دیتے ہو، اس کی تمہارے دل میں اہمیت نہیں ہے...... اور اگر سٰمِرًا کو جمع کے معنی میں لے لیں تو بِهٖ اسی کا متعلق مقدم ہو جائے یعنی بِهٖ سٰمِرًا، اس رسول کے متعلق تم قصہ گوئی کرتے ہو، اور مُسْتَكْبِرِيْنَ کی طرح اس میں بھی معنی جمع والا ہوگا، سامرین کے معنی میں ہوگا، اس حال میں کہ تم اس رسول کے متعلق قصہ گوئی کرتے ہو، اور فضول بکتے ہو، اور اس صورت میں تَهْجُرُوْنَ، هُجر سے ہو جائے گا۔ هُجر کا معنی

ہوتا ہے فضول گفتگو کرنا، جس کو ہم ہذیان کہتے ہیں، یا بکواس کرنا کہتے ہیں۔ جس وقت میری آیات تم پر پڑھی جاتی ہیں، پھر تم اپنی ایڑیوں کے اوپر پھر جاتے ہو، تکبر کرتے ہوئے، رسول کی تکذیب کرتے ہوئے، قصہ گو کو چھوڑتے ہوئے، یا، تکبر کرتے ہوئے، رسول کے متعلق قصہ گوئی کرتے ہوئے، ہذیان بکتے ہوئے۔

اَفَلَمْ یَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ: کیا ان لوگوں نے قول میں تدبر نہیں کیا؟ قول سے یہی قولِ رسول مراد ہے، جو قَدْ کَانَتْ اٰیٰتِیْ تُتْلٰی عَلَیْکُمْ سے معلوم ہو رہا ہے، تدبر کا لفظ اصل میں دُبر سے لیا ہوا ہے، دُبر کہتے ہیں ہر چیز کے پچھلے حصے کو، تو کسی بات میں یوں غور کرنا کہ اس بات کا انجام کیا ہے؟ صحیح ہے غلط ہے؟ مفید ہے نقصان دہ ہے؟ اس کو سوچنا، یہ ہے تدبر۔ کیا انہوں نے قول میں تدبر نہیں کیا؟ اَمْ جَآءَهُمْ مَّا لَمْ یَاْتِ اٰبَآءَهُمُ الْاَوَّلِیْنَ: یا ان کے پاس آ گئی وہ چیز جو نہیں آئی تھی ان کے پہلے آباء کے پاس؟ اَمْ لَمْ یَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ فَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ: یا نہیں پہچانا انہوں نے اپنے رسول کو پس وہ اس رسول کو اوپرا جاننے والے ہیں، اَمْ یَقُوْلُوْنَ بِهٖ جِنَّةٌ: یا یہ کہتے ہیں کہ اس کو جنون ہے؟ ان باتوں میں سے کوئی بات نہیں، ان کے اعراض کی یہ وجہ نہیں، یہ قول کو بھی سمجھتے ہیں، اور باتیں بھی ایسی نہیں ہیں جو پہلے لوگوں کے پاس نہ آئی ہوں، پہلے سے ہی رسول آئے ہیں اور اس قسم کی باتیں اللہ کی طرف سے آتی ہیں، اور یہ اپنے رسول کو بھی اچھی طرح سے پہچانتے ہیں، یہ کوئی اجنبی شخصیت نہیں ہے، کہ پہچانتے نہ ہوں اور اس کو اجنبی سمجھتے ہوں، اس کے صدق امانت دیانت ہر چیز سے واقف ہیں، اور یہ بھی ان کا دل جانتا ہے کہ اس کو جنون نہیں، یہ ان سب سے زیادہ عقل مند اور سمجھدار ہے، پھر یہ مانتے کیوں نہیں، نہ ماننے کی یہ وجوہ نہیں ہیں، بَلْ جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ وَاَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ: بلکہ وجہ یہ ہے کہ ان کے پاس حق بات لایا ہے اور ان میں سے اکثر حق سے کراہت کرنے والے ہیں، حق ان کو پسند نہیں، بس شہوات پرستی میں، لذت پرستی میں اپنی خواہشات کے پیچھے جو لگے ہوئے ہیں، بس اسی میں دوڑے جا رہے ہیں، سچی بات انہیں اچھی نہیں لگتی۔

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ: اگر حق ان کی خواہشات کا تابع ہو جائے، جس طرح سے ان کی خواہش ہے کہ یہ رسول ایسی باتیں لائے جو ہماری مرضی کے مطابق ہوں، اسی طرح جیسے وہ قرآن کریم میں تبدیلی کا مطالبہ کرتے تھے، اگر حق ان کی خواہشات کا تابع ہو جائے، لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِیْهِنَّ تو زمین و آسمان فاسد ہو جائیں گے، کیونکہ ان کی خواہشات بہت متضاد ہیں، اور اللہ کے غضب کو دعوت دینے والی ہیں، اگر حق اسی کو قرار دے دیا جائے جو ان کی خواہشات ہیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ فسق و فجور عیاشی بدمعاشی اس سب کو حق قرار دے دیا جائے، اور اس کے اوپر اللہ کا غضب آئے گا، زمین و آسمان ٹوٹ پھوٹ جائیں گے۔ اگر حق ان کی خواہشات کا تابع ہو جائے البتہ خراب ہو جائیں گے آسمان اور زمین اور وہ سب چیزیں جو ان میں ہیں۔

بَلْ اَتَیْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ: بلکہ ہم ان کے پاس ان کی نصیحت لائے ہیں، فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ: اور یہ لوگ اپنی نصیحت سے اعراض کرنے والے ہیں، یعنی ہم ان کو جو یاد دہانی کرا رہے ہیں یہ انہی کے نفع کی یاد دہانی ہے، اور یہ اس سے اعراض کرنے والے ہیں۔

اَمْ تَسْئَلُهُمْ خَرْجًا: اور اعراض کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ ایک آدمی باتیں تو آپ کو اچھی بتاتا ہے لیکن بات بتانے پر فیس مانگتا ہے کہ میں نے تمہیں یہ بات جو دی ہے تو مجھے اتنے پیسے دو۔ یا تو ان سے کوئی خراج مانگتا ہے، اس لیے یہ لوگ بدکتے

ہیں؟ یعنی خراج بھی آپ نہیں مانگتے فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ: تیرے رَبّ کا خراج بہتر ہے، جو تیرے رَبّ کی طرف سے تجھے ملے گا وہ بہتر ہے، وَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ: اور وہ بہترین رزق دینے والے ہے، وَاِنَّكَ لَتَدْعُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ: اور بے شک آپ البتہ انہیں دعوت دیتے ہیں صراطِ مستقیم کی طرف، وَاِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ: اور بے شک وہ لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے عَنِ الصِّرَاطِ لَنٰكِبُوْنَ: نَکَبَ عَنْہُ: ایک طرف کو ہٹ جانا۔ وہ راستے سے ایک طرف کو ہٹنے والے ہیں، وَلَوْ رَحِمْنٰهُمْ: اور اگر ہم ان پر رحم کریں، وَكَشَفْنَا مَا بِهِمْ مِّنْ ضُرٍّ اور دُور ہٹا دیں اس تکلیف کو جو ان کو ہے، لَّلَجُّوْا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ: ''لَجّ'' کا معنی ہوتا ہے کسی بات میں اَڑ کے لگے رہنا، تو البتہ یہ اِصرار کریں اپنی سرکشی میں بھٹکتے ہوئے۔ یعنی اگر کبھی ایسا ہو جاتا ہے کہ انہیں تکلیف پہنچتی ہے پھر ہم رحم کر کے اس کو دُور کر دیتے ہیں، تو نہ یہ تکلیف سے متاثر ہو کے سیدھے ہوتے ہیں، نہ ہمارے رحم کے شکریہ کے طور پر سیدھے ہوتے ہیں، اپنی اسی طغیان اور سرکشی میں اندھے ہو کر بھٹکتے پھرتے ہیں، اسی پہ مُصر رہتے ہیں۔ ''عَمِیَ'' کا معنی ہوتا ہے آنکھوں سے اندھا ہونا، اور ''عَمِهَ'' کا معنی ہوتا ہے دل کا اندھا ہونا، یعنی جس کے دل میں بصیرت پیدا نہیں ہوئی اور وہ بھٹکتا پھرتا ہے۔ وَلَقَدْ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ: اور البتہ تحقیق ہم نے انہیں عذاب میں پکڑا، عذاب سے دُنیوی تکلیفیں مراد ہیں، فَمَا اسْتَكَانُوْا لِرَبِّهِمْ: پس یہ نہ دبے اپنے رَبّ کے لئے، وَمَا يَتَضَرَّعُوْنَ: اور نہ یہ گڑگڑاتے ہیں، زاری کرتے ہیں۔ تضرّع: گڑگڑانا، زاری کرنا۔ حَتّٰى اِذَا فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا ذَا عَذَابٍ شَدِيْدٍ: حتیٰ کہ جب کھول دیں گے ہم ان کے اوپر دروازہ سخت عذاب کا، اِذَا هُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ: پس اچانک وہ اس عذاب میں مایوس ہونے والے ہوں گے۔ یعنی یہ چھوٹی چھوٹی تکلیفوں سے متاثر نہیں ہوتے، اور ان کی یہ سرکشی اس وقت تک جاری رہے گی جب تک ان کے اوپر سخت عذاب کا دروازہ نہ کھل جائے، اور جب سخت عذاب کا دروازہ کھل جائے گا تو پھر یہ مایوس ہو جائیں گے، ان کو چھوٹنے کی کوئی امید نہیں رہے گی۔ اَبْلَسَ مایوس ہونے کے معنی میں ہے، پس اچانک یہ اس میں امید توڑ بیٹھیں گے، آس توڑ بیٹھیں گے۔

تفسیر

ماقبل سے ربط

جس طرح سے اس سورت کی اِبتدا میں اللہ تعالیٰ نے عبادت کی ترغیب دی تھی، اس رکوع کی پہلی آیت بھی اسی ترغیب کے سلسلے میں ہے۔

حلال اور حرام کھانے کے اثرات اعمال پر

رسولوں کو خطاب کر کے دو حکم دیے گئے، اور رسولوں کی وساطت سے یہی حکم امتوں کو دیا گیا کہ حلال کھاؤ، اور نیک اعمال کرو۔ ان دو باتوں کی بہت اہمیت ہے اور دونوں کا آپس میں جوڑ ہے یعنی حلال کھانا اور نیک عمل کرنا، حلال کھائیں گے تو نیک عمل کی توفیق ہوگی اور نیک عمل پر اچھے اثرات مرتب ہوں گے، اور اگر کھانا حلال نہ ہو تو اول تو نیک عمل کی توفیق ہی نہیں ہوتی، اور اگر

توفیق ہو بھی جائے تو اس قسم کا عمل اللہ کے ہاں قبول نہیں ہوتا۔حرام کھا کے کوئی شخص اللہ کی جنت کو حاصل نہیں کر سکتا، جنت اگر ملے گی تو نیک اعمال سے ملے گی، اور نیک اعمال ناشی ہوتے ہیں حلال خوراک سے۔حدیث شریف میں آتا ہے سرور کائنات ﷺ نے فرمایا: ''کُلُّ لَحْمٍ نَبَتَ مِنَ السُّحْتِ کَانَتِ النَّارُ اَوْلٰی بِهٖ'' ہر وہ گوشت جو حرام مال کھانے کے ذریعے سے پیدا ہوا ہو تو جہنم ہی اس کے لائق ہے،[1] ایسا گوشت جہنم میں جائے گا، جنت میں نہیں جائے گا۔اور اسی طرح سے حضور ﷺ نے فرمایا کہ ایک آدمی سفر میں ہے(سفر میں انسان کے اوپر ویسے ہی تواضع اور انکسار کے حالات طاری ہو جاتے ہیں) اور وہ اللہ کے سامنے لمبے لمبے ہاتھ پھیلاتا ہے،(اور ہاتھ پھیلانا، زاری کرنا، یہ دعا کی قبولیت کا ایک مستقل ذریعہ ہے) یا ربّ! یا ربّ! کہہ کے الحاح کرتا ہے، لیکن ''مَطْعَمُهٗ حَرَامٌ وَمَشْرَبُهٗ حَرَامٌ وَمَلْبَسُهٗ حَرَامٌ وَغُذِیَ بِالْحَرَامِ فَاَنّٰی یُسْتَجَابُ لِذٰلِكَ'' اس کی خوراک حرام ہے، اس کا پینا حرام کا ہے، اس کا لباس حرام ہے، ابتدا سے اس کو حرام کی غذا دی گئی، اس کی دعا کہاں قبول ہوگی۔[2] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حرام خوری کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ دعا بھی قبول نہیں فرماتے، تو حلال کھانا ایک بنیادی چیز ہے، حلال کھانے کے ساتھ پھر انسان کو حرام کاموں سے اللہ تعالیٰ محفوظ رکھتے ہیں اور نیکی کی توفیق دیتے ہیں۔یہ واقعہ ہے، آپ جس وقت بھی دیکھیں گے، جن لوگوں کی کمایاں حرام ہیں، رشوت کھاتے ہیں، سود کھاتے ہیں، یا ان کے پاس چوری کا، ڈکیتی کا، دھوکے بازی کا مال ہوتا ہے، اکثر و بیشتر آپ دیکھیں گے کہ وہ لوگ عیاش ہوں گے، بدمعاش ہوں گے، اور فسق و فجور کے اندر مبتلا ہوں گے، جیسا کھائیں گے اسی قسم کے اثرات ان کے بدن پر طاری ہوتے ہیں، شراب اور زنا حرام کمائی والوں کا عام مشغلہ ہوتا ہے، ان کو نیکی کی توفیق نہیں ہوا کرتی۔اگر آپ نیک عمل کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے بہت ضروری ہے کہ رزق حلال حاصل کیجئے.....تو اللہ کے رسولوں کو حکم دے کر اصل میں سنانا امتوں کو مقصود ہے، ورنہ اللہ کے رسول تو معصوم ہوتے ہیں، وہ تو کسی قسم کی غلطی کر نہیں سکتے، ان کی وساطت سے یہ حکم امتوں کو دیا جا رہا ہے۔

سب رسولوں کے اُصول ایک ہی ہیں

اور پھر فرمایا کہ تم سب کا طریقہ یہی ایک ہی طریقہ ہے، رسول جتنے بھی آئے اصول سب کے ایک ہی تھے، دین ایک ہی ہے، اسلام ہی لے کے آئے، اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کا درس دیتے تھے، وقتی طور پر اگر چند احکام میں اختلاف آ جائے تو یہ ملّت اور دین کا اختلاف نہیں ہے، وہ تو ایسے ہے جیسے ہم سب کا دین اسلام ہے، لیکن آپ جانتے ہیں کہ احادیث کی روشنی میں فقہاء کے مسلک علیحدہ علیحدہ بھی ہیں، یا جیسے ہم سب انسان ہیں، انسان ہونے میں کوئی شبہ نہیں، لیکن کسی کا رنگ گورا ہے کسی کا کالا ہے، کسی کا قد لمبا ہے کسی کا چھوٹا ہے، کسی کی آنکھیں چھوٹی ہیں کسی کی بڑی ہیں، کسی کی ناک کیسی ہے کسی کی کیسی ہے، تو یہ جو تھوڑا بہت تشخص میں فرق ہوتا ہے اس سے انسانیت میں فرق نہیں آیا۔یہی وجہ ہے کہ دین تو سب انبیاء کا ایک ہی ہوتا ہے،

(۱) مشکوۃ ۲۴۲/۱، باب الکسب، فصل ثانی۔نیز ترمذی ۱۳۲/۱، باب ما ذکر فی فضل الصلوۃ۔ ولفظه: اِنَّهٗ لَا یَرْبُوْ لَحْمٌ نَبَتَ مِنْ سُحْتٍ اِلَّا کَانَتِ النَّارُ اَوْلٰی بِهٖ

(۲) مسلم ۳۲۶/۱ باب بیان اسم الصدقة یقع علی کل الخ. ترمذی ۱۲۸/۲، کتاب التفسیر، سورۃ بقرہ کا آخر۔مشکوۃ ۲۴۱/۱ باب الکسب، فصل اول۔

وقتی مصلحت کے طور پر یہ جزوی اختلافات جو ہوتے ہیں، یہ تو ایسے ہی ہیں جیسے انسانوں کی شکل وصورت میں اختلافات آ گئے، ان اختلافات کے باوجود حقیقت ایک ہی رہتی ہے۔ تو یہ طریقہ ایک ہی طریقہ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ میں ہی تمہارا رب ہوں، پس مجھ سے ہی ڈرو۔ جیسے سورۂ مریم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وعظ میں آیا تھا اِنَّ اللّٰہَ رَبِّیْ وَرَبُّکُمْ فَاعْبُدُوْہُ کہ اللہ ہی میرا اور تمہارا رب ہے، پس تم اسی کی عبادت کرو۔

مال واولاد کی کثرت کُفّار کے لئے درحقیقت آلۂ عذاب ہیں

لوگوں نے اپنے اس اَمرِ دینی کو ٹکڑے ٹکڑے کرلیا، اور ہر شخص نے جو عقیدہ اختیار کرلیا جو نظریہ اختیار کرلیا اسی پہ خوش ہے۔ اور یہ واقعہ ہے، جس کے پاس چاہے چلے جاؤ، جس نے جو بھی نظریہ اختیار کررکھا ہے وہ سمجھتا ہے کہ بس یہی ٹھیک ہے، اپنے عقائد اور اپنے خیالات پر سارے ہی خوش ہیں، تو آپ ان کے پیچھے نہ پڑیے، ان کو ان کی جہالت میں چھوڑ دیجئے ایک وقت تک۔ اور پھر اگر یہ مال ودولت کی وجہ سے، بیٹوں کی کثرت کی وجہ سے غرور میں آئے ہوئے ہیں، تو یہ کوئی اچھی چیز نہیں جو اللہ انہیں دے رہا ہے، یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے استدراج ہے، ان کی رسی ڈھیلی چھوڑی ہوئی ہے، جیسے سورۂ براءت کے اندر آیا تھا وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَاَوْلَادُهُمْ ۚ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا (سورۂ توبہ:۸۵) ان کے مالوں اور ان کی اولاد کو دیکھ کے تعجب میں نہ پڑیں، کہ یہ فاسق ہیں، منافق ہیں، کافر ہیں، اللہ کے ناشکرے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ انہیں اولاد اور مال کیوں دے رہا ہے، اللہ تعالیٰ اسی مال اور اولاد کے ذریعے ان کو عذاب دینا چاہتا ہے۔ یہ مال اور اولاد ان کے لیے دنیا میں بھی عذاب بنتی ہے، پریشانیوں کا باعث بنتی ہے، اور اسی کی وجہ سے غرور میں مبتلا ہو کے جو آخرت کے لیے تیاری نہیں کرتے تو آخرت میں یہ مستقل عذاب کا ذریعہ بنے گی، تو یہ ان کے اسی ذہن کے اوپر چوٹ لگائی جارہی ہے جو مال اور اولاد کی وجہ سے غرور میں آ کے حق کے مطابق عمل نہیں کرتے کہ وہ یہ نہ سمجھیں کہ ہم ان کو اچھی چیزیں دے رہے ہیں، اچھی چیزیں نہیں ہیں، بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ کا یہی معنی ہے کہ یہ اس بات کو سمجھتے نہیں، کہ مال اور اولاد کے متعلق سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیں بھلائیاں مل رہی ہیں، تو مال اور اولاد بھلا ہے، لیکن بشرطیکہ اللہ کی عبادت اور اس کی اطاعت کا ذریعہ بن جائے، اللہ کی شکرگزاری کا ذریعہ بن جائیں، پھر تو یہ اچھی چیزیں ہیں، اور اگر یہ اللہ کی نافرمانی کا ذریعہ بن جائیں، بغاوت اور سرکشی کا ذریعہ بن جائیں، پھر یہ آلۂ عذاب ہیں، یہی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔

نیکیوں میں سبقت کرنے والے لوگ

ہاں! البتہ نیکیوں کی طرف مسارعت اور نیکیوں کے لیے مسابقت ان لوگوں کی ہے (جن کی صفات آرہی ہیں) یعنی یہ چیزیں ہیں جن کی وجہ سے انسان نیکی میں آگے بڑھتا ہے۔ مال میں ترقی یا اولاد میں ترقی کے ساتھ انسان کوئی درجہ حاصل نہیں کرتا، یہ اچھے لوگ ہیں جن کا آگے ذکر کیا جارہا ہے، یہ مؤمنین کے لئے بشارت ہے اور ان کی مدح ہے، جو اپنے رب کی آیات پر ایمان لاتے ہیں، تو رب کی آیات پہ ایمان لانا، اور اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا، اور ہر وقت اس کی ہیبت سے ڈرتے رہنا، اور دیتے ہیں جو کچھ دیتے ہیں اور ان کے دل ڈر رہے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ کے ہاں قبول نہ ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری اس نیکی

کے اندر کوئی کسی قسم کا خلل آجائے، یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور عبادت کرتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں۔ ایک بدبخت انسان ایسا ہوتا ہے جو اللہ کی نافرمانی کرتا ہوا نہیں ڈرتا، جس طرح سے مشرکین مکہ تھے کہ اللہ کی نافرمانی کرتے تھے، اور نافرمانی کرنے کے باوجود نہیں ڈرتے تھے، اور نیک لوگ وہ ہوا کرتے ہیں جو نیکی کرتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں۔ جیسے حضرت عائشہ صدیقہ نے حضور ﷺ سے پوچھا تھا کہ یارسول اللہ! یہ جو آیا ہے کہ وہ ڈرتے ہیں، تو کیا وہ چوری کرنے کی وجہ سے ڈرتے ہیں؟ شراب پینے کی وجہ سے ڈرتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ نہیں، نیکیاں کرتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارے اس عمل میں کوئی نقص رہ جائے اور اللہ کے ہاں قبول نہ ہو، یہ خوف ان کے اُوپر ہر وقت طاری رہتا ہے۔[1] تھوڑی سی نیکی کرنا، نیکی کرنے کے بعد مست ہو جانا کہ ہم نے بہت نیکی کر لی اور جنت ہمارے لیے ہوگئی، یہ اچھی علامت نہیں ہے، یہ عمل کے قبول نہ ہونے کی علامت ہے، عمل قبول وہی ہوتا ہے کہ جس میں خوف اور رَجاء دونوں لگے ہوئے ہوں، کہ اللہ کی رحمت سے امید بھی رکھو، لیکن اس بات سے ڈرو بھی کہ کسی مخفی خامی کی بنا پر یہ رَدّ نہ کر دیا جائے۔ اور یہ خوف ان کے اوپر طاری رہتا ہے کہ ہم اپنے رَبّ کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں، اور وہاں جب جائیں گے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری اس نیکی میں کوئی خلل نکل آئے، یہ لوگ ہیں جو نیکیوں میں سبقت لے جانے والے ہیں، بھلائیوں میں سبقت لے جانے والے ہیں، مال واولاد میں ترقی کرنے بھلائیوں میں سبقت لے جانے والے نہیں، بلکہ یہ لوگ بھلائیوں میں سبقت لے جانے والے ہیں، ایک دوسرے سے آگے نکلنے والے ہیں۔

کوئی ایسا نیک کام نہیں جو اِنسان نہ کرسکے

پھر آگے ان اعمال کی ترغیب اس انداز سے دی گئی کہ جو کچھ یہ ذکر کیا گیا اوپر، یعنی نیک اعمال، یہ کوئی ایسے مشکل نہیں کہ انسان ان کو نہ کر سکے، ہم کسی نفس کو تکلیف نہیں دیتے مگر اس کی وسعت کے مطابق، یہ سارے کے سارے کام انسان کی وسعت میں ہیں، کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔ اور جو کوئی کرے گا اس کا کوئی عمل ضائع نہیں کیا جائے گا، ہمارے پاس کتاب ہے جس میں سب کچھ درج ہوتا چلا جارہا ہے، اور وہ لوگ ظلم نہیں کیے جائیں گے۔ یہ تو مؤمنین کی حالت ہوگئی۔

مشرکین اور مال دار، نیکیوں کی طرف متوجہ کیوں نہیں ہوتے؟

مشرکین ان نیکیوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتے؟ ان باتوں سے متأثر نہیں ہوتے، بلکہ ان کے دل غفلت میں پڑے ہوئے ہیں، اور صرف جہالت غفلت یہی انکا جرم نہیں، ان کے اور بھی اعمال ہیں ان کے علاوہ جن کو یہ کرنے والے ہیں، اس میں سارا فسق وفجور آ گیا۔ اور ان کی یہ غفلت اس وقت تک جاری رہے گی جب تک کہ ہماری طرف سے عذاب نہ آجائے، اور جب ہم ان کے خوش حال لوگوں کو پکڑیں گے (خوش حال لوگوں کا ذکر اس لیے کر دیا کہ ان لوگوں کے پاس اپنے تحفظ کا سامان ہوتا ہے، جب اللہ کی گرفت ان پر آجائے گی تو باقی بیچارے جن کے پاس اپنی حفاظت کا سامان ہی نہیں ہوتا وہ تو کس شمار میں ہیں، نچلا طبقہ تو رگڑے

(۱) ترمذی ۲/ ۱۵۱، ابواب التفسیر، سورۂ مؤمنون/ ابن ماجہ ص ۳۰۹، کتاب الزھد، باب التوقی فی العمل/ مشکوۃ ۲/ ۴۵۷، باب البکاء، فصل ثانی۔

میں آہی جایا کرتا ہے) جب ہم ان کے خوش حال لوگوں کو پکڑیں گے عذاب میں پس اچانک یہ چلائیں گے، پھر انہیں کہا جائے گا کہ آج مت چلاؤ، بے شک تم ہماری طرف سے مدد نہیں کیے جاؤ گے یعنی اب روؤ، پیٹو، جو چاہو کرو، ہماری طرف سے مدد نہیں ملے گی، جرائم تمہارے یہی ہیں کہ آیات تم پر پڑھی جاتی تھیں اور تم اپنی ایڑیوں کے بل پھر جاتے تھے منہ موڑ کے چلے جاتے تھے۔

کافروں کو حق بُرا لگتا ہے

اگلی آیت کا مفہوم میں نے اچھی طرح سے آپ کے سامنے واضح کر دیا، تکبّر کرنے والے ہوتے تھے تم، اس رسول کی تکذیب کرنے والے ہوتے تھے، اللہ کے قرآن اور اللہ کے رسول کے متعلق قصہ گوئی کرنے والے ہوتے تھے، فضول بکواس کرتے تھے، یا یہ مطلب ہے کہ رسول کو اس طرح چھوڑ کر چلے جاتے تھے جس طرح سے کسی قصہ گو کو چھوڑ کے جایا کرتے ہیں......
اب ان کے نہ ماننے پر یہ کہا جارہا ہے کہ نہ ماننے کی وجہ کیا ہے؟ یہ نہیں کہ یہ بات سمجھتے نہیں، اور یہ نہیں کہ کوئی نئی بات ہم نے ان کے سامنے ذکر کر دی جو پہلے لوگوں کے پاس نہیں آئی، یا یہ رسول ان کے لیے کوئی اجنبی ہے اس کو پہچانتے نہیں، ان باتوں میں سے کوئی بات نہیں ہے، یا یہ کہتے ہیں کہ یہ تو پگلا ہے اس کو جنون ہو گیا تو یہ جنون والی بات بھی نہیں، اصل بات یہ ہے کہ ان لوگوں کو حق بُرا لگتا ہے، ہم ان کے پاس حق لائے ہیں اور حق سے ان کی طبیعت میں کراہت ہے، حق کے خود تابع ہوتے نہیں اور چاہتے ہیں کہ حق ہماری خواہشات کے تابع ہو جائے، حق کے خواہشات کا تابع ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہماری خواہشات کو ہی حق قرار دے دیا جائے۔

حق کو لوگوں کی خواہشات کے تابع کر دینا فسادِ عظیم کا سبب ہے

اگر اس طرح سے اس رسی کو ڈھیلا چھوڑ دیا جائے کہ جو یہ لوگ چاہیں اسی کو حق قرار دے دیا جائے تو زمین و آسمان کا نظم کبھی بحال ہی نہیں رہ سکتا فساد ہی فساد ہو جائے گا، چنانچہ خواہشات پر چلنے کے نتیجے میں آپس میں اختلافات اور توڑ پھوڑ تو روز آپ کے سامنے ہوتی رہتی ہے، اتفاق تو تبھی رہ سکتا ہے کہ حق ایک متعین ہو اور لوگ اپنی خواہشات کو اس کے تابع کریں اور اگر حق کو اپنی خواہشات کے ساتھ موڑنا شروع کر دیا یعنی حق اسی چیز کو قرار دے دیا گیا جو اپنے دل کی خواہش ہے تو کسی صورت میں امن و امان قائم نہیں ہوسکتا، فساد ہی فساد ہو جائے گا۔ آپ کی خواہش اور ہے آپ اس کو حق قرار دے دیں، میری خواہش اور ہے میں اس کو حق قرار دے دوں، اور اسی حق کے پیچھے لڑتے رہیں، اصل میں ہیں اپنی خواہشات، اور اسی کے نتیجے میں فساد ہوگا۔ ہم ان کے پاس ان کی نصیحت لائے ہیں اور یہ اپنی نصیحت سے اعراض کرنے والے ہیں یعنی ہم ان کو جو یاد دہانی کروا رہے ہیں انہی کے فائدے کی یاد دہانی کروا رہے ہیں، اور یہ ادھر سے منہ موڑے ہوئے ہیں۔

کسی رسول نے کبھی ''فیس'' کا مطالبہ نہیں کیا

اور ان کے نہ ماننے کی یہ وجہ بھی نہیں ہوسکتی کہ آپ ان سے دنیا طلب کرتے ہیں، پیسے مانگتے ہیں، فیس کا مطالبہ کرتے

ہیں، اُجرت لیتے ہیں۔ اور مطالبے کی نفی قرآن کریم میں تقریباً ہر رسول نے کی کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا، مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ (سورۂ شعراء) ہر رسول یہ اعلان کرتا ہے کہ یہ نہ سمجھنا کہ میں کسی دنیوی غرض کے لئے، کوئی مال مفاد اٹھانے کے لیے تمہارے پیچھے لگا ہوا ہوں، ایسی بات نہیں ہے، یہ سراسر تمہارا نفع ہے..... تیرے رَبّ کا خراج (خراج یہاں آمدنی کے معنی میں ہے) یا تو ان سے کوئی محصول مانگتا ہے؟ کوئی خرج مانگتا ہے؟ خرج ایسے ہے جیسے آپ خرچ کا لفظ استعمال کرتے ہیں، آپ ان سے کوئی خرچ مانگتے ہیں؟ محصول کا مطالبہ کرتے ہیں؟ فیس کا مطالبہ کرتے ہیں؟ ایسی کوئی بات نہیں، تیرے رَبّ کا خراج بہتر ہے، اور وہ بہترین رزق دینے والا ہے۔ آپ تو انہیں سیدھے راستہ کی طرف بلاتے ہیں اور یہ سیدھے راستہ پر چلتے نہیں، اور جو ایمان آخرت پر نہیں لاتے وہ سیدھے راستہ سے ایک طرف کو ہٹنے والے ہیں۔

نیک بخت لوگ تکالیف کو دیکھ کر اللہ کے سامنے جھک جاتے ہیں

اور آگے یہ کہا جا رہا ہے کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ جو تھوڑی بہت تکلیفیں بھیجتا ہے تو یہ بھی عبرت کا سامان ہے، نیک بخت وہ ہوا کرتے ہیں جو انہی تکلیفوں سے متاثر ہو کر اللہ کے سامنے جھک جاتے ہیں، اور جو اکڑتے رہتے ہیں پھر کوئی سخت عذاب آتا ہے، اس کے بعد سنبھلنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن سنبھلنے کا موقع نہیں ہوتا۔ اگر ہم ان پہ رحم کرتے ہیں اور کھول دیتے ہیں اس تکلیف کو جو انہیں پہنچی تو یہ اصرار کرتے ہیں اپنی سرکشی میں بھٹکتے ہوئے، اور ہم نے انہیں عذاب میں پکڑا (اس عذاب سے دنیوی یعنی چھوٹی موٹی تکلیفیں مراد ہیں) لیکن یہ اپنے رَبّ کے لئے دبے نہیں اور نہ یہ گڑگڑاتے ہیں، نہ انہوں نے زاری کی۔ یہ سلسلہ ان کا جاری ہے رہے گا حتیٰ کہ ہم جب ان کے اوپر سخت عذاب کا دروازہ کھول دیں گے تو اچانک اس میں یہ مایوس ہو جائیں گے پھر چھوٹنے کی کوئی توقع نہیں رہے گی۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝ وَهُوَ الَّذِيْ

اللہ وہ ہے جس نے پیدا کیے تمہارے لیے کان اور آنکھیں اور دل، تم بہت کم شکر ادا کرتے ہو﴿۷۸﴾ اللہ وہ ہے جس نے

ذَرَاَكُمْ فِي الْاَرْضِ وَاِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝ وَهُوَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَلَهُ

تمہیں پھیلایا زمین میں اور اسی کی طرف ہی تم جمع کیے جاؤ گے﴿۷۹﴾ وہی اللہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور اسی کے لئے ہے

اخْتِلَافُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ بَلْ قَالُوْا مِثْلَ مَا قَالَ الْاَوَّلُوْنَ ۝

رات اور دن کا اختلاف، کیا تم سوچتے نہیں ہو؟﴿۸۰﴾ بلکہ انہوں نے کہا مثل اس بات کے جو کہی پہلے لوگوں نے﴿۸۱﴾

قَالُوۡۤا ءَاِذَا مِتۡنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبۡعُوۡثُوۡنَ ﴿۸۲﴾ لَقَدۡ وُعِدۡنَا نَحۡنُ

کہتے ہیں، کیا جس وقت ہم مرجائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں ہوجائیں گے کیا بے شک ہم البتہ اُٹھائیں جائیں گے؟ ﴿۸۲﴾ تحقیق وعدہ کیے گئے ہم بھی

وَاٰبَآؤُنَا هٰذَا مِنۡ قَبۡلُ اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِيۡرُ الۡاَوَّلِيۡنَ ﴿۸۳﴾ قُلۡ لِّمَنِ الۡاَرۡضُ

اور ہمارے آباءبھی اس بات کا اس سے قبل نہیں ہے یہ مگر پہلے لوگوں کے قصے کہانیاں ﴿۸۳﴾ آپ ان سے پوچھئے کس کی ملکیت ہے زمین

وَمَنۡ فِيۡهَاۤ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۸۴﴾ سَيَقُوۡلُوۡنَ لِلّٰهِ‌ ؕ قُلۡ اَفَلَا تَذَكَّرُوۡنَ ﴿۸۵﴾

اور جو لوگ اس میں ہیں؟ اگر تم کچھ علم رکھتے ہو ﴿۸۴﴾ تو عنقریب وہ جواب دیں گے کہ یہ سب کچھ اللہ ہی کے لئے ہے، آپ ان سے کہیے کہ پھر تم سوچتے کیوں نہیں؟ ﴿۸۵﴾

قُلۡ مَنۡ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبۡعِ وَرَبُّ الۡعَرۡشِ الۡعَظِيۡمِ ﴿۸۶﴾ سَيَقُوۡلُوۡنَ لِلّٰهِ‌ ؕ

آپ ان سے پوچھئے، ساتوں آسمانوں کا رَبّ اور عرشِ عظیم کا رَبّ کون ہے؟ ﴿۸۶﴾ تو عنقریب کہیں گے کہ یہ سب کچھ اللہ ہی کے لئے ہے

قُلۡ اَفَلَا تَتَّقُوۡنَ ﴿۸۷﴾ قُلۡ مَنۡۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوۡتُ كُلِّ شَىۡءٍ وَّهُوَ يُجِيۡرُ وَلَا يُجَارُ

تو آپ کہیے کہ پھر تم ڈرتے نہیں ہو؟ ﴿۸۷﴾ آپ ان سے یہ بھی پوچھئے کون ہے جس کے قبضے میں ہے ہر چیز کی ملکیت، اور وہ پناہ دیتا ہے اور اس کے

عَلَيۡهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۸۸﴾ سَيَقُوۡلُوۡنَ لِلّٰهِ‌ ؕ قُلۡ فَاَنّٰى تُسۡحَرُوۡنَ ﴿۸۹﴾

خلاف پناہ نہیں دی جاسکتی، اگر تمہیں پتا ہے ﴿۸۸﴾ تو عنقریب کہیں گے کہ یہ سب صفات اللہ ہی کے لئے ہیں، آپ کہہ دیجئے پھر تم کہاں جادو کیے جاتے ہو؟ ﴿۸۹﴾

بَلۡ اَتَيۡنٰهُمۡ بِالۡحَـقِّ وَاِنَّهُمۡ لَـكٰذِبُوۡنَ ﴿۹۰﴾ مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنۡ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ

بلکہ ہم ان کے پاس سچی بات لائے ہیں اور بے شک یہ لوگ جھوٹے ہیں ﴿۹۰﴾ نہیں اختیار کی اللہ نے کوئی اولاد، اور نہیں ہے اس کے ساتھ

مِنۡ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍ ۢ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعۡضُهُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ‌ ؕ سُبۡحٰنَ اللّٰهِ

کوئی معبود، تب لے جاتا ہر الہ اپنی مخلوق کو اور ان کا بعض بعض پر چڑھائی کرتا، پاک ہے اللہ

عَمَّا يَصِفُوۡنَ ﴿۹۱﴾ عٰلِمِ الۡغَيۡبِ وَالشَّهَادَةِ فَتَعٰلٰى عَمَّا يُشۡرِكُوۡنَ ﴿۹۲﴾

ان باتوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں ﴿۹۱﴾ غیب وحاضر کو جاننے والا ہے، بلند ہے ان کے شریک ٹھہرانے سے ﴿۹۲﴾

رُکوع میں بیان کردہ مضمون

سورۂ مؤمنون کے یہ جو آخری دو رُکوع آپ کے سامنے آرہے ہیں ان میں اللہ تعالیٰ نے زیادہ تر معاد کے مسئلے کو بیان

فرمایا ہے، بارہا آپ کی خدمت میں یہ بات عرض کی جا چکی، مکی سورتوں میں زیادہ تر زور تین مسئلوں پر ہی ہے، اثباتِ توحید جس کے ساتھ ساتھ رَدِّ شرک ہوتا ہے، اور اثباتِ معاد یعنی بعث بعد الموت، مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنا، اور اس بارے میں جوان کے شبہات ہیں ان کو دُور کیا جاتا ہے، اور اثباتِ رسالت۔ تو یہ جو دو رکوع ہیں ان میں دو مسئلے ذکر کیے جا رہے ہیں، ایک معاد کا اور ایک توحید کا، یہ آیات جو آپ کے سامنے اس وقت آ رہی ہیں ان کا مضمون بار بار چونکہ گزرا ہوا ہے اس لیے ان کی زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں، ترجمہ دیکھتے چلیے، جس آیت کی تفصیل ضروری ہوگی وہ ساتھ ساتھ کرتا جاؤں گا۔

تفسیر

اِثباتِ معاد کے لیے دلائلِ قدرت

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ: اللہ وہ ہے جس نے پیدا کیے تمہارے لیے کان اور آنکھیں اور دل۔ اَنْشَاَ: پیدا کرنا، اور یہاں موقع محل کے مطابق اس کا ترجمہ ''بنانے'' کے ساتھ بھی کیا جا سکتا ہے، اللہ وہ ہے جس نے بنائے تمہارے نفع کے لیے کان اور آنکھیں اور دِل، الْاَفْـِٕدَةَ، فُؤاد کی جمع ہے۔ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ: تم بہت کم شکر ادا کرتے ہو، کیونکہ شکر کا مطلب یہ ہوا کرتا ہے کہ مُنعِم یعنی احسان کرنے والے کی عظمت دل میں لا کر اس کی اطاعت کی جائے، یہ کتنی بڑی بڑی نعمتیں ہیں کان، آنکھ، اور دِل جن میں اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی صلاحیتیں رکھیں ہیں، اس بات کو اگر سوچا جائے کہ اللہ نے ہمارے لیے پیدا کیے اور ہم ان سے فائدہ اُٹھاتے ہیں تو اللہ کی اطاعت کی طرف متوجہ ہونا چاہیے، اس میں احسانات کا پہلو بھی ہے اور قدرت کا بھی ہے، جیسے آپ کو متوجہ کرتا رہتا ہوں، وَهُوَ الَّذِيْ ذَرَاَكُمْ فِي الْاَرْضِ: ذَرَاَ: پھیلانا۔ اللہ وہ ہے جس نے تمہیں پھیلایا زمین میں، وَاِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ: اور اسی کی طرف ہی تم جمع کیے جاؤ گے، یعنی پھیلانے والا بھی وہی ہے اور بعد میں اکٹھا کرنے والا بھی وہی ہے، جس طرح سے کسان کھیتی بوتا ہے، تو صرف بونے کی غرض سے نہیں بوئی جایا کرتی، بلکہ اس کی نشوونما کرنے کے بعد پھر اس کو کاٹا جاتا ہے، کاٹنے کے بعد اس کو سمیٹا جاتا ہے، سمیٹنے کے بعد اس میں سے مقصود اور غیر مقصود کو علیحدہ علیحدہ کیا جاتا ہے، غلہ علیحدہ ہو گیا، بھوسا علیحدہ ہو گیا، پتے علیحدہ کر دیے گئے، اسی طرح سے اگر اللہ تعالیٰ نے اس زمین کو پیدا کرنے کے بعد اس میں انسانوں کو پھیلایا ہے تو پھیلانے کے بعد سمیٹے گا بھی وہی، اور سمیٹنے کے بعد پھر اسی طرح چھانٹی بھی کرے گا، جیسے دوسری جگہ ہے وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ (سورۂ یٰسٓ:۵۹) اچھوں کو علیحدہ کرے گا، بروں کو علیحدہ کرے گا، تبھی جا کے یہ سارے کا سارا سلسلہ حکمت پر مبنی ہو سکتا ہے، جیسا کہ آخر آخر میں آ جائے گا کہ اگر تمہارے تصور میں یہ جزا اور سزا نہیں ہے تو اس کا مطلب ہے کہ ہم نے تمہیں ایک عبث کے طور پر پیدا کیا ہے؟ جس کا کوئی اچھا نتیجہ نکلنے والا نہیں، اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا تم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ہم نے ایک عبث حرکت کرتے ہوئے تمہیں پیدا کیا ہے؟ ایک فضول کام کرتے ہوئے پیدا کیا ہے؟ ایسا نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے حکمت کے تحت پیدا کیا ہے اور اسی طرح سے اس کا نتیجہ سامنے آئے گا۔ وَهُوَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ: وہی اللہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے یعنی وہی زندگی دیتا ہے،

وہی موت دیتا ہے، وَلَهُ اخْتِلَافُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ: اور اسی کے لئے ہے رات اور دن کا اختلاف، یعنی رات کا آنا دن کا جانا، دن کا آنا رات کا جانا، اسی طرح چھوٹا ہونا، بڑا ہونا، یہ سب چیزیں اس میں آجاتی ہیں، مطلب یہ ہے کہ موت وحیات بھی اسی کے ہاتھ میں ہے، اور یہ اوقات کا نظم جتنا بھی ہے سب اسی کے ہاتھ میں ہے، وقت میں بھی تصرف وہی کرتا ہے۔ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ: کیا تم سوچتے نہیں ہو؟ کہ جس نے زندہ کیا، جس کے ہاتھ میں موت ہے، جو زمانے کے اندر متصرف ہے، کیا اس کا کوئی شریک ہوسکتا ہے؟ اور مارنے کے بعد کیا وہ دوبارہ زندہ کرنے پر قادر نہیں؟ جیسے آگے مسئلہ یہی ذکر کیا جارہا ہے۔

مشرکین کی طرف سے اِنکارِ معاد

بَلْ قَالُوْا مِثْلَ مَا قَالَ الْاَوَّلُوْنَ: بَلْ اِضراب کے لئے ہوا کرتا ہے، تو اس سے پہلے یہ بات نکالیں گے کہ ان باتوں میں غور وفکر کرنے کے بعد، سوچ کر وہ توحید کے قائل نہیں ہوتے، اور اسی طرح سے وہ آخرت کا عقیدہ نہیں بناتے کہ مرنے کے بعد دوبارہ اُٹھنا بھی ہے، بلکہ انہوں نے کہا مثل اس بات کے جو کہی پہلے لوگوں نے، پہلے لوگوں کے بات کرنے کی طرح ہی انہوں نے بات کی۔ پہلے لوگوں نے کیا کہا تھا؟ وہ اگلی بات ہے جو پہلوں نے بھی کی تھی اور اسی قسم کی بات یہ کہتے ہیں قَالُوْٓا ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا کہتے ہیں، کیا جس وقت ہم مرجائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں ہوجائیں گے، ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ: کیا بے شک ہم البتہ اُٹھائے جائیں گے؟ یہی بات پہلوں نے کہی تھی اور یہی بات اب یہ کہتے ہیں، لَقَدْ وُعِدْنَا نَحْنُ وَاٰبَآؤُنَا هٰذَا مِنْ قَبْلُ: تحقیق وعدہ کیے گئے ہم بھی اور ہمارے آباء بھی اس بات کا اس سے قبل۔ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ: نہیں ہے یہ مگر پہلے لوگوں کے قصے کہانیاں، اساطیر اُسطورۃ کی جمع ہے، اُسطورۃ اس بات کو کہتے ہیں جو پہلے سے نقل ہوتی چلی آرہی ہو، مشرک کہتے ہیں کہ یہ پہلے لوگوں کے ساتھ بھی وعدہ کیا گیا تھا، کہ مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنا ہے، تو وہی باتیں نقل ہوتی ہوئی آرہی ہیں، ورنہ کہاں اٹھنا، کہاں جینا، جس طرح پیچھے اسی سورت میں آیا تھا اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ یہ دنیوی زندگی ہے کوئی مرتا ہے کوئی پیدا ہوتا ہے، بس اس سے آگے کچھ نہیں، تو پہلے لوگوں نے بھی یہی باتیں کہی تھیں اور یہ بھی ایسے کہتے ہیں، یہ باتیں نقل ہوتی ہوئی پیچھے سے چلی آرہی ہیں، ورنہ مرنے کے بعد اٹھنا نہیں ہے۔

اِثباتِ معاد کے لئے مزید دلائلِ قدرت

اور یہ بھی آپ کے سامنے عرض کیا تھا کہ جہاں بھی بعث کا ذکر آتا ہے اور وہ لوگ بعث کا انکار کرتے ہیں تو اس میں اصل کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی قدرت کا انکار لازم آتا ہے، یہی وجہ ہے کہ جہاں بھی اس مسئلہ کو ذکر کیا جاتا ہے، تو پھر اللہ تعالیٰ اپنے علم اور قدرت کو اچھی طرح سے نمایاں کرتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کا علم اتنا محیط ہے اور اس کی قدرت اتنی تام ہے تو پھر اس کے سامنے کیا مشکل ہے کہ مارنے کے بعد دوبارہ زندہ کردے؟ اسی قسم کی آیات یہاں اب آرہی ہیں قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ: آپ ان سے پوچھئے، تو کہہ، اور یہ کہنا بطور پوچھنے کے ہے، آپ فرمادیجئے، کہہ دیجئے، ان سے پوچھئے، یہ زمین کس کے لئے ہے؟ کس کی ملکیت ہے؟ وَمَنْ فِيْهَآ: اور جو لوگ اس میں ہیں وہ کس کی ملکیت ہیں؟ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ: اگر تم کچھ علم رکھتے ہو تو بتاؤ! زمین اور زمین میں بسنے

والے سارے کے سارے کس کے مملوک ہیں؟ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ: تو عنقریب وہ جواب دیں گے کہ یہ سب کچھ اللہ ہی کے لئے ہے، یہ جواب تو متعین ہے، قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ تو آپ ان سے کہیے کہ پھر تم سوچتے کیوں نہیں ہو؟ کہ جو اس زمین کا مالک ہے اور جو کچھ اس زمین کے اندر ہے اس کا بھی مالک ہے تو اس کے لئے کیا مشکل ہے کہ جیسے اس نے پہلے بنایا تھا اسی طرح سے دوبارہ بنا دے، اس میں کوئی مشکل نہیں ہے، اور جب مالک وہی ہے تو پھر اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا کیسے درست ہے؟

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ: آپ ان سے پوچھئے! (یہاں قُلْ سوال کرنے کے لیے ہے، آپ کہیے، فرمائیے) ساتوں آسمانوں کا رَبّ اور عرش عظیم کا رَبّ کون ہے؟ عرشِ عظیم: بڑا تخت، جس کا مطلب یہ ہوا کہ زمین بھی اسی کی مملوک اور ساتوں آسمان بھی اسی کے، اور عرشِ عظیم کا مالک بھی وہی، اور یہ بھی آپ سُن چکے کہ عرشِ عظیم کے مالک ہونے کا مطلب یہ ہے کہ تختِ سلطنت کا مالک وہی ہے، ساتوں آسمانوں میں بھی حکومت اسی کی، سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ تو عنقریب کہیں گے کہ یہ سب کچھ اللہ ہی کے لئے ہے، کیونکہ اس سوال کا حاصل یہ ہے کہ آسمانوں میں حکومت کس کی ہے؟ اور اس ساری کائنات میں تخت نشین کون ہے؟ تختِ عظیم کا مالک کون ہے؟ تو اس کا جواب بھی یہی ہے کہ یہ سب کچھ اللہ ہی کے لئے ہے، تو آپ کہیے کہ پھر تم ڈرتے نہیں ہو؟ کہ ایسے رَبّ کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک کرتے ہو، یا ایسے رَبّ کی باتوں پر تم یقین نہیں لاتے، تم ڈرتے نہیں؟

قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ: اور آپ ان سے یہ بھی پوچھئے کہ کون ہے جس کے قبضے میں ہے ہر چیز کی ملکیت؟ ملکوت مِلک کے معنی میں ہے، ہر چیز کی ملکیت کس کے قبضے میں ہے؟ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ: اور وہ پناہ دیتا ہے اور اس کے خلاف پناہ نہیں دی جاسکتی یعنی کسی مصیبت سے بچانا ہو کسی دشمن سے بچانا ہو وہ تو بچاتا ہے، اور اس کے خلاف نہیں پناہ دی جاسکتی کہ وہ کسی کو پکڑنا چاہے یا تکلیف پہنچانا چاہے تو کوئی بچا نہیں سکتا، اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ اگر تمہیں پتا ہے تو بتاؤ کہ یہ شان کس کی ہے، سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ: تو عنقریب کہیں گے کہ یہ سب صفات اللہ ہی کے لئے ہیں، قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ: یہ لفظ سِحر سے ہے، سِحر کہتے ہیں جادو کو۔ آپ کہہ دیجئے کہ پھر تم کہاں جادو کیے جاتے ہو؟ لفظی معنی یہ ہوا، یعنی جس طرح سے کسی آدمی پر جادو کر دیا جائے تو اس کا دماغ ماؤف ہو جاتا ہے وہ صحیح سوچ نہیں سکتا، صحیح بات کو سمجھ نہیں سکتا، تو تم پر کیا جادو ہو رہا ہے کہ سب باتوں کو مان رہے ہو پھر اس کا نتیجہ نہیں مانتے کہ اللہ وحدہٗ لاشریک ہے، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے جس طرح سے ابتداءً پیدا کرتا ہے تو دوبارہ بھی پیدا کر سکتا ہے تو تم کہاں خبطی ہوئے جارہے ہو؟ تمہیں کیا خبط ہو گیا ہے؟ تمہاری عقل ماری گئی، تمہاری مت ماری گئی، تم سوچتے نہیں ہو، اس لفظ کا یہاں یہ مفہوم ہے۔ تم کہاں جادو کیے جارہے ہو، یعنی تمہاری کہاں عقلیں ماری گئیں، تم پر کس شخص نے جادو کر دیا کہ تم خبطی ہو گئے، تمہیں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ سب مقدمات کو مان رہے ہو اور نتیجے کے قائل نہیں ہوتے، یہ خبط تم پر سوار ہے۔

اللہ کی بات سچّی ہے اور کافر جھوٹے ہیں

بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِالْحَقِّ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ: یہ جو کہتے تھے جیسے پیچھے ان کا قول آیا تھا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اس میں تکذیب ہے اس بات کی جو اللہ کے انبیاء کی طرف سے کہی گئی تھی کہ مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنا ہے، تو وہ کہتے تھے کہ ایسے ہی

بنی بنائی باتیں ہیں، کہاں اٹھنا ہے، یہ اٹھنا کیسے ہوسکتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اپنی ان صفات کو ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ ہم نے انہیں سچی سچی بات بتائی ہے۔ سچی بات کیا بتائی ہے؟ کہ مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنا ہے، اور حساب وکتاب کے لئے پیش ہونا ہے، بلکہ ہم ان کے پاس سچی بات لائے ہیں، اور بے شک یہ لوگ جھوٹے ہیں، دونوں باتوں میں جھوٹے ہیں، یہ جو کہتے ہیں کہ مرنے کے بعد اٹھنا نہیں، اس بات میں جھوٹ ہیں۔ اور یہ جو کہتے ہیں کہ اللہ کی اس الوہیت میں، خدا کی خدائی میں دوسری چیزیں بھی شریک ہیں اس بات میں بھی جھوٹے ہیں۔ یا یہ جو کہتے ہیں کہ ہمارے شفعاء شرکاء ہمیں بچالیں گے، اوپر جو بات آئی کہ پناہ دینا اللہ کا کام ہے، اللہ کے خلاف کسی کو پناہ نہیں دی جاسکتی، اگر اللہ تعالیٰ پکڑنا چاہے تو کوئی شخص بچا نہیں سکتا، تو یہ جو شفعاء کے متعلق اس قسم کے اختیارات ثابت کرتے ہیں، اس میں بھی یہ جھوٹے ہیں، بات وہی صحیح ہے جو ہم نے بتلائی...... بلکہ ہم لائے ہیں ان کے پاس سچی بات (بِالْحَقِّ پر باء تعدیہ کی ہے، اَتٰی یَاْتِی: آنا، اور جب باء تعدیہ کی آ گئی تو اس کا معنی ہوگیا، لانا) بلکہ ہم ان کے پاس سچی بات لائے ہیں اور بے شک یہ لوگ البتہ جھوٹے ہیں۔

عقیدۂ ولدیت اور شرک کی تردید

مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ: یہ وہی پچھلے مقدمات کے نتیجے کے طور پر اثباتِ توحید ہے۔ نہیں اختیار کی اللہ نے کوئی اولاد، اور نہیں ہے اس کے ساتھ کوئی معبود، اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۭ بِمَا خَلَقَ: اِذًا کے اوپر جو تنوین ہے، ''نحو'' میں جس طرح سے آپ پڑھتے ہیں، یہ مضاف الیہ کے عوض میں ہے، اس کا ترجمہ اُردو میں کر دیا جاتا ہے ''تب''۔ تب البتہ لے جاتا ہر الٰہ اپنی مخلوق کو، بِمَا خَلَقَ میں جو باء ہے یہ بھی تعدیہ کی ہے، ذہب: جانا، اور باء تعدیہ کی آ گئی تو ''لے جانے'' کے معنی میں ہے، جیسے ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ (سورۂ بقرہ: ۱۷) اللہ ان کے نُور کو لے گیا۔ تب لے جاتا ہر اِلٰہ اپنی مخلوق کو، وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ: اور ان کا بعض بعض پر چڑھائی کرتا۔ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ: پاک ہے اللہ ان باتوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں، عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ: حاضر اور غیب کو جاننے والا ہے، فَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ: بلند ہے ان کے شریک ٹھہرانے سے، یا بلند شان والا ہے ان چیزوں سے جن کو یہ شریک ٹھہراتے ہیں، ''مَا'' مصدریہ بھی ہوسکتی ہے (مظہری) اور موصولہ بھی (جلالین وغیرہ)۔

یہ رَدِّ شرک کی طرف اللہ تعالیٰ نے ایک واضح نشان دہی فرمائی کہ اللہ کی کوئی اولاد نہیں، کوئی ایسی مخلوق نہیں جو اللہ تعالیٰ کے لیے اولاد کی جگہ ہو، جس طرح سے انہوں نے ملائکہ کو اللہ کی بیٹیاں بنا رکھا تھا، یا بعض دوسرے باطل فرقوں نے بعض اشخاص کو اللہ کی اولاد قرار دیا، عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہا، یہودیوں کے بعض گروہوں نے عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہا، تو فرمایا کہ اللہ نے کوئی اولاد اختیار نہیں کی، اور نہ اسکے ساتھ کوئی دوسرا الٰہ ہے، اُلوہیت بھی صرف اسی کے لیے ہے، کسی دوسرے کے لیے نہیں، کیونکہ جو الٰہ ہوگا وہ خالق بھی ہوگا، مالک بھی ہوگا، یہ تو اس کی صفات لازمہ میں سے ہے۔

توحید پر عقلی دلیل

اگلی بات جو کہی جارہی ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ دنیا میں تم دیکھتے ہو، اگر دو برابر کی قوتیں بادشاہی کو حاصل کیے ہوئے

ہوں جیسا کہ مختلف ملک بٹے ہوئے ہیں، اور ایک ایک ملک میں ایک ایک بادشاہ ہے، تو عادت یہی ہے کہ یہ سارے کے سارے بادشاہ کبھی اتفاق سے نہیں رہتے، جیسے کہ اب لوگ کہتے ہیں کہ علم وعقل بہت ترقی کر گئی، لیکن اس علم وعقل کے ترقی کر جانے کے بعد جتنا اختلاف اب دنیا میں ہے شاید اس سے پہلے تاریخ میں اتنا اختلاف نہیں ہوا، ساری دنیا ایک دوسرے کے خلاف آستینیں چڑھائے ہوئے ہے اور لڑنے مرنے کے لیے تیار ہے، اب اس علم وعقل کی ترقی کے دور میں بھی ان بادشاہوں سے کوئی کہے، ان ملکوں کے صدروں سے کوئی کہے کہ بھائی! اللہ کی مخلوق کو چین لینے دو، تم سارے کے سارے اکٹھے بیٹھو، اتفاق سے رہو، مل کے مشورہ کر کے دنیا کا نظام چلاؤ، تو کیا یہ ممکن ہے؟ آج کے حالات میں یہ ممکن ہے؟ ممکن نہیں ہے، بلکہ ہر ملک کا صدر اپنے ماتحت فوجوں کو مرتب کر رہا ہے، دھڑا دھڑ اسلحہ خرید رہا ہے، جنگ کے ہتھیار خرید رہا ہے، اور ہر وقت تیار ہیں کہ کس وقت پڑوسی ملک کے اوپر چڑھائی کریں اور اس کے اوپر قبضہ کر لیں، آج دنیا میں آپ دیکھ لیں کہ کتنے ملکوں کے اندر اسی طرح سے جنگ جاری ہے، ایک دوسرے کے اوپر قبضہ جمانے کے لیے، ایک دوسرے کے اوپر بڑائی حاصل کرنے کے لیے یہ صدور اور یہ بادشاہ جتنے بھی ہیں ہر وقت یہ تیار بیٹھے ہیں، اور کوئی بھی دوسرے کی طرف سے مطمئن نہیں، انسانی تاریخ کے اندر ایسا ممکن نہیں ہے کہ سارے کے سارے بادشاہ اتفاق کر کے اس دنیا کو سنبھالیں، لڑائی سے بچائیں اور مخلوق کے لئے راحت اور آرام کا انتظام کریں۔ تو اللہ تعالیٰ ہمیں ہمارے ماحول کا حوالہ دے کر بتاتے ہیں کہ جس طرح سے مختلف بادشاہ آپس میں اتفاق نہیں کرتے، اگر اتفاق کبھی کر بھی لیں تو اتفاق چلتا نہیں، ہر کوئی اپنے اپنے ملک کی رعایا کو ساتھ لیتا ہے، اپنی فوجوں کو ترتیب دیتا ہے، ایک دوسرے پر چڑھائی کرتا ہے، اور یہ دنیا جنگ وجدال کا میدان بن جاتی ہے، اور زمین پر خون بہتے ہیں، بربادیاں ہوتی ہیں۔ اگر اللہ کے علاوہ اور الٰہ ہوتے تو آخر ان کی بھی مخلوق ہوتی اور ان کے بھی مملوک ہوتے، تو ان کا بھی یہی حال ہوتا کہ ہر الٰہ اپنی اپنی مخلوق کو ساتھ لیتا پھر ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے چڑھائی کرتے، ایک دوسرے کے مقابلے میں بڑائی حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے پہ چڑھ دوڑتے۔ اب تم ہی بتاؤ کہ جب دنیا میں عاجز انسان آپس میں لڑتے ہیں تو دنیا میں کیا فتنہ فساد ہوتا ہے، تو اگر یہ خدا آپس میں لڑ پڑتے تو کیا کائنات باقی رہ سکتی؟ بلکہ کائنات کا ستیاناس ہو جاتا، ساری کائنات بکھر جاتی، ذرہ ذرہ اور ریزہ ریزہ ہو جاتی، جیسے سورۂ انبیاء میں ہے لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا تو یہاں وہی لڑائی کا نمونہ دکھا کے بربادی دکھائی ہے، کہ اگر ایسی نوبت آجاتی، سارے آپس میں لڑتے، لڑنے کے بعد فساد برپا ہو جاتا۔ جیسے دنیا کے اندر قوت والے لوگ، بادشاہ قسم کے لوگ، جن کو عارضی طور پر بادشاہتیں حاصل ہیں، یہ آپس میں اتفاق نہیں کرتے، بلکہ اپنے اپنے تابع لوگوں کو ساتھ لے کر ایک دوسرے پر چڑھتے ہیں، تو خداؤں کی بھی لڑائی اسی طرح سے ہو جاتی اور کائنات کا نظام کبھی بھی بحال نہ رہتا، یہ سارے کا سارا زمین اور آسمان کا نظم اور سیاروں ستاروں کا نظم جو اچھی طرح سے قائم ہے، اسی لیے قائم ہے ان سب پر کنٹرول ایک کا ہے، تو یہ اسی قسم کی دلیل ہے جیسے لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا (سورۂ انبیاء: ۲۲) کے تحت بیان کی گئی۔

اس کو دوبارہ دیکھئے...... اللہ نے کوئی اولاد اختیار نہیں کی، اور اللہ کے ساتھ کوئی الٰہ نہیں، تب (تب کا مطلب یہ ہے کہ اگر

کوئی اور اِلٰہ ہوتا) تب لے جاتا ہر اِلٰہ اپنی مخلوق کو، اور چڑھائی کرتا ان کا بعض بعض پر، جس کے نتیجے میں فساد ہی فساد ہو جاتا، کائنات کسی طریقے سے بھی ایسے منظم اور مرتب نہ ہوتی جیسے کہ اب منظم اور مرتب ہے، تو خداؤں کی لڑائی ہو جانے کے ساتھ فساد اور اس کائنات کا برباد ہو جانا لازم تھا۔ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ: جو باتیں یہ بیان کرتے ہیں کہ اللہ کے لیے اولاد ہے، یا اللہ کے ساتھ دوسرے شرکاء بھی ہیں، اللہ ان سب باتوں سے پاک ہے۔ یہ سب عیب ہیں جو یہ لوگ اللہ کے اوپر لگاتے ہیں۔ وہ حاضر اور غیب کو جاننے والا ہے، اور بلند ہے ان کے شریک ٹھہرانے سے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

قُلْ رَّبِّ اِمَّا تُرِيَنِّيْ مَا يُوْعَدُوْنَ ﴿۹۳﴾ رَبِّ فَلَا تَجْعَلْنِيْ فِي الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۴﴾

آپ کہہ دیجئے! کہ اے میرے رَبّ! اگر تُو دکھائے مجھے وہ چیز جس کا یہ وعدہ دیے جاتے ہیں ﴿۹۳﴾ اے میرے رَبّ! پس نہ کرنا تو مجھے ظالم لوگوں میں ﴿۹۴﴾

وَاِنَّا عَلٰٓى اَنْ نُّرِيَكَ مَا نَعِدُهُمْ لَقٰدِرُوْنَ ﴿۹۵﴾ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ

اور بے شک ہم اس بات پر کہ آپ کو دکھا دیں وہ چیز جس کا ہم ان سے وعدہ کرتے ہیں البتہ قدرت رکھنے والے ہیں ﴿۹۵﴾ دفع کیجئے اس بات کے ذریعے جو کہ

اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ؕ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَصِفُوْنَ ﴿۹۶﴾ وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ

اچھی ہے، ہم خوب جانتے ہیں ان باتوں کو جو یہ بیان کرتے ہیں ﴿۹۶﴾ اور آپ یہ دُعا کیجئے اے میرے رَبّ! میں تیری پناہ پکڑتا ہوں

هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ ﴿۹۷﴾ وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ ﴿۹۸﴾ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ

شیاطین کے وساوس سے ﴿۹۷﴾ اور تیری پناہ پکڑتا ہوں اے میرے رَبّ! اس بات سے کہ وہ شیاطین میرے قریب آئیں ﴿۹۸﴾ حتّٰی کہ جب آ جائے گی

اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ﴿۹۹﴾ لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ

ان میں سے کسی کو موت، تو کہے گا کہ اے میرے رَبّ! مجھے لوٹا دے ﴿۹۹﴾ تاکہ میں نیک عمل کر لوں اس چیز میں جس کو میں چھوڑ آیا ہوں

كَلَّا ؕ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا ؕ وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

ہرگز نہیں ہوگا، یہ ایک بات ہے جس کو وہ کہتا جا رہا ہے، اور ان کے سامنے ایک پردہ ہے اُٹھائے جانے کے دِن تک ﴿۱۰۰﴾

فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ ﴿۱۰۱﴾

پھر جب پھونک ماری جائے گی صور میں تو نہیں ہوں گے نسب ان کے درمیان اس دِن، اور نہ آپس میں ایک دوسرے سے پوچھیں گے ﴿۱۰۱﴾

فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ

پھر جس کے ترازو بوجھل ہو گئے پس یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں ﴿۱۰۲﴾ اور جس کے ترازو ہلکے ہو گئے پس یہی لوگ ہیں

الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فِيْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ النَّارُ وَهُمْ فِيْهَا

جنہوں نے اپنے نفسوں کو خسارے میں ڈال دیا، جہنم میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے ﴿۱۰۳﴾ آگ جھلس دے گی ان کے چہروں کو اور وہ اس جہنم میں

كٰلِحُوْنَ ﴿۱۰۴﴾ اَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ قَالُوْا رَبَّنَا

بدشکل ہوں گے ﴿۱۰۴﴾ کیا میری آیات تم پر پڑھی نہیں جاتی تھیں؟ پھر تم ان آیات کی تکذیب کیا کرتے تھے ﴿۱۰۵﴾ وہ کہیں گے اے ہمارے پروردگار!

غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَكُنَّا قَوْمًا ضَآلِّيْنَ ﴿۱۰۶﴾ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ

ہم پر ہماری بدبختی غالب آ گئی اور ہم بھٹکے ہوئے لوگ تھے ﴿۱۰۶﴾ اے ہمارے ربّ! ہمیں اس آگ سے نکال دے، اگر ہم دوبارہ

عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۰۷﴾ قَالَ اخْسَئُوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ ﴿۱۰۸﴾ اِنَّهٗ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْ

ایسا کریں تو ہم قصوروار ہیں ﴿۱۰۷﴾ اللہ فرمائیں گے: ذلیل ہو کر پڑے رہو اس جہنم میں اور مجھ سے بات نہ کرو ﴿۱۰۸﴾ بے شک میرے بندوں

عِبَادِيْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾

میں سے ایک گروہ تھا جو یوں کہا کرتے تھے اے ہمارے ربّ! ہم ایمان لے آئے تُو ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم کر اور تُو بہت اچھا رحم کرنے والا ہے ﴿۱۰۹﴾

فَاتَّخَذْتُمُوْهُمْ سِخْرِيًّا حَتّٰٓى اَنْسَوْكُمْ ذِكْرِيْ وَكُنْتُمْ مِّنْهُمْ تَضْحَكُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ اِنِّيْ

تم نے ان کے مذاق اُڑائے حتیٰ کہ انہوں نے تمہیں میری یاد بھلا دی، اور تم ان سے ہنسا کرتے تھے ﴿۱۱۰﴾ بے شک میں نے

جَزَيْتُهُمُ الْيَوْمَ بِمَا صَبَرُوْٓا ۙ اَنَّهُمْ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ قٰلَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْاَرْضِ

آج ان کو بدلہ دیا ان کے صبر کرنے کی وجہ سے، بے شک وہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں ﴿۱۱۱﴾ کہنے والا کہے گا: کتنا ٹھہرے تم زمین میں

عَدَدَ سِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَسْئَلِ الْعَآدِّيْنَ ﴿۱۱۳﴾ قٰلَ

سالوں کی گنتی؟ ﴿۱۱۲﴾ وہ کہیں گے کہ ہم ٹھہرے ایک دِن یا دِن کا کچھ حصہ، شمار کرنے والوں سے پوچھو ﴿۱۱۳﴾ کہنے والا کہے گا

اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا لَّوْ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۱۴﴾ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا

نہیں ٹھہرے تم مگر بہت کم مدت، کاش! تم اس بات کو جان لیتے ﴿۱۱۴﴾ کیا پھر تم نے یہ سمجھ لیا کہ ہم نے تمہیں عبث حرکت کے طور پر پیدا کیا ہے؟

وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱۵﴾ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ رَبُّ الْعَرْشِ
اور بے شک تم ہماری طرف لوٹائے نہیں جاؤ گے؟ ﴿۱۱۵﴾ پس بلند شان والا ہے اللہ جو حقیقی بادشاہ ہے، کوئی معبود نہیں مگر وہی، وہ عرشِ کریم
الْكَرِيْمِ ﴿۱۱۶﴾ وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۙ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ ۙ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ
کا رَبّ ہے ﴿۱۱۶﴾ اور جو کوئی پکارے اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود، جس کے معبود ہونے پر اس کے پاس کوئی برہان نہیں، پس سوائے اس کے نہیں کہ اس کا حساب
رَبِّهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ وَقُلْ رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۱۱۸﴾
اس کے رَبّ کے پاس ہے، بے شک بات یہ ہے کہ کافر کامیاب نہیں ہوں گے ﴿۱۱۷﴾ اور آپ کہہ دیجئے کہ اے میرے رَبّ! تُو بخش دے اور تُو رحم کر، اور تُو بہترین رحم کرنے والا ہے ﴿۱۱۸﴾

تفسیر

کُفّار پر آئے ہوئے عذاب سے حفاظت کی دُعا کی تلقین

- قُلْ رَّبِّ اِمَّا تُرِيَنِّيْ مَا يُوْعَدُوْنَ: آپ کہہ دیجئے کہ اے میرے رَبّ! اگر تُو دِکھائے مجھے وہ چیز جس کا یہ وعدہ دیے جاتے ہیں۔ اب یہ گویا کہ عذاب کے وقوع کی طرف اشارہ ہے، جس طرح سے پیچھے آیا تھا کہ ہم ان کے اوپر جب عذابِ شدید کا دروازہ کھولیں گے تو یہ مایوس ہو جائیں گے، تو حضور ﷺ کو یہ دُعا تلقین کی گئی کہ آپ یہ دُعا کریں کہ اے اللہ! اگر میری زندگی میں ان پر عذاب آئے اور میری آنکھوں کے سامنے آئے، تو مجھے ہر قسم کی تکلیف سے محفوظ رکھیو، کیونکہ عذاب اگرچہ منکرین پہ آتا ہے، کافروں پہ آتا ہے، لیکن بسا اوقات اللہ تعالیٰ کی حکمت کے تحت اس میں نیک بھی لپیٹے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے گناہوں کی سزا کے طور پر قحط آجائے تو اس میں صرف گناہگار ہی تو بھوکے نہیں مرتے، نیک لوگوں کو بھی تکلیف پہنچتی ہے، اسی طرح زلزلہ آتا ہے، بربادی آتی ہے تو مکان صرف بروں کے تو نہیں گرتے، نیکوں کے بھی ساتھ گر جاتے ہیں، یہ علیحدہ بات ہے کہ نیکوں کے لئے وہ تکلیف باعث رحمت ہوگی، اور آخرت میں اللہ اجر دے گا، لیکن دنیا میں تو لپیٹ میں سارے آ جاتے ہیں۔ اگر گناہوں کی سزا کے طور پر سیلاب آتا ہے تو فصلیں صرف بُروں کی نہیں ڈوبتیں، اچھوں کی بھی ڈوبتی ہیں، لیکن اچھوں کی جو ڈوبتی ہیں تو اللہ تعالیٰ آخرت میں جزا دے گا، یہ نقصان بظاہر عارضی سا ہے، آخرت میں نفع ہی نفع ہے۔ تو یہ ظاہری طور پر تکلیف نیکوں کو بھی پہنچ جایا کرتی ہے، اس میں اس عذاب کی شدت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ حضور ﷺ کو دُعا تلقین کی گئی کہ آپ یہ دُعا کیجئے کہ اے اللہ مجھے اس سے محفوظ رکھیو، مجھے ظالموں کے ساتھ قرار نہ دیجیو، اس میں اس عذاب سے ہول (خوف) پیدا کرنا مقصود ہے۔ اے میرے رَبّ! اگر دِکھائے تُو مجھے وہ چیز جس کا یہ وعدہ دیے جاتے ہیں، اے میرے رَبّ! پس نہ کرنا تُو مجھے ظالم لوگوں میں، یعنی ظاہری طور پر مجھے ظالم لوگوں میں شامل نہ کرنا، کہ جس طرح سے ظالموں پہ عذاب آئے تو میں بھی تکلیف میں مبتلا

ہو جاؤں۔ رسول اللہ ﷺ کی زبان سے یہ الفاظ نکلوائے جا رہے ہیں کافروں کے اوپر خوف طاری کرنے کے لئے، کہ عذاب ایک ڈرنے کی چیز ہے کہ دیکھو، نبی بھی دُعا کرتے ہیں کہ اے اللہ! مجھے بچانا، اور دوسروں کو تعلیم دینی مقصود ہے، وَاِنَّا عَلٰۤى اَنْ نُّرِيَكَ مَا نَعِدُهُمْ لَقٰدِرُوْنَ: اور بے شک ہم اس بات پر کہ آپ کو دکھادیں وہ چیز جس کا ہم ان سے وعدہ کرتے ہیں البتہ قدرت رکھنے والے ہیں۔ لَقٰدِرُوْنَ یہ ''اِنَّ'' کی خبر ہے، بے شک ہم البتہ قدرت رکھنے والے ہیں اس بات پر کہ دکھادیں ہم آپ کو وہ چیز جس کا ہم ان سے وعدہ کرتے ہیں۔ جب ہمیں قدرت ہے، آپ کی موجودگی میں، آپ کی آنکھوں کے سامنے اس عذاب کو ہم اتار سکتے ہیں، ہمیں قدرت حاصل ہے، اس لیے آپ یہ دعا کیجئے کہ اے اللہ! اگر میری زندگی کے اندر یہ عذاب آجائے تو مجھے ہر قسم کی شر و آفت سے محفوظ رکھیو، حضور ﷺ کو یہ دُعا تلقین کی جا رہی ہے دوسروں کو سنانے کے لیے، سکھانے کے لیے، اور اس میں اس عذاب کی ہیبت بھی آگئی کہ یہ کتنی بڑی بات ہے کہ اللہ کا نبی بھی ڈرتا ہوا یہ دُعا کرتا ہے۔

بُرائی کا دِفاع اچھائی کے ساتھ کریں

اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ: جب تک عذاب نہیں آتا آپ ان کے ساتھ یہ معاملہ رکھیے۔ دفع کیجئے اس بات کے ذریعے جو کہ اچھی ہے السَّيِّئَةَ بُری بات کو۔ اِدْفَعْ السَّيِّئَةَ دُور ہٹایئے بُرائی کو بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ اس خصلت کے ذریعے سے جو کہ اچھی ہے، یعنی ان کی بُرائی کا دفاع اچھائی کے ساتھ کیجئے، یہ ظلم کرتے ہیں آپ آگے سے انصاف کریں، یہ زیادتیاں کرتے ہیں آپ عفو اور درگزر سے کام لیں، یہ بے مروتیاں کرتے ہیں آپ ان کے ساتھ احسان اور کرم سے پیش آئیں، جو خصلت اچھی ہے اس کے ذریعے سے ان کی بُرائی کو دفع کیجئے، نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَصِفُوْنَ: ہم خوب جانتے ہیں ان باتوں کو جو یہ بیان کرتے ہیں۔

غصے اور شیطانی وساوس سے بچنے کی دُعا

وَقُلْ: اور آپ یہ دُعا کیجئے، اس دُعا کا حاصل یہ ہے کہ جب دوسروں کی طرف سے بُرا برتاؤ ہو تو بسا اوقات غصہ آجاتا ہے، اور غصے میں آکر انسان ایسی بات کر بیٹھتا ہے یا ایسی حرکت کر بیٹھتا ہے جو مصلحت کے خلاف ہوتی ہے اس لیے دُعا کرو کہ غصہ ہی نہ آئے، اور غصہ اکثر و بیشتر شیطان کے وسوسے ڈالنے سے اور اس کے بہکانے سے آتا ہے تو یہاں شیطان سے بچنے کے لئے جو اللہ کے ساتھ تعوّذ کیا جا رہا ہے تو اس کا یہی مطلب ہے، کہ اگر دوسروں کی طرف سے بُرا برتاؤ ہو تو ہمیں توفیق دے کہ ہم اچھائی کریں، اور شیطانی وسوسوں سے ہمیں محفوظ رکھیے کہ شیطانی وسوسے کے طور پر ہمیں غصہ نہ آئے، کہ اس غصے میں آکر ہم کوئی ایسی بات کر بیٹھیں یا ایسی حرکت کر بیٹھیں جو مصلحت کے خلاف ہو۔ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ: اے میرے رَبّ! میں تیری پناہ پکڑتا ہوں شیاطین کے وساوس سے، شیاطین شیطان کی جمع ہے، اور هَمَزٰت همزه کی جمع ہے، همزه سے وسوسہ مراد ہے، همز اصل میں دھکا دینے کو کہتے ہیں، اور شیطان کی دھکا یہی ہے کہ وہ وسوسہ ڈال کے گناہ کی طرف دھکیل دے۔ شیاطین کے وساوس سے میں تیری پناہ پکڑتا ہوں، وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ: اور میں تیری پناہ پکڑتا ہوں اے میرے رَبّ! اس بات سے کہ وہ شیاطین میرے قریب آئیں، اَيْ اَنْ يَحْضُرُوْنِي، نون کے نیچے جو کسرہ ہے وہ یائے متکلم پر دال ہے۔ میں اس بات سے تیری پناہ پکڑتا

ہوں کہ وہ میرے قریب آئیں یعنی میرے قریب ہی نہ آنے پائیں، کہ مجھے بہکا کر، اُکسا کر، وسوسہ ڈال کے، غصہ دلا کر مجھ سے کوئی ایسی بات کروالیں، یا ایسا کوئی کام کروالیں جو مصلحت کے خلاف ہو، اس سے میں تیری پناہ پکڑتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ کو خطاب کرتے ہوئے ''ارْجِعُوْا'' کو جمع لانے کی وجہ

حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ: حتی کا مُغَیّا محذوف ہے، یعنی یہ شرک کرتے رہیں گے یا اسی طرح سے غفلت میں پڑے رہیں گے، اور یہ یونہی شرارتیں کرتے رہیں گے، سمجھیں گے نہیں، حتیٰ کہ جب ان میں سے کسی کو موت آجائے گی تو کہے گا رَبِّ ارْجِعُوْنِ، جب موت آجائے گی، موت طاری ہوگی، موت کے آثار طاری ہوں گے، تب ان کی عقل ٹھکانے آئے گی، پھر یوں کہیں گے رَبِّ ارْجِعُوْنِ اے میرے رَبّ! مجھے لوٹا دے۔ اَیْ اِرْجِعُوْنِیْ، اب اِرْجِعُوْا جمع کا صیغہ آگیا، حالانکہ رَبِّ میں خطاب واحد کو ہے، اے میرے رَبّ! تم مجھے لوٹا دو، یا تو یہ ادب کے طور پر ہے، جس طرح سے واحد کو خطاب کرتے وقت تعظیم کے طور پر جمع سے تعبیر کر دیا جاتا ہے، تو ''ارْجِعُوْ'' میں بھی اسی طرح سے ادب کے طور پر جمع کا صیغہ بول دیا، مراد مفرد ہی ہے۔ یا مفسرین یوں بھی کہتے ہیں کہ جب کسی بات کا تکرار ہو تو اس کو بھی بسا اوقات جمع کے صیغے سے تعبیر کر دیا جاتا ہے، تثنیہ یا جمع لا کر اس کے تکرار کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے، تکرار کی طرف اشارہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جس وقت کافر کے اوپر موت طاری ہوگئی اور اس کی آنکھوں کے سامنے وہ عذاب آگیا، فرشتے نمایاں ہوگئے، جیسا کہ احادیث سے تفصیل معلوم ہوتی ہے کہ جان کنی شروع ہوتی ہے تو عالم آخرت منکشف ہو جاتا ہے، تو منکشف ہونے کے بعد پھر وہ کہے گا: رَبِّ ارْجِعْ، رَبِّ ارْجِعْ، رَبِّ ارْجِعْ، بار بار اصرار کرے گا، اے میرے رَبّ! مجھے واپس لوٹا دے، اے میرے رَبّ! مجھے واپس لوٹا دے، اے میرے رَبّ! مجھے واپس لوٹا دے، تو یہ جو اِرْجِعْ اِرْجِعْ کا تکرار ہے اسی کو ارْجِعُوْ جمع کے صیغے کے ساتھ تعبیر کر دیا، جیسے آپ نے سبعہ معلقہ میں پڑھا ہوگا، یا پڑھ لیں گے، پہلا قصیدہ امرئ القیس کا ہے، اس میں جو پہلا مصرعہ ہے:

قِفَا نَبْكِ مِنْ ذِكْرٰى حَبِيْبٍ وَّمَنْزِلٖ

قِفَا اُمر کا صیغہ ہے، یا تو اس کے دو ساتھی تھے جن کو خطاب کر کے کہتا ہے، کہ اے میرے دونوں ساتھیو! ٹھہر جاؤ، ہم رولیں اپنے حبیب کو یاد کر کے اور اس کے ٹھکانے کو یاد کر کے رولیں، دونوں ٹھہر جاؤ، تو دو کو خطاب ہے۔ اور اس میں دوسری توجیہ یہ بھی ہے قِفْ قِفْ ٹھہر ٹھہر، یہ جو اصرار آیا، قِفْ قِفْ اس کو قِفَا کے ساتھ تعبیر کر دیا۔ تو یہ تثنیہ اور جمع تکرار کی طرف اشارہ کرنے کے لیے بھی آیا کرتا ہے، تو اسی طرح یہاں جو کہے گا کہ مجھے لوٹا دے، مجھے لوٹا دے، مجھے لوٹا دے، بار بار جو اس طرح سے کہے گا، تو اس کو: ''ارْجِعُوْ'' جمع کے ساتھ تعبیر کر دیا گیا۔ یا یہ جمع تعظیم کے لیے ہے۔

کافر کی دُنیا میں واپس جانے کی تمنا پوری کیوں نہیں ہوگی؟

لَعَلِّیْۤ اَعْمَلُ صَالِحًا فِیْمَا تَرَكْتُ: تا کہ میں نیک عمل کرلوں اس چیز میں جس کو میں چھوڑ آیا ہوں مَا تَرَكْتُ سے مراد دنیا ہے،

جس دنیا کو میں چھوڑ آیا ہوں، میں اس میں جا کے نیک عمل کر لوں، اے میرے پروردگار! مجھے لوٹا دے، جیسے کہ سورۂ الم تنزیل میں آئے گا: فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا، ہمیں لوٹا دے تا کہ ہم نیک عمل کر لیں، اور سورۂ منافقون کے آخر میں بھی ایسے ہی ہے: رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِیْٓ اِلٰٓی اَجَلٍ قَرِیْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ کہ مجھے تھوڑی سی مہلت کیوں نہ دے دی کہ میں اس مال کا صدقہ کرآؤں جو میں نے جمع کر رکھا ہے، اور نیک لوگوں میں سے ہو جاؤں۔ تو یہاں مَا تَرَكْتُ سے دنیا بھی مراد لی جاسکتی ہے، اور اسی طرح اس سے یہ بھی مراد لیا جاسکتا ہے کہ جو مال متاع میں چھوڑ آیا ہوں، اس مال و متاع کے بارے میں میں نیک عمل کرآؤں۔ اور مال و متاع کے بارے میں نیک عمل کیا ہے؟ کہ اس کو تیرے نام پر خیرات کرآؤں، جیسے ابھی سورۂ منافقون کی آیت آئی فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ مجھے تُو نے تھوڑی سی مہلت کیوں نہ دے دی، یعنی مجھے تھوڑی سی مہلت دے دے تا کہ میں صدقہ کرآؤں اور میں نیک لوگوں میں سے ہو جاؤں، یہاں بھی یہی بات ہے، مَا تَرَكْتُ سے دنیا مراد ہے، یا مال و متاع مراد ہے۔ تا کہ میں نیک عمل کر لوں اس چیز میں جس کو میں چھوڑ آیا ہوں۔ كَلَّا: اللہ کی طرف سے یہ رَدع اور ڈانٹ پڑ جائے گی، ہرگز نہیں، ایسا نہیں ہوسکتا، كَلَّا میں انکار کس بات پر ہے؟ یا تو ارْجِعُوْنِ پر ہے، کہ وہ کہتا ہے، لوٹا دو، تو اس کی تردید ہے کہ كَلَّا ہرگز نہیں ہوگا، اب نہیں لوٹایا جاسکتا......
اور كَلَّا کا تعلق اس سے بھی ہوسکتا ہے کہ لَعَلِّیْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا وہ کہتا ہے کہ مجھے چھوڑ دو، مجھے لوٹا دو تا کہ میں دنیا کے اندر جا کر اپنے چھوڑے ہوئے سامان میں کچھ نیکی کرآؤں، اللہ فرماتے ہیں ہرگز نہیں، اس بدبخت کو اگر لوٹا دیا گیا پھر بھی جا کر نیکی نہیں کرے گا، جا کر دوبارہ پھر اسی طرح سے مستیاں کرے گا جس طرح سے پہلے کرتا رہا ہے، یہ مفہوم بھی اس کا ہوسکتا ہے، قرآن کریم میں اس بات کو بھی ذکر کیا گیا ہے کہ اگر ان کو ان کی منشا کے مطابق لوٹا بھی دیا جائے وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ (سورۂ انعام: ۲۸) اگر یہ لوٹا بھی دیے جائیں تو اسی طرف ہی لوٹیں گے جس سے ان کو روکا گیا ہے، یہ دوبارہ وہی کام کریں گے جن سے ان کو روکا گیا ہے، اس میں کوئی بُعد نہیں ہے، یہ آپ دیکھ لیا کریں، روزمرہ کے واقعات ہیں، جس وقت کوئی انسان کسی مصیبت میں پھنستا ہے، بیماری میں پھنس گیا، کسی حادثے کا شکار ہو گیا، تو چار پائی پہ پڑا ہوا اسی طرح سے کیا کرتا ہے کہ اے اللہ! بس اب اس مصیبت سے نجات دے دے، آئندہ نماز پڑھا کروں گا، ہمیشہ زکوۃ دوں گا، اب معاف کر دے، آئندہ میں گناہ نہیں کروں گا، دیکھ لینا! جب بھی انسان مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے تو اسی قسم کی باتیں کرتا ہے، اور جس وقت مصیبت دُور ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ دوبارہ صحت دے دیتے ہیں، اور پریشانی زائل ہو جاتی ہے تو جو کرتوت پہلے تھے وہی بعد میں ہوتے ہیں، سارے کیے ہوئے وعدے بھول جاتا ہے، تو اسی طرح سے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر ان کو لوٹا بھی دیا جائے تو دوبارہ وہی کام کریں گے جن سے ان کو روکا گیا ہے، ایک مزاج جو بن گیا، ایک افتادِ طبیعت جو بن گئی، مار پڑتی ہے سزا ہوتی ہے اس وقت انسان کچھ توبہ توبہ کرتا ہے، لیکن جب پھر رَسّی ڈھیلی ہوتی ہے تو دوبارہ پھر ویسے ہو جاتا ہے، تو ان کو اگر لوٹا بھی دیا جائے تو جس طرح یہ دنیا کی محبت میں مبتلا ہیں، واپس جا کے بھی اس مال و متاع میں نیکی نہیں کریں گے، یہ پھر ویسے کریں گے جس طرح پہلے کرتے رہے ہیں، تو كَلَّا کے ساتھ اس کی اس بات پہ انکار ہے۔ زیادہ واضح بات یہی ہے کہ ارْجِعُوْا کے جواب میں كَلَّا کہا جا رہا ہے کہ وہ کہتا ہے مجھے لوٹا دو، اللہ فرماتے ہیں کہ ہرگز نہیں،

اب یہ کام نہیں ہوگا۔ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا: یہ ایک بات ہے جس کو وہ کہتا جارہا ہے، اوراس کے اوپر کوئی اثر مرتب نہیں ہوگا، اب وہ اِرجِعُوا ارجِعُوا پکارتا رہے گا، یہ ایک بات ہے جس کو وہ کہنے والا ہے، یعنی اس کے منہ سے نکلتی ہے، باقی! اس کے اوپر اب اثر کوئی بھی مرتب نہیں ہوگا۔

برزخ کی وضاحت

وَمِنْ وَّرَآىِٕهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ: برزخ کہتے ہیں آڑ کو، جیسے سورۂ رحمٰن میں آئے گا، بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ اللہ نے دو دریا کھاری اور میٹھے چلائے، اوران کے درمیان ایک آڑ ہے جس کی بنا پر وہ ایک دوسرے پر زیادتی نہیں کرسکتے، کہ کھارا میٹھے میں چلا جائے، اور میٹھا کھارے میں چلا جائے، سمندر میں اس قسم کی لہریں چلتی ہیں، یہ پانی جارہا ہے جو کھارا ہی کھارا ہی، اس کے ساتھ دوسرا بالکل میٹھا پانی آجاتا ہے، حالانکہ اگر آپ بالٹی میں پانی ڈالیں تو آپ کی یہ طاقت نہیں ہے کہ دو حصوں میں علیحدہ علیحدہ ڈال لیں، کہ ادھر والا اس میں نہ ملے، اور ادھر والا اس میں نہ ملے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے پردے درمیان میں حائل کیے ہوئے ہیں کہ کھاری اور میٹھے پانی دونوں برابر ہیں اور ایک دوسرے پر زیادتی کر کے ایک دوسرے میں داخل نہیں ہوسکتے۔ تو برزخ آڑ کو کہتے ہیں، یہ سمندر میں اس قسم کی لہریں ہیں، جہاں میٹھا اور کھارا پانی ساتھ ساتھ ہوتا ہے، درمیان میں قدرت کی ایک آڑ قائم کی ہوئی ہے جس کی بنا وہ ایک دوسرے میں داخل نہیں ہوسکتے...... اور یہاں برزخ سے مراد وہ زمانہ ہے جو اس دنیوی زندگی کے ختم ہونے کے بعد قیامت سے پہلے ہے، یعنی قبر والا زمانہ، اس کو برزخ کہا جاتا ہے، کیونکہ یہ آخرت اور دنیا کے درمیان میں ایک آڑ ہے، ادھر دنیاوی زندگی ہے، اور دوبارہ اٹھیں گے تو اس کے بعد آخرت ہوجائے گی، تو اس موت سے لے کر دوبارہ قیامت کے دِن اُٹھنے سے پہلے پہلے جو وقت گزرتا ہے اس کو برزخ کہتے ہیں...... ان کے سامنے ایک پردہ ہے، ایک رکاوٹ ہے، اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ: اُٹھائے جانے کے دِن تک یعنی اب ایک رکاوٹ ایک پردہ آگیا جس کی بنا پر اب یہ دنیا کی طرف دوبارہ نہیں آسکیں گے، مرنے کے بعد برزخ میں چلے گئے، اب ایک رکاوٹ پیش آگئی، اب یہ اس دنیا کی طرف لوٹ کے نہیں آئیں گے۔

''صور'' کی حقیقت اور ''نفخِ صور'' کا اثر

فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ: پھر جس وقت پھونک ماری جائے گی صور میں۔ صور یہ کوئی چیز ہے جس طرح سے بگل بجایا جاتا ہے، آپ نے ملنگوں کے پاس دیکھا ہوگا، ایک سینگ سا بنا ہوا ہوتا ہے، اس میں پھونک مارتے ہیں تو آواز نکلتی ہے، تو اللہ تعالیٰ نے عالمِ آخرت کے حقائق انہی الفاظ کے ساتھ ہی بیان فرمائے ہیں جن کو ہم سمجھ سکیں۔ اصل تو یہ ہے کہ فرشتہ ایک آواز دے گا اور وہ آواز کسی ذریعے سے ساری کائنات میں پھیلے گی، پہلی دفعہ آواز دے گا تو ساری کی ساری کائنات ٹوٹ پھوٹ جائے گی، دوبارہ اسی طرح سے ایک آواز دے گا تو سارے کے سارے ٹھیک ہوجائیں گے، اب ہمیں سمجھانے کے لیے بات کہی جارہی ہے کہ بگل بجے گا، اور قرن یعنی سینگ کی شکل میں ایک چیز ہے جس میں فرشتہ پھونک مارے گا، اور اس سے آواز نکلے گی، تو اس آواز کا پہلا اثر یہ ہوگا کہ ساری کائنات ٹوٹ پھوٹ جائے گی، دوسری دفعہ آواز آئے گی تو سارے کے سارے درست ہوجائیں گے۔ تو صور اصل

میں قرن کو کہتے ہیں جس کے اندر پھونکا جاتا ہے، سینگ کی شکل کی چیز جس میں پھونک مارتے ہیں تو آواز نکلتی ہے، بسااوقات یہ ملنگ اُٹھائے پھرتے ہیں، ہرن کے سینگ ہوتے ہیں اوراس میں پتا نہیں کیا کچھ لگا کے بنا لیتے ہیں، اس میں پھونک مارنے سے آواز نکلتی ہے جس کو بگل بجانا کہتے ہیں۔ جیسے فوجوں کو تیار کرنے کے لیے بگل بجایا جاتا ہے، یا کسی مجمع کو منتشر کرنے کے لیے بگل بجایا جاتا ہے، اکٹھا کرنے کے لیے بگل بجایا جاتا، تو دنیا کے اندر ایسے ہوتا ہے، چھاؤنی میں جس وقت جوانوں کو کسی کام کے لیے بلانا ہو تو ایک بگل بجاتے ہیں جس طرح باجا ہوتا ہے، آواز سنتے ہی سارے کے سارے اکٹھے ہوجاتے ہیں۔ اور چھٹی کا وقت آتا ہے تو وہی بگل بجاتے ہیں، سارے منتشر ہوجاتے ہیں، اور یہ آپ کی گھنٹی بھی تو ایسے ہی ہے، کبھی اکٹھا کرنے کے لیے بجتی ہے، کبھی منتشر کرنے کے لیے، تو اسی طرح اسرافیل علیہ السلام آواز دیں گے، پہلی آواز پر ساری کائنات میں انتشار ہوجائے گا اور دوسری آواز پر سارے اکٹھے ہوجائیں گے، یہاں سے نفخہ ثانیہ مراد ہے، جیسے دوسری جگہ ہے: ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ (سورۂ زمر: ۶۸) جب دوبارہ اس میں نفخ کیا جائے گا تو سارے لوگ کھڑے جھانکیں گے، سارے کے سارے اٹھ کے کھڑے ہوجائیں گے اور جھانک رہے ہوں گے۔

قیامت کے دِن کوئی کسی سے نہیں پوچھے گا سوائے متقین کے

فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَىِٕذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ: جب صور میں پھونک ماری جائے گی تو نہیں ہوں گے نسب ان کے درمیان اس دن اور نہ آپس میں ایک دوسرے سے پوچھیں گے۔ تَسَاۤئُل: ایک دوسرے سے سوال کرنا، اَنساب نسب کی جمع ہے۔ کوئی رشتے داریاں نہیں ہوں گی، اور کوئی ایک دوسرے سے نہیں پوچھے گا، سب آپ دھاپ پڑ جائے گی، افراتفری ہوگی، نفسانفسی ہوگی، کوئی کسی کا رشتہ دار نہیں ہوگا یعنی رشتہ داری کا لحاظ نہیں ہوگا، ورنہ نسب تو ہیں ہی، باپ بیٹے کا تعلق تو ہے ہی، لیکن لحاظ نہیں ہوگا، جس طرح سے سورۂ عبس کے آخر میں آئے گا: يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ۝ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ ۝ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ ۝ سب کا ذکر کردیا، بھائیوں سے، بیٹوں سے، بیویوں سے، ماں سے، باپ سے ہر کوئی بھاگے گا تاکہ ایک دوسرے کے سامنے کے ساتھ کوئی کہہ نہ دے کہ یا اللہ! اس نے مجھے گمراہ کیا تھا، یا ایک دوسرے کے حق جو تلف کیے ہوں گے تو ایک دوسرے سے ڈریں گے کہ کہیں باپ بیٹے کو گریبان سے نہ پکڑ لے، بیٹا باپ کو گریبان سے نہ پکڑ لے کہ تو نے مجھے غلطی میں ڈالا تھا، تو نے مجھے گمراہی میں ڈالا تھا، اس لیے ایک دوسرے کو چھوڑ کے بھاگیں گے، کوئی کسی کا نہیں ہوگا، فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ ان کے درمیان میں رشتہ داریاں نہیں ہوں گی، جیسے ایک جگہ آیا ہے تَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ (سورۂ بقرہ: ۱۶۶) جتنے تعلقات ہیں سب ٹوٹ جائیں گے، کوئی نہیں پوچھے گا، اسی طرح ایک جگہ ہے اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَىِٕذٍۢ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ (سورۂ زخرف: ۶۷)۔ ہاں! البتہ متقی لوگ، تقوے والے لوگ جو اللہ تعالیٰ کے مقبول بندے ہیں ان کے آپس میں تعلقات بحال رہیں گے اور کے تعلقات سے فائدہ بھی پہنچے گا، جس سے معلوم ہوگیا کہ تعلقات بحال نہ رہنا اور ایک دوسرے سے بھاگنا، ایک دوسرے سے نفرت کر کے دوڑنا، یہ بات کافروں کے متعلق ہے، ورنہ مؤمن بندے، نیک صالحین، مقربین، وہ تو ایک دوسرے کا خیال رکھیں گے، اور یہ لوگ (کفار) آپس میں ایک دوسرے سے

پوچھیں گے بھی نہیں...... یہ ایک وقت ہوگا جب حساب و کتاب کی پریشانی سر پر کھڑی ہوگی، ورنہ ایک وقت ایسا بھی آجائے گا کہ اَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ﴿۲۷﴾ (سورۂ صافات: ۲۷) ایک دوسرے سے پوچھیں گے بھی کہ کیا ہوا، کس طرح سے ہوا؟ پھر جواب بھی دیں گے۔ تو یہ مختلف اوقات کے اعتبار سے مختلف حالات طاری ہوں گے۔

قیامت کے دِن تین وقت ایسے آئیں گے کہ کوئی کسی کو یاد نہیں کرے گا

جس وقت پہلے پہلے میدانِ قیامت میں آئیں گے اور انسان کے سامنے اپنا انجام پوری طرح واضح نہیں ہوگا، اس وقت تک نفسانفسی ہوگی۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک دفعہ پوچھا، جب کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر فکرِ آخرت طاری تھا اور آخرت کو یاد کر کے رو رہی تھیں، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یارسول اللہ! آپ اپنے اہل و عیال کو بھی یاد رکھو گے یا نہیں؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خوف کو بحال رکھنے کے لئے فرمایا کہ عائشہ! تین وقت تو ایسے ہیں کہ کوئی کسی کو یاد نہیں آئے گا۔ ایک وہ وقت کہ جس وقت اعمال تلنے لگیں گے، اس وقت تک ہر کوئی اپنی فکر میں مبتلا ہوگا، کوئی کسی دوسرے کی طرف خیال نہیں کرے گا جب تک اس کو پتا نہ چل جائے کہ میری میزان بھاری ہے یا ہلکی؟ اور دوسرا جس وقت نامہ اعمال اُڑائے جائیں گے، جس وقت تک انسان کو خود اطمینان نہیں ہوجائے گا کہ میرا نامۂ اَعمال میرے دائیں ہاتھ میں آتا ہے کہ بائیں ہاتھ میں، اس وقت تک اپنا ہی دھیان ہوگا، نفسانفسی ہوگی، کوئی کسی کا خیال نہیں کرے گا۔ اور تیسرے جس وقت پُل صراط پر سے گزریں گے، اس وقت بھی ہر کسی کو اپنا فکر ہوگا، کوئی کسی کا خیال نہیں کرے گا، جب تک اس کو یہ اطمینان نہ ہوجائے کہ میں گزر گیا ہوں۔[1]

نیک لوگوں کے ساتھ تعلق آخرت میں کام آئے گا

تو مختلف اوقات میں یہ احوال طاری ہوں گے، اور دوسرے اوقات میں ایک دوسرے کا خیال بھی کریں گے، خاص طور پر مؤمنین سفارش کریں گے اللہ کے سامنے اپنے ساتھیوں کے لئے روئیں گے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب جنّتی جنّت میں چلے جائیں گے، جہنمی جہنم میں چلے جائیں گے، تو اہلِ ایمان اپنے ساتھیوں کو یاد کریں گے جن کے ساتھ دنیا میں تعلق تھا، اور ان الفاظ کے ساتھ ذکر فرمایا کہ ''تم دُنیا میں اپنا حق (جو کسی کے ذِمّے ثابت ہوجائے) تو تم اپنا حق کسی سے اتنی شدت کے ساتھ نہیں مانگتے، جتنی شدت کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے جنّتی اہلِ جہنم کے متعلق سفارش کریں گے۔'' کہیں گے کہ یااللہ! وہ فلاں لوگ جو ہمارے ساتھ نمازیں پڑھا کرتے تھے، ہم آپس میں مل کر روزے رکھا کرتے تھے، وہ جہنم میں چلے گئے، انہیں نجات دے دے، اس طرح سے اللہ تعالیٰ سے اصرار کریں گے، تب اللہ تعالیٰ انہیں اجازت دے گا کہ جاؤ! اپنے اپنے رفقاء کو تلاش کر لاؤ،[2] تو پھر جنّتی جہنم میں جائیں گے، اور جہنم میں پہلے اعلان ہو گیا ہوگا، تو جہنمی صفیں باندھے کھڑے ہوں گے انتظار

---

(۱) ابو داؤد ۲/ ۲۹۸، باب فی ذکر المیزان۔ مشکوٰۃ ص ۴۸۶ باب الحساب، فصل ثانی۔

(۲) مسلم ۱/ ۱۰۳، باب اثبات الشفاعۃ سے پہلے۔ نیز بخاری ۲/ ۱۱۰۷، باب قول اللہ وجوہ یومئذ ناضرۃ۔ مشکوٰۃ ۲/ ۴۹۰، باب الحوض والشفاعۃ۔

میں، کہ دیکھو! کوئی ہمارا ملنے والا بھی آتا ہے یا نہیں آتا تو ایک جنتی جارہا ہوگا اور جہنمیوں میں سے (جو اس قطار میں کھڑے ہوں گے ان میں سے) ایک آدمی اسے کہے گا کہ او اللہ کے بندے! ''یا عبداللہ!'' کہہ کے اسے متوجہ کرے گا، متوجہ کرنے کے بعد کہے گا: ''اما تعرفنی؟'' تو مجھے پہچانتا نہیں؟ وہ (جنتی) کہے گا کہ نہیں، میں نے تو تجھے نہیں پہچانا! وہ کہے گا کہ فلاں وقت میں نے تجھے وضو کے لئے پانی دیا تھا! اس جنتی کو یاد آجائے گا، اسی وقت اس کا بازو پکڑ لے گا، کہے گا ٹھیک ہے چل۔[1] یعنی اتنا اتنا تعلق بھی اس وقت کام آجائے گا، اگر کسی نیک آدمی کو کسی وقت وضو کے لیے پانی دیا تھا، تو وہ وضو کے لیے دیا ہوا پانی اس کے لیے سفارش کا ذریعہ بن جائے گا۔ اسی طرح سے ایک آدمی دوسرے کو یاد دلائے کہ میں نے تجھے فلاں وقت میں پانی پلایا تھا، اس کو وہ پیا ہوا پانی یاد آجائے گا، اتنا سا احسان کسی نیک آدمی پر، وہ بھی نجات کا ذریعہ بن جائے گا (حوالہ مذکورہ)۔ تو مؤمنین تو آپس میں ایک دوسرے کی پوچھ گوچھ کریں گے، اور سورۂ طور میں آپ کے سامنے آئے گا: اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ کہ ہم ان مؤمنین کے ساتھ ان کی اولاد کو ملا دیں گے، یعنی اولاد اگر ماں باپ کے پاس اولاد جانا چاہے گی تو اولاد کا درجہ بلند کر کے ماں باپ کے پاس وہ پہنچادی جائے گی، وہاں مفسرین نے لکھا ہے کہ ذُرّیت عام ہے، نسبی ہو یا رُوحانی ہو، اس لیے شاگرد اور اُستاذ کا تعلق، شیخ اور مرید کا تعلق، اور اسی طرح باپ اور بیٹے کا تعلق، بشرطیکہ ایمان سالم چلا جائے، ایمان محفوظ چلا جائے، تو یہ سارے کے سارے تعلقات فائدہ دیں گے، اُستاذ کی وجہ سے شاگردوں کے درجات بلند ہوں گے، بسا اوقات شاگرد کا درجہ اُونچا ہو گیا تو اس کی معرفت اُستاذ کا درجہ اُونچا ہو جائے گا، اسی طرح شیخ اور مرید ایک دوسرے کو فائدہ پہنچائیں گے، ماں باپ اور اولاد کا ایک دوسرے کو فائدہ پہنچے گا، یہ ساری صورتیں پیش آئیں گی۔ دوزخ میں بھی جا کے سفارش کریں گے، جنت کے اندر بلندیٔ درجات کا ذریعہ بھی بنیں گے، حضور ﷺ بھی، دیگر انبیاء بھی، ملائکہ بھی، شہداء بھی، علماء بھی، حفاظ بھی، سب کے متعلق تذکرہ آتا ہے کہ یہ سفارشی ہیں، سفارش کریں گے اور چھڑا کے لے جائیں گے، بشرطیکہ ایمان محفوظ ہو...... اور کافروں کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہوگا، بلکہ ایک دوسرے پر لعنت کریں گے اور ایک دوسرے سے بھاگیں گے، اور پوچھ گوچھ بھی ہوگی تو ملامت کے انداز میں آپس میں ایک دوسرے سے پوچھیں گے، توفَلَاۤ اَنۡسَابَ بَيۡنَهُمۡ يَوۡمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوۡنَ یا تو کسی خاص وقت پر محمول ہے، یا پھر یہ قصہ کافروں کا ہے۔

کامیاب کون؟ اور ناکام کون؟

فَمَنۡ ثَقُلَتۡ مَوَازِيۡنُهٗ: پھر جس کے ترازو بوجھل ہو گئے یعنی ایمان والا ترازو بوجھل ہو گیا فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ پس یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں، وَمَنۡ خَفَّتۡ مَوَازِيۡنُهٗ: اور جس کے ترازو ہلکے ہو گئے فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ خَسِرُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ پس یہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے نفسوں کو خسارے میں ڈال دیا، فِىۡ جَهَنَّمَ خٰلِدُوۡنَ جہنم میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے۔ تَلۡفَحُ وُجُوۡهَهُمُ النَّارُ: جہنم میں پھر ان

---

[1] مشکوٰۃ ۲/۴۹۴ باب الحوض والشفاعۃ، فصل ثانی۔ شرح السنۃ ۱۵/۱۸۵ باب الحوض، رقم: ۴۳۵۳۔

کے ساتھ کیا ہوگا؟ آگ جھلس دے گی ان کے چہروں کو، وَهُمْ فِيهَا كَالِحُونَ: اور وہ اس جہنم میں "کالح" ہوں گے، "کالح" کا معنی یہاں ہے بدشکل، ان کے منہ بگڑے ہوئے ہوں گے، چہرے بگڑے ہوئے ہوں گے، لیکن "کالح" اصل میں اس شخص کو کہا جاتا ہے کہ جس کے دونوں ہونٹ عام حالات میں اس کے دانتوں کو نہ چھپائیں، بلکہ اوپر کا ہونٹ اوپر کو چڑھا ہوا ہو اور نیچے کا ہونٹ نیچے کو لٹکا ہوا ہو، جیسے اونٹ کا نیچے کو لٹک رہا ہوتا ہے، اور اس کے دانت ننگے ہوں، اصل کے اعتبار سے کالح اس کو کہتے ہیں۔ چنانچہ اس "کالح" کی تفسیر بھی حدیث شریف میں آتی ہے، سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ نچلا ہونٹ ان کا اس طرح سے متورّم ہو جائے گا، سوج جائے گا کہ تَضْرِبَ سُرَّتَهٗ، لٹکتا ہوا ناف کو لگے گا، اور اوپر والا سکڑ جائے گا اور سکڑتا ہوا اوپر تک پہنچ جائے گا،[1] اب آپ بھی اندازہ کرلیں کہ یہ انسان کتنا بدشکل ہو جائے گا، اس کے دانت نمایاں ہو جائیں گے، اس کا منہ کھل جائے گا، اس قسم کی کیفیت ان کی ہو جائے گی۔ ان کے چہروں کو آگ جھلس دے گی اور وہ اس آگ میں بدشکل ہوں گے، ان کے منہ بگڑے ہوئے ہوں گے۔

کافروں کو رُوحانی سرزنش

اَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ: اور پھر روحانی طور پر ان کو یہ سرزنش ہوگی، ان سے کہا جائے گا، کیا میری آیات تم پر پڑھی نہیں جاتی تھیں؟ فَكُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ پھر تم ان آیات کی تکذیب کیا کرتے تھے، ان کو جھٹلاتے تھے۔ قَالُوْا رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا: وہ کہیں گے اے ہمارے پروردگار! ہم پر ہماری بدبختی غالب آ گئی، وَكُنَّا قَوْمًا ضَآلِّيْنَ اور ہم بھٹکے ہوئے لوگ تھے، اس وقت اقرار کریں گے کہ ہم بدبخت تھے۔ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْهَا: اے ہمارے ربّ! ہمیں اس آگ سے نکال دے، فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ پھر اگر دوبارہ ہم ایسی حرکتیں کریں، تو پھر ہم قصوروار ہوں گے، پھر ہم ظالم ہوں گے۔ جب وہ یوں کہیں گے کہ ہمیں نکال دے اگر ہم دوبارہ ایسا کریں تو ہم قصوروار ہیں، پھر تو ہماری نہ سننا، تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: اخْسَئُوْا فِيْهَا: ذلیل ہو کر پڑے رہو اس جہنم میں۔ اِخْسَأْ: یہ دھتکارنے کے لیے ہوتا ہے، جیسے کسی کتّے کو دھتکارا جاتا ہے، تو یہی کہا جاتا ہے: اِخْسَأْ، دفع ہو جا! اس قسم کے موقع کے لیے یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ ذلیل ہو کے پڑے رہو اس آگ میں! وَلَا تُكَلِّمُوْنِ: اور مجھ سے بات نہ کرو! اَیْ لَا تُكَلِّمُوْنِيْ۔ تو حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ جواب مل جائے گا، تو پھر ان کے اُوپر پوری مایوسی طاری ہو جائے گی، پھر ویل یعنی ہلاکت اور چیخ و پکار میں لگ جائیں گے، اس کے بعد اُمید کی کوئی کرن ان کے سامنے نہیں ہوگی۔[2]

کُفّار کی سرزنش کے ضمن میں صابر مؤمنین کی حوصلہ افزائی

اللہ تعالیٰ ڈانٹتے ہوئے ان کو ایک دوسری بات بھی کہیں گے کہ (دیکھو! اس میں اہلِ ایمان کی حوصلہ افزائی ہوگی)

---

(۱) تَشْوِيْهِ النَّارُ فَتَقَلَّصُ شَفَتُهُ الْعُلْيَا حَتّٰى تَبْلُغَ وَسَطَ رَأْسِهٖ وَتَسْتَرْخِيْ شَفَتُهُ السُّفْلٰى حَتّٰى تَضْرِبَ سُرَّتَهٗ (ترمذی ۸۶/۲ باب صفۃ طعام اہل النار مشکوٰۃ ۵۰۳/۲)

(۲) فَعِنْدَ ذٰلِكَ يَئِسُوْا مِنْ كُلِّ خَيْرٍ وَعِنْدَ ذٰلِكَ يَأْخُذُوْنَ فِي الزَّفِيْرِ وَالْحَسْرَةِ وَالْوَيْلِ. (حوالہ مذکورہ بالا)

اللہ تعالیٰ ان سے کہیں گے کہ: اِنَّهٗ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْ عِبَادِيْ بے شک میرے بندوں میں سے ایک گروہ تھا جو یوں کہا کرتے تھے اے ہمارے رَبّ! ہم ایمان لے آئے، تُو ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم کر اور تُو بہت اچھا رحم کرنے والا ہے۔ میرے بعض بندے تھے جو ایمان لے آئے، ایمان لانے کے وہ میرے سامنے یوں گڑگڑاتے تھے، مجھ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے تھے اور مجھ سے رحم طلب کرتے تھے، کتنی اچھی بات تھی، میرے ساتھ ان کا تعلق نمایاں تھا۔ تو فَاتَّخَذْتُمُوْهُمْ سِخْرِيًّا تم نے ان کے مذاق اُڑائے، تم نے ان کا تمسخر بنایا، جہاں اس قسم کے صوفی آدمی، نیک لوگ، اللہ اللہ کرنے والے، اللہ کے سامنے دُعائیں کرنے والے تمہارے سامنے آتے تھے، تم ان کا مذاق اُڑاتے تھے، ان سے تمسخر کرتے تھے، یعنی نیکوں کے ساتھ تمہارا یہ معاملہ تھا، میرے بندوں کے ساتھ تمہارا یہ برتاؤ تھا، جس کا مطلب یہ ہوا کہ تم نے میرے حقوق بھی تلف کیے اور میرے بندوں کو بھی تم نے دنیا میں ذلیل کیا، تو جن بندوں کے ساتھ تمہارا یہ برتاؤ تھا، آج میں نے ان کو عزت دے دی، اور تم اسی طرح ذلیل ہو کے پڑے رہو۔ تو نیکوں کے ساتھ جو تمہاری عداوت تھی، نیکوں کے ساتھ جو تم مذاق اور تمسخر کیا کرتے تھے، آج اس کی یہی سزا ہے کہ تم اسی طرح سے ذلیل ہو گے اور ان کو میں عزت دوں گا۔ تم نے ان کا مذاق اڑایا، حَتّٰۤى اَنْسَوْكُمْ ذِكْرِيْ: اور تم ان کے پیچھے اتنے لگے کہ انہوں نے تمہیں میری یاد بھلا دی، ان میں تم اتنے مشغول ہو گئے کہ تمہیں میں کبھی یاد ہی نہیں آیا، کہ اللہ تعالیٰ کبھی ہم سے پوچھے گا بھی، وَكُنْتُمْ مِّنْهُمْ تَضْحَكُوْنَ اور تم ان سے ہنسا کرتے تھے، اِنِّيْ جَزَيْتُهُمُ الْيَوْمَ بِمَا صَبَرُوْۤا: میں نے آج ان کو بدلہ دیا ان کے صبر کرنے کی وجہ سے، اس سے معلوم ہو گیا کہ نیکوں کا مذاق جس وقت یہ کافر اور فاسق اڑائیں تو اس کے مقابلے میں نیکوں کو صبر کرنا چاہیے، اس صبر کی بنا پر پھر اللہ تعالیٰ بدلہ دے گا، اور دیکھو! اللہ کتنی حوصلہ افزائی کرتا جو آج کافروں کو ڈانٹ رہا ہے کہ جن سے تم ہنستے تھے جن کا تم مذاق اڑایا کرتے تھے، میرے بندے جو مجھ سے مغفرت طلب کرتے تھے، میری رحمت کے طالب ہوتے تھے، آج میں نے ان کو ان کے صبر کی وجہ سے بدلہ دیا، اَنَّهُمْ هُمُ الْفَآىِٕزُوْنَ بے شک وہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔

دُنیا کی خوش حال زندگی قیامت کے دِن کفّار کو ایک خواب معلوم ہو گی

قٰلَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْاَرْضِ عَدَدَ سِنِيْنَ: یہاں قٰلَ کا قائل مذکور نہیں ہے کہ کہنے والا کون ہے؟ قرآنِ کریم کی دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپس میں ایک دوسرے سے گفتگو کرتے ہوئے پوچھیں گے، کوئی کہنے والا کہے گا، پوچھنے والا پوچھے گا کہ کتنا ٹھہرے تم زمین میں سالوں کی گنتی؟ یعنی کتنے سالوں کی گنتی تم زمین میں ٹھہرے۔ اللہ تعالیٰ سوال کرے، یا فرشتے سوال کریں، ایسا بھی ہو سکتا ہے، اور آپس میں ایک دوسرے سے پوچھیں ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ تو دوسرے جواب دیں گے لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ کہ ہم ٹھہرے ایک دِن یا دِن کا کچھ حصہ۔ فَسْــَٔلِ الْعَآدِّيْنَ شمار کرنے والوں سے پوچھو! وہی صحیح بتائیں گے، ہم نے تو شمار ہی نہیں کیا، ایسے معلوم ہوتا ہے کہ ساری دنیا کی زندگی ایک دِن میں اور آدھے دِن میں گزر گئی یعنی وہاں جا کر سارا نشہ ہرن ہو جائے گا جو آج سمجھتے ہیں کہ ہماری عمریں بڑی لمبی ہیں، ہمارا عیش کا زمانہ بڑا طویل ہے، وہاں جا کر ایسے معلوم ہو گا جیسے خواب وخیال تھا اور گزر

گیا۔ یادر کھیے، عزیزو! غفلت کی زندگی کا حال یہی ہوتا ہے، اس کا طول وعرض اس وقت تک ہی ہے جب تک یہ حاصل ہے، اور جب یہ ختم ہو جائے گی تو ایسے لگے گا جیسے خواب آیا تھا، گزر گیا، پھر خوشی عیش کے دن یاد نہیں رہیں گے، اور مصیبت آ کے ان سب کو فراموش کر دے گی، ہر چیز بھول جاتی ہے، غفلت کی زندگی کا طول وعرض کچھ نہیں ہے، جس وقت یہ ختم ہو جائے تو اس کے بعد ایسے معلوم ہوگا جیسے ایک انسان خواب میں کیا کیا مزے اُڑاتا ہے، لیکن جب آنکھ کھلتی ہے تو کچھ بھی نہیں، یہ وہی حساب ہے۔ قٰلَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِیْلًا پھر وہ کہنے والا کہے گا کہ ٹھیک ہے بھئی! یہ بات تو صحیح ہے کہ ہم بہت تھوڑا ٹھہرے، کاش! اس وقت سمجھ میں آ جاتا کہ دنیا میں تھوڑا رہنا ہے، اس وقت تو ہم سمجھتے تھے کہ شاید یہی دنیا ہے اور ہم یہاں سے کبھی زائل ہونے والے ہی نہیں، اور اپنے لیے دنیا میں تم دوام بنائے بیٹھے تھے۔ کہنے والا کہے گا کہ نہیں ٹھہرے تم مگر بہت کم مدت، لَّوْ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ: کاش! کہ تم اس بات کو جان لیتے۔

اِنسان کی تخلیق عبث حرکت نہیں

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا: عبث کہتے ہیں ایسے کام کو جس میں کوئی مصلحت اور حکمت نہ ہو، جس کو فضول حرکت کہا جاتا ہے، اور یہ عَبَثًا خَلَقْنَا کا مفعول لہ ہے، کیا پھر تم نے یہ گمان کیا کہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ ہم نے تمہیں عبث حرکت کے طور پر پیدا کیا ہے؟ اور عبث کو اگر عابثین کے معنی میں لے لیا جائے تو خلقنا کی ضمیر سے حال بھی واقع ہو سکتا ہے (نسفی وغیرہ)، کیا پھر تم نے یہ سمجھ لیا کہ ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے اس حال میں کہ ہم کوئی عبث حرکت کرنے والے ہیں؟ فضول حرکت کرنے والے ہیں؟ وَّاَنَّكُمْ اِلَیْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ: اور بے شک تم ہماری طرف لوٹائے نہیں جاؤ گے؟

اِثباتِ توحید اور رَدِّ شرک

فَتَعٰلَی اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ: پس بلند شان والا ہے اللہ جو حقیقی بادشاہ ہے، حقیقی مالک ہے۔ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ: کوئی معبود نہیں مگر وہی، رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِیْمِ: وہ عرشِ کریم کا رَبّ ہے۔ عرشِ کریم، عرشِ مجید، عرشِ عظیم تینوں طرح سے یہ لفظ قرآن کریم میں آیا ہے۔ وَمَنْ یَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ: اور جو کوئی پکارے اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود، لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ جس کے معبود ہونے پر اس کے پاس کوئی بُرہان نہیں، لَا بُرْهَانَ لَهٗ نہیں ہے کوئی بُرہان اس کے لیے بِهٖ اس کے الٰہ ہونے کی، بُرھان قطعی دلیل کو کہتے ہیں، فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ پس سوائے اس کے نہیں کہ اس کا حساب اس کے رَبّ کے پاس ہے۔ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ: بے شک بات یہ ہے کہ کافر فلاح نہیں پائیں گے، کافر کامیاب نہیں ہوں گے۔

وَقُلْ رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ: اور آپ کہہ دیجئے کہ اے میرے رَبّ! تو بخش دے، کس چیز کو بخش دے؟ مفعول محذوف ہے یعنی ہماری ہر قسم کی تقصیرات کو، گناہوں کو، کوتاہیوں کو تو معاف کر دے، اور تُو رحم کر۔ اغْفِرْ میں دفعِ مضرّت ہے، یعنی نقصان کی چیز کا دُور ہٹانا، اور ارْحَمْ کے اندر جلبِ منفعت ہے، یعنی فائدے اور نفع کی چیز کا حاصل کرنا۔ دنیا اور آخرت میں ہماری کوتاہیوں

سے درگزر کر، اور ہمیں ہر قسم کے نقصان سے بچا، اور ہمارے اوپر رحم کر، دنیا اور آخرت میں ہر قسم کی فائدے کی چیز ہمیں عطا فرما وَارْحَمْ کا یہ مفہوم ہوگا، وَاَنْتَ خَیْرُ الرّٰحِمِیْنَ اور تو بہترین رحم کرنے والا ہے، تمام رحم کرنے والوں میں سے اچھا رحم کرنے والا ہے۔

سورت کی ابتدا ہوئی تھی قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ سے، اور اختتام ہوگیا اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ پر۔ تو ابتدا اور انتہا سے یہ مضمون نکل آیا کہ مؤمن فلاح پائیں گے، کافر فلاں نہیں پائیں گے۔ اور درمیان میں یہ بات آئی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے کافروں کو جہنم میں سرزنش کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ میرے کچھ بندے تھے جو یہ دعا کرتے تھے: رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَیْرُ الرّٰحِمِیْنَ اور کافران کا مذاق اُڑاتے تھے، تو آخر میں اشارہ کردیا کہ اپنے اسی موقف پر ڈٹے رہو اور یہی دعا کرتے رہو۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ